شاہکار

وأشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمداً عبده ورسوله

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا

انسائیکلوپیڈیا

شاہکار

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کا

انسائیکلوپیڈیا

جلد اوّل

سید قاسم محمود

الفیصل ناشران و تاجران کتب
اردو بازار لاہور

سید قاسم محمود کی آخری کتاب

میاں محمد افضل

سمجھ نہیں آتی کہ بات کہاں سے اور کس طرح شروع کی جائے! ؏ نفس گم گشتہ می آیند جنید و بایزید ایں جا۔ جس پاک اور مقدس ہستی، پیغمبر ﷺ اعظم و آخر کی زندگی کے کسی ایک گوشے کے متعلق صرف ایک چھوٹا سا مضمون بھی کسی لکھنے والے کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور تادمِ آخر فخر کے لائق کارنامہ ہو سکتا ہو...... مقامِ محمود پر متمکن اُس عظیم ترین ہستی، سرورِ کونین، فخرِ موجودات رحمت العالمین، محسنِ انسانیت، ساقیٔ کوثر، شافع محشر، شرف آدمیت، فروغ بزم کائنات، وجود میں الکتاب، صاحب اسرارشش جہات، حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ کی سیرت کے ہر پہلو پر ایک انسائیکلوپیڈیا لکھ دینا کتنی بڑی سعادت اور بخشش کا کیسا شاندار ذریعہ بن سکتا ہے۔

دو بڑی جلدوں پر مشتمل سیرتِ طیبہ کے اس انسائیکلوپیڈیا کے مرتب اور مؤلف سید قاسم محمود (1928ء-2010ء) نے وہ کام کر دکھایا ہے جو عام طور پر سکالرز اور ماہرین کی پوری ٹیم طویل عرصے میں کیا کرتی ہے۔ کتاب کو دیکھنے اور پڑھنے سے اُن کی محنت، لگن اور عرق ریزی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ راقم الحروف کو ایک زمانے میں سید صاحب کو قریب سے کام کرتے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میرے خیال میں تو اپنی باشعور زندگی کا ہر لمحہ انہوں نے علم و دانش کی خدمت میں صرف کیا ہے۔ اُن کا مشن ہمیشہ یہ رہا کہ قیمتی سے قیمتی علمی معلومات (کتاب کے ذریعے) سب لوگوں کی دسترس میں لائی جائیں۔

اس مقصد بلکہ آدرش کی تکمیل کے لئے انیس سو ستر کی دہائی میں انہوں نے اپنے ادارہ (مکتبہ شاہکار) کے ذریعے بے شمار اعلیٰ اور نایاب کتابیں (جریدی اور جیبی تقطیع میں) شائع کیں، علاوہ ازیں خود بھی شاہکار اسلامی انسائیکلوپیڈیا اور انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا جیسی متعدد ضخیم اور وقیع کتابیں مرتب اور تالیف کر کے اردو زبان کے علمی سرمائے میں یادگار اضافے کیے۔ اس زمانے میں شاہ صاحب کے پاس لکھنے والوں کی ایک بڑی اچھی ٹیم ہوا کرتی تھی لیکن سچ یہ ہے کہ اصل کریڈٹ سید قاسم محمود صاحب کو ہی جاتا ہے کیونکہ ٹیم اور ادارے کے روحِ رواں وہی تھے اور سب کچھ ان ہی کی رہنمائی اور ہدایات کے مطابق ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انہی دنوں، جب ان کا ادارہ لاہور میں کام کر رہا تھا، میری بھی چند کتابیں شاہ صاحب نے شائع کیں۔ ان میں سے ایک کتاب ''قابوس نامہ'' (فارسی سے ترجمہ کردہ) پر مجھے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید مرحوم کی

طرف سے نہایت ہی حوصلہ افزا خط ملا۔ ڈاکٹر صاحب پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ صحافت کے بانی چیئرمین رہے ہیں اور علم و ادب کی دنیا میں اپنے والد (مولانا عبدالمجید سالک) کی طرح نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

خیر یہ بات تو محض ضمناً یاد آ گئی، لاہور میں شاہ صاحب کا ادارہ بڑے طمطراق اور بہترین رفتار کے ساتھ کام کر رہا تھا کہ اس کی ترقی اور نئے سے نئے تجربے دیکھ کر ان کے کئی حاسد اور نقال میدان میں آ گئے۔ اس دوران جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء بھی شروع ہو گیا، کئی قسم کی پابندیاں لگ گئیں، شاہ صاحب نے بحالتِ مجبوری رختِ سفر باندھا اور کراچی جا بسے اور زندگی کا ایک نیا اور غالباً مختلف دور شروع کیا۔ پھر یوں ہوا کہ وہاں بھی ناسازگاری حالات کی وبا پلیگ کی طرح پھیلی۔ شاہ صاحب ایک بار پھر لاہور واپس آ گئے اور ایک نئے عزم کے ساتھ نئے لاہور میں اپنا پرانا سفر شروع کیا۔ سچ اور حق یہ ہے کہ زندگی کے اِن آخری بارہ تیرہ سالوں میں بھی وہ اردو اور پاکستان کو بہت کچھ دے گئے۔ ان کی اپنی آخری سوغاتوں میں ایک یہ "انسائیکلوپیڈیا سیرت النبی ﷺ" بھی ہے، جس کی تکمیل تو اُن کی زندگی میں ہو گئی تھی لیکن اشاعت کی نوبت اب اُن کی وفات کے تین چار سال بعد آ رہی ہے۔ اگرچہ یہ ان کی آخری کتاب ہے لیکن قدر و قیمت میں سب سے اول ہے۔

پاکستان ایک ایسی تکون ہے جس کے دو زاویے اُردو اور اسلام ہیں۔ یہاں بہت سے مشہور لوگ ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے، سوتے جاگتے پاکستان کے وجود میں کیڑے نکالتے ہیں (اپنے کھانے کیلئے)۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں پاکستان نے ہی سب کچھ دیا ہے، پاکستان نہ ہوتا تو وہ کچھ بھی نہ ہوتے۔ پاکستان اُن لوگوں کے لئے ایک محسن مملکت ہے کہ یہ ان کی چراگاہ ہے لیکن چند (صرف معدودے چند) آدمی ایسے بھی ہیں جنھوں نے پاکستان پر احسان کیا ہے، ان میں سب سے بڑے محسن، پاکستان قائداعظم محمد علی جناح ہیں۔ (یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ ادب کی ترقی پسند تحریک کے دورِ عروج میں گہری وابستگی کے باوجود سید قاسم محمود، قائداعظم اور پاکستانی نظریات پر غیر متزلزل یقین رکھتے تھے، بلکہ قائداعظم کی زندگی پر ایک کتاب بھی لکھنی شروع کی تھی جو غالباً مکمل نہ ہو سکی)۔ ان کے علاوہ بھی چند افراد ہیں جو بہرحال سیاستدان نہیں ہیں۔ اسی طرح اردو کا معاملہ ہے، اردو کی وجہ سے بھی بعض لوگوں کو بڑے انعام و اکرام اور شہرت ملی ہے۔ لہٰذا اُردو اُن کی محسن زبان ہے، لیکن مرزا غالب، علامہ اقبال، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، شیخ سر عبدالقادر اور مولانا صلاح الدین جیسے بھی کچھ اشخاص ہیں جنھوں نے اُردو زبان کی توسیع اور ترقی میں یادگار کردار ادا کیا ہے۔ یہ لوگ اردو کے محسن ہیں۔ سید قاسم محمود کا شمار بھی ان کے کام کے پیشِ نظر اردو زبان کے محسنوں میں ہونا چاہیئے۔ درحقیقت وہ اپنے اسی مشن میں آخری دم تک ہمہ تن مصروف رہے۔ ایسے کمیاب انسانوں کو اپنے عظیم الشان کاموں کو منوانے کے لئے کسی صدارتی ایوارڈ یا تمغۂ حسن کارکردگی کی حاجت نہیں ہوتی، وہ ان چیزوں سے واقعی بالاتر ہوتے ہیں۔ کاش کوئی شخص سید قاسم محمود کی اُردو زبان کے لئے بے لوث خدمت اور علمی سرمائے میں زبردست اضافے کے سلسلے میں ان کے کام پر پی ایچ ڈی کر ڈالے۔

''مشک آنست کہ خود ببوید نا کہ عطار بگوید''۔ یعنی مشکِ نافہ وہ ہوتا ہے کہ اگر عطریات کی دکان میں کسی جگہ رکھا ہوا ہو تو وہ خود بتائے گا کہ میں مشکِ نافہ ہوں، عطر فروش کو اس کی نشاندہی کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اس کی خاص خوشبو تمام دیگر عطروں اور خوشبوؤں پر غالب ہوتی ہے۔ یہی بات موجود کتاب کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ سیرت طیبہ بذاتِ خود ایک خوشبو ہے، مشکِ نافہ سے بھی بڑھ کر! میرے خیال میں تو اس سے پہلے اس قسم کا کوئی انسائیکلوپیڈیا جو صرف سیرت رسول ﷺ کا احاطہ کرتا ہو، منصفہ شہود پر نہیں آیا۔ لہٰذا اسی بڑے پراجیکٹ میں بھی اولیت ایک بار پھر سید قاسم محمود کے حصے میں آرہی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی اس محنت اور کاوش کو قبول فرمالیں آمین!

سیرتِ نبوی ایک ایسا دلکش بلکہ دلربا موضوع ہے کہ اسلام کے اولین دور سے اب تک اس پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جارہی ہیں، یہ کتابیں تقریباً دنیا کی ہر زندہ زبان میں موجود ہیں اور یہ سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا۔ صرف اردو زبان میں اس موضوع پر ایک اندازے کے مطابق چار پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں اور اگر مختلف جرائد میں شامل مضامین شمار کئے جائیں تو تعداد آٹھ دس گنا بڑھ جائے گی۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اعلیٰ علمی تحقیق و تفحص پر مبنی کتابوں (جیسے مولانا شبلی و سید سلمان ندوی، محمد حسین ہیکل، قاضی سلمان منصور پوری، صفی الرحمٰن مبارکپوری، ڈاکٹر محمد طیب النجار کی کتابیں یا بنیادی کتب سیرت مثلاً ابن اسحاق یا ابن ہشام وغیرہ) کی تعداد جن کی سند سب حلقوں میں تسلیم کی جاتی ہو، زیادہ نہیں۔ پیشِ نظر کتاب (انسائیکلوپیڈیا سیرت النبیؐ) کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس کی ترتیب و تالیف میں جن ذرائع پر انحصار کیا گیا ہے وہ بہت ہی مستند ہیں، علاوہ ازیں بعض مضامین صاحب تالیف نے خود بھی تحریر کیے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا قسم کی کتابوں میں عام طور پر حروفِ ابجد کے مطابق چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے جاتے ہیں۔ اگر سیرت النبی ﷺ کے موضوع پر بھی یہ طریقہ استعمال کیا جاتا تو اس کی افادیت بہت محدود ہو کر رہ جاتی، چنانچہ سید قاسم محمود نے موضوعات کی بنیاد پر مضامین کو ترجیح دی ہے جو ایک بہتر طریقہ ہے اور اس طرح کتاب کی افادیت اور جامعیت بڑھ گئی۔ مثلاً آغاز حقیقت نبوت اور ارتقائے نبوت سے ہوتا ہے! درمیان میں حیاتِ طیبہ اہل بیت، صحابہ، صحابیات، حضور ﷺ کا تبلیغی مشن، خطابات، مکتوبات، غزوات، حدیث و سنت، مکالمات، شمائل، طب نبوی، معجزات، عدالت نبوی، فلسفہ کاملیت، سیرت نگاری کی تاریخ (یہ تو بہت ہی اہم مضمون ہے)، منظوم نذرانہ عقیدت وغیرہ آتے ہیں اور اختتام جامعیت عہد نبوی ﷺ پر ہوتا ہے۔ موضوعات کی اس ترتیب پر بحث ہوسکتی ہے (مثلاً احادیث کے مجموعوں کے مطابق صحابہ اور صحابیات کو آخر میں رکھا جاتا تو زیادہ مناسب ہوتا) لیکن کتاب کی ہمہ گیریت اور قطعیت ایک ایسا کھلا جادو ہے جو سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔

اس سلسلے میں جو سب سے اہم بات ہے وہ یہ ہے کہ اتنی عظیم کاوش سید صاحب نے کسی خارجی امداد کے بغیر صرف

اپنے محدود وسائل اور ذرائع سے پایۂ تکمیل تک پہنچائی ہے۔ تاہم اسناد اور حوالوں کی گونا گونی اور وسعت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ فاضل مؤلف نے یہ ایک معطر گلدستہ تیار اور پیش کرنے کے لیے کتنے بے شمار گلستانوں اور بوستانوں سے طرح طرح کے خوبصورت پھول چنے اور اکھٹے کیے ہیں۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے محنت کس قدر کی ہے۔

1947ء میں دلی کے قریب سادات کے قصبہ کھرکھودہ سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والا "ایک اداس، مایوس، لہولہان، قافلہ (جس میں اُن کے عزیز و اقارب قتل ہو گئے تھے) سے بچھڑا تنہا" انیس سالہ قاسم علی، سید قاسم محمود بننے تک زندگی کی کئی دشوار راہوں سے گزرا، لیکن کسی مرحلے پر علم و دانش اور تحقیق کے لئے ان کا جذبہ کمزور یا سرد نہیں ہوا۔ آزمائشوں اور امتحانوں بلکہ ابتلاؤں کے باوجود اُن کی پاکستانیت اور اسلامیت میں کبھی ڈنٹ نہیں پڑا۔ چنانچہ موجودہ کتاب کے تالیفی پہلوؤں میں بھی یہی رنگ غالب نظر آتا ہے اور یہ خصوصیت کوئی معمولی چیز نہیں۔ خونِ جگر کے ساتھ ساتھ جذبہ تحقیق اور اخلاص بھی ہو تو نقش ہمیشہ پائیدار اور کامل ہوتا ہے۔ اس جامع انسائیکلوپیڈیا کی تالیف میں بھی یہی حقیقت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ سید صاحب نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں جو یہ ایک نقش تخلیق کیا ہے وہ ایک پائیدار نقش ہوگا اور شاندار پذیرائی حاصل کرے گا۔

انسان مٹ جاتا ہے لیکن اس کی محنت، لیاقت اور اخلاص کے نقوش آنے والی نسلوں کی منفعت اور رہنمائی کے لیے باقی رہتے ہیں۔ اجتماعی سطح پر بڑی قومیں اپنے نقوش چھوڑ جاتی ہیں اور انفرادی سطح پر یہ کام وہ انسان کرتے ہیں جن کی شخصیت، لیاقت اور تخلیقی صلاحیت عام انسانوں سے بہت بلند ہوتی ہے۔ اسی چیز کو علمائے تمدن، اجتماعی یا انفرادی میراث کہتے ہیں۔ چنانچہ قارئین کرام ہزاروں صفحات پر مشتمل جو علمی، ادبی اور تحقیقی سرمایہ (جس میں سب سے آخری مگر بہترین میری نظر میں انسائیکلوپیڈیا سیرت النبی ﷺ ہے) سید صاحب نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے وہ ایک ایسا ورثہ ہے جو باقی رہنے والا ہے کیونکہ اس کی ضرورت رہے گی، پاکستان کو آنے والی نسلوں کو بلکہ سب لوگوں کو۔

اپریل 2014ء

ابتدائیہ

سرورِ کائنات، پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر اردو میں سینکڑوں کتب شائع ہو چکی ہیں مگر ہر کتاب میں سیرت نبوی ﷺ کا کوئی نہ کوئی پہلو تشنہ رہ گیا۔ اس خامی کو سید قاسم محمود صاحب مرحوم نے شدت سے محسوس کیا۔ آپ تصنیف وادارت کا خداداد ملکہ رکھتے تھے۔ سوامرِ ربی سے یہ منصوبہ بنا کہ ایسا ''سیرت انسائیکلوپیڈیا'' مرتب کیا جائے جس میں نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ سے وابستہ ہر خیال، ہر جذبہ، ہر واقعہ، ہر معلومات اور ہر پہلو سمٹ کر آ جائے۔ یہ ایک انقلابی منصوبہ تھا اور بڑی گہرائی ومحنت کا طلب گار!

اس خیال سے والد گرامی مرحوم آہستہ آہستہ سیرت نبوی ﷺ سے متعلق کتب وجرائد جمع کرنے لگے۔ بیرونِ ملک سے بھی کتب منگوائی گئیں۔ جب سارا تحریری سرمایہ جمع ہو گیا، تو انسائیکلوپیڈیا سیرت النبی ﷺ کی تصنیف وتالیف کا مرحلہ شروع ہوا۔ قطرہ قطرہ کر کے ہزارہا کتب وجرائد کا بیش قیمت جوہر سیرت انسائیکلوپیڈیا میں کشید کر دیا گیا۔ یہ اپنی ہیئت و نوعیت کے اعتبار سے کتبِ سیرت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

مرحوم نے یہ بھاری بھرکم ذمہ داری بڑی جانفشانی، دل سوزی اور والہانہ جذبے سے نبھائی۔ سو یہ کتاب ان کے عشق نبوی ﷺ کی پرتو بن گئی۔ حضور اکرم ﷺ سے قاسم صاحب کی محبت مثالی تھی۔ وہ انسان دوست فنکار تھے، مگر اپنے نبی ﷺ کی شان اقدس پر انھوں نے کبھی متعصب لوگوں سے سمجھوتہ نہیں کیا، بلکہ انہیں سرِ عام للکارا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے:

قاسم صاحب اپنے قصبے، کھر کھودہ (ضلع سونی پت، بھارت) میں تیسری جماعت میں زیرِ تعلیم تھے۔ کلاس میں 90 فیصد ہندو طلبہ تھے بقیہ مسلمان۔ ایک دن ہندو استاد نے ذات اقدس ﷺ پر حملہ کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر مرحوم تڑپ اٹھے۔ انھیں اتنا غصہ آیا کہ اپنی تختی اس نابکار کو دے ماری اور استاد کا سر پھٹ گیا۔ ہندو طلبہ نے مار مار کر والد محترم کو زخمی کر دیا۔ انھوں نے فاخرانہ غرور کے ساتھ یہ مصیبت برداشت کی۔

انسائیکلوپیڈیا سیرت النبی ﷺ میں حیات طیبہ اور تعلیمات سے متعلق کوئی پہلو شاید ہی رہ گیا ہو۔ کتاب کی قلمی خاصیت یہ ہے کہ اسے عام پاکستانیوں کی خاطر قابلِ فہم اور سادہ انداز میں لکھا و مرتب کیا گیا۔ مدعا یہ تھا کہ ہر پاکستانی

حیاتِ مبارکہ کے سبھی مفید واعلیٰ ترین پہلوؤں سے شناسا ہو کر اپنی زندگی بھی انھی بلند تر اصولوں کے مطابق ڈھال سکے۔

جناب محمد فیصل نے بھی اس مقدس ومبارک کتاب کی تزئین وآرائش کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ سے اپنی عقیدت ومحبت کا مظاہرہ کیا اور سیرت انسائیکلوپیڈیا کو سینکڑوں خطاطی کے رنگین نمونوں، نقشوں، خاکوں اور شجروں سے مزین کیا ہے۔ ان دیدہ زیب اور معلومات افزا نقشہ جات نے انسائیکلوپیڈیا سیرت النبی ﷺ کی شان دوبالا کر دی اور اس کی اہمیت کو چار چاند لگا دیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی سادگی وقناعت کا مرقع ہے۔ اس کتاب کو بھی سادگی کی خوبصورتی و شوکت سے متصف کرتے ہوئے دو رنگا شائع کیا گیا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا سیرت النبی ﷺ کو خاص طور پر بڑے فونٹ میں شائع کیا گیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ بوڑھے، بچے جوان، خواتین......غرض ہر پاکستانی اس قیمتی خزانے کی برکات سے بہ آسانی استفادہ کر سکے۔

آج سیرت النبی ﷺ کو جتنا عام کرنے کی ضرورت ہے، پہلے کبھی نہ تھی۔ مغربی تہذیب کی یلغار پاکستانی مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات سے دور کر رہی ہے۔ اسی باعث بہت سے پاکستانی مادہ پرستی کے جال میں پھنس کر دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو چکے ہیں۔ ہر قسم کی بدی ان کے دل ودماغ میں رچ بس چکی۔

ایسے گمراہ کن ماحول میں یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر پاکستانی خصوصاً نوجوان نسل کو اسوۂ حسنہ کے زر وجواہر سے واقف کرایا جائے تاکہ وہ اپنی زندگیوں کو اعلیٰ اسلامی اقدار کے مطابق ڈھال سکیں۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ جب بھی حضور اکرم ﷺ کی سیرت وتعلیمات کا ذکر مبارک ہوتا ہے، انسانیت کے سبھی بہی خواہ، حتیٰ کہ غیر مسلم مفکر بھی انسانوں کو یہی رائے دیتے ہیں، پندرہ سو برس پیچھے کی طرف دیکھو، ورنہ بہت سے جدید معلمین کا کہنا ہے کہ ماضی کی سمت نہیں حال کو دیکھ اور مستقبل کا سوچ!

حقیقت یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی بابرکت ذات وصفات کا قلمی تذکرہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ مگر سید قاسم محمود اور محمد فیصل صاحب نے حتی المقدور کوشش کی کہ سیرت نبوی ﷺ کے بے پناہ سمندر کو بہ صورت اس کتاب کوزے میں سمیٹ دیا جائے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اگر اس میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اسے دور کیا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اپنے محبوب وحبیب ﷺ کے صدقے ہم سب کو سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

سیّد عاصم محمود

سیرت نبوی ﷺ
عالمی شہرت یافتہ شخصیات کی نظر میں

☆ سر تھامس کارلائل (انگریز ادیب و مؤرخ): حضرت محمد ﷺ ایک عظیم خاموش روح تھے۔ خلوص نیت اور احساس سے متصف! آپ ﷺ دنیا کو نیک راہ دکھلانے والے آفتاب تھے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کو یہ ذمہ داری سونپی۔ مغربی دانشوروں نے آپ ﷺ کے متعلق جو جھوٹ بولے، ان کی بدولت وہی ذلت و رسوائی سے دوچار ہوئے۔

(On Heroes, Hero. Worship and the Heroic in History, P 60-1, 1846)

☆ واشنگٹن ارونگ (امریکی ادیب و مؤرخ): آپ ﷺ منکسر المزاج اور سادہ شخصیت کے مالک تھے۔ روزمرہ معاملات میں انصاف پسند تھے۔ امیر غریب، کمزور طاقتور، عام و خاص، سبھی کے ساتھ انصاف کرتے۔ خوش خلقی کے سبب عام لوگ آپ ﷺ پر جان دیتے۔ آپ نے کوئی جنگ ذاتی شہرت یا جھوٹے فخر کی خاطر نہیں لڑی۔ جب آپ ﷺ کو زبردست قوت حاصل ہوگئی، تب بھی سادہ طرز زندگی اپنائے رکھی۔ حتیٰ کہ کسی محفل میں لوگ اٹھ کر استقبال کرتے، تو آپ ﷺ برا مناتے۔

(Life of Mahomet, P 192-3, London, 1889)

☆ ایڈورڈ گبن (برطانوی مؤرخ): شہنشاہوں جیسی شان و شوکت حضرت محمد ﷺ کو چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ اللہ کے رسول ﷺ معمولی گھریلو کام بھی خود انجام دیتے...... آگ جلاتے، فرش صاف کرتے، بکریوں کا دودھ دوہتے اور اپنے ہاتھوں سے جوتے و کپڑے مرمت کرتے۔ آپ تارک الدنیا یا راہب ہرگز نہیں تھے، بس رہن سہن انتہائی سادہ رکھا۔

(History of the Saracen Empire, London, 1870)

☆ جارج برنارڈ شاہ (برطانوی ڈرامہ نگار و ادیب): اگر آج حضرت محمد ﷺ دنیا کے حاکم بنا دیئے جائیں، تو مجھے یقین ہے کہ آپ ﷺ سارے عالمی مسائل حل کر دیں گے۔ یوں دنیا امن و محبت کا مرکز بن جائے گی۔ میں سمجھتا ہوں آپ کے مذہب کو یورپ آج اپنا سکتا ہے اور کل بھی۔

(The Genuine Islam (Magazine),Singapore, vol 1, No8, 1936)

☆ ایچ۔جی ویلز (مشہور امریکی ادیب): اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد ﷺ خدا کے سچے نبی تھے۔ آپ ﷺ کی بدولت صحرائے عرب میں ایسا شاندار معاشرہ تخلیق ہوا جس میں ظلم وستم اور معاشرتی جبر کا نام ونشان نہ تھا۔ دنیا والوں نے ایسا معاشرہ، بھلا پہلے کب دیکھا تھا؟

(The Out line of History, Part, II, P 269-1920)

☆ ول ڈیوران (ممتاز امریکی مؤرخ): حضرت محمد ﷺ غریب خاندان میں پیدا ہوئے۔ تب کسی کے وہم وگمان میں نہ تھا کہ آپ ﷺ اپنی قوم تخلیق کریں گے جو ایک صدی کے اندر اندر آدھی دنیا فتح کرلے گی۔ عربوں کی فتوحات زمانہ قدیم کا سب سے غیر معمولی واقعہ ہے۔ اگر ہم اثر ورسوخ کو عظمت کا پیمانہ بنائیں تو ماننا پڑے گا کہ حضرت محمد ﷺ تاریخ انسانی کی عظیم شخصیات میں عظیم ترین ہیں۔

(The Story of Civilization, 1935-75)

☆ سٹینلے لین پول (برطانوی مؤرخ): آپ ﷺ شیریں زبان تھے اور خوش دلانہ گفتگو کرتے۔ جو آپ ﷺ کو دیکھتے احترام سے ان کے سر جھک جاتے۔ جو قریب آتے، آپ سے محبت کرنے لگتے۔ جو آپ ﷺ کا ذکر فرماتے، یہی کہتے ''ہم نے آپ ﷺ جیسا پہلے کبھی نہیں دیکھا اور نہ بعد میں۔'' آپ ﷺ کم گو تھے مگر کلام کرتے تو پُریقین لہجے میں اور جو آپ کی باتیں سنتا، کبھی بھلا نہ پاتا۔

(The Speeches and table talk of the Prophet Muhammad, 1882)

☆ گاندھی جی (ہندوستانی رہنما): مجھے یقین ہو چکا کہ اسلام تلوار کے بل پر نہیں بلکہ حضرت محمد ﷺ کے عظیم کردار کی بدولت پھیلا۔ آپ کامل سادگی سے مالا مال تھے۔ ہمیشہ حیا وانکسار سے پیش آتے۔ وعدے کے پکے تھے اور با اصول! ہر ایک سے محبت کرنے والے، دلیر تھے اور بے خوف۔ آپ ﷺ کو خدا اور اپنے مشن پر پختہ ایمان تھا۔

(Young India (Periodical) September 23, 1924)

☆ الفانسوی لامارتین (مشہور فرانسیسی مفکر): اگر مقصد کے عظیم الشان پھیلاؤ، وسائل کی انتہائی کمی اور حیران کن نتائج انسانی جوہر قابل کی تین بڑی نشانیاں سمجھی جائیں، تو تاریخ انسانی میں کوئی شخصیت عظیم حضرت محمد ﷺ کا مقابلہ کرنے کی مثال قائم نہیں کرسکتی۔

(History of Turkey, P 154, 1855-7)

☆ کیرن آرمسٹرانگ (برطانوی ماہر تقابل مذہب): آپ ﷺ نے انتہائی مخالفانہ ماحول میں اسلام کی تبلیغ جاری رکھی اور بت پرستی کو ختم کر کے دم لیا۔ آپ ﷺ کی زندگی بجائے خود ایک معجزہ ہے۔

(Muhammad- A biography of the Prophet, Page 53-54)

☆ اینی بیسنٹ (ہندوستانی مصلح): جو بھی سیرت نبوی ﷺ کا مطالعہ کرے، خود بخود آپ ﷺ کی عزت کرنے لگتا ہے۔ میں جب بھی سیرت محمد ﷺ کا مطالعہ کروں، میری روح سرشار ہو جاتی ہے۔

(The life and teaching of Muhammad, Madras, 1932)

☆ سروجنی نائیڈو (ہندوستانی رہنما و شاعرہ): آپ ﷺ نے پہلے ایسے مذہب کی بنیاد رکھی جس نے جمہوریت کو اپنایا۔ مسجد میں جب شاہ و گدا جمع ہوں، تو اسلامی جمہوریت عروج پر ہوتی ہے۔ تب بادشاہ اور فقیر شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر خدا کے حضور جھکتے اور پکارتے ہیں کہ خدا سب سے بڑا ہے۔

(Ideals of Islam, Speeches and writing, Madras, 1918)

☆ ایس۔ پی۔ سکاٹ (مشہور امریکی دانشور): اگر مذہب کا مقصد یہ ہے کہ اخلاقیات کی تعلیم دی جائے، شر کا خاتمہ ہو، انسان دلی راحت و سکون پائے، انسانی عقل میں بڑھوتری ہو، اور روزِ حشر نیک کام نجات کا ذریعہ بن جائیں، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت محمد ﷺ خداوند تعالیٰ کے نبی تھے۔

(History of the Moorish Empire, in Europe, P 126,1910)

سوانحی خاکہ: سید قاسم محمود

تاریخ پیدائش: 17 نومبر 1928ء مولد: کھرکھودہ، ضلع روہتک۔

1940ء۔ پرائمری وظیفے کا امتحان۔ پنجاب بھر میں اول۔

1944ء۔ مڈل سکول کے امتحان میں پنجاب بھر میں اول۔

1946ء۔ ملازمت ہمدرد دواخانہ دہلی، مکتبہ جامعہ دہلی۔

1947ء۔ میٹرک کا امتحان۔ انبالہ ڈویژن میں اول۔

1948ء۔ زمانہ ہجرت۔ زندگی کا سنہرا زمانہ۔ والٹن و باداملی ریفیوجی کیمپوں میں رضا کار۔ لکڑہارا۔ محکمہ بجلی کے لائن مینوں کا سیڑھی بردار معاون۔ اخبار فروشی۔ اخبار "زمیندار" میں چپراس گیری۔ مولانا ظفر علی خان، مولانا اظہر امرتسری اور مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش کا مددگار۔

1949ء۔ ماہنامہ "عالمگیر" (حافظ محمد عالم، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے ہمراہ) پبلشرز یونائیٹڈ، ریلوے بک سٹال (شیخ محمد اشرف، شیخ مبارک علی اور شیخ نصیر ہمایوں کے ہمراہ)۔

1950ء۔ پنجاب یونیورسٹی میں کلرک۔ ڈاکٹر ایم افضل، اور پھر اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے دفتر میں علامہ محمد شفیع کے ہمراہ۔

1951ء تا 1956ء۔ حکومت پنجاب کی مجلس زبان دفتری میں بطور مترجم۔ حلقہ ارباب ذوق کے تعلق سے افسانہ نگاری۔ تراجم اور تصنیف و تالیف کا آغاز۔

1949ء تا 1956ء۔ جزو وقتی صبح شام کی نوکریاں۔ مکتبہ جدید، گوشہ ادب، ریلوے بک سٹال، ماہنامہ ہمایوں ہفت روزہ اجالا ہفت روزہ قندیل، روزنامہ امروز، روزنامہ نوائے وقت۔

1956ء۔ نائب مدیر پندرہ روزہ صادق (سید عابد علی عابد کے ہمراہ)۔

1957ء۔ نائب مدیر ہفت روزہ "لیل و نہار" (فیض احمد فیض اور سید سبط حسن کے ہمراہ)۔

1958ء۔ نائب مدیر۔ سہ ماہی "صحیفہ" (جسٹس ایس اے رحمٰن اور سید عابد علی عابد کے ہمراہ)۔

1959ء تا 1964ء۔ سلسلہ تراجم۔ تصنیف و تالیف۔

1960ء۔ اپنے ادارے شیش محل کتاب گھر کا قیام۔ ماہنامہ "علم" کا اجرا۔

1964ء۔ مدیر اعلیٰ سیارہ ڈائجسٹ۔ "قرآن نمبر" اور رسول ﷺ نمبر مرتب ہوئے۔

1965ء۔ مدیر ماہنامہ "ادب لطیف"۔ مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا (فیروز سنز)۔

1966ء تا 1971ء۔ آفیسر انچارج "نیشنل بک کونسل"۔ مدیر ماہنامہ "کتاب"۔ "بزم کتاب" کی بنیاد (ابن انشا اور قدرت اللہ شہاب کی ہمراہی میں)۔

1969ء تا 1972ء۔ مینار پاکستان کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے "مینار پاکستان" کے چبوترے پر یادگار تختیوں کی تدوین، نقش گری کا کام انجام دیا (مختار مسعود کی ہمراہی میں)۔

1969ء۔ پاکستان کی سبز کتب یعنی "قائداعظم کا پیغام" مرتب و شائع کیا۔

1970ء۔ اردو کے سب سے بڑے انسائیکلوپیڈیا "معلومات" کا قسط وار اجرا۔

1971ء تا 1975ء۔ دوبارہ "سیارہ ڈائجسٹ" کی ادارت۔

1975ء۔ مکتبہ شاہکار لاہور کا قیام۔ شاہکار جریدی کتب، اسلامی انسائیکلوپیڈیا اور بے بی انسائیکلوپیڈیا کا قسط وار اجرا۔

1976ء۔ 1977ء۔ حکومت پنجاب کی "مجلس زبان دفتری" کے رکن کی حیثیت سے دفتری اصطلاحات کی لغت مرتب کی (پروفیسر محمود احمد خان، صوفی تبسم، سید وقار عظیم اور ڈاکٹر نذیر احمد کی ہمراہی میں)۔

1978ء۔ 1979ء۔ پندرہ روزہ "قافلہ" کا اجرا۔ سیاسی صحافت میں شرکت اور مارشل لاء کی سخت مزاحمت۔

1980ء۔ مارشل لاء سے شکست فاش۔ ہجرت ثانی: لاہور تا کراچی۔ ''عالمی ڈائجسٹ'' کے ادارہ تحریر میں شمولیت (زاہدہ حنا کی ہمراہی میں)۔
1981ء۔ کراچی میں ''شاہکار بک فاؤنڈیشن'' کا قیام۔
1982ء۔ روزنامہ ''نوائے وقت'' کراچی کی ڈپٹی ایڈیٹری۔
1983ء۔ ''اسلامی انسائیکلوپیڈیا'' یک جلدی کی اشاعت۔
1985ء۔ ماہنامہ ''سائنس میگزین کا اجرا'' ''انسائیکلوپیڈیا فلکیات'' اور ''انسائیکلوپیڈیا ایجادات'' کی اشاعت۔
1988ء۔ ''انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا'' قسط وار اشاعت۔
1990ء۔ ''علم القرآن'' کے عنوان سے اردو تفاسیر کا انتخاب، پارہ وار اشاعت۔
1995ء۔ ماہنامہ ''تشریح القرآن'' بیک وقت پانچ زبانوں (عربی، انگریزی، اردو، ہندی، گجراتی) میں قرآن مجید کی پارہ وار اشاعت۔
1996ء۔ ''شاہکار تاریخ انسانیت'' (قسط وار) اور شاہکار ''تاریخ پاکستان'' (قسط وار) کا اجرا۔
1997ء۔ ''انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا'' کی یک جلدی کی اشاعت۔
1998ء۔ لاہور سے کراچی آمد۔ مشیر مطبوعات اکادمی ادبیات پاکستان۔
1999ء تا حال۔ الفیصل کے زیر اہتمام اسلامی انسائیکلوپیڈیا اور انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا کی بار بار اشاعت۔
2001 تا 2004ء۔ سیرت نبوی ﷺ انسائیکلوپیڈیا کی تدوین۔
2005 تا 2008ء۔ ماہنامہ احیائے علوم، انسائیکلوپیڈیا اسلامی ثقافت، انسائیکلوپیڈیا تاریخ و تہذیب۔
2009ء۔ انسائیکلوپیڈیا قرانیات کی تصنیف۔
31 مارچ 2010ء۔ وفات۔

تخلیقات:

- ☆ دیوار پتھر کی (افسانوں کا پہلا مجموعہ)
- ☆ قاسم کی مہندی (افسانوں کا دوسرا مجموعہ)
- ☆ سید قاسم محمود کے افسانے (تیسرا مجموعہ)
- ☆ چلے دن بہار کے (ناول)
- ☆ پنڈت جلال الدین نہر (ناولٹ)

تصانیف:

- ☆ آدم و آدمی
- ☆ داستان گلگامش
- ☆ مذہب اور دیوتا
- ☆ قلوپطرہ ہفتم
- ☆ اصول سیاسیات
- ☆ ہٹلر کی خفیہ زندگی
- ☆ وادی دجلہ و فرات
- ☆ حکومت و فرعونیت
- ☆ داستان فرعون
- ☆ ابراہیمؑ سے یوسفؑ تک
- ☆ معاشیات کے جدید نظریے
- ☆ بے شمار مقالات

تراجم:

☆ Macbeth	Willam Shakespeare
☆ Othello	Willam Shakespeare
☆ Hamlet	Willam Shakespeare
☆ Julius Caeser	Willam Shakespeare
☆ Death of ivan llyich	Tolstoy
☆ Uni Vie	Maupassant
☆ The Gambler	Dostoevsky
☆ Wuthering Heights	Emily Bronte
☆ A Tale of Two Cities	Charies Dickens
☆ Justice	John Gaisworthy
☆ Bhowani Junction	John Masters
☆ Sea of Grass	Conrad Richter
☆ Captrain Caution	Conrad Richter0
☆ Lust for Life	Irving Stone
☆ Patterns of Culture	Dr. Ruth Benedict
☆ Waht ia s Classic?	T.S. Eliot
☆ The Great Ascent	Robert Bruner
☆ Psysiology of Sex	Dr. Kenneth Walker
☆ Poysiology of Sex	Dr. Kenneth Walker
☆ Immense Jounery	Prof. Loren Eiseley
☆ Aspects of Culture	Harry Shopiro
☆ Inventivity	Robert Mueller
☆ Contemporay Knowledge	C.E.M. Joad
☆ Autobiography	Shah of Ira
☆ Autobiography	Sophia Loren

فہرست مشمولات

پہلی کتاب:

نبوت اور وحی

نبوت: قرآن کی روشنی میں

تاریخی لحاظ سے عالم انسانیت کے تہذیبی ارتقا پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اس کی تمام تگ ودَو اور کامرانیوں کا حاصل ہمیشہ دو چیزیں رہی ہیں۔ ایک وہ کوششیں جو تلاش حقیقت کے سلسلے میں عقل وخرد کے بل بوتے پر اس نے از خود انجام دیں اور اس کے نتیجے میں فطرت کے رازہائے درونِ پردہ کا انکشاف ہوا۔ دوسرے فیضانِ ربوبیت کا وہ کرشمہ جس نے ہر دور میں اس کی روحانی و اخلاقی سطح کو رفعتیں عطا کیں، یعنی دریافت کی برکتیں اور وحی والہام کی وسعت گیری۔ یہی وہ دو محور ہیں جن کے گرد ہزاروں برس ارتقا کا عملیہ گھومتا رہا اور یہی وہ دو روشنی کے مینار ہیں، زندگی کے بحرِ بے کراں میں جن کی تابش سے تہذیب وتمدن کے سفینے رواں دواں رہے۔ طائفہ فکر ودانش کے گل سرسبد، جنھوں نے ماضی میں حقیقت کو پالینے کی سعی کی، کنفیوشس، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے نام سے مشہور ہوئے اور وہ گروہ پاک جس نے انسانیت کو تزکیہ و تحلیہ کی راہ دکھائی، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور آنحضرت ﷺ (صلوٰت اللہ علیہم اجمعین) کی صورت میں جلوہ گر ہُوا۔

تاریخ کے اس تجزیے سے محسوس ہوتا ہے کہ انسان کی سعی فکر وتعمق اور آسمانی فیوض وہدایت کی بہرہ مندی کی راہیں جدا جدا اور مختلف ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ یہ تجزیہ سراسر وہم وخیال کی فسوں سازی ہے ورنہ یہ دونوں دراصل ایک ہی حقیقت کے دو پَرتو اور انعکاس ہیں۔

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیاتِ علم وحکمت نے اپنے اظہار کے لیے تکوین وتشریع کی دو سطحیں پسند کیں۔ تکوینی سطح پر تو اس نے چاہا کہ انسان اپنی فکری وعقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور تجربہ ومشاہدہ کی مدد سے بالاتر حقائق تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے اور تشریعی سطح پر اس کے فیض ربوبیت نے یہ چاہا کہ ایسے انبیا ورُسُل کو دنیا میں مبعوث فرمائے جو اپنی تعلیمات وعمل سے انسان کو رُشد وہدایت کی راہ دکھائیں، اور اس کے اندر کے اس فائق تر انسان کو نکھاریں جو خدا سے ڈرتا ہے، خدا سے محبت رکھتا ہے اور اس حقیقت سے آشنا ہے کہ تسخیر کائنات کا راز کیا ہے؟ مزید برآں جو اس فلسفے سے آگاہ ہے کہ انسانی رشتوں کو کیوں کر عدل وانصاف کی بنیادوں پر استوار کرنا ممکن ہے۔

وحی وتنزیل اور دریافت ویافت کی فکری وعملی کوششوں میں کہیں تضاد یا تناقض نہیں پایا جاتا۔ دونوں میں ہم آہنگی اور اتحاد ہے، دونوں انسان کی فلاح و بہبود کے لیے برابر کوشاں رہتے ہیں، اور دونوں ہی کی غرض وغایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کسی نہ کسی طرح انسان کی تکمیل کی جائے اور اسے فطرت کا راز داں بنایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں عقل وخرد کے تقاضے اور مذہب ودین کے واجبات، دو متناقض پہلو ہونے کے بجائے اس کے تکمیلی اجزا ہیں جو انسانی فطرت کو اور جلا بخشتے ہیں اور اس کے مضمراتِ ارتقا کو ابھارتے ہیں، چاہے ان کا تعلق اس کی سیرت وکردار کے معجزات سے ہو اور چاہے ذہن وعقل کے خوارق سے۔ غرض ومقصد کے اتحاد سے قطع نظر ہم یہ کہیں گے کہ دونوں کے جوہر ومزاج ہی میں اتحاد ویگانگت پائی جاتی ہے۔ وحی وتنزیل کے داعیے اپنی آغوش میں عقل وخرد کے وہ تمام آفتاب چھپائے ہوئے ہیں جن کی روشنی میں تہذیب وتمدن کے قافلوں کو آگے قدم بڑھانا ہے اور اسی طرح عقل وخرد کے عملیہ میں وحی والہام کے تقاضوں کا بھی دخل ہے اور وہ وقت دور نہیں ہے جب تشریع اور تکوین کے دائروں کو آپس میں بہرحال ملنا اور متحد ہونا ہے اور جب آسمانی اور زمینی کوششوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھلنا ہونا ہے۔

سسرو کے نقطۂ نظر کی غلطی

نبوت کے بارے میں ہم سسرو کی اس تقسیم کو صحیح نہیں مانتے کہ اس کا تعلق کہانت اور اظہار حقیقت کے ان خانوں سے ہے جس میں خواب وبیداری میں بربنائے حدس آیندہ واقعات کی غیر واضح جھلک دیکھ لینا اور اس کے بل پر پیش گوئی کرنا ہے۔ ہمارے نزدیک نبوت اور کہانت وغیرہ میں رشتہ وتعلق کی نوعیت یہ نہیں کہ یہ کہانت کی ارتقائی شکل ہے۔ نبوت اللہ تعالیٰ کے فیضِ ربوبیت کا ایک مستقل بالذات مظہر ہے۔ اس کا تعلق تدبیر الٰہی کے کرشموں سے ہے اور اصلاح وتعمیر کے اس باقاعدہ نظام سے ہے جس کا منتہائے مقصود بنی نوع انسان کو زندگی کی ضروری اقدار سے روشناس کرانا اور اس کی فکری وعملی صلاحیتوں کو چمکانا اور سنوارنا ہے۔ یہ مظہر نہ تو بخت واتفاق کی اُعجوبہ کاریوں کا مرہونِ منت ہے اور نہ کسی غیر منطقی اور بے ڈھب مظہر فطرت کی ارتقائی شکل۔ اس کا تعلق عقیدہ وفکر کے ان تین اصولوں سے ہے:

1: اللہ تعالیٰ زندہ، قیوم اور رحمت وشفقت کی ارزانیوں کا سرچشمہ اور مصدر ہے۔ اس کا اپنے بندوں سے تعلق بیگانگی اور اجنبیت کا نہیں پیار اور محبت کا ہے جس کا اقتضا یہ ہے کہ وہ دنیا میں انسان کی اصلاح وتدبیر کا اہتمام کرے اور تاریخ کے ہر مناسب موڑ پر اس کی راہ نُمائی کرے، اسے روشنی عطا کرے اور اسے قابل ٹھہرائے کہ یہ اس کی صفات کا صحیح معنوں میں ترجمان ثابت ہو۔

2: یہ ذات حق اصلاح و تدبیر کے لیے ایسے نفوس قدسیہ کو چنے جو فکر و عمل کے لحاظ سے بالاتر اور فائق تر صلاحیتوں سے بہرہ مند ہوں' جو اپنے مخاطبین سے بہر حال اونچے ہوں اور شخصیت و کردار کے اعتبار سے اس لائق ہوں کہ ان سے ایمان و عقیدت کے رشتوں کو استوار کیا جا سکے۔

3: جس ماحول میں یہ حضرات تشریف لائیں' اس میں ایسے حل طلب اجتماعی و انفرادی مسائل و مشکلات کا ہونا ضروری ہے جنھیں یہ سلجھائیں اور ان کے جواب میں ایسی روش اختیار کریں جو معقول اور سمجھ میں آنے والی ہو۔

مظہر نبوت کی تشریح

مظہر نبوت کیا ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان سہ گونہ مقدمات کو تسلیم کر لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ حیّ و قیوّم ہے' فعّال و کریم ہے اور چاہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرے جس سے اسے جسم و جان کی شادمانیاں حاصل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی اس خصوصیت کو ہم ''صفت ربوبیت'' سے تعبیر کرتے ہیں جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس نے انسان کو پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے کہ یہ صدیوں زندگی کے تضادات سے نبرد آزما ہوتا رہے اور بغیر کسی ہدایت اور زندگی کے واضح نقشے کے ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے اور خود اپنی محنت' تجربہ اور عقل و خرد کی کاوشوں سے اپنے لیے راہ عمل دریافت کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ انسان آج بھی غاروں' جنگلوں اور صحراؤں میں بھٹکتا پھرتا اور تہذیب و تمدن کی شیمہ آرائیوں سے قطعی محروم رہتا۔ یہ اس کا کرم بے پایاں اور عنایت فزوں تر کا فیض ہے کہ اس نے تہذیب و ترقی اور اصلاح و تعمیر کے عملیہ کو انبیاء و رسل کے ذریعہ تیز تر کر دیا اور فکر و عمل کی ان تمام گمراہیوں سے انسان کو بچا لیا جو ممکن ہے زندگی کے کسی موڑ پر اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوتیں' اور بجائے اس کے انسان اپنے تجربات کی روشنی میں آگے بڑھتا' ان سب اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے نوع انسانی کی ہلاکت کا باعث بنتا۔

جب ہم نبوت و وحی کے سرچشمہ کی تعیین کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت و عنایت کا ذکر کرتے ہیں' تو اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اس کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے' انسان کی طرف سے نہیں' جس کا مطلب یہ ہے کہ ذہن اور حالات و واقعات کی کروٹیں یا انسانی جذبہ تحقیق و جستجو اور مجاہدہ و ریاضت کی کوششیں اسے جنم نہیں دیتیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بخششیں اور محبت اسے بروئے کار لانے کی ذمہ دار ہیں' لیکن اس کے یہ معنیٰ بھی نہیں کہ ہم پیغمبر کی اپنی عظیم تر ذہنی و عملی صلاحیتوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کے قلب و ذہن میں تحقیق حق اور سچائی کو ماننے کا جو بے پناہ جذبہ موجزن ہوتا ہے ہم اس کی نفی کرتے ہیں اور پیغمبر کو محض ایک غیر فعال' غیر متحرک اور ایسا آلہ تسلیم کرتے ہیں جو وحی والہام کی موجوں کو وصول کرتا اور انسانوں تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کے برعکس ہم پیغمبر کی ذاتی خوبیوں اور اس کی ذہنی و فکری بلندیوں کو مانتے ہیں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حالات و مسائل کے مطالعے سے خود اس کے دل میں بھی حق جوئی کے ولولے بیدار ہوتے ہیں اور شدت و اشتیاق میں اس درجہ بڑھ جاتے ہیں کہ آخرالامر یہی جستجو' ولولہ اور طلب و تلاش کی کوششیں اس کے اندر ان ذہنی صلاحیتوں کو چمکانے کا سبب بنتی ہیں' جن کی بدولت یہ اس لائق ٹھہرتا ہے کہ حق تعالیٰ کے عطا کردہ اس منصب کو قبول کر سکے اور وحی والہام کی روشنی میں بنی نوع انسان کی اصلاح و تعمیر کے فرائض سے عہدہ برآ ہو سکے۔

اس اہم اور بدرجہ غایت توجہ طلب موضوع سے ناانصافی ہو گی اگر ہم بحث کے اس مرحلے میں یہ نہ بتائیں کہ نبوت کی تشریح فارابی کے نظریۂ تخیل اور صوفیہ کی بولی میں مجاہدہ و ریاضت کی طرفہ طرازیوں سے کیوں نہیں ہو سکتی۔

اس لیے کہ وحی تخیل و کشف کے نتائج اور ان کی فطرت اور اسلوب سے بالکل مختلف شے ہے۔ دونوں میں اصولی اور بنیادی فرق یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں معروضیت سے بڑی حد تک تہی ہیں۔ دونوں کا تانا بانا متعین اور مخصوص عقائد و نظریات کی کارفرمائیوں سے تیار ہوتا ہے۔ جب کہ وحی و تنزیل یک سر معروضی حقائق کی ترجمانی کرتی ہے۔ اس میں معاشرے کے مادی تقاضوں' اجتماعی مشکلات اور تضادات کا حل تو موجود ہوتا ہے مگر اس کی حیثیت یہ نہیں ہوتی کہ یہ اپنے دور کے حالات و کوائف کے ردِ عمل کے طور پر وجود میں آئے۔ یہ اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے ایک مستقل بالذات حقیقت ہے جس کا سرچشمہ عنایت الٰہی کا فیض گسترانہ فعل و عمل ہے۔

ان میں اور وحی الٰہی میں دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ تخیل و کشف کی بلند پروازیوں کا بالعموم تعلق چونکہ موضوعیت سے ہوتا ہے' اس لیے ان کے حاصل کردہ نتائج کی حیثیت ایک فرد یا شخص کے اپنے تجربات و احوال اور اپنے حدود ذہنی کے تطابق سے زیادہ نہیں ہوتی' ان میں وہ جامعیت اور انسانی زندگی کے جملہ اصلاح طلب پہلوؤں کا استیعاب نہیں ہو پاتا' جسے وحی اپنی آغوش میں سمو لیتی ہے' جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وحی اپنے عملیہ کے اعتبار سے ہمیشہ کلیت کی حامل ہوتی ہے اور کشف و تخیل کے نتائج جزئیات کی سرحدوں سے آگے نہیں بڑھ پاتے۔

وحی و تنزیل اور تخیل و کشف کے نتائج میں تیسرا فرق حجت و استناد کا ہے۔ وحی اس لیے حجت و مستند ہے کہ اس میں خطا و لغزش کا احتمال نہیں ہوتا اور کشف و تخیل اس وجہ سے حجت و استناد سے عاری ہیں کہ خطا و لغزش کا ہدف و نشانہ بنتے رہتے ہیں۔

یہاں تک تو تقابل کی صورت یہ تھی کہ ہم نے تخیل و کشف کے نتائج پر ایک ساتھ غور کیا لیکن اگر مقابلہ صرف کشف اور وحی و تنزیل کے درمیان ہو تو ان میں چوتھا فرق جو ابھر کر نظر و فکر کے سامنے آتا ہے' یہ ہے کہ کشف کی ترکیب و ساخت میں چوں کہ موضوعیت و معروضیت کے دو گونہ عناصر ملے جلے رہتے ہیں اور اظہار کا طریق رمزیہ ہوتا ہے' اس بنا پر اس کی کئی تعبیریں ہو سکتی ہیں اور وحی کے معاملے میں یہ نہیں ہوتا۔ وحی ہمیشہ صاف' واضح اور متعین زبان و تعبیر کی حامل ہوتی ہے جس میں الجھاؤ' تضاد اور تعبیر کی کثرت و بوقلمونی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک وحی کے متعلق دوسرے اور تیسرے اصول کا تعلق ہے' اس کے لیے دلیل آرائی کی قطعی ضرورت نہیں' ان کی وضاحت و تشریح ہی ان کی حقانیت پر دلالت کناں ہے۔ مزید برآں ایسا ہوتا ہے کہ بسا اوقات سچائیاں اپنے نتائج کے اعتبار سے بجائے خود حجت و استناد کے ایسے معیار

قائم کر لیتی ہیں کہ جن سے انحراف ممکن نہیں رہتا۔ بیکن نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ حقیقت کا اثبات ضروری نہیں کہ منطقی صغریٰ کبریٰ کی ترکیب و ساخت ہی کا مرہون منت ہو۔ تجربہ اور نتائج کی استواری وصحت بھی بسا اوقات اثبات مدعا کا کام دے جاتی ہے۔ اگر انبیاؑ کی ذہنی سطح اپنے ہم عصروں سے اونچی نہ ہوتی' اگر ان کے کردار میں اعلیٰ درجے کی پاکیزگی اور بلندی نہ پائی جاتی اور اگر وہ پیش آمدہ مسائل کا صحیح صحیح حل پیش نہ کر پاتے تو نوع انسانی کی کوئی خدمت سرانجام نہ دے سکتے اور اپنے ہم زمانہ لوگوں میں اپنے لیے محبوبیت و پزیرائی کا وہ مقام ہرگز حاصل نہ کر پاتے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے نقوش قدم کی پیروی و اطاعت صدیاں بیت جانے کے بعد بھی انسانی سعادت کی معراج قرار پاتی۔ تاریخ نے اگر کچھ ناموں' شخصیتوں اور فکر و کردار کے سانچوں کو محفوظ رکھا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے دور میں فکر و تصور کی بلندی اور کردار و سیرت کی استواری و پاکیزگی کے ایسے نمونے پیش کیے ہیں اور انسانی معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کے لیے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں کہ تاریخ باوجود اپنی سرد مہریوں کے انھیں بھلا نہیں سکی اور یہی صورت حال مظہر نبوت کی تحقیق و اثبات کا قابلِ اعتماد پیمانہ بھی ہے۔ عنایت الٰہی کی ان ارزانیوں سے جو نبوت و رسالت کی اصطلاحوں سے تعبیر ہیں' انسان کی ذہنی و فکری شادمانیوں کا اگر اہتمام ہوا ہے اور ہر دور کے مسائل کی گتھیاں اگر اُنھوں نے سلجھائی ہیں اور تہذیب و تمدن کے قافلوں کو آگے بڑھایا ہے تو اپنے دعووں میں بلاشبہ یہ حضرات صادق تھے۔ انھیں حق بجانب ٹھہرانے کے لیے کسی مصنوعی تفلسف' منطق آرائی اور علم الکلام کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پیغام کی کامیابی' ان کی ذہنی و فکری بلندی اور کردار و سیرت کا غیر معمولی تفوق ہی وہ حقائق ہیں جو انھیں صداقت شعار قرار دینے کے لیے کافی ہیں۔

تصورِ نبوت کے بارے میں ڈاکٹر صبحی صالح کی حرفیت پسندی

جس طرح ہم نے تصورِ نبوت کے بارے میں سسرو کے اس نظریہ سے اختلاف رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ کہانت اور وحی کے دو خانوں میں تقسیم پزیر ہے' اور یہ بتایا ہے کہ نبوت کا اطلاق صرف ایک ہی متعین و مخصوص مظہر پر ہوتا ہے اور وہ مظہر وہ ہے جس کا تعلق عنایات الٰہی کی فیض رسانیوں سے ہے' اسی طرح ہمیں اجازت دیجیے کہ ڈاکٹر صبحی صالح کے اس عجیب و غریب نظریہ کی تردید کریں کہ پیغمبر کی ذات دو مختلف عناصر سے تعبیر ہے۔ ایک عنصر وہ ہے جو وحیٔ و تنزیل کے اشارات کو قبول کرتا اور لوگوں تک پہنچاتا ہے اور ایک وہ ہے جس کا تعلق پیغمبر کی بشریت سے ہے۔ جہاں تک پیغمبر کی اس حیثیت کا تعلق ہے جو وحی و تنزیل کا محل و گہوارہ ہے' اس میں بلاشبہ لغزش و خطا کا کوئی احتمال نہیں لیکن بشری تقاضے انھیں نہ صرف لغزش و خطا کا ہدف ہی قرار دیتے ہیں بلکہ کبھی کبھی گناہ اور ذنب کے ارتکاب پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔

انھیں تعجب ہے کہ رازی اور سید رشید رضا نے قرآن حکیم کے ان مقامات کی تاویل کیوں کی' جہاں پیغمبر کے لیے ''ذنب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے' جہاں بعض امور پر اسے ٹوکا اور متنبہ کیا گیا ہے' اور کھلے اور واضح الفاظ میں اس کے طرز عمل پر عتاب و سرزنش کا اظہار کیا گیا ہے اور طلبِ مغفرت کی تلقین کی گئی ہے۔

رازی اور رشید رضا کا کہنا ہے کہ قرآن حکیم کے اس اسلوبِ بیان اور ان مقامات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے' جہاں پیغمبر کے لیے ''ذنب'' کا لفظ بولا گیا ہے' جہاں اسے ایک خاص طرزِ عمل اختیار کرنے پر زجر و توبیخ کا سزاوار قرار دیا گیا ہے۔ کیوں کہ یہ تمام مقامات تاویل طلب ہیں اور سیاق و سباق کی رعایت' لغت و ادب کے صحیح مفہوم اور منصب نبوت کی عظمت و توقیر کی روشنی میں ان تمام آیات کی ایسی مناسب اور شایانِ شان تشریح ممکن ہے جس سے کہ پیغمبر کی عصمتِ کردار پر حرف نہ آنے پائے اور ذات پیغمبر بدستور انسانی ہدایت و راہ نُمائی کا مینار بنی رہے۔ ہمیں رشید رضا اور رازی کے موقف سے پورا پورا اتفاق ہے۔

ہمارے نزدیک صبحی صالح نے نبوت کے بارے میں جس طرح استدلال کا سہارا لیا ہے وہ کھری حرفیت پسندی پر مبنی ہے اور اس بصیرت' عمق اور منطق سے قطعی محروم ہے جس سے نبوت کے فہم و ادراک میں مدد لینا چاہیے۔ قرآن حکیم کی رو سے نبوت کیا ہے؟ کن کن ذہنی و فکری خوبیوں اور بلندیوں سے آراستہ ہے اور نبی وحی و تنزیل کے کون کون سے خزائنُ اللّٰہ کے بندوں تک پہنچانے پر مامور ہے؟ اس سے قطع نظر کہ خود ان باتوں سے بھی اس کی حیثیت کا تعیّن ہوتا ہے' اس کی ذات پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے کہ انسانی معاشرہ میں اس کا کردار کیا ہے۔ کیا اسے لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے نہیں بھیجا جاتا؟ کیا اس کی ذمہ داریوں میں یہ بات داخل نہیں کہ یہ فرد و معاشرہ کو گناہ و معصیت کی راہ سے ہٹا کر صحت و صواب اور تزکیہ و تحلیہ کی راہ پر ڈالنے کی سعی بلیغ فرمائے؟ ان میں شر اور بغاوت کے جذبات کو فرو کرنے کی کوشش کرے اور اطاعت و پیروی کی روح پھونکے؟ انھیں فکر و عمل کی پاکیزگی بخشے اور اس لائق ٹھہرائے کہ اس عالمِ شر و فساد میں نیکی کا پرچم اونچا رکھیں۔

اگر ہمارا یہ تجزیہ صحیح ہے اور پیغمبر کا اجتماعی کردار ان تمام تقاضوں کو امکان کی حد تک پورا کرنے کا ذمہ دار ہے تو پھر اس کی حیثیت یہ تو ہرگز نہ ہونی چاہیے کہ یہ گناہ اور معصیت کے اثرات سے اپنا ہی دامن بچا نہ سکے اور احکام الٰہی یا منشائے الٰہی کا چلتا پھرتا نمونہ اور ترجمان بننے کے بجائے ادبدا کر خود بھی ادنیٰ خواہشات کے گڑھے میں کود جائے۔ پیغمبر کے بارے میں یہ بدگمانی' بدذوقی اور ذات پیغمبر سے بیگانگی پر مبنی ہے۔ پیغمبر کا وجود کسی نوع کی ثنویت کا متحمل نہیں ہوتا۔

اس حرفیت پسندی کے علاوہ جس نے نبوت کی وحدت کو دو خانوں میں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے' ڈاکٹر صبحی صالح کے طرز استدلال میں خامی دو وجہ سے ابھری ہے۔ ایک تو انھیں یہ معلوم نہیں کہ بشریت کے حدود و ارتقا کہاں سے کہاں تک وسعت پزیر ہیں' اور دوسرے ان کی نظر وحی کی ضوفشانیوں سے ناآشنا ہے۔ جہاں تک انبیا کی بشریت کا تعلق ہے اہل علم کے حلقوں میں اس میں دو رائیں نہیں پائی جاتیں۔ قرآن حکیم نے بار بار ان کی بشریت کا اقرار کیا ہے۔ اقرار ہی نہیں کیا' اس پر زور دیا ہے اور اسے ایک مسلمہ عقیدہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے' اور مشرکین مکہ کے اس استعجاب و انکار پر کہ کیا بشر رسول ہوسکتا

ہے یہ بتایا ہے کہ بشر ہی کو یہ زیبا ہے کہ وہ منصب نبوت پر فائز ہو سکے کیوں کہ بصورت دیگر اس کی زندگی عالم بشری کے لیے نمونہ واسوہ کیوں کر قرار پا سکتی ہے؟

نقطۂ اختلاف یہ امر ہے کہ بشریت کے مضمرات ارتقا متعین اور محدود ہیں اور کیا بشر کے معنی صرف اکل وشرب کی عادی اور انسانی کمزوریوں کی حامل مخلوق ہی کے ہیں' یا رشد واصلاح اور تعلیم وتزکیہ اور مجاہدہ وریاضت کی خوبیوں سے اس مقام تک بھی اس کی رسائی ممکن ہے کہ جہاں یہ بشر ہوتے ہوئے بھی گناہوں سے اپنا دامن عمل بچا لینے پر قدرت حاصل کر سکے۔ یہی نہیں' جہاں اس کی حرکت وعمل کا محور صرف گناہوں سے باز رہنا اور مجتنب رہنا ہی نہ ہو بلکہ اس کی تلاش وجستجو اور دوڑ دھوپ کا مرکز یہ سوال قرار پائے کہ یہ کس حد تک خوب سے خوب تر کی طرف بڑھ سکتا ہے' کس حد تک حسن سے احسن تک ترقی کر سکتا ہے اور کس حد تک یہ اپنی اخلاقی وروحانی سطح کو بلند سے بلند تر فراز تک اچھال دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ہمارے نزدیک بشریت اپنے فکری وعملی ارتقا کے اعتبار سے کلی طور پر مشکک ہے' جس کے اوائل کا تعین تو ممکن ومعلوم ہے' انتہا کی تعیین نہیں کی جا سکتی۔ یعنی ہم نہیں بتا سکتے کہ اس کے فکر کی پرواز کن کن معجزات عقلی کا احاطہ کرے گی اور اس کی محبت خیر وحق اسے کردار وعمل کے کن نئے نئے آفاق سے روشناس کرائے گی۔ انبیا کی نسبت سے عصمت عمل وکردار کا تصور بشریت کے معمولی اور ابتدائی درجے کی غمازی کرتا ہے' جس پر بہت سے حکیم اور صوفی فائز رہے ہیں۔ انبیا کا وصف اس کے برعکس یہ ہے کہ وہ نہ صرف خود کامل ومعصوم ہوں بلکہ انسانوں کو کمال وخیر کی راہ دکھائیں۔ چنانچہ یہ حضرات صرف معصوم ہی نہیں ہوتے' خیر کا پیکر فعال بھی ہوتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایسے سرچشمۂ فیض کی ہوتی ہے جس سے ہمیشہ نیکی' سچائی اور خیر کی لہریں اٹھتی اور چھلکتی رہتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پیغمبر سے بھی سہو ونسیان اور لغزش فکر کا صدور ہو سکتا ہے لیکن اس لغزش فکر کی حیثیت یہ نہیں ہوتی کہ یہ گناہ اور نیکی میں سے اپنے لیے بتقاضائے بشری کوئی گناہ پسند کر لیتا ہے اور اس طرح اپنے منصب کو پورے طور سے ادا کرنے میں قاصر رہتا ہے۔ پیغمبر اور گناہ کا ارتکاب منطق کی اصطلاح میں متناقض بنفسہٖ کے مترادف ہے' کیوں کہ پیغمبر اگر عام انسانوں کی طرح گناہ گار ہو تو وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے پیغمبر نہیں ہو سکتا۔

پیغمبر کی غلطی کس نہج کی ہوتی ہے' اسے سمجھنے کے لیے ایک سائنٹسٹ' ایک طبیب اور ایک فقیہ کی مثال فکر ونظر کے سامنے لائیے۔ فرض کیجیے' ایک سائنٹسٹ اپنے معمل میں طبیعیات کے بعض قوانین کو عملی جامہ پہنانا چاہتا ہے اور اس سلسلے میں بسا اوقات بعض ایسے مفروضے اور مقدمات فرض کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے جو نتائج کے اعتبار سے صحیح ثابت نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے فکر وفہم کی یہ غلطی اس کے جذبۂ تحقیق کو روک دینے کا باعث نہیں ہوتی بلکہ اس جذبے کے لیے مہمیز ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح طبیب مریض کے علاج کے سلسلے میں مختلف دواؤں کو آزماتا ہے اور آخر کار ناکامی کی صورت میں مایوس نہیں ہو جاتا بلکہ صحیح نسخہ دریافت کر لینے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ یہی حال فقیہ کا ہے' وہ بھی جزئیات ومسائل کے حل وکشود کے لیے مختلف اصول جانچتا پرکھتا ہے' مختلف آیات واحادیث پر نظر دوڑاتا ہے اور تطبیق واطلاق کے ضمن میں بعض اوقات اجتہاد وفکر کی بے راہ روی کا مرتکب بھی ہو جاتا ہے۔ ان میں کسی کی غلطی بھی ایسی نہیں جو جرم' گناہ اور فن ومنصب سے غداری کہلائے۔ کیوں کہ فکر وعمل اور سعی وطلب کے عمل کا یہ خاصہ ہے کہ صحت وصواب کی تلاش میں انسان لغزش کا بھی شکار ہو جاتا ہے چنانچہ اس میں بلاشبہ ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سے ایک سائنٹسٹ' ایک طبیب اور ایک فقیہ مختلف زاویہ ہائے نظر سے دوچار ہوتا ہے اور پریشان ہو جاتا ہے کہ حصول مقصد کی خاطر یہ کس اصول کا اطلاق کرے اور معاملہ زیر بحث کو کس زاویۂ نظر سے دیکھے اور جانچے۔ اور پھر جب اس بارے میں ان سے کسی لغزش کا صدور ہو جاتا ہے جو بتقاضائے بشری ہونا چاہیے' تو یہ لغزش ایک اناڑی' جاہل اور احدی انسان کی لغزش نہیں ہوتی کہ اس پر مورد عتاب ٹھہرے۔ یہ لغزش ایک بیدار عقل' ایک بے قرار جستجو اور عالم وفقیہ کی لغزش ہوتی ہے جو آیندہ کامیابیوں کی تمہید بن جاتی ہے۔ یہی حال پیغمبر کی سعی خیر وجمال کا ہے۔

یعنی ایک پیغمبر معاشرے کی اصلاح یا اپنی روحانی تکمیل وارتقا کے سلسلے میں جب خوب سے خوب تر کی تلاش میں فکر واجتہاد کی کوششوں کا آغاز کرتا ہے تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ خوب تر کی بجائے خوب پر قناعت کر بیٹھے اور اولیٰ وافضل کو اختیار کرنے کے عوض مباحات ہی کو اپنا لینے میں مصلحت سمجھے۔ مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کی یہ لغزش اجتہاد وفکر جو فی نفسہٖ خیر اور بہت بڑی نیکی ہے' گناہ اور معصیت سمجھی جائے یا پیغمبر کے اس اختیار کو خواہشات نفس کی پیروی پر مبنی مانا جائے۔ پیغمبر نہ تو کبھی نفس کی سطح سے بولتا ہے اور نہ نفس کی سطح سے متاثر ہو کر کوئی قدم ہی اٹھاتا ہے۔ وہ اپنے عمل وکردار کے لیے جس قندیل سے روشنی حاصل کرتا ہے وہ رضائے الٰہی اور احکام الٰہی کی قندیل ہے جس کی لو کبھی مدھم نہیں ہونے پاتی۔

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰیo اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰیo﴾ (النجم: 3تا4)

''اور وہ خواہش نفس سے منہ سے نہیں بولتا' یہ قرآن تو وحی خداوندی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔''

وحی کا مفہوم

وحی سے ہماری مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس لائق سمجھتا ہے کہ اسے منصب نبوت سے بہرہ مند کرے تو اس کے قلب وضمیر اور وجدان وفکر کو وحی وتنزیل کے نور سے روشن کر دیتا ہے اور یہ وحی چوں کہ زندگی کے بارے میں رشد وہدایت کی حامل ہوتی ہے اور ان نکات ومعارف کی ترجمانی کرتی ہے' جن سے خیر وشر میں فرق وامتیاز کے خطوط ابھرتے ہیں' جن سے انسان میں ایک خاص طرز عمل اور متعین اسلوب اور فکر کی تخلیق ہوتی ہے اور کردار وبصیرت' اخلاق کے پاکیزہ سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ اس بنا پر وحی کے اس عمل کو ہم محض میکانکی عمل قرار نہیں دے سکتے کہ جس سے اصلاح' تعمیر اور روحانی ارتقا کا کام نہیں لیا جاتا۔ پیغمبر کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وحی والہام کی روشنی سے یہ خود بیگانہ رہتا ہے یا اس منصب سے اس کی اپنی زندگی متاثر نہیں ہو پاتی۔ وحی

تعلیم ہی نہیں تربیت بھی ہے' ابلاغ ہی نہیں عمل بھی ہے۔ اسی طرح اسے صرف پیغام ہی نہیں کہہ سکتے' اسے خیر و جمال کی اداؤں کی دل نوازی عطا کرنے والی ایک ہمہ جہت قوت سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس سے صرف پیغمبر کا نہاں خانۂ عمل ہی مستفید نہیں ہوتا' اس کے ساتھ سیرت اور روز مرہ معمولات کا ہر ہر گوشہ بھی جگمگا اٹھتا ہے' اس سے پیغمبر روشنی اور زندگی کے حقیقی راز سے آشنائی حاصل کرتا ہے اور اس نکتہ سے آگاہ ہوتا ہے کہ ایک کم زور اور ضعیف و ناتواں انسان توفیق الٰہی کی دست گیری سے کیوں کر گناہ' شر اور برائی پر فتح حاصل کر سکتا ہے اور ایک گناہ گار اور مجرم معاشرے کو کس طرح تقویٰ اور پاک بازی کی راہ پر ڈال دینے کی استطاعت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔

یہاں تک تصور نبوت و وحی کے منطقی لوازم کا تذکرہ تھا اور بحث و نظر کا اسلوب عموم و اجمال لیے ہوئے تھا۔ اب ہمیں قدرے تفصیلات سے تعرض کرنا ہے اور یہ بتانا ہے کہ اہل کتاب نے وحی و نبوت کے ظہور کو کس نظریے سے دیکھا اور اسلام نے اسے کیوں کر نکھارا اور واضح کیا۔ اس کے بارے میں کس کس غلط فہمی کو دور کیا اور کیوں کر فیوض ربوبیت کی اس روشنی میں اسے تکمیل و اتمام کی منزلوں تک پہنچایا۔ بات یہ ہے کہ وحی و نبوت کے مسئلے میں اختلاف کے کئی پہلو ہیں' اور اس کے باوجود یہودی' عیسائی اور مسلمان بظاہر سب انبیا علیہم السلام کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور نبوت مشترکہ مسلمہ کی حیثیت رکھتا ہے' مگر غور کیجیے تو پتا چلے گا کہ ذوق و ادراک کے فرق' اغراض و مقاصد کی بوقلمونی اور تاریخ کی ستم ظریفیوں نے اس اشتراک میں متعدد رخنے ڈال رکھے ہیں۔

سب سے پہلے انبیا کی فہرست پر ہی نظر ڈالیے' اس میں ایسے نام نظر آئیں گے جو ایک گروہ کے ہاں خاصے جانے بوجھے اور معروف ہیں تو دوسرا گروہ ان سے قطعی ناآشنا ہے۔ مثلاً قرآن حکیم نے حضرت ہودؑ' صالحؑ' شعیبؑ اور ذوالکفلؑ کا پیغمبر کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے' لیکن اسرائیلی ادبیات میں ان اسما سے وقوف و شناسائی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

اسی طرح عہد نامہ قدیم میں اشعیا کا نام آتا ہے' جس نے 769-693ق۔م میں اپنے کو پیغمبر کے نام سے پیش کیا۔ ارمیا کا ذکر ہوا ہے' جس نے شاہ یوشی یاہ کے عہد میں فرائض نبوت انجام دیے اور بارک نامی شخص کی تعلیمات جز و کتاب بنی ہیں' جو پہلے ارمیا کا کاتب تھا اور پھر منصب نبوت کا اہل سمجھا گیا۔ یہ اور اس نوع کے کئی نام اور ہیں جن سے اسلامی روایات کوئی جان پہچان نہیں رکھتیں۔ ناموں کے اختلاف کے علاوہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ نبوت کی حقیقت و جوہر سے متعلق بھی فکر و عقیدہ کا انداز ایک سا نہیں ہے تو اس سے اس مظہر اصلاح و ہدایت کے لیے کوئی مشترکہ اساس' رشتہ اور خصوصیت کا تعین از حد دشوار ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کی حدود کو وسیع تر کرنے میں بنی رائیل کی اس بدقسمتی کو بڑا دخل ہے کہ ان کے ہاں شروع ہی سے وحی و نبوت کی پہچان تصدیق کے لیے کوئی واضح اور اونچا داخلی یا خارجی پیمانہ پایا نہیں جاتا' جس کی وجہ سے عظیم منصب کے تقدس کو برقرار رکھنے میں مدد مل سکے۔

ہوا یہ کہ سقوط فلسطین کے بعد یہودیوں کے نقطۂ نظر میں ایک خوف ناک تبدیلی نے کروٹ لی۔ جب ان پر اجنبی اقتدار کی گرفت سخت ہوئی اور انھیں اپنے قدیم ماحول اور گرد و پیش سے نکل کر دوسری قوموں اور گروہوں کی غلامی کا جوا اپنی گردن میں ڈالنا پڑا تو اس سے ان کے قومی پندار و غرور کو سخت دھچکا لگا اور ان کا سب سے بڑا نصب العین یہ قرار پایا کہ اپنی تمام تر کوششوں کو فلسطین کی بازیابی کے مسئلے پر مرکوز کر دیں اور اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ نبوت و وحی کے کردار و عظمت کی سمتیں بدل گئیں۔

جہاں ابراہیمؑ' داؤدؑ اور موسیٰؑ ایسی بلند پایہ شخصیتیں اپنی غیر معمولی بصیرت و ادراک' اپنے سیاسی تدبر و شکوہ اور اپنے پیغام کی رفعتوں کی بدولت پیغمبر کی حیثیت سے منظر عام پر آئیں' وہاں ایسے لوگوں کو بھی اقلیم نبوت میں در آنے کا موقع ملا جن کا کارنامہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے اسرائیل کے قومی پندار کو اجاگر کیا' حادثۂ فلسطین پر نوحے ترتیب دیے اور فلسطین کے اقتدار کو بحال کرنے کی پیش گوئیاں کیں۔ فلسطین کی شکست اور اجنبی اقتدار و تسلط کے مسئلے نے یہودیوں کو اس درجہ دیوانہ کر دیا کہ یہ مذہب کی روح کو بالکل فراموش کر بیٹھے اور مخالفین کے خلاف معاندانہ جذبات نے ان سے دینی بصیرت کو اس حد تک چھین لیا کہ جس نے بھی ان کی قومیت کو ابھارا اور فتح و نصرت کے وعدوں کا اعادہ کیا' فلسطین پر دوبارہ قبضے کی پیش گوئی کی' بغیر سوچے سمجھے اسے نبوت کی مسند پر بٹھا دیا گیا' چاہے اس کے نوحوں' نعروں اور وعدوں میں کوئی جان نہ ہو' کوئی روحانی پیغام نہ ہو اور کسی معاشرتی مسئلے کا حل نہ پایا جائے۔ اس سے بڑھ کر چاہے اس کے کردار و عمل کے دامن پر فسق و فجور کے شرم ناک چھینٹے نمایاں ہوں۔ یہودیوں میں یہ بیماری یہاں تک بڑھی کہ انبیا کی فہرست میں چار سو حضرات ایسے پائے گئے ہیں جن کی پیش گوئیاں پوری نہ ہوئیں اور اس بنا پر انھیں جھوٹے نبی کے نام سے پکارا گیا۔

نبوت کے اس غلط تصور سے دو واضح نقصان پہنچے۔ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ سے مکالمہ و مخاطبہ کا یہ اسلوب و منہاج بدنام ہوا اور نبوت' وحی و تنزیل کی بلندیوں سے گر کر کہانت کی سطحوں پر آ پہنچی۔ دوسرے یہودیت ایک عالم گیر روحانی و اخلاقی دعوت و پیغام ہونے کے بجائے تنگ نظرانہ قومیت کی علم بردار بن گئی اور لطف یہ ہے کہ یہودی متکلمین اور حکما کی کوششوں کے باوجود آج بھی مذاہب عالم کی برادری میں یہودیت کا شمار ایک ایسے مذہب ہی کی حیثیت سے ہوتا ہے جس کی حدود نسل اور جغرافیہ کے تقاضوں سے آگے نہیں بڑھ پائیں۔

نبوت کی اس روایت سے کلیسا کا انحراف

غالباً تصور کی اس پستی کا یہ رد عمل تھا کہ کلیسا نے مسیح کو خدا یا لاہوت کے ایک اقنوم کی شکل میں پیش کیا۔ اس نے جب دیکھا کہ یہودی روایات میں نبوت کا منصب حد درجہ پستی لیے ہوئے ہے تو اسے یہ شایان شان نہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے محبوب پیر و مرشد کو پیغمبر کے روپ میں دکھائے۔ اس نے اس طرح ہزاروں برس کی اس رچی جمی روایت سے انحراف اختیار کیا۔ اول اول اس تصور کی تخم ریزی یوحنا کی انجیل نے کی' پال نے فلو (PHILO) کے رنگ میں اسے فلسفہ کا رنگ دیا اور کلیسا نے اس مصرع طرح پر تثلیث کی پوری غزل کہہ دی اور کہا کہ جب خداوند خدا نے دیکھا کہ اس مظہر خاص سے

جسے منصب نبوت سے تعبیر کیا جاتا ہے' انسان کی اصلاح و تکمیل کے تقاضے پورے نہیں ہو پاتے۔ یعنی گلستانِ انسانیت کی دیکھ بھال کا کام پوری طرح نہیں ہو پاتا' تو خداوند مسیح کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے کہ اس گلستان کی خود حفاظت و نگرانی کر سکے۔

یہ انجیل کے رنگ میں ایک تمثیل اور پیرایۂ بیان ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ پیغمبر بھیجنے کی جو رسم ہزاروں برس سے دنیا کی ہدایت و راہ نمائی کی خاطر چلی آ رہی تھی' نتائج کے اعتبار سے ناکام ثابت ہوئی' اس لیے اب اسے نئے تجربے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ذات گرامی جس نے پیغمبر اور نبی بھیجے تھے بہ نفسِ نفیس انسان کے روپ میں خود دنیا میں آئے اور انسانی مصائب و آلام کا مداوا کرے۔

بحث و تحقیق کے اس موڑ پر ہم یہ سوال پوچھے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے کہ کیا اس عجیب و غریب تجربے کی ناکامی کا اللہ تعالیٰ کو پہلے سے علم نہ تھا اور کیا اظہارِ ذات کے اس تجربے سے انسان کے شخصی و اجتماعی آلام کا قطعی خاتمہ ہو گیا ہے اور انسان نے تمام انواع کے دکھ درد سے نجات پالی ہے؟ کلیسا کے اس تصور کو اظہار ذات (SELF DISCLOSURE) یا تجسیم (INCARNATION) کے الفاظ سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے نقطۂ نظر سے لاہوت' تین اقانیم پر مشتمل ایک حقیقت کا نام ہے' جو باپ' بیٹا اور روح القدس کے نام سے مشہور ہیں اور ان میں رابطہ و تعلق کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ تین ہوتے ہوئے بھی ایک ہیں اور ایک ہوتے ہوئے بھی تین ہیں۔ ہم تثلیث کی منطق کو چیلنج کیے بغیر یہ کہیں گے کہ عقائد کا یہ اسلوب کلیسا کے حلقوں میں تو بلاشبہ سند قبول حاصل کر سکتا ہے کہ یہاں اس کے علاوہ اور بھی متعدد ایسی انوکھی باتیں ہیں جنھیں باور کیا جاتا ہے' مگر جہاں تک مسیح کے ان مخاطبین کا تعلق ہے جن کی اصلاح و ہدایت کے لیے یہ معبوث ہوئے ان میں اتنی استعداد ہرگز نہ تھی کہ وہ اس مابعد الطبیعی گورکھ دھندے کو سمجھ سکیں' بلکہ کہنا چاہیے کہ آج کا پختہ اور سائنسی شعور و ادراک بھی اس گورکھ دھندے کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے عیسائی دانش وروں نے اس کی ایسی توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو قابل فہم ہوں۔ ایل ہاڈگاسن (L.HODGOSON) کا کہنا ہے کہ مسیح کی تجسیم یا الوہیت کے پیکر میں ظہور کی تین صورتیں عقل و خرد کی گرفت میں آ سکتی ہیں:

(۱)...... یہ کہ انسان نے اللہ کے علم کُل میں مسلسل مشارکت کی ہو۔ تعبیر کے اس انداز کو اختیار کرنے میں یہ احتمال پنہاں ہے کہ شاید اسے عیسائیوں کا کوئی بھی مدرسۂ فکر قبول نہ کر سکے' کیوں کہ یہ اس عقیدے کے خلاف ہے جو لوقا کی انجیل میں درج ہے کہ ہمارا لارڈ صحیح معنوں میں انسان یا بشر کامل تھا۔

(۲)...... یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا لارڈ (ناقابلِ فہم طریق سے) علم کی اس نوعیت سے بہرہ مند ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے جو خدا کے ساتھ مخصوص ہے' لیکن انسان کے روپ میں جلوہ گر ہونے کی وجہ سے وہ پوری طرح علم کی اس نوعیت کا اظہار نہ کر سکا۔ یہ دراصل اناجیل میں ان مختلف فقرات کی تطبیق و توافق کی ایک شکل ہے' جن سے کہیں اس کی الوہیت کی طرف اشارہ ہے اور کہیں اس کی بشریت کی طرف۔

(۳)...... یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حدود تجسیم میں داخل ہونے کے معنی بشری تجربے سے دوچار ہونے کے ہیں' جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیح جب تک بشری روپ میں ہے' اس وقت تک وہ جسم و روح اور فکر و نفسیات کے اعتبار سے بشر ہی ہے۔

یہ انداز فکر تو اس دور کے عیسائی متکلمین کا ہے۔ خود قدیم عیسائی متکلمین بھی تجسیم اور تثلیث کو مان کر مسیح کے بارے میں یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ عالم لاہوت میں ان کا مقام کیا ہے اور تجسیم اپنے جلو میں خدائی کے کن پہلوؤں کو لیے ہوئے ہے۔ جسٹن (JUSTIN) کی یہ رائے ہے کہ تجسیم کے یہ معنی ہیں کہ مسیح کی ذات میں عقل و خرد مرکوز ہو گئی ہے' اور اس میں وہ مسیح کو منفرد نہیں مانتا بلکہ عقل و خرد کے اس ارتکاز کو سقراط' افلاطون اور ہیراکلیٹس میں بھی تسلیم کرتا ہے کیوں کہ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ کلمہ (LOGOS) کا مسکن و محل بفرق مراتب ہر شخص کا ذہن ہے۔

اسکندریہ کے مدرسۂ فکر کے بہت بڑے نقیب کلیمنٹ (CLEMENT) کا کہنا ہے کہ مبدأ اوّل زمان و مکاں سے بالا و منزہ ہے۔ اس کا کوئی حقیقی نام نہیں' یہ تعداد و عدد سے بھی پاک ہے۔ انسان اپنی نیکی کی وجہ سے بیٹے (یعنی مسیح) کی طرح ہو سکتا ہے لیکن خدا نہیں ہو سکتا۔ کلیمنٹ کے نزدیک بیٹے اور باپ میں فرق ہے' بیٹا کلمہ کی تجسیم ہے اور باپ بیٹے سے بہر حال بڑا ہے۔ اسی اسکندری فلسفے کے دوسرے عظیم شارح آریگن (ORIGEN) ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ باپ سرچشمہ وجود اور خالص روح ہے اور بیٹا اگرچہ خدائی صفات بھی رکھتا ہے مگر خدا ہرگز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اس بات کو جائز نہیں سمجھتا کہ براہ راست مسیح کے آگے دست دعا دراز کیا جائے۔ دعا اس کے نزدیک صرف خدا ہی سے مانگنی چاہیے۔

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یوحنا کے ابہام اور پال کی تصریحات سے کلیسا نے جو مسیح کی الوہیت کا عقیدہ گھڑا وہ محض علم و فضل کا تصنع ہے' ورنہ کلمہ' روح اور بیٹے کا لفظ محض تعبیر و تشریح کا ایک انداز ہے جس میں اس دور کے ذہنی و فکری پس منظر کی جھلک نمایاں ہے اور اس پس منظر کا تانا بانا کئی عوامل سے تیار ہوا ہے' جن میں ایک عیسائیت کا رومی علم الاصنام سے آشنا ہونا ہے اور دوسرا اس میں ان پڑھے لکھے یہودیوں کا داخلہ ہے جو (PHILO) کے حکیمانہ افکار سے متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ عیسائیت کی تعبیر ان افکار کی روشنی میں کی جائے۔ تیسرا عامل بائبل کی ذو معنی زبان اور محاورات ہیں' ان سب عوامل نے مل جل کر تثلیث و تجسیم کا مرقع تیار کیا اور ماحول کی مجبوریوں کو مدنظر رکھ کر اگر ان تصورات کا تجزیہ کیا جائے جو کلیسا کی روایتی ٹکسال سے ڈھل کر نکلے ہیں تو اس کا مطلب اس سے زیادہ سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت مسیحؑ کے عقیدت مندان کو بائبل میں مذکورہ انبیا کے مقابلے میں زیادہ اونچا' زیادہ بلند اور کامل دیکھنے کے آرزومند ہیں اور کیوں نہ ہوں جب یہودی روایات میں نبوت و رسالت کا منصب عظیم محض قومی تنگ نظری کا مظہر بن جائے اور پیغمبر کا مصرف صرف یہ رہ جائے کہ فلسطین کی بازیابی کی پیش گوئی کرے تو پھر ضروری ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کے ایسے اطلاق کی تلاش کی جائے جو نسبتاً وسیع اور عالم گیر ہو اور اس لائق ہو کہ انسانیت اس سے سکون حاصل کر سکے۔ (مولانا محمد حنیف ندوی)

نبوت کی حقیقت

1:......خداوندِ عالم نے جو ساری کائنات کا خالق، مالک اور فرماں روا ہے' اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصے میں جسے زمین کہتے ہیں' انسان کو پیدا کیا۔ اسے جاننے، سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں' بھلائی اور برائی کی تمیز دی' انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی' تصرف کے اختیارات بخشے اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

2:......اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوندِ عالم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمھارا اور تمام جہان کا مالک' معبود اور خالق میں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو نہ کسی دوسرے کے بندے ہو' اور نہ میرے سوا کوئی تمھاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمھیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے' دراصل تمھارے لیے ایک امتحان کی مدت ہے' جس کے بعد تمھیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمھارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمھارے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرو۔ جو ہدایات میں بھیجوں' اس کے مطابق دنیا میں کام کرو اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمھارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمھارے لیے ہر وہ رویّہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویّہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمھیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمھیں ابدی راحت و مسرت کا وہ گھر دوں گا' جس کا نام جنت ہے' اور اگر دوسرے کسی رویّے پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تمھیں آزادی ہے) تو دنیا میں تمھیں فساد اور بےچینی کا مزا چکھنا ہوگا' اور دنیا سے گزر کر عالمِ آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے' جس کا نام دوزخ ہے۔

3:......یہ فہمائش کر کے کائنات کے مالک نے نوعِ انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اولین افراد (آدم اور حوّا) کو وہ ہدایت بھی دے دی' جس کے مطابق انھیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اوّلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے' بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انھیں ان کا قانونِ حیات بتا دیا گیا تھا۔ ان کا طریقِ زندگی خدا کی اطاعت (یعنی اسلام) تھا اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ خدا کے مطیع (مسلم) بن کر رہیں' لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریقِ زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رویّوں کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے غفلت سے اسے گم بھی کیا اور شرارت سے اسے مسخ بھی کر ڈالا۔ انھوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی' خیالی اور مادی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھہرا لیا۔ انھوں نے خدا کے دیے ہوئے علمِ حقیقت (العِلم) میں طرح طرح کے اَوہام' نظریوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے بے شمار مذاہب پیدا کر لیے۔ انھوں نے خدا کے مقرر کیے ہوئے عادلانہ اصولِ اخلاق و تمدن (شریعت) کو چھوڑ کر یا بگاڑ کر اپنی خواہشاتِ نفس' اور اپنے تعصبات کے مطابق ایسے قوانینِ زندگی گھڑ لیے' جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

4:......خدا نے جو محدود خود اختیاری انسان کو دی تھی' اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رویّے کی طرف موڑ دیتا' اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مہلت اس نوع کے لیے اور اس کی مختلف قوموں کے لیے مقرر کی تھی' اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اس بغاوت کے رونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفرینش سے اس نے اپنے ذمّے لیا' وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی مہلتِ عمل کے دوران میں اس کی راہ نمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اس خود عائد کردہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اس نے انھیں اپنا نمائندہ بنایا' اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے' انھیں علمِ حقیقت بخشا' انھیں صحیح قانونِ حیات عطا کیا اور انھیں اس کام پر مامور کیا کہ بنی آدم کو اسی راہِ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں' جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

5:......یہ پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں میں اٹھتے رہے۔ ہزار ہا برس تک ان کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزار ہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ ان سب کا ایک ہی دین تھا' یعنی وہ صحیح رویّہ جو اوّل روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا' وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے' یعنی اخلاق و تمدن کے وہ ازلی و ابدی اُصول' جو آغاز ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیے گئے تھے اور ان سب کا ایک ہی مشن تھا' یعنی یہ کہ اس دین اور اس ہدایت کی طرف اپنے ابنائے نوع کو دعوت دیں' پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں' انھیں منظم کر کے ایک ایسی اُمت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں

قانونِ الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جدوجہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دور میں اپنے اس مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی اور جنھوں نے اسے قبول کر کے امتِ مسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے، حتیٰ کہ ان میں سے بعض امتیں ہدایتِ الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مسخ کر دیا۔

6:...... آخر کار خداوند کریم نے سرزمینِ عرب میں محمد ﷺ کو اسی کام کے لیے مبعوث کیا، جس کے لیے پچھلے انبیا آتے رہے تھے۔ ان کے مخاطب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیا کے بگڑے ہوئے پیرو بھی۔ سب کو صحیح روتیہ کی طرف دعوت دینا، سب کو ازسرِ نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں، انھیں ایک ایسی اُمت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے...... اسی دعوت و ہدایت کی کتاب ''قرآن'' ہے جو اللہ نے محمد ﷺ پر نازل فرمائی۔

نبوت کے معنی

نبوت کا مادہ ہے ن ب أ (نَبَاء)۔ لغوی معنی ہیں بلند مقام، بلندی، رفعت۔ لہٰذا نبی کے معنی ہیں بلند مقام پر کھڑا ہونے والا۔ نبی اس مقامِ بلند پر ہوتا ہے جہاں سے اسے عالم الغیب والشہادہ (دنیائے محسوس و غیر محسوس) دونوں کا مشاہدہ کرا دیا جاتا ہے۔ وہ ایک طرف (وحی کے ذریعے) کائنات کے بنیادی حقائق کا مشاہدہ کرتا ہے اور دوسری طرف ان حقائق کو دنیائے محسوسات تک پہنچاتا اور انھیں انسان کی تمدنی زندگی پر منطبق کرتا ہے۔

نبوت ایک ایسا منصب ہے جو اکتسابی نہیں، یعنی اپنی کوشش اور ریاضت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہبی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا عطیہ اور اس کی بخشش ہے۔ اللہ تعالیٰ تبلیغِ دین اور اپنے احکام و اوامر بندوں تک پہنچانے کے لیے اپنے کسی برگزیدہ بندے کو منتخب فرما کر نبوت کے بلند و اعلیٰ منصب پر فائز کر دیتا ہے۔ امام راغب اصفہانی کے مطابق نبوت اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان دینوی اور اخروی فلاح کے لیے سفارت ہے۔ منصبِ نبوت کے ساتھ عام طور پر تین چیزیں وابستہ کی جاتی ہیں۔

1: عالم الغیب پر اللہ کی جانب سے اطلاع
2: خوارق کا ظہور، یعنی خلافِ عادت، فوق الفطری واقعات کا ظہور
3: وحی الٰہی کی آمد یا فرشتوں کو مختلف صُورتوں میں دیکھنا یا ان کی آمد اور موجودگی کو محسوس کرنا

ضرورتِ نبوت

اللہ تعالیٰ نے جمادات، نباتات اور حیوانات سب کو پیدا کیا اور زندگی کی ہر ایک نوع کو اس کی خصوصیات اور مقتضیات کے مطابق فطری الہام کے ذریعے فرائض اور وظائف بتا دیئے۔ اور یہ سب تقاضۂ فطرت کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ ہر نوع اپنے نوعی تقاضوں کے مطابق بعض خصوصیات کی حامل ہے جو خاص اس نوع سے مخصوص ہیں۔ انسان اپنے نوعی خواص کی وجہ سے اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اپنی قوتِ گویائی اور استعدادِ نطق کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر کے اپنے خیالات دوسروں کو سمجھا سکتا ہے۔ وہ اپنی ذہانت اور عقل کی بدولت اشیا کی ماہیت و حقیقت کو بھانپ لیتا ہے۔ نئی نئی معلومات حاصل کر کے عملی تجربات کے ذریعے ایجادات و اختراعات سے معاشی انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ انسان نے فلسفہ و حکمت اور دیگر بے شمار علوم و فنون میں بڑی ترقی کی۔ بڑے بڑے مصلحین، مفکرین اور دانش وروں نے بنی نوع انسان کے دامن کو علم و حکمت سے تو بھر دیا، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آخرت کی طرف کوئی راہ نمائی نہیں کی۔ عالم الغیب سے متعلق ان کا دامن بالکل تہی ہے۔ دنیا بھر کے دانش وروں اور حکما و فضلا نے الٰہیات اور مابعد الطبیعیات کی اَن دیکھی دنیا کے سلسلے میں کوئی ایسی قابلِ ذکر خدمت انجام نہیں دی، جسے انبیائے کرام کی تعلیمات کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ باطن کی نورانیت اور قلب و نظر کی تسکین کے لیے فلسفہ و حکمت کچھ کام نہ آ سکے۔ یہ اہم خدمت صرف نبوت و رسالت کے ذریعے انجام پائی۔ خالقِ کائنات نے اپنی اشرف المخلوقات کی دینوی کامرانی اور اخروی نجات و فلاح کے لیے سلسلۂ نبوت جاری کیا۔ انبیائے کرام نے وقتاً فوقتاً آ کر (وحی الٰہی کے ذریعے) نوعِ انسانی کی تعلیم و تربیت کا اہم کام انجام دیا۔ انھیں تہذیب و تمدن اور فلاح و ہدایت کی راہ دکھائی۔ اخروی نجات کے اصول بتائے اور ان کی روحانی و قلبی تسکین کے لیے ملکوتی علوم و معارف سے روشناس کرایا۔

نبی کا مفہوم

اللہ تعالیٰ کی طرف سے (بذریعہ وحی) غیب کی خبریں دینے والا ایسا برگزیدہ انسان جسے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے منصبِ نبوت کے لیے منتخب فرما کر تبلیغِ دین کے لیے کسی قوم یا آبادی کی طرف پیغمبر بنا کر بھیج دے اور اپنے اس برگزیدہ بندے کو "اَرْسَلْنٰکَ اِلٰی قَومٍ یا اِلَی النَّاسِ جَمِیعاً" یا اسی قسم کے الفاظ سے مخاطب فرمائے، جس سے یہ واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کو منصبِ نبوت پر فائز فرمایا ہے۔

نبی اور رسول

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رسول وہ ہے جو اپنے ساتھ کتاب بھی لائے اور نبی وہ ہے جسے اللہ کی طرف سے کتاب نہ دی گئی ہو۔ لیکن قرآن کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ اللہ نے تمام انبیا کو کتاب دی تھی: ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ (البقرہ:213) (تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے اور ان کے ساتھ کتابِ برحق نازل کی)۔'' یہی الفاظ رسولوں کے لیے آئے ہیں مثلاً سورۂ حدید کی آیت 25 میں ہے: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ (ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں او،

ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی)۔''

انبیائے کرام کی ان کتابوں کے بارے میں سورۂ بقرہ کی آیت 136 میں کہا گیا:
''(جو انبیا کرام کو) ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھیں، ہم ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے مسلم ہیں۔'' اگلی آیت میں کتاب ہدایت پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا: ''پھر اگر وہ اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم ایمان لائے ہو تو ہدایت پر ہیں اور اگر اس سے منہ پھیریں گے تو کھلی بات ہے کہ وہ ہٹ دھرمی میں پڑ گئے ہیں۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا: ﴿اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا﴾ (سورۂ مریم آیت 30) (اللہ تعالیٰ نے) مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔'' ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ ہر نبی صاحبِ کتاب ہوتا ہے۔

درحقیقت نبوت اور رسالت ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ نبی وحی کے ذریعے حقائق کا مشاہدہ کر لیتا ہے۔ یہ مقامِ نبوت ہے۔ پھر وہ وحی کو لے کر انسانوں کی طرف آتا ہے اور عملاً متشکل کر کے دکھاتا ہے۔ یہ منصبِ رسالت ہے، یعنی وحی کو دوسروں تک پہنچانا۔ سادہ لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نبوت وحی کی وصولی ہے اور رسالت وحی کی ترسیل۔ اسی لیے انبیائے کرام کو مثلاً خود رسولِ کریم ﷺ کو کہیں نبی کہا گیا ہے (سورۃ طلاق، آیت 1) اور کہیں رسول (سورۃ الفتح، آیت 29)۔ حتیٰ کہ حضرت اسماعیلؑ کو بیک وقت رسول بھی کہا گیا اور نبی بھی۔ سورۂ مریم کی آیت نمبر 54 میں کہا گیا: ﴿وَکَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا﴾ (وہ رسول نبی تھا)۔

نبوت اور مشیّتِ الٰہی

جو لوگ نبوت و رسالت پر فائز ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے احکام بے خوف و خطر اور بے کم و کاست لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ نہ تو وقتی ضرورت و مصلحت کا لحاظ رکھتے ہیں اور نہ اصول ترک کر کے مخالف حالات کے سامنے جھکنا گوارا کرتے ہیں۔ تبلیغِ دین کے سلسلے میں جرأت مندانہ اقدام سے خطرات ضرور پیدا ہوتے ہیں لیکن ان سے بچانے کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اٹھائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام کبھی اضطراب، گھبراہٹ اور بے چینی کا شکار نہیں ہوئے۔ بڑے سکون و اطمینان سے اللہ کا پیغام پہنچانے میں مصروف رہے ہیں۔ نبوت اور کتاب کا عطیہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مرہونِ منت ہے۔ انسان کی اپنی خواہشات اور امیدوں کو اس میں کچھ دخل نہیں ہے۔ نیز یہ کہ منصبِ نبوت پر فائز ہونے والوں کے سارے کام مشیّتِ الٰہی کے تابع ہوتے ہیں۔ مثلاً سورۂ قصص، آیت 86 میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَا کُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ یُّلْقٰٓی اِلَیْکَ الْکِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُوْنَنَّ ظَهِيْرًا لِّلْکٰفِرِیْنَ﴾ (القصص: 86)

''اے پیغمبر! تم اس بات کے ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی۔ یہ تو محض تمہارے رب کی مہربانی سے تم پر نازل ہوئی ہے۔ پس تم کافروں کے مددگار نہ بنو۔''

یا مثلاً سورۂ یونس کی آیت 16 میں آیا ہے:

﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْکُمْ وَلَآ اَدْرٰىکُمْ بِهٖ ۫ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْکُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (یونس: 16)

''اے پیغمبر! کہہ دیجیے کہ اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سناتا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟''

یا مثلاً سورۃ الشوریٰ، آیت 52 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَکَذٰلِکَ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ (الشوریٰ: 52)

''اسی طرح (اے نبی ﷺ) ہم نے اپنے حکم سے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے۔ آپ نہ تو یہ جانتے تھے کہ کتاب کیا چیز ہے اور نہ یہ کہ ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اس (قرآن) کو نور بنا دیا ہے کہ اس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں۔ بے شک آپ راہِ راست ہی کی ہدایت کرتے ہیں۔''

یہ آیت بھی اپنے مفہوم و مقصد میں بڑی واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی صراحت سے یہ حقیقت بیان کر دی ہے کہ فیضانِ الٰہی کے بغیر کوئی استعداد اور صلاحیت کام نہیں آتی۔ کمالات سب کے سب اللہ کی بخشش اور عطا ہیں۔ کسی انسان کو اپنے اختیار اور مرضی سے نہ نبوت ملتی ہے نہ کتاب۔ انسانوں کی ہدایت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت کے تابع ہے۔

منصبِ نبوت کے مزاج اور منہاج کے بارے میں سورۃ النحل، آیت 2 میں فرمایا:

﴿یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِکَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ﴾ (النحل: 2)

''وہ اس روح (وحی) کو اپنے جس بندے پر چاہتا ہے، اپنے حکم سے ملائکہ کے ذریعے نازل فرما دیتا ہے (اس ہدایت کے ساتھ کہ لوگوں کو) آگاہ کر دو، میرے سوا کوئی تمہارا معبود نہیں ہے۔ لہٰذا تم مجھی سے ڈرو۔''

نبوت مشیّتِ الٰہی کے تابع ہے اور انبیا کا فریضہ ہے کہ وہ اس کی علانیہ تبلیغ کرتے رہیں۔ سورۂ یونس کی آیت 15 میں یہی بات واضح کی گئی ہے کہ نبی وحیِ الٰہی کی پیروی کرتا ہے:

﴿قُلْ مَا یَکُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ﴾ (یونس: 15)

''اے نبی ﷺ ان سے کہو، مجھے اختیار نہیں کہ میں اس (وحی) کو اپنی مرضی سے بدل دوں۔ میں تو صرف وحیِ الٰہی کی پیروی کروں گا، اپنے رب کی نافرمانی کرتے ہوئے مجھے تو ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔''

اس آیت میں واضح کر دیا گیا کہ نبی وحیِ الٰہی کا اتباع کرتا ہے۔ اسے وحی میں کسی قسم کی تبدیلی کا اختیار نہیں۔ دین اور شریعت کے بارے میں نبی اپنی طرف سے کچھ

نہیں کہتا۔ وہ تو صرف وہی کچھ کہتا ہے' جو اس کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔ وحی کے آغاز کا اعلان اور اس کی اتباع ہی مقصدِ نبوت ہے۔

حید کی دعوت

انبیائے کرام کی دعوت کا پہلا اور اہم ترین حصہ توحید باری تعالیٰ رہا ہے۔ ہر نبی نے یہی پیغام دیا اور اسی بات کی تبلیغ کی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کا کوئی ہم سر نہیں۔ اسی کی واحد ذات بندگی اور عبادت کے لائق ہے۔ وہی خالقِ حقیقی ہے۔ ساری کائنات اسی کی مخلوق ہے۔ تندرستی اور بیماری' نفع و نقصان اور دکھ سکھ سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اولاد' رزق' صحت سب اسی کی عطا اور بخشش ہے۔ سورۂ انبیا' آیت نمبر 25 میں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ (الانبیا: 25)

''جو پیغمبر ہم نے آپ ﷺ سے پہلے بھیجے' ان کی طرف ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ پس میری ہی عبادت کرو۔''

چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے یہی پیغام دیا: (ترجمہ) ''اور ابراہیم کو بھیجا' جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا' اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے' اگر تم جانو۔ تم اللہ کو چھوڑ کر جسے پوج رہے ہو' وہ تو محض بُت ہیں اور تم ایک جھوٹ گھڑ رہے ہو۔ درحقیقت اللہ کو چھوڑ کر جن کی تم پرستش کرتے ہو' وہ تمھیں کوئی رزق بھی دینے کا اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ ہی سے رزق مانگو اور اسی کی بندگی کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔ اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔'' (العنکبوت: 16-17)

حضرت ہودؑ نے بھی اپنی قوم (قومِ عاد) کو یہی پیغام دیا: (ترجمہ) ''تمھارا کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ تم شرک کر کے اللہ پر بہتان باندھتے ہو۔ یہ سن کر قوم نے جواب دیا کہ تمھاری باتیں آسیب زدہ اور دیوانوں کی سی ہیں۔ ہم تو تمھیں ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔''

(سورۂ ہود۔ آیت: 50)

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم (قومِ ثمود) کو توحید کا وعظ یوں فرمایا: (ترجمہ) ''اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تمھیں زمین سے پیدا کیا۔ اس میں آباد کیا' تو اسی سے مغفرت مانگو اور اسی کے آگے توبہ کرو۔ بے شک میرا رب قریب بھی ہے اور دعا قبول کرنے والا بھی۔ قوم نے جواب دیا کہ تم انوکھی باتیں کر کے ہمیں باپ دادا کی راہ سے ہٹانا چاہتے ہو۔ ہمارے دل میں تمھارے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں۔'' (سورۂ ہود' آیت 61)

حضرت شعیبؑ کو اہلِ مدین کی طرف بھیجا تھا اور انھوں نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے یوں فرمایا: (ترجمہ) ''اے میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں اور ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ میں تو تمھیں آسودہ حال دیکھتا ہوں اور مجھے تمھارے بارے میں ایک ایسے دن کے عذاب کا ڈر ہے جو تمھیں گھیر کر رہے گا۔ قوم نے یہ جواب دیا کہ اے شعیب! تم ہمارے آبائی اعتقادات و عبادات سے ہمیں روکنا چاہتے ہو۔ یہ باتیں ہمیں گوارا نہیں ہیں۔'' (ہود' 84)

شرک کی مذمت

غرضیکہ توحید تو مرکزی نکتہ ہے۔ ہر نبی نے توحید کی دعوت دینے پر پوری قوت صرف کر دی' مگر بدقسمت قوم نے دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تبلیغِ توحید کا لازمی نتیجہ ہے کہ شرک کی بھی مذمت کی جائے۔ چنانچہ قرآن مجید میں شرک کی پُرزور مذمت کی گئی۔ شرک کو ظلمِ عظیم' بہتانِ عظیم اور صریح گم راہی قرار دیا گیا۔

سورۂ لقمان کی آیت 13 میں شرک کو ظلمِ عظیم قرار دیا گیا:

﴿لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (لقمان: 13)

''اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو' بلاشبہ شرک ظلمِ عظیم ہے۔''

سورۃ الانعام کی آیت نمبر 88 میں فرمایا گیا:

﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الانعام: 88)

''شرک کرنے سے تمام اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔''

سورۂ مائدہ کی آیت 72 میں ارشادِ ربانی ہے کہ شرک کرنے والے پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

سورۂ حج' آیت 31 میں فرمایا کہ جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتا ہے تو وہ گویا ایسا ہے' جیسے آسمان سے گر پڑے' پھر اسے پرندے اُچک لے جائیں یا ہوا کسی دور جگہ اڑا کر پھینک دے۔ شرک ایک تو کبیرہ گناہ ہے' دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اتنا سخت ناگوار ہے کہ اسے ناقابلِ معافی جرم قرار دیا۔ سورۃ النساء' آیت نمبر 48 میں فرمایا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا او رگناہ جسے چاہے معاف کر دے اور جس نے اللہ کا شریک ٹھہرایا' اس نے بہت بڑا بہتان باندھا۔ اسی سورت کی آیت 116 میں مشرک کے بارے میں یہی فیصلہ سنانے کے بعد مشرک کو صریح گم راہ اور بھٹکا ہوا قرار دیا۔ غرضیکہ بے شمار آیات میں شرک کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ شرک کی مذمت میں شدت اس سے زیادہ اور کیا ہو گی کہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ انعام (آیات 83 تا 86) میں اٹھارہ انبیائے کرام کا نام لے کر ذکر کیا ہے: حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت اسحاقؑ' حضرت یعقوبؑ' حضرت داؤدؑ' حضرت سلیمانؑ' حضرت ایوبؑ' حضرت یوسفؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت ہارونؑ' حضرت زکریاؑ' حضرت یحییٰؑ' حضرت عیسیٰؑ' حضرت الیاسؑ' حضرت اسماعیلؑ' حضرت ہارونؑ' حضرت یونسؑ اور حضرت لوط علیہم السلام۔ ساتھ ہی فرمایا: ''ان میں سے ہر ایک کو ہم نے تمام دنیا والوں پر فضیلت عطا کی۔ نیز ان کے آباؤ اجداد اور ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بہتوں کو ہم نے نوازا۔ انھیں اپنی خدمت کے لیے چن لیا اور صراطِ مستقیم کی طرف ان کی راہ نمائی کی۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے' جس کے ساتھ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے' راہ نمائی کرتا ہے لیکن اگر کہیں ان لوگوں نے بھی شرک کیا ہوتا تو ان کا سب کیا کرایا غارت ہو جاتا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت

عطا کی تھی۔ اب اگر یہ لوگ اس نے ماننے سے انکار کرتے ہیں تو (پروا نہیں) ہم نے کچھ اور لوگوں کو یہ نعمت سونپ دی ہے جو اس سے منکر نہیں ہیں۔ اے نبی ﷺ! وہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے انھی کے راستے پر تم چلو اور کہہ دو کہ میں (اس تبلیغ و ہدایت کے) کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ یہ تو ایک عام نصیحت ہے تمام دنیا والوں کے لیے۔" (الانعام 6' آیات 90 تا 93)

تلقینِ آخرت

انبیائے کرام کی دعوت کا ایک اور اہم رکن عقیدۂ آخرت ہے۔ انھوں نے حیات بعد الموت' حشر نشر' حساب کتاب اور جزا سزا کی اہمیت بیان کی اور یومِ آخرت کے ہول ناک اور لرزہ خیز کوائف و احوال' نیز جنت کی نعمتوں اور دوزخ کے عذاب سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ قرآن مجید نے حضرت نوحؑ کے بارے میں ارشاد فرمایا: (ترجمہ) "اور ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اور انھوں نے اپنی قوم سے کہا' میں تو تمھیں کھلم کھلا ڈرانے والا ہوں اور یہ کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ مجھے تمھاری نسبت دردناک عذاب کا ڈر ہے۔ (ہُودؑ آیات: 25-26)

حضرت ابراہیمؑ یومِ آخرت کی ہیبت اور خوف کے مارے عجز و انکساری کا پیکر بن کر اللہ تعالیٰ سے بخشش اور مغفرت کی امید رکھے ہوئے ہیں۔

(الشعرا 26' آیات: 82 تا 91)

حضرت ہُودؑ اپنی قوم سے جسے زندگی کی تمام آسائشیں اور سہولتیں میسر تھیں' یوں مخاطب ہوتے ہیں: "مجھے تمھارے بارے میں خوف ناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔" غرضیکہ ہر نبی نے اپنی قوم کو آخرت کے عذاب سے ڈرایا۔ ڈرانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ خوف ناک انجام سے آگاہ ہو کر اللہ کے احکام کی اطاعت کریں اور اپنی زندگی شریعتِ الٰہی کے تابع بنا کر آخرت میں سرخ روئی حاصل کریں۔ نجاتِ اُخروی ہر نبی کا مطمحِ نظر تھا۔

ایمان بالغیب کی دعوت

انبیائے کرام کی دعوت و تبلیغ کی ایک اور امتیازی خصوصیت ایمان بالغیب کی دعوت ہے۔ انبیا نے اس پر بڑا زور دیا ہے' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد ضروری ہے کہ ایک مومن اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرت و طاقت اور اس کے حیرت افزا افعال کی صمیمِ قلب سے تصدیق کرے۔ نیز آسمانی کتابوں پر صدق دلی سے ایمان لائے اور انبیا اور رسولوں کی بتائی ہوئی باتوں اور خبروں پر پورا اعتماد کرے۔ ایمان بالغیب کے بغیر معجزات اور خارق عادات افعال پر یقین ممکن نہیں۔ ایمان بالغیب میں بڑی قوت ہے۔ اس سے دل کو سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اس سے جذبۂ صدق و یقین کو استحکام ملتا ہے۔ ایمان بالغیب پر یقین رکھنے والا انسان کبھی شک اور تذبذب کا شکار نہیں ہو پاتا۔ قرآن مجید نے کئی ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن کی قوانینِ طبعی سے یا عقلی توجیہ نظر نہیں آتی۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کے لیے آتشِ نمرود کا سرد پڑ جانا' حضرت سلیمانؑ کا ہوا کے دوش پر لمبی مسافت تھوڑے عرصے میں طے کرنا' نیز چیونٹیوں کی گفتگو سمجھنا' پلک جھپکنے میں ملکہء سبا کے تخت کا منتقل ہونا' حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ سے زندہ سلامت نکلنا' حضرت موسیٰؑ کی ضرب سے پتھر سے بارہ چشموں کا جاری ہونا' حضرت موسیٰؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے دریا کا پھٹ جانا' حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ پیدائش اور پھر ان کے معجزات' سنگ ریزوں سے اصحاب الفیل کی بربادی' نیز آنحضور ﷺ کے بے شمار معجزات' یہ سب ایسے خارق عادت واقعات ہیں جنھیں صرف ایمان بالغیب والا ہی قبول کر سکتا ہے۔ عقل و دانش کی اپنی حدود ہیں اور توحید' آخرت' عالم الغیب کی حقیقت عقلی حدود سے ماورا ہے۔ لہٰذا انبیا کے ادراکات اور بیانات پر یقین و ایمان ضروری ہو جاتا ہے۔ ایمان بالغیب ہی کی بدولت یقینِ محکم اور ایمانِ کامل نصیب ہوتا ہے اور اسی سے سکونِ قلب اور روحانی سکون میسر آتا ہے۔

انبیائے کرامؑ کی ناقدری کا انجام

مغرور اور متکبر افراد و اقوام نے انبیائے کرام کی ناقدری کی اور ان کی دعوت و تلقین کے مقابلے پر اپنے علم پر اترائے تو قرآن مجید نے ان کا انجام یہ بتایا کہ "جب ان کے رسول ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ اپنے مروجہ علم پر اترانے لگے اور جس چیز سے وہ تمسخر کیا کرتے تھے' اس نے انھیں آن گھیرا۔ (سورۃ مومنؑ آیت 83) اللہ تعالیٰ نے ایسی ہر قوم کو' جس نے اپنے نبی سے تمسخر و استہزا کیا' دنیا ہی میں سزا دی اور انھیں تباہی و بربادی کے گھاٹ اُتار دیا۔ چنانچہ سورۃ انعام کی آیت 45 کے مصداق "اس طرح جڑ کاٹ دی گئی ان لوگوں کی جو ظلم کرتے تھے اور ساری تعریف و حمد اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔"

انبیائے کرام نے لوگوں کو ایمان و اطاعت کی دعوت دی۔ کفار تکذیب و تعذیب کے ساتھ تمسخر و استہزا پر اُتر آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چند انھیں مہلت دی اور سمجھنے اور راہِ راست اختیار کرنے کا موقع دیا' لیکن وہ ثروت و دولت اور خوش حالی میں مست رہے' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دفعۃً انھیں پکڑ لیا۔ اب ان کی حسرت و یاس کی حد نہ رہی اور ان کا اپنی جانوں پر اور نظامِ کائنات پر ظلم رنگ لایا اور عذابِ الٰہی نے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

نصرتِ الٰہی کا وعدہ

انبیائے کرام کی بعثت ہمیشہ بڑے نامساعد اور مخالف ماحول اور تاریک دور میں ہوتی رہی۔ انھیں بڑے سنگ دل اور جابر دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا' لیکن بے سرو سامانی اور مادی اسباب کے فقدان کے باوجود وہ اپنے خلوص' ایمان' تقویٰ' اخلاق' مستقل مزاجی اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کے باعث تبلیغ و دعوت میں کامیاب و کامران رہے۔ یہ اس لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کی ہمیشہ نصرت فرمائی اور اس کا وعدہ ہے کہ وہ ان بندوں کی نصرت و مدد فرمائے گا۔ سورۃ مجادلہ' آیت 21 میں ہے: "اللہ تعالیٰ نے یہ طے کر رکھا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور غالب آئیں گے۔ بے شک اللہ بڑا قوت والا اور بڑے غلبے والا ہے۔"

سورۃ مومن، آیت 51 میں ہے: ''بے شک ہم مدد کرتے ہیں اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگی میں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے۔''

سورۃ الصّٰفّٰت، آیت 171 میں ارشاد ہوا: ''ہماری یہ بات ہمارے بندگانِ مرسل کے لیے پہلے سے طے شدہ ہے کہ وہی کامیاب ہوں گے اور ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ غلبہ آخر کار حق ہی کو ہوتا ہے اور اہلِ حق ہر دور میں دلائل کی صداقت وقوت کے لحاظ سے یقیناً غالب رہتے ہیں۔ باطل عارضی طور پر اپنی شان وشوکت قائم رکھتا ہے۔ انجام کار انبیا کی دعوت ضرور کامیاب ہوتی ہے اور اہلِ حق دنیا وآخرت میں سرخ رو ہوتے ہیں۔

حضرت نوحؑ کو دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کس طرح کامیاب وکامران کیا اور تکذیب وانکار کرنے والوں کا انجام یہ ہوا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے طوفان کی نذر ہو گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی بھی ہمارے سامنے ہے۔ اللہ کے نافرمانوں نے کیا کیا تکلیفیں ان کے لیے سوچ رکھی تھیں، مگر آتشِ نمرود بھی اللہ نے ان کے لیے گل زار بنا دی۔ جب حضرت خلیل اللہ نے اپنے خاندان کو عرب کے بے آب وگیاہ ریگستان میں آباد کر دیا تھا تو ریت کے تودوں سے پانی کا ایسا چشمہ پھوٹ نکلا جو رہتی دنیا تک اہلِ ایمان کی سیرابی کرتا رہے گا۔ غرضیکہ ہر نبی کسی نہ کسی کڑے اور سخت امتحان سے تو ضرور گزرا، مگر اس کی دعوت نے ایک دنیا کو بدل ڈالا۔

خود رحمتِ عالم ﷺ کو دیکھیے کہ آپ کیسے کیسے سخت اور کٹھن مصائب سے دوچار ہوئے۔ وہ کون سی مصیبت اور اذیت تھی جس کا آپ نے خندہ پیشانی سے مقابلہ نہیں کیا۔ قریشِ مکہ کی اذیتیں اور سازشیں، اپنی برادری کا عدم تعاون اور ترکِ موالات، اہلِ طائف کی بدسلوکی اور ایذا رسانی، اہلِ ایمان پر ظلم وستم، سب سے بڑھ کر یہ کہ گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، لیکن تبلیغ دین اور اشاعتِ حق میں سرِمو فرق نہیں آنے دیا۔ دشمنوں نے پردیس میں بھی چین نہ لینے دیا۔ یلغار پر یلغار کر کے دینِ حق کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی، لیکن حق تعالیٰ نے ان کے ہر اقدام کو ناکام ونامراد بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں اور پیغمبروں کی نصرت اور اعانت فرما کر انھیں سرخ روئی عطا کی اور ان کے انکار کرنے والوں کا نام ونشان تک باقی نہ رہا۔ انبیائے کرام کا مقصد دنیوی جاہ وجلال اور سیاسی غلبہ واقتدار نہیں ہوتا، بلکہ ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا حصول، آخرت کی کامیابی، جذبۂ ایمان کی بیداری اور کلمۃ اللہ بلند کرنے کا عزم راسخ پیدا کرنا ہوتا ہے۔ انبیائے کرام ایمانِ خالص اور عملِ صالح کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کو تقویٰ اور فلاح کی طرف بلاتے ہیں۔ ان کے دلائل وبراہین قطعی ہوتے ہیں اور مخالفین کو دم بخود کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیا کی نصرت ومدد کے ساتھ اہلِ ایمان کی نصرت وتائید کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ سورۂ محمد، آیت 7 اور 8 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمھاری مدد کرے گا اور تمھارے قدم جما دے گا اور کافروں کے لیے بربادی ہے اور اللہ ان کے اعمال کو برباد کر دے گا۔'' ان آیات میں ایک طرف تو ایمان والوں سے نصرت وایمان کا وعدہ ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں بالخصوص میدانِ جنگ میں ثابت قدم رکھنے کا یقین دلایا گیا ہے، بشرطیکہ اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کے دین کی نصرت ومدد پر کمربستہ رہیں اور دوسرے کفر وانکار کرنے والوں کے لیے انتباہ ہے کہ ان کے اعمال کی کوئی حیثیت اور قدر وقیمت نہیں۔ ان کا سب کیا کرایا اکارت جائے گا۔ ان کے سارے فلاح وبہبود کے کام کالعدم قرار دیے جائیں گے۔ یہ انتباہ بھی انبیا اور اہلِ ایمان کے لیے نصرت واعانت کا ایک انداز ہے۔ سورۃ الروم، آیت 47 میں ارشاد ہے: ''ہم نے آپ سے پہلے (اے رسول ﷺ!) رسولوں کو ان کی قوموں کے پاس بھیجا۔ پس وہ دلائل اور کھلی نشانیاں لے کر ان کے پاس آئے۔ پھر ہم نے مجرموں کو پوری سزا دی اور اہلِ ایمان کی مدد ہم پر لازم تھی۔'' نصرت کا یہ انداز یہ بتاتا ہے کہ دلائل وبراہین کے بعد حجت پوری ہو گئی۔ پھر تکذیب وانکار اور استہزا وتمسخر کے جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے دھر پکڑا اور ان مجرموں کو ان کے جرم کی پاداش میں پوری سزا دی گئی۔ آنحضور ﷺ کی پوری زندگی اس بات کی شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر موقع پر آپ ﷺ کی اور مسلمانوں کی مدد اور نصرت فرمائی۔ بدر وحنین اور دیگر معرکوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید اور نصرتِ غیبی کا ذکر قرآن مجید میں بھی فرمایا ہے۔

انبیائے کرام کی اطاعت

انبیائے کرام صرف اللہ تعالیٰ کے احکام اور وحی کے پابند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے۔ وہ صرف اور صرف وحیِ الٰہی کی اطاعت کرتے ہیں اور انھیں یہی حکم ہے۔ جیسا کہ سورۂ یونس کی آیت 109 میں صادر ہوا: ''اے نبی ﷺ! آپ صرف اس کی اتباع کرتے رہیں جو آپ ﷺ پر وحی کیا جاتا ہے۔'' سورۂ احزاب کی دوسری آیت میں بھی یہی حکم دیا۔ آنحضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے بھی اقرار و اعلان کرایا گیا۔ سورۂ اعراف کی آیت 203 کا ترجمہ یوں ہے: ''اے نبی ﷺ! آپ کہہ دیجیے، میں تو صرف اُسی کی اتباع اور اطاعت کرتا ہوں جو کچھ میری طرف میرے رب کی جانب سے وحی ہوتا ہے۔''

اس مضمون کی اور بھی کئی آیات موجود ہیں۔ اسی طرح انبیائے کرام پر ایمان لانے والوں کے لیے بھی لازم قرار دیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت واتباع کریں تاکہ احکامِ الٰہی کی تعمیل کا پورا پورا حق ادا ہو سکے۔ سورۂ آلِ عمران، آیت 132 میں ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾

''اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے احکام سے متعلق بہت سی آیات ہیں۔ یہ بھی ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ ہی کی اطاعت ہے (سورۃ النسا، آیت 80)۔ رسول ﷺ کا کلام تمام تر وحیِ الٰہی پر مبنی ہوتا ہے، یہ وحی خواہ لفظی ہو یا معنوی۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ اُمورِ شریعت اور مسائلِ دین کے بارے میں اللہ کے رسول صرف وحیِ الٰہی سے بات کرتے ہیں۔ سورۃ اعراف، آیت 3 میں صاف طور پر حکم ہے: ''پیروی اس کی کرو

جو کچھ تم پر تمھارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اللہ کو چھوڑ کر دوسرے رفیقوں کی پیروی مت کرو۔"

اطاعت کی ضد نافرمانی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورۃ مجادلہ (آیات: 8-9) میں رسولِ اکرم ﷺ کی نافرمانی کے بارے میں سرگوشیاں کرنے کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے۔ (ترجمہ) "کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنھیں سرگوشیاں کرنے سے منع کر دیا گیا تھا' پھر بھی وہ وہی حرکت کیے جاتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا۔ یہ لوگ چھپ چھپ کر آپس میں گناہ اور زیادتی اور رسول کی نافرمانی کی باتیں کرتے ہیں اور جب تمھارے پاس آتے ہیں تو تمھیں اس طریقے سے سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ نے تم پر سلام نہیں کیا ہے اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ ہماری ان باتوں پر اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا؟ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے۔ اسی کا وہ ایندھن بنیں گے۔ بڑا ہی بُرا انجام ہے ان کا۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو! جب تم آپس میں پوشیدہ بات کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول ﷺ کی نافرمانی کی باتیں نہیں' بلکہ نیکی اور تقویٰ کی باتیں کرو اور اس اللہ سے ڈرتے رہو' جس کے حضور تمھیں حشر میں پیش ہونا ہے۔"

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا احساس کافروں کو اس وقت شدت سے ہوگا جب دوزخ میں انھیں عذاب ہو رہا ہوگا اور وہ بڑی حسرت سے کہیں گے (ترجمہ): "کاش ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہوتی (سورۃ احزاب' 66)۔ اطاعت کے صلے میں فوزِ عظیم یعنی بہت بڑی کامیابی ملے گی۔ سورۃ النسا' آیت 13 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا' اللہ اُسے بہشت کے باغوں میں داخل کرے گا' جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔"

ختمِ نبوت

نبوت کا آغاز حضرت آدمؑ سے اور اختتام حضرت محمد ﷺ پر ہُوا۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے بے شمار انبیا مبعوث فرمائے۔ پھر آنحضور ﷺ پر یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ انبیائے کرام کے الگ الگ حالات و کوائف گزشتہ صفحات میں بیان ہو چکے ہیں۔ ختم نبوت کی ضرورت پر اختصار کے ساتھ چند اشاروں کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

آنحضور ﷺ سے پہلے ہر قوم میں الگ الگ پیغمبر آتے رہے ہیں۔ ان کی تعلیم و تبلیغ اپنی قوم اور اپنے زمانے تک محدود رہی' لیکن حضور ﷺ کی نبوت و رسالت ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ چنانچہ جب ایک ایسا نبی جو تمام قوموں اور زمانوں کے لیے مبعوث ہوا' تو اسے نہ صرف "رحمت للعالمین" خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا' بلکہ ان کی ذات پر نبوت و رسالت ختم کرتے ہوئے انھیں "خاتم النبیین" بھی قرار دیا گیا۔ حضور ﷺ کے بعد اب کسی نبی اور رسول کے آنے کا امکان ہی نہیں رہا۔ آپ ﷺ کے بعد نبی یا رسول ہونے کا دعویٰ کرنے والا شخص جھوٹا اور دجّال و کذّاب ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت سے دین اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ انسان کی تمام ضرورتوں کی تسکین کی خاطر احکام و مسائل کی تکمیل کر دی گئی۔ مکمل شریعت اور مکمل قانون کو دائمی اور ابدی قرار دینے کے لیے اس کی اہلیت و صلاحیت کے تمام تقاضے پُورے کر کے اتمامِ نعمت کا اعلان فرما دیا اور ہمیشہ کے لیے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ: 3)

"آج مَیں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

عبدالقیوم۔ (اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ' جلد 22)

نبوت و رسالت

اسلامی اور غیر اسلامی تصور

خدا نے ہر زمانے اور ہر قوم میں انسانوں کی راہ نمائی کے لیے نبی اور رسول مبعوث کیے ہیں اس لیے نبی یا رسول یا خدائی فرستادوں کا تصور ہر ملک اور ہر قوم میں ملتا ہے لیکن رسالت اور نبوت کے غیر اسلامی تصورات میں انبیا کی شان اتنی گھٹا دی گئی تھی کہ ان میں کوئی روحانی پاکیزگی یا اخلاقی بلندی نظر نہیں آتی یا پھر انبیا کی شان میں اس قدر مبالغہ کیا گیا ہے کہ انھیں خدا بنا لیا گیا اور ان کے بت پوجے گئے۔

حضور اکرم ﷺ نے وحی الٰہی کے ذریعے رسالت اور نبوت کا وہ تصور دیا جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے اور جو ان انبیا کے شایان شان بھی ہے مثلاً اس آیت کو ملاحظہ کیجیے۔ نبی اور رسول کا کیسا حسین امتزاج ہے۔

''وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے بدی سے روکتا ہے۔ ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ اور ان پر سے بوجھ اُتارتا ہے اور ان بندشوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ دبے اور جکڑے ہوئے تھے' پس جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اس کی حمایت کریں اور اس کی مدد کریں اور اس نور کی پیروی کریں جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے' وہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (الاعراف:19)

یہودیوں کا تصورِ رسالت

یہودیوں میں نبی اور رسول کا تصور بڑا گھٹیا تھا۔ وہ ہر پیشین گوئی کرنے والے کو نبی کہتے تھے۔ اس صفت پیشین گوئی کے علاوہ وہ ہر اعتبار سے نبی کو ایک معمولی انسان سمجھتے تھے۔ وہ ہر قسم کے گناہ بھی کر سکتا تھا اور بداخلاقیوں کا بھی مرتکب ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ نبی کہلاتا تھا اور مانا جاتا تھا۔ یہودیوں کی مقدس کتابوں میں انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پر ایسے ایسے الزامات لگائے گئے ہیں کہ ان نبیوں کو ایک اوسط درجہ کا شریف آدمی ماننا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں بائبل کے یہ الفاظ ہیں:

''اور نوح کاشتکاری کرنے لگا اور اس نے انگور کا ایک باغ لگایا اور اس نے اس کی مے پی اور اسے نشہ آیا اور وہ اپنے ڈیرے میں برہنہ ہو گیا اور کنعان کے باپ حام نے اپنے باپ کو برہنہ دیکھا اور اپنے بھائیوں کو باہر آ کر خبر دی۔ تب سام اور یافث نے ایک کپڑا لیا اور اسے اپنے کندھوں پر دھرا اور پیچھے کو اُلٹے چل کر گئے اور باپ کی برہنگی ڈھانپی سو ان کے مُنہ الٹی طرف تھے اور انھوں نے اپنے باپ کی برہنگی نہ دیکھی۔'' (پیدائش باب 9 آیت 20 تا 25) حضرت نوحؑ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ شراب پی کر برہنہ ہو گئے۔ اب حضرت ابراہیمؑ کے متعلق سنیے کہ انھوں نے (نعوذ باللہ) اپنی بیوی کو بہن بنا کر غیر شخص کے حوالے کر دیا:

''اور اس ملک میں کال پڑا اور ابراہام مصر کو گیا کہ وہاں ٹکا رہے کیوں کہ ملک میں سخت کال تھا اور ایسا ہوا کہ جب وہ مصر میں داخل ہونے کو تھا تو اس نے اپنی بیوی سارہ سے کہا دیکھ میں جانتا ہوں کہ تو دیکھنے میں خوب صورت عورت ہے اور یوں ہوگا کہ مصری تجھے دیکھ کر کہیں گے کہ یہ اس کی بیوی ہے سو وہ مجھے تو مار ڈالیں گے مگر تجھے زندہ رکھ لیں گے سو تو یہ کہہ دینا کہ مَیں اس کی بہن ہوں تاکہ تیرے سبب سے میری خیر ہو اور میری جان تیری بدولت بچی رہے اور یوں ہوا کہ جب ابراہام مصر میں آیا تو مصریوں نے اس عورت کو دیکھا کہ وہ نہایت خوب صورت ہے اور فرعون کے امرا نے اسے دیکھ کر فرعون کے حضور میں اس کی تعریف کی اور وہ عورت فرعون کے گھر میں پہنچائی گئی اور اس نے اس کی خاطر ابراہام پر احسان کیا اور بھیڑ بکریاں گائے گدھے بیل اونٹ غلام لونڈیاں اس کے پاس ہو گئیں۔'' (پیدائش آیت 10 تا 17) حضرت لوطؑ پر اس سے بھی زیادہ سنگین الزام یہ لگایا گیا ہے کہ انھوں نے معاذ اللہ بیٹیوں سے زنا کیا:

اور'' لوط ضُغر سے نکل کر پہاڑ پر جا بسا اور اس کی دونوں بیٹیاں اس کے ساتھ تھیں کیوں کہ اسے ضُغر میں بہت ڈر لگا اور وہ اور اس کی دونوں بیٹیاں ایک غار میں رہنے لگے۔ تب پہلوٹھی نے چھوٹی سے کہا کہ ہمارا باپ بڈھا ہے اور زمین پر کوئی مرد نہیں جو دنیا کے دستور کے مُطابق ہمارے پاس آئے۔ آؤ ہم اپنے باپ کو مے پلائیں اور اس سے ہم آغوش ہوں تاکہ اپنے باپ کی نسل باقی رکھیں۔ سو اسی رات انھوں نے اپنے باپ کو مے پلائی اور پہلوٹھی اندر گئی اور اپنے باپ سے ہم آغوش ہوئی۔ پر اس نے نہ جانا کہ وہ کب لیٹی اور کب اٹھ گئی۔ سو لُوط کی دونوں بیٹیاں اپنے باپ سے حاملہ ہوئیں۔'' (پیدائش۔ باب 19 آیت 30 تا 38)

حضرت ابراہیمؑ کی طرح حضرت اسحٰقؑ کے متعلق بھی یہی بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کے ڈر سے اپنی بیوی کو بہن بنایا۔ ''پس اسحٰق جرار میں رہنے لگا اور وہاں کے باشندوں نے اس سے اس کی بیوی کی بابت پوچھا اس نے کہا'' میری بہن ہے کیوں کہ وہ اسے اپنی بیوی بتاتے ڈرا۔'' (پیدائش باب 26 آیت 6 تا 7)

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں یہ کہانی ملتی ہے کہ انھوں نے اپنے باپ سے برکت حاصل کرنے کے لیے دھوکا دہی کی واردات کی اور اس دھوکا میں آ کر حضرت اسحٰقؑ نے جو نابینا تھے بڑے بیٹے عیسو کی بجائے چھوٹے بیٹے یعقوب کو برکت دے دی۔ اس طرح یعقوب علیہ السلام کی فریب دہی کامیاب رہی۔

(پیدائش باب 27 تا 38)

بائیبل میں حضرت موسیٰ، حضرت ہارونؑ اور بنی اسرائیل کے جو واقعات درج ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کو ایک قومی راہ نما کے طور پر مانتے تھے۔ ان کی سیاسی قیادت انھوں نے اس لیے قبول کر لی تھی کہ فرعون کے پنجے سے گلوخلاصی حاصل کریں اور اپنا ایک علیحدہ وطن بنائیں لیکن نیشنل لیڈر ہونے کے علاوہ حضرت موسیٰ کی جو حیثیت رسالت تھی اس پر ان کا ایمان بس برائے نام تھا۔ اسی لیے وہ بات بات میں حضرت موسیٰؑ سے کٹ حجتی اور کج بحثی کرتے تھے اور ان کے احکامات کی مستقلاً خلاف ورزی کرتے رہے۔ رسول اور نبی کا تصور ان کے نزدیک صرف یہ تھا کہ اس کے ذریعہ سے سیاسی آزادی حاصل کی جائے۔ رسالت کے احترام اور عشق رسول کا پہلو وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ ان کا رسول بس ایک قومی لیڈر تھا اور اپنے اس لیڈر سے وہ بار بار الجھ پڑتے تھے۔ مثلاً جب فرعون اور اس کی فوج ان کا تعاقب کرنے لگے تو وہ حضرت موسیٰؑ سے کہنے لگے: ''کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہمیں وہاں سے مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے۔ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہمیں مصر سے نکال لایا۔ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہمیں رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیوں کہ ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہے۔'' تب موسیٰؑ نے لوگوں سے کہا ''ڈرو مت۔ چپ چاپ کھڑے ہو کر خداوند کی نجات کے کام دیکھو۔'' (خروج باب 14 آیت 11 تا 12)

بیابان میں بنی اسرائیل کو کھانا اچھا نہیں ملا تو کہنے لگے: اور بنی اسرائیل کہنے لگے ''کاش کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک میں جب ہی مار دیے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے کیوں کہ تم تو ہمیں اس بیابان میں اسی لیے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مار دو۔'' (خروج باب 16 آیت 2 تا 3)

''کیا یہ چھوٹی بات ہے کہ تو ہمیں ایک ایسے ملک سے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے نکال لایا ہے کہ ہمیں بیابان میں ہلاک کرے اور اس پر بھی یہ طرّہ ہے کہ اب تو سردار بن کر ہم پر حکومت جتاتا ہے۔'' (گنتی۔ باب 16 آیت 13 تا 14) اور لوگ خدا کی اور موسیٰ کی شکایت کر کے کہنے لگے تم کیوں ہمیں مصر سے مرنے کے لیے بیابان میں لے آئے یہاں تو نہ روٹی ہے نہ پانی اور ہمارا جی اس نکمّی خوراک سے کراہت کرتا ہے۔'' (گنتی باب 21 آیت 5 تا 6)

سو وہ موسیٰؑ اور ہارونؑ کے خلاف اکٹھے ہو گئے اور لوگ موسیٰؑ سے جھگڑنے اور یہ کہنے لگے ہائے کاش ہم بھی اُس وقت مر جاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے۔ (گنتی باب 60 آیت 2 تا 3)

اور کہنے لگے ''ہمیں کون گوشت کھانے دے گا؟ ہمیں وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مصر میں مفت کھاتے تھے اور ہائے وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ پیاز اور لہسن لیکن اب تو ہماری جان خشک ہو گئی۔ یہاں کوئی چیز میسر نہیں۔ (گنتی باب 11 آیت 5 تا 6)

یہ ناشکری اور نافرمانی کا رویہ اسی لیے تھا کہ ان کے تصور رسالت میں رسول سے محبت اور اطاعت قلبی کا تصور شامل نہیں تھا، اسی لیے جنگ کے موقع پر انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا، جاؤ تم اور تمھارا خدا لڑو ہماری جان مفت کی نہیں ہے۔ بائیبل میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے یہ دیکھا کہ ان کا مقابلہ ایک زور آور قوم سے ہے تو ان کی کیفیت یہ ہو گئی:

''تب ساری جماعت زور زور سے چیخنے لگی اور یہ لوگ اس رات کو روتے ہی رہے اور کل بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی شکایت کرنے لگے اور ساری جماعت ان سے کہنے لگی، اے کاش ہم مصر ہی میں مر جاتے یا کاش اس بیابان میں ہی مرتے۔ خداوند کیوں ہمیں اس ملک میں لے جا کر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال نہیں بن جائیں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔ پھر وہ آپس میں کہنے لگے آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لوٹ چلیں' تب موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کی ساری جماعت کے سامنے اوندھے منہ ہو گئے اور نوت کا بیٹا یشوع اور یفنہ کا بیٹا کالب جو اس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے، اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر بنی اسرائیل سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال ہم نے دریافت کیا ہے، بہت اچھا ہے اگر خدا ہم سے راضی رہا تو ہمیں اس ملک میں ضرور پہنچائے گا۔ فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو۔ وہ تو ہماری خوراک ہیں۔ ان کی پناہ ان کے سروں پر سے جاتی ہے ہمارے ساتھ خداوند ہے، سو ان کا خوف نہ کرو۔ تب ساری جماعت بول اٹھی کہ انھیں سنگسار کرو۔ اس وقت خیمہ اجتماع میں سب بنی اسرائیل کے سامنے خداوند کا جلال نمایاں ہوا اور خداوند نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا یہ لوگ کب تک میری توہین کرتے رہیں گے۔'' (گنتی باب 14 آیت 2 تا 11)

حضور اکرم ﷺ نے یہودیوں کو متنبہ کیا کہ اللہ کے نبی بشر ہوتے ہیں لیکن وہ عام انسانوں سے بہت ماورا بھی ہوتے ہیں۔ ان کی محبت اور اطاعت ہی عین ایمان ہے۔ اور نبی معصوم ہوتے ہیں تم جو انبیا کو عام انسانی سطح پر رکھ کر زنا کار شرابی اور قاتل اور گناہ گار کہتے ہو یہ انبیا پر بہتان ہے۔ کسی نبی نے اس طرح کے گناہ نہیں کیے جو تم اپنی روایتوں میں بتاتے ہو۔

یہودیوں میں ایک گروہ مشرکین سے بھی متاثر ہوا۔ حضرت موسیٰؑ ہی کے زمانے میں انھوں نے گئوسالہ پرستی شروع کر دی تھی اور بعد میں مشرک عورتوں سے شادی بیاہ کرنے کے نتیجے میں ان کے درمیان بھی شرک پھیلا اور حضرت عزیرؑ کو انھوں نے ابن اللہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ قرآن نے یہودیوں کے اس مشرک گروہ کی بھی تردید کی اور اس موحد گروہ کو بھی متنبہ کیا جو توحید کو تو مانتا تھا لیکن رسولوں کے احترام کا قائل نہیں تھا۔ ان کی بے حرمتی کرتا تھا اور انھیں قتل و سنگسار تک کر دیتا تھا۔

عیسائیوں کا تصور رسالت

عیسائیوں نے نبی اور رسول کے تقدس کے تصور میں اس قدر مبالغہ کیا کہ اسے خدا بنالیا۔ وہ رسول کو بشریت سے پاک خدا کا جزو یا خدا یا ناسوت اور لاہوت کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ انسان پیدائشی گناہ گار ہے اور گناہ گار کسی کو راہ راست

نہیں دکھا سکتا۔ اس لیے خدا کا بیٹا آسمان سے زمین پر آنا چاہیے۔ عیسائیوں کا یہ تصور کہ رسول کی ہستی مافوق انسان ہونی چاہیے۔ مشرک رومیوں کے اثرات کا نتیجہ تھا۔ کیوں کہ رومی تین دیوتاؤں کے قائل تھے۔ ان تین دیوتاؤں کے وزن پر تثلیث کا عقیدہ تراشا گیا چوں کہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لیے یہ کہا گیا کہ امر الٰہی یا کلام حضرت مریم پر نازل ہوا اور مجسم ہوا اس طرح باپ بیٹا اور روح القدس کی اقانیم ثلاثہ بنیں اور پھر یہ بحث پیدا ہوئی کہ ایک میں تین ہے یا تین میں ایک ہے۔ اس کے بعد ایک اور فرقہ شروع ہوا' اس نے حضرت مریم کو بھی خدائی میں شریک کر لیا اور مسیح کے ساتھ مریم کی بھی پرستش ہونے لگی اور انھیں خدا کی ماں کا لقب دیا گیا۔ ویسے عیسائیوں سے پہلے یہودیوں نے بھی حضرت عزیرؑ کو ابن اللہ مانا تھا اور یہی ابن اللہ کا عقیدہ عیسائیوں میں منتقل ہوا۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ کے متعلق حسب ذیل تین خیالات تھے:

ا: ایک فریق حضرت عیسیٰ کو خدا کہتا تھا۔

ب: دوسرا گروہ انھیں خدا کا بیٹا تسلیم کرتا تھا۔

ج: تیسرا طبقہ حضرت عیسیٰ کو اقانیم ثلاثہ کی ایک اقنوم مانتا تھا۔

ان عیسائیوں کے سامنے حضور اکرم ﷺ نے یہ وحی الٰہی پیش کی:

''یقیناً ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا' خدا مریم کا بیٹا مسیح ہے۔ تم ان لوگوں سے کہو اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو روئے زمین پر جتنے انسان بستے ہیں سب کو ہلاک کر ڈالے تو کون ہے جو اس کی بادشاہی میں دخل دینے کی جرأت کر سکتا ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں تم کہ دو کہ اگر ایسا ہی ہے تو پھر خدا تمھاری بداعمالیوں کی وجہ سے تمھیں عذاب کیوں دیتا رہا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے تم بھی انسان ہو اور وہ جسے چاہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے۔'' (المائدہ 17:5۔19)

اور یہ کہ: ''یقیناً انھوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا خدا مسیح مریم کا بیٹا ہے۔ مسیح کی تعلیم تو یہ تھی کہ اس نے کہا تھا اے بنی اسرائیل خدا کی بندگی کرو جو میرا اور تمھارا سب کا پروردگار ہے۔ بلاشبہ جس کسی نے خدا کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھیرایا تو اس پر اللہ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا آتش دوزخ ہوا اور ظلم کرنے والوں کے لیے کوئی نہیں جو مددگار ہوگا۔

یقیناً وہ لوگ (حق سے) منکر ہوئے جنھوں نے کہا کہ خدا تین میں کا ایک ہے (یعنی باپ' بیٹا اور روح القدس) حالانکہ کوئی معبود نہیں مگر وہی معبود یگانہ اور جو کچھ یہ کہتے ہیں اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ان میں سے جن لوگوں نے انکار حق کیا ہے انھیں عذاب دردناک پیش آئے گا۔ (المائدہ:72، 73)

''اور جب ایسا ہوگا کہ اللہ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کیا تو نے لوگوں سے یہ کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو تو عیسیٰ علیہ السلام جواب میں عرض کرے گا' تیرے لیے پاکی ہو بھلا مجھ سے یہ بات کیسے ہو سکتی ہے کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں۔ اگر یہ میں نے کہا ہوگا تو ضرور تجھے معلوم ہوگا تو میرے دل کی بات جانتا ہے مگر مجھے تیرے ضمیر کا علم نہیں۔ تو ہی غیب کی ساری باتیں جاننے والا ہے میں نے تو صرف وہی بات کہی جس کے کہنے کا تو نے حکم دیا تھا۔ یعنی اللہ کی بندگی کرو میرا اور تمھارا سب کا پروردگار وہی ہے جب تک میں ان میں رہا ان کا نگران حال تھا۔ جب تو نے میرا وقت پورا کر دیا تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز کو دیکھنے والا اور نگہبانی کرنے والا ہے اگر تو ان لوگوں کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں تجھے اختیار ہے اور اگر انھیں بخش دے تو تو سب پر غالب ہے اور حکمت رکھنے والا ہے۔'' (المائدہ 116:5 تا 118)

ہندوؤں کا تصوّرِ رسالت

ہندوؤں کے ہاں نبی اور رسول خدا کے اوتار یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھے جاتے تھے جنھیں ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔ رام چندر جی کے متعلق یہ عقیدہ گھڑا گیا کہ ان کے اندر وشنو (کائنات کی پرورش کرنے والا دیوتا) نے حلول کیا تھا۔ اسی طرح سری کرشن جی کو بھی وشنو کا مظہر قرار دیا گیا اور ان کی پرستش ہونے لگی۔ دوسری طرف یہی ہستی جسے خدا کا اوتار قرار دیا جاتا ہے' جنسی لذائذ اور حسین عورتوں پر ریجھی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ نہاتی ہوئی گوپیوں کے کپڑے چھپا لیتے ہیں۔ ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے اتنے ہی جسم پیدا کر لیتے ہیں جتنی گوپیاں تھیں اور جب شک رشی سے راجا ہرکشت پوچھتا ہے کہ یہ کیسا اوتار خداوندی ہے جو دوسروں کی عورتوں سے ناجائز تعلقات رکھتا ہے تو رشی جواب دیتا ہے کہ خود دیوتا بھی بعض اوقات نیکی کی راہ سے ہٹ جاتے ہیں مگر ان کے گناہ ان کی ذات پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ مہاتما گوتم بدھ نے برہمنیت اور خدا و رسالت کے متعلق ہندو تصورات سے بغاوت کی لیکن ان کے انتقال کے ایک سو سال بعد ہی لوگوں نے بدھ کو خدا بنا ڈالا اور خدا کا تصور رسول کے تصور سے گڈمڈ ہو کر ایک ایسا تصور بنا جو نہ خدا کا ہے نہ رسُول کا۔

عرب مُشرکین کا تصوّرِ رسالت

عرب کے لوگ بھی ہندوؤں یونانیوں اور دوسری مشرک اقوام کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسانوں کی راہ نُمائی کے لیے انسان سے بالاتر ہستی ہونی چاہیے مثلاً جیسے فرشتے یا اس طرح کی کوئی آسمانی مخلوق' اسی لیے وہ آنحضرت ﷺ کے دعویٰ رسالت پر بڑی حیرت سے کہتے تھے ﴿اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل 94:17) کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا ہے! اور پوچھتے تھے ﴿اَبَشَرٌ یَّهْدُوْنَنَا﴾ (التغابن 6:64) کیا انسان ہماری راہنمائی کریں گے؟ وہ حضرت محمد ﷺ پر اعتراض ہی یہ کرتے تھے کہ وہ انسان ہیں ﴿اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ (ابراہیم 10:14) تم تو نہیں ہو لیکن ہماری طرح ایک بشر۔ انکار نبوت کے لیے ان کی دلیل یہ تھی ﴿هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ (انبیا 3:21) نہیں ہے' لیکن تمھاری ہی

طرح بشر۔﴿مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ نہیں ہیں لیکن تمھاری ہی طرح بشر' وہ کہتے تھے ہم تمھیں کیوں مانیں۔﴿مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا﴾ (الشعرا:154) تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو ﴿مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا﴾ (ہود:27) ہم تو تمھیں اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔

سورہ قٓ میں ہے "بلکہ انھیں تعجب ہے کہ انہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا۔ کافروں نے کہا یہ تو بڑی تعجب کی بات ہے۔" (ق:20) وہ پوچھتے تھے کہ اللہ کو اگر اپنا قاصد زمین پر بھیجنا تھا تو کسی فرشتے کو کیوں نہیں روانہ کیا۔

"جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے پیغمبر جب ان کے پاس سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا۔ ہم تو تمھاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔ (فصلت:14)

"انھوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے کہ یہ تو کھاتا پیتا ہے۔ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لیے خاص کوئی باغ کیوں نہ ہوا جس سے یہ کھاتا (الفرقان:۷۔۸) قرآن نے عرب مشرکین کو بتایا کہ یہ اعتراض کہ کوئی بشر نبی نہیں ہوسکتا' بڑا پرانا اعتراض ہے جب حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی رسالت کا اعلان کیا تو ان کی قوم نے بھی یہی کہا:

"یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تم ہی جیسا ایک انسان ہے جو تم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے ورنہ اگر خدا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا۔ یہ انوکھی بات تو ہم نے اپنے بزرگوں سے کبھی سنی ہی نہیں تھی (کہ انسان خدا کا پیغمبر بن کر آئے) (المومنون: ۲۴)۔ حضرت ہودؑ پر بھی یہی اعتراض کیا گیا تھا: "یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک بشر ہے تم ہی جیسا۔ وہی کچھ کھاتا ہے جو تم کھاتے ہو وہی کچھ پیتا ہے جو تم پیتے ہو اگر تم نے اپنے جیسے ایک بشر کی اطاعت کی تو بڑے گھاٹے میں رہو گے۔"

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ سے کہا گیا:

"کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں" (المومنون:47)

اس کے جواب میں انبیا علیہم السلام نے ہمیشہ یہ جواب دیا:

"ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمھاری ہی طرح بشر ہیں لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔" (ابراہیم:11)

عرب مشرکین رسول کے بارے میں یہ تصور بھی رکھتے تھے کہ خدا کی خدائی میں کچھ اس کی مرضی بھی چلتی ہے اس لیے وہ کہتے تھے کہ اگر تم خداؑ کے رسول ہو تو ہمارے لیے سونے کی چھت بنا دو۔ ریگستان میں نہریں جاری کردو۔ انھیں باغ و بہار علاقہ بنا دو۔ اپنے جلو میں فرشتے لے کر چلو یا ہمارے سامنے آسمان پر جا کر وہاں سے ایک کتاب لے آؤ۔ ان مطالبات کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ میں تو صرف ایک بشر ہوں تمھاری ہی طرح کا۔

"اور انھوں نے کہا ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے جب تک تم ہمارے لیے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمھارے لیے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا تم کہتے ہو آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمھارے لیے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمھارے آسمان پر چڑھنے کا ہمیں اس وقت تک یقین نہیں آئے گا جب تک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پہ اتار لاؤ جسے ہم پڑھ لیں۔" (بنی اسرائیل:91 تا94) اس کا جواب یہ تھا:

"کہہ دے اے پیغمبر' سبحان اللہ میں تو ایک بشر ہوں اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی ایمان لانے سے باز نہیں رکھا مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو آسمان سے ہم فرشتے کو رسول بنا کر ان پر اتارتے" (بنی اسرائیل:93)

اسی طرح مشرکین کو سمجھایا جاتا ہے:

"اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو جنھیں ہم وحی کرتے تھے۔ جاننے والوں سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے۔ (انبیا۔۷) سُورہ یوسف میں ہے۔

"اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔" (یوسف:109)

سورۂ نحل میں ہے "اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اُتاری تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اُتارا گیا اور تاکہ وہ سوچیں۔"

حضور اکرم ﷺ کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جاہل عربوں کو یہ بات ذہن نشین کرادی کہ رسول بھی بشر ہوتے ہیں اور وہ خدا کی الوہیت میں کسی طرح کے شریک نہیں ہوتے۔

"کہہ دے کہ مَیں تو تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔" (الکہف:110)

سورۂ حٰمٓ السجدہ کی آیت ہے۔ "کہہ دے کہ میں تو تمھاری طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہے اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو۔ خرابی شرک کرنے والوں کے لیے ہے۔"

"اے محمد ﷺ کہو میں تو اپنی ذات کے لیے بھی نفع و نقصان کی قدرت نہیں رکھتا سوائے اس کے جو خدا چاہے۔" (یونس:49)

"اے محمد ﷺ کہو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں نہ میں غیب کا حال جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔" (الانعام:50)

اور لوگو مَیں غیب جاننے والا ہوتا تو اپنے لیے بہت کچھ فائدے سمیٹ لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا میں تو محض ایک متنبہ کرنے والا ہوں اور جو میری بات مان لیں انھیں خوش خبری دینے والا ہوں۔" (الاعراف:118)

(عبدالکریم عابد)

نبوتِ محمدی ﷺ کا عقلی ثبوت

کچھ دیر کے لیے جسمانی آنکھیں بند کر کے تصور کی آنکھیں کھول لیجیے اور ایک ہزار چار سو بیس برس پیچھے پلٹ کر دنیا کی حالت پر نظر ڈالیے۔ یہ کیسی دنیا تھی۔ انسان اور انسان کے درمیان تبادلۂ خیالات کے وسائل کس قدر کم تھے۔ قوموں اور ملکوں کے درمیان تعلق کے ذرائع کتنے محدود تھے۔ انسان کی معلومات کس قدر کم تھیں۔ اس کے خیالات کس قدر تنگ تھے۔ اس پر وہم و تُحش کا کس قدر غلبہ تھا۔ جہالت کے اندھیرے میں علم کی روشنی کتنی دُھندلی تھی۔ اس اندھیرے کو دھکیل دھکیل کر کتنی دقتوں کے ساتھ پھیل رہی تھی۔ دنیا میں نہ تار تھا' نہ ٹیلیفون تھا' نہ ریڈیو تھا' نہ ریل اور ہوائی جہاز تھے' اور نہ مطابع اور اشاعت خانے تھے۔ نہ مدرسوں اور کالجوں کی کثرت تھی' نہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے تھے' نہ کتابیں کثرت سے لکھی جاتی تھیں' نہ کثرت سے ان کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس زمانے کے ایک عالم کی معلومات بھی بعض حیثیات سے موجودہ زمانے کے ایک عامی کی بہ نسبت کم تھیں۔ اس زمانے کی ایک اونچی سوسائٹی کا آدمی بھی موجودہ زمانے کے مزدور کی بہ نسبت کم شائستہ تھا۔ اس زمانے کا ایک روشن خیال آدمی بھی آج کل کے تاریک خیال آدمی سے زیادہ تاریک خیال تھا۔ جو باتیں آج ہر کس و ناکس کو معلوم ہیں' اس زمانے میں برسوں کی محنت اور تلاش کے بعد بھی بمشکل معلوم ہو سکتی تھیں۔ جو باتیں آج روشنی کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہیں' اور ہر بچے کو ہوش سنبھالتے ہی حاصل ہو جاتی ہیں' ان کے لیے اس زمانے میں سیکڑوں میل کے سفر کیے جاتے تھے' اور عمریں ان کی جستجو میں بیت جاتی تھیں۔ جن باتوں کو آج اوہام و خرافات سمجھا جاتا ہے' وہ اس زمانے کے ''حقائق'' تھے۔ جن افعال کو آج ناشائستہ اور وحشیانہ کہا جاتا ہے' وہ اس زمانے کے عام معمولات تھے۔ جن طریقوں سے آج انسان کا ضمیر نفرت کرتا ہے' وہ اس زمانے کے اخلاقیات میں نہ صرف جائز تھے' بلکہ کوئی شخص یہ خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ ان کے خلاف بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔ انسان کی عجائب پرستی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ کسی چیز میں اس وقت تک کوئی صداقت کوئی بزرگی کوئی پاکیزگی تسلیم ہی نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ فوق الفطرت نہ ہو' خلاف عادت نہ ہو' غیر معمولی نہ ہو' حتیٰ کہ انسان خود اپنے آپ کو اس قدر ذلیل سمجھتا تھا کہ کسی انسان کا خدا رسیدہ ہونا اور کسی خدا رسیدہ ہستی کا انسان ہونا اس کے تصور کی رسائی سے بہت دور تھا۔

اس تاریک دور میں زمین کا ایک گوشہ ایسا تھا' جہاں تاریکی کا تسلّط اور بھی زیادہ بڑھا ہوا تھا جو ممالک اس زمانے کے معیار تمدن کے لحاظ سے متمدن تھے۔ ان کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد' ایران' روم اور مصر کے ملکوں میں علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی کچھ روشنی پائی جاتی تھی۔ مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے انھیں عرب سے جدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے' اور صرف اموال کا مبادلہ کر کے واپس آ جاتے تھے۔ علم و تہذیب کی کوئی روشنی ان کے ساتھ نہ آتی تھی۔ ان کے ملک میں نہ کوئی مدرسہ تھا' نہ کتب خانہ تھا' نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا' نہ علوم و فنون سے کوئی دلچسپی تھی۔ تمام ملک میں گنتی کے چند آدمی تھے جنھیں کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اس زمانے کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے۔ ان کے پاس ایک اعلیٰ درجے کی باقاعدہ زبان ضرور تھی' جس میں خیالات کو ادا کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ ان میں بہترین ادبی مذاق بھی موجود تھا مگر ان کے لٹریچر کے جو بھی باقیات ہم تک پہنچے ہیں انھیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کس قدر محدود تھیں' تہذیب و تمدن میں ان کا درجہ کس حد تک پست تھا۔ ان پر اوہام کا کس قدر غلبہ تھا۔ ان کے خیالات اور ان کی عادات میں کتنی جہالت اور وحشت تھی' ان کے اخلاقی تصورات کتنے بھدے تھے۔

وہاں کوئی باقاعدہ حکومت نہ تھی' کوئی ضابطہ اور قانون نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا' اور صرف ''جنگل کے قانون'' کی پیروی کی جاتی تھی جس کا جس پر بس چلتا اُسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قابض ہو جاتا۔ یہ بات ایک عرب بدوی کی فہم سے بالاتر تھی کہ جو شخص اس کے قبیلے کا نہیں اسے وہ کیوں نہ مار ڈالے اور اس کے مال پر کیوں نہ متصرف ہو جائے۔

اخلاق اور شائستگی کے جو کچھ بھی تصورات ان لوگوں میں تھے وہ نہایت ادنیٰ اور سخت ناتراشیدہ تھے۔ پاک صاف' جائز و ناجائز' شائستہ اور ناشائستہ کی تمیز سے وہ تقریباً ناآشنا تھے۔ ان کی زندگی نہایت گندی تھی۔ ان کے طریقے وحشیانہ تھے۔ زنا' جوا' شراب' چوری راہزنی اور قتل و غارت گری ان کی زندگی کے معمولات تھے۔ وہ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف برہنہ ہو جاتے تھے۔ ان کی عورتیں ننگی ہو کر کعبے کا طواف کرتی تھیں' وہ اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے زندہ دفن کر دیتے تھے محض اس جاہلانہ خیال کی بنا پر کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے۔ وہ اپنے باپوں کے مرنے کے بعد اپنی سوتیلی ماؤں سے نکاح کر لیتے تھے۔ انھیں کھانے' لباس اور طہارت کے معمولی آداب بھی معلوم نہ تھے۔

مذہب کے باب میں وہ ان تمام جہالتوں اور ضلالتوں کے حصہ دار تھے جن میں اس زمانے کی دنیا مبتلا تھی۔ بت پرستی' ارواح پرستی' کواکب پرستی' غرض ایک خدا کی پرستش کے سوا اس وقت دنیا میں جتنی ''پرستیاں'' پائی جاتی تھیں' وہ سب ان میں رائج

تھیں۔ انبیائے قدیم اور ان کی تعلیمات کے متعلق کوئی صحیح علم ان کے پاس نہ تھا۔ وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ ان کے باپ ہیں۔ مگر یہ نہ جانتے تھے کہ دونوں باپ بیٹوں کا دین کیا تھا' اور وہ کس کی عبادت کرتے تھے۔ عاد اور ثمود کے قصے بھی ان میں مشہور تھے۔ مگر ان کی جو روایتیں عرب مؤرخین نے نقل کی ہیں' انھیں پڑھ جایئے کہیں آپ کو صالحؑ اور ہودؑ کی تعلیمات کا نشان نہ ملے گا۔ انھیں یہودیوں اور عیسائیوں کے واسطے سے بنی اسرائیل کی کہانیاں بھی پہنچی تھیں مگر وہ جیسی کچھ تھیں ان کا اندازہ کرنے کے لیے صرف ایک نظر ان اسرائیلی روایات پر ڈال لینا کافی ہے جو مفسرین اسلام نے نقل کی ہیں۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اہل عرب اور خود بنی اسرائیل جن انبیا سے واقف تھے' وہ کیسے انسان تھے اور نبوت کے متعلق ان کا تصور کتنا گھٹیا درجے کا تھا۔

ایسے زمانے میں' ایسے ملک میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے۔ بچپن ہی میں ماں' باپ اور دادا کا سایہ اس کے سر سے اٹھ جاتا ہے۔ اس لیے اس گئی گزری حالت میں ایک عرب بچے کو جو تھوڑی بہت تربیت مل سکتی تھی وہ بھی اسے نہیں ملتی۔ ہوش سنبھالتا ہے تو وہ بدوی لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے۔ اٹھنا' بیٹھنا' ملنا' جلنا سب کچھ انھی عربوں کے ساتھ تھا' جن کا حال اوپر آپ نے دیکھ لیا تعلیم کا نام تک نہیں' حتّٰی کہ پڑھنا لکھنا تک نہیں آتا۔ کسی عالم کی صحبت بھی میسر نہ ہوئی کہ "عالم" کا وجود اس وقت تمام عرب میں کہیں نہ تھا۔ چند مرتبہ اسے عرب سے باہر قدم نکالنے کا اتفاق ضرور ہوا۔ مگر یہ سفر صرف شام کے علاقے تک تھے اور ویسے ہی تجارتی سفر تھے جیسے کہ اس زمانے میں عرب کے تجارتی قافلے کیا کرتے تھے۔ بالفرض اگر ان اسفار کے دوران میں اس نے کچھ آثار علم و تہذیب کا مشاہدہ کیا اور کچھ اہل علم سے ملاقات کا اتفاق بھی ہوا تو ظاہر ہے کہ ایسے منتشر مشاہدات اور ہنگامی ملاقاتوں سے کسی انسان کی سیرت نہیں بن جاتی۔ ان کا اثر کسی شخص پر اتنا زبردست نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ماحول سے بالکل آزاد' بالکل مختلف اور اتنا بلند ہو جائے کہ اس میں اور اس کے ماحول میں کچھ نسبت ہی نہ رہے۔ ان سے ایسا علم حاصل ہونا ممکن ہی نہیں ہے جو ایک ان پڑھ بدوی کو ایک ملک کا نہیں تمام دنیا کا' اور ایک زمانے کا نہیں تمام زمانوں کا لیڈر بنا دے۔ اگر بہ فرض محال اس نے باہر کے لوگوں سے استفادہ کیا بھی ہو تو جو معلومات اس وقت دنیا کے کسی شخص کو حاصل ہی نہ تھیں' مذہب' اخلاق' تہذیب اور تمدّن کے جو تصورات اور اصول اس وقت دنیا میں کہیں موجود ہی نہ تھے' انسانی سیرت کے جو نمونے اس وقت کہیں پائے ہی نہیں جاتے تھے ان کے حصول کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

صرف عرب ہی کا نہیں تمام دنیا کا ماحول پیش نظر رکھیے اور دیکھیے کہ یہ شخص جن لوگوں میں پیدا ہوا' جن میں بچپن گزارا' جن کے ساتھ پل کر جوان ہوا' جن سے اس کا میل جول رہا' جن سے اس کے معاملات رہے' ابتدا ہی سے عادات میں' اخلاق میں وہ ان سب سے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا' اس کی صداقت پر اس کی ساری قوم گواہی دیتی ہے۔ اس کے کسی بدترین دشمن نے بھی کبھی اس پر یہ الزام نہیں لگایا کہ اس نے فلاں موقع پر جھوٹ بولا تھا۔ وہ کسی سے بدکلامی نہیں کرتا۔ کسی نے اس کی زبان سے کبھی گالی یا کوئی فحش بات نہیں سُنی۔ وہ لوگوں سے ہر قسم کے معاملات کرتا ہے مگر کبھی کسی سے تلخ کلامی اور تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کی زبان میں سختی کی بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی ایسی کہ جو کوئی اس سے ملتا ہے' گرویدہ ہو جاتا ہے۔ وہ کسی سے بدمعاملگی نہیں کرتا۔ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ برسوں سوداگری کا پیشہ کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسا بھی ناجائز طریقے سے نہیں لیتا۔ جن لوگوں سے اس کے معاملات پیش آتے ہیں' وہ سب اس کی ایمان داری پر کامل بھروسا رکھتے ہیں۔ ساری قوم اسے امین کہتی ہے۔ دشمن تک اس کے پاس اپنا قیمتی مال رکھواتے ہیں' اور وہ ان کی بھی حفاظت کرتا ہے۔ بے حیا لوگوں کے درمیان وہ ایسا حیادار ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اُسے برہنہ نہیں دیکھا۔ بداخلاقوں کے سامنے وہ ایسا پاکیزہ اخلاق ہے کہ کبھی کسی بدکاری میں مبتلا نہیں ہوتا۔ شراب اور جوئے کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ ناشائستہ لوگوں کے درمیان وہ ایسا شائستہ ہے کہ ہر بدتمیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے' اور اس کے ہر کام میں ستھرائی اور پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ سنگ دلوں کے درمیان وہ ایسا نرم دل ہے کہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا ہے۔ کسی کو اس سے دکھ نہیں پہنچتا اور وہ دوسروں کی خاطر دکھ اٹھاتا ہے۔ وحشیوں کے درمیان وہ ایسا صلح پسند ہے کہ اپنی قوم میں فساد و خوں ریزی کی گرم بازاری دیکھ کر اسے اذیت ہوتی ہے۔ اپنے قبیلے کی لڑائیوں سے دامن بچاتا ہے' اور مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش رہتا ہے۔ بت پرستوں کے درمیان وہ سلیم الفطرت اور صحیح العقل ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز اسے پوجنے کے لائق نظر نہیں آتی۔ کسی مخلوق کے آگے اس کا سر نہیں جھکتا۔ بتوں کے چڑھاوے کا کھانا بھی وہ قبول نہیں کرتا۔ اس کا دل خود بخود شرک اور مخلوق پرستی سے نفرت کرتا ہے۔

اس ماحول میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے کہ جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہے یا پتھروں کے ڈھیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے۔

تقریباً چالیس سال تک ایسی پاک صاف' شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک انقلاب شروع ہوتا ہے۔ وہ اس تاریکی سے گھبرا اٹھتا ہے' جو اسے ہر طرف محیط نظر آ رہی تھی۔ وہ جہالت' بداخلاقی' بدکرداری' بدنظمی' شرک اور بت پرستی کے اس ہول ناک سمندر سے نکل جانا چاہتا ہے' جو اسے گھیرے ہوئے تھا۔ اس ماحول میں کوئی چیز بھی اسے اپنی طبیعت کے مناسب نظر نہیں آتی۔ وہ سب سے الگ ہو کر آبادی سے دور پہاڑوں کی صحبت میں جا جا کر بیٹھنے لگتا ہے۔ تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گزارتا ہے۔ روزے رکھ رکھ کر اپنی روح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے' سوچتا ہے' غور و فکر کرتا ہے' کوئی ایسی روشنی ڈھونڈتا ہے جس سے وہ اس چاروں طرف چھائی ہوئی تاریکی کو دُور کر دے۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے اس بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے سنوار دے۔

یکایک اس کی حالت میں ایک عظیم الشان تغیر رُونما ہوتا ہے۔ ایک دم اس کے

دل میں وہ روشنی آ جاتی ہے' جو پہلے اس میں نہ تھی۔ اچانک اس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے' جس سے وہ اس وقت تک خالی تھا۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل کر آتا ہے۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے۔ اس سے کہتا ہے کہ یہ بت جن کے آگے تم جھکتے ہو یہ سب بے حقیقت چیزیں ہیں۔ انھیں چھوڑ دو۔ کوئی انسان' کوئی درخت' کوئی پتھر' کوئی روح' کوئی سیارہ اس قابل نہیں کہ تم اس کے آگے اپنا سر جھکاؤ' اور اس کی بندگی وعبادت کرو او اس کی فرماں برداری واطاعت کرو۔ یہ زمین' یہ چاند' یہ سورج' یہ ستارے' یہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمھارا اور ان سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ وہی مارنے اور جلانے والا ہے۔ اُسی کی بندگی کرو۔ اُسی کا حکم مانو۔ اُسی کے آگے سر جھکاؤ۔ یہ چوری' یہ لوٹ مار' یہ قتل وغارت گری' یہ ظلم وستم' یہ بدکاریاں جو تم کرتے ہو' سب گناہ ہیں۔ انھیں چھوڑ دو' خدا انھیں پسند نہیں کرتا' سچ بولو' انصاف کرو' نہ کسی کی جان لو' نہ کسی کا مال چھینو' جو کچھ لو حق کے ساتھ لو۔ جو کچھ دو حق کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو' اور انسان سب برابر ہیں۔ نہ کوئی ذلّت کا داغ لے کر پیدا ہوا ہے اور نہ کوئی عزّت کا تمغہ لے کر دنیا میں آیا۔ بزرگی اور شرف' نسل اور نسب میں نہیں' صرف خدا پرستی' نیکی اور پاکیزگی میں ہے۔ جو خدا سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے' وہی اعلیٰ درجے کا انسان ہے اور جو ایسا نہیں' وہ کچھ بھی نہیں۔ مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ تم میں سے ہر شخص اپنے اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس خدا کے سامنے' جو سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے۔ تم کوئی چیز اس سے نہیں چھپا سکتے۔ تمھاری زندگی کا کارنامہ اس کے سامنے بے کم وکاست پیش ہوگا اور اسی کارنامے کے لحاظ سے وہ تمھارے انجام کا فیصلہ کرے گا۔ اس عادل حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی' نہ رشوت چلے گی' نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا۔ وہاں صرف ایمان اور نیک عمل کی پوچھ ہوگی' جس کے پاس یہ سامان ہوگا' جنت میں جائے گا اور جس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہ ہوگا' وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

یہ تھا وہ پیغام جسے لے کر وہ غار حرا سے نکلا۔

جاہل قوم اس کی دشمن ہو جاتی ہے' گالیاں دیتی ہے' پتھر مارتی ہے۔ ایک دن دو دن نہیں' اکٹھے تیرہ برس تک اس پر سخت سے سخت ظلم توڑتی ہے۔ یہاں تک کہ اسے وطن سے نکال باہر کرتی ہے اور پھر نکالنے پر بھی دم نہیں لیتی۔ جہاں جا کر وہ پناہ لیتا ہے' وہاں بھی اسے ہر طرح ستاتی ہے۔ تمام عرب کو اس کے خلاف اُبھار دیتی ہے' اور کامل آٹھ برس اس کے خلاف برسرِ پیکار رہتی ہے۔ وہ ان سب تکلیفوں کو سہتا ہے' مگر اپنی بات سے نہیں ٹلتا۔

یہ قوم اس کی دشمن کیوں ہوئی؟ کیا زر اور زمین کا کوئی جھگڑا تھا؟ کیا وہ ان سے دُنیا کی کوئی چیز بھی مانگ رہا تھا؟ نہیں' ساری دشمنی صرف اس بات پر تھی کہ وہ ایک خدا کی بندگی' پرہیز گاری اور نیکوکاری کی تعلیم کیوں دیتا ہے؟ بُت پرستی' شرک اور بدعملی کے خلاف تبلیغ کیوں کرتا ہے؟ پجاریوں اور پروہتوں کی پیشوائی پر کیوں ضرب لگاتا ہے؟ سرداروں کی سرداری کا طلسم کیوں توڑتا ہے؟ انسان اور انسان کے درمیان سے اونچ نیچ کا فرق کیوں مٹانا چاہتا ہے؟ قبائلی اور نسلی تعصبات کو جاہلیت کیوں قرار دیتا ہے؟ زمانۂ قدیم سے سوسائٹی کا جو نظام بندھا چلا آ رہا ہے' اسے کیوں توڑنا چاہتا ہے؟ قوم کہتی تھی یہ باتیں جو تو کہہ رہا ہے' یہ سب خاندانی روایات' اور قومی طریقے کے خلاف ہیں۔ تو انھیں چھوڑ دے ورنہ ہم تیرا جینا بھی مشکل کر دیں گے۔

اچھا تو اس شخص نے یہ تکلیفیں کیوں اٹھائیں؟ قوم اسے بادشاہی دینے پر آمادہ تھی۔ دولت کے ڈھیر اس کے قدموں میں ڈالنے کو تیار تھی' بشرطیکہ وہ اپنی تعلیم سے باز آ جائے۔ مگر اس نے ان سب کو ٹھکرا دیا۔ اور اپنی تعلیم کی خاطر' پتھر کھانا اور ظلم سہنا قبول کیا۔ یہ آخر کیوں؟ کیا ان کے خدا پرست اور نیکوکار بن جانے میں اس کا ذاتی فائدہ تھا؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کے مقابلے میں ریاست' امارت' دولت اور عیش کے سارے لالچ بھی ناقابل التفات تھے؟ کیا کوئی ایسا فائدہ تھا جس کی خاطر ایک شخص سخت سے سخت جسمانی اور روحانی اذیتوں میں مبتلا ہونا اور کامل اکیس سال مبتلا رہنا بھی گوارا کر سکتا ہو؟ غور کرو۔ کیا نیک نفسی' ایثار اور ہمدردیٔ بنی نوع کا اس سے بھی بلند تر کوئی مرتبہ تمھارے تصور میں آ سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدے کی خاطر نہیں' دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھائے؟ جن کی بھلائی اور بہتری کے لیے وہ کوششیں کرتا ہے' وہی اسے پتھر ماریں' گالیاں دیں' گھر سے بے گھر کر دیں' غریب الوطنی میں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑیں اور ان سب باتوں پر بھی وہ ان کا بھلا چاہنے سے باز نہ آئے!

پھر دیکھو! کیا کوئی جھوٹا شخص کسی بے اصل بات کے پیچھے ایسی مصیبتیں برداشت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی تیر تکے لڑانے والا انسان محض گمان وقیاس سے کوئی بات کہہ کر اس پر اتنا جم سکتا ہے کہ مصیبتوں کے پہاڑ اس پر ٹوٹ جائیں' زمین اس پر تنگ کر دی جائے' تمام ملک اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہو' بڑی بڑی فوجیں اس پر اُمنڈ اُمنڈ کر آئیں' مگر وہ اپنی بات سے یک سرمو ہٹنے پر آمادہ نہ ہو؟ یہ استقامت' یہ عزم' یہ ثبات خود گواہی دے رہا ہے کہ اسے اپنی صداقت پر کامل یقین تھا۔ اگر اس کے دل میں شک وشبہ کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو وہ مسلسل اکیس سال تک مصائب کے پے در پے طوفانوں کے مقابلے میں کبھی نہ ٹھہر سکتا۔ یہ تو اس شخص کے انقلابِ حال کا ایک پہلو تھا۔ دوسرا پہلو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔

چالیس برس کی عمر تک وہ ایک عرب تھا عام عربوں کی طرح۔ اس دوران میں کسی نے اس سوداگر کو ایک خطیب' ایک جادو بیان مقرر کی حیثیت سے نہ جانا۔ کسی نے اسے حکمت اور دانائی کی باتیں کرتے نہ سُنا۔ کسی نے اسے الٰہیات اور فلسفۂ اخلاق' قانون اور سیاسیات ومعاشیات اور عمرانیات کے مسائل پر بحث کرتے نہ دیکھا۔ کسی نے اس سے خدا' ملائکہ' آسمانی کتابوں' پچھلے انبیا' امم قدیمہ' قیامت' حیات بعد الموت اور جنت ودوزخ کے متعلق ایک لفظ بھی نہ سنا۔ وہ پاکیزہ اخلاق' شائستہ اطوار اور بہترین سیرت تو ضرور رکھتا تھا مگر چالیس برس کی عمر کو پہنچنے تک اس کی ذات میں کوئی غیر معمولی بات نہ پائی گئی' جس سے لوگ متوقع ہوتے کہ یہ شخص اب کچھ بننے والا ہے۔ اس وقت تک جاننے والے اسے محض ایک خاموش' امن پسند اور نہایت شریف انسان کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مگر چالیس برس کے بعد جب وہ اپنے غار سے ایک نیا پیغام لے کر

نکلا تو یک لخت اس کی کایا ہی پلٹی ہوئی تھی۔

اب وہ حیرت انگیز کلام سنا رہا تھا جسے سن کر سارا عرب مبہوت رہ گیا۔ اس کلام کی شدت تاثیر کا یہ حال تھا کہ اس کے کٹر دشمن بھی اسے سنتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں یہ دل میں نہ اتر جائے۔ اس کی فصاحت و بلاغت اور زور بیان کا یہ عالم تھا کہ تمام قوم عرب کو، جس میں بڑے بڑے شاعر، خطیب اور زبان آوری کے مدعی موجود تھے اس نے چیلنج دیا اور بار بار چیلنج دیا کہ تم سب مل کر ایک ہی سورۃ اس کے مانند بنا لاؤ۔ مگر اس کے مقابلے کی جرأت کوئی نہ کر سکا۔ ایسا بے مثل کلام کبھی عرب کے کانوں نے سنا ہی نہ تھا۔

اب یکایک وہ ایک بے مثل حکیم، ایک لاجواب مصلح اخلاق و تمدن، ایک حیرت انگیز ماہر سیاسیات، ایک زبردست مقنن، ایک اعلیٰ درجے کا جج، ایک بے نظیر سپہ سالار بن کر ظاہر ہوا۔ اس ان پڑھ صحرا نشین نے حکمت و دانائی کی وہ باتیں کہنی شروع کر دیں، جو اس سے پہلے کسی نے نہ کہی تھیں، نہ اس کے بعد کوئی کہہ سکا۔ وہ امی الٰہیات کے عظیم الشان مسائل پر فیصلہ کن تقریریں کرنے لگا۔ اخلاق، تہذیب اور شائستگی کا درس دینے لگا۔ تاریخ اقوام سے عروج و زوال امم پر لیکچر دینے لگا۔ پرانے مصلحین کے کارناموں پر تبصرے، مذاہب عالم پر تنقید اور اختلافات اقوام کے فیصلے کرنے لگا۔ اس نے معاشرت اور معیشت، اجتماعی معاملات اور بین الاقوامی تعلقات کے متعلق قوانین بنانا شروع کر دیے اور ایسے قوانین بنائے کہ بڑے بڑے علماء اور عقلا غور و خوض اور عمر بھر کے تجربات کے بعد بمشکل ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں اور دنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں ان کی حکمتیں اور زیادہ کھلتی جاتی ہیں! وہ خاموش پرامن سوداگر، جس نے تمام عمر کبھی تلوار نہیں چلائی تھی، کبھی کوئی فوجی تربیت نہ پائی تھی حتٰی کہ جو عمر بھر میں صرف ایک مرتبہ ایک لڑائی میں محض ایک تماشائی کی حیثیت سے شریک ہوا تھا، دیکھتے دیکھتے وہ ایک ایسا بہادر سپاہی بن گیا جس کا قدم سخت سے سخت معرکوں میں بھی اپنے مقام سے ایک انچ نہ ہٹا۔ ایسا زبردست جنرل بن گیا جس نے نو سال کے اندر تمام عرب کو فتح کر لیا۔ ایسا حیرت انگیز ملٹری لیڈر بن گیا کہ اس کی پیدا کی ہوئی فوجی تنظیم اور جنگی روح کے اثر سے بے سر و سامان عربوں نے چند سال میں دنیا کی دو عظیم الشان فوجی طاقتوں کو الٹ کر رکھ دیا۔

وہ الگ تھلگ رہنے والا سکون پسند انسان، جس کے اندر کسی نے چالیس سال تک سیاسی دلچسپی کی بو بھی نہ پائی تھی، یکایک ایک زبردست ریفارمر اور مدبر بن کر ظاہر ہوا کہ تئیس سال کے اندر اس نے بارہ لاکھ مربع میل میں پھیلے ہوئے ریگستان کے منتشر، جنگ جو، جاہل، سرکش، غیر متمدن اور ہمیشہ آپس میں لڑنے والے قبائل کو ریل اور تار، ریڈیو اور پریس کی مدد کے بغیر، ایک تہذیب، ایک قانون اور ایک نظام حکومت کا تابع بنا دیا۔ اس نے ان کے خیالات بدل دیے۔ ان کے خصائل بدل دیے۔ ان کے اخلاق بدل دیے۔ ان کی ناشائستگی کو اعلیٰ درجے کی شائستگی میں، ان کی وحشت کو بہترین مدنیت میں، ان کی بدکرداری اور بداخلاقی کو اصلاح و تقویٰ اور مکارم اخلاق میں، ان کی سرکشی اور انارکی کو انتہا درجے کی پابندی قانون اور اطاعت امر میں تبدیل کر دیا۔ اس بانجھ قوم کو، جس کی گود میں صدیوں سے کوئی ایک بھی قابل ذکر انسان پیدا نہ ہوا تھا، اس نے ایسا مردم خیز بنایا کہ اس میں ہزار در ہزار اعاظم رجال اٹھ کھڑے ہوئے اور دنیا کو دین، اخلاق اور تہذیب کا درس دینے کے لیے چار دانگ عالم میں پھیل گئے اور یہ کام اس نے ظلم، جبر، دغا اور فریب سے انجام نہیں دیا۔ بلکہ دل موہ لینے والے اخلاق، روحوں کو مسخر کر لینے والی شرافت اور دماغوں پر قبضہ کر لینے والی تعلیم سے انجام دیا۔ اس نے اپنے اخلاق سے دشمنوں کو دوست بنا لیا۔ رحم اور شفقت سے دلوں کو موم کیا۔ عدل و انصاف سے حکومت کی۔ حق و صداقت سے کبھی ایک سر مو انحراف نہ کیا۔ جنگ میں بھی کسی سے بدعہدی اور دغا نہ کی۔ اپنے بدترین دشمنوں پر بھی ظلم نہ کیا۔ جو اس کے خون کے پیاسے تھے جنھوں نے اسے پتھر مارے تھے، اسے وطن سے نکالا تھا، اس کے خلاف تمام عرب کو کھڑا کیا تھا حتٰی کہ جنھوں نے جوش عداوت میں اس کے چچا کا کلیجا تک نکال کر چبا ڈالا تھا، انھیں بھی اس نے فتح پا کر بخش دیا۔ اپنی ذات کے لیے کبھی اس نے کسی سے بدلہ نہ لیا۔

ان سب باتوں کے ساتھ اس کے ضبط نفس، بلکہ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ تمام ملک کا بادشاہ ہو گیا، اس وقت بھی وہ جیسا فقیر پہلے تھا، ویسا ہی فقیر رہا۔ پھونس کے چھپر میں رہتا تھا۔ بوریے پر سوتا تھا۔ موٹا جھوٹا پہنتا تھا۔ غریبوں کی سی غذا کھاتا تھا۔ فاقے تک کر گزرتا۔ رات رات بھر اپنے خدا کی عبادت میں کھڑا رہتا تھا۔ غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت کرتا تھا۔ ایک مزدور کی طرح کام کرنے میں بھی اسے تامّل نہ تھا۔ آخر وقت تک اس کے اندر شاہانہ تمکنت، امیرانہ ترفع اور بڑے آدمیوں کے سے تکبر کی ذرا سی بو بھی پیدا نہ ہوئی۔ وہ ایک عام آدمی کی طرح لوگوں سے ملتا تھا۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ عوام کے درمیان اس طرح بیٹھتا تھا کہ اجنبی آدمی کو یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا تھا کہ اس محفل میں قوم کا سردار، ملک کا بادشاہ کون ہے۔ اتنا بڑا آدمی ہونے کے باوجود چھوٹے سے چھوٹے آدمی کے ساتھ بھی ایسا برتاؤ کرتا تھا کہ گویا وہ اسی جیسا ایک انسان ہے۔ تمام عمر کی جدوجہد میں اس نے اپنی ذات کے لیے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ اپنا پورا ترکہ اپنی قوم کے لیے وقف کر دیا۔ اپنے پیروؤں پر اس نے اپنے یا اپنی اولاد کے کچھ بھی حقوق قائم نہ کیے۔ حتٰی کہ اپنی اولاد کو زکوٰۃ لینے کے حق سے بھی محروم کر دیا۔ محض اس خوف سے کہ کہیں آگے چل کر اس کے پیرو اس کی اولاد ہی کو ساری زکوٰۃ نہ دینے لگ جائیں۔

ابھی اس عظیم الشان آدمی کے کمالات کی فہرست ختم نہیں ہوئی۔ اس کے مرتبے کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے آپ کو تاریخ عالم پر بحیثیت مجموعی ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ صحرائے عرب کا یہ ان پڑھ بادیہ نشین، جو چودہ سو برس پہلے اس تاریک دور میں پیدا ہوا تھا، دراصل دور جدید کا بانی اور تمام دنیا کا لیڈر ہے۔ وہ نہ صرف ان کا لیڈر ہے جو اسے مانتے ہیں بلکہ ان کا بھی لیڈر ہے جو اسے نہیں مانتے۔ انھیں اس امر کا احساس تک نہیں کہ جس کے خلاف وہ زبان کھولتے ہیں اس کی راہ نمائی کس طرح ان کے خیالات میں، ان کے اصول حیات اور قوانین عمل میں اور ان کے عصر جدید کی روح میں پیوست ہو گئی ہے۔

یہی شخص ہے جس نے دنیا کے تصورات کا رخ وہمیت و عجائب پرستی اور رہبانیت

کی طرف سے ہٹا کر عقلیت، حقیقت پسندی اور متقیانہ دنیاداری کی طرف پھیر دیا۔ اسی نے محسوس معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزوں کو سمجھنے اور انھی کو معیار صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اسی نے خرقِ عادت میں خدائی کے آثار ڈھونڈنے والوں کی آنکھیں کھولیں' اور انھیں آثار فطرت (Natural Phenomena) میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا خُوگر بنایا۔ اسی نے خیالی گھوڑے دوڑانے والوں کو قیاس آرائی (Speculation) سے ہٹا کر تعقل' تفکر، مشاہدہ اور تحقیق کے راستے پر لگایا۔ اسی نے عقل وحس اور وجدان کے امتیازی حدود انسان کو بتائے۔ مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی۔ دین نے علم وعمل اور علم وعمل سے دین کا ربط قائم کیا۔ مذہب کی طاقت سے دنیا میں سائنٹیفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔ اسی نے شرک اور مخلوق پرستی کی بنیادوں کو اکھاڑا' اور علم کی طاقت سے توحید کا اعتقاد ایسی مضبوطی کے ساتھ قائم کیا کہ مشرکوں اور بت پرستوں کے مذہب بھی وحدانیت کا رنگ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اسی نے اخلاق' اور روحانیت کے بنیادی تصورات کو بدلا۔ جو لوگ ترکِ دنیا اور نفس کشی کو عین اخلاق سمجھتے تھے' جن کے نزدیک نفس وجسم کے حقوق ادا کرنے اور دنیوی زندگی کے معاملات میں حصہ لینے کے ساتھ روحانی ترقی اور نجات ممکن ہی نہ تھی' انھیں اُسی نے تمدّن اور سماج اور دنیوی عمل کے اندر فضیلت اخلاق اور ارتقائے روحانی اور حصول نجات کا راستہ دکھایا۔ پھر وہی ہے جس نے انسان کو اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ کیا۔ جو لوگ بھگوان، اوتار اور ابن اللہ کے سوا کسی کو ہادی وپیشوا تسلیم کرنے پر تیار نہ تھے' انھیں بھی اسی نے بتایا کہ انسان اور تمھارے جیسا ہی انسان آسمانی بادشاہت کا نمائندہ اور خداوند عالم کا خلیفہ ہوسکتا ہے۔ جو لوگ ہر طاقت ور انسان کو اپنا خلیفہ بناتے تھے' انھیں اسی نے سمجھایا کہ انسان بجز انسان کے اور کچھ نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص تقدس، حکمرانی اور آقائی کا پیدائشی حق لے کر آیا ہے' اور نہ کسی پر ناپاکی، محکومیت اور غلامی کا پیدائشی داغ لگا ہوا ہے۔ اسی کی تعلیم نے دنیا میں وحدتِ انسانی، مساوات، جمہوریت اور آزادی کے تخیلات پیدا کیے۔

تصورات سے آگے بڑھیے۔ آپ کو اس اُمّی کی لیڈر شپ کے عملی نتائج' دنیا کے قوانین، طریقوں اور معاملات میں اس کثرت سے نظر آئیں گے کہ ان کا شمار مشکل ہو جائے گا۔ اخلاق اور تہذیب وشائستگی اور طہارت ونظافت کے کتنے ہی اُصول ہیں جو اس کی تعلیم سے نکل کر تمام دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ معاشرت کے جو قوانین اس نے بنائے تھے' دنیا نے کس قدر ان کی خوشہ چینی کی اور اب تک کیے جا رہی ہے۔ معاشیات کے جو اصول اس نے سکھائے ہیں' ان سے دنیا میں کتنی تحریکیں پیدا ہوئیں اور اب تک پیدا ہوئے جا رہی ہیں۔ حکومت کے جو طریقے اس نے اختیار کیے تھے' ان سے دنیا کے سیاسی نظریات میں کتنے انقلابات برپا ہوئے اور ہو رہے ہیں' عدل اور قانون کے جو اصول اس نے وضع کیے تھے' انھوں نے دنیا کے عدالتی نظامات اور قانونی افکار کو کس قدر متاثر کیا اور اب تک ان کی تاثیر خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔ جنگ اور صلح اور بین الاقوامی تعلقات کی تہذیب جس شخص نے عملاً دنیا میں قائم کی' وہ دراصل یہی عرب کا اُمّی ہے' ورنہ پہلے دنیا اس سے ناواقف تھی کہ جنگ کی بھی کوئی تہذیب ہوسکتی ہے' اور مختلف قوموں میں مشترک انسانیت کی بنیاد پر بھی معاملات ہونے ممکن ہیں۔

انسانی تاریخ کے منظر میں اس حیرت انگیز انسان کی بلند وبالا شخصیت اتنی اُبھری ہوئی نظر آتی ہے کہ ابتدا سے لے کر اب تک بڑے بڑے تاریخی انسان جنھیں دنیا اکابر HEROES میں شمار کرتی ہے' جب اس کے مقابلے میں لائے جاتے ہیں تو اس کے آگے بونے نظر آتے ہیں۔ دنیا کے اکابر میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کے کمالات کی چمک دمک انسانی زندگی کے دو ایک شعبوں سے آگے بڑھ سکی ہو۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے مگر عملی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پُتلا ہے مگر فکر میں کم زور ہے۔ کسی کے کمالات سیاسی تدبیر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہانت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے پہلو پر اتنی اچھی ہے کہ دوسرے پہلو اوجھل ہو گئے ہیں۔ کسی نے اخلاق اور روحانیت کو لیا' تو معیشت وسیاست کو بھلا دیا۔ کسی نے معیشت وسیاست کو لیا' تو اخلاق وروحانیت کو نظر انداز کر دیا۔ غرض تاریخ میں ہر طرف یک رُخے ہیرو ہی نظر آتے ہیں۔ مگر تنہا یہی ایک شخصیت ایسی ہے جس میں تمام کمالات جمع ہیں۔ وہ خود ہی فلسفی بھی ہے اور حکیم بھی' اور خود ہی اپنے فلسفے کو عملی زندگی میں نافذ کرنے والا بھی۔ وہ سیاسی مُدبّر بھی ہے' فوجی لیڈر بھی ہے۔ واضع قانون بھی ہے۔ معلم اخلاق بھی ہے۔ مذہبی اور روحانی پیشوا بھی ہے۔ اس کی نظر انسان کی پُوری زندگی پر پھیلتی ہے' اور چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات تک جاتی ہے۔ کھانے اور پینے کے آداب اور جسم کی صفائی سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک ایک ایک چیز کے متعلق وہ احکام اور ہدایات دیتا ہے۔ اپنے نظریات کے مطابق ایک مستقل تہذیب CIVILIZATION وجود میں لا کر دکھا دیتا ہے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں میں ایسا صحیح توازن EQUILIBRIUM قائم کرتا ہے کہ افراط وتفریط کا کہیں نشان تک نظر نہیں آتا۔

کیا اس جامعیت کا کوئی دوسرا شخص تمھاری نظر میں ہے؟

دنیا کی بڑی بڑی تاریخی شخصیتوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو کم وبیش اپنے ماحول کی پیدا کردہ نہ ہو۔ مگر اس شخص کی شان سب سے نرالی ہے۔ اس کے بنانے میں اس کے ماحول کا کوئی حصہ نظر نہیں آتا اور نہ کسی دلیل سے یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ عرب کا ماحول اس وقت تاریخی طور پر ایسے ایک انسان کی پیدائش کا مقتضی تھا۔ بہت کھینچ تان کر تم جو کچھ کہہ سکتے ہو وہ اس سے زیادہ کچھ نہ ہوگا کہ تاریخی اسباب عرب میں ایک ایسے لیڈر کے ظہور کا تقاضا کرتے تھے جو قبائلی انتشار کو مٹا کر ایک قوم بناتا اور ممالک کو فتح کر کے عربوں کی معاشی فلاح وبہبود کا سامان کرتا یعنی ایک نیشنلسٹ لیڈر' جو اس وقت کی تمام عربی خصوصیات کا حامل ہوتا۔ ظلم' بے رحمی' خوں ریزی اور مکر ودغا' غرض ہر ممکن تدبیر سے اپنی قوم کو خوش حال بناتا اور ایک سلطنت پیدا کر کے اپنے پس ماندوں کے لیے چھوڑ جاتا۔ اس کے سوا اس وقت کی عربی تاریخ کا کوئی تقاضا تم ثابت نہیں کر سکتے۔ ہیگل کے فلسفۂ تاریخ یا مارکس کی مادی تعبیر تاریخ کے نقطۂ نظر سے تم حد سے حد یہی حکم لگا سکتے ہو کہ اس وقت اس ماحول میں ایک قوم اور ایک سلطنت بنانے والا ظاہر

ہونا چاہیے تھا' یا ظاہر ہو سکتا تھا۔ مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعے کی توجیہ کیوں کر کرے گا کہ اس وقت اس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہوا جو بہترین اخلاق سکھانے والا' انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا اور جاہلیت کے اوہام و تعصبات کو مٹانے والا تھا۔ جس کی نظر قوم' نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پوری انسانیت میں پھیل گئی۔ جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں' بلکہ عالم انسانی کے لیے ایک اخلاقی' روحانی' تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد ڈالی۔ جس نے معاشی معاملات، سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کو عالم خیال میں نہیں بلکہ عالم واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھایا اور روحانیت، مادیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا ویسا ہی شاہ کار ہے جیسا اس وقت تھا۔ کیا ایسے شخص کو تم عرب جاہلیت کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا' بلکہ جب ہم اس کے کارنامے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے' اس کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی صدیوں اور ہزاروں MILLENNIA کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی اور عملی ہدایات دیتا ہے کہ جو ہر حال میں یکساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنھیں تاریخ نے پُرانا کر دیا ہے' جن کی تعریف ہم صرف اس حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے اچھے راہ نُما تھے۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز' وہ انسانیت کا ایسا راہ نُما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت MARCH کرتا ہے اور ہر دور میں ویسا ہی جدید MODERN نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دور کے لیے تھا۔ تم جن لوگوں کو فیاضی کے ساتھ "تاریخ بنانے والے" HISTORY MAKERS کا لقب دیتے ہو' وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوئے CREATURES OF HISTORY ہیں۔ دراصل تاریخ بنانے والا پوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے۔ دنیا کے لیے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کیے ہیں' ان کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ ہر ایسے موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے' اور وہ اسباب خود ہی اس انقلاب کا رخ اور راستہ بھی معیّن کر رہے تھے جس کے برپا ہونے کے وہ مقتضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضا کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اُس ایکٹر کا پارٹ ادا کر دیا جس کے لیے اسٹیج اور کام دونوں پہلے سے معیّن ہوں۔ مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا کرنے والوں کی پوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے' وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کر دیا۔ جہاں انقلاب کا مواد موجود نہ تھا' وہاں اس نے خود مواد تیار کیا۔ جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی' وہاں خود اس نے اپنے مطلب کے آدمی تیار کیے' اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزار ہا انسانوں کے قالب میں اُتار دیا اور انھیں ویسا بنایا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کی طاقت اور قوت ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان پیدا کیا۔ خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معیّن کی اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اس راستہ پر چلایا' جس پر وہ اسے چلانا چاہتا تھا۔ اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز تمھیں اور کہاں نظر آتا ہے۔؟

آیئے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ تمھیں چودہ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشے میں ایک گلہ بانی' سوداگری کرنے والے اَن پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکا یک اتنا علم' اتنی روشنی' اتنی طاقت' اتنے کمالات' اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کون سا ذریعہ تھا؟ آپ کہتے ہیں یہ سب اس کے دل و دماغ کی پیداوار تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھی تو اسے خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا تو وہ دنیا جس نے رام کو خدا بنا ڈالا' جس نے کرشن کو بھگوان قرار دینے میں تامّل نہ کیا' جس نے بودھ کو خود بخود خدا بنا لیا' جس نے مسیح کو اپنی مرضی سے ابن اللہ مان لیا' جس نے آگ' پانی اور ہوا تک کو پُوج ڈالا' وہ ایسے زبردست با کمال شخص کو خدا مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر دیکھو' وہ خود کیا کہہ رہا ہے وہ اپنے کمالات سے ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا۔ کہتا ہے:

"میں ایک انسان ہوں' تمھی جیسا انسان' میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں۔ سب کچھ خدا کا ہے' اور خدا ہی کی طرف سے ہے' یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوع انسانی عاجز ہے' میرا کلام نہیں ہے' میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے' لفظ بہ لفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو میں نے دکھائے' یہ قوانین جو میں نے وضع کیے' یہ اصول جو میں نے تمھیں سکھائے ہیں' ان میں سے کوئی چیز بھی میں نے نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں خدا کی راہ نُمائی کا محتاج ہوں۔ ادھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔"

دیکھو یہ کیسی حیرت انگیز صداقت ہے! کیسی امانت اور راست بازی ہے! جھوٹا انسان تو بڑا بننے کے لیے دوسروں کے ایسے کمالات کا کریڈٹ لے لینے میں بھی تامّل نہیں کرتا' جن کے اصل ماخذ کا پتا بآسانی چل جاتا ہے' لیکن یہ شخص ان کمالات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا' جنھیں وہ اپنے کمالات کہتا تو کوئی اسے جھٹلا نہ سکتا تھا' کیوں کہ کسی کے پاس اس کے اصل ماخذ تک پہنچنے کا ذریعہ ہی نہیں۔ سچائی کی اس سے زیادہ کھلی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس شخص سے زیادہ اور کون سچا ہو گا جسے ایک نہایت مخفی ذریعے سے ایسے بے نظیر کمالات حاصل ہوں' اور وہ بلا تکلف اپنے اصلی ماخذ کا حوالہ دے دے؟ بتاؤ! کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟ (سیّد ابوالاعلیٰ مودودی)

وحی کی حقیقت

لفظ وحی کا مادہ ''و ح ی'' ہے۔ لغوی معنی ہیں لطیف اور مخفی اشارہ' پیغام (رسالت)' دل میں ڈالنا (الہام)' چھپا کر بات کرنا (کلامِ خفی)' کتابت (لکھنا)' کتاب اور مکتوب' نیز جو کچھ تم کسی دوسرے کے خیال میں ڈالو۔

الوحی' ایسا اشارہ جس میں تیزی اور سُرعت ہو۔ وَحَیْتُ لَکَ بِخَبرِ کَذا (مَیں نے تمھیں فلاں بات کا اشارہ کر دیا یا چپکے سے مطلع کر دیا)۔ چنانچہ سورۃ مریم میں حضرت زکریاؑ کے متعلق ہے۔ انہوں نے کہا: ''پروردگار' میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔'' فرمایا: ''تیرے لیے نشانی ہے کہ تو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا۔'' چنانچہ وہ محراب سے نکل کر اپنی قوم کے سامنے آیا اور اس نے اشارے سے انھیں ہدایت کی۔'' (آیات 10' 11)۔ یعنی حضرت زکریاؑ نے زبان سے نہیں' اشارے سے بات کی۔

الوحی کے ایک معنی کتابت (لکھنا) بھی ہیں۔ وَحَیتُ الکِتَابَ (مَیں نے کتاب کو لکھا)۔ واحِ' لکھنے والا (کاتب)۔ الوحِیّ لکھی ہوئی چیز یا نامہ' سورۃ مائدہ کی آیت 111 میں جو ہے: ﴿وَاِذْ اَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیّنَ﴾ تو اس میں وحی کے معنی لکھے ہوئے حکم کے ہیں۔ یعنی اس وحی کے ذریعے (جو بقول راغب) حضرت عیسیٰؑ کی وساطت سے انجیل میں لکھی ہوئی بھیجی گئی تھی۔

اَوحیٰ کے معنی حکم کرنا' امر کرنا۔ چنانچہ صاحب تاج نے کہا ہے کہ سورۃ مائدہ کی آیت 111 میں حواریوں کی طرف وحی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انھیں حکم دیا تھا۔ اور یہ وحی حضرت عیسیٰ کی وساطت سے حواریوں کو ملی تھی۔ ابنِ فارس نے کہا ہے کہ وہ چیز جسے تم کسی کی طرف پہنچا دو اور اسے اس کا علم ہو جائے' وحی کہلاتی ہے' خواہ اسے پہنچانے کی کیفیت کچھ ہی ہو۔ مخفی طور پر یا واضح طور پر۔

سورۃ حٰم سجدۃ' آیت 12 میں ہے: ﴿وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا﴾ (اور ہر آسمان میں اس کا امر یعنی قانون وحی کر دیا)۔ اس میں ''امر وحی'' کے معنی مامور کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ قانونِ خداوندی' جس کی رو سے خارجی کائنات کی ہر شے اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرداں ہے۔ اسی کو سورۃ نور کی آیت 41 میں اس طرح بیان کیا گیا ہے (ترجمہ): ''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ کی تسبیح کر رہے ہیں' وہ سب جو آسمانوں اور زمین میں ہیں' اور وہ پرندے جو پر پھیلائے اڑ رہے ہیں؟ ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کا طریقہ جانتا ہے۔ اور یہ سب جو کچھ کرتے ہیں' اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔'' یعنی کائنات کی ہر شے جانتی ہے کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور وہ مقصد کیا ہے جس کے حصُول کے لیے انھیں سرگرم عمل رہنا ہے۔ یہی وہ ''وحی'' ہے جو ان میں جاری و ساری ہے۔ یعنی امرِ خداوندی' قانونِ خداوندی۔

کائنات میں ہر شے خدا کے امر (حکم) کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ یہ خدا کی وہ وحی ہے جو ہر شے میں از خود ودیعت کر دی گئی ہے۔ اسی کو قانونِ فطرت کہتے ہیں یا جان داروں کے لیے جبلّت' یہ قانونِ خداوندی ہے۔ یہ ان چیزوں کا خود پیدا کردہ نہیں ہوتا بلکہ خدا کی طرف سے عائد کردہ ہوتا ہے۔

انسان بھی کائنات کا ایک حصّہ ہے۔ اس لیے اس کے لیے بھی ضروری ہے کہ یہ ایک ایسے قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کا خود پیدا کردہ نہ ہو بلکہ اسے خارج سے ملے۔ جہاں تک اس کی طبیعی زندگی کا تعلق ہے' اس پر وہی قانونِ فطرت عائد ہوتا ہے جو دوسرے حیوانات پر ہوتا ہے۔ کھانا پینا' سونا' جاگنا' افزائشِ نسل' بیماری' موت' سب اسی قانون کے مطابق واقع ہوتے ہیں۔ یہ قانون انسان کا اپنا وضع کردہ نہیں۔ لیکن انسان کی زندگی صرف طبیعی زندگی ہی نہیں' بلکہ اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی بھی ہے۔ نیز اس کی ذات بھی ہے۔ اس کے لیے بھی اسے قانون کی ضرورت ہے اور وہ قانون ایسا ہونا چاہیے جو اس کا خود ساختہ نہ ہو' بلکہ قانونِ فطرت کی طرح اسے خارج سے ملا ہو۔ اس قانون کا نام بھی ''وحی'' ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ:

(1) یہ وحی ہر فرد کو الگ الگ نہیں ملتی۔ اس کے لیے خدا کی طرف سے قاعدہ یہ مقرر ہوا تھا کہ یہ وحی کسی ایک انسان کو دی جائے اور وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچائے۔ اس انسان کو نبی اور رسول کہتے ہیں۔ یہ وحی انبیا سے مخصوص ہے۔

(2) کائنات کی کسی چیز کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ چاہے تو اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرے جو اس کے لیے وحی کیا گیا ہے اور چاہے تو اس کے خلاف کوئی اور طریقہ اختیار کرے۔ لیکن انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو اس وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اس کے خلاف کوئی دوسری روش اختیار کرے۔ یہ اس لیے کہ انسانی ذات کی نشوونما کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا اختیار و ارادہ استعمال کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ وحی کے لیے یہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہر فرد کو براہ راست نہ ملے' بلکہ رسول کی معرفت دوسرے انسانوں تک پہنچے تو اس میں بھی یہی مصلحت پوشیدہ ہے کہ انسان وحی کے راستے پر اپنے اختیار و ارادہ سے چلے' اس لیے کہ اشیائے کائنات کو جو وحی براہِ راست دے دی جاتی ہے' تو انھیں اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ اس سے سرکشی برتیں۔ انھیں بہر حال اس کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔

(3) انسان کو یہ تو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو وحی کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اس کے خلاف روش اختیار کرے۔ لیکن یہ اس کے بس میں نہیں کہ وہ وحی کے خلاف زندگی بسر کر کے وہ نتائج حاصل کر لے جو وحی کے مطابق زندگی بسر کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ جس طرح اسے اس کا تو اختیار ہے کہ وہ سنکھیا کی ڈلی نگل جائے یا اسے اٹھا کر پھینک دے لیکن اس کا اختیار نہیں کہ وہ سنکھیا کھا کر اس کا اثر مصری کی ڈلی کا سا پیدا کر لے۔

خدا کا قانون جو انبیائے کرام کی وساطت سے انسانوں کو ملتا ہے ''الوحی'' کہلاتا ہے۔ اس کے خدا سے پانے میں نبی کے سوا کوئی دوسرا انسان شریک نہیں ہوتا۔ یعنی انبیا کے سوا کسی اور کو وحی نہیں مل سکتی اور اس وحی کو انبیائے کرام اپنے کسب و ہنر سے حاصل نہیں کرتے بلکہ یہ انھیں خارج سے اسی طرح ملتی ہے جس طرح اشیائے کائنات کو از خود خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ وحی منزل من اللہ ہوتی ہے یعنی خدا کی طرف سے نازل شدہ۔ یعنی یہ شخص اپنی کوشش سے وحی کے مقام تک نہیں پہنچتا بلکہ وحی خود اُتر کر اس تک پہنچتی ہے۔ ''منزل من اللہ'' کہنے میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ انسان اپنی کوشش سے طبعی دنیا کے پوشیدہ حقائق کو دریافت و منکشف کر سکتا ہے لیکن جو حقائق اسے وحی کے ذریعے ملتے ہیں وہ صاحبِ وحی پر از خود منکشف (Revealed) ہوتے ہیں۔ یعنی وحی کے ذریعے حقیقت خود اپنے آپ کو صاحبِ وحی پر منکشف کرتی ہے۔ اسی کو نزولِ وحی کہتے ہیں۔ سورۃ بقرہ آیت 97 میں ہے: ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (جبریل نے اللہ ہی کے اذن سے یہ قرآن تمھارے قلب پر نازل کیا ہے)۔'' چوں کہ وحی صرف انبیائے کرام کو ملتی ہے اس لیے ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ اس کی کیفیت و ماہیت کیسی ہوتی ہے؟ وہ کس طرح ملتی ہے ہمیں صرف اس پر ایمان رکھنا ہوتا ہے کہ وہ نبی کو من جانب اللہ ملتی ہے اور اس پر بھی کہ چوں کہ رسولِ کریم ﷺ کے بعد نبوت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اس لیے اب کسی انسان کو براہِ راست وحی نہیں مل سکتی۔

(وحی کی ضرورت آخر انسانوں کو کیوں پیش آتی ہے؟ وحی کس صورت یا کن صورتوں میں اللہ کی جانب سے نازل ہوتی ہے؟ کیا قرآن بھی منزل من اللہ اور وحی الٰہی ہے؟ رسولِ کریم ﷺ پر وحی کیوں کر نازل ہوتی تھی؟ یہ اور اس نوعیت کے انتہائی مشکل اور پیچیدہ اُمور و مسائل پر ایک انتہائی فاضلانہ تحقیق عرصہ ہوا مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے کی تھی جو ''وحی الٰہی'' کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوئی تھی۔ یہاں سیرتِ محمدی ﷺ کے حوالے سے کتابِ مذکورہ کے متعلق حصوں کی تلخیص پیش کی جاتی ہے)

وحی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ زیورِ علم و عقل سے آراستہ کیا اور اس نے انسان کی جسمانی نشوونما اور اس کی مادی زندگی کی ترقی و فلاح کے لیے کارگاہ ہست و بود کو رنگ رنگ کے نقش و نگار سے سجایا اور ابنِ آدم کی تربیت و کامرانی کے لیے ایک مخصوص نظام کے ماتحت قطعی و حتمی وسائلِ معیشت پیدا کیے۔ چنانچہ وہ پانی پیتا ہے ہوا میں سانس لیتا ہے بادلوں سے بارش ہوتی ہے جو اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز و شاداب کر دیتی ہے اور جس سے اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ آگ سے وہ اپنی غذا تیار کرتا ہے۔ آفتاب کی دھوپ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں جن کی تخلیق میں انسان کی صنعت و حرفت کو کوئی دخل نہیں انھی پر حیاتِ انسانی کے قیام و بقا کا دارومدار ہے۔ یہ تمام اشیا وہ ہیں جنھیں مادی زندگی کے قدرتی وسائل و ذرائع کہا جاتا ہے لیکن اس مادی زندگی سے بڑھ کر انسان کی ایک اور زندگی ہے جسے روحانی اور اخلاقی زندگی کہتے ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہی وہ اصل حیات ہے جس پر انسان کی اجتماعی زندگی کا صالح اور درست نظام قائم رہ سکتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام تمدنی ترقیات عمرانی ایجادات و اختراعات اور عقلی تحقیقات و اکتشافات انسانیت کی تعمیر میں مفید ثابت ہونے کے بجائے خود اس کے لیے سمِ قاتل بن جائیں اور اس کے سماج وحشیوں اور درندوں کے مہیب ریوڑ کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ جائیں۔ جس طرح پورے نظامِ شمسی کے قیام و بقا کا دارومدار اجرامِ فلکی کے باہمی جذب و انجذاب پر ہے ٹھیک اسی طرح انسانی معاشرے کے نظم و نسق اور اس کی فلاح و نجاح کا انحصار حاسۂ اخلاقی یا روحانی اعمال و ضوابط پر ہے۔

اس بنا پر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رب العالمین جس نے انسان کی مادی و جسمانی زندگی کے قرار و قیام کا خود انتظام کیا اس کے لیے ایسے قدرتی وسائل و ذرائع پیدا کیے جن کی صنعت و تخلیق میں انسان کے اپنے دستِ ایجاد کو مطلقاً دخل نہیں ہے۔ وہ ہمیں اخلاقی اور روحانی زندگی کے ایسے قدرتی اصول و آئین نہ بتاتا جو صالح تمدن کے اساس و بنیاد بنیں اور جو قطعی و حتمی ہونے کی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانے میں ہر شخص کے لیے لائقِ عمل ہوں اور ان میں کسی کے لیے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

عقل کی کوتاہی

کہا جا سکتا ہے اس طرح کے اصول و ضوابط کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خدا کے بنائے ہوئے ہوں اور اس نے ہی انسان کو ان کی تلقین کی ہو۔ جس طرح انسان اپنے رہنے کے لیے مکانات بناتا ہے گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے لیے کپڑے بُنتا اور تیار کرتا ہے اور اسی طرح کی ہزاروں صنعتیں اس نے اپنے نفع کے لیے ایجاد کر رکھی ہیں۔ وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے لیے اخلاقی ضوابط و قواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کے لیے خود ہی کوئی نسخۂ کیمیا تجویز کر لے۔ عقل جس طرح مادی ترقی کی راہ میں راہ نُمائی کرتی ہے اخلاق اور روحانیت کے میدان میں بھی وہ اسی طرح شمعِ ہدایت بن سکتی ہے اور اس کا ناخنِ تدبیر دونوں جگہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی عقل کتنی ہی کامل و مکمل ہو نقص سے مبرّا نہیں ہو سکتی۔ انسان خود اپنی فطرت و طبیعت کے اعتبار سے ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس بنا پر اس کی کوئی قوت بھی خواہ ظاہری ہو یا باطنی مادی ہو یا روحانی کامل نہیں ہے۔ ہر معاملے میں صحت کے ساتھ خطا کمال

کے ساتھ نقص اور حافظہ کے ساتھ سہو ونسیان کا خدشہ لگا ہوا ہے اور کیوں نہ ہو' امکان و حدوث کی ظلمت کے ساتھ کمالِ بے خطا کا نور جمع کس طرح ہو سکتا ہے۔ جس طرح انسان رنگ اور شکل میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں' ٹھیک اسی طرح اپنے قوائے فکریہ و باطنیہ کے لحاظ سے بھی وہ مختلف اور ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ کوئی انسانی اختراع وایجاد خواہ کتنی ہی حقیقت سے قریب ہو' اختلاف کی گنجائش سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آج تک دنیا کی ممتاز عقلیں بھی کسی ایک مسئلے پر متفق الرائے نہ ہو سکیں۔ فلسفۂ یونان کے جو بنیادی نظریے تھے اور جو صدیوں تک عالم میں مقبول و رائج رہے' آج موجودہ فلسفۂ یورپ نے انھیں پرزہ پرزہ کر کے فضا میں منتشر کر دیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آج فلسفۂ حال کی عمارت جس بنیاد پر کھڑی ہے' مستقبل میں کوئی قوم اپنے جدید نظریات و افکار کی قوت سے اسے پاش پاش نہیں کر دے گی اور اس عمارت کے کھنڈروں پر ایک نئے نظام فکر و عمل کی دنیا نہیں بسائے گی۔ قرنوں اور صدیوں کے بعد جو کچھ ہو گا' اسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے' لیکن اتنا تو اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ فلسفۂ جدیدہ کی شان دار عمارت کو ارتیاب و شک کا گھن ابھی سے لگنا شروع ہو گیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی استاد فلسفۂ جدیدہ' جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ''فہمِ انسانی'' کے مقدمہ میں اس رازِ سربستہ کا افشا اس طرح کرتے ہیں:

''اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل بدل کر کھلے یا چھپے' اقرارِ جہل کی تاریخ بن کر رہ گئی۔ لاک کے یہاں یہ اقرار حسیت' کے نقاب میں ہے اور برکلے کے ہاں ادعائے تصوریت کے' مگر اتنی باریک اور شفاف کہ روپوشی سے زیادہ رونمائی کی زینت ہے۔ آخر برکلے کے بعد ہی ڈیوڈ ہیوم نے اس رونما نقاب کو بھی تار تار کر دیا اور نہ صرف جہل ارتیابیت کا کھل کر اقرار کیا بلکہ اپنے آپ کو ارتیابی ہی کہلانا پسند کیا۔''

عقلِ انسانی کی کوتاہی اور اس کے عجز وقصور کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا کہ وہ عظیم المرتبت فلاسفۂ عالم جن کے فلسفیانہ افکار ونظریات عقل وفکر کی تاریخ ارتقا کا آخری نقطۂ عروج مانے جاتے رہے ہیں' جب عالمِ حقیقت کی لامحدود وسعتوں میں انھیں قدم قدم پر حیرت و گم شدگی سے سابقہ پڑا تو خود انھیں بھی بجز اس کے کوئی اور چارۂ کار نہ تھا کہ وہ برملا عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف کریں۔ سقراط کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے: ''ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔'' یونانی فلسفی دیمقراط (پیدائش 460ق م) کا قول ہے: ''کوئی بات سچ نہیں' اور اگر ہے تو ہمیں معلوم نہیں۔''

پس جب عقل خود ناقص ہے تو کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے جو ذرائع اختیار کیے جائیں گے یعنی قیاس استقرا اور تمثیل ان کی نسبت کیوں کر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی صحیح اور یقینی نتیجے تک ہماری راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے یقینی علم کے لیے مشاہدے سے بڑھ کر کوئی اور قوی دلیل نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ قدیم فلاسفہ میں تو لا ادریہ کا ایک مستقل گروہ تھا ہی' جو کہا کرتا تھا کہ ہمیں کسی شے کی کوئی حقیقت معلوم نہیں۔ یورپ کے جدید فلاسفہ کی صف میں بھی برکلے جیسے فلسفی نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں کہ کسی شے کا وجود صرف وہی ہے جو ذہن میں ہے۔ اس کے علاوہ وجود خارجی کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان فلاسفہ نے جو کچھ کہا' وہ ٹھیک ہے' بلکہ مدعا صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر عقل کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور خدا کی ہدایت اس کی دست گیری نہ کرے تو خود اس کی کوششیں بسا اوقات فرطِ حیرت کی ناکامی و مایوسی پر منتہی ہوتی ہیں اور ادراکِ حقیقت کی کسی روشنی تک پہنچنے کی بجائے وہ لاعلمی و نادانی کی تاریکیوں میں خود اپنے آپ کو بھی گم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر اتنی بات اور یاد رکھنی چاہیے کہ جب طبیعیات میں عقل کی کوتاہ رسی کا یہ عالم ہے کہ وہ قطعی طور پر کسی چیز کی ذاتیات اور عرضیات میں بھی امتیاز نہیں کر سکتی اور اسی بنا پر اربابِ منطق تسلیم کراتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی حد بیان کرنا ناممکن ہے' تو ظاہر ہے مابعد الطبیعیات میں اس کی کوتاہ رسی کا کیا حال ہو گا اور چوں کہ فضائل اخلاق اور روحانی کمالات کا تعلق ایک بڑی حد تک حقائق مابعد الطبیعیات کے تصور سے ہے' اس لیے عقل اس راہ میں ہماری کامیاب راہ نُما ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ہم اس پر اعتمادِ کلی کر سکتے ہیں۔

عقل اور دل

اس مقام پر مزید توضیح وتشریح کی غرض سے اتنا اور یاد رکھیے کہ انسان کو جتنے معاملات پیش آتے ہیں' ان کا تعلق صرف عقل سے ہوتا ہے یا فقط دل سے اور یا دونوں سے' اور یہ واقعہ ہے کہ انسانی زندگی کا قیام و بقا اور اس کی روحانی واخلاقی دنیا کا نظم و نسق مبنی ہے اس بات پر کہ انسان عقل اور دل دونوں سے کام لے کیوں کہ جس طرح عقل مصدرِ شعور واحساس ہے' اسی طرح جذبات وعواطف کا سرچشمہ ہے دل۔ اگر ہم عقل (Reason) کے تابع فرمان ہو جائیں اور دل (Feeling) کو ہم پر کوئی دسترس حاصل نہ ہو تو ہم اس فلسفی کی طرح ہو کر رہ جائیں گے جسے شادی میں غم اور غم میں شادی کی تصویر نظر آتی ہے اور جو اپنی ہستی کے قطرے کو وجودِ ابدی کے بحرِ ناپیدا کنار میں فنا کر دینے کے بعد ہر قسم کے فعل وعمل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم عقل سے بالکل صرفِ نظر کر لیں اور اپنے تمام معاملات اور افعال واعمالِ دل کے میلانات وعواطف کے تابع بنا لیں تو اس کا انجام بھی بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہماری مثال انتہائی عیش پرست اور ظالم و جابر انسان کی سی ہو گی یا پرلے درجہ کے مغلوب الجذبات' نرم خو اور مہر آگیں شخص کی سی۔ غرضیکہ دونوں صورتوں میں خیالات و احساسات کا توازن مفقود ہو کر انسانی اجتماعیات کے شیرازے کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ دونوں میں ارتباط وتوازن ملحوظ رکھا جائے۔

فلسفۂ اشراق

جن لوگوں نے تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب مسیحیت اور فلسفہ دونوں انسان کی روحانی تشنگی کے فرو کرنے میں ناکام ثابت ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت عقل کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی اور فلسفہ روح اور دل کے لیے کوئی

سامانِ تسکین فراہم نہیں کر سکا تو افلاطون کے پیروکاروں نے فلسفہ اور مذہب دونوں کی آمیزش سے ایک معجون مرکب تیار کی جس کا نام فلسفۂ اشراق (Neo-Platonism) رکھا گیا۔ اس کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ طبیعاتی مسائل و مباحث کے ساتھ ساتھ اخلاقیات، الٰہیات اور روحانیت کے مسائل بھی اس میں شامل تھے۔ فلسفہ کے اس نئے اسکول کا بانی فلاطینس (Plotinus) تھا جو 204ء میں مصر میں پیدا ہوا اور 270ء میں انتقال کر گیا۔

اسباب وعلل خواہ کچھ بھی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فلسفہ کو مشرق میں اور مغرب میں دونوں جگہ بہت فروغ ہوا اور غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایشیا کے دل و دماغ پر تو اس فلسفے کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ مذہبی عقائد کی مضبوط بنیادیں تک متزلزل ہوگئیں لیکن چوں کہ اس فلسفہ کا تمام تار و پود عقل کی موشگافیوں ہی سے تیار ہوا تھا اور اگرچہ اس میں ضمیر کی پکار کو بھی دخل تھا' لیکن وہ مغلوب تھی' اور غلبہ عقل ہی کو تھا۔ اس لیے معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کے میدان میں انھیں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانا پڑیں اور یہ رہ نوردانِ حکمت و دانائی جاں فروشانہ تگ و دو کے بعد بھی اُس سرچشمۂ ہدایت تک نہ پہنچ سکے جو روح اور دل کے لیے واحد سرمایۂ تسکین ہے۔

فلسفۂ اشراق خدا کو صرف مانتا ہی نہیں بلکہ وہ اسے تمام کائنات میں جاری وساری مانتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا منبع خیر ہے اور مادہ مخزنِ شر وظلمات۔ اس کے یقین میں خدا حقیقتِ واحدہ ہے اور انسانی روح اس کا پرتو۔ اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ اشراق روحانیت' اخلاق' تزکیۂ باطن اور تصفیۂ نفس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے اور انسان کو لذائذِ جسمانی ترک کر کے تقویٰ وطہارت کی زندگی بسر کرنے پر اُبھارتا ہے۔ یہ سب کچھ سہی لیکن اصل یہ ہے کہ چوں کہ اس فلسفے کی بنیاد کسی خدائی قانون (وحیٔ الٰہی) پر نہیں تھی اور یہ محض عقل کی لاٹھی کے سہارے کھڑا ہوا تھا' اس بنا پر خود خدا کی صفات و ذات کی نسبت اس فلسفے نے ایسی موشگافیاں کیں کہ انھوں نے انسان کی روح کو دلاسا دینے کی بجائے اسے ایک اور ہول ناک ورطۂ حیرت وتذبذب میں پھنسا دیا۔

اسبابِ تسکین ویقین

عقل' منطق اور فلسفہ ان سب دروازوں سے مایوس لوٹنے کے بعد پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اچھا بتاؤ' اطمینان وسکون کا وہ خزانہ کہاں ہے جو انسانیت کی روحانی طلب کو سکون عطا کر سکے؟ قبل اس کے کہ آپ اس کا جواب معلوم کریں' یہ جان لینا ضروری ہے کہ یقین کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

کم وبیش تمام علمائے نفسیات نے یقین کی ماہیت اور اس کے اسباب وعلل پر بحث کی ہے لیکن نفس یقین کی کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً منطقی یقین' نفسیاتی یقین اور مذہبی یقین۔ ان اقسام کی تعریفیں جدا جدا ہیں لیکن ان سب کی قدر مشترک یہ ہے کہ یقین ایک طرح کا نفسی میلان ہے جو خاص خاص موثراتِ خارجی و ذہنی کے زیر اثر انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نفسی میلان کو پیدا کرنے کے لیے نہ فلسفیانہ اور منطقی دلائل کی ضرورت ہے اور نہ ریاضی واقلیدس کی' بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ میلان نہ علم پر موقوف ہے اور نہ جہل پر۔ اس کا انحصار نہ سچ پر ہے اور نہ جھوٹ پر۔

غرض یہ ہے کہ یقین جس کی حقیقت ایک نفسی میلان کے سوا اور کچھ نہیں ہے' مختلف جذبات وقلبی کیفیات کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس بنا پر کوئی ایک شخص کسی دوسرے کو اس لیے ملعون نہیں کر سکتا کہ وہ کسی چیز کی نسبت اس کی طرح یقین واذعان کیوں نہیں رکھتا۔ ہاں لعن وطعن اور ملامت اگر ہو سکتی ہے تو وہ محض اس بات پر ہو سکتی ہے کہ اس دوسرے شخص کے دل میں وہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے دل میں اس چیز کی نسبت نفسی میلان پیدا ہوتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کفار کے متعلق جو کلمہ حق قبول نہیں کرتے تھے' یہ نہیں کہا کہ انھیں آنحضرت ﷺ کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کا یقین کیوں نہیں آتا بلکہ یہ کہا:

﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ (البقرہ 2: 7)

''اللہ نے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔''

یعنی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں فطرتاً اتنی صلاحیت واستعداد ہی نہیں کہ ان کے دل میں آنحضرت ﷺ اور قرآن کی حقانیت وصداقت کے متعلق نفسی میلان پیدا ہو۔

گویا یقین بذاتِ خود کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ثمرہ ہوتا ہے ایک خاص طرح کے طبعی وقلبی جذبات وتاثرات کا۔ اب اس مقدمہ کو ذہن نشین کر کے آپ غور کریں گے تو بیّن طور پر محسوس ہوگا کہ وحی الٰہی انسان کے دل میں جس طرح اطمینان وسکون پیدا کرتی ہے' وہ بالکل ایک نفسیاتی طریقہ ہے اور اس لیے انسان اس پیغامِ ربانی کو سن کر اس شک وتردد سے دوچار نہیں ہوتا جس کا سبب بالعموم منطقی طرزِ بحث واستدلال ہوتا ہے۔

مثلاً اگر اسے یہ بتانا ہے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ خدا کلام کرتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کرتا ہے تو کس طرح؟ کیا اس کے لیے نطق پایا جا سکتا ہے؟ کیا نطق کے لیے عضلات واعصاب کی ضرورت نہیں ہے؟ جبریل رسول اللہ کے قلب پر کلامِ خداوندی کا القا کرتے ہیں تو کس طرح؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ جانتا تھا کہ یہ مابعد الطبیعاتی حقائق ہیں جن کی گرہ کشائی آج تک نہ کسی عقل کے ناخن تدبیر نے کی ہے اور نہ کر سکے گا۔ جب مشاہدات اور محسوسات کی دنیا ہی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں تو پھر

عالمِ مجردات ومعقولات کی وسعتیں کس طرح انسان کی محدود عقل میں سمٹ سمٹا کر جمع ہوسکتی ہیں۔ اس لیے قرآن نے اس طریقۂ بحث واستدلال کو چھوڑ کر ایک بالکل نفسیاتی اور بہت زیادہ مؤثر طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو دنیا کے سامنے پیش کیا اور دعوت دی کہ تم حضور ﷺ کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت وسکون کو نہایت گہری تنقید مگر انصاف اور عدل کی نگاہ سے دیکھو۔ اِسے جانچو، پرکھو اور بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اس ذاتِ گرامی کو جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟ کیا تمھیں کبھی ان کی کوئی حرکت مشتبہ نظر آئی ہے؟ کیا ان کے کسی فعل وقول پر بھی تمھیں کبھی حرف گیری کا موقع ملا ہے؟ اگر ان سب باتوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو یقین کریں کہ جس ذات نے عمر کا بہترین حصہ (چالیس سال) اس تقویٰ وطہارت، معصومیت اور فضائلِ اخلاق کے ساتھ بسر کیا ہے، وہ آج بھی جھوٹ نہیں بول سکتی اور آج بھی اس کی زبانِ حق ترجمان کسی نا ملائم اور نادرست بات سے آشنا نہیں ہوسکتی۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے کوہ صفا پر چڑھ کر پہلی مرتبہ قریش کو دعوتِ اسلام دی تو یہی طریقہ اختیار کیا کہ ان سے پوچھا: ''بتاؤ، تم مجھے کیا سمجھتے ہو''؟ جب سب نے بیک آواز اقرار کرلیا کہ آپ تو امین وصادق ہیں، آپ نے آج تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی، تو پھر آپ نے ان تک اسلام کا پیغام پہنچایا اور خود قرآن بھی سیّد کونین کی زبانِ اقدس سے یُوں گویا ہوتا ہے:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (یونس 10: 16)

''میں نے تو تمھارے درمیان مدت تک عمر گزاری ہے، کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے''؟

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وحیِ الٰہی پیغمبر کو ایک فاضل وکامل معلم یا ایک شفیق وعقل مند باپ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور انسان کے ضمیر ووجدان سے اپیل کرتی ہے کہ جس طرح شاگرد وجدانی طور پر استاد پر اور بیٹا باپ پر اعتمادِ کلی رکھتا ہے اور اس لیے استاد کی تعلیمات اور باپ کی نصیحتوں کو شک وشبہ کی نظر سے نہیں دیکھتا، اسی طرح تمام دنیا کو پیغمبر کی ذات پر اعتماد رکھنا چاہیے اور اس کی تعلیمات وہدایات کو گوشِ حقیقت نیوش سے سُن کر حرزِ دل وجان بنالینا چاہیے۔

پس یہ ثابت ہوگیا کہ اصل صداقت وحقانیت اور کامل اطمینان وسکون کا سراغ صرف وحیِ الٰہی کے ذریعے ہی مل سکتا ہے اور انسان کی روحانی تشنگی صرف اسی سرچشمۂ ہدایت کے آبِ زلال سے بجھ سکتی ہے۔ اللہ بس ماقی ہوس۔

ڈیوڈ ہیوم کو سب جانتے ہیں کہ ارتیابی تھا اور وحی الہام کا بھی منکر تھا لیکن پھر بھی ایک موقع پر سازِ فطرت کے نغمہ کی ایک ہلکی سے آواز اس کی زبانِ قلم سے ظاہر ہو ہی گئی۔ وہ لکھتا ہے:

''جہاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے، وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ان کی اصلی اور محکم بنیاد وحی وایمان پر ہے۔''

مولانا عبدالباری ندوی نے ''فہم انسانی'' کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت دل چسپ اور بلیغ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''ظواہر عالم کی نسبت ہم بہت کچھ جانتے اور جان سکتے ہیں لیکن حقائق عالم کی نسبت کچھ جاننے کا دعویٰ کریں تو نرا جہل مرکب ہوگا اور بقول سقراط ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ اس زندگی کو ہم چاہے جتنا سنواریں اور بنائیں لیکن اس کے آگے اور پیچھے کی اگر کچھ فکر ہو تو نہ پیچھے کا کچھ نشان ملا نہ آگے کی کچھ خبر دے سکتے ہیں سوائے اس کے بس بیچ کے اوراق اُلٹ پلٹ کر لال بجھکڑوں کی طرح ہرن کے پاؤں میں چکی کا پاٹ باندھتے رہیں۔ غرض اپنے یا کائنات کے آغاز وانجام، حقیقت وماہیت، غرض وغایت کے بارے میں، یہ یا اس طرح کے جتنے سوالات یا ان کی تفصیلات ہوں، خالص عقل واستدلال نے ان کے بارے میں کبھی اذعان واطمینان نہیں بخشا۔ بلکہ فلسفہ سے انسانیت کی یہ پیاس اپنے حلق میں صرف کانٹوں کا اضافہ کرتی رہی اور جہاں انسانی عقل وفہم نے تجربے کی راہ سے ذرا بہک کر اس خارزار میں اپنے دامن کو الجھایا تو خود فلسفہ کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ طفلانہ ہمت نے دو چار ہی قدم ڈالے تھے کہ شک اور ریب، جہل اور لاعلمی کے کانٹوں نے ہر طرف سے دامن پکڑنا شروع کیا۔ ایک نکالا نہیں اور دس نے پکڑا، جال کے اندر جتنا پھڑکو وہ اتنا ہی کھال کے اندر گھستا جاتا ہے۔ انسانیت کی بیش تر آبادی ہمیشہ اس وادی میں وحی وایمان کی راہ نُمائی کو قبول کر کے چلتی رہی، عقل کو اگر دخل دیا بھی تو زیادہ تر قبول ہی کے لیے۔ البتہ مغرب، جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں بلکہ ڈوبتا ہے، وہاں کی نئی پرانی دنیا دونوں کو وحی وایمان سے کچھ قدرۃً بُعد رہا ہے تو اس کے فلسفہ کی نئی پرانی دونوں تاریخوں کی جو کم وبیش اڑھائی ہزار سال کی وسعت میں پھیلی ہیں۔ ورق گردانی کر جاؤ، جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی دانش کی جگہ نادانی اور علم کی جگہ لاعلمی سے دوچار ہوتے جاؤ گے۔''

اس حقیقت کو ایک اور مثال سے سمجھیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام مشاہدات کا تعلق بینائی سے ہے لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ مشاہدہ کا انحصار صرف قوت وبصارت کے صحیح وسالم ہونے پر ہے؟ ہرگز نہیں۔ بصارت کے ساتھ ساتھ خارجی روشنی کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ بینائی کی۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی تیز نظر ہو لیکن اگر کوئی خارجی روشنی نہ ہو، آفتاب کی ہو یا کسی لیمپ یا بجلی کی اور تمام فضا تاریک ہو تو ظاہر ہے کہ یہ تیز نظری کسی کام کی ثابت نہیں ہوگی۔ پس اسی طرح عقل میں قدرت کی طرف سے جو قوتِ بصیرت ودیعت رکھی گئی ہے، وہ اپنی جگہ مسلّم اور دُرست ہے۔ لیکن جس طرح بصارت بغیر خارجی روشنی کے محض بے کار ہے، اسی طرح عقل کی روشنی صرف اسی وقت کارآمد ہوسکتی ہے جب کہ خارج میں بھی اس کی راہ نُمائی کے لیے کوئی قوی روشنی موجود ہو اور یہ روشنی وہی ہے جسے مذہب کی اصطلاح میں ''وحی'' کہتے ہیں۔ سورۃ احزاب کی آیت 43 میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾ (الاحزاب 33: 43)

''(خدا) وہی ہے جو خود اور اس کے فرشتے تم پر رحمت بھیجتے ہیں تاکہ وہ تمھیں تاریکیوں

سے نکال کر نور کی طرف لے آئے اور اللہ تعالیٰ مومنوں پر بڑا رحم کرنے والا ہے۔"

اس آیت میں لفظ "مومن" قابلِ غور ہے، وہ جو ایمان لے آیا۔ ایمان لانے میں یہ سب باتیں شامل ہیں: یقین کرنا، تسلیم کرنا، تصدیق کرنا، اعتماد کرنا، بات ماننا، اطاعت کرنا۔ گویا یقین واطمینان تو اسی کو حاصل ہوتا ہے جو مومن ہے، جو ایمان لے آیا۔ بصارت اور بصیرت میں صرف ظاہر و باطن کا فرق ہے، ورنہ دونوں کا حال افادہ کے اعتبار سے بالکل یکساں ہے۔ جس طرح آفتاب سماوی کے بغیر بصارت ناکارہ ہے، ٹھیک اسی طرح عقل وخرد کی بصیرت خورشید حقیقت کی جلوہ پاشیوں کے بغیر اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باوجود قطعاً بے فائدہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس روشنی کے بغیر ہی محض عقل کے سہارے چلنا چاہتا ہے تو وہ اس بے وقوف سے کسی طرح کم درجہ کا احمق نہیں ہے جو نہایت شدید تاریکی میں بھی اپنی آنکھوں پر اعتماد کر کے سرپٹ دوڑنا چاہتا ہے۔

وحی کی مختلف صورتیں

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ پر وحی مختلف طریقوں سے نازل ہوتی تھی۔ حافظ ابنِ قیم نے "زاد المعاد" میں انھیں حدیثوں کے پیشِ نظر، وحی کی حسب ذیل صورتیں بیان کی ہیں:

(1) رویائے صادقہ (سچے خواب دیکھنا)

(2) نفث فی الروح یا القائی القلب (دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا)

(3) صلصلۃ الجرس (گھنٹی کی آواز کی طرح آنا)

(4) تمثل (فرشتہ کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا)

(5) فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نظر آنا

(6) وہ طریقۂ مکالمہ جو معراج میں پیش آیا

(7) بلاواسطہ مکالمہ

اب ہم ہر ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں:

رویائے صادقہ

رویائے صادقہ کے معنی ہیں سچا خواب، یعنی جو کچھ رات کو خواب میں دیکھا فوراً ہی کچھ دنوں کے بعد بعینہٖ اس کے مطابق کوئی واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس خواب کو نبوت کا چھیالیسواں جزو بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ رویائے صادقہ کو نبوت کا جزو محض اس لیے فرمایا ہے کہ جس طرح نبی کی خبر بالکل صحیح ہوتی ہے اور اس میں کذب و دروغ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا، اسی طرح یہ خواب بالکل سچا ہوتا ہے۔ جو رات کو خواب میں نظر آیا، دن کو وہی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

یہی وجہ ہے کہ رویائے صادقہ کو نبوت کا جزو قرار دیا گیا ہے، رسالت کا نہیں کیوں کہ نبوت کے معنی بعض غیبی امور سے واقف ہونا اور ان کی اطلاع دینا ہے اور چونکہ رویائے صادقہ میں بھی یہی ہوتا ہے، اس لیے اسے نبوت کا ایک جزو کہا جا سکتا ہے۔ لیکن رسالت کا مقام اس سے بلند ہے۔ اس کے مفہوم میں احکام شرعیہ کی تبلیغ و اشاعت اور اوامر و نواہی سے لوگوں کو خبردار کرنا داخل ہے۔ ظاہر ہے کہ رویائے صادقہ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

یہی رویائے صادقہ ہیں جن سے آنحضرت ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا۔ صحیح بخاری کے پہلے باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: "سب سے پہلی وہ چیز جس سے آنحضرت ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا، نیند میں رویاء صادق ہے۔ حضور ﷺ جو خواب دیکھتے تھے، وہ صبح کے تڑکے کی طرح صحیح نکلتا تھا۔" یہ واضح رہنا چاہیے کہ انبیائے کرام کا خواب ہمارے خواب اور ان کی نیند ہماری نیند کی طرح نہیں ہوتی۔ اس عالم میں ان کی آنکھیں اگرچہ بند ہوتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے:

"تَنَامُ اَعْيُنُهُم وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُم."

"ان کی آنکھیں سوتی ہیں، دل نہیں سوتے ہیں۔"

آنحضرت ﷺ خود اپنی نسبت فرماتے ہیں: "تَنَامُ عَيْنِي وَلَا يَنَامُ قَلْبِي." اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ عربی زبان میں رویا صرف اس خواب کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کے اخبار و اعلام یا اس کی جانب اشارہ و ایما پر مبنی ہو۔ عام خواب جس میں شیطانی وساوس کو زیادہ دخل ہو، اسے حلم، جمع احلام کہتے ہیں۔ چنانچہ بخاری کتاب الرویا میں آنحضرت ﷺ سے روایت ہے:

"الرؤيا من الله والحلم من الشيطان."

"رویا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور حلم شیطان کی طرف سے۔"

پھر ان خوابوں میں جو خواب ہائے پریشان ہوتے ہیں، انھیں اضغاثِ احلام کہتے ہیں۔ سورۂ یوسف کی آیت 43-44 میں تینوں لفظ جمع ہو گئے ہیں:

﴿يَاَيُّهَا الْمَلَاُ اَفْتُوْنِيْ فِيْ رُءْيَايَ اِنْ كُنْتُمْ لِلرُّءْيَا تَعْبُرُوْنَ ۝ قَالُوْا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ وَمَا نَحْنُ بِتَاْوِيْلِ الْاَحْلَامِ بِعٰلِمِيْنَ ۝﴾

(یوسف: 43، 44)

"اے درباریو! اگر تم خوابوں کی تعبیر بیان کر سکتے ہو تو میرے خواب کے بارے میں اپنی رائے بیان کرو۔ ان لوگوں نے کہا، یہ تو اوہام پریشان ہیں اور ہم ان اوہام کی تعبیر سے واقف نہیں۔"

نفث فی الروح

وحی کی دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ آپ کے قلب پر بغیر نظر آئے کسی بات کا القا کر دیتا تھا جیسا کہ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں: "روح القدس نے میرے قلب میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی نفس اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک وہ اپنے رزق کی تکمیل نہیں کر لے گا۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور طلب میں خوش روشی سے کام لو اور خبردار رہو کہ کہیں رزق کا متاخر ہو جانا تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ اللہ کی معصیت کی راہ سے اس رزق کو طلب کرو، کیوں کہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اس کی اطاعت و بندگی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔"

صلصلۃ الجرس

وحی کی تیسری صورت یہ تھی کہ وحی صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹا کی آواز کی طرح آتی تھی۔ صحیح بخاری میں ہے: "حارث بن ہشام نے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ پر وحی کس طرح نازل ہوتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "کبھی کبھی وحی میرے پاس گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ میرے اوپر سخت ترین ہوتی ہے۔ جب یہ مجھ سے منقطع ہوتی تھی تو فرشتہ جو کچھ کہتا تھا وہ سب مجھے یاد ہو جاتا تھا۔"

وحی کی اس خاص نوعیت کو سمجھنے کے لیے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ صلصلۃ اصل میں اس آواز کو کہتے ہیں جو لوہے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ پس اس لفظ کا اطلاق ہر اُس آواز پر ہونے لگا ہے جس میں جھنجھناہٹ (طنین) ہو۔ وحی کی آواز کو اس آواز سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ شبہ یہ ہے کہ جس طرح گھنٹا کی آواز صوتِ محض کی صورت میں سنائی دیتی ہے اور اس کا کوئی مبدا و مقطع نہیں ہوتا' اسی طرح وحی یا پیغامبر وحی کی اس آواز میں بھی کوئی مبدا یا مقطع نہیں ہوتا تھا۔ اس بنا پر یہ آواز مرکب نہیں بلکہ بسیط ہوتی تھی۔ شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے وجہ شبہ یہ بیان کی ہے کہ جس طرح گھنٹا کی آواز کے لیے کوئی صوتِ خاص نہیں ہوتی بلکہ وہ تمام جوانب و جہات سے سُنائی دیتی ہے' اسی طرح وحی کی اس آواز کے لیے بھی کوئی جانب یا جہت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت الاستاذ نے اس وجہ شبہ کو نہایت لطیف کہا ہے۔ لیکن خود ایک جگہ فرماتے ہیں: "نزولِ وحی کے وقت گھنٹا کی سی آواز ٹیلیگرام کی کھڑ کھڑاہٹ کی طرح ہے جو پیغام رسانی کے لیے کی جاتی ہے۔"

اس تشبیہ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تار کی کھڑ کھڑاہٹ میں آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن بولنے والا نظر نہیں آتا۔ اسی طرح وحی کی اس صورت میں آنحضرت ﷺ محض آواز سنتے تھے لیکن بولنے والا نظر نہ آتا تھا۔

جیسا کہ صلصلۃ الجرس والی حدیث میں مذکور ہے کہ آنحضرت ﷺ پر یہ حالت بہت شاق گزرتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی اور دن نہایت سرد ہوتا تھا' پھر بھی (وحی کے بار سے) آپ پر دباؤ اس قدر شدید ہوتا تھا کہ آپ ﷺ کی پیشانی سے پسینا پُھوٹ نکلتا تھا اور اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تھے تو سواری بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ پر اس طرح وحی آئی۔ حضرت زید بن ثابتؓ اس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اور سیّد کونین کا فرق مبارک ان کی ران پر تھا۔ حضرت زیدؓ پر وحی کا اتنا شدید بار ہوا کہ ان کا جسم دبا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔"

حضرت عبادۃ بن صامتؓ کا بیان ہے کہ جب آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ ﷺ کو اضطراب پیدا ہو جاتا اور چہرۂ مبارک کا رنگ بدل جاتا۔ آپ ﷺ اس وقت سر جھکا لیتے اور جو صحابہ آپ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے۔ وحی کے بعد آپ سر اٹھاتے تھے۔

صفوان بن یعلی بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ یعلی کو بڑی خواہش تھی کہ وہ آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہوئی دیکھیں۔ خدا نے ان کی مراد پوری کی۔ ایک مرتبہ جب کہ آنحضرت ﷺ جعرانہ میں قیام فرما تھے' یعلی کو یہ سعادت نصیب ہو گئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جعرانہ کے دورانِ قیام آنحضرت ﷺ صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس نے خوش بو لگا رکھی تھی اور سوال کیا: "یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ ﷺ اس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے ایک خوش بو لگے ہوئے جبہ ہی میں احرام کی نیت کر لی۔" یہ سوال سن کر آنحضرت ﷺ نے تھوڑی دیر انتظار فرمایا' یہاں تک کہ آپ پر یکا یک وحی نازل ہوئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کا چہرۂ مبارک سرخ ہے اور سانس بھی تیز ہو گیا ہے جیسے کوئی تھکا ہوا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے سائل کو بلا کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی تو سب برابر ہے' پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ پر وحی کی یہ قسم (صلصلۃ الجرس) بقیہ طرزِ وحی کی بہ نسبت زیادہ گراں گزرتی تھی؟ اگر ایک نوعِ وحی کا تحمل بہ آسانی ہو سکتا تھا تو اس نوعِ وحی کا تحمل کیوں دشوار تھا؟ اس کا جواب جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں لکھا ہے' یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں' ایک مَلکیّت قوتِ بشریت اور دوسری قوتِ ملکیت۔ پھر فرشتے جب ان نفوسِ قدسیہ پر نازل ہوتے ہیں جن میں نبوت کی استعداد ہوتی ہے تو انھیں ظلمتِ بشری مَلکیت سے نکل کر عالمِ نور میں آنے کی وجہ سے سخت کش مکش اور مزاحمتِ باطنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کش مکش کی وجہ سے ان کے تمام اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھیے کہ انسان نیند کی حالت میں کوئی ہیبت انگیز خواب دیکھتا ہے تو اگرچہ اس خواب کا تعلق جسم سے نہیں ہوتا لیکن نفس کے تعلق بالجسم کے باعث اس خواب کا اثر جسمانی اعضاء و جوارح پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اس موقع پر یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ قلب اور عقل یہ دونوں جس طرح انبیا میں ہوتے ہیں اور انسانوں میں بھی ہوتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیائے کرام میں قلب اور عقل کا وہ رخ جو روح اور سرّ کہلاتا ہے' اس درجہ بلند اور قوی ہوتا ہے کہ کسی اور انسان میں یہ بات نہیں ہوتی۔ اس بنا پر انھیں عالمِ فوق سے اتصال ہوتا ہے اور انھیں ایسے ایسے مقامات اور احوال پیش آتے ہیں جو دوسروں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ قرآن مجید میں حضور پُر نور کی زبانِ حق ترجمان سے جو ارشاد فرمایا گیا ہے: "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ" تو اس میں "اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ" اعضاء و جوارح میں انسانوں کے ساتھ مشارکت کی بنا پر ہے اور پھر "يُوْحٰى اِلَيَّ" جو فرمایا گیا ہے تو اس میں اِس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قلب و عقل کے دو فوقانی رخ جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی زبان میں روح اور سرّ ہیں' وہ اس قدر بلند اور ارفع ہیں کہ آنحضرت مہبطِ وحی ہیں۔

مگر یہ بات کہ انسان' انسان ہونے کے باوجود جس طرح ایک پُر دل' انتہائی

بہادر انسان کے شجاعانہ کارناموں کو ایک غبی پر لے درجہ کی ذکاوت و ذہانت رکھنے والے انسان کی دماغی بلند پروازیوں اور ذہنی کمالات کو نہیں سمجھ سکتا اور جب ان کا ذکر سنتا ہے تو حیرت و استعجاب سے انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ''مجرد صرف'' ''ذاتِ حق'' اور حقیقت مطلقہ سے قرب و اتصال کے باعث انبیائے کرام پر جن اسرارِ الٰہیہ وکونیہ کا فیضان ہوتا ہے' ہم لوگ جب ان کا ذکر سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ضرور ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ اُمور ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں لیکن ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ ہمارے لیے کسی چیز کا ناقابلِ فہم ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ اس کے وجود کا انکار ہی کر دیا جائے۔ مولانا شبلی مرحوم نے صحیح بخاری کی حدیثِ وحی پر کلام کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے: ''حضور ﷺ نے کیا دیکھا؟ ناموس اعظم (حضرت جبریلؑ) نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوئے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا تحمل نہیں کر سکتیں۔'' ایک مادر زاد اندھے کو روشنی کی حقیقت لاکھ کھول کر سمجھایئے' کوئی بات اس کے ذہن نشین نہیں ہوتی۔ تو کیا محض اس بنا پر نابینا کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ روشنی کے وجود کا ہی سرے سے انکار کر دے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے صلصلۃ الجرس کی تشریح تو کی' لیکن نفسِ آواز سے بحث نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ آواز خدا کی تھی یا فرشتہء وحی کی یا خود وحی کی آواز تھی۔ انھوں نے صرف اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ آواز خواہ کسی کی ہو' اسے زبانِ نبوت نے گھنٹہ کی آواز سے تشبیہ دی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصراً اس کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ یہ آواز کس کی تھی؟ اس سلسلے میں سب سے زیادہ نمایاں مسلک امام بخاری کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ آواز خدا کی ہوتی تھی جو تمام فضا میں گونج جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت ﷺ کے سوا کوئی اور اسے نہیں سن سکتا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب التوحید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں:

(ترجمہ) ''اللہ تعالیٰ جب کلام بالوحی کرتا ہے تو اہلِ سمٰوٰت کچھ سنتے ہیں۔ پھر جب ان کے قلوب سے خوف و ہراس کم ہو جاتا ہے اور آواز ٹھہر جاتی ہے تو وہ پہچانتے ہیں کہ یہی حق تھا اور وہ آپس میں ندا کرتے ہیں کہ تمھارے رب نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ حق کہا''!

اس سلسلے میں امام بخاری نے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جو عبداللہ بن انیسؓ سے مروی ہے' فرماتے ہیں کہ مَیں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو جمع کرے گا اور انھیں ایسی ندا دے گا کہ قریب و بعید سب اسے یکساں سنیں گے۔'' پھر آگے چل کر ایک باب کا ترجمہ ''وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيمًا'' باندھا اور اس کے ذیل میں چند احادیث نقل کیں' جن سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چوں کہ آیتِ بالا میں کَلَّمَ فعل کی تاکید مصدر تکلیم کے ساتھ لائی گئی ہے۔ اس لیے علمِ نحو کے قواعد کے مطابق یہاں کلام سے مُراد حقیقت ہے' مجاز نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسٰیؑ نے وادیٔ سینا میں جو آواز سنی تھی وہ سچ مچ خدا ہی کی آواز تھی۔ امام بخاری نے فرقہ جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں اور بھی احادیث پیش کی ہیں اور ان سے خدا کے لیے صوت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اس بنا پر صلصلۃ الجرس والی حدیث میں جس آواز کا ذکر ہے' وہ امام بخاری کے نزدیک خدا ہی کی آواز ہے۔

اربابِ تصوف و عرفان میں شیخ اکبر کا جو مقام ہے' اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ بھی خدا کے لیے صوت مانتے ہیں۔ چنانچہ حدیثِ وحی پر کلام کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اللہ کی آواز کے لیے کوئی جہت اور سمت متعین نہیں کی جا سکتی اور چوں کہ گھنٹا کی آواز کا حال بھی یہی ہے کہ وہ ہر طرف سے سنی جاتی ہے' اسی بنا پر ہی صوت بالوحی کو گھنٹا کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے۔ لیکن علما کی اکثریت جس میں صحیح بخاری کے شارحین بھی داخل ہیں' اس بات کے قائل ہیں کہ یہ آواز فرشتہء وحی کے پروں کی یا فرشتہ کی زبانی وحی کی ہوتی تھی۔ حافظ ابن حجر عسقلانی پہلی شق کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔

فرشتہ کا انسانی شکل میں آنا

وحی کا چوتھا طریقہ یہ تھا کہ فرشتہء وحی کسی انسان کی شکل وصورت میں آتا تھا اور آپ ﷺ سے خطاب کرتا تھا' یہاں تک کہ آپ ﷺ کو وہ پوری بات یاد ہو جاتی تھی جو وہ آپ سے کہتا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید اور بال بہت سیاہ تھے۔ اس پر کوئی علامتِ سفر بھی نہیں تھی اور ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی اُسے نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص آنحضرت ﷺ کے پاس آ کر اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے حضور ﷺ کے گھٹنوں پر ٹیک لیے اور اپنے دونوں ہاتھ آپ ﷺ کی رانوں پر رکھ دیئے۔ پھر سلام' ایمان' احسان' قیامت اور علاماتِ قیامت سے متعلق آپ ﷺ سے چند سوالات کیے۔ آپ ان سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے اور سائل ہر جواب پر ''صَدَقْتُ'' (آپ نے سچ فرمایا) کہتا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں' ہمیں بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ شخص سوال کرتا ہے اور جواب ملنے پر تصدیق بھی کرتا جاتا ہے گویا اسے ان سوالات کے جوابات کا علم پہلے سے ہی تھا۔ سوال و جواب کے ختم ہونے پر یہ شخص واپس چلا گیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا: ''تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص تھا''؟ انھوں نے جواب دیا: ''اللہ اور اس کا رسول اعلم ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جبریل تھے جو تمھیں دین سکھانے آئے تھے۔''

صحابہ میں حضرت دحیہؓ خوب صورتی اور حُسن و جمال کے لحاظ سے ممتاز تھے' اس لیے فرشتہء وحی کبھی کبھی ان کی شکل میں بھی آتا تھا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ جبریل امین آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور باتیں کرنے لگے' اس وقت آنحضرت ﷺ کے پاس اُمِ سلمہؓ بیٹھی ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا: ''یہ کون ہیں''؟ وہ بولیں: ''یہ تو دحیہ ہیں۔'' اُم سلمہ کا بیان ہے کہ بخدا میں انھیں دحیہ ہی سمجھتی رہی' یہاں تک کہ مَیں نے آنحضرت ﷺ کا خطبہ سنا جس میں آپ نے جبریل امین کے آنے کی خبر دی۔ تب میں سمجھی کہ جبریل دحیہ کی شکل میں

آئے تھے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ پیش آیا۔ ایک مرتبہ انھوں نے آنحضرت ﷺ کو دیکھا کہ ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جو سواری پر سوار ہے۔ جب آپ ﷺ گھر واپس آئے تو ام المومنین نے پوچھا: "یہ کون شخص تھا جس سے آپ گفتگو کر رہے تھے"؟ ارشاد ہوا: "یہ جبریل تھے، انھوں نے مجھے خدا کا حکم پہنچایا ہے کہ میں بنو قریظہ کی طرف چلا جاؤں۔"

فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا

وحی کا پانچواں طریقہ یہ تھا کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تھا اور اللہ کا پیغام آپ ﷺ تک پہنچاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ واقعہ معراج میں، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اور ایک دفعہ کسی اور مقام پر غالباً اجیاد میں۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ النجم کی مندرجہ ذیل آیات انہی دو واقعوں سے متعلق ہیں۔ معراج کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے جو جبریل امین کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا، اس کا ذکر سورۂ نجم کی آیات 4 تا 12 میں ہے:

﴿إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۝ ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ ۝ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۝ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۝ أَفَتُمَارُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۝﴾ (النجم 53: 4 تا 12)

"یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔ اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا صاحبِ حکمت ہے۔ وہ سامنے آ کھڑا ہوا جب کہ وہ بالائی افق پر تھا۔ پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔"

ان آیات میں جبریل امین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں، سورۂ تکویر آیات 19 تا 23 میں بھی ان میں سے بعض کا ذکر ہے:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝ ذِي قُوَّةٍ عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ۝ وَمَا صَاحِبُكُم بِمَجْنُونٍ ۝ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ۝﴾

(التکویر 81: 19 تا 23)

"یہ ایک بزرگ پیغامبر کا قول ہے جو بڑی طاقت والا ہے۔ عرش کے مالک اللہ کے نزدیک بلند مرتبے والا ہے۔ وہاں اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ وہ وہاں امانت دار ہے۔ اور (اے اہل مکہ) تمھارا رفیق (رسول کریم ﷺ) مجنون نہیں ہے۔ انھوں نے فرشتہ کو افق مبین پر دیکھا ہے۔"

سورۃ النجم اور سورۂ تکویر کی ان آیتوں پر غور کیجیے، ان میں یہ بات مشترک ہے کہ جبریل امین کی صفت طاقت ور اور امین بیان کی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انھیں افقِ اعلیٰ پر دیکھا ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس مرتبہ فرشتۂ وحی کا نزول کسی غیر معمولی اور عظیم و جلیل شکل میں ہوا اور دوسری یہ کہ فرشتہ نے خود اپنی زبان سے وحی کا تلفظ کیا تھا۔ "إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ" سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ پھر دونوں صورتوں میں فرشتہ کے نزول کے بیان کے بعد اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو کچھ دیکھا اور سنا، وہ سراسر حق تھا اور آپ کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا، اسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ حضرت جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کا، جو معراج میں پیش آیا، اس کا ذکر سورۂ نجم کی آیات 13 تا 18 میں ہے:

﴿وَلَقَدْ رَآهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۝ عِندَ سِدْرَةِ الْمُنتَهَىٰ ۝ عِندَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ۝ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۝ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۝﴾ (النجم 53: 13 تا 18)

"اور ایک مرتبہ پھر اس (حضور ﷺ) نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اسے اُترتے دیکھا جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا، جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

چھٹا طریقۂ وحی

کسی فرشتے یا آواز کے توسط کے بغیر اللہ تعالیٰ کا براہِ راست اپنے نبی پر وحی کرنا، جیسا کہ شب معراج میں، جب آسمانوں پر تھے پنج گانہ نماز فرض کی اور دوسرے احکام صادر فرمائے۔

ساتواں طریقۂ وحی

فرشتے کے توسط کے بغیر اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی سے گفتگو کرنا، جیسا کہ معراج کی حدیث میں اس کا ذکر آیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے بھی ایسی براہِ راست گفتگو قرآن مجید سے ثابت ہے۔

بعض علما نے وحی کے مذکورہ بالا طریقوں کے علاوہ ایک طریقہ یہ بھی بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام واسطوں، پردوں اور حجابوں کو اُٹھا کر جلوہ نما ہوا اور اپنے نبی سے ہم کلام ہو۔ اس سلسلے میں اکثر اہلِ علم اس بات کے قائل ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے معراج کے موقع پر اپنی چشم مبارک سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کیا۔ علما کا یہ طبقہ رویت بصری کا قائل ہے۔ لیکن بعض علما رویت بصری کی نفی کرتے ہیں اور وہ اپنی دلیل کی تائید میں سورۃ انعام کی آیت 103 پیش کرتے ہیں:

﴿لَّا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ ۖ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾

(الانعام: 103)

"اُس (اللہ) کو نگاہیں نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ وہ بڑا باریک بین اور

بڑا باخبر ہے۔"

رویتِ بصری کے قائل یہ جواب دیتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق تو اس ناسوتی اور مادی دنیا میں رویت سے ہے، یعنی رویت کی نفی اس دنیا کے ساتھ محدود ہے، لیکن آنحضور ﷺ نے معراج کی رات آسمانوں پر جو دیدارِ الٰہی کیا، اس کا تعلق عالمِ ناسوت سے نہیں بلکہ عالمِ لاہوت اور عالمِ آخرت سے ہے۔ آنحضور ﷺ کی رویت باری تعالیٰ سے متعلق مختلف احادیث و روایات میں تطبیق کی ایک صورت علما نے یہ بھی بیان کی ہے کہ رویت کی نفی کرنے والی روایات کو رویت بالبصر پر محمول کر لیا جائے اور رویت کی تائید کرنے والی روایات کو رویت بالفواد پر محمول کر لیا جائے تو اختلاف کی صورت ختم ہو سکتی ہے۔ اثبات رویت ایک خاص دید کے لحاظ سے ہے اور نفیٔ رویت دنیوی دید کے اعتبار سے۔

قرآن اور وحی

چوں کہ تمام اعتقادات اور ایمان و عمل کا دارومدار اس یقین پر ہے کہ پیغمبر کی زبانِ حق ترجمان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے وہ من جانب اللہ ہے اور جن احکام کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کے ارشاد فرمائے ہوئے ہیں۔ اس لیے ہر آسمانی مذہب کا فرض ہے کہ وہ اپنے احکام کی تعلیم و تلقین سے پہلے لوگوں کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلائے۔ اور اسلام چوں کہ دنیا کا آخری اور سب سے زیادہ کامل و مکمل مذہب ہے اور اس کی دعوت کسی خاص ملک و قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لیے ہے۔ اس بنا پر تمام سماوی ادیان و مذاہب میں یہ امتیازِ خصوصی صرف قرآنِ مجید کو حاصل ہے کہ جس تکرار و تاکید سے اس نے اپنا مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہ ہونا بیان کیا ہے، کسی اور کتاب نے اپنی نسبت اس شدومد اور تاکید و تکرار سے نہیں بیان کیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر تحدّی: جو لوگ اس کے منزّل من اللہ ہونے پر شک کرتے ہیں انھیں تحدّی کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰي عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝﴾ (البقرہ 2: 23)

"اگر تمھیں کچھ شبہ ہو اس چیز کے متعلق، جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی کوئی سورۃ لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے گواہوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔"

پھر اسی پر ہی بس نہیں بلکہ سخت تہدید کے انداز میں فرمایا جاتا ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ښ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۝﴾ (البقرہ 2: 24)

"اور اگر تم ایسا نہ کرو (یعنی قرآن کی کسی سورت کا مثل نہ لاؤ) اور تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہوں گے، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔"

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 88 میں ہے:

﴿قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓي اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل 17: 88)

"(اے نبی!) آپ کہہ دیجیے کہ اگر انسان اور جن اس قرآن کا مثل لانے پر متفق ہو جائیں تب بھی وہ اس کا مثل نہیں لا سکیں گے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔"

ایک جگہ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہ ماننے والوں کو، جو اسے خود آنحضرت ﷺ کا کلام کہتے تھے، اس طرح تحدّی کی گئی ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (یونس 10: 38)

"کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے (نبی نے) خود اسے گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجیے کہ اچھا اگر ایسا ہے تو تم اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا جنھیں تم بلا سکتے ہو، بلا لو اگر تم سچے ہو۔"

یہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے، ان کی نسبت فرمایا گیا کہ یہ محض اپنی کوتاہ علمی اور ناواقفیت کے باعث ایسا کہتے ہیں اور اس امر کی نسبت جھوٹ بولتے ہیں جسے یہ خود نہیں جانتے۔ آیتِ بالا کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے:

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ۭ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ﴾ (یونس 10: 39)

"بلکہ انھوں نے اس چیز کی تکذیب کی جس کے علم کا احاطہ انھوں نے نہیں کیا اور جس کی اصل حقیقت ان کے سامنے نہیں آئی، اسی طرح ان لوگوں سے پہلے بھی لوگوں نے تکذیب کی ہے۔ پس آپ دیکھیے کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔"

ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝﴾ (ہود 11: 13 تا 14)

"کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خود قرآن گھڑ لیا ہے، آپ کہہ دیجیے کہ اچھا اس طرح کی دس گھڑی ہوئی سورتیں ہی لے آؤ اور اللہ کے سوا جن لوگوں کو تم بلا سکو، بلا لو اگر تم سچے ہو، اور اگر وہ کچھ جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ اللہ کے علم سے اُتارا گیا ہے اور یہ کہ سوائے خدا کے کوئی دوسرا معبود نہیں ہے، تو کیا تم اطاعت قبول کرنے والے ہو۔"

اور خود آنحضرت ﷺ کو ان منکرین کی ہوا پرستی کا اس طرح یقین دلایا جاتا ہے:

﴿فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَاۗءَهُمْ ۭ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الظّٰلِمِيْنَ٥﴾ (القصص 28: 50)

”(اے محمد ﷺ) اگر وہ لوگ آپ کو جواب نہ دیں تو آپ جان لیں کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشوں کا اتباع کرتے ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ گم راہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہوں۔ کوئی شبہ نہیں کہ اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

یہ آیات جو اوپر گزریں، ان میں قرآنی اعجاز کو پیش کر کے سخت ترین تحدی کی گئی ہے اور منکرین کے عجز سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت ﷺ کا کلام نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی وحی ہے۔ ان آیات کے علاوہ بکثرت دوسری آیتیں بھی ہیں جن میں قرآن مجید کے وحی ہونے پر بعض واقعات اور قرآن مجید کے مضامین و مطالب سے استدلال کیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت یوسفؑ کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ٥﴾ (یوسف 12: 102)

”یہ غیب کی خبریں جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں اور آپ (اے محمد ﷺ) ان کے پاس نہیں تھے، جب انھوں نے اپنی کوشش مرکوز کر لی اور وہ تدبیریں کرنے لگے۔“

حضرت مریم کے واقعہ کے بعد فرمایا گیا ہے:

﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ٥﴾

(آل عمران 3: 44)

”(اے نبی!) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمھیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اُس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریم کا کفیل کون ہوگا، اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے (یعنی قرعہ اندازی کر رہے تھے) اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان جھگڑا ہو رہا تھا۔“

اس آیت کو ذرا غور سے پڑھیے اور دیکھیے کہ اس میں دو مرتبہ ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ﴾ فرما کر اس بات پر زور ڈالا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ بذاتِ خود حضرت مریم کی کفالت پر بحث و تکرار کے وقت موجود نہیں تھے۔ تو اب قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ کو اس واقعہ کا علم کس طرح ہوا؟ قرآن مجید اس کا جواب دیتا ہے کہ ﴿نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ﴾ ہم آپ ﷺ پر اس کی وحی بھیجتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی گزشتہ واقعہ کو معلوم کرنے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اسے کسی اخبار یا کسی کتاب میں پڑھا ہو اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے سُننے کا اتفاق ہوا ہو۔ آنحضرت ﷺ کے لیے ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی متحقق نہیں تھی۔ پہلی صورت کی تو آپ نے خود ”لستُ بقارئ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ فرما کر نفی کر دی اور آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کی تردید نہیں کر سکا۔ اب رہی دوسری صورت یعنی یہ کہ آپ ﷺ کو کسی نے یہ واقعاتِ غیب سنائے ہوں، تو قرآن مجید اس کی تردید اس طرح کرتا ہے، حضرت نوحؑ کے قصہ کے بعد ارشاد ہے:

﴿تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۭ فَاصْبِرْ ۭ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ٥﴾ (ھود 11: 49)

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ اسے جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، آپ صبر کیجیے! کوئی شبہ نہیں کہ عاقبت پرہیز گاروں کے لیے ہی ہے۔“

پس جب آنحضرت ﷺ کے لیے ان دونوں میں سے کوئی ایک ذریعہ علم بھی نہیں ہے تو اب قرآن کا دعوٰی ”نوحیه الیك“ کے تسلیم کرنے میں کیا تذبذب ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ اِذْ قَضَيْنَآ اِلٰى مُوْسَى الْاَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ الشّٰهِدِيْنَ٥﴾ (القصص 28: 44)

”اور (اے نبی!) آپ طور کی جانب غربی میں نہیں تھے، جب ہم نے موسیٰ کی طرف اپنا فیصلہ نازل کیا اور آپ اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔

اِس کے بعد ارشاد ہوا:

﴿وَلٰكِنَّآ اَنْشَاْنَا قُرُوْنًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ۚ وَمَا كُنْتَ ثَاوِيًا فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ تَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۙ وَلٰكِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ٥﴾

(القصص 28: 45)

”لیکن ہم نے بہت سی جماعتیں پیدا کیں اور ان پر دراز مدتیں گزر گئیں اور آپ مدین والوں میں نہ تھے کہ انھیں ہماری آیات سناتے لیکن ہم رسول بھیجتے رہے ہیں۔“

اس آیت کے بعد جو آیت ہے، اس میں بھی اس مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّوْرِ اِذْ نَادَيْنَا وَلٰكِنْ رَّحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰىهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ٥﴾

(القصص 28: 46)

”اور آپ طور کے کسی کنارے پر نہیں تھے، جب ہم نے ندا دی، لیکن آپ کو یہ واقعہ محض اپنے رب کی رحمت سے معلوم ہوا ہے تا کہ آپ اس قوم کو ڈرائیں جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔“

عرب کی گزشتہ قوموں کے حالات سنانے کے بعد ارشادِ حق بنیاد ہے:

﴿تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا٥﴾ (الاعراف 7: 101)

”یہ آبادیاں وہ ہیں جن کے کچھ حالات ہم آپ کو سناتے ہیں۔“

سورۂ عنکبوت کی آیت ذیل میں اسی مضمون کو کہ آنحضرت ﷺ کے پاس انسانی ذرائع علم میں سے کوئی ذریعہ نہیں تھا اور آپ کا ذریعۂ علم صرف وحی الٰہی تھا اور زیادہ واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ٥﴾ (العنکبوت 29: 48)

"نزول قرآن سے پہلے نہ تو آپ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کے لیے شبہ کی کوئی گنجائش بھی نکلتی۔"

اس آیت میں صراحتاً اس بات کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ آپ نزول قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ﴾ (الشوریٰ 42 : 52)

"اور اس طرح ہم نے آپ کے پاس اپنے حکم سے روح بھیجی، آپ جانتے ہی نہیں تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔"

اب ایک احتمال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ غیبی اطلاعات آپ نے کسی سے سنی ہوں تو اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مکہ معظمہ میں دو قسم کے لوگ آباد تھے، ایک مشرکین اور دوسرے اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ۔ مشرکین چوں کہ کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے، اس لیے انھیں انبیا متقدمین کا کوئی واقعہ بھی معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت مریم کے قصہ میں ﴿وَمَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ﴾ فرما کر اسی امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اب رہے مکہ کے اہل کتاب، یہود و نصاریٰ، تو اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں کی آسمانی کتابوں میں بعض انبیا کے واقعات کا تذکرہ ضرور ہے۔ لیکن سید کونین ﷺ کے بڑے سے بڑے دشمن بھی جانتے تھے کہ آپ ﷺ نبوت سے پہلے ان لوگوں سے الگ تھلگ رہتے تھے اور اس لیے کوئی شخص ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ آپ ﷺ کو ان غیبی قصص و واقعات کا علم یہود و نصاریٰ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دشمنوں نے آپ کی تکذیب میں کیا کچھ کہا، لیکن قرآن کے ادعا "نَقُصُّ عَلَيْكَ" یا "نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ" کے جواب میں یہ کہنے کی جسارت کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی کہ آپ فلاں وقت یا فلاں مقام پر کسی عیسائی یا یہودی سے قصہ سن رہے تھے۔ لے دے کے عیسائیوں کے پاس بحیرا راہب کا ایک افسانہ ہے جو اول تو ثابت نہیں اور اگر ثابت مان بھی لیا جائے تو کیا دنیا کا کوئی معمولی عقل کا انسان بھی اسے باور کر سکتا ہے کہ راہب نے چند منٹوں ہی میں آپ کو جب کہ آپ کی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی اور آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر پر جا رہے تھے، وہ سب کچھ بتا دیا جو قرآن مجید کے دو دفتوں کے درمیان ہے اور پھر آپ ﷺ نے اسے بغیر لکھے ہی من وعن گوشۂ حافظہ میں محفوظ کر لیا اور لطف یہ ہے کہ آپ شام سے واپس آتے ہیں اور اس کے بعد (نبوت سے قبل تک) ستائیس اٹھائیس سال مکہ میں رہتے ہیں۔ اپنے قبیلہ کے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں اور اس کے باوجود راہب کے سنائے ہوئے واقعات کو چہل سالگی کی عمر تک بالکل حرف راز کی طرح سینہ میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اشارۃً و کنایۃً بھی کسی سے کسی واقعہ کا ذکر نہیں آتا اور چالیس سال کی عمر کے بعد یکایک غیبی اطلاعات کا سمندر امنڈ پڑتا ہے، یا للعجب۔

بہر حال یہ احتمال چوں کہ اس درجہ کم زور تھا کہ آپ کے دشمنوں کے حاشیہ خیال میں بھی موجود نہیں تھا، اس لیے قرآن مجید نے اس سے سکوت کیا:

جزئی واقعات کے علاوہ قرآن مجید میں اختلاف کے نہ ہونے سے بھی اس کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء 4 : 82)

"کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں کثیر اختلاف پاتے۔"

اہل کتاب اگرچہ زبان سے انکار کرتے تھے لیکن دل میں وہ بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ خود اہل کتاب تھے اور اس بنا پر کلام الٰہی اور وحی ربانی کے مفہوم سے یک سر بیگانہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے قلب کی تسکین کے لیے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ﴾ (الانعام 6 : 114)

"اور وہ لوگ جنھیں ہم نے کتاب دی ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوا ہے، پس آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔"

ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿وَيَرَى الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ هُوَ الْحَقَّ﴾ (سبا 34 : 6)

"اور وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی جانب سے نازل کیا گیا ہے، وہی حق ہے۔"

ایک اہل کتاب کی شہادت کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔ لیکن چوں کہ اس زمانہ میں عرب کے جاہل مشرکین بنو اسرائیل کے علم و فضل سے مرعوب تھے اور آنحضرت ﷺ کی نبوت اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی تردید و تکذیب کے لیے ان علماء کا سہارا ڈھونڈتے تھے، جس میں انھیں ہمیشہ ناکامی اس بنا پر ہوتی تھی کہ خدا نے خود ان علما کی زبان سے آنحضرت ﷺ کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کی تصدیق کرا دی تھی بلکہ ان میں بعض علما تو ایسے تھے جنھوں نے سرکار دو عالم کا روئے انور دیکھتے ہی سر اطاعت و تسلیم خم کر دیا اور بے ساختہ بول اٹھے: "اِنَّ هٰذَا الْوَجْهَ لَيْسَ بِوَجْهِ كَاذِبٍ" بلاشبہ یہ چہرہ کوئی کاذب چہرہ نہیں ہے۔" اس لیے ان منکرین وحی کو عار دلانے اور قرآن مجید کے وحی الٰہی ہونے کی حقیقت کو ان پر بطور الزام ثابت کرنے کے لیے ایک عالم بنی اسرائیل (عبداللہ بن سلام) کی شہادت کو بھی اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَلٰي مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ

الظّٰلِمِیْنَ۝﴾ (الاحقاف 46:10)

''آپ فرمایئے بھلا تو اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے آیا ہو اور تم نے اسے نہیں مانا اور بنو اسرائیل کا ایک گواہ اس کی گواہی بھی دے چکا اور وہ ایمان لے آیا (مگر) تم نے غرور کیا' بے شک اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

سورۂ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا یُتْلٰی عَلَیْهِمْ یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ وَّ یَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا۝﴾ (بنی اسرائیل 17: 107تا108)

''آپ کہیے! تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ' جن لوگوں کو قرآن سے پہلے علم ملا ہے' ان پر جب اس قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں' پاک ہے ہمارا رب' اس کا وعدہ ہو کر رہا۔''

ایک آیت میں مشرکین سے پوچھا گیا ہے کہ کیا علمائے بنی اسرائیل کا قرآن کی حقیقت سے آگاہ ہونا تمھارے لیے خدا کی کوئی نشانی نہیں ہے؟

﴿اَوَلَمْ یَكُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ﴾

(الشعراء 26:197)

''کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اسے علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں۔''

مشرکین وحی سے بیگانہ تھے اور اہلِ کتاب وحی اور کلامِ الٰہی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ خود ان کی آسمانی کتابوں کی پیش گوئیوں اور بشارتوں کے مطابق بنو اسمٰعیل میں ایک نبی پیدا ہو گا اور اپنے ساتھ اللہ کی ایک کتاب بھی لائے گا۔ پس اگر یہ لوگ بھی قرآن کو وحی ماننے سے انکار کریں اور آنحضرت ﷺ کی نبوت پر ایمان نہ لائیں تو ظاہر ہے ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے۔ چوں کہ اسلام قبول کرنے کی توقع مشرکین کی بہ نسبت ان لوگوں سے زیادہ تھی' اس لیے خدا نے حکم دیا کہ مسلمانوں کا معاملہ اہلِ کتاب کے ساتھ نرمی کا ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو ان سے کہنا چاہیے کہ تمھیں قرآن کے وحی ماننے میں کیا تامل ہے' آخر تم بھی تو ہماری طرح ایک کتابِ الٰہی پر ایمان رکھتے اور اسے منزل من اللہ مانتے ہو۔ دیکھیے! کس بلیغ پیرایہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَاُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ یُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ۝﴾ (العنکبوت 29: 46تا47)

''اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو' مگر بطریقِ احسن ...... سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں ...... اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے اور اس چیز پر بھی جو تمھاری طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا خدا اور تمھارا خدا ایک ہی ہے اور ہم اسی کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔ (اے نبی ﷺ!) ہم نے اسی طرح تمھاری طرف کتاب نازل کی ہے' اس لیے وہ لوگ جنھیں ہم نے پہلے کتاب دی تھی' وہ اس پر ایمان لاتے ہیں' اور ان لوگوں میں سے بھی بہت سے اس پر ایمان لا رہے ہیں' اور ہماری آیات کا انکار صرف کافر ہی کرتے ہیں۔''

مشرکین کے اعتراضات کی تردید

پھر ان استدلات و ترغیبات ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعض دریدہ دہن مشرکین و کفار قرآن کی اس حیثیت پر جو اعتراضات کرتے تھے' ان سب کے جوابات دیے گئے ہیں۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قرآن اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں نسخ نہ پایا جاتا۔ قرآن اس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

﴿وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۝﴾ (النحل 16:101)

''اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کرتا ہے' وہ اسے خوب جانتا ہے' تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم یہ قرآن خود گھڑتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ حقیقت سے ناواقف ہیں۔''

اور آنحضرت ﷺ کو اس کے جواب میں یہ کہنے کا امر کیا جاتا ہے:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًی وَّبُشْرٰی لِلْمُسْلِمِیْنَ۝﴾ (النحل 16:102)

''آپ کہہ دیجیے کہ اس قرآن کو میرے رب کی طرف سے روح القدس نے ٹھیک ٹھیک بتدریج نازل کیا ہے تاکہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں' انھیں ثابت قدمی حاصل ہو اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہو۔''

بعض کہتے تھے کہ حضور ﷺ کا کوئی معلم ہے جو آپ ﷺ کو یہ تمام باتیں سکھاتا ہے۔ اس قول میں یہ بہتان طراز خود دو قسم کے لوگ تھے۔ کوئی کسی نصرانی غلام کو معلم بتاتا تھا اور کوئی کسی یہودی غلام کا نام لیتا تھا۔ لیکن تھے یہ دونوں غلام عجمی۔ اگر مشرکین کا یہ ''معلم'' عربی ہوتا تو وہ متعین طور پر اس کا نام لے سکتے تھے۔ قرآن مجید میں کفار کی اس بہتان طرازی اور اس کی تردید کا بیان اس طرح ہے:

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ۝﴾ (النحل 16:103)

''اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرکین کہتے ہیں کہ آپ کو ایک انسان قرآن سکھاتا ہے' (حالانکہ) جس شخص کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں' وہ عجمی ہے اور قرآن کی زبان صاف اور واضح عربی ہے۔''

اس کے بعد ان لوگوں کے جھوٹ پر مہر توثیق اس طرح ثبت کی گئی ہے:

﴿اِنَّمَا یَفْتَرِی الْكَذِبَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ۝﴾ (النحل 16:105)

''یہ جھوٹ کا افترا وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی وہ

لوگ ہیں جو جھوٹے ہیں۔"

بعض مشرکین کا خیال تھا کہ قرآن مجید کا القا شیاطین کی طرف سے ہوتا ہے اور عموماً کاہن غیب کی خبریں بیان کرتے ہی ہیں۔ آپ بھی کاہن ہیں اور اس لیے غیب کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس شیطانی وسوسے کی تردید بھی نہایت پُر زور الفاظ میں کی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ○ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ○﴾ (الشعراء 26: 210،211)

"اس قرآن کو شیاطین نے نہیں اُتارا اور نہ یہ ان کے لائق ہے اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں۔"

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ○ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ○﴾ (التکویر 81: 25،26)

"اور یہ قرآن مردود شیطان کا قول نہیں ہے، پس تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔"

قرآن کو بعض لوگ شاعرانہ کلام کہتے تھے۔ اس کی بھی تردید کی گئی:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ○ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ○﴾ (الحاقہ 69: 41،42)

"اور وہ (قرآن) کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو اور نہ وہ کسی کاہن کا قول ہے، تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔"

ان سب اعتراضات اور شیطانی وساوس کی تردید کے بعد اللہ تعالیٰ خود اپنی اور فرشتوں کی شہادت سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے:

﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ○﴾ (النساء 4: 166)

"لیکن اللہ اس کی شہادت دیتا ہے جو آپ پر نازل کیا گیا ہے۔ اللہ نے اسے اپنے علم سے اتارا ہے اور فرشتے بھی گواہ ہیں (اگرچہ) شہادت کے لیے تو اللہ ہی کافی ہے۔"

مشرکین کا کوئی اور حیلہ کارگر نہیں ہوا تو انھوں نے یہی کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ معجزہ ہی کیا ہوا، نبی بھی عربی اور قرآن بھی عربی۔ اصل معجزہ تو جب ہوتا کہ عربی نبی پر عجمی قرآن نازل ہوتا۔ قرآن نے مشرکین کے اس قول کی رکاکت کا بھی اظہار کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے:

﴿وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ ○﴾ (حم السجدہ 41: 44)

"اگر ہم اسے عجمی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے "کیوں نہ اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں؟ کیا ہی عجیب بات ہے کہ کلام عجمی ہے اور مخاطب عربی۔" ان سے کہو یہ قرآن ایمان لانے والوں کے لیے تو ہدایت اور شفا ہے، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے لیے یہ کانوں کی ڈاٹ اور آنکھوں کی پٹی ہے۔ ان کا حال تو ایسا ہے جیسے انھیں دُور سے پکارا جا رہا ہو۔"

بعض کفار خود اپنا منہ چڑانے کے لیے کہتے تھے کہ قرآن (معاذ اللہ) من گھڑت ہے اور دوسرے لوگوں نے اس میں آپ کی مدد کی ہے۔ قرآن اس کی بھی تردید کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨ افْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ○﴾ (الفرقان 25: 4)

"کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو کچھ بھی نہیں، نرا بہتان ہے اور اس کے بنانے میں دوسرے لوگوں نے اس کی مدد کی ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے بالکل جھوٹ اور ظلم کی بات کہی ہے۔"

اُوپر جو آیات گزریں، دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے وحیِ الٰہی ہونے کے دلائل بیان کیے ہیں اور دوسری وہ آیات ہیں جن میں قرآن مجید سے متعلق کفار و مشرکین کے بے ہودہ خیالات، باطل توہمات اور شیطانی وساوس کی پُر زور تردید کی گئی ہے۔ ان آیات کے علاوہ کثرت سے ایسی آیات بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف اور واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید کا نزول اللہ کی جانب سے ہوا ہے۔ اس مضمون کے بار بار تکرار سے منشا یہی ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال کا یہ اساسی عقیدہ اس طرح لوگوں کے دل و دماغ میں مرتسم ہو جائے کہ انھیں اس بارے میں ذرا سا بھی تذبذب اور شک باقی نہ رہے۔ آیاتِ ذیل ملاحظہ کیجیے!

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (الدخان 44: 3)

"ہم نے بلاشبہ اس قرآن کو مبارک رات میں اُتارا۔"

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ○﴾ (القدر 97: 1)

"بے شک ہم نے اسے (قرآن کو) شب قدر میں نازل کیا۔"

﴿تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ○﴾ (طٰہٰ 20: 4)

"اس قرآن کا نزول اس ذات کی طرف سے ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔"

﴿قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الفرقان 25: 6)

"آپ کہہ دیجیے کہ اس قرآن کو اُس ذات نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں سے واقف ہے۔"

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ تَنْزِيْلًا ○﴾ (الدھر 76: 23)

"ہم نے ہی قرآن مجید آپ ﷺ پر ٹھہر ٹھہر کر نازل کیا ہے۔"

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○﴾ (الحجر 15: 9)

"ہم نے ہی اس نصیحت (قرآن) کو اُتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

پورے قرآن کو اوّل سے آخر تک پڑھیے تو اس مضمون کی آیات چند ایک نہیں بلکہ بہت زیادہ ملیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے وحی ہونے کے مضمون کو جس شد و مد اور تاکید و تکرار سے بیان کیا ہے، دنیا کی کسی اور کتابِ سماوی نے اپنے

متعلق اس طرح بیان نہیں کیا۔ اس سلسلے کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تشنۂ تکمیل رہ گیا ہو۔

حضرت جبریل علیہ السلام کی توثیق

یہ ظاہر ہے کہ وحی اللہ کی طرف سے انبیا پر عموماً حضرت جبریل علیہ السلام کے واسطہ سے نازل ہوتی رہی ہے اور خود قرآن بھی آنحضرت ﷺ پر اسی طرح نازل ہوا۔ اس بنا پر قرآن میں حضرت جبریل علیہ السلام کی وساطت کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور ان کی توثیق کر کے اس شبہ کو دُور کر دیا گیا ہے کہ ممکن ہے ان سے پیغامِ الٰہی کے پہنچانے میں کوئی تغیر و تبدل ہو گیا ہو۔ ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾

(البقرہ 2: 97)

''آپ کہہ دیجیے کہ جو لوگ جبریل علیہ السلام کے دشمن ہیں (ہُوا کریں)، انھوں نے ہی تو اللہ کے حکم سے آپ پر قرآن اتارا ہے۔''

سورۂ نحل میں ہے:

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ۝﴾ (النحل 16: 102)

''آپ کہہ دیجیے کہ اسے روح القدس نے میرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے تاکہ وہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور وہ مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہو۔''

سورۂ شعرا میں انھیں روح الامین کہا گیا ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جبریل امینِ کامل ہیں۔ ان سے کسی خیانت یا کوتاہی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ فرمایا گیا ہے:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۝﴾

(الشعراء 26: 193تا194)

''اس قرآن کو روح الامین (جبریل) نے آپ کے قلب پر اُتارا ہے تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔''

سورۂ تکویر میں اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ جبریل کی توثیق کی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ۝ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ۝ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ۝﴾ (التکویر ۱۸: 19تا21)

''بے شک وہ معزز قاصد کا کلام ہے جو قوت والا ہے، خدائے عرش کے نزدیک مرتبہ والا ہے، اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں امین و معتبر ہے۔''

آنحضرت ﷺ کی توثیق

حضرت جبریل علیہ السلام کے تعارف اور ان کی توثیق کے بعد ضرورت تھی کہ آنحضرت ﷺ کی بھی توثیق کی جاتی تاکہ کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے آپ سے وحی کے پہنچانے میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہو۔ ساتھ ہی ضروری تھا کہ اس معاملے میں آنحضرت ﷺ کی صحیح حیثیت بھی بیان کر دی جاتی، جس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور ﷺ تو محض ایک پیغامبر ہیں۔ اللہ کی طرف سے آپ ﷺ پر جو وحی نازل ہوتی ہے، آپ اسے بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہنچانے پر مامور ہیں۔ پھر چوں کہ اس منصبِ جلیل و عظیم (رسالت) کے لیے خدا نے آپ کا انتخاب کیا ہے، اس لیے آپ کے ذہنی اور دماغی قویٰ بھی عام انسانوں سے زیادہ بلند اور مضبوط ہیں، جس کے باعث آپ وحی میں نہ کوئی تغیر و تبدل کر سکتے ہیں اور نہ اس کے کسی لفظ اور معنی کا مفہوم سمجھنے میں آپ سے غلطی ہو سکتی ہے۔ رب الوحی نے یہ سب باتیں بھی قرآن میں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہو جائے۔

اس سلسلہ میں بعض آیات تو وہ ہیں جن میں عمومی طور پر فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس عموم کے ماتحت خود سرورِ کائنات کی ذاتِ ستودہ صفات بھی داخل ہے۔ مثلاً یہ آیت:

﴿وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝﴾

(یونس 10: 37)

''اور یہ قرآن وہ نہیں ہے کہ اسے غیر خدا نے گھڑ لیا ہو۔ لیکن اس کتاب کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے نازل ہوئی اور اس کی ہی تفصیل ہے، اس قرآن کے رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔''

ان کے علاوہ دوسری آیات وہ ہیں جن میں آنحضرت ﷺ کی ذات سے متعلق چند تصریحات و توضیحات ہیں۔ مثلاً:

1: ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی اور انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ آپ پر وحی اُترتی ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (حم السجدہ 41: 6)

''آپ فرما دیجیے، میں تمھاری طرح ایک بشر ہوں، البتہ مجھ پر وحی آتی ہے۔''

اور آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ سے پہلے بھی انبیا آتے رہے اور ان پر بھی وحی نازل ہوتی رہی ہے۔ بس آپ کا فرضِ منصبی یہی ہے کہ خدا کا پیام جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیں، اس کے ماسوا آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ خود آپ کے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا:

﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ﴾ (الاحقاف 46: 9)

''ان سے کہو، میں کوئی نرالا رسول تو نہیں ہوں، میں نہیں جانتا کہ کل تمھارے ساتھ کیا ہونا ہے اور میرے ساتھ کیا۔ میں تو صرف اُس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔''

2: حضور ﷺ کو لوگوں کے ثواب و عتاب میں بھی کوئی دخل نہیں ہے۔ ارشادِ

خداوندی ہے:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝﴾ (آل عمران 3:128)

"آپ کو اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں ہے۔ اللہ انھیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے یا انھیں عذاب دے وہ تو بہر حال ظالم ہیں۔"

3: حضور ﷺ کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ خدا نے لوگوں سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ قریب ہے یا بعید ہے۔ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ إِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ مَا تُوعَدُونَ أَمْ يَجْعَلُ لَهُ رَبِّي أَمَدًا ۝﴾ (الجن: 25)

"آپ کہہ دیجیے میں نہیں جانتا کہ تم سے جس چیز کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا نہیں یا میرا رب اس کے لیے کوئی مدت مقرر کرے گا۔"

بعض مشرکین مکہ آنحضرت ﷺ سے کہتے تھے کہ آپ کی عام پند و نصائح تو بڑی ہی عمدہ ہیں لیکن قرآن میں بت پرستی کی جو مذمت کی جاتی ہے اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ اس لیے آپ یا تو موجودہ قرآن کو چھوڑ کر کوئی دوسرا قرآن لے آئیے جس میں ایسی "دل خراش" باتیں نہ ہوں یا پھر کچھ اور نہیں تو اس قرآن ہی میں ترمیم اور تغیر و تبدل کر دیجیے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۙ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ ۖ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝﴾ (یونس 10:15)

"جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے یعنی حشر کا عقیدہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ آپ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیے یا اسے ہی بدل دیجیے۔ آپ (ان سے) فرما دیجیے کہ میں قرآن کو اپنی طرف سے بدل نہیں سکتا۔ میں تو اس چیز کی پیروی کروں گا جس کی وحی مجھے بھیجی گئی ہے۔ اگر میں نے نافرمانی خداوندی کی تو میں اپنے رب کے سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔"

4: آنحضرت ﷺ وحی کو بعینہٖ پہنچا دیتے ہیں اور اس میں ہوا و ہوس کا بالکل دخل نہیں ہوتا۔ اعلان واجب الاذعان ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۝﴾ (النجم 53: 3، 4)

"آپ اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے آپ کا نطق وحی ہے جس کی آپ پر وحی ہوئی ہے۔"

5: اور آپ نطق عن الہویٰ کر بھی نہیں سکتے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝﴾ (الحاقہ 69: 44 تا 47)

"اور اگر وہ (محمد ﷺ) بعض باتیں بنا کر ہماری طرف منسوب کر دیتے تو ہم ضرور ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ان کی رگ کاٹ ڈالتے اور تم میں سے کوئی اس کا روکنے والا نہ ہوتا۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۖ فَإِنْ يَشَإِ اللَّهُ يَخْتِمْ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۗ وَيَمْحُ اللَّهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝﴾ (الشوریٰ 42: 24)

"کیا وہ کہتے ہیں کہ محمد نے اللہ پر جھوٹ باندھا ہے اگر اللہ چاہتا تو وہ آپ کے دل پر مہر لگا دیتا۔ اللہ باطل کو مٹاتا اور حق کو اپنے کلمات سے ثابت کرتا ہے بے شبہ وہ دلوں کے اسرار سے خوب واقف ہے۔"

6: کوئی شبہ نہیں کہ آپ دیانت دار اور سچے قاصد ہیں اللہ کی وحی بعینہٖ لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں:

﴿إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ۝﴾ (الحاقہ 69: 40)

"کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قول ہے۔"

جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے سورہ تکویر میں تو "رسول کریم" سے مراد جبریلؑ ہیں لیکن سورۃ الحاقہ میں "رسول کریم" سے مراد آنحضرت ﷺ ہیں۔ آنحضرت ﷺ اور جبریلؑ دونوں کو "رسول" اس لیے کہا گیا کہ جبریل اللہ اور آنحضرت ﷺ کے اور سرور دو عالم ﷺ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان نامہ بری (رسالت) کا فرض انجام دیتے ہیں اور چوں کہ دونوں اپنے اپنے فریضۂ منصبی کے ادا کرنے میں نہایت دیانت دار اور امین ہیں اس لیے دونوں "رسول کریم" ہیں۔ کسی شخص کو قول کے لفظ سے اشتباہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کی اضافت رسول کی طرف ہے۔ کیوں کہ یہ ظاہر ہے کہ قاصد کا قول اگرچہ اس کی زبان سے ادا ہوتا ہے، اس لیے اس کا قول (مجازاً) کہلاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ وہ ہوتا ہے کلام اس شخص کا جس کا نامہ بر یہ قاصد ہوتا ہے۔

7: آنحضرت ﷺ کو قرآن پڑھانا اور اسے آپ کے سینۂ اقدس و اطہر میں محفوظ رکھنا یہ سب اللہ کے ذمہ ہے۔ اس بنا پر آپ سے اس کے یاد کرنے اور سمجھنے میں نہ کوئی غلطی ہو سکتی ہے اور نہ آپ کو اس میں کوئی سہو پیش آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید کونین فداہ ابی و امی اس خیال سے کہ کہیں وحی الٰہی کا کوئی لفظ گوشۂ یاد سے اوجھل نہ ہو جائے نزول وحی کے وقت اپنی زبان حق ترجمان کو جلدی جلدی حرکت دیتے تھے تو خدا نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ ارشاد ہے:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝﴾ (القیامۃ 75: 16 تا 18)

"آپ جلدی جلدی پڑھنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیجیے قرآن کا (آپ کے سینے میں) جمع کرنا اور اس کا پڑھانا تو ہمارا ذمہ ہے۔ جب ہم آپ کو پڑھائیں گے تو آپ بھی اس کا اتباع کیجیے۔"

کور چشمانِ باطن اگر آفتابِ حقیقت کی ایک ہلکی سی کرن بھی دیکھ سکیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ قرآن مجید کے وحیٔ الٰہی ہونے کے تمام دلائل ایک طرف اور صرف "لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ" ایک طرف۔ یہ مختصری آیت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ قرآن حضور ﷺ کا اپنا کلام نہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کوئی متکلم کلام کرتے وقت اپنی زبان کو اس لیے جلد جلد حرکت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے یاد رہ جائے۔ یقینی بات ہے کہ حضور ﷺ پر مبداء فیاض کی جانب سے قرآن مجید کا فیضان ہو رہا تھا اور آپ بہ تقاضائے بشریت اسے یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو جلد جلد حرکت دے رہے تھے۔ اس پر حضرت حق جلّ شانہٗ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ایک اور آیت میں ہے:

﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝﴾ (الاعلیٰ 87: 6تا8)

"ہم آپ کو پڑھائیں گے، پھر آپ نہ بھولیں گے، مگر وہ جسے اللہ ہی چاہے۔ وہ کھلی اور چھپی باتوں کو جانتا ہے اور ہم آہستہ آہستہ آپ کو آسانی تک پہنچائیں گے۔"

8: صرف پڑھانا اور یاد کرانا ہی نہیں بلکہ اس کی تشریح و توضیح بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے:

﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝﴾ (القیامۃ 75: 19)

"پھر اسے سمجھانا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔"

الغرض آنحضرت ﷺ کے متعلق بسلسلۂ وحی جتنے امور بحث طلب ہو سکتے تھے، دیکھو قرآن نے کس طرح ان میں سے ایک ایک امر کے بارے میں واضح تصریحات کی ہیں۔

قرآن آپ کے قلب پر نازل ہوا

ساتھ ہی اس نے نزولِ قرآن کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ اس کا تعلق حواسِ ظاہری سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔ ارشاد ہے:

﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰي قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (البقرہ 2: 97)

"جبریل نے قرآن کو اللہ کے حکم سے آپ ﷺ کے قلب دل پر اتارا ہے۔"

ایک اور مقام پر ہے:

﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰي قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝﴾ (الشعراء 26: 193تا194)

"قرآن کو روح الامین آپ ﷺ کے قلب پر لے کر نازل ہوئے ہیں تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہوں۔"

لوحِ محفوظ کا بیان

ساتھ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت ﷺ کے قلبِ مطہر پر نازل ہونے سے پہلے لوحِ محفوظ میں موجود تھا۔ ارشاد ہے:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (البروج 85: 21تا22)

"بلکہ وہ قرآن مجید ہے جو لوحِ محفوظ میں ہے۔"

ایک آیت میں لوحِ محفوظ کو "کتابِ مبین" کہا گیا ہے اور اس میں بھی اس کی اسی صفت کا بیان ہے:

﴿وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ (الانعام 6: 59)

"اور اللہ کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں صرف اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان چیزوں کو جو خشکی میں اور سمندر میں ہیں اور جو پتا گرتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ گرتا ہے اللہ تعالیٰ ہی اسے جانتا ہے اور کوئی تر اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں ہے جو کھلی ہوئی اور واضح کتاب میں نہ ہو۔"

سورۂ حدید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝﴾ (الحدید 57: 22)

"ملک میں یا خود تمھارے اندر جو مصائب نازل ہوئے ہیں ان میں کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو اسے پیدا کرنے سے پہلے لوحِ محفوظ میں محفوظ نہ ہو۔ یہ بے شک اللہ کے لیے آسان ہے۔"

سورۃ القمر میں اس کا بیان اس طرح ہے:

﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝﴾ (القمر 54: 52،53)

"اور ہر وہ چیز جو انھوں نے کی، لکھی ہوئی ہے ورقوں میں اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی جا چکی ہے۔"

ان آیات کی روشنی میں قرآن مجید سے لوحِ محفوظ کی نسبت صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں آفرینش سے انتہا تک کے تمام حالات وواقعات، اوامر ونواہی اور رموز واسرار لکھے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ قرآن بھی اس میں لکھا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں اتنی بات کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن میں آلاتِ کتابت وتحریر میں سے قلم کا بھی ذکر ہے، ارشاد ہے:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝﴾ (القلم 68: 1)

"ن، قسم ہے قلم کی اور اس کی جس سے لکھتے ہیں۔"

لیکن اس لوح کی شکل وصورت کیسی ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن نے حسبِ دستور عرش وکرسی کی طرح اس کی بھی کوئی حقیقت بیان نہیں کی۔ البتہ بعض کتبِ احادیث میں اس کے متعلق حضرت ابن عباس کا ایک اثر ملتا ہے لیکن اس کی بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لوحِ محفوظ ایک جوہر مجرد ہے، کسی چیز میں نہیں اور وہ صورِ علمیہ کے لیے بمنزلہ آئینہ کے ہے لیکن کتاب وسنت کے ظواہر الفاظ سے اس کی بیّن تائید نہیں ہوتی۔ بہ طور مثل یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح حافظِ قرآن کے دماغ میں قرآن مجید کے کلمات ثبت ہوتے ہیں، لیکن وہ اس میں

منقوش و مکتوب نہیں ہوتے' اسی طرح لوحِ محفوظ میں تمام عالم کے مقادیر ثبت ہیں لیکن عام الواحِ دنیا پر قیاس کر کے ان کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس میں مقادیر منقوش ہیں۔ واللہ اعلم۔

قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے

پھر قرآن مجید کو صرف وحی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اسے صاف لفظوں میں کلام اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿وَ اِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبہ 9: 6)

''اور اگر کوئی مشرک آپ سے امن طلب کرے تو آپ اسے امن دے دیجیے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔''

قولِ بشر کہنے پر عذابِ دوزخ کی وعید

اب چونکہ حضرت جبریل اور آنحضرت ﷺ کی توثیق کر کے قرآن کے وحی اور منزل من اللہ ہونے کے ثبوت میں اللہ کی طرف سے حجت تمام ہو چکی ہے' اس لیے اب کسی منکر کا عذر لائق پزیرائی نہیں ہو سکتا اور جو شخص اب بھی قرآن کو کلامِ بشر یا جادو کہتا ہے' وہ بلاشبہ دوزخ کے عذاب کا سزاوار ہے۔

ایک مرتبہ ولید بن مغیرہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ ﷺ نے قرآن پڑھ کر سنایا' وہ کسی قدر اس سے متاثر ہوا مگر ابوجہل اور دوسرے سردارانِ قریش نے اسے ورغلایا اور پوچھا: ''قرآن کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے''؟ کہنے لگا: ''ذرا سوچ لوں......'' آخر تیوری بدل کر اور منہ بنا کر بولا: ''یہ تو بابل کا جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آتا ہے اور یہ تو انسان کا قول ہے۔'' اس پر قرآن مجید میں آیت ذیل اُتری' جس میں عذابِ دوزخ کی وعید کی گئی ہے:

﴿فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ۙ ثُمَّ نَظَرَ ۙ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ۙ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ۙ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ۭ﴾ (المدثر 74: 19تا25)

''اس نے سوچا اور دل میں ایک بات ٹھہرائی' وہ مارا ہی جائے' اس نے دل میں کیا بات ٹھہرائی تھی۔ پھر وہ مارا ہی جائے' اس نے کیا ٹھہرایا تھا۔ پھر اس نے دیکھا' تیوری چڑھائی اور منہ پھلا لیا' پھر پشت پھیر لی اور غرور کیا اور کہنے لگا یہ تو جادو ہے جو منقول ہو کر آتا ہے' یہ تو قولِ بشر ہی ہے۔''

یہاں تک تو ولید بن مغیرہ کا مقولہ اور اس کے احوال و کوائف کا بیان تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ۭ لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝﴾ (المدثر 74: 26تا29)

''اب اسے میں دوزخ میں ڈالوں گا اور آپ کیا سمجھے کہ کیسی ہے وہ دوزخ' وہ نہ کچھ باقی رکھتی ہے اور نہ چھوڑتی ہے' وہ آدمیوں کو جھلسانے والی ہے۔''

قرآن مع عربی الفاظ کے وحیٔ الٰہی ہے

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن جسے اللہ کا کلام کہا گیا ہے۔ وہ صرف معانی و مطالب کے لحاظ سے ہے یا عربی الفاظ اور ان کی مخصوص نشست و ترکیب کے لحاظ سے بھی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ لفظ و معنی کی تفریق خاص عہد نبوت میں ان لوگوں نے بھی نہیں کی جو رسول صادق و امین کی تکذیب کے لیے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ وہ خود اربابِ لسان تھے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت اور اسالیب بیان کی مہارت میں یگانۂ روزگار تھے۔ اس کے باوجود قرآنی الفاظ کے اعجاز نے انھیں اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ وہ پورے قرآن کو تو مع اس کے الفاظ و معانی کے ''ساحرانہ'' یا ''شاعرانہ'' کلام کہتے تھے لیکن یہ کہنے کی ہمت انھیں بھی نہیں ہوئی کہ ''محمد ﷺ کے الفاظ میں ایسی کون سی الوہی خصوصیت ہے کہ وہ انھیں بھی اللہ کا نازل کیا ہوا کہتے ہیں۔ ایسے جملے اور ایسی عبارتیں تو ہم بھی بول اور لکھ سکتے ہیں۔''

لیکن خدائے علام الغیوب کو علم تھا کہ اب نہیں تو بعد میں تفلسف اور عقلیت پرستی کے دور میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ایک طرف اپنے مسلمان ہونے کا ادعا کریں گے اور دوسری طرف اپنے تفلسف کا بھرم قائم رکھنے کے لیے قرآن کو معانی و مطالب تک کے لحاظ سے تو وحیٔ خداوندی تسلیم کریں گے لیکن اس کے الفاظ کی نسبت خود آنحضرت ﷺ کی طرف کرنے میں متامل نہیں ہوں گے۔ اس بنا پر قرآن مجید نے اس مسئلہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا اور اس کی بھی تصریح کر دی کہ قرآن مع الفاظ عربی کے اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی طرف سے وحی کا نزول انھی عربی الفاظ میں ہوا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ ۝﴾ (الزمر 39: 28)

''قرآنِ عربی بغیر کسی کجی کے۔''

علاوہ ازیں آیاتِ ذیل غور سے پڑھیے:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ۝﴾ (یوسف 12: 2)

''ہم نے قرآن عربی نازل کیا ہے۔''

﴿اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝﴾ (الزخرف 43: 3)

''بلاشبہ ہم نے اسے عربی قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھو۔''

دیکھیے! ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلق قرآن کے نزول کی نسبت اپنی طرف سے نہیں کی بلکہ اس قرآن کی نسبت اپنی طرف کی ہے جو عربی زبان میں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہونا بھی یہی چاہیے تھا کیوں کہ محض معانی و مطالب کے القا و ایجاد کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس طرح معنی کا زبان سے اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معانی کا دل میں خطور اور ان کا تعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے۔

تنقیحات و نتائج

اب ان سب آیات کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح قرآن مجید کی نسبت ایک ایک بات کو کھول کر بیان کیا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' اس میں

رمز بھی ہے کہ لوگوں کو قرآن مجید کے وحیٔ الٰہی ہونے میں کوئی شک اور تردّد نہ رہے۔ یہی مسئلہ دین کی اساس اور بنیاد ہے۔ اس لیے ضرورت تھی کہ اس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا۔ ان تمام آیات سے حسب ذیل نتائج ثابت ہوتے ہیں:

1: قرآن مجید اللہ کا کلام ہے مع الفاظ و معانی کے
2: حضرت جبریل اسے لے کر نازل ہوئے ہیں
3: آنحضرت ﷺ پر وہ نازل ہوا ہے
4: جبریل اور آنحضرت ﷺ دونوں بے انتہا امین اور دیانت دار ہیں
5: آنحضرت ﷺ نے یا کسی اور شخص نے اسے بنایا نہیں ہے
6: شیاطین نے اس کا القا نہیں کیا
7: آنحضرت ﷺ رسول کریم تھے۔ قرآن آپ پر جیسا نازل ہوتا تھا ویسا ہی لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔ آپ کو اس میں نہ نسیان ہو سکتا تھا اور نہ کوئی مغالطہ
8: آپ شاعر، کاہن یا ساحر ان میں سے کچھ نہ تھے
9: قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل قاطع کا بیان
10: اس پر کفار و مشرکین کے اعتراضات و وساوس کا حتمی ردّ
11: عام انسانوں تک اللہ کے کلام کے پہنچانے کا ذریعہ صرف آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے اور آپ چوں کہ ہر طرح اللہ کے معتمد اور اس کے سچے رسول ہیں، اس لیے جو کلام آپ کی وساطت سے پہنچا ہے اور خود آنحضرت ﷺ نے بھی اسے خدا کا کلام کہا ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ بے چون و چرا اسے قبول کرلے اور اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔

مندرجہ بالا نتائج قرآن مجید کے اشارۃ النص یا دلالۃ النص سے نہیں بلکہ ظواہر نصوص سے واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں اور اس بنا پر جس طرح کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کو خدا کا رسول نہ مانے۔ اسی طرح ایسے شخص کا ادعاء اسلام صحیح نہیں ہے جو مندرجہ بالا تنقیحات پر ایمان و اعتقاد نہ رکھے۔ جمہور اُمت کا ہر قرن اور ہر زمانہ میں اس پر اتفاق رہا ہے اور جس کسی نے اس کے خلاف کیا اُسے مرتد قرار دے کر گردن زدنی قرار دیا گیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ”سلف ان لوگوں کو جہمی کہتے ہیں جو صفات کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت نہیں ہوگی، کیوں کہ جہم سب سے پہلا شخص ہے جس نے نفی اسما و صفات کی بدعت جاری کی اور اس میں انتہائی غلو اور انہماک سے کام لے کر بار بار اس کی دعوت دی۔ جعد بن درہم نے بھی مسلمانوں کو اس فتنۂ عظیم میں مبتلا کرنا چاہا تو خالد بن عبداللہ القسری نے جو عراق کا گورنر تھا، عین بقرعید کے دن ذبح کر دیا اور ذبح کرتے وقت یہ الفاظ کہے: ”لوگو! تم اپنی اپنی قربانیاں کرو، اللہ تمھاری قربانیاں قبول فرمائے، میں جعد بن درہم کو قربان کرتا ہوں۔ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا اور اس نے حضرت موسیٰؑ سے کلام بھی نہیں کیا تھا۔ اللہ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے۔“

پس جہاں تک اسلامی عقائد کا تعلق ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے، ناگزیر ہے کہ وہ قرآن مجید کو مع الفاظ و معانی کے اللہ کا کلام مانے اور دل سے اس کا اعتقاد جازم رکھے۔ دنیا بھر کے تمام جزئی اختلافات کے باوجود یہی اعتقاد ایک ایسا رشتۂ اتحاد ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان ہر قرن اور ہر زمانہ میں قائم رہا ہے۔ اگر کوئی مدعیٔ اسلام آج اس اعتقاد پر قائم نہیں ہے تو جس طرح زمانۂ سلف میں ایسے گم راہ لوگوں کو مسلمانوں کی برادری سے خارج کر دیا گیا تھا، یہ شخص بھی ہمارے اسی سلوک کا مستحق ہونا چاہیے۔“

(مولانا سعید احمد اکبرآبادی)

وحی کا نزول

ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم و مغفور نے ''خطباتِ بہاول پور'' میں ایک خطبے بہ عنوان ''دین'' میں وحی کی حقیقت پر اپنے مخصوص سادہ اسلوب میں روشنی ڈالی ہے۔ اس خطبے کا متعلقہ اقتباس یہاں شامل کیا جاتا ہے:

''بعض مذاہب میں عقیدہ یہ ہے کہ اللہ انسان کے قالب میں جنم لیتا ہے۔ جس شخص کے اندر اللہ حلول کر جاتا ہے، اس کا ہر قول اللہ کا قول اور ہر فعل اللہ کا فعل ہوتا ہے۔ دوسرا تصور یہ ہے کہ اللہ اپنے کسی برگزیدہ بندے کے پاس اپنا پیغام بھیجتا ہے۔ یہ پیغام اس تک مختلف طریقے سے پہنچایا جاتا ہے۔ کبھی تو اللہ کی آواز براہِ راست اس نبی کے کان تک پہنچتی ہے، جیسا کہ حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے متعلق ہے کہ خدا نے ان سے بات کی۔ کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ پیغام ایک فرشتہ لاتا ہے اور انسان تک پہنچاتا ہے۔ فرشتے کا لفظ فارسی مصدر ''فرستادن'' کا اسمِ مفعول ہے، یعنی بھیجا ہوا۔ اس سے مراد وہ نوری مخلوق ہے جو اللہ کا پیغام انسان تک پہنچاتی ہے۔ ان فرشتوںؑ میں یہ خامی نہیں ہوتی کہ پیغام کا کوئی جزو بھول جائیں یا اس کے پہنچانے میں کوئی غلطی کریں۔ فرشتے خدا کا جو پیغام لاتے ہیں، اسے ہم اصطلاح میں ''وحی'' کہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وحی کیا چیز ہے؟ جو لوگ مسلمان نہیں ہیں، اور اسلام پر اعتراض کرتے رہے ہیں، وہ وحی پر بھی اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ایک بیماری ہے۔ گزشتہ صدی کا ایک مشہور جرمن مستشرق اشپرنگر برطانوی دورِ حکومت میں ہندوستان میں رہا تھا۔ اس نے علمِ طب کی تعلیم حاصل کر رکھی تھی اور عربی دان بھی تھا۔ چنانچہ اپنی ذاتی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ مرگی کی بیماری معلوم ہوتی ہے۔ نزولِ وحی کے متعلق عربی کی کتابوں میں جو روایات اور بیانات ہیں کہ جب وحی آتی تو رسول اللہ ﷺ کا چہرہ سُرخ ہو جاتا، آپ پسینے پسینے ہو جاتے اور سکتے کا عالم طاری ہو جاتا۔ تو اشپرنگر کہتا ہے کہ یہ علامات مرگی کی ہیں۔ چوں کہ میں ڈاکٹر نہیں ہوں، کہ نہیں سکتا کہ اس کا یہ بیان کس حد تک صحیح ہے۔ بہر حال اس نے یہ اعتراض کیا ہے، لیکن اس کے متعلق اگر میں اپنی رائے ظاہر کر سکوں تو وہ یہ ہے کہ اشپرنگر نے وحی کے بارے میں اور وحی کی کیفیت سے متعلق ساری معلومات جمع نہیں کیں؛ بلکہ صرف چند چیزیں لیں اور ان کی اساس پر کہا کہ یہ فلاں بیماری کی علامات ہیں۔ میرے خیال میں یہ صحیح علمی اور دیانت دارانہ طریقہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مَیں نے وہ حدیثیں جمع کیں جن میں وحی کے نزول کے وقت کا مشاہدہ مختلف صحابیوں سے مروی ہے۔ مثلاً ایک صحابی فرماتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ فلاں دن یکا یک رسول اللہ ﷺ کی حالت متغیر ہو گئی۔ وحی نازل ہونے لگی اور اس وقت کی یہ کیفیت چند لمحوں کے بعد دُور ہو گئی اور رسول اللہ ﷺ اپنی معتاد بشری حالت میں آ گئے، وغیرہ وغیرہ۔ ایسی جو حدیثیں مَیں نے جمع کیں ان میں ایک بات غیر معمولی ہے، جس کی طرف اشپرنگر کے بیان میں کوئی اشارہ تک نہیں چہ جائیکہ وہ اس کی توجیہ یا اس سے استدلال کی کوشش کرتا۔ وہ یہ ہے کہ جب وحی نازل ہوتی تو وہ تمام صحابہ جنھیں اس کا مشاہدہ ہوا تھا، کہتے ہیں کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ اتنے بوجھل ہو جاتے کہ اس بوجھ کا تحمل تقریباً ناممکن ہو جاتا۔ چنانچہ اگر آپ کسی اونٹنی پر سوار ہوتے اور اس وقت وحی نازل ہونے لگتی تو اونٹنی آپ کے بوجھ کو برداشت نہ کر سکتی اور مجبور ہو جاتی کہ بیٹھ جائے۔ اگر وہ بیٹھنا نہ چاہتی یا بیٹھ نہ سکتی، اس کے پاؤں سیدھے ہو جاتے اور اکڑنے لگتے گویا وہ اب چٹخ کر ٹوٹ جائیں گے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، لوگوں کی کثرت تھی۔ حضرت زید بنؓ ثابت کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا زانو میرے زانو پر تھا۔ آپ ﷺ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اتنا بوجھ محسوس ہوا کہ مجھے خوف ہوا کہ میری ران کی ہڈی چٹخ کر ٹوٹ جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی ذات نہ ہوتی تو میں چیخ کر اپنا پاؤں کھینچ لیتا۔ میرے لیے تقریباً ناممکن تھا کہ میں آپ ﷺ کا بوجھ سہار سکوں۔ جیسا کہ مَیں نے کہا، اس کی توجیہ اشپرنگر کے بیان میں اور اعتراض کی عبارت میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور مؤلفوں نے بھی خیال آرائی کی ہے لیکن وہ بھی اس نکتے پر چُپ سادھ لیتے ہیں اور اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ بات میرے نزدیک بہت اہم اور غیر معمولی ہے۔ مجھے یا آپ کو ایسی کیفیت کبھی پیش نہیں آ سکتی۔ عام بشری کیفیت پر قیاس کر کے میں اس کی توجیہ کبھی نہیں کر سکوں گا کہ وحی کیا چیز ہے؟ وحی صرف پیغمبر پر آتی ہے اور پیغمبر کی بھی چوبیس گھنٹے وہ حالت نہیں رہتی بلکہ کبھی کبھی اللہ کوئی پیغام بھیجتا ہے تو اس پر وہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک طرف یہ چیز ہے، دوسری طرف میرے ایک ڈاکٹر دوست نے مرگی کی بیماری کے متعلق علمی نقطۂ نظر سے کچھ تازہ ترین معلومات مہیا کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرگی کا بیمار تشنج کی حالت میں ہوتا ہے، ہاتھ پاؤں مارتا ہے، بے قرار ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ اس کی زبان سے کچھ آوازیں نکلتی ہیں لیکن وہ بالکل ناقابلِ فہم ہوتی ہیں۔ وہ کچھ کہنا ضرور چاہتا ہے لیکن کوئی ایسی بات نہیں ہوتی جسے ہم سننے والے سمجھ سکیں اور یہ کہ مرگی والے شخص کی اولاد میں بھی یہ مرض منتقل ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں غور کرنا چاہیے کہ، اور ہاتھ پاؤں مارنے اور بے قرار ہو جانے کا کوئی ذکر رسول اللہ ﷺ

میں اور وحی کے مشاہدات سے متعلق روایتوں میں نہیں ملتا۔ اس لحاظ سے مرگی کا انتساب رسول اللہ ﷺ کی طرف درست معلوم نہیں ہوتا' اس کے برعکس ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ' وحی کے وقت ہمیشہ ساکت و صامت ہو جاتے تھے' یہ نہیں کہ ہاتھ پاؤں مارتے تھے یا تشنج کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی' کبھی نہیں کبھی بھی نہیں۔ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا۔ دوسری چیز ہمیں یہ بھی نظر آتی ہے کہ وحی کے دوران میں شروع سے آخر تک اور وحی کے ختم ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے جو آوازیں نکلتیں' وہ قابلِ فہم عبارتیں ہوتیں' یعنی قرآن کی آیتیں' جنھیں سن کر ہر شخص سمجھ سکتا تھا۔ یہ نہیں کہ جانوروں کی طرح چیخیں مارتے ہوں یا جیسے کہ بیمار بعض اوقات کراہتا ہے اور ایسی آوازیں نکالتا ہے جو سمجھ میں نہیں آسکتیں' ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں وحی کے دوران میں رسول اللہ ﷺ بلند آواز سے وحی سناتے۔ بعض اوقات وحی کے ختم ہونے کے بعد سناتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں سورۃ القیامت میں ایک آیت ہے کہ "لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ یعنی ابتدا ہی سے جیسے جیسے وحی نازل ہوتی اور جیسے جیسے فرشتہ آپ کو کچھ الفاظ پہنچاتا' رسول اللہ ﷺ اُسی وقت اسے بآوازِ بلند دُہراتے رہتے۔ اس طرح کی فوری تبلیغ آپ کی نیک نیتی پر مبنی تھی کہ کچھ بھول نہ جائیں تو اللہ نے کہا ایسا نہ کریں۔ پہلے سکون کے ساتھ پوری وحی کو سن لیں' وہ آپ کے ذہن سے غائب نہیں ہوگی' ہم اسے محفوظ رکھیں گے۔ وحی کا نزول ختم ہونے کے بعد آپ اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ اس کے بعد سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس معمول کو بدل دیا اور وحی کے اختتام تک سکوت فرماتے۔ ان تفصیلات کی روشنی میں ہمیں نظر آتا ہے کہ مرگی کی بیماری' تشنج وغیرہ بے معنی آوازوں کا آپ ﷺ کی زبان سے نکلنا' ان باتوں کا وہاں کوئی وجود نہیں ہے۔ اسی طرح رسول اکرم ﷺ کے گھر چھے سات لڑکے لڑکیاں ہوئیں اور لڑکیوں کی اولاد اب تک دنیا میں باقی ہے اور مرض کے توارث سے تاریخ ساکت ہے۔

اس کے علاوہ ایک طویل فہرست ایسی حدیثوں اور روایتوں کی ہے جن میں لکھا ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے' یکایک آپ ﷺ کی حالت غیر ہوگئی اور وحی نازل ہونے لگی۔ آپ ﷺ کی زبان سے آواز نکلنا بند ہوگئی اور آپ ﷺ چُپ چاپ کھڑے رہے۔ چند لمحوں کے بعد وہ حالت دُور ہو گئی۔ پھر آپ نے خطبہ دینا شروع کیا اور فرمایا کہ مجھ پر ابھی فلاں وحی نازل ہوئی ہے اور اس کی تبلیغ فرما دی۔ ایک دوسری روایت میں یہ کہا گیا ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ کھانا کھا رہے تھے' آپ کے ہاتھ میں ایک گوشت کا ٹکڑا تھا۔ یکایک آپ ﷺ پر وحی نازل ہونا شروع ہوگئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ حالت دُور ہو گئی۔ وہ ٹکڑا بدستور آپ کے ہاتھ میں رہا' گرا نہیں یعنی اپنی ذات پر آپ ﷺ کا کنٹرول برقرار رہا۔ اس طرح کی اور حدیثیں بھی ہیں جن میں ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کو اپنے آپ پر ویسا ہی کنٹرول رہتا تھا جیسا کہ عام حالت میں ہوتا تھا' سوائے اس فرق کے کہ اس وقت آپ بے حرکت ہو جاتے اور آپ ﷺ کے جسم سے پسینا نکلنے لگتا' حتیٰ کہ انتہائی شدید سردی کے زمانے میں بھی پسینے کے قطرے ایک قطار کی صورت میں آپ ﷺ کی پیشانی سے گرنے لگتے۔ اس کے سوا اور کوئی فرق نظر نہیں آتا یا یہ کہ آپ کے چہرے کا رنگ' چند لمحوں کے لیے غالباً خون کی گردش کی وجہ سے سُرخ ہو جاتا یا ذرا سا سانولا ہو جاتا۔ اس کے علاوہ ہمیں اور کوئی فرق نظر نہیں آتا۔

مغربی مؤرخوں کی تالیفات میں ایک اور چیز بھی نظر آتی ہے' وہ کہتے ہیں کہ جب وحی نازل ہوتی تو رسول اللہ ﷺ لیٹ جاتے اور آپ کے چہرے کو ڈھانپ دیا جاتا' جیسا کہ پُرانے کاہنوں کی عادت تھی۔ مَیں نے اس بارے میں تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ آپ کے چہرے کو ڈھانپ دینا اور آپ کا لیٹ جانا' صرف ایک مرتبہ پیش آیا ورنہ عام طور پر ایسی کوئی صورت کبھی واقع نہیں ہوئی۔ مثلاً اونٹنی پر ہیں یا منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ دے رہے ہیں تو وہاں چہرے یا جسم کو کسی کپڑے سے ڈھانپ دینے اور آپ کے لیٹ جانے کی کوئی صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ایک واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عفت کے بارے میں جھُوٹے بہتان لگائے گئے تھے تو ایک دن آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے ملنے کے لیے' ان کے والد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں گئے کیوں کہ اس زمانے میں وہ والدین کے گھر تھیں۔ وہاں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے گفتگو کی' کچھ سوالات کیے' پھر یکایک آنحضرت ﷺ پر وحی کا نزول شروع ہوا۔ راوی لکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لیٹ گئے اور آپ ﷺ کے چہرے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی بیوی نے احتراماً ایک چھوٹا سا کپڑا ڈال دیا' اس خیال سے کہ کہیں رسول اللہ ﷺ کی متغیر حالت دیکھ کر ہم ہنس نہ پڑیں یا ان پر بے ادبی سے نظر نہ پڑ جائے۔ اس ایک روایت کے علاوہ اور اس خاص واقعہ کے علاوہ کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ لیٹ جاتے ہوں اور رسول اللہ ﷺ کے چہرے کو لوگ ڈھانپ دیتے ہوں۔ ایک اور واقعہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے' جس میں لیٹنے کا ذکر نہیں ہے' لیکن چہرے کو ڈھانپنے کا ایک طریقہ نکل آتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک صحابیؓ کہتے ہیں کہ مجھے اسلام لانے سے پہلے یہ معلوم ہوا تھا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ پر وحی آتی ہے۔ پھر اللہ نے مجھے توفیق دی اور میں مسلمان ہوا تو میری تمنا تھی کہ وحی کے نزول کے وقت رسول اللہ ﷺ کو دیکھوں۔ میری اس تمنا سے کچھ اور لوگ بھی واقف تھے۔ اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر میری موجودگی میں یکایک رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہونے لگی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ تم رسول اللہ ﷺ کو نزولِ وحی کی حالت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر تمھاری یہ تمنا برقرار ہے تو آؤ میں تمھیں دکھاؤں۔ تو یہ راوی کہتے ہیں اس وقت رسول اللہ ﷺ ایک پردے کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے' پردے کی دوسری طرف ہم لوگ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پردے کو ذرا کھینچ کر کہا: "اندر دیکھ لو" مَیں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور سانس قدرے زور

زور سے لے رہے ہیں۔ اس کے بعد پھر اس پردے کو کھینچ لیا گیا اور ہم ادب سے بیٹھے رہے۔ چند لمحوں کے بعد وحی کی یہ حالت ختم ہو گئی۔ ان دو واقعات کے سوا' جن میں ایک مرتبہ چہرے پر پردہ ڈالنے کا ذکر اور ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے پردے کے پیچھے بیٹھنے کا ذکر ہے' اور کسی روایت میں ایسی تفصیل نہیں ملتی جو کاہنوں کی حالت اور اس طرح کی چیزوں سے مشابہت رکھتی ہو۔

بہر حال' وحی کیا چیز ہے؟ اس کی تشریح ہمارے لیے ناممکن ہے کیوں کہ وحی ہم میں سے کسی پر نہیں آتی۔ وحی کے وقت رسول اللہ ﷺ کی حالت جیسی ہوتی تھی' اسے ہم مختلف لوگوں کے مشاہدے کے حوالے سے بیان کر سکتے ہیں۔ کچھ مشاہدے تو وہ ہیں جو ئیں نے آپ سے بیان کیے' کچھ یہ ہیں کہ ایک صحابی نے جرأت کر کے ایک مرتبہ براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپ پر جب وحی نازل ہوتی ہے تو اس وقت آپ کیا محسوس کرتے ہیں''؟ وہ جواب بھی دل چسپ ہے' اس جواب کا ذکر کر کے میں اس بحث کو ختم کروں گا۔ رسول ﷺ نے فرمایا کہ بعض اوقات میرے کانوں میں گھنٹی بجتی ہے اور بہت تکلیف کی حالت ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میری جان نکل جائے گی۔ اس وقت میں کچھ آوازیں سنتا ہوں' وہ آوازیں میرے دماغ میں پتھر پر کندہ نقش کی طرح ثبت ہو جاتی ہیں۔ اس حالت کے ختم ہونے کے بعد وہ مجھے ایسے ہی یاد ہوتی ہیں گویا مجھے زبانی یاد تھیں' تو لوگوں کے سامنے دُہراتا ہوں۔ لیکن بعض اوقات کوئی شخص نظر آتا ہے' یا تو آدمی کی شکل میں اور اس وقت وہ آدمی کی طرح مجھ سے بات کرتا ہے۔ بعض اوقات وہ پرندے کی شکل میں ہوتا ہے یعنی ایک ایسا انسان جس کے پر بھی ہوں اور وہ فضا میں اُڑتا رہتا ہے یا کھڑا رہتا ہے اور وہ مجھے مخاطب کر کے کچھ چیزیں کہتا ہے اور مَیں انھیں سنتا ہوں۔ میں بھول نہیں سکتا' وہ میرے حافظہ میں نقش ہو جاتی ہیں اور پھر میں انھیں دُہراتا ہوں۔ یہ رسول اللہ ﷺ کا بیان ہے۔ یہ الفاظ کافی اہم ہیں کہ اتنی شدید تکلیف ہوتی ہے گویا میری جان نکل جائے گی۔ یہ رسول اللہ ﷺ محسوس کرتے تھے۔ اس لیے کوئی حیرت کی بات نہیں کہ آپ کا وزن بھی اتنا زیادہ ہو جاتا تھا کہ کسی اونٹنی کو بھی اس کا تحمل ممکن نہیں ہوتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ خود محسوس کرتے تھے کہ یہ غیر معمولی حالت ہے۔ یہ ہے وحی کی کیفیت اور اس سے زیادہ ہم کوئی اور چیز بیان نہیں کر سکتے۔ یہ خصوصی کیفیت ہے جو اللہ کے نبی ﷺ کو ہوتی ہے اور ہم اسے عام انسانوں کی کیفیتوں اور ڈاکٹروں کے مرض کی تشخیص سے حل نہیں کر سکتے۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

وحی کیا ہے؟

تاریخ کی ابتدا سے انسانوں کے دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے نزدیک کائنات کی حقیقت روحانی ہے' دوسرے کے نزدیک مادّی۔ پہلے کے نزدیک روح مقدم ہے' اور مادّہ اس کا عکس' پَر تو یا ثانوی پیداوار ہے۔ دوسرے کے نزدیک مادّہ مقدم ہے' اور روح مادہ کی ایک لطیف شکل ہے۔ پہلے کے نزدیک روح مادّہ یا جسم سے پہلے وجود رکھتی ہے' اور مادّہ یا جسم کے فنا ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہے۔ دوسرے کے نزدیک مادّہ روح سے پہلے وجود رکھتا ہے اور روح کے فنا ہو جانے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

یہ دونوں گروہ کائنات کی تخلیق کے بارے میں بھی متضاد نظریات رکھتے ہیں۔ پہلا گروہ کائنات کے حادث ہونے کا قائل ہے۔ اس کے نزدیک ایک وقت تھا جب کائنات نہیں تھی' اور ایک وقت ہوگا جب کائنات نہیں رہے گی۔ دوسرے کے نزدیک کائنات قدیم ہے۔ وہ ہمیشہ تھی اور ہمیشہ باقی رہے گی۔

حیات انسانی کے منشا و مقصد کے بارے میں بھی دونوں گروہ متضاد تصورات کے حامل ہیں۔ پہلے کے نزدیک حیاتِ انسانی موت کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا مقصود حیاتِ اُخروی ہے۔ دوسرے کے نزدیک موت' حیات کے سلسلے کو ختم کر دیتی ہے۔ اس لیے اس کا مقصود صرف دنیاوی زندگی ہے۔ غرض کائنات و حیات کے ہر چھوٹے بڑے مسئلے کے متعلق یہ دونوں گروہ متضاد نظریات' تصورات اور رویّے رکھتے ہیں۔ اور تاریخ کے ہر دور میں ایک دوسرے کے مخالف کی حیثیت سے موجود رہے ہیں۔

تاریخ یہ بھی شہادت دیتی ہے کہ ان دونوں گروہوں نے مختلف اَدوار میں اپنے اپنے مذاہب اور نظام ہائے فکر پیدا کیے ہیں۔ دونوں طرف بڑے بڑے اہل حکمت اور مفکّر موجود رہے ہیں۔ اور اپنے اپنے موقف کی حمایت اور دوسروں کی تردید میں لامختتم دلائل پیش کرتے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ تاریخ میں اوّل الذکر گروہ کا پلّہ بھاری رہا ہے۔ نہ صرف اس اعتبار سے کہ ہر دور میں انسانوں کی عظیم اکثریت روحانیئن کے موقف کو تسلیم کرتی آئی ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے بھی کہ عظیم ترین اہل فکر کی بڑی تعداد اوّل الذکر تصور کی حامی رہی ہے۔ گویا عوام اور خواص دونوں بڑے پیمانے پر مادّی نقطۂ نظر کے بجائے روحانی نقطۂ نظر کے قائل رہے ہیں۔ البتہ تاریخ انسانی میں پہلی بار گزشتہ چار سو برس کا عرصہ ایسا آیا ہے' جب مادی نقطۂ نظر ایک غالب فکر کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ اور اپنے ساتھ بے شمار ایسے مسائل کو لے کر آیا ہے' جنھوں نے پوری انسانی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ یقیناً تاریخ اور خود نفس انسانی میں اس کے عمیق محرّکات موجود ہوں گے لیکن ہم انھیں بیان کرنے کی بجائے فکر کی ایک خاص صورت کو بیان کرنا چاہتے ہیں' جو اس دور میں خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔

مذہب کی رُوحانی بنیاد

جو شخص مذہب سے تھوڑا بہت بھی تعلق رکھتا ہے' اسے کسی شبہ کے بغیر معلوم ہے کہ مذہب کی بنیاد روحانی ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب جزوی عقائد میں ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں' لیکن چند بنیادی باتوں پر ہمیشہ متفق رہے ہیں۔ مثلاً روح کی بقا کا عقیدہ تمام مذاہب میں مشترک طور پر موجود رہا ہے۔ یہاں تک کہ بعض ایسے مذاہب بھی' جو خدا کے بارے میں خاموش ہیں' روح کی بقا کے قائل ہیں۔ مثلاً بدھ مذہب۔ یہ ایک انتہائی مثال ہے۔ ورنہ اُلوہیت کا عقیدہ بھی قریب قریب ہر مذہب میں موجود ہے۔ صرف الوہیت ہی نہیں' اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وحدانیت کا عقیدہ بھی مذاہب کا جزوِ اعظم رہا ہے۔ یہاں تک وہ مذاہب بھی جو کثرت پرستی میں مبتلا نظر آتے ہیں' ان میں بھی کسی نہ کسی حد تک توحید کا تصور موجود ہے۔ اور جوں جوں انسانی تحقیق آگے بڑھ رہی ہے۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی جا رہی ہے کہ ان مذاہب کی اصل بنیاد توحید تھی۔ اور کثرت پرستی عقائد کے بگاڑ یا عدم تفہیم سے پیدا ہوئی ہے۔ ایک زمانے میں ثنویت پرستی کو زرتشت سے منسوب کیا جاتا تھا مگر جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ اصل دینِ زرتشتی کی بنیاد بھی توحید پر تھی۔ خیر' میرا منشا مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہیں ہے۔ میں یہاں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ مذاہب تاریخی طور پر روحانی نقطۂ نظر سے وابستہ رہے ہیں' اور تھوڑے بہت اختلافات کے ساتھ روحانی حقائق کی تاکید کرتے رہے ہیں۔ اور اسلام تو چوں کہ ایک مذہب ہی نہیں بلکہ الدین ہے' اس لیے اس کی اساس بھی روحانی ہے۔ آگے چل کر میں بیان کروں گا کہ اس کا میرے موضوع یعنی ''وحی'' سے کیا تعلق ہے۔

اب چوں کہ اسلام کی بنیاد روحانی ہے' اس لیے ہماری پہلی ضرورت یہ ہے کہ اسے مادّی فکر سے الگ کر دیا جائے۔ اور جہاں کہیں اس کی آمیزش نظر آئے اسے کھول دیا جائے۔ یہ ضرورت موجودہ زمانے میں غیر معمولی اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ کیوں کہ آج کل ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا ہے' جو اساسی طور پر مادّی فکر کے حامل ہیں' مگر اپنے تصورات کو واشگاف انداز میں پیش کرنے کے بجائے اسے مذہبی رنگ دے کر

بیان کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اس گروہ کی اس روش کی بنیاد بدنیتی ہے یا کج فہمی یا دونوں کا ملغوبہ۔ بہرحال اگر یہ مخلص ہیں تو ان کے بارے میں جو کم از کم بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دو متضاد قسم کے تصورات کے درمیان فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ اور ایک اندھے کی طرح سیاہ و سفید میں تمیز نہیں کر سکتے۔

یاد رہے کہ یہاں ہمارا موقف مادّی یا رُوحانی تصور میں سے کسی ایک کی حمایت یا مخالفت نہیں ہے۔ بلکہ عملی طور پر یہ جاننا کہ دونوں میں کیا فرق ہے اور یہ کہ ایک کو دوسرے سے ملایا نہیں جا سکتا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو اسلام یا کسی بھی مذہب کے عقائد مطمئن نہیں کر سکتے' تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اسے ترک کر دے۔ اور جو تصورات اسے مطمئن کرتے ہوں انھیں اختیار کر لے لیکن مذہبی جذبہ اور علمی دیانت دونوں کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ سیاہ و سفید کو ایک ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ خدا ایک ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں۔ رسول کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے انھیں کتاب اور شریعت دے کر انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ کتاب و ہدایت کا ذریعہ وحی ہے۔ وحی کے لغوی معنی جو کچھ بھی ہوں' لیکن اصطلاحی معنوں میں یہ خدا کا وہ کلام ہے' جو بالواسطہ یا بلاواسطہ خدا کے پیغمبروں پر نازل ہوتا ہے۔ اس سیدھے سادے عقیدے میں بنفسہٖ کوئی پیچ نہیں ہے' جس کی وضاحت کے لیے کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہو' لیکن ماننے اور نہ ماننے والوں کے نقطۂ نظر سے اس پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ ہم پہلے انکار کے نقطۂ نظر کا جائزہ لیں گے۔

وحی سے انکار کی صورتیں

وحی محمدی ﷺ سے انکار کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی مطلقاً وحی کا منکر ہو۔ یعنی اس بات کو تسلیم نہ کرتا ہو کہ خدا کا کلام کسی بھی صورت انسان پر نازل ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وحی کا قائل ہو' مگر اس بات کا منکر ہو کہ رسول کریم ﷺ پر وحی نازل ہوئی ہے۔ جیسے یہودی اور نصرانی وحی کے قائل ہیں' مگر حضور ﷺ کو نہیں مانتے۔ یا اہلِ ہنود' جو دیوبانی اور الہامی کلام کے معتقد ہیں' مگر قرآن حکیم کو کلام الٰہی تسلیم نہیں کرتے۔ اب چوں کہ یہ لوگ وحی کی حقیقت کے منکر نہیں ہیں' اس لیے ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ موضوع زیر بحث سے ان کا اختلاف اصولی نہیں فروعی ہے۔ بنیادی اختلاف ان کا ہے' جو وحی سے فی نفسہٖ منکر ہیں۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جنھیں ہم مادّیین کہتے ہیں۔ یہ صرف وحی سے انکار نہیں کرتے۔ بلکہ وحی کے منبع ہی کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک خدا نہیں ہے۔ ملائکہ نہیں ہیں۔ تو پھر ظاہر ہے کہ نبوت کی کیا حقیقت ہو سکتی ہے؟ چنانچہ یہ لوگ یا تو وحی کے تصور ہی کو خرافات (نعوذ باللہ) کہہ کر مسترد کر دیتے ہیں۔ یا پھر اس کی نفسیاتی توجیہ کرتے ہیں۔

مثلاً ان میں سے ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ پیغمبر چوں کہ سچے لوگ ہوتے ہیں' اس لیے ان پر جھوٹ کا گمان نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر اپنے تجربہ میں سچا ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس لیے وحی کی حقیقت صرف یہ ہے کہ پیغمبر کی قوت متخیلہ بہت بلند ہوتی ہے اور حد درجہ حساس ہونے کے سبب سے وہ اپنے محسوسات اور خیالات کو مجسّم شکلوں میں دیکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی قوتِ کلام اپنی شدت میں اس کی قوت متخیلہ سے مل کر فرشتے کی شکل اختیار کر لیتی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح مادّیین کا ایک گروہ صرف وحی ہی نہیں' تمام مذہبی تصورات کی ایسی ہی توجیہات پیش کرتا ہے۔ مثلاً خدا باپ کی تخئیلی شکل ہے۔ دوزخ و جنت خواہشات اور کیفیاتِ نفس کی تمثیلیں ہیں۔ حیاتِ آخرت یا رُوح کی بقا کا تصور خواب کی صورتوں سے پیدا ہوا ہے۔

میرا کام چوں کہ مناظرہ بازی نہیں ہے' اس لیے میں ان تصورات کی تردید نہیں کروں گا۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ یہ نقطۂ نظر ان لوگوں کا ہے' جو کائنات کی روحانی بنیاد کے منکر ہیں۔ یہ ایک دنیا ہی الگ ہے جس کے رہنے والے کبھی اہل مذہب یا روحانیین سے نہیں مل سکتے۔ البتہ جب یہ تصورات مذہبی توجیہات کی صورت اختیار کر لیں تو پھر مذہب کے صحیح عقائد کو ان سے الگ کر دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

وحی کی مادّی تعبیر

اس خاص زاویۂ نگاہ سے میری تنقید کا ہدف مسلمانوں کا وہ گروہ ہے' جو مادّی نقطۂ نظر سے مرعوب یا متاثر ہے۔ لیکن اس کا اعلان یا اعتراف نہیں کرتا اور بہ ظاہر مذہب کی تائید کرتے ہوئے مذہبی عقائد و تصورات کی ایسی توجیہات کرتا ہے' جو صرف مادّی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔ مثلاً اہل مذہب کا عقیدہ ہے کہ خدا قادر مطلق ہے' جو اگر چاہے تو مادّہ میں تصرف کر سکتا ہے' اور اس کے احوال و اعمال کو بدل سکتا ہے۔ اس کے برعکس مادئین کا یہ نقطہ نظر ہے کہ مادہ کے اعمال میں تغیر ناممکن ہے۔ یعنی آگ کا کام جلانا ہے' تو یہ نہیں ہو سکتا کہ آگ موجود ہو اور کسی خارجی سبب کے بغیر جلانے سے باز رہے۔ اہل مذہب کے نزدیک قدرت خداوندی سے یہ ممکن ہے اور اسے معجزہ کہتے ہیں۔ اب وہ گروہ' جو مادی نقطہ نظر سے متاثر ہے' پوشیدہ طور پر مادئین کی تائید کرتے ہوئے معجزے کے عقیدے ہی سے انکار کر دیتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اسلام میں اس قسم کے عقیدے کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی طرح معراج کی تاویل یہ ہے کہ ایک تخئیلی واردات تھی۔ ملائکہ سے صاف انکار ممکن نہیں ہے۔ مگر اس کی تعبیر یہ ہے کہ یہ نفس انسانی کی مثبت قوتیں ہیں۔ چنانچہ مذہب کے پردے میں رہتے ہوئے وحی کی مادی تعبیر یہ ہے کہ یہ خود نفس پیغمبر کی ایک کیفیت ہے۔ اس طرح مذہبی اصطلاحوں سے ہیر پھیر کے بعد وہی نتائج نکالے جاتے ہیں جو مادّی نقطۂ نظر کے مطابق ہیں۔

مذہبی عقائد کی یہ تشریح موجودہ زمانہ میں سب سے بڑے فتنے کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ مادئین سے لڑا جا سکتا ہے لیکن مادّہ پرستی کے مذہبی جو فروش تو خود حق کا نام لے کر حق کو مشتبہ کر دیتے ہیں۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ حق اور باطل کو نہ ملاؤ۔ اب چوں کہ یہ آمیزش مذہب کے نام پر ہو رہی ہے' اس لیے اہلِ حق کا سب سے بڑا

کام عقائد کی حفاظت ہے۔

وحی ذریعۂ علم ہے

اب جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے وحی کا وہ تصور، جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، قرآن حکیم کے ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ○﴾

(الشعرا 26: 192تا193)

''یہ ربّ العالمین کی نازل کردہ چیز ہے۔ اسے لے کر تیرے دل پر امانت دار روح اُتری ہے۔''

ان الفاظ پر غور کیجیے تو وحی کی حقیقت بطور ایک ذریعۂ علم سامنے آتی ہے۔ انسانی علم کے تین ذرائع معروف ہیں۔ حواس، عقل اور وجدان۔ وحی نہ حسّی علم ہے، نہ عقلی اور نہ وجدانی۔ کیوں کہ یہ سارے ذرائع ہمیں ایک محدود قسم کا علم دیتے ہیں۔ حواس مجرّد تصورات کا علم حاصل نہیں کر سکتے۔ عقل مجرّد تصورات تک پہنچ سکتی ہے، مگر لطیف وجدانی کیفیات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ وِجدان، صاحب وجدان کی قوت متخیّلہ کا پابند ہوتا ہے۔ لیکن وحی ان تینوں ذرائع علم کے علاوہ ایک چوتھا ذریعۂ علم ہے۔ اس تصور پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وحی کی یہ توجیہ، کہ وہ خود صاحب وحی کی قوّت متخیّلہ کا عمل ہے، باطل ہے۔ کیوں کہ اگر جبریل، صاحب وحی کی قوّت متخیلہ کی پیکر تراشی کا نتیجہ ہے، تو وہ کسی معروضی علم کو فراہم نہیں کر سکتا۔ یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ صاحب وحی اپنی نفسی کیفیات کو بیان کر دے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی ایسی چیز کی خبر دے سکے جو اس کے علم اور تجربے سے باہر ہو۔ معروضی علم صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب جبریل کی حقیقت خود معروضی ہو۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے اہل کتاب اور دوسرے لوگوں نے ایسے سوال کیے، جن کے جواب آپ ﷺ کو معلوم نہیں تھے۔ لیکن حضور ﷺ نے وحی کے ذریعے ان کا جواب دیا۔ وحی جب تک ایک معروضی ذریعۂ علم کی حیثیت سے تسلیم نہ کر لی جائے ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی کے ذریعے آپ کو بہت سی ایسی چیزوں کی خبر دی، جو مستقبل میں ظہور پزیر ہونے والی تھیں۔ مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر فتح مبین کی بشارت دی۔ یا روم کے غلبے کی پیش گوئی۔ ماضی اور حال کے ایسے واقعات کا صحیح علم کسی موضوعی تجربے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے جبریل کی حقیقت معروضی ہے۔ اور وہ نبی کو وہ علم فراہم کرتا ہے، جس کا صدور خود ذات علم سے ہوتا ہے۔ ماضی کے حالات اور مستقبل کے واقعات کے علاوہ وحی سے جو اور حقائق معلوم ہوتے ہیں، وہ سب کے سب حواس، عقل اور وجدان کی حدود سے ماوراہیں۔ مثلاً فرشتوں کا علم نہ حواس سے ہو سکتا ہے، نہ عقل سے، نہ وجدان سے۔ یہ ذرائع علم جنت و دوزخ اور حیات اُخروی کا علم دینے سے بھی یک سر قاصر ہیں۔ چنانچہ ان دلائل کے پیش نظر جبریلؑ کی کوئی اور تاویل، سوائے اس کے کہ ایک باجبروت فرشتہ ہے، جو خدا کی طرف سے علم لے کر صاحب وحی کو پہنچاتا ہے، ممکن نہیں ہے۔

وحی ذریعۂ احکام ہے

وحی علم کا بھی ایک ذریعہ ہے اور احکام کا بھی۔ یہ احکام انسانی زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہیں۔ ان میں وہ احکام بھی ہیں، جو انفرادی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ احکام بھی، جو اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں قوموں کی حیات وموت کے قوانین بھی بیان ہوتے ہیں۔ اور ہیئت اجتماعیہ میں عدل وتوازن کے دستور بھی۔ آپ اِن احکام وقوانین کو بہ نگاہِ غائر دیکھیے اور ان کی جامعیت پر غور کیجیے۔ یہ باہم اس طرح مربوط، اور اپنی وسعت میں اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ زبانِ حال سے خود بشارت دیتے ہیں کہ انہیں کسی ذہن انسانی نے تخلیق نہیں کیا۔ ہمارے سامنے حمورابی کے قوانین بھی ہیں۔ افلاطون کی کتاب جمہوریت بھی ہے رومن لا کی تفصیلات بھی ہمارے سامنے ہیں، اور مہاراجا اشوک کے فرامین بھی۔ غرض کہ ذہنِ انسانی نے اپنے بَل بوتے پر جو کچھ بھی تخلیق کیا ہے، اس کا مقابلہ ان قوانین واحکام سے کیجیے، جو وحی کے ذریعے حاصل ہوئے ہیں، تو ایک غیر متعصب نظر دیکھ لے گی کہ نظم حیات کا یہ دستورِ اعلیٰ خود خالق کائنات کا عطیہ ہے۔ کسی انسان کی تخلیق نہیں۔

وحی ایک معجزہ ہے

وحی کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ کلام کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے۔ اور خود وحیٔ الٰہی نے اسے معجزے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ قرآن حکیم کا رہتی دنیا تک انسانوں اور جنوں کو چیلنج ہے کہ اگر وہ قرآن کے وحیٔ الٰہی ہونے کے منکر ہیں تو سب مل کر اللہ کے سوا اور تمام قوتوں کو مجتمع کر کے قرآن کی مثل ایک سُورت ہی پیدا کر کے دکھائیں۔ اب تک اس چیلنج کا جواب ممکن نہیں ہوا۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔

وحی کی ان تین حیثیتوں پر اس مختصر سی گفتگو سے جو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں، ان میں سب سے پہلی یہ ہے کہ ہم نے عقیدے کی حقیقت نہیں بیان کی ہے بلکہ عقیدے کے مضمرات کو ظاہر کیا ہے۔ کسی عقیدے پر ایمان رکھنے کے لیے ہمیں اس کی حقیقت کو جاننا ضروری بھی نہیں۔ ایمان کے لیے صرف یہ کافی ہے کہ عقیدے کو جوں کا توں تسلیم کیا جائے۔ اور اس کے نتائج کو تسلیم کر لیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وحی کا جبریل کے ذریعہ نبی ﷺ کے قلب پر نازل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ ذریعۂ علم معروضی ہے۔ وحی کے ذریعہ نبی ﷺ کے حواسی، عقلی، وجدانی، تخیلی علم کا انکشاف نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ علم حاصل ہوتا ہے جو قطعی غیر شخصی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ وحی کے ذریعے جو ''غیر شخصی'' علم حاصل ہوتا ہے وہ وحی کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اس علم کو مان کر ہی انسان ہدایت حاصل کر سکتا ہے۔ نفسیاتی نظریے چوں کہ عقیدۂ وحی کے ان تینوں پہلوؤں کا احاطہ نہیں کر سکتے اس لیے نفسیاتی نظریات اس کی تشریح کے ناقابل ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ بات صرف ''مادّی'' نفسیات کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔ ''روحانی'' نفسیات ان سارے حقائق کی تشریح کر سکتی ہے۔ لیکن وہ اس وقت میرے موضوع سے خارج ہے۔　(تحریر: سلیم احمد)

وحی محمدیؐ اور کیفیت نزول

انبیا علیہم السلام کو جو خصوصیات عام انسانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ان میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔اس مکالمۂ الٰہی کی متعدد صورتیں ہیں۔اور ان میں سے ایک وحی ہے۔لغت عرب میں وحی کے معنی اشارہ کرنا' لکھنا' پیغام دینا' دل میں ڈالنا' چھپا کر بولنا اور دوسرے کے خیال میں اپنا خیال ڈالنا ہے۔لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصلی معنی ''دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں۔''

قرآن مجید میں یہ لفظ اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے: فطری حکم' جیسے ''تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں کو وحی کیا۔'' اور ''اس لیے کہ تیرے پروردگار نے زمین کو وحی کیا۔'' دل میں بات ڈالنا' جیسے ''اور جب مَیں نے حواریوں کو حکم کیا کہ مجھ پر اور میرے پیغمبر پر ایمان لاؤ۔'' اور ''ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کیا کہ اس بچے کو دودھ پلاؤ۔'' چپکے چپکے بات کرنا' جیسے ''یہ ایک دوسرے کو چکنی چپڑی بات وحی کرتے ہیں۔'' اور ''یہ شیطان لوگ اپنے دوستوں کو وحی کرتے ہیں۔''

وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے' اور وہ یہ ہے کہ ''منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا۔یا اگر الفاظ ہوں تو وہ اس قدر پوشیدہ ادا ہوں کہ دوسرے انھیں نہ سن سکیں۔'' اس لیے اشارہ کرنا' لکھنا' دل میں ڈال دینا' فطری حکم' خط کتابت' اور جانوروں کا اپنی حرکات سے اپنا مطلب ظاہر کرنا' سب اس کے معنوں میں داخل ہیں۔

احادیث نبوی میں نزول وحی کی اور صورتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔اور انھی کے پیش نظر حافظ ابن قیم نے وحی محمدی ﷺ کی یہ سات قسمیں قرار دی ہیں:

۱۔رویائے صلصلۃ' یعنی سچے خواب دیکھنا۔۲۔نفث فی الروع یا القاء فی القلب یعنی دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا۔۳۔صلصلۃ الجرس' یعنی گھنٹی کی طرح آواز آنا۔۴۔تمثیل یعنی فرشتے کا کسی شکل میں متشکل ہو کر نظر آنا۔۵۔فرشتے کا اپنی اصلی صورت میں نمودار ہونا۔۶۔وہ طریق مکالمہ جو معراج میں پیش آیا۔۷۔بلا واسطہ مکالمہ

آنحضرت ﷺ کے مکالمۂ الٰہی اور وحی کا آغاز رویا اور خواب سے ہوا۔صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔

((اوّل مابُدءَ بہٖ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ السلام وسلّم من الوحی الرؤیا الصالحۃ فی النوم فکان لایری رؤیا الا جائت مثل فلق الصبح۔)) (باب بدء الوحی)

''آنحضرت ﷺ کے ساتھ وحی کا آغاز اچھے خواب سے ہوا۔آپ ﷺ جو خواب دیکھتے' وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہوتا تھا۔''

وحی کی دوسری قسم متعدد حدیثوں میں یوں آئی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''روح القدس نے میرے دل میں یہ ڈالا ہے کہ کوئی انسان اس وقت تک نہیں مرسکتا' جب تک وہ اپنی روزی پوری نہ کرے۔تو لوگو! خدا سے ڈرو اور روزی کی تلاش میں صحیح طریقے اختیار کرو۔کیوں کہ جو خدا کے پاس ہے وہ اس کی بندگی ہی سے مل سکتا ہے۔''

وحی کی تیسری صورت یعنی گھنٹی کی سی آواز کا سنائی دینا' اس کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ صورت مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔صحیح بخاری کے پہلے ہی باب میں حدیث ہے کہ ایک صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ! آپ ﷺ پر وحی کیوں کر آتی ہے؟ آپ نے فرمایا؟

((احیانا یاتینی مثل صلصلۃ الجرس و ھوا شدّہ' علیٰ' فیفصم عنّی' وقد وعیت عنہ ماقال واحیانًا یتمثل لی الملک رجلًا' فیکلمنی' فاعی مایقول۔))

''کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح میرے پاس آتی ہے' اور یہ مجھ پر زیادہ سخت ہوتی ہے۔پھر یہ حالت دور ہو جاتی ہے' اور جو کچھ وہ کہتا ہے مَیں اسے محفوظ کر لیتا ہوں۔اور کبھی وہ فرشتہ (جبریل) میرے لیے انسان کی شکل میں نمودار ہوتا ہے' اور وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے' اور جو وہ کہتا ہے' اسے میں محفوظ کر لیتا ہوں۔'' (باب بدٔ الوحی)

صلصلۃ الجرس یعنی گھنٹی کی سی آواز کی تشریح متکلمین اور ارباب باطن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔لیکن اس کا صاف اور صریح مطلب یہ ہے جو عوام ''ہاتف غیب'' یا ''منادیٔ غیب'' کے لفظ سے لیتے ہیں۔یعنی یہ کہ آواز سنائی دے' لیکن کوئی صورت نظر نہ آئے۔بانگ جرس کے ساتھ اس کی تشبیہ محض اس بات میں ہے کہ جس طرح دُور سے جرس کی آواز سنائی دیتی ہے اور اس کے متعینہ اشاروں سے انسان کچھ سمجھ جاتا ہے' حالانکہ جرس یا اس کے بجانے والے کی شکل آنکھوں سے اوجھل یا بہت دُور ہوتی ہے' اسی طرح پیغمبر کبھی دُور سے منادیٔ غیب کی آواز سنتا

ہے' لیکن کوئی مجسم شکل اس کے سامنے نہیں ہوتی۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوتا ہے' اس صورت میں جب وحی نازل ہوتی تھی' تو آپ ﷺ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''وحی اترنے کی حالت میں میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی۔ تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبینِ مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی۔'' (بخاری' بدء الوحی)

ایک اور موقع پر حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں: ''وحی کی حالت میں آپ ﷺ پر شدت کی جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ ہوئی' اور وحی کے بوجھ سے جاڑوں میں آپ ﷺ کی پیشانی سے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے ڈھلکنے لگے۔'' (بخاری' واقعہ افک) صحابہؓ کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسم مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا' سواری کے اونٹ بیٹھ بیٹھ جاتے تھے۔ (مسند ابن حنبل بہ سند عائشہ و مستدرک حاکم تفسیر سورۂ مزمل)

حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں۔ ''ایک دفعہ آپ ﷺ پر وحی آئی' اور میرا پاؤں زانوئے مبارک کے نیچے دبا تھا' مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پاؤں بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔'' (بخاری' کتاب الحج وباب کیف نزل الوحی) یعلیٰؓ بن امیہ ایک صحابی تھے۔ انھیں بڑا شوق تھا کہ کبھی نزولِ وحی کے عالم میں آپ ﷺ کی زیارت کریں۔ اتفاق سے حج کے سفر میں انھیں یہ سعادت نصیب ہو گئی۔ وہ کہتے ہیں: ''میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا ہے' اور آپ ﷺ خراٹے لے رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ حالت رفع ہو گئی۔'' (مسلم' باب عرق النبی ﷺ) سلطنت بنانے والا ظاہر ہونا چاہیے تھا' یا ظاہر ہو سکتا تھا۔ مگر ہیگلی یا مارکسی فلسفہ اس واقعے کی توجیہ کیوں کر کرے گا اس وقت اس ماحول میں ایسا شخص پیدا ہوا جو بہترین اخلاق سکھانے والا' انسانیت کو سنوارنے اور نفوس کا تزکیہ کرنے والا اور جاہلیت کے اوہام و تعصبات کو مٹانے والا تھا۔ جس کی نظر قوم اور نسل اور ملک کی حدیں توڑ کر پوری انسانیت میں پھیل گئی۔ جس نے اپنی قوم کے لیے نہیں' بلکہ عالم انسانی کے لیے ایک اخلاقی' روحانی' تمدنی اور سیاسی نظام کی بنیاد ڈالی جس نے معاشی معاملات اور سیاست اور بین الاقوامی تعلقات کو عالم خیال میں نہیں بلکہ عالم واقعہ میں اخلاقی بنیادوں پر قائم کر کے دکھایا اور روحانیت اور مادیت کی ایسی معتدل اور متوازن آمیزش کی جو آج بھی حکمت و دانائی کا ویسا ہی شاہ کار ہے جیسا اس وقت تھا۔ کیا ایسے شخص کو تم عرب جاہلیت کی پیداوار کہہ سکتے ہو؟

یہی نہیں کہ وہ شخص اپنے ماحول کی پیداوار نظر نہیں آتا' بلکہ جب ہم اس کے کارنامے پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے' اس کی نظر وقت اور حالات کی بندشوں کو توڑتی ہوئی صدیوں اور ہزاروں MILLENNIA کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ وہ انسان کو ہر زمانے اور ہر ماحول میں دیکھتا ہے اور اس کی زندگی کے لیے ایسی اخلاقی اور عملی ہدایات دیتا ہے کہ جو ہر حال میں یکساں مناسبت کے ساتھ ٹھیک بیٹھتی ہیں۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنھیں تاریخ نے پرانا کر دیا ہے' جن کی تعریف ہم صرف اس حیثیت سے کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے اچھے راہ نُما تھے۔ سب سے الگ اور سب سے ممتاز' وہ انسانیت کا ایسا راہ نُما ہے جو تاریخ کے ساتھ حرکت MARCH کرتا ہے اور ہر دور میں ویسا ہی جدید MODERN نظر آتا ہے جیسا اس سے پہلے دور کے لیے تھا۔ تم جن لوگوں کو فیاضی کے ساتھ ''تاریخ بنانے والے'' HISTORY MAKERS کا لقب دیتے ہو' وہ حقیقت میں تاریخ کے بنائے ہوئے CREATURES OF HISTORY ہیں۔ دراصل تاریخ بنانے والا پوری انسانی تاریخ میں صرف یہی ایک شخص ہے۔ دنیا کے لیے جتنے لیڈروں نے تاریخ میں انقلاب برپا کیے ہیں' ان کے حالات پر تحقیقی نگاہ ڈالو۔ تم دیکھو گے کہ ہر ایسے موقع پر پہلے سے انقلاب کے اسباب پیدا ہو رہے تھے' اور وہ اسباب خود ہی اس انقلاب کا رخ اور راستہ بھی معیّن کر رہے تھے جس کے برپا ہونے کے وہ مقتضی تھے۔ انقلابی لیڈر نے صرف اتنا کیا کہ حالات کے اقتضا کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے اس ایکٹر کا پارٹ ادا کر دیا' جس کے لیے اسٹیج اور کام دونوں پہلے سے معیّن ہوں۔ مگر تاریخ بنانے والوں یا انقلاب برپا کرنے والوں کی پوری جماعت میں یہ اکیلا ایسا شخص ہے کہ جہاں انقلاب کے اسباب موجود نہ تھے' وہاں اس نے خود اسباب کو پیدا کر دیا۔ جہاں انقلاب کا مواد موجود نہ تھا' وہاں اس نے خود مواد تیار کیا۔ جہاں اس انقلاب کی اسپرٹ اور عملی استعداد لوگوں میں نہ پائی جاتی تھی' وہاں خود اس نے اپنے مطلب کے آدمی تیار کیے' اپنی زبردست شخصیت کو پگھلا کر ہزار ہا انسانوں کے قالب میں اُتار دیا اور انھیں ویسا بنایا جیسا وہ بنانا چاہتا تھا۔ اس کی طاقت اور قوت ارادی نے خود ہی انقلاب کا سامان پیدا کیا۔ خود ہی اس کی صورت اور نوعیت معیّن کی اور خود ہی اپنے ارادے کے زور سے حالات کی رفتار کو موڑ کر اس راستہ پر چلایا' جس پر وہ اسے چلانا چاہتا تھا۔ اس شان کا تاریخ ساز اور اس مرتبے کا انقلاب انگیز تمھیں اور کہاں نظر آتا ہے؟

آیئے اب اس سوال پر غور کیجیے کہ چودہ سو برس پہلے کی تاریک دنیا میں عرب جیسے تاریک تر ملک کے ایک گوشے میں ایک گلّہ بانی' سوداگری کرنے والے ان پڑھ بادیہ نشین کے اندر یکایک اتنا علم' اتنی روشنی' اتنی طاقت' اتنے کمالات' اتنی زبردست تربیت یافتہ قوتیں پیدا ہو جانے کا کون سا ذریعہ تھا؟ آپ کہتے ہیں یہ سب اس کے دل و دماغ کی پیداوار تھی۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ اسی کے دل و دماغ کی پیداوار تھی تو اسے خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے تھا اور اگر وہ ایسا دعویٰ کرتا تو وہ دنیا جس نے رام کو خدا بنا ڈالا' جس نے کرشن کو بھگوان قرار دینے میں تامل نہ کیا' جس نے بودھ کو خود بخود خدا بنا

لیا' جس نے مسیح کو اپنی مرضی سے ابن اللہ مان لیا' جس نے آگ' پانی اور ہوا تک کو پُوج ڈالا' وہ ایسے زبردست باکمال شخص کو خدا مان لینے سے کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر دیکھو' وہ خود کیا کہہ رہا ہے وہ اپنے کمالات سے ایک کا کریڈٹ بھی خود نہیں لیتا۔ کہتا ہے:

میں ایک انسان ہوں' تم جیسا انسان' میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں۔ سب کچھ خدا کا ہے' اور خدا ہی کی طرف سے ہے۔ یہ کلام جس کی نظیر لانے سے تمام نوع انسانی عاجز ہے' میرا کلام نہیں ہے' میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے' لفظ بہ لفظ خدا کی طرف سے میرے پاس آیا ہے اور اس کی تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔ یہ کارنامے جو مَیں نے دکھائے' یہ قوانین جو مَیں نے وضع کیے' یہ اصول جو مَیں نے تمھیں سکھائے ہیں' ان میں سے کوئی چیز بھی مَیں نے نہیں گھڑی ہے۔ میں کچھ بھی اپنی ذاتی قابلیت سے پیش کرنے پر قادر نہیں ہوں۔ ہر ہر چیز میں خدا کی راہ نُمائی کا محتاج ہوں۔ اِدھر سے جو اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور وہی کہتا ہوں۔

دیکھو یہ کیسی حیرت انگیز صداقت ہے! کیسی امانت اور راست بازی ہے! جھوٹا انسان تو بڑا بننے کے لیے دوسروں کے ایسے کمالات کا کریڈٹ لے لینے میں بھی تامّل نہیں کرتا' جن کے اصل ماخذ کا پتا آسانی چل جاتا ہے' لیکن یہ شخص ان کمالات کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا' جنھیں وہ اپنے کمالات کہتا تو کوئی اسے جھٹلا نہ سکتا تھا' کیوں کہ کسی کے پاس اس کے اصل ماخذ تک پہنچنے کا ذریعہ ہی نہیں۔ سچائی کی اس سے زیادہ کھلی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس شخص سے زیادہ اور کون سچا ہوگا جسے ایک نہایت مخفی ذریعے سے ایسے بے نظیر کمالات حاصل ہوں' اور وہ بلا تکلف اپنے اصلی ماخذ کا حوالہ دے دے؟ بتاؤ! کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟

امرِ عظیم

ابوجہل نے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کو بہ حالت نماز قتل کرنے کی نیت سے پتھر اُٹھایا۔ اللہ نے اس پر ہیبت طاری کر دی۔ اس کے ہاتھ شل ہو گئے۔ ساتھیوں کے پاس ناکام لَوٹ گیا۔ انھوں نے حال دریافت کیا تو اس نے اپنی کیفیت بیان کی۔ اس پر زعمائے قریش میں سے نضر بن حارث نے اٹھ کر یہ تقریر کی:

اے گروہ قریش! تمھارے اوپر ایک ایسا معاملہ آپڑا ہے کہ آگے چل کر اس کے خلاف تمھاری کوئی تدبیر کارگر نہ ہوگی۔ محمد ﷺ تمھارے درمیان ایک نوعمر لڑکا تھا۔ تم میں سب سے بڑھ کر راست گو' تم میں سب سے بڑھ کر امانت دار' یہاں تک کہ اس کی کنپٹیوں میں سفید بال آ گئے۔ وہ تمھارے لیے ایک پیغام لایا ہے' تو تم نے اسے جادوگر بنا دیا' نہیں' واللہ وہ جادوگر نہیں ہے۔ ہم نے جادوگروں کے جنتر منتر دیکھے ہوئے ہیں۔ تم کہتے ہو وہ کاہن ہے! نہیں خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کی کہانت دیکھی ہے۔ تم کہتے ہو وہ شاعر ہے! نہیں' خدا کی قسم وہ شاعر نہیں ہے۔ ہم نے شعر دیکھے ہیں' اور جملہ اصناف شعر کو جانتے ہیں۔ تم کہتے ہو وہ دیوانہ ہے! نہیں خدا کی قسم وہ دیوانہ نہیں ہے۔ ہم نے دیوانگی خوب دیکھی ہوئی ہے۔ نہ وہ اختناقی حالت اور نہ دیوانگی کی بے سروپا گفتگو۔

اے گروہ قریش! اپنے مؤقف پر غور کرو' کیوں کہ قسم ہے خدا کی تمھارے سامنے ایک امر عظیم آچکا ہے۔'' (سیرت ابنِ ہشام)

ختم نبوت

آنحضرت ﷺ پر ہر قسم کی نبوت اور وحی کا اختتام ہو گیا۔ آپ ﷺ آخری نبی اور رسول ہیں۔

اسلام کے بدیہی عقائد سے مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی ہمیشہ واقف رہے ہیں۔ اور چودہ سو برس کی تاریخ میں یہ بحث کبھی نہیں پیدا ہوئی کہ نبوت کی بھی کچھ قسمیں ہوتی ہیں' اور ان میں سے کوئی خاص قسم نبی آخرالزماں ﷺ کے بعد بھی باقی ہے۔ نبوت کی تشریعی و غیر تشریعی' ظلّی و بروزی یا مجازی اور لغوی اقسام کا نہ قرآن و حدیث میں کوئی اشارہ تک ملتا ہے' نہ علمائے امت ان سے واقف تھے۔ البتہ اس دور میں تعلیمات اسلامی سے عام غفلت اور جہالت نے اور فتنوں کی طرح اس فتنے کا در بھی وا کیا۔ سب سے پہلے باب اور بہا کے فرقے نے اس مسئلے میں اجماع امت سے اختلاف کیا۔ مگر وہ بھی اسے علمی رنگ نہ دے سکا۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی نے بحث کا دروازہ کھولا۔ مگر اس بحث میں بھی اس قدر الجھاؤ اور تضاد کی کارفرمائی ہے کہ خود ان کے ماننے والے بھی تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقہ انھیں صاحب شریعت نبی اور رسول مانتا ہے۔ یہ ظہیر الدین اروپی کا فرقہ ہے۔ دوسرا انھیں غیر تشریعی نبی کہتا ہے۔ یہ قادیانی پارٹی ہے' جس کا مرکز اب ربوہ میں ہے۔ تیسرا فرقہ مرزا صاحب کو رسول نہیں بلکہ مسیح موعود یا مہدیٔ موعود قرار دیتا ہے۔ یہ لاہوری پارٹی ہے۔

قادیانی مغالطے

حقیقت میں مرزا صاحب کے دعوائے نبوت میں ایک تدریجی ارتقا ہے۔ ابتدا میں ان کا عقیدہ جمہور اہل سنت کے مطابق کی آواز سنتا ہے' لیکن کوئی مجسم شکل اس کے سامنے ہوتی۔ جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث سے معلوم ہوتا ہے' اس صورت میں جب وحی نازل ہوتی تھی' تو آپ ﷺ پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''وحی اترنے کی حالت میں مَیں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی' تو سخت سردی کے دنوں میں بھی جبین مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی۔'' (بخاری' بدء الوحی)

ایک اور موقع پر حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں' وحی کی حالت میں آپ ﷺ پر شدت کی جو کیفیت طاری ہوتی تھی وہ ہوئی اور وحی کے بوجھ سے جاڑوں میں آپ

ﷺ کی پیشانی سے موتیوں کی طرح پسینے کے قطرے ڈھلکنے لگے۔'' (بخاری' واقعہ افک) صحابہؓ کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسم مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا' سواری کے اونٹ بیٹھ بیٹھ جاتے تھے۔ (مسند ابن حنبل بہ سند عائشہ و مستدرک حاکم تفسیر سورۂ مزمل)

حضرت زیدؓ بن ثابت کہتے ہیں۔ ''ایک دفعہ آپ ﷺ پر وحی آئی' اور میرا پاؤں زانوئے مبارک کے نیچے دبا تھا' مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا پاؤں بوجھ سے ٹوٹ جائے گا۔'' (بخاری' کتاب الحج و باب کیف نزل الوحی) یعلیٰ بن امیہ ایک صحابی تھے۔ انھیں بڑا شوق تھا کہ کبھی نزولِ وحی کے عالم میں آپ ﷺ کی زیارت کریں۔ اتفاق سے حج کے سفر میں انھیں یہ سعادت نصیب ہوگئی۔ وہ کہتے ہیں۔ ''مَیں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کا چہرہ سرخ ہوگیا ہے' اور آپ ﷺ خراٹے لے رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ حالت رفع ہوگئی۔'' (مسلم' باب عرق النبی ﷺ)

وحی کی چوتھی صورت وہ تھی کہ فرشتہ اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوتا تھا۔ جبریل علیہ السلام اس طریقے سے پہلی وحی غارِ حرا میں لے کر آئے۔ اس وقت عمر شریف چالیس برس کی تھی اور اقراء باسم ربك الذی خلق کی ابتدائی آیات اس مکتب کا اوّلین درس تھا۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک وحی کا سلسلہ رکا رہا' آپ ﷺ کو سخت صدمہ ہوا۔ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی یعنی سلسلۂ وحی کے رک جانے کے بعد سورۂ مدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔ اس زمانے میں آپ ﷺ بدستور غارِ حرا میں جاتے رہے۔ اسی اثنا میں ایک دن آپ ﷺ غارِ حرا سے نکل کر اور پہاڑی سے نیچے اُتر کر جب میدان میں پہنچے تو غیب سے آواز آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مَیں نے آگے پیچھے' دائیں بائیں دیکھا پھر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو پہلے غارِ حرا میں نظر آیا تھا۔ آسمان اور زمین کے بیچ میں تخت پر بیٹھا ہے۔ میں مرعوب ہو کر گھر واپس آ گیا'' آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کے پاس آئے تو کہا'' مجھے کمبل اوڑھا دو اور مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔'' اسی حالت میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ﴾ (المدثر 74: 1تا3)

''اے گلیم پوش! اٹھ اور لوگوں کو خدا سے ڈرا۔ اور اپنے ربّ کی کبریائی بیان کرو۔''

اس کے بعد حضرت جبریلؑ کی پے در پے آمد شروع ہوئی۔ بارگاہ نبوی میں ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ صبح شام' روز و شب' صلح و جنگ' ہر وقت فیضان الٰہی کا چشمہ ابلتا رہتا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ نصف شب کو سوتے سے اٹھ کر بقیع کے قبرستان میں تشریف لے گئے۔ صبح کو آپ ﷺ نے فرمایا ''رات جبریلؑ نے مجھے پیغام دیا کہ میں اسی وقت بقیع میں جا کر لوگوں کی مغفرت کے لیے دعا مانگوں۔'' (نسائی' باب الاستغفار للمومنین)

غزوۂ بدر میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''جبریلؑ اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں۔'' (صحیح بخاری' غزوۂ بدر) غزوۂ خندق سے جب آنحضرت ﷺ مسلمانوں کی فوج لے کر واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا۔ جبریلؑ نے سامنے آ کر کہا کہ آپ ﷺ نے ہتھیار کھول دیئے۔ حالانکہ ہم اب تک مسلح ہیں' اور بنو قریظہ کو بھی ان کی غداری کا صلہ دینا ہے۔ (صحیح بخاری' غزوۂ خندق)

جبریل علیہ السلام سب سے زیادہ ماہِ رمضان میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ وہ ہر روز آپ ﷺ سے قرآن مجید سنتے تھے' اور خود آپ ﷺ کو سناتے تھے۔ (صحیح بخاری' باب بدأ الوحی) جبریلؑ اس وقت بھی آتے تھے' جب آپ ﷺ لوگوں کے مجمع میں بیٹھے ہوتے تھے لیکن جو کچھ آپ ﷺ دیکھتے اور سنتے تھے وہ عموماً دوسروں کو دکھائی اور سنائی نہ دیتا تھا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ حضرت عائشہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے عائشہ! جبریلؑ تم پر سلام بھیجتے ہیں۔'' انھوں نے کہا: ''یارسول اللہ! آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی'' (بخاری' باب بدأ الخلق)

وحی کی پانچویں صورت وہ تھی کہ جبریلؑ کسی انسان کی شکل اختیار کر کے آتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ لوگوں کے ساتھ باہر بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آپ ﷺ کے پاس آ کر بیٹھا' اس نے سوال کیا'' ایمان کیا ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ خدا پر' اس کے فرشتوں' پر' خدا سے ملنے پر' اور اس کے پیغمبروں پر' اور قبر سے پھر جی اٹھنے پر تم یقین رکھو۔'' اس نے پھر پوچھا: ''اسلام کیا ہے؟'' جواب دیا: ''یہ کہ تم خدا کی اطاعت کرو' اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ' اور نماز پڑھو' زکوٰۃ مفروضہ دو اور روزے رکھو۔'' اس نے کہا'' اور احسان کیا ہے۔'' ارشاد ہوا: ''احسان یہ ہے کہ تم خدا کی اس طرح پرستش کرو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ کیوں کہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے۔'' اس نے پھر سوال کیا: ''قیامت کب آئے گی؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجیب اس باب میں سائل سے زیادہ واقف نہیں۔ البتہ میں تمھیں اس کی علامتیں بتاتا ہوں۔ جب لونڈی اپنے آقا کو جنے' اور جب اونٹوں کے چرانے والے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں' قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں سے ہے' جنھیں خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا'' پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ان اللہ عندہٗ علم الساعۃ (قیامت کا علم خدا ہی کو ہے) وہ شخص اس کے بعد اٹھ کر چلا گیا تو آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اسے ذرا واپس بلاؤ۔ لوگوں نے ادھر ادھر دیکھا تو نظر نہ آیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا'' یہ جبریلؑ تھے' جو تمھیں تمھارا دین سکھانے آئے تھے۔''

(بخاری' باب الایمان)

صحابہ کرامؓ میں دِحیہ نامی ایک صحابی بہت حسین تھے۔ جبریلؑ اکثر انھی کی صورت

میں مجسم ہو کر آیا کرتے تھے اور اس حالت میں کبھی کبھی لوگوں کو نظر بھی آ جاتے تھے۔
حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ دحیہؓ آپ ﷺ کے سامنے بیٹھے آپ ﷺ سے باتیں کر رہے ہیں، مجھے کچھ بھی شک نہ ہوا کہ یہ دحیہؓ نہیں ہیں۔ اتنے میں مسجد نبوی میں میں نے آپ ﷺ کے خطبے کی آواز سنی، آپ ﷺ فرما رہے تھے کہ ابھی میرے پاس جبریلؑ آئے، تب میں سمجھی کہ وہ اصل میں دحیہؓ نہیں بلکہ جبریلؑ تھے۔ (بخاری، کیف نزل الوحی)

وحی محمدی کی آخری دو صورتیں ذات الٰہی سے براہ راست مکالمے کی تھیں۔ ان میں سے ایک وہ تھی جس کی تفصیل معراج کے واقعات میں بیان کی گئی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی متعدد حدیثوں سے براہ راست مکالمہ ثابت ہے۔ ان تمام ذرائع سے سرمایۂ وحی کی جو دولت اسلام کو ہاتھ آئی، وہ قرآن کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں اور سفینوں میں اب تک محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ گنج گراں مایہ حدیث صحیحہ کے اوراق میں مخزون ہے۔ حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے قرآن عطا کیا گیا اور اتنا ہی اور۔'' (ابوداؤد، کتاب السنۃ) یعنی وہ احکام اور مواعظ جنھیں جاں نثاروں نے حرز جاں بنا کر رکھا اور دوسروں کے سپرد کیا۔ یعلیٰ بن امیہ حجۃ الوداع کے زمانے کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ﷺ جعرانہ میں تھے۔ ایک شخص نے آ کر سوال کیا ''یارسول اللہ! اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں، جس نے کپڑے میں خوش بو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی؟'' آنحضرت ﷺ نے کسی قدر انتظار کیا، آپ ﷺ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ جب وہ کیفیت زائل ہوئی، تو آپ ﷺ نے دریافت فرمایا کہ وہ آدمی کہاں گیا۔ اسے سامنے لائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم خوش بو تو مل چکے ہو، اسے تین دفعہ دھو ڈالو اور اس کپڑے کو اتار ڈالو پھر حسب معمول عمرہ ادا کرو۔''

اور بہت سی احادیث ہیں جن میں یہ تصریح ہے کہ ''خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے'' یا خدا نے مجھ سے یہ کہا'' لیکن وہ قرآن مجید کے اجزا نہیں ہیں۔ اسی لیے فقہا نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں۔ ایک وحی متلوٗ یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے، یعنی قرآن۔ اور دوسرے وحی غیر متلوٗ یعنی جو تلاوت نہیں کی جاتی۔ مثلاً وہ احکام ونصائح جو بہ روایت صحیح احادیث میں مذکور ہیں۔ پہلی وحی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک حرف تواتر روایت سے ثابت ہے اور وہ اپنے لفظ و معنی دونوں کے لحاظ سے اللہ کا کلام ہے۔ دوسری قسم تواتر سے بہت کم مروی ہے، اور وہ اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ معنی کے لحاظ سے اللہ کا ارشاد ہے۔

(اعجاز احمد فاروقی)

مراجع

۱: منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین — مولانا سیّد ابوالحسن ندوی
۲: نبوت اور وحی — ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن
۳: الوحی المحمدیؐ — سیّد محمد خورشید رضا مصری، ترجمہ: سیّد رشید احمد ارشد
۴: حقیقت وحی — شیخ الہند مولانا محمود الحسن
۵: انسائیکلوپیڈیا آف سیرۃ (انگریزی) — جلد چہارم
۶: اُردو دائرہ معارف اسلامیہ — جلد ۲۱، عنوان ''وحی''

دوسری کتاب:

نبوت کا ارتقاء

ختم نبوت

مبشرات

نبوت محمدیؐ

انبیائے سابقہ

نبوت کا اِرتقاء

قرآنِ مجید کی سورۂ فاطر کی آیت 24 میں آیا ہے کہ دنیا میں کوئی قوم اور بستی ایسی نہیں ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اپنا نبی اور رسول نہ بھیجا ہو۔ قرآن مجید نے بعض انبیا کا ذکر نام لے کر کیا ہے اور بہت سے انبیا ایسے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ بعض انبیا کے متعلق اشارات ملتے ہیں۔ قرآن مجید میں جن انبیائے کرام کا ذکر آیا ہے' ان کے نام یہ ہیں:

حضرت آدم علیہ السلام' حضرت نوح علیہ السلام' حضرت ہود علیہ السلام' حضرت صالح علیہ السلام' حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت لوط علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام' حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت شعیب علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت ادریس علیہ السلام' حضرت یوسف علیہ السلام' حضرت موسیٰ علیہ السلام' حضرت ہارون علیہ السلام' حضرت داؤد علیہ السلام' حضرت سلیمان علیہ السلام' حضرت زکریا علیہ السلام' حضرت یحییٰ علیہ السلام' حضرت یونس علیہ السلام' حضرت ایوب علیہ السلام' حضرت الیاس علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ۔

حضرت آدمؑ

نبوت کی تاریخ میں پہلا نام حضرت آدم علیہ السلام کا آتا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کا نام مندرجہ ذیل نو سورتوں میں پچیس آیات میں پچیس مرتبہ آیا ہے:

سورۂ بقرہ: آیات 37'35'34'33'31
سورۂ آلِ عمران: آیات 59'33
سورۂ المائدہ: آیت 27
سورۂ الاعراف: آیات 172'35'31'27'26'19'11
سورۂ الاسرا: آیت 70'61
سورۂ الکہف: آیت 50
سورۂ مریم: آیت 58
سورۂ طٰہٰ: آیت 121'120'117'116'115
سورۂ یٰسٓ: آیت 60

کیفیت یہ ہے کہ قصۂ آدمؑ ان پچیس آیات میں بکھرا ہوا ہے۔ یہاں ان تمام اجزا کو ایک منطقی ترتیب سے مربوط کر لیا گیا ہے تا کہ قصے کا معنوی تسلسل قائم ہو جائے۔ یہ آیات کا خلاصہ نہیں بلکہ مکمل ترجمہ ہے:

خلافت آدم یا خلیفۃ اللہ فی الارض

''پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

فرشتوں نے عرض کیا: ''کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس میں فساد کرے اور خوں ریزی کرے؟ آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کے لیے تقدیس تو ہم کر ہی رہے ہیں''

فرمایا: ''جو کچھ میں جانتا ہوں' وہ تم نہیں جانتے'' (سورۂ بقرہ آیت 30)

مزید فرمایا: ''میں گارے' مٹی اور بدبودار کیچڑ سے ایک بشر پیدا کر رہا ہوں' جب میں اسے پورا بنا چکوں' اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا'' (سورۂ حجر 29'28۔ سورۂ ص 72'71)

علم و حکمت

اس کے بعد اللہ نے آدم کو ساری چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر انھیں فرشتوں کے سامنے لایا اور فرمایا: ''اگر تمھارا خیال صحیح ہے (کہ کسی کے خلیفہ مقرر کرنے سے زمین پر فتنہ پھیلے گا) تو ذرا ان چیزوں کے نام بتاؤ''

انھوں نے عرض کیا: ''نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے۔ ہم تو بس اتنا ہی علم رکھتے ہیں' جتنا آپ نے ہمیں دیا ہے۔ حقیقت میں سب کچھ جاننے اور سمجھنے والا آپ کے سوا کوئی نہیں''

پھر اللہ نے آدم سے کہا: ''تم انھیں ان چیزوں کے نام بتاؤ''

جب آدم نے انھیں سب چیزوں کے نام بتا دیے تو اللہ نے فرمایا: ''دیکھو میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی وہ ساری حقیقتیں جانتا ہوں' جو تم سے مخفی ہیں۔ جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی مجھے معلوم ہے' اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اُسے بھی جانتا ہوں (سورۂ بقرہ 31 تا 33)

پھر اللہ نے آدم سے کہا: ''بے شک ہم نے تمھاری تخلیق کی ابتدا کی۔ پھر تمھاری صورت بنائی (سورۂ اعراف 11)

آدم کو سجدہ

پھر اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا: ''آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو'' (سورۂ بقرہ 34)

''اس حکم پر سب نے سجدہ کیا' مگر ابلیس نے وہ سجدہ نہیں کیا۔ وہ سجدے کرنے والوں

میں شامل نہیں ہوا پس اس نے نافرمانی کی۔ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل ہونے سے انکار کیا' تکبر کیا اور نافرمانوں میں شامل ہو گیا۔(سورۂ بقرہ 34۔ سورۂ حجر 28)

اللہ نے کہا: ''اے شیطان' تو نے سجدہ کیوں نہیں کیا۔ کس چیز نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا' جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا' جب کہ اسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے؟ تو بڑا بن رہا ہے۔ یا تو ہے کچھ اونچے درجے کی ہستیوں میں سے؟'' سورۂ ص 75:38)

ابلیس نے کہا: ''میرا یہ کام نہیں ہے کہ میں بشر کو سجدہ کروں' جسے تُو نے سڑی ہوئی مٹی سے' سوکھے گارے سے پیدا کیا۔ کیا میں اسے سجدہ کروں' جسے تو نے مٹی سے بنایا ہے؟ دیکھ تو سہی' یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ میں اس سے بہتر ہوں' کیوں کہ تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے'' (سورۂ بقرہ 34۔ سورۂ اعراف 12'11۔ سورۂ بنی اسرائیل 61)

اللہ نے فرمایا: ''اچھا تو یہاں سے نیچے اُتر۔ تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں اپنی بڑائی کا تکبر کرے۔ نکل جا کہ در حقیقت تو ان لوگوں میں سے ہے جو خود اپنی ذلت چاہتے ہیں۔ نکل جا یہاں سے' تُو مردُود ہے اور تیرے اُوپر قیامت تک میری لعنت''

(اعراف 13۔ حجر 34)

[illegible]س کی مُہلت طلبی

ابلیس نے کہا: ''اے میرے رب' یہ بات ہے تو پھر مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے دے' جب یہ لوگ دوبارہ اُٹھائے جائیں گے''

فرمایا: ''اچھا تجھے اس روز تک کی مہلت' جس کا وقت مجھے معلوم ہے''

ابلیس نے کہا: ''اچھا تو جس طرح تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا ہے' اسی طرح میں اب اس زمین میں ان کے لیے دل فریبیاں پیدا کر کے ان سب کو بہکاؤں گا۔ میں دنیا میں بُری باتوں کو اچھا کر کے دکھاؤں گا۔ اور تیری عزت کی قسم' سب کو بہکاؤں گا۔ انھیں بہکانے کے لیے اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا۔ پھر ان کے آگے سے' ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے' بائیں سے' ہر طرف سے انھیں گھیروں گا' اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ (سورۂ اعراف 14 تا 17) سورۂ حجر (40,39)

مزید کہا: ''اگر تو نے قیامت تک کے لیے مجھے مہلت دی تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں گا' سوائے تیرے اُن بندوں کے' جنھیں تو نے ان میں خالص کر لیا ہو' (حجر 36 تا 39)

فرمایا: ''خالص بندہ ہونا ہی وہ راستہ ہے جو سیدھا مجھ تک پہنچتا ہے۔ بے شک' جو میرے حقیقی بندے ہیں' ان پر تیرا بس نہ چلے گا۔ تیرا بس تو صرف ان بہکے ہوئے لوگوں ہی پر چلے گا جو تیری پیروی کریں اور ان سب کے لیے جہنم کی وعید ہے۔''

(حجر 41 تا 43)

فرمایا: تو جا پھر کوئی تیری پیروی کرے گا تو بے شک جہنم تیری سزا ہو گی' پوری سزا۔ تو جس جسے اپنی دعوت سے بہکا سکتا ہے' بہکا لے اور چڑھ جا ان پر اپنے سوار اور پیدل لے کر' اور حصہ بانٹ لے ان کے مال میں اور اولاد میں' اور انھیں وعدوں کے جال میں پھانس' اور شیطان کے وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ یقیناً میرے بندوں پر تجھے کوئی اقتدار حاصل نہ ہو گا' اور توکل کے لیے تیرا ربّ کافی ہے۔''

(بنی اسرائیل 63 تا 65)

شجرِ ممنوعہ

پھر اللہ آدم علیہ السلام سے مخاطب ہوا: ''اے آدم' تم اور تمھاری بیوی' دونوں اس جنت میں رہو جہاں جس چیز کو تمھارا جی چاہے' کھاؤ' مگر اس درخت کے پاس نہ جاؤ۔ اگر تم جاؤ گے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے (البقرہ 35:) اے آدم' یاد رکھو' یہ ابلیس تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ تمھیں جنت سے نکلوا دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ' یہاں تو تمھیں ایسی آسائشیں حاصل ہیں کہ نہ بھوکے ننگے رہتے ہو نہ پیاس اور دھوپ تمھیں ستاتی ہے (طٰہٰ 117 تا 119)

شیطان کی ترغیب

لیکن شیطان نے انھیں وسوسے میں ڈال دیا' تا کہ ان کی شرم گاہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں' ان کے سامنے کھول دے۔ اس نے ان سے کہا: ''تمھارے رب نے تمھیں جو اس درخت سے روکا ہے' اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ' یا تمھیں ہمیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے۔'' اور اس نے قسم کھا کر ان سے کہا کہ میں تمھارا سچا خیر خواہ ہوں۔ اس طرح دھوکا دے کر وہ ان دونوں کو رفتہ رفتہ اپنے ڈھب پر لے آیا۔ آخر کار جب انھوں نے اس درخت کا مزہ چکھا تو ان کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کُھل گئے۔ اور وہ اپنے جسموں کو جنت کے پتوں سے ڈھانکنے لگے (اعراف 20 تا 22)

آدم کی توبہ و استغفار

تب اللہ نے ان دونوں کو پکارا: ''کیا میں نے تمھیں اس درخت کے پھل کھانے سے نہ روکا تھا' اور نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا دشمن ہے۔ دونوں بول اٹھے'' :اے رب' ہم نے اپنے اُوپر ستم کیا۔ اب اگر تُو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے'' (سورۂ اعراف 23:)

''تب اللہ نے اسے برگزیدہ کیا اور اسے معاف کیا اور اس کی توبہ قبول کر لی۔''

(طٰہٰ 122)

ہبُوطِ آدم

پھر اللہ نے اُسے ہدایت بخشی اور فرمایا: ''تم دونوں (انسان اور شیطان) یہاں سے اُتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن رہو گے اور تمھارے لیے ایک خاص مدت تک زمین ہی میں جائے قرار اور بسر کرنے کا سامان ہے۔ وہیں تمھیں جینا اور وہیں مرنا ہے' اور اسی میں سے آخر کار تمھیں نکالا جائے گا (اعراف 25'24)

مزید ہدایات عطا کیں: ''اے اولاد آدم علیہ السلام ہم نے تم پر لباس نازل

ہے کہ تمھارے جسم کے قابلِ شرم حصوں کو ڈھانکے اور تمھارے لیے جسم کی حفاظت اور زینت کا ذریعہ بھی ہو اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے۔ یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے' شاید کہ لوگ اس سے سبق لیں۔ اے بنی آدم! ایسا نہ ہو کہ شیطان تمھیں پھر اسی طرح فتنے میں مبتلا کر دے' جس طرح اس نے تمھارے والدین کو جنت سے نکلوایا تھا اور ان کے لباس ان پر سے اُتروا دیے تھے' تاکہ ان کی شرم گاہیں ایک دوسرے کے سامنے کھولے۔ وہ اور اس کے ساتھی تمھیں ایسی جگہ سے دیکھتے ہیں جہاں سے تم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ ان شیاطین کو ہم نے ان لوگوں کا سرپرست بنا دیا ہے جو ایمان نہیں لاتے'' (اعراف 26'27)

پھر اللہ نے مزید فرمایا: ''اب اگر میری طرف سے تمھیں کوئی ہدایت پہنچے تو جو کوئی میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو اسے کچھ خوف نہ ہوگا' نہ وہ رنجیدہ ہوگا نہ بہکے گا اور نہ بدبخت ہوگا۔ اور جو میری ہدایت سے منہ موڑے گا' اس کے لیے دنیا میں زندگی تنگ ہوگی اور قیامت کے روز ہم اُسے اندھا اٹھائیں گے'' (طٰہٰ 123'124)

حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر انسان کے خلیفہ بننے سے لے کر ہبوط تک کا یہ قصہ جو ہم چند منٹوں میں پڑھ لیتے ہیں' اپنی تدوین و تشکیل میں ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے۔ قصے کے آغاز میں اس زمانے کی نشان دہی کی جا رہی ہے' جب ابھی اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر نہیں کیا تھا' مقرر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب زمین پر ایسی زندہ مخلوق موجود تھی' جس کے بارے میں فرشتوں کو بھی معلوم تھا کہ وہ فتنہ و فساد برپا کرتی ہے اور خوں ریزی کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فرشتوں کو اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ محض حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس ناکافی ہے۔ اس کے خلیفہ کا تکالیف' مصائب' فتنہ و فساد اور خوں ریزیوں میں سے گزرنا اور انھیں مغلوب کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ بات صرف اللہ جانتا تھا' فرشتے نہیں جانتے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بشر گارے' مٹی اور بدبودار کیچڑ' مادہ حیات' مادہ تولید' تخم مایہ (پروٹو پلازم) سے بننا شروع ہو گیا تھا۔ ابھی وہ پورا نہیں بنا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ابھی اللہ تعالیٰ نے اپنی روح میں سے کچھ زیر تکوین آدمی کے خمیر میں شامل نہیں کیا تھا۔ ابھی وہ حیوانیت کے آخری مرحلہ ارتقا سے گزر رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پہلے سے موجود تمام مخلوقات کو' خواہ وہ ارضی تھیں' یا غیر ارضی' ذہنی طور پر اس کے مقرر کردہ خلیفہ کی برتری اور قیادت تسلیم کرنے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔

اوپر کا بیان علمی و تحقیقی کاوشوں کا حاصل ہے۔ مذہب کا بیان علم کے بیان سے مختلف ہو سکتا ہے۔ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام واحد نبی ہیں جن کے بارے میں یہ بنیادی سوال ذہن میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے آدمی تھے؟ یہ بنیادی سوال ہمیں ایک ایسے مقام پر لے آتا ہے' جہاں عقل پریشان ہو جاتی ہے' لیکن عقیدہ مطمئن رہتا ہے مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی کو بھی اپنی مشہور تصنیف ''قصص القرآن'' میں حضرت آدم علیہ السلام کا باب کھولتے وقت اس سوال کا سامنا کرنا پڑا تھا اور انھوں نے اپنی طرف سے بڑا عمدہ' متوازن اور مبنی بر عقل جواب دیا تھا۔

وہ فرماتے ہیں: ''حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق قرآن عزیز نے جو حقائق بیان کیے ہیں' ان کے تفصیلی تذکرے سے پہلے یہ واضح ہو جانا ضروری ہے کہ انسان کے عالمِ وجود میں آنے کا مسئلہ آج علمی نقطۂ نگاہ سے بحث کا ایک نیا دروازہ کھولتا ہے' یعنی نظریۂ ارتقا (سائنس) کا یہ دعویٰ ہے کہ موجودہ انسان اپنی ابتدائی تخلیق و تکوین ہی سے انسان پیدا نہیں ہوا' بلکہ کائنات ہست و بود میں اس نے بہت سے مدارج طے کر کے موجودہ انسان کی شکل حاصل کی ہے' اس لیے کہ مبداءِ حیات نے جمادات و نباتات کی مختلف شکلیں اختیار کر کے ہزاروں لاکھوں برس بعد درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے اول لبونہ (پانی کی جونک) کا لباس پہنا اور پھر ایسی ہی طویل مدت کے بعد حیوانات کے مختلف چھوٹے بڑے طبقات سے گزر کر موجودہ انسان کی شکل میں وجود پزیر ہوا۔''

''اور مذہب یہ کہتا ہے کہ خالق کائنات نے پہلے آدمی کو حضرت آدم علیہ السلام کی شکل ہی میں پیدا کیا اور پھر اس کی طرح ایک ہم جنس مخلوق حوا کو وجود دے کر کرۂ ارض پر انسانی نسل کا سلسلہ قائم کیا' اور یہی وہ انسان ہے جسے خالق کائنات نے عام مخلوق پر برتری اور بزرگی عطا فرمائی اور امانت الٰہی کا بارگراں اس کے سپرد فرمایا اور کل کائنات کو اس کے ہاتھ میں مسخر کر کے خلافت و نیابت الٰہی کا شرف اسی کو بخشا۔''

''اب غور طلب بات یہ ہے کہ نظریۂ ارتقا (سائنس) اور مذہب کے درمیان اس خاص مسئلے میں علمی تضاد ہے یا تطبیق کی گنجائش نکل سکتی ہے خصوصاً جب کہ سائنس اور تجربے نے یہ حقیقت واشگاف کر دی ہے کہ دینی مذہبی حقائق اور علم کے درمیان کسی بھی موقف پر تضاد نہیں ہے' اور اگر ظاہر سطح میں کہیں ایسا نظر آتا بھی ہے تو وہ علم کے بعض حقائق مستور ہونے کی وجہ سے نظر آتا ہے' کیوں کہ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی علم کے مستور حقائق سے پردہ اٹھا تو اسی وقت تضاد بھی جاتا رہا اور وہی حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی' جس کا اظہار وحی الٰہی کے ذریعے ہو چکا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ لیجیے کہ علم اور مذہب کے درمیان اگر کسی وقت بھی تضاد نظر آیا تو نتیجے میں علم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑی اور وحی کا فیصلہ اپنی جگہ اٹل رہا۔''

یہ بڑا کانٹے کا سوال ہے کہ علم اور وحی' یعنی سائنس اور مذہب کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

اس سوال کے مناسب اور مدلّل جواب کے لیے ہم مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع مرحوم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مولانا صاحب اپنی معروف تفسیر ''معارف القرآن'' کا آغاز ہی ''وحی کی ضرورت'' سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''ہر مسلمان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں آزمائش کے لیے بھیجا ہے اور اس کے ذمے کچھ فرائض عائد کر کے پوری کائنات کو اس کی خدمت میں لگا دیا ہے۔ لہٰذا دنیا میں آنے کے بعد انسان کے لیے دو کام ناگزیر ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس کائنات سے اور اس کائنات میں پیدا کی ہوئی اشیا سے ٹھیک ٹھیک کام لے۔ اور دوسرے یہ کہ اس کائنات کو استعمال کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو مدنظر رکھے' اور کوئی ایسی حرکت نہ کرے' جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو''

''ان دونوں کاموں کے لیے انسان کو علم کی ضرورت ہے' اس لیے کہ جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کون سی چیز کے کیا خواص ہیں؟ ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟ اس وقت تک وہ دنیا کی کوئی بھی چیز اپنے فائدہ کے لیے استعمال نہیں کر سکتا۔ نیز جب تک اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے؟ وہ کون سے کاموں کو پسند اور کن کو ناپسند کرتا ہے؟ اس وقت تک اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا ممکن نہیں۔''

''چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تین چیزیں ایسی پیدا کی ہیں' جن کے ذریعے اسے مذکورہ باتوں کا علم حاصل ہوتا رہے۔ ایک انسان کے حواسِ خمسہ' دوسرے عقل اور تیسرے وحی۔ چنانچہ انسان کو بہت سی باتیں اپنے حواس کے ذریعے معلوم ہو جاتی ہیں' بہت سی عقل کے ذریعے' اور جو باتیں ان دونوں ذریعوں سے معلوم نہیں ہو سکتیں' ان کا علم وحی کے ذریعے عطا کیا جاتا ہے۔''

''علم کے ان تینوں ذرائع میں ترتیب کچھ ایسی ہے کہ ہر ایک کی ایک خاص حد اور مخصوص دائرہ کار ہے' جس کے آگے وہ کام نہیں دیتا۔ چنانچہ جو چیزیں انسان کو اپنے حواس سے معلوم ہو جاتی ہیں' ان کا علم نری عقل سے نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک دیوار کو آنکھ سے دیکھ کر آپ کو علم ہو جاتا ہے کہ اس کا رنگ سفید ہے' لیکن اگر آپ اپنی آنکھیں بند کر کے صرف عقل کی مدد سے اس دیوار کا رنگ معلوم کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح جن چیزوں کا علم ''عقل'' کے ذریعے حاصل ہوتا ہے' وہ صرف حواس سے معلوم نہیں ہو سکتیں' مثلاً آپ صرف آنکھوں سے دیکھ کر یا ہاتھوں سے چھو کر یہ پتا نہیں لگا سکتے کہ اس دیوار کو کسی انسان نے بنایا ہے' بلکہ اس نتیجے تک پہنچنے کے لیے عقل کی ضرورت ہے۔''

''غرض جہاں تک حواس خمسہ کام دیتے ہیں' وہاں تک عقل کوئی راہ نُمائی نہیں کرتی' اور جہاں حواس خمسہ جواب دے دیتے ہیں' وہیں سے عقل کا کام شروع ہوتا ہے' لیکن عقل کی راہ نُمائی بھی غیر محدود نہیں ہے۔ یہ بھی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے اور بہت سی باتیں ایسی ہیں' جن کا علم نہ حواس کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور نہ عقل کے ذریعے۔ مثلاً اسی دیوار کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ اسے کس طرح استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ راضی اور کس طرح استعمال کرنے سے ناراض ہوگا' یہ نہ حواس کے ذریعے ممکن ہے نہ عقل کے ذریعے۔ اس قسم کے سوالات کا جواب انسان کو دینے کے لیے جو ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے' اسی کا نام وحی ہے' اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے کسی کو منتخب فرما کر اسے اپنا پیغمبر قرار دیتا ہے اور اس پر اپنا کلام نازل فرماتا ہے' اسی کلام کو ''وحی'' کہا جاتا ہے۔''

''اس سے واضح ہو گیا کہ وحی انسان کے لیے وہ اعلیٰ ترین ذریعہ علم ہے جو اسے اس کی زندگی سے متعلق ان سوالات کا جواب مہیا کرتا ہے جو عقل اور حواس کے ذریعے حل نہیں ہو سکتے' لیکن ان کا علم حاصل کرنا اس کے لیے ضروری ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صرف عقل اور مشاہدہ انسان کی راہ نُمائی کے لیے کافی نہیں' بلکہ اس کی ہدایت کے لیے وحی الٰہی ایک ناگزیر ضرورت ہے اور چوں کہ بنیادی طور پر وحی کی ضرورت پیش ہی اس جگہ آتی ہے' جہاں عقل کام نہیں دیتی' اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی ہر بات کا ادراک عقل سے ہو ہی جائے' بلکہ جس طرح کسی چیز کا رنگ معلوم کرنا عقل کا کام نہیں' بلکہ حواس کا کام ہے' اسی طرح بہت سے دینی عقائد کا علم عطا کرنا بھی عقل کے بجائے وحی کا منصب ہے' اور ان کے ادراک کے لیے نری عقل پر بھروسا کرنا درست نہیں۔ پس اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ''وحی'' محض ایک دینی اعتقاد ہی نہیں' بلکہ ایک عقلی ضرورت ہے' جس کا انکار درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کا انکار ہے۔''

(حوالہ: مقدمہ معارف القرآن۔ جلد اوّل)

وحی اور علم کے بارے میں ایک ضروری نکتہ' جو ہمہ وقت ذہن نشین رہنا چاہیے' وہ یہ ہے کہ وحی اٹل ہے' غیر مبدل ہے' اپنی جگہ پر استوار و قائم ہے۔ اس کے برعکس علم اٹل نہیں ہے' تحقیق اور تجربے کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ یہ علم ہے جسے اپنے افکار و نظریات و قیاسات کو تجربوں کی بھٹی میں' پختہ سے پختہ تر کر کے' توثیق کے لیے وحی کے پاس چل کر جانا پڑتا ہے۔ وحی قرآن ہے' علم قاری۔ علم کو وحی کی سند توثیق حاصل ہو جائے تو وہ مستند و معتبر اور قابل یقین ہے' اور اگر سند توثیق حاصل نہ ہو سکے تو اسے ایک مرتبہ پھر تحقیق اور تجربے کی بھٹی میں پکنا پڑتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ پخت و پز کا یہ عمل ہزار ہا سال تک جاری رہنے کے باوجود وحی سے مطابقت پیدا نہ کر سکے۔

یہی معاملہ ''پہلے آدمی'' کے ساتھ ہوا ہے۔ بعض مفسرین کے نزدیک انسان کو یک بارگی مٹی کے پتلے میں روح ڈال کر' زمین پر اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیج دیا گیا۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے آدمی تھے۔ علم کا تقاضا ہے کہ وہ ثبوت مانگتا ہے۔ یعنی اگر آدم علیہ السلام ہی پہلے آدمی تھے تو اس کا ثبوت؟۔ ثبوت و تصدیق کے لیے علم کو عقل کی مدد سے تحقیق و تجربے کی بھٹی میں سلگنا پڑتا ہے۔ کدالیں اور مشینیں لے کر زمین کی طبق در طبق گہرائیوں میں دور تک ان آثار و باقیات کو کھودنا پڑتا ہے جو قدیم زمانوں اور تہذیبوں کے لوگ مدفون چھوڑ گئے ہیں۔ مثلاً مختلف اقسام کے برتن' اوزار اور روزمرہ استعمال کی دیگر اشیا' قدیم ترین انسان کی دوسری سرگرمیوں کے آثار بقیہ' مثلاً عمارتیں' چٹانوں کے کتبات' چٹانوں اور غاروں میں منقوش تصویریں اور قدیم انسان کے جسموں کے ڈھانچے اور ہڈیاں۔

سائنس (علم) کا کام گردشِ ایام میں پیچھے ہٹتے ہٹتے اس پہلے آدمی کی دریافت ہے جو عقلی لحاظ سے بھی وحی الٰہی کے آدم علیہ السلام کے مطابق ہو جائے۔ یہ منزل ابھی بہت دور ہے۔

قصۂ آدم و ابلیس کے متعلق قرآنِ حکیم میں آدم کے وسیع مفہوم میں بشر' انس' انسان اور آدم کے لفظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ چار الفاظ بنی آدم کے چار ارتقائی مراحل کی نشان دہی کرتے ہیں۔ پہلا نام جو آفرینشِ کائنات کے وقت ابتدائی حالت کے اظہار کے لیے استعمال کیا گیا' وہ ''بشر'' ہے۔ ''انی خالق بشرا''۔ دوسرا نام جو بشر کی ترقی یافتہ صورت کے لیے استعمال کیا' وہ انس ہے۔ ''مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ

وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ." تیسرا نام انسان ہے جو انس کی ترقی یافتہ نسل ہے "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ طِيْنٍ" اور چوتھا نام آدم ہے جو انسان کی ترقی یافتہ نسل کے لیے استعمال کیا گیا و علم آدم الاسماء کلھا۔

آدمی کی پیدائش اور تخلیق کے بارے میں قرآن کی آیات بالکل واضح ہیں۔ انسان کی تخلیق مٹی اور پانی کے ملاپ سے ہوئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ مٹی بیضہ ہے اور پانی نطفہ۔ چند آیات قرآنی ملاحظہ ہوں:

1: کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے، جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا (کہف۔37)

2: ہم نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر گوشت کی بوٹی سے (الحج۔5)

3: اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفے سے۔ پھر تمھارے جوڑے بنا دیئے۔ (فاطر۔11)

4: ہم نے انسان کو کیچڑ کے خلاصے سے پیدا کیا۔ (مومنون۔12)

5: اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے۔ پھر اسے درست کیا اور اس کے اندر اپنی رُوح میں سے پھونک دیا (سجدہ۔7 تا 9)

6: اور اللہ نے تمھیں زمین سے اگایا جس طرح کہ اگایا جاتا ہے (نوح۔17)

7: انسان کو اس نے ٹھیکری جیسے سوکھے سڑے گارے سے بنایا (رحمٰن۔14)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ مٹی، یہ پانی، اور ان کا ملاپ، یہ سوکھا سڑا گارا، یہ کیچڑ کا خلاصہ، یہ حقیر پانی کا ست، آخر یہ وحی کی اصطلاحات سائنس کی زبان میں اپنا مفہوم کیوں کر ظاہر کرتی ہیں؟

آدمی کی پیدائش و نشو ونما پہلا حیاتیاتی (اور قرآنی بھی) اصول یہ ہے کہ اس کی تخلیق ایک واحد زندہ خلیے سے ہوتی ہے۔ سورۂ انعام کی آیت 98 کو اس اصول کی کلید سمجھنا چاہیے۔ ﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (ترجمہ) "اور وہی ہے جس نے تمھیں نفس واحدہ (ایک جان) سے پیدا کیا۔" اکثر مفسرین "نفس واحدہ" کو حضرت آدم علیہ السلام کے مثل قرار دیتے رہے ہیں کہ تمام انسان اس ایک نفس (آدم علیہ السلام) سے پیدا ہوئے، لیکن جب سے حیاتیات کی جدید شاخ جینی انجینئرنگ اور جینیات کی مدد سے ڈی این اے کی دریافت ہوئی ہے، تفسیر جدید نے بھی اب اسے تسلیم کر لیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری اب یوں بیان کرتے ہیں: "نطفے اور بیضے کے ملاپ سے پیدا ہونے والے خلیے یعنی جفتے (Zygote) کو نفس واحدہ کہتے ہیں۔" شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالمجید عزندانی کی بھی یہی رائے ہے۔ وہ نطفے کو کسی بھی مائع چیز کا قطرہ کہتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ مایۂ حیات بھی نطفہ ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ القیامہ کی آیت 37 میں آیا ہے: "کیا انسان ایک حقیر پانی کی بوند نہ تھا۔ جو رحمِ مادر میں ٹپکایا گیا تھا"

رسول کریم ﷺ کی حدیث سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ انسان کی پیدائش منی کے قطرے سے ہوتی ہے، بلکہ آپ ﷺ نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ بچے کی پیدائش تمام ہی مادۂ حیات سے نہیں ہوتی۔ حیاتیات اور جدید طب نے ثابت کر دیا ہے کہ ایک دفعہ کے انزال میں جتنے نطفے خارج ہوتے ہیں، وہ کروڑوں کی تعداد میں ہوتے ہیں۔ وہ سارے کے سارے بار آوری کے عمل میں کام نہیں آتے۔ صرف ایک نطفہ حمل ٹھہرانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ نطفے زیادہ تر ابتدائی حصے میں ہوتے ہیں۔ انھی میں حرکت اور توانائی ہوتی ہے اور باقی رہ جانے کی صلاحیت۔ پچھلے حصے کے مادۂ حیات میں قوت بقا نہیں ہوتی۔

آدمی کی پیدائش کا نقطۂ آغاز بار آوری ہے۔ بار آوری اس وقت ہوتی ہے جب نطفہ بیضے سے ملاپ کرتا ہے۔ نطفے اور بیضے کی یک جائی سے یک خلوی نامیہ پیدا ہوتا ہے، جسے جفتہ (Zygote) کہتے ہیں۔ جفتے کا مطلب ہے انسانی زندگی کی پہلی دھڑکن۔ نطفہ اکیلا کچھ نہیں، بیضہ بھی اکیلا کچھ نہیں۔ دونوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والا نیا خلیہ "جفتہ" ہے، جسے قرآن نے "علق" کہا ہے۔ علق ہی زندگی کا آغاز ہے۔ ہم میں سے ہر شخص، مرد و زن کی انفرادی شخصیت علق ہی کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔

خالی آنکھ سے دیکھیں تو جفتہ ایک ننھا سا دھبا نظر آتا ہے۔ خُردبین سے دیکھیں تو ایک ذرا بڑا اور لمبوترا متحرک و توانا خلیہ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں دوہرے مورثے (Gene) ہوتے ہیں۔ ایک لڑی باپ کی طرف سے آتی ہے۔ دوسری لڑی ماں کی طرف سے آتی ہے۔ دونوں لڑیاں آپس میں اس طرح گندھی ہوئی ہوتی ہیں، جس طرح چٹیا یا مینڈھیاں۔ یہ یک خلوی جفتہ تقسیم، نقل و حرکت، نشو و نما، تقسیم در تقسیم اور جمع تفریق کی منزلوں سے گزرتا ہوا ایک مکمل کثیر خلوی انسان بن جاتا ہے۔

حیاتیات، جینیات، طب اور کیمیا کی ان اصطلاحات کو قرآنی اصطلاحات میں ترجمہ کر کے سوچیے تو رحمِ مادر میں حمل سے لے کر ولادت تک کے مراحل کی تصویر یوں بنتی ہے:

﴿خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۙ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ؕ﴾ (الطارق 86: 7،6)

"اِنسان کو ایک اُچھلنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔"

﴿وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ﴾ (السجدہ 32: 7 تا 8)

"اس نے انسان کی پیدائش کی ابتدا گارے سے کی ہے۔ پھر اس کی نسل ایک ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔"

﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ (الدھر 76: 2)

"ہم نے انسان کو ایک مخصوص نطفے (امشاج) سے پیدا کیا۔" (یعنی جفتہ سے۔)

﴿مِنْ نُّطْفَةٍ ؕ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ۙ﴾ (عبس 80: 19)

''اللہ نے اسے نطفے سے پیدا کیا۔ پھر اس کی تقدیر مقرر کی۔''

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ﴾ (البقرہ 2:223)

''تمھاری عورتیں تمھاری کھیتیاں ہیں۔''

﴿اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰىo﴾ (القیامۃ 75:37)

''کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو رحم مادر میں ٹپکایا جاتا ہے۔''

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍo﴾ (المومنون 23:13)

''پھر اسے محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا گیا۔''

﴿ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً﴾ (المومنون 23:14)

''پھر اس نطفے کو لوتھڑے کی شکل دی۔''

﴿فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً﴾ (المومنون 23:14)

''پھر ہم نے لوتھڑے کو بوٹی بنایا۔''

﴿فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا﴾ (المومنون 23:14)

''پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔''

﴿فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾ (المومنون 23:14)

''پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔''

﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾

(المومنون 23:14)

''پھر ہم نے اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔''

﴿مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗo ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗo﴾ (عبس 80:19تا20)

''اللہ نے اسے نطفے سے پیدا کیا۔ پھر اس کی تقدیر مقرر کی۔ پھر اس کے لیے زندگی کی راہ آسان کی۔

﴿اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ﴾

(الرعد 13 : 8)

''اللہ ایک ایک حاملہ کے پیٹ سے واقف ہے۔ اور جو کچھ گھٹ رہا ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ بڑھ رہا ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔''

اولادِ آدمؑ

حضرت آدم علیہ السلام کے تین فرزند تھے۔ قابیل ہابیل اور شیث علیہ السلام۔ قرآن مجید میں اُن کا ذکر نہیں ہے۔ صرف قابیل اور ہابیل کا ذکر ہے لیکن وہ بھی نام لے کر نہیں صرف ''ابنی آدم'' کہہ کر مجمل چھوڑ دیا ہے۔ البتہ توراۃ میں ان کے بھی نام بیان کیے گئے ہیں۔ قابیل نے اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تھا۔ اس واقعے کے متعلق ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے منقول ہے۔ اس روایت کا مضمون یہ ہے: ''دنیائے انسانی میں اضافے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ حوا سے توام (جوڑیا) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ درپیش تھا۔ قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیر ہابیل کی ہمشیر سے زیادہ خوب صورت تھی۔ اس لیے قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستورِ زمانہ کے مطابق ہابیل کی ہمشیر سے اس کی شادی ہو اور ہابیل کی شادی اس کی ہمشیر سے۔ معاملہ ختم کرنے کے لیے حضرت آدم علیہ السلام نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی اللہ کے حضور پیش کریں۔ جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنا ارادہ پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

جیسا کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں قربانی (نذر) کا یہ الہامی دستور تھا کہ نذر و قربانی کی چیز کسی بلند جگہ پر رکھ دی جاتی اور آسمان سے آگ نمودار ہو کر اسے جلا دیتی تھی۔ اس دستور کے مطابق ہابیل نے اپنے ریوڑ میں سے ایک بہترین دنبہ خدا کی نذر کیا۔ اور قابیل نے اپنے کھیت کے غلے میں سے ردّی قسم کا غلہ قربانی کے لیے پیش کیا۔ دونوں کی اچھی اور بُری نیت کا اندازہ ان کے عمل سے ہو گیا۔ حسبِ دستور آگ نے نمودار ہو کر ہابیل کی نذر کو خاکستر کر دیا اور اس طرح قبولیت کا شرف بھی ہابیل کے حصے میں آیا۔

قابیل یہ توہین برداشت نہ کر سکا اور اس نے طیش میں آ کر ہابیل کو قتل کی دھمکی دی۔ ہابیل نے جواب دیا' میں تو کسی طرح تجھ پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ باقی تیری مرضی۔ رہا قربانی کا معاملہ' تو خدا کے ہاں تو نیک نیت ہی کی نذر قبول ہوتی ہے۔ وہاں بدنیت کی دھمکی کام آ سکتی ہے اور نہ غم و غصہ۔ اس پر قابیل نے مشتعل ہو کر اپنے چھوٹے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا۔

قرآن مجید میں شادی کا قصہ مذکور نہیں ہے۔ صرف نذر و قربانی کا ذکر سورۂ مائدہ کی آیت 27 تا 31 میں یوں آیا ہے (ترجمہ):۔

''اور ذرا انھیں آدم کے دو بیٹوں کا قصہ بھی بے کم و کاست سنا دو۔ جب ان دونوں نے قربانی کی تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کی گئی اور دوسرے کی نہ کی گئی۔ اس نے کہا: ''میں تجھے مار ڈالوں گا۔'' اس نے جواب دیا: ''اللہ تو متقیوں ہی کی نذریں قبول کرتا ہے۔ اگر تُو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تو ہی سمیٹ لے اور دوزخی بن کر رہے۔ ظالموں کے ظلم کا یہی ٹھیک بدلہ ہے۔'' آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کے لیے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ پھر اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کھودنے لگا' تا کہ اسے بتائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیسے چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا' افسوس مجھ پر! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپانے کی تدبیر نکال لیتا۔ اس کے بعد وہ اپنے کیے پر بہت پچھتایا۔''

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک حدیث روایت کی ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دنیا میں جب بھی کوئی ظلم سے قتل ہوتا ہے تو اس کا گناہ حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے بیٹے (قابیل) کی گردن پر ضرور ہوتا ہے' اس

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت
بحیرہ کسپئین
فارس
خلیج فارس
عرب
ار
بابل
دریائے دجلہ
دریائے فرات
حران
بحیرہ اسود
دمشق
بیت ایل
الخلیل
بیر السبع
قوم ثمود
بحیرہ روم
قاہرہ
مکہ
بحیرہ قلزم

لیے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ظالمانہ قتل کی ابتدا کی اور یہ ناپاک سنت جاری کی۔"

حضرت آدم علیہ السلام کے تیسرے بیٹے "شیثؑ" بھی اللہ کے نبی تھے' جن پر پچاس صحیفے نازل ہوئے' لیکن سب امتدادِ زمانہ سے تلف ہو گئے۔ "شیثؑ" کے معنی ہیں عطیہ خداوندی۔ چوں کہ آپ قابیل کے ہاتھوں ہابیل کے قتل کے پانچ سال بعد پیدا ہوئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے ہابیل کے نعم البدل کے طور پر عطا کیا تھا' اس لیے یہ نام شیث پڑ گیا۔ یہ شیثؑ ہی ہیں جن سے حضرت آدم علیہ السلام کی نسل چلی' کیوں کہ ہابیل نے اپنا کوئی وارث نہیں چھوڑا تھا اور قابیل کے وارث سیلاب میں غرق ہو گئے تھے۔ حضرت شیث علیہ السلام کے بعد انسان دو واضح گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک وہ جو ان کی اطاعت کرتے تھے دوسرے وہ جو قابیل کی اولاد کے پیرو تھے۔

حضرت شیث علیہ السلام اپنے پیروکاروں میں بہت مقبول اور کامیاب رہے' یہاں تک کہ لوگ آپ کے انتقال کے بعد بھی آپ ہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہے اور آپ کی تلقین و تعلیم پر عمل کرتے رہے۔ جب سلسلۂ اولاد بڑھتے بڑھتے مہلائیل پر پہنچا تو لوگ آپ کے دین سے پھر گئے۔ مہلائیل بہت خوب صورت اور وجیہ و شکیل تھے۔ ہر کوئی ان سے پیار کرتا اور محبت رکھتا تھا۔ مہلائیل کے انتقال کے بعد ان کی قوم نے اپنے جذبات کی تسکین کے لیے ان کا بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا' حتیٰ کہ اس اندھی محبت اور کورانہ تقلید نے تمام قوم کو بت پرست بنا دیا۔

حضرت ادریس علیہ السلام

ان بت پرستوں کا زور توڑنے کے لیے حضرت ادریس علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا۔ آپ کا شجرہ نسب یہ ہے: ادریس بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث بن آدم علیہ السلام۔ گویا آپ حضرت آدم علیہ السلام کی چھٹی پشت میں سے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام کے پڑدادا۔ آپ کی جائے پیدائش کوفہ ہے۔ جو وادیٔ دجلہ و فرات کے وسط میں واقع ہے' جس کے جنوب میں کچھ فاصلے پر بابل واقع ہے۔

آپ نے نبوت حاصل ہونے پر مشرک اور مفسد لوگوں کو راہِ ہدایت کی تبلیغ شروع کی' مگر مشرکوں نے ایک نہ سنی اور حضرت آدم علیہ السلام کی شریعت کے مخالف ہی رہے۔ البتہ ایک چھوٹی سی جماعت آپ کے شیدائیوں کی ضرور تیار ہو گئی۔ چوں کہ مخالفین کی اکثریت تھی' اس لیے وہ حضرت ادریس علیہ السلام پر غالب آ گئے اور آپ اپنی جماعت سمیت مصر کی جانب ہجرت کر گئے۔ دریائے نیل کے کنارے ایک بستی میں حضرت ادریس علیہ السلام اور ان کی جماعت کے لوگ اقامت پزیر ہو گئے۔

حضرت ادریس علیہ السلام پہلے نبی ہیں جو صاحبِ قلم ہیں۔ انھوں نے علم ہیئت و نجوم کی ابتدا کی' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اجرامِ فلکی اور ان کی ترکیب و ترتیب' ان کے اجتماع و افتراق کے نقاط' ان کی باہمی کشش و تجاذب کے اسرار کی تعلیم دی۔ علم اعداد اور حساب کا علم دیا۔ یونانی بائبل کی رُو سے آپ ہی پہلی ہستی ہیں' جنھوں نے سائنس' فلکیات اور فنِ خطاطی کا آغاز کیا۔ حضرت ادریس علیہ السلام صاحبِ کتاب بھی تھے۔ دورِ جدید میں بابل شہر کی اثری کھدائیوں سے جو مٹی کی الواح برآمد ہوئی ہیں' ان میں ایک کتاب حضرت ادریس علیہ السلام کے نام سے بھی منسوب ہے۔ یہ عبرانی زبان میں ہے۔ بعض یہودی اور عیسائی علما اس کتاب کو مستند تسلیم نہیں کرتے۔

حضرتِ ادریس علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ اول سورۂ مریم کی آیات 56 اور 57 میں' جن کا ترجمہ یہ ہے: "اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کرو۔ وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا اور اسے ہم نے بلند مقام پر اٹھایا تھا" دوم سورۃ انبیا کی آیت 85 اور 86 میں' جن کا ترجمہ یہ ہے: "اور یہی نعمت اسماعیل علیہ السلام اور ادریس علیہ السلام اور ذوالکفل علیہ السلام کو دی کہ یہ سب صابر لوگ تھے اور انھیں ہم نے اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحوں میں سے تھے"

مفسرین کا عام خیال یہ ہے کہ بائبل میں جن بزرگوں کا نام حنوک یا اخنوخ بتایا گیا ہے' وہی حضرت ادریس علیہ السلام ہیں۔ ان کے متعلق بائبل کا بیان یہ ہے: "اور حنوک پینسٹھ برس کا تھا' جب اس سے متوسلح پیدا ہوا اور متوسلح کی پیدائش کے بعد حنوک تین سو برس تک خدا کے ساتھ ساتھ چلتا رہا......اور وہ غائب ہو گیا' کیوں کہ خدا نے اُسے اٹھا لیا۔" (پیدائش۔ باب 5۔ آیت 24'21)

تلمود کی اسرائیلی روایات میں ان کے حالات زیادہ تفصیلات کے ساتھ بتائے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے جب بنی آدم میں بگاڑ کی ابتدا ہوئی تو خدا کے فرشتے نے حنوک کو' جو لوگوں سے الگ تھلگ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے' پکارا کہ "اے حنوک' اٹھو' گوشۂ عزلت سے نکلو اور زمین کے باشندوں میں چل پھر کر انھیں وہ راستہ بتاؤ' جس پر انھیں چلنا چاہیے' اور وہ طریقے بتاؤ جن پر انھیں عمل کرنا چاہیے۔" یہ حکم پا کر وہ نکلے اور انھوں نے جگہ جگہ لوگوں کو جمع کر کے وعظ و تلقین کی اور نسلِ انسانی نے ان کی اطاعت قبول کر کے اللہ کی بندگی اختیار کر لی۔ حنوک 353 برس تک نسلِ انسانی پر حکمران رہے۔ ان کی حکومت انصاف اور حق پرستی کی حکومت تھی۔ ان کے عہد میں زمین پر خدا کی رحمتیں برستی تھیں"

سورۂ مریم کی آیت 57 بھی اسرائیلی روایات میں کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو بلند مرتبہ عطا کیا تھا' لیکن اسرائیلی روایات سے نقل ہو کر یہ بات ہمارے ہاں بھی مشہور ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا۔ بائبل میں تو صرف اسی قدر ہے کہ وہ غائب ہو گئے' کیوں کہ "خدا نے انھیں اٹھا لیا۔" مگر تلمود میں اس کا ایک طویل قصہ بیان ہوا ہے' جس کا خاتمہ اس پر ہوتا ہے کہ "حنوک ایک بگولے میں آتشیں رتھ اور گھوڑوں سمیت آسمان پر چڑھ گئے۔" (سید مودودی۔ تفہیم القرآن۔ جلد سوم)

طبری نے ایک حدیث قتادہ عن انس بن مالک سے مرفوعاً (یعنی آنحضرت ﷺ تک) نقل کی ہے' جس میں رسول کریم ﷺ کی معراج میں حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ملاقات کا ذکر ہے۔ یہ حدیث صحیحین (باب الاسراو

المعراج) میں مالکؓ بن صعصعۃ اور ابوذر غفاریؓ دو صحابیوں سے انسؓ بن مالک نے مرفوعاً روایت کی ہے۔ ابوذرؓ کی روایت میں آسمانی منازل کی صراحت نہیں' لیکن انبیا کے نام مع ادریس علیہ السلام' جن سے ملاقات ہوئی' دونوں حدیثوں میں یکساں ملتے ہیں۔ تاہم حضرت ادریس علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کا ان احادیث میں مطلق ذکر نہیں ہے' لہٰذا عہد حاضر کے مفسرین کی رائے قرین صواب مانی جائے گی کہ بعد کی' روایات' جو مسلمانوں میں حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق مشہور ہوئیں' اسرائیلیات میں شامل ہیں اور یہودیوں کی غیر مستند اساطیر سے لی گئی ہیں۔ قرآن و حدیثِ صحیح میں حوالہ متروک ہے۔ ان کی کوئی دلیل نہیں پائی جاتی''

اسرائیلی روایات کے رواج پانے سے عام مسلمانوں میں رفتہ رفتہ یہ عقیدہ پھیل گیا کہ ادریس علیہ السلام (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح) چوتھے آسمان پر زندہ ہیں' یہ بھی اسرائیلیات میں سے ہی ہے جس طرح الیاس علیہ السلام اور خضر علیہ السلام زمین پر زندہ جاوید ہیں۔ پھر ان بیرونی روایات میں طرح طرح کی اسلامی تعلیمات کی آمیزش ہوتی رہی' مثلاً یہ قصہ کہ ادریس علیہ السلام نے ملک الموت سے امتحاناً روح قبض کرنے کی درخواست کی' عجوبہ ہے اور جب دوبارہ روح پائی تو جنت سے نہیں گئے اور نہ دوبارہ روح قبض کیے جانے پر راضی ہوئے اور قرآن کی مذکورہ دو آیات سے اپنے طرزِ عمل کی سند پیش کی۔ کئی حکایتوں میں ادریس علیہ السلام کے سورج (دیوتا یا فرشتے) سے خصوصی تعلقات دکھائے گئے ہیں۔ ان اساطیر سے' نیز تورات میں ان کا زمانہ تین ہزار سال قبل مسیح بتائے جانے سے ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ادریس علیہ السلام کا زمانہ بہت قدیم یعنی ابراہیم علیہ السلام و نوح علیہ السلام سے پیش تر کا ہوگا' جب کہ انسانوں میں سورج کی پوجا یا کواکب پرستی پھیلی ہوئی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد حضرت نوح علیہ السلام پہلے نبی ہیں جو رسول بھی ہیں۔ نبی اور رسول میں فرق یہ ہے کہ نبی ہر صاحب وحی کو کہتے ہیں' لیکن رسول صاحب وحی ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب شریعت بھی ہوتا ہے۔ حدیث نبوی ﷺ میں حضرت نوح علیہ السلام کے لیے ''اول الرسل'' کا لفظ آیا ہے یعنی پہلے رسول۔ مولانا محمود الحسن اپنے ''تفسیری فوائد'' میں لکھتے ہیں: ''حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی' تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہوگئی۔ گویا اول حالت محض تعلیمی حالت تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہوگئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرماں برداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے۔ چنانچہ انبیائے اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر بھی اول عذاب حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا۔''

حضرت نوح علیہ السلام کا شجرۂ نسب یہ ہے: نوح علیہ السلام بن لامک بن متوسلح بن حنوک (ادریس علیہ السلام) بن یارد بن مہلائیل بن قینان بن انوش بن شیث علیہ السلام بن ابوالبشر آدم علیہ السلام۔

مؤرخین اور تورات کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ہزار بارہ سو سال اور آٹھ پشتوں کا فاصلہ حائل ہے۔ آپ کا تعلق اب جدید اثری کھدائیوں سے واضح طور پر ثابت ہو چکا ہے اور یہ تعلق معروف طوفانِ نوح علیہ السلام کے حوالے سے ہے۔

قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر 28 سورتوں میں 43 آیات میں آیا ہے: آل عمران۔ 33، النسا۔ 163، انعام۔ 84، اعراف۔ 59۔ 69، توبہ۔ 70، یونس۔ 71' 73، ہود۔ 89' 48' 46' 45' 42' 36' 32' 25، ابراہیم۔ 9، اسرا۔ 3، مریم۔ 58، انبیا۔ 76' 77، حج۔ 42، مومنون۔ 23' 30، فرقان۔ 37، شعرا۔ 166' 121' 106' 105، عنکبوت۔ 14' 15، احزاب۔ 70 صافات۔ 79' 75، ص۔ 12، الحاقہ۔ 11' 12، شوریٰ۔ 13، ق۔ 12، ذاریات۔ 46، نجم۔ 52، نوح۔ 1۔ 21۔ 36، قمر۔ 9' 16، حدید۔ 26، تحریم۔ 10

حضرت نوح علیہ السلام اور قوم نوح کا مسکن وادی دجلہ و فرات یعنی عراق میں تھا۔ عراق میں اس وقت طرح طرح کی برائیاں اور مذہبی و سماجی خرابیاں پیدا ہو چکی تھیں۔ لوگوں نے مختلف بتوں کی پرستش شروع کر دی تھی۔ ان کے ہاں اس وقت زیادہ تر پانچ دیوتاؤں وُدّ' سواع' یغوث' یعوق اور نسر کی پرستش ہوتی تھی۔ انھیں حضرت نوح علیہ السلام کی رسالت و نبوت سے بھی انکار تھا۔ فکری و اعتقادی بگاڑ کے ساتھ ساتھ ان میں عملی اور معاشرتی طور پر بھی ایسی ایسی برائیاں پیدا ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے وہ پوری طرح سزا دیئے جانے کے مستحق تھے۔ سورۃ ہود کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ ان میں طبقاتی اونچ نیچ اور ذات پات کی تفریق کا مرض بھی لاحق ہو چکا تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو وعظ و نصیحت کے ذریعے راہ راست پر لانے کی بڑی کوشش کی' مگر بے سود۔ انھوں نے اس مقصد کے لیے رات دن ایک کر دیا تھا۔ اس وعظ و نصیحت سے قوم ان کے سخت خلاف ہو گئی اور انھیں مجنون و دیوانہ قرار دینے لگی۔ جلد ہی انھیں صریح گم راہ بھی کہا جانے لگا اور پھر قوم انھیں سنگ سار کرنے کی دھمکیاں بھی دینے لگی۔

بالآخر آپ علیہ السلام اپنی قوم کی اصلاح سے بالکل مایوس ہو گئے اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ اب اس قوم کی ہلاکت و بربادی کے سوا دنیا کی بقا و سلامتی کی کوئی سبیل نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی اور عرض کی: ''اے میرے پروردگار! کسی کافر کو بھی روئے زمین پر باقی نہ چھوڑ۔ اگر تو انھیں رہنے دے گا تو یہ تیرے بندوں کو گم راہ کریں گے اور ان سے جو اولاد ہوگی' وہ بھی بدکار اور ناشکر گزار ہوگی۔'' اللہ نے آپ علیہ السلام کی دعا اور آہ و زاری قبول فرمائی۔

''نوح علیہ السلام پر وحی کی گئی کہ تمھاری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے' سو وہ لا چکے۔ اب کوئی ایمان نہ لائے گا۔ ان کے کرتوتوں پر غم کھانا چھوڑ دو اور ہماری نگرانی میں

ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کر دو۔ اور دیکھو جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے حق میں مجھ سے کوئی سفارش نہ کرنا' یہ سارے کے سارے اب ڈوبنے والے ہیں۔ نوح کشتی بنا رہا تھا اور اس کی قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا' وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس نے کہا: "اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں۔ عن قریب تمھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی۔" (ہود 11:36 تا 39)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کی تیار کردہ کشتی موجودہ زمانے کے چھوٹے بحری جہازوں کی طرح سہ منزلہ تھی۔ اہل تحقیق کے مطابق یہ کشتی 325 فٹ لمبی' ساڑھے ستاسی فٹ چوڑی اور ساڑھے باون فٹ اونچی تھی۔ جب یہ کشتی تیار ہو چکی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو آنے والے طوفان اور اس سے بچنے کی تدابیر سے آگاہ کیا۔ اس موقع پر حکم آیا کہ: "ہر قسم کے جانوروں کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو۔ اپنے گھر والوں کو بھی' سوائے ان اشخاص کے جن کی نشان دہی پہلے کی جا چکی ہے' اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں۔ اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لائے تھے۔" (ہود 11-40)

حضرت نوح علیہ السلام نے مذکورہ افراد کو (جانوروں کو نچلی' انسانوں کو وسطی اور پرندوں کو بالائی منزل میں) سوار کیا اور کہا: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا﴾ "اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اس کا ٹھہرنا بھی۔" (ہود: 41)

باقی تفاصیل سورۃ ہود کی آیات 42 تا 48 میں بیان ہوئی ہیں' جن کا ترجمہ یہ ہے: "کشتی ان لوگوں کو لیے چلی جا رہی تھی اور ایک ایک موج پہاڑ کی طرح اٹھ رہی تھی۔ نوح علیہ السلام کا بیٹا دور فاصلے پر تھا۔ نوح علیہ السلام نے پکار کر کہا: "بیٹا' ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ کافروں کے ساتھ نہ رہ۔" اس نے پلٹ کر جواب دیا: "میں ابھی ایک پہاڑ پر چڑھا جاتا ہوں جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔" نوح علیہ السلام نے کہا: "آج کوئی چیز اللہ کے حکم سے بچانے والی نہیں ہے' سوائے اس کے کہ اللہ ہی کسی پر رحم فرمائے۔" اتنے میں ایک موج دونوں کے درمیان حائل ہو گئی اور وہ بھی ڈوبنے والوں میں شامل ہو گیا۔"

حکم ہوا: "اے زمین' اپنا سارا پانی نگل جا اور اے آسمان رُک جا۔" چنانچہ پانی زمین میں بیٹھ گیا' فیصلہ چکا دیا گیا۔ کشتی جودی پر ٹک گئی اور کہہ دیا گیا کہ دور ہوئی ظالموں کی قوم۔"

نوح علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا۔ کہا: "اے رب' میرا بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے۔ اور تیرا وعدہ سچا ہے' اور تو سب حاکموں سے بڑا اور بہتر حاکم ہے۔" جواب میں ارشاد ہوا: "اے نوح وہ تیرے گھر والوں میں سے نہیں ہے۔ وہ تو ایک بگڑا ہوا کام ہے اور اس کے کام بگڑے ہوئے ہیں۔ لہٰذا تو اُس بات کی مجھ سے درخواست نہ کر' جس کی حقیقت تو نہیں جانتا۔ میں تجھے نصیحت کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو جاہلوں کی طرح نہ بنا لے۔" نوح علیہ السلام نے فوراً عرض کیا: "اے میرے رب' میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ وہ چیز تجھ سے مانگوں جس کا مجھے علم نہیں۔ اگر تو نے مجھے معاف نہ کیا اور رحم نہ فرمایا تو میں برباد ہو جاؤں گا۔"

حکم ہوا: اے نوح اُتر جا۔ ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں ہیں تجھ پر اور ان گروہوں پر جو تیرے ساتھ ہیں اور کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جنھیں ہم کچھ مدت سامان زندگی بخشیں گے۔ پھر انھیں ہماری طرف سے دردناک عذاب پہنچے گا۔" (حوالہ)

طوفانِ نوح کی حقیقت کے بارے میں' پچھلی دو صدیوں کے دوران اثری کھدائیوں سے پہلے' ہمارے پاس جو کچھ مواد تھا' وہ یا تو الہامی اور مذہبی کتب یعنی قرآن مجید' بائبل' مہابھارت اور پرانوں کے بیانات اور قدیم لوگوں مثلاً سکندر مقدونی کے ہم عصر بابلی مؤرخ بروسیس کے بیانات پر مبنی ہے۔ یا پھر مختلف قوموں میں سینہ بہ سینہ چلی آنے والی حکایات میں پایا جاتا ہے' لیکن پچھلی دو صدیوں میں ایسے متعدد قدیم کتبے عراق سے مل گئے ہیں' جن پر کسی بہت بڑے طوفان کے واقعات درج ہیں۔

1851ء میں سر اے ایچ لیارڈ نے قدیم عراق کے مشہور شہر اور شاہان اشوریہ کے پایہ تخت نینوا کی کھدائی شروع کرائی جو دوسرے حضرات کی سرکردگی میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے 1900ء تک جاری رہی۔ یہاں سے اشوری حکمران سنحریب 705 (تا 681 ق م) کے نام ور پوتے اشوربنی پال 669 (۔626 ق م) کا رفیع الشان محل نکلا اور اسی محل سے اس کی مشہور زمانہ لائبریری برآمد ہوئی۔ یہاں سے 25 ہزار سے کچھ زیادہ الواح نکال کر یورپ پہنچا دی گئیں۔ یہ الواح مٹی کی پتلی پتلی اینٹوں پر لکھی ہوئی ہیں۔ یہیں سے وہ بارہ تختیاں بھی نکلی ہیں جن پر بابل کے ہیرو گلگامش کی مشہور رزمیہ داستان بھی موجود ہے۔ ان میں سے دو تختیوں پر ایک بڑے طوفان کا قصہ بڑے ہی موثر پیرایے میں درج ہے۔

1910ء میں عراق کے قدیم شہر نپور سے ایک اور قدیم ٹکڑا ہاتھ آیا۔ گو اس کے مسخ شدہ حصوں میں سے صرف چند سطور باقی رہ گئی ہیں اور مضمون میں کسی خاص شخص کا نام بھی نہیں ہے' لیکن یہ امر قطعاً واضح ہے کہ اس پر طوفان کی بابلی روایت مرقوم ہے۔ نپور والا یہ کتبہ اس وقت کا ہے جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شہر ار میں اپنے گھر کو ابھی نہیں چھوڑا تھا۔ ان مختلف "طوفانی" الواح کے علاوہ سیلاب عظیم کی روایت ہی سے متعلقہ دو اور کتبے ملے ہیں۔ ان میں سے ایک تو بابل کے پہلے شاہی خاندان کے آخری نصف دور کا ہے اور دوسرا اس سے بھی پہلے کا ہے۔ غرض اس طرح طوفان نوح علیہ السلام سے متعلق قدیم ترین تحریری ورثہ بھی ہاتھ آ گیا۔

گلگامش کی بابلی رزمیہ کے علاوہ ایک بڑے طوفان یا سیلاب عظیم سے متعلق کہانیاں مصر' ہندوستان' یونان' چین' برما' ملائیشیا' آئرلینڈ' نیوزی لینڈ' نیوگنی' پولی نیشیا' شمالی و جنوبی امریکا' یورپ و افریقہ کے دیگر علاقوں اور آسٹریلیا کے قدیم باشندوں میں پائی جاتی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان سب کہانیوں کا مرکز ایک ہی ہے؟ جناب ابن حنیف

اپنی تصنیف: ''ہزاروں سال پہلے'' میں اس کا جواب یوں دیتے ہیں: ''ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تمام کہانیاں مشترک الاصل نہیں ہیں' بلکہ ہوا یہ ہے کہ بابلی واقعہ مذہبی مبلغین' تجار اور مفتوحہ مفرور اقوام کے ذریعے سے بیش تر ایشیائی اور یورپی مما لک میں پھیل گیا' لیکن امریکا اور آسٹریلیا وغیرہ کی حکایتیں وہاں مقامی طور پر آزادانہ پھیلیں''

ایک سوال علمی حلقوں میں یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا طوفان واقعی آیا تھا؟ انیسویں صدی کے متعدد علما اس بین الاقوامی شہرت کے حامل سیلاب یا طوفان نوح کی آمد کے سرے ہی سے منکر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ طوفان نوح سے متعلق جتنی بھی روایات چلی آتی ہیں' تاریخی طور پر ان میں کوئی اصلیت نہیں۔

سید سبط حسن اپنی تصنیف ''ماضی کے مزار'' میں طوفان پر شبہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عجیب بات ہے کہ ہندوستان' میکسیکو اور دوسری پرانی تہذیبوں کی اساطیر میں بھی سیلاب عظیم کی روایت ملتی ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ ہونہ ہو' سیلاب کا یہ تصور قدیم انسان کے تحت الشعور کی کرشمہ سازی ہے۔ شاید انسان کے ذہن میں یہ تصور برفانی دور میں پیدا ہوا جب منطقہ حارہ میں برفانی چشمے کبھی آگے بڑھتے' کبھی پیچھے ہٹتے تھے' اور موسلا دھار بارشیں ہوتی تھیں اور دریا اُبل کر سمندر بن جاتے تھے''

اور جناب ... حنیف طوفان نوح کی مدافعت میں وثوق سے لکھتے ہیں: ''ہمیں تعجب ہے کہ آخر اس چیز کو باور کرنے میں کیا چیز مانع ہے کہ زمانہ قدیم میں عراق کا کچھ حصہ کسی لرزہ خیز طوفان یا سیلاب کی لپیٹ میں آ گیا' جب کہ وہاں اکثر شدید بارشیں اور سیلاب آتے رہتے تھے۔ اب اس سیلاب کو ہم طوفانِ نوح کہ لیں یا بابلی رزمیہ کے ہیرو اتنا شتم کا سیلاب' بات ایک ہی ہے اور مراد بھی ایک ہی طوفان سے ہے۔''

منکرین طوفان کے استدلال کے خلاف اور الہامی کتب کی تائید میں ایک ثبوت قدرت نے انگریز ماہر اثریات سر لیونارڈ وولی کی ان کھدائیوں کے ذریعے سے پہنچا دیا جو انھوں نے عراق میں کیں۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ سر وولی 1929ء میں قدیم عراق کے شہر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وطن مالوف ار میں ایک جگہ کھدائی کرا رہے تھے کہ غیر متوقع طور پر آبادی کے نشانات ختم ہو گئے اور صاف چکنی مٹی کی تہ نکل آئی۔ وولی اس چیز کو مان نہ سکے کہ مسلسل مدنیت کے آثار یوں یک لخت ختم ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے کھدائی برابر جاری رکھی۔ چنانچہ آٹھ فٹ سے کچھ ہی زیادہ موٹی تہ کے بعد حسب توقع کھنڈر پھر شروع ہو گئے۔ اس جگہ سے شمال مغرب میں تین سو گز پرے ہٹ کر کھدائی کی گئی تو وہاں بھی چکنی مٹی کی ایسی ہی تہ پائی گئی۔

آخر اس غیر معمولی تہ کا کیا راز تھا؟ اور یہ مٹی جو عراق کی دو تہذیبوں کے درمیان گویا حد فاصل کا کام دے رہی تھی' کہاں سے آئی؟ چنانچہ وولی کو بجا طور پر خیال گزرا کہ اس نے طوفان نوح کی اثری شہادت کا سراغ پا لیا ہے اور اتنی موٹی تہ کسی بڑے ہی خوف ناک طوفان کی جمائی ہوئی تھی۔ ایسا ہول ناک طوفان جس کی مثال مقامی تاریخ میں کوئی نہ ہو گی اور جسے لوگ عرصہ دراز تک نہ بھول سکے۔ سمیری حکایات میں اسی طوفان کا ذکر ہے۔ اسی طوفان کی جانب قرآن کریم اور دیگر مذہبی کتب میں اشارے ہیں۔

عام طور پر مشہور ہے کہ ساری دنیا طوفان کی لپیٹ میں آ گئی تھی' لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہوا اور نہ عقل ہی اسے تسلیم کر سکتی ہے۔ بابل کی قدیم رزمیہ ''گلگامش'' میں بھی سیلاب کی داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوتاؤں نے طوفان ایک مخصوص شہر یا علاقے کی تباہی کے لیے بھیجا تھا۔ قرآن کی رُو سے بھی طوفان عالم گیر نہ تھا۔ البتہ بائبل کا انداز اس قسم کا ہے' گویا یہ سیلاب ساری دنیا کا احاطہ کر گیا تھا۔

سر لیونارڈ وولی نے طوفان کی جمائی ہوئی مٹی کی جو تہ نکالی ہے' اس کے اوپر سومیری قوم کے آثار تمدن تھے۔ لیکن اس کے نیچے سومیریوں اور اس قوم کے مخلوط آثار تھے جو وادی دجلہ و فرات میں سومیریوں سے پہلے آباد تھی۔ گویا یہ طوفان سومیریوں اور ان کی پیش تر قوم کے سر سے گزرا تھا۔ سومیری تو عموماً پختہ شہروں میں آباد تھے اور ان کے یہ شہر اونچی جگہوں پر بنے ہوئے تھے۔ اور غیر سومیری لوگ نشیب میں واقع کچے دیہات میں رہتے تھے۔ ان کے کچھ شہر بچ رہے تھے اور یہ یقیناً وہ تھے جو پختہ تھے اور بہت بلندی پر آباد تھے۔

طوفان کے مقامی ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ حضرت نوح کی کشتی کے بارے میں یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ کشتی کوہ جودی پر جا کر رُک گئی۔ جودی پہاڑ عراق کے شمال میں کردستان کے علاقے جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ بائبل میں جو ارارات کا ذکر آتا ہے' وہ اسی سلسلہ کوہ کا معروف نام ہے اور جبل جودی اسی سلسلے میں ایک پہاڑ ہے اور اسی پہاڑ نے ارارات اور گرجستان کے سلسلہ ہائے کوہ کو باہم ملا دیا ہے۔ یہ قدیم تاریخوں میں کشتی ٹھہرنے کی جگہ بتائی گئی ہے۔

تاریخ انسانیت کا یہ واقعہ اہلِ عقل و شعور کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ آج سے ہزاروں سال قبل' ایک قوم نے اللہ کی نافرمانی پر اصرار کیا اور اس کے بھیجے ہوئے رسول کے رُشد و ہدایت کے پیغام کو جھٹلایا' ٹھکرایا اور قبول کرنے سے انکار کر دیا' ان کے بڑوں نے عوام سے صاف صاف کہ دیا کہ تم کسی طرح ودّ' سواع' یغوث' یعوق اور نسر جیسے دیوتاؤں کے بتوں کی پرستش نہ چھوڑو۔ پس اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی یہ دُعا قبول کر لی: ''اے پروردگار' تو کافروں میں سے کسی کو بھی زمین پر باقی نہ چھوڑ۔ اگر تو انھیں یوں ہی چھوڑ دے گا تو یہ تیرے بندوں کو بھی گم راہ کریں گے اور ان کی نسل بھی انھی کی طرح نافرمان ہو گی۔'' اللہ نے اپنی قدرت کا مظاہرہ کیا اور ایسے سرکشوں کو زبردست طوفان باد و باراں میں غرق کر کے تباہ و برباد کر دیا' اور اسی حالت میں حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی مختصر سی ایمان دار جماعت کو محفوظ رکھ کر نجات دی۔ طوفان میں حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا یام (کنعان) اور ان کی کافرہ بیوی بھی ہلاک ہوئی۔

حضرت ہود علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے یام (کنعان) تو طوفان میں غرق ہو گیا اور باقی تین سے مختلف براعظموں میں اقوام پھیلیں۔ پہلے بیٹے سام تھے جن سے ایشیائی اقوام کا ظہور ہوا' جن میں عرب اور یہود بھی شامل ہیں۔

دوسرے بیٹے حام سے حامی یعنی افریقہ کے حبشی اور تیسرے بیٹے یافث سے یورپی اقوام کا سلسلہ چلا۔ سام کے پانچ بیٹوں کے نام یہ تھے۔ عیلام' اشور' ارفکسد' لوذ اور ارم۔ ارفکسد کے بیٹے کا نام سلح تھا۔ اس سے عبر پیدا ہوا۔ عبر کے دو بیٹے تھے' قحطان اور فلج۔ بنی قحطان جنوبی عرب میں یمن سے ظفار تک آباد ہوئی جو حضر موت کے مشرق میں ہے۔ ارم کے بیٹے عوض سے عاد پیدا ہوئے۔ اسی کو قومِ عاد کا مورث اعلیٰ سمجھنا چاہیے۔ حضرت ہود علیہ السلام کو قوم عاد کا پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔

قرآن مجید میں حضرت ہود علیہ السلام کا ذکر تین سورتوں کی سات آیات میں آیا ہے۔ تفصیل یہ ہے: سورۂ اعراف 65۔ سورۂ ہود 50'53'58'60'89۔ سورۂ شعراء 124۔ قوم عاد کا ذکر نو سورتوں میں ہوا ہے یعنی اعراف' ہود' مومنون' شعراء' حٰم سجدہ' احقاف' ذاریات' قمر اور حاقہ۔

حضرت ہود اور عاد کا زمانہ عروج 2200 تا 1700 قبل مسیح کا ہے۔ ان کا مسکن قرآن کی رو سے احقاف کا علاقہ تھا۔ احقاف کے لغوی معنی ہیں ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ پہنچے ہوں' لیکن اصطلاح میں یہ صحرائے عرب (الربع الخالی) کے جنوبی مغربی حصے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی بلاد احقاف کے تحت لکھتے ہیں: ''یمامہ' عمان' بحرین' حضر موت اور مغربی یمن کے بیچ میں جو صحرائے اعظم ''ربع خالی'' کے نام سے واقع ہے' اس کے اطراف میں کہیں کہیں آبادی کے لائق تھوڑی تھوڑی زمین ہے' خصوصاً اس حصے میں جو حضر موت سے نجران تک پھیلا ہوا ہے۔ عہد قدیم میں اسی علاقے میں ''عاد ارم'' کا مشہور قبیلہ آباد تھا۔ یہ لوگ دولت مند' خوش حال اور باعظمت تھے۔ اسی تکبر میں عرب سے نکل کر شام' مصر اور بابل کی طرف بڑھے اور ان علاقوں میں جا کر زبردست حکومتوں کی بنیاد رکھی۔ اب چوں کہ یہ اپنے مستقر سے نکل کر چلے گئے تھے۔ اس لیے عرب طنزاً ان باہر جانے والوں کو امم بائدہ (ہلاک ہو جانے والی اقوام) یا عرب عاربہ (خالص عرب) اور ان کی مختلف جماعتوں کے افراد کو عاد' ثمود' طسم اور جدیس کہتے ہیں۔ (تاریخ ارض القرآن جلد اول)

مولانا مودودی عاد کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''یہ عرب کی قدیم ترین قوم تھی جس کے افسانے اہلِ عرب میں زبان زد عام تھے۔ بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ ان کی شوکت و حشمت ضرب المثل تھی۔ پھر دنیا سے ان کا نام و نشان تک مٹ جانا بھی ضرب المثل ہو کر رہ گیا تھا۔ اسی شہرت کی وجہ سے عربی زبان میں ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے۔ آثار قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں۔ جس زمین کے مالک باقی نہ رہے ہوں' اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے افتادہ پڑی ہوئی ہو' اسے ''عادی الارض'' کہا جاتا ہے۔ قدیم عربی شاعری میں ہمیں بڑی کثرت سے اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ عرب کے ماہرین انساب بھی اپنے ملک کی معدوم شدہ اقوام میں سب سے پہلے قوم عاد ہی کا نام لیتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بنی ذہل بن شیبان کے ایک صاحب آئے جو عاد کے علاقے کے رہنے والے تھے اور انھوں نے وہ قصے حضور ﷺ کو سنائے جو اس قوم کے متعلق قدیم زمانوں سے ان کے علاقے کے لوگوں میں نقل ہوتے چلے آ رہے تھے۔''

قوم نوح کی ''طوفانی'' تباہی کے بعد دنیا میں جس قوم کو عروج عطا کیا گیا' وہ یہی قوم تھی۔ ''یاد کرو اللہ کے اس فضل و انعام کو کہ نوح کی قوم کے بعد اس نے تمھیں خلیفہ بنایا (اعراف 69:7) جسمانی حیثیت سے یہ بڑے تنومند اور زور آور لوگ تھے: ''اور تمھیں جسمانی ساخت میں خوب تنومند کیا۔'' (اعراف 69:7) اپنے دور میں یہ بے نظیر قوم تھی۔ کوئی دوسری قوم اس کے برابر کی نہ تھی۔ ''جس کے مانند ملکوں میں کوئی قوم پیدا نہیں کی گئی۔'' (فجر 8:89)

قوم عاد کا تمدن بڑا شاندار تھا۔ اونچے اونچے ستونوں کی بلند و بالا عمارتیں بنانا اس کی وہ خصوصیت تھی جس کے لیے وہ اس وقت کی دنیا میں مشہور تھی۔ ''تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے کیا کیا اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ'' (فجر 89: 7-6) اس مادی اور جسمانی زور آوری نے انھیں سخت متکبر بنا دیا تھا اور انھیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ تھا: ''رہے عاد' تو انھوں نے زمین میں حق کی راہ سے ہٹ کر تکبر کی روش اختیار کی اور کہنے لگے کہ کون ہے ہم سے زیادہ زور آور؟'' (حٰم سجدہ 41: 15) ان کا سیاسی و معاشی نظام چند بڑے بڑے جباروں کے ہاتھ میں تھا جن کے آگے کوئی دم نہ مار سکتا تھا: ''اور انھوں نے ہر جبار دشمن حق کے حکم کی پیروی کی۔''

مذہبی عقائد کے لحاظ سے یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے منکر نہ تھے' بلکہ شرک میں مبتلا تھے۔ انھیں اس بات سے انکار تھا کہ بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے۔ وہ بت پرست تھے اور ستاروں کی بھی پرستش کرتے تھے۔ یہ شاندار اور زبردست قوم گم راہ ہو چکی تھی۔ کردار و اخلاق کے اعتبار سے نچلی سطح پر تھی۔ شیطنت ان کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ دولت و ثروت اور عقل و دانش کے باوجود راہِ حق سے بھٹک چکے تھے۔ رزق دینے' بارش برسانے' اولاد دینے' تن درستی عطا کرنے اور مختلف حاجات کے لیے انھوں نے الگ الگ بت تراش رکھے تھے' جنھیں وہ معبود سمجھ کر ان کی پرستش کرتے تھے۔

تب اللہ تعالیٰ نے انھی میں سے ایک پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت ہود علیہ السلام عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرد تھے۔ سرخ و سپید رنگ اور وجیہ تھے۔ ان کی ڈاڑھی بڑی تھی۔ انھوں نے اپنی قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دی اور لوگوں پر ظلم و جور کرنے سے منع فرمایا' مگر عاد نے ایک نہ مانی اور انھیں سختی سے جھٹلایا اور غرور و تکبر کے ساتھ کہنے لگے کہ آج دنیا میں ہم سے زیادہ شوکت و جبروت کا مالک کون ہے۔ مگر حضرت ہود علیہ السلام مسلسل اسلام کی تبلیغ میں لگے رہے۔ وہ اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈراتے۔ غرور و سرکشی کے قدرتی نتائج بتا کر قوم نوح کے واقعات یاد دلاتے۔ بار بار یہ بھی دہراتے کہ میں تم سے کسی اجر و عوض کا خواہاں نہیں۔ میرا اجر تو خدا ہی کے پاس ہے۔

عاد کو حضرت ہود علیہ السلام کی یہ نصیحتیں سخت شاق گزرتی تھیں۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے عقائد و خیالات و اعمال میں کوئی بھی شخص حائل ہو۔ اس

لیے انھوں نے اب یہ روش اختیار کی کہ حضرت ہود علیہ السلام کا مذاق اڑایا۔ انھیں بے وقوف گردانا اور ان کے دلائل و براہین اور صداقتوں کو جھٹلانا شروع کر دیا۔

حضرت ہود علیہ السلام اور ان کی قوم عاد کے واقعات کی تفصیل نہایت عبرت آموز طریقے سے قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن حکیم کے علاوہ تاریخ کی کوئی کتاب یا توراۃ عاد کے متعلق روشنی نہیں ڈالتی۔ اس لیے اس قوم کے حالات یہاں قرآن عزیز کی آیات کی روشنی میں دیئے جا رہے ہیں:

''اور اسی طرح ہم نے قوم عاد میں ان کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا ''اے برادران قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ پھر کیا تم غلط روی سے پرہیز نہ کرو گے؟'' اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر رہے تھے' جواب میں کہا'': ہم تو تمھیں بے عقلی میں مبتلا سمجھتے ہیں' اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو' اس نے کہا: ''اے برادران قوم' میں بے عقلی میں مبتلا نہیں ہوں' بلکہ میں رب العالمین کا رسول ہوں۔ تمھیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں' اور تمھارا ایسا خیر خواہ ہوں' جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ کیا تمھیں اس بات پر تعجب ہوا کہ تمھارے پاس خود تمھاری اپنی قوم کے ایک آدمی کے ذریعے سے تمھارے رب کی یاد دہانی آئی' تا کہ وہ تمھیں خبردار کرے؟ بھول نہ جاؤ کہ تمھارے رب نے نوح علیہ السلام کی قوم کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا اور تمھیں خوب تنومند کیا۔ پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو' امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔'' انھوں نے جواب دیا: ''کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے اللہ ہی کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں؟ اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے' اگر تو سچا ہے۔'' اس نے کہا: ''تمھارے رب کی پھٹکار تم پر پڑ گئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا۔ کیا تم مجھ سے ان ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں' جن کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ اچھا تو تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرتا ہوں۔'' آخر کار ہم نے اپنی مہربانی سے ہود علیہ السلام اور اس کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی جو ہماری آیات کو جھٹلا چکے تھے اور ایمان لانے والے نہ تھے۔''

(الاعراف 7:65 تا 72)

حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اللہ کی نعمتیں یاد دلائیں۔ یہ بھی جتایا کہ میں کوئی عوض یا بدلہ اپنی خدمات کے صلے میں نہیں چاہتا۔ پھر بھی عاد اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے۔ ''اور ہم نے عاد کی طرف ان کے بھائی بندوں میں سے ہود علیہ السلام کو بھیجا۔ اس نے کہا: ''اے برادران قوم' اللہ کی بندگی کرو۔ تمھارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادران قوم' اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اس کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے؟ اور اے میری قوم کے لوگو' اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دے گا اور تمھاری موجودہ قوت پر مزید قوت کا اضافہ کرے گا۔ مجرموں کی طرح منہ نہ پھیرو۔''

''انھوں نے جواب دیا: ''اے ہود' تو ہمارے پاس کوئی صریح شہادت لے کر نہیں آیا ہے' اور تیرے کہنے سے تو ہم اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے' اور تجھ پر ہم ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے اوپر ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے۔''

''ہود نے کہا: میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں۔ اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے' اس سے میں بے زار ہوں۔ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو۔ میرا بھروسا اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ کوئی جان دار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ اگر تم منہ پھیرتے ہو تو پھیر لو۔ جو پیغام دے کر میں تمھارے پاس بھیجا گیا تھا' وہ میں تمھیں پہنچا چکا ہوں۔ اب میرا رب تمھاری جگہ دوسری قوم کو اٹھائے گا اور تم اس کا کچھ نہ بگاڑ سکو گے۔ یقیناً میرا رب ہر چیز پر نگران ہے۔''

''پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے ہود کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے نجات دے دی اور ایک سخت عذاب سے انھیں بچا لیا۔ یہ ہیں عاد' اپنے رب کی آیات سے انھوں نے انکار کیا۔ اس کے رسولوں کی بات نہ مانی' اور ہر جبار دشمن حق کی پیروی کرتے رہے۔ آخر کار اس دنیا میں بھی ان پر پھٹکار پڑی اور قیامت کے روز بھی۔ سنو' عاد نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو' دور پھینک دیئے گئے عاد۔ ہود کی قوم کے لوگ۔''

یہ سورۂ ہود 11 کی آیات 50 تا 60 کا ترجمہ ہے۔ اب سورۂ مومنون 23 کی آیات 31 تا 41 کا ترجمہ ملاحظہ ہو کہ اس میں چند مزید نکتے غور و فکر کے لیے اٹھائے گئے ہیں: ''ان (نوح علیہ السلام) کے بعد ہم نے ایک دوسرے دور کی قوم اُٹھائی۔ پھر ان میں خود انھی کی قوم کا ایک رسول بھیجا' جس نے انھیں دعوت دی کہ اللہ کی بندگی کرو۔ تمھارے لیے اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے۔ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ اس کی قوم کے سرداروں نے ماننے سے انکار کیا اور آخرت کی پیشی کو جھٹلایا' جنھیں ہم نے دنیا کی زندگی میں آسودہ کر رکھا تھا' وہ کہنے لگے: ''یہ شخص کچھ نہیں ہے' محض ایک بشر تم ہی جیسا۔ جو کچھ تم کھاتے ہو' وہی یہ کھاتا ہے' اور جو کچھ تم پیتے ہو' وہی یہ پیتا ہے۔ اب اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک بشر کی اطاعت قبول کر لی تو گھاٹے ہی میں رہے۔ یہ تمھیں اطلاع دیتا ہے کہ جب تم مر کر مٹی ہو جاؤ گے اور ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ جاؤ گے' اس وقت تم قبروں سے نکالے جاؤ گے؟ بعید' بالکل بعید ہے یہ وعدہ جو تم سے کیا جا رہا ہے۔ زندگی کچھ نہیں ہے' مگر بس یہی دنیا کی زندگی۔ یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے' اور ہم ہرگز اٹھائے جانے والے نہیں ہیں۔ یہ شخص خدا کے نام پر محض جھوٹ گھڑ رہا ہے' اور ہم کبھی اس کی ماننے والے نہیں ہیں۔'' رسول علیہ السلام نے کہا: ''پروردگار' ان لوگوں نے جو میری تکذیب کی ہے' اس پر اب تو ہی میری نصرت فرما۔'' جواب میں ارشاد ہوا:

''قریب ہے وہ وقت جب یہ اپنے کیے پر پچھتائیں گے۔'' آخر کار ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ایک ہنگامہ عظیم نے انھیں آلیا اور ہم نے انھیں کچرا بنا کر پھینک دیا۔ دور ہو ظالم قوم''!

سورۂ احقاف 46 کی آیات 21 تا 28 میں قصے نے ایک نیا رخ اختیار کیا ہے۔

''ذرا انھیں عاد کے بھائی (ہود علیہ السلام) کا قصہ سناؤ' جب کہ اس نے احقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا۔ اور ایسے خبردار کرنے والے اس سے پہلے بھی گزر چکے تھے' اور اس کے بعد بھی آتے رہے۔ کہ ''اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔ مجھے تمھارے حق میں ایک بڑے ہول ناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔'' انھوں نے کہا: ''کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں بہکا کر ہمارے معبودوں سے برگشتہ کر دے؟ اچھا تو لے آ' اپنا وہ عذاب جس سے تو ہمیں ڈراتا ہے' اگر واقعی تو سچا ہے۔'' اس نے کہا کہ ''اس کا علم تو صرف اللہ ہی کو ہے۔ میں صرف وہ پیغام تمھیں پہنچا رہا ہوں' جسے دے کر مجھے بھیجا گیا ہے۔ مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ جہالت برت رہے ہو۔'' پھر جب انھوں نے اس عذاب کو اپنی وادیوں کی طرف آتے دیکھا تو کہنے لگے'': یہ بادل ہے جو ہمیں سیراب کر دے گا''' ''نہیں' بلکہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے۔ یہ ہوا کا طوفان ہے جس میں دردناک عذاب چلا آ رہا ہے' اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تباہ کر ڈالے گا۔'' آخر کار ان کا حال یہ ہوا کہ ان کے رہنے کی جگہوں کے سوا وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح ہم مجرموں کو بدلہ دیا کرتے ہیں۔ انھیں ہم نے وہ کچھ دیا تھا جو تم لوگوں کو نہیں دیا ہے۔ انھیں ہم نے کان' آنکھیں' اور دل' سب کچھ دے رکھے تھے' مگر نہ وہ کان ان کے کسی کام آئے' نہ آنکھیں نہ دل' کیوں کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے' اور اسی چیز کے پھیر میں وہ آ گئے' جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے''

وہ انجام ہونا ہی تھا جو بالآخر ہو کر رہا'': آخر کار ہم نے چند منحوس دنوں میں سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی' تا کہ انھیں دنیا ہی کی زندگی میں ذلت و رسوائی کے عذاب کا مزا چکھا دیں'' اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ فیصلہ سورۂ حم السجدۃ 41 کی آیت 16 میں صادر کر دیا۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اس عذاب کی جو تفصیل آئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ عذاب ہوا کی صورت میں آیا اور یہ ہوا مسلسل سات رات اور آٹھ دن تک چلتی رہی۔ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے' جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں (حاقہ 69:7)۔ جس چیز پر سے بھی یہ ہوا گزر گئی' اسے بوسیدہ کر کے رکھ دیا۔ (ذاریات 42:51) جس وقت یہ ہوا آ رہی تھی' اس وقت عاد کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے کہ خوب گھٹا گھر کر آئی ہے' بارش ہو گی اور سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے گا۔ مگر وہ آئی تو اس طرح آئی کہ اس نے ان کے پورے علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیا:

''ہم نے ایک پیہم نحوست کے دن سخت طوفانی ہوا ان پر بھیج دی جو لوگوں کو اٹھا اٹھا کر اس طرح پھینک رہی تھی' جیسے وہ جڑ سے اکھڑے ہوئے کھجور کے تنے ہوں ('' سورۂ قمر 19:54۔20)

اس عذاب سے حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے مومن ساتھی بچا لیے گئے۔ اور یوں عادِ اولیٰ ہلاک ہوئے۔ عادِ اولیٰ وہ لوگ تھے' جنھوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی پچاس برس کی تبلیغ پر لبیک نہ کہی اور عذاب سے ہلاک ہوئے۔ عاد ثانیہ وہ لوگ تھے' جنھوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت قبول کی اور عذاب سے پیشتر احقاف کا علاقہ چھوڑ کر محفوظ مقام پر چلے گئے۔

حضرت صالح علیہ السلام

حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے جو شمال مغربی عرب میں اس مقام پر آباد تھی جسے ''وادی القریٰ'' کا نام دیا گیا۔ اس نام کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس وادی میں جابجا چھوٹی چھوٹی بستیاں موجود تھیں۔ وادی القریٰ حجاز اور شام کے مابین عربوں کی اس مشہور تجارتی شاہ راہ پر واقع ہے جو یمن سے بحیرہ قلزم کے ساحل کے کنارے کنارے حجاز و مدین سے گزر کر خلیج عقبہ کے کنارے سے نکل کر شام کو جاتی ہے اور جسے قرآن حکیم میں الحجر یعنی کھلا راستہ کہا گیا ہے۔

قرآن حکیم میں حضرت صالح علیہ السلام کا نام تین سورتوں میں آٹھ مقامات پر آیا ہے' جس کی تفصیل یہ ہے۔: سورۃ الشعرا 143۔

سورۂ اعراف 77' 75' 73۔ سورۂ ہود 89' 66' 62' 61۔ ان کی قوم ثمود کا ذکر نو سورتوں میں آیا ہے یعنی اعراف' ہود' حجر' نمل' حٰم السجدۃ' نجم' قمر' حاقہ' شمس' اور سورۂ الشعرا۔

بائبل حضرت صالح کے ذاتی حالات اور آپ کے دعوتی' تبلیغی اور اصلاحی اقدامات کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔ مشہور مؤرخ علامہ طبری نے آپ کا سلسلہ نسب حضرت نوح علیہ السلام تک اس طرح بیان کیا ہے: (1) حضرت نوح علیہ السلام (2) سام (3) ارام (4) جثر (5) ثمود (6) حضرت صالح علیہ السلام۔

حضرت ہود علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ارفکسد کے پوتے تھے' اور حضرت صالح علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ارام کے پڑپوتے تھے۔

قوم ثمود عرب کی قدیم ترین اقوام میں سے دوسری قوم ہے جو قوم عاد کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہے۔ نزول قرآن سے پہلے اس کے قصے اہل عرب میں زبان زد عوام تھے۔ زمانۂ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت اس کا ذکر ملتا ہے۔ اشوریہ کے کھنڈروں سے جو الواح ملی ہیں' ان سے بھی ان کی شہادت ملتی ہے۔ یونان' اسکندریہ اور روم کے قدیم مؤرخین اور جغرافیہ نویس بھی اس کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایاجات موجود تھے۔ چنانچہ رومی مؤرخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے' جن سے ان کی پرانی دشمنی تھی۔

قوم ثمود کا مسکن شمال مغربی عرب کا وہ علاقہ تھا جو آج بھی ''الحجر'' کے نام سے موسوم ہے۔ موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک سٹیشن

پڑتا ہے جسے ''مدائن صالح'' کہتے ہیں۔ یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور قدیم زمانے میں حجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبے میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں جنھیں ثمود کے لوگوں نے پہاڑوں میں تراش تراش کر بنایا تھا اور اس شہرِ خموشاں کو دیکھ کر اندازہ کیا جاتا ہے کہ کسی وقت اس شہر کی آبادی چار پانچ لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ حجاز کے شمالی حصے میں رابغ سے عقبہ تک اور مدینہ وخیبر سے تیما اور تبوک تک کا سارا علاقہ آج بھی ثمود کے آثار سے بھرا ہوا ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں یہ آثار موجودہ حالت سے کچھ زیادہ ہی واضح اور نمایاں ہوں گے۔

قرآن مجید کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم عاد کی تباہی و بربادی کے بعد عرب کی جس قوم نے شہرت پائی' وہ قوم ثمود تھی۔ اس کا تمدن انتہائی شان دار تھا۔ فن سنگ تراشی اور فنِ تعمیر میں اس قوم نے بڑی ترقی اور عظمت حاصل کی تھی۔ یہ لوگ پہاڑ کاٹ کاٹ کر نہایت شان دار اور پائدار عمارتیں بناتے تھے۔ چنانچہ حضرت صالح علیہ السلام بڑے ناصحانہ انداز میں انھیں یاد دلاتے ہیں: ''یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمھیں اس کا جانشین بنایا اور تمھیں زمین میں منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالی شان محل بناتے ہو اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو۔ پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو''(اعراف 74:7)

قومِ ثمود کی عمارت سازی اور یادگاریں تعمیر کرنے کا شوق دراصل ان کی معاشی خوش حالی اور فارغ البالی کا نتیجہ تھا۔ ان کے کھیت اور باغات سرسبز وشاداب اور پُرثمر تھے۔ عمدہ قسم کے پھلوں کی بہتات تھی۔ حضرت صالح علیہ السلام اللہ کی نعمتیں یاد دلا کر اس کے شکر گزار اور فرماں بردار بندوں کی حیثیت سے انھیں زندگی بسر کرنے کی ترغیب اس طرح دیتے ہیں:

''کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں' بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیئے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں' ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں۔ تم پہاڑ کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو''(شعرا 26:146 تا 150)

جس طرح عاد تنومند' زور آور' دراز قد اور قوی ہیکل تھے' اسی طرح ثمود بھی قوی الجثہ' طاقت ور اور طویل العمر لوگ تھے۔ عاد نے سب سے پہلے اونچے اونچے ستونوں پر بلند و بالا عمارتیں بنانے کا فن ایجاد کیا تو ثمود نے پہاڑ تراش کر عالی شان محلات بنانے کے فن سے دنیا کو روشناس کرایا۔ جنوبی ہند میں ایلورا اور اجنتا میں پہاڑ تراش کر بنائی گئی عمارتیں ثمود ہی کی تقلید کے شاہ کار ہیں۔''

جیسا کہ اوپر بیان ہوا' قرآن مجید کی نو سورتوں میں قوم ثمود کا ذکر آیا ہے۔ ان سورتوں کی متعلقہ آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کے مذہبی' معاشی' سماجی سیاسی حالات اور نظامِ حیات کا جو نقشہ سامنے آتا ہے' اس کا خلاصہ حافظ فروغ احسن اس طرح بیان کرتے ہیں:

''وہ اللہ کو سب سے بڑا رب ماننے کے باوجود کچھ اور ہستیوں کو بھی اس کی خدائی میں شریک سمجھتے تھے اور ان کی بندگی بھی بجالاتے تھے۔ ان کی پوجا پاٹ بھی کرتے تھے اور ان کے آستانوں پر نذریں اور نیازیں بھی چڑھاتے تھے۔ اس شرک نے ان کے سماج میں بھی تفریق پیدا کر دی تھی۔ ایک طبقہ اونچا اور مراعات یافتہ قرار پایا اور دوسرا طبقہ وہ جو ہر قسم کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم تھا۔ اقتصادی لحاظ سے یہ لوگ بڑے خوش حال' فارغ البال اور مال دار تھے' لیکن آہستہ آہستہ اونچے طبقے نے تمام وسائل معاش پر قبضہ کر کے پسماندہ طبقے کو اپنا دست نگر بنالیا۔ اس خوش حالی اور فارغ البالی نے قوم کے کھاتے پیتے لوگوں میں مادہ پرستی اور نفس پرستی کے رجحانات کو جنون کی حد تک پروان چڑھایا۔ انھوں نے اپنی شان وشوکت اور دولت وحشمت کے اظہار کی خاطر بڑے بڑے قصر' محلات اور یادگاریں تعمیر کیں۔ اس طرح وہ تمدن پروان چڑھا جس میں ایک طرف تو بلاضرورت بلند و بالا اور رفیع الشان عمارتیں تعمیر ہوئیں اور دوسری طرف کچھ لوگوں کو سر چھپانے کے لیے بھی مناسب جگہ میسر نہ تھی۔ اس طبقاتی اور استحصالی نظامِ معاشرت نے پوری قوم میں مفاد پرستی کی ایک دوڑ شروع کر دی۔ جس کے نتیجے میں ان کی اجتماعی اور سیاسی قیادت پر وہ خود غرض اور مفاد پرست لوگ قابض ہو گئے جو ہر قسم کی اخلاقی شرافت اور تعمیری اور اصلاحی صلاحیتوں سے محروم تھے۔ چنانچہ قرآن مجید ان کے قائدین کے مفسدانہ طرزِ عمل کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''اس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح کا کوئی کام نہ کرتے تھے۔''

اللہ کے برگزیدہ نبی حضرت صالح علیہ السلام نے ایک روحانی طبیب حاذق کی حیثیت سے اپنی قوم کی روحانی' اخلاقی اور سماجی بیماریوں کے قلع قمع کے لیے ایک تین نکاتی منشور پیش کیا۔ یہ منشور صرف مذہبی عقائد کی اصلاح تک محدود نہ تھا' بلکہ ایک نہایت جامع' ہمہ گیر اور ہمہ پہلو انقلابی منشور تھا۔ اس میں ذہنوں کی تطہیر کا بھی سامان تھا اور سیرت وکردار کی تعمیر کا بھی۔ اس میں اصلاح معاشرہ کا پروگرام بھی شامل تھا اور شر وفساد پھیلانے والی سیاسی قیادت کو ہٹا کر اس کی جگہ تعمیر واصلاح کا آہنی عزم رکھنے والی ٹیم کے ہاتھوں میں زمامِ قیادت تھمانے کا منصوبہ بھی۔

قرآنِ مجید میں اس کا ذکر یوں آیا ہے: ''ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالح علیہ السلام نے ان سے کہا: ''کیا تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو رب العالمین کے ذمہ ہے۔ کیا تم ان سب چیزوں کے درمیان جو یہاں ہیں' بس یوں ہی اطمینان سے رہنے دیئے جاؤ گے؟ ان باغوں اور چشموں میں؟ ان کھیتوں اور نخلستانوں میں جن کے خوشے رس بھرے ہیں؟ تم پہاڑ کھود کھود کر فخریہ ان میں عمارتیں بناتے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔''

حضرت صالح علیہ السلام کو فساد بپا کرنے والے سرداروں پر تنقید کرنے کے ساتھ اپنے آپ کو بطور راہ نُما و مقتدا پیش کرنے کی جرأت اس لیے بھی ہوئی کہ قوم آپ علیہ السلام کی فہم و فراست، دیانت و صداقت اور آپ کے اعلیٰ کردار کی، آپ کے اعلانِ نبوت سے پہلے ہی معترف تھی، چنانچہ آپ نے اپنا اصلاحی پروگرام پیش کیا تو لوگوں نے بے ساختہ کہا: ''اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے، اس کے بارے میں ہمیں سخت شبہ ہے، جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے۔''
(ہود 11:61 تا 68)

قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام کی نبوت تسلیم کرنے اور آپ کی قیادت و سیادت ماننے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کی وجوہ یہ تھیں:

1: حضرت صالح علیہ السلام ایک بشر ہیں۔ وہ انسانیت سے بالاتر نہیں ہیں۔ پھر ان کی بڑائی اور نبوت کیسے تسلیم کی جائے؟

2: وہ ہماری قوم ہی کے ایک فرد ہیں، اس لیے انھیں ہم پر کسی صورت بھی بالاتری حاصل نہیں۔

3: وہ عام آدمی ہیں، وہ اکیلے ہیں، کوئی بڑے سردار اور رئیس نہیں۔

ثمود کا نقطہ نظر یہ تھا کہ نبی یا تو کوئی فوق البشر ہستی ہو یا اگر وہ انسان ہی ہو تو ہمارے ملک اور ہماری قوم میں پیدا نہ ہوا ہو، بلکہ کہیں اُوپر سے اُتر کر آئے یا باہر سے بھیجا جائے۔ اور اگر یہ بھی نہیں تو کم از کم اُسے کوئی رئیس اور جتھا دار ہونا چاہیے، جس کی غیر معمولی شان و شوکت کی وجہ سے مان لیا جائے کہ خدا نے ہماری راہ نُمائی اور قیادت کے لیے مناسب انتخاب کیا ہے۔ قرآن مجید نے اس قوم کے دلائل اور ان کے اعتراضات کو نہایت جامع انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

''ثمود نے تنبیہات کو جھٹلایا اور کہنے لگے: ''ایک اکیلا آدمی جو ہم ہی میں سے ہے، کیا اب ہم اس کے پیچھے چلیں؟ اس کا اتباع ہم قبول کر لیں، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم بہک گئے ہیں اور ہماری عقل ماری گئی ہے۔ کیا ہمارے درمیان بس یہی ایک شخص تھا جس پر خدا کا ذکر نازل کیا گیا؟ نہیں، بلکہ یہ پرلے درجے کا جھوٹا اور برخود غلط ہے۔'' (قمر 54:23 تا 25)

قومِ ثمود معاشی اور سماجی لحاظ سے دو طبقوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک اونچا طبقہ جو ہر قسم کے مادی ساز و سامان سے لیس تھا اور دوسرا وہ طبقہ جو زندگی کی بنیادی سہولتوں سے بھی محروم تھا۔ اونچے طبقے نے اپنے مفادات کا جال کچھ اس طرح بچھا رکھا تھا کہ کسی کم زور اور پس ماندہ شخص کے لیے ان کے حلقہ تصرف و اقتدار سے باہر نکلنا سخت دشوار تھا۔ لیکن جب حضرت صالح علیہ السلام نے دعوت توحید کا آغاز کیا تو نچلے طبقے کے کچھ لوگ جرأت و ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپ پر ایمان لے آئے اور یوں قوم میں ایک کش مکش شروع ہو گئی، جس کا ذکر قرآن مجید اس طرح کرتا ہے:

''اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی بندوں میں سے صالح علیہ السلام کو بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو تو یکا یک وہ دو متخاصم فریق بن گئے۔ صالح علیہ السلام نے کہا: ''اے میری قوم کے لوگو! بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو؟ کیوں نہیں اللہ سے مغفرت کرتے؟ شاید کہ تم پر رحم فرمایا جائے؟'' انھوں نے کہا: ''ہم نے تو تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو بدشگونی کا نشان پایا ہے۔'' صالح نے جواب دیا: ''تمھارے نیک و بد شگون کا سر رشتہ تو اللہ کے پاس ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم لوگوں کی آزمائش ہو رہی ہے۔ اس شہر میں نو جتھے دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انھوں نے آپس میں کہا ''خدا کی قسم کھا کر عہد کر لو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔''
(نمل 27:45 تا 49)

قوم کے رئیس اور نو سردارانِ قبائل جو اللہ کے نبی کی اصلاحی تحریک میں اپنے مسرفانہ اور مفسدانہ طرزِ زندگی کی موت دیکھ رہے تھے اور انھیں محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کی چودھراہٹ اور ان کی خدائی کا سنگھاسن متزلزل ہو رہا ہے، انھوں نے اپنی اصلاح کی طرف توجہ دینے کی بجائے اللہ کے نبی کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کی مہم شروع کر دی۔ دوسری طرف حضرت صالح علیہ السلام سے کہنا شروع کیا کہ تم نے قومی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے، اس لیے تمھارا وجود تمھاری دعوت اور تحریک قومی و ملکی نقطہ نظر سے نہایت منحوس ثابت ہو رہے ہیں اور تم اپنی نبوت کے دعوے میں جھوٹے ہو۔ اور اگر سچے ہو تو وہ عذاب ہم پر جلد سے جلد لے آؤ جس سے تم ہر وقت ہمیں ڈراتے رہتے ہو۔

قومِ ثمود میں حق و باطل کی یہ کش مکش پوری شدت سے جاری رہی۔ آخر کار انھوں نے اللہ کے نبی کو زچ کرنے کے لیے مطالبہ کیا: ''اے صالح! تو محض ایک سحر زدہ آدمی ہے۔ تو ہم جیسے ایک انسان کے سوا اور کیا ہے؟ لا کوئی نشانی، اگر تو سچا ہے۔''
(شعرا 26:153، 154)

اللہ تعالیٰ نے ان مخالفین کو لاجواب کرنے اور اپنے نبی کی صداقت ظاہر کرنے کے لیے ان کے اس مطالبے کو پورا کرنے کا فیصلہ کر دیا۔ چنانچہ اللہ کے حکم سے حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا: ''نشانی کے طور پر یہ اونٹنی ہے۔ ایک دن اس کے پانی پینے کا ہے اور ایک دن تم سب کے پانی لینے کا۔ اسے ہرگز نہ چھیڑنا، ورنہ ایک بڑے دن کا عذاب تمھیں آ لے گا'' (شعرا 26:155، 156)

اس اونٹنی کو اللہ کی نشانی قرار دیتے ہوئے حضرت صالح علیہ السلام اپنی قوم کے سرکشوں کو متنبہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ اللہ کی اونٹنی تمھارے لیے ایک نشانی کے طور پر ہے۔ لہٰذا اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے۔ اسے کسی برے ارادے سے ہاتھ نہ لگانا، ورنہ ایک دردناک عذاب تمھیں آ لے گا۔'' (اعراف 7:73)

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کی طرف سے معجزے کے مطالبے کے جواب

جو اونٹنی پیش کی تھی۔ ظاہر ہے وہ کوئی معمولی اونٹنی نہ ہوگی، جیسی ہر عرب کے پاس اس وقت پائی جاتی تھی، بلکہ ضرور اس کی پیدائش اس کی خلقت اور اس کے ظہور میں کوئی ایسی چیز تھی جسے معجزے کے طور پر پیش کرنا معقول ہوتا۔ مزید برآں حضرت صالح علیہ السلام کی طرف سے یہ چیلنج بھی بڑا سخت تھا کہ ایک دن تنہا وہ اونٹنی تمھارے کنوؤں اور چشموں سے پانی پیئے گی اور ایک دن ساری قوم کے جانور اور آدمی پانی پییں گے۔ خبردار! اس کی باری کے دن کوئی شخص پانی پینے کی جگہ پھٹکنے نہ پائے۔ نیز وہ تمھاری چراگاہوں، تمھارے کھیتوں اور نخلستانوں میں جہاں چاہے گی، آزادانہ چرتی پھرے گی۔

اب یہ بدبخت قوم اللہ کی اس نشانی یعنی اونٹنی سے سخت پریشان ہو چکی تھی۔ وہ جس جنگل اور کھیت میں چرتی، سب لوگوں کے جانور ڈر کر وہاں سے بھاگ جاتے اور اسی طرح اپنی باری کے دن جس کنوئیں سے پانی پیتی، اسے خالی کر دیتی۔ آخر کار ان مفسدوں نے حضرت صالح علیہ السلام کی تنبیہ پس پشت ڈال کر اسے ہلاک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ایک دن موقع پا کر انھوں نے اپنے سرغنے کو بلایا۔ وہ بدبخت تیار ہو گیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے پھر انتباہ کیا اور روکنا چاہا۔ مگر وہ قوم جو اپنی ہلاکت و بربادی کو خود دعوت دے رہی تھی، نہ مانی اور اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ کر اسے ہلاک کر دیا۔ قرآن مجید اس واقعے کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''ثمود نے اپنی سرکشی کی بنا پر جھٹلایا۔ جب اس قوم کا سب سے زیادہ شقی آدمی بپھر کر اٹھا تو اللہ کے رسول نے ان لوگوں سے کہا کہ خبردار! اللہ کی اونٹنی کو ہاتھ نہ لگانا، اور اس کے پانی پینے میں مانع نہ ہونا۔ مگر انھوں نے اس کی بات کو جھوٹا قرار دیا اور اونٹنی کو مار ڈالا (شمس 91:11 تا 14)

قوم کی سرکشی، خودسری اور بدبختی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اس نے اپنے اس فعل پر نادم اور شرمندہ ہونے کی بجائے پوری ڈھٹائی اور سینہ زوری سے حضرت صالح علیہ السلام کو چیلنج کیا کہ اگر تو واقعی اللہ کا رسول ہے تو ہم پر وہ عذاب مسلط کر دے جس کا تو ہم سے ذکر کیا کرتا ہے۔ قرآن نے حد سے بڑھی ہوئی ان کی سرکشی کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''پھر انھوں نے اس اونٹنی کو مار ڈالا اور پورے تمرد کے ساتھ اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر گزرے اور صالح سے کہہ دیا کہ لے آ وہ عذاب، جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے، اگر تو واقعی پیغمبروں میں سے ہے'' (اعراف 7:77)

اس بدبخت اور بدنصیب قوم کے حق میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے تمام حجتیں پوری ہو چکی تھیں، اس لیے بحکم خداوندی حضرت صالح علیہ السلام نے انھیں تین دن کی مہلت دیتے ہوئے عذاب الٰہی کے آنے کی خبر دی۔ ''جب انھوں نے اونٹنی کو مار ڈالا تو صالح علیہ السلام نے انھیں خبردار کیا کہ بس اب تین دن اپنے گھروں میں اور رہ بس لو۔ یہ ایسی میعاد ہے جو جھوٹی ثابت نہ ہوگی'' (ہود 11:65)

اللہ کے رسول کی طرف سے عذاب کا وقت مقرر ہونے کے باوجود اس قوم کے سرکشوں، متکبروں اور مفسدوں کے دلوں میں کسی قسم کا خوف پیدا ہونے کی بجائے ان کے تکبر و غرور میں اضافہ ہو گیا۔ اپنی اصلاح کی طرف توجہ دینے اور اپنے آپ کو موعودہ عذاب سے بچانے کی فکر کرنے کی بجائے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس شخص کا رشتۂ حیات ہی کاٹ کر رکھ دیا جائے جو ہمیں عذاب کی خبر دے رہا ہے اور اس زبان ہی کو خاموش کر دیا جائے جو ہمیں مکافاتِ عمل سے ڈرا رہی ہے۔ قرآن مجید نے ان کی اس سازش اور ان کے خفیہ منصوبے کی تفصیلات اس طرح بیان کی ہیں: ''اس شہر میں نو جتھا دار تھے جو ملک میں فساد پھیلاتے تھے اور کوئی اصلاح کا کام نہ کرتے تھے۔ انھوں نے آپس میں کہا: ''خدا کی قسم کھا کر عہد کرو کہ ہم صالح اور اس کے گھر والوں پر شب خون ماریں گے اور پھر اس کے ولی سے کہہ دیں گے کہ ہم اس کے خاندان کی ہلاکت کے موقع پر موجود نہ تھے، ہم بالکل سچ کہتے ہیں۔'' یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی انھیں خبر نہ تھی۔ اب دیکھ لو کہ ان کی چال کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا انھیں اور ان کی پوری قوم کو اور ان کے گھر خالی پڑے ہیں اس ظلم کی پاداش میں جو وہ کرتے تھے۔ اس میں ایک نشان عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں''

(نمل 27:48 تا 52)

قرآن مجید کے طرز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ان ظالموں نے حضرتِ صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کے لیے وہی رات مقرر کی تھی، جس رات وہ خود عذاب الٰہی کی گرفت میں آ گئے۔

بالآخر اس قوم کی مہلت کی مدت ختم ہو گئی۔ فیصلے کا وقت آ گیا وفاداروں کو کامیابی اور سرخ روئی نصیب ہوئی اور ظالم رسوا کن ہلاکت سے دوچار ہوئے۔ قرآن اس وقت کا منظر یوں بیان کرتا ہے: ''آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے صالح کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے تھے، بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے انھیں محفوظ رکھا۔ بے شک تیرا رب ہی دراصل طاقت ور اور بالادست ہے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے ظلم کیا تھا تو ایک سخت دھماکے نے انھیں دھر لیا اور وہ اپنی بستیوں میں اس طرح بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے کہ گویا وہ کبھی وہاں بسے ہی نہ تھے۔ سنو! ثمود نے اپنے رب سے کفر کیا۔ سنو! دور پھینک دیئے گئے ثمود۔''

قوم ثمود کے مبتلائے عذاب ہونے کی وجہ، قرآن مجید دوسری جگہ اس طرح نوع انسانی کو سناتا ہے: ''رہے ثمود تو ان کے سامنے ہم نے راہ راست پیش کی، مگر انھوں نے راستہ دیکھنے کی بجائے اندھا بنا رہنا ہی پسند کیا۔ آخر ان کے کرتوتوں کی بدولت ذلت کا عذاب ان پر ٹوٹ پڑا، اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور گمراہی و بدعملی سے پرہیز کرتے تھے'' (حم سجدہ 41:17-18)

یہ عذاب کتنا ہولناک، الم ناک اور تباہ کن تھا، اس سلسلے میں قرآن حکیم کا بیان ہے: ''ہم نے ان پر بس ایک ہی دھماکا چھوڑا۔ اور وہ باڑے والے کی روندی ہوئی باڑھ کی طرح بھس ہو کر رہ گئے'' (قمر 54:31)

''ثمود اور عاد نے اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا تو ثمود ایک سخت حادثے سے ہلاک کیے گئے۔'' (حاقہ 69:54)

اس عذاب کے لیے سورۂ اعراف میں الرجفہ (زبردست زلزلہ) اور سورۂ ہود میں الصیحہ (زور کا دھماکا) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ سورۂ حم سجدہ میں اسے صاعقۃ العذاب (عذاب کا کڑاکا) اور سورۂ حاقہ میں الطاغیہ (حد سے زیادہ سخت حادثہ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک ہی واقعہ کی مختلف کیفیات کا بیان ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے مدتوں اپنی قوم کی خیر خواہی کا پورا پورا حق ادا کیا' لیکن قوم نے انھیں جھٹلایا۔ انھیں جھوٹا' خود پسند اور جادوگر قرار دیا۔ الزامات' اتہامات اور گالیوں کی بارش کی۔ آپ کی توہین و تضحیک کا ہر حربہ استعمال کیا۔ آخر میں آپ اور آپ کے گھر والوں کے قتل کا منصوبہ تیار کیا۔

قوم کے اس ظالمانہ اور سفاکانہ سلوک کے باوجود جب یہ قوم اپنی بداعمالیوں کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہوئی تو اس پر خوش ہونے اور اپنے مخالفین پر طنز کے تیر برسانے کے بجائے حضرت صالح علیہ السلام نہایت دل سوزی سے ان کی حالت زار پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اپنے دل دردمند کے جذبات کا اظہار اس طرح فرماتے ہیں: ''آخر کار ایک دہلا دینے والی آفت نے انھیں آ لیا اور وہ اپنے گھروں میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے اور صالح یہ کہتے ہوئے ان کی بستیوں سے نکل گیا کہ ''اے میری قوم' میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تیری بہت خیر خواہی کی' مگر میں کیا کروں کہ تجھے اپنے خیر خواہ پسند ہی نہیں ہیں۔''

(الاعراف 7:78-79)

جب قوم ثمود پر عذاب کی مار پڑی تو حضرت صالح علیہ السلام اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کے ہم راہ اس علاقے سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کی طرف ہجرت کر گئے' چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام والے پہاڑ کے ساتھ ہی ایک پہاڑی ہے جس کا نام جبلِ صالح مشہور ہے۔ مقامی روایات میں بتایا جاتا ہے کہ یہی آپ کی جائے قیام تھی۔

ثمود کا علاقہ اس شاہ راہ پر واقع تھا' جس سے قریش کے تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے ہوئے گزرتے تھے۔ عرب کے لوگ عموماً اور قریش کے تاجر خصوصاً ثمود کی اُجڑی ہوئی بستیوں میں سے گزرتے تھے جو اپنے مکینوں کی تباہی کے بعد خود بھی ایسی ویران اور سنسان ہوئیں کہ انھیں دوبارہ رونق حاصل نہ ہوئی۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر جب رسول کریم ﷺ اسلامی لشکر کے ساتھ ثمود کے تباہ شدہ علاقے ''حجر'' میں پہنچے تو آپ علیہ السلام نے وہاں قیام فرمایا۔ علامہ ابن ہشام یہاں کے قیام کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لوگوں نے یہاں کے کنوؤں سے پانی بھرا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہاں کا پانی نہ تو پینا اور نہ ہی وضو کے لیے اسے استعمال میں لانا۔ اور تم نے یہاں کے پانی سے جو آٹا گوندھا ہوا سے بھی خود نہ کھانا' بلکہ اونٹوں کو کھلا دینا' اور رات کو جو شخص تم میں سے لشکر سے باہر جائے وہ تنہا نہ جائے بلکہ کسی دوسرے کو ساتھ لے کر جائے۔''

''حضور ﷺ کے اس ارشاد پر سب نے عمل کیا' مگر بنی ساعدہ کے دو شخص بھول گئے۔ ان میں ایک تنہا رات کو قضائے حاجت کے لیے باہر چلا گیا۔ راستے میں اسے خناق کا عارضہ لاحق ہو گیا اور دوسرا جو اونٹ تلاش کرنے کے لیے گیا تھا' اسے آندھی نے اٹھا کر بنو طے کے علاقے میں پھینک دیا' جو یہاں سے خاصے فاصلے پر واقع تھا۔ جب حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو فرمایا: ''اسی لیے میں نے تمھیں پہلے ہی منع کر دیا تھا کہ اکیلا کوئی شخص باہر نہ نکلے۔'' جس شخص کو خناق ہو گیا تھا' حضور ﷺ نے اس کے لیے دعا کی اور اُسے صحت ہو گئی۔ اور دوسرا شخص جسے آندھی نے بنو طے کے پہاڑوں میں پھینک دیا تھا' جب اس قبیلے کے لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے تو اسے بھی ساتھ لے آئے۔''

''جب رسول کریم ﷺ اس علاقے سے گزرے تو آپ ﷺ نے اپنا چہرہ کپڑے سے ڈھانپ لیا اور اپنے صحابہ سے فرمایا کہ ظالموں کے مکانات سیر و سیاحت کی جگہ نہیں' بلکہ مقامِ عبرت ہیں' اس لیے یہاں سے روتے ہوئے گزرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اس بلا میں گرفتار ہو جاؤ' جس میں وہ ہوئے تھے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تورات کے مطابق دس پشتوں کا فاصلہ ہے۔ اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام اور آدم علیہ السلام میں بھی تقریباً دس پشتوں کا فصل ہے۔ طوفانِ نوح کے بعد روئے زمین پر حضرت نوح علیہ السلام کے باقی ماندہ تین بیٹوں سام' حام' اور یافث سے جو نسل پھیلی' ان میں سب سے پہلے سب سے برگزیدہ نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں۔ آپ پہلے نبی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالم گیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک' برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا' جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

تورات کے الفاظ میں آپ کی اولاد ریت کے ذروں سے زیادہ ہے۔ آپ سے تین نسلیں وجود میں آئیں۔ بنی اسرائیل' بنی اسماعیل اور بنی قطورہ۔ آپ کی اولاد سے بے شمار پیغمبر ہوئے اور سلسلۂ نبوت کے خاتم حضرت محمد ﷺ آپ ہی کی اولاد سے ہیں۔ دنیا کے تین بڑے مذہب یہودیت' نصرانیت اور اسلام کے بانی مبانی آپ ہی ہیں۔

آپ کا سلسلۂ نسب یوں بیان ہوا ہے: حضرت نوح علیہ السلام' سام' ارفکسد' سلخ' عبر' فلج' رعو' سروج' نحور' تارح' ابراہیم علیہ السلام۔ تورات میں آپ کے والد کا نام تارح دیا گیا ہے۔ جب کہ قرآن میں آذر دیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ عرصہ دراز سے متنازعہ چلا آ رہا ہے۔ کسی گروہ نے بھی مدلل طور پر یہ ثابت نہیں کیا کہ آپ کے والد کا صحیح نام کیا تھا۔ بعض محقق آذر کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا بتاتے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی اپنی ''تفسیر قرآن'' میں لکھتے ہیں: ''عربی تورات میں اس لفظ کا املا تارح ملتا ہے اور انگریزی میں تیراح (Terah) اور تالمود میں ترا۔ جو لوگ علم الألسنہ کے مبادی

سے بھی واقفیت رکھتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی نام مختلف زبانوں میں جا کر کیسے کیسے عجیب تلفظ اختیار کر لیتا ہے۔ فلسطین کے قدیم مسیحی مؤرخ یوسفین 264ء تا 349ء) کے ہاں ''آثر'' یا ''ہاتھور'' آیا ہے۔ ان دونوں لفظوں کی مشابہت اور مماثلت آذر سے بالکل ظاہر ہے۔''

علامہ عبدالحق حقانی یوں لکھتے ہیں: ''ابراہیم کے والد کا نام تارح تھا اور لقب آذر۔ یا اس کے برعکس کہ نام آذر تھا اور لقب تارح۔ ویسے یہ ایک ہی شخصیت تھی۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت سمیریوں کے قدیم شہر اُر (UR) میں 2160 ق م کے لگ بھگ ہوئی' جو جنوبی عراق میں دریائے فرات کے کنارے بابل اور نینوا سے بہت پہلے سے آباد تھا۔ آج کل اس شہر کا نام ''مقیر'' ہے' اور یہ مقام بابل اور خلیج فارس کے درمیان واقع ہے۔ فلاڈلفیا میوزیم یونیورسٹی امریکا کے میوزیم اور برٹش میوزیم کی ایک مشترکہ ٹیم نے بیسویں صدی میں اس شہر کے آثار دریافت کر لیے ہیں۔ ان اثری اکتشافات سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سرگزشت اور ان کے حالات اور بھی واضح ہو گئے ہیں۔

اکثر علمائے تاریخ کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل کے پہلے عربی النسل شاہی خاندان کے نام ور قانون ساز چھٹے حکمران حمورابی کے ہم عصر تھے۔ حمورابی نے 2067 ق م سے 2025 ق م تک حکومت کی ہے۔ اس خاندان کے گیارہ بادشاہوں نے 2169 ق م سے 1870 ق م تک تین سو سال تک حکومت کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی طویل عمر کے سبب اس خاندان کے کئی بادشاہوں کا دور دیکھا' بلکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھی ان سلاطین کا زمانہ دیکھا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سال ولادت اگر سر چارلس مارسٹن' جناب مالک رام اور ان کے ہم خیال مؤرخین کی رائے کے مطابق 2160 ق م اور سال وفات 1965 ق م تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ نے اس شاہی خاندان کے پہلے سات فرماں رواؤں کا عہد دیکھا تھا۔

قرآن مجید کے رشد و ہدایت کا پیغام چوں کہ ملتِ ابراہیمی کا پیغام ہے' اس لیے اس نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے۔ آپ علیہ السلام کا ذکر مکی اور مدنی دونوں قسم کی سورتوں میں آیا ہے۔ ان تمام سورتوں اور آیات کا نقشہ یہ ہے۔:

سورۂ بقرہ: 124 تا 127 '130 '132 '133 '135 '136 '140 _158 160، سورۂ آل عمران: 33 _35 _67 _68 _84 _95 _97، سورۂ النسا: 54 _125 _163، سورۂ انعام: 74 _75 _83 _151، سورۂ توبہ: 70 _114، سورۂ ہود: 69 _74 _75 _76، سورۂ یوسف: 6 _38، سورۂ ابراہیم: 36، سورۂ حجر: 51، سورۂ النحل: 120 _123، سورۂ مریم: 4 _46 _58، سورۂ انبیا: 51 _60 _62 _69، سورۂ حج: 36 _43 _78، سورۂ شعرا: 69، سورۂ عنکبوت: 16 _31، سورۂ احزاب: 70، سورۂ الصّٰفّٰت: 83 _104 _109، سورۂ ص: 45، سورۂ شوریٰ: 13، سورۂ زخرف: 26، سورۂ ذاریات: 24، سورۂ نجم: 37، سورۂ حدید: 26، سورۂ ممتحنہ: 4، سورۂ الاعلیٰ: 19، یعنی 25 سورتوں کی 63 آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے واقعات کے ساتھ چند دوسرے انبیائے کرام کے حالات زندگی بھی وابستہ ہیں' مثلاً ان کے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ۔ نیز ان کے دو فرزندوں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے واقعات' اس لیے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ستاسی سال اور حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت کے وقت ان کی عمر پورے سو سال تھی۔ ان تینوں انبیا کے واقعات مستقل عنوان کے تحت درج ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالاتِ زندگی اور حق کے لیے ان کی جدوجہد کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے مذہبی' تمدنی اور معاشرتی حالات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ جدید اثری تحقیقات کے سلسلے میں نہ صرف وہ شہر دریافت ہو گیا ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے تھے' بلکہ اس عہد میں اس علاقے کے لوگوں کی جو حالت تھی اس پر بھی بہت کچھ روشنی پڑی ہے۔ ماہر اثریات سر لیونارڈ وولی Sir Wooley Leonard نے اپنی کتاب ''ابراہیم'' مطبوعہ لندن' 1935ء میں اس تحقیقات کے جو نتائج شائع کیے تھے' اُن کا خلاصہ مولانا مودودی نے اپنی معروف تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے لیے کیا تھا جو ان کی تالیف ''سیرت سرور عالم ﷺ'' (جلد اول) میں منقول ہوا' اور اس کی تلخیص یہاں دی جا رہی ہے:

''اندازہ کیا گیا ہے کہ 2100 قبل مسیح کے لگ بھگ زمانہ' جسے اب عام طور پر محققین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ظہور کا زمانہ تسلیم کرتے ہیں' شہر ار (UR) کی آبادی ڈھائی لاکھ کے قریب تھی اور بعید نہیں کہ پانچ لاکھ ہو۔ بڑا صنعتی و تجارتی مرکز تھا۔ ایک طرف پامیر اور نیلگری تک سے وہاں مال آتا تھا اور دوسری طرف اناطولیہ تک سے اس کے تجارتی تعلقات تھے۔ جس ریاست کا یہ صدر مقام تھا اس کے حدود موجودہ حکومت عراق سے شمال میں کچھ کم اور مغرب میں کچھ زیادہ تھے۔ ملک کی بیش تر آبادی صنعت و تجارت پیشہ تھی۔ اس عہد کی جو تحریرات آثار قدیمہ کے کھنڈروں میں دستیاب ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطۂ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصد حیات تھا۔ سود خوری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور آپس میں بہت مقدمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے خداؤں سے ان کی دعائیں زیادہ تر درازیٔ عمر' خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ آبادی تین طبقوں پر مشتمل تھی:

(1) عمیلو۔ یہ اونچے طبقے کے لوگ تھے جن میں پجاری' حکومت کے عہدہ دار اور فوجی افسر وغیرہ شامل تھے۔

(2) مشکینو۔ یہ تجار' اہل صنعت اور زراعت پیشہ لوگ تھے۔

(3) اُردو۔ یعنی غلام۔

ان میں سے پہلے طبقہ یعنی عمیلو کو خاص امتیازات حاصل تھے۔ ان کے فوج داری اور دیوانی حقوق دوسروں سے مختلف تھے اور ان کے جان و مال کی قیمت دوسروں سے بڑھ کر تھی۔

یہ شہر اور یہ معاشرہ تھا جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنکھیں کھولیں۔ ان کا اور ان کے خاندان کا جو حال ہمیں تلمود میں ملتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عمیلو طبقہ کے ایک فرد تھے اور ان کا باپ ریاست کا سب سے بڑا عہدہ دار تھا۔

اُر کے کتبات میں تقریباً 5 ہزار خداؤں کے نام ملتے ہیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ خدا تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ خدا ہوتا تھا جو رب البلد' مہادیو' یا رئیس الالٰہ سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ ار کا رب البلد ''ننار'' (چاند دیوتا) تھا اور اسی مناسبت سے بعد کے لوگوں نے اِس شہر کا نام ''قمرینہ'' بھی لکھا ہے۔ دوسرا بڑا شہر لرسہ تھا جو بعد میں اُر کے بجائے مرکز سلطنت ہوا۔ اس کا رب البلد 'شماش'' (سورج دیوتا) تھا۔ ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے اور ان بڑے خداؤں کے ماتحت بہت سے چھوٹے خدا بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے اور لوگ اپنی مختلف فروعی ضروریات ان سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی اور زمینی دیوتاؤں اور دیویوں کی شبیہیں بتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور تمام مراسم عبادت انھی کے آگے بجالائے جاتے تھے۔

''ننار'' کا بت اُر میں سب سے اونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اس کے قریب ''ننار'' کی بیوی ''نن گل'' کا معبد تھا۔ ننار کے معبد کی شان ایک شاہی محل سرا کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ رات کو ایک پجارن جا کر اس کی دلہن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں کی سی تھی۔ وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو ''خدا کے نام پر'' اپنی بکارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک مرتبہ اپنے آپ کو ''راہِ خدا'' میں کسی اجنبی کے حوالے کرنا عورت کے لیے ذریعہ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پجاری حضرات ہی ہوتے تھے۔

ننار محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمین دار' سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغ' مکانات' اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی کے علاوہ' کسان' زمین دار' تجار سب ہر قسم کا غلہ' دودھ' سونا' کپڑا اور دوسری چیزیں لا کر مندر میں نذر بھی کرتے تھے جنھیں وصول کرنے کے لیے مندر میں ایک بہت بڑا اسٹاف موجود تھا۔ بہت سے کارخانے مندر کے ماتحت قائم تھے۔ تجارتی کاروبار بھی بہت بڑے بڑے پیمانے پر مندر کی طرف سے ہوتا تھے۔ یہ سب کام دیوتا کی نیابت میں پجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر ملک کی سب سے بڑی عدالت مندر ہی میں تھی۔ پجاری اس کے جج تھے اور ان کے فیصلے ''خدا'' کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ خود شاہی خاندان کی حاکمیت بھی ننار ہی سے ماخوذ تھی۔ اصل بادشاہ ننار تھا اور فرماں روائے ملک اس کی طرف سے حکومت کرتا تھا۔ اس تعلق سے بادشاہ خود بھی معبودوں میں شامل ہو جاتا تھا اور خداؤں کے مانند اس کی پرستش کی جاتی تھی۔

ار کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں حکمران تھا' اس کے بانی اول کا نام ارنمو تھا۔ جس نے 2300 برس قبل مسیح میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی۔ اس کے حدود مملکت مشرق میں سوسہ سے لے کر مغرب میں لبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس سے اس خاندان کو ''نمو'' کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بعد اس خاندان اور اس قوم پر مسلسل تباہی نازل ہونا شروع ہوئی۔ پہلے عیلامیوں نے اُر کو تباہ کیا اور نمرود کو ننار کے بت سمیت پکڑ لے گئے۔ پھر لرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُر کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لرسہ اور اُر دونوں اس کے زیر حکم ہو گئے۔ ان تباہیوں نے ننار کے ساتھ اُر کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا کیوں کہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد کے ادوار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کا اثر اس ملک کے لوگوں نے کہاں تک قبول کیا۔ لیکن بابل کے بادشاہ حمورابی نے جو قوانین مرتب کیے تھے وہ شہادت دیتے ہیں کہ بالواسطہ ان کی تدوین میں مشکوٰۃ نبوت سے حاصل کی ہوئی روشنی کسی حد تک ضرور کارفرما تھی۔ ان قوانین کا مفصل کتبہ 1902ء میں ایک فرانسیسی ماہر آثار قدیمہ کو ملا اور اس کا انگریزی ترجمہ G-H-W-John نے 1903ء میں The Oldest Code of Law کے نام سے شائع کیا۔ اس ضابطہ قوانین کے بہت سے اصول اور فروع موسوی شریعت سے مشابہت رکھتے ہیں۔

یہ اب تک کی اثری تحقیقات کے نتائج اگر صحیح ہیں تو ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم میں شرک محض ایک مذہبی عقیدہ اور بت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری معاشی' تمدنی' سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدہ پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید کی جو دعوت لے کر اُٹھے تھے' اُس کا اثر صرف بتوں کی پرستش ہی پر نہ پڑتا تھا' بلکہ شاہی خاندان کی معبودیت اور حاکمیت' پجاریوں اور اونچے طبقوں کی معاشرتی' معاشی اور سیاسی حیثیت' اور پورے ملک کی اجتماعی زندگی اس کی زد میں آ جاتی تھی۔ ان کی دعوت کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ نیچے سے اوپر تک ساری سوسائٹی کی عمارت ادھیڑ ڈالی جائے اور اسے از سر نو توحید اللہ کی بنیاد پر تعمیر کیا جائے۔ اس لیے ابراہیم علیہ السلام کی آواز بلند ہوتے ہی عوام اور خواص' پجاری اور نمرود سب کے سب بیک وقت اسے دبانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب نمرود پایہ تخت بابل میں حکومت کر رہا تھا۔ شہر اُر بابل سے زیادہ

فاصلے پر نہ تھا اور نمرود ہی کی قلم رو میں شامل تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا باپ ایک بت پرست، بت تراش اور ستارہ پرست تھا۔ اس علاقے کے تمام لوگ اسی مذہب پر قائم تھے۔ وہ بتوں کو پوجتے تھے۔ ستاروں کو نظام کائنات چلانے والے سمجھتے تھے۔ ستاروں کے نام پر سونے، چاندی، پتھروں اور خصوصاً سنگِ مرمر کے بت بناتے اور ان سے دعائیں مانگتے۔ ان پر جانوروں اور اولاد کی قربانی کرتے اور نذر و نیاز چڑھاتے۔

ایسے ماحول اور موروثی اثرات کو لیے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے۔ نفسیات کے اصول کی رو سے جس ماحول میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی، آپ کو انھی معتقدات کا حامل ہونا چاہیے تھا، لیکن ایک نبی اور عام بچے میں فرق ہوتا ہے۔ ابتدائے بچپن ہی میں ان کے تجسس کی یہ حالت تھی کہ انھوں نے اپنی ماں سے پوچھا: ''اے ماں تمھارا خدا کون ہے؟'' ماں نے جواب دیا: ''تیرا باپ جو مجھے رزق دیتا ہے۔'' تب آپ نے سوال کیا کہ پھر میرے باپ کا خدا کون ہے؟ ماں نے جواب دیا: ''ستارے۔'' لیکن آپ نے ایک سوال اور کر ڈالا کہ ستاروں کا خدا کون ہے؟ ماں اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔

یہ تھا وہ طرزِ فکر، جس نے حضرت کو ابتدائے بچپن میں خدا کی جستجو پر مائل کیا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ شرک کا سب سے بڑا مرکز خود ان کے اپنے گھر میں قائم ہے اور باپ کی بت پرستی و بت سازی پوری قوم کے لیے محور بنی ہوئی ہے۔ اس لیے فطرت کا تقاضا ہے کہ دعوتِ حق کی ابتدا گھر ہی سے ہونی چاہیے۔ چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے اپنے والد ہی کو مخاطب کیا اور فرمایا: ''اے باپ خدا پرستی اور معرفتِ الٰہی کے لیے جو راستہ تو نے اختیار کیا ہے اور جسے آباؤ اجداد کا قدیم راستہ بتلاتا ہے، یہ گم راہی اور باطل پرستی کی راہ ہے۔'' سورۂ مریم میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

باپ بیٹے کا معاملہ

اور (اے پیغمبر) اس کتاب میں ابراہیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرو۔ بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔ انھیں ذرا اس موقع کی یاد دلاؤ، جب اس نے اپنے باپ سے کہا کہ ''ابا جان آپ کیوں ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں اور نہ آپ کا کوئی کام بنا سکتی ہیں؟ ابا جان، میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا۔ آپ میرے پیچھے چلیں۔ میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا۔ ابا جان آپ شیطان کی بندگی نہ کریں۔ شیطان تو رحمان کا نافرمان ہے۔ ابا جان، مجھے ڈر ہے کہیں آپ رحمان کے عذاب میں مبتلا نہ ہو جائیں اور شیطان کے ساتھی بن کر رہیں۔''

باپ نے کہا: ''ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگ سار کر دوں گا۔ بس تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔''

ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔ میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور ان ہستیوں کو بھی، جنھیں آپ لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارا کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کے نامراد نہ رہوں گا۔''

باپ اور بیٹے کے درمیان جب اتفاق کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی اور آذر نے کسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی رشد و ہدایت کو قبول نہ کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آذر سے جدائی اختیار کر لی اور اپنی دعوتِ حق کو وسیع کر دیا اور اب صرف آذر ہی مخاطب نہ رہا، بلکہ پوری قوم کو مخاطب بنا لیا۔ نصیحت و موعظت کے اس موثر اندازِ خطابت کو جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد اور قوم کے سامنے پیش کیا، سورۂ شعرا میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آیات 69 تا 89 میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ کے اس دور کا قصہ بیان ہوا ہے، جب کہ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد شرک و توحید کے مسئلے پر آپ کی اپنے خاندان اور اپنی قوم سے کش مکش شروع ہوئی تھی۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے: ''اور انھیں ابراہیم علیہ السلام کا قصہ سناؤ، جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے پوچھا تھا کہ ''یہ کیا چیزیں ہیں جنھیں تم پوجتے ہو؟''

انھوں نے جواب دیا: ''کچھ بت ہیں جن کی ہم پوجا کرتے ہیں اور انھی کی سیوا میں ہم لگے رہتے ہیں۔''

اس نے پوچھا: ''کیا یہ تمھاری سنتے ہیں جب تم انھیں پکارتے ہو؟ یا یہ تمھیں کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟''

انھوں نے جواب دیا: ''نہیں بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔''

اس پر ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''کبھی تم نے آنکھیں کھول کر ان چیزوں کو دیکھا بھی، جن کی بندگی تم اور تمھارے پچھلے باپ دادا بجا لاتے رہے؟ میرے تو یہ سب دشمن ہیں، بجز ایک رب العالمین کے، جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری راہ نمائی فرماتا ہے، جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے، اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ مجھے زندگی بخشے گا، اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دے گا۔''

(اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی:) ''اے میرے رب مجھے حکم عطا کر، اور مجھے صالحوں کے ساتھ ملا، اور بعد کے آنے والوں میں مجھے سچی نام وری عطا کر، اور مجھے جنتِ نعیم کے وارثوں میں شامل فرما۔ اور میرے باپ کو معاف کر دے کہ بے شک وہ گم راہ لوگوں میں سے ہے۔ اور مجھے اس دن رسوا نہ کر، جب کہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے، جب کہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد، بجز اس کے کہ کوئی شخص قلبِ سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔''

بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت کی یہ

توجیہ بیان کی ہے کہ مغفرت بہرحال اسلام کے ساتھ مشروط ہے' اس لیے حضرت کا اپنے والد کی مغفرت کے لیے دعا کرنا گویا اس بات کی دعا کرنا تھا کہ اللہ تعالیٰ اسے اسلام لانے کی توفیق عطا فرمائے' لیکن قرآن مجید میں اس کے متعلق مختلف مقامات پر جو تصریحات ملتی ہیں' وہ اس توجیہ سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والد کے ظلم سے تنگ آ کر جب گھر سے نکلنے لگے تو انھوں نے رخصت ہوتے وقت فرمایا: ''سلام ہے آپ کو۔ میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ میرا رب مجھ پر بڑا ہی مہربان ہے۔'' (سورۂ مریم۔ آیت 47) اسی وعدے کی بنا پر انھوں نے یہ دعائے مغفرت نہ صرف اپنے باپ کے لیے کی' بلکہ ایک دوسرے مقام یعنی سورۂ ابراہیم' آیت 41 میں بیان ہوا ہے کہ ماں اور باپ دونوں کے لیے کی۔ لیکن بعد میں انھیں خود یہ احساس ہو گیا کہ ایک دشمنِ حق' چاہے وہ ایک مومن کا باپ ہی کیوں نہ ہو' دعائے مغفرت کا مستحق نہیں ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کی آیت 114 میں یوں آیا ہے: ''ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت کرنا محض اس وعدے کی وجہ سے تھا جو اس نے اس سے کیا تھا' مگر جب یہ بات اس پر کھل گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس نے اس سے اظہارِ بے زاری کر دیا۔'' (مولانا مودودی تفہیم القرآن۔ جلد سوم' صفحہ 506)

مگر آذر اور اس کی قوم کے دل کسی طرح قبولِ حق کے لیے نرم نہ ہوئے اور ان کا انکار اور ہٹ دھرمی حد سے گزر گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بت پرستی کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی بھی کرتی تھی اور ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسانوں کی موت و حیات ان کا رزق' ان کا نفع نقصان' خشک سالی' قحط سالی' فتح و شکست' غرض تمام کائنات کا نظم و نسق ستاروں اور ان کی حرکات کی تاثیر پر چل رہا ہے' اور یہ تاثیر ان کے ذاتی اوصاف میں سے ہے' اس لیے ان کی خوشنودی ضروری ہے اور یہ ان کی پرستش کے بغیر ممکن نہیں۔

اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس طرح انھیں ان کے سفلی معبودانِ باطل کی حقیقت واشگاف کر کے راہِ حق کی طرف دعوت دی' اسی طرح ضروری سمجھا کہ ان کے علوی معبودانِ باطل کی بے ثباتی اور فنا کے منظر کو پیش کر کے اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیں کہ تمھارا یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ ان چمکتے ہوئے ستاروں' چاند اور سورج کو خدائی طاقت حاصل ہے۔ ہرگز نہیں' یہ خیال خام اور باطل عقیدہ ہے' مگر یہ باطل پرست جب کہ اپنے خود ساختہ بتوں سے اس قدر خائف تھے کہ انھیں بُرا کہنے والے کے لیے ہر آن یہ تصور کرتے تھے کہ وہ ان کے غضب میں آ کر تباہ و برباد ہو جائے گا تو ایسے اوہام پرستوں کے دلوں میں بلند ستاروں کی پرستش کے خلاف جذبہ پیدا کرنا کوئی آسان کام نہ تھا' اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ذہن و نفسیات کے عین مناسب ایک عجیب اور دل چسپ پیرایۂ بیان اختیار فرمایا۔

ملاحظہ ہو' (سورۂ انعام' آیات 76 تا 83)

''چنانچہ جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے آسمان پر ایک چمکتا ہوا ستارہ دیکھا۔ اس نے کہا' کیا یہ میرا رب ہے؟ لیکن جب وہ ڈوب گیا تو بولا' ڈوب جانے والوں کا تو میں گرویدہ نہیں ہوں۔ (آیت 76) پھر جب چاند چمکتا نظر آیا تو ابراہیم علیہ السلام نے کہا' اچھا' تو یہ میرا رب ہے؟ لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو کہا' اگر میرے رب نے میری راہ نُمائی نہ کی ہوتی تو میں بھی گم راہ لوگوں میں شامل ہو گیا ہوتا (آیت 77) پھر جب صبح ہوئی اور سورج چمکتا ہوا طلوع ہوا تو ابرہیم نے کہا' یہ ہے میرا رب' یہ سب سے بڑا ہے؟ مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا تو ابراہیم پکار اٹھا: ''اے برادرانِ قوم' میں ان سب سے بیزار ہوں' جنھیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو' (آیت 78) مَیں نے تو یک سو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمان پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' (آیت 79)

اس کی قوم اس سے جھگڑنے لگی تو اس نے قوم سے کہا: ''کیا تم لوگ اللہ کے معاملے میں مجھ سے جھگڑتے ہو؟'' حالانکہ اس نے مجھے راہِ راست دکھا دی ہے' اور میں تمھارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا۔ ہاں اگر میرا رب کچھ چاہے تو وہ ضرور ہو سکتا ہے۔ میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے۔ پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ (آیت 80)

اور آخر میں تمھارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں' جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے' جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟ ہم دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی و اطمینان کا مستحق ہے؟ بتاؤ اگر تم کچھ علم رکھتے ہو۔ (آیت 81) حقیقت میں تو امن انھی کے لیے ہے اور راہ راست پر وہی ہیں جو ایمان لائے اور جنھوں نے اپنے ایمان کو ظلم کے ساتھ آلودہ نہیں کیا (آیت 82)

یہ تھی ہماری وہ حجت' جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی قوم کے مقابلے میں عطا کی۔ ہم جسے چاہتے ہیں' بلند مرتبے عطا کرتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ تمھارا رب نہایت دانا اور علیم ہے (آیت 83)

نمرود سے مذاکرہ

بائبل کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کے دو بھائی تھے: نحور اور حاران۔ حاران اُرہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اُس کی اولاد میں ایک لڑکا لوط اور دو لڑکیاں ملکاہ اور اسکاہ تھیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے والد آذر نے نحور اور اُس کے اہل خانہ کو اُرہی میں چھوڑا اور خود اپنے بیٹے ابراہیمؑ اور پوتے لوطؑ کو لے کر کنعان (فلسطین) کے ارادے سے چلا' لیکن راستے میں بابل پڑا۔ وہیں قیام کیا اور مستقل رہائش اختیار کی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بابل آ کر ایک اور ہی رنگ دیکھا۔ پہلے تو انھوں نے انسانوں کو پتھروں کے بت اور ستاروں کو خدا کہتے' اور پوجتے دیکھا تھا' مگر اب انھوں نے دیکھا کہ ایک انسان بھی خود کو خدا کہتا ہے اور لوگ اسے اپنا خدا تسلیم کرتے ہیں۔ آپ نے یقیناً اس موقع پر بھی سوچا ہوگا کہ انسان جو پیدائش اور موت پر قابو نہیں رکھتا' وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ خدا تو وہی ہے جو انسانوں کو پیدا کرتا اور مارتا ہے۔

بابل کا یہ انسان جو خود کو خدا کہلواتا تھا' وہاں کا بادشاہ نمرود تھا۔ اس زمانے میں

بابل کے بادشاہ کا لقب نمرود تھا جس طرح مصر کا بادشاہ فرعون کہلاتا تھا۔ اس وقت کا نمرود حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے حام کے لڑکے کوش کا بیٹا تھا۔ اس نے بڑی طویل عمر پائی۔ قد وقامت اور طاقت میں بھی بے مثال تھا۔ لوگ اس سے خوف کھاتے تھے۔ وہ طاقت ور سے طاقت ور جانور کا شکار کر لیتا۔ اس لیے وہ جوانی ہی میں ''شکاری سورما'' مشہور ہو گیا۔ اسی بنا پر اس نے یکے بعد دیگرے متعدد علاقوں پر قبضہ کیا۔ بابل شہر کو اپنا دارالحکومت بنا کر قرب و جوار کے علاقے اور پھر دُور دراز کے علاقے بھی اپنے تصرف میں لے لیے۔

ان دنوں بابل میں بت پرستی رائج تھی۔ ایک بڑا بت کدہ بھی موجود تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بت کدے بھی تھے۔ ہر گھر میں چھوٹے چھوٹے بت رکھے ہوتے اور لوگ ان کی پوجا پاٹ کرتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد بت تراش آذر کا کام بابل میں خوب چمکا' اور یوں کنعان جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ان بتوں میں روز و شب رہ کر اور ہر وقت غور و فکر کرتے رہنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوچا کہ اب مجھے رشد و ہدایت کا ایسا پہلو اختیار کرنا چاہیے جس سے لوگوں کو یہ مشاہدہ ہو جائے کہ ہمارے دیوتا واقعی صرف لکڑیوں اور پتھروں کی بے جان مورتیاں ہیں' جو گونگی بھی ہیں اور بہری بھی اور اندھی بھی۔ اتفاق کی بات کہ قریب ہی زمانے میں قوم کا سالانہ مذہبی میلا آ گیا۔ سب لوگ میلے میں شرکت کے لیے شہر سے باہر چلے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نے میلے میں چلنے کے لیے کہا' لیکن انھوں نے عذر پیش کر دیا۔ وہ تو اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنا چکے تھے۔ جب دیکھا کہ لوگ میلے کے مشاغل اور تفریحات میں مصروف اور شراب و کباب میں مشغول ہیں اور میدان صاف ہے تو انھوں نے ایک کلہاڑی لی اور سب سے بڑے بت کدے میں پہنچے۔ دیکھا تو وہاں دیوتاؤں کے سامنے قسم قسم کے حلووں' مٹھائیوں' میووں اور پھلوں کے چڑھاوے رکھے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے طنزیہ لہجے میں چپکے چپکے ان مورتیوں سے کہا' کہ جب یہ سب کچھ موجود ہے تو کھاتے کیوں نہیں؟ اور پھر کہنے لگے' میں تم سے بات کر رہا ہوں' تم میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟ اور پھر ان سب کو توڑ پھوڑ ڈالا اور اپنی کلہاڑی سب سے بڑے بت کے کندھے پر رکھ کر چلے گئے۔

جب لوگ میلے سے واپس آئے تو ہیکل (مندر) میں بتوں کا یہ حال دیکھا۔ سخت برہم ہوئے اور ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے کہ یہ کیا ہوا اور کس نے کیا؟ ہم میں سے یہ حرکت کون کر سکتا ہے؟ چند لوگوں نے' جنھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خیالات معلوم تھے اور جنھوں نے آپ کو بت پرستی کی توہین کرتے سنا تھا' بتایا کہ ہو نہ ہو یہ کام تارح کے بیٹے ابرام کا ہے۔ سب لوگ ہجوم کی شکل میں آذر کے گھر پہنچے اور ان سے شکایت کی۔ آذر اپنے بیٹے ابراہیم علیہ السلام کے خیالات سے واقف تھے' سمجھ گئے' مگر کہا' ٹھہرو میں ابراہیم کو بلاتا ہوں اور تمھارے سامنے پوچھتا ہوں' اگر اسی نے ایسا کیا ہے تو میرا لڑکا حاضر ہے۔ جو تمھارا دل چاہے' اس کے ساتھ سلوک کرو۔ ابراہیم علیہ السلام سامنے لائے گئے تو انھوں نے رُعب داب سے پوچھا:

''کیوں ابراہیم ہمارے دیوتاؤں کے ساتھ یہ سب کچھ تو نے کیا ہے؟'' ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ اب وہ بہترین موقع آ گیا ہے جس کے لیے میں نے یہ تدبیر اختیار کی۔ مجمع موجود ہے۔ لوگ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے دیوتاؤں کا کیا حشر ہو گیا' اس لیے ان کاہنوں اور مذہبی پیشواؤں کو لوگوں کی موجودگی میں ان کے باطل عقائد پر نادم کر دینے کا وقت ہے۔ چنانچہ انھوں نے کہا: ''ان میں سے اس بڑے بت نے کیا ہے۔ پس اگر یہ تمھارے دیوتا بولتے ہوں تو ان سے دریافت کر لو۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس یقینی حجت اور قاطع دلیل کا پجاریوں اور کاہنوں کے پاس کیا جواب ہو سکتا تھا۔ وہ ندامت میں غرق تھے۔ لوگ بھی سب کچھ سمجھ گئے اور انھوں نے اپنی آنکھ سے وہ منظر دیکھ لیا جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ وہ نہایت شرم ساری کے ساتھ سرنگوں ہو کر کہنے لگے: ''ابراہیم (علیہ السلام) تو جانتا ہے کہ ان دیوتاؤں میں بولنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ تو بے جان مورتیاں ہیں۔'' تب ابراہیم علیہ السلام نے مختصر مگر جامع الفاظ میں انھیں نصیحت بھی کی اور ملامت بھی' اور بتایا کہ جب یہ دیوتا نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان' تو پھر یہ خدا اور معبود کیسے ہو سکتے ہیں۔ افسوس تم اتنا بھی عقل سے کام نہیں لیتے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس نصیحت کا اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ تمام قوم اپنے باطل عقیدے سے تائب ہو کر ملّتِ حنفی اختیار کر لیتی' لیکن سرکش ذہنیت اور باطنی خباثت نے اس جانب آنے نہ دیا۔ سب ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ اگر دیوتاؤں کی خوشنودی چاہتے ہو تو اس گستاخ کو سخت سزا دو اور دہکتی آگ میں جلا ڈالو۔

ابھی یہ مشورے ہو ہی رہے تھے کہ ہوتے ہوتے بات بادشاہ وقت نمرود تک پہنچی۔ نمرود کو جب یہ معلوم ہوا تو آپے سے باہر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ اگر اس شخص کی تبلیغی سرگرمیاں اسی طرح جاری رہیں تو یہ میری ربوبیت' ملوکیت' اور الوہیت سے نہ سب رعایا کو برگشتہ کر دے گا اور اس طرح اجداد کے مذاہب کے ساتھ ساتھ میری یہ سلطنت بھی زوال میں آ جائے گی' اس لیے اس قصے کو ابتدا ہی میں ختم کر دینا چاہیے۔ یہ سوچ کر اس نے حکم دیا کہ ابراہیم کو ہمارے دربار میں پیش کیا جائے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے دربار میں پہنچے تو نمرود نے پوچھا: ''تو اپنے باپ دادا کے دین کی مخالفت کس لیے کرتا ہے اور مجھے رب ماننے سے کیوں انکاری ہے؟''

حضرت ابراہیم نے جواب دیا: ''میں خدائے واحد کا پرستار ہوں۔ کسی کو اس کا شریک نہیں مانتا۔ ساری کائنات اور تمام موجودات اسی کی مخلوق ہیں اور وہی ان سب کا خالق و مالک ہے۔ تو بھی اسی طرح ایک انسان ہے' جس طرح ہم سب انسان ہیں۔ پھر تو کس طرح رب یا خدا ہو سکتا ہے۔ اور کس طرح لکڑی کے یہ بے جان' گونگے بہرے بت خدا ہو سکتے ہیں؟ میں صحیح راہ پر ہوں اور تم سب غلط راہ پر ہو' اس لیے میں حق کی تبلیغ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں اور تمھارے باپ دادا کے خود ساختہ دین کو کیسے اختیار کر سکتا ہوں؟''

نمرود نے دریافت کیا: ''اگر میرے علاوہ تیرا کوئی رب ہے تو اس کا ایسا وصف بیان کر کہ جس کی قدرت مجھ میں نہ ہو''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''میرا رب وہ ہے جس کے قبضے میں موت و حیات ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔'' (البقرہ 258:2)

کج فہم نمرود موت وحیات کی حقیقت سے نا آشنا تھا۔ کہنے لگا: ''موت وحیات تو میرے قبضے میں بھی ہے۔'' یہ کہ کر اس نے اسی وقت ایک بے قصور شخص کے متعلق جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن مار دو اور موت کے گھاٹ اتار دو۔ جلاد نے فوراً حکم کی تعمیل کر دی۔ پھر ایک قتل کے سزایافتہ مجرم کو جسے پھانسی چڑھایا جانا تھا' جیل سے بلا کر حکم دیا کہ جاؤ ہم نے تمھاری جان بخشی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگا: ''دیکھا' میں بھی کس طرح زندگی بخشتا اور موت دیتا ہوں۔ پھر تیرے خدا کی خصوصیت کیا رہی؟''

حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ نمرود یا تو موت وحیات کی اصل حقیقت سے نا آشنا ہے اور یا رعایا کو مغالطہ دینا چاہتا ہے' تا کہ وہ اس فرق کو نہ سمجھ سکیں کہ زندگی بخشنا اس کا نام نہیں ہے' بلکہ نیست سے ہست کرنے کا نام زندگی بخشنا ہے۔ اسی طرح کسی کو پھانسی سے بچا لینا موت سے بچانا نہیں۔ موت کا مالک وہی ہے جو انسانی روح کو اس کے جسم سے نکال کر اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ تاہم انھوں نے سوچا کہ اگر میں نے اس موقع پر موت وحیات کے دقیق فلسفے پر بحث شروع کر دی تو نمرود کا مقصد پورا ہو جائے گا اور وہ لوگوں کو مغالطے میں ڈال کر اصل معاملے کو الجھا دے گا اور اس طرح میرا نیک مقصد پورا نہ ہو سکے گا۔ اس لیے انھوں نے بات کو سمجھانے کا ایک دوسرا پیرایہ اختیار کیا اور ایسی دلیل پیش کی' جس کا صبح شام ہر شخص اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔

انھوں نے فرمایا: ''میں اس ہستی کو اللہ کہتا ہوں جو روزانہ سورج کو مشرق سے لاتا ہے اور مغرب کی جانب لے جاتا ہے۔ پس اگر تو بھی اسی طرح خدائی دعویٰ کرتا ہے تو اس کے خلاف سورج کو مغرب سے نکال اور مشرق میں چھپا۔'' (بقرہ 258:2)

یہ سن کر نمرود مبہوت اور لاجواب ہو کر رہ گیا۔ اس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے نمرود پر اللہ کی حجت پوری ہوئی۔ اس مرحلے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جدوجہد کا معاملہ ختم ہو گیا اور اب عقلی دلائل کی قوت کے مقابلے میں مادی طاقت نے مظاہرہ شروع کر دیا۔ سورۂ عنکبوت 29 کی آیت 24 میں ہے کہ ''پھر اس قوم کا جواب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انھوں نے کہا' قتل کر ڈالو یا جلا ڈالو اسے۔'' اس فقرے سے خود بخود یہ بات نکلتی ہے کہ ان لوگوں نے آخر کار حضرت ابراہیم کو جلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ طے پایا کہ انھیں آگ میں جلا دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ایک مخصوص جگہ بنوائی گئی۔ اس میں کئی روز مسلسل آگ دہکائی گئی' حتیٰ کہ اس کے شعلوں سے قرب وجوار کی اشیا تک جھلسنے لگیں۔ جب اس طرح نمرود اور قوم کو کامل یقین ہو گیا کہ اب ابراہیم علیہ السلام کے بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں' تب ایک گوپھن (منجنیق) میں ابراہیم علیہ السلام کو بٹھا کر دہکتے ہوئے الاؤ میں پھینک دیا گیا۔ آگ اسی وقت قدرت خدا سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حق میں سرد پڑ گئی اور دشمن اُنھیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکے اور حضرت ابراہیمؑ دہکتی آگ سے سالم و محفوظ دشمن کے نرغے سے نکل گئے۔

قرآن مجید میں اس معجزانہ واقعے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔ سورۂ انبیا 21 کی آیات 69 تا 71 میں ہے: ''انھوں نے کہا' جلا ڈالو اسے اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی' اگر تمھیں کچھ کرنا ہے۔'' ہم نے کہا'' اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم علیہ السلام پر۔ ان کا ارادہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ برائی کریں' مگر ہم نے انھیں بری طرح ناکام بنا دیا۔''

سورۂ صافات 37 کی آیات 97 تا 99 میں یوں آیا ہے: ''انھوں نے آپس میں کہا' اس کے لیے ایک الاؤ تیار کرو اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو۔ انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنا چاہی تھی' مگر ہم نے انھی کو نیچا کر دکھایا''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینکے جانے اور آگ کے سرد پڑ جانے کو بعض مفسرین ''معجزہ'' خیال کرتے ہیں' اور بعض اسے معجزہ خیال نہیں کرتے۔ معجزہ خیال کرنے والے مفسرین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سورۂ انبیا 21 کی آیت 69 کے الفاظ: ''ہم نے کہا اے آگ ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم علیہ السلام کے لیے'' ثابت کرتے ہیں کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں پھینک دیا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں اس سے بہ سلامت سے نکال دیا۔ معجزہ خیال نہ کرنے والے مفسرین کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس سرکش قوم اور ان کے بادشاہ نمرود نے اپنے جوش انتقام میں یہ منصوبہ ضرور باندھا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے الاؤ میں ڈال دیا جائے' تا کہ ان کے معبود دیوتا روز روز کی تحقیر وتذلیل سے محفوظ رہیں' لیکن قبل اس کے کہ وہ ان پر ہاتھ ڈالتے' آپ حکم خداوندی کے مطابق وہاں سے ہجرت کر گئے اور یوں وہ قوم اپنے ارادوں میں ناکام یاب رہی۔ یہ ویسی ہی صورتِ حال ہے جب اہلِ مکہ نے یہ سازش کی کہ نبی کریم ﷺ کو رات کی تاریکی اور خاموشی میں قتل کر دیا جائے' تو آپ نے حکمِ خداوندی کے مطابق مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی اور یوں قریش کے خفیہ منصوبے خاک میں مل گئے۔

حضرت ابراہیم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے آنکھوں سے یہ دکھا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ سورۂ بقرہ 2 کی آیت 260 میں یوں آیا ہے: ''میرے مالک مجھے دکھا دے تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے' فرمایا: ''کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟'' اُس نے عرض کیا: ''ایمان تو رکھتا ہوں لیکن دل کا اطمینان درکار ہے۔'' فرمایا: ''اچھا تو چار پرندے لے اور انھیں اپنے سے مانوس کر لے۔ پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر انھیں پکار۔ وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت بااقتدار اور حکیم ہے۔''

اس واقعے کی مفسرین کرام نے مختلف تاویلیں کی ہیں۔ مثلاً مولانا محمود الحسن

فرماتے ہیں: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام حسبِ ارشادِ الٰہی چار جانور لائے۔ ایک موز، ایک مرغ، ایک کوّا اور ایک کبوتر اور چاروں کو اپنے ساتھ ہلایا، تاکہ پہچان رہے اور بلانے سے آنے لگیں۔ پھر چاروں کو ذبح کیا۔ پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے۔ دوسرے پہاڑ پر پر رکھے۔ تیسرے پہاڑ پر سب کے دھڑ رکھے۔ چوتھے پر پاؤں رکھے۔ پہلے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک کو پکارا، اُس کا سر ہوا میں کھڑا ہوا، پھر دھڑ ملا، پھر پر لگے، پھر پاؤں۔ وہ دوڑتا چلا آیا۔ پھر اسی طرح چاروں آ گئے۔ یہاں دو خلجان پیدا ہونے کا قوی احتمال ہے۔ اول تو جسم بے جان متفرق اجزا کا زندہ ہونا قابلِ انکار ہے۔ دوسرے ان خصوصیات کو کہ وہ پرندے ہوں اور چار بھی ہوں اور چار بھی فلاں فلاں ہوں اور اس طرح ان کے اجزا کو متفرق کر کے بلایا جائے تو زندہ ہو کر دوڑتے چلے آئیں گے، اس کا کوئی دخل نہیں اور ان قیود کا کوئی منافع معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے پہلے خلجان کے جواب میں ''عزیز'' اور دوسرے کے جواب میں ''حکیم'' فرما کر دونوں شبہات کا قلع قمع فرما دیا۔''

مولانا سید نعیم الدین مُرادآبادی کی بھی یہی رائے ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ: ''اس واقعے کو دکھلا کر اللہ تعالیٰ نے اِحیائے یوم قیامت کی کیفیت بتلا دی کہ اس طرح اول اجزائے بدنیہ مختلف مقامات سے جمع ہو کر آئیں گے، پھر ان میں روح پڑ جائے گی۔'' مولانا امین احسن اصلاحی یہی بات اپنے الفاظ میں یوں بیان فرماتے ہیں: ''چار پرندوں کی ہدایت اس لیے ہوئی ہوگی کہ چاروں سمتوں سے ان کے مجتمع ہونے کا انھیں مشاہدہ کرایا جائے، تاکہ اس بات پر ان کا یقین مستحکم ہو جائے کہ قیامت کے دن اسی طرح صور پھونکنے پر تمام مخلوق ہر سمت سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑے گی۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی: ''عام اہلِ ایمان کو اس زندگی میں جو خدمت انجام دینا ہوتی ہے، اس کے لیے محض ایمان بالغیب کافی ہے، لیکن انبیا ایمان بالغیب کی منزل سے منصب امامت پر مامور ہونے سے پہلے گزر چکے ہوتے ہیں۔ نبی ہونے کے بعد انھیں ایمان باشہادت کی نعمت دی جاتی ہے اور یہ نعمت صرف انبیا کے ساتھ مخصوص ہے۔''

سورۂ انبیا 21 کی آیت 98 کے یہ الفاظ: ''انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنا چاہی تھی، مگر ہم نے انھی کو نیچا دکھا دیا'' صاف ثابت کر رہے ہیں کہ ان کا ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کا منصوبہ پورا نہ ہو سکا اور یوں انھی کی تذلیل ہوئی۔ اگلی آیت 99 میں ہے: ''میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں، وہی میری راہ نُمائی کرے گا۔''

اب انھوں نے جنوب کا رخ کیا، تاکہ کسی ایسے چھوٹے سے خطۂ زمین پر جا آباد ہوں، جہاں کوئی اور بڑی طاقت نہ بستی ہو۔ غرض یہ قافلہ بابل کی عظیم وادیوں سے بچتا ہوا اور صحرائے عرب کے کنارے کنارے ہوتا ہوا مغربی ایشیا کی چراگاہوں میں آ پہنچا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شادی ہو چکی تھی، مگر کوئی بچہ نہ تھا، آپ کے ہم راہ آپ کی بیوی سارہ تھیں اور بھتیجا لوط۔ اب وہ کنعان (حدودِ فلسطین) کی طرف روانہ تھے۔ حضرت ابراہیم نے اعلیٰ درجے کی تمدنی زندگی اور اپنی معقول زمین داری ترک کی اور خانہ بدوشی کی زندگی اختیار کر کے موجودہ سرزمین کی جانب اپنے مختصر سے قبیلے کو لے کر چلے اور اس طرح عبرانیوں کی سب سے پہلی ہجرت کا آغاز ہوا۔

اس وقت وہاں کنعانی آباد تھے جو طوفانِ نوح کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کے باقی ماندہ تینوں بیٹوں میں سے ایک حام کی اولاد سے کنعان کی نسل سے تھے۔ اس نسل کے کئی قبیلے پورے کنعان یعنی صیدا سے غزہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ آپ جب بابل سے روانہ ہوئے تو آپ کی عمر 75 سال تھی۔ کنعان وہی ملک تھا جو آپ کی اولاد کو دینے کا وعدہ اللہ نے کیا تھا۔ چنانچہ جب آپ کنعان کی حدود میں داخل ہوئے اور آگے ہی آگے بڑھتے ہوئے سکم (موجودہ نابلس) کے مقام پر پہنچے تو ایک قربان گاہ بنائی۔ پھر آگے بڑھے اور بیت ایل کے مقام پر پہنچ کر قیام کیا۔ یہاں بھی آپ نے ایک قربان گاہ تیار کی۔ اللہ سے دعا کی اور آگے بڑھ کر کنعان کے جنوب میں رہائش اختیار کر لی۔

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک مہاجر بلکہ مسافر کی حیثیت میں تھے۔ کوئی زیادہ اثاثہ نہ تھا۔ یہاں حطّی قوم آباد تھی جو سورج کی پرستش کرتی تھی۔ یہاں بھی بت تراشی اور بت پرستی عام تھیں۔ چنانچہ آپ ایک عرصے تک الگ تھلگ رہے، اور توحید الٰہی کی تعلیم و تربیت حسب موقع دیتے رہے۔ اسی دوران میں کنعان کے پورے علاقے میں زبردست قحط پڑا۔ وہاں کے مقامی باشندے اس مصیبت سے نبٹنا جانتے تھے۔ ان کے پاس زمینیں تھیں۔ وہ غلہ بچا رکھتے تھے، کیوں کہ اس علاقے میں عموماً ہر چند سال کے بعد قحط کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا، کوئی مدد کرنے والا بھی نہ تھا۔ لہٰذا آپ نے قریبی اور زرعی ملک مصر جانے کا ارادہ کر لیا۔

مصر پر اس زمانے میں ہیکسوس (چرواہے بادشاہوں) کی حکومت تھی۔ یہ عرب تھے اور یہ وہ سامی النسل خاندان ہے جن کے دور میں خانوادہ ابراہیمی کے پانچ پیغمبر ہو گزرے ہیں، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام۔

فرعون نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ کا بہت احترام اور اعزاز کیا اور انھیں ہر قسم کے مال و منال سے نوازا اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ خاندانی روابط قائم کرنے اور انھیں مضبوط و مستحکم کرنے کے لیے اپنی بیٹی ہاجرہ کو بھی ان کی زوجیت میں دے دیا، جو اس زمانے کے رسم و رواج کے اعتبار سے پہلی اور بڑی بیوی سارہ کی خدمت گزار قرار پائیں۔ لیکن اکثر یہودی مؤرخین کا یہ قول ہے کہ ہاجرہ فرعون کی لونڈی تھیں۔ تاہم بعض منصف مزاج یہودی مؤرخ بیٹی قرار دیتے ہیں۔ مثلاً تورات کا ایک معتبر مفسر ربّی شلوملو اسحاق کتاب پیدائش باب 16 کی آیت 1 کی تفسیر میں لکھتا ہے: ''جب شاہِ مصر نے سارہ کی وجہ سے کرامت کو دیکھا تو کہا: ''میری بیٹی کا اس گھر میں لونڈی ہو کر رہنا دوسرے گھر میں ملکہ ہو کر رہنے سے بہتر ہے'' (حوالہ ارض القرآن جلد دوم مصنفہ سید سلیمان ندوی)

اس تفسیر اور تورات کی آیت کو جمع کرنے سے یہ حقیقت بخوبی آشکار ہو جاتی ہے کہ تورات میں ہاجرہ کو صرف اسی لیے لونڈی کہا گیا ہے شاہ مصر نے انھیں سارہ اور ابراہیم علیہ السلام کے سپرد کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ وہ سارہ کی خدمت گزار رہے گی۔ یہ مطلب نہ تھا کہ وہ لونڈی یا باندی ہیں' اس لیے کہ ربی شلوملو تصریح کرتا ہے کہ ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھیں۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے جو روایت مذکورہ ہے' اس میں بھی یہ جملہ موجود ہے:''اس لیے بنی اسرائیل کا یہ طعنہ کہ بنی اسماعیل ہم سے اس لیے کم تر ہیں کہ وہ لونڈی سے ہیں اور ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ سے' صحیح نہیں ہے اور تاریخ اور واقعہ دونوں کے خلاف ہے اور جس طرح تورات کے دوسرے مضامین میں تحریف کی گئی ہے' اسی طرح اس واقعے میں بھی تحریف کی گئی ہے اور واقعے کی تمام تفصیلات کو حذف کر کے صرف''لونڈی'' کا لفظ باقی رہنے دیا گیا ہے۔''

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی لفظ''ہاجرہ'' کے بارے میں لکھتے ہیں:''ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ''ہاغار'' ہے جس کے معنی ہیں بیگانہ' اجنبی۔ ان کا وطن چوں کہ مصر تھا' اس لیے یہ نام پڑ گیا' لیکن اسی اصول کے پیشِ نظر زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ ''ہاغار'' کے معنی''جدا ہونے والے'' کے ہیں اور عربی میں ہاجرہ کے معنی بھی یہی ہیں۔ یہ چوں کہ اپنے وطن سے جدا ہو کر یا ہجرت کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریکِ حیات اور حضرت سارہ کی خدمت گزار بنیں' اس لیے حضرت ہاجرہ کہلائیں۔''

(قصص القرآن' جلد اول)

جب آپ مصر سے روانہ ہوئے تو فرعون کے خاص ملازمین نے آپ کو بڑی عزت سے رخصت کیا۔ ادھر کنعان میں قحط کے آثار ختم ہو چکے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سارہ' ہاجرہ اور لوط کو لے کر کنعان کی طرف لوٹ آئے۔ کنعان کے جنوب میں آپ نے اسی جگہ یعنی بیت ایل میں قیام فرمایا جہاں انھوں نے ایک قربان گاہ تعمیر کرائی تھی۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے پاس بہت سی گائیں' بیل اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ تھے۔ ریوڑوں کی کثرت کے باعث چرواہوں کے درمیان آئے دن لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ پھر یہ چراگاہ اور اس کا میدان جہاں فی الوقت ان کا قیام تھا' اتنی کثرت سے ریوڑوں کے لیے چھوٹا اور ناکافی تھا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بھتیجے سے کہا۔ اب ہم دونوں کے ریوڑ بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور یہ میدان بھی ناکافی ہے' اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم الگ ہو جاؤ اور اس وسیع علاقے میں' جو دور دور تک نظر آتا ہے جہاں چاہو آباد ہو جاؤ۔ حضرت لوط علیہ السلام نے بھی اسے تسلیم کر لیا۔ چند روز تک وہ گھوم پھر کر علاقے میں کوئی اچھی سی جگہ تلاش کرتے رہے' انھیں دریائے اُردن کی ترائی پسند آئی۔ یہ علاقہ مصر کی طرح سرسبز و شاداب تھا۔ اس علاقے میں سدوم اور عمورہ آباد تھے۔ حضرت لوط علیہ السلام سدوم کی طرف قیام پزیر ہو گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی بیت ایل کا علاقہ چھوڑ کر حبرون Hebron کے علاقے میں چلے گئے جو بعد میں الخلیل کہلایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کنعان آئے دس سال گزر چکے تھے اور اب آپ کی عمر 85 سال ہو رہی تھی۔ مگر ابھی تک اولاد نہ ہوئی تھی۔ ان کے گھر کا مالک ایک خانہ زاد الیعزر دمشقی تھا۔ ایک روز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں فرزند کے لیے دعا کی تو اللہ نے ان کی دعا کو قبول کر لیا اور انھیں تسلی دی۔

''ابرام نے کہا' اے خداوند تو مجھے کیا دے گا۔ میں تو بے اولاد جاتا ہوں اور میرے گھر کا مالک الیعزر رہے۔ پھر ابرام نے کہا کہ تو نے مجھے فرزند نہ دیا اور دیکھ خانہ زاد میرا وارث ہوگا۔ تب خداوند کا کلام اس پر اترا اور اس نے کہا کہ یہ تیرا وارث نہیں ہونے کا' بلکہ جو تیری صلب سے پیدا ہو' وہی تیرا وارث ہوگا۔''

(تورات' پیدائش باب 15)

اور یہ دعا اس طرح قبول ہوئی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی چھوٹی بی بی ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔ اس کا قصہ تورات ہی کے مطابق یوں ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو راضی برضا تھے' مگر سارہ' جو ایک عورت تھیں' انھیں اولاد کی شدید خواہش تھی۔ تورات کے مطابق آپ بانجھ تھیں۔ ویسے بھی آپ کی عمر اب ایامِ کہولت میں داخل ہو چکی تھی' اس لیے اولاد کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ آپ نے شوہر سے کہا' ہاجرہ کو اپنی بیوی بناؤ۔ شاید اولاد ہو اور میری آرزو بر آئے۔ آپ نے اس تجویز کی معقولیت کے سبب اسے قبول کر لیا اور حضرت ہاجرہ کو اپنی زوجیت میں لے لیا' اور اسی سال آپ حاملہ ہوئیں۔

جب حضرت سارہ کو یہ پتا چلا تو انھیں بہ تقاضائے بشریت ہاجرہ سے رشک پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی قدرتی امر ہے کہ مرد اس بیوی سے زیادہ التفات برتتا ہے جو اس کی اولاد کی ماں ہو۔ چنانچہ حضرت ابرہیم علیہ السلام کا طبعی رجحان ہاجرہ کی طرف زیادہ رہنے لگا۔ یہ بات بھی حضرت سارہ کے لیے جلن کا باعث ہوئی۔ نیز یہ کہ حضرت سارہ نے دراصل ہاجرہ پر یہ ذاتی احسان کیا تھا کہ ان کی شادی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنی ترغیب پر کرائی تھی۔ یہ ساری چیزیں حضرت سارہ کے دل میں حقارت اور حسد کی شکل اختیار کر گئیں۔ چنانچہ آپ نے حضرت ہاجرہ کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتّٰی کہ آپ کے کان چھید دیے۔ اس سے آپ کا حسن دوبالا ہو گیا تو مزید حسد کی بنا پر آپ پر مزید ظلم ڈھائے۔ حضرت ہاجرہ مجبور ہو کر ان کے پاس سے چلی گئیں۔

''تورات میں ہے اور خداوند کے فرشتے نے اسے میدان میں پانی کے ایک چشمے کے پاس پایا' یعنی اس چشمے کے پاس' جو صور کی راہ پر ہے' اور اس نے کہا کہ اے سری کی لونڈی ہاجرہ تو کہاں سے آئی اور کدھر جاتی ہے؟ وہ بولی کہ میں اپنی بی بی سری کے سامنے سے بھاگی ہوں۔ اور خداوند کے فرشتے نے اُسے کہا کہ تو اپنی بی بی کے پاس جا اور اس کے تابع رہ۔ تو حاملہ ہے۔ تیرے لڑکا ہوگا۔ تو اس کا نام اسماعیل رکھنا۔ اور اس طرح حضرت ہاجرہ اپنے گھر واپس آ گئیں۔ وضع حمل ہوا تو لڑکا پیدا ہوا۔ اسماعیل نام رکھا گیا۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔ مگر حضرت سارہ اور حضرت ہاجرہ کے

درمیان جو کشیدگی چلی آ رہی تھی، وہ مزید بڑھ گئی۔ حضرت سارہ کا حسد انتہائی شدت اختیار کر گیا۔ اب ہاجرہ اور اس کے بچے کی موجودگی ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئی۔ اس لیے آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ حضرت ہاجرہ کو علیحدہ کر دیا جائے، بلکہ دور بیابان میں چھوڑ دیا جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی بیوی کی یہ بات بڑی گراں گزری، اور آپ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، مگر حکم ہوا: ''اے ابراہیم علیہ السلام، جو کچھ سارہ کہتی ہے وہی کر۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک اونٹ پر حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو بٹھایا اور اس مقام پر لے گئے، جہاں اب خانہ کعبہ ہے۔ یہ دشتِ فاران کہلاتا تھا۔ اسی جگہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔ ایک مشکیزہ پانی اور کچھ کھجوریں حضرت ہاجرہ کے پاس تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سلسلے میں حکم خداوندی کی وجہ سے مطمئن تھے اور حضرت ہاجرہ بھی زیادہ متفکر نہ تھیں، کیوں کہ وہ تو پہلے ہی حضرت سارہ کے سخت رویے کی وجہ سے علیحدہ ہونا چاہتی تھیں۔ اگرچہ یہ مقام ویران، بے آب وگیاہ اور خشک بنجر تھا، مگر آپ کو زیادہ تشویش نہ ہوئی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو غیبی امداد کی پوری پوری امید تھی۔ مگر پھر بھی باپ تھے اور حضرت اسماعیل اکلوتے بیٹے ہونے کے علاوہ کم سن تھے۔ شفقتِ پدری کے جذبے سے مجبور ہو گئے۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کنعان واپس جاتے ہوئے آپ نے بیوی اور بچے کے حق میں دعا کی۔ آپ کی دعا قبول ہوئی۔ حضرت ہاجرہ اور ننھے اسماعیل کی روزی اور آسائش کا بندوبست اس بے آب وگیاہ سرزمین میں غیب سے ہو گیا۔

ایک روز جب سورج بلند ہوا۔ دھوپ پھیلی اور گرمی بڑھنے لگی۔ مشکیزہ کا پانی پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ پیاس کی شدت بڑھنے لگی تو آپ سخت پریشان ہوئیں۔ دائیں بائیں خشک پہاڑیاں تھیں۔ چھاؤں کا دُور دُور نام ونشان تک نہ تھا معصوم بچہ پیاس سے بلک رہا تھا۔ قریب ہی ایک جھاڑی پر نظر پڑی۔ بچے کو اس جھاڑی کے سائے میں لٹا دیا اور خود پانی کی تلاش میں نکلیں۔ شاید کہیں پانی مل جائے۔ بچے کی محبت اور پانی کی جستجو میں اضطراب کا یہ عالم تھا کہ آپ کبھی ایک طرف پانی کے لیے دوڑتیں اور پھر بچے کی حفاظت کے خیال سے بچے کی طرف واپس آتیں۔ پھر دوسری جانب دوڑتیں اور مایوس ہو کر ننھے بچے کی طرف واپس آتیں۔ دھوپ کی حدت کے سبب بچے کو آغوش میں نہ رکھتی تھیں۔ یہی عمل بار بار دُہرایا۔ آخری بار بچے کی طرف واپس آئیں تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ جس جگہ اسماعیل جھاڑی کے سائے میں پڑے ایڑیاں رگڑ رہے تھے اس جگہ پانی کا شفاف چشمہ بہہ رہا ہے۔ حیرت اور خوشی کی کیفیت میں آپ نے بچے کو چھاتی سے چمٹا لیا۔ بچے کو پانی پلایا۔ خود پیا اور سکون سے بیٹھ گئیں۔ رات گزری، دن نکلا۔ اسی طرح کئی دن گزر گئے۔

ایک روز اس طرف سے بنو جرہم کا ایک قافلہ گزرا، اور پانی کا چشمہ اس مقام پر دیکھ کر حیران رہ گیا، اس لیے کہ پہلے اس جگہ کوئی چشمہ نہ تھا۔ اس قافلے نے وہیں حضرت ہاجرہ سے قیام کی اجازت چاہی اور پانی کے استعمال کی قیمت ادا کی، جو اشیائے خورد ونوش کی صورت میں تھی۔ اب یہ جگہ رفتہ رفتہ قافلوں کے پڑاؤ کے لیے ہو گئی۔ یوں اس جگہ پر ایک چھوٹی سی آبادی کی صورت پیدا ہو گئی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی آب وہوا میں پروان چڑھتے رہے۔

پانچ سال گزر گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وقفے وقفے سے آنے والے احکام خداوندی کی تعمیل کرتے رہے۔ کنعان کے باشندوں کی اصلاح، ان کے جھگڑوں کے تصفیے میں مصروف رہے۔ درمیان میں کبھی کبھی ہاجرہ اور اسماعیل کو دیکھ آتے کہ وہ کس حال میں گزر بسر کر رہے ہیں۔

آٹھ سال اور گزر گئے۔ اس موقع پر ختنہ کرنے کا حکم ہوا۔ اس حکم کے ذریعے گھر کے ہر لڑکے کا ختنہ کرانا لازمی قرار دیا گیا، اور یہ حضرت ابراہیم اور اللہ کے درمیان عہد کا نشان قرار پایا۔ تورات کتاب پیدائش باب 17 میں یوں ہے: ''تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کیا کرنا۔ اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمھارے درمیان ہے۔ تمھارے ہاں پشت در پشت ہر لڑکے کا ختنہ، جب وہ آٹھ روز کا ہو کیا جائے۔ خواہ وہ گھر میں پیدا ہو، خواہ اسے کسی پردیسی سے خریدا ہو، جو تیری نسل سے نہیں۔ میرا عہد تمھارے جسم میں ابدی عہد ہوگا، اور وہ فرزند نرینہ، جس کا ختنہ نہ ہوا ہو، اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے، کیوں کہ اس نے میرا عہد توڑا۔''

اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ آپ نے اپنے سب غلاموں کا ختنہ ایک ہی دن کرایا۔ اولادِ نرینہ میں فقط اسماعیل ہی تھے۔ چنانچہ آپ پھر حضرت ہاجرہ کے پاس گئے۔ وہاں اپنے اور حضرت اسماعیل کے ختنے کرائے اور پھر واپس آ گئے۔ تورات میں لکھا ہے: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل کے ختنے ایک ہی دن ہوئے۔'' اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ننانوے سال اور حضرت اسماعیل کی عمر تیرہ سال تھی۔

اسی سال یعنی جس سال ختنے کا حکم ہوا، آپ نے خواب میں اپنے بیٹے اسماعیل کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا۔ قرآن کی سورۂ صافات کی آیات 102 تا 108 میں یوں آیا ہے: ''وہ لڑکا جب دوڑ دھوپ کرنے کی عمر کو پہنچ گیا تو ایک روز ابراہیم علیہ السلام نے اس سے کہا ''بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں۔ اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے؟'' اس نے کہا: ''ابا جان، جو کچھ آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اسے کر ڈالیے۔ آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے۔'' آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا اور ہم نے ندا دی کہ ''اے ابراہیم علیہ السلام تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ یقیناً ایک کھلی آزمائش تھی۔'' اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اس بچے کو چھڑا لیا اور اس کی تعریف وتوصیف ہمیشہ کے لیے بعد کی نسلوں میں چھوڑ دی۔''

''بڑی قربانی'' سے مراد جیسا کہ بائبل اور اسلامی روایات میں بیان ہوا ہے، ایک مینڈھا ہے جو اس وقت اللہ تعالیٰ کے فرشتہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے

سامنے پیش کیا' تاکہ بیٹے کے بدلے اسے ذبح کر دیں۔ اسے بڑی قربانی کے لفظ سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام جیسے وفادار بندے کے لیے فرزند ابراہیم علیہ السلام جیسے صابر و جاں نثار لڑکے کا فدیہ تھا اور اسے اللہ تعالیٰ نے ایک بے نظیر قربانی کی نیت پوری کرنے کا وسیلہ بنایا تھا۔ اس کے علاوہ اسے ''بڑی قربانی'' قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری کر دی کہ اسی تاریخ کو تمام اہلِ ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری و جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعے کی یاد تازہ کرتے رہیں۔

اس وقت دنیا میں کوئی مرکز ایسا نہیں تھا جسے عالم گیر انسانیت کے نظام کے مرکز و محور کے حیثیت حاصل ہو۔ کعبہ اس نظام کا مرکز تھا جو تمام بنی نوع انسان کے لیے عالم گیر حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں کعبہ یا حج کا ذکر آیا ہے انھیں ''للناس'' کہہ کر پکارا گیا ہے یعنی کسی خاص قبیلے' قوم وطن حکومت یا مذہب کا مرکز نہیں' بلکہ نوع انسان کے لیے جامعیت کے نظام کا مرکز' تمام انسانوں کے امت واحدہ بننے کے لیے مرکز ثقل۔ یہ مرکزی حیثیت تھی اس گھر کی' جس کی تعمیر کے لیے حضرت ابراہیم کو حکم دیا گیا اور جس کی پاس بانی کا فریضہ حضرت اسماعیل اور آپ کی اولاد کے سپرد کیا گیا۔

اس وقت دنیا کے مختلف گوشوں میں بڑے بڑے بت کدے' دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے لیے عظیم الشان مندر' سورج چاند ستاروں کی پرستش کے لیے وسیع و عریض ہیکل موجود تھے۔ لیکن تمام کرۂ ارض پر اللہ واحد کی عبودیت کے لیے کوئی مقام نہ تھا۔ یہ منصب جلیلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سعادت کے لیے مقدر تھا۔

''یاد کرو وہ وقت جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے اس گھر (خانہ کعبہ) کی جگہ تجویز کی تھی (اس ہدایت کے ساتھ) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھو''

(حج 26-25)

''بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی' وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اسے خیر و برکت دی گئی اور تمام دنیا والوں کے لیے مرکز ہدایت بنایا گیا۔'' (آلِ عمران۔96)

یہ تھی وہ عدیم النظیر خدمت جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تفویض کی گئی تھی۔ یوں تو اس تمام کائنات میں کون سی چیز ہے جو اللہ کی نہیں' لیکن مٹی اور پتھر کی جس سادہ سی چار دیواری کو مالکِ ارض و سمٰوات نے اپنی نسبت کا شرف عطا فرمایا' وہ یہی بیت اقدس تھا' جس کا سنگِ بنیاد جناب ابراہیم خلیل اللہ جیسے توحید پرست کے مقدس ہاتھوں نے رکھا اور جس کی تعمیر کے لیے اسماعیل جیسے تیرہ چودہ سال کے لڑکے نے' جو پیکر ایثار تھا' مٹی اور پتھروں کو اپنے سر پر اٹھایا:

''اس گھر کو ہم نے بنی نوع انسان کے لیے مرکز اور امن کی جگہ قرار دے دیا' اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام جہاں عبادت کے لیے کھڑے ہوتا ہے' اس مقام کو مستقل جائے نماز بنالو' اور ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو تاکید کی تھی کہ میرے اس گھر کو طواف اور اعتکاف اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔'' (بقرہ آیت 125)

مرکز امن کا یہ مقام اس بے آب و گیاہ' خشک بنجر وادی میں تھا جہاں انسانی سکونت و اقامت کے لیے کوئی جاذبیت نہ تھی۔ اسی لیے اس کے انتخاب کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر بے اختیار یہ دعا آ گئی:

''اے میرے رب' اس شہر کو امن کا شہر بنا دے اور اس کے باشندوں میں سے جو اللہ اور یوم آخرت کو مانیں انھیں ہر قسم کے پھلوں کا رزق دے۔'' جواب میں اس کے رب نے فرمایا'' اور جو نہ مانے گا دنیا کی چند روزہ زندگی کا سامان تو میں اسے بھی دوں گا مگر آخر کار اسے جہنم کے عذاب کی طرف گھسیٹوں گا اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔''

(البقرہ:127)

''اور یاد کرو ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے تو دعا کرتے جاتے تھے'' اے ہمارے رب' ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے تو سب کی سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اے رب' ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا۔ ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا' جو تیری مسلم ہو' ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما' تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اور اے رب' ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو' جو انھیں تیری آیات سنائے' انھیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔ تو بڑا مقتدر اور حکیم ہے۔'' (البقرہ۔127 تا 129)

یہ وہ حسین و مقدس دعائیں تھیں کہ ادھر زبان سے نکلیں اور ادھر شرفِ قبولیت سے ہم آغوش ہو گئیں۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر سو سال ہو رہی تھی کہ آپ کو دوسرے بیٹے اسحاق کی پیدائش کی بشارت ہوئی اور وہ بھی انسانوں کے بھیس میں فرشتوں کے ذریعے۔ یہ واقعہ قرآن اور تورات دونوں میں موجود ہے' اگرچہ قرآن اور تورات کا انداز بیان مخصوص اور جدا ہے۔ اور یہاں صرف قرآن مجید کی سورۂ ہود آیات 69 تا 76 کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

اور دیکھو' ابراہیم علیہ السلام کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لیے ہوئے پہنچے۔ کہا' تم پر سلام ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا' تم پر سلام ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم علیہ السلام ایک بھنا ہوا بچھڑا (ضیافت کے لیے) لے آیا۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا۔ انھوں نے کہا: ''ڈرو نہیں۔ ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔'' ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی' وہ یہ سن کر ہنس دی۔ پھر ہم نے اسے اسحاق علیہ السلام کی اور اسحاق کے بعد یعقوب علیہ السلام کی خوش خبری دی۔ وہ بولی: ''ہائے میری کم بختی کیا اب میرے ہاں اولاد ہو گی جب کہ میں بڑھیا پھونس ہو گئی

اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔'' فرشتوں نے کہا: ''اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم علیہ السلام کے گھر والو تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں اور یقیناً اللہ نہایت قابل تعریف اور بڑی شان والا ہے۔''

فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بجائے حضرت سارہ کو یہ خوش خبری اس لیے سنائی کہ اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں تو ان کی دوسری بیوی حضرتِ ہاجرہ سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے' مگر حضرتِ سارہ اس وقت تک بے اولاد تھیں اور اس بنا پر دل انھی کا زیادہ غم گیں تھا۔ ان کے اس غم کو دور کرنے کے لیے فرشتوں نے انھیں صرف یہ خوش خبری نہیں سنائی کہ تمھارے ہاں اسحاق علیہ السلام جیسا جلیل القدر بیٹا پیدا ہوگا' بلکہ یہ بھی بتایا کہ بیٹے کے بعد پوتا بھی یعقوب علیہ السلام جیسا عالی شان پیغمبر ہوگا۔

اگلا موسم بہار آیا۔ اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔ اور وقتِ معینہ پر حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ آٹھویں روز آپ کے ختنے کرائے گئے۔ ایک بڑی ضیافت کا اہتمام ہوا غریبوں' مسافروں اور اپاہجوں کو کھانا کھلایا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر سو سال اور حضرت سارہ کی عمر اکانوے سال تھی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تقریباً چودہ سال تھی۔

تورات کے مطابق جب حضرت سارہ کی عمر 127 برس کی ہوئی تو پیامِ اجل آ گیا۔ اس وقت اسماعیل علیہ السلام کی عمر تقریباً پچاس سال تھی اور اسحاق علیہ السلام 36 برس کے تھے۔ آپ نے حبرون میں انتقال کیا۔ اس وقت حضرت ابرہیم علیہ السلام مکہ میں تھے۔ ان تک خبر پہنچی تو آپ فوراً حبرون پہنچے۔ تکفین کے بعد تدفین کا مسئلہ درپیش آیا۔ وہاں آپ کا کوئی قبرستان نہ تھا اور نہ آپ کی زرخرید زمین تھی' اس لیے آپ حطیوں کے پاس گئے اور کہا' میں تمھارے ملک میں ابھی تک ایک پردیسی اور غریب الوطن کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ یہاں کوئی زمین میری ملکیت نہیں ہے۔ میری بیوی فوت ہو گئی ہے۔ تم مجھے اپنے ملک میں زمین کا کوئی ٹکڑا قیمتاً دے دو تاکہ میں اسے قبرستان کے طور پر استعمال کروں۔ حطیوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا: ''ہمارے قبرستان موجود ہیں۔ جس جگہ چاہو دفن کر دو۔'' آپ نے جواب دیا: ''میں نہیں چاہتا کہ تمھارے قبرستان میں اپنے مردے دفن کروں۔ تم بس میری اتنی مدد کرو کہ عفرون بن صحر سے میری سفارش کر دو اور اس پر زور دو کہ مکفیلہ کا غار' جو اس کی ملکیت ہے' اور اس کے کھیت کے کنارے پر ہے' اس کی پوری قیمت لے کر میرے ہاتھ فروخت کر دے۔ عفرون وہیں موجود تھا۔ اس نے سب لوگوں کے سامنے کہا' میں وہ غار اور کھیت دونوں چیزیں کسی معاوضے کے بغیر دینے کو تیار ہوں۔ آپ کے مقابلے میں اس کی قیمت کوئی حیثیت نہیں رکھتی' مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اصرار کیا اور چاندی کی چار سو مثقال دے کر عفرون حطی سے زمین خرید لی' اور اپنی بیوی سارہ کو اسی غار میں دفن کیا جو آپ نے کھیت کے ساتھ خریدا تھا۔ فلسطین میں یہ آپ کی پہلی ملکیت تھی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام بیوی کی تدفین کے بعد پھر مکہ واپس چلے گئے اور عبادتِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام فلسطین ہی میں اسی جگہ اپنے غلاموں اور بھیڑ بکریوں کے ساتھ رہتے رہے۔ اب وہ 36 سال کے بھرپور جوان تھے۔ اچھے برُے کو سمجھتے تھے اور خود مختار تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر 136 برس ہو چکی تھی۔ اب وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ اور بار بار سفر کرنے سے قاصر تھے کہ کبھی فلسطین جائیں اور کبھی مکہ۔ مگر حضرت اسحاق علیہ السلام کی شادی کی فکر بھی لاحق تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بعد حضرت اسحاق فلسطین ہی میں حطیوں میں شادی کریں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کی شادی آبائی وطن سے ان کے اپنے خاندان میں ہو۔ آپ کو کسی ذریعے سے پتا چل گیا تھا کہ آپ کے بھائی نحور کی اولاد ہے اور اس کی ایک خوب صورت پوتی بھی ہے' جس کا نام ربقہ ہے۔ وہ اسحاق کی شادی ربقہ ہی سے کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک معتمد غلام الیعزر کو حاران بھیجا اور شادی کا سوال کیا' جو منظور ہوا۔ یہ شادی حضرت سارہ کی وفات کے چار سال بعد ہوئی۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کی شادی کے بعد آپ 35 سال اور زندہ رہے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی جانب سے اطمینان کر لینے کے بعد آپ نے ایک اور شادی کی۔ آپ کی اس تیسری بیوی کا نام قطورہ تھا۔ قطورہ کے بطن سے آپ کے چھ لڑکے پیدا ہوئے اور ان کی اولاد بنی قطورہ کہلائی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے 175 سال کی عمر پائی تو پیامِ اجل آ پہنچا اور آپ اپنے رب سے جا ملے۔ اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام دونوں بیٹوں نے آپ کی تجہیز و تکفین میں حصہ لیا۔ اور مکفیلہ کے اسی غار میں جو آپ نے زندگی میں خریدا تھا' اپنی بیوی سارہ کے پہلو میں دفن کر دیے گئے اس مقام کو اب الخلیل کہتے ہیں۔ قرآن مجید کی دو سورتوں میں ''صحف ابراہیم علیہ السلام'' کا بھی ذکر ہے۔ سورۂ نجم کی آیت 53 میں یوں آیا ہے: ''کیا اسے ان باتوں کی کوئی خبر نہیں پہنچی جو موسیٰ کے صحیفوں اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہیں جس نے وفا کا حق ادا کر دیا۔''

سورۃ الاعلیٰ کی آیات 18 اور 19 میں یہی عبارت ہے: ''یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں بھی کہی تھی ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں۔''

حضرت موسیٰ کے صحیفوں سے مراد تورات ہے۔ رہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے تو وہ آج دنیا میں کہیں موجود نہیں ہیں' اور یہود و نصاریٰ کی کتب مقدسہ میں بھی ان کا کوئی ذکر نہیں پایا جاتا۔ صرف قرآن ہی وہ کتاب ہے جس میں دو مقامات پر صحف ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کے بعض اجزا نقل کیے گئے ہیں۔ سورۂ نجم اور سورۃ الاعلیٰ۔ البتہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں ایک اشارہ ملتا ہے: ''اہل تاریخ کے نزدیک متعدد صحیفے تھے۔ ایک صحیفہ جوان کی طرف منسوب ہے' یونانی سے انگریزی میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ اس کا نام ہے Testament of Abrahlm اور مترجم کا نام ہے G-H-Box۔ یہ ترجمہ لندن سے 1927 میں شائع ہوا۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ خصوصیت' جس میں کوئی نبی آپ کا شریک نہیں'

وہ یہ ہے کہ ہر مسلمان آخری رسول محمد مصطفٰے کے ساتھ ساتھ ان پر اور ان کی آل پر بھی درود بھیجتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے ہر درود جو سکھایا ہے اس میں یہ بات ضرور شامل ہے کہ آپ ﷺ پر ویسی ہی مہربانی فرمائی جائے، جیسی ابراہیم علیہ السلام اور آلِ ابراہیم پر فرمائی گئی ہے۔ اس مضمون کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں علمائے کرام نے کی ہیں، مگر وہ تاویل دل کو لگتی ہے جو مولانا مودودی نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "میرے نزدیک صحیح تاویل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ایک خاص کرم فرمایا ہے جو کسی اور پر نہیں فرمایا، اور وہ یہ ہے کہ تمام وہ انسان جو نبوت، اور وحی اور کتاب کو رشد و ہدایت کا ماخذ مانتے ہیں، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیشوائی پر متفق ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ لہٰذا آنحضور ﷺ کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیا کے پیرووں کا مرجع بنایا ہے، اسی طرح مجھے بھی بنا دے، اور کوئی ایسا شخص جو نبوت کا ماننے والا ہو، میری نبوت پر ایمان لانے سے محروم نہ رہ جائے" (تفہیم القرآن، جلد چہارم، صفحہ 126)

اور پھر خود اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توصیف میں مستقل فرمادیا:
"ابراہیم علیہ السلام تو وہ شخص ہے، جسے ہم نے دنیا میں اپنے کام کے لیے چن لیا تھا، اور آخرت میں اس کا شمار صالحین میں ہوگا۔ اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا: "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا "میں رب العالمین کا مسلم ہو گیا۔" اسی طریقے پر چلنے کی ہدایت اس نے اپنی اولاد کو کی تھی" (بقرہ۔ آیت 131)

حضرت لوط علیہ السلام

آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں۔ بائبل کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بھائی تھے۔ نحور اور حاران۔ حضرت لوط حاران کے بیٹے تھے۔ آپ کا شجرۂ نسب اس طرح بنتا ہے:۔ لوط بن حاران بن آذر (تارح۔) حاران کے نام پر ایک شہر آج بھی وادی فرات (شام) میں آباد ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام عراق کے قدیم شہر "اُر" میں پیدا ہوئے۔ یہی وہ شہر تھا جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل تھا۔ یہ شہر جنوبی عراق میں دریائے فرات کے کنارے بابل اور نینوا سے بھی پہلے آباد تھا۔ اس کا محل وقوع اس جگہ تھا جہاں آج کل "تل العبید" واقع ہے۔ برٹش میوزیم اور فلاڈلفیا یونیورسٹی کے میوزیم کی ایک مشترکہ اثری مہم نے بیسویں صدی کے اوائل میں تل العبید کی کھدائی کا کام شروع کیا اور سات آٹھ برس کی محنت کے بعد یہ شہر نمودار ہو گیا۔ اس اثری انکشاف سے قرآن مجید اور انبیائے کرام کے متعدد گوشوں اور بابلی تہذیب وثقافت کے کئی پہلوؤں پر مزید روشنی پڑی ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام نے برسوں اپنے شفیق چچا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رہ کر شام، فلسطین اور مصر کے وسیع و عریض علاقے میں دینِ حق کی تبلیغ واشاعت کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے بعد آپ نبوت کے منصب پر فائز ہوئے اور آپ کے سپرد یہ کام ہوا کہ دریائے اردن کی وادی بحیرہ میت یا بحیرہ مُردار یا بحیرہ لوط Dead Sea کے کنارے آباد شہروں میں رہنے والی قوم کو راست روی کی دعوت دیں، مگر اس قوم نے خیر خواہی کی بات سننے اور ماننے کی بجائے اللہ کے نبی کو اپنی بستیوں سے نکال باہر کرنے کا پروگرام بنایا اور انھیں کھلم کھلا دھمکیاں دیں۔ اس قوم کی سرکشی اور بدمستی اسے اس طرح لے ڈوبی کہ اس کے پررونق شہروں اور سرسبز شاداب نخلستان کا روئے زمین پر نام ونشان تک باقی نہیں رہا۔ اس پورے علاقے یعنی بحیرہ لوط کے جنوبی اور مشرقی حصوں پر اب بھی ویرانی اور نحوست کی ایسی فضا مسلط ہے کہ جغرافیہ دانوں کا بیان ہے کہ ایسی ویرانی کی نظیر روئے زمین پر کہیں نہیں ملتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وطن میں توحید کا پیغام عام کیا۔ مشرکوں پر ان کے عقائد ونظریات کی غلطی واضح کرنے کے لیے ان کے معبودانِ باطل یعنی بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں حکومت وقت نے انھیں بھڑکتی آگ میں پھنکوا دیا اور پھر ہزاروں نہیں، لاکھوں انسانوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آگ ان پر گل زار بن گئی۔ ابراہیم علیہ السلام کے رب نے انھیں بچالیا، جب کہ ان لوگوں کے باطل خدا اپنے آپ کو ضرب ابراہیمی سے نہ بچا سکے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ اس موقع پر بہت سے لوگ اپنے دل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صداقت کے قائل ہو گئے ہوں، لیکن حکومت کے قہر وغضب کے ڈر سے کوئی شخص بھی حق کا ساتھ دینے کی جرأت نہ کر سکا، مگر اس وقت جس مردِ حق نے پوری بے باکی سے حق کا ساتھ دینے کا برملا اعلان کیا، اور جنھیں خلیل اللہ کے مقدس مشن کی حمایت کی سعادت حاصل ہوئی، وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے "لوط" تھے۔ انھوں نے اپنے چچا اور چچی کے ساتھ اپنے پیارے شہر اور پیارے وطن کو خیر باد کہا اور ہجرت کی سختیاں مردانہ وار برداشت کیں۔ قرآن مجید آپ علیہ السلام کی اس تاریخ ساز عزیمت واستقامت کا بیان اس طرح کرتا ہے: "اس وقت لوط علیہ السلام نے اس (ابراہیم علیہ السلام) کو مانا" اور ابراہیم علیہ السلام نے کہا: "میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں۔ وہ زبردست ہے اور حکیم ہے۔" (عنکبوت۔ 26)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے وطن عراق سے ہجرت کر کے شام سے ہوتے ہوئے فلسطین تشریف لے آئے۔ اس زمانے میں یہ علاقہ کنعان کہلاتا تھا۔ آپ علیہ السلام نے ایک داعی کی حیثیت سے شام، فلسطین اور مصر کے پورے علاقے میں بندگانِ خدا کو دینِ حق کی دعوت دی۔ اس عظیم کام میں حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے چچا کے ساتھ رفاقت ونصرت کا پورا پورا حق ادا کیا۔

حضرت لوط علیہ السلام اپنے چچا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مصر سے واپس آئے تو اللہ نے آپ کو بھی منصبِ نبوت پر فائز کیا اور ایسی قوم کی اصلاح اور ہدایت کا فریضہ آپ کے سپرد ہوا جو ایک ایسی شرم ناک بداخلاقی میں مبتلا تھی جس کی مثال سے پوری انسانی تاریخ خالی ہے۔ اس قوم نے انسان کی فطرت اور اس کی طبعی ساخت کے تقاضے پسِ پشت ڈال کر شہوت رانی اور لذت پرستی کی ایسی مکروہ اور قابلِ نفرت

صورت ایجاد کی تھی، جس سے انسانی اخلاق وتمدن کی تمام جڑیں کٹ کے رہ گئیں، یعنی اغلام اور امرد پرستی۔

یہ قوم جس علاقے میں آباد تھی، اسے آج کل شرق اردن کہتے ہیں۔ اس کی آبادیاں اس شاہ راہ پر واقع تھیں، جس پر حجاز سے شام اور عراق سے مصر جانے والے قافلے گزرتے تھے۔ بائبل کے مطابق اُس کے صدر مقام کا نام ''سدوم'' تھا جو بحیرہ لوط کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ سدوم کے علاوہ چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے۔ ان شہروں کے درمیان کا علاقہ اس قدر سرسبز وشاداب تھا کہ میلوں تک باغ ہی باغ تھے۔

آج اس قوم کا نام ونشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے اور یہ متعین نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ آج ان کی صرف ایک ہی یادگار باقی رہ گئی ہے جسے بحرمیت یا بحیرہ مردار یا بحیرہ لوط کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید کے نزول کے وقت قریش اور اہلِ عرب کے قافلے شام کو جاتے ہوئے اس ویران اور تباہ شدہ علاقے سے گزرتے تھے۔ اللہ کی آخری کتاب اس علاقے کا ذکر اس طرح کرتی ہے: ''(قوم لوط کی تباہی کے) اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو صاحبِ فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، گزرگاہِ عام پر واقع ہے۔ اس میں سامانِ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو صاحبِ ایمان ہیں۔'' (حجر، 75۔77)

بائبل اس علاقے کی سرسبزی وشادابی کا تذکرہ اس طرح کرتی ہے:

''تب لوط نے آنکھ اٹھا کر دریائے اردن کی ترائی کی طرف دیکھا۔ سدوم اور عمورہ کی تباہی سے پہلے ترائی کا یہ پورا علاقہ خداوند کے باغ (جنت) اور مصر کے ملک کی طرح سیراب تھا۔ لوط نے دریائے اردن کی ساری ترائی کو اپنے لیے چن لیا۔''

(کتاب پیدائش، باب 13)

موجودہ بائبل حضرت لوط علیہ السلام کی کردار کشی کرتے ہوئے بتاتی ہے ''لوط'' حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لڑ کر سدوم چلا گیا تھا۔'' (کتاب پیدائش، باب 13)

قرآن مجید اس غلط بیانی کی تردید کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ حضرت لوطؑ اپنے چچا حضرت ابراہیمؑ سے لڑ کر سدوم نہیں گئے تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں رسول بنا کر علاقے میں آباد قوم کی طرف بھیجا تھا۔ قرآن کا بیان ہے:

''لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔ یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا تھا کہ تم ڈرتے نہیں؟ میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں، لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میری اُجرت رب العالمین کے ذمے ہے۔'' (الشعراء۔160 تا164)

بائبل میں جو سب سے پہلا سیاسی واقعہ بیان ہوا ہے اس کا تعلق بھی حضرت لوط علیہ السلام کی ذات سے ہے۔ تفصیل اس طرح ہے:

''جب حضرت لوط علیہ السلام نبوت کے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں دریائے اردن کی ترائی کے علاقے میں رہائش پذیر تھے تو عراق کے بادشاہ امرافیل نے سدوم کے بادشاہ پر چڑھائی کر دی۔ دونوں کے مابین سخت جنگ ہوئی جس میں عراق کے بادشاہ کو فتح حاصل ہوئی۔ اس نے اس علاقے کے بے شمار لوگوں کو گرفتار کر لیا اور انھیں قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے چلا۔ ان گرفتار شدگان میں حضرت لوط علیہ السلام بھی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ نے ''حوبہ'' تک دشمن کا تعاقب کیا۔ حوبہ کا شہر دمشق کے بائیں جانب تھا۔ آپ نے حضرت لوط علیہ السلام اور دوسرے قیدیوں کو عراق کے بادشاہ کی قید سے آزاد کرا لیا اور اس طرح بہت سا مال غنیمت بھی آپ کے ہاتھ آیا۔'' (کتاب پیدائش، باب 14)

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم اللہ کے نام سے واقف تھی۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام نے جب اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے ڈرو تو انھوں نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ ہم نہیں جانتے اللہ کون ہے۔ اسی طرح جب اس قوم کی سرکشی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور حضرت لوط علیہ السلام نے انھیں عذاب الٰہی کی وعید سنائی تو انھوں نے پوری ڈھٹائی سے کہا کہ اگر تو سچا ہے تو ہم پر اللہ کا عذاب لے آ۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب کہا کہ میں اللہ کی طرف سے تمھارے پاس ایک امانت دار رسول کی حیثیت سے آیا ہوں تو ان لوگوں نے قوم نوحؑ، عاد اور ثمود کی طرح کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم تجھے خدا کا رسول ماننے کے لیے تیار نہیں کیوں کہ تو ہماری طرح ایک انسان ہے۔ تو ہماری طرح کھاتا پیتا، بازاروں میں چلتا پھرتا اور زندگی کے عام بکھیڑوں میں حصہ لیتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قوم توحید اور رسالت کے عقائد ونظریات سے بے خبر نہیں تھی۔

اس قوم کا علاقہ نہایت زرخیز اور سرسبز وشاداب تھا۔ باغوں اور کھیتوں کی سیرابی کے لیے پانی کی فراوانی تھی، اس لیے غلے اور پھلوں کی پیداوار بکثرت ہوتی تھی۔ اس طرح شہروں اور بستیوں میں خوش حالی اور فارغ البالی کا دَور دورہ تھا۔ اس خوش حالی ہی نے یہاں کے رہنے والوں کو عیش وعشرت اور بے حیائی وفحاشی کا گرویدہ بنا دیا۔

یہ قوم ایک بگڑی ہوئی قوم تھی۔ قدرت نے نوعِ انسانی کے سلسلے کو قائم رکھنے کے لیے اس کی دو اصناف بنائیں، یعنی مرد اور عورت۔ اور پھر دونوں صنفوں میں باہمی کشش کی ایک خاص کیفیت ودیعت فرما دی تاکہ توالد وتناسل کا تعمیری نظام قائم رہے۔ اور یہ فطری داعیہ ایک مرد اور ایک عورت کو شادی کے بندھن میں بندھ کر اس امر پر آمادہ کرتا رہے کہ وہ ایک خاندان کی بنیاد رکھ کر انسانی تہذیب ومعاشرت کے ارتقا واستحکام میں اپنا حصہ ادا کریں مگر اس قوم نے فطرت کی اس اسکیم کو تہ وبالا کر دیا۔ مردوں نے عورتوں کے بجائے مردوں ہی سے شہوانی روابط قائم کرنا شروع کر دیے۔ اس غیر فطری اور غیر اخلاقی طرزِ عمل نے جہاں مردوں کو شرافت وانسانیت کی تمام اعلیٰ اقدار سے کلیۃً محروم کیا وہیں عورتوں کو بھی بے حیائی اور بے شرمی کے دہکتے جہنم میں جھونک دیا۔

قرآنِ مجید اس قوم کی رزالت اور ذلالت کا نقشہ حضرت لوط علیہ السلام کی زبانی متعدد مقامات پر پیش کرتا ہے۔ ایک جگہ بیان ہوتا ہے:

''اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا۔ پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا: ''اپنی عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔'' (سورۃ اعراف' آیات 81'82)

ایک اور مقام پر حضرت لوط علیہ السلام ان کی غلط روش پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''کیا تم دنیا کی مخلوق میں سے مردوں کے پاس جاتے ہو اور تمھاری بیویوں میں تمھارے رب نے تمھارے لیے جو کچھ پیدا کیا ہے' اسے چھوڑ دیتے ہو؟ بلکہ تم لوگ تو حد ہی سے گزر گئے ہو۔'' (سورۃ شعراء آیات 165'166)

اس قوم کی بدبختی اور علانیہ بے شرمی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ وہ اس گھناؤنے فعل کا ارتکاب اپنی بھری محفلوں میں کھلم کھلا کرتے اور اپنی اس جرأت وفخر ومباہات کے اظہار سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت لوط علیہ السلام ان کی اس ڈھٹائی پر تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تم تو وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا والوں میں سے کسی نے نہیں کیا۔ کیا تمھارا حال یہ ہے کہ مردوں کے پاس جاتے ہو اور راہ زنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں برے کام کرتے ہو۔'' (سورۃ عنکبوت' آیات 29'28)

حضرت لوط علیہ السلام کی مندرجہ بالا تقریروں سے اس قوم کی نہایت مکروہ صورت سامنے آتی ہے۔ یہی وہ قوم ہے جس نے تاریخ انسانی میں سب سے پہلے مردوں کا مردوں کے ساتھ شہوانی اختلاط کا طریقہ ایجاد کیا' چنانچہ آج بھی اس فعلِ بد کو اس قوم اور شہر سدوم کی نسبت سے لواطت (انگریزی میں Sodomy) کہا جاتا ہے۔

یہ تھی وہ قوم جس کی ہدایت اور اصلاح کے کام پر حضرت لوط علیہ السلام اللہ کی طرف سے مامور ہوئے تھے۔ آپؑ نے ان پر یہ بات واضح کی کہ میں تم تک خدا کا پیغام پہنچا رہا ہوں اور تمھارے برے اعمال کے عواقب ونتائج سے تمھیں ڈرا رہا ہوں۔ تا کہ تم ہدایت اختیار کرو۔ اس وعظ ونصیحت سے میرا مقصد دنیاوی نام ونمود یا مال و دولت جمع کرنا نہیں۔ میں عوض میں تم سے کسی چیز کا طالب نہیں۔ میرا بدلہ تو صرف خدا کے ذمے ہے جس کی پیغام رسانی کا کام میرے سپرد ہوا ہے۔

آپ نے بار بار اُس قوم کو اُس کی مخصوص گم راہی یعنی شہوت پرستی اور غیر فطری افعال کی طرف توجہ دلائی اور اُسے اِن حرکات شنیعہ سے باز رکھنے کی کوشش کی مگر قوم کے بدمست لوگوں نے ہمیشہ یہی جواب دیا:

''اے لوط' اگر تو ان باتوں سے باز نہ آیا تو جو لوگ ہماری بستیوں سے نکالے گئے ہیں' ان میں تو بھی شامل ہو کر رہے گا۔'' (الشعراء۔167)

اس جواب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قومِ لوط کے افراد شہوت پرستی اور اغلام جیسے افعال بد کے ایسے رسیا ہو گئے تھے کہ وہ اپنے اس طرز عمل کے خلاف کسی کی کوئی بات سننے کو تیار نہ تھے۔ جو کوئی بھی ان سے سیدھی راہ پر چلنے اور حرام چھوڑ کر حلال ذرائع استعمال کرنے کی بات کہتا' وہ ان کے نزدیک اتنا قابلِ ملامت اور لائق نفرت قرار پاتا کہ ان کی بستیوں میں پھر اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ ایسی نصیحت کرنے والوں کو فوراً بستی سے نکال دیا جاتا تھا۔

حضرت لوط علیہ السلام قوم کی دھمکیوں کو خاطر میں لائے بغیر مسلسل دعوت وارشاد کے کام میں منہمک رہے۔ اس پر قوم کے بدبختوں کی جاہلانہ اور فاسقانہ حمیت جوش میں آ گئی اور انھوں نے اعلان کر دیا: ''نکال دو لوط کے گھر والوں کو اپنی بستی سے۔ یہ بڑے پاک باز بنتے ہیں۔'' (نمل 56)

قرآن مجید اور بائبل سے اس بات کا تو پتا نہیں چلتا کہ آپ نے اپنی قوم میں کتنے عرصے تبلیغ وارشاد کا کام کیا' لیکن انبیائے کرام کی دعوت کی جو تفصیلات قرآنِ مجید نے ہمیں بتائی ہیں' ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت لوط نے ایک لمبے عرصے تک رسالت کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ ہوسکتا ہے یہ عرصہ نصف صدی سے زیادہ وقفہ پر پھیلا ہوا ہو۔

حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کو خدا کی طرف سے نازل ہونے والے عذاب سے ڈرایا' مگر وہ لوگ اپنی بدمستیوں میں اتنے مدہوش تھے کہ انھوں نے پوری سرکشی کے انداز میں کہا:

''لے آ اللہ کا عذاب اگر تو سچا ہے۔'' (عنکبوت 29)

جب کوئی قوم خود عذابِ الٰہی کو دعوت دینے لگے تو عذاب اس کا مقدر بن کے رہتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام سمجھ جاتے ہیں کہ اب یہ قوم پوری طرح عذاب الٰہی کی مستحق ہو چکی ہے' اس لیے وہ ایک شفیق اور خیر خواہ مصلح کی حیثیت سے اس کے حال پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اپنے رب سے فریاد کرتے ہیں:

''لوط نے کہا: ''تمھارے کرتوتوں پر جو لوگ کڑھ رہے ہیں میں ان میں شامل ہوں۔ اے پروردگار' مجھے اور میرے اہل وعیال کو ان کی بدکرداریوں سے نجات دے۔''

(الشعراء 169'168)

قرآن مجید دوسرے مقام پر آپ کی فریاد اس طرح نقل کرتا ہے: ''لوط نے کہا ''میرے رب' ان مفسد لوگوں کے مقابلے میں میری مدد فرما۔'' (عنکبوت 30)

اللہ کے پیغمبر کی دعا قبول ہوئی۔ خدا کے حکم سے فرشتے انسانی صورت میں اس بدکردار قوم کی بستیوں کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے زمین پر آئے۔ یہ فرشتے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور انھیں بڑھاپے میں حضرت اسحٰق اور ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی ولادت کی خوش خبری سنائی۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ ہم ایک مجرم قوم یعنی لوط کی قوم کو ان کی بدکرداریوں کا مزہ چکھانے کے لیے ان کے علاقے کی طرف جا رہے ہیں۔ قرآن مجید نے فرشتوں کی آمد کی تفصیل دل نشیں انداز میں بیان فرمائی ہے:

فرشتوں کا مکالمہ

''اور دیکھو' ابراہیم کے پاس ہمارے فرشتے خوش خبری لیے ہوئے پہنچے۔ کہا تم پر سلام ہو۔ ابراہیم نے جواب دیا تم پر بھی سلام ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا ان کی ضیافت کے لیے لے آیا۔ مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی

طرف نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس کرنے لگا۔ انھوں نے کہا ''ڈرو نہیں ہم تو لوط کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں'' (ہود۔70'69)

''ابراہیم کی بیوی بھی کھڑی تھی۔ وہ یہ سن کر ہنس دی۔ پھر ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی۔ وہ بولی 'ہائے' میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہوگی جب کہ میں بڑھیا پھونس ہوگئی اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔'' فرشتوں نے کہا: ''اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم کے گھر والو تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں اور یقیناً اللہ نہایت تعریف اور بڑی شان والا ہے۔'' (ہود۔71 تا73)

پھر جب ابراہیم کی گھبراہٹ دور ہوگئی اور اولاد کی بشارت سے اس کا دل خوش ہو گیا تو اس نے قوم لوط کے معاملے میں جھگڑنا شروع کیا۔ حقیقت میں ابراہیم بڑا حلیم اور نرم دل آدمی تھا اور ہر حال میں ہماری طرف رجوع کرتا تھا۔ آخر کار ہمارے فرشتوں نے اس سے کہا: ''اے ابراہیم! اس سے باز آ جاؤ۔ تمھارے رب کا حکم ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آ کر رہے گا جو کسی کے پھیرے سے نہیں پھر سکتا۔''
(ہود74 تا76)

قرآن مجید کا یہ اقتباس وضاحت کر رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کی زبانی قوم لوط کی تباہی کا خدائی فیصلہ سن کر اپنے رب سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر ''جھگڑے'' کا لفظ اس انتہائی محبت اور ناز کا تعلق ظاہر کرتا ہے جو حضرت ابراہیم اپنے مولائے حقیقی کے ساتھ رکھتے تھے۔ فرشتوں کے ساتھ حضرت ابراہیم کی جرح کی تفصیل بائبل میں بھی مذکور ہے جس کا خلاصہ ہے:

''ابراہیم نے کہا کیا خدا بدوں کے ساتھ نیکوں کو بھی ہلاک کر دے گا؟ ارشاد ہوا اگر اس میں پچاس مومن بھی ہوں گے تو وہ بستی تباہ نہیں کی جائے گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بار بار پوچھا اگر وہاں 45'یا40'یا30'یا20'یا10 مومن ہوں تب؟ ہر بار جواب ملا جب بھی نہیں۔'' (کتاب پیدائش باب18)

قرآن مجید بتاتا ہے کہ اس موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور فرشتوں کے درمیان اس طرح سوال و جواب ہوئے:

فرشتے: (ابراہیم سے) ہم اس بستی کے لوگوں کو ہلاک کرنے والے ہیں کیوں کہ وہ سخت ظالم ہو چکے ہیں۔

ابراہیمؑ: ''وہاں تو لوطؑ موجود ہے۔''

فرشتے ''ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون کون ہیں۔ ہم اس کی بیوی کے سوا' اسے اور اس کے باقی سب گھر والوں کو بچالیں گے۔'' (عنکبوت32'31)

یہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رخصت ہو کر قوم لوط کے صدر مقام ''سدوم'' پہنچے۔ قرآن مجید اور بائبل میں ان کی آمد اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔ ہم انھیں ترتیب وار پیش کرتے ہیں۔

قرآن مجید یہ واقعہ جس انداز سے بیان کرتا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ فرستادگانِ الٰہی شہر سدوم میں خوب صورت لڑکوں کی صورت میں پہنچے تھے اور حضرت لوط اس امر سے بالکل بے خبر تھے کہ یہ فرشتے ہیں اس لیے آپ ان حسین اور نوخیز اجنبیوں کو دیکھ کر سخت پریشان ہوئے' کیوں کہ آپ اپنی قوم کی بدمستی اور خباثت سے پوری طرح واقف تھے۔ آپ کے اس قلبی اضطراب کی کیفیت قرآن مجید اس طرح بیان کرتا ہے:

''جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس پہنچے تو ان کی آمد پر وہ گھبرایا اور دل تنگ ہوا اور کہنے لگا کہ آج بڑی مصیبت کا دن ہے''۔ (ہود77)

فرشتوں کی آمد اور حضرت لوط کی پریشانی کی وجوہات بائبل اس طرح بیان کرتی ہے: ''جب یہ نوجوان لڑکے سدوم پہنچے اس وقت لوط شہر کے پھاٹک کے پاس موجود تھا۔ اس نے جو خوب صورت اجنبی جوانوں کو آتے دیکھا تو قوم کی بُری عادتوں کے پیشِ نظر انھیں اپنے گھر چلنے اور وہاں رات بسر کرنے کی دعوت دی۔ انھوں نے چوک ہی میں رات گزارنے کا خیال ظاہر کیا۔ لیکن جب وہ بضد ہوا تو اس کے ہم راہ اس کے گھر آ گئے۔''

قوم کی یلغار

ان اجنبیوں کا حضرت لوط کے گھر پہنچنا تھا کہ اس کی خبر پورے شہر میں پھیل گئی۔ شہر کے لوگ پوری بے تابی سے آپ کے گھر کی طرف دوڑ پڑے تاکہ ان حسینوں کو اپنے قبضے میں لا کر اپنی من مانی کریں۔ اس صورت حال کی منظر کشی قرآن مجید اس طرح کرتا ہے:

''ان مہمانوں کا آنا تھا کہ اس کی قوم کے لوگ بے اختیار اس کے گھر کی طرف دوڑ پڑے۔ پہلے سے وہ ایسی ہی بدکاریوں کے خوگر تھے۔'' (ہود78)

دوسرے مقام پر ان لوگوں کی خباثت کا نقشہ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

''اتنے میں شہر کے لوگ خوشی کے مارے بے تاب ہو کر لوط کے گھر چڑھ آئے۔ لوط نے کہا: ''بھائیو یہ میرے مہمان ہیں۔ میری فضیحت نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو۔ مجھے رسوا نہ کرو۔'' وہ بولے: ''کیا ہم بارہا تمھیں منع نہیں کر چکے ہیں کہ دنیا بھر کے ٹھیکے دار نہ بنو۔'' (سورۃ حجر:67۔71)

آخری انتباہ

حضرت لوط علیہ السلام قوم کے فاسقانہ اور معاندانہ رویے پر سخت تنگ دل اور پریشان حال تھے تاہم آپ نے اس نازک موقع پر بھی اپنی قوم کے لوگوں کو بھلائی کی طرف بلانے اور ان کے جذبۂ انسانیت کو بیدار کرنے کی سعی بلیغ فرمائی نیز قوم کے روحانی باپ کی حیثیت سے انھیں غیر انسانی اور غیر فطری روش یعنی اغلام کو ترک کر کے فطرت کے صحیح و حلال طریقے یعنی اپنی عورتوں کے ساتھ جائز تعلقات استوار کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ قرآن مجید آپ کے اس آخری وعظ کو اس طرح نقل کرتا ہے: ''لوط نے ان سے کہا: بھائیو یہ میری بیٹیاں موجود ہیں۔ یہ تمھارے لیے پاکیزہ تر ہیں۔ کچھ خدا کا خوف کرو اور میرے مہمانوں کے معاملے میں مجھے ذلیل نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی

بھلا آدمی نہیں؟'' (ہود 78)

قوم کی بدبختی و بدنصیبی انتہا کو پہنچ چکی تھی' اس لیے انھوں نے اپنے شفیق روحانی باپ کی نصیحت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ ''انھوں نے جواب دیا: ''تجھے تو معلوم ہی ہے کہ تیری بیٹیوں میں ہمارا کوئی حصہ نہیں اور یہ بھی جانتا ہے کہ ہم چاہتے کیا ہیں؟'' (ہود 79)

حضرت لوط علیہ السلام اپنی قوم کی اس باغیانہ روش سے بے تاب ہو کر درد بھرے انداز میں اپنی بے کسی اور بے چارگی کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں: ''کاش! میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ تمھیں سیدھا کر دیتا یا کوئی مضبوط سہارا ہی ہوتا کہ اس کی پناہ لیتا۔'' (ہود:80)

حضرت لوط علیہ السلام کو اس مصیبت اور فضیحت سے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی اور قوم اپنے قول و فعل سے یہ ثابت کر چکی تھی کہ اس میں خیر کی کوئی ہلکی سی رمق بھی باقی نہیں رہی۔ پھر یک دم مایوسیوں کی تاریک فضا چھٹتی ہے اور امید کی ایک کرن حضرت لوط علیہ السلام کے قلب و روح کی دنیا کو منور کر جاتی ہے۔ وہی حسین نوجوان جو آپ کی کڑی آزمائش کا ذریعہ بنے ہوئے تھے' حقیقت حال سے پردہ اٹھاتے ہیں: ''تب فرشتوں نے اس سے کہا: ''اے لوط' ہم تیرے رب کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں۔ یہ لوگ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ بس تو کچھ رات رہے اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل جا۔ اور دیکھو تم میں سے کوئی شخص پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے' مگر تیری بیوی تیرے ساتھ نہیں جائے گی کیوں کہ اس پر بھی وہی گزرنے والا ہے جو ان لوگوں پر گزرنا ہے۔ ان کی تباہی کے لیے صبح کا وقت مقرر ہوا ہے۔ صبح ہوتے اب دیر ہی کتنی ہے۔'' (ہود 81)

عذاب کا نزول

یہ قوم اپنی اخلاقی پستی کے لحاظ سے پوری انسانی تاریخ میں ایک بے مثل قوم تھی اس لیے جب اس پر خدا کا قہر نازل ہوا تو وہ بھی اپنی نوعیت اور شدت کے لحاظ سے منفرد تھا۔ قرآن مجید نے اس نازل ہونے والے عذاب کی کیفیات مختلف مقامات پر مختلف پیرائے میں بیان کی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

1: ''آخر کار ہم نے لوط اور اس کے گھر والوں کو' بجز اس کی بیوی کے' جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔ بچا کر نکال دیا اور اس قوم پر برسائی ایک بارش' پھر دیکھو کہ ان مجرموں کا کیا انجام ہوا۔'' (اعراف 84'83)

2: ''پھر جب ہمارے فیصلے کا وقت آ پہنچا تو ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر تابڑ توڑ برسائے جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے ہاں نشان زدہ تھا اور ظالموں سے یہ سزا کچھ دور نہیں۔'' (ہود 83'82)

3: ''تیری جان کی قسم اے نبی' اس وقت ان پر ایک نشہ سا چڑھا ہوا تھا جس میں وہ آپے سے باہر ہوئے جاتے تھے۔ آخر کار پو پھٹتے ہی انھیں ایک زبردست دھماکے نے آ لیا اور ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کی بارش برسائی۔ اس واقعے میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو صاحبِ فراست ہیں۔ اور وہ علاقہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا' گزرگاہ عام پر واقع ہے۔ اس میں سامانِ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو صاحب ایمان ہیں''۔ (حجر' 72 تا 77)

4: ''آخر کار ہم نے اسے اور اس کے سب اہل و عیال کو بچا لیا' بجز ایک بڑھیا کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔ پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے تباہ کر دیا اور ان پر برسائی ایک برسات۔ بڑی ہی بری بارش تھی جو ان ڈرائے جانے والوں پر نازل ہوئی۔ یقیناً اس میں ایک نشانی ہے مگر ان میں سے اکثر ماننے والے نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی۔'' (الشعراء۔ آیات 170 تا 175)

5: ''آخر کار ہم نے بچا لیا اسے اور اس کے گھر والوں کو بجز اس کی بیوی کے جس کا پیچھے رہ جانا ہم نے طے کر دیا تھا۔ اور برسائی ان لوگوں پر ایک برسات' بہت ہی بُری برسات تھی وہ ان لوگوں کے حق میں جو متنبہ کیے جا چکے تھے۔'' (نمل 58'57)

6: (فرشتوں نے کہا) ''ہم اس بستی کے لوگوں پر آسمان سے عذاب نازل کرنے والے ہیں اُس فسق کی بدولت جو یہ کرتے رہے ہیں۔'' اور ہم نے اس بستی کی ایک کھلی نشانی چھوڑ دی ہے ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔'' (العنکبوت 34'35)

7: ''پھر باقی سب کو تہس نہس کر دیا۔ آج تم شب و روز ان کے اجڑے دیار سے گزرتے ہو کیا تمھیں عقل نہیں آتی۔'' (الصافات: 136، 138)

8: ''ابراہیم نے کہا: ''اے فرستادگان الٰہی کیا مہم آپ کو در پیش ہے۔'' انھوں نے کہا: ''ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں تاکہ اس پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر برسا دیں جو آپ کے رب کے ہاں حد سے گزر جانے والوں کے لیے نشان زدہ ہیں۔'' پھر ہم نے ان سب لوگوں کو بچا لیا جو اس بستی میں مومن تھے اور وہاں ہم نے ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔ اس کے بعد ہم نے وہاں بس ایک نشانی ان لوگوں کے لیے چھوڑ دی جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔'' (الذاریات 31۔37)

9: ''لوط کی قوم نے تنبیہات کو جھٹلایا اور ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا اس پر بھیج دی۔ صرف لوط کے گھر والے اس سے محفوظ رہے۔ انھیں ہم نے اپنے فضل سے رات کے پچھلے پہر بچا کر نکال دیا۔ یہ جزا دیتے ہیں ہم ہر اس شخص کو جو شکر گزار ہوتا ہے۔ لوط نے اپنی قوم کے لوگوں کو ہماری پکڑ سے خبردار کیا مگر وہ ساری تنبیہات کو مشکوک سمجھ کر باتوں میں اڑاتے رہے۔ پھر انھوں نے اسے اپنے مہمانوں کی حفاظت سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ آخر کار ہم نے ان کی آنکھیں موند دیں کہ چکھو مزہ اب میرے عذاب کا اور میری تنبیہات کا۔'' (قمر' 33 تا 39)

قرآن مجید کے ان اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ قوم لوط پر یہ عذاب سخت زلزلے اور تباہ کن آتش فشانی کی شکل میں آیا تھا۔ زلزلے کے شدید جھٹکوں نے بستیوں کو تہ و بالا کیا اور آتش فشاں کے پھٹنے سے ان کے اوپر اتنے زور کا پتھراؤ ہوا' گویا پتھروں کی مسلسل بارش اس پورے علاقے پر ہوئی۔ یہ پتھر اس آتشیں مٹی کے تھے جو آتش فشاں علاقے میں زیر زمین دباؤ کے تحت سخت گرم لاوے کی صورت میں نکلتی اور دُور دُور تک برستی ہے اور پھر ٹھنڈی ہو کر پتھر کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ آج تک بحیرۂ مردار یعنی بحیرہ لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں آتش فشانی کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔

ابراہیم کو بشارت اور قوم لوط کی تباہی

جو فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے لیے بیٹے کی بشارت لے کر آئے وہی قوم لوط کی تباہی کا حکم بھی ساتھ لے کر آئے۔ بظاہر ان دو واقعات کا بیک وقت ذکر بے جوڑ سا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا کی طرف سے انعامات کی عطا اور سزا کے کوڑے برسانے کے اصول و ضوابط ایک دل کش داستان کے ذریعے بیان کیے جارہے ہیں اور ان واقعات میں جہاں اہلِ وفا کے لیے حوصلہ افزائی کا پیغام ہے وہیں اربابِ جفا کے لیے کھلی تنبیہ بھی۔

ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں جو حق و صداقت کی خاطر گھر سے بے گھر ہو کر ایک اجنبی ملک میں مقیم ہیں اور بظاہر کوئی طاقت ان کے پاس نہیں' مگر اللہ تعالیٰ ان کے حُسنِ عمل کا یہ پھل انھیں دیتا ہے کہ بانجھ بیوی کے پیٹ سے بڑھاپے میں حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوتے ہیں' پھر ان کے ہاں یعقوب علیہ السلام کی پیدائش ہوتی ہے اور ان سے بنی اسرائیل کی وہ عظیم الشان نسل چلتی ہے جس کی سیاسی' علمی اور مادی عظمت کے ڈنکے صدیوں اسی شام و فلسطین میں بجتے رہے جہاں حضرت ابراہیم ایک بے خانماں مہاجر کی حیثیت سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ دوسری طرف قوم لوط ہے جو اسی سرزمین کے ایک حصے میں اپنی خوش حالی پر مگن اور اپنی بدکاریوں میں مست ہے اور لوط علیہ السلام کی نصیحتوں کو چٹکیوں میں اڑا رہی ہے۔ مگر جس تاریخ کو ابراہیم کی نسل سے ایک بڑی اقبال مند اور سعادت مند قوم کے اٹھائے جانے کا فیصلہ کیا جاتا ہے ٹھیک وہی تاریخ ہے جب ایک بدکار قوم کو دنیا سے نیست و نابود کرنے کا فرمان صادر ہوتا ہے اور وہ ایسے عبرت ناک طریقے سے تباہ کی جاتی ہے کہ اب اس کی بستیوں کا نشان کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

جرم کے مطابق سزا

اس قوم نے انسانی فطرت کی اُس اسکیم کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا جو قدرت نے نوعِ اِنسانی کے تعمیری ارتقا اور تہذیب و معاشرت میں زیبائی و رعنائی کی جملہ خوبیاں پیدا کرنے کی خاطر وضع کی تھی' اس لیے اس بد بخت قوم کو سزا بھی اس کے جرم کے عین مطابق ملی۔ اس نے زمین کے جس خطے پر قدرت کی حکمت عملی کو تلپٹ کیا تھا' وہ خطہ ان پر اسی طرح پلٹ دیا گیا۔ زمین کا نچلا حصہ اوپر اور اوپر کا حصہ نیچے کر کے ان سب مجرموں کو پیس دیا گیا۔ مزید برآں اُن پر پتھروں کی بارش ہوئی تا کہ آنے والی نسلوں کو معلوم ہو جائے کہ اس جرم کا مرتکب اس امر کا مستحق ہے کہ اسے سنگ سار کیا جائے۔ اُس قوم پر پتھروں کی بارش ہو سکتا ہے آسمان سے شہاب ثاقب کی صورت میں ہوئی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتش فشانی کے ذریعے لاوے کے تودے اُن پر برسے ہوں۔

قرآن مجید نے جس جگہ بھی اُس قوم کے گرفتارِ عذاب ہونے اور اہل ایمان کو اس مصیبت سے بچا لینے کا ذکر کیا ہے' وہاں ساتھ ہی بتا دیا ہے کہ حضرت لوط کے تمام گھر والوں کو اس عذاب سے نجات دی جائے گی لیکن آپ کی بیوی اپنی قوم کے ساتھ مبتلائے عذاب ہوگی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت اسی قوم کی بیٹی تھی۔ جب حضرت لوط علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہو کر اس قوم میں آئے تو آپ نے اس عورت سے شادی کر لی مگر یہ عورت حضرت لوط علیہ السلام کی زوجیت میں رہنے کے باوجود فکر و عمل کے لحاظ سے اپنے شوہر نام دار کے ساتھ مطابقت پیدا نہ کر سکی۔ وہ اپنی قوم کے لوگوں ہی کی ہمنوا رہی' چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب فرشتے خوب صورت لڑکوں کی صورت میں آپ کے پاس آئے تو یہی وہ عورت تھی جس نے شہر کے لوگوں کو ان کی آمد کی خبر دی جس پر یہ لوگ حضرت لوط کے گھر کی طرف دوڑ پڑے اور آپ سے ان نوجوانوں کا مطالبہ کیا۔

حضرت لوط علیہ السلام کی نجات

جب اس قوم پر عذاب کا فیصلہ ہو گیا تو فرشتوں نے حضرت لوط سے کہا کہ آپ رات کو اپنے گھر والوں کے ساتھ اس شہر سے نکل جائیں۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہیں' مگر سب سے پیچھے رہیں اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے مڑ کر نہ دیکھے۔ بائبل میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام کو گھر سے نکلنے میں دیر ہوئی تو فرشتے انھیں اور ان کے ساتھیوں کو پکڑ کر شہر سے باہر لائے اور کہا: ''جلدی کر اور وہاں چلا جا' کیوں کہ میں کچھ نہیں کر سکتا جب تک تو وہاں پہنچ نہ جائے' اسی لیے اس شہر کا نام ضغر پڑا۔

(کتاب پیدائش۔ باب 19)

قوم پر عذاب نازل ہونے کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کے حالات قرآن مجید میں ہیں نہ بائبل میں۔ آپ کی عمر اور تاریخ وفات کے متعلق بھی بائبل سے کچھ معلوم نہیں ہوتا۔

بائبل نے آپ کی اولاد میں سے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کا ذکر کیا ہے' بیٹیوں کے نام تو نہیں بتائے۔ البتہ بیٹوں کے نام لیے ہیں جو یہ ہیں:

موآب۔ اس کی نسل تاریخ میں موآبیوں کے نام سے مشہور ہوئی۔ بن عمی۔ اس کی اولاد نے بنی عمون کے نام سے شہرت پائی۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند ارجمند اور سب سے بڑے صاحب زادے۔ آپ علیہ السلام کو بھی منصب نبوت سے سرفراز کیا گیا' جیسا کہ سورۂ مریم کی آیات

54۔55 سے ثابت ہے: ''اور اس کتاب میں اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کرو۔ وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک ایک پسندیدہ انسان تھا۔''

نبوت کے علاوہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ایک شرف تو یہ ملا کہ آپ اپنے والد بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر میں شریک ہوئے تھے (بقرہ۔127) دوسرا یہ کہ چشمۂ زم زم کا وجود میں آنا اور تیسرا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اللہ کی خوشنودی کے لیے ذبح کر رہے ہیں تو حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بلا تامل اپنے آپ کو اس عظیم قربانی کے لیے پیش کر دیا' لہٰذا ان کا لقب ''ذبیح اللہ'' ہوا۔ یہ تینوں واقعات اس وقت تک وقوع پذیر ہو چکے تھے۔ جب آپ کی عمر پندرہ سال تھی۔ ان واقعات کی تفصیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات میں آ چکی ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام' حضرت ہاجرہ کے بطن سے ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سب سے پہلی اولاد ہیں۔ جب ان کی ولادت ہوئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال تھی (باب تکوین۔۔16) آپ کے بھائی اسحاق علیہ السلام' جو حضرت سارہ کے بطن سے تھے' آپ سے تیرہ چودہ برس چھوٹے تھے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ''اے پروردگار' مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو۔'' (اس دعا کے جواب میں) ہم نے اُسے ایک حلیم لڑکے کی بشارت دی (صافات۔۔101) یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ بچپن اور عنفوان شباب کا زمانہ اپنے والد ماجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر تربیت گزارا۔

جوان ہوئے تو ان کا طرز و انداز اور ان کا حسن شباب قبیلہ بنی جرہم میں بہت بھایا' جو زم زم کے چشمے کی وجہ سے حضرت ہاجرہ کی اجازت کے ساتھ وہیں آباد ہو گیا تھا۔ انھوں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد حضرت ہاجرہ کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین سے برابر اپنے اہل و عیال کی خبر گیری کے لیے آتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ تشریف لائے تو اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ ان کی اہلیہ سے دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ روزی کی تلاش میں باہر گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دریافت کیا' گزر بسر کس طرح ہو رہی ہے؟ گھر میں کھانے پینے کی کوئی چیز ہے۔ اس نے نفی میں جواب دیا اور کہا: ''ہم سخت مصیبت اور پریشانی میں ہیں۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا: ''اسماعیل سے میرا اسلام کہہ دینا اور کہنا کہ گھر کی چوکھٹ بدل دیں۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام واپس آئے تو اپنے والد کے نور نبوت کے آثار محسوس کیے۔ بیوی سے پوچھا' کیا کوئی شخص آیا تھا۔ بی بی نے سارا واقعہ سنایا اور پیغام بھی دیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا' وہ میرے والد تھے اور ان کا مشورہ یہ ہے کہ چوکھٹ بدل لوں' یعنی تجھے طلاق دے دوں۔ لہٰذا میں تجھے جدا کرتا ہوں۔

پھر انھوں نے دوسری شادی کر لی۔ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پھر بیٹے کی عدم موجودگی میں آئے۔ اسی طرح ان کی اہلیہ سے گھر کے حالات معلوم کیے۔ بی بی نے کہا' اللہ کا احسان ہے' شکر ہے کہ اچھی طرح سے گزر رہی ہے۔ دریافت کیا' کھانے کو کیا ملتا ہے؟ اسماعیل علیہ السلام کی اہلیہ نے جواب دیا' گوشت۔ حضرت نے پوچھا۔ اور پینے کو؟ اس نے جواب دیا ''پانی۔'' تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی: ''اللھم بارك لھم فی اللحم و الماء'' (اللہ ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔) اور چلتے ہوئے پیغام دے گئے کہ اپنے گھر کی چوکھٹ محفوظ رکھنا۔ اسماعیل علیہ السلام آئے تو ان کی اہلیہ نے تمام واقعہ دُہرایا اور پیغام بھی دیا۔ انھوں نے کہا' یہ میرے والد ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کا پیغام یہ ہے کہ تو زندگی بھر میری رفیقہ حیات رہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کا ذکر قرآن حکیم یا احادیث نبوی ﷺ میں تفصیل کے ساتھ نہیں آیا۔ البتہ تورات نے ان کے ناموں کا الگ الگ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ تورات کے مطابق حضرت اسماعیل کے بارہ لڑکے تھے جو بارہ سردار کہلائے اور عرب کے مستقل قبائل کے جد امجد بنے۔ اور ایک لڑکی تھی جس کا نام بشامہ تھا۔ ان بارہ بیٹوں میں سے دو بڑے بیٹے نبایوت اور قیدار زیادہ مشہور ہوئے' اور ان کا ذکر تورات میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے اور عرب مورخین بھی ان کی تفصیلات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہی وہ نبایوت ہیں (نابت) جن کی نسل ''اصحاب الحجر'' اور قیدار کی نسل ''اصحاب الرس'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان دو کے علاوہ دوسرے بھائیوں اور ان کے خاندانوں کے حالات بہت کم ملتے ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے وقت ان کی اولاد اور نسل کا سلسلہ حجاز' شام' عراق' فلسطین اور مصر تک پھیل گیا تھا۔ مشہور مورخ ابوالفدا لکھتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قبائل یمن اور عمالیق کی جانب رسول بنا کر بھیجا گیا۔ انھوں نے تمام عمر اللہ کا پیغام اہلِ عرب تک پہنچایا اور انھیں حج بیت اللہ کے لیے دعوت دی۔ تورات کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قبر فلسطین میں ہے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ جب کہ عرب مورخین کہتے ہیں کہ وہ اپنی والدہ کے پاس بیت اللہ کے قریب حرم کے اندر حطیم میں مدفون ہیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذات کے بارے میں ایک بنیادی سوال یا مسئلہ ایسا ہے جو دنیا کے دو بڑے مذاہب یعنی اسلام اور عیسائیت کے مابین وجہ نزاع بنا ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے جن صاحب زادے کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوئے تھے' اور جنھوں نے اپنے آپ کو خود اس قربانی کے لیے پیش کر دیا تھا' وہ کون تھے؟ اس مسئلے پر دونوں مذہبوں کے علما اور مورخین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ اپنے اپنے موقف کے حق میں بے شمار تاویلیں پیش کی ہیں اور دلائل دیے ہیں۔ مولانا مودودی نے بڑی تحقیق و تفتیش کے بعد اس سوال کا ایک جامع و شافی جواب دیا ہے جو یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

(ملاحظہ ہو: تفہیم القرآن۔ جلد چہارم' صفحہ 297)

''سب سے پہلے اس سوال کا جواب ہمارے سامنے بائبل کی طرف سے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا نے ابرہام کو آزمایا اور اسے کہا' اے ابرہام' تو اپنے بیٹے اضحاق کو' جو تیرا اکلوتا ہے اور جسے تو پیار کرتا ہے' ساتھ لے کر موریاہ کے ملک میں جا اور وہاں اسے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ پر' جو میں تجھے بتاؤں گا' سوختنی قربانی کے طور پر چڑھا۔''

(پیدائش۔ باب 22۔ آیات 21)

اس بیان میں ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق علیہ السلام کی قربانی مانگی تھی' اور دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ اکلوتے تھے' حالانکہ خود بائبل ہی کے دوسرے بیان سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام اکلوتے نہ تھے۔ اس کے لیے ذرا بائبل ہی کی حسب ذیل تصریحات ملاحظہ ہوں:

اور ابرہام کی بیوی سارہ کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کی ایک مصری لونڈی تھی جس کا نام ہاجرہ تھا۔ اور سارہ نے ابرہام سے کہا کہ دیکھو خداوند نے مجھے تو اولاد سے محروم رکھا ہے' سو تو میری لونڈی کے پاس جا' شاید اس سے میرا گھر آباد ہو۔ اور ابرہام نے سارہ کی بات مانی۔ اور ابرہام کو ملک کنعان میں رہتے دس برس ہو گئے تھے جب اس کی بیوی سارہ نے اپنی مصری لونڈی اسے دی کہ اس کی بیوی بنے اور وہ ہاجرہ کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی'' (پیدائش۔ باب۔ 16۔ آیات 1 تا 3)

''خداوند کے فرشتے نے اس سے کہا کہ تو حاملہ ہے اور تیرے بیٹا پیدا ہوگا۔ اس کا نام اسماعیل رکھنا'' (پیدائش۔ باب 16۔ آیت 11)

''اور خداوند نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ سارہ جو تیری بیوی ہے' اس سے بھی تجھے بیٹا بخشوں گا۔ تو اس کا نام اضحاق رکھنا' جو اگلے سال اسی وقت معین پر سارہ سے پیدا ہو گا۔ تب ابرہام نے اپنے بیٹے اسماعیل کو' اور گھر کے سب مردوں کو لیا اور اسی روز خدا کے حکم کے مطابق ان کا ختنہ کیا۔ ابرہام ننانوے برس کا تھا جب اس کا ختنہ ہوا' اور جب اسماعیل علیہ السلام کا ختنہ ہوا تو وہ تیرہ برس کا تھا۔''

(پیدائش۔ باب۔ 17 آیات 15 تا 25)

''اور جب اس کا بیٹا اضحاق اس کے پیدا ہوا تو ابرہام سو برس کا تھا۔''

(پیدائش۔ باب 21۔ آیت 5)

اس سے بائبل کی تضاد بیانی صاف کھل جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ چودہ برس تک تنہا حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ اب اگر قربانی اکلوتے بیٹے کی مانگی گئی تھی تو وہ اسحاق علیہ السلام کی نہیں' بلکہ اسماعیل کی تھی' کیوں کہ وہی اکلوتے تھے' اور اگر حضرت اسحاق کی قربانی مانگی گئی تھی' تو پھر یہ کہنا غلط ہے کہ اکلوتے بیٹے کی قربانی مانگی گئی تھی۔

مولانا مودودی صاحب اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے' مزید لکھتے ہیں: اگر تحقیق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ امر ہر شک سے بالاتر نظر آتا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح تھے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(1) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ اپنے وطن سے ہجرت کرتے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک صالح بیٹے کے لیے دعا کی تھی' اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک حلیم (بردبار) لڑکے کی بشارت دی۔ یہ کلام صاف بتا رہا ہے کہ یہ دعا اس وقت کی گئی تھی جب آپ علیہ السلام بے اولاد تھے' اور بشارت جس لڑکے کی دی گئی' وہ آپ کا پہلوٹا بچہ تھا۔ پھر یہ بھی قرآن ہی کے سلسلۂ کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہی بچہ جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا اشارہ فرمایا گیا۔ اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلوٹے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے نہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام۔ خود قرآن مجید میں صاحب زادوں کی ترتیب اس طرح بیان ہوئی ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ وَهَبَ لِىْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّىْ لَسَمِيْعُ الدُّعَآءِ﴾ (ابراہیم کی آیت 39) ترجمہ ہے: ''شکر ہے اللہ کا' جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام جیسے بیٹے دیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب ضرور دعا سنتا ہے۔''

(2) قرآن مجید میں جہاں حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی گئی ہے' وہاں ان کے لیے غلام علیم (علم والے لڑکے) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں: ﴿وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ﴾ (ذاریات۔ 28)

اسی طرح سورۂ حجر کی آیت 53 میں بھی یہی الفاظ استعمال ہوئے ہیں: ﴿لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ﴾ (ڈرو نہیں' ہم تمھیں ایک غلام علیم کی بشارت دیتے ہیں۔) مگر یہاں جس لڑکے کی بشارت دی گئی ہے' اس کے لیے غلام حلیم (بردبار لڑکے) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صاحب زادوں کی دو نمایاں صفات الگ الگ تھیں' اور ذبح کا حکم غلام علیم کے لیے نہیں' بلکہ غلام حلیم کے لیے تھا۔

(3) قرآن مجید میں حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی خوش خبری دیتے ہوئے ساتھ ہی ساتھ یہ خوش خبری بھی دے دی گئی تھی کہ ان کے ہاں یعقوب علیہ السلام جیسا بیٹا پیدا ہوگا: ﴿فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ﴾ (سورۂ ہود کی آیت 71۔ ترجمہ: پھر ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحٰق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی۔'' اب ظاہر ہے کہ جس بیٹے کی پیدائش کی خبر دینے کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دی جا چکی ہو کہ اس کے ہاں ایک لائق لڑکا پیدا ہوگا' اس کے متعلق اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ خواب دکھایا جاتا کہ آپ اسے ذبح کر رہے ہیں' تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے کبھی یہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ اس بیٹے کو قربان کر دینے کا اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔ علامہ ابن جریر اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ممکن ہے' یہ خواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس وقت دکھایا گیا ہو جب حضرت اسحاق علیہ السلام کے ہاں حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہو چکے ہوں' لیکن در حقیقت یہ اس دلیل کا نہایت ہی بودا جواب ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ یہ ہیں: ''جب وہ لڑکا باپ کے ساتھ دوڑنے

چلنے کے قابل ہو گیا'' تو یہ خواب دکھایا گیا تھا۔ ان الفاظ کو جو شخص بھی خالی الذہن ہو کر پڑھے گا' اس کے سامنے آٹھ دس برس کے بچے کی تصویر آئے گی۔ کوئی شخص بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ جوان صاحب اولاد بیٹے کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے گئے ہوں گے۔

(4) اللہ تعالیٰ سارا قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرماتا ہے کہ ''ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی' ایک نبی صالحین میں سے۔'' اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی بیٹا نہیں ہے جسے ذبح کرنے کا اشارہ کیا گیا تھا' بلکہ پہلے کسی اور بیٹے کی بشارت دی گئی۔ پھر جب وہ باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہوا تو اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ پھر جب حضرت ابراہیم اس امتحان میں کامیاب ہو گئے' تب انھیں ایک اور بیٹے اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی۔ واقعات کی یہ ترتیب قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ جن صاحب زادے کو ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا' وہ حضرت اسحاق علیہ السلام نہ تھے۔ بلکہ وہ ان سے کئی برس پہلے پیدا ہو چکے تھے۔ علامہ ابن جریر اس صریح دلیل کو یہ کہہ کر رد کر دیتے ہیں کہ پہلے صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔ پھر جب وہ خدا کی خوشنودی پر قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئے تو اس کا انعام اس شکل میں دیا گیا کہ ان کے نبی ہونے کی خوش خبری دی گئی' لیکن یہ ان کے پہلے جواب سے بھی زیادہ کم زور جواب ہے۔ اگر فی الواقع بات یہی ہوتی تو اللہ تعالیٰ یوں نہ فرماتا کہ ''ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی' ایک نبی صالحین میں سے'' بلکہ یوں فرماتا کہ ہم نے اسے یہ بشارت دی کہ تمھارا یہی لڑکا ایک نبی ہوگا صالحین میں سے۔

(5) معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیہ میں جو مینڈھا ذبح کیا گیا تھا' اس کے سینگ خانہ کعبہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے زمانے تک محفوظ تھے۔ بعد میں جب حجاج بن یوسف نے حرم میں ابن زبیر کا محاصرہ کیا اور خانہ کعبہ کو مسمار کر دیا تو وہ سینگ ضائع ہو گئے۔ ابن عباسؓ اور عامر شعبی دونوں اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انھوں نے خود خانہ کعبہ میں یہ سینگ دیکھے ہیں (ابن کثیر۔) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قربانی کا یہ واقعہ شام میں نہیں' بلکہ مکہ معظمہ میں پیش آیا تھا' اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا' اسی لیے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام کے تعمیر کردہ خانہ کعبہ میں اس کی یادگار محفوظ رکھی گئی تھی۔

(6) یہ بات صدیوں سے عرب کی روایات میں محفوظ تھی کہ قربانی کا یہ واقعہ منیٰ میں پیش آیا تھا' اور یہ صرف روایت ہی نہیں تھی' بلکہ اس وقت سے رسول اللہ ﷺ کے زمانے تک مناسک حج میں یہ کام بھی برابر شامل چلا آ رہا تھا کہ اسی مقام منیٰ میں جا کر لوگ اسی جگہ پر جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی کی تھی' جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پھر جب نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے تو آپ ﷺ نے بھی اس طریقے کو جاری رکھا' حتیٰ کہ آج تک حج کے موقع پر دس ذی الحج کو منیٰ میں قربانیاں کی جاتی ہیں۔ ساڑھے چار ہزار برس کا یہ متواتر عمل اس امر کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس قربانی کے وارث بنی اسماعیل ہوئے ہیں نہ کہ بنی اسحاق۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل میں ایسی کوئی رسم کبھی جاری نہیں رہی ہے جس میں ساری قوم بیک وقت قربانی کرتی ہو اور اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کی یادگار کہتی ہو۔

سورۂ مریم کی آیت 54 میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: ''وہ وعدے کا سچا (اس وعدے کا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لائیں' وہ انھیں صابر پائیں گے) اور رسول اللہ اور نبی تھا' اس نے اپنے اہل و عیال کو صلوٰۃ و زکوٰۃ کا حکم دیا (کہ دین اسلام کی روح اور بنیادی ارکان ہیں) وہ اپنے رب کے ہاں پسندیدہ تھا (ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ انھوں نے رضائے الٰہی کے لیے اپنی جان تک پیش کر دی)

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا' حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بنو جرہم میں شادی کی۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو حرم کعبہ کے آس پاس آباد تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد دی اور انھیں برومند کیا' یہاں تک کہ ان کی نسل شمالی عرب میں پھیل گئی اور عرب عاربہ (یعنی قدیم اور بیابان میں بسنے والے عربوں) کے مقابلہ میں عرب مستعربہ (یعنی آبادکار عربوں) کی اصطلاح وضع ہوئی۔ ان کے تعلقات اپنے عم زاد بھائیوں سے کبھی خوشگوار رہے' کبھی کشیدہ۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی یہی تھا کہ ان کی نسل سے بارہ سردار پیدا ہوں گے (بائیبل۔ باب تکوین۔ آیت 30) ان میں نبطیوں کا مورث اعلیٰ ''نبایوت'' جنھوں نے شمالی عرب میں شان و شوکت حاصل کی' اور قیدار سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ قیدار ہی سے بواسطہ عدنان ہمارے نبی علیہ السلام کا سلسلۂ نسب حضرت اسماعیل علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

حضرت اسحاق علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے عمر میں تیرہ چودہ برس چھوٹے تھے۔ ان کی ولادت حبرون (دوسرا نام الخلیل) میں ایک اندازے کے مطابق 2060 ق م میں ہوئی۔ جہاں مصر سے واپسی پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اقامت اختیار کر لی تھی۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت ان کے والدین کو پیرانہ سالی میں ملی۔ اس وقت آپ علیہ السلام کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ایک سو سال اور آپ کی والدہ سارہ کی عمر اکیانوے سال تھی اور بقول تورات وہ بانجھ تھیں۔ اسرائیلی روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم بھوکوں اور ناداروں کو اپنے ساتھ کھانا کھلائے بغیر نہیں کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ پندرہ دن تک کوئی مہمان نہ آیا' تا آنکہ تین اجنبی اشخاص وارد ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے لیے ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آئے' جس پر انھوں نے کہا کہ ہم قیمت ادا کیے بغیر کوئی چیز نہیں کھائیں گے' اور وہ یہ کہ شروع میں اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو' آخر میں اس کی حمد کرو اور پھر انھیں ایک بیٹے کی بشارت دی۔

قرآن مجید میں بھی یہ واقعہ مذکورہ ہے' لیکن ذرا مختلف انداز میں۔ چنانچہ فرمایا:

''دیکھو! ابراہیم علیہ السلام کے پاس ہمارے فرشتے' خوش خبری لیے ہوئے پہنچے۔ کہا تم پر سلام ہو۔ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا' تم پر بھی سلام ہو۔ پھر کچھ دیر نہ گزری کہ ابراہیم علیہ السلام ایک بھنا ہوا بچھڑا (ان کی ضیافت کے لیے) لے آیا' مگر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے پر نہیں بڑھتے تو وہ ان سے مشتبہ ہو گیا اور دل میں ان سے خوف محسوس ہونے لگا۔ انھوں نے کہا ''ڈرو نہیں' ہم تو لوط علیہ السلام کی قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔'' ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بھی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ یہ سن کر ہنس دی۔ پھر ہم نے اسے اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی۔ وہ بولی ''ہائے میری کم بختی! کیا اب میرے ہاں اولاد ہو گی؟ جب کہ میں بڑھیا پھونس ہو گئی ہوں اور میرے میاں بھی بوڑھے ہو چکے ہیں؟ یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔'' فرشتوں نے کہا: ''اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیم علیہ السلام کے گھر والو تم لوگوں پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں'' (سورۂ ہود۔ آیات 69 تا 73)

سورۂ ذاریات کی آیات 24 تا 28 میں اس واقعے کو مزید آگے بڑھایا گیا ہے:

''اے نبی ﷺ' ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تمھیں پہنچی ہے؟ جب وہ اس کے ہاں آئے تو کہا' آپ کو سلام ہے۔ اس نے کہا ''آپ لوگوں کو بھی سلام ہے۔ کچھ نا آشنا سے لوگ ہیں۔'' پھر وہ چپکے سے اپنے گھر والوں کے پاس گیا' اور ایک (بھنا ہوا) موٹا تازہ بچھڑا لا کر مہمانوں کے آگے پیش کیا۔ اس نے کہا' آپ حضرات کھاتے نہیں؟ پھر وہ اپنے دل میں ان سے ڈرا۔ انھوں نے کہا ''ڈریئے نہیں'' اور اسے ایک غلام علیم (علم والے لڑکے) کی پیدائش کا مژدہ سنایا۔ یہ سن کر اس کی بیوی چیختی ہوئی آگے بڑھی اور اس نے اپنا منہ پیٹ لیا اور کہنے لگی ''بوڑھی بانجھ۔'' انھوں نے کہا: ''یہی کچھ فرمایا ہے تیرے رب نے' وہ حکیم ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔''

بائبل میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے حالات کسی قدر تفصیل سے کتاب پیدائش کے ابواب 25 اور 26 میں دیئے گئے ہیں۔ ان کے مطابق حضرت اسحاق علیہ السلام آٹھ روز کے تھے کہ آپ کے ختنے ہوئے اور ضیافت کا اہتمام کیا گیا۔ جب دودھ چھڑایا گیا' تب بھی آپ کے والد ابراہیم علیہ السلام نے ایک ضیافت دی۔ آپ کی پرورش اور تربیت زیادہ تر اپنی والدہ سارہ کے زیر سایہ ہوئی' جس طرح کہ ان کے بڑے بھائی اسماعیل کی پرورش اور تربیت زیادہ تر اپنے والد ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام زیادہ تر حجاز میں رہتے تھے اور وہاں عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کی رہائش کا آپ کے والد نے معقول انتظام کر دیا تھا اور بہت سی بھیڑ بکریاں' اونٹ' گائے' بیل اور مال و متاع آپ کو دے دیا تھا۔ آپ نے کافی ترقی کی اور اس مال و متاع میں مزید اضافہ ہوا۔ آپ نے کھیتی باڑی بھی کی' جس میں اللہ تعالیٰ نے برکت دی۔ وہ کنوئیں جو آپ کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جرار کے علاقے میں کھدوائے تھے' فلستیوں (فلسطینیوں) نے انھیں بند کر دیا تھا۔ آپ نے وہ سب کنوئیں دوبارہ کھدوائے۔ علاقہ خوب سیراب اور سرسبز و شاداب ہو گیا۔ فلستی آپ سے حسد کرنے اور آپ کے درپے آزار رہنے لگے۔ انھوں نے جرار کے بادشاہ ابی ملک کو بھڑکایا کہ اسحاق کی قوت و طاقت اور ثروت و دولت بڑھتی جا رہی ہے' اس کے نوکر چاکر بھی کافی تعداد میں ہو چکے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تجھ سے بڑھ جائے۔ ابی ملک کو پھر وہی خدشہ پیدا ہوا گیا جو پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہوا تھا' مگر اس وقت تو اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خوف زدہ ہو کر معاہدہ کر لیا تھا اور انھیں اپنے علاقے سے نکالنے کی جرأت نہ ہوئی تھی' مگر اسحاق علیہ السلام سے اس نے کوئی معاہدہ نہ کیا' بلکہ اس علاقے سے نکل جانے کے لیے کہا۔

حضرت اسحاق علیہ السلام نے جرار کا علاقہ چھوڑ دیا اور آپ بئر سبع میں آ کر رہنے لگے۔ لیکن قدرت نے یہاں بھی آپ کے ہر کام میں برکت دی۔ آپ حسب سابق ترقی کرتے رہے۔ آپ نے وہاں بھی کئی کنوئیں کھدوائے اور پانی کی تکلیف بھی دُور ہو گئی۔ یہ بات جب ابی ملک کو معلوم ہوئی تو بڑا حیران ہوا اور سمجھ گیا کہ باپ کی طرح خدا بیٹے کے ساتھ بھی ہے' اور ہم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا وہ بئر سبع میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے پاس آیا۔ آپ نے ابی ملک کو دیکھتے ہوئے کہا: ''اب تو میرے پاس کیا لینے آیا ہے۔ تو نے مجھے علاقے سے نکال دیا تھا۔''

ابی ملک نے کہا: ''وہ میری غلطی تھی۔ اب مَیں نے دیکھا ہے کہ تو سچا ہے اور خدا تیرے ساتھ ہے' کیوں کہ تیرے ہر کام میں برکت ہوتی ہے' اس لیے تو ہمارے ساتھ بھائیوں کی طرح مل جل کر رہ' تاکہ ہمیں بھی تیری وجہ سے برکت ملے۔'' حضرت اسحاق علیہ السلام نے جب دیکھا کہ اس کی نیت میں خلوص ہے تو خوشی سے ملے اور ابی ملک اور اس کے ساتھیوں کی دعوت کی۔ رات بھر مہمان رکھا اور صبح کو صلح کا معاہدہ کر کے رخصت کیا۔

آپ کی والدہ حضرت سارہ کا انتقال ہو گیا تو آپ تنہا رہ گئے۔ آپ کے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آپ کی شادی کی فکر ہوئی۔ آپ علیہ السلام چاہتے تھے کہ ان کی شادی کسی کنعانی یا حتی لڑکی سے نہ ہو' بلکہ خاندان ہی کی کسی مناسب لڑکی سے رشتہ ہو جائے۔ چوں کہ آپ بڑھاپے کے سبب سفر نہیں کر سکتے تھے' اس لیے اپنے معتمد غلام الیعزر دمشقی کو اپنے آبائی وطن حاران اپنے بھائی ناحور کے ہاں بھیجا اور ناحور کی پوتی ربقہ (Rebecca) سے اسحاق علیہ السلام کی شادی ہو گئی۔

حضرت اسحاق علیہ السلام نے اپنی بیوی کے لیے خداوند سے دعا کی' کیوں کہ وہ بانجھ تھی اور خدا نے ان کی دعا قبول کی اور ان کی بیوی ربقہ حاملہ ہوئی۔ اور جب وضع حمل کے دن پورے ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے پیٹ میں دو جڑواں بچے ہیں۔ پہلا جو پیدا ہوا تو وہ سرخ تھا اور اوپر سے ایسا جیسے پشمینہ اور انھوں نے اس کا نام عیسو رکھا۔ اس کے بعد اس کا بھائی پیدا ہوا' اور اس کا ہاتھ عیسو کی ایڑی کو پکڑے ہوئے تھا اور اس کا نام یعقوب رکھا گیا۔ جب وہ ربقہ سے پیدا ہوئے تو حضرت اسحاق علیہ السلام ساٹھ برس کے تھے۔ وہ لڑکے بڑے ہوئے۔ عیسو شکار میں ماہر ہو گیا اور جنگل میں رہنے لگا۔ یعقوب سادہ مزاج' درویش منش اور ڈیروں میں رہنے والا آدمی تھا' اور

قال اللہ تعالیٰ فی القرآن العزیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ

صدق اللہ العظیم

محمد باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے لیکن رسول ہے اللہ کا اور مُہر سب نبیوں پر

قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّينَ لَا نَبِيَّ بَعْدِي

میں "خاتم النبیین" ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں

یا حبیبی یا رسول اللہ

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم صل على محمد وعلى آل محمد

كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

اللهم بارك على محمد وعلى آل محمد

كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

كتبه الفقير نفيس الحسيني اللاهوري غفر الله ذنوبه وستر عيوبه في رمضان المبارك سنة ١٤١٣

محمد عربی کابروی هر دو سراست

کسی که خاک درش نیست خاک بر سر او

محمد

صلی اللہ علیہ وسلم

بسم الله الرحمن الرحيم

لا اله الا الله محمد رسول الله

قل ان صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين

محمد از خدا میخواہم

محمد از خدا

نبارك لكم ذكرى يوم المبعث النبوي الشريف

محمد رسول الله

بسم الله الرحمن الرحيم

ما اسمك غدا صدق رسول الله وصدق حبيب الله

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ❁ صلوا خمسكم وصوموا شهركم وحجوا بيت ربكم وادوا زكوة اموالكم طيبة بها انفسكم تدخلوا جنة ربكم بلا حساب ولا عذاب ❁ صدق رسول الله فيما قال

كتبه المذنب علي الوصفي

لا إله إلا الله محمد رسول الله

من عادى لي وليا فقد آذنته بالحرب

وما تقرب إلي عبدي بشيء أحب إلي مما افترضته عليه

ولا يزال عبدي يتقرب إلي بالنوافل حتى أحبه

فإذا أحببته

كنت سمعه الذي يسمع به وبصره الذي يبصر به

ويده التي يبطش بها ورجله التي يمشي بها

ولئن سألني لأعطينه ولئن استعاذني لأعيذنه

ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون

اسحاق علیہ السلام عیسو کو پیار کرتے تھے کیوں کہ وہ ان کے لیے شکار کا گوشت لاتا تھا' اور ربقہ یعقوب کو پیار کرتی تھی۔

''اور ایک روز یعقوب نے دال پکائی اور عیسو جنگل سے آیا' اور بے دَم ہو رہا تھا' اور عیسو نے یعقوب سے کہا کہ یہ جو لال لال ہے' مجھے کھلا دے' کیوں کہ میں بے دَم ہو رہا ہوں' اسی لیے اُس کا نام ادوم'' بھی ہو گیا۔ تب یعقوب نے کہا' تو آج اپنا پہلوٹھے کا حق میرے ہاتھ بیچ دے۔ عیسو نے کہا' دیکھ میں تو مرا جاتا ہوں' پہلوٹھے کا حق میرے کس کام آئے گا۔ تب یعقوب نے کہا کہ آج ہی مجھ سے قسم کھا۔ اُس نے اُس سے قسم کھائی اور اُس نے اپنا پہلوٹھے کا حق یعقوب کے ہاتھ بیچ دیا۔ تب یعقوب نے عیسو کو روٹی اور مسور کی دال دی۔ وہ کھا پی اُٹھا اور چلا گیا۔ یوں عیسو نے اپنے پہلوٹھے کے حق کو ناچیز جانا''

بائبل میں حضرت اسحاق علیہ السلام کے حالات کے بارے میں آیا ہے۔:''اور اس ملک میں اس پہلے کال کے علاوہ جو ابرہام کے ایام میں پڑا تھا' پھر کال پڑا۔ تب اسحاق علیہ السلام جرار کو فلستیوں کے بادشاہ ابی ملک کے پاس گیا' اور خدا نے اس پر ظاہر ہو کر کہا کہ مصر کو نہ جا' بلکہ جو ملک میں تجھے بتاؤں' اس میں رہ۔ تو اسی ملک میں قیام رکھ اور میں تیرے ساتھ رہوں گا' اور تجھے برکت بخشوں گا' کیوں کہ میں تجھے اور تیری نسل کو یہ سب ملک دوں گا اور میں اس قسم کو جو تیرے باپ ابرہام سے کھائی' پورا کروں گا' اور میں تیری اولاد کو بڑھا کر آسمان کے تاروں کی مانند کروں گا اور یہ سب ملک تیری نسل کو دوں گا اور زمین کی سب قومیں تیری نسل کے وسیلے سے برکت پائیں گی' اس لیے کہ ابرہام نے میری بات مانی اور میری نصیحت اور میرے حکم اور قوانین و آئین پر عمل کیا۔ پس اضحاق جرار میں رہنے لگا اور وہاں کے باشندوں نے اس سے اس کی بیوی کی بابت پوچھا۔ اس نے کہا' وہ میری بہن ہے' کیوں کہ وہ اسے اپنی بیوی بتاتے ڈرا' یہ سوچ کر کہ ربقہ کے سبب سے وہاں کے لوگ اسے قتل نہ کر ڈالیں' کیوں کہ وہ خوب صورت تھی۔ جب اسے وہاں رہتے ہوئے بہت دن ہو گئے تو فلستیوں کے بادشاہ ابی ملک نے کھڑکی میں سے جھانک کر نظر کی اور دیکھا کہ اضحاق اپنی بیوی سے ہنسی کھیل کر رہا ہے۔ تب ابی ملک نے اضحاق کو بلا کر کہا کہ وہ تو حقیقت میں تیری بیوی ہے۔ پھر تو نے کیوں کر اسے اپنی بہن بتایا؟ اضحاق نے اس سے کہا' اس لیے کہ مجھے خیال ہوا کہ کہیں میں اس کے سبب سے مارا نہ جاؤں۔ ابی ملک نے کہا' تو نے ہم سے کیا کیا؟ یوں تو آسانی سے ان لوگوں میں سے کوئی تیری بیوی کے ساتھ مباشرت کر لیتا اور تو ہم پر الزام لاتا۔

''تب ابی ملک نے سب لوگوں کو یہ حکم کیا کہ جو کوئی اس مرد کو یا اس کی بیوی کو چھوئے گا' سو مار ڈالا جائے گا۔ اور اضحاق نے اس ملک میں کھیتی کی اور اسی سال اسے سو گنا پھل ملا اور خداوند نے اسے برکت بخشی' اور وہ بڑھ گیا اور اس کی ترقی ہوتی گئی' یہاں تک کہ وہ بڑا آدمی ہو گیا اور اس کے پاس بھیڑ بکریاں اور گائے بیل اور بہت سے نوکر چاکر تھے' اور فلستیوں کو اس پر رشک آنے لگا' اور انھوں نے سب کنوئیں جو اس کے باپ کے نوکروں نے اس کے باپ ابرہام کے وقت سے کھودے تھے' بند کر دیئے اور انھیں مٹی سے بھر دیا۔ اور ابی ملک نے اضحاق سے کہا' کہ تو ہمارے پاس سے چلا جا' کیوں کہ تو ہم سے زیادہ زورآور ہو گیا ہے۔ تب اضحاق نے وہاں سے جرار کی وادی جا کر اپنا ڈیرا لگایا اور وہاں رہنے لگا۔ اور اضحاق نے پانی کے ان کنوؤں کو' جو اس کے باپ ابرہام کے ایام میں کھودے گئے تھے' پھر کھدوایا' کیوں کہ فلستیوں نے ابرہام کے مرنے کے بعد انھیں بند کر دیا تھا اور اس نے ان کے پھر وہی نام رکھے جو اس کے باپ نے رکھے تھے' اور اضحاق کے نوکروں کو وادی میں کھودتے کھودتے بہتے پانی کا ایک سوتا مل گیا۔ تب جرار کے چرواہوں نے اضحاق کے چرواہوں سے جھگڑا کیا اور کہنے لگے کہ یہ پانی ہمارا ہے اور اس نے اس کنوئیں کا نام عسق رکھا' کیوں کہ انھوں نے اس سے جھگڑا کیا اور انھوں نے دوسرا کنواں کھودا۔ اور اس کے لیے بھی وہ جھگڑنے لگے' اور اس نے اس کا نام ستنہ رکھا۔ سو وہ وہاں سے دوسری جگہ چلا گیا' اور ایک اور کنواں کھودا' جس کے لیے انھوں نے جھگڑا نہ کیا اور اس نے اس کا نام رحوبوت رکھا' اور کہا کہ اب خداوند نے ہمارے لیے جگہ نکالی اور ہم اس ملک میں برومند ہوں گے۔

''وہاں سے وہ بیرسبع کو گیا' اور خداوند اسی رات اس پر ظاہر ہوا اور کہا کہ میں تیرے باپ ابرہام کا خدا ہوں۔ مت ڈر' کیوں کہ میں تیرے ساتھ ہوں اور تجھے برکت دوں گا اور اپنے بندے ابرہام کی خاطر تیری نسل بڑھاؤں گا۔ اور وہاں اس نے مذبح بنایا اور خداوند سے دعا کی اور اپنا ڈیرا وہیں لگایا' اور وہاں اضحاق کے نوکروں نے ایک کنواں کھودا۔ تب ابی ملک اپنے دوست اخوزت اور اپنے سپہ سالار فیکل کو ساتھ لے کر جرار سے اس کے پاس گیا۔ اضحاق نے ان سے کہا کہ تم میرے پاس کیوں کر آئے' حالانکہ مجھ سے کینہ رکھتے ہو اور مجھے اپنے پاس سے نکال دیا۔ انھوں نے کہا ہم نے خوب صفائی سے دیکھا کہ خداوند تیرے ساتھ ہے۔ سو ہم نے کہا کہ ہمارے اور تیرے درمیان قسم ہو جائے اور ہم تیرے ساتھ عہد کریں' کہ جیسے ہم نے تجھے چھوا تک نہیں' اور نیکی کے سوا تجھ سے اور کچھ نہیں کیا اور تجھ کو سلامت رخصت کیا۔ تو بھی ہم سے کوئی بدی نہ کرے گا' کیوں کہ تو اب خداوند کی طرف سے مبارک ہے۔ تب اس نے اُن کے لیے ضیافت تیار کی اور انھوں نے کھایا پیا' اور وہ صبح سویرے اٹھے اور آپس میں قسم کھائی' اور اضحاق نے انھیں رخصت کیا اور وہ اس کے پاس سے سلامت چلے گئے۔ اسی روز اضحاق کے نوکروں نے آ کر اس سے اس کنوئیں کا ذکر کیا' جسے انھوں نے کھودا تھا اور کہا کہ ہمیں پانی مل گیا۔ سو اس نے اس کا نام سبع (Sheba) رکھا' اسی لیے شہر آج تک بیرسبع کہلاتا ہے۔''

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ ربقہ کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام کے دو توام بیٹے عیسو اور یعقوب پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاق علیہ السلام عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور ربقہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ عیسو شکاری تھا اور بوڑھے والدین کو شکار کا گوشت لا کر دیتا تھا اور یعقوب خیمے ہی میں رہتے تھے۔

تورات کے مطابق ایک روز عیسو تھکا ماندہ آیا اور یعقوب سے کہنے لگا' میں تھکا ہوا

ہوں اور آج شکار بھی نہیں آیا۔ تو اپنے کھانے مسور اور پسی میں سے مجھے بھی کچھ دے دے۔ یعقوب نے کہا کہ فلسطینیوں کا یہ دستور ہے کہ میراث بڑے لڑکے کو ملتی ہے اس لیے باپ کا وارث تو ہوگا۔ اگر تو اپنے اس حق سے دست بردار ہو جائے تو میں تجھے کھانا کھلاؤں گا۔ عیسو نے کہا' مجھے اس میراث کی کوئی پروا نہیں۔ تو ہی وارث ہو جانا۔ تب یعقوب نے عیسو کو کھانا کھلایا۔

ایک مرتبہ حضرت اسحاق علیہ السلام نے' جب کہ بہت بوڑھے اور ضعیف البصر ہو گئے تھے' یہ چاہا کہ عیسو کو برکت دیں' اور اس سے کہا کہ جا شکار کر کے لا اور عمدہ کھانا پکا کر میرے سامنے پیش کر۔ ربقہ نے یہ سنا تو دل سے چاہا کہ یہ برکت یعقوب کو ملے۔ فوراً یعقوب کو بلا کر کہا کہ جلدی سے عمدہ کھانا تیار کر کے باپ کے سامنے لے جا اور برکت کی دعا کا طالب ہو۔ یعقوب نے اپنا نام بتائے بغیر ایسا ہی کیا اور اپنے باپ اسحاق علیہ السلام سے برکت کی دعا حاصل کر لی۔ جب عیسو آیا اور اس نے سب قصہ سنا تو انتہائی ناگواری محسوس کی اور یعقوب سے کینہ رکھنے لگا۔ تب ربقہ نے یعقوب کو رائے دی کہ وہ یہاں سے اپنے ماموں لابان کے پاس کچھ دنوں کے لیے چلا جائے۔ یعقوب اپنے ماموں کے ہاں پہنچا اور وہیں کچھ مدت گزاری اور یکے بعد دیگرے لابان کی دونوں لڑکیوں لئیہ اور راحیل سے شادی کر لی۔

(کتاب پیدائش۔ باب 64۔ آیات 1 تا 65)

اور عیسو بھاگ کر اپنے چچا اسماعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے اور وہاں ان کی صاحب زادی بشامہ یا باسمہ (جو بھی نام صحیح ہو) سے شادی کر لی' اور ان کے علاوہ بھی شادیاں کیں اور اپنے خاندان کو لے کر سعیر کو اپنا وطن بنا لیا اور یہاں ادوم کے نام سے مشہور ہوئے اور اس لیے ان کی نسل بنی ادوم کے نام سے مشہور ہوئی۔

حضرت اسحاق علیہ السلام کا انتقال حبرون میں ہوا' اور وہیں اپنے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سارہ کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ان تینوں کے مزار مکفیلہ کے غار میں ہیں۔ یہ غار اور اردگرد کے کھیت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک حطی باشندے سے خریدے تھے۔ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت سارہ' حضرت اسحاق علیہ السلام کے علاوہ ربقہ' حضرت یعقوب اور لیاہ دفن ہیں۔ الخلیل کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر ہو گئی' اور اب یہ مقام الخلیل ہی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام مسلمانوں اور یہودیوں کے نزدیک یکساں طور پر قابل احترام ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام

حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت اسحاق کے بیٹے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے تھے۔ ان کی والدہ کا نام ربقہ تھا اور ان کے نانا بتوئیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ ان کا حقیقی توام بھائی عیسو اپنے والد کا محبوب اور پیارا تھا اور یعقوب اپنی والدہ ربقہ کے چہیتے تھے۔

ان دونوں بھائیوں کی باہمی ناراضی کا واقعہ' جو بائیبل میں مذکور ہے' حضرت اسحاق علیہ السلام کے باب میں بیان ہو چکا ہے۔ آگے کی روایت یوں ہے کہ جب حضرت یعقوب اپنی والدہ کے اشارہ پر اپنے ماموں لابان کے پاس فدان آرام چلے گئے تو ان کے ماموں نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال ان کے یہاں رہ کر ان کی بکریاں چرائیں' تو وہ اس مدت کو مہر قرار دے کر اپنی لڑکی سے شادی کر دیں گے۔ جب یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو پورا کر دیا تو لابان نے اپنی لڑکی لئیہ سے ان کا نکاح کرنا چاہا' مگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنا رجحان طبع چھوٹی لڑکی راحیل کی جانب ظاہر کیا۔ لابان نے یہ عذر کیا کہ یہاں دستور کے مطابق بڑی لڑکی کے نکاح سے قبل چھوٹی لڑکی کا نکاح نہیں ہو سکتا' اس لیے تم اس رشتے کو منظور کر لو اور اپنے قیام کو دس سال اور طویل کر دو اور میری خدمت میں رہو تو راحیل بھی تمہارے نکاح میں دی جا سکے گی (کیوں کہ اس زمانے میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا)' چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس مدت کو بھی پورا کر دیا' اور راحیل سے شادی کر لی۔ ان دونوں کے علاوہ لئیہ کی خالہ زاد زلفا اور راحیل کی خالہ زاد بلہا بھی ان کی زوجیت کے رشتے میں منسلک ہو گئیں اور ان سب سے اولاد ہوئی۔ اور بن یمین کے علاوہ یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد اپنے ماموں کے ہاں پیدا ہوئی اور جب یعقوب علیہ السلام وطن واپس آ گئے' تو یہاں بن یمین پیدا ہوئے۔ لابان نے یعقوب علیہ السلام کو بیس سال اپنے پاس رکھنے کے بعد بہت سامال ومتاع اور ریوڑ دے کر رخصت کیا اور یہ پھر اپنے دادا کے دار الہجرت یعنی فلسطین میں آ کر مقیم ہو گئے۔

یہ تمام واقعات تورات میں بیان ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم ان تفصیلات کے حق میں قطعاً خاموش ہے۔ صرف ان کے جلیل القدر نبی' صاحب صبر واستقامت اور حضرت یوسف علیہ السلام کے برگزیدہ باپ ہونے کا ذکر آتا ہے' اور اسی ضمن میں نام لیے بغیر حضرت یوسف کے دوسرے گیارہ بھائیوں کا بھی ذکر آ جاتا ہے۔ قرآن مجید میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا نام گیارہ جگہ آتا ہے' اور اگرچہ سورۂ یوسف میں جگہ جگہ ضمائر اور اوصاف کے لحاظ سے اور بعض دوسری سورتوں مثلاً سورۂ مومنون میں اوصاف کے اعتبار سے ان کا تذکرہ موجود ہے' مگر نام کے ساتھ صرف دو ہی جگہ ان کا ذکر کیا گیا ہے۔

مندرجہ ذیل جدول میں اس کی وضاحت ہے:

سورۂ بقرہ۔ آیات 132' 133' 136' 140' سورۂ انعام۔ آیت 85' سورۂ مریم آیت 60' سورۂ انبیا۔ آیت 72' سورۂ نسا۔ 163' سورۂ یوسف۔ آیات 6' 38' سورۂ ص' 45۔

حضرت یعقوب علیہ السلام بنی اسرائیل کے جدامجد تھے۔ اس کا تعارف یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں۔ ایک حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور دوسرے عرب قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا' اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد نہ تھے' وہ بھی چوں کہ ان کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم وبیش متاثر تھے' اس لیے وہ اپنا سلسلۂ نسب انھی سے جوڑتے تھے۔

دوسرے حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد' جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام' یوسف علیہ السلام' موسیٰ علیہ السلام' داؤد علیہ السلام' سلیمان علیہ السلام' یحییٰ علیہ السلام' عیسیٰ علیہ السلام اور بہت سے انبیائے کرام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب اسرائیل تھا جس کے معنی ہیں بندۂ خدا۔ یہ لقب انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا' اور اسی مناسبت سے ان کی نسل ''بنی اسرائیل'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ بائیبل کی کتاب 12' آیت 4 کے مطابق اس قوم کی اپنی روایات یہ ہیں کہ ان کے مورث اعلیٰ حضرت یعقوب علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کشتی لڑی۔ رات بھر کشتی ہوتی رہی' اور صبح تک لڑ کر بھی اللہ تعالیٰ انھیں نہ پچھاڑ سکا۔ پھر جب صبح ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا: ''اب مجھے جانے دو' تو انھوں نے کہا: ''میں تجھے نہ جانے دوں گا' جب تک تو مجھے برکت نہ دے۔'' اللہ تعالیٰ نے پوچھا: ''تمھارا نام کیا ہے؟'' انھوں نے کہا: یعقوب'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آیندہ تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا' کیوں کہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے جو دو بیویوں اور دو باندیوں سے تھے۔ ان کی تفصیل یہ ہے۔:

پہلی بیوی لئیہ بنت لابان کے بطن سے چھے بیٹے پیدا ہوئے:

روبن	Reuben
شمعون	Simeon
لاوی	Levi
یہودا	Judah
اشکار	Issachar
زبلون	Zebulun

دوسری بیوی یعنی لئیہ کی چھوٹی بہن راحیل (Rachal) کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے:

حضرت یوسف	Joseph
بن یمین	Benjamen

زلفہ (Zilpha) سے دو بیٹے پیدا ہوئے:

جاد	Gad
آشر (اشیر)	Asher

بلہاہ کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے:

دان	Dan
نفتالی	Naphtali

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو خدائے واحد کی عبادت کی وصیت کی تھی' جس کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے: ''میرے بچو! اللہ نے تمھارے لیے یہی دین پسند کیا ہے۔ لہٰذا مرتے دم تک مسلم ہی رہنا۔ پھر کیا تم اس وقت موجود تھے' جب یعقوب علیہ السلام اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا؟ اس نے مرتے وقت اپنے بیٹوں سے پوچھا'' بچو' میرے بعد کس کی بندگی کرو گے؟'' ان سب نے جواب دیا: ''ہم اسی ایک خدا کی بندگی کریں گے' جسے آپ نے اور آپ کے بزرگوں ابراہیم علیہ السلام' اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام نے واحد خدا مانا اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔''

(سورۂ بقرہ۔ آیات 132۔133)

بائیبل میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وفات کا حال بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے' جس کا ذکر حضرت یوسف علیہ السلام کے تذکرے میں آئے گا' مگر حیرت ہے کہ اولاد کے نام اس وصیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تلمود میں جو مفصل وصیت درج ہے' اس کا مضمون قرآن حکیم کے بیان سے مشابہ ہے۔ تلمود میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے یہ الفاظ ملتے ہیں:

''خداوند اپنے خدا کی بندگی کرتے رہنا۔ وہ تمھیں اسی طرح تمام آفات سے بچائے گا' جس طرح تمھارے آباؤ اجداد کو بچاتا رہا ہے۔ اپنے بچوں کو خدا سے محبت کرنے اور اس کے احکام بجا لانے کی تعلیم دینا' تاکہ ان کی مہلت زندگی دراز ہو' کیوں کہ خدا ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے جو حق کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کی راہوں پر ٹھیک ٹھیک چلتے ہیں۔'' جواب میں ان کے لڑکوں نے کہا: ''جو کچھ آپ نے ہدایت فرمائی ہے' ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہو۔'' تب حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: ''اگر تم خدا کی سیدھی راہ سے دائیں یا بائیں نہ مڑو گے تو خدا ضرور تمھارے ساتھ رہے گا۔''

سید مودودی لکھتے ہیں: ''حضرت یعقوب علیہ السلام کے حالات' جیسا کہ تورات میں مصنفین نے تفصیل سے بیان کیے ہیں' ایک دل چسپ اور ڈرامائی داستان تو یقیناً معلوم ہوتے ہیں' لیکن ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بائیبل میں تحریف کی گئی ہے۔ پھر تحریف ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا' بلکہ بائیبل کی تفسیروں میں بھی اللہ کے اس برگزیدہ نبی پر خوب تنقید کی گئی ہے۔ مثلاً بائیبل کے مفسر مورس بلیکارڈ لکھتے ہیں: ''انسان میں نیکی اور برائی میں کش مکش جاری رہتی ہے۔ بائیبل مقدس کے کسی کردار میں یہ کش مکش اتنی صفائی سے نظر نہیں آتی' جتنی کہ یعقوب علیہ السلام میں۔'' ان کی زندگی کی وضاحت دو مرکزی خیالوں سے ہے۔:

(1) خاندانی رقابت اور کثرت ازواج کے پیدا کردہ مسائل' اور رنج و غم

(2) خدا کی رفاقت و شراکت کی قدرت جو اچھے یا بُرے افعال کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔

یعقوب علیہ السلام کو ''حق مارنے والا'' کہا جاتا ہے' کیوں کہ اس نے اپنے بڑے بھائی عیسو کا پہلوٹھے کا حق مارا تھا۔ اس لحاظ سے وہ کوئی قابل تقلید نمونہ نہیں۔ اس نے اپنے بھائی اور باپ دونوں سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ خاندان میں پہلوٹھے کو تین برکات ملتی تھیں۔ اول خاندان اور قبیلے کی سربراہی۔ وراثت میں سے دوگنا حصہ۔ خاندان کی کہانت اور قبیلے کی کہانت (علم نجوم) کی سرداری۔ اگرچہ یعقوب چھوٹا تھا'

مگر پیشین گوئی ہو چکی تھی کہ اسے پہلوٹھے کا حق ملے گا' لیکن وہ اس بات کا انتظار کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ خدا کو اپنا ارادہ اور منصوبہ پورا کرنے دے۔ اس نے چار طرح سے گناہ کیا۔ اول اس نے خدا پر بھروسہ نہ کیا کہ وہ اپنے ارادے اور منصوبے کو اپنے وقت پر پورا کرے۔ دوم اس نے باپ کی نافرمانی کی اور اسے دھوکا بھی دیا۔ سوم نے اس نے عیسو کے برے وقت سے فائدہ اٹھایا اور بڑی زبردست سودے بازی کی۔ چہارم اس نے وقت سے پہلے ہی وعدہ چھین لیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اچھا نتیجہ حاصل کرنے کے لیے برائی کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔''

''پھر مفسر صاحب نے ان چاروں گناہوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے'': اپنی کئی ایک شرم ناک باتوں کے باوجود خدا کو یہ خاندان منظور تھا۔ اسی سے بارہ قبیلوں کا آغاز ہونا تھا۔ ان بارہ قبیلوں سے وہ قوم ابھرنی تھی' جس میں مسیح کو پیدا ہونا تھا۔ بائیبل مقدس کے مصنفین نے لوگوں کے حالات بڑی سچائی سے بیان کیے۔ دنیا کی کوئی کتاب اپنے مشاہیر اور بزرگوں کی خامیاں بیان کرنے میں اتنی صاف گو نہیں' جتنی کہ بائیبل ہے۔''

اس کے برعکس قرآن حکیم کا رویہ ہے کہ انبیائے کرام کا ذکر' ان کے ناموں اور کاموں کا تذکرہ انتہائی عقیدت و احترام سے کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر بھی ان برگزیدہ انبیا میں کیا گیا ہے' جو اللہ کی بارگاہ میں بطور خاص مقرب تھے اور ان پر صحائف نازل ہوئے۔ اس بنا پر انھیں بارگاہ خداوندی سے اسرائیل (اسرا بمعنی عبد۔ ایل بمعنی اللہ) کا لقب ملا اور ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔ قرآن مجید سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ مستقل شریعت پر عمل پیرا تھے' جو شریعت ابراہیمی تھی اور انھوں نے لوگوں کو اس کی دعوت دی۔ غالباً انھیں اہل کنعان کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔ اسلامی ادب میں ان کا ذکر ایک غم زدہ' مبتلائے مصیبت' اور انتہائی صابر و شاکر نبی کے طور پر تمثیلی پیرایے میں کثرت سے ملتا ہے۔ دیدۂ یعقوب ایک دوامی تلمیح ہے۔

عیسو۔ ادوم

حضرت اسحاق علیہ السلام کے چھوٹے بیٹے یعقوب علیہ السلام کو نبوت ملی اور بڑے بیٹے عیسو کو حکومت و ثروت۔ جب بھائیوں میں ناچاقی ہوئی تو عیسو خفا ہو کر اپنے محترم چچا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے پاس چلے گئے اور ان کی صاحب زادی بشامہ سے شادی کر لی۔ پھر چند اور شادیاں کیں' جن سے متعدد اولادیں' اور ان کی بھی اولادیں ہوئیں' جن میں عمالیق اور عوض زیادہ مشہور ہوئیں۔

پھر عیسو اپنی بیویوں اور بیٹے بیٹیوں اور اپنے گھر کے سب نوکر چاکروں اور اپنے چوپایوں اور تمام مویشیوں اور اپنے سب مال اسباب کو' جو اس نے ملک کنعان میں جمع کر لیا تھا' لے کر اپنے بھائی یعقوب علیہ السلام کے پاس سے ایک دوسرے ملک ''سعیر'' کو چلا گیا۔ ان کے پاس اس قدر سامان ہو گیا تھا کہ وہ ایک جگہ نہیں رہ سکتے تھے' اور ان کے مویشیوں کی کثرت کے سبب سے اس زمین میں گنجائش نہیں تھی۔

یہ علاقہ کوہ سعیر (شعیر) سے انتہائی یمن تک طولاً وسیع ہے عیسو کا نام عرفِ عام میں ادوم (سرخ) تھا۔ اسی لیے اِس خاندان اور اِس ملک کا نام ادوم پڑ گیا۔ چند صدیوں کے بعد یہ خاندان ایک کثیر آبادی والی قوم بن گیا' جس نے 1700 قبل مسیح سے پہلے ایک عظیم الشان حکومت قائم کی۔ اسی عہد میں بنی اسرائیل جب مصر سے آئے ہیں تو ادوم کی حکومت سعیر میں قائم تھی۔ ساؤل (طالوت) جو بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ تھے' اور جن کا زمانہ 1000 قبل مسیح ہے' اور جنھیں قرآن مجید نے جالوت کی رعایت سے طالوت کہا ہے' سب سے پہلے ادوم پر حملہ کیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ادوم کو فتح کر کے مملکتِ اسرائیل میں شامل کیا۔ ہداذ جو اس وقت ادوم کا شہزادہ تھا' بھاگ کر مدین آیا اور یہاں سے مصر چلا گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے بعد وہ اپنے ملک ادوم واپس آ گیا۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کے مختلف سلاطین کے عہد میں بنو ادوم نے شدید بغاوتیں کیں۔ نویں صدی قبل مسیح کے نصفِ اول میں وہ یہودیہ کے ماتحت تھے (ان بغاوتوں اور جنگوں کی تاریخ تورات کے باب ''سلاطین'' میں تفصیل سے درج ہے)

اس کے بعد اشوریہ (Assyria) کا دور شروع ہوتا ہے۔ اشوریہ کے بادشاہ تغلت پلاسر چہارم کے عہد 701 (ق م) میں اشوری الواح و کتبات میں ادومی حکومت کا بہ حیثیت خراج گزار ریاست ذکر موجود ہے۔ ایک اہم تاریخی واقعہ یہ ہے کہ بنو کدنصر' بادشاہ اشوریہ کے مقابلے میں بغاوت کی' اور ناکام رہے۔ بنو کدنصر نے دیگر قوموں کے ساتھ انھیں بھی پامال کر دیا۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں میڈیا والوں کے ہاتھوں تباہ ہوا۔ اسی عہد میں موقع پا کر ان اسماعیلی عربوں نے اس پر قبضہ کر لیا' جن کا نام تاریخ میں ''نبطی'' ہے۔ ادومی مجبور ہو کر بحر مردار کے پار چلے گئے۔ ادوم جس خطے میں آباد ہوئے' یونانی زبان میں اب تک اسے ادومیہ (Idumia) کہتے ہیں۔

ادوم کی ایک نسل کا نام عوض تھا۔ حضرت ایوب علیہ السلام اسی عوض بن ادوم کی نسل میں سے تھے۔ حضرت ایوب علیہ السلام پر ایک جداگانہ باب اپنے مقام پر آئے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت یوسف علیہ السلام حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹے' حضرت اسحاق علیہ السلام کے پوتے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پڑپوتے تھے۔ ان کے حالات زندگی کے بنیادی ماخذ دو ہیں یعنی بائیبل اور قرآن۔ بائیبل کے بیان کے مطابق جس کی تائید قرآن کے اشارات سے بھی ہوتی ہے' حضرت یوسف اور ان کے چھوٹے بھائی بن یامین (یا بن یمین یا بنجمن) ایک بیوی سے اور باقی دس دوسری بیویوں سے تھے (ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پچھلا باب حضرت یعقوب علیہ السلام)

حضرت یوسف علیہ السلام کی پیدائش 1906 قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں ہوئی اور 1890 ق م کے قریبی زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا' جن سے ان کے حالات زندگی پر پہلی روشنی پڑتی ہے۔ یعنی خواب دیکھنا اور پھر کنوئیں میں پھینکا جانا۔ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر سترہ برس تھی۔ جس کنوئیں میں وہ پھینکے گئے' وہ بائیبل

اور تلمود کی روایات کے مطابق سکم کے شمال میں دوتن (موجودہ دوثان) کے قریب واقع تھا' اور جس قافلے نے انھیں کنوئیں سے نکالا' وہ جلعاد (شرق اردن) سے آ رہا تھا اور مصر کی طرف عازم تھا۔ جلعاد کے کھنڈر اب بھی دریائے اردن کے مشرق میں وادی الیابس کے کنارے واقع ہیں۔

مصر پر اس زمانے میں پندرھویں خاندان کی حکومت تھی جو مصر کی تاریخ میں چرواہے بادشاہوں (ہیکسوس) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ عربی نسل کے تھے اور فلسطین و شام سے مصر جا کر دو ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ زمانے میں سلطنت مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ عرب مورخین نے ہیکسوس کے لیے ''عمالیق'' کا نام استعمال کیا ہے جو مصریات کی موجودہ تحقیقات سے ٹھیک مطابقت رکھتا ہے۔ مصر میں یہ لوگ اجنبی حملہ آور کی حیثیت رکھتے تھے اور ملک کے اندرونی نزاعات کے سبب سے انھیں وہاں اپنی بادشاہت قائم کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ یہی سبب ہوا کہ ان کی حکومت میں حضرت یوسف علیہ السلام کو عروج حاصل کرنے کا موقع ملا اور پھر بنی اسرائیل وہاں ہاتھوں ہاتھ لیے گئے' ملک کے بہترین زرخیز علاقے میں آباد کیے گئے اور انھیں وہاں بڑا اثر و رسوخ حاصل ہوا' کیوں کہ وہ ان غیر ملکی حکمرانوں کے ہم جنس تھے۔

پندرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر تک یہ لوگ مصر پر قابض رہے اور ان کے زمانے میں ملک کا سارا اقتدار عملاً بنی اسرائیل کے ہاتھ میں رہا۔ اسی دور کی طرف سورۂ مائدہ آیت 20 میں ارشاد کیا گیا ہے: ''یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمھیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں سے نبی پیدا کیے۔ تمھیں فرماں روا بنایا اور تمھیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔'' عین عروج کے بعد ملک میں ایک زبردست قوم پرستانہ تحریک اٹھی۔ مصر کے اصلی باشندوں نے غیر ملکی ''چرواہوں'' کو مصر سے باہر نکالنے کی تحریک چلائی اور ہکسوس کا تختہ الٹ دیا۔ ڈھائی لاکھ کی تعداد میں عمالقہ ملک سے نکال دیئے گئے۔ ایک نہایت متعصب قبطی نسل کا خاندان برسرِ اقتدار آ گیا۔ انھوں نے عمالقہ کے زمانے کی یادگاروں کو چن چن کر مٹا دیا اور بنی اسرائیل پر ان مظالم کا سلسلہ شروع کیا جن کا ذکر حضرت موسیٰ کے حالات میں آتا ہے۔

قدیم مصر کی تاریخ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان چرواہے بادشاہوں نے مصری دیوتاؤں کو تسلیم نہیں کیا تھا' بلکہ اپنے دیوتا شام سے اپنے ساتھ لائے تھے' اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مصر میں ان کا مذہب رائج ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید حضرت یوسف علیہ السلام کے ہم عصر بادشاہ کو ''فرعون'' کے نام سے یاد نہیں کرتا' کیوں کہ ''فرعون'' مصر کی مذہبی اصطلاح تھی' اور یہ ''چرواہے'' لوگ مصری مذہب کے قائل نہ تھے' لیکن بائبل میں غلطی سے اسے بھی فرعون کا نام دیا گیا ہے۔ شاید اس کے مرتب کرنے والے سمجھتے ہوں گے کہ مصر کے سب بادشاہ ''فرعون'' ہی تھے۔

موجودہ زمانے کے محقق' جنھوں نے مصر کی تاریخ اور بائبل کا تقابلی مطالعہ کیا ہے' عام رائے یہ رکھتے ہیں کہ چرواہے بادشاہوں میں سے جس فرماں روا کا نام پندرھویں خاندان میں یوفس یا ابوفیس (Apohis) ملتا ہے' وہی حضرت یوسف کا ہم عصر تھا۔

مصر کا دارالحکومت اس زمانے میں ممفس تھا' جس کے کھنڈر قاہرہ کے جنوب میں چودہ میل کے فاصلے پر پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں وہاں پہنچے۔ دو تین سال عزیز مصر فوطیفار کے گھر رہے۔ آٹھ نو سال جیل میں گزارے۔ تیس سال کی عمر میں ملک کے وزیر اعظم ہوئے اور اسی سال تک بلاشرکت غیرے تمام مملکت مصر پر حکومت کرتے رہے۔ اپنی حکومت کے نویں یا دسویں سال انھوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو اپنے پورے خاندان کے ساتھ فلسطین سے مصر بلا لیا اور اس علاقے میں آباد کیا جو دمیاط اور قاہرہ کے درمیان واقع ہے۔ بائبل میں اس علاقے کا نام جشن بتایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے تک یہ لوگ اسی علاقے میں آباد رہے۔ بائبل کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک سو دس سال کی عمر میں وفات پائی اور انتقال کے وقت بنی اسرائیل کو وصیت کی کہ جب تم اس ملک سے نکلو تو میری ہڈیاں اپنے ساتھ لے جانا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے کی جو تفصیلات بائبل اور تلمود میں بیان کی گئی ہیں' ان سے قرآن کا بیان قدرے مختلف ہے' مگر قصے کے اہم اجزا میں تینوں متفق ہیں۔ جہاں جہاں یہ اختلاف موجود ہیں' متن میں اس کی نشان دہی کر دی جائے گی۔

سورۂ یوسف

حضرت یوسف علیہ السلام کے ذاتی حالات اور اس زمانے کی معاشرتی کیفیت کے بارے میں قرآن مجید میں ان کے نام سے منسوب ایک الگ سورت موجود ہے۔ انھیں یہ فخر حاصل ہے کہ اپنے پردادا ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کے نام پر بھی ایک مکمل سورت نازل ہوئی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات سے متعلق عبرت و موعظمت کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ قرآن حکیم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعے کو ''احسن القصص'' کہا ہے' اس لیے کہ اس ایک واقعے میں جس قدر عبرتیں' حکمتیں اور مواعظ و نصائح ودیعت ہیں' دوسرے کسی واقعے میں یک جا نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ واقعہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے عجیب دل کش اور زمانے کے عروج و زوال کی زندہ یادگار ہے۔ یہ ایک فرد کے ذریعے اقوام کے بننے اور بگڑنے' گرنے اور ابھرنے کی ایسی بولتی ہوئی تصویر ہے جو کسی تشریح کی محتاج نہیں رہتی۔ یہ بدوی اور خانہ بدوش قبیلے کے ایک ایسے فرد یگانہ اور اَن مول موتی کی حیرت انگیز تاریخ ہے جسے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے اعجاز نے اس زمانے کی سب سے بڑی متمدن قوم کی راہ نمائی اور ان پر حاکمانہ اقتدار کے لیے چن لیا تھا اور شرف نبوت سے نوازا تھا۔

حضرت یوسف کا خواب

اب ہم داستانِ یوسف کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ داستان جیسا کہ اوپر تعارف میں بیان ہوا' قرآن مجید کی سورۂ یوسف میں' اور نیز تورات کی کتاب پیدائش کے ابواب 37 تا 50 میں تقریباً تمام تفاصیل کے ساتھ موجود ہے۔ باب 37 کا آغاز یوں ہوتا ہے: ''اور یعقوب علیہ السلام ملک کنعان میں رہتا تھا۔ جہاں اس کا باپ مسافر کی

طرح رہا تھا۔ یعقوب کی نسل کا حال یہ ہے کہ یوسف سترہ برس کی عمر میں اپنے بھائیوں کے ساتھ بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ یہ لڑکا اپنے باپ کی بیویوں بلہاہ اور زلفہ کے بیٹوں کے ساتھ رہتا تھا اور وہ ان کے برے کاموں کی خبر باپ تک پہنچاتا تھا۔ اور اسرائیل یوسف کو اپنے سب بیٹوں سے زیادہ پیار کرتا تھا کیوں کہ وہ اس کے بڑھاپے کا بیٹا تھا اور اس نے اسے ایک بوقلمون قبا بھی بنوادی۔ اور اس کے بھائیوں نے دیکھا کہ ان کا باپ اُن سب بھائیوں سے زیادہ اسی کو پیار کرتا ہے۔ سو وہ اس سے بغض رکھنے لگے اور ٹھیک طور سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ اور یوسف نے ایک خواب دیکھا جسے اُس نے اپنے بھائیوں کو بتایا تو وہ اس سے اور بھی بغض رکھنے لگے اور اُس نے اُن سے کہا' ذرا وہ خواب تو سنو جو میں نے دیکھا ہے۔ ہم کھیت میں پولے باندھتے تھے اور کیا دیکھتا ہوں۔ کہ میرا پولا اٹھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا اور تمھارے پولوں نے میرے پولوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اسے سجدہ کیا۔ تب اس کے بھائیوں نے اس سے کہا کہ کیا تو سچ مچ ہم پر سلطنت کرے گا یا ہم پر تیرا تسلط ہوگا؟ اور انھوں نے اس کے خوابوں اور اس کی باتوں کے سبب سے اس سے اور بھی زیادہ بغض رکھا۔ پھر اس نے دوسرا خواب دیکھا اور اپنے بھائیوں کو بتایا۔ اُس نے کہا' دیکھو مجھے ایک اور خواب دکھائی دیا ہے کہ سورج اور چاند اور گیارہ ستاروں نے مجھے سجدہ کیا۔ اور اس نے اسے اپنے باپ اور بھائیوں دونوں کو بتایا۔ تب اس کے باپ نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ یہ خواب کیا ہے جو تو نے دیکھا ہے؟ کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کر تجھے سجدہ کریں گے۔ اور اس کے بھائیوں کو اس سے حسد ہو گیا لیکن اس کے باپ نے یہ بات یاد رکھی۔ اور اس کے بھائی اپنے باپ کی بھیڑ بکریاں چرانے سکم کو گئے۔''

سورۂ یوسف میں یوں آیا ہے: ''جب یوسف علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا' ابا جان میں نے خواب دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے ہیں اور سورج اور چاند ہیں اور مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔'' جواب میں اس کے باپ نے کہا: ''بیٹا' اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کو نہ سنانا' ورنہ وہ تیرے درپے آزار ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان آدمی کا کھلا دشمن ہے۔ اور ایسا ہی ہوگا (جیسا تو نے خواب دیکھا ہے کہ) تیرا رب تجھے منتخب کرے گا اور تجھے باتوں کی تہ تک پہنچنا سکھائے گا (جس میں تعبیر خواب کا علم بھی شامل ہے) اور تیرے اوپر اور آل یعقوب پر اپنی نعمت اسی طرح پوری کرے گا جس طرح اس سے پہلے وہ تیرے بزرگوں ابراہیم علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام پر کر چکا ہے۔''

بائبل اور تلمود کا بیان قرآن مجید کے اس بیان سے مختلف ہے۔ ان کا بیان یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب سن کر بیٹے کو ڈانٹا اور کہا کہ اچھا اب تو یہ خواب دیکھنے لگا ہے کہ میں اور تیری ماں اور تیرے سب بھائی تجھے سجدہ کریں گے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو معلوم تھا کہ یہ سوتیلے بھائی یوسف علیہ السلام سے حسد رکھتے ہیں اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی ایسے صالح نہیں ہیں کہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے کوئی غلط اور ناروا کارروائی کرنے میں انھیں کوئی تامل ہو'

اس لیے انھوں نے اپنے صالح بیٹے کو متنبہ فرما دیا کہ ان سے ہوشیار رہنا۔ خواب کا صاف مطلب یہ تھا کہ سورج سے مراد حضرت یعقوب' چاند سے مراد ان کی بیوی (حضرت یوسف کی سوتیلی والدہ) اور گیارہ ستاروں سے مراد گیارہ بھائی ہیں۔ ذرا غور کرنے سے بآسانی یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیغمبرانہ سیرت سے قرآن کا بیان زیادہ مناسبت رکھتا ہے نہ کہ بائبل اور تلمود کا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب بیان کیا تھا' کوئی اپنی تمنا اور خواہش بیان نہیں کی تھی۔ خواب اگر سچا تھا' اور ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس کی جو تعبیر نکالی تھی وہ سچا خواب سمجھ کر ہی نکالی تھی' تو اِس کے صاف معنی یہ تھے کہ یہ یوسفؑ کی خواہش نہیں تھی' بلکہ تقدیر الٰہی کا فیصلہ تھا کہ ایک وقت انھیں یہ عروج حاصل ہو۔ پھر کیا ایک پیغمبر تو درکنار' ایک معقول آدمی کا بھی یہ کام ہو سکتا ہے کہ ایسی بات پر بُرا ماننے اور خواب دیکھنے والے کو الٹی ڈانٹ پلائے؟ اور کیا کوئی شریف باپ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہی بیٹے کے آیندہ عروج کی بشارت سن کر خوش ہونے کی بجائے الٹا جل بھن جائے۔

پھر ایک اور اختلاف یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے جب اپنا خواب حضرت یعقوب علیہ السلام کو سنایا تو دوسرے بھائی وہاں موجود نہ تھے اور تورات کہتی ہے کہ یہ معاملہ بھائیوں کی موجودگی میں پیش آیا۔

تقاضائے فطرت یہ ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنے اس خواب کو بھائیوں سے الگ ہو کر بیان کریں اور یعقوب علیہ السلام بیٹے کے اس خواب کو سن کر مسرور ہوں کہ ہر ایک باپ اپنی اولاد کی ترقی' درجات اور بلندی مناصب کا خواہش مند ہوتا ہے۔ خصوصاً جب کہ یعقوب علیہ السلام نبی ہونے کی وجہ سے خواب کی تعبیر میں یوسف علیہ السلام کے لیے جو بلندی دیکھ رہے تھے' وہ موجب صد ہزار مسرت تھی نہ کہ باعثِ رنج والم۔

چاہِ کنعان

آخر کار حسد کی بھڑکتی ہوئی آگ نے ایک روز برادران یوسف علیہ السلام کو ان کے خلاف سازش کرنے پر مجبور کر ہی دیا۔ اس سازش کا حال قرآن مجید میں یوں بیان ہوا ہے'' ''اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا: ''یہ یوسف اور اس کا بھائی (بن یامین) دونوں ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہیں' حالانکہ ہم پورا ایک جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں۔ چلو یوسف کو قتل کر دو یا اسے پھینک دو تاکہ تمھارے والد کی توجہ صرف تمھاری ہی طرف ہو جائے۔ یہ کام کر لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا۔''

''اس پر ان میں سے ایک بولا: ''یوسف کو قتل نہ کرو۔ اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا۔''

(آیت10)

اس باہمی مشورے کے بعد سب جمع ہو کر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ ''ابا جان' کیا بات ہے کہ آپ یوسف کے معاملے میں

ہم پر بھروسا نہیں کرتے' حالانکہ ہم اس کے سچے خیر خواہ ہیں؟ کل اسے ہمارے ساتھ بھیج دیجیے گا۔ کچھ کھائے پیئے گا اور کھیل کود سے بھی دل بہل جائے گا۔ ہم اس کی حفاظت کو موجود ہیں'' (آیات 11-12)

قرآن کا یہ بیان بھی بائبل اور تلمود سے مختلف ہے۔ ان کی روایت یہ ہے کہ برادران یوسف علیہ السلام اپنے مویشی چرانے کے لیے سکم کی طرف گئے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے خود یعقوب علیہ السلام نے ان کی تلاش میں حضرت یوسف علیہ السلام کو بھیجا تھا' مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوب نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے حسد کا حال جاننے کے باوجود انھیں موت کے منہ میں بھیجا ہو' اس لیے قرآن کا بیان ہی زیادہ مناسب حال معلوم ہوتا ہے۔

حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ گئے کہ ان کے دلوں میں کھوٹ ہے' اور یہ یوسف کو نقصان پہنچانے کے در پے ہیں۔ مگر صاف لفظوں میں اس بات کو ظاہر نہیں فرمایا' تاکہ بگڑ کر وہ علانیہ دشمنی پر آمادہ نہ ہو جائیں' اور یہ بھی خیال کیا کہ اشارہ کنایہ سے ممکن ہے' وہ اپنی ظالمانہ سازش سے باز رہیں' اس لیے اشارے اشارے میں ان پر حقیقت حال واضح کر دی کہ واقعی مجھے یوسف علیہ السلام کے بارے میں تم سے اندیشہ ہے۔ انھوں نے کہا: ''تمہارا اسے لے جانا مجھے شاق گزرتا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اسے بھیڑیا نہ پھاڑ کھائے' جب کہ تم اس سے غافل ہو'' (آیت 14)

یہ سن کر برادرانِ یوسف علیہ السلام نے بہ یک زبان کہا: ''اگر ہمارے ہوتے اسے بھیڑیے نے کھا لیا' جب کہ ہم ایک جتھا ہیں تب تو ہم بڑے ہی نکمے ہوں گے'' (آیت 14)

''اس طرح اصرار کر کے جب وہ اسے لے گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ اسے ایک اندھے کنوئیں میں چھوڑ دیں تو ہم نے یوسف علیہ السلام کو وحی کی کہ ایک وقت آئے گا جب تو ان لوگوں کو ان کی یہ حرکت جتائے گا۔ یہ اپنے فعل کے نتائج سے بے خبر ہیں۔'' (آیت 15)

بائبل اور تلمود اس ذکر سے خالی ہیں کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوسف علیہ السلام کو کوئی تسلی بھی دی گئی تھی۔ اس کے بجائے تلمود میں جو روایت بیان ہوئی ہے' وہ یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کنوئیں میں ڈالے گئے تو وہ بہت بلبلائے اور خوب چیخ چیخ کر انھوں نے بھائیوں سے فریاد کی۔ قرآن مجید کا بیان پڑھیے تو محسوس ہوگا کہ ایسے نوجوان کا بیان ہو رہا ہے جو آگے چل کر تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں میں شمار ہونے والا ہے۔ تلمود کو پڑھیے تو کچھ ایسا نقشہ سامنے آئے گا کہ صحرا میں چند بدو ایک لڑکے کو کنوئیں میں پھینک رہے ہیں' اور وہ وہی کچھ کر رہا ہے جو ہر لڑکا ایسے موقع پر کرے گا۔

''شام کو وہ روتے پیٹتے اپنے باپ کے پاس آئے اور کہا: ''ابا جان ہم دوڑ کا مقابلہ کرنے میں لگ گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ اتنے میں بھیڑیا آیا اور اسے کھا گیا۔ آپ ہماری بات کا یقین نہ کریں گے' چاہے ہم سچے ہی ہوں'' (آیت 16-17)

''اور وہ یوسف کے قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے تھے۔ یہ سن کر باپ نے کہا'' بلکہ تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا' صبر کروں گا اور بخوبی کروں گا۔ جو بات بنا رہے ہو' اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے'' (آیت 18)

بائبل اور تلمود اس موقع پر حضرت یعقوب علیہ السلام کے تاثر کا نقشہ بھی کچھ ایسا پیش کرتی ہیں جو کسی معمولی باپ کے تاثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ ''تب یعقوب علیہ السلام نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپیٹا اور بہت دنوں تک اپنے بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔'' اور تلمود کا بیان ہے: ''یعقوب علیہ السلام بیٹے کا قمیص پہچانتے ہی اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور دیر تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بڑے زور سے چیخا کہ ہاں میرے بیٹے کا قمیص ہے۔۔۔۔۔۔ اور وہ سال ہا سال تک یوسف کا ماتم کرتا رہا۔'' اس نقشے میں حضرت یعقوب وہی کچھ کرتے نظر آتے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرے گا' لیکن قرآن مجید جو نقشہ پیش کر رہا ہے' اس سے ہمارے سامنے ایک ایسے غیر معمولی انسان کی تصویر آتی ہے جو کمال درجے کا بردبار' صابر اور باوقار ہے۔ انھوں نے یوسف علیہ السلام کا قمیص دیکھا کہ خون آلود تھا' مگر کسی ایک جگہ سے بھی خراش تک نہ آئی تھی' اور نہ چاک داماں تھا۔ اپنی فہم و فراست سے معاملے کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھانپ جاتے ہیں کہ یہ ایک بناوٹی بات ہے جو ان حاسد بیٹوں نے بنا کر پیش کی ہے' اتنے پیارے اور چہیتے بیٹے کی وفات کی اتنی بڑی غم انگیز خبر سن کر بھی وہ اپنا ذہنی توازن نہیں کھوتے' بلکہ عالی ظرف انسانوں کی طرح صبر کرتے اور اللہ پر بھروسا کرتے ہیں۔

حضرت یوسف اور غلامی

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ حجازی اسماعیلیوں (مدیانیوں) کا ایک قافلہ ادھر آیا اور اس نے اپنے سقے کو پانی لانے کے لیے بھیجا۔ سقے نے جو کنوئیں میں ڈول ڈالا تو (یوسف کو دیکھ کر) پکار اٹھا ''مبارک ہو یہاں تو ایک لڑکا ہے۔'' ان لوگوں نے اسے مال تجارت سمجھ کر چھپا لیا' حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے تھے' اللہ اس سے باخبر تھا۔ (آیت 19)

''آخر کار انھوں نے اسے تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملے میں کچھ زیادہ کے امیدوار نہ تھے۔'' (آیت 20)

داستان یوسف علیہ السلام کا یہ ٹکڑا بائبل میں یوں بیان ہوا ہے: ''اور وہ کھانا کھانے بیٹھے اور آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ اسماعیلیوں کا ایک قافلہ جلعاد سے آ رہا ہے اور گرم مصالحے اور روغن بلسان اور مر اونٹوں پر لادے ہوئے مصر کو لیے جا رہا ہے۔ تب یہوداہ نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں اور اس کا خون چھپائیں تو کوئی نفع نہ ہوگا۔ آؤ اسے اسماعیلیوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں کہ ہمارا ہاتھ اس پر نہ اٹھے کیوں کہ وہ ہمارا بھائی اور ہمارا خون ہے۔ اس کے بھائیوں نے اس کی بات مان لی۔ پھر وہ مدیانی سوداگر ادھر سے گزرے۔ تب انھوں نے یوسف کو کھینچ کر

گڑھے سے باہر نکالا اور اسے اسماعیلیوں کے ہاتھ بیس روپے کو بیچ ڈالا اور وہ یوسف علیہ السلام کو مصر میں لے گئے ('' کتاب پیدائش باب 37۔ آیت 25 تا 28)

بازار مصر

آج دارالحکومت کے بارونق مرکزی بازار میں ہزاروں تاجروں اور عوام کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے۔ بازار میں تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں۔ بازار کے عقب میں ایک وسیع و عریض میدان ہے۔ یہاں اکثر میلا لگا کرتا ہے۔ گھوڑ دوڑ اور نیزہ بازی کے مقابلے ہوا کرتے ہیں۔ باہر کے شہروں کے سوداگر اسی میدان میں اپنے سامانِ تجارت کی نمائش کیا کرتے ہیں اور منہ مانگے دام وصول کیا کرتے ہیں۔

ایک تاجر جس کا نام مالک بن زعر ہے اس کا مال تجارت آج ایک حسین و جمیل نوجوان غلام ہے۔ ایک پیغمبر کا بیٹا' دوسرے پیغمبر کا پوتا' تیسرے پیغمبر کا پڑپوتا۔ اسے ایک سنہری کرسی پر بہترین لباس پہنا کر بٹھایا گیا ہے۔ کئی گھنٹے سے لوگ اس کے گرد جمع ہیں۔ امرا و رؤسا اس غلام کو خریدنے کا اشتیاق رکھتے ہیں اور اس کی قیمت ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔

خود یوسف علیہ السلام کے دل میں بار بار یہ خیال آتا ہے کہ جانے مجھے کتنے داموں میں کس کے ہاتھ فروخت کیا جائے گا۔ وہ کون ہے جو مجھے خریدے گا؟ میرے مالک نے مجھے بیس درہم میں خریدا ہے۔ اگر سو درہم میں فروخت کر دے تو اسے بہت نفع ہو۔ میں ایک عاجز' بے کس بے یار و مددگار غلام ہوں۔ میری اتنی قیمت بھی زیادہ ہے۔

مالک بن زعر خزاعی نے اس کی قیمت مقرر کر رکھی ہے: '' ساٹھ لاکھ دینار' موتیوں کے ایک ہزار ہار' ایک ہزار اطلس عمدہ' اطلس رومی کے ایک ہزار تھان' ایک ہزار مصری خلعت' ایک ہزار عراقی اونٹ' ایک ہزار اصیل گھوڑے مع لگام و زین' ایک ہزار کنیزان رومی' ایک ہزار غلام مزین کمر اور ایک ہزار شمشیر آبدار''

جناب یوسف علیہ السلام اپنی قیمت سن کر حیران پریشان ہو جاتے ہیں۔ تمام رؤسا و امرا مایوس ہو کر لوٹ جاتے ہیں۔ اس قدر مال و دولت کہاں کہ اس غلام کو خریدا جا سکے؟

ایک بڑھیا سوت کی ایک انٹی لیے آ پہنچی ہے۔ شہر کے خوش مزاج لڑکے اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔ ایک لڑکا بڑھیا سے دریافت کرتا ہے: '' بڑی اماں! تم نے یوسف کی قیمت بھی سنی ہے؟'' '' ہاں سنی ہے'' بڑھیا نے کہا:

دوسرے لڑکے نے کہا: '' ہاں تیری یہ سوت کی انٹی تو اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ یوسف تو اس انٹی کے مقابلے میں بہت ہی کم ہے''

بڑھیا نے کہا: '' نہیں بیٹا! یہ انٹی یوسف کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ میں تو صرف یوسف کے خریداروں کی فہرست میں اپنا نام لکھوانے آئی ہوں۔ کل جب قیامت کے دن خریداران یوسف کو بلایا جائے گا اس شمار میں میرا نام بھی موجود ہوگا۔''

یوسف و زلیخا

بالآخر مصر جس شخص نے اسے خریدا' بائبل میں اس کا نام فوطیفار لکھا ہے۔ قرآن مجید اسے '' عزیز'' کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ یہ شخص مصر میں ایک بڑا عہدہ دار شاہی خاندان کا ایک رئیس تھا۔ '' عزیز'' کے معنی ایسے اقتدار شخص کے ہیں جس کی مزاحمت نہ کی جا سکتی ہو۔ بائبل اور تلمود کا بیان ہے کہ وہ شاہی جلوداروں (باڈی گارڈ) کا افسر تھا۔

بائبل میں ہے: '' فوطیفار مصری نے' جو فرعون کا ایک حاکم اور جلوداروں کا سردار تھا' اسے اسماعیلیوں کے ہاتھ سے' جو اسے وہاں لے گئے تھے' خرید لیا۔ اور خداوند یوسف کے ساتھ تھا اور وہ اقبال مند ہوا اور اپنے مصری آقا کے گھر میں رہتا تھا۔ اور اس کے آقا نے دیکھا کہ خداوند اس کے ساتھ ہے اور جس کام کو وہ ہاتھ لگاتا ہے' خداوند اسے اس میں اقبال مند کرتا ہے۔ چنانچہ یوسف اس کی نظر میں مقبول ٹھہرا اور وہی اس کی خدمت کرتا تھا اور اس نے اسے اپنے گھر کا مختار بنا کر اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا۔ اور جب اس نے اسے گھر کا اور سارے مال کا مختار بنا دیا تو خداوند نے اس مصری کے گھر میں یوسف علیہ السلام کی خاطر برکت بخشی اور اس کی سب چیزوں پر جو گھر میں اور کھیت میں تھیں' خداوند کی برکت ہونے لگی۔ اور اس نے اپنا سب کچھ یوسف کے ہاتھ میں چھوڑ دیا اور سوائے روٹی کے جسے وہ کھا جاتا تھا' اسے اپنی کسی چیز کا ہوش نہ تھا''

آگے قرآن مجید کا بیان یوں ہے: '' مصر کے جس شخص نے اسے خریدا' اس نے اپنی بیوی سے کہا: '' اسے اچھی طرح رکھنا۔ بعید نہیں کہ یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم اس کو بیٹا بنا لیں'' (آیت 21)

تلمود میں عزیز مصر کی بیوی زلیخا (Zelicha) لکھا ہے اور یہی نام مسلمانوں کی روایات میں مشہور ہوا۔ تلمود ہی کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر اٹھارہ سال کی تھی اور فوطیفار ان کی شان دار اور وجیہ شخصیت کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے' بلکہ کسی شریف خاندان کا چشم و چراغ ہے اسے حالات کی گردش یہاں کھینچ لائی ہے۔ چنانچہ جب وہ انھیں خرید رہا تھا تو اس نے اسی وقت سوداگروں سے کہہ دیا تھا کہ یہ غلام تو معلوم نہیں ہوتا۔ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شاید تم اسے کہیں چرا کر لائے ہو۔ اسی بنا پر فوطیفار نے ان سے غلاموں کا برتاؤ نہیں کیا' بلکہ انھیں اپنے گھر اور اپنی کل املاک کا مختار بنا دیا۔

'' مگر جس عورت کے گھر میں وہ تھا' وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگی اور ایک روز دروازے بند کر کے بولی '' آ جا'' یوسف نے کہا: خدا کی پناہ! میرے رب نے تو مجھے اچھی منزلت بخشی اور میں یہ کام کروں۔ ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پایا کرتے۔'' (آیت 23)

اور ایک روز یوں ہوا '' وہ اس کی طرف بڑھی اور یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا' اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ ہم اس سے بدی اور بے حیائی کو دور کر دیں۔ در حقیقت وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے تھا'' (آیت 24)

اس آیت میں بشریت اور نبوت کا ایک انتہائی باریک اور نازک فرق بیان کیا گیا ہے۔ یہاں '' رب کی برہان'' سے مراد اللہ کی سجھائی ہوئی وہ دلیل ہے جس کی بنا پر یوسف علیہ السلام کے ضمیر نے ان کے نفس کو اس بات کا قائل کر لیا کہ اس عورت کی

دعوت عیش قبول کرنا تجھے زیبا نہیں ہے۔ اور وہ دلیل کیا تھی؟ اسے پچھلے فقرے میں بیان کیا جاچکا ہے' یعنی یہ کہ ''میرے رب نے تو مجھے یہ منزلت بخشی اور میں ایسا برا کام کروں' ایسے ظالموں کو کبھی فلاح نصیب نہیں ہوا کرتی۔'' یہی وہ برہان حق تھی جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اس نوخیز جوانی کے عالم میں ایسے نازک موقع پر معصیت سے باز رکھا۔ پھر یہ جو فرمایا کہ ''یوسف بھی اس کی طرف بڑھتا' اگر اپنے رب کی برہان نہ دیکھ لیتا'' تو اس سے عصمتِ انبیا کی حقیقت پر بھی پوری روشنی پڑ جاتی ہے۔ نبی کی معصومیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس سے گناہ اور لغزش وخطا کی قوت واستعداد سلب کرلی گئی ہے' حتیٰ کہ گناہ کا صدور اس کے امکان ہی میں نہیں رہے' بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی اگرچہ گناہ کرنے پر قادر ہوتا ہے' لیکن بشریت کی تمام صفات سے متصف ہونے کے باوجود' اور جملہ انسانی جذبات' احساسات اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی وہ ایسا نیک نفس اور خداترس ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر کبھی گناہ کا قصد نہیں کرتا۔ وہ اپنے ضمیر میں اپنے رب کی ایسی ایسی زبردست دلیلیں اور برہان رکھتا ہے' جن کے مقابلے میں خواہش نفسانی کبھی کامیاب نہیں ہونے پاتی۔ اور اگر نادانستہ اس سے کوئی لغزش سرزد ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ فوراً وحی کے ذریعے سے اس کی اصلاح فرما دیتا ہے' کیوں کہ اس کی لغزش تنہا ایک شخص کی لغزش نہیں ہے' ایک پوری اُمت کی لغزش ہے۔ وہ راہ راست سے بال برابر ہٹ جائے تو دنیا گمراہی میں میلوں دور نکل جائے۔

اگلی پانچ آیات 29 تا 25 میں یوں آیا ہے: ''آخرکار یوسف اور وہ آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف کا قمیص کھینچ کر پھاڑ دیا۔ دروازے پر دونوں نے اس کے شوہر کو موجود پایا۔ اسے دیکھتے ہی عورت کہنے لگی: ''کیا سزا ہے اس شخص کی' جو تیری گھروالی پر نیت خراب کرے؟ اس کے سوا اور کیا سزا ہوسکتی ہے کہ اسے قید کیا جائے یا اسے سخت عذاب دیا جائے۔''

یوسف علیہ السلام نے کہا: ''یہی مجھے پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی۔'' اس عورت کے اپنے کنبہ والوں میں سے ایک شخص نے قرینے کی شہادت پیش کی کہ ''اگر یوسف کا قمیص آگے سے پھٹا ہو تو عورت سچی ہے اور یہ جھوٹا۔ اور اگر اس کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہو تو عورت جھوٹی ہے اور یہ سچا۔ جب شوہر نے دیکھا کہ یوسف علیہ السلام کا قمیص پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے کہا: ''یہ تم عورتوں کی چالاکیاں ہیں۔ واقعی بڑے غضب کی ہوتی ہیں تمھاری چالیں یوسف اس معاملے میں سے درگزر کر۔ اور اے عورت' تو اپنے قصور کی معافی مانگ' تو ہی اصل میں خطار کار تھی۔''

عزیز مصر نے اگرچہ بدنامی اور رسوائی سے بچنے کے لیے اس معاملے کو یہیں پر ختم کردیا' مگر بات پوشیدہ نہ رہ سکی اور ہوتے ہوتے خاندان کی عورتوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ عزیز مصر کی بیوی کس قدر بے حیا ہے کہ اپنے غلام پر ریجھ گئی۔ اس کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ محبت نے اسے بے قابو کر رکھا ہے۔ ہمارے نزدیک تو وہ صریح غلطی کررہی ہے۔ اتنے بڑے مرتبے کی عورت اور غلام سے اختلاط کا ارادہ۔ رفتہ رفتہ خبر عزیز کی بیوی تک پہنچ گئی۔ اسے یہ طعنے بے حد شاق گزرے اور اس نے چاہا کہ اس کا انتقام لے' اور ایسا انتقام لے کہ جس بات پر وہ مجھ پر طعن کرتی ہیں' اسی میں انھیں مبتلا کیا جائے۔ یہ سوچ کر ایک روز اس نے شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتوں کو دعوت دی۔ ان کے لیے تکیہ دار مجلس آراستہ کی اور ضیافت میں ہر ایک کے آگے ایک ایک چھری رکھ دی۔ پھر عین اس وقت جب کہ وہ پھل کاٹ کاٹ کر کھا رہی تھیں' اس نے یوسف علیہ السلام کو اشارہ کیا کہ باہر آئے۔ جب ان عورتوں کی نگاہ یوسف علیہ السلام پر پڑی تو وہ جمال یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں اور اس قدر متاثر ہوئیں کہ اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بے ساختہ پکار اٹھیں' ''کون کہتا ہے یہ انسان ہے' بخدا یہ کوئی بزرگ فرشتہ اور نور کا پتلا ہے''

عزیز کی بیوی بہت خوش ہوئی۔ اور اپنی کامیابی اور ان کی شکست پر فخر کرتے ہوئے کہنے لگی: ''دیکھ لیا' یہ ہے وہ شخص جس کے معاملے میں تم مجھ پر باتیں بناتی ہو۔ تم نے مجھے مطعون کر رکھا ہے اور تیر ملامت کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ بے شک میں نے اسے رجھانے کی کوشش کی تھی' مگر یہ بچ نکلا۔ اگر یہ میرا کہنا نہ مانے گا تو قید کیا جائے گا اور بہت ذلیل وخوار ہوگا'' (آیات 30 تا 32)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے اونچے طبقوں کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ عزیز کی بیوی زلیخا نے جن خواتین کو بلایا ہوگا' وہ امرا اور رؤسا اور بڑے افسروں کی بیگمات ہی ہوں گی۔ ان عالی مرتبہ خواتین کے سامنے وہ اپنے محبوب نوجوان کو پیش کرتی ہے اور اس کی خوب صورت جوانی دکھا کر انھیں قائل کرنے کوشش کرتی ہے کہ ایسے جواں رعنا پر میں مرنہ مٹتی تو آخر اور کیا کرتی۔ پھر یہ بڑے گھروں کی بہو بیٹیاں خود بھی اپنے عمل سے گویا اس امر کی تصدیق فرماتی ہیں کہ واقعی ان میں سے ہر ایک ایسے حالات میں وہی کچھ کرتی جو بیگم عزیز نے کیا۔ اس پر شریف خواتین کی اس بھری مجلس میں معزز میزبان کو علانیہ اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ اگر اس کا خوب صورت غلام اس کی خواہش نفس کا کھلونا بننے پر راضی نہ ہوا تو وہ اسے جیل بھجوا دے گی۔

آئندہ تین آیات کا ترجمہ یہ ہے: ''یوسف نے کہا: اے میرے رب' قید مجھے منظور ہے بہ نسبت اس کے کہ میں وہ کام کروں جو یہ لوگ مجھ سے چاہتے ہیں۔ اور اگر تو نے ان کی چالوں کو مجھ سے دفع نہ کیا تو میں ان کے دام میں پھنس جاؤں گا اور جاہلوں میں شامل ہو رہوں گا۔ اس کے رب نے اس کی دعا قبول کی اور ان عورتوں کی چالیں اس سے دفع کردیں۔ بے شک وہی ہے جو سب کی سنتا اور سب کچھ جانتا ہے''

غور کیجیے' عزیز کی بیوی گھر کی ملکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ اختیار نہیں کی' جس سے یوسف کو رام کیا جاسکے۔ پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انھوں نے اپنے ہر ممکن داؤ گھات یوسف علیہ السلام پر استعمال کیے' مگر پھر بھی ناکامی رہی۔ اب آخری درجہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یا تو یوسف علیہ السلام اسے شادکام کرے ورنہ قید خانے میں ڈالا جائے گا۔ ایسی حالت میں ایک باخدا انسان' صاحب عزیمت' باحوصلہ ہستی اور خوف خدا کو تمام کائنات کے غیظ وغضب پر

غالب رکھنے والا انسان اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا تھا کہ خدایا' میں اس عمل بد کے مقابلے میں زنداں کو ترجیح دیتا ہوں۔ مجھے قید و بند سب کچھ منظور ہے' لیکن تیری نافرمانی منظور نہیں۔

دوتن وہ مقام جہاں بائبل کے بیان کے مطابق برادرانِ یوسف علیہ السلام کو کنوئیں میں پھینکا۔

سکم وہ مقام جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام کی آبائی جائداد تھی۔ اب اس مقام کا نام نابلوس ہے۔

حبرون وہ مقام جہاں حضرت یعقوب علیہ السلام رہتے تھے۔ اسے الخلیل بھی کہتے ہیں۔

ممفس مصر کا قدیم پایہ تخت۔ اب اہل مصر اسے منف کہتے ہیں۔

جشن وہ علاقہ جہاں حضرت یوسف نے مصر میں بنی اسرائیل کو آباد کیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام زنداں میں

بہرحال یوسف علیہ السلام کو قید خانے بھیج دیا گیا اور ایک بے خطا کو خطا کار اور معصوم کو مجرم بنا دیا گیا۔ تاکہ عزیز مصر کی بیوی فضیحت سے بچ جائے اور مجرم کو کوئی مجرم نہ کہہ سکے۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کا قید میں ڈالا جانا درحقیقت ان کی اخلاقی فتح اور مصر کے پورے طبقۂ امراو حکام کی اخلاقی شکست کا اتمام و اعلان تھا۔ اب حضرت یوسف علیہ السلام کوئی غیر معروف اور گم نام آدمی نہ رہے تھے۔ سارے ملک میں' اور کم از کم دارالحکومت میں تو عام و خاص سب ان سے واقف ہو چکے تھے۔ جس شخص کی دل فریب شخصیت پر ایک دو نہیں' اکثر و بیشتر بڑے گھرانوں کی خواتین فریفتہ ہوں اور جس کے فتنہ روزگار حسن و جمال سے اپنے گھر بگڑتے دیکھ کر مصر کے حکام نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی کہ اسے قید کر دیں' ظاہر ہے کہ ایسا شخص چھپا نہیں رہ سکتا۔ یقیناً گھر گھر اس کا چرچا پھیل گیا ہوگا۔ عام طور پر لوگ اس بات سے بھی واقف ہو گئے ہوں گے کہ یہ شخص کیسے بلند اور مضبوط اور پاکیزہ اخلاق کا انسان ہے' اور یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ اس شخص کو جیل اپنے کسی جرم پر نہیں بھیجا گیا ہے' بلکہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ مصر کے امرا اپنی عورتوں کو قابو میں رکھنے کی بجائے اس بے خطا اور بے گناہ کو جیل بھیج دینا زیادہ آسان پاتے تھے۔

غالباً اس وقت جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام قید کیے گئے' ان کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ تلمود میں بیان کیا گیا ہے کہ قید خانے سے چھوٹ کر جب وہ مصر کے فرماں روا ہوئے تو ان کی عمر تیس سال تھی۔ اور قرآن کہتا ہے کہ قید خانے میں کئی سال رہے۔

حُسنِ اتفاق کہ یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو نوجوان اور قید خانے میں داخل ہوئے۔ یا وہ پہلے سے وہاں موجود تھے۔ بائبل کی روایت کے مطابق ان میں سے ایک شاہِ مصر کے ساقیوں کا سردار تھا اور دوسرا شاہی باورچیوں کا افسر۔ ان دونوں کو شاہ مصر نے اس قصور پر جیل بھیجا تھا کہ ایک دعوت کے موقع پر روٹیوں میں کچھ کرکراہٹ پیدا ہوگئی تھی اور شراب کے ایک گلاس میں مکھی نکل آئی تھی۔ ایک روز دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان میں سے ساقی کہنے لگا: "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں انگوروں کی شراب کشید کر رہا ہوں' اور دوسرے نے کہا: "میں نے خواب میں یوں دیکھا ہے کہ میرے سر پر روٹیاں رکھی ہیں اور پرندے انھیں کھا رہے ہیں۔" دونوں نے کہا: "ہمیں ہمارے خوابوں کی تعبیر بتائیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نیک آدمی ہیں اور ہم نے سنا ہے کہ آپ خوابوں کی تعبیر کا علم جانتے ہیں۔"

ان کی اس فرمائش کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا۔ وہ سورۂ یوسف کی آیات 37 تا 41 میں بیان ہوا ہے: "یہاں جو کچھ تمھیں ملا کرتا ہے' اس کے آنے سے پہلے میں تمھیں ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ یہ علم ان علوم میں سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ کر جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں' اپنے بزرگوں ابراہیم علیہ السلام' اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہمارا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرائیں۔ درحقیقت یہ اللہ کا فضل ہے ہم پر اور تمام انسانوں پر (کہ اس نے اپنے سوا کسی کا بندہ ہمیں نہیں بنایا) مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ اے زنداں کے ساتھیو' تم خود ہی سوچو کہ بہت سے متفرق رب بہتر ہیں یا وہ ایک اللہ جو سب پر غالب ہے؟ اسے چھوڑ کر تم جن کی بندگی کر رہے ہو' وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے آباواجداد نے رکھ لیے ہے۔ اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی۔ فرماں روائی کا اقتدار اللہ کے سوا کسی کے لیے نہیں ہے۔ اس کا حکم ہے کہ خود اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو۔ یہی سیدھا سچا طریق زندگی ہے' مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ اے زنداں کے ساتھیو' تمھارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم میں سے ایک تو اپنے رب (شاہ مصر) کو شراب پلائے گا۔ رہا دوسرا تو اسے سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ فیصلہ ہو گیا اس بات کا جو تم پوچھ رہے تھے۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کی قید خانے میں یہ تقریر اس پورے قصے کی جان ہے اور خود قرآن میں بھی توحید کے موضوع پر بہترین تقریروں میں سے ہے' بائبل اور تلمود میں کہیں اس کی طرف ادنیٰ سا اشارہ تک نہیں ہے۔ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو محض ایک دانش مند اور پرہیزگار آدمی کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں' مگر قرآن صرف یہی نہیں کہ ان کی سیرت کے ان پہلوؤں کو بھی بائبل اور تلمود کی بہ نسبت بہت زیادہ روشن کر کے پیش کرتا ہے' بلکہ اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنا ایک پیغمبرانہ مشن رکھتے تھے اور اس دعوت و تبلیغ کا کام انھوں نے قید خانے ہی میں شروع کر دیا تھا۔

یہ تقریر ایسی نہیں ہے کہ اس پر سے یوں ہی سرسری طور پر گزر جائیے۔ اس کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ اور غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے:

(1) یہ پہلا موقع ہے جب حضرت یوسف علیہ السلام ہمیں دینِ حق کی تبلیغ

کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی داستان حیات کے جو ابواب پیش کیے گئے ہیں' ان میں صرف اخلاق فاضلہ کی مختلف خصوصیات مختلف مرحلوں پر ابھرتی رہی ہیں' مگر تبلیغ کا کوئی نشان وہاں نہیں پایا جاتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے پہلے مراحل محض تیاری اور تربیت کے تھے۔ نبوت کا کام عملاً اس قید خانے کے مرحلے میں ان کے سپرد کیا گیا ہے اور نبی کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی تقریر دعوت ہے۔

(2) یہ بھی پہلا ہی موقع ہے کہ انھوں نے لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی۔ اس سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نہایت صبر وشکر کے ساتھ ہر اُس حالت کو قبول کرتے رہے ہیں جو انھیں پیش آئی۔ جب قافلے والوں نے انھیں پکڑ کر غلام بنایا' جب وہ مصر لائے گئے' جب انھیں عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کیا گیا' جب انھیں جیل بھیجا گیا' ان میں سے کسی موقع پر بھی انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں ابراہیم علیہ السلام و اسحاق علیہ السلام کا پوتا اور یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں۔ ان کے باپ دادا کوئی غیر معروف لوگ نہ تھے۔ قافلے والے خواہ اہل مدین ہوں یا اسماعیلی' دونوں ان کے خاندان سے قریبی تعلق رکھنے والے ہی تھے۔ اہل مصر بھی کم از کم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ناواقف نہ تھے' بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام جس انداز سے ان کا اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کا ذکر کر رہے ہیں' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تینوں بزرگوں کی شہرت مصر میں پہنچی ہوئی تھی۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے کبھی دادا کا نام لے کر اپنے آپ کو ان حالات سے نکالنے کی کوشش نہ کی' جن میں وہ پچھلے کئی سال کے دوران میں مبتلا ہوتے رہے۔ غالباً وہ خود بھی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ انھیں بنانا چاہتا ہے' اس کے لیے ان کا ان حالات سے گزرنا ہی ضروری ہے' مگر اب انھوں نے محض اپنی دعوت و تبلیغ کی خاطر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ میں کوئی نیا اور نرالا دین پیش نہیں کر رہا ہوں' بلکہ میرا تعلق دعوت توحید کی اس عالم گیر تحریک سے ہے جس کے امام ابراہیم علیہ السلام و اسحاق علیہ السلام و یعقوب علیہ السلام ہیں۔ ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ داعی حق کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اٹھا کرتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے' جو اس سے پہلے کسی کو نہ سوجھی تھی' بلکہ پہلے قدم ہی پر یہ بات کھول دیتا ہے کہ میں ازلی و ابدی حقیقت کی طرف بلا رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام اہلِ حق پیش کرتے رہے ہیں۔

(3) پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے جس طرح اپنی تبلیغ کے لیے موقع نکالا' اس میں ہمیں حکمتِ تبلیغ کا ایک اہم سبق ملتا ہے۔ دو آدمی اپنا خواب بیان کرتے ہیں اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اس کی تعبیر پوچھتے ہیں۔ جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ تعبیر تو میں تمھیں ضرور بتاؤں گا' مگر پہلے یہ سن لو کہ اس علم کا ماخذ کیا ہے' جس کی بنا پر میں تمھیں تعبیر بتاتا ہوں۔ اس طرح ان کی بات میں سے اپنی بات کہنے کا موقع نکال کر آپ ان کے سامنے اپنا دین پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغ حق کی دھن سمائی ہوئی ہو اور وہ حکمت بھی رکھتا ہو تو کیسی خوب صورتی کے ساتھ گفتگو کا رخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ جسے دعوت کی دھن لگی ہوئی نہیں ہوتی' اس کے سامنے تو کئی مواقع آتے ہیں اور وہ کبھی محسوس نہیں کرتا کہ یہ موقع ہے اپنی بات کہنے کا' مگر وہ جسے دھن لگی ہوئی ہوتی ہے' وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے اور اسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بہت فرق ہے حکیم کی موقع شناسی میں اور اس نادان مبلغ کی بھونڈی تبلیغ میں جو موقع و محل کا لحاظ کیے بغیر لوگوں کے کانوں میں زبردستی اپنی دعوت ٹھونسنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر لیچڑپن اور جھگڑالوپن سے انھیں الٹا متنفر کر کے چھوڑتا ہے۔

(4) اس سے یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت دین پیش کرنے کا صحیح ڈھنگ کیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام چھوٹتے ہی دین کے تفصیلی اصول اور ضوابط پیش کرنا شروع نہیں کر دیتے' بلکہ ان کے سامنے دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کرتے ہیں' جہاں سے اہلِ حق کا راستہ اہلِ باطل سے جدا ہوتا ہے' یعنی توحید اور شرک کا فرق۔ پھر اس فرق کو وہ ایسے معقول طریقے سے واضح کرتے ہیں کہ عقلِ سلیم رکھنے والا کوئی شخص اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصیت کے ساتھ جو لوگ اس وقت ان کے مخاطب تھے' ان کے دل و دماغ میں تو تیر کی طرح یہ بات اتر گئی ہوگی' کیوں کہ وہ نوکر پیشہ غلام تھے اور اپنے دل کی گہرائیوں میں اس بات کو خوب محسوس کرتے تھے کہ ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا' اور سارے جہاں کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی۔ پھر وہ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنا دین چھوڑو اور میرے دین میں آ جاؤ' بلکہ ایک عجیب انداز میں ان سے کہتے ہیں کہ دیکھو' اللہ کا یہ کتنا فضل ہے کہ اس نے اپنے سوا ہمیں کسی کا بندہ نہیں بنایا' مگر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور خواہ مخواہ خود گھڑ گھڑ کر اپنے رب بناتے اور ان کی بندگی کرتے ہیں۔ پھر وہ اپنے مخاطبوں کے دین پر تنقید بھی کرتے ہیں' مگر نہایت معقولیت کے ساتھ اور دل آزاری کے ہر شائبے کے بغیر۔ بس اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو تم ان داتا' کسی کو خداوند نعمت' کسی کو مالک زمین اور کسی کو رب دولت یا مختار صحت وغیرہ کہتے ہو' یہ سب خالی خولی نام ہی ہیں۔ ان ناموں کے پیچھے کوئی حقیقی ان داتائی اور خداوندی اور مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ اصل مالک اللہ تعالیٰ ہے جسے تم بھی کائنات کا خالق تسلیم کرتے ہو اور اس نے ان میں سے کسی کے لیے بھی خداوندی اور معبودیت کی کوئی سند نہیں اتاری ہے۔ اس نے تو فرماں روائی کے سارے حقوق و اختیارات اپنے لیے ہی مخصوص رکھے ہیں اور اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو۔

(5) اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے کی زندگی کے یہ آٹھ دس سال کس طرح گزارے ہوں گے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں چوں کہ ان کے ایک ہی وعظ کا ذکر ہے' اس لیے انھوں نے صرف ایک دفعہ دعوت دین کے لیے زبان کھولی تھی۔ مگر اول تو ایک پیغمبر کے متعلق یہ گمان کرنا ہی سخت بدگمانی ہے کہ وہ اپنے اصل کام سے غافل ہوگا۔ پھر جس شخص کی تبلیغی دھن کا یہ حال تھا کہ دو آدمی تعبیر خواب پوچھتے ہیں اور وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دین کی تبلیغ

شروع کر دیتا ہے۔ اس کے متعلق یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس نے قید خانے کے یہ چند سال خاموش ہی گزار دیئے ہوں گے۔

(6) اس یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ قید خانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کس نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اوپر جن واقعات کا ذکر گزر چکا ہے' انھیں پیش نظر رکھنے سے یہ بات قابل تعجب نہیں رہتی کہ ان دو قیدیوں نے آخر حضرت یوسف علیہ السلام' ہی سے آ کر اپنے خواب کی تعبیر کیوں پوچھی اور ان کی خدمت میں یہ نذر عقیدت کیوں پیش کی کہ "ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ایک نیک آدمی ہیں۔" جیل کے اندر اور باہر سب لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص کوئی مجرم نہیں ہے' بلکہ ایک نہایت نیک نفس آدمی ہے' سخت ترین آزمائشوں میں اپنی پرہیزگاری کا ثبوت دے چکا ہے۔ آج پورے ملک میں اس سے زیادہ نیک انسان کوئی نہیں ہے' حتّٰی کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں میں بھی اس کی نظیر مفقود ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف قیدی انھیں عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے' بلکہ قید خانے کے حکام اور اہل کار تک ان کے مُعتقِد ہو گئے تھے۔

داستان کو آگے بڑھاتے ہوئے بائبل میں یوں لکھا ہے: "اور تیسرے دن جو فرعون کی سال گرہ کا دن تھا۔ یوں ہوا کہ اس نے اپنے سب نوکروں کی ضیافت کی اور اس نے سردار ساقی اور سردار نان پز کو اپنے نوکروں کے ساتھ یاد فرمایا' اور اس نے سردار ساقی کو پھر اس کی خدمت پر بحال کیا اور وہ فرعون کے ہاتھ میں پیالہ دینے لگا۔ لیکن اس نے سردار نان پز کو پھانسی دلوائی جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے تعبیر کر کے انھیں بتایا تھا' لیکن سردار ساقی نے یوسف کو یاد نہ کیا بلکہ اُسے بھول گیا۔"

یہی بات سورۂ یوسف کی آیت 42 میں یوں بیان ہوئی ہے: "پھر ان میں سے جس کے متعلق خیال تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا' اس سے یوسف علیہ السلام نے کہا کہ اپنے رب (شاہ مصر) سے میرا ذکر کرنا مگر شیطان نے اسے (ساقی کو) ایسا غفلت میں ڈالا کہ وہ اپنے رب (شاہ مصر) سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا اور یوسف علیہ السلام کئی سال قید میں پڑا رہا۔" اس آخری جملے سے حضرت یوسف علیہ السلام کی مراد نہ تھی کہ اپنے بادشاہ سے کہنا کہ ایک بےقصور اور بے گناہ انسان اس طرح مجرم بنا کر زنداں میں ڈال دیا گیا ہے' بلکہ درحقیقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ بادشاہ کے سامنے میرا ذکر کرنا کہ ایک ایسا شخص' جو قید میں پڑا ہے' ہمیں اس طرح دین حق کی تلقین کرتا ہے اور اپنی ملت کو ہماری ملت سے جدا بتاتا ہے۔

فرعون کا خواب

غرض کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے میں پڑے پڑے کئی سال ہو گئے۔ وہ ابھی زنداں ہی میں تھے کہ بائبل کی رو سے "فرعون نے خواب دیکھا کہ وہ لب دریا کھڑا ہے۔ اور اس دریا میں سے سات خوب صورت اور موٹی موٹی گائیں نکل کر نیستان میں چرنے لگیں۔ ان کے بعد اور سات بدشکل اور دبلی دبلی گائیں ان ساتوں خوب صورت اور موٹی موٹی گایوں کو کھا گئیں۔"

تب بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ اور پھر سو گیا اور اس نے دوسرا خواب دیکھا کہ ایک ٹہنی میں اناج کی سات موٹی اور اچھی اچھی بالیں نکلیں۔ ان کے بعد اور سات پتلی اور پوربی ہوا کی ماری مرجھائی ہوئی بالیں نکلیں۔ یہ پتلی بالیں ان ساتوں موٹی اور بھری ہوئی بالوں کو نگل گئیں اور بادشاہ جاگ گیا اور اسے معلوم ہوا کہ یہ خواب تو تھا۔ مگر وہ بہت پریشان ہو گیا۔ فوراً دربار کے مشیروں سے اپنا خواب بیان کیا اور خواب کی تعبیر چاہی۔ درباری بھی خواب سن کر پریشان ہو گئے اور جب حل نہ کر سکے تو اپنی بے چارگی کو چھپانے کے لیے کہنے لگے "بادشاہ' یہ خواب نہیں ہے بلکہ پریشان خیالات ہیں جن کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ ہم سچے خواب کی تعبیر تو دے سکتے ہیں' لیکن پریشان خیالات کا حل نہیں نکال سکتے" بادشاہ کو درباری مشیروں کے اس جواب سے اطمینان نہ ہوا تو اس نے اعلان عام کے ذریعے سے اپنے ملک کے تمام دانش مندوں' کاہنوں' مذہبی پیشواؤں اور جادوگروں کو جمع کر کے ان سب کے سامنے یہ سوال پیش کیا۔

دریں اثنا ان دو قیدیوں میں سے' چند برس پہلے جو بچ گیا تھا' یعنی سردار ساقی' اسے ایک مدت دراز کے بعد اب بات یاد آئی۔ اس نے کہا: "میں آپ حضرات کو ان خوابوں کی تاویل بتاتا ہوں۔ اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات بیان کیے' اور قید خانے میں اس کے خواب اور اس کے ساتھی کے خواب کی جیسی صحیح تعبیر انھوں نے دی تھی' اس کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ میں ان سے اس کی تاویل پوچھ کر آتا ہوں۔ مجھے قید خانے میں ان سے ملنے کی اجازت عطا کی جائے۔"

بادشاہ کی اجازت سے سردار ساقی اسی وقت قید خانے پہنچا اور جا کر کہا: "یوسف' اے صدیق اے سراپا راستی' مجھے اس خواب کا مطلب بتا کہ سات موٹی گائیں ہیں جنھیں سات دبلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات بالیں ہری ہیں اور سات سوکھی۔ آپ اس خواب کی تعبیر بتایئے۔ آپ سچائی اور تقدس کے پیکر ہیں۔ آپ ہی اسے حل کر سکتے ہیں اور کیا عجب ہے کہ جن لوگوں نے مجھے بھیجا ہے' جب میں صحیح تعبیر لے کر ان کے پاس جاؤں تو وہ آپ کی حقیقی قدر و منزلت جان لیں۔"

حضرت یوسف علیہ السلام کا کمال صبر و استقلال اور جلالت کا انداز کیجیے۔ سردار ساقی کو نہ ملامت کی اور نہ برسوں تک بھولے رہنے پر جھڑکا اور نہ عطائے علم میں بخل سے کام لیا اور نہ یہ سوچا کہ ظالموں نے مجھے بے خطا زنداں میں ڈالا ہے۔ یہ لوگ اگر تباہ ہو جائیں اور اس خواب کا حل نہ پا کر برباد ہو جائیں تو اچھا ہے' ان کی یہی سزا ہے۔ نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا' بلکہ اسی وقت خواب کی تعبیر دی اور اپنی جانب سے اس سلسلے میں صحیح تدبیر بھی بتلا دی اور ساقی کو پوری طرح مطمئن کر دیا اور فرمایا: "اس خواب کی تعبیر اور اس کی بنا پر جو کچھ تمھیں کرنا چاہیے' وہ یہ ہے کہ سات برس تک لگا تار کھیتی کرتے رہو گے اور یہ تمھاری خوش حالی کے سال ہوں گے۔ جب فصل کی کٹائی کا وقت آئے تو جس قدر پیداوار تمھارے سال بھر کی کھانے کے لیے ضروری ہو' اسے الگ کر لو اور باقی غلے کو ان کی بالوں ہی میں رہنے دو' تاکہ محفوظ رہے اور گلے سڑے نہیں۔ اس کے بعد سات برس بہت سخت مصیبت کے آئیں گے۔ وہ تمھارا جمع کیا ہوا تمام ذخیرہ ختم کر دیں گے۔ اس کے بعد پھر ایک برس ایسا آئے گا کہ خوب پانی برسے

گا۔ کھیتیاں ہری بھری ہوں گی اور لوگ پھلوں اور دانوں سے عرق اور تیل بہتات کے ساتھ نکالیں گے۔ یعنی موٹی گائیں اور بالیں خوش حالی کے سال ہیں اور دبلی گائیں اور بالیں خشک سالی کے برس، جو خوش حالی کی پیداوار کو کھا جائیں گے۔''

سردار ساقی نے یہ سب معاملہ بادشاہ کے روبرو جا کر سنایا۔ بادشاہ نے ساقی کی زبان سے کچھ جملے پہلے یوسف علیہ السلام کی تعریف وتوصیف میں سنے تھے، خواب کی تعبیر کا معاملہ دیکھ کر ان کے علم ودانش اور جلالت قدر کا قائل ہو گیا اور نادیدہ مشتاق بن کر کہنے لگا کہ ایسے شخص کو میرے پاس لاؤ۔

''مگر جب شاہی فرستادہ یوسف علیہ السلام کے پاس پہنچا تو اس نے کہا: ''اپنے رب کے پاس واپس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ ہے، جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ میرا رب تو ان کی مکاری سے واقف ہی ہے۔''

(سورۂ یوسف۔ آیت 50)

قرآن حکیم کا بیان یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے باہر آنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ اس طرح تو میں جانے کو تیار نہیں ہوں۔ تم اپنے آقا کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ پہلے وہ اس امر کی تحقیق کرے کہ ان عورتوں کا کیا معاملہ تھا، جنھوں نے دسترخوان پر اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ پہلے یہ بات صاف ہونی چاہیے، تب ہی میں تمھارے بادشاہ کے پاس جا سکتا ہوں۔

حضرت یوسف علیہ السلام بے قصور اور بے خطا برسوں سے قید خانے میں بند تھے اور بلاوجہ انھیں قیدی بنایا ہوا تھا۔ اب جب کہ بادشاہ نے مہربان ہو کر رہائی کا مژدہ سنایا تو چاہیے تھا کہ وہ مسرت وخوشی کے ساتھ زنداں سے باہر نکل آتے، مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اپنے اوپر آئے ہوئے الزام کے معاملے کی تحقیق کا مطالبہ شروع کر دیا۔ انھوں نے سوچا کہ اگر بادشاہ کی اس مہربانی پر میں رہا ہو گیا تو یہ بادشاہ کا رحم وکرم سمجھا جائے گا اور میرا بے قصور اور معصوم ہونا ظاہر نہ ہوگا۔ اس طرح صرف میری عزت نفس ہی کو ٹھیس نہیں لگے گی، بلکہ دعوت وتبلیغ کے اس مقصد کو بھی نقصان پہنچے گا جو میری زندگی کا نصب العین ہے۔ پس اب بہترین وقت ہے کہ معاملے کی اصل صورت سامنے آ جائے اور حق ظاہر اور عیاں ہو جائے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس واقعے کا ذکر فرماتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر وضبط کو بہت سراہا اور کسر نفسی اور انکساری کی حد تک اسے بڑھا چڑھا کر ارشاد فرمایا: ''اگر میں اس قدر دراز مدت تک قید میں رہتا، جس قدر یوسف رہے تو بلانے کی دعوت فوراً قبول کر لیتا۔''

اس جگہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اگرچہ یوسف علیہ السلام کا معاملہ براہ راست عزیز کی بیوی زلیخا کے ساتھ پیش آیا تھا، مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کا ذکر نہیں کیا، بلکہ ان مصری عورتوں کا حوالہ دیا، جنھوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ حضرت نے ایسا کیوں کیا؟ اس کی دو وجوہ تھیں۔ اول یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اگرچہ عزیز کی بیوی سے زیادہ تکلیف پہنچی تھی، مگر قید کے معاملے میں ان عورتوں کی بھی سازش تھی، اس لیے کہ ان میں سے ہر ایک یوسف کی عاشق اور انھیں اپنی جانب مائل کرنے کی آرزومند تھی، اور ناکامی کی صورت میں سب نے مل کر عزیز کی بیوی کو اس کے قید والے فیصلے پر شہ دی اور عملی جامہ پہنا کر چھوڑا۔ یہی وجہ ہے کہ قید خانے میں داخل ہونے کا معاملہ ان عورتوں کے قضیے کے بعد پیش آیا۔ دوم یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھتے تھے کہ عزیز مصر نے میرے ساتھ ہر ممکن حسن سلوک برتا ہے۔ میری عزت اور میرا احترام کیا ہے، اس لیے موزوں نہیں ہے کہ میں اس کی بیوی کا نام لے کر اس کی رسوائی اور بدنامی کا باعث بنوں۔

قرآن کا بیان تو یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانے سے باہر جانے سے انکار کر دیا اور پہلے اپنے خلاف الزام کی انکوائری کا مطالبہ پیش کیا، لیکن بائبل کا بیان یہ ہے کہ بادشاہ کی طلبی پر حضرت یوسف علیہ السلام فوراً چلنے کے لیے تیار ہو گئے، حجامت بنوائی، کپڑے بدلے اور دربار میں جا حاضر ہوئے۔ تلمود اس سے بھی بڑھ کر اس واقعے کو پیش کرتی ہے۔ اس کا بیان یہ ہے: ''بادشاہ نے اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ یوسف علیہ السلام کو میرے حضور پیش کرو، اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ دیکھو ایسا کوئی کام نہ کرنا کہ لڑکا گھبرا جائے اور صحیح تعبیر نہ دے سکے۔ چنانچہ شاہی ملازموں نے یوسف علیہ السلام کو قید خانے سے نکالا، حجامت بنوائی، کپڑے بدلوائے اور دربار میں لا کر پیش کر دیا۔ بادشاہ اپنے تخت پر بیٹھا تھا۔ وہاں زر وجواہر کی چمک اور دربار کی شان و شوکت دیکھ کر یوسف علیہ السلام ہکا بکا رہ گیا اور اس کی آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ شاہی تخت کی سات سیڑھیاں تھیں۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی معزز آدمی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا چاہتا تو وہ چھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جاتا اور بادشاہ سے ہم کلام ہوتا تھا، اور جب ادنیٰ طبقے کا کوئی آدمی شاہی مخاطبت کے لیے بلایا جاتا تو وہ نیچے کھڑا رہتا اور بادشاہ تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے بات کرتا۔ یوسف علیہ السلام اس قاعدے کے مطابق نیچے کھڑا ہوا اور زمین بوس ہو کر اس نے بادشاہ کو سلامی دی، اور بادشاہ نے تیسری سیڑھی تک اتر کر اس سے گفتگو کی۔'' اس تصویر میں بنی اسرائیل نے جلیل القدر پیغمبر کو جتنا گرا کر پیش کیا ہے، اسے نگاہ میں رکھیے اور پھر دیکھیے کہ قرآن حکیم ان کے قید سے نکلنے کی جو شرط مقرر کرتا ہے، وہ کس قدر انسانی احترام اور پیغمبرانہ شان کے مطابق ہے۔

اب بادشاہ نے ان عورتوں کی شہادت لی، جنھوں نے زلیخا کی ضیافت میں ہاتھ کاٹ لیے تھے۔ ممکن ہے کہ شاہی محل میں ان تمام خواتین کو جمع کر کے یہ شہادت لی گئی ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ نے کسی معتمد خاص کو بھیج کر فرداً فرداً ان سے دریافت کرایا ہو۔ بادشاہ نے ان عورتوں سے پوچھا کہ صاف صاف اور صحیح صحیح بتاؤ کہ اس معاملے کی اصل حقیقت کیا ہے، جب تم نے یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالے تھے تاکہ تم اسے اپنی طرف مائل کر لو۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا: ''حاشاللہ'' ہم نے تو اس میں بدی کا شائبہ تک نہ پایا۔'' اس محفل میں عزیز کی بیوی بھی موجود تھی، اور اب وہ عشق ومحبت کی بھٹی میں خام نہ تھی، کندن تھی، اور ذلت ورسوائی کے خوف سے آگے نکل چکی تھی۔ وہ بول اٹھی: ''جو اصل حقیقت تھی، وہ ظاہر ہو چکی۔ وہ میں ہی تھی جس نے

یوسف کو پھسلانے کی کوشش کی تھی' بے شک وہ اپنے بیان میں بالکل سچا ہے۔''

یہ نفسِ نفیس پوری تحقیق کر لینے کے بعد جب بادشاہ پر اصل حقیقت منکشف ہو گئی تو اس کے قلب میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عظمت و جلالت کا سکہ بیٹھ گیا۔ سردار ساقی کا حُسنِ عقیدت کے ساتھ یوسف علیہ السلام کی عقل و دانش کا ذکر' خواب کی بہترین اور دل لگتی تعبیر' قید خانے سے رہا ہونے کی بجائے انکوائری کا مطالبہ' زلیخا کا اعتراف جرم اور یوسف کے بے خطا ہونے کا انکشاف' یہ سب اُمور تھے' جنھوں نے مل کر بادشاہ کو اس باوقار ہستی کے دیدار اور اس سے استفادے کا عاشق بنا دیا: ''انھیں میرے پاس جلد لاؤ تا کہ میں انھیں خاص اپنے کاموں کے لیے مقرر کر دوں۔''

مصر کا مختارِ مطلق

حضرت یوسف اب بایں رعنائی و دل بری' بایں عصمت و پاک بازی اور بایں عقل و دانش قید خانے سے نکل کر بادشاہ کے دربار میں تشریف لائے۔ گفتگو ہوئی۔ بادشاہ حیران رہ گیا کہ اب تک جس کی راست بازی اور پاک بازی کا تجربہ کیا تھا' وہ عقل و دانش اور حکمت و فطانت میں بھی منفرد نکلا۔ مسرت کے ساتھ کہنے لگا: ''اب آپ ہمارے ہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور ہمیں آپ کی امانت پر پورا بھروسا ہے۔'' یہ بادشاہ کی طرف سے گویا ایک کھلا اشارہ تھا کہ آپ کو ہر ذمہ داری کا منصب سونپا جا سکتا ہے۔

یوسف علیہ السلام نے جھٹ کہا: ''ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے۔ میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں (حفیظ) علم بھی رکھتا ہوں (علیم)

یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے کوئی نوکری کی درخواست نہیں تھی جو کسی طالبِ جاہ نے بادشاہ وقت کا اشارہ پاتے ہی جھٹ سے پیش کر دی ہو۔ درحقیقت یہ اس انقلاب کا دروازہ کھولنے کے لیے آخری ضرب تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی قوت سے پچھلے دس سال کے دوران میں نشو و نما پا کر ظہور کے لیے تیار ہو چکا تھا اور اب جس کا فتح کا باب صرف ایک ضرب کا محتاج تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام آزمائشوں کے ایک طویل سلسلے سے گزر کر آ رہے تھے اور یہ آزمائش کسی گم نامی کے گوشے میں پیش نہیں آئی تھی' بلکہ بادشاہ سے لے کر عام شہریوں تک مصر کا بچہ بچہ ان سے واقف تھا۔ ان آزمائشوں میں انھوں نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ امانت' راست بازی' حلم' ضبطِ نفس' عالی ظرفی' ذہانت' و فراست اور معاملہ فہمی میں کم از کم اپنے زمانے کے لوگوں کے درمیان تو اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ ان کی شخصیت کے یہ اوصاف اس طرح کھل چکے تھے کہ کسی کو ان سے انکار کی مجال نہ رہی تھی۔ زبانیں ان کی شہادت دے چکی تھیں۔ دل ان سے مسخر ہو چکے تھے۔ خود بادشاہ ان کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا۔ ان کا ''حفیظ'' اور ''علیم'' ہونا اب محض ایک زبانی کلامی دعویٰ نہ تھا بلکہ ایک ثابت شدہ حقیقت تھی' جس پر سب ایمان لا چکے تھے۔ اب اگر کچھ کسر باقی تھی تو وہ صرف اتنی کہ حضرت یوسف علیہ السلام خود حکومت کے ان اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینے پر رضا مندی ظاہر کریں' جن کے لیے بادشاہ اور اس کے اعیانِ سلطنت اپنی جگہ بخوبی جان چکے تھے کہ ان سے زیادہ موزوں آدمی اور کوئی نہ ہے۔ چنانچہ یہی وہ کسر تھی جو انھوں نے اپنے اس فقرے سے پوری کر دی۔ ان کی زبان سے اس مطالبے کے نکلتے ہی بادشاہ اور اس کی کونسل نے جس طرح اسے بسر و چشم قبول کیا' وہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ پھل اتنا پک چکا تھا کہ اب ٹوٹنے کے لیے ایک اشارے ہی کا منتظر تھا (تلمود کا بیان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو حکومت کے اختیارات سونپنے کا فیصلہ تنہا بادشاہ ہی نے نہیں کیا تھا بلکہ پوری شاہی کونسل نے اتفاق رائے سے کیا تھا)

چنانچہ بادشاہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی تمام مملکت کا امین و کفیل بنا دیا اور خزانوں کی کنجیاں ان کے حوالے کر کے مختارِ کل بنا دیا۔ یعنی اب ساری سرزمین مصر یوسف علیہ السلام کی تھی۔ مصر کی ہر جگہ کو وہ اپنی جگہ کہہ سکتا تھا۔ وہاں کوئی گوشہ بھی ایسا نہ تھا جو اس سے روکا جا سکتا ہو۔ علامہ ابن جریر طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''ہم نے یوسف علیہ السلام کو ان سب چیزوں کا مالک بنا دیا جو مصر میں تھیں' دنیا کے اس حصے میں وہ جہاں جو کچھ چاہتا' کر سکتا تھا۔ وہ سرزمین اس کے حوالے کر دی گئی تھی' حتیٰ کہ اگر وہ چاہتا کہ فرعون کو اپنا زیردست کر لے اور خود اس سے بالاتر ہو جائے تو یہ بھی کر سکتا تھا۔''

بائبل میں ان کے مختارِ مطلق ہونے کا واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے: ''یہ تعبیر فرعون کی نگاہ میں اور اس کے سب خادموں (کونسل) کی نظر میں اچھی معلوم ہوئی۔ فرعون نے اپنے خادموں سے کہا کہ کیا ہمیں ایسا آدمی جیسا یہ ہے' جس میں خدا کی روح ہے' مل سکتا ہے؟ اور فرعون نے یوسف سے کہا' چوں کہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے' اس لیے تیری مانند دانش ور اور عقل مند کوئی نہیں۔ سو تو میرے گھر کا مختار ہو گا اور میری ساری رعایا تیرے حکم پر چلے گی۔ فقط تخت کا مالک ہونے کے سبب سے میں بزرگ تر ہوں گا۔ اور فرعون نے یوسف سے کہا کہ دیکھ میں تجھے سارے ملک مصر کا حاکم بناتا ہوں' اور فرعون نے اپنی انگشتری اپنے ہاتھ سے نکال کر یوسف کے ہاتھ میں پہنا دی اور اسے باریک کتان کے لباس میں آراستہ کروا کر سونے کا طوق اس کے گلے میں پہنایا' اور اس نے اسے اپنے دوسرے رتھ میں سوار کرا کر اس کے آگے آگے یہ منادی کرا دی کہ گھٹنے ٹیکو اور اس نے اسے سارے ملک مصر کا حاکم بنا دیا۔ اور فرعون نے یوسف سے کہا' میں فرعون ہوں اور تیرے حکم کے بغیر کوئی آدمی اس سارے ملک مصر میں اپنا ہاتھ یا پاؤں ہلانے نہ پائے گا۔''

سورۂ یوسف کی آیت 56 میں یوں بیان ہوا: ''اس طرح ہم نے یوسف کے لیے سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے' اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جسے چاہتے ہیں نوازتے ہیں۔ نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا۔ اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لے آئے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے۔''

سورۂ یوسف میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے دو جگہ ''تمکن فی الارض'' یعنی سرزمین میں قدم جمانے اور مالک بنا دینے کی بشارت سنائی گئی ہے اور دونوں مقامات پر تعبیر کا نیا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر میں کیا خوب کہا ہے: ''حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی کے د

انقلاب انگیز نقطے تھے۔ایک وہ جب وہ غلام ہو کر بکے اور پھر عزیز کی نظروں میں ایسے معزز ہوئے کہ اس کے علاقے کے مختار ہو گئے دوسرا یہ کہ قید خانے سے نکلے اور نکلتے ہی وہاں پہنچ گئے کہ حکومت و اقتدار کی مسند اجلال پر جلوہ افروز نظر آئے۔ پس جب پہلے انقلاب تک سرگزشت پہنچی تھی تو آیت 21 میں حکمتِ الٰہی کی کرشمہ سنجیوں پر توجہ دلائی تھی "اس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اُسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔" اور اب کہ دوسرا انقلاب پیش آیا تو اسی طرح آیت 56 میں فرمایا: "اس طرح ہم نے یوسف علیہ السلام کے لیے اس سرزمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی..... نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا۔" وہاں چوں کہ معاملہ مصر کی ابتدا ہوئی تھی اور ابھی حضرت یوسف علیہ السلام کو حکمرانی اور معاملہ فہمی (سیاست) کی دانش سیکھنی تھی' اس لیے فرمایا تھا "معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا' اور یہاں چوں کہ کئی سال کی تکمیل کار کے بعد اس کا نتیجہ ظاہر ہو گیا تھا' اس لیے فرمایا: "نیک لوگوں کا اجر ہمارے ہاں مارا نہیں جاتا"

برادرانِ یوسف کی آمد

شاہِ مصر کی خواب والی پیش خبری کے مطابق حضرت یوسف کی حکومت کے پہلے سات سال مصر میں انتہائی خوش حالی کے گزرے اور ان ایام میں انھوں نے آنے والے قحط کے لیے وہ تمام پیش بندیاں کر لیں' جن کا مشورہ بادشاہ کو تعبیر بتاتے وقت وہ دے چکے تھے۔اس کے بعد قحط کا دور شروع ہوا اور یہ قحط صرف مصر ہی میں نہ تھا بلکہ آس پاس کے ممالک بھی اس کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔شام' فلسطین' شرق اردن' شمالی عرب' سب جگہ خشک سالی کا دور دورہ تھا۔ان حالات میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دانش مندانہ انتظام کی بدولت صرف مصر ہی وہ ملک تھا جہاں قحط کے باوجود غلے کی افراط تھی۔اس لیے ہمسایہ ممالک کے لوگ مجبور ہوئے کہ غلہ حاصل کرنے کے لیے مصر کی طرف رجوع کریں۔اور یوسف علیہ السلام نے ارزانی کے سات برسوں میں جو غلہ کثرت سے بستیوں میں جمع کرایا تھا' اس کے کھتے کھول کر مصریوں کے ہاتھ بیچے اور مصر کی زمین میں کال بڑھا اور سارے ملکوں کے لوگ مصر میں غلہ مول لینے آئے۔ جب یعقوب علیہ السلام نے دیکھا کہ مصر میں غلہ ہے' تب انھوں نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم یوں ایک دوسرے کو تاکتے ہو؟ دیکھو میں نے سنا ہے کہ مصر میں غلہ ہے۔تم وہاں جاؤ اور وہاں سے ہمارے لیے مول لو' تا کہ ہم جئیں' مریں نہیں۔

(بائبل۔پیدائش باب 14۔آیت 46 تا 57)

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی مصر آئے اور ان کے ہاں حاضر ہوئے۔ حضرت نے بھائیوں کو پہچان لیا' مگر وہ اس سے ناآشنا تھے' نہ پہچان سکے۔ برادران یوسف کا آپ کو نہ پہچاننا کچھ بعید از قیاس نہیں ہے۔جس وقت انھوں نے آپ کو کنوئیں میں پھینکا تھا' اس وقت آپ سترہ سال کے لڑکے تھے' اور اب آپ کی عمر 36 سال کے لگ بھگ تھی۔اتنی طویل مدت آدمی کو بہت کچھ بدل دیتی ہے۔ پھر یہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ جس بھائی کو وہ کنوئیں میں پھینک گئے تھے' وہ آج مصر کا مختارِ مطلق ہو گا۔

بہرحال یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کا سامان اور غلہ لدوا دیا تو چلتے وقت ان سے کہا: "اپنے سوتیلے بھائی کو میرے پاس لانا۔ دیکھتے نہیں ہو کہ میں کس طرح پیمانہ بھر دیتا ہوں اور کیسا اچھا مہمان نواز ہوں اگر تم اسے نہ لاؤ گے تو میرے پاس تمھارے لیے کوئی غلہ نہیں ہے بلکہ تم میرے قریب بھی نہ پھٹکنا" (سورۂ یوسف 59 تا 60)

ان دو آیتوں میں اختصار کے ساتھ ساری کہانی بیان کر دی گئی ہے۔اختصار بیان کی وجہ سے شاید سمجھنے میں دقت ہو کہ حضرت یوسف علیہ السلام جب اپنی شخصیت کو ان پر ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے تو پھر ان کے سوتیلے بھائی کا ذکر کیسے آ گیا اور اس کے لانے پر اس قدر اصرار کیوں تھا' کیوں کہ اس طرح تو راز فاش ہونے کا خطرہ تھا۔لیکن حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہاں غلے کی ضابطہ بندی تھی اور ہر شخص ایک مقررہ مقدار میں ہی غلہ لے سکتا تھا۔غلہ لینے کے لیے یہ دس بھائی آئے تھے' مگر وہ اپنے والد اور اپنے گیارھویں بھائی کا حصہ مانگتے ہوں گے۔اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا ہو گا کہ تمھارے والد کے خود نہ آنے کا کیا معقول سبب ہو سکتا ہے؟ کہیں تم ایک فرضی نام سے زائد غلہ حاصل کرنے اور پھر ناجائز تجارت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب میں اپنے گھر کے کچھ حالات بیان کیے ہوں گے اور بتایا ہو گا کہ وہ ہمارا سوتیلا بھائی ہے اور بعض وجوہ سے ہمارے والد اسے ہمارے ساتھ بھیجنے میں تامل کرتے ہیں۔تب حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا ہو گا کہ خیر اس وقت تو ہم تمھاری زبان کا اعتبار کر کے تمھیں پورا غلہ دیے دیتے ہیں مگر آئندہ اگر اسے ساتھ نہ لائے تو تمھارا اعتبار جاتا رہے گا اور تمھیں یہاں سے کوئی غلہ نہ مل سکے گا اس حاکمانہ دھمکی کے ساتھ آپ نے انھیں اپنے احسان اور اپنی مہمان نوازی سے بھی رام کرنے کی کوشش کی' کیوں کہ دل اپنے چھوٹے بھائی (بن یامین) کو دیکھنے اور گھر کے حالات معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

آگے کی آیت 61 اور 62 کا ترجمہ یہ ہے: "انھوں نے کہا' ہم کوشش کریں گے کہ والد صاحب اسے بھیجنے پر راضی ہو جائیں اور ہم ایسا ضرور کریں گے۔" یوسف نے اپنے غلاموں کو اشارہ کیا کہ ان لوگوں نے غلے کے عوض جو مال دیا ہے' وہ چپکے سے ان کے سامان ہی میں رکھ دو۔ یہ یوسف علیہ السلام نے اس امید پر کیا کہ گھر پہنچ کر وہ اپنا واپس کیا ہوا مال پہچان جائیں گے (یا اس فیاضی پر احسان مند ہوں گے) اور عجب نہیں کہ پھر پلٹیں۔"

برادرانِ یوسف کی مصر میں یہ پہلی آمد اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی پہلی ملاقات کا مختصر حال تھا جو قرآن مجید اور اس کے مفسرین کی زبانی بیان ہوا۔ بائبل میں یہ قصہ کسی اور ہی رنگ میں بیان ہوا ہے۔

(ملاحظہ ہو کتاب پیدائش کا باب۔42 آیت 4 تا 29)

"یوسف کے دس بھائی غلہ مول لینے کو مصر میں آئے۔ پر یعقوب نے یوسف کے بھائی بن یامین کو اس کے بھائیوں کے ساتھ نہ بھیجا کیوں کہ اس نے کہا کہ اس پر کوئی

آفت نہ آ جائے۔ سو جو لوگ غلہ خریدنے آئے ان کے ساتھ اسرائیل کے بیٹے بھی آئے کیوں کہ کنعان کے ملک میں کال تھا۔ اور یوسف ملک مصر کا حاکم تھا اور وہی ملک کے سب لوگوں کے ہاتھ غلہ بیچتا تھا۔ سو یوسف کے بھائی آئے اور اپنے سر زمین پر ٹیک کر اس کے حضور آداب بجالائے۔ یوسف اپنے بھائیوں کو دیکھ کر انھیں پہچان گیا' پر اس نے ان کے سامنے اپنے آپ کو انجان بنالیا اور ان سے سخت لہجہ میں پوچھا تم کہاں سے آئے ہو؟ انھوں نے کہا کنعان کے ملک سے اناج مول لینے کو۔''

یوسف نے اپنے بھائیوں کو پہچان لیا تھا پر انھوں نے اسے نہ پہچانا۔ اور یوسف ان خوابوں کو جو اس نے ان کی بابت دیکھے تھے یاد کر کے اُن سے کہنے لگا کہ تم جاسوس ہو۔ تم آئے ہو کہ اس ملک کی بُری حالت دریافت کرو۔ انھوں نے اس سے کہا نہیں خداوند۔ تیرے غلام اناج مول لینے آئے ہیں۔ ہم سب ایک ہی شخص کے بیٹے ہیں۔ ہم سچے ہیں۔ تیرے غلام جاسوس نہیں ہیں۔ اس نے کہا نہیں بلکہ تم اس ملک کی بُری حالت دریافت کرنے کو آئے ہو۔ تب انھوں نے کہا تیرے غلام بارہ بھائی ایک ہی شخص کے بیٹے ہیں جو ملک کنعان میں ہے۔ سب سے چھوٹا اس وقت ہمارے باپ کے پاس ہے اور ایک کا کچھ پتا نہیں۔ تب یوسف نے ان نے کہا۔ میں تو تم سے کہہ چکا ہوں کہ تم جاسوس ہو۔ سو تمھاری آزمائش اس طرح کی جائے گی کہ فرعون کی حیات کی قسم تم یہاں سے جانے نہ پاؤ گے جب تک تمھارا سب سے چھوٹا بھائی یہاں نہ آئے۔ سو اپنے میں سے کسی ایک کو بھیجو کہ وہ تمھارا بھائی لے آئے اور تم قید رہو تا کہ تمھاری باتوں کی تصدیق ہو کہ تم سچے ہو یا نہیں ورنہ فرعون کی حیات کی قسم تم ضرور ہی جاسوس ہو۔ اور اس نے ان سب کو تین دن تک اکٹھے نظر بند رکھا۔

اور تیسرے دن یوسف نے ان سے کہا ایک کام کرو تو زندہ رہو گے کیوں کہ مجھے خدا کا خوف ہے۔ اگر تم سچے ہو تو اپنے بھائیوں میں سے ایک کو قید خانے میں بند رہنے دو اور تم اپنے گھر والوں کے کھانے کے لیے اناج لے جاؤ۔ اور اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو میرے پاس لے آؤ۔ اور وہ آپس میں کہنے لگے کہ ہم در اصل اپنے بھائی کے سبب مجرم ٹھہرے ہیں کیوں کہ جب اس نے ہم سے منت کی تو ہم نے یہ دیکھ کر بھی کہ اس کی جان کیسی مصیبت میں ہے اس کی نہ سنی۔ اس لیے یہ مصیبت ہم پر آ پڑی ہے۔ تب روبن بول اٹھا' کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ اس بچے پر ظلم نہ کرو اور تم نے نہ سنا۔ سو دیکھ لو۔ اس کے خون کا بدلہ لیا جاتا ہے۔ اور انھیں معلوم نہ تھا کہ یوسف ان کی باتیں سمجھتا ہے اس لیے کہ درمیان ایک ترجمان تھا۔ تب وہ ان کے پاس سے ہٹ گیا اور رویا اور پھر ان کے پاس آ کر ان سے باتیں کیں اور ان میں سے شمعون کو لے کر ان کی آنکھوں کے سامنے اُسے بندھوا دیا۔ پھر یوسف نے حکم کیا کہ ان کے بوروں میں اناج بھریں اور ہر شخص کی نقدی اسی کے بورے میں رکھ دیں اور انھیں زاد راہ بھی دے دیں۔ چنانچہ ان کے لیے ایسا ہی کیا گیا۔ اور انھوں نے اپنے گدھوں پر غلہ لاد لیا اور وہاں سے روانہ ہوئے۔ جب ان میں سے ایک نے منزل پر اپنے گدھے کو چارا دینے کے لیے اپنا بورا کھولا تو اپنی نقدی بورے کے منہ میں رکھی دیکھی۔ تب اس نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ میری نقدی پھیر دی گئی ہے۔ وہ میرے بورے میں ہے۔ دیکھ لو! پھر تو وہ حواس باختہ ہو گئے اور ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے اور کہنے لگے خدا نے ہم سے یہ کیا کیا؟

برادرانِ یوسف اپنے والد کی خدمت میں

اب وہ دس بھائی اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں آئے۔ اس کا حال پہلے بائبل میں پڑھیے' پھر قرآن مجید میں۔ کتاب پیدائش کے ابواب 42 اور 43 میں خاصی رنگ آمیزی کے ساتھ یوں بیان کیا گیا ہے:

''اور وہ ملک کنعان میں اپنے باپ یعقوب کے پاس آئے اور ساری واردات اسے بتائی اور کہنے لگے۔ کہ اس شخص نے جو اس ملک کا مالک ہے ہم سے سخت لہجہ میں باتیں کیں اور ہمیں اس ملک کے جاسوس سمجھا۔ ہم نے اس سے کہا ہم سچے آدمی ہیں۔ ہم جاسوس نہیں۔ ہم بارہ بھائی ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں۔ ہم میں سے ایک کا کچھ پتا نہیں اور سب سے چھوٹا اس وقت ہمارے باپ کے پاس ملک کنعان میں ہے۔ تب اس شخص نے جو ملک کا مالک ہے ہم سے کہا میں اسی سے جان لوں گا کہ تم سچے ہو کہ اپنے بھائیوں میں سے کسی کو میرے پاس چھوڑ دو اور اپنے گھر والوں کے کھانے کے لیے اناج لے کر چلے جاؤ۔ اور اپنے سب سے چھوٹے بھائی کو میرے پاس لے آؤ۔ تب میں جان لوں گا کہ تم جاسوس نہیں بلکہ سچے آدمی ہو اور میں تمھارے بھائی کو تمھارے حوالے کر دوں گا۔ پھر تم ملک میں سوداگری کرنا۔ اور یوں ہوا کہ جب انھوں نے اپنے اپنے بورے خالی کیے تو ہر شخص کی نقدی کی تھیلی اسی کے بورے میں رکھی دیکھی اور وہ اور ان کا باپ نقدی کی تھیلیاں دیکھ کر ڈر گئے۔ اور ان کے باپ نے ان سے کہا تم نے مجھے بے اولاد کر دیا۔ یوسف نہیں رہا اور شمعون بھی نہیں ہے اور اب اسے بھی لے جانا چاہتے ہو۔ سب باتیں میرے خلاف ہیں۔ تب روبن نے اپنے باپ سے کہا اگر میں اسے تیرے پاس نہ لے آؤں تو میرے دونوں بیٹوں کو قتل کر ڈالنا۔ اُسے میرے ہاتھ میں سونپ دے اور میں اسے پھر تیرے پاس پہنچا دوں گا۔ اس نے کہا میرا بیٹا تمھارے ساتھ نہیں جائے گا کیوں کہ اس کا بھائی مر گیا اور وہ اکیلا رہ گیا ہے۔ اگر راستہ میں جاتے جاتے اس پر کوئی آفت آ پڑے تو تم میرے سفید بالوں کو غم کے ساتھ گور میں اُتارو گے۔''

اور کال ملک میں اور بھی سخت ہو گیا۔ اور یوں ہوا کہ جب اس غلہ کو مصر سے لائے تھے کھا چکے تو ان کے باپ نے ان سے کہا کہ جا کر ہمارے لیے پھر کچھ اناج مول لے آؤ۔ تب یہوداہ نے اسے کہا کہ اس شخص نے ہمیں نہایت تاکید سے کہا تھا کہ تم میرا منہ نہ دیکھو گے جب تک تمھارا بھائی ساتھ نہ ہو۔ سو اگر تو ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دے تو ہم جائیں گے اور تیرے لیے اناج مول لائیں گے اور اگر تو اسے نہ بھیجے تو ہم نہیں جائیں گے کیوں کہ اس شخص نے کہہ دیا ہے کہ تم میرا منہ نہ دیکھو گے جب تک تمھارا بھائی ساتھ نہ ہو۔''

تب اسرائیل نے کہا کہ تم نے مجھ سے کیوں یہ بدسلوکی کی کہ اس شخص کو بتایا کہ

ہمارے ایک بھائی اور بھی ہے؟ انھوں نے کہا اس شخص نے بضد ہو کر ہمارا اور ہمارے خاندان کا حال پوچھا کہ کیا تمھارا باپ اب تک جیتا ہے؟ اور کیا تمھارا کوئی اور بھائی ہے؟ تو ہم نے ان سوالوں کے مطابق اسے بتا دیا ہم کیا جانتے تھے کہ وہ کہے گا کہ اپنے بھائی کو لے آؤ۔ تب یہوداہ نے اپنے باپ اسرائیل سے کہا' اس لڑکے کو میرے ساتھ کر دے تو ہم چلے جائیں گے تا کہ ہم اور تو اور ہمارے بال بچے زندہ رہیں اور ہلاک نہ ہوں۔ اور میں اس کا ضامن ہوتا ہوں۔ تو اسے میرے ہاتھ سے واپس مانگنا۔ اگر میں اسے تیرے پاس پہنچا کر سامنے کھڑا نہ کر دوں تو ہمیشہ کے لیے گناہ گار ٹھہروں گا۔ اگر ہم دیر نہ لگاتے تو اب تک دوسری دفعہ لوٹ کر آ بھی جاتے۔

تب ان کے باپ اسرائیل نے ان سے کہا اگر یہی بات ہے تو ایسا کرو کہ برتنوں میں اس ملک کی مشہور پیداوار میں سے کچھ اس شخص کے لیے نذرانہ لیتے جاؤ جیسے تھوڑا سا روغن بلسان' تھوڑا سا شہد کچھ گرم مسالا در مر اور پستہ اور بادام۔ اور دونا دام اپنے ہاتھ میں لے لو اور نقدی جو پھیر دی گئی اور تمھارے بوروں کے منہ میں رکھی ملی' اپنے ساتھ واپس لے جاؤ کیوں کہ شاید بھول ہو گئی ہو گی۔ اور اپنے بھائی کو بھی ساتھ لو اور اٹھ کر پھر اس شخص کے پاس جاؤ۔ اور خدائے قادر اس شخص کو تم پر مہربان کرے تا کہ وہ تمھارے دوسرے بھائی کو اور بن یامین کو تمھارے ساتھ بھیج دے' میں اگر بے اولاد ہوا تو ہوا۔

قرآن مجید میں باپ بیٹوں کی ملاقات کا احوال سورۂ یوسف کی آیات 63 تا 68 میں بیان ہے۔: ''جب وہ اپنے باپ کے پاس گئے تو کہا: ''ابا جان' آیندہ ہمیں غلہ دینے سے انکار کر دیا گیا ہے' لہٰذا ہمارے بھائی کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے تا کہ ہم غلہ لے کر آئیں اور اس کی حفاظت کے ہم ذمہ دار ہیں۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام نے جواب دیا: ''کیا میں اس کے معاملے میں تم پر ویسا ہی بھروسا کروں جیسا اس سے پہلے اس کے بھائی کے معاملے میں کر چکا ہوں؟ اللہ ہی بہتر محافظ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے''

پھر جب انھوں نے اپنا سامان کھولا تو دیکھا کہ ان کا مال بھی انھیں واپس کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ پکار اٹھے: ''ابا جان' ہمیں اور کیا چاہیے۔ دیکھیے یہ ہمارا مال بھی ہمیں واپس دے دیا گیا ہے۔ بس اب ہم جائیں گے اور اپنے اہل وعیال کے لیے رسد لے آئیں گے۔ اپنے بھائی کی بھی حفاظت کریں گے اور ایک اونٹ کا بار اور زیادہ لے آئیں گے۔ اتنے غلہ کا اضافہ آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔''

ان کے باپ نے کہا: ''میں اسے ہرگز تمھارے ساتھ نہ بھیجوں گا' جب تک کہ تم اللہ کے نام سے مجھے پیمان نہ دے دو کہ اسے میرے پاس ضرور واپس لے کر آؤ گے' سوائے اس کے کہ کہیں تم ہی گھیر لیے جاؤ۔''

جب انھوں نے اپنے والد کو اپنے اپنے پیمان دے دیے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا: ''دیکھو' ہمارے اس قول پر اللہ وکیل ہے۔'' پھر انھوں نے کہا: ''میرے بچو' مصر کے دارالسلطنت میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا مختلف دروازوں سے جانا۔ مگر میں اللہ کی مشیت سے تمھیں نہیں بچا سکتا۔ اس کے سوا کسی کا حکم بھی نہیں چلتا۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا' اور جسے بھی بھروسا کرنا ہو' اسی پر کرے۔''

''اور واقعہ بھی یہی ہوا کہ جب وہ اپنے والد کی ہدایت کے مطابق شہر میں متفرق دروازوں سے داخل ہوئے تو اس کی یہ احتیاطی تدبیر اللہ کی مشیت کے مقابلے میں کچھ بھی کام نہ آ سکی۔ ہاں بس یعقوب علیہ السلام کے دل میں جو ایک کھٹک تھی' اسے دور کرنے کے لیے اس نے اپنی سی کوشش کر لی۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بعد ان کے بھائی کو بھیجتے وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل پر کیا کچھ گزر رہی ہوگی۔ اگرچہ اللہ پر بھروسا تھا اور صبر و تسلیم میں ان کا مقام نہایت بلند تھا۔ مگر تھے پھر بھی انسان ہی۔ طرح طرح کے اندیشے دل میں آتے ہوں گے اور رہ رہ کر اس خیال سے کانپ اٹھتے ہوں گے کہ خدا جانے اب اس لڑکے کی صورت بھی دیکھ سکوں گا یا نہیں۔ اسی لیے وہ چاہتے ہوں گے کہ اپنی حد تک احتیاط میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔

یہ احتیاطی تدبیر کہ مصر کے دارالسلطنت میں یہ سب بھائی ایک دروازے سے نہ جائیں' ان سیاسی حالات کے پیش نظر صاف سمجھ میں آ جاتی ہے جو اس وقت پائے جاتے تھے۔ یہ لوگ سلطنت مصر کی سرحد پر آزاد قبائلی علاقے کے رہنے والے تھے۔ اہلِ مصر اس علاقے کے لوگوں کو اس شبے کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے' جس نگاہ سے ہندوستان کی برطانوی حکومت آزاد قبائلی علاقے والوں کو دیکھتی رہی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو اندیشہ پیدا ہوا ہوگا کہ اس قحط کے زمانے میں اگر یہ لوگ ایک جتھا بنے ہوئے وہاں داخل ہوں گے تو شاید انھیں مشتبہ سمجھا جائے اور یہ گمان کیا جائے کہ یہ یہاں لوٹ مار کی غرض سے آئے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا یہ اشارہ کہ ''سوائے اس کے کہ کہیں تم ہی گھیر لیے جاؤ'' اس مضمون کی طرف خود اشارہ کر رہا ہے کہ یہ مشورہ سیاسی اسباب کی بنا پر تھا۔

برادرانِ یوسف کی دوسری آمد

چنانچہ اب دس کی بجائے گیارہ بھائی مصر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سفر کا حال اور بعد کے واقعات کی تفصیلات میں قرآن مجید اور بائبل میں خاص فرق نہیں ہے' سوائے اس کے کہ بائبل میں تاریخ نگاری کے اصول و طریق کے مطابق تفصیل اور جزئیات نگاری سے کام لیا گیا ہے' جب کہ قرآن مجید میں اختصار سے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے وفات سے پہلے اپنے خاندان والوں سے عہد لیا کہ مجھے مصر میں دفن نہ کریں گے بلکہ جب خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کہ بنی اسرائیل دوبارہ فلسطین یعنی ابراہیم علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی سرزمین میں واپس ہوں تو میری ہڈیاں وہیں لے جا کر سپرد خاک کرنا۔ چنانچہ انھوں نے وعدہ کیا اور جب یوسف علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو انھیں حنوط (ممی) کر کے تابوت میں محفوظ کر دیا گیا۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو تابوت کو بھی ساتھ لیتے گئے اور آباواجداد کی سرزمین ہی میں سپرد خاک کر دیا۔

حموی کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر بلاطہ میں ہے جو فلسطین کے علاقے نابلس کا ایک گاؤں ہے۔

قرآن مجید داستانِ یوسف علیہ السلام میں یہ بات نمایاں کر کے دکھاتا ہے کہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، اور حضرت یوسف علیہم السلام کا دین وہی تھا جو آنحضرت ﷺ کا تھا اور اسی چیز کی طرف یہ انبیا بھی دعوت دیتے تھے جس کی طرف محمد ﷺ رسول اللہ دے رہے ہیں۔

پھر قرآن ایک طرف حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے کردار اور دوسری طرف برادران یوسف علیہ السلام، قافلہ تجار، عزیز مصر، اس کی بیوی، بیگمات مصر اور حکام مصر کے کردار ایک دوسرے کے مقابلے میں رکھ دیتا ہے اور محض اپنے اندازِ بیان سے سامعین و ناظرین و قارئین کے سامنے یہ خاموش سوال پیش کرتا ہے کہ دیکھو، ایک نمونے کے کردار تو وہ ہیں جو اسلام، یعنی اللہ کی اطاعت و بندگی اور آخرت کے یقین سے پیدا ہوتے ہیں، اور دوسرے نمونے کے کردار وہ ہیں جو کفر و جاہلیت، دنیا پرستی اور خدا و آخرت سے بے نیازی کے سانچوں میں ڈھل کر تیار ہوتے ہیں۔ اب تم خود اپنے ضمیر سے پوچھو کہ وہ ان میں سے کس نمونہ کو پسند کرتا ہے۔

پھر اس قصے سے قرآن حکیم ایک اور گہری حقیقت بھی انسان کے ذہن نشین کراتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کام کرنا چاہتا ہے، وہ بہرحال پورا ہو کر رہتا ہے۔ انسان اپنی تدابیر سے اس کے منصوبوں کو روکنے اور بدلنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، بلکہ بسا اوقات ایک کام اپنے منصوبے کی خاطر کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں نے ٹھیک نشانے پر تیر مار دیا، مگر نتیجے میں ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے اسی کے ہاتھوں سے وہ کام لے لیا جو اس کے منصوبے کے خلاف اور اللہ کے منصوبے کے عین مطابق ہے۔ یوسف علیہ السلام کے بھائی جب انھیں کنوئیں میں پھینک رہے تھے تو ان کا گمان تھا کہ ہم نے اپنی راہ کے کانٹے کو ہمیشہ کے لیے ہٹا دیا، مگر فی الواقع انھوں نے یوسف علیہ السلام کو اس بام عروج کی پہلی سیڑھی پر اپنے ہاتھوں لا کھڑا کیا، جس پر اللہ انھیں پہنچانا چاہتا تھا اور اپنی اس حرکت سے اُنہوں نے خود اپنے لیے اگر کچھ کمایا تو بس یہ کہ یوسف علیہ السلام کے بام عروج پر پہنچنے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ عزت کے ساتھ اپنے بھائی کی ملاقات کو جاتے، انھیں ندامت و شرم ساری کے ساتھ، اسی بھائی کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

عزیز مصر کی بیوی یوسف کو قید خانے بھجوا کر اپنے نزدیک تو ان سے انتقام لے رہی تھی، مگر فی الواقع اس نے ان کے لیے تختِ اقتدار پر پہنچنے کا راستہ صاف کیا اور اپنی اس تدبیر سے خود اپنے لیے اس کے سوا کچھ نہ کمایا کہ وقت آنے پر ملک کے فرماں روا کی مربی کہلانے کی بجائے اسے علی الاعلان اپنی خیانت کے اعتراف کی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ یہ محض دو چار استثنائی واقعات نہیں ہیں، بلکہ تاریخ ایسی بے شمار مثالوں سے بھری پڑی ہے جو اس حقیقت کی گواہی دیتی ہیں کہ اللہ جسے اٹھانا چاہتا ہے، ساری دنیا مل کر بھی اسے نہیں گرا سکتی، بلکہ جس دنیا جس تدبیر کو اس کے گرانے کی نہایت کارگر اور یقینی تدبیر سمجھ کر اختیار کرتی ہے، اللہ اسی تدبیر میں سے اس کے اٹھنے کی صورتیں نکال دیتا ہے، اور ان لوگوں کے حصے میں رُسوائی کے سوا کچھ نہیں آتا، جنھوں نے اسے گرانا چاہا تھا، اور اسی طرح اس کے برعکس خدا جسے گرانا چاہتا ہے، اسے کوئی تدبیر سنبھال نہیں سکتی، بلکہ سنبھالنے کی ساری تدبیریں الٹی پڑتی ہیں اور ایسی تدبیریں کرنے والوں کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔

سب سے بڑا سبق جو حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی سے ملتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مومن اگر حقیقی اسلامی سیرت و کردار رکھتا ہو اور علم و حکمت سے بھی بہرہ یاب ہو، تو وہ محض اپنے اخلاق اور حُسنِ سلوک کے زور سے ایک پورے ملک کو فتح کر سکتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو دیکھیے۔ سترہ برس کی عمر، تن تنہا، بے سروسامان، اجنبی ملک اور پھر کم زوری کی انتہا یہ کہ غلام بنا کر بیچے گئے ہیں۔ تاریخ کے اس دور میں غلاموں کی جو حیثیت تھی، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس پر مزید یہ کہ ایک شدید اخلاقی جرم کا الزام لگا کر انھیں جیل بھیج دیا گیا، جس کی سزا کی مدت بھی کوئی نہ تھی۔ اس حالت تک گرا دیے جانے کے بعد وہ اپنے ایمان اور اخلاق کے بل پر اٹھتے ہیں اور بالآخر پورے ملک کو مسخر کر لیتے ہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام

حضرت شعیب علیہ السلام حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے۔ وہ اصحاب الایکہ اور اہل مدین کی طرف بھیجے گئے تھے۔ بعض مفسرین انھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خسر تصور کرتے ہیں، حالانکہ قرآن مجید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خسر کا کوئی نام نہیں بتایا۔

قرآن مجید میں حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی قوم کا تذکرہ سورۂ اعراف، ہود اور شعرا میں قدرے تفصیل سے کیا ہے، اور سورۂ حجر اور عنکبوت میں مختصر ہے۔ ان سورتوں میں حجر کے علاوہ حضرت شعیب کا نام دس جگہ درج ذیل تفصیل کے مطابق مذکور ہے:

سورۂ اعراف 85، 88، 90، 92، سورۂ ہود 84، 87، 90، 95، سورۂ شعرا 177، سورۂ عنکبوت 36

بائبل میں مختلف مقامات پر حضرت شعیب علیہ السلام کے دو نام بتائے گئے ہیں، حو باب اور تیرہ آپ کو جس قوم پر معبوث کیا گیا تھا، اسے اہل مدین بھی کہتے ہیں اور اصحاب الایکہ بھی۔ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا مدین اور اصحاب الایکہ الگ الگ قومیں ہیں یا ایک ہی قوم کے دو نام ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ دو الگ قومیں ہیں اور اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سورۂ اعراف میں حضرت شعیب علیہ السلام کو اہل مدین کا بھائی فرمایا گیا ہے: ﴿وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا﴾ اور یہاں اصحاب الایکہ کے ذکر میں صرف یہ اشارہ ہوا ہے کہ ﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ﴾ (جب کہ ان سے شعیب علیہ السلام نے کہا۔) ان کے بھائی "اخوھم" کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس بعض مفسرین دونوں کو

ایک ہی قوم قرار دیتے ہیں' کیوں کہ سورۂ اعراف اور ہود میں جو امراض اور اوصاف اصحابِ مدین کے بیان ہوئے ہیں' وہی یہاں اصحاب الایکہ کے بیان ہو رہے ہیں۔ حضرت شعیب کی دعوت ونصیحت بھی یکساں اور آخر کار ان کا انجام میں بھی فرق نہیں ہے۔

تاریخی تحقیق

اس فرق واختلاف پر مولانا مودودی نے تحقیق کا حق ادا کیا۔ مولانا اپنی تالیف سیرت سرور عالم ﷺ جلد اول میں اس موضوع پر رائے زنی کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اقوال اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ بلا شبہ دو الگ قبیلے ہیں' مگر ہیں ایک ہی نسل کی دو شاخیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جو اولاد ان کی بیوی یا کنیز قطورا کے بطن سے تھی' وہ عرب اور اسرائیل کی تاریخ میں بنی قطورا کے نام سے معروف ہے۔ ان میں سے ایک قبیلہ' جو سب سے زیادہ مشہور ہوا' حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند مدیان کی نسبت سے مدیانی یا اصحاب مدین کہلایا اور اس کی آبادی شمالی حجاز سے فلسطین کے جنوب تک اور وہاں سے جزیرہ نمائے سینا کے آخری گوشے تک بحر قلزم اور خلیج عقبہ کے سواحل پر پھیل گئی۔ اس کا صدر مقام شہر مدین تھا جس کی جائے وقوع مورخ ابوالفدا نے خلیج عقبہ کے مغربی کنارے پر ایلہ (موجودہ عقبہ) سے پانچ دن کی مسافت پر بتائی ہے۔ باقی بنی قطورا شمالی عرب میں تیما اور تبوک اور العلا کے درمیان آباد ہوئے۔ ان کا صدر مقام تبوک تھا' جسے قدیم زمانے میں ایکہ کہتے تھے۔

''مدین کا اصل علاقہ حجاز کے شمالی مغرب اور فلسطین کے جنوب میں بحر قلزم اور خلیج عقبہ کے کنارے پر واقع تھا' اگرچہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرقی ساحل پر بھی اس کا کچھ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہ راہ بحر قلزم کے کنارے کنارے یمن سے مکہ اور ینبوع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی' اور ایک دوسری تجارتی شاہ راہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی' اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں تھیں اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا' اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی' کیوں کہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات دن اس کے آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔

اہلِ مدین کے متعلق ایک اور ضروری بات' جسے اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے' یہ ہے کہ یہ لوگ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادے مدیان کی طرف منسوب ہیں جو ان کی تیسری بیوی قطورا کے بطن سے تھے۔ قدیم زمانے کے قاعدے کے مطابق جو لوگ کسی بڑے آدمی کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے' وہ رفتہ رفتہ اسی کی آل اولاد میں شمار ہو کر بنی فلاں کہلانے لگتے تھے۔ اسی قاعدہ پر عرب کی آبادی کا بڑا حصہ بنی اسماعیل کہلایا۔ اور اولاد یعقوب علیہ السلام کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہونے والے لوگ سب کے سب بنی اسرائیل کے جامع نام کے تحت کھپ گئے۔ اسی طرح مدین کے علاقے کی ساری آبادی بھی' جو مدیان بن ابراہیم علیہ السلام کے زیر اثر آئی' بنی مدیان کہلائی اور ان کے ملک کا نام ہی مدین یا مدیان ہو گیا''۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی صاحب ''قصص القرآن'' میں اس بحث کا نتیجہ یہ نکالتے ہیں: ''اصحاب مدین کہلایا اور زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے اصحاب ایکہ'' کے لقب سے مشہور ہوا۔ اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ ہے جو باپ کی نسبت سے مدین عربی میں ''ایکہ'' ان سرسبز وشاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اگی رہتی ہیں اور جھاندے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اور یہ قبیلہ ایسی ہی زمین پر آباد تھا۔ اصحاب ایکہ کا مطلب ہے جھنڈ والے''۔

حضرت شعیب علیہ السلام کا زمانہ سترھویں اور سولھویں صدی قبل مسیح کے درمیان تھا' کیوں کہ حضرت موسیٰ کا زمانہ 1520 تا 1400 ق م تشخیص ہو چکا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام جوانی کے عالم میں مدین پہنچے تو آپ کافی ضعیف اور سن رسیدہ تھے۔ اسی طرح جب حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر جزیرہ نمائے سینا کے علاقے میں پہنچے تو بائبل کے بیان کے مطابق آپ زندہ تھے اور آپ علیہ السلام نے موسیٰ کا استقبال کیا۔

آپ کی قوم کی حالت

بائبل اور قرآن حکیم سے قوم شعیب (اصحاب مدین واصحاب ایکہ) کی حالت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ یہ لوگ تہذیب وتمدن میں خاصے ترقی یافتہ تھے۔ سیاسی نظام قبائلی تھا' لیکن منظم تھا۔ ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا تھا۔ جو شیخ یا بادشاہ کہلاتا تھا۔ یہ دونوں قبائل چوں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے' اس لیے دعوت ابراہیمی سے واقف اور توحید' رسالت اور آخرت کے تصور سے آشنا تھے' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مذہبی عقائد میں بگاڑ آنا شروع ہو گیا تھا۔ مشرک قوموں کے ساتھ میل جول اور اختلاط کے نتیجے میں بہت سے مشرکانہ عقائد نے ان کے ہاں جگہ لے لی تھی۔ بائبل کے مطابق ان کا سب سے بڑا بت بعل تھا۔ اس بت کے لیے لوبان اور بخورات جلائے جاتے اور اس پر قربانیاں اور نذریں چڑھائی جاتیں۔ سب سے بڑی قربانی یہ تھی کہ اُس کی خوشی حاصل کرنے کے لیے اولاد کو آگ میں ڈال دیا جاتا۔ مذہبی رسول کی انجام دہی کے فرائض جس شخص کے سپرد ہوتے' وہ کاہن کہلاتا اور اکثر وہی علاقے کا حکمران بھی ہوتا تھا۔

یہ دونوں قبائل قدیم تجارتی شاہ راہ پر آباد تھے۔ اس لیے انھوں نے بحیثیت قوم تجارت کو بطور پیشہ اپنایا۔ ایمان واسلام کی روح پرور نعمتوں سے محروم ہونے کے بعد یہ لوگ مالی برائیوں کے گرداب میں پھنس گئے۔ سورۂ اعراف' سورۂ ہود' سورۂ الشعرا میں ان کی تجارتی بددیانتی کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ وہ ناپ تول کی کمی' لین دین میں بے ایمانی' خرید وفروخت میں دھوکا دہی' سود اور سٹے جیسی تمام کاروباری بداعمالیوں میں ملوث تھے۔

یہ لوگ یمن سے شام اور عراق سے مصر جانے والی بین الاقوامی تجارتی شاہ راہوں

کے سنگم پر آباد تھے۔ اپنی اس جغرافیائی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے بڑے پیمانے پر راہ زنی کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ دوسری قوموں کے تجارتی قافلوں کو بھاری خراج لیے بغیر نہ گزرنے دیتے۔ کاروبار میں وسعت اور مال و دولت کی فراوانی اور خوش حالی نے ان قوموں کو عیاشی اور اسراف بے جا کا دل دادہ بنا دیا تھا' جس کے نتیجے میں ان کی اخلاقی پستی اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ بے راہ روی اور بداخلاقی کے اس سیلاب نے قوم کی بیٹیوں کو بھی اخلاق باختہ اور بے حیا بنا کر رکھ دیا۔ بائبل کا بیان ہے کہ جب بنی اسرائیل کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا مقابلہ ان قوموں کے مرد اپنی قوتِ بازو سے نہ کر سکے تو قوم کی لڑکیاں میدان میں نکل آئیں اور انھوں نے اسرائیلی سرداروں کو اپنے مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر انھیں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے رب سے برگشتہ کر دیا۔

آپ علیہ السلام کی اصلاحی تحریک

یہ تھے اس قوم کے وہ حالات جن میں حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی اصلاحی تحریک کا آغاز اس جامع تقریر سے کیا: ''اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں' تمھارے رب کی صاف راہ نمائی آ گئی ہے۔ لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو۔ لوگوں کو ان کی چیزیں میں گھاٹا نہ دو' اور زمین میں فساد برپا نہ کرو' جب کہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے' اگر واقعی تم مومن ہو۔ اور زندگی کے ہر راستے پر راہ زن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ یاد کرو وہ زمانہ جب تم تھوڑے تھے' پھر اللہ نے تمھیں بہت کر دیا' اور آنکھیں کھول کر دیکھو کہ دنیا میں مفسدوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر' جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں' ایمان لاتا ہے' اور دوسرا ایمان نہیں لاتا تو صبر کے ساتھ دیکھتے رہو' یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے' اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے'' (سورۂ اعراف۔ 85 تا 87)

آپ علیہ السلام کی دعوت اتنی پُر خلوص اور پُر اثر تھی اور آپ کی اصلاحی تحریک انسانی فطرت اور انسانی ضمیر سے اتنی ہم آہنگ تھی کہ وہ ذہنوں اور دلوں کو مسخر کرتی چلی گئی اور سعید روحیں آپ کی پکار پر آپ کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ اس انقلاب نے ان مفاد پرستوں کو' جن کا معاشی اور سیاسی مفاد اسی استحصالی نظام سے وابستہ تھا' چونکا دیا۔ انھوں نے آپ کی تحریک کے وابستگان کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے ہوئے صاف کرنے کی منظم جدوجہد شروع کر دی اور اس طرح معاشرے میں ہر مرحلے اور ہر قدم پر کش مکش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

کش مکش کا آغاز

''اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے' اس سے کہا کہ اے شعیب علیہ السلام ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں' اپنی بستی سے نکال دیں گے' ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہو گا۔'' شعیب علیہ السلام نے جواب دیا: ''کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا' خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے' اگر تمھاری ملت میں پلٹ آئیں جب کہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لیے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں' الا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے۔ ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے' اسی پر ہم نے اعتماد کر لیا۔ اے رب' ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے'' اس کی قوم کے سرداروں نے' جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے' آپس میں کہا: ''اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کر لی تو برباد ہو جاؤ گے'' (اعراف 88 تا 90)

قوم کے ان سرکش اور جاہ پسند لیڈروں نے عوام میں آپ کی دعوت کے خلاف پروپیگنڈے کی تحریک چلائی' لیکن حضرت شعیب علیہ السلام انھیں ہر مرحلے پر فلاح کی راہ کی طرف دعوت دیتے رہے اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔ اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ آج میں تمھیں اچھے حال میں دیکھ رہا ہوں' مگر مجھے ڈر ہے کہ کل تم پر ایسا دن آئے گا' جس کا عذاب سب کو گھیر لے گا۔ اور اے برادرانِ قوم! ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دیا کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ کی دی ہوئی بچت تمھارے لیے بہتر ہے' اگر تم مومن ہو' اور بہر حال میں تمھارے اُوپر کوئی نگران کار نہیں ہوں۔'' (ہود۔ 84 تا 86)

''انھوں نے جواب دیا: ''اے شعیب علیہ السلام' کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے؟ یا یہ کہ ہمیں اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو؟ بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے۔''! (ہود۔ 87)

''شعیب علیہ السلام نے کہا: ''بھائیو' تم خود ہی سوچو کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک کھلی شہادت پر تھا' اور پھر اس نے اپنے ہاں سے مجھے اچھا رزق بھی عطا کیا (تو اس کے بعد میں تمھاری گمراہیوں اور حرام خوریوں میں تمھارا شریک حال کیسے ہو سکتا ہوں؟۔) اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتا ہوں کہ جن باتوں سے میں تمھیں روکتا ہوں' اُن کا خود ارتکاب کروں۔ میں تو اصلاح کرنا چاہتا ہوں' جہاں تک بھی بس چلے۔ اور یہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اس کا سارا انحصار اللہ کی توفیق پر ہے۔ اسی پر میں نے بھروسا کیا' اور ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں اور اے برادرانِ قوم' میرے خلاف تمھاری ہٹ دھرمی کہیں یہ نوبت نہ پہنچا دے کہ آخر کار تم پر بھی وہی عذاب آ کر رہے جو نوح علیہ السلام یا ہود علیہ السلام یا صالح علیہ السلام کی قوم پر آیا تھا۔ اور لوط علیہ السلام کی قوم تو تم سے کچھ زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ دیکھو! اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ بے شک میرا رب رحیم ہے اور اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے'' (ہود۔ 88 تا 90)

''انھوں نے جواب دیا: ''اے شعیب علیہ السلام تیری بہت سی باتیں تو ہماری

سمجھ میں نہیں آتیں' اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے۔ تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگ سار کر چکے ہوتے۔ تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو'' (ہود۔91)

''شعیب علیہ السلام نے کہا:'' بھائیو' کیا میری برادری تم پر زیادہ بھاری ہے کہ تم نے (برادری کا خوف کیا اور) اللہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا؟ جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ اللہ کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ اے قوم کے لوگو' تم اپنے طریقے پر کام کیے جاؤ اور میں اپنے طریقے پر کرتا رہوں گا۔ جلدی ہی تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر ذلت کا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمھارے ساتھ چشم براہ ہوں'' (ہود۔93)

عذاب الٰہی

سورۂ ہود کی آیات 94 تا 96 میں اس عذاب کی کیفیت درج ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:'' آخر کار جب ہمارے فیصلے کا وقت آ گیا تو ہم نے اپنی رحمت سے شعیب علیہ السلام اور اس کے ساتھی مومنوں کو بچا لیا' اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا' انھیں ایک سخت دھماکے نے ایسا پکڑا کہ وہ اپنی بستیوں میں بے حس و حرکت پڑے کے پڑے رہ گئے' گویا وہ کبھی وہاں رہے بسے ہی نہ تھے۔ سنو! مدین والے بھی دور پھینک دیئے گئے' جس طرح ثمود پھینکے گئے تھے''

اس عذاب کی طرف سورۂ شعرا کی آیت 189 میں بھی اشارہ ہے:'' آخر کار چھتری والے دن کا عذاب ان پر آ گیا' اور وہ بڑے خوف ناک دن کا عذاب تھا''

سورۂ ہود میں عذاب کو ''سخت دھماکا'' کہا گیا اور سورۂ شعراء میں ''چھتری والے دن کا عذاب'' کہا گیا۔ اکثر مفسرین نے سورۂ ہود کے عذاب کا اطلاق اصحابِ مدین پر کیا ہے اور سورۃ الشعرا کے عذاب کا اطلاق اصحاب ایکہ پر کیا ہے۔ یعنی اہلِ مدین پر عذاب ہول ناک دھماکے اور زلزلے کی صورت میں آیا۔ ان کی یہ تباہی مدت دراز تک آس پاس کی قوموں میں ضرب المثل رہی ہے۔ چنانچہ زبور داؤد علیہ السلام میں ایک جگہ آتا ہے کہ ''اے خدا' فلاں فلاں قوموں نے تیرے خلاف عہد باندھ لیا ہے' لہٰذا تو ان کے ساتھ وہی کر جو تو نے مدیان کے ساتھ کیا۔'' اور یسعیاہ نبی ایک جگہ بنی اسرائیل کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ آشور والوں سے نہ ڈرو' اگرچہ وہ تمھارے لیے مصریوں کی طرح ظالم بنے جا رہے ہیں۔ لیکن کچھ دیر نہ گزرے گی کہ رب الافواج ان پر اپنا کوڑا برسائے گا اور ان کا وہی حشر ہوگا جو مدیان کا ہوا''

چھتری والے دن کے عذاب (عذاب الظلۃ) کے بارے میں مولانا مودودی اس کی تفہیم و تشریح میں لکھتے ہیں:'' اس عذاب کی کوئی تفصیل قرآن مجید میں یا کسی صحیح حدیث میں مذکور نہیں ہے۔ ظاہر الفاظ سے جو بات سمجھ میں آتی ہے' وہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے چوں کہ آسمانی عذاب مانگا تھا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک بادل بھیج دیا اور وہ چھتری کی طرح ان پر اس وقت تک چھایا رہا' جب تک باران عذاب نے انھیں بالکل تباہ نہ کر دیا۔ قرآنِ عزیز سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اصحابِ مدین کے عذاب کی کیفیت اصحابِ ایکہ کے عذاب سے مختلف تھی۔ اصحابِ مدین پر عذاب ایک دھماکے اور زلزلے کی شکل میں آیا' اور اصحاب ایکہ چھتری والے عذاب سے ہلاک ہوئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام

کلیم اللہ' جلیل القدر نبی اور رسول' صاحب شریعت۔ ان کے حالات کا صحیح تعارف ممکن نہیں' جب تک پہلے مصر قدیم کی تاریخ کے متعلقہ اوراق کا' اختصار کے ساتھ مطالعہ نہ کر لیا جائے۔

یہودیت' عیسائیت اور آخر میں اسلام یعنی اہلِ کتاب کے مذہب میں داخل ہونے سے پہلے کی مصری تاریخ 4777 قبل مسیح سے لے کر 30 ق م تک' یعنی تقریباً پانچ ہزار سال تک تیس حکمران خاندانوں کے پانچ سو سے زائد بادشاہوں نے حکومت کی۔ مصر کی قدیم زبان میں بادشاہ کو ''فرعون'' کہا جاتا تھا۔ ان تیس حکمران خاندانوں میں سے ہمارا تعلق پندرھویں اور انیسویں خاندان سے ہے' کیوں کہ پندھوریں خاندان میں بنی اسرائیل کو مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دم قدم سے عروج حاصل ہوا اور انیسویں خاندان کے عہد میں فراعنہ نے بنی اسرائیل پر جو مظالم ڈھائے' ان سے حضرت موسیٰ نے نجات دلائی اور بنی اسرائیل نے مصر سے ہمیشہ کے لیے خروج کیا۔

چرواہے بادشاہ

تیرھویں اور چودھویں خاندان کے بارے میں معلومات بہت کم دست یاب ہیں۔ انتشار اور عدم استحکام کا یہ حال تھا کہ دو سو سال کے عرصے میں سو سے زیادہ بادشاہوں نے حکومت کی۔ ہر بادشاہ کا عہد حکومت اتنا مختصر تھا کہ وہ ابھی ضابطے کے مطابق تخت نشین بھی نہ ہو پاتا تھا کہ تاج و تخت سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا' وہی ہوا۔ یہ کہ مصر زوال' پستی اور جہالت کے گڑھے میں گرتا چلا گیا۔ اس عہد میں نہ اہرام بنائے گئے' نہ مندر' نہ مجسمہ سازی ہوئی نہ سنگ تراشی شاعری ہوئی نہ کہانیاں لکھی گئیں' اور جیسا کہ ہر قوم کے دورِ زوال میں ہوا کرتا ہے' بیرونی طاقتیں داخل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ چودھویں دور کے آخر میں غیر ملکیوں نے ملک پر حملہ کیا اور قبضہ کر لیا۔

یہ غیر ملکی کون تھے؟ اہل مصر ان کا نام چرواہے بادشاہ (Hyksos) بتاتے ہیں۔ یہ چرواہے بادشاہ عرب تھے۔ سامی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ انھیں عرب مورخین عمالقہ کہتے ہیں۔ یہ وہ مقدس خاندان ہے جس کے عہد میں خانوادۂ ابراہیمی علیہ السلام کے پانچ بڑے انبیا ہو گزرے ہیں' یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت لوط علیہ السلام' حضرت اسحاق علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام۔ قدیم مصر کے مورخ مونیتھو نے 260 ق م کے لگ بھگ یونانی زبان میں مصر کی تاریخ لکھی تھی' جسے مصر کی اولین تاریخ قرار دیا جاتا ہے۔ مونیتھو نے ان غیر ملکی حملہ آوروں کے بارے میں لکھا ہے:

''ہمیں نہیں معلوم کہ کیوں کر ہوا۔ خدا ہم سے ناراض ہو گیا' اور مشرق سے جانے کس نسل کے کم ذات لوگ' عجیب وغریب وحشیانہ انداز میں ہمارے ملک میں در آئے۔ ان میں اتنی طاقت اور اتنا حوصلہ تھا کہ انھوں نے ہمارے ملک پر چڑھائی کر دی اور کسی لڑائی کے بغیر فتح کر لیا۔ انھوں نے ہمارے حکمرانوں پر قابو پالیا۔ ان کے ہاتھ باندھ دیئے اور ہمارے شہروں کو نذر آتش کر دیا' اور ہمارے دیوتاؤں کے مندروں کو ڈھا دیا اور ہر طرح بربریت کا مظاہرہ کیا۔ سخت جبر وتشدد کیا۔ مردوں کو قتل کر دیا۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا۔ ملک پر پورا تسلط جمالینے کے بعد انھوں نے اپنے میں سے ایک کو بادشاہ بنالیا۔''

اس عہد کے بارے میں دورِ حاضر کے مورخ فلینڈرس پیٹری نے اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے: ''اس وقت ملک میں ہر طرف انتشار ہی انتشار تھا۔ کسی معمولی دشمن کی مزاحمت کرنے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ عین ایسی طوائف الملوکی کی ابتر وخستہ کیفیت میں مشرق کی سمت سے ایک وحشی اور اجڈ قوم ٹوٹ پڑی۔ انھوں نے یہاں کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ سرداروں کو تہ تیغ اور بستیوں کو تہس نہس کر دیا۔ باقی جو بچ گئے وہ ان وحشیوں کے رحم وکرم پر تھے۔ یہ غیر ملکی چرواہے یہاں جم کر بیٹھ گئے اور جب انھیں رہتے رہتے ایک صدی ہو گئی تو ان میں مصری تہذیب رچ بس گئی اور وہ کسی قدر مہذب ہو گئے۔ اور کیوں نہ ہوتے' جب کہ ان کی دوسری اور تیسری نسل نے مصری ماؤں کا دودھ پیا تھا۔ مصری دودھ کے ساتھ مصری ثقافت بھی ان کی روحوں میں اُتر گئی۔ چنانچہ انھوں نے مصری انداز میں' مصری طرز کی اپنی ایک بادشاہت قائم کر لی۔ مصر کی ثقافتی روایات اور سماجی اقدار ورسوم اختیار کر لیں۔ اور مقامی باشندوں کی وفا داری اور اطاعت حاصل کرنے کے لیے انھیں حکومت اور انتظامیہ میں شریک کر لیا۔''

کیا مقامی مصری باشندے ان غیر ملکی چرواہے حکمرانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے؟ اس سوال کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندوی اپنی تصنیف ''ارض القرآن'' میں لکھتے ہیں: ''اس کی شہادتیں آج سے دو ہزار سال پیش تر کی موجود ہیں' یہاں تک کہ سامی اقوام کے راہ نُما اور پیشوا بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں اور مَیں نے بھی چرائی ہیں۔ سر ولیم میور جو نبی کریم ﷺ کے بکریاں چرانے سے آپ ﷺ کی ذلت وتحقیر کا پہلو نکالتے ہیں' انھیں مورخ یوسفوس کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے تھا اور اپنی مذہبی کتاب تورات میں دیکھنا چاہیے تھا کہ ابراہیم علیہ السلام' لوط علیہ السلام' اسحاق علیہ السلام' یعقوب علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا کیا پیشہ تھا؟''

حضرت موسیٰ کی ولادت

حضرت یوسف علیہ السلام نے آلِ یعقوب علیہ السلام کو مصریوں سے الگ تھلگ ایک خاص علاقے ''جشن'' میں آباد کیا۔ کیوں کہ مصری' جو مہذب تھے' ان چرواہے بدوؤں سے نفرت کرتے تھے' اور وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ تاہم حکومت چوں کہ ان پر مہربان تھی' اس لیے آلِ یعقوب علیہ السلام نے اقتصادی لحاظ سے بہت ترقی کی اور ان کی تعداد میں تیز رفتاری سے اضافہ ہوا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا دور گزر جانے کے بعد مصر میں ایک قوم پرستانہ انقلاب برپا ہوا اور قبطیوں (مصریوں) کے ہاتھ میں جب دوبارہ اقتدار آیا تو نئی قوم پرست حکومت نے بنی اسرائیل (آلِ یعقوب یا چرواہے بادشاہ) کا زور توڑنے کی پوری کوشش کی۔ اس سلسلے میں صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا گیا کہ اسرائیلیوں کو ذلیل وخوار کیا جاتا اور انھیں ادنیٰ درجے کی خدمات کے لیے مخصوص کر لیا جاتا' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ پالیسی اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد گھٹائی جائے اور ان کے لڑکوں کو قتل کر کے صرف ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے' تاکہ رفتہ رفتہ ان کی عورتیں قبطیوں کے تصرف میں آتی جائیں اور ان سے اسرائیلی کی بجائے قبطی نسل پیدا ہو۔

جس فرعون کے زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی' وہ مصر کے فرعونی دور کے انیسویں خاندان کا بادشاہ رعمسیس دوم Rameses تھا جو سیتی اول کا بیٹا تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام عمران کے گھر پیدا ہوئے۔ چوں کہ فرعون نے بنی اسرائیل کے لڑکوں کو ایک عرصے سے قتل کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا' لہٰذا بیٹے کی ولادت فرعون کے جاسوسوں سے زیادہ عرصہ مخفی نہ رہ سکتی تھی' لیکن اللہ تعالیٰ کو تو یہ منظور تھا کہ نہ صرف یہ بچہ زندہ رہے' بلکہ اپنی جان کے دشمن خود فرعون کے قصر شاہی میں ناز و نعمت کے ماحول میں پرورش پائے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے الہام یا کسی اور طریقے سے اس بچے کی والدہ ماجدہ کو بتا دیا کہ وہ اُسے دودھ پلاتی رہے اور جب اسے یہ اندیشہ ہو کہ اب فرعون کو اس کی خبر ہو سکتی ہے تو وہ بچے کو صندوق میں رکھ کے دریا میں ڈال دے۔ ساتھ ہی اس کی مامتا کو اس وعدے سے تسلی دے دی کہ اللہ تعالیٰ بچے کو واپس آغوشِ مادر میں پہنچا دے گا اور اسے منصب رسالت پر سرفراز فرمائے گا' لہٰذا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ (طٰہٰ 37 تا 39۔ القصص 8 تا 20)

حضرت موسیٰ کی والدہ نے جب فرعونیوں کی طرف سے خطرہ محسوس کیا تو انھیں ایک صندوق میں رکھ کے دریا میں ڈال دیا' مگر مامتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنی بیٹی اور بچے کی بڑی بہن کو مامور کیا کہ وہ صندوق کے پیچھے پیچھے جائے اور نگاہ رکھے کہ وہ کدھر جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر صندوق کا بڑی احتیاط سے پیچھا کرتی رہی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے کہ اس کا بچے کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔
(القصص:11)

آخر کار دریا نے صندوق کو کنارے پر ڈال دیا' جہاں سے فرعون کی بیوی نے اُسے اٹھا لیا۔ جب صندوق کھولا گیا اور اس میں بچہ پڑا دیکھا تو اسے بچہ پر رحم آیا اور وہ بچے کو قصر شاہی میں لے گئی اور قدرت نے ملکہ کے دل میں بچے کی محبت پیدا کر دی۔
(طٰہٰ۔39)

اور اس نے اسے پالنے کا ارادہ کیا اور پھر فرعون سے یہ کہا' یہ میرے اور تیرے

لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہے‘ اسے قتل نہ کرو۔ کیا عجب یہ ہمارے لیے مفید ثابت ہو یا ہم سے بیٹا ہی بنا لیں۔ (القصص۔9)

فرعون نے بیوی کی رائے کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت تو یہ تھی کہ بچہ واپس اپنی والدہ کے پاس پہنچے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ننھے موسیٰ علیہ السلام کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ وہ کسی عورت کے دودھ کو منہ نہ لگائے۔ اور پھر ایسے ہی ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر نے‘ جو صندوق کے پیچھے پیچھے کسی طرح محل کے اندر پہنچ گئی تھی‘ جب یہ صورتِ حال دیکھی تو ایسی انا لانے کی پیش کش کی جو بچے کی خیر خواہ اور اس کے لیے قابل قبول ہو۔ فرعون کے گھر والوں نے‘ جو بہت سی اناؤں کو آزما کر عاجز آ گئے تھے‘ فوراً اس لڑکی کی بات کو مان لیا اور یوں حضرت موسیٰ اپنی والدہ ماجدہ کے پاس واپس آ گئے اور اس طرح ماں کے دل کو قرار اور آنکھوں کو ٹھنڈک ملی۔ اس سے ان کا یہ یقین اور پختہ ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہوتا ہے۔ (طٰہٰ 40۔ القصص 10 تا۔13)

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت فرعون کے محل میں ہونے لگی اور جب وہ سن بلوغت کو پہنچے تو نہایت طاقت ور‘ قوی الجثہ اور بہادر جوان نکلے۔ قدرت نے زور بازو کے ساتھ ساتھ انھیں قوت فکر بھی بخشی تھی (القصص۔24)

آپ کا شجرۂ نسب

بائبل کی تصریحات کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ساتویں پشت میں تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح سے بیان کیا گیا ہے:

"حضرت موسیٰ علیہ السلام بن عمران بن قاہاث بن لاوی بن حضرت یعقوب علیہ السلام بن حضرت اسحاق علیہ السلام بن حضرت ابراہیم علیہ السلام۔"

آپ کی والدہ ماجدہ کا نام کولبد تھا۔ ان کا تعلق بھی خاندان بنی لاوی سے تھا۔ قرآن مجید نے آپ کے بڑے بھائی کا نام ہارون بتایا ہے۔ بائبل کی روایت کے مطابق آپ کی پیدائش کے وقت حضرت ہارون علیہ السلام کی عمر دس سال تھی۔

حضرت موسیٰ کا تذکرہ قرآن مجید میں

انبیائے کرام میں حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ تفصیل سے ہوا ہے۔ قرآن حکیم کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے کم و بیش چالیس سورتوں میں آپ علیہ السلام کے حالات‘ دعوت و ارشاد کے انداز و اطوار اور آپ کے کردار کے روشن پہلوؤں کا ذکر نہایت بلیغ اور موثر پیرائے میں ہوا ہے۔ (اسی طرح بائبل کی دوسری کتاب خروج‘ تیسری کتاب احبار‘ چوتھی گنتی اور پانچویں استثنا میں آپ ہی کے حالات و واقعات درج ہیں)۔

مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی تالیف: قصص القرآن میں ایک نقشہ دیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام یا بنی اسرائیل اور فرعون کے واقعات کن کن سورتوں اور آیات میں مذکور ہیں۔

یہ نقشہ یہاں دیا جا رہا ہے۔:

سورۂ بقرہ (47 تا 61 ۔ 63 تا 75 ۔ 83 تا 87 ۔ 92 ۔ 93 تا 108‘ 136)، مائدہ (12۔13۔20 تا 25۔ 32۔ 45۔ 70۔ 71۔ 78۔ 79)، انعام (84 تا 90۔ 146۔ 154۔ 189)، اعراف (103 تا 157۔ 159 تا 171) انفال (54)، یونس (74 تا 93)، ہود (96 تا 99۔ 110)، ابراہیم (5۔6۔8)، النحل (124)، بنی اسرائیل (2 تا 8۔ 101 تا 104)، کہف (60 تا 83)، مریم (51۔53)، طٰہٰ (90۔98)، انبیا (48۔49)، مومنون (45۔49)، فرقان (35۔36)، شعرا (10۔66)، نمل (7۔14)، قصص (3۔48)، عنکبوت (39۔40)، سجدہ (23۔24)، احزاب (29)، صافات (114۔122)، مومن (23۔45)، زخرف (36۔56)، دخان (17۔33)، جاثیہ (16۔17)، ذاریات (38۔40)، قمر (14 تا 55)، صف (5)، جمعہ (5۔6)، تحریم (11)، حاقہ (9۔10)، مزمل (15۔16)، نازعات (15 تا 25)، فجر (10 تا 13)

فرعون کی بیوی

فرعون کے محل کی جس خاتون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھتے ہی جذبۂ شفقت سے سرشار ہو کر آپ کو پالنے اور اپنا بیٹا بنا لینے کے ارادے کا اظہار کیا تھا‘ وہ بائبل کے بیان کے مطابق فرعون کی بیٹی تھی‘ لیکن قرآن مجید واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ وہ فرعون کی بیوی تھی۔ احادیث میں اس کا نام آسیہ بتایا گیا ہے۔

اس وقت کا فرعون رعمسیس دوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت کافی سن رسیدہ ہو چکا تھا۔ لازمی طور پر اس کی کئی بیویاں تھیں‘ کیوں کہ بائبل کی روایت کے مطابق اس کی اولاد کی تعداد ایک سو پچاس تک پہنچ چکی تھی۔ فرعون کی یہ بیوی جس کا ذکر قرآن مجید نے کیا ہے‘ نہایت سلیم الفطرت اور نیک سیرت خاتون تھی۔ یہ فرعون کے مظالم اور اس کی بداعمالیوں سے سخت بیزار اور متنفر تھی‘ اور خدا کی بارگاہ میں اس کے مآل بد سے پناہ اور اپنی بخشش کی دعا مانگا کرتی تھی۔ اس کی برگزیدگی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآنِ مجید نے اس کا ذکر بڑی تعریف کے ساتھ کیا ہے۔ سورۂ تحریم کی آیت 11 میں ارشاد خداوندی ہے: "اور اہل ایمان کے معاملے میں اللہ تعالیٰ فرعون کی بیوی کی مثال پیش کرتا ہے‘ جب کہ اس نے دعا کی۔ کہا‘ اے میرے رب میرے لیے اپنے ہاں جنت میں ایک گھر بنا دے اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے بچا لے اور ظالم قوم سے مجھے نجات دے۔"

اس فضیلت مآب خاتون کے متعلق رسول خدا ﷺ نے فرمایا: "مردوں میں تو بہت سے لوگ کمال کو پہنچے ہیں‘ لیکن عورتوں میں آسیہ علیہا السلام فرعون کی بیوی اور مریم علیہا السلام بنت عمران درجہ کمال کو پہنچی تھیں اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی دیگر عورتوں پر فضیلت ایسی ہے۔ جیسے ثرید کی دوسرے کھانوں پر۔"

(امام بخاری بہ روایت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ)

موسیٰ علیہ السلام کی جوانی

اگرچہ آپ شاہی محل سے براہِ راست وابستہ تھے‘ عیش و عشرت کی تمام سہولتیں مہیا تھیں‘ لیکن اس کے باوجود آپ اپنی فطرت کی سلامتی کی وجہ سے کسی ایسی عادت اور

کسی ایسے مشغلے میں ملوث نہیں ہوئے' جو آپ کی اجلی شخصیت کو داغ دار بنانے کا موجب بنے۔ آپ اپنے معاشرے میں ایک اسرائیلی نوجوان کی حیثیت سے متعارف تھے' لیکن آپ کی اس شناخت کے باوجود پوری سرکاری مشینری کا رویہ آپ کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا تھا۔ اسی عالم میں آپ پر شباب کا دور آیا۔ اس وقت آپ حکمت و دانائی' فہم و فراست اور دینی و دنیاوی علوم سے آراستہ ہو چکے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید آپ کے عہد جوانی کا ذکر کرتے ہوئے آپ کے فضائلِ حَسنہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

''جب موسیٰ علیہ السلام اپنی پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کی نشو و نما مکمل ہو گئی تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا۔ ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔''

(قصص 14)

آپ نے زمانہ شاہ زادگی میں تعلیم و تربیت کے ذریعے جو کمال حاصل کیا' بائبل اس کا ذکر ہوئے بتاتی ہے۔ ''موسیٰ نے مصریوں کے تمام علوم کی تعلیم حاصل کی' اور وہ کام اور کلام میں قوت والا تھا۔''

آپ کی جوانی کے دور کی کیفیت بیان کرتے ہوئے تلمود کا بیان ہے: ''موسیٰ فرعون کے گھر میں ایک خوب صورت جوان بن کر اٹھے۔ شاہزادوں کا لباس پہنتے اور لوگ ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ وہ اکثر جشن کے علاقے میں جاتے' جہاں اسرائیلیوں کی آبادیاں تھیں اور ان تمام سختیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے جوان کی قوم کے ساتھ مصری حکومت کے ملازمین کرتے تھے۔ انھی کی کوشش سے فرعون نے اسرائیلیوں کے لیے ہفتے میں ایک دن کی چھٹی مقرر کی۔ انھوں نے فرعون سے کہا کہ مسلسل کام کرنے کی وجہ سے یہ لوگ کم زور ہو جائیں گے اور حکومت کے کام کو نقصان ہو گا۔ اس طرح اپنی دانائی سے آپ نے بہت سے ایسے کام کیے جن کی وجہ سے تمام ملک میں ان کی شہرت ہو گئی تھی۔''

مدین کی طرف ہجرت

پھر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ موسیٰ کو فرعون کی تربیت سے الگ کر کے کسی مومن کی صحبت میں پہنچایا جائے تا کہ ان کی فطرت کا انشراح درجہ کمال کو پہنچ جائے اور وہ علم اور ہدایت میں کامل ترین انسان بن جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک تقریب بہم پہنچائی۔

ایک دفعہ بے وقت محل سے باہر نکل کر جا رہے تھے کہ دیکھا' دو آدمی آپس میں جھگڑ رہے ہیں جن میں ایک اسرائیلی ہے اور دوسرا قبطی۔ اسرائیلی نے حضرت موسیٰ سے فریاد کی کہ اس قبطی کے خلاف اس کی مدد کریں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قبطی کے ایک گھونسا مارا۔ جس کی تاب نہ لا کر قبطی وہیں ڈھیر ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کا ارادہ محض تادیب کرنے کا تھا نہ کہ قتل' سخت پشیمان ہوئے اور دل میں کہنے لگے کہ بلاشبہ یہ شیطان کی کارستانی ہے کہ وہی انسان کو ایسے غلط کاموں پر اکساتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا اور مغفرت کے خواستگار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے مغفرت عطا کر دی' یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پشیمانی زائل ہو گئی اور دل کو سکون مل گیا۔ جس پر شکرانِ نعمت کے طور پر موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا کہ وہ آیندہ کسی مجرم کی مدد نہیں کریں گے۔ (القصص۔ آیات 15 تا 17)

اس قتل کا راز کس طرح افشا ہوتا ہے اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے قرآن مجید بتاتا ہے: ''دوسرے روز وہ صبح سویرے ڈرتا ہوا اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتا ہوا شہر میں جا رہا تھا کہ یکا یک کیا دیکھتا ہے کہ وہی شخص (اسرائیلی) جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا' آج پھر اسے پکار رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا' تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے۔ روزانہ کسی نہ کسی سے جھگڑتا رہتا ہے اور اس کے بعد اس قبطی کو الگ کرا دینے کی غرض سے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ اسرائیلی یہ سمجھ کر کہ چوں کہ اسے ڈانٹا ہے' لہٰذا لازمی طور پر اسے مارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہے' فوراً چیخ اٹھا: ''اے موسیٰ علیہ السلام' کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے' جس طرح تو کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے''

(القصص۔15۔19)

بائبل کا بیان ہے کہ آپس میں لڑنے والے دونوں اسرائیلی تھے' لیکن قرآن مجید اس کے بیان کی اصلاح کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ ان میں ایک اسرائیلی تھا اور دوسرا قبطی تھا۔ چنانچہ جب اسرائیلی نے قبطی کے سامنے کل کے واقعے کی رُوداد بیان کر دی تو راز فاش ہو گیا اور قبطی نے کارکنانِ حکومت کے پاس اس کی رپورٹ کر دی' جس کے نتیجے میں ایوانِ حکومت میں آپ کی گرفتاری کے مشورے ہونے لگے۔

آپ کے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہو گیا' جس کی خبر آپ کے ایک خیر خواہ کو مل گئی۔ جو یقیناً اسرائیلی ہو گا۔ اس نے بڑی سرعت کے ساتھ آپ کو اس کی اطلاع دی اِس کی تفصیل سورۂ القصص کی آیات 20 تا 22 میں یوں دی گئی ہے: ''اس کے بعد ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا: ''موسیٰ' سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں۔ یہاں سے نکل جا۔ میں تیرا خیر خواہ ہوں۔ خبر سنتے ہی موسیٰ ڈرتا اور سہا ہوا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی: ''اے میرے رب' مجھے ظالموں سے بچا۔'' مصر سے نکل کر جب موسیٰ علیہ السلام نے مدین کا رخ کیا تو اس نے کہا: امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا۔''

آپ نے یہ وحشت ناک خبر سنتے ہی مصر سے نکلنے کے لیے مدین کا رخ کیا' کیوں کہ قریب ترین آزاد اور آباد علاقہ یہی تھا۔ مدین کا علاقہ اس وقت فرعون کی سلطنت سے باہر تھا۔ مصر کی حکومت پورے جزیرہ نما سینا پر نہ تھی' بلکہ صرف جنوبی اور مغربی حصے اس کی حدود میں شامل تھے۔ خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی ساحل' جن پر بنی مدیان آباد تھے' مصری تسلط اور اثر و اقتدار سے بالکل آزاد تھے۔

قدیم و جدید سیاحوں' جغرافیہ نویسوں اور عربوں کی روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکل کر مدین کے جس مقام پر سب سے پہلے پہنچے تھے' وہ خلیج عقبہ کے مغربی ساحل پر مقنا سے چند میل جانب شمال واقع تھا۔ آج کل اسے البدع کہتے ہیں اور وہاں ایک چھوٹا سا قصبہ آباد ہے۔ مقامی روایات کے مطابق مدین اسی

جگہ واقع تھا۔ اس کے قریب تھوڑے فاصلے پر وہ جگہ ہے جسے "مغائر شعیب" کہتے ہیں۔ اس سے تقریباً میل ڈیڑھ میل کے فاصلے پر کچھ قدیم کھنڈر موجود ہیں، جن میں دو اندھے کنوئیں ہیں۔ ان میں سے ایک کنواں وہ تھا، جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بکریوں کو پانی پلایا تھا (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے)

بالآخر کئی روز کی تھکا دینے والی مسافت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین یا مدیان کے قبیلے میں پہنچ گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کی بستی کے باہر ایک کنوئیں کے پاس پہنچے، جہاں کچھ لوگ اپنے اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ دو عورتیں اپنے جانور روکے الگ کھڑی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان عورتوں سے پوچھا "تمھیں کیا پریشانی ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے، جب تک کہ یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں، اور ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔" حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کے جانوروں کو پانی پلایا اور سایے کی جگہ جا بیٹھے اور بے چارگی کے عالم میں ایک مرتبہ پھر اسی ذات کی طرف رجوع کیا جو ولادت سے لے کر اب تک ان کی حفاظت اور راہ نمائی فرما رہی تھی۔ رب غفور نے فی الفور دعا قبول فرمائی۔ اور آپ پر خیر کے دروازے کھول دیے گئے۔ یہ کیسے ہوا؟ قرآن مجید اس کے جواب میں واقعات کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے:

"کچھ دیر نہ گزری تھی کہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم و حیا سے چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں، تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے، اس کا اجر دیں۔" موسیٰ علیہ السلام جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ سنایا تو اس نے کہا: "کچھ خوف نہ کرو۔ اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو۔"

ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا: "ابا جان! اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے۔ بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں، وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔"

اس کے باپ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ اپنی ان دو بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمھارے ساتھ کر دوں، بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمھاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم ان شاء اللہ مجھے نیک پاؤ گے۔" موسیٰؑ نے جواب دیا: "یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کر دوں، اس کے بعد پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو اور جو کچھ قول و قرار ہم کر رہے ہیں، اللہ اس پر نگہبان ہے۔" (القصص آیات 25 تا 28)

یہ بزرگ کون تھے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلافات ہیں۔ قرآن مجید نے ان بزرگ کا نام نہیں بتایا۔ حافظ افروغ احسن نے اپنے مقالے میں ان اختلافات کے بارے میں یوں لکھا ہے: "یہ بزرگ شخص، جس نے آپ کو تسلی دی اور باعزت ٹھکانا دیا، یہاں تک کہ اپنی ایک بیٹی آپ کے نکاح میں دے کر اپنے گھر کا ایک فرد بنا لیا، مفسرین کے بیان کے مطابق حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ گو علامہ ابن کثیر اور علامہ ابن جریر جیسے محققین نے رائے ظاہر کی ہے کہ مفسرین نے جن روایات کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے، ان کی اسناد قابلِ اعتبار نہیں۔ تاہم اکثر مفسرین کی رائے یہی ہے۔ بائبل میں ایک جگہ ان کا نام "رعوایل" اور دوسری جگہ "یترو" بتایا گیا ہے۔ قرآن مجید کے اسلوب بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح دین ابراہیمی علیہ السلام پر قائم تھے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت اسحاق ابن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے تھے، تو یہ بزرگ بھی مدیان بن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔"

منصبِ نبوت پر سرفرازی

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ظلم سے بچ کر مدین آئے تھے، اس وقت آپ کی عمر تقریباً بیس سال تھی۔ آپ پورے دس سال مدین میں رہے۔ مصر میں آپ کی حیثیت ایک شہزادے کی تھی اور ناز و نعمت میں وقت گزر رہا تھا، لیکن مدین میں آپ کے سپرد کام ہوا، وہ بھیڑ بکریوں اور جانوروں کو جنگلوں میں چرانا تھا۔ گلہ بانی کے اس کام سے آپ میں نگرانی و نگہبانی، چوکسی و مستعدی اور جفاکشی و سخت کوشی کی صلاحیتیں پوری طرح پروان چڑھیں، جو آپ کی داعیانہ اور قائدانہ زندگی میں پوری طرح کارگر ثابت ہوئیں۔

مدین آتے ہی آپ کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ تواریخ میں بیوی کا نام "صفورا" مذکور ہے۔ اللہ نے آپ کو اولاد کی نعمت سے بھی نوازا۔ اسی عرصے میں مصر کا فرعون رعمسیس دوم مر گیا اور اس کے بعد اس کا تیرھواں بیٹا منفتاح، جو اپنے باپ کی زندگی میں کاروبارِ حکومت میں شریک تھا، سریر آرائے سلطنت ہوا۔

حضرت حسنؓ بن حضرت علیؓ کے بیان کے مطابق حضرت موسیٰ نے مدین میں آٹھ سال کی بجائے دس سال کی مدت پوری کی۔ اس کے بعد آپ نے مصر واپس جانے کا پروگرام بنایا، کیوں کہ آپ نے سوچا کہ دس سال گزر چکے ہیں اور وہ فرعون بھی مر چکا ہے، جس کے زمانہ میں وہ مصر سے نکلے تھے۔ اب اگر خاموشی کے ساتھ وہاں جاؤں اور اپنے خاندان والوں کے ساتھ رہنے لگوں تو شاید کسی کو بھی پتا نہ چلے۔

آپ نے اپنے پروگرام کے مطابق اپنے اہل و عیال اور اپنے مویشیوں کے ساتھ مدین سے مصر کا سفر اختیار کیا اور اس مقصد کے لیے وہ راستہ منتخب کیا، جس پر کوہ طور واقع ہے۔ قرآن مجید آپ کے اس سفر کا ذکر اس طرح کرتا ہے: "جب موسیٰ علیہ السلام نے مدت پوری کر دی اور وہ اپنے اہل و عیال کو لے کر چلا تو طور کی جانب اسے ایک آگ نظر آئی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے کہا، ٹھہرو، میں نے ایک آگ دیکھی ہے۔ شاید میں وہاں سے کوئی خبر لے آؤں یا اس آگ سے کوئی انگارا ہی اٹھا لاؤں جس سے تم تاپ سکو (القصص 29)

قرآنِ مجید ایک اور مقام پر آپ کو دوران سفر میں پیش آنے والے اس واقعے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے: "انھیں اس وقت کا قصہ سناؤ، جب موسیٰ علیہ

سلام نے اپنے گھر والوں سے کہا: ''مجھے آگ سی نظر آتی ہے' میں ابھی وہاں سے کوئی برلے کر آتا ہوں یا کوئی انگارا چن لاتا ہوں' تاکہ تم لوگ گرم ہوسکو'' (النمل: 7)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب آپ مدین سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی حصے میں اس مقام پر پہنچے جو اب کوہ سینا اور جبل موسیٰ علیہ السلام کہلاتا ہے اور جس وقت قرآن مجید نازل ہورہا تھا' اس وقت یہ ''طور'' کے نام سے مشہور تھا۔ یہ رات کا وقت تھا اور موسم سخت سرد تھا۔ آپ ایک اجنبی علاقے سے گزر رہے تھے' جس سے آپ کو کوئی زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے اپنے گھر والوں سے کہا کہ میں جاکر معلوم کرتا ہوں۔ یہ کون سی بستی ہے آگ جل رہی ہے اور یہاں سے کدھر کدھر کو راستے جاتے ہیں' اور اگر معلومات نہ بھی مل سکیں۔ تو کم از کم آگ کے کچھ انگارے ہی لے آؤں' تاکہ تم آگ جلا کر کچھ گرمی ہی حاصل کرسکو۔

وادی میں پہنچ کر آپ نے عجب حیران کن منظر دیکھا۔ آپ نے مشاہدہ کیا کہ ایک درخت سے عجیب وغریب اور پُر ہیبت شعلے بھڑک رہے ہیں۔ آگ جس قدر بڑھتی ہے درخت اسی قدر زیادہ سرسبز وشاداب ہوجاتا ہے اور جوں جوں درخت کی سرسبزی اور شادابی میں اضافہ ہوتا ہے' آگ کا اشتعال بھی تیز ہوتا جاتا ہے۔ یہ آگ دنیا کی عام آگ نہ تھی' بلکہ یہ تجلیاتِ الٰہی کی ضیا پاشی تھی' جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے:

(''موسیٰ) وہاں پہنچا تو پکارا گیا' اے موسیٰ علیہ السلام میں ہی تیرا رب ہوں۔ جوتیاں اُتار دے۔ تو وادی مقدس طویٰ میں ہے' اور مَیں نے تجھے چن لیا ہے۔ سن' جو کچھ وحی کیا جاتا ہے۔ میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔ قیامت کی گھڑی ضرور آنے والی ہے۔ میں اس کا وقت مخفی رکھنا چاہتا ہوں' تاکہ ہر متنفس اپنی سعی کے مطابق بدلہ پائے۔ پس کوئی ایسا شخص جو اس پر ایمان نہیں لاتا اور اپنی خواہشِ نفس کا بندہ بن گیا ہے' تجھے اس گھڑی کی فکر سے نہ روک دے' ورنہ تو ہلاکت میں پڑ جائے گا'' (طٰہٰ 11 تا 16)

اس مقام پر آپ کو نبوت کے جلیل القدر منصب پر فائز کردیا گیا اور ساتھ ہی دین حق کی وہ بنیادی تعلیمات بھی القا کردی گئیں جن کی طرف تمام انبیائے کرام نے بندگان خدا کو دعوت دی ہے' یعنی توحید اور آخرت۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان جو مکالمہ ہوا' قرآن مجید نے اسے نہایت دل نشین پیرائے میں روایت کیا ہے۔:

غیبی ندا: ''اے موسیٰ علیہ السلام' یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟''

موسیٰ علیہ السلام: ''یہ میری لاٹھی ہے۔ اس پر ٹیک لگا کر چلتا ہوں۔ اس سے اپنی بکریوں کے لیے پتے جھاڑتا ہوں۔ اور بھی بہت سے کام ہیں جو اس سے لیتا ہوں''

غیبی ندا: ''پھینک دے اسے اے موسیٰ علیہ السلام''

(اس نے پھینک دیا اور یکا یک وہ ایک سانپ بنا جو دوڑ رہا تھا)

غیبی ندا: ''پکڑ لے اسے اور ڈر نہیں۔ ہم اسے پھر ویسا ہی کردیں گے جیسی یہ تھی۔ اور ذرا اپنا ہاتھ بغل میں دبا' چمکتا ہوا نکلے گا بغیر کسی تکلیف کے۔ یہ دوسری نشانی ہے' اس لیے کہ ہم تجھے اپنی بڑی نشانیاں دکھانے والے ہیں۔ اب تو فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہوگیا ہے۔''

موسیٰ علیہ السلام: ''میرا سینہ کھول دے' اور میرے کام کو میرے لیے آسان کردے' اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے' تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں اور میرے لیے میرے کنبے سے ایک وزیر مقرر کردے ہارون جو میرا بھائی ہے' اُس کے ذریعے میرا ہاتھ مضبوط کر اور اسے میرے کام میں شریک کردے تاکہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں' تو ہمیشہ میرے حال پر نگران رہا ہے''

غیبی ندا: ''اے موسیٰ علیہ السلام' جو تونے مانگا' تجھے دیا گیا'' (طٰہٰ 17 تا 36)

یوں اچانک حضرت موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوت پر سرفراز کرنے اور چند بنیادی تعلیمات دینے کے بعد باری تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا کے اژدھا بن جانے اور ید بیضا کے دو معجزے عطا کیے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بھی بتادیا گیا کہ یہ دو معجزے من جملہ ان نو معجزوں کے ہیں جن کے ساتھ تمھیں مشن پر بھیجا جارہا ہے (نمل۔ 12)

اب آپ اپنے اہلِ خانہ اور اپنے مویشیوں کے ساتھ مصر کی طرف بڑھے۔ اسی دوران میں مصر میں حضرت ہارون علیہ السلام کو نبی بنایا گیا اور خدا کے حکم سے وہ اپنے چھوٹے بھائی موسیٰ علیہ السلام سے ملنے کے لیے بیابان سینا کی طرف روانہ ہوئے اور کوہ طور کے قریب پہنچ کر آپ کی پیشوائی کی۔ دونوں طرف سے محبت واُلفت کے جذبات کا اظہار ہوا۔ اس وقت دونوں بھائیوں کو وحی کے ذریعے حکم ملا: جا' تو اور تیرا بھائی میری نشانیوں کے ساتھ۔ اور دیکھو' تم میری یاد میں تقصیر نہ کرنا۔ جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا۔ شاید کہ وہ نصیحت قبول کرلے یا ڈر جائے'' (طٰہٰ۔ 42 تا 44) اس حکم پر دونوں بھائیوں نے پورے ادب کے ساتھ عرض کیا: ''پروردگار ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا پل پڑے گا'' (طٰہٰ۔ 45)

اس اندیشے کو دور کرنے کے لیے ان کے رب نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ڈرو مت' میں تمھارے ساتھ ہوں۔ سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔ جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لیے چھوڑ دے اور انھیں تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہے اس کے لیے جو راہ راست کی پیروی کرے۔ ہمیں وحی سے بتایا گیا ہے کہ عذاب ہے اس کے لیے جو جھٹلائے اور منہ موڑے۔ (طٰہٰ۔ 46 تا 48)

قرآن مجید نے فرعون اور اس کے امراء اور وُسا کے پاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے دو مقاصد بیان کیے ہیں: ''اول بنی اسرائیل کی رہائی اور انھیں مصر سے باہر نکال لے جانا دوم' فرعون اور اس کے اُمراء اور وُسا کو راہِ راست دکھانا' شاید وہ نصیحت پکڑ لیں۔ فرعون' ہامان' قارون اور سلطنت فرعونی کے اکابر' جنھیں قرآن ''مستکبرین''

بتاتا ہے' سے مراد وہ لوگ ہیں جو سیاسی' سماجی اور معاشی لحاظ سے مقتدر تھے' اور بنی اسرائیل یا عباداللہ سے مراد صرف آل یعقوب علیہ السلام نہیں۔

مصر سے نجات پانے والوں سے مراد ایک نسلی گروہ یعنی آل یعقوب علیہ السلام نہیں' بلکہ اس سے مراد تمام مظلوم و مقہور لوگ تھے۔جنھیں قرآن ''مستضعفین'' بتلاتا ہے' یعنی وہ لوگ جو معاشرتی اور معاشی طور پر پسے ہوئے اور کچلے ہوئے تھے اور جنھیں آخر کار حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے بحفاظت و سلامت نکال کر صحرائے سینا میں لے گئے (ان میں بنی اسرائیل بھی تھے۔)

فرعون کے دربار میں

خدا کے یہ دونوں نبی' موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام فرعون منفتاح کے دربار میں پہنچے اور کہا کہ ہم دونوں رب العالمین کے نمائندے ہیں۔ہم تیرے پاس اس لیے آئے ہیں کہ تجھے خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دیں اور ساتھ ہی تجھ سے کہیں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے تاکہ وہ تیرے ظلم و ستم کے شکنجے سے آزاد ہوں۔اس پر فرعون اور آپ کے درمیان اس طرح گفتگو ہوئی:

فرعون: ''کیا ہم نے تجھے اپنے ہاں بچہ سا نہیں پالا تھا۔تو نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے ہاں گزارے اور اس کے بعد کر گیا جو کچھ کر گیا۔تو بڑا احسان فراموش آدمی ہے۔''

موسیٰ: ''اُس وقت وہ کام مَیں نے نادانستگی میں کر دیا تھا۔پھر میں تمھارے خوف سے بھاگ گیا۔اس کے بعد میرے رب نے مجھے حکم عطا کیا اور مجھے رسولوں میں شامل فرمالیا۔رہا تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا تھا''

فرعون: ''اور یہ رب العالمین کیا ہوتا ہے؟''

موسیٰ علیہ السلام: ''آسمانوں اور زمین کا رب' اور ان سب چیزوں کا رب جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں' اگر تم یقین لانے والے ہو''

(فرعون نے اپنے گرد و پیش کے لوگوں سے کہا ''سنتے ہو؟'')

موسیٰ علیہ السلام: ''وہ تمھارا بھی رب ہے اور تمھارے اُن آباؤ اجداد کا بھی رب جو گزر چکے ہیں۔''

فرعون: (حاضرین سے) ''تمھارے یہ رسول صاحب' جو تمھاری طرف بھیجے گئے ہیں بالکل ہی پاگل معلوم ہوتے ہیں۔''

موسیٰ: ''مشرق اور مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے' سب کا رب۔اگر آپ لوگ کچھ عقل رکھتے ہیں''

فرعون: اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کردوں گا جو قید خانوں میں پڑے سڑ رہے ہیں۔

موسیٰ: ''اگرچہ میں لے آؤں تیرے سامنے ایک صریح چیز بھی؟''

فرعون: اچھا تو لے آ' اگر تو سچا ہے''

(اس کی زبان سے یہ بات نکلتے ہی آپ نے اپنا عصا پھینکا اور یکا یک وہ ایک صریح اژدھا تھا۔پھر آپ نے اپنا ہاتھ بغل سے کھینچا اور وہ سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا)۔(شعرا۔18 تا 33)

فرعون نے آپ کی پر مغز اور فکر انگیز باتیں سننے اور پیش کردہ معجزے دیکھنے کے باوجود جو طرزِ عمل اختیار کیا' اس میں آپ کی تکذیب بھی تھی اور تضحیک بھی' اور ساتھ ہی اس نے کھلم کھلا دھمکیاں بھی دیں' لیکن آپ اپنے موقف پر پوری عزیمت و استقامت سے ڈٹے رہے اور مسلسل دعوت و ارشاد کا فریضہ انجام دیتے رہے۔آپ اسے مخاطب کر کے بار بار حقیقت کی طرف توجہ دلاتے رہے: ''اے فرعون! میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں۔میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں۔میں تم لوگوں کے پاس تمھارے رب کی طرف سے صریح دلیل ماموریت لے کر آیا ہوں' لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے''

فرعون نے کہا: اگر تو کوئی نشانی لایا ہے اور اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے پیش کر'' موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا اور یکا یک وہ ایک جیتا جاگتا اژدھا تھا۔اس نے اپنی جیب سے ہاتھ نکالا اور سب دیکھنے والوں کے سامنے وہ چمک رہا تھا''

(اعراف۔104 تا 108)

آپ کا اندازِ تبلیغ و دعوت اتنا موثر اور دل نشیں تھا اور آپ کی پیش کردہ نشانیاں اتنی واضح اور صریح تھیں کہ مخالفین کے دل آپ کی صداقت کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہے' لیکن اغراض و مفادات کی کشش انھیں قبول حق سے روکے ہوئے تھی۔قرآن مجید اس حقیقت کو اس طرح واضح کرتا ہے:

''مگر جب ہماری کھلی کھلی نشانیاں ان لوگوں (فرعونیوں) کے سامنے آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو کھلا جادو ہے۔انھوں نے سراسر ظلم اور غرور کی راہ سے ان نشانیوں کا انکار کیا حالانکہ دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔اب دیکھ لو ان مفسدوں کا انجام کیسا ہوا۔''(نمل:13' 14)

آپ کی دعوت کے اثرات

حضرت موسیٰ علیہ السلام تقریباً تیس سال کی عمر میں واپس مصر تشریف لائے۔آپ نے کھلے عام اپنی نبوت کا اعلان کیا۔بنی اسرائیل کی پوری قوم نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی۔آپ نے فرعون کے سامنے بھرے دربار میں پیغامِ حق کا آوازہ بلند کیا اور نشانیاں پیش کیں۔فرعون نے آپ کو جھٹلایا' دھمکیاں دیں اور آپ کو مرعوب کرنے کے لیے آپ کے خلاف درج شدہ مقدمہ قتل کا ذکر بھی کیا' لیکن اس کے باوجود اسے آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی حالانکہ یہ فرعون اور اس کا باپ ہزاروں اسرائیلی بچوں کو پوری بے دردی سے قتل کرا چکا تھا۔

آپ بلا خوف و خطر ملک کے ہر گوشے اور ہر حصے میں بندگانِ خدا تک اسلام کی دعوت پہنچا رہے تھے۔آپ کی یہ آزادی اور بے باکی مصر کی قبطی قوم اور حکمران طبقے کو سخت حیرت زدہ کیے ہوئی تھی۔ہر ہوش مند انسان دل سے یہ بات باور کرنے پر مجبور تھا

کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اس کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کی پشت پر کوئی ایسی طاقت ضرور ہے جس نے ان دونوں کو اتنا پُر جلال اور پر رعب بنا دیا ہے کہ دنیا کے بڑے سے بڑے طاقت وَر اور جابر فرماں روا کی بھی یہ جرأت نہیں کہ ان کے سامنے آنکھ اٹھا کر ہی دیکھ سکے۔

ملک کی فضا میں یہ تاثر عام ہوتا گیا۔ اسے فرعون اور اس کے درباریوں نے شدت سے محسوس کیا۔ انھیں اپنے اقتدار کا سنگھاسن ڈولتا نظر آیا۔ اس لیے فرعون نے آپ کی تحریکِ دعوت اور باوقار شخصیت کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ایک منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد تھا کہ وہ اپنی قوم کو یقین دلائے کہ

1: موسیٰ رب العالمین کا فرستادہ نہیں بلکہ محض ایک جادوگر ہے۔
2: وہ اپنے جادو کی طاقت کے بل بوتے پر ملک کے اقتدار پر قبضہ کر کے موجودہ حکمرانوں کو ملک بدر کرنا چاہتا ہے۔
3: وہ اپنی انسانی مساوات کی تحریک کے ذریعے قبطی قوم کے اعلیٰ اور بلند معیارِ زندگی کو ختم کر کے ملک کے ذلیل اور کمین لوگوں کے ہم پلہ بنانا چاہتا ہے
4: وہ ہمارے طرزِ زندگی اور نظامِ حیات کو گم راہی و کج روی کا شکار قرار دے کر ہمارے آباؤ اجداد کی توہین کا ارتکاب کر رہا ہے۔

یہ تھے وہ بنیادی نکات جن کے ذریعے اس نے اپنی قوم کو آپ کے خلاف ورغلانے' بھڑکانے اور اشتعال دلانے کی ایک ہمہ گیر پروپیگنڈا مہم کا آغاز کیا اور سلطنت کے تمام وسائل اس کی کام یابی کے لیے وقف کر دیے۔ قرآن مجید نے اس کی اس مہم کا مختلف مقامات پر ذکر کیا ہے چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

—''فرعون نے (معجزات دیکھنے کے بعد) اپنے گرد وپیش کے سرداروں سے کہا' یہ شخص (موسیٰ علیہ السلام) یقیناً جادوگر ہے۔ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے۔ اب بتاؤ تم کیا حکم دیتے ہو؟''

انھوں نے کہا ''اسے اور اس کے بھائی کو روک لیجیے اور شہروں میں ہرکارے بھیج دیجیے کہ ہر سیانے جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔''

(سورۂ شعرا: آیات 34 تا 37)

قرآن مجید اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ آپ کو جادوگر قرار دینے اور جادوگروں کے ساتھ آپ کا مقابلہ کرا کے آپ کے دعوائے نبوت کا پول کھولنے کا خیال صرف فرعون ہی کا نہیں تھا بلکہ اس کے مصاحبوں نے بھی معجزات دیکھ کر اسی خیال اور رائے کا اظہار کیا تھا:

(''حضرت موسیٰ سے کھلی نشانیاں دیکھنے کے بعد) فرعون کی قوم کے سرداروں نے آپس میں کہا کہ یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے' تمھیں تمھاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ اب کہو کیا کہتے ہو؟ پھر اُن سب نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اسے اور اس کے بھائی کو انتظار میں رکھے اور تمام شہروں میں ہرکارے بھیج دے کہ ہر ماہرِ فن جادوگر کو آپ کے پاس لے آئیں۔ (سورۂ اعراف' آیات: 109 تا 112)

فرعون اپنی قوم کے لوگوں کو آپ کے خلاف مشتعل کرنے کے لیے آپ سے برسرِ دربار سوال و جواب کرتا ہے۔ قرآن مجید انھیں اس طرح بیان کرتا ہے:

فرعون: ''اے موسیٰ علیہ السلام اچھا تو پھر تم دونوں کا رب کون ہے؟''

موسیٰ: ''ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی (یعنی پیدا کیا) پھر اسے راستہ بتایا۔''

فرعون: ''اور پہلے جو نسلیں گزر چکی ہیں۔ ان کی پھر کیا حالت تھی؟''

موسیٰ: اس کا علم میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں محفوظ ہے۔ میرا رب بھولتا ہے نہ چوکتا ہے۔ وہ وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کا فرش بچھایا اور اس میں تمھارے چلنے کو راستے بنائے اور اُوپر سے پانی برسایا۔ پھر اس کے ذریعے مختلف اقسام کی پیداوار نکالی۔'' (سورۂ طٰہٰ آیات 49 تا 53)

فرعون نے آپ سے گزشتہ نسلوں کے متعلق اس لیے سوال کیا تھا کہ آپ کہیں گے کہ وہ بھی گم راہ تھے' اس سے اسے اپنے لوگوں کو بھڑکانے کا موقع مل جائے گا' لیکن آپ نے اسے حکیمانہ انداز میں جواب دے کر لاجواب کر دیا۔

جب مقابلے کے لیے تمام نام وَر جادوگر جمع ہو گئے تو فرعون نے انھیں اور پورے مجمع عام کو خطاب کرتے ہوئے آپ کے خلاف صف آرا ہونے کی اپیل کی۔ قرآن مجید نے یہ اپیل اس کے خصوصی مشیروں کی زبانی نقل کی ہے:

''یہ دونوں تو محض جادوگر ہیں۔ ان کا مقصد ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمھاری زمین سے بے دخل کر دیں اور تمھارے مثالی طریق زندگی کا خاتمہ کر دیں۔ اپنی ساری تدبیریں آج اکٹھی کر لو اور ایک ایک کر کے میدان میں آؤ۔''

(سورۂ طٰہٰ آیات 63 تا 64)

فرعون اور اس کے مشیر اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ جادوگروں نے کبھی اپنے جادو کے زور سے کوئی سیاسی انقلاب برپا نہیں کیا۔ وہ اپنے ملک میں روزانہ دیکھتے تھے کہ جادوگر اپنے کرتب دکھا کر لوگوں سے بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ وہ اپنی شعبدہ بازی کے باوجود ملک میں کبھی سیاسی اور انقلابی قوت نہ بن سکے۔ تاہم فرعون اور اس کے ساتھی اپنے موقف کی کم زوری کا احساس کرنے کے باوجود اپنی بات پر ڈٹے رہے۔

مقابلے کا دن اور وقت

جادوگروں سے آپ کا یہ مقابلہ فرعون کے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ وہ اس کے فیصلے کو اپنی قسمت کا فیصلہ قرار دے چکا تھا' اس لیے اس نے تمام ملک میں ہرکارے دوڑا دیے تا کہ وہ جادوگروں کو ملک کے کونے کونے سے لا کر جمع کریں۔ چنانچہ فرعونیوں نے اپنی اس تیاری کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا:

''اچھا' ہم بھی تیرے مقابلے میں ویسا ہی جادو لاتے ہیں' طے کر لے کہاں اور کب مقابلہ کرنا ہے' نہ ہم اس قرارداد سے پھریں گے نہ تو پھریؤ کھلے میدان میں سامنے آ جا۔'' (سورۂ طٰہٰ آیت 58)

ان کے فیصلوں سے آپ کی دلی مراد بر آئی۔ اس طرح آپ کو موقع مل رہا تھا کہ

آپ لوگوں کے ایک بڑے مجمع کے سامنے اپنی صداقت اور مخالفوں کی گمراہی کا مظاہرہ کر سکیں۔ اس لیے آپ نے فرمایا کہ الگ کوئی دن اور جگہ مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے، جشن کا دن قریب ہے جس میں تمام ملک کے لوگ دار السلطنت میں کھنچ کر آ جاتے ہیں۔ وہیں میلے کے میدان میں مقابلہ ہو جائے اور وقت بھی دن کی روشنی کا ہوتا کہ اس مقابلے کا نتیجہ ساری قوم دیکھ لے اور کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے۔ آپ نے فرمایا: ''جشن کا دن طے ہوا اور دن چڑھے لوگ جمع ہوں۔''

آپ کی تنبیہ

جب لاکھوں انسانوں کی نظریں مقابلے کا منظر دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں، تو آپ نے پیغمبرانہ جلالی شان کے ساتھ مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''شامت کے مارو، نہ جھوٹی تہمتیں باندھو اللہ پر ورنہ وہ ایک سخت عذاب سے تمھارا خانہ خراب کر دے گا۔ جھوٹ جس نے بھی گھڑا وہ نامراد ہوا۔''

آپ کی اس پرجلال تنبیہ سے پورے مجمع پر سناٹا چھا گیا اور منتظمین گھبرا کر آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ قرآن مجید کا بیان ہے:

''یہ سن کر ان کے درمیان اختلاف رائے ہو گیا اور وہ چپکے چپکے مشورہ کرنے لگے۔''

(سورۂ طٰہٰ آیت ۶۲)

آخر کار فیصلہ ہوا کہ قرارداد کے مطابق مقابلہ ہونا چاہیے۔

مقابلہ کا منظر

قرآن مجید نے مقابلہ کے اس منظر کو کئی جگہ نہایت دل پذیر اور فکر انگیز پیرائے میں بیان کیا ہے۔ سورۂ اعراف میں اس کی تفصیل اس طرح بیان ہوئی ہے:

''جادوگر فرعون کے پاس آ گئے اور انھوں نے کہا ''اگر ہم غالب رہے تو ہمیں اس کا صلہ ضرور ملے گا؟''

فرعون نے جواب دیا ''ہاں اور تم مقرب بارگاہ ہو گے۔'' پھر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا ''تم پھینکتے ہو یا ہم پھینکیں؟''

''موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا ''تم ہی پھینکو۔''

انھوں نے جو اپنے انچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوف زدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے۔

ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اشارہ کیا کہ پھینک اپنا عصا، اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ ان کے جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔

اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انھوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی مقابلہ میں مغلوب ہوئے اور فتح مند ہونے کے بجائے الٹے ذلیل ہو گئے۔ (سورۂ اعراف آیات 119 تا 133)

قرآن مجید نے سورۂ طٰہٰ میں اس منظر کی جزئیات کو مزید وضاحت کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے:

جادوگر بولے ''موسیٰ علیہ السلام تم پھینکتے ہو یا پہلے ہم پھینکیں؟''

''موسیٰ نے کہا ''نہیں، تم ہی پھینکو۔''

یکا یک ان کی لاٹھیاں اور رسیاں ان کے جادو کے زور سے موسیٰ کو دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں اور موسیٰ اپنے دل میں ڈر گیا۔ ہم نے کہا مت ڈر تو ہی غالب رہے گا۔ پھینک جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے ابھی ان کی ساری بناوٹی چیزوں کو نگلے جاتا ہے۔ یہ جو کچھ بنا کر لائے ہیں یہ تو جادوگری کا فریب ہے اور جادوگر کبھی کام یاب نہیں ہو سکتا خواہ کسی شان سے وہ آئے۔'' (سورۂ طٰہٰ آیات 65 تا 69)

اس دل چسپ اور عبرت انگیز واقعہ کو قرآن مجید نے سورۂ شعرا میں نہایت پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''چنانچہ ایک روز مقررہ وقت پر جادوگر اکٹھے کر لیے گئے اور لوگوں سے کہا گیا تم اجتماع میں چلو گے شاید ہم جادوگروں کے دین ہی پر رہ جائیں اگر وہ غالب رہے۔ جب جادوگر میدان میں آئے تو انھوں نے کہا:

''ہمیں انعام تو ملے گا اگر ہم غالب رہے۔

اس نے کہا ہاں اور تم اس وقت مقربین میں شامل ہو جاؤ گے۔

موسیٰ نے کہا پھینکو جو کچھ تم نے پھینکنا ہے۔

انھوں نے فوراً اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینک دیں اور بولے:

''فرعون کے اقبال سے ہم ہی غالب رہیں گے۔''

پھر موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا تو یکا یک وہ ان کے جھوٹے کرشموں کو ہڑپ کرتا چلا جا رہا تھا۔'' (سورۂ شعرا آیات 41 تا 46)

قرآنِ مجید کے مندرجہ بالا اقتباسات سے عیاں ہے کہ جادوگر اس مقابلے میں صرف انعام واکرام کے لالچ میں شریک ہوئے تھے۔ انھوں نے میدان میں اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں جو جادو کے زور سے سانپوں کی شکل میں تبدیل ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف لپکتی ہوئی نظر آنے لگیں جس سے آپ نے خوف بھی محسوس کیا، لیکن جب آپ نے خدا کے حکم سے اپنا عصا میدان میں پھینکا تو طلسم کا اثر زائل ہو گیا۔ اب رسیاں اور لاٹھیاں اپنی اصل حالت میں میدان میں بے حس وحرکت پڑی ہوئی تھیں۔

جادوگروں کا طرزِ عمل

یہ جادوگر اپنے فن میں ماہر تھے۔ انھوں نے خود مشاہدہ کر لیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کے متعلق کہا گیا تھا کہ وہ ایک جادوگر ہیں، حقیقت میں رب کائنات کے فرستادہ اور پیغمبر ہیں، جادو سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے وہ جو مسحور کن نشانیاں دکھا رہے ہیں وہ رب ذوالجلال کی عطا کردہ ہیں۔

اس حقیقت کو پا لینے کے بعد انھوں نے پوری بے باکی اور پامردی سے اعلان کیا:

''مان گئے ہم رب العالمین کو.........موسیٰ اور ہارون کے رب کو۔''

(سورۂ شعراء آیات 47 تا 48)

دوسرے مقام پر ان کے فوری ردعمل کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:

''اور جادوگروں کا حال یہ ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انھیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے' ہم نے مان لیا رب العالمین کو' اس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون مانتے ہیں۔''

(سورۂ اعراف آیات ۱۲۰ تا ۱۲۲)

لاکھوں انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے سامنے فرعون کو جس ناکامی اور ذلت وخواری کا سامنا کرنا پڑا اور جس سے اس کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب ہوئے اس کا اندازہ ہر ہوش مند انسان کر سکتا ہے۔ وہ جادوگر جو تھوڑی دیر پہلے اس کی نظرِ کرم کے مشتاق تھے اب انھوں نے اس کے مخالف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم مسلک اور پیروکار ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس پر فرعون نے مغلوب الغضب ہو کر اپنے جبر وستم کا سہارا لیتے ہوئے کہا:

تم اس پر ایمان لے آئے قبل اس کے کہ میں تمھیں اجازت دوں؟ یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش تھی جو تم لوگوں نے اسی دارالسلطنت میں کی تا کہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو۔ اچھا تو اس کا نتیجہ اب تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمھارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور اس کے بعد تم سب کو سولی پر چڑھا دوں گا۔''

(سورۂ اعراف۔ آیات 123 تا 124)

فرعون نے جادوگروں پر حکومتِ وقت کا تختہ اُلٹنے کی سازش میں شرکت کا الزام لگا کر اس سزا کا اعلان کیا جو اس دور میں غداروں، سازشیوں اور باغیوں کے لیے مخصوص تھی' لیکن اب ان پر ایمان کا نشہ چڑھ چکا تھا حقیقتِ حال ان پر واضح ہو چکی تھی۔ اس لیے انھوں نے پوری بے خوفی و بے باکی سے جواب دیا:

''بہر حال ہمیں پلٹنا اپنے رب کی طرف ہے۔ تو جس بات پر ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہمارے رب ہی کی نشانیاں جب ہمارے سامنے آ گئیں تو ہم نے انھیں مان لیا۔'' (سورۂ اعراف۔125 تا126)

ایمان کتنی بڑی طاقت ہے' جب یہ نعمت کسی خوش قسمت کو حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کی ہمت اور حوصلے کی وسعت کا اندازہ کرنا کسی انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ یہی نعمت اب جادوگروں کو حاصل ہو چکی تھی اس لیے انھوں نے سخت ترین سزا کا فیصلہ سننے کے بعد پورے اطمینان سے کہا:

''قسم ہے اُس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے' یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آ جانے کے بعد بھی صداقت پر تجھے ترجیح دیں۔ تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے۔ زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم تو اپنے رب پر ایمان لے آئے' تا کہ وہ ہماری خطائیں معاف کر دے اور اس جادوگری سے جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا تھا' درگزر فرمائے۔ اللہ ہی اچھا ہے اور وہی باقی رہنے والا ہے۔''

(سورۂ طٰہٰ۔ آیات 72 تا 73)

مقابلے کے میدان میں جو کچھ ہوا اس نے فرعونیوں کو بدحواس کر کے رکھ دیا اور ساتھ ہی پورے ملک میں حضرت موسیٰ کے موقف کی فتح اور فرعون کے مسلک کی شکست کی خبریں پھیل گئیں۔ اس فضا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت اور مشن کے پھیلنے کے لیے راہیں ہموار کر دیں اور آپ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ اس صورت حال سے حکومت کی پوری مشینری بوکھلا اٹھی اور قوم کے سرداروں نے جمع ہو کر فرعون سے فریاد کرتے ہوئے کہا:

''کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد پھیلائیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھیں؟'' (سورۂ اعراف آیت۔ (137)

فرعون کے پاس کوئی دلیل نہ تھی جس کے ذریعے وہ آپ کی اصلاحی تحریک کا مقابلہ کرتا۔ آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ تھی کیوں کہ آپ سے ڈرتا تھا' لیکن اپنی ضد اور سرکشی سے بھی باز آنے کو تیار نہ تھا۔ اس کے پاس آپ کا مقابلہ کرنے کے لیے صرف ایک ہی ہتھیار تھا اور وہ تھا طاقت کا ظالمانہ استعمال۔ چنانچہ اس نے متکبرانہ انداز میں جواب دیا:

''میں ان (بنی اسرائیل) کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور ان کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت ان پر مضبوط ہے۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 127)

مصر میں بنی اسرائیل کی نسل کشی کی یہ دوسری مہم تھی۔ پہلی مہم آپ کی پیدائش کے وقت موجودہ فرعون کے باپ رعمسیس دوم نے چلائی تھی جس میں ہزاروں معصوم بچے قتل کر دیے گئے تھے۔ اب یہ دوسری مہم آپ کو زچ کرنے کے لیے جاری کی گئی جس پر آپ کی قوم نے سراپا احتجاج بن کر آپ سے فریاد کی تھی:

''اے موسیٰ' تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 129)

اس پر آپ نے انھیں دلاسا دیتے ہوئے کہا تھا:

''قریب ہے وہ وقت کہ تمھارا رب تمھارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تمھیں زمین میں خلیفہ بنائے تا کہ پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 129)

مصیبت و پریشانی کی اس گھڑی میں آپ نے اپنی قوم کو صبر اور اپنے رب سے مدد مانگنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو' زمین اللہ کی ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخری کامیابی انھی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 128)

بنی اسرائیل میں آپ کا تربیتی کام

بنی اسرائیل ایک مسلمان قوم تھی۔ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسحٰق علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیا کی پاکیزہ اور مقدس تعلیمات کی امین تھی' مگر ایک طویل عرصے کی غلامی نے اس سے ایمان واخلاق کی جملہ خوبیاں سلب کر لی تھیں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ فراعنہ مصر نے اس کی طاقت اور قوت کو کچلنے کے لیے جہاں اس کی نسل کشی جیسے ظالمانہ اقدامات کیے تھے وہیں اس کے دینی تشخص اور ملی حمیت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس کی عبادت گاہوں کو بھی مسمار کر دیا تھا۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے واپس تشریف لائے اور اپنی قوم کو جمع کر کے اس کے سامنے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو سب نے یک زبان ہو کر آپ کی تصدیق کی' لیکن جب فرعون کی شدید مخالفت کی وجہ سے ملک میں حق و باطل کے مابین کش مکش کا سلسلہ شروع ہوا تو اب صرف چند نوجوان ہی ایسے رہ گئے جو آپ کی عملی جدوجہد میں آپ کے معاون اور مددگار کی حیثیت سے ثابت قدم رہے ورنہ اکثریت نے فرعون کے خوف کی وجہ سے غیر جانب داری کی روش اپنانے ہی میں خیریت سمجھی۔

قوم کے اس طرزِ عمل کی نشان دہی قرآن مجید اس طرح کرتا ہے:

(''پھر دیکھو کہ) موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا' فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے جنھیں خوف تھا کہ فرعون انھیں عذاب میں مبتلا کرے گا اور واقعہ یہ ہے کہ فرعون زمین میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر رُکتے نہیں ہیں۔'' (سورۂ یونس۔آیت 83)

قوم کے بڑے لوگوں کی کم ہمتی اور بزدلی کا نقشہ بائبل نے بھی پوری صراحت سے کھینچا ہے جو اس طرح ہے:

''جب وہ (اسرائیلی سردار) فرعون کے پاس سے نکلے آ رہے تھے تو انھیں موسیٰ اور ہارون ملاقات کے لیے راستہ پر کھڑے ملے۔تب انھوں نے ان سے کہا کہ خداوند ہی دیکھے اور تمھارا انصاف کرے' تم نے تو ہمیں فرعون اور اس کے خادموں کی نگاہ میں ایسا گھنونا کیا ہے کہ ہمارے قتل کے لیے ان کے ہاتھ میں تلوار دے دی ہے۔'' (خروج۔باب 16)

تلمود میں درج ہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے کہتے تھے:

''ہماری مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بھیڑیے نے بکری کو پکڑا اور چرواہے نے آ کر اسے بچانے کی کوشش کی اور دونوں کی کش مکش میں بکری کے ٹکڑے اڑ گئے' بس اسی طرح تمھاری اور فرعون کی کھینچا تانی میں ہمارا کام تمام ہو کر رہے گا۔''

یہ لوگ ایک حد تک حق بجانب تھے۔فرعون کی گرفت بڑی سخت تھی۔اس کی تعذیب کے انداز نہایت اذیت ناک اور دردناک تھے۔وہ اپنی آنکھوں سے ایمان لانے والے جادوگروں کا حشر بھی دیکھ چکے تھے جنھیں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے مطابق مقابلے کے دن ہی ہول ناک اذیتیں دے کر شہید کر دیا گیا تھا۔

آپ نے اپنی قوم کی اس کم زوری اور کم ہمتی کا مشاہدہ کر کے اپنی قوم میں ارشاد وہدایت کا جو پروگرام بنایا قرآن مجید نے اس کی دو شقوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔وہ شقیں یہ تھیں:

1: قوم میں ایمان باللہ اور توکل علی اللہ کی زندگی بخش حرارت پیدا کرنا۔

2: اقامت صلوٰۃ کا نظام قائم کر کے اس میں اتفاق واتحاد' نظم وضبط اور اخلاق و اعمال کی پسندیدہ خصوصیت پروان چڑھانا۔

صبر وتوکل کی تلقین

آپ نے ان ایمانی صفات پر جس انداز میں زور دیا اس کا ذکر قرآن مجید یوں کرتا ہے:

''لوگو! اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسا کرو اگر مسلمان ہو۔''

قوم نے اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے کہا:

''ہم نے اللہ ہی پر بھروسا کیا ہے۔اے ہمارے رب' ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا اور اپنی رحمت سے ہمیں کافروں سے نجات دے۔'' (سورۂ یونس۔84 تا 86)

نماز باجماعت کے نظام کا قیام

اس مقصد کی تکمیل کے لیے رب کریم نے اپنے نبیوں کو اس طرح ہدایت فرمائی:

''اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں چند مکان اپنی قوم کے لیے مہیا کرو' ان مکانوں کو قبلہ ٹھہرالو' نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو بشارت دے دو۔''

(سورۂ یونس۔آیت 87)

قرآن مجید نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی پوری نوع انسانی تک یہ مژدہ جاں فزا پہنچا دیا کہ آلام ومصائب' مایوسیوں اور پریشانیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اپنے پالن ہار پر بھروسے اور اس کی بارگاہ میں آداب بندگی بجا لانے سے ہی کامیابی وکامرانی کی روشن راہیں ہموار کی جا سکتی ہیں۔

تنبیہات اور آیاتِ الٰہی

حق کے مقابلے میں فرعونیوں کی بغاوت وسرکشی بڑھتی گئی۔حق کا ساتھ دینے والوں پر زندگی اجیرن بنا دی گئی۔آپ نے دلائل وبراہین سے انھیں سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ان کے دل قبولِ حق کے سلسلے میں پتھر ہوتے چلے گئے۔اس لیے انھیں جھنجوڑنے اور چونکانے کے لیے ان پر مختلف قسم کے عذاب مسلط کیے گئے۔قرآن مجید ان نازل ہونے والی مصیبتوں اور تکلیفوں کو آیاتِ الٰہی قرار دیتا ہے۔اس کا بیان ہے:

''ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو نو نشانیاں عطا کی تھیں۔جو صریح طور پر دکھائی دے رہی تھیں۔اب یہ تم خود بنی اسرائیل سے پوچھ لو کہ جب وہ سامنے آئیں تو فرعون نے یہی کہا تھا نا کہ ''اے موسیٰ میں سمجھتا ہوں کہ تو ضرور ایک سحر زدہ آدمی ہے۔''

موسیٰ نے اس کے جواب میں کہا ''تو خوب جانتا ہے کہ یہ بصیرت افروز نشانیاں رب السموات والارض کے سوا کسی نے نازل نہیں کی ہیں اور میرا خیال یہ ہے کہ اے فرعون تو ضرور ایک شامت زدہ آدمی ہے۔''

(سورۂ بنی اسرائیل۔آیات 101 تا 102)

قرآن مجید نے آپ کے جن نو معجزات کا ذکر کیا ہے ان میں سے دو یعنی' عصا' اور ید بیضا' کا تفصیلی ذکر پہلے ہو چکا ہے۔باقی سات معجزات جن کا ذکر آئندہ ہو گا وہ آفات کی صورت میں فرعونیوں پر نازل ہوئے اور وہ اپنے بے پناہ مادی وسائل کے باوجود ان سے اپنا بچاؤ کرنے میں ناکام رہے۔ہر مرتبہ وہ آپ سے استدعا کرتے تھے کہ آپ اپنے خدا سے دعا کر کے اس مصیبت کو ہم سے ہٹا دیں اور آپ کی دُعا ہی سے انھیں اس مصیبت سے نجات ملتی تھی۔

قرآن مجید ان کے اس طرزِ عمل کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''جب کبھی ان پر بلا نازل ہو جاتی تو کہتے' اے موسیٰ علیہ السلام تجھے اپنے رب کی طرف سے جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے حق میں دعا کر۔ اگر اب کے تو ہم پر سے یہ بلا ٹلوا دے تو ہم تیری بات مان لیں گے اور بنی اسرائیل کو تیرے ساتھ بھیج دیں گے۔'' (سورۂ اعراف۔ آیات 34 تا 35)

اسی طرح آپ کے دشمن آپ کے منصب رسالت کا برملا اقرار کرتے نظر آتے تھے۔

آفات کی تفصیل

بائبل نے نازل ہونے والی دس آفات کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ جب حضرت ہارون علیہ السلام آپ کا عصا دریائے نیل پر مارتے تھے۔ تو وہ آفت نازل ہوتی تھی۔ اس صورت حال کی پوری تفصیل کتاب خروج کے باب ۷ سے باب ۱۲ تک کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

قرآن مجید نے سات آفات کا ذکر کیا ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے:

''ہم نے فرعون کے لوگوں کو کئی سال تک قحط اور پیداوار کی کمی میں مبتلا رکھا۔ شاید انھیں ہوش آئے۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 130)

اس کے بعد بتایا گیا ہے:

''ہم نے ان پر طوفان بھیجا' ٹڈی دل چھوڑے' سرسریاں پھیلائیں' مینڈک نکالے اور خون برسایا۔ یہ سب نشانیاں الگ الگ کر کے دکھائیں' مگر وہ سرکشی کیے چلے گئے اور وہ بڑے ہی مجرم لوگ تھے۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 133)

قرآن مجید کے بیان کی روشنی میں ان آفات کی فہرست اس طرح بنتی ہے:

قحط سالی: بارشیں رُک گئیں اور دریائے نیل خشک ہو گیا۔

پھلوں میں کمی: مناسب بارشوں اور دریائے نیل کی روانی کے باوجود فصلوں کی برداشت میں نمایاں کمی آ گئی۔

طوفان: بارش کا طوفان' جس میں نہایت وزنی اولے پڑے

ٹڈی دل: جو پورے ملک پر چھا گیا اور فصلوں کو تباہ کر گیا۔

سرسریاں: اس ننھے کیڑے نے غلے کے ذخیروں کو مٹی بنا دیا۔

مینڈک: جو اتنی کثرت سے پھیلے کہ لوگوں کی زندگی دوبھر ہو گئی۔

خون: دریائے نیل کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا اور پینے کے لیے خالص پانی کی ایک بوند کا ملنا بھی محال ہو گیا۔

ان تمام نشانیوں کے دیکھنے اور بار بار حق کو تسلیم کر لینے کے اقرار کے باوجود فرعون اور اس کے ساتھیوں کی ضد اور ہٹ دھرمی میں کوئی فرق نہ آیا۔

آپ کے قتل کا منصوبہ

فرعون' حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حق و انصاف اور عدل و مساوات کے نظام کے قیام کی ولولہ انگیز تحریک سے سخت خائف بھی تھا اور پریشان بھی۔ وہ آپ کی تحریک کو کچلنے کے لیے جبر و استبداد کا ہر حربہ استعمال کر کے ناکامی کی ذلت و خواری سے دوچار ہو چکا تھا' چنانچہ اس نے آپ کے متعلق آخری فیصلہ کرنے کے لیے شاہی کونسل کا اجلاس بلایا اور اسے خطاب کرتے ہوئے بڑے پُر جلال انداز میں کہا:

''چھوڑ دو مجھے' میں اس موسیٰ کو قتل کیے دیتا ہوں اور پکار دیکھے اپنے رب کو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمھارا دین بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کر دے گا۔''

(سورۂ مومن۔ آیت 26)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا انداز تبلیغ و دعوت اتنا حکیمانہ اور اتنا اثر آفرین تھا کہ بے کراں مزاحمتوں کے باوجود آپ کا پیغام دلوں اور ذہنوں کی دنیا مسخر کرتا چلا گیا۔ آپ کی پچاس سالہ جدوجہد کا یہ نتیجہ تھا کہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے بااثر لوگ دل کی گہرائیوں سے آپ کے ہم نوا ہو گئے۔ اس کا اندازہ شاہی کونسل کے ایک ممبر کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے جو اس نے فرعون کے منصوبے کے جواب میں کی تھی۔ قرآن مجید نے اسے نہایت فصیح و بلیغ پیرائے میں روایت کیا ہے۔ اس کے چند اقتباسات ذیل میں پیش ہیں:

''اس موقع پر آل فرعون میں سے مومن شخص جو اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا' بول اٹھا' کیا تم ایک شخص کو صرف اس بنا پر قتل کر دو گے کہ وہ کہتا ہے میرا رب اللہ ہے؟ حالانکہ وہ تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس بینات (کھلی کھلی نشانیاں) لے آیا۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کا جھوٹ خود اس پر پلٹ پڑے گا' لیکن اگر وہ سچا ہے تو جن ہولناک نتائج کا وہ تمھیں خوف دلاتا ہے ان میں سے کچھ تو تم پر ضرور ہی آ جائیں گے۔'' ''اللہ کسی ایسے شخص کو ہدایت نہیں دیتا جو حد سے گزر جانے والا اور کذاب (جھوٹا) ہے۔'' ''اے میری قوم کے لوگو! آج تمھیں بادشاہی حاصل ہے اور زمین میں غالب ہو' لیکن اگر خدا کا عذاب ہم پر آ گیا تو پھر کون ہے جو ہماری مدد کر سکے گا۔''

(سورۂ مومن۔ آیات 27 تا 28)

یہی مردِ مومن گزشتہ گم راہ اور سرکش قوموں کے انجام بد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے کہتا ہے:

''اے میری قوم کے لوگو! مجھے خوف ہے کہ کہیں تم پر بھی وہ دن نہ آ جائے جو اس سے پہلے بہت سے جتھوں پر آ چکا ہے۔ جیسا دن قوم نوح اور ثمود اور ان کے بعد والی قوموں پر آیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اے قوم مجھے ڈر ہے کہ کہیں تم پر فریاد و فغاں کا دن نہ آ جائے۔ جب تم ایک دوسرے کو پکارو گے اور بھاگے بھاگے پھرو گے' مگر اس وقت اللہ سے بچانے والا کوئی نہ ہو گا۔''

(سورۂ مومن۔ آیات 30 تا 33)

فرعون نے اپنی کونسل اور اپنے خاندان کے ایک فرد کی مخلصانہ اور ہمدردانہ باتوں اور مشوروں کا کوئی مثبت اثر لینے کے بجائے ایک اٹل حقیقت کا مذاق اڑاتے ہوئے اپنے وزیر اعظم سے کہا:

''اے ہامان' میرے لیے ایک بلند عمارت بنا تاکہ میں راستوں تک پہنچ سکوں' آسمان کے راستوں تک اور موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں۔ مجھے تو یہ موسیٰ جھوٹا ہی معلوم ہوتا ہے۔'' (سورۂ مومن۔ آیات 36 تا 37)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پیغمبرانہ کردار

جب فرعون اپنے اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر آپ کے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا' اُس وقت آپ نے اپنے رب پر جس بے پناہ اعتماد اور بھروسے کا بھرپور اظہار کیا ہے' وہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ آپ واقعی اس کے نمائندہ اور رسول تھے۔ آپ نے فرمایا تھا:

''مَیں نے تو ہر اس متکبر کے مقابلے میں جو یومِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا اپنے رب اور تمھارے رب کی پناہ لے لی ہے۔'' (سورۂ مومن۔ آیت 27)

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشن کے دو اہم پہلو تھے:

1. فرعون اور اس کی قوم کو خدا کی بندگی کی طرف بلانا۔
2. بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم سے نجات دلانا۔

فرعونیوں کو سمجھانے اور انھیں راہِ راست پر لانے کے لیے آپ نے مسلسل تقریباً نصف صدی تک ان تھک جدوجہد کی' مگر انھوں نے ہر دلیل کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا' ہر معجزے اور ہر روشن نشانی کو جادو قرار دے کر اس کا مذاق اڑایا۔ خیرخواہی اور ہمدردی کے ہر اقدام کو سیاسی سازش قرار دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے رسول کے تذلیل کی برملا جرأت کی جیسا کہ قرآن مجید نے اس کے اس طرزِ عمل کی وضاحت کی ہے:

''فرعون نے اپنی قوم کے درمیان پکار کر کہا' لوگو' کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے نیچے نہیں بہ رہی ہیں؟ کیا تم لوگوں کو نظر نہیں آتا؟ میں بہتر ہوں یا یہ شخص جو ذلیل وحقیر ہے اور اپنی بات بھی کھول کر بیان نہیں کر سکتا؟''

(سورۂ زخرف۔ آیات 51 تا 52)

جب فرعون کا قہر وغرور اور اہلِ حق پر اُس کا ظلم وتشدد اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور اصلاحِ حال کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تو آپ نے اپنے شہنشاہ حقیقی کے دربار میں نہایت تفرع وزاری کے ساتھ التجا کی:

''اے ہمارے رب' تُو نے فرعون اور اُس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب' کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب' ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں' جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں (سورۂ یونس۔ آیت 88)

نبی کی یہ دعا اپنے خدائے واحد کے ساتھ اخلاص ووفا کے جذبے اور داعیے پر مبنی تھی۔ اس لیے اسے فوراً سند قبولیت حاصل ہوئی اور اعلان کیا گیا:

''تم دونوں (موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام) کی دعا قبول کی گئی۔ ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔''

(سورۂ یونس۔ آیت 89)

اب قدرت کی طرف سے ایسی سکیم تیار ہوئی جس کے ذریعہ مظلوم قوم نجات پا گئی اور ظالم لوگ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئے۔ اس سکیم کے سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم یہ ملا کہ:

''راتوں رات میرے بندوں (اسرائیلوں) کو لے کر نکل جاؤ۔ تمھارا پیچھا کیا جائے گا۔'' (سورۂ شعرا۔ آیت 52)

ہجرت کا حکم ملتے ہی آپ نے مصر سے نکلنے کی ایک تاریخ مقرر کر دی اور اس کی اطلاع تمام اسرائیلی بستیوں میں اس ہدایت کے ساتھ بھیج دی کہ مقررہ وقت پر سب لوگ قافلوں کی صورت میں ہجرت کے لیے نکل پڑیں۔ ہجرت کے لیے رات کا وقت مقرر کیا گیا تا کہ فرعون کے اپنے لشکر کے ساتھ نکلنے سے پہلے راتوں رات اتنا راستہ طے کر لیں کہ اس سے بہت آگے نکل جائیں۔

ہجرت کے اس حکم کے ساتھ ہی آپ کو یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ آپ کا دشمن تعاقب میں نکلے گا' لیکن وہ سمندر میں غرق ہوگا۔ بتایا گیا کہ:

''اچھا تو راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ۔ تم لوگوں کا پیچھا کیا جائے گا۔ سمندر کو اس کے حال پر چھوڑ دے' یہ سارا لشکر غرق ہونے والا ہے۔''

(سورۂ دخان۔ آیات 23 تا 24)

آپ کی ہدایت کے مطابق مقررہ رات کو اسرائیلی اپنے بال بچوں اور مال و اسباب کے ساتھ اپنے گھروں سے نکل پڑے۔ اس وقت انھیں مصر میں آئے ہوئے چار سو تیس سال ہو چکے تھے۔ اسرائیلی بستیوں یعنی جشن وغیرہ سے فلسطین کی طرف جانے کا قریبی اور سیدھا راستہ خشکی کا تھا۔ اسی راستے سے اس زمانے میں آمدورفت ہوتی تھی' لیکن آپ نے ارشادِ الٰہی پا کر یہ راستہ چھوڑ کر لمبا راستہ اختیار کیا۔

بائبل کی کتاب خروج کے مطابق بنی اسرائیل اپنے ہیڈ کوارٹر جشن سے نکل کر سکات پہنچے۔ اگلے دن وہاں سے کوچ کر کے رات کو قیام کے لیے ایتام میں ڈیرے ڈالے اور پھر وہاں سے چل کر مدالی اور بحرہ قلزم کے درمیان بعل صفوان کے قریب قیام کیا۔ (کتاب خروج۔ باب 12' 13' 14)

اس قافلہ ہجرت کی راہ نمائی قدرت اپنے خصوصی انداز میں کس طرح کر رہی تھی اس کے متعلق بائبل کی روایت سنیے:

''خداوند انھیں راستہ دکھانے کے لیے' دن کو بادل کے ستون میں اور رات کو روشنی دینے کے لیے آگ کے ستون میں ہو کر ان کے آگے آگے چلا کرتا تھا تا کہ وہ دن رات دونوں میں چل سکیں۔'' (کتاب خروج۔ باب 13)

فرعون کا ردِ عمل

اسرائیلیوں کے مصر سے نکل جانے سے فرعون کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا۔ اگر اس مرحلہ پر وہ خاموش ہو جاتا تو اس کی حکومت' اس کا ٹھاٹھ باٹھ اور اُس کا سامان عیش وعشرت اسی حالت میں قائم رہتے' مگر اس کی شامتِ اعمال اس کے سر پر مسلط ہو چکی تھی۔ اس لیے اس نے قہر وغضب کے جذبات سے مغلوب ہو کر ان کا تعاقب کرنے اور سزا کے طور پر انھیں نیست ونابود کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے اس فیصلے کے مطابق جو اقدام کیا اس سے اس کے دل میں چھپے ہوئے اس خوف کا بھی اظہار ہوتا

ہے جواسے ہمیشہ آپ سے اور آپ کی قوم سے لاحق رہا تھا۔ قرآن مجید کا بیان ہے:

''فرعون نے فوجیں جمع کرنے کے لیے شہروں میں نقیب بھیج دیے اور کہلا بھیجا کہ یہ مٹھی بھر لوگ ہیں اور انھوں نے ہمیں بہت ناراض کیا ہے اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے۔'' (سورۂ شعرا۔ آیات 53 تا 54)

فرعون اپنے لاؤلشکر کو جمع کر کے جس شان وشوکت کے ساتھ تعاقب میں نکلتا ہے، بائبل اس کا منظر اس طرح بیان کرتی ہے:

''تب اس فرعون نے اپنا رتھ تیار کروایا اور اپنی قوم کے لوگوں کو ساتھ لیا۔ اور اس نے چھ سو چنے ہوئے رتھ بلکہ مصر کے سب رتھ لیے اور ان سبھوں میں سرداروں کو بٹھایا اور خداوند نے مصر کے بادشاہ فرعون کے دل کو سخت کر دیا اور اس نے بنی اسرائیل کا پیچھا کیا۔'' (کتاب خروج۔ باب ۱۴)

قرآن مجید اس تعاقب کی رُوداد اس طرح سناتا ہے:

''صبح ہوتے یہ لوگ (آلِ فرعون) ان کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ کے ساتھی چیخ اُٹھے کہ ہم پکڑے گئے۔''

(سورۂ الشعرا۔ آیات 60 تا 61)

اسرائیلیوں کی یہ چیخ پکار اس وقت کی صورت حال کے پیش نظر ایک فطری بات تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ سامنے سمندر ہے اور پیچھے سے فرعون کا لشکر جرار سر پر آن پہنچا ہے جو انھیں تہس نہس کرنے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔ بائبل نے اس صورت حال کی منظر کشی اس طرح کی ہے:

''بنی اسرائیل خوف زدہ ہو کر موسیٰ سے کہنے لگے' کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہمیں مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے۔ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہمیں مصر سے نکال لایا؟ کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہمیں رہنے دے کہ مصریوں کی خدمت کریں؟ کیوں کہ ہمارے لیے ان کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر ہوتا۔'' (خروج۔ باب 14)

خوف ودہشت کی اس دل دوز اور لرزہ انگیز حالت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک جلیل القدر راہ نُما کی حیثیت سے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہرگز نہیں' میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور میری راہ نُمائی فرمائے گا۔''

(سورۂ شعرا۔ آیت 62)

معجزانہ غیبی امداد

جب بچاؤ کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں' تو رب کائنات نے اپنے نبی سے کیے ہوئے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے اسے حکم دیا:

''مار اپنا عصا سمندر پر۔ یکا یک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ایک ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا۔ اسی جگہ ہم دوسرے گروہ (فرعونیوں) کو بھی قریب لے آئے۔ موسیٰ علیہ السلام اور ان سب لوگوں کو جو اس کے ساتھ تھے' ہم نے بچالیا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔'' (سورۂ شعرا۔ آیات 63 تا 66)

سمندر پر عصا مارنے سے اس کی کیا کیفیت ہو گئی تھی۔ قرآن مجید کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ سمندر پھٹ گیا۔ بیچ میں گزرنے کے لیے خشک راستہ بن گیا اور پانی دونوں طرف بڑے بڑے پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اسی راستے سے بنی اسرائیل گزر کر سمندر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ پیچھے سے فرعون اپنے لشکر سمیت پہنچا اور وہ بھی اس راستہ پر چل پڑا۔ جب سارے فرعونی بیچ میں پہنچ گئے تو کھڑا ہوا پانی پھر رواں ہو گیا۔ اس طرح وہ سب غرق ہو گئے۔ اس پوری کیفیت کو قرآن مجید اس طرح روایت کرتا ہے:

''ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ اب راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چل پڑ اور ان کے لیے سمندر میں سوکھی سڑک بنالے تجھے کسی کے تعاقب کا ذرا خوف نہ ہو اور نہ سمندر کے بیچ سے گزرتے ہوئے ڈر لگے۔

''پیچھے سے فرعون اپنے لشکر لے کر پہنچا اور پھر سمندر ان پر چھا گیا جیسا کہ چھا جانے کا حق تھا۔ فرعون نے اپنی قوم کو گم راہ ہی کیا تھا' کوئی صحیح راہ نُمائی نہیں کی تھی۔''

(سورۂ طٰہ۔ آیات 77 تا 79)

فرعون جب سمندر کی موجوں میں غلطاں و پیچاں تھا اس وقت اس کی کیا حالت تھی اور کن حقائق کا اعتراف کر رہا تھا۔ اس کا پورا منظر قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

''اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے۔ پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم وزیادتی کی خاطر سے ان کے پیچھے چلے۔ حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں۔''

جواب دیا گیا ''اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنے۔'' (سورۂ یونس۔ آیات 90 تا 92)

فرعون کی لاش

قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کا یہ ایک اہم ثبوت ہے کہ اس کے اعلان کے مطابق ساڑھے تین ہزار سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی فرعون کی لاش قاہرہ کے عجائب خانے میں تماشا گاہِ خاص وعام بنی ہوئی ہے۔

آج تک وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے جہاں فرعون کی لاش سمندر میں تیرتی پائی گئی تھی۔ اس جگہ کو آج کل جبل فرعون کہتے ہیں اور اس کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جسے مقامی لوگ حمام فرعون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مصریوں نے فرعون کی لاش ایک تابوت میں رکھ کر خاموشی سے دفن کر دی تھی مگر جب 1898ء میں آثار قدیمہ کے ماہرین کی نگرانی میں باب مملوک کی کھدائی کی گئی تو یہ تابوت برآمد ہو گیا۔ 1907ء میں سر گرافٹن ایسٹ سمتھ نے اس کی ممی پر سے پٹیاں کھولیں تو اس کی لاش پر نمک کی ایک تہ جمی ہوئی پائی گئی۔ یہ علامت تھی اس بات کی کہ

وہ کھاری پانی میں غرق ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ ڈوبتے وقت کسی پتھر سے ٹکرا کر فرعون کی ٹھوڑی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ ہڈی اب بھی ٹوٹی ہوئی ہے۔ باقی تمام لاش اپنی اصل حالت ہی میں موجود ہے۔

قہرِ الٰہی جوش میں

فرعون کی ہلاکت و غرقابی اس امر کا نتیجہ تھی کہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی بغاوت و سرکشی اس کا بے کراں ظلم و تشدد اور اس کی بے پایاں فتنہ انگیزی و شر پسندی قہر الٰہی کو جوش میں لانے کا موجب بن گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی اس واقعہ کا تذکرہ ہوا ہے وہاں رب جلیل کا جلال اور اس کا غضب اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ اس لیے ہم ذیل میں اس کی چند جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

''ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں سمندر میں غرق کر دیا کیوں کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تھا اور ان سے بے پروا ہو گئے تھے۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 136)

آخر کار فرعون نے ارادہ کیا کہ موسیٰ اور بنی اسرائیل کو زمین سے اکھاڑ پھینکے' مگر ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو اکٹھا غرق کر دیا۔''

(سورۂ بنی اسرائیل۔ آیت 103)

''آخر کار ان لوگوں نے جو بُری سے بُری چالیں چلیں وہ اس مومن کے خلاف چلیں۔ اللہ نے ان سب سے اسے بچا لیا اور فرعون کے ساتھی خود بدترین عذاب کے پھیر میں آ گئے۔ دوزخ کی آگ ہے جس کے سامنے صبح و شام وہ پیش کیے جاتے ہیں۔''

(سورۂ مومن۔ آیات 54 تا 46)

''کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شان دار محل تھے جو وہ چھوڑ گئے۔ کتنے ہی عیش کے سرو سامان جن میں وہ مزے کر رہے تھے ان کے پیچھے دھرے رہ گئے۔ یہ ہوا ان (فرعونیوں) کا انجام۔ ہم نے دوسروں کو ان چیزوں کا وارث بنا دیا۔ پھر ان پر آسمان رویا نہ زمین اور ذرا سی مہلت بھی انھیں نہ دی گئی۔'' (سورۂ دخان۔ آیات 25 تا 29)

''یاد کرو وہ وقت جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمھارے لیے راستہ بنایا۔ پھر اس میں سے تمھیں بخیریت گزروا دیا' پھر وہیں تمھاری آنکھوں کے سامنے فرعونیوں کو غرقاب کیا۔''

(سورۂ بقرہ۔ آیت 50)

''فرعون نے اپنی قوم کو ہلکا سمجھا اور انھوں نے اس کی اطاعت کی' درحقیقت وہ تھے ہی فاسق لوگ۔ آخر کار جب انھوں نے ہمیں غضب ناک کر دیا تو ہم نے ان سے انتقام لیا اور انھیں اٹھا کر غرق کر دیا اور بعد والوں کے لیے پیش رو اور نمونہ عبرت بنا کر رکھ دیا۔'' (سورۂ زخرف۔ آیات 54 تا 56)

فرعون کی ہلاکت کی ان جھلکیوں کے بعد ہم قرآن مجید کا ایک ایسا اقتباس پیش کرتے ہیں جس میں بارہ چھوٹی چھوٹی آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے مابین ہونے والی حق و باطل کی پچاس سالہ کش مکش کو بڑی خوب صورتی سے بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ اقتباس اپنی فصاحت و بلاغت' اپنے اعجازِ بیان اسلوب کی ندرت کے لحاظ سے ایک نادر المثال شاہکار ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

''کیا تمھیں موسیٰ علیہ السلام کے قصے کی خبر پہنچی ہے؟ جب اس کے رب نے اسے طویٰ کی مقدس وادی میں پکارا تھا کہ فرعون کے پاس جا' وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے کہہ کیا تو اس کے لیے تیار ہے کہ پاکیزگی اختیار کرے اور میں تیرے رب کی طرف تیری راہ نمائی کروں تو اس کا خوف تیرے اندر پیدا ہو؟ پھر موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے پاس جا کر اسے بڑی نشانی دکھائی مگر اس نے جھٹلایا اور نہ مانا۔ پھر چال بازیاں کرنے کے لیے پلٹا اور لوگوں کو جمع کر کے اس نے پکارا اور کہا کہ میں تمھارا سب سے بڑا رب ہوں۔ آخر کار اللہ نے اسے آخرت اور دنیا کے عذاب میں پکڑ لیا۔ درحقیقت اس میں بڑی عبرت ہے ہر اس شخص کے لیے جو اس سے ڈرے۔''

(سورۂ النازعات۔ آیات 15 تا 26)

اظہارِ تشکر

بنی اسرائیل کی تاریخ میں یہ واقعہ نہایت اہم تھا کہ اس نے معجزانہ طور پر سمندر کو عبور کیا اور اسی کے سامنے اس کا دشمن بڑی بے چارگی کے عالم میں اسی سمندر میں غرق ہو گیا۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو حکم دیا کہ وہ اپنے خدا کے اس احسانِ عظیم پر شکر بجا لائیں اور جشن منائیں تاکہ یہ واقعہ قوم کی تاریخ میں یادگار رہے۔ اس موقع پر آپ نے اپنے مالک حقیقی کی حمد و ثنا کا جو ترانہ گایا وہ آج بھی بائبل کے صفحات میں محفوظ ہے ہم اس کے چند بند بطورِ نمونہ پیش کرتے ہیں:

''میں خداوند کی ثنا کروں گا
کیوں کہ وہ جلال کے ساتھ فتح مند ہوا
اس نے گھوڑوں کو سوار سمیت سمندر میں ڈال دیا
وہ میرا خدا ہے۔ میں اس کی بڑائی کروں گا
وہ میرے باپ کا خدا ہے میں اس کی بندگی کروں گا
فرعون کے رتھوں اور لشکر کو اس نے سمندر میں ڈال دیا۔
اور اس کے چیدہ چیدہ سردار بحر قلزم میں غرق ہوئے
گہرے پانی نے انھیں چھپا لیا
وہ پتھر کی مانند تہ میں چلے گئے
تیرے نتھنوں کے دم سے پانی کا ڈھیر لگ گیا
سیلاب تودے کی طرح سیدھے کھڑے ہو گئے
اور گہرا پانی سمندر کے بیچ میں جم گیا
دشمن نے تو یہ کہا تھا کہ میں پیچھا کروں گا
میں جا پکڑوں گا' میں لوٹ کا مال تقسیم کروں گا
ان کی تباہی نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا
اپنی رحمت سے تو نے ان لوگوں کو جنھیں تو نے خلاصی بخشی
راہ نمائی کی
اور اپنے زور سے تو انھیں مقدس مکان کی طرف لے چلا ہے

قومیں سن کر ٹھہر گئی ہیں

سمندر پار کرنے کے بعد

بائبل کے بیان کی روشنی میں محققین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کو جس مقام سے عبور کیا تھا وہ غالباً موجودہ سویز اور اسماعیلیہ شہر کے درمیان کوئی مقام تھا۔ یہاں سے گزر کر یہ لوگ جزیرہ نمائے سینا کے جنوبی علاقہ کی طرف ساحل کے کنارے کنارے روانہ ہوئے۔ اس زمانے میں جزیرہ نمائے سینا کا مغربی اور شمالی حصہ مصر کی حکومت میں شامل تھا۔

اس طرح مصر سے ہجرت کے بعد اس قوم کا پہلا مسکن جزیرہ نمائے سینا کا جنوبی حصہ بنا۔ بائبل میں اسی علاقے کو بیابان شور' سین اور وادی سینا کہا گیا ہے۔ یہی وادی تیہ بھی کہلاتا ہے۔ گزشتہ زمانے میں یہ بیابان سرزمین عرب میں شامل تھا اور اس کا دامن طور تک وسیع تھا۔ یہ علاقہ ایک خشک اور بے آب و گیاہ میدان تھا۔ یہاں شدت کی گرمی پڑتی تھی اور درخت نہ ہونے کی وجہ سے سائے کا بھی کوئی انتظام نہ تھا۔ جزیرہ نمائے سینا کے جغرافیائی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے موجودہ دور کے چند محققین نے جو کتاب الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اور نہ معجزات پر' یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ بنی اسرائیل اپنی تیس لاکھ کی آبادی کے ساتھ جزیرہ نمائے سینا کے اس حصہ سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر قرآن مجید اور بائبل میں آیا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصے میں پیش آئے ہوں گے۔

جزیرہ نمائے سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے ایک انسان یہ معلوم کر کے کہ لاکھوں انسان چالیس سال تک اس لق دوق اور بے آب و گیاہ بیابان میں مختلف مقامات پر پڑاؤ کرتے ہوئے گزرے تھے' آج بھی محوِ حیرت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس حیرت و استعجاب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے مصر کی طرف سے رسد کا راستہ بالکل منقطع ہو چکا تھا اور دوسری طرف اسی جزیرہ نما کے شمال اور مشرق میں عمالقہ جیسی طاقت ور قوم ان کی مزاحمت پر ہر لحہ آمادہ تھی۔

ترقی اور سائنس کے اس دور میں بھی آج اس پورے جزیرہ نما کی انسانی آبادی 55 ہزار سے زیادہ نہیں۔

ان حقائق کی روشنی میں اس امر کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ بنی اسرائیل کا جزیرہ نما سینا میں چالیس سالہ قیام قدرت الٰہی کا ایک ایسا کرشمہ تھا جسے معجزہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

بنی اسرائیل کی ہجرت کا زمانہ

سر چارلس مارسن کی تحقیقات اور بائبل کی تصریحات کی روشنی میں ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے جو سن ہائے ولادت تشخیص کیے ہیں ان کے مطابق حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے پورے خاندان کے ساتھ 1870 قبل مسیح میں مصر تشریف لائے تھے۔ اس واقعہ کے چارسوتیس سال بعد بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں مصر سے سفر ہجرت اختیار کیا۔ اس لیے اس واقعہ ہجرت کا سال ۱۴۴۰ ق م بنتا ہے۔

بنی اسرائیل کی تعداد

ہجرت کے بعد جب بنی اسرائیل جزیرہ نمائے سینا میں پہنچے تو آپ نے ان کی مردم شماری کرائی۔ بائبل نے قبیلہ وار اس مردم شماری کی پوری تفصیل بیان کی ہے جس کے مطابق جنگ کے قابل مردوں کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ اس طرح بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کو ملا کر ان کی کل تعداد کسی طرح تیس لاکھ سے کم نہیں بنتی۔

بائبل کی کتاب گنتی کے پہلے باب میں جو اعداد و شمار درج ہیں ان کے مطابق بنی یہوداہ کی تعداد سب سے زیادہ اور بنی بمین کی تعداد سب سے کم تھی۔

بنی اسرائیل پر خصوصی انعامات

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ اسرائیلی مصر سے نکل کر ایسے بیابان میں سکونت پذیر ہوئے تھے جہاں پینے کے لیے نہ پانی تھا نہ کھانے کے لیے خوراک کا کوئی انتظام۔ مزید برآں یہاں سائے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ ان کے پاس اتنے خیمے بھی نہیں تھے جن میں وہ موسم کی شدت کے مقابلے میں پناہ لے سکیں۔ اگر اس وقت ان پر خدائے رحیم کی خصوصی رحمت اور عنایت نہ ہوتی تو یہ لوگ بھوک پیاس اور دھوپ کی حدت کی وجہ سے ہلاکت ہو جاتے۔

قرآن مجید نے مختلف مقامات پر انھیں اپنے بندے کہا ہے کیوں کہ یہ لوگ انبیائے کرام کی نسل سے بھی تھے اور ان کی نورانی اور حیات آفرین تعلیمات کے امین اور وارث بھی۔ انھوں نے مصر میں فرعون کی غلامی میں سخت ابتلا کا دور گزارا تھا۔ انھی کی مدد اور عزت و آبرو کی بحالی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر مبعوث ہوئے تھے۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ یہ لوگ بھوک اور پیاس کی مصیبت سے ہلاک ہو جائیں' چنانچہ ان کی بنیادی ضروریات کا معجزانہ انداز میں انتظام کیا گیا۔

سائے کا انتظام

وادی سینا میں لاکھوں انسانوں کے پاس دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لیے مکان تو دور کی بات ہے' خیمے بھی نہ تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ان پر ابر کا سایہ کر دیا۔ ارشاد ہے:

''ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا۔'' (سورۂ بقرہ۔ آیت 58)

بائبل نے ابر کے اس سائے کے متعلق جو تفصیلات بتائی ہیں ان کے مطابق یہ بادل سایہ بھی کرتا تھا اور ان کی راہ نمائی بھی اور رات کو اس سے روشنی نکلتی تھی۔ اس کا بیان ہے:

''خداوند کا ابر اسرائیل کے سارے گھرانے کے سامنے اور ان کے سارے سفر میں دن کے وقت تو مسکن کے اوپر ٹھہرا رہتا اور رات کو اس میں آگ رہتی تھی۔''

(کتاب خروج۔ باب 40)

خوراک کا بندوبست

جب بنی اسرائیل اپنی اس دشت نوردی کے دوران مین سین کے بیابان میں ایلم

اور سینا کے قریب پہنچے تو ان کے پاس کھانے کا سامان ختم ہو گیا۔ وہ سخت پریشان ہوئے اور جمع ہو کر آپ کے پاس آئے۔ اس وقت ان کی جو کیفیت تھی بائبل نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر بڑبڑانے لگی اور بنی اسرائیل کہنے لگے کہ کاش ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے کیوں کہ تم تو ہمیں اس بیابان میں اس لیے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مار دو۔''

(کتاب خروج۔ باب 61)

قوم کی پریشانی پر آپ نے اپنے رب سے دعا کی جس کے نتیجے میں ان کی خوراک کا انتظام کیا گیا۔ اس کا ذکر قرآن مجید اس طرح کرتا ہے:

''ان پر من و سلویٰ اتارا..... کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تمھیں بخشی ہیں۔''

(سورۂ اعراف۔ آیت 120)

اس قوم پر خداوند کریم کی یہ خصوصی عنایت تھی کہ اسے بغیر محنت مشقت کے رزق ملنے لگا۔ سورۂ بقرہ میں یہ بات اس طرح بیان ہوئی ہے:

''ہم نے من و سلویٰ کی غذا تمھارے لیے فراہم کی اور تم سے کہا کہ جو پاک چیزیں ہم نے تمھیں بخشی ہیں انھیں کھاؤ، مگر تمھارے اسلاف نے جو کچھ کیا وہ ہم پر ظلم نہ تھا مگر انھوں نے اپنے اوپر ہی ظلم کیا۔'' (سورۂ بقرہ۔ آیت 57)

یہ من و سلویٰ کیا تھا؟ بائبل کی کتاب خروج کے باب 16 میں ان کی تفصیلات درج ہیں۔ ان کے مطابق من دھنیے کی بیج جیسی ایک چیز تھی جو اوس کی طرح گرتی اور زمین میں جم جاتی تھی۔ اس کا رنگ سفید اور مزہ شہد کی طرح شیریں تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی کچھ مقدار جمع کر کے ایک مرتبان میں محفوظ کر لی تھی تا کہ آنے والی نسلیں اسے دیکھ کر خدا کی قدرت کا مشاہدہ کر سکیں۔ یہ مرتبان صدیوں تک مقدس صندوق میں بحفاظت رہا۔

سلویٰ بٹیر کی قسم کے پرندے تھے۔ خدا کے فضل و کرم سے ان کی اتنی کثرت تھی کہ ایک پوری قوم انھی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اس طرح وہ فاقہ کشی کی مصیبتوں سے بچی رہی۔

اس پوری قوم کے لیے قدرتی غذا کا یہ اہتمام پورے چالیس برس تک جاری رہا۔ خدا کی عطا کردہ اس غذا کے متعلق آپ نے قوم کو ہدایت کر دی تھی کہ

''یہ لوگ نکل کر فقط ایک دن کا حصہ ہر روز جوڑا کریں کہ اس سے میں ان کی آزمائش کروں گا۔'' (کتاب خروج۔ باب 16)

من کے متعلق جدید ترین معلومات

1923ء میں ماہرین کی ایک جماعت نے جو وادی سینا میں کام کر رہی تھی دریافت کیا کہ اب بھی وہاں جھاؤ قسم کی ایک جھاڑی ہوتی ہے جس سے سفید رنگ کا ایک مادہ خارج ہوتا ہے جو جم جاتا ہے اور کھایا جاتا ہے۔ یہ من ہے۔ جس کا ذکر قرآن مجید اور بائبل میں آیا ہے۔ اس پودے پر جب ایک خاص قسم کے کیڑے کا حملہ ہوتا ہے تو یہ مادہ کثرت سے خارج ہوتا ہے اور جم جاتا ہے۔

(انبیائے قرآن۔ جلد دوم صفحہ 236)

پانی کا انتظام

بنی اسرائیل جزیرہ نمائے میں سفر کرتے ہوئے رفیدیم کے میدان میں پہنچے تو وہاں پینے کا پانی دستیاب نہ ہوا۔ انھیں سخت پیاس لگی اور وہ سب آپ کے پاس اپنی اس شکایت کو لے کر آئے اور پوری شدت سے پانی کا مطالبہ کیا۔ بائبل کا بیان ہے:

''وہ لوگ موسیٰ پر بڑبڑانے لگے اور کہا کہ تو ہمیں ہمارے بچوں اور چوپایوں کو پیاسا مارنے کے لیے کیوں ملک مصر سے نکال لایا۔ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا میں ان لوگوں سے کیا کہوں؟ وہ سب تو ابھی مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔''

(کتاب خروج۔ باب 17)

اضطرار و اضطراب کی اس پریشانی کن حالات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا:

''اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے اشارہ کیا کہ فلاں چٹان پر اپنی لاٹھی مارو چنانچہ اس چٹان سے یکا یک بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ متعین کر لی۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 120)

اس حیرت انگیز واقعہ کو قرآن مجید نے ایک اور مقام پر اس طرح بیان کیا ہے:

''یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی تو ہم نے کہا کہ فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو۔ چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اور ہر قبیلے نے جان لیا کہ کون سی جگہ اس کے پانی لینے کی ہے۔ اس وقت یہ ہدایت کر دی گئی کہ اللہ کا دیا ہوا رزق کھاؤ پیو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔'' (سورۂ بقرہ۔ آیت 60)

وہ چٹان جس سے بارہ چشمے جاری ہوئے تھے آج بھی جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اب بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنی کتاب مسائل و قصص میں اس چٹان کے متعلق رقم طراز ہیں:

''یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے۔ آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے۔ یہ لیجا کے وسیع میدان میں واقع ہے۔ شگاف اور رخنے جابجا پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ مٹے ہوئے ہیں۔ کچھ بڑے ہیں اور کچھ چھوٹے۔ گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں اور اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس۔ سب سے پہلے قرآن مجید نے حتمی طور پر اسرائیل کے بارہ قبائل کے لیے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے اور یہ اشارہ انھی شگافوں کی طرف ہے۔''

بنی اسرائیل کی تنظیم

سائے، خوراک اور پانی کے انتظامات کے علاوہ اس قوم پر اللہ تعالیٰ نے جو ایک اور احسان کیا وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے نبی کے ذریعہ اس کی شیرازہ بندی اور تنظیم کا بھی

انتظام فرما دیا تا کہ یہ قوم کسی اجتماعی اور سیاسی انتشار کا شکار نہ ہو اور اس نظم کے ذریعہ وہ دینی اخلاقی معاشرتی اور سیاسی میدانوں میں پوری یک سوئی اور ہم آہنگی کے ساتھ ترقی کی راہ پر مسلسل آگے بڑھتی چلی جائے۔ اس مقصد کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو اقدامات کیے اس کی تفصیل بائبل کی کتاب گنتی میں مذکور ہے:

1: ہجرت کے دوسرے سال کے پہلے مہینے میں آپ نے قوم کے قابل جنگ مردوں کی گنتی کرائی۔ تیسرے سال پھر دوسری مردم شماری کرائی۔

2: پوری قوم کو بارہ قبیلوں میں تقسیم کیا۔

3: ہر قبیلے کا سردار مقرر کیا اور اسے اپنے قبیلے کے درمیان اتحاد و اتفاق رکھنے کا ذمے دار قرار دیا۔

4: ان میں سے ایک قبیلے بنی لاوی کو اس امر پر مامور کیا کہ وہ پوری قوم میں تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت کی شمع کو روشن رکھے تا کہ اس میں دینی اور اخلاقی اقدار کا شعور پختہ ہو۔ اسی قبیلہ بنی لاوی سے آپ کا اور آپ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کا تعلق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تنظیم کے اس سارے کام کو اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے اپنی آخری کتاب میں اس طرح اعلان کیا ہے:

اور ہم نے اس قوم کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انھیں مستقل گروہوں کی شکل دے دی تھی۔'' (سورۂ اعراف۔ آیت 160)

بائبل کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کے گھرانوں کی تقسیم حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کی نسل کی بنیاد پر ہوئی تھی۔ ہر بیٹے کی اولاد ایک زبردست قبیلہ بن چکی تھی۔ ذیل میں ہم اس تقسیم کا گوشوارہ پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی پہلی مردم شماری کے قبیلہ وار اعداد و شمار بھی درج کرتے ہیں۔ یہ تعداد صرف قابل جنگ مردوں کی ہے:

نمبر شمار	نام قبیلہ	تعداد
1	بنی روبن	46500
2	بنی شمعون	59300
3	بنی جد	45350
4	بنی یہوداہ	74600
5	بنی اشکار	54400
6	بنی زبلون	57400
7	بنی دان	62700
8	بنی آشر	41500
9	بنی نفتالی	54400
10	بنی یوسف علیہ السلام	72500
11	بنی بن یمین	35400

بارھویں قبیلے بنی لاوی کے اعداد و شمار مندرجہ بالا گوشوارے میں شامل نہیں کیوں کہ ان کی مردم شماری علیحدہ ہوئی اور اس میں ایک مہینے سے زیادہ عمر کے ہر فرد کو شمار کیا گیا۔ ان کی کل تعداد بائیس ہزار بنی۔

بے آب و گیاہ جزیرہ نمائے سینا میں صحرا نوردی کے دوران میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو حکم دیا کہ وہ اس نجات پر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں اور انھوں نے خود بھی اللہ کی حمد و ثنا بیان کی (خروج۔ 15 تا 18)

راستے میں ایک ایسی بستی کے پاس سے گزر ہوا جس کے باشندے بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ بنی اسرائیل نے جو غالباً مصر میں قوم فرعون کی بت پرستی سے متاثر تھے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ جاہلانہ فرمائش کی کہ ان کے لیے بھی ایسا ہی کوئی معبود بنا دیں جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انھیں سرزنش کی کہ اتنی آزمائش کے بعد بھی تم غیر اللہ کی عبادت کی خواہش کرتے ہو۔ (اعراف۔ 138 تا 141)

کچھ عرصے کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے کتاب اور شریعت نازل کرنے کی دعا کریں تا کہ اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ وہ کوہ طور پر چالیس روز اعتکاف کریں جس کے بعد انھیں کتاب و شریعت عطا کی جائے گی (بقرہ۔ 51)

حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب بنا کر اور ضروری ہدایات دینے کے بعد کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ وہاں اللہ تعالیٰ سے شرف ہم کلامی نصیب ہوا تو انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنا دیدار کرانے کی درخواست کی جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا' البتہ تو اس پہاڑ کی طرف دیکھتا رہ۔ اگر وہ اپنی جگہ قائم رہا تو مجھے دیکھ سکے گا۔ جب اللہ تعالیٰ پہاڑ پر جلوہ فرما ہوا تو انوار ربانی کی تجلی نے اسے ریزہ ریزہ کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش آیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تقصیر کی معافی مانگ لی۔ (اعراف۔ 145)

بہر حال اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن کے بعد لکھی ہوئی چند الواح عطا کیں (جو لکڑی کی تھیں یا پتھر کی۔) ان الواح میں تورات اور احکام عشرہ کی صورت میں وہ تمام ضروری احکام درج تھے جن کی بنی اسرائیل کو ضرورت تھی اور ہر حکم وضاحت کی ساتھ بیان کر دیا گیا تھا (اعراف۔ 145)۔ ان الواح پر دس احکام درج تھے جن کی تفصیل سورۂ بنی اسرائیل میں بیان کی گئی ہے۔

الواح عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ ان کی عدم موجودگی میں سامری نے بنی اسرائیل کو گم راہ کر دیا ہے (طٰہٰ 73 تا 85)۔ اور بنی اسرائیل ایک بچھڑے کی پرستش کرنے لگے ہیں (اعراف۔ 148)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی اس جہالت کی خبر ملی تو شدید غم و غصے کی حالت میں اپنی قوم کے پاس آئے اور ان سے باز پرس کی۔ قوم نے عذر پیش کیا کہ سامری

نے ہمیں یہ بچھڑا دے ڈالا (طٰہٰ۔86 تا89)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وہ الواح ایک طرف رکھیں اور حضرت ہارون علیہ السلام سے جواب طلبی کی کہ انھوں نے قوم کو گم راہ ہونے سے کیوں نہ روکا اور اگر وہ نہ سمجھتے تھے تو کوہ طور پر آ کر مجھے کیوں مطلع نہ کیا۔

حضرت ہارون علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ لوگ مجھ پر حاوی ہو گئے تھے اور اس بات کا خطرہ تھا کہ کہیں وہ مجھے قتل نہ کر دیں۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ آپ واپسی پر مجھے یہ نہ کہیں کہ تم نے قوم میں تفرقہ ڈال دیا ہے۔

یہ جواب سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ قدرے کم ہوا اور انھوں نے اپنے لیے اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی (اعراف 150۔151) (سورۂ طٰہٰ 87 تا۔94) اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام سامری کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے اس کے اس فعل پر ملامت کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی پر اکتفا نہ کیا' بلکہ سامری کو اپنی جماعت سے خارج کر دیا اور حکم دیا کہ کوئی اس سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھے۔ نیز اسے بد دعا دی کہ لوگ اسے اچھوت سمجھیں اور وہ کہتا پھرے گا کہ مجھے کوئی نہ چھوئے (طٰہٰ۔97) رہا بچھڑا تو اُسے جلا کر اُس کی راکھ دریا میں بکھیر دی گئی (طٰہٰ۔97 تا98) اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ فرو ہوا تو وہ الواح اٹھائیں' جس کے مندرجات میں لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت تھی (اعراف:54) بنی اسرائیل نے اپنے اس گناہ پر توبہ کی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو الواح بارگاہ ایزدی سے ملی تھیں' اب ان میں مندرج احکام بنی اسرائیل کو بتائے' لیکن انھوں نے کہا کہ ہم اس وقت تک اللہ کا کلام نہیں مانیں گے' جب تک اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بہت سمجھایا' مگر وہ نہ مانے۔ آخر وہ ان کے ستر چیدہ چیدہ اشخاص کو ساتھ لے کر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وقت پر کوہ طور پر تشریف لے گئے۔ وہاں سخت زلزلہ آیا' جس کے نتیجے میں یہ ستر کے ستر آدمی مر گئے' لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رحم کرنے کی درخواست کی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ زندہ کر دیا (بقرہ 55' 56۔ اعراف 155 تا156۔ تقابل کے لیے دیکھیے خروج' 20۔18۔19) ان ستر آدمیوں نے قوم میں واپس آ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات کی تصدیق کی۔ مگر پھر بنی اسرائیل احکام الٰہی کی سختی کی شکایت کرنے اور سرکشی اختیار کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے کوہ طور کے ایک حصے کو سزا کے طور پر اٹھا کر کھڑا کر دیا' گویا وہ سائبان تھا۔ اس طرح مجبوراً انھوں نے اظہار اطاعت کیا (بقرہ 63۔64۔ سورۂ النساء 154۔ اعراف۔171)

جہاد کا حکم اور بنی اسرائیل کا رویہ

بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اصلی منزل فلسطین اور اردن کا علاقہ تھا' جہاں اس زمانے میں ایک طاقت ور قوم عمالقہ یا عمالیق حکمران تھی۔ ان سے جہاد کرنا ناگزیر تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو جہاد پر آمادہ کیا' لیکن غلامی کی زندگی بسر کرنے کے عادی بنی اسرائیل نے جہاد سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ اس سرزمین میں بڑے زبردست لوگ رہتے ہیں' جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں' ہم ہرگز وہاں داخل نہ ہوں گے۔ روایت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارہ افراد پر مشتمل ایک دستے کو اس علاقے کی جاسوسی کرنے اور شادابی دیکھنے کے لیے روانہ کیا۔ ان میں سے دس افراد دشمنوں کی فوجی قوت سے سخت مرعوب ہو گئے۔ البتہ ان میں سے دو مومنوں نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ اللہ پر بھروسا کر کے حملہ کر دو' تم غلبہ پاؤ گے' لیکن بنو اسرائیل پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا' بلکہ وہ گستاخانہ زبان استعمال کرتے ہوئے بول اٹھے: ''اے موسیٰ! جب تک وہ لوگ وہاں ہیں' ہم ہرگز ہرگز اس سرزمین میں داخل نہ ہوں گے۔ اگر لڑنا ہی ہے تو تم اور تمھارا خدا جا کر لڑو' ہم یہیں بیٹھے رہیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ اے میرے پروردگار! میں اپنے اور اپنے بھائی کے سوا اور کسی پر اختیار نہیں رکھتا۔ تو ہم میں اور ان نافرمان لوگوں میں جدائی کر دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس دعا پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو یہ سزا دی کہ چالیس سال کے لیے ارضِ فلسطین کو ان پر حرام کر دیا اور اس دوران میں وہ اس بیابان میں سرگرداں پھرتے رہے (مائدہ 20 تا30)

ذبحِ بقر کا واقعہ

وادی سینا میں بنی اسرائیل کے دوران قیام میں گائے کے ذبح کرنے کا ایک واقعہ پیش آیا جس کا ذکر قرآن مجید (بقرہ۔67 تا73) میں کیا گیا ہے اور تورات میں بھی اس کے متعلق کچھ اشارے ملتے ہیں۔ قرآن مجید کے بیان کردہ واقعے کی رو سے بنی اسرائیل میں سے کسی کے ہاتھوں ایک شخص قتل ہو گیا' لیکن قاتل کا پتا نہ چلتا تھا کہ کون ہے' جس کی وجہ سے بنی اسرائیل کے مابین تنازع کھڑا ہو گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس معاملہ پیش کیا گیا تو انھوں نے ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اپنے پیغمبر کے حکم پر انھوں نے معمول کے مطابق لیت و لعل سے کام لیا' لیکن ہر طرح ان کی تسلی کر دی گئی تو انھوں نے وحی الٰہی کی بیان کردہ صفات کا حامل بیل یا گائے ذبح کی اور مقتول کے جسم پر لگائی تو وہ نہ صرف زندہ ہو گیا' بلکہ اس نے قاتل کا نام بھی بتا دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام

قرآن مجید کی سورۂ کہف' آیات 60 تا82 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عبد صالح کا واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے اور حدیث نبوی ﷺ میں بھی اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ قرآن مجید میں اس صالح بندے کا نام مذکور نہیں' لیکن امام بخاری کی حدیث میں اس کا نام خضر علیہ السلام بتایا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام سے ملاقات کب ہوئی' اس بارے میں بھی کوئی قطعی خبر موجود نہیں۔ قرآن مجید میں اس واقعے کی جو تفصیلات مذکور ہیں' ان کے پیش نظر قیاس کیا جاتا ہے کہ ملاقات کا یہ واقعہ قیام مصر کے دوران میں پیش آیا ہو گا۔ ملاقات کے مقام کے بارے میں قرآن مجید (کہف۔60) میں مجمع البحرین کا ذکر آتا ہے' جس سے دو دریاؤں یا سمندروں کا سنگم مراد ہے' اس کے بارے میں علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک دریائے نیل کی دو شاخیں' بحر ابیض اور

بحر ازرق ہیں جو خرطوم کے قریب آپس میں مل جاتی ہیں، بعض نے اور مقامات بھی مراد لیے ہیں۔ اس عبد صالح کے مقام کی نشانی یہ بیان کی گئی تھی کہ وہاں پہنچتے ہی مچھلی زندہ ہو کر دریا میں چلی جائے گی۔

جب دونوں یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کا شاگرد دو دریاؤں کے مقام اتصال پر پہنچے تو اپنی مچھلی بھول گئے اور مچھلی پھدک کر دریا میں چلی گئی۔ آگے جا کر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی نے مچھلی کا واقعہ بتایا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ یہی تو وہ مقام ہے، جس کی ہمیں تلاش تھی۔ چنانچہ وہ واپس آئے۔ وہاں انھوں نے اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ دیکھا، جسے اللہ تعالیٰ نے تخلیق و تکوین کائنات کے اسرار ورموز کا علم بخشا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بندہ صالح سے درخواست کی کہ انھیں بھی اس علم میں سے کچھ باتیں سکھا دیں۔ آخر کار اس شرط پر یہ درخواست منظور کر لی گئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام استفسار سے گریز کریں گے۔ اس کے بعد تین واقعات پیش آئے ہیں:۔

1: دونوں کشتی میں سوار ہوئے، مگر حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی میں سوراخ کر دیا۔

2: انھیں ایک لڑکا ملا، جسے حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے اس واقعے کی وجہ پوچھی، جس سے حضرت خضر علیہ السلام نے انھیں طے شدہ شرط کی یاد دہانی کرا دی۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے معذرت کی۔

3: دونوں آگے چل کر ایک گاؤں والوں سے کھانا طلب کرتے ہیں، مگر وہ ضیافت اور میزبانی سے انکار کر دیتے ہیں۔ اتنے میں وہاں ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی، حضرت خضر علیہ السلام نے اسے سیدھا کر دیا، جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام معترض ہوئے اور کہنے لگے کہ انھوں نے تو ضیافت سے انکار کیا اور آپ نے بلا اُجرت دیوار ٹھیک کر دی۔ اس تیسرے استفسار پر حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ اب ہمارے مابین جدائی ہے۔ البتہ جدا ہونے سے قبل انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تینوں واقعات کے رموز و اسرار سے آگاہ کر دیا۔ آخر میں حضرت خضر علیہ السلام نے یہ صراحت کر دی کہ یہ کام انھوں نے اپنی مرضی سے نہیں کیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت سرانجام دیے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات

لاکھوں مظلوم و مجبور لوگوں کو ظالم متکبروں سے نجات دلانے اور صحرائے سینا میں اگلی نسل کی تربیت کر کے انھیں اس قابل بنانے کے بعد کہ وہ ان کے نائب یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کے جابر حکمرانوں سے حکومت چھین لیں اور وہاں ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کریں جو باقی دنیا کے لیے نمونہ ہو، اللہ تعالیٰ کے اس جلیل القدر نبی نے ایک سو بیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ تورات اور بعض عرب مورخین کے بیان کی رو سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی اور ان کے معاون نبی حضرت ہارون علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے وفات پائی تھی۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت اور منقبت بیان کی گئی ہے، جس سے ان کے جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مخلص نبی اور رسول بنایا اور مقرب بارگاہ کیا (مریم۔50، 51) اور پھر ہم کلامی کا شرف بخشا۔ احادیث نبوی ﷺ میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فضائل و مناقب مذکور ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم فرمائے کہ انھیں مجھ سے بھی کہیں زیادہ اذیت پہنچائی گئی تھی اور انھوں نے تمام اذیتوں کے مقابلے میں صبر و ضبط ہی سے کام لیا۔ (بخاری، مسلم)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے آخری ایام میں اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے آحضرت ﷺ کی نبوت و رسالت کی بشارت دی تھی اور انھیں آپ ﷺ کا اتباع کرنے کی تلقین کی تھی۔

یہ پیش گوئی اس وقت بھی تورات میں مذکور ہے۔ اس لیے قرآن حکیم (بقرہ، آیت 146) میں ارشاد باری تعالی ہے کہ یہود نصاریٰ آپ ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ نیز سورۂ اعراف کی آیت 157 میں فرمایا: پس آج یہ رحمت ان لوگوں کا حصہ ہے جو اس پیغمبر، نبی اُمی ﷺ کی پیروی اختیار کریں، جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب یعنی تورات عطا کی، جس میں تمام شرعی احکام کی وضاحت کر دی گئی تھی اور وہ بنی نوع انسان کے لیے رشد و ہدایت کا سرچشمہ اور رحمت تھی (انعام 154۔ ہود 17۔ احقاف 16) اور حق و باطل میں فرق کرنے والی تھی۔ (انبیا: 48) موجودہ بائبل کی پہلی پانچ کتابوں کو تورات یا عہد نامہ قدیم کہا جاتا ہے، لیکن یہ اصل تورات نہیں، بلکہ اس کی تحریف شدہ اور ترمیم شدہ شکل ہے، جس کی گواہی خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دی ہے (بقرہ 75، 78 آل عمران 78۔ النسا 46) اور متعدد مقامات پر قرآن مجید نے ان تحریفات وغیرہ کی نشان دہی اور تصحیح بھی کی ہے۔

(تفصیلی مباحث کے لیے دیکھیے کتاب: ''اظہار الحق'' مولفہ رحمت اللہ کیرانوی)

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد تورات میں حضرت یوشع بن نون (Joshua) کا ذکر بکثرت آتا ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات میں ان کے خادم تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ اور جانشین نبوت بنے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر نام کے ساتھ نہیں ہے، مگر ان کی طرف حوالہ آیا ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ارض مقدس لے جانا چاہتے تھے اور بنی اسرائیل عمالقہ سے لڑنے سے جی چراتے تھے تو صرف دو خدا ترس آدمیوں نے آپ کا ساتھ دیا تھا (مائدہ 21 تا 25) یہ یوشع اور کالب (Caleb) ہیں۔ اسی طرح نو جوان خادم کو ساتھ لے کر حضرت خضر

سے ملنے گئے تھے اور جس کا نام قرآن مجید میں نہیں ہے (کہف 62 تا 64) وہ یوشع کے سوا کوئی اور نہیں۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے: یوشع بن نون بن فراہیم بن یوسف بن یعقوب بن ابراہیم علیہ السلام

یہ فریضہ یوشع کے سپرد کیا گیا کہ مصریوں کو صحیح دین قبول کرنے کی دعوت دیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ہی میں یوشع نبوت سے سرفراز ہو جاتے ہیں' تا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا خاتمہ سکون و اطمینان کے ساتھ ہو۔ عمالقہ پر فتح حضرت یوشع علیہ السلام کے عہد میں ہوئی۔ جب یوشع عمالقہ سے کامیابی کے ساتھ لڑ رہے تھے تو جمعہ کی شام آ جاتی ہے۔ اگر یوم سبت (ہفتہ) کا آغاز ہو جاتا تو جنگ جاری نہیں رکھی جا سکتی تھی اور فتح مکمل نہیں ہو سکتی تھی' اس لیے یوشع نے چاہا کہ اللہ تعالیٰ جمعے کی شام غروب آفتاب کو موخر کر دے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے فتح مکمل ہونے تک سورج غروب نہ ہوا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ غروب سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے فتح عطا کر دی تھی۔ فتح کے بعد یوشع نے چاہا کہ مال غنیمت جمع کر کے قربانی دیں' مگر اسے جلانے کے لیے آسمانی آگ نہ آئی' کیوں کہ کچھ بددیانتی ہوئی تھی۔

حضرت یوشع علیہ السلام نے ہر قبیلے کو بلایا اور گناہ گار کا ہاتھ مصافحے میں حضرت یوشع علیہ السلام کے ہاتھ سے چمٹ کر رہ گیا۔ تواریخ میں یہ بھی آیا ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام کے لباس پر ہر قبیلے کی علامت موجود تھی۔ اس وقت گناہ گار قبیلے کی علامت ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ ایک بیل کا سر' جو سونے سے بنایا گیا تھا اور جواہرات اور موتیوں سے آراستہ تھا' گناہ گار کے پاس ملا۔ اسے لے کر مال غنیمت میں شامل کر دیا گیا۔ اس وقت ایک آگ اتری' جس نے اس قربانی کو جلا دیا اور اس کے ساتھ بیل کا سر اور گناہ گار یہودی بھی بھسم ہو گئے۔ چالیس دن تک یوشع اس قابل نہ ہوئے کہ دریائے اردن کو عبور کریں۔ انھوں نے دعا کی اور دریا کے دونوں کناروں کی پہاڑیاں پل بن گئیں۔ جس پر سے ان کی قوم گزر گئی۔ چھے دن تک اریحا (Jerichó) کا محاصرہ رہا اور ساتویں دن اس کی دیواریں گر پڑیں۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے یوشع اور بنی اسرائیل نے اریحا میں سب سے پہلے عمالقہ کو شکست دی اور اس کے بعد کنعان کو فتح کرتے ہوئے فلسطین جا پہنچے اور بیت المقدس بھی فتح کر لیا اور چوں کہ یہ مقام ان کی فتوحات کا مرکز اور مقصد وحید تھا' اس لیے جب وہ بھی فتح ہو گیا تو اب اللہ تعالیٰ نے اس عظیم الشان کامیابی پر وہ حکم دیا جس کا ذکر قرآن مجید میں ہے۔

قرآن مجید میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کامیاب کیا اور شہر کے اندر وہ فاتحانہ داخل ہونے لگے تو اس نے حکم دیا کہ مغرور اور متکبر انسانوں کی طرح داخل نہ ہونا بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے والوں کی طرح بارگاہِ الٰہی میں خشوع کے ساتھ جھکتے ہوئے اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے داخل ہونا' تا کہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندوں اور معزز و سرکش انسانوں کے درمیان امتیاز رہے' مگر فتح و نصرت کے بعد بنی اسرائیل کی باغیانہ سرشت غالب آئی اور خدا کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مغرور اور متکبر لوگوں کی طرح بستی میں داخل ہوئے۔ وہ اتراتے ہوئے سر کو بلند کرتے ہوئے اور اکڑتے ہوئے جا رہے تھے اور استغفار و نیاز مندی کی بجائے سوقیانہ الفاظ کہتے ہوئے' گویا اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ساتھ مذاق کرتے ہوئے داخل ہو رہے تھے۔ آخر غیرتِ حق کو جوش آیا اور قانون قدرت نے عذاب کی صورت میں انھیں آ پکڑا۔ (دیکھیے سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف)

تورات میں ہے کہ جب بنی اسرائیل جنگ کے لیے تیار ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے تابوت سکینہ ان کے ساتھ تھا۔ اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا' حضرت ہارون علیہ السلام کا پیرہن اور من کا مرتبان بھی تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے تبرکات بھی تھے' کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا تھا کہ تم من کو محفوظ کر لو' تا کہ تمھاری آیندہ نسلیں بھی مشاہدہ کر لیں کہ تم پر خدا کا انعام ہوا تھا۔

حضرت حزقیل علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے انبیائے کرام کا طویل سلسلہ ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ صدیوں پر محیط اس دور میں کس قدر انبیا و رسل مبعوث ہوئے' ان کی صحیح تعداد اللہ ہی کو معلوم ہے۔ قرآن مجید نے ان میں سے چند پیغمبروں ہی کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر تو تفصیل سے آیا ہے اور بعض کا اختصار کے ساتھ اور بعض کا صرف نام ہی مذکور ہے۔ تورات میں قرآن مجید کی بیان کردہ فہرست پر چند اور نبیوں کا اضافہ ہے' اور ان کے حالات و واقعات کا بھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام و حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد باتفاق تورات و تاریخ حضرت یوشع علیہ السلام بن نون منصب نبوت پر فائز ہوئے اور ان کے بعد ان کی جانشینی کا حق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے رفیق کالب بن یوحنا نے ادا کیا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیر مریم بنت عمران کے شوہر تھے' مگر نبی نہیں تھے۔

ان کے بعد جس ہستی نے بنی اسرائیل کی روحانی اور دنیوی قیادت کا فرض انجام دیا' وہ حزقیل علیہ السلام ہیں۔ بائبل میں حزقی ایل (Ezekiel) سے منسوب ایک کتاب شامل ہے۔ تورات کے مطابق وہ بوذی کاہن کے بیٹے ہیں۔

کتب تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے صحابہ سے یہ روایت منقول ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک بہت بڑی جماعت سے جب ان کے بادشاہ یا ان کے پیغمبر حزقیل علیہ السلام نے یہ کہا کہ فلاں دشمن سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا فرض ادا کرو' تو وہ اپنی جانوں کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے اور یہ یقین کر کے کہ اب جہاد سے بچ کر موت سے محفوظ ہو گئے ہیں' دور ایک وادی میں قیام پذیر ہو گئے۔

اب یا تو پیغمبر نے ان کے اس فرار کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی یا قضا و قدر کے فیصلے سے روگردانی سمجھ کر اظہارِ ناراضی کرتے ہوئے ان کے لیے بددعا کی یا خود اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ حرکت ناگوار ہوئی' بہر حال اللہ کے غضب نے ان پر موت طاری کر دی اور وہ سب کے سب آغوشِ مرگ میں چلے گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ان پر حضرت

حزقیل علیہ السلام کا گزر ہوا تو انھوں نے ان کی اس حالت پر اظہار افسوس کیا اور دعا مانگی کہ اے رب العالمین! انھیں موت کے عذاب سے نجات دے تاکہ ان کی زندگی خود ان کے لیے اور دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت بن جائے۔ پیغمبر کی دعا قبول ہوئی اور وہ زندہ ہو کر نمونہ عبرت و بصیرت بنے۔

قرآن مجید میں اس واقعے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔:

(''اے مخالف'')! کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے ہزاروں کی تعداد میں نکلے۔ پھر اللہ نے فرمایا کہ مر جاؤ۔ پھر انھیں زندہ کر دیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے' لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

(سورۂ بقرہ:243)

اس سے اگلی آیت 244 آیت جہاد ہے' جس میں مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کیا گیا ہے:﴿ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ (اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو۔) اس آیت کی تفسیر یہ ہے کہ جب کلام کا رخ حکم جہاد کی جانب ہوا تو اس سے قبل بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کیا گیا' کہ اگلے وقتوں میں ایک قوم نے جہاد سے رُوگردانی کر کے اللہ کا عذاب مول لیا تھا' اور اس کے بعد قرآن مجید کے مخاطبین کو حکم دیا گیا کہ جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ۔

حضرت الیاس علیہ السلام

قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد صراحت کے ساتھ' سب سے پہلے جس نبی کا ذکر موجود ہے' وہ حضرت الیاس علیہ السلام ہیں۔ یہ حضرت حزقیل علیہ السلام کے جانشین اور بنی اسرائیل میں ایلیا (Elijah) کے نام سے مشہور ہیں۔ قرآن مجید نے ان کا نام الیاس بتایا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ سورۂ انعام کی آیت 85 اور سورۂ صافات کی آیات 123 تا 132 میں۔ حضرت الیاس علیہ السلام کی بعثت کے متعلق مفسرین اور مورخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا مشہور شہر ان کی ہدایت و رسالت کا مرکز تھا۔

حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم مشہور بت ''بعل'' کی پرستار اور توحید سے بیزار' شرک میں مبتلا تھی۔ ''بعل'' مشرق میں آباد سامی اقوام کا سب سے مشہور و مقبول دیوتا تھا۔ فونیقی' کنعانی' موآبی' اور مدیانی قبائل خاص طور پر اس کی پرستش کرتے تھے۔ موآبی اور مدیانی اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد سے پوجتے چلے آتے تھے۔ شام کا مشہور شہر بعلبک اسی کے نام سے منسوب تھا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو مدین میں اسی کے پرستاروں سے واسطہ پڑا تھا۔

یہود کے یہاں بعل دیوتا کی پرستش کے لیے مختلف موسموں میں عظیم الشان مجالس منعقد ہوا کرتی تھیں اور اس کے لیے بڑے ہیکل اور عظیم الشان قربان گاہیں بنائی جاتی تھیں اور کاہن اسے بخورات کی دھونی دیتے اور اس پر طرح طرح کی خوشبوئیں چڑھاتے تھے اور کبھی کبھی اسے انسانوں کی بھینٹ بھی دی جاتی تھی۔

حضرت الیاس علیہ السلام کے زمانے میں بھی یمن و شام کا یہ بت ہی محبوب دیوتا تھا اور حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم دوسرے بتوں کے ساتھ خصوصیت سے اس بت کی پرستش کرتی تھی۔ چنانچہ اسی تقریب کی نسبت سے قرآن مجید میں اس کا ذکر آیا ہے:

''اور الیاس علیہ السلام بھی یقیناً مرسلین میں سے تھا۔ یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم لوگ ڈرتے نہیں؟ کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑ دیتے ہو' اس اللہ کو' جو تمھارا اور تمھارے اگلے پچھلے آباواجداد کا رب ہے؟ مگر انھوں نے اسے جھٹلا دیا۔ سو اب یقیناً وہ سزا کے لیے پیش کیے جانے والے ہیں' بجز ان بندگانِ خدا کے' جنھیں خالص کر لیا گیا تھا۔ اور الیاس علیہ السلام کا ذکر خیر ہم نے بعد کی نسلوں میں باقی رکھا۔ سلام ہے الیاس علیہ السلام پر۔ ہم نیکی کرنے والے کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ واقعی وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا'' (سورۂ صافات۔ آیات 123 تا 132)

سورۂ انعام کی آیات 84 تا 86 میں بھی حضرت الیاس علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ نیز اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل کے انبیا کی ایک مختصر فہرست ہے۔ ارشاد ہے۔:

''پھر ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام جیسی اولاد دی' اور ہر ایک کو راہِ راست دکھائی جو اس سے پہلے نوح علیہ السلام کو دکھائی تھی' اور اُسی کی نسل سے ہم نے داؤد علیہ السلام' سلیمان علیہ السلام' ایوب علیہ السلام' یوسف علیہ السلام' موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو ہدایت بخشی۔ اس طرح ہم نیکوکاروں کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔ اسی کی اولاد سے زکریا علیہ السلام' یحییٰ علیہ السلام' عیسیٰ علیہ السلام اور الیاس علیہ السلام کو راہ یاب کیا۔ ہر ایک ان میں سے صالح تھا۔ اسی کے خاندان سے اسماعیل علیہ السلام' الیسع علیہ السلام اور یونس علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو راستہ دکھایا۔''

مولانا محمد حفیظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی تالیف ''قصص القرآن'' میں اس آیت کی تفسیر میں ایک نکتہ صاحب ''المنار'' کی سند سے اٹھایا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ تفسیری نکتہ بھی درج کیا جائے۔ لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انبیا و رسل کو تین جدا جدا جماعتوں میں اس لیے بیان فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیا میں خصوصی امتیازات کے پیشِ نظر تین قسم کی جماعتیں تھیں۔:

(1)......بعض انبیا علیہم السلام وہ تھے جو صاحب تخت و تاج اور صاحبِ حکومت تھے یا وزارت و سرداری کے مالک تھے۔ اس پہلی فہرست میں اول حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر کیا جو نبی و رسول ہونے کے علاوہ صاحب مملکت بھی تھے۔ اس کے بعد حضرت ایوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کیا جو اگرچہ صاحب مملکت نہ تھے' مگر حضرت ایوب علیہ السلام چھوٹی سی ریاست کے مالک تھے اور حضرت یوسف علیہ السلام حکومت مصر کے وزیر اور مختار کل تھے۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام و ہارون علیہ السلام کا نام آیا جو نہ بڑی حکومت کے مالک تھے نہ چھوٹی ریاست کے مالک یا کسی حکومت کے وزیر اور مختار کل' بلکہ اپنی قوم

کے رسول اور پیغمبر بھی تھے اور ان کے سردار بھی۔

(2)...... دوسری فہرست میں ان انبیائے کرام کا تذکرہ ہے جنھوں نے ساری عمر زُہد واتقا میں گزاری۔ انھوں نے نہ رہنے کو مکان بنایا نہ کھانے پینے کا سامان فراہم کیا۔ دن بھر تبلیغ حق میں مصروف رہتے اور شب کو یادِ الٰہی کے بعد جہاں جگہ میسر آ جاتی' ہاتھ کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سو رہتے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام' زکریا علیہ السلام' عیسیٰ علیہ السلام اور الیاس علیہ السلام اس سلسلے میں بہت مشہور اور ممتاز ہیں۔

(3)...... تیسری فہرست میں ان پیغمبروں کا ذکر ہے' جنھوں نے نہ حکومت و سرداری کی اور نہ خالص زہد اختیار کیا' بلکہ متوسط زندگی سے وابستہ رہ کر حق تبلیغ و ریاست ادا کیا۔ چنانچہ حضرت اسماعیل' الیسع' یونس اور لوط علیہم السلام اسی درمیانی زندگی کے حامل ہیں۔

حضرت الیاس علیہ السلام نے اپنی بت پرست قوم کو بہت سمجھایا اور راہ ہدایت دکھائی۔ صنم پرستی اور کواکب پرستی کے خلاف وعظ و پند کرتے ہوئے خالص توحید کی جانب دعوت دی۔

حضرت الیسع علیہ السلام

حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاس علیہ السلام کے چچا زاد بھائی' نائب اور خلیفہ ہیں اور اوائل عمر میں اُنھی کی رفاقت میں رہتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی راہ نمائی کے لیے حضرت الیسع علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرمایا اور انھوں نے حضرت الیاس علیہ السلام ہی کے طریقے پر بنی اسرائیل کی راہ نمائی فرمائی۔ قرآن مجید کی سورۂ انعام اور سورۂ ص میں صرف ان کا نام آیا ہے۔

حضرت اشموئیل علیہ السلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے ایک اہم نبی۔ انھوں نے اسرائیل کی حکومت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ بائبل میں ان پر دو مستقل کتابیں بھی ان کے نام سے ہیں۔ ان کی رو سے ان کے والد کا نام القانہ تھا جو بنی اسرائیل کے قاضی تھے۔ اشموئیل (Samuel) رامہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ بچپن عیلی کاہن کے پاس سیلا میں بسر ہوا۔ وہیں انھیں نبوت ملی اور انھوں نے بنی اسرائیل کو رشد و ہدایت کی راہ دکھانا شروع کی۔

اشموئیل وہ پہلے نبی ہیں جن کی سرکردگی میں بنی اسرائیل نے ساؤل (طالوت) کو اپنا بادشاہ تسلیم کیا۔ بائبل میں آیا ہے کہ اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں ان کے پاس آئے اور کہا آپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور آپ کے بیٹے آپ کے نقش قدم پر نہیں' اس لیے اب آپ کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر دیں' جو ہم پر حکومت کرے۔ چنانچہ انھوں نے اسی ہدایت کے مطابق ساؤل بن قیس کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا۔ پھر لوگوں کو آداب سلطنت بتائے اور اس کے بارے میں ایک کتاب لکھی۔ باسٹھ برس کی عمر میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

قرآن مجید میں بھی اشموئیل کا ذکر آیا ہے' اگرچہ ان کا نام نہیں لیا گیا۔ سورۂ بقرہ کی آیت 246 میں اس کا ذکر یوں آیا ہے: (ترجمہ) ''پھر تم نے اس معاملے پر بھی غور کیا جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا تھا؟ انھوں نے اپنے نبی سے کہا: ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ نبی نے پوچھا'' کہیں ایسا تو نہ ہو گا کہ تمھیں لڑائی کا حکم دے دیا جائے اور پھر تم نہ لڑو؟ وہ کہنے لگے: ''بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہِ خدا میں نہ لڑیں' جب کہ ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا گیا ہے اور ہمارے بال بچے ہم سے جدا کر دیئے گئے ہیں۔ مگر جب انھیں جنگ کا حکم دیا گیا تو ایک قلیل تعداد کے سوا وہ سب پیٹھ موڑ گئے اور اللہ ان میں سے ایک ایک ظالم کو جانتا ہے۔''

مفسرین نے یہاں بنی اشموئیل یا سموئیل ہی مراد لیا ہے۔ اس وقت بنی اسرائیل پر عمالقہ چیرہ دست ہو گئے تھے اور انھوں نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔ سموئیل نبی اس زمانے میں بنی اسرائیل کے درمیان حکومت کرتے تھے' مگر وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے' اس لیے بنی اسرائیل کے سرداروں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کوئی اور شخص ان کا سربراہ کار ہو' جس کی قیادت میں وہ جنگ کر سکیں۔

قرآن مجید نے بنی سموئیل کے مقرر کردہ بادشاہ کا نام طالوت بتایا ہے' جسے بائبل میں ساؤل لکھا گیا ہے۔ یہ قبیلہ بن یمین کا ایک تیس سالہ نوجوان تھا۔ بنی اسرائیل میں اس سے خوب صورت کوئی شخص نہ تھا اور ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے۔ اپنے باپ کے گم شدہ گدھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ راستے میں جب سموئیل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جسے ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے منتخب کیا ہے۔ چنانچہ سموئیل نبی اسے اپنے گھر لے آئے۔ تیل کی کپی لے کر اس کے سر پر انڈیلی' اور اسے چوما اور کہا کہ خداوند نے تجھے مسح کیا تاکہ تو اس کی میراث کا پیشوا ہو۔ اس کے بعد انھوں نے بنی اسرائیل کا اجتماع عام کر کے اس کی بادشاہی کا اعلان کیا (سموئیل کتاب اول۔ باب 9 اور 10)

بعض لوگوں نے اس انتخاب پر اعتراض کیا اور کہا'' ہم پر بادشاہ بننے کا وہ کیسے حق دار ہو گیا؟ اس کے مقابلے میں بادشاہی کے ہم زیادہ حق دار ہیں۔ وہ تو کوئی بڑا مال دار آدمی نہیں ہے۔'' نبی نے جواب دیا ''اللہ نے تمھارے مقابلے میں اسی کو منتخب کیا ہے' اور اسے دماغی و جسمانی دونوں قسم کی اہلیتیں فراوانی کے ساتھ عطا فرمائی ہیں' اور اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جسے چاہے دے' اللہ تعالیٰ بڑی وسعت رکھتا ہے اور سب کچھ اس کے علم میں ہے'' (سورۂ بقرہ آیت 247)

اگلی آیت 248 میں یوں آیا ہے: ''اس کے ساتھ ان کے نبی نے انھیں یہ بھی بتایا کہ خدا کی طرف سے اس کے بادشاہ مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے عہد میں وہ صندوق تمھیں واپس مل جائے گا' جس میں تمھارے رب کی طرف سے تمھارے لیے سکونِ قلب کا سامان ہے' جس میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں۔''

یہ صندوق ''تابوت سکینہ'' کہلاتا ہے۔ بنی اسرائیل اس صندوق کو بڑا متبرک اور

اپنے لیے فتح ونصرت کا نشان سمجھتے تھے۔ ایک لڑائی کے موقعے پر فلسطینی مشرکوں نے بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا۔ جب یہ صندوق ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو پوری قوم کی ہمت جواب دے گئی اور ہر ایک اسرائیلی یہ سوچنے لگا کہ خدا کی رحمت ہم سے دُور ہوگئی اور اب ہمارے برے دن آ گئے (سیموئیل۔ کتاب اول۔ باب 6'7)

بائبل کے مطابق اس صندوق میں حضرت یوسف علیہ السلام کا جسد مبارک' ہڈیاں اور کپڑے تھے اور اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

''قصص الانبیا'' میں ہے کہ اس متبرک صندوق میں تورات کا اصل نسخہ' حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ہارون علیہ السلام کا پیرہن اور من کا مرتبان محفوظ تھے۔ قرآن مجید میں اس کے بارے میں تصریح ہے کہ اس میں آلِ موسیٰ علیہ السلام اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات تھے' جن میں پتھر کی وہ الواح بھی تھیں جو طور سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا وہ اصل نسخہ بھی اس میں تھا' جسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سپرد کیا تھا۔ نیز ایک بوتل میں من بھی بھر کر اس میں رکھ دیا گیا تھا' تا کہ آیندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کریں' جو صحرا میں اس نے ان کے باپ دادا پر کیا تھا' اور غالباً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ عصا بھی اس کے اندر تھا' جو خدا کے عظیم الشان معجزات کا مظہر بنا تھا (تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ 189)

جب طالوت بنی اسرائیل کا بادشاہ بنا تو یہ صندوق بھی بنی اسرائیل کو دوبارہ واپس مل گیا۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبردست خواہش تھی کہ وہ اس صندوق کے لیے ایک مستقل گھر بنائیں' تا کہ یہ محفوظ رہے' لیکن اسرائیلیات کے مطابق انھیں بتایا گیا کہ یہ گھر ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں تعمیر ہوگا۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام اس کی تعمیر کے لیے ضروری سامان جمع کرتے رہے اور اپنے بیٹے کے کام کو آسان کرنے کی خاطر اس کام میں متواتر مصروف رہے۔ بالآخر حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے مبارک عہد میں یہ گھر تعمیر کیا جو ہیکل سلیمانی کے نام سے مشہور ہوا۔ ۵۹۸ ق م میں جب بابل کے بادشاہ بخت نصر نے، ہیکل سلیمانی کو تباہ و برباد کیا اور جلا کر راکھ کر دیا تو اس افراتفری میں ''تابوت سکینہ'' بھی غائب ہوگیا اور آج تک اس کا سراغ نہیں مل سکا۔

طالوت نے فلسطینیوں کو کیوں کر شکست سے دو چار کیا' اس کی تفصیل تو بہت زیادہ ہے۔ قرآن مجید کی سورۂ بقرہ کی آیات 249 تا 251 کا مطالعہ اہل خرد کے لیے کافی ہے: (ترجمہ) ''پھر جب طالوت لشکر لے کر چلا تو اس نے کہا: ایک دریا پر اللہ کی طرف سے تمھاری آزمائش ہونے والی ہے۔ جو اس کا پانی پیے گا' وہ میرا ساتھی نہیں۔ میرا ساتھی صرف وہ ہے جو اس سے پیاس نہ بجھائے' ہاں ایک آدھ چلو کوئی پی لے تو پی لے'' مگر ایک گروہ قلیل کے سوا وہ سب اس دریا سے سیراب ہوئے۔

''پھر جب طالوت اور اس کے ساتھی دریا پار کر کے آگے بڑھے تو انھوں نے طالوت سے کہہ دیا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے' لیکن جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انھیں ایک دن اللہ سے ملنا ہے' انھوں نے کہا: ''بارہا ایسا ہوا ہے کہ ایک قلیل گروہ اللہ کے اِذن سے ایک بڑے گروہ پر غالب آ گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے''۔ اور جب وہ جالوت اور اس کے لشکروں کے مقابلے پر نکلے تو انھوں نے دعا کی: ''اے ہمارے رب' ہم پر صبر کا فیضان کر' ہمارے قدم جما دے اور اس کافر گروہ پر ہمیں فتح نصیب کر۔''

''آخر کار اللہ تعالیٰ کے اِذن سے انھوں نے کافروں کو مار بھگایا اور داؤد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت سے نوازا' اور جن جن چیزوں کا چاہا' اسے علم دیا۔ اگر اس طرح اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعے سے نہ ہٹاتا رہتا تو زمین کا نظام بگڑ جاتا' لیکن دنیا کے لوگوں پر اللہ کا بڑا فضل ہے کہ وہ اس طرح دفع فساد کا انتظام کرتا رہتا ہے۔''

داؤد علیہ السلام اس وقت ایک کم سن نوجوان تھے۔ اتفاق سے طالوت کے لشکر میں عین اس وقت پہنچے' جب فلسطینیوں کی فوج کا گراں ڈیل پہلوان جالوت (Goliath) بنی اسرائیل کی فوج کو دعوتِ مبارزت دے رہا تھا اور اسرائیلیوں میں سے کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس کے مقابلے کو نکلے۔ حضرت داؤد علیہ السلام یہ رنگ دیکھ کر بے محابا اس کے مقابلے پر میدان میں جا پہنچے اور اسے قتل کر دیا۔ اس واقعے نے انھیں تمام اسرائیلیوں کی آنکھوں کا تارا بنا دیا۔ طالوت نے اپنی بیٹی ان سے بیاہ دی اور آخر کار وہی اسرائیلیوں کے فرماں روا ہوئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے فرمان روا بننے سے پہلے حضرت سموئیل کا انتقال ہو چکا تھا۔

حضرت داؤد علیہ السلام

حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کی بڑھتی ہوئی محبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ طالوت کی موجودگی ہی میں یا اس کی موت کے بعد عنانِ حکومت حضرت داؤد علیہ السلام کے ہاتھ میں آ گئی اور اس عرصے میں ان پر خدا کا ایک اور زبردست انعام یہ ہوا کہ وہ منصب نبوت و رسالت سے بھی سرفراز کر دیے گئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام سے قبل بنی اسرائیل میں یہ سلسلہ قائم تھا کہ حکومت ایک سبط (خاندان) سے وابستہ تھی اور نبوت دوسرے سبط سے۔ یہودا کے گھرانے میں نبوت چلی آئی تھی اور فراہیم کے خاندان میں حکومت وسلطنت۔ داؤد علیہ السلام پہلے شخص ہیں جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں نعمتیں یک جا کر دی تھیں۔ وہ خدا کے پیغمبر اور رسول بھی تھے اور صاحب تاج و تخت بھی۔ انبیائے کرام میں سے حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ صرف حضرت داؤد علیہ السلام ہی وہ پیغمبر ہیں جنھیں قرآن مجید نے ''خلیفہ'' کے لقب سے پکارا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر قرآن مجید کی نو سورتوں میں آیا ہے۔ ان سورتوں میں سولہ مقامات پر نام لے کر ذکر کیا گیا ہے۔ بعض سورتوں میں مختصر اور بعض میں تفصیل سے ان کے حالات و واقعات کا ذکر اور ان کی رشد و ہدایت کا بیان ہے۔

سورتوں اور آیات کا نقشہ یہ ہے:۔

بقرہ 102' نساء 162، المائدہ 78، انعام 84 تا 90، اسراء 55، انبیا 78 تا 82، نمل 15، سبا 10'14، ص 17 تا 26_30 تا 40۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو خاص فضل اور انعام فرمایا تھا' قرآن مجید نے اس کا خصوصی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا﴾ (سورۂ سبا: آیت 10) یعنی ہم نے اپنی جانب سے داؤد کو خاص فضیلت دی۔ ان خاص انعامات کی قرآن مجید نے تفصیل بھی بیان کی ہے:۔

1: اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں اور پرندوں کو ان کا مطیع بنا دیا تھا' جو صبح شام ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتے تھے۔ (سبا:10)

2: اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام کو پرندوں کی بولیوں (منطق الطیر) کی تعلیم اور فہم عطا کیا تھا (نمل:17)

3: اللہ تعالیٰ نے لوہے کو ان کے لیے موم کی طرح نرم کر دیا تھا اور وہ اسے جس طرح چاہتے' موڑ لیتے تھے (سبا : 10)

4: اللہ تعالیٰ نے انھیں زرہ سازی کا فن عطا کیا' جس سے وہ اپنی روزی اپنے ہاتھ سے کماتے تھے۔ چنانچہ حدیث نبوی ﷺ میں وارد ہوا ہے کہ ''انسان کا بہترین رزق وہ ہے جو وہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے اور اللہ کے نبی داؤد اپنے ہاتھ کی محنت سے اپنی روزی کماتے تھے'' (انبیا:80۔ سبا:10۔ بخاری 5:2)
قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت پر ایک نعمت و احسان کے طور پر یہ ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ ''ہم نے انہیں (داؤد کو) تمھارا ایسا لباس تیار کرنے کا فن سکھایا جو تمھیں شدت جنگ کے وقت محفوظ رکھتا ہے'' (انبیا:80)

5: اللہ تعالیٰ نے سلطنت داؤدی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: وَشَدَدْنَا مُلْکَهٗ (ص :20) یعنی ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا اور اللہ تعالیٰ نے اُنہیں خلافت ارضی عطا کر کے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا (ص : 25) چنانچہ مورخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو خدا نے ساری اقوام کے تمام خطوں کی حکومت عطا کی تھی' جس میں شام' فلسطین اور جزیرہ عرب کے بعض حصے بھی شامل تھے۔

6: خدا نے انھیں حکمت' منصب نبوت اور خطابت کی فصاحت اور صحیح فیصلے کی قوت بخشی تھی (ص 19)

7: قرآن کریم نے جن آسمانی صحائف کا ذکر کیا ہے' ان میں زبور بھی ہے' جو اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی (نساء :163۔ بنی اسرائیل 57) بنی اسرائیل کی رشد و ہدایت کے لیے اصل اور اساس تورات تھی' لیکن واقعات و حالات اور زمانے کے تغیرات کے پیش نظر حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی زبور عطا ہوئی جو تورات کے اصول و قوانین کے اندر رہ کر اسرائیلیوں کی رشد و ہدایت کے لیے بھیجی گئی تھی۔ زبور خدا کی حمد کے نغموں سے معمور تھی اور حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسا لہجہ اور سحر آگیں لحن عطا فرمایا تھا کہ جب زبور کی تلاوت فرماتے تو جن و انس' حتیٰ کہ حیوان اور پرندے تک وجد میں آ جاتے' اسی لیے آج تک ''لحن داؤدی'' ضرب المثل ہے۔ البدایۃ والنہایۃ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ جب ابو موسیٰ اشعریؓ کے حسن صوت کو سنتے تو ارشاد فرماتے: ابو موسیٰؓ کو اللہ تعالیٰ نے لحن داؤد عطا فرمایا ہے۔'' قرآن کریم نے جگہ جگہ تورات اور زبور کو خدا کی وحی فرمایا ہے اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے دیدہ دانستہ خدا کی ان کتابوں کو بدل ڈالا اور جگہ جگہ اپنی مرضی کے مطابق ان میں تحریف کر دی۔ حتیٰ کہ اب ان کے حقائق پر اس قدر پردہ پڑ گیا ہے کہ اصل اور جعل کے درمیان فرق کرنا مشکل' بلکہ ناممکن ہو گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیا ہے: ''بعض یہود وہ ہیں جو (تورات و انجیل و زبور کے) کلمات کو انھیں اصل حقیقت سے بدلتے اور پھیرتے ہیں۔

8: زہد و عبادت میں اللہ تعالیٰ نے انھیں انہاک بخشا تھا' جو انسانیت کے لیے ایک نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ نصف شب تک آرام کرتے۔ تہائی رات عبادت میں بسر کرتے اور ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ اسی لیے رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ نماز داؤد کی نماز ہے اور اللہ کے نزدیک پسندیدہ روزہ داؤد کا روزہ ہے۔''

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کی زندگی کا ایک سبق آموز واقعہ یوں ذکر ہوا ہے کہ ایک روز حضرت داؤد علیہ السلام فیصلہ کرنے کے لیے عدالت میں تشریف فرما تھے اور آپ کے فرزند حضرت سلیمان علیہ السلام بھی ان کے پاس موجود تھے۔ مقدمہ یہ درپیش تھا کہ کسی ریوڑ والے کی بھیڑوں نے رات کو کسی کی پکی ہوئی فصل کھا لی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ دیا کہ کھیت والے کا زبردست نقصان ہوا ہے' اس لیے بھیڑیں بطور تاوان اس کے سپرد کر دی جائیں' مگر گیارہ سالہ سلیمان علیہ السلام نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے فیصلے میں دونوں فریقوں کا خیال رکھیے۔ اس پر داؤد علیہ السلام نے کہا کہ تم فیصلہ دو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ بھیڑیں کھیت والے کو دے دی جائیں' وہ ان سے فائدہ اٹھائے' اور کھیت بھیڑوں والے کو دیا جائے جو اس پر محنت کر کے اس حالت پر لے آئے جو برباد ہونے کے وقت تھی۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس فیصلے سے اتفاق فرمایا (سورۂ انبیا: 79)
مفسروں نے اس واقعے کی بنا پر مقدمات پر نظر ثانی اور قاضیوں کے آداب کے سلسلے میں کئی ایک مسائل استنباط کیے ہیں۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام کے صاحب زادے ہیں' اس لیے ان کا نسب بھی یہوداہ کے واسطے سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ ابن ماجہ کی ایک حدیث میں صرف اس قدر منقول ہے کہ سلیمان علیہ السلام کی والدہ نے ایک دفعہ انھیں یہ نصیحت فرمائی: ''بیٹا'

رات بھر نہ سوتے رہا کرو' اس لیے کہ رات کے اکثر حصے کو نیند میں گزار دینے سے انسان خیر سے محروم رہ جاتا ہے۔

قرآن مجید میں آپ کا ذکر مندرجہ ذیل سورتوں میں آیا ہے۔:

بقرہ 102، نسا 163، انعام 85، انبیا 81,79,78، نمل 16 تا 44، سبا 12، ص 34,30

حضرت سلیمان علیہ السلام اپنے والد حضرت داؤد علیہ السلام کی وفات کے بعد تیرہ سال کی عمر میں تختِ سلطنت کے مالک ہوئے اور بقول بعض بائیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں نبوت اور حکومت دونوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کا جانشین بنا دیا۔

پھر حضرت داؤد علیہ السلام کی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی بعض خصوصیات اور امتیازات سے نوازا اور اپنی نعمتوں میں سے بعض ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہیں۔

(1) **منطق الطیر:**...... اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان دونوں کو یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ وہ چرند پرند کی بولیاں سمجھ لیتے تھے اور دونوں بزرگوں کے لیے ان کی آوازیں ایک ناطق انسان کی گفتگو کی طرح تھیں۔ سورۂ نمل کی آیات 16 تا 18 میں سلیمان علیہ السلام نے اپنے اور اپنے خاندان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں گنواتے ہوئے کہا کہ ''ہمیں پرندوں کو بولیاں سکھائی گئی ہیں۔ اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا نمایاں فضل ہے۔ سلیمان علیہ السلام کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: ''اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ' کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمھیں کچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو' سلیمان علیہ السلام اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا۔''

یہ فہم و فراست کا کمال ہے' جس کے مختلف درجات (کم تر نوعیت کے) اور لوگوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جانور پالنے والے بھی کسی حد تک جانوروں کی آوازوں سے ان کا مطلب سمجھنے لگتے ہیں (گڈریے اپنے گلے کے جانوروں کی اور طوطی' بلبل' لال' بٹیر' تیتر' مرغ وغیرہ پالنے والے اپنے اپنے جانوروں کی) یہ استعداد حضرت سلیمان علیہ السلام میں بدرجہ کمال پائی جاتی تھی' یہاں تک کہ پالتو جانوروں کے علاوہ بھی آپ جانوروں کا مفہوم سمجھ لیتے تھے اور ان سے کام بھی لے سکتے تھے' جیسے آپ نے ہدہد کی بولی سمجھی اور اس کی معرفت اپنا نامہ ملکہ سبا کے پاس بھجوایا۔

(2) **تسخیر ریاح:**...... حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کے خصوصی امتیازات میں سے ایک امتیاز یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ''ہوا'' کو ان کے حق میں مسخر کر دیا تھا اور وہ ان کے زیر فرمان کر دی گئی تھی۔ قرآن حکیم نے تین مقامات پر آپ کی اس امتیازی خصوصیت کا ذکر کیا ہے۔:

''اور سلیمان کے لیے ہم نے تیز ہوا کو مسخر کر دیا' جو ان کے حکم سے اس ملک میں چلتی تھی مہینے کی۔'' (سورۂ انبیا: 81)

''اور سلیمان علیہ السلام کے لیے ہم نے ہوا کو مسخر کر دیا' صبح کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک اور شام کے وقت اس کا چلنا ایک مہینے کی راہ تک۔ (سورۂ سبا۔ 12)

''تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم کے ساتھ نرمی کے ساتھ چلتی تھی' جدھر وہ چاہتا تھا'' (سورۂ ص: 36)

قرآن حکیم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس شرف کے متعلق تین باتیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ ''ہوا'' کو سلیمان کے حق میں مسخر کر دیا گیا۔ دوسری یہ کہ ''ہوا'' ان کے حکم کے اس طرح تابع تھی کہ شدید اور تیز و تند ہونے کے باوجود ان کے حکم سے ''نرم'' اور آہستہ روی کے باعث ''راحت'' ہو جاتی تھی۔ تیسری بات یہ کہ نرم رفتاری کے باوجود اس کی تیز رفتار کا یہ عالم تھا کہ حضرت سلیمان کا صبح شام کا جدا جدا سفر ایک شاہ سوار کی مسلسل ایک ماہ کی رفتار مسافت کے مساوی ہوتا تھا۔ گویا تخت سلیمان علیہ السلام انجن اور مشین جیسے ظاہری اسباب سے بالاتر صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک بہت تیز رفتار ہوائی جہاز سے بھی زیادہ تیز مگر سبک روی کے ساتھ ہوا کے کاندھے پر اڑا چلا جاتا تھا۔

(3) **تسخیر جن و حیوانات:**...... حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا ایک بڑا امتیاز یہ تھا کہ ان کے زیر نگین صرف انسان ہی نہیں تھے بلکہ جن اور حیوانات بھی تابع فرمان تھے اور یہ سب حضرت سلیمان کے حاکمانہ اقتدار کے تابع اور زیر حکم تھے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان نے بارگاہ الٰہی میں یہ دعا کی۔:

''اے میرے رب' مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو' بے شک تو ہی اصل داتا ہے'' (سورۂ ص: 35)

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کرتے ہوئے فرمایا:

''تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی' جدھر وہ چاہتا تھا۔ اور شیاطین (جن) کو مسخر کر دیا' ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور اور دوسرے جو پابند سلاسل تھے'' (ص: 36 تا 38)

اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کی دعا کی قبولیت کے ساتھ انھیں ایسی عجیب و غریب حکومت عطا فرمائی کہ نہ ان سے پہلے کسی کو نصیب ہوئی اور نہ ان کے بعد کسی کو میسر آئے گی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ نبی اکرم نے ایک دن ارشاد فرمایا:

''گزشتہ شب ایک سرکش جن نے اچانک یہ کوشش کی کہ میری نماز میں خلل ڈالے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس پر قابو دے دیا اور میں نے اسے پکڑ لیا۔ اس کے بعد میں نے ارادہ کیا کہ اسے مسجد کے ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب دن میں اسے دیکھ سکو' مگر اس وقت اپنے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا یاد آ گئی۔ یہ دعا یاد آتے ہی میں نے

اسے ذلیل کر کے چھوڑ دیا۔ آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ "اپنے بھائی سلیمان کی یاد آ گئی" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر چہ اللہ تعالیٰ نے مجھ میں کل انبیا و رُسل کے خصائل و امتیازات جمع کر دیے ہیں اور اس لیے جنات کی تسخیر پر بھی مجھے قدرت حاصل ہے' لیکن جب کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس خصوصیت کو اپنا طغرائے امتیاز قرار دیا ہے' تو میں نے اس سلسلے کا مظاہرہ مناسب نہیں سمجھا۔

(4) **بیت المقدس کی تعمیر**:......حق تعالیٰ نے "جن" کو ایسی مخلوق بنایا ہے جو مشکل سے مشکل اور سخت سے سخت کام انجام دے سکتی ہے' اس لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ ارادہ فرمایا کہ مسجد (ہیکل) کے چاروں جانب ایک عظیم الشان شہر آباد کیا جائے اور مسجد کی تعمیر بھی از سر نو کی جائے۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ مسجد اور شہر کو بیش قیمت پتھروں سے بنوائیں اور اس کے لیے دور دراز مقامات سے خوب صورت اور بڑے بڑے پتھر منگوائیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے کے ذرائع نقل و حمل محدود اور مختصر تھے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی خواہش کی تکمیل کے لیے کافی نہیں تھے' اور یہ کام صرف "جن" ہی انجام دے سکتے تھے' لہٰذا انھوں نے جنات ہی سے یہ خدمت لی۔ چنانچہ وہ دور دراز مقامات سے خوب صورت اور بڑے بڑے پتھر جمع کر کے لائے اور بیت المقدس کی تعمیر کا کام انجام دیتے تھے۔

جنات نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے بیت المقدس کے علاوہ اور بھی تعمیرات کیں اور بعض ایسی چیزیں بنائیں جو اس زمانے کے لحاظ سے عجیب و غریب سمجھی جاتی تھیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہے:

"اور شیاطین (سرکش جنات) میں سے ہم نے ایسے بہت سوں کو اس کا تابع بنا دیا تھا جو اس کے لیے غوطے لگاتے اور اس کے سوا دوسرے کام کرتے تھے۔"

(سورۂ انبیا:82)

"اور ایسے جن اس کے تابع کر دیے جو اپنے رب کے حکم سے اس کے آگے کام کرتے تھے۔ ان میں سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا' اسے ہم بھڑکتی ہوئی آگ کا مزہ چکھاتے۔ وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا' اونچی عمارتیں' تصویریں' بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں (سورۂ سبا:13)

"سلیمان علیہ السلام کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے" (النمل:17)

"اور سلیمان کے لیے شیاطین (سرکش جن) کو مسخر کر دیا' ہر قسم کے کام کرنے والے' عمارت بنانے والے اور دریا میں غوطہ لگانے والے اور وہ جو جکڑے ہوئے زنجیروں میں۔" (ص:38'39)

عام طور سے یہ مشہور ہے کہ مسجد اقصیٰ اور بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں ہوئی تھی' لیکن جیسا کہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے لکھا ہے' مرفوع حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے نبی اکرم سے دریافت کیا: "یا رسول اللہ' دنیا میں سب سے پہلی مسجد کون سی ہے؟"

آپ ﷺ نے فرمایا: "مسجد حرام۔" ابوذرؓ نے پھر دریافت کیا: "اس کے بعد کون سی مسجد وجود میں آئی؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "مسجد اقصیٰ۔" ابوذر غفاری نے تیسری مرتبہ سوال کیا' کہ ان دونوں کی درمیانی مدت کس قدر ہے؟" تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "دونوں کے درمیان چالیس سال کی مدت ہے۔ حالانکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بانی مسجد حرام کے درمیان ایک ہزار سال سے بھی زیادہ مدت کا فاصلہ ہے' اس حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام کی بنیاد رکھی' اور وہ مکہ کی آبادی کا باعث بنی' اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام نے مسجد بیت المقدس کی بنیاد ڈالی اور اس کی وجہ سے بیت المقدس کی آبادی وجود میں آئی' پھر عرصہ دراز کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے مسجد اور شہر کی تعمیر کی تجدید کی گئی اور جنوں کی تسخیر کی وجہ سے بے نظیر اور شان دار تعمیر وجود میں آئی جو آج تک لوگوں کے لیے باعث حیرت ہے کہ ایسے دیو پیکر پتھر کہاں سے لائے گئے اور کس طرح لائے گئے اور جر ثقیل کے وہ کون سے آلات تھے جن کے ذریعے انھیں ایسی بلندیوں پر پہنچا کر باہم اتصال پیدا کیا گیا۔"

(قصص القرآن' حصہ دوم' صفحہ 106)

(5) **آزمائش کا واقعہ**:......سورۂ ص کی آیات 34 تا 36 میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش اور اللہ تعالیٰ کی جانب سے ابتلا کا ایک واقعہ اس طرح مرکوز ہے۔

"(اور دیکھو کہ) سلیمان علیہ السلام کو بھی ہم نے آزمائش میں ڈالا اور اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کیا اور کہا کہ: اے میرے رب مجھے معاف کر دے' اور مجھے وہ بادشاہی دے کہ جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو' بے شک تو ہی اصل داتا ہے۔"

ان آیات میں یہ ظاہر نہیں کیا گیا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب آزمائش پیش آئی تو وہ کیا تھی۔ صرف اس قدر اشارہ ہے کہ ان کی کرسی پر ایک جسد ڈالا گیا۔ نیز احادیث میں بھی اس سے متعلق کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے۔ اس ابہام کی وجہ سے مفسرین و مورخین نے اپنے قیاس سے کئی رائیں قائم کر لی ہیں۔ مولانا مودودی کی رائے زیادہ قرین عقل اور صائب معلوم ہوتی ہے۔ مولانا صاحب لکھتے ہیں: "حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام قرآن مجید کے مشکل ترین مقامات میں سے ہے اور حتمی طور پر اس کی کوئی تفسیر بیان کرنے کے لیے ہمیں کوئی یقینی بنیاد نہیں ملتی' لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا کے یہ الفاظ کہ: "اے میرے رب' مجھے معاف کر دے اور مجھے وہ بادشاہی دے جو میرے بعد کسی کے لیے سزاوار نہ ہو۔" اگر بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں پڑھا جائے تو بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل میں غالباً یہ خواہش تھی کہ ان کے بعد ان کا بیٹا جانشین ہو اور حکومت و فرماں روائی آئندہ انھی کی نسل میں باقی رہے۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں "فتنہ" (آزمائش) قرار دیا اور اس پر وہ اس وقت متنبہ ہوئے جب ان کا ولی عہد رحبعام ایک ایسا نالائق نوجوان بن کر اٹھا' جس کے

پچھن صاف بتا رہے تھے کہ وہ داؤد و سلیمان علیہما السلام کی سلطنت چار دن بھی نہ سنبھال سکے گا۔ ان کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈالے جانے کا مطلب غالباً یہی ہے کہ جس بیٹے کو وہ اپنی کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے' وہ ایک کندہ ناتراش تھا۔ تب انھوں نے اپنی اس خواہش سے رجوع کیا اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ کر درخواست کی کہ بس یہ بادشاہی مجھ پر ختم ہو جائے۔ میں اپنے بعد اپنی نسل میں بادشاہی جاری رہنے کی تمنا سے باز آیا۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے اپنے بعد کسی کے لیے بھی جانشینی کی نہ وصیت کی اور نہ کسی کی اطاعت کے لیے لوگوں کو پابند کیا۔ بعد میں ان کے اعیان سلطنت نے رجعام کو تخت پر بٹھایا' مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ بنی اسرائیل کے دس قبیلے شمالی فلسطین کا علاقہ لے کر الگ ہو گئے اور صرف یہوداہ کا قبیلہ بیت المقدس کے تخت سے وابستہ رہ گیا۔''

(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم' صفحہ 338)

(6) **لشکر سلیمان علیہ السلام اور وادی نملہ:**......حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جانوروں اور پرندوں کی بولیاں سمجھنے کا علم عطا فرمایا تھا۔ چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ قرآن مجید میں وادی نملہ (چیونٹیوں کی بستی) سے متعلق اس طرح مذکور ہے:

''اور ہم نے داؤد علیہ السلام و سلیمان علیہ السلام کو علم عطا کیا' اور انھوں نے کہا کہ شکر ہے اس خدا کا' جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا کی۔ اور داؤد علیہ السلام کا وارث سلیمان ہوا۔ اور اس نے کہا: ''لوگو' ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں' اور ہمیں ہر طرح کی چیزیں دی گئی ہیں۔ بے شک یہ اللہ تعالیٰ کا نمایاں فضل ہے۔'' سلیمان علیہ السلام کے لیے جن اور انسانوں اور پرندوں کے لشکر جمع کیے گئے تھے اور وہ پورے ضبط میں رکھے جاتے تھے۔ (ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کوچ کر رہا تھا) یہاں تک کہ جب یہ سب چیونٹیوں کی وادی میں پہنچے تو ایک چیونٹی نے کہا: ''اے چیونٹیو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمھیں کچل ڈالیں اور انھیں خبر بھی نہ ہو۔ سلیمان علیہ السلام اس کی بات پر مسکراتے ہوئے ہنس پڑا اور بولا: ''اے میرے رب' مجھے قابو میں رکھ کہ میں تیرے اس احسان کا شکر ادا کرتا رہوں' جو تو نے مجھ پر اور میرے والدین پر کیا ہے' اور ایسا عمل صالح کروں جو تجھے پسند آئے اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے صالح بندوں میں داخل کر۔''

(سورۂ نمل۔ آیات 15 تا 19)

ان آیات کو بھی بعض مفسرین و مورخین نے تشریح و تاویل سے عجیب و غریب کہانی بنا دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی نمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے' بلکہ یہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقے میں تھی' حالانکہ جدید سائنسی علوم نے ثابت کر دیا ہے کہ شہد کی مکھیوں اور چیونٹیوں کا اس قدر اچھا اور منظم نظام ہے کہ اسے ''نظام حکومت'' کہنا مبالغہ نہیں کہا جا سکتا' بلکہ بعض عالموں نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ انسان نے بھی اپنا نظام انھی دو نظاموں کو دیکھ کر مرتب کیا ہے۔ عقلی حیثیت سے یہ بات کچھ بعید بھی نہیں ہے کہ ایک چیونٹی اپنی جنس کے افراد کو کسی آتے ہوئے خطرے سے خبردار کرے اور بلوں میں گھس جانے کے لیے کہے۔ رہی یہ بات کہ حضرت سلیمانؑ نے اس کی بات کیسے سن لی' تو جس شخص کے حواس کلام وحی جیسی لطیف چیز کا ادراک کر سکتے ہوں' اُس کے لیے چیونٹی کے کلام جیسی کثیف چیز کا ادراک کر لینا کوئی بڑی مشکل بات نہیں ہے۔

وادی نمل کا یہ واقعہ ذکر کرنے سے اللہ تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ جب اس آیت سے قبل یہ بیان کیا گیا کہ ''حضرت داؤد اور سلیمان علیہ السلام کو ''علم منطق الطیر'' عطا کیا گیا' تو اُس کے ثبوت میں مناسب سمجھا گیا کہ ایک دو واقعات ایسے بیان کر دیے جائیں کہ جس سے مخاطب کو اس مسئلے میں کسی قسم کا تردد اور شک باقی نہ رہے اور اسے علم الیقین حاصل ہو جائے کہ قرآن مجید نے جس حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے' اس کے پیش نظر یہ علم عام دنیوی علم کی طرح کا علم نہیں تھا' بلکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان دونوں عظیم المرتبت پیغمبروں کے لیے خاص عطا و بخشش اور معجزہ تھا۔ چنانچہ پہلا واقعہ تو یہی چیونٹیوں کی بستی اور ان کے مکالمے کا بیان ہوا۔ اس واقعے کے فوراً بعد دوسرا واقعہ ملکہ سبا کا بیان ہوا۔

(7) **حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا:**......اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے عظیم الشان اور بے مثال دربار میں انسانوں کے علاوہ جن اور حیوانات بھی خدمات انجام دینے کے لیے حاضر رہتے تھے اور اپنے اپنے مراتب اور مفوضہ خدمات پر بے چون و چرا تابع فرمان۔ ایک مرتبہ دربار سلیمانی اپنے پورے جاہ و حشم کے ساتھ منعقد تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جائزہ لیا تو ہدہد کو اپنی جگہ پر غیر حاضر پایا۔ باقی کی تفصیل قرآن مجید میں یوں بیان ہوئی ہے۔ (سورۂ نمل۔ آیات 20 تا 44 کا ترجمہ)

(ایک اور موقع پر) سلیمان علیہ السلام نے پرندوں کا جائزہ لیا اور کہا: ''کیا بات ہے کہ میں فلاں فلاں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذبح کر دوں گا' ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنا ہو گی۔''

''کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس نے آ کر کہا: ''میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں' جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمران ہے۔ اسے ہر طرح کا سرو سامان بخشا گیا ہے اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کے بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے۔ شیطان نے ان کے اعمال ان کے لیے خوش نما بنا دیئے اور انھیں شاہ راہ سے روک دیا' اس وجہ سے وہ یہ سیدھا راستہ نہیں پاتے کہ اس خدا کو سجدہ کریں جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں نکالتا ہے' اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم لوگ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو۔ اللہ کہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں' جو عرش عظیم کا مالک ہے۔''

سلیمان نے کہا' ابھی ہم دیکھ لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹ بولنے والوں

میں سے ہے۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے۔ پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِعمل ظاہر کرتے ہیں۔"

ملکہ بولی: "اے اہلِ دربار! میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اللہ تعالیٰ رحمان و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ "میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ" (خط سنا کر) ملکہ نے کہا: "اے سرداران قوم! میرے اس معاملے میں مجھے مشورہ دو' میں کسی معاملے کا فیصلہ تمھارے بغیر نہیں کرتی ہوں۔"

انھوں نے جواب دیا: "ہم طاقت ور اور جنگ جو لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے"

ملکہ نے کہا: بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اُسے خراب اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں' پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں"

جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا: "کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے' وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمھیں دیا ہے۔ تمھارا ہدیہ تمھی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف۔ ہم ان پر لشکر لے کر آئیں گے جن کا وہ مقابلہ نہ کر سکیں گے اور ہم انھیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے"

سلیمان علیہ السلام نے کہا: "اے اہلِ دربار' تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟ جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا' میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔"

جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا' وہ بولا: "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں۔"

"جوں ہی کہ سلیمان علیہ السلام نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا' وہ پکار اٹھا "یہ میرے رب کا فضل ہے تا کہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافر نعمت بن جاتا ہوں۔ اور جو کوئی شکر کرتا ہے' اس کا شکر اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے' ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں کریم ہے۔

سلیمان نے کہا: "اَن جان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو۔ دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہ راست نہیں پاتے۔ ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا' کیا تیرا تخت ایسا ہی ہے؟

وہ کہنے لگی: "یہ تو گویا وہی ہے۔ ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا (یا ہم مسلم ہو چکے تھے۔)

اسے ایمان لانے سے جس چیز نے روک رکھا تھا' وہ ان معبودوں کی عبادت تھی' جنھیں وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پوجتی تھی' کیوں کہ وہ ایک کافر قوم سے تھی۔

اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اُترنے کے لیے اس نے اپنے پائنچے اُٹھا لیے۔ سلیمان علیہ السلام نے کہا' یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔ اس پر وہ پکار اٹھی: "اے میرے رب' آج تک میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی' اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔"

(سورۂ نمل۔ آیات 20 تا 44)

حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کا یہ واقعہ بجائے خود مفصل و مکمل ہے' تاہم چند قابل ذکر امور کی نشان دہی ضروری ہے:

"سبا" قحطانی نسل کی ایک مشہور شاخ ہے۔ یہ اپنے قبیلے کا جد اعلیٰ تھا اور اس کا نام عمر یا عبد شمس تھا اور سبا اس کا لقب۔ یہ شخص بڑا جری اور صاحب ہمت تھا اور اس نے زبردست فتوحات کے ذریعے حکومت سبا کی بنیاد ڈالی۔ سبا کا زمانہ عروج تقریباً 100 اق م سمجھا جاتا ہے' اس لیے کہ تقریباً 1000 ق م میں اس کی حکومت وطاقت اور عروج کا ذکر حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"اے خدا' بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے۔ وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا۔ ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں دیں گے اور سبا اور سبا کے بادشاہ ہدیے گزاریں گے۔ وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اسے دیا جائے گا۔ اس کے حق میں سدا دعا ہو گی۔"

چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کی یہ دعا قبول ہوئی اور تقریباً 950 ق م میں ملکہ سبا نے حاضر ہو کر سبا کا سونا اور جواہرات نذر گزارے' بلکہ مسلمان ہو کر حکومت سبا ہی کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے زیر فرمان کر دیا۔

سبا کی حکومت کا اصل مرکز عرب کے جنوبی حصہ یمن کے مشرقی علاقے میں تھا اور دارالحکومت کا نام مآرب تھا۔ اسے شہر سبا بھی کہتے تھے' اور اس کا دائرہ آہستہ آہستہ وسیع ہو کر مغرب میں حضرموت تک وسیع ہو گیا تھا اور دوسری جانب افریقہ تک بھی اس کا اثر پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ حبشہ میں اذینہ کا علاقہ سبا کے ماتحت تھا جس پر ایک سبائی گورنر حکومت کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ معین کی حکومت زوال پذیر تھی اور سبا نے یمن اور اطراف یمن میں اپنے مشہور قلعے تعمیر کر لیے تھے اور معین کے قلعے کھنڈر کی صورت میں بدلتے جا رہے تھے۔ سبا کی مختلف شاخیں تھیں اور عرصہ دراز کے بعد ان میں سے متعدد شاخوں نے یمن کو مرکز حکومت بنا کر عظیم الشان تمدن اور حکومت کی بنیادیں قائم کر لی تھیں۔ ان میں سے حمیر اور تبابعہ مشہور حکمران شاخیں ہیں اور اُن سے قبل کے سبا کے حکمران "ملوک سبا" کے نام سے مشہور ہیں۔ ملوک سبا کا آخری دور حکومت 550 ق م بتایا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سبا کے واقعہ میں یہ نہیں بتایا کہ اس ملکہ کا نام کیا تھا' اور نہ یہ تعیین کی کہ وہ سبا کے دائرہ حکومت کے تین مرکز یمن' حبشہ اور شمالی عرب میں سے کس حصے سے آئی تھی' کیوں کہ اس کے مقصد کے لیے یہ دونوں باتیں غیر ضروری ہیں' مگر یہود کی اسرائیلی داستانوں میں اس کا نام بلقیس مذکور ہے۔

کتب تفاسیر میں منقول ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا (بلقیس) سے نکاح کر لیا اور اسے اپنے ملک میں جانے کی اجازت دی' اور حضرت سلیمان علیہ السلام گاہے گاہے اس سے ملاقات فرماتے رہتے تھے۔ لیکن قرآن مجید اور صحیح احادیث میں نفی یا اثبات دونوں حیثیتوں میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(8) حضرت سلیمان علیہ السلام اور جادوگری

بنی اسرائیل نے اپنی الہامی کتابوں میں تحریف کر دی تھی اور اپنے دنیوی مقاصد و اغراض کی خاطر ان میں ہر قسم کا ردوبدل کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے معاملے میں تو اس درجہ جسارت کی کہ ان کی نبوت و رسالت سے بھی انکار کر کے ان پر طرح طرح کے الزام اور بے ہودہ بہتان لگائے۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر الزام لگایا ہے کہ انھوں نے ملکہ سبا کے ساتھ معاذ اللہ زنا کا ارتکاب کیا اور اسی حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بخت نصر پیدا ہوا جس نے بیت المقدس کو تباہ کیا۔

(جیوش انسائیکلوپیڈیا' جلد 11' صفحہ 443 بحوالہ تفہیم القرآن' جلد سوم' صفحہ 582)

اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علما کا ایک گروہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر تورات کے احکام کی خلاف ورزی' غرور حکومت' غرور عقل و دانش' زن مریدی' عیش پرستی اور شرک و بت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں' اور بقول مولانا مودودی: ''یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ بائبل انھیں نبی کے بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ احکامِ الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہو گیا' جس کا دل خدا سے پھر گیا اور جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف مائل ہو گیا'' (سلاطین کتاب اول۔ باب۔ 11) ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود ان کی پھینکی ہوئی غلاظتوں سے صاف کیا اور یہ بنی اسرائیل کتنے احسان فراموش ہیں کہ اس پر بھی یہ قرآن اور اس کے لانے والے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں (تفہیم القرآن۔ جلد سوم۔ صفحہ 582)

من جملہ دوسرے الزامات کے ایک سخت الزام حضرت سلیمان علیہ السلام پر یہود نے یہ بھی لگایا کہ وہ جادو کے حامل تھے اور جادو ہی کے زور پر جن وانس' جانوروں اور پرندوں کو مسخر کیے ہوئے تھے۔ قرآن حکیم نے اپنا فرض ادا کرتے ہوئے بنی اسرائیل کے لگائے ہوئے اس بہتان کی مدلل تردید کی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی پیغمبرانہ عظمت کو نمایاں اور روشن کیا۔ (ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ کی متعلقہ آیات 102 اور 102 کا ترجمہ)

''اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ہوا آیا' جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی' تو ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ تعالیٰ کو اس طرح پس پشت ڈالا' گویا وہ جانتے ہی نہیں۔ اور لگے ان چیزوں کی پیروی کرنے جو شیاطین' سلیمان علیہ السلام کی سلطنت کا نام لے کر پیش کیا کرتے تھے' حالانکہ سلیمان علیہ السلام نے کبھی کفر نہیں کیا۔ کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ وہ پیچھے پڑے اس چیز کے جو بابل میں دو فرشتوں' ہاروت و ماروت پر نازل کی گئی تھی' حالانکہ وہ (فرشتے) جب بھی کسی کو اس کی تعلیم دیتے تھے' تو پہلے صاف طور پر متنبہ کر دیا کرتے تھے کہ ''دیکھ ہم محض ایک آزمائش ہیں' تو کفر میں مبتلا نہ ہو۔'' پھر بھی یہ لوگ ان سے وہ چیز سیکھتے تھے۔ جس سے شوہر اور بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ ظاہر تھا کہ اذن الٰہی کے بغیر وہ اس ذریعے سے کسی کو بھی ضرر نہ پہنچا سکتے تھے' مگر اس کے باوجود وہ ایسی چیز سیکھتے تھے' جو خود ان کے لیے نفع بخش نہیں' بلکہ نقصان دہ تھی' اور انھیں خوب معلوم تھا کہ جو اس چیز کا خریدار بنا' اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ کتنی بری متاع تھی' جس کے بدلے انھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا' کاش انھیں معلوم ہوتا۔''

قرآن مجید نے یہ واقعہ جس غرض سے بیان کیا ہے وہ تو صرف اس قدر ہے کہ بنی اسرائیل کا حضرت سلیمان علیہ السلام پر جادو (کفر) کا بہتان بالکل غلط اور افترا ہے۔ یہ کام شیاطین کا تھا۔ حضرت سلیمان کا دامن اس سے پاک ہے۔ اور یہ کہ بنی اسرائیل نے شیاطین کی پیروی اختیار کی اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ قرآن عزیز نے باقی تفصیلات کو نظر انداز کر کے صرف اجمال پر اکتفا کیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات

قرآن مجید نے سورۂ سبا میں حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کا جو واقعہ بیان کیا ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان کے حکم سے جنوں کی ایک بہت بڑی جماعت عظیم الشان عمارتیں بنانے میں مصروف تھی کہ سلیمان علیہ السلام کو پیغام اجل آ گیا' مگر جنوں کو ان کی موت کی خبر نہ ہوئی اور وہ اپنی مفوضہ خدمات میں مصروف رہے اور عرصے کے بعد جب دیمک نے لاٹھی کو چاٹ کر اس کا توازن خراب کیا' جس کے سہارے حضرت سلیمانؑ ٹیک لگائے کھڑے نظر آتے تھے' اور وہ گر گئے۔ تب جنوں کو معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عرصہ ہوا انتقال ہو گیا تھا' مگر افسوس کہ ہم معلوم نہ کر سکے' کاش کہ ہم علم غیب رکھتے' تو عرصے تک اس محنت و مشقت میں نہ پڑے رہتے' جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے خوف سے مبتلا رہے۔ سورۂ سبا کی آیت 14 کا ترجمہ یہ ہے:

''پھر جب سلیمان علیہ السلام پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتا دینے والی کوئی چیز اس گھن کے سوا نہ تھی جو اس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمان گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔''

گویا خود جنوں کو پتا چل گیا کہ غیب دانی کے متعلق ان کا زعم غلط ہے۔ نیز عام لوگ جو جنوں کو غیب داں سمجھتے تھے' ان پر بھی یہ راز فاش ہو گیا کہ وہ کوئی علم غیب نہیں رکھتے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

اللہ کے ایک برگزیدہ نبی۔ ان کا ذکر قرآن مجید کی چار سورتوں میں آیا ہے:

سورۂ نسا:163، سورۂ انعام:84، سورۂ انبیا:83،84، سورۂ ص :41 تا 44

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام بڑے دکھ درد اور مصائب میں مبتلا ہوئے مگر انھوں نے صبر وشکر کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور بارگاہ رب العزت میں آہ وزاری کے ساتھ اس اذیت سے نجات کی دعا کی جو قبول ہوئی۔اس طرح ان کی زندگی عالم انسانیت کے لیے ایک مثال بن گئی۔

بائبل میں ان کا نام Job آیا ہے اور ان کی طرف ایک صحیفہ منسوب ہے جو کتاب سلاطین ثانی میں درج ہے' لیکن بائبل میں جو کتاب ایوب علیہ السلام کے نام سے منسوب ہے' وہ بعد کی تصنیف ہے۔بعض مسلم مصنفین نے اس قصے میں اسرائیلیات کو شامل کرلیا ہے۔ان اسرائیلیات کی بنیاد یا تو کتاب ایوب اور تالمود کے ان قصوں پر ہے جو یہودی ربیوں نے بیان کیے ہیں یا یونانی عہد نامۂ ایوب پر۔اس کے علاوہ اس قصے کی تفصیلات کو مکمل کرنے کے لیے بعض مصنفین نے تخیل سے بھی کام لیا ہے۔اس بات پر تقریباً سب ہی متفق ہیں کہ حضرت ایوب علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تھے۔ابن عساکر کا قول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کی ماں حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی تھیں۔اکثر محققین تورات کا خیال ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام عرب تھے۔بیوی کا نام رحمتہ بتایا جاتا ہے۔حضرت ایوب علیہ السلام کی دولت فراواں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ بے حد مخیر تھے اور غریبوں' مصیبت زدوں' مہمانوں اور اجنبیوں پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔

آپ کی پرہیزگاری اور خدا ترسی سے ابلیس کے سینے میں دشمنی کی آگ بھڑک اٹھی اور اس نے اللہ تعالیٰ سے حضرت ایوب علیہ السلام کو آزمانے کی اجازت طلب کی۔اللہ کی جانب سے تین مراحل میں آپ کی آزمائش کی اجازت دی گئی: مال میں' خاندان میں اور جسم میں۔حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کے تمام عزیزوں نے چھوڑ دیا' صرف ایک وفادار بیوی باقی رہ گئیں جو ان کی دیکھ بھال کرتی تھیں' حتیٰ کہ جب آپ کو گھورے پر پھینک دیا گیا تو اس وقت بھی بیوی نے آپ کا ساتھ نہ چھوڑا۔دوستوں کی غلط فہمی حضرت علیہ السلام کی تکالیف میں مزید اضافے کا باعث ہوئی۔جب اس ابتلا سے بھی آپ کے پائے استقلال میں تزلزل پیدا نہ ہوا تو شیطان نے آپ کو اس طرح بہکانے کی کوشش کی' جیسے اس نے حضرت حوا کے ذریعے سے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا تھا' لیکن آپ اس کی چال کو سمجھ گئے اور قسم کھائی کہ اگر آپ کی بیوی نے شیطان کی بات پر کان دھرا تو آپ اسے ماردیں گے۔بالآخر حضرت جبرئیل یہ بشارت لائے کہ آپ ایک کراماتی چشمے کے ذریعے ابتلا سے نجات پائیں گے۔

سورۂ ص کی آیات 42 اور 43 میں ہے: ''اور ہمارے بندے ایوب علیہ السلام کا ذکر کرو' جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ شیطان نے مجھے تکلیف اور عذاب میں ڈال دیا ہے۔(ہم نے اسے حکم دیا) اپنا پاؤں زمین پر مار۔یہ ہے ٹھنڈا پانی نہانے کے لیے اور پینے کے لیے۔ہم نے اسے اس کے اہل وعیال واپس دیے اور ان کے ساتھ اتنے ہی اور' اپنی طرف سے رحمت کے طور پر اور عقل وفکر رکھنے والوں کے لیے درس کے طور پر''

آپ سلسلہ انبیا میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد مبعوث ہوئے۔ایک قول ہے کہ آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد ہوئے۔ابن الکلبی نے آپ کو حضرت یونس علیہ السلام کے بعد رکھا ہے۔آپ صاحب رسالت تھے اور آپ نے بمقام حوران اپنی قوم میں دین حق کی تبلیغ فرمائی۔روایتوں میں ہے کہ جب لوگوں کے مختلف گروہ جنت میں داخل ہو رہے ہوں گے۔تو ''صبر کرنے والوں'' کے سردار ہوں گے۔جغرافیہ داں مسعودی نے لکھا ہے کہ 332(ہجری میں) دمشق کے نزدیک نوئ میں آپ کا مقبرہ زیارت گاہ خاص وعام تھا۔یہاں وہ چٹان اب تک دیکھی جاسکتی ہے جہاں بیٹھ کر آپ نے زمانہ ابتلا بسر کیا تھا' اور وہ چشمہ بھی جس میں غسل کرکے آپ نے شفا پائی تھی۔

علالت وابتلا کے زمانے میں حضرت ایوب علیہ السلام نے جس صبر وتحمل کا ثبوت دیا' اس سے ''صبر ایوب'' کی ترکیب نکلی جو ادب میں بطور ضرب المثل رائج ہے۔یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے ملتان فتح کیا تو اس وقت وہاں کے بڑے بڑے مندر کا بت حضرت ایوب علیہ السلام کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔آپ کی وفات کے بعد آپ کے صاحب زادے ذوالکفلؑ کے لقب سے نبی مبعوث ہوئے۔

حضرت یونس علیہ السلام

اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی' جنھیں اہل نینوا کی رشد وہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا تھا۔نینوا عراق کا مشہور مرکزی شہر اور اشور حکومت کا پائے تخت تھا۔تورات میں حضرت یونس علیہ السلام کا نام (Jonah) مذکور ہے۔آپ کا شمار اسرائیلی پیغمبروں میں کیا جاتا ہے۔آپ کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط میں متعین کیا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر چھے سورتوں میں آیا ہے:

سورۂ نسا163، سورۂ انعام86، سورۂ یونس98، سورۂ انبیا87،88، سورۂ صافات 139 تا 148، سورۂ القلم 48 تا 50

حضرت یونس علیہ السلام کو ایک لاکھ سے زائد انسانوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا۔انھوں نے ایک مدت تک اپنی قوم کو پیغام سنایا اور توحید کی طرف بلایا' لیکن اس نافرمان اور سرکش قوم نے ایک نہ سنی۔جب حضرت یونس علیہ السلام نے دیکھا کہ قوم کفر وشرک کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو وہ قوم سے مایوس ہو کر ان کے لیے عذاب الٰہی کی بددعا کرتے ہوئے غصے اور خفگی کے عالم میں قوم کو کفر کی حالت میں چھوڑ کر شہر سے نکل کھڑے ہوئے۔قوم سے بھاگ کر وہ ایک کشتی میں سوار ہوگئے۔سواریوں سے بھری ہوئی کشتی طوفانی موجوں کی لپیٹ میں آگئی اور قریب تھا کہ کشتی لہروں کی نذر ہو جائے۔کشتی والوں نے اپنے عقیدے کے مطابق یہ نتیجہ نکالا کہ کشتی میں کوئی ایسا غلام سوار ہوگیا ہے جو اپنے آقا سے بھاگ کر آیا ہے اور اس کی وجہ سے کشتی کو ڈوب جانے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے' لہٰذا اہلِ کشتی کی سلامتی اسی بات میں ہے کہ اس بھاگے ہوئے غلام کو کشتی سے نکال باہر کیا جائے۔اور جس کے نام کا رقعہ نکلے' اسے پانی میں پھینک دیا جائے تاکہ باقی سب لوگ بچ سکیں۔جب قرعہ اندازی ہوئی تو قرعہ حضرت

یونس علیہ السلام کے نام نکلا' مگر ان کی پیغمبرانہ معصومیت' پاک بازی اور نیک صورت کو دیکھ کر اہل کشتی کو یہ گوارا نہ ہوا کہ انھیں طوفانی لہروں کے سپرد کر دیا جائے۔ تین مرتبہ قرعہ اندازی کی گئی اور ہر مرتبہ انھی کا نام نکلا۔

بالآخر حضرت یونس علیہ السلام پانی میں کود پڑے جہاں انھیں ایک وہیل مچھلی نے نگل لیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس مچھلی کو حکم تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو نہ کھائے اور نہ کوئی گزند پہنچائے۔ مچھلی کو صرف نگل لینے کی اجازت تھی۔ خوراک بنانے کی اجازت قطعاً نہ تھی۔ مچھلی انھیں نگلنے کے بعد اپنے پیٹ میں اٹھائے پانیوں میں گھومتی پھرتی رہی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس مچھلی کو ایک اور بڑی مچھلی نے نگل لیا تھا' اسی لیے سورۂ انبیا کی آیت 87 میں ہے: فنادیٰ فی الظلمٰت ''یعنی یونس علیہ السلام نے اندھیروں میں اپنے رب کو پکارا۔ اندھیروں سے مراد ہے پانی کے اندر کا اندھیرا' ایک مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا' اور پھر دوسری مچھلی کے پیٹ کا اندھیرا۔ ان تمام اندھیروں میں انھیں اپنی اجتہادی غلطی کا شدید احساس ہوا کہ بہ حیثیت پیغمبر انھیں جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے تھا' بلکہ منصب نبوت کا تقاضا تھا کہ وہ وحی الٰہی کا انتظار کرتے۔ اذن الٰہی کے بغیر قوم کو چھوڑ کر غصے کے عالم میں نکل کھڑے ہونے کو انھوں نے اپنی جان پر ظلم کے مترادف سمجھا' چنانچہ پریشانی اور غم کے عالم میں ندامت و توبہ کا اظہار کرتے ہوئے پکار اٹھے:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ o﴾ (الانبیا : 87)

''اے اللہ! تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ہے۔ بے شک میں ہی قصوروار اور اپنی جان پر ظلم کرنے والا ہوں۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پکار سن لی اور انھیں غم سے نجات دے دی۔ حضرت یونس علیہ السلام کو کئی غم لاحق تھے۔ ایک غم تو قوم کے ایمان نہ لانے کا تھا۔ دوسرا وحی الٰہی کا انتظار کیے بغیر قوم کو چھوڑ کر چل دینے کا' اور تیسرا مچھلی کے پیٹ میں محبوس ہونے کا۔ جب اللہ تعالیٰ کی رحمت جوش میں آئی تو مچھلی کو حکم دیا کہ وہ حضرت یونس علیہ السلام کو اگل دے۔ چنانچہ مچھلی نے انھیں ساحل پر ایک چٹیل میدان میں اگل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر یونس علیہ السلام تسبیح اور استغفار نہ کرتے تو مچھلی کے پیٹ سے نجات نہ پاتے۔ مچھلی کے پیٹ کے اندر رہنے کی وجہ سے وہ بڑے کمزور' ناتواں اور مضمحل ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے وہاں حضرت یونس علیہ السلام کی صحت کی بحالی کے لیے ایک بیل دار درخت لگا دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کدو کی بیل تھی۔ پھر جب تن درست و توانا ہو گئے تو انھیں حکم ہوا کہ اپنی قوم کے پاس چلے جائیں' جو ان کی گرغیر حاضری میں ایمان لا چکی تھی (صافات: 139 تا 148)

ہوا یہ کہ جب حضرت یونس علیہ السلام قوم سے ناراض ہو کر شہر سے نکلے تو قوم نے عذاب کی علامات اور نشانیاں بھانپ لیں اور قرائن و آثار سے عذاب کو یقینی سمجھ کر توبہ و استغفار کرنے لگے۔ نہایت عجز و انکساری سے اللہ تعالیٰ کے سامنے جھک گئے اور گناہوں سے تائب ہو کر حضرت یونس علیہ السلام پر ایمان لے آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان کے ایمان کی تصدیق فرما دی۔ چنانچہ موجودہ عذاب ان سے ٹل گیا۔ حضرت یونس علیہ السلام حکم الٰہی کے مطابق دوبارہ اپنی قوم میں جا کر ان کی راہ نُمائی کرنے لگے اور ان کی قیادت میں ان کی قوم امن و سکون سے زندگی بسر کرنے لگی۔ حضرت یونس علیہ السلام کی قوم تنہا ایسی قوم ہے جس نے عذاب سے فوراً پہلے توبہ کر لی اور عذاب ان سے ٹل گیا۔

سورۂ القلم کی آیات 48 اور 49 میں اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو حکم دیا: ''اچھا' اب رب کا فیصلہ صادر ہونے تک صبر کرو اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو جاؤ' جب اس نے پکارا تھا اور وہ غم سے بھرا ہوا تھا۔ اگر اس کے رب کی مہربانی اس کے شامل حال نہ ہو جاتی تو وہ مذموم ہو کر چٹیل میدان میں پھینک دیا جاتا۔ آخر کار اس کے رب نے اسے برگزیدہ فرما لیا اور اسے صالح بندوں میں شامل کر لیا''

بہر حال حضرت یونس علیہ السلام کو اب دوبارہ حکم ہوا کہ وہ نینوا جائیں اور قوم میں رہ کر ان کی راہ نُمائی فرمائیں تا کہ خدا کی اس قدر کثیر مخلوق ان کے فیض سے محروم نہ رہے۔ چنانچہ یونس علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی اور نینوا میں واپس تشریف لے آئے۔ قوم نے جب انھیں دیکھا تو بے حد مسرت و خوشی کا اظہار کیا اور ان کی راہ نُمائی میں دین و دنیا کی کامرانی حاصل کرتی رہی۔

پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ جو بھی ایمان والا ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے' اللہ اس کی دعا کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ انبیائے کرام کے شرف کے پیش نظر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی کو بھی زیب نہیں دیتا کہ یہ کہے کہ ''میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔'' یہ بھی فرمایا کہ میں نہیں کہتا کہ ''کوئی شخص یونس بن متی سے افضل ہے۔'' نیز فرمایا: ''تم میں سے کوئی شخص نہ کہے کہ میں یونس بن متی سے بہتر ہوں۔''

حضور ﷺ نے یہ ارشادات اس لیے فرمائے کہ کوئی شخص حضرت یونس علیہ السلام کے احوال دیکھ کر ان کی تنقیص یا توہین کی جسارت نہ کر پائے۔ حضور ﷺ کا مقصد یہ ہے کہ منصب نبوت کا تقدس و احترام کسی صورت بھی مجروح نہ ہونے پائے۔

حضرت ذوالکفل علیہ السلام

آپ کا اسم مبارک قرآن مجید میں پیغمبروں کے سلسلے میں دو بار آیا ہے۔ سورۂ انبیا آیت 85 اور سورۂ ص آیت 48 میں۔ ان دونوں مقامات پر ان کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں ملتی' البتہ ان کے صبر اور نیکی کی تعریف کی گئی ہے۔ احادیث بھی تفصیلات سے خالی ہیں۔ ذکر جو کچھ ملتا ہے' وہ یا تو عہد نامہ عتیق اور اس کی بعض شروح میں ملتا ہے یا عربی کے عام تذکروں اور کتب لغت میں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی رقم طراز ہیں: ''بڑی بحث نام سے متعلق ملتی ہے: کسی نے کہا کہ یہ یوشع نبی تھے۔ کسی نے کہا کہ الیاس نبی تھے۔ اور کسی نے کہا کہ زکریا نبی تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے' مگر یہ قول قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات کے مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ کنعان کے جس ہم عصر بادشاہ

کو آپ نے دعوت ایمان دی تھی' اس کے لیے آپ جنت کے ''کفیل'' (ضامن) ہو گئے اور اسے آپ نے جنت کا کفالت نامہ (ضمانت نامہ) لکھ کر دے دیا تھا۔ چنانچہ اسی مناسبت سے آپ کا لقب ''ذوالکفل'' (صاحب ضمانت) پڑ گیا' لیکن نسبتاً معتبر قول یہ ہے کہ آپ کا شمار انبیائے بنی اسرائیل میں ہے' اور آپ کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح کا ہے۔

ذوالکفل کا سال پیدائش تخمیناً 622 ق م قرار دیا گیا ہے' ممکن ہے کہ اس سے بھی قبل کا ہو۔ والد کا نام عہد نامہ عتیق میں بوزی (Buzi) آیا ہے' جو بیت المقدس میں ہیکل مقدس کے مجاوروں یا اسرائیلی اصطلاح میں کاہنوں کے خاندان سے تھے۔ 598 ق م میں جب بابل کے مشہور تاج دار بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کیا تو ہزاروں قیدی وہاں سے لایا اور انھیں اپنے ملک میں آباد کیا۔ انھی میں حضرت حزقیل بھی تھے' جس کا معرب ذوالکفل ہے۔ آپ کو نبوت اسی اسیری کے پانچویں سال عطا ہوئی تھی' جب کہ آپ کی عمر تیس سال سے یقیناً متجاوز ہو چکی تھی۔''

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ''تفہیم القرآن'' میں مذکورہ بالا آیات کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''یقین و اعتماد کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فی الواقع یہ کون سے نبی ہیں۔ موجودہ زمانے کے مفسرین نے اپنا میلان حزقی ایل علیہ السلام نبی کی طرف ظاہر کیا ہے' لیکن ہمیں کوئی معقول دلیل ایسی مل سکے تو یہ رائے قابل ترجیح ہو سکتی ہے' کیوں کہ بائبل کے صحیفہ حزقی ایل کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع وہ اس تعریف کے مستحق ہیں یعنی صابر و صالح۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو یروشلم کی آخری تباہی سے پہلے بخت نصر کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ بخت نصر نے عراق میں اسرائیلی قیدیوں کی ایک نو آبادی دریائے خابور کے کنارے قائم کر دی تھی جس کا نام تل ابیب تھا۔ اسی مقام پر 594 ق م میں حضرت حزقی ایل نبوت کے منصب پر سرفراز ہوئے' جب کہ ان کی عمر تیس سال تھی اور مسلسل بائیس سال ایک طرف گرفتار بلا۔ اسرائیلیوں کو اور دوسری طرف یروشلم کے غافل و سرشار باشندوں اور حکمرانوں کی بیداری کی خدمت انجام دیتے رہے۔ اس کار عظیم میں ان کے انہماک کا جو حال تھا' اس کا اندازہ اس سے لگا جا سکتا ہے کہ نبوت کے نویں سال ان کی بیوی (جنھیں وہ خود منظور نظر کہتے تھے) انتقال کر جاتی ہیں' لوگ ان کی تعزیت کے لیے جمع ہوتے ہیں اور حزقی ایل اپنا دُکھڑا چھوڑ کر اپنی ملت کو خدا کے اس عذاب سے ڈرانا شروع کر دیتے ہیں جو اس کے سر پر تلا کھڑا تھا۔''

حضرت عزیر علیہ السلام

قرآن مجید میں حضرت عزیر علیہ السلام کا نام صرف ایک جگہ سورۂ توبہ (آیت 30) میں مذکور ہے۔

''یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔ یہ بھی انھی کی ریس کرتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت۔ یہ کدھر بھٹکے جا رہے ہیں'

سورۂ بقرہ' آیت 259 میں ایک واقعہ مذکور ہے (ترجمہ:) ''مثال کے طور پر اس شخص کو دیکھو' جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر اوندھی گری پڑی تھی۔ اس نے کہا: ''یہ آبادی جو ہلاک ہو چکی ہے' اسے اللہ کس طرح دوبارہ زندگی بخشے گا؟'' اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کی روح قبض کر لی اور وہ سو برس تک مردہ پڑا رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے دوبارہ زندگی بخشی اور اس سے پوچھا: ''بتاؤ' کتنی مدت پڑے رہے ہو؟'' اس نے کہا: ''ایک دن یا چند گھنٹے رہا ہوں گا۔'' فرمایا: ''تم پر سو برس اسی حالت میں گزر چکے ہیں۔ اب ذرا اپنے کھانے اور پانی کو دیکھو کہ اس میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے۔ دوسری طرف ذرا اپنے گدھے کو بھی دیکھ (کہ اس کا پنجر تک بوسیدہ ہو رہا ہے) اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے کہ ہم تمھیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دیکھو کہ ہڈیوں کے اس پنجر کو ہم کس طرح اٹھا کر گوشت پوست اس پر چڑھاتے ہیں۔'' اس طرح جب حقیقت اس کے سامنے بالکل نمایاں ہو گئی تو اس نے کہا: ''میں جانتا ہوں ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص کون تھا جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تو اس کے جواب میں مشہور قول ہے کہ یہ حضرت عزیز علیہ السلام تھے۔ حضرت علیؓ حضرت عبداللہ عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا رجحان اسی جانب ہے کہ یہ واقعہ حضرت عزیر علیہ السلام سے متعلق ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کی زندگی کے حالات کے بارے میں کتب سیر و تاریخ زیادہ تر خاموش ہیں۔ جو روایات ملتی ہیں' ان میں سے اکثر اسرائیلی ہیں اور سند کے اعتبار سے کم زور ہیں۔ بہر حال بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کیا تو وہ صغیر سن تھے۔ بخت نصر اسرائیلیوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا تو یہ بھی ان قیدیوں میں شامل تھے۔ چالیس برس کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے اُنھیں ''حکمت'' سے نوازا اور بنو اسرائیل نے اُنھیں ''فقیہ'' تسلیم کر لیا اور بابل ہی میں وہ منصب نبوت سے سرفراز ہوئے۔ بنو اسرائیل کی اسیری بابل سے لے کر آزادی' پھر بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر اور آبادی تک حضرت عزیر علیہ السلام بنو اسرائیل کے ساتھ ساتھ رہے۔ وہ اپنے زمانے میں تورات کے سب سے عالم اور حافظ تھے۔

جب بخت نصر نے بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور بنو اسرائیل کے بچوں اور بوڑھوں' مردوں اور عورتوں کو قیدی بنا کر لے گیا تو اس وقت اس نے تورات کے تمام نسخوں کو اس طرح نذر آتش کیا کہ کوئی نسخہ رہنے نہ پایا۔ چنانچہ زمانہ اسیری میں بنو اسرائیل تورات سے بالکل محروم رہے۔ جب اسیری سے رہائی ملی اور وہ بیت المقدس میں دوبارہ آباد ہوئے تو تورات حاصل کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس وقت حضرت عزیر علیہ السلام کے سوا اور کوئی ایسا حافظ تورات موجود نہ تھا' جسے اول سے آخر تک تورات حفظ ہو۔ تورات کو دوبارہ لکھوانے اور وجود بخشنے کا شرف حضرت عزیر علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ جب یہودیوں نے یہ دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو الواح پر لکھی ہوئی تورات لائے تھے' لیکن حضرت عزیر علیہ السلام نے کسی نسخے یا الواح کی مدد کے بغیر محض اپنے حافظے سے ساری تورات لکھوا دی ہے تو ان میں سے بعض یہودیوں

نے اسی بنا پر حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا (ابن اللہ) کہنا شروع کر دیا' جس کی تردید قرآن مجید میں کرنی پڑی۔ حضرت عزیر علیہ السلام کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح قرار دیا جاتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام

حضرت زکریا علیہ السلام و یحییٰ علیہ السلام انبیائے اسرائیل میں سے ہیں اور ان کا تذکرہ قرآن مجید میں موجود ہے:

آل عمران: 37 تا 41، انعام: 85، مریم: 2 تا 11، انبیا: 89' 90

حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام معاصر تھے۔ انبیائے بنی اسرائیل میں ''زکریا'' نام کے دو نبی ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک زکریا بن برخیا ہیں جو انبیائے تورات میں سے تھے۔ ان کا ظہور فارس (ایران) کے بادشاہ دارا بن گشتاسب کے عہد میں ہوا۔ دوسرے زکریا ابو یحییٰ ہیں جو حضرت مریم علیہا السلام کے خالو اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاصر تھے۔ اول الذکر زکریا کا تذکرہ قرآن مجید میں نہیں' بلکہ مجموعہ تورات کے صحیفہ زکریا میں ان کا ذکر موجود ہے۔ دونوں میں تقریباً چار سو سال کا عرصہ حائل ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام اولاد سلیمان بن داؤد علیہ السلام میں سے تھے۔ ''لاوی'' ہونے کی حیثیت سے وہ ہیکل کے کاہنوں یا خادموں میں شامل تھے۔ ہیکل کا کاہن یا خادم ہونا بنی اسرائیل میں ایک بہت معزز عہدہ تصور ہوتا تھا۔ حضرت زکریا اور حضرت مریم کے والد عمران بن ماثان ہم زلف تھے۔ زکریا کی بیوی کا نام ایشاع اور عمران کی بیوی کا نام حنہ تھا۔

حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کے ہم زلف عمران بن ماثان (والد مریم علیہا السلام) کا حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہونا بھی اہلِ کتاب اور اہلِ اسلام دونوں کی روایات کی بنیاد پر ثابت اور مسلم ہے۔ اسی طرح حضرت زکریا علیہ السلام' ان کے بیٹے حضرت یحییٰ' اور حضرت عیسیٰ کا معاصر ہونا بھی ثابت اور مسلم ہے۔ طبری کے بیان کے مطابق حضرت یحییٰ علیہا السلام کی پیدائش بابل پر سکندر کے حملے کے تین سو تیس سال بعد اور حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے صرف چھ ماہ قبل ہوئی۔ ابن اثیر نے وضاحت سے لکھا ہے کہ سب سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام نے نبوت مسیح کی تصدیق کی اور انھیں بپتسما بھی حضرت یحییٰ ہی نے دیا تھا۔ حضرت یحییٰ اور زکریا علیہا السلام کا قتل رفع مسیح سے ایک سال قبل ہوا۔ ابن اثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ بابل سے واپسی کے بعد بنی اسرائیل نے بیت المقدس کی تعمیر کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس اپنے رسول بھیجے' مگر انھوں نے سب کو یا تو قتل کر دیا یا تکذیب کی۔ آخری انبیائے کرام زکریا علیہ السلام' یحییٰ علیہ السلام اور مسیح علیہ السلام تھے جن میں سے دو اول الذکر قتل کیے گئے۔

چار سورتوں میں بیان ہوا ہے:

آل عمران 37 تا 41، الانعام 85، مریم 2 تا 11، الانبیاء 90۔

حضرت زکریا کے زمانے میں انھی کے خاندان میں ''عمران'' نامی ایک بلند پایہ بزرگ اور کاہن تھے۔ ان کی بیوی کا نام ''حنہ'' تھا۔ وہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی ''ایشاع'' کی حقیقی بہن تھی۔ یہ خاتون بڑی عابدہ' زاہدہ اور خدا رسیدہ تھیں۔ ان کے خدا تعالیٰ سے گہرے تعلق کا اہم ثبوت یہ ہے کہ جب انھیں حمل ہوا تو انھوں نے اپنے رب کے حضور منت مانی کہ میرے پیٹ میں جو بچہ ہے میں اُسے تیرے نام پر تیرے مقدس گھر کی خدمت کے لیے وقف کرتی ہوں۔ وہ دنیا کی دوسری تمام ذمہ داریوں سے پوری طرح آزاد ہوگا۔ اس منت میں ایک لطیف خواہش بھی مضمر تھی کہ اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو' کیوں کہ اس زمانے میں ہیکل یعنی خداوند کے مقدس گھر کی خدمت کے لیے لڑکے ہی قبول کیے جاتے تھے۔ اس خدا ترس خاتون کی اس منت کا ذکر قرآن مجید اس طرح کرتا ہے: ''اللہ تعالیٰ اس وقت سن رہا تھا جب عمران کی عورت کہہ رہی تھی کہ میرے پروردگار اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے' تیری نذر کرتی ہوں۔ وہ تیرے ہی کام کے لیے وقف ہوگا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرما۔ تو سننے اور جاننے والا ہے۔'' (آل عمران: 35)

حضرت مریم علیہا السلام کی ولادت

جب بچہ پیدا ہوا تو وہ لڑکے کی بجائے لڑکی تھی۔ یہ صورت حال ماں کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ اس تشویش کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کی دلی خواہش کے برخلاف لڑکی پیدا ہوگئی۔ دوسرے انھیں اس بات کا قلق تھا کہ اب وہ اس پوزیشن میں نہ تھیں کہ اپنے خدا کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کر سکیں۔ قرآن مجید نومولود بچی کی ماں کے اس اضطراب کو اس طرح بیان کرتا ہے: ''پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا' مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ اس نے جو کچھ جنا تھا' اللہ کو اُس کی خبر تھی' اور لڑکا' لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔ خیر میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے' اور میں اسے اور اس کی آیندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔'' (آل عمران: 36)

مریم کی پیدائش ایک عام بچی کی پیدائش نہ تھی' بلکہ قادر مطلق کی ایک عظیم اور پُرحکمت سکیم کا ایک اہم حصہ تھی اور مستقبل میں قدرت ان کی وساطت سے اپنے ایک عہد آفرین کارنامے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتی تھی' اس لیے اس بچی میں خیر و خوبی اور کشش و جاذبیت کی بے پناہ صفات ودیعت فرما دیں۔ بچپن ہی سے اس کے چہرے بشرے سے سعادت کے نورانی آثار ظاہر ہونے لگے' جس کے نتیجے میں ہیکل مقدس کے مجاوروں اور کاہنوں نے اپنے مروجہ دستور میں ترمیم کر کے اس ہونہار اور سلیم الفطرت بچی کو خداوند کے مقدس گھر کی خدمت کے لیے قبول کر لیا۔ چنانچہ جب مریم ذرا سوجھ بوجھ کی عمر کو پہنچیں تو انھیں بیت المقدس کی عبادت گاہ ''ہیکل'' میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ دن رات ذکر الٰہی میں مشغول رہنے لگیں۔ ان کی سرپرستی اور تعلیم و تربیت کے لیے حضرت زکریا علیہ السلام مقرر ہوئے جو رشتے میں ان کے خالو تھے۔ یہ واقعہ قرآن مجید اپنے بلیغ انداز میں اس طرح بیان کرتا ہے:

''آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول فرما لیا۔ اسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا'' (آل عمران:37)

عبادت خانے میں قیام کے دوران میں حضرت مریم نے اپنے حسنِ سیرت' اخلاقی عظمت اور غیر معمولی روحانی رفعت کی بدولت معبد کے تمام مجاوروں اور کاہنوں کے دلوں میں ایک بلند مقام حاصل کر لیا۔ انھی دنوں ان کے والد عمران کا انتقال ہو گیا' اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ اب ان کی کفالت کی ذمہ داری کس کے سپرد ہو۔ ہیکل کے ہر خادم کی دلی خواہش تھی کہ یہ اعزاز اسے نصیب ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے قرعے کے ذریعے فیصلہ کرنے کا پروگرام طے ہوا۔

قرعہ اندازی کا طریقہ

اُس زمانے میں فال نکالنے یا قرعہ ڈالنے کا یہ طریقہ رائج تھا کہ نے کے قلم' جو تورات لکھنے کے لیے استعمال میں لائے جاتے تھے' ان پر تورات ہی کے کچھ کلمات لکھ کر انھیں دریائے اردن میں ڈال دیا جاتا تھا۔ عام طور پر یہ قلم دریا کے بہاؤ کے رُخ بہنے لگتے' لیکن بعض قلم مخالف رُخ پر بھی بہتے' اور یہی مخالف بہاؤ کامیابی کی علامت سمجھا جاتا۔ جیت ایسے ہی قلم کے مالک کی ہوتی' گویا غیب سے ڈگری اس کے حق میں ہو گئی۔ اور یہی صورت یہاں بھی پیش آئی۔ قرعہ حضرت زکریا علیہ السلام کے نام نکل آیا۔ اس واقعے کی تفصیل قرآن مجید نہایت دل کش انداز میں نوع انسانی کو اس طرح سناتا ہے: ''اے محمدؐ' یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تمھیں وحی کے ذریعے بتا رہے ہیں' ورنہ تم اس وقت وہاں موجود نہ تھے جب (ہیکل کے خادم) یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریم کا سرپرست کون ہو' وہ اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے' اور نہ تم اس وقت حاضر تھے' جب ان کے درمیان جھگڑا ہو رہا تھا'' (آل عمران:44)

حضرت مریم علیہا السلام پر اللہ کی خصوصی عنایات

حضرت مریم پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نوازشات تھیں' جن کی وجہ سے ان کی ذات بے شمار برکات و کرامات کے ظہور کا موجب بنی ہوئی تھی۔ حضرت زکریا علیہ السلام وقتاً فوقتاً ان کی دیکھ بھال اور تربیت کے لیے ان کے حجرے میں تشریف لے جاتے تو وہاں عجیب و غریب فیوض و برکات کے نزول کا مشاہدہ فرماتے۔ ان کے پاس کھانے پینے کا ایسا سامان پاتے جسے دیکھ کر ان کی عقل دنگ رہ جاتی۔ چنانچہ جب آپ ان سے دریافت کرتے کہ یہ سامان ان کے پاس کہاں سے آتا ہے تو وہ جواب میں کہتیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے عطا فرماتا ہے۔ قرآن مجید اس معجز نما کیفیت کو اس طرح بیان کرتا ہے: ''زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب (حجرے) میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا' مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ وہ جواب دیتی' اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے' بے حساب دیتا ہے'' (آل عمران:37)

قرآن مجید کے جس لفظ کا ترجمہ مندرجہ بالا اقتباس میں ''کھانے پینے کے سامان'' سے کیا گیا ہے' وہ ''رزق'' ہے۔ علامہ ابن کثیر نے اس لفظ ''رزق'' سے مراد غیر موسمی پھل لیے ہیں۔ بعض مفسرین کے نزدیک ''رزق'' سے یہاں مراد حکمت و معرفت ہے۔ قرآن مجید نے وحی و ہدایت کے لیے یہ لفظ متعدد مقامات پر استعمال کیا ہے۔

حضرت زکریاؑ کی دُعا

غرض یہ کہ حضرت مریم کو جو رزق خزانۂ غیب سے مل رہا تھا' وہ چاہے مادی ہو یا روحانی' اپنی کیفیت اور نوعیت کے لحاظ سے تعجب انگیز تھا۔ حضرت مریم کی کم عمری کے لحاظ سے اسے غیر موسمی پھلوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ قدرت کے ان کرشموں کا اپنی بصیرت سے مشاہدہ کرنے کے بعد حضرت زکریاؑ کے دل میں بھی اپنے لیے ایک غیر موسمی پھل کی تمنا پیدا ہوئی' یعنی نیک اولاد کی تمنا۔ اُس وقت آپ بوڑھے ہو چکے تھے اور آپ کی بیوی بانجھ تھیں' اور اسی وجہ سے آپ ابھی تک بے اولاد تھے' اور اب اولاد ہونے کا کوئی ظاہری امکان بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اپنے پروردگار کی قدرت کاملہ پر بے پناہ اعتماد کرتے ہوئے نہایت خشوع و خضوع سے دُعا کی: ''(مریم کا یہ حال دیکھ کر) زکریاؑ نے اپنے رب کو پکارا: ''پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر۔ تو ہی دُعا سننے والا ہے'' (آل عمران:38)

آپ اولاد کے لیے یہ دُعا نا اُمیدی اور مایوسی کی کس کیفیت میں کرتے ہیں' اُس کا منظر قرآن مجید فصیح و بلیغ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے: ''ذکر ہے اُس رحمت کا جو تیرے رب نے اپنے بندے زکریا پر کی تھی' جب کہ اُس نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا۔ اُس نے عرض کیا: ''اے میرے پروردگار! میری ہڈیاں گھل گئی ہیں' اور سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے۔ اے پروردگار! میں تجھ سے دعا مانگ کر کبھی نامراد نہیں رہا۔ مجھے اپنے پیچھے اپنے بھائی بندوں کی بُرائی کا خوف ہے' اور میری بیوی بانجھ ہے۔ تو مجھے اپنے فضل خاص سے ایک وارث عطا کر دے جو میرا وارث بھی ہو' اور آل یعقوب کی میراث بھی پائے' اور اے پروردگار! اسے ایک پسندیدہ انسان بنا۔'' (سورۂ مریم 1 تا 6)

قبولیت دُعا کی بشارت

دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی ان کی دُعا قبول ہوئی اور اس طرح بشارت دی گئی: ''اے زکریاؑ' ہم تجھے ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحیٰی ہوگا۔ ہم نے اس نام کا کوئی آدمی اس سے پہلے پیدا نہیں کیا۔

عرض کیا: ''پروردگار' بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا' جب کہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بوڑھا ہو کر سُوکھ چکا ہوں''

جواب ملا: ''ایسا ہی ہوگا۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ یہ تو میرے لیے ذرا سی بات ہے۔ آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں جب کہ تُو کوئی چیز نہ تھا''

زکریا نے کہا: ''میرے لیے کوئی نشانی مقرر کر دے۔''

فرمایا: ''تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تُو پیہم تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا''

چنانچہ وہ محراب (حجرے) سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آیا اور اُس نے اشارے

سے انھیں ہدایت کی کہ صبح شام تسبیح کرو' (سورۂ مریم: 7 تا 11)

قرآن مجید نے اس واقعے کو سورۂ آل عمران (آیات 39 تا 41) اور سورۂ انبیا (آیت 90) میں بھی بیان کیا ہے' جس میں ارشادِ ربانی ہے: ''پس ہم نے اُس کی دُعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا کیا اور اُس کی بیوی کو اُس کے لیے دُرست کر دیا''

نجّاری کا پیشہ

حضرت زکریاؑ انجیل کی وضاحت کے مطابق کہانت عُظمیٰ کے جلیل القدر منصب پر فائز تھے اور قرآن کی تصریح سے آپ ایک عظیم المرتبت نبی بھی تھے۔ اس طرح آپ کی ذمہ داریاں نہایت اہم' ہمہ پہلو اور ہمہ گیر تھیں۔ اِس دینی رفعت وجلالت کے باوجود آپ نے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی معاشی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے محنت ومشقت اور اپنے ہاتھ سے کام کر کے روزی حاصل کرنے کی روش اپنائی۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''حضرت زکریا نجاری کرتے تھے'' (مسلم' مسند احمد' ابن ماجہ)۔ گویا آپ لکڑی کا کام کرتے تھے۔ اس قسم کے کاری گروں کو ہمارے ہاں ترکھان یا بڑھئی کہا جاتا ہے۔

حضرت یحییٰؑ

حضرت یحییٰؑ کا ذکر قرآن مجید میں اُنھی سورتوں میں آیا ہے جن میں اُن کے والد حضرت زکریاؑ کا ذکر ہے' یعنی آلِ عمران' انعام' مریم اور انبیا۔

جیسا کہ حضرت زکریاؑ کے حالات میں بیان ہُوا' آپ اپنے والد کی پیغمبرانہ دعاؤں کا حاصل تھے' اور اُن کا نام بھی اللہ تعالیٰ کا فرمودہ ہے۔ حضرت یحییٰؑ حضرت عیسیٰؑ سے چھے ماہ بڑے تھے۔ آپ کی پیدائش بیت المقدس کے قریب اُس مقام پر ہوئی جسے آج کل ''عین کریم'' کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آپ کے جن اخلاقی وروحانی کمالات کا تذکرہ ہُوا ہے' وہ تعداد میں چودہ ہیں' جن کی فہرست درج ذیل ہے:

1: اللہ کے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا
2: سیّد یعنی سرداری اور بزرگی کی شان والا
3: حصور یعنی حد درجہ ضابط اور پاک دامن
4: منصب نبوت پر فائز
5: صالح یعنی صُلح وخیر سے بہرہ وَر
6: بچپن میں قوتِ فیصلہ اور قوت اجتہاد سے سرفراز
7: حنان یعنی نرم دل اور رقیق القلب
8: پاک باز یعنی مجسمۂ طہارت ونظافت
9: متقی یعنی ہر بُرائی سے بچنے والا
10: والدین کا حق شناس
11: سرکشی اور نافرمانی سے اجتناب کرنے والا
12: نیکی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے والا
13: خوف ورغبت سے خدا کو پکارنے والا
14: خدا کے سامنے جھکنے والا

خفی نبوت سے سرفرازی

قرآن مجید واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ آپ منصب نبوت پر فائز تھے' اس لیے آپ نے تعلیم وتبلیغ اور ارشاد وہدایت کا یہ تمام حیات افزا کام اپنے خدائے ذوالجلال کی نگرانی میں اُس کی ہدایت کے مطابق انجام دیا۔ آپ کی یہ تمام سعی وکاوش ذاتی خواہش کی بنا پر نہیں' بلکہ حکم خداوندی کے تحت تھی۔ آپ نے خدا کے پیغام کو آبادی کے ہر طبقے تک پہنچانے کی کوشش کی۔ آپ کے پاس جو بھی اپنی اصلاح کے لیے آتا' آپ اُس سے سابقہ گناہوں سے توبہ کراتے۔ پھر اُسے بپتسمہ دیتے۔ بپتسمہ ایک رسم تھی جس کا مطلب بندے کو خدا کے رنگ میں رنگنا تھا۔ اس کی ظاہری صورت یہ تھی کہ جو شخص اپنے گناہوں سے توبہ کرتا اور آپ کی تعلیمات پر چل کر آئندہ گناہوں سے بچ کر رہنے کا وعدہ کرتا' آپ دریائے یرون کا پانی اُس کے سر پر چھڑک کر اُس کے حق میں خیر وبرکت کی دُعا کرتے۔ یہ عمل بپتسمہ (اصطباغ) کہلاتا تھا۔

حضرت یحییٰؑ کی پکار میں اتنا سوز وگداز تھا کہ جو بھی سنتا' وہ بے خود ہو کر آپ کی طرف ضرور متوجہ ہو جاتا۔ چنانچہ آپ کی توبہ کرانے اور غسل دے کر جسم ورُوح کو پاک صاف کرنے کی تحریک پورے علاقے میں بڑی مقبول ہوئی۔ یہودیہ اور یروشلم کے لوگ بکثرت آپ کے معتقد ہو گئے اور آپ کے پاس آ کر بپتسمہ لیتے تھے۔ اسی بنا پر آپ کا نام ''یوحنا بپتسمہ دینے والا'' مشہور ہو گیا۔ عام طور پر بنی اسرائیل کے لوگ آپ کی نبوت تسلیم کر چکے تھے۔ مسیحؑ کا قول تھا: ''جو عورتوں سے پیدا ہوئے ہیں' اُن میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے بڑا کوئی نہیں''

خفی حضرت عیسیٰؑ کی آپ سے ملاقات

جب آپ شرقِ اردن کے علاقے میں اپنی تبلیغی اور اصلاحی مہم میں منہمک تھے تو حضرت عیسیٰؑ گلیل کے شہر ناصرہ سے آپ کی ملاقات کے لیے تشریف لے گئے۔ انجیل متی میں مذکور ہے: ''اُس وقت یسوع گلیل سے یوحنا کے پاس دریائے اردن کے کنارے بپتسمہ لینے آیا' مگر یوحنا اُسے یہ کہ کر منع کرنے لگا: ''میں خود تجھ سے بپتسمہ لینے کا محتاج ہوں اور تُو میرے پاس آیا ہے۔'' یسوع نے جواب میں اُس سے کہا کہ اب تو ہونے ہی دے۔ اس پر اُس نے اسے ہونے دیا'' (باب سوم)

بدبخت قوم کا ردِ عمل

حضرت یحییٰؑ نے خدا کے حکم سے اپنی قوم کو خواب غفلت سے جگانے اور ضلالت و گم راہی کی خاردار راہوں سے ہدایت وفلاح کی صراط مستقیم پر لانے کا کام جس اخلاص ودل سوزی سے کیا' قوم نے اُسے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ کی بے غرضی و بے لوثی کا اعتراف کیا اور اکثریت نے آپ کی نبوت کو تسلیم کیا۔ ان حقائق کے باوجود اس بدبخت اور شقی القلب قوم نے آپ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا' وہ یہ تھا کہ ایک خودسر اور عیش وعشرت میں بدمست یہودی سردار نے اپنی ایک فاحشہ محبوبہ کے اشارۂ ابرو پر آپ کا مقدس سرتن سے جُدا کروا کے اُس کی نذر کر دینے میں بھی تامل نہ کیا۔

اس قوم کی اس حق ناشناسی اور احسان فراموشی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس دور کے سیاسی حالات کا اختصار کے ساتھ مطالعہ کیا جائے' جس میں سے یہ قوم اُس وقت گزر رہی تھی۔

فرعونِ مصر کی غلامی سے آزادی کے بعد کی بنی اسرائیل کی تاریخ عہد شکنی' حق دشمنی اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بغاوت وسرکشی کی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ اس کے نتیجے میں اسے بارہا ذلت وخواری کے ادوار سے گزرنا پڑا۔ اس میں بے شمار انبیائے کرام مبعوث ہوئے۔ ان کی اصلاحی کوششوں کے مثبت اثرات بھی وقتی طور پر ظاہر ہوئے' لیکن پھر وہی اندھیری رات۔

حضرت زکریاؑ کے زمانے میں اس قوم کے سرداروں کے اختلافات اتنے وسیع ہو گئے کہ خود انھوں نے رومیوں کو اپنے علاقے میں آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ حضرت یحییٰؑ کی ولادت سے باسٹھ سال پہلے 63ق م میں روم کے قیصر پومپی نے فلسطین کی طرف توجہ دی۔ اُس نے بیت المقدس فتح کر کے یہودیوں کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن رومن فاتحین کی یہ مستقل پالیسی تھی کہ وہ مفتوحہ علاقوں پر براہ راست اپنا نظم ونسق قائم کرنے کی بجائے مقامی حکمرانوں کے ذریعے اپنا کام نکلوانا زیادہ پسند کرتے تھے' اس لیے انھوں نے فلسطین میں اپنے زیر سایہ ایک دیسی ریاست قائم کر دی جو بالآخر 40ق م میں ایک ہوشیار یہودی ہیرود (Herod) کے قبضے میں آئی۔ یہ شخص تاریخ میں ہیرودِ اعظم کے لقب سے مشہور ہے۔ اُس نے ایک طرف مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی کر کے یہودیوں کو خوش رکھا اور دوسری طرف رومی تہذیب کو فروغ دے کر اور رومی سلطنت کی وفاداری کا مظاہرہ کر کے قیصر کی خوشنودی بھی حاصل کی۔ اُس زمانے میں یہودیوں کی دینی واخلاقی حالت گرتے گرتے زوال کی آخری حد کو پہنچ چکی تھی۔

حضرت یحییٰؑ کے عہد میں شام اور فلسطین کا پورا علاقہ قیصر روم کے زیر نگیں تھا۔ قیصر کا نام طبریس (Tiberius) تھا۔ اس علاقے میں چار دیسی ریاستیں تھیں۔ ہر ریاست کا فرماں روا علیحدہ علیحدہ تھا۔ ان سب کا تقرر قیصر کرتا تھا۔ ان چار ریاستوں اور اُن کے حکمرانوں کے نام درج ذیل ہیں:

1: یہودیہ (Judaea) پنطیس پلیطس (Puntias Pilate)
2: گلیل Galilee (ہیروڈ Herod)
3: ترخونی تس Trachitis (فلپ Philip)
4: ابلینے Abilena (لسانیاس Lysanils)

ہیرودا اور فلپ آپس میں حقیقی بھائی تھے۔

یہودی سیاسی آزادی کی نعمت ہی سے محروم نہیں ہوئے تھے' بلکہ وہ رومیوں کی تہذیبی غلامی میں مبتلا ہو کر اپنی اعلیٰ اخلاقی اور دینی اقدار سے بھی پوری طرح محروم ہو گئے تھے۔ اخلاقی بے راہ روی' فحاشی اور بے حیائی کا سیلاب اُن کے گھروں کی چار دیواریوں میں بھی گھس آیا تھا' جس کا اندازہ ذیل کے واقعے سے لگایا جا سکتا ہے:

''حضرت یحییٰ علیہ السلام کے علاقے گلیل کا حاکم ہیرود تھا۔ اُس کے اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاس سے ناجائز تعلقات تھے جو ایک فاحشہ تھی' لیکن تھی نہایت خوب صورت۔ وہ اپنے خاوند فلپ کو چھوڑ کر ہیرود کے پاس آ گئی۔ ہیرود نے اُسے محل سرا کی زینت بنا لیا۔ حضرت یحییٰؑ نے اُس کی اس حرکت پر اُسے سخت ملامت کی اور اُس کے اِس فعل کو ناجائز اور حرام قرار دیا۔

آپ اس کے دوسرے غلط کاموں پر بھی علانیہ تنقید کرتے تھے۔ اس کے باوجود ہیرود حضرت یحییٰؑ کو گزند پہنچاتے ہوئے ڈرتا تھا' کیوں کہ وہ دل سے آپ کی عظمت اور صداقت ونبوت کا قائل تھا' لیکن ہیرودیاس آپ کے خون کی پیاسی ہو گئی۔ وہ سمجھتی تھی کہ جب تک یحییٰؑ کی دعوت وتبلیغ کا یہ سلسلہ جاری ہے' اس جیسی عورتوں کے لیے معاشرے میں عزت کا کوئی مقام نہیں۔ چنانچہ اُس نے ہیرود کو بہت بھڑکایا۔ اس پر ہیرود نے آپ کو گرفتار کر کے قید خانے میں بھجوا دیا۔ انجیل مرقس کے باب 6 میں ہے: ''ہیرود نے خود آدمی بھیج کر یوحنا کو پکڑوایا اور اپنے بھائی فلپ کی بیوی ہیرودیاس کے سبب اُسے قید خانے میں بند رکھا' کیوں کہ ہیرود نے اُس سے بیاہ کر لیا تھا اور یوحنا نے اُس سے کہا تھا کہ اپنے بھائی کی بیوی کو رکھنا تجھے روا نہیں'' آگے چل کر مزید بتایا گیا ہے: ''پس ہیرودیاس اُس (یحییٰؑ) سے دشمنی رکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ اسے قتل کرا دے' مگر ایسا نہ ہو سکا' کیوں کہ ہیرود اُسے راست باز اور مقدس آدمی جان کر اُس سے ڈرتا تھا''

حضرت عیسیٰؑ کا اعلانِ نبوت

حضرت یحییٰؑ قید خانے میں تھے' جب آپ کو حضرت مسیحؑ کی تعلیمات اور آپ کے معجزوں اور حیرت انگیز کاموں کی اطلاعات ملیں۔ آپ نے اپنے دو شاگردوں کو حضرت عیسیٰؑ کے پاس یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا کہ آیا یہ وہی مسیحؑ ہیں جن کا راستہ ہموار کرنے اور جن کی بشارت خلق خدا کو سنانے کے لیے آپ خلعت نبوت سے سرفراز ہوئے تھے۔ حضرت مسیحؑ نے آپ کے شاگردوں کو نفی یا اثبات میں جواب دینے کی بجائے انہیں اپنی رشد وہدایت سے بہرہ یاب فرمایا اور اپنے معجزات دکھائے اور فرمایا کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے' وہ یوحنا کو جا کر بتا دو۔ انجیل متی کے باب 11 میں ہے:

''اور یوحنا نے قید خانے میں مسیحؑ کے کاموں کا حال سُن کر اپنے شاگردوں کی معرفت اُن سے پچھوایا کہ ''آنے والا تُو ہی ہے یا کسی اور کی راہ دیکھیں۔'' یسوع نے جواب میں کہا: ''جو کچھ تم دیکھتے ہو اور سنتے ہو' جا کر یوحنا سے بیان کر دو کہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے پھرتے ہیں۔ کوڑھی پاک صاف کیے جاتے ہیں' اور غریبوں کو خوش خبری سنائی جاتی ہے' اور مبارک ہے وہ جو میرے سبب سے ٹھوکر نہ کھائے''

یحییٰؑ نبی کی شہادت

ادھر ہیرودیاس اپنے غرور ونخوت کا انتقام لینے کی قسم کھا چکی تھی' لیکن جب انتقام لینے کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں تو خاموشی سے موقع کا انتظار کرنے لگی' پھر موقع ملتے ہی اُس نے زہریلی ناگن کی طرح حملہ کر دیا۔ ہُوا یوں کہ ہیرود کی سال گرہ کا جشن

منعقد ہوا جس میں دُور دُور سے مہمان آئے۔ اس جشن میں ہیرودیاس کی لڑکی نے رقص کیا، جس سے ہیرود بہت خوش ہُوا اور اُس نے کہا: "جو مانگنا ہے مانگ۔" لڑکی نے ماں سے پوچھا: "کیا مانگوں؟"۔ ماں نے کہا: "یحییٰ کا سر مانگ لے"

ہیرود یہ مطالبہ سن کر سخت رنجیدہ اور پشیمان ہُوا لیکن سب کے سامنے زبان دے چکا تھا اس لیے اپنی بات کی لاج رکھنے کے لیے سپاہیوں کو جیل میں بھیج کر حضرت یحییٰؑ کو قتل کر دیا اور آپ کا سر ایک طشت میں رکھ کر اُس رقاصہ کی نذر کر دیا۔ اور وہ اسے اپنی ماں کے پاس لے گئی اور اُس کے شاگردوں نے آ کر لاش اُٹھائی اور اسے دفن کر دیا اور جا کر یسوع کو خبر کر دی" (انجیل متی)

انجیل کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ حضرت عیسیٰؑ سے چھے ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ آپ کی شہادت کے بعد جب حضرت عیسیٰؑ نے رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا کام علانیہ شروع کیا تو اُس وقت اُن کی عمر تیس سال تھی۔ اس حساب سے آپ کی کُل عمر تیس سال چھے ماہ بنتی ہے۔ اگر انجیل کے اس بیان کو درست مان لیا جائے کہ آپ کو نبوت تیس سال کی عمر میں ملی تھی تو آپ کی نبوت کا دور کم و بیش چھے ماہ بنتا ہے، لیکن بعض علما کا خیال ہے کہ آپ کو نوعمری ہی میں یہ نعمت عطا ہو گئی تھی۔ معاملہ خواہ کچھ بھی ہو آپ کی دعوت اور پکار سے پوری سوسائٹی میں ایک ہل چل پیدا ہو گئی تھی، یہ تو اُن کی قوم کی بدنصیبی اور بدبختی تھی کہ انھوں نے اس چشمۂ فیض سے فائدہ نہ اُٹھایا اور اپنی سرکشی اور حق کے مقابلے میں اپنی بغاوت کی وجہ سے عتابِ الٰہی کے مستحق ٹھہرے، جیسا کہ قرآن مجید نے اعلان کیا ہے:

"آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت و خواری اور پستی و بدحالی اُن پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔ یہ نتیجہ تھا اس کا کہ وہ اللہ کی آیات سے کفر کرنے لگی اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے لگی۔ یہ نتیجہ تھا اُن کی نافرمانیوں کا اور اس بات کا کہ وہ حدودِ شرع سے نکل نکل جاتے تھے" (بقرہ۔61)

تعلیمات کا خلاصہ حدیثِ نبوی ﷺ میں

حضرت یحییٰؑ کی تعلیمات کا چاروں انجیلوں میں کوئی مربوط اور مفصل ذکر نہیں، صرف چند مبہم اشارے ملتے ہیں، مگر نبی کریم ﷺ کی حدیث میں اُن کا مفصل خاکہ بیان ہُوا ہے۔ حضرت حارثؓ اشعری راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ کو پانچ باتوں کا خصوصیت کے ساتھ حکم دیا تھا کہ خود بھی اُن پر کاربند رہیں اور بنی اسرائیل کو بھی ان کی تلقین فرمائیں۔ وہ احکام خمسہ یہ ہیں:

پہلا حکم یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھہراؤ، کیوں کہ شرک کی مثال اُس غلام کی سی ہے جسے اُس کے مالک نے اپنے روپے سے خریدا، مگر غلام نے یہ وتیرہ اختیار کیا کہ جو کچھ کماتا ہے، وہ مالک کے سوا ایک دوسرے شخص کو دے دیتا ہے۔ تو اب بتاؤ کہ تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ اُس کا غلام ایسا ہو۔ لہٰذا سمجھ لو کہ خدا ہی نے تمھیں پیدا کیا، وہی تمھیں رزق دیتا ہے۔ تو تم بھی صرف اُسی کی بندگی کرو، اور کسی کو اُس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ تم خشوع و خضوع سے نماز ادا کرو، کیوں کہ جب تک تم نماز میں کسی اور جانب متوجہ نہ ہو گے اللہ تعالیٰ برابر رحمت کے ساتھ تمھاری طرف متوجہ رہے گا۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ روزہ رکھو اس لیے کہ روزے دار کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس کے پاس مُشک کی تھیلی ہو۔ چنانچہ مُشک اسے اور اُس کے ساتھیوں کو اپنی خوش بو سے مست کرتا رہے گا۔ روزے دار کے منہ کی بُو مُشک کی خوش بو سے زیادہ پاک ہے۔

چوتھا حکم یہ ہے کہ مال میں سے صدقہ نکالا کرو، کیوں کہ صدقہ دینے والے کی مثال اُس شخص کی سی ہے جسے اُس کے دشمنوں نے اچانک پکڑ لیا ہو اور اُس کے ہاتھوں کو گردن سے باندھ کر مقتل کی جانب لے چلے ہوں اور اس ناامیدی کی حالت میں وہ کہے: "کیا یہ ممکن ہے کہ مال دے کر اپنی جان چُھڑا لوں؟" اور اثبات میں جواب پا کر اپنی جان کے بدلے سب مال و دولت قربان کر دے۔

پانچواں حکم یہ ہے کہ شب و روز کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے رہو، کیوں کہ ذکر کرنے والے کی مثال اُس شخص کی سی ہے جو دشمن سے بھاگ رہا ہو اور دشمن تیزی سے اُس کا تعاقب کر رہا ہو اور وہ بھاگ کر کسی مضبوط قلعے میں پناہ گزیں ہو کر دشمن سے محفوظ ہو جائے۔ بلا شبہ انسان کا ذکر الٰہی میں مشغول ہو جانا اپنے دشمن شیطان کے مقابلے میں محکم قلعے میں محفوظ ہو جانا ہے۔"

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: "میں بھی تمھیں ایسی پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جس کا خدا نے مجھے حکم دیا ہے، وہ ہیں۔ لزوم جماعت۔ سمع۔ اطاعت۔ ہجرت۔ جہاد فی سبیل اللہ۔" (ترمذی۔ ابن ماجہ۔ مسند احمد)

امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیحین میں حضرت مالکؓ بن صعصعہ سے آنحضور ﷺ کے سفر معراج کے متعلق جو طویل اور مفصل روایت نقل کی ہے، اُس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"پھر جبرئیل مجھے دوسرے آسمان کی طرف لے گئے۔ انھوں نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔

کہا گیا: "تُو کون ہے؟ اور تیرے ساتھ کون ہے؟"

جبرائیل نے کہا: "میں جبرائیل ہوں اور میرے ساتھ محمد ﷺ ہیں"

پوچھا گیا: "کیا اِن کی طرف کوئی پیغام بھیجا گیا تھا؟"

جبرائیل نے کہا: "ہاں"

کہا گیا: "مرحبا ہے ان کے لیے اور آنے والا اچھا ہے"

پھر دروازہ کھولا گیا تو دیکھا کہ وہاں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت یحییٰؑ موجود ہیں جو آپس میں خالہ زاد بھائی ہیں"

جبرائیل نے کہا: "یہ یحییٰ اور عیسیٰؑ ہیں۔ آپ انھیں سلام کہیں"

میں نے انھیں سلام کیا۔ دونوں نے سلام کا جواب دیا اور کہا "مرحبا ہو صالح بھائی اور صالح نبی کو۔"

پھر جبرائیل مجھے تیسرے آسمان کی طرف لے گئے" (بخاری مسلم)

حضرت عیسیٰ ؑ

بنی اسرائیل کے انبیا کے آخری نبی۔

قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ کے واقعات وحالات کو بسط وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور اُن کی حیات طیبہ کے دیباچے کے طور پر اُن کی والدہ حضرت مریمؑ کے واقعات کو بھی روشن کیا ہے۔ یہ ذکر قرآن حکیم کی گیارہ سورتوں میں ہُوا ہے۔ ان میں سے کسی جگہ نام عیسیٰ سے یاد کیا گیا ہے اور کسی جگہ مسیح اور عبداللہ کے لقب سے اور کسی مقام پر کنیت ''ابن مریم'' کے ساتھ۔ سورتوں اور آیات کا نقشہ یہ ہے:

البقرہ 253,87، آلِ عمران 60,45,43,42، النساء 159172,171، 156۔، المائدہ 47,18,17۔118۔78۔110,۔72، الانعام 86، مریم 35۔16، الانبیا 91، مومنون 61,58، الزخرف 59,5764,63,61، الحدید 27، الصف 6

حضرت عیسیٰ کا نسب نامہ بمطابق ابن کثیر یہ ہے: عیسیٰ ابن مریم بنت عمران بن ہاشم بن امون بن میشا بن حزقیا بن احریق بن موثم بن عزاز یا بن امصیا بن یاوش بن احر یہو بن یازم بن یہفاشاط بن ایشا بن ایان بن رحبعام بن سلیمانؑ بن داؤد۔ عیسائی گو انھیں یوسف نجار کا بیٹا نہیں سمجھتے، لیکن نسب اُسی کی طرف سے شمار کرتے ہیں۔ اس بنا پر ان کا بیان کردہ نسب مسلمان ماہرین انساب کے دیئے ہوئے نسب سے مختلف ہے۔ چوں کہ عمران کے بارے میں جو قرآن مجید کے مطابق حضرت مریمؑ کے والد اور حضرت عیسیٰ کے نانا ہیں، بائبل میں کچھ بھی مذکور نہیں، اس لیے حضرت عیسیٰ کا اصلی نسب نامہ یعنی والدہ کی طرف سے انجیلوں میں مکمل طور سے نظر انداز کیا گیا ہے۔

قرآن مجید میں ان کے مندرجہ ذیل اسماء بیان کیے گئے ہیں:

عیسیٰ (تقریباً 26 مرتبہ) کلمۃ اللہ (ایک مرتبہ)
مسیح (تقریباً 11 مرتبہ) روح اللہ (ایک مرتبہ)
ابن مریم (23 مرتبہ) عبداللہ (دو مرتبہ)
وجیھاً فی الدنیا والآخرت (ایک مرتبہ)

قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ، اُن کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ، اُن کے نانا حضرت عمران اور اُن کی نانی (حنہ بنت فاقوذ، جسے امرۃ عمران کہا گیا ہے) بلکہ اُن کے پورے خاندان کا بہت اچھے الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کے خاندان کو اُن خاندانوں میں شمار کیا گیا ہے، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر خیر و برکت پھیلائی (آل عمران: 33 تا 37)

ولادت باسعادت

حضرت عیسیٰ کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ اپنے باپ عمران کی اکلوتی دختر تھیں۔ قرآن مجید کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کی ولادت حضرت آدم کی طرح عام مروجہ طریقے سے ہٹ کر ہوئی (آل عمران: 59) آدمؑ کی تخلیق ماں باپ کے بغیر ہوئی اور حضرت عیسیٰ بغیر واسطۂ پدری کے عالم وجود میں آئے۔

حضرت مریمؑ نہایت عابدہ، زاہدہ اور صالح خاتون تھیں، چنانچہ اُن کی نیکی اور پارسائی کی وجہ سے انھیں اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کی عورتوں میں سے بطور خاص منتخب فرمایا (آل عمران: 37 تا 42)۔ انھوں نے ساری عمر اللہ کی عبادت میں بسر کی۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے خصوصی نشانات کے ظہور کے لیے چُن لیا۔ چنانچہ انہیں پہلے بے موسمی پھل عطا کیے گئے (آل عمران: 42) پھر انہیں کسی قسم کے ظاہری واسطے کے بغیر محض اپنے فضل وکرم سے اپنے ایک نبی کی ماں بننے کی سعادت بخشی (آل عمران: 45 ومابعد)۔ چنانچہ ایک دن جب کہ وہ مسجد اقصیٰ (ہیکل) کی مشرقی جانب لوگوں سے عبادت یا طہارت کی غرض سے الگ ہو کر بیٹھی تھیں کہ انھیں حضرت جبرائیل انسانی شکل وصورت میں نظر آئے۔

حضرت مریم حضرت جبرائیلؑ کو دیکھ کر گھبرا گئیں، مگر حضرت جبرائیلؑ نے کہا کہ میں تمھارے رب کا فرستادہ ہوں اور تمہیں ایک پاکیزہ بیٹے کی بشارت دینے آیا ہوں (مریم: ۱۷ تا ۱۹)۔ حضرت مریم نے کہا: ''یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟ مجھے تو کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا''

حضرت جبرائیلؑ نے فرمایا: ''اللہ کے لیے یہ کام کچھ مشکل نہیں۔ اللہ نے جس طرح یہ کائنات بغیر واسطے اور وسیلے کے پیدا کر دی ہے، تو کسی ایک شخص کا پیدا کرنا کیا مشکل ہے (آل عمران: 47۔ مریم: 20)۔ چنانچہ حکم خداوندی کے مطابق حضرت عیسیٰ پدری واسطے کے بغیر شکم مادر میں قرار پا گئے (مریم: 21)

مفسرین کے مطابق اسی بنا پر اس موقع پر قرآن حکیم میں ''خلق'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی چیز کو بغیر ذرائع اور اسباب ظاہری کے پیدا کرنا۔ چوں کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت عام مروجہ طریقے سے ہٹ کر ہوئی، اسی لیے قرآن حکیم میں ان کے لیے روح اللہ (تحریم: 12) اور کلمۃ اللہ (نسا: 171) کے دو لفظ استعمال کیے گئے ہیں، جن کا مفہوم خود قرآن ہی نے کئی مقامات پر واضح کر دیا ہے۔ حضرت آدمؑ کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے: فَاِذَا وَنَفَخۡتُ فِیۡہِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ (حجر۔ 29) یعنی جب میں اُس میں اپنی روح پھونک دوں، اس بنا پر حضرت عیسیٰ کے متعلق بھی اس لفظ کا یہی مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ظاہری اسباب کی عدم موجودگی میں حضرت عیسیٰ میں روح، جو ایک امر ربّی (بنی اسرائیل: 85) ہے ڈال دی۔ کلمے کا مفہوم بھی خود قرآن ہی واضح کرتا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَاۤ اَمۡرُہٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡئًا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ﴾ (یٰس۔ 82) یعنی اللہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کا کام بس یہ ہے کہ اُسے حکم دے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ اس بنا پر تمام فقہا اور مفسرین کے نزدیک رُوح اور کلمہ کے لفظ سے سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے جو عربی زبان میں عام طور پر مروّج ہے۔

جب حضرت عیسیٰ رحم مادر میں قرار پا گئے تو حضرت مریمؑ کو اندیشہ لاحق ہُوا کہ اگر یہ واقعہ ہیکل میں رہتے ہوئے پیش آیا تو قوم حقیقتِ حال سے باخبر ہونے سے پہلے ہی ان کا اور اُن کے بچے کا جینا حرام کر دے گی۔ اس بنا پر انھوں نے بیت المقدس کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر یوسف بن یعقوب نجار کا ذکر بھی کیا جاتا ہے جنھیں

عیسائی حضرت مریم کا خاوند بتلاتے ہیں (متی۔ پہلا باب)' اور بعض مسلم مفسرین نے اسرائیلی روایات کی بنا پر یوسف کو حضرت مریمؑ کا خالہ زاد بھائی اور ہیکل میں اُن کے ساتھ عبادت اور خدمت کرنے والا بتلایا ہے۔ لیکن قرآن کریم اور مستند روایات میں اس کا قطعاً کوئی ذکر نہیں آتا۔ اسی بنا پر یہ یہودیوں کی اُس سازش کا حصہ ہے جو انھوں نے حضرت مریمؑ عفیفہ اور اُن کے بیٹے کو بدنام کرنے کے لیے شروع کی تھی اور چوں کہ اناجیل اس واقعے کے بہت عرصہ بعد لکھی گئی ہیں' اس لیے بلاتحقیق وتفتیش ان روایات کو ان میں شامل کرلیا گیا ہے۔

جب حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کا وقت قریب آیا تو اُس وقت حضرت مریمؑ بیت المقدس سے چند میل کے فاصلے پر کوہِ ساعیر کے دامن میں تھیں۔ یہ جگہ بیت لحم کے نام سے مشہور ہے۔ بعض علما نے جائے پیدائش ناصرہ کو قرار دیا ہے۔ جب تکلیف کا آغاز ہوا تو وہ ایک کھجور کے درخت کے نیچے اس کا سہارا لے کر بیٹھ گئیں۔ انتہائی کرب' مستقبل کی پریشانی اور تنہائی کی وجہ سے کہنے لگیں: ''اے کاش! میں یہ دن دیکھنے سے پہلے مرگئی ہوتی اور اب تک بھولی بسری ہوچکی ہوتی۔'' اُس وقت فرشتے نے انہیں نخلستان کے نشیب سے پکارا ''مریم' غم گیں نہ ہو۔ تیرے پروردگار نے تیرے نیچے نہر جاری کردی ہے اور کھجور کا تنا پکڑ کر ہلا تو پکے اور تازہ خوشے تجھے مل جائیں گے۔ پس تُو کھا' پی اور اپنے بچے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر (مریم: 24 تا 26)۔ نہر سے مُراد پانی کی نعمت بھی ہوسکتی ہے اور خود حضرت عیسیٰؑ بھی' جن سے ایک مستقل روحانی سلسلہ چلا۔ یہ واقعہ تقریباً 14 ق م کا ہے۔

ولادت کے وقت اناجیل میں' مختلف نشانات کا بھی ذکر آتا ہے جو اس موقع پر ظاہر ہوئے اور جن کی نشان دہی اناجیل میں کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض علمائے اسلام نے بھی نقل کردیئے ہیں۔ اس موقع پر حضرت مریمؑ کو یہ بھی فکر تھا کہ میں قوم کو اس بارے میں کیا جا کر کہوں گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے نے انہیں یہ کہا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو اور وہ تم سے اس بچے کی نسبت پوچھے تو کہہ دینا کہ میں نے آج خدا کے لیے چپ رہنے کی نذر مان رکھی ہے (لہٰذا جو پوچھنا ہے' اس بچے سے پوچھو)۔

''پھر وہ اُس بچے کو لیے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے: ''اے مریمؑ' یہ تو تُو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن' نہ تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔'' مریم نے بچے کی طرف اشارہ کردیا۔ لوگوں نے کہا: ''ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے؟'' (مریم: 27 تا 29)

''بچہ بول اٹھا'' میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اُس نے مجھے کتاب دی' اور نبی بنایا' اور بابرکت کیا' جہاں بھی میں رہوں اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں' اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا' اور مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا۔ سلام ہے مجھ پر' جب کہ میں پیدا ہوا اور جب کہ میں مروں' اور جب کہ زندہ کرکے اُٹھایا جاؤں۔'' (مریم: 29 تا 31)

حضرت عیسیٰؑ کی گہوارے میں یہ گفتگو چوں کہ خلافِ عادت تھی' اسی بنا پر یہ اُن کا اوّلین معجزہ قرار دیا گیا ہے۔ اناجیل میں اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بہرحال جب اُن کی عُمر آٹھ یوم کی ہوئی تو موسوی شریعت کے مطابق اُن کا ختنہ کیا گیا۔

پیدائش کے بعد سے لے کر نبوت تک حضرت عیسیٰؑ کہاں رہے؟ یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ قرآن وحدیث میں اس مسئلے پر سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ علامہ ابن کثیر نے وہب بن منبہ وغیرہ سے' جو اسرائیلی روایات کے ماہر تھے' یہ نقل کیا ہے کہ حضرت مریمؑ بادشاہ وقت ہیرودیس (Herediace) کے خوف سے مصر کے کسی مقام پر چلی گئی تھیں اور حضرت عیسیٰؑ کی عمر کے ابتدائی بارہ برس وہیں گزرے۔ ابن کثیر وغیرہ نے حضرت عیسیٰؑ سے بارہ سال کی عمر میں متعدد نشانات کا ظہور ثابت کیا ہے' مثلاً دہقان کے گھر میں رہتے ہوئے ایک چور کی حیرت انگیز طور پر دریافت۔ حافظ ابن عساکر وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے حضرت عیسیٰؑ کے بچپن کے بعض واقعات بھی نقل کیے ہیں۔ قرآن کریم (سورۂ مومنون' آیت 50) سے مترشح ہوتا ہے کہ اسی بچپن کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ اور اُن کی والدہ کو ایک جگہ قرار عطا فرمایا تھا جو ٹھنڈے پانی' عمدہ آب وہوا والی رہائش کے قابل' کسی قدر اونچی جگہ تھی۔ یہاں انھوں نے کم وبیش بارہ سال بسر کیے۔ بعدازاں جب بیت المقدس کا بادشاہ مرگیا تو حضرت زکریاؑ نے حضرت مریمؑ کو بُلا بھیجا۔ اب حضرت مریمؑ اپنے بچے سمیت بیت المقدس میں واپس تشریف لے آئیں۔ واپس آکر حضرت عیسیٰؑ نے بیت المقدس کے قریب مقامِ ناصرہ میں' جو صوبہ گلیلی میں تھا' رہائش اختیار کی' جس کی بنا پر ان کے پیروکاروں کو ''نصاریٰ'' کہا جاتا ہے۔ بچپن سے لے کر عہد نبوت تک کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔

نبوت ووحی

جب حضرت عیسیٰؑ کی عُمر تیس سال کی ہوئی تو اُن پر نزول وحی کا آغاز ہوا۔ انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے حضرت یحییٰؑ سے بپتسمہ لیا۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تنہا یہودیہ کے جنگل کی سیاحت کرتے ہوئے گزارا۔ یہاں اُن پر فطرت کے بہت سے حقائق منکشف ہوئے۔ یہاں اُن کا شیطان سے بھی مکالمہ ہوا۔ اسی سیاحت کے دوران میں اُن پر پہلی وحی نازل ہوئی۔

انجیل متی۔ (باب سوم۔ آیات 16'17) کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح القدس کبوتر کی شکل میں نظر آئے جو آسمان سے نازل ہورہے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی یہ حالت آنحضرت ﷺ کی حالت سے کافی مماثلت رکھتی ہے' کیوں کہ آنحضرت ﷺ کو بھی پہلی مرتبہ روح القدس زمین وآسمان کے درمیان بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے تھے (سورۂ نجم)۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے پورے زور شور سے دعوت وتبلیغ کا آغاز کردیا۔ ان کی تبلیغ میں حکمت ودانائی کے ساتھ ساتھ احکام الٰہی پر شدت سے عمل کرنے اور کرانے کا جذبہ بھی پایا جاتا تھا۔ انھوں نے اپنے مواعظ میں ان مذہبی لوگوں کو خاص طور پر ہدف تنقید بنایا' جنھوں نے مذہب کے نام پر دکان داریاں

رکھی تھیں۔انھوں نے اعلان نبوت کے چند دن بعد ایک پہاڑی سے وعظ کہا جسے خطبۂ کوہ Sermon of the Mount کہا جاتا ہے۔

پہاڑی کے وعظ میں اُن کی تمام تعلیمات کا نچوڑ موجود ہے۔پھر جیسے جیسے عوام اُن سے متاثر ہوتے گئے' خواص' یعنی مذہبی لوگ' کاہن اور فریسی اتنے ہی اُن کے مخالف ہوتے گئے' کیوں کہ انہیں اپنی مذہبی سیادت ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔

چند ہی دنوں میں حضرت عیسیٰ کے خلاف مخالفت کا طوفان شدت اختیار کر گیا اور بات یہاں تک پہنچی کہ وہ جس شہر یا قصبے کا رُخ کرتے' وہاں سے انہیں نکال دیا جاتا۔ اس بنا پر اُن کا زیادہ تر وقت جنگلوں' بیابانوں میں گزرا۔وہ کہا کرتے تھے:''لومڑوں کے بھی بھٹ ہوتے ہیں اور ہوا کے پرندوں کے گھونسلے' مگر ابن آدم کے لیے سر دھرنے کو بھی جگہ نہیں (متی۔باب8۔آیت20)۔انھی دنوں میں انھوں نے اپنی طرف سے قاصد یا نمائندے منتخب کیے اور انہیں اپنی طرف سے مختلف شہروں اور قصبوں میں تبلیغ کے لیے روانہ کیا۔انجیل متی کے مطابق اُن کی تعداد بارہ تھی جو بعد ازاں بارہ شاگرد یا حواری کے نام سے مشہور ہوئے۔

لیکن اس کے باوجود دشمنوں کی طرف سے اُن کی ایذا رسانی کا سلسلہ جاری رہا۔ حضرت عیسیٰ نے جب دیکھا کہ لوگ روز بروز اُن کے مخالف ہوتے جا رہے ہیں تو انھوں نے ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰہِ﴾ (آل عمران:52۔صف:14) یعنی ''اللہ کے راستے میں کون میرا مددگار ہوگا'' کا نعرہ لگایا جس پر حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ واحد کی راہ میں آپ کے مددگار ہیں۔حضرت عیسیٰ کے یہ ابتدائی شاگرد نہایت مخلص اور پاک باز لوگ تھے۔یہ حواری سفر و حضر میں حضرت عیسیٰ کے ساتھ ساتھ رہتے۔اُن کے ارشادات سنتے اور انہیں دوسروں تک پہنچاتے۔ان میں زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ تھے' مگر دینی ثقاہت اور وجاہت کے اعتبار سے اُن کا بڑا درجہ ہے۔

رفع آسمانی

حضرت عیسیٰ کی صُلح جو پالیسی کے مقابلے میں اُن کے دشمنوں نے اُن کے خلاف کارروائیاں تیز تر کر دیں تو حضرت عیسیٰ کو اندیشہ ہوا کہ مبادا دشمن انہیں حضرت یحییٰ کی طرح پکڑ کر خوار کرنے اور ہلاک کرنے میں کام یاب ہو جائیں۔چنانچہ انھوں نے اللہ سے فریاد کی' جس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ تسلی دی:

''جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو کہا' اے عیسیٰ' تمہاری دنیا میں رہنے کی مدت پوری کر کے میں تجھے اپنی طرف اُٹھالوں گا اور تجھے کافروں سے پاک کروں گا۔''

(آل عمران:55)

قرآن کریم اس پر بہت زور دیتا ہے کہ دشمن حضرت عیسیٰ کو سُولی دینے اور قتل کرنے میں بُری طرح ناکام رہے۔چنانچہ سورۂ النسا کی آیات 157 & 158 میں آیا ہے:''یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور نہ انہیں سُولی پر چڑھایا' بلکہ اُن پر شبہ ڈال دیا گیا۔جو لوگ اُن کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں' وہ ان کے حال سے شک میں پڑے ہیں اور ظن کی پیروی کے سوا اُنھیں اس کا مطلق علم نہیں' اور ان یہودیوں نے حضرت عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں بہت سے قرائن سے اس مسئلے پر نص قرآنی کا استشہاد کیا جا سکتا ہے:

(1) عیسائی اور یہودی اس بات پر متفق تھے کہ حضرت عیسیٰ کو سُولی پر چڑھایا گیا۔آگے کچھ اختلاف تھا۔یہودی کہتے تھے' حضرت عیسیٰ قتل ہو گئے۔عیسائی کہتے تھے کہ وہ تین دن مردہ رہنے کے بعد زندہ ہوئے اور آسمان پر چلے گئے۔اللہ تعالیٰ نے اِن دونوں گروہوں کی بابت فرمایا کہ یہ دونوں شک میں مبتلا ہیں۔درحقیقت حضرت عیسیٰ کو یہ لوگ گرفتار ہی نہ کر سکے تھے۔

(2) وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہ اور ''بَل رَّفَعَہٗ'' کی تمام ضمائر مرجع ایک ہی ٹھہرایا اور وہ حضرت عیسیٰ کا جسد مع الرّوح ہے' کیوں کہ قتل اور صُلب جسد و رُوح دونوں کا ہوتا ہے' نہ کہ محض جسد کا یا محض رُوح کا' اس لیے رفع محض روح کا کیوں کہ تصور کیا جا سکتا ہے۔

(3) آخر میں عزیز اور حکیم کے دو اپنے صفاتی ناموں سے اس مضمون کو مزید تقویت پہنچائی کہ خدا کو اس پر قدرت حاصل ہے اور یہ کہ خدا کے ہر کام میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے۔

(4) تردید میں مَاتہ یا توفاہ کے الفاظ کے بجائے' جو موت کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں' رفع کے واضح الفاظ استعمال فرمائے۔اس بنا پر جُملہ مفسرین' فقہا اور صلحائے اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰ کو روح و جسم سمیت اٹھا لیا گیا ہے۔

بہر حال دشمنوں نے رومی گورنر پیلاطس (Pontsmpil ate) کو حضرت عیسیٰ کے خلاف اُبھارا اور اُس کے سپاہیوں کے ساتھ مل کر حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرنے کی سازش تیار کر لی اور بقول انجیل حضرت عیسیٰ کے ایک شاگرد یہوداہ اسکریوتی کو تیس دینار پر جاسوسی کے لیے تیار کر لیا۔حضرت عیسیٰ مذہبی تہوار کے موقع پر بیت المقدس آئے ہوئے تھے۔یہاں انھوں نے بقول متی (باب 26) فسح کا آخری کھانا کھایا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے گیارہ حواریوں سمیت شہر کے باہر گتسمنی (Gethsemane) نام ایک جگہ میں شب باشی کے لیے تشریف لے گئے۔پھر اپنے شاگردوں سے الگ ہو کر منہ کے بل گر کر اللہ تعالیٰ سے یُوں دُعا مانگی:''اے میرے خدا (باپ)' اگر ہو سکے تو یہ پیالہ (موت) مجھ سے ٹل جائے (تقریباً تین مرتبہ یہی الفاظ دہرائے)۔(انجیل متی۔باب26)

اس دعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی نازل ہوئی۔مسلم علما کا اس پر اتفاق ہے کہ جب دشمن حضرت عیسیٰ کے ایک حواری یہوداہ اسکریوتی کی راہ نُمائی میں مذکورہ جگہ کے پاس پہنچے اور اُس کا محاصرہ کر لیا تو عین اُسی وقت حضرت عیسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھا لیا اور خود گرفتار کروانے والے پر حضرت عیسیٰ کی شکل و شباہت طاری کر دی۔چنانچہ حکومت کے اہل کاروں اور یہودیوں' حتیٰ کہ حواریوں نے بھی اُسی کو پھانسی پر چڑھا دیا۔مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ چوں کہ بوجہ

انہیں اس کام میں عجلت تھی، اس بنا پر زیادہ تحقیق و تفتیش نہ کی گئی۔

ایک اور روایت کے مطابق جب حضرت عیسیٰؑ کو اپنی گرفتاری کا یقین ہو گیا تو انھوں نے اپنے حواریوں سے کہا کہ کون شخص میرے بدلے اپنی جان کا فدیہ دے کر جنت کا مستحق بنے گا۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنا نام پیش کیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اُسے اپنا عمامہ اور اپنا لباس پہنایا اور اللہ تعالیٰ نے اُسی کو حضرت عیسیٰؑ سے مشابہت دے ڈالی۔ بعد ازاں وہی یہودیوں کے سامنے نکلا اور اُسی کو پکڑ کر سُولی پر چڑھا دیا گیا۔

اناجیل میں سے انجیل برناباس کے بیان کو اگر قابلِ استناد سمجھا جائے تو اس سے مکمل طور پر اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ برناباس لکھتا ہے: ''اور جب کہ سپاہی یہوداہ کے ساتھ اس جگہ کے نزدیک پہنچے جس میں یسوع تھا۔ یسوع نے ایک بھاری جماعت کا نزدیک آنا سُنا۔ تب وہ گھر میں چلا گیا اور گیارھوں شاگرد سور ہے تھے۔ پس جب اللہ نے اپنے بندے کو خطرے میں دیکھا تو اپنے سفیروں جبرائیل، میخائیل، رفائیل اور اوریل کو حکم دیا کہ وہ یسوع کو دنیا سے لے لیویں۔ تب پاک فرشتے آئے اور یسوع کو دکھن کی طرف دکھائی دینے والی کھڑکی سے لے لیا۔ پس وہ اسے اٹھا لے گئے اور اسے تیسرے آسمان پر فرشتوں کی صحبت میں رکھ دیا۔

(انجیل برناباس: 215۔1 تا 5)

بہر حال مسلم اور بعض مسیحی علما کے نقطۂ نظر سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو دشمنوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچا لیا اور اُن کی جگہ یہوداہ اسکریوتی یا کسی اور شخص کو مسیح سمجھ کر پھانسی دے دی گئی۔ رفعِ سماوی کے بعد اُس شخص کو کسی جگہ بھی نہیں دیکھا گیا۔ سماوی کا واقعہ تقریباً 29 عیسوی بمطابق 593 قبل ہجری میں پیش آیا۔ اُس وقت حضرت عیسیٰؑ کی عمر 33 سال کے قریب تھی۔

نزولِ مسیحؑ

اسلامی عقیدے کے مطابق چوں کہ حضرت عیسیٰؑ نہ تو قتل ہوئے ہیں اور نہ ہی طبعی موت مرے ہیں، بلکہ آسماں پر زندہ اٹھا لیے گئے ہیں، اس پر آخری زمانے میں اُنھیں دوبارہ نازل کیا جائے گا۔ اِس مضمون کو تقریباً تمام کتب احادیث میں مرفوعاً آنحضرت ﷺ سے نقل کیا گیا ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: (ترجمہ) اُس ذات پاک کی قسم، جس کے قبضے میں میری جان ہے، ضرور وہ وقت آنے والا ہے، جب عیسیٰؑ بن مریم عادل حاکم بن کر اُتریں گے، وہ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے، اور جنگ موقوف کر دیں گے اور مال کی اس درجہ کثرت ہوگی کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ملے گا۔ ایک دوسری روایت میں ہے: ''تمھارا اُس وقت کیا حال ہوگا جب عیسیٰؑ تمھارے اندر اُتریں گے۔''

(بخاری۔ مسلم)

امام احمد بن حنبل (مسند) نے ایک طویل اور کسی قدر مفصل روایت نقل کی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے صرف نزول عیسیٰؑ کی خبر دی ہے، بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی وہ علامات بھی بتائی ہیں جن سے اُنھیں پہچاننے میں آسانی ہوگی۔ فرمایا: وہ درمیانہ قد، سُرخ و سفید رنگت والے ہوں گے۔ اُن کے بدن پر سرخی مائل دو چادریں ہوں گی۔ وہ اِس حال میں نازل ہوں گے، گویا ابھی غسل کر کے آ رہے ہیں۔

امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ نزولِ مسیح ملک شام میں اُس وقت ہوگا جب اہل اسلام دشمن سے ایک بڑے معرکے کے دوران میں نماز پڑھنے میں مصروف ہوں گے۔ مُسلم (198:8) ہی نے ایک دوسری تفصیلی روایت حضرت نواسؓ بن سمعان سے نقل کی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے قربِ قیامت کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ قیامت کے قریب دجّال ظاہر ہوگا۔ اُسے ہلاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰؑ کو نازل فرمائیں گے۔ وہ دمشق کے مشرقی سفید مینارے پر نازل ہوں گے۔ اُن کے بدن پر دو چادریں ہوں گی۔ اس بارے میں جن صحابۂ کرام سے روایات منقول ہیں، اُن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

عمرانؓ بن حصین	سمرۃؓ بن جندب
نافعؓ بن عیینہ	نواسؓ بن سمعان
ابو برزہ اسلمیؓ	عمروؓ بن عوف
حذیفہؓ بن ابی العاص	حذیفہؓ بن الیمان
جابرؓ بن عبداللہ	ابو امامہؓ باہلی
عبداللہ بن مسعودؓ	عبداللہ بن عمروؓ بن العاص

اِن روایات کو نقل کرنے والے لوگ انتہائی صادق و راست باز علما تھے، جن سے جھوٹ کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اتنی بڑی تعداد میں صحابہ کرامؓ جس روایت کو نقل کرتے ہوں، اُسے ''متواتر'' کہتے ہیں اور اس کی حیثیت انتہائی محکم ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس عقیدے کو اُن عقائد میں شمار کیا جاتا ہے، جن پر ایمان لانا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

آنحضرت ﷺ نے معراج کے موقع پر دیگر انبیا کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ سے بھی ملاقات کی۔ بعد میں اپنے متعدد ارشادات میں حضرت عیسیٰؑ کا حلیہ بیان کیا، جو یہ ہے: اُن کا رنگ سرخ اور اس قدر صاف تھا کہ گویا وہ ابھی ابھی حمام سے نکلے ہیں، اُن کے بال گھنگھریالے تھے جو اُن کے کندھوں کے درمیان لٹکتے رہتے۔ وہ چوڑے سینے والے اور انتہائی حسین شکل و صورت کے مالک تھے۔ (بخاری۔ کتاب الانبیا)

شمائل و عادات

حضرت عیسیٰؑ نہایت حلیم الطبع، وسیع القلب، خنداں رُو اور غریبوں اور مصیبت زدہ لوگوں کے بہی خواہ تھے۔ طبیعت میں حد درجہ ملائمت تھی، جس کی بنا پر کبھی بھی اُن کے دل میں کسی کے خلاف کوئی معاندانہ یا متشددانہ جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ اُن کی صلح جوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ انھوں نے ایک شخص کو اپنی آنکھوں سے چوری کرتے ہوئے دیکھا تو اُسے کہا: ''کیا تُو نے چوری کی ہے؟'' اُس نے کہا: ''خدا کی قسم ہرگز نہیں'' حضرت عیسیٰؑ نے فی الفور کہا: ''میں خدا کی قسم پر یقین رکھتا ہوں اور اپنی آنکھوں کو جھٹلاتا ہوں۔''

(بخاری۔ کتاب الانبیا)

وہ کسی سے بُرائی کا بدلہ بھی لینے کے خلاف تھے۔ اُن کا قول تھا: ''شریر کا مقابلہ نہ کرنا' بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر تپانچہ مارے' دوسرا گال بھی اُس کی طرف پھیر دے' اور اگر کوئی تجھ پر نالش کر کے تیرا کرتہ لینا چاہے تو چوغہ بھی اُسے لے لینے دے اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے تو اُس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔''

(متی۔ باب 5)

طبیعت کی اس حلیمی اور بُردباری کا یہ اثر ہے کہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُن کی اُمت کے ان بندوں کا حال دریافت کرے گا' جو اُنھیں خدا کا بیٹا قرار دیتے رہے تو وہ جواب میں اپنی برأت ظاہر کرنے کے بعد فرمائیں گے:

''اے اللہ! اگر تُو اُنھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں۔ اور اگر بخش دے تو تیری مہربانی ہے۔ بے شک' تو غالب اور حکمت والا ہے۔ (المائدہ:118)

جب وہ کسی مصیبت زدہ کو دیکھتے تو اُن کا دل بھر آتا۔ اور جو کچھ اُن سے بن سکتا' اُس سے دریغ نہ کرتے۔ اُن کا مسلک یہ تھا کہ اپنے آپ کی اصلاح کرلو' تمام عالم کی اصلاح ہوجائے گی۔

مذہبی اعتبار سے وہ سخت گیر اور متشدد نہ تھے۔ اُن کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی تھی۔ انھوں نے اپنے مختصر دورِ حیات میں لوگوں کو آپس میں مل جُل کر رہنے کا سبق دیا' اور اس طرح انبیائے بنی اسرائیل کے مشن کو آگے بڑھانے کی بھرپور کوشش کی۔ بعض مسائل میں اُن کا رویہ کافی سخت تھا' جو اس معاشرے کی اصلاح کے لیے ناگزیر تھا۔ وہ سرمایہ داری اور دنیاداری کے سخت مخالف تھے۔ اُن کی نظر میں اپنے اور بیگانے' غریب و امیر سب برابر تھے۔ وہ عورتوں کو طلاق دینے کے بھی سخت خلاف تھے۔

انھوں نے مجرّد رہ کر تقویٰ وطہارت اور عصمت وعفت کی ایک مثال قائم کی۔ اسی بنا پر اُن کی سیرت کو' جس میں نبی کریم ﷺ کی طرح جامعیت نہیں ہے' حضرت یحییٰ کی طرح صرف ایک خاص طبقے کی نمائندہ کہا جاسکتا ہے' لیکن اسلامی عقیدے کے مطابق یہ اُن کی حیاتِ طیبہ کا صرف آغاز تھا۔ بعد میں جب وہ اپنی بقیہ زندگی مکمل کرنے کے لیے نازل ہوں گے تو اُن کی سیرت کے بہت سے پہلو اپنی تکمیلی شان کے ساتھ نمودار ہوں گے۔

تعلیمات

حضرت عیسیٰ کی نبوت کا زمانہ اگرچہ بڑا مختصر تھا' اڑھائی یا تین سال' مگر انھوں نے اس مختصر عرصے میں تعلیمات کے وہ گہرے نقوش چھوڑے جو ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ حضرت عیسیٰ ان اُولوالعزم انبیائے کرام میں سے ایک ہیں جن کا قرآن نے بطور خاص ذکر کیا ہے (احزاب:7) اور جن کی تعلیمات کا بار بار حوالہ دیا ہے۔ قرآن کریم ایک طرف تو حضرت عیسیٰ کی عظمت ورفعت کو اُجاگر کرتا ہے' تاکہ اُن کے متعلق یہودیوں کی پھیلائی ہوئی بدگمانیوں کا قلع قمع ہو' اور دوسری طرف اُن لوگوں کی شدید مذمت کرتا ہے' جنھوں نے انھیں خدا یا خدا کا بیٹا قرار دیا۔ اس کے برعکس قرآن حکیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صاف ستھری تعلیمات کا بار بار حوالہ دیتا ہے' جن سے عقیدۂ توحید' رسالت اور معاد کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں بطور خاص حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے جن پہلوؤں کو جابجا اُجاگر کیا گیا ہے' وہ حسب ذیل ہیں:

(1) معجزات:

قرآن مجید میں قدیم انبیائے کرام میں سے سب سے زیادہ جن انبیا کے معجزات بیان کیے گئے ہیں' اُن میں حضرت عیسیٰ بھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ان کی سیرت کا انتہائی نازک موضوع ہے۔ قرآن کریم میں بیان کردہ اُن کے معجزات یہ ہیں:

1: اُن کا بغیر واسطۂ پدری پیدا ہونا (آل عمران:45'46)
2: اُن کا گہوارے میں کلام کرنا (آل عمران:46۔ مریم:29)
3: اُن کا پیدائشی طور پر کتب انبیا کا ماہر ہونا۔ (آل عمران:48۔ مائدہ۔:110)
4: مٹی سے جیتے جاگتے جانور بنا کر پھونک مار کر اُڑا دینا۔
(آل عمران:49۔ مائدہ:110)
5: مادرزاد اندھے اور کوڑھ کے مریض کو' طبی طریقہ استعمال کیے بغیر' ہاتھ پھیر کر تن درست کردینا۔ (آل عمران:49۔ مائدہ:110)
6: بعض مُردوں کو زندہ کردینا (آل عمران 49۔ مائدہ:110)
7: اُن پر آسمان دسترخوان یعنی کھانے میں برکت کا نازل ہونا۔
(مائدہ:111 تا115)
8: اُن کا آسمان پر جسم وروح سمیت زندہ اٹھالیا جانا۔ (نسا:158)
9: لوگوں کو گھروں میں موجود ذخیرے کی خبر دینا۔ (آل عمران:49)

ان میں سے بعض معجزات' مثلاً پرندوں کو پھونک مار کر اُڑا دینا' خود اناجیل میں بھی موجود نہیں۔ چوں کہ ان معجزات سے بہت سے لوگوں کو حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی غلط فہمی پیدا ہوئی تھی' اس بنا پر ان تمام کے ساتھ یہ تصحیح بار بار دُہرائی گئی' کہ ان کا صدور ہرگز حضرت عیسیٰ کے اختیار میں نہ تھا۔ اس کے برعکس یہ تمام معجزات اذن خداوندی اور اُس کے اشارۂ ''کُن'' کے مرہونِ منت تھے۔

(2) توحید باری

حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے ضمن میں سب سے زیادہ زور جس بات پر دیا گیا ہے' وہ توحید باری ہے۔ قرآن حکیم بار بار یہ نکتہ پیش کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے لوگوں کو ہمیشہ توحید باری کا سبق دیا اور لوگوں کو شرک وبدعات سے منع کیا۔ مثلاً سورۂ مائدہ کی آیت 116 میں آیا ہے:

''اُس وقت کو یاد کرو' جب اللہ فرمائے گا' اے عیسیٰ بن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری والدہ کو معبود مقرر کرلو۔ وہ کہیں گے تو پاک ہے۔ مجھے کب شایاں تھا کہ میں ایسی بات کہتا' جس کا مجھے کچھ حق نہیں۔''

یا مثلاً سورۂ آل عمران کی آیت 51 میں فرمایا: ''(یعنی حضرت عیسیٰ نے کہا) کچھ شک نہیں اللہ ہی میرا اور تمھارا پروردگار ہے۔ پس تم اُس کی عبادت کرو۔ یہی سیدھا رستہ ہے۔'' نیز سورۂ آل عمران' آیت 59 میں فرمایا: ''کسی آدمی کو شایان نہیں کہ خدا تو

اُسے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ' بلکہ اُس ... لہٰذا سزاوار ہے کہ اے اہل کتاب' تم علمائے ربانی ہو جاؤ' کیوں کہ تم کتاب (خدا) پڑھتے پڑھاتے ہو۔

سورۂ مائدہ' آیت 52 میں کہہ دیا گیا: ''وہ لوگ بلاشبہ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح بن مریم خدا ہیں' حالانکہ مسیحؑ تو یہ کہا کرتے تھے کہ اے بنی اسرائیل! تم خدا ہی کی عبادت کرو' جو میرا بھی پروردگار ہے اور تمھارا بھی (اور جان رکھو کہ) جو شخص خدا کے ساتھ شرک کرے گا' خُدا اُس پر بہشت کو حرام کر دے گا اور اُس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ گو موجودہ اناجیل تحریف شدہ ہیں' مگر پھر بھی اُن میں عیسوی تعلیمات کی کچھ جھلک دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ خدا تعالیٰ کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے:

''اور تُو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ' بڑا اور پہلا حکم یہی ہے۔'' (متی)

ایک جگہ حضرت عیسیٰؑ اپنی تعلیم کا خلاصہ یُوں بیان کرتے ہیں: ''اور ہمیشہ کی زندگی تو یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو' جسے تُو نے بھیجا ہے' جانیں۔ (یُوحنا۔ باب 17)

(3) ابنیت مسیح کی تردید:

قرآن مجید نے جابجا اس نظریے کی بھی تردید کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ (معاذ اللہ) خُدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔ سورۂ مریم' آیات 34' 35 میں ارشاد ہے: ''یہ مریم کے بیٹے عیسیٰ ہیں' اور یہ سچی بات ہے' جس میں لوگ شک کرتے ہیں' خدا کو سزاوار نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے' وہ پاک ہے۔''

حضرت عیسیٰؑ کو نصاریٰ کے خدا کا بیٹا کہنے پر تبصرہ کرتے ہوئے سورۂ مریم' آیات 88 تا 92 میں فرمایا: ''وہ کہتے ہیں کہ خدا بیٹا رکھتا ہے۔ ایسا کہنے والو! تم بہت بُری بات زبان پر لاتے ہو۔ قریب ہے کہ اس افترا سے آسمان پھٹ پڑا ہو اور زمین شق ہو جائے' اور پہاڑ پارہ پارہ ہو کر گر پڑیں کہ انھوں نے خدا کے لیے بیٹا تجویز کیا اور خُدا کو شایاں نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے۔''

سورۂ مائدہ' آیت 75 میں حضرت عیسیٰؑ کے آدمی ہونے پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا: ''مسیح بن مریمؑ تو صرف خدا کے پیغمبر تھے۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں اور اُن کی والدہ مریمؑ خدا کی ولی اور سچی فرماں بردار تھیں۔ دونوں انسان تھے اور کھانا کھایا کرتے تھے۔''

اسی بنا پر قرآن حکیم نے حضرت عیسیٰؑ کا جہاں بھی ذکر کیا ہے' وہاں ابن مریم ضرور ساتھ بڑھایا ہے۔ قرآن حکیم کی یہ تعلیم خود حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ اناجیل میں' جہاں بھی حضرت عیسیٰؑ اپنا ذکر فرماتے ہیں' وہاں' خود کو ابن آدم (عربی میں ابن الانسان' انگریزی میں The Son of Man) کہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو خدا سے دعا مانگنے' اُس کے سامنے گریہ وزاری کرنے کی بار بار تلقین کرتے ہیں (متی۔ باب 6) اور جہاں تک حضرت عیسیٰؑ کے ان الفاظ کا تعلق ہے'' جن میں وہ خدا کو باپ اور خود کو بیٹا ظاہر کرتے ہیں' تو وہ درحقیقت ان کی زبان و بیان کا ایک انداز ہے' کیوں کہ انھوں نے جس طرح خود کو بیٹا کہا' اُسی طرح وہ دوسروں کو بھی خدا کا بیٹا کہتے ہیں (مثلاً دیکھیے متی باب 6)۔ ایک موقع پر فرمایا: ''اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو' کیوں کہ تمھارا باپ ایک ہی ہے' جو آسمانی ہے' اور نہ تم ہادی کہلاؤ' کیوں کہ تمھارا ہادی ایک ہی ہے' یعنی مسیحؑ (متی۔ باب 23)۔ یہ انداز صرف حضرت عیسیٰؑ تک ہی محدود نہیں ہے' سابق انبیائے بنی اسرائیل کے ہاں بھی یہ استعارے جگہ جگہ ملتے ہیں' مثلاً تکوین (باب 6) میں خدا کے بیٹوں کا ذکر ہے۔ خروج (باب 4) میں اسرائیل کو خدا کا پلوٹھا بیٹا قرار دیا گیا ہے' اور ظاہر ہے' ان سے مُراد حقیقت نہیں' بلکہ محض استعارہ ہے' اور یہی استعارہ کسی قدر وسعت کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ نے استعمال کیا۔

حضرت عیسیٰؑ خود کو ہمیشہ ہادی' رسول اور ابن آدم ہی سمجھتے رہے۔ چنانچہ ایک موقع پر فرمایا: ''جو مجھ پر ایمان لاتا ہے' وہ مجھ پر نہیں' بلکہ میرے بھیجنے والے پر ایمان لاتا ہے'' (یوحنا۔ باب 12)۔ اس سے اگلے باب میں ہے: ''میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ نوکر اپنے مالک سے بڑا نہیں ہوتا اور نہ رسول اپنے بھیجنے والے سے' اور بجز یوحنا کی انجیل کے' جس کے متعلق اہلِ تحقیق کا کہنا ہے کہ جدید عیسائیت کے بانی پال (Paul) کی تحریک کے زیرِ اثر لکھی گئی' کسی انجیل نے ''بیٹا باپ میں اور باپ بیٹا میں'' کا نظریہ پیش نہیں کیا۔ تثلیث (Trinity) کا عقیدہ پہلی مرتبہ پال کے زیرِ اثر اُبھرا اور اس کی پہلی صدائے بازگشت رسولوں کے عہد میں سنائی دی۔ تاہم ایک زمانے تک ایسے فرقے موجود تھے' جو حضرت عیسیٰؑ کو محض خدا کا رسول قرار دیتے تھے۔ خود آنحضرت ﷺ کے عہد میں حبشہ کا عیسائی حکمران اصحمہ نجاشی اس مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا۔

(4) خاص بنی اسرائیل کی طرف بعثت: قرآن کریم نے متعدد جگہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر بھیجے گئے تھے' نہ کہ ساری دنیا کی طرف اور ان کی شریعت ایک خاص قوم تک محدود تھی اور اسے عالم گیر حیثیت حاصل نہ تھی۔ سورۂ آل عمران' آیت 49 میں ارشاد ہے: ﴿وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ﴾ (اور حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے)۔'' سورۂ صف' آیت 6 میں فرمایا گیا۔ (ترجمہ): ''وہ وقت بھی یاد کرو جب عیسیٰؑ بن مریم نے کہا' اے بنی اسرائیل میں تمھاری طرف خدا کا رسول ہوں'' خود انجیل میں بھی ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو اپنی آمد کی منادی کرنے کے لیے مختلف شہروں میں بھیجا' تو انھیں کہا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا' بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی۔ باب 19)

اسلامی تعلیمات کے مطابق الوہیت اور ابنیت مسیح کی طرح حضرت عیسیٰؑ کی بعثت عامہ کا نظریہ بھی اُن کے بعد تراشا گیا۔

(5) شریعت مُوسوی کی تعلیم

حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے گو ایک الگ کتاب انجیل عطا فرمائی تھی، مگر احکام اور دین کے اعتبار سے وہ موسوی شریعت یعنی احکامِ تورات' کے پابند تھے۔ اسی بنا پر خود اُن کی زندگی موسوی شریعت کی پیروی میں گزری۔ سورۂ آلِ عمران آیت 48 میں ہے: "اور اللہ اُسے کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا اور تورات و انجیل کا علم سکھائے گا۔" اسی سورت کی آیت 50 میں ہے: "(حضرت عیسیٰؑ نے کہا) اور جو کتاب مجھ سے قبل آ چکی ہے، یعنی تورات' اُس کی تصدیق کرتا ہوں۔"

اس مضمون کو انجیل میں یوں بیان کیا گیا ہے" "یہ نہ سمجھو میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔
(متی۔ باب 5)

(6) بشارتِ محمدی ﷺ

علاوہ ازیں حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات میں آنحضرت ﷺ کی آمد کی بشارت بھی ملتی ہے۔ سورۂ صف کی آیت 6 میں ارشاد ہے ﴿وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ﴾ یعنی حضرت عیسیٰؑ نے کہا "اور میں بشارت دینے والا ہوں ایک پیغمبر کی جو میرے بعد آئیں گے، جن کا نام احمد ہوگا۔" حضور ﷺ کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کی یہ بشارت انجیل یُوحنا میں یوں پائی جاتی ہے: "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے' کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا' لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا (باب 16۔ آیت 7)۔ اگلی آیات میں فرمایا: "لیکن جب وہ' یعنی سچائی کی رُوح' آئے گا تو تمھیں تمام سچائی کی راہ دکھائے گا' اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا' لیکن جو کچھ سُنے گا' وہی کچھ کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔"

اس پیشین گوئی میں موعود ہستی کا ایک خاص وصف کے ساتھ تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ وصف اگر چہ بائبل کے جدید ایڈیشنوں میں مددگار' وکیل' معزّی اور شفیع کے نام سے ترجمہ کیا جاتا ہے' لیکن قدیم یونانی' فرانسیسی' لاطینی اور انگریزی تراجم میں پیرا کلوطوس اور عبرانی اور عربی تراجم میں "فارقلیط" ہے جو عربی لفظ 'احمد' کے ہم معنی ہیں۔ "اظہار الحق" تصنیف: رحمت اللہ کیرانوی میں تیرہ دلیلوں سے آنحضور ﷺ کو فارقلیط قرار دیا گیا ہے۔ انجیل برنا باس میں تو باقاعدہ لفظ "محمد" سے یہ پیش گوئی کئی جگہ موجود ہے۔

(7) آسمانی کتاب

حضرت عیسیٰؑ جس وقت تشریف لائے' اُس وقت ہر طرف دنیا میں ظلم و جہالت کا دور دورہ تھا۔ خود اہلِ کتاب' یعنی یہودی بہت سی خرابیوں کا مرکز بن چکے تھے۔ صدیوں کے ذہنی و علمی جمود نے اُنھیں علمی اعتبار سے مکمل لکیر کا فقیر بنا دیا تھا۔ وہ دین متین کی رُوح کو سمجھنے کی بجائے صرف اُس کے ظاہر کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کے وقت یہودیوں کے مندرجہ ذیل گروہ تھے:

1: صدوقی۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کے نیک و بد اعمال کا ثمرہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے نہ کہ آخرت میں۔

2: فریسی (Pharisees) یہ لوگ دنیوی لذات سے کنارہ کشی ہی ذریعہ نجات قرار دیتے تھے' مگر پھر ترکِ دنیا میں بھی بدعملی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔

3: کاہن: اِن لوگوں نے مذہبی عبادات کی ادائی میں خلوص اور للّٰہیت کو ختم کر کے اس کی جگہ دنیاداری کو رواج دے رکھا تھا۔

4: احبار یا فقیہ: یہ مذہب کے اجارہ دار بن گئے تھے۔ جس چیز کو چاہتے' حلال ٹھہرا دیتے اور جسے چاہتے حرام کر دیتے۔

اس کے علاوہ دینی و علمی پسماندگی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ہیکل سلیمانی کو تجارتی منڈی بنایا ہوا تھا' اور خود مذہب بھی ایک تجارت بن کر رہ گیا تھا۔ غریبوں اور پست حال لوگوں کی ہمدردی کا' کسی کے دل میں کوئی جذبہ بھی موجود نہ تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے آخر ان تمام برائیوں کے خلاف آواز بلند کی اور قوم میں مذہب اور دین کا نیا جذبہ بیدار کیا۔ گو انھوں نے بہت عرصے تک تبلیغ نہیں فرمائی' لیکن اِس مختصر سے عرصے میں بھی اُن کے بہت سے مخلص پیدا ہو گئے اور اُن کی آواز گھر گھر اور قریہ قریہ جا پہنچی۔ انھوں نے غریبوں اور معاشرے کے پست حال لوگوں کی حمایت میں آواز بلند کی۔ اُن کی اِس دعوت سے وہاں کے مذہبی اور سیاسی راہ نُماؤں کو اپنی سیادت کے متزلزل ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا اور اس طرح حضرت عیسیٰؑ جو ایک پُرجوش مبلغ اور داعی تھے' دنیا سے اُٹھا لیے گئے' مگر اُن کی چند روزہ تحریک کے اثرات ہمیشہ تاریخ پر ثبت رہیں گے۔

ختم نبوت

آنحضرت ﷺ پر ہر قسم کی نبوت اور وحی کا اختتام ہو گیا۔ آپ ﷺ آخری نبی اور رسول ہیں۔

اسلام کے بدیہی عقائد سے مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی ہمیشہ واقف رہے ہیں۔ اور چودہ سو برس کی تاریخ میں یہ بحث کبھی نہیں پیدا ہوئی کہ نبوت کی بھی کچھ قسمیں ہوتی ہیں، اور ان میں سے کوئی خاص قسم نبی آخر الزماں ﷺ کے بعد بھی باقی ہے۔ نبوت کی تشریعی وغیر تشریعی، ظلی و بروزی یا مجازی اور لغوی اقسام کا نہ قرآن وحدیث میں کوئی اشارہ تک ملتا ہے، نہ علمائے اُمت ان سے واقف تھے۔ البتہ اس دور میں تعلیماتِ اسلامی سے عام غفلت اور جہالت نے اور فتنوں کی طرح اس فتنے کا دَر بھی وا کیا۔ سب سے پہلے باب اور بہا کے فرقے نے اس مسئلے میں اجماعِ امت سے اختلاف کیا۔ مگر وہ بھی اسے علمی رنگ نہ دے سکا۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد قادیانی نے بحث کا دروازہ کھولا۔ مگر اس بحث میں بھی اس قدر الجھاؤ اور تضاد کی کارفرمائی ہے کہ خود اُن کے ماننے والے بھی تین فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک فرقہ اُنھیں صاحبِ شریعت نبی اور رسول مانتا ہے۔ یہ ظہیر الدین اروپی کا فرقہ ہے۔ دوسرا اُنھیں غیر تشریعی نبی کہتا ہے۔ یہ قادیانی پارٹی ہے، جس کا مرکز اَب ربوہ میں ہے۔ تیسرا فرقہ مرزا صاحب کو رسول نہیں بلکہ مسیحِ موعود یا مہدیٔ موعود قرار دیتا ہے۔ یہ لاہوری پارٹی ہے۔

قادیانی مغالطے

حقیقت میں مرزا صاحب کے دعوائے نبوت میں ایک تدریجی ارتقا ہے۔ ابتدا میں ان کا عقیدہ جمہور اہل سنت کے مطابق تھا۔ 23 اکتوبر 1891ء کو انھوں نے جامع مسجد دہلی کے ایک جلسۂ عام میں ایک تحریری بیان دیا، جس میں کہا گیا:

''اب میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار کرتا ہوں، کہ جناب خاتم الانبیا ﷺ کی ختم نبوت کا قائل ہوں، اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو، اُس کو بے دین اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔''

(تبلیغ رسالت حصہ دوم۔ ص 23)

پھر 1899ء کے بعد مرزا صاحب نے اپنی تحریروں میں نبی اور خاتم النّبیین کی انوکھی تعریف پیش کرنا شروع کر دی۔ مثلاً: ''اللہ جل شانہٗ نے آنحضرت ﷺ کو صاحب خاتم بنایا۔ یعنی آپ ﷺ کو افاضۂ کمال کے لیے مُہر دی، جو کسی اور نبی کو ہرگز نہیں دی گئی۔ اس وجہ سے آپ ﷺ کا نام خاتم النّبیین ٹھیرا۔ یعنی آپ ﷺ کی پیروی کمالات نبوت بخشتی ہے، اور آپ ﷺ کی توجہ رُوحانی نبی تراش ہے۔ اور یہ قوت قدسیہ کسی اور نبی کو نہیں ملی۔''

(حقیقۃ الوحی۔ ص 97 حاشیہ۔ از مباحثہ راولپنڈی ص 141)

اس عبارت میں انھوں نے اپنے نبی ہونے کے لیے گویا دلیل بیان کی ہے۔ بالآخر بیسویں صدی کے اوائل میں انھوں نے کھلے طور پر رسالت اور وحی اور نبوت کا دعویٰ کر دیا مثلاً: ''سچا خدا وہی ہے، جس نے قادیان میں اپنا رسول بھیجا۔'' (دافع البلاء۔ ص 110) ''حق یہ ہے کہ خدا کی وہ پاک وحی جو میرے اوپر نازل ہوتی ہے، اُس میں ایسے لفظ رسول اور مرسل اور نبی کے موجود ہیں، نہ ایک دفعہ، بلکہ ہزار دفعہ۔''

(براہین احمدیہ۔ ص 298)

اور اس کے بعد تو انھوں نے تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر نہ صرف صاحب شریعت رسول ہونے کا دعویٰ کیا، بلکہ تمام انبیا علیہم السلام کی ہم سری بلکہ اُن سے افضلیت کا دعویٰ کیا۔ ان کی توہین میں متعدد عبارتیں لکھیں، حتّٰی کہ خود سرور کونین ﷺ سے اپنے آپ کو بڑھانے کی جسارت سے بھی باز نہ آئے۔ ''محمد ﷺ میں اور ہمارے میں بڑا فرق ہے، کیوں کہ مجھے تو ہر ایک وقت خدا کی تائید اور مدد مل رہی ہے!'' (نزول المسیح ص 96)۔ اس منزل پر پہنچ گئے تو مرزا صاحب نے عامۃ المسلمین سے علیحدہ ایک اُمت کی بنیاد ڈالی اور یہ اعلان کر دیا کہ ''ہر ایک شخص جسے میری دعوت پہنچی ہے اور اس نے مجھے قبول نہیں کیا، وہ مسلمان نہیں ہے۔'' (حقیقۃ الوحی ص 163۔ از خاتمۂ بحث ص 26)

اُن کی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو جب نبی بننے کا شوق دامن گیر ہوا تو خاتم النّبیین اور مسئلہ نبوت کو اپنی راہ میں حائل پا کر انھوں نے اس کی تحریف وتاویل شروع کر دی۔ کبھی خاتم النّبیین ہی کے معنی بدل کر مہر نبوت قرار دیا۔ کبھی ختم نبوت کے معنی اپنے مشہور ومعروف معنی میں رکھ کر ظلی بُروزی قسم کی نبوتیں ایجاد کیں، اور ظلی نبی کو (معاذ اللہ) عین محمد واحمد بتلا کر ختم نبوت کی زد سے باہر آنے کی سعی فرمائی۔ اور کہیں ختم نبوت میں یہ شرط بڑھا کر اس سے گلوخلاصی کی کوشش کی کہ ختم ہونے والی نبوت تو وہ ہے، جس کے ساتھ شریعت بھی ہو۔ مطلق نبوت کا اختتام مراد نہیں!

ایک منصف مزاج اور سلیم الفہم آدمی کے لیے تو خود مرزا صاحب کی متضاد اور بے تکی باتیں ہی ان کے دعاوی اور عقائد کو یک سر مُسترد کر دینے کو کافی ہیں۔ تاہم عام مسلمانوں کے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے مسئلہ ختم نبوت کے تمام پہلوؤں کو قرآن،

حدیث، آثارِ صحابہ اور سلف صالحین وعلمائے دین کے اقوال کے ذریعے واضح کرنا ضروری ہے۔

ختم النبوۃ فی القرآن

قرآن کریم سے کسی مسئلے کو ثابت کرنے کے لیے علمائے اصول استدلال نے چار طریقے طے کیے ہیں۔ اوّل عبارت النص، دوسرے اشارۃ النص، تیسرے دلالۃ النص اور چوتھے اقتضاءُ النص۔ کلام پاک میں ننانوے آیات ایسی موجود ہیں جو ان چاروں میں سے کسی نہ کسی طریق سے ختم نبوت کا ثبوت مہیا کرتی ہیں۔ چنانچہ اس باب میں پہلی اور صریح ترین آیت یہ ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الاحزاب: 40)

"نہیں ہیں محمد (ﷺ) تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ۔ لیکن آپ ﷺ اللہ کے رسول اور تمام انبیا کے ختم کرنے والے ہیں۔ اور ہے اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا۔"

اس آیت کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ چند روز پہلے ہی وحی کے ذریعے عرب کے اس رواج کو مسترد کیا گیا تھا جس کے تحت لے پالک اولاد کو حقیقی اولاد کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اس رواج کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی غرض سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے آزاد کردہ غلام اور متبنّٰی حضرت زیدؓ بن حارث کی مطلقہ حضرت زینبؓ سے حکم خداوندی کے مطابق نکاح فرمالیا۔ اس پر کفار نے شور مچایا کہ یہ کیسا نبی ہے جو اپنے بیٹے کی مطلقہ سے نکاح کرتا ہے۔ اسی طعنے کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی کہ محمد ﷺ تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں۔ اس لیے آپ ﷺ پر یہ الزام بے محل ہے۔ اس امر واقعہ کے بیان کردینے کے بعد اسی سے پیدا ہونے والے ممکنہ شبہات کے ازالے کے لیے فرمایا گیا: "لیکن آپ ﷺ اللہ کے رسول اور آخر الانبیا ہیں۔" مطلب یہ ہے کہ اگر چہ آپ ﷺ کے کوئی صلبی فرزند نہیں، اور آپ ﷺ اس اعتبار سے کسی مرد کے باپ نہیں، لیکن آپ ﷺ خدا کے برگزیدہ رسول ہیں، اور رسول اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔ جو لوگ حضور ﷺ کو ابتر اور مقطوع النسل ہونے کا طعنہ دیتے تھے، انھیں بھی اسی آیت میں جواب دے دیا گیا کہ رسول تو اپنی پوری امت کا باپ ہوتا ہے اور محمد ﷺ چوں کہ قیامت تک کے لیے نبی ہیں، لہٰذا آپ ﷺ کی روحانی اولاد کا بھی کوئی شمار نہیں۔

اس جگہ لفظ "خاتم النّبیین" کے اضافے کی دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اس طرح اقوام عالم کو خبردار کردیا گیا۔ یہ ہمارا آخری رسول ہے۔ اس کے بعد کوئی پیغمبر نہ بھیجا جائے گا۔ اس لیے دین ودنیا کی اصلاح چاہتے ہو تو اس کی تصدیق کرو۔ ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ما کان محمد ابا احد میں نفی ابوت سے وہم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ میں شفقت پدری بھی نہ ہوگی۔ اس وہم کو رفع کرنے کے لیے ولٰکن رسول اللہ کے الفاظ بڑھائے گئے۔ یعنی اگر چہ آپ ﷺ کسی مرد کے نسبی باپ نہیں لیکن رسول اللہ ہونے کی حیثیت سے نسبی باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا: وخاتم النّبیین یعنی جب ہر رسول اپنی امت کا شفیق باپ ہوتا ہے تو خاتم النّبیین تو تمام انبیا سے زیادہ شفیق اور مہربان ہوں گے کیونکہ انبیاء کو اپنے بعد اور رسولوں کے آنے کی توقع ہوتی تھی، ان سے اگر کوئی چیز رہ جاتی تو بعد میں آنے والے اس کی تکمیل کردیتے تھے۔ لیکن تمام انبیا کے خاتمیں یہ فکر تھی کہ آگے کا راستہ اتنا صاف کردیا جائے کہ قیامت تک آنے والے انسان گم راہ نہ ہوں۔ چنانچہ ہمارے آقائے نامدار سرور کائنات ﷺ نے شریعت کی صراطِ مستقیم کو ایسا ہموار چھوڑا ہے، جس میں رات اور دن برابر ہے۔ اب نہ ہمیں کسی شریعت سابقہ کی حاجت ہے، نہ لاحقہ کی۔ نہ کسی جدید نبی کی ضرورت ہے نہ جدید شریعت کی۔

تکمیل شریعت

قرآن مجید کی جس آیت میں محمد ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی ابدی تکمیل کا اعلان کیا گیا، وہی ختم نبوت کے ثبوت میں دوسری واضح دلیل ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ: 3)

"آج میں نے تمھارا دین کامل کردیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی، اور تمھارے لیے دین اسلام ہی پسند کیا۔"

آیت مذکورہ میں اکمال دین کی جس زاویے سے بھی تفسیر کی جائے، ماحصل یہی ہے کہ اس دن کے بعد کوئی دین، اور آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی تا قیامت پیدا نہ ہوگا۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ اس آیت کے بعد نہ کوئی حلال کرنے والا حکم نازل ہوا، اور نہ حرام کرنے والا، اور نہ کوئی چیز فرائض وسنن میں اور نہ حدود اور دوسرے احکام میں سے۔ (تفسیر مظہری ص8۔ سورۂ مائدہ) اور حدیث میں ہے کہ جس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو فاروق اعظمؓ رونے لگے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ کیوں روتے ہو؟ فاروق اعظمؓ نے عرض کیا:

"ہم اپنے دین میں زیادتی اور ترقی میں تھے۔ لیکن جب وہ کامل ہوگیا ہے، اور (عادات الٰہی اسی طرح جاری ہے کہ) جب کوئی شے کامل ہوجاتی ہے تو پھر وہ ناقص ہوجاتی ہے۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "تم نے سچ کہا۔" اور یہی آیت آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر سمجھی گئی، اور آپ ﷺ اس کے بعد صرف اکیاسی روز اس عالم میں زندہ رہے۔

فاروق اعظمؓ کا یہ واقعہ مذکورۃ الصدر تفسیر کی روشن دلیل اور کھلی شہادت ہے۔ کیوں کہ اگر کمال دین اور اتمام نعمت سے نزول احکام دین کا اختتام اور وحی نبوت کا انقطاع اور خاتم الانبیا ﷺ کی وفات مُراد نہ تھی تو فاروق اعظمؓ کا اس موقع پر رونا بے محل اور بے معنی ہوجائے گا۔

افادیتِ ختم نبوت

جس طرح قرآن پاک کی ننانوے آیات ختم نبوت کا ثبوت فراہم کرتی ہیں، اسی

طرح دوسو دس صحیح احادیث میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ ان میں ایک سو سے زیادہ احادیث متواتر ہیں۔ امام ابن حزم نے لکھا ہے: ''جن حضرات نے آنحضرت ﷺ کی نبوت، معجزات اور قرآن مجید کو نقل کیا ہے، ان میں کثیر التعداد حضرات کی نقل سے آنحضرت ﷺ کا یہ فرمان بھی ثابت ہو چکا ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں۔'' (الملل والنحل، ج۱، ص۷۷)۔ اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ حدیث لا نبی بعدی نہ صرف متواتر ہے بلکہ اس کا تواتر بھی اُسی درجے کا ہے جس درجے کا آپ ﷺ کی نبوت، معجزات اور قرآن مجید کا تواتر ہے۔ اب ان احادیث میں سے چند کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ آنحضرت ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری مثال مجھ سے پہلے انبیاء کے ساتھ ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا، اور اسے بہت عمدہ اور آراستہ و پیراستہ بنایا، مگر اس کے ایک گوشے میں ایک اینٹ کی جگہ تعمیر سے چھوڑ دی، پس لوگ اُس کے دیکھنے کو جوق در جوق آتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں، اور کہتے جاتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ بھی کیوں نہ رکھ دی گئی (تاکہ مکان کی تعمیر مکمل ہو جاتی) چنانچہ میں نے اس جگہ کو پُر کیا، اور مجھی سے قصرِ نبوت مکمل ہوا، اور میں ہی خاتم النّبیین ہوں، (یا) مجھ پر تمام رُسل ختم کر دیے گئے۔'' (بخاری، مسلم، احمد، نسائی اور ترمذی نے روایت کیا)۔

حضرت ابو حازمؒ فرماتے ہیں کہ میں پانچ سال حضرت ابو ہریرہؓ کے ساتھ رہا۔ میں نے خود سُنا کہ وہ یہ حدیث بیان کیا کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''بنی اسرائیل کی سیاست خود اُن کے انبیا کیا کرتے تھے۔ جب کسی نبی کی وفات ہوتی تھی تو اللہ تعالیٰ کسی دوسرے نبی کو اُن کا خلیفہ بنا دیتا تھا۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں، البتہ خلفا ہوں گے، اور بہت ہوں گے۔'' صحابہؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ان خلفا کے متعلق آپ کیا حکم دیتے ہیں؟'' فرمایا: ''ہر ایک کے بعد دوسرے کی بیعت کرو، اور اُن کے حقِ اطاعت کو پورا کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی رعیت کے متعلق اُن سے سوال کرے گا۔'' (بخاری، مسلم، احمد، ابن ماجہ، ابن جریر اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا)۔

حضرت جُبیرؓ بن مطعم روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''میں محمد ہوں، اور میں احمد ہوں، اور میں ماحی ہوں جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا، اور میں حاشر ہوں یعنی میرے بعد ہی قیامت آئے گی اور حشر برپا ہوگا: (یعنی کوئی نبی میرے اور قیامت کے درمیان نہ آئے گا)، اور میں عاقب ہوں، اور عاقب اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے بعد اور کوئی نبی نہ ہو۔'' (بخاری، مسلم اور ابو نعیم نے روایت کیا)

حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ''تم میرے ساتھ ایسے ہو، جیسے حضرت ہارونؑ موسیٰؑ کے ساتھ تھے۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔'' بخاری اور مسلم نے غزوۂ تبوک کے باب میں یہ حدیث روایت کی۔ مسلم کی روایت میں اتنی بات اور زیادہ ہے کہ نبی ﷺ نے ایک جہاد میں حضرت علیؓ کو ساتھ نہیں لیا، بلکہ گھر پر چھوڑ دیا۔ حضرت علیؓ نے (بطور نیاز مندانہ شکایت) عرض کیا: ''آپ نے مجھے عورتوں اور بچوں کے ساتھ چھوڑ دیا!'' آپ ﷺ نے (اُن کی تسلی کے لیے) ارشاد فرمایا: ''کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تم میرے ساتھ ایسے ہو جاؤ جیسے ہارونؑ موسیٰؑ کے ساتھ؟ (یعنی جس طرح حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر تشریف لے جاتے وقت ہارونؑ کو بنی اسرائیل میں اپنا نائب بنا کر چھوڑ گئے تھے، اسی طرح تم اس وقت میرے نائب تھے۔) لیکن میرے بعد نبوت نہیں۔'' (اس لیے تمھارا مرتبہ اگرچہ ہارونؑ کا سا ہے، مگر تمھیں نبوت حاصل نہیں۔) اور مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''اَلَا اِنَّکَ لَسْتَ نَبِیًّا'' (مگر تم نبی نہیں ہو)۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک کہ دو جماعتوں میں جنگ عظیم رونما نہ ہو، حالانکہ دونوں کا دعویٰ ایک ہی ہو۔ اور قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ تقریباً تیس دجّال کاذب دنیا میں نہ آ چکیں، جن میں سے ہر ایک یہ کہتا ہوگا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔'' (بخاری، مسلم اور احمد نے روایت کیا)۔

حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''قریب ہے کہ میری اُمت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، جن میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں۔ حالانکہ میں خاتم النّبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔'' (مسلم نے روایت کیا)

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تمام انبیا پر چھ باتوں میں فضیلت دی گئی۔ اوّل یہ کہ مجھے جوامع الکلم دیے گئے۔ دوسرے یہ کہ رعب سے میری مدد کی گئی۔ (یعنی مخالفین پر میرا رُعب پڑ کر انھیں مغلوب کر دیتا ہے)۔ تیسرے میرے لیے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا۔ (بخلاف انبیائے سابقین کے کہ مالِ غنیمت اُن کے لیے حلال نہ تھا، بلکہ آسمان سے ایک آگ نازل ہوتی تھی، جو تمام مالِ غنیمت کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیتی تھی، اور یہی جہاد کی مقبولیت کی علامت سمجھی جاتی تھی)۔ چوتھے، میرے لیے تمام زمین نماز پڑھنے کی جگہ بنا دی گئی (بخلاف اُمَمِ سابقہ کے کہ اُن کی نماز صرف مسجدوں ہی میں ہو سکتی تھی)، اور زمین کی مٹی میرے لیے پاک کرنے والی چیز بنا دی گئی (یعنی وقتِ ضرورت تیمّم جائز کیا گیا، جو پہلی اُمتوں کے لیے جائز نہ تھا)۔ پانچویں، میں تمام مخلوق کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں (بخلاف انبیائے سابقین کے کہ وہ خاص خاص قوموں کی طرف کسی خاص اقلیم میں ایک محدود زمانے کے لیے مبعوث ہوتے تھے)۔ چھٹے، مجھ پر تمام انبیا ختم کر دیے گئے۔'' (مسلم نے روایت کیا)۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے مرضِ وفات میں دروازے کا پردہ کھولا۔ آپ ﷺ کا سر مبارک مرض کی وجہ سے بندھا ہوا تھا۔ اُدھر لوگ صدیق اکبرؓ کے پیچھے صفیں باندھے کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد

فرمایا: ''نبوت میں کوئی جُزو باقی نہیں رہا، مگر وہ اچھا خواب جو مسلمان دیکھتا ہے، یا اُس کے لیے کوئی اور دیکھے۔'' (مسلم اور نسائی نے روایت کیا)۔

عجیب تاویلات

ختم نبوت کے منکرین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کی اِن صراحتوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے عجیب وغریب تاویلات کا سہارا لیتے ہیں، اور قرآن وحدیث میں تحریف کرتے ہیں۔ مثلاً مرزا غلام احمد نے نبی بننے کے شوق میں آیت خاتم النّبیین کے معنی یہ بیان کیے ہیں: ''آپ ﷺ کی پیروی کمالات نبوت بخشی ہے، اور آپ ﷺ کی توجہ رُوحانی نبی تراش ہے۔'' اور یہ کہ ''ایک وہی ہے جس کی مُہر سے ایسی نبوت مل سکتی ہے۔'' یہ مفہوم نہ صرف عربی زبان اور محاورے کی رُو سے سراسر غلط ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی کو نبی بنانا آنحضرت ﷺ کے اختیار میں ہے۔ جس پر چاہیں نبوت کی مہر لگادیں۔ حال آں کہ رسول اور نبی کا تقرر صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ علاوہ ازیں اس تحریف کے نتیجے میں نبوت ایک اکتسابی چیز بن جاتی ہے۔

قرآن کی رُو سے یہ بھی غلط ہے۔ کیوں کہ نبوت حاصل کرنا کسی کے اختیار میں نہیں۔

اگر، اِس نوایجاد تفسیر کو مان لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اِس امت میں جتنے زیادہ نبی آئیں اتنا ہی حضور ﷺ کا کمال ظاہر ہوگا۔ لیکن تحریف کرنے والے کو بھی تیرہ سو برس میں اپنے سوا اور کوئی اس طریقے سے نبی بنتا نظر نہیں آیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ جس ہستی کو، بقول مرزا صاحب، اللہ نے ''نبی تراش'' بنایا اُس کی روحانی توجہ ایک لاکھ سے زائد صحابہ میں سے تو کسی کو نبی بنا نہ سکی، ان کے بعد خیر القرون میں بھی کسی کو یہ سعادت نصیب نہ ہوسکی۔ اور نعوذ باللہ چودھویں صدی میں آ کر بس ایک مرزا صاحب پیدا ہوئے تو اس اعزاز کے اہل ٹھیرے۔ قرآن پاک کی تحریف اور رسول کریم ﷺ کی توہین اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتی ہے! نعوذ باللہ من ذٰلک۔

آیت خاتم النّبیین کی قادیانی تحریف کا ایک اور رُخ مرزا غلام احمد کے اشتہار ''ایک غلطی کا ازالہ'' میں یُوں بیان ہوا ہے: ''لیکن اگر کوئی شخص اِس خاتم النّبیین میں ایسا گم ہو کہ بہ باعث نہایت اتحاد اور نفی غیریت کے اسی کا نام پالیا ہو، اور صاف آئینہ کی طرح محمدی چہرے کا انعکاس ہوگیا ہو، تو وہ بغیر مہر توڑنے کے نبی کہلائے گا۔ کیوں کہ وہ محمد ﷺ ہے، گو ظلی طور پر۔ باوجود اُس شخص کے دعوائے نبوت کے، جس کا نام ظلی طور پر محمد ﷺ اور احمد ﷺ رکھا گیا ہے، پھر بھی سیّدنا محمد ﷺ کی تصویر اور اسی کا نام ہے۔''

ظل وبروز کی یہ کہانی شاید ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ وحلول سے اخذ کی گئی ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی کہیں شہادت نہیں ملتی۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ آنحضرت ﷺ کے کامل اتباع سے کوئی شخص عین محمد مصطفےٰ ﷺ بن جاتا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ابتدائے اسلام سے مرزا غلام احمد کی پیدائش تک کسی اور کو یہ کامل اتباع کیوں نصیب نہیں ہوئی؟ صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم خیر الخلائق بعد الانبیاء کے مصداق ہیں۔ اور حدیث میں ''لو کان بعدی نبیٌ لکان عُمَر'' وغیرہ کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں۔ تو کیا یہ حضرات بھی ظلی طور پر محمد مصطفےٰ ﷺ بن گئے تھے؟

نبوت کا چھیالیسواں حصہ

صرف یہی نہیں کہ قرآن میں بروز اور بروزی نبی کے پیدا ہونے کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ بہت سی احادیث بھی اس عقیدے کا صاف صاف بطلان کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر یہ حدیث ملاحظہ کیجیے:

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! نبوت کا کوئی جزء سوائے اچھے خوابوں کے باقی نہیں رہا۔'' (بخاری اور مسلم نے روایت کیا۔)

اس حدیث کا حاصل یہ ہے کہ نبوت بالکلیہ ختم ہوچکی ہے۔ سلسلۂ وحی منقطع ہوگیا۔ البتہ اجزائے نبوت میں سے ایک جُزو، مبشرات، باقی ہے۔ یعنی جو سچے خواب مسلمان دیکھتے ہیں، یہ بھی نبوت کے اجزا میں سے ایک جُزو ہے۔ اس کی تشریح بخاری ہی کی دوسری حدیث میں اس طرح آتی ہے کہ سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصّہ ہے۔ اب ذرا قادیانی عقلِ کج مزاج کی دلیری ملاحظہ کیجیے کہ اسی حدیث سے بقائے نبوت ثابت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اس حدیث میں بتلایا گیا ہے کہ نبوت کا ایک جزو باقی ہے۔ اسی سے نفس نبوت کی بقا ثابت ہوتا ہے۔ جیسے پانی کا ایک قطرہ بھی باقی ہو تو پانی کو باقی کہا جاسکتا ہے، اسی طرح نبوت کے جُزو کا باقی ہونا، خود نبوت کا باقی ہونا ہے۔ اگر یہ منطق مان لی جائے کہ کسی شے کے ایک جُزو کے وجود کو کُل کا وجود قرار دیا جاسکتا ہے، تو پھر ایک اینٹ کو پُورا مکان کہنا بھی درست ہوگا! کھانے کے بیس اجزا میں سے ایک جُزو نمک ہے تو نمک کو کھانا کہنا بھی روا ہوگا! اور پھر تو شاید ایک دھاگے کو کپڑا کہنا بھی جائز ہوگا! اور ایک انگلی کے ناخن کو اِنسان، اور ایک رسّی کو چارپائی بھی کہا جائے اور ایک میخ کو کواڑ بھی! یہ محض لچر اور ناقابل ذکر بات ہے کہ نبوت کا ایک جُزو باقی ہونے سے نبوت کی بقا ثابت کرڈالا۔

اس حدیث میں قابل لحاظ بات تو یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انقطاع نبوت کے ذکر کے ساتھ صرف رویائے صالحہ کی بقا کا ذکر فرمایا ہے۔ اور کسی قسم کی نبوت کا نام نہیں لیا۔ گویا نبوت کی کوئی قسم آپ ﷺ کے بعد باقی نہیں رہی، ورنہ ضروری تھا کہ نبوت کی جو قسم باقی رہنے والی ہے، بجائے سچے خواب کے اُس کا ذکر فرمایا جاتا۔ اور اسی پر بس نہیں۔ بلکہ نبوت کے تمام اجزا اور اقسام کے بالکلیہ انقطاع کی خبر دے کر صرف ایک جُزو، یعنی رُویائے صالحہ کا اِستثنا فرمایا گیا ہے۔ اب اِنصاف کیجیے کہ اگر سوائے رویائے صالحہ کے اور بھی کوئی جُز ویا کوئی نوع، یا کوئی قسم نبوت کی باقی رہنے والی تھی، تو اس کا اِستثنا کیوں نہیں فرمایا گیا۔

مرزا صاحب نے اپنی اسلام دشمنی پر پردہ ڈالنے کے لیے کبھی فرمایا کہ ختم نبوت کا مسئلہ تو میرا ایمان ہے، مگر صرف تشریعی نبوت ختم ہوئی ہے۔ اور میری نبوت غیر تشریعی ہے۔ اور کبھی کہا کہ کلی نبوت ختم ہوئی ہے اور میری نبوت جزئی ہے۔ اور کبھی ارشاد ہوا

کہ حقیقی نبوت ختم ہوئی ہے، اور میری ظلی و بروزی ہے۔ اور کہیں لکھا ہے کہ مستقل نبوت ختم ہوئی ہے، اور میری نبوت غیر مستقل ہے۔ غرض اِن متعارض اور متضاد اقوال کو اختیار کر کے وہ سمجھے کہ ہماری نبوت بھی سیدھی ہوگئی اور مسلمانوں کے سامنے یہ کہنے کی گنجائش بھی باقی رہ گئی کہ ہم قرآن و حدیث کے صریح حکم یا امّت کے اجماعی عقیدۂ ختم نبوت کے منکر نہیں ہیں۔ لیکن اس حدیث نے مرزا صاحب کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے۔

ختم نبوت اور نزولِ مسیحؑ

آیت خاتم النّبیین کی روشن دلیل کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی غرض سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کے بعد اور کوئی نبی نہیں آ سکتا تو آخر زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام، جو متفق علیہ نبی ہیں، کیسے آ سکتے ہیں؟ حالانکہ ان کا قیامت کے قریب آنا مسلمانوں کا اجماعی عقیدہ ہے اور قرآن وحدیث سے بھی ثابت ہے۔ غرض یا ختم نبوت سے اِنکار کیجیے، یا نزولِ مسیحؑ سے ہاتھ اٹھائیے۔ یہ شُبہ خلطِ مبحث کا شاہ کار ہے۔ حقیقت میں اِن دونوں عقیدوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں ہے۔ اور اس کے دلائل یہ ہیں:

عربی لغت اور محاورے کی رُو سے خاتم النّبیین اور آخر الانبیا کے معنی یہ ہیں کہ آپ ﷺ وصفِ نبوت کے ساتھ (اس عالم میں) سب سے آخر میں متصف ہوئے۔ یعنی آپ ﷺ کے بعد کسی کو نبوت نہ دی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ ﷺ سے پہلے تمام انبیا وفات پا گئے ہوں۔ اہلِ عرب جب خاتم الاولاد یا آخر الاولاد بولتے ہیں تو مُراد یہی ہوتی ہے کہ یہ بچہ سب سے آخر میں پیدا ہوا، نہ یہ کہ پہلی تمام اولاد کا صفایا ہو چکا۔ حدیث میں اِسی مفہوم کی صراحت یوں ہے کہ حضرت سہلؓ ابن سعد الساعدی راوی ہیں کہ حضرت عباسؓ نے آنحضرت ﷺ سے ہجرت کی اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے میرے چچا! اپنی جگہ ٹھیرے رہو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ہجرت ختم کر دی ہے، جیسا کہ مجھ پر انبیا کو ختم کر دیا ہے۔'' (طبرانی، ابونعیم، ابویعلیٰ، ابن عساکر، اور ابن النجار نے روایت کیا)۔ دیکھیے خود حضرت رِسالت پناہ ﷺ نے ختم نبوت کو ختم ہجرت کی تمثیل میں پیش فرما کر بحث کا خاتمہ فرما دیا۔ کسی ادنیٰ سمجھ بُوجھ والے آدمی پر بھی یہ بدگمانی نہیں کی جا سکتی کہ وہ حضرت عباسؓ کے خاتم المہاجرین ہونے کو اُن سے پہلے مہاجرین کے دنیا میں باقی رہنے کا مخالف یا معارض سمجھے۔ یا حضرت عباسؓ پر ختمِ ہجرت کا یہ مطلب قرار دے کہ اُن سے پہلے کے سب مہاجرین مر چکے۔

ایک اور حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آیت کریمہ ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِیّٖنَ مِیْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ﴾ (الاحزاب:7) کی تفسیر میں فرمایا: ''میں خلقت میں سب انبیا سے پہلے اور بعثت میں سب کے آخر میں ہوں۔'' اِس حدیث نے بھی خاتم النّبیین کے معنی کو بالکل صاف کر دیا ہے۔ مُراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کی بعثت دُنیا میں سب سے آخر میں ہوئی: نہ یہ کہ آپ ﷺ سے پہلے سارے انبیائے کرام وفات پا چکے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰؑ کے نزول سے متعلق احادیث میں اِس اَمر کی تصریح موجود ہے کہ آپ علیہ السلام اِس دنیا میں جب دوبارہ تشریف لائیں گے تو نبی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اِمام کی حیثیت سے تشریف لائیں گے اور شریعت محمدی ﷺ کی پیروی کریں گے۔

انکارِ ختم نبوت کی سزا

قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور اقوال اَئمہ ومفسرین ختم نبوت کے اِس اجماعی عقیدے پر نہ صرف کلی طور پر متفق ہیں، بلکہ اِس سے انکار کرنے اور آیت خاتم النّبیین کی خلافِ اجماع تاویل کرنے کو قابل تعزیر جُرم قرار دیتے ہیں۔ سیّد محمد آلوسی بغدادی اپنی مشہور و مستند تفسیر ''روح المعانی'' میں حضرت عیسیٰؑ کے نزول کے خلاف شُبے کا ازالہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اور آنحضرت ﷺ کے خاتم النّبیین ہونے سے مُراد یہ ہے کہ آپ ﷺ کے اِس عالم میں وصفِ نبوت کے ساتھ متصف ہونے کے بعد وصفِ نبوت کا پیدا ہونا بالکل منقطع ہو گیا۔ جن وانس میں سے کسی میں اب یہ وصف پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مسئلہ ختم نبوت اس عقیدے سے ہرگز معارض نہیں، جس پر امّت نے اجماع کیا ہے، اور جس میں احادیث شہرت کو پہنچی ہوئی ہیں، اور شاید درجۂ تواترِ معنوی کو پہنچ جائیں، اور جس پر قرآن نے تصریح کی ہے، اور جس پر ایمان لانا واجب ہے، اور اس کے منکر، مثلاً فلاسفہ کو کافر سمجھا گیا ہے، یعنی آخر زمانے میں نزولِ عیسیٰؑ۔ کیوں کہ وہ آنحضرت ﷺ کے اِس عالم میں نبوت ملنے سے پہلے وصفِ نبوت کے ساتھ متصف ہو چکے تھے۔''

اسی آیت کی شرح کرتے ہوئے علامہ آلوسیؒ مزید فرماتے ہیں:

''اور آنحضرت ﷺ کا آخر النّبیین ہونا اُن مسائل میں سے ہے جن پر قرآن بول اٹھا، اور جس پر احادیث نے صاف صاف تقریر کی اور جس پر امّت نے اجماع کیا۔ اس لیے اس کے برخلاف دعویٰ کرنے والے کو کافر سمجھا جائے گا، اور اگر توبہ نہ کرے تو قتل کیا جائے گا۔''

حجۃ الاسلام امام غزالی قدس اللہ سرّہٗ، جو علومِ ظاہرہ و باطنہ کے مسلّم اِمام ہیں، آیت خاتم النّبیین کی تفسیر میں ایک ایسا مضمون تحریر فرماتے ہیں کہ گویا قادیانی فتنہ اُن پر منکشف ہو گیا تھا۔ اسی کی رَد کے لیے یہ الفاظ لکھے ہیں:

''خوب سمجھ لو کہ تمام امت نے خاتم النّبیین کے الفاظ سے یہی سمجھا ہے کہ یہ آیت بتلا رہی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے بعد نہ کوئی نبی ہے نہ رسُول۔ اور اس پر بھی اجماع واتفاق ہے کہ نہ اِس آیت میں کوئی تاویل ہے، اور نہ تخصیص۔ اور جس شخص نے اِس آیت میں کسی قسم کی تخصیص کے ساتھ کوئی تاویل کی، اس کا کلام ایک بکواس و ہذیان ہے، اور یہ تاویل اُس کے اُوپر کفر کا حکم کرنے سے روک نہیں سکتی۔ کیوں کہ وہ اِس نصِ صریح کی تکذیب کرتا ہے جس کے متعلق امّت محمدیہ ﷺ کا اتفاق ہے کہ اِس میں کوئی تاویل و تخصیص نہیں۔''

امام حدیث علامہ شاطبیؒ، جو آٹھویں صدی ہجری کے مشہور معروف امام ہیں، اپنی کتاب ''اعتصام'' میں اُن لوگوں کی ایک مختصر فہرست شمار کرتے ہیں، جنھوں نے نبوت یا وحی یا عصمت کا دعویٰ کیا اور اُمّت کے اجماع نے اُنھیں واجب القتل سمجھا۔ اِسی سلسلے میں امام موصوف نے فازازی نام کے ایک شخص کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ اُس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس نے بہت سے ایسے شعبدے بھی دکھائے جو کرامت یا خارقِ عادت سمجھے جاتے ہیں۔ عوام ہر زمانے میں عجائب پرست ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی ایک گروہ اس کے ساتھ ہوگیا۔ یہ شخص بھی مرزا غلام احمد کی طرح اِتباعِ قرآن کا مدّعی تھا۔ اس لیے اس نے آیت خاتم النّبیین کی ایسی تاویلات شروع کیں جن کے ذریعے آنحضرت ﷺ کے بعد کسی نبی کی گنجائش نکل آئے۔ مگر علمائے وقت نے اس کے دعوے اور تاویلات کو اتفاق رائے سے کفر والحاد قرار دیا۔ چنانچہ اُس زمانے کے امام مقتدر شیخ المشائخ ابوجعفر ابن زبیرؒ کے فتوے پر اسے قتل کر دیا گیا۔ (مولانا مفتی محمد شفیعؒ)

ختم نبوت

ختم نبوت کے مسئلے پر سورۂ احزاب کی آیت 40 قرآنی نص اور برہان قاطع کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی تفسیر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک طویل اور جامع مضمون قلم بند کر رکھا ہے، جس میں قرآن وحدیث کے حوالوں کے ساتھ ساتھ اس مسئلے کی تاریخ بھی رقم کی ہے۔ اور جو ''تفہیم القرآن'' کی جلد چہارم میں سورۂ احزاب کی تفسیر کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔ یہی مضمون یہاں نقل کیا جارہا ہے:

''ایک گروہ، جس نے اس دور میں نئی نبوت کا فتنۂ عظیم کھڑا کیا ہے، لفظ خَاتَمُ النَّبِیّٖن کے معنی ''نبیوں کی مہر'' کرتا ہے اور اس کا مطلب یہ لیتا ہے کہ نبی ﷺ کے بعد جو انبیا بھی آئیں گے، وہ آپ ﷺ کی مہر لگنے سے نبی بنیں گے، یا بالفاظ دیگر جب تک کسی کی نبوت پر آپ ﷺ کی مہر نہ لگے، وہ نبی نہ ہو سکے گا۔

جس آیت میں حضور پاک ﷺ کو خاتم النّبیین کہا گیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الاحزاب: 40)

لیکن جس سلسلۂ بیان میں یہ آیت وارد ہوئی ہے، اس کے اندر رکھ کر اسے دیکھا جائے تو اس لفظ کا یہ مفہوم لینے کی قطعاً گنجائش نظر نہیں آتی، بلکہ اگر یہی اس کے معنی ہوں تو یہاں یہ لفظ بے محل ہی نہیں، مقصود کلام کے بھی خلاف ہو جاتا ہے۔ آخر اس بات کی کیا ''تک'' ہے کہ اوپر سے تو نکاح زینبؓ پر معترضین کے اعتراضات اور ان کے پیدا کیے ہوئے شکوک وشبہات کا جواب دیا جارہا ہے اور یکا یک یہ بات کہ ڈالی جائے کہ محمد ﷺ نبیوں کی مہر ہیں۔ آیندہ جو نبی بھی بنے گا، ان کی مہر لگ کر بنے گا۔ اس سیاق وسباق میں یہ بات نہ صرف یہ کہ بالکل بے تکی ہے، بلکہ اس سے وہ استدلال الٹا کمزور ہو جاتا ہے، جو اوپر سے معترضین کے جواب میں چلا آرہا ہے۔ اس صورت میں تو معترضین کے لیے یہ کہنے کا اچھا موقع تھا کہ آپ ﷺ یہ کام اس وقت نہ کرتے تو کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس رسم کو مٹانے کی ایسی ہی کچھ شدید ضرورت ہے تو آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کی مہر لگ کر جو انبیا آتے رہیں گے، ان میں سے کوئی اسے مٹا دے گا۔

ایک دوسری تاویل اس گروہ نے یہ بھی کی ہے کہ ''خاتم النّبیین'' کے معنی افضل النّبیین کے ہیں، یعنی نبوت کا دروازہ تو کھلا ہوا ہے، البتہ کمالات نبوت حضور پاک ﷺ پر ختم ہوگئے ہیں، لیکن یہ مفہوم لینے میں بھی وہی قباحت ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے۔ سیاق وسباق سے یہ مفہوم بھی کوئی مناسبت نہیں رکھتا، بلکہ الٹا اس کے خلاف پڑتا ہے۔ کفار ومنافقین کہ سکتے ہیں کہ حضرت کم تر درجے ہی کے سہی بہرحال آپ کے بعد بھی نبی آتے رہیں گے، پھر کیا ضرور تھا کہ اس رسم کو بھی آپ ہی مٹا کر تشریف لے جاتے۔

لغت کی رو سے:

خاتم النّبیین کے معنی

پس جہاں تک سیاق وسباق کا تعلق ہے، وہ قطعی طور پر اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ یہاں خاتم النّبیین کے معنی سلسلۂ نبوت کو ختم کر دینے والے ہی کے لیے جائیں اور یہ سمجھا جائے کہ حضورؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ لیکن یہ صرف سیاق ہی کا تقاضا نہیں ہے۔ لغت بھی اسی معنی کی مقتضی ہے۔ عربی لغت اور محاورے کی رو سے ''ختم'' کے معنی مہر لگانے، بند کرنے، آخر تک پہنچ جانے اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں۔

خَتَمَ العَمَلَ کے معنی ہیں۔ ''فَرَغَ مِنَ العَمَلِ کام سے فارغ ہوگیا۔''

خَتَمَ الاِنَاءَ کے معنی ہیں: ''برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مہر لگادی کہ نہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو۔''

خَتَمَ الکِتَابَ کے معنی ہیں ''خط بند کر کے اس پر مہر لگادی تاکہ خط محفوظ ہو جائے۔''

خَتَمَ عَلَی القلب ''دل پر مہر لگادی کہ نہ کوئی بات اس کی سمجھ میں آئے۔ نہ پہلے سے جمی ہوئی کوئی بات اس میں سے نکل سکے۔''

خِتَامُ کُلِّ مَشروُب ''وہ مزہ جو کسی چیز کو پینے کے بعد آخر میں محسوس ہوتا ہے۔''

خَاتمہ کُلِ شَیءٍ عاقبته وا ٰخرته ''ہر چیز کے خاتمہ سے مراد ہے اس کی عاقبت اور آخرت۔''

خَتَمَ الشیء بلغ اٰخره ''کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے۔ اس کے آخر تک پہنچ جانا اس معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں اور اس معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خَاتَمُ القَومِ اٰخِرهُم ''خاتم القوم سے مراد ہے، قبیلے کا آخری آدمی (ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس اور اقرب الموارد)

اسی بنا پر تمام اہل لغت اور اہل تفسیر نے بالاتفاق خاتم النّبیین کے معنی آخر النّبیین کے لیے ہیں۔ عربی لغت ومحاورے کی رو سے خاتم کے معنی ڈاک خانے کی مہر کے نہیں ہیں جسے لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ مہر ہے جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے اور نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشادات

قرآن کے سیاق وسباق اور لغت کے لحاظ سے اس لفظ کا جو مفہوم ہے، اس کی تائید نبی ﷺ کی تشریحات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

1- نبی ﷺ نے فرمایا: بنی اسرائیل کی قیادت انبیا کیا کرتے تھے۔ جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفاء ہوں گے (بخاری، کتاب المناقب، باب ماذکر عن بنی اسرائیل)

2- نبی ﷺ نے فرمایا، میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین وجمیل بنائی مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوٹی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے۔ مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں۔ اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے۔ جسے پر کرنے کے لیے کوئی آئے۔

(بخاری کتاب المناقب باب خاتم النّبیین)

اسی مضمون کی چار حدیثیں مسلم، کتاب الفضائل، باب خاتم النّبیین میں ہیں اور آخری حدیث میں یہ الفاظ زائد ہیں۔ فَجِئْتُ فَختمت الانبیا ''پس میں آیا اور میں نے انبیا کا سلسلہ ختم کر دیا۔''

یہی حدیث انھی الفاظ میں ترمذی، کتاب المناقب، باب فضل النبی اور کتاب الآداب باب الامثال میں ہے۔

مسند ابوداؤد وطیالسی میں یہ حدیث جابرؓ بن عبداللہ کی روایت کردہ احادیث کے سلسلہ میں آئی ہے۔ اور اس کے آخری الفاظ یہ ہیں: ختم بی الانبیا ''میرے ذریعہ سے انبیا کا سلسلہ ختم ہو گیا۔''

مسند احمد میں تھوڑے تھوڑے لفظی فرق کے ساتھ اس مضمون کی احادیث حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کی گئی ہیں۔

3- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے چھ باتوں میں انبیا پر فضیلت دی گئی ہے (1) مجھے جامع اور مختصر بات کہنے کی صلاحیت دی گئی (2) مجھے رعب کے ذریعے نصرت بخشی گئی (3) میرے لیے اموال غنیمت حلال کیے گئے (4) میرے لیے زمین کو مسجد بھی بنا دیا گیا اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ بھی (یعنی میری شریعت میں نماز صرف مخصوص عبادت گاہوں ہی میں نہیں۔ بلکہ رُوئے زمین پر ہر جگہ پڑھی جاسکتی ہے۔ اور پانی نہ ملے تو میری شریعت میں تیمم کر کے وضو کی حاجت بھی پوری کی جاسکتی ہے اور غسل کی حاجت بھی) (5) مجھے تمام دنیا کے لیے رسول بنایا گیا (6) اور میرے اوپر انبیا کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

4- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔

(ترمذی، کتاب الرویا، باب ذہاب النبوۃ۔ مسند احمد، مرویات انس بن مالکؓ)

5- نبی ﷺ نے فرمایا: میں محمد ﷺ ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں کہ میرے ذریعہ سے کفر محو کیا جائے گا۔ میں حاشر ہوں کہ میرے بعد لوگ حشر میں جمع کیے جائیں گے۔ (یعنی میرے بعد اب قیامت ہی آنی ہے) اور میں عاقب ہوں اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔ (بخاری و مسلم، کتاب الفضائل، باب اسماء النبی، ترمذی، کتاب الآداب۔ باب اسماء النبی المستدرك للحاكم، کتاب التاريخ، باب اسماء النبی)

6- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا جس نے اپنی امت کو دجال کے خروج سے نہ ڈرایا ہو، (مگر ان کے زمانے میں وہ نہ آیا) اب میں آخری نبی ہوں اور تم آخری اُمت ہو۔ لامحالہ اب اسے تمھارے اندر ہی نکلنا ہے۔

(ابن ماجه کتاب الفتن، باب الدجال)

7- عبدالرحمٰن بن جبیر کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن عاص کو یہ کہتے سنا کہ ایک روز رسول اللہ ﷺ اپنے مکان سے نکل کر ہمارے درمیان تشریف لائے اس انداز سے کہ گویا آپؐ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں، آپؐ نے تین مرتبہ فرمایا: ''میں محمد نبی اُمّی ہوں'' پھر فرمایا ''اور میرے بعد کوئی نبی نہیں'' (مسند احمد مرویات عبداللہ عمرو بن العاص)

8- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ صرف بشارت دینے والی باتیں ہیں۔ عرض کیا گیا۔ وہ بشارت دینے والی باتیں کیا ہیں۔ یا رسول اللہؐ؟ فرمایا: اچھا خواب یا فرمایا صالح خواب (یعنی وحی کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اشارہ ملے گا بھی تو بس اچھے خواب کے ذریعے سے مل جائے گا) (مسند احمد، مرویات ابوالطفیل۔ نسائی۔ ابوداؤد)

9- نبی ﷺ نے فرمایا: میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو عمر بن خطابؓ ہوتے۔

(بخاری و مسلم، کتاب فضائل الصحابہؓ)

10- رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: میرے ساتھ تمھاری نسبت وہی ہے جو موسیٰ کے ساتھ ہارون کی تھی۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

بخاری ومسلم نے یہ حدیث غزوۂ تبوک کے ذکر میں بھی نقل کی ہے۔ مسند احمد میں اس مضمون کی دو حدیثیں حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت کی گئی ہیں۔ جن میں سے ایک کا آخری فقرہ یوں ہے۔ (الا انه لا نبوة بعدی) مگر میرے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ ابوداؤد طیالسی، امام احمد اور محمد بن اسحٰق نے اس سلسلے میں جو تفصیلی روایات نقل کی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ تبوک کے لیے تشریف لے جاتے وقت نبی ﷺ نے حضرت علیؓ کو مدینہ طیبہ کی حفاظت ونگرانی کے لیے اپنے پیچھے

چھوڑنے کا فیصلہ فرمایا تھا۔ منافقین نے اس پر طرح طرح کی باتیں ان کے بارے میں کہنا شروع کر دیں۔ انھوں نے جا کر حضور ﷺ سے عرض کیا:

''یا رسول اللہ ﷺ کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جا رہے ہیں۔'' اس موقع پر حضور ﷺ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: تم میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہو جو موسیٰ کے ساتھ ہارون رکھتے تھے۔ یعنی جس طرح حضرت موسیٰ نے کوہ طور پر جاتے ہوئے حضرت ہارونؑ کو بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے پیچھے چھوڑا تھا۔ اسی طرح میں تمھیں مدینے کی حفاظت کے لیے چھوڑے جا رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی حضور ﷺ کو اندیشہ ہوا کہ حضرت ہارون کے ساتھ یہ تشبیہ کہیں بعد میں کسی فتنے کا موجب نہ بن جائے اس لیے فوراً آپ نے یہ تصریح فرما دی کہ میرے بعد کوئی شخص نبی ہونے والا نہیں ہے۔

11- ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا...... اور یہ کہ میری امت میں تیس کذاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ (ابوداؤد، کتاب الفتن)

اسی مضمون کی ایک اور حدیث ابوداؤد نے کتاب الملاحم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے۔ ترمذی نے بھی حضرت ثوبان اور حضرت ابوہریرہؓ سے دونوں روایتیں نقل کی ہیں اور دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: حتّٰی یبعث دجّالون کذّابون قریب من ثلاثین کلّھم یزعم انّہ رسول اللّٰہ۔ ''یہاں تک کہ اٹھیں گے تیس کے قریب جھوٹے فریبی، جن میں سے ہر ایک دعویٰ کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔''

12- نبی ﷺ نے فرمایا، تم سے پہلے جو بنی اسرائیل گزرے ہیں، ان میں ایسے لوگ ہوئے ہیں جن سے کلام کیا جاتا تھا، بغیر اس کے کہ وہ نبی ہوں، میری اُمت میں اگر کوئی ہوا تو عمرؓ ہوگا۔ (بخاری، کتاب المناقب)

مسلم میں اس مضمون کی جو حدیث ہے اس میں یکلمون کے بجائے محدَّثون کا لفظ ہے۔ لیکن مکلم اور محدث دونوں کے معنی ایک ہی ہیں، یعنی ایسا شخص جو مکالمہ الٰہی سے سرفراز ہو، یا جس کے ساتھ پردۂ غیب سے بات کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کے بغیر مخاطبہ الٰہی سے سرفراز ہونے والے بھی اس اُمت میں اگر کوئی ہوتے تو وہ حضرت عمرؓ ہوتے۔

13- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی اُمت (یعنی کسی نئے آنے والے نبی کی امت) نہیں۔

(بیہقی، کتاب الرؤیا، طبرانی)

14- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں آخری نبی ہوں اور میری مسجد آخری مسجد (یعنی مسجد نبویؐ) ہے۔ (مسلم، کتاب الحج، باب فضل الصلوٰۃ مسجد مکہ والمدینہ)

یہ احادیث بکثرت صحابہؓ نے نبی ﷺ سے روایت کی ہیں اور کثرت سے محدثین نے انھیں بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے، مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہیں، آپؐ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ نبوت کا سلسلہ آپؐ پر ختم ہو چکا ہے اور آپؐ کے بعد جو لوگ بھی رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں، وہ دجال و کذاب ہیں۔ قرآن کے الفاظ ''خاتم النبیین'' کی اس سے زیادہ مستند و معتبر اور قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہو سکتی ہے۔ رسول پاک ﷺ کا ارشاد تو بجائے خود سند و حجت ہے، مگر وہ قرآن کی ایک نص (واضح حکم) کی شرح کر رہا ہو۔ تب تو وہ اور بھی زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ سے بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ ختم نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم اسے قبول کرنا کیا معنی، قابل غور بھی سمجھیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع

قرآن و سنت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابہ کرامؓ کے اجماع کی ہے۔ یہ بات تمام معتبر تاریخی روایات سے ثابت ہے۔ نبی ﷺ کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، ان سب کے خلاف صحابہ کرامؓ نے بالاتفاق جنگ کی تھی۔

اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ مسیلمہ کذاب کا معاملہ قابل ذکر ہے۔ یہ شخص نبی کریم ﷺ کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اسے حضور پاک ﷺ کے ساتھ شریک نبوت بنایا گیا ہے۔ اس نے حضور پاک ﷺ کی وفات سے پہلے جو عریضہ آپ ﷺ کو لکھا تھا، اس کے الفاظ یہ ہیں:

مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کی طرف۔ آپ پر سلام ہو۔ آپ کو معلوم ہو کہ میں آپ کے ساتھ نبوت کے کام میں شریک کیا گیا ہوں۔

(طبری، جلد دوم، ص 399، طبع مصر)

علاوہ بریں مورخ طبری نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ مسیلمہ کے ہاں جو اذان دی جاتی تھی، اس میں اشھد ان محمد رسول اللّٰہ کے الفاظ کہے جاتے تھے۔ اس صریح اقرار رسالت محمدی ﷺ کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملت قرار دیا گیا اور اس سے جنگ کی گئی۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بنو حنیفہ نیک نیتی کے ساتھ اس پر ایمان لائے تھے اور انھیں اس غلط فہمی میں ڈالا گیا تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اسے خود شریک رسالت کیا ہے۔ نیز قرآن کی آیات کو ان کے سامنے مسیلمہ پر نازل شدہ آیات کی حیثیت سے ایسے شخص نے پیش کیا تھا، جو مدینہ طیبہ سے قرآن کی تعلیم حاصل کر کے گیا تھا۔ (البدایہ و النھایہ لا بن کثیر، جلد 5، ص 51) مگر اس کے باوجود صحابہ کرامؓ نے انھیں مسلمان تسلیم نہیں کیا اور ان پر فوج کشی کی۔ پھر یہ کہنے کی بھی گنجائش نہیں کہ صحابہؓ نے ان کے خلاف ارتداد کی بنا پر نہیں بلکہ بغاوت کے جرم میں جنگ کی تھی۔ اسلامی قانون کی رو سے باغی مسلمانوں کے خلاف اگر جنگ کی نوبت آئے تو ان کے اسیران جنگ غلام نہیں بنائے جا سکتے، بلکہ مسلمان تو درکنار، ذمی بھی اگر باغی ہوں تو گرفتار ہونے کے بعد انھیں غلام بنانا جائز

نہیں ہے۔ لیکن مسیلمہ اور اس کے پیروؤں پر جب چڑھائی کی گئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اعلان فرمایا کہ ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا جائے اور جب وہ لوگ اسیر ہوئے تو فی الواقع انھیں غلام بنایا گیا۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہؓ نے جس جرم کی بنا پر اس سے جنگ کی تھی، وہ بغاوت کا جرم نہ تھا، بلکہ یہ جرم تھا کہ ایک شخص نے محمد ﷺ کے بعد نبوت کا دعویٰ کیا اور دوسرے لوگ اس کی نبوت پر ایمان لائے۔ یہ کارروائی حضور اکرم ﷺ کی وفات کے فوراً بعد ہوئی ہے، ابوبکر صدیقؓ کی قیادت میں ہوئی ہے اور صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت کے اتفاق سے ہوئی ہے۔ اجماع صحابہؓ کی اس سے زیادہ صریح مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔

علمائے اُمت کا اجماع

اجماع صحابہؓ کے بعد چوتھے نمبر پر مسائل دین میں جس چیز کو حجت کی حیثیت حاصل ہے، وہ دور صحابہؓ کے بعد کے علمائے امت کا اجماع ہے۔ اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی سے لے کر آج تک ہر زمانے کے، اور پوری دنیائے اسلام میں ہر ملک کے علما اس عقیدے پر متفق ہیں کہ محمد ﷺ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ جو بھی آپ ﷺ کے بعد اس منصب کا دعویٰ کرے، یا اسے مانے، وہ کافر خارج از ملت اسلام ہے اس سلسلے کے بھی چند شواہد ملاحظہ ہوں۔

1-امام ابوحنیفہؒ (80ھ-150ھ) کے زمانے میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور کہا، مجھے موقع دو کہ میں اپنی نبوت کی علامات پیش کروں۔ اس پر امام اعظمؒ نے فرمایا: کہ جو شخص اس سے نبوت کی کوئی علامت طلب کرے گا، وہ بھی کافر ہو جائے گا۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ فرما چکے ہیں کہ: لا نبی (بعدی مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ لابن احمد المکی ج1 ص161 مطبوعہ حیدر آباد۔1321ھ)

2-علامہ ابن جریر طبری (224ھ-310ھ) اپنی مشہور تفسیر قرآن میں آیت ولکن رسول اللہ وخاتم النّبیین کا مطلب بیان کرتے ہیں ''جس نے نبوت کو ختم کر دیا اور اس پر مہر لگا دی اب قیامت تک یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا۔''
(تفسیر ابن جریر، جلد22 ص12)

3- امام طحاوی (239ھ-321ھ) اپنی کتاب ''عقیدۃ سلفیہ'' میں سلف صالحین اور خصوصاً امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے عقائد بیان کرتے ہوئے نبوت کے بارے میں یہ عقیدہ تحریر فرماتے ہیں'' اور یہ محمد ﷺ اللہ کے برگزیدہ بندے چیدہ نبی اور پسندیدہ رسول ہیں اور وہ خاتم الانبیا، امام الاتقیا، سید المرسلین اور حبیب رب العالمین ہیں اور ان کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہش نفس کی بندگی ہے۔'' (شرح، الطحاویہ فی العقیدۃ السّلفیہ، دار المعارف مصر صفحات 15,87,96,97,100, 102)

4-علامہ ابن حزم اندلسی (384ھ-456ھ) لکھتے ہیں ''یقیناً وحی کا سلسلہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد منقطع ہو چکا ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ وحی نہیں ہوتی مگر ایک نبی کی طرف اور اللہ عزوجل فرما چکا ہے کہ محمد تمہیں ہیں، تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ مگر وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔'' (المحلی، ج1 ص26)

5-امام غزالیؒ (450ھ-505ھ) فرماتے ہیں۔ اگر یہ دروازہ (یعنی اجماع کو حجت ماننے سے انکار کا دروازہ) کھول دیا جائے تو بڑی قبیح باتوں تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً اگر کہنے والا کہے کہ ہمارے نبی محمد ﷺ کے بعد کسی رسول کی بعثت ممکن ہے تو اس کی تکفیر میں تامل نہیں کیا جا سکتا لیکن بحث کے موقع پر جو شخص اس کی تکفیر میں تامل کو ناجائز ثابت کرنا چاہتا ہو اسے لامحالہ اجماع سے مدد لینا پڑے گی، کیوں کہ عقل اس کے عدم جواز کا فیصلہ نہیں کرتی اور جہاں تک نقل کا تعلق ہے، اس عقیدے کا قائل لا نبی بعدی اور خاتم النّبیین کی تاویل کرنے سے عاجز نہ ہوگا۔ وہ کہے گا کہ خاتم النّبیین سے مراد اولوالعزم رسولوں کا خاتم ہونا ہے اور اگر کہا جائے کہ نبیین کا لفظ عام ہے تو عام کو خاص قرار دے دینا اس کے لیے کچھ مشکل نہ ہوگا اور لا نبی بعدی کے متعلق وہ کہہ دے گا کہ لا رسول بعدی تو نہیں کہا گیا ہے، رسول اور نبی میں فرق ہے اور نبی کا مرتبہ رسول سے بلند تر ہے۔ غرض اس طرح کی بکواس بہت کچھ کی جا سکتی ہے اور محض لفظ کے اعتبار سے ایسی تاویلات کو ہم محال نہیں سمجھتے، بلکہ ظواہر تشبیہ کی تاویل میں ہم اس سے بھی زیادہ بعید احتمالات کی گنجائش مانتے ہیں اور اس طرح کی تاویلیں کرنے والے کے متعلق ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ نصوص (بالکل واضح قرآنی احکامات) کا انکار کر رہا ہے۔ لیکن اس قول کے قائل کی تردید میں ہم یہ کہیں گے کہ امت نے بالاتفاق اس لفظ (یعنی لا نبی بعدی) سے اور ﷺ کے قرائن احوال سے یہ سمجھا ہے کہ حضور پاک ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ آپ ﷺ کے بعد کبھی نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول۔ نیز امت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس میں کسی تاویل اور تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو منکر اجماع کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا (الاقتصاد فی الاعتقاد۔ المطبعۃ الادبیہ مصر، ص114)

6- محی السنہ بغوی (متوفی 510ھ) اپنی تفسیر ''معالم التنزیل'' میں لکھتے ہیں: ''اللہ نے آپؐ کے ذریعہ سے نبوت کو ختم کیا۔ پس آپ ﷺ انبیا کے خاتم ہیں...... اور ابن عباس کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ نبی ﷺ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ (جلد3 ص158)

7-علامہ زمخشری (467ھ-538ھ) تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں: ''اگر تم کہو کہ نبی ﷺ آخری نبی کیسے ہوئے، جب کہ حضرت عیسیٰؑ آخر زمانے میں نازل ہوں گے۔ تو میں کہوں گا کہ آپ ﷺ کا آخری نبی ہونا اس معنی میں ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی شخص نبی نہ بنایا جائے گا اور عیسیٰ ان لوگوں میں سے ہیں جو آپ ﷺ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمدیہؐ کے پیرو آپ ﷺ کے قبلے کی طرف نماز پڑھنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ گویا وہ آپ ہی کی امت کے ایک فرد ہیں، (جلد2، ص215)

8- قاضی عیاض (متوفی 544ھ) لکھتے ہیں: ''جو شخص خود اپنے حق میں نبوت کا

دعویٰ کرے یا اس بات کو جائز رکھے کہ آدمی نبوت کا اکتساب کر سکتا ہے اور صفائی قلب کے ذریعہ سے مرتبۂ نبوت کو پہنچ سکتا ہے، جیسا کہ بعض فلسفی اور غالی صوفی کہتے ہیں اور اس طرح جو شخص نبوت کا دعویٰ تو نہ کرے مگر یہ دعویٰ کرے کہ اس پر وحی آتی ہے۔ ایسے سب لوگ کافر اور نبی ﷺ کے جھٹلانے والے ہیں کیوں کہ آپ ﷺ نے خبر دی ہے کہ آپ خاتم النّبیین ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں اور آپؐ نے اللہ کی طرف سے یہ خبر پہنچائی ہے کہ آپ ﷺ نبوت کے ختم کرنے والے ہیں اور تمام انسانوں کی طرف آپ ﷺ کو بھیجا گیا ہے اور تمام امت کا اس پر اجماع ہے کہ یہ کلام اپنے ظاہر مفہوم پر محمول ہے۔ اس کے معنی و مفہوم میں کسی تاویل و تخصیص کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا ان تمام گروہوں کے کافر ہونے میں قطعاً کوئی شک نہیں، بر بنائے اجماع بھی بر بنائے نقل بھی۔" (شفا جلد: 2 ص 270-271)

9- علامہ شہرستانی (متوفی 548ھ) اپنی مشہور کتاب "الملل والنحل" میں لکھتے ہیں "اور اسی طرح جو کہے...... کہ محمد ﷺ کے بعد کوئی نبی آنے والا ہے، (بجز عیسیٰ علیہ السلام کے) تو اس کے کافر ہونے میں دو آدمیوں کے درمیان بھی اختلاف نہیں۔" (جلد 3 ص 269)

10- امام رازی (543ھ-606ھ) اپنی "تفسیر کبیر" میں آیت خاتم النّبیین کی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اس سلسلۂ بیان میں خاتم النّبیین اس لیے فرمایا کہ جس نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی ہو، وہ اگر نصیحت اور توضیح احکام میں کوئی کسر چھوڑ جائے تو اس کے بعد آنے والا نبی اُسے پورا کر سکتا ہے، مگر جس کے بعد کوئی آنے والا نبی نہ ہو، وہ اپنی اُمت پر زیادہ شفیق ہوتا ہے اور اُسے زیادہ واضح راہ نمائی دیتا ہے، کیوں کہ اس کی مثال اس باپ کی ہوتی ہے جو جانتا ہے کہ اس کے بیٹے کا کوئی ولی و سرپرست اس کے بعد نہیں ہے۔ (جلد 6 ص 581)

11- علامہ بیضاوی (متوفی 685ھ) اپنی تفسیر "انوار التنزیل" میں لکھتے ہیں۔ یعنی آپ ﷺ انبیا میں سب سے آخری نبی ہیں۔ جس نے ان کا سلسلہ ختم کر دیا یا جس سے انبیا کے سلسلے پر مہر کر دی گئی اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا اس ختم نبوت میں قادح نہیں ہے۔ کیوں کہ جب وہ نازل ہوں گے تو آپؐ ہی کے دین پر ہوں گے۔" (جلد 4 ص 164)

12- علامہ حافظ الدین النسفی (متوفی 710ھ) اپنی تفسیر "مدارک التنزیل" میں لکھتے ہیں اور آپؐ خاتم النّبیین ہیں...... یعنی نبیوں میں سب سے آخری۔ آپؐ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا۔ رہے عیسیٰؑ تو وہ ان انبیا میں سے ہیں جو آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمدؐ پر عمل کرنے والے کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ گویا کہ وہ آپ کی امت کے افراد میں سے ہیں۔" (ص 471)

13- علامہ علاؤ الدین بغدادی (متوفی 725ھ) اپنی تفسیر "خازن" میں لکھتے ہیں: وخاتم النّبیین، یعنی اللہ نے آپؐ پر نبوت ختم کر دی۔ اب نہ آپؐ کے بعد کوئی نبوت ہے، نہ آپؐ کے ساتھ کوئی اس میں شریک۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا یعنی یہ بات اللہ کے علم میں ہے کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔" (ص 471-472)

14- علامہ ابن کثیر (متوفی 774ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں لکھتے ہیں:
"پس یہ آیت اس باب میں نص صریح (بالکل واضح حکم رب) ہے کہ نبی ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور جب آپؐ کے بعد نبی کوئی نہیں تو رسول بدرجہ اولیٰ نہیں ہے۔ کیوں کہ رسالت کا منصب خاص ہے اور نبوت کا منصب عام، ہر رسول نبی ہوتا ہے۔ مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ حضورؐ کے بعد جو شخص بھی اس مقام کا دعویٰ کرے، وہ جھوٹا، مفتری، دجال، گمراہ اور گمراہ کرنے والا ہے، خواہ وہ کیسے ہی خرق عادت اور شعبدے اور جادو اور طلسم اور کرشمے بنا کر لے آئے۔ یہی حیثیت ہر اس شخص کی ہے، جو قیامت تک اس منصب کا مدعی ہو۔" (جلد 3 ص 493-494)

15- علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی 911ھ) تفسیر جلالین میں لکھتے ہیں۔ یعنی اللہ اس بات کو جانتا ہے کہ آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی نہیں اور عیسیٰؑ جب نازل ہوں گے تو آپ کی شریعت ہی کے مطابق کریں گے۔" (ص 768)

16- علامہ ابن نجیم (متوفی 970ھ) اصول فقہ کی مشہور کتاب الاشباہ والنظائر، کتاب السیر میں لکھتے ہیں: "اگر آدمی یہ نہ سمجھے کہ محمدؐ آخری نبی ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، کیوں کہ یہ ان باتوں میں سے ہے جن کا جاننا اور ماننا ضروریات دین میں سے ہے۔ (ص 179)

17- ملا علی قاری (متوفی 1016ھ) شرح فقہ اکبر میں لکھتے ہیں: "ہمارے نبیؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنا بالاجماع کفر ہے۔" (ص 202)

18- شیخ اسماعیل حقی (متوفی 1137ھ) تفسیر روح البیان میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "عاصم نے لفظ خاتم، ت کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی ہیں آلۂ ختم کے جس سے مہر کی جاتی ہے۔ جیسے طابع اس چیز کو کہتے ہیں، جس پر ٹھپا لگایا جائے۔ مراد یہ ہے کہ نبی ﷺ انبیا میں سب سے آخر تھے۔ ان کے ذریعے سے نبیوں کے سلسلے پر مہر لگا دی گئی۔ فارسی میں اسے "مہر پیغمبر" کہیں گے۔ یعنی آپؐ سے نبوت کا دروازہ سربمہر کر دیا گیا اور پیغمبروں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ باقی قاریوں نے اسے ت کے زیر کے ساتھ خاتم پڑھا ہے۔ آپؐ مہر کرنے والے تھے۔ فارسی میں اسے "مہر کنندۂ پیغمبران" کہیں گے۔ اس طرح یہ لفظ بھی خاتم کا ہم معنی ہی ہے...... اب آپ کی امّت کے علما آپؐ سے صرف ولایت ہی کر پائیں گے۔ نبوت کی میراث آپؐ کی خمیت کے باعث ختم ہو چکی، اور عیسیٰ علیہ السلام کا آپؐ کے بعد نازل ہونا آپؐ کے خاتم النّبیین ہونے میں قادح نہیں ہے، کیوں کہ خاتم النّبیین ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہ بنایا جائے گا...... اور عیسیٰؑ آپؐ سے پہلے نبی بنائے جا چکے تھے اور جب وہ نازل ہوں گے تو شریعت محمدیؐ کے پیرو کی حیثیت سے نازل ہوں گے۔ آپؐ کے قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھیں گے۔ آپؐ کی امت کے ایک فرد کی طرح ہوں گے۔ نہ ان کی طرف وحی آئے گی اور نہ وہ

خوف وخطر اس کا انکار کریں گے۔ خطرہ ہوسکتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی باز پرس ہی کا تو ہوسکتا ہے۔ وہ قیامت کے روز ہم سے پوچھے گا تو ہم یہ سارا ریکارڈ بر سر عدالت لا کر رکھ دیں گے۔ جس سے ثابت ہو جائے گا کہ معاذ اللہ اس کفر کے خطرے میں تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہی نے ہمیں ڈالا تھا۔ ہمیں قطعاً کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ اس ریکارڈ کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ ہمیں کسی نئے نبی پر ایمان نہ لانے کی سزا دے ڈالے گا۔ لیکن اگر نبوت کا دروازہ فی الواقع بند ہے اور کوئی نبی آنے والا نہیں ہے اور اس کے باوجود کوئی شخص کسی مدعی کی نبوت پر ایمان لاتا ہے تو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کفر کی پاداش سے بچنے کے لیے وہ کون سا عذر خدا کی عدالت میں پیش کر سکتا ہے جس سے وہ رہائی کی توقع رکھتا ہو۔ عدالت میں پیشی ہونے سے پہلے اسے اپنی صفائی کے مواد کا یہیں جائزہ لے لینا چاہیے اور ہمارے پیش کردہ مواد سے مقابلہ کر کے خود ہی دیکھ لینا چاہیے کہ جس صفائی کے بھروسے پر وہ یہ کام کر رہا ہے، کیا عقل مند آدمی اس پر اعتماد کر کے کفر کی سزا کا خطرہ مول لے سکتا ہے۔

دوسری بات:

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے، جو ہر اس شخص میں پیدا ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عمل صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اس قابل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے، جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ اس ضرورت کا تقاضا ہوتا ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیا پر انبیا نہیں بھیجے جاتے۔

قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آئی ہے تو پتا چلا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیا مبعوث ہوئے ہیں۔

اوّل یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اُس تک نہ پہنچ سکا تھا۔ دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بھلا دی گئی ہو یا اس میں تحریف ہو گئی ہو، اور اس کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔ سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعے مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیل دین کے لیے مزید انبیا کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی پاکؐ کے ہوتے ہوئے باقی نہیں رہی ہے۔ قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضور کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے اور دنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپ کی بعثت کے بعد سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپ کی دعوت قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی تھی، اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیا آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

قرآن اس پر گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث وسیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا۔ جو کتاب آپؐ لائے تھے، اس میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی آج تک نہیں ہوئی۔ نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو ہدایت آپؐ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپؐ کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔

پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضور پاکؐ کے ذریعے سے دین کی تکمیل کر دی گئی۔ لہٰذا تکمیل دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضور پاکؐ کے زمانے میں آپؐ کے ساتھ مقرر کیا جاتا، ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کون سی ہے، جس کے لیے آپؐ کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے، اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لیے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جائے اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے، یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے، یا اسے تحریفات سے پاک کرنے کے لیے۔ قرآن اور سنت محمدؐ کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیا کی۔

تیسری بات:

تیسری بات قابل توجہ بات یہ ہے کہ نبی جب کسی قوم میں آئے گا، فوراً اس میں کفر و ایمان کا سوال اٹھ کھڑا ہو گا۔ جو اُسے مانیں گے، وہ ایک امت قرار پائیں گے اور جو اُسے نہ مانیں گے وہ لامحالہ دوسری اُمت ہوں گے۔ ان دونوں امتوں کا اختلاف محض فروعی اختلاف نہ ہو گا۔ بلکہ ایک نبی پر ایمان لانے اور نہ لانے کا ایسا بنیادی اختلاف ہو گا۔ جو انھیں اس وقت تک جمع نہ ہونے دے گا، جب تک ان میں سے کوئی اپنا عقیدہ نہ چھوڑ دے۔ پھر ان کے لیے عملاً بھی ہدایت اور قانون کے ماخذ الگ الگ ہوں گے، کیوں کہ ایک گروہ اپنے تسلیم کردہ نبی کی پیش کی ہوئی وحی اور اس کی سنت سے قانون لے گا اور دوسرا گروہ اس کے ماخذ قانون ہونے کا سرے سے منکر ہو گا۔ اس بنا پر ان کا ایک مشترک معاشرہ بن جانا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو گا۔

ان حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھے تو اس پر یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی کہ ختم نبوت اُمت مسلمہ کے لیے اللہ کی ایک بہت بڑی رحمت ہے۔ جس کی بدولت ہی اس امت کا ایک دائمی اور عالم گیر برادری بننا ممکن ہوا ہے۔ اس چیز نے مسلمانوں کو ایسے ہر بنیادی اختلاف سے محفوظ کر دیا ہے، جو ان کے اندر مستقل تفریق کا موجب ہو

سکتا ہو۔ اب جو شخص بھی محمدؐ کو اپنا ہادی و راہ بر مانے اور ان کی دی ہوئی تعلیم کے سوا کسی اور ماخذ ہدایت کی طرف رجوع کرنے کا قائل نہ ہو، وہ اس برادری کا فرد ہے اور ہر وقت ہوسکتا ہے۔ یہ وحدت اس اُمت کو کبھی نصیب نہ ہوسکتی تھی۔ اگر نبوت کا دروازہ بند نہ ہوجاتا، کیوں کہ ہر نبی کے آنے پر یہ پارہ پارہ ہوتی رہتی۔

آدمی سوچے تو اس کی عقل خود یہ کہہ دے گی کہ جب تمام دنیا کے لیے ایک نبی بھیج دیا جائے اور جب اس نبی کے ذریعہ سے دین کی تکمیل بھی کردی جائے اور جب اس نبی کی تعلیم کو پوری طرح محفوظ بھی کردیا جائے، تو نبوت کا دروازہ بند ہوجانا چاہیے تاکہ اس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہوکر تمام دنیا میں ہمیشہ کے لیے اہلِ ایمان کی ایک ہی اُمت بن سکے اور بلاضرورت نئے نئے نبیوں کی آمد سے اس اُمت میں بار بار تفرقہ نہ برپا ہوتا رہے۔ نبی خواہ ''ظلی'' ہو یا ''بروزی'' اُمتی ہو یا صاحب شریعت اور صاحب کتاب، بہرحال جو شخص نبی ہوگا اور خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ہوگا۔ اس کے آنے کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کے ماننے والے ایک اُمت بنیں اور نہ ماننے والے کافر قرار پائیں۔ یہ تفریق اس حالت میں تو ناگزیر ہے، جب کہ نبی کے بھیجے جانے کی فی الواقع ضرورت ہو، مگر جب اس کے آنے کی کوئی ضرورت نہ رہے تو خدا کی حکمت اور اس کی رحمت سے یہ بات قطعی بعید ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنے بندوں کو کفر و ایمان کی کش مکش میں مبتلا کرے اور انھیں کبھی ایک اُمت نہ بننے دے۔ لہٰذا جو کچھ قرآن سے ثابت ہے اور جو کچھ سنت اور اجماع سے ثابت ہے عقل بھی اسی کو صحیح تسلیم کرتی ہے اور اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہی رہنا چاہیے۔

مسیح موعود کی حقیقت:

نئی نبوت کی طرف بلانے والے حضرات عام طور پر ناواقف مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ احادیث میں مسیح موعود (PROMISED MESSIAH) کے آنے کی خبر دی گئی ہے اور مسیح نبی تھے، اس لیے ان کے آنے سے ختم نبوت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوتی، بلکہ ختم نبوت بھی برحق اور اس کے باوجود مسیح موعود کا آنا بھی برحق۔

اسی سلسلے میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''مسیح موعود'' سے مراد عیسیٰ ابن مریم نہیں ہیں، ان کا تو انتقال ہوچکا۔ اب جس کے آنے کی خبر احادیث میں دی گئی ہے وہ مثیلِ مسیح، یعنی حضرت عیسیٰؑ کے مانند ایک مسیح ہے اور وہ فلاں شخص ہے، جو آچکا ہے۔ اس کا ماننا عقیدۂ ختم نبوت کے خلاف نہیں ہے۔

اس فریب کا پردہ چاک کرنے کے لیے ہم یہاں پورے حوالوں کے ساتھ وہ مستند روایات نقل کیے دیتے ہیں۔ جو اس مسئلے کے متعلق حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان احادیث کو دیکھ کر ہر شخص خود معلوم کرسکتا ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے کیا فرمایا تھا اور آج اسے کیا بنایا جارہا ہے۔

1- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، ضرور اتریں گے تمھارے درمیان ابن مریم حاکم عادل بن کر پھر وہ صلیب کو توڑ ڈالیں گے، اور خنزیر کو ہلاک کردیں گے اور جنگ کا خاتمہ کردیں گے۔ صلیب کو توڑ ڈالنے اور خنزیر کو ہلاک کردینے کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت ایک الگ دین کی حیثیت سے ختم ہوجائے گی۔ دین عیسوی کی پوری عمارت اس عقیدے پر قائم ہے کہ خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے (یعنی حضرت عیسیٰ) کو صلیب پر ''لعنت'' کی موت دی جس سے وہ انسان کے گناہ کا کفارہ بن گیا۔ اور انبیا کی اُمتوں کے درمیان عیسائیوں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے صرف عقیدے کو لے کر خدا کی پوری شریعت رد کردی۔ خنزیر تک کو حلال کرلیا جو تمام انبیا کی شریعتوں میں حرام رہا ہے۔ پس جب حضرت عیسیٰؑ آکر خود اعلان کردیں گے کہ نہ میں خدا کا بیٹا ہوں نہ مَیں نے صلیب پر جان دی، نہ میں کسی کے گناہ کا کفارہ بنا تو عیسائی عقیدے کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی باقی نہ رہے گی۔ اسی طرح جب وہ بتائیں گے کہ مَیں نے تو نہ اپنے پیروؤں کے لیے سؤر حلال کیا تھا اور نہ انھیں شریعت کی پابندی سے آزاد ٹھہرایا تھا تو عیسائیت کی دوسری امتیازی خصوصیت کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔

دوسری روایت میں حرب کے بجائے جزیہ کا لفظ ہے، یعنی جزیہ ختم کردیں گے اور مال کی وہ کثرت ہوگی کہ اس کا قبول کرنے والا کوئی نہ رہے گا، اور (حالت یہ ہو جائے گی کہ لوگوں کے نزدیک خدا کے حضور) ایک سجدہ کرلینا دنیا و مافیہا سے بہتر ہوگا۔'' (بخاری، کتاب احادیث الانبیا باب نزول عیسیٰ ابن مریم، مسلم، باب بیان نزول عیسیٰؑ۔ ترمذی ابواب الفتن، باب فی نزول عیسیٰ مسند احمد، مرویات ابوہریرہؓ)

دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ملتوں کے اختلافات ختم ہوکر سب لوگ ایک ملتِ اسلام میں شامل ہوجائیں گے اور اس طرح نہ جنگ ہوگی اور نہ کسی پر جزیہ عائد کیا جائے گا۔ اسی بات پر آگے احادیث نمبر 15,5 دلالت کررہی ہیں۔

2- ایک اور روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ان الفاظ میں ہے کہ: لا تقوم الساعة حتّى نزل ابن مريم ''قیامت قائم نہ ہوگی جب تک نازل نہ ہولیں عیسیٰ ابن مریم۔'' اور اس کے بعد وہی مضمون ہے جو اوپر کی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ (بخاری کتاب المظالم باب كسر الصليب۔ ابن ماجة كتاب الفتن باب فتنة الدجال)

3- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: کیسے ہوگے تم جب کہ تمھارے درمیان ابن مریم اُتریں گے اور تمھارا امام اس وقت خود تم میں سے ہوگا۔'' (بخاری کتاب احادیث الانبیا باب نزول عیسیٰ، مسلم، بیان نزول عیسیٰؑ مسند احمد مرویات ابی ہریرہؓ)

یعنی نماز میں حضرت عیسیٰؑ امامت نہیں کرائیں گے بلکہ مسلمانوں کا جو امام پہلے سے ہوگا اسی کے پیچھے وہ نماز پڑھیں گے۔

4- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: عیسیٰؑ ابن مریم نازل ہوں گے۔ پھر وہ خنزیر کو قتل کریں گے اور صلیب کو مٹادیں گے اور ان کے لیے نماز جمع کی جائے گی اور وہ اتنا مال تقسیم کریں گے کہ اسے قبول کرنے والا کوئی نہ ہوگا اور

خراج ساقط کردیں گے اور روحا کے مقام (مدینہ منورہ سے 35 میل کے فاصلے پر ایک مقام) پر منزل کر کے وہاں سے حج یا عمرہ کریں گے، یا دونوں کو جمع کریں گے۔ راوی کو شک ہے کہ حضورؐ نے ان میں سے کون سی بات فرمائی تھی۔ (مسند احمد، بسلسله مرویات ابی هریرۃؓ۔ مسلم کتاب الحج باب جواز التمتع فی الحج والقرآن) (واضح رہے کہ اس زمانے میں جن صاحب کو مثیل مسیح قرار دیا گیا ہے، انھوں نے اپنی زندگی میں حج کیا اور نہ عمرہ)

5- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے (دجال کے خروج کا ذکر کرنے کے بعد حضور اکرمؐ نے فرمایا) اس اثنا میں کہ مسلمان اس سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ صفیں باندھ رہے ہوں گے اور نماز کے لیے تکبیر اقامت کہی جا چکی ہوگی کہ عیسیٰ ابن مریم نازل ہو جائیں گے اور نماز میں مسلمانوں کی امامت کریں گے اور اللہ کا دشمن (یعنی دجال) انھیں دیکھتے ہی اس طرح گھلنے لگے گا، جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ اگر عیسیٰ اسے اس کے حال ہی پر چھوڑ دیں تو وہ آپ ہی گھل کر مرجائے، مگر اللہ اسے ان کے ہاتھ سے قتل کرائے گا اور وہ اپنے نیزے میں اس کا خون مسلمانوں کو دکھائیں گے۔ (مشکوٰۃ کتاب الفتن، باب الملاحم، بحواله مسلم)

6- ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا: میرے اور ان (یعنی عیسیٰؑ) کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے اور یہ کہ وہ اترنے والے ہیں، پس جب تم انھیں دیکھو تو پہچان لینا وہ ایک میانہ قد آدمی ہیں۔ رنگ مائل بہ سُرخی وسپیدی ہے، وہ زرد رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے۔ ان کے سر کے بال ایسے گویا اب ان سے پانی ٹپکنے والا ہے۔ حالانکہ وہ بھیگے ہوئے نہ ہوں گے۔ وہ اسلام پر لوگوں سے جنگ کریں گے۔ صلیب کو پاش پاش کر دیں گے۔۔۔ خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ جزیہ ختم کردیں گے اور اللہ ان کے زمانے میں اسلام کے سوا تمام ملتوں کو مٹا دے گا اور وہ مسیح دجال کو ہلاک کر دیں گے۔ اور زمین میں وہ چالیس سال ٹھہریں گے۔ پھر ان کا انتقال ہو جائے گا اور مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے۔ (ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال، مسند احمد، مرویات ابوہریرہؓ)

7- حضرت جابرؓ بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے سنا ہے کہ...... پھر عیسیٰؑ ابن مریم نازل ہوں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ آئیے، آپ نماز پڑھائیے۔ مگر وہ کہیں گے کہ نہیں۔ تم لوگ خود ہی ایک دوسرے کے امیر ہو۔ (یعنی تمھارا امیر تم ہی میں سے ہونا چاہیے) یہ وہ اس عزت کا لحاظ کرتے ہوئے کہیں گے جو اللہ نے اس اُمت کو دی ہے۔ (مسلم، بیان نزول عیسیٰؑ ابن مریم، مسند احمد بسلسله مرویات جابرؓ بن عبدالله)

8- جابرؓ بن عبداللہ (قصہ ابن صیاد کے سلسلہ میں) روایت کرتے ہیں کہ پھر عمرؓ بن خطاب نے عرض کیا، یا رسول اللہؐ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسے قتل کر دوں اس پر رسول خداؐ نے فرمایا کہ اگر یہ وہی شخص (یعنی دجال) ہے تو اس کے قتل کرنے والے تم نہیں ہو۔ بلکہ اسے تو عیسیٰؑ ابن مریم ہی قتل کریں گے اور اگر یہ وہ شخص نہیں ہے تو تمھیں اہل عہد (یعنی ذمیوں) میں سے ایک آدمی کو قتل کر دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ (مشکوٰۃ، کتاب الفتن، باب قصه ابن صیاد، بحواله شرح السنه بغوی)

9- جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ (دجال کا قصہ بیان کرتے ہوئے نبیؐ نے فرمایا) اس وقت یکا یک عیسیٰؑ ابن مریم مسلمانوں کے درمیان آ جائیں گے۔ پھر نماز کھڑی ہوگی اور ان سے کہا جائے گا کہ اے روح اللہ، آگے بڑھیے مگر وہ کہیں گے کہ نہیں تمھارے امام ہی کو آگے بڑھنا چاہیے، وہی نماز پڑھائے۔ پھر صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمان دجال کے مقابلے پر نکلیں گے جب وہ کذاب حضرت عیسیٰؑ کو دیکھے گا تو گھلنے لگے گا۔ جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھیں گے اور اسے قتل کر دیں گے اور حالت یہ ہوگی کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے کہ اے روح اللہ! یہ یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ دجال کے پیروؤں میں سے کوئی نہ بچے گا۔ جسے وہ (یعنی عیسیٰؑ) قتل نہ کر دیں۔ (مسند احمد، بسلسله روایات جابرؓ بن عبدالله)

10- حضرت نواس بن سمعان کلابی (قصہ دجال بیان کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ اس اثنا میں کہ دجال یہ کچھ کر رہا ہوگا، اللہ تعالیٰ مسیح ابن مریم کو بھیج دے گا۔ اور وہ دمشق کے مشرقی حصے میں، سفید مینار کے پاس زرد رنگ کے دو کپڑے پہنے ہوئے، دو فرشتوں کے بازوؤں پر ہاتھ رکھے ہوئے اُتریں گے۔ جب وہ سر جھکائیں گے، تو ایسا محسوس ہوگا کہ قطرے ٹپک رہے ہیں، اور جب سر اٹھائیں گے تو موتی کی طرح قطرے ڈھلکتے نظر آئیں گے۔ ان کے سانس کی ہوا جس کافر تک پہنچے گی، اور وہ ان کی حد نظر تک جائے گی۔ وہ زندہ نہ بچے گا۔ پھر ابن مریم دجال کا پیچھا کریں گے اور لُد کے دروازے پر جا پکڑیں گے اور قتل کر دیں گے۔ (مسلم ذکر الدجال، ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب خروج الدجال، ترمذی، ابواب الفتن باب فی فتنته الدجال، ابن ماجه کتاب الفتن، باب فتنته الدجال)

(واضح رہے کہ لُد LYDDA اسرائیل کے دارالسلطنت تل ابیب سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے اور یہودیوں نے وہاں بہت بڑا ہوائی اڈا بنا رکھا ہے)

11- عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: دجال میری امت میں نکلے گا اور چالیس (میں نہیں جانتا چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کا اپنا قول ہے) رہے گا۔ پھر اللہ عیسیٰؑ ابن مریم کو بھیجے گا۔ ان کا حلیہ عروہؓ بن (مسعود ایک صحابی) سے مشابہ ہوگا۔ عیسیٰؑ اس کا پیچھا کریں گے اور اسے ہلاک کر دیں گے کہ دو آدمیوں کے درمیان بھی عداوت نہ ہوگی۔

(مسلم، ذکر الدجال)

12- حذیفہ بن اسید الغفاری کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیؐ ہماری مجلس میں تشریف لائے اور ہم آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ آپؐ نے پوچھا کیا بات ہو رہی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا، ہم قیامت کا ذکر کر رہے تھے۔ فرمایا وہ ہرگز قائم نہ ہوگی، جب تک اس سے پہلے دس نشانیاں ظاہر نہ ہو جائیں۔ پھر آپؐ نے وہ دس نشانیاں یہ بتائیں 1- دھواں 2- دجال 3- دابۃ الارض 4- سورج کا مغرب سے طلوع ہونا 5- عیسیٰؑ ابن

مریم کا نزول 6- یاجوج و ماجوج 7- تین بڑے خسف (زمین دھنس جانا) ایک مشرق میں 8- دوسرا مغرب میں 9- تیسرا جزیرۃ العرب میں 10- سب سے آخر میں ایک زبردست آگ، جو یمن سے اٹھے گی اور لوگوں کو ہانکتی ہوئی محشر کی طرف لے جائے گی۔ (مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعہ۔ ابو دائود، کتاب الملاحم، باب امارات الساعہ)

13- نبی ﷺ کے آزاد کردہ غلام ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور پاکؐ نے فرمایا: ''میری امت کے دو لشکر ایسے ہیں جنھیں اللہ نے دوزخ کی آگ سے بچا لیا، ایک وہ لشکر جو ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ دوسرا وہ جو عیسیٰؑ ابن مریم کے ساتھ ہوگا۔''
(نسائی، کتاب الجهاد، مسند احمد، بسلسلہ روایات ثوبان)

14- مجمع بن جاریۂ انصاری کہتے ہیں، مَیں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ ابن مریم دجال کو لُد کے دروازے پر قتل کریں گے۔ (مسند احمد۔ ترمذی۔ ابواب الفتن)

15- ابو امامہ باہلی (ایک طویل حدیث میں دجال کا ذکر کرتے ہوئے) روایت کرتے ہیں کہ عین اس وقت جب مسلمانوں کا امام صبح کی نماز پڑھنے کے لیے آگے بڑھ چکا ہوگا۔ عیسیٰ ابن مریم ان پر اُتر آئیں گے۔ امام پیچھے پلٹے گا تا کہ عیسیٰؑ آگے بڑھیں۔ مگر عیسیٰؑ اس کے شانوں کے درمیان ہاتھ رکھ کر کہیں گے کہ نہیں، تم ہی نماز پڑھاؤ، کیوں کہ یہ تمھارے لیے کھڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ وہی نماز پڑھائے گا۔ سلام پھیرنے کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کہیں گے کہ دروازہ کھولو، چنانچہ وہ کھولا جائے گا۔ باہر دجال 70 ہزار مسلح یہودیوں کے ساتھ موجود ہوگا۔ جوں ہی عیسیٰ علیہ السلام پر اس کی نظر پڑے گی وہ اس طرح گھلنے لگے گا، جیسے نمک پانی میں گھلتا ہے اور وہ بھاگ نکلے گا۔ عیسیٰؑ کہیں گے۔ میرے پاس تیرے لیے ایک ایسی ضرب ہے جس سے تو بچ کر نہ جا سکے گا۔ پھر وہ اسے لد کے مشرقی دروازے پر جالیں گے اور یہودیوں کو ہرا دے گا۔۔۔ اور زمین مسلمانوں سے اس طرح بھر جائے گی جیسے برتن پانی سے بھر جائے۔ سب دنیا کا کلمہ ایک ہوجائے گا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہوگی۔ (ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب فتنتہ الدجال)

16- عثمان بن ابی العاص کہتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا ہے ۔۔۔ اور عیسیٰؑ ابن مریم فجر کی نماز کے وقت اُتریں گے۔ مسلمانوں کا امیر ان سے کہے گا کہ اے روح اللہ! آپ نماز پڑھائیے وہ جواب دیں گے کہ اُس امت کے لوگ خود ہی ایک دوسرے پر امیر ہیں۔ تب مسلمانوں کا امیر آگے بڑھ کر نماز پڑھائے گا۔ پھر نماز سے فارغ ہو کر عیسیٰؑ اپنا حربہ لے کر دجال کی طرف چلیں گے۔ وہ جب انھیں دیکھے گا تو اس طرح پگھلے گا، جیسے سیسہ پگھلتا ہے۔ عیسیٰؑ اپنے حربے سے اسے ہلاک کر دیں گے اور اس کے ساتھی شکست کھا کر بھاگیں گے۔ مگر کہیں انھیں چھپنے کو جگہ نہ ملے گی، حتّٰی کہ درخت پکاریں گے اے مومن، یہ کافر یہاں موجود ہے۔ اور پتھر پکاریں گے کہ اے مومن، یہ کافر یہاں ہے۔ (مسند احمد طبرانی۔ حاکم)

17- سمرہ بن جندبؓ (ایک طویل حدیث میں) نبیؐ سے روایت کرتے ہیں، پھر صبح کے وقت مسلمانوں کے درمیان عیسیٰؑ ابن مریم آ جائیں گے اور اللہ، دجال اور اس کے لشکروں کو شکست دے گا۔ یہاں تک کہ دیواریں اور درختوں کی جڑیں پکار اٹھیں گی کہ اے مومن یہ کافر میرے پیچھے چھپا ہوا ہے آ اور اسے قتل کر۔
(مسند احمد، حاکم)

18- عمرانؓ بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا موجود رہے گا۔ جو حق پر قائم اور مخالفین پر بھاری ہوگا۔ یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ آ جائے اور عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہو جائیں۔
(مسند احمد)

19- حضرت عائشہؓ (دجال کے قصے میں) روایت کرتی ہیں پھر عیسیٰ علیہ السلام اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ اس کے بعد عیسیٰ علیہ السلام چالیس سال تک زمین میں ایک عام عادل اور حاکم منصف کی حیثیت سے رہیں گے۔ (مسند احمد)

20- رسول اللہؐ کے آزاد کردہ غلام سفینہ (دجال کے قصے میں روایت کرتے ہیں) عیسیٰؑ نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ دجال کو افیق کی گھاٹی کے قریب ہلاک کر دے گا۔ (مسند احمد) (افیق، جسے آج کل فیق کہتے ہیں، شام اور اسرائیل کی سرحد پر موجودہ ریاست شام کا آخری شہر ہے، اس کے آگے مغرب کی جانب چند میل کے فاصلہ پر طبریہ نامی جھیل ہے جس میں سے دریائے اردن نکلتا ہے اور اس کے جنوب مغرب کی طرف پہاڑوں کے درمیان ایک نشیبی راستہ ہے، جو تقریباً ڈیڑھ دو ہزار فٹ تک گہرائی میں اتر کر اس مقام پر پہنچتا ہے، جہاں سے دریائے اردن طبریہ میں سے نکلتا ہے۔ اسی پہاڑی راستے کو عقبہ افیق یعنی افیق کی گھاٹی کہتے ہیں)

21- حضرت حذیفہ بن یمان (دجال کا ذکر کرتے ہوئے) بیان کرتے ہیں، پھر جب مسلمان نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں گے تو ان کی آنکھوں کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام ابن مریم اُتریں گے اور وہ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں گے پھر سلام پھیرنے کے بعد لوگوں سے کہیں گے کہ میرے اور اس دشمنِ خدا کے درمیان سے ہٹ جاؤ...... اور اللہ دجال کے ساتھیوں پر مسلمانوں کو مسلط کر دے گا اور مسلمان انھیں خوب ماریں گے، یہاں تک کہ درخت اور پتھر پکار اٹھیں گے۔ اے عبداللہ، اے عبدالرحمٰن، اے مسلمان، یہ رہا ایک یہودی مار و اسے۔ اس طرح اللہ انھیں فنا کر دے گا۔ اور مسلمان غالب ہوں گے۔ اور صلیب توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے۔ اور جزیہ ساقط کر دیں گے۔ (مستدرک حاکم۔ مسلم میں بھی یہ روایت اختصار کے ساتھ آئی ہے۔ اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری جلد 6 ص 45 میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔)

یہ 21 روایات ہیں جو 14 صحابیوں سے صحیح سندوں کے ساتھ حدیث کی معتبر ترین کتابوں میں وارد ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کے علاوہ دوسری، بہت سی احادیث میں بھی یہ ذکر آیا ہے، لیکن طول کلام سے بچنے کے لیے ہم نے ان سب کو نقل نہیں کیا ہے، بلکہ صرف وہ روایتیں لے لی ہیں جو سند کے لحاظ سے قوی تر ہیں۔

ان احادیث سے کیا ثابت ہوتا ہے

جو شخص بھی ان احادیث کو پڑھے گا، وہ خود دیکھ لے گا کہ ان میں کسی ''مسیح موعود'' یا ''مثیل مسیح'' یا ''بروز مسیح'' کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے نہ ان میں اس امر کی کوئی گنجائش ہے کہ کوئی شخص اس زمانے میں کسی ماں کے پیٹ اور کسی باپ کے نطفے سے پیدا ہو کر یہ دعویٰ کر دے کہ میں ہی وہ مسیح ہوں، جس کے آنے کی سیدنا محمدؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔ یہ تمام حدیثیں صاف اور صریح الفاظ میں ان عیسیٰ علیہ السلام کے نازل ہونے کی خبر دے رہی ہیں، جو اب سے دو ہزار سال پہلے باپ کے بغیر حضرت مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ اس مقام پر یہ بحث چھیڑنا بالکل لا حاصل ہے کہ وہ وفات پا چکے ہیں یا زندہ کہیں موجود ہیں۔ بالفرض وہ وفات ہی پا چکے ہوں تو اللہ انھیں زندہ کر کے اٹھالانے پر قادر ہے۔ جو لوگ اس بات کا انکار کرتے ہیں انھیں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 259...... فرما لینی چاہیے جس میں اللہ تعالیٰ صاف فرماتا ہے کہ اس نے اپنے ایک بندے کو 100 برس تک مُردہ رکھا اور پھر زندہ کر دیا۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ .... ورنہ یہ بات بھی اللہ کی قدرت سے ہرگز بعید نہیں ہے۔ کہ وہ اپنے کسی بندے کو اپنی کائنات میں کہیں ہزارہا سال تک زندہ رکھے اور جب چاہے، دنیا میں واپس لے آئے۔ بہر حال اگر کوئی شخص حدیث کو نہ مانتا ہو تو وہ سرے سے کسی آنے والے کی آمد کا قائل ہی نہیں ہو سکتا کیوں کہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ احادیث کے سوا کسی اور چیز پر مبنی نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک عجیب مذاق ہے کہ آنے والے کی آمد کا عقیدہ تو لے لیا جائے احادیث سے اور پھر انھی احادیث کی اس تصریح کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ آنے والے عیسیٰ ابن مریم ہوں گے۔ نہ کہ کوئی مثیل مسیح۔

دوسری بات جو اتنی ہی وضاحت کے ساتھ ان احادیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ کا یہ دوبارہ نزول نبی ہو کر آنے والے شخص کی حیثیت سے نہیں ہوگا، نہ ان پر وحی نازل ہوگی۔ نہ وہ خدا کی طرف سے کوئی نیا پیغام یا نئے احکام لائیں گے۔ نہ وہ شریعتِ محمدیؐ میں کوئی اضافہ یا کوئی کمی کریں گے، نہ اُنھیں تجدید دین کے لیے دنیا میں لایا جائے گا، نہ وہ آ کر لوگوں کو اپنے ماننے والوں کی ایک الگ اُمت بنائیں گے۔ وہ صرف ایک کارِ خاص کے لیے بھیجے جائیں گے اور وہ یہ ہوگا کہ دجال کے فتنے کا خاتمہ کر دیں۔ اس غرض کے لیے وہ ایسے طریقے سے نازل ہوں گے کہ جن مسلمانوں کے درمیان ان کا نزول ہوگا وہ کہیں گے کہ یہ عیسیٰ ابن مریمؑ ہی ہیں، جو رسول اللہؐ کی پیشگوئیوں کے مطابق ٹھیک وقت پر تشریف لائے ہیں۔ وہ آ کر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جائیں گے۔ جو بھی مسلمانوں کا امام اس وقت ہو گا۔ اسی کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ اور جو بھی اس وقت مسلمانوں کا امیر ہوگا، اسے آگے رکھیں گے تا کہ اس شبہ کی کوئی ادنیٰ سی گنجائش بھی نہ رہے کہ وہ اپنی سابقہ پیغمبرانہ حیثیت کی طرح اب پھر پیغمبری کے فرائض انجام دینے کے لیے واپس آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی جماعت میں اگر خدا کا پیغمبر موجود ہو تو نہ اس کا کوئی امام دوسرا شخص ہو سکتا ہے اور نہ امیر۔ پس جب وہ مسلمانوں کی جماعت میں آ کر محض ایک فرد کی حیثیت سے شامل ہوں گے تو یہ گویا خود بخود اس امر کا اعلان ہوگا کہ وہ پیغمبر کی حیثیت سے تشریف نہیں لائے ہیں اور اس بنا پر ان کی آمد سے مہر نبوت کے ٹوٹنے کا قطعاً کوئی سوال پیدا نہ ہوگا۔

علمائے اسلام نے اس مسئلے کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ علامہ تفتازانی (722ھ۔792ھ) شرح عقائد نسفی میں لکھتے ہیں، یہ ثابت ہے کہ محمدؐ آخری نبی ہیں۔ اگر کہا جائے کہ آپؐ کے بعد عیسیٰؑ کے نزول کا ذکر احادیث میں آیا ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ ہاں آیا ہے۔ مگر وہ محمدؐ کے تابع ہوں گے، کیوں کہ ان کی شریعت تو منسوخ ہو چکی ہے۔ اس لیے نہ ان کی طرف وحی ہوگی اور نہ وہ احکام مقرر کریں گے، بلکہ وہ رسول اللہؐ کے نائب کی حیثیت سے کام کریں گے۔

حضرت عیسیٰؑ کا آنا بلا تشبیہ اس نوعیت کا ہوگا، جیسے ایک صدر ریاست کے دور میں کوئی سابق صدر آئے اور وقت کے صدر کی ماتحتی میں مملکت کی کوئی خدمت انجام دے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی بھی یہ بات بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ ایک صدر کے دور میں کسی سابق صدر کے محض آ جانے سے آئین نہیں ٹوٹتا۔ البتہ دو صورتوں میں آئین کی خلاف ورزی لازم آتی ہے۔ ایک یہ کہ سابق صدر آ کر پھر سے فرائض صدارت سنبھالنے کی کوشش کرے۔ دوسرے یہ کہ کوئی شخص اس کی سابق صدارت کا بھی انکار کر دے۔ کیوں کہ یہ ان تمام کاموں کے لیے جواز کو چیلنج کرنے کا ہم معنی ہوگا جو اس کے دورِ صدارت میں انجام پائے تھے۔ ان دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی نہ ہو تو بجائے خود سابق صدر کی آمد آئینی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ یہی معاملہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی کا بھی ہے کہ ان کے محض آ جانے سے ختم نبوت نہیں ٹوٹتی۔ البتہ اگر وہ آ کر پھر نبوت کا منصب سنبھال لیں اور فرائض نبوت انجام دینا شروع کر دیں، یا کوئی شخص ان کی سابق نبوت کا بھی انکار کر دے تو اس سے اللہ تعالیٰ کے آئینِ نبوت کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ احادیث نے پوری وضاحت کے ساتھ دونوں صورتوں کا سدباب کر دیا ہے ایک طرف وہ تصریح کرتی ہیں کہ محمدؐ کے بعد کوئی نبوت نہیں ہے۔ اور دوسری طرف وہ خبر دیتی ہیں کہ عیسیٰؑ ابنِ مریم دوبارہ نازل ہوں گے۔ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی یہ آمدِ ثانی منصبِ نبوت کے فرائض انجام دینے کے لیے نہ ہوگی۔ اسی طرح ان کی آمد سے مسلمانوں کے اندر کفر و ایمان کا بھی کوئی نیا سوال پیدا نہ ہوگا۔ ان کی سابقہ نبوت پر تو آج بھی اگر کوئی ایمان نہ لائے تو کافر ہو جائے۔ حضرت محمدؐ خود ان کی اس نبوت پر ایمان رکھتے تھے۔ اور آپؐ کی ساری اُمت ابتدا سے حضرت عیسیٰؑ کی نبوت پر ایمان رکھتی ہے۔ یہی حیثیت اس وقت بھی ہوگی۔ مسلمان کسی تازہ نبوت پر ایمان نہ لائیں گے بلکہ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کی سابقہ نبوت پر ایمان رکھیں گے، جس طرح آج رکھتے ہیں۔ یہ چیز نہ آج ختم نبوت کے خلاف ہے نہ اس وقت ہوگی۔

آخری بات جو ان احادیث سے اور بکثرت دوسری احادیث سے بھی معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دجال، جس کے فتنہ عظیم کا خاتمہ کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ ابن مریم

علیہ السلام کو بھیجا جائے گا، یہودیوں میں سے ہوگا اور اپنے آپ کو ''مسیح'' کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ اس معاملے کی حقیقت کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا، جب تک وہ یہودیوں کی تاریخ اور ان کے مذہبی تصورات سے واقف نہ ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل پے درپے تنزل کی حالت میں مبتلا ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آخرکار بابل اور اسیریا کی سلطنتوں نے انھیں غلام بنا کر زمین میں تتر بتر کر دیا تو انبیائے بنی اسرائیل نے انھیں خوش خبری دینا شروع کی کہ خدا کی طرف سے ایک مسیح آنے والا ہے جو انھیں ذلت سے نجات دلائے گا۔ ان پیشگوئیوں کی بنا پر یہودی ایک مسیح کی آمد کے متوقع تھے جو بادشاہ ہو، لڑ کر ملک فتح کرے۔ بنی اسرائیل کو ملک ملک سے لا کر فلسطین میں جمع کر دے اور ان کی ایک زبردست سلطنت قائم کر دے۔ لیکن ان کی ان توقعات کے خلاف جب حضرت عیسیٰؑ ابن مریم خدا کی طرف سے مسیح ہو کر آئے اور کوئی لشکر ساتھ نہ لائے تو یہودیوں نے ان کی مسیحیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور انھیں ہلاک کرنے کے درپے ہو گئے۔ اس وقت سے آج تک دنیا بھر کے یہودی اس مسیح موعود کے منتظر ہیں جس کے آنے کی خوش خبریاں انھیں دی گئی تھیں۔ ان کا لٹریچر اس آنے والے دور کے سہانے خوابوں سے بھرا پڑا ہے۔ تلمود اور ربیوں کے ادبیات میں اس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے، اس کی خیالی لذت کے سہارے صدیوں سے یہودی جی رہے ہیں اور یہ امید لیے بیٹھے ہیں کہ یہ مسیح موعود ایک زبردست جنگی و سیاسی لیڈر ہوگا جو دریائے نیل سے دریائے فرات تک کا علاقہ (جسے یہودی اپنی میراث کا ملک سمجھتے ہیں) انھیں واپس دلائے گا اور دنیا کے گوشے گوشے سے یہودیوں کو لا کر اس ملک میں پھر سے جمع کر دے گا۔

اب اگر کوئی شخص مشرق وسطیٰ کے حالات پر ایک نگاہ ڈالے اور نبیؐ کی پیشگوئیوں کے پس منظر میں انھیں دیکھے تو وہ فوراً یہ محسوس کرے گا کہ اس دجال اکبر کے ظہور کے لیے اسٹیج بالکل تیار ہو چکا ہے جو حضور پاکؐ کی دی ہوئی خبروں کے مطابق یہودیوں کا مسیح موعود بن کر اٹھے گا۔ فلسطین کے بڑے حصے سے مسلمان بے دخل کیے جا چکے ہیں اور وہاں اسرائیل کے نام سے ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی ہے۔ اس ریاست میں دنیا بھر کے یہودی کھنچ کھنچ کر چلے آ رہے ہیں۔ امریکہ، برطانیہ اور فرانس نے اسے ایک زبردست جنگی طاقت بنا دیا ہے۔ یہودی سرمائے کی بے پایاں امداد سے یہودی سائنسدان اور ماہرینِ فنون اسے روز افزوں ترقی دیتے چلے جا رہے ہیں اور اس کی یہ طاقت گرد و پیش کی مسلمان قوموں کے لیے ایک خطرہ عظیم بن گئی ہے۔ اس ریاست کے لیڈروں نے اپنی اس تمنا کو کچھ چھپا کر نہیں رکھا کہ وہ اپنی ''میراث کا ملک'' حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مستقبل کی یہودی سلطنت کا جو نقشہ وہ ایک مدت سے کھلم کھلا شائع کر رہے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پورا شام، پورا لبنان، پورا اردن اور تقریباً سارا عراق لینے کے علاوہ ترکی سے اسکندریہ، مصر سے سینا اور ڈیلٹا کا علاقہ، سعودی عرب سے بالائی حجاز و نجد کا علاقہ لینا چاہتے ہیں، جس میں مدینہ منورہ بھی شامل ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے صاف محسوس ہوتا ہے کہ آئندہ کسی عالم گیر جنگ کی ہڑبونگ سے فائدہ اٹھا کر وہ ان علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے اور ٹھیک اس موقع پر وہ دجال اکبر ان کا مسیح موعود بن کر اٹھے گا، جس کے ظہور کی خبر دینے ہی پر نبیؐ نے اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں پر مصائب کے ایسے پہاڑ ٹوٹیں گے کہ ایک دن ایک سال کے برابر محسوس ہوگا۔ اسی بنا پر آپؐ فتنہ دجال مسیح سے خود بھی خدا کی پناہ مانگتے تھے اور اپنی امت کو بھی پناہ مانگنے کی تلقین فرماتے تھے۔

اس مسیح دجال کا مقابلہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کسی مثیل مسیح کو نہیں، بلکہ اس اصلی مسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو نازل فرمائے گا، جسے دو ہزار برس پہلے یہودیوں نے ماننے سے انکار کر دیا تھا اور جسے وہ اپنی دانست میں صلیب پر چڑھا کر ٹھکانے لگا چکے تھے۔ اس حقیقی مسیح کے نزول کی جگہ ہندوستان یا افریقہ یا امریکہ میں نہیں، بلکہ دمشق میں ہوگی کیوں کہ یہی مقام اس وقت عین محاذ جنگ ہوگا۔ اسرائیل کی سرحد سے دمشق بمشکل پچاس ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ پہلے جو احادیث ہم نقل کر آئے ہیں، ان کا مضمون اگر آپ کو یاد ہے تو آپ کو یہ سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی کہ مسیح دجال ستر ہزار یہودیوں کا لشکر لے کر شام میں گھسے گا اور دمشق کے سامنے جا پہنچے گا۔ ٹھیک اس نازک موقع پر دمشق کے مشرقی حصے میں ایک سفید مینار کے قریب حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام صبح دم نازل ہوں گے اور نماز فجر کے بعد مسلمانوں کو اس کے مقابلے پر لے کر نکلیں گے۔ ان کے حملے سے دجال پسپا ہو کر افیق کی گھاٹی سے اسرائیل کی طرف پلٹے گا اور وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ آخر لد کے ہوائی اڈے پر پہنچ کر وہ ان کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ (حدیث نمبر 15,14,10) اس کے بعد یہودی چن چن کر قتل کیے جائیں گے اور ملت یہود کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (احادیث نمبر 21,15,9) اور تمام ملتیں ایک ہی ملت مسلمہ میں ضم ہو جائیں گی (حدیث نمبر 15,6)

یہ ہے وہ حقیقت جو کسی شک و شبے اور الجھن کے بغیر احادیث میں صاف نظر آتی ہے۔ اس کے بعد اس امر میں کیا شک باقی رہ جاتا ہے کہ ''مسیح موعود'' کے نام سے جو کاروبار ہمارے ملک میں پھیلایا گیا ہے وہ ایک جعل سازی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔

اس جعل سازی کا سب سے زیادہ مضحکہ خیز پہلو یہ ہے کہ جو صاحب اپنے آپ کو ان پیش گوئیوں کا صداق قرار دیتے ہیں، انھوں نے خود عیسیٰ ابنِ مریمؑ بننے کے لیے یہ دل چسپ تاویل فرمائی ہے:

''اس نے (یعنی اللہ تعالیٰ نے) براہین احمدیہ کے تیسرے حصے میں میرا نام مریم رکھا۔ پھر جیسا کہ براہین احمدیہ سے ظاہر ہے، دو برس تک صفت مریمیت میں مَیں نے پرورش پائی۔۔۔ پھر۔۔۔ مریمؑ کی طرح عیسیٰ کی رُوح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارے کے رنگ میں مجھے حاملہ ٹھہرایا گیا اور آخر کئی ماہ بعد جو دس مہینے سے زیادہ نہیں بذریعہ اس الہام کے جو سب سے آخر براہینِ احمدیہ کے حصہ چہارم میں درج ہے، مجھے مریمؑ سے عیسیٰؑ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابن مریم ٹھہرا۔

(کشتی نوح۔ ص 89,88,87)

یعنی پہلے مریم بنے، پھر خود ہی حاملہ ہوئے، پھر اپنے پیٹ سے آپ عیسیٰ ابن مریم بن کر تولد ہو گئے، اس کے بعد یہ مشکل پیش آئی کہ عیسیٰؑ ابن مریم کا نزول تو احادیث کی رو سے دمشق میں ہونا تھا، جو کئی ہزار برس سے شام کا ایک مشہور و معروف مقام ہے۔ اور آج بھی دنیا کے نقشے پر اسی نام سے موجود ہے یہ مشکل ایک دوسری پر لطف تاویل سے یوں رفع کی گئی:

واضح ہو کہ دمشق کے لفظ کی تعبیر میں میرے پر من جانب اللہ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس جگہ ایسے قصبے کا نام دمشق رکھا گیا ہے جس میں ایسے لوگ رہتے ہیں، جو یزیدی الطبع اور پلید کی عادات اور خیالات کے پیرو ہیں۔۔۔ یہ قصبہ قادیان بوجہ اس کے کہ اکثر یزیدی الطبع لوگ اس میں سکونت رکھتے ہیں، دمشق سے ایک مشابہت اور مناسبت رکھتا ہے۔ (حاشیہ ازالہ اوہام ص 63 تا 73)

پھر ایک اور الجھن یہ باقی رہ گئی کہ احادیث کی رو سے ابن مریم کو ایک سفید منارہ کے پاس اترنا تھا۔ چنانچہ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ مسیح صاحب نے آ کر اپنا منارہ خود بنوا لیا۔ اب اسے کون دیکھتا ہے کہ احادیث کی رو سے منارہ وہاں ابن مریمؑ کے نزول سے پہلے موجود ہونا چاہیے تھا اور یہاں وہ مسیح موعود صاحب کی تشریف آوری کے بعد تعمیر کیا گیا۔

آخری اور زبردست الجھن یہ تھی کہ احادیث کی رُو سے تو عیسیٰؑ ابن مریم کو لد کے دروازے پر دجال کو قتل کرنا تھا۔ اس مشکل کو رفع کرنے کی فکر میں پہلے طرح طرح کی تاویلیں کی گئیں۔ کبھی تسلیم کیا گیا کہ لد بیت المقدس کے دیہات میں سے ایک گاؤں کا نام ہے (ازالہ اوہام، شائع کردہ انجمن احمدیہ لاہور، بہ تقطیع خورد ص 220) پھر کہا گیا کہ لد ان لوگوں کو کہتے ہیں جو بے جا جھگڑا کرنے والے ہوں۔ جب دجال کے بے جا جھگڑے کمال تک پہنچ جائیں گے، تب مسیح موعود ظہور کرے گا اور اس کے تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دے گا۔ (ازالہ اوہام ص 730) لیکن جب اس سے بھی بات نہ بنی تو صاف کہہ دیا گیا کہ لد سے مراد لدھیانہ ہے اور اس کے دروازے پر دجال کے قتل سے مراد یہ ہے کہ اشرار کی مخالفت کے باوجود وہیں سب سے پہلے مرزا صاحب کے ہاتھ پر بیعت ہوئی۔ (الہدیٰ: 91)

ان تاویلات کو جو شخص بھی کھلی آنکھوں سے دیکھے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹے بہروپ کا صریح ارتکاب ہے جو علی الاعلان کیا گیا ہے۔

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

ختم نبوت
(ایک غلط فہمی کا ازالہ)

یہ عقیدہ کہ دین مکمل ہو چکا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ خدا کے آخری پیغمبر اور خاتم النّبیین ہیں اور یہ کہ اسلام خدا کا آخری پیغام اور زندگی کا مکمل نظام ہے۔ ایک انعامِ خداوندی اور موہبت الٰہی تھا جسے خدا نے اس اُمت کے ساتھ مخصوص کیا۔ اسی لیے ایک یہودی عالم نے حضرت عمرؓ کے سامنے اس پر بڑے رشک اور حسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ قرآن کی ایک آیت ہے جسے آپ لوگ پڑھتے رہتے ہیں اگر وہ ہم یہودیوں کی کتاب میں نازل ہوتی اور ہم سے متعلق ہوتی تو ہم اس دن کو جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اپنا قومی تہوار اور یوم جشن بنا لیتے۔ اس کی مراد سورۂ مائدہ کی اسی آیت ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ سے تھی جس میں ختم نبوت اور تکمیل نعمت کا اعلان کیا گیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس نعمت کی جلالت وعظمت اور اس اعلان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا۔ صرف اتنا فرمایا کہ ہمیں کسی نئے یوم مسرت اور تہوار کی ضرورت نہیں۔ یہ آیت خود ایسے موقع پر نازل ہوئی ہے جو اسلام میں ایک عظیم الشان اجتماع اور عبادت کا دن ہے۔ اس موقع پر دو دو عیدیں جمع تھیں۔ یوم عرفہ (9 ذی الحجہ) اور روز جمعہ۔

ذہنی انتشار سے حفاظت

اس عقیدہ نے اسلام کو انتشار پیدا کرنے والی اور ملت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والی ان تحریکات اور دعوتوں کا شکار ہونے سے بچایا جو تاریخ اسلام کی طویل مدت اور عالم اسلام کے وسیع رقبہ میں وقتاً فوقتاً سر اٹھاتی رہیں۔ اسی عقیدہ کا فیض تھا کہ اسلام ان مدعیانِ نبوت اور محرفین اسلام کا بازیچۂ اطفال بننے سے محفوظ رہا جو تاریخ کے مختلف وقفوں اور عالم اسلام کے مختلف گوشوں میں پیدا ہوتے رہے۔ "ختم نبوتؐ" کے اسی حصار کے اندر یہ ملّت ان مدعیوں کی دست بُرد اور یورش سے محفوظ رہی جو اس کے ڈھانچے کو بدل کر ایک نیا ڈھانچا بنانا چاہتے تھے اور وہ ان تمام سازشوں اور خطرناک حملوں کا مقابلہ کر سکی جن سے کسی پیغمبر کی امّت اس سے پہلے محفوظ نہیں رہی اور اتنے طویل عرصہ تک اس کی دینی اور اعتقادی وحدت اور یکسانی قائم رہی۔ اگر یہ عقیدہ اور یہ حصار نہ ہوتا تو یہ امتِ واحدہ ایسی مختلف اور متعدد اُمتوں میں تقسیم ہو جاتی جن میں سے ہر امّت کا روحانی مرکز الگ ہوتا۔ علمی وتہذیبی سرچشمہ الگ ہوتا۔ ہر ایک کی الگ تاریخ ہوتی ہر ایک کے الگ اسلاف اور مذہبی پیشوا اور مقتدا ہوتے۔ ہر ایک کا الگ ماضی ہوتا۔

ختم نبوت کا زندگی اور تمدّن پر احسان

عقیدۂ ختم نبوت در حقیقت نوع انسانی کے لیے ایک شرف وامتیاز ہے۔ وہ اس بات کا اعلان ہے کہ نوعِ انسانی سنِ بلوغ کو پہنچ گئی ہے اور اس میں یہ لیاقت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ خدا کے آخری پیغام کو قبول کرے۔ اب انسانی معاشرے کو کسی نئی وحی کسی نئے آسمانی پیغام کی ضرورت نہیں۔ اس عقیدے سے انسان کے اندر خود اعتمادی کی روح پیدا ہوتی ہے۔ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکا ہے اور اب دنیا کو اس سے پیچھے جانے کی ضرورت نہیں۔ اب دنیا کوئی وحی کے لیے آسمان کی طرف دیکھنے کے بجائے خدا کی پیدا کی ہوئی طاقتوں سے فائدہ اٹھانے اور خدا کے نازل کیے ہوئے دین واخلاق کے بنیادی اصولوں پر زندگی کی تنظیم کے لیے زمین کی طرف اور

اپنی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے۔ عقیدہ ختم نبوت انسان کو پیچھے کی طرف لے جانے کے بجائے آگے کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ انسان کے سامنے اپنی طاقتوں کو صرف کرنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ وہ انسان کو اپنی جدوجہد کا حقیقی میدان اور رخ بتلاتا ہے۔ اگر ختم نبوت کا عقیدہ نہ ہوتو انسان ہمیشہ تذبذب اور بے اعتمادی کے عالم میں رہے گا۔ وہ ہمیشہ زمین کی طرف دیکھنے کے بجائے آسمان کی طرف دیکھے گا۔ وہ ہمیشہ اپنے مستقبل کی طرف سے غیر مطمئن اور متشکک رہے گا۔ اسے ہر مرتبہ ہر نیا شخص یہ بتلائے گا کہ گلشنِ انسانیت اور روضۂ آدم ابھی تک نامکمل تھا۔ اب وہ برگ و بار مکمل ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو مرزا غلام احمد صاحب کا شعر

میرے آنے سے ہوا کامل بجملہ برگ و بار
روضۂ آدم کہ تھا وہ نامکمل اب تلک

اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ جب اس وقت تک یہ نامکمل رہا تو آئندہ کی کیا ضمانت ہے۔ اس طرح وہ بجائے اس کی آبیاری اور اس کے پھلوں اور پھولوں سے متمتع ہونے کے نئے باغ بان کا منتظر رہے گا جو اسے برگ و بار سے مکمل کرے۔

ایک جسارت اور جدّت:

اسلام کے خلاف وقتاً فوقتاً جو تحریکیں اٹھیں۔ ان میں قادیانیت کو خاص امتیاز حاصل ہے وہ تحریکیں یا تو اسلام کے نظام حکومت کے خلاف تھیں یا شریعتِ اسلامی کے خلاف لیکن قادیانیت درحقیقت نبوت محمدی ﷺ کے خلاف ایک سازش ہے۔ وہ اسلام کی ابدیت اور امت کی وحدت کو چیلنج ہے۔ اس نے ختم نبوت سے انکار کر کے اس سرحدی خط کو بھی عبور کر لیا جو اس امت کو دوسری امتوں سے ممتاز و منفصل کرتا ہے اور جو کسی مملکت کی حدود کو حاضر کرنے کے لیے قائم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبالؒ نے اپنے ایک انگریزی مضمون میں جو ہندوستان کے اخبار اسٹیٹسمین میں شائع ہوا تھا۔ بڑی خوبی سے قادیانیت کی اس جسارت اور جدّت کو واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

''اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی الوہیّت پر ایمان، انبیا پر ایمان اور رسولِ اکرم ﷺ کی ختمِ رسالت پر ایمان، دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملّتِ اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔ مثلاً برہمو سماج خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسولِ کریم ﷺ کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انھیں ملتِ اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیا کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کوئی اسلامی فرقہ اس حدِ فاصل کو عبور کرنے کی جسارت نہیں کر سکا۔ ایران میں بہائیوں نے ختمِ نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلایا لیکن ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ الگ جماعت ہیں اور مسلمانوں میں شامل نہیں ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم ﷺ کی شخصیت کا مرہونِ منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں یا ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول کر لیں۔ ان کی جدید تاویلیں محض اس غرض سے ہیں کہ ان کا شمار حلقۂ اسلام میں ہوتا کہ انھیں سیاسی فوائد پہنچ سکیں۔'' (حرف اقبال صفحہ 136 تا 137)

علامہ اقبالؒ ایک دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں:

''مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔ چنانچہ ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنائے نبوت پر رکھے اور بزعمِ خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے، مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختمِ نبوت ہی سے استوار ہوتی ہے۔''

علامہ آگے چل کر لکھتے ہیں

''یہ ظاہر ہے کہ اسلام جو تمام جماعتوں کو ایک رسی میں پرونے کا دعویٰ رکھتا ہے ایسی تحریک کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھ سکتا جو اس کی موجودہ وحدت کے لیے خطرہ ہو اور مستقبل میں انسانی سوسائٹی کے لیے مزید افتراق کا باعث بنے۔''

(قادیانی اور جمہور مسلمان۔ حرف اقبال صفحہ 122، 123)

دعویدارانِ نبوت

مرزا غلام احمد صاحب کی جدوجہد اور تحریک کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ نبوت کی حرمت و عظمت اور اس منصب کی آبرو اور شرف اٹھ جائے۔ انھوں نے نبوت کے اجرا و تسلسل پر جوز ورِ قلم صرف کیا اور اس کی جس طرح تبلیغ و اشاعت کی۔ انھوں نے الہام کو جو اہمیت دی اور اس پر جس طرح نبوت کی بنیاد رکھی۔ اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے کہ نبوت بازیچۂ اطفال بن جائے۔ وہ اگرچہ نبوت کے اجرا و تسلسل کی تقریر محض اپنی نبوت کے امکان و ثبوت کے لیے کرتے ہیں اور ختم نبوت کا انکار محض اپنی حد تک ہے ورنہ آنے والوں کے لیے وہ اپنے ہی کو خاتم النّبیین سمجھتے ہیں۔

خطبۂ الہامیہ میں مرزا صاحب فرماتے ہیں۔

"فكان خاليا موضع لبنة اعنى المنعم عليه من هذه العمارة فاراد الله ان يتم النباء ويكمل البنا بالبنة الاخيرة ايها الناظرون." (صفحه 112)

خود ہی اس کا ترجمہ فرماتے ہیں۔ ''اور اس عمارت میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی یعنی منعم علیہم۔ پس خدا نے ارادہ فرمایا کہ اس پیش گوئی کو پورا کرے اور آخری اینٹ کے ساتھ بنا کر کمال تک پہنچا دے۔ پس میں وہی اینٹ ہوں۔

علامہ اقبال کے بلیغ الفاظ ہیں:

''خود بانی احمدیّت کا استدلال جو قرونِ وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی نہ پیدا ہو سکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں کہ پیغمبر اسلام کی روحانیت میں پیغمبر خیز قوت تھی۔ خود اپنی

نبوت کو پیش کرتا ہے لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ محمد ﷺ کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے مترادف ہے کہ محمد ﷺ آخری نبی نہیں۔ میں آخری نبی ہوں۔ اس امر کے سمجھنے کے بجائے کہ ختمِ نبوت کا اسلامی تصور نوع انسان کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا تہذیبی قدر رکھتا ہے' بانی احمدیت کا خیال ہے کہ ختمِ نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ محمد ﷺ کا کوئی پیرو نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا' خود محمد ﷺ کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے۔ جب میں بانیٔ احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ ان کے دعوائے نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبر اسلام کی تخلیقی قوت کو صرف ایک نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی کی پیدائش تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختمِ نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔''

(نہرو کے سوالات کا جواب حرفِ اقبال صفحہ 150'151)

لوگوں کا ذہن اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی نبوت آفرینی کی قوت ایک فرد واحد کے لیے مخصوص اور اس کی ذات تک محدود ہو اور نہ اس سے پہلے اس قوت نے اپنا فعل کیا ہو اور نہ اس شخص کے بعد (جو بعثتِ محمدی ﷺ کے تیرہ سو سال بعد آیا ہے اور اس کے بعد معلوم نہیں دنیا کو کتنے ہزار سال تک رہنا ہے) فعل کر سکے۔ چنانچہ دوسروں کا کیا ذکر خود مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے لکھا ہے کہ

''خدا تعالیٰ کافروں کی نسبت کہتا ہے۔ ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ﴾ (الزمر ۳۹ : ٦٧)

یعنی انھوں نے خدا تعالیٰ کی قدر کو نہیں سمجھا اور یہ سمجھ لیا ہے کہ خدا کے خزانے ختم ہو گئے۔ اس لیے کسی کو کچھ دے نہیں سکتا۔ اسی طرح یہ کہتے ہیں کہ خواہ کتنا ہی زُہد اور اتقا میں بڑھ جائے' پرہیز گاری اور تقویٰ میں کئی نبیوں سے آگے گزر جائے' معرفت الٰہی کتنی ہی حاصل کرے لیکن خدا اسے نبی نہیں بنائے گا اور کبھی نہیں بنائے گا۔ ان کا یہ سمجھنا خدا تعالیٰ کی قدر ہی کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہے ورنہ ایک نبی کیا میں تو کہتا ہوں ہزاروں نبی ہوں گے۔ (انوارِ خلافت صفحہ 62)

چنانچہ مرزا غلام احمد صاحب کے بعد لوگوں کو نبوت کا دعویٰ کرنے کی عام جرأت ہو گئی۔ ہمیں کم از کم ہندوستان کی تاریخ میں جو خاصی حد تک تفصیل کے ساتھ محفوظ ہے اکبر کے سوا کسی شخصیت کا علم نہیں جس نے ختمِ نبوت کے انکار اور دین جدید کے ظہور کی جسارت کی ہو۔ اکبر نے بھی اس منظم اور واضح طریقہ پر جدید نبوت کا دعویٰ نہیں کیا تھا لیکن مرزا صاحب کے بعد یہ دروازہ عمومی طور پر کھل گیا۔ پروفیسر الیاس برنی صاحب نے 1355ھ تک سات مدعیانِ نبوت کا حوالہ دیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر زیادہ اہتمام سے ان مدعیانِ نبوت کی ''مردم شماری'' ہو تو صرف پنجاب میں اس سے بہت زیادہ تعداد ثابت ہو گی۔ ان مدعیانِ نبوت کی کثرت اور خام خیالی پر خود مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے احتجاج فرمایا۔ انھوں نے ایک تقریر میں فرمایا۔

''دیکھو ہماری جماعت میں ہی کتنے مدعیٔ نبوت کھڑے ہو گئے ہیں۔ ان میں سے سوائے ایک کے سب کے متعلق یہ خیال رکھتا ہوں کہ وہ اپنے نزدیک جھوٹ نہیں بولتے۔ واقعہ میں ابتدا میں انھیں الہام ہوئے اور کوئی تعجب نہیں اب بھی ہوتے ہوں مگر نقص یہ ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے الہاموں کو سمجھنے میں غلطی کھائی ہے۔ ان میں سے بعض سے مجھے ذاتی واقفیت ہے اور میں گواہی دے سکتا ہوں کہ ان میں اخلاص پایا جاتا تھا۔ خشیتِ اللہ پائی جاتی تھی۔ آگے خدا تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ میرا یہ خیال کہاں تک درست ہے۔ مگر ابتدا میں ان کی حالت مخلصانہ تھی۔ ان کے الہاموں کا ایک حصہ خدائی الہاموں کا تھا' مگر نقص یہ ہو گیا کہ انھوں نے الہاموں کی حکمت کو نہ سمجھا اور ٹھوکر کھا گئے۔ (الفضل یکم جنوری 1935ء)

تفریق بین المسلمین

ان جدید ''نبوتوں'' سے عالمِ اسلام میں جو زبردست انتشار' مسلمانوں میں جو خوفناک تفریق اور امتِ واحدہ کی جو افسوس ناک تقسیم ہو گی اس کے تصور سے بھی ایک مسلمان کو وحشت ہوتی ہے۔ لادینیت اور مذہب بیزاری کے اس دور میں خود بخود لوگوں میں "انا الحق" اور "انا النبی" کہنے کا ذوق نہیں رہا لیکن مرزا غلام احمد صاحب کے لٹریچر کے اثر اور سبک سر قادیانی مبلغین کی تبلیغ سے آج عالمِ اسلام میں نبوت کے دعوے کا ذوق پیدا ہو جائے اور عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں مختلف اشخاص اپنا اپنا علمِ نبوت بلند کریں اور جو اس علم کے نیچے نہ آئے نبوت کے لازمی نتیجہ کے طور پر ان کی تکفیر شروع کر دیں تو عالمِ اسلام میں کیسا ذہنی انتشار اور تصادم پیدا ہو گا اور کس طرح عالمِ اسلام مختلف دینی محاذوں میں تقسیم ہو جائے گا اور جو امت رنگ و نسل اور قوم و وطن کی تفریق مٹانے اور ساری نوعِ انسانی کو ایک دوسرے کا بھائی اور ہم درد بنانے آئی ہے وہ کس طرح دینی تعصبات اور باہمی تفریق و تکفیر کا شکار ہو کر رہ جائے گی۔ اس خطرے کو مولوی محمد علی صاحب لاہوری نے بھی محسوس کیا اور بڑی خوبی اور قوت کے ساتھ اپنے ایک مضمون میں اس کا اظہار کیا ہے لیکن انھوں نے غور نہیں کیا کہ اس خطرے کا دروازہ مرزا غلام احمد صاحب نے کھولا ہے اور اسلام کی پوری تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نبوت کے اجرا و تسلسل کو ایک دعوت اور تحریک کے طور پر پیش کیا ہے۔ مولوی محمد علی صاحب اہلِ بصیرت کو خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''خدارا غور کرو کہ یہ عقیدہ میاں صاحب کا درست ہے کہ نبی آتے رہیں گے اور ہزاروں نبی آئیں گے۔''

میاں صاحب اس عقیدہ کے مصنف یا موجد نہیں ہیں انھوں نے تو صرف مرزا صاحب کی ترجمانی کی ہے۔ (مضمون نگار) جیسا کہ انھوں نے بالصراحت ''انوارِ خلافت'' میں لکھ دیا ہے تو یہ ہزاروں گروہ ایک دوسرے کو کافر کہنے والے ہوں گے یا نہیں اور اسلامی وحدت کہاں ہو گی؟ یہ بھی مان لو کہ وہ سارے نبی احمدی جماعت ہی کے ہوں گے پھر احمدی جماعت کے کتنے ٹکڑے ہوں گے۔ آخر گزشتہ سنتوں سے تم

اتنے ناواقف نہیں ہو کہ کس طرح نبی کے آنے پر ایک گروہ اس کے ساتھ اور ایک خلاف ہوتا ہے۔ وہ خدا جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر کل دنیا کی قوموں کو ایک کرنے کا ارادہ ظاہر کر چکا ہے کیا اب وہ مسلمانوں کو اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا کہ ایک دوسرے کو کافر کہ رہے ہوں اور آپس میں کوئی تعلقات اخوتِ اسلامی کے نہ رہ گئے ہوں۔ یاد رکھو اگر اسلام کے کل ادیان پر غالب کرنے کا وعدہ سچا ہے تو یہ مصیبت کا دن اسلام پر کبھی نہیں آ سکتا کہ ہزاروں نبی اپنی اپنی ٹولیاں علیحدہ علیحدہ لیے پھرتے ہوں اور ہزار ہا ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں ہوں جن کے پجاری اپنی اپنی جگہ ایمان اور نجات کے ٹھیکے دار بنے ہوئے ہوں اور دوسرے تمام مسلمانوں کو کافر بے ایمان قرار دے رہے ہوں۔(ردِّ تکفیر اہل قبلہ صفحہ 49' 50)

متوازی اُمّت

قادیانیت کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے صدہا دینی و علمی اختلافات اور مکاتبِ فکر میں سے ایک دینی و علمی اختلاف رائے اور ایک خاص مکتبِ فکر ہے اور اس کے پیرو اُمتِ اسلامیہ کے مذہبی فرقوں اور جماعتوں میں سے ایک مذہبی فرقہ اور جماعت ہیں اور یہ کہ یہ اسلام کی کلامی و فقہی تاریخ کا کوئی انوکھا واقعہ نہیں۔

قادیانیت کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنے سے یہ غلط فہمی اور خوش گمانی دور ہو جاتی ہے کہ اور ایک منصف مزاج انسان اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیت ایک مستقل مذہب اور قادیانی ایک مستقل امت ہیں۔ جو دینِ اسلام اور امتِ اسلامیہ کے بالکل متوازی چلتے ہیں اور اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے اس بیان میں کوئی مبالغہ اور غلط بیانی نہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

''یہ غلط ہے کہ دوسرے لوگوں سے ہمارا اختلاف صرف وفاتِ مسیح یا اور چند مسائل میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات رسول کریم ﷺ قرآن' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ غرض کہ آپ نے تفصیل سے بتایا کہ ایک ایک جز میں ہمیں ان سے اختلاف ہے۔

(خطبۂ جمعہ مرزا بشیر الدین محمود صاحب مندرج الفضل 31۔دسمبر 1914ء)

اور یہ کہ:

''حضرت خلیفہ اوّل نے اعلان کیا تھا کہ ان کا (مسلمانوں کا) اسلام اور ہے اور ہمارا اور ہے۔''

متوازی مذہبی نظام

قادیانی تحریک اسلام کے دینی نظام اور زندگی کے ڈھانچے کے مقابلہ میں ایک نیا دینی نظام اور زندگی کا نیا ڈھانچا پیش کرتی ہے۔ وہ دینی زندگی کے تمام شعبوں' مطالبوں کی بطورِ خود خانہ پُری کرنا چاہتی ہے۔ وہ اپنے پیروؤں کو جدید نبوت' جدید مرکزِ محبت و عقیدت' نئی دعوت' نئے روحانی مرکز اور مقدسات' نئے مذہبی شعائر' نئے مقتدا' نئے اکابر' نئی تاریخی شخصیتیں عطا کرتی ہے۔ غرض یہ کہ وہ قلب و دماغ اور فکر و اعتقاد کا نیا مرکز قائم کرتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اسے ایک فرقہ اور فقہی یا کلامی دبستان یا مکتبِ خیال سے زیادہ ایک مستقل مذہب اور نظامِ زندگی کی شکل عطا کرتی ہے۔ اس کے اندر اس بات کا ایک واضح رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ نئی مذہبی بنیادوں پر ایک نئے معاشرے کی تعمیر کرے اور مذہبی زندگی کو ایک نئی شکل اور مستقل وجود بخشے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ جو افراد خلوص اور جوش کے ساتھ اس تحریک و دعوت کو قبول کرتے ہیں اور اس کے دائرہ میں آ جاتے ہیں' ان کے فکر و اعتقاد کا مرکز بدل جاتا ہے اور ان کی زندگی میں قدیم دینی مرکزوں اور اداروں (اپنے وسیع معنی میں) اور شخصیتوں کی جگہ پر جدید دینی مرکز اور ادارے اور شخصیتیں سامنے آ جاتی ہیں اور وہ ایک نئی امت بن جاتے ہیں جو اپنے جذبات' طریقِ فکر عقیدت و محبت میں ایک مستقل شخصیت اور وجود کے مالک ہوتے ہیں۔ انفرادیت اور تقابل کا یہ رجحان قادیانیت کے اندر شروع سے کام کر رہا ہے اور وہ اب بلوغ و پختگی کے اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ قادیانی اصحاب بے تکلفی اور سادگی کے ساتھ اسلامی شعائر و مقدسات کے ساتھ قادیانی شعائر اور مقدسات کا مقابلہ کرتے ہیں اور ان کا ہم پلہ اور مساوی قرار دیتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کو اسلام کے دینی نظام میں جو مرکز و مقام حاصل ہے وہ ظاہر ہے لیکن قادیانی حضرات مرزا صاحب کے رفقا اور ہم نشینوں کو صحابہ رسول ﷺ ہی کا درجہ دیتے ہیں۔ ایک قادیانی ذمہ دار اس ذہنیت کی اس طرح ترجمانی کرتے ہیں:

ان دونوں گروہوں (صحابہ کرام اور رُفقائے مرزا غلام احمد صاحب) میں تفریق کرنی یا ایک کو دوسرے سے مجموعی رنگ میں افضل قرار دینا ٹھیک نہیں۔ یہ دونوں فرقے درحقیقت ایک ہی جماعت ہیں۔ صرف زمانہ کا فرق ہے۔ وہ بعثتِ اولیٰ کے تربیت یافتہ ہیں اور یہ بعثتِ ثانیہ کے۔(الفضل۔28۔مئی 1918ء)

اسی طرح وہ مرزا غلام احمد صاحب کے مدفن کو مرقدِ رسول ﷺ اور گنبدِ خضرا کا مماثل و شبیہ بتاتے ہیں۔ ''الفضل'' نے 18۔دسمبر 1922ء کی اشاعت میں قادیان کے شعبہ تربیت کا یہ بیان شائع کیا تھا جس میں ان شرکائے جلسہ کی دینی بے حسی اور بدذوقی کی شکایت کرتے ہوئے جو قادیان حاضر ہونے کے باوجود مرزا صاحب کے مدفن پر حاضری نہیں دیتے کہا گیا ہے:

''کیا حال ہے اس شخص کا جو قادیان دارالامان میں آئے اور دو قدم چل کر مقبرہ بہشتی میں حاضر نہ ہوا۔ اس میں وہ روضۂ مطہرہ ہے جس میں اس خدا کے برگزیدہ کا جسمِ مبارک مدفون ہے جسے افضل الرسل نے اپنا سلام بھیجا اور جس کی نسبت حضرت خاتم النّبیین نے فرمایا۔ یُدْفَنُ مَعِی فِی قَبْرِیْ۔ اس اعتبار سے مدینہ منورہ کے گنبدِ خضرا کے انوار کا پورا پورا پرتو اس گنبد بیضا پر پڑ رہا ہے اور آپ گویا ان برکات سے حصہ لے سکتے ہیں جو رسول کریم ﷺ کے مرقدِ منور سے مخصوص ہیں' کیا ہی بدقسمت ہے وہ شخص جو احمدیت کے حجِ اکبر میں اس تمتع سے محروم رہے۔''

(الفضل۔ جلد 10 نمبر 48)

قادیانی اصحاب اس دینی و روحانی تعلق کی بنا پر جو نئی نبوت اور نئے اسلام کا مرکز

ہونے کی بنا پر قادیان کے ساتھ قائم ہوتا ہے یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ قادیان اسلام کے مقاماتِ مقدسہ میں سے ایک اہم ترین اور عظیم ترین مقام ہے اور وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے ساتھ قادیان کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں۔ مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا:

''ہم مدینہ منورہ کی عزت کر کے خانہ کعبہ کی ہتک کرنے والے نہیں ہو جاتے۔ اسی طرح ہم قادیان کی عزت کر کے مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ کی توہین کرنے والے نہیں ہو سکتے۔ خدا تعالیٰ نے ان تینوں مقامات کو مقدس کیا اور ان تینوں مقامات کو اپنی تجلیات کے اظہار کے لیے چنا۔ (الفضل 3۔ ستمبر 1935ء)

خود مرزا غلام احمد صاحب نے قادیان کو سرزمین حرم سے تشبیہ و تمثیل دی ہے' وہ فرماتے ہیں:

زمینِ قادیاں اب محترم ہے
ہجومِ خلق سے ارضِ حرم ہے

(دُرِّ ثمین صفحہ 52)

ان کے نزدیک قادیان کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے اور مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود کی مسجد ہے۔ عمارۃ مسیح کے اشتہار (28۔ مئی 1900ء) میں آپ نے لکھا ہے۔

''جیسا کہ سیر مکانی کے لحاظ سے خدا تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو مسجد حرام سے بیت المقدس تک پہنچا دیا تھا' ایسا ہی سیرِ زمانی کے لحاظ سے آں جناب کو شوکتِ اسلام کے زمانہ سے جو آنحضرت ﷺ کا زمانہ تھا' برکاتِ اسلامی کے زمانہ تک جو مسیح موعود کا زمانہ ہے پہنچا دیا۔ پس اس پہلو کی رو سے جو اسلام کے انتہائے زمانہ تک آنحضرت ﷺ کا سیر کشفی ہے۔ مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود کی مسجد ہے جو قادیان میں واقع ہے جس کی نسبت براہینِ احمدیہ میں کلام یہ ہے۔ مبارك و مبارك مبارك نجعل منه.

اور یہ مبارک کا لفظ جو بصیغہ مفعول اور فاعل واقع ہوا۔ قرآنِ شریف کی آیت وبَارَكْنَا حوله کے مطابق ہے پس کچھ شک نہیں جو قرآن شریف میں ''قادیان'' کا ذکر ہے۔ (مجموعہ وحی مقدس صفحہ 345'346)

ان سب بیانات اور قادیان کے بارے میں اعتقادات کا منطقی اور طبعی نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا کہ اس کے لیے شدِّ رحال کر کے سفر کرنے اور وہاں سال بسال حاضر ہونے کو حج ہی کا سا ایک مقدس عمل بلکہ ایک طرح کا حج سمجھا جانے لگے۔ چنانچہ قادیانیت کے راہ نُماؤں اور ذمہ داروں نے سفرِ قادیان کو ظلّی حج کا لقب دیا ہے اور اسے ان لوگوں کے لیے جو خانہ کعبہ کے حج کو نہ جا سکیں' حج اسلام کا ''حج بدل'' قرار دیا ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود صاحب نے اپنے ایک خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا:

''چوں کہ حج پر وہی لوگ جا سکتے ہیں جو مقدرت رکھتے اور امیر ہوں' حالانکہ الٰہی تحریکات پہلے غربا میں پھیلتی اور پنپتی ہیں اور غربا کو حج سے شریعت نے معذور رکھا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور ظلّی حج مقرر کیا تا کہ وہ قوم جس سے وہ اسلام کی ترقی کا کام لینا چاہتا ہے اور تازہ غریب یعنی ہندوستان کے مسلمان اس میں شامل ہو سکیں۔ (الفضل یکم دسمبر 1922ء)

اس بارے میں اتنا غلو ہونے لگا کہ قادیان کے سفر کو حج بیت اللہ پر ترجیح دی جانے لگی اور یہ اس ذہنیت کا لازمی و قدرتی نتیجہ ہے کہ قادیانیت ایک زندہ اور جدید مذہب اور اس کا مرکز ایک زندہ اور جدید مذہب کا روحانی مرکز ثقل ہے جس سے نئی زندگی اور نئی مذہبی توانائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی بنا پر ایک قادیانی بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ ''جیسے احمدیت کے بغیر پہلا یعنی حضرت مرزا صاحب کو چھوڑ کر جو اسلام باقی رہ جاتا ہے وہ خشک اسلام ہے' اسی طرح اس حج ظلّی کو چھوڑ کر مکہ والا حج بھی خشک رہ جاتا ہے کیوں کہ وہاں پر آج کل حج کے مقاصد پورے نہیں ہوتے۔

(پیغام صلح جلد 21 نمبر 3)

انفرادیت کا رجحان اور ایک مستقل دین اور نئی تاریخ کے آغاز کا احساس اتنا بڑھ گیا کہ قادیانی حضرات نے اپنی نئی تقویم کی بنیاد ڈال دی اور سال کے مہینوں کے نئے ناموں سے تاریخ لکھنے لگے۔ قادیانیت کے سرکاری ترجمان ''الفضل'' میں مہینوں کے جو نام چھپتے رہے۔ وہ حسبِ ذیل ہیں۔

صلح' تبلیغ' امان' شہادت' ہجرت' احسان' وفا' ظہور' تبوک' اخا' نبوت' فتح۔

ان مذہبی تصورات اور انفرادیت کے رجحانات کا نتیجہ یہ ہے کہ مذہب و تحریکِ قادیانیت کا ذہنی' روحانی' سیاسی مرکز بجائے جزیرۃ العرب اور مکہ معظمہ و مدینہ طیبہ کے (جو اسلام کا گہوارہ اور اس کی زندگی کا سرچشمہ اور ابدی مرکز ہیں) قادیان بننے لگا جو اس نئے مذہب و تحریک کے ظہور اور نشو و نما کا مرکز ہے۔ (مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی)

ختم نبوت اور تکمیل دین

اگر قدرے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ موضوع کے دونوں حصے ''ختم نبوت'' اور ''تکمیل دین'' باہم سبب و نتیجے کا تعلق رکھتے ہیں کہ تکمیلِ دین سبب ہے اور ''ختم نبوت'' اس کا قدرتی نتیجہ۔ جب حضور ﷺ کی بعثت کے ذریعے دین کی تکمیل ہوگئی اور خاتم النّبیین ﷺ نے ہر شعبۂ حیات سے متعلق دینی احکامات اللہ کی مخلوق کو پہنچا دیئے تو اب نبوت و رسالت کا وہ سلسلہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے اب تک جاری تھا ختم کر دیا گیا۔

بعثت انبیا علیہم السلام

تخلیق آدم علیہ السلام کے بعد انسانی معاشرہ وجود میں آتے ہی انسان کے گونا گوں معاشرتی مسائل شروع ہو گئے' روزی روزگار کے مسائل' شادی بیاہ' باہم لین دین کے مسائل و دیگر متعدد مسائل۔ انسانوں کو ان میں رہبری کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انبیا کے ذریعے یہ راہ نُمائی فرمائی۔ کچھ عرصے اس راہ نُمائی کا اثر رہا اور لوگوں نے روشن آسمانی ہدایت کے زیر اثر راحت و پاکیزگی کی زندگی بسر کی۔ مگر کچھ عرصے بعد پھر لوگوں نے ہوا و ہوس کا راستہ اختیار کیا اور ان میں گمراہی پھیلنا شروع ہوئی تو عادت الٰہی کے مطابق ان کی اصلاح کے لیے پھر انبیا و رسول بھیجے گئے۔

قرآن کریم نے اسے اس طرح بیان فرمایا:

﴿اِنَّھُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَھُمْ ضَآلِّیْنَo فَھُمْ عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ یُھْرَعُوْنَo وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَھُمْ اَکْثَرُ الْاَوَّلِیْنَo وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِیْھِمْ مُّنْذِرِیْنَo﴾

(الصافات: 69تا72)

''انھوں نے اپنے بڑوں کو گمراہی کی حالت میں پایا تھا' پھر یہ انھی کے قدم بقدم تیزی کے ساتھ چلتے تھے اور ان سے پہلے بھی اگلے لوگوں میں اکثر گم راہ ہو چکے ہیں' اور ہم نے ان میں بھی ڈرانے والے بھیجے تھے۔''

اور سورۂ روم میں اسی مضمون کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِھِمْ فَجَآءُوْھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِیْنَ اَجْرَمُوْا وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

(الروم: 47)

''اور ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبران قوموں کے پاس بھیجے اور وہ ان کے پاس دلائل لے کر آئے۔ سو ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا جو مرتکبِ جرائم ہوئے تھے اور اہلِ ایمان کا غالب کرنا ہمارے ذمے تھا۔''

ایسے ہی بارہ انبیا و رسل کا نام کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے سورۂ النسا میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِہٖ ۚ وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِیْسٰی وَاَیُّوْبَ وَیُوْنُسَ وَھٰرُوْنَ وَسُلَیْمٰنَ ۚ وَاٰتَیْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًاo﴾

(النساء: 163)

''ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے جیسے نوح کے پاس بھیجی تھی اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ اور عیسیٰؑ اور ایوبؑ اور یونسؑ اور ہارونؑ اور سلیمانؑ کے پاس وحی بھیجی تھی اور ہم نے داؤد کو زبور دی تھی۔''

اور پھر بارہویں پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کے علاوہ بھی متعدد دوسرے پیغمبر ہیں' جنھیں ہم نے مخلوق کی ہدایت کے لیے بھیجا۔ ان میں سے بعض کا حال ہم نے آپ سے بیان کر دیا ہے جب کہ بعض کا نہیں بیان کیا:

﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰھُمْ عَلَیْکَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْھُمْ عَلَیْکَ ۭ وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًاo﴾ (النساء: 164)

''اور ایسے پیغمبروں کو صاحبِ وحی بنایا جن کا حال اس سے قبل ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں اور ایسے پیغمبروں کو جن کا حال ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا اور موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا۔''

مقصد بعثت

ان انبیا و رسل کے بھیجنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَکَانَ اللّٰہُ عَزِیْزًا حَکِیْمًاo﴾ (النساء: 165)

''ان سب کو خوش خبری دینے والے اور خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لیے بھیجا تا کہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذر باقی نہ رہے (یعنی ظاہراً بھی عذر باقی نہ رہے اور قیامت میں یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں تو دنیا میں بھلائی برائی کا علم ہی نہ تھا کہ اللہ کے نزدیک کیا چیز اچھی ہے اور کیا بری) اور اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔''

مختلف بستیوں کی طرف ہدایاتِ ربانی

چنانچہ ہمیں کچھ تو قرآن و سنت کی تصریحات سے اور کچھ مختلف آیات تورات و کتب تاریخ عالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ پاک نے مختلف بستیوں کی ہدایت کے لیے ان انبیا و رسل کو اس طرح بھیجا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو ان کی اس وقت کی موجود ذرّیت کی طرف۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ایک لاکھ چالیس ہزار مربع کلومیٹر کے علاقے جزیرہ کی طرف۔ حضرت ہود علیہ السلام کو ارضِ احقاف میں قوم عاد کی طرف۔ حضرت صالح علیہ السلام کو حجر و وادیٔ قُریٰ میں قوم ثمود کی طرف۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قصبہ اور (عراق) کلدان' حاران' فلسطین شام و مصر وغیرہ کی طرف۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو وادیِ غیر ذی زرع کی طرف حضرت اسحٰق و یعقوب علیہما السلام کو فدّانِ آرام وارض کنعان (فلسطین) کی طرف۔ حضرت لوط علیہ السلام کو شرقِ اردن۔ سدوم و عامورہ کی بستیوں کی طرف۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو اصحاب مدین وایکہ کی طرف۔ حضرت یوسف علیہ سلام کو کنعان (فلسطین) و مصر کی طرف۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کو مصر میں بنی اسرائیل کی طرف۔ حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کو اریحا و یروشلم کی طرف۔ حضرت الیاس علیہ السلام کو بعلبک کی طرف۔ حضرت الیاس کے خلیفہ و نائب حضرت الیسع علیہ السلام کو بعلبک و نواحی بستیوں کی طرف' حضرت داؤد علیہ السلام کو شام' عراق' فلسطین' شرق اردن۔ ایلہ (خلیج عقبہ) و حجاز وغیرہ کی طرف۔ حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو شام و عراق و یروشلم و لبنان وغیرہ متعدد علاقوں کی طرف۔ حضرت ایوب علیہ السلام کو سرزمین عوض کی طرف' حضرت یونس علیہ السلام کو اہلِ نینویٰ کی طرف۔ حضرت عزیر علیہ السلام کو بابل' یروشلم وسائر آباد (عراق) کی طرف۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو اہل بیت المقدس کی طرف۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بیت المقدس و نواح یرون کی طرف۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تمام اسرائیلی دنیا کی طرف اور آخر میں خاتم النّبیین سرور دو عالم فخر کائنات سیدنا حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کو جمیع انس و جن اور تمام عالم کی طرف۔

پیغمبروں کے لیے دو اعزاز

اللہ کے وہ مقرب بندے جو وقتاً فوقتاً مختلف انسانی بستیوں کی طرف ہدایت کے لیے بھیجے گئے اور جن کے ذریعے اللہ ربّ العزت کا پیغام اور اس کی شریعت بندوں تک پہنچی ان میں سے بعض کے لیے قرآن کریم میں صرف لفظ ''نبی'' استعمال کیا گیا

جب کہ بعض دیگر کے لیے صرف لفظ ''رسول'' ۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک قرآنی آیت میں جسے ''نبی'' کہا گیا دوسری آیت میں اسی کو ''رسول'' کے لفظ سے یاد کیا گیا۔ یعنی اس پیغمبر کو دو عزتوں سے نوازا گیا اور کبھی ایسا بھی ہوا کہ ایک ہی آیت میں ''نبی'' و ''رسول'' دونوں لفظ اس پیغمبر کے لیے یک جا کر دیے گئے مثلاً درج ذیل آیات ۔

(1)....﴿وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا﴾ (مریم : 49)

اس آیت میں حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب علیہما السلام کے لیے لفظ ''نبی'' استعمال کیا گیا۔

(2)....﴿وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا﴾ (مریم : 53)

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے لفظ نبی استعمال کیا گیا۔

(3)....﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ (مریم : 56)

اس آیت میں حضرت ادریس علیہ السلام کے لیے صدیق نبی کا لفظ استعمال کیا گیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے سورۂ مریم آیت 30 میں لفظ ''نبی'' استعمال کیا گیا جب کہ درج ذیل آیت میں انھوں نے اپنے لیے لفظ ''رسول اللہ'' کا استعمال کیا۔

(4)....﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ﴾ (الصف : 6)

اور اس طرح وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب کہ عیسیٰ بن مریم نے فرمایا کہ اے بنی اسرائیل میں تمھارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔

حضور ﷺ کو درج ذیل آیت میں ''یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ'' کہہ کر مخاطب کیا گیا:

(5).... ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ اغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (التوبہ : 73)

اے (نبی ﷺ) کفار سے (بذریعہ تلوار) اور منافقین سے (بذریعہ زبان) جہاد کیجیے اور ان پر سختی کیجیے۔''

جب کہ درج ذیل آیت میں لفظ ''یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ'' کہہ کر آپ سے خطاب کیا گیا۔

(6)....﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ﴾ (المائدہ : 67)

''اے رسول! جو کچھ آپ کے ربّ کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ سب کو پہنچا دیجیے۔''

بعض قرآنی آیات میں بعض پیغمبروں کے لیے ''رسول'' اور ''نبی'' دونوں لفظ ایک ساتھ ہی استعمال کیے گئے مثلاً:

(7).... ﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰۤى ؗ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۝﴾ (مریم : 51)

''اور اس کتاب میں موسیٰ کا بھی ذکر کیجیے۔ وہ بلاشبہ اللہ کے خاص کیے ہوئے بندے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے۔''

(8)....﴿وَ اذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ؗ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَ كَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا۝﴾ (مریم : 54)

اور اس کتاب میں اسماعیل کا بھی ذکر کیجیے۔ بلاشبہ وہ وعدے کے بڑے سچے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے۔

قرآن مجید میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو رسول نبی کہا گیا جب کہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے لیے صرف نبی کا لفظ استعمال کیا گیا۔ علامہ ابن کثیر دمشقی (م ۷۷۴ھ) اسی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی حضرت اسحٰق علیہ السلام پر فضیلت ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''فی ھٰذا دلالۃ علی شرف اسمعیل علی اخیہ اسحٰق لانہ انما وصف بالنبوۃ فقط واسماعیل وصف بالنبوۃ والرسالۃ۔'' (14)

اس آیت سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ان کے چھوٹے بھائی حضرت اسحاق پر فضیلت معلوم ہوتی ہے کہ حضرت اسحاق کو صرف نبی کہا گیا جب کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نبی بھی اور رسول بھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے بھی یہ دونوں لفظ جمع کیے گئے اور ان کے لیے بھی رسولاً نبیا کہا گیا چنانچہ ان کی بھی دیگر متعدد انبیا پر فضیلت معلوم ہوتی ہے چنانچہ علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

''وکان رسولاً نبیا جمع اللہ لہ بین الوصفین فانہ کان من المرسلین الکبار اُولی العزم الخمسۃ، وھم نوح و ابراھیم و موسیٰ و عیسیٰ و محمد صلوات اللہ وسلامہ علی سائر الانبیا اجمعین۔''

''حضرت موسیٰ رسول بھی تھے اور نبی بھی تھے۔ اللہ پاک نے ان کے لیے دونوں اوصاف جمع کر دیے تھے کہ وہ ان پانچ عظیم المرتبت اولوالعزم رسولوں میں سے تھے یعنی حضرت نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور محمد ﷺ، صلوٰت اللہ وسلامہ علی سائر الانبیا اجمعین۔

حضور ﷺ کے تین اعزاز

دیگر انبیا علیہم السلام کے لیے گزشتہ قرآنی آیات میں دو اعزاز بیان ہوئے، ایک ان کا نبی ہونا اور دوسرا ان کا رسول ہونا۔ حضور ﷺ کو وہ دو اعزاز بھی ملے جیسا کہ سورۃ التحریم (آیت 9) اور سورۂ المائدہ (آیت 67) میں اوپر بیان ہوا جب کہ آپ کو تیسرا عظیم الشان اعزاز خاتم النّبیین ہونے کا بھی ملا جو اب تک کسی نبی کو بھی نہ ملا تھا۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الاحزاب : 40)

''محمد ﷺ تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النّبیین ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔''

تو اب تک عظیم المرتبت اور اولوالعزم پیغمبروں کو نبی و رسول ہونے کے دو اعزاز خلاقِ عالم کی طرف سے مرحمت ہوئے تھے' حضور ﷺ کو "خاتم النّبیین" ہونے کا تیسرا اور سب سے بڑا اعزاز دے کر بتا دیا گیا کہ اب خاتم النّبیین کے تشریف لانے کے بعد نبوت و رسالت کا وہ سلسلہ جو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے اب تک جاری و ساری تھا' ختم کر دیا گیا۔ چنانچہ علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ "یہ آیت اس بارے میں صریح نص ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور جب آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو آپ کے بعد کسی رسول کا نہ آنا بدرجہ اَولیٰ ثابت ہوگا۔ کیوں کہ مقام رسالت' مقام نبوت کے مقابلے میں زیادہ خاص ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے جب کہ ہر نبی رسول نہیں ہوتا اور اس بارے میں صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت سے حضور ﷺ کی متواتر احادیث وارد ہیں۔"

حاصل کلام یہ ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وہ درجہ' فضیلت عطا فرمایا کہ آپ سے پہلے کسی پیغمبر کو عطا نہ ہوا تھا کہ آپ نبی بھی ہیں۔ رسول بھی اور خاتم النّبیین بھی۔

یہ تینوں لفظ قرآن مجید میں جس طرح استعمال ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی کے اعتبار سے ان تینوں میں کچھ فرق ہے۔ تو اوّلاً ہم ان تین الفاظ نبی' رسول اور خاتم النّبیین کے لغوی معنی کی طرف توجہ کرتے ہیں اور ثانیاً ان کے درمیان فرق کو واضح کریں گے۔

لفظ نبی

اس کے متعلق دو قول ہیں: ایک یہ کہ یہ لفظ نَبَاءٌ سے نکلا ہے جس کے معنی اہم خبر کے ہیں۔ "نبی" چوں کہ انسانوں کو احکام الٰہی کی اہم خبر دیتا ہے اس لیے اسے نبی کہتے ہیں' اور دوسرا قول یہ ہے کہ یہ لفظ نبوۃ بمعنی رفعت و بلندی سے ماخوذ ہے' اور نبی چوں کہ عام انسانوں کے مقابلے میں ارفع و اعلیٰ درجے کا مالک ہوتا ہے اس لیے اسے نبی کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی (م 502ھ) لکھتے ہیں کہ "نبأ ایسی خبر کو کہتے ہیں جس کا فائدہ عظیم ہو۔ جو یقینی علم کے حصول کا ذریعہ ہو یا جس خبر سے غلبۂ ظن (غالب گمان) حاصل ہوتا ہو۔ یہ اصل میں ایسی ہی خبر کو کہتے ہیں جس میں یہ مذکورہ تینوں چیزیں پائی جائیں۔ (عظیم فائدہ' علم' غلبۂ ظن) اور نبأ کہلائے جانے کے لیے اس خبر کا پورا پورا "حق" یہ ہے کہ اس میں جھوٹ' بالکل نہ ہو (جھوٹ کا شائبہ تک نہ ہو) مثلاً خبر متواتر (اتنے زیادہ معتبر لوگوں کا پے درپے بیان جن کا جھوٹ پر جمع ہونا محال ہو) یا جیسے خبر الٰہی یا خبر نبوی علیہ السلام۔"

درج ذیل قرآنی آیات میں نبأ کے مذکورہ تینوں پہلوؤں کا موثر انداز میں ذکر ہے مثلاً:

﴿قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيمٌo أَنتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُونَo﴾ (ص: 67تا68)

"آپ کہہ دیجیے کہ وہ قیامت کی خبر ایک عظیم الشان خبر ہے جس سے تم بالکل ہی بے پرواہ ہو رہے ہو۔"

یہاں نَبَؤٌا کے ساتھ عظیم کی صفت اس خبر کے عظیم فائدے کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اس دنیاوی زندگی کو آخرت کی کھیتی سمجھ کر آخرت اور روزِ قیامت کے لیے تیاری کرو۔ اس طرح مثلاً:

﴿عَمَّ يَتَسَآءَلُونَo عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِo الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَo﴾

(النباء: 1تا3)

"یہ قیامت کا انکار کرنے والے لوگ کس خبر کا حال دریافت کرتے ہیں۔ اس بڑے واقعے کا حال دریافت کرتے ہیں جس میں یہ لوگ اہل حق کے ساتھ اختلاف کر رہے ہیں۔"

یہاں بھی نبأ کے ساتھ عظیم کا ذکر ہے جو خبر کے عظیم ہونے کی خبر دیتی ہے۔ لفظ "نبأ" کا دوسرا عنصر یہ ہے کہ اس خبر سے یقینی علم حاصل ہو۔ اس پہلو کے متعلق ارشاد ہوا۔

﴿تِلْكَ مِنْ أَنبَآءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَآ إِلَيْكَ ۖ مَا كُنتَ تَعْلَمُهَآ أَنتَ وَلَا قَوْمُكَ مِن قَبْلِ هَٰذَا﴾ (ھود: 49)

"یہ قصہ (وقتِ طوفانِ نوح' حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے رب سے اپنے بیٹے کے لیے درخواست کرنا) من جملہ اخبار غیب کے ہے جسے ہم بذریعہ وحی آپ کو پہنچاتے ہیں۔ ہمارے بتانے سے قبل اس قصے کو نہ آپ جانتے تھے۔ نہ آپ کی قوم۔"

تو اس قصے کا یقینی علم آپ کو بذریعہ وحی حاصل ہوا۔ لفظ نبا کا تیسرا پہلو غلبۂ ظن کا ہے یعنی غالب گمان۔ اس پہلو کو درج ذیل آیت واضح کرتی ہے۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِن جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوٓا أَن تُصِيبُوا قَوْمًۢا بِجَهَٰلَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَٰدِمِينَ﴾ (الحجرات: 6)

"اے ایمان والو۔ اگر کوئی شریر آدمی تمھارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو' کبھی کسی قوم کو نادانی سے ضرر نہ پہنچا دو۔ پھر اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔"

نزول آیت کا پس منظر یہ ہے کہ حضور ﷺ کی زوجہ مطہرہ حضرت جویریہؓ کے والد حضرت حارث بن ضرارؓ نے جو قبیلہ بنی مصطلق کے رئیس تھے قبول اسلام کے وقت حضور ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے قبیلے میں بھی اسلام کی تبلیغ کریں گے اور اپنے قبیلے کے مسلمانوں کی زکوٰۃ کی رقوم جمع کر کے حضور ﷺ کے قاصد کو ادا کیا کریں گے۔ چنانچہ وقتِ مقررہ پر حضور ﷺ نے حضرت ولید بن عقبہؓ کو قاصد بنا کر حارث بن ضرار کے پاس زکوٰۃ کی جمع کردہ رقوم کی وصول یابی کے لیے بھیجا۔ ولید بن عقبہ جب قاصد بن کر حارث بن ضرار کے پاس جا رہے تھے تو راستے میں انھیں خیال آیا کہ قبیلہ بنی مصطلق سے ان کی پرانی دشمنی چل رہی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس قبیلے کے لوگ مجھے قتل کر دیں۔ چنانچہ یہ خیال آتے ہی وہ راستے ہی سے واپس آ گئے۔ بعض روایات کے مطابق قبیلہ بنی المصطلق کے لوگ حضور ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے ان کا استقبال کرنے آئے تو ولید بن عقبہ سمجھے کہ یہ لوگ زکوٰۃ سے انکاری ہیں اور اپنی پرانی دشمنی نکالنے کے لیے انھیں قتل کرنے آئے ہیں چنانچہ اپنے اسی خیال کے مطابق انھوں نے حضور ﷺ کو آ کر اطلاع دے دی۔ حضور ﷺ یہ سن کر برہم ہوئے

اور آپ ﷺ نے تحقیقِ حال کے لیے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ایک دستے کے ہم راہ بھیجا تاہم آپ نے حضرت خالدؓ کو تاکید کردی کہ پہلے معاملے کی پوری تحقیق کرلیں۔ چنانچہ حضرت خالدؓ بن ولید حارث بن ضرار کے پاس پہنچے اور تحقیقِ حال کی تو معلوم ہوا کہ بات صحیح نہیں اور یہ کہ ولید بن عقبہ تو حارث بن ضرار سے ملے ہی نہیں۔ حضرت خالد نے پوری بات آ کر حضور ﷺ کو بتادی تو اگر بغیر تحقیق حضرت خالد بن ولیدؓ زکوٰۃ نہ دینے پر قبیلہ بنی مصطلق پر فوجی یلغار کردیتے تو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں بڑا نقصان پہنچ جاتا۔ اس لیے اس قرآنی آیت میں ہدایت کی گئی کہ اگر خبر غیر معمولی نوعیت کی ہو تو بہتر ہے اس میں توقف سے کام لیا جائے اور غلبہ ظن کے باوجود اس کے عواقب پر دوبارہ نظر ڈال لی جائے۔ حضرت امام راغب اصفہانیؒ اسی کی تشریح میں فرماتے ہیں:

"فتنبیه انه اذا کان الخبر شیئاً عظیماً له' قدر فحقه ان یتوقف فیه وان علم وغلب صحته علی الظن حتّٰی یعاد النظر فیه ."

اس آیت میں اس بات پر تنبیہ ہے کہ اگر کوئی خبر غیر معمولی نوعیت کی ہو جس کے اہم نتائج برآمد ہوسکتے ہوں تو اس میں توقف سے کام لینا چاہیے اور علم و غلبہ ظن کی صورت میں اس میں بارِ دگر غور وخوض کرلینا چاہیے۔

تو اس قول کے مطابق لفظ نبی نبأ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ایسی خبر کے ہیں جو نوعیت کے اعتبار سے بہت مفید ہو اور جس سے یقینی علم یا غالب گمان حاصل ہوتا ہے۔ چوں کہ نبی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایسی ہی خبر کا ذریعہ یا واسطہ ہوتا ہے اس لیے اسے نبی کہتے ہیں۔

دوسرے قول کے مطابق لفظ نبی نبوۃ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں رفعت وبلندی۔ چوں کہ نبی کا مقام ودرجہ دوسرے تمام لوگوں سے ارفع وبلند ہوتا ہے اس لیے اسے نبی کہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام راغب اصفہانیؒ المفردات میں فرماتے ہیں:

"وقال بعض العلماء هو مِن النبوّة ای الرفعة و سمّی نبیًّا لِرفعة محلّه سائر الناس المدلول علیه بقوله و رَفَعْناه مکانًا عَلِیّاً ."

اور بعض علما نے فرمایا لفظ نبی "النبوۃ" سے نکلا ہے بمعنی رفعت وبلندی اور نبی کو نبی اس لیے کہتے ہیں کہ اس کا مقام باقی تمام لوگوں سے ارفع واعلیٰ ہوتا ہے جیسا کہ (سورۃ مریمؑ آیت ۵۷ میں حضرت ادریس علیہ السلام کے متعلق) فرمایا کہ ہم نے انھیں کمالات میں بلند مرتبے تک پہنچایا۔

لفظ رسول

اس کا مادّہ ر س ل ہے۔ زیر وزبر کے اختلافات اور مختلف الفاظ کے ساتھ استعمال سے اس کے معنی مختلف ہوجاتے ہیں مثلاً (1) رَسْل (ر کا زبر۔ سین کا جزم) لفظ "سَیْر" (چلنا) کے ساتھ استعمال ہو تو بمعنی نرم چال اور جب لفظ شَعْر (بال) کے ساتھ استعمال ہو تو بمعنی لٹکے ہوئے بال (2) لفظ رِسْل (ر کا زیر۔ س کا جزم) بمعنی آسودگی۔ آہستگی۔ نرمی؛ عربی محاورے میں کہتے ہیں علی رسلك یا رجل (ارے میاں باوقار رہو۔ اتنی زیادہ جلدی نہ دکھاؤ) (3) لفظ رِسْلة (ر کا زیر) بمعنی جماعت۔ عربی محاورے میں کہا جاتا ہے جاء وا رسلةً (وہ گروہ در گروہ آئے) (4) لفظ رَسَل (را اور س دونوں کا زبر) بمعنی جماعت۔ گروہ جمع اَرْسَال (5) رَسْله (ر کا زبر۔ س کا جزم) بمعنی نرمی محاورے میں کہا جاتا ہے ناقةٌ رَسْلةٌ۔ نرم چال والی اونٹنی۔ ایک عربی محاورہ اس طرح بھی ہے هم فی رَسْلة من العیش (وہ لوگ آرام۔ راحت وآسودگی میں ہیں) (6) رِسَالہ۔ رَسَالةٌ (ر کا زبر اور زیر) بمعنی پیغام؛ پیغام رسانی؛ خط۔ اس کی جمع رَسَائِل ورسالات آتی ہے (7) رَسُول۔ رَسیل بمعنی بھیجا ہوا۔ پیغامبر۔ ان کی جمع رُسُل' ارسل اور رُسلاء آتی ہیں۔

امام راغب اصفہانی لفظ رسول کی مزید تحقیق کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"والرسول یقال للواحد و الجمع۔ قال تعالٰی لقد جاء کم رسول من انفسکم۔ قال انا رسول رب العلمین ."

لفظ "رسول' واحد اور جمع دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ سورۂ توبہ۔ آیت 128 میں یہ بطور واحد اور سورۂ الشعرا آیت ۱۶ میں بطور جمع استعمال ہوا ہے۔

"وَرُسُلُ الله تارة یُراد بها الملائکة و تارة یُرادبها الانبیا ."

اور اللہ کے رسولوں سے مراد کبھی فرشتے اور کبھی انبیا علیہم السلام ہوتے ہیں۔

چنانچہ سورۂ ہود کی آیات 69' 77 اور 81 اور سورۂ تکویر آیت 19 میں رسول یا رُسل سے فرشتے مراد ہیں یعنی اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے۔ اور سورۂ آلِ عمران آیت 144 اور سورۂ مائدہ آیت 67 میں مراد انسان رسول ﷺ ہیں نہ کہ فرشتے۔ اور درج ذیل آیت میں لفظ "رُسل" سے مراد نہ صرف پیغمبر ہیں بلکہ پیغمبر بھی اور ان کی امتوں کے نیک افراد بھی۔ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ (المؤمنون: 51)

"اے پیغمبرو! تم (اور تمھاری امتیں) نفیس چیزوں کھاؤ اور نیک کام کرو۔"

یہاں لفظ الرُّسل استعمال کیا گیا جس کے معنی رسولوں کے ہیں مگر مراد رسول بھی ہیں اور ان کے اچھے امتی بھی۔ امام راغب اصفہانی کے بقول یہاں مراد رسول اور ان کے مخلص اصحاب ہیں۔ ان اصحاب کو بھی رُسل اس لیے کہہ دیا گیا کہ وہ بھی انھی کے ساتھ ہیں جیسے مُہلّب (ہجو کیا ہوا) اور ان کے متعلقین کو مہالبہ کہہ دیا جاتا ہے اور سورۂ المومنون کی اس آیت میں حلال غذا کھانے اور نیک اعمال بجالانے کے دو حکم کو یک جا کردیا گیا ہے اس میں اس طرح بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ نیک اعمال بجالانے اور اکلِ حلال میں بڑا گہرا ربط ہے کہ نیک اعمال کی توفیق اکلِ حلال کے بعد ہی ہوتی ہے۔

نبی ورسول کا فرق

قرآن کریم نے جس طرح "نبی" اور "رسول" کے الفاظ استعمال کیے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کے معنی میں فرق ہے۔ وہ فرق کیا ہے اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں:

(1) شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اپنی کتاب ''النبوات'' میں فرماتے ہیں کہ نبی وہ ہے جو اللہ کی بتائی ہوئی چیزیں لوگوں تک پہنچائے۔ اگر اس نبی کی بعثت منکرین ومخالفین کی طرف ہوئی ہے تو وہ قرآنی اصطلاح میں رسول ہے ورنہ صرف نبی۔ رسول ہونے کے لیے شریعتِ جدیدہ کا حامل ہونا ضروری نہیں۔ حضرت یوسفؑ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان قرآنی تصریح کے مطابق رسول تھے حالانکہ وہ کسی جدید شریعت کے حامل نہ تھے بلکہ حضرت یوسفؑ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت کے پیرو تھے اور حضرت داؤد و سلیمان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے پیرو۔

(2) قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ رسول وہ ہے جو جدید شریعت لے کر آیا ہو (بعض نے جدید شریعت کے بجائے کہا کہ وہ آسمانی کتاب کا حامل ہو) جب کہ نبی کے لیے یہ ضروری نہیں تو نبی عام ہے اور رسول خاص۔ درج ذیل حدیث سے اس قول کی تائید ہوتی ہے۔

"عن ابی ذر عن رسول الله ﷺ قال کان الانبیا مأة الف و أربعة و عشرین الفاو کان الرسل خمسة عشر و ثلاثمائة رجل فیهم او لهم آدم الی قوله آخر هم محمد."

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا حضرات انبیا ایک لاکھ 24 ہزار ہوئے ہیں اور رسول 315 جن میں سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام اور سب سے آخر میں محمد ﷺ ہیں۔

(3) علامہ رشید رضا اپنی تفسیر المنار میں لکھتے ہیں نبی وہ ہے جسے بذریعہ وحی الٰہی ان احکام واخبار سے آگاہ کیا جائے جن سے آگاہی انسانی کوشش سے ممکن نہ ہو اور رسول ایسا نبی ہے جسے اللہ نے تبلیغ دین ودعوت شریعت کے لیے بھیجا ہو اور اسے اپنی ذات کو دوسروں کے لیے عملی نمونہ بنانے کا حکم دیا ہو۔ رسول کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ جدید شریعت یا جدید کتاب بھی لے کر آیا ہو۔ مذکورہ تینوں اقوال بیان کرنے کے بعد قاضی زین العابدین لکھتے ہیں کہ ''بہرحال ان تینوں اقوال کی روشنی میں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ باعتبار ''دعوت'' اور ''مدعوئین'' کے ''نبی'' عام ہے اور ''رسول'' خاص لیکن باعتبار جنسیت داعی کے ''رسول'' عام ہے کہ اس کا اطلاق ''رسل بشر'' پر بھی ہوتا ہے اور رسل ملائکہ پر بھی اور ''نبی'' خاص کہ اس کا اطلاق رسل ملائکہ پر نہیں ہوتا''

(4) حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ''رسول اور نبی'' کے معنی کے فرق کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ رسول اور نبی کی تفسیر میں اقوال متعدد ہیں۔ تتبع آیات مختلفہ سے جو بات احقر کے نزدیک محقق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں کے مفہوم میں عموم وخصوص من وجہ ہے۔ رسول وہ ہے جو مخاطبین کو شریعتِ جدیدہ پہنچا دے۔ خواہ وہ شریعت اس رسول کے اعتبار سے بھی جدید ہو جیسے تورات وغیرہ یا صرف مرسل الیہم (جن کی طرف وہ رسول بھیجا گیا) کے اعتبار سے جدید ہو۔ جیسے اسماعیل علیہ السلام کی شریعت کہ وہی شریعت ابراہیمی تھی لیکن قوم جرہمیں اس کا علم حضرت اسماعیل ہی سے حاصل ہوا اور خواہ وہ رسول نبی ہو یا نبی نہ ہو جیسے ملائکہ کہ ان پر رسل کا اطلاق کیا گیا ہے اور وہ انبیا نہیں ہیں یا جیسے انبیا کے فرستادے اصحاب جیسا سورۂ یٰسٓ میں ہے۔ ﴿إِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ﴾ (یٰس : ۱۳)

اور نبی وہ ہے جو صاحب وحی ہو خواہ شریعت جدیدہ کی تبلیغ کرے یا شریعت قدیمہ کی جیسے اکثر انبیا بنی اسرائیل کہ شریعت موسویہ کی تبلیغ کرتے تھے۔ پس من وجہ وہ عام ہے۔ من وجہ یہ عام ہے۔ پس جن آیتوں میں دونوں جمع ہیں اس میں تو کوئی اشکال نہیں کہ عام وخاص کا جمع ہونا صحیح ہے اور جس موقع پر دونوں میں تقابل ہوا ہے جیسے ﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ﴾ (الحج آیت 52) چوں کہ عام وخاص مقابل ہوتے نہیں اس لیے وہاں نبی کو عام نہ لیں گے بلکہ خاص کر لیں گے مبلغ شریعت سابقہ کے ساتھ پس معنی یہ ہوں گے۔ ما ارسلنا من قبلك من صاحب شرع جدید و لا صاحب شرع غیر جدید۔ یعنی رسول کے معنی صاحب شرع جدید اور نبی کے صاحب شرع غیر جدید

(5) حضرت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نبی ورسول کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شریعت اسلامی میں نبی اس ہستی کو کہتے ہیں جسے حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے چن لیا ہو اور وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئی ہو اور رسول اس نبی کو کہا جاتا ہے جس کے پاس اللہ کی جانب نئی شریعت اور نئی کتاب بھیجی گئی ہو'

لفظ ''خاتم النّبیین''

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ اللہ پاک نے دیگر انبیا ورسل کو یا تو صرف اس عزت سے نوازا کہ انھیں نبی بنا کر بھیجا۔ بندوں کی ہدایت ان سے متعلق کر دی اور اللہ پاک ان انبیا سے ہم کلام ہوا۔ یا ان کو دو عزتوں سے نوازا کہ نبی رسول بنا کر بھیجا' جدید شریعت یا جدید کتاب یا دونوں بھی انھیں عنایت فرمائیں۔ حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے ان دو عزتوں کے علاوہ ایک تیسری ایسی عزت سے بھی نوازا جس سے اب تک کسی اور نبی یا نبی رسول کو نہیں نوازا تھا یعنی آپ کے خاتم النّبیین ہونے کی عزت کہ آپ پر سلسلۂ نبوت بھی ختم کر دیا اور آپ کے ذریعے اپنے دین کی تکمیل بھی فرما دی۔ والحمد للہ علی ذالک۔ اس مضمون کی تشریح کے سلسلے میں درج ذیل دو قرآنی آیتیں مرکزی حیثیت کی حامل ہیں: سورۃ الاحزاب کی درج ذیل آیت۔

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا﴾ (الاحزاب: 40)

''محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔''

اور سورۂ المائدہ کی درج ذیل آیت جس میں حضور ﷺ کے ہاتھوں اور آپ کی بعثت کے ذریعے تکمیل دین' انسانیت پر اتمام نعمت اور اسلام کی عالمگیریت واضح کی گئی ہے۔

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدہ: 3)

''آج کے دن میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں نے السلام کو تمھارا دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔''

اب ان مذکورہ دو قرآنی آیات میں ہمیں درج ذیل تشریح طلب امور پر غور کرنا چاہیے۔

1: حضور ﷺ کے لیے مردوں میں سے کسی کی اُبوۃِ صلبیہ کی نفی اور اُبوۃ روحانیہ کا اثبات: اس کی تشریح

2: لفظ خاتم کی دو قرأتیں: ان کے معنی اور تشریح

3: آیت میں خاتم المرسلین نہیں کہا گیا' بلکہ خاتم النّبیین کہا گیا: اس کی حکمت

4: تکمیل دین' اتمام نعمت اور اسلام کی عالم گیریت کی تشریح

اُبوۃِ صلبیہ و اُبوۃِ روحانیہ

اُبوہ۔ باپ ہونا' صلب' پشت۔ ابوۃِ صلبیہ' حقیقی باپ ہونا ابوۃ روحانیہ' بحیثیت مرشد وہادی و پیغمبر امت کا باپ ہونا۔ روحانی رشتہ سے ہر امتی کا باپ ہونا سورۃ الاحزاب کی آیت ۴۰ میں (جس کا ابھی ذکر ہوا) فرمایا گیا ہے کہ حضور ﷺ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں (آپ کے چار بیٹوں میں سے تین بیٹے نزولِ آیت سے پہلے بچپن ہی میں فوت ہوگئے تھے اور چوتھے بیٹے حضرت ابراہیم ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور وہ بھی چھوٹی عمر ہی میں فوت ہوئے۔ تو ان چاروں بیٹوں میں کوئی بھی پختہ عمر کو نہ پہنچ سکا کہ رجل (مرد) کہلاتا اور منہ بولا بیٹا (متبنّیٰ) صلبی جسمانی۔ حسی و حقیقی بیٹے کی طرح نہیں ہوتا کہ اس کی طلاق شدہ بیوی سے اس کے باپ کا نکاح صحیح نہ ہو یا اس کی موت کی صورت میں باپ کو اس کی میراث سے حصہ ملے یا ان کا نفقہ خرچ اس پر واجب ہو۔ یہ چیزیں تو حقیقی بیٹے کی صورت میں ہوتی ہیں۔ تو کفار کا یہ طعن صحیح نہیں کہ حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی مطلقہ بیوی' حضرت زینب بنت جحش کا نکاح حضور ﷺ کے ساتھ کیسے صحیح ہو گیا اور اس میں درحقیقت عظیم دینی مصلحت تھی کہ خوب واضح ہو جائے کہ متبنّیٰ کی مطلقہ کے ساتھ نکاح درست ہے)۔

اب رہا یہ شبہ کہ حضور ﷺ کو اگر اُبوۃ صلبیہ و جسمانیہ حاصل نہیں تو کیا کسی طرح کی ابوۃ (باپ ہونا) بھی حاصل نہیں۔ قرآن کریم نے ﴿وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ﴾ کہ کر اس شبہ کا ازالہ فرما دیا کہ نہیں ایسا نہیں بلکہ آپ کو تو ایسی ابوۃ روحانیہ تو یہ حاصل ہے کہ آپ کی روحانی اولاد (اُمتِ مسلمہ) تعداد میں بھی اربوں کھربوں (جسمانی اولاد کی طرح صرف چار نہیں) اور قوتِ کیفیہ کے اعتبار سے بھی ایسی کہ آپ کی اور آپ کے دین کی عزت و ناموس پر مر مٹنے کے لیے ہمہ وقت تیار۔ اور آپ صرف نبی یا صرف رسول ہوتے تو یہ عزت وقتی ہوتی۔ صرف ایک محدود وقت کے لیے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ بلکہ آپ پر سلسلۂ نبوت ختم ہے اور اس طرح یہ عزت آپ کے لیے قیامت تک کے لیے ہے۔

لفظ خاتم: دو قرأتیں

امام عاصم اور امام حسن نے لفظ خاتمیں ت کے زبر کے ساتھ محفوظ کیا ہے جب کہ دیگر تمام قرا نے ت کے زیر کے ساتھ۔ زبر کے ساتھ ہو تو لفظ خاتم بمعنی مہر ہے جب کہ زیر کے ساتھ ہو تو اس کے معنی ختم کرنے والا' آخر قوم۔ دونوں صورتوں میں معنی وہی آخری نبی کے ہیں جن کے بعد اور کوئی نبی نہ آئے' کیوں کہ مہر بھی آخر ہی میں لگائی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

﴿خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ وَ عَلٰی سَمْعِھِمْ﴾ (البقرہ: 7)

''اللہ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر۔''

یعنی اب کوئی خیر و بھلائی کی چیز ان سیاہ قلوب والے کافروں کے اندر داخل نہیں ہو سکتی۔ علامہ زمخشریؒ اپنی مشہور عالم تفسیر کشاف میں فرماتے ہیں کہ ''خاتم: ت کے زبر کے ساتھ' بمعنی آلہ مہر اور ت کے زیر کے ساتھ بمعنی مہر کرنے والا یا ختم کرنے والا اور اسی دوسرے معنی کی تقویت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت ولکن نبیا ختم النّبیین سے ہوتی ہے۔ اگر آپ کو یہ شبہ ہو کہ حضور ﷺ کو خاتم الانبیا بھلا کیسے کہتے ہیں جب کہ حسب روایت حضرت عیسیٰ علیہ السلام آخری زمانے میں نزول کریں گے تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ آخر الانبیا کے معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی شخص نبی نہیں بنایا جائے گا جب کہ حضرت عیسیٰ تو ان میں سے ہیں جنھیں آپ سے پہلے نبی بنایا گیا''

اور حضرت امام غزالیؒ کتاب الاقتصاد میں فرماتے ہیں۔

"ان الامة قد فهمت من هذااللفظ انه افهم عدم نبی بعده ابداً و عدم رسول بعده ابداً وانه ليس فيه تاويل و لا تخصيص فكلامه' من انواع الهذيان لايمنع الحكم بتكفيره لانه مكذب بهذا النص الذى اجمعت الامة على انه غير ماول ولا مخصوص.

پوری امت نے اس خاتم النّبیین کے لفظ سے یہی سمجھا ہے کہ نہ کبھی آئندہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کبھی رسول آئے گا۔ اس میں نہ کسی تاویل کی گنجائش ہے نہ کسی تخصیص کی۔ اگر کوئی اس لفظ کی تاویل کرے تو اسے ہذیان اور دماغی خلل کہا جائے گا اور یہ تاویل اسے کافر کہے جانے سے نہیں روک سکتی کیوں کہ وہ ایسی نص قرآنی کو جھٹلا رہا ہے جس کی نہ تاویل ہو سکتی ہے اور نہ جس میں کسی تخصیص کی گنجائش ہے۔

خاتم المرسلین نہ کہنے کی حکمت

قرآن کریم کی اس آیت میں ابتداءً لفظ رسول استعمال ہوا ہے (ولکن رسول اللہ) تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسی آیت کے دوسرے حصہ میں لفظ خاتم المرسلین کہا جاتا تو مناسب ہوتا لیکن اس کی بجائے لفظ خاتم النّبیین استعمال کیا گیا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ لفظ خاتم المرسلین کے استعمال کے بعد اس کی گنجائش رہتی کہ حضور ﷺ کے بعد کوئی رسول (جدید شریعت یا جدید کتاب والا) تو نہیں آسکتا مگر آپ کے بعد شاید کوئی نبی آسکتا ہو جو جدید شریعت یا جدید کتاب والا نہ ہو مگر نبی ہو تو لفظ ''خاتم النّبیین''

سے اس کی بھی نفی ہوگئی کہ آپ کے بعد نہ کوئی جدید شریعت یا جدید کتاب والا نبی آ سکتا ہے نہ قدیم شریعت والا عام نبی۔ تو لفظ خاتم النّبیین میں زیادہ بلاغت ہے اور زیادہ عموم اس لیے بجائے خاتم المرسلین یہ لفظ استعمال کیا گیا۔ حضرت مولانا مفتی شفیعؒ فرماتے ہیں کہ ''اوپر آنحضرت ﷺ کا ذکر بصفت رسول آیا ہے۔ ان کے لیے بظاہر مناسب یہ تھا کہ آگے ''خاتم الرسل'' یا خاتم المرسلین کا لفظ استعمال ہوتا مگر قرآن کریم نے اس کے بجائے خاتم النّبیین کا لفظ اختیار فرمایا۔ وجہ یہ ہے کہ جمہور علما کے نزدیک نبی اور رسول میں ایک فرق ہے وہ یہ کہ نبی تو ہر اس شخص کو کہا جا سکتا ہے جسے حق تعالیٰ اصلاح خلق کے لیے مخاطب فرمائیں اور اپنی وحی سے مشرف فرمائیں خواہ اس کے لیے کوئی مستقل کتاب اور مستقل شریعت تجویز کریں یا پہلے ہی نبی کی کتاب و شریعت کے تابع لوگوں کو ہدایت کرنے پر مامور ہو۔ جیسے ہارون علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب و شریعت کے تابع ہدایت کرنے پر مامور تھے اور لفظ رسول خاص اس نبی کے لیے بولا جاتا ہے جسے مستقل کتاب و شریعت دی گئی ہو۔ اسی طرح لفظ نبی کے مفہوم میں بہ نسبت لفظِ رسول کے عموم زیادہ ہے تو آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ آپ ﷺ انبیا کے ختم کرنے والے اور سب سے آخر میں ہیں خواہ وہ صاحب شریعت نبی ہوں یا صرف پہلے نبی کے تابع۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کی جتنی قسمیں اللہ کے نزدیک ہوسکتی ہیں وہ سب آپ پر ختم ہوگئیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی مبعوث نہیں ہوگا۔''

تکمیل دین، اتمام نعمت، السلام کی عالم گیریت

ختم نبوت کے سلسلے میں اوپر جو دو قرآنی آیات نقل کی گئیں اب تک ان میں سے پہلی آیت (سورۃ الاحزاب، آیت 40) کے درج ذیل تین پہلو واضح کیے گئے۔

1: رجال میں حضور ﷺ کی جسمانی ابوۃ کی نفی اور روحانی ابوۃ کا اثبات۔

2: لفظ خاتم النّبیین میں لفظ خاتم کی ت کے زبر اور زیر کی دو قرأتیں

3: آیت قرآنی میں بجائے خاتم المرسلین کے خاتم النّبیین کہنے کی حکمت

اب ختم نبوت کے سلسلے کی اُوپر مذکورہ دوسری آیت (سورۃ مائدہ۔ آیت 3) کے متعلق عرض کیا جاتا ہے۔ اس میں ختم نبوت کے تین اسباب بیان کیے ہیں۔

1۔ تکمیلِ دین: بعثت انبیا کا مقصد انسانوں کو احکام الٰہی پہنچانا اور دین کی ارتقائی تکمیل تھی۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری سے وہ مقصد پورا ہوگیا تو آپ کو خاتم النّبیین بنا کر سلسلہ ختم کر دیا گیا۔

2۔ اتمام نعمت: اللہ پاک کی جانب سے انسانوں کو ہدایت ملنا اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت تھی اور زندگی کے ہر پہلو سے متعلق ایک بہت ہی کامل و مکمل ہدایت کہ حل کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے درحقیقت اس نعمت کا اتمام ہے۔

3۔ اسلام کی عالم گیریت:

اب تک پیغمبر کسی خاص خطۂ ارضی کے لیے آتے یا کسی مخصوص مدت کے لیے اور پھر اس خطے میں یا اس پیغمبر کی مدت ہدایت گزرنے پر وہ دین منسوخ ہو جاتا اور نیا پیغمبر بھیجا جاتا لیکن حضور ﷺ کو ہر دور اور ہر خطہ ارضی کے لیے مبعوث کیا گیا۔

حضور ﷺ کی تشریف آوری سے بعثت انبیا کے یہ تینوں مقاصد پورے ہوگئے تو آپ پر سلسلۂ ختم نبوت کو ختم کر دیا گیا۔ حضور ﷺ نے اسے ایک تمثیل کے ذریعہ سمجھایا۔ حدیث شریف میں آپ نے ارشاد فرمایا:

''مثلی و مثل الانبیاءؑ کمثل قصرٍ احسن بنیانہ' ترك منه موضع لبنة فطاف به النظار يتعجبون من حسن بنيانه الا موضع تلك اللبنة فكنت انا سددت موضع اللبنة ختم بى البنيان و ختم بى الرسل و فى رواية فانا اللبنة وانا خاتم النّبيين.''

میری اور دوسرے تمام انبیا کی مثال اس محل جیسی ہے جس کے در و دیوار نہایت شاندار اور عمدہ ہوں لیکن اس دیوار میں ایک اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی ہو اور جب لوگ اس محل کے گرد پھر کر عمارت کو دیکھیں تو عمارت کی شان و شوکت اور در و دیوار کی خوش نمائی انھیں حیرت میں ڈال دے مگر ایک اینٹ کے بقدر اس خالی جگہ کو دیکھ کر انھیں سخت تعجب ہو۔ پس میں اس اینٹ کی جگہ کو بھرنے والا ہوں۔ اس عمارت کی تکمیل میری ذات سے ہے اور مجھ پر انبیا و رسل کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے۔ اور ایک روایت میں ہے میں ہی وہ اینٹ ہوں (جس کی جگہ خالی رکھی گئی تھی) اور میں ہی نبیوں کی آمد کے اس سلسلے کو ختم کرنے والا ہوں۔''

اس طرح ختم نبوت اور تکمیل دین کو حضور ﷺ نے نفسیاتی طریقے سے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا۔ دین کی ارتقائی تکمیل کے متعلق علامہ ابو محمد عبدالحق حقانی دہلویؒ لکھتے ہیں کہ ''آپ سے پہلے سیکڑوں انبیا دنیا میں آئے اور گم راہی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ طرح بطرح احکام کے تبدیل و تغیر کرنے سے اصلاحیں ہوتی رہیں۔ آخر جو کچھ کسر باقی رہ گئی تھی وہ آپ کے عہد میں پوری کر دی گئی۔ رہیں نئی پیش آنے والی ضرورتیں ان کی تدبیر بھی کتاب و سنت میں رکھ دی گئی ہے۔ وقتاً فوقتاً مجتہد یا مجتہد یا حکیم امت کتاب و سنت سے وہ حاجت برآری کر سکتے ہیں۔ نئے نبی بھیجنے میں سیاستِ ملیہ میں بڑا انقلاب واقع ہوتا ہے جس میں ہزاروں گم راہ ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس مشقت اور رحمت کو اپنے بندوں سے دُور کر دیا جس کی طرف وکان اللہ بکل شئی علیما میں اشارہ ہے کہ عواقب امور اللہ کی نظر میں ہیں اس کی مصلحت وہ خوب جانتا ہے...... بندوں پر خدا نے ایسے نبی کے بھیجنے سے بڑا احسان کیا ہے۔ اس لیے اس نعمت کے شکریے میں حکم دیتا ہے۔ کہ اے ایمان والو! اللہ کو بہت یاد کیا کرو اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اور بعثت انبیا سے مقصود بھی یہی ہے کہ بندے اپنے اللہ کو یاد کیا کریں''

ہدایت کے اس ارتقائی عمل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حضور ﷺ سے پہلے کسی بھی پیغمبر کا دین کبھی ناقص بھی تھا۔ آپ ﷺ سے پہلے بھی ہر پیغمبر کا دین کامل تھا مگر ان کے اپنے اپنے دَور کے لیے اور ایک مخصوص مدت کے لیے۔ جب نئے معاشی و معاشرتی مسائل ابھرتے اور ایک مخصوص مدت کے بعد علم الٰہی میں ایک نئے نبی کی بعثت منظور ہوتی۔ نیا نبی یا رسول بھیج دیا جاتا اور پہلے نبی کی شریعت منسوخ ہو جاتی، تا آنکہ عقل

انسانی اور دینی و معاشرتی شعور ایک ایسے مقام پر آ گئے کہ وہ احکام و بنیادی اصول بتا دیئے گئے اور حضور ﷺ کے ذریعے وہ ابدی حقائق واضح کر دیئے گئے کہ اب قیامت تک ان کی روشنی میں پاکیزہ دینی زندگی گزاری جا سکتی ہے اور کسی نئے پیغمبر کی ضرورت باقی نہیں رہی چنانچہ حضرت قفال مروزیؒ فرماتے ہیں کہ ''اللہ کا دین کبھی ناقص نہیں تھا بلکہ ہمیشہ سے کامل تھا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل شریعتیں اپنے اپنے وقت میں بالکل کامل اور کافی تھیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو بعثت کے شروع وقت ہی میں اس بات کا علم تھا کہ جو شریعت آج کامل و مکمل ہے کل نہ وہ ایسی کامل رہے گی اور نہ اس آیندہ دور کے لیے کافی۔ اس لیے اسے ایک خاص مقرر وقت پر پہنچ کر منسوخ کر دیا جاتا تھا لیکن آخری زمانے کی بعثت کے وقت اللہ تعالیٰ نے ایسی کامل شریعت نازل فرمائی جو ہر دور کے لیے کامل ہو اور قیامت تک اس کے باقی رہنے کا حکم فرمایا۔ تو اللہ کی شریعت ہمیشہ کامل تھی لیکن مخصوص ایام تک اور یہ حضور ﷺ کے ذریعے بھیجی ہوئی شریعت قیامت تک کے لیے کامل و مکمل ہے۔ تو اسی معنی کی بنا پر آیت کریمہ میں ارشاد فرمایا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ کہ آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین کامل کر دیا۔''

تکمیل دین، تین پہلو

تکمیل دین کے مفہوم کے تین درج ذیل پہلو ہیں:

1۔ یہ دین اسلام ایک محدود و مختصر مدت کے لیے نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے کامل و مکمل ہے۔

2۔ یہ دین اسلام انسانی زندگی کے محدود و مخصوص معاشرتی مسائل ہی کا حل نہیں بلکہ اس میں حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں، دینی، دنیاوی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، مادی، روحانی، انفرادی، اجتماعی، عدالتی وغیرہ جملہ مسائل کا حل موجود ہے۔

3۔ یہ دین اسلام کسی مخصوص خطے یا ملک یا کسی متعین معاشرے ہی کے لیے نہیں بلکہ دنیا کے ہر ہر خطے، ہر ہر ملک اور ہر ہر معاشرے کے لیے ہے۔

ان میں سے پہلے پہلو پر ہم اوپر تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔ دوسرے پہلو پر گفتگو کرنے سے پہلے ہمیں حیاتِ انسانی کے مختلف مظاہر اور مختلف شعبوں کی نشان دہی کرنا ہوگی اور اس نشان دہی کے بعد یہ وضاحت سے بیان کرنا ہوگا کہ ان مختلف شعبۂ ہائے حیات میں مختلف مسائل اور مشکلات کے جو حل اسلام نے پیش کیے ہیں وہ دیگر نظام ہائے حیات کے پیش کردہ حل سے کن وجوہ کی بنا پر بہتر اور مثالی ہیں۔

اسلام نے جس نظر سے انسانی حیات کو دیکھا ہے اس کی رو سے حیات کے درج ذیل اہم شعبے بنتے ہیں کہ اگر ان شعبوں میں اسلام کی بتائی ہوئی ہدایات پر عمل کر لیا جائے تو ایک مثالی اور کامیاب فرد اور ایک مثالی اور کامیاب و خوش حال معاشرہ تشکیل پا سکتا ہے۔

1۔ فکری اصلاح

انسان عقائد کے شعبے میں اپنی اصلاح کرے کہ اسلام کے بتائے ہوئے سات بنیادی عقائد۔ اللہ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان، رسولوں پر ایمان، یوم آخرت پر ایمان، قدر پر ایمان کہ جملہ افعال نیک و بد اللہ کی خلق ہیں اور بندہ کو ان کا فاعل و کاسب ہونے کی بنا پر اچھے اور برے نتیجے ملتے ہیں اور اخیراً موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے پر ایمان، جب دنیاوی زندگی کے اچھے اور برے اعمال کے پورے طور پر عملاً اچھے اور برے نتائج سے انسان دوچار ہوگا۔ یہ سات بنیادی تصورات و عقائد۔ انسان کے قلب و ذہن میں گھر کر لیں اور اس کے عمل کو ایک خاص پاکیزہ ڈگر پر ڈال دیں۔

2۔ ظاہری عبادات کی اصلاح

نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ظاہری عبادات کی ایسی اصلاح کہ یہ تمام عبادات قرآنی آیات، ہدایات نبوی اور فقہی تقاضوں سے ہم آہنگ حرام و مکروہ سے پاک اور فرائض و سنن و مستحبات سے مزین ہو جائیں۔

3۔ باطنی عبادات کی اصلاح:

تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر و شکر وغیرہ باطنی عبادات سنور جائیں اور انسان روزہ، نماز وغیرہ عبادات کے بعد قلب کا نور اور باطن کا اطمینان محسوس کرنے لگے۔

4۔ معاملات کی اصلاح:

باہم مالی لین دین، نکاح، طلاق وعدت وغیرہ، خصومات مقدمات و عدالتی امور وغیرہ، امانتوں کی سپردگی وغیرہ، وراثت و ترکے کے سلسلے میں عدل، سیاسی و معاشی امور میں اسلامی ہدایات کی روشنی میں عمل۔ غرض ایسے جملہ معاملات میں جہاں انسانوں کا باہم ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے انسان عدل و دیانت سے کام لے۔

5۔ حقوق و فرائض کی ادائیگی اور معاشرتی ذمہ داریوں کی اصلاح:

ماں باپ، اولاد، اقربا، پڑوسی، بیمار، یتیم، مہمان، ماتحت اہل کار، حاجت مند، بیواؤں، غریبوں، تمام مسلمانوں، غیر مسلم اقلیتوں حتیٰ کہ جانوروں تک کے حقوق کی رعایت۔

6۔ اخلاقی رویوں کی اصلاح اور رذائل اخلاق سے اجتناب:

صدق، دیانت و امانت عفو و درگزر، خوش گفتاری، تواضع و انکساری، حق گوئی و استقامت، رحم و احسان وغیرہ کی پاس داری اور بے شرمی، جھوٹ، حرص، بغض و کینہ، بہتان و ظلم وغیرہ سے اجتناب و پرہیز۔

7۔ معاشرتی آداب کی اصلاح:

کھانے پینے، گفتگو کرنے، ملاقات کرنے، چلنے پھرنے، سیر سفر کرنے، سونے، غم خوشی وغیرہ منانے کے شرعی اور اسلامی آداب۔

مندرجہ بالا سات عنوانات کے تحت حیاتِ انسانی کا تقریباً ہر شعبہ آ جاتا ہے اور قرآن کریم اور کتب احادیث و فقہ میں ان سب کے لیے تفصیلی ہدایات موجود ہیں۔ اس طرح تکمیلِ دین کا یہ پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے کہ اللہ پاک نے حضور خاتم النّبیین ﷺ کے ذریعے دین اسلام کو ایسا کامل و مکمل فرما دیا ہے کہ ہر شعبۂ حیات کے لیے اس سے راہ نمائی لی جا سکتی ہے۔ درج ذیل قرآنی آیت میں تکمیلِ دین کے

اسی پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے۔

﴿وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل: 89)

''اور ہم نے آپ پر قرآن اُتارا ہے کہ تمام باتوں کا بیان کرنے والا ہے اور مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور خوش خبری سنانے والا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

"قدبین لنا فی هذا القران کل علم و کل شیٔ ."

''اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے اس قرآن میں ہر علم اور ہر شے بیان فرمادی ہے۔''

حضرت مجاہد فرماتے ہیں کل حلال و کل حرام (اس میں ہر حلال و ہر حرام چیز کا بیان ہے۔)

ان دونوں اقوال کا موازنہ کرتے ہوئے ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ ''اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول زیادہ عام اور زیادہ ہمہ گیر ہے اس لیے کہ قرآن کریم میں ہر مفید علم موجود ہے خواہ وہ گزشتہ ادوار کی خبریں ہوں یا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کا علم اور ہر حلال وحرام کا علم اور ہر اس چیز کا علم اس میں موجود ہے کہ جس کی طرف انسانوں کو اپنے دنیاوی اُمور دینی اُمور یا معاش و معاد کے اُمور کی احتیاج ہوتی ہے۔''

بعض مفسرین نے آیت کی تشریح دوسری طرح کی ہے۔ علامہ عبدالحق حقانیؒ فرماتے ہیں کہ ''قرآن کے بعد اور کوئی کتاب نہیں آنے کی۔ پھر اس میں سب دینی مسائل نہ ہوں تو کیا ہو۔ ''تبیان'' یعنی کھول کر بیان کرنا۔ قرآن کا سب مسائل کا حاوی ہونا دو وکیلوں کے ذریعے سے ہے: اول سنت یعنی جو کچھ قرآن کے بعد مسائل تھے انھیں ان کے اصل مودوعہ سے جو قرآن میں ودیعت رکھی گئی ہیں رسول ﷺ نے بیان کر دیا اور جو ان سے بھی بچی انھیں مجتہدین نے استنباط کر کے بیان کر دیا اور آیندہ استنباط کے اصول فقہ میں قواعد مقرر کر دیئے۔ اس اعتبار سے مجتہدین بھی قرآن کے وکیل یا ترجمان ہیں۔ غیر مجتہد پر بضرورت ان کی تقلید کرنا قرآن کو ماننا ہے۔ (حاشیہ) بہت سے مسائل نصوص قرآنیہ میں نہیں۔ ہاں احادیث میں ہیں۔ اس طرح بہت سے احادیث میں بھی نہیں وہ استنباطِ قرآن واحادیث سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس مقام پر بیضاوی وغیرہ کہتے ہیں "من اُمور الدین علی التفصیل اَوالا جمال بالا حالة الی السنة والقیاس" (دینی اُمور تفصیلی واجمالی جو سنت وقیاس کی طرف پھیر دیئے جائیں)''

تکمیل دین کا تیسرا پہلو اسلام کی عالم گیریت اور حضور ﷺ کی بعثت کا دنیا کے ہر خطے اور ہر ملک و براعظم کے لیے ہونا اور آپ کا تمام جہاں والوں کے لیے رحمت ہونا ہے۔ مشہور آیت ہے:

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾ (الانبیا: 107)

اور ہم نے (ایسے مضامین میں نافعہ دے کر) آپ کو اور کسی بات کے واسطے نہیں بھیجا مگر دنیا جہاں کے لوگوں (یعنی مکلفین) پر مہربانی کرنے کے لیے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''عالمین عالم کی جمع ہے جس میں ساری مخلوقات' انسان' جن' حیوانات' نباتات' جمادات' سب ہی داخل ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ان سب چیزوں کے لیے رحمت ہونا اس طرح ہے کہ تمام کائنات کی حقیقی روح اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت ہے۔ اور جب ذکر اللہ وعبادت کا ان سب چیزوں کی روح ہونا معلوم ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ کا ان سب چیزوں کے لیے رحمت ہونا خود بخود ظاہر ہوگیا۔ کیوں کہ اس دنیا میں قیامت تک ذکر اللہ اور عبادت آپ ہی کے دم قدم اور تعلیمات سے قائم ہے۔''

اور رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ آپ ﷺ کے رحمة للعالمین ہونے کا ایک دوسرا پہلو بیان فرماتے ہیں۔

"من اٰمن باللہ والیوم الآخر کتب له الرحمة فی الدنیا و الآخرة ومن لم یؤمن باللہ و رسوله عوفی مما اصاب الامم من الخسف والقذف."

جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لایا آپ اس کے لیے اس طرح رحمت ہیں کہ اس مومن کے لیے دنیا و آخرت دونوں جگہ رحمت ہے اور جو نہ ایمان لایا آپ اس کے لیے اس طرح رحمت ہیں کہ گذشتہ پیغمبروں کی اُمت میں ایمان نہ لانے والوں کو زمین میں دھنسا دیا جاتا یا پتھروں کی بارش سے تباہ کر دیا جاتا تھا جب کہ حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اس طرح کے عذاب منسوخ ہوگئے (تو اس طرح حضور ﷺ گویا اپنے مخالفین کے لیے بھی رحمت ہوگئے)۔

حضور ﷺ کی بعثت عامہ اور دنیا کے ہر ہر خطے کے لیے آپ ﷺ کے رسول ہونے کو دوسری جگہ قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (السباء: 28)

''اور ہم نے تو آپ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے (ایمان لانے پر اور انھیں ہماری رضا اور ثواب کی) خوش خبری سنانے والے اور (ایمان نہ لانے پر انھیں ہمارے غضب وعذاب سے) ڈرانے والے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کے سلسلے میں ارشاد فرمایا:

"ان اللہ تعالیٰ فضّل محمدًا ﷺ علی اهل السماء وعلی الانبیا."

''اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو اہل آسمان وانبیا پر فضیلت عطا فرمائی۔''

لوگوں نے پوچھا کہ اے ابن عباس! اللہ نے آپ ﷺ کو انبیا پر کیسے فضیلت عطا فرمائی تو انھوں نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ نے دیگر انبیا کے لیے فرمایا (ابراہیم: آیت 14) اور ہم نے تمام پہلے پیغمبروں کو انھی کی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا تا کہ ان سے احکام الٰہیہ کو بیان کریں (تو ان جملہ انبیا کے لیے لفظ قوم استعمال کیا) جب کہ اللہ

پاک نے حضور ﷺ کو اس آیت میں اس طرح خطاب فرمایا" اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے واسطے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن و انس سب کی طرف بھیجا ہے۔" چنانچہ حضور ﷺ حدیث شریف میں ارشاد فرماتے ہیں۔

"وَكان النبي يُبعث الى قومه وَ بُعثتُ الى الناس عامةً ."

"اور نبی کو مجھ سے پہلے خاص اس کی قوم ہی کی طرف بھیجا جاتا تھا جب کہ میری بعثت دنیا کے تمام لوگوں کی طرف ہے۔"

"وَاُرسلت الى الخلق كافة وختم بى النبيون ."

"اور مجھے جمیع مخلوق کی طرف بھیجا گیا ہے اور مجھ پر انبیا کا خاتمہ کر دیا گیا ہے کہ آئندہ نبی نہیں آئے گا۔"

اس تفصیل سے تکمیل دین کے تینوں پہلو واضح ہو گئے (1) آپ کا لایا ہوا اللہ پاک کا دین اسلام اس اعتبار سے بھی کامل و مکمل کہ دیگر ادیان و دیگر انبیا ایک محدود اور مختصر مدت کے لیے ہوتے جب کہ آپ کا یہ دین اسلام قیامت تک کے لیے ہے۔ (2) دیگر انبیا علیہم السلام کی شریعتیں انسانی مسائل کا ایسا کامل و مکمل احاطہ نہ کرتی تھیں جیسا کہ شریعت محمدی نے کامل احاطہ کیا اور ہر شعبۂ حیات کا انتہائی مکمل حل پیش کیا۔ (3) اور تیسرا پہلو کہ دیگر انبیا مخصوص انسانی آبادیوں کی طرف بھیجے جاتے اور ایک مخصوص مدت کے بعد ان کا دین منسوخ ہو جاتا اور نیا نبی آ جاتا جب کہ آپ کا لایا ہوا دین اسلام دنیا کے ہر ہر خطے ہر ہر ملک اور ہر ہر دور کے لیے ہے اور اس لیے آپ کے بعد کسی طرح کا کوئی نبی نہیں آئے گا۔

جھوٹے مدعیانِ نبوت

جھوٹی نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کے متعلق حضور ﷺ نے احادیث میں پیش گوئی فرما دی تھی کہ آئندہ ایک ایسا فتنہ بھی اُبھرنے والا ہے تاکہ مسلمان اس کے استیصال سے غفلت نہ برتیں۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:

"لا تقوم الساعة حتّٰى يبعث دجالون كذابون قريباً من ثلاثين كلهم يزع انّه رسول الله ."

قیامت اُس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک تیس کے قریب جھوٹے دجال ظاہر نہ ہو جائیں کہ ان میں سے ہر ایک گمان کرے گا کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔

اور مسلم شریف ہی میں حضرت ثوبانؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

"سيكون فى امتى كذابون ثلاثون كلهم يزعم انّهٗ نبى وا نا خاتم النّبيين لا نبى بعدى ."

عن قریب میری اُمت میں تیس جھوٹے ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک کا گمان ہوگا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں خاتم النّبیین ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ربیع الاول ۱۱ھ حضور ﷺ کے وصال کے بعد مسلمانوں کے انتخاب سے خلیفہ مقرر ہوئے اور 21 جمادی الثانی 13ھ اپنے انتقال تک دو سال تین ماہ دس دن مسلمانوں کی یہ عظیم خدمت انجام دیتے رہے۔

اقتدار سنبھالتے ہی آپ کو بعض درج ذیل اہم مسائل کا سامنا کرنا پڑا کہ اگر وہ ان کے فوری حل کی طرف پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ متوجہ نہ ہوتے تو اِسلام کے وجود کو بڑا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا!

1: تحفظ دین و تدوین قرآن
2: اندرُونی شورش و بدامنی کا خاتمہ
3: رومیوں کے مقابلے میں مہم اسامہ بن زید کی تکمیل
4: مدعیان نبوت کے خلاف جہاد
5: منکرین زکوٰۃ کی تادیب وارتداد کا استیصال

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے مدعیان نبوت کے خلاف پورے عزم و حوصلے سے جہاد کیا اور اس میں انھیں نمایاں کامیابی بھی ہوئی۔ حضور ﷺ کے دور ہی میں بعض جھوٹے نبی پیدا ہو گئے تھے مثلاً اسود عنسی' مسیلمہ کذاب وطلیحہ بن خویلد وغیرہ اور ان میں سے بعض مثلاً اسود عنسی (جو بقول حضرت عروہ حضور ﷺ کی وفات سے ایک دن ایک رات قبل مارا گیا اور بذریعہ وحی آپ کو اس کے قتل کی خبر دی گئی) آپ کے دور میں ختم بھی ہو گئے لیکن ان کے خلاف اصل معرکے عہد صدیقی ہی میں ہوئے۔

(1) اسود عنسی سَوَّدَ اللہ وجہہٗ

جب اسود عنسی نے نبوت کا دعویٰ کیا تو حضور ﷺ نے حضرت فیروز دیلمی کو اس کے قتل کے لیے یمن روانہ فرمایا تھا اور وہ ذلت کے ساتھ مارا گیا۔ شاعر عبدالرحمٰن ثمالی نے درج ذیل اشعار میں اسی طرف اشارہ کیا ہے:

وقال رسول الله سيروا لقتله
على خبر موعود واسعد السعد

آنحضرت ﷺ نے فرمایا اس کے قتل کے لیے جاؤ اور اچھے وعدے اور خوش نصیبی کی خبر دی۔

فَسِرنا اليه فى فوارس بهمةٍ
على حين امر من و صاة محمد

چنانچہ ہم چند سواروں کے ہم راہ اس کے قتل کے لیے روانہ ہو گئے آپ کے حکم و وصیت کی تعمیل کے لیے بعض مورخین مثلاً طبری و ابن اثیر کی تحقیق کے مطابق اسود عنسی کی جماعت میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور اپنے ہی ایک ساتھی قیس بن مکشوح کے ہاتھوں وہ حالتِ نشہ میں مارا گیا۔

اس کا نام عبہلہ بن کعب تھا۔ چوں کہ چہرہ چھپا کر چلتا تھا اس لیے اسود ذوالخمار کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ خمار عورتوں کی اوڑھنی کو کہتے ہیں۔ پوشیدہ شے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یعنی چھپے چہرے والا۔ اس کے پاس سحیق و شقیق نامی دو مسخر شیطان تھے۔ حضور ﷺ کے یمن کے عامل باذان کا جب انتقال ہوا تو ان شیطانوں یا کسی نے باذان کے انتقال کی خبر دی تو اس نے یمن کی حکومت پر قبضہ کر لیا' اور باذان کی بیوہ

مرزبانہ سے شادی کرلی۔ مرزبانہ دل سے اس شادی پر راضی نہ تھی اور بالآخر حضرت فیروز دیلمیؓ کی مدد سے اسود عنسی سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کام یاب ہوگئی۔

(2) طلیحہ بن خویلد اسدی:

یہ ایک عامل و فال گو تھا۔ پھر مسلمان ہوا۔ حضور ﷺ کے آخری دور میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ حضور ﷺ نے حضرت ضرار بن الازورؓ کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا مگر ابھی یہ عسکری مہم ختم نہ ہوئی تھی کہ حضور ﷺ کی وفات کی خبر مشہور ہوئی اور حضرت ضرارؓ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔ طلیحہ اسدی نے اس فرصت کو غنیمت جانا اور غطفان، ہوازن بنو طے وغیرہ متعدد قبائل کو اپنے ساتھ ملا لیا اور نجد کے چشمے پر اپنا کیمپ قائم کر کے ایک بہت بڑی جمعیت اکٹھا کرلی اور مسلمانوں سے مقابلہ کی تیاری کرنے لگا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ملک کی اندرونی گڑبڑ دور کرنے کے لیے گیارہ نام ور بہادروں اور دانش وروں کا انتخاب فرمایا، گیارہ جھنڈے تیار کرائے، ہر ایک کو بطور نشانی ایک ایک جھنڈا دیا اور انھیں درج ذیل مختلف جہتوں کی طرف روانہ فرمایا۔

1: حضرت خالد بن ولیدؓ کو طلیحہ بن خویلد اور مالک بن نویرہ کے استیصال کے لیے نجد و بطاح کی طرف۔
2: حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کو مسیلمہ کذاب کے استیصال کے لیے یمامہ کی طرف
3: حضرت شرجیل بن حسنہؓ کو اولاً عکرمہؓ کی امداد اور ثانیاً بنو کندہ و بنو قضاعہ کو زیر کرنے کے لیے حضرموت کی طرف۔
4: حضرت خالدؓ بن سعید بن العاص کو باغی قبائل کی سرکوبی کے لیے سرحدِ شام کی طرف۔
5: حضرت عمرو بن العاصؓ کو مرتدین کی سرکوبی کے لیے بنو قضاعہ کی طرف۔
6: حضرت حذیفہ بن محسنؓ کو شریروں کو سبق سکھانے کے لیے عمان کی طرف۔
7: حضرت عرفجہ بن ہرثمہؓ کو دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے اہل مہرہ کی طرف۔
8: حضرت طریفہ بن حاجزؓ کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے بنو سلیم و بنو ہوازن کی طرف۔
9: حضرت سوید بن مقرنؓ کو مخالفین اور دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے تہامہ یمن کی طرف۔
10: حضرت علاء بن الحضرمیؓ کو شریروں کی سرکوبی کے لیے بحرین کی طرف
11: حضرت مہاجرین اُمیہؓ کو دشمنوں کو زیر کرنے کے لیے صنعا کی طرف

ماہ جمادی الاول ۱۱ھ میں (حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اقتدار سنبھالنے کے صرف دو ماہ بعد) یہ حضرات مدینہ منورہ سے اپنے اپنے مشن پر روانہ ہوئے۔

حضرت خالدؓ بن ولید کی ڈیوٹی اوّلاً اسی مدعی نبوت طلیحہ بن خویلد اسدی کی سرکوبی کے لیے لگی تھی چنانچہ اس مقصد کے لیے وہ بزاخہ (نجد) کی طرف روانہ ہوئے۔ حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدیؓ بن حاتم جو پہلے ہی اپنے قبیلے طے کے کئی شریروں کو سمجھانے کے بعد اپنے کام یاب مشن کے بعد لوٹ رہے تھے وہ بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ حضرت خالدؓ بن ولید سے آملے اور اس طرح مدعی نبوت پر زبردست حملہ ہوا۔ اس کی فوج کے متعدد سپاہی مارے گئے بہت سے بھاگ گئے اور کچھ گرفتار ہوئے۔ خود طلیحہ اپنی بیوی کے ساتھ شام کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ حکومت میں مدینہ واپس آیا اور آپ کے ہاتھ پر دوبارہ مسلمان ہوا۔

(3) مسیلمہ کذاب:

9ھ اور 10ھ میں اہم مذاکرات کے لیے ملک کے مختلف حصوں اور بیرونی ممالک سے جو وفود حضور ﷺ کے پاس مدینہ آئے ان میں وفد بنی حنیفہ کو اس لیے اہمیت حاصل ہے کہ اس میں مدعی نبوت مسیلمہ کذاب بھی شامل تھا گو 9ھ میں جب وہ وفد کے ساتھ مدینہ آیا۔ ابھی تک اس نے دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا جو اس وفد کے ناکام مذاکرات کے بعد کیا۔ یہ وفد سترہ افراد پر مشتمل تھا۔ سولہ افراد حضور ﷺ کی خدمت میں آکر مشرف بہ اسلام ہوئے جب کہ مسیلمہ تکبر کی وجہ سے آپ کے پاس نہ آیا۔ حضور ﷺ دارِ بنت الحارث اس کے پاس تشریف لے گئے جہاں مدینہ میں اس کا قیام تھا اور مسیلمہ کی بیوی کیسہ بنت الحارث بن کریز کا گھر تھا جہاں مسیلمہ آکر ٹھہرا تھا۔ جب حضور ﷺ تبلیغ السلام کے لیے مسیلمہ کے پاس آئے تو خطیب رسول اللہ ﷺ حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ آپ کے ہم راہ تھے۔ آپ نے جب اسے دعوتِ اسلام دی تو وہ کہنے لگا۔

"اِن شئتَ خلّيتَ بيننا وبين الامر ثم جعلتَه' لنا بعدك ."

اگر آپ چاہیں تو آپ ہمارے اور اس نبوت کے درمیان حائل نہ ہوں۔ پھر اپنے بعد یہ نبوت ہمیں سونپ دیں۔

یعنی جب تک آپ زندہ ہیں آپ نبی اور آپ کی آنکھیں بند ہونے کے بعد میں نبی اور آپ کا خلیفہ۔ یہ مسئلہ آپ کے اور میرے درمیان کیوں حائل ہو کیوں نہ ہمارا اور آپ کا سمجھوتا ہو جائے۔ بخاری شریف میں ہے۔

"وفي يد رسول الله ﷺ قضيب فوقف عليه...... فقال له النبي ﷺ لو سألتني هذا القضيب ما اَعطيتكه و في رواية اُخرٰى و لن تَعْدوَ امرا الله فيك ولئن ادبرتَ ليعقرنك الله و انى لاراك الذى اريت فيه مارأيت ."

اور حضور ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی ایک چھڑی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو اگر مجھ سے یہ چھڑی بھی مانگے گا تو میں تجھے وہ بھی نہ دوں گا (اور دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا) اور تیرے بارے میں اللہ نے جو فیصلہ کیا ہے تو اس سے ہرگز تجاوز نہ کر سکے گا۔ اگر تو نے میری اطاعت سے روگردانی کی تو اللہ تعالیٰ تجھے ہلاک کردے گا اور میں سمجھتا ہوں تو وہی ہے جو خواب میں مجھے دکھایا گیا ہے۔

نبوت کا دعویٰ کرنے کے بعد اس نے حضور ﷺ کو درج ذیل خط بھیجا۔

"من مسيلمه رسول الله الى محمدٍ رسول الله اما بعد فانى قد

اشرکت معك في الامر و انّ النا نصف الارض ولقريش نصف ولكن قريشاً لا ينصفون والسلام ."

رسول اللہ مسیلمہ کی جانب سے رسول اللہ محمد ﷺ کی طرف' امابعد۔ میں اس کام میں آپ کے ساتھ شریک ہوتا ہوں کہ نصف زمین ہماری اور نصف قریش کی لیکن قریش انصاف نہیں کرتے' والسلام۔

حضور ﷺ نے اس خط کا درج ذیل جواب لکھوایا:

"مِن محمد رسول الله الى مسيلمة الكذّاب اما بعد فالسلام على من اتبع الهدى فان الارض لله يورثها من يشاء من عباده والعاقبة للمتقين ."

"محمد رسول اللہ کی جانب سے مسیلمہ کذاب (بہت جھوٹے) کی طرف۔ امابعد سلام اس پر جو ہدایت کا اتباع کرے۔ بلاشبہ زمین اللہ کی ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے عطا کردے اور اچھا انجام پرہیز کرنے والوں کا ہے۔"

اس طرح گویا اولاً مسیلمہ کذاب نے حضور ﷺ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ آپ اپنی زندگی میں نبی رہیں۔ بعد میں یہ چیز مجھے دے جائیں یا پھر ہم دونوں زمین کو آدھا آدھا بانٹ لیں۔

حضور ﷺ کا یہ جواب ملنے کے بعد مسیلمہ کو اپنی مقصد برآری کے لیے جنگ کی تیاریوں کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہ سوجھی اور اس نے باقاعدہ جنگ کی تیاریاں شروع کردیں۔ ادھر حضور ﷺ نے اپنے وصال سے پیش تر آخری کوشش کے طور پر مسیلمہ ہی کے قبیلے بنوحنیفہ کے ایک شخص رجال بن عنفوہ کو جس نے یمامہ سے منتقل ہو کر مدینہ کی سکونت اختیار کرلی تھی، مسیلمہ کے پاس سمجھانے اور نصیحت کرنے کے لیے بھیجا۔ یہ شخص جب یمامہ پہنچا تو بجائے مسیلمہ کو سمجھانے کے خود مسیلمہ کے ساتھ مل گیا اور اس طرح مسیلمہ کی طاقت روز بروز بڑھتی رہی اور اس دوران حضور ﷺ کا وصال ہوگیا اور حضرت صدیق اکبرؓ کے کاندھوں پر حکومت کی بھاری ذمہ داری آپڑی۔ آپؓ نے مسیلمہ کی سرکوبی کے لیے ابتداءً حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل کو بھیجا اور پھر حضرت شرجیل بن حسنہ کو ان کی کمک کے لیے روانہ کیا۔ حضرت عکرمہؓ نے مسیلمہ پر حملہ کرنے میں ذرا جلدی کی۔ وہ حضرت شرجیلؓ کے پہنچنے سے پہلے ہی حملہ آور ہوگئے اور شکست کھائی۔ ادھر حضرت خالدؓ بن ولید مقام بطاح میں اپنی مہم سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ واپس آئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو مسیلمہ کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔ مسیلمہ کی جنگی تیاری کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے ساتھ صرف قبیلہ ربیعہ کے چالیس ہزار جنگجو تھے اور کئی دیگر قبائل کے ہزاروں لوگ بھی اس کے ساتھ جمع ہوگئے تھے جب کہ حضرت خالد بن ولید کا لشکر صرف تیرہ ہزار افراد پر مشتمل تھا۔ جو لوگ مسیلمہ کذاب کو جھوٹا سمجھتے تھے وہ بھی محض قومی وقبائلی عصبیت کی بنا پر مسیلمہ کے ساتھ ہوگئے تھے۔

حضرت خالد بن ولید کی فوجیں جب یمامہ کے قریب پہنچیں تو آپ نے فوج کے ایک دستے کو مقدمۃ الجیش کے طور پر پیش قدمی کا حکم دیا۔ مسیلمہ پہلے ہی مجاعہ بن مرارہ کی سرکردگی میں ساٹھ آدمیوں کا ایک دستہ بنوتمیم پر شب خون مارنے کے لیے بھیج چکا تھا۔ اسلامی فوج سے اس دستہ کا ٹکراؤ ہوا اور یہ سب مرتد اسلامی فوج کے ہاتھوں قتل ہوئے اور مجاعہ گرفتار ہوا۔ اب مسلمانوں کو مسیلمہ کی اصل فوج سے نبردآزما ہونا تھا۔ مسیلمہ نے اسلامی فوج پر زبردست حملہ کیا لیکن مسلمان اس پامردی سے لڑے کہ مسیلمہ کی فوجوں کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ بھاگے۔ مسیلمہ کی فوج کے دو سپہ سالار تھے۔ رجال بن عنفوہ اور محکم بن طفیل۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے صاحب زادے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ نے محکم بن طفیل کو قتل کیا۔ اب مسیلمہ کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ مسیلمہ کی فوج قریب ہی ایک قلعہ نما باغ (حدیقۃ الرحمٰن) میں تھی۔ مسیلمہ فرار ہونے کی نیت سے اس باغ کے دروازہ سے باہر جانا چاہتا تھا کہ حضرت وحشیؓ (جنھوں نے حالت کفر میں غزوۂ احد میں حمزہؓ کو شہید کیا تھا، بعد میں وہ اسلام لائے تھے۔ وہ اس دروازے کے قریب موجود تھے انھوں) نے مسیلمہ کو اس زور سے نیزہ کھینچ کر مارا کہ نیزہ مسیلمہ کی زرہ کو پار کرتا ہوا مسیلمہ کے سینے کے پار ہوگیا اور اس طرح مسیلمہ واصل جہنم ہوا اور حضرت وحشیؓ پر حضرت حمزہ کو شہید کرنے کا جو بڑا دھبا لگا ہوا تھا کسی قدر کم ہوگیا۔

مسیلمہ کذاب کے خلاف مسلمانوں کی یہ جنگ جو تاریخ میں جنگ یمامہ کے نام سے مشہور ہے ماہ ذی الحجہ 11ھ میں ہوئی اور اس کی شدت خون ریزی اور جانی نقصان کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں مسیلمہ کذاب کی فوج کے ستر ہزار آدمی مارے گئے جب کہ ایک ہزار سے زائد صحابہ وتابعین شہید ہوئے جن میں خطیب رسول ﷺ اور مسلمانوں کے علم بردار حضرت ثابت بن قیسؓ بھی شامل تھے۔ 9ھ میں جب وفد بنوحنیفہ مذاکرات کے لیے مدینہ آیا تھا تو وہ مسیلمہ سے بات کرنے حضرت ﷺ کے ساتھ گئے تھے اور جب مسیلمہ نے حضور ﷺ سے اُوٹ پٹانگ بات شروع کی تو بقیہ تفصیلی گفتگو کے لیے آپ نے اپنی طرف سے انھیں نامزد کیا تھا کہ اے مسیلمہ اب میری طرف سے باقی بات تم سے یہ ثابت بن قیسؓ کریں گے۔

(4) سجاح بنت الحرث بن سوید:

اس زمانے میں عورتوں کو بھی نبوت کے دعوی کا سودا سمایا۔ چنانچہ بنی تغلب کی اس عورت نے بھی نبوت کا دعوی کردیا اور مدینے پر چڑھائی کے لیے چار ہزار کا لشکر جمع کرلیا اور اس مذموم مقصد میں بعض قبائل کے سردار مثلاً بنی تمر کا سردار عقبہ بن ہلال' بنو تغلب کا سردار ہذیل بن عمران اور بنی شیبان کا سلیل بن قیس بھی اس کے ساتھ ہوگئے۔ اس نے اپنے مذہب میں اس سہولت کا اعلان کردیا کہ نمازیں تو ضرور پڑھو مگر زنا کرنا' شراب پینا اور سور کھانا جائز ہے۔ اس ترغیب سے بہت سے عیسائی بھی اس کے پیروکار بن گئے چوں کہ مسیلمہ کذاب اور سجاح کا مدینہ پر حملہ کرنا مشترکہ مقصد تھا لہٰذا اس نے مسیلمہ کذاب سے شادی کرلی اور مہر یہ قرار پایا کہ مسیلمہ نے آدھی پیغمبری اپنے پاس رکھی اور آدھی سجاح کو دے دی۔ نیز مسیلمہ نے سجاح کے پیروکاروں پر عشا اور فجر کی دو مشکل نمازیں معاف کردیں مگر یہ شادی زیادہ دن نہ چل سکی۔ صرف تین

دن دونوں کا ساتھ رہا اور پھر جیسے ہی حضرت خالدؓ بن ولید کی فوج سجاح کی فوج کے بالمقابل ہوئی سجاح کے سب ساتھی اسے تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے اور یہ بھی بھاگی اور بنی تغلب کے مقام جزیرہ پہنچ کر کہیں رُوپوش ہوگئی۔

(5) فازازی:

آٹھویں صدی ہجری کے امام حدیث علامہ شاطبیؒ نے اپنی کتاب ''الاعتصام'' میں اس جھوٹے نبی سے متعلق کچھ تفصیل لکھی ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ اسے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور بہت سے ایسے اُمور دکھلائے جو کرامت و خارق عادت سمجھے جاتے ہیں۔ عوام ہر زمانے میں عجائب پرست ہوتے ہیں اس وقت بھی ایک جماعت فازازی کے ساتھ ہوگئی۔ یہ بھی مرزا قادیانی کی طرح اتباع قرآن کا مدعی تھا۔ اس لیے اس نے آیتِ خاتم النّبیین میں ایسی تاویلات شروع کیں جن کے ذریعے کسی نبی کی گنجائش آنحضرت ﷺ کے بعد نکل آئے مگر باتفاق علما وقت اس کا دعویٰ اور تاویلات سب کفر و الحاد قرار دی گئیں اور اس زمانے کے امام مقتدر شیخ المشائخ ابوجعفر بن زبیرؒ کے فتوی پر اسے قتل کر دیا گیا۔''

(6) مرزا غلام احمد قادیانی:

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسوی صدی کے اوائل میں برصغیر ہند و پاک میں دعویٰ نبوت کا یہ فتنہ مرزا غلام احمد قادیانی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس مدعی نبوت کے گھرانے نے خصوصاً مرزا غلام احمد کے باپ مرزا غلام مرتضیٰ نے مسلمانوں کی تحریک آزادی کو کچلنے کے سلسلے میں انگریزی حکومت کی بھرپور مدد کی تھی۔ انگریزی حکومت کی یہ ایک سیاسی ضرورت تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبۂ حریت کو کچلنے اور ان میں جہادی روح ختم کرنے کے لیے اس خاندان کو استعمال کیا جائے اور دین میں ایک نیا شوشہ چھوڑ کر یہ مذموم مقصد پورا کیا جائے۔ انگریزوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بھرپور طور پر یہ حربہ استعمال کیا۔

حضرات فقہاؒ نے کافروں کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ 1۔ مطلق کافر (2) منافق کافر (3) زندیق کافر

مطلق کافر:

ایمان مجمل و ایمان مفصل میں جن سات بنیادی عقائد و افکار پر ایمان لانا اور ان کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔ وہ ان کا صراحتاً یا اشارتاً انکار کرتا ہے یا صراحتاً یا اشارتاً ان میں شک کا اظہار کرتا ہے اور یا ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے جن سے صراحتاً یا اشارتاً انکار سمجھا جائے۔

منافق کافر:

وہ زبان سے تو ان ایمانیات کا اقرار کرتا ہے مگر دل سے انکار کرتا ہے۔ اس کا ظاہری اقرار درحقیقت دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

زندیق کافر:

وہ دین میں تحریف کا مرتکب ہوتا ہے۔ آیات و احادیث کی اپنی مرضی اور اپنے مذموم مقاصد کے اعتبار سے تشریح کرتا اور سلف صالحین کی تعبیرات کو نظر انداز کرتا ہے، اپنے کفر پر اسلام کا لیبل لگاتا اور بدبودار شراب کو آب شیریں کہہ کر فروخت کرتا ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کافروں کے اس تیسرے زمرے میں آتا ہے۔

(1) دنیا کے مسلمانوں نے اسلام کے خلاف اس تخریبی تحریک کو محسوس کیا اور رابطۃ العالم الاسلامی کے تحت مکہ مکرمہ میں 6 تا 10 اپریل 1974ء 140 مسلمان تنظیموں کا اجلاس ہوا جنھوں نے متفقہ طور پر قادیانیت کو اسلام کے خلاف ایک تخریبی تحریک قرار دیا۔

(2) 9 جون 1974ء پاکستان اور بیرونی ممالک میں اس تخریبی تحریک کے توڑ کے لیے مجلسِ عمل تحفظ ختم نبوت وجود میں آئی اور علمائے حق اس تحریک کے خلاف میدان عمل میں آ گئے۔

(3) 14۔ جون 1974ء۔ پاکستان بھر میں اس کے خلاف ملک گیر ہڑتال اور پرامن مظاہرے ہوئے۔ 29 مئی 1974ء کو قادیانیوں نے ربوہ ریلوے اسٹیشن پر مرزا طاہر کی سربراہی میں نشتر میڈیکل کالج کے طلبا پر لاٹھیوں اور سریوں سے جو ظلم کیا تھا اور مارتے جاتے اور کہتے جاتے ''اور ختم نبوت کے نعرے لگاؤ'' اس پر شدید احتجاج کیا گیا اور حکومتِ وقت کو مجبور کیا گیا کہ وہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے۔

(4) 30۔ جون 1974ء کو پاکستان کی قومی اسمبلی میں ضروری آئینی ترامیم اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد پیش کی گئی۔

(5) 7۔ ستمبر 1974ء کو قومی اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا بل منظور ہوا۔

مرزا غلام احمد قادیانی 'مسیلمہ کذّاب کی طرح قتل تو نہ ہوا اور 26 مئی 1908ء کو اپنی موت مرا لیکن علماءِ حق نے اس کے دجل و فریب کو خوب خوب چاک کیا اور اس طرح عامۃ المسلمین اس کے عظیم شر سے محفوظ رہے۔

(مولانا سید محبوب حسین واسطی)

ماخوذ: ''جریدۃ السیرۃ'' شمارہ ہشتم

مبشرات

انبیا و کتب سابقہ کی بشارتیں

ابن عربی نے اپنی مشہور کتاب ''فتوحات مکیہ'' میں رسول کریمؐ کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ فرماتے ہیں: ''دنیا میں ایک لاکھ آدم ہو گزرے ہیں اور ہم ان میں سے سب سے آخری کی اولاد ہیں'' ایک اور دل فریب روایت ہے: ''ایک مرتبہ حضرت موسیٰ نے خدا سے کہا: ''مجھے اپنا کوئی معجزہ دکھایئے۔ خدا نے موسیٰ کو ایک خاص مقام پر پہنچنے کا حکم دیا۔ وہ ایک صحرا تھا جہاں کوئی متنفس نہ تھا۔ صرف ایک گڑھا تھا۔ موسیٰ نے گڑھے میں ایک کنکری پھینکی۔ اچانک گڑھے میں سے آواز آئی: ''کون ہو بھئی؟'' موسیٰ نے اپنا تعارف کرایا اور آدم تک اپنا شجرۂ نسب بیان کیا''۔ اور موسیٰ کو اپنے وسیع علم پر فخر تھا...... مگر اس نظر نہ آنے والے کی آواز آئی: ''تم کس آدم کی بات کرتے ہو، کیوں کہ ہر دس ہزار سال بعد کوئی نہ کوئی یہاں آتا ہے اور اس گڑھے میں ایک کنکری پھینکتا ہے۔ جب اس سے پوچھا جاتا ہے تو وہ بالکل وہی نام اور نسب بیان کرتا ہے جو تم نے کیا ہے، اور یہ گڑھا ان کنکریوں سے بھرا جا رہا ہے۔''

ایک حدیث رسولؐ سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ آدم کے بعد ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر گزرے ہیں، اور وہ (رسول اللہ) آخری نبیؐ ہیں۔ آپؐ سے پہلے کے سبھی پیغمبروں نے خدا کی توحید کی ازلی صداقت، حیات بعد الموت اور آپؐ کے ختمِ نبوت کی بشارت دی ہے۔

سید مناظر احسن گیلانی نے اپنی تصنیف ''النبی الخاتمؐ'' کے آغاز میں لکھا ہے:

''یوں آنے کو تو سب ہی آئے، سب میں آئے، سب جگہ آئے (سلام ہو ان پر) بڑی کٹھن گھڑیوں میں آئے، لیکن کیا کیجیے کہ ان میں جو بھی آیا، جانے ہی کے لیے آیا۔ پر ایک اور صرف ایک جو آیا اور آنے ہی کے لیے آیا، وہی جو آ گئے کے بعد پھر کبھی نہیں ڈوبا، چمکا اور چمکتا ہی چلا جا رہا ہے، بڑھا اور بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ چڑھا اور چڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ سب جانتے ہیں اور سبھوں کو جاننا ہی چاہیے کہ جنھیں کتاب دی گئی اور جو نبوت کے ساتھ کھڑے کیے گئے، برگزیدوں کے اس پاک گروہ میں اس کا استحقاق صرف اسی کو ہے اور اس کے سوا کس کو ہو سکتا ہے، جو پچھلوں میں بھی اس طرح ہے جس طرح پہلوں میں تھا، دور والے بھی اسے ٹھیک اسی طرح پا رہے ہیں اور ہمیشہ پاتے رہیں گے، جس طرح نزدیک والوں نے پایا تھا، جو آج بھی اسی طرح پہچانا جاتا ہے اور ہمیشہ پہچانا جائے گا، جس طرح کل پہچانا گیا تھا، کہ اسی کے اور صرف اسی کے دن کے لیے رات نہیں، ایک اسی کا چراغ ہے جس کی روشنی بے داغ ہے۔''

سید مناظر احسن گیلانی کے ان الفاظ کی صداقت پر زمانہ گواہ ہے، لیکن حضرت محمدؐ کی آمد اور آپؐ کے ظہور کے بعد آپؐ کے چراغ کی بڑھتی ہوئی روشنی کی گواہی اور بات ہے، اور آپؐ کی آمد سے سیکڑوں ہزاروں سال پہلے اللہ کے فرستادہ پیغمبروں، برگزیدہ ہستیوں اور مذاہب عالم کی مقدس کتابوں کی گواہی اور بات، جسے معجزاتی بشارت کہا جا سکتا ہے۔ یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت ادریسؑ نے کہا:

ہم حضرت آدمؑ یا ان کے بیٹے حضرت شیثؑ پر نازل ہونے والی کتب کے مندرجات سے لاعلم ہیں۔ ہم تک جو قدیم ترین ریکارڈ پہنچا ہے، وہ حنوک کے بارے میں جنھیں ہم حضرت ادریسؑ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسلامی روایات میں انھیں تحریر کا موجد بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ''عہد نامہ جدید'' میں یہودہ کے نام ایک خط ہے۔ مسیحی شارحین کے مطابق اس خط میں کسی آنے والے کے متعلق پیش گوئی کی گئی ہے، جو سرور عالمؐ کے ظہور پر منطبق ہوتی ہے۔ خط کی متعلقہ عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''ان کے بارے میں حنوک (ادریسؑ) نے بھی پیش گوئی کی تھی جو آدمؑ کی ساتویں پشت میں تھے۔ انھوں نے کہا: ''دیکھو خداوند اپنے لاکھوں مقدسوں کے ساتھ آیا ہے، تاکہ سب آدمیوں سے انصاف کرے اور سب بے دینوں کو ان کی بے دینی کے ان سب کاموں کے باعث، جو انھوں نے بے دینی سے کیے ہیں، اور ان سب سخت باتوں کے سبب جو بے دین گناہ گاروں نے اس کی مخالفت میں کہی ہیں، قصوروار ٹھہرائے۔''

زرتشت نے کہا:

زرتشت کی کتاب اویستا میں ایک بت شکن کی آمد کی پیش گوئی کی گئی ہے جس کا نام سوشیانت (سب پر رحمت کرنے والا، رحمت للعالمین) اور اُستوات اریات (لوگوں کو پستی سے بلندی پر پہنچانے والا) ہوگا۔

گوتم بدھ نے کہا:

سیّد مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب ''النبی الخاتم'' میں لکھتے ہیں: ''اپنی زندگی ختم کرتے ہوئے خدا کے اس بندے (گوتم بدھ) نے اپنے چیلے نندا کے کان میں اپنا آخری فقرہ اس وقت ڈالا جب اس کی سانس اکھڑ رہی تھی اور اس کا مخلص خادم اس کے قدموں کو اپنے آنسوؤں سے یہ کہتے ہوئے دھو رہا تھا: ''آقا، آپ کے جانے کے بعد دنیا کو کون تعلیم دے گا؟''

گوتم بدھ نے کہا: ''میں پہلا بودھ نہیں ہوں جو زمین پر آیا۔ نہ آخری بودھ ہوں۔ اپنے وقت پر دنیا میں ایک اور بودھ آئے گا، مقدس، منور القلب، عمل میں دانائی سے لبریز، مبارک عالم کائنات، انسانوں کا عدیم النظیر سردار، جو حقائق میں ظاہر کرتا رہا ہوں، وہ بھی وہی ظاہر کرے گا۔ وہ ایک مکمل اور خالص مذہبی نظام زندگی کی میری طرح تبلیغ کرے گا۔''

نندا نے پوچھا ''ہم اسے کس طرح پہچانیں گے؟''

مہاتما بدھ نے فرمایا: وہ تیریا کے نام سے موسوم ہوگا۔''

16۔ اکتوبر 1930ء کی اشاعت میں الہ آباد کے مشہور انگریزی اخبار ''لیڈر'' میں ایک بدھ عالم کا یہ مضمون صفحہ 7 کالم تین میں شائع ہوا تھا جس میں لفظ ''تیریا'' کا ترجمہ اس نے لکھا تھا ''وہ جس کا نام رحمت ہے۔'' سب جانتے ہیں، رحمت للعالمین نبی کریمؐ ہی کا نام ہے۔''

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ''سیرت محمدیؐ'' پر اپنی تصنیف میں مہاتما بدھ کا یہ قول نقل کیا ہے: ''میں نے مذہب کو مکمل نہیں کیا، بلکہ ایک متریا (سب پر رحم کرنے والا) ابھی آنا باقی ہے۔''

ویدوں نے کہا:

ہندوؤں کی مذہبی کتابوں، ویدوں اور پرانوں میں آنحضور ﷺ کا ذکر ''کلکی اوتار'' کے نام سے ملتا ہے جس کے معنی سب سے بڑے اور آخری رسول کے ہیں۔

کتاب بھوشیہ پران میں لکھا ہے ''جو رسول کل جگ میں پیدا ہوگا، اس کا نام سروانما ہو گا۔ سروانما سنسکرت زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب ہے ایسا شخص جس کی سب سے زیادہ تعریف کی جائے۔ عربی زبان کے لفظ ''محمدؐ'' کے معنی بھی یہی ہیں۔

کتاب کلکی پران میں ہے: ''کلکی اوتار سومتی سے پیدا ہوگا اور اس کے باپ کا نام وشنوویش ہوگا۔'' سومتی کا ترجمہ ''آمنہ'' اور وشنوویش کے معنی ''عبداللہ'' کے ہیں۔ آمنہ حضرت محمدؐ کی والدہ اور عبداللہ ان کے والد کا نام ہے۔

کتاب بھاگوت پران میں ہے: ''کلکی اوتار شنبل گرام میں وشنوویش کے ہاں ان کے برہمن مہنت گھر پیدا ہوگا۔'' شنبل گرام کے معنی ہیں، امن والا شہر۔ پوری دنیا جانتی ہے، امن والا شہر ''مکہ'' کو کہتے ہیں اور قرآن مجید میں اسے ''بلد الامین'' کہا گیا ہے۔ برہمن مہنت کے معنی میں دینی پیشوا۔ حضرت محمدؐ کے دادا عبدالمطلب دینی پیشوا تھے اور عبداللہ ان کے بیٹے۔

کتاب کلکی پران میں ہے: ''کلکی اوتار کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے فوت ہو جائے گا اور اس کی ماں پیدائش کے تھوڑا ہی عرصہ بعد۔''

کتاب کلکی پران میں مزید لکھا ہے: ''کلکی اوتار ایک پہاڑ کی گپھا (غار) میں جائے گا اور وہاں شورام سے علم حاصل کرے گا۔'' غار سے مراد ''غار حرا'' ہے اور شورام کے معنی روح القدس یعنی حضرت جبرئیلؑ کے ہیں۔

بھاگوت پران میں واقعہ معراج کا بھی ذکر ملتا ہے: ''کلکی اوتار کو ایک اُڑنے والا گھوڑا دیا جائے گا جو بجلی سے بھی تیز ہوگا اور وہ اس پر سوار ہو کر زمین اور ساتوں آسمانوں کی سیر کرے گا۔''

بھاگوت پران میں کلکی اوتار کو ''جگت پتی'' بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی ہیں دنیا کا سردار اور مسلمان آنحضور ﷺ کو ''سرور عالم'' بھی کہتے ہیں۔ اسی پران میں کلکی اوتار کو آخری پیغمبر بھی کہا گیا ہے۔

کتاب بھوشیہ پران میں مزید لکھا ہے: ''کلکی اوتار ریگستان میں پیدا ہوں گے۔ پنچ تتو پانی سے دنیا کو سیراب کریں گے جس طرح دریائے گنگا سیراب ہوتا ہے۔ ان کے پسینے میں چندن (صندل) کی خوش بو ہوگی جو فضا کو معطر کرے گی۔''

پنچ تتو پانی کی تشریح میں ''آبِ زم زم'' کہا ہے۔ کتب احادیث اور سیرت پاک میں نبی کریمؐ کے جسم سے اٹھنے والی خوش بو کا واضح ذکر ملتا ہے۔

ہندوؤں کی ایک اور مقدس کتاب وشنو پران کے باب 24 میں کہا گیا ہے کہ: ''ویدوں (حقیقی علم کی کتاب) کو پسِ پشت ڈال دیا جائے گا۔ قانونی ادارے عضو معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ پھر تاریک دور کا انجام قریب ہوگا۔ اللہ کا آخری اوتار کلکی (بت شکن) کی شکل میں آئے گا۔ وہ سنبلہ دب کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوگا۔ اس کے باپ کا نام وشنویاسا (عبداللہ) اور ماں کا نام سومتی (آمنہ) ہوگا۔

شری کرشن چندر کے اقوال کے مجموعے کا نام ''بھگوت گیتا'' ہے۔ چنانچہ اب سے چار ہزار سال پہلے ''پارکشٹ راجا'' کے زمانے میں کرشن جی کے بھگت، سوامی شک منی نے کرشن جی کی زبان سے سنی ہوئی پیش گوئیاں ذیل کے الفاظ میں بیان کی ہیں جو کلکی اوتار (بت شکن نبی)، ایشور اوتار (رسول اللہ) اور جگت گرو (سرورِ عالمؐ) کی بابت ہیں۔ کرشن جی راجا پارکشٹ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اے مہاراجا! تمھاری وفات کے گیارہ سو پندرہ برس بعد شری کرشن جی کی تعلیم کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ نمو کھا نکشتر میں مریخ کا دور ہوگا۔ اس وقت دیوتاؤں کے خاندان میں نند نامی ایک راجا پیدا ہوگا اور کل یگ کا دور بارہ سو سال تک رہے گا۔ راجا نند کے خاندان میں سو سال حکومت رہے گی۔ پھر 137 سال تک ''خاندان مور'' کے راجا اس زمین پر حکومت کریں گے۔ ان کے بعد ایک سو دس سال تک شرنگ خاندان کے راجاؤں کی حکومت رہے گی۔ پھر 245 سال تک اس زمین پر کنور خاندان کے راجا حکومت کریں گے۔ اس کے بعد آندھرا خاندان کے راجا 641 سال تک حکمران رہیں گے۔ اس کے بعد ہندواستھان میں شہنشاہیت کا دور ختم ہو جائے گا۔ گناہوں کی کثرت ہوگی اور زمانے کی حالت انتہا درجے خراب ہو جائے گی۔ ملک کے اندر خود مختار ریاستیں قائم ہو کر ملک ان میں تقسیم ہو جائے گا، یہاں تک کہ 3658 کل یگ میں بھگوان ''کلکی'' کی شکل میں ظاہر ہوگا اور زمین کے بوجھ کو ہلکا کر دے گا۔''

سوامی شک منی کی پیشین گوئی بھی پوری ہوئی اور حضور اقدسؐ اس وقت دنیا میں تشریف لائے جب دنیا گناہوں میں اس قدر مبتلا تھی کہ حلال و حرام کا امتیاز بھی باقی نہ

رہا تھا اور بدترین گناہوں سے زمین بھری ہوئی تھی۔ آنحضور ﷺ کی تشریف آوری کا وہی سال تھا جو سوامی شک منی نے کرشن جی کی دی ہوئی بشارت کے مطابق بتلایا ہے یعنی 3658 کل یگ۔

کلکی پران اور بھاگوت پران میں سرورِ عالمؐ کے ظہور کے بارے میں جو پیش گوئی کی گئی ہے، وہ اس قدر واضح اور صاف ہے کہ کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ لکھا ہے:

''جگت گورو (نبی رحمتؐ) کے باپ کا نام وشنو بھگت (عبداللہ) ہوگا۔ ماں کا نام سومتی (آمنہ) ہوگا۔ تاریخ پیدائش 12 بیساکھ 3658 اور دن پیر کا (پیر 9 ربیع الاوّل۔ سن ایک عام الفیل، سن بکری کے مطابق سمت 628 مطابق 22، اپریل 571 عیسوی) ہوگا۔ جگت گورو دو گھڑی دن چڑھے (بعد از صبح صادق قبل از طلوع) پیدا ہوں گے۔

باپ کا انتقال پہلے ہوگا، ماں کا بعد میں۔ جگت گورو سنبلہ دب کی رانی (مال دار عورت) سے شادی کریں گے۔ ایک غار (حرا) میں پرسرام (یعنی فرشتہ۔ جبرئیل) سے تعلیم پائیں گے اور جب بستی میں آ کر تبلیغ کریں گے تو لوگ تکلیف دیں گے، جس کی وجہ سے وہ شمالی پہاڑوں (مدینہ منورہ) کی جانب ہجرت کریں گے۔ وہاں سے تلوار لے کر پھر اسی بستی کو آئیں گے اور ملک فتح ہو جائے گا۔ جگت گورو کا ایک گھوڑا ہوگا جو بجلی سے زیادہ تیز چلے گا (براق)۔ آپؐ اس پر سوار ہو کر کل زمین اور آسمانوں کی سیر کریں گے۔''

سیّد احمد حسین اپنی کتاب ''کلکی اوتار'' میں رقم طراز ہیں: ''حیدر آباد دکن کے ضلع اورنگ آباد میں ایلورا کے مشہور تاریخی غار ہیں۔ ہزاروں سال پرانے ان غاروں کی جن لوگوں نے سیر کی ہے، وہ گواہ ہیں کہ یہاں ایک غار نمبر 16 ہے جس میں ''دیوتاؤں کا آسن'' ہے۔ اس آسن پر مختلف النوع سواریوں پر دیوتاؤں کی شبیہیں بیٹھی ہیں۔ ان میں ایک سواری خالی ہے۔ جو آخری سواری کی منتظر ہے۔ اس سواری کے نیچے لکھا ہے ''کلکی اوتار کی سواری''، یعنی بت شکن نبی کی سواری۔ صاحب قاب و قوسین حضورؐ کے انتظار میں ہزاروں سال سے چشم براہ اس سواری کی شبیہ وہی ہے جو ''براق'' کی بیان کی گئی ہے۔

گورونانک کی گواہی:

سکھ مت کے بانی گورونانک اگرچہ آں حضورؐ کے ظہور کے صدیوں بعد پیدا ہوئے لیکن انھوں نے لفظ ''محمدؐ'' کی شان میں جو رباعی کہی ہے اور اس سے ریاضی کا ایک فارمولا نکالا ہے، وہ عقیدت واحترام سے ایک زبردست پیشین گوئی اور شہادت کا درجہ رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں:

ہر عدد کو چوگن کر لو، دو کو اس میں دو بڑھائے
پورے جوڑ کر پنچ گن کر لو، بیس سے اس میں بھاگ لگائے
باقی بچے کو نوگن کر لو، دو کو اس میں دو بڑھائے
گرو نانک یوں کہے، ہر شے میں محمدؐ کو پائے

فارمولا یہ ہے: 20x9+2 ÷ 4+2x5

یعنی کسی بھی لفظ کے حروف ابجد کے اعداد کو جمع کر کے اسے چار گنا کرو۔ جو ان کا حاصل جمع آئے، اس میں دو اور جمع کر لو۔ اور پھر جو آئے، اس کے پنچ گنے کر کے بیس سے تقسیم کر دو۔ تقسیم کے بعد جو بھی باقی بچے اسے نو سے ضرب دے دو۔ اس طرح جو بھی حاصل آئے، اس میں دو اور جمع کر دو۔

اس طرح دنیا کی ہر چیز کا آخری ہندسہ 92 ہوگا۔ جو آں حضورؐ کے اسم گرامی کا حاصل عدد ہے یعنی 92۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی ہر شے میں محمدؐ کا ظہور جلوہ گر ہے۔

حضرت موسیٰؑ کی بشارت:

تورات کی کتاب استثنا، باب 18 کی آیات 15 تا 19 میں حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے سرورِ عالمؐ کے ظہور کی بشارت دی تھی۔ وہ فرماتے ہیں:

''خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے، یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا، تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا، جو تو نے مجمع کے دن اپنے خدا سے حورب میں کی تھی کہ مجھے نہ تو خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو، تاکہ میں مر جاؤں۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور پھر اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا، وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو، جنھیں وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔''

یہ تورات کی صریح پیشین گوئی ہے جو حضرت محمدؐ کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہو سکتی اس کی طرف قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے۔ سورۃ الصف، آیت 6 میں ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ﴾ (الصف: 6)

''اور یاد کرو عیسیٰؑ ابن مریمؑ کی وہ بات جو اس نے کہی تھی کہ اے بنی اسرائیل، میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تصدیق کرنے والا ہوں اس تورات کی، جو مجھ سے پہلے آئی ہوئی ہے، اور میں بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہوگا۔''

اس آیت میں دو فقرے ہیں۔ دونوں فقروں کو ساتھ ملا کر پڑھنے سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ میں اللہ کے رسولؐ کی آمد کے متعلق تورات کی دی ہوئی بشارتوں کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت دیتا ہوں۔ اس معنی کے لحاظ سے حضرت عیسیٰؑ کے اس قول کا اشارہ اس بشارت کی طرف ہے جو رسول کریمؐ کے متعلق حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو مذکورہ بالا خطاب کرتے ہوئے دی تھی۔

حضرت عیسیٰؑ کی بشارت:

مذکورہ آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے قول کا دوسرا فقرہ ہے: ''اور میں بشارت دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہوگا۔'' اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ نے آنحضور ﷺ کا نام ''احمد'' لے کر انتہائی واضح الفاظ میں آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بارے میں بشارت دی ہے۔

اب وہ چند پیشین گوئیاں دیکھیے جو انجیل یُوحنا میں مسلسل باب 14 سے 16 تک منقول ہوئی ہیں:

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے یعنی روحِ حق، جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی، کیوں کہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے۔ تم اسے جانتے ہو، کیوں کہ وہ تمھارے ساتھ رہتا ہے اور تمھارے اندر ہے۔'' (باب 14۔ آیات 16، 17)

''مَیں نے یہ باتیں تمھارے ساتھ رہ کر تم سے کہیں۔ لیکن مددگار یعنی روح القدس، جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ مَیں نے تم سے کہا ہے، وہ سب تمھیں یاد دلائے گا۔'' (باب 14۔ آیت 30)

''لیکن جب وہ مددگار آئے گا، جسے میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا، یعنی سچائی کی روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے، تو وہ میری گواہی دے گا۔''
(باب 15۔ آیت 6)

''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمھارے لیے فائدہ مند ہے، کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا۔'' (باب 16۔ آیت 7)

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم انھیں برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گا تو تمھیں سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا، لیکن جو کچھ سنے گا، وہی کہے گا اور تمھیں آیندہ کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا، اس لیے کہ مجھ ہی سے حاصل کر کے تمھیں خبریں دے گا۔ جو کچھ باپ کا ہے وہ سب میرا ہے۔ اس لیے مَیں نے کہا کہ وہ مجھ ہی سے حاصل کرتا ہے اور تمھیں خبریں دے گا۔'' (باب 16۔ آیات 12 تا 15)

تورات و بائبل میں اور بھی آیات ایسی ہیں جن میں آنحضور ﷺ کی آمد کے بارے میں واضح اشارے ملتے ہیں، لیکن انجیل ''یوحنا'' کی مذکورہ بالا آیات کا خاص طور پر انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ انجیل میں جو تحریفات کی گئی ہیں، یہ آیات بھی ان میں شامل ہیں۔ ان آیات میں روحِ حق، روح القدس اور مددگار کے الفاظ کا اضافہ کر کے مدعا کو خبط کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً لفظ ''احمد'' کو دیکھیے اس لفظ کی تحریف کی وضاحت میں مولانا حافظ محمد ادریس کاندھلوی اپنی کتاب ''بشائر النبیین'' میں لکھتے ہیں:

لفظ فارقلیط کی تحقیق:

حضرت عیسیٰؑ کی اصل بشارت میں لفظ ''احمد'' موجود تھا اور جیسا کہ انجیل برناباس میں اب بھی موجود ہے، لیکن جب انجیل کا عبرانی زبان سے یونانی زبان میں ترجمہ ہوا، تو یونانیوں نے اپنی عادت کی بنا پر کہ وہ ترجمہ کرتے وقت ناموں کا بھی ترجمہ کر دیا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کے نام مبارک ''احمد'' کا ترجمہ بھی پیرا کلوطوس (Paracletus) سے کر دیا اور پھر جب یونانی نسخے کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا تو پیرا کلوطوس کا معرب ''فارقلیط'' کر لیا گیا۔ اب عرصے تک عربی، فارسی اور اردو نسخوں میں ''فارقلیط'' کا لفظ رہا۔ اس کے بعد اس کا ترجمہ ''روح القدس'' سے کیا گیا اور مسیحی علما ''روح القدس'' کے لفظ کو بطور تفسیر خطوط وحدانی میں لکھتے رہے۔ رفتہ رفتہ ''فارقلیط'' کا لفظ بالکل حذف کر دیا، پھر کسی نے فارقلیط کی جگہ ''روح القدس'' کا لفظ اور کسی نے ''روحِ حق'' کا لفظ، اور کسی نے ''مددگار'' کا لفظ رکھ دیا، اور فارقلیط کا لفظ انجیل کے نسخوں سے بالکل حذف کر دیا۔

مسیحی علما نے ''فارقلیط'' کو مختلف معانی میں بیان کیا ہے، مثلاً تسلی دینے والا، معین (مدد کرنے والا)، شافع (شفاعت کرنے والا) وکیل (وکالت کرنے والا)، حماد (بڑا سراہنے والا)، بڑا سراہا گیا (جس کا عربی ترجمہ محمد ہے)، بڑا ہی ستودہ، جس کی بہت زیادہ تعریف کی جاتی ہے۔ (احمد) اور بعضوں نے فارقلیط کا ترجمہ امید گاہ سے کیا۔ بعض نسخوں میں رسول کا لفظ ہے۔

انجیل کے تمام قدیم نسخوں میں، عربی، فارسی اور اُردو تمام نسخوں میں ''فارقلیط'' کا لفظ موجود تھا۔ مگر اب موجودہ نسخوں میں (جیسا کہ مذکورہ بالا آیات میں درج ہے) فارقلیط کی بجائے زیادہ تر روحِ حق یا روح القدس یا مددگار کے لفظ پائے جاتے ہیں، مگر ان تحریفات کے باوجود اصل مدعا حاصل ہے، اس لیے کہ ان آیات میں فارقلیط کے جو اوصاف ذکر کیے گئے ہیں، وہ تمام کے تمام آنحضرت محمد ﷺ پر منطبق ہیں اور فارقلیط کے جو بھی معنی لیے جائیں، وہ سب آپ ﷺ پر صادق ہیں۔

لفظ منحمنا کی تحقیق:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی کتاب ''نصرانیت قرآن کی روشنی میں'' لکھتے ہیں:

''لیکن فیصلہ اس پر بھی موقوف نہیں ہے کہ یوحنا نے یونانی زبان میں دراصل کون سا لفظ لکھا تھا، کیوں کہ بہر حال وہ بھی ترجمہ ہی تھا اور حضرت مسیحؑ کی زبان فلسطین کی سریانی تھی، اس لیے انھوں نے اپنی بشارت میں جو لفظ استعمال کیا ہوگا، وہ لامحالہ کوئی سریانی لفظ ہی ہونا چاہیے۔ خوش قسمتی سے وہ اصل لفظ ہمیں ابن ہشام کی سیرت میں مل جاتا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی اسی کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا ہم معنی یونانی لفظ کیا ہے۔ ابن اسحٰق کے حوالے سے ابنِ ہشام نے یوحنا کی انجیل کے باب 15، آیات 23 تا 27 اور باب 16 کی پہلی آیت کا پورا ترجمہ نقل کیا ہے، اور اس میں یونانی ''فارقلیط'' کی بجائے سریانی زبان کا لفظ منحمنا استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ابن اسحٰق اور ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ ''منحمنا'' کے معنی سریانی زبان میں محمد اور یونانی میں برقلیطس ہے۔''

"اب اگر ابن اسحٰق کے نقل کردہ ترجمے میں اصل سریانی لفظ "منحمنا" استعمال ہوا ہے، اور ابن اسحٰق یا ابن ہشام نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ عربی میں اس کا ہم معنی محمد اور یونانی میں برقلیطس ہے تو اس امر میں کسی شک کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ حضرت عیسیٰ نے حضورؐ کا نام مبارک لے کر آپؐ ہی کے آنے کی بشارت دی تھی۔

نجاشی کی تصدیق:

اس سے بھی قدیم تر تاریخی شہادت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت ہے کہ مہاجرین حبشہ کو جب نجاشی نے اپنے دربار میں بلایا اور حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب سے رسول کریمؐ کی تعلیمات سنیں تو نجاشی نے کہا "مرحبا تمھیں اور اس ہستی کو جس کے ہاں سے تم آئے ہو، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور وہی ہیں جن کی بشارت عیسیٰ ابن مریم نے دی تھی۔"

یہ قصہ احادیث میں خود حضرت جعفرؓ اور حضرت ام سلمہؓ سے بھی منقول ہوا ہے۔

اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ساتویں صدی کے آغاز میں نجاشی کو یہ معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ ایک نبی کی پیشین گوئی کر گئے ہیں، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس نبی کی ایسی صاف نشان دہی انجیل میں موجود تھی، جس کی وجہ سے نجاشی کو یہ رائے قائم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا کہ محمدؐ ہی وہ نبی ہیں۔ البتہ اس روایت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت عیسیٰ کی اس بشارت کے متعلق نجاشی کا ذریعہ معلومات یہی انجیل یوحنا تھی یا کوئی اور ذریعہ بھی اسے جاننے کا اس وقت موجود تھا۔

مبشرات عیسیٰ انجیل برنا باس میں

حقیقت یہ ہے کہ صرف رسول اللہ ﷺ ہی کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کی پیشین گوئیوں کو نہیں، خود حضرت عیسیٰ کے اپنے صحیح حالات اور آپ کی اصل تعلیمات کو جاننے کا بھی معتبر ذریعہ وہ چار انجیلیں نہیں ہیں جنھیں مسیحی کلیسا نے معتبر و مسلم انجیل CANONICAL GOSPELS قرار دے رکھا ہے، بلکہ اس کا زیادہ قابل اعتماد ذریعہ وہ انجیل برنا باس ہے جسے کلیسا غیر قانونی اور مشکوک الصحت APOCRYPHAL کہتا ہے۔ عیسائیوں نے اسے چھپانے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ صدیوں تک یہ دنیا سے ناپید رہی ہے۔ سولھویں صدی میں اس کے اطالوی ترجمے کا صرف ایک نسخہ پوپ سکسٹس SIXTUS کے کتب خانے میں پایا جاتا تھا اور کسی کو اس کے پڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں وہ ایک شخص جان ٹولینڈ کے ہاتھ لگا۔ پھر مختلف ہاتھوں میں گشت کرتا ہوا 1728ء میں ویانا کی امپیریل لائبریری میں پہنچ گیا۔ 1907ء میں اسی نسخے کا انگریزی ترجمہ آکسفورڈ کے کلیرنڈن پریس سے شائع ہو گیا تھا مگر غالباً اس کی اشاعت کے بعد فوراً ہی عیسائی دنیا میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ یہ کتاب تو اس مذہب کی جڑ ہی کاٹ دے رہی ہے جسے حضرت عیسیٰ کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس کے مطبوعہ نسخے کسی خاص تدبیر سے غائب کر دیے گئے اور پھر کبھی اس کی اشاعت کی نوبت نہ آسکی۔ دوسرا ایک نسخہ اسی اطالوی ترجمہ سے اسپینی زبان میں منتقل کیا ہوا اٹھارہویں صدی میں پایا جاتا تھا، جس کا ذکر جارج سیل نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں کیا ہے۔ مگر وہ بھی کہیں غائب کر دیا گیا اور آج اس کا بھی کہیں پتا نشان نہیں ملتا۔ مجھے آکسفورڈ سے شائع شدہ انگریزی ترجمے کی ایک فوٹو اسٹیٹ کاپی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور میں نے اسے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے جس سے عیسائیوں نے محض تعصب اور ضد کی بنا پر اپنے آپ کو محروم کر رکھا ہے۔

مسیحی لٹریچر میں اس انجیل کا جہاں کہیں ذکر آتا ہے، اسے یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک جعلی انجیل ہے جسے شاید کسی مسلمان نے تصنیف کر کے برنا باس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ لیکن یہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے جو صرف اس بنا پر بول دیا گیا کہ اس میں جگہ جگہ بصراحت نبی کریمؐ کے متعلق پیشین گوئیاں ملتی ہیں۔ اوّل تو اس انجیل کو پڑھنے ہی سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کسی مسلمان کی تصنیف کردہ نہیں ہو سکتی۔ دوسرے اگر کسی مسلمان نے لکھی ہوتی تو مسلمانوں میں یہ کثرت سے پھیلی ہوئی ہوتی اور علمائے اسلام کی تصنیفات میں بکثرت اس کا ذکر پایا جاتا۔ مگر یہاں صورت حال یہ ہے کہ جارج سیل کے انگریزی مقدمہ قرآن سے پہلے مسلمانوں کو سرے سے اس کے وجود تک کا علم نہ تھا۔ طبری، یعقوبی، مسعودی، البیرونی، ابن حزم اور دوسرے مصنفین جو مسلمانوں میں مسیحی لٹریچر پر وسیع اطلاع رکھنے والے تھے، ان میں سے کسی کے ہاں بھی مسیحی مذہب پر بحث کرتے ہوئے انجیل برنا باس کی طرف اشارہ تک نہیں ملتا۔ دنیائے اسلام کے کتب خانوں میں جو کتابیں پائی جاتی تھیں ان کی بہترین فہرستیں ابن ندیم کی الفہرست اور حاجی خلیفہ کی کشف الظنون ہیں، اور وہ بھی اس کے ذکر سے خالی ہیں۔ انیسویں صدی سے پہلے کسی مسلمان عالم نے انجیل برنا باس کا نام تک نہیں لیا ہے۔ تیسری اور سب سے بڑی دلیل اس بات کے جھوٹ ہونے کی یہ ہے کہ نبیؐ کی پیدائش سے بھی 75 سال پہلے پوپ گلاسیس اوّل GELASIUS کے زمانے میں بدعقیدہ اور گم راہ کن HERETICAL کتابوں کی جو فہرست مرتب کی گئی تھی، اور ایک پاپائے فتوے کے ذریعہ سے جن کا پڑھنا ممنوع کر دیا گیا تھا، ان میں انجیل برنا باس EVANGELIOM BARNABE بھی شامل تھی۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت کون سا مسلمان تھا جس نے یہ جعلی انجیل تیار کی۔ (مولانا مودودی)

اب یہاں بطور نمونہ "انجیل برنا باس" سے چند بشارتیں نقل کی جاتی ہیں۔

O "تمام انبیا جنھیں خدا نے دنیا میں بھیجا، جن کی تعداد ایک لاکھ 24 ہزار تھی، انھوں نے ابہام کے ساتھ بات کی۔ مگر میرے بعد تمام انبیا اور مقدس ہستیوں کا نور آئے گا جو انبیا کی کہی ہوئی باتوں کے اندھیرے پر روشنی ڈال دے گا کیوں کہ وہ خدا کا رسول ہے۔" (باب:17)

O "فریسیوں اور لاویوں نے کہا اگر تو نہ مسیح ہے، نہ الیاس، نہ کوئی اور نبی، تو کیوں تو نئی تعلیم دیتا ہے اور اپنے آپ کو مسیح سے بھی زیادہ بنا کر پیش کرتا ہے؟ یسوع نے جواب دیا جو معجزے خدا میرے ہاتھ سے دکھاتا ہے وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں وہی کچھ کہتا ہوں جو خدا چاہتا ہے، ورنہ درحقیقت میں اپنے آپ کو اس (مسیح) سے بڑا شمار کیے

جانے کے قابل نہیں قرار دیتا جس کا تم ذکر کر رہے ہو۔ میں تو اس خدا کے رسول کے موزے کے بند یا اس کی جوتی کے تسمے کھولنے کے لائق بھی نہیں ہوں جسے تم مسیح کہتے ہو، وہ مجھ سے پہلے بنایا گیا تھا اور میرے بعد آئے گا اور صداقت کی باتیں لے کر آئے گا تا کہ اس کے دین کی کوئی انتہا نہ ہو۔'' (باب:42)

O ''بالیقین میں تم سے کہتا ہوں کہ ہر نبی جو آیا ہے وہ صرف ایک قوم کے لیے خدا کی رحمت کا نشان بن کر پیدا ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان انبیا کی باتیں ان لوگوں کے سوا کہیں اور نہیں پھیلیں، جن کی طرف وہ بھیجے گئے تھے۔ مگر خدا کا رسول جب آئے گا، خدا گویا اسے اپنے ہاتھ کی مہر دے گا، یہاں تک کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو جو اس کی تعلیم پائیں گے نجات اور رحمت پہنچا دے گا۔ وہ بے خدا لوگوں پر اقتدار لے کر آئے گا اور بت پرستی کا ایسا قلع قمع کرے گا کہ شیطان پریشان ہو جائے گا۔'' (اس کے آگے شاگردوں کے ساتھ ایک طویل مکالمہ میں حضرت عیسیٰ تصریح کرتے ہیں کہ وہ بنی اسماعیل میں سے ہوگا۔ (باب:43)

O ''اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کا رسول وہ رونق ہے جس سے خدا کی پیدا کی ہوئی قریب قریب تمام چیزوں کو خوشی نصیب ہوگی۔ کیوں کہ وہ فہم اور نصیحت، حکمت اور طاقت، خشیت اور محبت، حزم اور ورع کی روح سے مزین ہے جو اس نے خدا سے ان تمام چیزوں کی بہ نسبت تین گنا پائی ہے جنھیں خدا نے اپنی مخلوق میں سے یہ روح بخشی ہے۔ کیسا مبارک وقت ہوگا جب وہ دنیا میں آئے گا۔ یقین جانو، مَیں نے اسے دیکھا ہے اور اس کی تعظیم کی ہے۔ جس طرح ہر نبی نے اسے دیکھا ہے۔ اس کی روح کو دیکھنے ہی سے خدا نے انھیں نبوت دی۔ اور جب مَیں نے اسے دیکھا تو میری روح سکینت سے بھر گئی، یہ کہتے ہوئے کہ اے محمدؐ، خدا تمھارے ساتھ ہو، اور وہ مجھے تمھاری جوتی کے تسمے باندھنے کے قابل بنا دے کیوں کہ یہ مرتبہ بھی پا لوں تو میں ایک بڑا نبی اور خدا کی ایک مقدس ہستی ہو جاؤں گا۔'' (باب:44)

O ''(میرے جانے سے) تمھارا دل پریشان نہ ہو، نہ تم خوف کرو، کیوں کہ مَیں نے تمھیں پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ خدا ہمارا خالق ہے، جس نے تمھیں پیدا کیا ہے، وہی تمھاری حفاظت کرے گا، رہا میں تو اس وقت میں دنیا میں اس رسول خدا کے لیے راستہ تیار کرنے آیا ہوں جو دنیا کے لیے نجات لے کر آئے گا۔۔۔ اندریاس نے کہا، استاد ہمیں اس کی نشانی بتا دے تا کہ ہم اسے پہچان لیں۔ یسوع نے جواب دیا، وہ تمھارے زمانے میں نہیں آئے گا بلکہ تمھارے کچھ سال بعد آئے گا جب کہ میری انجیل ایسی مسخ ہو چکی ہوگی کہ مشکل سے کوئی 30 آدمی مومن باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت اللہ دنیا پر رحم فرمائے گا اور اس کے ذریعہ سے خدا کی معرفت دنیا کو حاصل ہوگی۔ وہ بے خدا لوگوں کے خلاف بڑی طاقت کے ساتھ آئے گا اور زمین پر بت پرستی کو مٹا دے گا۔ اور مجھے اس کی بڑی خوشی ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ سے ہمارا خدا پہچانا جائے گا اور اس کی تقدیس ہوگی اور میری صداقت دنیا کو معلوم ہوگی اور وہ ان لوگوں سے انتقام لے گا جو مجھے انسان سے بڑھ کر کچھ قرار دیں گے۔۔۔ وہ ایک ایسی صداقت کے ساتھ آئے گا جو تمام انبیا کی لائی ہوئی صداقت سے زیادہ واضح ہوگی۔'' (باب:72)

O ''خدا کا عہد یروشلم میں، معبد سلیمان کے اندر تعمیر کیا گیا تھا نہ کہ کہیں اور۔ مگر میری بات کا یقین کرو کہ ایک وقت آئے گا جب خدا اپنی رحمت ایک اور شہر میں نازل فرمائے گا، پھر ہر جگہ اس کی صحیح عبادت ہو سکے گی، اور اللہ اپنی رحمت سے ہر جگہ سچی نماز کو قبول فرمائے گا۔۔۔ میں دراصل اسرائیل کے گھرانے کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں، مگر میرے بعد مسیح آئے گا، خدا کا بھیجا ہوا تمام دنیا کی طرف، جس کے لیے خدا نے یہ ساری دنیا بنائی ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں اللہ کی عبادت ہوگی، اور اس کی رحمت نازل ہوگی۔'' (باب:83)

O ''(یسوع نے سردار کاہن سے کہا) زندہ خدا کی قسم جس کے حضور میری جان حاضر ہے، میں وہ مسیح نہیں ہوں جس کی آمد کا تمام دنیا کی قومیں انتظار کر رہی ہیں، جس کا وعدہ خدا نے ہمارے باپ ابراہیم سے یہ کہ کر کیا تھا کہ ''تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی۔'' (پیدائش 18:22) مگر جب خدا مجھے دنیا سے لے جائے گا تو شیطان پھر یہ بغاوت برپا کرے گا کہ ناپرہیزگار لوگ مجھے خدا اور خدا کا بیٹا مانیں۔ اس کی وجہ سے میری باتوں اور میری تعلیمات کو مسخ کر دیا جائے گا یہاں تک کہ بمشکل تین صاحب ایمان باقی رہ جائیں گے۔ اس وقت خدا دنیا پر رحم فرمائے گا اور اپنا رسول بھیجے گا جس کے لیے اس نے دنیا کی یہ ساری چیزیں بنائی ہیں، جو قوت کے ساتھ جنوب سے آئے گا اور بتوں کو بت پرستوں کے ساتھ برباد کر دے گا، جو شیطان سے وہ اقتدار چھین لے گا جو اس نے انسانوں پر حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کی رحمت ان لوگوں کی نجات کے لیے اپنے ساتھ لائے گا جو اس پر ایمان لائیں گے، اور مبارک ہے وہ جو اس کی باتوں کو مانے۔'' (باب:96)

O ''سردار کاہن نے پوچھا، کیا خدا کے اس رسول کے بعد دوسرے نبی بھی آئیں گے؟ یسوع نے جواب دیا اس کے بعد خدا کے بھیجے ہوئے سچے نبی نہیں آئیں گے۔ مگر بہت سے جھوٹے نبی آ جائیں گے جن کا مجھے بڑا غم ہے۔ کیوں کہ شیطان خدا کے عادلانہ فیصلے کی وجہ سے انھیں اٹھائے گا اور وہ میری انجیل کے پردے میں اپنے آپ کو چھپائیں گے۔'' (باب:97)

''سردار کاہن نے پوچھا کہ وہ مسیح کس نام سے پکارا جائے گا اور کیا نشانیاں اس کی آمد کو ظاہر کریں گی؟ یسوع نے جواب دیا اس مسیح کا نام ''قابل تعریف'' ہے، کیوں کہ خدا نے جب اس کی روح پیدا کی تھی، اس وقت اس کا یہ نام خود رکھا تھا اور وہاں اسے ایک ملکوتی شان میں رکھا گیا تھا۔ خدا نے کہا: ''اے محمد، انتظار کر، کیوں کہ تیری ہی خاطر میں جنت، دنیا اور بہت سی مخلوق پیدا کروں گا اور اسے تجھے تحفہ کر دوں گا، یہاں تک کہ جو تیری تبریک کرے گا اسے برکت دی جائے گی اور جو تجھ پر لعنت کرے گا اس پر لعنت کی جائے گی۔ جب میں تجھے دنیا کی طرف بھیجوں گا تو میں تجھ کو اپنے پیغامبر نجات کی حیثیت سے بھیجوں گا۔ تیری بات سچی ہوگی یہاں تک کہ زمین و آسمان ٹل جائیں گے

مگر تیرا دین نہیں مٹے گا''، سو اس کا مبارک نام محمد ہے۔'' (باب: 97)

O برناباس لکھتا ہے کہ ایک موقع پر شاگردوں کے سامنے حضرت عیسیٰؑ نے بتایا کہ میرے ہی شاگردوں میں سے ایک (جو بعد میں یہوداہ اسکریوتی نکلا) مجھے 30 سکوں کے عوض دشمنوں کے ہاتھ بیچ دے گا، پھر فرمایا:

''اس کے بعد مجھے یقین ہے کہ جو مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے مارا جائے گا، کیوں کہ خدا مجھے زمین سے اُوپر اٹھالے گا اور اس غدار کی صورت ایسی بدل دے گا کہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ وہ میں ہی ہوں۔ تاہم جب وہ ایک بُری موت مرے گا تو ایک مدت تک میری ہی تذلیل ہوتی رہے گی، مگر جب محمد ﷺ، خدا کا مقدس رسول آئے گا تو میری وہ بدنامی دور کر دی جائے گی اور خدا یہ اس لیے کرے گا کہ مَیں نے اس مسیح کی صداقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مجھے اس کا یہ انعام دے گا کہ لوگ یہ جان لیں گے کہ میں زندہ ہوں اور اس ذلت کی موت سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔'' (باب: 113)

O ''(شاگردوں سے حضرت عیسیٰؑ نے کہا) بے شک میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر موسیٰ کی کتاب سے صداقت مسخ نہ کر دی گئی ہوتی تو خدا ہمارے باپ داؤدؑ کو ایک دوسری کتاب نہ دیتا؟ اور اگر داؤد کی کتاب میں تحریف نہ کی گئی ہوتی تو خدا مجھے انجیل نہ دیتا، کیوں کہ خداوند ہمارا خدا بدلنے والا نہیں ہے اور اس نے سب انسانوں کو ایک ہی پیغام دیا ہے۔ لہٰذا جب اللہ کا رسول آئے گا تو وہ اس لیے آئے گا کہ ان ساری چیزوں کو صاف کر دے جن سے بے خدا لوگوں نے میری کتاب کو آلودہ کر دیا ہے۔'' (باب: 124)

ان صاف اور مفصل پیشین گوئیوں میں صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو بادی النظر میں نگاہ کو کھٹکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں، اور انجیل برناباس کی متعدد دوسری عبارتوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے مسیح ہونے کا انکار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ صرف انھی عبارتوں میں نہیں بلکہ اس انجیل کے بہت سے مقامات پر رسول اللہ کا اصل عربی نام ''محمدؐ'' لکھا گیا ہے، حالانکہ یہ انبیا کی پیشین گوئیوں کا عام طریقہ نہیں ہے کہ بعد میں آنے والی کسی ہستی کا اصل نام لیا جائے۔ تیسری یہ کہ اس میں آنحضرت ﷺ کو مسیح کہا گیا ہے۔

مبشراتِ عیسیٰ

﴿وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ﴾ (الصف: 6)

''اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمھارے پاس خدا کا قاصد بن کر اور مجھ سے پہلے جو تورات آئی اس کی تصدیق کرتا ہوا، اور اپنے بعد احمد ﷺ نام ایک پیغمبر کی خوش خبری لے کر آیا ہوں''

قرآن حکیم کی اس آیت کریمہ میں عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے دو مقاصد بیان فرمائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ شریعت موسوی کی تصدیق کے لیے اور مرورِ ایام سے اس میں جو بگاڑ پیدا ہو گیا تھا، اس کی اصلاح کرنے کو تشریف لائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ آپ نبی آخر الزماں، ہادی کل، رحمت عالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ظہور کی بشارت دیں اور اقوام عالم کو انسانیت کے محسنِ اعظم کے استقبال کی تیاری کرنے پر آمادہ کریں۔ اس اعتبار سے لازم ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت و تبلیغ کا بڑا حصہ انھی دو مقاصد کے تابع ہو لیکن آپ کی تعلیمات جس وسیع تحریف و تغلیط کا شکار ہوئی ہیں، اس کی بدولت موجودہ زمانے کی رائج انجیل میں انھی مقاصدِ کبیرہ کی جھلک سب سے زیادہ دھندلائی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس مضمون کا موضوع چوں کہ ظہورِ محمدی ﷺ کے بارے میں عیسیٰ علیہ السلام کے ارشادات ہیں، اس لیے ہم بعثت عیسوی کے اول الذکر مقصد سے بحث نہیں کریں گے اور اس موضوع پر بھی علمائے سیرت نے متعدد تصنیفات میں مروجہ تورات و انجیل کے ان مقامات کی نشان دہی کر دی ہے جن پر خاتم المرسلین ﷺ سے متعلق پیش گوئی کا اطلاق ہو سکتا ہے، ہم یہاں ان مقامات کا اعادہ نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ ہمارے سامنے عیسیٰ علیہ السلام کے سوانح کا وہ حصہ ہے، جسے ارباب کلیسا نے یہ کہ کر صدیوں پوشیدہ رکھا کہ جعلی انجیل ہے جو کسی ''بدعتی'' نے لکھ دی ہے۔

یہ وہ انجیل ہے جو برناباس حواری نے لکھی تھی۔ دنیا کو اس کے وجود کا علم پہلی بار اٹھارویں صدی کے اوائل میں ہوا جب شاہ پروشیا (PRUSSIA) کے مشیر جے۔ ایف۔ کریمر (J.F. CRAMER) نے 1709ء میں ایمسٹرڈیم کے کسی معزز آدمی کے کتاب خانے میں اس کا نسخہ دریافت کیا۔ یہ ایطالی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ کریمر نے یہ نسخہ 1713ء میں سافوئے کے شاہزادہ یوجین کی نذر کر دیا۔ 1738ء میں شاہزادہ یوجین کا سارا کتب خانہ وی آنا کے شاہی کتب خانہ HOFBIBLIOTEK میں منتقل ہوا، اور تب سے انجیل برناباس کا یہ ایطالی نسخہ وہیں محفوظ ہے۔

وی آنا پہنچنے تک اس کتاب کا علم چند خاص خاص لوگوں سے باہر نہیں نکلا۔ خصوصاً مسلمانوں کو اس کی موجودگی کا بالکل پتا نہ تھا۔ اس دَور کے عیسائی علماء بھی اس سے پوری طرح واقف نہ ہوئے تھے۔ البتہ اس کا چرچا ان کے حلقوں میں ہو چکا تھا۔ اور وہ یوں تھا کہ مسلمانوں نے کوئی جعلی انجیل لکھ رکھی ہے، جس کا ایطالی ترجمہ یورپ میں موجود ہے اور پھر خود ایک عیسائی عالم ہی نے انکشاف کیا کہ اس کتاب کا ایک ہسپانوی ترجمہ بھی موجود ہے۔ مشہور انگریز مستشرق جارج سیل نے ایطالی نسخے کے وی آنا پہنچنے سے چار سال قبل 1734ء میں قرآن حکیم کا ترجمہ شائع کیا، تو اس کے تمہیدی مباحث میں اس نے یہ عبارت لکھی: ''مسلمانوں کے پاس ایک عربی انجیل بھی ہے، جسے وہ سینٹ برناباس کی انجیل بتاتے ہیں۔ اس انجیل میں یسوع مسیح کی تاریخ ایسے ڈھنگ سے بیان کی گئی ہے، جو صحیح اناجیل کے طرز بیان کے بالکل برعکس ہے اور انھی طریقوں پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے، جن پر محمد ﷺ اپنے قرآن میں چلے ہیں۔''

اس کے بعد جارج سیل نے اس انجیل کی دریافت کا قصہ بیان کیا اور ایک

ہسپانوی مسلمان مصطفیٰ عرندی کو اس کی تصنیف کا ذمہ دار قرار دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اس مفروضے کی دلیل میں برناباس کی ایک روایت نقل کی، جو اس مضمون میں اقتباس نمبر 19 کے تحت ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ہماری معلومات کی حد تک بیش تر مسلمان علما نے اس معاملے کو وقعت نہیں دی۔ موجودہ صدی کے سیرت نگاروں کے ہاں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ البتہ مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی مشہور مناظرانہ تصنیف ''اظہار الحق'' میں مختصراً جارج سیل کے اس الزام کی تردید کی کہ مسلمانوں نے کوئی جعلی انجیل مرتب کی تھی، اور اس کے بعد اس کی نقل کردہ روایت کو کلامِ عیسیٰ ٹھہرایا۔ بہرحال، جہاں تک خود اس انجیل برناباس کا تعلق تھا، علمائے اسلام اس سے ناواقف رہے۔ حتیٰ کہ سرسید احمد خان 1869ء میں جب لندن میں بیٹھے سیرتِ رسول ﷺ کے لیے مواد جمع کر رہے تھے، انھیں بھی اس نادرۂ روزگار کتاب کا پتا نہ چلا۔ آخر 1907ء میں ایک انگریز پادری لانسڈیل راگ اور ان کی اہلیہ لارا راگ LONSDALE AND LAURA RAGG نے اس کا انگریزی ترجمہ شائع کر دیا۔ اس سے مصر کے ایک عیسائی عالم ڈاکٹر خلیل سعادت نے 1908ء میں عربی ترجمہ کیا اور اس عربی ترجمے کو مولوی محمد حلیم انصاری ردولوی نے اردو میں منتقل کر کے ۱۹۱۰ء میں لاہور سے شائع کیا۔

عیسائی علما نے انجیل برناباس کے آشکار ہو جانے کے بعد اسے جعلی ثابت کرنے کے لیے بڑی دل چسپ بحثیں چھیڑی ہیں لیکن وہ اس مضمون کے موضوع سے باہر ہیں۔ بہرحال اس کتاب کے اصل ہونے پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ بعینہٖ متّی لوقا، مرقس اور یوحنا کی انجیلوں پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ گویا برناباس کی انجیل کا بہ اعتبارِ صحت کم از کم وہ مقام ضرور ہے جو عیسائیوں کی تسلیم کردہ دوسری اناجیل کا ہے۔ چنانچہ جس طرح علمائے سیرت نے مروجہ تورات اور انجیل سے نبی آخر الزماں ﷺ کے ظہور کے لیے استشہاد کیا ہے، اسی طرح برناباس کی انجیل سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ یہ کتاب اناجیل اربعہ کی نسبت اس کی زیادہ مستحق ہے، کیوں کہ بنیادی عقائد کے معاملے میں انجیل برناباس جس قدر قرآن اور سنتِ نبوی سے قریب ہے، اتنی قریب عیسائیوں کی کوئی اور مقدس کتاب نظر نہیں آتی۔

برناباس حواری کی انجیل میں آنحضرت ﷺ کی بعثت کے آثار اور آپ ﷺ کے وہ خصائص کبریٰ جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو افضل الانبیا اور خاتم المرسلین کے رُتبۂ بلند سے سرفراز فرمایا ہے، اس قدر تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں کہ ایک عام سلیم الفکر قاری کے لیے مزید وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ ہم یہاں اس کتاب سے وہ تمام اقتباسات نقل کر رہے ہیں جو ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔

سینٹ برناباس کے بیان کی رو سے عیسیٰ علیہ السلام کو تیس سال کی عمر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فریضۂ نبوت کی ادائیگی کا حکم سنایا۔ چنانچہ آپ نے تبلیغِ دین کے لیے جو پہلا خطبہ بیت المقدس میں ارشاد فرمایا، اس میں افضل الانبیا کی آمد کی طرف یوں اشارہ کیا:

(1) ''پاک ہے نام اللہ قدوس کا، جس نے تمام رسولوں اور نبیوں کا نور پیدا کیا سب چیزوں سے قبل، تاکہ اُسے دنیا کے چھٹکارے کے لیے بھیجے، جیسا کہ اس نے اپنے بندے داؤدؑ کے ذریعے یہ کہتے ہوئے کلام کیا ہے کہ ''میں نے پاک روحوں کی روشنی میں صبح کے ستارے سے قبل تجھے کو پیدا کیا۔'' (7:12)

اوّل مخلوق

اس اجمال کی تفصیل انجیل برناباس کے باب 35 میں اس موقع پر بیان کی گئی ہے، جب عیسیٰ علیہ السلام بیت المقدس میں یہودی کاہنوں اور علما کے درمیان تبلیغ توحید کے باعث ان کے غصے کا مورد بن چکے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو اطمینان دلا دیا تھا کہ یہ لوگ آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے اور آپ کو اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک دنیا اختتام کے قریب نہ پہنچ جائے۔ اس بشارت کے بعد عیسیٰ علیہ السلام مخالفت اور عداوت سے بے نیاز ہو کر اعلائے کلمۃ الحق میں سرگرم ہو گئے۔ اس دوران میں جب آپ دریائے اردن کے پار صحرا میں فروکش تھے، ایک روز آپ کے حواریوں نے اس نکتہ کی وضاحت چاہی کہ ابلیس غرور کے باعث کیوں کر راندۂ درگاہِ الٰہی ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

(2) ''جب اللہ نے مٹی کا ایک ٹکڑا پیدا کیا، اور اسے پچیس ہزار سال بغیر اس کے ڈالے رکھا کہ کچھ اور کرے، شیطان نے، جو کاہن اور فرشتوں کے سردار کی مانند تھا، بوجہ اس بڑے اِدراک کے جو اسے حاصل تھا، یہ معلوم کر لیا کہ بے شک اللہ اسی ٹکڑے سے ایک لاکھ چوالیس ہزار نبیوں کو بنائے گا، جنھیں نبوت کی عزت دی گئی ہوگی اور رسول اللہ کو بھی، جس کی روح اللہ نے ہر دیگر چیز سے ساٹھ ہزار سال قبل پیدا کی ہے۔'' (6:35-8) اس کے بعد آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے ابلیس کے انکار کا واقعہ تقریباً اسی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، جو قرآن مجید میں درج ہے۔ اور پھر اس ضمن میں عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

(3)۔ ''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو آدمی نماز نہیں پڑھتا، وہ شیطان سے بھی بُرا ہے۔ اور عن قریب اس پر بہت ہی بڑا عذاب وارد ہوگا۔ اس واسطے کہ شیطان کے لیے اس کے گرنے سے قبل ڈرنے کے بارے میں کوئی عبرت موجود نہ تھی۔ اور اللہ نے اس کے لیے کوئی رسول نہیں بھیجا، جو اسے توبہ کی طرف بلاتا لیکن انسان۔ بہ حالیکہ تمام انبیا سوائے اس رسول اللہ کے آ چکے ہیں، جو میرے بعد آئے گا، کیوں کہ اللہ اسی امر کا ارادہ رکھتا ہے کہ میں اس کا راستہ صاف کروں۔ بے فکری کے ساتھ بغیر کسی خوف کے یوں زندگی بسر کرتا ہے، گویا خدا موجود ہی نہیں۔'' (2:36-6)

اس ارشاد میں اس امر کی تصریح موجود ہے کہ آنحضور ﷺ خاتم المرسلین ہوں گے۔ آگے چل کر باب 39 میں تخلیق آدم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے اور اس میں دوبارہ محمد ﷺ کے نور کی تخلیق صراحت سے بیان کی گئی ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کا یہ بیان حضرت برناباس نے یوحنا حواری کے اس سوال کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ آدم علیہ

السلام نے کیوں کر غرور کے سبب شجرِ ممنوعہ کھانے کی خطا کی۔عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

(4) پھر اللہ نے اپنی طرف سے انسان کو جان عطا کی اور اس وقت سب فرشتے یہ (نغمہ) گاتے تھے: ''اے ہمارے اللہ! ہمارے پروردگار! بزرگ ہے تیرا پاک نام!'' پس جب آدم اپنے پیروں پر کھڑا ہوا' اس نے آسمان میں ایک تحریر سورج کی طرح چمکتی دیکھی۔جس کی عبارت تھی لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔تب آدم نے اپنا منہ کھولا اور کہا: ''میں تیرا شکر کرتا ہوں اے میرے پروردگار! کیوں کہ تو نے مہربانی کی پس مجھے پیدا کیا۔لیکن میں تیری منت کرتا ہوں' مجھے خبر دے کہ ان کلمات کے کیا معنی ہیں۔محمد رسول اللہ۔''

تب اللہ نے جواب دیا ''مرحبا ہے تجھے' اے میرے بندے آدم! اور میں تجھے بتلاتا ہوں کہ تو پہلا انسان ہے جسے میں نے پیدا کیا۔اور یہ شخص' جسے تو نے دیکھا ہے' تیرا ہی بیٹا ہے۔جو اس وقت کے بہت سال بعد دنیا میں آئے گا اور وہ میرا ایسا رسول ہوگا کہ اس کے لیے میں نے سب چیزوں کو پیدا کیا ہے۔وہ رسول کہ جب آئے گا' دنیا کو ایک روشنی بخشے گا۔یہ وہ نبی ہے کہ اس کی روح ایک آسمانی روشنی میں رکھی گئی ساٹھ ہزار سال قبل اس کے کہ میں کسی چیز کو پیدا کروں۔'' پس آدم نے بہ منت یہ کہا: ''اے پروردگار یہ تحریر مجھے میرے ہاتھ کی انگلیوں کے ناخنوں پر عطا فرما۔'' تب اللہ نے پہلے انسان کو یہ تحریر اس کے دونوں انگوٹھوں پر عطا کی۔داہنے ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن پر یہ عبارت: لا الٰہ الا اللہ' اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن پر یہ عبارت: محمد رسول اللہ۔تب پہلے انسان نے ان کلمات کو بڑی محبت کے ساتھ بوسہ دیا' اور اپنی دونوں آنکھوں سے ملا اور کہا: ''مبارک ہے وہ دن جس میں تو دنیا کی طرف آئے گا۔''
(28-13:39)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ان بشارتوں میں تمام مخلوقات سے قبل نور محمدی ﷺ کی تخلیق کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے' اس کا ذکر احادیث نبوی میں بھی ملتا ہے۔اس سلسلے میں سب سے پہلی روایت ''مصنف عبدالرزاق'' میں ہے: یا جابر اول ماخلق اللہ نور نبیك من نورہ' ''اے جابر سب سے پہلے اللہ نے تیرے پیغمبر کا نور اپنے نور سے پیدا کیا۔'' اس کے بعد ذکر ہے کہ اس نور کے چار حصے ہوئے' اور انھی سے لوح و قلم' عرش و کرسی' آسمان و زمین' اور جن و انس کی پیدائش ہوئی۔اس میں شک نہیں کہ یہ اور اس مضمون کی دوسری روایات علم حدیث کے مسلّمہ پیمانوں کی رُو سے مستند نہیں کہی جا سکتیں۔چنانچہ وہ علما جو کسی روایت کو صحت کی شرائط کے بغیر قبول نہیں کرتے' ان روایات میں کلام کرتے ہیں۔البتہ علما کا ایک گروہ' جس میں ارباب سیر کی کثیر تعداد شامل ہے' فضائل کے باب میں روایت کی صحت پر اتنا اصرار نہیں کرتے' جتنا احکام کے باب میں کیا جاتا ہے۔اس لیے وہ ایسی تمام روایات کو جن کی تائید دوسرے طریقوں سے ہوئی ہو' اپنی کتابوں میں درج کرتے آئے ہیں' گویا یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے نور محمدی ﷺ کی تخلیق کی' اس میں علما کی دو رائیں ہیں' البتہ اس امر پر سب متفق ہیں کہ انبیا میں اوّل مخلوق حضور انور ﷺ ہی ہیں۔اس سلسلے میں مشکوٰۃ المصابیح میں شرح السنۃ سے مندرجہ ذیل روایت قابل ذکر ہے۔

''عن العرباض بن سارية عن رسول الله ﷺ انه قال انی عندالله مكتوب خاتم النبيين وان اٰدم لمنجدل فی طينته و ساخبركم باول امری' دعوة ابراهيم' وبشارة عيسیٰ' ورؤيا امی التی رأت حين وضعتنی' وقدخرج لها نور أضاء لها منه قصور الشام.''
(مشکوٰۃ: 5759)

حضرت عرباضؓ بن ساریہ کہتے ہیں ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں (اس وقت سے) خاتم النّبیین لکھا ہوا ہوں' جب آدم اپنی گندھی ہوئی مٹی میں پڑے تھے۔اور میں تمھیں بتلاتا ہوں کہ میری (نبوت کے معاملے میں) پہلی (خبر) ابراہیمؑ کی دعا تھی' پھر عیسیٰؑ کی بشارت تھی اور پھر میری والدہ کا وہ خواب جو انھوں نے مجھے جنتے وقت دیکھا' اور ان کے سامنے ایک نور ظاہر ہوا جس سے شام کے محل انھیں نظر آئے۔''

مذکورہ بالا دونوں احادیث عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت نمبر ۴ کے ساتھ ملا کر پڑھی جائیں تو اس امر میں شک وشبے کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ آنحضور ﷺ کا نور مخلوق اوّل ہے۔اور آپ ﷺ کی فضیلت کا اظہار سب سے پہلے آدم علیہ السلام کے سامنے ہوا۔بلکہ حضرت آدمؑ پر یہ حقیقت بھی روشن کر دی گئی کہ آپ ﷺ کو عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا جائے گا۔چنانچہ انجیل برنباس میں ہبوط آدم ہی کا قصہ بیان کرتے ہوئے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

(5) پھر اللہ نے آدم اور حوا سے' جو دونوں رو پیٹ رہے تھے' کہا: تم دونوں جنت سے نکل جاؤ۔اور بدنوں کو مشقت میں ڈالو۔اور تمھاری امید کم زور نہ ہو' کیوں کہ میں تم دونوں کے بیٹے کو ایسی حالت میں بھیجوں گا کہ اس حالت سے تمھاری ذریّت کے لیے نوعِ انسانی پر سے شیطان کا قابو اٹھا دینا ممکن ہوگا۔اس لیے کہ میں عن قریب اپنے اس رسول کو' جو کہ جلد ہی آنے والا ہے' تمام چیزیں عطا کروں گا۔'' پھر اللہ پوشیدہ ہو گیا' اور فرشتہ میخائیل نے دونوں کو جنت سے نکال دیا۔پس جب آدم نے مڑ کر نگاہ کی' اس نے دروازے پر لکھا دیکھا: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔تب وہ اس وقت رویا' اور کہا: ''اے بیٹے! کاش اللہ یہ ارادہ کرے کہ تو جلد آئے اور ہمیں اس کم بختی اور مصیبت سے نجات دلائے۔'' (31-25:41)

بالکل اسی مضمون کی ایک حدیث المواہب اللدنیہ میں حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام سے خطا کا ارتکاب ہو گیا تو انھوں نے عرض کیا! اے پروردگار میں محمد ﷺ کے واسطے سے مغفرت کی درخواست کرتا ہوں۔سو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے آدم! تم نے محمد ﷺ کو کیسے پہچانا؟ حالانکہ ہنوز میں نے انھیں پیدا بھی نہیں کیا۔عرض کیا کہ اے رب میں نے سر جو اٹھایا تو عرش کے پایوں پر یہ لکھا ہوا دیکھا لا الٰہ الا اللہ محمدا رسول اللہ سو میں نے معلوم کر لیا کہ آپ نے اپنے نام پاک کے ساتھ ایسے ہی شخص

کے نام کو ملایا ہوگا جو آپ کے نزدیک تمام مخلوق سے زیادہ پیارا ہوگا۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم! تم سچے ہو۔ واقعی وہ میرے نزدیک تمام مخلوق سے زیادہ پیارے ہیں۔ اور جب تم نے ان کے واسطے سے مجھ سے درخواست کی ہے تو میں نے تمھاری مغفرت کی اور اگر محمد ﷺ نہ ہوتے تو میں تمھیں بھی پیدا نہ کرتا۔

روشن چراغ:

تورات اور انجیل کی مروّجہ کتابوں میں بھی اس امر کے متعدد ارشادات ملتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو انبیائے سابق کی پیشگوئیوں کی بنا پر اس ہادیٔ کل کی آمد کا انتظار تھا' جو ساری دنیا کے لیے ہدایت اور نجات لے کر آئے گا۔ یہودیوں کی کتب مقدسہ میں اس آنے والے کا نام کہیں مذکور نہ تھا۔ البتہ اس کے لیے مسیا کا لقب استعمال کیا گیا تھا۔ ادھر عیسیٰ علیہ السلام سے جن معجزات کا ظہور ہو رہا تھا' ان کے باعث بنی اسرائیل کے عوام اور علما دونوں طبقوں کو اس امر میں شک کرنے کی تو گنجائش نہ تھی کہ ابن مریم اللہ کے نبی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی فوری طور پر یہ سوال ان لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا کہ کہیں یہ وہی نبی تو نہیں جس کی آمد کی خبر موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت یحییٰ تک سب انبیا اہتمام کے ساتھ دیتے آئے تھے۔ یہ سوال کچھ لوگوں کے دلوں میں تو اس وجہ سے پیدا ہوا کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ حقیقت سے آگاہ ہونے کے متمنی تھے۔ ان میں خود حضرت عیسیٰ کے شاگرد شامل تھے۔ چنانچہ آپ کو اپنے شاگردوں سے خطاب کے دوران میں جوں ہی اس کا موقع ملا۔ آپؑ نے انھیں آگاہ کر دیا کہ اللہ کی طرف سے آخری ہدایت لے کر آنے والا میرے بعد آئے گا۔ چنانچہ انجیل برناباس کے باب 17 میں جہاں توحید باری تعالیٰ پر نہایت دل نشین خطبہ نقل کیا گیا ہے' ایک شاگرد نے اس وقت کی یہودی کتب مقدسہ کے حوالے سے یہ کہا کہ ان میں تو اللہ کے لیے باپ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اپنے شاگرد کی اس اُلجھن کو حل کرنے کی غرض سے حضرت عیسیٰ نے جواب دیا تو اس میں خاتم المرسلین ﷺ کی ایک اہم خصوصیت بھی بیان فرمادی ہے۔ وہ یہ ہے:

(6) تب یسوع نے جواب دیا: "تحقیق نبیوں (کی کتابوں) میں بہت سی ایسی مثالیں لکھی ہوئی ہیں' کہ ہمیں ان کے لفظوں کا لینا واجب نہیں' بلکہ ان کے معنی اخذ کرنے چاہئیں۔ کیوں کہ تمام انبیا نے' جن کی تعدا ایک لاکھ چوالیس ہزار تک (پہنچتی) ہے۔ جنھیں اللہ نے دنیا میں بھیجا' انھوں نے معموں میں تاریکی کے ساتھ باتیں کی ہیں لیکن عن قریب میرے بعد تمام نبیوں اور پاک آدمیوں کی روشنی آئے گا' تب وہ تمام نبیوں کے اقوال کی تاریکی پر نور چمکائے گا۔ کیوں کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔"
(23-20:17)

اس کا موازنہ ذرا سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 85 سے کیجیے' جہاں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: ﴿وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا﴾ (بنی اسرائیل: 85) "اور تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی قرآن مجید کی اس آیت کا مطالعہ کیجیے' جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس خصوصیت کا ذکر ہے:

﴿وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ: 151)

"اور وہ تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے' جو تم نہ جانتے تھے۔"

بلکہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس اور تعلیم دونوں کے لیے نور کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد بارہا ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ آپ بنی نوعِ انسان کو تاریکی سے نکال کر نور کی طرف لے جانے کے لیے بھیجے گئے ہیں اور اس حیثیت سے آپ ﷺ کی ذات ایک روشن چراغ کی مانند ہے۔

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ۝ وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَ سِرَاجًا مُّنِیْرًا ۝﴾ (الاحزاب: 45تا46)

"اے نبی ﷺ! ہم نے تمھیں بھیجا ہے گواہ بنا کر' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر' اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر۔"

انجیل برناباس میں عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے واقعات اسی ترتیب کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں' جس ترتیب سے ان کا ظہور ہوا' چنانچہ مروجہ انجیل کے برعکس' اس کتاب کے مطالعے سے اللہ کے اس پیغمبر کی تحریک کی رفتار اور اس سے پیدا ہونے والے ردِعمل کی تدریجی شدت کا بہ آسانی اندازہ ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ واضح ہے کہ آپؑ نے اپنی نبوت کے دونوں بنیادی مقاصد کو اوّل روز سے پیش نظر رکھا۔ یعنی ایک طرف بنی اسرائیل کو صراطِ مستقیم کی طرف واپس لانا اور دوسری طرف انھیں آگاہ کرنا کہ اللہ کا آخری رسول مکمل اور ابدی ہدایت کے ساتھ آنے والا ہے' اس کے استقبال کی تیاری کرو۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے' بنی اسرائیل انبیائے سابق کے ارشادات کی روشنی میں چوں کہ خاتم المرسلین کے منتظر تھے' اس لیے سب سے پہلے خود حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہ گمان پیدا ہوا کہ آپؑ ہی ان ارشادات کے مصداق ہیں۔ چنانچہ مذکورہ بالا بشارت نمبر 6 کے ذریعے آپؑ نے اپنے شاگردوں کو حقیقت کی خبر دی۔ اس کے بعد بنی اسرائیل کے طبقۂ علما نے اس معاملے کی وضاحت طلب کرنے کے لیے اپنے ایلچی آپؑ کے پاس بھیجے۔ انھوں نے آتے ہی یہ سوال کیا کہ کیا تو مسیا ہے؟ پھر جو گفتگو ہوئی' وہ ملاحظہ فرمائیے:

(7) اس وقت یسوع نے کہا: "میں ایک آواز ہوں شور مچانے والی تمام یہودیہ میں' جو چیختی ہے کہ پروردگار کے رسول کا راستہ دُرست کرو' جیسا کہ یسعیاہ میں لکھا ہوا ہے۔" انھوں نے کہا: "جب تو نہ مسیح ہے' نہ ایلیا نہ کوئی اور نبی تو پھر کیوں ایک نئی تعلیم کی بشارت دیتا ہے' اور اپنے آپ کو مسیا سے بڑھ کر شان دار بتاتا ہے؟"

یسوع نے جواب دیا: "تحقیق خدا کی نشانیاں' جو اللہ میرے ہاتھ سے عیاں کرتا ہے' وہ ظاہر کرتی ہیں کہ میں وہی کہتا ہوں جو اللہ کا ارادہ ہوتا ہے۔ اور میں اپنے آپ کو اس کی مانند نہیں شمار کرتا' جس کی نسبت تم کہہ رہے ہو۔ کیوں کہ میں اس لائق بھی نہیں ہوں کہ اس رسول اللہ کے موزے کے بند یا جوتے کے تسمے کھولوں' جسے تم مسیا کہتے

ہو۔ وہ مجھ سے پہلے پیدا کیا گیا اور اب میرے بعد آئے گا۔ اور وہ بہت جلد کلامِ حق کے ساتھ آئے گا' اور اس کے دین کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔'' (17-10:42)

اس موقع پر چوں کہ خطاب علمائے بنی اسرائیل سے تھا' اس لیے حضرت عیسیٰؑ نے اپنے مشن کا استشہاد سب سے پہلے تورات سے کیا۔ اس جگہ یسعیاہ نبی کی جس پیش گوئی کا حوالہ دیا گیا ہے' وہ دراصل عہد نامۂ قدیم کی کتاب یسعیاہ کے چالیسویں باب کے آغاز میں ہے۔ ویسے یہ پورا باب اور اس کے بعد اگلے دو ابواب بھی ایک آنے والے رسول کی ان خصوصیات سے پُر ہیں جن کا اطلاق آنحضرت ﷺ کے سوا اور کسی پر نہیں ہو سکتا۔ اس باب کی تیسری آیت سے یہ مضمون یوں شروع ہوتا ہے:

بیابان میں ایک منادی کرنے والے کی آواز۔ تم خداوند کی راہ دُرست کرو۔ صحرا میں ہمارے خدا کے لیے ایک سیدھی راہ تیار کرو۔ ہر ایک نشیب اونچا کیا جائے۔ اور ہر ٹیڑھی چیز سیدھی اور ناہموار جگہیں ہموار کی جائیں۔ اور خداوند کا جلال آشکارا ہوگا' اور سب بشر ایک ساتھ اسے دیکھیں گے کہ خداوند کے منہ نے یہ فرمایا ہے۔ ایک آواز ہوئی کہ منادی کر! دو میں نے کہا میں کیا منادی کروں۔ سب بشر گھاس ہے اور ان کی ساری رونق میدان کے پھول کی مانند ہے۔ گھاس مرجھاتی ہے' پھول کملاتے ہیں کیوں کہ خداوند کی ہوا اس پر بہتی ہے۔ یقیناً لوگ گھاس ہیں۔ ہاں گھاس مُرجھاتی ہے' پھول کملاتے ہیں' پر ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے۔ اے تو جو صیہون کو خوش خبریاں سناتی ہے' اونچے پہاڑ پر چڑھ۔ اے تو' جو یروشلم کو بشارت دیتی ہے' زور سے اپنی آواز کو بلند کر۔ خوب پکار اور مت ڈر! یہودا کی بستیوں سے کہہ' دیکھو اپنا خدا! دیکھو خداوند خدا زبردستی کے ساتھ آوے گا' اور اس کا بازو اپنے لیے سلطنت کرے گا۔ دیکھو اس کا صلہ اس کے ساتھ ہے اور اس کا اجر اس کے آگے۔ وہ چوپان کے مانند اپنا گلہ چراوے گا۔ وہ برّوں کو اپنے ہاتھ سے فراہم کرے گا اور اپنی گود میں اٹھا کے لے چلے گا اور انھیں جو دودھ پلاتی ہیں' آہستہ آہستہ لے جائے گا۔''

(یسعیاہ 40:3-11)

وَعدۂ براہیمیؑ:

عیسیٰ علیہ السلام نے کاہنوں کے ایلچیوں کے سامنے یسعیاہ نبی کا یہ حوالہ یوں ہی نہیں دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان لوگوں کے پاس اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے بعد ان ایلچیوں نے جو سوال کیا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں قدیم بشارتوں میں کلام نہیں تھا۔ اور وہ یہ بھی تسلیم کرنے کو تیار تھے کہ حضرت عیسیٰؑ اس زبردست رسول سے متعلق پیش گوئیوں کے مصداق نہیں ہیں۔ البتہ انھیں دکھ اس بات کا تھا کہ آنے والے کی بشارت دینے کا یہ منصب طبقۂ علماء سے باہر کیوں چلا گیا۔ آگے چل کر ان کی اس عداوت کا دائرۂ اسباب اس وجہ سے اور بھی وسیع ہو گیا کہ حضرت عیسیٰؑ نے آنحضرت ﷺ کا بنی اسماعیل میں سے ہونا قرار دیا۔ اور اس سلسلے میں بھی خود تورات کے حوالوں سے یہ ثابت کیا کہ نبوت کا منصب بالآخر بنی اسماعیل ہی کو سونپا جائے گا۔ انجیل برنا باس کی رو سے اس حقیقت کا اظہار انھوں نے سب سے پہلے اپنے شاگردوں کی مجلس ہی میں کیا:

(8) اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ بے شک اللہ چوں کہ درحقیقت کامل ہے' اسے آرام یا غنا کی کچھ حاجت نہیں۔ کیوں کہ غناء خود اس کے پاس ہی ہے۔ اور یوں جب اس نے عمل کا ارادہ کیا' سب چیزوں سے پہلے اپنے رسول کی روح پیدا کی۔ وہ رسول جس کے سبب سے تمام چیزوں کے پیدا کرنے کا قصد کیا' تا کہ مخلوقات خوشی اور اللہ سے برکت پائے' اور اس کا رسول اس کی تمام خلائق سے خوش ہو' جن کے لیے خدا نے یہ مقدر کیا ہے کہ وہ اس کے بندے ہوں۔ اور کس لیے؟ اور کیا یہ یوں ہی ہوا؟ مگر اس لیے کہ اللہ نے اس کا ارادہ کیا؟ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ہر ایک نبی جب وہ آتا ہے' تو فقط ایک ہی قوم کے لیے اللہ کی رحمت کا نشان اٹھا کر لاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان انبیا کا کلام اس قوم سے آگے نہیں بڑھا' جس کی جانب وہ بھیجے گئے تھے۔ لیکن رسول اللہ جب آئے گا' اللہ اسے وہ چیز عطا کرے گا' جو اس کے ہاتھ کی انگشتری کی مانند ہے۔ پس وہ زمین کی ان تمام قوموں کے لیے اخلاص اور رحمت لائے گا' جو اس کی تعلیم کو قبول کریں گی۔ اور عن قریب وہ ظالموں پر ایک زور کے ساتھ آئے گا اور بتوں کی عبادت کو مٹا دے گا۔ شیطان ذلیل و خوار ہوگا۔ کیوں کہ اللہ نے ابراہیم سے ایسا ہی وعدہ کیا ہے اور کہا ہے: ''دیکھ' میں تیری نسل سے تمام زمین کے قبیلوں کو برکت دوں گا' اور جس طرح تو نے' اے ابراہیم! بتوں کو توڑ کر ریزہ ریزہ کیا ہے' ویسے ہی تیری نسل کرے گی۔''

یعقوب نے کہا: ''اے استاد! ہمیں بتا کہ یہ عہد کس سے کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ یہود کہتے ہیں کہ اسحاق سے ہوا ہے' اور اسماعیل کہتے ہیں کہ اسماعیل سے۔''

یسوع نے جواب دیا: ''داؤد کس کا بیٹا تھا' اور کس کی نسل سے؟''

یعقوب نے کہا: ''اسحاق کی اولاد سے' کیوں کہ اسحاق یعقوب کا باپ تھا' اور یعقوب یہودا کا باپ' جس کی نسل سے داؤد ہے۔'' تب اس وقت یسوع نے کہا'' اور جب رسُول اللہ آئے گا' تو وہ کس کی نسل سے ہوگا؟'' شاگردوں نے جواب دیا: ''تم اپنے آپ کو دھوکے میں نہ ڈالو' کیوں کہ داؤد اسے روح میں یہ کہتے ہوئے رب کے نام سے پکارتا ہے: ''اللہ نے میرے رب سے کہا کہ تو میری داہنی جانب بیٹھ تا کہ میں تیرے دشمنوں کو تیرے پاؤں کی چوکی بناؤں۔ تیرا رب تیرے نیزے کو بھیجے گا' جو تیرے دشمنوں کے وسط میں غلبے والا ہوگا۔'' پس جب رسول اللہ' جسے تم مسیا داؤد کا بیٹا کہتے ہو' یہی ہوگا' تو پھر داؤد اسے رب کیوں کر کہتا؟ تم مجھے سچا مانو' کیوں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تحقیق عہد اسماعیل کے ساتھ کیا گیا ہے' نہ کہ اسحٰق کے ساتھ۔''

(31-8:34)

اس مفصّل بشارت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جہاں آنحضرت ﷺ کی خصوصیاتِ مبارکہ بیان کی ہیں' وہاں دین ابراہیمی سے متعلق اس بحث میں بھی اسرائیلی علماء کے خلاف پہلی مثبت دلیل بیان کر دی' جو آنحضرت ﷺ کی بعثت تک جاری رہی اور آج بھی یہودیوں کی ضد اور غیر منطقی استدلال کی مظہر ہے۔ یعنی یہ کہ بنی

نوع انسان کی کلّی ہدایت کا منصب عطا کرنے کا وعدہ حضرت ابراہیمؑ کی ذُرّیّت میں سے بنی اسرائیل کے ساتھ کیا گیا تھا یا بنی اسماعیل سے۔ انجیل برناباس کے مذکورہ بالا اقتباس کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے اس مسئلے کو صاف کرنے کے لیے بڑی پیاری دلیل دی ہے۔ اور اس کے ذریعہ اس بحث کا ایک ایسا گوشہ منکشف ہو گیا ہے، جس پر آج تک مسلمان اہلِ علم کی نظر پڑی ہی نہ تھی۔ اس اقتباس میں حضرت داؤدؑ کے جس قول کا حوالہ دیا گیا ہے وہ مروّجہ بائیبل میں زبور ۱۱۰ میں بھی موجود ہے اور متی کی انجیل کے باب ۲۲ میں بھی تقریباً انھی الفاظ میں اس کا تذکرہ ہے، جن میں برناباس نے نقل کیا ہے۔ متی کی عبارت یہ ہے:

جب فریسی جمع تھے، یسوع نے ان سے پوچھا کہ مسیح کے حق میں تمھارا کیا گمان ہے، وے کس کا بیٹا ہے، وے بولے داؤد کا۔ اس نے ان سے کہا۔ پھر داؤد روح کے بتانے سے کیوں کر اُسے خداوند کہتا ہے کہ خداوند نے میرے خداوند کو کہا کہ جب تک میں تیرے دشمنوں کو تیرے پاؤں کی چوکی نہ کروں، تو میرے دہنے بیٹھ۔ پس جب داؤد اسے خداوند کہتا ہے تو وہ اس کا بیٹا کیوں کر ٹھیرا؟ (متی 22:41-45) متی کی عبارت اپنے سیاق وسباق میں بالکل الگ نظر آتی ہے۔ نہ اوپر کے بیان سے اس کا کوئی تعلق ہے، نہ آگے کی عبارت سے کوئی ربط ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس انجیل کے مرتب کرنے والوں نے یا تو تحریف کی ہے یا ان تک پوری بات پہنچی ہی نہیں۔ یہ تو تاریخی طور پر ثابت ہے کہ مروّجہ اناجیل میں سے کوئی بھی ان حواریوں کی لکھی ہوئی نہیں جن سے وہ منسوب کی جاتی ہیں اس کے برعکس حضرت برناباس نے شروع سے آخر تک ایک عینی شاہد کی حیثیت سے اہم واقعات کی رُوداد قلم بند کی ہے اور اسی لیے جابجا متکلم کا صیغہ بھی استعمال کیا ہے چنانچہ مذکورہ بالا اقتباس نمبر 8 میں انھوں نے تصریح کر دی ہے کہ یہ گفتگو حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں سے فرمار ہے تھے، نہ کہ فریسیوں اور کاہنوں سے۔ ہم نے یہ اقتباس انجیل برناباس کے 43 ویں باب کے آخر تک نقل کیا ہے۔ اس سے اگلے باب میں بھی یہی مضمون جاری ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے استدلال کا رخ سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا بھی مطالعہ کیا جائے، کیوں کہ اس کا اختتام بھی آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تذکرۂ طیبہ پر ہوتا ہے:
مع الصفحات

(9) تب شاگردوں نے کہا: "اے معلّم! موسیٰ کی کتاب میں یوں ہی کہا گیا ہے کہ عہد اسحاق کے ساتھ کیا گیا۔" یسوع نے جواب دیا: "یہی لکھا ہوا ہے لیکن اسے موسیٰ نے نہیں لکھا، اور نہ یشوع نے۔ بلکہ ہمارے احبار نے، جو خدا سے نہیں ڈرتے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم فرشتہ جبرئیل کے کلام پر غور کرو گے، تو تمھیں ہمارے فقیہوں اور کاتبوں کی سستی کا علم ہو جائے گا کیوں کہ فرشتے نے کہا: اے ابراہیم عن قریب تمام دنیا جان لے گی کہ اللہ تجھ سے کیسی محبت کرتا ہے، دنیا کو تیری اللہ کے ساتھ محبت کیوں کر معلوم ہو؟ یقیناً تجھ پر واجب ہے کہ تو خدا کی محبت کے لیے کچھ کرے۔ ابراہیم نے جواب دیا: یہ اللہ کا بندہ مستعد ہے کہ جو خدا کا ارادہ ہو وہی کرے۔ تب اس وقت اللہ نے ابراہیم سے کہا: تو اپنے پلوٹھے بیٹے اسماعیل کو لے اور پہاڑ پر چڑھ جا تا کہ اسے قربانی کے طور پر پیش کرے۔ پس اسحاق کیوں کر پلوٹھا ہو سکتا ہے، حالانکہ وہ جب پیدا ہوا تھا، اس وقت اسماعیل کی عمر سات سال کی تھی؟"

تب اس وقت شاگردوں نے کہا: "بے شک فقیہوں کا دھوکا صاف ظاہر ہے اس لیے تو ہی ہم سے سچ سچ کہہ، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ تو خدا کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔" تب یسوع نے جواب دیا: "میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ بے شک شیطان ہمیشہ خدا کی شریعت کو باطل کرنے کا ارادہ کیا کرتا ہے۔ پس اسی لیے اس نے اور اس کے پیروؤں اور ریاکاروں، برے کام کرنے والوں نے آج تمام چیزوں کو ناپاک کر دیا ہے۔ پہلوں نے جھوٹی تعلیم کے ذریعہ سے اور دوسروں نے نذرانہ طرزِ زندگی سے۔ یہاں تک کہ قریب قریب حق کا تو وجود ہی نہیں رہ گیا۔ تباہی ہے ریاکاروں کے لیے۔ کیوں کہ اس دنیا کی مدح عن قریب ان پر اہانت سے بدل جائے گی، اور جہنم کا عذاب ہو جائے گی۔

اور اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ بتحقیق رسول اللہ ایک روشنی ہے، جو تقریباً تمام مصنوعات باری کو مسرور کرے گا۔ کیوں کہ وہ فہم اور مشورت کی روح سے آراستہ ہے۔ حکمت اور قوت کی روح سے۔ خوف اور محبت کی روح سے۔ بینش اور اعتدال کی روح سے۔ وہ محبت اور رحمت کی روح سے آراستہ ہے۔ عدل اور تقویٰ کی روح سے۔ لطف اور جبر کی روح سے۔ ایسی روحیں کہ من جملہ اُن کے جو اللہ نے اپنی تمام مخلوقات کو عطا کی ہیں۔ اس رسول نے اس کا سہ چند اللہ سے لیا ہے۔ وہ کیسا مبارک زمانہ ہے، جس میں یہ دنیا میں آئے گا۔ تم مجھے سچا مانو، ہر آئینہ میں نے اسے دیکھا ہے۔ کیوں کہ اللہ ان (نبیوں) کو اس کی روح بہ طور پیش گوئی عطا کرتا ہے۔ اور جب میں نے اسے دیکھا، میں تسلی سے بھر کر کہنے لگا: اے محمد! اللہ تیرے ساتھ ہو، اور مجھے اس قابل بنائے کہ میں تیری جوتی کا تسمہ کھولوں۔ کیوں کہ اگر میں یہ حاصل کرلوں تو بڑا نبی اور اللہ کا قدوس ہو جاؤں گا۔" اور جب یسوع نے یہ بات کہی، اس نے اللہ کا شکر ادا کیا۔
(32:44)

اس جگہ حضرت عیسیٰؑ نے تاریخی طور پر ثابت کیا ہے کہ ذبیح کا اعزاز اسماعیل علیہ السلام کو حاصل ہوا تھا۔ نہ کہ حضرت اسحٰقؑ کو۔ تورات کی مروجہ کتابوں میں یہ تضاد بیانی تو پہلے ہی موجود تھی کہ ایک طرف حضرت اسحاقؑ کو پلوٹھا بیٹا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسری طرف ان کی پیدائش کے وقت حضرت اسماعیلؑ کی عمر چودہ برس بتائی گئی ہے۔ لیکن انجیل برناباس کے مذکورہ بالا اقتباس نے اس کی تصحیح بھی کر دی اور صاف کہا ہے حضرت اسماعیلؑ نہ صرف پلوٹھے بیٹے تھے، بلکہ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش کے وقت ان کی عمر سات سال تھی۔ اس سے واقعۂ ذبح عظیم کے متعلق قرآنِ پاک کے اس بیان کی حرف بہ حرف تصدیق ہوتی ہے جو سورۃ الصافات میں وارد ہوا ہے۔ اس کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ابراہیمؑ کو سب سے پہلے ایک بردبار لڑکے کی بشارت دی۔ یہ لڑکا "جب باپ کے ساتھ دوڑنے چلنے کے قابل ہو گیا۔" تو حضرت ابراہیمؑ کو قربانی کا خواب

دکھایا گیا۔ اور اس آزمائش میں پورا اترتے ہی آپؑ کو حضرت اسحقؑ کی پیدائش کی بشارت دی گئی۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ واقعۂ ذبح عظیم کے وقت حضرت اسماعیلؑ کی عمر چھے سات برس کے لگ بھگ تھی۔ اور پھر اس کے فوراً بعد حضرت اسحقؑ پیدا ہوئے۔ گویا انجیل برناباس کی مذکورہ روایت میں حضرت اسماعیلؑ کی عمر درست بتائی گئی ہے اسی روایت میں حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے پہلی مرتبہ سرور کائنات ﷺ کے اسمِ گرامی کا اظہار ہوا ہے۔ مروجہ اناجیل کے تاریخی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دراصل حضرت عیسیٰؑ نے نبیٔ آخرالزماں ﷺ کے نام کے لیے اپنے زمانے کی بولی میں یعنی سریانی زبان میں مُنحمّنا کا لفظ استعمال کیا تھا' جس کا لغوی عربی ترجمہ "محمد" ہی ہے۔ بعد میں عیسائیوں نے انجیل کے یونانی ترجمے میں اس لفظ کے معنی تبدیل کردیے اور اس کی جگہ صوتی اعتبار سے ملتا جلتا لفظ لکھ دیا جس کے معنی تسلی دینے والے ہیں۔ اور اب یہ ترجمہ عیسائیوں کے ہاں رائج ہے۔ اس مسئلے پر مسلمان علما نے اپنی کتابوں میں مفصّل بحثیں کی ہیں اور عیسائیوں کی تحریف ثابت کی ہے۔ یہ بحث مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن کی جلد پنجم میں سورۃ الصف کی تفسیر میں سمیٹی ہے۔ بہر حال ہمارے لیے قرآن پاک کی شہادت سے بڑھ کر کون سی شہادت ہوسکتی ہے۔ جب اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کردیا کہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنی قوم سے خطاب کرتے وقت آنحضور ﷺ کا نام لے کر بشارت دی تھی' تو یہ گویا ایک تاریخی حقیقت تھی۔ ایک امر واقعہ تھا اور انجیل برناباس میں اس حقیقت کا بیان دراصل اس کتاب کی صحت کی دلیل ہے۔ رہی یہ بات کہ بنی اسرائیل کے لیے یہ پیش گوئی بہت چونکا دینے والی تھی۔ تو ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ یہ امر بھی تاریخی طور پر ثابت کیا جاسکتا ہے کہ ان لوگوں کو آنحضرت ﷺ کی خصوصیات اور آپ ﷺ کے منفرد اوصاف ہی کی خبر نہیں دی گئی تھی' بلکہ آپ ﷺ کے اسمِ گرامی سے بھی آگاہ کردیا گیا تھا۔ اس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

انجیل برناباس کے مذکورہ اقتباسات نمبر 8 اور نمبر 9 کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ہم نے واضح کیا تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کا یہ خطاب اپنے حواریوں کی مجلس میں تھا۔ اس سے قبل اسرائیلی علما نے جو ایلچی آپؑ کے پاس بھیجے تھے' ان کے سامنے آپؑ نے صرف یہ اصرار کیا تھا کہ جس کا انتظار کیا جارہا ہے' وہ میں نہیں ہوں۔ علمائے بنی اسرائیل اس جواب سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے' کیوں کہ اس کی بنا پر وہ حضرت عیسیٰؑ کے خلاف مہم چلانے کی کوئی دلیل پیش نہ کرسکتے تھے۔ علاوہ ازیں انھیں ابھی تک یہ بھی معلوم نہ تھا کہ رسالت اور دینِ کامل جیسے مہم اُمور کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کو حقیقت کا علم کس حد تک ہے۔ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ نبی آخرالزماں کا ظہور کس قوم میں ہوگا لیکن اپنی نادانی اور نسلی غرور کے باعث وہ تقدیرِ الٰہی سے فرار چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس فرار کا وسیلہ حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کو بنایا جائے۔ ابتدائی سلسلہ جنبانی ہی میں ان پر واضح ہوگیا کہ وہ اس مقصد میں کام یابی حاصل نہیں کرسکتے۔ حضرت عیسیٰؑ کوئی معمولی لیڈر تو نہ تھے جو سیاسی اقتدار کا خواہاں ہو اور اس کے لیے کچھ دو اور کچھ لو کے ریاکارانہ اصول کو قبول کرنے پر آمادہ ہو۔ آپؑ مرسل من اللہ تھے۔ کاہنوں نے جب یہ دیکھا تو آپؑ کو بے معنی فروعات میں الجھا کر عوام کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی۔ کبھی کہا کہ یہ شخص دینی شعائر کی توہین کرتا ہے۔ کبھی معجزات کو سحر سے تعبیر کیا اور کبھی سبت کی حرمت توڑنے کا الزام لگا۔ یہ سب حربے یکے بعد دیگرے ناکام ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک روز حضرت عیسیٰؑ یروشلم میں ہیکل کے اندر گئے تو وہاں پر موجود علما نے انھیں پھر فروعی مسائل میں اُلجھانا چاہا۔ آپؑ نے ہر سوال پر انھیں لاجواب کیا اور بالآخر وہ بات کہ دی' جس کے سننے سے وہ ڈرتے تھے۔ یہ واقعہ ایک مجمع عام میں پیش آیا۔ انجیل برناباس کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے جزا و سزا اور عملِ صالح کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

تحویلِ قبلہ کی بشارت

(10) اللہ حزقی ایل نبی کی زبانی کہتا ہے: مجھ سے اپنی قربانیاں دور رکھو! کیوں کہ تمھاری قربانیاں میرے نزدیک ناپسند ہیں۔ اس لیے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے' جب وہ بات پوری ہوجائے گی' جس کی نسبت ہمارے اللہ نے ہوسیع نبی کی زبانی یوں ارشاد کیا ہے کہ بے شک میں غیر پسندیدہ قوم کو پسندیدہ قوم کہوں گا۔ اور جیسا کہ حزقی ایل نبی کہتا ہے۔ اللہ اپنی قوم کے ساتھ ایک ایسا نیا پیمان کرے گا' جو کہ اس پیمان کی مانند نہیں ہے جو تمھارے باپ دادا کو عطا کیا تھا۔ انھوں نے اس اقرار کو پورا نہیں کیا۔ اور عنقریب ان سے ایک دل' جو پتھر کا ہے' لے لے گا اور انھیں نیا دل عطا کرے گا اور یہ سب اس لیے ہوگا کہ تم اس وقت خدا کی شریعت کے موافق نہیں چلتے ہو۔ اور تمھارے پاس کنجی ہے اور تم نہیں کھولتے بلکہ یقیناً راستے کو ان لوگوں پر بند کرتے ہو' جو اس پر چلتے ہیں۔" (4:67-7)

یہ اس امر کی صاف بشارت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبوت کا منصب بنی اسرائیل سے لے کر بالآخر بنی اسماعیل کے ساتھ کرنے کا جو وعدہ کیا تھا۔ اس کے پورا ہونے کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے سابق انبیا کے کلام کا خود تورات سے حوالہ دیا ہے جنھوں نے اپنی قوم کو اللہ کے اس فیصلے سے آگاہ کیا تھا۔ ہوسیع نبی کا ذکر اسلامی روایات میں کہیں نہیں تھا اور تورات کے بیان کے مطابق ان کا ظہور نویں صدی قبل مسیح میں ہوا تھا۔ مروجہ کتب میں ایک کتاب انھی کے نام سے منسوب ہے۔ اور اس کے پہلے ہی باب میں یہ وعید ہے کہ اللہ اسرائیل کے گھرانے کی سب مشکلات تمام کردے گا۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ نے حزقی ایل نبی کا جو قول نقل کیا ہے وہ تورات کی کتاب یرمیاہ میں یوں درج ہے "دیکھ وہ دن آتے ہیں' خداوند کہتا ہے کہ میں اسرائیل کے گھرانے کے ساتھ نیا عہد باندھوں گا۔ اس عہد کے موافق ہوگا جو مَیں نے اس کے باپ دادوں سے کیا جس دن مَیں نے ان کی دست گیری کی' تاکہ زمین مصر سے انھیں نکال لاؤ۔ اوّل نے میرے اس عہد کو توڑا اور مَیں نے انھیں ترک کردیا۔" (یرمیاہ 31:31'32)

اور اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے اگلے فقرے کا مصداق کتاب حزقی ایل کی

مندرجہ ذیل عبارت ہے:

اور میں تمھیں ایک نیا دل بخشوں گا' اور ایک نئی روح تمھارے اندر ڈالوں گا۔ اور تمھارے گوشت میں سے سنگین کو نکال ڈالوں گا۔'' (حزقی ایل 26:36)

سینٹ برناباس نے حضرت عیسیٰ کی اس تقریر کا جو محل بیان کیا ہے' اس سے پتا چلتا ہے کہ آپ ہیکل میں ایک جگہ کھڑے وعظ وارشاد میں مصروف تھے۔ عوام کا ایک مجمع آپ کے گرد جمع تھا۔ ہیکل کے متولی اور کاہن اور دوسرے اسرائیلی علما دور کھڑے اس منظر کو حسد کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے میں سے ایک آدمی کو حضرت عیسیٰ کے پاس بھیجا تاکہ وہ سبکی کی صورت پیدا کر کے آپ کو عوام کے سامنے نیچا دکھائے۔ لیکن حضرت عیسیٰ نے الٹا اسے اپنے دلائل کے آگے دھر لیا۔ اس نے بحث کے دوران میں جان چھڑا کر واپس جانے کی کوشش کی تو آپ نے اسے روک لیا کہ اب پوری بات سن کر جاؤ۔ وہیں کھڑے کھڑے آپ نے بلند آواز سے گفتگو کی تاکہ کاہنوں کا سردار بھی سب کچھ سن لے۔ یہ خطاب اس قدر اثر انگیز تھا کہ کاہن مبہوت کھڑے رہ گئے اور عوام کے دلوں میں حضرت عیسیٰ سے عقیدت اور بڑھ گئی۔

دشمن کے اپنے مورچے پر جا کر اسے زک دینے کے بعد حضرت عیسیٰ دوبارہ اپنے تبلیغی دورے پر نکل گئے۔ انجیل برناباس کے بیان کے مطابق اس اثنا میں ایک سامری عورت سے گفتگو کے دوران میں عیسیٰ نے ایک بار پھر بنی اسرائیل سے خیر کا اعزاز چھن جانے' بلکہ تحویل قبلہ کی بشارت دی۔ آپ نے فرمایا:

(11) مگر تو مجھے سچا جان! بے شک ایک ایسا وقت آئے گا کہ اللہ اپنی رحمت اس وقت دوسرے شہر کے اندر دے گا۔ اور تب اس کے لیے ہر جگہ میں حق کے ساتھ سجدہ کرنا ممکن ہوگا اور اللہ ہر جگہ میں اپنی رحمت سے حقیقی نماز کو قبول کرے گا۔''

عورت نے جواب دیا: ''تحقیق ہم مَسِیا کے منتظر ہیں۔ پس جب وہ آئے گا' ہمیں تعلیم دے گا۔''

یسوع نے جواب دیا: ''اے عورت! کیا تو جانتی ہے کہ مَسِیا ضرور آئے گا؟''

اس نے جواب دیا: ''ہاں اے سیّد!'' اس وقت یسوع کا چہرہ چمک اٹھا اور اس نے کہا: ''اے عورت! مجھے دکھائی دیتا ہے کہ تو ایمان والی ہے۔ پس تو اب جان لے کہ تحقیق مَسِیا پر ایمان لانے ہی سے اللہ کا ہر برگزیدہ نجات پائے گا۔ اور اس حالت میں واجب ہے کہ تو مَسِیا کو جانے۔'' عورت نے کہا: ''شاید تو ہی مَسِیا ہے اے سیّد!'' یسوع نے جواب دیا: ''حق یہ ہے کہ میں اسرائیل ہی کے گھرانے کی طرف نجات کا نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ لیکن میرے بعد جلد ہی اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا مَسِیا تمام دنیا کے لیے آئے گا۔ وہ مَسِیا کہ اللہ نے اس کی وجہ سے دنیا کو پیدا کیا ہے۔ اور اس وقت تمام دنیا میں اللہ کو سجدہ کیا جائے گا' اور رحمت حاصل کی جائے گی' یہاں تک کہ جوبلی کا سال جو اس وقت ہر سو برس پر آتا ہے' مَسِیا اسے ہر سال ایک جگہ (دن) میں مقرر کر دے گا۔'' (18-9:82)

اس بشارت میں پہلی بات تو یہ بیان کی گئی ہے کہ اللہ عن قریب بیت المقدس کے بجائے ایک اور شہر کو قبلۂ عالم قرار دے گا۔ اس عورت نے دراصل حضرت عیسیٰ سے سوال ہی یہ کیا تھا کہ بنی اسرائیل ہیکل سلیمانی کے سوا کسی اور جگہ پر سجدہ کیوں جائز نہیں سمجھتے۔ اس پر آپ نے جواب دیا کہ اب تک اللہ کا حکم یہی تھا۔ لیکن یہ قبلہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گا۔ موجودہ تورات میں بھی ایک مقام پر اس مضمون کی پیش گوئی حضرت یسعیاہ سے منسوب ہے:

''وہ اپنی راہیں ہمیں بتلائے گا اور ہم اس کے راستوں پر چلیں گے کیونکہ شریعت صیہون سے اور خداوند کا کلام یروشلم سے نکلے گا۔'' (یسعیاہ۔ 3:2)

اس کے بعد حضرت عیسیٰ نے اس امر کی صراحت کی کہ آپ کو صرف بنی اسرائیل کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا۔ اور وہ رسول جس کا انتظار کیا جا رہا ہے' ساری دنیا کے لیے ہدایت اور رحمت لے کر آئے گا۔ انجیل برناباس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی یہ بشارتیں بہت تیزی کے ساتھ ملک کے عوام وخواص میں پھیل گئیں۔ اور یہودی عمائدین کو اس امر میں شک نہیں رہا کہ ان کی نسلی سیادت خطرے میں ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک کانفرنس بلا کر آپس میں صلاح مشورہ کیا' سینٹ برناباس نے اس کی جوڑ دار بیان کی ہے' اس سے ان لوگوں کا طرز فکر کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اس موقع پر بعض لوگوں نے حضرت عیسیٰ پر پہلا الزام تو یہ عائد کیا کہ اس شخص کو اگر سیاسی اقتدار حاصل ہو گیا تو طریقِ عبادت میں شریعتِ موسوی کے مطابق اصلاح کر دے گا جس سے ہم لوگوں کا مرتبہ ختم ہو جائے گا۔ اور دوسرے الزام کی تفصیل ملاحظہ کیجیے:

(12) اس وقت یہ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ایک بادشاہ' اور ایک حاکم دونوں ہماری شریعت سے اجنبی ہیں' اور ہماری شریعت کی کوئی پروا کرنے والے نہیں' جیسے کہ ہم ان کی شریعت کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اور اسی سبب سے ہم قدرت رکھتے ہیں کہ جو چاہیں وہ کر لیں۔ پس اگر ہم نے غلطی کی' تو ہمارا اللہ رحیم ہے۔ قربانی اور روزے کے ساتھ اسے راضی کر لینا ممکن ہے مگر جب یہ آدمی (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) بادشاہ ہو گیا تو ہرگز نہ راضی کیا جا سکے گا بجز اس کے کہ اللہ کی عبادت ویسی ہی ہوتی دیکھے جیسی موسیٰ نے لکھی ہے۔ اور اس سے بھی بڑھ کر آفت کی بات یہ ہے کہ وہ کہتا ہے کہ مَسِیا داؤد کی نسل سے نہ آئے گا' جیسا کہ اس کے ایک نہایت خاص شاگرد نے ہم سے کہا ہے' بلکہ وہ کہتا ہے کہ درحقیقت وہ اسماعیل کی نسل سے آئے گا' اور یہ کہ وعدہ اسماعیل کے ساتھ کیا گیا تھا' نہ کہ اسحاق کے ساتھ۔'' (142:13-18)

رحمتِ عالم:

انجیل برناباس میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ ان یہودی علما نے حضرت عیسیٰ کے اس دعوے کے جواب میں کوئی شہادت یا دلیل پیش کی ہو۔ بلکہ ایک جگہ اس امر کی صاف وضاحت موجود ہے کہ علمائے اسرائیل کو اللہ کے اس فیصلے کا بخوبی علم تھا۔ لیکن وہ اسے چھپاتے تھے۔ اس طبقے میں سے ایک عالم نیقودیمس کو حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے کا شرف حاصل ہوا' چنانچہ اس کے گھر دو روز قیام کے دوران میں اس مسئلے پر جو گفتگو ہوئی وہ درج ذیل ہے:

(13) اے بھائی! تو مجھے بتا' جب کہ تو شریعت کا بڑا واقف کار فقیہ ہے' کہ ہمارے باپ ابراہیم کے ساتھ کس کے لیے مَسیّا کا وعدہ کیا گیا تھا؟ اسحاق کے ساتھ یا اسماعیل کے ساتھ؟'' کاتب نے جواب دیا: ''اے معلم! میں موت کی سزا کے سبب سے تجھے اس بات کی خبر دینے سے ڈرتا ہوں۔''

اس وقت یسوع نے کہا: ''بھائی میں افسوس کرتا ہوں کہ تیرے گھر میں کیوں روٹی کھانے کو چلا آیا۔ کیوں کہ تو اس موجودہ زندگی کو اپنے پیدا کرنے والے سے بہت بڑھ کر دوست رکھتا ہے۔ اور اسی سبب تو اپنی جان جانے سے ڈرتا ہے مگر ایمان کے چلے جانے اور ابدی زندگی کا خسارہ اٹھانے سے نہیں ڈرتا' جو کہ اسی وقت ضائع ہو جاتی ہے جب زبان اس (حقیقت) کے برعکس بولے جسے دل خدا کی شریعت میں سے جانتا ہے۔''

اس وقت نیک کاتب رویا' اور اس نے کہا: ''معلم! اگر میں جانتا کہ کیوں کر پھل لاؤں تو بے شک میں نے بہت سی مرتبہ اس کی بشارت دی ہوتی' جس کے ذکر سے میں نے اس لیے گریز کیا ہے کہ قوم میں بے چینی نہ پیدا ہو۔'' یسوع نے جواب دیا: ''تجھ پر واجب ہے کہ تو (اس صورت میں) نہ قوم کی' نہ تمام دنیا کی' نہ تمام پاک آدمیوں کی اور نہ سب فرشتوں کی عزت کر جب کہ (وہ) اللہ کا غضب لائیں۔ پس تمام (دنیا) کا ہلاک ہو جانا بہتر ہے اس بات سے کہ تو اپنے پیدا کرنے والے کو غضب میں لائے۔ اور تو دنیا کو گناہ میں محفوظ نہ رکھ۔ اس لیے کہ گناہ ہلاک کرتا ہے اور محفوظ نہیں کرتا۔ مگر اللہ پس وہ سمندر کی ریگ کے ذروں کی تعداد کے برابر بلکہ اس سے بھی زائد عالموں کو پیدا کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔''(190:1۔10)

(14) اس وقت کاتب نے کہا: ''اے معلم! معاف کر' اس لیے کہ میں نے غلطی کی ہے۔''

یسوع نے کہا: ''اللہ تجھے معاف کرے۔ اس لیے کہ تو نے اسی کی خطا کی ہے۔''

تب یہیں سے کاتب نے کہا: ''تحقیق میں نے بہت سی چھوٹی قدیم کتابیں موسیٰ اور یشوع کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی ہیں۔ وہ یشوع جس نے کہ آفتاب کو ٹھہرا دیا تھا' جیسا کہ تو نے کیا ہے۔ اور یہ دونوں اللہ کے خادم اور نبی ہیں۔ اور وہ موسیٰ کی اصل کتاب ہے۔ پس اس میں لکھا ہوا ہے کہ اسماعیل ہی مسیّا کا باپ ہے اور اسحاق مَسیّا کے رسول کا باپ ہے۔ اور یہ کتاب یوں کہتی ہے کہ موسیٰ نے کہا: اے رب! اسرائیل کے اللہ! قدیر! رحیم! تو اپنے بندے کو اپنی بزرگی کی روشنی میں ظاہر کر' تب وہیں سے اللہ نے اسے اپنا رسول اسماعیل کے دونوں بازوؤں پر دکھایا اور اسماعیل کو ابراہیم کے دونوں بازوؤں پر۔ اور اسماعیل کے پاس ہی اسحاق کھڑا ہوا تھا' اور اس کے بازوؤں پر ایک بچہ تھا جو یہ کہتا ہوا اپنی انگلی سے رسول اللہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ یہی ہے وہ جس کے لیے اللہ نے ہر شے کو پیدا کیا ہے۔ تب وہیں سے موسیٰ خوشی کے ساتھ چلایا: ''اے اسماعیل! بے شک تیرے بازوؤں میں ساری دنیا اور جنت ہے۔ تو مجھے یاد رکھ کہ میں اللہ کا بندہ ہوں تا کہ میں تیرے اس بیٹے کے سبب سے جس کے لیے اللہ نے ہر شے بنائی ہے' اللہ کی نظر میں کچھ نعمت پاؤں۔(191:1۔10)

(15) اس کتاب میں یہ نہیں پایا جاتا کہ اللہ چوپایوں یا بھیڑ بکریوں کا گوشت کھاتا ہے۔ اس کتاب میں یہ نہیں پایا جاتا کہ اللہ نے اپنی رحمت کو فقط اسرائیل ہی میں منحصر کیا ہے۔ بلکہ بے شک اللہ ہر ایسے انسان پر رحم کرتا ہے' جو حق کے ساتھ اپنے پیدا کرنے والے کو طلب کرتا ہے۔ میں اس کتاب کو پورا نہیں پڑھ سکا۔ اس لیے کہ کاہنوں کے سردار نے' جس کے کتب خانے میں میں تھا' مجھے یہ کہ کر منع کیا کہ یہ کتاب ایک اسماعیلی نے لکھی ہے۔'' تب اس وقت یسوع نے کہا: ''دیکھ' تو اب پھر کبھی نہ پلٹنے تا کہ حق کو چھپائے اس لیے کہ بلاشبہ مَسیّا ہی پر ایمان لانے سے اللہ تمام انسانوں کو نجات دے گا۔ اور کوئی آدمی اس کے بغیر کبھی نجات نہ پائے گا۔''(192:1۔5)

یہودی علما کی یہ کیفیت تو خود آنحضرت ﷺ کی بعثت تک رہی کہ آپ ﷺ کی آمد کا انتظار کرتے تھے اور اُمید رکھتے تھے کہ آپ ﷺ کے آنے کے بعد بنی اسرائیل کی نکبت کے دن تمام ہو جائیں گے۔ یہ عقیدہ ان کا اس وجہ سے تھا کہ وہ اللہ کی نعمت ورحمت کو بنی اسرائیل کی نسل کے لیے محدود سمجھتے تھے۔ اس غلط تصور کی وجہ سے یہ بات ان کے صیغۂ خیال میں آ ہی نہ سکتی تھی کہ اللہ کی رحمت صرف عملِ صالح سے مشروط ہے۔ نسل کی کوئی تخصیص نہیں۔ اور یہ بات تو آج تک ان کی سمجھ میں نہیں آئی ہے اور آج بھی یہودی دنیا کی سب سے بڑی نسل پرست قوم ہیں۔ بہرحال خاتم الانبیا کی موعودہ بعثت سے ان کی واقفیت کی شہادت قرآن مجید میں بھی موجود ہے:

﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۝﴾ (البقرہ: 89)

''اور اب جو ایک کتاب اللہ کی طرف سے ان کے پاس آئی ہے' تصدیق کرتی ہوئی اس کی جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی۔ درآں حالیکہ اس سے پہلے وہ خود کفار کے مقابلے میں فتح ونصرت مانگا کرتے تھے' مگر جب وہ چیز آ گئی' جسے وہ پہچان بھی گئے' تو انھوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔ خدا کی لعنت ان منکرین پر!''

امام ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ ''التوسل والوسیلہ'' میں اس آیت کے بارے میں اہل تفسیر سے یہ مستند روایت نقل کی ہے کہ بعثت محمدی سے قبل یہودی مشرکین سے یہ کہا کرتے تھے کہ وہ نبی بس آنے ہی والا ہے اور پھر ہم اس کے ساتھ مل کر تم سے لڑیں گے اور تمھیں مار ڈالیں گے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دعا بھی مانگتے تھے کہ ''اے اللہ! اس نبی امی کو بھیج تا کہ ہم اس کی پیروی کریں اور اس کے ساتھ مل کر ان لوگوں سے لڑیں!'' بعض روایات میں ہے کہ مدینے کے یہودی آنحضرت ﷺ کا نام لے کر دعا مانگتے تھے۔ مدینے کے ایک یہودی عالم عبداللہ بن سلام کے اسلام لانے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اس کی جو تفصیل ابن اسحاق نے بیان کی ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ یہ ہے:

وہ ایک ماہر عالم تھے۔ انھوں نے بتایا: جب میں نے رسول اللہ ﷺ کے متعلق

سنا' اور آپ ﷺ کی صفت' آپ کا نام اور آپ ﷺ کا وہ زمانہ' جس کے ہم لوگ منتظر تھے' مجھے معلوم ہو گیا' تو مَیں نے اس معاملے کو خاموشی سے یہاں تک راز میں رکھا کہ رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے' جب آپ ﷺ بنی عمرو بن عوف کے محلہ قبا میں تشریف فرما ہوئے' تو ایک شخص آیا اور آپ ﷺ کی تشریف آوری کی خبر ایسی حالت میں دی کہ میں کھجور کے ایک درخت کے اُوپر کام کر رہا تھا۔ اور میری پھوپھی خالدہ بنت الحارث اس درخت کے نیچے بیٹھی تھیں۔ جب مَیں نے رسول اللہ ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سنی تو تکبیر کہی۔ میری پھوپھی نے تکبیر سنی تو کہا: اللہ تجھے ناکام رکھے! واللہ تو اگر موسیٰ بن عمران کی تشریف آوری کی خبر سنتا' تو اس سے زیادہ کچھ نہ کرتا۔ مَیں نے ان سے کہا: پھوپھی جان! اللہ کی قسم! وہ موسیٰ بن عمران کا بھائی ہے' انھی کے دین پر ہے اور اسی چیز کے ساتھ بھیجا گیا ہے' جس کے ساتھ وہ بھیجے گئے تھے' پھر تو میری پھوپھی نے کہا: بابا! کیا یہ وہی نبی ہے' جس کی خبر ہمیں دی جاتی رہی ہے کہ عین قیامت کے قریب بھیجا جائے گا؟ میں نے کہا: ہاں۔ پھوپھی نے کہا: جبھی تو تمھاری یہ حالت ہے!''

اس کے علاوہ اور متعدد صحیح روایات کتب احادیث میں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی آنحضور ﷺ کو پہچان گئے تھے' مگر صرف اس حسد میں کفر کرتے تھے کہ آخری نبی ہماری قوم میں سے کیوں نہیں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سے بھی ان کی دشمنی میں اسی باعث شدت پیدا ہوتی چلی گئی کہ آپؑ ابراہیم علیہ السّلام سے اللہ کے وعدے کو بلاتحریف بیان فرماتے تھے۔ نقودیمس سے مذکورہ بالا گفتگو کے بعد حضرت عیسیٰ ایک روز ہیکل میں تشریف لے گئے تو براہ راست کاہنوں کے سردار سے گفتگو ہوئی' جس کا اقتباس انجیل برناباس سے حسب ذیل ہے:

(16) اور جب دن ہوا' یسوع قوم کی ایک بڑی بھیڑ کے ساتھ ہیکل میں گیا۔ تب کاہنوں کا سردار یہ کہتا ہوا اس کے قریب آیا: ''اے یسوع! لو مجھے بتا' کیا تو وہ سب باتیں بھول گیا ہے' جو تو نے اعتراف کرتے ہوئے کہی تھیں کہ تو نہ تو اللہ ہے' نہ اللہ کا بیٹا اور نہ مَسِیّا؟''

یسوع نے جواب دیا: ''ہرگز نہیں۔ میں بھولا نہیں ہوں۔ اس لیے کہ یہی وہ اعتراف ہے' جس کی شہادت میں حساب کے دن خدا کی کرسی عدالت کے سامنے دوں گا۔ کیوں کہ موسیٰ کی کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے' وہ پوری طرح صحیح ہے' پس بے شک ہمارا پیدا کرنے والا اللہ یکتا ہے۔ اور میں اللہ کا بندہ ہوں' اور اس رسول اللہ کی خدمت میں رغبت رکھتا ہوں جس کا نام تم لوگ مَسِیّا لیتے ہو۔''

کاہنوں کے سردار نے کہا: ''تب اس صورت میں اتنی بھاری بھیڑ کے ساتھ ہیکل میں آنے سے کیا مراد ہے؟ شاید تو یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اپنے آپ کو اسرائیل کا بادشاہ بنا دے۔ تو اس بات سے ڈر کہ تجھے کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔'' یسوع نے جواب دیا: ''اگر میں بزرگی طلب کرتا اور اپنے لیے اس دنیا کے حصے میں رغبت رکھتا' تو اس وقت بھاگ نہ جاتا جب نائین والوں نے مجھے بادشاہ بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ تو یقیناً مجھے سچا مان کہ درحقیقت میں اس دنیا میں کچھ بھی نہیں طلب کرتا۔''

اُس وقت کاہنوں کے سردار نے کہا: ''ہم چاہتے ہیں کہ کچھ مَسِیّا کی بابت معلوم کریں' اس وقت کاہن اور فریسی گھیرا بنا کر یسوع کے گرد جمع ہو گئے۔

یسوع نے جواب میں کہا: ''وہ کون سی چیز ہے جو تم مَسِیّا کی بابت معلوم کرنا چاہتے ہو؟ شاید وہ جھوٹ ہے! حق یہ ہے کہ میں تم سے جھوٹ نہ کہوں گا۔ اس لیے کہ اگر مَیں نے جھوٹ کہا ہوتا تو بے شک تو خود' اور کاتب' اور فریسی' مع تمام اسرائیل کے' میری پرستش کرتے۔ مگر تم مجھ سے عداوت رکھتے ہو' اور اس جستجو میں ہو کہ مجھے مار ڈالو' اس لیے کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔'' (206:1-17)

اس جگہ بھی حضرت عیسیٰ نے اپنی بعثت کا ایک مقصد یہی بیان کیا کہ آپؑ خاتم المرسلین ﷺ کی آمد کی بشارت دینے آئے تھے' کاہنوں کے سردار نے خلط مبحث کے لیے حضرت عیسیٰؑ پر الزام لگایا کہ آپؑ (نعوذ باللہ) شیطان کے اشارے پر یہ باتیں کر رہے تھے۔ آپؑ نے اس کی پرزور تردید کی اور کہا کہ میں تو تم لوگوں کو شریعتِ ابراہیمی سے وفاداری کی نصیحت کرتا ہوں۔ مگر تم خود اس راہ سے اتنی دُور ہٹ چکے ہو کہ حضرت ابراہیم کے اُسوۂ مبارک کو بھی بھلا بیٹھے ہو۔ آپؑ نے فرمایا:

(17) قسم ہے اللہ کی جان کی! بے شک ابراہیم نے اللہ سے ایسی محبت کی اس نے جھوٹے بتوں کو چور چور توڑ دینے اور اپنے ماں باپ کو چھوڑ دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا' بلکہ وہ اللہ کی فرماں برداری کے لیے اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔''

کاہنوں کے سردار نے جواب دیا: ''میں تجھ سے محض یہی بات پوچھتا ہوں' اور تجھے قتل نہیں کرنا چاہتا۔ پس تم ہمیں بتا کہ ابراہیم کا یہ بیٹا کون تھا؟''

یسوع نے جواب دیا: ''اے اللہ! تیرے شرف کی غیرت مجھے بھڑکاوے اور میں چپ نہ ہو سکوں! میں سچ کہتا ہوں کہ ابراہیم کا یہ بیٹا اسماعیل ہی ہے' جس کی اولاد سے مَسِیّا کا آنا واجب ہے۔ وہ مَسِیّا کہ اس کے ساتھ ابراہیم کو یہ وعدہ دیا گیا ہے کہ اسی کے ورود سے زمین کے تمام قبیلے برکت پائیں گے۔''

پس جب کاہنوں کے سردار نے یہ سنا' وہ غصے سے بھر گیا اور چیخا: ''ہمیں اس فاجر کو سنگسار کرنا چاہیے' کیوں کہ یہ اسماعیلی ہے' اور اس نے موسیٰ اور اللہ کی شریعت پر کفر بکا ہے۔'' (208:4-8)

عیسیٰ کی تصدیق:

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودی علما نے حضرت عیسیٰؑ کے قتل کا فیصلہ آخر کار اسی بنا پر کیا کہ آپؑ نہ صرف رسول اللہ ﷺ کی آمد کی بشارت دیتے تھے' بلکہ یہ اعلان بھی کر رہے تھے کہ آنحضور ﷺ بنی اسماعیل میں سے ہوں گے۔ ادھر عیسیٰ علیہ السلام کو نہ صرف اپنے خلاف اس سازش کا علم تھا' بلکہ اللہ کی جانب سے آپ کو یہ اطمینان بھی دلایا جا چکا تھا کہ یہ لوگ اپنے ان ناپاک منصوبوں میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اور وہی غدار شاگرد آپؑ کی شباہت میں قتل کیا جائے گا' جو آپؑ کو دشمنوں کے حوالے کرے گا۔ اور پھر دنیا اس واقعے کی حقیقت اس وقت جان لے گی' جب محمد رسول

ﷺ تشریف لائیں گے۔ انجیل برناباس کے مطابق حضرت عیسیٰ نے اس امر کی اپنے شاگردوں کو مندرجہ ذیل الفاظ میں باخبر کر دیا تھا:

(18) اور عن قریب میرا ایک شاگرد مجھے تیس سونے کے ٹکڑوں کے عوض بیچ ڈالے گا اور اسی بنا پر مجھے اس بات کا یقین ہے کہ جو شخص مجھے بیچے گا وہی میرے نام سے قتل کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اللہ مجھے زمین سے اُوپر اٹھالے گا اور بے وفا کی صورت بدل دے گا۔ یہاں تک کہ اسے ہر ایک یہی خیال کرے گا کہ میں ہوں۔ مگر جب مقدّس محمد رسول اللہ آئے گا' وہ اس بدنامی کے دھبے کو مجھ سے دور کر دے گا۔ اور وہ یہ اس لیے کرے گا کہ مَیں نے مَسِیا کی حقیقت کا اقرار کیا ہے۔ وہ مَسِیا جو مجھے یہ بدلہ دے گا یعنی میں پہچانا جاؤں کہ زندہ ہوں اور یہ کہ میں ایسی موت مرنے کے دھبے سے بری ہوں۔" (112:13-18)

موجودہ بائبل میں اس واقعے کو مسخ کر کے حضرت عیسیٰ کو مصلوب و مقتول ظاہر کیا گیا ہے لیکن سینٹ برناباس نے واقعے کی وہی تفصیلات بیان کی ہیں جو قرآن شریف میں مذکور ہیں۔ البتہ ایک معاملے میں قرآن وحدیث خاموش ہیں اور برناباس کی انجیل میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد تین روز کے لیے دوبارہ روئے زمین پر تشریف لائے تھے۔ اس موقع پر آپؑ نے اپنے شاگردوں کو وہی مشن جاری رکھنے کی ہدایت کی' جس کے لیے آپؑ کو بھیجا گیا تھا۔ اس جگہ پھر آپؑ نے فرمایا کہ مجھ پر چوروں کے درمیان مصلوب ہونے کی بدنامی کا جو داغ لگا ہے' اسے آنحضرت ﷺ دھو دیں گے۔

(19) پس اس وقت اس لکھنے والے نے کہا: "اے معلّم! اگر اللہ رحیم ہے' تو اس نے ہمیں یہ خیال کرنے والا بنا کر اس قدر تکلیف کیوں دی کہ تو مُردہ تھا؟ اور تحقیق تیری ماں تجھے اس قدر روئی کہ مرنے کے قریب پہنچ گئی۔ اور اللہ نے یہ روا رکھا کہ تجھ پر تہمت؟ پہاڑ پر چوروں کے مابین قتل ہونے کا دھبا لگے! حالانکہ تو اللہ کا قدوس ہے۔"

یسوع نے جواب میں کہا: "اے برناباس! تو مجھے سچا مان کہ اللہ ہر خطا پر' خواہ وہ کتنی ہی ہلکی کیوں نہ ہو' بڑی سزا دیا کرتا ہے۔ کیوں کہ اللہ گناہ سے غضب ناک ہوتا ہے۔ پس اسی لیے جب میری ماں اور میرے ان وفادار شاگردوں نے' جو میرے ساتھ تھے' مجھ سے دنیاوی محبت کی' نیک کردار خدا نے اس محبت پر موجود رنج کے ساتھ سزا دینے کا ارادہ کیا' تا کہ اس پر دوزخ کی آگ کی سزا نہ دی جائے۔ پس جب آدمیوں نے مجھے اللہ اور اللہ کا بیٹا کہا تھا حالانکہ میں خود دنیا میں بے گناہ تھا' اس لیے اللہ نے ارادہ کیا کہ اس دنیا میں آدمی یہودا کی موت پر میرے ساتھ ٹھٹھا کریں۔ یہ خیال کر کے کہ میں ہی صلیب پر مرا ہوں' تا کہ قیامت کے دن شیطان مجھ سے ٹھٹھا نہ کرے۔ اور یہ بدنامی اس وقت تک باقی رہے گی جب محمد رسول اللہ آئے گا' جو کہ آتے ہی اس فریب کو ان لوگوں پر کھول دے گا جو اللہ کی شریعت پر ایمان لائیں گے۔
(220:14-20)

اوپر کا اقتباس انجیل برناباس میں وہ آخری مقام ہے جہاں ہمیں آنحضور ﷺ کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے متعدد مقامات اور ہیں جہاں سرور کائنات ﷺ کی آمد اور آپ ﷺ کے خصوصی اوصاف تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب اپنے حواریوں کے سامنے ذکر کیا کہ مجھے عن قریب آسمان پر اٹھا لیا جائے گا تو وہ لوگ بہت پریشان ہوئے۔ اس پر آپؑ نے اُنھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا:

فاتحِ عالم

(20) یسوع نے جواب دیا: "تمھارے دل بے چین نہ ہوں' اور تم نہ ڈرو۔ اس لیے کہ میں ہرگز وہ نہیں ہوں جس نے تمھیں پیدا کیا۔ بلکہ اللہ' جس نے تمھیں پیدا کیا ہے تمھاری حفاظت کرے گا۔ باقی رہا میرا خاص معاملہ' سو میں تحقیق اس لیے آیا ہوں کہ رسول اللہ کے واسطے' جو جلد ہی دنیا کے لیے ایک نجات لے کر آئے گا' راستہ صاف کروں لیکن تم اس بات سے ڈرتے رہو کہ دھوکا دیے جاؤ۔ اس واسطے کے بعد میں بہت سے جھوٹے نبی آئیں گے' جو میرے کلام کو اخذ کریں گے اور میری انجیل کو ناپاک بنائیں گے۔" تب اس وقت اندراوس نے کہا: "اے معلّم! ہمارے لیے کوئی نشان بتا' تا کہ ہم اسے پہچانیں۔" یسوع نے جواب دیا: "بے شک وہ تمھارے زمانے میں نہ آئے گا' بلکہ تمھارے (گزرنے کے) کئی برسوں کے بعد جس وقت کہ میری انجیل باطل کر دی جائے گی' اور قریب قریب تیس مومن بھی نہ پائے جائیں گے۔ اس وقت اللہ دنیا پر رحم کرے گا' پس وہ اپنے اس رسول کو بھیجے گا' جس کے سر پر سفید ابر کا ایک ٹکڑا قرار پزیر ہوگا۔ اسے اللہ کا ایک برگزیدہ پہچانے گا' اور وہی اسے دنیا پر ظاہر کرے گا۔ اور وہ (رسول) بدکاروں پر بڑی قوت کے ساتھ آئے گا' اور بتوں کی پوجا کو دنیا سے نابود کر دے گا۔ اور میں اس بات کو راز کی طرح کہتا ہوں' کیوں کہ اسی کے ذریعے اس کا اعلان ہوگا اور اللہ کی بڑائی کی جائے گی اور میری سچائی ظاہر ہوگی۔

اور عن قریب وہ (رسول) ان لوگوں سے انتقام لے گا' جو کہتے ہیں کہ میں انسان سے بڑھ کر ہوں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تحقیق چاند اسے اس کے بچپن میں سلانے کے لیے لوریاں دے گا۔ اور جب وہ بڑا ہوگا' تو وہ اس (چاند) کو اپنی ہتھیلیوں سے پکڑ لے گا۔ پس چاہیے کہ دنیا اس کا انکار کرنے سے ڈرے' اس لیے کہ وہ بت پرستوں کو قتل کر دے گا۔ پس تحقیق موسیٰ اللہ کے بندے نے اس سے بہت زیادہ قتل کیا۔ اور یشوع نے ان شہروں کو باقی نہیں چھوڑا جنھوں نے اسے جلا دیا' اور بچوں کو قتل کیا تھا۔ اس لیے کہ جو پرانا زخم ہو' اس کے لیے گرم لوہے سے داغنا استعمال کیا جاتا ہے۔

اور وہ ایک ایسے حق کے ساتھ آئے گا' جو تمام نبیوں سے واضح تر ہوگا۔ اور وہ اسے ملامت کرے گا' جو دنیا میں اچھا سلوک نہ کرے۔ اور ہمارے باپ دادا کے شہر کے برج خوشی کی وجہ سے ایک دوسرے کو مبارک باد دیں گے۔ پس جس وقت بتوں کی پوجا کا زمین سے دور ہونا دیکھا جائے گا' اور یہ اقرار کیا جائے گا کہ بے شک میں بھی تمام انسانوں جیسا ایک انسان ہوں' تو میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اللہ کا نبی اس وقت آئے گا۔" (72:8-24)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے آنحضورﷺ کی چند خاص نشانیوں کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ مثلاً یہ کہ آنحضرتﷺ کے سر پر سفید ابر کا ایک ٹکڑا قرار پذیر ہوگا۔ کتب سیر و تاریخ میں اس کیفیت کے متعلق روایات موجود ہیں لیکن اہلِ تحقیق نے ان روایات کو ضعیف یا موضوع قرار دیا ہے۔ البتہ یہ کہ اسے اللہ کا ایک برگزیدہ پہچانے گا' اور وہی اسے دنیا پر ظاہر کرے گا۔ یہ غالباً حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ مردوں میں آپ ہی نے سب سے پہلے اور بلاحیل و حجت رسول اللہﷺ کی تصدیق کی اور اہلِ مکہ کے سامنے آپﷺ کی رسالت کی شہادت دی۔ آگے چل کر معجزۂ شق القمر کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے اور پھر سب سے بڑا وصف یہ کہ آنحضورﷺ نے جہاد بالسیف کیا۔

خاتم النّبیینﷺ

مذکورہ بالا اقتباس اور آئندہ ہم آنحضورﷺ کی خصوصیات سے متعلق حضرت عیسیٰؑ کے جو ارشادات انجیل برناباس سے نقل کیے گئے ہیں۔ انھیں سمجھنے کے لیے اس حدیث شریف کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے' جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مذکور ہے:

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا: مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں' جو مجھ سے پہلے کسی کو نہیں ملیں: (1) ابھی ایک ماہ کی مسافت ہو کہ دشمن پر میرا رعب طاری ہو جاتا ہے۔ (2) ساری زمین میرے لیے مسجد اور پاکیزہ بنا دی گئی ہے جو جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے۔ (3) غنیمت کا مال میرے لیے حلال کر دیا گیا ہے' جو پہلے کسی پر حلال نہیں تھا۔ (4) مجھے شفاعت کا حق دیا گیا ہے۔ (5) پہلے نبی اپنی قوم کے لیے خاص ہوا کرتا تھا مگر میں ساری دنیا کے لیے نبی ہو کر آیا ہوں۔'' اسی مضمون میں حضرت ابوہریرہؓ سے جو روایتیں صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں ملتی ہیں انھیں بھی اس کے ساتھ پڑھا جائے تو آنحضورﷺ کی ان خصوصیات میں تین کا اضافہ اور ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہیں! (6) مجھے جوامع الکلم عطا کیے گئے۔ (7) میرے ساتھ ہی نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ (8) خزائن ارض کی کنجیاں خواب میں میرے سامنے رکھ دی گئیں۔

انجیل برناباس کے زیرِ نظر اقتباسات میں آنحضرتﷺ کی یہ تمام خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ کہیں آپﷺ سے متعلق مفصل پیش گوئیوں میں کہیں ضمنی طور پر۔ ایسی ہی ایک مفصل پیش گوئی انجیل برناباس کے پورے دو ابواب پر محیط ہے۔ اور یہ دراصل عیسیٰؑ کے ایک طویل خطبے کا حصہ ہے جو آپؑ نے اپنے متعلق رُومی بُت پرستوں کے پھیلائے ہوئے غلط اعتقاد کے بُطلان اور اپنی دعوت کی توضیح کے لیے ایک بہت بڑے مجمع میں ارشاد فرمایا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے حواریوں سمیت چالیس روزے رکھنے کے لیے کوہِ طور پر تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت تک آپ کے معجزات کی بدولت پورا ملک آپؑ سے رُوشناس ہو چکا تھا۔ تاہم آپ کے حواریوں کی تعداد میں اضافہ نہ ہوا تھا جو ملک میں پھیل کر آپؑ کی تعلیم کو متواتر صحیح صورت حال میں پیش کرتے اور لوگوں کے عقائد کو پختہ کرتے۔ اس لیے اس طویل غیر حاضری کے زمانے میں وہی فتنہ کھڑا ہو گیا جس میں عیسائی آج تک مبتلا ہیں۔ کسی نے آپ کو معبود کہا' کسی نے اللہ کا بیٹا کہا' کچھ لوگ تھے جو آپؑ کو اللہ کا نبی مانتے تھے۔ یہ بحث اتنی شدّت اختیار کر گئی کہ لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف ہتھیار اُٹھا لیے۔ آخر رومی حکام اور علمائے بنی اسرائیل کو بیچ بچاؤ کرانا پڑا اور یہ طے پایا کہ ''یسوع خود اپنے بارے میں جو صراحت کرے اس کے موافق ایمان لایا جائے۔'' اب آپؑ کی تلاش شروع ہوئی۔ اور آخر جب آپؑ سینا سے واپس تشریف لائے تو یروشلم سے باہر اُردن کے کنارے پر لاکھوں کا مجمع آپ کا منتظر تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کو اس غیر معمولی اژدحام کا سبب معلوم ہوا تو آپؑ نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ہیکل کا کاہن اعظم بھی وہاں موجود تھا۔ رومی حکام یعنی ہیرود اور پیلاطس بھی تھے۔ کاہن خود اس قدر بہک چکا تھا کہ آپؑ کو دیکھتے ہی سجدے میں گرنے لگا۔ اس پر آپؑ نے اسے خوب ملامت کی۔ اور پھر اسے اپنے روبرو کھڑا کر کے عوام کے سامنے اپنے متعلق غلط عقائد سے برأت کا اعلان کیا۔ انجیل برناباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا اور لوگوں نے توبہ کی۔ اس کے بعد کی رُوداد برناباس کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔

(21) اور جس وقت دعا ختم ہو چکی' کاہن نے بلند آواز سے کہا: ''اے یسوع! ٹھہر جا! اس لیے کہ ہم پر واجب ہے ہم جانیں کہ تو کون ہے' اپنی قوم کی تسکین کے لیے۔'' یسوع نے جواب دیا: ''میں یسوع' مریم کا بیٹا ہوں۔ ایک مرے ہوئے آدمی داؤد کی نسل سے ہوں' اور اللہ سے ڈرتا ہوں' اور یہ درخواست کرتا ہوں کہ بزرگی اور عزت خدا کے سوا اور کسی کو نہ دی جائے۔''

کاہن نے جواب میں کہا: ''موسیٰ کی کتاب میں یہ لکھا ہوا ہے کہ ہمارا اللہ عن قریب ہمارے لیے مَسِیّا کو بھیجے گا' جو ہمیں اللہ کے ارادے کی خبر دینے آئے گا۔ اور دنیا کے لیے اللہ کی رحمت لائے گا۔ اسی لیے ہم تجھ سے امید کرتے ہیں کہ تو ہمیں سچ بتا آیا تو ہی وہ اللہ کا مَسِیّا ہے' جس کے ہم منتظر ہیں؟''

یسوع نے جواب دیا: ''حق یہ ہے کہ اللہ نے ایسا ہی وعدہ کیا ہے' مگر میں وہ نہیں ہوں' اس لیے کہ وہ مجھ سے پہلے پیدا کیا گیا ہے' اور میرے بعد آئے گا۔''

کاہن نے جواب میں کہا: ''ہم تیری باتوں اور تیری نشانیوں سے بہرحال یہ اعتقاد کرتے ہیں کہ تو ضرور نبی اور اللہ کا قدوس ہے' اس لیے میں تجھ سے تمام یہودیہ اور اسرائیل کے نام سے یہ اُمید کرتا ہوں کہ تو ہمیں اللہ کے واسطے بتا دے کہ مَسِیّا کس کیفیت سے آئے گا!''

یسُوع نے جواب دیا: ''اُسی اللہ کی جان کی قسم ہے جس کے حضور میں میری جان ایستادہ ہوگی! در حقیقت میں وہ مَسِیّا نہیں ہوں' جس کا ساری دنیا کے قبیلے انتظار کرتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ نے ہمارے باپ' ابراہیم سے یہ کہہ کر وعدہ کیا ہے کہ میں تیری ہی نسل سے دنیا کے کل قبائل کو برکت دوں گا۔ مگر جب اللہ مجھے دنیا سے اٹھا لے گا' تب شیطان دوسری دفعہ اس ملعون فتنے کو پھر یوں اٹھائے گا کہ غیر متقی کو یہ اعتقاد کرنے پر

ادہ کرے گا کہ میں اللہ ہوں یا اللہ کا بیٹا۔ پس اس کے سبب سے میرا کلام اور میری یم نجس ہو جائے گی' یہاں تک کہ قریب قریب تیس مومن بھی باقی نہ رہیں گے۔ اس ت اللہ دنیا پر رحم کرے گا' اور اپنے اس رسول کو بھیجے گا' کہ اسی کے لیے سب چیزیں را کی ہیں۔ وہ نبی کہ جنوب سے قوت کے ساتھ آئے گا اور بتوں اور بتوں کی پوجا رنے والوں کو ہلاک کرے گا۔ اور شیطان سے اس کی حکومت چھین لے گا' جو اسے سانوں پر حاصل ہے اور وہ ان لوگوں کی نجات کے لیے' جو اس پر ایمان لائیں گے' لہ کی رحمت لائے گا۔ اور جو اس کے کلام پر ایمان لائے گا۔ مبارک ہوگا۔''

(15۔1:96)

(22) اور باوجود اس کے کہ میں اس کی جوتی کا تسمہ کھولنے کا بھی مستحق نہیں وں' میں نے اللہ کی طرف سے رحمت اور نعمت کے طور پر یہ (رتبہ) حاصل کیا ہے کہ سے دیکھوں۔'' تب اس وقت کاہن نے' حاکم اور بادشاہ سمیت' یہ کہتے ہوئے جواب یا: ''اے یسوع' اللہ کے قدوس! تو اپنے دل کو پریشان نہ کر! اس لیے کہ یہ فتنہ ہمارے مانے میں دوسری دفعہ پیدا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ ہم عن قریب مقدس رومی مجلسِ شیوخ کو ایک بادشاہی حکم صادر کرنے کے لیے لکھ دیں گے کہ اب کے بعد کوئی آدمی تجھے لٰہ یا اللہ کا بیٹا نہ کہے۔''

تب یسوع نے کہا: ''تحقیق تمھارا کلام مجھے کچھ تسلی نہیں دیتا۔ اس لیے کہ ایک یسا اندھیرا آنے والا ہے' جس میں تم روشنی کی اُمید ہی کیا کرو گے! مگر میری تسلی اس رسول کے آنے میں ہے جو میرے بارے میں ہر جھوٹے خیال کو محو کر دے گا۔ اور اس کا دین پھیلے گا' اور تمام دنیا میں عام ہو جائے گا' کیوں کہ اللہ نے ہمارے باپ' ابراہیم سے یوں ہی وعدہ کیا ہے۔ اور جو چیز مجھے تسلی دیتی ہے' وہ یہ ہے کہ اس رسول کے دین کی کوئی حد نہیں۔ اس لیے کہ اللہ اسے درست اور محفوظ رکھے گا۔''

اس پر کاہن نے پوچھا: ''کیا رسول اللہ کے آنے کے بعد اور رسول بھی آئیں گے؟'' یسوع نے جواب دیا: ''اس کے بعد خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے سچے نبی کوئی نہیں آئیں گے۔ مگر جھوٹے نبیوں کی ایک بڑی تعداد آئے گی۔ اور یہی بات ہے جو مجھے رنج دیتی ہے۔ اس لیے کہ شیطان انھیں عادل اللہ کے حکم سے اکسائے گا' پس وہ میری انجیل کے دعوے کے پردے میں چھپیں گے۔'' ہیرودس نے اس پر دریافت کیا: ''یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ان کافروں کو آنا عادل اللہ کے حکم سے ہو؟''

یسوع نے جواب دیا: ''یہ بات انصاف ہی میں سے ہے کہ جو شخص اپنی نجات کے لیے حق پر ایمان نہ لائے' وہ اپنی لعنت کے لیے جھوٹ پر ایمان لائے۔ اسی لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ تحقیق دنیا ہمیشہ سے نبیوں کی توہین کرتی رہی ہے' اور اس نے جھوٹوں کو دوست رکھا ہے' جیسا کہ میکاہ اور یرمیاہ کے زمانے میں مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ جنس اپنے ہم جنس ہی کو پسند کرتا ہے۔'' تب اس وقت کاہن نے کہا: ''مسیّا کا نام کیا رکھا جائے گا' اور وہ کیا نشانی ہے جو اس کے آنے کا اعلان کرے گی؟''

یسوع نے جواب دیا: ''مسیّا کا نام عجب ہے اس لیے کہ اللہ نے جس وقت اس کی ذات کو پیدا کیا' اور اسے آسمانی روشنی میں رکھا' خود ہی اس کا نام بھی رکھا۔ اللہ نے کہا: اے محمد! تو صبر کر! اس لیے کہ میں جنت اور دنیا کی مخلوقات کی بڑی بھاری بھیڑ جو کہ تجھے بخشوں گا' تیرے ہی لیے پیدا کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہاں تک کہ جو تجھے برکت دے گا' مبارک ہوگا۔ اور تجھ پر لعنت کرے گا' ملعون ہوگا۔ اور جس وقت میں تجھے دنیا میں بھیجوں گا' تجھے نجات کے لیے اپنا رسول بناؤں گا۔ اور تیرا کلام سچا ہوگا۔ یہاں تک کہ آسمان اور زمین دونوں کمزور ہو جائیں گے' مگر تیرا ایمان کبھی کمزور نہ ہوگا' تحقیق اس کا مبارک نام محمد ﷺ ہے۔'' اس وقت عام لوگوں نے یہ کہتے ہوئے شور مچایا: ''یا اللہ! تو ہمارے لیے اپنے رسول کو بھیج! اے محمد ﷺ تو جلد دنیا کو نجات دینے کے لیے آ۔'' (97:1۔19) اس واقعہ کے بعد ہی حضرت عیسیٰ نے مزید 72 حواری ساتھ لیے۔ اللہ تعالیٰ نے ان حواریوں کو بھی انھی خوارق پر قادر کیا جو عیسیٰ علیہ السلام سے صادر ہو رہے تھے۔ پھر انھیں قریہ قریہ پھیل جانے کا حکم دیا تا کہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ یہ معجزات خاص حضرت عیسیٰ کی ذات سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے ظاہر ہوتے ہیں اور اللہ چاہے تو دوسرے انسان بھی ان کے حامل ہو سکتے ہیں۔

میثاقِ انبیا:

مندرجہ بالا اقتباسات میں یہ بات ضمناً کئی جگہ بیان ہو چکی ہے کہ حضرت عیسیٰ کسی نئے دین کی طرف دعوت دینے نہیں آئے تھے۔ بلکہ آپ سے پہلے جو دین دوسرے انبیا کی وساطت سے بنی نوع انسان کو دیا جا چکا تھا' اس کی دعوت جاری رکھنا آپ کا فریضہ تھا۔ اس کے علاوہ آپ نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ اللہ کا دین ایک ہی ہے۔ اور تمام انبیائے کرام اس کی تکمیل کے عمل میں وہ کام انجام دیتے چلے آئے ہیں جو بارگاہِ الٰہی سے انھیں تفویض ہوئے۔ اور اس دعوت کی تکمیل خاتم النبیین محمد ﷺ کے ہاتھوں انجام پائے گی۔ اس سلسلے میں انجیل برناباس کے مندرجہ ذیل دو اقتباس قابلِ ذکر ہیں:

(23) پس جب نماز ختم ہو چکی' یسوع کے شاگرد اس کے قریب آ بیٹھے۔ اور یسوع نے اپنا دہن کھول کر کہا: ''اے یوحنا! تو نزدیک آ۔ اس لیے کہ آج میں تجھے ہر اس چیز کا جواب دوں گا جو تو دریافت کرے گا۔ ایمان ایک مہر ہے کہ اللہ اس کے ذریعے اپنے پسندیدہ بندوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ اور یہ وہی انگشتری ہے جو اللہ نے اپنے رسول کو عطا کی ہے۔ ایسا رسول کہ ہر ایک برگزیدہ نے ایمان کو اسی کے ہاتھوں سے لیا ہے۔ پس ایمان ایک ہی ہے جیسے کہ اللہ ایک ہی ہے۔ اسی لیے جب اللہ نے ہر چیز سے پہلے اپنے رسول کو پیدا کیا' اسے ہر چیز سے قبل ایمان دیا جو بمنزلہ اللہ کی صورت اور اس کی کل مصنوعات اور اس کے فرمان کے ہے۔'' (90:1۔4)

(24) پھر وہ چیز جو موسیٰ کی کتاب پر منطبق ہوتی ہے' حق ہے۔ پس تم اسے قبول کر لو۔ اس لیے کہ جب اللہ ایک ہے' حق بھی ایک ہی ہوگا۔ پس اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تعلیم ایک ہی ہے۔ اور یہ کہ تعلیم کے معنی ایک ہی ہیں۔ تو ایمان بھی اس حالت میں ایک ہی ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ بے شک اگر موسیٰ کی کتاب سے حق محو نہ

کیا گیا ہوتا'' تو اللہ ہمارے باپ داؤد کو دوسری کتاب کبھی نہ دیتا۔ اور اگر داؤد کی کتاب بگاڑ نہ دی گئی ہوتی' تو اللہ اپنی انجیل میرے حوالے نہ کرتا۔ اس لیے کہ پروردگار ہمارا معبود غیر متغیر ہے۔ اور البتہ اس نے ایک ہی پیغام انسانوں کے لیے کہا ہے' پس جب رسول اللہ آئے گا' وہ اس لیے آئے گا کہ ہر اس چیز کو' جسے میری کتاب میں بدکاروں نے خراب کر دیا ہے' پاک کرے۔ (11-5:124) ان دونوں اقتباسات کے ساتھ اوپر دیے گئے اقتباس نمبر 9 کا یہ جملہ بھی پیش نظر رکھا جائے کہ ''تم مجھے سچا مانو' ہر آئینہ میں میں نے اسے دیکھا ہے' کیوں کہ اللہ ان (نبیوں) کو اس کی روح بطور پیش گوئی عطا کرتا ہے۔'' یہ سب عبارتیں قرآن پاک کی اس آیت کی تصدیق کرتی ہیں:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۝﴾ (آل عمران: 81)

''یاد کرو' جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ آج ہم نے تمھیں کتاب اور حکمت و دانش میں سے جو کچھ دیا ہے' پھر تمھارے پاس ایک رسول اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے گا جو تمھارے پاس موجود ہے' تو تمھیں اس پر ایمان لانا ہوگا۔ اور اس کی مدد کرنا ہوگی۔ (پھر اللہ نے) فرمایا: کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو' اور میری طرف سے اس عہد کی ذمہ داری اٹھاتے ہو؟ انھوں نے کہا: ہاں' ہم اقرار کرتے ہیں۔ (اللہ نے) فرمایا: اچھا تو گواہ رہو' اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہ ہوں۔''

شرح صدر

اس میثاق کی کیفیت کیا تھی؟ اور آنحضرت ﷺ کی اس میثاق میں کیا حیثیت تھی؟ یہ بھی اسی طرح قدرت الٰہی کے اسرار میں سے ہے جس طرح نور محمدی ﷺ کے تخلیق کی اولیت ہے۔ انجیل برنباس کے مطابق حضرت عیسیٰؑ نے بھی اس امر کی تشریح سے معذوری ظاہر کی اور صرف ایک انسان کو اس راز سے کلی آگاہی کا حامل بتایا۔ چنانچہ ایک موقع پر حواریوں سے آپؑ کا یہ خطاب نقل کیا گیا ہے۔

(25) اس وقت یسوع نے کہا: ''بھائیو! اس میں شک نہیں کہ برگزیدگی کا سابق میں ہو جانا ایک بڑا بھاری راز ہے تا آنکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ کوئی اسے صاف طور پر نہیں جانتا سوائے ایک انسان کے۔ اور وہی انسان ہے کہ اس کی طرف قومیں گردن اٹھا کر دیکھ رہی ہیں۔ وہ ایسا انسان ہے کہ اللہ کے راز اس پر پوری طرح واضح اور جلی ہوں گے۔ پس زہے نصیب ان لوگوں کے جو اس کے کلام پر کان لگائیں گے جب وہ دنیا میں آئے گا۔ اس لیے کہ اللہ اس پر سایہ کرے گا جیسے کہ یہ کھجور کا درخت ہم پر سایہ کر رہا ہے۔ ہاں' بے شک! جس طرح یہ درخت ہمیں جلانے والے آفتاب کی دھوپ سے بچاتا ہے' ویسے ہی اللہ کی رحمت ایمان والوں کو اس نام کے ذریعے شیطان سے بچائے گی۔''

شاگردوں نے دریافت کیا: ''اے معلم! وہ آدمی کون ہوگا' جس کی نسبت تو یہ باتیں کہہ رہا ہے' اور جو کہ دنیا میں عن قریب آئے گا؟'' یسوع نے دلی خوشی کے ساتھ جواب دیا: ''بے شک وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہے! اور جب وہ دنیا میں آئے گا' تو اس اصلی رحمت کے وسیلے سے' جسے وہ لائے گا' انسانوں کے درمیان نیک اعمال کا ذریعہ بنے گا' جس طرح بارش کے عرصۂ دراز تک بند رہنے کے بعد مینہ زمین کو بار آور کرتا ہے' پس وہ سفید ابر اللہ کی رحمت سے بھرا ہوا ہے۔ اور یہی رحمت ہے کہ اللہ اس کی پھوار ایمان والوں پر پانی کی بوندوں کی طرح نثار کرے گا۔'' (11-3:163)

رسولِ مُبین ﷺ

حضرت عیسیٰؑ نے آنحضور ﷺ کا یہ وصف متعدد بار بیان کیا کہ آپ ﷺ ان تمام امور کو کھول کر بیان فرما دیں گے جن کے بارے میں انبیا سابق خاموش رہے یا مبہم اشارات سے آگے نہ بڑھے۔ یہی وہ وصف ہے جسے قرآن پاک نے رسول مبین' نذیر مبین اور نور مبین کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اسی موضوع پر انجیل برنباس کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

(26) یسوع نے اپنے شاگردوں سے کہا: ''خدا کا یہ قول کہ وہ لذت اٹھائیں گے' کیا فائدہ دے گا؟ حق یہ ہے کہ اللہ صاف صاف کہہ رہا ہے۔ مگر جنت میں قیمتی پہننے والی شے کی چار نہروں اور بے حد افراط سے پھلوں کے ہونے کا کیا فائدہ ہے؟ اس لیے کہ یہ یقینی ہے کہ اللہ نہیں کھاتا۔ اور فرشتے نہیں کھاتے۔ اور نفس نہیں کھاتا اور حس نہیں کھاتی بلکہ بدن (ہی کھاتا ہے) جو کہ یہ ہمارا جسم ہے۔ پس جنت کی بزرگی یہی جسم کا غذا کھانا ہے۔ رہا نفس اور حس پس ان دونوں کے لیے اللہ سے اور فرشتوں سے باتیں کرنا اور مبارک روحوں سے۔ اور رہی یہ بزرگی' تو اسے عن قریب رسول اللہ روشن ترین بیان سے ساتھ واضح کر دے گا' جو کہ ہر مخلوق سے زیادہ چیزوں کا جاننے والا ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے سب چیزوں کو اسی کی محبت میں پیدا کیا ہے۔''

(7-1:176)

اسی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ کی جو دعائیں انجیل برنباس میں منقول ہیں' ان میں آپؑ نے توحید باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ رسالتِ محمدی ﷺ پر ایمان کا اقرار کیا۔ بلکہ اللہ سے درخواست کی' رسولِ رحمت ﷺ کو جلد مبعوث فرمائے تاکہ بنی نوع انسان جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر ہدایت کے نور سے فیض یاب ہو سکے۔ اس مضمون کی دو دعائیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

(27) پھر یسوع نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور یہ کہتے ہوئے دعا مانگی: ''اے پروردگار! معبود! رحیم! قدیر! جس نے ہم' اپنے بندوں' کو پیدا کیا ہے اپنی رحمت سے' اور ہمیں بشر کا رُتبہ اور اپنے حقیقی رسول کا دین بخشا ہے۔ ہم تیرے سب انعاموں پر تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ زندگی بھر تجھ اکیلے ہی کی عبادت کرتے رہیں۔ اپنے گناہوں پر ماتم کرتے ہوئے نماز پڑھتے اور صدقہ دیتے ہوئے' روزہ رکھتے اور تیرے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے' ان لوگوں کو دُرست کرتے ہوئے جو تیری مشیت کو نہیں جانتے ہیں' تیری محبت میں دنیا کی تکلیفوں کو برداشت

کرتے ہوئے' اور تیری خدمت میں اپنی جانوں کو موت کے واسطے خرچ کرتے ہوئے! پس تو ہی' اے پروردگار! ہمیں شیطان اور بدن اور دنیا سے نجات دلا' جس طرح کہ تو نے اپنے مصطفیٰ کو نجات دی اپنی ذات کی خاطر سے۔ اور اپنے رسول کا اکرام کرنے کے لیے' وہ رسول کہ اس کے لیے تو نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اور اپنے کُل قدسیوں اور نبیوں کے اکرام کے لیے۔(26-16:122)

حضرت عیسیٰ اور اُمتِ محمدی

یہ دعا انجیل برناباس میں حواریوں کے سامنے حضرت عیسیٰ کے ایک خطبے کے آخر میں درج ہے۔ اس کے بعد ایک اور دعا اس موقع پر منقول ہے جب آپؑ کے خلاف یہودیوں کی سازش مکمل ہو چکی تھی اور ان کے مخبر آپؑ کی تلاش میں تھے۔ حضرت عیسیٰ کو وحی الٰہی کے ذریعہ اس صورتِ حال کا علم ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپؑ نے اپنے حواریوں کو بتا دیا کہ میں اب جلد تم سے رخصت ہونے والا ہوں۔ آپ نے انھیں حق پر قائم رہنے کی وصیّت فرمائی اور پھر ایک طویل دعا مانگی جس کے آخر میں یہ عبارت آتی ہے:

(28) اے رب بخشش والے اور رحمت میں غنی! اپنے خادم کو قیامت کے دن اپنے رسول ﷺ کی امت میں ہونا نصیب فرما۔ اور فقط مجھے ہی نہیں بلکہ ان سب کو بھی جنھیں تو نے مجھے عطا فرمایا ہے مع ان تمام لوگوں کے جو آگے چل کر ان کی ہدایت کے واسطے سے ایمان لائیں گے۔ اور اے رب! اس بات کو اپنی ذات کے لیے کرتا کہ' اے رب! شیطان تیرے آگے فخر نہ کرے۔ اے وہ پروردگار' معبود! جو اپنی عنایت سے تمام ضروریات اپنی قوم اسرائیل کو پیش کرتا ہے' زمین کے ان سب قبائل کو یاد کر جن سے تو نے یہ وعدہ کیا ہے کہ انھیں اپنے اس رسول کے ذریعے برکت دے گا جس کے سبب سے تو نے دنیا کو پیدا کیا ہے۔ دنیا پر رحم کر اور اپنے رسول کے بھیجنے میں جلدی کرتا کہ وہ رسول تیرے دشمن شیطان سے اس کی مملکت کو چھین لے۔'' اور یسوع نے اس (دعا) سے فارغ ہو کر تین مرتبہ کہا: ''اے رب عظیم ورحیم! چاہیے کہ ایسا ہی ہو!'' تب سب لوگوں نے روتے ہوئے جواب میں کہا: ''چاہیے کہ یہی ہو! چاہیے کہ یہی ہو!'' سوائے یہودا کے' کیوں کہ وہ کسی چیز پر ایمان نہیں لایا۔(20-14:212)

شافعِ محشر:

اب تک ہم نے انجیل برناباس سے جو بشارتیں نقل کی ہیں' ان میں آنحضرت ﷺ کے تقریباً تمام اوصاف امتیازات اور فضیلتوں کا تذکرہ موجود ہے لیکن ہمارے خیال میں اس کتاب میں سب سے زیادہ مہتم بالشان بشارت وہ ہے جس میں حشر کے روز شفیع المذنبین کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کے رتبۂ بلند کا بیان ہے۔ اور بیان ایسا ہے کہ نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس سے قبل کہ ہم یہ اقتباسات نقل کریں' بہتر ہے کہ آیت کریم عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا کی احادیث نبوی سے تفسیر پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ قاضی سلیمان منصور پوری اس باب میں لکھتے ہیں کہ مقام محمود ہی مقامِ شفاعت ہے کہ جب نبی ﷺ اس مقام پر ایستادہ ہوں گے' تو جملہ اوّلین وآخرین حضور ﷺ کی حمد کریں گے (تفسیر خازن) اس آیت کی تفسیر میں وہ حدیث صحیح موجود ہے جسے امام بخاری وامام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی اپنی تفسیر میں بروایت انس رضی اللہ عنہ درج فرمایا ہے کہ:

جب اللہ تعالیٰ لوگوں کو قیامت کے دن جمع کرے گا' تب ان کے دل میں یہ بات ڈالی جائے گی کہ ہم اگر اللہ کی جناب میں کسی کو شفاعت کے لیے پیش کریں (تو خوب ہے) تا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس جگہ سے نجات دے۔ تب لوگ آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے' اور کہیں گے کہ آپ ابوالبشر ہیں' اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے ہاتھ سے بنایا' پھر جنّت میں ٹھہرایا' پھر فرشتوں نے آپ کو سجدہ کیا' اللہ تعالیٰ نے جملہ اسماء کی تعلیم آپ کو دی۔ لہٰذا آپ ہماری شفاعت کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہاں سے نجات (راحت) دے۔ وہ کہیں گے: نہیں میں نہیں کر سکتا۔ پھر وہ اپنی خطا کا ذکر کریں گے' اور اللہ تعالیٰ سے حیا کا ذکر کر کے کہیں گے کہ تم نوحؑ کے پاس جاؤ' وہ پہلے رسول ہیں۔ تب لوگ نوحؑ کے پاس جائیں گے' نوحؑ کہیں گے: نہیں' میں نہیں۔ وہ بھی اپنی خطا کا ذکر کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے حیا کریں گے' اور فرمائیں گے: تم ابراہیمؑ کے پاس جاؤ' جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا ہے۔ وہ کہیں گے: نہیں' میں نہیں۔ وہ بھی اپنی خطا کو یاد کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے حیا کا ذکر کریں گے۔ کہیں گے کہ موسیٰ کے پاس جاؤ' جن سے اللہ تعالیٰ نے کلام بھی کیا اور انھیں تورات بھی دی۔ وہ کہیں گے: نہیں' میں نہیں۔ وہ اپنی خطا کا ذکر کریں گے اور حیا کا۔ پھر کہیں گے کہ عیسیٰ روح اللہ کے پاس جاؤ۔ لوگ عیسیٰ روح اللہ وکلمۃ اللہ کے پاس آئیں گے۔ وہ کہیں گے: میں نہیں' تم محمد ﷺ کے پاس جاؤ۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے ہیں کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اگلا پچھلا سب کچھ معاف کر دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ تب لوگ میرے پاس آئیں گے تب میں اپنے ربّ سے اِذن حاصل کروں گا۔ مجھے اِذن دیا جائے گا۔ پھر جب میں اپنے رب کو دیکھوں گا' تو سجدے میں گر پڑوں گا۔ پھر اللہ تعالیٰ مجھے دعا سکھائے گا جو کچھ وہ چاہے گا میری زبان سے کہلائے گا۔ تب اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''یَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَه'' اے محمد ﷺ! اپنا سر اٹھاؤ! بولو تمھاری سنی جائے گی۔ شفاعت کرو! تمھاری شفاعت قبول ہوگی۔ مانگو! تمھیں دیا جائے گا۔'' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں سر اٹھاؤں گا' اور پھر اللہ تعالیٰ کی حمد کروں گا' وہ تحمید کہ مجھے اللہ تعالیٰ ہی سکھلا دے گا۔ پھر میں شفاعت کروں گا۔ پھر میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی۔ میں اتنے لوگوں کو آگ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کرا دوں گا۔ حضرت انسؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ تین یا چار بار اسی طرح اللہ تعالیٰ سے اِذن لے کر شفاعت کریں گے۔ چوتھی دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا: پھر میں کہہ دوں گا کہ اے ربّ! اب تو آگ میں وہی رہ گیا ہے جسے قرآن نے روک رکھا ہے۔ یعنی وہی جس پر خلود واجب ہے۔

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ نبی ﷺ نے پھر یہ آیت ﴿عَسٰى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾ پڑھی اور فرمایا کہ مقام محمود جس کا وعدہ اللہ نے

تمھارے نبی سے کیا ہے' وہ یہی مقام ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ منصبِ شفاعت نبی ﷺ کے سوا کسی کو عطا نہیں کیا گیا۔ آدم ونوح' ابراہیم وموسیٰ' اور عیسیٰ علیہم السلام بھی شفاعت کی جرأت نہ کریں گے۔ رہی یہ بات کہ لوگ حضور ﷺ سے پہلے دوسرے انبیائے کرام کے خدمت میں کیوں جائیں گے؟ اس میں نکتہ یہ ہے کہ کسی شخص کے دل میں یہ شبہ باقی نہ رہ جائے کہ ہم سرورِ دو عالم ﷺ کے سوا کسی دوسرے نبی کے پاس جاتے تو شاید وہ بھی شفاعت کر دیتے۔ اب ہر آستانے سے صاف جواب مل جائے گا تو سب کو یقین ہوگا کہ منصبِ شفاعت میں کوئی نبی' کوئی رسول اور کوئی ولی حضور ﷺ کا سہیم و شریک نہیں۔

اب انجیل برناباس کے یہ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے جن میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کے سامنے انتہائی پرزور الفاظ میں آنحضور ﷺ کی اس مہتم بالشان خصوصیت کا ذکر کیا ہے:

(29) میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اللہ کی عدالت کا دن بڑا پُر رعب ہوگا۔ ایسا کہ نکالے ہوئے (گناہ گار) دس جہنمیوں کو اس بات پر ترجیح دیں گے کہ وہ جا کر خدا کا سخت غضب کے ساتھ ان سے کلام کرنا سنیں۔ وہ لوگ کہ ان پر تمام مخلوقات گواہی دے گی۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تنہا نکالے ہوئے ہی ڈرنے والے نہ ہوں گے' بلکہ پاک ذاتیں اور اللہ کے برگزیدہ اشخاص بھی۔ یہاں تک کہ ابراہیم اپنی نیکوکاری پر بھروسا نہ کرے گا۔ اور ایوب کو اپنی بے گناہی کے بارے میں کوئی اعتماد نہ ہوگا۔ اور میں کیا کہہ رہا ہوں؟ بلکہ تحقیق رسول اللہ کو بھی خوف ہوگا۔ کیوں کہ اللہ اپنا جلال ظاہر کرنے کے لیے اپنے رسول کو یادداشت کی قوت سے خالی بنا دے گا۔ یہاں تک کہ وہ یاد نہ رکھے گا کہ کیوں کر اللہ نے اسے ہر چیز عطا کی ہے۔'' (1:52-9)

اس کے بعد قیامت کی علامات کبریٰ کا بیان ہے جس میں سب سے پہلے حضرت عیسیٰؑ نے خاتمۂ دنیا سے قبل اپنے دنیا میں واپس آنے کا ذکر کیا ہے۔ علاماتِ کبریٰ میں آپؑ نے پندرہ نشانیاں گنوائی ہیں جو پندرہ ہی روز میں ظاہر ہوں گی۔ ان میں تیرہویں نشانی یہ ہے کہ آسمان کاغذ کے تختے کی طرح لپیٹا جائے گا۔ یہ تمام تفصیلات باب 52 کی بقیہ گیارہ آیات اور باب 53 کی کل 37 آیات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کے بعد یوم نشور کا مندرجہ ذیل بیان ہے:

(30) پس جب یہ علامتیں گزر جائیں گی' دنیا کو چالیس برس تک تاریکی ڈھانپ لے گی۔ کوئی اس میں زندہ نہ ہوگا' سوائے اللہ کے جو کہ اکیلا ہے۔ ایسا اللہ کہ اسی کے لیے بزرگی اور بڑائی ہے ابد تک۔ اور جب چالیس سال گزر جائیں گے' تب اللہ اپنے رسول کو زندہ کرے گا' جو اس وقت بھی سورج کی طرح نکلے گا' مگر یہ کہ وہ چمکتا ہوگا ہزار سورجوں کی مانند' پس وہ بیٹھے گا اور کوئی بات نہ کرے گا' اس لیے کہ وہ کچھ بدحواس سا ہوگا۔ اور اللہ چار فرشتوں کو بھی اُٹھا لے گا' جو اس کے مقرب ہیں اور وہ رسول اللہ ﷺ کو تلاش کریں گے۔ پھر جب اسے پا جائیں گے' اس کی جگہ کے چاروں کونوں پر محافظ بن کر کھڑے ہو جائیں گے۔

اس کے بعد اللہ تمام فرشتوں کو زندگی بخشے گا' جو شہد کی مکھیوں کی طرح آ کر رسول اللہ ﷺ کے گرد حلقہ کر لیں گے۔ اور اس کے بعد اللہ اپنے جملہ نبیوں کو جان دے گا' جو سب کے سب آدم کے پیچھے ہو کر آئیں گے۔ پس وہ رسول اللہ کا ہاتھ چومیں گے' اپنے آپ کو اس کی حفاظت اور امداد کی پناہ میں رکھتے ہوئے۔ پھر اللہ اس کے بعد اپنے تمام برگزیدوں کو زندہ کرے گا' جو پکار پکار کر کہیں گے کہ اے محمد! ہمیں یاد کر۔ پس ان کی چیخ پکار سے رسول اللہ میں رحم کی جنبش ہوگی۔ اور وہ ڈرتے ڈرتے غور کرے گا کہ ان کے چھٹکارے کے لیے کیا کرنا لازم ہے۔ پھر اللہ اس کے بعد کل مخلوق کو زندہ کرے گا' پس وہ اپنے ابتدائی وجود کی جانب واپس آ جائے گی۔ اور ان میں سے ہر ایک میں نُطق کی قوت مستزاد ہوگی۔ اس کے بعد اللہ سب (اپنے حضور سے) نکالے ہوؤں کو زندہ کرے گا' جن کے اٹھتے ہی اللہ کی کل خلقت ان کی بدصورتی سے ڈر جائے گی۔ اور وہ نکالے ہوئے چلائیں گے: اے پروردگار ہمارے معبود! تو ہمیں اپنی رحمت سے (محروم) نہ چھوڑ۔

اور اس کے بعد اللہ شیطان کو (زندہ کر کے) اٹھائے گا۔ وہ شیطان کہ تمام مخلوق اس کی طرف نظر کرتے ہی اس کی ڈراؤنی صورت کے نظارے سے ڈر کے مارے مُردہ جیسی ہو جائے گی۔'' پھر یسوع نے کہا: ''میں اللہ سے درخواست کرتا ہوں اس روز اس ڈراؤنی صورت کو نہ دیکھوں۔ تحقیق اکیلا رسول اللہ ان نظاروں سے خوف نہ کھائے گا' کیوں کہ وہ اللہ یکتا کے سوا اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ اس وقت فرشتہ دوسری مرتبہ نرسنگھا پھونکے گا۔ پس سب کے سب اس کے نرسنگھے کی آواز سے یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوں گے: اے خلائق! حساب دینے آؤ کیوں کہ تمھارا خالق تم سے حساب لینا چاہتا ہے۔ پس اس وقت آسمان کے بیچ میں وادیٔ یہوشافاط کے اوپر ایک چمک دار تخت دکھائی دے گا' جس پر سفید بادل کا ٹکڑا سایہ کیے ہوگا۔ پس فرشتے پکاریں گے: پاک ہے تو معبود ہمارا! تو ہی ہے جس نے ہمیں پیدا کیا اور شیطان کے جال میں گرنے سے بچا لیا۔

اس وقت رسول اللہ ڈرے گا' کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ایک نے بھی اللہ سے ویسی محبت نہیں کی جیسی کہ لازم ہے۔ کیوں کہ جو شخص صرّاف سے سونے کا ایک ٹکڑا لینا چاہے' تو واجب ہے کہ اس کے پاس ساٹھ پیسے ہوں۔ پس جب اس کے پاس ایک ہی پیسہ ہو' تو وہ یہ قدرت نہیں رکھتا کہ اسے صرّاف سے بدل لے۔ مگر جب اللہ کا رسول ڈرے' تب بدی سے بھرے ہوئے بدکار کیا کریں گے۔؟'' (1:54-25)

(31) اور رسول اللہ تمام نبیوں کو جمع کرنے جائے گا' جن سے وہ خواہش کرے گا کہ اس کے ساتھ چلیں تا کہ اللہ کی جناب میں مومنوں کے لیے منت کی جائے۔ پس ہر ایک خوف کی وجہ سے عذر کرے گا۔ اور قسم ہے اللہ کی زندگانی کی! بے شک میں بھی وہاں نہ جاؤں گا' کیوں کہ میں جانتا ہوں' جو کچھ کہ جانتا ہوں۔ اور جس وقت اللہ اس بات کو دیکھے گا' وہ اپنے رسول کو یاد دلا دے گا کہ کیوں کر اس نے

سب چیزوں کو اس کی محبت کے لیے پیدا کیا ہے۔ تب اس کا خوف جاتا رہے گا' اور وہ محبت اور ادب کے ساتھ عرش کی طرف بڑھے گا۔ اور فرشتے گاتے ہوں گے: برکت والا ہے تیرا قدوس نام اے اللہ' ہمارے معبود! اور جب وہ عرش کے نزدیک آ پہنچے گا' اللہ اپنے رسول کے لیے پردہ کھول دے گا' جیسے کہ ہر ایک دوست ملاقات پر لمبی مدت گزرنے کے بعد اپنے دوست کے لیے (دروازہ کھول دیتا ہے)۔

اور رسول اللہ پہلے بات چیت کی ابتدا کر کے کہے گا: میں تیری عبادت اور تجھ سے محبت کرتا ہوں اے میرے معبود! اور اپنے تمام دل و جان سے تیرا شکر کرتا ہوں۔ کیوں کہ تو نے ارادہ کیا' پس مجھے پیدا کیا تاکہ میں تیرا بندہ بنوں۔ اور تو نے ہر چیز کو میری محبت کے سبب سے پیدا کیا' تاکہ میں ہر چیز کی وجہ سے' اور ہر چیز کے اندر اور ہر چیز سے بڑھ کر تجھ سے محبت کروں۔ پس چاہیے کہ' اے میرے معبود! تیری تمام مخلوقات تیری حمد کرے۔

''اس وقت اللہ کی تمام مخلوقات کہے گی: اے رب ہم تیرا شکر کرتے ہیں۔ برکت والا ہے تیرا قدوس نام۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تحقیق شیطان اور شیطان کے ساتھ نکالے گئے سب اس وقت اس قدر روئیں گے کہ ان میں ایک ایک کی آنکھ کا اردن کے پانی سے زیادہ پانی جاری ہوگا۔ اور اس کے باوجود وہ اللہ کو ہرگز نہ دیکھیں گے۔ اور اللہ اپنے رسول سے یہ کہ کر کلام کرے گا: خوب آیا تو' اے میرے امانت دار بندے' پس تو مانگ! تجھ کو ہر چیز ملے گی' تب رسول اللہ جواب دے گا: اے ربّ! تو یاد کر کہ تو نے جب مجھے پیدا کیا' اس وقت کہا تھا کہ بے شک تو نے ارادہ کیا ہے کہ دنیا اور جنّت اور فرشتوں اور آدمیوں کو میری محبت میں پیدا کرے' تاکہ وہ تیری بزرگی بیان کریں میرے ساتھ مل کر' میں جو کہ تیرا بندہ ہوں۔ اسی لیے اب تیری جناب میں منّت کرتا ہوں' اے پروردگار' معبود' رحیم اور عادل! یہ کہ تو اپنا وعدہ اپنے بندے کے ساتھ یاد کر!

تب اللہ ایک ایسے دوست کی مانند' جو اپنے دوست سے ہنسی کرتا ہو' یہ جواب دے گا' اور کہے گا' کیا تیرے پاس اس بات پر کچھ گواہ بھی ہیں' اے میرے دوست محمد؟ پس وہ ادب کے ساتھ کہے گا: بے شک' اے رب! تب اللہ کہے گا: جا' اور انھیں بلا کر لا' اے جبریل! پس جبریل رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر پوچھے گا: اے سیّد! تیرے گواہ کون کون ہیں؟ تب رسول اللہ ﷺ جواب دے گا: وہ یہ ہیں' آدم' اور ابراہیم اور اسماعیل اور موسیٰ اور داؤد اور یسوع' مریم کا بیٹا۔

پس فرشتہ جا کر مذکورہ گواہوں کو پکارے گا' جو ڈرتے ڈرتے وہاں حاضر ہوں گے۔ پھر جب وہ حاضر ہو جائیں گے' اللہ ان سے کہے گا: کیا تمھیں وہ بات یاد ہے جو میرے رسول نے ثابت کی ہے؟ وہ جواب دیں گے: اے پروردگار! کیا چیز؟ تب اللہ کہے گا: یہ کہ میں نے سب چیزیں اس کی محبّت میں پیدا کی ہیں' تاکہ تمام مخلوقات اس کے ساتھ مل کر میری حمد کریں (ہونا چاہیے)۔ اس وقت ہر ایک ان میں سے جواب دے گا: اے رب! ہمارے پاس تین گواہ ہم سے بڑھ کر ہیں۔ پس اللہ پوچھے گا' اور وہ تینوں گواہ کون کون ہیں؟ تب موسیٰ کہے گا: اوّل وہ کتاب ہے جو تو نے مجھے عطا کی ہے۔ اور داؤد کہے گا: دوسرے وہ کتاب ہے جو تو نے مجھے دی۔ اور یہ شخص' جو تم سے باتیں کر رہا ہے' کہے گا: اے رب! تحقیق تمام دنیا کو شیطان نے بہکا دیا' اس لیے اس نے کہا کہ میں تیرا بیٹا تھا اور تیرا شریک۔ لیکن وہ کتاب جو تو نے مجھے دی ہے' اس نے کہا ہے کہ فی الحقیقت میں تیرا بندہ ہی ہوں۔ اور یہ کتاب اس بات کا اقرار کرتی ہے جسے تیرے رسول نے ثابت کیا ہے۔ اس وقت رسول اللہ کلام کرے گا' اور کہے گا: یوں ہی وہ کتاب کہتی ہے' جو اے رب! تو نے مجھے عطا کی ہے۔

جس وقت کہ رسول اللہ یہ کہے گا' اللہ یہ کہ کر کلام کرے گا: تحقیق جو کچھ میں نے اس وقت کیا ہے' محض اس لیے کیا ہے کہ ہر ایک کو میرا تجھ سے محبت کرنے کا درجہ معلوم ہو جائے۔

اور یوں کہنے کے بعد اللہ اپنے رسول کو ایک نوشتہ دے گا جس کے اندر اللہ کے تمام برگزیدہ بندوں کے نام ہوں گے۔ اسی لیے اللہ کی کل مخلوق یہ کہتے ہوئے سجدہ کرے گی: اے ہمارے رب! تنہا تیرے ہی لیے ہے بزرگی اور احسان' کیوں کہ تو ہی نے ہمیں اپنا رسول بخشا ہے۔ (39_1:55)

(32) اور اللہ اس نوشتے کو کھولے گا' جو اس کے رسول کے ہاتھ میں ہے۔ پس اس کا رسول اس کے اندر پڑھے گا' اور سب فرشتوں اور نبیوں اور تمام برگزیدہ آدمیوں کو پکارے گا۔ اور ہر ایک کی پیشانی پر رسول اللہ کی علامت لکھی ہوگی' اور نوشتے میں جنّت کی بزرگی لکھی جائے گی۔

تب اس وقت ہر ایک اللہ کی داہنی جانب سے ہو کر گزرے گا' ایسی جانبِ راست کہ رسول اللہ اس کے نزدیک ہوگا۔ اور انبیا اس کے پہلو میں بیٹھیں گے اور پاک آدمی انبیا کے پہلو میں بیٹھیں گے اور مبارک لوگ پاک آدمیوں کے پہلو میں۔ تب اس وقت فرشتہ نرسنگھا پھونکے گا اور شیطان کو جواب دہی کے لیے بلایا جائے گا۔''
(8_1:56)

اس کے بعد شیطان اور اس کے متبعین کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اس کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اور آخر میں نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کے انصاف پر گواہی دیں گے۔ انجیل برناباس میں اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے:

(33) اور جب سب کا حساب ختم ہو جائے گا' اللہ اپنے رسول سے کہے گا: اے میرے دوست! دیکھ ان کی شرارت کس قدر بڑھی ہے! پس میں نے' جو ان کا پیدا کرنے والا ہوں' کل مخلوق کو ان کی خدمت کے لیے مطیع بنایا' پھر بھی انھوں نے ہر معاملے میں میری اہانت کی! اس لیے اب انصاف' اور پورا انصاف یہ ہے کہ میں اِن پر رحم نہ کروں۔

تب رسول جواب دے گا: حق ہے' اے رب' ہمارے بزرگوار معبود! بے شک کوئی بھی دوستوں اور بندوں میں سے یہ قدرت نہیں رکھتا کہ تجھ سے ان کے لیے کوئی مہربانی طلب کرے اور میں تیرا ہی بندہ' سب سے پہلے ان کے بارے میں انصاف طلب کرتا ہوں۔'' (24_20:57)

عیسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد برناباس نے ایک حواری کا یہ شبہ درج کیا ہے کہ شیطان اور اس کی اُمّت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ سخت رویّہ آپ ﷺ کی صفتِ رحمت کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ اس پر حضرت عیسیٰؑ نے نہایت دل نشیں انداز میں عدلِ الٰہی کی حکمتیں بیان فرمائیں۔ علاوہ ازیں آگے چل کر ایک موقع پر آنحضور ﷺ کی آخری شفاعت کا حال بھی بیان کیا۔ جو اس طرح ہے:

(34) ہر شخص، پر خواہ وہ کوئی ہو، جہنم میں جانا لازمی ہے۔ مگر وہ بات جس میں کوئی خرابی نہیں یہ ہے کہ اللہ کے پاک بندے اور نبی وہاں صرف دیکھنے کے لیے جاسکیں گے نہ کہ کوئی تکلیف بیان کرنے کے لیے۔ رہے اللہ کے نیک بندے، سو وہ خوف کے سوا اور کوئی دکھ نہ سہیں گے۔ اور میں کیا کہتا ہوں؟ میں تمھیں بتلاتا ہوں کہ رسول اللہ تک وہاں جائیں گے تاکہ اللہ کے عدل کو دیکھیں۔ تب اس وقت دوزخ ان کی تشریف آوری کے سبب کانپنے لگے گی۔ اور چوں کہ وہ (رسول اللہ) انسانی جسم رکھتے ہیں، اس لیے بدن رکھنے والے ہر اس انسان پر سے بھی، جس پر عذاب کا حکم نافذ کر دیا گیا ہے، عذاب اٹھالیا جائے گا۔ پس رسول اللہ کے جہنم کو ملاحظہ کرنے کی مدت تک وہ بھی عذاب برداشت کیے بغیر رہے گا۔ لیکن رسول اللہ وہاں نہ ٹھیریں گے سوائے ایک پلک جھپکنے کے وقفے تک۔ اور اللہ یہ محض اس لیے کرے گا کہ تمام مخلوق اس بات کو جان لے کہ اس نے رسول اللہ سے کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کیا ہے۔ اور جب رسول وہاں گئے، شیطان شور مچائیں گے اور آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں کے نیچے چھپنے کی کوشش کریں گے اور ایک دوسرے سے کہتے ہوں گے: بھاگو، بھاگو! اس لیے کہ ہمارا دشمن محمد ﷺ آ گیا! پس جب شیطان اس بات کو سنے گا، وہ اپنے منہ پر دوہتڑ مار کر شور کرتا ہوا کہے گا کہ یہ میری مرضی کے خلاف مجھ سے برتر ہوا ہے اور یہ بات محض بے انصافی سے کی گئی ہے۔

رہی وہ حالت، جو ان مومنوں کے لیے خاص ہے کہ ان کے بہتر درجے ہیں مع در دیگر درجے والوں کے کہ ان کے پاس ایمان نیک کاموں کے بغیر تھا۔ اس لیے کہ پہلا فریق نیک کاموں پر رنجیدہ اور دوسرا ابدی کے ساتھ خوش تھا۔ پس یہ سب جہنم میں ہزار سال رہیں گے۔ اور ان برسوں کے بعد فرشتہ جبریل جہنم میں آئے گا اور انہیں یہ کہتے سنے گا: "اے محمدؐ! تیرا ہم سے یہ وعدہ کرنا کہاں ہے کہ جو شخص تیرے دین پر ہوگا وہ جہنم میں ابد تک نہ رہے گا؟" تب اس وقت فرشتہ جبریل جنت کو واپس جائے گا اور ادب کے ساتھ رسول اللہ کے قریب آنے کے بعد وہ ان سے بیان کرے گا جو کچھ کہ سنا ہے۔ پس اس وقت رسول اللہ کلام کرے گا، اور کہے گا: اے میرے پروردگار اور اللہ! تو میرا اپنے بندے کے ساتھ اپنا یہ وعدہ یاد کر کہ جو لوگ میرا دین قبول کریں گے وہ ابد تک جہنم میں نہ رہیں گے، تب اللہ جواب دے گا: "اے میرے حبیب! جو تو چاہتا ہے، مانگ! کیوں کہ میں سب کچھ جو تو مانگے تجھے بخشوں گا۔" (21-7:136)

(35) تب اس وقت اللہ کا رسول کہے گا: "اے رب! جہنم میں مومنوں میں سے ایسا شخص بھی ہے جو ستر ہزار سال (وہاں) رہا ہے۔ پس اے رب! تیری رحمت کہاں ہے؟ میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں، اے رب! کہ تو انھیں سخت عذابوں سے آزاد کر دے۔" تب اس وقت اللہ چاروں مقرّب فرشتوں کو حکم دے گا کہ جہنم میں جاؤ اور ہر اس شخص کو جو کہ رسول اللہ کے دین پر ہو، نکال کر جنّت کی طرف لے جاؤ، اور یہی کام وہ فرشتے کریں گے اور رسول اللہ کے دین کا نفع یہاں تک ہوگا کہ ہر وہ شخص جو ان پر ایمان لائے گا، وہ اس سزا کے بعد جو مَیں نے بیان کی ہے، جنّت میں جائے گا، اگرچہ اس نے کوئی بھی نیک کام نہ کیا ہو، کیوں کہ وہ ان کے دین پر مرا ہے۔" (6-1:37)

بعد از خدا بزرگ توئی:

اللہ کے بندوں پر اللہ کے محبوب رسول ﷺ کی یہ رحمت اور برکت حضرت عیسیٰؑ کے بقول اس پر بھی تمام نہ ہوگی، بلکہ ہمیشہ کی زندگی میں اللہ کی جو نعمتیں اہلِ جنّت کو میسر ہوں گی، ان میں بھی آنحضور ﷺ کی ذاتِ گرامی عجیب انداز میں شامل ہوگی، ایک مرتبہ سینٹ برناباس نے جنّت کی کیفیات کے بارے میں ایک سوال کیا تو اس کے جواب میں حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا:

(36) اے برناباس! اللہ نے مجھ سے یوں کہا ہے کہ "اے گناہ گار انسانو! تم جس دنیا میں رہتے ہو، اس کے لیے چاند اور ستارے ہیں جو اس (دنیا) کو تمھاری مسرت اور فائدے کے واسطے زینت دیتے ہیں۔ اس لیے کہ مَیں نے انھیں اسی واسطے پیدا کیا ہے۔ تو کیا دریں صورت تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ گھر جس میں مومنین میرے ساتھ رہیں گے زیادہ بڑھ کر نہ ہوگا؟ حق یہ ہے کہ تم اسے سمجھنے میں غلطی کرتے ہو۔ اس لیے کہ میں تمھاری جنت کا سورج ہوں۔ اور میرا رسول چاند ہے جو مجھ سے ہر شے میں مدد حاصل کرتا ہے۔ اور ستارے میرے وہ انبیا ہیں جنھوں نے تمھیں کچھ بشارت دی ہے۔ پس جس طرح مجھ پر ایمان لانے والوں نے میرے نبیوں سے (اس دنیا میں) میرا کلام اخذ کیا ہے، ایسے ہی وہ ان کے ذریعے میری مسرتوں سے جنت میں مسرت اور فرحت پائیں گے۔" (9-2:177)

انجیل برناباس کے یہ وہ اہم اقتباسات تھے، جن میں عیسیٰؑ روح اللہ نے نبی آخر الزماں ﷺ کو بشارت دی ان کے علاوہ اور بھی کئی مقامات پر آپ ﷺ کا سرسری تذکرہ آتا ہے اور ان تمام عبارتوں کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی بعثت کا دوسرا بڑا مقصد یہی تھا کہ مبشراً برسول یاتی من بعدی اسمه احمد۔ (عرفان بخاری)

نبوتِ محمدی ﷺ

نبوت و رسالتِ محمدی ﷺ:

اس دنیاوی زندگی میں، جہاں معلومات حاصل کرنے اور اغراض اور ضروریات کو پورا کرنے کا دارومدار انسان کے ظاہری حواس اور عقلی صلاحیتوں پر ہے، اور جو زندگی اسی پر اعتماد کرتی ہے، سلسلۂ نبوت اور انبیائے کرام کا کیا مقام ہے؟ اور دوسرے علما و عقلا سے انبیا کس بنا پر ممتاز ہوتے ہیں، اور کیوں صرف انھی کو حق پہنچتا ہے کہ ایسے حقائق سے متعلق گفتگو کریں، اور ایسی خبریں سنائیں جن تک نہ تیز ترین احساسات پہنچ سکتے ہیں، نہ ذکی ترین عقلوں کی رسائی ہے، حالانکہ سب ایک ہی ماحول میں پلے بڑھے ہیں، اور ایک ہی سرزمین پر زندگی گزارتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ یہ لوگ ایسی چیزیں دیکھ لیتے ہیں، جو ان کے زمانے کے عبقری اور فوق العادۃ صلاحیتوں والے بھی نہیں دیکھ سکتے اور یہ اَن دیکھی چیزیں صبح کے اُجالے کی طرح واضح اور روشن ہو جاتی ہیں، اور ان کی پیشین گوئی پوری اترتی ہے؟

یہ ایک قدرتی سوال ہے، جو ہر نئی بعثت پر لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوا اور دل و دماغ پر چھا گیا، نبی کریم ﷺ کو جب شرف نبوت سے سرفراز کیا گیا اور تبلیغ و اصلاح کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ کو بھی اس سوال کا سامنا کرنا ضروری تھا، اور رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر جو موقف اختیار کیا اور جس حکیمانہ انداز سے اس مسئلہ کو حل کیا وہ آپ کے لافانی معجزات میں سے ایک ہے۔ عرب قوم اور بالخصوص وادی مکہ کے بسنے والے ایک مدت سے دقیق مسائل، علمی اصطلاحات اور فلسفیانہ مباحث سے الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے، لیکن ذہن کی تیزی، سلامت فہم، صداقت کے اعتراف اور اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں ممتاز اور فائق تھے، رسول اللہ ﷺ نے "اس زندگی میں انبیا کا مقام کیا ہے؟ انھیں دوسروں کے مقابلہ میں جو حواس ظاہری کے علاوہ کسی اور ذریعہ علم کے مالک نہیں، اَن دیکھی حقیقتوں کے اظہار کا حق کیوں حاصل ہے"، اس کی تشریح آپ نے اس انداز میں فرمائی، جس میں عربوں کے اس ممتاز وصف کا پورا لحاظ ہے، آپ کا یہ حکیمانہ انداز ائمہ کلام اور علمائے فلسفہ کی ہزاروں دلیلوں سے کہیں زیادہ موثر اور دل نشیں تھا، آپ نے اس کے لیے جو ترتیب اور طریقہ کار اختیار کیا اور جن مقدمات سے کام لیا وہ مخاطبین کی فطرت سلیم، ان کی عقلی و علمی سطح اور موقع و محل سے پوری مطابقت رکھتے تھے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا بھی یہی طریقہ ہے، کہ وہ اپنی نبوت کے احقاق و اثبات میں بناوٹ، تکلف اور استعارہ و کنایہ کا راستہ نہیں اختیار کرتے، بلکہ چھوٹی اور معمولی چیزوں سے گراں قدر اور اہم نتائج پیدا کرتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں نہ تو صحافت کا وجود تھا، نہ لاسلکی کی طاقت انسانوں کے قابو میں آئی تھی، اور نہ آواز کو بلند کرنے اور پھیلانے والے آلات ایجاد ہوئے تھے، ایسے وقت میں وادی مکہ کے بسنے والوں کو ایک جگہ متعین وقت میں جمع کرنے کا کیا ذریعہ ہو سکتا تھا؟ کس طرح ان کے دل و دماغ پر اتنا اثر ڈالا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی دلچسپیوں سے ہاتھ کھینچ لیتے اور بھاگتے ہوئے سب کے سب آپ کی طرف چلے آتے؟

رسول اللہ ﷺ عرب قوم ہی کے ایک فرد تھے، آپ عربوں کی عادتوں اور ان کے رسم و رواج سے خوب واقف تھے، آپ یہ بھی جانتے تھے کہ ان رسوم کا ان کی طبیعتوں اور ان کے معاشرہ میں کتنا گہرا اثر ہے؟ اس دُشوار اور نازک کام میں بھی آپ نے اس سے مدد لی۔

عربوں کی عادت تھی کہ جب ان کا کوئی فرد کوئی خطرہ محسوس کرتا اچانک قوم پر کسی دشمن کے حملہ کا خوف ہوتا یا کوئی دشمن گھات میں لگا ہوتا اور شہر والے اس سے غافل ہوتے تو وہ کسی پہاڑی کی چوٹی یا کسی ٹیلا پر چڑھ جاتا اور بلند آواز سے پکارتا "یا صباحاہ" (خطرہ خطرہ) "یا صباحاہ" (دشمن دشمن) پوری قوم یہ آواز سنتے ہی گھبرا جاتی، اسلحہ سنبھالتی اور خطرہ یا دشمن کا مقابلہ کرنے دوڑ پڑتی، لیکن...... وہ کون سا خطرہ تھا، جو عام طور پر انھیں پریشان کر دیتا، اور ان کے آرام و راحت کو سلب کر لیتا؟ وہ صرف ایک تھا...... دشمن...... جس کا لشکر ان کی ایک کثیر تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیتا، ان کا مال و اسباب لوٹ لیتا، اُونٹوں اور دوسرے جانوروں کو ہنکا لے جاتا، اور انھیں نقصان پہنچاتا، قبائلی و صحرائی زندگی میں اسی ایک خطرہ سے وہ آشنا تھے، اور جب یہ الفاظ بولے جاتے تو ان کے وہی ایک معنی سمجھے جاتے تھے۔

یہ خطرات اور نقصانات، اپنی واقعیت اور اہمیت کے باوجود انبیائے کرام کی نظروں میں ہیچ ہیں، جو اس کائنات کے پیدا کرنے والے اور اسے چلانے والے کی ذات اس کی صفات اور اس کے حقوق سے جہالت کے خطرہ کی اہمیت سے آگاہ ہوتے ہیں، اور اس جاہلی زندگی کی زہرناکی سے بھی باخبر ہوتے ہیں، جو اس زمانہ میں مکہ والوں کی تھی، اور اس جاہلی معاشرہ میں پھیلے ہوئے گناہوں اور فاسد اخلاق کے نقصانات سے بھی واقف ہوتے ہیں، "اس زمانہ کے لوگ بُت پوجتے، مردار کھاتے، فواحش کا ارتکاب کرتے، قطع رحمی کرتے، پڑوسیوں کو پریشان کرتے اور طاقت والے

کم زوروں کو پامال کر دیتے۔"

رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ دشمن کہیں باہر نہیں وہ ان کے دل ودماغ، ان کے عقائد واخلاق میں پرورش پا رہا ہے، وہ باہر کے تمام دشمنوں سے زیادہ مضرت رساں اور خطرناک ہے، خطرہ کا یہ سرچشمہ جو ان کی اپنی ذات اور ان کے "اندرون" سے نکلا ہے، ان تمام خطرات سے بڑا اور اہم ہے، جن سے ان کی جاہلیت کی طویل زندگی میں سابقہ پڑا تھا، یا جن سے وہ عرب کی قبائلی زندگی میں دوچار ہوئے تھے، ان کی نفسوں کی دشمنی، ہر دشمن قبیلہ یا جنگ آزما لشکر کی دشمنی سے زیادہ سخت تھی، ان کی زندگی کے اطوار قدرت وغلبہ والے خدا کی آتش غضب کو بھڑکانے والے تھے، جو نہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند کرتا ہے، نہ روئے زمین پر فساد چاہتا ہے۔

کوہِ صفا پر

رسول اللہ ﷺ ایک صبح کو کوہِ صفا پر تشریف لے گئے، جو مکہ کی قریبی پہاڑی تھی، اور بلند آواز سے ندا دی "یا صباحاہ، یا صباحاہ" اس وادی کے بسنے والوں کے دلوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی، کہ انتہائی سنجیدہ اور خطرناک موقع پر یہ آواز بلند کی جاتی ہے، اور عام طور پر اس میں غلط بیانی، فریب دہی یا مذاق سے کام نہیں لیا جاتا، مکہ والوں نے یہ مشہور ومعروف آواز سنی، جو ان کے شہر کے سب سے سچے آدمی کے منہ سے نکل رہی تھی، جس کا انھوں نے "صادق" اور "امین" نام ہی رکھ دیا تھا، وہ اس آواز کا مطلب خوب سمجھتے تھے، ان کے سامنے تجربات اور حادثات کا طویل سلسلہ تھا۔

انھوں نے اس آواز کی طرف بڑھنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی اور لوگ جمع ہو گئے، کچھ خود آئے، کچھ نے اپنے نمائندے بھیج دیئے۔

جب لوگ جمع ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں مخاطب فرمایا، اے بنی عبد المطلب، اے بنی فہر، اے بنی کعب! تمہارا کیا خیال ہے، اگر میں تمھیں خبر دوں کہ اس پہاڑ کے دامن میں سواروں کا ایک لشکر چھپا ہوا ہے، اور تم پر بے خبری میں حملہ کرنا چاہتا ہے، تو کیا تم میری اس بات کو باور کرو گے؟

رسول عربی ﷺ نے جن لوگوں کو مخاطب کیا تھا، اور جن سے یہ سوال کیا تھا، وہ "ناخواندہ" اور "غیر ترقی یافتہ" تھے، انھوں نے فلسفہ ومنطق نہیں پڑھا تھا، نہ بال کی کھال نکالنے کے عادی تھے، بلکہ (جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) حقیقت پسند اور عملی لوگ تھے، انھیں اللہ نے سلامت فہم اور عقل عام کا وافر حصہ عنایت فرمایا تھا، انھوں نے موقع ومحل کا جائزہ لیا اور جس مقام پر یہ خطیب کھڑا تھا، اس کی طبعی ساخت کو دیکھا۔

انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص جس کی سچائی، امانت، اخلاص اور خیر خواہی کا بارہا تجربہ کر چکے تھے، ایک پہاڑی پر کھڑا ہے، وہ سامنے بھی دیکھ رہا ہے، جس میں اس کے مخاطبین بھی اس کے ساتھ ہیں، اور ساتھ ہی وہ پہاڑ کے عقب کی جانب دوسری طرف بھی دیکھ رہا ہے، جہاں سامنے پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہونے والوں کی نظر نہیں پہنچتی، لوگ بغیر کسی شک اور ادنیٰ تامل کے سمجھ گئے کہ جو شخص اس پوزیشن میں ہے اسے حق حاصل ہے کہ پہاڑ کے دوسری طرف چھپے ہوئے دشمن یا خطرہ کی خبر دے اور جن لوگوں کے سامنے پہاڑ حائل ہے، انھیں یہ حق نہیں کہ اسے جھٹلا دیں اور اس کی خبر کو صرف اس بنیاد پر رد کر دیں کہ اس مشاہدہ میں وہ لوگ خطیب کے ساتھ شامل نہیں ہیں، کیوں کہ بیچ میں حائل ہونے والے پہاڑ نے ان کی حالت اور خطیب کی حالت میں فرق کر دیا ہے، اور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے خطیب کو دوسری طرف دیکھنے اور گواہی دینے کا موقع دیا ہے، جو ان لوگوں کو حاصل نہیں۔

عرب منصف تھے، بہادر اور سچے تھے، انھوں نے کہہ دیا "ہاں ہم ایسی اطلاع کی تردید نہیں کر سکتے، ہمیں اسے باور کرنا ہوگا۔"

نبوت کی حکیمانہ تمثیل

نبوت کی اس عدیم المثال وہبی حکمت کے ذریعہ، اور اس عربی فصاحت وبلاغت کی مدد سے جس کا آپ کو حصہ وافر عطا ہوا تھا، آپ ﷺ نے ان کے سامنے نبوت اور انبیا کے بے مثل اور نازک مقام کی تصویر کھینچ دی اور ان کی ممتاز حیثیت کو واضح کر دیا، جس کی وجہ سے وہ ایسے عالم کا مشاہدہ کرتے ہیں، جس کا مشاہدہ ان کے زمانے کے انھی جیسے دوسرے انسان نہیں کر سکتے، اور ایسے اُمور وحوادث کی خبر دیتے ہیں، جس کی شہادت دوسرے مصلحین اور زعما نہیں دے سکتے، کیوں کہ وہ نبوت کے بلند پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوتے ہیں، انسان ہونے کی حیثیت سے اور احساسات کی پاکیزگی اور فطرت کی سلامتی کی وجہ سے وہ محسوس دنیا کو اسی طرح دیکھتے ہیں، جیسے سب صحیح الحواس اور صحیح الدماغ انسان، لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر وہ اللہ کی عطا کی ہوئی نبوت (اور اللہ کی مرضی کے مطابق) عالم غیب سے تعلق کی وجہ سے عالم نبوت اور غیبی حقائق کا بھی مشاہدہ کرتے ہیں۔

﴿قُلْ إِنَّمَآ أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰٓ إِلَيَّ﴾ (الکہف: 110)

"کہہ دو کہ میں تمھاری طرح کا ایک بشر ہوں البتہ میری طرف وحی آتی ہے۔"

کسی ذہین سے ذہین انسان، بہت بڑے عالم، یا بہت بڑے عقل مند کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ انھیں جھٹلا دے اور ان کے مشاہدات کا انکار کر دے، کیوں کہ وہ انبیا کے ساتھ، ان کے اس مشاہدہ میں شریک نہیں، جن چیزوں کو انبیا دیکھتے ہیں، وہ نہیں دیکھتا، جس طرح پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہونے والے انسان کے لیے کسی صورت میں یہ جائز نہیں ہو سکتا کہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے انسان کو جھٹلا دے اور پہاڑ کے پیچھے کی خبروں اور چوٹی کے اوٹ کے حادثات کا انکار کر دے۔

یہی وجہ ہے کہ جب کوئی حواس ظاہری کی طلسمات کا گرفتار ان سے جھگڑتا اور حجت بازی کرتا ہے تو وہ تعجب کا اظہار کرتے ہیں، اور پوری قوت واعتماد سے کہتے ہیں۔

﴿أَتُحَٰٓجُّوٓنِّي فِي ٱللَّهِ وَقَدْ هَدَىٰنِ﴾ (الانعام: 80)

"تم مجھ سے خدا کے بارے میں کیا بحث کرتے ہو، اس نے تو مجھے سیدھا رستہ دکھایا ہے۔"

عرب کے یہ جاہل اس ابتدائی مرحلہ میں فلاسفہ اور حکما سے زیادہ عقل مند ثابت ہوئے جنھوں نے صرف اس بنا پر انبیا ورسل کی خبروں کو جھٹلا دیا، اور حقائق کا انکار کر دیا کہ خود انھوں نے ان اُمور کا مشاہدہ نہیں کیا تھا، اور انھیں یہ باتیں معلوم نہیں تھیں۔

﴿بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَ لَمَّا يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ﴾ (یونس: 39)
''حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر یہ قابو نہیں پا سکے اور اسے نادانی سے جھٹلا دیا اور ابھی اس کی حقیقت ان پر کھلی ہی نہیں۔''

اور جب یہ فطری، عقلی اور ضروری مرحلہ طے ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے پورے عزم و یقین کے ساتھ قدم آگے بڑھایا اور دوسرے اور آخری مرحلہ میں داخل ہوئے اور فرمایا:

﴿فَاِنِّيْ نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ﴾ (میں تمھیں ایک آنے والے سخت عذاب سے ڈرا رہا ہوں) آپ نے انھیں اس حقیقی اور مستقل خطرہ سے ڈرایا جو ان کے طریقہ حیات کا، جس کے مطابق وہ زندگی گزار رہے تھے، ان عقائد کا، جن کا وہ اعتقاد رکھتے تھے، ان بتوں کا جن کے وہ شیدائی تھے، جاہلی اور فاسد اخلاق و عادات کا، جنھیں وہ دانتوں سے پکڑے ہوئے تھے اور مختصر الفاظ میں انتہائی جہالت کا، جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے، طبعی تقاضا تھا، جس میں نہ ایمان تھا نہ علم، نہ انصاف تھا نہ خدا ترسی، اور اس زندگی کا فطری انجام ہے، معاشرہ میں ہمہ گیر فساد، زندگی میں تنگی اور پریشانی، قلبی اضطراب اور داخلی عذاب۔

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ٥﴾ (الروم: 41)
''خشکی اور تری میں...... لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے تاکہ خدا انھیں ان کے بعض عملوں کا مزہ چکھائے عجب نہیں کہ وہ باز آجائیں۔''

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (السجدہ: 21)
''اور ہم انھیں قیامت کے بڑے عذاب کے سوا عذاب دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے۔ شاید ہماری طرف لوٹ آئیں۔''

اور اس زندگی کے بعد ہمیشہ کا عذاب ہے، جس کے سامنے سارے عذاب اور ہر قسم کی تکلیفات ہیچ و بے قیمت ہیں۔

﴿وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ﴾ (الرعد: 34)
''اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی سخت ہے۔''

﴿وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى﴾ (طٰہٰ: 127)
''اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر تک رہنے والا ہے۔''

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى﴾ (حم السجدہ: 16)
''اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی ذلیل کرنے والا ہے۔''

علما اور محققین نے دواؤں کے خواص دریافت کیے ہیں، مختلف اشیا کی طبائع اور ہر چیز میں چھپی ہوئی قوت کو معلوم کر کے معلومات کا قیمتی خزانہ جمع کر دیا ہے، لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور جمع کرنے والوں کی محنت و سعی اور فضل و کمال کا اعتراف کیا اور انھیں خراج تحسین ادا کیا، لیکن اللہ کی ذات، اس کی صفات، اس کے احکام، اس کی مرضیات اور عقائد و اعمال کی خاصیات اور صحیح و غلط، اچھے اور برے اخلاق کے نتائج کا علم، آخرت میں نیک و بد، ثواب و عذاب اور جنت و جہنم کی معرفت کا، انبیائے کرام واحد سرچشمہ اور ذریعہ علم ہیں، اس زندگی کے بعد کے حالات اور اس عالم میں ہونے والے حشر و نشر، انعام و عذاب اور نعمت و نقمت کے علم کے لیے اللہ نے اپنی مرضی کے مطابق انبیائے کرام کو مخصوص فرمایا ہے۔

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا٥ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ﴾ (الجن: 26)
''وہی غیب کی بات جاننے والا ہے اور کسی پر اپنے غیب کو ظاہر نہیں کرتا ہاں جس پیغمبر کو پسند فرمائے۔''

انبیائے کرام (علیہم الصلوٰۃ والتسلیم) نبوت کے پہاڑ پر کھڑے ہوتے ہیں اور اس عالم کو بھی دیکھتے ہیں، اور عالم غیب کو بھی اور انسانیت اور اس کی تہذیب و تمدن پر مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں شب خون مارنے والوں کی خبر دیتے ہیں، چھپے ہوئے خطرات و نقصانات سے آگاہ کرتے ہیں اور شفقت، محبت، مہربانی اور اخلاص کے ساتھ اپنی قوم کو ڈراتے ہیں، اور جب کوئی ان کے اس فطری اور عقلی حق کا انکار کرتا ہے، اس بدیہی چیز میں شک کرتا ہے، یا ان کی بلند حیثیت اور اعتماد کو چیلنج کرتا ہے، تو وہ نصیحت و اخلاص اور رنج و الم کے ساتھ کہتے ہیں۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَ فُرَادٰى ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ لَّكُمْ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ٥﴾ (السباء: 46)
''کہہ دو کہ میں تمھیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم خدا کے لیے دو دو اور اکیلے اکیلے کھڑے ہو جاؤ، پھر غور کرو، تمھارے رفیق کو سودا نہیں، وہ تمھیں عذاب سخت کے آنے سے پہلے صرف ڈرانے والے ہیں۔''

ہدایت کا واحد ذریعہ

اور اسی وجہ سے قرآن بار بار زور دیتا ہے کہ اللہ کی ذات اور اس کی حقیقی صفات کی نشان دہی کرنے والے صرف انبیائے کرام ہی ہیں، اور وہی اللہ کی صحیح معرفت کا، جس میں نہ جہالت و گمراہی کا شائبہ ہو، نہ غلط فہمی یا غیر مناسب انداز بیان کا شبہ، واحد وسیلہ ہیں، اور ان کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے وہ معرفت حاصل ہو بھی نہیں سکتی، نہ تنہا عقل راہ نمائی کر سکتی ہے، نہ ذہن کی تیزی و ذکاوت کافی ہو سکتی ہے، نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ بن سکتی ہے، نہ ذہن کی بلند پروازی کی وہاں گزر ہے، نہ عقل و خرد کی کاوشیں اس تک پہنچا سکتی ہیں، نہ تجربات کا خزانہ ہی مددگار ثابت ہو سکتا ہے، اللہ نے اسی حقیقت کا اظہار اہل جنت کی زبانی کیا ہے جو سچے بھی ہیں اور صاحب تجربہ بھی، اور یہ موقع بھی ایسا ہے کہ وہاں غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی کی کوئی گنجائش نہیں۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ (الاعراف: 43)

''خدا کا شکر ہے جس نے ہمیں یہاں کا رستہ دکھایا اور اگر خدا ہمیں رستہ نہ دکھاتا تو ہم رستہ نہ پاسکتے۔''

اور اس اعتراف و اقرار کے ساتھ ہی وہ انبیا کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہی معرفت صحیح کا ذریعہ اور اس راستہ کے راہ نُما تھے' جو اس منزل تک پہنچاتا ہے۔

﴿لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾ (الاعراف: 43)

''بے شک ہمارے پروردگار کے رسول حق بات لے کر آئے تھے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیائے کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی بعثت ہی کی وجہ سے ان کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کریں اور اس کی مرضی اور اس کے احکام معلوم کریں' اور ان پر عمل پیرا ہوں۔ اور اسی کے نتیجہ میں جنت میں داخلہ ممکن ہوا۔

ماورائے عقل و حواس حقائق کی دریافت کے بارے میں انسانوں کی عقلی و باطنی قوتیں جتنی بے بس' کم زور' محدود اور ناقابل اعتماد ہیں' نامناسب نہ ہوگا کہ اس سلسلے میں ہم ان عارفین و محققین کی شہادتیں اور تجربات بھی سنتے جائیں' جو عقل و قلب دونوں کوچوں سے نہ صرف آشنا بلکہ دونوں کے محرمِ اسرار تھے۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ معروف بہ مجدد الف ثانی (متوفی 1034ھ) نے اپنے محققانہ مکاتب میں اس مضمون کو بار بار دُہرایا ہے کہ عقلِ انسانی انبیا علیہم السلام کی مدد و راہ نُمائی کے بغیر صانع عالم کا اثبات تو کرسکتی ہے' اور اس کے وجود کو ضروری قرار دے سکتی ہے' لیکن اس کی ذات و صفات کی صحیح معرفت اور تقدیس و تنزیہ اور توحید صحیح مقام تک نہیں پہنچ سکتی وہ ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں۔

''خلاصہ یہ ہے کہ عقل اس دولت عظمیٰ کے ثابت کرنے سے قاصر اور ان حضرات انبیا کی ہدایت کے بغیر اس دولت سرا کا راستہ پانے سے عاجز ہے۔''

فلسفہ' اشراق اور مذاہب کی تاریخ بھی اس کی پورے طور پر تائید کرتی ہے' کہ محض عقل و استدلال یا فلسفہ و اشراق پر تکیہ کرنے والوں نے خدا کی معرفت اور اس کے لیے صحیح صفات ثابت کرنے اور صحیح افعال کی نسبت کرنے میں کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں' اور کن کن گم راہیوں اور نادانیوں میں مبتلا ہوئے ہیں۔ مجدد صاحبؒ اپنے مکتوبات میں ثابت کرتے ہیں کہ جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے ماورا ہے اسی طرح نبوت کا مرتبہ عقل سے ماورا ہے' اور کسی چیز کے مخالف عقل اور ورائے عقل ہونے میں بڑا فرق ہے۔ خدا کی تنزیہ کا طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور انبیا کی اطلاع و تعلیم پر موقوف ہے' انھوں نے معرفت الٰہی میں عقلا یونان کی بے عقلیوں کے نمونے پیش کیے ہیں' جن پر عقل بھی انگشت بدنداں ہے' اسی طرح اہل اشراق اور صفائی نفس کے مدعیوں کی بوالعجبیوں کا بھی عبرت ناک نقشہ کھینچا ہے۔

اسی طرح انھوں نے دوسرے مکتوب 1/266 بنام خواجہ عبداللہ اور خواجہ عبیداللہ فرزندانِ حضرت خواجہ باقی باللہؒ میں بڑی تفصیل سے وضاحت کے ساتھ ثابت کیا ہے' کہ پیغمبروں کی بعثت اللہ کی ذات و صفات اور احکام کی معرفت کا واحد ذریعہ ہے' اور یہ کہ عقل و کشف دونوں کا خالص اور بے آمیز ہونا ممکن نہیں' وہ جسم عنصری کے اثرات' قوتِ واہمہ کے تخیلات' رذائلِ اخلاق اور بشری کم زوریوں سے کلیتہً مبرا اور آزاد نہیں ہوسکتے' اس کے فیصلے اور اس کے اخذ کیے ہوئے نتائج و احکام اور ''علوم و معارف'' ان کم زوریوں کے رنگ میں رنگ کر اور ان کا اثر قبول کرکے ظاہر ہوتے ہیں' ان میں اکثر ان مقدمات کی کارفرمائی ہوتی ہے' جو اس کے نزدیک مسلم اور بدیہی اور حقیقتاً خلافِ واقعہ اور فرضی ہوتے ہیں' ان صحیح اور غیر صحیح مقدمات میں تمیز کرنا' اس کے اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر ناممکن ہوتا ہے' ان کے مکاتیب اس طرح کے معارف و حقائق سے پُر ہیں' اور اس سلسلہ میں ان کا مطالعہ نہایت مفید اور ایمان افروز ہے۔

اللہ نے قرآن کی ایک عظیم الشان سورہ ''سورۃ الصّٰفّٰت کو (جس میں مشرکین کی گم راہی' ان کی بداعتقادی اور اللہ کی طرف ان امور کی نسبت کی تردید کی ہے' جو ذات باری کے شایانِ شان نہیں ہیں) ان الفاظ پر ختم کیا ہے۔

﴿سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○﴾ (الصّٰفّٰت: 180تا182)

''یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں تمھارا پروردگار جو صاحب عزت ہے اس سے پاک ہے اور پیغمبروں پر سلام اور سب طرح کی تعریف خدائے رب العالمین کو سزاوار ہے۔''

یہ تینوں آیتیں ایک طلائی زنجیر کی کڑیاں ہیں' جو ایک دوسرے سے پیوست ہیں' کیوں کہ جب اللہ نے اپنی ذات کو مشرکین کی لغو اور بے ہودہ باتوں سے منزہ فرمایا تو انبیائے کرام کا بھی ذکر کیا' جنھوں نے خدا کی کامل تنزیہ و تقدیس کو اجاگر کیا' اور اللہ کے صحیح اوصاف بیان کیے' اللہ نے ان پر سلام بھیجا اور ان کی تعریف کی کیوں کہ مخلوق سے خالق کے صحیح تعارف اور خالق کے صحیح صفات سے روشناس کرانے کا سہرا انھیں کے سر ہے' اور ان کی بعثت مخلوق پر احسان' انسانوں کے لیے نعمت اور اللہ کی ربوبیت' رحمت اور حکمت کا تقاضا ہے' اس لیے اس سلسلہ کو ختم کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الصافات: 182)

''اور ساری تعریفیں اللہ ہی کو سزاوار ہیں جو سارے جہاں کا رب ہے۔''

حضرت مجدد الف ثانیؒ اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''انبیا بہترین موجودات ہیں' اور بہترین دولت ان کے سپرد کی گئی' اولیا کی انتہا انبیا کی ابتدا ہے نہ کہ عکس' نبوت کی پیروی میں قرب بالفرائض حاصل ہوتا ہے' کمالاتِ ولایت کمالاتِ نبوت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے' وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے۔''

انبیا اور نبوت کی فضیلت کے بارے میں انھوں نے اور ان کے ایک پیش رو محقق و عارف مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحیٰی منیریؒ نے اپنے مکاتیب میں بڑے بلند معارف و حقائق کا اظہار فرمایا ہے۔ مجدد صاحب لکھتے ہیں کہ ''ولایت میں سینہ کی تنگی کی وجہ سے مخلوق کی طرف پوری توجہ نہیں ہوسکتی (اس لیے ان سے وہ ہدایت اور نفع عام نہیں ہوتا جو انبیا سے ہوتا ہے) اور نبوت میں سینہ کی انتہائی فراخی اور کشائش کی وجہ

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن

رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ (الاحزاب)

بسم الله الرحمن الرحيم

قال الله تعالی فی القرآن العزیز الحکیم

ما كان محمد ابا احد من رجالكم ولكن

رسول الله وخاتم النبيين (الاحزاب)

قال النبی صلی الله علیه وسلم

انا خاتم النبيين لا نبي بعدي

ومبشرا برسول يأتي من بعدي اسمه أحمد

صلوا علیہ وآلہ

لا الٰه الا الله محمد رسول الله

عن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

كان اذا وصف النبي صلى الله عليه وسلم قال

لم يكن بالطويل الممغط ولا بالقصير المتردد كان ربعة

من القوم ولم يكن بالجعد القطط ولا بالسبط كان

جعدا رجلا ولم يكن بالمطهم ولا بالمكلثم وكان في الوجه

تدوير ابيض مشرب ادعج العينين اهدب الاشفار

جليل المشاش والكتد اجرد ذو مسربة شثن الكفين

والقدمين اذا مشى تقلع كانما يمشي في صبب

واذا التفت التفت معا

لا اله الا الله
محمد رسول الله

إن الله وملٰئكته يصلون على النبي

يا أيها الذين آمنوا

صلوا عليه وسلموا تسليما

اللہ اور اُسکے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر

اے ایمان والو!

رحمت بھیجو! اس پر ﷺ اور سلام بھیجو سلام کہکر

محمد رسول اللہ والذین معہ
اشداء علی الکفار رحماء بینھم

محمد رسول اللہ والذین معہ
اشداء علی الکفار رحماء بینھم

ورفعنا لک ذکرک

۱۳۹۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللھم صل علی محمد

وعلی آل محمد

کما صلیت علی ابراہیم وعلی

آل ابراہیم انک حمید مجید

اللھم بارک علی محمد وعلی آل

محمد کما بارکت علی ابراہیم وعلی

آل ابراہیم انک حمید مجید

کتبہ حافظ سید انیس الحسینی غفر اللہ [illegible] ○ عزیز مارکیٹ اردو بازار لاہور پاکستان

بسم الله الرحمن الرحيم

الحياء خير كله

صدق رسول الله

احمد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

سے نہ توجہ حق توجہ خلق سے مانع ہوتی ہے اور نہ توجہ خلق توجہ حق میں حائل ہوتی ہے۔"

مخدوم صاحب فرماتے ہیں کہ "انبیا کی ایک سانس تمام اولیا کی پوری زندگی سے افضل ہے انبیا کا جسم خاکی اپنی صفائی و پاکیزگی اور قرب خداوندی میں اولیائے کرام کے دل، ان کے سر اور راز و نیاز کے برابر ہے ان کے جسم کو وہاں لے جاتے ہیں جہاں دوسرے کا راز و نیاز پہنچ سکتا ہے۔"

فلسفۂ یونان کی ناکامی کا راز

یہی وجہ ہے کہ جو بھی انبیا کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اللہ کی ذات و صفات اور اسمائے حسنیٰ کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس دنیا سے اللہ کے تعلق اور اس تعلق کی کیفیت اللہ کی قدرت اس کے احکام اور اس دنیا میں ان احکام کے اثرات کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے لیے اپنی عقل اپنے علم اپنی ذہانت و ذکاوت کسی علم و ہنر سے واقفیت بعض کوششوں سے کامیابی اور علمی میدان میں معمولی یا عظیم الشان کارناموں پر اعتماد کرتا ہے اس کی ساری محنت ضائع ہو جاتی ہے اور سوائے سرگردانی اور گمراہی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا اور ان پر اللہ کا یہ فرمان صادق آتا ہے۔

﴿هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝﴾

(آل عمران: 66)

"تم لوگ جھگڑ چکے جس میں تمھیں کچھ خبر تھی اب کیوں جھگڑتے ہو جس بات میں تمھیں کچھ خبر نہیں اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔"

یونان کے قدیم الٰہیاتی فلسفہ اور اس کے مفکرین اور ماہرین کی ناکامی اور گمراہی کا یہی راز ہے ان کی بے نظیر ذکاوت و فطانت ان کے علمی و ادبی شاہکار ان کی باکمال اور سحر انگیز شاعری بڑے بڑے رزم ناموں اور ریاضی ہندسہ اقلیدس طبیعیات نجوم اور فلکیات کی مہارت نے انھیں دھوکا میں ڈال دیا اور انھوں نے سمجھا کہ مابعد الطبیعیات اور الٰہیات میں بھی وہ اسی طرح کامیاب رہیں گے چنانچہ انھوں نے الٰہیات کے مسائل اور خدا کی ذات اور اس کی صفات کے موضوع پر بھی طبع آزمائی کی۔

لیکن اس دماغ سوزی کا جو نتیجہ انھوں نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے وہ بوالعجبیوں کا ایک مرقع داناؤں کی نادانی کا ایک شاہکار اور باہم متضاد و مختلف اقوال و آرا اور قیاسات اور دعاوی کا مجموعہ ہے حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے اس پر بالکل صحیح تبصرہ فرمایا ہے۔

"تہ بہ تہ تاریکیاں ہی تاریکیاں اگر کوئی انسان اس طرح کا اپنا خواب بیان کرے تو اسے سوء مزاج کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ (تہافتہ الفلاسفہ)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس طرح کی چیزوں سے ایک دیوانہ بھی کیسے مطمئن ہو سکتا ہے اور کہاں یہ عقلا جو بزعم خود بال کی کھال نکالتے ہیں۔"

اسی طرح شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فلاسفہ اور حکماء کے اقوال پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"ارباب عقل ان لوگوں کے کلام پر غور کریں جنھیں اپنی عقل اور تحقیق کا اتنا غرہ ہے کہ انبیائے کرام کی بتائی ہوئی باتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اپنی حکمت کی انتہا اور فلسفہ کے اعلیٰ معیار پر بھی دیوانوں جیسی باتیں کرتے ہیں اور ثابت شدہ و متعین حق کو اپنی پر فریب اور شکوک میں مبتلا کرنے والی باتوں سے رد کر دیتے ہیں اور واضح اور مشہور باطل کو قبول کر لیتے ہیں۔"

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"الٰہیات کے بارے میں جب معلم اول (ارسطو) کے کلام پر نظر ڈالی جاتی ہے اور ایک پڑھا لکھا آدمی اسے غور سے دیکھتا ہے تو وہ اضطراراً اس نتیجہ پہ پہنچتا ہے کہ ان فلاسفۂ یونان سے بڑھ کر رب العالمین کی معرفت سے کوئی بے بہرہ اور نا آشنا نہیں تھا وہ دریائے حیرت میں غرق ہو جاتا ہے جب دیکھتا ہے کہ کچھ لوگ یونان کی الٰہیات کا پیغمبروں کے علوم و تعلیمات سے مقابلہ کرنے لگتے ہیں اسے یہ بات ایسی ہی نظر آتی ہے جیسے کوئی لوہاروں کا فرشتوں سے یا گاؤں کے زمین داروں کا شاہانِ عالم سے مقابلہ کرنے لگے۔"

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد فاروقیؒ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"عقل اگر اس مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفۂ یونان جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدیٰ بنایا تھا گمراہی کے بیابان میں نہ بھٹکتے اور حق تعالیٰ کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پہچانتے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے معاملہ میں جاہل ترین شخص یہی لوگ ہیں کہ انھوں نے حق سبحانہٗ کو بیکار اور معطل سمجھ لیا ہے۔"

پھر ان کے عجیب و غریب اقوال نقل کر کے لکھتے ہیں:

"عجیب بات یہ ہے کہ ایک گروہ ان احمقوں (حکمائے یونان) کو حکما کے لقب سے یاد کرتا ہے اور حکمت کی طرف انھیں منسوب کرتا ہے ان (فلاسفہ) کے اکثر مسائل خصوصاً الٰہیات میں (جو مقصد اعلیٰ ہے) غلط ہیں اور کتاب و سنت کے مخالف حکما کا انھیں لقب دینا جن کا سرمایہ جہل مرکب ہے آخر کس لحاظ سے ہے؟"

ہاں طنز و مذاق کے طور پر ہو سکتا ہے یا اس طرح جس طرح نابینا کو بینا کہا جائے۔"

انھی لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ قول صادق آتا ہے۔

﴿اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَ يُسْـَٔلُوْنَ﴾ (الزخرف: 19)

"کیا یہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے عن قریب ان کی شہادت لکھ لی جائے گی اور ان سے باز پرس کی جائے گی۔"

﴿مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا۝﴾ (الکہف: 51)

میں نے انھیں نہ تو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت اور میں ایسا نہ تھا کہ گمراہ کرنے والوں کو مددگار بناتا۔

عہد اسلامی کے فلسفہ کی لغزش

افسوس کہ ہمارا اسلامی فلسفہ (علم کلام) جو یونان کے ملحدانہ فلسفہ کا مقابلہ کرنے

کے لیے عالمِ وجود میں آیا تھا' وہ بھی اسی رُجحان سے متاثر ہو گیا' اور ایسے مسائل میں تفصیلی بحثیں کی گئیں' جن کے نہ تو اُصول و مبادی انسانوں کو معلوم تھے' نہ وہ ان کے مقدمات کا صحیح علم رکھتے تھے' اس میں بھی وہی بے قابو فلسفیانہ روح سرایت کر گئی جو اپنی قدر و قیمت نہیں پہچانتی اور حدود سے تجاوز کر جاتی ہے' یہاں بھی ذات باری سے متعلق ' مسائل اور اسما و صفات کی تاویل میں وہی باریکیاں اور بال کی کھال نکالنے کی کوشش نظر آتی ہے' اور لوگوں نے ان مسائل میں اتنی تفصیل سے کام لیا' اور ایسا تجزیہ اور ایسی تشریح کی ہے' جیسے وہ کسی سائنسی تجربہ گاہ میں کھڑے ہوں' اور تمام اجزا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک

انبیائے کرام کا امتیاز

انبیائے کرام (صلوات اللہ علیہم) کا اس حیات بخش علم میں کوئی سہیم و شریک نہیں' جس کے بغیر نہ انسانوں کو سعادت حاصل ہو سکتی ہے' نہ نجات مل سکتی ہے' وہ علم جس کی روشنی میں انسان اپنے خالق اور اس کائنات کو وجود بخشنے والی ذات' اس کی اعلیٰ صفات اور اس کے اور بندوں کے باہمی تعلق کی نوعیت معلوم کرتا ہے' اسی کی روشنی میں انسان کی ابتدا اور اس کی انتہا معلوم ہوتی ہے' اور اس دنیا میں اس کا مقام اور رب کے مقابلہ میں انسان کا موقف متعین ہوتا ہے' اور اللہ کو راضی کرنے' غصہ دلانے اور آخرت میں انسان کو خوش نصیب و کامران یا ناکام و نامراد بنانے والے اُمور و اعمال اور انسان کے عقائد' اعمال اور اخلاق و عادات کے خواص' ان کی جزا و سزا اور انسانوں سے صادر ہونے والے اقوال' اعمال اور اعتقادات کے نتیجہ میں ملنے والے ثواب یا عذاب اور طویل مدت تک اثر انداز ہونے والے اہم نتائج کی نشان دہی ہوتی ہے' اور یہی وہ علم ہے جسے ''علم النجاۃ'' کہا جا سکتا ہے۔

انبیائے کرام ارفع و اعلیٰ صلاحیتوں' احساس کی لطافت و نزاکت اور فطری ذہانت و ذکاوت کے مالک ہونے کے باوجود اپنے زمانہ کے مروجہ اور عام علوم میں دخل نہیں دیتے' نہ ان علوم و فنون میں اپنے کمال یا اپنی مہارت کا دعویٰ کرتے ہیں' بلکہ وہ تمام چیزوں سے بالکل الگ صرف اس فریضہ کی ادائیگی اور اسی خدمت کے انجام دینے میں مشغول رہتے ہیں' جن کے لیے وہ مبعوث کیے گئے ہیں' جن کے مامور بنائے گئے ہیں' اور جن پر انسان کی شقاوت و سعادت کا دار و مدار ہے۔ وہ انھی علوم کو دوسروں تک پہنچانے کی دُھن میں لگے رہتے ہیں۔

(تحریر: مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی)

بعثتِ محمدی کی اتمامی و تکمیلی شان

علے صاحبھا الصّلوٰۃ والسّلام

نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی امتیازی شان کے بیان میں جو الفاظ قرآن حکیم میں تین مقامات پر وارد ہوئے ہیں (یعنی سورۂ توبہ' 33' سورۂ الفتح' 28 اور سورۂ الصّف' 9) وہ الفاظ یہ ہیں۔

﴿هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبہ: 33)

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اسے کل دین پر۔''

اور یہ بات نہایت اہم ہے کہ یہ الفاظ نبی اکرم ﷺ کے ذکر میں قرآن مجید میں تین بار اس شان کے ساتھ وارد ہوئے ہیں کہ ان میں ایک شوشے کا بھی فرق نہیں ہے' جب کہ پورے قرآن مجید میں یہ الفاظ کسی دوسرے نبی یا رسول کے لیے ایک بار بھی استعمال نہیں ہوئے۔

ان الفاظ مبارکہ پر امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی مشہور تالیف ''اِزَالَةُ الْخَفَا عَنْ خِلَافَةِ الْخُلَفَاء'' میں مفصّل کلام کیا ہے' اور انھیں نبی اکرم ﷺ کے مقصد بعثت کی تعیین کے ضمن میں مرکزی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ اسی طرح مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے بھی ان الفاظ کو بین الاقوامی اسلامی انقلاب کا عنوان قرار دیا ہے۔ بہرنوع آنحضور ﷺ کی بعثت کے اتمامی اور تکمیلی مقصد کے فہم کے لیے ان الفاظِ مبارکہ پر غور و تدبّر لازمی ہے۔

ان الفاظ پر توجہ مرکوز کیجیے تو سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کو دو چیزیں دے کر بھیجا گیا ایک ''الہدیٰ'' (بقرہ۔6) اور دوسرے دینِ حق۔ (بقرہ۔185)

الہدیٰ

''الہدیٰ'' کو وسیع لغوی مفہوم پر رکھیے تب بھی بات غلط نہ ہوگی لیکن نظائر قرآنی کی مدد سے اس کی مراد کے تعین کی کوشش کی جائے تو وہ ہے ''قرآن حکیم'' اس لیے کہ وہی ''هُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ'' بھی ہے اور ''هُدًی لِّلنَّاسِ'' بھی اور اسی کی شان میں یہ الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں کہ ﴿وَلٰكِنۡ جَعَلۡنٰهُ نُوۡرًا نَّهۡدِیۡ بِهٖ مَنۡ نَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِنَا﴾ (الشوریٰ۔52) اور یہ بھی کہ ﴿اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ یَهۡدِیۡ لِلَّتِیۡ هِیَ اَقۡوَمُ﴾ (بنی اسرائیل۔9) اور وہی ہے کہ جسے جنوں کے ایک گروہ نے سنا تو فوراً پکار اٹھے کہ ﴿اِنَّا سَمِعۡنَا قُرۡاٰنًا عَجَبًا یَّهۡدِیۡۤ اِلَی الرُّشۡدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾ (الجن۔1' 2)

مزید برآں سورۃ الحدید کی آیت 25 میں ارسالِ رُسُل کے ضمن میں فرمایا کہ:

﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ﴾ (الحدید: 25)

''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو واضح تعلیمات اور روشن نشانیوں کے ساتھ اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان۔''

ظاہر ہے کہ اس آیہ مبارکہ میں جس طرح ''المیزان'' کو ''دِیۡنِ الۡحَقِّ'' کے قائم مقام کی حیثیت حاصل ہے اسی طرح ''اَلۡكِتٰب'' ٹھیک اس مقام پر وارد ہوا ہے جہاں آیۂ زیر بحث میں ''اَلۡهُدٰی'' کا لفظ آیا ہے۔ گویا ''اَلۡهُدٰی'' سے مراد بعثت محمدی ﷺ کے ضمن میں سوائے ''اَلۡقُرۡاٰن'' کے اور کچھ نہیں۔ (واضح رہے کہ

سورۃ الحدید "اُمُّ الْمُسَبِّحَات" کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی اسی ایک آیت کی شرح کی حیثیت رکھتی ہے پوری سورۃ الصف جس کی مرکزی آیت وہی ہے جس میں زیر بحث الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں)

دِین الحق

اسی طرح "دِین الْحَقّ" کو بھی خواہ ظاہری ترکیب اضافی پر محمول کر لیا جائے گویا اس کا ترجمہ کیا جائے "حق کا دین" خواہ اسے ترکیب توصیفی بشکل ترکیب اضافی مان کر ترجمہ کر لیا جائے "سچا دین" (جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے!) معنی و مراد کے اعتبار سے کوئی فرق واضح نہیں ہوتا جو بہرصورت ایک ہی ہیں یعنی "اللہ کا دین" اس لیے کہ سچا دین سوائے اللہ کے اور کس کا ہو سکتا ہے اور ذات حق بھی ذات باری سبحانہ و تعالیٰ کے سوا اور کس کی ہے؟ بحوائے آیات قرآنی:

(1)..... ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ (الحج: 62)

"یہ اس لیے کہ ایک اللہ ہی تو ہے "حق" (یعنی کامل حق یا سراپا حق)

(2)..... ﴿وَيَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ﴾ (النور: 25)

"اور وہ خوب جانتے ہیں کہ صرف اللہ ہی ہے کھلا "حق"

گویا "دِيـنِ الْـحَقِّ" بالکل مساوی و مترادف ہے "دین اللہ" کے (اور عجیب بات ہے کہ قرآن حکیم میں تین ہی بار آیت زیر بحث کے ضمن میں "دین الحق" کی ترکیب استعمال ہوئی ہے اور پورے قرآن میں ٹھیک تین ہی مرتبہ اللہ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں (آل عمران 83، نور 2، النصر 2) لفظ "دین" پر توجہ مرکوز کیجیے تو عربی لغت میں اس کا اساسی مفہوم بالکل وہی ہے جس میں یہ لفظ "اساس القراٰن" یعنی سورۃ فاتحہ کی تیسری آیت میں مستعمل ہوا ہے یعنی بدلہ (جو لامحالہ نیکی کا جزا کی صورت میں ہوگا اور بدی کا سزا کی شکل میں)

چنانچہ قرآن حکیم کی ابتدائی سورتوں میں یہ لفظ بغیر کسی اضافی یا توصیفی ترکیب کے اپنی سادہ ترین صورت میں بدلے اور جزا و سزا ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے:

(1)..... ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ﴾ (الماعون: 1)

"تم نے دیکھا اسے جو جھٹلاتا ہے جزا و سزا کو؟"

(2)..... ﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ﴾ (التین: 7)

"تو اس کے بعد کیا چیز آمادہ کرتی ہے تجھے جزا و سزا کے جھٹلانے پر؟"

(3)..... ﴿كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ﴾ (الانفطار: 9)

"کوئی نہیں بلکہ تم جھٹلاتے ہو جزا و سزا کو۔"

اور سورۃ الفاتحہ کے علاوہ مختلف مقامات پر بارہ مرتبہ آیا ہے لفظ "یوم" کی اضافت کے ساتھ یوم قیامت کے معنی میں یعنی بدلے یا جزا و سزا کا دن!

پھر چوں کہ بدلے اور جزا و سزا کا تصور لازماً مستلزم ہے کسی قانون اور ضابطے اور اس کی اطاعت و متابعت کے تصور کو لہٰذا لفظ "دین" نے بھی جب اپنی اصل لغوی اساس سے اٹھ کر قرآنی اصطلاح کی صورت اختیار کی تو اس میں اوّلاً اطاعت کا مفہوم پیدا ہوا۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دو مرتبہ "مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ" اور ایک بار "مُخْلِصًا لَّـهٗ دِيْنِىْ" اور چھ مرتبہ "مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" کے الفاظ اطاعت اور بندگی و فرماں برداری کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالص کر لینے ہی کے مفہوم میں آئے ہیں جن میں مزید زور اور تاکید کے لیے کہیں کہیں اضافہ کیا جاتا ہے۔ "حَنِيْفًا" یا "حُنَفَاءَ" کے الفاظ کا۔ اور یہی مفہوم ہے قرآن حکیم کے ان الفاظ مبارکہ کا کہ ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ (سورۃ الزمر: 3) اور ﴿وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا﴾ (سورۃ النحل 52 اور بالآخر اس نے "نظام اطاعت" کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی اضافت حقیقی تو اس ذات کی طرف ہوتی ہے جسے مطاع مان کر نظام زندگی کا تفصیلی ڈھانچا اور ضابطہ تیار کیا گیا ہو جیسے سورۃ یوسف میں فرمایا۔

﴿كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِىْ دِيْنِ الْمَلِكِ﴾
(یوسف: 76)

"اس طرح ہم نے تدبیر کر دی یوسفؑ کے لیے ورنہ بادشاہ کے قانون کی رو سے وہ مجاز نہ تھے کہ اپنے بھائی کو روک سکتے۔"

گویا مصر کے اس دور کے رائج الوقت نظام ملوکیت کو جس میں مطاع مطلق کی حیثیت بادشاہ یا "ملک" کو حاصل تھی قرآن حکیم "دین الملک" سے تعبیر کرتا ہے اور ٹھیک اسی مفہوم میں قرآن مجید نے استعمال کیے ہیں "دِیْنِ اللہ" کے الفاظ سورۃ النصر میں:

﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ o وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا o فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا o﴾ (النصر)

"جب آ گئی اللہ کی مدد اور فتح اور دیکھ لیا تم نے لوگوں کو داخل ہوتے ہوئے اللہ کے دین میں فوج در فوج۔"

گویا آنحضور ﷺ کی بیس سال سے زائد جدوجہد کے نتیجے میں جب عرب میں یہ صورت حال پیدا ہو گئی کہ اللہ ہی کو مطاع مطلق مان لیا گیا اور لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ اس کے نظام اطاعت میں داخل ہوتے چلے گئے تو اسے قرآن مجید نے "دین اللہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا۔ (اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ہرگز غلط نہ ہوگا اگر دورِ جدید کے محبوب و مقبول طرز حکومت یعنی جمہوریت کو جس میں غلط یا صحیح بہر حال نظری طور پر حاکمیت کے حامل قرار دیے جاتے ہیں۔ جمہور تعبیر کیا جائے "دِيْنُ الْجَمْهُوْر" کے الفاظ سے۔)

البتہ قرآن حکیم میں "دین" کی ایک دوسری نسبت و اضافت بھی بکثرت وارد ہوئی ہے جسے اضافت مجازی قرار دیا جانا چاہیے جیسے "دِيْنِىْ" یا "دِيْنُكُمْ" یا "دِيْنُهُمْ" یہ اس اعتبار سے ہے کہ انسان نے جس نظام اطاعت کو قبول کر لیا ہو یا جس کے تحت وہ زندگی گزار رہا ہو وہ گویا "اس کا دین" بن گیا۔ (اسی مجازی نسبت کی مثال ہے اس مشہور دعا کے الفاظ میں "اَللّٰهُمَّ انْصُرْ مَنْ نَصَرَ دِيْنَ مُحَمَّدٍ......

الخ۔ اسلام اصلاً تو دین اللہ ہے لیکن مجازاً! دین محمد ﷺ بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ اس دین کے لانے والے وہی ہیں فِدَاهُ اٰبَآءُ نَا وَاُمَّهَاتُنَا

حاصل کلام یہ کہ ''دین الحق'' سے مراد ہے ''دین اللہ'' یعنی وہ نظام زندگی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی ومطلقہ کی بنیاد پر قائم ہوا اور یہ دراصل خاتم النبیین وآخر المرسلین ﷺ کو عطا شدہ اتمامی وتکمیلی صورت ہے اس ''اَلْمِیْزَان'' کی جو تاریخ انسانی کے مختلف ارتقائی مراحل پر قدرے مختلف صورتوں میں عطا ہوتی رہی تھی سابق رسولوں کو' عَلٰی نَبِیِّنَا وَعَلَیْهِمُ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَام...... اور اس اعتبار سے اس کی حیثیت ہے اس ''نظامِ عدل اجتماعی'' کی جس میں ہر ایک کے حقوق وفرائض کا صحیح صحیح تعین کر دیا گیا ہے ''تا کہ لوگ قائم رہیں اس نظام قسط پر'' (الحدید۔25)

آخری بعثت کے لیے وقت کی تعیین وانتخاب

مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ختم نبوت' اتمام نعمت شریعت اور تکمیل دین حق کے لیے وقت کے انتخاب میں جو حکمت الٰہی کارفرما ہے اس کی جانب بھی انھی دو الفاظ سے راہ نمائی ملتی ہے اس لیے کہ بعثت محمدی ﷺ کا زمانہ نوع انسانی کی تاریخ کا وہ دور ہے جس میں دو ہی اعتبارات سے نسلِ انسانی گویا عہد طفولیت سے نکل کر بلوغ کو پہنچی تھی:

(1)......ایک اس اعتبار سے کہ عقل انسانی اپنی پختگی کو پہنچ گئی تھی اور انسان بحیثیت انسان جو کچھ سوچ سکتا تھا سوچ چکا تھا۔ یا یوں کہ لیں کہ نسلِ انسانی عقلی وفکری اعتبار سے بالغ ہو گئی تھی۔ محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور جنھوں نے مذاہب عالم' فلسفہ' تصوّف اور علم کلام کا نہایت وسیع مطالعہ کیا' گواہی دیتے ہیں کہ تاریخ انسانی کے بارہ سو سال یعنی چھے سو سال قبل مسیح سے چھے سو سال بعد مسیحؑ تک کا عرصہ فکر انسانی کے عہد طفولیت سے نکل کر عقل وشعور کی پختگی تک پہنچنے کا زمانہ ہے۔ چنانچہ اس عرصے کے دوران میں تمام مذاہب عالم بھی بیدار ہو چکے تھے اور تمام مکاتب فلسفہ بھی وجود میں آ چکے تھے۔ اس کے بعد مادی علوم نے ضرور ترقی کی ہے اور انسانی معلومات کا دائرہ یقیناً نہایت وسیع ہوا ہے لیکن فکر کے میدان میں ہرگز کوئی ترقی نہیں ہوئی۔ چنانچہ نہ کوئی واقعتہً نیا مذہب وجود میں آیا ہے نہ حقیقتاً جدید مکتب فکر یا مدرسۂ فلسفہ۔ اور فلسفہ جدید کے نام سے بھاری بھرکم عنوانات اور اصطلاحات کے ساتھ جو مکاتب فکر سامنے آئے ہیں ان کی حیثیت نئی بوتلوں میں پرانی شراب کے سوا اور کچھ نہیں۔ اب اگر یہ صحیح ہے' اور یقیناً صحیح ہے تو صاف سمجھ میں آتا ہے کہ ساتویں صدی عیسوی ہی موزوں ومناسب تھی اس کے لیے کہ ''نوع انسان را پیام آخریں'' یعنی قرآن حکیم ''الہدیٰ'' بنا کر نازل کر دیا جاتا اور اس کی ابدالآباد تک حفاظت کا اہتمام وانتظام بھی کر دیا جاتا کہ نوع انسانی کی فکری راہ نمائی کا مستقل سامان ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم ان دعاوی کے ساتھ نازل ہوا کہ:

(1)...... ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾ (بنی اسرائیل: 9)

''یقیناً یہ قرآن راہ نمائی کرتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی ہے۔''

(2)...... ﴿وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ (بنی اسرائیل: 105)

''اور اس (قرآن) کو ہم نے حق ہی کے ساتھ نازل فرمایا اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل ہوا۔''

(3)...... ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا﴾

(بنی اسرائیل: 88)

''کہہ دو کہ اگر مجتمع ہو جائیں تمام انسان اور تمام جن اس پر کہ لے آئیں اس جیسا قرآن تو نہ لا پائیں گے اس کا مثل خواہ وہ سب ایک دوسرے کے لیے مددگار اور حمایتی بن جائیں۔''

اور اس نے پوری نوع انسانی کو بار بار چیلنج کیا کہ:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾

(البقرہ: 23)

''اور اگر ہو تم شک میں اس کے بارے میں جو نازل فرمایا ہے ہم نے اپنے بندے ﷺ پر تو لے آؤ اس جیسی ایک ہی سورۃ!''

افسوس کہ تا حال قرآنِ حکیم کے وجوہِ اعجاز میں سے اصل توجہ صرف اس کے ادبی ولغوی محاسن اور انداز واسلوب کی مٹھاس گویا فصاحت وبلاغت ہی پر صرف کی جاتی رہی ہے اور ساری بحث الفاظ کی موزونیت' تراکیب کی چستی اور اصوات کے آہنگ ہی کے گرد گھومتی رہی ہے۔ اور اس کے فکر کی جانب کوئی توجہ ہوئی بھی ہے تو نہایت بھونڈے انداز میں بایں طور کہ کبھی ارسطو کی منطق کو اس پر حاکم بنا کر لا بٹھایا گیا اور کبھی جدید سائنسی نظریات کی بیڑیاں اس کے قدموں میں ڈال دی گئیں در آں حالیکہ ابھی وہ خود نہایت خام اور ناپختہ حالت میں تھے۔

واضح رہنا چاہیے کہ قرآن اصلاً ''اَلْهُدٰی'' ہے اور اس کا اصل اعجاز اس کی فکری وعملی راہ نمائی ہی میں مضمر ہے اور یہ انسان کو اس وقت عطا کیا گیا جب فکر انسانی بطور خود اپنی آخری بلندیوں کو چھو چکی تھی! گویا انسان عقلی اور فکری اعتبار سے بالغ ہو گیا تھا۔

(2)......آخری بعثت کے لیے وقت کے انتخاب میں دوسرا پہلو جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی تک انسان کا اجتماعی شعور بھی پختہ ہو چکا تھا اور انسان کی ہیئتِ اجتماعیہ بھی ارتقا کے جملہ مراحل طے کر کے گویا اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ انسان اوّلاً قبائلی زندگی اور اس کے بعد شہری ریاستوں (CITY STATES) کے قیام کے مراحل طے کر چکا تھا اور عظیم سلطنتوں کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ گویا حیاتِ انسانی پر نظامِ اجتماعی کی گرفت پوری شدت کو پہنچ چکی تھی' اور انسان کو تمدن واجتماعیت کے نازک اور پیچ در پیچ مسائل سے سابقہ پیش آ چکا تھا۔ مزید برآں اب اس دور کا آغاز ہونے والا تھا جس میں فرد بمقابلہ جماعت' مرد بمقابلہ عورت اور سرمایہ بمقابلہ محنت ایسے پیچیدہ اور لاینحل مسائل کے ضمن میں انسان کی عقلی ٹھوکروں اور فکری

بے اعتدالیوں کے طفیل عالم انسانیت کو موت و حیات کی شدید کش مکش اور اذیت بخش کیفیت سے دوچار ہونا تھا لہٰذا یہی موزوں وقت تھا کہ انسان کو ایک ایسا ''نظام عدل اجتماعی'' عطا کر دیا جائے جو واقعتہً ''المیزان'' کے حکم میں ہو اور تمدن و اجتماعیت کے جملہ نازک اور پیچیدہ مسائل میں مختلف پہلوؤں سے راہِ وسط کا تعین کر دے اور معاشرت، معیشت اور سیاست تینوں کے ضمن میں صراطِ مستقیم اور سواء السبیل کو پوری طرح واضح کر دے تاکہ نہ معاشرتی بے راہ روی کا کوئی امکان باقی رہے نہ معاشی استحصال کا اور نہ سیاسی جبر کا۔ اور ارسالِ رُسل اور انزالِ کتاب و میزان کا جو مقصد ہمیشہ سے پیش نظر تھا یعنی ''لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' وہ نبی آخر الزماں ﷺ پر تکمیل دین حق کے ذریعے ابدالآباد تک کے لیے پورا ہو جائے بمصداق آیت قرآنی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ: 3)

''آج کے دن میں نے کامل کر دیا تمھارے لیے تمھارا دین اور پوری کر دی تم پر اپنی نعمت اور پسند کر لیا میں نے تمھارے لیے دین اسلام کو۔''

لِيُظْهِرَهٗ

اب ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور ''لِيُظْهِرَهٗ'' پر غور فرمائیے تو بحمد اللہ یہاں 'اظہار' کے معنی تو متفق علیہ ہیں یعنی ''غالب کر دینا'' البتہ یہاں فعل اظہار کے فاعل و مفعول دونوں کے بارے میں ایک سے زائد رائیں موجود ہیں اگرچہ ان سے مراد معنی میں کوئی حقیقی و واقعی فرق واقع نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں فعل اظہار کا فاعل بھی وہی ہے جو فعل ارسال کا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور دوسری رائے یہ ہے کہ ''لِيُظْهِرَهٗ'' میں ضمیر فاعلی رسول کی جانب راجع ہے۔ اس معاملے میں اس اصول سے قطع نظر کہ ضمیر کا مرجع اگر قریب موجود ہو تو دُور جانا صحیح نہیں الا آنکہ کوئی خاص قرینہ موجود ہو، سوال یہ ہے کہ اس سے فرق کیا واقع ہوتا ہے؟ ہمارا ایمان ہے کہ فاعل حقیقی تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کے باوجود عالم واقعہ میں قرآن حکیم کے جملہ اوامر و نواہی کے مخاطب انسان ہی ہیں اور انھی کو دین کے تمام مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنا خون پسینا ایک کرنا لازم ہے۔ چنانچہ اظہار دین حق کے لیے عالم واقعہ میں بالفعل سعی و جہد اور شدید محنت و مشقت آنحضور ﷺ ہی نے کی اگرچہ فاعل حقیقی تو ہر آن اللہ ہی ہے بمصداق آیت قرآنی:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى﴾ (الانفال: 17)

''تو انھیں (کفار قریش کو) تم نے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے کیا اور (اے نبی ﷺ) جب تم نے ان پر خاک پھینکی تو تم نے نہیں پھینکی تھی (وہ مشت خاک) بلکہ اللہ نے پھینکی تھی!''

کاش کہ وہ لوگ جو تاویل کے اس بودے اور کم زور سے اختلاف کو پہاڑ بنا کر اپنے دینی فرائض کے پورے تصور ہی کو مسخ کر رہے ہیں اور بزعم خویش اس دلیل کی بنیاد پر فریضہ اظہار دین حق ہی سے بری ہو بیٹھے ہیں وہ غور کرتے کہ غزوۂ بدر کے بعد جب آیت متذکرہ بالا نازل ہوئی اگر آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اسے ظاہر الفاظ پر محمول کرتے ہوئے آیندہ کے لیے سعی و جہد سے دست کش ہو کر بیٹھ رہتے تو تاریخ کا دھارا کس رخ بہتا؟ اور آیا اس صورت میں ہم میں سے کوئی ایک بھی دولت ایمان اور نعمت اسلام سے بہرہ ور ہو سکتا؟ غور کرنا چاہیے کہ کہیں ہم شیطان کے فریب میں تو نہیں آ گئے؟ اور صورتِ حال وہ تو نہیں جو ''خوئے بدرا بہانہ بسیار!'' کی کہاوت میں بیان ہوئی یا جگر مراد آبادی کے اس شعر میں کہ:

تپتی راہیں مجھے پکاریں، دامن پکڑے چھاؤں گھنیری!

اگر صفائے نیت کے ساتھ حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معاملہ بالکل صاف ہے۔ سورۃ التوبہ، سورۃ الفتح اور سورۃ الصف جن میں آیت زیر بحث وارد ہوئی ہے تینوں اللہ کی راہ میں جہاد اور قتال سے تفصیلاً بحث کرتی ہیں۔ خصوصاً سورۃ الصف تو از اوّل تا آخر ہے ہی جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر۔ اور اس میں اس آیہ مبارکہ یعنی: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (الصف: 61) کے فوراً بعد مسلمانوں کے جذبہ جہاد و قتال کو للکارا گیا ہے۔ بایں طور کہ پہلے سوال کیا گیا کہ عذاب جہنم سے چھٹکارا پانے کے طالب ہو یا نہیں؟ اور پھر صاف صاف بتا دیا گیا کہ اس کی ایک ہی راہ ہے اور وہ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کی کٹھن اور پُر صعوبت وادیوں سے ہو کر گزرتی ہے۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ہ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ تُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ﴾ (الصف: 10 تا 11)

''اے اہل ایمان! کیا میں راہ نمائی کروں تمھاری ایسے کاروبار کی جانب جو چھٹکارا دلا دے تمھیں دردناک عذاب سے؟ ایمان (محکم) رکھو اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور جہاد کرو اس کی راہ میں اور کھپاؤ اس میں اپنے مال بھی اور اپنی جانیں بھی۔''

اگر اس راہ کو اختیار کرتے ہو تو مغفرت کا وعدہ بھی ہے اور جنت کا بھی، اخروی فوز و فلاح کا وعدہ بھی ہے اور دنیا میں تائید اور فتح و نصرت کا بھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نصرت خدا اور رسول ﷺ کے بلند و بالا مقام پر فائز ہونے کا امکان بھی ہے اور محبوبیتِ خداوندی کے اعلیٰ مرتبے پر بھی...... بصورتِ دیگر یہ مقاماتِ بلند تو خارج از بحث ہیں ہی، عذاب الیم سے چھٹکارا پانا بھی اُمیدِ موہوم کے سوا کچھ نہیں!

گویا یہ بات بالکل سیدھی ہے کہ دین اصلاً اللہ کا ہے اور اسے غالب کرنا اصلاً فرض منصبی ہے رسول اللہ ﷺ کا۔ اب جو ان دونوں پر ایمان کے دعویدار ہوں ان کے خلوص و اخلاص کا اصل امتحان (TEST) یہ ہے کہ اگر اپنا تن من دھن اس کام میں کھپا کر اللہ اور رسول ﷺ دونوں کے مددگار ہونے کا مرتبہ حاصل کر لیں تو کامیاب و کامران ہیں ورنہ خائب و خاسر اور ناکام و نامراد!

چنانچہ سورۃ الحدید کی آیت نمبر ۲۵ کے آخر میں بھی وضاحت فرمادی:

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ (الحدید: 25)

''اور تا کہ دیکھ لے اللہ کہ کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی غیب کے باوجود۔''

اور سورۃ الصف کا اختتام بھی ہوا اس آیہ مبارکہ پر!

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْۤا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ (الصف: 14)

''اے اہل ایمان! بنو مددگار اللہ کے جیسے کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے اپنے حواریوں سے کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف!''

اس کے بعد بھی اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اس کی مرضی۔ لِيُظْهِرَهٗ کی ضمیر مفعولی کے بارے میں بھی دو رائیں ہیں: ایک یہ کہ اس کا مرجع ہے۔ دین الحق اور دوسری یہ کہ راجع ہے رسول ﷺ کی جانب...... اگر چہ اس سے بھی ہرگز کوئی فرق واقع نہیں ہوتا اس لیے کہ رسول ﷺ کے غلبے کا مطلب بھی ان کی ذات یا ان کے کنبے اور قبیلے کا غلبہ نہیں دین حق ہی کا غلبہ ہے۔

عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

''عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' کا ترجمہ اکثر و بیش تر مترجمین نے ''تمام ادیان پر'' کیا ہے۔ گویا ''الدین'' کے لام تعریف کو لام استغراق قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہاں جس قدر امکان لام استغراق کا ہے اتنا ہی لام جنس کا بھی ہے؛ چنانچہ بعض حضرات نے اس کا ترجمہ ''سب دین پر'' یا ''سارے دین پر'' یا ''کل دین پر'' یا ''پورے جنس دین پر'' بھی کیا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کے اوّلین اُردو مترجمین امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے جلیل القدر صاحب زادے شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ ہیں۔ ان میں سے مقدم الذکر کے ترجمے میں رعایت لفظی زیادہ ملحوظ ہے اور مؤخر الذکر کا ترجمہ بامحاورہ قرار دیا جاتا ہے۔ بعد کے اکثر و بیش تر مترجمین اصلاً ان دو بھائیوں ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے تو اپنے ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں صاف اعلان کیا ہے کہ اصلاً وہ شاہ عبدالقادرؒ ہی کا ترجمہ ہے جس میں ایک صدی بیت جانے کے باعث اُردو کے محاورے میں جو تبدیلی آ گئی ہے صرف اس کے پیش نظر لفظی تبدیلی کی گئی ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ نے ''عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ'' کا ترجمہ سورۃ التوبہ اور سورۃ الفتح میں تو ''ہر دین سے'' کے الفاظ سے کیا ہے اور سورۃ الصف میں ''دینوں سے سب سے'' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں جب کہ شاہ رفیع الدینؒ نے صرف سورۃ التوبہ میں ''اوپر دین سب کے'' کے لفظ استعمال فرمائے ہیں؛ اور سورۃ الفتح اور سورۃ الصف دونوں مقامات پر ''اوپر دین سارے کے'' کی تعبیر اختیار کی ہے۔

گویا جہاں تک ٹھیٹھ عربی قواعد کا تعلق ہے یہ دونوں ترجمے مساوی طور پر صحیح اور درست ہیں؛ البتہ اگر حسب ذیل حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح تر اور موزوں تر ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ ہی کا ہے۔

(1)...... پورے قرآن مجید میں نہ کہیں 'ادیان' کا لفظ استعمال ہوا ہے؛ نہ ہی کوئی دوسرا مقام ایسا ہے جہاں ''الدین'' کا ترجمہ ''تمام ادیان'' کرنا ممکن ہو۔

(2)...... تفسیر قرآن کے اہم اصول "القرآن يفسّر بعضة بعضاً" کے پیش نظر اس معاملے میں یہ حقیقت تو انتہائی فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے کہ ''الدین'' کے ساتھ ''کُلّہ'' کا تاکیدی کلمہ ان تین آیات کے علاوہ پورے قرآن میں صرف حسب ذیل آیہ مبارکہ میں وارد ہوا ہے:

﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: 39)

''اور جنگ کرتے رہو ان سے یہاں تک کہ فتنہ بالکل فرو ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔''

اور یہاں ظاہر ہے کہ ''سارے ادیان'' کا ترجمہ قطعاً ممکن نہیں ہے بلکہ صرف ایک ہی ترجمہ ممکن ہے یعنی ''پورے کا پورا دین'' یا ''سارے کا سارا دین'' اس لیے کہ تمام ادیان کے اللہ کے لیے ہو جانے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں جب کہ سارے کے سارے دین یا پورے کے پورے دین کا اللہ کے لیے ہونا قرآن حکیم کا ایک معروف مضمون ہے۔ (جیسا کہ اس سے قبل ''مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ'' **اور** ''**اِلَا** لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ'' اور ''وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا'' **کے حوالے** سے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔)

اب ''الدین'' کے اصطلاحی معنی ذہن میں مستحضر کر کے ﴿هُوَ الَّذِيْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ کا ترجمہ کیجیے تو وہ یوں ہوگا:

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو الہدیٰ (یعنی قرآن حکیم) اور دین حق (یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کلی کے اُصول پر مبنی نظام زندگی یعنی اسلام) کے ساتھ تا کہ غالب کر دے وہ (یعنی رسول ﷺ) اسے (یعنی اللہ کی اطاعت کے نظام کو) پورے کے پورے دین (یعنی نظام اطاعت یا نظام زندگی) پر!''

اس آیہ مبارکہ کے مفہوم و معنی کی اس تفصیلی وضاحت کے ساتھ ہی عقلی اور منطقی طور پر بھی سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے لیے یہ اِظْهَارُ دِيْنِ الْحَقِّ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کیوں ضروری تھا؟

اچھی طرح سمجھ لیا جانا چاہیے کہ آنحضور ﷺ کے لیے یہ ''اظہار دین حق'' دو وجوہات کی بنا پر لازمی ولابدی تھا:

(1)...... ایک اس لیے کہ دین اپنی فطرت کے اعتبار ہی سے غلبہ چاہتا ہے اور وہ نظام اطاعت بے معنی ہے جو فی الواقع قائم و نافذ نہ ہو۔

اس اعتبار سے دین اور مذہب میں آسمان اور زمین کا سا فرق و تفاوت ہے۔ مذہب اصلاً ایک جزوی شے ہے اور کسی بھی دین کے تحت رہ کر گزارا کر سکتا ہے جس

طرح غلبۂ اسلام کے زمانے میں عیسائیت' یہودیت اور مجوسیت یا بدھ مت اور ہندو مت ایسے مذاہب ﴿یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ (التوبہ۔29) کی کیفیت کے ساتھ زندہ رہے یا غلبۂ انگریز کے زمانے میں اسلام ایک مذہب کی صورت اختیار کر کے زندہ رہا...... جب کہ دین ایک کلی حقیقت ہے جس کے کوئی معنی ہی نہیں اگر وہ غالب نہ ہو۔ چنانچہ جس طرح دو تلواریں ایک میان میں نہیں سما سکتیں یا جمہوریت اور ملوکیت یا کیپٹلزم اور کمیونزم کسی خطۂ زمین پر بیک وقت قائم نہیں ہو سکتے اسی طرح دو دین بھی کسی جگہ ہم سر اور ہم پلّہ ہو کر نہیں رہ سکتے۔ اور ان کے مابین مفاہمت یا پرامن بقائے باہمی کی کوئی صورت اس کے سوا موجود نہیں ہے کہ ان میں سے ایک تو دین ہی کی حیثیت میں رہے اور غالب ہو اور دوسرا سمٹ اور سکڑ کر مذہب کی حیثیت اختیار کر لے اور مغلوب ہو کر رہنے پر راضی ہو جائے!

دین و مذہب کے مابین فرق و امتیاز کے ضمن میں دو حقیقتیں اور بھی پیش نظر رہنی چاہییں: ایک یہ کہ لفظ مذہب پورے قرآن حکیم میں کہیں نہیں آیا اور حدیث نبوی ﷺ کے پورے ذخیرے میں بھی یہ لفظ عام معروف اصطلاحی معنوں میں کہیں مستعمل نہیں ہوا۔ بعد میں بھی اس لفظ کا استعمال بالکل صحیح طور پر ہوا یعنی مختلف فقہی مدرسہ ہائے فکر کے لیے۔ جیسے مذہب حنفی' مذہب مالکی' مذہب شافعی' مذہب حنبلی اور مذہب اہل حدیث جن کی حیثیت دین اسلام کے اصل شجرۂ ثابتہ کی فروع اور شاخوں سے زیادہ کچھ نہیں ہے!

دوسرے یہ کہ اگرچہ رسولوں کی لائی ہوئی شریعتوں میں اختلاف ہوتا رہا ہے جیسے شریعت موسویؑ اور شریعت محمدی ﷺ کے مابین عبادات اور معاملات کے تفصیلی احکام میں نمایاں فرق ہے تاہم از حضرت آدمؑ تا آنحضور ﷺ جملہ انبیا و رُسل کا دین ایک ہی تھا' بفحوائے آیات قرآنی:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى﴾ (الشوریٰ: 13)

مقرر کیا اس (اللہ نے) تمہارے لیے (اے مسلمانو) دین کے طور پر وہی جس کی وصیت کی تھی اس نے نوحؑ کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبی ﷺ) تمہاری طرف' اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ (علیہم السلام) کو۔

(2)...... نبی اکرم ﷺ کے لیے 'اظہار دین الحق علی الدین کلّہ' اس لیے بھی ضروری تھا کہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور عمدہ سے عمدہ نظام اجتماعی بھی جب تک بالفعل قائم کر کے اور عملاً چلا کے نہ دکھا دیا جائے بس ایک خیالی جنت (UTOPIA) کی حیثیت رکھتا ہے اور رسالت محمدی ﷺ کی جانب سے نوع انسانی پر ''شہادت'' اور ''اتمام حجت'' اور ''قطع عذر'' (جو سلسلۂ رسالت کی غرض اصلی ہے) کا حق اس وقت تک ادا نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ آپ ﷺ اس دین حق کو بالفعل قائم و نافذ کر کے نہ دکھا دیتے جس کے ساتھ آپ ﷺ مبعوث فرمائے گئے تھے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اگر آنحضور ﷺ نے مسلسل محنت و مشقت اور پیہم سعی و جہد سے غلبہ دین حق کی صورت میں وہ نظام عدل اجتماعی بالفعل قائم نہ کر دیا ہوتا۔ جو بعد میں خلافت راشدہ کے دوران میں بالکل اسی شان کے ساتھ پھلا پھولا جیسے ایک بند کلی کھل کر پھول بنتی ہے اور اس کے دوران میں نوع انسانی کے سامنے یہ ''معجزات'' عملاً رونما نہ ہو جاتے کہ ''انسانی حریت' اخوت اور مساوات'' صرف وعظ کے موضوعات نہیں ہیں بلکہ حقیقت اور واقعہ کا روپ بھی دھار سکتے ہیں اور نہ صرف یہ کہ نظام عائلی میں مرد کی قوّامیت کے باوجود عورت کو ایک انتہائی باعزت اور باوقار مقام دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ بھی کہ نظام سیاسی میں کامل آزادیٔ رائے کے باوصف نظم اور ڈسپلن بھی برقرار رکھا جا سکتا ہے بلکہ عدل و انصاف کے جملہ تقاضے بھی باحسن وجوہ پورے کیے جا سکتے ہیں اور اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ نظام معاشی کے ضمن میں انفرادی ملکیت اور ذاتی مفاد کے جذبۂ محرکہ کو برقرار رکھتے ہوئے بھی دولت کی تقسیم اور سرمائے کی گردش کا ایک حد درجہ معتدل اور نہایت عادلانہ و منصفانہ نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ تو اس دور کے انسان پر دین حق کی جانب سے ''اتمام حجّت'' کیسے ہو سکتا ہے جس کے فاتح ہیں آنحضور ﷺ اور کیسے واضح ہو سکتی ہے یہ حقیقت کہ انسان نظام اجتماعی کے ضمن میں جس خیر (GOOD) یا قدر (VALUE) کا بھی تصور کر سکے وہ اسے بتمام و کمال اور بغایت توازن و اعتدال موجود پائے اس نظام میں جو آج سے چودہ سو سال قبل قائم کیا محمد رسول اللہ ﷺ نے اور بالکل یہ محسوس ہو کہ نظام عدل اجتماعی کے ضمن میں نوع انسانی کی ساری ذہنی تگ و دو اور عملی بھاگ دوڑ گویا نظام محمدی تک رسائی کی سعی و کوشش ہے' بقول علامہ اقبال:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزُو!
یا ز نورِ مصطفیٰ ﷺ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ است

گویا آنحضور ﷺ پر اتمام نعمت شریعت اور تکمیل دین اور ختم و اکمال نبوت و رسالت کا لازمی تقاضا تھا کہ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد یہ قرار پاتا کہ آپ ﷺ انذار و تبشیر' دعوت و تبلیغ' وعظ و نصیحت' تعلیم و تربیت اور تزکیہ و اصلاح پر مستزاد تنظیم' ہجرت' جہاد اور قتال پر مشتمل ایک انقلابی جدّ و جہد کے ذریعے باطل نظام زندگی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر اس کی جگہ دین حق کو بالفعل قائم و نافذ کر دیں اور نظام اطاعت خداوندی کو پورے نظام اطاعت پر عملاً غالب کر دیں۔

چنانچہ یہی ہے آپ ﷺ کے مقصد بعثت کی وہ اتمامی و تکمیلی شان جس کے اعتبار سے آپ ﷺ انبیا و رُسل کی پوری جماعت میں ایک منفرد مقام اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

داعیٔ انقلاب

اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اگر دنیا کے عام داعیانِ انقلاب پر قیاس کرتے ہوئے آنحضور ﷺ کو بھی داعی انقلاب کے الفاظ سے یاد کیا جائے تو یہ یقیناً آپ

کی تحقیر و توہین ہے' لیکن اس میں بھی ہرگز کوئی شک نہیں کہ ''داعیِ انقلاب'' کا اطلاق اگر نسلِ آدم کے کسی فرد پر بتمام وکمال ہو سکتا ہے تو وہ صرف مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ہیں! اس لیے کہ تاریخ انسانی کے دوران میں اور جتنے بھی انقلاب آئے وہ بشمول انقلاب فرانس و انقلاب روس سب کے سب جزوی تھے اور ان سے حیاتِ انسانی کے صرف کسی ایک گوشے ہی میں تبدیلی رونما ہوئی جیسے انقلاب فرانس سے نظامِ سیاسی اور ہیئت حکومت میں اور انقلاب روس سے نظامِ معیشت کے تفصیلی ڈھانچے میں جب کہ نبی اکرم ﷺ نے جو انقلاب عظیم دنیا میں برپا کیا اس سے پوری انسانی زندگی میں تبدیلی رونما ہوئی اور عقائد و نظریات' علوم و فنون' قانون و اخلاق' تہذیب و تمدن' معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت الغرض حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ بھی بدلے بغیر نہ رہا۔

انقلابی جد و جہد

رہی آپ ﷺ کی انقلابی جدّ وجہد تو واقعہ یہ ہے کہ اس اعتبار سے بھی نسلِ انسانی کی پوری تاریخ میں کوئی دوسری مثال موجود نہیں ہے کہ کسی ایک ہی شخص نے انقلابی فکر بھی پیش کیا ہو' پھر دعوت کا آغاز بھی خود کیا ہو' پھر تنظیمی مراحل بھی آپ ہی طے کیے ہوں اور پھر اس انقلابی جدوجہد کو کش مکش اور تصادم کے جملہ مراحل اور ہجرت و جہاد و قتال کی تمام منازل سے لے کر کامیابی سے ہمکنار بھی کر دیا ہو۔ اور یہ نہایت محیّر العقول کارنامہ اور حد درجہ عظیم معجزہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا کہ آپ ﷺ نے ایک فردِ واحد سے دعوتِ حق کا آغاز فرما کر کل 23 برس (اور وہ بھی قمری) کی مختصر سی مدت میں اعلاء کلمۃ اللہ کا حق ادا فرما دیا اور سرزمین عرب پر دینِ حق کو بالفعل غالب و نافذ فرما دیا۔ فصلّی اللہ علیہ وسلم و فداہ اٰباء ناو اُمّھاتنا!

نبوی ﷺ طریقِ کار

رہا یہ سوال کہ یہ عظیم تبدیلی کیسے رونما ہوئی اور انقلاب محمدی ﷺ کا منہاج اساسی کیا ہے؟ اور آپ ﷺ کی انقلابی جدوجہد کن کن مراحل سے گزری؟ تو یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔

سردست موضوع زیر بحث کی مناسبت سے دو مزید امور کی نشان دہی مطلوب ہے:

1۔ مغربی مفکرین کی نا سمجھی

ایک یہ کہ نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کے اسی اتمامی و تکمیلی پہلو کو نہ سمجھنے کے باعث سخت ٹھوکریں کھائی ہیں آنحضور ﷺ کی سیرت طیبہ کے فہم میں مغربی مفکرین یا مستشرقین نے۔ ان بے چاروں کے سامنے بعثتِ انبیا و رُسل کی اساسی غرض و غایت تو ہے' چنانچہ وہ یہ تو جانتے ہیں کہ نبی و رسول داعی بھی ہوتے ہیں اور مبلغ بھی' معلم بھی ہوتے ہیں اور مربی و مزکی بھی' بشیر بھی ہوتے ہیں اور نذیر بھی' واعظ بھی ہوتے ہیں اور ناصح بھی' ریفارمر بھی ہوتے ہیں اور مصلح بھی لیکن چوں کہ ان پر ختم نبوت اور تکمیل رسالت کے تقاضے واضح نہیں ہیں لہٰذا یہ بات ان کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ کوئی نبی یا رسول صاحبِ سیف بھی ہو سکتا ہے اور صاحبِ علم بھی' سپہ سالار بھی ہو سکتا ہے اور مدبّر و سیاستدان بھی۔ چنانچہ جب وہ آنحضور ﷺ کی شخصیت مبارکہ میں یہ جملہ کمالات پہلو بہ پہلو دیکھتے ہیں تو سخت خلجان میں مبتلا ہو جاتے ہیں چنانچہ ان میں سے کوئی تو آپ ﷺ کو نبی یا رسول ماننے سے صریحاً انکار کر دیتا ہے اور آپ ﷺ کی عظمت صرف بطور انسان تسلیم کر کے رہ جاتا ہے۔ جیسے پروفیسر منٹگمری واٹ کے الفاظ:

ONE OF THE GREATEST SONS OF ADAM

یا جیسے ڈاکٹر مائیکل ہارٹ کے الفاظ:

THE ONLY MAN IN HISTORY WHO WAS SUPREMELY SUCCESSFUL ON BOTH THE RELIGIOUS AND SECULAR LEVELS

کوئی ایسی احمقانہ بات کہہ بیٹھتا ہے کہ ''محمد بحیثیت نبی تو ناکام ہو گئے البتہ بحیثیت مدبر و سیاستدان کامیاب ہو گئے۔'' جیسے پروفیسر ٹائن بی نے کہا۔

MOHAMMAD FAILED AS A PROPHET BUT SUCCEEDED AS A STATESMAN

اور کوئی آپ ﷺ کی شخصیت کو دو مستقل حصوں میں منقسم کر بیٹھتا ہے' چنانچہ اسے ''مکے والا محمد ﷺ'' اور نظر آتا ہے اور ''مدینے والا'' اور پروفیسر منٹگمری واٹ نے آنحضور ﷺ کی سیرت پر دو مستقل کتابیں تصنیف کر کے ایک Mohammad At Mecca اور دوسری Mohammad At Madinah یہ دُوئی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

2۔ اُمت کا فرضِ منصبی

اور دوسرے یہ کہ آیا نبی اکرم ﷺ کے مقصدِ بعثت کی تکمیل جملہ اعتبارات سے بہ تمام وکمال ہو چکی ہے یا وہ کسی پہلو یا اعتبار سے ہنوز شرمندہ تکمیل ہے اور اگر بات دوسری ہے اور صورت واقعہ یہ ہے کہ

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

تو کیا امت صرف عید میلاد النبی ﷺ منا کر' یا جلسے کر کے اور جلوس نکال کر یا ذوق و شوق کے ساتھ درود و سلام بھیج کر اپنے فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے اور صورتِ حال یہ ہے کہ

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

تاہم:

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُنھیں مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے!

کے مصداق گزارش ہے...... کہ اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ ختم نبوت و رسالت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو کام آنحضور ﷺ سے قبل انبیا و رُسُل کیا کرتے تھے آپ ﷺ کے بعد اب وہ سب کے سب آپ ﷺ کی امت کے ذمے ہیں۔ گویا خواہ دعوت و تبلیغ، انذار و تبشیر، تعلیم و تربیت اور اصلاح و تزکیہ پر مشتمل فریضۂ شہادتِ حق ہو جو بعثتِ انبیا و رُسُل کی غرضِ اصلی اور غایت اساسی ہے، خواہ اعلاءِ کلمۃ اللہ، اقامتِ دین اور اظہارِ دینِ حق علی الدّین کُلِّہٖ پر مشتمل بعثتِ محمدی ﷺ کا مقصدِ امتیازی اور منتہائے خصوصی ہو، جملہ اہلِ ارض اور جمیع کرۂ ارضی کے اعتبار سے یہ سارے فرائض اب ان لوگوں پر عائد ہوتے ہیں جو آنحضور ﷺ کے نام لیوا ہیں اور آپ ﷺ کے نام نامی سے منسوب ہونے پر فخر کرتے ہیں اور آپ ﷺ کی امت میں ہونے کو موجب سعادت جانتے ہیں۔

اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ چوں کہ نبی اکرم ﷺ پر نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا، لہٰذا آپ ﷺ دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے، ایک اپنے زمانے کے اہلِ عرب کی جانب اور دوسری تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کی جانب چنانچہ سورۃ الجمعہ میں بھی فرمایا گیا کہ آپ ''امیین'' کے لیے بھی مبعوث ہوئے اور ''آخرین'' کے لیے بھی اور آغازِ کلام میں آنحضور ﷺ کے جس خطبے سے اقتباس دیا گیا تھا، اس میں بھی آپ ﷺ نے فرمایا:

"اِنِّیْ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ خَاصَّۃً وَّاِلَی النَّاسِ کَافَّۃً."

''میں یقیناً اللہ کا فرستادہ ہوں تمہاری طرف خصوصاً اور پوری نوعِ انسانی کی جانب بالعموم!''

ان میں سے ''بعثتِ اولیٰ'' کے جملہ فرائض "شہادت علی النّاس" اور "اظہارِ دینِ حق علی الدّین کُلِّہٖ" دونوں کے اعتبار سے آپ ﷺ نے بنفسِ نفیس ادا فرما دیے خواہ اس میں مخالفت ہوئی یا مزاحمت، تمسخر ہوا یا استہزا، ذہنی کوفت کا سامنا ہوا یا جسمانی اذیت کا، مصیبتیں آئیں یا مشکلات، محنت کرنا پڑی یا مشقت، پھر خواہ شعب بنی ہاشم کا دور آیا یا یوم طائف، اور ہجرت کا مرحلہ آیا یا جہاد کا۔ خواہ غارِ ثور میں چھپنے کی نوبت آئی یا سراقہ ابن مالک کے تعاقب کی، اور بدر کا معرکہ پیش آیا یا اُحد کا۔ اور خواہ مصعبؓ بن عمیر کی بے گور و کفن لاش سامنے آئی یا حمزہؓ ابن عبدالمطلب کا اعضا بریدہ لاشہ، خواہ خندق کا مرحلہ آیا یا حُنین کا اور خواہ خیبر کی مہم سر کرنا پڑی یا تبوک کی، آپ کے پائے ثبات میں کہیں لغزش نہ آئی اور

یا تن رسد بہ جاناں
یا جاں ز تن برآید!

کے مصداق آپ ﷺ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی میں لگے رہے!

حتّٰی کہ تئیس برس کی محنت شاقہ کے نتیجے میں حق کا بول واقعتہً بالا ہو گیا، کلمۂ حق بالفعل سب سے بلند ہو گیا اور سرزمین عرب پر دینِ حق کا پرچم فی الواقع لہرانے لگا تا آنکہ حجۃ الوداع کے موقع پر جمیع اطراف و اکناف عرب سے آئے ہوئے کم از کم تعداد کے مطابق چالیس ہزار اور بعض دوسری روایات کے مطابق سوا لاکھ افراد کے عظیم اجتماع سے "اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ" (میں نے پہنچا دیا یا نہیں) کے جواب میں یہ گواہی لینے کے بعد کہ "نَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَ اَدَّيْتَ وَ نَصَحْتَ" (ہم گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے تبلیغ بھی فرما دی اور ہماری خیر خواہی کا حق بھی ادا فرما دیا) آپ ﷺ چند ہی ماہ کے اندر اندر رفیق اعلیٰ کی طرف رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ!

آپ ﷺ کے بعد، آپ ﷺ کی بعثت عامہ کی جملہ ذمہ داریاں اُمت کے کاندھوں پر آ گئیں بحوائے آیتِ قرآنی: ﴿لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے جو آپ ﷺ کے حقیقی جانشین تھے، خلافت راشدہ کے دوران میں جو واقعتہً خلافت علیٰ منہاج النبوۃ تھی، آپ ﷺ کی جانب سے تبلیغِ دین و شہادت علی الناس، اقامت دین، اور اظہار دینِ حق علی الدّین کُلِّہٖ کے فرائض ادا کیے اور تیس سال کی قلیل سی مدت میں اللہ کے دین کا پرچم اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک بہت بڑے حصے پر لہرا دیا۔

(تحریر: ڈاکٹر اسرار احمد)

انبیائے سابقہ

آنحضور ﷺ اور انبیائے سابقین:

یہودیوں کے لیے صرف بنی اسرائیل کے انبیا کو ماننا ضروری ہے' عیسائی فقط مسیح کو مان کر خدا کی بادشاہت کے حق دار ہو جاتے ہیں۔ ہندو سری کرشن' رام چندر جی اور اپنے اوتاروں کے علاوہ کسی دوسری شخصیت پر ایمان رکھنے کے پابند نہیں ہیں۔ آتش پرست حضرات کو زرتشت کے علاوہ کسی اور کو ماننے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ لیکن مسلمانوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ اکیلے حضرت محمد ﷺ پر ایمان لا کر مشرف بہ ایمان نہیں ہو سکتے' تکمیل ایمان کے لیے تمام انبیا پر ایمان لازمی قرار دیا گیا ہے اور یہ ایک اہم اور انقلابی بات ہے۔

آنحضرت ﷺ کے زمانے تک یہ طریقہ رائج تھا کہ مختلف انسانی گروہ اور قومیں اپنے اپنے نبیوں کو مانتی تھیں۔ اور اگرچہ تمام انبیا کی دعوت اصلاً ایک تھی' مگر ان کے بعد لوگ ان کی دعوت سے ہٹ کر اس گمان پر قائم رہ گئے کہ ہدایت الٰہی صرف انھی کے پاس آئی ہے اور دوسرے اس سے محروم ہیں۔ بیش تر قوموں مثلاً بنی اسرائیل وغیرہ کا خیال یہ تھا کہ انبیا بنی اسرائیل سے باہر آ ہی نہیں سکتے۔ اس صورت حال کی وجہ سے ہر قوم نسلی تعصب اور بے جا غرور کے مرض کا شکار ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر قوم کے لوگ اپنے آپ کو برگزیدہ اور خدا کی مہربانیوں کی خاص حق دار قوم سمجھتے تھے اور دوسروں کے متعلق ان کا خیال یہ ہوتا تھا کہ یہ سب گھٹیا درجے کی اقوام اور انسانی گروہ ہیں جو اس لائق نہیں سمجھے گئے کہ خدا انھیں ہدایت کرتا اور ان میں انبیا کی بعثت ہوتی۔

ان حالات میں آنحضرت ﷺ نے تشریف لا کر اس حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ ہدایت الٰہی کسی قوم کی میراث نہیں۔ جس طرح سورج کی روشنی سب کے لیے عام ہے' ایسے ہی آفتاب ہدایت ہر ملک اور ہر قوم میں طلوع ہوتے رہتے ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں میں وحی الٰہی اور صحائف آسمانی نازل ہوئے اور ہر جگہ نبی پیدا ہوئے۔ ان سب کو ماننا ضروری ہے۔ اس طرح معاشرتی تنگ نظری کی جگہ وسعت نظر پیدا ہوئی اور مذہب کی بنیاد پر نسلی برتری کا تصور ختم ہوا۔

ہدایت الٰہی سے انحراف اور محض حامل ہدایت ہونے کے تفاخر کے باعث قوموں اور گروہوں کے درمیان باہمی عداوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ یہودی حضرت عیسیٰ کو نہ صرف یہ کہ مانتے نہیں تھے بلکہ ان کے بارے میں طرح طرح کی بری باتیں کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں شدید نفرت تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے یہودیوں اور عیسائیوں دونوں سے کہا کہ یہ بے کار کی نفرت اور جنگ ختم کرو۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی نبی تھے اور حضرت موسیٰ بھی۔ آپس میں لڑنے کے بجائے ان نبیوں کی اصل تعلیمات پر عمل کرنے کی کوشش کرو۔ ایسے ہی عرب صرف حضرت ابراہیم' نوح اور چند پیغمبروں کو مانتے تھے۔ موسیٰ اور عیسیٰ سے ان کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ انجیل اور تورات' کسی پر ان کا ایمان نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے عربوں اور اہل کتاب کے درمیان بھی نفرت کی خلیج حائل تھی۔ یہ رسول الی کافۃ الناس محمد ﷺ تھے جنھوں نے جاہل اور مشرک عربوں سے موسیٰ اور عیسیٰ کا کلمہ پڑھوایا اور یہ اصول مقرر کیا کہ جو صرف اپنے نبی کو مانے وہ کافر ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾

(النسا: 150 تا 152)

"بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ نکالیں' وہی تو حقیقت میں کافر ہیں' اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کے درمیان فرق نہیں کیا' تو وہی لوگ ہیں جن کا اجر خدا انھیں دے گا' اور اللہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔"

﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ﴾ (البقرہ: 177)

"بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ پر اور یوم آخرت پر اور تمام فرشتوں اور کتاب پر اور تمام انبیا پر ایمان لائے۔"

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (البقرہ: 285)

"یہ سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔"

یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے میں جو چیز سب سے زیادہ گراں

گزرتی تھی وہ یہی تھی کہ مسلمان ہونے کے لیے حضرت عیسیٰ کو ماننا پڑے گا۔ بہت سے یہودی مسلمان ہونا چاہتے تھے اس شرط پر کہ انھیں حضرت عیسیٰ پر ایمان لانے سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے یہ بات نہیں مانی اور ان سے فرمایا:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝﴾ (المائدہ: 59)

''ان سے کہو اے اہل کتاب! تم جس بات پر ہم سے بگڑتے ہو وہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان لائے جو ہماری طرف نازل ہوئی اور تم میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔''

قریش اور مشرکین عرب کی یہ حالت تھی کہ حضرت عیسیٰ کے نام سے چڑتے تھے۔ ان سے کہا گیا:

﴿وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝﴾

(الزخرف: 57تا58)

''اور جوں ہی ابن مریم کی مثال دی گئی تمھاری قوم نے اس پر غل مچا دیا اور لگے کہنے کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ؟ یہ مثال وہ تمھارے سامنے محض کج بحثی کے لیے لائے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہیں ہی جھگڑالو لوگ۔''

یہ انبیائے سابقین کی تصدیق کا مذہب' ایسا مذہب تھا' جو انسانوں کے درمیان مذہبی جھگڑوں کو ختم کیا کرتا تھا۔ اب کوئی کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تمھارا نبی غلط' ہمارا نبی صحیح۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے کیا خوب لکھا ہے:

ایک یہودی کے لیے حضرت موسیٰ کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں۔ ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے۔ ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ' شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے۔ ایک زرتشتی تمام عالم کو بجز ظلمات کہہ کر بھی نورانی ہو سکتا ہے اور وہ ابراہیمؑ' موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دینداری کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعویٰ کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ آنحضرت ﷺ تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا ''سب نبی برحق تھے اور محمد ﷺ بھی برحق ہے۔'' غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی ﷺ نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ پہلے موسوی' عیسوی اور ایرانی و ہندی نہ بن جائے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت' حقانیت' راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے۔''

(سیرۃ النبی جلد چہارم صفحہ 581)

ایک روایت کے مطابق حضور اکرم ﷺ سے پہلے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا مبعوث کیے گئے۔ ان میں سے قرآن میں صرف ان انبیا کا ذکر ہے' جن سے عرب' یہودی اور عیسائی واقف تھے۔ بقیہ نبیوں کا تذکرہ نہیں کیا گیا اور صرف یہ اصولی بات بتا دی گئی۔

﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ﴾ (یونس: 47)

''اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔''

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا﴾ (النحل: 36)

''اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔''

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ﴾ (الروم: 47)

''اور ہم نے تم سے پہلے رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا۔''

﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ (الرعد: 7)

''اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی آیا۔''

﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (الفاطر: 24)

''اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک نذیر (متنبہ کرنے والا) نہ آیا ہو۔''

﴿وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ﴾ (الزخرف: 6)

''پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی ہم نے بارہا نبی بھیجے ہیں۔''

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾

(ابراھیم: 4)

''ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔''

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ﴾ (المومن: 78)

''تم سے پہلے ہم بہت سے رسول بھیج چکے ہیں' جن میں سے بعض کے حالات ہم نے تمھیں بتائے اور بعض کے نہیں بتائے۔''

ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو نبی سے محروم رہی ہو' لیکن ایک قوم کے نبی سے بعض اوقات دوسری قومیں ناواقف ہوتی ہیں۔ مثلاً حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ سے یہود و نصاریٰ ناواقف تھے۔ صرف عرب انھیں مانتے تھے۔ قرآن نے تصدیق کی کہ حضرت ہودؑ اور حضرت شعیبؑ کو یہ ماننا بلاوجہ نہیں ہے وہ واقعی پیغمبر تھے۔ یہود و نصاریٰ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کو صرف بادشاہ کہتے تھے' پیغمبر نہیں تسلیم کرتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ واضح کیا کہ یہ دونوں شخصیتیں بھی پیغمبر تھیں۔

انبیائے سابقین کے بارے میں ایک بات یہ تھی کہ ان کے بارے میں بے سروپا قصے اور کہانیاں گھڑ لی گئی تھیں۔ ان قصوں میں انبیائے سابقین کی شان اور عزت کو گرانے والی باتیں شامل تھیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اس طرح کی تمام بے سروپا باتوں کی تردید کی۔ مثلاً انجیل کے مطالعے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنی والدہ کی عزت نہیں کرتے تھے اور نماز روزہ کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ اس کی تردید میں قرآن نے حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہلوایا:

﴿وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۪ۖ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ٘ ۫ وَ لَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا﴾

(مریم: 31تا32)

''اور اس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا۔ اور مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا۔''

یہودی حضرت مریمؑ پر تہمت رکھتے تھے۔ قرآن نے کہا:

﴿وَ مَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ﴾ (التحریم: 12)

''اور عمران کی بیٹی مریمؑ جس نے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی تھی، پھر ہم نے اس کے اندر اپنی طرف سے روح پھونک دی اور اس نے اپنے رب کے ارشادات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزار لوگوں میں سے تھی۔''

حضرت سلیمانؑ کو گنڈے تعویذ، عملیات اور سحر وجادو کا موجد سمجھا جاتا تھا۔ قرآن پاک نے اس کی تردید کی:

﴿وَ مَا كَفَرَ سُلَیْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّیٰطِیْنَ كَفَرُوْا یُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾

(البقرہ: 102)

''حالاں کہ سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا۔ کفر کے مرتکب تو وہ شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔''

بائبل میں حضرت لوطؑ پر اپنی بیٹیوں سے زنا کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ قرآن میں اس کی بھی تردید آئی۔ حضور اکرم ﷺ نے دوسرے انبیا کی یہاں تک عزت کی کہ بعض اوقات اپنے آپ کو بھی فراموش کر دیا۔ ایک بار ایک صحابیؓ نے آنحضرت ﷺ کو ''اے بہترین خلق'' کہہ کر خطاب کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: بہترین خلق تو ابراہیمؑ تھے۔ ایک دفعہ حضور ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے اعلیٰ خاندان کون تھا؟ فرمایا: ''حضرت یوسف بن پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ۔'' ایک روایت میں ہے کہ مدینے میں ایک یہودی نے کہا: ''قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰؑ کو تمام انسانوں پر فضیلت دی۔'' ایک مسلمان کو یہ بات ناگوار گزری کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے۔ اس پر تکرار ہوئی۔ مسلمان نے یہودی کو تھپڑ مارا۔ یہودی نے دربارِ نبوی ﷺ میں شکایت کی۔ حضور اکرم ﷺ نے مسلمان کو بلا بھیجا۔ مقدمے کی روداد سنی۔ اور شدت تاکید کے ساتھ فرمایا: ''پیغمبروں کو باہم ایک دوسرے پر فضیلت نہ دو۔'' (یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی توہین ہوتی ہو) قرآن میں ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (البقرہ: 253)

''ان رسولوں کو ہم نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہم کلام ہوا، کسی کو اس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے اور آخر میں عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح پاک سے اس کی مدد کی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ رسولوں کے بھی مختلف درجات ہیں۔ کسی کے کم، کسی کے زیادہ لیکن اس اختلاف درجات کو اس طرح بیان کرنا کہ باہمی کشیدگی یا جھگڑے پیدا ہوں، ممنوع ہے۔ انبیائے سابقین کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ عرب، جو حضرت عیسیٰؑ کا حال سن کر مذاق اڑاتے تھے جنھیں حضرت موسیٰؑ کی جلالت شان کے تذکرہ پر غصہ آتا تھا، وہ انبیائے سابقین کے ایسے قائل ہوئے کہ اپنی اولاد کے نام عیسیٰ اور موسیٰ رکھنے لگے اور آج بھی انبیائے سابقین کا احترام مسلمانوں کے ایمان میں شامل ہے۔ صرف احترام ہی نہیں۔ کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک وہ ختم المرسلین ﷺ کے ساتھ ساتھ سابق انبیا کو بھی اللہ کے فرستادہ تسلیم نہ کرے۔

وحدتِ دین

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں یہ خیال بھی عام تھا کہ ایک نبی کی تعلیمات دوسرے انبیا کی تعلیمات سے مختلف ہیں اور ہر ایک کا مذہب الگ الگ ہے۔ آدمی ان میں سے کسی ایک کو مان سکتا ہے، سب کو نہیں مان سکتا۔ کیوں کہ ان کی تعلیمات باہم متضاد ہیں۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے بتایا کہ دین میں کوئی اختلاف نہیں۔ سب نبیوں نے از آدمؑ تا ابنِ مریمؑ ایک دین کی تعلیم دی ہے اور وہ ہے اسلام کا دین۔ فرق جو کچھ ہے وہ دین میں نہیں، شریعت اور منہاج میں ہے۔ ہر قوم کے حالات کے لحاظ سے اس کے لیے شریعت مقرر کی گئی۔ مثلاً حضرت نوحؑ کی قوم کے لوگ بہت تنومند اور صحت مند تھے۔ اس لیے ان کے روزے کئی کئی دن کے ہوتے تھے۔ بعد کی اُمتوں میں جسمانی ضعف پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے انھیں صرف ایک دن کا روزہ رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ اس طرح کے اختلافات بنیادی اصولوں کے اختلاف نہیں ہیں۔ قومی مزاج اور حالات کے اختلافات ہیں۔ مگر اب وقت آ گیا ہے کہ قومی شریعتوں اور مناسک کی جگہ ایک بین الاقوامی شریعت اور بین الاقوامی مناسک و رسوم مقرر کیے جائیں۔ تاکہ انسانیت ٹکڑوں میں بٹی رہنے کے بجائے متحد و متفق ہو سکے۔ اس کے لیے خاتم النبیین محمد ﷺ اور ان کی شریعت و مناسک نازل کیے گئے ہیں، جو انبیائے سابقین اور ان کی شریعتوں اور مناسک کی تکذیب نہیں کرتے، تصدیق کرتے ہیں اور ان شریعتوں اور مناسک کا بیش تر حصہ جو آج بھی مفید اور قابل عمل ہے، شریعت محمدیہ ﷺ میں شامل کیا گیا ہے۔ صرف وہ چیزیں چھوڑ دی گئی ہیں جو اس زمانے کے مخصوص تقاضوں کے لیے تھیں اور جن کی کوئی دائمی اور ابدی حیثیت نہیں۔ وحدت دین، یعنی تمام انبیا کا ایک ہی دین تھا، اس نظریے کو قرآن میں اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِیْۤ اَوْحَیْنَاۤ اِلَیْكَ وَ مَا وَصَّیْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِیْسٰۤى اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا

فِيهِ ۚ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ ۚ اللَّهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ ○ وَمَا تَفَرَّقُوا إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَبِّكَ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ أُورِثُوا الْكِتَابَ مِنْ بَعْدِهِمْ لَفِي شَكٍّ مِنْهُ مُرِيبٍ ○ فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ ۖ وَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ ۖ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ ۖ وَقُلْ آمَنْتُ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ ۖ وَأُمِرْتُ لِأَعْدِلَ بَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۖ لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ۖ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ ۖ اللَّهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ○﴾ (الشوریٰ: 13تا15)

''اس نے تمھارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا' اور جسے (اے محمد ﷺ) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعے بھیجا ہے' اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمد) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے' جو اس کی طرف رجوع کرے لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ اگر تیرا رب پہلے ہی یہ نہ فرما چکا ہوتا کہ ایک وقت مقرر تک فیصلہ ملتوی رکھا جائے گا' تو ان کا قضیہ چکا دیا گیا ہوتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگلوں کے بعد لوگ کتاب کے وارث بنائے گئے۔ وہ اس کی طرف بڑے اضطراب انگیز شک میں پڑے ہوئے ہیں چوں کہ یہ حالت پیدا ہو چکی ہے اس لیے (اے محمد ﷺ) اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو اور جس طرح تمھیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی سے قائم ہو جاؤ' اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو' اور ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے۔ میں اس پر ایمان لایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہی ہمارا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمھارے اعمال تمھارے لیے۔ ہمارے اور تمھارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے۔''

ان آیات میں کہا گیا ہے کہ محمد ﷺ کا دین وہی ہے جو نوحؑ کا تھا' ابراہیمؑ کا تھا' موسیٰؑ کا تھا اور اگلی نسل کے بعد پچھلی نسلوں نے اپنی تحریفات سے اس دین میں تفرقے پیدا کر دیے تھے۔ آپس کی ضد اور تعصبات کو مذہب بنا لیا تھا۔ یہ بات بھول گئے کہ دین سب کا ایک ہی ہے۔ اہلِ کتاب بھی اس وحدت کو بھول کر شکوک و شبہات کا شکار ہوئے۔ اب اے محمد ﷺ تمھیں حکم ہوتا ہے کہ سب کو اصل دین کی طرف بلاؤ اور کہو کہ دنیا میں خدا کی طرف سے جو کتاب بھی آئی ہے میں ان سب کو مانتا ہوں اور تم مختلف مذہبوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے اِن لوگوں سے انصاف کرو' یعنی جس کے پاس جو سچائی ہے' اسے قبول کرو۔ اور اس سچائی پر سب آپس میں متحد ہو جائیں' جھگڑا ختم کریں۔ یہی بات ایک اور قرآنی آیت میں بھی کہی گئی ہے۔

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ﴾ (آل عمران: 64)

''کہو اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنا لے۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو' ہم تو مسلم (صرف خدا کی اطاعت اور بندگی کرنے والے) ہیں۔''

ایک اور مقام پر قرآن شریف میں کہا گیا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ﴾ (الانعام: 159)

''جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ بن گئے۔ یقیناً ان سے تمھارا کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے۔ وہی انھیں بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا ہے۔''

سورۂ المومنون میں وحدت دین کا مضمون یوں بیان کیا گیا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۖ إِنِّي بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ○ وَإِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُونِ ○ فَتَقَطَّعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ○﴾

(المومنون: 51تا53)

''اے پیغمبرو! کھاؤ پاک چیزیں اور عمل کرو صالح۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو' میں اُسے خوب جانتا ہوں۔ اور یہ تمھاری اُمت ایک ہی اُمت ہے اور میں تمھارا رب ہوں' پس مجھی سے ڈرو' مگر بعد میں لوگوں نے اپنے دین کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر لیا۔ ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے' اسی میں وہ مگن ہے۔''

حدیثِ نبوی ﷺ میں اس حقیقت کو یوں ظاہر کیا گیا ہے:

"عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا أَوْلَى النَّاسِ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَالْأَنْبِيَاءُ إِخْوَةٌ لِعَلَّاتٍ أُمَّهَاتُهُمْ شَتَّى وَدِينُهُمْ وَاحِدٌ."

(صحیح بخاری' کتاب الانبیا)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں سب لوگوں سے زیادہ عیسیٰؑ ابن مریم سے دنیا اور آخرت میں قریب ہوں۔ اور تمام انبیا آپس میں علاتی بھائی ہیں' کہ ان کی مائیں جدا جدا ہیں اور دین (جو مثل والد کے ہے) ایک ہے۔''

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب سب انبیا حق اور صداقت پر تھے تو حضرت

محمد ﷺ کے احکامات کی پابندی اور پیروی کیوں ضروری ہو۔ آدمی کسی ایک نبی کو مان لے اور اس کے احکامات پر عمل کرلے تو وہ حق اور صداقت پر ہوگا۔ جب حضرت محمد ﷺ بھی حق پر ہیں اور حضرت عیسیٰ اور موسیٰ بھی، تو آدمی اگر موسیٰ یا عیسیٰ کی شریعت اور احکام پر عمل کرتا ہے، اور حضرت محمد ﷺ کے احکامات کو نظرانداز کرتا ہے تو اس میں آخر حرج کی کیا بات ہے؟ بہ الفاظ دیگر دنیوی اور اخروی نجات کے لیے کسی خاص نبی کی شریعت کی پابندی ضروری نہیں۔ آدمی اپنے حسبِ منشا کسی بھی نبی کی شریعت کو اپنے لیے منتخب کرسکتا ہے! اس کا جواب یہ ہے کہ شریعت محمدیہ ﷺ سے پہلے کی تمام شریعتیں وقتی اور محدود حیثیت رکھتی تھیں۔ وہ ایک مختصر عرصہ کے لیے تھیں اور ان خاص حالات کے لیے تھیں جو اس وقت موجود تھے۔ یہ عرصہ اور یہ حالات چوں ختم ہوگئے، اس لیے یہ شریعتیں بھی منسوخ ہیں، اور ان کی جگہ وہ شریعت محمدی ﷺ اب مستند حیثیت رکھتی ہے جو ہر ملک کے لیے ہے، ہر قوم کے لیے ہے اور ہر زمانے کے لیے ہے۔ حضرت موسیٰ کو جو شریعت ملی تھی وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ کتابِ استثنا (موسیٰ کی پانچویں اور آخری کتاب) میں ہے، ''موسیٰ نے ہمیں ایک شریعت عطا فرمائی جو کہ یعقوبؑ کی جماعت کی میراث ہو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ شریعت موسوی صرف آل یعقوب کی شریعت ہے۔ حضرت موسیٰ کا مشن محدود مشن تھا اور وہ صرف یہ تھا۔

''اور میں نازل ہوا ہوں کہ انھیں مصریوں کے ہاتھ سے چھڑاؤں اور اس زمین سے نکال کے اچھی زمین میں، جہاں دودھ اور شہد موج مارتا ہے، کی جگہ میں لاؤں۔''

(کتاب خروج۔8)

''بس اب تو جا، میں تجھے فرعون کے پاس بھیجتا ہوں، میرے لوگوں کو جو بنی اسرائیل ہیں مصر سے نکال۔'' (کتاب خروج۔18)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کی بعثت کا مقصد فقط اتنا تھا کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے چھٹکارا دلائیں اور انھیں ایک علیحدہ آزاد وطن لے کر دیں۔ اس لیے ان کی شریعت بنی اسرائیل اور بنی اسرائیل کے بھی ان خاص حالات کے لیے تھی تاہم اس کا جو دائمی اور ابدی حصہ ہوسکتا تھا، وہ شریعتِ محمدیہ ﷺ میں شامل کیا گیا۔ شریعت موسوی کے بیش تر احکام شریعت محمدیہ ﷺ میں شامل ہیں اور جو نہیں شامل ہیں وہ وقتی نوعیت کے تھے یا سرے سے احکام ہی نہیں تھے۔ بعد کے لوگوں نے انھیں خواہ مخواہ حضرت موسیٰ سے منسوب کردیا تھا۔ موسیٰ سے حضرت عیسیٰ تک جتنے نبی آئے وہ بھی سب بنی اسرائیل کے لیے ہی تھے اور انھوں نے شریعت موسوی ہی کو برقرار رکھا۔ انجیل میں حضرت عیسیٰ خود کہتے ہیں:

''میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔''

انجیل متی میں ہے کہ جب مسیح نے اپنے بارہ شاگردوں کو تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا تو انھیں ہدایت کی:

''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا'' اس سے ظاہر ہوا کہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں کی تبلیغ غیر قوموں کے لیے نہیں تھی اور بنی اسرائیل میں سے بھی سامریوں کے لیے نہیں تھی۔ اس لیے ان کے پاس جانے کی ممانعت کردی گئی۔ اس کے برخلاف حضور اکرم ﷺ کا خطاب یٰاَیُّهَا النَّاسُ رہا ہے۔

﴿قُلْ یٰاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا﴾

(الاعراف: 158)

''اے محمد ﷺ کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

اور یہ کہ:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (السباء: 28)

''اور ہم نے تمھیں تمام ہی انسانوں کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔''

انبیائے سابقین کو خود بھی یہ بات معلوم تھی کہ ان کا مشن محدود نوعیت کا ہے، اور ان کے احکامات وقتی ہیں، اور ایک ایسا نبی جو ساری انسانیت کا نبی ہو، اور جس کی شریعت چار دانگ عالم کے لیے ہو، وہ ابھی آنے والا ہے۔ اس لیے انھوں نے اس آنے والے نبی کی پیش گوئی بھی کی، اور یہ ہدایت بھی کی کہ وہ جب آئے تو اس کی اطاعت کرنا۔ خدا نے حضرت موسیٰ سے فرمایا: ''میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔'' (استثنا: 18۔19)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ کے بعد ان کی طرح ایک صاحب شریعت نبی اور آئے گا اور خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا۔

''لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمھیں سب چیزیں سکھائے گا۔ اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمھیں یاد دلائے گا۔'' (یوحنا: 14۔26)

''اور وہ فارقلیط آکر دنیا کو گناہ سے راستی و عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے۔ میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں مگر اب تم انھیں برداشت نہیں کرسکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی، تو وہ تمھیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی۔ اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ سنے گی سو کہے گی۔ میری بزرگی کرے گی۔'' (یوحنا: 16۔8)

اس میں حضرت عیسیٰ نے اپنے کلام کو خود ہی ناتمام قرار دیا ہے اور ایک آیندہ آنے والے کی خبر دی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اعلان کیا:

﴿اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ (المائدہ: 3)

''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی ہے۔ اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے پسند کیا ہے۔''

دین کو کامل کرنے کا دعویٰ حضور اکرم ﷺ سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔ اس لیے

کہ یہ انبیائے سابقین کے زمانے میں کامل نہیں ہوا تھا۔ آپ ﷺ ہی کے زمانے میں آ کر کامل ہوا۔ اور آپ ﷺ کے بعد پھر کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے ختم نبوت کا بھی اعلان کیا گیا۔ حضور اکرم ﷺ سے پہلے کسی نے ختم نبوت کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ بلکہ انبیائے سابقین میں سے ہر ایک نے اپنے بعد ایک بڑے نبی کے آنے کی پیش گوئی کی تھی اور ان پیش گوئیوں کا مصداق حضور اکرم ﷺ کی ذات تھی۔ (تحریر: عبدالکریم عابد)

آنحضور ﷺ اور یہودی

رحمتہ للعالمین سراپا رحمت تھے لیکن یہودیوں کے حق میں انھیں غضبِ الٰہی کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ ابتدا میں عرب کے دوسرے گروہوں کی طرح یہودیوں سے بھی حضور ﷺ نے نرمی اور رحمت کا سلوک کیا۔ لیکن یہ وہ قوم تھی کہ اس کی سازشوں اور مکاریوں کے جواب میں سخت رویہ ضروری تھا اور خدا کے حکم سے رسُول اللہ نے یہ سخت رویہ اختیار کیا۔ اس سخت رویہ کی نظیر حضور ﷺ کے طرزِ عمل میں کسی اور گروہ کے بارے میں نہیں ملتی۔ یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو جلاوطن کیا گیا۔ وہ مدینہ اور اس کے گردونواح سے نکال دیئے گئے اور یہودیوں کے سات آٹھ سو آدمیوں کے ایک گروہ کو تو حضور ﷺ کے حکم پر قتل کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ بعض سرکردہ یہودی شخصیتوں کو جو نہایت شر انگیز پراپیگنڈا کے ذریعے لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے ابھار رہی تھیں حضور ﷺ نے آدمی بھیج کر قتل کرا دیا۔ اس طرح قتل کیے جانے والوں میں ایک شاعرہ عورت عصما اور ایک سو سالہ بوڑھا ابو عنک بھی شامل ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے اس سخت طرزِ عمل پر مغربی مصنفین نے بہت سے اعتراضات بھی کیے ہیں۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ یہودی لیڈر شپ بنیادی طور پر شر پسند اور فساد پسند رہی ہے۔ یہ ہر زمانے میں شر اور فساد کی آگ بھڑکاتے رہے ہیں۔ اور حضور اکرم ﷺ کے لیے ان کی شر پسندی کا سدِ باب سخت رویّہ کے بغیر ممکن نہیں رہا تھا۔ اس وجہ سے حضور ﷺ نے دوسرے گروہوں سے نرمی برتی لیکن یہودیوں کو سختی سے کچلا اور اس کا جواز خود انھوں نے اپنی شر پسندانہ اور مفسدانہ حرکتوں سے فراہم کیا۔

عہد نبوی میں یہودیوں کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بے چینی سے خاتم الانبیا محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد کے منتظر تھے۔ وہ اس پر یقین رکھتے تھے کہ خاتم الانبیاءؑ قریب آنے والے ہیں۔ اپنی محفلوں میں وہ اس مبارک وجود کی آمد کا تذکرہ کرتے اور اپنی مشکلات حل کرنے کے لیے خدا کے حضور جب دعائیں مانگتے تو قبولیت دعا کے لیے مستقبل کے اس رحمت للعالمین کا واسطہ دے کر دعائیں مانگتے تھے۔ مدینہ میں اگر یہودیوں اور عربوں کے درمیان کبھی تیز کلامی کی نوبت آ جاتی تو یہودی، عربوں کو یہ کہہ کر ڈراتے "ذرا اور صبر کرو آنے والے نبی کا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ ہم اس کے پیرو بن کر اس کی پناہ میں تمھیں تہس نہس کر دیں گے"، لیکن جب ان کے درمیان محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی نبوت کا انکار کیا بلکہ ہر طرح سے رسول اللہ کی مخالفت کی۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ مخالفت اس لیے بھی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ یہودی بت پرست نہیں تھے، خدا پرست تھے، مُوحد تھے۔ وہ خدا پر، فرشتوں پر، سلسلۂ رسالت پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتے تھے۔ اس لیے مشرکین عرب کے مقابلے میں اسلام کا پیغام یہودیوں کے لیے زیادہ آسانی سے قابل قبول تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے ان کے مذہب کی تکذیب نہیں کی بلکہ تصدیق کی تھی۔ خود حضور اکرم ﷺ ان تمام معاملات میں جہاں وحی الٰہی نازل نہیں ہوئی تھی، موسوی شریعت کے احکام پر عمل کرتے تھے اور بہت سے معاملات میں وحی الٰہی وہی ہوتی تھی جو موسوی شریعت میں تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ حضور اکرم ﷺ اور تمام مسلمان عرصہ تک یہودیوں ہی کے مقدس مقام بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔

مخالفت کے اسباب

مسلمانوں اور یہودیوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں، اس کے باوجود بغض وعناد اور مخالفت کا جو رویّہ یہودیوں نے اختیار کیا اس کی پہلی وجہ یہی ہے کہ یہودی سمجھتے تھے کہ خاتم الانبیا ہماری نسل اور قوم سے آئیں گے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ بنو اسحاق کی بجائے بنو اسماعیل میں پیدا ہوئے اور ایک غیر قوم کے آدمی کو اپنا نبی مان لینا اس غیر قوم کی برتری کو تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ اس کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔ وہ خیال کرتے تھے کہ نبوت ہمیشہ سے ہمارے باپ دادا میں سے چلی آ رہی ہے۔ ہم پڑھے لکھے مہذب لوگ ہیں اور ہر اعتبار سے عرب مشرکین کے مقابلے میں برتر ہیں۔ اور خدا ہمیں چھوڑ کر ایک کم تر غیر قوم میں نبی پیدا نہیں کر سکتا اور خاتم الانبیا کی نبوت کی فضیلت بھی یہودی ہی کے حصے میں آئے گی۔ یہ وہ نسلی اور قومی عصبیت تھی جس نے انھیں تصدیقِ نبوت سے روک دیا۔ تاہم یہودیوں کے وہ علماء جو خدا ترس تھے انھوں نے اس نسلی اور قومی عصبیت کے چکّر میں پڑے بغیر فوراً محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی۔ انھی علماء میں علامہ حصین بن سلام ہیں۔ وہ مسلمان ہوئے تو ان کا نام تبدیل کر کے عبداللہ بن سلامؓ رکھا گیا۔ عبداللہ بن سلامؓ کا یہودی بڑا ادب واحترام کرتے تھے لیکن جب یہ مسلمان ہوئے تو یہودی ان کے بھی مخالف ہو گئے اور انھیں گالیاں دینے لگے۔

انکار نبوت کی دوسری وجہ یہ تھی کہ یہودی مدینہ کے عربوں پر حکومت کرتے تھے۔ یہ عرب دو قبیلوں اوس اور خزرج میں تقسیم تھے، ان کے درمیان قبائلی عداوت اور جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور آپس کی لڑائی سے یہ روز بروز کم زور ہوتے چلے جا رہے تھے اور یہودی انھیں لڑا کر خود طاقت ور بنتے چلے جا رہے تھے۔ مدینہ کے لوگوں یعنی اوس اور خزرج نے جب اسلام قبول کیا تو یہ متفق ومتحد ہو گئے اور ایک طاقت بن گئے۔ یہ بات یہودیوں کو بڑی ناگوار لگی۔ کیوں کہ یہ ان کے غلبہ اور حکومت کے عزائم کے خلاف تھی۔ اس لیے انھوں نے اسلام کو اپنے غلبہ اور حکومت کی راہ کا پتھر سمجھ کر اس کی

مخالفت شروع کر دی۔

یہودیوں کے لیے نبی کریم ﷺ سے اعراض اور انکار کی تیسری اہم وجہ یہ تھی کہ حضور اکرم ﷺ جہاں تورات کی تصدیق کرتے تھے وہاں انجیل کی بھی تصدیق کرتے تھے اور حضرت موسیٰ کے ساتھ حضرت عیسیٰ پر بھی ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے، جب کہ یہودی حضرت عیسیٰ کی نبوت کے نہ صرف منکر تھے بلکہ ان کے متعلق گستاخانہ خیالات رکھتے تھے۔ یہودیوں کو یہ دعوت کہ وہ حضرت عیسیٰ کو نبی مان لیں۔ اس کے معنی یہ تھے کہ یہودیوں کے بزرگوں نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا وہ گمراہی اور شرارت کا رویہ تھا۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کی دشمنی میں وہ محمد ﷺ کے بھی دشمن ہو گئے۔

مخالفت کی چوتھی وجہ یہودیوں کی نفسانیت اور بے جا دنیا پرستی تھی۔ وہ اپنی شریعت کے احکام کو نظر انداز کر کے لوگوں سے طرح طرح کے مالی فائدے حاصل کرتے تھے۔ سود خوری عام تھی اور نفس پرستی ان کا اصل مذہب بن گیا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ شریعت موسوی کی ٹھیک ٹھیک پابندی کریں اور گناہوں سے باز رہیں مگر ان کا نفس اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے وہ حیلے بہانے بنا کر محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا بھی انکار کرتے تھے۔ نفسانیت نے ان کے دلوں کو سخت کر دیا تھا۔ اس سے پہلے ان کے بزرگوں نے یسعیاہ نبی، ارمیاہ نبی، یحییٰ نبی کو قتل کر دیا تھا اور عیسیٰ مسیح کا (بزعم خود) قتل تو وہ اپنے کارنامے کے طور پر بیان کرتے تھے۔ اب خدا ایسے لوگوں میں جو نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں، نبی کیسے بھیجتا؟ ان کی سخت دلی اور نفسانیت نبوت کو کسی صورت قبول کرنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

البتہ یہودیوں میں جو نفس پرست نہیں، خدا پرست تھے، انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ لیکن عام یہودیوں کو اسلام اور مسلمانوں سے بغض و عناد اس حد تک تھا کہ وہ مسلمانوں سے سلام علیکم کی بجائے السام علیکم (تم پر ہلاکت ہو) کہا کرتے تھے۔ صحابہؓ نے حضور سے شکایت کی کہ یہودی ہمیں السام علیکم کہتے ہیں تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جھگڑا مت کرو صرف جواب میں وعلیکم کہہ دیا کرو۔

ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت آستانۂ نبوت میں حاضر ہوئی۔ انھوں نے حسب معمول حضور سے بھی السام علیکم کہا۔ یہ سن کرام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بہت غصہ آیا۔ انھوں نے غصہ میں یہودیوں سے کہا: "السَّامُ عَلَيْكُمْ وَ لَعَنَكُمُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْكُمْ" یعنی تم پر ہلاکت ہو اور اللہ کی لعنت ہو اور اللہ کا تم پر غضب ہو۔ یہ سن کر رسول خدا ﷺ نے فرمایا: اے عائشہ! تم پر رفق اور نرمی لازم ہے۔ سختی اور گالم گفتار کی باتوں سے بچتی رہو۔ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن حضور ﷺ کے اس طرز عمل سے بھی یہودیوں کے رویہ میں کوئی تبدیلی برانہیں ہوئی۔

ایک مرتبہ یہودیوں کے علماء اور سرداروں کے وفد نے آنحضرت ﷺ سے یہ کہا قوم میں جس قدر ہمارا وقار ہے، آپ ﷺ بھی اسے جانتے ہیں اگر ہم آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں تو تمام یہودی آپ ﷺ کے پیرو ہو جائیں گے۔ وہ لوگ ہماری مخالفت کر ہی نہیں سکتے۔ لیکن ہمارا اپنے ایک گروہ کے ساتھ تنازع ہے۔ دونوں حریف یہ مقدمہ آپ ﷺ کے پاس لائیں گے۔ اگر آپ ﷺ ہمارے حق میں فیصلہ کر دیں تو ہم آپ ﷺ پر ایمان لے آئیں گے۔ لیکن رسول اللہ نے یہ سودا منظور نہیں کیا۔ اسی موقع پر قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں:

''اور اے پیغمبر ہم نے تمھیں حکم دیا کہ جو کچھ خدا نے تم پر نازل کیا ہے۔ اس کے مطابق ان لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، ان کی طرف سے ہوشیار رہو کہیں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے، اس کے کسی حکم میں تمھیں ڈگمگا دیں۔''

اسی طرح تحویل قبلہ کے حکم پر یہودیوں نے یہ پیش کش کی کہ اگر آپ پہلے کی طرح مسجد اقصیٰ کو قبلہ بنا لیں تو پھر ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس سے انکار کیا۔ یہودیوں نے ایک ترکیب یہ سوچی کہ کسی طرح حضرت محمد ﷺ کو مدینہ سے باہر چلے جانے پر آمادہ کیا جائے۔ اس ترکیب کے تحت وہ آنحضرت ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ سابقہ پیغمبروں میں سے ہر ایک نے بیت المقدس کو اپنا مرکز بنایا ہے۔ اگر آپ نبی ہیں تو دوسرے انبیا کی روش پر چلیے۔ لیکن حضور ﷺ نے کہا کہ نہیں، مدینہ ہی میرا مرکز رہے گا اور یہودی بڑے مایوس ہو گئے۔

پھوٹ ڈالنے کی چالیں!

یہودیوں نے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور انھیں آپس میں لڑانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مدینہ کے لوگ اوس اور خزرج قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے درمیان پرانی عداوت تھی۔ اسلام نے اس عداوت کو مٹایا۔ یہودی چاہتے تھے کہ عداوت کی یہ آگ پھر بھڑک اٹھے۔ اس لیے ایک یہودی نوجوان کو جو ان دونوں قبیلوں میں اکثر جا کر بیٹھا کرتا تھا، یہ سکھایا گیا کہ کسی ایسے موقع پر جب کہ اوس اور خزرج کے بہت سے آدمی جمع ہوں، ان کی سابقہ جنگ وجدل کا قصہ چھیڑ دینا۔ چنانچہ اس نے ایک بڑے مجمع میں جا کر جنگ بعاث (جو پہلے ان میں ہو چکی تھی) کی رزمیہ نظمیں پڑھنا شروع کر دیں۔ مسلمان، یہودیوں کی یہ چال نہ سمجھ سکے اور گزشتہ واقعات کی یاد نے پرانے زخم ہرے کر دیے اور عداوت کی دبی ہوئی چنگاری دفعتہً سلگ اٹھی۔ وہ طعن و تشنیع سخت کلامی سے گزر کر مرنے مارنے پر مستعد ہو گئے۔ جب ہادیٔ اُمت ﷺ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بہ نفس نفیس اپنے جلیل القدر صحابہ کو لے کر موقع پر پہنچے اور فرمایا: ''مسلمانو! یہ کیا حرکت ہے؟ ابھی میں تم میں موجود ہوں اور تم لوگ عہد جاہلیت کی باتوں کو تازہ کر رہے ہو۔'' یہ سن کر سب شرمندہ ہوئے اور آپس میں بغل گیر ہوئے اور عہد کیا کہ آئندہ ان یہودی فتنہ پردازوں کے چکر میں نہیں آئیں گے۔ اس طرح یہودیوں کی مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی کوششیں ناکام رہیں۔

جان لینے کی کوشش

یہودیوں کی تاریخ قتل انبیا کے واقعات کی تاریخ رہی ہے۔ اس تاریخی پس منظر

کی موجودگی میں یہ بات باعثِ تعجب ہوتی' اگر وہ حضور ﷺ کی جان لینے کی کوشش نہ کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہود کی طرف سے آپ ﷺ کو ہر وقت جان کا کھٹکا لگا رہتا تھا۔ اسی بنا پر طلحہ بن براؓ صحابی نے اپنی بیماری میں وصیت کی تھی کہ اگر میں رات کے وقت رحلت کروں تو رسولِ خدا ﷺ کو اس کی خبر نہ کرنا۔ کیوں کہ یہود کی طرف سے فتنہ کا خوف ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میری وجہ سے حضور ﷺ پر کوئی حادثہ گزر جائے۔

یہودیوں نے ایک بار یہ منصوبہ بنایا کہ آپ ﷺ پر پتھر کی چٹان گرا دی جائے لیکن یہ منصوبہ ناکام رہا۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ کو ایک یہودی عورت کے ذریعے زہریلا گوشت کھانے کے لیے دیا گیا۔ اس وقت آپ ﷺ خیبر کی فتح کے بعد خیبر میں قیام فرما تھے اور خیبر کی ایک یہودی عورت نے بھنی ہوئی بکری کے شانے میں زہر ملایا اور آپ ﷺ کے پاس لے آئی اور اظہارِ نیاز مندی کر کے درخواست کی کہ اسے آپ تناول فرمائیں آپ ﷺ چوں کہ تالیفِ قلوب کے لیے غیر مسلموں کا ہدیہ بھی قبول کرتے تھے اس لیے یہودی عورت کی خوشنودی کی خاطر گوشت کھانا شروع کیا لیکن پہلا ہی لقمہ کھا کر آپ ﷺ نے محسوس کر لیا کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے۔ کچھ صحابیؓ بھی کھانے میں شریک تھے۔ آپ ﷺ نے سب سے فرمایا کہ ہاتھ روک لو کیوں کہ گوشت میں زہر ہے۔ اس کے بعد سب یہودیوں کو جمع کیا گیا اور انھوں نے اقرار کر لیا کہ ہم نے زہر دیا تھا اور یہ کہا کہ ہمارا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ (نعوذ باللہ) جھوٹے نبی ہیں تو ہمیں آپ ﷺ سے نجات مل جائے گی اور اگر سچے ہیں تو آپ ﷺ محفوظ رہیں گے۔ حضور اکرم ﷺ اس زہر سے محفوظ رہے لیکن دوسرے صحابی جنھوں نے مسموم گوشت کھایا تھا شہید ہو گئے۔ انھی میں ایک صحابی بشرؓ بن برا بھی تھے۔ ان کے ورثا نے آپ ﷺ کے حضور میں زہر دینے والی عورت کے خلاف استغاثہ دائر کیا۔ آپ ﷺ نے اپنے معاملے میں تو اس عورت کو معاف کر دیا لیکن مقدمہ میں انصاف ضروری تھا۔ اس لیے عورت کو موت کی سزا دی گئی۔

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کا بیان ہے کہ پیغمبر خدا ﷺ ہر سال اس زہریلے گوشت کے اثر سے علیل ہو جاتے تھے۔ آپ ﷺ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں اس زہر کا اثر ہمیشہ آپ ﷺ کے تالو اور مسوڑھوں میں دیکھا کرتا تھا اور آپ بسا اوقات اس تکلیف سے بیمار ہو جاتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے مرضِ موت میں اُمّ المومنین سے فرمایا: اے عائشہؓ میں ہمیشہ اس زہریلی غذا کی تکلیف محسوس کرتا رہا جو مجھے خیبر میں کھلائی گئی تھی۔ اور اب یہ وہ وقت ہے کہ اسی زہر کے اثر سے میری رگِ جاں کٹتی اور میرا انتقال ہوا چاہتا ہے۔" زہر خورانی کے اس واقعہ کے نتیجے کے طور پر حضور ﷺ نے خیبر کے یہودیوں سے کوئی بدلہ نہیں لیا' انھیں معاف کر دیا گیا۔ صرف زہر دینے والی عورت کو' چوں کہ اس پر مقدمہ تھا اور یہ مقدمہ حضور ﷺ کی ذات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا' سزائے موت دے دی گئی۔

لری کی شرارت

یہودیوں نے ایک جادوگر لبید بن اعصم کے ذریعے آپ ﷺ پر جادو کرایا۔ اس سے آپ ﷺ کو اور تو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ البتہ یہ اثر ظاہر ہوا کہ آپ ﷺ ناکردہ دنیوی کاموں کی نسبت خیال کرنے لگتے تھے کہ کر چکے ہیں۔ چالیس روز تک اس جادو کا اثر رہا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے صحت یابی کے لیے دعا کی۔ اور فرشتوں نے حضور ﷺ کو جادو کی ساری تفصیل بتائی۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ کو ایک کنویں پر بھیجا۔ اس کنویں میں سے رسول مقبول ﷺ کی موی تصویر برآمد ہوئی۔ اس میں سوئیاں چھدی ہوئی تھیں اور ایک دھاگا بندھا ہوا تھا۔ جس میں گیارہ گرہیں تھیں۔ حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ اسے لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سورۂ فلق اور سورۂ الناس نازل فرمائی۔ ان کی ہر آیت کے پڑھنے سے ایک ایک گرہ کھلتی گئی اور سوئیاں نکلنے لگیں اور آپ ﷺ کو صحت ہو گئی۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اس جادوگر کو سزا دی جائے۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: "مجھے شفا ہو گئی ہے اب بدلہ لینے کی ضرورت نہیں۔" مدینہ منورّہ اور اس کے گرد و نواح میں یہودیوں کے تین بڑے قبیلے آباد تھے۔ ایک بنونضیر دوسرا بنوقریظہ اور تیسرا بنوقینقاع! یہ تینوں قبیلے نہ صرف علم و ہنر اور جاہ و دولت میں ممتاز تھے۔ بلکہ اپنے علاقوں میں بڑے بڑے مضبوط قلعوں کے بھی مالک تھے۔ یہ سونے چاندی کے زیور بناتے اور بیچتے تھے۔ شراب بنانے اور اسے فروخت کرنے کا بھی کاروبار تھا۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں کو سود پر قرضہ بھی دیا کرتے تھے۔ اور سود در سود اس طرح وصول کرتے تھے کہ قرض داروں کی زمین جائداد اور عورتوں تک پر قبضہ کر لیتے تھے اور اس سود خوری سے وہ باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ کون خدا کو خوش دلی کے ساتھ قرض دیتا ہے تو فخاص یہودی نے یوں طنز کیا "کہ دیکھو (نعوذ باللہ) مسلمانوں کا خدا کیسا محتاج ہے کہ وہ ہم سے قرض مانگتا ہے اور ہمیں سود خوری سے منع کر رہا ہے مگر خود دو تین گنا زیادہ سود دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔" حضرت ابوبکرؓ اس یاوہ گوئی پر ضبط نہ کر سکے۔ یہودی کو ایک تپانچہ مارا اور کہا "اے دشمنِ خدا! اگر تم لوگوں سے معاہدہ نہ ہوتا تو میں تیری گردن اڑا دیتا۔"

یہودیوں اور مسلمانوں کا معاہدہ

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو مسلمانوں کی مشترکہ قوت کے مقابلے میں یہودی کم زور تھے۔ اس کے باوجود انھیں یہ پیش کش کی گئی کہ وہ مسلمانوں سے معاہدہ کر کے امن چین سے رہیں۔ یہ معاہدہ جو مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا۔ "صحیفہ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی 52 دفعات تھیں۔ اس معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ مسلمان اور یہودی آپس میں حلیف ہوں گے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے رہیں گے۔ مدینہ پر حملہ ہوگا تو سب مل کر مدافعت کریں گے۔ مذہبی باتوں کے علاوہ باقی امور میں مسلمان اور یہود ایک گروہ شمار ہوں گے۔ اور کوئی کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کر سکے گا۔ یہ معاہدہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مشترکہ مفاد کے مطابق تھا اور یہ پرامن بقائے باہمی کی ایک شان دار مثال تھی۔ لیکن یہودیوں کی نیت اچھی نہیں تھی اور جب رسول اللہ ﷺ بدر سے فتح یاب لوٹے تو یہودیوں کا حسد بڑھ گیا اور

انھوں نے معاہدہ شکنی شروع کردی۔ اس عہد شکنی میں پہل بنی قینقاع کے یہودیوں نے کی اور کھلم کھلا مدینہ میں بلوہ اور بغاوت کی تیاریاں کرنے لگے۔

یہودیوں سے پہلی جنگ

آنحضرت ﷺ کو جب اس عہد شکنی کی اطلاع ملی تو انھوں نے عہد شکنی کرنے والے یہودیوں کو بنی قینقاع کے بازار میں جمع کیا اور ان سے کہا: ''خدا سے ڈرو اور قریش کے حشر سے عبرت حاصل کرو۔'' اس پر ان یہودیوں نے کہا: ''اے محمد ﷺ! آپ کسی دھوکا میں نہ رہیں۔ آپ کی جنگ ان لوگوں سے ہوئی ہے جنھیں فنِ حرب سے واقفیت نہیں اس لیے آپ ﷺ کو جیتنے کا موقع مل گیا۔'' اسی دوران میں ایک مسلمان عورت بنی قینقاع کے بازار میں آئی اور ایک سنار کی دکان پر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے لیے زیور بنوا رہی تھی کہ ایک یہودی آیا اور پیچھے سے اس کی قمیص پیٹھ تک کھول دی۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ جب وہ کھڑی ہوئی تو اس کی بے پردگی ہوگئی اور سب یہودی اس پر ہنسنے لگے۔ ایک مسلمان سے یہ برداشت نہ ہوسکا۔ اس نے یہودی کو' جس نے یہ شرارت کی تھی قتل کردیا اور یہودیوں نے اس مسلمان کو شہید کردیا۔ اس کے بعد یہودیوں نے اپنے قلعوں کے اندر پناہ لے لی۔ آنحضرت ﷺ نے محاصرہ کیا۔ پندرہ دن میں ان قلعہ بند یہودیوں نے اس شرط پر ہتھیار رکھ دیے کہ انھیں مدینہ سے باہر نکل جانے کی اجازت دی جائے گی۔ یہ تعداد میں سات آٹھ سو تھے۔ یہ مدینہ سے شام چلے گئے اور ان کی دولت پر مسلمانوں نے قبضہ کرلیا۔

بنونضیر کی عہد شکنی

بنونضیر کے یہودیوں نے آنحضرت ﷺ سے معاہدہ کو بہ ظاہر برقرار رکھا لیکن اندر ہی اندر وہ مکہ کے مشرکین کو اکساتے رہے کہ وہ حملہ کریں۔ انھی میں ایک کعب بن اشرف تھا جو مقتدر سردار اور شاعر تھا۔ وہ مکہ پہنچ کر بدر کی شکست کے ماتم میں شریک ہوا اور اپنے پرجوش مرثیوں سے عرب مشرکین میں جذبۂ انتقام اور نفرت و عداوت کی آگ بھڑکائی۔ اور پھر مدینہ واپس آ کر ایسے اشعار کہنے لگا جن میں اسلام' مسلمانوں اور خاص طور پر مسلمان خواتین کی علانیہ توہین ہوتی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب قریش بدر کا انتقام لینے کی تیاریاں کر رہے تھے اور ہجوگو ابوعفک' شاعرہ عصما بنتِ مروان اور کعب بن اشرف کی شاعری جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھی۔ معاہدہ کے مطابق بنی نضیر کو چاہیے تھا کہ وہ کعب بن اشرف وغیرہ کو ان حرکات سے روکیں لیکن انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے اپنے آدمی بھیج کر ابوعفک' شاعرہ عصما بنت مروان' کعب بن اشرف اور اس کے ایک مددگار ابوحقیق یہودی کو قتل کروادیا۔ اب دو صورتیں تھیں۔ یا تو بنی نضیر اس پر متنبہ ہوکر قریش کے مشرکین سے ساز باز ترک کرتے یا علانیہ مسلمانوں سے لڑنے کے لیے تیار ہوجاتے لیکن بنونضیر نے ایک تیسرا راستہ اختیار کیا جو دھوکے اور فریب کا راستہ تھا۔ انھوں نے قتل کے ایک تنازع میں دیت کا مسئلہ طے کرنے کے لیے حضور اکرم ﷺ کو اپنے پاس آنے کی دعوت دی اور خفیہ طریقے پر منصوبہ یہ بنایا کہ جب آپ ﷺ آئیں تو آپ ﷺ کو قتل کردیا جائے۔ حضور اکرم ﷺ گئے تو انھیں ایک دیوار کے نیچے ٹھہرایا گیا اور طے شدہ پروگرام کے مطابق عمرو بن جحاش دیوار پر چڑھ گیا وہ آپ پر پتھر کی چٹان گرانے والا تھا کہ وحیٔ الٰہی نے رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے ارادہ کی اطلاع کردی اور آپ ﷺ فوراً اس جگہ سے ہٹ گئے۔ یہودیوں نے یہ دیکھا کہ ان کا منصوبہ ناکام رہا تو وہ لڑائی کے لیے قلعہ بند ہوگئے مگر بعد میں خوف زدہ ہوگئے اور اس شرط پر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوگئے کہ وہ اپنا مال و اسباب جو اونٹوں پر لاد سکیں لے کر اس جگہ سے چلے جائیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی درخواست کو مان لیا اور یہ یہودی خیبر چلے گئے۔

بنی قریظہ کی عہد شکنی

بنی نضیر کے یہودی اگرچہ مدینہ چھوڑ کر خیبر میں جا کر آباد ہوگئے تھے لیکن انتقام کے لیے بے چین تھے۔ ان کے سردار مکہ جا کر ابوسفیان سے ملے اور ان سے کہنے لگے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ آؤ سب مل کر اسلام کا خاتمہ کردیں۔ ان لوگوں نے مدینہ کے شمال مشرق اور دوسرے علاقوں میں آباد یہودیوں سے بھی رابطہ قائم کیا' انھیں اپنا مددگار بنایا۔ اس موقع پر بنی قریظہ کے یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان معاہدۂ صلح اور دوستی موجود تھا لیکن وہ اس معاہدہ کے باوجود مشرکین عرب کو مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اکساتے رہتے تھے۔ اس کے نتیجے میں جنگ خندق ہوئی۔ اور مکہ کے دس ہزار مشرکین نے مدینہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس محاصرہ کی حالت میں بنی قریظہ نے مشرکین کی مدد کی۔ رسول اللہ ﷺ کے قاصدوں نے جب بنوقریظہ کو یہ یاد دلانے کی کوشش کی کہ معاہدہ کی رو سے ہم ایک دوسرے کے دشمنوں کو مدد نہیں دے سکتے تو انھوں نے جواب دیا: ''ہم نہیں جانتے محمد ﷺ کون ہیں اور معاہدہ کیا ہے۔'' یہودیوں کا خیال تھا اب مسلمانوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو جب ان کے اس رویے کی اطلاع ہوئی تو فرمایا حسبنا اللہ و نعم الوکیل اور جب جنگ خندق میں مسلمان فتح یاب رہے اور لشکر اسلام خندق سے ہٹ کر شہر واپس آیا۔ اسی سہ پہر کو آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ مسلمان ابھی ہتھیار نہ رکھیں اور فوراً روانہ ہوکر نمازِ عصر بنوقریظہ کے قلعوں کے سامنے پڑھیں۔ بنوقریظہ مقابلہ کے لیے قلعہ بند ہوگئے پھر اس شرط پر ہتھیار رکھ دیے کہ سعدؓ بن معاذ کو منصف مقرر کیا جائے وہ جو فیصلہ کریں گے انھیں منظور ہوگا۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ سعدؓ بن معاذ اور ان کے قبیلے سے یہودیوں کی پرانی دوستی رہی ہے۔ اس لیے وہ رسول اللہ کے مقابلے میں بہت نرم فیصلہ دیں گے لیکن سعدؓ بن معاذ نے کہا کہ میں فیصلہ تورات کے مطابق دوں گا۔ اور تورات کا قانون یہ ہے کہ لڑنے والے فسادی قتل کیے جائیں۔ انھوں نے یہ فیصلہ دیا اور اس فیصلے کے مطابق چھے یا سات سو یہودی قتل کردیے گئے۔ ویسے بھی اب یہودیوں کی روز افزوں شرارت کے پیش نظر بے جا نرمی مسلمانوں کے لیے خطرہ کا باعث ہوسکتی تھی۔ اس لیے بنوقریظہ کے لڑنے والے قتل کردیے گئے۔ اگر بنوقریظہ کے یہودی رسول اللہ ﷺ کو منصف بناتے تو شاید ان کی جان بچ جاتی۔

فدک میں یہودیوں کا ایک قبیلہ آباد تھا اور یہ ان یہودیوں کو جو مدینہ سے نکل کر

خیبر میں آباد ہونے کے لیے جاتے تھے۔ مسلمانوں سے جنگ وجدل پر ابھارتا تھا اور اس کے لیے امداد کی پیش کش بھی کرتا تھا' مسلمانوں نے اسے بھی زیر کرلیا۔ خیبر پر بھی حملہ کیا جہاں یہودی جمع تھے اور مدینہ پر حملے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ خیبر میں یہودیوں کے سارے قلعے مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ رسول اللہ ﷺ کو زہر دینے کا واقعہ خیبر کی فتح کے بعد ہی پیش آیا۔ اہلِ خیبر نے اپنی شکست کے بعد آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ انھیں نصف پیداوار کے عوض کاشت کاری کی اجازت دی جائے اور اسلامی حکومت کو حق حاصل ہوگا کہ جب چاہے انھیں شہر بدر کردے اور آنحضرت ﷺ نے یہ درخواست منظور کرلی۔ خیبر کے بعد یہودیوں نے وادی القریٰ میں مسلمانوں کا مقابلہ کیا یہاں بھی انھیں شکست ہوئی۔ حضور اکرم ﷺ نے جنگ سے پہلے وادی القریٰ کے یہودیوں کو سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم تم سے لڑنے نہیں آئے ہیں بلکہ خیبر سے واپس ہوتے ہوئے یہاں ٹھہر گئے ہیں' ستا کر چلے جائیں گے لیکن یہودیوں نے ایک نہ سنی۔ وہ خیبر کی شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے مگر انھیں شکست ہوئی۔ اس شکست کے باوجود حضور اکرم ﷺ نے تمام قابل کاشت اراضی اور باغات بٹائی کے معاہدے کے تحت انھی کے قبضے میں دے دیے اور انھیں حسب سابق رہنے سہنے کی آزادی دے دی گئی۔

یہودی اچھے بھی تھے

یہودیوں نے عام طور پر بدعہدی کی اور اس کی انھیں سزا ملی۔ لیکن یہودیوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو ہمیشہ معاہدہ کے پابند رہے۔ انھی میں سے مخریق یہودی بھی تھا جو جنگ اُحد میں مسلمانوں کی طرف سے بڑی بہادری سے لڑا تھا اور قتل ہوگیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا "مخریق بہترین یہودی ہے۔" اور ایسے یہودیوں کو جنھوں نے معاہدوں کی پابندی کی' عزت واحترام کے ساتھ رکھا گیا۔ وہ آزادی سے اپنے مذہب پر قائم تھے اور ان میں سے بعض کو اسلامی حکومت کی طرف سے اہم خدمات بھی سپرد کی گئیں۔ ابتدا میں رسول اللہ ﷺ کا محرر ایک یہودی ہی تھا جو آنحضرت ﷺ کی جانب سے عبرانی اور سریانی زبانوں میں احکام کی خط وکتابت کرتا تھا۔ مگر بنونضیر کی جلاوطنی پر یہ محرر ان کے ساتھ چلا گیا اور پھر آنحضرت ﷺ نے زیدؓ بن ثابت کو عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا۔

قانونی حقوق

اور صرف اچھے یہودیوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ برے یہودیوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک ہوتا رہا۔ اسلامی حکومت میں ان کے قانونی حقوق پوری طرح محفوظ تھے۔ یہودی عام طور پر قرضے دیا کرتے تھے اور اسی قرضہ کی واپسی کے لیے حضور اکرم ﷺ کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا کرتے تھے جہاں ان کے حق میں فیصلہ ہوتا تھا۔ ایک بار ایک یہودی قرض خواہ نے ایک صحابی کے قرض کا معاملہ پیش کیا اور کہا کہ میں اپنا قرض ابھی لوں گا اور وہ اس قرض کے بدلے میں صحابی کا تہ بند لے گیا اور صحابی نے تہ بند کی جگہ عمامہ سر سے اُتار کر لپیٹا۔ حالانکہ یہودی پر سختی بھی کی جاسکتی تھی کہ وہ ابھی اپنا قرض نہ لے لیکن ان کے قانونی حقوق کے تحفظ کے مسئلہ کو اہمیت دی گئی۔ خیبر میں جہاں یہودی آباد تھے' حضرت عبداللہؓ بن رواحہ پیداوار کی بٹائی کے لیے تشریف لاتے اور اس انصاف سے معاملہ کرتے کہ ایک مرتبہ خیبر کے یہودیوں نے کہا: "خدا کی قسم! اسی عدل پر زمین وآسمان قائم ہیں۔"

مورّخ گرائٹز کا بیان

ایک یہودی مؤرخ گرائٹز نے یہود کی ایک مفصل تاریخ عہد حضرت ابراہیم سے 1870ء تک لکھی ہے یہ پانچ ضخیم جلدوں میں ہے اور 1892ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ وہ' یہود مدینہ کی حالت اور ان کا برتاؤ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ' جس طرح بیان کرتا ہے وہ اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

"622ء میں جب محمد ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو انھوں نے یہود کو ملا لینے کی کوشش کی اور اپنے اغراض اسی طور سے پیش کیے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ آپ ﷺ تمام عرب میں یہودیت پھیلانا چاہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے جب یہود کو یوم کفارہ پر روزہ رکھتے دیکھا تو یہ کہ کر کہ یہودیوں سے زیادہ ہم اس کے قائل ہیں' یوم عاشورہ مقرر کیا۔ باہمی حفاظت کے لیے آپ ﷺ نے قبائلِ یہود سے ایک معاہدہ کیا اور بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا۔ مسلمانوں اور یہودیوں کے مقدمات میں جو کسوٹی کے طور پر پیش آتے تھے' آپ ﷺ یہود کے ساتھ نرمی کرتے تھے۔ اس لیے مسلمان اپنے مقدمات سرداران یہود کے پاس لے جاتے تھے۔ کیوں کہ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ آپ ﷺ سے زیادہ ہمارے حق میں فیصلہ دیں گے۔ ایک عرصہ تک آپ ﷺ نے ایک یہودی کاتب رکھا۔ یہ باتیں ایک ایسے شخص کی جانب سے جس کی ذات سے آئندہ امیدیں وابستہ تھیں' یہود مدینہ کے لیے دل خوش کن تھیں۔ وہ یہ سمجھے کہ آپ ﷺ ایک حد تک یہودی ہوگئے ہیں اور اس لیے یہ اُمید ہوئی کہ آپ ﷺ کے ذریعے سے یہودیت عرب میں غالب ہو جائے گی۔ بعض یہودی آپ ﷺ پر ایمان لاکر زمرۂ انصار میں داخل ہوئے لیکن بہ استثنائے معدودے چند کوئی اور یہودی مدینے میں ایمان نہیں لایا۔ یہود اپنے پیغمبروں کی شان اس سے کہیں زیادہ ارفع واعلیٰ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ شخص اگر نبی ہے تو فلسطین میں کیوں پیدا نہیں ہوا۔ محمد ﷺ کے سربرآوردہ مخالفوں میں ایک یہودی فخاص ابن عازورہ اس بلا کا ستم ظریف تھا کہ کسی موقع پر نہ چوکتا تھا کہ آپ ﷺ کی ہنسی نہ اڑائے۔ دوسرا شخص مشہور ومعروف کعب بن اشرف تھا جس کا باپ عرب اور ماں یہودن تھی۔ ایک شاعر ابوعفک پیر صد سالہ تھا جس کی کوشش یہ تھی کہ جاہل عرب آپ ﷺ سے متنفر ہو جائیں۔ اسی طرح عبداللہ بن صوریا جو حجاز میں سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا تھا آپ ﷺ کے خلاف نفرت پھیلاتا تھا۔ آنحضرت محمد ﷺ نے جب بنی قینقاع کو دعوتِ السلام دی تو فخاص نے ایک مشہور تقریر میں یوں مضحکہ اُڑایا کہ محمد ﷺ کہتے ہیں کہ اللہ کو قرض حسنہ دو! کیا خدا ایسا فقیر ہوگیا ہے کہ ہم سے قرض کی بھیک مانگتا ہے۔ مخالفین یہود اس طور سے وحی اور آپ ﷺ کے اقوال کی تحقیر واستہزا کرتے تھے اور

یہ نہ جانتے تھے کہ یہ مہاجرِ مکّی جو مدینہ سے اعانت چاہنے آیا ہے ان کے قبائل کو ذلیل و تباہ کردے گا اور آیندہ ان کے لاکھوں ہم مذہبوں کی قسمت کا مالک بن جائے گا۔ انھیں اپنی بہادری اور قوت پر ناز تھا اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ سب سے زیادہ خطرناک دشمن وہ ہے جس کی کچھ پروانہ کی جائے۔ بے شک ابتدا میں محمد ﷺ نے اس تحقیر کو فراخ دلی حوصلگی سے برداشت کیا اور آپ ﷺ نے اپنے متبعین کو یوں سمجھایا کہ: ''اور مت جھگڑا کرو اہل کتاب سے مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔'' یہود نے مسلمانوں کے بہکانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا۔ یہاں تک کہ سردارِ مدینہ عبداللہ بن اُبی کا دل آپ ﷺ کی طرف سے ایسا پھیر دیا کہ مرتے دم تک وہ دشمن ہی رہا۔''

مذکورہ بالا تحریر ایک متعصب یہودی کی ہے لیکن اس سے یہودِ عرب کے کیرکٹر کا اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے کہ انھوں نے حضور اکرم ﷺ کی نرمی کے باوجود کیسی کیسی شرارتیں کیں۔

یہودیوں کی ایک بڑی شرارت یہ تھی کہ وہ موحد اور خدا پرست ہونے کے باوجود مشرکین کے ساتھی بن گئے۔ حالانکہ توحید اور خدا پرستی کے نقطہ نظر سے انھیں مشرکین کے بجائے محمد ﷺ کا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ کیوں کہ یہودیوں سے زیادہ یہ بات اور کون سمجھ سکتا ہے کہ مشرکین عرب کی بت پرستی غلط چیز ہے اور قریش آنحضرت ﷺ کے دشمن اسی لیے ہوئے تھے کہ وہ انھیں بت پرستی سے منع کرتے تھے۔ ایک بار خود قریش مکہ نے یہودیوں سے پوچھا کہ تم اہل کتاب ہو ہم سے زیادہ معلومات رکھتے ہو۔ یہ بتاؤ کہ ہم مشرک بت پرستوں کا دین اچھا ہے یا محمد ﷺ کا دین؟ تو یہودی علما اور راہ نُماؤں نے انھیں یہ جواب دیا کہ صاحبو! آپ کا دین اسلام سے بہتر ہے اور ان کے مقابلے میں آپ لوگ حق پر ہیں۔ یہودیوں کے اس کتمانِ حق پر قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی۔

''اے پیغمبر! کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر نظر نہیں کی جنھیں کتاب آسمانی سے حصہ دیا گیا اور وہ لگے بتوں کا اور شیطانوں کا کلمہ بھرنے اور مشرکین کی نسبت کہنے لگے کہ یہی لوگ زیادہ حق پر ہیں۔''

یہودیوں کا یہ طرزِ عمل ایسا تھا کہ بعد میں خود یہودی دانش وروں نے اس کی مذمت کی ہے۔ ڈاکٹر اسرائیل ولفسوں اپنی کتاب ''تاریخ الیہود فی العرب'' میں لکھتے ہیں:

''یہود نے کیسا ستم ڈھایا جو قریش کے سامنے بُت پرستی کو توحید اسلامی کے مقابلے میں بہتر قرار دیا! انھیں یہی خطرہ تو تھا کہ اگر قریش کے سامنے منہ دیکھی بات نہ کہی تو وہ ان کی تحریک پر اہلِ اسلام کے ساتھ جنگ کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ مگر وہ بھول گئے کہ خود ان کے مورثِ اعلیٰ یعنی بنی اسرائیل نے بت پرستی کے خلاف کس طرح قوموں سے جنگیں جاری رکھیں۔ اور توحید پھیلانے کے جرم میں ان کے پیش رووں میں سے کتنے حضرات نے جام شہادت نوش فرمایا اور ان میں سے کتنے حضرات صرف خدائے واحد پر ایمان لانے کی پاداش میں زخمی ہوئے! یہود کو چاہیے تھا کہ بت پرستوں کو سرنگوں کرنے کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کردیتے اور جس قدر مال و دولت ان کے قبضے میں تھا اس راہ میں لٹا دینا اپنا فرض سمجھتے، نہ یہ کہ انھوں نے بت پرستوں کے سامنے ان کے عقیدہ کو سراہا۔ یہ تو اپنے عقیدہ کے خلاف جنگ کرنا تھا اور تورات کی اس تعلیم کے منافی تھا جس میں بت پرستوں سے جنگ کرنے کا حکم موجود ہے۔'' (عبدالکریم عابد)

آنحضور ﷺ اور عیسائی

ولادت نبوی سے ایک سو سال پہلے نجران میں نصرانیوں کی ایک خود مختار حکومت تھی، اور یمن (حمیر) میں یہودیوں کی ایک مضبوط سلطنت تھی جس کا فرماں رواذونواس تھا۔ یہ بزنطینی عیسائیوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ روم اور مصر پر بزنطینی شہنشاہ حکمران تھا۔ یہودیت کو ہر جگہ سے پسپا ہونا پڑا تھا اور وہ یمن میں محصور ہوکر رہ گئی تھی۔ ذونواس طاقت ور بادشاہ تھا اس لیے یمن اب تک عیسائیوں کی عمل داری سے باہر ہی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ حبشہ پر حملہ کرکے قبضہ کرلے مگر اس سے پہلے ضروری تھا کہ نجران کی طاقت توڑ دی جائے تاکہ عقب سے کوئی خطرہ نہ رہے۔ چنانچہ اس نے نجران پر حملہ کردیا۔ ان کی عبادت گاہیں جلا دیں۔ بڑے بڑے گڑھے کھودے اور ان میں آگ جلا کر عیسائیوں کی بڑی تعداد زندہ جلا دی گئی۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن پاک میں اصحابِ خدود کے نام سے آیا ہے۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے تاریخی پس منظر کا مطالعہ کرلیا جائے۔ یمن، حبش اور نجران پر زمانہ قدیم میں سَبا کی سلطنت قائم تھی۔ سَبا کے لوگ ستارہ پرست تھے اور سورج دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔ 950ق۔م میں اسی سلطنت کی ایک ملکہ، جس کا نام روایات میں بلقیس ہے اور جسے اہلِ حبش ماکدہ کہتے تھے، حضرت سلیمانؑ کے دربار میں حاضر ہوئی اور دینِ حق قبول کرلیا۔ اس وقت سے سلطنت سَبا میں دین موسوی کی اشاعت ہوئی مگر اقتدار کبھی ستارہ پرست خاندانوں میں اور کبھی یہودی قبائل کے ہاتھوں منتقل ہوتا رہا۔

سبا کے حکمرانوں کا پہلا دور 1200ق۔م سے 550ق۔م تک ہے۔ اس دور کے پہلے بادشاہوں کا لقب 'مکارِبِ سبا'' تھا۔ ان کے بعد وہ ''ملوک سبا'' کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا دارالحکومت مآرب مشرقی یمن میں واقع تھا۔ ان کی مدت حکمرانی زیادہ سے زیادہ 450 سال تک ہے۔ سبا کے لوگ تاجر پیشہ تھے اور خشکی کے راستے مصر، حبش اور یمن سے شام و عراق تک ان کے کارواں جاتے تھے۔ ۵۵۰ق۔م سے 115ق۔م تک 435 برس ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے سترہ حکمرانوں کے نام تاریخ میں ملتے ہیں۔ ان کے لقب ''ذو'' اور ''قیل'' تھے جنکی جمع ''اذوا'' اور ''اقیال'' ہے۔

سبا کے مقبوضات میں حبش، یمن اور شمالی عرب شامل تھے۔ ۱۱۵ق۔م میں یہ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ حبش پر اکسومی خاندان قابض ہوگیا جس کے بادشاہ نجاشی کہلائے۔ شمالی عرب میں اسماعیلی عرب خود مختار بن گئے۔ یمن میں شاہان سبا کے سلسلے

کا ایک خاندان ''حمیر'' حکمران ہوا' جو مغربی یمن میں رہتا تھا۔ اسی زمانے میں بحری تجارت کا آغاز ہوا۔ یہی بحری تجارت تھی جس نے سبا کی سلطنت کو ختم کر دیا۔ اور حمیر جو بحر احمر اور بحر عرب کے ساحلوں کے قریب آباد تھے' غالب آ گئے۔ ان حمیری حکمرانوں کا لقب ذو (اذوا) تھا۔ شاہان حمیر کا زمانہ پہلی صدی ق۔م کے وسط سے شروع ہوتا ہے اور اس کے آخری بادشاہ ذو نواس کی موت پر 525ء میں ختم ہوتا ہے۔

شاہانِ حمیر میں سے تبان ابوسعد ابوکرب نے یہودی مذہب قبول کر لیا تھا۔ ان دنوں حبش اور یمن میں یہودیت اور نصرانیت میں شدید مسابقت تھی۔ حبش کے اکسومی خاندان نے حمیر کی ضد میں عیسائیت کو قبول کر لیا۔ اس وقت رومن سلطنت روم' شام اور مصر پر قابض تھی۔ یمن کے پہلو میں نجران کی چھوٹی ریاست تھی۔ جہاں کی ساری آبادی مسیحی تھی۔ نجران کے عقیدے اور رومی عیسائیوں کے عقیدے میں فرق تھا۔ رومی حقیقی معنوں میں مسیحؑ کے عقیدے کے پیرو اور سچے مسیحی نہیں تھے بلکہ وہ مسیحؑ کے جھوٹے جانشین پال کی عیسائیت کو ماننے والے تھے۔ ان کے برعکس نجران کے مسیحی پال کی بدعتوں کو نہیں مانتے تھے بلکہ وہ مسیح کے سچے حواریوں' خاص طور سے حواری برناباس کے مسلک کے پیرو تھے۔ اسی لیے وہ مسیحؑ کو خدا یا ابنِ اللہ نہیں مانتے تھے بلکہ بندۂ خدا اور رسولِ خدا مانتے تھے۔ اور صحیح معنوں میں موحد تھے۔ ان کی تبلیغی کوششوں سے دین حق یمن میں پھیلتا جا رہا تھا اور یہی بات ذو نواس کے اشتعال کا باعث بنی جو سخت متعصب یہودی تھا۔ نجران کے انھی موحد مسیحیوں پر ذو نواس نے حملہ کر کے انھیں آگ کے گڑھوں میں گرا دیا تھا اور شہر نجران کی کثیر آبادی ہلاک ہوگئی تھی۔ قرآن میں ان کا ذکر اس طرح آیا ہے:

﴿قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ۝ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ۝ وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ۝ وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ۝﴾ (البروج: 4تا8)

''مارے گئے گڑھے والے' جس میں خوب بھڑکتے ہوئے ایندھن کی آگ تھی جب کہ وہ اس (گڑھے کے کنارے) پر بیٹھے ہوئے تھے اور جو کچھ ایمان لانے والوں کے ساتھ کر رہے تھے' اسے دیکھ رہے تھے۔ اور ان اہلِ ایمان سے ان کی دشمنی اس کے سوا کسی وجہ سے نہ تھی کہ وہ اس خدا پر ایمان لے آئے تھے جو زبردست اور اپنی ذات میں محمود ہے۔''

''اصحب اخدود' ذو نواس کے یہودی لشکر کو کہا گیا ہے اور ان کی ہلاکت کی وعید سنائی ہے۔ اس دردناک واقعہ کا وبال جلد ہی ان پر پڑا۔ کہتے ہیں کہ شہر نجران کی ساری آبادی جل کر راکھ ہوگئی تھی صرف ایک شخص جلی ہوئی انجیل کا نسخہ (جو غالباً برناباس کی انجیل تھی) لے کر نکل بھاگا اور حبشہ پہنچا' اور نجران میں یہودیوں کے مظالم کی داستان سنائی جس سے ساری عیسائی دنیا میں تہلکہ برپا ہوگیا۔ یہ شخص انجیل کا جو نسخہ لایا تھا وہ اکسومی بادشاہوں کے محل میں رہا اور غالباً اسی انجیل کے مطالعہ نے حضور اکرم ﷺ کے ہم عصر نجاشی کو در پردہ رومن عقیدے سے منحرف کر دیا تھا اور وہ دل ہی دل میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ابن اللہ ہونے کے برخلاف ان کے بندۂ خدا اور رسول ہونے کا قائل تھا۔ چنانچہ جب مسلمانوں کے نمائندہ حضرت جعفرؓ نے اس کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کی آیات پڑھیں تو اس نے بے اختیار تصدیق کی کہ خدا کی قسم مسیحؑ اس سے ذرّہ برابر زیادہ نہیں تھے۔ قیصر روم جسٹینین نے حبشہ کے اکسومی بادشاہ کالب الاصبح کے پاس جنگی جہاز اور فوج بھیجی تاکہ وہ یمن پر حملہ کر کے یہودی حکومت کا خاتمہ کر دے۔ ادھر ذو نواس نجران کو تباہ و برباد کر کے جب یمن پہنچا تو حیران رہ گیا۔ کیوں کہ ساحلِ یمن پر حبشیوں اور رومیوں کی متحدہ فوج اُتر چکی تھی اور فاتحانہ پیش قدمی کر رہی تھی۔ ذو نواس نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا اور شکست کھا کر بھاگا۔ کہتے ہیں کہ وہ جان بچا کر دریا میں کود گیا اور پھر ایک ہیکل میں جا چھپا۔ مگر موت بھی اس کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی۔ ہیکل میں سجدہ کر کے وہ اٹھ رہا تھا کہ اس کے لبادے کا دامن ایک چراغ پر جا پڑا اور چراغ اس پر الٹ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے لباس نے آگ پکڑ لی اور وہ اسی آگ میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ یہ نجران کی آگ تھی جو اس کا پیچھا کر رہی تھی اور جس نے اسے کیفر کردار تک پہنچا کر چھوڑا۔ ذو نواس کی موت پر ۵۲۵ء میں یمن کی حمیری سلطنت کے شاہان تبع کا دور ختم ہو جاتا ہے۔

رومیوں نے یمن کے خلاف فوج کشی میں حبشیوں کو اس شرط پر مدد دی تھی کہ اس کے عوض حبش کے حکمرانوں کی طرح اکسوم کے تمام باشندے عیسائی مذہب قبول کر لیں۔ چنانچہ اکسوم کے شہریوں کی اکثریت نے عیسائیت کے رومی عقیدے کو اپنا لیا۔ عہد اوّل کے پیروان مسیحؑ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انسان ہونے اور رسول ہونے کے قائل تھے' جیسا کہ پطرس حواری نے عید ''فسح'' کے موقع پر مسیحؑ کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:

''ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا۔''

مسیح کو ابن اللہ بنانے والا پہلا شخص ساؤل نامی ایک یہودی فریسی تھا' جو حواریوں کو بہت ایذا دیتا تھا۔ رفع عیسیٰؑ کے بعد اچانک اس شخص نے اعلان کیا کہ اس نے مسیحؑ کا نور دیکھ لیا ہے۔ پھر وہ مسیحؑ کا مبلغ بن کر حواریوں میں شامل ہوگیا۔ اپنا نام بدل کر پولس رکھا' جو سینٹ پال کے نام سے مشہور ہے۔ یہی شخص ''عیسائیت'' نامی مذہب کا بانی ہے جو یسوع مسیحؑ کے دین حق سے بالکل ہی جداگانہ عقائد کا مجموعہ ہے۔ سب سے پہلے سینٹ پال نے اعلان کیا کہ واقعۂ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ ابن اللہ کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا۔ پال ہی نے مسیحؑ کے لیے ''خداوند خدا یسوع مسیح'' کا خطاب پہلی بار اس کی الوہیت کے اظہار کی نیت سے استعمال کیا۔

اس سے پہلے ابن اللہ کا عقیدہ یہودیوں کے ہاں ملتا ہے۔ ان کے ایک فرقے نے عزرا کا ہن کو' خدا کا بیٹا' بنایا تھا' جس کا ذکر قرآن میں سورۂ توبہ میں ہے۔:

﴿وَ قَالَتِ الۡيَهُوۡدُ عُزَيۡرُ ۨابۡنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الۡمَسِيۡحُ ابۡنُ اللّٰهِ﴾ (التوبہ: 30)

''یہودی کہتے ہیں عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں مسیحؑ اللہ کا بیٹا ہے۔''

پال یہودی عالم تھا چنانچہ وہ عزیر کو ابن اللہ بنانے کی روایت سے واقف تھا اور مسیحؑ کو ابن اللہ بنانے کی جانب اس کا ذہن آسانی سے منتقل ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں یہ بات قرائن کے قریب ہے کہ جب یہودیوں نے دیکھا کہ مسیحؑ کا دین پھیلتا جا رہا ہے، پھر انھیں اس بات سے بھی تشویش ہوئی کہ حکمران مشرک رومیوں میں بھی اس دین کی طرف میلان پیدا ہو رہا ہے تو وہ بہت مایوس ہوئے۔ مگر ان کے چالاک ذہن نے یہ راہ نکال لی کہ اگر دینِ مسیحؑ کو پھلنے پھولنے سے روکا نہ جا سکے تو اسے بھی اسی طرح مسخ کر دیا جائے جس طرح انھوں نے خود اپنے دینِ موسویؑ کو مسخ کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے چالاک عالم ساؤل کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ حواریوں میں شامل ہو کر دینِ مسیحؑ کے عقائد کو تبدیل کر دے۔ چنانچہ پال نے ابن اللہ کے عقیدے سے مسیحؑ کی تعلیمات میں وہ الجھنیں پیدا کیں کہ اب تک حل نہیں ہو سکیں۔ (1) مسیحؑ خدا ہے۔ (2) مسیحؑ کی ذات میں خدا اور انسان اور کلام جمع ہیں۔ (3) مسیح باپ بیٹے اور روح القدس سے مرکب ہے۔ (4) خدائی میں مسیحؑ اور مریمؑ یعنی بیٹا اور ماں بھی باپ کے شریک ہیں۔ یہ اور اس طرح کی بحثیں شروع ہو گئیں۔ ''ایک میں تین'' اور ''تین میں ایک'' کا معما حل تو نہیں ہوا البتہ اس کی مختلف تعبیروں پر مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔ یہودیوں کی سازش کامیاب ہو گئی۔ ایک طرف تو انھوں نے مسیح علیہ السلام کے دین کو یکسر تبدیل کر دیا۔ دوسری طرف عیسائیوں کو فرقوں میں بانٹ دیا، جن کے درمیان عرصہ دراز تک مناظرے مجادلے اور خوں ریز فسادات ہوتے رہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون ''مسیحیت'' میں ریورنڈ جارج ولیم ناکس نے مسیحی کلیسا کے بنیادی عقیدے پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

عقیدۂ تثلیث کا فکری سانچا یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات بائبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفہ میں۔'' (باب 14)

واضح رہے کہ تین خداؤں کی وحدت کا مشرکانہ تصور رومی اور یونانی دیومالا میں ملتا ہے۔

تیسری صدی عیسوی تک بکثرت ایسے عیسائی موجود تھے جو مسیحؑ کی الوہیت کے قائل نہیں تھے۔ اگرچہ تازہ فکر پرجوش مبلغوں کا ایک گروہ یہ استدلال کر رہا تھا کہ جب مسیحؑ کلام الٰہی کا جسدی ظہور ہے تو وہ بلحاظ اپنی طبیعت کے الوہیت میں شامل ہے۔ اس مسئلہ پر مسیحی کلیسا میں کافی عرصہ تک بڑے ہنگامہ خیز مباحثے اور مجادلے ہوئے۔ یہاں تک کہ 325ء میں ''نیقیا'' کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ اصل مسیحی عقیدہ قرار دے دیا۔ بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح کی الوہیت بھی تسلیم کی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمے اور رائج الوقت شعائر میں باپ اور بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس عقیدۂ تثلیث کو جن مخصوص اصطلاحوں میں مرتب کیا گیا وہ غیر محسوس طور پر اثر انداز ہونے والے یہودی ذہن کی غمازی کر رہی ہیں۔ غرض ان مختلف تعبیروں پر نسطوری، یعقوبی، ملکانی، پولسی اور دیگر فرقے روم، شام، مصر اور حبش میں پیدا ہو گئے تھے۔

ایک روایت کے مطابق حبشہ کے نجاشی نے نجران کے فریادی کو اور جلی ہوئی انجیل کو بازنطینی شہنشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ قیصر روم نے ذونواس سے بدلہ لینے کے لیے جنگی کشتیوں کا ایک بیڑا روانہ کیا۔ نجاشی نے بھی بہت سی کشتیاں تیار کیں اور ستر ہزار کا لشکر یمن پر حملہ کے لیے بھیجا۔ یونانی روایت کے مطابق لشکر کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی۔ ذونواس کو مقابلے کی تاب نہیں تھی۔ اس لیے صلح کی پیش کش کی اور جب گفتگو کے لیے حبشی لشکر کے سپہ سالار اس کے پاس پہنچے تو اس نے دھوکا سے انھیں قتل کرا دیا اور حبشیوں پر اچانک حملہ کر کے اس لشکر کو پسپا کر دیا۔ نجاشی نے دوبارہ ستر ہزار کے لشکر سے یمن پر زبردست حملہ کیا اور ذونواس کو شکست دے کر بھگا دیا۔

یمن پر حملہ آور حبشی فوج کا سردار ریاط تھا۔ اس نے یمن میں عیسائی معابد کی حفاظت کی، یہودیوں کو قتل کرایا اور نجران میں عیسائیوں کی ازسرِنو آبادکاری کا انتظام کیا۔ اسی دوران میں حبشی فوج میں اختلافات پیدا ہو گئے اور فوج کے ایک حصے نے بغاوت کر دی۔ باغیوں کا سردار ابرہہ تھا۔ اس شورش میں اریاط مارا گیا اور ابرہہ تنہا یمن کا حاکم بن گیا۔ اریاط نے بیس سال حکومت کی تھی۔ اس عرصے میں وہ نجاشی شاہ حبش کا وفادار اور نمائندہ رہا۔ ابرہہ 543ء میں یمن کا حاکم بنا۔

ابرہہ کو یونانی مؤرخ ابرامس اور سریانی مؤرخین ابراہام لکھتے ہیں جس کا حبشی تلفظ ابرہہ ہے۔ یہ شخص چوں کہ ناک کٹا تھا اس لیے ''اشرم'' کہلاتا تھا۔ ابرہہ بازنطینی کلیسا کا معتقد اور نہایت متعصب عیسائی تھا۔ اس نے بڑے بڑے شہروں میں کنیسے تعمیر کرائے۔ سب سے بڑا کنیسہ اپنے دارالحکومت صنعا میں تعمیر کیا۔ جسے عرب ''القلیس'' کہتے ہیں۔ اس کے زیر اثر نجران میں موحد مسیحیوں کا قلع قمع ہو گیا اور نجران میں بھی رومن کیتھولک کلیسا قائم ہوا۔

ابرہہ نے حکم جاری کیا کہ لوگ کعبے کے بجائے اس کے تعمیر کردہ معبد میں حج کے لیے آئیں۔ اس اعلان پر مشتعل ہو کر کسی عرب نوجوان نے رات کو چھپ کر اس کلیسا کو نجس کر دیا۔ اس بے حرمتی پر ابرہہ غضب ناک ہو گیا اور کعبے کو ڈھانے کے ارادے سے عرب پر فوج کشی کر دی۔ اس کی فوج میں ساٹھ ہزار سپاہی اور تیرہ یا نو ہاتھی تھے۔ راستے میں یمن کے سردار ذونفر نے مقابلہ کیا مگر ناکام رہا۔ خثعم کے علاقے میں عرب سردار نفیل بن حبیب نے راستہ روکا، مگر وہ بھی مارا گیا۔ ابرہہ کی فوج طائف پہنچ گئی۔ طائف کے قبیلہ بنو ثقیف نے اس خوف سے کہ وہ ان کے بت لات کو نقصان نہ پہنچائے اس کی اطاعت کی اور ایک شخص ابورغال کو بدرقہ کے طور پر اس کے ساتھ کر دیا۔ ابورغال نے ابرہہ کے لشکر کو مکہ کا راستہ دکھایا۔ مگر مکہ سے نو دس میل کے فاصلہ پر المغمس کے مقام پر وہ مر گیا۔ بعد میں عرب اس کی قبر پر سنگ باری کرتے تھے اور طائف والوں کو اس بے غیرتی پر طعنے دیتے تھے۔

ابرہہ کا لشکر عرفات اور طائف کے درمیان حدودِ حرم کے قریب ٹھہر گیا۔ اس وقت حضور اکرم ﷺ کے دادا عبدالمطلب مکہ کے سردار تھے۔ وہ قریش کو لے کر

پہاڑیوں پر چڑھ گئے اور کعبہ کو ربّ کعبہ کی حفاظت پر چھوڑ دیا۔ ابرہہ کا لشکر جب کعبہ کو ڈھانے کے لیے شہر کی طرف روانہ ہونے لگا تو اچانک آسمان پر پرندوں کے جھنڈ نمودار ہوئے۔ ان کی چونچوں اور پنجوں میں کنکریاں تھیں۔ یہ کنکریاں ابرہہ کے لشکر پر برسنے لگیں۔ ان آسمانی مار سے ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں سمیت کھائے ہوئے بھوسے کی طرح تباہ و برباد ہوگیا۔ اس واقعے کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ الفیل میں ہے۔ یہ واقعہ 570ء یا 571ء کا ہے۔ اسی سال مکہ میں حضور اکرم ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ابرہہ بھی کنکریوں سے زخمی ہوکر بھاگا مگر بلاد خثعم میں پہنچ کر مر گیا۔ اس کا جسم بھی گل سڑ کر بھوسے کی طرح اڑ گیا۔

ابرہہ کی موت اور اس کے لشکر کی تباہی کے بعد یمن میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ حبشیوں اور رومیوں سے چھٹکارا پانے کے لیے اہلِ یمن نے ایران کے شہنشاہ سے مدد طلب کی اور ایرانی لشکر نے یمن پر حملہ کر کے قبضہ کرلیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ایرانیوں کے مقابلے میں رومیوں کو شام اور عراق میں شکست ہوچکی تھی۔ اور ان کی فوجیں مصر میں داخل ہوگئی تھیں۔ یمن میں حالات کی تبدیلی کا نجران پر کوئی اثر نہ پڑا۔ وہاں پال کے بدعتی مسلک کے حامل عیسائی کلیسا کا اقتدار مستحکم ہوگیا۔ مگر نجران میں شخصی بادشاہت قائم نہ ہوسکی اور ایک قسم کی مذہبی جمہوریت قائم ہوگئی جس میں تین عہدیدار تمام معاملات کے ذمہ دار تھے۔ ایک عاقب، جو امیر قوم کا رتبہ رکھتا تھا، ہر کام اس کے حکم اور مشورے سے ہوتا تھا، دوسرا اسید تھا جو جماعتی تنظیم کا ناظم اور سفر و کوچ کے انتظامات کا ذمے دار تھا، تیسرا اسقف، جو ان کے مذہب کا عالم، کلیسا کا امام اور مذہبی پیشوا ہوتا تھا۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ آتش زدگی کے سانحہ سے پہلے اہلِ نجران حضرت مسیح کے اس پیغام پر عامل تھے جو حواری برناباس کی انجیل میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ مگر اس دوسرے دور میں سینٹ پال کی فقہ اور مسلک سرکاری مذہب بن گیا جو رومن کیتھولک کلیسا کا عقیدہ ہے۔ اس تبدیلی سے توحید الٰہ کے بجائے تثلیث اور مسیح کی الوہیت اور مسیح و مریم کی پرستش اور کفارہ کے مشرکانہ عقائد کو فروغ ہوا۔ تاہم رومن کلیسا کے اقتدار کے باوجود لوگوں کے ذہن میں برناباس کی تعلیمات کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں باقی رہے اور ایک بڑا گروہ اس مسلک کا قائل بھی رہا۔ یہاں تک کہ مکہ میں خاتم النبیین حضور اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی اور دینِ حق کا چرچا ہر طرف ہونے لگا۔

نجران میں مسیحی علوم کی ایک بڑی درس گاہ تھی۔ جس کے علما مسیح و مریم کی بت پرستی کے مخالف تھے۔ مگر یہ اقلیت میں تھے اور کم زور تھے۔ مشرک عیسائیوں کا گروہ، جو مسیح و مریم کے بتوں کی پرستش کرتا تھا، نجران کی حکومت پر قابض تھا۔ دونوں طرف کے اہلِ علم میں اس مسئلہ پر مباحثے اور مناظرے ہوتے رہتے تھے۔ انھی دنوں میں نجران میں متواتر یہ خبریں پہنچیں کہ مکہ میں ایک شخص نے رسالت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ توحید کی دعوت دیتا ہے اور مسیح علیہ السلام کی رسالت کی بھی تصدیق کرتا ہے۔ اس خبر کو قدرتی طور پر نجران کی مسیحی درس گاہ کے علما نے زیادہ دلچسپی سے سنا۔ پھر انھوں نے بیس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد کو تحقیق کے لیے مکہ بھیجا۔ انھوں نے قدیم صحیفوں میں سے وہ پیش گوئیاں جمع کر لیں جن میں آخری رسول کی بشارت اور نشانیاں درج تھیں۔ خاص طور پر انجیل کے وہ اجزا جن میں رسولِ موعود کا نام بھی صراحتاً موجود تھا۔ حج کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ جب یہ وفد مکہ پہنچا، اتفاق سے اس وقت لوگوں کے ایک مجمع میں رسول اللہ دعوتِ توحید دے رہے تھے۔ وفد کے لوگوں نے آپ ﷺ کی باتیں سنیں تو سمجھ گئے کہ یہی وہ رسول ہیں، جن کی خبر انھیں ملی تھی۔ آپ ﷺ کی باتیں ان کے دل کو لگیں۔ کیوں کہ وہ خود بھی اپنی قوم کے بت پرستوں سے یہی کچھ کہتے تھے۔ جب انھوں نے رسول اللہ سے ملاقات کی اور ان علامتوں کی جستجو کی جو اگلے نبیوں نے بیان کی تھیں، تو انھیں یقین آ گیا کہ رسولِ موعود یہی ہیں۔ پھر انھوں نے کھلے دل سے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی۔

مشرکینِ مکہ نے نجران کے اس وفد کو حضور ﷺ کے بارے میں بہت بہکایا۔ انھیں توقع تھی کہ عیسائی محمد ﷺ سے ملنے کے بعد ضرور انھیں جھٹلائیں گے اور مکہ والوں پر اس کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ مگر ان کی توقع کے برخلاف جب عیسائیوں نے حضور ﷺ کے رسولِ برحق ہونے کی تصدیق کی تو قریش سخت مایوس ہوئے۔ ابوجہل غیظ و غضب سے لرزنے لگا اور نجرانیوں سے مخاطب ہوکر بولا:

''خدا تمھیں بے نصیب رکھے، تم بھی بہکاوے میں آ گئے اور اس کی تصدیق کرنے لگے! میں نے تم جیسے نادان آدمی نہیں دیکھے!''

نجرانیوں نے جواب دیا:

''ہم یہاں کسی سے جھگڑنے نہیں آئے۔ ہم نے جو کچھ سچ پایا اس کی شہادت دے دی۔ تم مانو نہ مانو ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔''

ابنِ اسحاق کہتے ہیں کہ یہ وفد حبشہ کے نصرانیوں کا تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے۔ بہرحال یہ وفد بعثت کے دسویں سال معراج سے قبل مکہ آیا تھا۔ اس واقعے کے بعد سیرتِ رسول ﷺ میں نجران والوں کا ذکر 9 ہجری میں ملتا ہے۔ اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا۔ عرب و یمن کے قبائل کے وفود کا تانتا بندھا ہوا تھا تاکہ اسلامی حکومت سے اطاعت کا عہد و پیمان کریں۔ اہلِ نجران بھی خوب سمجھتے تھے کہ مسلمانوں سے لڑنا ان کے بس میں نہیں۔ ان کے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو مسلمان ہوجائیں یا ذمی بن جائیں۔ اس مسئلے پر غور کرنے کے لیے نجران کی درس گاہ کے اہلِ علم اور برسرِ اقتدار علماء کے درمیان مشاورت منعقد ہوئی۔ اس مشاورت کا سبب وہ خط تھا جو اسقف کے نام مدینہ سے آیا تھا۔ احمد بن عبدالجبار کی روایت کے مطابق خط کا مضمون حسبِ ذیل ہے:

''محمد رسول اللہ کی جانب سے نجران کے اسقف اور اہلِ نجران کے نام:''

''ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کے خدا کے نام پر شروع کرتا ہوں۔

''امابعد!''

''میں تمھیں بندوں کی عبادت سے خدا کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں، اور بندوں کی ولایت سے خدا کی ولایت کی طرف بلاتا ہوں۔ اگر تم نے اس سے انکار کیا تو تم پر جزیہ ہے اور اگر تم نے اس سے بھی انکار کیا تو پھر تمھیں حرب کی اطلاع دی جاتی ہے۔ والسلام''

اس مشاورت میں درس گاہ کے نمائندوں نے کہا:

''خداوند نے ابراہیمؑ سے وعدہ کیا تھا کہ اسماعیلؑ کی اولاد میں ایک نبی ہوگا۔ ہوسکتا ہے یہ وہی ہوں۔''

اس بات پر لوگوں میں اختلاف ہوگیا۔ پھر طے ہوا کہ اس سارے معاملے کو عوام کے سامنے رکھا جائے۔ اسقف کے اعلان پر تمام اہل وادی جمع ہوگئے۔ ان کے سامنے بھی نامۂ مبارک پڑھا گیا۔ بحث مباحثے کے بعد اس جلسۂ عام میں طے ہوا کہ ایک وفد مدینے جا کر پوری طرح اطمینان کر کے آئے۔ چنانچہ وفد روانہ ہوا۔ ابن اسحٰق کرز بن علقمہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اس وفد میں ساٹھ سوار تھے جن میں 24 آدمی ان کے شرفا و معززین میں سے تھے اور تین آدمی مختار اور مقتدر تھے۔ ایک عبدالمسیح جو عاقب تھا' دوسرا ایہم' یہ سید قوم کے مرتبہ کا تھا' تیسرا ابوالحارث بن علقمہ تھا۔

ابوالحارث انجیل کا عالم تھا اور اسے یقین ہوگیا کہ مدینے کے نبی ہی رسولِ آخرالزماں ہیں۔ اس لیے اس نے مدینے کے راستے ہی میں اپنے بھائی کرز بن علقمہ سے کہا:

''خدا کی قسم یہی وہ نبی امی ہیں جن کا ہم لوگوں کو انتظار تھا۔ لیکن اس بات کو ظاہر کردوں تو یہ سب ہمارے خلاف ہوجائیں گے۔''

کرز بن علقمہ کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور جب مدینہ پہنچے تو وہ بے تامّل مسلمان ہوگئے۔ وفد نے مدینہ پہنچنے کے بعد رسول اللہ سے بہت سے سوالات کیے اور حضور ﷺ نے ان کے جوابات دیے۔ آخر میں انھوں نے پوچھا کہ ''آپ ﷺ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کیا کہتے ہیں؟'' حضور ﷺ نے فرمایا۔ ''ابھی ٹھہرو' اس کے متعلق (اللہ کی طرف سے) جو کچھ ہمیں بتایا جائے گا میں تمھیں اس کی خبر دوں گا۔'' دوسرے روز یہ آیت نازل ہوئی:

﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ فَلَا تَكُن مِّنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنفُسَنَا وَأَنفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَل لَّعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ۝﴾ (آل عمران 59 تا 61)

''عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہوگیا۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمھارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے۔ اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو' جو اس میں شک کرتے ہیں۔ یہ علم آ جانے کے بعد اب جو کوئی' اس معاملے میں تم سے جھگڑا کرے' تو اے محمد ﷺ! اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور خدا سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو۔''

اس دعوتِ مباہلہ پر اہل نجران گھبرا گئے۔ کیوں کہ ان میں سے اکثر دلوں میں آپ ﷺ کی نبوت کے قائل ہوگئے تھے۔ جب ان سے کہا گیا کہ آؤ ہمارے مقابلے میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت' تو وہ خوف زدہ ہوگئے۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

''خدا کی قسم ہمارے سامنے ایک امرِ عظیم ہے۔ اگر یہ شخص خدا کا نبی اور مرسل ہے اور ہم نے اس کے ساتھ ملاعنت کرلی تو ہم میں سے کوئی ناخن اور بال برابر بھی باقی نہیں رہے گا۔''

آخر ان لوگوں نے مباہلہ سے گریز کیا اور اطاعت پر آمادہ ہوگئے۔ حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اپنا معاملہ آپ ﷺ پر چھوڑتے ہیں ہمیں یقین ہے کہ ہمارے معاملہ میں آپ ﷺ حق و انصاف سے کام لیں گے۔ حضور ﷺ نے دوسرے روز ایک عہد نامہ تیار کرایا جس پر وفد کے نمائندوں نے دستخط کردیے۔ اس معاہدے کا مضمون حسب ذیل ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم''

''یہ تحریر ہے جو محمد نبی اور خدا کے رسول نے اہل نجران کے لیے لکھی ہے۔ جب کہ ان کا حکم ہوگیا وہاں کے تمام ثمر پر۔ ہر زرد اور ہر سفید و سیاہ پر اور ہر رقیق و غلام پر۔

''انھوں نے اہلِ نجران پر فضل کیا اور یہ ساری چیزیں انھیں چھوڑ دیں' اس شرط پر کہ وہ دو ہزار حلّے ہر سال ادا کریں۔ ایک ہزار ہر رجب میں اور ایک ہزار ہر صفر میں۔ ہر حلّہ ایک اوقیہ کا اور اوقیہ پر جو زیادتی کمی ہو وہ حساب میں محسوب ہوگی۔ درع' گھوڑا' اونٹ یا جو چیز ان سے لی جائے گی وہ اسی حساب میں۔

''اور اہلِ نجران پر میرے قاصد کے رہنے کا انتظام لازم ہوگا۔ اور کوئی قاصد ایک ماہ سے زیادہ نہ روکا جائے گا۔

''اگر یمن میں کوئی نزاع پیش آ جائے تو اہل نجران پر لازم ہوگا کہ وہ تیس زرہیں' تیس گھوڑے اور تیس اونٹ بطور عاریت دیا کریں گے اور جو چیزیں عاریتاً ملیں گی۔ ان میں سے کوئی چیز ہلاک یا ضائع ہو تو اس کا ضمان میرے آدمی پر لازم ہوگا جب تک ادا نہ کردے۔

''اور اہلِ نجران کے لیے خدا کا جوار اور محمد رسول اللہ کا ذمہ ہے۔ ان کی ذاتوں کا' ان کی ملّت کا' ان کی اراضی اور اموال کا' ان لوگوں کا جو حاضر ہیں اور ان کا جو غائب ہیں۔ ان کے قبیلہ کے آدمی ہوں یا ان کے متبعین۔

''اور شرط یہ ہے کہ جس حالت میں وہ ہیں اس میں کوئی تغیر و تبدل نہ کیا جائے۔ ان کے حقوق میں سے کسی حق کو بدلا نہ جائے۔ نہ ان کے اساقفہ میں سے کسی اسقف کو بدلا جائے۔ اور جو قلیل و کثیر ان کے ہاتھوں میں' اس میں تغیر و تبدل نہ کیا جائے۔

''وہ جاہلیت کے کسی اشتباہ میں ماخوذ نہ ہوں گے۔ جاہلیت کے خون کا کوئی مطالبہ ان سے نہ ہوگا۔ کوئی ان پر حملہ نہ کرے گا۔ کوئی فوج ان کی زمین میں داخل نہ ہوگی۔

''ان میں سے کوئی شخص اگر حق کا مطالبہ کرے تو ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہوگا۔ اگر کوئی صاحب وجاہت ان میں سے ربا (سود) کھائے تو میرا ذمہ اس سے بری ہے۔ ان میں کا کوئی شخص کسی دوسرے کے ظلم کی وجہ سے ماخوذ نہ ہوگا۔ اور ان تمام باتوں پر جو اس صحیفہ میں ہیں خدا کا جوار اور محمد ﷺ نبی اور رسول اللہ کا ذمہ

ہے۔ حتیٰ کہ خدا کا حکم آ جائے۔“

اس معاہدے پر ریاستِ مدینہ کی طرف سے دستخط کرنے والوں میں یہ نام ہیں: ابو سفیان بن حرب، غیلان بن عمرو، مالک بن عوف، اقرع بن حابس حنظلی اور مغیرہ بن شعبہ۔ نجران کا وفد اس معاہدے کو لے کر جب واپس آیا تو نجران کے کلیسا کا اسقف اور معززین وعوام ایک روز کی مسافت تک ان کے استقبال کو آئے۔ اسقف کے ساتھ اس کا ایک ابنِ عم تھا، جس کا نام بشر بن معاویہ تھا، اور کنیت ابوعلقمہ تھی۔ اسقف نے رسول اللہ کا خط لیا اور اس خط کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ واپس ہونے لگا۔ سب اس کے ساتھ تھے۔ ایک موقع پر بے اختیار اسقف کے منہ سے نکل گیا: ”خدا کی قسم یہ نبی مرسل ہیں۔“ بشر نے جیسے ہی یہ جملہ سنا اس نے اپنے اونٹ کو مدینہ کی طرف پھیر کر زور سے ہنکایا۔ لوگوں نے پیچھا کیا اور اسے روکتے رہے مگر وہ نہ رکے اور مدینہ آ کر دم لیا۔ رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو کر یہیں رہے اور ایک غزوہ میں شہید ہوئے۔

بیہقی نے باسناد صحیح حضرت ابنِ مسعودؓ سے روایت کیا ہے کہ سید اور عاقب جب ملاعنت سے ڈرے اور رسول اللہ کی تمام باتوں کو ماننے کے لیے مستعد ہوئے تو حضور ﷺ سے کہا کہ آپ ﷺ ایک امین شخص کو ہمارے ساتھ کر دیجیے، مگر وہ واقعی امین ہو۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تمھارے ساتھ ایک شخص کو دیتا ہوں جو ایسا امین ہے جیسا امانت کا حق ہے، اور کہا: ”اٹھو! ابوعبیدہ بن الجرّاح!“ جب وہ کھڑے ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: یہ اس اُمّت کے امین ہیں۔“ اس وقت سے آپ کا لقب ”امین الامۃ“ ہے۔

نجران جانے والے قاصدوں میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب کے نام بھی ہیں جنھیں صدقات وجزیہ کی وصولی کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس معاہدے کے بعد نجران کے عیسائیوں میں ایک بڑی تعداد نے اور دیہات کے تمام مشرک قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور نصرانیوں سے جزیہ۔ یہاں تک کہ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں پورے یمن اور نجران کی آبادیاں مسلمان ہو گئیں اور یہودی اور عیسائی بہت ہی کم تعداد میں رہ گئے۔ (محمود فاروقی)

افضل الانبیا

خدائے بزرگ و برتر نے زمین کو انسانیت کی آماج گاہ بنایا اور تخلیقِ کائنات کا عمل کُنْ فَیَکُوْنَ کے امر سے عالمِ وجود میں آیا۔ عالمِ کائنات کو مختلف النوع مخلوق سے آباد فرمایا، مگر حضرت انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ اب ان نفوسِ انسانی کے اخلاق و تربیت کی تکمیل کے لیے مخزنِ اخلاق انبیا علیہم السلام کا سلسلہ شروع ہوا۔ فضائل اخلاق، عصمت وعفاف، زہد و تقویٰ، غیرت واستغنا، احسان و کرم، عفو و حلم، عزم و ثبات اور لطف و ایثار کی تعلیم کا فریضہ پیغمبران علیہم السلام کو سونپا گیا۔

آج جب ہم تاریخ انسانی کے ادوار کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی بقا اور راہ نمائی کے لیے نفوسِ قدسیہ ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ جو فضائل اخلاق کی رو سے خاص صنف سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تعلیمات اپنے دور کی خصوصیات کو محیط کیے ہوئے ہیں اور اس خاص مکتبِ فکر سے ماورا اپنی افادیت کھو دیتی ہیں۔ مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت نوحؑ کی بیاضِ تعلیم میں عفوِ عام کے اوراق خالی ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے اوراقِ تعلیم میں صرف حلم و تحمل، قناعت و تواضع اور صلح وعفو کے ابواب موجود ہیں، مگر حکومت وفرماں روائی کی اقدار ان کے صفحات میں ناپید ہیں۔ گویا گزشتہ تاریخ انسانی کے ہر دور کی تعلیم و تربیت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر قدم پر ایک نئے راہ نُما کی ضرورت پیش آئی۔ اور اسی لیے عالم انسانی اپنی تکمیل کے لیے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر و نگیں بھی ہوا اور گوشہ نشیں بھی۔ شہنشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدائے بے نوا بھی۔ فرماں روائے جہاں بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی۔ مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریا دل بھی۔ وہ صاحب محراب و منبر بھی ہو اور نمونہ صدقِ وصفا بھی ہو۔ چنانچہ ان ستودہ صفات کا اطلاق نبیٔ آخر الزماں شہنشاہ کون و مکاں حضرت محمد ﷺ کی سیرت طیبہ پر ہوتا ہے۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ از روئے اسلام ایک طرف تمام انبیا علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور انھیں تمام پیغمبرانہ صفات سے متصف جاننا ضروری ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (البقرہ: 285)

”ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔“

اس لیے ضروری ہے کہ تمام انبیا علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوی سے متصف مانا جائے۔ دوسری طرف ارشاد ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ (البقرہ: 253)

”یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعض پر فوقیت بخشی ہے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کے مراتبِ کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے۔ اور دونوں صداقتوں کے درمیان مناسبت یوں ہو سکتی ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تمام کمالات نبوت وفضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے۔ مگر زمانہ اور ماحول کی ضروریات اور مصالح الٰہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور تمام انبیا میں یکساں نہیں ہوا۔ بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے یعنی جس زمانے کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی بہ مصلحت کما حقہ ظہور نہیں ہوا۔

اس کی مزید وضاحت نبیٔ اکرم ﷺ کی اس حدیث سے ہو جاتی ہے کہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر انھیں چھوڑ دینے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے شدت ورحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں۔ اے ابوبکرؓ تمھاری مثال ابراہیم وعیسیٰ علیہما السلام کی اور اے عمرؓ تمھاری مثال نوح وموسیٰ علیہما السلام کی ہے۔ یعنی ایک فریق سے رحم وکرم کا اور

دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا۔

اس حدیث میں اس نقطۂ اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو انبیا علیہم السلام کے مختلف احوال مبارکہ میں رونما رہا ہے لیکن حضرت محمد ﷺ کی نبوت چوں کہ آخری اور عمومی تھی اس لیے بہ ضرورت احوال آپ ﷺ کے تمام کمالاتِ نبوت آپ ﷺ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے۔ اور آپ ﷺ کی نبوت کے آفتاب عالم تاب کی ہر کرن دنیا کے لیے مشعلِ ہدایت بنی۔ اور ظلمت کدۂ عالم کا ہر گوشہ آپ ﷺ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پرنور ہوا۔ اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ نہ ہونے پائے جس سے دوسرے انبیا علیہم السلام کی توہین یا کسرِ شان پیدا ہو کہ اس سے ایمان کے ضائع ہو جانے کا خطرہ ہے۔ آیئے ان احادیث پر غور کریں جن میں ارشادات گرامی اس بات کا ثبوت ہیں کہ آقائے نام دار تاج دارِ حرم حضرت محمد ﷺ کا درجہ تمام انبیا علیہم السلام سے زیادہ ہے۔

ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں یہ باتیں بلافخر کہتا ہوں کہ قیامت کے روز میں تمام اولاد آدمؑ کا سردار ہوں گا اور لواء حمد بھی میرے ہی ہاتھ میں ہوگا اور تمام انبیا میرے ہی علم کے نیچے ہوں گے اور سب سے پہلے میری ہی قبر کھلے گی اور سب سے پہلے میں ہی شفاعت کروں گا اور میری شفاعت مقبول ہوگی۔

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک روز صحابہؓ بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور پاس آ کر ان کی باتیں سنیں۔ کوئی کہتا تھا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنا لیا ہے۔ دوسرا بولا کہ حضرت موسیٰؑ اللہ سے ہم کلام ہوئے۔ تیسرے نے کہا حضرت عیسیٰؑ کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے۔ ایک بولا حضرت آدمؑ کو اللہ نے اپنا برگزیدہ بندہ بنا لیا ہے۔ حضور اکرم ﷺ جب ان کے قریب آئے تو فرمایا کہ تمھاری باتیں اور تمھارا تعجب سے یہ کہنا میں نے سن لیا ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں اور دراصل وہ ایسے ہی ہیں اور یہ کہ حضرت موسیٰؑ نجی اللہ ہیں، بے شک یہ بھی سچ ہے اور حضرت عیسیٰؑ بھی کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں، اور حضرت آدمؑ بھی اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ لیکن میں بلافخر کہتا ہوں کہ میں اللہ کا حبیب اور پیارا ہوں۔ قیامت کے روز لواء حمد میرے ہی ہاتھ میں ہوگا کہ آدمؑ اور ان کے ساتھ سب لوگ اسی کے نیچے ہوں گے۔ اور قیامت کے روز سب سے پہلے میں ہی شفاعت کروں گا اور میری ہی شفاعت قبول ہوگی۔ اور سب سے پہلے میں ہی بہشت پر دستک دوں گا۔ اللہ تعالیٰ اسے کھول دے گا پھر میں اور میرے ساتھ مومنین بہشت میں چلے جائیں گے اور اولین اور آخرین میں سب سے زیادہ اللہ کے نزدیک میں مکرّم اور معزز ہوں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز سب نبیوں کا امام اور ان کا خطیب اور شفاعت کرنے والا میں ہی ہوں گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور امام محی السنۃ بغوی کا قول ہے کہ معجزات میں بھی آپ ﷺ کو فضیلت حاصل ہے۔ ان احادیث اور دیگر احادیث کے علاوہ قرآن مجید کے الفاظ واذاخــذ اللّٰــــہ میثــاق الــنّبیّــن میں صاف اعلان کیا گیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے متعلق تمام پیغمبروں سے عہد لیا گیا ہے اور اس عہد کا گواہ خود حق سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے کو بنایا ہے۔

عقل واستدلال کی روشنی میں بھی جب ہم سفرِ حیات میں کوئی کٹھن منزل پاتے ہیں اور تاریک مراحل کو طے کرنا دشوار گزار ہوتا ہے۔ تو ہماری راہ نُمائی کے لیے سیرت طیبہ سے روشنی کے مینار اپنی ردائے نوری کو پھیلا دیتے ہیں جس سے منزل سمٹ کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی مثال آپ ﷺ نے پیش نہ کی ہو مگر جب ہم دیگر انبیا علیہم السلام کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں بعض دشواریوں میں ان سے امداد نہیں ملتی۔ مثلاً ازدواجی حالات میں حضرت عیسیٰؑ سے ہم کوئی راہ نُمائی نہیں لے سکتے مگر زندگی کے ہر شعبہ میں آنحضرت ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہماری رہبر اور راہ نُما بنتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے انبیا علیہم السلام پر چھے چیزوں میں فضیلت ہے۔ اول یہ کہ مجھے جوامع الکلم عطا ہوئے ہیں۔ دوسرے، مخالفین کے دلوں میں میرا رعب بیٹھ کر میری امداد ہو جاتی ہے، تیسرے میرے لیے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا ہے، چوتھے تمام زمین میرے اور میری اُمّت کے لیے مسجد اور پاک کرنے والی کر دی گئی ہے۔ پانچویں یہ کہ میں تمام مخلوق کے لیے پیغمبر ہوں، چھٹے مجھ پر نبیوں کا آنا ختم ہو گیا ہے۔ (صحیح مسلم، تحریر: گوہر ملسیانی)

مراجع

۱: کلکی اوتار — سیّد احمد حسن
۲: ہندوؤں کی کتبِ مقدسہ میں بشاراتِ حضورؐ — مولانا حسن میاں پھلواری
۳: ہندوؤں کی کتبِ مقدسہ میں بشاراتِ حضورؐ — الحاج بشیر الدین پنڈت
۴: النبی الخاتمؐ — سیّد مناظر احسن گیلانی
۵: محمد رسول اللہؐ (اُردو ترجمہ) — ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۶: نصرانیت: قرآن کی روشنی میں — مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
۷: تذکرۃ الانبیاء — زاہد اقبال گنائی
۸: قصص الانبیاء — زاہد اقبال گنائی
۹: قصص القرآن — مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی
۱۰: حضرت آدمؑ تا حضرت محمدؐ — فاطمۃ الزہرا بلگرامی
۱۱: سیارہ ڈائجسٹ — رسول نمبر
۱۲: ششماہی ''السیرۃ'' — مدیر: سیّد فضل الرحمٰن
۱۳: اُردو ڈائجسٹ — حافظ فروغ احسن کا سلسلۂ انبیائے کرام
۱۴: حیاتِ انبیاء کرام (بہ زبانِ قرآن) — نگہت نذیر

تیسری کتاب:

بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت عالمی حالات

پوری دنیائے انسانیت

عرب کے حالات

پوری دنیائے انسانیت

دنیائے قبل از اسلام

نوع انسانی کی دینی ترقی میں جو تسلسل پایا جاتا ہے، وہ ایک ایسا موضوع ہے، جو انسان کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے انتہائی دلچسپی رکھتا ہے۔ نفس انسانی کا تدریجاً ایک ہمہ گیر ذات، ایک محیط کائنات ارادے کو پہچاننا! اندھیرے میں بھٹکنے پھرنے کی جو زحمتیں، کیا افراد اور کیا اقوام دونوں نے جھیلی ہیں، اس سے پیش تر کہ ان کے ذہنوں پر ایک ایسی روح مطلقہ کا تصور جلوہ گر ہوتا، جو تمام موجودات میں جاری وساری اور نظام فطرت کو قاعدہ وقانون کے سانچے میں ڈھالنے والی ہے، یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے نہایت معنی خیز سبق حاصل ہوتے ہیں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جس عمل کے ذریعے نوع انسانی اشیائے مادی کی پرستش سے ترقی کر کے عبادت الٰہی تک پہنچی ہے، وہ معرض تصدیق میں پڑ گیا۔ اقوام اور افراد کثیر تعداد میں شاہ راہ ترقی سے منحرف ہو گئے اور اپنی خواہشات نفسانی کے غول راہ کا دھوکا کھا کر اپنے عہد طفولیت کے بتوں کی طرف لوٹ گئے، جو محض ان کے جذبات کے تراشے ہوئے مجسمے تھے۔ لیکن خدا کی آواز چاہے کوئی اسے سنتا یا نہ سنتا، ہمیشہ دعوت حق دیتی رہی ہے اور وقت آنے پر اس کے بندگان خاص نے اٹھ کر اعلان کیا ہے کہ انسان پر دوسرے انسانوں کی طرف سے اور اس کے پیدا کرنے والے کی طرف سے کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ یہ بندگان خاص خدا کے حقیقی پیغمبر تھے۔ وہ اپنی قوموں میں اپنے وقت کی پکار بن کر آئے۔ جس میں سچائی، پاکبازی اور انصاف کے وہ تمام ولولے تڑپ رہے تھے جو روح انسانی میں ودیعت کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے زمانے کے روحانی تقاضوں کا ترجمان تھا۔ ہر ایک اس لیے آیا کہ ایک گری ہوئی قوم کو سدھارے، نکھارے اور ابھارے اور ایک بگڑی ہوئی مملکت کو بنائے۔ بعض ایک محدود تمدن کی تعلیم دینے کے لیے آئے جو ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر محصور رہا۔ دوسرے ایک عالم گیر پیغام لے کر آئے۔ ایک ایسا پیغام جو کسی ایک نسل یا قوم کے لیے نہ تھا بلکہ ساری نوع بشر کے لیے تھا محمد ﷺ کا شمار موخر الذکر زمرے میں ہوتا ہے۔ آپ کا پیغام صرف عربوں کے لیے نہ تھا۔ آپ ﷺ صرف ایک زمانے یا ملک کے لیے مبعوث نہ ہوئے تھے بلکہ سارے بنی آدم کے لیے، اس دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جتنے بندگان خدا ہیں ان سب کے لیے تھے۔ اس معلم اعظم ﷺ کا ظہور، جس کے سوانح حیات اس کی بعثت کے لمحے سے لے کر اخیر تک مصدقہ طور پر قلم بند ہو چکے ہیں۔ محض ایک اتفاقی حادثہ یا تاریخ عالم کے حاشیے پر لکھا ہوا ایک غیر متعلق اور ضمنی واقعہ نہ تھا۔ وہ اسباب، وہ زبان حال سے پکارتی ہوئی خرابیاں، ساری کائنات میں جاری وساری ایک قدرت مطلقہ پر یقین محکم پیدا کرنے کے وہ اندرونی داعیے، جو قیصر آگسٹس کے زمانے میں گلیلی کے کنارے ایک ایسے پیغمبر کو وجود میں لائے تھے، جس کی زندگی ایک المیہ تھی۔ وہی ساتویں صدی عیسوی میں دوبارہ بروئے کار آئے اور اب کے پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ، جیسا کہ بجا طور پر کہا گیا ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کا آغاز قومی، معاشرتی اور مذہبی انتشار کا زمانہ تھا، اس میں جو مظاہر رونما ہوئے، وہ ویسے ہی تھے، جیسے مثبت ایمان وایقان کے کسی نئی صورت میں جلوہ گر ہونے کا باعث بنتے ہیں تا کہ آوردہ سرگرداں قوتوں کو مذہبی ارتقا کے اس ناگزیر راستے پر لایا جا سکے، جس کی منزل مقصود ذاتی عبادت کی تکمیل وتنظیم ہے۔ یہ تمام مظاہر اس پر دلالت کر رہے تھے کہ یہودیت اور عیسائیت نے خدا کی مملکت کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس سے کسی زیادہ مربوط مرقع کا صورت پذیر کیا جانا ضروری تھا۔ زرتشت، حضرت موسیٰ نے جو شمع روشن کی تھی، اس کی لو انسانی خون کے چھینٹوں سے بجھائی جا چکی تھی۔ ایک بگڑی ہوئی زرتشیت نے اور ایک اس سے بھی زیادہ بگڑی ہوئی عیسائیت نے، جو ایک دوسرے سے برسر پیکار تھیں، انسانی ضمیر کی ناطقہ بندی کر رکھی تھی اور کرۂ ارض کے بعض شاد ماں ترین خطوں کو لہو کی ندیوں کا سنگھم بنا رکھا تھا۔ بالا دستی کی خاطر مسلسل رزم آرائیوں، دائمی خانہ جنگیوں اور مذہبوں اور فرقوں کی لگا تار چپقلشوں نے قوموں کا خون زندگی نچوڑ لیا تھا اور روئے زمین کے باشندے، جو ایک بے جان مشائخ پرستی کی آہنی ایڑیوں سے کچلے جا رہے تھے، خدا سے اپنے آقاؤں کے مظالم کی فریاد کر رہے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں ایک نجات دہندہ کی اس سے زیادہ ضرورت کبھی لاحق نہ ہوئی تھی اور نہ کبھی اس کے ظہور کے لیے اس سے موزوں تر وقت آیا تھا۔

چناں چہ محمد ﷺ نے دنیائے اخلاق میں جو کچھ کر دکھایا، اس کا صحیح صحیح اندازہ لگانے کی خاطر ضروری ہے کہ اسلام سے پہلے اور طلوع اسلام کے وقت اقوام عالم کے جو مذہبی اور معاشرتی حالات تھے، ان پر ایک سرسری سی نظر ڈالی جائے۔

باختر (BACTER) کی سطح مرتفع، جسے عرب جغرافیہ دانوں نے ام البلاد کا موزوں نام دیا ہے، نوع انسانی کا گہوارہ مذہبوں، اور قوموں کا مرزبوم خیال کی جاتی ہے۔ نوع بشر کے بچپن پر تقابلی علم الاقوام جو مدھم سی روشنی ڈالتا ہے، وہ اس روشنی میں ہمیں نسل انسانی کے اس ابتدائی مسکن میں خاندانوں کے چند در چند گروہ دکھاتی ہے، جو رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے

ناطے جوڑ کر جرگوں اور قبیلوں کی شکل اختیار کرتے ہیں اور پھر بڑھتی ہوئی آبادی کے دباؤ کے تحت موج در موج باہر نکل کر زمین کے مختلف خطوں کو آباد کرتے ہیں۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے اپنے اس قدیم وطن کو خیر باد کہی' وہ غالباً حامی (HAMITIC) نسل کے لوگ تھے۔ ان کے بعد جو لوگ نکلے' وہ تورانی تھے یا جیسا کہ انھیں کبھی کبھی ملقب کیا جاتا ہے اگروفنی (Ugro-Finnish) نسل کے لوگ' جو یافثی (JAPHETIC) خاندان کی ایک شاخ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بعض شمال کی طرف گئے اور پھر مشرق میں پھیل کر نوع انسانی کی موجودہ منگولی (MANGOLIAN) شاخ کے مورثِ اعلیٰ بنے۔ ایک اور شاخ مغرب کی طرف چل نکلی اور آذر بائیجان' ہمدان اور گیلان میں آباد ہوگئی۔ جو بحیرہ خزر کے جنوب اور جنوب مغرب میں ہیں اور جو تاریخ قدیم میں ماد (MEDIA) کے نام سے نسبتاً زیادہ معروف ہیں۔ اس شاخ کے ایک حصے نے کچھ مدت کے بعد سرزمین بابل کے زرخیز میدانوں میں جا کر اپنے پہلے کی حامی نو آبادیوں کو مسخر کیا اور رفتہ رفتہ ان میں مل جل کر اکادی (ACCADIAN) قوم کی شکل اختیار کی' جسے یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں میں کوشی (KUCHITE) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس مخلوط نسل نے بابل کی بناڈالی اور ایک ایسا مذہب ایجاد کیا جو اپنی بلند سطحوں پر فطرت پرستانہ وحدت الوجودیت سے مشابہ تھا۔ لیکن زیریں سطحوں پر اس میں ہمہ دیوات (PAN-DAEMONISM) کا عقیدہ تھا اور سورج دیوتاؤں اور چاند دیوتاؤں کی پوجا تھی۔ ان چیزوں کے ساتھ ساتھ لنگ پوجا تھی' جنسی خواہشوں کی تسکین کرنے والی رسمیں تھیں۔ بعل اور (MOLOCH) دیوتاؤں پر بچوں کی قربانیاں تھیں۔ بلتیس (BELTIS) اور اشتورث (ASHTORETH) دیویوں پر کنوار پن کی بھینٹ چڑھانے کی ریت تھی۔ چناں چہ بابل کا مذہب ایک ایسے معاشرے کا مذہب تھا جس میں ایک طرف تو اعلیٰ درجے کی مادی ترقی تھی اور دوسری طرف پرلے درجے کی نفسانیت پرستی اور خون آشامی' جسے مذہب کی سند قبول حاصل تھی۔

اس کے بعد جس شاخ نے اُم البلاد سے کوچ کیا' وہ سامی (SEMITIC) نسل تھی۔ سامی بھی تورانیوں کے نقش قدم پر چل کر مغرب کی طرف گئے اور معلوم ہوتا ہے کہ بین النہرین (MESOPOTAMIA) کے ڈیلٹے کے شمالی حصے میں آباد ہوگئے۔ بہت جلد انھوں نے تعداد اور قوت میں ترقی کر کے بابل کی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کی جگہ ایک وسیع سلطنت قائم کی۔ جس کا سکہ تمام ہمسایہ ملکوں میں چلتا تھا۔ مغربی ایشیا کے دو بڑے دریاؤں کے درمیان اشوریوں (ASSYRIANS) نے جو دارالحکومت بنایا' اس میں جو مذہب رائج تھا' وہ کبھی کبھی ایک مثبت تصور توحید کی بلندی تک جا پہنچتا تھا۔ ان کے ہاں جو سماوی سلسلہ مراتب تھا' اس میں ایک افضل و اعلیٰ ہستی کے صریح اعتراف کے نشان ملتے ہیں۔

ادھر ڈیلٹے کے شمالی حصے میں سامی نو آبادوں کی بڑی جماعت ترقی کے مراحل طے کر رہی تھی۔ ادھر سامیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ اُر (UR) کے علاقے میں داخل ہوگیا جو کلدانی سلطنت کے زیرنگیں تھا۔ اس قبیلے کا شیخ' جس کی خود اختیاری جلاوطنی اور بادیہ گردی بہت سے مذہبوں کے قصوں کا مضمون بن گئی ہے' مستقبل کے تاریخ آفرینوں کا جد امجد بنا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یافثی شاخ دوسری تمام شاخوں کے چلے جانے کے بعد بھی اپنے اصل وطن میں مقیم رہی۔ جس زمانے میں دوسری شاخیں اپنے اصلی تنے سے جدا ہو کر سلطنتیں قائم اور مذاہب ایجاد کر رہی تھیں' اسی زمانے میں یافثی شاخ اپنے طور پر نشو ونما پا رہی تھی۔ لیکن قوموں کی جادہ پیمائی جب ایک بار شروع ہوگئی تو پھر کہاں تھمتی تھی؟ یافثی قبیلے یکے بعد دیگرے مغرب کی طرف روانہ ہوگئے۔ نہ جانے اس فطری بے چینی کے باعث جو وحشی قوموں کو ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتی اس وجہ سے کہ ان کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کی اصلی سرزمین ان کے راعیانہ مشاغل کے لیے ناکافی ہوگئی تھی۔ جو لوگ سب سے پہلے نکلے' ان میں پلیسجین (THE PELASGIANS) اور کلٹ (THE CELTS) تھے۔ ان کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی کوس رحلت بجایا تا آنکہ بالآخر صرف خالص آریہ لوگ اپنے قدیم مسکن میں باقی رہ گئے۔ ان کا ایک گروہ بدخشاں کے نزدیک آباد تھا۔ اور دوسرا بلخ کے نزدیک' جہاں وہ ہمسایہ قوموں سے الگ تھلگ اور ان کے جنگ و جدل اور نقل و حرکت سے کوئی سروکار رکھے بغیر صدیوں تک بود و باش کرتے رہے۔ تاریخ کی جو روشنی سلطنتوں اور تہذیبوں کی بنیاد رکھنے والی مغربی نسلوں پر پڑتی ہے' وہ زمین کے ان قدیم باشندوں کا ایک دھندلا سا نقشہ بھی ہمیں دکھاتی ہے' جس میں ان کے بہت سے قبیلے اس سطح مرتفع پر رہتے سہتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مکمل وحشت سے ترقی کر کے نیم وحشت کے درجے تک پہنچے ہیں اور ایک عالم گیر مجرد ذات کا مبہم سا احساس ان کے ذہنوں میں شکل پذیر ہو رہا ہے اب تک وہ خوف کے مارے لرزہ براندام ہو کر جن اشیائے فطری کی پرستش کرتے رہے تھے' ان کی جگہ لاتعداد خیالی ہستیاں لے رہی ہیں۔ بعض قبیلوں کے ہاں مجرد شخصیتوں کا یہ لشکر دو جامع اصولوں کا تابع فرمان ہے' یعنی نور اور ظلمت' زندگی اور روشنی کا نقیب آفتاب ایک واحد خدائے رحیم کی علامت بن جاتا ہے' جس کی قوت ابھی مزاحمتوں سے دوچار ہے لیکن آخرالامر اپنے مخالف اصول' یعنی ظلمت اور شر پر غالب آجائے گی۔

دوسرے قبیلوں کے ہاں یہ صورت حال ہے کہ وہ اپنے معبود بتوں کو جن خیالی ہستیوں کا جامہ پہنا رہے ہیں' وہ خیالی ہستیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی ہیں۔ کبھی تو وہ جُدا جُدا شخصیتیں بن کر سامنے آتی ہیں اور کبھی یک جا ہو کر ذی حیات مادے کی ایک وحدت بن جاتی ہیں۔ دھند کے بادل رفتہ رفتہ چھٹ جاتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ شعوب و قبائل بادشاہیوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ زراعت نے آہستہ آہستہ راعیانہ مشاغل کی جگہ لے لی ہے۔ دھاتوں کا استعمال رائج ہو رہا ہے اور ان سب سے زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ ایک افضل و اعلیٰ شخصیت کا بلند تر تصور ذہنوں کے بند دریچے کھول کر بزور داخل ہو رہا ہے۔ کیومرس' ہوشنگ اور دوسرے شاہان پاستان' جن کے گیت ایک حیرت انگیز قادر الکلامی سے فردوسی نے گائے ہیں' ایک روبہ ترقی تہذیب کے اوّلین نشان بردار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں آریوں کے ہاں

بادشاہی کا آغاز ہوا' اسی زمانے کے لگ بھگ آریائی خاندان کی دو شاخوں میں وہ مذہبی تنازع رونما ہوا' جس کے نتیجے میں مشرقی شاخ اپنے مرزبوم سے جلاوطن ہوگئی۔ مغربی آریوں میں ایک معلّم نے' جو اپنے مذہب کی کتابوں میں ستانہ زرتشت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے' ایک زبردست انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس تحریک نے جو شدید مذہبی کش مکش پیدا کی' اس کے نشان ان تبرّ وں میں ملتے ہیں' جو ویدوں کے بھجنوں میں مشرقی آریوں کی نسل و مذہب کے دشمن ''جروشتی'' پر بھیجے گئے ہیں۔ اصلاح شدہ مذہب کے بارے میں ان بھجنوں کے لکھنے والوں کا جو ذہنی زاویہ تھا' وہ ناموں کے غیر معمولی توارد سے بھی بڑھ کر اس امر کا قوی ترین ثبوت ہے کہ یہ مذہبی اختلاف ہی خالص آریوں کی دو شاخوں کے علیحدہ ہو جانے کا فوری اور بلاواسطہ سبب تھا۔ اس مذہبی جنگ میں' جو غالباً انسانی تاریخ کی پہلی مذہبی جنگ تھی' مغربی آریوں کے ثنویت مسلک (DUALAST) قبیلے اپنے مشرقی بھائیوں کو جن کا مذہب تعداد ارباب (POLYTHEISM) اور وحدۃ الوجود (PANTHEISM) کی ایک معجون مرکب تھا، (PAROPAMISADAC) کی سرحدوں سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے۔ مشرقی آریہ ہندوستان پر ٹوٹ پڑے یہاں انھوں نے اصلی سیاہ فام باشندوں کو اپنی آبادیوں سے نکال باہر کیا' یا قتل کر دیا' یا غلام بنالیا اور انھیں ہمیشہ اپنے سے کم تر ہستیاں' یعنی داس اور شودر سمجھتے رہے۔ بہر حال ویدوں کے مذہب اور زرتشتی مذہب میں جو اختلاف تھا' وہ محض اضافی تھا۔ زرتشتیت مظاہر کے بجائے ان کے سبب کی پرستش کرتی تھی۔ جہاں تک ویدوں کے دیوتاؤں کا تعلق تھا' اس نے انھیں دیووں کا جامہ پہنا دیا اور دیو پرستوں کو کافر قرار دیا۔ ویدوں کے بھجن لکھنے والوں نے اس کے جواب میں اوستا کے خدا اہوار کو ایک خبیث دیوتا اور دیوتاؤں کا دشمن کہا اور ''جرد شتی'' پر دل کھول کر سب وشتم کی بوچھاڑ کی۔

پہلا زرتشت کہاں اور کس زمانے میں ہوا۔ یہ پردۂ لاعلمی میں مستور ہے۔ بہر حال وار پوش ہستاسپ کے عہد میں اس نام کا ایک معلّم گزرا جس نے پرانی تعلیمات کی تجدید' تدوین اور توسیع کی۔

ہندوستان

اگر ہم ایک قدم پیچھے ہٹ کر نگاہ ڈالیں' تو ہمیں ہندوستان میں آریائی فتوحات کا سیلاب صدیوں تک مشرق اور جنوب کی سمت بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ آریائی مذہب جو حملہ آور قدیم وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے' زیادہ تر دو چیزوں پر مشتمل تھا' یعنی اجداد کی ارواح کی پرستش اور مرئی مظاہر میں مجسم قوائے فطرت کی پرستش۔ پنجاب میں روحانی تصور نے مزید نشوونما پائی۔ ویدوں میں ہمیں ترقی کا کارواں آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے' تا آنکہ ہم اُپنشدوں میں ہندوؤں کے مذہبی خیالات کو اپنے اوجِ کمال پر پہنچا ہوا دیکھتے ہیں۔ اُپنشدوں میں روحانی ولولہ اس شدت سے ہے کہ وہ بلند ترین وحدانیت کے قریب جا پہنچتا ہے۔ اپنشد نہ صرف خدا کے نفوذِ مطلق سے بحث کرتے ہیں' جو ایک ایسا تصور ہے' جس نے بعد کے زمانوں میں مادی وحدت الوجود کی صورت اختیار کر لی' بلکہ یہ تعلیم بھی دیتے رہے کہ روحِ مطلق پرم آتما تمام موجودات کی محافظ اور ساری کائنات کی حاکم ہے۔ وہ انسانوں کے دلوں میں رہتی ہے اور آخر الامر انفرادی روحوں کو لامتناہیت میں یوں جذب کر لیتی ہے' جیسے سمندر دریاؤں کو اپنے اندر غرق کر لیتا ہے۔ جب یہ انجذاب ہو جاتا ہے' تو انسانی روح پر کالبد خاکی میں جو تجربات گزرے ہوتے ہیں' وہ ان سب کا شعور کھو دیتی ہے۔ لیکن انسانی ترقی کی ان دل چسپ دستاویزوں میں بلاشک وشبہ روحانی انحطاط کے جراثیم موجود تھے جنھوں نے بہت جلد ارتقا کے عمل کا رخ پلٹا دیا۔ چناں چہ مزید عروج کی بجائے ہمیں مسلسل تنزل دکھائی دیتا ہے۔ اُپنشدوں کا مقام پُران حاصل کر لیتے ہیں اور پھر تنتروں کا طریق پرستش پرانوں کو اس مقام سے ہٹا دیتا ہے۔

اُپنشدوں میں جو خیال بار بار دہرایا گیا ہے کہ پرم آتما مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے' اس سے اوتاروں کا تصور پیدا ہوا۔ جس طرح مغربی غیر اہل کتاب کا فلسفہ کائنات نفس عامہ کی اس زبردست خواہش کی تسکین نہ کر سکا کہ اسے ایک ایسا شخصی خدا مل جائے' جو انسانوں میں رہ چکا ہو اور ان کے ساتھ آئے دن کا میل جول رکھ چکا ہو۔ اسی طرح اُپنشدوں کے موحدانہ ولولے ہندوستان کے عوام کو جذباتی تشفی بہم نہ پہنچا سکے۔ چناں چہ انھوں نے بہت جلد کشتری جاتی سے ایک ہیر دیوتا ڈھونڈ نکالا جس کے متعلق تھوڑی مدت کے بعد یہ عقیدہ رائج ہوگیا کہ وہ بنفسہٖ پر ماتما تھا اور پرمیشور کا اوتار بن کر اس سنسار میں زندگی بسر کرنے آیا تھا۔

کرشن بھگتی کو اپنے حریف کالی پوجا کی طرح جو عام مقبولیت حاصل ہوئی' وہ نہ صرف اس امر کی پرزور شہادت دیتی ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں ہندوستان کیسی مذہبی ابتری میں مبتلا تھا۔ بلکہ اس وسیع خلیج کو بھی نمایاں کرتی ہے' جو اُپنشدوں اور بھگوت گیتا کے لکھنے والے فلسفیوں کے ذہن اور عوام کے جذبات وخیالات کے درمیان حائل تھی۔ یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس علاقے میں داخل ہونے سے پہلے' جسے صحیح معنوں میں ہندوستان یا آریہ ورت کہا جاتا ہے' ان آریوں نے جو پنجاب میں آباد تھے' یا ان کے پروہتوں اور مذہبی معلموں نے بہت سخت قاعدے وضع کیے تھے' جن کا مقصد یہ تھا کہ آریوں نے اپنے طول طویل فاتحانہ کوچ کے دوران میں جن قوموں کو مطیع ومنقاد بنایا تھا' ان میں خلط ملط ہو جائیں۔ ان قوموں کو سماج کے اسفل ترین طبقے میں جگہ دی گئی انھیں اچھوت قرار دیا گیا اور جو مذہبی رسومات اونچی ذاتوں کے لیے مقرر تھیں' وہ ان کے لیے سختی سے ممنوع کر دی گئیں۔

وحدت الوجود کے موضوع پر آریائی ہندو فکر میں جو مدوجزر آئے ہیں' ان سب کے دوران میں ارواح اسلاف کی پرستش مذہبی ومعاشرتی نظام کا ایک لازمی جزو بن کر ہندوؤں کے ذہنوں میں جمی رہی ہے۔ یوں تو شودروں کو بھی اجازت تھی کہ اپنے آباؤ اجداد کی ارواح پر چڑھاوے چڑھائیں گے لیکن اگر کوئی برہمن ان کی پوجا میں شریک ہوتا' تو اسے بڑی سنگین سزا دی جاتی۔ اگر کوئی شودر اتفاقاً کسی برہمن کو منتر پڑھتے ہوئے سن پاتا' تو اس کے لیے یہ سزا مقرر تھی کہ اس کے کانوں میں پگھلا ہوا

سیسہ ڈال دیا جائے۔ اگر وہ کسی برہمن کے برابر چوکی پر بیٹھ جاتا تو اس کے بدن کو لوہے سے داغ دیا جاتا۔ شودروں اور تین اونچی جاتیوں کے لوگوں کی آپس میں شادیاں انتہائی بے رحمانہ سزاؤں کی مستوجب اور قطعاً ممنوع تھیں۔ لیکن کسی قسم کی قانونی پابندیاں بھی آریوں کے مذہبی افکار و عبادات کو اصلی باشندوں کے عقائد کا اثر قبول کرنے سے نہ روک سکیں۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ غیر آریہ قوموں اور قبیلوں کے دیوتا ہندوؤں کی دیومالا میں داخل ہو گئے۔ اور ان کی پوجا ہندوؤں کی آئے دن کی ریتوں میں شامل ہو گئی۔ بھانت بھانت کے پختہ اور خام نئے اور پرانے عقیدوں کے گڈمڈ ہو جانے کا نتیجہ ناگزیر طور پر یہ ہوا کہ فلاسفہ صدیوں سے جس پیچیدہ اور دقیق وحدت الوجودی نظامِ خیال کے ارتقا میں مصروف تھے اس میں ابتذال آ گیا۔

جب تک تابعین اسلام نے وہ پردہ نہ اٹھایا جس کے پیچھے ہندوستان ہزاروں سالوں سے ایک پراسرار زندگی بسر کر رہا تھا' اس وقت تک ہندوستان کی کوئی تاریخ نہ تھی۔ یہ کہنا ناممکن ہے کہ واسودیو کرشن کس زمانے میں گزرا یا اس کی شخصیت کیسی تھی۔ اس کے بارے میں ان گنت کہانیاں ہیں' جو بے سروپا اور لچر معلوم ہوتی ہیں' ظاہر ہے کہ یہ کہانیاں پروہتوں نے گھڑیں' جو دیوتاؤں سے اونچے نہیں' تو ان کے ہم سر ضرور بن گئے تھے اور جن کا فائدہ اس میں یہ تھا کہ عوام کے دلوں کو لبھائے اور رجھائے رکھیں۔ واسودیو کرشن کو ہندو دیومالا میں وشنو کے اوتار کا مقام حاصل ہے اور اس حیثیت سے وہ بھگوت گیتا کے اس حصے کی' جو بھکتی سے تعلق رکھتا ہے' مرکزی شخصیت ہے۔ وہ بدیہی طور پر ایک جامع شخصیات دیوتا ہے۔ اس کی ایک شخصیت وہ منش دیوتا' وہ رنگیلا کنتھیا ہے' جو گوکل کے گوالوں میں رہتا تھا اور برندابن کے مشہور کنجوں میں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ لیلا رچا کر اپنا جی بہلاتا تھا۔

واسودیو کرشن کے مسلک کا بنیادی رکن یہ تھا کہ پورا پورا دھرم یعنی ایمان مکتی نجات کی کنجی ہے۔ جو کوئی وشنو کے اس اوتار پر ایمان لے آتا' اس کے اعمال چاہے کیسے ہی ہوتے' اسے ابدی سعادت کا نصیب ہونا یقینی تھا۔

اس کامل ایمان کے نظریے نے بعض ایسی رسومات اور عقائد کو جنم دیا' جو اب تک ہندوستان میں رائج ہیں' چوں کہ پارسائی اس پر مشتمل سمجھی جاتی تھی کہ کرشن کو پرماتما سمجھ کر اپنے من میں لبھا لیا جائے اور پھر اپنے من سے پوری پوری لو لگا لی جائے' اس لیے عام لوگ بیراگ اور سنیاس کو مہاپن تصور کرنے لگے۔ آنکھیں اپنے بدن کے کسی ایک حصے پر جما کر اور من کو کرشن جی سے لگا کر سال ہا سال تک جنگل میں بیٹھے رہنا' برسوں تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہنا' بدن میں آنکڑے گڑوا کر ادھر ادھر گھسٹتے پھرنا' یہ سب ایسے کام تھے' جو سب پاپ دھو ڈالتے تھے۔ اگر کسی شخص کو کسی گناہ کا کفارہ دینا یا کوئی منت ماننا منظور ہوتا' تو وہ کسی آدمی کو کچھ دان دے کر اس کام پر لگا دیتا کہ وہ اس کے گھر سے دیوتا کے مندر تک کا راستہ اپنے بدن کی لمبائی سے ماپتا ہوا چلا جائے۔

بھگوت گیتا کا پورے دھیان کے ساتھ پاٹھ کرنے سے یا گنگا جل میں اشنان کرنے سے ساری برائیاں' دوش اور پاپ دھل جاتے تھے۔

شکتی پوجا نے بہت سے ہندوؤں کے دلوں پر جو سکہ جما رکھا ہے' وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ یہ سکہ اس نے کب جمایا۔ شکتی ہر ہندو دیوتا کا نسوانی نصف اور فعال تخلیقی پہلو ہے۔ شیو جی کی شکتی یا استری وہ بھیانک دیوی ہے' جو پاربتی' بھوانی' کالی' مہا کالی' درگا' چمپنڈا اور دوسرے ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ اس دیوی کی پوجا جیسے کہ وہ بھوا بھوتی کے ڈرامے میں' جو غالباً ساتویں صدی عیسوی میں لکھا گیا' بیان کی گئی ہے' انسانی قربانیوں اور دوسری انسانیت سوز رسموں کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اسے چاہے کسی نام سے پکارا جائے اور اس کی پوجا چاہے کسی طریقے سے کی جائے' اس میں عیسائی مذہب کی "مادرِ غم خوار" (MATER DOLOROSA) کی سی کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ اسکندریہ کے پجاری آئی سس (ISIS) دیوی کی طرف جو انسانی رحم اور انسانی دکھ درد سے ہمدردی منسوب کرتے تھے' اس کا بھی شائبہ تک ہندوؤں کی اس خوف ناک دیوی میں موجود نہیں۔ یہ ہیبت ناک بلکہ دہشت انگیز تصور' جو تنزل پذیر مذہبی نفوس کی پیداوار ہے' صریحاً غیر آریہ قوموں سے مستعار لیا گیا اور یہ ایک ایسا تصور ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے غیر اہل کتاب مذاہب میں نہیں ملتی اور تو اور سبلی (CYBELE) یعنی اہل روما کی مادرِ کبریٰ (MAGNA MATER) بھی اتنی بے رحم اور انسانوں کو دکھ پہنچانے کی اتنی شائق نہ تھی' جتنی تباہی کے دیوتا شو کی شکتی تھی۔ اس دیوی کی پوجا تنتروں کی رسومات کے مطابق کی جاتی ہے' جو گویا شکتی دھرم کی بائیبل ہیں۔ تنتروں کے بہت سے بھجن بھکتی اور سادھنا سے بھرے ہوئے ہیں اور دیوی سے جو پرارتھنائیں کی گئی ہیں' ان میں اکثر اس سے دیا اور کرپا کی بھیک مانگی گئی ہے لیکن فلسفیوں کے لیے تنتروں میں خواہ کیسے ہی صوفیانہ معانی ہوں' عام لوگ ان کی بتائی ہوئی پوجا پر لغو اعمل کرتے ہیں۔

تنتری پجاریوں کے دو بڑے بڑے گروہ ہیں۔ دکھنا چاری اور برہمچاری' یعنی دائیں ہاتھ کی اور بائیں ہاتھ کی ریتوں پر عمل کرنے والے۔ دکھنا چاری کی پوجا کھلے طور پر ہوتی ہے اور اس میں دوسری دیویوں مثلاً وشنو دیوتا کی شکتی لکشمی یا مہا لکشمی سے بھی خطاب کیا جاتا ہے۔ برہمچاری کی پوجا میں' جسے خاص طور پر تنتریکا کہا جاتا ہے' کالی دیوی بلاشرکت غیرے معبود ہوتی ہے۔ یہ پوجا تنہائی میں کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت سی ناپاک رسمیں ہوتی ہیں۔ سارے ہندوستان میں برہم چاری پنتھ کے پیروکار بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور اس کی بے شمار شاخیں ہیں۔ درگا پوجا میں' جو عموماً اگست کے مہینے میں منائی جاتی ہے' درگا کی مورتی کو سنگھاسن پر بٹھا کر جلوس نکالے جاتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں اس مورتی کو ہلدیہ رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ بنگال میں اس کی مورتی بالکل کالی ہوتی ہے۔ اس کے چار ہاتھ ہوتے ہیں اور وہ شیر پر سوار ہوتی ہے۔ کالی گھاٹ (جس سے کلکتہ کا نام پڑا) کے مندر میں دیوی خونچکاں سریوں کی ایک مالا پہنے ہوتی ہے۔ جے پور کے ایک مندر میں دیوی کا سر پیچھے کو مڑا ہوا ہے۔ روایت ہے کہ انسان کے بجائے اسے بکری بھینٹ چڑھائی گئی تو اس نے گھن کے مارے منہ پھیر لیا۔

ہندوؤں کے دو بڑے حماسوں سے جن میں سے ایک پانڈوؤں اور کوروؤں کی لڑائی اور دوسرا لنکا کے راجا راون کے ہاتھوں سیتا کے اغوا کی کہانی بیان کرتا ہے ہمیں کافی وضاحت کے ساتھ پتا چل جاتا ہے کہ اس زمانے میں کس قسم کے مذہبی عقیدے اور طریقے عوام میں رائج تھے۔ دونوں حماسوں میں ایک خاصے ارتقایافتہ معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ جس میں کافی مادی ترقی ہو چکی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اخلاقی انحطاط بھی بہت بڑھ چکا تھا۔ چناں چہ بدھ مت کے بانی گوتم بدھ کے خروج سے بہت مدت پہلے ہندوستان کے عوام میں مذہبی عبادت محض بلیدانوں اور چڑھاووں کا ایک رسمی مجموعہ بن کر رہ گئی تھی جس میں ثواب کا معیار پوجا کرنے والے کی نیکی یا پرہیزگاری نہیں بلکہ پروہت (جس کے بغیر ان رسموں کا ادا کرنا سرے سے ممکن ہی نہ تھا) کی یہ صلاحیت ہوتی تھی کہ وہ مناسب جنتر منتر پڑھ کر دیوتا کو دعا قبول کرنے پر مجبور کر سکے۔ گوتم بدھ اور مہابیر نے جو بغاوت کی وہ خود غرض پروہتوں کے اقتدار کے خلاف ہندوؤں کے دل سے اٹھنے والی ایک آواز تھی۔

دونوں مذہبی پیشوا اس کے منکر ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خالق ہے یا اس پر کوئی ایسی عقل کل حکمران ہے جو اس کا نظام چلا رہی ہے لیکن دونوں یہ اعلان کرتے ہیں کہ انفرادی زندگی بالآخر معدوم ہو جائے گی اور دونوں یہ کہتے ہیں کہ یہ نیک انجام صرف اچھے کاموں کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ان میں ایک فرق ہے۔ جین مت تو ہندو مت سے وابستہ رہا ہے اور اب عملی طور پر برہمنوں کے مذہب کا ایک فرقہ بن گیا ہے لیکن بدھ مت نے جرأت سے کام لے کر ایک نئی روش کی داغ بیل ڈالی اور اس پر چل نکلا۔ اس نے کرم یعنی عمل کو مکتی کا واحد وسیلہ قرار دیا اور اس کے جلیل المرتبت بانی کے عمر بھر عمل کے میدان میں جدوجہد کی۔ موت کے بعد انسان کی تقدیر کے بارے میں بدھ مت کا جو تصور تھا وہ برہمنی نظریوں کی عین ضد تھا اور اس کا سری تصوف بہت جلد دوسرے مذاہب میں سرایت کر گیا۔ لیکن اپنی جنم بھومی میں ایک مختصر مگر شان دار زندگی بسر کرنے کے بعد بدھ مت انتہائی مصائب سے دوچار ہوا۔ ظفر مند برہمن دھرم نے اسے جو سنگین سزائیں دیں ان کی روداد جنوبی ہندوستان کے مندروں کی دیواروں پر منقوش دکھائی دیتی ہے۔ بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اپنی اصلی صورت میں بدھ مت وہ کشش نہ رکھتا تھا جس کی بدولت برہمن دھرم نے اپنے پیروؤں کے دل موہ لیے۔ اس نے کبھی ایک مثبت دین ہونے کا دعویٰ نہ کیا۔ اس کی جزائیں اور سزائیں آیندہ زندگی میں راحت و سعادت کے وعدے اس زندگی میں فرائض ادا نہ کرنے کے نتیجے سب اتنے مبہم تھے کہ عام لوگوں کے دلوں پر ان کا کوئی اثر نہ ہو سکتا تھا۔ بہت جلد اس کے لیے ضروری ہو گیا کہ یا تو خارجی دنیا سے مقابلہ ترک کر دے یا جس مذہب کی جگہ لینے کی اس نے کوشش کی تھی اس سے سمجھوتا کرے۔ چناں چہ اسے اپنے پیروؤں کو یہ اجازت دینا پڑی کہ نیک کاموں کو چھوڑ کر پوجا پاٹ میں لگ جائیں یا اس کی بے لطف تعلیمات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے تنترک رسومات اختیار کریں۔ اسے اپنے اصلی وطن میں نہایت موافق حالات کے تحت جو ناکامی ہوئی اس نے اس کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ اپنے آپ کو ایک ولولہ انگیز مذہبی نظام ثابت کر سکے۔ اگر چہ یہ درست ہے کہ اس کے بعض صوفیانہ پہلو مغربی ایشیا اور مصر کے فلسفوں پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔

بدھ مت کے ہندوؤں سے دیس نکالے کے بعد برہمن دھرم نے دوبارہ غلبہ حاصل کر لیا جس زمانے میں بدھ مت کا راج تھا۔ اس زمانے میں برہمن دھرم نے جو برے دن دیکھے تھے ان سے اس نے کوئی سبق نہ سیکھا تھا۔ اس کے روحانی تصورات میں کوئی اصلاح نہ ہوئی تھی۔ چناں چہ وہ بے جان رسم پرستی جس کے خلاف مہاتما بدھ نے بغاوت کی تھی آگے سے بھی زیادہ استوار بنیادوں پر از سر نو قائم ہو گئی۔ بحال شدہ برہمن راج میں لوگوں کی زندگی پر ایک ایسے مذہب کا آگے سے بھی کڑا پہرہ لگ گیا جو محض قربانیوں کا ایک سلسلہ تھا۔ یہ مذہب لوگوں کے روحانی تقاضوں کی تو کیا تسکین کرتا، البتہ وہ ان کے حواس اور غالباً ان کے جذبات کو بھاتا تھا۔ عام لوگوں کی مذہبی عبادت بے معنی اور بے ہودہ رسموں کا ایک روزانہ چکر بن گئی۔ ان کے معبود پروہت تھے اگلوں کی روحیں تھیں اور محض ظاہر داری کے طور پر ویدوں کے دیوتا تھے۔ ہندوستان کے اصلی باشندوں سے جو بت پرستی ہندوؤں نے سیکھی تھی اسے نہ ان کا فلسفہ نہ بدھ مت کی اخلاقی تعلیم مٹا سکی۔ اس نے اب تمام جاتیوں کی اندرونی زندگی میں گھر کر لیا۔ درخت پتھر دوسری اشیائے فطری اور بت جو گھروں اور خاندانوں کے دیوتاؤں اور پرانے دیوتاؤں کی علامتی مورتیاں تھے عام لوگوں کے معبود بن گئے۔

منو کا دھرم شاستر جس پر ہندوؤں کو بجا طور پر فخر ہے اور جو بعد کے زمانوں میں دوسری مشرقی اقوام کے قانونی نظریوں کا نمونہ بنا ایک ایسی مملکت کا ضابطہ آئینی ہے جس میں ایک طرف تو مادی تہذیب بڑی ترقی کر چکی تھی اور دوسری طرف پروہتوں کے طبقے کا مطلق اقتدار اور عوام میں ایک تعجب انگیز اخلاقی انحطاط تھا۔ پروہتوں کی طرح اب راجا بھی دیوتا بن گیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں اگر چہ منوسمرتی کی اب بھی عزت کی جاتی تھی اور اسے ہر معاملے میں حتمی سند سمجھا جاتا تھا لیکن اس کی جگہ دھیان گرو بجنولکیہ کی تفسیر نے لے لی۔ اس کے نزدیک ذات پات کا فرق اتنا ہی پتھر کی لکیر تھا جتنا منو کے نزدیک تھا۔ دونوں کی نگاہوں میں شودر اتنے ہی ملیچھ تھے جتنے وہ ابتدائی زمانوں میں سمجھے جاتے تھے۔

نوزائیدہ بچیوں کو مار ڈالنے کی رسم ہندوؤں میں اتنی ہی عام تھی جتنی دور جہالت کے عربوں میں تھی۔ اس کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ملتا کہ ستی کی رسم کب شروع ہوئی لیکن قرائن بتاتے ہیں کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں عام تھی۔ بہر حال بیوائیں یقیناً جیتے جی چتا میں جل جانا خوشی سے قبول کرتی ہوں گی۔ کیوں کہ اگر ان کے اولاد نہ ہوتی تو ان کی زندگی اجیرن ہوتی تھی۔

عورتوں کو اجازت نہ تھی کہ ویدوں کا پاٹھ کریں یا اگلوں کی روحوں کو جو بھوگ دیے جاتے تھے ان کے دینے میں شریک ہوں یا دیوتاؤں کو جو بھینٹیں چڑھائی جاتی تھیں ان کے چڑھانے میں شمولیت کریں۔ استری کا دھرم یہی تھا کہ اپنے ناتھ کی

سیوا کرے اور اس کا جگ جگ کا سکھ چین اسی فرض کے ادا کرنے پر منحصر تھا۔ جو باوفا عورت اپنے سوامی کی چتا میں جل کر ستی ہو جاتی تھی' اسے ہندو مذہب کے تمام پیرو اپنے دل میں جگہ دیتے تھے اور صنفِ نسواں کے بہترین اور برگزیدہ ترین افراد میں شمار کرتے تھے' بلکہ اکثر اسے دیوی بنا کر اس کی پوجا کرتے تھے۔

اگر چہ سوچ بچار کرنے والے لوگوں کو ہندو مذہب کی ان رکیک رسموں میں کوئی گہرے معانی نظر نہ آتے تھے اور ان کی روحیں ان رسموں سے بلند تر فضاؤں میں پرواز کرتی تھیں' لیکن کسی فلسفی یا پنڈت نے بے بس اور عموماً نوعمر بیواؤں کی ان ظالمانہ قربانیوں پر نفرت یا غصے کا اظہار نہ کیا۔ بہت سی دھرم سبھائیں وجود میں آ گئی تھیں۔ جن میں مرد بھی شریک ہوتے تھے اور عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں اور جن کی امتیازی صفات میں پاک بازی شامل نہ ہوتی تھی۔ تجرّد کی زندگی بسر کرنے والی بہت سی منڈلیاں بھی بن گئی تھیں' جو مختلف دیوتاؤں کو پوجتی تھیں۔ ان کے اراکین ہمیشہ دھرم شالوں میں جمع ہوتے تھے' جن میں عورتوں کو بھی داخلہ دیا جاتا تھا۔ ان منڈلیوں میں اور اسی طرح جوگیوں اور سنیاسیوں کی ان منڈلیوں میں' جو اس زمانے کے لگ بھگ وجود میں آئیں' کنوار پن کا بچپن محض دھوکے کی ٹٹی تھا اور پالنے کی خاطر نہیں بلکہ توڑنے کی آسانی کی خاطر دیا جاتا تھا۔ جوگیوں کے جتھے مندروں اور مٹھوں میں مزے کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بہت سے بیراگی اور سنیاسی قرونِ وسطیٰ کے بھک منگے راہبوں کی طرح یا فلیولیس (Flaylis) کے عہد کے تارک الدنیا (CYNICS) کی طرح عقیدت مند لوگوں سے خیرات لے کر ثواب کمانے کی خاطر ادھر ادھر پھرتے رہتے تھے۔ خیرات دینے والوں کی نظروں میں ان کی سندِ استحقاق کیا ہوتی تھی؟ ان کے گندھے ہوئے لمبے لمبے بال' الجھی ہوئی گھنی ڈاڑھی' گیروے رنگ کا کرتہ' بھبوت ملا ہوا بدن' کشکول اور ڈنڈا۔

چوں کہ دیوتا ناچ اور گانے کے رسیا ہوتے تھے' اس لیے مندروں میں بہت سی ناچنے گانے والی عورتیں آتی تھیں جو نام کو تو دیوداسیاں کہلاتی تھیں لیکن دراصل پروہتوں کے آنند کے لیے رکھی جاتی تھیں۔ عورتوں کو شروع شروع کے قوانین میں بہت پست درجہ دیا گیا تھا۔ منو نے عورتوں کے بارے میں جو نفرت و ملامت سے بھرے ہوئے الفاظ لکھے ہیں' ان کی نظیر صرف عیسوی سینٹ ٹرٹلین (TERTULLIAN) کے تعصب انگیز اقوال میں ملتی ہے۔ منو کہتا ہے ''عورتوں میں ناپاک خواہشیں ہوتی ہیں' وہ ارادے کی کچی اور چال چلن کی خراب ہوتی ہیں۔ ضروری ہے کہ انھیں دن رات کڑی نگرانی میں رکھا جائے۔''

جہاں تک شودروں کا تعلق تھا' اس نے تقریباً (PANDECTS) کے الفاظ میں اعلان کیا کہ خدا نے انھیں غلام پیدا کیا ہے اور اگر کوئی شودر غلامی سے آزاد کر بھی دیا جائے تو بھی وہ آزاد نہیں ہوتا۔ چوں کہ غلامی اس کی فطرت میں ہے' اس لیے اسے کون اس سے چھٹکارا دلا سکتا ہے؟

اجمالاً یہ تھے آریہ قوم کی ایک سب سے زیادہ ترقی یافتہ شاخ کے مذہبی و معاشرتی حالات جس وقت' جب پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنا پیغام دنیا کو دیا۔

ایران

آیئے! اب ہم ایران پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ایران ہماری سنجیدہ توجہ کا مستحق ہے۔ ایک تو اس لیے کہ وہ اسلام کے مرز بوم سے اتنا قرب رکھتا ہے اور دوسرے اس لیے کہ اس نے نہ صرف دینِ موسوی اور دینِ عیسوی کے مزاج پر بلکہ فکرِ اسلامی پر بھی بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

مغربی آریہ ایک قوم کی صورت میں متحد ہو کر روحانی نشوونما کے مدارج طے کر کے اپنے قدیم وطن کی حدود سے باہر نکل پڑے اور ان علاقوں میں' جو آج کل ایران اور افغانستان کہلاتے ہیں' پھیل گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان علاقوں میں حامی اور کوشی (KUSHITE) نسلوں کے جو باشندے تھے' انہوں نے انھیں مسخر کر لیا یا تباہ کر دیا اور رفتہ رفتہ بحیرۂ خزر تک جا پہنچے جہاں وہ حامیوں اور کوشیوں سے زیادہ مضبوط اور جفاکش تورانیوں سے دوچار ہوئے۔ جو ماد اور سوسیانہ (SUSIANA) میں آباد تھے۔ لیکن اس سے پیش تر کہ وہ تورانیوں کو محکوم بناتے' وہ خود ایک غیر ملکی حملہ آور کے حلقۂ بگوش ہو گئے' جو یا کوشی تھا یا اشوری (اغلب یہ ہے کہ اشوری تھا) اور بڑی مدت تک اس کے زیرِ فرمان رہے۔ ان غیر ملکی فاتحین کے نکال دیے جانے کے بعد ایرانیوں اور تورانیوں کی وہ جنگ شروع ہوئی' جس میں کبھی ایک فریق غالب آ جاتا تھا اور کبھی دوسرا اور جو صدیوں تک جاری رہنے کے بعد ماد اور سوسیانہ میں تورانیوں کے محکوم بن جانے پر ختم ہوئی۔ افراسیاب اور کیکاؤس کے پیروؤں کو رزم و بزم میں ایک دوسرے سے بسا اوقات جو سابقہ پڑا۔ اس نے ایرانیوں کے مذہب پر ایک دائمی اثر ڈالا۔ تورانیوں کی انتہائی مادیت ان کے ایرانی حریفوں اور ہمسایوں کی ناپختہ تصوریت میں پستی پیدا کیے بغیر نہ رہی۔ ایرانیوں نے ماد کے قدیم آبادکاروں پر غلبہ تو پالیا' لیکن تورانیوں کے طریقہ ہائے پرستش ان کے مذہب میں داخل ہو گئے۔ چناں چہ جہاں ایران میں صرف ہرمزد کی پرستش کی جاتی تھی اور اہرمن کو ملعون سمجھا جاتا تھا' وہاں ماد میں خیر و شر کے ان دونوں نمائندوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ تورانی باشندوں کا ایرانی فاتحوں کے خدا کی بہ نسبت اپنے قومی دیوتا کی پرستش کی طرف زیادہ راغب ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ چناں چہ تورانی عوام اہرمن یا افراسیاب کو ہرمزد پر ترجیح دیتے تھے۔

مادیوں اور بابلیوں کا ایک تعاونی معاہدے کی بدولت' جو تاریخ میں اپنی قسم کا پہلا معروف معاہدہ ہے' اشوری سلطنت کا تختہ الٹ گیا لیکن اشوری مذہب بہت سے ایسے علاقوں پر جو آریوں نے فتح کیے' اتنی مدت تک مسلط رہ چکا تھا کہ زرتشتیوں کے تصورات پر اس کے نقوش کا ثبت رہنا ناگزیر تھا۔ سماوی رابطہ بندیوں اور ایک قدسی مراتب کا جو پیچیدہ تصور اشوریوں میں رائج تھا' اس کا پیوند زرتشتی مذہب میں لگ گیا۔ اب ہرمزد کی ایک اشور ثانی کے طور پر پرستش ہونے لگی اور ایرانیوں نے روشنی کے خدائے مہربان کو مجسم کرنے کے لیے جو علامتی نشان منتخب کیا وہ اشوریوں کا ایک پردار سپاہی تھا' جو ہاتھ اوپر کو اٹھائے اور ایک کمان تھامے سنسار چکر میں محصور کھڑا تھا۔ ان

کے ہاں جو جھاڑ نشو ونما کی علامت تھا' پہلے اس کی اوپر کو اٹھی ہوئی شاخیں مل کر صنوبر کے پھل کی شکل بناتی تھیں' اب وہ سرو کے پھل کی شکل بنانے لگیں۔ اس سے قبل کہ کسریٰ نے آ کر فتوحات کے ذریعے مملکت کو سلیمت بخشی ابتدائی مہاجروں اور آبادکاروں میں جو علامتی پرستش رائج تھی' وہ عوام کے ہاں بگڑ کر آتش پرستی بن گئی یا اس نے کلدانیوں اور اشوریوں کے صابی مذہب کی صورت اختیار کر لی۔

آشور کا شہر جس نے تقریباً ایک ہزار سال سرحدِ ہندوستان تک سارے مغربی ایشیا پر حکومت کی تھی اور جس کے زیرِ فرمان آنے سے فراعنۂ مصر کی سلطنت بال بال بچی تھی' طاقت ور سارگون اور عظیم سنجاریب (SENNACHERIB) کا شہر بابلیوں اور مادیوں کے مجموعی لشکروں کے ہاتھوں زیر ہو چکا تھا۔ اور ایسے طور پر زیر ہو چکا تھا کہ پھر اسے اقوام عالم میں سر اٹھانا نصیب نہ ہوا۔ بابل جو شروع شروع میں نینوا کا حریف رہ کر اشوریہ کے زیرِ نگیں آ گیا تھا' پھر ایک بار ایشیائی تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اس نے ان تمام علوم وفنون کو' جو ایک ہزار سال کی نشو ونما کا حاصل اور ''قوموں' مذہبوں' مندروں اور پروہتوں کے اختلاط کا نتیجہ تھے۔'' اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور زمانۂ سلف کے بے جان مذہبوں اور جدید اعتقادات کے درمیان رابطے کی کڑی بن گیا۔ اشوریہ نے اکادیوں سے نہ صرف ان کا تمدن اور ادب حاصل کیا تھا بلکہ ان کے مذہب سے بھی بہت کچھ اکتساب کیا تھا۔ بابل' جس کی عظیم تر شان وشوکت نے نینوا کی خاکستر کے اندر سے جنم لیا تھا' ایک ایسے مذہب کا علمبردار تھا' جو اشوری اور کلدانی مذہبوں کا نچوڑ تھا۔ بنونصر (بخت نصر) کے عہد حکومت میں بابل کی سلطنت اپنے اوج اقتدار کو پہنچ گئی۔ یہودیہ اس کی قلم رو میں آ گیا اور اس کے چیدہ وبرگزیدہ لوگ غلام بنا کر بابل میں منتقل کر دیئے گئے تاکہ اس کے دریا کے کنارے بیٹھ کر یہودہ کی بادشاہی کا ماتم کریں۔ یہ طاقت ور فاتح عرب میں بھی داخل ہو گیا اور وہاں اس نے بنی اسماعیل کو مسخر کر کے قریب قریب تباہ کر دیا۔ اس نے صوریوں کو بھی زبردست ضربیں لگائیں اور فراعنۂ مصر کی قوت کا بھی خاتمہ کر ڈالا۔ اگرچہ عبرانی وطن پرست دل کھول کر بابل پر لعنتیں بھیجتے ہیں' تاہم بابل نے یہودیوں پر اتنی سختیاں نہ کیں' جتنی مصر نے کیں۔ بنی اسرائیل خود اس فیاضانہ سلوک کی شہادت دیتے ہیں' جو ان سے کیا گیا۔ جب تک نجات دہندہ (یعنی حضرت موسیٰ) نے ایک جری لشکر لے کر اس بدنصیب شہر پر چڑھائی نہ کی' اس وقت تک بنی اسرائیل نے بابل کے خلاف کوئی آواز بلند نہ کی۔ لیکن جب انھیں رہائی مل گئی تو انھوں نے سب وشتم' بددعاؤں اور ملامت ونفرین کا وہ ہنگامہ برپا کیا' جو نسلِ عبرانی کے دورِ وحشت کا خاصہ تھا۔ ''بابل کے دریاؤں کے کنارے ہم بیٹھ گئے اور صیہون کو یاد کر کر کے روئے۔ اسے دخترِ بابل! خوش نصیب ہو گا وہ شخص' جو نوزائیدہ بچوں کو پتھروں پر پٹک دے گا۔ بنونصر کے عہد حکومت میں بابل بلاشک وشبہ اس دور کی تمام تہذیبوں کا مرکز تھا اور اس کے پروہتوں کو جو اثر ونفوذ حاصل تھا' وہ بابلیہ کی سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ختم نہ ہو گیا۔ یہودی نظام پر بھی اور عیسوی نظام پر بھی بابلی تصورات کے نقوش نمایاں طور پر ثبت نظر آتے ہیں۔ یہودیوں نے کلدانی مویدوں کے درمیان غریب الوطنی کی جو طویل زندگی گزاری' بعض عبرانیوں کو شاہ بابل کے دربار میں جو رسوخ حاصل ہوا اور دونوں قوموں میں ناگزیر طور پر جو میل جول ہوا' ان سب نے یک جا ہو کر قرونِ اخریٰ کی یہودیت کا مزاج بدل دیا۔ جب یہودی قیدی بنا کر بابل لے جائے گئے تو وہ نیم وحشی تھے۔ جب وہ دیارِ غربت کی طویل آزمائشوں کے بعد صیہون لوٹے' تو وہ ایک ایسی قوم بن چکے تھے' جو نظریات وعقاید میں ترقی یافتہ' بڑھے ہوئے حوصلوں اور مملو اور ایک وسیع تر سیاسی بصیرت کی مالک تھی۔

فتح بابل سے مذہب کے ارتقا کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب ایشیا پر مذہب ثنویت کی حکومت قائم ہو گئی۔ کسریٰ نے یہودیوں سے جو فیاضانہ رواداری کی' اس کے صلے میں انھوں نے قدرتی طور پر اسے ''مسیحا''' ''نجات دہندہ'' اور ''شفیع عالم'' کے القاب دیئے۔ عبرانی قبیلوں کی اسیری' ایرانی اقتدار کے مرکز کے قریب ان کا مجبوراً آباد ہونا اور کسریٰ کے تحت ان کا ایرانیوں سے اختلاط' یہ چیزیں غالباً زرتشتیوں کی اس مذہبی اصلاح کی محرک ہوئیں جو داریوش ہتاسپ کے تحت ظہور میں آئی۔ فعل وانفعال کا دوطرفہ عمل جاری رہا۔ اسرائیلیوں نے تجدید یافتہ زرتشتی مذہب پر ایک محیط کل قدسی شخصیت کا گہرا اور پائدار تصور مرتسم کر دیا۔ اس کے بدلے میں انھوں نے ایرانیوں سے ایک سماوی سلسلہ مراتب اور خیر وشر کی تخلیق کے اصول دوگانہ کا خیال اکتساب کیا۔ اب اسرائیلی یہ نہ کہتے تھے کہ خدا خود گناہگاروں کے اندر بدی کی روح داخل کر دیتا ہے۔ اہرمن کی طرح شیطان نے عبرانیوں کی مذہبی واخلاقی تاریخ میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔

کسریٰ کا عہد حکومت ملک گیری کا دور تھا' تنظیم کا دور نہ تھا۔ داریوش کا عہد حکومت استحکام کا دور تھا۔ وہ ہرمُزد کا پکا پرستار تھا اور اپنی ساری فتوحات کو اس کا احسان کہتا تھا۔ چناں چہ اس نے یہ کوشش کی کہ زرتشتی مذہب کو ساری غیر ملکی آلائشوں سے پاک کر دے' مادیوں کی مجوسیت کا قلعہ مسمار کر دے اور آریہ نژاد ایرانیوں کو مہذب دنیا کی سب سے بڑی طاقت بنائے لیکن انحطاط کا جو عمل شروع ہو چکا تھا' وہ کسی کے روکے رک نہ سکتا تھا۔ ایک سو سال نہ گزرنے پائے تھے کہ زرتشتی مذہب نے وہ ساری خرابیاں کوٹ کوٹ کر اپنے اندر بھر لیں' جس کا اس نے اپنے عہد طفلی میں مقابلہ کیا تھا۔ جو لوگ بُت پرستوں کے لیے عذاب کے فرشتے تھے اور جن کا جوشِ بُت شکنی اس غضب کا تھا کہ انھوں نے مصریوں کے متبرک بیل ایپس (APAS) کو ذبح کر ڈالا تھا اور اس کے استھان کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی' انھوں نے بہت جلد ہرمزد کی پرستش میں اپنے محکوم ملکوں کی سامی خداؤں کو داخل کر لیا۔ پرانی مجوسی عناصر پرستی ازسرِنو تازہ ہو گئی اور داریوش کے ایک قریبی جانشین اردشیر میمون (ARTAXERXES MNEMON) نے زرتشتیوں میں مخنث دیوتا متھرا کی پوجا رائج کرائی۔ یہ کلدانی دیوتا مِلتا یا اناتی تیس کا مثنیٰ تھا اور اس کے ساتھ لنگ پُوجا بھی وابستہ تھی۔ اس متھرا پوجا کا نشو ونما پا کر خوب صورت سورج دیوتا کی پرستش میں تبدیل ہو جانا تاریخ کے

عجائبات میں سے ہے۔ جگمگاتا ہوا سورج' پہاڑوں کی درزوں کے اندر سے نکلتا ہوا' بیل کو باڑے میں لے جا کر ہلاک کرتا ہوا اور اس کے خون سے انسانی گناہوں کا کفارہ ادا کرتا ہوا' یہ ایک ایسا تصور ہے' جو دنیا کے ایک عظیم مذہب پر اپنا ان مٹ نقش چھوڑ گیا ہے۔ متھرا کی پوجا کو رومی لشکری وادیِ فرات سے یورپ کے دُور ترین گوشوں میں لے گئے اور قیصر ڈائیوکلیشین (DIOCLATION) کے زمانے میں وہ روما کا سرکاری مذہب بن گئی۔

مجوسی زرتشتیوں کے تحت عورتوں کے جو حالات تھے' اس سے بدتر اور کبھی نہ ہوئے تھے۔ وہ مردوں کے من کی موج کی باندیاں تھیں۔ منو کے قوانین نے ایک قسم کی عصمت عائد کی اور اپنی گوت کے باہر بیاہ کرنے کا جو سخت قاعدہ ابتدائی آریوں میں رائج تھا' اس نے کسی حد تک نفسانی خواہشات پر لگام کا کام دیا۔ لیکن ایرانی جنسی تعلقات کے معاملے میں اپنی مرضی کے سوا کسی قانون کے تابع نہ تھا۔ وہ اپنی قریبی رشتہ داروں سے شادی کر سکتے تھے اور اپنی خوشی سے بیویوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ عورتوں کو پردے میں رکھنے کی رسم ایرانیوں ہی تک محدود نہ تھی۔ آیونیا (IONIA) کے یونانیوں کے یہاں عورتیں حرم سرا (GYNAIKONITIS) میں بند رہتی تھیں۔ جس کے دروازے عموماً قفل بستہ ہوتے تھے۔ اور انھیں سرِ عام باہر آنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ بہر حال ابتدائی زمانے میں یونانی حرم سراؤں کی رہنے والیوں کو مجروح کر کے بے بس کر دیا جاتا تھا۔ ایران میں عورتوں کی نگہبانی کے لیے خواجہ سراؤں کو ملازم رکھنے کا دستور قدیم ترین زمانوں سے چلا آ رہا تھا۔ یونان کی طرح ایران میں بھی جاریہ بازی یعنی باندیوں کو داشتہ بنا کر رکھنے کا دستور ایک معروف دستور تھا۔ اور معاشرے کی رگ و پے میں ساری تھا۔ بہر حال ایرانیوں نے شہوت رانی کو اپنی قومی عبادت میں داخل نہیں ہونے دیا۔ ان کے ہاں کوئی افروڈائٹی پینڈیموس (APHRODITE PANDEMOS) نہ تھی۔ زرتشتی معاشرہ اس اخلاقی وبا میں مبتلا نہ تھا' جو تمام بدکاریوں میں سب سے ذلیل بدکاری ہے اور یونان میں عام تھی اور پھر روم میں بھی پھیل گئی اور جس کا قلع قمع عیسائیت بھی نہ کر سکی۔

جب ہخامنشی سلطنت کو زوال آیا تو اس کے بعد زرتشت دنیا کی ترقی میں ایک قوتِ محرکہ نہ رہی۔ فاتحوں کے ان ٹڈی دل لشکروں نے جو ایران کی سرزمین پر جھکڑوں کی طرح آئے' معاشرتی اور اخلاقی زندگی کا نظام تہ و بالا کر دیا۔ سکندر مقدونی کا ظفر مندانہ حملہ بھانت بھانت کے جتھے جو اس کے جلو میں آئے' ایشیائے کوچک کے وہ ذلیل ترین لوگ بیلشی' صُوری' پمفیلی' فریزی اور لاتعداد دوسری قوموں کے لوگ نیم یونانی' نیم ایشیائی جو گار کی طرح اس طغیانی کے ساتھ آ کر ایران کی سرزمین پر پھیل گئے اور جو کوئی اخلاقی قانون نہ مانتے تھے' اور ان سب سے بڑھ چڑھ کر خود فاتح کا جلد باز اور بے دھڑک مزاج' ان سب نے مل کر زرتشتی مذہب کو پستی میں دھکیل دیا۔ قومی زندگی کے نمائندے موبد فاتح کی چیرہ دستیوں کے تختۂ مشق بنے۔ کیوں کہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ایشیا کو یونانی رنگ میں رنگنا تھا۔

سکندر کی زندگی ایک شہابِ ثاقب کی طرح تھی۔ قصے کہانیوں کا جو تانا بانا اس کی شخصیت کے گرد بنا گیا ہے اور جس نے اس کی زندگی کو ایک حماسہ بنا دیا ہے' اسے ہٹا بھی دیا جائے' تو اس صورت میں بھی وہ مہتم بالشان تصورات اور بلند ہمت مقاصد کا ایک مجسمہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ جس میں اعلیٰ درجے کی اولوالعزمی تھی' ایک ایسی زبردست فطانت تھی جو ہر طرح کی مخالفت پر غالب آ جاتی تھی اور ایک ایسی شخصی جاذبیت تھی' جس کی بدولت وہ اپنے اردگرد کے تمام لوگوں کے دل و دماغ کو اپنے ارادوں کے سانچے میں ڈھال دیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایک اجتماعِ ضدین تھی۔ وہ تھا تو ارسطو کا ایک شاگرد' جس کا نصب العین یہ تھا کہ ایشیا کو ایک یونانِ ثانی بنا دے اور خود ساری دنیا سے خراجِ عبودیت وصول کرے اور دوسرے وہ فلاسفہ و حکما کا ہم صحبت بھی رہ چکا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی نفرت انگیز زیادتیوں سے مملو تھی۔ اس کا ایک مداح ذیل کے الفاظ میں اس امر کا اعتراف کرتا ہے:

''صُور کی تاخت و تاراج اور اس کے باشندوں کو طوقِ غلامی پہنانا' ہندوستان اور باختر میں اس نے جو ہنگامۂ قتال برپا کیا' کلائٹس کا قتل' فلوٹس اور وفادار پارمینیو کی موت کے جو فرمان اس نے جاری کیے' طوائفوں کے کہنے پر تختِ جمشید کا جلانا اور اس کے کتب خانہ کو راکھ کا ڈھیر بنا دینا' یہ سب ایسے کام تھے' جن کی کوئی معذرت تاریخ پیش نہیں کر سکی۔''

سکندر کی فتح یابی اور ہخامنشی سلطنت کی بربادی کے بعد مذہب زرتشت کی جگہ یونانیت اور کلدانی تہذیب کی بدترین روایات نے لے لی۔ اساطیر لصنادید کے اس ہیرو کے دل میں بابل کی جو محبت اور اسے ایک نئی' قوی تر اور مکمل تر تہذیب کا مرکز بنانے کی جو زبردست خواہش تھی' اس کی وجہ سے اس نے تمام ایسے مذاہب و عقاید اور سیاسی یا مذہبی اداروں کو پروان چڑھنے سے روکا' جو اس کے واحد مقصد کے منافی تھے۔ سلیوکی حکمرانی کے تحت ایرانیوں کی قومی خصوصیات کو تبدیل کرنے کا عمل ثابت قدمی سے جاری رہا۔ اینٹیوکس اپی فینیز کو' جس نے یہودہ کے پرستاروں پر انتہائی مظالم توڑے' یہودیوں نے بھی اور زرتشتیوں نے بھی اہرمن کا نفرت انگیز لقب دیا۔ پارتھیوں کے برسرِ اقتدار آنے کا بھی یہ اثر ہوا کہ مذہب زرتشت کے زوال میں سُرعت آ گئی۔ سلیوکی فرماں روا دجلہ اور اورونٹیز کے کناروں پر حکمران تھے۔ پارتھیوں نے ہخامنشی سلطنت کے وسط میں اپنی بادشاہی قائم کی۔ یونانی باختری خاندان مشرقی علاقوں یعنی باختر اور شمالی افغانستان پر قابض تھے۔ سلیوکیوں کا سرکاری مذہب کلدانی اور یونانی مذاہب کا مرکب تھا۔ یہودی اور زرتشتی جلاوطن اور معاشرتی حقوق سے محروم کر دیئے گئے۔ پارتھیوں کے تحت مزدکیت اگرچہ بالکل ختم نہ ہو گئی' پھر بھی حکمرانوں کی نظر بچا کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئی۔ جن علاقوں میں امن و امان تھا' وہاں زرتشتیت مادیوں اور کلدانیوں کی پرانی صابیت سے مخلوط ہو گئی۔ اگر کسی جگہ وہ اپنی اصلی صورت میں قائم بھی رہی تو وہاں بھی اسے صرف چند ایسے موبدوں کے دلوں میں جگہ ملی' جو ملک کے دور دراز حصوں میں روپوش تھے لیکن جب پارتھیا پھیل کر ایک سلطنت بن گیا اور

پارتھی حکمرانوں کے سینوں میں شہنشاہ کے لقب کا شوق پیدا ہوا تو انھوں نے جبری تعدی کو چھوڑ کر رواداری کا شیوہ اختیار کیا۔ چناں چہ مجوسی زرتشتیت نے از سرِ نو مذاہب عالم کی صف میں سر اٹھایا۔ ساسانیوں کے عروج نے اسے مزید تقویت بخشی۔ نئی سلطنت کے بانی نے مویدوں کو اعیانِ مملکت کے منصب عطا کیے۔ ایک قریب مرگ مذہب کے یہ آخری نمایندے ان تمام امیدوں کا مرجع تھے جو زرتشتیوں کے دلوں میں ساسانی خاندان کے زیر سایہ نئی زندگی پانے سے متعلق پیدا ہوئیں۔ اس نئی سلطنت کے بانی اردشیر بابکان کی اولوالعزمانہ امنگیں کہاں تک پوری ہوئیں' یہ ایران کی تاریخ کی ایک چیستان ہے۔ ایران کی سیاسی آزادی' یعنی اس کی قومی زندگی تو بحال ہو گئی لیکن معاشرتی اور مذہبی زندگی اس حد تک زوال پزیر ہو چکی تھی کہ اس کا احیا حکمرانوں کے بس میں نہ تھا۔ قدیم تعلیمات کتابوں کے اوراق میں تو محفوظ تھیں' لیکن لوگوں کے سینوں میں وہ گشتاسپ اور رستم کی طرح مُردہ ہو چکی تھیں۔

سلطنت روما

ساسانیوں کے عہد میں زرتشتیوں کا اقتدار اپنے نقطۂ عروج پر تھا۔ کئی صدیوں تک وہ ایشیا کی سلطنت کے لیے رومیوں کے حریف رہے۔ بارہا انھوں نے روما کی فوجوں کو شکست دی۔ اس کے شہروں کو تاخت و تاراج کیا۔ اس کے قیصروں کو قیدی بنایا اور اس کی رعایا کی دولت لوٹی۔ لیکن ایک اخلاقی عامل کی حیثیت سے زرتشتیت کی آگ ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔ وہ آتش کدوں میں تو اب بھی جل رہی تھی' لیکن لوگوں کے دلوں میں بجھ چکی تھی۔ خدائے برحق کی پرستش کی جگہ کلدانی مجوسیت نے لے لی تھی۔ اردشیر نے جس سخت تعصب سے کام لے کر حریف مذاہب کو دبانے کی کوشش کی۔ اس سے بھی زرتشتیت کی حالت بہتر نہ ہوئی آخری ساسانی بادشاہوں کے تحت ایرانی سلطنت میں فرقہ بازی کا جو بازار گرم تھا' اس کے بادشاہ جس شہوت پرستی میں مبتلا تھے' اس کے اشراف و اعیان جس اخلاقی پستی میں گرے ہوئے تھے اور اس کے موید اور کشیش جس تکبر کا شکار تھے' ان سب چیزوں میں اس کی واحد نظیر بازنطینیوں کی سلطنت تھی۔ بادشاہ دیوتا تصور کیے جاتے تھے وہ رعایا کے جان و مال پر کلی اختیار رکھتے تھے اور رعایا غلاموں کی طرح تمام حقوق سے محروم تھی۔ بدکاریوں اور خرابیوں کی انتہا اس وقت ہوئی جب مزدک نے چھٹی صدی عیسوی کے آغاز میں اس اشتراکیت کا پرچار کیا' جس سے یورپ حال ہی میں آشنا ہوا ہے اور لوگوں کو یہ تعلیم دی کہ "وہ آگ' پانی اور گھاس کی طرح دولت اور عورتوں کو اپنی مشترکہ ملکیت سمجھیں' نجی املاک کو ختم کر دیں اور دنیا کی اچھی اور بری چیزوں میں برابر کے شریک ہوں۔" مجوسی زرتشتیت نے بہنوں اور خون کے رشتے کی دوسری عورتوں کے ساتھ شادی پہلے ہی جائز قرار دے رکھی تھی۔ اس اشتراکیت کے پرچار نے صحیح الخیال ایرانیوں کو برگشتہ خاطر کیا۔ چناں چہ مزدک' جو اپنے آپ کو زرتشت کا جانشین کہتا تھا' قتل کر دیا گیا' لیکن اس کے خیالات ایران میں جڑ پکڑ چکے تھے۔ وہاں سے وہ مغربی ایشیا میں بھی جا پہنچے۔

یہ خرابیاں اخلاقی زندگی کے انتہائی انحطاط کی علامتیں اور قوم کے مستقبل کے حق میں ایک فالِ بد تھیں۔ اس فالِ بد کو کسریٰ نوشیرواں کی بلند سیرت نے کچھ مدت تک پورا ہونے سے روکے رکھا۔ لیکن اس کی موت کے بعد وہ پوری ہو کر رہی۔ بہر حال ایک معلمِ عظیم کا ظہور ہو چکا تھا جسے دنیا کے جسدِ مردہ میں نئی روح پھونکنا تھی۔

یہودیوں کو بابل کی قیدِ غلامی سے آزاد ہوئے گیارہ صدیاں گزر چکی تھیں اور ان کے حالات میں بڑے تغیر رونما ہو چکے تھے۔ جو قیامتیں ملّت موسوی پر یکے بعد دیگرے ٹوٹیں' ان میں قیامت کبریٰ قیصران ٹائٹس اور ہیڈرین کی جنگیں تھیں۔ روم نے ان کے ہیکل کو مسمار کر دیا تھا اور تیغ و آتش سے ان کا بحیثیت ایک قوم کے خاتمہ کر دیا تھا۔ عیسوی قسطنطنیہ نے بھی اتنی ہی بے رحمی سے انھیں مظالم کا نشانہ بنایا لیکن انھوں نے ماضی کے تجربوں سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ انھوں نے شقی القلب جابروں کے ہاتھوں جو اذیتیں اٹھائی تھیں' ان سے انھوں نے انسانیت اور امن پسندی کا سبق نہ سیکھا۔ مصر' قبرص اور سیرینی کے شہروں میں جہاں وہ مقامی باشندوں سے دوستی کا ڈھونگ رچا کر بود و باش کر رہے تھے' انھوں نے جو انسانیت سوز مظالم کیے' وہ ان کی حالتِ زار پر رحم کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے۔ قوم اسرائیل کا گھر اُجڑ گیا' اس کے افراد روئے زمین پر آوارہ و سرگرداں تھے اور انھیں کہیں دیر تک امان نصیب نہ ہوتی تھی۔ وہ جہاں جاتے اپنا متمردانہ غرور اور اپنی شقاوتِ قلب' جس کی مذمت ان کے انبیا یکے بعد دیگرے کر چکے تھے' اپنے ساتھ لے جاتے۔ غیر ممالک میں جہاں کہیں انھیں پناہ ملی' انھوں نے اپنی تاریخ دہرائی اور وہی پہلے سے کرتوت کیے۔ یہ قوم امیدوں پر زندہ تھی لیکن امیدوں میں ایک طرف تو ایک اکھڑ اور کٹر تعصب اور دوسری طرف شہوت رانی اور عیش پرستی ملی ہوئی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ آ کر جا چکے تھے۔ لیکن وہ ان کی حالت کو بدل نہ سکے تھے۔ ایک مسیحا کے آنے کے بارے میں اس وقت جو خیالات عام تھے' حضرت عیسیٰؑ نے ان کی فضا میں آنکھ کھولی اور تربیت پائی۔ ناممکن تھا کہ اس معلم کے دل پر' جو اپنی قوم کے ادبار پر آنسو بہا رہا تھا' کتاب دانیال کا گہرا اثر نہ ہوتا۔ جو قوم کے سیاہ ترین ایام میں لکھی گئی تھی اور جو اس کی آرزوؤں کا اظہار اور اس کے لیے امید کا ایک پیغام تھی۔ پہاڑوں میں پناہ گزین زیلوٹوں کا شدید تعصب' صدوقیوں کی بے جان رسم پرستی' فریسیوں کی ظاہر دارانہ آزادمنشی' اسینوں کا ایک ہاتھ اسکندریہ کی طرف اور دوسرا بدھ مت کے پیرو ہندوستان کی طرف پھیلائے امیدوں بھرے خواب دیکھنا' اس درویش پرخروش کا ملامت آمیز وعظ' جس کی زندگی ہیرودیس کے دربار کی سیاہ کاری پر بھینٹ چڑھی' ان سب چیزوں نے حضرت عیسیٰؑ کو متاثر کیا۔ لیکن رومی عقاب نے یہودیہ کے دل کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا اور روما کے لشکر کسی قسم کے انقلاب کو سر اٹھاتے ہی کچل دیتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ترک دنیا کی جو تعلیم دی اور براہِ راست خدا کے ہاتھوں قائم کی جانے والی آسمانی بادشاہی کا جو پُرآزاد خواب انھوں نے دیکھا' دونوں ان کے وقت کی پیداوار تھے۔ وہ کسی سے مصالحت نہ کرنے والے ہٹ دھرموں کی قوم میں عالم گیر اخوت اور محبت کے پیغامبر بن کر آئے۔ ایک اکھڑ اور اکل کھری قوم میں رہ کر انھوں نے فروتنی اور انکسار کو اپنا

شیوہ بنالیا۔ وہ اپنے حواریوں سے شفقت و مودت کا سلوک کرتے تھے اور اپنے تمام پیروؤں کی بہبود کا خیال رکھتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے ایک عالی ظرفانہ ایثارِ نفس کی مثال اپنے پیچھے چھوڑی۔ طاقت ور' دولت مند حکمران طبقوں کے سینوں میں انھوں نے صرف نفرت' خوف اور دشمنی کے جذبات پیدا کیے تھے لیکن غریبوں' جاہلوں' ستم رسیدوں اور محروموں کے دلوں کو انھوں نے شکر گزاری اور محبت کے جذبات سے معمور کر دیا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت وہ دل میں یہ امید لے کر کہ وہ مسیحائے موعود بن کر دنیا میں جو کام کرنے آئے تھے' اس میں انھیں کامیابی حاصل ہونے ہی والی تھی' یہودی تعصب کے قلعے میں وارد ہوئے تھے۔ دو ہفتے نہ گزرنے پائے تھے کہ وہ اپنے وقت کی مفاد پرستی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ گئے۔

حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت اور زندگی پر افسانوں کا جو پردہ پڑا ہوا ہے' اسے ہٹایا جائے تو چند واقعات واضح طور پر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں۔ وہ غریبوں میں پیدا ہوئے اور ان کا پیغام بھی غریبوں کے لیے تھا۔ وہ ربانوی علوم میں بڑی دست رس رکھتے تھے۔ لیکن ان کی مختصر المیعاد تبلیغ صرف دیہات کے مسکین لوگوں یعنی غریب کسانوں اور گلیلی کے ماہی گیروں کے لیے وقف رہی۔ ان کے حواری بھی غریب اور ان پڑھ لوگ تھے۔ اگر چہ یہ لوگ زود اعتقاد تھے اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کے پراسرار طریقے سے غائب ہو جانے نے انھیں حیرت میں ڈال دیا۔ پھر بھی ان لوگوں نے انھیں ہمیشہ ایک انسان ہی خیال کیا۔ ان کے مجسم خدا یا فرشتہ ہونے کا تصور تو بعد میں سینٹ پال نے عیسائیت میں داخل کیا۔ کلیسا کا مؤرخ موشیم کہتا ہے کہ اگر چہ روح القدس کے خود بخود جلوہ گر ہونے کا وعدہ ہو چکا تھا۔ تاہم ''یہ ضروری سمجھا گیا کہ آسمانی پیغام کی حمایت کے لیے کوئی ایسا شخص ہو' جو اتنی علمی فضیلت رکھتا ہو کہ یہودی علما اور غیر اہل کتاب فلاسفہ کا مقابلہ خود ان کے ہتھیاروں سے کر سکے۔ چناں چہ حضرت عیسیٰؑ نے خود ایک آواز غیبی کی ہدایت پر ایک تیرھواں شخص اپنے حواریوں کے حلقے میں شامل کیا' جس کا نام سال تھا (بعد میں بدل کر پال ہو گیا) اور جسے عبرانی اور یونانی علوم سے کافی واقفیت تھی۔''

مجوسی زرتشتیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک نجات دہندہ فرشتہ یا سروشِ غیبی مشرق سے نمودار ہوگا۔ بدھ مت کے پیرو ایک مجسم دیوتا یا اوتار کے قائل تھے' جسے ایک کنواری کے بطن سے پیدا ہونا تھا۔ اسکندریہ کے صوفیوں نے کلام یا ایک ''نیم خدا'' کا نظریہ ایجاد کیا اور سائرس کی پیدائش' موت اور دوسری زندگی کے سرّی تصورات' آئی سس سریز کا تصور' یعنی اس کنواری ماں کا تصور' جو نو زائیدہ سورج دیوتا ہورس کو گود میں لیے ہوئے ہے۔ یہ تصورات مصر میں بھی اور شام میں بھی عام تھے۔ پال جو ایک صاحب علم فریسی تھا' ان نیم صوفیانہ اور نیم فلسفیانہ خیالات سے بڑی حد تک متاثر تھا۔ وہ ایک خیال پرست اور جوشیلی طبیعت کا آدمی تھا۔ سٹراس کے قول کے مطابق وہ جسمانی عارضوں میں بھی مبتلا تھا۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اسے حضرت عیسیٰؑ سے کبھی قریب کا تعلق نہ رہا تھا۔ چناں چہ اس کے لیے آسان تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف الوہیت کی صفات منسوب کر دے یا انھیں ایک مجسم فرشتہ کہے۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ کی سیدھی سادی تعلیمات میں فیثا غورثیت جدید کے پراسرار نظریے داخل کر دیے' جن میں مشرق بعید سے مستعار لیے ہوئے عقولِ ساویہ اور تین واجب الوجود ہستیوں کے تصورات بھی شامل تھے۔

ملکی اور غیر ملکی یہودی اور غیر یہودی تابعین میں جو رقابت تھی' اس کا مظاہرہ سب سے نمایاں طور پر حضرت عیسیٰؑ کے شاگردوں پطرس اور پال کی مشہور باہمی مخالفت میں ہوا۔ ابیونی غالباً بنی ناصری کے اصلی شاگردوں کے خیالات کے نمائندے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کی تھی اور انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو ''عقلی اور جوانی زندگی'' کے تمام اعمال میں اپنا ہم جنس اور ہم فطرت پایا تھا۔ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو بچپن' نوجوانی اور بلوغ کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے اور عقل و دانش میں ترقی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ چناں چہ ان لوگوں کا حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں جو عقیدہ تھا' وہ ان کی انسانی شخصیت سے اس واقفیت پر مبنی تھا۔ یہ اصلی عقیدہ تبدیلیوں کے ایک سلسلے سے گزر کر بگڑا' جس کی قابل ذکر کڑیاں دوسیتی' مارشونی' پتری پاسی اور ان سب سے اخیر میں نیس کی کونسل ہے' جو ۳۲۸ء میں منعقد ہوئی۔ اس زمانے میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ذات باری کا قرن بہ قرن صدور ہوتا ہے۔ اس کی بدولت ہر طبقے کے لوگوں نے' بالخصوص جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ کو دیکھا نہ تھا' ان کی انسانی شخصیت سے آشنا نہ ہوئے تھے اور ان کی آئے دن کی زندگی ملاحظہ نہ کی تھی۔ ان کی الوہیت کا نظریہ قیل و قال کے بغیر قبول کر لیا۔

جب حضرت عیسیٰؑ نے تبلیغ شروع کی۔ اس وقت روما کی سلطنت نصف سے زیادہ یورپ پر پھیلی ہوئی تھی اور تقریباً سارا شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا کا بہت بڑا حصہ اس کے زیر نگیں تھا۔ تاریخ کے ایک اتفاقی حادثے کی بدولت یہ وسیع اقلیم عیسائیت کی پود کیاری اور مخالف فرقوں کا میدان کارزار بن گئی۔

فریزیوں کی دیوی سبلی کے روم لائے جانے سے ایک صدی پیش تر بطلیموس سوتر' جو اسکندریہ کے سب سے خوش قسمت اور غالباً سب سے دور اندیش جرنیلوں میں تھا' مصر پر قابض ہو چکا تھا۔ مصریوں اور یونانیوں کو ایک مشترک مذہب کے رشتے میں مربوط کر کے ایک واحد قوم بنانے کی خاطر اس نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک ایسا طریق عبادات ایجاد کرے' جس میں دونوں قومیں شامل ہو سکیں۔ یہی خیال دو ہزار سال بعد اکبر اعظم کو سوجھا تھا۔ لیکن جہاں اکبر ناکام رہا' وہاں بطلیموس کو کامیابی ہوئی' کیوں کہ حالات سب کے سب اس کے مساعد تھے۔ یونانی زیوس' دمتیر اور اپالو یا ڈایونیشیس کی پوجا کرتے تھے۔ مرصی' اوسائرس' آئی سس اور ہورس کی۔ عقیدہ تثلیث دونوں میں مشترک تھا۔ مصری مذہب کا مدار اوسائرس اور آئی سس کے بیٹے ہورس کی اذیت کشی اور تسخیر تھی۔ یونانی مذہب کا مدار ڈایونیشیس کی اذیت کشی اور تسخیر۔ یونان کے شہر ایلیوس میں بھی پرستش کے پراسرار طریقے رائج تھے' جن میں نو واردوں کے داخلے کی مخفی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ مصری سر کشیش بھی آئی سس کی پراسرار پرستش کی

پیشوائی بھی اسی قسم کی مخفی رسوم کے ساتھ کرتے تھے۔ نہ یونانیوں کے لیے اور نہ مصریوں کے لیے یہ بات کوئی اہمیت رکھتی تھی کہ جن دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی یا جن کے سامنے رسوم ادا کی جاتی تھیں' ان کے نام کیا تھے۔ انھیں صرف پوجا اور رسوم سے مطلب تھا۔ ناموں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ یوں سیراپیوم کا مسلک وجود میں آیا۔ سیراپس نے یونانیوں کے ہاں زیوس کی اور مصریوں کے ہاں اوسائی رس کی جگہ لے لی۔ آئی سس نے اسکندریہ کے مسلک کی ''مادرِ غم خوار'' بن کر دیمیتر کو برطرف کر دیا اور ڈایونیشیس کو اب تک جو خراجِ عبودیت پیش کیا جاتا تھا' وہ اب ہورس ہپو کریٹس کو پیش کیا جانے لگا۔ بہرحال ڈایونیشیس نے ایشیائے کوچک کے ساحلی علاقوں میں اپنا مرتبہ نہ کھویا۔ چناں چہ عام لوگوں میں جو عقیدہ رائج تھا کہ ایک دیوتا انسانوں میں رہ چکا تھا اور اذیتیں اٹھا کر دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور پھر قبر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس عقیدے نے بعد میں عیسائیت کو پھیلنے میں سہولت بہم پہنچائی۔

کہا جاتا ہے کہ آئی سس' جس کی شان و شوکت اور جس کے شوہر کی عظمت ماند پڑ گئی تھی۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے اسّی سال پہلے روم میں پوجی جانے لگی۔ اس کی پوجا نے بہت جلد عوام کو بھی اور شائستہ طبقوں کو بھی اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس کی بھڑکیلی رسومات' اس کے سرمنڈے صفاچٹ ڈاڑھیوں والے پروہت' اس کے سفید پوش نوعمر اونی پروہت جو مشعلیں اٹھائے چلتے تھے' اس کے باوقار جلوس' جن میں اوسائی رس ہورس کی تکلیف اور موت پر غم و اندوہ کے پرجوش جذبات اور اس کے دوبارہ زندہ ہونے پر دیوانہ وار خوشی کے جذبات کے اکسانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جاتا تھا۔ اس کے صوفیانہ معانی سے مملو پراسرار عبادات اور سب سے بڑھ کر حیاتِ جاودانی کی بشارتیں ایک ایسی دنیا کے لیے جس کے پرانے دیوتا چپ ہو چکے تھے اور جو کائنات کے دائمی مسائل سے ایک قریب تر واسطے کی تمنائی تھی' بڑی کشش رکھتی تھیں۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آئی سس نے رومیوں کے دلوں پر مضبوطی سے قبضہ جما لیا۔

اگرچہ ''دکھیاریوں پر ایک ماں کی مامتا نچھاور کرنے والی'' آئی سس کی پوجا لوگوں کے جذبات پر ہمیشہ مسلط رہی' لیکن سورج دیوتا متھرا کے نسبتاً زیادہ مردانہ وار مسلک نے' جس میں پراسرار رسومات کے ساتھ ساتھ کفارہ گناہ کا نظریہ اور انسانوں کے ساتھ دیوتا کے براہ راست تعلق پر اصرار بھی تھا۔ رومی لشکریوں میں خاص ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ جہاں کہیں یہ لشکری گئے وہیں وہ متھرا پوجا کی یادگاریں چھوڑ آئے۔

عیسائیت کا جو دعوٰی ہے کہ اسے تمام مذاہب سے بڑھ چڑھ کر بلکہ کسی دوسرے مذہب کی شرکت کے بغیر یہ حق ہے کہ وہ ساری نوع انسانی کو اپنے پرچم کے نیچے جمع کرے اور اس کے ضمیر پر فرماں روائی کرے' اس دعوے پر منصفانہ رائے قائم کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ ان اسباب کو ذہن نشین کر لیا جائے' جو شہنشاہ قسطنطین کی تخت نشینی سے پہلے دینِ ناصری کی اشاعت میں مدومعاون ثابت ہوئے۔ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ دنیا میں آنے کی بشارت نے اور اس خوش خبری نے کہ ان کے آنے کے ساتھ ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی' جس میں غریبوں کو سرفرازی حاصل ہو گی اور دولت مند طبقہ کی جگہ غریب جنت کی نعمتوں کا لطف اٹھائے گا' ادنیٰ طبقوں کے دلوں میں امیدوں کی ایک ہل چل برپا کر دی۔ حضرت عیسیٰ کے قریبی حواریوں اور پیروؤں کے ولولوں سے بھری ہوئی امیدوں نے آس پاس کے لوگوں کو بھی متاثر کیا اور جیسے جیسے دینِ عیسوی کے مبلغوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے یہ پرجوش عقیدہ دور دراز علاقوں میں پھیلتا چلا گیا۔ قدرتی امر تھا کہ ایک ایسے مذہب کو جو عدم مساوات زیادتیوں اور بے انصافیوں کو بہت جلد رفع کرنے کا وعدہ کرتا تھا' عوام میں فوراً ہر دل عزیزی حاصل ہو جائے۔ یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ کے دوبارہ آتے ہی خدا کی بادشاہی قائم ہو جائے گی' لوگوں کے دلوں میں اس قدر راسخ تھا کہ اگرچہ اس عہد کا ایفا جس کے بارے میں یقین دلایا گیا تھا کہ وہ ابتدائی حواریوں کی زندگی ہی میں ہو جائے گا۔ مستقبل کی دھندلی دوریوں میں آنکھوں سے ہٹتا چلا گیا۔ تاہم جن توقعات اور امیدوں کو اس نے جنم دیا تھا' ان کا زور اس وقت تک کم نہ ہوا۔ جب تک عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں حتمی شکست نہ ہوئی۔ ایک ہزار سال کی مدت کے بعد جو پہلے مصائب کا اور پھر کامیابی کا دور تھا' دینِ عیسوی کے غازی اپنے آقا کے ظہورِ ثانی کا پختہ عقیدہ دل میں لیے ایک دوسرے مذہب کے نام لیواؤں کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے میدان میں آئے۔

اس کے علاوہ اور بھی اتنے ہی قوی اسباب تھے' جو عیسائیت کے اس صورت میں پھیلنے کے کفیل ہوئے' جو اس نے حضرت عیسیٰ کی وفات یا ابیونی اور مسلم عقیدہ کے مطابق ان کے پردۂ غیب میں چھپ جانے کے بعد اختیار کی۔

جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں' یہودیوں کے سوا ایشیائے کوچک' شام اور بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں کے تمام لوگوں میں ایک مرکز بنائے ہوئے خدا اور ایک تثلیث قُدسیہ کا تصور عام تھا مصریوں کے سراپیسی مذہب کا یہ ایک لازمی رکن تھا۔ لیکن آئی سس کی پوجا کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ رومی سلطنت کے ہر حصے میں تثلیث کا تصور سرایت کرتا چلا گیا۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ کی وفات کے بعد عیسائیت نے جن عقائد کی صورت اختیار کر لی' ان کے مانے جانے کے رستے میں نہ کوئی جذباتی اور نہ کوئی مذہبی رکاوٹ تھی۔

ساتھ ہی ساتھ فلسفیوں نے بھی عیسائیت کو کمک پہنچائی۔ اگرچہ غیر شعوری طور پر اور اس کی حمایت کرنے کے ارادے کے بغیر' بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس کے عقائد سے واقف ہوئے بغیر انھوں نے فطرت الٰہی اور حیاتِ بعد الموت کے بارے میں جو قیاس آرائیاں کیں' ان کا اثر یہ ہوا کہ آئی سس اور متھرا کے اسرار اور پرانے مسلکوں کی رسومات و عبادات پر بہت سے صاحبِ فکر لوگوں کا یقین متزلزل ہو گیا لیکن شائستہ طبقوں کے لوگ دینِ عیسوی کے انقلابی نظریات کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور اسکندریہ کے خداؤں اور سورج دیوتا نے ان کے دلوں پر کچھ اس طرح تسلط کر رکھا تھا کہ تقریباً تین صدیوں تک عیسائیت کی اشاعت ان پڑھ اور غیر متمول طبقوں تک محدود رہی۔ جب تک عیسوی کلیسا نے اپنے عظیم اور مسخر القلوب حریفوں سے بہت سے

ایمانیاتی مسائل اور ان کے تقریباً تمام قاعدے، رسمیں، عملیات اور ارادے مستعار لے کر اپنے الٰہیاتی اور عبادتی نظام میں داخل نہ کیے اس وقت تک اسے اصحابِ فرہنگ وثقافت میں مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ پھر جب یہ لوگ مذہبی جبر یا سلطانی حکم کے دباؤ سے کلیسا کے حلقے میں داخل ہوئے تو وہ اپنے ساتھ وہ تمام عناصر لے کر آئے، جنھوں نے جدید عیسائیت اور اس کے لاتعداد فرقوں کی تشکیل کی ہے۔ بہرحال دینِ عیسوی کی نشوونما کے ابتدائی دور میں اس بے پناہ جبر وتشدد نے جو صدیوں تک جاری رہا، عقائد ونظریات میں ایک طرح کی وحدت برقرار رکھی۔

عوام الناس میں آئی سس پوجا نے مریم پرستی کی شکل اختیار کرلی۔ حضرت عیسیٰؑ کی والدہ حضرت مریمؑ مصری دیوی کی جگہ ''امن کا ملجا'' اور ''رحم کا ماؤی'' بن گئیں۔ اب ان کی پرستش ''خدا کی ماں'' کے طور پر ہونے لگی۔ جیسی کہ آج تک لاطینی نسلوں میں ہوتی ہے۔

ترک دنیا فدایان اسکندریہ کے پرستاروں کا ایک مرغوب دستور تھا۔ فیثاغورث اور آرفیس کے مسالک کے تابعین اس پر عمل کرتے تھے۔ اور انھوں نے اسے گنگا کے ڈیلٹے کے پروہتوں سے، جس کے ہاں یہ عام تھا، اکتساب کیا تھا۔ عیسوی کلیسا نے اسے اختیار کیا اور مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے اسے مقدس قرار دیا۔ بپتسمہ دینے والے یوحنا کی رسم بالکل سیدھی سادی تھی۔ آئی سس پوجا کے زیر اثر وہ ایک پرتکلف اور پراسرار رسم بن گئی۔ داخلے کی رسم کی جگہ شرکت اعشائے ربانی کا قاعدہ رائج ہو گیا۔ اور تو اور آئی سس کی سری عبادات سے جو یہ عقیدہ متعلق تھا کہ مرے ہوئے خدا کا لہو شراب میں تبدیل ہو جاتا ہے، وہ بھی عیسوی نظام کا ایک لازمی جزو بن گیا۔ عیسوی کلیسا کے سرمنڈے صفا چٹ ڈاڑھیوں والے پادریوں کو، سفید پوش، خادموں کو، رسومات کی شان وشوکت کو، عشائے ربانی کے طریقوں کو، روزوں، ضیافتوں کی مدتوں کو تاریخ بین عینک لگا کر دیکھیے، تو وہ قدیم تر مذہب جن کی جگہ عیسائیت نے لی، اپنے سارے طمطراق اور دھوم دھڑ کے ساتھ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ عیسوی کلیسا کے مکالماتی دعائیہ سنگیتوں میں ہمیں وہ من موہنے بھجن سنائی دیتے ہیں، جو ہزاروں سفید پوش لڑکے لڑکیاں مل کر اسکندریہ کی دیوی (یعنی مغربی اہل کتاب دنیا کی ''مادر غم خوار'') کے حضور گایا کرتے تھے اور سینٹ پیٹر یا سینٹ کے پال کے گرجا سے سراپیوم کے مندر تک خیالی سفر کرنے کے لیے کسی خاص کوشش کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(تحریر: جسٹس سید امیر علی، ترجمہ: محمد ہادی حسن)

عالمی مذہبی حالات

خاتم النّبیین حضرت محمدؐ کے دور میں متداول ادیان زرتشت، برہمنیت (ہندومت)، بدھ مت، صابیت، یہودیت اور عیسائیت تھے جو دوسرے مذاہب سے زیادہ اہم اور ملکی عوام کے لیے آسانی سے قابل رسائی تھے۔ ان مذاہب کو آسمانی اور انسانوں کی جاری کردہ اصنام پرستی نیز دہریت سے بہتر تصور کیا جا سکتا تھا۔ یہ سب مذاہب بنیادی طور پر مصر کے قدیم مذہب سے متاثر تھے۔ لیکن ان مذاہب میں سے کوئی بھی مذہب پیغمبر اسلام کے حقیقت پسند ذہن کو مطمئن نہ کرسکا، مگر کیوں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے مذکورہ مذاہب کا تعارف ضروری ہے۔

قدیم مصری مذہب

مصر کے ابتدائی باشندے پتھروں، پہاڑوں، درختوں، چوپایوں، پرندوں، رینگنے والے جانوروں، مچھلیوں، کچھوؤں، مینڈکوں اور دوسری چیزوں کے علاوہ اپنے آباؤاجداد کی ارواح کو بھی پوجتے تھے۔ مصری مذہب میں کوئی مرکزی عقیدہ یا مخصوص عقائد نہیں تھے اور نہ ایک ہی مجموعے کی شکل میں کوئی مقدس کتاب تھی۔ مصریوں کا مذہب بہت سے پیچیدہ اور متضاد عقائد ونظریات کا مجموعہ تھا، لیکن یہ تضاد عین فطری اور ناگزیر تھا، اس لیے کہ مصر میں بسنے والے مختلف قبیلوں، گروہوں، اور پھر شہروں، قصبوں اور دیہات کے اپنے اپنے ''مقامی'' معبود اور سرپرست دیوی دیوتا تھے اور اسی مناسبت سے ان کے اپنے اپنے عقائد اور نظریے تھے۔ تخلیق کائنات سے لے کر آخرت اور جزاوسزا تک کے بارے میں ان کے ہاں عقائد وتصورات موجود تھے۔

مصری تاریخ کے ہر دور میں انسانوں اور دیوی دیوتاؤں کا باہمی ربط ایسا گہرا تھا، جیسے انسان اور اس کی شاہ رگ۔ انھوں نے اپنے دیوی دیوتاؤں کو اپنے ماحول، حالات اور معاشرے کی روشنی میں دیکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان سے پہلے سرزمین مصر میں دیوی دیوتا ہی آباد تھے۔ اس نظریے یا عقیدے پر مشتمل روایات ان کے نوشتوں میں تحریری طور پر مل چکی ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ مصر کے اولین حکمران بھی دیوتا تھے اور وہاں ان کی بادشاہتیں قائم تھیں۔ پتاح دیوتا، راع دیوتا، شو دیوتا، گیب، اوزیرس، حورس، ثوث وغیرہ شمالی اور جنوبی مصر کے حکمران رہ چکے تھے۔ مصریوں اور یونانیوں کی یہ روایات سرے سے بے بنیاد اور مضحکہ خیز نہیں ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ قدیم مصری دیومالا میں متعدد دیوی دیوتاؤں کو ہیرو بنا کر پیش کیا گیا تھا اور ان سے بہت سارے کارنامے منسوب کر دیئے ہیں۔ یہ کارنامے درحقیقت مختلف اشخاص یا گروہوں نے انجام دیئے تھے۔ ایسے انسان جو تھے تو انسان ہی، لیکن ان کے کام اور کارنامے دیوتاؤں کے سے خیال کر کے انھیں دیوتا بنا لیا گیا۔

مصریوں کا خیال تھا کہ ان کے معبود خود ان جیسے ہیں۔ ان کی طرح کھاتے پیتے ہیں، اوڑھتے پہنتے ہیں، محبت اور نفرت کرتے ہیں۔ ان کے جذبات، محسوسات اور خواہشات سبھی انسانوں کے سے ہیں ان کے دیوی دیوتا خوشامد پسند تھے۔ جھانسے میں بھی آ جاتے تھے۔ ان کی چاپلوسی کر کے لوگ اپنی التجائیں پوری کرا سکتے تھے۔ وہ رشوت بھی قبول کر لیا کرتے تھے، اور یہ رشوت مختلف قسم کے نذرانوں اور تحفوں کی شکل میں ہوتی تھی، مثلاً خوش بوئیات، مسالے، روغنیات، گوشت، پھل پھول، سبزیاں اور شراب وغیرہ۔ نذرانوں کو رشوت خیال کیا جائے یا دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ، یہ اپنی اپنی فہم کی بات ہے۔ مصریوں کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ مخصوص حالات کے تحت دیوی دیوتا بھی انسانوں ہی کی طرح دکھ اور تکلیف میں مبتلا ہو سکتے ہیں، جیسا

کہ است دیوی اور اوزیرس دیوتا است دیوی اور راع دیوتا کی اساطیری کہانیوں سے ظاہر ہے۔ دیوتاؤں کا انسانوں پر ایک اور احسان یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسانوں کو روزی کمانے کے طور طریقے اور معاشرتی تعلقات کی برکتوں اور بنیادی اخلاق سے دیوتاؤں ہی نے روشناس کرایا ہے۔

یہ درست ہے کہ عام مصریوں نے اپنے دیوی دیوتاؤں سے ایسی خصوصیات منسوب کر رکھی تھیں جو انسانوں میں پائی جاتی ہیں' لیکن ان کے مذہبی ادب سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ذہین افراد اور دانش ور ایسے ضرور تھے جو کسی عظیم تر اور برتر ہستی پر یقین رکھتے تھے۔ اس کی مثال سوڈان کے موجودہ وحشی قبائل سے دی جاسکتی ہے کہ وہ اگرچہ اپنے پیش رو قدیم مصریوں اور نوبیا والوں کی طرح ہر قسم کی بدارواح کو پوجتے ہیں' اس کے باوجود ایک ''ہستی اعلیٰ'' پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ شاید مصری یہ سمجھتے تھے کہ یہ برترین اور ارفع ترین ہستی اتنی عظیم' اتنی بلند و ماورا اور مقتدر ہے کہ انسانوں کے معاملات و مسائل سے واسطہ رکھنا اس کے شایان شان نہیں۔ چناں چہ اس برترین ہستی نے کاروجہاں بے شمار دیوی دیوتاؤں' نیک و بدارواح' فرشتوں اور شیاطین کے سپرد کر رکھا ہے کہ وہ دنیاوی امور کا انتظام و انصرام اور انسانی مقدرات کا فیصلہ کیا کریں۔ سعید ارواح کی تو مصریوں کو کوئی ایسی خاص فکر نہیں تھی' لیکن بدارواح کی بدخوئی اور ضرر رسانی سے خوف کھانے میں ان کی ساری عمر گزر جاتی تھی۔ اسی لیے ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ بدارواح کو نذرانے اور تحفے تحائف پیش کر کے' معمولی پوجا پاٹ کر کے انھیں خوش رکھا جائے اور ان کے غیظ و غضب سے بچا جائے۔

مصر کے تمام کائناتی دیوتاؤں میں سب سے پہلا مقتدر دیوتا ''آسمان'' کا دیوتا تھا۔ مصری زبان میں لفظ آسمان مونث ہے' اس لیے مصریوں نے آسمان کو دیوی بنالیا۔ اس کا نام ہاتور رکھا یا نوط۔ یہ یقیناً سورج دیوتا تھا ''جسے قرص خورشید'' کی شکل میں دکھایا جاتا تھا' جسے راع دیوتا اور ''آتن'' کے ناموں سے پکارتے تھے' بلکہ ''آتن'' تو سورج دیوتا راع سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ وہ پورے آسمان کی بھی تجسیم تھا۔ آسمانی سلطنت کا باسی تھا اور باز کی شکل میں رہتا تھا۔ ایسے کائناتی دیوتا کے لیے ضروری تھا کہ اس کا مسکن دھرتی سے اوپر ہی کہیں ہو۔ چناں چہ مصریوں نے اسے پروں والا دیوتا مانا جو اپنے پروں کی توانائیوں اور بھرپور اڑانوں کے سہارے اوپر فضاؤں میں رہتا ہے۔ مصر کے تمام پرندوں میں باز ہی سب سے جری' بہادر اور خوب صورت پرندہ تھا۔ دن کی بھرپور روشنی میں وہ صبح ہوتے ہی اڑانیں شروع کرتا تو شام کا اندھیرا چھانے تک اڑتا ہی رہتا۔ لامحدود فضاؤں کا سینہ چیرتا رہتا۔ پرندوں پر جھپٹتا۔ گویا یہ زمین اور آسمان کا نگران اور چوکس بادشاہ تھا۔ اس دیوتا کا نام ''حورس کبیر'' تھا اور حورس کبیر اور حورس خرد کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں کسی نہ کسی صورت میں برتر ہستی یا قادر مطلق یا معبود اعظم کا تصور موجود تھا۔

مصری مذہبی افکار و عقائد کا ارتقا ہزاروں سال پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کا مذہبی ادب بہت زیادہ مقدار میں دستیاب ہوا ہے' اتنی زیادہ مقدار میں کہ یہ باقی تمام قدیم مصری اصناف ادب کی مجموعی مقدار سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ اصل میں جس مذہبی معاشرے میں عام طور پر کاہن اور پجاری ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور یہی لوگ نوشتے بھی رقم کرتے تھے' وہاں ہمیشہ مذہبی ادب ہی غالب رہا۔ ان کی مذہبی تحریروں اور نگارشات کو ان کے ادب میں نمایاں اور خاص مقام حاصل ہے۔ یہ مذہبی تصانیف باقی تمام غیر مذہبی تصانیف کے مقابلے میں زیادہ مفصل اور طویل ہیں' اور انھیں زیادہ صحت اور احتیاط کے ساتھ مرتب کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پجاری اپنی مذہبی عبارتوں میں وقتاً فوقتاً تبدیلی و ترمیم کرتے رہتے تھے۔ تاہم یہ امر ذہن نشین رہنا چاہیے کہ قدیم مصری ادب صحیح معنی میں مرتب شدہ' یک جا مجموعے کی صورت میں نہیں ملا ہے۔ مصریوں کے ہاں مذہبی تصانیف کی وہی اہمیت تھی جو قرون وسطیٰ کے یورپ میں بائبل کو اور ہندوؤں کے نزدیک ویدوں کی تھی اور اب بھی ہے۔

زرتشتی مذہب

سرور عالم ؐ کے عہد میں رائج مذاہب میں سے غالباً قدیم ترین زرتشتی (یا زردشتی) مذہب تھا۔ آگ پرستی اس مذہب کا بنیادی عقیدہ اور طریق عبادت ہے' جس کے بانی ایران کے زرتشت تھے۔ ان کے والد کا نام پوروبش اور والدہ کا نام دغدا تھا۔ یورپ میں وہ زوراسٹر Zoraster کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ زرتشت کے متعلق ایرانیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اور زرتشت ایک ہی شخصیت کے نام ہیں اور صحف ابراہیمی اور ''اوستا'' ایک ہی چیز کا نام ہے' لیکن یہ خیال غلط ہے۔ اس نقطۂ نظر کو اسلامی دور میں آتش پرستوں نے رواج دیا' تاکہ اپنے آپ کو اہل کتاب ظاہر کر کے وہ سہولتیں حاصل کریں۔ زرتشت کی تاریخ ولادت میں فرق ہے۔ پارسی علما کہتے ہیں کہ وہ حضرت عیسیٰؑ سے کم از کم 1300 سال پہلے پیدا ہوئے۔ لیکن بیش تر محققین کے نزدیک زرتشت کی پیدائش 660 ق م ہیں' جب کہ وفات 583 ق م میں ہوئی۔

زرتشت کے مقام پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک وہ آذربائیجان میں پیدا ہوئے اور بعض کے نزدیک فلسطین میں۔ جب زرتشت کی عمر سات برس کی ہوئی تو ان کے باپ نے تعلیم کے لیے برزین خسرو کے سپرد کیا۔ ان سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد زرتشت نے سیر و سیاحت سے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے ایران کے دانش مندوں سے گفتگو کی۔ اکثر مرکزی مقامات پر گئے۔

ان کے بارے میں مشہور ہے کہ سات برس خاموش رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ زرتشت نے تیس برس تک محض پنیر پر جنگل میں بسر اوقات کی۔ تیس برس کی عمر مذہبی تیاری' عبادت' مراقبہ اور گوشہ نشینی میں گزاری۔ تیسویں سال انھیں خواب میں فرشتہ دکھائی دیا اور یہ فرشتہ انھیں خدا کے حضور میں لے گیا۔ اس کے بعد زرتشت کو سات دفعہ الہام ہوا۔ سات برس کے بعد اس کی چھ فرشتوں سے ملاقات ہوئی۔ یہ فرشتے رب النوع' حیوانات' آگ' مٹی' پانی اور درخت وغیرہ کے تھے۔ انھوں نے ان اشیا کی

حفاظت کے واسطے زرتشت کو ہدایت کی اور ان کا محافظ قرار دیا۔ اس طرح جب زرتشت کو نور مطلق کی پہچان ہوگئی اور کائنات کے اسرار و رموز سے واقف ہو گئے۔ اس کے بعد اس دین (مجوسیت) کی تبلیغ و اشاعت میں لگ گئے۔ کافی عرصہ تبلیغ کرنے کے باوجود صرف ایک شخص "مینی وماہ" اس دین میں داخل ہوا۔ اب زرتشت نے بادشاہ گشتاسف کو دعوت دی۔ بادشاہ نے یہ دین قبول کرلیا اور اپنی پوری سلطنت میں رائج کرنے کی کوشش کی۔ چناں چہ ایک عرب مؤرخ لکھتے ہیں:

"جب بادشاہ نے دین اختیار کرلیا تو اس نے اپنی رعایا کو جبراً اس دین میں داخل کیا اور جس نے انکار کیا' اسے مار ڈالا۔ اس طرح دین زرتشت ایران میں پھیل گیا اور اہل ایران کا یہ قومی دین ہوگیا۔ ضریر اور اسفندیار کی قوت بازو سے مغربی ایشیا اور ہندوستان میں بھی یہ دین پھیل گیا۔ بعض کا قول ہے کہ اہل یونان بھی اس دین کے کچھ معتقد ہوئے اور خود اہل یونان کا یہ قول ہے کہ افلاطون اس دین سے متاثر ہوا تھا۔"

کیا زرتشت پیغمبر تھے؟ اس سوال کے بارے میں بھی مورخین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے پیغمبر تھے اور خدا نے انھیں اہل ایران کی طرف بھیجا' تاکہ وہ ایک خدا کی تعلیم دیں اور لوگوں کو برائیوں سے روکیں اور انھیں راہ راست پر لائیں۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ زرتشت نے واضح طور پر توحید کا تصور پیش کیا' نیز دیگر تعلیمات بھی الہامی مذاہب جیسی ہیں' اس لیے یہ پیغمبر تھے۔ بعض عرب مورخین نے' جن میں ہشام' طبری' ابن الاثیر شامل ہیں' زرتشت کو بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر "آرمیانبی" کا شاگرد قرار دیا ہے۔ اسی طرح ایک عربی مورخ الدکتور حامد عبدالقادر نے اپنی کتاب "زرادشت الحکیم بنی قدامی الایرانیین" میں ثابت کیا ہے کہ زرتشت ایک نبی تھے اور انھوں نے توحید کی تعلیم دی۔

مذہب اور زرتشت کا دینی ادب

جس طرح زرتشت کے حالات زندگی اور تعلیمات محفوظ نہیں ہیں' اسی طرح اس کا مقدس دینی ادب اور کتب بھی غیر محفوظ ہیں۔ البتہ تمام مسلمان مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ اوستا دین زرتشت کی مقدس کتاب ہے۔ پہلوی زبان میں اسے "اوستاک" کہتے ہیں۔ یہ پہلے بہت ضخیم تھی' اب مختصر رہ گئی ہے۔ روایت ہے کہ یہ گائے کی بارہ ہزار کھالوں پر لکھی گئی تھی۔ سکندر یونانی نے دارا سوم کو شکست دے کر ایران پر قبضہ کیا تو اسے جلا دیا' لیکن حافظان اوستا نے صدیوں تک اسے اپنے سینوں میں محفوظ رکھا۔ پہلے اشکانی بادشاہ بلاش اوّل نے (151-178ء) نے اوستا کا متن مہیا کرنے کی کوشش کی۔ پھر اردشیر بابکان (226-241ء) بانی سلطنت ساسانی نے' جس کے عہد میں زرتشتی دین کا احیا ہوا' اوستا کے اصل متن کی فراہمی اور ترتیب کا بیڑا اٹھایا' مگر عام روایت یہی ہے کہ اصل کتاب کا صرف پانچواں حصہ فراہم ہوسکا۔

اوستا کے پانچ حصے ہیں جنھیں ناسک (Nesk) یا زند اوستا بھی کہتے ہیں۔ ان حصوں میں سے صرف گاتھا مستند طریق پر زرتشت کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ بظاہر گاتھا وہی لفظ ہے جسے ہندی میں گیتا یا گیت کہا جاتا ہے۔ یہ عبادات اور شادی بیاہ کے گیتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں عام فلسفے اور مابعد الطبیعیات کی باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ہر گیت تین لائنوں پر مشتمل ہے۔ یہ گیت گویا خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا میں مختلف ترانے تھے جو زرتشت کی زبان پر وقتاً فوقتاً جاری ہوئے۔

زرتشت کی تعلیمات

زرتشت کے تصور "الٰہ" کے بارے میں خاصا ابہام پایا جاتا ہے۔ بعض مصنفین کے نزدیک زرتشت عقیدۂ توحید پر قائم رہے اور خدا کو ایک مانتے تھے' وہ "آہورا مزدا" یا مقدس روح کا نام دیتے ہیں۔ بعض کے مطابق زرتشت ثنویت کے قائل تھے اور دو خداؤں کی تعلیم دیتے تھے' جس میں سے ایک روح خیر اور دوسری روح شر ہے۔ بعض کے نزدیک پہلے زرتشت عقیدۂ توحید پر قائم تھے' لیکن بعد میں ثنویت کی تعلیم دینے لگے۔

دین زرتشت میں خدائے مطلق کو "آہورا مزدا" (Ahuramazda) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسے یزداں بھی کہتے ہیں۔ اس کی چھ بنیادی صفات ہیں: شفقت' تقویٰ' خدا ترسی' نجات' دوام' بادشاہت یا حکومت۔ اوستا میں یزداں یا آہورا مزدا کی صفات اس طریقے پر بیان کی گئی ہیں:

1: آہورا مزدا عقل مند اور دانا بادشاہ ہے

2: آہورا مزدا سب سے زیادہ جاننے والا ہے

3: وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے جو ماضی میں ہوئیں' اور ان تمام چیزوں کو بھی جو مستقبل میں ہوں گی۔ وہ ان تمام اشیا کا اندازہ اپنی معرفت کُل سے کرتا ہے۔

4: وہ قادر مطلق ہے۔ وہ پاکیزہ ہستی ہے۔

اہرمن (Angramyinyaua) اوستا میں اسے "اینگرامینو" کے نام سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ دو عناصر کا مرکب ہے۔ ایک صفتی اور دوسرا اسم ذات کا نام رکھتا ہے۔ اس کے معنی سیاہ یا تاریک کے ہیں۔ اہرمن ایک تاریک اور دھندلی ذہانت ہے جو کہ "آہورا مزدا" سے دشمنی رکھتا ہے۔ وہ ہر بری چیز کو پیدا کرنے والا اور اسے تقویت دینے والا ہے۔ وہ شروع ہی سے آہورا مزدا (یزداں) کا مخالف ہے اور اس کے ساتھ دائمی اور متواتر جنگ جوئی میں مصروف رہتا ہے۔ یزداں جو کوئی اچھی چیز پیدا کرے' اہرمن اسے تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اہرمن ہر طرف تباہی و بربادی کرنے والا شیطان ہے اور دنیا میں برائی کا منبع ہے۔

اہرمن زمین کو بنجر کرسکتا ہے۔ اسے کانٹے دار' زہریلے پودے پیدا کرنے والی بنا دیتا ہے۔ وہ زلزلے' طوفان' ژالہ باری کی آفت' کڑک' بیماری اور موت پیدا کرسکتا ہے۔ یزداں اس پر قابو نہیں پا سکتا' سوائے اس کے کہ وہ گناہ والے کاموں پر دائمی نگرانی رکھے اور انھیں پھیلنے سے روکے۔ ان دونوں بڑی ہستیوں نے کائنات کی حکومت کو اس طرح اپنے درمیان تقسیم کرلیا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی تنہا رہنے سے مطمئن نہ تھا۔

زرتشت کی تعلیمات کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ دو خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ ایک خیر کا خدا جس کا نام آہورا مزدا (یزداں) ہے اور دوسرا شر کا خدا یعنی اہرمن۔ زرتشت کے مطابق دنیا کا خالق ایک نہیں' بلکہ دو ہیں۔ ایک وہ جس نے دنیا کی تمام مفید اور کار آمد چیزیں پیدا کیں' اور دوسرا وہ جس نے تمام مضر اور تخریبی اشیا کی تخلیق کی۔ اس مذہب کی اعلیٰ و برتر چیز مقدس آگ ہے' جو کہ واضح طور پر ہندوستانی اور ایرانی مذہب کا قدیم عنصر ہے' جسے زرتشت نے گہری اخلاقی اہمیت دی ہے۔ آگ کے متعلق زرتشت نے یہ تعلیم دی کہ یہ انصاف و نیکی کا زندہ نشان ہے۔ زرتشت کے ہاں آگ مسلمانوں کے قبلہ اور عیسائیوں کے صلیب کی طرح مقدس اور قابل احترام ہے۔ مقدس آگ کے تین درجے ہیں' یعنی اتاش' باہرام اتاش اور درگاہ۔ ان میں سے سب سے اہم درجہ ''باہرام اتاش'' کو حاصل ہے۔

زرتشت کے مذہب میں آتش پرستی کو باقاعدہ مرکزی حیثیت حاصل ہوئی' چناں چہ آتش پرستی کی وجہ سے اسے مجوسیت (پارسیت) کہا جانے لگا۔ مجوسیوں کے عبادت خانے یعنی آتش کدے میں آگ ہر وقت جلتی رہتی ہے اور آگ کی پوجا ہوتی ہے۔ زرتشت نے ایرانی بادشاہ گشتاسپ کے عہد میں پہلا آتش کدہ بنوایا تھا جسے آذر زرتشت کہتے ہیں۔ بعد میں گشتاسپ نے بلخ میں ایک بہت بڑا آتش کدہ تعمیر کیا' جسے آذر گشتاسپ کہتے ہیں۔ ایران میں بہت سے قدیم آتش کدے دریافت ہوئے ہیں۔ ان سب میں طرز تعمیر کا یہ پہلو مشترک ہے کہ ایک گنبد کے گوشوں پر ایک ایک محراب ہے۔ تمام مسقف حصے کے اردگرد ایک غلام گردش ہوتی ہے جس میں محرابیں کھلتی ہیں۔ آتش مقدس کی قربان گاہ گنبد کے نیچے ہوتی ہے۔

اسلام اور مجوسیت

قرآن مجید میں لفظ مجوس صرف ایک دفعہ' سورۂ حج کی آیت 17 میں آیا ہے۔ (ترجمہ): ''بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی' صابئی' نصاریٰ اور مجوسی ہوئے اور جو لوگ مشرک ہیں۔'' اس آیت کے ساتھ سورۂ بقرہ (62) اور سورۂ مائدہ (69) کا مطالعہ ضروری ہے۔ ان میں تین مقامات پر اہل کتاب کا ذکر ہے' لیکن صرف سورۂ حج ایسی ہے جس میں مجوسی کا نام بھی مذکور ہوا ہے' مگر اسی آیت میں مشرکین کا ذکر بھی آیا ہے' جو کسی حالت میں اہل کتاب کی اصطلاح میں شامل نہیں کیے جاسکتے۔ مجوسی دو خداؤں پر یقین رکھتے ہیں' ان کا نبی بھی حقیقی نبی نہیں' بلکہ ایک متنبّی ہے۔

حدیث شریف میں مجوس کے بارے میں خصوصی طور پر کچھ زیادہ مذکور نہیں۔ حدیث کا لب لباب یہ ہے کہ مجوسی اہل کتاب تو نہیں' لیکن بعض معاملات میں ان سے اہل کتاب جیسا سلوک کرنا چاہیے اور نتیجہ یہ ہے کہ ان کے لیے جزیہ ادا کرنا لازمی ہے۔ عملی طور پر مسلمانوں کا ترقی پزیر حکومتی اقتدار اس کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ کتب حدیث میں حضرت عبدالرحمٰن عوفؓ کی روایت مذکور ہے کہ آنحضورؐ نے مجوس سے جزیہ قبول فرمایا۔ آنحضورؐ نے مجوس کو خط لکھا کہ جو اسلام لے آئے گا' اس کا اسلام قبول کرلیا جائے گا اور جو اسلام نہیں لائے گا' اس پر جزیہ لگا دیا جائے گا' نہ اس کا ذبیحہ کھایا جائے گا اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کیا جائے گا۔ گو حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ آنحضورؐ نے بحرین کے زرتشتیوں کے سامنے پیش نہاد کی تھی کہ وہ اسلام اور جزیہ میں سے جس چیز کو چاہیں' قبول کرلیں۔ مجوس کے متعلق بعض دیگر احادیث بھی نقل کی گئی ہیں' لیکن وہ چنداں اہم نہیں۔ تاہم ان روایات پر اعتماد کرتے ہوئے فقہا نے مجوس کی بابت یہ جچی تلی رائے قائم کی کہ وہ اہل کتاب کی طرح ہیں' مگر خود اہل کتاب نہیں ہیں۔ بنابریں ان کے ذبیحہ اور عورتوں کے حلال ہونے کے سوا' جو قرآن میں صرف اہل کتاب سے مختص کیے گئے ہیں' ان سے تمام سلوک اہل کتاب جیسا کیا جائے گا۔ وہ ذمی بن کر رہ سکتے ہیں۔ ان سے جزیہ قبول کیا جاسکتا ہے۔ انھیں مملکت اسلامی میں بیع و شریٰ کی اجازت ہے' وغیرہ۔

آنحضورؐ کی بعثت کے وقت مکہ میں اس مذہب کا پیروکار کوئی نہ تھا۔ مگر ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں: ''تاہم مشرقی اور جنوبی عرب میں بہت سے زرتشتی (مجوسی) آباد تھے' جہاں مکہ کے تجارتی قافلے بکثرت آتے جاتے تھے۔ زرتشت کی کتاب ''اوستا'' جو ژندی زبان میں تھی' ناپید ہوچکی تھی' بلکہ اوستا کی شرح جو بہت بعد میں ''پاژند'' زبان میں لکھی گئی تھی' اور جس کے اوراق جستہ جستہ ہم تک پہنچے ہیں' نہ صرف نظر انداز ہوچکی تھی' بلکہ مجوسیوں اور مزدکیوں کے درمیان مذہبی جنگوں میں تباہ ہوچکی تھی۔ ممکن ہے زرتشت ایک خدا ''آہورا مزدا'' کی تعلیم دیتا ہو' لیکن عرب اور ثنویت (دوئی) اور خویدوگداس (تزویج محرمات) کا بانی تصور کرتے ہیں۔ ثنویت وہ عقیدہ ہے جس میں دو مستقل جوہر یا خدا مانے جاتے ہیں یعنی اہرمن اور یزداں۔ تزویج محرکات کے عقیدے کے مطابق حقیقی بہن' بیٹی اور ماں سے شادی کسی اور سے شادی کی نسبت بہتر اور مفید تصور کی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ عقائد اس مذہب کی حقیقی تعلیمات میں شامل نہ ہوں' مگر ساتویں صدی عیسوی کے اوائل تک یہ مذہب اتنا بگڑ چکا تھا کہ اس نے آگ کی پوجا کی شکل اختیار کرلی تھی۔''

چناں چہ مذاہب کے بارے میں آنحضورؐ کا رویہ آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ آپؐ کے دل میں اللہ کی تعظیم اس قدر تھی کہ وہ یہ تصور ہی نہ کرسکتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ''بدی'' پیدا فرماسکتا ہے۔ مگر ثنویت میں اہرمن کا جو تصور ہے' اس کے مطابق دو خداؤں میں مسلسل جنگ جاری ہے' جس میں فتح عموماً یزداں کو حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خالق کو بالواسطہ خوش کرنے کے لیے اس کی تخلیق کی تعریف بیان کی جائے۔ آنحضورؐ کے وقت میں آگ سے زیادہ طاقت ور کوئی عنصر نہ تھا۔ آگ ہر چیز کو جلانے اور تباہ کرنے پر قادر تھی۔ چناں چہ اسے اللہ تعالیٰ کی قدرت مطلقہ کا ایک مظہر تصور کیا جاسکتا تھا۔ ان کے خیال میں آگ کی تعظیم دراصل اس کے خالق کو تعظیم دینے کے مترادف تھی اور یہی بت پرستی تھی' حتیٰ کہ قدیم سے قدیم اور کٹر سے کٹر بت پرست کا بھی یہ عقیدہ نہ تھا کہ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا بت اس کا خدا ہے' بلکہ وہ اسے خدا کی علامت' اس کے کسی وصف کا اظہار یا مظہر ہی تصور کرتا ہے۔

حقیقی رشتہ داروں کے درمیان شادی کو ہمیشہ ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا

ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت آدمؑ جو اس دنیا کے پہلے انسان تھے اور جن کی اہلیہ ہمیشہ دو بچوں کو جنم دیتی تھیں‘ ایک حمل کی لڑکی کی شادی دوسرے حمل کے لڑکے سے کرتے تھے۔ ایک ہی حمل سے پیدا ہونے والے بہن بھائی کی شادی نہیں کی جاتی تھی‘ اور بعد کی نسلوں میں عم زاد بہنوں یا دور کی رشتہ دار لڑکیوں کو ترجیح دی جاتی تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اگر جڑواں بہن بھائی کے درمیان شادی رواج پا جاتی تو نسل انسانی پرندوں اور چوپایوں کی نسلوں کی طرح غیر محرک ہو کر رہ جاتی اور توام پیدائش معمول بن جاتی۔ چناں چہ انسانی ذہن کا ارتقا اور بلندی دور کے رشتہ داروں کے درمیان باہمی ازواج کی مرہون منت ہے۔ کچھ بھی ہو زرتشتوں (مجوسیوں‘ پارسیوں) کا عقیدہ تزویج محرمات (Incest) ایک ایسی اختراع تھی جسے قابل نفرت تصور کیا جاتا تھا اور اس کی وجہ سے پورے زرتشتی مذہب کی مذمت کی جاتی تھی۔ وہ جس انداز میں جانوروں کو ذبح کرتے تھے‘ عرب اس سے بھی نفرت کرتے تھے۔

جدید تحقیقات سے پتا چلتا ہے کہ زرتشت خدائے واحد‘ فرشتوں‘ الہام (یا وحی)‘ جنت اور دیگر امور پر ایمان رکھتا تھا۔ اس کی کتاب ''اوستا'' کے ایک قول کے مطابق اس نے ایک بت شکن کی آمد کی پیش گوئی کی‘ جس کا نام سوشیانت (سب پر رحم کرنے والا یعنی رحمت للعالمین) اور استوات اریات (لوگوں کو پستی سے بلندی پر پہنچانے والا) ہوگا۔

صابئیت

قرآن پاک میں اس مذہب کا دو مرتبہ نام آیا ہے۔ (سورۂ بقرہ 62 اور سورۂ حج‘ آیت 17) لیکن اس کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ تاہم اس آیت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ صابئیت بعض الہامی کتاب پر مبنی ہے ممکن ہے‘ یہ کتاب حضرت نوحؑ پر نازل ہوئی ہو جیسا کہ دور جدید کے صابی (Sabian) دعوٰی کرتے ہیں۔ اب اس کتاب کا تو کوئی وجود نہیں ہے‘ البتہ اس کے مندرجات کا لب لباب روایات کی صورت میں محفوظ ہے اور اس مذہب کے پیروکاروں میں مروج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ صابئیت کے پیروکار ستاروں کی پوجا کرتے ہیں اور ان کے اثرات پر یقین رکھتے ہیں۔ کبھی سات ممالک میں اس مذہب کے پیروکاروں کے معبد موجود تھے اور ان کے نام سات ستاروں کے ناموں پر رکھے گئے تھے۔ المسعودی کے مطابق صابی اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ مکہ مکرمہ کا معبد (کعبہ) زحل کے زیر اثر ہے جس کے لغوی معنی ''دوام'' کے ہیں (ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

صابی کے نام سے قدیم زمانے میں دو گروہ مشہور تھے۔ ایک حضرت یحییٰ کے پیرو‘ جو بالائی عراق کے علاقے میں اچھی خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور حضرت یحییٰ کی پیروی میں اصطباغ کے طریقے پر عمل کرتے تھے۔ دوسرے ستارہ پرست لوگ جو اپنے دین کو حضرت شیثؑ اور حضرت ادریسؑ کی طرف منسوب کرتے تھے اور عناصر قدرت پر سیاروں کی اور سیاروں پر فرشتوں کی فرماں روائی کے قائل تھے‘ ان کا مرکز حران تھا اور عراق کے مختلف حصوں میں ان کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دوسرا گروہ اپنے فلسفہ و سائنس اور فن طب کے کمالات کی وجہ سے زیادہ مشہور ہوا ہے۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ عہد نبویؐ میں پہلا گروہ موجود تھا‘ اور دوسرا گروہ بعد میں وجود میں آیا اور اگر عہد نبویؐ میں موجود تھا تو اس نام سے موسوم نہ تھا۔

ہندو مت

قرآن حکیم میں براہ راست برہمنیت کا ذکر نہیں آیا۔ درحقیقت سرور عالمؐ کے ظہور کے وقت ہندو مت اور اس کے مدمقابل مذہب بدھ کے درمیان موت و حیات کی کش مکش جاری تھی۔ آنحضورؐ ہندوستانیوں کو تو ضرور جانتے تھے‘ مگر یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے مذہب کے بارے میں بھی کچھ جانتے تھے (ڈاکٹر محمد حمید اللہ)۔ قرآن حکیم میں یہودیوں کے طلائی بچھڑے کی جو داستان بیان کی گئی ہے‘ اس کے مطابق اس بچھڑے کا خالق سامری نام کا ایک زرگر تھا (بائبل کا یہ کہنا کہ اس بچھڑے کا خالق حضرت موسیٰؑ کا بھائی ہارون تھا‘ درست نہیں)۔ اس ضمن میں چھوت چھات کا بھی ذکر آتا ہے (سورۂ طٰہٰ کی آیات 75 تا 97)۔ یہ دونوں یعنی گئو پوجا اور چھوت چھات برہمنیت کے خواص ہیں۔ سامری ان کے سرداروں کا ایک گروہ ہے۔ اگر گئو پوجا ان کی نمایاں خصوصیت ہے تو دوسرے مذاہب کے لوگوں سے چھوت چھات کا غیر انسانی تصور بھی انھی کا حصہ ہے۔

پھر قرآن مجید زبور الاولین (قدیم لوگوں کی حکایات پر مبنی کتب) کا بھی ذکر کرتا ہے۔ (سورۂ شعرا‘ آیت 196)۔ یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ ہندو برہمنوں کی متعدد مذہبی کتب ہیں اور وہ ان سب کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ ان میں پران بھی (جس کے لغوی معنی قدیم کتاب کے ہیں) شامل ہے۔ پھر حضرت ابراہیمؑ اور ہندو شاہ زادے رام کی کہانیوں میں حیرت انگیز مماثلت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو ان کے باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ جب وہ اپنی اہلیہ سارہ کے ساتھ مصر پہنچے تو وہاں کے بادشاہ نے جو ایک بداخلاق ظالم تھا‘ سارہ کو زبردستی اٹھوا لیا اور اپنے محل لے گیا‘ مگر ایک معجزے کی بدولت سارہ کی عصمت بچ گئی اور وہ شاہی تحائف کے ساتھ واپس اپنے شوہر کے پاس پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ مصری بادشاہ کی بیٹی ہاجرہ بھی تھیں جو آگے چل کر حضرت اسماعیلؑ کی والدہ بنیں۔ انجیل کے مطابق حضرت ابراہیمؑ کا اصل نام ''ابرام'' تھا۔ اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ابراہیم (بابائے قوم) کا خطاب دیا تھا۔ ہندوستانی شہزادے رام کو بھی اس کے باپ نے ملک سے نکال دیا تھا۔ جب وہ جنگل میں جلاوطنی کے دن پورے کر رہا تھا تو لنکا کا بادشاہ راون اس کی خوب صورت بیوی سیتا پر عاشق ہو گیا اور اسے زبردستی اغوا کر کے لے گیا۔ سیتا بھی اپنی عصمت بچانے میں کامیاب رہی۔ اس نے بعد میں ایک بڑی آگ میں سے صحیح سلامت گزر کر ثابت کر دیا کہ وہ عفت مآب تھی (حضرت ابراہیمؑ بھی نمرود کی آگ سے محفوظ رہے تھے)

ہندو اپنی مذہبی کتب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ شرتی (یعنی کانوں سے سنی ہوئی) اور سمرتی (باپ دادا کی روایات)۔ شرتی تو ویدوں پر مشتمل ہے‘ اور دوسرے حصے میں ساری کتب شامل ہیں جو ویدوں کے علاوہ ہیں۔ وید کسی خاص کتاب کا نام نہیں‘ بلکہ یہ نام ہے تقریباً دو ہزار سال کے طویل عرصے پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا۔ وید

چار ہیں' رگ وید' یجروید' سام وید' اتھروید۔ ہر وید کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

1: منتر بھاگ: اس حصے میں دیوی دیوتاؤں کو مخاطب کر کے ان سے دعائیں مانگی گئی ہیں۔

2: براہمن بھاگ: اس حصے میں منتروں کی تشریح کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کون سا منتر کس موقع پر پڑھنا چاہیے۔

3: ارنیک بھاگ: یہ حصہ جنگلوں میں تصنیف کیا گیا یا جنگلوں میں جا کر پڑھا جاتا ہے۔

لفظ وید صرف ان معروف کتب ہی کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ دوسری کئی کتابوں کو بھی یہ نام دیا گیا ہے' مثلاً آیوروید (طب)' سرپ وید (سانپ کا وید)' پشاچ وید (چڑیلوں کا وید)' اُسرِوید (شیطانوں کا وید)' دھنر وید (تیر کمان کا وید)' اتہاس وید (تاریخ)' پران وید (قصے کہانیوں کا وید)

مسلمانوں کے نزدیک جو تقدس قرآن حکیم کو اور عیسائیوں کے نزدیک بائبل کو حاصل ہے۔ وہی تحریم و تقدیس ہندوؤں کے نزدیک ویدوں کو حاصل ہے۔

رگ وید کی تکمیل اس وقت ہوگئی تھی جب آریہ پنجاب میں مستقل آباد ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے تھے۔ باقی تین ویدوں کی تالیف اس وقت ہوئی جب آریہ تہذیب وادی گنگا میں برگ و بار لانے لگی۔

آریہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ وہ تجربہ کار' دانا بزرگوں کے اقوال واشعار حفظ کر لیتے تھے جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہتے تھے۔ امتدادِ زمانہ سے اقوال واشعار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ جب آریوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تو قدما اور عقلا کے وہ تمام اقوال واشعار جو انھیں حفظ تھے' ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ اس طرح وید' ویدی ادب اور ویدی فلسفہ وجود میں آتے گئے۔ ان کا پورا زمانہ تالیف 1500 ق م سے 300 ق م تک محیط ہے۔ ویدوں کی تحریری زبان سنسکرت تھی۔ یہ اقوال واشعار جو دیوی دیوتاؤں کے حضور حمد و ثنا کی صورت میں ہیں' قربانی کے وقت پڑھے جاتے تھے اور ان کا حق ملکیت صرف ان خاص رشیوں اور ان کے خاندانوں تک محدود تھا' جنھوں نے انھیں بالکل ابتدا میں حفظ کیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی فنِ تحریر وجود میں نہ آیا تھا اور آج بھی اگر ویدوں کے مطبوعہ نسخے کسی وجہ سے ضائع ہو جائیں تو ایسے رشی اور پنڈت سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جو ویدوں کو لفظ بہ لفظ پوری صحت کے ساتھ پڑھ کر' بلکہ گا کر سنا سکتے ہیں۔

ویدوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ ابتدا میں مصریوں' یونانیوں اور رومیوں کی طرح مظاہرِ قدرت کی پوجا کرتے تھے' یعنی جن مظاہر یا چیزوں سے انھیں فائدہ پہنچتا تھا یا نقصان کا احتمال ہوتا تھا' ان کی پوجا شروع کر دیتے تھے' لیکن جوں جوں ان کی تہذیب ترقی کے مراحل طے کرتی گئی' خداؤں اور دیوتاؤں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ چاروں ویدوں میں کسی دیوی کا ذکر نہیں ہے' لیکن ویدی زمانے کے بعد متعدد دیویاں دھرم میں داخل کر لی گئیں۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ ان تمام دیویوں اور دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے قربانیوں اور پوجا پاٹ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا' اس پر عمل کرنا انتہائی دشوار ہو گیا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ایک ایسے طبقے کی ضرورت محسوس کی گئی جو عام معاشرے کے مفاد کی خاطر ان لاتعداد دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کا اہتمام کرتا رہے اور باقی لوگ کاروبارِ حیات میں مصروف رہیں۔ چناں چہ اس طرح ایک بڑی اونچی اُتم جاتی وجود میں آئی جسے برہمن کہا جاتا ہے۔

برہمنیت

ویدوں کے زمانے کے بعد برہمنوں کو مذہبی قیادت حاصل ہو گئی تھی۔ انھوں نے اپنی مذہبی قیادت کے جواز کے لیے جو کتب تالیف کیں' انھیں ''برہمنا'' کہا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ یوں متعین کیا جا سکتا ہے کہ ان میں سکندر یونانی اور ہنوں کا ذکر نہیں ہے۔ وادی گنگا و جمنا میں آریاؤں کے آباد ہونے کا زمانہ برہمنا کا زمانہ کہلاتا ہے۔ برہمنا دراصل ویدوں کے ضمیمے یا تتمے کی حیثیت رکھتے ہیں' انھیں رسوم اور دینیات کی کتب کہا جا سکتا ہے۔ برہمنا کا عہد 800 تا 500 ق م ہے۔ اس سے پہلے ویدوں کا زمانہ امید و رجائیت اور خوشی و خوش حالی کا زمانہ تھا' لیکن برہمنا کے آغاز میں ہندو ذہن پر مایوسی اور قنوطیت غالب آ گئی۔ ہندو مذہب میں زوال شروع ہوا۔ ایک پیشہ ور مذہبی طبقے نے جنم لے لیا اور تمام مذہبی رسوم اور عبادات کی پیشوائی انھی کے ہاتھ میں تھی۔ اس طرح ہندو مذہب میں ذات پات کی ایسی تقسیم ہوئی کہ آج تک اس لعنت سے چھٹکارا نہیں پایا جا سکا۔

''برہمن'' کے وجود میں آنے سے وہ آریہ جو کھلے میدانوں میں سورج اور روشنی کی عبادت کرتے تھے' مندروں کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے لیے ہزاروں اقسام کے مندر تعمیر کیے جانے لگے' جن پر ''برہمن'' کی آقائی اور مولائی مسلط ہو گئی۔ معاشرت اور مذہبیت کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد اونچی اور نیچ ذاتیں مختص کی گئیں۔ یہ تخصیص برہمنوں کے ایما پر کی گئی۔ نیچ ذاتوں کا کام صرف اونچی ذات والوں کی سیوا تھا۔ انسانی تاریخ نے اپنے کسی دور میں بھی اتنے ذلیل فلسفہ عمل کو نہیں اپنایا۔ اونچ نیچ کا تصور کسی انتظامی بنیاد پر قائم نہیں تھا' بلکہ برہمنوں نے اس کی دوامی بنیادیں وضع کرنے کے لیے ایک مذہبی عقیدے کی تخلیق کی تھی جسے تناسخ یا آواگون کہلاتا ہے۔

عقیدۂ آواگون

انسان کے مرنے کے بعد روح کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

1: جسم کے ساتھ روح بھی ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے۔ (یہ خیال مادہ پرستوں کا ہے)

2: اسے اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا کے مرحلے سے گزر کر ہمیشہ کے لیے جنت یا دوزخ میں رہنا پڑے۔ (یہ خیال اہلِ کتاب یعنی یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کا ہے)

3: اسے اپنے اعمال کے مطابق قالب بدلنے پڑیں' تاوقتیکہ وہ اپنی اصلی حالت پر آ کر خدا سے مل جائے۔ (یہ خیال ہندوؤں کا ہے۔ اسی کو آواگون کہتے ہیں)

آواگون کی رو سے انسانوں کی روح مختلف اشکال اور اجسام کی صورت میں دنیا میں آتی رہتی ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے کسی پچھلے جنم میں برے اعمال کا ارتکاب کیا تھا' دنیا میں اپنے کیے کی سزا پانے کے لیے نیچ ذات میں پیدا کر دیئے گئے' تا کہ وہ اونچی ذات والوں کی مخلصانہ خدمت سے اپنی سابقہ بداعمالیوں کا پرائسچت (کفارہ) ادا کر سکیں اور آیندہ جنم میں انھیں کسی اونچی ذات کے اساہ یا حیوان کی شکل میں پیدا ہونے کا موقع ملے اور ان کی مکتی (نجات) کی صورت پیدا ہو۔ بے چارے شودر موجودہ جنم اور آیندہ جنم کی اصطلاحوں کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ برہمنوں نے مزید تحفظ کے لیے یہ انتظام کیا کہ برہمنوں اور راجاؤں کے سوا ہر شخص کے لیے سنسکرت پڑھنا' لکھنا' سننا اور سمجھنا ممنوع قرار دے دیا۔ وید سنسکرت زبان میں تھے اور یوں برہمنوں نے ان کے اوپر اپنی اجارہ داری بھی قائم کر لی اور راجاؤں کو بھی اپنا دست نگر بنا لیا۔ شودروں کے لیے اس خاندان کی خلاف ورزی کی سزائیں بہت شدید تھیں۔ یعنی اگر کوئی شودر سنسکرت کا کوئی لفظ زبان سے ادا کرے تو اس کے حلق میں' اور سنے تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا گرم سیسہ ڈال کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ شودر اچھوت سمجھے جانے لگے' یعنی ان سے مس ہونا بھی حرام قرار پایا۔ کسی مندر کے قریب سے شودر کا گزرنا یا کسی برہمن پر اس کی پرچھائیں کا پڑ جانا بھی اس کے لیے موت کی سزا لاتا تھا۔ ابتدا میں برہمن صرف ''سپاہی'' سے مرعوب تھے' لیکن برہمنیت کی بنیادیں مضبوط ہو جانے کے بعد وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ عام لوگوں کا صرف یہ فرض تھا کہ وہ ہزاروں دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے برہمنوں کی معرفت' قربانیوں کے لیے مویشی اور بعض حالات میں شودر فراہم کرتے رہیں۔

برہمنیت کا فلسفہ

رگ وید کی تالیف کے زمانے میں جب آریہ لوگ پنجاب میں آباد تھے تو اسے تاریخ میں آریہ تہذیب کا پہلا دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانے کی تہذیب کا واحد مآخذ صرف رگ وید ہے' اور اس عہد میں ان کی معاشرتی زندگی بہت سادہ تھی' لیکن ستلج پار کرنے اور وادی گنگا وجمنا میں آباد ہونے کے بعد انھوں نے پر پرزے نکالے۔ اسے آریہ تہذیب کا دوسرا دور کہا جاتا ہے۔ ذات پات کی تقسیم وتفریق اسی دوسرے دور میں پیدا ہوئی' جس کی عمارت ایک فلسفہ حیات وکائنات پر تعمیر کی گئی۔ اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے: برہمن کے لفظی معنی ہیں روح کائنات۔ یہ روح کائنات تریمورتی (مثلث) کہی جاتی ہے یعنی ایک وجود میں تین خدا' اس لیے برہمن کی ذات میں تین خدا پوشیدہ ہیں۔

ایک براہما (کائنات کو پیدا کرنے والا)

دوسرے وشنو (کائنات کو برقرار رکھنے والا)

تیسرے شیو (کائنات کو تباہ کرنے والا)

براہما نے سب سے پہلے جس انسان کو وجود بخشا' وہ منو تھا۔ منو کے وجود سے تمام بنی نوع انسان اس طرح وجود میں آئے:

1: منو کے سر سے تمام مقدس انسان پیدا ہوئے جو برہمن ہیں۔ برہمن کا کام دینی تعلیم اور پوجا پاٹ کرنا ہے۔

2: منو کے ہاتھوں سے وہ لوگ پیدا ہوئے جن کا کام حکومت اور جنگ کرنا ہے۔ انھیں کھتری کہتے ہیں۔

3: منو کے کولھوں سے وہ لوگ پیدا ہوئے جن کا کام زراعت اور صنعت وحرفت ہے۔ کاشت کار' فن کار' دست کار ان میں شامل ہیں' انھیں ویش کہتے ہیں۔

4: منو کے پیروں سے وہ لوگ پیدا ہوئے جن کا کام ان تین طبقوں کی خدمت کرنا ہے۔ انھیں شودر (اچھوت) کہتے ہیں۔

دوسرے قدیم مذاہب کی طرح ہندومت بھی کسی آنے والا کا منتظر ہے۔ مثال کے طور پر ہندوؤں کی کتاب اتھروید میں اس آنے والے کا نام نرمی شنسا استی وشیاتی (یعنی محمود' جس کی تعریف وتوصیف کی جائے) بتایا گیا ہے۔ اس کی گاڑی کو اونٹ کھینچیں گے' وہ اتنی تیزی سے رواں دواں ہوں گے کہ وہ آسمان کو چھو رہے ہوں گے وغیرہ۔ ہندوؤں کی ایک اور کتاب ''وشنو پران'' کے باب 24 میں کہا گیا ہے کہ ویدوں کی تعلیمات پس پشت ڈال دی جائیں گی۔ قانونی ادارے عضو معطل ہو کر رہ جائیں گے اور تاریک دور کا انجام قریب ہوگا تو خدا کا ''آخری اوتار'' ایک جنگ جو کی شکل میں آئے گا۔ وہ سنبلہ دب (ریت کا جزیرہ' صحرا) کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوگا۔ اس کے باپ کا نام وشنو یاسا (عبداللہ) اور ماں کا نام سومتی (آمنہ: جس پر ہر طرح اعتماد کیا جا سکے) ہوگا' وغیرہ۔

جین مت

چھٹی صدی قبل مسیح کو انسانیت کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ شاید پوری دنیا میں انسانوں پر ویسے ہی ذہنی وجسمانی مظالم ڈھائے جا رہے تھے' جو برہمنوں نے اقتصادی ترقی وخوش حالی اور تہذیبی جم جماؤ حاصل کرنے کے باوجود ذات پات کی تقسیم' عقیدۂ تناسخ اور انسانی وحیوانی قربانیوں کی صورت میں روا رکھے۔ ہندوؤں اور بالخصوص ان کے مذہبی راہ نما یعنی برہمنوں ہی کے مظالم وشدائد کا ردعمل تھا کہ اس زمانے میں چین اور ہندوستان سے لے کر ایران اور یونان تک' مختلف ملکوں میں بڑے بڑے مصلح' فلسفی اور بانیان مذہب پیدا ہوئے۔ اس صدی میں ہندوستان میں گوتم بدھ اور مہاویر پیدا ہوئے۔ چین میں کنفیوشس اور لاؤزے' ایران میں زرتشت اور یونان میں فیثاغورث۔

آج تک مؤرخین یہ معلوم کرنے سے قاصر رہے ہیں کہ جین مت کی بنیاد کہاں اور کب رکھی گئی' مگر جینی لوگوں کا کہنا ہے کہ جین مت ابدی اور غیر فانی ہے۔ یہ اس وقت سے ہے جب کائنات کا ظہور ہوا اور جب تک کائنات قائم ہے' جین مت بھی قائم رہے گا۔ ان کے خیال کے مطابق جینی پیغمبر وقتاً فوقتاً بنی نوع انسان کی اصلاح کے لیے ظاہر ہوتے رہے۔ ان کے نزدیک آخری جینی پیغمبر مہاویر (560-468ق م) ہیں۔ ان کا اصل نام وردھ مان ہے اور مہاویر لقب ہے یعنی بہادر اعظم۔ وہ صوبہ بہار کے ایک کھتری حکمران خاندان کے راج کمار تھے۔ پٹنہ کے قریب ویسالی میں پیدا

ہوئے۔ گوتم بدھ کے ہم عصر تھے۔ تیس برس کے تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہو گیا اور انھوں نے دنیا اور اس کی آسائشوں سے تنگ آ کر تاج و تخت کو خیر باد کہا اور سچائی کی تلاش میں جنگل کی راہ لی اور تنہا سخت ریاضت کی۔ بارہ برس کی ریاضت کے بعد آخر عرفان حاصل ہوا اور وہ مہاویر کہلانے لگے۔ بیالیس برس کی عمر میں اپنے پرانے فرقے کی ازسرنو تنظیم کی اور اس کا نام جین مت رکھا۔ آئندہ تیس سال مگدھ اور آس پاس کی ریاستوں میں پرچار کیا۔ کئی شاہی خاندانوں سے تعلق ہونے کی وجہ سے انھیں اپنے مذہب کی اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ تاہم جین مت بدھ مت کی طرح زیادہ نہ پھیل سکا۔

مہاویر کے عقیدے کے مطابق انسانی زندگی کا مقصد نروان حاصل کرنا ہے، جو تین اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ صحیح عقیدہ، صحیح علم اور صحیح عمل۔ جین مت کے بنیادی اصولوں میں سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ کسی جان دار کو ایذا نہ پہنچائی جائے۔ ان کے نزدیک پتھر، پہاڑ اور دیگر بے جان چیزیں بھی روح اور زندگی سے خالی نہیں۔ ان کے پروہت تو یہاں تک احتیاط کرتے ہیں کہ پانی چھان کر پیتے ہیں۔ ناک پر کپڑا رکھتے ہیں تاکہ ہوا بھی جراثیم سے چھن کر اندر جائے۔ مسواک نہیں کرتے کہ اس سے دانتوں کے کیڑے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بعض حالتوں میں چلتے وقت آگے سے جگہ صاف کرتے جاتے ہیں کہ کوئی کیڑا مکوڑا پاؤں تلے آ کر کچلا نہ جائے۔ ترک دنیا اور نفی حیات کا مسلک بھی ان کا ایک بنیادی اصول ہے۔ فاقہ کشی سے خودکشی کر لینا ان کے نزدیک زندگی کا صحیح انجام گویا معراج ہے۔ ہندوؤں کے ویدوں کو نہیں مانتے اور برہمن کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ذات پات کی تفریق کو انسانیت کی توہین خیال کرتے ہیں۔ جین مت کا سب سے بڑا اصول ''اہنسا'' یعنی جان داروں کو ایذا نہ پہنچانا ہے، اس لیے وہ گوشت خوری کے سخت خلاف ہیں۔

(آج کل بھارت میں جینی لوگوں کی تعداد بیس لاکھ کے قریب ہے۔ یہ لوگ عام طور پر خوش حال اور امیر کبیر ہیں۔ تجارت پیشہ ہیں۔ گجرات، کاٹھیاواڑ، راجپوتانہ، بنگال اور بمبئی میں رہتے ہیں۔ کاٹھیاواڑ اور راجپوتانہ میں کوہ آبو پر ان کے بڑے خوب صورت مندر ہیں)

بدھ مت

برہمنوں کے خلاف جینی تحریک سے بھی زیادہ موثر اور شدید تحریک بدھ تحریک تھی، جس نے غیر معمولی مقبولیت اور پزیرائی حاصل کی۔ بدھ مت کا آغاز ہندو برہمنیت کے عقائد و رسوم کے خلاف بطور احتجاج ہوا۔ یہ کوئی مکمل نیا مذہب نہیں تھا۔ بلکہ بت شکنی اور برہمنیت کی ایک اصلاحی تحریک تھی۔ چناں چہ اس میں متعدد دیگر مذاہب کی خصوصیات شامل تھیں۔ مثلاً بدھ مت ''آواگون'' پر بھی یقین رکھتا ہے۔ بدھ مت خیرات، ترک دنیا اور گیان دھیان کی تعلیم دیتا ہے۔ جس کے ذریعے انسان کو از خود حقیقی علم حاصل ہو جاتا ہے۔

بدھ مت کا بانی سدھارت گوتم (560-483 ق م) ساکیا قبیلے کے کھتری راجا سدھودن کا بیٹا تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا فنون سپہ گری میں مہارت حاصل کر کے سورما بنے اور اس کے بعد اس کا راج پاٹ سنبھالے لیکن وہ لوگوں کے غم واندوہ اور دردناک واقعات سے اس قدر متاثر ہوا کہ گھر بار اور بال بچوں کو چھوڑ کر نکل گیا اور رہبانیت اختیار کر لی۔ برس ہا برس سردی اور گرمی، تنہائی اور خاموشی میں جنگلوں میں رہا اور مراقبے کرتا رہا۔ پھر آخری مراقبے (دھیان) کا وقت آیا تو وہ بدھی دانش کے درخت کے پاس بیٹھ کر دھیان میں گم ہو گیا۔

پورے انچاس دن بے حس و حرکت درخت کے نیچے بیٹھا رہا۔ اس زمانے میں بڑے زور کا مینہ برسا۔ ایک ناگ نے اپنے سر کی چھتری تان کر گوتمھیں اس بارش سے بچایا۔ آخر حقیقت گوتم پر آشکار ہو گئی۔ دکھ کے سوال کا جواب اور نجات کی راہ کا پتا اسے مل گیا۔ شک کے بادل چھٹ گئے۔ سورج میں روشنی آئی اور آنکھوں میں عرفان کا نور چمکا۔

انوکھے وجدان سے افکار نے نئی صورت پکڑی۔ دانش کا نیا محاورہ نکلا جو ویدوں سے ماخوذ نہ تھا۔ یہ گوتم کے اپنے مراقبوں اور ریاضتوں کا حاصل تھا۔ یہ محاورہ روایتی محاورے سے اس قدر مختلف تھا کہ اس کا آزمانا سامعین کے درمیان لازم ہوا۔ دل نے کہا، شہر چلیے اور وہاں اپنے وجدان کی خبر پہنچائیے۔ شہر کی طرف روانہ ہوا تو جنگل میں ان پانچ سنیاسیوں سے ملاقات ہوئی، جن کے ساتھ اس نے تیاگ کے آغاز میں چند مہینے گزارے تھے۔ یہ سنیاسی اس کے چہرے پر اطمینان کا نور دیکھ کر متحیر ہوئے اور اس کی باتیں سن کر اور بھی متاثر۔ انھوں نے گوتمھیں اپنا گورو مانا۔ بدھ مت کے سب سے پہلے پیرو یہی پانچ یار تھے۔

سارناتھ میں، جو بنارس سے دور نہیں، گوتم نے پہلی بار مجمع کے آگے تقریر کی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جیون کا نام ہے دکھ کی حالت۔ ہم یہاں دکھ کی حالت میں اس لیے ہیں کہ پچھلے جنم کے آخر میں ہم جیون کی خواہش لے کر مرے۔ جب تک یہ خواہش ختم نہ ہو، نجات نہ ہو گی۔ دکھ جیون کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس سے نجات کی راہ یہی ہے کہ جیون کی خواہش کا اُلٹ ہو، یعنی پورے خلوص سے دھرتی کی زندگی تیاگ دی جائے اور اس زندگی کی خواہش رتی بھر بھی نہ رہے۔ آٹھ باتوں کے درست ہونے سے خلوص آئے گا۔ دھیان، فہم، خیال، قول، عمل، روزی کی کمائی، کوشش اور تدبیر۔ تیاگ کی خواہش میں پورا اخلاص ہو گا تو تناسخ کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر اگلا جنم کوئی نہ ہو گا۔ بیماری، بڑھاپے اور موت کے دکھوں سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ نجات کسی بہشت میں داخل ہونے کا نام نہیں۔ نجات اس میں ہے کہ خاتمہ ہو جائے اور ہم نہ رہیں، اور نیستی اور سناٹا ہی باقی رہ جائیں۔ اسی کو اس نے خاتمہ بالخیر کہا ہے۔

آواگون کا عقیدہ گوتم نے ہندو مت کے اثر سے کیا۔ بس یہی ایک بات ہے جو اس کے عقیدے اور ہندو عقیدے کے درمیان مشترک ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ کسی دیوتا یا دیوی کا ذکر اس کی تعلیم میں نہیں ہے۔ ویدوں کے الہام کو بالائے طاق رکھ دینا اور دیوتاؤں کی پوجا کو روحانیت سے خارج کر دینا بڑی جرأت کی بات ہے۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ گوتمھیں خدا کے وجود سے انکار تھا؟ جواب یوں

دیا گیا ہے کہ گوتم آفرینش کے ہنگامے ہی کا قائل نہ تھا' اس لیے آفریدگاری اور آفرید گار کا بھی قائل نہ تھا۔ اس کے تصور میں سبب اور نتیجہ' علت و معلول کا سلسلہ ازلی و ابدی ہے' یعنی اس کا نہ آغاز ہے اور اس کا خالق کوئی نہیں۔ یہ خیال کہ پہلے صرف خدا تھا اور اس کے سوا اور کچھ نہ تھا اور پھر خدا نے عدم محض میں سے موجودات کو پیدا کیا' اسے قبول نہیں۔ آفریدگار (رب' خدا' پروردگار) کا عقیدہ اس کے دل میں گھر نہ کر سکا۔

گوتم کا ایک چیلا تھا' ملنکیا۔ گورو کی باتیں سنتا تو تھا' لیکن تامل کے ساتھ۔ ایک روز جھنجلا کر بول اٹھا: ''گورو جی' تم گول مول باتیں کرتے ہو۔ صاف صاف کہو' ایشور کا وجود ہے یا نہیں۔ اس کا جواب گوتم نے ایک تمثیل سے دیا۔ فرمایا' فرض کرو کہ کسی آدمی کو کسی نے زہر آلود تیر سے زخمی کیا اور فوراً ایک معالج کو لائے۔ معالج نے جوں ہی مستعدی سے تیر کھینچنے اور مرہم پٹی اور دوا دارو کی تدبیر کا ارادہ کیا' بیمار نے اس کا ہاتھ روک کر کہا' ڈاکٹر تیر نکالنے سے پہلے یہ بتاؤ کہ اس کا پیکان کس دھات کا بنا ہوا ہے اور کس زہر سے آلودہ کیا گیا ہے۔ ہوشیار اور ذمہ دار معالج کیا یہ نہ کہے گا' بھلے آدمی' ان باتوں کے جواب کا وقت کہاں ہے۔ ان سوالوں کو علاج سے کوئی واسطہ نہیں۔ علاج کی فکر کرو اور بے فائدہ سوال نہ اٹھاؤ۔ سو بھائی نجات کی فکر کرو۔ ایک جنم میں فرصت کم ہے۔ جتنی ہے' اس سے کام لو۔ فالتو سوالوں سے اسے گنواؤ نہیں۔

ظاہر ہے کہ گوتم دیوی دیوتاؤں کے قصے کہانیوں اور آتما اور پرماتما کی ان بحثوں سے بے زار ہوا' جن میں دکھی لوگوں کی چارہ گری کا کوئی خیال شامل نہ تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ بیدی (دانش ور) اور گیانی (عابد و زاہد) آتما' خدا اور دیوتا کی شان میں ڈھول پیٹ کر روحانیت کے اصل اصول کو پس پشت ڈالے رکھتے ہیں اور وہ اصل اصول ہے چارہ گری۔ یہ سوال اٹھانے کی بجائے کہ خدا ہے یا نہیں' اور اگر ہے تو کون ہے' کہاں ہے' یہ سوچنا چاہیے کہ ہم تم آپس میں رحم دل ہیں یا بے رحم۔ گوتم کی رائے میں روحانیت کا انحصار اسی سوال پر ہے۔ کسی کو دکھ نہ دینا' کسی خدا کے حکم سے کیوں ہو؟ دکھ نہ دینے کا سبق بس اس بنا پر ہونا چاہیے کہ دکھ دکھ ہی ہے اور دکھ اٹھانے والا دکھی ہے' بے چارہ ہے' بے کس ہے۔ رحم اور ہم دردی کا مستحق ہے۔ اس نے ایسی سادگی سے یہ بات کہی کہ سب دکھیوں نے کہا' بھائیو' پتے کی بات تو اس نے کہی۔

گوتم کی صاف گوئی اور سوجھ بوجھ دونوں کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس نے محبت کا درس نہ دیا۔ رحم دلی اور ہم دردی کا درس دیا۔ محبت پر وعظ کہنا یوں بھی مضحکہ خیز مشغلہ ہے' لیکن گوتم کے ہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔ اس کی طبیعت اوّل تا آخر مردم بیزار رہی' اس حد تک کہ اسے اپنے آپ سے بھی محبت نہ تھی۔ وہ آدمی کو درندوں میں شمار کرتا تھا اور آدمی ہونا اس کی نظر میں ایک طرح کی لعنت ہے۔ جس شخص کے محسوسات ایسے ہوں اور جھوٹ بولنا اس کی سرشت میں نہ ہو' وہ محبت کی تعلیم کیوں دے گا۔ گوتم کی صداقت اور اس کے خلوص کا بڑا ثبوت یہی ہے کہ اس نے محبت کا مضمون اپنے وعظ میں کبھی نہ چھیڑا۔ اس کے بجائے صرف ہم دردی اور رحم کا درس دیا۔

گوتم کی تعلیم میں تجرد کی تاکید ہے۔ اس کے پیرو آغاز میں سب مجرد تھے۔ نئی جماعت (سنگھا) میں شرکت کا دروازہ اس نے اچھوتوں کے لیے بھی کھلا رکھا۔ گنتی کی چند عورتوں کو بھی شریک کر لیا گیا' لیکن خانقاہ میں زن و مرد کی یک جائی میں خطرات نظر آئے۔ نئی جماعت مجرد مردوں کی جماعت بن کر بڑھنے لگے۔ گوتم کے یہ مقلد بھکشو کہلاتے تھے' اس لیے کہ یہ بھیک پر گزارہ کرتے تھے۔ گوتم کی داستان حیات اور اس کی تعلیمات کی تبلیغ بھی انھی کا کام تھا۔ شہر میں بھیک مانگنے آتے تو ان کی تقریر غریب لوگ شوق سے سنتے۔ ان کی بہتر روحانیت سے سب متاثر تھے۔

برہمنوں کے خلاف بدھ مت نے تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں اور دیکھتے دیکھتے ہندوستان کا انقلابی' عوامی مذہب بن گیا۔ اس کی وجوہ ظاہر ہیں کہ برہمنیت کا کوئی بانی نہ تھا۔ بدھ مت کا ایک بانی تھا جو ذاتی لحاظ سے نہایت سادہ' پارسا اور پرہیز گار تھا۔ دوسرے یہ کہ برہمنیت میں پرچار سنسکرت زبان میں ہوتا تھا جسے راجا اور برہمن کے سوا کوئی نہیں بول سکتا تھا۔ بدھ مت کی تبلیغ کے لیے عام بول چال کی زبان استعمال کی گئی۔ تیسرے یہ کہ بدھ مت درحقیقت برہمنیت کی ذات پات کی تفریق ہی کے ردعمل میں پیدا ہوا تھا۔ اس تحریک سے عوام جوق در جوق بدھ مت کی طرف راغب ہو گئے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا' سرورِ عالم ﷺ کی بعثت کے وقت ہندوستان میں ہندو مت اور اس کے مدمقابل مذہب بدھ مت کے درمیان موت و حیات کی کش مکش جاری تھی۔ اس وقت تک بدھ مت ہندوستان اور چین کے بڑے حصے میں پھیل چکا تھا اور اس طرح آنحضورؐ کے ظہور کے وقت اسے ایک بڑے مذہب کی حیثیت حاصل تھی۔

مہاتما بدھ نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی' مگر اس کے اقوال جو اس کے چیلوں اور بھکشوؤں نے جمع کیے ہیں' ہم تک پہنچے ہیں۔ گوتم خدا کے بارے میں خاموش ہے۔ وہ ترک دنیا اور نفس کشی کی تلقین کرتا ہے۔ گوتم بدھ نے بت شکنی کی تعلیم دی ہے' مگر اس مذہب کے ظہور کے وقت موجود بت تراشوں نے خود مہاتما بدھ کے بت تراشنا شروع کر دیئے اور بدھ مت کے انتہائی محتاط پیروکار اپنے گرو کا بت توڑنے اور یوں اپنے آقا کی بے حرمتی کی جرأت نہ کر سکے۔ چناں چہ بدھ مت بھی دوسرے بت پرست مذاہب کی طرح بت پرستی کی طرف مائل ہو گیا۔ یوں خود مہاتما بدھ کے بت کی پرستش کی جانے لگی۔

قرآن مجید یا حدیث شریف میں بدھ مت کا براہ راست کوئی ذکر نہیں۔ تاہم متعدد قدیم و جدید مفسرین نے قیاس ظاہر کیا ہے کہ انجیر کا درخت (جس کا ذکر سورۃ التین میں آیا ہے) غالباً برگد کے اس درخت کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے نیچے مہاتما بدھ کو نروان حاصل ہوا تھا۔ اس کی جائے پیدائش کپل وستو کی وجہ سے غالباً ایک پیغمبر کو ذوالکفل (کفل یعنی کپل سے آنے والا) کا نام دیا گیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ذوالکفل کے بارے میں' جس کا ذکر قرآن مجید میں دوبار آیا ہے' قرآن یا حدیث میں کوئی تفصیل نہیں ملتی اور نہ دیگر اسلامی کتب ہی میں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

ایسا مذہب جس میں بت پرستی عملاً شامل ہو اور جو رہبانیت کو لازمی قرار دے' وہ

نہ تو عوام کی توجہ کا مرکز بن سکتا تھا اور نہ آنحضورؐ اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ سکتے تھے۔ ہاں یہ عجیب بات ہے کہ مہاتما بدھ نے بھی یہی کہا ہے۔

یہودیت

قرآن پاک میں جن قدیم مذاہب کا ذکر آتا ہے ان میں یہودیت کی سب سے زیادہ تفصیل دی گئی ہے۔ یہودیت حضرت موسیٰؑ کا دین تھا۔ یہودیت کا مختصر تاریخی پس منظر جناب مولانا مودودی کے الفاظ میں یہ ہے کہ: ''حضرت نوحؑ کے بعد حضرت ابراہیمؑ پہلے نبی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی عالم گیر دعوت پھیلانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ انھوں نے پہلے خود عراق سے مصر تک اور شام و فلسطین سے ریگستان عرب کے مختلف گوشوں تک برسوں گشت لگا کر اللہ کی اطاعت (یعنی اسلام) کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔ پھر اپنے اس مشن کی اشاعت کے لیے مختلف علاقوں میں اپنے خلفا مقرر کیے۔ شرق اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوطؑ کو شام و فلسطین میں اپنے بیٹے حضرت اسحٰقؑ کو اور اندرون عرب میں اپنے بڑے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو مامور کیا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مکے میں وہ گھر تعمیر کیا جس کا نام کعبہ ہے اور اللہ ہی کے حکم سے وہ اس مشن کا مرکز قرار پایا۔

حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے دو بڑی شاخیں نکلیں۔ ایک حضرت اسماعیلؑ کی اولاد جو عرب میں رہی۔ قریش اور عرب کے بعض دوسرے قبائل کا تعلق اسی شاخ سے تھا اور جو عرب قبیلے نسلاً حضرت اسماعیلؑ کی اولاد نہ تھے وہ بھی چوں کہ ان کے پھیلائے ہوئے مذہب سے کم و بیش متاثر تھے اسی لیے وہ اپنا سلسلۂ نسب انھی سے جوڑتے تھے۔

دوسرے حضرت اسحاقؑ کی اولاد جن میں حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ اور بہت سے انبیائے کرام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوبؑ کا نام چوں کہ اسرائیل تھا اسی لیے یہ نسل بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ ان کی تبلیغ سے جن دوسری قوموں نے ان کا دین قبول کیا انھوں نے یا تو اپنی انفرادیت ہی ان کے اندر گم کر دی یا وہ نسلاً تو ان سے الگ رہے مگر مذہباً ان کے مقلد رہے۔ اسی شاخ میں جب پستی و تنزل کا دور آیا تو پہلے یہودیت پیدا ہوئی اور پھر عیسائیت نے جنم لیا۔

حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹے چار بیویوں سے تھے۔ حضرت یوسفؑ اور ان کے چھوٹے بھائی بن یمین ایک بیوی سے اور باقی دس دوسری بیویوں سے۔ حضرت یعقوبؑ کا لقب ''اسرائیل'' تھا جو انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ وہ حضرت اسحٰقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے۔ انھی کی نسل کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ جو آگے چل کر یہودی کہلائے۔ عموماً بنی اسرائیل کے عروج کی تاریخ حضرت موسیٰؑ سے شروع ہوتی ہے لیکن قرآن اس مقام پر سورۂ مائدہ آیت 20 میں تصریح کرتا ہے: ''یاد کرو جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ 'اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی اس نعمت کا خیال کرو جو اس نے تمھیں عطا کی تھی۔ اس نے تم میں نبی پیدا کیے۔ تمھیں فرماں روا بنایا اور تمھیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہ دیا تھا۔'' گویا بنی اسرائیل کا اصل زمانہ عروج حضرت موسیٰؑ سے پہلے گزر چکا ہے۔ جسے خود حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے سامنے اس کے شان دار ماضی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔''

مولانا مودودی مزید لکھتے ہیں: ''بنی اسرائیل کے انبیا میں سے کوئی بھی یہودی نہ تھا اور نہ ان کے زمانے میں یہودیت پیدا ہوئی تھی۔ یہ مذہب اس نام کے ساتھ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ یہ اس خاندان کی طرف منسوب ہے جو حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے یہوداہ کی نسل سے تھا۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد جب ان کی سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی تو یہ خاندان اس ریاست کا مالک ہوا جو یہودیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور بنی اسرائیل کے دوسرے قبیلوں نے اپنی الگ ریاست قائم کر لی جو 'سامریہ' کے نام سے مشہور ہوئی۔ پھر اسیریا (اشوریوں) نے نہ صرف یہ کہ سامریہ کو برباد کر دیا بلکہ ان اسرائیلی قبیلوں کا بھی نام و نشان مٹا دیا جو اس ریاست کے بانی تھے۔

اس کے بعد صرف یہوداہ اور اس کے ساتھ بن یمین کی نسل ہی باقی رہ گئی جس پر یہوداہ کی نسل کے غلبے کی وجہ سے یہود کے لفظ کا اطلاق ہونے لگا۔ اس نسل کے اندر کاہنوں، ربیوں اور احبار نے اپنے اپنے خیالات اور رجحانات کے مطابق عقائد، رسوم اور مذہبی ضوابط کا جو ڈھانچا صدہا برس میں تیار کیا اس کا نام یہودیت ہے۔ یہ ڈھانچا چوتھی صدی قبل مسیح سے بننا شروع ہوا اور پانچویں صدی بعد مسیح تک بنتا رہا۔ اللہ کے رسولوں کی لائی ہوئی ربانی ہدایت کا بہت تھوڑا ہی عنصر اس میں شامل ہے۔ اور اس کا حلیہ بھی اچھا خاصا بگڑ چکا ہے۔ اسی بنا پر قرآن مجید میں اکثر مقامات پر انھیں ''اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا'' کہہ کر خطاب کیا گیا ہے یعنی اے وہ لوگو جو یہودی بن کر رہ گئے ہو ان میں سب کے سب اسرائیلی ہی نہ تھے بلکہ وہ غیر اسرائیلی لوگ بھی تھے جنھوں نے یہودیت قبول کر لی تھی۔ قرآن میں جہاں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے وہاں بنی اسرائیل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور جہاں مذہب یہود کے پیروؤں کو خطاب کیا گیا ہے وہاں ''اَلَّذِیْنَ ھَادُوْا'' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔''

قرآن یہودیوں کی کتاب تورات کو الہامی تسلیم کرتا ہے۔ مسلمان اور یہودی دونوں توحید پرست ہیں اور مسئلہ توحید میں ان کے درمیان کوئی نزاع نہیں۔ مزید برآں قرآن پاک میں متعدد بار غیر مبہم الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ خدا یہودیوں کو دوسری تمام قوموں سے برتر تصور کرتا تھا۔ فطری طور پر اس بات کا تعلق حضرت موسیٰؑ کے دور پیغمبری اور اس زمانے سے ہے جب یہودی دین موسوی کی حرف بہ حرف پیروی کرتے تھے۔ چناں چہ حضرت محمدؐ کے دور میں دنیا بھر میں یہودیوں پر جو ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے قرآن حکیم میں ان کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ انھوں نے اللہ کے قوانین و احکام کی مسلسل خلاف ورزی کی تھی۔

ایسی قوم سے کوئی نیا رسول صرف یہ کہ سکتا تھا کہ اوّل تو ان کی الہامی کتاب نبی آخرالزماںؐ کی آمد کی پیش گوئی کرتی ہے (آنحضورؐ کے ظہور کے وقت یہودی اس نبی آخرالزماںؐ کے منتظر تھے) اور دوم ان کی اس الہامی کتاب کا پوری طرح تحفظ نہیں کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تورات پر جو گزری وہ ایک الم ناک روایت ہے۔ اس مقدس

کتاب کو پہلے بابل کے بادشاہ بخت نصر نے، پھر انطوخشس طیطوس اور دوسروں نے تباہ کیا۔ یوں تورات کا آخری نسخہ تک صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ اس کے کوئی ایک سو سال یا اس سے بھی زائد عرصے کے بعد محض یادداشت سے تورات کو ازسرِنو مرتب کرنے کی سعی کی گئی۔ جدید مغربی دانش وروں کی تحقیق کے مطابق تورات کا جو متن موجود ہے، اس میں ابہام، آمیزش اور متعدد متضاد اور بے جوڑ باتیں شامل ہیں۔

جہاں تک حضرت موسیٰ کی طرف سے آخری پیغمبر کی بعثت کی پیش گوئی کا تعلق ہے، وہ مندرجہ ذیل الفاظ پر مشتمل ہے: ''میں انھی میں سے تمھاری طرح (اے موسیٰ) ایک پیغمبر پیدا کروں گا اور اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا اور وہ ان سے صرف وہ بات کرے گا جس کا میں اسے حکم دوں گا۔'' (باب استثنا۔ تورات)۔ (اس پیش گوئی کا قدرے تفصیل سے ذکر اس باب میں کیا گیا ہے، جس کا عنوان ہے: ''انبیائے کرامؑ کی پیش گوئیاں۔'')

عیسائیت

حضور اکرمؐ نے عیسائیت کو دوسرے مذاہب کی نسبت بعض مستثنیات کے ساتھ رحیم تر پایا۔ قرآن مجید از خود تسلیم کرتا ہے کہ عیسیٰؑ کلام اللہ تھے، روح اللہ تھے، وہ مسیح تھے، خدا کے رسول تھے۔۔۔ اور جو کسی بھی دوسرے مذہب نے عیسائیوں کے بارے میں تسلیم نہیں کیا۔۔۔ وہ ایک عفت مآب کنواری کے بطن سے پیدا ہوئے، گو ان کا کوئی باپ نہ تھا، وہ اللہ کا ایک معجزہ تھے جو اس کی قدرت مطلقہ کا اظہار تھا۔ قرآن یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ پر کتاب ''انجیل'' نازل کی۔ اس کے باوجود عقیدۂ تثلیث، حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دینا اور مریم پوجا (عیسائیوں کا ایک فرقہ حضرت مریم کے بت کی پوجا کرتا ہے) کے باعث آنحضرت محمدؐ کو اس مذہب میں بت پرستی نظر آئی۔ قرآن حکیم نے اس بات پر سخت نکتہ چینی کی ہے کہ عیسائیوں نے اپنے پادریوں کو خداوند (سورۂ توبہ، آیت 31 کے مطابق ارباب) قرار دے دیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کلیسا، کلیسا کی لاتعداد کونسلوں اور ارکان کونسل کی تاریخ کو مدنظر رکھا جائے تو اس (قرآن پاک) کی سرزنش سے مفر ممکن نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے غیر مبہم اور پرزور الفاظ میں اعلان کیا تھا کہ (متی۔ باب 5۔ آیت 17) وہ تورات اور دیگر انبیا کی کتب کی تنسیخ کے لیے نہیں آئے (جن کا ذکر انجیل میں موجود ہے) بلکہ وہ ان پر عمل کرانے آئے ہیں، اور جو کوئی بھی ان احکام سے روگردانی کرے گا، یا لوگوں کو اس کی ترغیب دے گا، وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں گر جائے گا۔ اس کے برعکس سینٹ پال نے نہ صرف اس کی تعلیم دی کہ ''عیسیٰؑ تورات کو منسوخ کرنے والے ہیں۔'' (رومیوں کے نام خط 10-4) بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر تصدیق کی کہ:

''کیوں کہ روح القدس نے اور ہم نے مناسب جانا کہ ان ضرورتوں کے سوا تم پر اور بوجھ نہ ڈالیں کہ تم بتوں کی قربانیوں سے، اور لہو اور گلا گھونٹے ہوئے جانوروں اور حرام کاری سے پرہیز کرو۔ اگر تم ان چیزوں سے خود کو بچائے رکھو گے تو سلامت رہو گے۔'' (رسولوں کے اعمال 15-28)

یوں لحمِ خنزیر اور شراب کو تو حلال قرار دے دیا گیا، مگر یوم سبت اور ختنہ کی رسم منسوخ قرار پائی۔ تورات کے تمام نسخے بھی پس پشت ڈال دیئے گئے۔ یہ سب برائیاں حضرت مسیح کے حواریوں کی زندگی ہی میں عیسائیت میں راہ پا گئیں۔ بعد میں عقیدۂ تثلیث کو جنم دیا گیا۔ مسیح کو خدا کا بیٹا اور اسی مادہ کو تخلیق قرار دے دیا گیا جس سے بقول ان کے مسیح کا ''باپ'' عبارت ہے۔ صلیب کو مذہب اور عقیدے کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا۔ مسیح اور مریم کی شبیہ اور مورتیاں پورے مذہبی جوش و خروش سے تیار کی گئیں اور انھیں رواج دیا گیا۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں: ''یہ باور کرنے کی کافی وجوہ موجود ہیں کہ حضورؐ کے ذہن میں حضرت عیسیٰؑ کا تصور بنو اسرائیل کی گم شدہ بھیڑ تک محدود ہو گیا تھا۔ (سورۂ آل عمران، آیات 48-49) یا ایسے شخص کا تصور تھا جو کہتا تھا، 'بچوں کی روٹی کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں۔'' (متی باب 15۔ آیات 24 تا 26) مگر آنحضورؐ تو کسی ایسی چیز کے متمنی تھے جس میں گم ہوں افلاک۔ آپ رحمت دو عالم کے قائل تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ پر جو وحی نازل فرمائی تھی، حضرت عیسیٰؑ اسے ضبط تحریر میں نہیں لانا چاہتے تھے یا وہ اپنے پیروکاروں کو ضبط تحریر میں لانے کا حکم نہ دے سکے، تاکہ اسے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ رکھا جا سکے۔ چناں چہ انجیل کے بعض حصے حضرت عیسیٰؑ کے بعض حواریوں کی یادداشت میں محفوظ رہے۔ جب ان حواریوں، ان کے جانشینوں یا پیروکاروں نے بعد میں اپنی اپنی یادداشتیں قلم بند کیں یا اپنے رسول کی سوانح ترتیب دی تو انھوں نے اسے ہی ''انجیل'' کا نام دے دیا۔ اگرچہ 70 انجیلوں کا سراغ ملتا ہے، مگر کلیسا نے ان میں سے صرف چار کو شرف قبولیت بخشا ہے، جب کہ باقی سب کو وضعی قرار دے دیا گیا ہے۔ قدرتی طور پر ان لاتعداد سوانح میں تضاد بھی موجود ہے۔ انجیل کا آرامی زبان میں نسخہ، جو انجیل کی زبان ہے، ناپید ہو گیا۔ اب اس کا صرف یونانی ترجمہ رہ گیا جو مروج ہے۔

انجیل کے ''عہد نامہ جدید'' میں حضرت عیسیٰؑ کی جو سوانح شامل ہے، ان میں حضرت عیسیٰؑ کی تقریروں کے بعض اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ اگرچہ ان کی تبلیغ کا دور تین سال سے زائد نہیں۔ وہ جانتے بھی تھے کہ ان کا انجام قریب ہے اور انھوں نے اگرچہ مغموم مگر غیر مبہم انداز میں کسی آنے والے (آنحضورؐ) کی پیش گوئی کی جو اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے گا جو ان سے ادھورا رہ گیا ہے۔

یُوحنا، باب 16، آیات 7 تا 14 کا ترجمہ یہ ہے: ''لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا ہی تمھارے لیے فائدہ مند ہے، کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمھارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمھارے پاس بھیج دوں گا، اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راست بازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔۔۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں، مگر اب تم ان باتوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ (روح حق) آئے گا تو تمھیں سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے تو کچھ نہ کہے گا، لیکن اللہ کی طرف سے جو کچھ سنے گا، وہی کہے گا اور وہ تمھیں

مستقبل کی خبریں دے گا۔ وہ میرا جلال ظاہر کرے گا' اس لیے کہ وہ جو کچھ مجھ سے سنے گا' وہی تمھیں بتائے گا۔''

آخری رسولؐ کے ظہور کے بارے میں انجیل میں حضرت عیسیٰ کی اور بھی بہت سی پیشین گوئیاں ہیں' جن کا ذکر ''انبیائے کرام کی پیش گوئیاں'' والے باب میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں جو ادیان و مذاہب رائج تھے' ان کا یہ مختصر سا حال ظاہر کرتا ہے کہ ان میں سے کوئی مذہب بھی آنحضور کو اطمینان قلب سے ہم کنار نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے عالمی مذہبی حالات میں رسول اللہؐ پر نزول وحی کا آغاز ہوا' جس نے بالآخر اسلام کی عظیم الشان عمارت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا

(سید قاسم محمود)

دُنیا کا سیاسی نظام

عہد نبوی ﷺ میں ریاست کے نشوو ارتقا کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے سیاسی رجحانات اور دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جانے والے نظام ہائے حکومت کا مختصر سا جائزہ پیش کر دیا جائے تا کہ ریاست نبوی ﷺ کو اس کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کی نوعیت اور قدر و قیمت کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔

زیر بحث دور یعنی چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں دنیا آج سے بہت کم تھی۔ نہ امریکا کے دونوں براعظم دریافت ہوئے تھے اور نہ آسٹریلیا سے لوگ واقف تھے۔ افریقہ کے بڑے حصہ پر تاریکی کا تسلط تھا اور ایشیا و یورپ کے انتہائی شمالی علاقے بھی انسانی دست رس سے باہر تھے۔ البتہ عرب' چین' ہندوستان' وسط ایشیا' ایران' عراق' شام' مصر' مغرب اقصیٰ' حبشہ' نیز جنوبی یورپ کے کچھ ممالک مثلاً یونان' اطالیہ' فرانس' اسپین اور وسطی و شمالی یورپ کے چند علاقے ایسے ضرور تھے جہاں آفتابِ تمدن ضوفگن تھا۔ مگر کہیں اس کی روشنی تیز تھی اور کہیں بہت مدھم۔ اور خاص بات یہ ہے کہ اس روشنی اور چمک دمک کے سب جلوے دراصل ظاہری اور سطحی تھے۔ جن کی تہ میں تاریکی ہی تاریکی تھی اور اسی تاریکی میں انسان بھٹک رہا تھا۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہمارے لیے مذکورہ بالا تمام علاقوں کے سیاسی رجحانات و میلانات کا مطالعہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ضروری۔ لہٰذا ہم اپنی توجہ صرف ان ملکوں اور خطوں تک محدود رکھیں گے جو تمدن و حضارت' جہانگیری و جہانبانی اور حکومت و سلطنت کے باب میں نہایت اہمیت رکھتے تھے اور جن کے پرچم اقتدار کے سائے میں دنیا کی مختلف قومیں آباد تھیں۔ نیز عرب کی وہ سرزمین بھی ہمارے جائزے کی خصوصی مستحق ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی' جہاں آپ نے سنہ ۱ھ میں ریاست کو قائم فرمایا اور جو پھر کم و بیش دس سال کے قلیل عرصہ میں نشوو ارتقا کے مراحل طے کر کے تقریباً تمام عرب پر محیط ہو گئی۔

روم

سلطنت رومہ کی تاریخ اگرچہ بہت طویل اور ایک بڑے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے اور اسے ہم کئی ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن مختصراً یہ عرض کر دینا کافی ہے کہ رومی شہنشاہیت کا آغاز دراصل جولیس سیزر سے ہوتا ہے جس نے اپنے دور اقتدار میں پورے طور پر استبداد اور مطلق العنانی کا مظاہرہ کیا اور اسی وقت سے دراصل اس عقیدہ کا بھی آغاز ہوا کہ ''قیصر صفاتِ الوہیت کا مالک ہے'' لیکن وہ شخص جس نے رومی شہنشاہی کو استوار کیا اور جس نے بعد کی تمام سیاسی نشوونما پر بہت گہرا اثر ڈالا وہ اَغسطس تھا۔ اس نے بادشاہت کو موروثی کرنے کی تدابیر کیں۔ اس کی قوت کا راز دولت' فوج پر قبضہ اور عنانِ حکومت پر مضبوط گرفت میں پوشیدہ تھا۔ اس کی وفات کے بعد ٹائبرس (14 تا 37ء) برسر اقتدار آیا اس کی تخت نشینی کے وقت مطلق العنانیت کا دعویٰ پھر کیا گیا کہ ''ناقابلِ تقسیم شے کو تقسیم کرنا غیر ممکن ہے۔ سلطنت ایک جسم واحد ہے اور صرف ایک ہی شخص کا دماغ اس پر حکمرانی کر سکتا ہے۔'' ان کے بعد سلطنت پر جنگی عنصر کا غلبہ بہت زیادہ بڑھ گیا۔ چناں چہ کلاڈیس اور نیرو دونوں کی تخت نشینی رومہ کے مقامی عساکر کی تائید کا نتیجہ تھی۔ پھر 29ء کے واقعات سے یہ بات اور بھی ظاہر ہو گئی کہ بادشاہ کا بنانا اور بگاڑنا فوج کا کام ہے۔

بہر حال مارکس آریلیئس کی موت کے بعد ۱۸۰ء سے رومیوں کے زوال کی ابتدا ہوئی۔ رومی سلطنت برابر انتشار سے دوچار ہوتی رہی اور پیہم خارجی حملوں کو سہتی رہی یہاں تک کہ جب ۳۰۶ء میں ''قسطنطنین اعظم'' قیصر ہوا تو گویا سلطنت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نے رومی سلطنت کی از سرِ نو تنظیم کی اور اسے متحد کیا' اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ سیاسی و جنگی مصالح کی بنا پر پایہ تخت کو روم سے قسطنطنیہ منتقل کیا۔ یونانی زبان کو دفتری زبان قرار دیا۔ اس سے ایک طرف تو بازنطینی سلطنت کی بنیاد پڑی اور دوسری طرف روم میں ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا جسے بعد میں پاپائے روم نے پر کیا۔ اس نے دوسرا اہم ترین قدم یہ اٹھایا کہ عیسائیت کو خود بھی اپنایا اور قانونی طور پر اسے سلطنت کا مذہب بھی قرار دیا۔ یہ تاریخ سلطنت رومہ میں ایک ایسا موڑ ہے جس کی بنا پر نہ صرف سلطنت کا ارتقا متاثر ہوا بلکہ عیسائیت نے ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسی افکار و ادارات کو بھی اس درجہ مغلوب کیا کہ انھیں عیسائی اعتقادات سے جدا کر کے سمجھنا ممکن نہیں اور ایک افکار سیاسی پر ہی کیا موقوف پوری مغربی تہذیب پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ''قسطنطنین اعظم'' کے یہ سارے اقدامات بھی سلطنت رومہ کے انتشار و زوال کو نہ روک سکے۔ سلطنت کے حصے بخرے ہو گئے' مشرقی اور مغربی حصے اور ان کے تاج دار الگ الگ ہو گئے اور قسطنطنین کی موت (337ء) کے بعد ہی سیاسی خانہ جنگیوں کے شعلے بھڑک اٹھے۔ سلطنت کی تقسیم کا آغاز باقاعدہ طور پر اگرچہ ولنٹینین کے زمانہ (364ء) سے ہی ہو چکا تھا لیکن قطعی تقسیم سلطنت 395ء میں اس طرح ہو گئی کہ مشرقی حصوں کا آرکیڈیس اور مغربی حصوں کا ہونوریس تاج دار بن گیا۔ اعیانِ سلطنت میں گروہ بندیاں قائم ہو گئیں۔ باہمی نفاق اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو گیا

اور دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر وحشی اقوام نے حملے شروع کر دیئے۔ چناں چہ روم قسطنطنین کے بعد پوری طرح سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ 410ء میں وزی گاتھ نے روم کو بڑی حد تک تاخت و تاراج کر دیا۔ رومہ کی اس تباہی و بربادی کی عام وجہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے یہ بیان کی کہ ''یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ عیسائیت کا زوال اس کے عروج کے فوراً بعد شروع ہوگیا۔ جس کا نظارہ عیسائی اور غیر قوتوں نے بھی کیا کہ عیسائیت کی تحریک ''تباہ کن'' ثابت ہوئی اور اس نے رومی سلطنت کو کمزور کر دیا۔ رومیوں کے اعلیٰ طبقہ کو دیکھتے ہوئے یہ نظر آتا ہے کہ عیسائیوں میں دنیاوی اور مادی خواہشات، نفسانی اغراض، عیش و عشرت کی ہوس، سرد مہری، عوامی معاملات کی طرف سے بے توجہی، قومی معبودوں اور خداؤں کے لیے ذلت و حقارت ایسی خصوصیات ہیں جنھوں نے مستقلاً رومی طاقت کو رفتہ رفتہ رو بہ زوال کر دیا۔ پھر عیسائیوں کا یہ اصرار کہ وہ وفاداری میں اولیت روم کو نہ دیں گے مزید بدنامی کا باعث ہوا۔''

اس تباہی و بربادی کے ٹھیک 45 سال بعد 455ء میں ونڈال نے پھر رومہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس طرح سلطنت رومہ کی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ پانچویں صدی کے آخر میں اس کا مغربی حصہ جو برطانیہ، فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہ سکا اور تقریباً ۵۶۰ء میں سلطنت کے مغربی حصہ پر وحشی اقوام کا مکمل قبضہ ہوگیا جسے جسٹینین جیسا بہادر فرماں روا بھی دوبارہ حاصل نہ کر سکا، حالانکہ اس کی بہادری یورپ میں ضرب المثل تھی۔

مغربی حصہ نکل جانے کے بعد مشرقی صوبوں پر مشتمل سلطنت کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی۔ سلطنت کی عدم مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ خود رعایا حکمرانوں سے اس حد تک نفرت کرتی تھی کہ وحشی اقوام کو رومیوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔ امرا، وزرا اور سلاطین میں اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ عوام کو بغاوت سے روک سکیں۔ ان اندرونی بدنظمیوں سے ملک کا جو حال ہوگیا تھا اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر روم کے تمام بیرونی مخالفین ختم بھی ہو جاتے تب بھی سلطنت زوال و انحطاط سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی تھی۔ مزید برآں ان کے پاس ایسی کوئی اخلاقی قوت اور ذہنی مسائل بھی نہیں تھے جو ان حالات میں ان کی دل جمعی اور قوت کا سہارا بن سکتے۔ چناں چہ ڈنگ نے لکھا ہے کہ ''رومی و یونانی علم و ادب کے حیرت انگیز افلاس نے (جو روم کی سیاسی فنا سے صدیوں پہلے ظاہر ہو چکا تھا) اس پُر آشوب زمانے کے لیے کوئی ذہنی وسائل باقی نہ چھوڑے اور یورپ مایوسانہ اور شرم ناک وہم پرستی میں مبتلا ہوگیا۔ زمانۂ وسطیٰ، غیر سیاسی، زمانہ تھا اور اس کے عزائم و تصورات مذہبی عقیدے کی شکل و معنی کے گرد مرکوز تھے۔''

بہرصورت چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر (یعنی رسول اکرم ﷺ کی ولادت سے چند سال بعد) روم بقول گبن زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا۔ گبن کے الفاظ کا خلاصہ یہ ہے کہ ''اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی جس کے سائے میں ایک وقت تک تمام اقوام عالم آباد تھیں مگر اب ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا۔''

غرض رومہ کا یہ مختصر سا تاریخی و سیاسی جائزہ اس بیان پر مہر صداقت ثبت کر دیتا ہے کہ ''شہنشاہی رومہ کی تاریخ اگرچہ جزءً جزءً عظیم الشان معلوم ہوتی ہے مگر دنیا کو وہ یہ سبق دے گئی کہ ایسا لامتناہی اختیار نہ حکمران کے لیے مفید ہے اور نہ اس کی رعایا کے لیے۔''

اب جہاں تک سلطنت کے نظریہ، تخیل اور نظام وغیرہ کا تعلق ہے تو اصولی طور پر مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ:

(الف) سلطنت رومہ کا اصل الاصول ''بادشاہت'' تھا۔ بادشاہ کے اختیارات غیر محدود تھے اور وہ تمام سیاسی وقتاً فوقتاً یہ دعویٰ کیا کرتا تھا کہ اسے کلیسا کے تمام دوسرے حکام پر تقدم حاصل ہے۔ شہنشاہ بھی اس ادعا کو کسی قدر تسلیم کرتا تھا مگر پوپ نہایت شدّت کے ساتھ اسے ناپسند کرتے تھے اور اس سے سیاسی معاملات میں ان کی خودمختاری کے میلان کی تصدیق ہوتی تھی۔ آخر میں بت پرستی کے متعلق اختلافِ عظیم برپا ہوا، جس سے یونانی اور رومی مسیحیت کے تمام مغائر میلانات نازک حد کو پہنچ گئے۔ کلیسا دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے کہ ''پوپ کی سیاسی حیثیت میں سب سے زیادہ کمزور نقطہ اس کا وہ تعلق تھا جو اسے روم کی آبادی کے ساتھ تھا۔ قدیم شہنشاہی کے زمانے سے نئے اسقف کے انتخاب کے موقع پر اکثر عام شورش اور خون ریزی ہو جایا کرتی تھی ازمنۂ وسطیٰ کو جنم دینے والے حالات کی بدولت یہ عہدہ ان امیر خاندانوں کے تحت اقتدار آگیا جنھوں نے شہر کو باہم تقسیم کر لیا تھا۔''

پھر بطور نتیجہ رقم طراز ہے کہ: ''عام طور پر یہ کہنا چاہیے کہ زمانۂ وسطیٰ کی اس ختم ہونے والی صدی کا فلسفہ ان تصورات پر محتوی تھا جو اقتدار اعلیٰ، حکومت کی عمومی بنیاد، فطری قانون، حقوق اور معاشرتی معاہدے سے متعلق تھے۔ یہ وہی تصورات ہیں جو مادی زندگی کے تغیر شدہ حالات کے زیر اثر دورِ جدید کی خصوصیت قائم کرنے والے تھے۔ مگر جن لوگوں نے اپنے کو باقاعدہ تخیل و تفکر کے لیے وقف کر دیا تھا وہ ہنوز پاپائیت و شہنشاہیت کے قدیم تصورات کے اس قدر زیر اثر تھے کہ وہ اپنے فلسفے کے طرز بیان یا مطالب کو ازمنۂ سابقہ کے معیار سے آزاد نہیں کر سکتے تھے۔ سیاسی نظریات کی کل رو کے متغیر کر دینے کا آوازہ پندرھویں صدی کے ختم ہونے کے عین بعد میکاویلی (۱۴۹۶ء تا ۱۵۲۷ء) کی طباعی نے بلند کیا۔''

(د) کش مکش صرف ریاست و کلیسا ہی میں نہیں، شہنشاہ پاپائیت اور ٹیوٹنی

بربریت کے درمیان بھی برپا ہوئی اور ان سب میں تصفیہ کی ایک شکل نظام جاگیرداری میں تلاش کی گئی۔ مگر وہ بجائے خود ایک سیاسی مصیبت ثابت ہوا۔ ٹیوٹنوں کے سیاسی تصورات کا اثر زیادہ تر ادارات پر پڑا تو مسیحیت کا رومی سیاسی فلسفہ پر۔ جب کہ نظام جاگیرداری کا دائرہ بالکل عملی تھا۔ لہٰذا ایک مصنف کے بقول ''کسی دو نظاموں میں اتنی زیادہ مغایرت نہیں پائی جاسکتی جتنی کہ مغایرت مقدس رومی سلطنت (جو لوگوں کے صرف ذہنوں پر حاوی تھی) اور واقعی جاگیردارانہ حکومت (جس میں عملاً لوگ رہتے تھے) میں پائی جاتی تھی۔ اس کے بعد ان دونوں کے درمیان جو لطیف اختلافات تھے ان کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی ہوسکتا ہے: ''(ان میں) سے ایک (طاقت) مرکزی تھی تو ایک مقامی' ایک بلند و عظیم نظریہ پر مبنی تھی تو دوسری نراجیت کی غیر مہذب اولاد۔ ایک نے تمام قوت غیر ذمہ دار حکمران کے ہاتھوں میں مرتکز کرنے کی کوشش کی تو دوسری نے اس کے حقوق کو محدود کرنے اور اس کے احکام کے خلاف شدید مزاحمت کی سعی کی' ایک کا مطالبہ تمام شہریوں کی برابری اور مساوات کا تھا' کیوں کہ وہ (مالک) سماوات کی یکساں مخلوق ہیں تو دوسرے نے ''اشرافیہ'' کے افتخار اور دوسرے درجات کے امتیازات تک محدود رکھا۔

سلطنت رومہ کے سلسلے میں نسبتاً تفصیلی گفتگو ہم نے اس لیے کی ہے کہ یورپ میں قرونِ وسطٰی کے سیاسی افکار' نظریات' مزاج اور ادارات کو سمجھنے کے لیے یہ انتہائی اہم ہے کیوں کہ سلطنت رومہ کے احوال و ظروف کا مطالعہ دراصل یورپ کا اور مذہبی عہدوں کا سرچشمہ تھا۔ سلطنت کا تمام طرزِ عمل شاہی مرضی کے تابع اور تمام تنظیمات کا تعلق بادشاہ ہی سے تھا اسی لیے جو ادارے مثلاً امرا کی مجلس یا مجلس جمہور وغیرہ بظاہر جمہوری نظر آتے ہیں وہ بالکل مصنوعی تھے۔ بادشاہت صرف ایک مخصوص گروہ' جماعت اور وطن کے اندر محصور تھی۔ حکمرانوں کی یہی وہ مخصوص جماعت تھی جس کی خاطر داری سلطنت کا مقصود تھی۔ اس لیے رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے کہ ''جیسا ہم دیکھ چکے ہیں' رومی سلطنت انسانوں سے (ظلم و زیادتی کے ذریعہ) ناجائز فائدہ اٹھا کر انسانوں کی مخصوص جماعت (حکمرانوں) کی راحت رسانی اور عیش و آرام کا سامان فراہم کرتی تھی۔''

(ب) سلطنت رومہ کا تخیل اگرچہ ''بہبود عامہ'' کے اصول پر مبنی تھا لیکن یہ اصول خیال سے نکل کر عمل میں بہت کم آتا تھا۔ اس کے تخیل میں یونانی اثرات بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ چناں چہ سسرو نے اپنی سیاسی تحریروں میں ایتھنز کے نمونے کو برابر پیش نظر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود رومی تصور میں چند امتیازات بھی موجود ہیں مثلاً رومیوں نے سلطنت کی قانونی حیثیت زیادہ واضح کی۔ قانون کو اخلاق سے ممیتز کیا۔ رومیوں کا خاندان' یونانیوں کی بہ نسبت سلطنت کی مداخلت سے زیادہ آزاد تھا۔ نیز رومی سلطنت شہری اور مقامی نہیں بلکہ قومی سلطنت تھی اور اس کا نصب العین ایک عالم گیر سلطنت کا تھا۔ اس کی نوعیت کے بارے میں سسرو کا خیال تھا کہ سلطنت رومہ ایک ایسی سلطنت ہے جو نام نہاد ''ممزوج'' سلطنت کا نمونہ ہے۔ یعنی وہ بادشاہی' اعیانیت اور جمہوریت سب شکلوں کا مجموعہ اور سب سے بہتر ہے لیکن ٹاسی ٹس نے کیا خوب کہا ہے کہ ''اول تو اس قسم کی سلطنت کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے اور اگر آجائے تو برقرار رہنا ناممکن ہے۔''

(ج) رومی شہنشاہ کو کلیسا کی حمایت حاصل تھی۔ چناں چہ یہ عقیدہ پختہ ہوگیا کہ ''رومی شہنشاہیت عطیہ خداوندی ہے'' تاکہ اس کی حکومت تمام دنیا پر تاابد قائم رہے۔ پھر جب مسیحیت رومی سلطنت کا سرکاری مذہب قرار پائی تو اس کا استعمال بالکل سیاسی زورآزمائی کے لیے ہونے لگا۔ اگر ایک طرف بادشاہ نے مذہب کے معاملہ میں بھی سند قطعی حاصل کرلی اور سب کچھ اسی کے حکم کا محتاج ہوگیا تو دوسری طرف پاپائیت کو فروغ حاصل ہوا اور اس نے اصل طاقت حاصل کرلی۔ پھر کلیسا اور ریاست کے درمیان کش مکش اور چپقلش کا آغاز ہوا جو پورے ازمنۂ وسطٰی کی بڑی نمایاں اور اہم خصوصیت ہے۔ اس کش مکش کی داستان ہے تو بہت طویل مگر یہاں اس کی ایک جھلک ملاحظہ کرلیجیے۔

ڈننگ لکھتا ہے: ''(پوپ) گریگری کی پیشوائی مذہب کے وقت (590ء تا 604ء) سے معقول حد تک پاپائیت کے تغیر کا اظہار ہوجاتا ہے۔ اس زمانے میں سیاسی معاملات قطعی طور پر پاپاؤں کی توجہ کا محتاج ہوگئے۔ اولاً یہ صورت صرف روم کے لیے ہوئی اور بعد ازاں کل اطالیہ کے لیے۔ کچھ زمانے تک قسطنطنیہ کا اقتدار اعلٰی اور اس کے نائب مملکت (مقیم رومہ) کا اختیار زور و قوت کے ساتھ تسلیم کیا جاتا رہا۔ مگر جب اطالیہ میں اہل لمبارڈی کی مداخلتوں کے ساتھ' ساتویں صدی میں' مشرق میں مسلمانوں کے فاتحانہ حملوں کا بھی شمول ہوگیا تو شہر روم کے بارے میں شہنشاہی دربار کی دلچسپی اور اس کا اثر برائے نام رہ گیا۔ قدیم اور جدید روم کے تعلقات کے ٹوٹنے میں کلیسائی اسباب نے مدد دی۔ دربار سے قریبی تعلق رکھنے کی وجہ سے قسطنطنیہ کا بطریق مطالعہ ہے اور نظری و عملی اعتبار سے جو خصوصیات عہد رومہ کی ہیں وہی خصوصیات قرونِ وسطٰی میں پورے یورپ کی ہیں۔ البتہ ازمنۂ وسطٰی میں بحیثیت مجموعی جب ہم پورے یورپ کے افکار سیاسی کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کا اختتام مندرجہ ذیل امور کے ضروری اضافے کے بغیر نہیں ہوسکتا یعنی یہ کہ:

1۔ بنیادی طور پر ازمنۂ وسطٰی میں کوئی خاص سیاسی فکر یا کوئی بڑا سیاسی فلسفی پورے یورپ میں خصوصاً اور تمام دنیا میں عموماً نظر نہیں آتا۔

2۔ قرونِ وسطٰی کے سیاسی نظریات و ادارات نہ تو واقعی اور حقیقی حالات کے مطالعہ و تجزیہ پر مبنی تھے اور نہ ہی کلیتہً ماضی کے تصورات و تجربات سے ماخوذ تھے۔ یہ کچھ تو یونانی و رومی دنیا سے وراثتاً ملے تھے اور کچھ مابعد الطبیعیاتی تصورات مذہبی سے مستنبط تھے۔ اور اسی لیے اس میں جابجا فکری اور علمی دونوں اعتبار سے تضادات نظر آتے ہیں۔

3۔ ازمنۂ وسطٰی کے افکار سیاسی کا سرمایہ' غیر تاریخی' غیر سائنٹیفک' غیر منطقی' غیر تنقیدی اور مذہبی و تخیلاتی ہے جسے تجربہ و تحقیق اور واقعہ سے قریب کا واسطہ نہ

تھا۔ تعلیم و تعلم محدود اور نظریات وافکار تنگ نظری اور متعصبانہ مذہبی محدودیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تضاد و انتشار کا شکار تھے۔

فارس

فارس اپنی قدامت تہذیب کے لحاظ سے دنیا کے ان چند حصوں میں شامل ہے جن کی تاریخ انتہائی قدیم اور طولانی ہے۔ عام طور پر اس کی تاریخ کا مطالعہ دو حصوں میں کیا جاتا ہے۔ ایک افسانوی دور اور دوسرا تاریخی دور۔ اگر افسانوی دور کو پیش نظر رکھا جائے تو شاید اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہو جاتی ہے جتنا کہ خود انسان ہے لیکن اس کا خالص تاریخی دور بھی ایک زمانہ دراز پر محیط ہے۔ فارس کئی سو سال قبل مسیح ہی میں رفعت و سربلندی حاصل کر چکا تھا اور وہ زمانہ جب کہ یونان میں افلاطون وارسطو کا طوطی بول رہا تھا۔ یا یوں کہیے کہ جب یونان بڑی حد تک عروج سے ہم کنار تھا تو اس وقت فارس انحطاط و زوال کی سرحدوں کو چھو رہا تھا۔ مختصر یہ کہ فارس نے جریدۂ عالم پر بہت گہرا نقش ثبت کیا تھا اور ملوک فارس اپنے دائرہ اقتدار و حاکمیت کو اس قدر وسیع اور مستحکم کر چکے تھے کہ اس وقت کی معلوم دنیا کے بیش تر ممالک ان کے حضور نذرانہ اطاعت پیش کرنے پر مجبور تھے۔ مزید برآں اس زمانے میں بھی جب کہ ان کا آفتابِ اقتدار گہنا گیا تھا اور ''ملوک طوائف'' فارس پر حکمرانی کر رہے تھے' وہ دنیا کے دوسرے حکمرانوں کے مقابلہ میں زیادہ قوت و جبروت کے مالک تھے۔ چناں چہ انھی ملوک طوائف کے زمانے میں یونان و روم پر حملے اور آس پاس کے علاقوں (مثلاً عراق و عرب) پر فوج کشی وغیرہ ہوئی۔ ان کے بعد ساسانیوں کے زمانے (226ء تا 653ء) میں بھی یہ روایت باقی رہی۔

بہر صورت قدامت تہذیب اور قدامت حکومت دونوں کے اعتبار سے فارس کی بادشاہی' تاریخ سیاست کے نہایت اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جیسا کہ ہم اُوپر اشارہ کر چکے ہیں اس کی تاریخ بہت طویل ہے جسے مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم بالفعل جس دور کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں اس کا تعلق ان کے چوتھے طبقہ یعنی ''ساسانیہ'' سے ہے۔ اس دور میں ملوک ساسانیہ کی ایک چھوٹی سی تعداد تو بلاشبہ ایسی ہے جس نے اپنے حکم واقتدار کا سکہ کافی عرصہ تک چلایا۔ اور اس زمانے میں کوئی ان کی ہم سری کا دعویٰ بھی بمشکل کر سکتا تھا لیکن تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ساسانی جاہ وجلال بھی ماند پڑتا چلا گیا۔ اس کے اوراق عظمت منتشر اور پراگندہ ہوتے چلے گئے۔ نااہل حکمرانوں' مسلسل بغاوتوں' سفاکانہ خون ریزیوں' سیاسی بدامنیوں' اختلافات و ہنگاموں اور آپس کی ریشہ دوانیوں نے آہستہ آہستہ ان کے شجرِ اقتدار کو کھوکھلا اور ان کی قبائے سیاست کو تار تار کر دیا۔

روم کی طرح فارس میں بھی شخصی' موروثی اور مطلق العنان بادشاہت تھی' اور یہی ایرانی نظام فکر و سیاست میں محور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ایک طرف حکمران یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ''ان کی رگوں میں خدائی خون ہے۔'' تو دوسری طرف اہلِ فارس بھی انھیں اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وہ خدا ہیں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ ان حکمرانوں کی فطرت میں ایک مقدس آسمانی چیز موجود ہے۔ چناں چہ یہ لوگ ان کے آگے سربسجود ہوتے تھے۔ ان کی الوہیت کے ترانے گاتے تھے اور انھیں قانون' تنقید اور بشریت سے بالاتر تصور کرتے تھے۔

ملک وقوم پر حکومت کرنے کے لیے ایک خاص گھرانا متعین تھا۔ اہل فارس سمجھتے تھے کہ صرف اسی گھرانے کے افراد تخت و تاج کے وارث اور ملک و سلطنت کے مالک ہو سکتے ہیں۔ چناں چہ لوگ بادشاہ پر ایمان رکھتے اور حکومت کو شاہی خاندان کا موروثی حق سمجھتے تھے اور اسی لیے اگر اس خاندان میں کوئی سن رسیدہ شخص نہ ملتا تو کسی نابالغ اور بچہ کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لینے میں بھی کوئی مضایقہ نہ سمجھتے تھے بلکہ اگر خاندان میں کوئی مرد باقی نہ رہتا تو عورت ہی کو تاج شاہی پہنا دیتے تھے۔ پھر تماشا یہ کہ تخت شاہی پر نصب وعزل کا یہ کھیل اس شان سے کھیلا جاتا تھا کہ اس میں کسی اصول اور ضابطے کی قید' اخلاق و کردار کی کوئی پابندی' رشتہ وعلائق کی کوئی پروا' چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز اور حلال وحرام' جائز و ناجائز اور حق و ناحق کا کوئی لحاظ نہ تھا' بس فکر صرف تخت کی اور ہوس محض اقتدار کی تھی اور مقصود صرف یہ تھا کہ تختِ حکومت حاصل ہو جائے خواہ اس کے لیے کوئی بھی راستہ کیوں نہ اختیار کرنا پڑے اور خواہ اس کے لیے اپنے دشمنوں ہی سے مدد کیوں نہ مانگنی پڑے۔ اسی لیے ہرمز سوم (457ء تا 459ء) کے مقابلہ پر اس کے بھائی فیروز اول (459ء تا 483ء) نے تاتاریوں (سفید ہن قبائل) سے مدد مانگی تھی۔ اور جب قباد اوّل (487 تا 531ء) نے مزدکی مذہب کی سرپرستی قبول کی تو ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا جس کے نتیجہ میں قباد کو تخت سے معزول کر دیا گیا اور اس نے قید سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس پناہ لی اور بالآخر انھی کی مدد سے دوبارہ تخت نشین ہوا۔ اسی اقتدار کی خاطر بلاش (487ء تا 583ء) کو معزول کیا گیا۔ اسی تخت کی ہوس میں نوشیرواں سے (531ء تا 579ء) دعویدار سلطنت کے قتل کی حرکت قبیحہ سرزد ہوئی۔ اسی کے لیے ہرمز چہارم اور خسرو پرویز (590 تا 628ء) قتل ہوئے اور اردشیر بن شیرویہ بمشکل ڈیڑھ سال حکمران رہا۔ شہر براز (یا شہریار) صرف چار دن حکومت کے مزے لوٹ سکا۔ اس کی جانشین بوران بنت کسریٰ پرویز صرف ایک سال چار ماہ تک بادشاہت کر سکی۔ اس کے بعد آنے والے حکمران جشندہ کی مدتِ ریاست تو ایک ماہ سے بھی کم رہی۔ آزرمیدخت محض چھے ماہ حکمرانی پر متمکن رہی۔ اس کا جانشین کسریٰ بن مہر جشنس چند دن بعد ہی قتل ہو گیا۔ یہی انجام فروز بن مہر جشنس کا ہوا۔ فرخزاد خسرو کی سلطانی چھے ماہ سے آگے نہ بڑھ سکی اور آخری بادشاہ (یزدجرد) یزدگرد بن شہریار کی عمر قتل کے وقت صرف ۲۲ سال تھی جب کہ اس کی حکمرانی کو دو یا چار سال گزرے تھے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اقتدار کی یہ ہوس صرف خاندان شاہی کے افراد تک محدود نہ تھی بلکہ بوران سے پہلے بعض دوسرے لوگوں نے بھی طالع آزمائی کی کوشش کی تھی۔ چناں چہ مذکورہ شہر براز (یا شہریار) کا تعلق خاندان شاہی سے نہ تھا۔

سلطنت فارس اگرچہ شخصی' موروثی اور مطلق العنان تھی اور بادشاہ اپنے حکم اور فیصلہ میں کسی کا پابند نہ تھا مگر اسی کے ساتھ ساتھ متعدد تاریخی واقعات سے ظاہر ہوتا ہے

کہ وہاں "عظمائے فارس" پر مشتمل ایک نوع کی "مجلس مشاورت" بھی تھی جو اگرچہ درباری اور شاہی خاندان کے افراد پر مشتمل تھی لیکن اپنی نوعیت میں وہ کتنی ہی محدود سہی بہرحال بادشاہ وقتاً فوقتاً احکام کے اجرا و نفاذ، والیوں کے تقرر دوسرے اہم مواقع پر اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ مثلاً جس زمانے میں یمن پر "مسروق" کی حکمرانی قائم تھی، سیف بن ذی یزن نامی ایک شخص اپنی قوم کی طرف سے پہلے قیصر روم کے دربار میں فریادی ہوا اور مسروق سے نجات دلانے کی درخواست کی لیکن وہاں سے مایوسی ہوئی تو عامل حیرہ نعمان بن منذر کی وساعت سے سیف نے نوشیرواں کے دربار میں بھی اس درخواست کو دہرایا۔ نوشیرواں نے سیف کی درخواست کو ہمدردی سے سنا اور مدد کے لیے آمادہ ہوگیا۔ مگر مدد کا طریقہ کار کیا ہو اور کیا صورت اختیار کی جائے تو اس سلسلے میں اس نے اہل دربار سے مشورہ کیا اور اسی مشورہ کے مطابق دہرز کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن روانہ کیا گیا جس نے مسروق کو قتل کر کے سیف کا یمن پر اقتدار قائم کر دیا۔ اسی طرح اردشیر بن شیرویہ کو جس وقت شہنشاہ بنایا گیا تو اس کی عمر مشکل سے سات سال تھی اور ظاہر ہے کہ اس عمر میں حکمرانی کے لیے وہ دوسروں کی مدد کا سخت محتاج بھی تھا۔ چناں چہ اس کی راہنمائی اور مشورہ کے لیے "مہاذرجنشس" کو منتخب کیا گیا تھا۔

سلطنت فارس کی تاریخ کا یہ ایک مختصر سا عمومی جائزہ تھا۔ اب جہاں تک چھٹی صدی عیسوی کے ربع آخر اور ساتویں صدی عیسوی میں بالخصوص اس سلطنت کی نوعیت و ماہیت کا تعلق ہے تو ہمیں مندرجہ ذیل اہم باتیں نظر آتی ہیں:

(الف) فارس میں شخصی، موروثی اور مطلق العنان شہنشاہیت کی روایت اپنے پورے التزام کے ساتھ جاری تھی۔ ایران کے حکمران جو اس زمانے میں انسانی قیادت کے دعویدار تھے ایک پرفریب اور مصنوعی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے رؤسا، امرا اور وزرا کو لذت اندوزی کے سوا کسی بات کی فکر نہ تھی "عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا۔ تکلفاتِ زندگی تعیشات اور سامان آرائش کی وہ بہتات تھی اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔" اس بے پناہ عیاشی اور امور سلطنت سے غفلت کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ سازشیں، بغاوتیں اور خون ریزیاں روز کا معمول بن گئیں اور بدامنی بے چینی عام ہوگئی اور یوں نظم مملکت روز بروز کم زور سے کم زور تر ہوتا چلا گیا۔

(ب) مجموعی طور پر سلطنتِ فارس روبہ زوال تھی۔ اگرچہ بعض حوصلہ مند حکمرانوں کے زمانے میں اس نے وقتی طور پر سنبھالا لیا لیکن یہ شمع زیادہ عرصہ تک اپنی تابانی نہ پھیلا سکی اور ایک مختصر سے عرصہ ہی میں بادشاہوں کی ایک بڑی تعداد زوال کے ناقوس بجاتی گزر گئی۔ سلطنت فارس کے اواخر عہد کا سب سے جلیل القدر حکمران، نوشیرواں تھا جس نے تقریباً 47 سال ایک بڑے علاقے کو اپنے زیر نگیں رکھا اور اس کی حکومت کے ختم ہونے میں سات سال باقی تھے کہ انسانیت کا آخری نجات دہندہ، دنیا کی ظلمتوں کو چیرتا ہوا اس عالمِ آب و گل میں تشریف لایا۔ نوشیرواں کا جانشین ہرمز بنا پھر بارہ سال کے بعد تخت فارس پر کسریٰ پرویز نامی وہ آخری حوصلہ مند بادشاہ متمکن ہوا جس کی ۳۲ سال فرماں روائی کے بعد انحطاط و زوال سلطنت کی رفتار انتہائی تیز ہوگئی۔ اسی کسریٰ پرویز کے دورِ حکومت میں آفتاب رسالت طلوع ہوا۔ اسی کے عہد میر آنحضرت ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی اور اسی کے عہد میں "ذی قار" کا وہ فیصلہ کن واقعہ پیش آیا جس کے بعد عرب و عجم کے درمیان تفریق ہوگئی اور رسالت محمدی کے ایک ادنیٰ سے مظاہرے نے سلطنت فارس کے عظیم سلسلہ حکومت کو فی الواقع منقطع کر دیا اور چند ہی برس میں فتوحاتِ اسلامی کا سیلاب ایرانی شوکت و سطوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔

(ج) سلطنت فارس کے انحطاط و زوال میں جن عوامل نے حصہ لیا اور اس کی سیاسی تنظیم کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ ان میں سے ایک ایران کی معاشرتی و اخلاقی حالت ہے جسے سیاسی تاریخ کے مطالعہ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہاں ایک طبقہ مسرفانہ اور عیش پسندانہ زندگی میں مشغول ہو کر دوسرے مشاغل و فرائض سے غافل ہو چکا تھا اور اس کا بار دوسرے طبقہ پر تھا جو محصولات اور حکومت کے بے جا مطالبات کی چکی میں پس رہا تھا نیز تیسرا طبقہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا جانوروں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اس کش مکش نے یقیناً اجتماعی بدنظمی اور انتشار کو دعوت دی کیوں کہ رعایا زیادہ عرصہ تک ظلم و تشدد اور بنیادی حقوق سے محرومی کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

اس کے اخلاقی زوال اور مذہبی انتشار کی تاریخ بھی ابتدا سے شانہ بشانہ چل رہی تھی۔ زمانہ قدیم میں اہل فارس مظاہرِ قدرت کے پرستار تھے۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں زرتشتی مذہب کا آغاز ہوا اور ساسانی حکمرانوں کا بھی سرکاری مذہب یہی تھا۔ تیسری صدی عیسوی میں شہوت پرستی اور جنسی تحریکات نے مذہب کا چولا اختیار کیا۔ مانی مذہب کا آغاز ہوا جو مسیحیت و مجوسیت کی آمیزش کا مرقع تھا اور جس میں نور و ظلمت کا ایسا گورکھ دھندا تھا جس سے آخر تک نکلنا اس قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ بہرام نے ۲۷۶ء میں مانی کو یہ کہتے ہوئے قتل کر ڈالا کہ تو دنیا کو تباہی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اس کے قتل ہو جانے کے باوجود اس مذہب کے اثرات صدیوں فارس میں قائم رہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایک دوسرا مذہب پیدا ہوا جس کا بانی مزدک تھا۔ عیش پرستوں اور ہوس رانوں نے اسے خوشی خوشی قبول کیا اور بہت جلد اس مذہب کو حکمرانِ وقت قباد (۴۸۷ء تا ۵۳۱ء) کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک جنسی بحران میں ڈوب گیا مگر اہل فارس جلد ہی اس سے عاجز آ گئے۔ چناں چہ نوشیرواں نے برسر اقتدار آتے ہی اس مذہب کے ایک لاکھ سے زائد پیروؤں کو قتل کر ڈالا۔ ان مشہور مذاہب کے علاوہ شاہ پرستی نے بھی تقریباً ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی تھی۔

مختصر یہ کہ ان معاشرتی اور اخلاقی بدحالیوں نے سیاسی حالات کو ابتر کرنے میں مؤثر کردار ادا کیا اور ایرانی سیاست کی قبائے دراز کو کرم خوردہ کر دیا۔

ہندوستان

اختصار کی خاطر ہندوستان کے مطالعہ کو ہم مندرجہ ذیل نکات کی صورت میں پیش کرنا چاہتے ہیں:

(الف) اپنے انتہائی قدیم زمانے سے قرونِ وسطیٰ تک ہندوستان میں حاکمیت کا ایک ہی تصور ہمیشہ قائم رہا کہ راجا ہی سیاسی تنظیم کا سربراہ' خدائی ارادہ کا مظہر' دیوتاؤں سے نسلی تعلق رکھنے والا اور اپنے ہم عصر فارسیوں کی طرح ہر قسم کی تنقید اور رائے زنی سے بالاتر ہوتا ہے۔ راجا ہی تمام طاقتوں کا سرچشمہ اور دیوتاؤں کا محبوب ونائب ہے۔ اس کا حکم قانون ہے۔ اس کا دربار سب سے بڑی عدالت ہے اور اس کی ذات غلطیوں سے پاک ومنزہ ہے۔ اخلاقیات کے گورکھ دھندوں سے دور محض سیاسی غلبہ کا حصول راجا کا مقصود ہے جس کے ضمن میں ہر جائز و ناجائز ذریعہ اختیار کرسکتا ہے۔ بہرصورت یہ بات طے ہے کہ ازمنۂ قدیم سے ہندوستان میں عام طرزِ جہانبانی ''بادشاہت'' اور ملوکیت رہا ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ بادشاہتیں بذریعہ انتخاب عمل میں آتی تھیں یا بذریعہ نامزدگی۔ تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ عام اصول نامزدگی اور موروثیت ہی کا تھا اور بعض اوقات جو کچھ انتخابی عمل نظر آتا ہے وہ محض نمائشی اور مصنوعی تھا۔

(ب) راجا اگرچہ تمام انتظامی' عدالتی اور فوجی شعبوں کا مالک تھا لیکن تمام کاموں کو اکیلا انجام نہیں دے سکتا تھا اس لیے اس نے مشیروں کی ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جو اسے اہم امور میں مشورہ دیتی تھی اور اس کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھی بلکہ ویدوں کے زمانے میں تو مقامی کونسل (سبھا) اور مرکز کونسل (سمتا) کی بنا پر بادشاہ کے اختیارات نسبتاً محدود ہو گئے تھے۔ ہاں ویدوں کے آخری زمانے میں ''سمتا'' کا نام ونشان بالکل مٹ گیا تھا۔ اسی طرح ہرش کے عہد میں بھی راجا فرماں روائے مطلق نہ تھا بلکہ اس کے اختیارات میں وزرا کا بھی عمل دخل تھا۔

(ج) ہندوستان میں 'اشرافیہ' (Aristocracy) طرز کی فرماں روائی کا آغاز کم از کم شمالی حصہ میں تقریباً اسی زمانہ میں ہوا جس زمانہ میں کہ یونان میں ہوا تھا۔ یہ ''اشرافی جمہوریتیں'' بہرحال بادشاہت کے شانہ بشانہ قائم ہوئیں کیوں کہ عام چلن بہرکیف ''بادشاہت'' ہی تھا۔

(د) سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی حالت بھی روم اور ایران سے کچھ کم خراب نہیں تھی۔ پانچویں صدی عیسوی کے اختتام سے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک کا زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ابتری اور گمنامی کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔ 320ء میں جس عظیم الشان گپت سلطنت کی بنیاد پڑی تھی' وہ پانچویں صدی کے پہلے نصف تک ہندوستان کی مرکزی حیثیت سے قائم رہی لیکن پھر روم اور ایران کی طرح وسطِ ایشیا کی وحشی اقوام نے گپت سلطنت کو بھی زمانہ شباب میں زوال سے ہم کنار کر دیا اور اس طرح ہندوستان بھی ان کی عظیم الشان سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا جو ایشیا اور یورپ پر پھیلی ہوئی تھی۔ گپت سلطنت کے زوال کے بعد سے ہرش وردھن کے تخت نشین ہونے تک کا زمانہ (500ء تا606ء) ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک تاریک باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ گپت سلطنت کا زوال اور وردھن حملہ آوروں کی آمد ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں دراصل ایک نہایت اہم موڑ تھا۔

(ہ) گپت سلطنت کا زوال بہت سے ناگزیر نتائج کا سبب بنا۔ صوبائی راجاؤں' گورنروں اور جاگیردار ریاستوں نے اپنی خود مختاری کا اعلان کردیا۔ پورا شمالی ہندوستان بہت سی آزاد ریاستوں میں منقسم ہوگیا۔ ہندوستان کی ابتر سیاسی صورت حال کے بارے میں اسمتھ لکھتا ہے: ''چھٹی صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں ہندوستان کی تاریخ کے متعلق بہت ہی کم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وہاں کسی کامل اقتدار رکھنے والی طاقت کا وجود نہیں تھا اور وادی گنگا کی تمام ریاستیں ہن قبائل کے حملوں سے تہ وبالا ہوچکی تھیں۔''

ایک اور مصنف کا بیان ہے کہ:

'قرونِ وسطیٰ کے آخری حصہ پر ہندوستان کی ملکی حالت بہت قابل اطمینان نہ تھی۔ چھوٹے چھوٹے راج بنتے جاتے تھے ہرش اور پل کیشی کے بعد تو ان کی سلطنتیں کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی تھیں۔ سولنکی' پال' سین' پریتہار' جادو' گوہل' راٹھور' متعدد خاندان اپنی اپنی ترقی میں کوشاں تھے۔ اس لیے ہندوستان کی مجموعی طاقت کوئی نہ تھی۔ صدہا ریاستوں میں بٹ جانے کے باعث ملک کی طاقت بکھری ہوئی تھی۔ قومیت کا احساس بالکل نہ تھا۔ ان راجاؤں میں برابر لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور سیاسی کیفیت روز بروز نازک ہوتی جاتی تھی۔ ملک کی سیاسیات اور دیگر انتظامی شعبہ جات پر ان حالات کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ سب ریاستیں رفتہ رفتہ زیادہ آزاد اور مطلق العنان ہوتی گئیں۔ راجاؤں کو رعایا کی بہبود کا خیال نہ رہا۔ رعایا کی رائے پیروں سے ٹھکرائی جانے لگی۔ آپس کی لڑائیوں سے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ رعایا کی آسائش کا خیال کریں۔ ہاں لڑائیوں کے لیے جب روپے کی ضرورت ہوتی رعایا پر محصول کا اضافہ کردیا جاتا تھا۔''

ایک اور مصنف صورت حال کی عکاسی یوں کرتا ہے:

''پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہن کے حملوں نے گپت سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ اور شاہانِ گپت ایک مقامی راجا کی حیثیت میں ڈوب گئے جو محض ایک محدود علاقے پر حکومت کرسکتا تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان کی سیاسی قیادت ہرش وردھن کے تحت قنوج کو منتقل ہوگئی جس نے اپنی سیاسی لیاقت اور فتح مندی سے آخری بار شمالی ہندوستان کے منتشر اجزا کو جوڑنے کی کام یاب کوشش کی۔''

مزید برآں جو خود مختار ریاستیں گپت سلطنت کے کھنڈروں پر قائم ہوئیں ان میں سے کسی ایک کو بھی مرکزی حیثیت حاصل نہ تھی۔ صرف وسط ہندوستان میں نو خود مختار ریاستیں قائم تھیں۔ بنگال کئی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور اسمتھ کے بقول کشمیر' سندھ' آسام اور نیپال میں الگ الگ ریاستیں قائم تھیں۔ ان ریاستوں کی آپس میں کش مکش کے نتیجہ میں بالآخر ہرش وردھن کی حکومت نے مخالفین کو مغلوب کر کے اپنے آپ کو مستحکم کیا اور اس کے بعد کے دور کو ہم ہندوستان کی سیاسی یک جہتی کا عارضی زمانہ کہہ سکتے ہیں۔

(و) ملک کے اندرونی و بیرونی خلفشار میں معاشرتی' اخلاقی اور مذہبی عناصر کا

کردار بھی بہت اہم رہا ہے۔ وہی طبقاتی کش مکش جو روم اور ایران میں تھی ہندوستان میں بھی موجود تھی بلکہ ہندوستان طبقہ واریت میں تمام اقوام عالم سے بڑھ گیا تھا۔ امرا اور مقتدر طبقہ متوسط اور غلام تو خیر موجود ہی تھے اونچ نیچ کا فرق اور ذاتوں کی تقسیم اس پر مستزاد تھی بلکہ راجا کے دیگر فرائض میں سے ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ ذاتوں کے فرق کو قائم رکھے۔ منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں:

1: برہمن یا مذہبی پیشوا
2: کھتری (حکمران اور لڑنے والے)
3: ویش (زراعت وتجارت پیشہ) اور
4: شودر جن کا کوئی خاص پیشہ نہیں تھا اور جو دوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے۔

یہ تقسیم الہامی سمجھی جاتی تھی۔ مزید برآں ایسے قوانین وضع کیے گئے تھے جس سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری وحمایت اور بعض پر جبر وستم مقصود تھا۔ مثلاً:

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بدھ راہبہ تک کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھولے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ہ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہییں۔ اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیے۔

ہندوستانی معاشرہ میں مظاہر پرستی اور بت پرستی بنیادی حیثیت رکھتی تھیں۔ عوام کا مذاق اور مزاج کسی ایسے مذہب کو قبول کرنے پر تیار ہی نہ ہوتا جس میں بت پرستی نہ ہو۔ ہندوستان کی تاریخ میں چھٹی صدی عیسوی کا زمانہ معبودوں کی کثرت کا زمانہ ہے۔ وید میں دیوتاؤں کی تعداد ۳۳ تھی لیکن اس زمانہ میں ۳۳ کروڑ ہوگئی تھی۔ دنیا کی ہر پسندیدہ شے قوت والی چیز اور ہرنا قابل تسخیر طاقت اہل ہند کے نزدیک عبادت اور پرستش کے لائق تھی۔ اسی طرح بتوں' دیوتاؤں' دیویوں کا کوئی شمار نہیں تھا اور قابل پرستش اشیا میں معدنیات و جمادات' اشجار و نباتات' پہاڑ' دریا' حیوانات حتیٰ کہ اعضائے مخصوصہ وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ اس طرح یہ قدیم مذہب افسانوی روایات اور عقاید وعبادات کا ایک دیو مالا بن کر رہ گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روز افزوں بت پرستی سے متاثر ہو کر جین مت اور بدھ مت نے بھی بت پرستی کو اپنے مذہب کا جزو قرار دیا اور اپنی ترقی اور استحکام کا ذریعہ سمجھا اور عبادات کے طریقوں میں سحر واوہام داخل کر لیے۔ ادھر ہندوؤں نے بدھ کو وشنو کا نواں اوتار مان لیا' اور بدھ مت نے عوام کی نظروں میں مقبولیت حاصل کی یہاں تک کہ دونوں مذاہب میں اس قدر یک رنگی پیدا ہوگئی کہ بدھ اور ہندو دونوں میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا۔

چین

چین کی تہذیب اور اس کا تمدن اتنا قدیم ہے کہ صحیح معنوں میں اس کے آغاز کا تعین اب تک نہیں ہو سکا۔ چین کے تاریخی دور کی ابتدا جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے ہیا کے زمانہ (۲۰۸۵ء تا ۲۰۰۴ ق م) سے ہوئی۔ اس کے بعد بتدریج شوان ینگ شانگ اور ینگ کے خاندان برسراقتدار آئے۔ پھر طوائف الملوکی کا طویل دور شروع ہوا جو چو خاندان کی حکومت کے قیام تک جاری رہا۔ ہان کا پہلا فرماں روا کوئی تھا۔ اس کے زمانے میں ملک کی علمی وسیاسی قوت نے فروغ پایا۔ اس خانوادہ کو تیسری صدی عیسوی تک حکومت کا موقع ملا۔ لیکن آغاز سے کچھ ہی عرصہ بعد ضعف وانحطاط کا عمل جاری ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ خانہ جنگیاں' بغاوتیں اور دوسرے فتنے بڑھ گئے یہاں تک کہ ایک فوجی سردار نے بغاوت کر کے ۲۲۱ء میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس کی وجہ سے اندرونی خلفشار اور افراتفری مزید بڑھ گئی اور صورت حال اس حد تک خراب ہوگئی کہ چالیس سال سے زائد عرصہ تک تخت شاہی خالی رہا اور کوئی حکومت وہاں قائم نہ ہو سکی۔ آخر کار ۲۶۵ء میں خاندان شی چیہ نے حالات پر قابو پایا اور اپنی بساط اقتدار کو چھٹی صدی عیسوی تک پھیلا دیا۔ بظاہر حکومت وسیادت کا یہ ایک طویل عرصہ ہے لیکن فی الحقیقت چین کی تاریخ میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ کیوں کہ ساڑھے تین سو سال کا یہ دور سخت انتشار واضطراب سے عبارت ہے اور طوائف الملوکی سے مختلف نہیں ہے۔ بہر حال عرصہ دراز کے افتراق کے بعد ۵۸۹ء میں سوئی خاندان برسر اقتدار آیا' سلطنت ہوا۔ تو کچھ مدت کے لیے ملک کے حالات سدھر گئے۔ اس کے باشندوں کو امن وامان میسر آیا اور یک گونہ سیاسی اتحاد قائم ہونے کے علاوہ ملک کا وقار بھی بلند ہوا۔ مگر ۶۱۸ء میں یعنی ہجرت نبوی ﷺ سے چار سال پہلے سوئی خاندان کو تانگ خاندان کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔ تانگ کا دور ۶۱۸ء سے ۹۰۶ء تک رہا۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے وقت چین میں سوئی خاندان مسند اقتدار پر فائز تھا اور تانگ خاندان نے اس وقت زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی جب کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کو آٹھ سال ہو چکے تھے اور آپ ﷺ قریش کے معاشی ومعاشرتی مقاطعہ کا سامنا کر رہے تھے۔ تانگ کا دور حکومت بہت طویل رہا۔ اس کا دوسرا فرماں روا تائی شنگ تھا۔ اس نے ۶۲۷ء سے ۶۴۹ء تک حکومت کی۔ اسی کے زمانے میں حضور ﷺ نے رحلت فرمائی اور خود جب وہ مرا تو اس وقت حضرت عثمانؓ تخت خلافت پر متمکن تھے۔ بہر حال مجموعی طور پر یہ کہنا چاہیے کہ خاندان تانگ سے چین کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ مزید برآں چین نے بت پرستی' کنفیوشس ازم اور بدھ مت کے عروج وزوال اور نسطوری و مانوی مذہب کے بعد اسلام کا جلوہ بھی اسی دور میں دیکھا۔

روم' ایران اور ہندوستان کی طرح چین میں بھی آمریت اور مطلق العنانیت کا دور دورہ تھا۔ ان کی حکومت شخصی' استبدادی اور موروثی تھی۔ بادشاہ ان کا فرماں روائے مطلق تھا۔ اسی کو تمام اختیارات حاصل تھے۔ اس کا حکم قانون تھا اور اس کا ایوان ملک کی

سب سے بڑی عدالت تھی۔ اہل چین اپنے بادشاہ کو "شہنشاہ فرزند آسمان" کہتے تھے کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان نر ہے اور زمین مادہ۔ اور کائنات کو انھی دونوں نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ ختا اول زمین اور آسمان کے جوڑے کی پہلی اولاد ہے۔ اسی بنا پر شاہ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا۔ اسے حق تھا کہ جو چاہے کرے۔ لوگ اس سے کہتے تھے کہ "آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں۔" لیکن اوپر کے سیاسی جائزہ سے یہ عجیب بات سامنے آتی ہے کہ اتنی سخت شاہ پرستی کے باوجود بعثتِ نبوی ﷺ سے قبل چین میں سلطنت کو استحکام حاصل نہیں ہو سکا۔ خانہ جنگیاں معمول بن چکی تھیں اور بیرونی حملہ آوروں نے پورے نظام سیاست کو برباد کر رکھا تھا۔

دوسرے ممالک

عرب کا مطالعہ تو ہم آئندہ صفحات میں کریں گے، یہاں ہم مختصراً دنیا کے بعض دوسرے ممالک کی سیاسی و تمدنی کیفیت پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ دنیا کے سیاسی نظام کی مکمل تصویر ہمارے سامنے آ جائے۔ البتہ یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ اب تک ہم جن ممالک کا جائزہ لے چکے ہیں ان کے علاوہ دوسرے ممالک کے بارے میں تفصیلات بہت کم ملتی ہیں مثلاً کمبوڈیا کے بارے میں صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ بعثتِ رسول ﷺ کے وقت وہاں کھمبر خاندان کی حکومت تھی جو ۶۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک قائم رہی۔ مصر کی تاریخ اگرچہ بہت قدیم ہے لیکن ملکہ قلوپطرہ کے انتقال ۳۰ ق م کے بعد سے آغاز اسلام تک مصر کی حیثیت سلطنت رومہ کے ایک صوبہ کی رہی۔ یہی صورت رسول اللہ ﷺ کی ولادت اور بعثت کے وقت تھی۔ قیصر روم کی طرف سے مقرر کردہ مصر کا گورنر اسکندریہ میں رہتا تھا۔ مقوقس بھی مصر کا گورنر ہی تھا جسے رسول اللہ ﷺ نے نامۂ مبارک بھیجا تھا۔ حبشہ بھی اس وقت سلطنت رومہ کے زیر اثر تھا پہلی صدی عیسوی میں جب یمن میں حمیر خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو حبشہ کے باشندوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا اور اکسوم کو اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ اس وقت سے یہاں بھی عیسائیت کو قبول کر لیا گیا۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت اور بعثت کے وقت یہاں عیسائیت رائج تھی اور یہاں کے بادشاہ کو نجاشی کہتے تھے۔ دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح اسپین کی سیاسی حالت بھی اس زمانے میں ابتر تھی۔ وہ رومی حکومت کے زوال کے بعد سے وحشی اقوام کی گزرگاہ بن گیا تھا۔ یہاں پہلے گاتھ فرماں روا ہوئے پھر ونڈال آئے اور پھر دوبارہ گاتھ قوم حکمران ہوئی۔ گاتھ قوم کا سیاسی نظام شاہی کونسل اور مذہب کونسل کے اشتراک سے روبہ عمل آیا۔ راہب اور پادری ہر وقت اپنے اقتدار کی فکر میں رہتے تھے۔ سیاسی رسہ کشی اور معیشت و معاشرت میں ابتری عام تھی۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق اسپین کے ملوک میں سے شیشوط رسول اللہ ﷺ کا ہم عصر تھا۔ جزائر برطانیہ میں رسول اللہ کی ولادت سے ایک صدی قبل تین قبیلے اینگل، سیکسن اور جوٹ، جٹ لینڈ اور جرمنی کے شمالی علاقے سے آ کر انگلینڈ پر قابض ہو گئے تھے۔ یہی قبیلے انگریزوں کے مورث اعلیٰ ہیں اور تاریخ میں اینگلو سیکسن کہلاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت جزائر برطانیہ آزاد ریاستوں میں منقسم تھا جن پر مختلف بادشاہ حکومت کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے وقت قبیلہ جوٹ کا فرماں روا اتھلبرٹ تھا۔ ۶۱۶ء میں وہ مر گیا تو اینگل کے ایڈون نے اقتدار سنبھالا۔ تاہم ملک میں نہ تو کوئی مرکزیت قائم ہو سکی اور نہ تہذیب و تمدن نے کوئی خاص ترقی حاصل کی۔ سیاسی، اخلاقی اور روحانی پستی پورے ملک میں تھی۔ باقی یورپ تمدن سے قطعاً ناآشنا تھا۔ وحشی اور غیر مہذب قبائل براعظم کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ اب جہاں تک مشرق اور وسط ایشیا کی دوسری قوموں کا تعلق ہے تو ان کا حال برا تھا۔ نہ کوئی علمی دولت ان کے پاس تھی نہ کوئی نظام سیاست ان کے ہاں موجود تھا۔ فی الحقیقت یہ قومیں (مغل، ترک، جاپانی وغیرہ) اپنے عبوری دور میں تھیں۔ جاہلانہ بت پرستی سے نکل کر تمدن کی طرف آ رہی تھیں اور چند قومیں ایسی بھی تھیں جو اس وقت تک شہریت اور زندگی کی ابتدائی منزل میں تھیں اور عقلی و تمدنی حیثیت سے ان کا دور طفولیت تھا۔ اور وہ مغربی قومیں جو بالکل شمال و مغرب میں آباد تھیں جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں اور جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان ممالک میں اب تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہ ہوئی تھی۔

عرب

اب ہم اخیر میں سرزمین عرب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا ہمارے موضوع سے براہ راست تعلق ہے اور اس کا جائزہ لیے بغیر پیش نظر ریاست کے نشو و ارتقا کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ عرب کی تہذیب اور اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی قدیم کہ اس خطہ ارضی پر انسانی آبادی کیوں کہ اس خطہ کو امم سامیہ کا مسکن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ یہ علاقہ مدت مدید سے مختلف اقوام و ملل کی آماج گاہ اور ان کے عروج و زوال کا امین رہا ہے۔ بقول سید سلیمان ندوی کہ "عرب کے ملک میں پانی کا دریا نہیں لیکن وہاں انسانوں کا دریا ہے۔ تاریخ نے چار بار اس دریا میں طوفان آتے دیکھا ہے۔ ایک مسیح سے ڈھائی یا تین ہزار برس پہلے جب یہاں سے قبائل کا سیلاب موجیں مارتا ہوا بابل و اسیریا، مصر اور فینشیا (کنعان) میں پھیل گیا۔ اس سیلاب کا زور کم ہو رہا تھا کہ ۱۵۰۰ ق م میں ایک اور طوفان آدومی، موآبی اور مدیانی قبائل کا اٹھا اور پاس کے ملکوں میں پھیل گیا۔ لیکن اس کا دائرہ پہلے سے کم تھا۔ تیسری بار معینی، سبائی وغیرہ اٹھے اور پھیلے لیکن سب سے آخری طوفان جو پہلی صدی ہجری میں مسیح سے چھ سو برس بعد اٹھا وہ بعد میں زیادہ وسیع الاثر تھا۔ جو ایک طرف گنگا کے دہانے سے مل گیا اور دوسری طرف بحر محیط سے۔"

قوم نوح کی بربادی کے بعد عرب میں جو سب سے پہلی مقتدر اور حکمران جماعت ظہور پزیر ہوئی قرآن کی زبان میں اس کا نام عاد ہے۔ جس کا تعلق عرب مورخین کے نزدیک امم بائدہ (برباد ہو جانے والے قبائل) سے ہے۔ لیکن عاد محض ایک محدود و مختصر قبیلہ نہ تھا بلکہ ایک عظیم الشان قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ ایشیا اور افریقہ کا کثیر حصہ اس کے زور و قوت کا تماشا گاہ تھا۔ بڑی بڑی

عظیم الشان عمارتیں اس کے دست صنعت کا نتیجہ تھیں۔ اس لیے قرآن نے عرب کے لیے اسے عبرت و بصیرت کا ایک نمونہ بنا کر پیش کیا اور اس کی داستان بار بار دہرائی۔ عاد کی عظمت اور ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م تک ہے اور صالحین عاد کا وجود اس کے بعد بھی ابتدائے عہد مسیح تک باقی رہا ہے۔ عاد کی مرکزی آبادی' عرب کے بہترین حصہ یعنی یمن و حضرموت میں سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔ مرکز حکومت ملک یمن میں تھا لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ عراق تک وسیع تھی۔ عاد کی سیاسی تاریخ کی دو جولان گاہیں تھیں' ایک بیرون عرب اور دوسری اندرون عرب۔ بیرون عرب ان کی حکومتیں پہلے مرحلہ میں (4000 تا 1900 ق م) بابل' مصر اور دیگر ممالک میں قائم ہوئیں اور دوسرے مرحلہ میں حضرموت سواحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک عاد ثانیہ' عرب میں حجاز سے حدود سینا تک ثمود' یمامہ میں طسم و جدیس اور یمن میں اہل معین نے حکومتیں قائم کیں۔ لیکن ہمیں باوجود کوشش کے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کے اقتدار و نظم حکومت کی نوعیت کیا تھی۔

عاد کے بعد شہرت اور سیاسی جانشینی ثمود کو حاصل ہوئی۔ ثمود عرب کے شمالی و مغربی علاقے پر قابض تھے جس کا نام اس زمانے میں وادی القریٰ تھا۔ ثمود کے ملک کا دارالحکومت حجر تھا' یہ شہر اس قدیم راستہ پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ اس قوم کے سیاسی حالات کا علم نہیں ہو سکا ہے لیکن اتنا معلوم ہے کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی۔ فن تعمیر میں عاد کی طرح اسے بھی کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا' پتھروں کی عمارات و مقابر تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ ان پر آرامی و ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں لیکن ان میں سے اکثر آرامی کتابت نبطی اقوام کی ہے جنھوں نے قبل مسیح و بعد اسی مقام پر حکومت قائم کی تھی۔ ان کا زمانہ تقریباً 1800 ق م تا 1600 ق م تک ہے۔ اس قوم کی اصلاح و تعلیم کے لیے حضرت صالحؑ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ ثمود اولیٰ کے جانشین اہل مدین ہوئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 900 ق م یا 1000 ق م میں اہل مدین جب بنی اسرائیل کے ہاتھ سے کلیتاً برباد ہو گئے تو ثمود ثانیہ نے پھر ایک بار سنبھالا لیا اور یہ وہی زمانہ ہے جس میں شاہ اشور نے شمالی عرب پر حملہ کر کے ثمود سے 700 ق م میں خراج وصول کیا۔ اس کے بعد ظہور مسیح سے پہلے انباط نے ثمود کو فتح کر لیا اس کے بعد جب رومیوں نے انباط پر حملہ کیا تو ثمود دشمنوں کے ساتھ ہو گئے اور اس خصوصیت سے تاریخ روم میں ثمود کا ذکر آیا۔ اسلام جب آیا تو ثمود کا نام و نشان نہ تھا۔ یہاں قبائل جہینہ' و بلی اور یہود اس وقت آباد تھے۔ اب جہاں تک دوسری قدیم ترین حکومتوں مثلاً معینی' سبائی' حمیری وغیرہ کا تعلق ہے جن کا غلبہ اور وجود ایک عرصہ تک قائم رہا تو ان کی تفصیلات کا جاننا اس وقت طوالت کا باعث اور غیر ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ عرب کے سلسلہ میں ان قدیم تاریخی صداقتوں کا ذکر ہم نے اس لیے کیا ہے کہ کچھ باتیں بطور مقدمہ معلوم کر لی جائیں۔ یعنی:

(الف) عرب کا علاقہ ازمنۂ قدیم سے تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہا ہے اور اپنے ثقافتی اثرات اس نے دنیا کے دوسرے حصوں تک منتقل کیے ہیں۔

(ب) اہل عرب ابتدائے عہد تاریخ سے تمدن و حضارت اور حکومت و سلطنت سے واقف رہے ہیں اور ان میں سیاست کا واضح تصور اور شعور موجود رہا ہے اور شاید اسی لیے مارگولیتھ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

''کتبات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عرب منظم ریاستوں کا ایک سلسلہ نامعلوم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔'' مزید برآں وہاں کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس علاقے سے ''ایک منظم سیاسی تنظیم کی یادیں وابستہ ہیں جو اپنی روایات و رسوم رکھتی ہیں اور جن کے پیچھے ایک تاریخ موجود ہے۔''

(ج) عرب میں اگرچہ ریاستوں کا وجود قدیم ہے لیکن کسی زمانے میں بھی کوئی ایک ہمہ گیر' ملک گیر اور متحدہ ریاست عرب میں قائم نہیں ہو سکی (دنیا کے دوسرے بہت سے علاقوں کی طرح مثلاً یونان) اور نہ کبھی پورا عرب ایک پرچم تلے جمع ہوا۔ بہرصورت رفتہ رفتہ تمام قدیم حکومتیں تباہ و برباد ہو گئیں۔ البتہ ظہور اسلام سے کچھ پہلے' چند حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں باقی تھیں۔ مثلاً:

(۱) حیرہ و عراق میں آل منذر (لخمیوں) کی موروثی حکومت تھی جو سلطنت فارس کے ماتحت تھی اور عرب و ایران کے درمیان ایک طفیلی ریاست کی حیثیت سے قائم تھی۔ آل منذر نے ساسانی دور میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ ''اسی کے توسط سے ساسانی خاندان نے عربوں پر اپنی برتری ثابت کی اور اسی کے ذریعہ شام کے وسیع و شاداب علاقوں کو بار بار روندا۔ ساسانی خاندان سرحدی امور میں انھی پر تکیہ کرتا تھا۔ خصوصیت سے منذر اول اور منذر ثالث کے دور میں تو ساسانی خاندان نے لخمیوں کی ناز برداری بھی کی۔ انھیں بڑے بڑے انعامات سے نوازا اور ان کی فوجوں سے شام کی تباہی و بربادی میں کام لیا۔'' اسی خاندان کے حکمران عمرو بن المنذر کے دور حکومت میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت ہوئی جب کہ اس کی حکومت کے 8 سال 8 ماہ گزر چکے تھے۔ بروایت ابن خلدون اس کا جانشین شقیقہ قابوس اور اس کا جانشین منذر ہوا اور اس کے بعد نعمان بن منذر برسر اقتدار آیا۔ نعمان کی کل مدت حکومت 22 سال ہے یعنی 8 سال ہرمز کے زمانہ میں اور ۱۴ سال کسریٰ پرویز کے زمانہ میں۔ کسریٰ پرویز نے نعمان کو قتل کیا اور لخمی خاندان کا اقتدار ختم کیا۔ اور حیرہ اور اس کے ساتھ اس سارے علاقہ کو جہاں تک لخمی خاندان کی ردائے اقتدار پھیلی ہوئی تھی۔ براہ راست اپنے تسلط میں لے لیا۔ گویا نعمان ملوک حیرہ کا آخری بادشاہ اور خاندان لخم کا آخری تاج دار تھا۔ اس کے بعد کسریٰ نے ایاس بن قبیصہ الطائی کو وہاں کا حاکم بنایا اور یوں حیرہ کی ریاست مرزبانان فارس کے قبضہ میں چلی گئی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے حیرہ کو فتح کیا۔

(۲) عرب کے شمال میں شام کی سرحد پر آل غسان (بنو جفنہ) کی حکومت قائم تھی اور مدت دراز سے چلی آ رہی تھی اور جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ ریاست انتداب روم کے ماتحت تھی' یہ اس زمانے کی بات ہے جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ قیصر روم نے اس اندیشہ سے کہ مبادا غسانی اہل فارس کی مدد کر دیں' ان کے

سردار ثعلبہ بن عمرو اور اس کے بھائی جزع بن عمرو کو بلایا اور ان سے اس بات پر معاہدہ کر لیا کہ اگر کوئی عرب قبیلہ غسان پر حملہ کرے گا تو قیصر ۴۰ ہزار رومی فوج کے ساتھ ان کی مدد کرے گا۔ اور اگر کوئی دشمن قیصر روم پر حملہ آور ہوگا تو غسانی ۲۰ ہزار سپاہ کے ساتھ اس کی مدد کو پہنچیں گے۔ چناں چہ اس معاہدہ سے غسانیوں کی حکومت مضبوط و مستحکم ہوگئی اور ایک حکمران سے دوسرے حکمران کو ورثہ میں ملتی رہی۔ ہمارے خیال میں ابن خلدون کا یہ بیان اس کی نوعیت کو اور واضح کر دیتا ہے کہ ملوک غسان کی کل تعداد ۳۲ اور ان کی مدت حکومت تقریباً ۶۰۰ سال ہے۔ ان کا مرکز حکومت بصری تھا۔ غساسنہ کے ایک حاکم "حارث بن ابی شمر" کے عہد حکومت میں بعثتِ نبوی ﷺ ہوئی۔ یہ نعمان بن منذر حاکم حیرہ کا ہم عصر تھا اور ان دونوں میں کش مکش ہوتی رہتی تھی۔ غساسنہ کا آخری فرماں روا جبلہ بن ایہم تھا۔

آلِ غسان کی تاریخ تمام تر ایران و روم کی تاریخ کا خلاصہ ہے اور اسی تعلق سے غسان ہمیشہ حیرہ کے بادشاہوں سے لڑتے رہتے تھے۔ ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کو اگر کبھی کامیابی ہوئی تو وہ ہمیشہ غسانیوں کی امداد ہی کا نتیجہ تھی اور خود رومی بھی شکر گزاری کے ساتھ اس نتیجہ کا احساس رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں چھٹی صدی کی ابتدا سے ربع صدی تک (۶۰۱ء تا ۶۲۵ء) مشرق و مغرب میں یا مجوسیت اور عیسائیت میں جو زور آزمائیاں ہوئیں ان سے غسانیوں کی یہ چھوٹی سلطنت بھی مستثنیٰ نہ تھی۔ خسرو پرویز کی اولوالعزمیوں نے پندرہ برس میں دامن فرات سے وادی نیل اور ساحل باسفورس تک ہر جگہ خاک اڑا دی تھی۔ پھر شام میں رومیوں کی شکست نے غسانیوں کی بساط الٹ دی۔ رومی اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی حصہ کھو چکے تھے۔ آرمینیہ، شام، مصر، ایشیائے کوچک ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا۔ ایرانی قسطنطنیہ کا محاصرہ کیے پڑے تھے۔ ہرقل قیصر روم قسطنطنیہ سے فرار کا سامان کر چکا تھا کہ دفعۃً ہوا کا رخ بدل گیا اور کچھ ہی عرصہ میں قرآن کی یہ پیش گوئی پوری ہوگئی کہ

﴿الٓمّٓ ٥ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ٥ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ٥ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ٥﴾ (الروم، ۳۰: 1 تا 4)

(الم۔ رومی قریب کے ملک میں مغلوب ہوگئے۔ وہ مغلوبی کے بعد عن قریب چند سالوں کے اندر غلبہ پالیں گے)

اور پھر یہی ہوا کہ رومیوں نے ایک ایک کر کے اپنے تمام علاقے واپس لے لیے بہر حال بعثت نبوی ﷺ تک کا یہ مختصر سا تاریخی جائزہ ہماری اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے کافی ہے کہ غسانیوں کی حکومت رومیوں کے زیر سایہ تھی اور انھی کے مفاد کا تحفظ اس کا مقصد اولیں تھا۔ آل غسان کی تاریخ میں ایک اور اہم بات یہ نظر آتی ہے کہ رومی نہ صرف یہ کہ ان کے بادشاہوں کو نامزد یا مقرر کر دیتے تھے بلکہ ان تاج دارانِ بالا استقلال کے علاوہ اپنی طرف سے ایسے عامل و حاکم بھی مقرر کرتے تھے جو غالباً خود مختار حیثیت رکھتے تھے ممکن ہے بیک وقت دو قسم کے حکمرانوں کا تقرر کرنے سے ان کا مقصود یہ ہو کہ اگر ایک حکمران رومی مفادات کے تحفظ سے گریز کرے تو مقامی طور پر دوسرے حکمرانوں کے ذریعہ اس کی سرکوبی کر دی جائے۔ چناں چہ "معان" میں بنو فاخرہ کی ریاست تھی اور جب ان میں سے ایک شخص فروہ بن عمر بن الفاخرہ حکمران ہوا تو اس کے پاس رسول اللہ ﷺ نے اپنا نامۂ گرامی بھیجا تھا اس کے جواب میں اس نے اپنے قبول اسلام کی اطلاع حضور کو دی اور ایک سفید خچر بھی بطور ہدیہ ارسال کیا۔

قیصر کی حکومت

اصلاً بابل سے تعلق رکھتی تھی مگر دولت حمورابی کے بعد ہجرت کے نتیجہ میں قائم ہوئی۔ دوسرے مرحلہ میں دولت سبائیہ آتی ہے جس کا حقیقی دور ۸۵۰ ق م تا ۱۱۵ ق م ہے اور تیسرے مرحلہ میں دولت حمیریہ کا قیام ہوا اور جس کی مدت حکومت ۱۱۵ ق م سے ۵۲۵ء تک ہے۔

آخری سلطنت حمیر کے بھی دو حصے کیے جاسکتے ہیں۔

(الف) پہلی صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی کے اواخر تک حمیر کا طبقہ اول یا سبا کا طبقہ ثالث فرماں روائی کرتا رہا اس حصہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس دور کے سلاطین کا لقب "ملک سبا و ذوریدان" ہے نیز اس زمانے میں حمیر کا رقبہ حکومت یمن تک محدود تھا۔ اس مدت میں یہاں عموماً کواکب پرستی رائج تھی۔ معاصر حکومتوں میں ایک طرف حبش تھا تو دوسری طرف مصر و شام پر رومی اقتدار کا سکہ رواں تھا اور تیسری طرف ساسانی فارس میں حکومت کر رہے تھے۔

(ب) دوسرا دور تیسری صدی عیسوی کے اواخر سے ۵۲۵ء تک جاری رہا لیکن اس دوران میں تقریباً ۳۴۰ء سے ۳۷۸ء تک اکسومیوں کی عارضی حکومت قائم رہی اور پھر ۵۲۵ء میں انھوں نے ہی دوبارہ حملہ کر کے سلطنت حمیر کا خاتمہ کر دیا اور اس طرح یمن و حضرموت پر ان کی حقیقی حکومت قائم ہوگئی۔ چناں چہ اس دور میں سلاطین کا لقب "ملک سبا و ذوریدان و حضرموت" ہوگیا۔ کیوں کہ اس دور میں رقبہ حکومت حضرموت تک ممتد ہوگیا تھا۔ نیز اسی دور میں سلاطین حمیر میں سے بعض عیسائی اور اکثر یہودی المذہب تھے۔ ان سلاطین یعنی "ملک سبا، ذوریدان و حضرموت" کو عرب مورخین "تبع" کہتے ہیں اور اسی کی جمع تبابعہ ہے۔ حبشی زبان میں اس کے معنی قادر و جبار اور صاحب قوت کے ہیں۔

بہر حال حمیر کا آخری بادشاہ "ذونواس" تھا۔ اس کے دور کا خاص واقعہ یہ ہے کہ وہ یہودیت کے تعصب میں دیوانہ ہوگیا اور نجران کا محاصرہ کر کے شہر فتح کیا۔ بعد ازاں بڑے بڑے گڑھوں میں آگ دہکائی اور ایک ایک کر کے عیسائیوں کو بلوایا جس نے بھی یہودیت کو قبول کرنے سے انکار کیا اسے نذر آتش کر دیا۔ قرآن میں "اصحاب الاخدود" کے نام سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ذونواس کی اس ظالمانہ حرکت نے اطراف کے تمام عیسائیوں کو بھڑکا دیا۔ چناں چہ دوس بن ثعلبان نامی یمن کے ایک عیسائی امیر نے نجاشی کے یہاں فریاد کی۔ نجاشی نے قیصر روم کے اشارہ سے یمن پر فوج کشی کی اور بالآخر ۵۲۵ء میں یمن کو فتح کر لیا۔

یمن کے فاتح اور پہلے حبشی حکمران کا نام مسلمان مورخین کے نزدیک ''ارباط'' ہے۔ارباط کے خلاف ''ابرہہ'' نے قیادت کی اور اسے قتل کر کے خود اقتدار سنبھال لیا۔ ابرہہ کے دور حکومت کا سب سے بڑا اور عظیم الشان واقعہ یہ ہے کہ اس نے ہاتھیوں کی ایک بڑی فوج (اصحاب الفیل) کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کی اور خانہ کعبہ کو منہدم کرنا چاہا۔ مگر منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اسے خائب و خاسر اور ناکام لوٹنا پڑا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسی واقعہ کے کوئی چالیس روز بعد ۵۶۹ء میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی۔

ابرہہ کا جانشین اس کا بیٹا یکسوم اور پھر اس کا جانشین مسروق ہوا۔اس دوران میں حالات خراب ہوئے اور اہل یمن حارث بن ابی شمر غسانی کو اس کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا۔ چناں چہ حارث نے اسے گرفتار کیا اور فلسطین میں مصلوب کر دیا۔اسی طرح ایک اور حاکم ابوجبلہ بن عبداللہ کو بھی رومیوں ہی نے مقرر کیا تھا۔ یہ وہی ابوجبلہ ہے جس سے مالک بن عجلان نے مدینہ کے یہود کے خلاف مدد مانگی تھی۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سرحدی حکومتیں عرب کے اندرونی علاقوں پر اپنے اثرات ڈالنے کے مواقع حاصل کرنے میں غفلت نہیں برتتی تھیں۔

(3) بنو قضاعہ کی ایک اور حکومت بھی تھی جس کی باگ ڈور کلب بن وبرہ کے ہاتھ میں تھی۔ مگر زمام حکومت کبھی کبھی کندہ کی شاخ سکون کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ چناں چہ دومۃ الجندل اور تبوک کے مقامات، بنوکلب کے قبضہ میں تھے اور وہ نصرانیت اختیار کر چکے تھے۔ظہور اسلام میں دُومۃ الجندل کا حکمران اکیدر بن عبدالملک بن سکون تھا۔ یہ کندی تھا اور ان حکمرانوں کی ذریّت میں سے تھا جنھیں ملوک تبابعہ نے بنو کلب کا حاکم مقرر کیا تھا اور اسے خالد بن ولید گرفتار کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لائے تھے۔

(4) عمان قبیلہ دوس کا وطن اور ان کا جائے قرار تھا۔ان کے بعد عمان کی حکومت ان کے بھائیوں بنونصر زہران کی طرف منتقل ہوگئی۔ظہور اسلام سے ذرا پہلے ان کا حکمران مستکبر بن مسعود بن جرار تھا۔ مگر ان میں سے جس نے اسلام کا زمانہ دیکھا وہ جیفر بن الجلندی اور اس کا بھائی عیاذ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں کی طرف ایک مراسلہ بھیجا تھا جس پر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے علاقے پر عمرو بن العاص کو عامل مقرر فرمایا تھا۔

(5) ایک اور قدیم حکومت جو ولادت نبوی ﷺ سے کچھ عرصہ پہلے ہی (امرا القیس کے دورِ حکومت کے بعد) چھٹی صدی عیسوی کے وسط (وفات امرأ القیس ۵۶۰ء) میں پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ ''دولت کندہ'' تھی۔ان کا اصلی وطن تو غالباً یمن کے مشرقی حصہ میں تھا اور ابتداءً یہ بنوحمیر کے ساتھ ملک و حکومت میں شریک تھے لیکن بعد میں زمامِ حکومت صرف بنوحمیر کے قبضہ میں آ گئی تو یہ ان کے ماتحت رہے۔ ملوک یمن ان کے ساتھ رشتے ناتے کرتے رہے اور انھیں حجاز کے قبائل معد (بن عدنان) کا حاکم مقرر کرتے رہے۔ پھر جب بنوحمیر کی حکومت منقرض ہوگئی تو عرب بادیہ پر یہی لوگ یکے بعد دیگرے حکمران ہوئے۔ دولت کندہ کا آخری حکمران امرأ القیس تھا۔ یہ اپنے باپ جو حجر بن الحارث (م ۵۵۰ء) کا بدلہ لینے اور امداد حاصل کرنے کے لیے قیصر روم کے پاس بھی پہنچا مگر اسی نے امرأ القیس کی زندگی کا چراغ بھی گل کرا دیا اور یوں دولت کندہ منقرض ہوگئی۔ شاہان کندہ کے بعد حکومت بنوجبلہ بن عدی بن ربیعہ کی طرف منتقل ہوگئی۔اس خاندان میں سے قیس بن معدیکرب نے خاص شہرت حاصل کی۔

(6) حضرموت میں، خاندان حضرموت کے ہاں حکومت و ریاست عہد اسلام تک قائم رہی۔ ان میں سے ہی وائل بن حجر ہیں جنھیں رسول اللہ ﷺ سے شرف ملاقات نصیب ہوا۔ جب وائل ۱۰ھ میں بنوکندہ کے وفد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے وائل کو حضرموت کی حکومت کا فرمان عطا فرمایا تھا۔

(۷) یمن کی تاریخ انتہائی طویل اور قدیم ہے۔ مختصر یہ کہ یہ علاقہ بڑی بڑی تہذیبوں کا گہوارہ اور حکومت و سیاست کا مدتِ مدید تک مرکز رہا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف سلطنتیں یہاں قائم ہوئیں۔ چناں چہ پہلے مرحلے میں دولت معینیہ قائم ہوئی (جو تکالیف و مصیبت میں گرفتار ہوئے تو ایک شخص جس کا نام سیف بن ذی یزن حمیری اور کنیت ابومرّہ تھی۔ اپنی قوم کی طرف سے بادشاہ روم کے پاس فریادی ہوا اور حبشی حکمرانوں کی شکایت کی۔ مگر وہاں سے اسے مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ تو پھر نعمان بن منذر عامل حیرہ کے توسط سے کسریٰ تک رسائی حاصل کی اور اس سے امداد کا خواہاں ہوا۔ کسریٰ نے غور و خوض اور مشاورت کے بعد مدد کا وعدہ کیا اور ''وہرز'' کی سرکردگی میں ایک لشکر یمن روانہ کر دیا جس نے مسروق کو قتل کر کے سیف بن ذی یزن کو حکمران کر دیا اور یمن کا علاقہ انتداب فارس کا امین بن گیا۔ سیف کے بعد کچھ عرصہ وہرز نے حکومت کی، پھر مرزبان مقرر ہونے لگے، چناں چہ بالترتیب ابن وصر تینجان بن مرزبان اور باذان کسریٰ کی طرف ہی سے برسر اقتدار آئے تھے۔ باذان آخری گورنر ثابت ہوا کیوں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت یہی باذان یمن کا گورنر تھا اور یہ حضور ﷺ کی صداقت سے متاثر ہو کر اسلام لے آیا تھا۔ اپنے اسلام کی اطلاع باذان نے حضور ﷺ کو دی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''انتم منّا والینا اهل البیت .))

(اب تم میری طرف منسوب ہو اور میرے اہل بیت ہو)

اب جہاں تک اہل یمن کے اجتماعی و سیاسی نظام کا تعلق ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ریاست و مملکت ''قصور'' و ''محافد'' کے مجموعہ کا نام تھا۔ ہر قصر اور محفد کا ایک الگ مالک یا شیخ یا امیر ہوتا تھا۔ ہر محفد میں ایک ہیکل یا معبود کا ہونا بھی ضروری تھا کیوں کہ اس علاقے یا قصر کی نسبت اس کے مالک یا اس کے معبود کی طرف ہی کی جاتی تھی۔

سربراہ ریاست ''بادشاہ'' (ملک) تھا جس کا حکم مطلق تھا، حکومت موروثی تھی، جو اس کے لڑکوں اور بھائیوں وغیرہ میں منتقل ہوتی چلی جاتی تھی (سوائے حضرموت کے

جہاں حکومت اشراف (اول مولود) کی طرف منتقل ہوتی تھی)۔ بادشاہوں کے القاب و آداب مختلف ہوتے تھے۔ اہلِ یمن نے ایسا سکہ بھی جاری کیا تھا جس پر بادشاہ کی صورت نقش ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا نام اور دار الضرب کا نام بھی کندہ ہوتا تھا۔ مختلف سیاسی و مذہبی اشکال و حروف اور رموز و اشارات بھی کندہ کرائے جاتے تھے۔ یمنی معاشرہ چار عناصر سے مرکب تھا:

1: فوجی　　2: کسان

3: صانع اور کاریگر اور　　4: تجار

ان میں سے ہر ایک طبقہ کے حقوق و فرائض اور حدود متعین تھے جن سے کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ بنیادی طور پر اہلِ یمن تجارت میں خصوصیت و شہرت عام رکھتے تھے۔ ان کی درآمد و برآمد کا سلسلہ برس ہا برس سے قائم تھا اور تجارتی تعلقات اس وقت کی معلوم دنیا کے تمام حصوں سے برّی اور بحری دونوں طرح سے استوار تھے۔ اہل یمن تمدن و معاشرت اور حضارت ہر معاملہ میں عرب کے دوسرے تمام حصوں سے بہت آگے تھے۔ وہ محلات، مکانات، قلعے، محافد اور ہیکل کے مالک تھے۔ ریشم اور حریر و دیبا کے قیمتی ملبوسات اور میوہ جات، مرغن غذائیں اور سونے چاندی کے بے شمار اقسام کے ظروف استعمال کرنا ان کے لیے غیر معمولی بات نہ تھی کہ وہ محض محاورتاً نہیں بلکہ واقعتاً سونے چاندی اور زر و جواہرات سے کھیلنے والے لوگ تھے۔

اس تفصیل کے ساتھ ہی ہماری وہ بحث مکمل ہو جاتی ہے جو عرب کا سیاسی جائزہ لیتے وقت ابتدا میں کی گئی تھی۔ یعنی پہلے درجہ میں ملوکیت اور بادشاہی کا رواج عرب کے متعدد علاقوں میں بہت مدت سے چلا آ رہا تھا اور ظہورِ اسلام کے وقت بھی یہ بادشاہتیں اور حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھیں۔ یمن کے سلسلے میں ہم یہ بیان بھی کر چکے ہیں کہ ملوک بالاستقلال کے علاوہ از وا اور اقیال کی خود مختار حکومتیں بھی قائم تھیں۔

بہر حال اب دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان بادشاہتوں اور حکومتوں کے علاوہ دوسرے درجہ میں اعیانیت بھی عرب کے مختلف حصوں میں مکمل یا نامکمل صورت میں موجود تھی۔ یعنی وہ رؤسائے قبائل جو اپنے قبیلوں کے امیر مانے جاتے تھے اور انھوں نے کہیں کہیں کسی حد تک خود مختار اور آزاد چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں قائم کر رکھی تھیں، چناں چہ مکہ، مدینہ، ینبوع، جرش، عدن، صحار، دبی، یمامہ، دومتہ الجندل، فدک، ایلہ اور مشرقی ساحل پر اچھی خاصی بستیاں تھیں جو کم و بیش شہری مملکتیں کہی جا سکتی ہیں۔''

مگر ان میں سب سے زیادہ مشہور و معروف، اہم اور منظم ترین مکہ کی شہری مملکت تھی۔ جسے حضور اکرم ﷺ کے جدِّ امجد قصی بن کلاب نے مکہ پر قبضہ کر کے ۴۴۰ء میں قائم کیا تھا۔ قصی بہت ہی جلد ایک مقبول حکمران بن گئے تھے حتیٰ کہ ابن سعد کے الفاظ میں ''جس طرح مذہب کی پیروی کی جاتی ہے اہلِ مکہ اسی طرح قصی کے حکم کی پیروی کرتے تھے اور زندگی تو زندگی مرجانے کے بعد بھی ان کے حکم پر عمل ہوتا تھا۔ قصی نے مملکت کے نظم و نسق کو بہترین حالت میں رکھنے کے لیے مختلف محکموں کو قائم کیا۔ پھر قصی کے بعد امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا رہا۔ بہر حال مجموعی طور پر اگر ان عہدوں کی فہرست مرتب کی جائے تو مندرجہ ذیل عہدوں کا پتا چلتا ہے:

۱: حجابہ (خانہ کعبہ کی دربانی)
۲: سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانا)
۳: رفادہ (حاجیوں کے لیے کھانے کا انتظام اور مالی بندوبست)
۴: لوا (جھنڈا۔ جنگی عہدہ)
۵: ندوہ (اجتماع گاہ، مشورت گاہ)
۶: مشورہ (امور مہمہ میں مشورہ)
۷: قیادہ (جنگ میں لشکر کی قیادت)
۸: قبہ (شامیانہ۔ فوجی معسکر کا انتظام)
۹: اعنہ (گھوڑے کی لگام، سواروں کے رسالے کی سپہ سالاری)
۱۰: اموال المحجرہ (بتوں کے چڑھاوے، نذرانے اور جائداد کا انتظام)
۱۱: ایسار و ازلام (بتوں سے استخارہ)
۱۲: اشناق (خون بہا، جرمانے اور مالی تاوان، دیت وغیرہ کا انتظام)
۱۳: حکومتہ (مقدمات کا فیصلہ وغیرہ)
۱۴: سفارہ (سفارت)
۱۵: عقاب (جھنڈا، جنگ کے وقت نشانِ قومی کی علم برداری)
۱۶: سدانہ (کعبہ کی دربانی، کلید برداری اور رکھوالی)
۱۷: افاضہ
۱۸: اجازہ
۱۹: نسئی (مہینے بدل دینا)
۲۰: حلوان النفر (بدلے میں دوسرا فوجی بھیج دینا، جنگی عہدہ)

یہ تمام عہدے اگرچہ اپنی ایک اہمیت و حیثیت رکھتے تھے مگر ان سب میں اہم ترین اور قابل ذکر ''ندوہ'' تھا جسے یقیناً قصی ہی نے قائم کیا تھا۔ دار الندوہ قریش کا منتدا، محل اجتماع سبھی کچھ تھا اور مکہ کی سیاسی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی اور معاشی تجارتی زندگی میں اس نے انتہائی موثر کردار ادا کیا۔ قریش کے تمام معاملات دار الندوہ میں طے پاتے تھے۔ جنگ و صلح، ثقافتی و انتظامی امور اور دیگر پیش آمدہ معاملات میں مشورہ اسی عمارت میں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ نکاح و بلوغ کا اعلان بھی اسی جگہ سے ہوتا تھا۔

اپنی زندگی میں مذکورہ بالا تمام عہدوں میں ربط و ارتباط اور ہم آہنگی کو قصی نے پوری طرح برقرار رکھا۔ لیکن قصی کی وفات کے بعد ایک اعیانیت قائم ہو گئی۔ کیوں کہ اپنی وفات کے وقت اس نے اپنے سیاسی فرائض اپنے بیٹوں کو بانٹ دیے تھے اور پھر کسی ایک فرد میں دوبارہ جمع نہ ہو سکے بلکہ منتشر ہی ہوتے چلے گئے اور ظہورِ اسلام تک یہی حال رہا۔ تمام عہدے قریش کی مختلف شاخوں میں تقسیم تھے۔ اس کی وجہ سے مختلف شاخوں کو مختلف دوسری بطون پر سیاسی و مذہبی برتری حاصل تھی۔ خصوصاً تولیت

ایک ایسا معزز عہدہ تھا جس کی وجہ سے حامل عہدہ کی نہ صرف مکہ بلکہ پورے عرب میں مذہبی وسیاسی برتری تسلیم کی جاتی تھی۔

بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت مکہ میں صورت یہ تھی کہ کل چودہ عہدے باقی تھے اور یہ دس مختلف قبائل اس طرح تقسیم تھے کہ سقایہ مع عمارہ بنو ہاشم' رفادہ بنونوفل' لوا' ندوہ اور سدانہ مع حجابہ بنوعبدالدار' مشورہ بنواسد' عقاب بنوامیہ' اموال المحجرہ اور حکومتہ بنوسہم' ایسار وازلام بنوجمح' اشناق بنوتیم' قبہ اور اعنہ بنومخزوم اور سفارت کے عہدے بنوعدی کے پاس تھے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اپنے طور پر ہر قبیلہ اپنے متعلقہ انتظامی شعبہ کا ذمہ دار تھا اور واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک نے انتظامی حُسن وکارکردگی کا ثبوت فراہم کر دیا تھا اور ان کی کارکردگی کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہلِ مکہ انتظام ریاست کا بڑی حد تک سلیقہ رکھتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خودسری اور آپس کی چپقلش یا عصبیت کی بنا پر ان کے درمیان ارتباط و ہم آہنگی میں کمی تھی اور قبائلی و معاشرتی امتیازات ان کے اتحاد میں مانع تھے۔

بہرحال اب ہم تیسرے مرحلہ میں عرب کی ایک تیسری سیاسی اکائی ''قبائل'' کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ عرب کا سیاسی جائزہ لیا جائے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ وہاں اگرچہ ملوکیت' اعیانیت اور دوسری سیاسی تنصیبات و ادارے موجود تھے لیکن بنیادی طور پر ''قبائل'' کا نظم ان سب ادارات پر حاوی تھا۔ گویا حکومت سے زیادہ فرد اور قبیلہ کو اہمیت حاصل تھی۔

پورے ملک میں چھوٹے بڑے سیکڑوں قبائل آباد تھے۔ ہر قبیلہ آزاد اور خودمختار تھا۔ اس کی بنیاد خون کے رشتوں پر تھی۔ اسی لیے حسب ونسب بہت اہمیت رکھتے تھے۔ ہر قبیلہ کا ایک سردار ہوتا تھا جو شیخ کہلاتا تھا۔ سرداری کے لیے باہم رقابت بھی ہو جاتی تھی۔ قبیلہ کی سرداری اور سیاست کے لیے چند شرائط کا ہونا اکثر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مگر کبھی کبھی اس سے گریز بھی کر لیا جاتا تھا۔ مزید برآں ہر قبیلہ کے نزدیک بعض شرائط وصفات لازمی درجہ رکھتی تھیں تو دوسروں کے نزدیک وہی صفات اضافی حیثیت کی مالک تھیں مثلاً مضر کے نزدیک ''صاحب رائے'' آدمی کا ہونا ضروری تھا۔ ربیعہ سیادت کے لیے ایسے لوگوں کو پسند کرتے تھے جو لوگوں کو کھانا کھلائے جب کہ اہل یمن کے ہاں اصل معیار ''حسب ونسب'' تھا۔ لیکن اس بات پر بہرحال سب کا اتفاق تھا کہ ایک شیخ قبیلہ کو خصوصیات وفضائل عرب سے ضرور متصف ہونا چاہیے۔ یعنی سخاوت' شجاعت و بہادری' صبر واستقلال' حلم' تواضع' قادر الکلامی اور قوت بیان۔ نیز کبرسنی' عطا وبخشش' عقل مندی' کثرت تعداد اور تونگری وغیرہ۔

عرب چوں کہ جمہوری مذاق رکھتے تھے اس لیے قبیلہ کا سردار اہل قبیلہ میں سے منتخب کر لیتے تھے اور جمہوری اصول کے مطابق وہی اس منصب کا اہل ہوسکتا تھا جسے عمر' عزت' اولاد' مال اور قابلیت کے علاوہ عرب کی فطری خصوصیات میں دوسروں پر تفوق حاصل ہو اور جس کے حامی سب سے زیادہ ہوں۔ کبھی کبھی اگر انہی خصوصیات کا حامل کسی سردار کا لڑکا ہوتا تو اسے بھی سرداری موروثی طور پر مل جاتی تھی۔

ایک شیخ قبیلہ یا کبیر کو اہل قبیلہ پر اختیار حاصل تھا اور وہ امور سیاسی وانتظامی کے علاوہ قانونی معاملات میں بھی مختار تھا۔ وہی قانون بناتا' یا پہلے سے بنے ہوئے قوانین یا شریعت سے اخذ کرتا ان کا نفاذ کرتا اور قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں جرمانہ اور سزا (مثلاً مکوں یا سلاخ کی ضربیں) بھی دے سکتا تھا۔ سرداروں کو قبیلہ میں حقوق کے اعتبار سے کوئی خاص امتیاز حاصل نہ تھا لیکن اس کے برعکس ان کے فرائض سب سے زیادہ تھے۔ ان کا سب سے بڑا فریضہ قبیلہ میں اتحاد و یک جہتی کا قائم رکھنا تھا۔ قبیلہ کے معاملات اجتماعی طور پر باہم مشاورت کے ذریعہ بھی طے کیے جاتے تھے۔

ہر قبیلہ میں ہر دس آدمیوں پر ایک عریف اور ہر ایک سو پر ایک قائد یا نقیب ہوتا تھا۔ قبیلہ میں بطن' فخذ' شعب وغیرہ کی شاخ در شاخ تنظیم وتقسیم پائی جاتی تھی۔ موالی بنانے اور قبائل کو حلیف بنانے کا طریقہ رائج تھا۔ کسی قبیلہ کے خلاف کوئی بیرونی حاکم اصولی طور پر کسی طرح کا اختیار سماعت نہ رکھتا تھا۔ بعض قوی قبیلے کم زور قبیلوں کو زیر کر کے ان سے خراج وصول کرتے تھے۔ قبائل پر بیرونی اثرات بھی ہوتے تھے۔ مگر ایک بہترین قبیلہ بیرونی اثر سے بالکل آزاد ہوتا تھا۔

شہروں میں جتنے محلے یعنی قبائلی آبادیاں تھیں اتنی ہی مجالس محلہ بھی تھیں' جنھیں ''نادی'' کہا جاتا تھا۔ ان نادیوں یا قبائل کی مجلس محلہ ہی میں اجنبیوں کو معاہدے کے ذریعہ مولا یعنی فرد خاندان بنانے کی رسم ادا کی جاتی تھی اور کسی فرد یا خاندان سے طرد وخلع وغیرہ کرنے کا اعلان بھی وہیں سے کیا جاتا تھا۔ شبانہ قصہ گوئی' انتظامی تجارتی معاملات' کاروانوں کی آمد ورفت وغیرہ قبائلی نادیوں سے ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ہر قبیلہ میں چند مناصب یا کچھ اہم اور ذمہ دار اشخاص بھی ہوتے تھے۔ مثلاً:

1۔ **نقیب**:...... جسے منادی یا موذن کہتے تھے۔ جس کا کام یہ ہوتا تھا کہ مجالس کے انعقاد کا ڈھنڈورا پیٹے۔ اس کے علاوہ ہر قبیلہ کے سردار کے پاس اپنے خصوصی منادی بھی ہوا کرتے تھے کسی تقریب یا دعوت کا بلاوا یا کسی خاندان یا فرد کے طرد وخلع کی اطلاع دوسرے محلوں کو کرنا بھی انھی سے متعلق تھا۔

2۔ **عریف**:...... قبیلے اور محلے کا منتظم۔ تمام امور کا انتظام اسی کے ذمہ ہوتا تھا۔ اہم لوگوں کے حالات اسی سے دریافت کیے جاتے تھے۔

3۔ **رائد**:...... عرب کے ہر قبیلے کا ایک رائد ہوتا تھا جسے زمینوں اور پانیوں وغیرہ کے حالات سے تجربہ وواقفیت ہوتی تھی۔ وہی پانی اور گھاس کی تلاش میں اپنی قوم سے پہلے جاتا تھا کہ اس کی قوم وہاں پہنچ کر اطمینان سے اتر سکے۔

4۔ **شاعر**:...... عربوں کے ہاں ایک رسم یہ بھی تھی کہ جب ان کے کسی قبیلے میں شاعر کا ظہور ہوتا تو دیگر قبائل آ کر مبارک باد دیتے پھر دعوت ہوتی اور مجلس رقص وسرود جمتی' گویا شادی کی تقریب ہے پھر ایک دوسرے کو مبارک سلامت کہتے اور بشارت دیتے تھے کیوں کہ شاعر:

الف: ان کی عزتوں کا بچانے والا۔

ب: ان کے حسب ونسب کا دفاع کرنے والا

ج: ان کے کارناموں کو ہیشگی اور دوام بخشنے والا۔ اور

د: ان کی شہرت کو بلند کرنے والا ہوتا تھا۔

نیز یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عرب صرف تین مواقع پر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے ایک لڑکے کی پیدائش پر، دوسرے گھوڑے کے بچہ جننے پر اور تیسرے شاعر کے ظاہر ہونے پر۔

5۔ **خطیب:**...... ہر قبیلے میں ہوتا تھا۔

6۔ **نساب:**...... کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس میں کوئی ایسا نسب دان نہ ہو جو فرع کو اصل سے ملا دے اور ایسے لوگوں کو باہر نہ نکال دے جو قبیلے میں سے نہ ہوں۔

7۔ **منصف یا حاکم:**...... ہر قبیلے کا ایک منصف ہوتا تھا جس کے پاس وہ اپنے مقدمات لے کر جاتے تھے۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ انھیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔ بعض اوقات منصف کو مقبولیت حاصل ہو جاتی تھی اور اپنی قابلیت و اہلیت کی بنا پر وہ دوسروں کے لیے بھی واجب التسلیم بن جاتا تھا۔ اور ان پر بھی اس کا حکم نافذ ہوتا تھا۔ مشہور حکّام میں اکثم بن صیفی بن رباح (بنی تمیم)، حاجب بن زرارہ، اقرع بن حابس، ربیعہ بن مخاشن، ضمرہ بن ضمرہ (بنی تمیم)، عاصر بن الظرب العدوانی (قیس)، غیلان بن سلمہ ثقفی (قیس) اور ابوطالب بن عبدالمطلب (قریش) وغیرہ شامل ہیں۔ اور دل چسپ بات یہ ہے کہ منصف و حاکم کے منصب پر نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی متمکن تھیں چناں چہ حکیمات الوب میں سے ہند بنت الخس الایادی، جمعہ بنت حابس الایادی، صحر بنت لقمان، خصیلہ بنت عامر بن الظرب العدوانی اور خدام بنت الریان مشہور ہیں۔ لیکن تعجب خیز امر یہ ہے کہ عرب میں بے شمار منصف اور حاکم...... ہونے کے باوجود وہاں کے معاشرہ میں عدل قائم نہیں ہو سکا۔ بلکہ دنیا کے دوسرے تمام معاشروں کی طرح ظلم وعدوان کا پرچم وہاں بھی انتہائی بلندی پر لہراتا رہا۔ علاوہ ازیں قاتل یا مجرم کو بجائے اس کے کہ کوئی ریاست یا قوت قاہرہ مناسب سزا دیتی، ثار و انتقام کے ذریعہ عداوت ونفرت کی آگ اور ظلم وتعدّی کے سلسلے کو اور دراز کر دیا جاتا تھا۔

اب آخر میں اہلِ عرب کے ایک ایسے ادارہ کا سیاسی پہلو بھی دیکھ لینا چاہیے جو بنیادی طور پر معاشی واقتصادی مقاصد رکھتا تھا یعنی وہ مجامع، بازار اور میلے جو عرب کے مختلف حصوں میں سال بھر تک جاری و ساری رہتے تھے۔ بڑے بڑے بازار (اسواق) عرب کے تیرہ مقامات (یعنی دومتہ الجندل، مشقر، صحار، دبی، شجرہ، عدن، صنعا، حضر موت، عکاظ، ذوالمجاز، منیٰ، خیبر اور یمامہ) پر لگا کرتے تھے۔ سیاسی طور پر ان کی اہمیت اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ یہی وہ مواقع تھے کہ جہاں ایک ہی وقت میں بہت سے قبائل جمع ہوتے تھے۔ آپس کے معاملات کو طے کرتے، باہمی خون کے مقدمات، سرداروں کے اختلافات، مقدمات کے فیصلے وغیرہ کو شہرت یہیں حاصل ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے ان مجامع کو ایک قسم کی بین القبائلی عدالت کا نام دیا جاسکتا ہے۔

ان اسواق و مجامع میں سب سے زیادہ اہم اور ایام جاہلیت کا سب سے بڑا بازار ''عکاظ'' تھا۔ یہاں قریش، ہوازن، غطفان، خزاعہ، حارث، ابن عبد مناف، عضل، مصطلق وغیرہ جمع ہوتے تھے۔ اس میں حسب تذکرہ امور کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا تھا مثلاً اس بازار کو اہل عرب کی لیاقت کی امتحان گاہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جو شخص جس فن میں قابل ہوتا تسلیم کر لیا جاتا اور پھر اس کے ذریعہ تمام ملک میں اس کی شہرت ہو جاتی تھی۔ ''شعرا اپنے قصائد یہیں سناتے تھے، خطبا تقریریں کرتے تھے، حکام اپنے فیصلے سناتے تھے اور شیوخ معاہدہ کی دفعات طے کرتے تھے۔ ان بازاروں کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان بازاروں نے پورے عرب میں جغرافیائی اور معاشی مشکلات کے باوجود نہ صرف یہ کہ ایک معاشی وفاق قائم کر دیا تھا بلکہ اس وفاق کی بدولت آیندہ کے لیے سیاسی وفاق کی راہ بھی ہموار کر دی۔

مجموعی طور پر عرب کی پوری آبادی بدوی اور حضری میں منقسم تھی۔ شہروں میں رہنے والوں کو حضری اور صحراؤں میں بسنے والوں کو خانہ بدوش یا بدوی کہا جاتا تھا اور مستقل سیاسی زندگی اور سیاسی طور پر اہمیت فی الحقیقت حضری آبادی ہی کو حاصل تھی۔ بعض اوقات یہ دل چسپ صورت حال بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک ہی قبیلے میں بدوی اور حضری آبادی پائی جاتی تھی۔ یعنی قبیلہ کے کچھ لوگ تو خانہ بدوشانہ یا بدویانہ زندگی گزارتے تھے تو کچھ بستیوں میں مستقل قیام کر کے حضری زندگی گزارتے تھے۔

حضری باشندوں کا ایک مستقل مقام اور مسکن تھا اور چوں کہ عرب کے مختلف حصے تہذیب وتمدّن کے لحاظ سے مختلف تھے۔ اس لیے ان کے شہری رواج و رسوم اور عادات و اطوار میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت، نظم وحکومت اور ریاست ومملکت کے مراکز ''حضری آبادی'' ہی میں پائے جاتے تھے۔

اہلِ عرب میں سے بڑی تعداد بدویانہ طریق زندگی کو اپنائے ہوئے تھی۔ ان کا نہ تو کوئی مسکن تھا نہ مرکز۔ یہ لوگ خیموں میں رہا کرتے تھے اور زیادہ تر ان کے پڑاؤ ریگستان کے کنارے شاداب مقامات پر ہوا کرتے تھے۔ لیکن یہ سرسبزی و شادابی چوں کہ عارضی ہوتی تھی اس لیے ان کا قیام بھی مختصر ہوتا تھا۔ بدویوں کا گزارا اکثر مویشیوں کے گوشت اور دودھ پر تھا نیز ان کی معاش کا ایک ذریعہ لوٹ مار بھی تھا۔ جسے وہ اپنا حق سمجھتے تھے۔ ان کی عزیز ترین چیز اونٹ تھی۔ فی الحقیقت اونٹ کے بغیر بدویت کا تصور ہی محال ہے۔ اونٹ ان کا سب کچھ تھا۔ ایک جگہ جم کر نہ رہنے کی وجہ سے بدوی تجارت، زراعت، صنعت وحرفت اور تمدن وسیاست سے بے نیاز اور بیگانہ تھے بلکہ انھیں ایسے کاموں سے نفرت تھی اور انھیں اپنی آزادی اور حریت کے منافی سمجھتے تھے۔

ہمارے خیال میں عرب اور اہلِ عرب کے سیاسی میلانات ورجحانات کا یہ جائزہ ہمارے آیندہ مطالعہ کے لحاظ سے کافی ہے۔ اس جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عرب میں اس وقت نہ تو کوئی منظم اور ہمہ گیر ریاست قائم تھی، نہ ان میں اتحاد، یک جہتی اور قومیت کا تصور تھا بلکہ اس کی جگہ مذہبی، اخلاقی، روحانی اور بالخصوص سیاسی دائرہ میں سخت انتشار وتشتت، افراتفری، لامرکزیت تھی اور نزاج کا دور دورہ تھا۔

(ڈاکٹر نثار احمد)

دُنیا کا معاشی نظام

جاہلی دنیا کی دینی، روحانی، اخلاقی و اجتماعی صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سیاسی و معاشی نقشہ پر خصوصی نظر ڈال لی جائے کہ دینی و اخلاقی اور اجتماعی ترقی و انحطاط میں سیاسی و معاشی حالات اور رائج الوقت سیاسی و معاشی تصورات اور قوانین کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور وہ قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کا ایک اہم و فعال عنصر ہے۔

مطلق العنان بادشاہت

زمانہ جاہلیت میں خالص آمرانہ حکومت کا دوز دورہ تھا۔ اس زمانہ کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی۔ یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قائم ہوتی تھی جیسا کہ ایران میں تھا۔ وہاں آلِ ساسان کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت پر ان کا موروثی حق ہے اور انھیں تائید الٰہی حاصل ہے۔ عام رعایا کو بھی پوری کوشش کر کے اس کا یقین دلایا گیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا تھا اور حکومت کے بارہ میں ان کا یہی عقیدہ ہو گیا تھا جو کبھی متزلزل نہیں ہوتا تھا۔

کبھی یہ بادشاہت محض سلاطین کی عظمت پر قائم ہوتی تھی۔ اہل چین اپنے بادشاہ کو ''شہنشاہ فرزند آسمان'' کہتے تھے کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان ''نر'' ہے اور زمین ''مادہ'' اور کائنات کو انھی نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ ختا اول زمین و آسمان کے جوڑے کی پہلی اولاد ہے۔ اسی بنا پر شاہ وقت کو قوم کا تنہا باپ تصور کیا جاتا تھا، اسے حق تھا کہ جو چاہے کرے۔ لوگ اس سے کہتے تھے کہ ''آپ ہی قوم کے مائی باپ ہیں۔'' شہنشاہ لی یان یا تائی تسنگ جب مرا ہے تو اہلِ چین نے سخت ماتم برپا کیا اور حد سے زیادہ غم کیا کسی نے سوئیوں سے اپنا چہرہ خون آلود کیا، کسی نے اپنے بال کاٹے، کسی نے جنازہ سے اپنے کان مار مار کر زخمی کر لیے۔

کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی جیسا کہ مملکت روما میں اعتقاد تھا وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت بنیادی قانون تھا۔ دوسری قومیں اور دوسرے ملک اس قومیت کے غلام تھے۔ ان کی حیثیت ان رگوں اور شرائین کی سی تھی جن سے خون جاری ہو کر اپنے مرکز کو پہنچتا ہے۔ سلطنت روما ہر قانون اور ہر ایک کے حق کو نظر انداز کر سکتی اور ہر ایک کی عزت و ناموس پامال کر سکتی تھی۔ وہ ہر ظلم و ستم انھیں جائز سمجھتی تھی۔ رومیوں کا ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہو کر اور حکومت کے ساتھ مخلص اور وفاداری کا اظہار کر کے بھی کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم و ستم سے بچ نہیں سکتا تھا۔ کسی قوم کو حکومت خود اختیاری یا اندرونی خود مختاری کا حق نہیں تھا اور نہ اس کا موقع تھا کہ اپنے ملک میں اپنے واجبی حقوق سے مستفید ہو سکے، ان محکوم قوموں اور مفتوح ملکوں کی مثال اس اونٹنی کی سی تھی جس پر وقت ضرورت سواری کی جاتی اور اس کا دودھ دوہا جاتا اور صرف اسی قدر اسے چارا دیا جاتا جو اس کی پیٹھ کو مضبوط اور تھن کو دودھ سے بھرا رکھ سکے۔ رابرٹ بریفالٹ رومی سلطنت کے بارے میں لکھتا ہے:

''رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہاں کی بڑھتی ہوئی خرابیاں (مثلاً رشوت وغیرہ) نہ تھیں بلکہ اصلی برائی اور بنیادی خرابی فساد وشر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور نشوونما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی۔ یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی، کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور کج بنیاد پر کی جائے گی تو اسے گرنے سے صرف ذہانتیں اور عملی سرگرمیاں نہیں بچا سکتیں۔ اور چوں کہ خرابیوں ہی پر اس سلطنت کی بنیاد تھی اس لیے اس کا خاتمہ اور زوال بھی ضروری تھا، کیوں کہ ہمیں معلوم ہے کہ رومی سلطنت صرف ایک چھوٹے سے طبقہ کے عیش اور راحت رسانی کا ذریعہ تھی اور جمہور عوام سے ناجائز منفعت اندوزی اور رعایا کا خون چوس کر شاہی قومیت کو غذا پہنچانا اس حکومت کا کام تھا، بلاشبہ روم میں تجارت، امانت داری اور انصاف کے ساتھ جاری تھی اور یہ بات حکومت کی بنیادی خصوصیات میں سمجھی جاتی تھی اور اس سے بھی انکار نہیں کہ حکومت اپنی طاقت و قابلیت میں نیز اپنے عدالتی نظام میں ممتاز تھی۔ لیکن یہ تمام خوبیاں حکومت کو تباہی سے نہیں بچا سکتی تھیں اور نہ اساسی غلطیوں کے سخت انجام سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔''

مصر و شام کی رومی حکومت

ڈاکٹر الفرڈ بٹلر رومی حکومت کے بارے میں لکھتا ہے:

''مصر میں رومی حکومت صرف ایک ہی غرض و غایت اپنے سامنے رکھتی تھی اور یہ تھی کہ جس طرح ممکن ہو رعایا سے مال لوٹ کھسوٹ کر حکام کو فائدہ پہنچایا جائے۔ رعایا کی بہبودی اور خوش حالی اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک نہیں آتا تھا، رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز ہے، ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی اسے فکر نہ تھی، مصر پر ان کی حکومت ان پردیسیوں کی سی حکومت تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسا کرتی ہے اور محکوم قوم کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی۔

ایک عرب شامی مؤرخ شام میں رومی حکومت کے بارہ میں لکھتا ہے:

''ابتدا میں رومیوں کا شامیوں کے ساتھ اچھا اور منصفانہ برتاؤ تھا۔ اگرچہ ان کی سلطنت میں اندرونی طور پر خلفشار تھا لیکن جب ان کی حکومت بوڑھی ہو گئی تو اس نے بدترین قسم کی غلامی کی شکل اختیار کر لی اور بدترین معاملہ جو غلام اور رعیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اس نے اپنی محکوم رعایا کے ساتھ کیا، روم نے براہِ راست شام کا بھی الحاق نہیں کیا اور شام کے باشندوں کو کبھی بھی رومیوں کی طرح شہری حقوق نہیں حاصل ہوئے نہ ان کے ملک کو رومی سلطنت اور سرزمین کا درجہ ملا۔ شامی ہمیشہ غریب الوطن افراد کی طرح رعایا بن کر رہے، اکثر سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لیے اپنی اولاد کو بیچ دینے پر مجبور ہوئے، مظالم کی زیادتی تھی، غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا، اسی بیگار سے رومی حکومت نے وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کیے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔''

رومیوں نے شام پر سات سو سال تک حکومت کی۔ ان کے آتے ہی ملک میں

اختلافات' خودسری اور تکبر کی بنیاد پڑ گئی تھی اور قتل کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا' یونانیوں نے شام پر ۳۶۹ سال حکومت کی۔ اس پورے عہد حکومت میں بڑی سخت جنگیں ہوئیں' رعایا پر مظالم ہوئے اور یونانیوں کے حرص و ہوس کی پوری کیفیت کھل کر ظاہر ہو گئی۔ شامی قوم پر ان کی سلطنت بدترین نحوست اور سخت ترین عذاب تھی۔ (خطوط در شام)

خلاصہ یہ کہ بدیسی سامراج کے ہاتھوں روم و ایران کے ممالک انتہائی تکلیف و مصیبت میں تھے اور سیاسی' مالی' اقتصادی ہر لحاظ سے ملک کے تمام مرکز اور دارالسلطنت حد درجہ ابتری کی حالت میں تھے۔

ایران میں خراج اور ٹیکس وصول کرنے کا انتظام

ایران میں سیاسی و معاشی نظام نہ عادلانہ تھا نہ مستحکم' بلکہ اکثر حالات میں بہت ہی ناہموار اور ظالمانہ تھا۔ خراج اور ٹیکس وصول کرنے والے عملہ کے اخلاق' ان کی خواہشات اور ملک کے جنگی اور سیاسی حالات کے مطابق یہ نظام بدلتا رہتا۔ ''ایران بعہد ساسانیاں'' کا مولف لکھتا ہے:

''خراج اور ٹیکس کے لگانے اور وصول کرنے میں محصلین خیانت اور استحصال بالجبر کے مرتکب ہوتے تھے' چوں کہ مالیات کی رقم سال بسال مختلف ہوتی رہتی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ سال کے شروع میں آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ہو سکے۔ علاوہ اس کے ان چیزوں کو ضبط میں رکھنا بھی بہت مشکل تھا' بسا اوقات نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ادھر تو جنگ چھڑ گئی ادھر روپیہ ندارد۔ ایسی حالت میں پھر غیر معمولی ٹیکس کا لگانا ضروری ہو جاتا تھا اور تقریباً ہمیشہ اس کی زد مغرب کے مالدار صوبوں خصوصاً بابل پر پڑتی تھی۔

شاہی خزانے اور ذاتی دولت

پبلک کے فائدے کے لیے جتنا روپیہ شاہی خزانے سے جمع ہوتا تھا وہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ شاہانِ ایران کے ہاں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جہاں تک ممکن ہوتا اپنے خزانہ میں نقد روپیہ اور قیمتی اشیا جمع کرتے۔ خسرو دوم نے ۶۰۷۔۶۰۸ء میں طیسفون (مدائن) میں اپنے خزانہ کو نئی عمارت میں منتقل کیا تو اس میں چھیالیس کروڑ اسی لاکھ (۴۶۸۰۰۰۰۰۰) مثقال سونا تھا۔ یعنی تقریباً سینتیس کروڑ پچاس لاکھ فرانک طلائی (چار ارب اڑسٹھ کروڑ روپے)۔ حکومت کے تیرہویں سال کے بعد اس کے خزانہ میں اسی کروڑ مثقال وزن کا سونا تھا۔ خسرو دوم کے تاج میں ۱۲۰ پونڈ (یعنی ڈیڑھ من) خالص سونا تھا۔

طبقاتی تفاوت

ایران کی قومی زندگی میں دولت و خوش حالی مخصوص افراد کے اندر محدود تھی' معدودے چند اشخاص نہایت دولت مند تھے۔ باقی نہایت تنگ دست اور پریشان حال۔ ایرانی تاریخ میں نوشیرواں کا زمانہ حسنِ انتظام اور عدل گستری کے لیے ضرب المثل ہے۔ ''ایران بعہد ساسانیاں'' کا مصنف اس عہد کے متعلق لکھتا ہے:

تاج جو سونے اور چاندی کا بنا ہوا' اور زمرد' یاقوت اور موتیوں سے مرصع تھا بادشاہ کے سر کے اوپر چھت کے ساتھ ایک سونے کی زنجیر کے ذریعے لٹکا رہتا تھا جو اس قدر باریک تھی کہ جب تک تخت کے بالکل قریب آ کر نہ دیکھا جائے نظر نہیں آتی تھی۔ اگر کوئی شخص دور سے دیکھتا تو یہ سمجھتا کہ تاج بادشاہ کے سر پر رکھا ہوا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس قدر بھاری تھا کہ کوئی انسانی سر اسے نہیں اٹھا سکتا تھا۔ کیوں کہ اس کا وزن 91½ کلو تھا۔ (تقریباً 2½ من ہوا)

''خسرو (نوشیرواں) کی مالی اصلاحات میں بے شک رعایا کی نسبت خزانے کے مفاد کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا' عوام الناس اسی طرح جہالت و عسرت میں زندگی بسر کر رہے تھے جیسا کہ زمانہ سابق میں بازنطینی فلسفی جو شہنشاہ کے ہاں آ کر پناہ گزیں ہو گئے تھے ایران سے جلد برداشتہ خاطر ہو گئے۔ یہ سچ ہے کہ وہ اتنے بلند نظر فلسفی نہ تھے کہ ایک غیر قوم کی عادات و رسوم کو غیر جانب داری کی نظر سے دیکھ سکتے اور جن باتوں کو وہ ایک فلسفی بادشاہ کی سلطنت میں دیکھنے کے خواہاں تھے وہ انھیں نظر نہ آئیں' اور چوں کہ علم الاقوام کے مطالعہ کا انھیں ذوق نہ تھا اور ان کی ذہنیت ایسی نہ تھی جو اس علم کے جاننے والے کی ہوتی ہے لہٰذا ایرانیوں کی بعض رسموں مثلاً ترویج محرمات کی رسم یا لاشوں کو زخمیوں پر کھلا چھوڑ دینے کی مذہبی رسم نے انھیں برہم کیا' لیکن محض یہ رسمیں نہ تھیں جن کی وجہ سے انھیں ایران میں رہنا نا گوار ہوا بلکہ ذات پات کی تمیز اور سوسائٹی کے مختلف طبقوں کے درمیان ناقابلِ عبور فاصلہ اور خستہ حالی جس میں نچلے طبقہ کے لوگ زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ وہ چیزیں تھی جنھیں دیکھ کر وہ آزردہ خاطر ہوئے۔ طاقت ور لوگ کم زوروں کو دباتے تھے اور ان کے ساتھ بہت ظلم اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے۔''
(ایران بہ عہد ساسانیاں)

یہ حال صرف ایران ہی میں نہ تھا اس کی معاصر و حریف بازنطینی سلطنت میں بھی سخت قسم کا طبقاتی نظام اور امتیازی سلوک رائج تھا۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے:

''یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے چلانے والے اس کی حرکت اور ارتقا کو روک دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں پاتے' اسی لیے رومی معاشرہ (اپنے انحطاط کے دور میں) سخت درجہ کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں کسا ہوا تھا۔ سوسائٹی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنا پیشہ بدل سکے۔ ہر لڑکے کے لیے ضروری تھا کہ اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے۔''

دونوں سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے' بڑے خاندانوں اور گھرانوں کے لیے مخصوص تھے جو جاہ و حشم رکھتے تھے اور حکام میں ان کا رسوخ تھا۔

ایران کے کسان

نت نئے ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑ دی تھی' بہت سے کسانوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی' ان ٹیکسوں سے بچنے اور اس کی حکومت کی فوجی خدمت کرنے سے نجات حاصل کرنے کے لیے جس سے انھیں دلی لگاؤ نہ تھا' انھوں نے عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لی تھی' نہ انھیں اس مقصد سے کچھ دلچسپی تھی جس کے لیے بار بار جنگیں کی جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیکاری اور جرائم کی گرم بازاری ہوئی اور ناجائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرنے کا مرض عام ہو گیا۔ ''ایران بعہد ساسانیاں'' کا مصنف

ایران کے کاشت کار طبقہ کے متعلق جو ملک کی خوراک اور آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھا' لکھتا ہے:

''کسانوں کی حالت بہت بدتر تھی وہ اپنی زمین کے ساتھ بندھے رہتے تھے اور ان سے ہر طرح کی بیگار اور خدمت لی جاتی تھی۔ مؤرخ امیاں مارسلینوس لکھتا ہے کہ ''ان بیچارے کسانوں کے بڑے بڑے گروہ فوج کے پیچھے پیچھے پیادہ کوچ کرتے تھے' گویا ابدی غلامی ان کی تقدیر میں لکھی ہے اور کسی قسم کی تنخواہ یا اجرت سے ان کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ کسانوں کا تعلق زمین داروں کے ساتھ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کہ غلاموں کا تعلق آقا کے ساتھ۔''

حکام کا رویہ

حکومت کے اہل کار و عہدہ دار عوام رعایا اور ملک کے باشندوں کے ساتھ ایسی سخت گیری اور بیدردی کا برتاؤ کرتے کہ اہل ملک ان سے عاجز تھے۔ ان حکام اور عہدہ داروں کو نہ عوام کے جان و مال کی پرواتھی' نہ ان کی عزت و آبرو کا پاس' لوگ شکایتیں کرتے' لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور تھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگتی' یہاں تک کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہ اندھیر نگری ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے اور اس سے نجات کی کوئی صورت نہیں۔ بعض اوقات وہ ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے۔

مصنوعی معاشرت اور پرعسرت زندگی

روم اور ایران دونوں جگہ عام طور سے لوگوں پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا۔ مصنوعی تہذیب اور پرفریب زندگی کا سیلاب امنڈ آیا تھا جس میں وہ سر سے پاؤں تک غرق تھے۔ سلاطین روم اور شاہان ایران اور ان کے امرا و رؤسا خواب غفلت میں پڑے تھے' لذت اندوزی کے سوا انھیں کسی بات کی فکر نہ تھی۔ عیاشی کی وہ انتہا تھی کہ قیاس کام نہیں کرتا' تکلفات زندگی تعیشات اور سامان آرائش کی وہ بہتات تھی اور اس میں ان باریکیوں اور نکتہ سنجیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ پارسی مؤرخ شاہین مکاریوس کے بیان کے مطابق ''کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھیں' پچاس ہزار اصیل گھوڑے' اس قدر سامانِ تعیش' محلات' نقد و جواہرات تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے۔ اس کا محل اپنی شان و شکوہ اور عظمت میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ مکاریوس لکھتا ہے کہ تاریخ میں مثال نہیں ملتی کہ کسی بادشاہ نے ان شاہانِ ایران کی طرح دادِ عیش دی ہو جن کے پاس تحائف اور خراج کی رقمیں ان تمام شہروں سے آتی تھیں جو شرق اوسط اور مشرق اقصیٰ کے درمیان واقع تھے۔ اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی عراق سے بے دخل ہوئے تو انھوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ان چھوڑے ہوئے سامانوں میں بیش قیمت جوڑے' طلائی ظروف' سنگار کا سامان' عطریات وغیرہ تھے۔'' طبری کی روایت ہے کہ عربوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے ملے جو سربمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے۔ عرب کہتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ اس میں کچھ کھانے کا سامان ہوگا' کھولنے سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن ہیں۔ مورخین نے فرشِ بہار کی (جس پر بیٹھ کر امرا ایران موسمِ خزاں میں شراب پیتے تھے) تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''یہ ساٹھ گز مربع تھا' تقریباً ایک ایکڑ زمین کو گھیر لیتا۔ اس کی زمین سونے کی تھی جس میں جابجا جواہرات اور موتیوں کی گلکاری تھی' چمن تھے جن میں پھول دار اور پھل دار درخت قائم تھے۔ درختوں کی لکڑی سونے کی' پتے حریر کے' کلیاں سونے چاندی کی اور پھل جواہرات کے بنائے گئے تھے' گرد ہیرے کی جدول تھی' درمیان میں روشیں اور نہریں بنائی گئی تھیں اور یہ سب جواہرات کی تھیں۔ موسم خزاں میں تاجدارانِ آلِ ساسان اس گلشنِ بے خزاں میں بیٹھ کر شراب پیا کرتے اور دولت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آتا جو زمانہ نے کبھی اور کہیں نہ دیکھا تھا۔''

رومی حکومت کے عہد میں شام اور اس کے مرکزی شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ یہ دونوں حکومتیں عیش پسندی اور تمدن کی باریکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ شہنشاہان روم ان کے شامی رؤسا و حکام نے کھل کر دادِ عیش دی۔ ان کے عالی شان محل اور دیوان خانے اور ناؤ نوش کی مجلسیں' عیش کے ساز و سامان اور دولت و فراغت کے اسباب سے لبریز تھیں۔ تاریخ و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عیش پسندی اور نفاست میں بہت آگے نکل چکے تھے۔ حضرت حسانؓ بن ثابت نے (جنھوں نے اسلام سے پہلے غسانی امرائے شام کی محفلوں میں شرکت کی تھی) جبلہ بن الایہم غسانی کی مجلس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''میں نے دس باندیاں دیکھیں جن میں پانچ رومی تھیں جو بربط پر گا رہی تھیں اور پانچ وہ تھیں جو اہل حیرہ کے دھن میں گا رہی تھیں جنھیں عرب سردار ایاس بن قبیصہ نے تحفتہً بھیجا تھا' اس کے علاوہ عرب کے علاقہ مکہ وغیرہ سے بھی گویّوں کی ٹولیاں جاتی تھیں' جب شراب نوشی کے لیے بیٹھتا تو اس کے نیچے فرش پر قسم قسم کے پھول چنبیلی' جوہی وغیرہ بچھا دیے جاتے اور سونے چاندی کے ظروف میں مشک و عنبر لگائے جاتے' چاندی کی طشتریوں میں مشک خالص لایا جاتا' اگر جاڑوں کا زمانہ ہوتا تو عود جلایا جاتا' اگر گرمیوں کا موسم ہوتا تو برف بچھائی جاتی' اور اس کے ہم نشینوں کے لیے گرمیوں کا لباس آتا جسے وہ اپنے اوپر ڈال لیتا' جاڑوں میں سمور' قیمتی کھالیں اور دوسرے گرم لباس حاضر کیے جاتے۔''

والیانِ ریاست' شاہ زادے' امرا' اونچے گھرانوں کے افراد نیز متوسط طبقہ کے لوگ بادشاہوں کے نقشِ قدم پر چلنے اور کھانے پینے' پوشاک اور طرزِ رہائش میں ان کی نقل کرنے کی کوشش کرتے اور ان کے عادات و اطوار اختیار کرتے۔ معیارِ زندگی بہت ہی زیادہ بلند ہو گیا تھا اور معاشرت بہت زیادہ پیچیدہ بن گئی تھی۔ ایک ایک شخص اپنی ذات پر اور اپنے لباس کے کسی ایک حصہ پر اس قدر خرچ کرتا تھا جس سے پوری ایک بستی کی پرورش ہو سکے یا جو پورے ایک گاؤں یا آبادی کی پوشاک اور ستر پوشی کے مصارف کے لیے کافی ہو' ایسا کرنا ہر ایک ممتاز اور شریف آدمی کے لیے ناگزیر تھا کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سوسائٹی میں انگشت نمائی ہوتی اور وہ اپنے ہم چشموں میں ذلیل ہوتا' یہاں تک کہ یہ بھی زندگی کی ایک ضرورت اور سوسائٹی کا ایک قانون بن گیا'

جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔

شعبی کہتے ہیں کہ اہلِ ایران اپنے سروں پر جو کلاہ رکھتے تھے وہ ان کی اس حیثیت کے مطابق ہوتی تھی جو انھیں اپنے قبیلہ میں حاصل تھی۔ چناں چہ جو اپنے قبیلہ میں شرافت وعزت کے لحاظ سے معیاری ہوتا تھا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی قیمت کی ہوتی تھی۔ ہرمز کا شمار انھی افراد میں تھا جن کی سیادت تسلیم شدہ تھی لہٰذا اس کی کلاہ ایک لاکھ کی تھی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ شرافت و وجاہت کا معیار یہ تھا کہ وہ ایران کے سات اونچے گھرانوں میں سے کسی ایک خاندان کا فرد ہو۔ ازادبہ (زادویہ) شہر حیرہ کا کسریٰ کے عہد میں حاکم تھا۔ وہ سیادت میں دوسرے نمبر کا سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کی ٹوپی کی قیمت پچاس ہزار تھی۔ رستم کی کلاہ ستر ہزار میں فروخت ہوئی اور اس کی قیمت ایک لاکھ تھی۔

لوگ اس انتہا پسندانہ معاشرت اور اس کے تباہ کن لوازم وضروریات کے اس طرح عادی ہوگئے تھے اور یہ تمدن ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر گیا تھا کہ یہ تکلفات ان کی طبیعت ثانیہ بن گئے تھے اور ان سے علیحدہ ہونا ان کے لیے ناممکن سا ہوگیا تھا۔ نازک سے نازک وقت میں مجبوری کی حالت میں بھی سادہ زندگی اور نیچی سطح پر اتر آنا ان کے لیے دشوار تھا۔

مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہِ ایران یزدگرد جس بے سروسامانی اور پریشانی میں دارالسلطنت چھوڑ کر بھاگا ہے۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے، مگر اس عجلت و پریشانی میں وہ اپنے ساتھ جو سامان لے گیا ہے اس سے اس ذہنیت اور معیارِ تمدن کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ''ایران بعہد ساسانیاں'' کا مصنف لکھتا ہے:

''یزدگرد اپنے ہم راہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ، ایک ہزار باز دار، اور بہت سے دوسرے لوگ لیتا گیا۔ اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی۔''

ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی بار مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا۔ پانی ایک موٹے سے پیالہ میں لایا گیا۔ اس نے کہا: چاہے میں پیاسا مرجاؤں مگر اس بھدے سے پیالے میں پانی پینا میرے لیے ممکن نہیں۔ چناں چہ اس کے لیے تلاش کر کے دوسرے برتن میں پانی لایا گیا جسے وہ پی سکا۔ ان دو واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ایرانیوں کی عادتیں کس قدر بگڑ گئی تھیں اور وہ مصنوعی زندگی اور تکلفات کے کس قدر عادی اور سادہ اور فطری زندگی سے کس قدر دور ہوچکے تھے۔

حکومت کی دولت ستانی

اس عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیکسوں میں اس قدر اضافے ہو جائیں جو رعایا کے لیے ناقابلِ برداشت ثابت ہوں، نئے نئے قوانین بنائے جائیں۔ جن کی رو سے کسانوں، تاجروں، کاری گروں اور اہلِ حرفہ سے زیادہ سے زیادہ مال گھسیٹا جاسکے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آئے دن کے ان اضافوں اور بھاری بھاری ٹیکسوں نے رعایا کی کمر توڑ دی اور حکومت کے مطالبات سے ان کی پیٹھ بوجھل ہوگئی۔

''ایران بعہد ساسانیاں'' کا مولف لکھتا ہے:

''باقاعدہ ٹیکسوں کے علاوہ رعایا سے نذرانے لینے کا بھی دستور تھا جسے آئین کہتے تھے۔ اسی آئین کے مطابق عید نوروز اور مہرگان کے موقعوں پر لوگوں سے جبراً تحائف وصول کیے جاتے تھے۔ خزانہ شاہی کے ذرائع آمدنی سے ہمارا خیال ہے کہ سب سے اہم ذریعہ جاگیر ہائے خالصہ کی آمدنی اور وہ ذرائع تھے جو بادشاہ کے لیے حقوق خسروی کے طور پر مخصوص تھے، مثلاً فارنگینوں (علاقہ آرمینیہ) کی سونے کی کانوں کی ساری آمدنی بادشاہ کی ذاتی آمدنی تھی۔''

مورخ شام رومی حکومت کے طرزِ عمل اور اس کی مدوں اور آمدنیوں کے متعلق لکھتا ہے:

''شامی رعایا پر لازم تھا کہ وہ حکومت کا ٹیکس ادا کرے اور اپنی تمام پیداوار اور آمدنی کا دسواں حصہ اور راس المال کا ٹیکس داخل کرے، فی کس ایک رقم مقرر تھی جس کا ادا کرنا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ رومی قوم کے کچھ دوسرے اہم ذرائع آمدنی تھے۔ مثلاً چنگی، کانیں، محاصل، اس کے علاوہ جو قطعات گندم کی کاشت کے قابل ہوتے، اور چراگاہیں ٹھیکا پر اٹھادی جاتیں ان ٹھیکا داروں کو ''عشارین'' کہتے تھے۔ یہ لوگ حکومت سے تحصیل وصول کے اختیار خرید لیتے اور رعایا سے مطالبات وصول کرتے۔ ہر صوبہ میں ان ٹھیکیداروں کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں، ہر کمپنی کے پاس کچھ منشی اور محصل ملازم تھے جو اپنے آپ کو افسروں اور مالکوں کے انداز میں پیش کرتے اور جس قدر انھیں لینے کا حق تھا اس سے زیادہ وصول کرتے، وہ لوگوں کو فراغت و راحت کے وسائل سے محروم کرتے اور اکثر انھیں غلاموں کی طرح فروخت بھی کر دیتے۔''

رومیوں کے سیاسی طرز کا اور ان کی پالیسی کا کسی نے خلاصہ یہ بیان کیا ہے:

''اچھا گلہ بان وہ ہے جو اپنی بھیڑوں کا اون کاٹ لیتا ہے نوچتا نہیں۔'' واقعہ یہ ہے کہ دو صدیاں گزر گئیں اور شہنشاہانِ روم اپنی مملکت کے باشندوں کا اون کاٹتے رہے (نوچنے کی کوشش نہیں کی) وہ ان سے بہت بڑی دولت وصول کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بیرونی دشمن سے ان کی حفاظت کرتے رہے۔

عوام کی خستہ حالی

روم و ایران دونوں مملکتوں میں اہلِ ملک دو علیحدہ طبقوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان واضح اور بیّن فرق تھا، ایک طبقہ بادشاہوں، شاہزادوں، اہلِ دربار، ان کے خاندانوں، عزیزوں اور ان کے متعلقین و وابستگان اور جاگیرداروں اور دولت مندوں کا تھا۔ یہ لوگ سدابہار پھولوں کی سیج پر زندگی گزارتے، ان کے گھر کے لوگ اور بچے سونے چاندی سے کھیلتے اور دودھ اور گلاب میں نہاتے۔ یہ اپنے گھوڑوں کی نعلیں بھی جواہرات سے جڑتے اور درودیوار کو بھی ریشم وکمخواب سے سجاتے تھے۔

دوسرا طبقہ کاشت کاروں، کاریگروں، اہلِ حرفہ اور چھوٹے تاجروں کا تھا، جن کی زندگی سراپا کلفت ومصیبت تھی۔ یہ زندگی کے بوجھ ٹیکسوں اور نذرانوں کے بار سے کچلے جارہے تھے ان کا جوڑ جوڑ اور بند بند مطالبات کے اندر جکڑا ہوا تھا۔ وہ اس جال کو توڑنے کی جس قدر کوشش کرتے اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے وہ جال اور کس

جاتا۔ اس کٹھن اور پُر مصیبت زندگی پر دوسری مصیبت یہ تھی کہ وہ اونچے طبقہ کی بہت سی باتوں میں نقل اتارنے کی کوشش بھی کرتے جس سے اور زیادہ پریشان ہوتے' ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں انھیں وہ دقت اور پریشانی لاحق نہ ہوتی جو اس نقالی اور اونچے طبقہ کی ریس کرنے میں انھیں پیش آتی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زندگی تلخ اور سراپا کوفت تھی' ان کا دماغ ہر وقت پریشان و پراگندہ رہتا اور انھیں حقیقی سکون اور اطمینان قلب کبھی میسر نہ آتا۔

سرکش دولت منداور خود فراموش مفلس

سرمایہ داری کی سرکشی و خدا فراموشی اور افلاس کی بے بسی اور خود فراموشی کے دو انتہائی سروں کے درمیان انبیا علیہم السلام کی دعوت و تعلیم کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی' اخلاق عالیہ اور زندگی کے بلند اصول پوری متمدن دنیا میں متروک اور ناقابل عمل سمجھ لیے گئے تھے۔ دولت مندوں کو اپنے تفریحی مشاغل اور تعیشات سے اس کی فرصت نہ تھی کہ وہ دین یا آخرت کے بارے میں کچھ سوچیں۔ کاشت کاروں اور محنت کش کو اس کے افکار و آلام اور زندگی کے بڑھتے ہوئے مطالبات اس کی مہلت نہیں دیتے تھے کہ وہ روز کی خوراک اور ضروریات کے علاوہ کسی اور طرف توجہ کرے۔ غرض یہ کہ زندگی اور زندگی کے مطالبات نے امیر و غریب سب کو الجھا رکھا تھا اور اسی میں ہر ایک سرگرداں تھا۔ زندگی کی چکی اپنی پوری قوت کے ساتھ گردش کر رہی تھی جس کی وجہ سے انھیں مطلق مہلت نہ تھی کہ وہ دین کی طرف توجہ کریں اور روح و قلب کے بارہ میں انسانیت کی بلند قدروں کے متعلق غور کر سکیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف (حجۃ اللہ البالغہ) میں ماقبل اسلام کی اس صورت حال کی پوری تصویر کھینچی ہے' وہ فرماتے ہیں:

''صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے' آخرت کو یک سر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آ جانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسانیوں اور سامان آرائش میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی' اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے' دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہل ہنر اور اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے جو اس سامانِ آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے۔ ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں' اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا' زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امرا میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا' اگر کسی کے پاس عالی شان محل' فوارہ' حمام' باغات' خوش خوراک اور تیار جانور' خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے۔ کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی' اس کی تفصیل بہت طویل ہے' اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو۔ یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جز و بن گئے تھے' اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے' اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ ایک مصیبتِ عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہر شہری پر یہ پر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اسے زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ تکلفات بیش قرار رقمیں صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشت کاروں' تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھیں۔ اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور انھیں سزائیں دی جاتیں۔ اور اگر وہ تعمیل کرتے تو انھیں گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے' جن سے آب پاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لیے انھیں پالا جاتا ہے اور محنت و مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں کسی وقت سر اٹھانے اور سعادت اُخروی کا خیال بھی کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی۔ بسا اوقات پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جسے اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔''

[مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی]

عرب کے حالات

لفظ ''عرب'': اہل لغت کے نزدیک ''عرب اور اعراب'' کے معنی فصاحت و بلاغت' زبان آوری' زبان دانی اور خوش بیانی کے ہیں۔ چوں کہ اہل عرب اپنی فصاحت و بلاغت کے سامنے ساری دنیا کو ہیچ اور کم تر سمجھتے تھے' اس لیے انھوں نے خود کو عرب (زبان آور) اور دنیا کی دوسری زبانیں بولنے والی اقوام کو عجم (گونگا) کہہ کر پکارا۔ بعض کا خیال ہے کہ عرب عبرانی لفظ ''عربا'' سے مشتق ہے' جس کے معنی ریگستان ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ''عرابہ'' اس کی اصل ہے یعنی گندم گوں۔ یہ عربوں کی رنگت کی طرف اشارہ ہے۔ کسی مورخ نے عرب کہلائے جانے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس کا پہلا باشندہ یعرب بن قحطان تھا۔ ملک اس کے نام سے موسوم ہوا۔ کچھ لوگ اس ملک کا پہلا نام ہی ''عربتہ'' بتاتے ہیں جو بعد میں عرب ہو گیا۔ بعض لوگ ''عبیر'' کی طرف منسوب کرتے ہیں' جس کے معنی ہیں خانہ بدوش۔

عرب قوم

دور حاضر کی وسیع تر اصطلاح میں جب ''عرب قوم'' کہا جاتا ہے تو اس سے مراد (سیاسی اور جغرافیائی حد بندیوں سے ماورا) وہ سب قومیں ہوتی ہیں جو عربی زبان بولتی ہیں۔ ان میں عراق' شام' اردن' لبنان' فلسطین اور مصر وغیرہ سب ممالک اور اقوام شامل ہیں' لیکن زمانہ قدیم میں جزیرۃ العرب کی قدیم حدود کے اندر رہنے والے ہی عرب قوم کہلاتے تھے جو اس خطے کے اندر آباد تھے۔ آج کی سیاسی حد بندیوں کے مطابق سعودی عرب' یمن' کویت' مسقط' بحرین اور متحدہ عرب امارات میں بسنے والی قومیں اس دور کی عرب قوم میں شامل ہیں' اس لیے جب ہم قدیم عرب قوم یا حضرت محمدؐ کے زمانے کی عرب قوم کا ذکر کرتے ہیں' تو اس سے مراد یہی عرب قوم ہوتی ہے۔

حدود اربعہ

آنحضورؐ کی بعثت سے پہلے ہی سے عرب پوری دنیا سے الگ تھلگ ایک جزیرہ نما ہے۔ براعظم ایشیا کے اس خطے کو جزیرہ نما اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے تین طرف پانی ہے۔ اس کے جنوب میں بہت بڑا سمندر بحر ہند ہے۔ شمال میں عراق اور شام کا علاقہ ہے جو اس وقت ایرانی اور رومی عمل داری میں تھا۔ مشرق میں خلیج فارس اور دریائے دجلہ وفرات سے لگا ہوا ملک ایران' دولت کسریٰ کہلاتا تھا۔ مغرب میں بحیرۂ قلزم کی لمبی کھاڑی ہے' جس کے بعد براعظم افریقہ واقع ہے۔

عرب کے تینوں اطراف سمندر کے ساحلی علاقے سرسبز و شاداب ہیں۔ شمال سے جنوب تک اور پھر جنوب سے مشرق تک ایک سلسلۂ کوہ پھیلا ہوا ہے' جسے جبل السراۃ کہتے ہیں۔ شمال میں یہ پہاڑ شام و فلسطین کے پہاڑوں سے مل جاتا ہے۔ اس سلسلۂ کوہ کو جگہ جگہ سے وادیاں (وسیع نالے) قطع کرتی ہیں جن کا پانی بارش کے زمانے میں مغربی سمندر میں گرتا ہے اور مشرق میں ریگستانوں میں جذب ہوتا ہے۔ درمیان میں صحرا ہے' لق و دق اور ناقابل عبور' ریت کے تودے کے تودے ادھر سے ادھر ایسے لہراتے ہیں جیسے سمندر میں طوفانی موجیں' جنوب مشرق میں واقع بڑا صحرا ''الربع الخالی'' اور وسطی ''صحرائے نفوذ'' کہلاتا ہے۔

جغرافیائی تقسیم

قدیم زمانے میں جغرافیائی اور طبعی اعتبار سے عرب چار حصوں میں منقسم تھا۔ عرب عراق اور عرب شام اس میں شامل نہیں تھے: عروض' نجد' حجاز' تہامہ' یمن۔ عرب کا مغربی حصہ پست ہے اور یہاں گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے' اسی لیے تہامہ کہتے ہیں۔ مشرقی حصے کی سطح بلند ہے' اس لیے وہ نجد (بلند) کہلاتا ہے۔ تہامہ اور نجد کے وسط میں حجاز ہے یعنی درمیانی حصہ۔ عروض میں تمام مشرقی حصہ شامل سمجھا جاتا ہے۔ عرب کے بڑے صحراؤں اور ریگستانوں میں صحرائے ربع الخالی' الدہنا' النفوذ اور بادیۃ الشام شامل ہیں۔

(1) عروض

اس خطے میں خلیج فارس پر واقع عمان' الاحسا (بحرین) حدود عراق تک اور نجد کے نیچے کا علاقہ یمامہ شامل ہیں۔ عمان کا ساحلی علاقہ سرسبز و شاداب اور آباد ہے۔ اس کے پہاڑ معدنیات سے مالا مال ہیں' خاص طور پر سیسہ اور تانبا کثرت سے ہیں۔ وادیاں زرخیز اور قابل کاشت ہیں۔ جنگلوں میں خوش بودار لکڑی پائی جاتی ہے۔ یہاں کے گھوڑے' گائے اور بکریاں مشہور ہیں۔

الاحسا' جس کا دوسرا نام بحرین ہے' یہ بھی ساحلی علاقہ ہے۔ اس کے ساحل اور متصل جزیرے موتیوں کے مخزن ہیں۔ بیش قیمت موتی بڑی تعداد میں نکالے جاتے ہیں۔ اب یہاں تیل کے چشمے بھی نکل آئے ہیں۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہ علاقہ سلطنت کسریٰ کے قبضے میں تھا۔ ایرانیوں کے نائب جو عراق (حیرہ) میں حکمران تھے' ان کی طرف سے یہاں کی حکومت مناذرہ خاندان کو دی گئی۔ 6 ہجری میں یہاں کا حاکم منذر بن ساویٰ آنحضورؐ کی دعوت پر اپنی رعایا کے ساتھ ایمان لے آیا۔

یمامہ کے علاقے میں سخت دشوار گزار ٹیلے ہیں۔ اس کا وہ حصہ جو نجد سے ملا ہوا ہے' ہرا بھرا اور آباد ہے۔ اس کے جنوب میں صحرائے ربع الخالی ہے۔ شمال میں نجد

ہے۔قدیم عمارتوں اور قلعوں کے آثار ظہور اسلام تک باقی تھے۔ یہاں کے قبیلہ بنو حنیفہ نے 8 ہجری میں خدمت نبویؐ میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ مسیلمہ کذاب' جھوٹا نبی یہیں کا سردار تھا جس سے عہد صدیقی میں زبردست جنگ ہوئی اور حضرت خالدؓ بن ولید کے ہاتھوں شکست کھائی۔ حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی نے مسلمان ہونے کے بعد اسے اس جنگ میں قتل کیا اور اپنے پہلے عمل کی تلافی کی۔

(2) نجد

کوہستان السراۃ کا مشرقی حصہ جو یمن سے شروع ہو کر ساوہ اور عراق تک پہنچتا ہے' نجد کہلاتا ہے۔ یہ وسطی عرب کا سرسبز و شاداب' عمدہ زمین والی سطح مرتفع ہے۔ سطح بحر سے 1200 میٹر بلند ہے۔ تین اطراف سے بے آب و گیاہ صحراؤں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے آزاد اور بیرونی اثرات سے محفوظ رہنے کی یہی وجہ ہے۔ یہاں کی زبان آج بھی محفوظ' غیر مخلوط اور قدیم عربی کا نمونہ ہے۔ عربی شاعری کا باوا آدم مہلہل اسی خاک سے اٹھا تھا۔ عرب کا سب سے بڑا چشمہ دھنا یہاں سے گزرتا ہے۔ وادیوں اور پہاڑوں کے دامن میں زراعت بھی ہوتی ہے۔ کثرت سے چراگاہیں ہیں۔ یہاں کے گھوڑے اور اونٹ خوب صورت اور تیز رفتار ہوتے ہیں۔ پھولوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ یہاں عہد قدیم میں کندہ خاندان کی حکومت تھی جس کا آخری شہزادہ امراؤ القیس عرب کا ملک الشعرا بنا۔ قبیلہ ہوازن جہاں حضورؐ نے بچپن میں پرورش پائی تھی' اس کے مغرب میں آباد تھا۔ ظہور اسلام کے وقت یہاں قبیلہ غطفان آباد تھا جو شروع ہی سے اسلام کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہا۔ 3 ہجری میں غزوۂ انمار اور 4 ہجری میں غزوۂ ذات الرقاع انھی کی سرکوبی کے لیے پیش آئے۔

(3) حجاز

اس کا نام حجاز اس لیے بھی رکھا گیا ہے کہ یہ السراۃ کا کوہستانی سلسلہ ہے جو تہامہ کو نجد سے الگ کر دیتا ہے۔ حجاز بحرۂ قلزم کے ساحل پر شمالاً جنوباً مستطیل شکل میں پہاڑوں سے گھرا ہوا علاقہ ہے۔ اس میں ایسے قطعے بھی ہیں جن کے پتھر سیاہ کھنجر کی طرح ہیں۔ انھیں عربی میں حرہ اور لابہ کہتے ہیں' یہ سطح بحر سے کافی بلند ہیں۔ ان کی قطعات کی تعداد سوتک شمار کی گئی ہے۔

حرہ ایسے بھربھرے پتھر ہوتے ہیں' گویا انھیں آگ میں جلا دیا گیا ہو' یہ سیاہ سنگستان حوران کے مشرق سے ہو کر بڑھتے بڑھتے مدینہ تک پھیلتے چلے گئے ہیں' حتیٰ کہ خود مدینہ دو حروں کے درمیان واقع ہے۔ یہ حرے زیادہ تر تبوک اور مکہ کے درمیان واقع ہیں۔

کوہ السراۃ کو تورات میں کوہ فاران کا نام دیا گیا ہے۔ سرزمین حجاز میں جا بجا ریت کے انبار دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں سرسبز ٹیلے بھی نظر آتے ہیں۔ یہی زیادہ تر عرب قبائل کے مسکن ہیں۔ بستیوں کے ارد گرد ان کے کھیت ہوتے ہیں۔ ٹیلوں کی نشیبی زمین پر اناج' میوہ' گھاس اور چارا پیدا ہوتا ہے۔ ریگستانی علاقے میں قدرتی چشموں سے نخلستان آباد ہیں۔ ساحلی علاقہ سرسبز و شاداب اور بہت آباد ہے۔ دامن کوہ میں چشمے جاری ہیں۔ باغ' کھیتیاں اور کہیں کہیں جنگل بھی ہیں۔ حجاز کا بڑا ساحلی شہر اور بندرگاہ جدہ ہے۔ ینبوع مدینہ کی گودی ہے۔ جدہ کا قدیم نام شعیب تھا۔

مکہ معظمہ

حجاز کا زیادہ حصہ بنجر اور بے آب و گیاہ ہے جسے قرآن نے ''وادی غیر زرع'' کہا ہے۔ اس میں بکہ یا مکہ کی وادی واقع ہے جو پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔ جن پہاڑوں نے انھیں گھیر رکھا ہے' ان کے نام جبل الفج' جبل الفلج' جبل قیقعان' جبل لعلع' جبل خندمہ اور جبل بوقبیس ہیں۔ یہیں روئے زمین پر پہلی بار اللہ کا گھر تعمیر ہوا۔ اس گھر کی چھت تھی نہ دہلیز نہ دروازہ۔ بس ایک چار دیواری تھی جو طول میں 32' عرض میں 22 اور بلندی میں 9 گز تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے لوگ اس کے حج کے لیے دور دراز سے آنے لگے۔ اللہ کے اس گھر پر سب سے پہلا غلاف قدیم زمانے کے یمن کے حمیری بادشاہ اسد تبغ نے چڑھایا۔ ہر دور میں اس کا تقدس برقرار رہا۔ حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال پہلے ہی سے یہ شام اور یمن کی تجارتی شاہ راہ پر ایک منزل تھی۔ بیت اللہ کی تعمیر کے بعد کچھ عرب قبائل یہیں بس گئے اور حج و زیارت کا رواج پڑنے لگا تو رفتہ رفتہ مکہ ایک بڑا شہر اور تجارتی مرکز بن گیا۔

بنو اسماعیل میں سے قصی نے یہاں اپنی ریاست قائم کی۔ وہی قریش کے جد اعلیٰ ہیں۔ مکہ میں سب سے پہلا گھر تعمیر کرنے والے کا نام سعید بن عمر تھا۔ قدیم عربی میں قریش کے معنی ''تاجر'' کے ہیں۔ بنی قریش کے بڑے بڑے تجارتی کارواں' جو پانچ سو سے ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل ہوتے تھے' موسم گرما میں ملک شام اور مصر کی طرف اور سردیوں میں مال تجارت لے کر یمن کی طرف جاتے تھے۔ صنعا اور مآرب کے بازاروں' عدن اور عمان کی بندرگاہوں میں حبشہ' جنوبی ہند اور جزائر الہند سے درآمد شدہ قیمتی اور خوش بودار مصالحہ جات قریش کے ذریعے ہی سے تمام عرب میں پہنچتے تھے۔ وہ بصرہ اور دمشق کے تجارتی میلوں سے اناج' کپڑے' برتن' ہتھیار' اسلحہ' عطر' تیل' زیور' خشک و تر میوے اور دیگر ضروریات کا سامان خرید کر لاتے۔ اس کے بدلے جانوروں کی کھالیں' اون' روغن' لوبان' گوند' قیمتی پتھر اور گھوڑے فروخت کرتے اور بے حد منافع کماتے۔

مکہ کو حضرت ابراہیمؑ کے تعمیر کردہ بیت اللہ کے علاوہ پیغمبر آخر الزماںؐ کے مقام ولادت بننے کا بھی شرف حاصل ہوا۔ مکہ سے 70 میل پر باغوں کا شہر پر فضا مرغ زار طائف ہے۔ یہاں بنو ثقیف کا قبیلہ آباد تھا۔ حجاز کا دوسرا بڑا شہر یثرب تھا' جس کی قسمت میں مدینۃ النبیؐ تھا۔ یہ مکہ سے 270 میل کے فاصلے پر ہے۔ یہی آنحضورؐ کا دارالہجرت اور آرام گاہ ہے۔ یہاں کے قبائل میں اوس و خزرج دو ممتاز قبائل تھے۔ ان کے علاوہ یہودی بھی کثرت سے آباد تھے جن کی اپنی جدا بستیاں تھیں۔

مکہ چوں کہ تجارتی مرکز تھا' اس لیے یہاں تجارتی میلے بھی لگتے تھے۔ ملک عرب

اگرچہ کسی سیاسی وحدت کے تابع نہ تھا' لیکن تجارتی میلوں کی وجہ سے ایک معاشی وحدت پیدا ہوگئی تھی۔ یہ تجارتی میلے کچھ اس طرح ہوتے تھے کہ پورے جزیرہ نمائے عرب پر محیط ہوتے۔ ان کی تفصیل کچھ یہ ہے۔ شام وحجاز کے مابین دومتہ الجندل میں یکم ربیع الاوّل کو میلا شروع ہوتا۔ مکہ سے قریش اپنا سامان تجارت لے کر جاتے۔ اس کے بعد تاجر بحرین میں میلا مشقر میں پورا جمادی الثانی گزارتے۔ اس میں ایران کے تاجر بھی شریک ہوتے۔ یہاں سے تاجر عمان کی بندرگاہ صحار میں پانچ دن کے لیے جمع ہوتے۔ پھر اس کی دوسری بندرگاہ دبا میں رجب کے آخر تک میلے کا اہتمام ہوتا۔ یہاں جہازوں میں بیٹھ کر سندھ' ہند اور چین کے تاجر آتے۔ اس کے بعد یہ میلا مہرہ کے شہر ''شحر'' میں شعبان کے وسط میں لگتا۔ یکم رمضان سے بیس دن کے لیے عدن میں میلا بھرتا۔ عدن عطریات کے لیے بہت مشہور تھا۔ یہاں اس کی بہت خرید وفروخت ہوتی۔ رمضان کے آخر میں پندرہ دن سب صنعا میں تجارت کرتے۔ وسط ذی قعد سے آخر ماہ تک دو جگہ یکساں میلا لگتا۔ حضر موت میں رابیہ پر اور مکہ کے قریب عکاظ میں تاجر بٹ جاتے۔ عکاظ کا محل وقوع یمامہ اور تہامہ کی سرحد کے قریب تھا۔ ذی الحجہ میں حج کا موسم آتا تو ذی المجاز اور منیٰ میں میلا لگتا۔ عکاظ' ذی المجاز اور منیٰ کے میلے بہت بڑے ہوتے۔ چوں کہ حج کے لیے بڑی تعداد میں لوگ جمع ہوتے' اس لیے ان میلوں میں شرکت اس لیے بھی زیادہ ہوتی کہ عہد قدیم سے چار ماہ یعنی ذی قعدہ' ذی الحجہ' محرم اور رجب محفوظ اور محترم مہینے قرار دیے گئے تھے۔ ہر طرف امن ہوتا' اس لیے تعداد زیادہ ہوتی۔ حج کے بعد دسویں محرم سے خیبر اور یمامہ میں میلے لگتے۔ خیبر سے تاجر ازرح اور بصریٰ کے میلوں میں شریک ہوتے۔ اس طرح سال بھر میں تمام عرب کے ساحلی مقامات کا تجارتی دورہ مکمل ہو جاتا اور چیزیں ادھر سے ادھر پہنچتی رہتیں اور یوں تمام سال خرید وفروخت کا ایک سلسلہ قائم رہتا۔

مکہ میں جبل عرفات کے پیچھے عکاظ میں ہر سال تجارتی میلا لگتا تھا۔ قبائل کے سردار بھی جمع ہوتے اور آپس میں معاہدات کی شرائط طے کرتے۔ میلے کے دنوں میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ تجارت کے ساتھ ساتھ شعروشاعری' خطابت اور فنون حرب کے مقابلے بھی ہوتے۔ سخن فہمی اور شعروشاعری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ان کی شاعری ان کے صحراؤں کی طرح وسیع' پہاڑوں کی مانند عظیم' بدویانہ زندگی کی طرح سادہ اور بے تکلف تھی۔ انھوں نے اونٹوں کی رفتار سے اپنے اشعار کے اوزان بنائے تھے۔ اپنی بادیہ پیمائی کے تذکروں' قبائلی فخر ومباہات' وادیوں اور صحراؤں کے قصے کہانیوں' شجاعت و بہادری کے تذکروں سے اشعار میں رنگ بھرتے۔ اہل قبیلہ شاہ سواروں اور جنگ جو دلیروں سے بھی زیادہ اپنے شعرا کی قدر ومنزلت کرتے۔ مشاعروں کو قبیلے کی عزت وآبرو کا نگہبان' حسب نسب کا محافظ اور آبا و اجداد کے کارناموں کا زندہ رکھنے والا سمجھتے۔ جب کسی قبیلے میں کوئی اچھا شاعر پیدا ہوتا تو دوسرے قبائل کے لوگ آکر مبارک باد دیتے۔ ان کی شاعری کی کل کائنات فخر نسب' اظہار عشق اور اعلان جنگ تھی۔ ہر قبیلے میں شاعر موجود تھے' اسی لیے ہر فرد کی زبان ایسی منجھ گئی تھی کہ اہل عرب دوسروں کو اپنا ہم سر نہیں سمجھتے تھے۔ عکاظ کے سالانہ میلے میں مختلف قبائل کے شاعر اور خطیب بڑھ بڑھ کر حصہ لیتے۔ شاعروں میں جس کا کلام شرف قبولیت حاصل کرتا' اس کے فن کا اعتراف اس طرح کیا جاتا کہ ریشمی کپڑے پر قصیدہ لکھ کر خانہ ءکعبہ میں آویزاں کر دیا جاتا۔

دور جاہلیت کے عربی ادب میں خاص طور پر سات قصیدوں نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ آج بھی عربی زبان میں ان کا تذکرہ ''سبع معلقات'' کے نام سے کیا جاتا ہے۔ ان سات شاعروں کے نام' جن کے قصائد کو عربی ادب میں لافانی شہرت نصیب ہوئی' اور جن کے قصیدے در کعبہ سے لٹکائے گئے' یہ ہیں:

1- امراؤالقیس بن حجرالکندی
2- طرفہ بن العبدالبکری
3- زُہیر بن ابی سلمیٰ المزنی
4- عنترہ بن شدادالعبسی
5- عمرو بن کلثوم التغلبی
6- لبید بن ربیعہ العامری
7- حارث بن حلزہ الیشکری البکری

ان میں حضرت لبید بن ربیعہ نے آنحضورؐ کا زمانہ پایا اور قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت سے متاثر ہو کر اپنے قبیلے جعفر بن کلاب کے وفد کے ساتھ رسول کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دولت اسلام پائی۔

(4) تہامہ

عرب کا وہ حصہ ہے جو بحیرۂ قلزم کے سواحل سے جبل السراۃ تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی ریتلی زمین سے جھلسنے والی حرارت وحدّت نکلتی رہتی ہے۔ اسی مناسبت سے نام ''تہامہ'' (انتہائی گرم) پڑ گیا۔

(5) یمن

یمن بڑا شاداب ملک ہے۔ یہ علاقہ کئی چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم تھا' جس میں حضر موت' بلاد الاحقاف' نجران اور صنعا شامل ہیں۔ قوم سبا کا مسکن شہر مارب تھا جہاں سیل عرم کا حادثہ ہوا۔ یہ سد دو پہاڑوں کے درمیان تھی جس میں سے ایک کا نام مارب اور دوسرے کا ابلق تھا۔ نجران وہی مقام ہے جہاں ''اصحاب الاخدود'' کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہاں ایک بت پرست بادشاہ تھا۔ وہ اپنی رعایا کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک خندق کھدوائی اور اس میں آگ دہکائی اور لوگوں کو جمع کر کے حکم دیا کہ بتوں کو سجدہ کرو' جس نے انکار کیا' پکڑ کر آگ میں جھونک دیا۔ وہ یہ ظلم کر ہی رہا تھا کہ خود وہ اور اس کے امرا آگ کی لپیٹ میں آ گئے اور سب کے سب جل کر بھسم ہوئے۔ عربی میں خندق کو ''اخدود'' بھی کہتے ہیں۔ قدیم قوم عاد کا مسکن ریگستان الاحقاف ہی تھا۔

حضرت ہودؑ کا مزار حضر موت کے علاقے میں تھا۔ یمن زمانہ ءقدیم ہی سے بہت

مشہور اور متمدن ملک تھا۔ بہت سرسبز' شاداب اور گنجان آباد تھا۔ اہل یمن نے زراعت کے لیے بڑے بڑے بند بنائے تھے' جن میں سے ''سد مارب'' کا قرآن کریم میں ذکر ہے۔سیل عرم اُسی کے ٹوٹنے سے پیش آیا تھا۔ پہاڑوں میں جواہر اور معدنیات کے ذخیرے ہیں۔ ڈھلوانوں پر قہوے کی کاشت ہوتی ہے۔خوش بودار لکڑی' عود' لوبان اور عطریات کے لیے ابتدا سے مشہور ہے۔قبل از اسلام اور بعد از اسلام یمن علم کا گہوارہ رہا۔ ملک یمن میں معین' سبا اور حمیریوں کی عظیم الشان سلطنتیں قائم ہوئیں۔ آثار اور کھنڈروں سے آج بھی ان کے فن تعمیر اور عظیم تمدنی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ظہور اسلام سے قبل یہاں پہلے حبشی' پھر ایرانی گورنر حکمران تھے جو نیم خودمختار حیثیت رکھتے تھے۔

نجران میں عیسائیوں کا عظیم الشان کلیسا بھی تھا جو عربوں میں کعبہ نجران کے نام سے مشہور تھا۔ یمن کے پایۂ تخت صنعا میں ابرہہ اشرم نے بھی ایک عالی شان کلیسا بنوایا۔اس کی خواہش تھی کہ اس کلیسا کو بھی ویسی ہی روحانی عظمت حاصل ہو جائے جیسی کعبہ کو تھی۔ چناں چہ اس نے اہل عرب کو مجبور کیا کہ وہ مناسک حج اس کلیسا میں ادا کریں۔ یہ بات اہل عرب کو سخت ناگوار گزری۔ چناں چہ بنی ملکان بنی کنانہ کے ایک شخص نے کلیسا میں حاجت رفع کی۔ ابراہہ کو معلوم ہوا تو وہ سخت مشتعل ہو گیا۔اس نے سوچا کہ جب تک کعبہ منہدم نہیں کیا جاتا' اس کلیسا کو وہ عظمت اور مرکزیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ چناں چہ اس نے ہاتھیوں کی فوج لے کر بیت اللہ کو گرا دینا چاہا۔ اس وقت قریش کے سردار حضرت عبدالمطلب (آنحضورؐ کے دادا) تھے۔سورۂ فیل میں اس واقعے کا ذکر ہے۔ یہ واقعہ حضورؐ کی ولادت سے 40 تا 55 دن پہلے پیش آیا تھا۔

عرب کے قدیم باشندے

نسلی اعتبار سے عرب میں بسنے والی اقوام سام بن نوحؑ کی نسل سے ہیں' جو طوفانِ نوحؑ سے ایک سو سال پہلے پیدا ہوئے تھے اور حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔عرب سامی النسل ہیں۔سامی اقوام میں بابلی' اشوری' عبرانی' فینقی' آرامی اور حبشی شامل ہیں۔ بعد میں جب یہ سامی اقوام مختلف چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئیں' تو ان میں سے بابلی اور اشوری عراق میں آباد ہوئے۔ فینقی شام میں جا بسے۔عبرانی فلسطین میں منتقل ہوئے۔حبشی حبشہ میں جاگزیں ہوئے۔سامی نسل کے عرب قحطانی اور عدنانی گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔قحطانی یمن سے عمان تک کے علاقے میں پھلے پھولے اور حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے کئی پشتوں کے بعد ایک مشہور شخصیت عدنان ہوئے۔وہ عربوں کی باقی رہنے والی تمام نسلوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔حجاز میں آباد لوگ عدنانی کہلاتے ہیں۔عرب کے قدیم باشندوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

1۔عرب بائدہ

یہ وہ قدیم نسل ہے جو تاریخی دور شروع ہونے سے پہلے ہی فنا ہو گئی۔ اقوام عاد و ثمود' جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے' ان کا تعلق انھی سے تھا۔ اب بابل' مصر' یمن اور عرب کے آثار قدیمہ سے انکشافات ہو رہے ہیں کہ حضرت مسیحؑ سے تین ساڑھے تین ہزار سال پہلے ان لوگوں نے بڑی سلطنتیں قائم کی تھیں۔ بابل اور اشوریہ کی قدیم تہذیب کے بانی یہی لوگ تھے۔ان کے مشہور قبائل عاد' ثمود' طلسم' جدلیس اور جرہم ہیں۔

2۔عرب عاربہ

یہ یعرب بن قحطان کی نسل سے ہیں۔عرب کی قدیم تاریخ انھی پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ یمن کے آس پاس آباد ہو گئے۔انھوں نے حکومت اور تہذیب کے اعتبار سے بڑی ترقی کی۔حمیر بن سبا نے منظم حکومت کی بنیاد ڈالی۔انھوں نے بڑے عالی شان محلات' بند اور عمارتیں بنوائیں جن کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کی ملکہ بلقیس اسی خاندان سبا سے تھیں۔ ان میں بنو حضر موت' بنو سبا' حمیرہ کہلان وغیرہ نے صدیوں حکومت کی۔شہر مآرب کا عظیم الشان بند تین پہاڑوں کے درمیان تعمیر کیا گیا تھا' جہاں بہت سے چشموں کا پانی آ کر جمع ہو جاتا تھا۔ایک بار پانی کے زور سے بند ٹوٹ گیا اور بڑی تباہی مچی۔ اکثر خاندان یہاں سے بھاگ کر دور دراز حصوں میں آباد ہوئے۔ ان میں ازد میں سے ثعلبہ اپنے قبیلے کے ساتھ یثرب میں آباد ہوا۔ انھی کی اولاد اوس وخزرج تھے۔قبیلہ ازد کا دوسرا شخص حارثہ بن عمر تھا جو خزاعہ کے نام سے مشہور تھا۔مکہ پر قبضہ کر کے بنی جرہمیں وہاں سے نکال باہر کیا۔ازد میں سے نصر تہامہ میں آباد ہوا۔اس کی اولاد میں متعدد قبیلے ہوئے۔عمر ازدی کا ایک بیٹا عمران عمان کی طرف نکل گیا۔ دوسرا بیٹا حنیفہ شام کی طرف نکل گیا' اور غسان نامی چشمے کے قریب بس گیا۔اس نے سرحدی قبائل پر اپنی حکومت قائم کر لی جو ملوک غسان کہلاتے ہیں۔ کہلان میں سے لخم کا قبیلہ عراق میں آباد ہوا۔ملوک حیرہ انھی کی نسل سے تھے۔قبیلہ طے کے لوگ مدینہ کے شمال مشرق میں جبل سلما اور جبل اجا کے درمیان بس گئے۔ بعد میں یہ قضاعہ کی ایک شاخ بن گئے۔نجد کی شمالی سرحد پر بنی کلب آباد ہوئے۔ البتہ حمیر کندہ اور مذحج بدستور یمن ہی میں جمے رہے۔

3۔عرب مستعربہ

یعنی عرب میں نئے آباد ہونے والے۔ یہ لوگ حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہیں جو آگے چل کر بنوعدنان کہلانے لگے۔حضرت ابراہیمؑ نے حکم الٰہی سے اپنی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بچے حضرت اسماعیلؑ کو اس ''وادی غیر ذی زرع'' میں چھوڑا تھا۔انھیں پانی کا ایک مشکیزہ اور کھجوروں کی ایک تھیلی دی اور واپس جانے لگے۔ بیوی نے پوچھا: ''کیا آپ اللہ کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں؟'' فرمایا: ہاں۔ وہ بولیں' پھر تو اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ جب کھجوریں اور پانی ختم ہو گیا تو بھوک اور پیاس سے ان کا برا حال ہوا۔ پانی کی تلاش میں بچے کو نیچے وادی میں چھوڑ کر صفا کی پہاڑی پر جاتیں۔ پانی کے آثار نہ ملتے تو بے قرار ہو کر بچے کے پاس آتیں۔ پھر دوڑ کر مروہ کی پہاڑی پر چڑھ جاتیں۔اس کی بلندی پر سے دیکھتیں کہ کہیں پانی کا نشان ہے۔ سات پھیروں کے بعد بچے کے پاس آئیں۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہے تھے۔ وہاں اپنی ایڑی ماری۔ وہاں سے ایک چشمہ پھوٹا اور زمین سے پانی ابلنے لگا۔حضرت ہاجرہ نے زم زم (ٹھہر ٹھہر) کہہ کر اس کا اطراف مینڈھ باندھی اور اسے اردگرد پھیلنے سے روک دیا۔

عرب مستعربہ زم زم کے دریافت کرنے والے نبی حضرت اسماعیلؑ کی اولاد تھے۔ عرب العاربہ اور عرب المستعربہ ساتویں پشت میں جا کر عیبر میں جا کر مل جاتے ہیں۔ عرب العاربہ عیبر کے بیٹے قحطان کی اولاد ہیں اور عرب مستعربہ عیبر کے بیٹے فالح کی نسل سے تھے۔ یہودی حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے حضرت اسحاق کی اولاد ہیں۔ اس طرح نسلی لحاظ سے یہودی (بنی اسرائیل) عرب مستعربہ سے حضرت ابراہیمؑ میں، عرب العاربہ سے عیبر میں اور عرب البائدہ سے سام میں جا کر مل جاتے ہیں اسی لیے عربوں اور یہودیوں کو سامی النسل (Semitic) کہا جاتا ہے۔

عرب مستعربہ میں مرکزی حیثیت آل اسماعیلؑ ہی کو حاصل ہے اور ان کا تشخص حضرت اسماعیلؑ کے حوالے ہی سے قائم ہوتا ہے۔ چوں کہ حضرت اسماعیلؑ بہت بعد میں جزیرہ نمائے عرب میں آئے تھے اس لیے عرب مستعربہ کے عروج وزوال کی کہانی بھی پہلے دو گروہوں کے بعد بیان کی جاتی ہے۔ آل اسماعیلؑ کے علاوہ اس گروہ میں حضرت اسحاقؑ کے بیٹے ادوم، حضرت ابراہیمؑ کی بیوی قطورہ، حضرت ابراہیمؑ کے بھائی ناحور اور حضرت لوطؑ کے بیٹوں مواب اور عمان کی آل اولاد کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے عرب مستعربہ حضرت ابراہیمؑ کے والد آزر کی نسل سے ہیں۔

اولادِ خلیلؑ

حضرت ابراہیمؑ کے حالات تو تفصیل سے "انبیائے کرام" کے باب میں درج ہیں یہاں عرب کے حوالے سے ان کی اولاد کا مختصر تذکرہ ضروری ہے۔ ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ جوان ہوئے تو انھوں نے بنی جرہم میں عمارہ بنت سعید سے، پھر رعلہ بنت مضاض سے شادی کی۔ ان سے بارہ بیٹے ہوئے جن میں دو بیٹوں ثابت اور قیدار نے بڑا نام پیدا کیا۔ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ حضرت ہاجرہ نے 90 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انھیں مقام حجر میں دفن کیا گیا۔ حضرت اسماعیلؑ کی قبر میزاب رحمت تلے رکن اور خانہ کعبہ کے درمیان ہے۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جب تعمیر نو کے لیے خانہ کعبہ کی بنیادیں اکھیڑ رہے تھے تو حطیم کے پاس ایک زرد مٹی والی قبر پر پہنچ کر کہا کہ یہ حضرت اسماعیلؑ کی قبر ہے اور اسے ڈھانپ دیا۔ حضرت اسماعیلؑ کے بعد بڑے بیٹے نابت نے کعبے کی تولیت سنبھالی۔ ان کے مرنے پر حضرت اسماعیلؑ کے نانا مضاض بن عمرو جرہمی نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس زمانے میں کعبے کی تولیت سارے عرب کی بادشاہت کے مترادف تھی۔ بنی جرہم کے بعد قبیلہ خزاعہ اس پر قابض ہو گیا۔ ان کے دور میں بیت اللہ بت خانہ بن گیا۔

بت پرستی

عرب میں بت پرستی کا رواج بعثت نبویؐ سے تقریباً چار سو برس پیش تر 200ء میں ہوا۔ اس رسم بد کا بانی عمرو بن لحی بن حارثہ بن امراؤالقیس بن ثعلبہ بن مازن الازد کہلان بن سبا کی اولاد سے تھا۔ قبیلہ قضاعہ اسی کی طرف منسوب ہے۔ عمرو بن لحی کا نام ربیعہ بن حارثہ تھا۔ اس نے قبیلہ جرہم کے سردار عامر کی بیٹی سے شادی کی۔ ایک مرتبہ وہ شام گیا جہاں عمالقہ کی حکومت تھی۔ یہ لوگ بت پرست تھے۔ عمرو بن لحی نے ایک بت جس کا نام ہبل تھا، وہاں سے لا کر کعبے کی چھت کے عین بیچ میں نصب کر دیا۔ یہ بت انسان کی شکل کا تھا اور سرخ رنگ عقیق سے بنایا گیا تھا۔ اس طرح مرکز وحدانیت شرک اور بت پرستی کی آماج گاہ بن گیا۔ طائف میں "لات" کی پرستش ہوتی تھی جو بت نہیں تھا بلکہ پتھر کی ایک مربع چٹان تھی۔ لات لفظ "اللہ" کا، منات منان کا اور عزیٰ لفظ عزیز کا مونث ہے۔ مکہ کے قریب نخلہ میں عزیٰ دیوی کی پوجا ہونے لگی۔ یثرب میں اوس وخزرج کے قبائل "منات" کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے علاوہ ودّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر نامی بت بھی پوجے جاتے تھے۔ یہ حضرت شیثؑ کے پوتوں اور پڑپوتوں کے نام تھے۔ وہ بڑے عابد اور متقی تھے۔ اہل عرب نے بت بنا کر یہ نام رکھ لیے۔ ودّ ایک نہایت قوی ہیکل انسان کی شکل کا بت تھا جس کے جسم پر تہ بند، چادر، بازو پر کمان، کمر میں تلوار اور ہاتھ میں نیزہ تھا، جس پر پرچم لہرا رہا تھا۔ یہ عدرہ کے مقام پر نصب تھا۔ بنی کلب کے بت کا نام ودّ تھا جو دومۃ الجندل میں تھا۔ بنی ہذیل کے بت کا نام سواع تھا۔ مضری قبائل اس کی پوجا کرتے تھے۔ بنی مذحج اور اہل حبرش نے اپنے بت کا نام یغوث رکھا تھا، پہلے بنی مراد، پھر بنی عطیف بھی اسے پوجنے لگے۔ بنی خیوان نے اپنے بت کا نام یعوق رکھا تھا۔ ان دونوں کو اہل یمن بھی اپنا دیوتا سمجھتے تھے۔ بنی ہمدان بھی اس کی پرستش کرتے تھے۔ بنی حمیر نے نسر کا بت تراشا تھا۔ یہودی مذہب اختیار کرنے سے پہلے وہ اسی کی پوجا کرتے تھے۔ اساف اور نائلہ کے بت چاہ زم زم پر براجمان تھے۔ بت پرستی کا یہ دور کئی صدیوں پر محیط ہے۔ بنی جرہم کے زمانے میں صفا پر مروہ کی شکل کا بت اساف اور مروہ پر عورت کی شکل کا بت نائلہ تھا۔ اساف بن یعلیٰ اور مسماۃ نائلہ بنت زید بن جرہم یمن کے باشندے تھے۔ وہ بیت اللہ میں زنا کے مرتکب ہوئے جہاں وہ مسخ کر دیئے گئے۔ انھیں رسوا کرنے کے لیے صفا پر اساف اور مروہ پر نائلہ کے لاشے پھینک دیئے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی شکلوں کے بت بنا کر ان کی پرستش شروع کر دی۔ نہیک اور مطعم نامی بت بھی صفا اور مروہ پر نصب تھے۔ ان کے علاوہ 360 بت خانہ کعبہ کے گرد تھے جو سیسے سے جوڑ کر کھڑے کیے گئے تھے۔

اہل عرب ان بتوں اور پتھروں کی تعظیم اور عبادت انھیں قادر مطلق سمجھ کر نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کا اعتقاد تھا کہ یہ انھیں خدا کے قریب کر دیں گے۔ خالق، رازق اور موت وحیات کا مالک تو اللہ ہی کو سمجھتے تھے۔ بت پرستوں کے علاوہ مکہ میں کچھ موحد بھی تھے جو اپنے آپ کو دین ابراہیمی کا پیروکار کہتے تھے۔ ستارہ پرست صابی، مجوسی، نصرانی اور یہودی مذہب کے ماننے والے بھی عرب کے مختلف حصوں میں آباد تھے۔

بنو قریش کے دس خاندان

کعبے کی تولیت کا منصب بدستور بنی خزاعہ کے پاس رہا۔ بالآخر بنو اسماعیلؑ میں وہ تاریخی شخصیت پیدا ہوئی جو عدنان کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی نسل سے فہر پیدا ہوئے جن کا لقب قریش تھا۔ قدیم عربی زبان میں قریش کے معنی تاجر کے ہیں۔ حجاز والے وہیل مچھلی کو بھی قریش کہتے تھے فہر اور ان کی اولاد چوں کہ عرب کے تمام قبائل

میں طاقت ور تھے اس لیے یہی ان کا بھی نام پڑ گیا۔ یمن کے بادشاہ حسان نے جب مکہ پر حملہ کیا تو فہر اسے شکست دے کر مشہور ہو گیا۔

بنو قریش کی اجتماعی اور سیاسی زندگی کا آغاز قصی کے زمانے سے ہوتا ہے۔ بڑے عالی مرتبت غیور اور بلند حوصلہ انسان تھے۔ انھوں نے بنو کنانہ کی مدد سے خزاعہ سے اپنا آبائی منصب تولیت کعبہ سے واپس لیا اور انھیں حرم سے نکال باہر کیا۔ منتشر قریشی قبائل کو مکہ میں جمع کیا اور ان کی تنظیم کر کے چھوٹی سی جمہوری ریاست کی بنیاد ڈالی۔ دارالندوہ قائم کیا جہاں بنی قریش کے سردار مشورت کے لیے جمع ہوتے تھے۔ سہولت کی خاطر انھوں نے انتظامی امور بنی قریش کے دس خاندانوں میں تقسیم کر دیے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

1۔ بنی ہاشم

شعبہ سقایہ اور عمارہ یعنی زائرین کعبہ کے لیے خورد و نوش کی ذمہ داری خصوصاً پانی کی فراہمی یہ کام بنی ہاشم کے سرداروں کے سپرد تھا۔ جناب عبدالمطلب کے بعد ان کے بیٹوں میں زبیرؓ ابو طالبؓ اور حضرت عباسؓ اس کے ذمہ دار ہوئے۔

2۔ بنی اُمیہ

امور افواج مثلاً قومی جھنڈا "عقاب" اٹھانے اور جنگ کی صورت میں سپہ سالاری کے فرائض ان کے ذمے تھے۔ بعثت نبویؐ کے وقت حضرت ابوسفیان اس منصب پر فائز تھے۔

3۔ بنی نوفل

امور رفادہ اس شاخ کے سپرد تھے۔ غریب غربا کی نگرانی اور ان کی مدد۔ بعثت نبویؐ کے وقت یہ فرائض حارث بن عامر انجام دے رہے تھے۔

4۔ بنی عبدالدّار

اس قبیلے میں امور حجابت یعنی کعبے کو زائرین کے لیے کھولنا اور بند کرنا کلید کعبہ کی حفاظت کا کام تھا۔ بعثت کے وقت حضرت عثمان بن طلحہ ذمہ دار تھے۔

5۔ بنی اسد

شعبہ مشاورت یعنی اہم امور میں صلاح و مشورے سے مسائل طے کرنا۔ دارالندوہ کے انتظامات بھی اس خاندان سے متعلق تھے۔ قریش کی لڑکیوں کی شادی بیاہ کا انتظام بھی اس شعبے کے سپرد تھا۔ یزید بن زمعہ اس خاندان کا سربراہ تھا۔

6۔ بنی تمیم

امور قصاص و دیت اس خاندان کے سپرد تھے۔ خوں بہا کا تعین ضمانت فوجداری مقدمات اور تاوان جنگ دوسرے الفاظ میں محکمہ انصاف و عدل۔ بعثت نبویؐ کے وقت اس کے سربراہ حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے۔

7۔ بنی مخزوم

امور جنگ میں سے قبہ یعنی فوجی کیمپ کا انتظام۔ بعثت کے وقت یہ ذمہ داری ولید بن مغیرہ کے سپرد تھی اور اعنہ یعنی سواروں کے دستوں کی سپہ سالاری۔ بعثت کے وقت ابوجہل اس منصب کا حامل تھا۔ قبہ اور اعنہ دونوں اہم عہدے بنی مخزوم کے پاس تھے۔

8۔ بنی عدی

اس قبیلے میں امور سفارت یعنی دیگر قبائل و ممالک میں بنی قریش کی نمائندگی کے فرائض تھے۔ بعثت کے وقت حضرت عمرؓ فاروق ذمہ دار تھے۔

9۔ بنی جمع

امور ایسار یعنی بتوں سے استخارے کی خدمت ظہور اسلام کے وقت ان امور کا نگران امیہ ابن خلف اور اس کا بیٹا صفوان تھا۔

10۔ بنی سہم

امور اموال محجرہ۔ یعنی بتوں کے چڑھاوے پر نگرانی یعنی محکمہ مال و خزانہ اور مقدمات کا فیصلہ۔ بعثت نبویؐ کے وقت یہ کام حارث بن قیس انجام دے رہا تھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ بھی اسی قبیلے سے تھے جنھوں نے نجاشی کے دربار میں مسلمان مہاجرین کی واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔

عسکری نظام

قریش مکہ کا عسکری نظام چار حصوں پر مشتمل تھا:

1: عقاب: قومی نشان کی علم برداری کا منصب
2: قبہ: فوجی کیمپ کا انتظام اور دیکھ بھال
3: اعنہ: فوج کی سپہ سالاری
4: سفارت: حکومت اور مختلف قبائل کے درمیان مراسلت

عدالتی نظام

چار عہدوں پر مشتمل تھا

1- حکومت:...... یعنی مقدمات کی سماعت اور ان کا فیصلہ جس کے ذمہ دار بنو سہم تھے۔ کبھی کبھی یہ مقدمات قریش اور دیگر قبائل عرب کے درمیان ہوتے۔ عہد جاہلیت کے ممتاز قاضیوں میں ہاشم بن عبد مناف ابولہب بن عبدالمطلب عاص بن وائل قیس بن ساعدہ اور امیہ بن ابی صلت کے نام ملتے ہیں۔

2- اشناق:...... جرمانہ خوں بہا اور مالی تاوان کی نگرانی بنو تیم سے متعلق تھی۔

3- مشورت:...... اہم امور میں تمام قریشی قبائل سے مشورت کا کام بنو اسد کے تفویض تھا۔

4- ندوہ:...... دارالندوہ کے انتظامات بنو عبدالدار کے سپرد تھے۔ یہ گویا قریش کا پارلیمنٹ ہاؤس تھا۔ بہت کچھ نقد و جنس بتوں پر چڑھایا جاتا اس لیے اس کے بہتر نظم و نسق کے لیے چھ مستقل عہدے تھے۔

1: عمارہ: کعبے کی نگرانی اور دیکھ بھال۔ بنو عبدالدار کے ذمے تھی۔
2: سقایہ: زمانہ حج میں زائرین کو پانی فراہم کرنا بنو ہاشم کے تفویض تھا۔
3: رفادہ: حجاج کے لیے کھانا پکانا غربا کی مدارات بنو نوفل کے سپرد تھی۔
4: سدانہ: کعبے کی دربانی اور کلید برداری اس لیے کہ نذرانے وغیرہ چار دیواری میں وصول کیے جاتے تھے۔

5: ایسار: خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے تیروں سے استخارہ۔ یہ کام بنو جمح کے لوگ انجام دیتے تھے۔ یہ بے پیکان کے تیر ہوتے تھے جن پر ہاں یا نہیں لکھا ہوتا۔

6: اموال محجرہ: بتوں پر چڑھاوے اوقاف نقد و جنس کا انتظام اور نگرانی بنو سہم کرتے تھے۔

سیاسی نظام

بعثت نبویؐ سے پہلے سیاسی حیثیت سے پورا عرب نراج اور انتشار و بحران کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ مختلف قبائل کی اپنے اپنے علاقے میں حکمرانی تھی۔ یمن کا علاقہ پہلے حبشی پھر ایرانی عمل داری میں آیا' حتی کہ مجاہدین اسلام کے ہاتھوں فتح ہوا۔ اس وقت کا ایرانی گورنر باذان آنحضور ﷺ پر ایمان لے آیا۔

بحرین سے فرات تک کا علاقہ عراق عرب کہلاتا تھا۔ اس کے والی مناذرہ ایرانی فرماں روا کی سرپرستی میں حکومت کرتے تھے۔ ان کا پایہ تخت حیرہ تھا۔ ان کے آخری حکمران منذر بن نعمان نے حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھوں شکست کھائی۔

شام میں آل غسان حکمران تھے۔ اس سے ملحقہ علاقہ فلسطین قیصر روم کے زیر تسلط تھا۔ آخری حکمران جبلہ بن ایہم 16 ہجری میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مسلمان ہوا۔ بعد میں مرتد ہوا اور عیسائی بن کر قسطنطنیہ میں ہرقل' قیصر روم سے جا ملا۔ بحرین کے حکمران کسرائے ایران کے زیر نگین تھے۔

معاشی نظام

عرب میں جس علاقے میں شادابی ہے' وہاں آبادی ہے۔ ورنہ لوگ دانہ و پانی کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ زیادہ تر حصہ غیر آباد اور بے آب و گیاہ ہے۔ جگہ جگہ پہاڑ ہیں۔ ان میں سے چشمے پھوٹتے ہیں۔ پانی کی وجہ سے وہاں کھجور اور ببول کے درختوں کے جھنڈ ہیں' جنھیں نخلستان کہتے ہیں۔ بدو لوگوں نے جہاں پانی کا چشمہ' جانوروں کا چارا اور اپنا گزارہ دیکھا' وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ تنبو تان لیے اور آسمان تلے بسیرا کرنے لگے۔ بھیڑ' بکریاں' گھوڑے اور اونٹ ان کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ انھی کا دودھ' گوشت یا پھر کھجور ان کی غذا۔ جانوروں کے چمڑے سے خیمے تیار کرتے اور ان کی لمبی اون کاٹ کر لباس پہنتے تھے۔ مینگنیاں جلانے کے کام آتی تھیں۔ ان کی معیشت کا دار و مدار زیادہ تر اونٹوں پر تھا۔ بدو اونٹوں پر بیٹھ کر دشوار گزار ریگستانوں میں سفر کرتے تھے۔ ان کی مہارت کا عالم یہ تھا کہ ایک مٹھی ریت سونگھ کر صحرا کے طول و عرض کا اندازہ کر لیتے تھے۔

پیشہ اور بود و باش کے اعتبار سے عرب کے باشندے دو طرح کے تھے۔ حضری (شہری) اور بدوی یا اعرابی (خانہ بدوش)۔ یمن' مکہ' جدہ' طائف' یثرب کی آبادیاں حضری تھیں۔ ان کے سوا زیادہ تر عرب لوگ بدویانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ حضری عربوں میں تمدن تھا۔ تجارت تھی۔ زراعت تھی۔ ان کے شادی بیاہ کے طریقے متعین تھے۔ کچی اینٹوں اور پتھروں سے مکان بناتے تھے۔ مخصوص اور پروقار لباس پہنتے تھے۔ شاعری اور خطابت کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ گھریلو زندگی میں عورتوں پر برتری حاصل تھی۔ مہمان نواز ایسے تھے کہ ایک غریب بدو بھی اپنی واحد ذریعہ معاش اونٹنی کو مہمان کی خاطر ذبح کرنے میں پس و پیش نہ کرتا۔ قبیلے کا سردار سائل کی طلب پر اونٹوں کے گلے بخش دیتا۔ عہد و پیماں کی پابندی ان کا عام شیوہ تھا۔ عہد کی خاطر جان' مال بلکہ اولاد تک قربان کر دیتے۔ مشہور شاعر امراؤالقیس نے اپنی تلواریں اور زرہیں ایک سردار سموال بن عاکے پاس بطور امانت رکھیں۔ حارث غسانی نے انھیں طلب کیا۔ انکار پر حملہ آور ہوا۔ سموال مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہو گیا۔ محاصرے کے دوران میں حارث نے قلعے کے باہر اس کے بیٹے کو پکڑ لیا اور کہا کہ امراؤالقیس کی امانت دو تو لڑکا بچ سکتا ہے۔ سموال نے بیٹے کا قتل ہونا گوارا کر لیا' لیکن بدعہدی کا داغ لگانا پسند نہ کیا۔ اگر کوئی اپنے عہد و پیمان کی پاسداری نہ کرتا تو شعرا اسے سارے ملک میں بدنام کر دیتے۔

بدوی عرب صحرائی زندگی کے عادی تھے۔ غذا اور چارا کی تلاش میں مارے مارے پھرتے۔ خیموں میں رہتے تھے۔ مویشی پالتے۔ فطرتاً دلیر' شجاع' مہمان نواز اور وعدے کے پکے تھے' لیکن فطرت جنگ جویانہ بلکہ جرائم پیشہ تھی۔ راہ زنی کو دلیری سمجھتے تھے۔ اسی لیے اکثر اپنی اولاد کو درندوں کے نام سے پکارتے' جیسے اسد' کلب' ذئب' حفص وغیرہ۔ مسافرانہ اور خانہ بدوشانہ زندگی کی وجہ سے ان میں آزادی' عصبیت' بربریت' انتقام اور جنگ و جدال کا دور دورہ تھا۔

اخلاقی گراوٹ

عربوں کی ان خوبیوں سے ہٹ کر وہ طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں بھی مبتلا تھے۔ شراب ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ سود خوری کے عادی تھے۔ بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماں بیٹے کے حرم میں آ جاتی۔ ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے۔ لڑائی میں عورتیں قید ہوتیں۔ انھیں فاتح اپنی لونڈیاں بنا لیتے تھے۔ لڑکیوں کی پیدائش کو نحس جانتے اور انھیں زندہ درگور کر دیتے۔ کینہ پروری اور انتقام کو فرض خیال کرتے۔ انتقامی لڑائیاں برس ہا برس جاری رہتیں۔ خون کے بدلے خون ہی معزز سمجھا جاتا۔ خون کے بدلے دیت لینے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا۔ رمل' جوتش اور کاہنوں کی باتوں پر یقین رکھتے۔ تیروں کے ذریعے فال نکالتے۔ جانوروں کے اڑنے اور بولنے سے بھی نیک و بد کا شگون لیتے۔ بتوں کو اپنا حاجت روا جانتے اور ان کے نام پر سانڈ چھوڑے جاتے۔ ان پر انسانی جان بھینٹ چڑھانے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ اخلاقی گراوٹ اس حد تک تھی کہ انسان اشرف المخلوقات کے مقام سے گزر کر جانور سے بھی بدتر ہو چکا تھا۔

تعلیمی حالت

بعثت نبویؐ کے وقت عربوں کی تعلیمی حالت "ناگفتہ بہ" تھی۔ جب اسلام آیا تو بنو قریش میں صرف سترہ آدمی لکھنا جانتے تھے' جن کے نام یہ ہیں:

1: عمرؓ بن خطاب　　2- عثمان بن عفان
3: علیؓ بن ابی طالب　　4- ابو عبیدہؓ بن الجراح
5: طلحہؓ　　6- یزیدؓ بن ابی سفیان
7: ابو حذیفہؓ بن عتبہ　　8- حاطب بن عمرو
9: ابو سلمہؓ بن عبدالاسد　　10- ابان بن سعید بن العاص

11: خالد بن سعید بن العاص 12- عبداللہ بن سعید بن ابی سرح
13: حویطب بن عبدالعزیٰ عامری 14- ابوسفیان بن حرب بن امیہ
15: معاویہؓ بن ابی سفیان 16- جہیم بن صلت
17: العلاءؓ بن حضرمی

مکے کے پیشے

مکہ میں وہ سب پیشے موجود تھے جو کسی متمدن شہر میں ہو سکتے ہیں۔ یہ ضروری تھا کہ بیٹا باپ کا پیشہ ہی اختیار کرے۔ ان پیشوں میں قابل ذکر یہ ہیں:

پارچہ فروش، غلہ فروش، عطر فروش، تیل فروش، شراب فروش، چرم فروش،
مویشی فروش، قصاب، درزی، بڑھئی، لوہار، تیر ساز
گویئے بیطار (جانوروں کا علاج کرنے والے)

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ پارچہ فروش تھے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص تیر ساز تھے۔ حضرت زبیرؓ گوشت فروش' ان کے والد عوام درزی تھے۔ حضرت عمرو بن العاص قصاب تھے۔ حضرت عثمان بن طلحہؓ درزی تھے۔ ابوسفیان بن حرب تیل فروش اور چمڑا فروش تھے۔ عقبہ بن ابی وقاص بڑھئی تھے۔ امیہ بن خلف پھل فروش اور عقبہ بن ابی معیط شراب فروش تھا۔ عبداللہ بن جدعان جانور پالتا اور فروخت کرتا تھا۔ ابوجہل کا بھائی عاص بن ہشام' ولید بن مغیرہ اور حضرت خبابؓ بن ارت لوہار تھے۔ عاص بن وائل بیطار یعنی جانوروں کا علاج کرتا تھا۔ نصر بن حارث رباب پر گایا کرتا تھا۔ ابوطالب عطر فروش تھے۔ بعض اوقات گیہوں بھی فروخت کرتے تھے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب سودی لین دین کے علاوہ عطر فروش بھی تھے۔

قبائل عرب

عرب میں سیکڑوں قبائل تھے جو جنوبی اردن سے بحیرۂ عرب کے ساحل تک تقریباً گیارہ لاکھ مربع میل زمین میں آباد تھے۔ ان میں کئی ہم نام تھے' مثلاً خزاعہ' ہوازن اور قریش کی ایک شاخ کا نام بنو کعب تھا اور کتنے ہی قبائل عوف' مالک اور ازد کہلاتے تھے۔ قبائل کے بڑے بڑے گروہ دو تھے۔ بنو عدنان اور بنو قحطان۔ عدنان آنحضورؐ کے اکیسویں جد تھے اور قحطان عدنان کا نانا تھا۔ جنوبی عرب یعنی یمن وغیرہ میں قحطان کی اولاد آباد تھی اور شمال میں عدنان کی۔ غطفان' خزاعہ' مزینہ' ہذیل' کنانہ' تمیم' دارم' مُرہ' کلاب' ہوازن' سلیم' مازن اور جشم عدنانی تھے۔ اور سبا' حمیر' کہلان' اوس' خزرج' کندہ' ہمدان' مراد' مہرہ وغیرہ قحطانی۔

ان دونوں گروہوں میں کچھ نام مشترک تھے' مثلاً ثعلبہ' جشم' حارث' حرب' ربیعہ' مرۃ' مزینہ' مازن اور غنم وغیرہ۔ عرب کا جغرافیہ لکھنے والوں نے عرب کی بستیوں' وادیوں اور پہاڑوں کے نام تو گنوا ڈالے ہیں' لیکن ان کا مقام متعین نہیں کیا۔ یاقوت حموی نے ''معجم البلدان'' میں یہ تو بار بار لکھا ہے کہ فلاں موضوع نجد یا حجاز میں فلاں قبیلے کی ملکیت تھا' لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ ریاض یا فید یا مدینے سے کس سمت میں کتنی دور واقع تھا۔ حجاز کا رقبہ 50 ہزار اور نجد کا سوا لاکھ مربع میل ہے۔ صرف یہ کہہ دینے سے کہ فلاں مقام نجد میں تھا' بات نہیں بنتی۔ سیرت نگار مستشرق منٹگمری واٹ نے بڑی محنت سے قبائل کے وطن کی ایک فہرست تیار کی تھی جو یہاں نقل کی جاتی ہے۔ اس سے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکے گا کہ کوئی قبیلہ حرمین سے کس سمت میں آباد تھا۔ وہ حرمین سے کتنی دور تھا؟ یہ سوال جواب کا منتظر ہے:

1: قبائل جو حرمین کے مغرب میں تھے: خزاعہ (اسلم' کعب بن عمرو' المصطلق)۔ کنانہ (بکر بن عبد مناۃ' ضمرہ وغفار' لیث' دئل' مدلج' حارث بن عبد مناۃ)۔ مزینہ۔ جہنیہ۔ ازدشنوآہ۔

2: قبائل جو حرمین کے مشرق میں تھے: خزیمہ (مدرکہ' کنانہ)۔ اسد بن خزیمہ (عضل اور قارہ) طے' ہذیل (لحیان) محارب۔ غطفان (اشجع' فزارہ' مرۃ' ثعلبہ (انمار۔ عوال)۔ سُلیم (رعل۔ شیبان)۔ ہوازن (عامر بن صعصعہ۔ البکا۔ ہلال۔ کلاب (قرطا' عرینہ)۔ ربیعہ۔ جشم۔ نصر۔ سعد بن بکر۔ ثمالہ۔ ثقیف (بنو مالک۔ احلاف (باہلہ)

3: قبائل جو حرمین کے شمال میں تھے: سعد بن حزیم۔ عذرہ۔ جُذام۔ قضاعہ (جرم۔ القین۔ سلامان)۔ بالی۔ بہرا' لخم۔ غسان۔ کلب۔

4: قبائل جو حرمین کے جنوب میں تھے: خثعم۔ مذحج (عنس' جعفی۔ خولان۔ صدا۔ زبید۔ بجیلہ۔ ہمدان۔ حارث بن کعب۔ مراد۔ کندہ۔ حمیر۔ عق اور اشعر۔

5: باقی ماندہ قبائل: مہرہ۔ ازدعُمان۔ عبدالقیس۔ حنیفہ۔ تمیم۔ وائل۔ بکر۔ تغلب۔ (قبائل کی فہرست پوری نہیں۔ ان کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔)

قبائل مدینہ

قحطان
یعرب
یشجب
سبا
حمیر — کہلان
زید
مالک
نبت
غوث
ازد
مازن
ثعلبہ
امرءالقیس
حارثہ
عامر
عمرہ
ثعلبہ
حارثہ
اوس — خزرج

(۱)

- حارثہ
  - خزرج (دیکھئے جدول ۲)
  - اوس
    - مرہ
      - عامر
        - قیس
          - زید
            - عطیہ
            - اُمیہ
            - وائل
    - جشم
      - خطمہ
    - امراء القیس
      - واقف
      - سلم
        - غنم
    - عوف
      - عمرو
        - ثعلبہ
        - حبیب
        - الاذان
        - عوف
          - مجحبہ
          - حنش
          - مالک
            - معادہ
              - عبید
              - اُمیہ
              - ضبیعہ
            - زید
    - النبیت
      - خزرج
        - ظفر
        - حارث
          - جشم
            - حارثہ
            - عبدالاشہل

(۲)

- خزرج
  - جشم
    - غضب
      - مالک
        - عبد حارثہ
          - حبیب
          - زُریق
            - عامر
              - بیاضہ
              - زُریق
    - حزید
      - ساردہ
        - اسد
          - علی
            - سعد
              - سلمہ
  - کعب
    - ساعدہ
  - عوف
    - عمرو
      - عوف
        - سالم (قواقلہ)
    - غنم
      - سالم (حبلی)
  - الحارث
    - عوف
      - ابجر
      - خدارہ
    - زید
    - جشم
    - خزرج
      - کعب
  - عمرو
    - ثعلبہ
      - النجار
        - دینار
        - مازن
        - عدی
        - مالک
          - عامر (بنو مبذول)
          - عمرو
            - عدی (بنو مغالہ)
            - معاویہ (بنو حدیلہ)
          - غنم

(تحریر: شاہ مصباح الدین شکیل)

عربوں کے مذہبی عقائد

دنیا کا کوئی نظامِ حیات نہ خلا میں پیدا ہوتا ہے اور نہ خلا میں پروان چڑھتا ہے بلکہ ہر نظام ایک خاص ماحول میں جنم لیتا ہے اور رائج الوقت نظام سے نبرد آزما ہو کر آگے بڑھتا ہے۔ اس لیے ہر نئے نظام کی روح، اس کے اساسی تصورات اور اس کے عملی تقاضوں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے اس ماحول کو سمجھنے کی کوشش کریں، جس میں وہ نظامِ حیات معرضِ وجود میں آیا ہے۔ یہی فطری اصول ہمیں اسلام کے معاملے میں بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ آپ اگر قرآن مجید کی تصریحات اور نبی اکرم ﷺ کی انقلاب انگیز تعلیمات کے مضمرات کو پوری طرح جاننا چاہتے ہیں، تو اس کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ہم سب سے پہلے اس پس منظر کو ذہن نشین کریں، جس میں اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا۔ اس مضمون میں ہم عربوں کے صرف مذہبی معتقدات پر بحث کریں گے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مثبت طور پر جس عقیدے پر سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ توحید ہے اور جس باطل خیال کا پوری شدت کے ساتھ ابطال کیا ہے وہ شرک ہے۔ عربوں کے اندر یوں تو شرک کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو موجود نہ ہو مگر اس میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت بت پرستی کو حاصل تھی۔ اس لیے ہم سب سے پہلے قدیم عربوں کی بت پرستی ہی کا جائزہ لیتے ہیں۔

عرب میں بُت پرستی کا آغاز

سب سے پہلے جس شخص نے عرب میں دینِ ابراہیمؑ کو مسخ کر کے بت پرستی کا آغاز کیا، وہ قبیلہ خزاعہ کا سردار عمرو بن ربیعہ لحی بن حارثہ بن عمرو بن عامر الازدی تھا۔ کعبہ کی تولیت پہلے الحارث کے سپرد تھی مگر جب عمرو بن لحی مکہ میں قیام پزیر ہوا تو اس نے حارث کے حق تولیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور اپنی اولاد کی مدد سے حارث اور اس کے خاندان کو اس قابلِ رشک عہدہ سے محروم کر کے خود اس پر قابض ہو گیا۔ اس انقلاب کے بعد عمرو بن لحی پر اچانک بیماری کا حملہ ہوا اور اس بیماری نے بڑی سرعت کے ساتھ شدت اختیار کی۔ موت وحیات کی اس کش مکش میں کسی حکیم ودانا نے اسے بتایا کہ شام میں البقا کے مقام پر گرم پانی کا ایک چشمہ موجود ہے۔ اگر وہ وہاں پہنچ کر اس کے پانی سے غسل کرے تو وہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ اس نے اس مشورے کو پوری خوش دلی سے قبول کیا اور البقا کے لیے رختِ سفر باندھا۔ قدرت کو اس کی صحت منظور تھی۔ چناں چہ اس نے جب اس چشمے کے پانی سے غسل کیا تو جلد شفایاب ہو گیا۔

صحت بحال ہو جانے کے بعد اس نے کچھ دنوں کے لیے وہاں مزید قیام کیا تا کہ اس کی قوت وتوانائی معمول پر آ جائے اور وہ آسانی کے ساتھ سفر کے مصائب اور صعوبتوں کو برداشت کر سکے۔ اس عرصہ قیام میں اس نے دیکھا کہ وہاں کے باشندے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں اور ان کے حضور سرِ نیاز خم کر کے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس قسم کی حرکات وسکنات سے پہلے وہ قطعاً ناشناسا نہ تھا۔ اس کے دل میں فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ان کے بارے میں ان سے استفسار کرے۔ جستجو کرنے پر اسے بتایا گیا کہ وہ ان کے معبود ہیں، جن کی طرف وہ بارش اور دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کے لیے رجوع کرتے ہیں۔ عمرو بن لحی نے ان سے درخواست کی کہ پتھر کے کچھ معبود اسے بھی دے دیئے جائیں۔ چناں چہ بقا کے باشندوں نے اس کے اس مطالبہ کے احترام میں چند بت اس کی خدمت میں بطور

نذرانہ پیش کردیے۔ یہ شخص پتھر کی ان مورتیوں کو لے کر مکہ واپس چلا آیا اور انھیں خانہ کعبہ کے اردگرد رکھ دیا۔

اسی سلسلہ میں ابن عباسؓ سے جو روایت منقول ہے وہ یہ ہے کہ قبیلۂ جُرہم سے تعلق رکھنے والے ایک شخص اساف اور ایک عورت نائلہ کے درمیان سرزمین یمن میں معاشقہ شروع ہوا۔ حج کے موسم میں یہ دونوں خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ جب وہ اللہ کے مقدس گھر میں داخل ہوئے تو اتفاق سے اس وقت وہاں ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ سفلی جذبات سے مغلوب ہو کر انھوں نے منہ کالا کیا۔ اس ذلیل اور مذموم حرکت کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار پڑی اور وہ بے جان پتھروں میں تبدیل کر دیے گئے۔ لیکن عربوں کی ''ذہانت'' کی داد دیجیے کہ انھوں نے ان سے عبرت پکڑنے کے بجائے ان کی پرستش شروع کر دی۔ خزاعہ اور قریش کے قبائل اس معاملے میں پیش پیش تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اولادِ اسماعیلؑ میں سے پہلا شخص جس نے بت پرستی کی رسم کو رواج دیا اور لوگوں کو اپنی اولاد کے نام بتوں کے ناموں پر رکھنے کی تلقین کی اور اس طرح اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ دین میں تحریف کا مرتکب ہوا۔ وہ ہُذیل بن مُدرکہ تھا۔

عرب کے مشہور بُت اور بُت کدے

ذیل میں ہم عرب کے مشہور بُتوں اور بُت کدوں کے نام اور ان کے مختصر حالات درج کرتے ہیں: قبیلہ ہُذیل سُواع کا پرستار تھا اور اس بت کو اہل قبیلہ نے مدینہ کے ایک گاؤں ینبع کے نزدیک ''برہاط'' کے مقام پر نصب کر رکھا تھا۔ اس صنم خانہ کی تولیت بنولحیان کے سپرد تھی۔ قبیلۂ کلب کے لوگ وَدّ کے سامنے اظہارِ عبودیت کرتے تھے۔

اسی طرح عرب کے دو مشہور قبائل مذحج اور اہل جُرش یغوث سے وابستہ تھے۔ ان بتوں سے ان قبائل کی عقیدت کا اظہار بعض اشعار سے بھی ہوتا ہے۔ مثلاً:

حَيَّـاكَ وَدٌّ فَـإنَّـا لا يَـحِلُّ لَنَـا
لَهْـوا النِّسَـا وان الدين قد عزمنا

''اے وَدّ! تمھیں حیاتِ جاوداں نصیب ہو۔ ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم عورتوں کے ساتھ دل بہلائیں۔ ہمارا دین پختہ اور مضبوط ہے۔''

قبیلہ خیوان کے لوگ یعوق کے حضور میں سر تسلیم خم کرتے تھے۔ ابن کلبی کے قول کے مطابق اسے کسی ایسے قبیلے کا ذکر نہیں ملتا، جس کے افراد نے اپنے نام اس بت کے نام پر رکھے ہوں۔ اسی طرح اس بت کا تذکرہ شعرا کے کلام میں بھی ناپید ہے۔ اس کی وجہ ابن کلبی کے نزدیک یہ ہے کہ خیوان، ہمدان اور اسی طرح کے دوسرے قبائل چوں کہ صنعا کے نزدیک آباد تھے اور حمیر سے اختلاط کی وجہ سے انھوں نے یا تو یہودیت کو قبول کر لیا تھا یا اس سے کافی متاثر تھے۔ اس لیے انھیں اس بت سے کوئی گہری وابستگی باقی نہ رہی تھی۔ یہ سرد مہری ہمیں قبیلہ حمیر کے افراد میں ان کے بت ''نسر'' کے بارے میں بھی دکھائی دیتی ہے اور اس کی وجہ بھی وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ قبیلہ تبّع کے عہدِ حکومت میں بت پرستی کو ترک کر کے دین موسوی میں داخل ہو گیا تھا۔

دین موسوی میں داخلے سے قبل حمیر نے صنعا کے مقام پر ایک صنم کدہ تعمیر کر رکھا تھا جو ریام کے نام سے اہل عرب میں مشہور تھا۔ لوگ اس کی بڑی تعظیم و توقیر کرتے۔ یہاں آ کر نذرانے چڑھاتے اور بتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جانوروں کی قربانیاں دیتے تھے۔

یہ صنم کدہ مکر و فریب کی آماج گاہ تھا، جس میں سادہ لوح عوام کو ان کی ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھا کر مختلف قسم کے فریب دیے جاتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق جب تبّع عراق کی مہم میں کام یاب ہو کر اپنے مستقر پر واپس آیا، تو اس نے دو مذہبی راہ نُماؤں کی مدد سے اس بت خانہ کو نیست و نابود کروا دیا۔ اس لیے قدیم عرب شاعری میں ریام اور نسر کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ یہ پانچ بت یعنی وَدّ، سُواع، یغوث، یعوق اور نسر، جن کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں کیا گیا ہے، قوم نوح کے نہایت معظم و محترم اصنام تھے۔ ان سے اسے گہری وابستگی تھی اور وہ اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کے لیے زیادہ تر انھی کی طرف رجوع کرتی تھی۔ قرآن مجید میں ان بتوں کی پرستش کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

''نوحؑ نے کہا اے میرے پروردگار! ان لوگوں نے میری نافرمانی کی اور ان کی پیروی کی، جن کے مال اور اولاد نے انھیں سوائے نقصان کے اور کچھ نہ دیا اور جنھوں نے بڑی بڑی تدبیریں کیں اور جنھوں نے کہا کہ تم اپنے معبودوں یعنی وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر سے کبھی منہ نہ موڑنا۔ ان لوگوں نے بہتوں کو گم راہ کر دیا۔'' (نوح۔ ۲۱ تا ۲۴)

یہ پانچوں بت یعنی وَدّ، سواع، یغوث، یعوق اور نسر عمرو بن لحی کی وساطت سے عربوں میں مقبول ہوئے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اصنام غیر ملکی تھے جنھیں باہر سے پرستش کے لیے درآمد کیا گیا تھا۔

عربوں کی قومی بُت پرستی

عربوں کے قومی بتوں میں مناۃ کی شہرت بہت زیادہ ہے۔ وہ نہ صرف اس بُت کی پورے جذبۂ عبودیت کے ساتھ پرستش کرتے بلکہ عقیدت اور احترام کی وجہ سے اپنی اولاد کو ایسے ناموں سے پکارتے، جو ہر لحاظ سے ان کی اس بت کے ساتھ گہری وابستگی کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ عربی ادب میں ہمیں اس قسم کے کئی نام ملتے ہیں، جن میں عبدمناۃ اور زیدمناۃ خاص طور پر مشہور و معروف ہیں۔ یہ بُت مکہ اور مدینہ کے درمیان مشلّل کے قریب قُدَید کے مقام پر رکھا ہوا تھا۔ اس بت کی قریب قریب سارے عرب قبائل میں پرستش ہوتی تھی اور اس کی خوشنودی کے حصول اور اس کی ناراضی سے بچنے کے لیے عرب جانوروں کی قربانیاں دیا کرتے تھے۔ مگر اس معاملے میں اوس اور خزرج سب پر سبقت لے گئے تھے۔ ابن کلبی، عمار بن یاسر کا، جو اوس اور خزرج کے حالات کے متعلق سب سے زیادہ اور مستند معلومات رکھتے تھے ایک قول نقل کرتے ہیں، جس سے ان قبائل کی مناۃ کے ساتھ غیر معمولی وابستگی کا پتا چلتا ہے:

''یہ لوگ جب حج کی غرض سے دوسرے حجاج کے ساتھ روانہ ہوتے تو وہ تمام ان مقامات پر ٹھہرتے، جن پر کہ عرب عام طور پر قیام کیا کرتے تھے اور وہ ساری رسوم ادا کرتے، جو اس وقت رائج تھیں، لیکن وہ اپنے سروں کو منڈانے سے اجتناب کرتے۔

واپسی پر جب وہ اس مقام پر پہنچتے' جہاں مناۃ کا بت نصب تھا' تو وہاں کچھ وقفہ کے لیے قیام بھی کرتے اور اپنے سر بھی منڈاتے' کیوں کہ ان کے نزدیک مناۃ کی زیارت بھی حج کا ایک نہایت ضروری حصہ تھا' اور جب تک اس رکن کو پوری طرح ادا نہ کیا جائے' اس وقت تک ان کی نظر میں حج کی تکمیل نہ ہوتی تھی۔''

اس بُت اور اس سے عربوں کی غیر معمولی عقیدت اور وابستگی کا ذکر قرآن مجید میں یوں آتا ہے:

''کیا تم نے لات اور عزّٰی اور تیسرے منات کے حال میں غور نہیں کیا ہے؟ کیا تمھارے لیے تو بیٹے ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں۔ اس اعتبار سے تو یہ بڑی بے ڈھنگی تقسیم ہے۔'' (النجم،۵۳۔۱۹:۲۲)

عربوں کے ہاں منات کی عرصہ دراز تک تعظیم وتکریم ہوتی رہی یہاں تک کہ نبی اکرم ﷺ نے سن آٹھ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ذریعہ اسے یک سر مسمار کروا دیا اور اس مہم میں مسلمانوں کو کافی مال واسباب ملا' جس میں وہ دو تلواریں بھی شامل تھیں' جو شاہ غسان حارث بن ابی شمر نے مناۃ کے حضور میں بطور نذرانہ پیش کی تھیں۔ ان میں سے ایک تلوار کا نام ''مخذم'' اور دوسری کا ''رسوب'' تھا۔ ان تلواروں کا ذکر علقمہ نے ایک شعر میں اس انداز میں کیا ہے:

مظاهر سربالی حديد عليهما
عقيلاً سيوفٍ: مخذمٌ و رسوب

''زرہ بکتر پہننے کے ساتھ ساتھ اس نے دو مرصّع تلواریں بھی یعنی مخذم اور رسوب بھی سجا رکھی تھیں۔''

حضور سرور کائنات ﷺ نے یہ دونوں تلواریں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا فرمائیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ انھیں میں سے ایک تلوار کو حضور سرور عالم ﷺ نے ذوالفقار کے نام سے موسوم فرمایا تھا۔ لیکن اسی سلسلہ میں ایک دوسرا قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب حضور ﷺ نے ''فلس'' کی مہم پر روانہ کیا تو اس وقت طی کے صنم کدے سے یہ تلواریں امیرالمومنین کے ہاتھ آئیں۔

مناۃ کے علاوہ عربوں کا دوسرا واجب التعظیم بت اللات تھا' جس نے طائف کی سرزمین میں کفر وشرک کی ظلمتیں پھیلا رکھی تھیں۔ اس صنم کدے کی تولیت ثقیف والوں کے سپرد تھی جن میں عتاب بن مالک کا خاندان سب سے نمایاں تھا۔ لات کا بت بھی منات کی طرح عرب کے سارے قبائل میں معظم اور مکرم تھا اور لوگ خیر و برکت کے حصول اور آسمانی اور ارضی آفات سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کے نام اس بت کے نام پر رکھتے تھے۔ اسلام سے قبل کی تاریخ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ''زید اللات'' اور ''تیم اللات'' زبان زد عام تھے۔

طائف کے میدان میں جو مسجد آج موجود ہے' اس کے بائیں مینار کے بالکل ساتھ ہی یہ بُت کبھی نصب تھا۔ عرب کی جاہلی شاعری میں ہمیں بے شمار مقامات پر اس بُت اور اس سے لوگوں کی عقیدت ومحبت کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً عمرو بن الجعید نے اپنے ایک شعر میں لات کا ذکر یوں کیا ہے:

فَاِنِّیْ و تَرْکِی وَصْلَ کَاْسٍ لکالّذی
تبرّأ من لاتٍ و کان یدینها

''میرا ترکِ شراب بلاشبہ اس شخص کی مانند ہے' جو لات سے بیزاری کا اظہار کرے' درآنحالیکہ وہ اسے اپنا دین وایمان سمجھتا تھا۔'' نبی اکرم ﷺ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ کو اس صنم کدے کے انہدام کے لیے بھیجا' چناں چہ انھوں نے اسے منہدم کر دیا۔ جس وقت شرک اور بُت پرستی کے اس مرکز کا استیصال کیا جارہا تھا' اس وقت شدّاد بن عارض الجشمی نے ثقیف والوں کو مخاطب کر کے بآواز بلند فرمایا۔

''لات کی مدد نہ کرنا' کیوں کہ لات کو برباد کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے جس کی قسمت میں کامیابی نہ ہو۔ تمھاری مدد سے کیا ہوگا۔ جو چیز آگ میں بھسم ہو کر راکھ ہو گئی اور اپنی کوئی مدافعت نہ کر سکی۔ وہ یقیناً ناکارہ شے ہے۔ جب حضور سرور عالم ﷺ آپ کی سرزمین میں اپنے مبارک قدم رکھیں گے اور پھر یہاں سے واپس تشریف لے جائیں گے تو ایک متنفس بھی لات کا حامی نہ ہوگا۔''

اہلِ عرب کی تیسری مشہور دیوی کا نام عزّٰی تھا۔ اس کی پرستش لات ومنات کے بعد شروع ہوئی۔ جاہلی عرب کی تاریخ اس حقیقت کی واضح طور پر نشان دہی کرتی ہے کہ اس دیوی کے نام پر عربوں نے اپنی اولاد کے نام بہت بعد میں رکھنا شروع کیے تھے۔ چناں چہ عبدالعزّٰی جیسا مرکب اسم پہلے دور میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کا تذکرہ عام طور پر ان شعرا کے کلام میں ملتا ہے' جو نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے ذرا پہلے پیدا ہوئے۔

عزّٰی کی پرستش کا آغاز ظالم بن اسعد کے ہاتھوں ہوا۔ مکہ سے جو راستہ عراق کی طرف جاتا ہے' ان پر بستان سے نو میل کے فاصلہ پر سڑک کے دائیں جانب اس دیوی کا بت نخلۃ الشامیہ کے مقام پر جسے حراض بھی کہتے ہیں' نصب تھا۔ اس بُت کے اردگرد ایک وسیع عمارت تعمیر کی گئی تھی' جسے بُس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس عمارت میں اِس دیوی کے حضور میں نذرانے پیش کیے جاتے' اس کی پرستش ہوتی اور غیب سے پراسرار آوازیں سنانے کے عجیب وغریب انتظام کیے جاتے تھے۔

اس دیوی کا وقار اور احترام مسلسل بڑھتا رہا۔ لوگوں نے دوسرے ناموں کو چھوڑ کر آہستہ آہستہ اپنی اولاد کے نام اسی دیوی کے نام پر رکھنا شروع کیے۔ چناں چہ ایک وقت بھی آیا' جب سب سے زیادہ مقدس نام عبدالعزّٰی خیال کیا جانے لگا۔ عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا' جس نے اس بت کی بندگی پر فخر نہ کیا ہو۔ لیکن اس معاملہ میں جتنی فدائیت اور جاں نثاری قریش کے ہاں دیکھنے میں آتی ہے' اس کی نظیر ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ عرب کے اس سب سے زیادہ طاقت ور اور بااثر قبیلے کے افراد کعبہ کے گرد طواف کرتے وقت اس بت کی تعریف وتوصیف کرتے۔ سورۂ نجم کے پہلے رکوع میں یہ الفاظ ہیں:

''قسم ہے الات وعزّٰی کی اور ان دو کے علاوہ تیسرے منات کی۔ یہی حسین وجمیل رفیع الشان لڑکیاں ہیں' انھی سے شفاعت کے لیے التجا کی جاتی ہے۔''

ان تینوں بتوں یعنی لات' منات اور عزّٰی کو اہل عرب خدا کی بیٹیاں تصور کرتے

بنوعدنان اور اُن کے ذیلی قبائل

عدنان
معد
نزار
مضر — ربیعہ — اسد — جدیلہ
ایاد
الیاس
طابخہ — قمعہ
اُد — قصی
مدرکہ (عمرو)
عمرو — مُر — عبدمنات
ہذیل
تمیم — وائل خبیبہ
اوس — عثمان
بنو مزینہ
زید منات — عمرو — عوف (عُکل)
خزیمہ
عیلان — مالک — امرؤالقیس — سعد
قیس — حنظلہ
عبدالوہاب
محمد بن عبدالوہاب
سعد — مسعود — عبداللہ رضی اللہ عنہ
لحیان
اسد — جحش — زینب رضی اللہ عنہا
کنانہ — ہون
عبدمنات — نضر — ضبہ
مالک
فہر (قریش)
غطفان — سعد — عصفہ
اعصر — محارب — عکرمہ
باہلہ — جسر — منصور
مُرّہ — مدرج
بکر — ضمرہ — ملیل — غفار
ابوذر رضی اللہ عنہ
ہوازن — سلیم — مازن
عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ
بعیض — ذبیان — عبس
فزارہ — بکر
عبداللہ بن عمرو
منبہ — سعد — معاویہ
ثقیف — حلیمہ سعدیہ — صعصعہ
عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ — ہلال — عامر
عبداللہ — عبدمناف — نمیر
حارث — خزیمہ
میمونہ رضی اللہ عنہا — زینب رضی اللہ عنہا
غالب — لؤی — کعب — مرہ — کلاب — قصی
محارب — خالد — عبید رضی اللہ عنہ
حارث — ضبہ — اہیب — ہلال — جراح — عبداللہ
ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ
عدی — نفیل — خطاب — عمر رضی اللہ عنہ
عمرو — ہصیص — سہم — جمح
عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ
تیم — ابوقحافہ عثمان رضی اللہ عنہ — ابوبکر رضی اللہ عنہ
عبداللہ — طلحہ رضی اللہ عنہ
زہرہ
عبدمناف — عبدالعزیٰ
ہاشم — اسد
عبدشمس — عبدالمطلب — خویلد
امیہ — ابوطالب — عباس رضی اللہ عنہ — عبداللہ — حمزہ رضی اللہ عنہ — عوام
علی رضی اللہ عنہ — خدیجہ رضی اللہ عنہا — زبیر رضی اللہ عنہ
محمد رسول اللہ ﷺ
عمرو — حرب — ابوالعاص
زید — ابوسفیان رضی اللہ عنہ — عفان
سعید رضی اللہ عنہ — معاویہ رضی اللہ عنہ — عثمان رضی اللہ عنہ
عبدمناف — حارث
وہب — اہیب — عبد
آمنہ — ابی وقاص — عبدعوف
سعد رضی اللہ عنہ — عوف
عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ

عدنان تک حضرت محمد ﷺ کا سلسلۂ نسب | نبی کریم ﷺ کی والدہ محترمہ | نبی کریم ﷺ کی رضاعی والدہ | نبی کریم ﷺ کی پہلی زوجہ محترمہ

نبی کریم ﷺ کی غیر قریشی عدنانی ازواجِ مطہرات | خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم | جنت کی بشارت پانے والے دس صحابہ رضی اللہ عنہم | نبی کریم ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

محمد بن عبدالوہاب رضی اللہ عنہ | اہم قبائلی سربراہ

بنو قحطان
اور اُن کے ذیلی قبائل

- قحطان
  - یعرب
    - یشجب
      - سبا
        - حمیر
          - مالک ← مرہ ← عمرو ← مالک ← قضاعہ
            - کلب ← خلیفہ ← دحیہ رضی اللہ عنہ
            - ملی ← اسلم ← زید رضی اللہ عنہ
            - عذرہ ← حارثہ ← زید رضی اللہ عنہ
            - زید ← جہینہ ← سہل ← ایاس رضی اللہ عنہ
          - ابین ← زید الجمہور ← کعب ← سبا اصغر ← تبع حارث
          - وائلہ (وائل) ← زید ← سکسک
        - عاملہ
        - کہلان
          - زید
            - عریب ← یشجب ← زید ← ادد
              - مرہ ← الحارث ← عدی
                - حارث ← عاملہ
                - عفیر ← کندہ ← قیس ← اشعث رضی اللہ عنہ
                - لخم ← عمرو ← ابی بلتعہ ← حاطب رضی اللہ عنہ
                - جذام
              - اشعر ← قیس ← ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ
              - سلامہ ← روح ← زنباع رضی اللہ عنہ
              - مذحج (مالک)
                - عنس ← یاسر ← عمار رضی اللہ عنہ
                - سعد العشیرہ ← جعفی ← حظلہ ← بشر رضی اللہ عنہ
                - جلد ← علہ ← عمرو ← نخع
                - مراد ← عامر ← اویس رضی اللہ عنہ
                - قیس ← زرارہ رضی اللہ عنہ
              - طے ← حاتم ← عدی رضی اللہ عنہ
            - مالک
              - الخیار ← ربیعہ ← اوسلہ ← زید ← مالک
                - اوسلہ (ہمدان)
                - الہان
              - نبت ← الغوث
                - علی ← عمرو ← لحیان ← اراش ← انمار ← بجیلہ ← عبداللہ ← جریر رضی اللہ عنہ
                - ازد
                  - نصر شنوءہ ← مالک ← عبداللہ ← کعب ← الحارث
                    - کعب ← زہران ← عبداللہ ← عدثان ← دوس
                      - عمرو ← طفیل رضی اللہ عنہ
                      - عامر ← ابوہریرہ (عمیر) رضی اللہ عنہ
                  - مازن ← ثعلبہ ← امرؤ القیس ← حارثہ ← عامر ← عمرو مزیقیا
                    - جفنہ
                    - حارثہ
                      - لحی ← عمرو ← خزاعہ (کعب)
                        - سفیان ← بسر رضی اللہ عنہ
                        - کلثوم ← بدیل رضی اللہ عنہ
                        - جزیمہ (مصطلق) ← حارث ← جویریہ رضی اللہ عنہا
                      - افصیٰ ← اسلم ← خصیب ← بریدہ رضی اللہ عنہ
                    - عمران
                      - عدی
                        - بارق ← جعد ← عروہ رضی اللہ عنہ
                        - غامد ← حارث ← حارث رضی اللہ عنہ
                    - ثعلبہ ← حارثہ
                      - اوس
                        - حضیر ← اسید
                        - معاذ ← سعد
                      - خزرج
                        - معرور ← براء رضی اللہ عنہ
                        - زرارہ ← اسعد رضی اللہ عنہ
                        - عبادہ ← سعد رضی اللہ عنہ ← قیس رضی اللہ عنہ
                        - مالک ← انس رضی اللہ عنہ
                        - ارقم ← زید رضی اللہ عنہ
            - ربیعہ ← ہمدان

بنو قحطان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام — قبیلے کا جدامجد — جدامجد کی بالواسطہ اولاد

عمرو بن لحی وہ پہلا شخص ہے جس نے جزیرہ نمائے عرب میں بت پرستی کو رواج دیا۔

بنواوس اور بنوخزرج کا شجرہ نسب

حارثہ بن ثعلبہ بہلول بن عمرو مزیقیا بن عامر ماء السماء بن حارثہ الغطریف

اوس بنواوس کا جدِ امجد

مالک

عوف — مالک — معاویہ

عمرو — عوف — مالک

ربیع — مرارہ رضی اللہ عنہ

زید — امیہ — حاطب — ثعلبہ رضی اللہ عنہ

عبید — ھدم — کلثوم رضی اللہ عنہا

ضبیعہ — ثابت — عاصم رضی اللہ عنہ

معاویہ — امیہ — قیس

ثابت — عبداللہ — عبداللہ رضی اللہ عنہ

عتیک — جابر رضی اللہ عنہ

حاطب — سبیع رضی اللہ عنہ

مالک — تیہان — مالک رضی اللہ عنہ

عمرو (نبیت) — خزرج الاصغر

حارث — جشم

زعوراء

عبدالاشہل — معاذ — سعد رضی اللہ عنہ

حضیر — اسید رضی اللہ عنہ

حارثہ — عازب رضی اللہ عنہ — براء رضی اللہ عنہما

ظفر (کعب) — سواد — ظہیم — قیس — ثابت رضی اللہ عنہ (حاسر)

امراؤالقیس — سلم — غنم — قدامہ — مالک رضی اللہ عنہ

مرہ — عامر — قیس — زید

امیہ

وائل

عطیہ — قیس — ہوذہ رضی اللہ عنہ

جشم — خطمہ (عبداللہ) — خالد — اوس رضی اللہ عنہ

خزرج الاکبر بنوخزرج کا جدامجد

جشم

غضب — مالک — عبدحارثہ — زریق — عثمان — سعد — عبادہ رضی اللہ عنہ (ابوعبادہ)

تزید — شاردہ — اسد — علی — سعد — سلمہ — کعب — غنم

عدی — عبید — سنان — خنساء — صخر — معرور — براء رضی اللہ عنہ

سواد — کعب — قین — عمرو — مالک — کعب رضی اللہ عنہ (مخلف تبوک)

کعب — حرام

زید — جموع

منذر — حباب رضی اللہ عنہ

عمرو رضی اللہ عنہ — معاذ رضی اللہ عنہ (ابوجہل کے قاتل)

عمرو — عبداللہ رضی اللہ عنہ — جابر رضی اللہ عنہ

حارث

خزرج — کعب — عدی — مالک — عامر — عویمر رضی اللہ عنہ (ابودرداء)

جشم — زید — عبدربہ — ثعلبہ — زید رضی اللہ عنہ — عبداللہ رضی اللہ عنہ

عوف — خدرہ (ابجر) — عبید — ثعلبہ — سنان — مالک — سعد رضی اللہ عنہ (ابوسعید خدری)

زید مناۃ — بشر

تمیم رضی اللہ عنہ

کلیب رضی اللہ عنہ

عوف — عمرو — عوف

سالم (حبلی) — عبادہ — عباس رضی اللہ عنہ

عجلان — مالک رضی اللہ عنہ

غنم (قوقل)

قیس — صامت — عبادہ رضی اللہ عنہ

سالم — حارث

مالک — ابی — عبداللہ — عبداللہ

عبداللہ — خولی — اوس رضی اللہ عنہ

کعب — شماس — قیس — ثابت رضی اللہ عنہ

عمرو — ثعلبہ — تیم اللہ (نجار)

عدی — غنم — نضر

انس رضی اللہ عنہ

مالک — انس رضی اللہ عنہ (خادم رسول) — براء رضی اللہ عنہ

مالک

عدی — غنم — عامر

خداش — حرام — لبید — زید — عمرو — سلمی (زوجہ ہاشم) — عبدالمطلب — عبداللہ — محمد ﷺ

جندب — حرام — زید — خالد — مالک (ملحان) — حرام رضی اللہ عنہ

عمرو — معاویہ — کعب — ابی رضی اللہ عنہ

غنم — عوف — ثابت — زید رضی اللہ عنہ (کاتب وحی)

ہے اور اس بات پر پختہ ایمان رکھتے تھے کہ ان کی شفاعت کے بغیر وہ دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران نہیں ہو سکتے۔ قرآن مجید نے بڑے زوردار الفاظ میں ان کے اس باطل عقیدہ کی تردید کی ہے:

"کیا تم نے لات، عزیٰ اور تیسرے منات کے حال پر غور نہیں کیا ہے؟ کیا تمھارے لیے تو بیٹے ہوں اور خدا کے لیے بیٹیاں؟ اس اعتبار سے تو یہ بڑی بے ڈھنگی تقسیم ہے، یہ نرے نام ہی نام ہیں، جنھیں تم نے اور تمھارے باپ دادا نے ٹھہرا لیا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے تو کوئی دلیل نہیں بھیجی۔ یہ لوگ بے بنیاد خیالات اور اپنے نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔ کیا انسان کی ہر خواہش اور تمنا پوری ہو جاتی ہے۔ سو اللہ ہی کے اختیار میں ہے دنیا اور آخرت اور بہت سے فرشتے جو آسمانوں میں موجود ہیں۔ ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آ سکتی مگر اللہ تعالیٰ جس کے معاملہ میں چاہیں اور جس سے راضی ہو، اجازت فرما دے اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، وہ فرشتوں کو بیٹی کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔" (النجم، ۵۳۔۱۹ تا ۲۷)

قریش نے حُریض کے قریب ایک پوری وادی جسے سُقام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے عزیٰ کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اس وادی کو یہ لوگ بڑی عزت و توقیر سے دیکھتے اور اسے خانہ کعبہ ہی کا ایک حصہ خیال کرتے تھے۔ چناں چہ عزیٰ کے ذکر کے ساتھ ساتھ اس "وقف" کا ذکر بھی عربی اشعار میں کئی جگہ ملتا ہے۔ ابوجندب الہذلی اپنی محبوبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے عزیٰ اور سقام دونوں کی طرف اپنے ایک شعر میں یوں اشارہ کرتا ہے:

"اس نے اس ذات کی پختہ اور سچی قسم کھائی، جس کے لیے سقام کی وادی وقف کی گئی تھی۔"

اسی طرح درہم بن زید الاوسی نے ایک شعر میں کہا ہے:

"خوش بخت عزیٰ کے رب کی قسم، اس اللہ کی قسم جس کے گھر (اور سقام) کے درمیان سرف موجود ہے۔"

عزیٰ کے صنم کدے میں ایک قربان گاہ بھی تھی جسے غبغب کہا جاتا تھا اور جہاں زائرین ہدیے کے جانور لا کر ذبح کرتے تھے۔ ایک شاعر کہتا ہے:

"اسما کا نکاح اس بچھڑی کے جبڑے سے کر دیا گیا جسے بنی غنم کے کسی شخص نے چڑھاوا دیا تھا اور جب وہ اسے غبغب عزیٰ کی جانب لے جا رہا تھا اور اسے تقسیم کے لیے کاٹا تو اس وقت اسے اس کی آنکھ میں عیب نظر آیا۔"

عزیٰ کا صنم کدہ عربوں کے ہاں کتنا مشہور و مقبول اور کس قدر واجب التعظیم تھا، اس کا ہلکا سا اندازہ قیس بن الحدادیۃ الخزاعی کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔

"ہم سب سے پہلے قسم اللہ کے گھر کی کھاتے ہیں۔ لیکن اگر وہ موثر نہ ہو تو پھر ان مقدس پتھروں کی جو غبغب کے مقام پر نصب ہیں۔"

اس امر کا فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ لات، منات اور عزیٰ میں عربوں کے نزدیک کون سی دیوی سب سے زیادہ قابل تکریم تھی۔ لیکن ایک بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ قریش کو عزیٰ سے ایک خاص قلبی لگاؤ تھا اور وہ اس کی عزت و تکریم کو اپنا جزو ایمان سمجھتے تھے۔

زید بن عمرو بن نفیل کا شمار ان سعید روحوں میں ہوتا ہے، جن کی فطرت سلیم نے انھیں بت پرستی سے اسلام کا آفتاب طلوع ہونے سے پہلے ہی بیزار کر دیا تھا۔ انھوں نے اپنے اشعار میں بُت پرستی کی پرزور مذمت کی ہے اور اس سے برأت کا کھلے بندوں اظہار کیا ہے۔ ان کے اشعار کے مطالعہ سے یہ بات بڑی آسانی سے اخذ کی جا سکتی ہے کہ حضور سرور کائنات ﷺ کی بعثت سے پہلے عربوں کی عقیدت کے کون کون سے مرکز و محور تھے اور وہ کن آستانوں پر اپنی جبین نیاز جھکا کر اپنے جذبۂ عبودیت کی تسکین کیا کرتے تھے۔ اس ضمن میں زید بن عمرو بن نُفیل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

"میں نے لات اور عزیٰ دونوں کی پرستش سے منہ موڑ لیا ہے اور جری اور بہادر آدمی اسی طرح کرتا ہے۔ میں اب نہ تو عزیٰ کا پرستار ہوں اور نہ ہی اس کی دونوں بیٹیوں کا۔ میں بنی غنم کے دونوں بتوں کی بھی زیارت نہیں کرتا۔ میں ہُبل کی زیارت اور اس کی پرستش کے لیے بھی نہیں جاتا حالانکہ جب میں سنِ بلوغ کو نہ پہنچا تھا اس وقت ہم اسے اس دنیا میں اپنا رب تصور کیا کرتے تھے۔"

عزیٰ کے صنم کدہ کی تولیت عرصہ دراز تک مجموعی طور پر بنی سلیم کے پاس رہی لیکن اس بُت خانہ کی حفاظت اور دربانی میں بنوشیبان پیش پیش تھے اور اس کام کو اپنے لیے ایک غیر معمولی اعزاز سمجھ کر اسے بڑے خلوص کے ساتھ سرانجام دیتے رہے۔

اس کی پرستش بھی دوسرے بتوں کی طرح حضور سرور عالم ﷺ کی بعثت تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بربادی کا حکم صادر فرما دیا۔ اس دیوی کے بارے میں عربوں کے جذبات کتنے نازک تھے اور اس کے ساتھ ان کی وابستگی کتنی گہری تھی۔ اس کا اندازہ اس صدمے سے لگایا جا سکتا ہے، جو انھیں اس کی مذمت سے پہنچا۔ سورۃ النجم کی مشہور آیت اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی جب نازل ہوئی تو اس سے کفار کو شدید اذیت ہوئی اور اس کے نتیجہ میں ابو اُحیحہ (عبد مناف کا پڑپوتا) سخت بیمار پڑ گیا۔ یہی بیماری بالآخر اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی۔ اسی دوران میں ابولہب اس کی عیادت کے لیے اس کی خدمت میں پہنچا تو اس نے اسے آہ و فغاں کرتے ہوئے دیکھا۔ ابولہب نے ابواُحیحہ سے کہا: "کیا تو موت سے خوف زدہ ہو کر آنسو بہا رہا ہے حالانکہ اس سے کوئی مفر نہیں۔" اس پر ابواُحیحہ نے جواب دیا: "نہیں مجھے موت کا قطعاً کوئی خوف نہیں اور اس کی وجہ سے میں بالکل پریشان نہیں۔ البتہ مجھے صرف ایک ہی غم کھائے جا رہا ہے کہ میرے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد عزیٰ کی پرستش ختم ہو جائے گی۔" ابولہب نے اسے تسلی دی اور کہا: "یہ محض تمھاری خام خیالی ہے کہ عزیٰ کی تعظیم و تکریم یا اس کی پرستش تمھاری ذات سے وابستہ ہے اور اس بنا پر یہ صرف تمھاری زندگی تک محدود رہے گی اور تمھارے چلے جانے کے بعد لوگ اس دیوی سے منہ موڑ لیں گے۔"

ابواُحیحہ نے جب یہ الفاظ سنے تو اسے بڑی مسرت ہوئی کہ عزیٰ سے عربوں کو خاص طور پر ابولہب کو غیر معمولی عقیدت اور وابستگی ہے۔

(عبدالحمید صدیقی)

عربوں کی تجارتی زندگی

جزیرۃ العرب کا زیادہ حصہ صحراؤں اور ریگستانوں پر مشتمل ہے۔ ان مرکزی صحراؤں اور ریگستانوں میں رہنے والے خانہ بدوش قبائل زمانہ قدیم ہی سے اونٹ اور بھیڑ بکریاں پالنے کے پیشہ سے وابستہ رہے ہیں' لیکن اس جزیرہ نما کے اردگرد دنیا کے قدیم ترین تہذیبی مراکز واقع ہیں۔ دریائے دجلہ وفرات کی وادی کو دنیا کا سب سے قدیم نہیں تو چند سب سے قدیم تہذیبی مرکزوں میں سے ایک شمار کیا جاتا ہے۔ اس سے ملحق ایران اور اس سے آگے برصغیر پاک و ہند ہیں۔ اس کے شمال میں شام' فلسطین اور ان سے آگے وادیٔ نیل ہیں' بحیرۂ احمر کے اس پار حبشہ ہے۔ یہ سب وہ خطے ہیں جہاں قدیم تہذیبوں نے جنم لیا' جہاں قدیم ترین سلطنتیں قائم ہوئیں۔ یہ وہ علاقے ہیں جن پر قبضہ کے لیے زمانہ قبل از تاریخ ہی سے قوموں میں باہمی لڑائیاں اور جنگیں ہوتی رہی ہیں۔ ان تہذیبی مراکز اور ممالک کی آپس کی لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اور زمانہ قدیم ہی سے ان کے درمیان تجارت بھی ہوتی رہی ہے۔ اس تجارت کے اہم اور بڑے راستے جزیرۃ العرب سے ہو کر گزرتے تھے اور جزیرۃ العرب کے مختلف تجارتی راستوں پر آباد قومیں اور قبائل' اس بین الاقوامی تجارت سے مختلف طریقوں سے وابستہ چلے آتے تھے۔ بحیرۂ عرب اور خلیج فارس کے ساحلی علاقوں کے عرب ملاح جہاز رانی پر قابض تھے' ان بندرگاہوں پر جو مالِ تجارت اترتا تھا' وہ مرکزی صحرا کے گرد سے ہو کر گزرنے والے راستوں سے شام' فلسطین اور مصر کی طرف جاتا تھا۔ ان راستوں پر عرب قبائل کا قبضہ تھا' ان پر سفر کی مشکلات عربوں اور ان کے اونٹوں کے علاوہ اور کوئی برداشت نہیں کر سکتا تھا' اس لیے تجارتی مال ان کے اونٹوں پر ان کی نگرانی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا تھا اور اس تجارت سے انھیں بھی اپنا حصہ مل جاتا تھا۔ بحیرۂ عرب کے ساحلی علاقوں کی پیداوار کی مصر میں بہت زیادہ ضرورت ہوتی تھی۔ مصر میں حکمرانوں اور امرا کے جسد خاکی کی ممیاں بنانے کی ابتدا کب ہوئی' یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا' لیکن دریافت شدہ شواہد سے اندازہ کیا گیا ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں بھی مصر کے حکمرانوں اور اہلِ زر کی ممیاں بنانے کا رواج موجود تھا۔ اس زمانے میں ممی بنانے کے لیے خام شورہ (Natron) استعمال کیا جاتا تھا جو مصر ہی میں دستیاب تھا۔ بعد میں ممی بنانے کے عمل میں خاص جڑی بوٹیاں (Incense) بھی استعمال کی جانے لگیں۔ یہ جڑی بوٹیاں' عود اور لوبان وغیرہ جزیرۃ العرب کے جنوبی حصہ یمن اور حضرموت سے منگوائی جاتی تھیں۔ اس خطے میں خوش بو اور دھونی دینے والی یہ جڑی بوٹیاں اس کثرت سے پیدا ہوتی تھیں کہ قدیم یونانی اسے بوٹیوں کا ملک (Incense Country) لکھا کرتے تھے۔ یہ خوش بو دینے والی جڑی بوٹیاں ممیاں بنانے کے علاوہ مصری مندروں اور عبادت گاہوں میں پوجا پاٹ اور دربارِ شاہی کی تقریبات کے وقت بھی جلائی جاتی تھیں' اس لیے مصریوں کو ان کی بہت بڑی مقدار کی ضرورت ہوتی تھی اور یہ ساری ضرورت یمن پورا کرتا تھا۔ بحر احمر کے دوسری طرف پنت (صومالیہ) میں بھی کچھ ایسی جڑی بوٹیاں اگتی تھیں جو وہاں سے پہلے یمن میں لائی جاتی تھیں اور پھر آگے مصر بھیجی جاتی تھیں۔ تورات میں ہے کہ سبا کی ملکہ بلقیس حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملنے یروشلم گئیں تو وہ ان کے لیے جو تحائف لے گئیں' ان میں خوش بودار بوٹیوں سے لدے اونٹ بھی تھے' یمن کے عرب تاجر اہلِ مصر کو محض خوش بو سے جلنے والی جڑی بوٹیاں ہی فراہم نہیں کرتے تھے' وہ ہندوستان اور چین سے درآمد کردہ اشیا بھی مصر اور اس سے ملحق ممالک شام وفلسطین تک لے جاتے تھے جہاں سے آگے یہ مال بحیرۂ روم کے ممالک اور یورپ تک جاتا تھا۔ ان اشیا کی تعداد میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ لوبان اور عود کے ساتھ عنبر' مشک' گرم مسالے' کالی مرچ' سونٹھ' سچے موتی' ہیرے جواہر' تلواریں' ہاتھی دانت سے بنی اشیا' ادویات اور ریشمی کپڑا بھی ان میں شامل ہو گئے۔ جب مصر پر یونانیوں اور ان کے بعد رومیوں نے قبضہ کر لیا تو ان کے اُپنے شاہی درباروں' مندروں اور امرا کے گھروں میں بھی یہ خوش بو دینے والی بوٹیاں جلائی جانے لگیں۔ یورپ میں کالی مرچ کا استعمال اتنی بڑی عیاشی سمجھا جاتا تھا کہ جب گوتھ حملہ آور ایلارک (Alaric) نے روم پر قبضہ کیا تو اس نے اہلِ شہر کو تاوان جنگ میں تیرہ سو ساٹھ کلوگرام کالی مرچ پیش کرنے کا حکم دیا تھا۔ (۱) چین کا بنا ریشم اور ریشمی کپڑا زمانہ قدیم ہی سے یورپ میں امرا کی بڑی اہم ضرورت رہا ہے۔ جن راستوں سے ریشم اور ریشمی کپڑا مغرب جاتا تھا' ان کے نام ہی شاہراہ ریشم (Silk Route) پڑ گئے تھے۔ بازنطینی عہد کے رومی امرا اور درباریوں کو ریشم کی اتنی بڑی ضرورت تھی کہ قیصر روم جسٹینین (Justinian) نے حبشہ کے عیسائی بادشاہ سے باقاعدہ معاہدہ کیا تھا کہ وہ بحری راستہ سے ہندوستان سے ریشم لا کر بازنطینیوں کے ہاتھ بیچا کرے تا کہ اس سے حاصل ہونے والا منافع ان کے مشترکہ دشمنوں (مذہبی) کے ہاتھ جانے سے بچ جائے۔ پلینی (Pliny) نے اس بات پر اپنے حکمرانوں کی مذمت کی ہے کہ ہر سال ان کا بہت سا روپیا' سونا چاندی اور تانبا ہندوستان اور چین کے مال کے عوض عربوں کے پاس چلا جاتا ہے۔

چین کا ریشم' ہندوستان اور مالابار کے گرم مسالے اور کالی مرچ' سونٹھ' ہاتھی دانت کی اشیا' سچے موتی' ہیرے جواہر' ہتھیار' ادویات اور کپڑا اور مشرقی افریقہ کا مالِ تجارت پہلے بحری راستوں سے جزیرۃ العرب کے مشرقی ساحل (خلیج فارس/ خلیج عرب) اور عدن کی بندرگاہوں تک لایا جاتا تھا اور وہاں سے آگے یہ اشیا اونٹوں پر لاد کر جزیرۃ العرب کے شمال کی منڈیوں تک پہنچائی جاتی تھیں۔ بعض دفعہ ان تجارتی قافلوں میں اڑھائی ہزار اونٹ تک شامل ہوتے۔ دجلہ اور فرات کے درمیان کا سات سو میل لمبا زرخیز علاقہ کرۂ ارض پر تہذیب کے اولیں مراکز میں سے ہے۔ اس کے جنوبی حصہ سمیر (Sumer) میں "ار" (UR) کا شہر تھا جس کے چاند دیوتا کے مندر اور شاہی محلوں پر ساگوان کی لکڑی کے شہتیر تھے۔ ساگوان ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا گیا ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں بھی ہندوستان سے خلیج کی بندرگاہوں تک بحری تجارت ہوتی تھی۔ اس دور میں اس وادی میں موروں کی پرورش

بھی ہوتی تھی' جو خاص طور پر ہندوستان کا پرندہ تھا۔ کپاس کو عبرانی (Hebrew) زبان میں ''کرپاس'' (Karpas) کہا جاتا ہے جس سے اندازہ کیا گیا ہے کہ اس خطہ میں کپاس بھی مشرق سے گئی تھی اور ان اشیا کی ساری بحری تجارت جزیرۃ العرب کے جنوبی اور جنوب مشرقی ساحلوں پر آباد عرب ملاحوں کے ہاتھوں میں تھی' جو سندھ اور اس سے آگے گجرات کے ساحلوں تک آتے جاتے تھے اور یہاں سے یہ اشیا لے جا کر آگے فروخت کر دیتے تھے۔ 45ء تک ان بحری راستوں پر عربوں کی اجارہ داری رہی' کیوں کہ مون سون ہواؤں کے رخ اور زیر آب ساحلی چٹانوں کے محل وقوع سے ان کے علاوہ اور کوئی واقف نہیں تھا۔ جب کیپٹن ہپالوس (Hipalus) نے 45ء میں مون سون ہواؤں کے بارے میں دریافت کیا کہ یہ چھ ماہ تک مسلسل مشرق سے مغرب کی سمت اور باقی چھ ماہ مغرب سے مشرق کو چلتی ہیں' تو اس کے بعد مغربی ملاح ان بحری راستوں کی طرف آنے لگے تھے اس کے باوجود ان بحری راستوں کے بارے میں ساری معلومات وہ اس سے بھی چالیس پچاس سال بعد جمع کر سکے تھے۔ اس کے بعد ان بحری راستوں پر ان کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ سکندر مقدونی نے پنجاب سے واپسی پر اپنی فوج کا ایک حصہ سمندر کے راستے خلیج تک بھیجا تھا۔ اس کے افسر دن کو سمندر میں سفر کرتے تھے اور رات ساحل پر گزارتے تھے' راہ نمائی کے لیے اس نے جو مقامی ملاح ساتھ رکھا' وہ انھیں آسانی سے خلیج تک لے گیا۔ اس سفر کا اصل مقصد بھی اس بحری راستے کی دریافت تھی جس کا راز عرب کسی اور کو نہیں بتاتے تھے۔ یہ راستہ دریافت کر کے سکندر مقدونی بحری تجارت پر سے عربوں کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتا تھا' لیکن اسے بھی خلیج سے آگے بحیرۂ احمر تک کا بحری راستہ دریافت کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ہندوستان سے مال تجارت زمینی راستوں سے بھی عراق' شام اور اس سے آگے جاتا تھا' مگر یہ راستے دشوار گزار تھے۔ ان میں سے ایک راستہ بلوچستان سے ہو کر گزرتا تھا' جو بہت زیادہ دشوار گزار تھا۔ دوسرا راستہ افغانستان اور آگے دشتِ لُوط سے ہو کر جاتا تھا۔ اس پر چلنے والے قافلوں کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا' تیسرا راستہ کوہِ البرز کے دامن کے ساتھ ساتھ ہو کر جاتا تھا۔ چوتھا راستہ بحیرۂ کیسپین اور ترکستان سے ہو کر گزرتا تھا' مگر ان راستوں پر سفر سے ایک تو وقت زیادہ لگتا تھا' دوسرے پہلے مصریوں اور ایرانیوں کے درمیان اور بعد میں یونانیوں' رومیوں اور ایرانیوں کے درمیان لڑائیوں کی وجہ سے ان راستوں پر تجارتی قافلوں کی آمدورفت بند ہو جاتی تھی اور مال کی فراہمی رک جاتی تھی۔ قبل از اسلام کے زمانہ میں ایرانیوں اور بازنطینیوں (رومیوں) کے درمیان مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے رومیوں کو ریشم اور دوسرا مالِ تعیش حاصل کرنے میں دشواریاں پیش آئیں تو قیصر روم کو خصوصی انتظامات کرنا پڑے تھے' لیکن بحری تجارت لڑائیوں کے دوران میں بھی کھلی رہتی تھی۔ جزیرۃ العرب کی بندرگاہوں سے آگے اس کے زمینی تجارتی راستے دشوار گزار ریگ زاروں اور صحراؤں کو کاٹ کر گزرتے تھے' ان کی سختیوں اور موسموں کا مقابلہ صرف عرب اور ان کے اونٹ ہی کر سکتے تھے۔ اس طرح بحری اور زمینی راستوں پر ان کے جہاز اور قافلے ہمیشہ آتے جاتے رہتے تھے۔ اگرچہ ایرانیوں کو اس تجارت کے محصول اور منافع سے کچھ حصہ مل جاتا تھا' کیوں کہ زمینی راستے ان کے علاقوں سے ہو کر گزرتے تھے' اس کے باوجود ایرانی شہنشاہ دارا نے اپنے ایک یونانی النسل بحری کمانڈر سکائی لیکس (Skylax) کو 512ء ہیں میں دریائے سندھ سے بحیرۂ عرب اور آگے بحیرۂ احمر تک کے بحری راستوں کی تلاش کے لیے بھیجا تھا' مگر اس کے بعد ایرانیوں نے عربوں کی بحری تجارت میں زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ مصریوں' یونانیوں اور رومیوں کو ہمیشہ یہ غم رہا کہ انھیں یہ اشیا بہت مہنگی ملتی ہیں اور اس منافع میں ان کا کوئی حصہ نہیں' اس لیے زمانہ قدیم ہی سے وہ اس میں سے حصہ بٹانے کے لیے ان راستوں پر قبضہ کرنے کی کوششیں کرتے رہے تھے۔ مصری فراعنہ کے مقبروں کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہ مصر ساہورے (Sahure) نے 2743 قبل مسیح میں بحیرۂ احمر میں اپنا بحری بیڑا بھیجا تھا اور فرعون سوسیترلیس نے دریائے نیل سے ایک نہر کھود کر بحیرۂ احمر سے ملا دی تھی' اس نہر کے راستے ان کے بحری جہاز بحیرۂ احمر سے آگے جزیرۃ العرب کی جنوبی بندرگاہوں تک آنے لگے تھے' لیکن یہ نہر مختلف ادوار میں مختلف وجوہ کی بنا پر چالو اور بند ہوتی رہتی تھی جس کی وجہ سے یہ تجارت جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ تورات کے مطابق حضرت سلیمانؑ کے جہاز بھی بحیرہ احمر میں موجود ہوتے تھے اور ان کے لیے سونا چاندی' ہاتھی دانت کی اشیا' مور اور بندر لایا کرتے تھے۔ مصر پر یونانیوں کے قبضہ کے بعد بطلیموس ثانی نے 285 قبل از مسیح میں دریائے نیل کو بحیرۂ احمر سے ملانے والی نہر کی صفائی کروا کر اسے پھر سے چالو کیا' کیوں کہ شام پر ایرانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا۔ مصر کے پٹولمی (Ptolemy) حکمرانوں نے اس نہر کی دیکھ بھال اور حفاظت کا بہت اہتمام کیا اور بحیرۂ احمر تک سامان تجارت لانے والے عرب ملاحوں اور تاجروں کو سہولتیں فراہم کیں۔ اس طرح اس زمانے میں بھی مصر کو ہندوستان اور چین کا مال پہنچانے کی ساری تجارت عربوں کے ہاتھ میں رہی' مگر جب قلوپطرہ حکمران بنی تو نظامِ حکومت خراب ہو گیا اور نیل سے نکالی گئی نہر میں جہاز رانی بند ہو گئی۔ اس کے بعد 30 قبل مسیح میں مصر پر رومیوں کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے اس نہر کو پھر سے صاف کیا اور ان کے تجارتی جہاز بحیرۂ احمر تک آنے لگے۔ انھوں نے یمن کے عربوں کی دولت اور تجارتی راستوں پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ قیصر روم آگسٹس نے دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک زبردست فوج جنوبی عرب پر فوج کشی کے لیے بھیجی' مگر چھ ماہ تک دشوار گزار صحراؤں میں مارے مارے پھرنے کے بعد یہ فوج واپس جانے پر مجبور ہو گئی۔ اس تلخ تجربہ کے بعد رومیوں نے کبھی یمن پر حملہ کی کوشش نہیں کی' البتہ بحیرۂ احمر کے تجارتی راستے کی حفاظت کے لیے انھوں نے اپنے محافظ مقرر کر دیئے اور ان کے جہاز ہندوستان تک جانے لگے۔ مون سون ہواؤں کے رُخ اور بحری راستوں کے بارے میں جملہ معلومات حاصل ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان سے ایک وقت بحری تجارت پر رومنوں کا قبضہ ہو گیا تھا' لیکن جب رومی سلطنت زوال پذیر ہوئی تو 510ء کے قریب ان راستوں پر پھر سے یمنی عربوں نے قبضہ کر لیا۔ جہاں تک جزیرۃ العرب سے گزرنے والے تجارتی راستوں کا تعلق ہے' وہ ہمیشہ عربوں کے قبضہ میں رہے۔ دوسری صدی قبل از مسیح میں صحرائے شام کے کنارے آباد عربوں نے وہاں

اپنی ریاست قائم کرلی تھی جس کا دارالحکومت پٹرا تھا۔ اپنے عروج کے زمانہ میں یہ نبطی ریاست خلیج عقبہ تک پھیلی ہوئی تھی اور اس کا دارالحکومت بڑی تجارتی منڈی بن گیا تھا۔ عربوں کے تجارتی قافلے پٹرا آتے تھے جہاں سے ایک راستہ بصریٰ اور دمشق کو چلا جاتا تھا اور دوسرا راستہ مصر اور اردن کی بندرگاہوں کی طرف نکل جاتا تھا۔ 106ء میں رومیوں نے اس ریاست کا خاتمہ کر کے اسے اپنی حکومت کا صوبہ بنالیا اور عقبہ کے مقام پر نگران چوکیاں قائم کردیں' جہاں تاجروں کے مال کی جانچ پڑتال کی جاتی تھی اور ان سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔ عقبہ سے آگے یہ تجارت کا مال رومیوں کی نگرانی میں جانے لگا تھا۔

جزیرۃ العرب کا سب سے اہم زمینی تجارتی راستہ عدن سے شروع ہو کر صنعا' ہمدان' مکہ یثرب (مدینہ) العلا' تبوک اور ایلہ سے ہوتا ہوا پٹرا تک جاتا تھا۔ عقبہ سے تجارتی قافلے غزہ کی طرف جاتے تھے جہاں ان کا رابطہ بحیرۂ روم کے ساحلوں کے تاجروں سے ہوجاتا تھا۔ دمشق سے ایک تجارتی راستہ جزیرۃ العرب کی ایرانی سرحد پر واقع تجارتی منڈی حیرہ تک جاتا تھا۔ جو تجارتی مال خلیج فارس کے ساحل پر اتارا جاتا تھا' وہ تدمر (Palmyre) سے ہوتا ہوا آگے جاتا تھا' لیکن جو مالِ تجارت بحیرۂ عرب کی بندرگاہوں پر اتارا جاتا تھا' وہ حضرموت اور عدن کے راستہ سے آگے جاتا تھا۔ جزیرۃ العرب کے اوپر سے ایک تجارتی راستہ خلیج فارس کے جزائر بحرین سے ہمدان تک جاتا تھا اور اس بڑے راستے سے مل جاتا تھا۔ ایک اور راستہ ایران کی سرحد پر واقع تجارتی منڈی حیرہ سے یمامہ (موجودہ ریاض) اور بنی تمیم کے علاقہ سے ہوتا ہوا نجران اور یمن تک جاتا تھا۔ اس راستہ سے ایران کا مالِ تجارت جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں تک پہنچایا جاتا تھا۔ اسی طرح پورے جزیرۃ العرب میں تجارتی راستوں کا ایک جال بنا ہوا تھا جو ربع الخالی اور صحرائے شام کے کناروں کے گرد پھیلا ہوا تھا۔

اس بحری اور برّی تجارت سے مختلف عرب مختلف طریقوں سے وابستہ تھے۔ عرب ملاح ہندوستان اور مشرقی افریقہ سے مال لاتے تھے' جو تاجر یہ مال منگواتے تھے' وہ مقامی منڈی میں عرب تاجروں کے ہاتھ مال فروخت کر دیتے تھے۔ جنوبی عرب کی جڑی بوٹیوں اور درآمد شدہ مال کے تاجر اونٹوں کے مالکوں کے ذریعے مالِ تجارت دوسری منڈیوں تک پہنچاتے تھے' جن قبائل کے علاقوں سے یہ تجارتی قافلے گزرتے تھے' وہ اسی طرح محصول وصول کرتے تھے جس طرح حکومتیں اپنے علاقوں سے گزرنے والے مالِ تجارت پر محصول لیتی تھیں۔ ان قبائل کے سردار تجارتی قافلوں کو پوری حفاظت کے ساتھ گزارنے کے لیے راہ نُما اور محافظ فراہم کرتے تھے۔ اس طرح کوئی مرکزی حکومت یا نظام نہ ہونے کے باوجود پورے جزیرۃ العرب میں ایک قسم کا ضابطہ نافذ تھا جس کی سب قبائل سختی سے پابندی کرتے تھے۔ جب یہ تاجر اور قافلے بیرونی منڈیوں سے واپس آتے تھے تو وہاں سے غلّہ اور عربوں کی ضرورت کی دوسری اشیا خرید لاتے تھے' تجارتی راستوں پر واقع شہروں کے تاجر یہ مال خرید کر ریگستانوں اور بیابانوں میں رہنے والوں تک پہنچاتے تھے یا وہ خود منڈیوں اور تجارتی میلوں سے ضرورت کی اشیا خرید کر لے جاتے تھے' اس طرح اس تجارت سے جزیرۃ العرب کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا تھا' ان کی ضرورت کی اشیا بھی فراہم ہوتی رہتی تھیں اور اس سے وابستہ مختلف گروہوں کو مختلف طریقوں سے مالی فائدہ بھی حاصل ہو جاتا تھا۔ جزیرۃ العرب کے کناروں کے ساتھ ساتھ قائم بڑی سلطنتوں کی آپس کی لڑائیاں بھی ایک طرح سے عربوں کے فائدے میں رہتی تھیں۔ وہ ان لڑائیوں سے الگ رہ کر سب فریقوں سے تجارت کرتے تھے اور سب کو ان کی ضرورت کی اشیا فراہم کیا کرتے تھے۔ (محمد رفیق ڈوگر)

بعثتِ نبوی ﷺ کے وقت مکہ مکرمہ

جزیرہ نمائے عرب کے صوبہ حجاز کا مرکزی شہر اور عالم اسلام کا دینی و روحانی مرکز۔ مشہور یونانی جغرافیہ نویس بطلیموس نے دوسری صدی عیسوی میں اپنے جغرافیہ میں مکہ کو Macorba لکھا ہے یہ عربی لفظ مقربہ کی تعریب ہے' جس کے معنی لوگوں کو معبودوں کے قریب لانے والا ہے۔ بعض محققین نے اس کے معنی معبد (عبادت گاہ) کے بھی لیے ہیں۔ بڑے قدیم زمانے سے لوگ اطراف ذوجوانب سے یہاں حج کرنے آتے تھے۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی حکم ہوا کہ حج کا اعلان کریں۔ کتب تاریخ و سیرت میں مکہ مکرمہ کے پچاس کے قریب نام مذکور ہیں' جن میں مشہور ترین مکہ' ام القریٰ' البیت العتیق اور البلد الامین ہیں۔

مکہ مکرمہ ۲۱ درجے' ۲۸ دقیقے' عرض بلد شمالی اور ۳۷ درجے ۵۴ دقیقے طول' بلد مشرقی پر واقع ہے۔ یہ جدہ سے ۴۵ میل جانب مغرب واقع ہے اور سطح بحر سے ۹۰۹ فٹ بلند ہے۔ مکہ ایک تنگ وادی میں واقع ہے جس کے دونوں طرف خشک اور پانی اور سبزے سے محروم پہاڑوں کا دہرا سلسلہ ہے۔ یہ جبل عرفات' جبل ثور' جبل ابی قبیس اور جبل ثبیر وغیرہ ہیں۔ شہر کے اردگرد بہت سی وادیاں واقع ہیں جن میں وادی فاطمہ اور وادی نعمان قابل ذکر ہیں۔ وادی نعمان کو نہر زبیدہ سیراب کرتی ہے۔ شروع میں مکہ مکرمہ کا دارومدار زمزم کے پانی پر تھا۔ اس کے علاوہ اور کنویں بھی تھے۔ اس کے باوجود پانی کی قلت رہتی تھی۔ عین زبیدہ اور عین عزیزہ کی تعمیر سے یہ مشکل کسی قدر دور ہوگئی تھی۔

شہر کی آب و ہوا گرمیوں میں سخت گرم ہوتی ہے۔ درجہ حرارت کبھی کبھی ۱۱۳ درجے فارن ہیٹ تک پہنچ جاتا ہے۔ امرا گرمیوں کا موسم طائف میں گزارتے ہیں جو مکہ سے ۵۰ میل جانب مشرق واقع ہے۔ موسم سرما خوش گوار ہوتا ہے۔ اناج اور غذائی ضروریات باہر سے آتی ہیں' پھل اور سبزیاں طائف بلکہ دوسرے ممالک سے منگوائی جاتی ہیں۔ اطراف کی زمینوں کو قابل کاشت بنانے کے لیے امریکہ کے انجینئروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ بارش بہت کم ہوتی ہے۔ شہر کے نشیب میں واقع ہونے کی وجہ سے اردگرد کے پہاڑوں سے سیلاب آتے رہے ہیں اور بہت نقصان پہنچاتے رہے ہیں۔ سیلاب کی گزرگاہ تبدیل کرنے اور بند باندھنے

کوششیں بھی زمانہ سابق میں ہوتی رہی ہیں۔
(عمر رضا کحالہ: جغرافیہ شبہ جزیرۃ العرب ۱۶۵ تا ۱۷۳، دمشق ۱۹۴۲ء)

مسجد حرام شہر کے اندر واقع ہے اور اس میں کعبہ واقع ہے جہاں اطراف عالم سے مسلمان حج وطواف کرنے آتے ہیں۔ مکہ کے مکانات پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور دو دو تین تین منزلہ ہیں۔ گلیاں اور بازار تنگ ہیں۔ اب شہر کے باہر نئی بستیاں بن گئی ہیں جن میں العزیزیہ اور الفیصلیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن میں تمدنی زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق شہر مکہ کی آبادی چار لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ ایام حج میں یہ آبادی دس، بارہ لاکھ کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ مستقل باشندوں میں آدھے سے زیادہ انڈونیشی، ہندی، بخاری اور مغربی ہیں جن کے اپنے اپنے محلے ہیں۔ عربی زبان کے علاوہ اردو بھی عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ مکہ کے بازار غیر ملکی مصنوعات سے بھرے رہتے ہیں۔ حج کے موسم میں خرید وفروخت عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ حجاج چادریں، رومال، ٹوپیاں، جانماز، تسبیحیں اور کھجوریں وغیرہ خرید کر لے جاتے ہیں۔ آج سے پچاس برس قبل باشندوں کی مالی حالت پتلی تھی۔ ان کا گزارہ حج کے زمانے کی تجارت، مکانات کے کرایوں اور مخیر حضرات کے عطیات پر تھا، مگر اب تیل کی دریافت سے دولت کی ریل پیل ہوگئی ہے اور لوگ خوش حال اور فارغ البال ہوگئے ہیں۔ شہر میں چھوٹی موٹی بہت سی صنعتیں قائم ہوگئی ہیں۔

قدیم تاریخ

مشہور ولندیزی مستشرق ڈوزی کی رائے میں مکہ کی تاریخ کا آغاز حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے سے ہوتا ہے، اس کا ذکر تورات اور انجیل میں بھی آیا ہے۔ بعض مورخین بیان کرتے ہیں کہ عمالقہ مصر سے حجاز آکر آباد ہوئے۔ جب عمالقہ کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو حضرت موسیٰ نے ان کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی۔ عمالقہ کے بعد بنو جرہم یمن چھوڑ کر مکہ چلے آئے اور اقتدار پر قابض ہوگئے۔ جرہم قحطانی تھے، اور ان کی زبان عربی تھی۔ اس وقت دنیا میں ہر طرف شرک وبت پرستی کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، چناں چہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر سے فلسطین آئے تو انھیں مکہ کی طرف جانے کا حکم ہوا۔ وہ حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر مکہ چلے آئے۔ حضرت اسماعیل جوان ہوئے تو انھوں نے بنو جرہم میں شادی کرلی اور ان سے عربی زبان سیکھی (لسان العرب، ۱۲:۹۷، مطبوعہ قاہرہ) کچھ دیر بعد حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکونے گھر (خانہ کعبہ) کی بنیاد رکھی۔

علمائے محققین کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کی بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلند کی۔ امام ازرقی نے لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا کیا تو اس میں جو اولین شے بنائی گئی وہ بیت اللہ کی تھی۔ یہ سرخ رنگ کے کھوکھلے یاقوت سے بنا ہوا اور بیت المعمور کے بالمقابل مقام تھا۔ اس کے اٹھائے جانے کے بعد اولاد آدم علیہ السلام نے اس جگہ ایک مکان پتھروں اور مٹی سے بنا دیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں یہ جگہ طوفان سے بے نشان ہوگئی اور وہاں سرخ رنگ کی مٹی کا ایک ٹیلا سا رہ گیا جہاں اطراف عالم سے حاجت مند اور ستم رسیدہ آتے تھے اور منہ مانگی مرادیں پاتے تھے۔ حج کے لیے لوگ بھی یہیں آتے تھے تا آنکہ اللہ تعالیٰ نے اس جگہ حضرت ابراہیم کو خانہ کعبہ کی تعمیر کا حکم دیا (اخبار مکہ ۱:۵۲، بار سوم بیروت ۱۹۷۹ء)۔ خانہ کعبہ کی تعمیر شروع ہوئی تو حضرت اسماعیلؑ پتھر اٹھا کر لاتے تھے اور حضرت ابراہیمؑ ان پتھروں کو نصب کرتے جاتے تھے۔ خدا کا یہ گھر سادہ سا تھا، اس کی نہ چھت تھی، نہ کواڑ (شبلی: سیرۃ النبی ﷺ ۱:۵۴، مطبوعہ اعظم گڑھ)

ایک عرصے تک کعبہ کی تولیت جرہم کے خاندان میں رہی، لیکن پھر بنو خزاعہ نے کعبہ پر قبضہ کرلیا اور عمرو بن لحی کو اپنا فرماں روا بنالیا۔ یہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت ابراہیم کے دین کو بگاڑا، بت پرستی کو رواج دیا اور خانہ کعبہ میں بت نصب کیے اور حلال وحرام کے نئے قانون بنائے جن کا شریعت ابراہیم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ حرم کعبہ پر پردہ چڑھانے کا رواج اسی دور سے ہوا۔ (الازرقی: اخبار مکہ، ص ۱۰۰، مطبوعہ بیروت)

بنو خزاعہ تین سو برس تک مکہ کے حاکم اور کعبہ کے متولی رہے تا آنکہ قُصَیّ بن کلاب کا ستارہ اقبال طلوع ہوا، جو قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

قُصَیّ نے حُلَیل خزاعی کی بیٹی سے شادی کی۔ حلیل نے مرتے وقت حرم کی خدمت قصی کے سپرد کردی۔ قصی نے رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے۔ انھوں نے اپنے خاندان کو جمع کرکے کعبہ کے ارد گرد بسایا۔ سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانا)، رفادہ (حاجیوں کی ضیافت کرنا) جیسے مناصب قائم کیے۔ دار الندوہ (دار المشورہ) کا قیام بھی ان کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے چرمی حوض بنوائے، جن میں موسم حج میں حاجیوں کے لیے پانی بھر کر رکھا جاتا تھا۔ ان خدمات کی وجہ سے قریش اول کا لقب انھی کو ملا اور ان کی وجہ سے قبیلہ قریش کا نام روشن ہوا۔ قریش کی اعلیٰ نسبی، خوش بیانی، صبر وحلم، مظلوموں کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کی سارے عرب میں دھوم تھی۔ ان کی زبان مستند اور معیاری مانی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اکابر قریش کے سامنے شعرا اپنا کلام بغرض اصلاح پیش کیا کرتے تھے۔

قُصَیّ کے چھ بیٹے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ باصلاحیت عبد مناف تھے، لہٰذا قُصَیّ کے بعد قریش کی ریاست عبد مناف کو ملی۔ عبد مناف کے بھی چھ بیٹے تھے، ان میں ہاشم نہایت بااثر اور بارسوخ تھے۔ یہ حضرت رسول اللہ ﷺ کے پردادا تھے۔ ہاشم نہایت سیر چشم تھے اور حاجیوں کی بڑی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ قحط کے زمانے میں ہاشم نے شوربا میں روٹیاں چورا کرا کر اہل مکہ کو کھلائیں۔ اس زمانے سے ان کا نام ہاشم مشہور ہوگیا۔ انھوں نے قیصر روم اور شاہ حبش نجاشی سے فرمان حاصل کیے تھے کہ قریش کے مال تجارت پر کوئی محصول نہ لیا جائے، چناں چہ عرب جاڑوں میں اور گرمیوں میں شام اور انگورہ (انقرہ) تک بے خوف وخطر جایا کرتے تھے۔ اندرون ملک میں بھی قریش کا قافلہ تجارت ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہا کرتا تھا۔

ہاشم تجارت کی غرض سے شام گئے ہوئے تھے کہ انھوں نے غزہ میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام شیبہ تھا۔ ہاشم کے بھائی مطلب شیبہ

کو مکہ معظمہ لے آئے اور ان کی پرورش کی۔ اس وجہ سے ان کا نام عبدالمطلب (مطلب کا غلام) پڑ گیا۔

عبدالمطلب نے چاہ زمزم کو ڈھونڈ نکالا اور اسے کھدوا کر نئے سرے سے درست کر لیا۔ یہ ایک مدت سے بے نشان اور گم چلا آ رہا تھا۔ ان کے زمانے کا اہم واقعہ ابرہہ حاکم یمن کی مکہ پر چڑھائی ہے۔ (۵۷۰ء)۔ وہ ہاتھیوں کا ایک بڑا لشکر لے کر کعبہ کے انہدام کے لیے چلا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے چڑیوں کے جھنڈ بھیج کر ابرہہ کے لشکر کو برباد کر دیا۔ یہ واقعہ قرآن مجید میں سورۂ فیل میں مذکور ہے۔

واقعہ فیل کے بعد عربوں کے دلوں میں قریش کی عظمت بیٹھ گئی اور کعبہ کی عزت و حرمت پر ان کا ایمان اور بھی بڑھ گیا۔ اس واقعہ کی عربوں میں بڑی اہمیت حاصل ہوئی' انھوں نے اس واقعہ سے نئی تاریخ کا آغاز کیا اور وہ لکھنے لگے کہ یہ بات عام الفیل میں پیش آئی یا فلاں شخص عام الفیل میں پیدا ہوا (ازرقی: اخبار مکہ' ص ۵۴' مطبوعہ بیروت)۔ عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے' جن میں ابولہب' ابوطالب' حضرت حمزہؓ اور حضرت عباسؓ زیادہ مشہور ہیں۔ عبداللہ تجارت کی غرض سے شام جا رہے تھے کہ انھوں نے راستہ میں انتقال کیا۔ یہ عبداللہ آنحضرت ﷺ کے والد ماجد تھے۔

مکہ ولادت نبوی ﷺ کے وقت

بعثت نبوی ﷺ سے پہلے مکہ تجارت کا بڑا مرکز بن چکا تھا۔ قریش کے تجارتی قافلے یمن سے لے کر شام بلکہ ایشیائے کوچک تک جایا کرتے تھے اور مختلف ممالک کی مشہور چیزیں لاتے تھے۔ اس تجارتی کاروبار میں مال دار خواتین بھی شریک ہوتی تھیں۔ بعض اکابر مکہ کے قیصر روم اور حکام یمن سے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ ان حکام کو تحفے بھیجا کرتے تھے۔ اس بیرونی آمد و رفت نے انھیں مہذب و متمدن اور معاملہ فہم زمانہ شناس بنا دیا تھا۔ اہل مکہ یوں بھی صحت و تن درستی' اعتدال مزاج' جواں مردی اور عالی ظرفی میں دوسرے علاقوں کے باشندوں سے ممتاز تھے۔ ان کے دولت مند افراد گرمیاں طائف میں گزارتے تھے۔ اہل مکہ کے بازار بیت اللہ کے پاس لگتے تھے۔ ان بازاروں میں گیہوں' گھی' شہد اور دوسری ضروریات زندگی موجود رہتی تھیں۔ عطر فروشوں' بزازوں' شراب بیچنے والوں اور زیتون کے تیل کا کاروبار کرنے والوں کی بھی دکانیں تھیں۔ بڑھئی' لوہار' معمار' حجام' درزی اور ظروف فروش بھی موجود تھے۔ صاع' مد' رطل' اوقیہ اور مثقال جیسے ناپ اور تول کے پیمانے رائج تھے۔ مکہ میں رومی و ایرانی و ساسانی سکوں کا چلن تھا اور یہ سکے درہم اور دینار کہلاتے تھے۔ درہم پر فارس کا نقش و مہر اور دینار پر بادشاہ روم کی تصویر ہوتی تھی۔ (ابوالحسن علی ندوی: السیرۃ النبویہ' ص ۶۳' ۶۴' قاہرہ ۱۹۷۷ء)

مکہ میں حبشی (افریقی) غلاموں کی بھی بڑی تعداد تھی' جو کھاتے پیتے گھرانوں میں ادنیٰ خدمات انجام دیا کرتے تھے۔ یہ معاشرہ کا مظلوم ترین طبقہ تھا۔ بعض اہل خیر ان غلاموں کو ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد بھی کر دیا کرتے تھے۔ سفید فام غلام عراق' شام اور بلاد یورپ سے لائے جاتے تھے اور بڑی قیمت پاتے تھے۔ یہ حبشی غلاموں کی نسبت زیادہ سمجھ دار' سلیقہ شعار اور ہنر مند ہوتے تھے اور جلد ہی عربی زبان سیکھ جاتے تھے۔ کتب سیرت اور تراجم صحابہ میں بہت سی یونانی باندیوں کے نام مذکور ہیں جو اشراف مکہ کے نکاح میں تھیں اور ان سے اولادیں بھی تھیں۔ ان غلاموں کی بدولت بہت سے حبشی' رومی اور فارسی کلمات عربی زبان میں داخل ہو گئے تھے' جن کی تفصیل جوالیقی کی کتاب المعرب میں موجود ہے۔

اہل مکہ کی مہمان نوازی مشہور تھی۔ وہ حاجیوں کو بیت اللہ کا مہمان سمجھ کر ان کی ہر ممکن خدمت کیا کرتے تھے۔ مکہ والے اپنے حسب و نسب اور زبان دانی پر فخر کیا کرتے تھے۔

انھیں اخبار عرب' ایام عرب اور اشعار عرب سے بڑی دلچسپی تھی۔ سربرآوردہ افراد کی محفلیں زیادہ تر بیت اللہ کے سامنے جمتی تھیں جہاں شعر و شاعری کا تذکرہ ہوتا تھا۔ بعض لوگوں کو اونٹوں' گھوڑوں' ان کے اعضا اور ان کی خصوصیات کی پہچان میں کمال حاصل تھا۔ علاج معالجے کے سادہ طریقے رائج تھے۔ بعض ہندی' یونانی دوائیں مستعمل تھیں۔ فصد کھلوانے' داغنے اور سینگے لگوانے کا بھی ذکر آیا ہے۔ (ابراہیم شریف: مکہ و مدینۃ فی الجاہلیہ و عہد الرسول' بحوالہ ابوالحسن علی ندوی: السیرۃ النبویہ' ص ۶۶' ۶۷ قاہرہ ۱۹۷۷ء)

عہد ابراہیمی سے دوری کے باوجود حضرت ابراہیمؑ کی بعض سنتیں باقی تھیں' مثلاً حج و طواف کرنا' ڈاڑھی بڑھانا' مونچھیں کترانا' ناخن کٹوانا' مسواک اور استنجا کرنا' زیر بغل اور زیر ناف بال صاف کرنا' ختنے' غسل جنابت کرنا اور مردوں کو کفن پہنا کر دفن کرنا وغیرہ' ویسے کا بھی رواج تھا۔ اسلام نے بھی ان سنتوں کو برقرار رکھا (محمود شکری الآلوسی: بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب' ۲: ۲۸۷ مطبوعہ قاہرہ)

تجارت کی گرم بازاری کی وجہ سے بعض طبقے خاصے خوش حال تھے۔ امتداد زمانہ سے خیموں کی جگہ پتھر یا گارے کے مکانات بن گئے تھے اور یہ مکانات بلندی میں کعبہ سے پست ہوتے تھے۔ بعض گھروں میں عیش و عشرت اور ناچنے گانے کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔ شہر میں سودی لین دین بھی ہوتا تھا۔ عوام ناخواندہ' تندخو' کینہ پرور اور منتقم مزاج تھے۔ عداوت کا سلسلہ پشتوں تک چلتا رہتا تھا۔ ایک قتل کے بدلے بیسیوں قتل ہو جاتے تھے۔ حرب الفجار میں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے تھے۔ لوگ غربت اور بدنامی کے مارے بچیوں کو زندہ درگور کر دیا کرتے تھے۔ جوئے بازی اور شراب خوری عام تھی۔ بت پرستی زوروں پر تھی۔ ہر گھر میں ایک بت تھا' جسے وہ اپنا معبود اور حاجت روا سمجھتے تھے۔ کعبے کے اندر اور صحن میں تین سو ساٹھ بت تھے۔ بتوں کے علاوہ بعض مظاہر قدرت کی بھی پرستش کی جاتی تھی۔ عوام جنوں' بھوتوں اور چڑیلوں پر اعتقاد رکھتے تھے' حشر و نشر جزا و سزا کے قائل نہ تھے۔ ان کی فکر و نظر دنیاوی زندگی تک محدود تھی۔ استبداد ظلم و ناانصافی اور جملہ قسم کی اخلاقی برائیوں کا دور دورہ تھا۔ یہ تھی مکہ کی مذہبی و معاشرتی صورت حال جب آنحضرت ﷺ کی ولادت مبارکہ ہوئی۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۰)

بعثت نبوی ﷺ کے وقت مدینہ منورہ

جزیرہ نمائے عرب کے صوبہ حجاز کا مقدس شہر' اس کا پہلا نام یثرب تھا۔ بطلیموس کے جغرافیہ میں یثرب کا نام یثربہ (Jathripa) آیا ہے آنحضرت ﷺ جب ہجرت فرما کر یثرب آئے تو انھوں نے مدینہ کا نام طیبۃ اور طابہ رکھ دیا۔ (لسان العرب' بذیل مادہ)۔ قرآن مجید میں یثرب اور مدینہ دونوں نام آئے ہیں۔ مدینہ کے انتیس نام زیادہ مشہور ہیں جن میں طیبہ' طابہ' جابرہ' محبوبہ' مدینۃ النبی ﷺ' مدینۃ الرسول اور دارالہجرۃ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (یاقوت: معجم البلدان' ۴: ۴۶۰' لائپزگ ۱۸۶۹ء)۔ مدینہ کے ممتاز مؤرخ السمہودی نے چورانوے نام لکھے ہیں (وفاء الوفاء باخبار دارالمصطفیٰ' ص ۷ تا ۱۹' بار اول' قاہرہ ۱۳۲۶ء)

مدینہ منورہ ۳۹ درجے' ۵۰ دقیقے طول بلد مشرقی اور ۲۴ درجے' ۳۲ دقیقے عرض بلد شمالی میں خط استوا کے شمال میں واقع ہے۔ یہ مکہ مکرمہ سے تین سو میل اور ینبع سے ایک سو تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے اور سطح بحر سے چھ سو میٹر بلند ہے۔ اس کے شمال میں جبل احد اور جنوب میں جبل عیر ہیں اور یہ دونوں مدینہ منورہ سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ شہر کے مغرب اور مشرق میں حرۃ الوبرۃ اور حرۃ الواقم واقع ہیں۔ یہ سیاہ پتھروں کے علاقے ہیں' جنھیں آتشیں سیال مادہ نے ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے اور جو سخت نوکیلے اور آڑے ترچھے ہیں اور میلوں کی مسافت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ شہر کے اردگرد کئی وادیاں ہیں جن میں وادی العقیق اور وادی رانونا قابل ذکر ہیں۔ ان میں بہت سے باغات اور کھیت ہیں اور یہ اہل مدینہ منورہ کی سیرگاہیں ہیں۔

مدینۂ منورہ میں چوبیس سے زیادہ پانی کے چشمے ہیں جن میں اہم ترین العین الزرقا ہے۔ اس کا اجرا امیر معاویہؓ کے حکم سے ہوا تھا۔ مدینہ کا پانی ہلکا' سرد اور شیریں ہے۔ شہر کی ہوا گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہوتی ہے۔ مدینہ منورہ کی اراضی دو قسم کی ہے' پہلی قسم سفید رنگ کی ریتلی زمین پر مشتمل ہے۔ یہ مدینہ منورہ کے مشرقی جانب ہے اور اس میں کھجور' انگور اور انار بکثرت ہوتے ہیں' دوسری قسم سیاہ رنگ کی ہے جس میں گندم' جو' انار' نارنگی' رنگ برنگ کے پھول اور قسم قسم کی سبزیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اراضی مدینہ کے جنوب میں قبا' عوالی اور عقیق میں واقع ہے۔ مدینہ منورہ کے مکانات پتھر کے بنے ہوئے ہیں اور دو دو تین تین منزلہ ہوتے ہیں۔ گلیاں اور بازار تنگ ہیں۔ باشندے حلیم' خلیق اور شیریں گفتار ہیں۔ بازار غیر ملکی مصنوعات سے بھرے رہتے ہیں۔ حج کے موسم میں خرید و فروخت عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ مدینہ کی سب سے بڑی سوغات کھجور ہے جو کئی اقسام کی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زائرین چادریں' رومال' ٹوپیاں اور جانماز تبرک کے طور پر خرید کر لے جاتے ہیں۔

قدیم تاریخ

یثرب کی وجہ تسمیہ یاقوت نے یہ لکھی ہے کہ یہ یثرب بن قانیہ نے آباد کیا تھا' جو حضرت نوحؑ کی اولاد میں ان کی ساتویں پشت میں تھا۔ (معجم البلدان' ۴: ۱۰۱۰' لائپزگ ۱۸۶۹ء)' جب حجاز میں عمالقہ کا ظلم و ستم حد سے بڑھ گیا تو حضرت موسیٰؑ نے ان کی سرکوبی کے لیے فوج بھیجی (۵۰۰ ق م)' عمالقہ کو شکست ہوئی اور ان کا بادشاہ قتل ہوا۔ جب یہ فوجی شام واپس گئے تو انھیں حضرت موسیٰؑ کے ایک قول کی خلاف ورزی کے الزام میں حجاز واپس کر دیا گیا' چناں چہ وہ حجاز واپس آ گئے' مدینہ منورہ اور حجاز میں یہود نے عارضی طور پر پناہ لی۔

پہلی صدی عیسوی' یعنی ۷۰ء میں رومیوں اور یہودیوں میں زبردست جنگ ہوئی جس سے پورا فلسطین تباہ ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہود دنیا کے مختلف علاقوں میں منتشر ہو گئے اور ان کی کئی جماعتوں نے عارضی پناہ کے لیے بلاد عرب کا رخ کیا۔

مدینہ منورہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے' بنوقینقاع' بنونضیر اور بنوقریظہ۔ ان قبائل کی بہت سی ذیلی جماعتیں تھیں' اسی لیے السمہودی نے لکھا ہے کہ یہود کے قبیلے بیس سے زیادہ تھے۔ (وفاء الوفا' ص ۱۱۶' مطبوعہ قاہرہ)۔ ان تینوں قبائل کے باہمی تعلقات کشیدہ رہتے تھے۔ بنوقینقاع اور دوسرے یہودیوں میں عداوت چلی آتی تھی کیوں کہ بنوقینقاع بنوخزرج کے ساتھ یوم بعاث میں شریک تھے اور بنونضیر اور بنوقریظہ نے بنوقینقاع کا بڑی بے دردی سے خون بہایا تھا اور ان کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا۔ مدینہ منورہ میں یہود مختلف بستیوں اور محلوں میں رہتے تھے جن میں قلعے اور مستحکم عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ قلعہ بند محلے یا گڑھیاں اطام یا اطم کہلاتی تھیں' جہاں دشمن کے حملے کے وقت لوگ پناہ لیتے تھے۔ جب مرد لڑنے کے لیے جاتے تھے تو عورتیں' بچے اور معذور لوگ یہاں چلے آتے تھے۔ یہ گڑھیاں گودام کے طور پر بھی استعمال ہوتی تھیں' جس میں غلے اور پھل جمع کیے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ ان میں ہتھیار بھی رکھے جاتے تھے۔ ان گڑھیوں کے دروازوں پر بازار بھی لگتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان گڑھیوں میں یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مدارس (یہودی مدارس) بھی ہوتے تھے وہاں دینی کتابیں بھی ہوتی تھیں اور وہاں یہودی سردار صلاح و مشورہ کے لیے بھی جمع ہوتے تھے۔

یہود تجارت' زراعت اور مالی معاملات میں سارے عرب پر چھائے ہوئے تھے۔ ان کے بیشتر مالی معاملات رہن اور سود پر قائم تھے۔ وہ لوگوں کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی عورتیں اور بچے بھی رہن رکھ لیتے تھے۔ مدینہ کے یہودی سود خوری میں مشرکین عرب سے بھی بازی لے گئے تھے۔ ان کی حرص و طمع کا یہ عالم تھا کہ وہ کنوؤں کا پانی ڈولوں کے حساب سے بیچا کرتے تھے۔ مدینہ منورہ کی اقتصادیات پر یہود کے تسلط کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ منڈیوں میں من مانی کرنے لگے۔ اپنی مصلحت و منفعت کے مطابق مصنوعی قلت پیدا کر کے چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کرنے لگے' اس لیے مدینہ کی اکثریت ان کی دھاندلی' حد سے زیادہ سود خوری اور نفع اندوزی کی وجہ سے ان سے نفرت کرنے لگی تھی۔ یہودی اپنے مخصوص دینی قوانین پر عمل کرتے تھے۔ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اپنی عبادات اور دینی شعائر انجام دیتے تھے۔ وہ اپنی عیدیں بھی مناتے تھے اور کچھ خاص دنوں جیسے یوم عاشورہ میں روزے رکھتے تھے۔

یہود کی مادری زبان عبرانی تھی' مگر حجاز آ کر ان کی زبان رفتہ رفتہ عربی ہو گئی تھی

اور وہ اسی زبان میں روزمرہ کا کام کرتے تھے۔عبرانی ان کی مذہبی اور تعلیمی زبان تھی۔

یہود کے علاوہ مدینہ میں عیسائی بھی موجود تھے۔اوس وخزرج (مدینہ کے عرب باشندے) سدّ مأرب کے انہدام کے بعد یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے۔اوس کے قبائل مدینہ منورہ کے جنوب ومشرق میں اور خزرج کے قبائل وسطی اور شمالی علاقے میں آباد ہوئے تھے (رک بہ الانصار اوس خزرج)۔یہود ان دونوں قبیلوں کو لڑاتے رہتے تھے تاکہ مدینہ منورہ پر ان کا اقتصادی تسلط برقرار رہے اور وہ ان کا استحصال کرتے رہیں۔اوس وخزرج کے درمیان آخری جنگ بعاث تھی جو ہجرت سے پانچ سال پہلے ہوئی تھی۔مدینہ میں کئی بازار تھے جن میں سب سے اہم سوق بنی قینقاع تھا جو سونے اور چاندی کے زیورات ومصنوعات اور کپڑے والوں کا خاص بازار تھا۔مدینہ میں سوتی اور ریشمی کپڑے رنگین غالیچے اور منقش پردے عام طور پر موجود تھے۔عطر فروش مختلف قسم کے عطر اور مشک فروخت کرتے تھے۔مدینہ کے بعض گھروں کے ساتھ باغ بھی تھے۔بیٹھنے کے لیے کرسی کا بھی استعمال ہوتا تھا شیشے اور پتھر کے پیالے اور آبخورے مستعمل تھے اور مختلف قسم کے چراغ استعمال ہوتے تھے۔قسم قسم کے زیورات بھی پہنے جاتے تھے جیسے کنگن باز وبند پازیب کان کے بندے اور بالیاں انگوٹھیاں اور سونے یا یمنی دانوں کے ہار وغیرہ۔عورتوں میں بننے اور کاتنے کا عام رواج تھا۔سلائی رنگائی معماری خشت سازی اور سنگ تراشی جیسی صنعتیں ہجرت سے بہت پہلے مدینہ میں رواج پا چکی تھیں۔یہ تھے مدینہ کے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی حالات جب حضرت محمد ﷺ مکہ معظمہ میں مبعوث ہوئے۔

(اردو دائرہ معارف اسلامیہ۔ جلد20)

مراجع

۱:	کلچر کے روحانی عناصر	ڈاکٹر داؤد رہبر
۲:	خطباتِ بہاول پور	ڈاکٹر محمد حمید اللہ
۳:	ضیاء القرآن	پیر محمد کرم شاہ
۴:	تعارف القرآن	حمید نسیم
۵:	سیرت النبیؐ (جلد اوّل)	علامہ شبلی نعمانی
۶:	الامین (جلد اوّل)	محمد رفیق ڈوگر
۷:	ارض القرآن	مولانا سیّد سلیمان ندوی
۸:	ارض القرآن	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

چوتھی کتاب:

حیاتِ طیبہ

حیاتِ طیبہ ﷺ

ولادتِ نبوی ﷺ

آخر کار وہ وقت آ پہنچا جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کے ایک حصے کو مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں لا کر بسایا تھا اور جس کے لیے خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت انھوں نے اور ان کے فرزند حضرت اسماعیلؑ نے دعا مانگی تھی کہ:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (البقرہ، ۲: 129)

''اے ہمارے رب! اور تو ان لوگوں میں خود انھی کی قوم سے ایک ایسا رسول اٹھائیو جو انھیں تیری آیات سنائے۔ ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کی زندگیاں سنوارے۔''

اس مبارک ساعت کے آنے سے تقریباً دو ماہ قبل ابرہہ ساٹھ ہزار فوج لے کر مکہ پر حملہ آور ہوا تھا۔ اصحاب الفیل کا یہ واقعہ، جس کا مفصل ذکر گزشتہ باب میں ہو چکا ہے، محرم میں پیش آیا تھا اور حضرت محمد ﷺ کی ولادت ربیع الاول میں ہوئی۔ جمہور مؤرخین و محدثین کا اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کی ولادت سعادت موسم بہار میں دوشنبہ (پیر) کے دن بارہ ربیع الاول سن ایک عام الفیل / اپریل ۵۷۱ء کو مکہ مکرمہ میں ہوئی۔

تاریخ انسانیت میں یہ دن سب سے زیادہ بابرکت، سعید اور درخشاں و تابندہ تھا۔ حضور ﷺ کی ولادت کے سلسلے میں یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ ربیع الاول کا مہینا اور دوشنبہ کا دن تھا اور وقت بعد از صبح صادق و قبل از طلوعِ آفتاب۔

دوشنبہ کا دن حضور ﷺ کی مبارک زندگی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ دوشنبہ کو پیدا ہوئے۔ دوشنبہ کے دن آپ ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا گیا۔ دوشنبہ کو مکہ سے مدینے کو ہجرت کے لیے نکلے اور دوشنبہ کو آپ ﷺ مدینے میں تشریف لے گئے۔ دوشنبہ کے دن آپ ﷺ نے اس دار فانی کو خیر باد کہا اور دوشنبہ کے دن ہی آپ ﷺ نے حجر اسود کو (۳۵ برس کی عمر میں) بیت اللہ میں نصب فرمایا تھا۔ ایک روایت میں دوشنبہ کے ساتھ ۱۲۔ ربیع الاول کا بھی ذکر ہے اور ساتھ ہی معراج نبوی کا دن بھی دوشنبہ بتایا گیا ہے۔

جمہور کے نزدیک ولادت مبارک کی تاریخ قمری حساب سے ۱۲۔ ربیع الاول ہے، مگر کتب سیرت میں حضور ﷺ کی ولادت کے سلسلے میں اور تاریخیں بھی مذکور ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

❀ سیرت النبی (علامہ شبلی نعمانی)......دوشنبہ 9۔ ربیع الاول 20۔ اپریل 571ء
❀ رحمت للعالمین (قاضی محمد سلیمان منصور پوری)......دوشنبہ 9۔ ربیع الاول۔ 22۔ اپریل 571ء
❀ تاریخ ابن ہشام......دوشنبہ 9۔ ربیع الاول۔ 22۔ اپریل 571ء
❀ تاریخ ابن خلدون (ابن خلدون)......دوشنبہ۔ 12۔ ربیع الاول
❀ سیرۃ المصطفیٰ (مولانا ادریس کاندھلوی)۔ دوشنبہ 8۔ ربیع الاول۔ اپریل 570ء
❀ قصص القرآن (مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی)......دوشنبہ 9۔ ربیع الاول۔ 21۔ اپریل۔
❀ محسن انسانیت (مولانا نعیم صدیقی)......دوشنبہ 9۔ ربیع الاول 22۔ اپریل 571ء
❀ حیاتِ سرور کائنات (ملا واحدی)......دوشنبہ 12۔ ربیع الاول 20۔ اپریل 571ء
❀ تحقیق (ڈاکٹر محمد حمید اللہ)......دوشنبہ۔ 12۔ ربیع الاول 17۔ جون 569ء

حضور ﷺ کی تاریخ ولادت کی مطابقت سے دنیا کے مشہور و مروجہ سنین کی کیفیت یہ تھی:

22۔ ربیع الاول	1 عام الفیل
18 ماہ دے	40 نوشیروانی (ایران)
25۔ ماہ برمودہ	287 قبطی جدید
22۔ اپریل	581 عیسوی
20 ماہ ہفتم	2585 ابراہیمی
یکم جیٹھ	628 بکرمی شمسی
یکم جیٹھ	3672 کل جگ
18 ماہ توت	1319 بخت نصری
10 ماہ ایار	4331 عبرانی

آپ ﷺ کی والدہ سیدہ آمنہؓ اس رات اپنے میکے میں تھیں۔ سیدہ کے والد وہب بن عبد مناف بنو زہرہ کے سردار اور قریش میں نہایت معزز و محترم تھے۔ جب آپ ﷺ کی ولادت کی اطلاع آپ ﷺ کے دادا جناب عبدالمطلب کو دی گئی تو وہ بہت خوش ہوئے، کیوں کہ آپ ﷺ ان کے مرحوم پیارے فرزند جناب عبداللہ کی یادگار تھے۔ اپنے نوجوان بیٹے کی اچانک وفات سے ضعیف العمر باپ کو جو شدید صدمہ ہوا تھا، آپ ﷺ کی ولادت سے ایک حد تک اس کا ازالہ ہو گیا۔ جناب عبدالمطلب کے دوسرے بیٹوں کو بھی بڑی خوشی ہوئی۔ آپ ﷺ کے چچا، ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے جب آپ ﷺ کی ولادت کی خوش خبری اپنے مالک کو

سنائی تو ابولہب نے خوش ہو کر اسے آزاد کر دیا۔

جناب عبدالمطلب خوشی خوشی پوتے کو دیکھنے کے لیے گھر آئے۔ آپ ﷺ کو گود میں اٹھا کر یمن و برکت کے لیے خانہ کعبہ میں لائے اور آپ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کے پاس واپس لے آئے۔ سیدہ آمنہؓ نے انھیں اپنے خوابوں سے بھی آگاہ کیا تھا جو سیدہ نے آپ ﷺ کی ولادت سے پہلے دیکھے تھے۔ بکثرت روایات میں سیدہ آمنہ کا یہ بیان نقل ہوا ہے کہ جب آپ ﷺ پیدا ہوئے تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے اندر سے ایک نور نکلا ہے جس سے مشرق و مغرب روشن ہو گئے ہیں۔ (بیہقی) اور ابن عبدالبر نے عثمان بن ابی العاص ثقفی کی ماں کا بیان نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ کی ولادت کے وقت وہ بی بی آمنہ کے پاس موجود تھی۔ اس وقت جدھر نظر جاتی تھی' نور ہی نور نظر آتا تھا۔ ولادت کے وقت دایہ کی خدمت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی والدہ شفا بنت عوف بن عبدالحارث زہری نے انجام دی۔

حضور ﷺ کے اسمائے گرامی

سنت ابراہیمیؑ کے مطابق عربوں' بالخصوص قریش مکہ میں عقیقہ کرنے کا دستور تھا۔ چناں چہ جناب عبدالمطلب نے ساتویں دن اپنے پوتے کا عقیقہ کیا اور ختنہ کرایا (آپ ﷺ کے مختون پیدا ہونے کی روایات بھی منقول ہیں)۔ اس موقع پر جانور ذبح کر کے قریش کو کھانے کی دعوت بھی دی۔ کھانے کے بعد قریش نے پوچھا: "اے عبدالمطلب! آپ نے اپنے جس بیٹے کے لیے ہماری ضیافت کی ہے' اس کا نام کیا رکھا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ میں نے اس کا نام محمد ﷺ رکھا ہے' اور میں چاہتا ہوں کہ آسمان میں اللہ اور زمین میں اس کی مخلوق آپ ﷺ کی تعریف کرے۔ یہ بھی روایات ہیں کہ آپ ﷺ کا اسم گرامی "محمد" الہامی ہے۔ نیز آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے خالق حقیقی کی طرف سے اشارہ پا کر آپ ﷺ کا نام احمد رکھا۔

حضور ﷺ کے یہ معروف اسمائے گرامی محمد ﷺ اور احمد ﷺ دونوں کا مادہ حمد ہے اور حمد کا مفہوم یہ ہے کہ کسی کے اخلاقِ حسنہ' اوصاف حمیدہ' کمالات جمیلا اور فضائل و محاسن کو محبت' عقیدت اور عظمت کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اسم پاک محمد ﷺ مصدر تحمید (باب تفعیل) سے مشتق ہے اور اس باب کی خصوصیت مبالغہ اور تکرار ہے۔ لفظ محمد ﷺ اسی مصدر سے اسم مفعول ہے اور اس سے مقصود وہ ذات بابرکات ہے' جس کے حقیقی کمالات' ذاتی صفات اور اصلی محامد کو عقیدت و محبت کے ساتھ بکثرت اور بار بار بیان کیا جائے۔ لفظ "محمد ﷺ" میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ وہ ذات جس میں خصائل محمودہ اور اوصاف حمیدہ بدرجۂ کمال موجود ہوں۔

"احمد" اسم تفضیل کا صیغہ ہے۔ بعض اہل لغت کے نزدیک یہ اسم فاعل کے معنی میں ہے اور بعض کے نزدیک اسم مفعول کے معنی ہیں۔ اسم فاعل کی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی حمد وستائش کرنے والا' اور مفعول کی صورت میں سب سے زیادہ تعریف کیا گیا اور سراہا گیا۔

لفظ محمد ﷺ تو پہلے بھی عرب میں شاذ و نادر بعض لوگوں کا نام تھا' مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پہلے کسی کا نام احمد ﷺ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کے ذریعے سے اہلِ عرب کو کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ ایک نبی اور آنے والا ہے جس کا نام محمد ﷺ ہوگا اور وہ بنی اسماعیل میں سے ہوگا۔ یہ باتیں سن کر عرب کے بعض لوگوں نے اپنے بیٹوں کے نام "محمد" رکھے تھے تا کہ شاید وہی نبی ہو جائے۔ حافظ ابن حجر نے "فتح الباری" میں لکھا ہے کہ میں نے تلاش و جستجو سے پندرہ ایسے اشخاص کے نام معلوم کیے ہیں' جن میں سے بعض نے حضور ﷺ کا زمانہ پایا اور اسلام بھی قبول کیا۔ مشیت الٰہی دیکھیے کہ محمد نام کے ان لوگوں میں سے کسی نے بھی نبوت و رسالت کا دعویٰ نہیں کیا۔

آپ ﷺ کا اسم گرامی "احمد" قرآن مجید میں صرف ایک مرتبہ مذکور ہے اور وہ بھی حضرت عیسیٰؑ کی پیش گوئی کے طور پر۔

﴿وَمُبَشِّرًا ۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ ۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ﴾ (الصّف،6:61)

"یعنی میں (عیسیٰؑ) اس رسول کی بشارت سناتا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور جس کا نام احمد ہوگا۔"

آپ ﷺ کا اسم گرامی محمد ﷺ چار مرتبہ قرآن مجید میں آیا ہے اور ہر مرتبہ آپ ﷺ کے منصب رسالت کے سیاق و سباق میں:

(1)..... ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ﴾ (آلِ عمران،144:3)

"محمد ﷺ تو اللہ کے رسول ہیں۔"

(2)..... ﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب،40:33)

(ترجمہ: محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں بلکہ اللہ کے پیغمبر اور نبیوں (کی نبوت) کی مہر (یعنی اسے ختم کر دینے والے ہیں۔)

(3)..... ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰي مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ﴾ (محمد،2:47)

"اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور جو (کتاب) محمد ﷺ پر نازل ہوئی' اسے مانتے رہے اور وہ ان کے رب کی طرف سے برحق ہے' ان کے گناہ معاف کر دیے اور ان کی حالت سنوار دی۔"

(4)..... ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ﴾ (الفتح،29:48)

"محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔"

ان چاروں آیات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کا نام لے کر آپ ﷺ کی رسالت و نبوت کے منصب کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے' تا کہ کسی قسم کے شک و شبے کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اسی مناسبت کی بنا پر آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کی امت نے دنیا کی تمام قوموں اور امتوں سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی

حمد وستائش کی اور قیامت تک کرتی رہے گی۔ ہر کام کے آغاز واختتام پر اللہ تعالیٰ کی تعریف اور حمد کا حکم دیا گیا اور امت کا ہر فرد یہ فریضہ انجام دے رہا ہے۔ بالکل اسی طرح حضور ﷺ کے محامد ومحاسن اور خصائل محمودہ اوصاف حمیدہ اور فضائل وکمالات کا بیان اور ذکر جس کثرت سے کیا گیا ہے اور ابد تک کیا جاتا رہے گا اس کی مثال بھی دنیا میں نہیں مل سکتی۔

رضاعت

حضور ﷺ کو آپ کی والدہ سمیت آٹھ عورتوں نے دودھ پلایا۔ (1) والدہ ماجدہ (2) ثوبیہ (3) خولہ بنت المنذر (4) سعدیہ (حلیمہ نہیں)۔ 5 تا 7 اور تین عورتوں نے جن کا نام عاتکہ تھا اور آخر میں (8) حلیمہ سعدیہ۔ والدہ ماجدہ نے سات روز۔ ثوبیہ نے آٹھ روز اور بقیہ عورتوں کا حال معلوم نہیں۔ جب حلیمہ آپ کو لے گئیں تو آپ ﷺ کم وبیش ایک ماہ کے تھے۔

حضور ﷺ نے سب سے پہلے اپنی والدہ حضرت آمنہ کا دودھ پیا۔ والدہ کے بعد دودھ پلانے کی سعادت حضرت ثوبیہ کے حصے میں آئی۔ اس وقت ان کا بیٹا مسروح آپ کا دودھ شریک بھائی تھا۔ ثوبیہ آپ ﷺ کے چچا عبدالعزیٰ یعنی ابولہب کی لونڈی تھی۔ اس نے آپ کی ولادت کی خوشی میں انھیں آزاد کر دیا۔ ثوبیہ کو اسلام قبول کرنے کی عزت بھی حاصل ہوئی۔ انھوں نے حضور ﷺ کے ہم عمر چچا حضرت حمزہؓ کو بھی دودھ پلایا۔ ان کے علاوہ عبداللہ بن جحش (ام المؤمنین حضرت زینبؓ بنت جحش کے سگے بھائی) اور ابوسلمہؓ (ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر) نے بھی ان کا دودھ پیا۔ اس لیے یہ حضرات حضور ﷺ کے رضاعی بھائی تھے۔ اسی خدمت کے صلے میں حضور ﷺ جوان ہونے کے بعد ہمیشہ ثوبیہ کے ساتھ حسن سلوک فرماتے رہتے تھے اور حضور ﷺ کی شادی ہونے کے بعد حضرت خدیجہؓ بھی ان کی تکریم اور ان کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرتی تھیں۔ ہجرت کے بعد حضور ﷺ مدینہ سے ثوبیہ کے لیے کپڑا اور خرچ بھیجا کرتے تھے۔ 7 ہجری میں فتح خیبر کے بعد وہ وفات پا گئیں۔ فتح مکہ کے وقت حضور ﷺ نے بطور خاص دریافت فرمایا کہ کوئی ان کی اولاد میں باقی ہے۔ معلوم ہوا کہ مسروح بھی فوت ہو گئے اور کوئی ان کے عزیزوں میں زندہ نہیں۔

حلیمہ سعدیہ

شرفائے مکہ کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلانے کے لیے صحرائی علاقوں کے اچھے قبائل میں بھیج دیتے تھے تاکہ عمدہ اور کھلی آب و ہوا میں پرورش پائیں اور عربی زبان کی فصاحت اور اہل عرب کی دیگر خصوصیات اوائل عمر ہی سے بچوں میں واضح ہو جائیں۔

صحرائی علاقوں کے قبائل کی عورتیں وقتاً فوقتاً مکہ آیا کرتی تھیں اور امراً اور سرداروں کے بچے لے جاتی تھیں جن سے انھیں معقول معاوضے ملتے تھے اور بعد میں بھی حسن سلوک کی توقع ہوتی تھی۔ اسی سلسلے میں حضور ﷺ کی ولادت کے کچھ مدت بعد بنی سعد (قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ) کی کچھ عورتیں بچے لینے کے مکہ گئیں جن میں حلیمہ بنت ابی ذویب بھی اپنے شوہر حارث بن عبداللہ کے ساتھ شامل تھیں۔

ابن ہشام نے حلیمہ کا اپنا بیان نقل کیا ہے کہ ''یہ سال قحط اور خشک سالی کا سال تھا۔ ہم بہت خستہ حال تھے۔ ہمارے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا جس پر گزر اوقات کر سکیں۔ ہماری گدھی اس قدر کمزور تھی کہ قافلے کے پیچھے رہ جاتی تھی۔ ہماری اونٹنی بھی ذرا دودھ نہ دیتی تھی۔ میری چھاتیوں میں بھی دودھ اتنا کم تھا کہ میرے بچے کا پیٹ نہ بھر سکتا تھا۔ رات بھر روتا رہتا تھا اور ہم سو بھی نہ سکتے تھے۔ بڑی مشکل سے ہم مکہ پہنچے اور سب نے بچے تلاش کرنے کے لیے گھر گھر چکر لگانے شروع کیے۔ بنی سعد کی عورتیں سیدہ آمنہ کے نونہال کے پاس بھی گئیں لیکن جب انھیں پتا چلتا کہ یہ یتیم ہے تو وہ واپس لوٹ آتیں یہ خیال کرتے ہوئے کہ اس کا باپ تو ہے نہیں جو ہماری خدمت پر ہمیں انعام واکرام سے مالا مال کر دے گا۔ بیوہ ماں اور بوڑھا دادا ہماری کیا خدمت کرے گا۔ چند دنوں میں ہر عورت کو بچہ مل گیا۔ ایک میں تھی جس کی گود خالی تھی۔ میری غربت تنگ دستی اور خستہ حالی کو دیکھ کر کوئی خاندان مجھے اپنا بچہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ آخر میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ بخدا میں خالی واپس گھر نہیں جاؤں گی۔ میں اس یتیم بچے ہی کو لے آتی ہوں۔ کم از کم خالی گود تو واپس نہیں جاؤں گی۔ میرے شوہر نے کہا ''ٹھیک ہے۔ اس یتیم بچے کو لے آؤ۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ اسی میں ہمیں برکت دے دے۔ چنانچہ میں گئی اور صرف اسی لیے اس بچے کو لے لیا کہ کوئی اور بچہ مجھے نہ ملا تھا۔ اپنے پڑاؤ پر پہنچ کر اس بچے کے منہ میں اپنی چھاتی دی تو اتنا دودھ اترا کہ وہ بھی سیر ہو گیا اور اس کے دودھ شریک بھائی نے بھی (جس کا نام عبداللہ رکھا تھا) خوب پیٹ بھر کر پی لیا۔ پھر میرے شوہر نے اونٹنی کا دودھ نچوڑنا شروع کیا تو اس نے اتنا دودھ دیا کہ ہم دونوں اچھی طرح سیر ہو گئے اور رات ہم نے بڑے آرام سے گزاری۔ صبح میرے شوہر نے کہا خدا کی قسم حلیمہ تو نے بڑا ہی مبارک بچہ لیا ہے۔

حلیمہ کہتی ہیں جب سب عورتوں کو رضاعت کے لیے بچے مل گئے تو ہمارا کارواں اپنے مسکن کی طرف روانہ ہوا۔ ساری خواتین اپنے نئے بچوں کے ساتھ اپنی اپنی اونٹنیوں پر سوار ہوئیں۔ میرے پاس وہی گدھی تھی جو کمزوری کے باعث چل نہیں سکتی تھی جس نے آتے ہوئے سارے قافلے کو پریشان کر دیا تھا۔ میں اپنے فرزند کے ساتھ اس پر سوار ہوئی۔ اب تو اس کی حالت ہی بدل گئی تھی۔ تیزی سے یوں قدم اٹھاتی تھی کہ قافلے کی ساری سواریاں پیچھے رہ گئیں۔ وہ گویا چل نہیں رہی تھیں بلکہ اڑ رہی تھی۔ قافلے والیاں چیخ اٹھیں۔ کہنے لگیں: اے ابی ذویب کی بیٹی! خدا تیرا بھلا کرے ہم پر رحم کر اور اپنی گدھی کو آہستہ آہستہ چلا۔ بھلا یہ تو بتا کیا یہ تیری وہی گدھی ہے جس پر تو ہمارے ساتھ آئی تھی جو قدم اٹھانے سے معذور تھی۔ اب اسے کہاں سے پر لگ گئے کہ اڑتی چلی جا رہی ہے۔ میں نے کہا ہاں بخدا یہ وہی گدھی ہے۔ ہم وطن واپس پہنچے تو زمین پر شاید ہی کوئی علاقہ اتنا اجاڑ ہو جتنا ہمارا گھر تھا۔ مگر میری بکریاں جہاں جاتیں پیٹ بھر کر چارہ کھاتیں اور خوب دودھ دیتیں۔ اس طرح ہم روز بروز اس بچے

کی برکتیں زیادہ ہی دیکھتے رہے۔ دو سال گزرے اور دودھ چھڑانے کا وقت آیا تو وہ بچہ سارے قبیلے کے بچوں سے زیادہ تن درست وتوانا تھا' اور ایسا لگتا تھا جیسے چار برس کا ہو۔ ہم اسے مکہ اس کی ماں کے پاس واپس لے گئے' مگر ہمارا جی چاہتا تھا کہ وہ ہمارے یہاں کچھ مدت اور رہے۔ میں نے اس کی ماں سے کہا کہ میرے اس بیٹے کو میرے پاس ابھی اور رہنے دو' تا کہ یہ خوب پل کر تنومند ہو جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مکے کی خراب آب وہوا اس کی صحت پر برا اثر نہ ڈالے۔ مکے کی وبازدہ فضا اور آلودہ ماحول سے ان کا دور رہنا ہی بہتر ہے۔ میں نے اس بات پر اتنا اصرار کیا کہ وہ اسے پھر میرے ساتھ بھیجنے پر راضی ہو گئیں۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اس طرح حضور ﷺ مزید دو سال حلیمہؓ کے ہاں رہے۔

شقِ صدر کا واقعہ

حلیمہ کا بیان ہے کہ واپس آ کر ہم ابھی دو تین ہی مہینے رہے تھے کہ ایک روز وہ بچہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پیچھے ہماری بکریوں میں تھا۔ اتنے میں اس کا بھائی دوڑتا ہوا آیا اور کہا:

''میرے اس قریشی بھائی کے پاس دو سفید پوش آدمی آئے اور انھوں نے اس کا پیٹ چاک کر دیا۔''

میں اور میرا شوہر دونوں بھاگتے ہوئے گئے تو دیکھا کہ وہ بچہ کھڑا ہے اور اس کا رنگ فق ہے۔ اس کے باپ نے اسے لپٹا لیا اور پوچھا' بیٹا تجھے کیا ہو گیا؟ اس نے کہا دو آدمی سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے۔ مجھے لٹا کر میرا پیٹ چاک کیا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر پھینک دی اور پیٹ کو پھر ویسا ہی کر دیا' جیسا وہ تھا۔ حلیمہ کہتی ہیں کہ ہم اسے گھر واپس لائے تو میرے شوہر نے کہا' حلیمہ مجھے ڈر ہے کہ اس بچے کو کچھ ہو نہ جائے۔ بہتر یہی ہے کہ اسے اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔ چناں چہ ہم اسے اس کی ماں کے پاس لے گئے۔ انھوں نے کہا: ''اناؔ تم کیسے اسے واپس لے آئیں۔ تم تو اسے اپنے پاس رکھنے کے لیے بڑی حریص تھیں؟'' میں نے کہا: ''اللہ نے اب بچے کو خوب پال کر بڑا کر دیا ہے اور میری جو ذمہ داری تھی' وہ میں نے پوری کر دی ہے۔ اب مجھے اندیشہ ہے کہ اسے کچھ حوادث پیش نہ آ جائیں۔'' بی بی آمنہ نے کہا: ''اصل بات کیا ہے' مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔'' حلیمہؓ نے ان کے اصرار پر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ انھوں نے کہا: ''کیا تمھیں اس بچے کے معاملے میں شیطان کا خوف ہے؟'' حلیمہؓ نے کہا: ''ہاں'' انھوں نے کہا: ''خدا کی قسم' شیطان کے لیے اس پر کوئی راہ نہیں۔ میرے اس بچے کی بڑی شان ہے۔'' پھر بی بی آمنہ نے حلیمہ کو زمانہ حمل کے واقعات اور پیدائش کے وقت کے حالات بتائے۔

ابن سعد نے لکھا کہ شق صدر کا واقعہ چار برس کی عمر میں پیش آیا۔ ابن جوزی نے بھی یہی لکھا ہے۔ احمد قسطلانی کا خیال ہے کہ غسلِ قلب کا واقعہ شیر خوارگی کے زمانے ہی پر موقوف نہیں' بلکہ متعدد بار ہوا۔ پہلی دفعہ عالم طفلی میں' دوسری بار صحرا میں' جب کہ آپ کی عمر دس سال تھی۔ تیسری مرتبہ یہ واقعہ غارِ حرا میں نزولِ وحی کے وقت پیش آیا

اور چوتھی مرتبہ سفر معراج کے موقع پر۔ اگر کوئی بات ناقص انسانی فہم سے بالاتر ہو تو اس کا انکار جہالت کی دلیل ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے سورہ ''الم نشرح'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ پہلی مرتبہ دل سے حب لہو ولعب نکالا گیا۔ دوسری مرتبہ شق صدر متوقع جوانی کی ترغیبات کے تدارک کے لیے تھا۔ تیسری مرتبہ قلب کو وحی کے تحمل کے قابل بنایا گیا۔ چوتھی مرتبہ معراج کے موقع پر قلب کو عالم ملکوت کے مشاہدے کی قوت دینے کے لیے۔

مولانا مودودی کا خیال ہے کہ ''شقِ صدر کا واقعہ اسرارِ الٰہی میں سے ہے' جس کی کنہ کو انسان نہیں پہنچ سکتا۔ انبیائے کرام کے ساتھ ایسے عجیب واقعات بے شمار پیش آئے ہیں' جن کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ لیکن توجیہ کا ممکن نہ ہونا اس کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ان کا انکار کر دیا جائے۔'' (سیرت عالم۔ جلد دوم' صفحہ 97)

پیر محمد کرم شاہ الازہری اس واقعے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شق صدر کے بارے میں جو روایات کتب حدیث میں موجود ہیں' ان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ خواب کا واقعہ نہیں ہے' بلکہ عالم بیداری میں حسی طور پر سینہ مبارک شق کیا گیا۔ قلب انور باہر نکالا گیا۔ اسے چیرا گیا۔ اس میں سے خون کا لوتھڑا کاٹ کر الگ کیا گیا۔ پھر اسے دھویا گیا۔ پھر اسے اپنے مقام پر رکھ کر سینہ مبارک کو سی دیا گیا۔ عرصہ دراز تک اس واقعے پر یہ اعتراض کیا جاتا رہا کہ ایسا ممکن نہیں...... واقعہ شق صدر پر آج سے چند سال قبل جو اعتراضات کیے جاتے تھے' انسانی علم کی پیش قدمی نے اب ان بنیادوں کو بھی مسمار کر دیا ہے۔ آج بہت سے ترقی یافتہ ممالک کے سرجن دل کا آپریشن کر رہے ہیں۔ وہ دل کو اپنی جگہ سے نکال کر باہر سینہ پر رکھ دیتے ہیں۔ انسان اس سارے عرصے میں زندہ رہتا ہے اور صحت یاب ہو کر پہلے سے بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتا ہے...... یورپ کے بعض مؤرخین جہاں بھی انھیں موقع ملتا ہے' حضور ﷺ کی بے داغ سیرت پر اعتراض کرنے سے باز نہیں آتے' اور جب وہ اعتراض کرتے ہیں تو اس وقت انھیں یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ علم وتحقیق کے اس بلند مرتبے پر فائز ہونے کے باوجود وہ کیسی بچگانہ اور مضحکہ خیز بات کر رہے ہیں...... پروفیسر نکلسن اپنی کتاب ''تاریخ ادبیات عربی'' اور سر ولیم میور اپنی کتاب ''دی لائف آف محمد ﷺ'' میں لکھتے ہیں کہ شق صدر کا واقعہ مرگی کے ایک دورے کی کیفیت تھی۔ لکھنے کو تو انھوں نے لکھ دیا' لیکن انھوں نے یہ نہ سوچا کہ اس جھوٹے الزام کو کون تسلیم کرے گا۔ مرگی کے مریضوں کی جو ذہنی کیفیت ہوتی ہے اور جو بے سروپا ہذیان سرائی وہ کرتے ہیں' کیا اس کا دور کا بھی تعلق اس مقدس زندگی سے ہو سکتا ہے جس کا ہر فعل' جس کا ہر قول' جس کی ہر حرکت اپنے اعتدال' اپنی حکمت اور اپنی ہدایت بخشی میں بے نظیر وبے مثیل ہے۔'' (ضیاء النبی ﷺ جلد دوم۔ صفحہ 75)

ڈاکٹر محمد حسین ہیکل رقم طراز ہیں: ''مستشرقین اور مسلمان محققین اس داستان کی تردید اس بنا پر کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ ایسے واقعات کے مجموعے کا نام ہے جن سے کمالِ انسانیت کی آئینہ داری ہوتی ہے۔ آپ کو دیگر انبیائے

کرام کی طرح اپنی رسالت کے ثبوت میں معجزات کے ظہور کی احتیاج ہرگز نہ تھی۔ مؤرخین اسلام بھی اس نظریے کی تائید اور ان تمام واقعات کی جن سے عقل سلیم ابا کرتی ہے، تردید کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو روایات مشہور ہیں، وہ ان کے نزدیک قرآن کریم کی آیات بینات کے منافی ہیں۔ قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ کسی صورت میں بھی لوگوں کو غور و فکر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ فطرت الٰہیہ میں تغیر یا تبدل رونما نہیں ہوتا۔ اس نے مشرکین کی مذمت اس بنیاد پر کی ہے کہ وہ دل و دماغ کی قدرتی صلاحیتوں سے کام نہیں لیتے، اور ان کی ہر بات اور ہر فعل سے حماقت ٹپکتی ہے۔"

صحرا میں پانچواں سال

آنحضرت ﷺ پورے پانچ سال بنی سعد کی کفالت میں صحرا کی آزاد فضا اور صحت بخش آب و ہوا میں آزادی اور مستقل مزاجی کے ساتھ رہتے اور درست عربی لہجہ سیکھتے رہے۔ چوں کہ آپ ﷺ قریشی تھے اور بنی سعد میں آپ ﷺ نے بچپن گزارا تھا، جن کی زبان ٹھیٹھ عربی تھی۔ اسی بنا پر آپ کبھی کبھی اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے تھے: "میں تم میں سب سے زیادہ عربی دان ہوں۔ میں قریشی ہوں اور بنی سعد بن بکر میں میری رضاعت کا زمانہ گزرا ہے۔"

صحرا میں ابتدائی چند سال رہنے سہنے سے آپ ﷺ کی طبیعت اور صحت پر خوشگوار اثر پڑا تھا۔ آپ ﷺ ہمیشہ بی بی حلیمہ اور ان کے افرادِ خانہ کے ساتھ حسنِ خلق اور تعظیم و تکریم سے پیش آتے تھے۔ چناں چہ ام المومنین حضرت خدیجہؓ سے شادی ہونے کے ایک سال بعد بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑ گیا تھا۔ بی بی حلیمہ حضور ﷺ کے پاس آئیں۔ جب واپس جانے لگیں تو حضور ﷺ نے ایک اونٹ اور چند بکریاں انھیں مرحمت فرمائیں۔

ایک عورت نے حضور ﷺ کے پاس حاضر ہونے کی اجازت مانگی؛ جس نے بچپن میں آپ ﷺ کو دودھ پلایا تھا۔ وہ آئی تو آپ ﷺ میری ماں، میری ماں کہتے ہوئے اٹھے اور اپنی چادر بچھا کر اسے بٹھایا۔

فتح مکہ کے موقع پر حلیمہ کی بہن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آپ ﷺ کو حلیمہ کے انتقال کی خبر دی تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر آپ ﷺ نے اسے دو سو درہم اور کپڑے دیئے اور سواری کے لیے کجاوے سمیت ایک اونٹ عطا فرمایا۔

غزوۂ ہوازن کے موقع پر جو لوگ قید ہو کر آئے تھے، ان میں حلیمہ کی وہ لڑکی شیما بھی شامل تھی، جو بچپن میں حضور ﷺ کو گود میں لیے پھرتی تھی۔ حضور ﷺ نے اسے پہچان لیا۔ بہت مہربانی کے ساتھ پیش آئے اور ان کی خواہش کے مطابق انھیں قبیلہ بنی ہوازن کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ہوازن کے وفد نے جب حضور ﷺ سے رحم کی درخواست کی اور کہا کہ ان قیدیوں میں آپ ﷺ کی خالائیں بھی ہیں، آپ کی انائیں بھی ہیں، جنھوں نے بچپن میں آپ ﷺ کو گودیوں میں کھلایا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو میرا اور بنی عبدالمطلب کا حصہ ہے، وہ میں نے چھوڑا۔ اس پر انصار نے کہا، جو ہمارا حصہ ہے، وہ ہم نے اللہ اور اللہ کے رسول کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ اس طرح چھے ہزار قیدی رہا کر دیئے گئے اور زرِ کثیر واپس دیا گیا۔ حضور ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ فاروق بھی حلیمہ کے خاندان کا خاص خیال رکھتے اور اس سے حسنِ سلوک اور تکریم کے ساتھ پیش آتے رہے۔

چھٹا سال والدہ ماجدہ کا انتقال

قبیلہ بنی سعد سے واپسی کے وقت آپ ﷺ چھ سال کے تھے۔ ساتواں سال پورا نہ ہوا تھا کہ بی بی آمنہ آپ کو ساتھ لے کر مدینہ کے لیے روانہ ہوئیں۔ اس سفر میں آپ ﷺ کی دایہ ام ایمن بھی آپ کے ساتھ تھیں۔ مدینہ میں بی بی آمنہ اپنے لختِ جگر کے ساتھ بنو عدی بن نجار کے پاس ٹھہریں، جو آپ ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب کے ننھیال تھے۔ اس سفر میں سیدہ آمنہ کا مقصد اپنے شوہر کی قبر کی زیارت تھا جو مدینہ میں نابغہ کے مکان میں تھی۔ یہاں سیدہ آمنہ نے ایک ماہ تک قیام کیا۔ انھوں نے وہ مکان آپ ﷺ کو دکھایا جہاں آپ کے والد جناب عبداللہ کا انتقال ہوا تھا۔ وہ جگہ دکھائی جہاں وہ مدفون تھے۔ اس سفر کے واقعات حضور ﷺ کو بعد میں اچھی طرح یاد رہے۔ ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لے گئے تو آپ ﷺ اپنے اصحاب کو اس پہلے سفرِ مدینہ کے حالات سناتے تھے جو آپ ﷺ نے اس چھوٹی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ کیا تھا۔ بنو عدی بن نجار کی گڑھی دیکھ کر آپ ﷺ فوراً اسے پہچان گئے۔ فرمایا، یہاں میں انصار کی ایک لڑکی انیسہ کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور اپنے دادا کی ننھیال کے لڑکوں کے ساتھ یہاں اترنے والے پرندوں کو اڑایا کرتا تھا۔ نابغہ کے مکان کو دیکھ کر فرمایا: "یہاں میں اپنی والدہ کے ساتھ اترا تھا اور اسی گھر میں میرے والد کی قبر ہے۔ میں نے بنو عدی بن نجار کے تالاب میں تیراکی کی خوب مشق کر لی تھی۔ جب سیدہ آمنہ نے مکے کو واپسی کا قصد کیا تو راستے میں بیمار ہو گئیں۔ ابواء کے مقام پر ان کا انتقال ہو گیا اور وہ یہیں دفن ہوئیں۔ ام ایمن حضور ﷺ کو لے کر مکہ واپس پہنچیں۔ اس کم سنی میں حضور ﷺ کو اپنی والدہ ماجدہ کی بھی دائمی جدائی اور ممتا سے محرومی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ حضور ﷺ کو وہ جگہ بھی یاد تھی جہاں آپ ﷺ کی والدہ دفن ہوئی تھیں۔ چناں چہ عمرۂ حدیبیہ کے موقع پر جب آپ ﷺ ابواء پر سے گزرے تو فرمایا: "اللہ نے محمد ﷺ کو اپنی ماں کی قبر پر جانے کی اجازت دے دی ہے۔"

پھر آپ ﷺ وہاں تشریف لے گئے۔ قبر کو درست کیا اور بے اختیار رو دیئے۔ آپ ﷺ کو دیکھ کر مسلمان بھی رونے لگے۔ عرض کیا گیا کہ آپ ﷺ تو رونے سے منع فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا "ان کی ممتا مجھے یاد آ گئی اور میں رو دیا۔" اپنی والدہ ماجدہ کی قبر پر حضور ﷺ کے تشریف لے جانے اور آپ ﷺ کے اوپر رقت طاری ہونے کا ذکر متعدد احادیث میں بھی آیا ہے۔

چھٹا سال دادا عبدالمطلب کی کفالت میں

ام ایمنؓ نے اس چراغِ تہِ داماں کو سینے سے لگایا اور مکے کی طرف روانہ ہوئیں۔

وہ ماں کی طرح نگران رہیں اور یہ ماں کہتی ہیں کہ میرے اس جلیل القدر بیٹے نے کبھی بھوک اور پیاس کی شکایت نہیں کی۔ اکثر صبح آب زم زم میں شربت نوش فرماتے۔ پھر رات تک کوئی چیز نہ کھاتے۔ دوپہر میں کھانا سامنے رکھا جاتا تو فرماتے' مجھے اشتہا نہیں ہے۔ حضورﷺ اکثر فرمایا کرتے کہ یہ خاتون میری والدہ کے بعد میری ماں ہیں۔

آپﷺ نے جب حضرت خدیجہؓ سے نکاح کر لیا تو ام ایمنؓ کو آزاد کر دیا۔ حضورﷺ نے نبوت کا اعلان کیا تو اولین تصدیق کرنے والوں میں سے ہوگئیں۔

حضورﷺ نے انھیں آزاد کر کے ان کا نکاح بنی حارث کے عبید بن زید بن عمرو سے کر دیا' جن سے ایمن پیدا ہوئے۔ اسی لیے ان کی کنیت ام ایمن تھی۔ اس شوہر کے انتقال پر حضورﷺ نے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ بن حارثہ سے ان کی شادی کروائی۔ اسامہ ابن زیدؓ ام ایمن کے بطن سے ہوئے جنھیں آپﷺ حقیقی بیٹوں کی طرح چاہتے تھے۔ ام ایمن نے دو ہجرتیں کیں۔ ایک حبشہ اور دوسری مدینہ کی جانب۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔

مکہ پہنچے تو حضرت عبدالمطلب نے یتیم وبیسر پوتے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ اسی سال پوتا شدید آشوب چشم میں مبتلا ہوا تو توجہ سے علاج کروایا۔ افاقہ نہ ہوا تو عکاظ میں ایک عیسائی خانقاہ کے راہب کو دکھلایا۔ دادا نے پوتے کو اپنے ساتھ رکھا اور اپنی تمام اولاد سے بڑھ کر آپﷺ کو چاہا۔ وہ آپﷺ کو ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ اپنے قریب بٹھاتے تھے۔ آپﷺ جس وقت چاہتے' ان کے پاس چلے جاتے تھے' خواہ وہ تخلیے میں ہوں یا سوئے ہوئے ہوں' حالانکہ ان کی دوسری اولاد ان کی ہیبت کی وجہ سے یہ جرات نہ کر سکتی تھی۔ وہ اس وقت تک کھانا نہیں کھاتے تھے' جب تک آپﷺ اس میں شریک نہ ہوں اور کبھی کبھی کھانے کے وقت آپﷺ کو گود میں بٹھا لیتے تھے۔

حضرت عبدالمطلب کے بیٹھنے کے لیے کعبہ شریف کے زیر سایہ فرش بچھایا جاتا۔ حطیم میں ان کی جگہ مخصوص تھی۔ معززین میں سے خود حرب بن امیہ تک' ادب سے اس کے اطراف میں بیٹھتا۔ ان کی عظمت اور وجاہت کی وجہ سے ان کے بیٹے تک مسند پر قدم نہ دھرتے۔ پوتا بڑھ کر مسند پر بیٹھ جاتا۔ چچا پیچھے ہٹانے کو بڑھتے تو عبدالمطلب' جن کی بینائی کم زور تھی' آواز سن کر کہتے' میرے بچے کو نہ ہٹاؤ۔ اس میں خودشناسی کا جوہر ہے۔ خدا کی قسم' اس کی شان ہی کچھ اور ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ یہ ایسے بلند مرتبے پر پہنچے گا جس پر اس سے پہلے کوئی عرب نہیں پہنچا۔''

پھر وہ آپﷺ کو اپنے پاس بٹھا کر آپﷺ کی پیٹھ اور سر پر ہاتھ پھیرتے۔ آپﷺ کا منہ چومتے اور آپﷺ کی حرکات وسکنات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔

جب کوئی قیمتی چیز کھو جاتی تو دادا آپﷺ کو ڈھونڈنے کے لیے کہتے۔ آپﷺ کی ذہانت پر حد درجہ اعتماد تھا اور آپ بھی گم شدہ چیز لے کر ہی واپس لوٹتے۔ ایک دفعہ کچھ اونٹ گم ہوگئے۔ لوگوں نے بہت تلاش کیا۔ ناکام لوٹے۔ دادا نے پوتے سے کہا۔ آپﷺ اس کام پر گئے تو بہت دیر ہوگئی دادا بے حد پریشان ادھر ادھر پھرنے لگے۔ اپنے آپ کو ملامت کر رہے تھے کہ ناحق اس کم سن کو پہاڑوں میں بھیج دیا۔ جانے کیا آفت پیش آئی ہوگی۔ بہت مضطرب ہوگئے تو بیت اللہ پہنچ کر طواف کیا۔ اللہ سے رو رو کر سلامتی کی دعائیں مانگیں۔ کچھ وقت نہیں گزرا کہ پوتا اونٹوں کو لیے لوٹ آیا۔ دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور عہد کیا کہ اب آئندہ کبھی اکیلا نہ بھیجوں گا۔

آخری عمر میں حضرت عبدالمطلب کی بینائی جاتی رہی تھی۔ 44 قبل ہجرت مطابق 579ء میں انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً بیاسی سال اور پوتے کی عمر آٹھ سال تھی۔ سب سے بڑے بیٹے حارث کا تو ان کی زندگی میں انتقال ہو چکا تھا۔ مرتے وقت اپنے بڑے بیٹے زبیر کو اپنا وصی جانشین اور سردار قبیلہ نامزد کیا۔ حضرت عباسؓ کو کعبے کی تولیت بخشی۔ بیٹیوں سے کہا کہ نوحہ کے اشعار سناؤ۔ ایسے میں انتقال ہو گیا۔ اس وقت پوتا دادا کے سرہانے کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔ ماں کے بعد اب محبت کرنے والا دادا بھی وہاں جا رہا تھا جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ جب ان کا جنازہ حجون کے قبرستان لے کر جایا جا رہا تھا تو آٹھ سالہ پوتا بھی میت کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

حضرت عبدالمطلب نے وفات سے پہلے اپنے بڑے بیٹے زبیر کے حق میں صدر خاندان کی وصیت کی۔ یہی ان کے وصی اور جانشین ہوئے۔ حضرت زبیر کوئی تیرہ سال تک بنو ہاشم کے سردار رہے۔ ان کے انتقال کے وقت حضورﷺ کی عمر اکیس بائیس برس کی تھی۔ ان کے بعد ابو طالب بنی ہاشم کے سربراہ اٹھائیس برس تک رہے۔ بعثت نبوی کا دسواں سال تھا اور حضورﷺ کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی کہ حضرت ابو طالب فوت ہوگئے۔ اب بنی ہاشم کی سربراہی دشمن دین ابولہب کے حصے میں آئی۔ وہ پانچ سال سے کچھ زیادہ عرصے تک سردار رہا۔ سن دو ہجری میں غزوۂ بدر کے چھ ماہ بعد سرطان یا طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر عبرت ناک موت پائی۔

ام ایمن کا یہ بیان منقول ہے کہ جب ان کا انتقال ہو رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ رسول کریمﷺ ان کے سرہانے کھڑے رو رہے ہیں۔ بعد کے زمانے میں جب حضورﷺ سے پوچھا گیا کہ آپﷺ کو اپنے دادا صاحب کی وفات یاد ہے؟ آپﷺ نے فرمایا' ہاں میں اس وقت آٹھ برس کا تھا۔

چچا ابو طالب کی کفالت میں

حضرت عبدالمطلب نے اپنی زندگی ہی میں نبی کریمﷺ کی کفالت ابو طالب کے سپرد کر دی تھی' حالانکہ ابو طالب عبدالمطلب کے سب سے بڑے بیٹے نہ تھے حارث سب سے بڑے بیٹے تھے' لیکن صاحب دولت وثروت نہ تھے۔ عباس کے پاس دولت تھی لیکن ان پر دولت کی محبت اتنی غالب تھی کہ کچھ خرچ کرتے ہوئے ان کی جان جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کعبے سے متعلق صرف سقایت کا منصب انھوں نے اپنی تحویل میں لیا تھا۔ رفادت کا عہدہ قبول کرنے سے انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اندریں حالات اگر عبدالمطلب نے ابو طالب کو آنحضرتﷺ کی سرپرستی کے لیے منتخب

ابرہہ کا مکہ مکرمہ پر ناکام حملہ

مدینہ منورہ
(یثرب)

حجاز

نوبیہ

مکہ مکرمہ

طائف

جزیرہ نمائے عرب

سوڈان

(بحیرہ احمر)

شمال
مشرق
مغرب
جنوب

یمامہ

ابرہہ حبشی کی یلغار

بحیرہ قلزم

یمن

صنعاء
حمیر

اکسوم

حبشہ

خلیج عدن

قبائل قریش

جنہیں نبی ﷺ نے دعوتِ اسلام دی

فِہر (قریش)

غالب

لُوَیّ

کعب — عدی

مُرّہ

کلاب

قُصَیّ

عبد مناف — عبد شمس

ہاشم

عبد المطلب

عبد اللہ

محمد رسول اللہ ﷺ

شجرۂ طیبہ

محمد رسول اللہ ﷺ اور دیگر انبیائے کرام علیہم السلام

عیسیٰ علیہ السلام

مریم علیہا السلام سے

یحییٰ علیہ السلام

زکریا علیہ السلام

سلیمان علیہ السلام

داؤد علیہ السلام

اہل نینویٰ کی طرف مبعوث ہوئے۔

یونس علیہ السلام

الیاس علیہ السلام

ہارون علیہ السلام

الیاس علیہ السلام کے عم زاد ساتھی، ان کا نسب یعقوب سے ملتا ہے۔

الیسع علیہ السلام

خاتم النبیین ﷺ جو سب قوموں کی طرف مبعوث ہوئے۔

موسیٰ علیہ السلام

عمران

بنیامین
روبن
شمعون
یہودا
لاوی
آشر
زبولون
دان
نفتالی
جاد
اشکار

ان قبائل سے بنی اسرائیل نکلے

محمد ﷺ

یہ جرہم، عمالیق اور یمن وغیرہ کی طرف بھیجے گئے۔

ذوالکفل

یوسف علیہ السلام

ایوب علیہ السلام

یعقوب علیہ السلام

اسماعیل علیہ السلام

انہیں مدین کے عربوں کی طرف بھیجا گیا۔

شعیب علیہ السلام

عیص

اسحاق

ابراہیم علیہ السلام

زمران
یقشان
معان
اسباق
سوخ
مدین

انہیں اہل دمشق اور مضافات کی طرف بھیجا گیا

انہیں الاحقاف والوں کی طرف بھیجا گیا۔

لوط علیہ السلام

ہاران

آزر

ہود علیہ السلام

سام

عرب بائدہ

یافث

نوح علیہ السلام

حام

صالح علیہ السلام

انہیں ثمود الحجر کی طرف بھیجا گیا

ادریس علیہ السلام

اہل سوڈان، اہل ہند، قبطی وغیرہ

آدم علیہ السلام

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”تمام لوگ آدم سے پیدا کیے گئے اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے تھے۔“

شجرۂ طیبہ امام الانبیاء ﷺ
اور
اُم المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا

فہر (قریش)
غالب
لؤی

- عامر
- معیص
- عبد
- حجر
- رواحہ
- ہرم (ہدم)
- الاصم (جندب)
- زائدہ
- فاطمہ
- خدیجہ رضی اللہ عنہا کی والدہ

کعب

- عدی
- نفیل
- خطاب
- عمر رضی اللہ عنہ
- حفصہ رضی اللہ عنہا

مرہ

- تیم
- ابو قحافہ رضی اللہ عنہ
- ابوبکر رضی اللہ عنہ
- عائشہ رضی اللہ عنہا

- یقظہ
- مخزوم
- ابو امیہ
- ام سلمہ رضی اللہ عنہا

کلاب

- زہرہ
- عبد مناف
- وہب
- آمنہ
- رسول اللہ ﷺ کی والدہ

قصی

- عبد العزیٰ
- اسد
- نوفل
- ورقہ

- خویلد
- خدیجہ رضی اللہ عنہا
- طاہر رضی اللہ عنہ، حارث رضی اللہ عنہ، ہالہ رضی اللہ عنہ، ہند رضی اللہ عنہ
- ہند
- محمد

عبد مناف

- عبد شمس
- امیہ
- حرب
- ابو سفیان رضی اللہ عنہ
- ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

ہاشم
عبد المطلب
عبد اللہ
محمد

رسول اللہ ﷺ سے خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد

قاسم رضی اللہ عنہ، عبد اللہ رضی اللہ عنہ، زینب رضی اللہ عنہا، رقیہ رضی اللہ عنہا، ام کلثوم رضی اللہ عنہا، فاطمہ رضی اللہ عنہا

تو اسمیں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ ابو طالب بے سروسامانی کے باوجود قریش کی نگاہ میں عزت کا مقام رکھتے تھے۔

ابو طالب کا اصل نام عبد مناف تھا' مگر اپنے بڑے بیٹے طالب کی وجہ سے ان کی کنیت ابو طالب اتنی مشہور ہوئی کہ اصل نام اس کے نیچے دب گیا۔ یہ لڑکا حضور ﷺ کا تقریباً ہم عمر تھا اور اسے حضور ﷺ سے بے انتہا محبت تھی۔ غزوہ بدر میں جب قریش کے لوگ بنی ہاشم کو مجبور کر کے لڑنے کے لیے لے گئے تو ان میں طالب بھی تھا' لیکن اس نے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لیا اور بعد میں نہ مقتولوں میں اس کا کہیں پتا چلا نہ زخمیوں میں' اور نہ وہ مکہ واپس پہنچا۔ پھر کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں چلا گیا۔

ابو طالب حضور ﷺ کے حقیقی چچا تھے۔ انھوں نے آپ ﷺ کو خود اپنی اولاد سے بھی بڑھ کر عزیز رکھا۔ اپنے پاس سلاتے تھے۔ جہاں جاتے' ساتھ لے جاتے تھے۔ کھانے کے وقت کوشش کرتے تھے کہ پہلے آپ آ کر شریک ہوں' تب دوسرے کھانا شروع کریں۔ ابو طالب کے اہل و عیال اگر حضور ﷺ کے بغیر کھانا کھاتے' خواہ الگ الگ کھائیں یا مل کر کسی کا پیٹ نہ بھرتا۔ اور جب رسول اکرم ﷺ ان کے ساتھ کھاتے تو سب کا پیٹ بھر کر بھی کھانا بچ رہتا۔ آپ ﷺ کی یہ برکت دیکھ کر ابو طالب نے قاعدہ بنا لیا کہ جب سب کھانے کے لیے بیٹھتے تو وہ کہتے کہ ٹھہر جاؤ' جب تک میرا بیٹا نہ آ جائے۔ پھر جب حضور ﷺ آ جاتے تو کھانا شروع کیا جاتا' اور ابو طالب کہتے کہ بیٹے تم بڑے مبارک ہو۔ کھانے پر حسب قاعدہ جب بچے چھین جھپٹ کرنے لگتے تھے تو حضور ﷺ ہاتھ روک کر بیٹھ جاتے۔ ابو طالب یہ حال دیکھ کر آپ ﷺ کے لیے الگ کھانا نکال کر دینے لگے۔ ابو طالب کے لیے الگ مسند بچھائی جاتی تھی' جس پر کوئی اور نہ بیٹھتا تھا' مگر حضور ﷺ ان کے ساتھ ہی جا کر بیٹھتے تھے۔ اس پر ابو طالب کہا کرتے کہ: ''ربیعہ کے خدا کی قسم' میرے اس بھتیجے پر سرداری بجتی ہے۔''

گلہ بانی

آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کی کم زور مالی حالت اور کثیر العیالی کو دیکھا تو خود کچھ کمانے کی فکر ہوئی۔ کام کرنے میں آپ ﷺ نے عار محسوس نہ کی۔ بچپن میں جب آپ ﷺ اپنی رضاعی والدہ کے ہاں تھے تو اپنے دودھ شریک بھائی بہنوں کے ساتھ ان کے گھر کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔ یہی کام ہوش سنبھال کر آپ ﷺ نے مکہ میں اجرت پر کرنا شروع کر دیا۔ اپنے ایک پڑوسی ابو معیط کی بکریاں مکہ کی ایک پہاڑی چراگاہ اجیاد میں اجرت پر چرانے لگے۔ حضور ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا' کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ لوگوں نے عرض کیا' کہ کیا آپ ﷺ نے بھی چرائی ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا' ہاں۔ صحیح بخاری' کتاب الاجارہ میں ہے کہ ''میں اہل مکہ کی بکریاں کچھ قراریط پر چرایا کرتا تھا''

جو بھی اجرت حاصل ہوتی' اپنے چچا کی نذر کرتے۔ کمائی کا یہ سلسلہ کوئی دس بارہ سال تک چلتا رہا' یہاں تک کہ آپ ﷺ نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ ایک بار ہم لوگ پیلو کے درخت کے پھل (جھڑ بیریاں) توڑ رہے تھے' تو آپ ﷺ نے فرمایا' اس کے جو پھل سیاہ ہو گئے ہوں وہ توڑو کہ وہی سب سے اچھے ہوتے ہیں۔ جب میں بھیڑ بکریاں چراتا تھا تو اس زمانے میں یہی پھل توڑا کرتا تھا۔'' (قراریط) قراط کی جمع ہے جو ایک دینار کے دسویں یا بیسویں حصے کو کہتے ہیں۔ ایک اور روایت کے مطابق قراریط سے مراد نقد رقم نہیں ہے بلکہ یہ اجیاد کے قریب ایک مقام تھا جہاں آپ بکریاں چرایا کرتے تھے' لیکن زیادہ تر محققین نے پہلی روایت کی تائید کی ہے۔

دسواں سال بچپن میں آپ ﷺ کی غیر معمولی شخصیت کا اظہار

حضور ﷺ کی پیدائش سے لے کر دس بارہ سال کی عمر تک کے جو واقعات مستند تواریخ میں بیان کیے جاتے ہیں' ان سے یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ بچپن ہی سے جن لوگوں کو آپ ﷺ سے سابقہ پیش آ رہا تھا' ان کے ذہن پر یہ نقش ثبت ہو چکا تھا گویا کہ یہ کوئی غیر معمولی شخصیت ہے جو ان کے درمیان پیدا ہوئی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ ﷺ کی ذات سے عجیب عجیب برکات کا ظہور ہو رہا تھا' بلکہ آپ ﷺ کی عادات و خصائل عام بچوں سے بالکل مختلف تھیں' معمولی پن نمایاں ہو رہے تھے۔

اس ضمن میں مولانا مودودی رقم طراز ہیں ''بیہقی اور ابن جریر نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا' میرے اندر دو مرتبہ سے زیادہ کبھی ان کاموں سے دل چسپی پیدا نہیں ہوئی جو اہل جاہلیت کیا کرتے تھے' اور دونوں مرتبہ اللہ عزوجل نے مجھے ان سے محفوظ رکھا اور اس کے بعد پھر میرے دل میں ان کا خیال تک نہ آیا۔ ایک روز میں نے اس لڑکے سے جو میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتا تھا' کہا کہ تو ذرا میری بکریوں کی دیکھ بھال کر' تاکہ میں مکہ جا کر رات کی ان دل چسپیوں میں حصہ لوں جن میں دوسرے لڑکے حصہ لیتے ہیں۔ وہ راضی ہو گیا۔ چناں چہ میں شہر کی طرف چلا اور میں نے پہلے ہی گھر میں گانے بجانے کی آوازیں سنیں۔ میں نے پوچھا' یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ فلاں اور فلاں کی شادی ہے۔ میں بیٹھ گیا اور یکا یک مجھے نیند آ گئی' یہاں تک کہ دن نکل آیا اور سورج کی گرمی سے میری آنکھ کھلی میں واپس گیا تو میرے ساتھی نے حال پوچھا۔ میں نے اسے ماجرا سنا دیا۔ دوسری رات میں نے اپنے ساتھی سے پھر وہی بات کہی اور اس نے مان لی۔ میں مکہ میں داخل ہوا تو وہی گانا بجانا پھر ہو رہا تھا۔ میں یہ تماشا دیکھنے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ پھر سو گیا اور دن نکلنے تک سوتا رہا۔ واپس جا کر میں نے اپنے ساتھی کو بتا دیا کہ آج بھی میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کے بعد میرے اندر اس طرح کی کسی چیز کی طرف میلان ہی پیدا نہ ہوا۔

''ابن سعد نے ام ایمنؓ کی روایت نقل کی ہے کہ بوانہ ایک بت تھا' جس کی زیارت کے لیے قریش کے لوگ جایا کرتے تھے۔ وہاں نذریں اور نیازیں چڑھاتے تھے۔ پورے ایک دن اس کے استھان میں اعتکاف کیا جاتا تھا اور پھر قربانی کر کے سر منڈوائے جاتے تھے۔ ابو طالب بھی اس طریقے کے مطابق اپنے خاندان کے

ساتھ وہاں جایا کرتے تھے۔ حضور ﷺ جو اس وقت ایک نوخیز لڑکے تھے' آپ ﷺ سے بھی کہا جاتا تھا کہ آپ ﷺ سب کے ساتھ چلیں۔ مگر ہر سال یہی جھگڑا ہوتا تھا کہ آپ ﷺ ساتھ جانے سے انکار کر دیتے اور اس پر آپ ﷺ کے چچا اور پھوپھیاں سخت ناراض ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ گھر کے بڑوں کی اس ملامت سے تنگ آ کر اس تہوار کے موقع پر چلے گئے اور بڑی دیر تک کہیں غائب رہے' حتیٰ کہ سب گھر والے آپ ﷺ کے لیے پریشان ہو گئے۔ واپس آئے تو سخت خوف زدہ تھے اور چہرے کا رنگ فق تھا۔ پھوپھیاں آپ ﷺ کو دیکھ کر لپکیں اور پوچھا' بچے' یہ تجھے کیا ہو گیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا' مجھے ڈر ہے کہ مجھے کچھ ہو نہ جائے۔ پھوپھیوں نے کہا: ''اللہ تجھے کبھی شیطان کے شر میں مبتلا نہ کرے گا' جب کہ تیرے اندر ایسی اور ایسی خوبیاں ہیں۔'' آپ ﷺ نے کہا' جب کبھی میں اس بت خانے میں کسی بت کی طرف جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی گورے رنگ کا لمبا تڑنگا آدمی کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ: ''اے محمد ﷺ دور رہو' اسے مت چھونا۔'' ام ایمن کہتی ہیں کہ اس کے بعد آپ ﷺ کبھی اس تہوار میں نہیں گئے۔

''ابن ہشام نے ابن اسحاق کا بیان نقل کیا ہے کہ مکہ میں قبیلہ لہب سے تعلق رکھنے والا ایک ماہر علم قیافہ آیا کرتا تھا اور جب کبھی وہ آتا' قریش کے لوگ اپنے اپنے بچوں کو اس کے پاس لے جاتے تھے' تاکہ وہ ان کے قیافے سے ان کے متعلق کچھ بتائے۔ ایک مرتبہ جب وہ آیا تو ابو طالب بھی حضور ﷺ کو دوسرے بچوں کے ساتھ اس کے پاس لے گئے۔ اس نے آپ ﷺ کو دیکھا اور پھر کسی اور طرف مشغول ہو گیا۔ ادھر سے فارغ ہو کر اس نے کہا' اس لڑکے کو لاؤ' جسے ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا تھا۔ ابو طالب نے جب دیکھا کہ وہ آپ ﷺ کو دیکھنے کے لیے بڑی بے تابی کا اظہار کر رہا ہے تو انھوں نے آپ ﷺ کو غائب کر دیا۔ اس نے کہا' اسے میرے پاس لاؤ' خدا کی قسم وہ بہت بڑا آدمی بننے والا ہے۔

''ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک روز قریش کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے میں بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا اور سب لڑکوں نے پتھر اٹھانے کے لیے اپنی اپنی ازار (تہبند) اتار کر گلے میں باندھ رکھی تھی' جس سے سب ننگے ہو جاتے تھے۔ میں نے جو ایسا کیا تو یکایک مجھ پر ایک زور کا گھونسا پڑا اور مجھ سے کسی نے کہا کہ: ''اپنی ازار باندھو۔'' چناں چہ میں نے اپنی ازار باندھ لی۔

''اس طرح لڑکپن ہی میں آپ ﷺ کو عریانی سے روک دیا گیا۔ اس سے ملتی جلتی صورت اس وقت پیش آئی جب سن 35 عام الفیل میں (جب کہ حضور ﷺ 35 سال کے تھے اور آپ ﷺ کے نبوت پر سرفراز ہونے میں ابھی پانچ سال باقی تھے) قریش نے از سر نو کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ اس موقع پر قریش کے سب لوگ اپنی اپنی ازاریں گلے میں باندھے پتھر ڈھوڈھو کر لا رہے تھے اور بڑے چھوٹے کسی کو برہنگی کا احساس تک نہ تھا۔ حضرت عباسؓ نے حضور ﷺ سے کہا' آپ ﷺ بھی ایسا کریں۔ مگر آپ ﷺ نے ایسا کیا ہی تھا کہ آپ ﷺ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے اور نظریں آسمان پر جم گئیں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری ازار۔'' چناں چہ وہ باندھ دی گئی۔ تب آپ ﷺ اٹھے۔

حضور ﷺ کو بچپن ہی سے شرک' بت پرستی اور اس کے تمام مظاہر ولوازم سے سخت نفرت تھی اور قبل نبوت کی زندگی میں آپ ﷺ کا دامن کبھی اس کے غبار تک سے آلودہ نہیں ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے آگے بتوں کے چڑھاوے کا کھانا اور ان کے لیے قربان کیے ہوئے جانور کا گوشت پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اسے کھانے سے انکار کر دیا۔ حضرت عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت خدیجہؓ کے ایک پڑوسی نے بیان کیا کہ ایک روز میں نے نبی کریم ﷺ کو حضرت خدیجہؓ سے یہ فرماتے سنا: ''اے خدیجہ' خدا کی قسم میں ہرگز لات اور عزیٰ کی عبادت نہ کروں گا' خدا کی قسم میں کبھی ان کی عبادت نہ کروں گا۔'' جواب میں حضرت خدیجہؓ کہہ رہی تھیں کہ ''چھوڑیئے لات کو اور چھوڑیئے عزیٰ کو۔'' یہ واقعہ بیان کر کے اس پڑوسی نے حضرت عروہ کو بتایا کہ اس زمانے میں قریش کے لوگ رات کو سونے سے پہلے ان بتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی کے آغاز کا واقعہ ہوگا۔''

(سیرتِ عالم۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۰۳)

بارھواں سال شام کا پہلا سفر

ایک مرتبہ ابو طالب ایک تجارتی قافلے کے ساتھ شام جانے لگے۔ حضور ﷺ کی عمر اس وقت بارہ سال تھی۔ سفر کی صعوبتوں کے پیش نظر ان کا خیال تھا کہ بھتیجے کو ہم راہ نہ لے جائیں' لیکن جب ابو طالب چلنے لگے تو حضور ﷺ ان سے لپٹ گئے۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا' چچا جان' آپ مجھے کس پر چھوڑے جا رہے ہیں۔ میری نہ ماں ہے نہ باپ جو میری دیکھ بھال کرے۔ اس پر ابو طالب کا دل پگھل گیا اور انھوں نے کہا کہ ''خدا کی قسم میں اسے جدا نہ کروں گا' نہ اس سے جدا ہوں گا۔ یہ میرے ساتھ جائے گا۔''

بحیرا راہب کا واقعہ

قریش کا یہ کاروان تجارت سرزمین شام کے ایک مقام بصریٰ میں اترا۔ بصریٰ اس زمانے میں بیت المقدس اور دمشق کے درمیان ایک اہم تجارتی منڈی اور قافلوں کی قیام گاہ تھا۔ یہ علاقہ چوں کہ بیزنطینی رومیوں کے قبضے میں تھا' اس لیے یہاں ایک کلیسا تھا' جس کے ایک نصرانی راہب نے' جو بحیرا کے نام سے مشہور تھا اور جس کا اصلی نام جرجیس تھا' قریش کے اہل قافلہ کی ضیافت کی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ بحیرہ نے اس طرح قریش کے قافلے کو ضیافت پر مدعو کیا تھا' حالانکہ اس سے پیش تر بارہا ایسے تجارتی قافلے اس کلیسا کے پاس سے گزر چکے تھے۔ روایت ہے کہ دعوت کی وجہ یہ تھی کہ جب بحیرہ راہب کلیسا میں بیٹھا ہوا تھا تو اس نے دیکھا کہ قافلے کے درمیان میں ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا چل رہا ہے جسکے اوپر بادل کا ایک ٹکڑا سایہ فگن ہے۔ جب قافلہ صومعہ کے قریب ایک درخت کی چھاؤں میں اترا تو ابر کا ٹکڑا اس درخت کے اوپر بھی سایہ فگن

اور ذوالمجاز کے بازاروں میں عرب کے شاعروں کا کلام اور خطیبوں کی تقریریں بھی سن لی تھیں۔ اب حرب الفجار میں شرکت کے سبب جنگ کے طور طریق بھی سیکھ لیے۔

اس جنگ کا نام "حرب الفجار" اس لیے مشہور ہوا کہ یہ اشہر حرام میں واقع ہوئی۔ عرب کا دستور تھا کہ مقدس مہینوں میں یعنی رجب، شعبان، رمضان وغیرہ میں جنگ نہیں کرتے تھے بلکہ عکاظ، مجنتہ اور ذوالمجاز کے بازاروں میں خرید و فروخت کرتے یا نسلی تکبر و تفاخر کے مظاہرے کرتے تھے۔ بعد ازاں بتوں کی زیارت کے لیے کعبہ میں جاتے تھے۔ عکاظ عرب کا مشہور و معروف بازار تھا۔ عرب کے شعرا اپنے چیدہ چیدہ قصائد اس بازار میں پڑھتے اور سامعین سے داد لیتے تھے۔ عرب کا مشہور خطیب قس بن ساعدہ تقریریں کیا کرتا تھا۔ اس بازار میں یہودی، عیسائی اور بت پرست امن و سکون کی فضا میں اپنے عقائد کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ مقدس مہینوں کے احترام کے پیش نظر کوئی کسی سے تعرض نہیں کرتا تھا۔ براض بن قیس کنانی نے اس قدیم دستور کے خلاف ان مقدس مہینوں کی حرمت کا قطعاً کوئی لحاظ نہ کرتے ہوئے عروۃ الرجال ہوازنی کو قتل کر دیا۔ موخر الذکر کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ کوئی اس پر حملہ آور ہوگا۔

اس واقعے کا پس منظر یہ ہے کہ نعمان بن منذر ہر سال حیرہ سے ایک قافلے کو مشک دے کر عکاظ روانہ کیا کرتا تھا اور اسے یہ ہدایات ہوتی تھیں کہ واپسی میں اس کے عوض یمن سے پوست، رسیاں اور زربفت لے آئے۔ براض کنانی نے یہ پیش کش کی کہ میں آپ کے (نعمان بن منذر) کے قافلے کو اپنے قبیلے کی حمایت میں منزل مقصود تک پہنچا دوں گا۔ دوسری طرف عروہ ہوازنی نے یہ وعدہ کیا میں قافلے کو نجد کی راہ سے حجاز لے جاؤں گا۔ چناں چہ نعمان بن منذر نے قافلے کی قیادت کے لیے عروہ کو منتخب کر لیا۔ یہ بات براض کنانی کو ناگوار گزری۔ اس نے انتقام کی نیت سے عروہ کا تعاقب کیا اور ایک مقام پر اسے تہ تیغ کر کے قافلے کا مال و اسباب لوٹ لیا۔ اس واقعے کے بعد ایک شخص بشر بن ابو حازم نے قریش کو اطلاع دی کہ قبیلہ ہوازن اپنے مقتول کا انتقام لینے کی فکر میں ہے۔ اس سے پہلے کہ قریش حرم کی حدود میں داخل ہوں، ہوازنی ان پر آ ٹوٹے اور لڑائی چھڑ گئی۔ قریش کسی نہ کسی جتن سے حرم کی حدود میں داخل ہو گئے، اس لیے ہوازنیوں کو بھی مجبوراً جنگ سے باز رہنا پڑا۔ لیکن پھر بھی انھوں نے قریش کو متنبہ کیا کہ اگلے سال عکاظ میں جنگ کے لیے تیار رہیں۔ مختصر یہ ہے کہ یہ جنگ چار سال برابر جاری رہی۔ آخر کار اس شرط پر صلح ٹھہری کہ جس فریق کا جانی نقصان کم ہوا ہے، وہ فریق ثانی کے اتنے آدمیوں کا خون بہا ادا کرے جو مقابلتہً زیادہ کام آئے ہیں۔ چناں چہ قریش نے بنو ہوازن کے بیس اشخاص کا خون بہا ادا کر دیا۔ اس جنگ کے نتیجے میں براض سنگ دلی اور بے رحمی میں ضرب المثل ہو گیا۔

تاریخ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ حرب الفجار کے زمانہ وقوع میں آنحضور ﷺ کی عمر کیا تھی؟ بعض کا خیال ہے کہ آپ پندرہ سال کے تھے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ آپ کی عمر بیس سال تھی۔ اس اختلاف کا سبب یہ ہے کہ یہ جنگ چار سال کی مدت تک چھڑی رہی اور ظاہر ہے کہ آغاز جنگ میں جس شخص کی عمر پندرہ سال ہو گی، اختتام جنگ تک وہ ضرور بیس سال کے لگ بھگ پہنچ جائے گا۔

اس جنگ میں ایک طرف قریش اور ان کے ساتھ بنو کنانہ تھے اور دوسری طرف قیس عیلان تھے۔ قریش اور کنانہ کا کمانڈر حرب بن امیہ تھا۔ پہلے پہر کنانہ پر قیس کا پلہ بھاری تھا، لیکن دو پہر ہوتے ہوتے قیس پر کنانہ کا پلہ بھاری ہو گیا۔ یہ امر متنازعہ فیہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے حرب الفجار میں کیا کردار ادا کیا؟ بعض کا بیان ہے کہ آپ فریق مخالف کے چھوڑے ہوئے تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ بعض کی رائے ہے کہ آپ نے ایک جنگ جو کی حیثیت سے حرب الفجار میں شرکت کی تھی اور دشمنوں پر تیر بھی چلائے تھے۔ جنگ چار سال جاری رہی تھی، اس لیے ہر دو روایات کی صحت کا امکان ہے۔ جنگ کے آغاز میں جب کہ آپ کی عمر پندرہ سال تھی، آپ دشمنوں کے چلائے ہوئے تیر اٹھا اٹھا کر اپنے چچاؤں کو دیتے ہوں گے لیکن جنگ کے آخری مرحلے پر جب آپ ﷺ بلوغت کی منزل تک پہنچ گئے تھے تو کوئی تعجب نہیں آپ نے تیر بھی چلائے ہوں۔ رسالت کے منصب پر فائز ہوئے جب چند سال گزر چکے تھے تو ایک دن آپ نے فرمایا تھا: "میں اس جنگ میں اپنے چچاؤں کے دوش بدوش جنگ میں شریک تھا۔ میں نے تیر بھی چلائے، میں اس پر نادم نہیں ہوں۔"

بیسواں سال حلف الفضول

شوال میں جنگ فجار ختم ہوتے ہی ذی قعد میں تجدید حلف الفضول کے لیے سلسلہ جنبانی شروع ہوئی۔ جنگ فجار میں معمولی سی بات پر اتنی خون ریزی کی وجہ سے بعض طبیعتوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن بنیادوں پر جرہمی دور میں قتل و غارت گری کے انسداد کے لیے تین اشخاص یعنی فضل بن فضالہ، فضل بن وداعہ اور فضیل بن حارث نے ایک معاہدہ مرتب کیا تھا، جو انھی کے ناموں پر "حلف الفضول" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کی تجدید کی جائے۔

اس تجدید کی تحریک زبیر بن عبدالمطلب نے کی۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ زبید (یمن کے ایک قبیلے) کا ایک شخص کچھ تجارتی سامان لے کر مکہ آیا اور اس سے مکہ کے ایک سردار عاص بن وائل نے مال خرید لیا، مگر قیمت نہ دی۔ اس نے بنی عبدالدار، بنی مخزوم، بنی جمح، بنی سہم، بنی عدی میں سے ایک ایک کے پاس جا کر فریاد کی، مگر سب نے اسے جھڑک دیا اور عاص بن وائل سہمی کے مقابلے میں اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ سب طرف سے مایوس ہو جانے کے بعد وہ صبح کے وقت کوہ ابوقبیس پر چڑھ گیا اور اس نے بلند آواز سے آل فہر کو پکار کر اپنی مظلومیت سے آگاہ کیا۔ اس پر حضور ﷺ کے چچا زبیر بن عبدالمطلب اٹھے اور انھوں نے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح نہیں چھوڑا جا سکتا۔ پھر انھوں نے بنی ہاشم، بنی عبدالمطلب، بن اسد، بنی زہرہ اور بنی تیم کو عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع کیا جو حضرت عائشہؓ کا چچا زاد بھائی تھا، اور وہاں سب نے اس بات پر حلف لیا کہ:

"خدا کی قسم، ہم سب مل کر ایک ہاتھ بن جائیں گے، اور وہ مظلوم کے ساتھ رہ کر ا

وقت تک ظالم کے خلاف اٹھا ہوا رہے گا' جب تک کہ ظالم مظلوم کا حق ادا نہ کر دے' اور اس وقت تک' جب تک کہ سمندر گھونگھوں کو بھگوتا رہے اور حرا و ثبیر کے پہاڑ اپنی جگہ قائم رہیں گے' اور ہماری معیشت میں مساوات رہے گی۔"

ابن ہشام اور حمیدی وغیرہ نے آنحضور ﷺ کے اس بیان کی روایت کی ہے کہ "اس معاہدے کے وقت میں بھی عبداللہ بن جدعان کے گھر میں حاضر تھا۔ معاہدے کے مقابلے میں اگر مجھے سرخ اونٹ بھی ملتے تو میں اسے چھوڑ کر انھیں قبول نہ کرتا' اور اگر آج دورِ اسلام میں بھی ایسے کسی معاہدے کی طرف دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔"

ابن سعد نے اس معاہدے کی تاریخ ذی قعد 20 عام الفیل لکھی ہے۔

پچیسواں سال شام کا دوسرا تجارتی سفر

بیس اور پچیس سال کی عمر کے درمیان حضور ﷺ کے وہ جوہر آپ ﷺ کے قبیلہ قریش پر عیاں ہوتے چلے گئے جو بچپن سے اب تک ایک محدود دائرے میں معلوم و معروف تھے۔ آپ ﷺ قریش میں سب سے زیادہ بامروت' خلیق' ہمسایوں کی خبرگیری کرنے والے' حلیم اور بردبار تھے۔ آپ ﷺ اپنے قول و فعل میں سب سے زیادہ سچے' راست باز اور امانت دار تھے۔ آپ ﷺ کی زبان ہر بری بات' فحش کلامی اور دشنام طرازی سے پاک تھی۔ انھی پیغمبرانہ صفات اور لوگوں سے نیک برتاؤ اور حسن معاملہ کی بنا پر عرب جیسی بے باک اور سخت گیر قوم نے عین جوانی کے عالم میں آپ ﷺ کو صادق اور امین جیسے القاب دیئے۔ آپ ﷺ کی نیک سیرت اور پاکبازی کی شہرت اہل عرب میں ضرب المثل بن گئی اور آپ ﷺ کا نام زندگی کے ہر معاملے میں مثال کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔

جناب ابوطالب عیال دار تھے اور ان کی زندگی عسرت سے بسر ہوتی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنے بھتیجے کے لیے کوئی نفع بخش روزگار مہیا کریں۔ چناں چہ انھیں ایک دن یہ پتا چلا کہ خدیجہؓ بنت خویلد قریش کے چند اشخاص سے اجرت و معاوضہ پر اپنے کاروبار میں خدمت لینا چاہتی ہیں۔ حضرت خدیجہؓ قریش میں اپنی عفت اور پاکیزہ سیرت کی بنا پر "طاہرہ" کے لقب سے معروف تھیں۔ پورے قبیلے میں ان کی دانائی اور فہم و فراست اور اخلاق و اوصاف کے لحاظ سے ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انھیں حسن و جمال کی دولت سے بھی نوازا تھا۔ قریش کی کوئی عورت ان سے زیادہ مال دار نہ تھی۔ بسا اوقات قریش کا آدھا قافلہ تجارت صرف ان کے مال پر مشتمل ہوتا تھا۔ ابوہالہ کی وفات کے بعد ان کی شادی عتیق بن عابد مخزومی سے ہوئی' جس سے ان کی صاحب زادی پیدا ہوئیں اور عہد نبوت میں وہ بھی مسلمان ہو گئیں۔ دوسرے شوہر کی وفات کے بعد وہ بیوہ ہی رہیں۔ قریش کے بہت سے سرداروں نے چاہا کہ وہ ان میں سے کسی کے ساتھ شادی کر لیں' مگر وہ راضی نہ ہوئیں۔ اپنے مال سے وہ تجارت کرتی تھیں اور کسی نہ کسی شخص سے معاملہ کر لیتی تھیں کہ وہ ان کی طرف سے تجارتی قافلوں میں جائے اور مقررہ حصہ لے لے۔

جب ابوطالب کے علم میں یہ بات آئی کہ خدیجہؓ کچھ لوگوں کو تجارت کے لیے شام بھیجنا چاہتی ہیں' تو انھوں نے حضور ﷺ سے' جن کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ پہنچ چکی تھی' کہا: "میرے پاس سرمایہ نہیں ہے اور میری زندگی کے دن معاشی بدحالی میں گزر رہے ہیں۔ میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ فلاں شخص کو خدیجہؓ نے دو اونٹوں پر اجیر مقرر کیا ہے' لیکن میں تمھارے لیے اتنی اجرت پر رضامند نہ ہوں گا۔ اگر تم چاہو تو میں تمھارے لیے خدیجہؓ سے بات چیت کروں۔"

حضور ﷺ نے جواب دیا: "آپ میرے حق میں جو کچھ بہتر سمجھتے ہیں' ضرور کریں۔"

غرضیکہ جناب ابوطالب خدیجہؓ کے پاس پہنچے اور کہا: "کیا تم میرے بھتیجے محمد ﷺ کو اجرت کی شرط پر کچھ مال دینا چاہتی ہو؟ میں نے سنا ہے کہ تم نے فلاں شخص کو دو اونٹوں پر اجیر مقرر کیا ہے' لیکن محمد ﷺ کے سلسلے میں' میں چار اونٹوں سے کم پر نہیں مانوں گا۔ حضرت خدیجہؓ نے کہا: "اگر آپ کسی غیر شخص کے لیے بھی فرماتے تو مجھے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوتا' بھلا اس شخص کے لیے جو آپ کا عزیز و قریب ہے' میں کیسے آپ کی بات نہیں مانوں گی۔ ابوطالب حضرت خدیجہؓ سے یہ بات چیت کر کے اپنے بھتیجے کے پاس گئے اور کہا' یہ سلسلۂ معاش ہے' جس کا بندوبست خدا نے تمھارے لیے گھر بیٹھے کیا ہے۔"

آنحضور ﷺ حضرت خدیجہؓ کے غلام میسرہ کے ہم راہ مکہ سے عازم سفر ہوئے۔ آپ ﷺ کے چچا نے میسرہ سے کہا کہ ذرا آپ ﷺ کا خیال رکھنا۔ تجارتی قافلہ وادی القریٰ' مدین' دیار ثمود اور ان مقامات سے' جہاں سے حضور ﷺ اپنے چچا ابوطالب کے ہم راہ بارہ سال پیش تر گزرے تھے' شام کی جانب روانہ ہوا۔ اس سفر میں آنحضرت ﷺ کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں وہ تمام دبے ہوئے نقوش ابھر آئے جو پہلے سفر میں جاگزیں ہوئے تھے' لہٰذا آپ ﷺ کو ان حالات و واقعات پر' جو شام کے پہلے سفر یا مکہ کے گرد و پیش میں آپ ﷺ کے علم و مشاہدہ میں آئے تھے' پھر غور و فکر کرنے کا موقع ملا۔ شام پہنچے تو آپ کو عیسائیوں سے سابقہ پڑا اور آپ ﷺ نے ان کے راہبوں سے مسیحیت کے بارے میں گفتگو کی۔ اس زمانے میں نصاریٰ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ نسطوری فرقے کا ایک راہب' جس کا نام تواریخ میں نسطورا آیا ہے' آپ سے ملا۔ روایت بیان کی گئی ہے کہ مقام بصریٰ میں حضور ﷺ ایک درخت کے نیچے ٹھہرے جو نسطورا راہب کے صومعے کے پاس تھا۔ نسطورا باہر نکل کر آیا اور اس نے حضرت خدیجہؓ کے غلام میسرہ سے' جو حضور ﷺ کے ساتھ تھا' دریافت کیا کہ اس درخت کے نیچے کون ٹھہرا ہے؟۔

میسرہ نے کہا: "قریش' اہل حرم میں سے ایک شخص"

نسطورا بولا: "اس درخت کے نیچے عیسیٰؑ کے بعد آج تک' نبی کے سوا کوئی نہیں ٹھہرا۔" پھر نسطورا آپ ﷺ کے پاس آیا۔ آپ ﷺ کا سر اور آپ ﷺ کے قدم چومے اور کہا: "میں شہادت دیتا ہوں آپ ﷺ اللہ کے رسول' وہ نبی امی

ہیں جن کی بشارت عیسیٰؑ نے دی تھی اور کہا تھا کہ میرے بعد اس درخت کے نیچے نبی امی ہاشمی العربی المکی صاحب الحوض والشفاعۃ کے سوا کوئی نہیں ٹھہرے گا۔" میسرہ نے اس کے اس قول کو ذہن نشین کر لیا۔

اس کے بعد حضور ﷺ بصریٰ کے بازار میں خرید و فروخت کے لیے نکلے۔ اس موقع پر ایک شخص سے قیمت کے معاملے میں آپ ﷺ کا اختلاف ہو گیا۔ اس شخص نے کہا: "لات و عزیٰ کی قسم کھایئے۔" حضور ﷺ نے فرمایا: "مَیں نے تو کبھی ان کی قسم نہیں کھائی۔"

اس پر اس شخص نے کہا: "پھر میں آپ ہی کی بات مانتا ہوں۔" اور الگ لے جا کر میسرہ سے کہا: "یہ نبی ہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' یہ وہی ہیں جن کا ذکر ہمارے احبار اپنی کتابوں میں پاتے ہیں۔" میسرہ نے یہ بات بھی ذہن نشین کر لی۔

ابونعیم کی روایت ہے کہ اس سفر میں میسرہ نے دیکھا کہ دو فرشتے آپ ﷺ پر سایہ کیے رہتے ہیں۔ جب یہ قافلہ مکہ پہنچا تو دوپہر کا وقت تھا۔ حضرت خدیجہؓ اس وقت اپنے بالاخانے پر تھیں۔ انھوں نے بھی دیکھا کہ حضور ﷺ اپنے اونٹ پر چلے آ رہے ہیں اور دو فرشتے آپ ﷺ پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ ابونعیم کی روایت پر دوسروں نے یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے اپنے ساتھ کی دوسری عورتوں کو بھی یہ منظر دکھایا اور وہ اس پر تعجب کرنے لگیں۔ پھر جب میسرہ حضرت خدیجہؓ کے پاس آیا تو انھوں نے اسے بتایا کہ مَیں نے یہ منظر دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو شام سے یہی کچھ دیکھتا چلا آ رہا ہوں۔ اس کے بعد اس نے انھیں وہ باتیں بھی سنائیں جو اس نے نسطورا راہب سے سنی تھیں اور وہ واقعہ بھی بیان کیا جو شام کے ایک تاجر کے ساتھ مال کی قیمت پر اختلاف کے سلسلے میں پیش آیا تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان مافوق الفطری روایات کو تسلیم کر لیا جائے؟ اس کا جواب مولانا مودودی نے اپنی تالیف "سیرت عالم" (جلد دوم' صفحہ ۱۰۸) میں دیا ہے' جو یہاں نقل کیا جاتا ہے: "اگر ان روایات کو تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نبوت سے پندرہ سال پہلے حضور ﷺ کو ایک مرتبہ پھر یہ معلوم ہو گیا تھا کہ آپ ﷺ نبی ہونے والے ہیں۔ (بارہ برس پہلے شام کے پہلے سفر کے وقت بحیرا راہب نے یہی پیشین گوئی کی تھی)۔ میسرہ اور حضرت خدیجہؓ اور ان کے ساتھ بیٹھی ہوئی قریش کی متعدد خواتین کو بھی اس کا علم ہو چکا تھا۔ اور قریش کے جس قافلے کے ساتھ آپ ﷺ شام گئے تھے' وہ بھی اور مکہ کے لوگ بھی اس بات سے بے خبر نہ رہے ہوں گے کہ فرشتے آپ ﷺ پر سایہ کر رہے ہیں' کیوں کہ جب میسرہ اور حضرت خدیجہؓ اور دوسری خواتین انھیں دیکھ رہی تھیں تو دوسرے لوگوں سے یہ منظر کیسے مخفی رہتا؟

"ہمارے نزدیک یہ ساری باتیں اگرچہ اکابر اہل علم و روایت سے منقول ہیں' مگر کئی وجوہ سے ناقابل قبول ہیں۔ اول تو یہ صریح قرآن کے خلاف پڑتی ہیں' جس میں رسول ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے۔"

﴿وَمَا كُنتَ تَرْجُوٓا أَن يُلْقَىٰٓ إِلَيْكَ ٱلْكِتَـٰبُ﴾ (القصص: 86)

"اور تم ہرگز اس کے امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائے گی۔"

﴿مَا كُنتَ تَدْرِى مَا ٱلْكِتَـٰبُ وَلَا ٱلْإِيمَـٰنُ﴾ (الشوریٰ: 52)

"تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔"

"یہ آیات اس بات میں بالکل قطعی ثبوت ہیں کہ نبوت کے منصب پر ہونے سے پہلے آپ ﷺ اس بات سے بالکل بے خبر تھے کہ آپ ﷺ نبی جانے والے ہیں' حالانکہ اگر بارہ برس ہی کی عمر میں آپ ﷺ کو یہ معلوم ہو چکا ہوتا اور پچیس سال کی عمر میں اس کی مزید تصدیق ہو گئی ہوتی' تو کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ اوپر کتاب کے نزول کی امید نہ رکھتے اور اس خیال سے خالی الذہن ہوتے آپ ﷺ کو ایک وقت اپنے اوپر ایمان لانے کی دعوت لوگوں کو دینی ہو گی۔

"قرآن مجید کے بعد یہ روایات ان صحیح ترین روایات کے خلاف بھی پڑتی جو حضور ﷺ پر پہلی وحی کے نزول اور اس پر آپ ﷺ کی کیفیت اور حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ کی گفتگو کے متعلق منقول ہوئی ہیں۔ اس وقت آپ ﷺ جو کیفیت طاری ہوئی' وہ کیسے طاری ہوتی' اگر آپ ﷺ اٹھائیس برس سے یہ جانتے ہوتے کہ آپ ﷺ نبی ہونے والے ہیں؟ اس حالت میں تو نزول وحی آپ ﷺ کی عین توقع کے مطابق ہوتا۔ پھر حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ سے غار حرا کا واقعہ سننے کے بعد جو کچھ کہا' وہ ایسی حالت میں ہرگز نہ کہتیں' جب کہ انھیں پندرہ برس سے یہ معلوم ہوتا کہ آپ نبی ہونے والے ہیں۔ اس صورت میں تو وہ یہ فرماتیں کہ یہ وہی کچھ پیش آیا ہے جس کی ہم پہلے سے توقع رکھتے تھے۔

"اسی طرح یہ روایات اس پوری تاریخ کے خلاف پڑتی ہیں جو کثیر اور متواتر روایات کی رو سے آپ ﷺ کے اعلان نبوت کے بعد مکہ میں پیش آئی۔ اگر قریش کے لوگ 31 سال سے یہ جانے ہوئے ہوتے کہ آپ ﷺ نبی ہونے والے ہیں تو آپ ﷺ کا اعلان نبوت ان کی توقعات کے خلاف نہ ہوتا اور اس پر ان کا ردعمل بھی اس سے بہت مختلف ہوتا جو بالکل ایک خلاف توقع معاملہ پیش آنے سے ہوا۔"

حضرت خدیجہؓ سے نکاح

حضور ﷺ کو شام کے اس سفر میں اپنی امانت اور سابقہ تجربے کی بنا پر دوسروں کی بہ نسبت کاروبار میں زیادہ نفع ہوا۔ میسرہ پر بھی آپ کے اخلاق کا اچھا اثر پڑا اور اس کے دل میں آپ ﷺ کے لیے عزت و احترام کے جذبات بیدار ہوئے۔ قافلے کی واپسی پر شام کے مال تجارت میں جو چیز بھی نبی کریم ﷺ نے پسند کی' اسے خدیجہؓ کے لیے خرید لیا' جب قافلہ مکہ کی حدود میں پہنچا تو میسرہ نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ اپنی اولین فرصت میں خدیجہؓ کے پاس جایئے اور جو خدمات آپ نے خدا کے فضل و کرم سے ان کے لیے سرانجام دی ہیں' ان سے انھیں مطلع کیجیے وہ آپ سے بہت خوش اور راضی ہوں گی۔

حضور ﷺ ظہر کے وقت مکہ پہنچے۔ خدیجہؓ اپنے مکان کے بالاخانے پر تھیں

فوراً اتریں اور حضور ﷺ کا خیر مقدم کیا۔ حضور ﷺ نے سفر شام اور تجارتی منافع سے متعلق دل پذیر پیرایہ بیان میں گفتگو کی۔ خدیجہ نے کامل انہماک اور پوری توجہ سے آپ ﷺ کا بیان سنا۔ بعد ازاں میسرہ نے حضرت خدیجہؓ سے حضور ﷺ کے اخلاق و عادات کی تعریف و توصیف کی اور یہ عرض کیا کہ مکہ کے نوجوانوں میں سے کوئی بھی اس شخص کی برابری نہیں کر سکتا۔

چند روز بعد خدیجہؓ کی یہ خوشنودی، محبت کے سانچے میں ڈھل گئی اور اس چالیس سالہ خاتون نے، جو اکابر قریش کے پیغام مسترد کر چکی تھیں۔ اگرچہ پہلے بھی وہ آپ ﷺ سے ناواقف نہ تھیں اور قریش میں آپ ﷺ کے جو محاسن عوام میں مقبول و معروف ہوتے جا رہے تھے، ان کا چرچا وہ سن چکی تھیں، لیکن اب انھوں نے طے کر لیا کہ حضور ﷺ سے بہتر شوہر انھیں نہیں مل سکتا۔ نکاح کا معاملہ کس طرح طے ہوا، اس کے متعلق روایات میں کچھ اختلاف ہے

ابن اسحاق کی روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے خود حضور ﷺ سے براہ راست بات کی اور کہا کہ اے ابن عم آپ ﷺ سے میری قرابت بھی ہے، اور میں آپ ﷺ کی امانت و صداقت اور شرافت اور اوصاف حمیدہ کی وجہ سے بھی یہ چاہتی ہوں کہ آپ ﷺ سے شادی کر لوں۔ (یاد رہے کہ حضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہؓ (حضرت زبیرؓ کی والدہ) حضرت خدیجہؓ کی بھاوج تھیں)

دوسری روایت کی رو سے اپنی خواہش اپنی سہیلی نفیسہ بنت منیہ سے ظاہر کی۔ وہ کہتی ہیں کہ حضرت خدیجہؓ نے نکاح کی خواہش ظاہر کرنے سے پہلے مجھے آپ ﷺ کے پاس بھیجا، تاکہ آپ ﷺ کی مرضی معلوم کر لوں۔ میں نے جا کر آپ ﷺ سے کہا: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟'' آپ نے فرمایا: ''میرے پاس کیا رکھا ہے کہ میں شادی کروں۔'' میں نے کہا اگر یہ مشکل پیش نہ آئے اور ایک خوب صورت، دولت مند اور صحیح النسب خاتون سے رشتہ کا امکان ہو تو کیا آپ یہ رشتہ قبول کر لیں گے؟'' حضور ﷺ نے دریافت کیا: ''آخر ایسی خاتون کون ہے؟'' میں نے جواب میں کہا: ''خدیجہؓ'' فرمایا: ''میری ان سے شادی کیسے ہو سکتی ہے؟'' میں نے کہا: ''اسے آپ میرے اوپر چھوڑ دیں۔''

بعد ازاں حضرت خدیجہؓ کی طرف سے پیغام ملا کہ فلاں وقت آپ اپنے رشتہ داروں سمیت آ جائیں۔ میرے رشتہ دار بھی موجود ہوں گے اور عقد کی رسوم ادا ہو جائیں گی۔ حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچا عمرو بن اسد کو کہلا بھیجا کہ آ کر میری شادی کر دیں (حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد کا انتقال ہو چکا تھا)۔ اس طرح حضرت خدیجہؓ کی طرف سے عمرو بن اسد اور ادھر سے حضور ﷺ اپنے چچاؤں حضرت حمزہ اور ابو طالب کو لے کر پہنچ گئے۔ نکاح کے وقت حضرت ابو بکر صدیقؓ اور سرداران قریش شریک تھے۔ مہر بیس اونٹ اور پانچ صد درہم طلائی قرار پایا۔ یہ شادی سفر شام سے حضور ﷺ کی واپسی کے دو مہینے 25 دن بعد ہوئی۔ حضور ﷺ کی عمر اس وقت پچیس سال تھی اور حضرت خدیجہؓ چالیس سال کی تھیں۔ نکاح کے وقت ابو طالب نے نہایت بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہے

''حمد و ثنا اسی خدا کے لیے ہے جس نے ہمیں ابراہیمؑ کے فرزند اور اسماعیلؑ کی ذریات میں بنایا۔ ہمیں معد و مضر کے پاک اصل سے باہر لایا۔ اپنے گھر کا نگہبان اور اپنے حرم کا پیشوا بنایا۔ ایسا گھر ہمیں عطا فرمایا کہ اطراف و جوانب کے لوگ اس کی زیارت کے قصد سے آتے ہیں۔ ایسا حرم عنایت فرمایا کہ جو شخص وہاں آ جائے، امان میں ہو جاتا ہے اور ہمیں لوگوں پر حاکم مقرر فرمایا۔ اما بعد! یہ میرے بھائی کا لڑکا محمد بن عبداللہ ہے۔ یہ ایک ایسا نوجوان ہے کہ قریش کے کسی شخص کا اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ کہ یہ اس سے بڑھا رہے گا۔ ہاں مال اس کے پاس کم ہے، لیکن مال ڈھلتی چھاؤں ہے اور ایک بدلنے والی چیز ہے۔ محمد ﷺ وہ شخص ہے جس کی میرے ساتھ قرابت و یگانگت کو تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ خدیجہؓ بنت خویلد کو جانتا ہے اور میرے مال میں سے بیس اونٹ مہر مقرر کرتا ہے۔ اور اس کا مستقبل خدا کی قسم عظیم الشان اور جلیل القدر ہے''

جناب ابو طالب کے خطبے کے جواب میں حضرت خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل نے بھی خطبہ پڑھا، جس کا مضمون یہ ہے:

''حمد و ثنا خدا کے لیے ہے، جس نے ہمیں ویسا ہی بنایا، جیسا کہ ابو طالب نے ذکر کیا۔ اور ہمیں وہ تمام فضیلتیں عطا فرمائیں، جنھیں آپ نے شمار کیا۔ پس ہم لوگ تمام عرب کے پیشوا اور سردار ہیں اور آپ لوگ تمام فضائل کے اہل ہیں۔ کوئی جماعت آپ کے فضائل کا انکار نہیں کر سکتی، اور کوئی شخص آپ کے فخر و شرف کو رد نہیں کر سکتا، اور بے شک ہم لوگوں نے نہایت رغبت سے آپ کے ساتھ شامل ہونے اور اس رشتے کو پسند کیا۔ پس اے قریش! گواہ رہو کہ خدیجہ بنت خویلد کو میں نے محمد بن عبداللہ کی زوجیت میں دیا چار سو مثقال کے عوض'' رومانیہ کے فاضل مستشرق کونسٹن ورجیل جورجیو نے اپنی تصنیف ''عکس سیرت'' (اردو ترجمہ) میں حضور ﷺ کے مہر کے بارے میں لکھا ہے: ''مجھے نہیں معلوم کہ کچھ عرب مصنفین نے کس بنا پر یہ لکھا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے مہر کے طور پر بیس اونٹ ادا کیے تھے، جب کہ تاریخ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کا مہر پانچ سو درہم ہی تھا۔''

حضور ﷺ کی ازدواجی زندگی

اگرچہ حضور ﷺ کی اور حضرت خدیجہؓ کی عمر میں پندرہ سال کا فرق تھا، لیکن دونوں کے درمیان اتنی محبت تھی کہ حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ ﷺ تمام عمر انھیں یاد کرتے رہے۔ بخاری میں حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ فرماتے تھے: ''خیر نساء ھا مریم و خیر نساءھا خدیجہ۔ دنیا کی بہترین خواتین یہ دو ہیں: مریم اور خدیجہ۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کی بیویوں میں سے کسی پر مجھے اتنا رشک نہیں آتا تھا جتنا حضرت خدیجہؓ پر آتا تھا، حالانکہ آپ ﷺ سے میری شادی ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اکثر آپ ﷺ کو ان کا ذکر کرتے سنتی تھی اور جب کبھی آپ ﷺ کوئی

بکری ذبح فرماتے تو اس میں سے ضرور حضرت خدیجہؓ کی ملنے والیوں کو ہدیہ بھیجتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک دن رسول کریم ﷺ کی زبان مبارک سے حضرت خدیجہؓ کا ذکر سن کر مجھے غیرت آئی اور عرض کیا! ''آپ ﷺ قریش کی ایک بوڑھی عورت کو اتنا یاد کرتے ہیں، جسے انتقال کیے مدت گزر گئی اور اللہ نے آپ کو ان سے بہتر بیوی دی ہے۔'' میری اس بات پر حضور ﷺ کا چہرہ سرخ ہو گیا' اور فرمایا: ''نہیں' خدا کی قسم' نہیں۔ مجھے اس سے بہتر بیوی نہیں ملی۔ وہ اس وقت ایمان لائیں جب سب لوگ کافر تھے۔ اس نے میری تصدیق کی' جب سب نے مجھے جھٹلایا۔ اس نے مال سے میری مدد کی' جب دوسروں نے محروم رکھا' اور اللہ نے اس سے مجھے اولاد دی۔'' ''میں نے آپ ﷺ کو ناراض دیکھ کر عرض کیا کہ قسم ہے اس خدا کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' میں آئندہ کبھی ان کا ذکر بھلائی کے سوا کسی طرح نہ کروں گی۔

جنگ بدر میں رسول اللہ کے داماد ابو العاص بھی گرفتار ہو کر آئے تھے۔ حضور ﷺ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ نے (جو اس وقت مکہ میں تھیں) انھیں چھڑانے کے لیے ایک فدیہ بھیجا جس میں حضرت خدیجہؓ کا وہ ہار بھی تھا جو انھوں نے ابو العاص سے ان کی شادی کے وقت زمانہ جاہلیت میں دیا تھا۔ اس ہار کو دیکھ کر حضور ﷺ پر رقت طاری ہو گئی اور آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ اگر تم مناسب سمجھو تو زینبؓ کے قیدی کو ویسے ہی چھوڑ دو اور اس کا فدیہ واپس کر دو۔ سب لوگ اس پر راضی ہو گئے اور ابو العاص فدیہ کے بغیر چھوڑ دیے گئے۔

حضرت خدیجہؓ پندرہ سال نبوت سے پہلے اور دس سال نبوت کے بعد آپ ﷺ کی بیوی رہیں۔ نبوت کے دسویں سال ان کا انتقال ہوا' جب کہ آپ ﷺ پچاس سال کے تھے اور وہ پینسٹھ سال کی تھیں' لیکن آپ ﷺ نے اپنی ساری' جوانی انھی ایک سن رسیدہ بیوی کے ساتھ گزار دی' اور کسی دوسری عورت کا خیال تک نہ کیا' حالانکہ اس وقت اہل عرب میں کسی شخص کا ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا کسی درجہ میں بھی معیوب نہ تھا اور نہ بیویاں ہی اس میں مانع ہوتی تھیں۔ خود حضرت خدیجہؓ کے خاندان سمیت' قریش کے تمام ہی خاندانوں میں ایک ایک شخص کی کئی کئی بیویاں ہونے کی بے شمار مثالیں موجود تھیں۔ اس کے باوجود آپ ﷺ کا پچاس برس کی عمر تک ایک ایسی بیوی پر قانع رہنا' جن کی عمر ۶۵ سال ہو چکی تھی' ان تمام معترضین کے لیے عملاً ایک منہ توڑ جواب ہے جو عمر شریف کے آخری دس برسوں میں حضور ﷺ کی کثرتِ ازواج کو معاذ اللہ نفس پرستی پر محمول کرتے ہیں۔

(سیرت سرورِ عالم۔ جلد دوم۔ صفحہ 117)

حضور ﷺ کی اولاد

حضور ﷺ کی ساری اولاد ماسوائے حضرت ابراہیمؓ کے (جو ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے) حضرت خدیجہؓ ہی سے تھی۔ ان میں دو صاحب زادے تھے اور چار صاحبزادیاں۔

(1) القاسم' جن کی نسبت سے آپ ﷺ ابوالقاسم کہلاتے تھے۔ (2) عبداللہ جنھیں طیب اور طاہر بھی کہا جاتا تھا۔ (3) حضرت زینبؓ (4) حضرت امیہؓ (5) حضرت ام کلثومؓ (6) حضرت فاطمہؓ (آنحضور ﷺ کی اولاد کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب پنجم۔ عنوان ''اہل بیت'')

زید بن حارثہ کا واقعہ

شادی کے بعد چند دن بنی ہاشم کے محلے میں گزار کر حضور ﷺ سوق عطار کے پیچھے حضرت خدیجہؓ کے مکان میں مستقل قیام کے لیے اٹھ آئے جو بیت اللہ کے قریب الحجر میں واقع تھا۔ بیوی نے محترم شوہر کی خدمت کے سلسلے ایک پندرہ سالہ نوجوان غلام کو پیش کیا' جن کا نام زیدؓ بن حارثہ تھا۔ یہ لڑکا یمن کے قبیلے بنو قضاعہ کے سردار حارثہ بن شرح بیل (شرجیل) کا لخت جگر تھا۔ آٹھ سال کی عمر میں ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گیا۔ ڈاکوؤں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں لے جا کر انھیں فروخت کر دیا۔ انھیں حکیم بن حزام نے خریدا اور اپنی پھوپھی خدیجہؓ کی نذر کیا۔ جب حضرت خدیجہؓ کا نکاح حضور ﷺ سے ہوا تو انھیں حضور ﷺ کی خدمت پر مامور کر دیا گیا۔

کچھ مدت بعد ان کے والد کو پتا چلا کہ زید مکہ میں ہے۔ باپ اور چچا حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ آپ جو فدیہ چاہیں' ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑ دیتا ہوں کہ وہ تمھارے پاس جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمھارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا۔ لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہے اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔''

انھوں نے کہا: ''یہ تو آپ نے انسان سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے۔ آپ بچے کو بلا کر پوچھ لیجیے۔''

حضور ﷺ نے زید کو بلایا اور ان سے کہا: ''ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟

انھوں نے عرض کیا: ''جی ہاں' یہ میرے والد ہیں' اور یہ میرے چچا۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اچھا تم انھیں بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمھیں پوری آزادی ہے' چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ رہو۔''

انھوں نے جواب دیا: ''میں آپ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔''

ان کے باپ اور چچا نے کہا: ''زید' کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟''

انھوں نے جواب دیا: ''میں نے اس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں' ان کا تجربہ کر لینے کے بعد اب میں دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔''

زیدؓ کا یہ جواب سن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضور ﷺ نے اسی وقت زیدؓ کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا: ''آپ

سب لوگ گواہ رہیں' آج سے زیدؓ میرا بیٹا ہے۔ یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔'' اسی بنا پر لوگ انھیں زیدؓ بن محمد کہنے لگے حتیٰ کہ اللہ نے منع فرمایا۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں۔

حضرت علیؓ کی کفالت

حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد حضور ﷺ کی مفلسی کا دور ختم ہو گیا۔ پہلے وہ دوسروں کے ذریعے سے تجارت کرتی تھیں' جس میں انھیں فائدہ کم ملتا تھا' کیوں کہ دوسرے لوگ جس اخلاقی حالت میں مبتلا تھے' اس میں یہ توقع کم ہو سکتی تھی کہ وہ غیر کے مال میں پوری دیانت اور خیر خواہی سے کام لیں گے' مگر جب ان کی تجارت رسول کریم ﷺ جیسے امین اور فرزانہ شخص کے ہاتھ میں آئی جو فطری خیر خواہی کے ساتھ شوہر ہونے کے باعث بھی اپنی اہلیہ کے حق میں کمال درجہ کے خیر خواہ تھے' تو آپ ﷺ کی تجارت چمک اٹھی اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پورا ہوا۔

﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَىٰ﴾ (الضحیٰ : 8)

''اور اللہ نے آپ کو غریب پایا۔ پھر غنی کر دیا''

اقتصادی لحاظ سے خوش حالی آنے کے بعد حضور ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کے ان احسانات کو بھی یاد رکھا جو بچپن سے جوانی تک انھوں نے آپ ﷺ پر کیے تھے۔ ایک مرتبہ جب مکہ اور اس کے اطراف میں شدید گرانی رونما تھی' آپ ﷺ کو خیال آیا کہ میرے چچا کی مالی حالت کم زور ہے اور وہ کثیر العیال آدمی ہیں۔ ان کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ چناں چہ آپ ﷺ اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ کے پاس گئے جو رئیس آدمی تھے اور ان سے کہا: ''آپ کے بھائی کا کنبہ بڑا ہے۔ مالی حالت اچھی نہیں ہے' اور لوگ جس شدید گرانی کی حالت میں مبتلا ہیں' وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ چلیے' ہم ان کا بار ہلکا کرنے کے لیے ان سے بات کریں اور ان کے ایک بیٹے کو آپ اپنی کفالت میں لے لیں اور ایک کو میں لے لیتا ہوں۔''

حضرت عباسؓ اس بات پر راضی ہو گئے اور دونوں چچا بھتیجوں نے ابو طالب کے پاس جا کر مدعا بیان کیا۔ جناب ابو طالب نے کہا' عقیل اور طالب کو میرے لیے چھوڑ دو' باقی جسے تم میں سے جو لینا چاہے' لے لے۔ اس طرح حضور ﷺ حضرت علیؓ کو اپنے ہاں لے گئے اور حضرت عباسؓ نے حضرت جعفرؓ کو لے لیا۔ حضرت علیؓ ان میں سب سے چھوٹے تھے۔ حضرت جعفرؓ ان سے دس برس بڑے' حضرت عقیل ان سے دس برس بڑے اور طالب ان سے بھی دس برس بڑے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت علیؓ بچپن ہی میں حضور ﷺ کی پرورش میں آ گئے تھے' اور حضور ﷺ نے اور حضرت خدیجہؓ نے انھیں اپنی اولاد کی طرح پالا تھا۔ اغلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی عمر اس وقت چار پانچ برس سے زیادہ نہ تھی۔

کعبے کی تعمیر نو

حضور ﷺ 53 سال کے تھے اور نبوت میں پانچ سال اور ہجرت میں اٹھارہ سال باقی تھے کہ قریش نے کعبے کو از سرِ نو تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔ کعبے کی بار بار تعمیر کی ضرورت اس لیے پیش آتی رہی کہ کعبہ نشیب میں واقع ہونے کی وجہ سے چشموں اور وادیوں کے سیلابوں کا نشانہ بنتا رہتا تھا۔ سیلابوں کے علاوہ مرور زمانہ سے اس کی دیواریں خستہ اور تعمیر میں کہنگی کے آثار پیدا ہوتے رہتے تھے۔ علاوہ ازیں دو تین مرتبہ آگ کے ہولناک شعلوں نے بھی اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس قسم کے حادثات کسی دشمن کے حسد کی بنا پر نہیں' بلکہ متولیوں کے تساہل کی وجہ سے پیش آتے رہے۔

قصی بن کلاب کے زمانے سے تولیت کعبہ کی ذمہ داری اور نگہداشت قریش کے ذمے تھی۔ قصی بن کلاب نے اپنے زمانہ حکومت میں بیت اللہ کی دیواروں کی مرمت کرائی۔ اس کے بعد قصی کے بیٹے عبد مناف نے کعبہ کی نگہبانی اور نگہداشت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا' مگر ان حفاظت کے باوجود سیلابوں کی لگاتار یلغار سے اس کی دیواریں اس قدر بوسیدہ ہو گئی تھیں کہ کسی وقت بھی کعبے کی عمارت زمین بوس ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ تعمیر کعبہ کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ کسی عورت نے کعبے کو دھونی دی۔ ایک شرارہ اڑ کر غلاف کعبہ پر بیٹھ گیا' جس سے آگ لگ گئی اور دیواریں مزید بوسیدہ ہو کر کم زور ہو گئیں۔ چناں چہ کعبے کی اس حالت کے پیش نظر قریش کو کعبے کی تعمیر نو کا خیال پیدا ہوا۔

قریش کے اس خیال کو چند اتفاقات نے مزید تقویت پہنچائی۔ انھی دنوں جب کہ قریش تعمیر کعبہ کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے' چند رومی تاجروں کا ایک جہاز جو شعیبہ (جدہ) کے پاس سے گزر رہا تھا' سمندر میں زبردست طوفان کے باعث خشکی پر چڑھ آیا اور ٹوٹ گیا۔ مکہ والوں کو جب اس واقعے کی خبر ہوئی تو وہ باوجود اپنی جہالت کے' ستم رسیدوں سے نہایت ہمدردی کے پیش آئے۔ جتنے آدمی زندہ بچے تھے' ان کی خبر گیری کی اور جو سامان بھی طوفان کی دست برد سے وہ بچا سکے تھے' اسے نہ صرف اچھے داموں خرید لیا' بلکہ درآمدی محصول بھی معاف کر دیا۔ یہاں تک کہ جہاز کی لکڑی کا معاوضہ دے کر اسے بھی خرید لیا۔ انھی طوفان زدہ پناہ گزینوں میں ایک قبطی معمار بھی تھا' جس کا نام باقوم تھا۔ وہ اہل مکہ کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر وہیں بس گیا تھا۔

مزید برآں بعض دیگر روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ جہاز کا سامان نفیس تعمیری ضرورتوں یعنی سنگ مرمر' لوہے اور لکڑی وغیرہ پر مشتمل تھا' اور ایک گرجے کی تعمیر و تیاری کے لیے مصر سے حبشہ جا رہا تھا۔ وہ سامان قریش مکہ کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ مزید ایک نیک فال یہ پیش آئی کہ کعبے کے تمام چڑھاوے اور نذریں کعبے کے دروازے کے پاس ہی لوگ حفاظت کے لیے جس اندھے کنوئیں میں ڈال دیا کرتے تھے' اس میں ایک بڑا سانپ پیدا ہو گیا تھا' اور اکثر نظر آ کر دہشت کا سبب بنتا تھا۔ تعمیر کعبہ کی تجویز کے زمانے میں ایک دن سانپ سر نکالے کنوئیں سے باہر جھانک رہا تھا کہ ایک عقاب آیا اور جھپٹا مار کر اسے پکڑ لے گیا۔ ان تمام قدرتی آفات نے اہل مکہ کے اس ارادے کو اور بھی پختہ کر دیا' کہ وہ بلا تاخیر اس پرانی اور مقدس عبادت گاہ کی از سرِ نو تعمیر کا اہتمام کریں۔

بہر حال جب تمام رؤسائے قریش کعبے کی تعمیر نو پر متفق ہو گئے تو حضور ﷺ

کے ماموں ابووہب بن عمرو مخزومی نے قریش سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''تعمیر کعبہ میں جو کچھ بھی خرچ کیا جائے' وہ کسبِ حلال ہو۔ زنا' چوری اور سود وغیرہ کی ایک کوڑی بھی اس خرچ میں شامل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور پاک ہی کو پسند کرتا ہے۔'' اس خطاب کے بعد تعمیر کعبہ کی سعادت میں مساوی شرکت کے لیے تعمیری امور مختلف قبائل میں تقسیم کردیئے گئے۔

اس تقسیم کے نتیجے میں دروازے کی جانب کی تعمیر عبد مناف اور بنی زہرہ کے حصے میں آئی۔ حجر اسود اور رکن یمانی کا درمیانی حصہ بنی مخزوم اور قریش کے دیگر قبائل کے ذمے اور بیت اللہ کی پشت کی تعمیر بنو جمح اور بنی سہم اور حطیم' بنی عبدالدار بن قصی' بن اسد اور بنی عدی کے حصے میں آیا۔

الغرض ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جب قدیم عمارت ڈھانے کا وقت آیا تو کسی کو یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ بیت اللہ کو منہدم کرنے کے لیے کدال چلائے۔ ہر شخص اس بابرکت اور باعظمت مکان کو گرانے سے خائف تھا۔ مبادا کہ وہ کسی ناگہانی آفت میں گرفتار ہو جائے۔ آخر کار ولید بن مغیرہ نے جرأت کی۔ اس نے ہاتھ میں کدال لے کر کعبے پر چڑھ کر کہا: ''اے اللہ' ہم دین سے منحرف نہیں ہوئے ہیں۔ ہم خیر کے سوا اور کچھ نہیں چاہتے۔'' یعنی کسی بری نیت سے تیرے گھر کو نہیں ڈھا رہے ہیں۔ یہ کہ کر اس نے کعبے کے ایک حصے پر ضرب لگائی اور پھر رک گیا۔ رات بھر سب لوگ اس انتظار میں رہے کہ ولید پر کوئی آفت آتی ہے یا نہیں۔ اگر ولید پر کوئی آفت نازل ہوئی تو ہم بیت اللہ کو پھر اس کی اصل پر بنادیں گے۔ بصورت دیگر ہم ولید کی مدد کریں گے۔ دوسری صبح جب ولید ہاتھ میں کدال اٹھائے صحیح سلامت حرم میں پہنچا تو لوگوں نے ولید کو دیکھ کر یقین کرلیا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے اس فعل سے راضی ہے اور پھر سب اس کام میں ولید کے ساتھ شریک ہوگئے۔ اہل مکہ نے بنیادوں کو اس گہرائی تک کھودا کہ حضرت ابراہیمؑ کی رکھی ہوئی بنیادیں نمودار ہوگئیں۔ کہتے ہیں کہ جب ایک قریشی نے حضرت ابراہیمؑ کی بنیادوں پر پھاوڑا چلایا تو اس قدر زور سے دھماکا ہوا کہ تمام مکہ لرز گیا۔ لوگوں نے اس دھماکے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ سمجھ کر آگے کھودنا بند کردیا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی بنیادوں ہی سے تقسیم کار کے مطابق ہر قبیلے نے علیحدہ علیحدہ پتھر چننے شروع کردیے۔

حضور ﷺ نے بھی اس تعمیر میں باقی قریش کی طرح پورا حصہ لیا۔ آپ ﷺ اپنے مبارک کاندھوں پر پتھر ڈھو ڈھو کر لاتے' اور چلتے وقت آپ ﷺ بار بار اپنے تہبند میں الجھ جاتے۔ برہنگی اور عریانی اہل عرب کے ہاں کوئی معیوب بات نہ تھی' مگر حضور ﷺ نے ہر ممکن کوشش کی کہ پتھر ڈھوتے وقت آپ ﷺ کے جسم اطہر کا کوئی حصہ نظر نہ آئے۔

بہر حال جب دیواریں ذرا بلند ہوئیں اور حجر اسود کو اپنے مقام پر رکھنے کا وقت آیا تو سب قبائل میں زبردست اختلاف پیدا ہوگیا۔ ہر قبیلہ یہ سعادت بلاشرکت غیرے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کش مکش نے یہاں تک طول کھینچا کہ چاروں طرف تلواریں کھنچ گئیں اور لوگ جنگ و جدال اور قتال پر آمادہ ہوگئے۔ حتیٰ کہ اسی حالت میں چار پانچ دن گزر گئے۔ تعمیر کا کام معطل ہوگیا اور کوئی بات طے نہ ہوسکی۔

آخر ایک روز حرم میں سب مشورے کے لیے جمع ہوئے۔ بنی مخزوم میں سے ایک شخص ابوامیہ بن مغیرہ (ولید بن مغیرہ کے بھائی) نے' جو اس وقت سب سے زیادہ سن رسیدہ تھا' اٹھ کر تجویز پیش کی کہ ''اے قریش کے لوگو! اپنے اس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے اس بات پر اتفاق کرلو کہ کل صبح سب سے پہلے جو شخص اس مسجد کے دروازے سے داخل ہو' وہ اس کا فیصلہ کردے۔'' اس تجویز کو سب نے مان لیا۔

اب خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ دوسری صبح سب سے پہلے داخل ہونے والے حضور ﷺ تھے۔ لوگوں نے آپ ﷺ کو دیکھتے ہی کہا: "هذا الامين' رضينا' هذا محمد" یہ امین ہیں۔ ہم راضی ہوگئے۔ یہ تو محمد ہیں۔''

جب حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ اب اس قضیے کا فیصلہ آپ ﷺ کو کرنا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایک کپڑا لاؤ۔'' لوگ کپڑا لے آئے۔ آپ ﷺ نے حجر اسود کو اس کپڑے پر رکھ دیا۔ پھر فرمایا' ہر قبیلہ ایک ایک طرف سے اس کپڑے کو پکڑ لے اور سب مل کر حجر اسود کو اٹھائیں جب پتھر اس مقام تک پہنچ گیا' جہاں اسے لگانا تھا' تو آپ ﷺ نے اسے اپنے ہاتھ سے وہاں لگا دیا۔

یہ نبوت کے صرف پانچ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت ساری قوم نے بالاتفاق حضور ﷺ کے ''امین'' ہونے کی شہادت دی تھی۔

تخلیہ پسندی

کعبے کی تعمیر نو ہوئی تو مشرکانہ دماغوں نے حسن کاری کے طریقے سوچے۔ عمارت کے اندر انبیا کی تصویریں بنائیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو تیروں سے فال نکالتے ہوئے دکھایا۔ آرائش و زیبائش کے لیے 360 بت رکھے گئے۔ ان پر چڑھاوے' نذر و نیاز کے انبار لگتے۔ اسی دور جہالت کا ایک واقعہ ایک غلام صحابی نے دورِ اسلام میں سنایا۔ مالک بڑے جتن سے ان کے ذریعے دودھ اور مکھن کا چڑھاوا ایک بت کے سامنے رکھتا۔ تاکید ہوتی' خبردار! کھا پی نہ لینا' ورنہ بتوں کی لعنت سے بچ نہ سکوگے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا جونہی وہ چیزیں بت کے سامنے رکھی جاتیں' کہیں سے ایک کتا آتا۔ دودھ مکھن چٹ کر جاتا اور پھر ٹانگ اٹھا کر بت پر پیشاب کرتا اور چلا جاتا۔ ایک قبیلے نے پتھر کی بجائے آٹے کا قد آدم بت بنایا۔ معبود بنا کر اس کی پوجا کی۔ قحط کے دن آئے تو بت کو کاٹ کاٹ کر ہضم کر گئے۔ ایک قبیلے نے لکڑی کا صنم تراشا۔ سردیوں کے دن آئے تو مسافر چوری سے اسے کاٹ کاٹ کر چولہوں کا ایندھن بنانے لگے۔

آنکھوں پر جہالت کے ایسے پردے پڑے تھے کہ بنو جرہم کی شہوت پرستی کو وہ بزرگی عطا کی گئی کہ خانہ کعبہ کے مجرم بھی دیوتا بنا دیئے گئے۔ نائلہ بنت دیک ایک حسین عورت نیم عریاں لباس میں نمائش حسن کے ساتھ طواف کرتی تھی۔ ایک مستانہ ہجوم اس کے پیچھے ہوتا۔ ایک نوجوان سردار اساف بن یعلیٰ بھی نائلہ کے شیدائیوں میں

سنے تھا۔ ایک دن جب کہ وہ طواف کر رہی تھی' اساف بے خود ہو کر دست درازی سے بھی آگے بڑھ گیا۔ شراب میں بدمست بنو جرہم حرم کعبہ کی اس بے حرمتی پر احتجاج کی بجائے اساف و نائلہ کے حسن و عشق کی داستان فخریہ بیان کرنے لگے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے بت بنائے اور مظہر عشق و محبت قرار دے کر پرستش کرنے لگے۔ یہ بت چاہِ زمزم کے کنارے نصب تھے۔

صادق و امین جیسی فہم و فراست والی ہستی بندگان خدا کی ان حرکتوں کو دیکھتی تو شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ ان ہنگامہ آرائیوں سے بچنے کے لیے دامنِ کوہ کی تنہائی سہارا بنتی۔ مکہ کے چند پاک دامن اور سعید فطرت اشخاص کڑھتے رہتے۔

اس زمانے میں نبی کریم ﷺ کی زندگی راحت و آرام سے بسر ہو رہی تھی۔ اگر بیٹے قاسم اور عبداللہ کی وفات کا غم نہ ہوتا ام المومنین کی محبت اور وفا کیشی آپ ﷺ کے دل پر کبھی گرد ملال نہ بیٹھنے دیتیں' اس آسودہ روزگاری کے عالم میں غور و فکر کی عادت بدستور باقی تھی۔ بت پرستی کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باتیں آپ دھیان دے کر سنا کرتے اور ان پر اپنے انداز میں غور بھی فرمایا کرتے تھے۔ قدرت' جس کی منشا یہ تھی کہ آپ کے اندر رسالت و نبوت کے اعلیٰ اوصاف سمودے' نیز آپ میں قابلیت کے ایسے جوہر پیدا کر دے جن کی بنا پر آپ مخلوقِ خدا کو راہ ہدایت دکھا سکیں' وہ ہرگز یہ گوارا نہیں کر سکتی کہ آپ کو دوسروں کی طرح تاریکی میں چھوڑ دیا جائے۔

حضور ﷺ کی افتادِ طبع کچھ ایسی تھی کہ حقیقت کے متلاشی رہتے تھے۔ انھیں وہ فرض ادا کرنے کی آٹھوں پہر فکر رہتی تھی جو قدرت نے ان پر عائد کیا تھا۔ روحانی اور معنوی زندگی کے ربط و ضبط کا نتیجہ ہی تھا کہ آپ ﷺ کبھی کاہنوں اور ورقہ بن نوفل ایسے داناؤں کے پاس نہیں بیٹھتے تھے' بلکہ خود ہی حقیقت کی جستجو میں رہتے اور اپنے افکار و خیالات سے دوسروں کو کم مطلع کرتے تھے۔

اس عہد میں یہ رواج تھا کہ متفکرین ہر سال لوگوں سے یکسو ہو کر عبادت و ریاضت میں مشغول ہوتے تھے اور اسی طریق کو خدا کی بارگاہ میں قرب کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ رسول کریم ﷺ بھی خلوت کو فکر و تامل کا بہترین ذریعہ قرار دیتے تھے اور اس حالت میں آپ کی روح سکون پذیر ہوتی تھی۔ آپ کو ہمیشہ خدا آگاہی کی جستجو رہتی تھی اور یہ جستجو روز بروز ترقی پر تھی۔

مکہ سے تین میل دور کوہ حرا کا ایک غار' جس کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز تھا۔ ریاضت و عبادت کے لیے بہترین مقام تھا۔ نبی کریم ﷺ رمضان المبارک کا مہینہ اسی غار میں بسر کرتے تھے۔ تھوڑا سا توشہ آپ کے پاس ہوتا تھا۔ آپ اسی پر قناعت کرتے ہوئے غور و فکر اور عبادت و ریاضت میں مصروف ہو جایا کرتے تھے۔ دنیا کی گہما گہمی اور اہل دنیا کی چہل پہل سے الگ تھلگ رہ کر جستجوئے حق میں مصروف رہتے۔ کبھی محویت و استغراق کا یہ عالم ہوتا کہ دنیا و مافیہا سے ہی نہیں' بلکہ اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جاتے' اور کھانے پینے کے طبعی تقاضے بھی آپ کی توجہ اپنی جانب مبذول نہ کر سکتے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر' تنہائی میں آپ پر یہ حقیقت منکشف ہوتی کہ حقیقت پر مجاز کے تاریک غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ غور و فکر کے بعد یہ حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی کہ عوام نے اپنے اوہام پر حق و صداقت کا خول چڑھایا ہوا ہے۔

حضور ﷺ حقیقت کے متلاشی تھے' لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتب کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ کائنات کی وسعت' صاف و شفاف آسمان' چمکتے ہوئے ستارے' چاند اور سورج' وسیع و عریض صحرا' سمندر اور اس کی لرزتی ہوئی لہریں اور وہ تمام اشیا جن سے وحدت الوجود کی حقیقت آشکارا ہوتی ہے آپ ﷺ کے غور و فکر کا موضوع بنی ہوئی تھیں۔ عزلت و خلوت کے عالم میں آپ ﷺ کی نگاہوں کے سامنے سے حجابات اٹھ جاتے اور آپ کی مقدس روح کے آئینے میں تخلیق کائنات کے اسرار و رموز پوری آب و تاب کے ساتھ منعکس ہوتے' یہ بات کہ لوگ راہ راست سے بھٹک گئے ہیں' آپ سے پوشیدہ نہ تھی۔ آپ سوچتے رہتے:

(ا) یہ بت کیا ہیں؟ نہ کسی کے نفع و نقصان پر قدرت رکھتے ہیں' نہ کسی کی تخلیق کر سکتے ہیں اور نہ کسی کو رزق بہم پہنچا سکتے ہیں۔ یہ بت کسی چیز پر بھی قادر نہیں۔ ہبل' لات' عزیٰ اور دوسرے بت جو کعبے کے اندر اور اس کے اطراف میں رکھے ہوئے ہیں' ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ان بتوں سے بھلا اہل مکہ کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

(ب) حق کیا ہے؟ اس وسیع و عریض کائنات' ارض و سما و اجرام سماویہ میں حق کہاں مستور ہے؟ ہم اس کی تلاش کہاں کریں؟ کیا حق ان چمکتے ہوئے ستاروں میں مستور ہے جو روشنی کا منبع اور حرارت کا سرچشمہ ہے' جو نزول باران رحمت کا باعث ہوتے ہیں؟ کیا یہ ستارے خود ہماری زمین کی طرح گردش میں ہیں؟ کیا حقیقت سماوی طبقات سے ماوراء اثیر کی لامحدود وسعتوں میں روپوش ہے؟

(ج) اثیر کیا ہے؟ ہماری زندگی جو موج صرصر کی طرح گریزپا اور ناپائیدار ہے' کس طرح ظہور میں آئی؟ کیا زمین کسی حادثے کے نتیجے میں پیدا ہو گئی ہے؟ لیکن زمین اور ہماری زندگی میں ایک کامل نظام موجود ہے جو تغیر نا آشنا ہے اور حادثات کسی نظم اور کسی آئین کے پابند نہیں ہوا کرتے۔ لوگ جو نیک و بدکام کرتے ہیں' آیا وہ ان کاموں میں خود مختار ہیں یا فطرت کے تقاضوں کے تحت مجبور ہیں؟

اس دور میں جن وجوہ سے آپ ﷺ مکہ کی آبادی چھوڑ کر سنسان پہاڑیوں کے درمیان حرا کے غار میں خلوت گزیں ہوتے تھے' اس کے وجوہ پر کچھ روشنی سورۂ الم نشرح کی اس آیت سے پڑتی ہے:

﴿وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ۝ الَّذِيٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ۝﴾ (نشرح: 2تا3)

''اور ہم نے تم پر سے وہ بھاری بوجھ اتار دیا' جو تمھاری کمر توڑے ڈال رہا تھا۔''

اس آیت میں ''وزر'' کے معنی بھاری بوجھ کے ہیں اور اس سے مراد رنج و غم اور فکر و پریشانی کا وہ بوجھ ہے جو اپنی قوم کی جہالت و جاہلیت کو دیکھ دیکھ کر آپ ﷺ کی حساس طبیعت پر پڑ رہا تھا۔ آپ ﷺ کے سامنے بت پوجے جا رہے تھے۔ شرک

اور مشرکانہ اوہام ورسوم کا بازار گرم تھا۔ اخلاق کی گندگی اور بے حیائی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ معاشرتے میں ظلم اور معاملات میں فساد عام تھا۔ زور داروں کی زیادتیوں سے بے زور پس رہے تھے۔ لڑکیاں زندہ دفن کی جا رہی تھیں۔ قبیلوں پر قبیلے چھاپے مار رہے تھے اور بعض اوقات سو سو برس تک انتقامی لڑائیوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ کسی کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہ تھی، جب تک کہ اس کی پشت پر کوئی مضبوط جتھا نہ ہو۔ یہ حالات دیکھ دیکھ کر آپ ﷺ کڑھتے تھے، مگر اس بگاڑ کو دور کرنے کی کوئی صورت آپ ﷺ کو نظر نہ آتی تھی۔ یہی فکر آپ ﷺ کی کمر توڑے ڈال رہی تھی جس کا بارگراں اللہ تعالیٰ نے ہدایت کا راستہ دکھا کر آپ کے اوپر سے اتار دیا۔

کائنات، زمین اور بشریت کے پر تفکر سوالات پر غور کرتے کرتے طبیعت تنہائی کی طرف مائل ہونے لگی۔ شریک حیات آپ ﷺ کے مزاج کو سمجھتی تھی۔ آخر اپنی مضطرب اور بے چین فطرت کی آسودگی کے لیے کوہ ودمن میں نکل آئے تو سامنے جبل نور تھا۔ اس پر چڑھنے لگے تو اس غار تک پہنچ گئے جہاں رمضان کے مہینے میں آپ کے دادا عبدالمطلب اعتکاف کیا کرتے تھے۔ یہاں پہنچے تو طبیعت نے زیست کا مزا پایا۔ اضطراب نے سکون کا دامن تھاما۔ حرا نے فکر کی راہیں کھول دیں۔ غار کا رخ کعبے کی طرف ہے۔ یہاں بیٹھتے تو اس انداز میں جیسے ہم التحیات میں بیٹھتے ہیں۔ سامنے کعبہ نظر آتا رہتا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے۔

محدثین نے اس انداز عبادت کو ''تحنث'' کا نام دیا ہے۔ یہ تنہائی بہت راس آئی۔ دل کو سکون واطمینان ملنے لگا۔ جب حضور ﷺ یہاں پہلی بار گئے تو کچھ توشہ، ستو وغیرہ ساتھ لیا۔ پھر آپ کا یہ معمول بن گیا کہ کچھ دنوں کے بعد گھر تشریف لاتے اور ایک آدھ دن قیام کرکے اور توشہ لے کر پھر اسی غار میں تشریف لے جاتے تھے۔ ادھر سے گزرنے والے مسافروں اور مساکین کو بھی آپ ﷺ شریک طعام کر لیا کرتے۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہونے لگے۔ غار حرا میں یہ عبادت تحنث تقریباً پانچ برسوں پر محیط ہے۔

غار حرا

مکہ شہر سے تین میل کے فاصلے پر جبل نور ہے جو شمال مشرق میں منیٰ وعرفات کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ پر سڑک سے چند فرلانگ پر ہے۔ قدیم زمانے میں اسے جبل حرام کہتے تھے۔ اس کی شکل گول برج کی سی ہے اور ٹیلوں سے الگ تھلگ صحرا کی چلچلاتی دھوپ میں اکیلا کھڑا ہے۔ اس کے چاروں طرف میلوں تک نگاہ کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔ بہت بڑا بنجر ٹیلا، جس میں بہت سی گھاٹیوں نے شگاف ڈال دیئے ہیں۔ دور دور تک نہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے اور نہ سایہ دار درخت، نہ کوئی سوتا اور نہ کوئی چشمہ۔ زمانہ جاہلیت میں رات کے وقت حجاج کی راہ نمائی کے لیے اس کی چوٹی پر روشنی کی جاتی تھی، تاکہ عرفات سے آنے والے راستہ پاسکیں۔ دن میں اپنی انوکھی وضع قطع کی بنا پر دور ہی سے پہچان لیا جاتا ہے۔

غار حرا چٹانوں کے گر جانے سے بنا ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے چکر دار چڑھائی ہے۔ قدرتی طور پر زینے سے بن گئے ہیں۔ چوٹی کے قریب بالائی حصہ ہموار ہے اور باقی آدھا حصہ سوسوا سو فٹ اوپر اٹھا ہوا ہے۔ ہموار حصے پر ٹیلے کے کنارے دو بڑی سلیں قدرتی طور پر اوپر سے مل گئی ہیں، جس سے خیمے کی سی شکل پیدا ہوگئی ہے۔ یہ غار مستطیل شکل کا ہے اور قدرتاً اس کا رخ کعبے کی جانب ہے۔ اندر سے تقریباً چار گز لمبا، پونے دو گز چوڑا اور اتنا ہی اونچا ہے۔ آدمی آسانی سے کھڑا ہو کر نماز ادا کر سکتا ہے۔ فرش قدرتاً ہموار اور مسطح ہے، جس پر آرام سے پاؤں پھیلا کر سویا جا سکتا ہے۔ سلوں کے باہم ملنے سے قدرتی طور پر دھوپ اور بارش سے بچاؤ ہو جاتا ہے۔

فضا گرد وغبار سے پاک ہو تو جبل حرا سے سمندر بھی دکھائی دیتا ہے جو تقریباً 45 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ دن ہو یا رات، یہاں ایک ملکوتی سکون کی فضا رہتی ہے۔ جویائے حق کے لیے یہ مقام فکر ونظر ہے۔ ہر وقت نظروں کے سامنے بیت اللہ ہے جس کی طرف دیکھنا بھی عبادت ہے۔ شاہ مصباح الدین شکیل نے کیا خوب لکھا ہے کہ ''یہاں تین چیزیں جمع ہوگئی ہیں۔ فکر کے لیے خلوت، نظر کے لیے کعبہ اور ذکر کے لیے سکون'' حرا کے لفظی معنی ہیں تلاش وجستجو کا غار۔ یہی وہ جگہ ہے جو خاتم النبیین کی عبادت گاہ ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت عیسیٰؑ کے اٹھائے جانے کے چھ سو سال بعد زمین اور آسمان کا رابطہ دوبارہ وحی کے ذریعے قائم ہوا تھا۔

41 واں سال رویائے صادقہ

دل مضطر کا سکون خلوت کدہ حرا میں تھا۔ یہیں نبوت کی بشارت ملی۔ پیر کا دن تھا اور ربیع الاول کا مہینہ۔ چھ ماہ کے بعد پہلی وحی کا نزول رمضان میں ہوا۔ ان چھ مہینوں کے دوران میں رویائے صادقہ (سچے خواب) آتے رہے۔ رویائے صادقہ کو، نبوت کا 46 واں حصہ کہا گیا ہے۔ اس طرح 23 سالہ دور نبوت کا 46 واں حصہ 6 ماہ بنتا ہے۔ مسلسل غور وفکر کے بعد آخر وہ وقت آ گیا تھا جب عالم خواب میں آپ ﷺ پر حقائق کا انکشاف ہونے لگا۔ یہ بات بھی آپ کے ذہن پر نقش ہوگئی کہ دنیا کی زندگی ناپائیدار اور بے حقیقت ہے۔ آپ ﷺ پر یہ چیز بھی روشن ہوگئی کہ عوام گم راہی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور بت پرستی نے ان کی اخلاقی اور روحانی زندگی کی روح قبض کر رکھی ہے۔ آپ ﷺ سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ تھی کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تعلیمات عوام کو راہ راست پر نہیں لا سکیں، اور وہ اس لیے کہ ان تعلیمات میں حقیقت کی جانب میلان کے باوجود بت پرستی کا رنگ جھلکتا تھا۔

حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم ﷺ پر وحی آنے کی ابتدا سچے خوابوں سے ہوئی تھی۔ سچے خوابوں کا سلسلہ بعد میں بھی زمانہ نبوت کے ہر دور میں جاری رہا ہے۔ چناں چہ احادیث میں آپ ﷺ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپ ﷺ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے اور قرآن مجید میں بھی آپ ﷺ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح، آیت 27)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے۔ یا مجھے یہ بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا

گیا ہے یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ احادیث قدسی زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

پہلی وحی

جب آپ ﷺ کی عمر چالیس سال چھے ماہ کی ہوگئی تو ایک روز ماہِ رمضان میں یکا یک آپ ﷺ پر غار حرا میں وحی نازل ہوئی اور فرشتے جبرئیل نے رو در رو آپ ﷺ کے سامنے آ کر آپ ﷺ سے کہا' پڑھو۔ بخاری میں کئی جگہ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ سے نقل ہوا ہے۔ وہ خود رسول اللہ کا ارشاد بیان کرتی ہیں کہ میں نے کہا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' اس پر فرشتے نے مجھے پکڑ کر بھینچا' یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا' پڑھو۔ میں نے کہا: ''میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔'' اس نے دوبارہ مجھے بھینچا اور میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا' پڑھو۔ میں نے پھر کہا: ''میں پڑھا ہوا نہیں ہوں' اس نے تیسری مرتبہ مجھے بھینچا' یہاں تک کہ میری قوت برداشت جواب دینے لگی۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ (پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا)۔ یہاں تک کہ فرشتہ ﴿مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ تک پہنچ گیا۔

یہ سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات ہیں:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ٥﴾ (العلق: 1)
''پڑھو اپنے رب کے نام کے ساتھ' جس نے پیدا کیا۔''

﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾ (العلق: 2)
''پیدا کیا انسان کو خون کی پھٹکی سے۔''

﴿اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ﴾ (العلق: 3)
''پڑھو اور تمھارا رب تو بہت عزت والا ہے۔''

﴿عَلَّمَ بِالْقَلَمِ﴾ (العلق: 4)
''اسی نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔''

﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ (العلق: 5)
''اسی نے انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا۔''

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ کانپتے لرزتے ہوئے غار حرا سے پلٹے اور حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر فرمایا: ''مجھے اڑھاؤ' مجھے اڑھاؤ۔'' چناں چہ آپ ﷺ کو اڑھا دیا گیا۔ جب آپ ﷺ پر سے خوف زدگی کی کیفیت دور ہوگئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے خدیجہؓ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔'' پھر سارا قصہ آپ ﷺ نے انھیں سنایا اور کہا: ''مجھے اپنی جان کا ڈر ہے۔'' انھوں نے کہا: ''ہرگز نہیں۔ آپ خوش ہو جائیے۔ خدا کی قسم' آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کبھی رسوا نہ کرے گا۔'' آپ ﷺ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں۔ امانتیں ادا کرتے ہیں۔ بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں۔ نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں۔''

پھر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو ان کے چچا زاد بھائی تھے۔ زمانہ جاہلیت میں بت پرستی چھوڑ کر عیسائی ہوگئے تھے۔ عربی اور عبرانی میں انجیل لکھتے تھے۔ بہت بوڑھے اور نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے ان سے کہا: ''بھائی جان' ذرا اپنے بھتیجے کا قصہ سنیے۔'' (حضور ﷺ کو ان کا بھتیجا اس لیے کہا کہ ان کی تیسری پشت میں حضور ﷺ کی چوتھی پشت میں عبد مناف کا بھائی تھا)، ورقہ نے حضور ﷺ سے کہا: ''بھتیجے تمھیں کیا نظر آیا؟''

رسول اللہ ﷺ نے جو کچھ دیکھا تھا' وہ بیان کیا۔

ورقہ نے کہا: ''یہ وہی ناموس ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ کاش میں آپ کے زمانہ نبوت میں قوی ہوتا۔ کاش میں اس وقت زندہ رہوں' جب آپ ﷺ کی قوم آپ کو نکالے گی' (ناموس کا مطلب ہے' عالم بالا سے وحی لانے والا فرشتہ)۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟''

ورقہ نے کہا: ''ہاں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپ ﷺ لائے ہیں اور اس کے ساتھ دشمنی نہ کی گئی ہو...... میں نے آپ ﷺ کا وہ زمانہ پایا' تو میں آپ ﷺ کی پرزور مدد کروں گا۔'' مگر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ ورقہ کا انتقال ہوگیا۔

پہلا فرض نماز

سب سے پہلی چیز جو اقرار توحید اور بتوں سے برأت کے بعد فرض کی گئی' وہ نماز تھی۔ حضرت عائشہؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ سب سے پہلے حضور ﷺ پر جو چیز فرض کی گئی تھی' وہ نماز تھی اور وہ ابتدا میں دو دو رکعت تھی۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ پر وحی آنے کے بعد پہلا کام یہ ہوا کہ جبرئیل نے آ کر آپ ﷺ کو وضو کا طریقہ بتایا۔ پھر جبرئیل نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور آپ ﷺ نے کہا کہ آپ ﷺ ان کے ساتھ نماز پڑھیں۔ پھر حضور ﷺ گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا۔ وہ خوشی کے مارے مدہوش ہو گئیں۔ پھر حضور ﷺ نے انھیں اسی طرح وضو کرنے کے لیے کہا اور انھیں ساتھ لے کر اسی طرح نماز پڑھی' جس طرح آپ نے جبرئیل کے ساتھ پڑھی تھی۔ پس یہ پہلا فرض تھا جو پہلی وحی کے بعد مقرر کیا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ اسی رات کی صبح کا واقعہ ہے جس رات پہلی وحی نازل ہوئی۔ اس کے بعد حضور ﷺ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا خفیہ طریقے سے نماز پڑھتے رہے۔

فترت وحی

فترت کے لفظی معنی ہیں' انقطاع' کم زوری' وقفہ۔ ایک نبی کے وصال سے لے کر دوسرے نبی کے ظہور تک کا درمیانی زمانہ' فترت'' کہلاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ اور نبی اکرم ﷺ کا درمیانی زمانہ بھی فترت ہے۔ سیرت رسول ﷺ کی اصطلاح میں یہ لفظ پہلی وحی سورۃ العلق اور دوسری وحی سورۂ مدثر کے درمیانی زمانے کے لیے استعمال

ہوتا ہے۔

حضور ﷺ پر پہلی وحی ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ نازل ہونے کے بعد سلسلہ وحی کچھ عرصے کے لیے منقطع ہو گیا۔ اسے فترت وحی یعنی وحی کی بندش کہتے ہیں' وحی کے رک جانے کے بعد حضور ﷺ کو بڑا رنج و ملال ہوا۔ آپ ﷺ کے دل میں جبرئیل امین سے ملاقات اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے بہرہ مند ہونے کے شوق نے اضطراب اور قلق کی ایسی صورت اختیار کر لی کہ آپ ﷺ شفتہ خاطر رہنے لگے۔ اس حالت میں بعض اوقات کسی کنوئیں پر تشریف لے جاتے اور اکثر غار حرا میں قیام کرتے۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ بے خودی کے عالم میں کبھی شبیر (مکہ کے ایک پہاڑ) اور کبھی حرا پر جا کر ارادہ فرماتے تھے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ اس حالت میں جب کہ آپ ﷺ کسی پہاڑ کے کنارے کا رخ کر رہے تھے' آپ ﷺ نے آسمان سے ایک آواز سنی اور آپ ﷺ ٹھہر گئے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو جبرئیل آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے نظر آئے اور انھوں نے کہا" اے محمد ﷺ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرئیل ہوں۔" حضور ﷺ فرشتے کو اس حالت میں دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ گھر واپس آ کر حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھے کمبل اڑھا دو۔ انھوں نے کمبل (یا لحاف) اڑھا دیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے وحی نازل کی ﴿یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ پھر لگاتار وحی کا نزول شروع ہو گیا۔

فترت وحی کی مدت میں اختلاف ہے۔ بعض نے تین برس کا عرصہ قرار دیا۔ بعض نے ڈھائی برس کا' اور حضرت عباسؓ کی روایت کے مطابق فقط چند روز۔

فترت کی مصلحت یہ تھی کہ پہلی وحی سے حضور ﷺ کو جو دہشت ہوئی تھی' وہ جاتی رہے۔ آپ ﷺ رفتہ رفتہ اسے برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں اور جبرئیل کو دوبارہ دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہو جائے۔ چناں چہ جب حیرت کے سائے سکڑ گئے' حقیقت کے نقوش پختہ ہو گئے اور نبی ﷺ کو یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ خدائے بزرگ و برتر کے نبی ہو چکے ہیں اور آپ ﷺ کے پاس جو شخص آیا تھا' وہ وحی کا سفیر اور آسمانی خبر کا ناقل ہے' اور اس طرح وحی کے لیے آپ کا شوق و انتظار اس بات کا ضامن ہو گیا کہ آئندہ وحی کی آمد پر آپ ثابت قدم رہیں گے اور اس بوجھ کو اٹھا لیں گے تو حضرت جبرئیل دوبارہ تشریف لائے اور وحی کی بندش ختم ہوئی اور پھر جو سلسلہ شروع ہوا تو حضور ﷺ کی رحلت تک جاری رہا۔

تبلیغ کا حکم

سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات کے نزول سے فترت وحی کا زمانہ ختم ہوا۔ ان آیات میں حضور ﷺ کو منصب رسالت پر مامور کر کے وہ ضروری ہدایات دی گئیں جو اس منصب کے فرائض ادا کرنے کے لیے درکار تھیں۔ سورۂ علق (پہلی وحی) کی پہلی پانچ آیات صرف یہ ظاہر کرتی تھیں کہ آپ ﷺ پر نزول وحی کا آغاز ہو گیا ہے اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی بنا دیے گئے ہیں۔ اب سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات میں آپ ﷺ کو نبوت کے ساتھ ساتھ فریضہ رسالت بھی سونپ دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ اٹھ کر اس فرض کو ادا کرنا شروع کر دیں۔

﴿یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ o قُمْ فَاَنْذِرْ o وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ o وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ o وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ o وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَکْثِرُ o وَلِرَبِّکَ فَاصْبِرْ o﴾

یہ تھیں وہ اولین تبلیغی ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس وقت دی تھیں جب اس نے آپ ﷺ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ ﷺ اٹھ کر رسالت کے کام کا آغاز فرمائیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے جملوں پر اور ان کے معنی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوت کا کام شروع کرتے وقت اس سے بہتر کوئی ہدایات نہیں دی جا سکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپ ﷺ کو کام کیا کرنا ہے اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام کس نیت' کس ذہنیت اور کس طرز فکر کے ساتھ انجام دینا ہے' اور اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا کہ اس کام میں آپ کو کن حالات اور دشواریوں سے سابقہ پیش آئے گا اور ان کا مقابلہ آپ ﷺ کو کس طرح کرنا ہو گا۔

حضرت خدیجہؓ کے کمبل (یا لحاف) اڑھانے پر لیٹ تو گئے' اور سکون بھی محسوس کیا ہو گا' لیکن سورۂ مدثر کی وحی نے منظر ہی بدل دیا۔ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے اپنی تصنیف "الرحیق المختوم" میں ان آیات پر تبصرہ آرائی کرتے ہوئے لکھا ہے: "ان آیات کا مطلع' اللہ بزرگ و برتر کی آواز میں ایک آسمانی ندا پر مشتمل ہے' جس میں نبی ﷺ کو اس عظیم و جلیل کام کے لیے اٹھنے اور نیند کی چادر پوشی اور بستر کی گرمی سے نکل کر جہاد اور سعی و مشقت کے میدان میں آنے کے لیے کہا گیا: ﴿یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ﴾ اے چادر پوش! اٹھ کر اور ڈرا۔ گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ جسے اپنے لیے جینا ہے' وہ تو راحت کی زندگی گزار سکتا ہے' لیکن آپ ﷺ جو اس زبردست بوجھ کو اٹھا رہے ہیں' تو آپ ﷺ کو نیند سے کیا تعلق؟ آپ ﷺ کو راحت سے کیا سروکار؟ آپ ﷺ کو گرم بستر سے کیا مطلب؟ پرسکون زندگی سے کیا نسبت؟ راحت بخش ساز و سامان سے کیا واسطہ؟ آپ اٹھ جائیے اس کار عظیم کے لیے جو آپ ﷺ کا منتظر ہے۔ اس بار گراں کے لیے جو آپ ﷺ کی خاطر تیار ہے۔ اٹھ جائیے جہد و مشقت کے لیے' تکان اور محنت کے لیے اٹھ جائیے کیوں کہ اب نیند اور راحت کا وقت گزر چکا۔ اب آج سے پیہم بیداری ہے اور طویل و پرمشقت جہاد ہے۔ اٹھ جائیے اور اس کام کے لیے مستعد اور تیار ہو جائیے۔"

خفیہ دعوت کا آغاز

حضور ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز اپنی زوجہ حضرت خدیجہؓ سے کیا۔ انھوں نے اسلام قبول کیا اور بروز جمعۃ المبارک شام کے وقت سب سے پہلے آپ ﷺ کے ہم راہ نماز پڑھی۔ ان کے بعد حضرت علیؓ جو مدت سے آپ ﷺ کی آغوش تربیت میں تھے' دس سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور بعثت سے اگلے روز یعنی بروز شنبہ انھوں نے حضور کے ہم راہ نماز ادا کی۔ حضور ﷺ نے اپنے رفیق قدیم ابوبکر صدیقؓ کو ایمان و اسلام کی دعوت دی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی تامل و تفکر اور

غور و تدبر کے بغیر اسلام کی دعوت قبول کر لی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "میں نے جس کسی پر بھی اسلام پیش کیا' وہ اسلام سے کچھ نہ کچھ ضرور جھجکا' مگر ابوبکرؓ نے اسلام قبول کرنے میں کوئی توقف نہیں کیا۔" ان کے ساتھ ہی حضور ﷺ کے غلام زیدؓ بن حارثہ بھی اسلام لائے۔ امام ابوحنیفہ سے کسی نے دریافت کیا کہ سب سے پہلے اسلام کون لایا؟ تو انھوں نے فرمایا: "خواتین میں حضرت خدیجہؓ آزاد مردوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ لڑکوں میں حضرت علیؓ اور غلاموں میں حضرت زیدؓ بن حارثہ سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔

ان حضرات کے چند روز بعد حضرت بلالؓ حضرت عمروؓ بن غصبہ اور خالدؓ بن سعد بن عاص بھی داخلِ اسلام ہو گئے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ بڑے مال دار اور مکہ معظمہ میں بزازی کی دکان کرتے تھے۔ آپ ﷺ زمانۂ جاہلیت میں بھی اپنی صائب رائے' پارسائی اور صدق و دیانت کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ ان کی تبلیغ سے حضرت عثمانؓ بن عفان' حضرت زبیرؓ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف' حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص مسلمان ہوئے۔ پھر حضرت عمارؓ حضرت خبابؓ بن الارث' حضرت ابوعبیدہؓ حضرت سعیدؓ بن زید' حضرت عبیدہؓ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب' حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ حضرت ابو سلمہؓ حضرت عثمانؓ بن مظعون' حضرت صہیبؓ رومی' اور حضرت ارقم نے اسلام کی دعوت قبول کی۔

عورتوں میں حضرت خدیجہؓ کے بعد حضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کی بیوی لبابہ بنت الحارث' حضرت اسماؓ بنت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب نے اسلام قبول کیا۔

پھر جو جو مسلمان ہوتا گیا' وہ آگے اپنے حلقۂ احباب میں نیک روحوں کی تلاش کر کر کے اندر ہی اندر اسلام پھیلاتا گیا۔ اس زمانے میں مسلمان چھپ چھپ کر مکہ کی سنسان گھاٹیوں میں نماز پڑھتے تھے' تاکہ کسی کو ان کی تبدیلی دین کا پتہ نہ چل سکے۔

دارِ ارقم میں مرکزِ تبلیغ

ڈھائی سال سے کچھ زیادہ ہی مدت گزری تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا جس سے اندیشہ ہوا کہ کہیں کفار مکہ سے قبل از وقت تصادم شروع نہ ہو جائے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ ایک روز مسلمان مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کے ایک گروہ نے انھیں دیکھ لیا اور انھیں سخت سست کہنا شروع کیا۔ بات بڑھتے بڑھتے لڑائی تک پہنچ گئی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک شخص کو اونٹ کی ہڈی کھینچ ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ شخص جس کا سر پھٹا تھا' وہ بنی تیم کا عبداللہ بن خطل تھا۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے بلاتاخیر حضرت ارقم بن ارقم کے مکان کو' جو صفا کے قریب واقع تھا' مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا دیا' تاکہ مسلمان یہیں جمع ہو کر نماز بھی پڑھیں اور جو جو لوگ خفیہ طریقے سے مسلمان ہوتے جائیں' وہ یہاں آتے رہیں۔

حضرت ارقمؓ قدیم ترین مسلمانوں میں سے تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ ساتویں مسلمان تھے اور دوسری روایت کے مطابق بارھویں۔ انھیں تقریباً 614ء میں اپنا مکان' جو کوہ صفا پر واقع تھا' حضور ﷺ کی سکونت کے لیے پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ مکان حضرت عمر فاروقؓ کے اسلام لانے کے وقت تک مسلمانوں کا مستقر رہا۔ ابن سعد نے کئی جگہ کچھ لوگوں کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے اور دیگر ایسے واقعات کا ذکر کیا ہے جو حضور ﷺ کے ارقم کے مکان میں تشریف لانے یا وہاں آنے سے پہلے پیش آئے تھے۔ ارقمؓ نے حضور ﷺ کے ساتھ مدینہ کو ہجرت کی اور غزوہ بدر اور دوسرے غزوات میں شریک ہوئے۔ ارقمؓ کا مکان' جس میں ایک عبادت گاہ بھی تھی' ان کے خاندان کے قبضے میں رہا' یہاں تک خلیفہ المنصور نے اسے خرید لیا۔ پھر یہ خلیفہ ہارون الرشید کی والدہ الخیز ران کے قبضے میں چلا گیا اور "بیت الخیز ران" کے نام سے مشہور ہوا۔

اسلام کی تاریخ میں دارارقم کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ تین سال کی خفیہ دعوت کا دور ختم ہونے اور علانیہ دعوت عام شروع ہو جانے کے بعد بھی یہ مسلمانوں کا مرکز رہا۔ اسی میں حضور ﷺ تشریف فرما رہتے تھے۔ یہیں آ کر مسلمان آپ ﷺ کے پاس جمع ہوتے تھے۔ شعب ابی طالب کی محصوری تک اس مکان کو دعوتِ اسلام میں ہیڈ کوارٹر کی سی حیثیت حاصل رہی۔

تین سال تک خفیہ تبلیغ ہوتی رہی۔ علانیہ تبلیغ کا ذکر کرنے سے پہلے' یہ دیکھ لینا چاہیے کہ خفیہ دعوت کے اس تین سالہ دور میں کتنا کام ہوا تھا۔ قریش کے کن کن قبیلوں کے کون کون اور کتنے لوگ مسلمان ہو چکے تھے' اور قریش سے باہر کے لوگوں اور موالی اور غلاموں اور لونڈیوں میں سے کس کس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بڑی تلاش و تجسس کے بعد شروع شروع میں اسلام قبول کرنے والوں کی ایک فہرست مرتب کی تھی جو ان کی تصنیف "سیرت سرورِ عالم" (حصہ دوم) میں شامل ہے۔ یہ پوری فہرست کسی بھی جگہ پہلی مرتبہ مذکورہ تصنیف میں شامل کی گئی تھی۔ یہاں وہ پوری فہرست نقل کی جا رہی ہے:

بنی ہاشم میں سے:

1: جعفرؓ بن ابی طالب
2: ان کی بیوی اسماءؓ بنت عمیس خثعمیہ (یہ غیر قریش میں سے تھیں)
3: صفیہؓ بنت عبدالمطلب (حضور ﷺ کی پھوپھی اور حضرت زبیرؓ کی والدہ)
4: ازدیٰ بنت عبدالمطلب (طلیبؓ بن عمیر کی والدہ اور حضور ﷺ کی پھوپھی)۔

بنی المطلب میں سے:

5: عبیدہؓ بن الحارث بن مطلب

بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے:

6: ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ
7: ان کی بیوی سہلہؓ بنت سہیل بن عمرو

بنی امیہ میں سے:

8: عثمانؓ بن عفان

9: ان کی والدہ اروئیؓ بنت کریز

10: خالدؓ بن سعید بن العاص بن امیہ (ابواحیحہ ان کے باپ سعید کی کنیت تھی)

11: ان کی بیوی امیمہؓ بنت خلف الخزاعیہ (بعض نے ان کا نام امینہ لکھا ہے)۔

12: ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان (پہلے عبید اللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں۔ بعد میں انھیں ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔)

خلفائے بنی امیہ میں سے:

13: عبداللہؓ بن جحش بن رئاب

14: ابواحمدؓ بن جحش

15: عبیدؓ اللہ بن جحشؓ

یہ بنی غنم بن دودان میں سے تھے۔ حضور ﷺ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے اور ام المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے۔ عبداللہ بن جحش نے اپنی بیوی حضرت ام حبیبہؓ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی' پھر وہاں عیسائی ہو کر مر گیا۔

بنی تیم میں سے:

16: اسماءؓ بنت ابی بکرؓ

17: ام رومانؓ (حضرت ابوبکرؓ کی اہلیہ اور حضرت عائشہؓ اور عبدالرحمٰن بن ابی بکر کی والدہ)۔

18: طلحہؓ بن عبیداللہ

19: ان کی والدہ صعبہؓ بنت الحضرمی

20: حارثؓ بن خالد

خلفائے بنی تیم میں سے:

21: صہیبؓ بن سنان الرومی

22: زبیرؓ بن العوام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی۔

23: خالد بن حزام (حکیم بن حزام کے بھائی اور حضرت خدیجہ کے بھتیجے)۔

24: اسودؓ بن نوفل

25: عمرو بن امیہ

بنی عبدالعزیٰ بن قصی میں سے:

26: یزیدؓ بن زمعہ بن الاسود

بنی زہرہ میں سے:

27: عبدالرحمٰنؓ بن عوف

28: ان کی والدہ شفاءؓ بنت عوف۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع کر دیا۔ دس سال تک آپ ﷺ کا یہ طریقہ رہا کہ آپ ﷺ منیٰ' عکاظ' مجنہ' اور ذی المجاز میں ایک ایک قبیلے کے پڑاؤ پر تشریف لے جاتے اور فرماتے: ''لوگو! کہو لا الٰہ الا اللہ فلاح پاؤ گے اور اس کلمے کی بدولت عرب کے حاکم بن جاؤ گے اور عجم تمھارا مطیع ہو جائے گا' اور جب تم ایمان لے آؤ گے تو جنت میں تم بادشاہ ہو گے۔'' پیچھے پیچھے ابولہب آ کر جب آپ کی مخالفت کرتا تو لوگ کہتے کہ تمھارے اپنے خاندان' قبیلے اور بستی کے لوگ تمھیں زیادہ جانتے ہیں۔ جب انھوں نے تمھاری پیروی قبول نہ کی تو ہم کیسے کریں۔ یہ جواب سن کر حضور ﷺ بس یہ کہ کر رہ جاتے ''خداوندا! اگر تو چاہتا تو یہ ایسے نہ ہوتے۔''

قریش کے سرداروں کو یہ کسی طرح بھی گوارا نہ تھا کہ یہ تبلیغ ہوتی رہے۔ ان کے آبائی دین کی جڑیں کٹتی رہیں۔ ان کے نظام زندگی' تمدن اور معاشرت کے بالکل برعکس ایک دوسرا نظام فروغ پاتا رہے اور لوگ اسلام قبول کرتے رہیں۔ اس لیے ان کا فیصلہ بہرحال یہی تھا کہ اس دعوت کو بہرحال پوری سختی سے کچل ڈالنا ہے اور ہر قیمت پر اسے زک دینی ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف سرداران قریش کا رویہ یکساں نہ تھا' بلکہ لوگ مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک طبقہ شدید ترین مخالفین کا تھا جو زیادہ تر بڑے بڑے سرداروں پر مشتمل تھا دوسرا طبقہ ان بہت سے سرداران قریش کا تھا جو دشمن تو ضرور تھے' مگر ایسے دشمن نہ تھے کہ متشدد گروہ کی طرح ہاتھ دھو کر حضور ﷺ اور مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئے ہوں۔ البتہ اسلام کے خلاف جو کارروائیاں کی جاتی تھیں' ان میں وہ دشمنوں کا ساتھ دیتے تھے۔ جو لوگ کم سے کم مخالف تھے' ان کا طرز عمل بھی قرآن مجید (ہود۔5) میں یہ بیان کیا گیا ہے: ''دیکھو یہ لوگ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں' تا کہ اس سے چھپ جائیں۔'' یعنی یہ لوگ حضور ﷺ کی دعوت سے ایسے بیزار ہیں کہ آپ ﷺ سے کتراتے ہیں۔ کہیں آپ ﷺ کو بیٹھے دیکھتے ہیں تو الٹے پھر جاتے ہیں۔ کبھی آپ ﷺ کو سامنے سے آتے دیکھتے ہیں تو رخ بدل لیتے یا کپڑے کی اوٹ میں منہ چھپا لیتے ہیں' تا کہ آمنا سامنا نہ ہو جائے اور آپ ﷺ انھیں مخاطب کر کے کچھ بات نہ کرنے لگیں۔

رہے' مکہ کے عام لوگ' تو ان میں کچھ غیر جانب دار تھے' کچھ دلوں میں اسلام کے قائل ہو گئے تھے' مگر اپنا اسلام چھپائے ہوئے تھے' کچھ اسلام قبول کرتے جا رہے تھے' اور ایک بڑی تعداد اپنے سرداروں کے بھڑکانے سے آبائی دین کی حمیت میں مبتلا ہو کر ان شرارتوں میں شریک ہو جاتی تھی' جو اسلام کے خلاف کی جاتی تھیں۔ مخالفین نے اسلام کی دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کئی تدابیر اختیار کیں' کئی چالیں چلیں۔ پہلے حضور ﷺ سے مصالحت کی کوششیں کیں۔ ان میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو حضور ﷺ کے چچا پر دباؤ ڈالا۔ چچا کا دل بھی نہ پسیجا تو پھر وہ ذلیل اور اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے' اور اسلام قبول کرنے والوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔ ان تمام تدبیروں' چالوں' حربوں' ہتھکنڈوں اور ظلم و ستم کا احوال سیرت ﷺ کی مختلف

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا

شجرۂ طیبہ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم

فہر (قریش)

- حارث — ضبّہ — اُہیب — ہلال — جراح — عبداللہ — ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ
- غالب — لوی — کعب — مرہ
- محارب
- تیم الادرم
- عامر — زمعہ — سودہ رضی اللہ عنہا
- خزیمہ
- حارث
- عدی — رزاح — قرط — عبداللہ
- ہصیص — عمرو — جمح
- سہم — سعید — ہاشم — وائل — عاص — عمرو رضی اللہ عنہ — عبداللہ رضی اللہ عنہ
- ریاح — عبدالعزیٰ — نفیل
- خطاب — عمر رضی اللہ عنہ — حفصہ رضی اللہ عنہا، عبداللہ رضی اللہ عنہ، عبداللہ
- عمرو — زید — سعید رضی اللہ عنہ
- کلاب — قصی — عبد مناف
- زہرہ — حارث — عبد — عبدعوف — عوف — عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ
- عبد مناف — وہب — آمنہ
- وہیب — ابی وقاص — سعد رضی اللہ عنہ
- عبد شمس — امیہ
- حرب — ابوسفیان رضی اللہ عنہ — معاویہ رضی اللہ عنہ، ام حبیبہ رضی اللہ عنہا، یزید رضی اللہ عنہ
- یزید جانشین معاویہ رضی اللہ عنہ
- ابوالعاص — عفان — عثمان رضی اللہ عنہ — عبداللہ بن رقیہ رضی اللہ عنہ
- حکم — مروان
- ہاشم — عبدالمطلب
- مطلب — حارث — عبیدہ رضی اللہ عنہ شہید بدر
- عبدالعزیٰ — اسد — خویلد — خدیجہ رضی اللہ عنہا
- عوام — زبیر — عبداللہ
- یقظہ — مخزوم
- عمرو — ابوامیہ — ام سلمہ رضی اللہ عنہا
- عمر — عبداللہ — مغیرہ — ولید — خالد رضی اللہ عنہ
- اسد — عبد مناف — ارقم رضی اللہ عنہ
- تیم — سعد — کعب — عمرو — عامر — عثمان رضی اللہ عنہ — عبداللہ — طلحہ رضی اللہ عنہ
- ابوقحافہ رضی اللہ عنہ — ابوبکر رضی اللہ عنہ — عائشہ رضی اللہ عنہا، ام کلثوم رضی اللہ عنہا، اسماء رضی اللہ عنہا، عبداللہ رضی اللہ عنہ، محمد رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ

عبدالمطلب کی اولاد:

- حارث — ابوسفیان رضی اللہ عنہ
- قثم، ضرار، غیداق، ابولہب، مقوم
- ام الحکیم بیضاء — والدہ عثمان رضی اللہ عنہ
- عاتکہ
- زبیر — عبداللہ رضی اللہ عنہ
- عبدالکعبہ
- حجل
- عباس رضی اللہ عنہ — قثم رضی اللہ عنہ، فضل رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ — عبدالرحمٰن، عبداللہ
- صفیہ رضی اللہ عنہا والدہ زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ
- حمزہ رضی اللہ عنہ — یعلیٰ رضی اللہ عنہ، عمارہ رضی اللہ عنہا
- عبداللہ
- امیمہ
- ابوطالب — طالب، عقیل رضی اللہ عنہ، جعفر رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ، ام ہانی رضی اللہ عنہا، عبداللہ رضی اللہ عنہ
- بّرہ
- اروی

علی رضی اللہ عنہ — فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد: حسن رضی اللہ عنہ، حسین رضی اللہ عنہ، محسن رضی اللہ عنہ، ام کلثوم رضی اللہ عنہا، زینب رضی اللہ عنہا

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی اولاد: قاسم رضی اللہ عنہ، عبداللہ رضی اللہ عنہ، زینب رضی اللہ عنہا، رقیہ رضی اللہ عنہا، ام کلثوم رضی اللہ عنہا، فاطمہ رضی اللہ عنہا

ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کی اولاد: ابراہیم رضی اللہ عنہ

- فہر قریش سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک شجرہ نسب
- قبائل کے بانی سردار
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قریشی ازواج
- صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم
- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد
- عبدالمطلب کی اولاد
- جنت کی بشارت پانے والے صحابہ کرام
- خلفائے راشدین
- عبداللہ بن عبدالمطلب کے ماں جائے بھائی بہنیں (فاطمہ بنت عمرو مخزومی کی اولاد)

شجرۂ طیبہ امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم
اور
سیّدہ آمنہ

کلاب

قُصَیّ — زہرہ

عبد مناف — حارث

عبد

عبد عوف

ہاشم — عوف

عبدالمطلب — عبد مناف — عبدالرحمن رضی اللہ عنہ

وہیب

عبداللہ — وہب — ابی وقاص

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم — آمنہ — سعد رضی اللہ عنہ

بحر قلزم

ابوسفیان کے قافلے کا راستہ

غزوہ بدر

غزوہ اُحد
کوہِ اُحد
نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ہمراہ نکلنے والا لشکر 1000
عبداللہ بن ابی سلول کے ساتھ لوٹنے والے
منافقین 300
عبداللہ بن جبیرؓ کے زیرِ قیادت تیر انداز
تیر اندازوں کی پہاڑی
خالد بن ولید کے گھڑ سواروں کا عقب سے حملہ
مسلمانوں کی صف بندی
علیؓ
حمزہؓ
مقدادؓ
مُسلمانوں کا حملہ
خالد کے 100 گھڑ سوار
صفوان بن امیہ کی قیادت میں پیدل فوج
عکرمہ کے 100 گھڑ سوار
کُفار کی کل تعداد 3000
مُشرکین کی صف بندی
مُشرکینِ مکہ کی پسپائی

کتابوں میں بیان ہوا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ تمام واقعات موضوع وار ترتیب میں جمع و مرتب کیے ہیں۔ یہاں ان سب کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

حضور ﷺ سے مصالحت کی کوشش

مخالفین نے بار بار یہ کوشش کی کہ آپ ﷺ سے بات چیت کر کے آپ ﷺ کو دین کے معاملے میں کسی نہ کسی طرح مصالحت پر راضی کر لیں۔ اس مقصد کے تحت ان کے متعدد وفود بھی آپ سے ملے اور خاص خاص اشخاص نے بھی مل کر بات کی۔

عتبہ بن ربیعہ کی ملاقات

ان ملاقاتوں میں سے ایک اہم ملاقات ابوسفیان کے خسر عتبہ بن ربیعہ کی تھی۔ ایک دفعہ قریش کے کچھ سردار مسجد حرام میں محفل جمائے بیٹھے تھے اور مسجد کے ایک دوسرے گوشے میں رسول اللہ تنہا تشریف رکھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت حمزہؓ ایمان لا چکے تھے اور قریش کے لوگ مسلمانوں کی جمعیت میں روز افزوں اضافہ دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہے تھے۔ اس موقع پر عتبہ بن ربیعہ نے سرداران قریش سے کہا' ''صاحبو! اگر آپ لوگ پسند کریں تو میں جا کر محمد ﷺ سے بات کروں اور ان کے سامنے چند تجویزیں رکھوں شاید کہ وہ ان میں سے کسی کو مان لیں اور ہم بھی اسے قبول کر لیں اور اس طرح وہ ہماری مخالفت سے باز آ جائیں۔ سب حاضرین نے اس سے اتفاق کیا اور کہا کہ ''ابوالولید' تم پر پورا اطمینان ہے۔ ضرور جا کر اس سے بات کرو۔''

عتبہ اٹھ کر حضور ﷺ کے پاس جا بیٹھا۔ آپ ﷺ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو اس نے کہا: ''بھتیجے' ہمارے ہاں تمھیں جو عزت حاصل تھی' وہ تم خود جانتے ہو' اور نسب میں بھی تم ایک شریف ترین گھرانے کے فرد ہو۔ تم اپنی قوم پر یہ کیا مصیبت لے آئے ہو؟ تم نے جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ ساری قوم کو بے وقوف ٹھہرایا۔ قوم کے دین اور اس کے معبودوں کی برائی کی' اور ہمارے باپ دادا جو مر چکے ہیں' ان سب کو تم نے کافر اور گم راہ ٹھہرایا۔ اب تم ذرا میری بات سنو۔ میں کچھ تجویزیں تمھارے سامنے رکھتا ہوں۔ ان پر غور کرو' شاید کہ ان میں سے کسی کو تم قبول کر لو۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ابوالولید' آپ کہیں' میں سنوں گا''

اس نے کہا: ''بھتیجے' یہ کام جو تم نے شروع کیا ہے' اس سے تمھارا مقصد اگر مال حاصل کرنا ہے تو ہم سب مل کر تمھیں اتنا کچھ دیئے دیتے ہیں کہ تم ہم میں سب سے زیادہ مال دار ہو جاؤ۔ اگر اس سے اپنی بڑائی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا سردار بنائے لیتے ہیں۔ کسی معاملے کا فیصلہ تمھارے بغیر نہ کریں گے۔ اگر بادشاہی چاہتے ہو تو ہم تمھیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر تم پر کوئی جن آتا ہے' جسے تم خود دفع کرنے پر قادر نہیں ہو' اور تمھیں سوتے اور جاگتے میں واقعی کچھ نظر آنے لگا ہے' تو ہم بہترین طبیب بلواتے ہیں اور سب مل کر اپنے خرچ پر تمھارا علاج کراتے ہیں۔

عتبہ یہ باتیں کرتا رہا اور حضور ﷺ خاموش سنتے رہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''ابوالولید' آپ کو جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکے یا ابھی کچھ اور کہنا ہے؟''

اس نے کہا: ''بس مجھے جو کہنا تھا' وہ میں نے کہہ دیا ہے''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اچھا' اب میری سنیے۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورۂ حٰم السجدہ کی تلاوت شروع کی اور عتبہ اپنے دونوں ہاتھ پیچھے زمین پر ٹیکے غور سے سنتا رہا۔ آیت سجدہ (آیت ۳۸) پر پہنچ کر حضور ﷺ نے سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھا کر فرمایا:

''ابوالولید' میرا جواب آپ نے سن لیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کا کام''

عتبہ اٹھ کر سرداران قریش کی مجلس کی طرف چلا تو لوگوں نے دور سے اسے دیکھتے ہی کہا: ''خدا کی قسم' عتبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ وہ صورت نہیں ہے جسے لے کر یہ گیا تھا۔ پھر جب وہ آ کر بیٹھا تو لوگوں نے کہا: ''کیا سن آئے؟''

اس نے کہا: ''بخدا' میں نے ایسا کلام سنا کہ کبھی اس سے پہلے نہ سنا تھا۔ خدا کی قسم نہ یہ شعر ہے' نہ سحر ہے' نہ کہانت۔ اے اہل قریش' میری بات مانو اور اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کلام رنگ لا کر رہے گا۔ فرض کرو' اگر عرب اس پر غالب آ گئے تو اپنے بھائی کے خلاف ہاتھ اٹھانے سے تم بچ جاؤ گے اور دوسرے اس سے نمٹ لیں گے۔ لیکن اگر وہ عرب پر غالب آ گیا تو اس کی بادشاہی تمھاری بادشاہی' اور اس کی عزت تمھاری عزت ہوگی۔''

سرداران قریش اس کی یہ بات سنتے ہی بول اٹھے: ''ولید کے ابا' آخر اس کا جادو تم پر بھی چل گیا۔''

عتبہ نے کہا: ''میری جو رائے تھی' وہ میں نے تمھیں بتا دی' اب تمھارا جو جی چاہے' کرتے رہو''

مصالحت کی چند اور کوششیں: (۱) عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول کریم ﷺ سے کہا کہ ہم آپ کو اتنا مال دے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ مال دار آدمی بن جائیں۔ آپ ﷺ جس عورت کو پسند کریں' اس سے آپ ﷺ کی شادی کیے دیتے ہیں۔ ہم آپ ﷺ کے پیچھے چلنے کے لیے تیار ہیں۔'' آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں' تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔

حضور ﷺ نے پوچھا: ''وہ کیا ہے؟''

انھوں نے کہا: ''ایک سال آپ ہمارے معبودوں میں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں' اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔''

حضور نے فرمایا: ''اچھا ٹھہرو۔ میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔

اس پر سورۂ کافرون وحی کی صورت میں نازل ہوئی:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ o لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ o وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ o وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ o وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ o لَكُمْ

دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ (الکافرون)

''کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی عبادت تم کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں' اور نہ میں ان کی عبادت کرنے والا ہوں جن کی عبادت تم نے کی ہے' اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں۔ تمھارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

(2) قریش کے لوگوں نے حضور ﷺ سے کہا: ''اے محمد ﷺ ' اگر تم ہمارے معبودوں کو چوم لو تو ہم تمھارے معبود کی عبادت کریں گے۔

(3) چند سرداران قریش حضور ﷺ سے ملے اور آپ ﷺ سے کہا: ''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم' آؤ ہم تمھارے معبود کی عبادت کرتے ہیں اور تم ہمارے معبودوں کی عبادت کرو اور ہم اپنے سارے کاموں میں تمھیں شریک کیے لیتے ہیں۔ اگر وہ چیز جو تم لے کر آئے ہو اس سے بہتر ہوئی جو ہمارے پاس ہے تو ہم تمھارے ساتھ اس میں شریک ہوں گے اور اپنا حصہ اس سے پالیں گے' اور اگر وہ چیز جو ہمارے پاس ہے' اس سے بہتر ہوئی جو تم لائے ہو تو تم ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گے اور اس سے اپنا حصہ پالو گے''

(4) قریش کے لوگوں نے حضور ﷺ سے کہا: ''اگر آپ پسند کریں تو ایک سال ہم آپ کے دین میں داخل ہو جائیں اور ایک سال آپ ہمارے دین میں داخل ہو جایا کریں''

جناب ابوطالب پر دباؤ ڈالنے کی کوششیں

دعوت اسلامی کو روکنے کے لیے قریش کی دوسری تدبیر یہ تھی کہ پے درپے ابو طالب سے مل کر ان پر بھی دباؤ ڈالیں کہ وہ بھتیجے کی حمایت ترک کر دیں اور ان کی وساطت سے حضور ﷺ پر بھی دباؤ ڈالیں کہ آپ اپنے کام سے باز آجائیں۔

اشرافِ قریش کا وفد: قریش نے جب دیکھا کہ ابو طالب حضور ﷺ کی حمایت کر رہے ہیں اور آپ ﷺ بھتیجے کو نہیں روکتے' تو اشراف قریش کا ایک وفد ان کے پاس گیا انھوں نے کہا: ''اے ابو طالب' آپ کے بھتیجے نے ہمارے معبودوں کی برائی کی۔ ہمارے دین میں عیب نکالا۔ ہماری عقلوں کو حماقت قرار دیا۔ ہمارے باپ دادا کو گم راہ ٹھہرایا۔ اب یا تو آپ اسے ہماری دل آزاری سے روکیں یا ہمارے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں' کیوں کہ آپ خود بھی تو ہماری طرح اس کے لائے ہوئے دین کے خلاف ہیں۔ پھر ہم اس سے نمٹ لیں گے۔''

ابو طالب نے انھیں بہت نرم جواب دے کر اور اچھی اچھی باتیں کر کے ٹھنڈا کیا اور وہ چلے گئے۔

دوسرا وفد: اشرافِ قریش دوسرا وفد لے کر ابو طالب کے پاس گئے اور کہا کہ اے ابو طالب' آپ ہمارے درمیان سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ شرف اور قدر و منزلت رکھتے ہیں۔ ہم نے آپ سے کہا تھا کہ آپ اس کی حمایت سے باز آجائیں' مگر آپ باز نہ آئے۔ ہم سے اپنے باپ دادا کی برائی اور اپنی عقلوں کی توہین اور اپنے معبودوں کی تضحیک برداشت نہیں ہو سکتی۔ اب یا تو آپ اسے روکیں یا پھر ہمارا اور آپ کا مقابلہ ہوگا' یہاں تک کہ فریقین میں سے کوئی ایک ہلاک ہو جائے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد ابو طالب نے آپ ﷺ کو بلا کر کہا: ''بھتیجے تمھاری قوم نے آکر مجھ سے یہ یہ باتیں کہی ہیں۔ تم میرے لیے بھی اور اپنے لیے بھی جینے کی کچھ گنجائش باقی رہنے دو اور مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں اور نہ تم اٹھا سکو۔ لہٰذا اپنی قوم سے ایسی باتیں کہنا چھوڑ دو جو انھیں ناگوار ہیں۔''

چچا ابو طالب کی یہ بات سن کر حضور ﷺ نے محسوس کیا کہ چچا کے لیے اب میری حمایت کرنا مشکل ہو گیا ہے اور وہ اس سے دست بردار ہونے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ تب آپ ﷺ نے فرمایا: ''چچا جان' اگر سورج میرے سیدھے ہاتھ پر اور چاند بائیں ہاتھ پر بھی رکھ دیا جائے تو میں یہ کام نہیں چھوڑوں گا' یہاں تک کہ یا تو اللہ اسے کام یاب کر دے یا میں اس راہ میں ہلاک ہو جاؤں۔'' پھر آپ ﷺ رنجیدہ ہو کر اٹھ کر جانے لگے۔

ابو طالب نے یہ دیکھ کر کہ حضور ﷺ پر اس بات کا سخت اثر ہوا ہے' آپ ﷺ کو پکارا۔ آپ ﷺ پلٹ کر آئے تو انھوں نے کہا' اپنا کام جاری رکھو اور جو کچھ کرنا چاہو کرو۔ خدا کی قسم میں کسی چیز کی وجہ سے بھی تمھیں دشمنوں کے حوالے نہیں کروں گا۔''

تیسرا وفد: اشراف قریش ایک دفعہ پھر ابو طالب کے پاس آئے اور ان سے کہا کہ آپ ہمارے بڑے اور سردار ہیں' ہم آپ کے سامنے ایک انصاف کی بات پیش کرتے ہیں اور آپ بھی ہمارے اور اس کے درمیان انصاف کریں۔ اپنے بھتیجے کو بلائیے اور اس سے کہیے کہ وہ ہمارے معبودوں کی برائی چھوڑ دے' اور ہم اسے اور اس کے معبود کو اس کے حال پر چھوڑے دیتے ہیں۔ اس پر ابو طالب نے حضور ﷺ کو بلایا اور کہا: ''بھتیجے یہ تمھارے چچا اور تمھاری قوم کے اشراف اور شیوخ آئے ہیں اور تم سے ایک انصاف کی بات کرنا چاہتے ہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''آپ لوگ کہیں' میں سنتا ہوں''

انھوں نے کہا: ''تم ہمیں اور ہمارے معبودوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو اور ان کی برائی کرنے سے باز آجاؤ۔ ہم تمھیں اور تمھارے معبود کو تمھارے حال پر چھوڑے دیتے ہیں''

ابو طالب نے کہا: ''یہ تو انھوں نے انصاف کی بات کہی ہے' اسے مان لو'

حضور ﷺ نے فرمایا: ''چچا جان' کیا میں اس سے بہتر چیز کی طرف انھیں نہ بلاؤں؟''

ابو طالب نے پوچھا: ''وہ کیا بات ہے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں انھیں ایک ایسے کلمے کی طرف بلاتا ہوں' جس کے اگر یہ قائل ہو جائیں تو عرب کے فرماں روا بن جائیں اور عجم ان کے تابع ہو جائے''

ابو جہل بولا: ''یہ تو بڑے نفع کا سودا ہے۔ تمھارے باپ کی قسم' ہم ایک نہیں دس ایسے کلمات کہنے کے لیے تیار ہیں''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''کہو لا الہ الا اللہ۔''

اس پر اشراف قریش غضب ناک ہو کر' نفرت کے ساتھ چھٹ گئے اور کہنے لگے: ﴿وَاصْبِرُوْا عَلٰى اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُّرَادُ﴾ (ص:6): ''اپنے معبودوں کی عبادت پر ڈٹے رہو۔ اس بات سے کچھ اور ہی مراد ہے''

چوتھا وفد: قریش نے جب دیکھا کہ ابو طالب کسی طرح حضور ﷺ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے اور وہ قوم کی عداوت اور اس سے جدائی تک اپنے بھتیجے کی خاطر مول لینے کو تیار ہیں تو وہ ولید بن مغیرہ کے بیٹے عمارہ بن ولید کو ان کے پاس لے گئے اور کہا: ''اے ابو طالب! یہ عمارہ بن ولید قریش کا نہایت نامور اور خوب صورت جوان ہے' اسے لے کر بیٹا بنا لو اور اس کے بدلے اپنے اس بھتیجے کو ہمارے حوالے کر دو' جس نے تمھارے آباواجداد کے دین کی مخالفت کی اور تمھاری قوم میں پھوٹ ڈال دی اور ہم سب کو احمق قرار دیا۔ ہم ایک آدمی دے کر دوسرا لیتے ہیں تا کہ اسے قتل کر ڈالیں''

ابو طالب نے جواب دیا: ''واللہ' تم نے بدترین سودا مجھ سے کیا۔ اپنا بیٹا مجھے دیتے ہو کہ میں اسے پالوں' اور میرا بیٹا مجھ سے مانگتے ہو کہ تم اسے قتل کر ڈالو۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

قریش کی ذلیل حرکات

حضور ﷺ کے خلاف قریش کے لوگ جو حرکات کر رہے تھے' ان میں سے بعض نہایت چھچھوری تھیں' جن سے مقصود آپ ﷺ کی دل شکنی کرنا اور آپ ﷺ کو تنگ کرنا تھا۔

حضرت زینبؓ کو طلاق دلوانے کی کوشش: ان میں سے ایک حرکت یہ تھی کہ قریش کے لوگوں نے حضور ﷺ کے داماد ابو العاص بن ربیع پر دباؤ ڈالا کہ وہ آپ ﷺ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کو بھی اسی طرح طلاق دے دیں' جس طرح ابولہب نے اپنے بیٹوں سے آپ کی صاحبزادیوں حضرت رقیہؓ اور ام کلثومؓ کو طلاق دلوائی تھی ابو العاص کی والدہ ہالہ بنت خویلد حضرت خدیجہؓ کی بہن تھیں۔ حضور ﷺ کے منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے حضرت زینبؓ کے ساتھ ان کا نکاح ہو چکا تھا اور حضرت خدیجہؓ انھیں بالکل اپنے بیٹے کی طرح سمجھتی تھیں۔ نبوت کے بعد اگرچہ یہ مسلمان ہوئے اور اپنے شرک ہی پر قائم رہے' لیکن انھوں نے قریش کے کسی دباؤ کو قبول نہ کیا اور حضرت زینبؓ کو طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حضرت زینبؓ اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہی مسلمان ہو چکی تھیں' لیکن چوں کہ اس زمانے میں مشرک و مومن کے درمیان نکاح کی حرمت کا کوئی حکم نہ آیا تھا' اس لیے وہ ابو العاص کے نکاح میں رہیں۔

سرداران قریش نے ابو العاص سے کہا: ''تم زینب کو طلاق دے دو۔ قریش کی جس عورت کو تم پسند کرو' اس سے ہم تمھاری شادی کرائے دیتے ہیں''

القاسم کی وفات پر اظہار مسرت: حضور ﷺ کے بڑے صاحب زادے حضرت قاسمؓ تھے۔ ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں۔ ان سے چھوٹے عبداللہ تھے' پھر تین صاحبزادیاں ام کلثومؓ' فاطمہؓ اور رقیہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا۔ پھر حضرت عبداللہؓ نے بھی وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا: ''ان کی نسل ختم ہو گئی۔ اب وہ ابتر ہیں'' (یعنی ان کی جڑ کٹ گئی ہے)۔ ابو جہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ عطاء بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ کے دوسرے صاحب زادے کا انتقال ہوا تو حضور ﷺ کا اپنا چچا ابولہب (جس کا گھر حضور ﷺ کے گھر سے متصل تھا) دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور انھیں یہ خوش خبری دی کہ: ''آج رات محمد لاولد ہو گئے یا ان کی جڑ کٹ گئی''

یہ تھے وہ انتہائی دل شکن حالات جن میں سورۂ کوثر حضور ﷺ پر نازل کی گئی' جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ﴾ (الکوثر: 3)
''اے نبی' تمھارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔''

قرآن کی آواز سنتے ہی شور مچا دینا: ایک اور ذلیل حرکت جو قریش نے اختیار کر رکھی تھی' وہ یہ تھی کہ جب قرآن پڑھا جاتا تو وہ شور مچاتے۔ ہر طرف سے دوڑ پڑتے تھے تا کہ قرآن نہ خود سنیں' نہ دوسروں کو سننے دیں۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ حم السجدہ' آیت نمبر 26 میں فرمایا گیا: ''یہ منکرین کہتے ہیں' اس قرآن کو ہرگز نہ سنو۔ اور جب یہ سنایا جائے تو اس میں خلل ڈالو' شاید کہ اس طرح تم غالب آ جاؤ۔'' ان کا پروگرام یہ تھا کہ اس کلام کو نہ خود سنو' نہ کسی کو سننے دو۔ محمد ﷺ جب بھی اسے سنانا شروع کریں' شور مچاؤ۔ تالیاں پیٹو۔ آوازے کسو۔ اعتراضات کی بوچھاڑ کر دو اور اتنی آواز بلند کرو کہ ان کی آواز اس کے مقابلے میں دب جائے۔

سورۂ معارج کی آیت 36' 37 میں ہے: ''پس اے نبی' کیا بات ہے کہ یہ منکرین دائیں اور بائیں سے گروہ در گروہ تمھاری طرف دوڑے چلے آتے ہیں؟'' ان آیات میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو حضور ﷺ کی دعوت و تبلیغ اور تلاوت قرآن کی آواز سن کر مذاق اڑانے اور آوازے کسنے کے لیے چاروں طرف سے دوڑ پڑتے تھے۔

مکہ میں جب حضور ﷺ اپنے گھر میں یا دار ارقم میں نماز پڑھتے وقت بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے تو کفار شور مچانے لگتے اور بسا اوقات گالیوں کی بوچھاڑ کر دیتے تھے۔ اس پر حکم ہوا کہ نہ تو اتنے زور سے پڑھو کہ یہ کفار سن کر ہجوم کر آئیں اور نہ اس قدر آہستہ پڑھو کہ تمھارے اپنے ساتھی بھی نہ سن سکیں۔ یہ حکم سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 110 میں آیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: ''اور اپنی نماز نہ بہت بلند آواز سے پڑھو اور نہ بہت پست آواز سے۔ ان دونوں کے درمیان اوسط درجے کا لہجہ اختیار کرو۔''

قرآن کو الٹے معنی پہنا کر لوگوں کو بہکانا: کفار مکہ کی اس تدبیر کا ذکر بھی قرآن میں

کیا گیا ہے' سورۂ حم السجدہ کی آیت 40 میں ارشاد ربانی ہے: ''جو لوگ ہماری آیات کو الٹے معنی پہناتے ہیں' وہ ہم سے کچھ چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ خود ہی سوچ لو کہ آیا وہ شخص بہتر ہے جو آگ میں جھونکا جانے والا ہے یا وہ جو قیامت کے روز امن کی حالت میں حاضر ہوگا؟ کرتے رہو جو کچھ تم چاہو' تمھاری حرکتوں کو اللہ دیکھ رہا ہے''

مسلمانوں کو فضول بحثوں میں الجھانا: کفار کے اس رویے کا ذکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے: ''اللہ کی دعوت پر لبیک کہے جانے کے بعد جو لوگ (لبیک کہنے والوں سے) اللہ کے دین کے معاملے میں جھگڑے کرتے ہیں' ان کی حجت بازی ان کے رب کے نزدیک باطل ہے'' (سورۂ شوریٰ۔ آیت نمبر 16) یہ اشارہ ہے اس صورتِ حال کی طرف جو مکے میں اس وقت آئے دن پیش آ رہی تھی' جہاں کسی کے متعلق لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا' ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ جاتے۔ مدتوں اس کی جان ضیق میں کیے رکھتے۔ نہ گھر میں اسے چین لینے دیا جاتا نہ محلے اور برادری میں۔ جہاں بھی وہ جاتا' ایک نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ جاتی جس کا مدعا یہ ہوتا کہ کسی طرح وہ حضور ﷺ کا ساتھ چھوڑ کر اسی جاہلیت کی طرف پلٹ آئے جس سے وہ نکلا ہے۔

سورۂ المطففین' آیات 29 تا 33 میں مسلمانوں کی تذلیل وتضحیک کا ذکر یوں کیا گیا ہے: مجرم لوگ ایمان لانے والوں کا مذاق اڑاتے تھے اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو آنکھیں مار مار کر ان کی طرف اشارے کرتے تھے اور جب اپنے گھر والوں کی طرف پلٹتے تو مزے لیتے ہوئے پلٹتے تھے' اور جب انھیں دیکھتے تو کہتے تھے کہ یہ بہکے ہوئے لوگ ہیں' حالانکہ وہ ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔'' یہاں مزے لیتے ہوئے پلٹنے'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد جب وہ اپنے گھروں کی طرف جاتے تو یہ خیال کرتے ہوئے جاتے تھے کہ آج تو مزا آ گیا۔ ہم نے فلاں مسلمان کا مذاق اڑا کر اور اس پر پھبتیاں اور آوازے کس کر خوب لطف اٹھایا۔

ناواقف لوگوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنا: قریش کی اس ذلیل حرکت کے متعلق سورۂ نحل' آیت 24 میں ارشاد ربانی ہوا (ترجمہ) اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمھارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے' تو کہتے ہیں: ''اجی وہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔'' حضور ﷺ کی دعوت کا چرچا جب چاروں اطراف میں پھیلا تو مکے کے لوگ جہاں کہیں جاتے تھے' ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمھارے ہاں جو صاحب نبی بن کر اٹھے ہیں' وہ کیا تعلیم دیتے ہیں؟ قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے مضامین کیا ہیں؟ اس طرح کے سوالات کا جواب کفار مکہ ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیتے تھے جن سے سائل کے دل میں حضور ﷺ اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی کتاب کے متعلق کوئی نہ کوئی شک بیٹھ جائے' یا کم از کم اسے آپ ﷺ سے اور آپ ﷺ کی نبوت کے معاملے میں دلچسپی باقی نہ رہے۔

''ثقافت'' کے ذریعے حملہ آوری

مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''ان گھٹیا تدبیروں کے علاوہ ایک اور تدبیر رسول اکرم ﷺ کی دعوت کو زک دینے کے لیے یہ بھی سوچی گئی کہ لوگوں کو جھوٹے قصوں کہانیوں اور گانے بجانے اور عیش و عشرت میں غرق کر کے اس قابل ہی نہ رکھا جائے کہ وہ ان سنجیدہ مسائل کی طرف توجہ کر سکیں جو قرآن اور رسول ﷺ ان کے سامنے پیش فرما رہے تھے۔

ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ بنی عبدالدار کے ایک شخص نضر بن حارث بن کلدہ نے قریش کے ایک مجمع میں کہا: ''تم لوگ محمد ﷺ کا مقابلہ جس طرح کر رہے ہو' اس سے کام نہیں چلے گا۔ وہ جب تمھارے درمیان نوعمر جوان تھا تو تمھارا سب سے زیادہ خوش اطوار آدمی تھا۔ سب سے زیادہ سچا اور سب سے بڑھ کر امین سمجھا جاتا تھا۔ اب جب کہ اس کے بال سفید ہونے کو آ گئے اور وہ تمھارے پاس وہ چیز لے کر آیا' جو وہ لایا ہے' تو تم کہتے ہو' یہ ساحر ہے' کاہن ہے' شاعر ہے' مجنون ہے۔ بخدا وہ ساحر نہیں ہے۔ ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے اور ان کی جھاڑ پھونک سے ہم واقف ہیں۔ بخدا وہ کاہن بھی نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کی تک بندیاں سنی ہیں اور جیسی گول مول باتیں وہ کیا کرتے ہیں' ہمیں ان کا علم ہے۔ بخدا وہ شاعر بھی نہیں ہے۔ شعر کی تمام اصناف سے ہم واقف ہیں اور اس کا کلام ان میں سے کسی صفت میں نہیں آتا۔ بخدا وہ مجنون بھی نہیں ہے۔ مجنون کی جو حالت ہوتی ہے اور جیسی بے تکی بڑھ ہانکتا ہے' کیا اس سے ہم بے خبر ہیں؟ اے سرداران قریش! کچھ اور بات سوچو۔ جس چیز کا مقابلہ تمھیں درپیش ہے' وہ اس سے زیادہ بڑی ہے کہ یہ باتیں بنا کر تم اسے شکست دے سکو۔''

اس کے بعد اس نے یہ تجویز پیش کی کہ عجم سے رستم و اسفندیار کے قصے لا کر پھیلائے جائیں' تاکہ لوگ ان میں دلچسپی لینے لگیں اور وہ انھیں قرآن سے زیادہ عجیب معلوم ہوں۔ چناں چہ کچھ دن اس پر عمل کیا گیا اور خود نضر نے داستان گوئی شروع کر دی۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس پر مزید اضافہ کیا ہے کہ نضر نے اس مقصد کے لیے گانے والی لونڈیاں بھی خریدی تھیں۔ جس کسی کے متعلق وہ سنتا کہ حضور ﷺ کی باتوں سے متاثر ہو رہا ہے' تو اس پر اپنی کوئی لونڈی مسلط کر دیتا' اور اس سے کہتا کہ اسے خوب کھلا پلا اور گانا سنا تاکہ تیرے ساتھ مشغول ہو کر اس کا دل ادھر سے ہٹ جائے۔

جھوٹ کی مہم

ان تدبیروں کے ساتھ قریش نے حضور ﷺ کی دعوت عام شروع ہوتے ہی ہر طرف آپ کے خلاف جھوٹ کی ایک مہم چلا دی' تاکہ لوگوں کو آپ ﷺ سے بدگمان اور متنفر کیا جائے۔ اس مہم میں چوں کہ صداقت کا کوئی سوال نہ تھا' بلکہ محض بدنام کرنا اور لوگوں کو آپ ﷺ سے دور بھگانا مقصود تھا' اس لیے جس کے منہ میں جو آتا وہ کہتا پھرتا تھا۔

دریں اثنا حج کا زمانہ آ گیا اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے۔ اگر محمد ﷺ نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر جا جا کر آنے والے حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور حج کے اجتماعات میں جگ

بلکہ کھڑے ہو کر قرآن جیسا بے نظیر اور مؤثر کلام سنانا شروع کر دیا تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔

اس موقع پر قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں یہ طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی حرم کے باہر اور اس کے اندر رسول کریم ﷺ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس کانفرنس میں ولید بن مغیرہ نے یہ تجویز پیش کی کہ تم سب عرب کے لوگوں سے کہو! یہ شخص جادوگر ہے۔ یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو اس کے باپ' بھائی' بیوی' بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبے کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وفود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انھوں نے آنے والے زائرین کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے' اس سے ہوشیار رہنا۔

قریش کی یہ جھوٹ کی مہم صرف حج کے موقع ہی پر نہیں چلتی تھی' بلکہ سال کے بارہ مہینے' اور مہینوں کے تیس دن شب و روز اس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مکہ کے عوام کو بھی ہر وقت آپ ﷺ کے خلاف بہکایا جاتا تھا۔ باہر سے آنے والوں کو بھی آپ ﷺ سے خبردار رہنے اور آپ ﷺ کے قریب نہ جانے کی تاکید کی جاتی تھی۔ عرب کے میلوں' عکاظ' مجنہ اور ذوالمجاز میں بھی قریش کے وفود پھیل جاتے تھے اور آپ ﷺ کے خلاف ہر طرح کے وسوسے اور شکوک دل میں ڈالتے تھے' اور خاص طور پر ہر سال حج کے موقع پر تو ان کے وفد حاجیوں کے ایک ایک پڑاؤ پر جاتے اور ہر وہ ممکن بات آپ ﷺ کی مخالفت میں پھیلاتے تھے' جس سے لوگ آپ ﷺ کی بات سننے سے پرہیز کرنے لگیں اور آپ ﷺ کی ذات کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھنے لگیں۔

مسلمانوں پر ظلم و ستم

مخالفت و مزاحمت کی دوسری تدبیروں کے ساتھ کفارِ قریش کی ایک نہایت سنگ دلانہ تدبیر یہ تھی کہ جس جس کے متعلق انھیں معلوم ہوتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے' یا جس نے بھی کسی طرح اپنے اسلام کا اظہار کیا' اس پر انھوں نے بے تحاشا ظلم و ستم ڈھانا شروع کر دیا' اور اسے اسلام سے پھیرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کا کوئی ممکن طریقہ استعمال کرنے سے ذرا دریغ نہیں کیا۔ اول اول تو یہ طریقہ رہا کہ اسلام قبول کرنے والوں میں سے جو لوگ کچھ عزت اور خاندانی شرف و حمایت رکھتے تھے' ان سے مل کر انھیں ملامت کی جاتی کہ تم نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دیا ہے' حالانکہ وہ تم سے زیادہ بھلائی اور برائی کی سمجھ رکھنے والے ہیں۔ اب اگر تم باز نہ آئے تو ہم تمھیں ذلیل و خوار کریں گے' تمھیں احمق ٹھہرائیں گے اور تمھاری عزت خاک میں ملا دیں گے۔ جو لوگ کوئی تجارت یا کاروبار یا صنعتی پیشہ کرتے تھے' انھیں دھمکیاں دی جاتیں کہ یا تو اسلام چھوڑ دو' ورنہ تمھاری تجارت برباد کر دی جائے گی اور تمھارے پیشے کو نہیں چلنے دیا جائے گا' یہاں تک کہ تم بھوکے مرنے لگو گے۔ رہے بے سہارا اور کم زور لوگ تو انھیں سخت عذاب دیئے جاتے تھے' لیکن رفتہ رفتہ نوبت یہ آ گئی کہ عزت دار' مال دار' بارسوخ اور خاندانی لوگوں تک کو مارا پیٹا اور باندھا جانے لگا۔

مشرکین نے جب دیکھا کہ ہر قسم کی تدبیریں اور کارروائیاں اسلامی دعوت کی راہ روکنے میں مؤثر ثابت نہیں ہو رہی ہیں تو وہ ایک بار پھر جمع ہوئے اور پچیس سرداران قریش کی ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا سربراہ رسول ﷺ کا چچا ابولہب تھا۔ اس کمیٹی نے باہمی مشورے اور غور و خوض کے بعد نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف ایک فیصلہ کن قرارداد منظور کی۔ طے کیا گیا کہ اسلام کی مخالفت پیغمبرِ اسلام کی ایذا رسانی اور اسلام لانے والوں کو طرح طرح کے جور و ستم اور ظلم و تشدد کا نشانہ بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

مشرکین نے قرارداد ظلم و ستم طے کر کے اسے روبہ عمل لانے کا عزم صمیم کر لیا۔ مسلمانوں اور خصوصاً کم زور مسلمانوں کے اعتبار سے تو یہ کام بہت آسان تھا' لیکن رسول کریم ﷺ کی ذات کے حوالے سے بڑی مشکلات تھیں۔ آپ ﷺ ذاتی طور پر بڑے باوقار' پرشکوہ اور منفرد شخصیت کے مالک تھے۔ دوست دشمن سبھی آپ ﷺ کو تعظیم کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آپ ﷺ جیسی شخصیت کا سامنا اکرام و احترام ہی سے کیا جا سکتا تھا اور آپ ﷺ کے خلاف کسی نیچ اور ذلیل حرکت کی جرأت کوئی رذیل اور احمق ہی کر سکتا تھا۔ اس ذاتی عظمت کے علاوہ آپ ﷺ کو ابوطالب کی حمایت و حفاظت بھی حاصل تھی' اور ابوطالب مکے کے ان گنے چنے لوگوں میں سے تھے جو اپنی ذاتی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اتنے باعظمت تھے کہ کوئی شخص ان کا عہد توڑنے اور ان کے خانوادے پر ہاتھ ڈالنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔

نبی کریم ﷺ پر جور و ستم

جناب مولانا صفی الرحمن مبارک پوری رحمہ اللہ اپنی تالیف ''الرحیق المختوم'' میں رقم طراز ہیں: ''اس صورت حال نے قریش کو سخت قلق' پریشانی اور کش مکش سے دوچار کر رکھا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو دعوت ان کی مذہبی پیشوائی اور دنیاوی سربراہی کی جڑ کاٹ دینا چاہتی تھی' آخر اس پر اتنا لمبا صبر کب تک؟ بالآخر مشرکین نے ابولہب کی سربراہی میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں پر ظلم و ستم کا آغاز کر دیا۔ درحقیقت حضور ﷺ کے متعلق ابولہب کا رویہ ابتدا ہی سے یہی تھا۔ اس نے بنی ہاشم کی ضیافت میں جو کچھ کیا' پھر کوہ صفا پر جو حرکت کی' اس کا ذکر ہو چکا۔ بعض روایات میں یہ بھی مذکور ہے کہ اس نے کوہ صفا پر نبی ﷺ کو مارنے کے لیے ایک پتھر بھی اٹھایا تھا'' اپنی دو بیٹوں کی شادی حضور ﷺ کی دو صاحبزادیوں رقیہ اور ام کلثوم سے کی تھی' لیکن بعثت کے بعد اس نے نہایت سختی اور درشتی سے ان دونوں کو طلاق دلوا دی۔ اسی طرح جب رسول ﷺ کے دوسرے صاحب زادے عبداللہ کا انتقال ہوا تو ابولہب کو اس قدر خوشی ہوئی کہ وہ دوڑتا ہوا اپنے رفقا کے پاس پہنچا اور انھیں یہ ''خوش خبری'' سنائی کہ محمد ﷺ ابتر (نسل بریدہ) ہو گئے ہیں۔ حج کے ایام میں ابولہب حضور ﷺ کی تکذیب کے لیے بازاروں اور اجتماعات میں آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔ ابولہب صرف تکذیب ہی پر بس نہیں کرتا تھا' بلکہ پتھر بھی مارتا رہتا تھا'

جس سے آپ ﷺ کی ایڑیاں خون آلود ہو جاتی تھیں۔

ابولہب کی بیوی ام جمیل، جس کا نام اروی تھا، اور جو حرب بن امیہ کی بیٹی اور ابوسفیان کی بہن تھی، وہ بھی نبی ﷺ کی عداوت میں اپنے شوہر سے پیچھے نہ تھی، چناں چہ وہ نبی ﷺ کے راستے میں اور دروازے پر رات کو کانٹے ڈال دیا کرتی تھی۔ خاصی بد زبان اور مفسدہ پرداز بھی تھی۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ کے خلاف بد زبانی کرنا، لمبی چوڑی دسیسہ کاری اور افترا پردازی سے کام لینا، فتنے کی آگ بھڑکانا اور خوفناک جنگ بپا رکھنا اس کا شیوہ تھا۔ اس لیے قرآن نے اسے ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ (لکڑی ڈھونے والی یعنی لگائی بجھائی کرنے والی) کا لقب عطا کیا۔

جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی اور اس کے شوہر کی مذمت میں قرآن مجید کی ایک سورت نازل ہوئی ہے تو وہ رسول کریم ﷺ کو تلاش کرتی ہوئی آئی۔ آپ ﷺ خانۂ کعبہ کے پاس مسجد حرام میں تشریف فرما تھے۔ ابوبکر صدیقؓ بھی ہم راہ تھے۔ یہ مٹھی بھر پتھر لیے ہوئے تھی۔ سامنے کھڑی ہوئی تو اللہ نے اس کی نگاہ پکڑ لی اور وہ رسول ﷺ کو نہ دیکھ سکی۔ صرف ابوبکرؓ کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سامنے پہنچتے ہی سوال کیا، ابوبکر تمھارا ساتھی کہاں ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ میری ہجو کرتا ہے۔ بخدا! اگر میں اسے پا گئی تو اس کے منہ پر یہ پتھر دے ماروں گی۔ اس کے بعد واپس چلی گئی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا: یا رسول اللہ! کیا اس نے آپ ﷺ کو دیکھا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا، نہیں۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اللہ نے اس کی نگاہ پکڑ لی تھی۔

ابولہب اس کے باوجود یہ ساری حرکتیں کر رہا تھا کہ رسول کریم ﷺ کا چچا اور پڑوسی تھا۔ اس کا گھر حضور ﷺ کے گھر سے متصل تھا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے دوسرے پڑوسی بھی آپ ﷺ کو گھر کے اندر ستاتے تھے۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جو گروہ گھر کے اندر رسول کریم ﷺ کو اذیت دیا کرتا تھا، وہ یہ تھا: "ابولہب، حکم بن ابی العاص بن امیہ، عقبہ بن ابی معیط، عدی بن حمراثقفی، ابن الاصداء ہذلی۔ یہ سب کے سب آپ کے پڑوسی تھے اور ان میں سے حکم بن ابی العاص (اموی خلیفہ مروان بن حکم کے والد) کے علاوہ کوئی بھی مسلمان نہ ہوا۔ ان کے ستانے کا طریقہ یہ تھا کہ جب آپ ﷺ نماز پڑھتے تو کوئی شخص بکری کی بچہ دانی اس طرح ٹکا کر پھینکتا کہ وہ ٹھیک آپ ﷺ کے اوپر گرتی۔ چولھے پر ہانڈی چڑھائی جاتی تو بچہ دانی اس طرح پھینکتے کہ سیدھی ہانڈی میں جا گرتی۔ آپ ﷺ نے مجبور ہو کر ایک گھروندا بنا لیا، تاکہ کم از کم نماز پڑھتے ہوئے ان سے بچ سکیں۔ بہر حال جب آپ ﷺ پر یہ گندگی پھینکی جاتی تو آپ ﷺ سے لکڑی پر لے کر نکلتے اور دروازے پر کھڑے ہو کر فرماتے: "اے بنی عبد مناف! یہ کیسی ہمسائیگی ہے؟" پھر اسے راستے میں ڈال دیتے۔

عقبہ بن ابی معیط اپنی بدبختی اور خباثت میں اور بھی بڑھا ہوا تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے، اور ابوجہل اور اس کے کچھ رفقا بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں بعض نے بعض سے کہا: "کون ہے جو بنی فلاں کے اونٹ کی اوجھڑی لائے اور جب محمد ﷺ سجدہ کریں تو ان کی پیٹھ پر ڈال دے؟" اس پر عقبہ بن ابی معیط اٹھا اور اوجھڑی لا کر انتظار کرنے لگا۔ جب حضور ﷺ سجدے میں تشریف لے گئے تو اسے آپ ﷺ کی پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان ڈال دیا۔ میں سارا ماجرا دیکھ رہا تھا، مگر کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ کاش میرے اندر بچانے کی قوت ہوتی۔ اس کے بعد وہ ہنسی کے مارے ایک دوسرے پر گرنے لگے اور رسول ﷺ سجدے ہی میں پڑے رہے۔ سر نہ اٹھایا، یہاں تک کہ فاطمہؓ آئیں اور آپ ﷺ کی پیٹھ سے اوجھڑی ہٹا کر پھینکی۔ تب حضور ﷺ نے سر اٹھایا، پھر تین بار فرمایا: "اللهم عليك بقريش" (اے اللہ تو قریش کو پکڑ لے)

امیہ بن خلف کا وتیرہ تھا کہ وہ جب رسول اللہ کو دیکھتا تو لعن طعن کرتا۔ اسی کے متعلق یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ (ہمزہ:1) "ہر لعن طعن کرنے والے چغل خور کے لیے تباہی ہے۔" اہل ہشام کہتے ہیں کہ ھمزہ وہ شخص ہے جو علانیہ گالی بکے اور آنکھیں ترچھی کر کے اشارے کرے۔ اور لمزہ وہ شخص ہے جو پیٹھ پیچھے لوگوں کی برائیاں کرے اور انھیں اذیت دے۔

امیہ کا بھائی ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط کا گہرا دوست تھا۔ ایک بار عقبہ نے حضور ﷺ کے پاس بیٹھ کر کچھ سنا۔ ابی کو معلوم ہوا تو اس نے عقبہ کو سخت سست کہا، عتاب کیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ جا کر حضور ﷺ کے منہ پر تھوک آئے۔ عقبہ نے ایسا ہی کیا۔ خود ابی بن خلف نے ایک مرتبہ بوسیدہ ہڈی لا کر توڑی اور ہوا میں پھونک کر رسول کریم ﷺ کی طرف اڑا دی۔

اخنس بن شریق ثقفی بھی رسول کریم ﷺ کے ستانے والوں میں تھا۔ قرآن میں اس کے نو اوصاف بیان کیے گئے ہیں، جس سے اس کے کردار کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ قلم۔ آیات 10 تا 13 کا ترجمہ: "اور کسی ایسے شخص کے کہنے میں نہ آ جا جو بہت قسمیں کھانے والا ذلیل ہے، لعن طعن کرتا ہے، چغلیاں کھاتا ہے، بھلائی سے روکتا ہے، حد درجہ ظالم بدعمل، جفاکار اور اس کے علاوہ بدذات ہے۔"

ابوجہل بھی کبھی حضور ﷺ کے پاس آ کر قرآن سنتا تھا، لیکن بس سنتا ہی تھا، ایمان و اطاعت، اور ادب اختیار نہیں کرتا تھا۔ وہ رسول کریم ﷺ کو اپنی ہر بات سے اذیت پہنچاتا اور اللہ کی راہ سے روکتا تھا۔ پھر اپنی اس حرکت اور برائی پر ناز اور فخر کرتا ہوا جاتا تھا۔ گویا اس نے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ سورۂ قیامہ کی آیت 31 تا 35 میں اس کی تشریح موجود ہے: ﴿فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّىٰ وَلَٰكِن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ثُمَّ ذَهَبَ إِلَىٰ أَهْلِهِ يَتَمَطَّىٰ﴾ "مگر اس نے سچ نہ مانا اور نہ (پڑھی) بلکہ جھٹلایا اور پلٹ گیا۔ پھر اکڑتا ہوا اپنے گھر والوں کی طرف چل دیا۔"

اس شخص نے پہلے دن جب حضور ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو اسی دن سے آپ ﷺ کو نماز سے روکتا رہا۔ ایک بار نبی کریم ﷺ مقام ابراہیم کے

نماز پڑھ رہے تھے کہ اس کا گزر ہوا۔ دیکھتے ہی بولا: ''محمد ﷺ کیا میں نے تجھے اس سے منع نہیں کیا تھا؟ ساتھ ہی دھمکی بھی دی۔ حضور ﷺ نے بھی ڈانٹ کر سختی سے جواب دیا۔ اس پر وہ کہنے لگا: ''اے محمد ﷺ مجھے کا ہے کی دھمکی دے رہے ہو۔ دیکھو خدا کی قسم اس وادی میں میری محفل سب سے بڑی ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿فلیدع نادیہ﴾ چھا تو وہ بلائے اپنی محفل کو (ہم بھی سزا کے فرشتوں کو بلائے دیتے ہیں)

ایک روایت میں مذکور ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اس کا گریبان گلے کے پاس سے پکڑ لیا اور جھنجھوڑتے ہوئے سخت سست ارشاد فرمایا۔

اس پر اللہ کا یہ دشمن کہنے لگا: ''اے محمد ﷺ مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ خدا کی قسم تم اور تمھارا پروردگار میرا کچھ نہیں کر سکتے۔ میں مکے کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان چلنے پھرنے والوں میں سب سے زیادہ معزز ہوں۔''

بہر حال اس ڈانٹ کے باوجود ابوجہل اپنی حماقت سے باز آنے والا نہ تھا' بلکہ اس کی بدبختی میں کچھ اور اضافہ ہی ہو گیا۔ چناں چہ صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک بار ابوجہل نے (سرداران قریش سے) کہا کہ محمد ﷺ آپ حضرات کے روبرو اپنا چہرہ خاک آلود کرتا ہے؟۔ جواب دیا گیا' ہاں۔ اس نے کہا: ''لات وعزیٰ کی قسم! اگر میں نے اس حالت میں اسے دیکھ لیا تو اس کی گردن روند دوں گا اور اس کا چہرہ مٹی پر رگڑ دوں گا۔ اس کے بعد اس نے رسول کریم ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا اور اس زعم میں چلا کہ آپ ﷺ کی گردن روند دے گا' لیکن لوگوں نے اچانک کیا دیکھا کہ وہ ایڑی کے بل پلٹ رہا ہے اور دونوں ہاتھوں سے بچاؤ کر رہا ہے۔ لوگوں نے کہا: ''تمھیں کیا ہوا؟'' اس نے کہا: ''میرے اور اس کے درمیان آگ کی ایک خندق ہے۔ ہولناکیاں ہیں اور پر ہیں۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب آتا تو فرشتے اس کا ایک ایک عضو اچک لیتے۔

ابوجہل جب کسی معزز اور طاقت ور آدمی کے مسلمان ہونے کی خبر سنتا تو اسے برا بھلا کہتا' ذلیل ورسوا کرتا اور مال وجاہ کو سخت خسارے سے دوچار کرنے کی دھمکیاں دیتا اور اگر کوئی کم زور آدمی مسلمان ہوتا تو اسے مارتا اور دوسروں کو بھی برانگیختہ کرتا۔

حضرت ابوبکرؓ پر ظلم عظیم

ایک روز حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ دارِ ارقم سے نکل کر مسجد حرام تشریف لے گئے۔ وہاں یکا یک حضرت ابوبکرؓ نے اٹھ کر تقریر شروع کر دی اور لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کسی نے حرم میں علی الاعلان دعوتِ اسلام دی ہو۔ مشرکین یہ تقریر سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ پر ٹوٹ پڑے اور انھیں گرا کر پاؤں سے روندا۔ عتبہ بن ربیعہ نے ان کے منہ پر اتنے جوتے مارے کہ سارا منہ سوج گیا اور ناک اس میں چھپ گئی۔ یہ حال دیکھ کر ان کے قبیلے والے (بنوتیم) آگے بڑھے اور کفار سے انھیں چھڑا کر ان کے گھر لے گئے۔ انھیں اس امر میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ یہ اب مر جائیں گے' اس لیے وہ پلٹ کر پھر مسجد میں گئے اور کہا کہ خدا کی قسم' اگر ابوبکرؓ مر گئے تو ہم عتبہ کو جیتا نہ چھوڑیں گے۔ شام تک حضرت ابوبکرؓ بے سدھ پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو ان کا پہلا سوال یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟ اس پر بنوتیم نے انھیں برا بھلا کہا۔ ملامت کی۔ اٹھ کر چلے گئے اور ان کی والدہ ام الخیر سے کہ گئے کہ انھیں کچھ کھلاؤ پلاؤ۔ ماں بیٹے جب تنہا رہ گئے تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنی والدہ سے پھر وہی سوال کیا' کہ رسول اللہ کا کیا حال ہے؟

انھوں نے کہا: ''بخدا مجھے تمھارے دوست کا کچھ حال معلوم نہیں''

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ''جا کر ام جمیل بنت خطاب سے پوچھو (یعنی فاطمہ بنت خطاب' حضرت عمرؓ کی بہن)۔ وہ اس وقت مسلمان ہو چکی تھیں' مگر انھوں نے اپنا اسلام چھپا رکھا تھا (حضرت ابوبکرؓ کی والدہ نے جب جا کر ان سے کہا کہ ابوبکر محمد بن عبداللہ کا حال پوچھ رہے ہیں تو انھوں نے جواب دیا: ''میں نہ محمد عبداللہ کو جانتی ہوں نہ ابوبکر کو البتہ آپ چاہیں تو میں ابوبکر کے پاس چلتی ہوں''

انھوں نے کہا: ''ہاں چلو''

وہ آئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بدحال پڑے دیکھ کر چیخ اٹھیں: ''خدا کی قسم' جن لوگوں نے تمھارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے' وہ کافر اور فاسق ہیں' اور میں امید رکھتی ہوں کہ اللہ ان سے انتقام لے گا۔''

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ کا کیا حال ہے؟''

انھوں نے چپکے سے کہا: ''آپ کی ماں سن رہی ہیں۔''

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ''ان کی فکر نہ کرو۔ ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔''

تب ام جمیل نے کہا: ''حضور ﷺ بالکل خیریت سے ہیں۔''

پوچھا: ''کہاں ہیں؟''

ام جمیل نے کہا: ''دار ارقم میں۔''

حضرت ابوبکرؓ نے کہا: ''واللہ میں نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا' جب تک ان کے پاس نہ جاؤں۔''

ام جمیل نے کہا: ''ذرا ٹھہر جائیے''

پھر جب شہر میں سکون ہو گیا' تو وہ اور ام الخیر انھیں سہارا دے کر دار ارقم لے گئیں۔ حضرت ابوبکرؓ کا حال دیکھ کر حضور ﷺ پر رقت طاری ہو گئی۔ آپ ﷺ ان پر جھکے اور انھیں چوم لیا۔ دوسرے مسلمان بھی جو وہاں موجود تھے' ان پر جھکے اور ان کی حالت دیکھی۔

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان' مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہے' سوائے اس تکلیف کے جو اس فاسق نے میرے منہ پر جوتے برسا کر پہنچائی۔ یہ میری ماں اپنے بیٹے کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ بابرکت ہیں۔ انھیں اللہ کی طرف دعوت دیجیے' اور دعا فرمائیے کہ اللہ انھیں آگ سے بچا لے۔''

چناں چہ حضور ﷺ نے ان کے لیے دعا کی اور انھیں اللہ کی طرف سے دعوت دی اور وہ مسلمان ہو گئیں۔ (سیرتِ عالم۔ جلد دوم۔ صفحہ 545)

حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ

جب حضرت خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو پتا چلا کہ ان کے باپ ابواحیحہ کو ان کے مسلمان ہونے کا علم ہو گیا ہے تو وہ اس کے ڈر سے چھپ گئے' لیکن اس نے انھیں تلاش کر کے پکڑ وابلایا اور سخت سست کہنے کے بعد انھیں اتنا مارا کہ وہ لکڑی ٹوٹ گئی جس سے وہ انھیں مار رہا تھا۔ پھر کہا کہ تو نے محمد ﷺ کی پیروی اختیار کر لی' حالانکہ تو دیکھ رہا ہے کہ وہ اپنی قوم کی مخالفت کر رہا ہے۔ آبائی دین میں عیب نکال رہا ہے اور ان اسلاف کو گم راہ قرار دے رہا ہے جو اس دین کی پیروی کرتے ہیں۔

حضرت خالدؓ نے کہا: ''خدا کی قسم' وہ سچے ہیں اور میں ان کا پیرو ہوں۔''

ابواحیحہ نے انھیں پھر مارا اور گالیاں دیں اور کہا: ''نالائق' جہاں تیرا جی چاہے' چلا جا۔ میرے گھر میں تجھے کھانا نہیں ملے گا۔''

انھوں نے کہا: ''آپ میرا رزق بند کر دیں گے تو اللہ مجھے رزق دے گا۔''

پھر وہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ ہی کے ساتھ رہنے لگے۔ ایک روز مکہ کے نواح میں کسی سنسان جگہ نماز پڑھ رہے تھے کہ ابواحیحہ کو اس کی خبر پہنچ گئی۔ اس نے بلا کر ان سے کہا: ''دین محمد ﷺ چھوڑ دے۔''

انھوں نے جواب دیا: ''میں مرتے دم تک یہ دین نہیں چھوڑوں گا''

یہ جواب سن کر ابواحیحہ نے ان کے سر پر لکڑی مارنا شروع کی' یہاں تک کہ لکڑی ٹوٹ گئی۔ پھر انھیں قید کر دیا اور تین دن تک بھوکا پیاسا بند رکھا۔ مکہ کی گرمی میں حضرت خالدؓ یہ عذاب بھگتتے رہے۔ آخر موقع پا کر گھر سے بھاگ نکلے اور مکہ کے نواح میں پھرتے رہے۔ یہاں تک کہ حبشہ کی طرف پہلی ہجرت ہوئی اور یہ ان مہاجرین کے ساتھ چلے گئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

ایک روز صحابہ کرامؓ نے آپس میں کہا کہ قریش نے کبھی کسی کو (یعنی ہم میں سے کسی کو) علانیہ بہ آواز بلند قرآن پڑھتے نہیں سنا ہے۔ ہم میں کون ہے جو ایک دفعہ انھیں یہ کلام پاک سنا ڈالے؟

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا: ''میں یہ کام کرتا ہوں۔''

صحابہ نے کہا: ''ہمیں ڈر ہے کہ وہ تم پر زیادتی کریں گے۔ ہمارے خیال میں کسی ایسے شخص کو یہ کام کرنا چاہیے جس کا خاندان زبردست ہو' تا کہ اگر قریش کے لوگ اس پر دست درازی کریں تو اس کے خاندان والے اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔''

حضرت عبداللہ نے فرمایا: ''مجھے یہ کام کر ڈالنے دو۔ میرا محافظ اللہ ہے۔'' پھر وہ دن چڑھے حرم میں پہنچے' جب کہ قریش کے سردار وہاں اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے تھے۔ حضرت عبداللہ نے مقام ابراہیمؑ پر پہنچ کر پورے زور سے سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کر دی۔ قریش کے لوگ پہلے تو سوچتے رہے کہ عبداللہ کیا کہ رہے ہیں جب انھیں پتا چلا کہ یہ وہ کلام ہے جسے محمد ﷺ اللہ کے کلام کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں' تو وہ ان پر ٹوٹ پڑے اور ان کے منہ پر تھپیڑ مارنے لگے' مگر حضرت عبداللہ نے پروا نہ کی۔ پٹتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب تک ان کے دم میں دم رہا' قرآن سنائے چلے گئے۔ آخر کار جب وہ اپنا سوجا ہوا منہ لے کر پلٹے تو ساتھیوں نے کہا' ہمیں اسی چیز کا ڈر تھا۔

حضرت عبداللہ نے جواب دیا: ''یہ خدا کے دشمن آج سے بڑھ کر میرے لیے کبھی ہلکے نہ تھے۔ تم کہو تو کل پھر انھیں قرآن سناؤں۔''

سب نے کہا' بس اتنا ہی کافی ہے۔ جو کچھ وہ نہیں سننا چاہتے تھے وہ تم نے انھیں سنا دیا۔ حضرت عثمان بن عفان کا چچا انھیں کھجور کی چٹائی میں لپیٹ کر نیچے سے دھواں دیتا۔

حضرت مصعبؓ بن عمیر کی ماں کو جب ان کے اسلام لانے کا علم ہوا تو ان کا دانہ پانی بند کر دیا اور انھیں گھر سے نکال دیا۔ یہ بڑے ناز و نعمت میں پلے تھے۔ حالات کی شدت سے دوچار ہوئے تو کھال اس طرح ادھڑ گئی جیسے سانپ کینچلی چھوڑتا ہے۔

حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ

سب سے زیادہ دردناک مظالم ان غلاموں' لونڈیوں اور موالی پر توڑے گئے جو اسلام لے آئے تھے اور جن کا مکہ میں کوئی پشت پناہ نہ تھا۔ اس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

ان میں سے ایک حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ تھے جو بنی جمح میں سے کسی کے غلام تھے اور غلامی کی حالت ہی میں ان کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ مشہور یہ ہے کہ وہ حبشی تھے۔ ان کے اسلام لانے کا حال جب کھلا تو امیہ بن خلف جمحی نے انھیں طرح طرح کے عذاب دیئے۔ وہ دوپہر کو سخت گرمی کے وقت انھیں نکال کر لے جاتا۔ مکہ کی تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتا اور کہتا کہ خدا کی قسم' تو اسی طرح پڑا رہے گا' جب تک محمد ﷺ کا انکار کر کے لات اور عزیٰ کی عبادت نہ کرے' مگر وہ جواب میں بس ''احد' احد'' ہی کہے چلے جاتے۔ حضرت عمرو بن العاص کی روایت ہے کہ ''میں نے بلال کو ایسی سخت تپتی ہوئی زمین پر لیٹے دیکھا ہے' جس پر اگر گوشت رکھ دیا جاتا تو وہ پک جاتا' مگر وہ اس حالت میں بھی صاف کہ رہے تھے کہ میں لات اور عزیٰ کا انکار کرتا ہوں۔''

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا چشم دید احوال بلاذری نے نقل کیا ہے کہ ''میں حج (یا عمرے) کے لیے مکہ گیا تو دیکھا کہ بلال ایک رسی میں بندھے ہوئے ہیں اور لڑکے انھیں گھسیٹے پھر رہے ہیں' مگر وہ کہے جا رہے ہیں کہ میں لات اور عزیٰ اور ہل اور اساف اور نائلہ اور بوانہ' سب کا انکار کرتا ہوں۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ گلے میں رسی باندھ کر انھیں لڑکوں کے حوالے کر دیا جاتا اور وہ مکے کی گھاٹیوں میں انھیں گھسیٹے لیے پھرتے۔ پھر تپتی ہوئی ریت پر لا کر اوندھے منہ لٹا دیتے اور ان پر پتھروں کا ڈھیر لگا دیتے۔ حضرت ابوبکرؓ کا گھر بنی جمح کے محلے ہی میں تھا۔ وہ یہ ظلم دیکھتے دیکھتے تنگ آ گئے۔ انھوں نے بلال کو خریدا اور آزاد کر دیا۔

حضرت عمار بن یاسرؓ

یاسر یمن کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے مکہ آئے اور ابوحذیفہ بن مغیرہ مخزومی

سے حلیفانہ تعلق قائم کرلیا اور ابو حذیفہ نے اپنی لونڈی سمیہ سے ان کی شادی کر دی۔ جب اسلام آیا تو یاسر، سمیہ، عمار اور ان کے بھائی عبداللہ سب مسلمان ہو گئے۔ اس پر یہ پورا خاندان سخت مبتلائے عذاب کر دیا گیا۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ اس مقام سے گزر رہے تھے جہاں ان لوگوں کو عذاب دیا جا رہا تھا۔ آپ ﷺ کو اس پر سخت رنج ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''صبر کرو اے آل یاسر، تمھارے لیے جنت کا وعدہ ہے۔''

ایک شخص نے ایک مرتبہ حضرت عمارؓ کو کرتا اتارے ہوئے دیکھا تو ان کی پیٹھ پر داغ ہی داغ نظر آئے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا' یہ اس عذاب کے نشانات ہیں جو مکہ کی تپتی ہوئی زمین پر مجھے دیئے جاتے تھے۔ آخر کار ان کے والد یاسرؓ عذاب کی سختیاں سہتے سہتے انتقال کر گئے۔ پھر ابوجہل نے ان کی والدہ سمیہ کو قتل کر دیا۔ ان کے بھائی عبداللہ کو تیر مارا گیا اور وہ گر گئے۔ اب صرف حضرت عمار رہ گئے تھے۔ انھیں پانی میں غوطے دیئے گئے' یہاں تک کہ ان سے برداشت نہ ہو سکا اور انھوں نے حضور ﷺ کا انکار اور ان کے معبودوں کی تعریف کر کے جان چھڑائی۔ پھر روتے ہوئے نبی ﷺ کے پاس گئے اور معذرت پیش کی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ (النحل: 106)

''جس نے اللہ پر ایمان لانے کے بعد کفر کیا' اس پر اللہ کا غضب اور عذاب عظیم ہے' لیکن جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہو' اس پر کوئی گرفت نہیں۔''

- حضرت فکیہہ' جن کا نام افلح تھا' بنی عبدالدار کے غلام تھے۔ ان کے مالکان ان کا پاؤں رسی سے باندھ کر انھیں زمین پر گھسیٹتے تھے۔
- حضرت خبابؓ بن ارت' قبیلہ خزاعہ کی ایک عورت ام انمار کے غلام تھے۔ مشرکین انھیں طرح طرح کی سزائیں دیتے تھے۔ ان کے سر کے بال نوچتے تھے اور سختی سے گردن مروڑتے تھے۔ انھیں کئی بار دہکتے انگاروں پر لٹا کر اوپر سے پتھر رکھ دیا کہ وہ اٹھ نہ سکیں۔
- زیرہ اور نہدیہؓ اور ان کی صاحب زادی اور ام عبیسؓ یہ سب لونڈیاں تھیں۔ انھوں نے اسلام قبول کیا اور مشرکین کے ہاتھوں اسی طرح کے سنگین جبر و تشدد سے دو چار ہوئیں۔ قبیلہ بنی عدی کے ایک خانوادے بنی مؤمل کی ایک لونڈی لبینہ مسلمان ہوئیں تو انھیں حضرت عمرؓ بن خطاب (جو بنی عدی سے تعلق رکھتے تھے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) اس قدر مارتے تھے کہ مارتے مارتے خود تھک جاتے تھے' اور اس کے بعد کہتے تھے کہ میں نے تجھے کسی مروت کی وجہ سے نہیں' بلکہ تھک جانے کی وجہ سے چھوڑا ہے۔

مشرکین نے ظلم و جبر کی ایک شکل یہ بھی اختیار کی تھی کہ بعض بعض صحابہ کو اونٹ اور گائے کی کچی کھال میں لپیٹ کر دھوپ میں ڈال دیتے تھے' اور بعض کو لوہے کی زرہ پہنا کر جلتے ہوئے پتھر پر لٹا دیتے تھے۔ درحقیقت اللہ کی راہ میں ظلم و جبر کا نشانہ بننے والوں کی فہرست بڑی لمبی ہے اور بڑی تکلیف دہ بھی۔ حالت یہ تھی کہ جس کسی کے مسلمان ہونے کا پتا چل جاتا تھا' مشرکین اس کے درپے آزار ہو جاتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کا مظلوم غلاموں کو خرید کر آزاد کرنا

اس ظلم و ستم کے دور میں حضرت ابوبکرؓ نے بے تحاشا دولت خرچ کر کے متعدد مظلوم غلاموں اور لونڈیوں کو خرید خرید کر آزاد کر دیا۔ ان افراد کی جملہ تعداد 9 بنتی ہے:

1: حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ
2: حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی والدہ حمامہؓ۔ انھیں بھی راہ خدا میں عذاب دیا جاتا تھا
3: عامر بن فہیرہ۔ یہ حضرت عائشہؓ کے ماں جائے بھائی طفیل بن الحارث کے غلام تھے اور ان مظلوموں میں شامل تھے' جنھیں عذاب دیا جاتا تھا۔
4: ابوفکیہہ۔ یہ بنی عبدالدار کی غلامی میں تھے۔ امیہ بن خلف اور دوسرے لوگ انھیں دوپہر کے وقت سخت گرمی میں نکالتے۔ لوہے کی بیڑیاں پہنا کر انھیں تپتی ہوئی زمین پر اوندھا لٹا دیتے اور ان کی پیٹھ پر بھاری پتھر رکھ دیتے' یہاں تک کہ یہ ہوش گم کر بیٹھے۔
5: لبینہ۔ بنی مؤمل کی ایک لونڈی۔ عمر بن خطاب اپنے زمانہ کفر میں انھیں خوب مارتے اور جب مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ میں نے صرف تھک جانے کی وجہ سے تجھے چھوڑا ہے۔
6،7: نہدیہ اور ان کی بیٹی۔ یہ دونوں بنی عبدالدار کی ایک عورت کی لونڈیاں تھیں۔ ان کی مالکہ بھی ان پر ظلم کرتی تھی۔
8: زنیرہ۔ بنی عدی کی لونڈی تھیں۔
9: ام عبیس۔ یہ بنی زہرہ کی لونڈی تھیں اور اسود بن عبد یغوث ان پر ظلم ڈھاتا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کو اس طرح ان غریب غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے دیکھ کر ان کے والد ابو قحافہ نے (جو اس وقت مشرک تھے) ان سے کہا کہ بیٹا' میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کمزور لوگوں کو آزاد کرا رہے ہو۔ اگر مضبوط جوانوں کی آزادی پر تم یہی روپیہ خرچ کرتے تو وہ تمھارے لیے قوت بازو بنتے۔

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: ''ابا جان، میں تو وہ اجر چاہتا ہوں جو اللہ کے ہاں ہے۔''

ایک اور زمانہ فترت

مولانا مودودی سورۂ ''الضحیٰ'' کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کی حکمت کے کام بھی نرالے ہیں جنھیں عقل نارسا کبھی نہیں سمجھ سکتی۔ عین وہ زمانہ، جب کہ کفر و اسلام کی باہمی کش مکش اس شدت کو پہنچی ہوئی تھی اور حضور ﷺ اور مسلمانوں پر زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت گزر رہا تھا، بظاہر تو اس بات کا متقاضی تھا کہ حضور ﷺ پر وحی کا نزول پیہم جاری رہتا، جس میں ہر روز پیش آنے والے نت نئے حالات میں راہ نمائی بھی ہوتی۔ رسول ﷺ اور اصحابِؓ رسول کے لیے تسلی اور ہمت افزائی بھی ہوتی اور کفار کے لیے ان مظالم پر تہدید بھی، لیکن اسی زمانے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے

یکا یک نزول وحی کا سلسلہ بند ہو گیا، جس پر حضور ﷺ بھی سخت پریشان ہوئے اور کفار کو بھی باتیں بنانے کا خوب موقع ملا۔

وحی کی اس بندش کا زمانہ ٹھیک کونسا تھا، یہ تو معلوم نہیں ہے، مگر اس سلسلے میں جو روایات حدیث میں منقول ہوئی ہیں، ان سے بھی اور خود ان دو سورتوں کے مضمون سے بھی، جو اس فترت کے خاتمے پر نازل ہوئیں، صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ دعوت عام شروع ہو جانے اور کارزار کفر و اسلام کا میدان گرم ہو جانے کے بعد پیش آیا تھا۔ یہ زمانہ اتنا طویل ضرور تھا کہ رسول ﷺ بھی اس پر سخت غمگین ہو گئے تھے اور مخالفین بھی آپ ﷺ کو طعنے دینے لگے تھے، کیوں کہ حضور ﷺ جو نئی سورت نازل ہوئی تھی، اسے آپ ﷺ لوگوں کو سنایا کرتے تھے، اس لیے جب اچھی خاصی مدت تک آپ ﷺ نے نئی وحی لوگوں کو نہ سنائی تو مخالفین نے سمجھ لیا کہ وہ سرچشمہ بند ہو گیا ہے، جہاں سے یہ کلام آتا تھا۔ مشرکین نے کہنا شروع کر دیا کہ محمد ﷺ کو ان کے رب نے چھوڑ دیا ہے۔

ابولہب کی بیوی اُم جمیل نے، جو حضور ﷺ کی چچی تھی، اور جس کا گھر حضور ﷺ کے مکان سے متصل تھا، آپ ﷺ سے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ تمھارے شیطان نے تمھیں چھوڑ دیا ہے۔'' اس صورت حال میں حضور ﷺ کے شدید رنج و غم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا، جب کہ محبوب کی طرف سے بظاہر عدم التفات، کفر و ایمان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کے بعد اسی ذریعہ طاقت سے بظاہر محرومی، جو اس جاں گسل کش مکش کے منجدھار میں آپ ﷺ کے لیے واحد سہارا تھا، اور اس پر دشمنوں کی مزید شماتت اور لعن طعن، یہ ساری چیزیں مل جل کر لامحالہ حضور ﷺ کے لیے سخت پریشانی کی موجب رہی ہوں گی، اور آپ ﷺ کو بار بار یہ شبہ گزرتا ہوگا کہ کہیں مجھ سے کوئی ایسا قصور تو نہیں ہو گیا ہے کہ میرا رب مجھ سے ناراض ہو گیا ہو اور اس نے مجھے حق و باطل کی اس لڑائی میں تنہا چھوڑ دیا ہو۔

اس پر پہلے سورۂ ضحیٰ نازل ہوئی۔ فرمایا گیا:

وَالضُّحٰیo وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰیo مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰیo﴾

(الضحیٰ: 1تا3)

''قسم ہے روز روشن کی اور رات کی، جب کہ وہ سکون کے ساتھ طاری ہو جائے۔ اے نبی ﷺ تمھارے رب نے تمھیں ہرگز نہیں چھوڑا اور نہ وہ ناراض ہوا۔''

اسی کے قریب زمانے میں، جب کہ دعوت اسلامی کی مشکلات حضور ﷺ کے لیے سخت پریشان کن ثابت ہو رہی تھیں، آپ ﷺ کی تسلی کے لیے سورۂ الم نشرح نازل ہوئی:

﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ﴾ (الانشراح: 1)

''اے نبی ﷺ کیا ہم نے تمھارا سینہ تمھارے لیے کھول نہیں دیا؟''

مزید فرمایا:

﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاo اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًاo﴾ (الانشراح: 6،5)

''پس حقیقت یہ ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔ بے شک تنگی کے ساتھ فراخی بھی ہے۔''

اس بات کو دو مرتبہ دہرایا گیا ہے تاکہ حضور ﷺ کو پوری طرح تسلی دے دی جائے کہ جن سخت حالات سے آپ ﷺ اس وقت گزر رہے ہیں، یہ زیادہ دیر رہنے والے نہیں ہیں، بلکہ ان کے بعد قریب ہی اچھے حالات چلے آ رہے ہیں۔ بظاہر یہ بات متضاد معلوم ہوتی ہے کہ تنگی کے ساتھ فراخی ہو، کیوں کہ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہوتیں، لیکن تنگی کے بعد فراخی کہنے کی بجائے تنگی کے ساتھ فراخی کے الفاظ اس معنی میں استعمال کیے گئے ہیں کہ فراخی کا دور اس قدر قریب ہے کہ گویا وہ اس کے ساتھ ہی لگا چلا آ رہا ہے۔

ہجرت حبشہ

مکہ میں اسلام کی دعوت عام شروع ہوئے ابھی دو سال ہی گزرے تھے کہ فضاؤں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ ایک ہلچل سی مچ گئی اور دعوت اسلامی کو جاری رکھنا دشوار سے دشوار تر ہو گیا۔ جو اصحابؓ اسلام قبول کر رہے تھے، ان کے لیے زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تنگ ہونے لگی۔ ان حالات میں رسول اکرم ﷺ نے جو اہم اور دور رس اقدامات کیے، ان میں ایک اہم قدم یہ تھا کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو حبشہ ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا۔

رجب 45 عام الفیل، 5 نبوی، 7 قبل ہجرت، اپریل 615ء۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے اصحابؓ سے فرمایا: ''اچھا ہو کہ تم لوگ نکل کر حبشہ چلے جاؤ۔ وہاں بادشاہ عدل پسند ہے۔ اس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا حبشہ ''ارض صدق'' (سچائی اور بھلائی کی زمین) ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ تمھاری اس مصیبت کو رفع کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ کرے، تم لوگ وہاں ٹھہرے رہو۔''

حبشہ یمن کے مغرب میں واقع ہے۔ اس زمانے میں وہاں کے بادشاہ کا لقب ''نجاشی'' (Negus) تھا۔ حضور ﷺ سے اجازت ملنے کے بعد گیارہ مردوں اور چار عورتوں پر مشتمل، مختصر سا قافلہ رات کی تاریکی میں مکہ سے روانہ ہوا۔ ان میں سے بعض سوار تھے اور بعض پیادہ۔ جب یہ قافلہ بندرگاہ شعیبہ (جدہ) پر پہنچا تو حسن اتفاق سے دو کشتیاں حبشہ جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ جہاز والوں نے پانچ درہم کرائے پر ان سب کو بٹھا لیا۔ قریش مکہ کو جب ان لوگوں کی روانگی کی خبر ہوئی تو تعاقب میں نکلے اور بندرگاہ تک پہنچے، مگر ان کے پہنچنے سے پہلے کشتیاں روانہ ہو چکی تھیں۔ چناں چہ قریش بے نیل مرام واپس آ گئے۔

حبشہ کو ہجرت کرنے والے اس مختصر سے قافلے کے سردار حضرت عثمانؓ بن عفان تھے۔ آپ کی اہلیہ سیدہ رقیہ بنت رسول ﷺ بھی آپ کے ہم راہ تھیں۔ ابن اسحاق

نے اس پہلی ہجرت کے مہاجرین کی جو فہرست دی ہے، وہ یہ ہے:

1: بنی امیہ میں سے حضرت عثمانؓ بن عفان
2: ان کی زوجہ حضرت رقیہؓ بنت رسول ﷺ
3: بنی عبد شمس بن عبد مناف میں سے حضرت ابو حذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ
4: ان کی زوجہ حضرت سہلہ بنت سہیل بن عمرو
5: بنی اسد بن عبد العزیٰ بن قصی میں سے حضرت زبیرؓ بن العوام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضور اکرم ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی)
6: بنی عبد الدار بن قصی میں سے حضرت مصعبؓ بن عمیر
7: بنی زہرہ بن کلاب میں سے حضرت عبد الرحمٰنؓ بن عوف
8: بنی مخزوم میں سے حضرت ابو سلمہؓ بن عبد الاسد
9: ان کی زوجہ ام سلمہؓ (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور ابو جہل کی سگی چچا زاد بہن تھیں۔)
10: بنی جمح میں سے حضرت عثمانؓ بن مظعون (ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ماموں)
11: بنی عدی میں سے عامرؓ بن ربیعہ عنزی (حلیف آل خطاب)
12: ان کی زوجہ لیلیٰ بنت ابی حثمہ رضی اللہ عنہا (یہ خود عدی میں سے تھیں)
13: بنی عامر بن لوی میں سے ابو سبرہؓ بن ابی رہم۔
14: بنی حارث بن فہر میں سے سہیلؓ بن بیضاء

ابن سعد نے واقدی کے حوالے سے ان پر دو اور ناموں کا اضافہ کیا ہے یعنی حاطبؓ بن عمرو بن عبد شمس اور عبد اللہ بن مسعودؓ حلیف بنی زہرہ۔

اس مبارک سفر پر سب سے پہلے حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہ حضرت رقیہؓ کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ان کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تو حضور ﷺ کو تشویش ہوئی۔ پھر قریش کی ایک عورت نے جو اس طرف سے آ رہی تھی، حضور ﷺ سے کہا کہ میں نے آپ ﷺ کے داماد کو دیکھا۔ کہ وہ اپنی بیوی کو ایک کم زور سے گدھے پر بٹھا کر خود اسے ہانکتے جا رہے تھے۔ حضور ﷺ نے دعا کی، اللہ ان کے ساتھ ہو۔ فرمایا: ''لوطؑ اور ابراہیمؑ کے بعد عثمانؓ پہلے شخص ہیں، جنھوں نے اپنی بیوی کے ساتھ خدا کی راہ میں ہجرت کی۔''

حبشہ قریش کی پرانی تجارت گاہ تھی جہاں وہ خوب رزق کماتے اور تجارت میں اچھے فائدے اٹھاتے تھے۔ اسی وجہ سے مہاجرین کو وہاں کوئی زحمت پیش نہ آئی۔ مہاجرین کا اپنا قول ہے کہ ہم وہاں بہت اچھی طرح رہے۔ اپنے دین کے معاملے میں پورے امن سے تھے۔ اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ کوئی اذیت ہمیں نہ تھی اور نہ کوئی ناگوار بات ہمیں سننی پڑتی تھی۔

قریش نے جب دیکھا کہ یہ لوگ حبشہ میں امن چین کے ساتھ جم گئے ہیں تو انھوں نے عمرو بن العاص اور عبد اللہ بن ابی ربیعہ و ہدیوں اور تحفوں کے ساتھ نجاشی کے پاس بھیجا، (جس کا نام اصحمہ تھا) تاکہ انھیں واپس لائیں، لیکن نجاشی نے ان کی بات نہ مانی اور انھیں ناکام واپس کر دیا۔

مہاجرین کی واپسی کا سبب

ہجرت کے دو ماہ بعد رمضان میں ایسا واقعہ پیش آیا جس کی خبر حبشہ میں مہاجرین کو اس شکل میں پہنچی کہ کفار مکہ سب کے سب مسلمان ہو گئے ہیں۔

وہ واقعہ یہ تھا کہ حضور ﷺ حرم کعبہ میں بلند آواز میں قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے۔ حرم پاک میں مسلمانوں کے علاوہ قریش کے لوگ بھی موجود تھے۔ حضور ﷺ نے ان کے سامنے سورۂ نجم تلاوت فرمائی۔ اس سورۂ میں اللہ تعالیٰ نے کفار مکہ کو ان کے رویے پر متنبہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ حضور ﷺ اللہ کے نبی ہیں اور آپ ﷺ جو دعوت دیتے ہیں، وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ حضور ﷺ نے اپنی طرف سے کچھ نہیں بنایا، جیسا کہ تم مشہور کرتے ہو۔ حضور ﷺ جو باتیں اور حقائق بیان کرتے ہیں وہ اس فرشتے نے ان تک پہنچائے ہیں، جنھیں حضور ﷺ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایک تو اس سورۂ کا صوتی آہنگ، پھر وحی کی تاثیر، اور رسول اللہ ﷺ کی مسحور کن تلاوت۔ مجمع پر وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ تلاوت جاری تھی:

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى o وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى o وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى o ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى o وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى o وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى o وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا o وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى o مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى o وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى o وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى o وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى o وَاَنَّهٗ اَهْلَكَ عَادًا الْاُوْلٰى o وَثَمُوْدَ فَمَا اَبْقٰى o وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى o وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى o فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى o فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى o هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى o اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ o لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ o اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ o وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ o وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ o فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا﴾ (النجم: 38تا62)

''یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے، اور یہ کہ اس کی سعی عن قریب دیکھی جائے گی۔ پھر اس کی پوری جزا اسے دی جائے گی، اور یہ کہ آخر کار پہنچنا تو تیرے رب ہی کے پاس ہے، اور یہ کہ وہ تمھیں ہنساتا ہے اور رلاتا ہے۔ اور یہ کہ وہی موت اور زندگی دیتا ہے۔ اسی نے ایک ٹپکائی جانے والی بوند سے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا۔ وہ موت کے بعد دوسری زندگی دینے پر قادر ہے۔ صرف وہی تنگی دور کرتا ہے اور غنی بنا دیتا ہے۔ وہی شعریٰ (ستارے) کا رب ہے۔ اسی نے عاد اولیٰ اور ثمود کو اس طرح مٹا دیا کہ ان کا کوئی نشان بھی باقی نہ چھوڑا۔ اور ان سے پہلے اسی نے قوم نوحؑ کو تباہ کیا تھا، کیوں کہ وہ بہت ظالم اور سرکش تھی۔ جس طرح اس نے ان بستیوں کو کھنڈر بنا دیا جو

الٹ دی گئی تھیں اور انھیں ہمیشہ کے لیے نگاہوں سے چھپا دیا۔ پھر تم اپنے رب کی کس طاقت کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا رہ سکتے ہو۔ یہ بھی اسی طرح کی تنبیہ ہے جیسی پہلے لوگوں کو دی گئی تھی۔ یہ کہ آخری گھڑی قریب آ رہی ہے۔ اگر چہ اس کے آنے کے اصل وقت کا بھید اللہ ہی کے پاس ہے۔ شاید تم ان بیانات کو عجیب سمجھتے ہو۔ اور تم ان پر رونے کی بجائے ہنستے ہو۔ اور گا بجا کر انھیں ٹالتے ہو؟ تم سب اللہ کی عبادت کرو اور اس کے حضور سجدہ کرو۔''

اور اب جو آخری آیت یعنی سجدے والی آیت آئی تو حضور ﷺ نے سجدہ کیا۔ حرم کعبہ میں جتنے بھی حاضرین تھے، مسلمان اور مشرک سب بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ کفار پر اللہ کا خوف اور قرآن کا اثر اتنا شدید تھا کہ انھیں ہوش ہی نہ رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ عتبہ بن ربیعہ، ولید بن مغیرہ اور امیہ بن خلف نے غرور وتکبر کی وجہ سے صرف خاک ہاتھ میں لے کر سجدے کے انداز میں جھک کر اپنی پیشانی سے لگائی۔ اللہ کی دین کہ جنھوں نے سجدہ کیا۔ وہ بعد میں ایمان سے سرفراز ہوئے۔ سوائے ان مغروروں کے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہتے ہیں کہ یہ پہلی سورت ہے جو آپ ﷺ نے کفار میں علی الاعلان سنائی اور پہلی سورت ہے جس میں آیت سجدہ نازل ہوئی۔

بعد میں جب انھیں احساس ہوا کہ کلام الٰہی کے جلال نے ان کی لگام موڑ دی، اور وہ ٹھیک وہی کام کر بیٹھے، جسے مٹانے اور ختم کرنے کے لیے انھوں نے ایڑی سے چوٹی تک زور لگا رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس واقعے میں غیر موجود مشرکین نے ان پر ہر طرف سے عتاب اور ملامت کی بوچھاڑ شروع کی تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ابوجہل کو معلوم ہوا تو اسے یقین نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ قریش جو اسلام اور رسول ﷺ کے دشمن تھے، وہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ مل کر سجدہ کر سکتے ہیں۔ جب تصدیق ہوگئی کہ کفار نے بھی حضور ﷺ کے ساتھ مل کر اللہ کے حضور سجدہ کیا تھا تو ابوجہل غضب ناک ہو گیا۔ اس نے ان مشرکوں کو سخت ڈانٹ پلائی، بہت برا بھلا کہا۔ کفار کے باقی لوگوں نے بھی انھیں ملامت کی۔ وہ مختلف وضاحتیں کرتے تھے، مگر سجدہ تو انھوں نے کیا تھا۔ اس کا کیا کیا جائے، قریش سے انھوں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے رسول کریم ﷺ پر افترا پردازی کی اور جھوٹ گھڑا اور سورۂ نجم کی آیات 19 تا 22 کا مفہوم کچھ کا کچھ کر دیا۔ اصل آیات یہ ہیں:

﴿اَفَرَءَیْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰی o وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰی o اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰی o تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰی o﴾ (النجم: 19 تا 22)

''اب ذرا بتاؤ۔ تم نے کبھی اس لات اور اس عزیٰ اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے؟ کیا بیٹے تمھارے لیے ہیں اور بیٹیاں خدا کے لیے؟ یہ تو پھر بڑی دھاندلی کی تقسیم ہوئی!''

کفار نے یہ جھوٹ گھڑا کہ آپ ﷺ نے ان کے بتوں کا ذکر عزت واحترام سے کرتے ہوئے یہ کہا:

''تلك الغرانيق العلیٰ و ان شفاعتهن لترجیٰ۔''

''یہ بلند پایہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی امید کی جاتی ہے۔''

یہ صریح جھوٹ تھا جو محض اس لیے گھڑ لیا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ سجدہ کرنے کی جو ''غلطی'' ہوگئی ہے، اس کے لیے ایک ''معقول'' عذر پیش کیا جا سکے، اور ظاہر ہے کہ جو لوگ نبی کریم ﷺ پر ہمیشہ افترا پردازی کرتے اور ہمیشہ جھوٹ گھڑتے رہتے تھے، وہ اپنا دامن بچانے کے لیے اس طرح کا جھوٹ کیوں نہ گھڑتے۔

بہر حال مشرکین کے سجدہ کرنے کے اس واقعے کی خبر حبشہ کے مہاجرین کو بھی معلوم ہوئی، لیکن اپنی اصل صورت سے بالکل ہٹ کر، یعنی انھیں یہ معلوم ہوا کہ مشرکین مسلمان ہو گئے ہیں۔ چناں چہ ماہ شوال میں مکہ واپسی کی راہ لی، لیکن جب اتنے قریب آ گئے کہ مکہ ایک دن سے بھی کم فاصلے پر رہ گیا تو حقیقت حال آشکار ہوئی۔ اس کے بعد کچھ لوگ تو سیدھے حبشہ پلٹ گئے اور کچھ لوگ چھپ چھپا کر یا قریش کے کسی بڑے آدمی کی پناہ لے کر مکہ میں داخل ہوئے۔

عرب کے دستور کے مطابق بغیر کسی کے پناہ میں آئے یا کسی قبیلے سے منسلک ہوئے بغیر زندگی ناممکن تھی۔ عربوں میں پناہ کی ذمہ داری ایک ایسی عجیب وفاداری تھی کہ کوئی بھی پناہ لیے ہوئے شخص کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھتا تو پناہ دہندہ اسے اپنی بے عزتی سمجھتا، اور بدسلوکی کرنے والا بڑے جرم کا مرتکب سمجھا جاتا۔

واپس آنے والے مہاجرین پر کیا گزری

مکہ میں داخل ہوتے وقت واپس آنے والے مہاجرین میں سے کس مسلمان نے قریش کے سرداروں میں سے کس کی پناہ حاصل تھی، ان کی تفصیل یہ ہے:

1: حضرت عثمانؓ کو پناہ دینے والا ابواحیحہ سعید بن العاص
2: حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ کو پناہ دینے والا امیہ بن خلف۔
3: حضرت زبیرؓ بن العوام کو پناہ دینے والا زمعہ بن الاسود
4: حضرت مصعبؓ بن عمیر کو پناہ دینے والا النضر بن الحارث بن کلدہ
5: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو پناہ دینے والا اسود بن عبد یغوث
6: حضرت عامرؓ بن ربیعہ کو پناہ دینے والا العاص بن وائل سہمی
7: حضرت ابوسبرہؓ بن ابی رہم کو پناہ دینے والا اخنس بن شریق
8: حضرت سہیل بن بیضا کو پناہ دینے والا ان کے قبیلے کا کوئی شخص (یہ روایت بھی ہے کہ وہ کچھ دن مکے میں چھپے رہے۔ پھر حبشہ واپس چلے گئے)۔

جو لوگ حبشہ سے مکہ واپس ہوئے، ان کی تعداد ۳۳ تھی۔ یہاں صرف نو حضرات کا ذکر کیا گیا ہے۔

دوسری ہجرت حبشہ

جب مکہ میں قریش کا ظلم شدید سے شدید تر ہوتا گیا اور حضور ﷺ نے دیکھا کہ حبشہ مسلمانوں کے لیے امن کی جگہ ثابت ہوا ہے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو دوبارہ حبشہ کی اجازت دے دی۔ جو اصحاب حبشہ سے واپس ہوئے، ان میں سے بیش تر پھر حبشہ روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ کچھ نئے اصحاب بھی تھے۔

یہ ہجرت بعثت نبوی کے چھٹے سال کے آغاز (۶۱۵ء) میں واقع ہوئی۔ اگرچہ قریش نے اس ہجرت کو روکنے کی پوری کوشش کی، نکلنے والوں کو بہت تنگ کیا اور ان کے راستے میں سخت مشکلات پیدا کیں، لیکن اس کے باوجود اس موقع پر ۸۰ سے زیادہ مردوں اور اٹھارہ انیس عورتوں نے حبش کی راہ لی۔ وہاں یہ لوگ بخیریت پہنچ گئے۔ ابن سعد نے مردوں کی تعداد ۸۳ بیان کی ہے اور عورتوں میں گیارہ قریشی اور سات غیر قریشی خواتین کا ذکر کیا ہے۔ ۸۳ مردوں میں حضرت عمار بن یاسرؓ کا نام لیا گیا ہے، مگر ابن اسحاق نے ان کے شریک ہونے میں شک کیا ہے۔

اس ہجرت کی اہمیت کا اندازہ مہاجرین کی اس فہرست سے ملتا ہے، جو ابن ہشام نے سیرت میں ابن اسحاق کے حوالے سے درج کی ہے، اور یہاں ہم نے سیرت سرور دو عالمؐ (مولفہ مولانا مودودی) سے نقل کی ہے:

بنی ہاشم سے

1: جعفرؓ بن ابی طالب
2: ان کی بیوی اسماؓ بنت عمیس

بنی امیہ میں سے

3: حضرت عثمانؓ بن عفان
4: ان کی بیوی رقیہؓ بنتِ رسول اللہ ﷺ
5: عمروؓ بن سعید بن العاص (ان کے باپ سعید بن العاص کی کنیت ابواحیحہ تھی)
6: ان کی بیوی فاطمہؓ بنت صفوان (یہ بنی کنانی میں سے تھیں)
7: ان کے بھائی خالدؓ بن سعید بن العاص
8: ان کی بیوی امینہؓ بنت خلف (بعض لوگوں نے ان کا نام ہمینہ لکھا ہے، یہ بنی خزاعہ میں سے تھیں)

خلفائے بنی امیہ میں سے

9: عبداللہؓ بن جحش (یہ بنی غنم دودان میں سے تھے اور ام المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے)
10: ان کا بھائی عبیداللہ بن جحش (یہ شخص حبش میں عیسائی ہو کر مرا)
11: اس کی بیوی ام حبیبہؓ (یہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں۔ حبش ہی میں رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کے توسط سے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا)
12: قیسؓ بن عبداللہ (یہ بنی اسد بن خزیمہ میں سے تھے)
13: ان کی بیوی برکہؓ یسار (ابوسفیان کی آزاد کردہ لونڈی)
14: معیقیبؓ بن ابی فاطمہ (یہ قبیلہ دوس میں سے تھے)

بنی عبد شمس بن عبد مناف سے

15: ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ

خلفائے بنی نوفل میں عبدالمناف میں سے

16: عتبہؓ بن غزوان (یہ بنی قیس بن غیلان میں سے تھے)

بنی اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی میں سے

17: زبیرؓ بن العوام بن خویلد
18: یزیدؓ بن زمعہ بن اسود بن مطلب (یہ حضرت خدیجہ کے بھتیجے تھے)
19: عمروؓ بن امیہ بن حارث بن اسد

بنی عبد بن قصی میں سے

طلیب بن عمیر بن وہیب (یہ حضور ﷺ کی پھوپھی اروٰی بنت عبدالمطلب کے صاحب زادے تھے)

بنی عبدالدار بن قصی میں سے

20: مصعبؓ بن عمیر بن ہاشم
21: سویطؓ بن سعد
22: جہمؓ بن قیس
23: ان کی بیوی ام حرملہؓ بنت عبدالاسود (یہ بنی خزاعہ میں سے تھیں)
24: ان کے بیٹے عمروؓ بن جہم
25: ان کے دوسرے بیٹے خزیمہؓ بن جہم۔
26: ابوالرومؓ بن عمیر بن ہاشم (حضرت مصعب کے بھائی)
27: فراسؓ بن نضر بن حارث بن کلدہ (یہ اُسی شخص کے بیٹے تھے جس نے سلام کو زک دینے کے لیے ثقافتی پروگرام شروع کیا تھا
28: بنی زہرہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف
29: عامرؓ بن ابی وقاص (حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے بھائی)
30: مطلبؓ بن ازہر
31: ان کی بیوی رملہ بنت ابی عوف (یہ بنی سہم میں سے تھیں)

خلفائے بنی زہرہ میں سے

32: عبداللہؓ بن مسعود (یہ قبیلہ ہذیل میں سے تھے)
33: ان کے بھائی عتبہؓ بن مسعود
34: مقدادؓ بن عمرو (یہ مقداد بن اسود کہلاتے تھے کیوں کہ اسود بن عبد یغوث نے انھیں بیٹا بنا لیا تھا)

بنی تیم میں سے

35: حارثؓ بن خالد۔ (یہ حضرت ابوبکرؓ کے ماموں زاد بھائی تھے)
36: ان کی بیوی ریطہؓ بنت الحارث بن جبلہ یا جبیلہ (یہ بھی بنی تیم میں سے تھیں)
37: عمروؓ بن عثمان۔ (یہ حضرت طلحہؓ کے چچا تھے)

ابو مخزوم میں سے

38: ابوسلمہؓ بن عبدالاسد۔ (حضور ﷺ کے دودھ شریک اور پھوپھی زاد بھائی)
39: ان کی بیوی ام سلمہ (یہ بھی بنی مخزوم میں سے تھیں اور بعد میں انھیں ام المومنین ہونے کا شرف نصیب ہوا)

40: شماسؓ بن عثمان (یہ عتبہ بن ربیعہ کے بھانجے تھے)
41: ہبارؓ بن سفیان
42: ان کے بھائی عبداللہؓ بن سفیان (بعض لوگوں نے ان کا نام عبیداللہ لکھا ہے)
43: ہشامؓ بن ابی حذیفہ بن مغیرہ (بعض لوگوں نے ان کا نام ہاشم لکھا ہے)
44: سلمہؓ بن ہشام بن مغیرہ (ابوجہل کے بھائی)
45: عیاشؓ بن ابی ربیعہ۔ (ابوجہل کے بھائی)

خلفائے بنی مخزوم میں سے
46: معتبؓ بن عوف (یہ بنی خزاعہ میں سے تھے)

بنی جمح میں سے
47: عثمانؓ بن مظعون۔ (حضرت عمرؓ کے برادر نسبتی)
48: ان کے بیٹے سائبؓ بن عثمان
49: ان کے بھائی قدامہؓ بن مظعون
50: ان کے دوسرے بھائی عبداللہؓ بن مظعون
51: حاطبؓ بن الحارث
52: ان کی بیوی فاطمہؓ بنت مجلل عامریہ
53: ان کے بیٹے محمدؓ بن حاطب
54: ان کے دوسرے بیٹے حارثؓ بن حاطب
55: ان کے بھائی حطابؓ بن الحارث
56: سفیانؓ بن معمر
57: ان کے بیٹے جابرؓ بن سفیان
58: ان کے دوسرے بیٹے جنادہؓ بن سفیان
59: ان کی بیوی حسنہؓ۔ (جابر و جنادہ کی ماں)
60: حسنہؓ کے دوسرے شوہر سے بیٹے شرجیلؓ بن حسنہ (یہ بنی غوث بن مرہ میں سے تھے)
61: عثمانؓ بن ربیعہ بن اہبان۔

بنی سہم میں سے
62: خنیسؓ بن حذافہ (حضرت عمرؓ کے داماد۔ حضرت حفصہؓ ام المومنین کے پہلے شوہر)
63: عبداللہؓ بن حارث
64: ہشامؓ بن عاص بن وائل۔ (عمروؓ بن العاص کے بھائی)
65: قیسؓ بن حذافہ
66: ابوقیسؓ بن حارث
67: عبداللہؓ بن حذافہ
68: حارثؓ بن حارث بن قیس
69: معمرؓ بن حارث بن قیس
70: بشرؓ بن حارث بن قیس
71: ان کے ماں جائے بھائی سعیدؓ بن عمرو (یہ بنی تمیم میں سے تھے)
72: سعیدؓ بن حارث بن قیس
73: سائبؓ بن حارث بن قیس
74: عمیرؓ بن رئاب

خلفائے بنی سہم میں سے
75: محمیہؓ بن الجزء (یہ بنی زبید میں سے تھے)

بنی عدی میں سے
76: معمرؓ بن عبداللہ نضلہ
77: عروہ بن عبدالعزیٰ۔ (بعض لوگوں نے عروہ بن ابی اثاثہ بن عبدالعزیٰ لکھا ہے)
78: عدیؓ بن نضلہ
79: ان کے بیٹے نعمانؓ بن عدی

خلفائے بنی عدی میں سے
80: عامرؓ بن ربیعۃ العنزی (بنی عنز بن وائل میں سے تھے اور خطاب نے انھیں بیٹا بنا رکھا تھا)
81: ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ (یہ بنی عدی میں سے تھیں)

بنی عامر بن لوئی میں سے
82: ابوسبرہؓ بن رہم۔ (حضور ﷺ کی پھوپھی برہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے)
83: ان کی بیوی ام کلثومؓ بنت سہیل بن عمرو۔
84: عبداللہؓ بن مخرمہ
85: عبداللہؓ بن سہیل بن عمرو۔
86: سلیطؓ بن عمرو
87: ان کے بھائی سکرانؓ بن عمرو۔ (یہ دونوں سہیل بن عمرو کے بھائی تھے)
88: ان کی بیوی سودہؓ بنت زمعہ (جنھیں بعد میں ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا)
89: مالکؓ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی)
90: ان کی بیوی عمرہؓ بنت السعدی (بعض لوگوں نے ان کا نام عمیرہ لکھا ہے)
91: حاطبؓ (یا ابوحاطب) بن عمرو

خلفائے بنی عامر میں سے
92: سعدؓ بن خولہ یا خولہ۔ (یہ یمنی تھے).

بنی الحارث بن فہر میں سے
93: ابوعبیدہؓ بن الجراح
94: سہیلؓ بن بیضاء

95: عمرؓو ابن ابی سرح

96: عیاض ابن زہیر (بعض نے ان کی جگہ ربیعہ بن ہلال کا نام لکھا ہے)

97: عمرؓو ابن الحارث بن زہیر

98: عثمان بن عبد غنم بن زہیر

99: سعدؓ (یا سعید) بن عبد قیس

100: حارثؓ بن عبد قیس

مسلمانوں کی مجموعی تعداد اس وقت بہت کم تھی۔ اس ہجرت سے مکے کے گھر گھر میں کہرام مچ گیا، کیوں کہ قریش کے بڑے اور چھوٹے خاندانوں میں سے کوئی ایسا نہ تھا جس کے چشم و چراغ ان مہاجرین میں شامل نہ ہوں۔ کسی کا بیٹا گیا تو کسی کا داماد۔ کسی کی بیٹی گئی تو کسی کا بھائی اور کسی کی بہن۔ ابوجہل کے بھائی سلمہؓ، ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہؓ، عتبہ بن ربیعہ کے بیٹے، اور جگر خوارہ ''ہندہ'' کے سگے بھائی ابوحذیفہؓ، سہیل بن عمرو کے بھائی، بیٹے، بیٹیاں اور داماد، اسی طرح دوسرے سرداران قریش اور مشہور دشمنانِ اسلام کے اپنے جگر گوشے دین کی خاطر گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس لیے کوئی گھر نہ تھا جو اس واقعے سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بعض لوگ اس کی وجہ سے اسلام دشمنی میں پہلے سے زیادہ سخت ہو گئے اور بعض کے دلوں پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ آخر کار وہ مسلمان ہو کر رہے۔

مکے میں تو اضطراب اور بے چینی کا عالم تھا، لیکن ادھر حبشہ مہاجرین کے لیے اچھی پناہ گاہ ثابت ہوا اور وہ وہاں اطمینان اور سکون سے رہنے لگے۔ حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ جب حبشہ پہنچے تو ہمارے ساتھ نجاشی کا سلوک بہت اچھا رہا۔ وہ ہمارے لیے بہترین پڑوسی تھے۔ دین کے معاملے میں ہم محفوظ و مامون ہو گئے۔ کوئی ہمیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچاتا تھا اور کوئی ناپسندیدہ بات ہمیں سننی نہیں پڑتی تھی۔

حبشہ اور نجاشی

حبشہ کی سرزمین مکہ کی مغربی جانب سوڈان کے صحرائی علاقے کے درمیان واقع ہے۔ درمیان میں بحر قلزم موجزن ہے۔ اہلِ عرب کے حبشہ سے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ شاہ مصباح الدین شکیل اپنی تالیف ''سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ'' جلد اول میں لکھتے ہیں: ''حضور اکرم ﷺ کے پردادا ہاشم کو قیصر روم نے تجارتی کارواں شام لانے کا پروانہ عطا کیا اور اپنے زیر اثر حاکم حبش کے نام سفارشی خط بھی لکھا۔ قریش کے تجارتی مال پر ٹیکس نہ لینے کا فرمان حاصل کرنے کے بعد تجارتی قافلے حبش جانے لگے۔ وہ عموماً چمڑے، گوند، لوبان، اونی کپڑے اور قبائیں بیچنے لے جاتے اور ان کے بدلے غلہ حاصل کرتے۔

عرب سے حبشہ جانے کے دو راستے تھے۔ تجارتی قافلوں کا خشکی کا راستہ فلسطین سے مصر اور پھر حبشہ کو جاتا تھا۔ بحری راستے سے کشتیاں جدہ (شعیبہ) سے چلتیں اور باب المندب سے ہوتے ہوئے حبشہ کی کسی بندرگاہ میں پہنچ جاتیں۔ حبشہ کے دارالحکومت اکسوم سے قریبی بندرگاہ کا نام اودلس تھا۔ سمندری سفر نسبتاً خراب اور طوفانی ہواؤں کی زد میں ہوتا۔ اس کے باوجود عرب بحری سفر اور سمندر سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔ اس وقت کے شاہ حبشہ کا نام ''اصحمہ'' اور لقب نجاشی تھا۔ جس طرح شاہ ایران کا لقب کسریٰ یا خسرو، شاہ روم کا لقب قیصر اور شاہ مصر کا لقب فرعون ہوتا تھا۔ نجاشی دراصل حبشی زبان کے لفظ نجوش یا نگوش (Negus) کا معرب ہے۔ اس کے لفظی معنی حکمران کے ہیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں اتھیوسیوس سکندریہ کا لارڈ پادری تھا۔ اس نے 330ء میں حبشہ کے دارالحکومت اکسوم میں پہلا بشپ بھیجا تھا۔ یہاں کی نصرانیت مسیحی فرقوں کی باہمی لڑائیوں سے پاک تھی۔ حبشیوں کا قول ہے کہ حضرت سلیمانؑ کی ملکہ بلقیس حبشہ کے شاہی خاندان کی شاخ سے تھیں جو یمن میں جا کر آباد ہو گئی تھی۔ شاہ جسٹنین اول کی درخواست پر 525ء میں شاہ حبشہ نے یمن کے عیسائیوں کی مدد کے لیے حملہ کیا۔ یہاں بحیثیت فاتح پچاس سال تک حکومت کی۔ اس زمانے میں یمن کے حبشی گورنر ابرہہ نے کعبہ ڈھا کر صنعا کا کلیسا آباد کرنا چاہا تھا۔ اس وقت حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب قریش کے سردار تھے۔

اس زمانے کے نجاشی کے عدل و انصاف کی بہت شہرت تھی۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے چچا کے بارہ بیٹے تھے۔ اہلِ حبشہ نے سوچا کہ اگر اس کے بھائی کو حاکم بنا دیا جائے تو کثرتِ اولاد کی وجہ سے حکومت زیادہ دن قائم رہے گی اور کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ چناں چہ اس کے باپ کو قتل کر کے چچا کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ اصحمہ چچا کے گھر میں پرورش پاتا رہا۔ اپنی دانش مندی اور حسن اخلاق سے بہت جلد چچا کا منظور نظر ہو گیا۔ قوم نے یہ دیکھا تو سوچا کہ اگر یہ چچا کے بعد تخت پر بیٹھا تو ہمارا حشر برا ہوگا۔ سازش کر کے اسے ملک بدر کرنے کا حکم جاری کروایا۔ زبردستی ایک تاجر کے ہاتھ سات سو درہم میں اُسے فروخت کر کے کشتی پر سوار کر دیا۔ اتفاق سے اس دن گھٹا چھا گئی۔ بادشاہ موسم کا لطف اٹھا رہا تھا کہ بجلی گری اور لقمہ اجل بن گیا۔ لوگوں نے اس کے بیٹوں میں سے کسی کو بادشاہ بنانا چاہا تو سب کو نااہل اور احمق پایا۔ آخر لوگ کشتی سے اصحمہ کو اتار لائے اور تخت پر بٹھا دیا۔ تاجر نے رقم مانگی تو ٹکا سا جواب دیا۔ مقدمہ نجاشی کی عدالت میں پیش ہوا۔ نجاشی نے حکم دیا کہ اس تاجر کی رقم واپس کر دی جائے ورنہ غلام اس کے حوالے کر دیا جائے، جسے وہ اپنے ساتھ جہاں چاہے، لے جائے۔ نجاشی کا یہ فیصلہ سن کر لوگوں نے سات سو درہم واپس کر دیئے۔ (ابن ہشام)

کفار مکہ کا تعاقب

مہاجرین حبشہ جن حالات سے گزرے، اس کی روداد ہمیں حضرت ام سلمہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کی روایتوں میں ملتی ہے۔ یہ وہ اصحاب ہیں جن کا براہ راست اس ہجرت سے تعلق تھا۔ پہلے تین اصحاب مہاجرین حبشہ میں سے ہیں اور حضرت عمرو بن العاصؓ مشرکین کی طرف سے سفیر کی حیثیت سے نجاشی کے پاس گئے تھے۔

جب قریش کے علم میں یہ بات آئی کہ تین سو کے لگ بھگ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے ہیں، تو ان کی عصبیت جاہلیہ بھڑک اٹھی۔ انھوں نے مشورہ کیا کہ اب کیا

کیا جائے؟ طے پایا کہ نجاشی کے پاس سفیر بھیج کر درخواست کی جائے کہ وہ ان لوگوں کو اپنے ملک سے نکال باہر کرے اور ہمارے حوالے کر دے۔ سفارت کے لیے دو خوب مضبوط اور توانا افراد کا انتخاب کیا جائے۔ نجاشی کو مکہ کی سب سے قیمتی چیزیں بطور تحفہ بھیجی جائیں۔ اس کے ایک ایک مذہبی راہ نُما کے لیے بھی تحائف کا انتظام کیا جائے۔ اہل حبشہ کو یہاں کے چمڑے بہت پسند تھے۔ عمدہ چمڑے جمع کیے گئے۔ اس کے علاوہ نجاشی کے لیے ایک گھوڑا اور ریشمی عبا بھی تھی۔ حبشہ کے مذہبی راہ نُماؤں کے لیے بھی تحفوں کا انتظام کیا گیا۔

قریش کا سفارتی مشن

ان تحائف کے ساتھ عمرو بن العاص (بعد میں فاتح مصر) اور عبداللہ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کا ماں جایا بھائی) کو سفارتی مشن پر روانہ کیا گیا۔ ان سفیروں نے حسب فیصلہ ہر سردار تک اس کا تحفہ پہنچایا اور اس سے کہا کہ ہمارے کچھ ناسمجھ جذباتی نوجوان آپ کے بادشاہ کی مملکت میں بھاگ آئے ہیں، اپنا دین چھوڑ دیا ہے۔ آپ کا دین (عیسائیت) بھی قبول نہیں کیا ہے، بلکہ ایک نیا ہی دین ایجاد کر رکھا ہے جس سے نہ ہم واقف ہیں نہ آپ حضرات۔ ہمارے اشراف اور سرداروں نے ہمیں بادشاہ کی خدمت میں بھیجا ہے تا کہ وہ انھیں واپس کر دیں۔ جب بادشاہ سے ہماری بات ہو تو آپ حضرات بادشاہ کو مشورہ دیں کہ وہ انھیں ہمارے حوالے کر دیں اور ان سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کریں، اس لیے کہ ان کے سردار اور ان کے بزرگ ان کے حالات سے زیادہ باخبر ہیں۔ ان پر دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ حبشہ کے مذہبی سرداروں نے اس سے اتفاق کیا۔

نجاشی سے ملاقات

اب دونوں سفیروں نے براہِ راست نجاشی سے ملاقات کی اور تحفے تحائف پیش کیے۔ نجاشی نے تحفے قبول کیے۔ اپنی نشست کے دائیں بائیں دونوں سفیروں کو جگہ دی۔ آمد کا مقصد دریافت کیا۔ انھوں نے وہی باتیں دہرائیں جو کہ پادریوں سے کی تھیں کہ ہمارے کچھ ناسمجھ نوجوان آپ کی مملکت میں بھاگ آئے ہیں۔ اپنی قوم کے دین کو ترک کر دیا ہے اور آپ کے دین کو بھی قبول نہیں کیا ہے، ایک نیا ہی دین اختیار کر رکھا ہے۔ ان کے قوم کے سرداروں نے، ان کے خاندان کے بزرگوں نے، ان کے باپوں اور چچاؤں نے، ان کا جن قبائل سے متعلق ہے، ان کے نمایاں افراد نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، تا کہ آپ انھیں ان کے وطن لوٹا دیں۔ سفیروں نے نجاشی کو بھی یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس مسئلے میں وہ ان مہاجرین سے کوئی بات نہ کرے، اس لیے کہ ان کی قوم ان کے غلط فکر و عمل سے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ واقف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں سفیروں کو یہ سخت ناگوار تھا کہ نجاشی سے مہاجرین کی گفتگو ہو۔ انھیں اندیشہ تھا کہ اس سے نجاشی متاثر ہو سکتا ہے۔ مجلس میں جو سردار اور مذہبی راہ نُما موجود تھے، انھوں نے بھی سفیروں کے اس خیال کی تائید کی کہ مہاجرین سے گفتگو کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

نجاشی نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور کہا: ''قسم خدا کی، میں تحقیق حال کے بغیر انھیں اس طرح ان کے حوالے نہیں کروں گا۔ یہ بات سراسر ناانصافی کی ہوگی کہ کچھ لوگوں نے میری ہمسائیگی اختیار کی۔ میرے ملک میں آئے۔ دوسروں کے مقابلے میں مجھے پسند کیا۔ میں ان سے بات چیت کیے بغیر ہی انھیں نکال باہر کروں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں ان سے معلومات حاصل کروں گا۔ اگر سفیروں کی بات درست نکلی تو انھیں ان کے حوالے کر دوں گا اور انھیں ان کی قوم کے پاس پہنچا دوں گا، لیکن اگر بات دوسری ہو تو میں انھیں ان سفیروں کے حوالے نہیں کروں گا۔ جب تک وہ میرے پاس ہیں، ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے گا۔''

مہاجرین سے گفتگو سے پہلے نجاشی نے مذہبی راہ نُماؤں (نصاریٰ کے علما اور پادریوں) کو طلب کیا۔ وہ حاضر ہوئے تو ان سے کہا کہ وہ اپنے صحیفے کھول لیں (غالباً اس خیال سے کہ دیکھیں، ان مہاجرین کی باتوں کی ان صحیفوں سے تصدیق ہوتی ہے یا نہیں؟)

جعفر طیارؓ کا کلمۂ حق

اب اس نے مہاجرین کو طلب کیا۔ قاصد ان کے پاس پہنچا تو انھوں نے باہمی مشورے سے طے کیا کہ بادشاہ کے سامنے وہی بات رکھی جائے، جس کی تعلیم ہمارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے دی ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ جعفرؓ نے کہا: ''نجاشی کے سامنے میں تم سب کی نمائندگی کروں گا۔ سب نے اس سے اتفاق کیا۔''

مہاجرین روانہ ہوئے۔ دربار میں پہنچنے سے پہلے حضرت جعفرؓ نے باہر سے آواز دی کہ جعفر دروازے پر ہے۔ اس کے ساتھ حزب اللہ ہے۔ کیا حاضری کی اجازت ہے؟ نجاشی نے کہا: ''ہاں تمھیں اللہ کی امان ہے، اس کی پناہ حاصل ہے۔ اندر آ سکتے ہو۔'' حضرت جعفرؓ داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے ان کے رفقا تھے، سلام کیا۔ دربار میں جو علماء اور راہب موجود تھے، انھوں نے ان سے کہا کہ بادشاہ کو سجدہ کرو۔ حضرت جعفرؓ نے انکار کر دیا۔

عمرو بن العاص نے کہا: ''یہ بڑے مغرور، متکبر اور نخوت بھرے لوگ ہیں۔ خود کو حزب اللہ کہتے ہیں۔ جس طرح دوسرے لوگ آپ کی تعظیم بجالاتے ہیں، اس طرح انھوں نے تعظیم نہیں کی اور سجدہ تعظیم بھی نہیں کیا'' نجاشی نے ان سے اس کی دریافت کی تو حضرت جعفرؓ نے کہا کہ ہم صرف اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں، اس کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ ہمارے پیغمبر نے ہمیں بتایا ہے کہ اہل جنت آپس میں سلام کریں گے۔ ہم بھی ایک دوسرے کو سلام ہی کرتے ہیں۔ چوں کہ انجیل میں یہ بات موجود ہے، اس لیے نجاشی سمجھ گیا کہ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔

نجاشی نے پوچھا: ''تمھارا دین کیا ہے، کیا تم عیسائی ہو؟''

حضرت جعفرؓ: ''نہیں''

نجاشی: ''کیا تم یہود ہو؟''

حضرت جعفرؓ: ''نہیں، ہم یہود نہیں ہیں۔''

نجاشی: ''کیا تمھارا دین وہی ہے جو تمھاری قوم کا ہے؟''

حضرت جعفرؓ: ''نہیں''

نجاشی: ''آخر تمھارا دین کیا ہے اور اس کا لانے والا کون ہے؟''

اس پر حضرت جعفرؓ نے ایک طویل تقریر کی: ''اے بادشاہ! ہم ایسے لوگ تھے جو جاہلیت میں گرفتار تھے۔ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ بے حیائی کے کاموں میں ملوث تھے۔ قطع رحم کا ارتکاب کرتے تھے۔ رشتوں کے حقوق ادا نہیں کرتے تھے۔ پڑوسیوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں جو قوی تھا، وہ کم زور کو کھائے جارہا تھا۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے ہم ہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ ان کے حسب نسب، صداقت، امانت، عفت وعصمت سے ہم واقف تھے۔ انھوں نے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی کہ ہم اسے ایک مانیں، اسی کی عبادت کریں۔ ہمارے باپ دادا اللہ کو چھوڑ کر بتوں کی اور پتھروں کی جو پوجا پرستش کرتے ہیں، اسے ترک کردیں۔ انھوں نے ہمیں راست گفتاری، امانت کی ادائیگی، صلہ رحمی اور پڑوسیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تعلیم دی۔ حرام چیزوں سے رک جانے کا حکم دیا۔ قتل وخون ریزی سے، فواحش اور منکرات سے، دروغ گوئی سے، یتیم کا مال کھانے سے اور پاکباز عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا۔ نماز، زکوٰۃ (صدقہ وخیرات) اور روزے کا حکم دیا۔''

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت جعفرؓ نے اس طرح اسلام کی بہت سی تعلیمات کی وضاحت کی۔ اس کے بعد کہا: ''ہم نے اللہ کے رسول ﷺ کی ان باتوں کی تصدیق کی۔ آپ ﷺ پر ایمان آئے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ جو تعلیمات لائے ہیں، انھیں ہم برحق مانتے ہیں۔ اللہ واحد کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، انھیں حرام اور جن چیزوں کو حلال کیا، انھیں حلال سمجھ کر عمل کرتے ہیں۔ اس پر ہماری قوم نے ہمارے ساتھ ظلم وزیادتی کی روش اختیار کررکھی ہے۔ اس نے ہمیں سخت سزائیں دیں۔ ہمیں اپنے دین سے پھیرنے کی کوشش کی، تاکہ ہمیں اللہ واحد کی عبادت سے پھیر کر بت پرستی کی طرف لے جائیں۔ ہم جن خبیث حرکتوں کا ارتکاب کرتے تھے، پھر ان کا ارتکاب کرنے لگیں۔ جب انھوں نے ہم پر قہر وغضب ڈھایا، ظلم کیا، زندگی ہمارے لیے تنگ کردی، ہمارے اور ہمارے دین کے درمیان رکاوٹ بن کر کھڑے ہوگئے، تو ہم نے دوسروں کے مقابلے میں آپ کے ملک کو ترجیح دی۔ آپ کے جوار میں رہنا پسند کیا، اس توقع پر کہ آپ کے ہاں، اے بادشاہ! ہم پر ظلم نہ ہوگا اور ہم زیادتیوں سے محفوظ رہیں گے۔''

یہ بے مثال اور دل ہلا دینے والی تقریر سننے کے بعد نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے دریافت کیا کہ تمھارے پیغمبر جو کلام اللہ کی طرف سے پیش کرتے ہیں، کیا اس کا کوئی حصہ تمھارے پاس ہے؟

حضرت جعفرؓ نے کہا: ''ہاں۔''

نجاشی: ''وہ مجھے سناؤ''

حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ نجاشی کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔ یہاں تک کہ اس کی ڈاڑھی تر ہوگئی۔ جو علماء دربار میں موجود تھے، ان کی آنکھیں بھی اشک بار ہوگئیں ایک روایت میں ہے کہ نجاشی نے کہا: یہ کلام اور حضرت عیسیٰؑ جو کلام لائے تھے، دونوں ایک ہی چراغ سے نکلے ہیں۔ پھر عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص سے کہا: ''آپ لوگ یہاں سے جائیں۔ میں انھیں تمھارے حوالے نہیں کروں گا۔''

عمرو بن العاص اور عبداللہ بن ربیعہ دربار سے باہر نکلے تو عمرو بن عاص نے کہا: ''کل ایک ایسی بات میں بادشاہ سے کہوں گا کہ وہ انھیں جڑ پیڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔''
ان دونوں میں عبداللہ بن ربیعہ نسبتاً نرم تھے۔ انھوں نے کہا: ''ایسی کوئی بات نہ کرو۔ یہ لوگ چاہے ہمارے دین کے خلاف ہوں، لیکن ان سے ہمارا خونی رشتہ ہے۔'' عمرو بن عاص اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ چناں چہ وہ دوسرے دن بادشاہ کے پاس پہنچے اور کہا: ''اے بادشاہ! یہ لوگ عیسیٰؑ بن مریم کے بارے میں بہت سخت بات کہتے ہیں۔ آپ ان سے اس سلسلے میں دریافت کریں۔''

نجاشی پر اثر

دوسرے دن نجاشی نے پھر مہاجرین کو طلب کیا۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ یہ ہمارے لیے بڑا نازک معاملہ تھا۔ لوگ جمع ہوئے اور مشورہ کیا کہ ہمیں اس سوال کا کیا جواب دینا چاہیے؟ پھر یہی طے پایا کہ ہم وہی کہیں گے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کہا ہے، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ چناں چہ یہ لوگ دربار میں پہنچے تو نجاشی نے سوال کیا کہ تم لوگ عیسیٰؑ ابن مریم کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

حضرت جعفرؓ نے جواب دیا: ''ہم ان کے بارے میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے پیغمبر نے ہمیں خدا کی طرف سے بتایا ہے۔ وہ اللہ کے بندے، اس کے رسول اس کی روح اور کلمہ تھے جو مریم عذرا بتول سے بغیر باپ کے، اللہ کے کلمے سے پیدا ہوئے۔''

نجاشی نے جعفرؓ کا یہ بیان سننے کے بعد زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: ''عیسیٰؑ ابن مریم اس بیان سے تنکے کے برابر بھی زیادہ نہ تھے۔'' (ابن ہشام)

حضرت جعفرؓ کی گفتگو کے ختم ہونے پر نجاشی نے دربار میں موجود عالموں اور راہبوں سے دریافت کیا کہ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ اس پر تم کیا اضافہ کرنا چاہتے ہو؟

انھوں نے جواب دیا: ''آپ ہی فرمائیں، آپ کا علمی رتبہ اور مقام ہم سے اونچا ہے۔'' نجاشی نے کہا: ''میں شہادت دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ یہ وہی پیغمبر ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں دی ہے۔''

نجاشی نے علما اور پادریوں سے کہا کہ خدائے تعالیٰ، جس نے حضرت عیسیٰؑ پر انجیل نازل کی، میں اس کی قسم دے کر تم سے پوچھتا ہوں کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد قیامت کے آنے سے پہلے کسی نبی کا ذکر تمھیں انجیل میں ملتا ہے یا نہیں؟''

انھوں نے جواب دیا: ''ہاں، ملتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس کی بشارت دی ہے

اور کہا ہے کہ جو اس پر ایمان لاتا ہے، وہ مجھ پر ایمان لاتا ہے، اور جو اس کی رسالت کا انکار کرتا ہے۔ وہ میرا انکار کرتا ہے۔

اس پر نجاشی نے کہا: ''اگر سلطنت کی ذمہ داری مجھ پر نہ ہوتی تو میں خود اس کی جوتیاں اٹھاتا اور اُس کے ہاتھ پیر دھلاتا۔''

نجاشی سے گفتگو کے دوران میں حضرت جعفرؓ نے نجاشی سے کہا کہ آپ ان سفیروں سے دریافت کریں کہ ہم غلام ہیں یا آزاد؟ اگر غلام ہیں تو بے شک ہم نے اپنے مالکوں سے فرار کی راہ اختیار کی ہے، آپ ہمیں لوٹا دیں۔

عمرو بن عاص نے کہا: ''نہیں! یہ آزاد لوگ ہیں۔''

حضرت جعفرؓ نے فرمایا: ان سے پوچھیں کہ کیا ہم نے ناحق کسی کا خون بہایا ہے کہ ہم سے قصاص کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ کیا ہم نے ناروا کسی کا مال لے رکھا ہے اور اس کا ادا کرنا ہم پر ضروری ہو گیا ہے؟

عمرو بن عاص نے جواب دیا: ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

نجاشی نے سفیروں سے کہا: ''آپ حضرات واپس جائیں، میں کبھی انھیں آپ کے حوالے نہیں کروں گا۔''

اس طرح نجاشی کو یقین ہو گیا کہ محمد ﷺ واقعتاً اللہ کے رسول ہیں۔ یہ مہاجرین ان کے اصحاب اور پیروکار ہیں۔ یہ کسی کے زرخرید غلام نہیں ہیں بلکہ آزاد بندے ہیں۔ انھوں نے کسی کا حق نہیں مارا ہے۔ کسی کا مال نہیں کھایا ہے، بلکہ ان کے ساتھ سراسر زیادتی ہوئی ہے اور وہ یہاں پناہ کے طالب ہیں۔ اس یقین نے اس کے جذبۂ ہمدردی کو بڑھا دیا۔ اس نے مہاجرین سے کہا: ''جاؤ تم لوگ میری سلطنت میں مامون و محفوظ ہو۔ جو کوئی تمھیں برا بھلا کہے گا، اس پر جرمانہ عائد ہو گا۔ تم میں سے کسی کو تکلیف پہنچا کر مجھے سونے کا پہاڑ بھی مل جائے تو میں اسے پسند نہ کروں گا۔''

نجاشی نے اپنے درباریوں سے کہا: ''ان سفیروں کے تحفے واپس کر دیے جائیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کے بعد مہاجرین حبشہ میں سکون سے رہنے لگے۔

نجاشی نے مہاجرین سے پوچھا کہ کیا کوئی تمھیں تکلیف پہنچاتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: ''ہاں''

اس پر نجاشی کے حکم سے منادی کرا دی گئی کہ جو کوئی انھیں تکلیف پہنچائے گا، اس پر چار دینار جرمانہ ہو گا۔ مہاجرین سے دریافت کیا کہ کیا یہ کافی ہے؟ انھوں نے اسے ناکافی بتایا تو نجاشی نے اسے دوگنا کر دیا۔

نجاشی نے بڑے نازک وقت میں مسلمانوں کو پناہ دی تھی۔ انھیں سکون اور اطمینان کے ساتھ دین پر عمل کے مواقع حاصل تھے، اس لیے اس کی سلطنت اور اقتدار کا باقی رہنا ان کے لیے فائدہ مند تھا۔ اس کے زوال اور خاتمے سے انھیں نقصان کا خطرہ تھا۔ چناں چہ اسی ہجرت کے دوران میں نجاشی کا ایک حریف اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کے درمیان جنگ کی نوبت آ گئی۔ اس موقع پر مسلمانوں کی فطری خواہش تھی کہ نجاشی اس میں کام یاب ہو اور اس کا اقتدار قائم رہے۔

نجاشی کا جوابی خط

حضرت جعفر طیارؓ کو نبی کریم ﷺ نے نجاشی کے نام ایک تعارفی خط بھی دیا تھا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی تصنیف ''رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی'' میں معتبر حوالوں سے یہ خط نقل کیا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول اللہ کی طرف سے نجاشی اصحم بادشاہ حبشہ کے نام

''میں اس اللہ کی تعریف تمھیں لکھتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں، جو بادشاہ مقدس، سلامتی والا، امان دہندہ اور سلامتی رکھنے والا ہے، اور میں اقرار کرتا ہوں کہ مریم کے بیٹے عیسیٰؑ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، جنھیں پاک اور برائی سے محفوظ مریم بتول کی طرف ڈالا گیا تو وہ اللہ کی روح اور پھونک سے حاملہ ہوئیں، جیسا کہ خدا نے حضرت آدمؑ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا تھا۔ میں تجھے خدائے واحد لاشریک کی طرف بلاتا ہوں اور یہ کہ تو میری اتباع کرے اور مجھ پر نازل شدہ چیز پر ایمان لائے، کیوں کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور میں تجھے اور تیرے لشکروں کو خدائے عزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے پیام پہنچا دیا اور بہی خواہی کی ہے۔ اب تم میری بہی خواہانہ نصیحت کو قبول کرو اور میں نے تمھارے پاس اپنے چچازاد بھائی جعفرؓ کو بھیجا ہے جس کے ہم راہ چند مسلمان بھی ہیں۔ جب وہ تیرے پاس آئیں تو ان کی مہمان داری کر اور تکبر چھوڑ دے۔ سلام اس پر جو ہدایت پر چلے۔''

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں کہ ''عام طور پر مؤرخ اس خط کو سن چھے ہجری کا بتاتے ہیں، جو درست نہیں۔ آخری جملہ صاف بتا رہا ہے کہ یہ تعارفی خط ہے اور حضرت جعفرؓ کے بدست نجاشی کو بھیجا گیا تھا۔ اس کے واقف کارانہ انداز سے یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ نبوت سے پہلے آنحضرت ﷺ خود حبشہ تشریف لے گئے اور بعض دیگر مکی تاجروں کے ساتھ نجاشی سے شخصی تعارف حاصل کیا تھا۔ آپ کا مہاجرین سے بوقت روانگی واقفانہ انداز میں فرمانا کہ ''حبشہ میں ایک ایسے بادشاہ کی حکمرانی ہے، جس کے ملک میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا'' اس کی مزید تائید کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے نجاشی کے جوابی خط کو بھی نقل کیا ہے۔ جوابی خط کا مضمون درج ذیل ہے:

''بخدمت محمد رسول اللہ ﷺ از طرف نجاشی اصحم بن ابجر۔ اے نبی ﷺ، تجھ پر سلام اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں اس اللہ کی، جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور جس نے مجھے اسلام کی ہدایت دی۔ یا رسول اللہ، آپ ﷺ کا خط مجھے ملا، جس میں حضرت عیسیٰؑ کا ذکر تھا۔ زمین اور آسمان کے مالک کی قسم، آپ ﷺ کی بیان کردہ چیز سے حضرت عیسیٰؑ رتی بھر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ وہ ویسے ہی تھے، جیسے آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہم نے آپ کے فرستادوں سے تعارف حاصل کیا اور آپ کے چچازاد بھائی اور اس کے ساتھیوں کی مہمان داری کی۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ ﷺ سچے اور تصدیق یاب رسول ﷺ ہیں۔ میں نے آپ ﷺ کے چچازاد بھائی اور اس کے ساتھیوں کی

ہجرت کی اور اس کے ہاتھوں خدائے رب العالمین کے سامنے سر اطاعت تسلیم کیا۔ میں نے آپ ﷺ کی خدمت میں اپنے بیٹے ارہا ابن اصحم کو بھیجا ہے، کیوں کہ اپنی ذات کے سوا کسی کا مالک نہیں۔ اگر آپ ﷺ چاہیں تو میں آپ ﷺ کے پاس آؤں گا، کیوں کہ میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ جو فرماتے ہیں، حق ہے۔"

حضور ﷺ کے مدینہ ہجرت کرنے کی خبر حبشہ پہنچی تو مہاجرین میں سے 33 مرد اور آٹھ خواتین مدینہ روانہ ہو گئے، جن میں 24 صحابہ کو غزوہ بدر میں شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ غزوہ خیبر 6 ہجری کے آخر میں رسول اکرم ﷺ نے حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ کو نجاشی کے پاس بھیجا کہ جو اصحاب حبشہ میں رہ گئے ہیں، انھیں مدینے بھیج دے۔ نجاشی نے دو کشتیوں میں انھیں روانہ کیا۔ یہ حضرات فتح خیبر کے دن پہنچے۔ ان میں حضرت جعفرؓ بھی تھے۔ رسول اکرم ﷺ ان سے چمٹ گئے اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ فرمایا: "مجھے نہیں معلوم کہ آج فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفرؓ کی آمد کی۔"

ہجرت حبشہ کی جو تفصیلی اوپر بیان ہوئی ہے، اس سے بعض اہم اسباق و نتائج سامنے آتے ہیں، جن کی طرف سید جلال الدین عمری، مدیر سہ ماہی "تحقیقات اسلامی" علی گڑھ نے اپنے ایک مقالے میں توجہ دلائی ہے۔ یہ مقالہ ماہنامہ "ترجمان القرآن" شمارہ جولائی 2001ء میں شائع ہوا ہے۔ سید عمری حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

1۔ خصوصی حالات میں ہجرت

حبشہ ہجرت کرنے کی صحابہ کرامؓ کو اس وقت اجازت دی گئی، جب کہ مکہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہو گئی، دین پر قائم رہنا دشوار سے دشوار تر ہو گیا، اور دعوت کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جس ملک میں رہتے ہیں، وہاں دین پر عمل کی اگر آزادی ہے، دعوت کے مواقع حاصل ہیں اور اس کی راہیں کھلی ہیں تو اس ملک کو چھوڑنے یا اس سے ہجرت کا جواز ان کے لیے نہیں ہے۔ ان کی دینی ذمہ داری ہے کہ وہ وہیں قیام کریں اور دین پر عمل کرتے ہوئے اس کی دعوت و تبلیغ اور سربلندی کی جدوجہد جاری رکھیں (تلاش معاش یا کسی دنیوی غرض سے کسی ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہونا یا رہائش اختیار کر لینا ہجرت نہیں ہے)۔

2۔ دین کی محبت کو فوقیت

ہجرت کرنے والوں نے انتہائی بے بسی اور مجبوری کی حالت میں اپنا وطن چھوڑا، گھر بار چھوڑا اور اپنے خویش و اقارب سے قطع تعلق کیا اور اجنبیت کی زندگی اختیار کی۔ کوئی تن تنہا تھا، کوئی جوان بیوی اور ننھے اور معصوم بچے کے ساتھ تھا، کسی کے پاس سواری تھی، زیادہ تر پیدل تھے۔ تن بہ تقدیر ایک نامعلوم مستقبل کی طرف چل پڑے۔ وہ قدم قدم پر اس بات کا ثبوت فراہم کرتے چلے جا رہے تھے کہ اللہ کا دین ان کے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دے سکتے ہیں۔ اس جذبے نے انھیں دنیا اور آخرت کی کامیابی سے ہم کنار کیا۔

3۔ دارالامن کی طرف

حبشہ ایک غیر اسلامی اور عیسائی سلطنت تھی لیکن وہاں مسلمانوں کو اسلامی عقیدے پر قائم رہنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی آزادی تھی۔ تبلیغ کے مواقع بھی حاصل تھے۔ اس پہلو سے وہ مہاجرین کے لیے دارالامن بن گیا۔ اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر کسی ملک میں اسلام قائم رہنا دشوار ہو جائے اور کوئی دارالسلام، جہاں مسلمان ہجرت کر سکے، موجود نہ ہو، تو وہ کسی غیر اسلامی ملک میں جہاں دین پر عمل اور اس کی دعوت و تبلیغ کی آزادی حاصل ہو، ہجرت کر سکتا ہے۔

4۔ حلیف غیر مسلم سے ہمدردی

نجاشی کا ایک حریف، سلطنت کا دعوے دار بن کر اس کے خلاف کھڑا ہوا۔ دونوں کے درمیان معرکہ آرائی کی نوبت آگئی، اس میں مسلمانوں کی ہمدردی نجاشی کے ساتھ تھی، اس لیے کہ نجاشی عدل و انصاف کا علم بردار تھا۔ ظلم و زیادتی کو صحیح نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے مملکت میں یہ اعلان کر رکھا تھا کہ کسی شخص کو مسلمان پر دست درازی کی اجازت نہ ہوگی ورنہ اس پر جرمانہ عائد ہوگا۔ اس طرح نجاشی نے ان کے دین اور ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے لیے تحفظ فراہم کیا تھا۔ اس کے حریف کے بارے میں یہ بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی تھی کہ وہ اسی طرح کا رویہ اختیار کرے گا۔ اس لیے مسلمانوں کی ہمدردی نجاشی کو حاصل تھی اور وہ اس کی کامیابی کے آرزومند تھے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو مسلمان کسی غیر اسلامی سلطنت میں رہتے ہیں انھیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کس فرد یا گروہ کا اقتدار اسلام کے لیے اور خود ان کے لیے بہتر اور مفید ثابت ہوگا اور جو اقتدار بہتر ہو اس کے حق میں ان کی ہمدردی ہونی چاہیے۔

5۔ دعوت و تبلیغ کا نیا چیلنج

دعوت و تبلیغ کے معاملے میں ہجرتِ حبشہ ایک نیا تجربہ تھا۔ مکہ میں مشرکین سے سابقہ تھا۔ وہاں شرک کی نامعقولیت واضح کی جا رہی تھی اور توحید کے دلائل دیے جا رہے تھے۔ حبشہ میں مسلمان ایک نئی صورت حال سے دوچار تھے۔ اس عیسائی مملکت میں چاروں طرف عیسائیت کا چرچا تھا اور مسیحی عقائد زیر بحث تھے۔ ہجرت حبشہ سے پہلے مکہ میں سورۂ مریم نازل ہو چکی تھی جس میں حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صحیح حیثیت واضح کی جا چکی تھی۔ ان کی تعلیمات بھی تفصیل سے بیان ہوئی تھیں۔ سورۂ کہف میں ابن اللہ کے تصور کی تردید اور عیسائی تاریخ کے بعض واقعات، توحید کی دعوت اور اس پر استقامت کا ذکر تھا۔ اس طرح مہاجرین اس نئی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے پہلے سے علمی اور فکری طور پر تیار تھے۔ نجاشی کے دربار میں اس سے فائدہ اٹھایا اور اس کے مطالبے پر قرآن کی تعلیمات قرآن ہی کے الفاظ میں پیش کیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس دور میں اور جس ماحول میں جو علمی و فکری سوالات ابھریں اسلام کی دعوت کے لیے ان کا جواب فراہم کرنا ضروری ہے، ورنہ اسلام کی حقانیت ثابت نہ کی جا سکے گی اور دعوت کا حق ادا نہ ہوگا۔

6۔ حکمران کا قبول اسلام

نجاشی اپنے دربار میں اعیانِ سلطنت اور مذہبی راہ نماؤں کے ساتھ موجود تھا۔ وہ

سب اسلام سے بے خبر اور عیسائیت کے ماننے والے اور اس کے علم بردار تھے۔ ان کے درمیان حضرت جعفرؓ نے ایمانی جرات کا زبردست ثبوت دیا۔ اسلام کے عقائد، توحید، رسالت ﷺ اور آخرت کے تصور اور اس کے اخلاقیات کی وضاحت کی اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اسلام کے عقیدے کو بے کم و کاست پیش کیا۔ اس طرح یہ ثابت کر دیا کہ نازک سے نازک حالات میں بھی دین کی ترجمانی اور اس کی تعبیر و تشریح میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، حالات اور ماحول کے زیر اثر اسلام کی ناقص اور نامکمل ترجمانی کی اجازت نہیں ہے۔ ان حضرات کا عزم و حوصلہ اور ایمانی جذبہ قیامت تک داعیان دین کے لیے نمونہ ہے۔

7- حکمران کا قبول اسلام

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نجاشی اسلام لے آئے تھے۔ متعدد واقعات سے ان کا اسلام پر ایمان و یقین، اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی کا ثبوت ملتا ہے۔ انھوں نے حضرت جعفرؓ کی تقریر سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں اپنے دربار میں کہا کہ یہی وہ آخری پیغمبر ہیں جن کی بشارت انجیل میں دی گئی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں آپ ﷺ کی تعلیمات بالکل صحیح ہیں آپ ﷺ سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے موقع ہوتا تو میں آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچتا اور آپ ﷺ کے پیر دھوتا، لیکن مملکت پر ان کا اتنا مضبوط کنٹرول نہیں تھا کہ وہ کھل کر اسلام کا اظہار کرتے۔ حبشہ کے عوام اسے برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چناں چہ جب وہاں لوگوں کو یہ محسوس ہوا کہ ان کا عقیدہ بدل گیا ہے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اس صورت حال کے پیش نظر نجاشی نے حضرت جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلایا۔ ان کے لیے کشتیوں کا انتظام کیا اور کہا کہ آپ حضرات ان کشتیوں پر سفر کے لیے تیار رہیں۔ اگر مجھے شکست ہو جائے تو جہاں چاہیں چلے جائیں۔ لیکن اگر مجھے فتح حاصل ہو تو حسب سابق یہیں قیام کریں۔ پھر ایک تحریر لکھی جس میں کلمہ شہادت "اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمدا عبدہ و رسولہ" تھا اور یہ بھی تھا کہ نجاشی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ابن مریم اللہ کے بندے، اس کے رسول اور اس کی روح تھے اور اس کا کلمہ تھے، جسے اس نے مریم کے اندر پھونکا تھا۔ اس تحریر کو نجاشی نے اپنی عبا کے نیچے دائیں جانب رکھ چھوڑا۔ اس کے بعد حبشہ کے باغی گروہ کے پاس پہنچا۔ وہ اس کے مقابلے کے لیے صف باندھے تیار تھے۔ ان سے کہا: کیا میں اس ملک پر حکومت کا سب سے زیادہ مستحق نہیں ہوں؟ لوگوں نے جواب دیا: ہاں، آپ ہی اس کے مستحق ہیں۔ نجاشی نے سوال کیا کہ تم نے میرا اخلاق اور میری سیرت کیسی دیکھی؟ لوگوں نے جواب دیا: آپ بہتر سیرت کے مالک ہیں، لیکن آپ نے ہمارا دین ترک کر دیا ہے اور یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اللہ کے بندے تھے۔ نجاشی نے ان سے سوال کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم ابن اللہ سمجھتے ہیں۔ اس پر نجاشی نے عبا کے اوپر سے سینے پر ہاتھ رکھا اور کہا: عیسیٰؑ ابن مریم اس سے زیادہ کچھ نہ تھے۔ (نجاشی کی مراد اس تحریر سے تھی جو ان کی عبا کے نیچے تھے لیکن مجمع نے سمجھا کہ وہ ان کے خیال کی تائید کر رہے ہیں)۔ وہ خوش مطمئن ہو گئے اور بغاوت ٹل گئی۔ نبی ﷺ تک بھی یہ بات پہنچی تھی۔

8- باحیثیت افراد کی مجبوریاں

اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ ایک عام آدمی ہی نہیں، صاحب حیثیت اور بااقتدار فرد بھی ایسے حالات میں گھر سکتا ہے کہ وہ اپنے ایمان کا اعلان اور اظہار نہ کر سکے۔ شریعت پر نجاشی کس حد تک عمل کر رہے تھے، اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ شریعت پر کھل کر عمل کرنا شاید ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اتنی بات طے ہے کہ وہ حج، ہجرت اور جہاد جیسے احکام پر عمل نہیں کر سکے اور اپنی مملکت میں اسلامی احکام بھی نافذ نہ کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود کفر و شرک کے ماحول میں اسلام اور مسلمانوں سے ان کی ہمدردی جاری رہی۔ مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دی۔ ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا۔ ان کی ہر طرح حفاظت کی، رسول اللہ ﷺ کے فرمان پر حضرت ام حبیبہؓ کا آپ سے نکاح کیا اور بڑے اہتمام سے رخصت کیا۔

حضرت جعفرؓ کا قافلہ جب روانہ ہونے لگا تو کشتیاں فراہم کیں، سفر کا انتظام کیا اور پورے ساز و سامان کے ساتھ روانہ کیا اور کہا رسول اللہ ﷺ کو میرے رویے کی اطلاع دیں، یہ میرا ایک ساتھی (عزیز) آپ حضرات کے ساتھ رسول ﷺ کی خدمت میں جا رہا ہے۔ کلمۂ شہادت پڑھا اور کہا کہ آپ حضرات حضور ﷺ سے درخواست کریں کہ وہ میری مغفرت کی دعا فرمائیں۔ خیبر پہنچنے پر نجاشی کے روانہ کردہ شخص نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ حضرت جعفرؓ یہاں موجود ہیں، آپ ﷺ ان سے دریافت فرمائیں کہ نجاشی کا رویہ ان کے ساتھ کیسا تھا اور ان کا عقیدہ کیا تھا۔ حضرت جعفرؓ نے تفصیل بتائی اور کہا کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں آپ ﷺ سے دعا کی درخواست کی ہے۔ آپ ﷺ نے وضو کیا اور تین مرتبہ فرمایا: اے اللہ! نجاشی کی مغفرت فرما۔ اس پر مسلمانوں نے آمین کہا۔

نجاشی کا 9 ہجری میں انتقال ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے مدینہ میں منادی کرائی کہ حبشہ کے ایک صالح بندے کا انتقال ہو گیا ہے۔ لوگو، چلو اس کی نماز جنازہ پڑھو، اس کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں: تمھارے بھائی اصحمہ (نجاشی کا نام) کا انتقال ہو گیا ہے، اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ چناں چہ آپ ﷺ لوگوں کو لے کر عیدگاہ تشریف لے گئے اور نماز پڑھی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے نجاشی کی نماز جنازہ اس لیے پڑھی کہ حبشہ میں ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی گئی تھی۔ ان کے قریب ایسے لوگ نہیں تھے جو اسلام پر ایمان رکھتے اور نماز جنازہ پڑھتے ہوں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نجاشی کس طرح کے ماحول میں گھرے ہوئے تھے۔ اس طرح کے حالات اور ماحول میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے انھوں

جو کچھ کیا شاید اس سے زیادہ وہ نہیں کر سکتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان مجبوریوں اور معذوریوں کے ساتھ ان کے ایمان اور خلوص کی تصدیق فرمائی۔ ان کی نماز جنازہ پڑھی اور مغفرت کی دعا فرمائی۔ ان کی کام یابی کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔

قریش کا مزید جبر و تشدد

ہجرتِ حبشہ کے بعد مکہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بہت کم لوگ باقی رہ گئے تھے، جن میں چند خواتین بھی تھیں۔ کفار پر اس وقت ایک تو ہجرت کی جھنجھلاہٹ طاری تھی، اور اس پر مزید غصے کا اضافہ اس بات سے ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کو حبشہ میں اچھی پناہ گاہ مل گئی تھی، اور مشرکین کا وفد وہاں سے ناکام و نامراد واپس آیا تھا۔ اس حالت میں وہ خود رسول اکرم ﷺ پر بھی دست درازیاں کرنے لگے۔

ایک روز آپ ﷺ کعبے کے صحن میں نماز پڑھ رہے تھے۔ یکا یک عقبہ بن ابی معیط آگے بڑھا اور اس نے آپ ﷺ کی گردن میں کپڑا ڈال کر اسے بل دینا شروع کر دیا، تاکہ گلا گھونٹ کر آپ ﷺ کو مار ڈالے، مگر عین وقت پر حضرت ابوبکرؓ پہنچ گئے اور انھوں نے دھکا دے کر اسے ہٹا دیا۔ جس وقت حضرت ابوبکرؓ اس ظالم سے کش مکش کر رہے تھے، اس وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے: ''کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے؟''

صحیح بخاری کی دوسری روایت میں یہ ہے کہ مشرکین نے حضور ﷺ کی ڈاڑھی اور سر کے بال نوچ ڈالے اور اکثر بال اکھڑ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ آپ ﷺ کی حمایت کے لیے اٹھے اور وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ ''کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے۔'' حضور اکرم ﷺ نے ان سے کہا: ''چھوڑ دو انھیں اے ابوبکر، قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میں ان کی طرف ذبح کے ساتھ ہی بھیجا گیا ہوں۔'' یہ سن کر لوگ آپ ﷺ کے پاس سے ہٹ گئے۔

عروہ بن زبیر نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے دشمنی کا جو اظہار کرتے تھے، اس میں سے شدید ترین واقعہ آپ نے کیا دیکھا ہے؟ انھوں نے کہا، میں ایک روز قریش کی مجلس میں گیا اور ان کے سردار حجر میں جمع تھے۔ انھوں نے رسول اکرم ﷺ کے بارے میں کہا کہ اس شخص کے معاملے میں ہم نے جتنا صبر کیا ہے، اتنا صبر کرتے ہوئے ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔

اس نے ہماری عقلوں کو حماقت ٹھہرایا۔ ہمارے باپ دادا کی برائی کی۔ ہمارے دین کی عیب جوئی کی اور ہماری جماعت میں تفرقہ ڈال دیا۔ حقیقت میں ہم نے بہت بڑی بات پر صبر کیا۔ دریں اثنا رسول کریم ﷺ نمودار ہوئے۔ چلتے ہوئے آگے بڑھ کر آپ ﷺ نے حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ پھر کعبے کا طواف کرتے ہوئے ان کے پاس سے گزرے۔ انھوں نے حضور ﷺ پر ایک چبھتا ہوا فقرہ کسا اور مَیں نے حضور اکرم ﷺ کے چہرے پر اس کا ناگوار اثر محسوس کیا۔ پھر دوسری مرتبہ آپ ﷺ گزرے۔ انھوں نے پھر آوازہ چست کیا، اور مَیں نے محسوس کیا کہ آپ کو وہ ناگوار گزار ہے۔ تیسری مرتبہ جب آپ ﷺ گزرے اور انھوں نے یہی حرکت کی تو آپ ﷺ رک کر کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ''قریش کے لوگو! سنتے ہو؟ قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں تمھارے پاس ذبح لے کر آیا ہوں۔''

عبداللہ بن عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اس بات پر سارے لوگ خاموش ہو کر رہ گئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ پھر ان میں سے جو سب سے زیادہ بڑھ بڑھ کر بول رہا تھا، اس نے آپ ﷺ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ایسی بات کرنی شروع کر دیں، جو وہ اپنے نزدیک بہتر سے بہتر پا تا تھا، یہاں تک کہ اس نے کہا: ''اے ابوالقاسم، اچھی طرح گزر جاؤ۔ خدا کی قسم، تم تو کبھی نادان نہ تھے۔'' چناں چہ حضور ﷺ وہاں سے پلٹ گئے۔

عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں: ''دوسرے روز پھر یہ لوگ حجر میں جمع ہوئے اور میں ان کے ساتھ تھا۔ انھوں نے آپس میں کہا: ''کچھ یاد ہے کہ یہ شخص تمھارے معاملے میں کہاں تک بڑھ گیا ہے، حتیٰ کہ اس نے وہ بات تک کھل کر کہہ دی جو کل کہی تھی اور پھر تم نے اسے چھوڑ دیا۔'' اتنے میں حضور ﷺ سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے۔ آپ ﷺ کے آتے ہی سب یک بارگی آپ ﷺ پر جھپٹے اور آپ ﷺ کو گھیر کر کہنے لگے: ''تم ہی ہو جو یہ اور یہ کہتے ہو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں میں ہی ہوں، جو یہ کہتا ہوں۔'' اتنے میں مَیں نے دیکھا کہ ان میں سے ایک شخص نے آپ ﷺ کی چادر کو گریبان سے پکڑ کر مٹھی میں لے لیا۔ اس پر ابوبکرؓ آپ ﷺ کی حمایت کے لیے اٹھے۔ وہ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: ''کیا تم ایک شخص کو صرف اس قصور میں مارے ڈالتے ہو کہ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے؟'' اس کے بعد لوگ آپ ﷺ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ہے شدید ترین معاملہ جو مَیں نے قریش کو رسول اللہ کے ساتھ کرتے دیکھا ہے۔''

حضرت امیر حمزہؓ کا اسلام لانا

اسی زمانے میں ایک روز ایسا واقعہ پیش آ گیا جس نے حضرت حمزہؓ کو اسلام کے دائرے میں داخل کر دیا۔ حضرت حمزہؓ رشتے میں رسول اکرم ﷺ کے چچا تھے۔ مگر عمر میں صرف دو تین سال بڑے تھے۔ حضرت حمزہؓ اور حضور ﷺ دونوں نے چوں کہ ثوبیہ کا دودھ پیا تھا، اس لیے رضاعی بھائی بھی تھے۔ حضرت حمزہؓ حضور ﷺ سے بے انتہا محبت کرتے تھے، اور ابھی اسلام قبول نہ کرنے کے باوجود حضور ﷺ کی ہر بات کو پسند کرتے تھے۔ حضرت حمزہؓ کا مذاق طبیعت سپہ گری تھا۔ شکار کے شوقین تھے۔ ان کا معمول تھا کہ صبح سویرے تیر کمان لے کر شکار کو نکل جاتے اور پورا پورا دن اسی شغل میں گزار دیتے۔ شام کو جب واپس آتے تو پہلے حرم میں جاتے اور طواف کرتے۔ قریش کے اشراف اور رؤسا اکثر حرم کے صحن میں اپنی مجالس الگ الگ جما کر بیٹھتے۔ حضرت حمزہؓ کو ان سے صاحب سلامت تھی، اس لیے سب لوگ آپ کی بہت قدر کرتے۔

کفار جس بے رحمی سے حضور ﷺ کے ساتھ پیش آتے تھے، بیگانوں سے بھی نہ دیکھا جاتا تھا۔ یہ نبوت کے چھٹے سال کا ذکر ہے کہ ایک روز حضور ﷺ کو ابوجہل نے بے تحاشا گالیاں دیں اور آپ ﷺ کی اور آپ کے لائے ہوئے دین کی شان میں بہت بُرے الفاظ استعمال کیے، مگر آپ ﷺ نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ آپ ﷺ کی خاموشی سے ابوجہل کے غصے کا پارا اور چڑھ گیا۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر حضور ﷺ کے سر پر دے مارا، جس سے آپ ﷺ زخمی ہو گئے اور خون بہنے لگا۔

حضرت حمزہؓ تیر کمان لیے ہوئے واپس آ رہے تھے کہ یہ قصہ سنا۔ غصے میں بھرے ہوئے حرم پہنچے، جہاں ابوجہل بیٹھا ہوا تھا اور جاتے ہی کمان اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ پھر کہا: ''تو انھیں گالیاں دیتا ہے! میں بھی ان کے دین پر ہوں اور وہی کہتا ہوں جو وہ کہتے ہیں۔ تجھ میں ہمت ہے تو وہی گالیاں ذرا مجھے دے کر دیکھ۔'' اس پر بنی مخزوم کے کچھ لوگ ابوجہل کی حمایت کے لیے اٹھے، مگر اس نے کہا: ''ابوعمارہ کو چھوڑ دو۔ میں نے واقعی ان کے بھتیجے کو بُری طرح گالیاں دی تھیں۔''

حضرت حمزہؓ حمیت میں آ کر یہ کام کر تو گئے، مگر جب اپنے گھر پہنچے تو دل میں کہا: ''تو قریش کا سردار ہے۔ دین سے پھرے ہوئے اس شخص کا پیرو بن گیا اور اپنے آبائی دین کو چھوڑ گیا۔ تیرے لیے موت اس کام سے بہتر ہے جو تو نے کیا ہے۔'' لیکن کچھ سوچ کر حضور ﷺ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا: ''بھتیجے، میں ایک ایسے معاملے میں پڑ گیا ہوں، جس سے نکلنے کی کوئی صورت مجھے نظر نہیں آتی، اور مجھ جیسے آدمی کا کسی ایسی چیز پر قائم رہنا، جس کے متعلق میں نہیں جانتا کہ وہ راستی ہے یا گمراہی، ایک شدید بات ہے۔''

حضور ﷺ نے ان کی بات سن کر انھیں نصیحت کی۔ خدا کا خوف دلایا اور اسلام کی دعوت دی۔ حضرت حمزہؓ نے اسی وقت کلمۂ شہادت پڑھا اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔

حضرت عمرؓ کا اسلام لانا

چند روز کے بعد دوسری اور زیادہ زبردست چوٹ قریش کو یہ لگی کہ یکایک انھیں معلوم ہوا کہ عمر بن خطاب بھی آپ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ وہ اسلام کی مخالفت میں قریش کے ایک اہم ستون تھے۔ اسلام قبول کرنے والوں پر ظلم وستم کرنے میں پیش پیش تھے۔ قریش میں انھیں بڑی اہم حیثیت حاصل تھی۔ عرب کے انساب کے علم میں ان کی شہرت تھی۔ قریش کی طرف سے سفارت کے منصب پر بھی وہ بھیجے جاتے تھے۔ قبائل کے درمیان منافرت اور عداوت کی نوبت آتی تو انھیں حَکَم بنایا جاتا اور ان کا فیصلہ تسلیم کیا جاتا۔ قریش سے کوئی مفاخرت کرتا تو انھی کو جواب دینے کے لیے بھیجا جاتا۔ بہادر تھے، طاقت ور تھے۔ شہسوار تھے۔ زبان آور تھے اور ان کی قوت بیان کا لوہا مانا جاتا تھا۔ قریش کو یہ تصور بھی نہ تھا کہ ان جیسا آدمی بھی ایک روز ان کے مقابلے میں اسلام کی علم برداری کے لیے کھڑا ہوگا، لیکن ایک تدریجی عمل ان کے اندر ایسا ہو رہا تھا جو بالآخر انھیں اسلام کی طرف کھینچ لے گیا۔

بعثت نبوی ﷺ کے وقت حضرت عمرؓ ستائیس سال کے تھے۔ حضرت عمرؓ کے گھرانے میں حضرت زیدؓ سب سے پہلے ایمان لائے۔ پھر ان کے بیٹے سعیدؓ نے اسلام قبول کیا۔ جب حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ کا نکاح سعید بن زیدؓ سے ہوا تو وہ بھی مسلمان ہو گئیں۔ اسی خاندان کے ایک اور معزز شخص نعیم بن عبداللہؓ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس وجہ سے اگرچہ حضرت عمرؓ کے گھرانے میں توحید کی آواز نامانوس نہیں تھی۔ تاہم حضرت عمرؓ نبوت کے چھٹے سال تک اسلام سے بیگانہ رہے۔

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا واقعہ بڑا دل چسپ اور ڈرامائی ہے۔ جب ابوجہل نے اعلان کیا کہ جو شخص محمد ﷺ کو قتل کرے گا، اس کے لیے میں ایک سو اونٹ کفیل اور ضامن ہوں تو حضرت عمر ابوجہل کے پاس پہنچے اور اعلان کے متعلق دریافت کیا۔ ابوجہل نے اپنے اعلان کی تصدیق کی۔ یہ سن کر آپ ننگی تلوار لے کر حضور ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں آپ کی ملاقات نعیمؓ بن عبداللہ سے ہوئی۔ اس نے پوچھا: ''دوپہر کے وقت اس طرح گھر سے نکلنے کا مطلب؟''

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''محمد ﷺ کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔''

نعیمؓ نے کہا: ''محمد ﷺ کو قتل کرنے سے پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ تمھاری بہن فاطمہؓ اور بہنوئی سعیدؓ تمھارا دین چھوڑ کر اسلام قبول کر چکے ہیں۔''

نعیمؓ کی زبان سے اپنی بہن اور بہنوئی کے قبول اسلام کا ذکر سن کر عمر بن خطاب غصے سے آگ بگولہ ہو گئے اور سیدھے بہن کے گھر پہنچے۔ وہاں حضرت خباب بن ارتؓ موجود تھے اور ان کے پاس ایک صحیفہ تھا، جس میں سورۂ طٰہٰ لکھی ہوئی تھی۔

وہ عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کو قرآن پڑھا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی آواز سن کر چھپ گئے۔

حضرت عمرؓ نے گھر میں داخل ہوتے ہی اپنی بہن اور بہنوئی سے کہا: ''شاید تم لوگ صابی ہو گئے ہو؟''

یہ سن کر سعیدؓ نے کہا: ''اے عمر، اگر تمھارا دین حق نہ ہو، بلکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا دین حق ہو، تو بتاؤ کیا کرنا چاہیے؟''

یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ سعیدؓ پر پل پڑے۔ فاطمہؓ اپنے شوہر کو بچانے کے لیے آگے بڑھیں، تو حضرت عمرؓ نے انھیں اس قدر مارا کہ ان کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ اس حالت میں بھی بہن نے بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا: ''اے خطاب کے بیٹے! تم سے جو کچھ ہو سکتا ہے، کر گزرو۔ ہم تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ اے اللہ کے دشمن، تو ہمیں محض اس لیے مارتا ہے کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ خوب سمجھ لے کہ ہم اسلام لا چکے ہیں، اگرچہ تیری ناک خاک آلود ہو۔''

حضرت عمرؓ بہن کی زبان سے اس شیفتگی اور والہانہ پن کے ساتھ اسلام کا ذکر سن کر نادم ہوئے۔ پھر کہنے لگے: ''اچھا وہ کتاب مجھے بھی سناؤ جو تم پڑھ رہے تھے۔''

بہن نے کہا: ''تو ناپاک ہے، اور قرآن کو پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔ جا، غسل کر کے آؤ۔''

چناں چہ حضرت عمرؓ نے غسل کرنے کے بعد وہ صحیفہ ہاتھ میں لیا اور سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کرنے لگے۔ جب اس آیت کریمہ پر پہنچے:

﴿اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ﴾ (طٰہٰ: 14)

"میں ہی معبود ہوں۔ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں پس میری عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔"

تو حضرت عمرؓ کلام الٰہی کے اثر سے اس درجہ مسحور ہوئے کہ بے ساختہ بول اٹھے "کیا ہی اچھا اور بڑا کلام ہے۔"

حضرت خباب ابن ارت ان کی یہ بات سن کر باہر نکل آئے اور کہا: "اے عمر، مجھے امید ہے کہ اللہ نے تمھیں اپنے نبی کی دعا کا مصداق بننے کے لیے چن لیا ہے۔ میں نے کل ہی رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ خدایا، ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) یا عمر بن خطاب کے ذریعے سے اسلام کی تائید فرما۔ پس اے عمر، اللہ کی طرف آؤ۔ اللہ کی طرف آؤ۔"

حضرت عمرؓ نے کہا: "مجھے محمد ﷺ کے پاس لے چلو، تاکہ میں مسلمان ہو جاؤں۔" حضرت خباب نے کہا: "وہ صفا کے قریب ایک مکان (دارارقم) میں اپنے اصحاب کے ساتھ ہیں۔"

چناں چہ حضرت خباب آپ کو دارارقم کی طرف لے چلے، جہاں حضور ﷺ اور بعض صحابہ کرامؓ جمع تھے۔ دروازہ بند تھا۔ حضرت عمرؓ نے دستک دی اور اندر آنے کی اجازت چاہی، مگر یہ معلوم کر کے کہ حضرت عمرؓ اندر آنا چاہتے ہیں، کسی کو دروازہ کھولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

آخر حضرت حمزہؓ نے جرات کرتے ہوئے فرمایا: "دروازہ کھول دو۔ اور عمر کو اندر آنے دو، اگر اللہ نے عمرؓ کے ساتھ بھلائی اور خیر کا ارادہ فرمایا ہے تو اللہ اسے ہدایت دے گا۔ ورنہ عمرؓ کو ٹھکانے لگانا ہمارے لیے کچھ دشوار نہیں، اور اسی کی تلوار سے اسے قتل کر دیں گے۔"

حضور ﷺ نے بھی مسکراتے ہوئے دروازہ کھولنے کی اجازت فرمائی۔ چناں چہ دروازہ کھول دیا گیا۔ حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ کا کرتا پکڑ کر کھینچا اور فرمایا: "اے خطاب کے بیٹے، اسلام لا۔"

اور پھر حضرت عمرؓ کے حق میں دعا فرمائی: "اے اللہ، یہ عمر بن خطاب حاضر ہے۔ اے اللہ، اس سے اپنے دین کو عزت دے۔"

پھر حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: "اے عمر، کیا تو اس وقت تک باز نہیں آئے گا، جب تک خدائے عزوجل تجھ پر کوئی رسوا کن عذاب نازل نہ فرمائے۔"

حضرت عمرؓ نے دربار رسالت میں عرض کیا: "یا رسول اللہ، میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ ایمان لاؤں، اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر، اور جو کچھ اللہ کے پاس سے نازل ہوا" اور پھر کلمہ شہادت پڑھا:

"اشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وانك رسول اللّٰہ۔"

حضرت عمرؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے ساتھ ہی دین کی عزت اور اسلام کا ظہور اور غلبہ شروع ہو گیا۔ علی الاعلان حرم میں نمازیں پڑھی جانے لگیں۔ اور علانیہ اسلام کی دعوت و تبلیغ شروع ہو گئی۔ اسی روز سے حق و باطل میں نمایاں فرق ظاہر ہونے لگا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ کو "فاروق" کا لقب عطا فرمایا یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والا۔

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا اصلی اور حقیقی سبب تو رسول کریم ﷺ کی دعا ہے۔ حضور ﷺ نے اللہ کی بارگاہ میں دعا مانگی تھی: "اے اللہ! ابوجہل اور عمر بن خطاب میں سے جو تیرے نزدیک زیادہ محبوب ہو، اسلام کی نعمت سے بہرہ ور فرما اور اس سے اسلام کو عزت بخش۔"

شعب ابی طالب میں محصوری

ایک طرف تو حبشہ سے قریش مکہ کی سفارت کے ناکام لوٹنے، مسلمانوں کے ساتھ نجاشی کے بہترین سلوک، اور حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے کے ساتھ ہی کفار کا زور ٹوٹنے لگا تھا، اور دوسری طرف حضور اکرم ﷺ کی تبلیغی مساعی سے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور قبائل میں بھی اسلام پھیلتا جا رہا تھا۔ اس صورت حال نے قریش کو نئے سرے سے حالات کا جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اسلام کی روز افزوں مقبولیت اور اثر انگیزی کو موثر طریقے سے روکنا ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔

چناں چہ قریش مکہ کا ایک اجلاس ہوا اور بڑی سوچ بچار اور صلاح مشورے کے بعد اتفاق رائے سے ایک دستاویز لکھی گئی جس میں حلفیہ طور پر یہ عہد کیا گیا تھا کہ جب تک بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب آپ ﷺ کو ان کے حوالے نہ کر دیں، اس وقت تک ان سے میل جول، شادی بیاہ، بول چال اور خرید و فروخت کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے گا۔ قریش کے تمام خاندانوں کے سربراہوں نے اس دستاویز کی توثیق کی اور اسے خانہ کعبہ میں آویزاں کر دیا گیا۔ اس دستاویز کی کتابت بغیض بن عامر بن ہاشم نے کی تھی۔

جب ابوطالب کو معلوم ہوا کہ قریش کے لوگ محمد ﷺ کی جان کے درپے ہیں تو انھوں نے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کو بلایا اور ان سے کہا کہ محمد ﷺ کو ساتھ لے کر سب کے سب شعب ابی طالب میں جمع ہو جائیں اور آخر وقت تک محمد ﷺ کی حفاظت کریں۔ اس تجویز کو دونوں خاندانوں نے قبول کیا۔ مسلمانوں نے دین کی وجہ سے اور کفار نے خاندانی اور نسبتی تعلق کی بنا پر۔ شعب کے معنی گھاٹی کے ہیں۔ شعب ابی طالب کوہ ابوقبیس کی گھاٹیوں میں سے ایک تھی جس میں ابوطالب رہتے تھے۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ اب اس کا موجودہ نام شعب علی ہے اور اسے سوق اللیل بھی کہا جاتا ہے۔ جناب غلام دستگیر نامی اپنی تالیف "تاریخ مکہ" میں لکھتے ہیں: "اب شعب ابی طالب مکہ کے بازار "سوق اللیل" کے مقابل ایک بستی ہے جو اطراف کی تین گھاٹیوں کے درمیان ہے۔ اسے محلہ ہاشمی بھی کہتے ہیں۔ مولد النبی ﷺ، مولد

علیؓ اور دار خدیجہ اس شعب میں واقع تھے، جہاں اب بھی ان کے آثار ملتے ہیں۔ آج کل اسے شعب علیؓ یا شعب بنی ہاشم کہا جاتا ہے۔''

مسلمانوں نے محصوری کے ان تین برسوں میں کیکر کے پتے کھا کھا کر گزر اوقات کی۔ سعدؓ بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ میں بھوکا تھا۔ اتفاق سے رات کے وقت میرا پاؤں کسی چیز پر پڑا۔ میں فوراً اسے زبان پر رکھ کر نگل گیا۔ یہ مجھے اب تک معلوم نہیں کہ وہ کیا چیز تھی۔ اسی طرح ایک رات اونٹ کی کھال کا سوکھا ہوا چمڑا سعدؓ بن ابی وقاص کو کہیں راستے میں پڑا ہوا ملا۔ آپ ﷺ نے پانی سے دھو کر اسے جلایا۔ پھر سفوف بنا کر پانی کے ساتھ کھا کر تین راتیں بسر کیں۔

قریش کا معاشرتی و اقتصادی مقاطعہ (بائیکاٹ) اتنا شدید تھا کہ قریش نے اجناس خوردنی کا جانا بھی بند کر دیا تھا۔ جب کوئی تجارتی قافلہ مکہ آتا تو ابولہب اٹھتا اور یہ اعلان کرتا پھرتا کہ کوئی تاجر اصحاب رسول ﷺ کو کوئی چیز عام نرخوں پر فروخت نہ کرے، بلکہ قیمت اتنی بڑھا کر بتائی جائے کہ وہ چیز ان لوگوں کی قیمت خرید سے باہر ہو جائے۔ صحابہؓ جب کوئی ضرورت کی چیز خریدنے کے لیے آتے تو نرخ کی گرانی کا یہ عالم دیکھ کر خالی ہاتھ واپس چلے جاتے۔

قریش میں سے بعض لوگوں کا اپنے عزیزوں کے اس حال کو دیکھ کر دل دکھتا تھا۔ وہ پوشیدہ طور پر ان کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان بھیج دیتے۔ اس زمانے میں حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام اور ہشام بن عمرو العامری چوری چھپے صلہ رحمی کا حق ادا کرتے رہے۔ ایک مرتبہ حکیم بن حزام اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کے لیے کچھ غلہ لے کر جا رہے تھے کہ ابوجہل نے راستہ روک لیا اور کہا: ''تم بنی ہاشم کے لیے خوراک کا سامان لے جا رہے ہو، اچھا میں تمھیں نہیں چھوڑوں گا، جب تک مکہ بھر میں تمھیں رسوا نہ کر دوں۔ اتنے میں ابوالبختری بن ہشام، جو حضرت خدیجہؓ کا قریبی رشتہ دار تھا، وہاں پہنچا اور اس نے پوچھا ''معاملہ کیا ہے؟''

ابوجہل نے کہا: ''یہ بنی ہاشم کے لیے غلہ لے جا رہا ہے۔'' ابوالبختری بولا: ''چھوڑ دے اسے یہ اس کی پھوپھی کا غلہ ہے جو وہ ان کے پاس لے جا رہا ہے۔ کیا تو ان کی اپنی چیز ان کے پاس نہیں لے جانے دے گا؟'' ابوجہل نے انکار کیا۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہو گئی اور ابوالبختری نے اسے بری طرح رگیدا، حتی کہ اونٹ کے جبڑے کی ہڈی اس کے سر پر اس زور سے ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا۔ اس سارے معاملے کو حضرت حمزہؓ دیکھ رہے تھے۔ اس لیے دونوں کافروں نے شرما کر اپنا جھگڑا ختم کر دیا، تاکہ بنی ہاشم اس پر خوش نہ ہوں۔

ہشام بن عمرو بھی خفیہ طریقے سے بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے ساتھ صلہ رحمی کرتا رہتا تھا۔ لیکن اکا دکا امداد سے دونوں بڑے خاندانوں کے افراد کا پیٹ نہ پالا جا سکتا تھا۔ چناں چہ مسلسل تین سال تک انھیں ایسی ہی تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسری طرف اہل مکہ کا یہ حال تھا کہ اس شہر کا کوئی بھی خاندان ایسا نہ تھا جس کی رشتہ داریاں بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب کے ساتھ نہ ہوں، اس لیے ابتداء ہی سے متعدد لوگوں کو اپنے عزیزوں کا یہ مقاطعہ ناگوار گزرتا تھا اور جوں جوں یہ طویل ہوتا گیا، اس کے خلاف جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا، کیوں کہ محصورین پر فاقہ کشی کی نوبت آ گئی تھی۔ ان کے بچوں کے رونے اور بلکنے کی آوازیں آس پاس کے محلوں تک پہنچ رہی تھیں، اور دوسرے خاندانوں میں ان کے رشتہ دار، جو پڑوس ہی میں رہتے تھے، ان آوازوں کو سن سن کر بے تاب ہوئے جاتے تھے۔ تیسرے سال کے اختتام پر بنی عبد مناف، بنی قصی اور دوسرے ان لوگوں نے جن کی شادی بیاہ کے رشتے بنی ہاشم سے تھے، ایک دوسرے کو ملامت کی اور صاف صاف کہنا شروع کر دیا کہ یہ قطع رحمی ہے جو ہم نے کی۔ یہ حرکت کر کے ہم نے خاندانی حقوق کی خلاف ورزی کی ہے۔

سب سے پہلے ہشام بن عمرو العامری اس کام کا بیڑا اٹھایا کہ وہ اس مقاطعہ کا خاتمہ کرا کے چھوڑے گا۔ وہ بنی مخزوم کے رئیس زہیر بن ابی امیہ سے ملا جو عبدالمطلب کے نواسے، حضور ﷺ کی حقیقی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے تھے اور ان سے جا کر کہا: ''اے زہیر، کیا تمھیں یہ بات گوارا ہے کہ تم اپنی خواہش سے جو چاہو کھاؤ، پہنو اور اپنی مرضی کے مطابق شادیاں کرو اور تمھاری ننہیال کے لوگ ایک ایک دانے کو ترسیں۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر معاملہ ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) کا ہوتا اور تم نے اس کی ننہیال کے ساتھ وہ معاملہ کیا ہوتا جو اس نے تمھاری ننہیال کے ساتھ کیا ہے تو وہ ہرگز نہ مانتا۔''

زہیر ابن امیہ نے کہا: ''میں اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہوں، اگر کوئی اور بھی ساتھ دینے والا ہوتا تو میں مقاطعہ کی دستاویز کو پھڑوائے بغیر نہ چھوڑتا۔''

ہشام نے کہا: ''ایک آدمی ساتھ دینے والا تو میں موجود ہوں۔''

زہیر نے کہا: ''ایک اور آدمی تلاش کرو۔''

پھر ہشام بنی نوفل کے سردار مطعم بن عدی کے پاس گئے اور انھیں بھی اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ مطعم نے بھی زہیر کی بیان کردہ مجبوری کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ابوالبختری اور زمعہ بن اسود کو اپنا ہم خیال بنایا۔

پھر یہ پانچوں آدمی رات کے وقت مکہ کے بالائی مقام حجون پر ملے اور آپس میں طے کیا کہ کس طرح مقاطعہ کی دستاویز کو ختم کرنے کی کوشش کریں گے۔ زہیر نے کہا کہ میں بات کا آغاز کروں گا اور تم لوگ میرا ساتھ دینا۔

جب دوسری صبح حسب معمول سب قریش مجلس میں جمع ہوئے تو زہیر بن ابی امیہ اٹھے اور لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے اہل مکہ! یہ کتنے ظلم اور غیرت کی بات ہے کہ ہم تو کھائیں پئیں، اور کپڑے پہنیں اور بیاہ شادی رچائیں، اس حال میں کہ بنی ہاشم ہلاک ہو رہے ہیں۔ نہ ان سے کچھ خریدا جاتا ہے اور نہ ان کے ہاتھ کچھ فروخت کیا جاتا ہے۔ خدا کی قسم، میں ہرگز نہ بیٹھوں گا جب تک اس ظالمانہ مقاطعہ کی دستاویز پھاڑ نہ دی جائے گی۔''

ابوجہل نے پکار کر کہا: ''خدا کی قسم، یہ عہد نامہ کبھی نہیں پھاڑا جائے گا۔''

زمعہ بن اسود اٹھے اور ابوجہل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''واللہ، تم سب

بڑھ کر جھوٹے ہو۔ ہم اس وقت بھی راضی نہ تھے جب یہ دستاویز لکھی گئی تھی۔"

ابوالبختری نے زمعہ کی تائید کی، اور پھر مطعم نے کھڑے ہو کر دونوں کی تائید کی۔

ابوجہل مجلس کا یہ رنگ دیکھ کر حیران رہ گیا اور کہنے لگا: "یہ معاملہ تو پہلے ہی سے طے شدہ معلوم ہوتا ہے۔"

ادھر رسول کریم ﷺ کو اللہ کی طرف سے خبر دی گئی کہ مقاطعے کی دستاویز میں جور وظلم اور قطع رحمی کا جو مضمون لکھا گیا تھا، اس سب کو دیمک چاٹ گئی ہے اور صرف اللہ کا نام باقی رہ گیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس کا ذکر اپنے چچا ابوطالب سے کیا۔ ابوطالب نے پوچھا، اب کیا کرنا چاہیے؟ حضور ﷺ نے کہا: "میری رائے یہ ہے کہ آپ لوگ اپنے بہترین کپڑے پہن کر قریش کی طرف نکلیں اور انھیں یہ بات بتائیں" چناں چہ سب نکلے اور حجر میں گئے جہاں قریش کے دانا اور بڑے لوگ بیٹھا کرتے تھے ان لوگوں کو آتے دیکھ کر سب حاضرین کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں اور وہ سوچنے لگے کہ آخر یہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

ابوطالب نے حضور ﷺ کی یہ خبر قریش مکہ کے سامنے بیان کی اور کہا: "میرے بھتیجے نے آج تک کوئی بات غلط نہیں کہی۔ اب تم وہ دستاویز منگوا کر دیکھو۔ اگر میرے بھتیجے کی بات سچی ہے تو ہمارے ساتھ قطع رحمی سے باز آ جاؤ اور جو کچھ تم نے اس دستاویز میں لکھا تھا اسے ختم کر دو۔ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو میں اسے تمھارے حوالے کر دوں گا۔ پھر تمھیں اختیار ہے چاہے قتل کرو چاہے زندہ رہنے دو۔" انھوں نے کہا، آپ نے یہ انصاف کی بات کہی ہے۔

پھر وہ دستاویز منگوائی گئی۔ کھول کر دیکھا تو واقعی اللہ کے پاک نام کے علاوہ دیگر تمام حروف کو دیمک چاٹ چکی تھی۔ اس پر کفار قریش کی گردنیں شرم وندامت سے جھک گئیں۔

ابوطالب اپنے ساتھیوں کے ہم راہ کعبے کے پردوں کے پیچھے گئے اور بیت اللہ کی دیواروں سے لپٹ کر انھوں نے دعا مانگی کہ: "خدایا، ان لوگوں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما جنھوں نے ہم پر ظلم کیا۔ ہم سے قطع رحمی کی اور وہ کچھ اپنے لیے حلال کر لیا جو ہمارے معاملے میں ان پر حرام تھا۔ دُعا مانگنے کے بعد وہ اپنے ہم راہیوں کے لیے ہوئے اپنی شعب کی طرف روانہ تھا۔ ان کے اٹھتے ہی قریش کے بہت سے لوگوں نے اس ظلم پر سخت ملامت کی جو بنی ہاشم اور بنی عبدالمطلب پر کیا گیا تھا۔

رسول اکرم ﷺ محصوری اور مقاطعے کی حالت میں بھی تبلیغ دعوت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ وحی کا نزول برابر ہوتا رہا۔ قرآن مجید کی جو سورتیں اور آیتیں نازل ہوتیں، وہ مسلمانوں کو سکھا اور لکھا دی جاتیں۔ مقاطعے کے دوران میں حضور ﷺ مکے کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے اسلام مکہ میں پھیل نہ سکا۔ البتہ اطراف وجوانب کی بستیوں میں نکل جاتے اور وہاں صحرا نشینوں، خانہ بدوشوں اور کاروانوں کو اسلام کی دعوت دیتے۔ ذوالمجاز کے میلوں میں لوگوں کو پیغام حق سناتے۔ حج کے موقع پر مختلف قبائل سے ملاقات کر کے انھیں ایمان واسلام کی دعوت دیتے۔

ایسے میں ایک اور شخص جو بھینگا اور دو ٹھوڑی والا (ابولہب) تھا، وہ آپ ﷺ کے پیچھے پیچھے ہوتا اور لوگوں سے کہتا (نعوذ باللہ) یہ شخص جھوٹا ہے، جو اس کی بات مانے لگا، دین سے گم راہ ہو جائے گا۔

محصوری کے زمانے میں حضور ﷺ نے جن قبیلوں کے لوگوں سے ملاقاتیں کیں اور انھیں دعوت حق دی، ان کے نام یہ ہیں: بنی عامر، بنی محارب، بنی حفصہ، بنی فزارہ، بنی غسان، بنی کلب، بنی حارث، بنی کعب، بنی عذرہ، بنی مرہ، بنی حنیفہ، بنی سلیم، بنی عبس، بنی نصر، بنی بکا، بنی کندہ اور بنی خزیمہ۔

محصوری کے ایام میں اللہ تعالیٰ نے وہ سورتیں نازل فرمائیں، جن میں ان تمام لوگوں کو دعوت اسلام دینے کا حکم دیا گیا، جس کے پاس کوئی آسمانی کتاب نہیں اتری شعب سے باہر آنے کے بعد اہل کتاب میں بھی تبلیغ کے احکام نازل ہوئے۔

جناب ابوطالب کی وفات

شعب سے باہر آئے ہوئے بمشکل چھ ماہ ہوئے تھے کہ رمضان المبارک 10 بعثت نبوی (بمطابق 3 قبل ہجری، جنوری فروری 619ء) میں ابوطالب پر بیماری کا حملہ ہوا اور جان کے لالے پڑ گئے۔ ان کے آخری وقت حضور ﷺ آپ کے پاس آئے۔ اس وقت ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ بھی ابوطالب کے پاس موجود تھے۔ حضور ﷺ نے اپنے شفیق چچا سے فرمایا کہ "اے چچا، ایک مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دیجیے تاکہ اللہ کے سامنے آپ کی شفاعت کے لیے حجت ہو۔" یہ سن کر ابوجہل اور عبداللہ ابن امیہ نے کہا: "ابوطالب، کیا تم عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے؟"

یہ سن کر ابوطالب نے قدرے توقف کیا اور پھر کہا: "میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔"

پھر ابوطالب نے حضور ﷺ کی طرف دیکھا اور کہا: "میں وہ کلمہ کہہ دیتا، لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا۔"

یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: "میں آپ کے لیے دعائے مغفرت کرتا رہوں گا، جب تک کہ خدا مجھے ایسا کرنے سے منع نہ فرما دے۔"

ابن سعد نے لکھا ہے کہ مرتے وقت ابوطالب نے قریش کے سرداروں کو وصیت کی کہ دیکھو، اس خانہ کعبہ کی تعظیم ملحوظ رکھنا کہ اسی میں رب کی خوشنودی ہے۔ صلہ رحمی کرنا۔ ایک دوسرے پر زیادتی اور حق ماری نہ کرنا۔ دعوت دینے والوں کی دعوت قبول کرنا۔ سائل کی حاجت روائی کرنا۔ صداقت اور ادائے امانت کے پابند رہنا۔ پھر اسی سلسلے میں انھوں نے کہا "میں تمھیں محمد ﷺ کے بارے میں وصیت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آنا، کیوں کہ وہ قریش میں امین اور تمام عرب میں صادق ترین آدمی ہے، اور وہ ان تمام خوبیوں کا جامع ہے جو میں نے تم سے بیان کی ہیں۔ وہ ایسی بات لایا ہے جسے دل مانتا ہے اور زبان لوگوں کی دشمنی کے خوف سے اس کا انکار کرتی ہے۔ مگر خدا کی قسم، میں گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ عرب کے کنگال اور اطراف ونواح کے لوگ اور کم زور لوگ آگے بڑھ کر اس کی دعوت قبول کر لیں گے۔

اس کے کلمے کی تصدیق کریں گے۔ اس کے کام کو آگے بڑھائیں گے، اور وہ انھیں لے کر خطرات کے میدان میں کود پڑے گا۔ اور قریش کے سردار اور اکابر دم چھلے بن کر رہ جائیں گے۔"

ابن سعد نے لکھا ہے کہ ابوطالب نے مرتے وقت اپنی اولاد کو وصیت کی کہ "تم ہمیشہ بخیر رہو گے، جب تک محمد ﷺ کی بات سنتے رہو گے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے رہو گے۔ لہٰذا اس کا اتباع کرو اور اس کی مدد کرو، راہ راست پر رہو گے۔"

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کی وفات

حضور ﷺ ابھی اپنے شفیق چچا کی رحلت کے غم واندوہ سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ چند روز بعد حضرت خدیجہؓ جیسی غم گسار اور جاں نثار رفیقہ حیات کا بھی انتقال ہو گیا۔ چچا کے فوراً بعد زوجہ کا انتقال جیسے حزن وملال کا باعث ہو سکتا ہے، ویسے ہی اس سال کا نام خود سرور دوعالم ﷺ نے "عام الحزن" رکھا۔

ام المومنین حضرت سودہؓ سے نکاح

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ گھر میں صرف دو کم سن صاحبزادیاں حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ رہ گئی تھیں، جن کی خبر گیری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ آپ ﷺ اس خطرناک زمانے میں فرائضِ رسالت ادا کرنے کے لیے باہر تشریف لے جاتے تو یہ صاحبزادیاں بے سہارا رہ جاتیں۔

ایک روز حضرت عثمان بن مظعونؓ کی بیوی خولہ بنت حکیم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! آپ شادی کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "کس سے کروں؟" انھوں نے کہا، آپ کنواری چاہیں تو وہ بھی موجود ہے۔ بیوہ چاہیں تو وہ بھی حاضر ہے۔ حضورؐ نے پوچھا، کنواری کون؟ انھوں نے کہا، تمام خلق میں جو شخص آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے، اس کی بیٹی یعنی عائشہؓ بنت ابی بکرؓ۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا: "اور بیوہ کون؟" انھوں نے عرض کیا: "سودہؓ بنت زمعہ جو آپ ﷺ پر ایمان لائیں اور جنھوں نے آپ ﷺ کی پیروی کی۔" آپ ﷺ نے فرمایا، دونوں جگہ جا کر بات کرو۔

پہلے خولہ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں گئیں اور ان کی اہلیہ ام رومانؓ سے بات کی۔ اس کے بعد وہ حضرت سودہؓ کے ہاں گئیں اور ان کے والد سے بات کی۔ دونوں جگہوں سے ہاں ہو گئی۔ لیکن پہلے حضرت سودہؓ سے نکاح ہوا اور چند روز کے بعد حضرت عائشہؓ سے ہوا۔ حضرت سودہؓ کو یہ عظمت حاصل ہے کہ آپ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد سب سے پہلے آنحضور ﷺ کے عقد میں آئیں۔ وہ ابتدائے نبوت ہی میں مشرف بہ اسلام ہو چکی تھیں۔ آپ کی شادی پہلے حضرت سکرانؓ بن عمرو سے ہوئی تھی۔ آپ انھی کے ساتھ داخل اسلام ہوئی تھیں۔ جب حضرت سکرانؓ بن عمرو نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو آپ ان کے ساتھ تھیں۔ حبشہ سے مکہ کو واپسی کے چند دن بعد حضرت سکرانؓ نے وفات پائی، اور ایک لڑکا جس کا نام عبدالرحمٰن تھا، یادگار چھوڑا۔

حضور ﷺ کے ایما پر خولہؓ نے حضرت سودہؓ کے والد کو جا کر حضور ﷺ کے نکاح کا پیغام دیا، جسے حضرت سودہ ور ان کے والد نے قبول کر لیا۔ چناں چہ حضور ﷺ خود تشریف لے گئے۔ حضرت سودہؓ کے والد نے نکاح پڑھایا اور چار سو درہم مہر قرار پایا۔ نکاح آخر رمضان المبارک سن دس نبوی (جنوری، فروری 619ء) میں ہوا۔

کچھ عرصہ کے بعد حضرت سودہؓ کا بھائی عبد بن زمعہ حج کر کے آیا تو یہ سن کر کہ اس کی بہن کی شادی حضور ﷺ سے ہو گئی ہے، اس نے اپنے سر پر خاک ڈال لی کہ کیا غضب ہو گیا۔ اس وقت وہ کافر تھے۔ پھر جب عبد خود مسلمان ہو گئے تو اپنے اس عمل پر انھیں ہمیشہ افسوس ہوتا تھا۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نکاح

جیسا کہ اوپر بیان ہوا، خولہ بنت حکیم پہلے حضرت ابوبکرؓ کے ہاں گئیں اور ان کی اہلیہ ام رومانؓ سے بات کی کہ مجھے رسول ﷺ نے عائشہ کے لیے پیغام دے کر بھیجا ہے۔ ام رومان نے خولہ سے کہا، مطعم بن عدی نے اپنے بیٹے کے لیے عائشہؓ کو مانگا تھا، اور خدا کی قسم ابوبکرؓ نے کبھی کسی سے وعدہ کر کے اس کے خلاف نہیں کیا۔ ادھر حضرت ابوبکرؓ مطعم کے پاس گئے۔ اس کے پاس اس کی بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بولی: "اے ابوبکر، ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر ہم اپنے لڑکے کا بیاہ تمھارے ہاں کر دیں تو تم ہمارے لڑکے کو بھی دین سے پھیر دو گے۔"

حضرت ابوبکرؓ نے مطعم سے پوچھا: "جو کچھ یہ کہ رہی ہے کیا تمھارا قول بھی یہی ہے؟" مطعم نے کہا: "ہاں۔"

یہ جواب سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ اس کے ہاں سے نکل آئے اور اللہ نے انھیں اس مخمصے سے نکال دیا جس میں وہ مطعم سے وعدہ کر کے پھنس گئے تھے۔ پھر انھوں نے خولہ سے کہا کہ رسول اللہ کو میرے ہاں بلا لاؤ۔ وہ حضور ﷺ کو بلا لائیں اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عائشہ کا نکاح آپ ﷺ سے کر دیا۔

حضرت عائشہؓ کا نکاح چھے سال کی عمر میں ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے ہوا اور رخصتی سن دو ہجری میں ہوئی۔ نکاح شوال سن دس نبوی (مطابق فروری مارچ 619ء) میں ہوا۔ اس وقت حضور ﷺ کی عمر مبارک 49 سال اور سات ماہ کی تھی۔

طائف کا تبلیغی سفر

اپنے خانگی معاملات سے فارغ ہونے کے بعد رسول اکرم ﷺ نے پھر تبلیغ دعوت پر بھرپور توجہ کی۔ جناب ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کے انتقال پر ملال کے بعد مکہ میں آپ ﷺ کا کوئی حامی وغم گسار نہ رہا۔ اگرچہ ان دونوں جاں نثاروں کی جدائی آپ ﷺ کو نہایت غم زدہ اور پر ملال کر گئی تھی، تاہم تبلیغ ودعوت کے لیے آپ ﷺ کی مساعی جمیلا میں کوئی فرق نہ پڑا، بلکہ حضور ﷺ نے پہلے سے بھی زیادہ تن دہی کے ساتھ دعوت اسلامی کا کام شروع کر دیا۔ چناں چہ آپ ﷺ قریش مکہ کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر آخر شوال سن دس نبوی میں طائف کا قصد

فرمایا۔ اس سفر میں زیدؓ بن حارثہ آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ مکہ معظمہ اور طائف کے درمیان جتنے قبائل آباد تھے، آپ ﷺ ان سب کو اسلام کا پیغام پہنچاتے ہوئے، اور ہر بستی میں توحید کی منادی فرماتے ہوئے، پاپیادہ طائف پہنچے۔

طائف مکہ سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر پہاڑوں میں ایک سرسبز و شاداب مقام ہے، جو اپنی خوشگوار آب و ہوا کی وجہ سے اہل حجاز کے لیے ایک صحت افزا مقام کی حیثیت رکھتا ہے۔ امرائے حجاز عموماً گرمیاں وہیں بسر کرتے ہیں۔ ابتدا میں طائف قبیلہ عدوان کا مسکن تھا، مگر بعد میں مشہور قبیلے بنوثقیف کے قبضے میں آیا۔ یہاں کی زرخیزی و شادابی کی وجہ سے افراط دولت ہوئی، جس کے باعث بنوثقیف حد درجہ مغرور و متکبر ہو گئے تھے۔

جن دنوں حضور ﷺ نے طائف کا تبلیغی سفر اختیار کیا، ان دنوں وہاں عمرو بن عمیر بن عوف کے تین بیٹے عبد یالیل، مسعود اور حبیب طائف کے سردار تھے۔

حضور ﷺ وہاں پہنچ کر ان تینوں بھائیوں کے پاس گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ ان تینوں بھائیوں نے کلمۂ حق سننے کے بجائے حضور ﷺ کو سختی سے جواب دیا۔ ایک نے کہا: ''میں کعبے کے سامنے ڈاڑھی منڈوا دوں، اگر تجھے اللہ نے رسول بنایا ہو۔''

دوسرا بولا: ''کیا خدا کو تیرے سوا اور کوئی رسول بنانے کو نہ ملا، جسے چڑھنے کو سواری بھی میسر نہیں۔ اور اگر خدا کو رسول بنانا ہی تھا تو کسی حاکم یا سردار کو یہ عظمت بخشی ہوتی۔''

تیسرے نے کہا: ''خدا کی قسم، میں تجھ سے کلام بھی نہ کروں گا۔ اگر واقعی اللہ نے تمھیں اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے، تب تو سخت خطرناک ہے کہ میں تیرے کلام کو رد کردوں۔ اور اگر تو اللہ کا رسول نہیں، تو پھر التفات کے لائق نہیں۔''

حضور ﷺ نے ان تینوں بھائیوں کا متکبرانہ جواب سن کر فرمایا: ''اب میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے خیالات دوسروں تک نہ پہنچاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ یہ خیالات دوسروں کے لیے ٹھوکر کا سبب بن جائیں۔''

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے وعظ فرمانا شروع کیا۔ ان مغرور سرداروں نے ازراہ تمسخر اپنے غلاموں اور شہر کے لڑکوں کو اکسایا کہ جب حضور ﷺ وعظ فرمائیں تو وہ سب مل کر آپ ﷺ پر پتھر برسائیں، اور آپ ﷺ کی ہنسی اڑائیں۔ چناں چہ ظالموں نے وعظ کے دوران میں حضور ﷺ پر اس قدر پتھر برسائے کہ حضور ﷺ لہولہان ہو گئے۔ ایک دفعہ ان لوگوں نے تاک تاک کر آپ ﷺ کے ٹخنوں اور ایڑیوں پر پتھر مارے۔ راستے کے دونوں جانب وہ صفیں بنائے کھڑے تھے، اور جیسے جیسے آپ قدم اٹھا کر چلتے جاتے تھے، وہ سنگ باری کیے چلے جاتے تھے، یہاں تک کہ آپ ﷺ کی جوتیاں خون سے بھر گئیں۔ چوٹوں کی تکلیف سے جب آپ ﷺ بیٹھ جاتے تو وہ آپ ﷺ کو پکڑ کر کھڑے کر دیتے، تاکہ آپ ﷺ پر پھر پتھر برسائیں۔ چناں چہ جب آپ ﷺ مجبوراً چلنا شروع کرتے تو وہ پتھر مارتے اور ٹھٹھے لگاتے چلے جاتے تھے۔ اس موقع پر حضرت زیدؓ بن حارثہ آپ ﷺ کو پتھروں سے بچانے کے لیے خود پتھروں کی بارش اپنے اوپر لیتے رہے، یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔

ایک مرتبہ ان اوباش فطرت اور بدطینت لوگوں نے حضور ﷺ کو اس قدر گالیاں دیں، تنگ کیا، تالیاں بجائیں اور ٹھٹھے لگائے کہ حضور کریم ﷺ ایک باغ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ یہ باغ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ کی ملکیت تھا، جو باوجود کافر ہونے کے شریف الطبع تھے۔ حضور ﷺ باغ کی دیوار کے ساتھ لگ کر انگور کی بیل کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتفاق سے قریش کے ان دونوں سرداروں نے آپ ﷺ کو اس حالت میں دیکھا تو ان کا دل پسیج گیا۔ انھوں نے فوراً اپنے غلام عداس کو ایک پلیٹ انگور دے کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ غلام نے آ کر انگوروں کی پلیٹ حضور ﷺ کے سامنے رکھ دی۔ حضور ﷺ نے جب ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھ کر انگور کھانے شروع کیے تو عداس نے بڑی حیرت سے نبی کریم ﷺ کی طرف دیکھا اور عرض کیا: ''خدا کی قسم، اس شہر میں کوئی شخص بھی ایسا کلام کہنے والا نہیں۔''

حضور ﷺ نے عداس سے پوچھا: ''تم کس شہر کے رہنے والے ہو اور تمھارا مذہب کیا ہے؟''

عداس نے عرض کیا: ''میں عیسائی ہوں اور شہر نینویٰ کا رہنے والا ہوں۔''

یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس نینویٰ کے جو مرد صالح یونس بن متی کی بستی ہے؟'' یہ سن کر عداس کو بڑا تعجب ہوا۔ کہنے لگا: ''آپ کو کیا معلوم کہ یونس بن متی کون تھے اور کیسے تھے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''وہ میرے بھائی ہیں۔ وہ بھی نبی تھے اور میں بھی نبی ہوں۔'' حضور ﷺ کی زبان سے یہ سنتے ہی عداس آپ ﷺ کے قدموں پر گر پڑا۔ اس نے بے اختیار آپ ﷺ کے مبارک قدموں کو بوسہ دیا اور آپ کے ہاتھوں اور سر کو چوما۔

ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ، جو دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، آپس میں کہنے لگے ''عداس ہمارے ہاتھوں سے گیا۔ ہمارے غلام کو بھی اس شخص نے بگاڑ دیا۔''

جب عداس اپنے مالکوں کے پاس پہنچا تو انھوں نے کہا: ''او کم بخت! تجھے کیا ہو گیا تھا کہ اس شخص کے ہاتھ، پاؤں اور سر چومنے لگ گیا تھا۔''

عداس نے جواب دیا: ''حضور والا، یہ بہترین انسان ہیں۔ زمین پر ان سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ انھوں نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے، جو نبی کے علاوہ کوئی نہیں بتا سکتا'' انھوں نے اسے ڈانٹ دیا اور خبردار کیا کہ اپنا دین مت چھوڑنا۔ تیرا دین ان کے دین سے بہتر ہے۔''

آخر کار حضور ﷺ جب طائف سے نکل گئے اور عتبہ و شیبہ کے باغ کی دیوار سے لگ کر انگور کی ایک بیل کے سائے میں بیٹھ گئے۔ اس موقع پر آپ ﷺ کا دل بھر آیا اور آپ ﷺ نے اپنے رب کی طرف رجوع کر کے، نہایت عاجزی سے یہ

دعا کی:

''یا اللہ، میں ناتواں اور بے سروسامان ہوں۔ لوگ مجھے حقیر خیال کرتے ہیں۔ یا اللہ، میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں، تو سب رحم کرنے والوں سے بڑا رحم کرنے والا ہے۔ تو سارے عاجزوں اور کم زوروں کا رب ہے اور میرا رب بھی تو ہی ہے۔ تو مجھے کن کے حوالے کیے دیتا ہے۔ بدمزاج اغیار سے اور ایسے دشمنوں سے میرا پالا پڑا ہے جو میرے کام کو چلنے نہیں دیتے۔ خیر، تو مجھ سے خوش ہے اور مجھ سے ناراض نہیں ہے تو مجھے کسی مصیبت کی پروا نہیں۔ مگر تیری طرف سے عافیت مجھے نصیب ہو جائے تو اس میں میرے لیے زیادہ کشادگی ہے۔ میں پناہ مانگتا ہوں تیری ذات کے اس نور کی، جو اندھیرے میں اجالا کرتا اور دنیا و آخرت کے معاملات کو درست کرتا ہے۔ مجھے اس سے بچالے کہ تیرا غضب مجھ پر نازل ہو یا میں تیرے عتاب کا مستحق ہو جاؤں۔ تیری مرضی پر راضی ہوں، یہاں تک کہ تو مجھ سے راضی ہو جائے۔ کوئی زور اور طاقت تیرے بغیر نہیں۔''

جنات کا قرآن سننا

طائف سے واپسی پر حضور ﷺ چند روز کے لیے نخلہ کے مقام پر جا کر ٹھہر گئے۔ پریشان تھے کہ اب کیسے مکہ جاؤں۔ طائف میں جو کچھ گزری ہے، اس کی خبریں وہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ اس کے بعد تو کفار پہلے سے بھی زیادہ دلیر اور سنگ دل ہو جائیں گے۔ انھی ایام میں ایک روز رات کو حضور ﷺ نماز میں قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے کہ جنوں کے ایک گروہ کا ادھر سے گزر ہوا۔ انھوں نے قرآن سنا۔ ایمان لائے۔ واپس جا کر اپنی قوم میں اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورۂ احقاف کی آیات 29 تا 32 میں اپنے نبی کو یہ خوش خبری دی کہ انسان چاہے آپ کی دعوت سے بھاگ رہے ہوں، مگر بہت سے جن اس کے گرویدہ اور شیدائی ہو گئے ہیں اور اسے اپنی جنس میں پھیلا رہے ہیں۔ تمام روایات اس بات پر متفق ہیں کہ اس موقع پر جن حضور ﷺ کے سامنے نہیں آئے تھے، نہ آپ ﷺ نے ان کی آمد کو محسوس کیا تھا، بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے آپ ﷺ کو ان کے آنے اور قرآن سننے کی خبر دی۔

اس موقع پر جنوں نے حضور اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن کی جو سورت سنی، وہ سورۂ رحمٰن تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ روایت منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے سورۂ رحمٰن خود تلاوت فرمائی یا آپ ﷺ کے سامنے سورۂ رحمٰن پڑھی گئی۔ پھر آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ''کیا بات ہے کہ میں تم سے ویسا اچھا جواب نہیں سن رہا ہوں جیسا جنوں نے اپنے رب کو دیا تھا؟''

لوگوں نے عرض کیا: ''وہ کیا جواب تھا؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد: ﴿فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ﴾ پڑھتا ہوں تو جن اس کے جواب میں کہتے: ((لا بشيء من نعمك ربنا نكذب فلك الحمد بشي من نعمه ربنا نكذب)) ''ہم اپنے رب کی کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے۔''

مکہ میں حضور ﷺ کا داخلہ

جب نخلہ سے حضور ﷺ نے مکہ تشریف لے جانے کا قصد فرمایا تو حضرت زید بن حارثہ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ وہاں کیسے داخل ہوں گے، جب کہ قریش آپ ﷺ کو نکال چکے ہیں؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اے زید، جو حالات تم دیکھ رہے ہو ان سے نکلنے کے لیے اللہ کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ وہ اپنے دین کا حامی و ناصر ہے اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے۔''

کوہ حرا پہنچ کر آپ ﷺ نے عبداللہ بن اریقط کو اخنس بن شریق کے پاس بھیجا، تاکہ وہ آپ ﷺ کو اپنی پناہ میں لے۔ اس نے کہا میں تو حلیف ہوں، اور حلیف قریش کے اصل قبیلوں کے مقابلے میں پناہ نہیں دے سکتا۔

پھر آپ ﷺ نے ابن اریقط کو سہیل بن عمرو کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا، بنی عامر بن لوی بنی کعب کے مقابلے میں پناہ نہیں دے سکتے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اسے مطعم بن عدی کے پاس بھیجا جو بنی عبد مناف کی شاخ بنی نوفل میں سے تھا۔

ابن اریقط نے مطعم بن عدی سے جا کر کہا: ''محمد ﷺ تم سے کہتے ہیں کہ کیا تم مجھے پناہ دینے کے لیے تیار ہو، تاکہ میں اپنے رب کے پیغامات پہنچا سکوں؟''

مطعم بن عدی نے جواب دیا: ''ہاں، وہ مکہ میں آجائیں۔''

چناں چہ حضور ﷺ شہر میں تشریف لے گئے اور رات مطعم کے ہاں رہے۔ صبح ہوئی تو مطعم اور اس کے چھے سات بیٹے مسلح ہو کر آپ ﷺ کو اپنے ساتھ حرم لے گئے اور کہا کہ آپ ﷺ طواف کریں۔ طواف کے دوران میں وہ سب آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے کھڑے رہے۔

ابوسفیان (یا بہ روایت دیگر ابوجہل) نے پوچھا: ''پناہ دینے والے ہو یا ان کی پیروی اختیار کر لی ہے؟''

مطعم بن عدی نے کہا: ''نہیں، بلکہ پناہ دینے والا ہوں۔''

اس نے کہا: ''تمھاری پناہ کو نہیں توڑا جا سکتا۔ جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے پناہ دی۔ مطعم بن عدی کا یہی احسان تھا، جس کی بنا پر حضور اکرم ﷺ نے غزوۂ بدر کے قیدیوں کے متعلق فرمایا تھا:

((لو کان المطعم بن عدی حیا ثم کلمنی فی هولاء النتنی لترکتهم له))

''اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور مجھ سے ان گھناؤنے لوگوں کے متعلق بات کرتا تو میں اس کی خاطر انھیں چھوڑ دیتا۔''

جنات کا قرآن سننا

طائف سے واپسی پر حضور ﷺ وادی نخلہ میں فروکش ہوئے۔ یہاں دو جگہیں

قیام کے لائق ہیں، السیل الکبیر اور دوسرے زیمہ، کیوں کہ دونوں ہی جگہ پانی اور شادابی موجود ہے، لیکن کسی ماخذ سے یہ پتا نہیں چل سکا کہ حضور ﷺ نے ان میں سے کس جگہ قیام فرمایا تھا۔

وادیٔ نخلہ میں حضور ﷺ کا قیام چند دن رہا۔ اس دوران میں جنوں کی ایک جماعت حضور ﷺ کے پاس آئی جس کا ذکر قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۂ احقاف میں، دوسرے سورۂ جن میں۔ سورۂ احقاف کی متعلقہ آیات 29 تا 31 کا ترجمہ یہ ہے:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ○ قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ○﴾

(الاحقاف: 29تا31)

''اور وہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جب ہم جنوں کے ایک گروہ کو تمھاری طرف لے آئے تھے، تاکہ قرآن سنیں۔ جب وہ اس جگہ پہنچے، (جہاں تم قرآن پڑھ رہے تھے) تو انھوں نے آپس میں کہا، خاموش ہو جاؤ۔ پھر جب پڑھا جا چکا تو وہ خبردار کرنے والے بن کر اپنی قوم کی طرف پلٹے۔ انھوں نے جا کر کہا: ''اے ہماری قوم کے لوگو، ہم نے ایک کتاب سنی ہے جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے۔ تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتابوں کی۔ راہ نمائی کرتی ہے حق اور راہ راست کی۔ اے ہماری قوم کے لوگو، اللہ کی طرف بلانے والے کی دعوت قبول کر لو اور اس پر ایمان لے آؤ۔ اللہ تمھارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمھیں عذاب الیم سے بچائے گا۔''

سورۂ جن کی ابتدائی دو آیات کا ترجمہ یہ ہے: ''اے نبی ﷺ! کہو میری طرف وحی بھیجی گئی ہے کہ جنوں کے ایک گروہ نے غور سے سنا۔ پھر جا کر اپنی قوم کے لوگوں سے کہا: ''ہم نے ایک بڑا ہی عجیب قرآن سنا ہے جو راہ راست کی طرف راہنمائی کرتا ہے، اس لیے ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں، اور اب ہم ہرگز اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔''

اس موقع پر جنوں نے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے قرآن کی جو سورت سنی، وہ سورۂ رحمٰن تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول کریم ﷺ نے سورۂ رحمٰن خود تلاوت فرمائی آپ ﷺ کے سامنے یہ سورت پڑھی گئی۔ پھر آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا: ''کیا وجہ ہے کہ میں تم سے ویسا اچھا جواب نہیں سن رہا ہوں، جیسا جنوں نے اپنے رب کو دیا تھا۔ لوگوں نے عرض کیا، وہ کیا جواب تھا؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''جب میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر پہنچتا تھا کہ اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے تو اس کے جواب میں وہ کہتے تھے۔

"لا بشيء من نعمك ربنا نكذب فلك الحمد."

''اے ہمارے رب، ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے پس تعریف تیرے ہی لیے ہے۔''

اگر چہ دوسری روایات میں بیان کیا گیا ہے کہ اس موقع پر رسول کریم ﷺ کو یہ معلوم نہ تھا کہ جن آپ ﷺ سے قرآن سن رہے ہیں، بلکہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ احقاف کی مذکورہ آیات میں آپ ﷺ کو یہ خبر دی کہ وہ آپ ﷺ سے قرآن سن رہے ہیں، لیکن بقول مولانا مودودی: ''یہ بات بعید از قیاس نہیں ہے کہ جس طرح اللہ نے حضور ﷺ کو جنوں کی سماعت قرآن پر مطلع فرمایا تھا، اسی طرح اللہ ہی نے آپ ﷺ کو یہ اطلاع بھی دے دی ہو کہ سورۂ رحمٰن سنتے وقت وہ اس کا کیا جواب دیتے جا رہے تھے۔''

مکہ میں حضور ﷺ کی واپسی

حضور ﷺ نے عزم صمیم فرما لیا کہ اب مکہ واپس جانا ہے اور نئے سرے سے دعوت اسلام اور تبلیغ رسالت کے کام میں مستعدی اور گرم جوشی کے ساتھ لگ جانا ہے۔ یہی موقع تھا جب حضرت زیدؓ بن حارثہ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ وہاں کیسے داخل ہوں گے، جب کہ قریش آپ ﷺ کو نکال چکے ہیں؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''اے زید، جو حالات تم دیکھ رہے ہو، ان سے نکلنے کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔ وہ اپنے دین کا حامی و ناصر ہے اور اپنے نبی کو غالب کرنے والا ہے۔''

آخر رسول وہاں سے روانہ ہوئے اور مکے کے قریب پہنچ کر کوہ حرا کے دامن میں ٹھہر گئے۔ آپ ﷺ نے عبداللہ بن اریقط کو اخنس بن شریق کے پاس بھیجا، تاکہ وہ آپ ﷺ کو اپنی پناہ میں لے۔ عبداللہ بن اریقط مشرک تھا، مگر حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اسے قابل اعتماد آدمی سمجھتے تھے۔ اسی لیے مدینے کی طرف ہجرت کرنے کے انتہائی خطرناک موقع پر آپ ﷺ نے راستہ بتانے کے لیے اسے ساتھ لیا تھا، اور اس نے پوری وفاداری کے ساتھ آپ ﷺ کی یہ خدمت انجام دی تھی، حالانکہ قریش کو آپ کے سفر اور راستے کی خبر دے کر وہ بھاری انعام وصول کر سکتا تھا۔ اخنس بن شریق دراصل بنی ثقیف میں سے تھا، لیکن مکہ میں بنی زہرہ (حضور کے ننھیال) کے ساتھ اس کے حلیفانہ تعلقات تھے، اور اس کی قابلیت کی وجہ سے بنی زہرہ میں اسے سرداری کا مقام حاصل تھا۔

مگر اخنس نے یہ کہہ کر آپ ﷺ کو پناہ دینے سے معذرت کر لی کہ میں حلیف ہوں اور حلیف پناہ دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے سہیل بن عمرو کے پاس یہی پیغام بھیجا، مگر اس نے بھی یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ بنی عامر کی دی ہوئی پناہ بنو کعب پر لاگو نہیں ہوتی۔ اس کے بعد آپ نے مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا۔ مطعم نے کہا: ''ہاں''، اور پھر ہتھیار پہن کر بیٹوں اور قوم کے لوگوں کو بلایا اور کہا: ''تم لوگ ہتھیار باندھ کر خانہ کعبہ کے گوشوں پر جمع ہو جاؤ، کیوں کہ میں نے محمد ﷺ کو پناہ دے دی ہے۔''

اس کے بعد مطعم نے حضور ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ مکے کے اندر

آ جائیں۔ آپ ﷺ پیغام پانے کے بعد حضرت زیدؓ بن حارثہ کو ہم راہ لے کر مکہ تشریف لائے اور مسجد حرام میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد مطعم بن عدی نے اپنی سواری پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ قریش کے لوگو! میں نے محمد ﷺ کو پناہ دے دی ہے۔ اب اسے کوئی نہ چھیڑے۔"

ادھر حضور ﷺ سیدھے حجر اسود کے پاس پہنچے، اسے چوما۔ پھر دو رکعت نماز پڑھی اور اپنے گھر کو پلٹ آئے۔ اس دوران میں مطعم بن عدی اور ان کے بیٹوں نے ہتھیار بند ہو کر حضور ﷺ کے اردگرد حلقہ باندھے رکھا، یہاں تک کہ آپ ﷺ اپنے مکان کے اندر تشریف لے گئے۔

کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر ابوجہل نے مطعم سے پوچھا تھا: "تم نے پناہ دی ہے۔ یا پیروکار بن گئے ہو؟" اور مطعم نے جواب دیا: "پناہ دی ہے۔" یہ جواب سن کر ابوجہل نے کہا تھا کہ جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے بھی پناہ دی۔

حضور ﷺ نے مطعم بن عدی کے اس حسن سلوک کو کبھی فراموش نہ فرمایا۔ چناں چہ بدر میں جب کفار مکہ کی ایک بڑی تعداد قید ہو کر آئی، اور بعض قیدیوں کی رہائی کے لیے حضرت جبیر بن مطعم آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا، پھر مجھ سے ان بدبودار لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتا تو میں اس کی خاطر سب کو چھوڑ دیتا۔"

قبائل میں تبلیغ اسلام

مکہ اور طائف کے لوگوں سے مایوس ہو کر حضور ﷺ نے عرب کے دوسرے قبائل کی طرف توجہ فرمائی جو عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں میں اور حج کے موقع پر منیٰ میں جمع ہوتے تھے۔ اگرچہ پہلے بھی دعوت عام کے لیے آپ ﷺ ان اجتماعات میں ہر قبیلے کے پڑاؤ پر تشریف لے جاتے تھے، لیکن اس وقت آپ ﷺ کا مقصد صرف دعوت الی اللہ پیش کرنا تھا، لیکن اب آپ ﷺ نے اللہ کی طرف دعوت دینے کے ساتھ ساتھ قبائل کے اشراف اور سرداروں سے مل کر یہ بھی کہنا شروع کیا کہ تم مجھے اپنی حمایت میں لے لو اور اس دعوت کے کام میں میری مدد کرو، کیوں کہ قریش نے مجھے اللہ کے پیغامات پہنچانے سے روک دیا ہے۔

ان تبلیغی دوروں کے سلسلے میں حضور ﷺ اکثر و بیشتر قبیلوں کے پاس گئے۔ آپ ﷺ مختلف قبائل کی سکونت گاہوں پر تشریف لے جاتے یا مکہ سے باہر چلے جاتے، اور اگر کہیں جانہ پاتے تو راستے میں کھڑے ہو جاتے اور جو مسافر بھی مل جاتا، اسے اللہ کا پیغام سناتے۔ عرب کے مشرقی ساحل سے لے کر مغربی ساحل تک، اور جنوب سے لے کر شمال تک، کوئی بااثر اور طاقت ور قبیلہ ایسا نہ تھا جس سے آپ ﷺ نے رابطہ قائم نہ کیا ہو، ان میں خاص طور پر قابل ذکر قبائل یہ ہیں:

(1) قبیلہ کندہ

اس قبیلے کا سردار ملیح تھا۔ جنوبی عرب کا ایک بڑا قبیلہ، حضرموت سے یمن تک اس کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔

(2) قبیلہ کلب

اس کا علاقہ شمالی عرب میں دومتہ الجندل سے تبوک تک وسیع تھا۔ حضور ﷺ اس قبیلے کی ایک شاخ بنوعبداللہ کے پاس تشریف لے گئے۔ انھیں اللہ کی طرف بلایا اور اپنے آپ کو ان پر پیش کیا۔ باتوں باتوں میں یہ بھی فرمایا کہ اے بنوعبداللہ! اللہ نے تمھارے جداعلیٰ کا نام بہت اچھا رکھا تھا، لیکن اس قبیلے نے آپ ﷺ کی دعوت قبول نہ کی۔

(3) بنی بکر بن وائل

یہ عرب کے بڑے بڑے لڑاکا قبیلوں میں شمار ہوتا تھا اور وسط عرب سے مشرقی ساحل تک اسے شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ 330ء میں اس قبیلے نے میں پہلی مرتبہ ایران کی حکومت سے ٹکر لی تھی اور عہد رسالت ﷺ میں اس کی پھر ایران سے لڑائی ہوئی، جس میں ایرانی شکست کھا گئے۔ تاریخ میں یہ جنگ ذی قار کے نام سے مشہور ہے۔

(4) بنی البکا

بنوعامر بن صعصعہ کی ایک شاخ جو مکہ اور عراق کے راستے پر آباد تھی۔

(5) ثعلبہ بن عکابہ

بنی بکر بن وائل کی ایک شاخ ہے۔

(6) بنی شیبان بن ثعلبہ

بنی ثعلبہ بن عکابہ کی ایک شاخ ہے۔

(7) بنی الحارث بن کعب

بنی تمیم کی ایک شاخ ہے۔

(8) بنی حنیفہ

یہ بنی بکر بن وائل کی ایک شاخ تھی جو یمامہ میں رہتی تھی۔ مسیلمہ کذاب، جس نے بعد میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، اسی قبیلے کا سردار تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں جو فتنہ ارتداد اٹھا تھا، اس میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ مقابلہ اسی قبیلے سے پیش آیا تھا۔ اس کا شمار عرب کے بڑے بڑے لڑاکا قبائل میں ہوتا تھا۔

(9) بنو سلیم

یہ قبیلہ قیس عیلان میں سے ایک بڑا قبیلہ تھا۔ اس کا مسکن خیبر کے قریب نجد کا بالائی علاقہ تھا، اور وادی القریٰ اور تیماء تک یہ لوگ پھیلے ہوئے تھے۔

(10) بنی عامر بن صعصعہ

یہ ہوازن کی ایک شاخ تھی اور ہوازن قیس عیلان میں سے تھے۔ یہ لوگ نجد میں رہتے تھے۔ پھر طائف کے ایک حصے تک بھی پہنچ گئے۔ گرمیاں طائف میں اور سردیاں نجد میں گزارتے تھے۔ حضور ﷺ ایک روز اس قبیلے کے پاس گئے۔ قبیلے کا سردار بحیرہ بن فراس تھا۔ حضور ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ یہ سن کر اس نے حضور ﷺ سے پوچھا: "اگر میں آپ کی بات مان لوں، اور آپ کو مخالفین پر غلبہ دلا دوں، تو کیا آپ کے بعد یہ غلبہ میرے حصے میں آئے گا؟ اگر آپ وعدہ فرمائیں تو

میں آپ کی بات ماننے کو تیار ہوں۔'' حضور ﷺ نے یہ شرط سن کر فرمایا: ''یہ تو اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے گا، میرا جانشین بنائے گا۔''

یہ سن کر بحیرہ بولا: ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں آپ کی خاطر سارے عرب سے دشمنی مول لوں، اور جب آپ کامیاب ہو جائیں تو آپ کی جانشینی کا لطف کسی اور کو ملے، مجھے ایسا سودا منظور نہیں۔''

(11) بنی عبس

یہ قیس عیلان کی ایک شاخ بنی غطفان کا ایک بڑا ذیلی قبیلہ تھا۔ نجد میں رہتا تھا اور بڑے لڑاکا قبائل میں شمار ہوتا تھا۔ زمانہ جاہلیت میں دوسرے قبیلوں سے ان کی لڑائیاں مدتوں چلتی رہیں۔

(12) بنی عذرہ

یہ بنی عبداللہ بن غطفان کی ایک شاخ ہے۔

(13) بنی غسان

یہ جنوبی عرب کی ایک بڑی قوم تھی جو شمالی عرب میں جا کر بس گئی تھی۔ اس میں بہت سے قبائل تھے، جن میں سے کچھ عیسائی ہو گئے تھے اور کچھ مشرک تھے۔ غسانیوں کی ایک ریاست بھی رومی سلطنت کی تابع تھی۔

(14) بنی فرازہ

یہ غطفان کے ذیلی قبائل میں سے ایک بڑا قبیلہ تھا۔ نجد اور وادیٔ القریٰ میں آباد تھا۔

(۱۵) بنو ہذیل بن شیبان

ان قبائل میں سے صرف اس قبیلے نے دعوت اسلام کو پوری توجہ سے سنا اور آپ ﷺ کی بے حد عزت کی۔ اس قبیلے میں جاتے وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی حضور ﷺ کے ہم راہ تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قبیلے کے سردار مفروق سے کہا: ''تم نے ہمارے رسول ﷺ کا تذکرہ سنا ہوگا۔ وہ یہی ہیں!'' مفروق نے حضور ﷺ سے عرض کیا: ''آپ ﷺ کیا تلقین فرماتے ہیں؟''

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''یہ کہ اللہ ایک ہے اور میں اس کا رسول ﷺ ہوں۔''

پھر حضور ﷺ نے سورۂ انعام کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۝﴾ (الانعام: 151)

''اے نبی، ان سے کہو کہ آؤ میں تمھیں سناؤں، تمھارے رب نے تم پر کیا پابندیاں عائد کی ہیں، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور انھیں بھی دیں گے، اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ، خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی، اور کسی جان کو، جسے اللہ نے محرم ٹھہرایا ہے، ہلاک نہ کرو، مگر حق کے ساتھ۔ یہ باتیں ہیں جن کی ہدایت اس نے تمھیں کی ہے، شاید کہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔''

سردار قبیلہ کے ساتھ قبیلے کے دوسرے سردار بھی موجود تھے۔ سب نے قرآن حکیم سن کر کہا: ''کلام تو بہت اچھا ہے، لیکن ہمارے لیے یکا یک اپنے اعتقادات بدل لینا اور اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ دینا دشوار کام ہے۔ اس کے علاوہ کسریٰ سے ہمارا معاہدہ ہے کہ اس کے سوا کسی کا اثر قبول نہیں کریں گے۔''

حضور ﷺ نے ان لوگوں کی راست گفتاری کو بہت پسند فرمایا اور کہا: ''اللہ اپنے دین کی آپ مدد کرے گا۔''

مدینے کے قبائل: اوس و خزرج

اس طرح مکہ اور اردگرد کے شہروں اور دیہات کے قبائل اس نعمت سے محروم رہ گئے جو خود چل کر ان کے پاس آئی تھی، اور اہلِ مدینہ وہ خوش نصیب لوگ تھے جو خود چل کر اس کے پاس گئے اور اسے پا لیا۔ اہلِ مدینہ پہلے سے ہی محمد عربی ﷺ کی دعوت قبول کرنے کے لیے مذہبی طور پر تیار تھے۔ ان میں اوس اور خزرج پیش در پیش تھے۔ ان کی بھی ایک تاریخ ہے۔

450 عیسوی کے لگ بھگ سد مارب کے پھٹنے سے یمن میں ایک بڑا سیلاب آیا تھا۔ اس کی وجہ سے قوم سبا کا ایک شخص عمرو بن عامر اپنے بال بچوں کو لے کر شمال کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ اس کے ایک بیٹے کی اولاد شام کے علاقے میں آباد ہوئی اور غسان کے نام سے مشہور ہوئی۔ دوسرے بیٹے حارثہ نے حجاز کے پہاڑوں اور بحیرۂ احمر کے ساحل کے درمیان اس طویل میدانی علاقے میں سکونت اختیار کی جو تہامہ کہلاتا ہے۔ اس کی اولاد خزاعہ کے نام سے مشہور ہے۔ تیسرے بیٹے ثعلبہ کی اولاد میں سے ایک شخص حارثہ کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام اوس تھا اور دوسرے کا نام خزرج۔ ان کی اولاد یثرب (مدینہ) میں جا کر آباد ہوئی۔ جہاں پہلے سے یہودی قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ ایک مدت تک یہودیوں نے اوس اور خزرج کی اولاد کو اصل شہر مدینہ اور اس کی سرسبز و شاداب زمینوں میں نہ گھسنے دیا اور یہ لوگ اطراف کی بنجر زمینوں میں تنگی ترشی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔

آخر کار انھوں نے اپنے ہم نسب عیسائیوں سے مدد مانگی۔ وہ فوج لے کر آئے اور یہودیوں کو زبردستی شہر سے نکال کر اوس و خزرج کو اس پر قبضہ دلوا دیا۔ یہودیوں کے دو قبیلے بنی قریظہ اور بنی نضیر، اطراف شہر میں بسنے پر مجبور ہوئے، اور ایک قبیلے بنی قینقاع نے قبیلہ خزرج کی پناہ لے کر شہر کے ایک محلے میں سکونت اختیار کی۔ بنی قریظہ اور بنی نضیر نے جب دیکھا کہ ان کا حریف قبیلہ بنی قینقاع، خزرج کا حلیف بن گیا ہے تو انھوں نے قبیلہ اوس سے معاہدہ کر کے اسے اپنا حلیف بنا لیا۔ اس کے بعد اوس و خزرج پونے دوسو سال تک یہودیوں کے ساتھ ایک ہی شہر اور اس کے نواح میں آباد رہے۔ اس دوران میں یہ دونوں عرب قبیلے، ہم نسب ہونے کے باوجود اور آپس

میں شادی بیاہ کے رشتے ہونے کے باوجود، جاہلیت کی بنا پر خود بھی باہم لڑتے رہے اور یہودی قبیلے اپنے حلیف قبیلوں کو ایک دوسرے سے لڑاتے بھی رہے، کیوں کہ ان کی آپس کی جنگ ہی میں وہ اپنی خیر دیکھتے تھے اور ان کے اتحاد کو وہ اپنے لیے موت کا پیغام سمجھتے تھے۔ اس طرح پونے دو صدیوں میں ان کے درمیان چھوٹی موٹی لڑائیوں کے علاوہ گیارہ خون ریز معرکے بَرپا ہوئے، جن میں سے آخری معرکہ ''یوم بعاث'' ہجرت سے صرف پانچ سال پہلے (یعنی سن آٹھ نبوت مطابق 618ء) پیش آیا تھا۔ بعاث ایک مقام یا گڑھی کا نام تھا جو بنی قریظہ کے قریب مدینے سے دو میل پر واقع تھا۔ اس لڑائی میں دونوں قبیلوں کے بڑے بڑے سردار مارے گئے تھے، لیکن ان لڑائیوں کے باوجود اہلِ مدینہ پر یہودیوں کا مذہبی اثر اتنا زیادہ تھا کہ جس عورت کے بچے پیدا ہو کر مر جاتے، وہ منت مانتی تھی کہ اب جو بچہ پیدا ہوگا، اسے یہودی بناؤں گی۔ مدینہ کے آس پاس کے مقامات یہودیوں کے قبضے میں تھے۔ ان کے ہاں دولت کی فراوانی تھی، اہلِ یہود میں چوں کہ بیس اکیس قبیلے بن گئے تھے، اس لیے انھوں نے دور دور تک بستیاں آباد کر لی تھیں۔

اوس و خزرج پر جو بعد میں انصار کہلائے، تین ایسے اہم اثرات مترتب ہوئے، جنھوں نے دوسرے تمام عرب قبائل کے برعکس انھیں قبولِ اسلام کے لیے ذہنی طور پر پہلے ہی مستعد کر رکھا تھا، اور اس کا موقع سامنے آتے ہی یہ لوگ اس دین اور اس کے داعی محمد ﷺ کی طرف اس طرح لپکے جیسے پیاسا پانی کی طرف لپکتا ہے۔

پہلا اثر یہ تھا کہ ایک مدت دراز سے یہودیوں کے ساتھ میل جول اور ربط ضبط رکھنے کے باعث ان کے کان نبوت، وحی، کتاب، شریعت وغیرہ الفاظ اور ان کے معنی سے آشنا ہو چکے تھے، اس وجہ سے ان کے لیے یہ چیزیں اتنی غیر مانوس نہ تھیں جتنی دوسرے اہلِ عرب کے لیے تھیں۔

دوسرا اثر یہ تھا کہ اپنے ہمسایہ یہودیوں کی باتوں سے انھیں اکثر یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ یہ لوگ بڑی بے چینی کے ساتھ ایک نبی کی آمد کے منتظر ہیں جس کے آنے کی پیشین گوئیاں ان کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو غیر یہودی قوموں کا غلبہ مٹے اور ہمارے عروج کا دور شروع ہو۔ خصوصیت کے ساتھ جب کبھی اوس و خزرج کے ساتھ ان کی خصومت ہوتی تو وہ کہتے تھے کہ عن قریب ایک نبی آنے والا ہے۔ وہ جب آئے گا تو ہم اس کی پیروی کریں گے اور اس کے ساتھ ہو کر تمھیں ایسا ماریں گے جیسے عاد و ارم مارے گئے تھے۔ قرآن مجید (سورۂ بقرہ - آیت 88) میں بھی ان کی ان باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾

پھر فرمایا: ''اور اس سے پہلے وہ خود کافروں کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔''

تیسرا اثر یہ تھا کہ اپنی تباہ کن خانہ جنگی سے وہ بہت تنگ آئے ہوئے تھے اور کسی ایسی قیادت کے طلب گار تھے جو ان میں وحدت و اخوت پیدا کر دے۔ قرآن مجید (سورۂ آلِ عمران - آیت ۱۰۳) میں اس حالت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے:

''اور تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے پر تھے، اللہ نے تمھیں اس سے بچایا۔''

اپنی اسی مصیبت کا علاج کرنے کے لیے اہلِ مدینہ یہاں تک تیار ہو گئے تھے کہ خزرج کے رئیس عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ بنالیں، تاکہ ان کا آپس کا تفرقہ مٹے اور ایک شخص کی ریاست پر وہ سب جمع ہو جائیں۔ ان حالات میں آخر کار وہ نعمت ان کے سامنے آ گئی، جس کے درحقیقت وہ طلب گار تھے۔

سوید بن صامت

جن دنوں حضور ﷺ طائف سے واپسی کے بعد مختلف قبائل میں اسلام کا تبلیغی دورہ فرما رہے تھے، اور فرداً فرداً ہر قبیلے کے پاس جا کر دعوتِ اسلام دے رہے تھے، آپ ﷺ کی ملاقات سوید بن صامت سے ہوئی۔ وہ اپنی لیاقت، شجاعت، شعر و سخن اور شرف و نسب کی بنا پر اپنی قوم میں کامل کہلاتے تھے۔ حضور ﷺ نے اسے دعوتِ اسلام دی۔

سوید نے کہا: ''شاید آپ کے پاس بھی وہی چیز ہے، جو میرے پاس ہے۔''

حضور ﷺ نے پوچھا: ''آپ کے پاس کیا چیز ہے؟''

انھوں نے کہا: ''مجلۂ لقمان۔'' یعنی حکمت لقمان۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''وہ مجھے سنائیے۔''

انھوں نے اسے پڑھ کر سنایا۔

حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ اچھا کلام ہے۔ مگر میرے پاس جو چیز ہے، وہ اس سے افضل ہے، وہ قرآن ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نازل کیا ہے۔ وہ ہدایت اور نور ہے۔''

پھر حضور ﷺ نے انھیں قرآن سنایا اور اسلام کی طرف دعوت دی۔ سوید نے بلا تامل اسلام قبول کر لیا اور بولے: ''یہ تو بہت ہی اچھا کلام ہے۔'' لیکن مدینہ واپس پہنچ کر اپنے قبیلے کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ سوید مدینے کے پہلے شخص تھے جو حضور ﷺ کی دعوت سے متاثر ہوئے۔

ایاس بن معاذ

اوس و خزرج کے خون ریز معرکوں میں جب قبیلۂ اوس کو شکست ہوئی تو اوس کے چند عمائدین، قریش مکہ کے پاس گئے کہ خزرج کے مقابلے میں انھیں اپنا حلیف بنائیں۔ ایاس بن معاذ اس وفد کے رکن تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان لوگوں کی آمد کا علم ہوا تو آپ ﷺ ان سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا: ''کیا تم اس چیز سے بہتر چیز قبول کرنا پسند کرو گے، جس کے لیے تم آئے ہو؟''

انھوں نے کہا: ''وہ کیا ہے؟''

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں اللہ کا رسول ہوں۔ اللہ نے مجھے اپنی مخلوق کے پاس بھیجا ہے۔ میں اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کی طرف دعوت دیتا ہوں، اور غیر اللہ کی بندگی سے روکتا ہوں۔ مجھ پر اللہ تعالیٰ نے کتاب نازل فرمائی ہے۔''

إنما إلهكم الله الذي لا إله إلا هو وسع كل شيء علما

وكفى بالله وكيلا

وكفى بالله وكيلا

١٤١٨

يا بني أقم الصلوة وأمر بالمعروف وانه عن المنكر واصبر على ما أصابك

إن ذلك من عزم الأمور

محمد رسول الله

بسم الله الرحمن الرحيم

إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

من لا یرحم الناس لا یرحمہ اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حمادہ ۱۴۲۲

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کآبروئے ہر دو سرا است

کسی کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پیامبر اعظم

مهدی ۱۴۲۵

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم

انما انا قاسم واللہ یعطی

محمد رسول الله والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم

حامد

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن

پھر آپ ﷺ نے انھیں اسلام کی تعلیمات بتائیں اور قرآن سنایا۔ وفد میں ایک نوجوان ایاس بن معاذ بھی تھے۔ انھوں نے حضور ﷺ کی باتیں سن کر کہا:

''لوگو، واللہ! یہ چیز اس سے بہتر ہے جس کے لیے تم آئے ہو۔''

وفد کے ایک رکن انس بن رافع نے ایک مٹھی مٹی اٹھا کر ایاس کے منہ پر دے ماری اور بولا: ''زبان بند کرو، ہم جس کام کے واسطے آئے ہیں، ہمیں وہی کرنا چاہیے۔ ہم اس کام کے لیے نہیں آئے۔'' ایاس نے خاموشی اختیار کر لی اور رسول اللہ ﷺ بھی اٹھ گئے۔ وفد قریش کے ساتھ حلف وتعاون حاصل کرنے میں کام یاب نہ ہو سکا، اور یوں ہی ناکام مدینہ واپس ہو گیا۔

مدینہ پلٹنے کے تھوڑے ہی دن بعد ایاس انتقال کر گئے۔ وہ اپنی وفات کے وقت تہلیل وتکبیر اور حمد وتسبیح کر رہے تھے۔ اس لیے لوگوں کو یقین ہے کہ ان کی وفات اسلام پر ہوئی۔

ابوذر غفاریؓ

یہ بھی یثرب کے رہنے والے تھے اور قبیلہ غفار سے آپ کا تعلق تھا۔ جب سوید بن صامت اور ایاس بن معاذ کے ذریعے یثرب میں رسول اللہ کی بعثت کی خبر پہنچی تو یہ خبر ابوذرؓ کے کان سے بھی ٹکرائی۔ انھوں نے حالات سے پوری طرح آگاہ ہونے کے لیے اپنے بھائی انیس کو مکہ بھیجا اور کہا کہ وہ حضور ﷺ سے مل کر آئے۔

انیس خود ایک زبان آور اور فصیح شاعر تھا۔ بھائی کے حکم پر وہ مکہ آیا۔ حضور ﷺ سے ملا، اور پھر واپس یثرب جا کر اپنے بھائی سے کہا ''میں نے محمد ﷺ کو ایک ایسا شخص پایا جو نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ حضرت ابوذرؓ نے بھائی سے یہ باتیں سن کر کہا کہ صرف اتنی خبر کافی نہیں۔ میں خود جا کر حقیقت حال کا پتا لگاتا ہوں۔

آخر ابوذرؓ پیدل چل کر مدینہ پہنچے۔ حضرت ابوذرؓ کو حضور ﷺ کی شناخت نہ تھی اور وہ کسی سے دریافت بھی نہ کرنا چاہتے تھے۔ چناں چہ زمزم کا پانی پی کر کعبے ہی میں لیٹ رہے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ تشریف لائے اور حضرت ابوذرؓ کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا کہ تم مسافر معلوم ہوتے ہو۔ ابوذرؓ نے جواب دیا ''ہاں میں مسافر ہوں۔'' حضرت علیؓ نے کہا، چلو میرے ہاں رات بسر کرو۔ اس پیشکش پر حضرت ابوذرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ ہو لیے، اور رات ان کے گھر میں گزاری، مگر رات کو نہ حضرت علیؓ نے ان سے کچھ پوچھا، نہ انھوں نے ہی اپنا مدعا بیان کیا۔

جب صبح ہوئی تو پھر کعبے میں گئے اور دن بھر حضور ﷺ کی تلاش میں رہے، مگر چوں کہ وہ کسی سے دریافت نہیں کرنا چاہتے تھے، اس لیے حضور ﷺ سے نہ مل سکے۔ دوسری رات پھر حضرت علیؓ انھیں اپنے گھر لے گئے۔ اس رات انھوں نے حضرت ابوذرؓ نے پوچھا: ''تمھیں ان ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

ابوذر غفاریؓ نے کہا: ''میں آپ کو اپنی آمد کا مقصد بتائے دیتا ہوں، لیکن اس بات کو اپنے تک ہی رکھیے گا۔ میں ان صاحب کی بابت معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں، جنھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ میں نے اپنے بھائی کو اس غرض کے لیے بھیجا تھا، لیکن وہ یہاں سے کوئی تسلی بخش بات لے کر نہیں گیا۔ اس لیے میں خود چلا آیا۔''

حضرت علیؓ نے یہ سن کر کہا: ''تم خوب آئے، اور یہ بہت اچھا ہوا کہ مجھ سے ملے۔ میں انھی کی خدمت میں جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔''

ابوذر حضرت علیؓ کی معیت میں حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے، اور عرض کیا ''مجھے سمجھائیے کہ اسلام کیا ہے؟''

حضور ﷺ نے انھیں اسلام کی تلقین کی۔ حضرت ابوذرؓ اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ابوذرؓ ابھی اس بات کو چھپائے رکھو، اور اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔ جب تمھیں ہمارے ظہور کی خبر مل جائے، تب آ جانا۔''

حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا: ''پہلے تو اس خیال سے اپنے آنے کا مقصد چھپایا تھا کہ دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ پڑ جاؤں اور سیدھا آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچوں، لیکن اب کیا ڈر ہے۔ بخدا، میں تو ان دشمنوں میں اسلام کا اعلان کر کے ہی وطن جاؤں گا۔''

چناں چہ حضرت ابوذرؓ کعبے میں آئے وہاں قریش جمع تھے۔ حضرت ابوذرؓ نے سب کو سنا کر بآواز بلند کلمہ شہادت پڑھا۔ کفار نے کہا: ''مارو اس بے دین کو۔'' چناں چہ کفار ان پر ٹوٹ پڑے اور حضرت ابوذرؓ کو نیچے گرا لیا۔ حضرت عباسؓ نے دیکھ لیا اور کہا: ''یہ تو قبیلہ غفار کا آدمی ہے، جہاں تم تجارت کو جاتے اور کھجوریں لاتے ہو۔''

لوگ یہ سنتے ہی ہٹ گئے۔ دوسرے دن پھر حضرت ابوذر غفاریؓ نے لوگوں کو سنا کر کلمہ پڑھا۔ لوگوں نے پھر مارا۔ اس دفعہ بھی حضرت عباسؓ نے ان کی جان بخشی کرائی۔ اس طرح دو دن تک کلمۂ حق کا اعلان کرنے اور لوگوں کی سختی برداشت کرنے کے بعد حضرت ابوذر غفاریؓ یثرب واپس چلے گئے۔ آپ مدینے کے پہلے مسلمان اور صحابیؓ ہیں، جنھوں نے کلمۂ اسلام کو بآواز بلند پکار کر قریش سے مار کھائی اور اسلام کے لیے ہر سختی کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔

طفیلؓ بن عمر دوسی

انھی دنوں قبیلہ دوس کا سردار طفیل بن عمر مکہ آیا۔ یمن کے نواح میں اس کے خاندان کی رئیسانہ حکومت تھی۔ طفیل بذات خود اچھا شاعر اور بڑا دانا اور عاقل شخص تھا۔ اہل مکہ میں اس کی کافی قدر ومنزلت تھی۔ چناں چہ اس کی آمد پر اہل مکہ نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا، اور طفیل کے شایان شان عزت وتکریم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ طفیل کے اپنے بیان کے مطابق اہل مکہ نے اسے حضور ﷺ کے متعلق بتایا:

''یہ شخص جو ہم میں سے نکلا ہے، اس سے ذرا بچ کر رہنا۔ اسے جادو آتا ہے، جس کی وجہ سے باپ بیٹے، میاں بیوی اور بھائی بھائی میں پھوٹ ڈال دیتا ہے۔ اس نے ہماری یک جہتی اور اتحاد کو درہم برہم اور ہمارے کاموں کو ابتر کر دیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمھاری قوم پر بھی ایسی ہی کوئی مصیبت پڑے، اس لیے ہماری نصیحت یہ ہے کہ اس شخص کے پاس بھی نہ پھٹکنا۔ نہ اس کی بات پر دھیان دینا اور نہ خود بات

چیت کرنا۔"

طفیل بن عمر کا کہنا ہے: "یہ باتیں اہل مکہ نے ایسی سدگی سے میرے ذہن نشین کر دیں کہ جب میں کعبے میں جانا چاہتا تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتا، مبادا کہ محمد ﷺ کی آواز کی بھنک بھی میرے کانوں میں پڑ جائے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں علی الصباح خانۂ کعبہ میں گیا۔ اس وقت نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ چوں کہ خدا کی مرضی یہ تھی کہ حضور ﷺ کی آواز میرے کانوں تک ضرور پہنچے، اس لیے میں نے سنا کہ آپ ﷺ ایک نہایت ہی عجیب کلام پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ میں خود شاعر ہوں، باعلم ہوں، اچھے برے کی تمیز رکھتا ہوں۔ پھر کیا وجہ ہے؟ اور کون سی رکاوٹ ہے؟ کہ میں حضور ﷺ کی بات نہ سنوں۔ اگر اچھی بات ہوگی تو قبول کرلوں گا، ورنہ انکار کر دوں گا۔ میں اس ارادے سے ٹھہر گیا۔ آخر جب حضور ﷺ گھر کو چلے تو میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا، اور جب مکان پر حاضر ہوا تو میں نے اپنا یہ تمام واقعہ حضور ﷺ کو سنایا کہ میں کس طرح مکہ میں آیا۔ لوگوں کے بہکانے سے کانوں میں روئی رکھ کر خانہ کعبہ میں آتا جاتا رہا، اور آج حضور ﷺ سے ایک عجیب پرلطف کلام سنا، جو میرے دل میں گھر کر گیا ہے، اور دربار رسالت ﷺ میں عرض کیا کہ مجھے آپ ﷺ اپنی بات سنائیں۔ آنحضرت ﷺ نے میری درخواست قبول فرماتے ہوئے قرآن حکیم پڑھا۔ بخدا، میں نے ایسا پاکیزہ کلام کبھی سنا ہی نہیں تھا، جو اس قدر نیکی اور انصاف کی ہدایت کرتا ہو۔ چناں چہ میں نے وہیں اسلام قبول کر لیا اور حق کی شہادت دی۔ اس کے بعد آپ ﷺ سے عرض کیا کہ میری قوم میں میری بات مانی جاتی ہے، میں ان کے پاس پلٹ کر جاؤں گا اور انھیں اسلام کی دعوت دوں گا، لہٰذا آپ ﷺ اللہ سے دعا فرمائیں کہ وہ مجھے کوئی نشانی دے دے۔ آپ نے دعا فرمائی۔"

حضرت طفیلؓ کو جو نشانی عطا ہوئی، وہ یہ تھی کہ جب وہ اپنی قوم کے پاس پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے چہرے پر چراغ جیسی روشنی پیدا کر دی۔ انھوں نے کہا: "یا اللہ، چہرے کے بجائے کسی اور جگہ۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لوگ اسے مثلہ کر دیں گے۔" چناں چہ یہ روشنی ان کے ڈنڈے میں پلٹ گئی۔ پھر انھوں نے اپنے والد اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی اور وہ دونوں مسلمان ہوگئے، ان کی قوم نے اسلام قبول کرنے میں تاخیر کی، مگر حضرت طفیلؓ بھی مسلسل کوشاں رہے۔ حتیٰ کہ غزوۂ خندق کے بعد جب انھوں نے ہجرت فرمائی تو ان کے ساتھ ان کی قوم کے ستر یا اسی خاندان تھے۔ حضرت طفیلؓ نے اسلام میں بڑے اہم کارنامے انجام دے کر یمامہ کی جنگ میں جام شہادت نوش فرمایا اور ابن ہشام کی روایت کے مطابق صلح حدیبیہ کے بعد شہادت پائی، کیوں کہ جب وہ مدینہ تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ خیبر میں تھے۔

ضماد ازدی

یہ یمن کے باشندے تھے۔ جھاڑ پھونک کرنا اور آسیب اتارنا ان کا کام تھا۔ مکہ آئے تو وہاں کے احمقوں سے سنا کہ محمد ﷺ پاگل ہیں۔ سوچا کیوں نہ اس شخص کے پاس چلوں۔ ہوسکتا ہے، خدا میرے ہی ہاتھوں سے اسے شفا دے دے۔ چناں چہ اس نے آپ ﷺ سے ملاقات کی، اور کہا: "اے محمد ﷺ، میں آسیب اتارنے کے لیے جھاڑ پھونک کیا کرتا ہوں۔ کیا آپ کو بھی اس کی ضرورت ہے؟"

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"الحمد لله نحمده، ونستعينه من يهده الله فلا مضلّ لهٗ و من يضلله فلا هادي لهٗ وانّي اشهد ان لا إله الا الله وحدهٗ، لا شريك له و اشهد أنّ محمداً عبدهٗ و رسولهٗ."

"تمام ثنا وصفت کا مستحق اللہ ہے۔ ہم اس کی حمد کرتے ہیں اور ہر کام میں اس کی مدد کے طلب گار ہوتے ہیں۔ جسے اللہ راہ ہدایت دکھا دیتا ہے، اسے کوئی گم راہ نہیں کر سکتا، اور جسے اللہ ہی راہ نہ دکھائے، اسے کوئی راہ پر نہیں لا سکتا۔ میں یہ بتاتا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرنی چاہیے۔ وہ ایک ہے اور شریک کار سے بے نیاز ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ محمد ﷺ، اس کا بندہ اور رسول ہے۔"

ضماد پر ان کلمات کا بے حد اثر ہوا۔ اس نے یہ کلمات دوبارہ بلکہ سہ بارہ پڑھنے کی درخواست کی۔ حضور ﷺ نے ضماد کی استدعا پر دو تین مرتبہ یہ کلمات تلاوت فرمائے۔ غرضیکہ تین مرتبہ سننے کے بعد ضماد بے اختیار بول اٹھے: "میں نے بہتیرے کاہن اور جادوگر دیکھے۔ بہت شاعروں کا کلام سنا، لیکن ایسا کلام تو میں نے کسی سے بھی نہیں سنا۔ یہ کلمات تو ایک اتھاہ سمندر جیسے ہیں۔ محمد! خدارا اپنا ہاتھ بڑھائیے کہ میں اسلام کی بیعت کرلوں۔" پھر حضرت ضماد نے اسلام قبول کرلیا۔

اسراء اور معراج

عام طور پر اس واقعے کے ضمن میں اسراء اور معراج کے دو عنوان قائم کیے جاتے ہیں اور ان میں کسی قدر فرق ہے۔ اسراء سے مراد مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک زمینی سفر ہے، جس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ بنی اسرائیل (آیت: ۱) میں کیا گیا ہے، جس کا دوسرا نام "سورۂ اسراء" ہے۔ "معراج" سے مراد عروج آسمانی ہے، جس میں رؤیت ملائکہ سے لے کر جنت و دوزخ کی سیر اور مناجات باری تک کے مقاصد شامل ہیں۔ اس کا ذکر سورۂ نجم" (آیات 1 تا 18) میں آیا ہے۔

یہ بے نظیر اور حیرت انگیز واقعہ کس مہینہ اور نبوت کے کس سال میں پیش آیا؟ اس کے تعین میں اختلاف ہے۔ تاہم مستند اور محقق یہی ہے کہ یہ واقعہ 27 رجب 10 نبوی کو بوقت شب بعد از نماز عشاء وقبل از نماز فجر پیش آیا۔

سورۂ بنی اسرائیل (سورۂ اسراء) کی پہلی آیت میں صرف مسجد حرام (یعنی بیت اللہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس تک حضور ﷺ کے لیے جائے جانے کی تصریح کی گئی ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ (الاسراء: 1)

"پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اس مسجد تک جس کے ماحول کو اس نے برکت دی ہے، تا کہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔"

اس کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرانا چاہتا تھا۔ اس سے زیادہ کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی، لیکن حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس واقعے کی تفصیلات بکثرت صحابہؓ سے مروی ہیں، جن کی تعداد کم از کم پچیس تک پہنچتی ہے۔

بخاری و مسلم میں منقول صحیح، مشہور اور مقبول روایات کا مجموعی بیان یہ ہے:

"نبی کریم ﷺ نے ایک صبح کو ارشاد فرمایا کہ "گزشتہ شب میرے خدا نے مجھے اپنے خاص شرف سے نوازا۔ گزشتہ شب جب کہ میں سو رہا تھا، رات کے ایک حصے میں جبرائیل آئے، مجھے بیدار کیا۔ میں ابھی پوری طرح جاگ بھی نہ پایا تھا کہ وہ مجھے حرم کعبہ میں اٹھا لائے۔ میں تھوڑی دیر لیٹا تھا کہ پوری طرح بیدار کر کے پہلے میرے سینہ کو چاک کیا اور (دنیاوی کدورتوں کو) دھویا اور ایمان و حکمت سے بھر دیا۔ اس کے بعد حرم کے دروازے پر لایا گیا اور وہاں جبرئیل نے میری سواری کے لیے خچر سے کچھ چھوٹا جانور براق پیش کیا، جو سپید رنگ کا تھا۔"

"جب میں براق پر سوار ہو کر روانہ ہوا تو اس کی سبک رفتاری کا یہ عالم تھا کہ حدِ نگاہ اور حدِ رفتار یکساں نظر آتی تھی کہ یکایک بیت المقدس جا پہنچے۔ یہاں جبرئیلؑ کے اشارے پر براق کو مسجد کے دروازے کے اس حصے سے باندھ دیا جہاں انبیا اپنی سواریاں باندھا کرتے تھے۔ مسجد اقصیٰ میں آپ ﷺ نے انبیائے کرام کے ساتھ نماز ادا کی۔ اب یہاں سے ملاءِ اعلیٰ کی تیاری شروع ہوئی تو اول جبرئیلؑ نے میرے سامنے دو پیالے پیش کیے۔ ان میں سے ایک شراب سے لبریز تھا اور دوسرا دودھ سے۔ مَیں نے دودھ کا پیالہ قبول کیا اور شراب کا پیالہ مسترد کر دیا۔ یہ دیکھ کر جبرئیلؑ نے کہا: "آپ نے دودھ کا پیالہ قبول کر کے دینِ فطرت کو اختیار کیا۔ اور یاد رکھیے کہ اگر آپ ﷺ نے شراب پی ہوتی تو آپ کی امت گم راہ ہو جاتی۔"

اس کے بعد ملاءِ اعلیٰ کا سفر شروع ہوا اور جبرئیل کی ہم رکابی میں براق نے آسمان کی جانب پرواز کی۔ جب ہم پہلے آسمان تک پہنچ گئے تو جبرئیل نے نگہبان فرشتوں سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ نگہبان فرشتے نے دریافت کیا "کون ہے؟" جبرئیل نے کہا: "میں جبرئیل ہوں۔" فرشتے نے دریافت کیا: "تمھارے ساتھ کون ہے؟" جبرئیل نے جواب دیا: "محمد ﷺ۔" فرشتے نے کہا: "کیا خدا کے مدعو ہو کر آئے ہیں؟"۔ جبرئیلؑ نے کہا: "بے شک۔" فرشتے نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: "ایسی ہستی کا آنا مبارک ہو۔"

جب ہم اندر داخل ہوئے تو حضرت آدم ﷺ سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیلؑ نے میری جانب مخاطب ہو کر کہا: "یہ آپ ﷺ کے والد آدمؑ ہیں۔ آپ انھیں سلام کیجیے۔" مَیں نے انھیں سلام کیا اور انھوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"مرحبا با بن الصالح والنبی الصالح."

"خوش آمدید صالح بیٹے اور صالح نبی۔"

اس کے بعد دوسرے آسمان تک پہنچے اور پہلے آسمان کی طرح سوال و جواب ہو کر دروازے میں داخل ہوئے تو وہاں یحییٰ و عیسیٰ علیہما السلام سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیل نے ان کا تعارف کرایا اور کہا آپ سلام پر پیش قدمی فرمائیے۔ مَیں نے سلام کیا۔ ان دونوں نے جواب دیتے ہوئے فرمایا:

"مرحبا بالاخ والنبی الصالح."

"خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی۔"

پھر تیسرے آسمان تک پہنچ کر یہی مرحلہ پیش آیا، اور جب میں تیسرے آسمان میں داخل ہوا تو حضرت یوسفؑ سے ملاقات ہوئی۔ جبرئیلؑ نے سلام کے لیے کہا اور میرے سلام کرنے پر یوسفؑ نے بھی سلام کا جواب دینے کے بعد یہی کلمہ کہا: "خوش آمدید اے برگزیدہ بھائی اور برگزیدہ نبی۔"

بعد ازاں چوتھے آسمان پر اس سوال و جواب کے ساتھ حضرت ادریسؑ سے ملاقات ہوئی۔ پانچویں آسمان پر حضرت ہارونؑ سے اور چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰؑ سے اسی طرح ملاقات ہوئی، لیکن جب میں وہاں سے روانہ ہونے لگا تو حضرت موسیٰؑ پر رقت طاری ہوگئی۔ مَیں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا: "مجھے یہ رشک ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے ایسی ہستی کو جو میرے بعد مبعوث ہوئی، یہ شرف بخش دیا کہ اس کی امت میری امت کے مقابلے میں چند در چند زیادہ جنت سے فیض یاب ہوگی۔

اس کے بعد حسب سابق سوال و جواب کا مرحلہ طے ہو کر جب میں ساتویں آسمان پر پہنچا تو حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ہوئی جو بیت معمور سے پشت لگائے بیٹھے تھے، اور جس میں ہر روز ستر ہزار فرشتے (عبادت کے لیے) داخل ہوتے ہیں۔ انھوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: "مرحبا اے میرے برگزیدہ بیٹے اور برگزیدہ نبی۔"

سات آسمانوں میں سے گزرنے کے بعد جلد ہی وہ مقام آن پہنچا تھا، جہاں "لوح محفوظ" پر قلم لکھنے میں مصروف تھا اور قلم کے لکھنے کی آواز آ رہی تھی۔ فرشتے خالقِ کائنات کی حمد و ثنا میں مصروف تھے۔ آخر کار حضور ﷺ "سدرۃ المنتہیٰ" تک پہنچ گئے تھے۔ یہ حد انتہائی تھی۔ یہاں پہنچ کر جبرئیلؑ یہ کہہ کر جدا ہو گئے: "یہ حد ادراک ہے جہاں رک جانے پر میں مجبور ہوں کہ اس مقام سے آگے میرا گزر ممکن نہیں، مگر اے شاہ مرسلاں اے محبوب خدا، آپ ﷺ اپنا سفر جاری رکھیں اور اپنے نور کے جلو میں نور مجسم خالق کائنات تک پہنچ جائیں، کہ رب دو جہاں آج کی رات اپنے محبوب کی آمد کا منتظر ہے۔"

اور پھر اللہ کا منتخب بندہ، اس کا محبوب وجہ تخلیق کائنات رحمۃ للعالمین، ان پردوں میں سے گزرتا گیا، جن میں وہ نہاں تھا، جو انسانی نظروں سے مستور ہے، یہاں تک کہ وہ وحدت کے آخری پردے تک جا پہنچا۔ پھر اس ﷺ نے اپنی نظروں سے اس

ذاتِ مطلق کو دیکھا، جسے کوئی دوسری آنکھ دیکھنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ محمد ﷺ کی جسمانی آنکھیں اس تجلی کو پوری طرح نہ دیکھ سکتی تھیں، اس لیے اللہ نے اپنے رسول کے قلب کی آنکھ روشن فرما دی، جواب ذاتِ خداوندی کے لامتناہی جلووں کو دیکھ سکتی تھی۔ سورۂ نجم کی ابتدائی سترہ آیات کی تلاوت کا وقت آ گیا ہے:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝﴾

(النجم: 1تا18)

"قسم ہے تارے کی، جب کہ وہ غروب ہوا۔ تمھارا رفیق نہ بھٹکا ہے نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔ اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحبِ حکمت ہے۔ وہ سامنے آ کھڑا ہوا جب کہ وہ بالائی افق پر تھا۔ پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر جھگڑتے ہو جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ اور ایک مرتبہ پھر اس نے سدرۃ المنتہٰی کے پاس اسے اترتے دیکھا، جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت سدرہ پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی نہ حد سے تجاوز ہوئی، اور اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

آپ نے جنت میں چار نہریں دیکھیں۔ دو ظاہری اور دو باطنی۔ ظاہری نہریں نیل و فرات تھیں۔ آپ ﷺ نے مالک، داروغہ جہنم کو بھی دیکھا۔ وہ ہنستا نہ تھا اور نہ اس کے چہرے پر خوشی اور بشاشت تھی۔ آپ ﷺ نے جنت و جہنم بھی دیکھی۔

آپ ﷺ نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جو یتیموں کا مال کھا جاتے ہیں۔ ان کے ہونٹ اونٹ کے ہونٹوں کی طرح تھے۔

آپ ﷺ نے سود خوروں کو بھی دیکھا۔ ان کے پیٹ اتنے بڑے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتے تھے، اور جب آلِ فرعون کو آگ پر پیش کرنے کے لیے لے جایا جاتا تو ان کے پاس سے گزرتے وقت انھیں روندتے ہوئے جاتے تھے۔

آپ ﷺ نے زناکاروں کو بھی دیکھا۔ ان کے سامنے تازہ اور فربہ گوشت تھا اور اس کے پہلو بہ پہلو سڑا ہوا چھیچھڑا بھی تھا۔ یہ لوگ تازہ اور فربہ گوشت چھوڑ کر سڑا ہوا چھیچھڑا کھا رہے تھے۔

آپ نے ان عورتوں کو دیکھا جو اپنے شوہروں پر دوسروں کی اولاد داخل کر دیتی ہیں۔ آپ نے انھیں دیکھا کہ ان کے سینوں میں بڑے بڑے ٹیڑھے کانٹے چبھا کر انھیں آسمان و زمین کے درمیان لٹکا دیا گیا ہے۔

آپ ﷺ نے آتے جاتے ہوئے اہل مکہ کا ایک قافلہ بھی دیکھا اور انھیں ان کا ایک اونٹ بھی بتایا جو بھڑک کر بھاگ گیا تھا۔ آپ ﷺ نے ان کا پانی بھی پیا جو ایک ڈھکے ہوئے برتن میں رکھا تھا۔ اس وقت قافلہ سو رہا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے اسی طرح برتن ڈھک کر چھوڑ دیا اور یہ بات معراج کی صبح آپ ﷺ کی صداقت کی ایک دلیل ثابت ہوئی۔

دوسرے دن صبح سب سے پہلے آپ نے اپنی چچا زاد بہن ام ہانی کو یہ روداد سنائی۔ پھر باہر نکلنے کا قصد کیا۔ انھوں نے آپ ﷺ کی چادر پکڑ لی اور کہا، خدا کے لیے یہ قصہ لوگوں کو نہ سنایئے گا، ورنہ انھیں آپ ﷺ کا مذاق اڑانے کے لیے ایک اور شوشہ ہاتھ آ جائے گا۔ مگر آپ ﷺ یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئے کہ میں ضرور بیان کروں گا۔

حرم کعبہ میں پہنچے تو ابوجہل سے آمنا سامنا ہوا۔ اس نے کہا "کوئی تازہ خبر؟"

فرمایا: "ہاں"۔ پوچھا کیا؟

فرمایا: "میں آج رات بیت المقدس گیا تھا۔"

ابوجہل نے کہا: "بیت المقدس؟ راتوں رات ہو آئے؟ اور صبح یہاں موجود ہو؟"

حضور ﷺ نے فرمایا: "ہاں۔"

ابوجہل نے کہا: "قوم کو جمع کروں؟ سب کے سامنے یہی بات کہو گے؟"

فرمایا: "بے شک۔"

ابوجہل نے چلا چلا کر لوگوں کو جمع کیا اور کہا: "اے قریش! جلدی کرو، آؤ اور محمد ﷺ کی زبانی شب معراج کے سفر کی حیرت انگیز کہانی سنو۔"

حضور ﷺ نے سب کے سامنے پورا قصہ بیان کر دیا۔ لوگوں نے مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ کوئی تالی پیٹ رہا تھا تو کوئی تعجب سے سر پر ہاتھ رکھ رہا تھا۔ دو مہینے کا سفر ایک رات میں؟ ناممکن۔ پہلے تو شک تھا، اب یقین ہو گیا کہ تم دیوانے ہو گئے ہو۔ آناً فاناً یہ خبر عام مکہ میں پھیل گئی۔ بعض مسلمان اسے سن کر اسلام سے پھر گئے۔ لوگ اس امید پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس پہنچے کہ یہ محمد ﷺ کے دست راست ہیں، یہ پھر جائیں تو اس تحریک کی جان ہی نکل جائے۔ انھوں نے یہ قصہ سن کر کہا، اگر واقعی محمد ﷺ نے یہ واقعہ بیان کیا ہے تو ضرور سچ ہو گا۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ میں تو روز سنتا ہوں کہ ان کے پاس آسمان سے پیغام آتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتا ہوں۔

پھر حضرت ابوبکرؓ حرم کعبہ میں آئے۔ رسول اللہ موجود تھے اور ہنسی اڑانے والا مجمع بھی۔ پوچھا، کیا واقعی آپ ﷺ نے ایسا فرمایا ہے۔ جواب دیا، ہاں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا: "بیت المقدس میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپ وہاں کا نقشہ بیان کریں۔"

حضور ﷺ نے بیت المقدس کا نقشہ بیان کرنا شروع کر دیا اور ایک ایک چیز

اس طرح بیان کی، گویا بیت المقدس سامنے موجود ہے اور دیکھ دیکھ کر اس کی کیفیت بتا رہے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی اس تدبیر سے جھٹلانے والوں کو ایک شدید ضرب لگی۔

وہاں بکثرت ایسے آدمی موجود تھے، جو تجارت کے سلسلے میں بیت المقدس جایا کرتے تھے۔ وہ سب دلوں میں قائل ہو گئے کہ نقشہ بالکل صحیح ہے۔ اب لوگ آپ ﷺ کے بیان کی صحت کا مزید ثبوت مانگنے لگے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلے پر سے گزرا جس کے ساتھ یہ یہ سامان تھا۔ قافلے والوں کے اونٹ براق کو دیکھ کر بھڑکے۔ ایک اونٹ فلاں وادی کی طرف بھاگ نکلا۔ مَیں نے قافلے والوں کو اس کا پتا دیا۔ واپسی پر فلاں وادی میں فلاں قبیلے کا قافلہ مجھے ملا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ مَیں نے ان کے برتن سے پانی پیا۔ اور اس بات کی نشانی چھوڑ دی کہ اس سے پانی پیا گیا ہے۔ ایسی ہی کچھ اور نشانیاں آپ ﷺ نے دیں۔ بعد میں آنے والے قافلوں سے ان کی تصدیق ہوئی۔ اس طرح زبانیں بند ہو گئیں۔ مگر دل یہی سوچتے رہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آج بھی بہت سے لوگ سوچ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہوا؟

معراج کے اس سفر کی کیفیت کیا تھی؟ یہ عالم خواب میں پیش آیا تھا یا بیداری میں؟ اور آیا حضور ﷺ بذاتِ خود جسمانی طور پر تشریف لے گئے تھے یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محض روحانی طور پر ہی آپ ﷺ کو یہ مشاہدہ کرا دیا گیا؟ ان اہم سوالات کا جواب ''معجزات رسول ﷺ'' والے باب میں تفصیل سے موجود ہے۔

معراج رسول ﷺ کے نتیجے میں مسلمانانِ عالم کو مندرجہ ذیل چار تحفے مستقل حاصل ہوئے:

1: ہر روز پانچ نمازیں فرض کی گئیں (ابتدا میں پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں۔ پھر معراج کے سفر کی واپسی میں حضرت موسیٰ کے کہنے پر حضور ﷺ نے بار بار جا کر کمی کے لیے عرض کیا اور آخر میں پانچ نمازیں فرض رہ گئیں اور انھیں کو اللہ تعالیٰ نے پچاس کے برابر قرار دیا)

2: سورۂ بقرہ کی آخری دو آیات تعلیم فرمائی گئیں۔

3: شرک کے سوا دوسرے سب گناہوں کی بخشش کا امکان ظاہر کیا گیا۔

4: ارشاد ہوا کہ جو شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے، اس کے حق میں ایک نیکی لکھ لی جاتی ہے اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، مگر جو برائی کا ارادہ کرتا ہے، اس کے خلاف کچھ نہیں لکھا جاتا، اور جب وہ اس پر عمل کرتا ہے تو ایک ہی برائی لکھی جاتی ہے۔

پہلی بیعت عقبہ

یہ نبوت کا گیارھواں سال ہے۔ ہجرت سے دو سال قبل (اور 62ء)۔ زمانہ حج میں قبیلہ خزرج کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ آئے۔ حضور ﷺ اپنے قاعدے کے مطابق قبائل عرب سے ملاقات کے لیے منیٰ کی طرف نکلے اور پھرتے پھراتے عقبہ کے قریب قبیلہ خزرج کے چند لوگوں کے پاس پہنچے جو آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ''عقبہ'' کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری اپنی تصنیف ''الرحیق المختوم'' میں لکھتے ہیں: ''عقبہ پہاڑ کی گھاٹی یعنی تنگ پہاڑی گزرگاہ کو کہتے ہیں۔ مکہ سے منیٰ آتے جاتے ہوئے، منیٰ کے مغربی کنارے پر ایک تنگ پہاڑی راستے سے گزرنا پڑتا ہے، یہی گزرگاہ عقبہ کے نام سے مشہور ہے۔ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ کو جس ایک جمرہ کو کنکری ماری جاتی ہے، وہ اسی گزرگاہ کے سرے پر واقع ہے، اسی لیے اسے ''جمرۂ عقبہ'' کہتے ہیں۔ اس جمرہ کا دوسرا نام جمرہ کبریٰ بھی ہے۔ باقی دو جمرے اس سے مشرق میں تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔ چوں کہ منیٰ کا پورا میدان، جہاں حجاج قیام کرتے ہیں، ان تینوں جمرات کے مشرق میں ہے، اس لیے ساری چہل پہل ادھر ہی رہتی تھی اور کنکریاں مارنے کے بعد اس طرف لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ اسی لیے نبی ﷺ نے بیعت لینے کے لیے اس گھاٹی کو منتخب کیا اور اسی مناسبت سے اسے ''بیعت عقبہ'' کہتے ہیں۔ اب پہاڑ کاٹ کر یہاں کشادہ سڑکیں نکال لی گئی ہیں۔''

آپ ﷺ حسب معمول ان لوگوں کے پاس تشریف لے گئے اور اسلام کی دعوت دی۔ انھیں قرآن سنایا۔ ان لوگوں نے آپس میں کہا: ''بھائیو، جان لو کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی آمد کے ڈراوے یہودی تمھیں دیا کرتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے سبقت لے جائیں۔'' چناں چہ پورے اطمینان کے ساتھ انھوں نے آپ ﷺ کی دعوت قبول کر لی۔ آپ ﷺ کی تصدیق کی اور اسلام جو آپ ﷺ نے ان کے سامنے پیش فرمایا تھا، اس پر ایمان لے آئے۔ پھر انھوں نے عرض کیا کہ ''ہم نے اپنی قوم کو اس حالت میں چھوڑا ہے کہ کوئی قوم ایسی نہ ہو گی جس میں اس سے زیادہ باہمی عداوت پائی جاتی ہو۔ شاید کہ اللہ تعالیٰ آپ کی وجہ سے انھیں جمع کر دے۔ ہم ان کے پاس واپس جاتے ہیں اور آپ کی طرح انھیں دعوت دیتے ہیں اور وہ دین ان کے سامنے پیش کرتے ہیں جو ہم نے قبول کیا ہے۔

''اگر اللہ نے انھیں آپ پر جمع کر دیا تو کوئی شخص آپ سے زیادہ طاقت ور نہ ہو گا۔''

یہ چھے آدمی تھے۔ ان کی فہرست یہ ہے:

بنی مالک بن النجار سے

1: ابوامامہؓ اسعد بن زرارہ (جاہلیت میں بھی توحید کے قائل اور بت پرستی کے مخالف تھے)۔

2: عوفؓ بن الحارث بن رفاعہ

بنی زریق میں سے

3: رافعؓ بن مالک

بنی سلیم میں سے

4: قطبہ بن عامر بن حدیدہ

بنی حرام بن کعب میں سے

5: عقبہؓ بن عامر بن نابی

بنی عبیدہ بن عدی میں سے

6: جابر بن عبداللہ بن رئاب

دوسری بیعت عقبہ

(بارھواں سال نبوی)

عقبہ کے مقام پر اسلام قبول کرنے والے یہ اولین چھے اصحاب مدینے واپس پہنچے تو انھوں نے وہاں اسلام کا چرچا شروع کیا، یہاں تک کہ انصار کے محلوں میں سے کوئی محلہ ایسا باقی نہ رہا جس میں رسول اللہ کا ذکر نہ ہونے لگا ہو۔ پھر دوسرے سال (یعنی سن بارہ نبوت) میں حج کے موقع پر مدینے کے بارہ آدمی آنحضرت ﷺ سے اسی عقبہ کے مقام پر ملے، جہاں گزشتہ سال خزرج کے لوگوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان میں پانچ آدمی تو وہی تھے جو پچھلے سال مسلمان ہوئے تھے (جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اس سال نہیں آئے تھے)۔ باقی سات آدمیوں میں پانچ خزرج کے اور دو اوس کے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

1: ذکوانؓ بن عبد قیس (ابن ہشام کا بیان ہے کہ یہ مدینہ سے مکہ واپس آ کر حضور ﷺ کے ساتھ ہی رہے اور آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی)

2: عبادہؓ بن صامت (خزرج)

3: معاذؓ بن الحارث (خزرج)

4: یزیدؓ بن ثعلبہ (خزرج)

5: عباسؓ بن عبادہ (خزرج)

6: ابوالہیثم مالک بن تیہان (اوس)

7: عویمؓ بن ساعدہ (اوس)

ابن اسحاق نے حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے اس بات پر بیعت کی: "یہ کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے۔ چوری نہ کریں گے۔ زنا نہ کریں گے۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے۔ اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گے (یعنی کسی پر جھوٹا الزام نہ لگائیں گے) اور یہ کہ کسی امر معروف میں رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی نہ کریں گے، اور آپ ﷺ کا حکم سنیں گے اور مانیں گے، خواہ ہم پر کسی کو ترجیح دی جائے، اور ہم حکومت کے معاملے میں اہل حکومت سے نزاع نہ کریں گے (مسند احمد میں اضافہ ہے کہ "اگرچہ تم سمجھتے ہو کہ حکومت میں ہمارا حق ہے" اور بخاری میں یہ اضافہ ہے کہ "الا یہ کہ تم کھلا کھلا کفر دیکھو") اور یہ کہ ہم جہاں اور جس حال میں بھی ہوں، حق بات کہیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ پس اگر تم نے اس عہد کو وفا کیا تو تمھارے لیے جنت ہے، اور اگر کسی نے ممنوع کاموں میں سے کسی کا ارتکاب کیا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، چاہے عذاب دے، چاہے معاف فرما دے۔"

مدینے میں اسلام کا پہلا سفیر: مصعبؓ بن عمیر

جب یہ بارہ نومسلم مدینہ واپس جانے لگے تو رسول اللہ نے ان کے ساتھ مصعبؓ بن عمیر کو بھیجا تاکہ انھیں قرآن کی تعلیم دیں اور اسلام سکھائیں اور ان کے اندر دین کی سمجھ پیدا کریں۔ چناں چہ مصعبؓ بن عمیر مدینے جا کر اسعدؓ بن زرارہ کے ہاں ٹھہرے گئے۔ ان کی قیادت میں انصار کے لوگوں نے بڑی تیزی کے ساتھ اسلام پھیلانا شروع کیا۔ کئی سرداروں نے اسلام قبول کیا۔ بنی عبدالاشہل کے سردار سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر ایک ہی دن ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے اور ان کے اسلام قبول کرتے ہی ان کا پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ سعدؓ اور اسیدؓ کے مسلمان ہونے کا قصہ دل چسپ ہے۔

ایک روز اسعدؓ بن زرارہ حضرت مصعبؓ بن عمیر کو ساتھ لے کر بنی ظفر (قبیلہ اوس کی ایک شاخ) کے باغوں میں سے ایک باغ میں گئے۔ وہاں وہ متعدد اصحاب جمع ہو گئے جو مسلمان ہو چکے تھے۔ اس کی اطلاع جب سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر کو پہنچی تو سعد نے اسید سے کہا کہ ذرا ان دونوں آدمیوں (اسعدؓ اور مصعبؓ) کے پاس جاؤ جو ہماری بستیوں میں آ کر ہمارے کم زور لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور انھیں ڈانٹ کر ہمارے علاقے میں آنے سے منع کر دو۔"

اس پر اسید بن حضیر تلوار لے کر باغ میں پہنچے اور کہا: "آپ کیوں ہمارے بچوں اور عورتوں کو بہکاتے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیں۔"

یہ سن کر مصعبؓ بن عمیر نے اسید سے فرمایا: "آپ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھیں، اور جو میں کہوں، اسے غور سے سنیں۔ اگر میری بات پسند آئے تو قبول کر لیں۔ اور اگر ناپسند ہو تو کنارہ کشی اختیار کریں۔"

یہ بات سن کر اسید بن حضیر ان کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر حضرت مصعبؓ بن عمیر نے ان کے سامنے اسلام کے محاسن بیان فرمائے۔ قرآن مجید کی تلاوت کی۔ "اسید نے سن کر کہا: "کیا ہی عمدہ اور کیا ہی بہتر کلام ہے۔" پھر پوچھا: "اس دین میں داخل ہونے کا کیا طریقہ ہے؟"

حضرت مصعبؓ بن عمیر نے فرمایا: "اول جسم اور کپڑوں کو پاک کرو، پھر کلمۂ شہادت پڑھو اور نماز ادا کرو۔"

اسید بن حضیر نے ایسا ہی کیا اور مسلمان ہو گئے۔ پھر سعد بن معاذ کو حضرت مصعبؓ کی خدمت میں بھیجنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ جب اسیدؓ واپس تشریف لائے تو سعد بن معاذ نے انھیں دیکھ کر کہا: تم وہ پہلے والے اسید معلوم نہیں ہوتے۔" حضرت اسیدؓ نے فرمایا: میں نے ان کی باتوں میں کوئی حرج نہیں پایا۔" یہ سن کر سعد بن معاذ کو غصہ آ گیا، اور تلوار سونت کر خود وہاں پہنچا، اور حضرت اسعد بن زرارہؓ سے مخاطب ہو کر کہا: "اگر تم سے میری قربت نہ ہوتی اور تم میرے خالہ زاد بھائی نہ ہوتے تو میں ابھی تلوار سے تمھارا کام تمام کر دیتا۔ تم قوم کو بہکانے کے لیے ان لوگوں کو یہاں کیوں لائے ہو؟"

حضرت مصعبؓ بن عمیر نے کہا: ''کیا یہ ممکن نہیں کہ تم کچھ دیر بیٹھ کر میری بات سنو۔ اگر پسند آئے تو قبول کر لینا، ورنہ پھر جو چاہو کرنا۔''

سعد بن معاذ یہ بات سن کر بیٹھ گئے۔ حضرت مصعبؓ نے ان کے سامنے بھی اسلام پیش کیا، اور قرآن حکیم کی تلاوت فرمائی۔ یہ پاکیزہ کلام سنتے ہی سعد بن معاذ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ غصہ یک لخت کافور ہو گیا، اور ان کا دل خود بخود اسلام کی کشش محسوس کرنے لگا، کہنے لگے: ''اس دین میں داخل ہونے کا طریقہ ہے؟''
حضرت مصعبؓ بن عمیر نے وہی طریقہ بتلایا، جو وہ پہلے اسیدؓ کو بتلا چکے تھے۔ چناں چہ سعد بن معاذ نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اسلام لے آئے۔

حضرت سعد بن معاذؓ قبول اسلام کے بعد سیدھے اپنی قوم کی مجلس میں پہنچے۔ لوگوں نے ان کے بدلے ہوئے تیور دیکھ کر قیاس کر لیا کہ یہ وہ سعد نہیں جو برہنہ تلوار لے کر مصعبؓ کے پاس گئے تھے۔ چناں چہ حضرت سعدؓ نے مجلس میں پہنچتے ہی اپنے قبیلے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے بنی عبدالاشہل، میرے متعلق تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟'' سب لوگوں نے کہا: ''تم ہمارے سردار ہو۔ تمھاری رائے اور تمھاری تلاش بہتر اور اعلیٰ ہے۔''

سعدؓ نے کہا: ''تو سنو، خدا کی قسم! میں تم سے اس وقت تک کلام نہ کروں گا، جب تک کہ تم سب مرد اور عورتیں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان نہ لے آؤ۔''

حضرت سعدؓ کے کہنے کا یہ اثر ہوا کہ قبیلے میں شام تک کوئی فرد ایسا نہ رہا، جس نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو، سوائے ایک شخص عمرو بن ثابت کے، جن کا لقب اصیرم تھا۔ یہ غزوہ احد کے دن اسلام لائے۔ جہاد کے لیے غزوہ میں پہنچے اور شہید ہوئے۔ حضور ﷺ نے ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی۔ یہ واحد مسلمان ہیں جنھوں نے ایک نماز بھی نہیں پڑھی اور شہادت کا درجہ حاصل کر کے جنت میں پہنچ گئے۔

مدینے میں جمعہ کا قیام

نماز جمعہ کا حکم آنے سے پہلے ہی مدینے کے انصار نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ ہفتے میں ایک دن اجتماعی نماز پڑھیں گے اور اس غرض کے لیے انھوں نے یہودیوں کے ہفتے اور عیسائیوں کے اتوار کو چھوڑ کر جمعہ کا دن اختیار کیا تھا (جسے جاہلیت کے زمانے میں یوم عروبہ کہا جاتا تھا)۔ سب سے پہلا جمعہ حضرت اسعد بن زرارہ نے بنی بیاضہ کے علاقے میں پڑھایا جس میں چالیس آدمی شریک تھے۔

حضرت عبداللہؓ بن عباس سے روایت ہے کہ مکہ معظمہ میں جب نماز جمعہ کا حکم آیا تو رسول اللہ نے حضرت مصعبؓ بن عمیر کو مدینے تحریری حکم بھیجا کہ زوال کے بعد لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھاؤ۔ مدینے میں اقامت جمعہ کا حکم بھیجنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت مکہ معظمہ میں جمعہ کی نماز پڑھنا ممکن نہ تھا۔

آخری بیعت عقبہ

ذی الحج سن تیرہ (13) نبوی (جولائی 622ء) کا زمانہ حج آنے تک مدینہ میں اسلام خوب پھیل چکا تھا۔ حال یہ ہو گیا تھا کہ ایک آدمی گھر سے نکلتا، ایمان لاتا، قرآن پڑھتا اور پلٹ کر جب اپنے گھر جاتا تو اس کے گھر والے بھی مسلمان ہو جاتے۔ اس طرح انصار کے محلوں میں سے کوئی ایسا نہ رہا، جس میں مسلمانوں کا ایک گروہ نہ پایا جاتا ہو۔

اسی سال حج کے لیے یثرب کے پانچ سو زائرین کا قافلہ مکہ روانہ ہوا۔ ابن اسحاق کی تفصیل کے مطابق مسلمانوں میں سے 73 مرد تھے۔ جن میں گیارہ اوس میں سے تھے اور 62 خزرج میں سے۔ اور دو عورتیں تھیں۔ ایک نسیبہؓ بنت کعب جو اپنے شوہر زیدؓ بن عاصم اور اپنے دو لڑکوں کے ساتھ آئی تھیں، اور دوسری اسماء بنت عمرو۔ ان لوگوں نے وادیٔ منیٰ میں پڑاؤ ڈالا۔ ایام تشریق کے بیچ والے دن کی شب، اسی قدیم گھاٹی عقبہ میں نبی کریم ﷺ سے بیعت کا اہتمام کیا گیا۔ مسلمانوں نے مشرک ساتھیوں سے اپنی مصروفیت پوشیدہ رکھی۔ البتہ ایک نیک طینت مشرک سردار ابو جابر عبداللہ کو اس رات اپنے ہم راہ لے گئے اور ان سے کہا کہ ہم نہیں چاہتے کہ تم جیسا شریف انسان دوزخ کا ایندھن بنے۔ ہم تمھیں اسلام اور رسول کرم ﷺ سے ملاقات کی دعوت دیتے ہیں۔ انھوں نے بخوشی لبیک کہا۔

ایک تہائی رات گزرنے کے بعد یہ لوگ چھپتے چھپاتے دو دو چار چار کی تعداد میں عقبہ میں جمع ہوئے۔ حضور ﷺ اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کے ساتھ تشریف لائے۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ نے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''لوگو! تمھیں معلوم ہے کہ قریش مکہ میرے بھتیجے محمد ﷺ کے خون کے پیاسے ہیں۔ اگر تم ان سے کوئی عہد و پیمان کرنے لگو تو یہ سمجھ لینا کہ یہ بہت مشکل اور نازک کام ہے۔ یہ سرخ و سیاہ آندھیوں کو دعوت دینا ہے۔ جو کچھ کرو، سوچ سمجھ کر کرو۔ یہاں سے ان کے نکلنے اور تم سے جا ملنے کے بعد ان کا ساتھ چھوڑ دینے اور دشمنوں کے حوالے کرنے کا ذرا بھی اندیشہ ہو تو بہتر یہی ہے کہ ابھی انھیں چھوڑ دو۔ وہ اپنی قوم میں مضبوط اور اپنے شہر میں بہر حال محفوظ ہیں۔''

اہل یثرب نے کہا کہ ہم نے آپ کی بات سن لی۔ اب کچھ اللہ کے رسول ﷺ ارشاد فرمائیں اور اپنے لیے جو عہد لینا چاہیں، ہم سے لے لیں۔ اس گزارش پر رسول کریم ﷺ نے قرآن مجید کی تلاوت فرمائی۔ انھیں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا: ''میں تم سے اس شرط پر بیعت لیتا ہوں کہ میری حفاظت اپنی جانوں کے برابر کرو گے۔''

خزرج کے رئیس براء بن معرور نے بڑھ کر آپ ﷺ کا دستِ مبارک پکڑ لیا اور عرض کیا: ''بے شک، ہم آپ ﷺ کی اسی طرح حفاظت کریں گے۔ آپ ﷺ ہم سے بیعت لیں۔''

اتنے میں ابو ہیثم بن تیہان بول اٹھے: ''یا رسول اللہ! اس وقت ہم یہودیوں سے حلیفانہ معاہدہ کیے ہوئے ہیں۔ اب اسے ختم کرنا پڑے گا۔ غلبہ پا کر کہیں آپ ﷺ ہمیں چھوڑ تو نہیں دیں گے؟ اپنی قوم میں واپس تو نہیں ہو جائیں گے؟ ہم تو دوستی کے معاہدے ختم کر کے آپ ﷺ کے لیے لڑائیاں لڑیں تو پھر ایسا

نہ ہو......''

اس پر حضور ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا: ''میرے تمھارے خون اور قصاص و بدلے مشترک ہوں گے۔ میرا خون تمھارا خون، میرا ذمہ تمھارا ذمہ ہے۔ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ تم جس سے لڑو گے، میں اس سے لڑوں گا۔ جس سے تم صلح کرو گے، میں اس سے صلح کروں گا۔''

بنی سالم کے عباسؓ بن عبادہ نے اپنے ساتھیوں کو متنبہ کیا: ''اے گروہ خزرج! تمھیں کچھ معلوم ہے کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم سے جنگ کی بیعت ہے۔ خوب سوچ لو اور سمجھ لو، اس میں تمھاری جائدادیں اور شرفاء ضائع ہوں گے۔ ان سے بچنے کے لیے اگر تم نے انھیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تو اللہ کی قسم! اس میں دین و دنیا دونوں کی رسوائی ہے، اور اگر اپنے عہد پر ثابت قدم رہے تو دین و دنیا میں یہ سب سے بہتر ہوگا اور تم اسے حاصل کر سکتے ہو۔''

حاضرین نے بہ آواز بلند جواب دیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کو لے کر اموال کو تباہی اور اشراف کو ہلاکت میں ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔ اب اسعدؓ بن زرارہ آگے بڑھ کر آئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ، آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ ہم اس کے لیے حاضر ہیں۔ آپ اللہ تعالیٰ کے لیے، اپنے لیے اور اپنے اصحاب کے لیے، ہم سے جو چاہیں، عہد لیں۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ اس کی عبادت کرو۔ کسی اور کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ مجھے اور میرے اصحاب کو پناہ دو۔ ہماری مدد کرو۔''

اس مختصر خطبے کے بعد حضور ﷺ خاموش ہو گئے تو حضرت عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ ہم سے جو چاہیں، عہد لیں۔ اگر ہم یہ تمام باتیں پوری کریں گے تو ہمیں کیا صلہ ملے گا؟''

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنت اور اس کی نعمتیں۔''

ہر طرف سے آواز آئی: ''ہم راضی ہیں، راضی ہیں۔''

اب حاضرین ہر طرف سے بیعت کے لیے آگے بڑھے۔ سب سے پہلے بیعت کا شرف حاصل کرنے والوں میں حضرت براؓ بن معرور تھے۔ یہ بیعت عقبہ کبیرہ کہلاتی ہے۔ بعض مورخین اسے بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔

جب سب لوگ بیعت کر چکے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس طرح عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے اپنے لیے بارہ اشخاص کو چن لیا تھا، اسی طرح میں تم میں سے بارہ نقیب منتخب کرتا ہوں، تا کہ تم واپس یثرب جا کر اسلام کی اشاعت کرو۔ میں اہل مکہ کے لیے خود یہ کام کروں گا۔''

پھر حضور ﷺ نے قبیلہ خزرج سے نو اور قبیلہ اوس سے تین اشخاص کا انتخاب کیا، جن کے نام یہ ہیں:

1: اسعدؓ بن زرارہ (نقیب النقباء۔ غزوہ بدر سے کچھ پہلے شوال دو ہجری میں وفات پائی)

2: سعدؓ بن ربیع (غزوہ احد میں شہید ہوئے)

3: عبداللہؓ بن رواحہ (صاحب سیف و قلم۔ غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے)

4: رافعؓ بن مالک (غزوۂ احد میں شہید ہوئے)

5: براء بن معرور (حضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے انتقال ہوا)

6: عبداللہؓ بن عمرو (غزوۂ احد میں شہید ہوئے)

7: عبادہ بن صامت (صفہ کی درس گاہ کی صدر مدرس بنے)

8: سعدؓ بن عبادہ (اپنے قبیلے میں ''کامل'' کے لقب سے مشہور تھے)

9: منذرؓ بن عمرو (بئر معونہ میں شہید ہوئے)

قبیلہ اوس میں سے منتخب نقیب تین تھے:

10: اسیدؓ بن حضیر (ان کا لقب بھی کامل تھا)

11: سعدؓ بن خیثمہ (قبا میں ان کے مکان پر حضورؐ نے لوگوں کو شرف ملاقات بخشا)

12: ابوالہیثم بن التیہان (بعض مورخین نے ان کی جگہ رفاعہؓ بن عبدالمنذر کا نام لکھا ہے)۔

آخری بیعت عقبہ بہت خفیہ طریقے پر ہوئی تھی جب بیعت ہو چکی تو حضور ﷺ نے انصار سے فرمایا: ''تم لوگ اپنے خیموں میں واپس چلے جاؤ۔''

قریش کا ردعمل

جس رات بیعتِ عقبہ واقع ہوئی، اس رات قریش کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی اور صبح ان کے بڑے بڑے آدمی اہل مدینہ کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ انھوں نے کہا: ''اے گروہ خزرج، ہمیں خبر ملی ہے کہ تم ہمارے اس آدمی (محمد ﷺ) سے ملے ہو اور تمھارا ارادہ اسے ہمارے ہاں سے نکال لے جانے کا ہے اور تم اس سے ہمارے خلاف جنگ کی بیعت کر رہے ہو۔'' اس پر اہل مدینہ میں سے جو لوگ مشرک تھے، انھوں نے اٹھ کر حلفیہ کہا: ''ایسا نہیں ہوا ہے اور ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔'' یہ بات کہنے میں وہ سچے بھی تھے، کیوں کہ واقعی انھیں اس کا علم نہ تھا، لیکن مسلمان ایک دوسرے کو نظروں ہی نظروں میں دیکھتے رہے۔ پھر قریش کے سردار عبداللہ بن ابی کے پاس گئے اور اس سے معاملے کا ذکر کیا۔ اس نے کہا: ''یہ اتنا بڑا کام ہے کہ میری قوم مجھ سے بالا بالا یہ نہیں کر سکتی اور میں نہیں جانتا کہ ایسا ہوا ہے۔''

قریش کا ان جوابات سے اطمینان نہ ہوا اور وہ برابر ٹوہ میں لگے رہے اور انھیں یقین ہو گیا کہ واقعی یہ معاملہ ہوا ہے۔ چناں چہ حج سے اہلِ مدینہ کی واپسی کے وقت راستے میں انھوں نے بیعت کرنے والوں کا پیچھا کیا اور مکہ سے باہر قریب ہی اذاخر کے مقام پر حضرت سعدؓ بن عبادہ اور منذرؓ بن عمرو کو جا لیا۔ منذرؓ تو ان سے بچ نکلے، مگر سعدؓ بن عبادہ پکڑے گئے۔ قریش کے لوگوں نے ان کے ہاتھ گردن سے باندھ دیئے اور انھیں مارتے پیٹتے اور ان کے سر کے بال پکڑ کر کھینچتے ہوئے مکے لے گئے۔

ادھر سے سہیل بن عمرو کا گزر ہوا۔ اس نے انھیں ایک گھونسہ رسید کیا۔ اتنے میں ابوالبختری بن ہشام ادھر آ نکلا۔ اس شریف آدمی نے پوچھا: ''کیا تمھارا قریش کے کسی

فرد سے کوئی عہد نہیں؟ حضرت سعدؓ نے کہا: ''میں اپنے علاقے میں جبیر بن مطعم اور حارث بن حرب کے تجارتی قافلوں کو پناہ دیتا ہوں۔'' پھر اس نیک بخت نے کہا: ''پھر ان کا نام لے کر دُہائی دو۔ ادھر حرم کعبہ میں جا کر ان سے کہا کہ خزرج کا ایک آدمی تمھارے نام پناہ کا خواہاں ہے۔ پوچھا کون ہے؟ سعدؓ بن عبادہ، وہ فوراً آئے اور حضرت سعدؓ کو پناہ دے کر ان ظالموں کی گرفت سے آزاد کرایا۔ راستے میں حضرت سعدؓ کے ساتھ نہ ہونے پر انصار میں کھلبلی مچی۔ طے پایا کہ چاہے جائیں خطرے ہی میں کیوں نہ پڑ جائیں، مکہ چل کر سعد کا پتا لگائیں گے۔ اتنے میں دیکھا کہ سعدؓ مکہ کی طرف سے آ رہے ہیں۔ انھیں لے کر انصار اپنے سفر پر روانہ ہوئے۔

مدینے میں اشاعت اسلام

مدینے واپس پہنچ کر انصار نے بہت تیزی سے اسلام پھیلانا شروع کر دیا، اور بڑے زبردست دینی جوش و خروش کے ساتھ وہ بت شکنی میں مشغول ہو گئے۔ مختلف قبیلوں کے جتنے بت تھے، سب پاش پاش کر دیئے گئے۔ مسلمان اس وقت مشرکینِ مدینہ پر ایسے چھا گئے کہ وہ اس بت شکنی کی کوئی مزاحمت نہ کر سکتے تھے۔

اس سلسلے میں ایک دل چسپ واقعہ ابن ہشام نے لکھا ہے۔ اہل مدینہ کے سرداروں میں سے بنی سلمہ کے سردار عمرو بن جموح اپنے شرک پر قائم تھے، حالانکہ ان کے بیٹے معاذؓ بن عمرو مسلمان ہو کر عقبہ میں بیعت بھی کر آئے تھے۔ انھوں نے اپنی حویلی میں لکڑی کا ایک بت بڑی عزت و حرمت کے ساتھ رکھ چھوڑا تھا، جس کا نام منات تھا۔ بیٹے نے چند نومسلم نوجوانوں کے ساتھ رات کے وقت اس بت کو غلاظت کے گڑھے میں ڈال دیا۔ صبح باپ نے دیکھا کہ ان کا معبود منات غائب ہے۔ آخر ڈھونڈ کر لائے۔ نہلایا اور خوش بو لگائی۔ دوسرے تیسرے دن بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ یہ کھیل کئی روز چلتا رہا۔ ایک دن جب وہ اسے گڑھے سے نکال کر لائے تو ایک تلوار اس کی گردن میں لٹکا دی اور اس سے کہا کہ مجھے معلوم نہیں تیرے ساتھ یہ حرکت کون کر رہا ہے۔ وہ شخص اگر مجھے مل جائے تو اسے سخت رسوا کروں گا۔ اب اگر تیرے اندر کوئی طاقت ہے تو اس تلوار سے اپنی حفاظت خود کر۔ رات کو اُن نوجوانوں نے وہ تلوار تو اس کی گردن سے اتار کر الگ رکھی۔ ایک مرا ہوا کتا اس کے ساتھ باندھا اور اسے لے جا کر بنی سلمہ کے ایک کنوئیں میں پھینک دیا جس کے اندر غلاظتیں ڈالی جاتی تھیں۔ صبح جب انھوں نے اسے غائب پایا تو ڈھونڈنے نکلے اور مرے ہوئے کتے کے ساتھ لوگوں کی غلاظتوں میں اسے اوندھا پڑا پایا۔ اس وقت ان کے قبیلے کے مسلمانوں نے انھیں سمجھایا۔ ان کی اپنی آنکھیں بھی کھل گئیں اور وہ سچے دل سے اسلام لے آئے۔

ہجرت کا اذن عام

آخری بیعت عقبہ (یعنی ذی الحجہ 13 نبوی) کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے مسلمانوں کو مدینے کی طرف ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اب تمھارے لیے بھائی پیدا کر دیئے ہیں اور ایک ایسا شہر فراہم کر دیا ہے، جہاں تم امن سے رہ سکتے ہو۔ دین کے لیے ہجرت جہاد کے بعد بہت بڑی عبادت ہے، کیوں کہ اس میں وطن چھوٹتا ہے۔ محنت سے کمایا ہوا مال و متاع، گھر بار، زمین جائداد سب سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ عزیز و اقارب، روزگار، کاروبار، سب کچھ چھوڑ کر اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے آیندہ زندگی کے لیے دوسروں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

ہجرت کی اجازت پا کر مسلمان دو دو چار چار، چھپ چھپا کر ٹولیاں بنا کر مکہ سے نکلنے لگے۔ بنی مخزوم کے ابوسلمہ بن عبدالاسد حبشہ سے واپس ہوئے تو قریش انھیں تکلیف دینے لگے۔ انصار ایمان لائے تو بیعت عقبہ سے ایک سال بعد ہی مدینہ ہجرت کر گئے۔ حضرت عامرؓ بن ربیعہ اور ان کی بیوی لیلیٰ بنت ابی حثمہ کا نام مہاجرین کی فہرست میں اول ہے۔ اس کے بعد حضرت عمار بن یاسر، حضرت بلالؓ بن رباح اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے نام لکھے گئے۔ حضرت عثمانؓ اپنی زوجہ حضرت رقیہ کے ساتھ چھپ کر مدینہ پہنچے۔ پھر ہجرت کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اہل ایمان کے خاندان کے خاندان ہجرت کرنے لگے۔ بنی مظعون، بنی بکر اور بنی جحش کے سب ہی لوگ مکہ سے نکل گئے۔ بنی جحش کے ساتھ بنی اسد بن خزیمہ والے بھی شامل ہو گئے۔ ادھر عتبہ، ابوجہل اور حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کا گزر ہوا تو عتبہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا کہ اب بنی جحش کا محلّہ سنسان پڑا ہے۔ ابوجہل نے حضرت عباسؓ کو طعنہ دیا کہ یہ سب کچھ تمھارے بھتیجے کا کیا دھرا ہے۔

ابوسفیان کی ایک بیٹی فرعہ حضرت ابواحمدؓ بن جحش کی بیوی تھی۔ اس نسبت سے اُن کی ہجرت کے بعد ابوسفیان نے داماد کے خاندان کے سارے گھروں پر قبضہ کر لیا۔ حضور ﷺ سے اس کی شکایت کی گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''کیا تم اس گھر کے بدلے میں جنت میں گھر ملنے پر راضی نہیں ہو؟ فتح مکہ کے بعد جب حضرت ابواحمدؓ نے اپنا دعویٰ پیش کیا تو فاتح مکہ نے خاموشی اختیار کر لی۔ حضور ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ راہِ خدا میں چھوڑا ہوا مال لوٹایا جائے۔ خود حضور ﷺ کے اپنے مکان پر ان کے چچا زاد بھائی عقیل ابن ابی طالب (فتح مکہ تک ایمان نہیں لائے) نے قبضہ جما لیا۔

بعض صحابہؓ نے ہجرت کی راہ میں بڑی تکالیف اٹھائیں، جن میں حضرت ابوسلمہ عبداللہ اور ان کی زوجہ حضرت ام سلمہؓ، حضرت صہیب رومیؓ، حضرت عیاشؓ بن ربیعہ، حضرت عبداللہ بن سہیلؓ کی بپتا رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ ہجرت کے ارادے سے ان کے شوہر ابوسلمہ عبداللہ اونٹ پر نکلے۔ میری گود میں چھوٹا بچہ تھا۔ قریش کو پتا چلا تو روک لیا۔ حضرت عبداللہ سے بیوی کے رشتہ داروں نے کہا کہ تم جا سکتے ہو، لیکن اپنی لڑکی کو ہم نہیں جانے دیں گے۔ اتنے میں بنی مخزوم کے لوگ آ گئے۔ انھوں نے کہا، ان کی گود میں بچہ ہمارے خاندان کا ہے اور وہ ان سے چھین لیا۔ یہ دیکھ کر راہِ حق کا مہاجر ابوسلمہؓ عبداللہ اکیلا ہی مدینہ کو سدھارا۔ حضرت ام سلمہؓ کو دوغم تھے۔ شوہر پاس نہیں اور بچہ بھی چھین لیا گیا۔ وہ روزانہ ابطح کے اس مقام پر چلی جاتیں، جہاں سے ان کے شوہر جدا ہوئے تھے۔ سارا سارا دن روتی رہتیں۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔ ایک بار ان کے ایک چچا زاد بھائی کی نظر ان پر پڑی اور اس کے دل میں رحم آ گیا۔ چناں چہ ان کی وجہ سے

حضرت ام سلمہؓ کو اجازت مل گئی۔ یہ دیکھ کر بنو اسد نے بچے کو واپس کر دیا۔ اونٹ تیار کر کے تن تنہا بچے کے ساتھ ہجرت اختیار کی۔ راہ میں بنی عبدالدار کے کعبے کے کلید بردار عثمان سے ملاقات ہوئی۔ اس شریف آدمی نے اونٹ کی نکیل پکڑی اور قباء تک پہنچا دیا۔

حضرت عیاشؓ بن ربیعہ، جو ابوجہل کے ماں جائے بھائی تھے، جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینے کے قریب پہنچ گئے تو پیچھے ان کے دونوں بھائی ابوجہل اور حارث پہنچے اور کہا، تمھاری ماں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک تمھیں نہ دیکھے گی نہ سر میں کنگھی کرے گی اور نہ دھوپ سے چھاؤں میں آئے گی۔ حضرت عیاشؓ پر ماں کی محبت غالب آ گئی۔ سوچا، ماں کی قسم پوری کرنے کے بعد اپنا مال لے کر واپس آ جاؤں گا۔ اونٹ کا رخ مکہ کی طرف پھیر دیا۔ راستے میں ابوجہل نے کہا، میرا اونٹ ٹھیک نہیں ہے۔ تم مجھے اپنے ساتھ سوار کر لو۔ اونٹ بٹھایا تو حارث اور ابوجہل نے موقع پا کر ان کی مشکیں باندھ لیں اور مکے میں لا کر ایک مکان میں قید کر دیا۔ اس طرح ایک اور مسلمان ہشامؓ بن عاص کو بھی قید کر دیا گیا تھا۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو بے چین ہو گئے۔ آخر حضرت ولیدؓ بن ولید (خالد بن ولید کے بھائی) کو انھیں چھڑا کر لانے مکہ روانہ کیا۔ وہ چھپتے چھپاتے رات کے وقت اس مکان میں داخل ہوئے۔ ان کی بیڑیاں کاٹیں اور اونٹ پر بٹھا کر مدینہ لائے۔

حضرت عبداللہ بن سہیل بن عمرو حبشہ میں مقیم تھے۔ مدینہ کی ہجرت کا سن کر مکہ آئے، تاکہ دارالہجرت میں رسول کریم ﷺ سے مل جائیں۔ باپ نے پکڑ کر پابہ زنجیر کر دیا اور طرح طرح کی تکلیفیں دینا شروع کر دیں۔ آخر تنگ آ کر باپ کو یقین دلایا کہ آبائی دین کی طرف لوٹتا ہوں۔ اس طرح نجات پائی۔ میدان بدر میں جب کفار اور اسلام کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو موقع پا کر اہل ایمان کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ ان کے باپ سہیل فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اللہ نے میرے بیٹے کے ایمان میں میرے لیے سامان خیر رکھا تھا۔

حضرت صہیبؓ بن سنان رومی مکہ چھوڑنے والوں میں آخری مہاجر تھے مشرکین ان کے سدِ راہ ہوئے۔ کہنے لگے تم مکہ میں مفلس ومحتاج آئے تھے۔ اب دولت لے کر فرار نہیں ہو سکتے۔ انھوں نے کہا، اے گروہ قریش! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھ سے بہتر تیر انداز کوئی نہیں۔ جب تک میرے ترکش میں تیر ہیں۔ تم میں سے کوئی قریب نہیں آ سکتا۔ ترکش خالی ہو جائے تو تلوار سے مقابلہ کروں گا۔ تم مجھے ہجرت سے نہیں روک سکتے۔ ہاں اگر دولت لے کر میرا راستہ چھوڑ سکتے ہو تو مال حاضر ہے۔ مشرکوں نے اسی پر اکتفا کیا۔ دنیاوی مال ومتاع کے عوض متاعِ ایمان کا سودا کر کے قبا پہنچے۔ انھیں دیکھ کر رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''ابویحییٰ! تم نے بڑی پُر منفعت تجارت کی ہے۔''

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ جس نے بھی ہجرت کی، وہ پوشیدہ اور خفیہ کی۔ صرف حضرت عمرؓ بن خطاب ہی ایک ایسی شخصیت ہیں کہ انھوں نے علانیہ طور پر ہجرت کی۔ جب عزم کیا تو تلوار گلے میں حمائل کی۔ پہلو میں نیزہ باندھا۔ پشت سے ترکش لگایا۔ ہاتھوں میں کمان لی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر سیدھے بیت اللہ کی طرف روانہ ہوئے۔ تمام دشمنان اسلام اپنی اپنی بیٹھکوں میں اپنے اپنے قبائل کے ساتھ تھے۔ انھوں نے پہلے سات بار کعبے کا طواف کیا۔ پھر مقام ابراہیمؑ پر آ کر دو رکعت نماز ادا کی۔ ہر حلقۂ مجلس پر کھڑے ہو کر کہا، تمھارے چہرے مسخ ہو جائیں۔ اللہ تمھاری ناک خاک آلود کر دے۔ جو شخص چاہتا ہے، اپنے پیچھے اپنی ماں کو روتا ہوا چھوڑے۔ اپنی بیوی کو بیوہ بنائے اور اپنے بچوں کو یتیم کہلوائے تو آئے اور حرم کے باہر مجھ سے نبرد آزما ہو۔ حضرت علیؓ بیان کرتے ہیں کہ اہل قریش میں سے کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ ان کا تعاقب کرے۔ البتہ کچھ کمزور مسلمان حضرت عمرؓ کے ساتھ آ ملے اور سفر ہجرت کے ساتھی بن گئے۔ اس گروہ کی تعداد بیس بتائی جاتی ہے۔

حضور کا مکے میں ٹھہرے رہنا

مجموعی طور پر حبش سے جو مہاجرین مدینے کی طرف ہجرت کرنے کے لیے مکے آئے تھے، ان میں سے سات آدمیوں کو قید کر لیا گیا اور وہ ہجرت نہ کر سکے۔ ان کے علاوہ مکہ میں ایک اچھی خاصی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو ہجرت کرتے ہوئے پکڑ لیے گئے، یا جو ایسے مجبور تھے کہ ہجرت نہ کر سکتے تھے، یا جو دل میں ایمان تو رکھتے تھے، مگر اپنی کمزوریوں کے باعث ہجرت کی ہمت نہ کر سکے۔ ایسے سب لوگوں کے سوا باقی جتنے لوگ بھی ہجرت کر سکتے تھے، وہ سب چلے گئے اور مکے میں صرف حضور ﷺ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت علیؓ باقی رہ گئے۔

جب حضرت ابوبکرؓ نے مدینے کی طرف ہجرت کا ارادہ کیا تو حضور نے فرمایا ''ذرا اپنی جگہ ٹھہرے رہو، کیوں کہ میں توقع رکھتا ہوں کہ مجھے بھی جانے کی اجازت مل جائے گی۔'' حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، کیا آپ اس کی توقع رکھتے ہیں؟'' فرمایا، ہاں، حضرت ابوبکرؓ نے دوسرے ہجرت کرنے والے صحابہؓ کے ساتھ جانے کے لیے دو اونٹنیاں خرید رکھی تھیں۔ جب انھیں یہ امید ہوگئی کہ انھیں حضور ﷺ کی معیت کا شرف حاصل ہوگا تو انھوں نے ان اونٹنیوں کو خوب کھلا پلا کر تیار کر لیا۔

حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو اس لیے روک لیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کے پیچھے مکہ میں ٹھہر کر ان سب لوگوں کی امانتیں واپس کر دیں، جنھوں نے اپنے قیمتی مال حفاظت کے لیے آپ ﷺ کے پاس رکھ چھوڑے تھے۔ مکے میں کوئی شخص ایسا نہ تھا، جس کے پاس اگر کوئی چیز ایسی ہوتی جس کے چوری ہو جانے کا اسے خطرہ ہوتا تو وہ اسے حضور ﷺ کے پاس بطور امانت نہ رکھوا دیتا ہو، کیوں کہ آپ کی دیانت وامانت پر دوست دشمن سب کو بھروسا تھا۔

حضور ﷺ کے قتل کا فیصلہ

مومنین کی ہجرت سے قریش بت پرستوں کے اشتعال میں اور بھی اضافہ ہوا، وہ فکر مند ہو گئے۔ مدینے کا محلِ وقوع ایسا تھا کہ وہاں مسلمانوں کی اس طاقت کے مجتمع

ہونے سے قریش کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ یمن سے شام کی طرف جو تجارتی شاہ راہ ساحل بحر احمر کے کنارے کنارے جاتی تھی اور جس کے محفوظ رہنے پر قریش اور دوسرے بڑے بڑے مشرک قبائل کی معاشی زندگی کا انحصار تھا، وہ مسلمانوں کی زد میں آ جائے گی اور اس شہ رگ پر ہاتھ ڈال کر مسلمان جاہلی نظام کی زندگی دشوار کر دیں گے۔ طائف اور دوسرے مقامات کی تجارت مکہ کے ماسوا تھی۔ اسی وجہ سے بیعت عقبہ کی خبر پاتے ہی قریش میں کھلبلی مچ گئی۔ پہلے تو انھوں نے اہل مدینہ کو نبی ﷺ سے توڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا، مگر اس میں وہ ناکام ہو گئے۔ پھر انھوں نے مکہ سے مسلمانوں کی ہجرت کو روکنے کے لیے ہر ممکن تدابیر اختیار کر لیں، مگر وہ چند ہی لوگوں کو روک سکے اور اہل ایمان کی بڑی تعداد مدینے پہنچ گئی۔ اس کے بعد وہ خطرے کو روکنے کے لیے آخری چارہ کار اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔

بت پرستوں کے جدامجد قصی بن کلاب نے ''دارالندوہ'' یا مشاورت خانہ تعمیر کیا تھا۔ ان لوگوں نے وہاں اجلاس بلایا۔ دارالندوہ میں بڑے اہم فیصلے کیے گئے۔ یہاں صرف قصی خاندان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو آنے کی اجازت تھی، اور شرط یہ تھی کہ وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچ چکے ہوں۔ جس وقت قریش کے نمائندگان مختلف علاقوں سے دارالندوہ میں داخل ہو رہے تھے، اس لمبے دراز قامت، رعب اور دبدبے والا معمر شخص دالان میں نظر آیا۔ اس نے اونی لباس پہن رکھا تھا۔

اس سوال پر کہ وہ کون ہے اور وہاں کیوں آیا ہے، اس نے جواب دیا ''میں نجد کا شیخ ہوں۔ تمھارے شریفانہ چال ڈھال سے متاثر ہو کر اور تمھاری خوش بو سے مرعوب ہو کر، جو تمھارے استعمال میں عطر سے آ رہی ہے، میرا دل چاہا کہ تم سے باتیں کی جائیں۔ اگر تم مجھے اپنے اجتماع میں شرکت کی اجازت دے دو تو ہو سکتا ہے، میرا مشورہ بھی کچھ یوں ہی رایگاں نہ جائے۔''

نجد کے لوگ اس قدر دور دراز علاقے میں رہتے تھے کہ ان پر یہ شک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انھوں نے محمد سے ساز باز کر لی ہے، اس لیے دارالندوہ کے بزرگوں نے اس اجنبی کو اپنے اجلاس میں شرکت کی اجازت دے دی۔ چناں چہ نجد کا یہ بزرگ باقی حاضرین کے ہم راہ مشاورت کے لیے مخصوص بڑے کمرے میں داخل ہوا۔ میر مجلس نے فوراً ہی بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا: ''ہم سب محمد ﷺ کی سازشوں سے واقف ہیں، اور ہمیں اس خطرے کا بھی علم ہے جو اس وقت ہمارے ملک کو درپیش ہے۔ ہمیں اپنے دفاع کے لیے ممکنہ انتظامات کرنے ہوں گے۔ اس سلسلے میں ہم میں سے ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کی اجازت ہے۔''

سب سے پہلے ابوالبختری نے تجویز پیش کی: ''ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے دشمن کو قید خانے میں ڈال دیں۔ اسے زنجیریں پہنا دیں اور زنداں کا دروازہ اس وقت تک مقفل رہے، جب تک وہ اس کے اندر جان نہ دے دے۔''

نجد کے شیخ نے اعتراض اٹھاتے ہوئے کہا: ''ان فیصلے کے نتائج بڑے خطرناک ہوں گے۔ تم لوگوں کے ظلم و تشدد کی خبر زنداں کے دروازوں سے نکل کر محمد ﷺ کے ساتھیوں تک پہنچ جائے گی اور تم جانتے ہو کہ وہ اسے آزاد کرانے کے لیے تم پر حملہ کر دیں گے۔ اور یثرب کے مسلمانوں کی مدد سے انھیں تم پر فتح و نصرت حاصل ہو گی۔ سو بہتر ہو گا کہ کسی اور کے پاس کوئی زیادہ موزوں مشورہ ہو تو دے۔''

اب ابن ربیعہ کھڑا ہوا اور کہا: ''ہم کیوں نہ اسے اپنے درمیان سے نکال کر ملک بدر کر دیں۔ جب وہ ملک ہی چھوڑ جائے گا تو پھر ہمیں یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس نے کہاں پناہ لی ہے اور اس کا کیا بنا ہے۔ ہمیں تو اس طرح اس سے نجات مل چکی ہو گی۔'' نجد کے شیخ نے کہا: ''بے شک یہ بڑی اچھی تجویز ہے۔ تم لوگ شاید اپنے مخالف کی جادو بیانی سے واقف نہیں ہو۔ اس کی آواز کے سحر سے غالباً آگاہ نہیں، اور اس کی باتوں میں دلائل اور منطق کس قدر ہوتی ہے، تم شاید یہ بھی نہیں جانتے۔ جوں ہی وہ قرب و جوار کے عرب قبائل کی سرزمین پر قدم رکھے گا اور اپنے بیان کا فسوں ان لوگوں میں پھونکے گا، انھیں اپنی پیروی میں لے لے گا اور پھر جلاوطنی ختم کر کے، ان سب کے سردار کی حیثیت سے واپس وطن لوٹ آئے گا۔ پھر وہ تم لوگوں سے جیسا سلوک چاہے گا، کرے گا، اس لیے مناسب ہو گا کہ اسے ختم کرنے کے لیے کوئی زیادہ قابل عمل اور بہتر منصوبہ بناؤ۔''

اب ابوجہل کی باری تھی۔ وہ اٹھا اور اجلاس کے لوگوں سے یوں مخاطب ہوا: ''مجھے اپنے خداؤں کی قسم! میرے پاس ایک تجویز ہے، اور مجھے یقین ہے کہ آپ سب اس سے متفق ہوں گے''

سامعین نے کہا: ''بتائیے کیا تجویز ہے آپ کی؟

ابوجہل نے کہا: ''تجویز یہ ہے کہ ہم اپنے قبائل میں سے ہر قبیلے کے ایک ایسے نوجوان کا انتخاب کریں گے جو کسی معزز خاندان سے ہو گا اور اس کے لیے بہادر و جری ہونا ضروری ہو گا۔ ہم اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والی تلوار دے دیں گے۔ یہ سارے نوجوان مل کر بیک وقت محمد ﷺ پر حملہ آور ہوں گے۔ یوں محمد ﷺ کے قتل کی ذمہ داری بجائے کسی ایک فرد کے کئی افراد پر عائد ہو گی جو مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے ہوں گے، اور عبد مناف جو مقتول کے رشتہ دار ہیں، ہمارے قبیلے کے ہر علاقے کے لوگوں کے خلاف اعلان جنگ نہیں کر سکیں گے، یوں انھیں مجبوراً قصاص قبول کرنا پڑے گا جو ہم بخوشی ادا کر دیں گے۔''

نجد کے شیخ نے، جو دراصل ابلیس تھا، اور انسانی شکل میں ان کے درمیان آیا ہوا تھا، اپنی رائے دیتے ہوئے کہا: ''بات تو یہ بڑی دانشمندی کی ہے، تمھاری مشکل کا حل اس کے سوا کسی اور شے میں نہیں۔''

اس اجلاس میں متفقہ طور پر اس پُر فریب تجویز کو منظور کر لیا گیا تھا۔ قتل کے لیے آدمی بھی نام زد کر دیے گئے۔ قتل کا وقت بھی مقرر کر دیا گیا اور اس ساری کارروائی کو اس قدر مخفی رکھا گیا کہ کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہونے پائی۔ اسی معاملے کی طرف سورۂ انفال (آیت 30) میں ارشاد کیا گیا ہے:

﴿وَاِذْ یَمْکُرُ بِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِیُثْبِتُوْکَ اَوْ یَقْتُلُوْکَ اَوْ یُخْرِجُوْکَ

وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ﴾ (الانفال: 30)

''اور اے نبی وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، جب کہ کفار تمھارے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تمھیں قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔ وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔''

حضور ﷺ کی تیاریاں

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو مکے سے ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی اور فرمایا:

﴿وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ (الاسراء: 80)

''اور (اے نبی) دعا کرو کہ اے میرے رب مجھے داخل کر سچائی کے ساتھ داخل ہونے کی جگہ، اور مجھے نکال سچائی کے ساتھ نکلنے کی جگہ سے، اور کسی طاقت کو میرا مددگار بنا دے۔''

یہ اجازت اس دن ملی، جس کے بعد آنے والی رات قریش نے رسول ﷺ کے قتل کے لیے مقرر کی تھی۔ اس روز جبریئل نے آ کر حضور ﷺ کو قریش کے ارادہ سے باخبر کیا اور آپ کو ہدایت کی کہ آج رات آپ ﷺ اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ دوپہر کو منہ پر کپڑا لپیٹے ہوئے حضرت ابوبکرؓ کے ہاں تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ روزانہ صبح یا شام کے وقت ہمارے ہاں تشریف لایا کرتے تھے، مگر اس روز آپ ﷺ ظہر کے وقت تشریف لائے جو معمولاً آپ ﷺ کے آنے کا وقت نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ''میرے ماں باپ ان پر قربان ہوں، ضرور کوئی بات ہے جس کی وجہ سے وہ اس وقت تشریف لائے ہیں۔''

پھر حضور ﷺ نے اندر آنے کی اجازت مانگی اور جب اجازت پا کر اندر تشریف لائے تو فرمایا: ''اپنے پاس سے سب کو ہٹا دو۔''

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''یہ تو آپ ﷺ ہی کے گھر کے لوگ ہیں'' (اس وقت حضرت عائشہؓ اور ان کی بہن اسماءؓ کے سوا حضرت ابوبکرؓ کے پاس اور کوئی نہ تھا)۔

تب حضور ﷺ نے فرمایا: ''مجھے نکلنے (ہجرت) کی اجازت دے دی گئی ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''میرے ماں باپ آپ پر قربان، مجھے تو معیت کا شرف نصیب ہوگا؟''

فرمایا: ''ہاں۔''

حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''میری ان دو اونٹنیوں میں سے ایک آپ لے لیں۔''

فرمایا: ''مگر قیمت دے کر لوں گا۔''

پھر حضور نے فرمایا: ''میں اسی قیمت پر لوں گا جس پر تم نے اسے خریدا ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ نے قیمت بتائی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تمھیں دوں گا۔''

اس کے بعد حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ نے بنی الدیل کے ایک شخص عبداللہ بن اریقط کو، جو راستوں کا ماہر تھا، اجرت پر راہ نمائی کے لیے مقرر کیا اور دونوں اونٹنیاں اس ہدایت کے ساتھ اس کے حوالے کیں کہ جس جگہ ہم بلائیں، اسی وقت انھیں لے کر اس جگہ پہنچ جانا۔

قتل کی رات کا ماجرا

اس کے بعد رسول کریم ﷺ اپنے مکان پر تشریف لے گئے اور رات ہونے تک وہیں رہے، تاکہ دشمنوں کو اس امر کا ذرہ برابر بھی شبہ نہ ہونے پائے کہ آپ ان کے ارادوں سے باخبر ہو چکے ہیں۔ رات کو ٹھیک اپنے طے شدہ وقت پر وہ سب لوگ آ پہنچے جو آپ ﷺ کے قتل پر مامور کیے گئے تھے۔ یہ جملہ بارہ آدمی تھے۔

لیکن ان لوگوں کے آنے سے پہلے ہی آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر اپنی سبز حضرموتی چادر اڑھا کر لٹا دیا تھا۔ اس لیے دشمن باہر سے تاک جھانک کر کے جب بھی دیکھتے، یہی سمجھتے رہے کہ یہ رسول ﷺ ہیں جو اپنے بستر پر سو رہے ہیں۔ یہ لوگ رات بھر بیٹھے رہے اور اس انتظار میں رہے کہ صبح سویرے جب رسول اللہ ﷺ اٹھیں تو یکبارگی آپ پر ٹوٹ پڑیں۔

رات کے پہلے حصے کے چار گھنٹے گزر گئے تو سازشیوں کو، جن میں ابوجہل بھی شامل تھا، آنحضرت ﷺ کے گھر کے قریب گھات میں بٹھا دیا گیا تھا، تاکہ محمد ﷺ کو فرار ہو جانے سے روک سکیں۔ یہ لوگ رات کی تاریکی میں اپنے جرم کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے تھے، کیوں کہ اس صورت میں خدشہ تھا کہ لوگ اس فعل میں اہلِ قریش کی شمولیت سے انکار کر دیں گے، چناں چہ ان سازشیوں نے پو پھٹنے کا انتظار کیا، تاکہ روشنی میں ہر شے نظر آ رہی ہو اور اس قتل میں ہر شخص کا برابر کا حصہ ہو۔

مگر وہ ذات کہ جسے نہ نیند آتی ہے نہ اونگھ، وہ اپنے رسول ﷺ کی نگہبانی کر رہی تھی جو دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ رات کو کسی وقت حضور ﷺ اطمینان سے باہر تشریف لائے اور ان کے سروں پر خاک ڈالتے ہوئے (ان کے درمیان سے نکل گئے)۔ اس وقت آپ سورۃ یٰسٓ کی یہ آیت پڑھ رہے تھے:

﴿وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ (یٰسٓ: 9)

''ہم نے ان کے آگے رکاوٹ کھڑی کر دی، اور ان کے پیچھے رکاوٹ کھڑی کر دی پھر ہم نے انھیں ڈھانک دیا ہے۔ انھیں اب کچھ نہیں سوجھتا۔''

صبح ہوئی تو ان لوگوں نے حضرت علیؓ کو حضور ﷺ کے بستر پر سے اٹھتے ہوئے دیکھا، اور اس وقت انھیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ تو کبھی کے جا چکے ہیں۔ انھوں نے حضرت علیؓ سے پوچھا: ''تمھارے صاحب کہاں ہیں؟''

حضرت علیؓ نے جواب دیا: ''مجھے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں تشریف لے گئے ہیں۔ میں ان پر کوئی نگران نہیں ہوں۔ تم لوگوں نے انھیں نکالا اور وہ نکل گئے۔'' اس پر وہ سفاک دشمن جھلا گئے۔ انھیں بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ مارا پیٹا اور مسجد حرام میں لے جا کر کچھ دیر بند رکھا۔ مگر جب کسی تشدد سے بھی حضور ﷺ کا پتا معلوم نہ کیا جا

مجبور ہو کر انھیں چھوڑ دیا۔

بعید نہیں کہ ان کے حضرت علیؓ کو چھوڑ دینے کا اصل سبب یہ ہو کہ حضور ﷺ نے انھی کو اہلِ مکہ کی امانتیں واپس دینے کے لیے چھوڑا تھا۔ کفار کو جب یہ معلوم ہوا ہوگا کہ رسول کریم ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس کام کے لیے مامور کر گئے ہیں تو کچھ انھیں اپنے مال واپس ملنے کے لالچ نے ان کی رہائی پر آمادہ کیا ہوگا اور کچھ انھیں شرم بھی آئی ہوگی کہ جس شخص کو وہ قتل کرنے آئے تھے، وہ اتنا بلند اخلاق انسان ہے کہ قتل گاہ سے نکلتے وقت بھی اسے اپنے دشمنوں کی امانتیں ادا کرنے کی فکر رہی۔

حضرت علیؓ سے فارغ ہو کر ان ظالموں نے حضرت ابوبکرؓ کے مکان کا رُخ کیا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر انھوں نے حضرت اسماءؓ سے پوچھا: ''تمھارا باپ کہاں ہے؟'' انھوں نے کہا: ''مجھے خبر نہیں۔'' اس پر ابوجہل نے اس زور سے تھپڑ مارا کہ حضرت اسماءؓ کے کان کی بالی ٹوٹ کر دور جا پڑی۔

حضور ﷺ کا غارِ ثور میں پناہ لینا

رسول اللہ ﷺ 27 صفر 14 نبوی مطابق 12-13 ستمبر 622ء کی درمیانی رات اپنے مکان سے نکل کر اپنے سب سے قابلِ اعتماد ساتھی حضرت ابوبکرؓ کے گھر تشریف لائے اور وہاں سے پچھواڑے کی ایک کھڑکی سے نکل کر دونوں حضرات نے باہر کی راہ لی تاکہ مکہ سے جلد از جلد یعنی طلوعِ فجر سے پہلے پہلے باہر نکل جائیں۔

رسول کریم ﷺ اپنے مکان سے نکل کر سیدھے حضرت ابوبکرؓ کے ہاں تشریف لے گئے اور دونوں صاحبوں نے راتوں رات جا کر مکہ سے دو تین میل دور ثور نامی ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لے لی۔ مکے سے نکلتے وقت حضور حزورہ کے مقام پر کھڑے ہوئے۔ بیت اللہ کی طرف رخ کیا اور بڑے درد کے ساتھ فرمایا: ''اے مکہ، خدا کی قسم، تو خدا کی زمین میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے، اور خدا کو بھی اپنی زمین میں تو ہی سب سے بڑھ کر محبوب ہے۔ اگر تیرے باشندوں نے مجھے نہ نکالا ہوتا تو میں کبھی تجھے چھوڑ کر نہ نکلتا۔'' اس کے بعد آپ ﷺ ثور کی طرف روانہ ہو گئے۔

چوں کہ نبی ﷺ کو معلوم تھا کہ قریش پوری جاں فشانی سے آپ ﷺ کی تلاش میں لگ جائیں گے اور جس راستے پر پہلے ان کی نظر اٹھے گی، وہ مدینہ کا کارروانی راستہ ہوگا جو شمال کے رخ پر جاتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے وہ راستہ اختیار کیا جو اس کے بالکل الٹ تھا، یعنی یمن جانے والا راستہ جو مکہ کے جنوب میں واقع ہے۔ آپ نے اس راستے پر کوئی پانچ میل کا فاصلہ طے کیا اور اس پہاڑ کے دامن میں پہنچے جو ثور کے نام سے معروف ہے۔

یہ نہایت بلند، پُر پیچ اور مشکل چڑھائی والا پہاڑ ہے۔ یہاں پتھر بھی بکثرت ہیں، جن سے رسول اللہ کے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے، اور کہا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نشان قدم چھپانے کے لیے پنجوں کے بل چل رہے تھے، اس لیے آپ ﷺ کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو، حضرت ابوبکرؓ نے پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر آپ ﷺ کو اٹھا لیا اور دوڑتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار کے پاس جا پہنچے جو تاریخ میں غارِ ثور کے نام سے معروف ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کے انتظامات

غارِ ثور کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ہی حضرت ابوبکرؓ نے تمام ضروری تیاریاں کر لی تھیں۔ بخاری میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ ہم لوگوں نے جلدی جلدی دونوں مسافروں کے لیے سامان سفر تیار کیا اور ایک تھیلے میں زادِ راہ کے طور پر ضروری چیزیں رکھ دیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہؓ کو، جو نہایت ہوشیار نوجوان تھے، ہدایت فرمائی کہ دن اہلِ مکہ میں گزارو اور خبریں لیتے رہو۔ پھر رات کو ہمارے پاس آ کر دن بھر کی جمع شدہ اطلاعات سنا دیا کرو۔ اپنے آزاد کردہ غلام حضرت عامر بن فہیرہؓ کو حکم دیا کہ وہ دن بھر حسبِ معمول ہماری بکریاں چراتے رہیں اور اہلِ مکہ کی خبریں لیتے رہیں۔ پھر رات گئے ہمارے پاس آ کر بکریوں کا دودھ بھی دے دیا کریں اور جو خبریں سنیں، وہ بھی ہمیں بتا دیا کریں۔

غارِ ثور کی سرگزشت

غار کے پاس پہنچ کر ابوبکرؓ نے کہا: ''خدا کی لیے ابھی آپ ﷺ اس میں داخل نہ ہوں۔ پہلے میں داخل ہو کر دیکھ لیتا ہوں۔ اگر اس میں کوئی چیز ہوئی تو آپ کے بجائے مجھے اس سے سابقہ پیش آئے گا'' چناں چہ ابوبکرؓ اندر گئے اور غار کو صاف کیا۔ ایک جانب چند سوراخ تھے، جنھیں اپنا تہ بند پھاڑ کر بند کیا، لیکن دو سوراخ باقی بچ رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں پر اپنے پاؤں رکھ دیئے۔ پھر رسول اللہ سے عرض کی کہ اندر تشریف لے آئیں۔ آپ ﷺ اندر تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکرؓ کی آغوش میں سر رکھ کر سو گئے۔ ادھر ابوبکرؓ کے پاؤں میں کسی چیز نے ڈس لیا۔ مگر اس ڈر سے ہلے بھی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ جاگ نہ جائیں، لیکن ان کے آنسو حضور ﷺ کے چہرے پر ٹپک گئے اور آپ ﷺ کی آنکھ کھل گئی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ابوبکر، تمھیں کیا ہوا؟'' عرض کی، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! مجھے کسی چیز نے ڈس لیا ہے۔ رسول اللہ نے اس پر لعاب دہن لگا دیا اور تکلیف جاتی رہی۔

ادھر قریش نے رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں مکہ اور اس کے اطراف کا کونہ کونہ چھان مارا۔ پھر وہ دو ماہر کھوجیوں کو لائے، تاکہ وہ قدموں کے نشانات سے آپ ﷺ کا سراغ لگائیں۔ یہ کھوجی سراغ لگاتے ہوئے غارِ ثور تک پہنچ گئے، مگر وہاں انھوں نے دیکھا کہ غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا تنا ہوا ہے۔ ایک کھوجی کرز بن علقمہ خزاعی نے کہا، یہاں سے آگے کوئی پتا نہیں چلتا۔ قریش کے جو لوگ کھوجیوں کے ساتھ آئے تھے، ان میں سے ایک نے کہا، غار میں چل کر بھی دیکھ لیا جائے۔ مگر امیہ بن خلف نے کہا: ''یہاں کیا پاؤ گے؟ اس غار پر تو مکڑی کا جالا محمد ﷺ کی پیدائش سے بھی پہلے کا تنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔'' اس کے بعد سب الٹے پلٹ گئے۔''

یہی موقع تھا جب ابوبکرؓ نے دشمنوں کو عین غار کے دہانے پر کھڑا دیکھ کر حضور ﷺ سے عرض کیا: ''یا رسول اللہ، اگر ان میں سے کوئی بھی اپنے پاؤں کے نیچے دیکھے تو ہمیں دیکھ لے گا۔''

حضور ﷺ نے پورے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: ''اے ابوبکرؓ، تمھارا کیا خیال ہے ان دو آدمیوں کے متعلق جن میں تیسرا اللہ ہے۔'' اسی واقعے کا ذکر قرآن پاک (سورۂ توبہ۔ آیت 40) میں یوں آیا ہے۔

﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبہ: 40)

''اگر تم (مسلمان) اس کی (یعنی نبی کی) مدد نہ کرو گے تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ اس کی مدد اس وقت کر چکا ہے جب اسے کافروں نے نکال دیا تھا، جب وہ دو میں کا ایک تھا، جب وہ دونوں غار میں تھے، جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کر۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

یہ آخری مقام تھا جہاں دشمن حضور ﷺ کو پانے کی امید کر سکتے تھے۔ یہاں جب آپ ﷺ نہ ملے تو انھوں نے سمجھ لیا کہ آپ ﷺ ان کی دست رس سے باہر جا چکے ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے عام اعلان کر دیا کہ جو شخص محمد ﷺ اور ابوبکرؓ کو پکڑ لائے یا قتل کر دے، اسے دونوں کی دیت دی جائے گی، یعنی سو سو اونٹ۔

یہاں دونوں حضرات نے تین راتیں یعنی جمعہ، ہفتہ، اور اتوار کی راتیں چھپ کر گزاریں۔ اس دوران میں حضرت ابوبکرؓ کے صاحب زادے عبداللہؓ بھی یہیں رات گزارتے تھے۔ سحر کی تاریکی میں وہ ان دونوں حضرات کے پاس سے چلے جاتے اور مکہ میں قریش کے ساتھ یوں صبح کرتے گویا انھوں نے رات یہیں گزاری ہے۔ پھر آپ دونوں کے خلاف سازش کی جو کوئی بات سنتے، اسے اچھی طرح یاد کر لیتے اور جب تاریکی گہری ہو جاتی تو اس کی خبر لے کر غار میں پہنچ جاتے۔

ادھر حضرت ابوبکرؓ کے غلام عامرؓ بن فہیرہ بکریاں چراتے رہتے اور جب رات کا ایک حصہ گزر جاتا تو بکریاں لے کر ان کے پاس پہنچ جاتے۔ اس طرح دونوں حضرات رات کو آسودہ ہو کر دودھ پی لیتے۔ پھر صبح سویرے ہی عامرؓ بکریاں ہانک کر چل دیتے۔ تینوں رات انھوں نے یہی کیا۔ مزید یہ کہ عامرؓ، حضرت عبداللہؓ بن ابی بکر کے مکہ جانے کے بعد انھی کے نشاناتِ قدم پر بکریاں ہانکتے تھے تاکہ نشانات مٹ جائیں۔

غارِ ثور سے مدینے کی طرف

تین ہی شب و روز میں حضور ﷺ کی تلاش کے لیے قریش کی سرگرمیاں سرد پڑ چکی تھیں۔ چناں چہ عبداللہ بن اریقط حضرت ابوبکرؓ کی ہدایت کے مطابق دونوں اونٹنیاں لے کر تیسری رات کے آخری حصے میں غارِ ثور میں پہنچ گیا۔ ٹھیک وقت پر حضرت اسماءؓ بھی زادِ راہ ایک تھیلے میں لیے ہوئے پہنچ گئیں، مگر اسے باندھنے کے لیے کوئی چیز ساتھ لانے کا انھیں خیال نہ رہا۔ آخر کار انھوں نے اپنا نطاق (وہ کپڑا جو اس زمانے میں خواتین کمر پر لپیٹتی تھیں) کھول کر اسے پھاڑا۔ ایک حصے سے توشہ باندھ کر کجاوے کے ساتھ لٹکا دیا، اور اپنی کمر باندھنے کے لیے دوسرے حصے پر اکتفا کیا۔ اسی بنا پر حضرت اسماءؓ کو ذات النطاقین (دو نطاقوں والی) کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد یہ قافلہ اس طرح روانہ ہوا کہ ایک اونٹنی پر رسول اللہ تھے۔ دوسری پر حضرت ابوبکرؓ اور انھوں نے اپنے پیچھے عامر بن فہیرہ کو بٹھا لیا تھا۔ آگے آگے عبداللہ بن اریقط راستہ بتانے کے لیے پیدل چل رہا تھا۔ اس طرح اس عظیم الشان سفرِ ہجرت کی ابتدا ہوئی جس نے دنیا کی تاریخ بدل ڈالی۔

عبداللہ بن اریقط جب اس قافلے کو لے کر چلا تو اس نے عام راستے سے ہٹ کر مدینہ جانے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا، تاکہ دشمنوں سے بچ کر نکلا جا سکے۔ حضرت ابوبکرؓ چوں کہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر پھرتے رہتے تھے، اس لیے لوگ انھیں دیکھ کر پہچان لیتے اور پوچھتے، یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ وہ جواب دیتے ''یہ ایک صاحب ہیں جو میری راہ نمائی کر رہے ہیں۔''

صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ ہم دوسرے دن دوپہر تک چلتے رہے۔ جب گرمی تیز ہوئی تو مَیں نے نظر دوڑائی کہ کہیں سایہ دار جگہ ہے؟ نہیں۔ دیکھا کہ ایک چٹان کے نیچے ابھی سایہ موجود ہے۔ وہاں جا کر مَیں نے رسول کریم ﷺ کے لیے فرش بچھا کر عرض کیا کہ آپ آرام فرما لیں۔ پھر میں ہر طرف دیکھتا رہا کہ کہیں ہماری تلاش میں کوئی آ تو نہیں رہا۔ اتنے میں ایک لڑکا بکریاں چراتا ہوا سایے میں پناہ کے لیے اسی چٹان کی طرف آ گیا۔ مَیں نے اس سے کہا، ہمیں اپنی کسی بکری کا دودھ نکال دو گے؟ وہ اس پر راضی ہو گیا۔ مَیں نے بکری کا تھن اور اس لڑکے کے ہاتھ صاف کرا کے ایک برتن میں دودھ نکلوایا۔ پھر تھوڑا سا پانی ڈال کر اسے ٹھنڈا کیا، اور لے جا کر رسول اللہ ﷺ کو پلایا۔

سراقہ بن مالک کا واقعہ

راستے میں سراقہ بن مالک نے تعاقب کیا اور اس واقعے کو خود سراقہ نے بیان کیا ہے۔ وہ بنی مدلج کا رئیس تھا اور قدید کے قریب اس کا علاقہ تھا۔ اس کا یہ واقعہ صحیح بخاری اور مسلم میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ہمارے پاس قریش کے آدمی یہ پیغام لے کر آئے کہ جو شخص محمد ﷺ اور ابوبکرؓ کو قتل کر دے یا گرفتار کر لے، اسے ان میں سے ہر ایک کی پوری دیت (سو سو اونٹ) دی جائے گی۔ اس کے بعد ایک روز اپنی قوم کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آ کر مجھ سے کہا: ''ابھی مَیں نے ساحل پر کچھ آدمی جاتے ہوئے دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی ہیں۔'' میں سمجھ گیا کہ واقعی وہی ہیں، مگر مَیں نے اس سے کہا کہ وہ نہیں، بلکہ تم نے فلاں فلاں کو دیکھا ہے جو ابھی ہمارے سامنے سے گزرے ہیں۔ پھر میں اس مجلس میں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد اٹھ کر اپنے گھر گیا اور اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس طرف خاموشی کے ساتھ نکل گیا کہ دوسرے لوگوں کو میرے جانے کا علم نہ ہونے پائے۔ میں ان کے قریب پہنچا تھا کہ یکایک اپنے گھوڑے پر سے گر پڑا۔ مَیں نے فال کے تیر اپنے ترکش سے نکال کر فال دیکھی تو وہ میری خواہش کے خلاف نکلی، میں اس کی پروا کیے بغیر پھر چلا اور اس قدر قریب پہنچ گیا کہ رسول اللہ ﷺ کی قرأت صاف سنائی دے رہی تھی۔ حضور ﷺ کسی طرف مڑ کر نہیں دیکھ رہے تھے۔ مگر ابوبکرؓ بار بار

طرف مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے۔ اتنے میں یک لخت میرے گھوڑے کے پاؤں زمین میں گھٹنوں تک دھنس گئے اور میں اس پر سے گر پڑا۔

حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ ہم اس وقت سخت زمین سے گزر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ ہمارا تعاقب کرنے والا بہت قریب آ گیا ہے۔ آپ ﷺ نے اس پر دعا کی اور وہ زمین میں پیٹ تک دھنس گیا۔

سراقہ کہتا ہے کہ میں نے پھر فال نکالی تو وہ میری خواہش کے خلاف نکلی۔ تب میں نے پکار کر امان مانگی اور وہ ٹھہر گئے۔ میں اپنے گھوڑے پر چڑھ کر ان کے پاس پہنچا۔ جو کچھ مجھ پر گزری تھی، اس سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کا کام کامیاب ہو کر رہے گا۔"

سراقہ نے پکار کر کہا: ''میں سراقہ بن جعشم ہوں۔ آپ لوگ مجھے موقع دیں کہ میں آپ سے بات کروں۔ خدا کی قسم، میں آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچاؤں گا اور نہ مجھ سے کوئی ایسی بات سرزد ہوگی جو آپ کو ناگوار ہو۔''

سراقہ کا بیان ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو بتایا کہ آپ کی قوم نے آپ کے لیے دیت کا اعلان کیا ہے اور لوگ اس فکر میں پھر رہے ہیں کہ یہ انعام حاصل کریں۔ پھر میں نے زادِ راہ اور سامان کی پیشکش کی، مگر آپ ﷺ نے اس کے سوا اور کسی چیز کی خواہش مجھ سے نہیں کی کہ میں آپ کی اطلاع کسی اور کو نہ دوں۔ میں نے درخواست کی کہ مجھے ایک امان نامہ لکھ دیجیے۔ حضور ﷺ نے عامرؓ بن فہیرہ کو حکم دیا تو انھوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر تحریر مجھے لکھ دی۔ جو تحریر میں نے اس وقت لی تھی، اسے اپنے پاس محفوظ رکھا اور کئی سال بعد جب حضور ﷺ حنین اور طائف کے معرکوں سے پلٹ کر جعرانہ میں قیام پزیر تھے تو میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور وہ تحریر پیش کر کے عرض کیا: ''میں سراقہ بن مالک ہوں اور یہ آپ کی دی ہوئی تحریر میرے پاس ہے۔ اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا: ''آج وعدہ پورا کرنے اور احسان کرنے کا دن ہے، اسے میرے نزدیک آنے دو۔'' میں قریب ہوا اور حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

حضور ﷺ نے سراقہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''وہ بھی کیا وقت ہوگا جب تم کسریٰ کے کنگن پہنو گے۔'' اس ارشاد کے چند ہی سال بعد جب حضرت عمرؓ کے پاس شاہِ ایران کے کنگن اور اس کا کمرپٹہ اور اس کا تاج لایا گیا تو انھوں نے حضرت سراقہؓ کو بلایا اور یہ چیزیں انھیں پہنا کر کہا، ہاتھ اٹھاؤ اور کہو: ''تعریف ہے اس خدا کی، جس نے یہ چیزیں اس کسریٰ بن ہرمز سے چھین لیں جو کہتا تھا کہ میں لوگوں کا رب ہوں اور انھیں بنی مدلج کے ایک بدو سراقہ بن مالک کو پہنا دیا۔''

ام معبد کا قصہ

قدید ہی کے علاقے سے گزرتے ہوئے یہ مقدس قافلہ بنی خزاعہ کی ایک عورت ام معبد کی قیام گاہ پر پہنچا۔ ام معبد (عاتکہ بنت خالد) پختہ عمر کی باعفت اور شان دار عورت تھی اور ان لوگوں کی میزبانی کیا کرتی تھی جو اس کے پاس سے گزرتے تھے۔

حضور ﷺ اور آپ کے ساتھی جب وہاں پہنچے تو وہ اپنے خیمے کے آگے صحن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ زمانہ قحط کا تھا، جس سے سارا علاقہ بُری طرح متاثر تھا۔ ان حضرات نے اس سے کہا کہ دودھ یا گوشت یا کھجوریں، جو کچھ بھی تمھارے پاس ہو، ہمیں دو، ہم اس کی قیمت ادا کر دیں گے۔ اس نے کہا، واللہ! اگر ہمارے پاس کچھ بھی ہوتا، تو ہم آپ لوگوں کی ضیافت کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کرتے۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ کی نظر ایک بکری پر پڑی جو خیمے کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ حضور ﷺ نے پوچھا: ''معبد کی ماں، یہ بکری کیسی ہے؟''

ام معبد نے کہا: ''یہ بےچاری اپنی لاغری اور کمزوری کی وجہ سے دوسری بکریوں کے ساتھ چرنے نہ جا سکی۔''

آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ کچھ دودھ دے سکتی ہے؟''

اس نے عرض کیا: ''یہ اس سے زیادہ نڈھال ہے کہ دودھ دے سکے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم مجھے اجازت دیتی ہو کہ میں اس کا دودھ دوہ لوں؟'' اس نے کہا: ''صدقے جائیں میرے ماں باپ آپ پر۔ اگر آپ اس میں کچھ بھی دودھ پائیں تو ضرور نچوڑ لیں۔''

آپ ﷺ نے بکری کو طلب کیا۔ پھر اس کے پاؤں باندھے۔ اس کے تھنوں اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ دعا فرمائی کہ یا اللہ، اس عورت کی بکریوں میں برکت دے اور اللہ کا نام لے کر دودھ دوہنا شروع کیا۔ خدا کی شان، بکری نے ٹانگیں پھیلائیں، جگالی کرنے لگی اور دودھ کی دھار اس کے تھنوں سے بہ نکلی۔ حضور ﷺ نے ایک بڑا برتن منگایا۔ آپ دوہتے چلے گئے، یہاں تک کہ برتن لبالب بھر گیا اور اوپر جھاگ آ گئے۔ آپ ﷺ نے پہلے ام معبد کو پلایا، حتیٰ کہ وہ سیر ہو گئی۔ پھر اپنے ساتھیوں کو پلایا اور وہ بھی سیر ہو گئے۔ آخر میں آپ ﷺ نے خود پیا اور فرمایا: ((ساقی القوم آخرھم)) یعنی لوگوں کو پلانے والا خود آخر میں پیتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ آپ ﷺ نے اس برتن کو دودھ سے بھر کر معبد کی ماں کے حوالے کیا اور یہ فرما کر آگے روانہ ہو گئے کہ یہ دودھ معبد کے باپ کو دے دینا، جب وہ آئے۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اس کا شوہر اپنی دبلی پتلی بکریاں لیے ہوئے پلٹا۔ دودھ سے بھرا ہوا برتن دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا: ''معبد کی ماں، یہ دودھ کہاں سے آیا ہے؟'' وہ بولی ''خدا کی قسم، ایک مبارک آدمی کا گزر یہاں سے ہوا تھا، اس نے یہ کچھ کیا۔'' پھر اس نے سارا قصہ اپنے شوہر کو سنایا۔ اس نے کہا، ذرا اس کا حلیہ تو مجھے بتا۔

ام معبد نے حضور ﷺ کا حلیہ بتایا: ''میں نے ایک ایسا شخص دیکھا جس کا حسن و جمال نمایاں تھا۔ چہرہ روشن تھا۔ اخلاق پاکیزہ تھے۔ بدن بھاری تھا نہ نحیف، خوب صورت اور خوش اندام تھا۔ آنکھوں میں گہری سیاہی تھی۔ پلکیں لمبی تھی۔ آواز بلند تھی مگر کرخت نہ تھی۔ آنکھوں کی پتلیاں بہت سیاہ اور ڈھیلے بہت سفید تھے۔ آنکھوں کے کوئے سیاہی مائل تھے۔ بھویں نہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھیں نہ بالکل ملی ہوئی، بلکہ درمیان میں، ہلکے ہلکے بال تھے اور بھوؤں کے کنارے باریک تھے۔ بال

نہایت سیاہ تھے۔ گردن میں درازی تھی۔ ڈاڑھی گھنی تھی۔ خاموش ہوتا تو اس کا وقار نمایاں ہوتا تھا۔ بولتا تو معلوم ہوتا کہ اس کی آواز گرد و پیش پر چھا گئی ہے۔ گفتگو ایسی تھی کہ جیسے زبان سے موتیوں کی لڑی سلسلہ وار نکلتی چلی آ رہی ہو۔ کلام شیریں اور واضح تھا۔ نہ کم گو تھا نہ باتونی۔ دور سے سنو تو اس کی آواز سب سے زیادہ بلند، مگر خوش آہنگ محسوس ہوتی، اور قریب سے سنو تو بہت شیریں اور لطیف معلوم ہوتی تھی۔ میانہ قد نہ ایسا دراز کہ بدنما نظر آئے اور نہ اتنا پستہ قد کہ کوئی نگاہ اس سے بلند قد کی طرف متوجہ ہو۔ اپنے ساتھیوں میں وہ سب سے زیادہ خوش منظر تھا اور سب سے زیادہ بہتر قدر و منزلت رکھتا تھا۔ اور اُس کے رفقا اسے گھیرے رہتے تھے۔ اس کی بات بڑی توجہ سے سنتے اور اس کے حکم پر دوڑ پڑتے تھے۔ وہ مخدوم تھا۔ مالوف تھا، نہ ترش رو اور نہ درشت کلام،" ابو معبد یہ سن کر بول اٹھا کہ خدا کی قسم، یہ تو وہی صاحب قریش تھے جن کا ذکر ہم سنتے رہے ہیں۔ اگر میں ان سے ملتا تو ان کا ساتھ دینے کی درخواست کرتا، اور اب موقع ملا تو میں ضرور اس کی کوشش کروں گا۔

راستے میں حضور ﷺ کو بریدہؓ اسلمی ملے۔ یہ اپنی قوم کے سردار تھے اور قریش نے جس زبردست انعام کا اعلان کر رکھا تھا، اسی کے لالچ میں نبی ﷺ اور ابوبکرؓ کی تلاش میں نکلے تھے، لیکن جب رسول اللہ ﷺ سے سامنا ہوا اور بات چیت ہوئی تو نقد دل دے بیٹھے اور اپنی قوم کے ستر آدمیوں سمیت وہیں مسلمان ہو گئے۔ پھر اپنی پگڑی اتار کر نیزے سے باندھ لی، جس کا سفید پھریرا ہوا میں لہراتا اور بشارت سناتا تھا کہ امن کا بادشاہ، صلح کا حامی، دنیا کو عدالت و انصاف سے بھرپور کرنے والا تشریف لا رہا ہے۔

راستے میں نبی کریم ﷺ کو حضرت زبیر بن عوام بھی ملے۔ یہ مسلمانوں کے ایک تجارت پیشہ گروہ کے ساتھ ملک شام سے واپس آ رہے تھے۔ حضرت زبیرؓ نے رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کو سفید پارچات پیش کیے۔

قبا میں تشریف آوری

یہ مختصر مگر مقدس قافلہ ربیع الاول کو جبل ثور سے روانہ ہوا اور آٹھ دن بعد آٹھ ربیع الاول سن 14 نبوی یعنی سن ایک ہجری مطابق 23 ستمبر 622ء کو بروز پیر قبا پہنچے۔ اس دن نبی کریم ﷺ کی عمر بغیر کسی کمی بیشی کے کے، ٹھیک ترپن سال ہوئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت، حجر اسود کی تنصیب، نبوت و رسالت، مکہ سے ہجرت، مدینہ منورہ میں آمد اور وفات سب ہی دوشنبہ یعنی پیر کے دن سے مخصوص ہیں۔

حضور ﷺ کے مکہ سے نکلنے کی اطلاع مدینے پہنچ چکی تھی۔ مسلمان روزانہ صبح کے وقت نکل کر مکہ کے راستے پر بیٹھ جاتے تھے اور اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک دھوپ کی تپش ناقابلِ برداشت نہ ہو جاتی۔ پھر اپنے گھروں کو پلٹ جاتے تھے۔ مہاجرین آپ ﷺ کی آمد میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے پریشان تھے۔ ہر روز وہ اور انصار حرۃ العصبہ پر جا بیٹھتے اور دھوپ چڑھنے تک انتظار کرتے رہتے تھے۔ حرہ لاوے سے جلی ہوئی سیاہ چٹانوں کو کہتے ہیں۔ مدینہ کے نواح میں ہر طرف یہ چٹانیں پائی جاتی ہیں۔ اسے حرہ قبا بھی کہتے ہیں۔

اس روز دوپہر کا وقت تھا اور لوگ حضور ﷺ کا انتظار کر کے گھروں کو جا چکے تھے۔ تب آپ ﷺ اپنے ساتھیوں کی معیت میں قبا پہنچے جو مدینے کی نواحی بستیوں میں مشہور ترین بستی ہے۔ ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ حرہ قبا کے قریب پہنچ کر اس کے ایک جانب اتر گئے اور انصار کو اطلاع دینے کے لیے کسی کو بھیجا۔ یہ خبر پاتے ہی لوگ آئے اور انھوں نے حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کو سلام کر کے عرض کیا، آپ ﷺ اطمینان سے تشریف لے چلیں۔ ہم سب آپ کے تابع فرمان ہیں۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری کی خبر سنتے ہیں پانچ سو آدمی استقبال کے لیے دوڑ پڑے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ جب حضور ﷺ قبا کے قریب پہنچے تو ایک یہودی نے جو اپنی گڑھی کے اوپر کسی کام کے لیے چڑھا ہوا تھا، آپ ﷺ کو آتے دیکھ کر انتہائی بلند آواز سے پکار کر کہا: "اے بنی قیلہ، یہ تمھارے سردار آ پہنچے" (اوس اور خزرج چوں کہ ایک ماں کی اولاد تھے، جس کا نام قیلہ تھا، اس لیے انھیں بنی قیلہ کہا جاتا تھا) سنتے ہی بنی عمرو بن عوف نے، جو قبا میں آباد تھے، بیک زبان نعرہ تکبیر بلند کیا اور ہتھیاروں سے سج کر آپ ﷺ کے استقبال کے لیے چل پڑے۔ ادھر حضور ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اپنی سواریوں سے اتر کر کھجور کے ایک درخت کے سایے میں تشریف فرما ہو گئے۔ انصار کا ہجوم بڑے جوش و خروش کے ساتھ آپ ﷺ کے مقامِ نزول پر حاضر ہوا۔ جذبۂ بے اختیاری کی وجہ سے لوگ ٹوٹے پڑتے تھے، مگر جانتے نہ تھے کہ دونوں صاحبوں میں سے رسول ﷺ کون سے ہیں۔ اس بنا پر اول اول وہ حضرت ابوبکر کو سلام کرتے رہے۔ پھر جب دھوپ حضور ﷺ تک پہنچنے لگی حضرت ابوبکرؓ نے اٹھ کر اپنی چادر سے آپ ﷺ پر سایہ کیا۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کون سے ہیں، اور لوگ آپ ﷺ کو سلام کرنے لگے۔

قبا میں حضور ﷺ کا قیام قبیلہ اوس کی ایک شاخ بنی عمرو بن عوف کی بستی میں رہا۔ وہاں آپ ﷺ کی میزبانی کا شرف حضرت کلثوم بن ہدم کو حاصل ہوا۔ یہ ایک سن رسیدہ بزرگ تھے۔ حضور ﷺ کی تشریف آوری کے تھوڑی مدت کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ قیام تو حضور ﷺ کا کلثوم کے ہاں تھا، لیکن حضور ﷺ لوگوں سے ملاقات کے لیے حضرت سعد بن خیثمہ کے ہاں تشریف فرما ہوتے تھے، کیوں کہ وہ بچوں والے نہ تھے اور ان کا پورا گھر مردوں کے لیے کھلا ہوا تھا۔

اسی زمانے میں حضرت علیؓ مکہ سے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ آپ ﷺ کے ساتھ ہی کلثومؓ بن ہدم کے ہاں قیام کیا۔ وہ مکہ میں تین دن ٹھہرے اور اہل مکہ کی وہ تمام امانتیں واپس کیں جو حضور ﷺ کے پاس رکھی ہوئی تھیں۔ اس کے بعد انھوں نے وہاں سے ہجرت کی۔

حضور ﷺ نے قبا میں قیام کے دوران میں مسجد قبا کی بنیاد رکھی۔ اس مسج

لیے زمین کلثوم بن ہدم نے ہدیہ کی۔ مسجد قبا اسلام کی پہلی مسجد ہے، جس کا سنگ بنیاد اللہ کے آخری رسول ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا تھا۔ دیکھنے میں پتھروں کی حد بندی تھی، لیکن اس کی رفعت وعظمت کا کون اندازہ کر سکتا ہے جس کے معمار ''السابقون الاولون'' ہوں۔ یہی وہ مسجد ہے جس کے بارے میں قرآن کی سورۂ توبہ، آیت 108 شہادت دے رہی ہے:

﴿لَا تَقُمْ فِيهِ أَبَدًا لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ أَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ (التوبہ: 108)

''البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن ہی سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے، اس قابل ہے کہ اس میں جایا (اور نماز پڑھا) کرو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک والوں کو پسند کرتا ہے۔''

مسجد قبا اب بھی مدینہ منورہ کے جنوب مغرب میں موجود ہے اس کے قبلے سے متصل جس مقام پر اب ایک قبہ ''مقام العمرہ'' کے نام سے معروف ہے، یہی حضرت کلثوم بن ہدم کا مکان تھا، اور اس کے قریب دوسرا قبہ جو مسجد سے متصل ہے اور بیت فاطمہ کے نام سے معروف ہے، وہ حضرت سعد بن خیثمہ کا مکان تھا۔

حضور ﷺ جمعہ کے روز دن چڑھے قبا سے روانہ ہوئے۔ بنی سالم بن عوف کی بستی میں پہنچے تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آ گیا۔ آپ وہاں اترے اور ان کی مسجد میں جمعہ پڑھا۔ تقریباً سو آدمی اس نماز میں شریک تھے اور یہ پہلا جمعہ تھا جو حضور ﷺ کی امامت میں پڑھا گیا۔ بنی سالم کی یہ مسجد وادی رانونا میں تھی اور پہلے مسجد غبیب کہلاتی تھی۔ حضور ﷺ کے وہاں جمعہ پڑھانے کے بعد مسجد جمعہ کے نام سے مشہور ہو گئی اور آج تک اس نام سے مشہور ہے۔ مدینہ سے قبا جاتے ہوئے یہ راستے کے بائیں جانب ملتی ہے۔

پہلے جمعے کا پہلا خطبہ

مسجد جمعہ میں حضور ﷺ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا، اس کا ترجمہ یہ ہے: ''حمد و ستائش اللہ کے لیے ہے۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں۔ مدد و بخشش اور ہدایت اسی سے طلب کرتا ہوں۔ میرا ایمان اسی پر ہے۔ اس کی نافرمانی نہیں کرتا، جو کرے اس کا دشمن ہوں۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ محمد ﷺ اُس کا بندہ اور رسول ہے۔ اُسی نے محمد ﷺ کو ہدایت دی۔ نور و نصیحت کے ساتھ بھیجا ہے، جب کہ مدتوں سے کوئی رسول دنیا میں نہیں آیا۔ علم کم ہو گیا تھا اور لوگ گم راہ ہو گئے تھے۔ اُسے آخری زمانے میں قیامت کے نزدیک زندگی کے اختتام کے قریب بھیجا گیا۔ جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، وہی ہدایت پاتا ہے۔ جس نے ان کا حکم نہ مانا، وہ بھٹک گیا۔ مقام (انسانیت) سے گر گیا۔ ضلالت اور گم راہی میں پھنس گیا۔

''مسلمانو! میں تمھیں اللہ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ بہترین وصیت جو مسلمان، مسلمان کو کر سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ آخرت کے لیے آمادہ کرے اور تقویٰ کے لیے کہے۔ اللہ نے جن باتوں سے تمھیں دور رہنے کو کہا ہے، ان سے بچتے رہو۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی نصیحت ہے نہ ذکر۔ یاد رکھو! جو شخص خشیت الٰہی کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کا تقویٰ آخرت میں بہترین مددگار ثابت ہو گا۔ نیز جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان کا معاملہ خفیہ اور ظاہر میں درست کرتا ہے، تو اس کے لیے دنیا میں ذکر باقی رہے گا اور آخرت میں نیکیوں کا ذخیرہ بن جائے گا، لیکن کوئی ایسا نہیں کرتا تو اس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے۔

جس نے اللہ کے حکم کو سچ جانا اور اُس نے وعدوں کو پورا کیا تو اس کی بابت اللہ تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے:

﴿مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ (ق: 29)

''ہمارے ہاں بات نہیں بدلتی اور ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتے۔''

''مسلمانو! اپنے موجودہ اور آیندہ، ظاہری اور باطنی امور میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے، وہ اس کی برائیوں کو دور اور اس کے اجر کو بہت زیادہ کر دیتا ہے۔ جو شخص اللہ سے ڈرا، اسے یقیناً عظیم کامیابی نصیب ہوئی۔ تقویٰ اللہ کے غضب، انسان کے درجات بلند کرتا ہے۔

''لوگو! اپنا حصہ لو، لیکن حقوق الٰہی میں کمی بیشی نہ کرو۔ اللہ نے تمھیں کتاب مبین سکھا دی اور اپنی راہ دکھا دی ہے، تاکہ سچوں اور جھوٹوں میں تمیز ہو۔ جس طرح اللہ نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے، تم بھی دوسروں کے ساتھ احسان کرو۔ نیز اس کے دشمنوں سے دشمنی کرو اور اس کی راہ میں ایسی کوشش کرو جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تمھیں برگزیدہ کیا اور تمھارا نام مسلمان رکھا۔ وہ ہلاک ہوا جو قرآن مجید کے مطابق ہلاکت میں پڑا، اور وہ زندہ ہوا جس نے قرآن مجید کے مطابق زندگی بسر کی۔ کسی کو نیکی کی طاقت اس کی مدد کے بغیر نہیں ہے۔ اللہ کا ذکر کثرت سے کرو اور آخرت کے لیے عمل صالح کرو۔ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان معاملہ درست کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے درمیان معاملے کو درست کر دینے کا کفیل بن جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا مالک ہے، اور اس کا کوئی مالک نہیں۔ اللہ ہی بڑا ہے، عظیم و برتر۔ اللہ کی توفیق کے بغیر کسی کو نیکی کرنے کی طاقت نہیں۔''

مدنی دور

سرورِ کائنات، حضرت محمد ﷺ نمازِ جمعہ کے بعد جب مدینہ جانے کے لیے تیار ہوئے تو بنی سالم کے لوگ حضرت عتبانؓ بن مالک اور حضرت عباسؓ بن عبادہ کی سربراہی میں سامنے آئے اور آپ ﷺ کی اونٹنی کی نکیل تھام کر انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! آپ ہمارے ہاں قیام فرمائیں۔ ہم تعداد میں بھی کافی ہیں۔ جنگی ساز و سامان بھی رکھتے ہیں اور دفاع کی طاقت بھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''میری قصویٰ کا راستہ چھوڑ دو، کیوں کہ یہ مامور ہے۔''

مطلب یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت چل رہی ہے اور اسی جگہ جا کر ٹھہرے

گی جہاں ٹھہرنے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا۔ آگے چلے تو بنی بیاضہ، بنی ساعدہ، بنی الحارث، بنی عدی بن نجار کے محلے راستے میں آئے۔ ہر جگہ ان قبیلوں کے لوگ اپنے سرداروں کی پیشوائی میں سامنے آ کر اپنے ہاں قیام کے لیے درخواست کرتے رہے، اور آپ ﷺ ان سب کو یہی جواب دیتے رہے کہ میری اونٹنی (جس کا نام قصویٰ تھا) کا راستہ چھوڑ دو، کیوں کہ یہ مامور ہے۔ حضور ﷺ نے اس کی نکیل ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی اور آپ ﷺ اسے کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں فرما رہے تھے کہ وہ کدھر جائے اور کہاں ٹھہرے۔ جب وہ بنی مالک بن نجار کے محلے میں پہنچی تو ٹھیک اس جگہ جا کر بیٹھ گئی جہاں آج مسجد نبوی اور بعض روایات کے مطابق منبر رسول ہے، مگر حضور ﷺ اس پر بیٹھے رہے۔ وہ پھر اٹھی اور کچھ دور چل کر پھر اسی جگہ پلٹ آئی اور وہیں ٹک گئی۔

جب حضور ﷺ اونٹنی سے اتر گئے تو سامنے ہی حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مکان تھا۔ وہ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرا مکان یہاں سے قریب ترین ہے۔ آپ اجازت دیں تو میں آپ ﷺ کا سامان اپنے ہاں لے جاؤں۔ حضور ﷺ نے انھیں اجازت دے دی اور وہ سامان اپنے ہاں اٹھالے گئے۔

حضرت ابوایوبؓ انصاری کا اپنا بیان ہے: ''جب حضور ﷺ میرے ہاں اترے تو آپ مکان کے نچلے حصے میں ٹھہرے اور میں اور ایوب کی ماں بالائی منزل میں رہے۔ رات کو میں نے ایوبؓ کی ماں سے کہا کہ حضور ﷺ اوپر قیام فرمانے کے زیادہ حق دار ہیں، کیوں کہ آپ ﷺ کے پاس ملائکہ آتے ہیں اور آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اس خیال سے نہ میں رات کو سوسکا اور نہ ایوب کی ماں۔ صبح میں نے حضور ﷺ سے یہ ماجرا عرض کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: نیچے کا مکان میرے لیے زیادہ آرام دہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں ایسے بالا خانے میں نہیں رہ سکتا۔ جس کے نیچے آپ قیام فرما ہوں۔ غرض میں نے اتنی التجا کی کہ آپ ﷺ اوپر کی منزل میں رہنے پر راضی ہو گئے۔

مدینے میں حضور ﷺ کا استقبال

اہل مدینہ نے انتہائی عقیدت و محبت کے ساتھ آپ ﷺ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، لیکن شہر مدینہ میں آپ ﷺ کا استقبال جس جوش و خروش اور جس والہانہ انداز میں ہوا، وہ بے نظیر تھا۔ عرب میں نہ اس سے پہلے کبھی کسی کا ایسا استقبال ہوا تھا، نہ اس کے بعد ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت ہے کہ جب ہم مدینے پہنچے تو لوگ ہمارے استقبال کے لیے سڑکوں پر نکل آئے۔ چھتوں پر ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ خدام اور لڑکے راستوں میں دوڑتے پھرتے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر ''جاء رسول اللّٰہ، جاء رسول اللّٰہ'' کا نعرہ تھا۔ حضرت بریدہ اسلمی جھنڈا فضاؤں میں لہراتے آگے آگے چل رہے تھے۔ حضرت انسؓ (جن کی عمر اس وقت دس سال تھی) آگے آگے یہی صدا لگاتے گزر رہے تھے۔ لوگ اونچی جگہوں پر چڑھ کر آپ ﷺ کے دیدار کے لیے نگاہیں دوڑا رہے تھے۔

عورتیں اور لڑکیاں چھتوں پر چڑھ کر یہ گیت گا رہی تھیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا
مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
أَيُّهَا الْمَبْعُوثُ فِيْنَا
جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

قریش کی جھلاہٹ

آنحضرت ﷺ کا بخیریت مدینے پہنچ جانا ہی کفار قریش کے لیے سخت پریشان کن تھا۔ مگر جب انھیں مدینے میں حضور ﷺ کے اس شان دار استقبال کی خبر پہنچی تو وہ بری طرح تلملا اٹھے اور انھوں نے مدینے کے سردار عبداللہ بن ابی کو خط لکھا:
''تم لوگوں نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم خدا کی قسم کھاتے ہیں کہ یا تو تم خود اس سے لڑو یا اسے نکال دو، ورنہ ہم سب تم پر حملہ آور ہوں گے اور تمھارے مردوں کو قتل اور تمھاری عورتوں کو کنیزیں بنالیں گے۔''

آنحضور ﷺ کی ہجرت سے پہلے اہل مدینہ عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ بنانے کی تیاری کر چکے تھے، جس کی تمناؤں پر حضور ﷺ کے مدینہ پہنچ جانے اور اوس و خزرج کی اکثریت کے مسلمان ہو جانے سے پانی پھر گیا تھا۔ اس لیے وہ کفار قریش کا خط ملنے پر کچھ آمادہ شر ہوا، مگر حضور نے بروقت اس شر کی روک تھام کر دی۔

پھر حضرت سعد بن معاذ رئیس مدینہ عمرے کے لیے مکہ گئے۔ وہاں عین حرم کے دروازے پر ابوجہل نے انھیں ٹوک کر کہا: ''تم ہمارے دین کے مرتدوں کو پناہ دو اور ان کی امداد و اعانت کا دم بھرو، اور ہم تمھیں اطمینان سے مکہ میں طواف کرنے دیں؟ بخدا اگر تم ابوصفوان (یعنی امیہ بن خلف) کے ساتھ نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ نہیں جا سکتے تھے۔''

حضرت سعد نے جواب میں کہا: ''بخدا، اگر تم نے مجھے اس چیز سے روکا تو میں تمھیں اس چیز سے روک دوں گا، جو تمھارے لیے اس سے شدید تر ہے، یعنی مدینہ پر سے تمھاری رہ گزر۔''

یہ گویا اہلِ مکہ کی طرف سے اس بات کا اعلان تھا کہ بیت اللہ کی زیارت کی راہ مسلمانوں پر بند ہے، اور اس کا جواب اہل مدینہ کی طرف سے یہ تھا کہ شامی تجارت کا راستہ مخالفین اسلام کے لیے پُرخطر ہے۔ اس معاملے نے واضح کر دیا کہ آئندہ حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں۔

مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر

حضرت ابوایوبؓ انصاری کے ہاں اترنے کے بعد رسول کریم ﷺ نے سب سے پہلے جس چیز کی فکر فرمائی، وہ یہ تھی کہ ایک مسجد تعمیر کی جائے۔ آپ کی اونٹنی جس جگہ جا کر ٹھہری تھی، وہاں مسلمان پہلے سے نماز کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ اسعدؓ بن زرارہ وہاں جماعت کراتے تھے اور جمعہ بھی وہاں ہوتا تھا۔ یہ دو یتیموں سہل اور سہیل کی زمین تھی جو حضرت اسعدؓ بن زرارہ کی سرپرستی میں تھے۔ اس زمین میں کھجوریں سکھائی جاتی

ہیں اور کچھ مشرکین کی پرانی قبریں تھیں۔ حضور ﷺ نے ان لڑکوں سے زمین کی قیمت کے متعلق بات کی۔ لڑکوں نے قیمت لینے سے انکار کر دیا' جسے آپ ﷺ نے قبول نہ فرمایا۔ قیمت ادا کر کے زمین حاصل کرنے کے بعد اس زمین کو صاف کیا گیا۔ اسے ہموار کیا گیا۔ قبریں اکھاڑ دی گئیں۔ کھجور کے درخت کاٹ کر ان کے تنوں سے مسجد کے لیے ستون بنا لیے گئے۔ کھجور کے پتوں کی چھت ڈال لی گئی۔ کچی اینٹوں اور گارے سے دیواریں تعمیر کر لی گئیں اور خالی زمین کا فرش رہنے دیا گیا۔ بعد میں جب بارش سے کیچڑ ہونے لگی تو کچے فرش پر کنکریاں بچھا دی گئیں اور جب کھجور کے پتوں کے نیچے گرمی ستانے لگی تو اوپر گارے کی لپائی کرا دی گئی۔ مسجد کی تعمیر میں رسول کریم ﷺ نے خود بھی سب کے ساتھ اینٹیں اور گارا ڈھونے کا کام کیا۔

حجروں کی تعمیر

مسجد نبوی سے متصل ہی حضور ﷺ نے ایک جانب اپنے لیے دو گھر بنائے۔ ایک حضرت سودہؓ کے لیے اور دوسرا حضرت عائشہ کے لیے۔ یہ گھر بھی کچی اینٹوں کے تھے۔ کھجور کی ٹہنیوں پر گارے کا لیپ کر کے حجرے الگ الگ کیے گئے تھے۔ کھجور کے پتوں ہی کی چھت ڈالی گئی تھی' اور دروازوں پر کمبل ڈال دیے گئے تھے۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ میں لڑکپن میں بلوغ سے پہلے حضور ﷺ کے گھروں میں گیا ہوں۔ چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ میں ہاتھ اٹھا کر انھیں چھو سکتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کے گھر میں ایک پٹ کا دروازہ تھا جو کبھی بند نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ بالا خانہ تھا جسے مشربہ کہتے تھے۔ ایلا کے ایام میں حضور ﷺ نے یہاں ایک مہینہ علیحدگی میں بسر فرمایا تھا۔

مسجد سے متصل ہی حضرت حارثہؓ بن نعمان کے مکانات تھے۔ حضرت سودہؓ جب مکہ سے آئیں تو انھی کے مکان میں اتریں۔ جب حضور ﷺ کسی خاتون کو شرف زوجیت بخشتے تو حضرت حارثہؓ اپنا ایک مکان خالی کر دیتے۔ اس طرح یکے بعد دیگر تمام مکان آپ ﷺ کی نذر کر دیے۔ ان میں سے چار مکان کچی اینٹ کے تھے جن کے اندرونی حجرے ٹہنیوں کے بنے ہوئے تھے۔ پانچ مکان گارے کی کہگل کی ہوئی کھجور کی شاخ کے تھے' جن میں حجرے نہ تھے۔ سارے گھر مسجد سے متصل تھے۔ حضرت عائشہؓ کے حجرے کا ایک دروازہ مسجد کے اندر مغربی رخ پر اس طرح تھا کہ مسجد اس کا صحن بن گئی۔ حضور ﷺ اس دروازے سے ہو کر مسجد میں تشریف لاتے۔ جب اعتکاف فرماتے تو سر مبارک حجرے کے اندر کر دیتے۔ حضرت عائشہؓ بال دھو کر کنگھا کر دیتیں۔ ضرورت پڑنے پر ہاتھ بڑھا کر کوئی چیز بھی طلب فرما لیا کرتے۔

حضور ﷺ جب دومتہ الجندل کی مہم پر تھے تو حضرت ام سلمہؓ نے اپنے حجرے کو کچی اینٹوں سے تعمیر کروایا۔ حضور ﷺ لوٹے تو سب سے پہلے اس پر آپ ﷺ کی نظر پڑی۔

آپ نے ام سلمہ سے پوچھا' یہ کیسی تعمیر دنیا ہے؟ عرض کیا کہ لوگوں کی نگاہوں کو روکنے کے لیے ستر ہے۔ فرمایا کہ سب سے بدتر مصرف' جس میں مسلمان کا مال خرچ ہو' تعمیر ہے۔

حضرت سودہؓ نے اپنا مکان حضرت عائشہ کو دینے کی وصیت فرمائی۔ حضرت عائشہؓ حضور ﷺ کے وصال کے بعد بھی اسی حجرے میں' جہاں مزار مبارک ہے' رہتی تھیں۔ پھر خواب میں اجازت پا کر متصل حصے میں' جو ایک دیوار اٹھا کر تقسیم کر دیا گیا تھا' سکونت اختیار کی۔ اس حجرے کو بھی جیتے جی ایک لاکھ اسی (80) ہزار درہم کے عوض حضرت معاویہؓ کو اس شرط پر فروخت کر دیا کہ تا زیست رہنے کی اجازت ہو۔ جب اس کی قیمت پیش کی گئی تو اسی مجلس میں اللہ کی راہ میں تقسیم کر دی۔ جب تک صدقہ بٹ نہ گیا' اپنی جگہ سے نہیں اٹھیں۔

حضرت صفیہؓ کے ورثا نے بھی ان کا مکان امیر معاویہؓ کو اسی قیمت پر بیچ دیا۔ حضرت حفصہؓ کا مکان حضرت عبداللہ ابن عمر کو ورثے میں ملا۔ انھوں نے بلا قیمت اسے مسجد نبوی میں شامل کر دیا۔ ولید بن عبدالملک کے حکم سے ازواج مطہرات کے مقدس حجروں کو مسجد نبوی میں شامل کر دیا گیا۔ جب یہ حکم مجمع عام میں پڑھ کر سنایا گیا تو اس دن لوگوں کو جتنا روتے دیکھا گیا' اتنا کبھی بھی روتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ کہتے تھے' کاش حجروں کو اسی حالت میں باقی رکھا جاتا' تاکہ لوگ دیکھتے کہ رسول ﷺ کا اختیار کردہ زہد کیسا تھا۔

اہل وعیال کی آمد

رجب تک رسول کریم ﷺ سات ماہ حضرت ابوایوبؓ انصاری کے ہاں مقیم رہے۔ اس دوران میں قبل اس کے کہ حضور ﷺ اپنے گھروں میں منتقل ہوتے' آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ اور اپنے آزاد کردہ غلام ابورافعؓ کو پانچ سو درہم اور دو اونٹ دے کر مکے میں بھیجا' تاکہ وہ آپ کے اہل وعیال اور متعلقین کو لے آئیں۔ ان دونوں کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ بن اریقط کو اپنے صاحب زادے عبداللہ کے نام خط دے کر بھیجا کہ وہ بھی اپنی والدہ اور بہنوں کو لے آئیں۔ زیدؓ بن حارثہ ام المومنین حضرت سودہؓ کو' حضور ﷺ کی صاحب زادیوں حضرت فاطمہؓ اور حضرت کلثومؓ کو' اور اپنی بیوی ام ایمن اور اپنے صاحب زادے اسامہ بن زید کو لے کر آئے۔ مگر حضرت زینبؓ کو نہ لا سکے' کیوں کہ ان کے شوہر ابوالعاص بن ربیع نے انھیں روک لیا۔ حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ انھی لوگوں کے ساتھ ام رومانؓ اور حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ کو لے آئے۔ مدینہ آنے پر حضور ﷺ نے اپنے خاندان والوں کو حضرت حارث بن نعمانؓ کے گھر ٹھہرایا۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہ تو پہلے ہی ہجرت کر کے آ چکے تھے۔ بڑے داماد ابوالعاص ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے۔ ان کی بیوی حضرت زینب (بنت رسول) ان کے ساتھ طائف میں مقیم تھیں۔

اذان کی ابتدا

مسجد نبوی کی تاسیس وتعمیر کے ساتھ ہی اب ایسے طریقے کی ضرورت پیش آئی' جس سے مسلمان نماز پنجگانہ کے اوقات سے آگاہ ہو سکیں اور نماز با جماعت ادا کر

سکیں۔ اس طریقے کی عدم موجودگی میں لوگ آگے پیچھے آتے اور جو جس وقت آتا' نماز پڑھ لیتا۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ کچھ لوگ مقرر کر دیے جائیں جو وقت پر لوگوں کو گھروں سے بلا لائیں' لیکن اس میں زحمت تھی۔ چناں چہ صحابہ کو بلا کر آپ ﷺ نے مشورہ فرمایا۔ بہت سی تجاویز پیش کی گئیں۔ کسی کی رائے تھی کہ اہل یہود کی طرح ناقوس بجایا جائے' اور کسی کی تجویز یہ تھی کہ عیسائیوں کی طرح گھنٹیاں بجائی جائیں۔ یہ رائے بھی دی گئی کہ نماز کے وقت جھنڈا کھڑا کیا جائے' جسے دیکھ کر لوگ باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے مسجد میں پہنچ جائیں' مگر آنحضرت ﷺ ان تمام تجاویز سے متفق اور مطمئن نہ تھے۔

یہ سعادت حضرت عمرؓ کے حصے میں آئی۔ انھوں نے اپنے ایک خواب کی تفصیل پیش کی کہ ایک آدمی یہ الفاظ کہ کر لوگوں کو نماز کے لیے بلا رہا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن زید نے بھی ایسے ہی خواب کا ذکر کیا۔ آنحضور ﷺ کو یہ الفاظ بہت پسند آئے۔ آپ ﷺ نے حضرت بلال کو اذان کے کلمات سکھا کر ان کی ڈیوٹی لگائی کہ پانچ وقت بلندی سے یہ منادی کیا کریں۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن ام مکتوم کو بھی یہ کلمات سکھائے تا کہ اگر کبھی بلالؓ موجود نہ ہوں تو وہ اذان کہیں۔

اگر چہ نماز مکہ میں فرض ہوئی تھی' لیکن نماز مغرب کے علاوہ' جس میں تین رکعتیں تھیں' باقی سب دو دو رکعت پڑھی جاتی تھیں۔ ہجرت کے ایک ماہ بعد ظہر' عصر اور عشاء میں دو دو رکعت کا اضافہ ہوا' یعنی چار چار رکعتیں فرض ہوئیں' البتہ سفر کی حالت میں اب بھی وہی دو رکعتیں قائم ہیں۔

مدینہ میں اس وقت یہودی بھی رہتے تھے' مشرک اور منافق بھی تھے' ان سب کی موجودگی میں چوبیس گھنٹے میں پانچ دفعہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول کریم ﷺ کی رسالت کا اعلان صرف فلاح اور نماز کی طرف بلانے کی منادی ہی نہیں تھی' بلکہ یہ اس شہر میں اسلام کے غلبے کی بھی نشانی تھی اور کفر اور شرک کی قوتوں کو کھلا چیلنج بھی۔

آزادیِ فکر

آنحضور ﷺ حضرت ابو ایوبؓ انصاری کے مکان سے اپنے گھر میں منتقل ہونے کے بعد انتہائی سنجیدگی اور کامل انہماک سے مسلمانوں کی آزادیِ فکر وعقیدہ کے بارے میں غور وخوض کیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ مال و جاہ اور تجارت کے طالب نہ تھے' البتہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے پیرووں کی آسودہ حالی اور سلسلہ روزگار کا سامان مہیا ہو' تا کہ مسلمان بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنے افکار وخیالات اور عقائد ونظریات کے اظہار واعلان میں آزاد ہوں' اور اس آزادی میں مسلمان' عیسائی اور یہودی برابر کے شریک ہوں' کیوں کہ آزادی کے ماحول میں حقیقت کی قدریں اجاگر ہوتی ہیں اور انسان اگر دنیا میں راہ کمال پر گامزن ہوتا ہے تو صرف آزادی کے سہارے۔ جہاں عقائد وافکار کی آزادی نہیں' وہاں وہم وگمان راہ پا جاتے ہیں۔ انسان کی روح پر ظلمت کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں' اور وہ قوت جو کائنات سے انسان کا رشتہ قائم رکھتی ہے' ضعیف اور بے حس ہو جاتی ہے۔

جنگ سے بیزاری

اس اندازِ فکر نے حضور ﷺ کو صلح وآشتی پر مائل اور جدال وقتال کے ہولناک تصورات سے بیزار کر دیا تھا۔ آپ ﷺ جنگ وخون ریزی کے معاملے میں ہمیشہ تامل کرتے تھے۔ جب کبھی دین کے تحفظ کا سوال سامنے آتا تھا' تو اس وقت آپ ﷺ کی طرف سے مدافعانہ جنگ کی اجازت تھی۔ عقبہ ثانیہ کے بعد جب مسلمانانِ مدینہ میں سے ایک شخص نے کہا تھا: ''خدا کی قسم! اگر آپ حکم دیں تو ابھی اہل منیٰ کو تہ تیغ کیے دیتے ہیں'' تو اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ابھی ہمیں اس بات کی اجازت نہیں ملی ہے۔ جنگ کے بارے میں جو پہلی آیت نازل ہوئی' وہ سورۂ حج کی آیت 39 تھی۔

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ﴾ (الحج: 39)

''اجازت دے دی گئی ہے انھیں جو جنگ کرتے ہیں' اس لیے کہ انھوں نے ظلم سہے ہیں اور اللہ ان کی فتح ونصرت پر قادر ہے۔''

اس کے بعد سورۂ انفال کی آیت 39 نازل ہوئی:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: 39)

''اور ان کے ساتھ جنگ کرو' یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے' اور تمام دین اللہ کے لیے ہو۔''

آنحضور ﷺ کو سوائے اس بات کے اور کوئی دھن نہ تھی کہ مسلمانوں کو دینی آزادی حاصل ہو۔ چناں چہ اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے جنگ کی اجازت بھی دے دی اور مسلمانوں کو یہ واضح حکم دے دیا کہ جو تمھارے اوپر زیادتی اور سختی کرنے تلے ہوئے ہیں' ان کے خلاف ضرور تلوار اٹھائیں' تا کہ کسی کو دین سے منحرف اور کسی کو محض عقائد کی بنا پر تختہ مشق ستم نہ بنا سکیں۔

ایک طرف تو حضور ﷺ کو مدینہ میں مستقل قیام کے بعد عقائد وافکار کی آزادی کی فکر دامن گیر تھی اور دوسری طرف وہ لوگ بھی' جنھوں نے آپ ﷺ کے استقبال میں سرگرمی اور گرم جوشی کا ثبوت دیا تھا' اس فکر سے غافل نہ تھے۔ مسلمان مہاجرین وانصار کے علاوہ اوس وخزرج کے وہ لوگ بھی جو مدینہ میں آباد تھے جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور ابھی ان کے دلوں میں دیرینہ عداوت کی بھٹی سلگ رہی تھی۔ ان کے علاوہ یہودی بھی مدینہ میں سکونت پزیر تھے۔ بنی قینقاع بستی کے اندر' قریظہ فدک میں' بنی نضیر مضافات میں اور خیبر کے یہودی مدینہ کے شمال میں بود وباش رکھتے تھے۔

اگر چہ اسلام نے مہاجرین وانصار کے درمیان دوستانہ تعلقات کی بنیاد رکھ دی تھی' لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ کو اندیشہ تھا کہ مبادا قدیم عداوتیں پھر ابھر آئیں۔ اس خیال سے آپ ﷺ کی خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اتحاد واتفاق

روح پھونک دی جائے اور وہ تمام اسباب جنگ دور کر دیے جائیں جو بالعموم جنگ اور خون ریزی کا باعث ہوتے رہتے ہیں۔ اوس وخزرج کے مشرک، بت پرست بھی آئے دن کی خون ریزی سے ضعیف اور مضمحل ہو چکے تھے اور انھیں یہ بات صاف نظر آ رہی تھی کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے مقابلے میں ہماری حیثیت کچھ بھی نہیں۔ وہ اس فکر میں رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان پھوٹ ڈلوا دیں۔ یہودیوں نے رسول کریم ﷺ کا خیر مقدم محض اس توقع کی بنا پر کیا تھا کہ شاید آپ ﷺ انھیں اپنا حلیف بنا سکیں اور ان سے معاہدہ کر لیں۔ یہودی یہ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کی اعانت سے عرب کو اپنا ہم نوا بنا کر عیسائیت کی اشاعت کے سیلاب پر بند باندھ دیں۔ یہودیوں کو غصہ یہ تھا کہ عیسائیوں نے انھیں ارض موعود سے دیس نکالا دے دیا تھا۔

سلسلۂ مواخات

اس مقام پر حضور ﷺ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ اس کی نظیر دیگر انبیائے کرامؑ کے حالات میں نہیں ملتی، اور یہ ہے سیاسی زندگی۔ زندگی کی اس جہت میں آپ ﷺ کے کمال تدبر سے عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ حضور ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ اپنے نئے وطن میں امن وسکون اور صلح وآشتی کی فضا پیدا کریں، تاکہ اس کے باشندوں میں کسی قسم کا اختلاف اور عداوت نہ رہے۔ پورے عرب میں اس انداز کے نظم وضبط کا کہیں وجود نہ تھا۔ آنحضور ﷺ نے اس بارے میں اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ سب سے پہلے ضرورت یہ محسوس کی جارہی تھی کہ مسلمانوں کی معنوی وحدت کی لڑی میں پرو دیا جائے۔

چناں چہ ہجرت کے پانچویں مہینے، رجب ایک ہجری میں حضرت انسؓ بن مالک کی رہائش گاہ پر تمام انصار ومہاجرین کو طلب کیا گیا۔ جمع ہونے والوں میں 45 مہاجر تھے اور 45 انصار۔ انصار خوش حال گھرانوں کے صاحب استطاعت افراد تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ کی راہ میں دو دو شخص بھائی بھائی بن جائیں۔ ہر شخص ایک مہاجر خاندان کو لے لے اور اپنے گھر بار، کاروبار میں شریک کر لے۔'' پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو کو بلا کر فرمایا: ''یہ اور تم دونوں بھائی بھائی ہو۔ دونوں مل کر کام کرو اور کمائی مل کر کھاؤ۔''

انصار نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ ہمارے ماں باپ، ہمارا مال وزر، ہم اور ہمارے بچے سب کچھ آپ پر قربان۔ ہماری تمام زمینیں ان بھائیوں کو دے دیجیے'' لیکن مہاجرین کی غیرتِ نفس نے اسے گوارا نہیں کیا۔ انصار نے کہا، اچھا ہماری زمینوں پر کاشت کریں اور پیداوار کا نصف حصہ اپنی محنت کے معاوضے میں لے لیں۔ اس تجویز کو قبول کر لیا گیا۔

انصار نے وسعت قلبی اور خوش دلی سے سلسلہ مواخات کو قبول کیا۔ انتہا یہ ہے کہ وراثت میں سے بھی حصہ بجائے رشتہ داروں کے، مہاجر بھائی کو دینے لگے تا آیں کہ سورۂ احزاب کی آیت 6 نازل ہوئی اور وراثت کا یہ طریق کار منسوخ ہو گیا:

﴿وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰی بِبَعْضٍ فِیْ کِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْٓا اِلٰٓی اَوْلِیٰٓئِكُمْ مَّعْرُوْفًا كَانَ ذٰلِكَ فِی الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا﴾ (الاحزاب: 6)

''اور رشتہ دار آپس میں کتاب اللہ کی رو سے مسلمانوں اور مہاجروں سے ایک دوسرے (کے ترکے) کے زیادہ حق دار ہیں۔ مگر یہ کہ تم اپنے دوستوں سے احسان کرنا چاہو۔ یہ حکم کتاب میں لکھ دیا گیا ہے۔''

فرمان نبوی سن کر انصار نے اپنی ہر شے کو دو حصے کر دیے اور آدھا اپنے مہاجر بھائی کو پیش کیا۔ حضرت سعدؓ بن ربیع کا واقعہ قابل ذکر ہے۔ وہ انصار تھے۔ وہ اپنے مواخاتی بھائی حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بنو حارثہ کے محلے میں جہاں ان کا گھر تھا، لے گئے۔ کھانا کھلایا۔ اس کے بعد کہا کہ میں اپنا مکان، باغ اور مال واسباب کا آدھا حصہ آپ کی نذر کرتا ہوں۔ میری دو بیویاں ہیں۔ انھیں دیکھ لو۔ ان میں سے جو تمھیں پسند آئے اسے طلاق دے دوں گا اور تم عدت کے بعد اس سے نکاح کر لینا۔

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے تمام گفتگو سننے کے بعد کہا، بھائی، اللہ تمھارے کاروبار میں برکت عطا فرمائے۔ اور یہ کہ کر سب کچھ انھیں واپس کر دیا۔ ان سے بازار کا راستہ معلوم کیا اور کاروبار شروع کر دیا۔ چند ہی روز میں اللہ تعالیٰ نے خوش حالی عطا فرمائی اور ان کا شمار بڑے تاجروں میں ہونے لگا۔

بعض صحابہؓ نے دکانیں کھول لیں۔ حضرت ابوبکرؓ کپڑے کا کاروبار کرنے لگے۔ حضرت عمرؓ بھی تجارت میں مشغول ہو گئے حضرت عثمانؓ نے بنو قینقاع کے بازار میں کھجور کی خرید وفروخت شروع کر دی۔ جب بحرین فتح ہوا تو حضور ﷺ نے انصار کو وہاں زمینیں دینی چاہیں، تو انھوں نے یہ شرط رکھی کہ مہاجرین کو بھی اسی قدر زمینیں عطا کی جائیں۔

انصار کے اس غیر معمولی ایثار اور ہمدردی کو دیکھ کر مہاجرین نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ، ہم جس قوم میں آ کر اترے ہیں، ان سے بڑھ کر مخلص، غم گسار، تنگی وفراخی ہر حال میں مددگار اور قوم کو نہیں پایا ہمیں اندیشہ ہے کہ تمام اجر انھیں مل جائے گا اور ہم محروم رہ جائیں گے۔ فرمایا، نہیں۔ تم ان کے لیے دعا کرتے رہو یعنی دعا کا احسان درہم ودینار سے کہیں زیادہ ہے۔

شاہ مصباح الدین شکیل اپنی تصنیف ''سیرت احمد مجتبیٰ'' میں رقم طراز ہیں: مواخات کا یہ نظام بصیرت نبوی کا شاہکار ہے۔ یہ مہاجرین کی فوری اور مستقل بحالی کا معاشی منصوبہ تھا۔ انصار کی معیشت کا دارومدار زراعت پر تھا۔ یہاں کی تجارت پر یہودیوں کی اجارہ داری تھی۔ اجارہ داری قائم ہونے کی وجہ سے وہ انصار کی کمزوریوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے۔ جب فصل بوئی جاتی تو اس مرحلے پر انصار کو سرمایے کی ضرورت پیش آتی۔ یہودی انھیں قرض کے جال میں بری طرح جکڑ لیتے اور جب فصلیں تیار ہو جاتیں تو ان سے ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے سستے داموں فصل ہتھیا لیتے تھے۔ یہ ساہوکاری کا ایک ایسا جال تھا جس میں اوس وخزرج کے قبیلے

اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ ان کا اس سے نکلنا ناممکن تھا۔ اب انھیں ایسے بھائی میسر آ گئے تو ان کی یہ مشکل حل ہوتی نظر آئی' کیوں کہ مہاجرین تجارت کے گُر جانتے تھے اور تجارتی سوجھ بوجھ میں یہودیوں سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ڈرنے اور محبت کرنے والے تھے۔ مہاجرین کے آباد ہونے سے انصار کو یہودیوں کے سود در سود کے کاروبار' چور بازاری' گراں فروشی اور ذخیرہ اندوزی سے نجات ملی۔ ادھر مہاجرین جو کاشت کاری کو عار سمجھتے تھے' محنت کی عظمت اور زمین کی برکت سے مستفیض ہوئے۔ اس معاشی حکمت عملی نے عیار و مکار یہودی قوم کو بے بس کر کے رکھ دیا۔ اللہ کی رضا کی خاطر بھائی چارہ (مواخات) برکتوں والا معاشی نظام ثابت ہوا۔

مواخات کے متبرک رشتے میں کون کس کا بھائی بنا' ان میں چند نام یہ ہیں:

مہاجرین	انصار
حضرت ابوبکرؓ بن ابی قحافہ	حضرت خارجہؓ بن زید
حضرت عمرؓ بن خطاب	حضرت عتبانؓ بن مالک
حضرت عثمانؓ بن عفان	حضرت اوسؓ بن ثابت
حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح	حضرت سعدؓ بن معاذ
حضرت زبیرؓ بن عوام	حضرت سلامہؓ بن وقش
حضرت مصعبؓ بن یاسر	حضرت ابوایوب انصاری
حضرت عمارؓ بن یاسر	حضرت حذیفہؓ بن یمان
حضرت سلمانؓ فارسی	حضرت ابودرداؓ
حضرت سعید بن زید	حضرت ابی ابن کعب
حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف	سعدؓ بن مالک
حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ	حضرت کعبؓ بن مالک
حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ	حضرت عویم بن ساعد

مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے ''سیرت المصطفیٰ'' میں مواخات کے دو مرتبہ وقوع پزیر ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقط مہاجرین کے مابین مواخات مکہ میں ہوئی اور مہاجرین اور انصار کے مابین مدینہ میں ہوئی۔ مکہ میں بین المہاجرین ہونے والی مواخات میں حسب ذیل بھائی چارے کے رشتے ہوئے ہیں:

سرور دو عالم ﷺ	حضرت علی مرتضیٰؓ
حضرت ابوبکر صدیقؓ	حضرت عمر فاروقؓ
حضرت حمزہ زبیرؓ بن عوام	حضرت عبداللہؓ بن مسعود
حضرت عثمانؓ بن عفان	حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف
حضرت عبیدہؓ بن حارث	حضرت بلالؓ بن رباح
حضرت مصعبؓ بن عمیر	حضرت سعدؓ بن ابی وقاص
حضرت ابوعبیدہؓ ابن جراح	حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ

حضرت سعیدؓ بن زید　　　حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ

مواخات کے قیام و استحکام کے بعد آنحضرت ﷺ انصار و مہاجرین کی یگانگت اور اتحاد کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔ اب اہم ترین کام یہودیوں کے ساتھ معاہدے کی تشکیل تھی' جس کے ذریعے سے آپ ﷺ نے اہل مدینہ کو اختلاف کے باوجود متحد و متفق کر دیا اور انھیں ایک نظام کے تابع کر دیا تھا۔

میثاق مدینہ کا پس منظر

رسول کریم ﷺ کی ہجرت کے وقت یثرب (مدینہ) مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس میں یہودی اور عرب قبائل آباد تھے۔ اوس و خزرج یہودیوں کے بہت بعد میں آ کر آباد ہوئے۔ یہودیوں کے تین بڑے قبیلے تھے:

1: بنوقینقاع
2: بنونضیر
3: بنوقریظہ

ان قبائل کی ذیلی شاخیں بیس سے زیادہ اور جملہ تعداد پانچ ہزار سے اوپر تھی' جن میں لڑنے والے ہر قبیلے میں سات سو افراد تھے۔ آپس میں اتحاد نہیں تھا' اس لیے لڑتے رہتے تھے۔ بنوقینقاع کو جب بنونضیر اور بنوقریظہ نے نواحی بستیوں سے بھگا دیا تو شہر کے اندر خاص محلوں میں رہنے لگے۔ وہ قبائلی عرب سرداروں کی حمایت میں امن و چین سے رہتے اور بدلے میں انھیں سالانہ محصول ادا کرتے تھے۔ قینقاع کے لفظی معنی ''سنار'' کے ہیں۔ یہی ان کا پیشہ تھا۔ سونے چاندی کے زیورات' نقرئی مصنوعات اور کپڑے کی خرید و فروخت کا خاص بازار تھا۔ یہ لوگ سودی لین دین کرتے تھے۔

نضیر کے لفظی معنی ''شاداب پودا'' یا ''تر و تازہ درخت'' کے ہیں۔ یہ قبیلہ زراعت پیشہ اور نخلستانوں کا مالک تھا۔

قریظہ کے معنی وہ درخت جو دباغت کے کام آتا تھا۔ جوتے بنانے کا کام کرتے تھے۔ یہودی اس پیشے کو حقیر سمجھتے تھے۔ چناں چہ بنی نضیر کے یہودی کی بہ نسبت بنو قریظہ کے یہودی کا خون بہا آدھا ہوتا تھا۔ آنحضور ﷺ نے اس غیر منصفانہ درجے کو ختم کر کے بنوقریظہ کو بھی مساوی درجہ عطا فرمایا' جس کی وجہ سے بنونضیر کا سردار کعب بن اشرف حضور ﷺ کا جانی دشمن ہو گیا۔

یہود آسمانی شریعت کے حامل تھے۔ پھر بھی تورات میں تحریف کرتے رہتے تھے۔ ان کے اپنے مدارس تھے۔ انبیائے کرامؑ اور رسولوں کے حالات پڑھتے' دینی و شرعی احکام کو مانتے اور مخصوص قوانین پر عمل کرتے تھے۔ یوم عاشورہ پر روزہ رکھتے۔ اپنی عیدیں الگ مناتے تھے۔ عرب عورت' جس کا لڑکا زندہ نہ رہتا' وہ نذر مانتی کہ بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنا دے گی۔ اس طرح بہت سے عرب یہودی بن گئے۔

یہودی مالی اعتبار سے مستحکم' سودی لین دین کے عادی' سونے چاندی کے بیوپاری' دولت پر جان دینے والے تھے۔ کسانوں کو کھیتی کے موقع پر قرض دے کر زراعت میں خوب حصہ بٹورتے تھے۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو بھی رہن رکھتے تھے۔

منڈیوں میں خرید و فروخت کے سلسلے میں من مانی کرتے تھے۔ مصنوعی قلت پیدا کرنا' چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے حربے استعمال کرنا ان کی فطرت تھی' ان کی ہوس زر کا یہ عالم تھا کہ میٹھے کنوؤں کا پانی ڈولوں کے حساب سے فروحت کرتے تھے۔ اکثر اوس و خزرج کے قبیلوں کو آپس میں لڑا کر مالی منفعت حاصل کرتے۔

یہود کی اصل زبان عبرانی تھی۔ عبادت اور تعلیم میں اسے استعمال کرتے۔ عربی پر بھی عبور تھا' لیکن اس میں عبرانی زبان کی آمیزش کرتے تھے۔ روزمرہ کا کام عربی ہی میں انجام دیتے تھے۔ یثرب میں یہود کے علاوہ نصرانی (عیسائی) بھی رہتے تھے۔

یہودیوں کے قلعوں کی تعداد 59 تھی۔ ان کے بعد آنے والے عربوں نے بھی اپنے قلعے بنائے' جن کی تعداد 13 تھی۔ اوس جن قلعوں میں آباد ہوئے' وہ زرخیز علاقہ تھا۔ یہ عوالی کہلاتا تھا جو مدینے کے جنوب اور مشرق میں تھا۔ خزرج کے قبائل وسطی اور شمالی علاقے میں بس گئے جو مدینے کا نشیبی حصہ ہے۔ یہ علاقہ زیادہ سرسبز نہ تھا۔ ان کے پڑوس میں یہودیوں کا قبیلہ قینقاع آباد تھا۔ ان کے دوسرے دو بڑے قبیلے بنی نضیر اور بنی قریظہ تھے جن کے اوس و خزرج سے جدا جدا معاہدے تھے۔ اس زمانے میں عرب قبائل کو یہودیوں پر بالادستی حاصل تھی۔ دینی معاملات میں وہ قریش کے تابع تھے۔ منات ان کا محبوب بت تھا جس کی بڑی عقیدت کے ساتھ پوجا کرتے تھے۔ یہ بت ساحل کے قریب مکہ مدینہ کے درمیان جبل قدید کے مقابل مشلل کے مقام پر نصب تھا۔

یثرب میں دو قسم کے علاقے تھے۔ ایک وہ جو زرعی زمینوں اور مکانات پر مشتمل تھا۔ دوسرا علاقہ قلعہ بند تھا' جہاں گڑھیاں (آطام) تھیں۔ ان 59 گڑھیوں کے دروازوں پر بازار لگتے۔ فصیل میں روشن دان ہوتے جو باہر سے بند اور اندر سے کھولے جاتے۔ حملے کے وقت وہ دروازے بند کر لیتے اور قلعہ بند ہو جاتے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی تصنیف ''عہد نبوی میں نظام حکمرانی'' میں لکھتے ہیں کہ اس وقت مدینہ کی آبادی دس ہزار کے لگ بھگ تھی' جس میں آدھے یہود تھے۔ بحثیت مجموعی وہاں ایک نراج کی کیفیت تھی۔ یہودیوں کے تینوں قبائل آپس میں متحد نہیں تھے۔ کچھ اوس اور کچھ خزرج کے حلیف تھے۔ اوس و خزرج کی باہمی جنگیں تو مشہور ہیں۔ ہر چند بیعت عقبہ کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے بارہ نقیب مقرر فرما کر ان میں سیاسی مرکزیت پیدا کرنے کی طرف ایک قدم اٹھایا تھا۔ پھر بھی اپنے اپنے سقیفے (سائبان' چوپال) میں مسائل طے کرتے تھے۔ رسول اللہ نے حالات کا بغور جائزہ لیا۔ بقول ڈاکٹر حمید اللہ رسول ﷺ نے حسب ذیل اقدامات کیے:

1: مہاجرین کی مستقل آبادکاری اور روزگار کی فراہمی
2: اپنے اور مقامی باشندوں کے حقوق و فرائض کا تعین
3: مدینہ کے غیر مسلم عربوں اور خصوصاً یہودیوں سے معاہدہ
4: مدینہ کی سیاسی تنظیم اور دفاع
5: مالی و جانی نقصان کا بدلہ' جو مشرکین مکہ سے مہاجرین کو پہنچا

میثاق مدینہ

پہلے آنحضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان ''مواخات'' قائم کر کے ایک مضبوط معاہدے کی بنیاد ڈالی' اور پھر یہودیوں اور غیر مسلموں سے بھی ایک معاہدہ کیا۔

حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ ان کے باپ کے گھر پر سارے مسلم و غیر مسلم قبائل کے نمائندوں کا ایک اجتماع ہوا۔ رسول اللہ کی تجویز تھی کہ بیرونی حملوں سے دفاع اور اہل مدینہ کے تنازعات کے تصفیے کے لیے ایک تنظیم عمل میں لائی جائے۔ نیز ایک شخص کو حاکم اعلیٰ متعین کیا جائے اور حقوق و فرائض لکھ لیے جائیں' پھر اس تجویز کی بنیاد پر ایک دستاویز مرتب کی گئی۔ اسے نئی ریاست مدینہ کا تحریری آئین خیال کیا جاتا ہے جو ہجرت نبوی کے پانچ ماہ بعد لکھا گیا۔ اسے ''میثاق النبی'' بھی کہا جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد حمید اللہ ''یہ شہری مملکت مدینہ کا دستور تھا۔ اور دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور بھی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ اہم تاریخی دستاویز لفظ بہ لفظ محفوظ ہے۔ اس کی حفاظت کے اہتمام کی یہ کیفیت تھی کہ ''یہ تحریر آنحضور ﷺ کی نیام میں ہوتی۔ بعد میں یہ تلوار حضرت علیؓ کو ملی تو انھوں نے کوفہ میں لوگوں کو اس دستاویز کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔''

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ معاہدہ ہے جو محمد ﷺ رسول اللہ مہاجرین (مسلمانان مکہ) اور انصار (مسلمانان مدینہ) اور ان غیر مسلم جماعتوں سے' جو ان سے تعلق رکھتی ہیں' کیا اور جس کی شرطیں یہ ہیں:

(1)...... یہ سب ملت واحد قرار دیئے جاتے ہیں اور باقی سب لوگ ان سے الگ ہیں۔

(2)...... مہاجرین قریش اپنی رسوم پر قائم رہیں گے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر خون بہا واجب ہوگا تو سب مل کر اسے ادا کریں گے۔ اپنے قیدی اجتماعی طور پر فدیہ دے کر چھڑائیں گے۔

(3)...... بنی عوف بھی اپنی سابقہ رسوم برقرار رکھیں گے' جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے عمل کیا کرتے تھے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پر خون بہا واجب ہوگا تو سب اس کی ادائی اجتماعی حیثیت میں کریں گے اور ہر قبیلہ اپنے قیدیوں کا فدیہ ادا کرے گا' اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی عدل اور حسن سلوک کے اصولوں پر (اس جگہ معاہدے میں انصار کی مختلف جماعتوں اور خاندانوں کے نام الگ الگ درج ہیں' مثلاً بنو ساعدہ' بنو حارث' بنو جشم' بنو نجار' بنو عمرو بن عوف' بنو نبیت اور بنو اوس) عمل کریں گے۔

(4)...... مومن اپنے میں کسی زیر بار قرض دار کو (خون بہا یا فدیہ دینے کے معاملے میں) بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے' بلکہ قاعدے کے مطابق خون بہا یا فدیہ (جو بھی اس کے ذمے ہو) ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے کوئی مومن کسی مومن کے غلام سے اس کے علم اور اجازت کے بغیر معاہدہ نہیں کرے گا۔

(5)...... اگر کوئی شخص سرکشی کرے، ظلم پر کمر باندھے، جرم کا ارتکاب کرے، زیادتی کرے یا مومنوں کے درمیان فساد پھیلائے تو مومن اس کے مقابلے میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے، خواہ وہ شخص ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(6)...... کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو کسی کافر کی حمایت میں ہلاک نہیں کرے گا، نہ کسی کافر کو کسی مومن کے مقابلے میں مدد دے گا۔

(7)...... خدا کا عہد ایک ہے۔ ادنیٰ ترین مسلمان اگر چاہے تو سب کی طرف سے عہد و پیمان کر سکتا ہے۔ مومن باہم ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ انھیں دوسروں سے کوئی سروکار نہیں۔

یہودیوں سے معاہدہ

(8)...... یہودیوں میں سے جو شخص ہمارا پیرو ہوگا (یعنی عہد کی پابندی کرے گا) وہ بھی ہماری اعانت اور ہمارے تعاون کا مستحق ہوگا۔ کوئی شخص اس پر دست درازی نہیں کرنے پائے گا اور ہم اس کے خلاف کسی کی مدد کے لیے آمادہ نہیں ہوں گے۔

(9)...... مومن کی صلح، صلح ہے۔ مومن کسی جنگ میں دوسرے مومن کی مرضی کے بغیر انصاف و مساوات سے بے نیاز ہو کر کسی بات کے لیے آمادہ نہ ہوگا۔

(10)...... جو قبیلہ ہمارے دوش بدوش جنگ کرے گا، اس کے دستے باری باری حصہ لیں گے۔

(11)...... مومن اس خون ریزی میں جو اللہ کی راہ میں ہوتی ہے، ایک دوسرے کی مدد کریں گے

(12)...... بلاشبہ متقی مومن سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر قائم ہیں۔

(13)...... مدینہ کا کوئی مشرک قریش (مکہ) کے کسی آدمی یا مال کو پناہ نہیں دے گا اور نہ ہی مسلمان کے مقابلے میں اس کی مدد کرے گا۔

(14)...... جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے گا اور اس پر جرم ثابت ہو جائے تو اسے مقتول کے عوض (بطور قصاص) قتل کیا جائے گا، سوائے اس کے کہ مقتول کا ولی خون بہا لینے پر راضی ہو جائے۔ تمام مومن اس کی تعمیل کے لیے متحد ہوں گے اور اس کے سوا ان کے لیے کوئی اور چیز جائز نہیں ہوگی۔

(15)...... کسی مومن کے لیے جو اس معاہدے کو تسلیم کرتا اور اللہ اور آخرت پر یقین رکھتا ہے، یہ زیبا نہیں کہ وہ کسی خطا کار کو مدد یا پناہ دے۔ اور جو کسی مجرم کو پناہ دے یا مدد دے گا، قیامت کے دن اللہ کے غضب اور اس کی لعنت کا مستوجب ہوگا اور اس کی توبہ یا فدیہ ناقابل قبول ہوگا۔

(16)...... اگر کسی معاملے میں اختلاف ہو تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کریں۔

(17)...... جب تک یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑائی میں شامل ہوتے رہیں گے، وہ مصارف جنگ میں حصہ ڈالتے رہیں گے۔

(18)...... بنی عوف کے (حلیف) یہودی مسلمانوں کے ساتھ متحد ہیں اور ایک امت کا حکم رکھتے ہیں یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین ہے، اور ان کے غلام انھی کے حکم میں داخل ہیں۔ البتہ وہ شخص جو ظلم کرے یا جرم کا مرتکب ہو، وہ نہ صرف اپنی ذات کو، بلکہ اپنے پورے خاندان کو مصیبت میں مبتلا کرے گا۔

(19)...... اور بنی نجار کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

(20)...... بنی الحارث کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

(21)...... بنی ساعدہ کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

(22)...... بنی جشم کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

(23)...... بنی اوس کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

(24)...... بنی ثعلبہ کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں، البتہ جو کوئی ظلم کرے گا یا عہد شکنی کرے گا اسے وہ حقوق حاصل نہیں رہیں گے۔ وہ نہ صرف اپنی ذات کو، بلکہ اپنے پورے خاندان کو مصیبت میں مبتلا کرے گا۔

(25)...... جفنہ کو بھی جو قبیلہ ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، وہی حقوق حاصل ہیں جو ان کی اصل کو حاصل ہیں۔

(26)...... بنی شطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کو حاصل ہیں اور ہر ایک پر اس معاہدے کی خلوص دل سے وفاداری لازم ہے جو عہد شکنی سے روکتی ہے۔

(27)...... اور ثعلبہ کے موالی (غلام) کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کے ہیں۔

(28)...... یہودی قبائل کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان کی اصل کے ہیں۔

(29)...... کوئی شخص آنحضور ﷺ کی اجازت کے بغیر معاہدین کے زمرے سے خارج نہ ہوگا۔ قصاص کا حکم کسی صورت ساقط نہ ہوگا۔ اور جو شخص کسی کا خون بہائے گا، اس کے اور اس کے خاندان کے ذمے خون بہا کی ادائیگی ہوگی۔ البتہ وہ شخص جس پر ظلم کیا گیا ہو، اس حکم سے مستثنیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایفائے عہد کے حق میں ہے۔

(30)...... جو شخص اس معاہدے میں شریک قبائل کے خلاف جنگ کرے گا، اس کے خلاف سب (مسلمان و یہودی) مل کر جنگ کریں گے (ایک دوسرے کی مدد کریں گے) اور کوئی شخص اپنے عہد سے بے وفائی نہیں کرے گا۔ یہودی بحالت جنگ

اپنے مصارف کے متحمل خود ہوں گے اور مسلمان اپنے اخراجات برداشت کریں گے۔

(31)......اور یہودی جنگ کا بار اس وقت تک برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جنگ میں شریک رہیں گے۔

(32)......کوئی شخص اپنے حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہ ہوگا اور مظلوم کی حمایت سب پر فرض ہوگی۔

(33)......اس معاہدے میں شریک ہونے والوں کے لیے یثرب کا جوف (اندرونی حصہ) حرم ہوگا یعنی اس کی حدود میں جنگ جائز نہ ہوگی۔

(34)......ہر شخص کا ہمسایہ خود اس کے برابر ہے۔ کسی کو یہ زیبا نہیں کہ وہ اپنے ہمسائے کے ساتھ بدسلوکی کرے۔

(35)......پناہ حاصل کرنے والے سے ویسا ہی برتاؤ کیا جائے گا' جیسا پناہ دینے والے کے ساتھ کیا جائے۔ پناہ حاصل کرنے والے کو ضرر نہ پہنچایا جائے اور نہ ہی وہ کسی جرم کا ارتکاب کرے۔

(36)......کسی پناہ گاہ میں وہاں کے لوگوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

(37)......اس معاہدے میں شریک ہونے والوں کے درمیان اگر کسی معاملے میں اختلاف رونما ہو یا نقصان اور فساد کا اندیشہ ہو تو اس متنازعہ امر میں فیصلے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف رجوع کرے۔ اللہ معاہدے کی بہتری میں ہے۔

(38)......قریش اور ان کے حامیوں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

(39)......اگر کوئی یثرب (مدینہ) پر حملہ آور ہوا تو اس معاہدے میں شریک فریق اس کے خلاف جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

(40)......اگر انھیں (یہودیوں کو) کسی سے صلح کر لینے کی دعوت دی جائے تو وہ اسے قبول کر لیں۔ اگر یہ صلح کا پیغام دیں تو مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ اسے قبول کر لیں' لیکن اس سے وہ شخص مستثنیٰ جو دین کے بارے میں جنگ پر آمادہ ہو۔

(41)......اس معاہدے کے تمام فریق اپنی اپنی جانب کے علاقے کے دفاع کے ذمہ دار ہوں گے۔

(42)......اوس کے (حلیف) یہودی اور ان کے غلام اس معاہدے سے مستفید ہوں گے۔ ان سے نیک سلوک روا رکھا جائے گا۔ اور وہ بھی اس معاہدے کے فریقوں کے ساتھ خالص وفا شعاری کا برتاؤ کریں گے اور اس معاہدے کی پابندی کریں گے اور عہد شکنی نہیں کریں گے۔

(43)......نیکی بدی سے قطعاً علیحدہ چیز ہے۔ جو جیسا کرے گا' ویسا بھرے گا۔ زیادتی کرنے والا اپنی ذات پر زیادتی کرے گا اور اللہ اس کے ساتھ ہے جو اس معاہدے کی زیادہ سے زیادہ وفاداری سے تعمیل کرے۔

(44)......اللہ اس معاہدے پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور اس کا منشا ہے کہ اس پر پورا پورا عمل ہو۔ ظالم اور مجرم کی حمایت منشائے ایزدی کے منافی ہے۔ جو شخص مدینے سے باہر چلا جائے' وہ امن میں ہے اور جو یہاں رہے' وہ بھی امن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ متقیوں اور نیکوکاروں کا ناصر و حامی ہے' اور محمد رسول اللہ ﷺ بھی اس کے حامی و مددگار ہیں۔

یہ معاہدہ ایک سیاسی کارنامہ ہے۔ اس کی رو سے عقائد و افکار کی آزادی اور مدینہ میں تمام قوموں اور فرقوں کے لوگوں کی حفاظت کے لیے ایک سیاسی نظام وجود میں آ گیا۔ اس معاہدے کے طے ہو جانے سے مدینہ اور اس کے اطراف میں ایک حکومت قائم ہوگئی جس کا دارالحکومت مدینہ تھا اور جس کے سربراہ رسول اللہ ﷺ تھے اور جس میں کلمہ نافذہ اور غالب حکمرانی مسلمانوں کی تھی' اور اس طرح مدینہ فی الحقیقت اسلام کا دارالحکومت بن گیا۔

نئے معاشرے پر اسلامی اثرات

جب آنحضور ﷺ مدینہ منورہ میں رونق افروز ہوئے اور اس شہر بے مثال میں اسلام کا خوب چرچا ہونے لگا تو علمائے یہود' عام یہودی اور عرب لوگ تجسس اور شوق کے مارے آنحضور ﷺ کی ذات اقدس اور نئے دین کی طرف متوجہ ہونے لگے' اور جوق در جوق مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ ان میں سے خاص طور پر عبداللہؓ بن سلام' ابوقیسؓ صرمہ اور سلمانؓ فارسی کے قبول اسلام کے واقعات قابل ذکر ہیں:

عبداللہ بن سلام کا اصل نام حصین بن سلام تھا۔ وہ یہود مدینہ کے دینی پیشوا اور بڑے عالم فاضل بزرگ تھے۔ ایک روز انھوں نے آنحضور ﷺ کو وعظ فرماتے سنا۔ حضور ﷺ کے یہ الفاظ انھیں ازبر ہوگئے:

((اَيُّهَا النَّاسُ! اَفْشُوا السَّلَامَ وَاَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَصِلُوا الْاَرْحَامْ وَصَلُّوا بِالَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ.))

''اے لوگو! سب کو سلام کر لیا کرو۔ اور سب کو کھانا کھلایا کرو۔ اور قرابت داروں سے اچھا سلوک کیا کرو' اور رات کے وقت جب لوگ سو جاتے ہیں' تم نماز پڑھا کرو'' یہودی پیشوا حصین بن سلام نے تین سوال کیے۔

1: قیامت کی پہلی نشانی کیا ہے؟
2: جو لوگ جنت میں جائیں گے وہاں انھیں سب سے پہلے کیا چیز کھانے کو دی جائے گی؟
3: اور اس کی کیا وجہ ہے کہ بچے کی شکل کبھی باپ پر ہوتی ہے اور کبھی ماں پر؟

نبی اکرم ﷺ نے جواب دیا:

1: قیامت کی پہلی نشانی آگ ہے۔
2: اہل جنت کو سب سے پہلے مچھلی کا کلیجہ کھانے کو دیا جائے گا۔
3: جب مرد کی منی عورت پر غالب آ جائے تو بچے کی صورت مرد پر ہوتی ہے اور جب عورت کی منی مرد کی منی پر غالب آ جائے تو بچے کی صورت عورت پر ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے جواب سے وہ مطمئن ہو گئے۔ ایک روز وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: ''میں شاہد ہوں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں اور

آپ ﷺ دین حق لے کر آئے ہیں۔'' اس نے اقرار کیا اور مسلمان ہو گئے۔

انھوں نے حضور ﷺ کو بتایا کہ مدینہ کے یہودیوں کو بھی آپ ﷺ کے رسول ہونے کا پتا تو چل گیا ہے' مگر وہ اس کا اقرار نہیں کر رہے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ میں یہودیوں کا عالم اور سردار ہوں۔ میرا باپ بھی ان کا عالم اور سردار تھا۔ جب انھیں معلوم ہوگا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو وہ مجھ پر الزامات لگائیں گے۔ میرے خلاف بہتان تراشی کریں گے۔ مناسب ہوگا کہ آپ ﷺ یہودیوں کو طلب فرمائیں اور یہ بتائے بغیر کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں' ان سے آپ ﷺ خود میرے بارے میں دریافت فرمائیں کہ میں کیسا ہوں؟''

نبی کریم ﷺ نے مدینہ کے یہودیوں کو طلب فرمایا اور حصین بن سلام کو پردے کے پیچھے چھپا دیا۔ پھر آپ ﷺ نے ان یہودیوں سے کہا: ''اے گروہ یہود! تم پر افسوس ہے۔ اللہ سے ڈرو۔ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ تم جانتے ہو کہ میں اللہ کا سچا رسول ہوں اور تمھیں جس دین کا پیغام دیتا ہوں' وہ سچا دین ہے۔''

''ہم تو نہیں جانتے کہ آپ اللہ کے رسول ﷺ ہیں' یہودیوں نے جواب دیا۔ رسول کریم نے تین بار اپنی بات دہرائی۔ یہودیوں نے تینوں بار یہی کہا: ''ہم تو نہیں جانتے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: ''حصین بن سلام کیسا آدمی ہے؟''

یہودیوں نے جواب دیا: ''وہ ہمارا سردار اور عالم ہے' اور ہمارے سردار اور عالم کا بیٹا ہے۔''

حضور ﷺ نے پوچھا: ''اگر حصین بن سلام مسلمان ہو جائے تو کیا تم بھی مسلمان ہو جاؤ گے؟''

''واللہ! خدا کی پناہ حصین بن سلام کبھی مسلمان نہیں ہوگا۔''

حضور ﷺ نے ابن سلام کو آواز دی۔ وہ پردے کے پیچھے سے نکل آئے اور یہودیوں کے سامنے کلمۂ شہادت پڑھا اور کہا: ''اے معشر یہود! اللہ سے ڈرو۔ واللہ' تم خوب جانتے ہو کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جس دین کی وہ دعوت دیتے ہیں' وہ سچا دین ہے۔''

یہودیوں نے ابن سلام کے بارے میں کہا: ''یہ تو ہم یہودیوں میں سب سے بڑا کذاب اور بدترین انسان ہے' اور اس کا باپ بھی ایسا ہی تھا۔''

ابن سلام نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ مجھے اس بات کا خطرہ تھا۔''

رسول کریم ﷺ نے حصین کا نام بدل کر عبداللہؓ رکھ دیا۔

حضرت عبداللہؓ بن سلام پہلے یہودی ہیں جنھوں نے پیغمبر اسلام کی دعوت پر لبیک کہا اور اسلام کی تصدیق کی۔ نصرانیوں میں یہ شرف حضرت ابوقیس صرمہؓ بن ابی انس کے حصے میں آیا۔ وہ عیسائی راہب تھے۔ فصیح و بلیغ شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ نصرانی الٰہیات کے فاضل اور مشہور واعظ تھے۔ انھی دنوں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے۔ ان کے اسلام لانے سے دوسرے عیسائیوں پر حجت قائم ہو گئی۔

حضرت میمونؓ بن یامین کا شمار روسائے یہود میں ہوتا تھا۔ ان پر بھی نبی کریم ﷺ کے دیدار سے وہی کیفیت طاری ہوئی جو حضرت عبداللہؓ بن سلام کی تھی۔ بالکل انھی کی طرح اس تصدیق کرنے والے نے بھی یہودیوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے یہود کو دعوت اسلام دی اور فرمایا: ''اپنے اور میرے درمیان کسی اپنے رئیس کو حکم بنالو۔ وہ جو فیصلہ کرے' قبول کر لو۔'' یہود نے کہا' ہم میمون بن یامین کے حکم بنائے جانے پر راضی ہیں۔ میمون نے بھی آ کر تصدیق رسالت کی' لیکن یہود اپنے وعدے سے مکر گئے۔

حضرت سلمانؓ فارسیؓ کا ایمان لانا سن ایک ہجری کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ان کا مجوسی نام مابہ تھا۔ آپؓ کے والد آتش پرست تھے۔ لیکن آپ نے آگ کی پرستش نہیں کی۔ ایک مرتبہ سلمان کو ان کے والد نے زمین کی نگہداشت کے لیے بھیجا۔ راستے میں آپ کا گزر ایک گرجا کے قریب سے ہوا۔ عیسائی اس وقت عبادت میں مصروف تھے۔ آپ کو ان کا انداز عبادت بہت پسند آیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک کھڑے انھیں دیکھتے رہے۔ جب وہ عبادت سے فارغ ہو گئے تو انھوں نے لوگوں سے کہا کہ میں آپ کے مذہب سے دل چسپی رکھتا ہوں۔ اس مذہب کی تعلیمات حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

ان لوگوں نے آپ کو بتایا کہ ملک شام میں عیسائیت کا مرکز ہے۔ اس کے بعد آپ گھر واپس آ گئے اور اپنے والد کو تمام قصہ بتایا' جسے سن کر وہ بہت ناراض ہوئے اور ان کا گھر سے نکلنا بند کر دیا' لیکن جب عیسائیوں کے ایک قافلے نے جو ملک شام جا رہا تھا' آپ کو اطلاع دی تو وہ بھی اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور اس طرح شام پہنچ گئے۔ وہاں آپ پادریوں کے ساتھ رہے اور عیسائیوں کے تمام علوم سیکھے۔ آپ کو عیسائیت اور دوسرے مذاہب کی تعلیمات کے مطالعے سے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ ارض حجاز میں ایک پیغمبر آئیں گے۔

چناں چہ آپ حجاز مقدس چلے گئے۔ وہاں پہنچے تو آپ ہر شخص کو غور سے دیکھتے۔ خاص طور پر کشادہ پیشانی والے اصحاب کو۔ بالآخر ایک دن آپ نے حضور ﷺ کی آمد کی خبر سنی۔ چناں چہ آپ کچھ صدقے کی کھجوریں لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے' لیکن جب کھجوریں حضور ﷺ کو پیش کیں تو آپ نے انھیں نوش فرمانے سے احتراز کیا۔ اس طرح سلمانؓ فارسی کو حضور ﷺ کے بارے میں ایک علامت مل گئی تھی۔ چناں چہ دوبارہ کھجوروں کا تحفہ پیش کیا' جن کے بارے میں یہ معلوم کر کے کہ یہ صدقہ نہیں' حضور ﷺ نے بھی خود بھی نوش فرمایا اور دوسرے صحابہ کو بھی کھانے کے لیے دیا۔

جب حضرت سلمانؓ کو دوسرے مذاہب کی پیش گوئیوں کے مطابق پختہ یقین ہو گیا کہ آپ ہی اللہ کے رسول ہیں تو ایمان لے آئے۔ سن پانچ ہجری میں حضرت سلمانؓ ہی کے مشورے سے کفار سے حفاظت کے لیے خندق کھودی گئی تھی۔ آپ اصحاب صفہ کے رکن بھی تھے۔ حضور ﷺ آپ کے ساتھ طویل گفتگو کیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں انھیں مدائن کا گورنر بنایا تھا۔ حضرت عثمان

غنیؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی ۔ (آپ کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے : کتاب پنجم، جس میں صحابہ کرامؓ کے حالات درج کیے گئے ہیں)

ہجرت کے بعد قریش کی فتنہ پردازی

مکی دور میں تو رسول ﷺ کے سامنے صرف کفار قریش کا مورچہ تھا جس نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا، مگر اب مدینہ میں یہ ایک محاذ تین مورچوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک طرف خود کفار قریش تھے جو مسلمانوں کے صحیح و سالم محفوظ و مامون مقام پر نکل جانے پر بوکھلائے ہوئے تھے۔ دوسری طرف سے یہود تھے جو رسول اکرم ﷺ کی آمد پر اوس و خزرج کے شیر و شکر ہونے پر اپنی معیشت کو تباہ ہوتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔

تیسرا سب سے خطرناک گروہ ان لوگوں کا تھا جو آستین کے سانپ تھے۔ یہ لوگ بظاہر کلمہ گو تھے اور اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے تھے لیکن در اصل یہ مسلمانوں میں رہ کر اسلام سے دشمنی کرتے تھے۔ ان کا سرغنہ عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا جو یثرب کا بادشاہ بننے کا خواہش مند تھا۔ کفار قریش نے عبداللہ بن ابی کی نفسیاتی کیفیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ کفار قریش نے اس کے نام ایک خط لکھا۔

"آپ لوگوں نے ہمارے صاحب کو پناہ دے رکھی ہے، اس لیے ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو آپ لوگ اس سے لڑائی کیجیے یا اسے نکال دیجیے یا پھر ہم اپنی پوری جمعیت کے ساتھ آپ لوگوں پر یورش کر کے آپ کے سارے مردان جنگی کو قتل کر دیں گے اور آپ کی عورتوں کی حرمت پامال کر ڈالیں گے۔"

حضور ﷺ کو کفار مکہ کی اس حرکت اور خط کے بارے میں اطلاع ملی تو حضور ﷺ خود عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے گئے۔ اسے سمجھایا کہ کیا تم اپنے بھائیوں اور بیٹوں سے لڑو گے؟ اور اگر ایسا ہوا تو تم ہی سوچو، یہ کس کا نقصان ہو گا۔ یہ باتیں عبداللہ بن ابی کی سمجھ میں آ گئیں۔

ادھر سے کچھ اطمینان ہو گیا تو دھمکی دینے والے دشمن (کفار قریش) کی طرف توجہ دینے سے پہلے یہود سے "میثاق" طے کر کے انھیں پابند کر لیا۔ اب سب سے بڑا خطرہ کفار قریش کی جانب سے تھا۔ ان کے کسی بھی وقت اچانک حملے کے اسباب و شواہد موجود تھے۔

انھی دنوں حضرت سعد بن معاذؓ عمرے کے لیے مکہ گئے اور امیہ بن خلف کے مہمان ہوئے ان دونوں کے درمیان دیرینہ دوستی تھی۔ انھوں نے امیہ سے کہا: "میرے لیے کوئی خلوت کا وقت دیکھو۔ ذرا میں بیت اللہ کا طواف کر لوں۔" امیہ دوپہر کے وقت انھیں لے کر نکلا تو ابوجہل سے ملاقات ہو گئی۔ ابوجہل نے امیہ سے پوچھا: "تمھارے ساتھ یہ کون ہے؟" امیہ نے کہا: "یہ سعد ہے۔" ابوجہل نے سعد کو مخاطب کر کے کہا: "اچھا" میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بڑے اطمینان سے طواف کر رہے ہو، حالانکہ تم لوگوں نے بے دینوں کو پناہ دے رکھی ہے اور یہ زعم رکھتے ہو کہ ان کی نصرت و اعانت بھی کرو گے۔

سنو! خدا کی قسم! اگر تم امیہ کے ساتھ نہ ہوتے تو اپنے گھر سلامت پلٹ کر نہ جا سکتے تھے۔" اس پر حضرت سعدؓ بن معاذ نے باآواز بلند کہا: "سن! خدا کی قسم! اگر تو نے مجھے اس سے روکا تو میں تجھے ایسی چیز سے روک دوں گا جو تجھ پر اس سے بھی زیادہ گراں ہو گی۔" (یعنی اہل مدینہ کے پاس سے گزرنے والا تجارتی راستہ جو شام کی طرف جاتا تھا۔ ابوجہل کے لیے یہ دھمکی بڑی کارگر ثابت ہوئی)

قریش نے مسلمانوں کو یہ پیغام بھیجا "تم مغرور نہ ہونا کہ مکہ سے صاف بچ کر نکل آئے۔ ہم یثرب ہی پہنچ کر تمھارا ستیاناس کر دیتے ہیں۔" یہ محض دھمکی نہ تھی بلکہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے ذرائع سے قریش کی چالوں اور برے عزائم کا علم ہو گیا تھا کہ آپ ﷺ یا تو جاگ کر رات گزارتے تھے یا صحابہ کرامؓ کے پہرے میں سوتے تھے۔ صحابہؓ باری باری مدینے کا حفاظتی گشت کرتے۔ چناں چہ ایسی ہی ایک رات جب خطرے کا زیادہ امکان تھا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دے۔" چناں چہ سعدؓ ابن ابی وقاص نے نگہبانی کے فرائض سنبھال لیے۔

کبھی کبھی راتوں کو چیخ و پکار سنائی دیتی۔ جب بھی ایسا واقعہ پیش آتا تو سارا شہر جاگ اٹھتا اور سب اپنی اپنی حفاظت کے لیے مستعد ہو جاتے۔ ایک رات ایسی ہی خوف و ہراس کی فضا تھی کہ حضور ﷺ نے حضرت ابوطلحہؓ کا "مندوب" نامی گھوڑا لیا اور گشت پر نکل گئے۔ عجلت اتنی تھی کہ گھوڑے پر آرام کے لیے زین کسنے کا وقت بھی نہ تھا۔ گشت سے واپس آ کر فرمایا: "اپنے اپنے گھروں میں آرام سے سو جاؤ۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔" اندرونی استحکام اور بیرونی سرگرمیوں دونوں پر حضور اکرم ﷺ کی بڑی کڑی نگاہ تھی اور یہی سربراہ مملکت کا سب سے زیادہ اہم فرض اور بڑی ذمہ داری ہے۔

ان حالات میں دفاع اور حفاظت خود اختیاری پر عمل کرنا ضروری تھا۔ حضور ﷺ نے مناسب سمجھا کہ کفار قریش کو مسلمانوں کی باخبری اور مستعد و ہوشیار رہنے کا احساس دلایا جائے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کے تجارتی قافلوں کی نگرانی اور ٹوہ کی خاطر گشتی دستے بھیجنا شروع کیے۔ اس کا مقصد قریش کے تجارتی قافلوں کی ناکہ بندی اور قرب و جوار کے قبائل کو مسلمانوں کی طاقت کا احساس دلانا تھا۔ سب سے پہلا دستہ حضرت امیر حمزہؓ کی قیادت میں ہجرت کے ساتویں مہینے رمضان سن ایک ہجری (مارچ 622ء) میں روانہ کیا گیا۔

سریہ اور غزوہ

سریہ (جمع سرایا) کے لغوی معنی قصد اور سیر کے ہیں۔ اصطلاحی معنی وہ نقل و حرکت جو کسی مسلمان نے اکیلے یا دوسرے مسلمانوں کے ہم راہ کی ہو۔ یعنی وہ مہم جس میں رسول اکرم ﷺ نے بذات خود شرکت نہیں کی، بلکہ اپنے صحابہؓ میں سے کسی کو امیر لشکر مقرر فرمایا۔ اس کا مقصد بڑے حزم و احتیاط سے دشمن کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنا ہو۔ نیز دور بینی اور بیدار مغزی سے مخالف کی جنگی تیاری یا افرادی طاقت کی فراہمی کو بار آور نہ ہونے دینا۔ کبھی مجرموں کی سرزنش، کبھی تبلیغ بھی سریہ کا مقصد بنی۔ اس کے لیے چھاپہ، جھڑپ اور طاقت آزمائی کے ذرائع کام میں لائے گئے۔ لفظ سریہ کو جنگ کا

ہم معنی سمجھنا درست نہیں۔

غزوہ (جمع غزوات) اس کے معنی جہاد کے ہیں۔ اور یہ وہ باضابطہ جنگیں ہیں جن میں رسول کریم ﷺ بہ نفس نفیس خود شریک ہوئے۔ انھیں مغازی بھی کہا جاتا ہے۔ سریہ ایک سو سے پانچ سو افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ پانچ سو سے زیادہ کے لشکر کو منسر کہتے تھے۔ اگر تعداد (800) آٹھ سو ہوتی تو جیش کا نام دیا جاتا تھا۔ جیش کے پانچ حصے ہوتے؛ جو مقدمہ، قلب، میمنہ، میسرہ اور عقبہ پر مشتمل ہوتے۔ ایسا جیش جو منتشر نہ ہو بلکہ جمع ہو وہ کتیبہ کہلاتا۔ جیش عظیم کو خمیس کے نام سے پکارتے تھے۔ لشکر کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہوتی، اسے جعفل کہتے۔

مؤرخین نے سرایا کی تعداد 47 اور غزوات کی تعداد 27 بتائی ہے۔ غزوات بدر، احد، مریسیع، خندق، قریظہ، خیبر، فتح مکہ، حنین اور طائف میں رسول اللہ ﷺ نے قتال کیا۔ باقی غزوات میں تلوار کا استعمال نہیں ہوا۔ غزوات میں جملہ 1048 افراد کام آئے، جن میں مسلمان شہدا کی تعداد 125 اور کفار کے 923 آدمی قتل ہوئے۔

علم۔ (جھنڈا)

جس غزوے میں حضور ﷺ خود تشریف لے جاتے تو اس کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھتے اور علم دوسروں کو عطا فرماتے تھے۔ اور جب کوئی سریہ روانہ فرماتے تو کمان کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی اور علم کسی اور کو عطا ہوتا۔ موتہ کی مہم کے وقت اس صورت حال پر عمل نہیں کیا گیا، کیوں کہ لشکر شام کے دور دراز مقام پر روانہ کیا گیا تھا۔ مقابلہ ایک نئی قوم یعنی عیسائیوں سے تھا۔ اس موقع پر حضرت زیدؓ ابن حارثہ کو امیر لشکر مقرر فرمایا اور انھی کو علم بھی عطا فرمایا۔ اب انھیں اختیار تھا کہ علم خود رکھیں یا کسی اور کے سپرد کر دیں۔ یہ ایک استثنائی صورت تھی۔ اس کے سوا ہر غزوہ اور سریہ میں سپہ سالار اور علمبردار جدا جدا ہوتے تھے۔ علمبردار کا کام علم کو بلند رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہوتا، اس لیے کہ علم کو بلند دیکھ کر لشکر ڈٹا رہتا۔ لشکر آگے بڑھتا تو علمبردار بھی پیش قدمی کرتا۔

علم اور لوا جھنڈے (پرچم) کو کہتے ہیں۔ علم وہ ہے جو کھلا رہے اور ہوا میں لہراتا نظر آئے۔ اس کے علاوہ وہ پرچم جو امیر کی قیام گاہ پر بطور علامت لہرایا جاتا تھا، وہ بھی علم ہی کہلاتا تھا۔ لوا وہ جھنڈا ہے جو نیزے کے ساتھ باندھ کر لپیٹ لیا جائے۔ لوا قابل اعتماد آدمی کو عطا کیا جاتا تھا۔

سریہ سیف البحر

آنحضور ﷺ نے رمضان المبارک سن ایک ہجری میں پہلا علم حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے لیے درست فرمایا۔ یہ علم سفید تھا۔ ان کی قیادت میں تیس شتر سوار مجاہدوں کو حکم ہوا کہ علاقہ جہینہ کے مقام عیص پر پہنچ کر قریش کے تجارتی کاررواں کو روکیں۔

مجاہد سفر پر روانہ ہونے لگے تو رسول کریم ﷺ نے ایک نیزے پر ایک سفید کپڑا باندھا اور یہ پرچم سپہ سالار حضرت امیر حمزہؓ کو عطا فرمایا۔ پہلے جنگی پرچم کے ہاتھ میں آتے ہی امیر حمزہؓ جھوم اٹھے۔ یہ بہت بڑا اعزاز اور بہت بڑی سعادت تھی۔

بے اختیار رجزیہ اشعار زبان پر آئے۔

''رسول اللہ کے حکم پر سب سے پہلے سرفروشی کے لیے جو شخص نکلا، وہ میں ہوں۔ اس کا پرچم کشار رسول، اور ایسا پرچم میرے اس واقعے سے پہلے کبھی ظاہر نہ ہوا تھا۔ یہ پرچم ایسا ہے کہ بہت عزت و شان والے معبود کی مدد کے ساتھ ہے، جس کا ہر کام بہترین ہے۔''

عیص کے قریب سیف البحر میں اُن کی قافلہ والوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ دشمن نے اپنی صفیں درست کیں تو تیس مجاہدوں نے بھی قطاریں باندھ لیں۔ ایک اور دس کا مقابلہ تھا۔ حضرت امیر حمزہؓ اور ان کے ساتھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے سرفروشی کے جذبے سے سرشار تھے۔ ابوجہل اور اس کے نگہبان مال تجارت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھے۔ آج پہلی بار ابوجہل کو محسوس ہوا کہ وہ دن گئے جب مسلمان ظلم سہنے اور صبر کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔

اس علاقے کے قبائلی سردار مجدی بن عمرو کو جب یہ خبر پہنچی تو وہ بیچ بچاؤ کے لیے آیا۔ وہ قریش کا قدیم حلیف تھا، لیکن مدینہ کی قربت کی وجہ سے مسلمانوں سے بھی بگاڑ نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بڑی دانائی سے کہا: ''میرے لیے قریش اور مسلمان دونوں برابر ہیں اور دوست ہیں۔'' ابوجہل نے مجدی کے فیصلے کو قبول کر لیا اور مکہ کی راہ لی۔ حضرت امیر حمزہؓ نے مجدی کی بات مان کر اس سے غیر جانب داری کا معاہدہ کیا۔ یہ مدینے سے باہر مسلمانوں کا پہلا سیاسی معاہدہ ہے۔ مجدی بن عمرو پہلا حکمران تھا جس نے مدینہ کی مملکت کی آزادانہ اور خود مختارانہ حیثیت کو تسلیم کی۔

سریہ عبیدہؓ بن حارث بن مطلب

اگلے ماہ شوال میں آنحضور ﷺ نے ساٹھ یا ستر مہاجر سواروں کو حضرت عبیدہؓ بن حارث کی سرکردگی میں رابغ کی طرف روانہ کیا۔ اس لیے یہ ''سریہ رابغ'' بھی کہلاتا ہے۔ یہ مقام جحفہ سے دس میل پر ہے اور مدینہ سے تقریباً 27 میل پر۔ عبیدہؓ بن حارث حضور اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ انھیں بھی سفید علم عطا کیا گیا۔ سالار نے یہ علم حضرت مسطح بن اثاثہ (حضرت ابوبکر کے خالہ زاد بھائی) کے سپرد کیا۔ مجاہدین جب ثنیۃ المرّہ کے نیچے پہنچے تو وہاں دو سو قریش ابوسفیان بن حرب اور عکرمہ بن ابوجہل کی قیادت میں موجود پائے۔ فریقین میں کوئی لڑائی نہ ہوئی، البتہ حضرت سعد بن ابی وقاص نے کفار پر تیر پھینکا، اور یہ پہلا تیر تھا جو مسلمانوں کی طرف سے کفار پر پھینکا گیا۔ دو مسلمان مقداد بن عمرو اور عتبہ بن غزوان بھی کفار کے ساتھ تھے۔ دونوں ابتدائی ایمان لانے والے تھے۔ مکہ میں زبردستی روک لیے گئے تھے۔ وہ موقع کی تلاش میں تھے۔ اُسی روز بھاگ کر مسلمانوں سے آملے۔

سریہ خرار

آئندہ ماہ ذی قعدہ سن ایک ہجری میں حضور ﷺ نے ایک مہم خرار بھیجنی چاہی تو بیس سواروں کے دستے کا امیر سعدؓ بن ابی وقاص کو بنایا۔ خرار شام کی تجارتی شاہ راہ پر ٹھہرنے والے کاروانوں کی منزل تھی۔ ان کے لیے بھی جو علم بنا، وہ سفید تھا اور مقداد

بن عمرو علمبردار تھے۔ انھیں حکم تھا کہ تجارتی قافلے کو ہراساں کرنا' مگر خرار سے آگے نہ جانا۔ یہ اللہ کی راہ میں مجاہدوں کا پہلا ''پیدل'' دستہ تھا۔ یہ لوگ صرف رات کے وقت سفر کرتے اور دن میں چھپ جاتے۔ پانچویں دن جب صبح کے وقت وہ وادی خرار میں پہنچے تو پتا چلا کہ رات تجارتی قافلہ' جس میں ساٹھ افراد تھے' پڑاؤ اٹھا چکا ہے۔

اس پاپیادہ مہمیں بھیجنے کا مقصد صحابہ کی فوجی تربیت تھا اور راتوں میں چلنے کی مشق اس کا ایک اہم حصہ تھا۔ مجاہدین جحفہ تک گشت لگا کر واپس چلے آئے۔

ہجرت کے پہلے سال کی آخری سہ ماہی میں یہ تین مہمات روانہ کی گئیں۔ کہیں بھی کوئی دو بدو لڑائی یا خون خرابے کی نوبت نہیں آئی۔ پہلی مہم بیچ بچاؤ کے طریق کار سے فتح کی گئی۔ دوسری مہم میں صرف تیروں کا تبادلہ ہوا۔ تیسری مہم میں قریش کا قافلہ بچ نکلا۔

حضرت عائشہؓ کی رخصتی

آنحضور ﷺ سے حضرت عائشہؓ کا نکاح شوال سن دس ہجری سے تین سال قبل مکہ میں ہوا تھا' لیکن رخصتی شوال سن ایک ہجری میں ہوئی۔ (حضرت عائشہؓ کے حالات زندگی کے لیے دیکھیے کتاب چہارم عنوان ''اہل بیت'')

جہاد بالسیف

سن دو ہجری۔ صفر کا مہینہ اور صفر کی بارہ تاریخ (4 اگست 623ء)۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قتال کی اجازت آئی۔ یہ اجازت اسلامی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔

اس سے پہلے ظلم سہنے اور صبر کرنے کا حکم تھا۔ اب اپنے دفاع اور اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کی اجازت ملی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا جو ارشاد نازل ہوا' وہ یہ تھا:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ﴾ (الحج: 39)

''جن لوگوں کے خلاف جنگ کی جارہی ہے' انھیں بھی جنگ کی اجازت دے دی گئی ہے' کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔''

یہ قتال فی سبیل اللہ کے بارے میں اولین آیت ہے جو نازل ہوئی۔ اس آیت میں صرف اجازت دی گئی تھی۔ بعد میں سورۂ بقرہ کی وہ آیات نازل ہوئیں' جن میں جنگ کا ''حکم'' دے دیا گیا یعنی:

﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (البقرہ: 190)

''اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں' مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

﴿وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرہ: 191)

''ان سے لڑو جہاں بھی تمھارا ان سے مقابلہ پیش آئے اور انھیں نکالو جہاں سے انھوں نے تمھیں نکالا' اس لیے کہ قتل اگرچہ برا ہے مگر فتنہ اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ اور مسجد حرام کے قریب جب تک وہ تم سے نہ لڑیں' تم نہ لڑو' مگر جب وہ وہاں لڑنے سے نہ چوکیں تو تم بھی بے تکلیف انھیں مارو کہ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔''

﴿وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ (البقرہ: 193)

''تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں' تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔''

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرہ: 216)

''تمھیں جنگ کا حکم دے دیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (البقرہ: 244)

''مسلمانو! اللہ کی راہ میں جنگ کرو' اور خوب جان رکھو کہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

حکم جہاد دو چیزوں سے مشروط ہے۔ دفاعی ہو اور اللہ کی راہ میں ہو۔ جہاد کی دو بڑی قسمیں ہیں:

1: مال کا جہاد (خیرات' صدقات' ہدایا اور عطیات وغیرہ)

2: جان کا جہاد (جہادِ نفس' جہادِ علم اور جہاد بالسیف)

جہادِ نفس کو جہادِ اکبر بھی کہا گیا ہے۔ جہادِ علم میں زبان (تقریر) اور قلم (تحریر) دونوں شامل ہیں۔ جہاد بالسیف کے لیے قرآنی اصطلاح ''قتال'' ہے' اس کا مقصد حق کی سربلندی ہے۔

جہاد بالسیف یا قتال کے سلسلے میں سورۂ بقرہ کی جن آیات کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے' ان کی روشنی میں حضور ﷺ نے عام لڑائی اور جہاد میں امتیاز کے لیے حسب ذیل آداب جہاد اپنے قول و عمل میں مقرر فرمائے۔

آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جنگ شروع ہونے سے پہلے اپنے صحابہؓ سے بیعت لیتے تھے کہ عین لڑائی میں کوئی راہ فرار اختیار نہ کرے۔ جہاد کے اقرار کی بیعت حضور ﷺ بھی اسی طرح لیتے تھے' جس طرح قبول اسلام کی۔

حضور ﷺ جہاد کے معاملے میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کرتے۔ جہاد کے موقع پر منزل کے انتخاب وغیرہ کے متعلق مشورہ کرتے۔ دشمن کی سرگرمیوں کی ٹوہ لگانے کے لیے جاسوس مقرر کرتے۔ دشمن کے جاسوسوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے۔ کوئی مسلمان اگر مسلمانوں کے پوشیدہ مشورے کی خبر کفار کو پہنچاتا تو آپ ﷺ سخت ناراض

ہوتے۔علم اور رایات سے کوئی لشکر خالی نہ ہوتا۔ زرہ اور دیگر سامان حرب کا ہر ممکن بندوبست کرتے۔ اگر سامان حرب کم ہوتا تو کفار سے بھی عاریتاً لے لیتے۔سفر کے وقت آرام کا خیال رکھتے اور تیز دھوپ میں قیام کرتے۔

آپ کا قاعدہ تھا کہ جب دشمن کے مقام کے قریب پہنچتے تو جیش کو روکتے۔اللہ سے فتح ونصرت کی دعا کرتے۔ پھر فرماتے' اب بڑھو بسم اللہ۔

دشمن کی تعداد اور تیاری زیادہ ہوتی تو آپ ﷺ صحابہ سے فرماتے: ''فتح و نصرت کثرتِ تعداد اور آلات حرب کی کثرت پر موقوف نہیں' بلکہ اصل چیز اللہ پر بھروسا اور صبر واستقامت ہے۔''

جہاد کے دوران میں حضور ﷺ کا طریقہ تھا کہ دشمن پر صبح کے وقت حملہ کرتے یا آفتاب ڈھلنے کے بعد۔ رات کے وقت حملہ نہیں کرتے تھے۔عین معرکۂ جنگ میں ان کافروں کے خلاف' جن سے حرب قائم ہو' ہر قسم کی تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ حضور ﷺ عورتوں' بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنے سے منع کرتے۔ آپ ﷺ کا حکم تھا کہ منکرین خدا کو قتل کرو۔ مگر ناک' کان وغیرہ نہ کاٹو۔ کفار سے جب بھی معاہدہ کرو' بدعہدی نہ کرو۔ حضور ﷺ کا حکم تھا کہ اس بوڑھے کے قتل سے دریغ نہ کرو' جو صاحب تجربہ ہو اور کفار اس کی رائے سے فائدہ اٹھائیں۔ آپ ﷺ صحابہ کرام سے فرماتے کہ دشمن کے علاقے میں قرآن حکیم لے کر نہ جائیں۔ آپ ﷺ امیر سریہ سے فرماتے کہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے اسلام کی دعوت دیا کرو۔ اگر دشمن دعوت قبول نہ کرے تو مقابلہ کرو۔ ورنہ ہاتھ روک لو۔ ایسی بستی جس سے اذان کی آواز سنی جائے یا اسلام کی کوئی علامت معلوم ہو' وہاں حملہ کرنے سے آپ ﷺ منع کرتے۔ آپ ﷺ کا حکم تھا کہ جو شخص کلمہ پڑھ لے' خواہ اس نے جان کے خوف ہی سے پڑھا ہو' اسے قتل نہ کیا جائے۔

آپ ﷺ کا عام قاعدہ یہ تھا کہ آپ فتح کے بعد وہاں تین دن تک قیام فرماتے۔ مالِ غنیمت کبھی اسی مقام پر تقسیم کر دیتے' کبھی وہاں سے چل کر راستے میں اور کبھی مدینہ پہنچ کر۔ ازواج مطہرات میں سے ایک نہ ایک غزوات میں آپ ﷺ کے ہم راہ ہوتیں۔ قبائل کی عورتیں بھی مرہم پٹی کے لیے کبھی کبھی ساتھ ہو جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ غلام بھی ساتھ ہوتے تھے۔ حضور ﷺ غلاموں کی خدمات کے پیش نظر مالِ غنیمت میں سے کچھ نہ کچھ انھیں عنایت کر دیا کرتے۔ مالِ غنیمت میں سے چھپا کر کچھ لینے کو حضور ﷺ گناہ میں شمار کرتے تھے۔ لیکن شہد' انگور اور کھانا اس میں داخل نہ تھے۔ صحابہؓ بقدرِ ضرورت کھانے کی اشیا لے لیتے تھے۔

غزوہ ودان

اس غزوہ کو غزوہ ابواء بھی کہتے ہیں۔ ودان مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام کا نام ہے۔ یہ رابغ سے مدینہ جاتے ہوئے 29 میل کے فاصلے پر پڑتا ہے۔ صفر سن دو ہجری (اگست 623ء) میں پیش آیا۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں حضور ﷺ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ آپ ﷺ کفار قریش کی ایک جماعت کی مزاحمت کی غرض سے مقامِ ودان تک گئے' مگر وہ لوگ نہ ملے اور کوئی معاملہ پیش نہ آیا۔ حضور ﷺ کے ساتھ ستر مہاجرین تھے۔ علم سفید تھا اور حضرت حمزہؓ علم بردار۔ آپ ﷺ نے مدینہ میں اپنے پیچھے حضرت سعدؓ بن عبادہ کو اپنا قائم مقام مقرر کیا تھا۔ اس غزوے میں آپ ﷺ پندرہ دن مدینے سے باہر رہے۔

اسی غزوہ میں آپ ﷺ نے بنوضمرہ کے سردار عمرو بن مخشی سے حلیفانہ معاہدہ کیا' جس کی عبارت یہ تھی: ''یہ بنوضمرہ کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی تحریر ہے۔ یہ لوگ اپنے جان اور مال کے بارے میں مامون رہیں گے اور جو ان پر یورش کرے گا' اس کے خلاف ان کی مدد کی جائے گی۔ الا یہ کہ یہ خود اللہ کے دین کے خلاف جنگ کریں۔ (یہ معاہدہ اس وقت تک کے لیے ہے) جب تک سمندر انھیں تر کرے (یعنی ہمیشہ کے لیے) اور جب نبی ﷺ اپنی مدد کے لیے انھیں آواز دیں گے تو انھیں آنا ہوگا۔

غزوۂ بواط

ہجرت کے تیرھویں مہینے' ربیع الاول سن دو ہجری میں مدینہ پر حضرت سعدؓ بن معاذ کو اپنا قائم مقام مقرر فرما کر' حضور ﷺ دو سو اصحاب کے ساتھ پھر غزوہ کے لیے نکلے۔ علم سفید تھا اور علم بردار سعدؓ بن ابی وقاص تھے۔ بواط اور رضوی کوہستان جہینہ کے سلسلے کے دو پہاڑ ہیں جو درحقیت ایک ہی پہاڑ کی دو شاخیں ہیں۔ یہ مکہ سے شام جانے والی شاہ راہ کے متصل ہے اور مدینہ سے تقریباً 48 میل کے فاصلے پر ہے۔

اس غزوے کا مقصد قریش کے ایک تجارتی قافلے کی مزاحمت تھا۔ یہ تجارتی قافلہ دو سو قریش اور ڈھائی ہزار اونٹوں پر مشتمل تھا۔ قریش کے جاسوسوں کو مسلمانوں کی اس نقل وحرکت کا علم ہو گیا۔ سالار قافلہ امیہ بن خلف عام راستے سے ہٹ کر تیزی سے بڑھ گیا۔ اس طرح مسلمان جنگی دستے کی گرفت سے تجارتی قافلہ محفوظ نکل گیا۔

غزوۂ سفوان

اسی مہینے (ربیع الاول) کے دوران میں حضور ﷺ کرز بن جابر فہری کے تعاقب کو نکلے۔ اس نے مشرکین کی ایک جماعت کے ساتھ مدینے کی چراگاہ پر چھاپہ مارا تھا اور کچھ مویشی لوٹ لیے تھے۔ اس غزوے میں علم سفید تھا اور علم بردار حضرت علیؓ۔ اس مرتبہ آپ نے زیدؓ بن حارث کو مدینے کا قائم مقام خلیفہ مقرر کیا۔ حضور ﷺ نے ستر اصحاب کے ساتھ بدر کے قریب وادیٔ سفوان تک کرز کا تعاقب کیا' مگر وہ نہ ملا۔ پھر حضور ﷺ مدینہ واپس آ گئے۔ اسے غزوۂ بدر اولیٰ بھی کہتے ہیں۔

غزوۂ ذی عشیرہ

اس غزوے کے لیے حضور ﷺ جمادی الاولیٰ (دسمبر 632ء) کے اواخر میں روانہ ہوئے اور جمادی الآخر میں واپس آئے۔ حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد مخزومی کو اپنے پیچھے مدینہ کا خلیفہ مقرر فرما کر حضور ﷺ دو سو مہاجرین کے ساتھ مدینہ سے باہر نکلے۔ ان میں سوار اور پیدل دونوں شامل تھے۔ اونٹوں کی تعداد تیس تھی' جن پر مجاہد باری باری سوار ہوتے' سفید پرچم حضرت امیر حمزہؓ کے ہاتھ میں تھا۔ عشیرہ بنی مدلج

ایک گاؤں ہے جو ینبوع میں واقع ہے۔

ینبوع ایک قلعہ ہے جس میں چشمے اور کھجور کے درخت بہت ہیں۔ اس غزوے کا مقصد ابوسفیان کی قیادت میں شام کو جانے والے تجارتی قافلے کی مزاحمت تھا' تا کہ قریش کو مرعوب اور دہشت زدہ کیا جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس قافلے میں پچاس ہزار اشرفی کی مالیت کا سامان ایک ہزار اونٹوں پر لدا ہوا تھا۔ دوسرا مقصد اس علاقے میں آباد قبائل سے دوستی کا معاہدہ تھا۔ چناں چہ بنی مدلج کے سردار سراقہ ابن جعشم نے (جس نے سفر ہجرت میں آپ ﷺ کا تعاقب کیا تھا) بڑی خوشی سے حلیفی قبول کی' اس لیے بھی کہ یہ قبیلہ بنی ضمرہ کا حلیف تھا جس سے پہلے ہی معاہدہ ہو چکا تھا۔ سراقہ نے مسلمان مجاہدوں کی شان دار ضیافت کی۔

آپ ﷺ کے پہنچنے سے پہلے ہی قریش کا قافلہ جا چکا تھا۔ یہ وہی قافلہ ہے جسے شام سے واپسی پر نبی ﷺ نے گرفتار کرنا چاہا تو یہ قافلہ تو بچ نکلا' لیکن غزوہ بدر پیش آ گیا۔

سریہ نخلہ

سریہ نخلہ ہجرت کے سترھویں مہینے رجب سن دو ہجری (جنوری 624ء) میں آنحضور ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو بارہ مہاجرین کے ساتھ قریش کی نقل و حرکت کی تحقیق کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت عبداللہؓ آپ ﷺ کے پھوپھی زاد امیر المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے۔ ''مدارج النبوت میں ہے کہ انھیں امیر المومنین کا خطاب بھی دیا گیا اس جماعت میں بارہ مہاجر تھے۔ ہر دو کی سواری کے لیے ایک اونٹ تھا۔

آنحضور ﷺ نے حضرت عبداللہؓ کو ایک بند خط دیتے ہوئے فرمایا: ''دو دن گزرنے کے بعد اس خط کو پڑھنا اور مندرجہ ہدایات کے مطابق عمل کرنا۔ حضرت عبداللہؓ نے حسب الحکم دو دن کی مسافت طے کرنے کے بعد خط کھول کر پڑھا۔ لکھا تھا: ''جب تم اس تحریر کو دیکھو تو یہاں تک چلو کہ مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ میں اتر جاؤ۔ وہاں رہ کر قریش کی کارروائیوں کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ ان کی خبروں سے ہمیں آگاہ کرو۔''

حضرت عبداللہ نے حکم نامہ پڑھ کر سنایا اور کہا' جو جانا چاہے' اسے اجازت ہے' اور جو شہادت کا متمنی ہے' وہ میرے ساتھ چلے۔ سب نے لبیک کہا۔ آپ نے سفر کا رخ حجاز کی جانب موڑ دیا۔ آگے چلے تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عتبہؓ بن غزوان کا اونٹ جسے پیچھے باندھ رکھا تھا' رسی تڑوا کر کہیں بھاگ گیا۔ یہ دونوں اسے ڈھونڈتے رہ گئے اور راستہ بھٹک گئے۔ وہ تلاش میں سرگرداں تھے کہ قریش کے ہتھے چڑھ گئے۔ انھوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن جحش نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی اور بطن نخلہ میں پہنچ کر ٹھہر گئے۔ یہ مقام مکہ اور طائف کے درمیان ایک نخلستان ہے جو ابن عامر کا باغ ہے۔ یہاں سے مکہ ایک رات کے سفر پر تھا۔ مکہ جانے والے تمام قافلے یہاں ٹھہرتے تھے۔ آخر شام کے وقت قریش کا وہ قافلہ' جس کی تاک میں آئے تھے' طائف کی طرف سے آتا نظر آیا۔ عمرو بن حضرمی' عبداللہ بن مغیرہ کے دو لڑکوں یعنی عثمان اور نوفل' اور بنی مغیرہ کے غلام حکم بن کیسان یہ چار آدمی اس قافلے میں شامل تھے۔ اونٹوں پر کشمش' چمڑا اور دوسرا سامان تجارت تھا۔

اس دن رجب کی آخری تاریخ تھی۔ اس مہینے میں قتل و قتال حرام تھا۔ مسلمانوں نے باہم صلاح مشورہ کیا۔ کسی نے کہا' اگر آج رات انھیں چھوڑ دیا جائے تو یہ لوگ حرم میں داخل ہو جائیں گے۔ روکا جائے تو لڑائی کا اندیشہ ہے اور یہ حرمت والا مہینہ ہے جس میں قتال منع ہے۔ کسی نے کہا' رجب ختم ہو چکا ہے اور شعبان شروع ہو گیا ہے۔ طے پایا کہ دشمن کو کسی صورت ہاتھ سے نہ نکلنے دیا جائے۔ مسلمان آگے بڑھے تو حضرت واقدؓ بن عبداللہ تمیمی نے اللہ کی راہ میں تیر چھوڑا تو عمرو بن حضرمی کے لگا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بڑھ کر عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو گرفتار کر لیا۔ اس افراتفری میں نوفل بن عبداللہ بھاگ نکلا۔ مسلمانوں نے مال تجارت پر قبضہ کر لیا۔

اس وقت تک چوں کہ مال غنیمت کے متعلق کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا' اس لیے مسلمانوں کے قائد حضرت عبداللہؓ بن جحش نے محض اپنے اجتہاد سے مال غنیمت کا پانچواں حصہ رسول کریم ﷺ کے لیے رکھ کر باقی چار حصے آپس میں تقسیم کر لیے۔ مجاہدین جب مدینہ پہنچے تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام واقعات بیان کیے اور مال غنیمت کا خمس پیش کیا۔ حضور ﷺ نے شہر حرمت میں لڑائی کو سخت ناپسند کیا۔ بہت ناراض ہوئے۔ فرمایا: ''تمھیں ماہ حرام میں لڑائی کی اجازت نہ تھی۔ پھر کیوں لڑے؟'' آپ نے غنیمت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کفار قریش اور یہودیوں کو تو اب ایک ایسا موقع مل گیا کہ جس کے ذریعے مسلمانوں کو بدنام کیا جائے۔ انھوں نے افواہیں پھیلائیں کہ مسلمانوں نے ماہ رجب کا احترام چھوڑ دیا ہے۔ خون ریزی کی۔ مال لوٹا۔ قیدی بنائے۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے یہ سب کچھ اپنی ذمہ داری پر کیا تھا۔ حضور ﷺ کی خفگی نے انھیں مزید پریشان کر دیا تھا۔ ادھر آنحضرت ﷺ پر ہر طرف سے الزامات اور سوالات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی کہ ان مہینوں کے بارے میں آخر اسلام کا کیا موقف ہے' اس پر سورۂ بقرہ کی آیت 217 نازل ہوئی:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾ (البقرہ: 217)

''لوگ پوچھتے ہیں' ماہ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ اس میں لڑنا بہت برا ہے' مگر راہ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا' اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ خون ریزی سے شدید تر ہے۔ وہ تو تم سے لڑے ہی جائیں گے' حتیٰ کہ اگر ان کا بس چلے تو تمھارے دین سے تمھیں پھیر لے جائیں۔''

یہ وحی آنے پر حضرت عبداللہ ابن جحش اور ان کے ساتھی بہت خوش ہوئے۔ اب حضور ﷺ نے ان کی غنیمت بھی قبول فرمائی اور دونوں قیدیوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ حضرت عبداللہ بن جحش کا اجتہاد اللہ کی بارگاہ میں اس قدر مقبول ہوا کہ جنگ بدر کے بعد حکم آیا کہ پانچواں حصہ رسول ﷺ کے لیے اور باقی مجاہدوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ قریش نے اپنے دونوں قیدیوں کا فدیہ بھیجا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک ہمارے دونوں ساتھی سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہؓ بن غزوان واپس نہ آ جائیں' ہم انھیں رہا نہیں کریں گے۔ اندیشہ ہے کہ تم انھیں قتل نہ کر دو' اگر ایسا کیا تو یہ دونوں بھی اسی انجام کو پہنچیں گے۔

چند دن بعد دونوں مجاہد واپس آ گئے۔ حضور ﷺ نے چالیس اوقیہ فدیہ لے کر عثمان اور حکم کو چھوڑ دیا۔ عثمان مکہ چلا گیا اور حالت کفر میں مرا' جب کہ حکم بن کسیان نے اسلام قبول کیا۔

اس واقعے سے اسلام کی سیاست کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔ سریہ کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ پہلا قتل' پہلی غنیمت' پہلا اجتہاد' پہلے قیدی اور پہلا امیر المومنین اسی سے متعلق ہیں۔ غزوہ بدر اور تمام لڑائیاں جو قریش کے ساتھ پیش آئیں' ان سب کا بڑا سبب یہی عمرو بن حضرمی کا قتل تھا جو عبداللہ حضرمی کا بیٹا تھا۔ گرفتار ہونے والے بھی بڑے بااثر لوگ تھے۔

تحویل قبلہ

رسول اللہ ﷺ جب تک مکہ میں مقیم رہے' مسجد حرام میں اس طرح نماز ادا فرماتے کہ کہ داہنی طرف رکن اسود اور بائیں جانب رکن یمانی ہوتا' اس طرح دونوں قبلے (کعبۃ اللہ اور بیت اللہ المقدس) آپ کے روبرو ہوتے۔ ہجرت کے بعد یہ صورت ممکن نہ ہوسکی کہ دونوں قبلوں کو جمع کر سکیں۔ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہیں تو کعبۃ اللہ کی طرف پشت ہو جاتی ہے۔ حضورؐ اکرم کا طریقہ یہ تھا کہ جن باتوں میں وحی نہ آتی' اس میں بنی اسرائیل کے انبیا کی موافقت فرماتے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی یہودیوں کی تالیف قلب کے لیے بیت المقدس ہی کو قبلہ رہنے دیا۔ یہود سمجھنے لگے کہ مسلمان بہت سی باتیں ہماری جیسی کرتے ہیں' ہم آہستہ آہستہ انھیں اپنے میں جذب کر لیں گے۔

حضور اکرم ﷺ نے جب یہ محسوس کیا کہ یہودی کسی طرح اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہیں' اور اب تو یہ بھی کہنے لگے ہیں کہ قبلے کے معاملے میں تو ہماری موافقت اور دین میں مخالفت' یہ کیسا تضاد ہے! یہ باتیں سن کر آپ ﷺ کا دل چاہتا تھا کہ قبلہ "کعبۃ اللہ" ہو جائے۔ دل میں شوق پیدا ہوا کہ رخ مسجد حرام کی طرف ہو جائے۔ آرزو بڑھی تو بار بار آسمان کی طرف ملتجیانہ نظریں اٹھنے لگیں۔ وحی کا انتظار ہونے لگا۔

آخر قبولیت کا دن آ پہنچا۔ بتایا جاتا ہے کہ شعبان کی پندرہ تاریخ تھی۔ سن دو ہجری مطابق 11 فروری 624ء۔ حضور ﷺ بشر بن براء بن معرور کے ہاں دعوت پر گئے ہوئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپ لوگوں کو نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکا یک وحی کے ذریعے سے یہ آیت نازل ہوئی۔ (سورۂ بقرہ: آیت 144)

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ۝﴾ (البقرہ: 144)

"یہ تمھارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ لو ہم اسی قبلے کی طرف تمھیں پھیرے دیتے ہیں' جسے تم پسند کرتے ہو۔ مسجد حرام کی طرف رخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں تم ہو' اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ اور جنھیں کتاب دی گئی تھی (یعنی یہود) وہ جانتے ہیں کہ یہی ان کے ربّ کی طرف سے حق ہے اور جو وہ کر رہے ہیں اللہ اس سے ہرگز لاعلم نہیں۔"

اسی وقت آپ اور آپ کی اقتدا میں جماعت کے تمام لوگ بیت المقدس سے کعبے کے رخ پھر گئے۔ اس کے بعد مدینہ اور اطراف مدینہ میں اس کی عام منادی کی گئی۔ براء بن عازب کہتے ہیں کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے۔ حکم سنتے ہی سب کے سب اسی حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ بنی سلمہ میں یہ اطلاع دوسرے روز صبح کی نماز کے وقت پہنچی۔ لوگ ایک رکعت پڑھ چکے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز پڑی: "خبردار رہو' قبلہ بدل کر کعبے کی طرف کر دیا گیا ہے۔" سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رخ بدل لیا۔

خیال رہے کہ بیت المقدس مدینے سے عین شمال میں ہے اور کعبہ بالکل جنوب میں ہے۔ نماز باجماعت پڑھتے ہوئے قبلہ تبدیل کرنے میں لامحالہ امام کو چل کر مقتدیوں کے پیچھے آنا پڑا ہوگا اور مقتدیوں کو صرف رخ ہی نہ بدلنا پڑا ہوگا' بلکہ کچھ نہ کچھ انھیں بھی چل کر اپنی صفیں درست کرنی پڑی ہوں گی۔ چناں چہ بعض روایات میں یہی تفصیل مذکور ہے۔

اگلی آیت 145 میں ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ لَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَ مَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝﴾ (البقرہ: 145)

"تم ان اہل کتاب کے پاس خواہ کوئی نشانی لے آؤ' ممکن نہیں کہ یہ تمھارے قبلے کی پیروی کرنے لگیں' اور نہ تمھارے لیے یہ ممکن ہے کہ ان کے قبلے کی پیروی کرو' اور ان میں سے کوئی گروہ بھی دوسرے کے قبلے کی پیروی کے لیے تیار نہیں ہے' اور اگر تم۔ اس علم کے بعد' جو تمھارے پاس آ چکا تھا' ان کی خواہشات کی پیروی کی تو یقیناً تمھارا شمار ظالموں میں ہوگا۔"

اس آیت کی تشریح میں مولانا مودودی رقم طراز ہیں "مطلب یہ ہے کہ قبلے۔

متعلق جو حجت و بحث یہ لوگ کرتے ہیں' اس کا فیصلہ نہ تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ دلیل سے انھیں مطمئن کر دیا جائے' کیوں کہ یہ تعصب اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں اور کسی دلیل سے بھی اس قبلے کو چھوڑ نہیں سکتے۔ جسے یہ اپنی گروہ بندی اور تعصبات کی بنا پر پکڑے ہوئے ہیں' اور نہ اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ان کے قبلے کو اختیار کر لو' کیوں کہ ان کا کوئی ایک قبلہ نہیں ہے' جس پر یہ سارے گروہ متفق ہوں اور اسے اختیار کر لینے سے قبلے کا جھگڑا ختم ہو جائے۔ مختلف گروہوں کے مختلف قبلے ہیں۔ ایک کا قبلہ اختیار کر کے بس ایک ہی گروہ کو راضی کر سکو گے۔ دوسروں کا جھگڑا بدستور باقی رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پیغمبر کی حیثیت سے تمھارا یہ کام ہے ہی نہیں کہ تم لوگوں کو راضی کرتے پھرو اور ان سے لین دین کے اصول پر مصالحت کیا کرو۔ تمھارا کام تو یہ ہے کہ جو علم ہم نے تمھیں دیا ہے' سب سے بے پروا ہو کر صرف اسی پر سختی کے ساتھ قائم ہو جاؤ۔ اس سے ہٹ کر کسی کو راضی کرنے کی فکر کرو گے تو اپنے پیغمبری کے منصب پر ظلم کرو گے اور اس نعمت کی ناشکری کرو گے' جو دنیا کا امام بنا کر ہم نے تمھیں بخشی ہے۔'' (تفہیم القرآن۔ جلد اول' صفحہ 122)

قبلے کی تبدیلی سے یہودی سخت برہم ہوئے' کیوں کہ تحویل قبلہ سے مسلمانوں کو ایک جداگانہ' منفرد اور امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ پہلے یہودی سمجھتے تھے کہ چوں کہ مسلمان بہت سی باتیں ان جیسی کرتے ہیں' اس لیے وہ مسلمانوں کو بہت جلد اپنے اندر جذب کر لیں گے' مگر تحویل قبلہ سے ان کی سب تمنائیں خاک میں مل گئیں۔ تحویل قبلہ پر انھوں نے یہ طعنہ دینا شروع کیا کہ آنحضرت نے ہماری مخالفت کے ارادے میں قبلہ بدل دیا ہے۔ چناں چہ یہودیوں نے لوگوں کو بدظن کرنے کے لیے عجیب عجیب باتیں بنانا شروع کیں۔ جہلاء' مشرکین اور منافقین نے ان کا ساتھ دیا' مگر وہ لوگ جو راہ حق پر تھے اور آپ ﷺ کی رسالت کے دل و جان سے قائل تھے' وہ تحویل قبلہ سے بہت خوش ہوئے۔ کیوں کہ اس سے وہ تمام آستین کے سانپ اصلی روپ میں سامنے آ گئے تھے جو دل میں اسلام اور بانی اسلام سے بغض و حسد رکھتے تھے۔ مسلمانوں کے نزدیک کعبے کا قبلہ قرار دیا جانا حضور ﷺ سرور کائنات کی رسالت کے شایان شان تھا۔

روزوں کی فرضیت

ماہ شعبان کے آخری عشرے' سن دو ہجری (فروری 622) میں رمضان المبارک کے روزے فرض کیے گئے۔ سورۂ بقرہ کی آیات 183 تا 187 میں یہی احکام پوری وضاحت سے موجود ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝﴾ (البقرہ: 183)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تم پر روزے فرض کر دیے گئے' جس طرح تم سے پہلے انبیا کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ روزوں کی فرضیت صرف امت محمدیؐ ہی کے لیے مخصوص نہیں' بلکہ پچھلی امتوں پر بھی روزے فرض کیے گئے تھے اور اس کا مقصد لوگوں کو متقی بنانا ہے۔ حضرت آدمؑ ہر مہینے ایام بیض (تیرہ' چودہ اور پندرہ تاریخ) میں روزے رکھا کرتے تھے۔ رمضان کے روزے حضرت نوحؑ کی اولیات میں سے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کامل تیس دن روزے رکھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام ہر تیسرے دن روزہ رکھتے۔ امت موسوی جہاں چالیس دن کے روزے کی پابند ہے' وہیں ان کے احبار جمعرات اور پیر کا روزہ بھی رکھا کرتے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ ایک دن روزہ رکھتے اور دو دن کھاتے پیتے۔ حضرت دانیالؑ اور حضرت یحییٰؑ کی امتیں بھی روزہ رکھا کرتی تھیں۔

پیغمبر آخر الزماں ﷺ نے ابتدا میں مسلمانوں کو ہر مہینے صرف تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی' مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ پھر شعبان سن دو ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا' مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں' وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں' بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ عام رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض اور مسافر اور حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بوڑھے لوگوں کے لیے' جن میں روزے کی طاقت نہ ہو' اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا' اور انھیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں' جتنے رمضان میں ان سے چھوٹ گئے ہیں۔

سورۂ بقرہ آیت 184 تک وہ ابتدائی حکم ہے جو رمضان کے روزوں کے متعلق سن دو ہجری میں جنگ بدر سے پہلے نازل ہوا تھا۔ اس کے بعد کی آیت 185 تا 187 اس کے ایک سال بعد نازل ہوئیں اور مضمون کی مناسبت کی وجہ سے اسی سلسلہ بیان میں شامل کر دی گئیں۔

غزوۂ بدر--- 17 رمضان المبارک سن دو ہجری

سیریہ نخلہ کے لیے عبداللہ بن جحش کے فوجی دستے کی تشکیل سے اسلامی سیاست نے اپنی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹا تھا' کیوں کہ اس موقع پر واقد بن عبداللہ تیمی کے تیر سے عمرو بن حضرمی کی ہلاکت عمل میں آئی تھی۔ یہ پہلا خون تھا جو مجاہدین اسلام کے ہاتھوں بہا اور اس بارے میں وہ آیات نازل ہوئیں جن کا ذکر ''جہاد بالسیف'' کے عنوان کے تحت ہو چکا ہے۔ ان آیات کی رو سے ان لوگوں کے ساتھ جنگ کی اجازت مل گئی تھی جو مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مسلمانوں نے ارادہ کر لیا تھا کہ جنگ کے ذریعے سے اپنا مال و متاع قریش سے واپس لیں۔ قریش اس واقعے (عمرو بن حضرمی کے قتل) کے بعد اس کوشش میں تھے کہ عرب قبائل کو مسلمانوں سے جنگ کے لیے آمادہ کریں اور ان کے خلاف یہ زہر اگلیں کہ مسلمانوں نے ماہ حرام میں ایک آدمی کو قتل کیا ہے' حالانکہ اس مہینے کی حرمت کا تقاضا یہ تھا کہ مطلق خون ریزی نہ ہوتی۔ ادھر آنحضرت ﷺ کو بھی یہ پختہ یقین ہو گیا تھا کہ قریش سے کسی قیمت پر صلح نہیں ہو سکتی۔

ابوسفیان کا تجارتی قافلہ

تین ماہ قبل قریش کا ایک تجارتی قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں شام گیا تھا' اور یہ وہی قافلہ تھا' جس کی تلاش میں حضور ﷺ عشیرہ تک گئے تھے' لیکن وہ دو روز پہلے روانہ ہو چکا تھا اور مسلمانوں نے یہ طے کیا تھا کہ اب اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ جب اس قافلے کی واپسی کے دن قریب آئے تو نبی کریم نے حضرت طلحہؓ بن عبداللہ اور حضرت سعیدؓ بن زید کو قافلے کی سراغ رسانی کے لیے روانہ فرمایا۔ یہ دونوں حوراء پہنچ کر کشد جہنی کے خیمے میں فروکش ہوئے۔ انھوں نے قافلے کو بالائی حصے سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ دونوں یعنی حضرت طلحہؓ اور حضرت سعیدؓ واپس آئے اور حضور ﷺ کو قافلے کی واپسی کی خبر دی' لیکن حضور ﷺ کو ان کی آمد سے پیش تر ہی خبر مل چکی تھی کہ قافلہ بہت بڑا ہے۔

اہل مکہ نے اس قافلے میں حسب استطاعت حصہ لیا ہے اور اس کے مال و اسباب کی مالیت پچاس ہزار دینار کے قریب ہے۔ آپ ﷺ کو اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ حضرت طلحہؓ اور حضرت سعیدؓ کی خبر رسانی کے وقت تک قافلہ گزر جائے اور مسلمان واپسی میں بھی اس پر قابو نہ پا سکیں' اس لیے حضور ﷺ نے مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ قریش کا قافلہ راستے میں ہے' باہر نکل کر اس کا تعاقب کرو۔

ابوسفیان کا پیغام قریش کے نام

بعض مسلمانوں نے اس پیغام پر لبیک کہا۔ بعض تذبذب میں پڑ گئے اور بعض نے مال غنیمت کی طمع میں (یہ مسلمان نہ تھے) مسلمانوں کے ہم راہ جانے کی خواہش ظاہر کی' لیکن حضور ﷺ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ تم اگر ہمارے ساتھ چلنا چاہتے ہو تو پہلے اسلام قبول کرو۔

ابوسفیان کو شام کی جانب سفر کرتے ہوئے یہ علم ہو چکا تھا کہ نبی کریم ﷺ قریشی قافلے کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ چناں چہ واپسی پر بھی اسے مسلمانوں کی طرف سے حملے کا اندیشہ تھا اور اس غرض سے وہ مسلمانوں کی نقل و حرکت سے متعلق حالات دریافت کرتا رہتا تھا۔ قافلہ شام سے لوٹتے ہوئے حوراء کے مقام پر پہنچا تو ابوسفیان نے کشد جہنی سے مسلمانوں کی سرگرمیوں کا حال دریافت کیا' جس کے خیمے میں حضرت طلحہؓ اور حضرت سعیدؓ فروکش ہوئے تھے۔ اگرچہ کشد جہنی نے اسے صحیح جواب نہ دیا' تاہم ابوسفیان کو ایک حد تک مہاجرین وانصار کی منصوبہ بندیوں کا علم ہو گیا تھا اور اسے اپنے انجام کا خوف دامن گیر تھا' کیوں کہ قافلے کے پاسبانوں کی تعداد تیس یا چالیس افراد سے زیادہ نہ تھی۔

اس خیال سے ابوسفیان نے ضمضم بن عمرو غفاری کو مکہ بھیجا اور اس ذریعے سے قریش کو یہ پیغام دیا کہ فوراً امداد کے لیے کچھ لوگ بھیجو۔ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی ہمارے درپے ہیں۔

ضمضم نے مکہ کے پاس پہنچ کر اپنے اونٹ کے کان کاٹ ڈالے۔ اس کی ناک چیر دی۔ کجاوہ الٹ دیا۔ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور اونٹ پر کھڑے ہو کر چلایا: "اے قریش' تمھارا مال خطرے میں ہے۔ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی کاروان ابوسفیان کا تعاقب کر رہے ہیں۔ تمھارے مال کی خیر نہیں۔ جلد مدد بھیجو۔" ابوجہل نے ضمضم کی یہ پکار سن کر خانہ کعبہ کے نزدیک کھڑے ہو کر لوگوں کو امداد کے لیے جمع کیا۔ ابوجہل بہت تیز طرار' دور اندیش اور زبان آور تھا۔ لیکن قریش کو اس موقع پر کسی تحریک و ترغیب کی ضرورت نہ تھی' کیوں کہ قافلے میں ہر ایک کا تھوڑا بہت مال تھا۔

کنانہ اور قریش کی عداوت

اہل مکہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو یہ محسوس کرتے تھے کہ قریش مسلمانوں پر خاصا ظلم و ستم کر چکے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو پہلے ہجرت حبشہ پر اور بعد میں ہجرت مدینہ پر مجبور کیا۔ وہ اس تذبذب میں تھے کہ قافلے کی حفاظت کے لیے جائیں یا یہ سمجھ کر کہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا' مکہ ہی میں ٹھہرے رہیں۔ ان لوگوں کا یہ خیال بھی تھا کہ قریش اور کنانہ کے درمیان قدیم ایام سے عداوت چلی آئی ہے' اور وہ ایک دوسرے سے انتقام لینے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ممکن ہے ادھر قریش اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے جائیں اور ادھر کنانہ انتقام لینے کے لیے مکہ پر چڑھائی کر دیں۔ قریب تھا کہ قریش پر بھی یہ اندیشہ غالب آ جائے اور قافلے کی حفاظت کے لیے روانگی کا قصہ ملتوی کر دیں' کہ مالک جشم مدلجی نے' جو کنانہ کے سرداروں میں سے تھا' مکہ پہنچ کر قریش کو اطمینان دلایا کہ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے جانے کے بعد کنانہ مکے پر حملہ نہیں کریں گے۔"

مالک بن جشم کی یقین دہانی پر ابوجہل اور عامر حضرمی کی یہ رائے کہ قافلے کی حفاظت کے لیے ضرور جانا چاہیے' غالب آئی اور جو شخص لڑنے کی طاقت رکھتا تھا' اس کے لیے دو ہی راستے تھے۔ یا تو خود قافلے کی حفاظت کے لیے جائے یا کسی دوسرے کو اپنی طرف سے بھیجے۔ اکابر قریش میں سے کوئی شخص بھی ابولہب کے سوا مکہ میں نہ رہا۔ عاص ابن ہشام کو ابولہب کے چار ہزار درہم دینے تھے' ابولہب نے اپنی جگہ اسے بھیج دیا۔ امیہ بن خلف بوڑھا اور بھاری بھرکم آدمی تھا۔ وہ بھی قافلے کی حفاظت کے لیے جانا نہیں چاہتا تھا' عقبہ بن معیط اور ابوجہل اس کے پاس گئے۔ عقبہ کے پاس انگیٹھی تھی اور دھونی کے لیے خوشبو۔ ابوجہل کے پاس سرمہ دانی اور سلائی تھی۔ عقبہ نے انگیٹھی امیہ بن خلف کے سامنے رکھی اور کہا: "ابوعلی! تو عورت ہے' خوش بو کی دھونی دے۔" ابوجہل بولا: "ابوعلی' تو صنف نازک ہے' سرمہ لگا۔" امیہ بن خلف نے ان کے طنز و طعن سے زچ ہو کر اونٹ خریدا اور دوسروں کے ساتھ اس نے بھی رخت سفر باندھا۔

آنحضرت ﷺ نے 12 رمضان المبارک سن دو ہجری کو مدینے سے قصد سفر کیا۔ روانگی سے قبل آپ ﷺ نے عمرو بن ام مکتومؓ کو امامت کے فرائض انجام دینے کی خدمات سپرد کیں اور مدینہ کے داخلی انتظامات کی باگ ڈور ابولبابہؓ کے سپرد کی۔ مجاہدین اسلام کی جماعت سیاہ رنگ کے دو پرچم لیے ہوئے تھی۔ ان کے پاس ستر اونٹ تھے۔ اونٹوں کی کمی کے باعث سواری کا بندوبست یہ کیا گیا تھا کہ باری باری سے دو سے چار اشخاص تک ہر اونٹ پر سوار ہوں۔ نبی کریم ﷺ حضرت علیؓ اور

حضرت مرثد غنویؓ کے ساتھ ایک اور صحابی شریک تھے اور دوسروں کی طرح باری باری اونٹ پر سوار ہوتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بھی ایک اونٹ کے مشترکہ سوار تھے۔

حضور ﷺ کے ساتھ جو مجاہدین شریک تھے ان کی تعداد 313 تھی۔ ان میں سے 83 مہاجرین 151 انصار اور 79 متعلقین انصار تھے۔ اس جماعت نے سبک گامی اور سرعت رفتار سے مسافت طے کی اس خیال سے کہ ابوسفیان قافلے کے ساتھ راہ فرار اختیار نہ کرے۔ راستے میں جہاں اس جماعت کا پڑاؤ ہوتا اس کے افراد ابوسفیان کے قافلے کا حال دریافت کرتے۔ عرق انطبیہ کے مقام پر ان کی ملاقات ایک اعرابی سے ہوئی۔ انھوں نے اس سے قافلے کے بارے میں پوچھ گچھ کی لیکن وہ کچھ نہ بتاسکا۔

وادی دفران پہنچنے کے بعد مسلمانوں کو پتا چلا کہ قریش اپنے قافلے کی حفاظت کے لیے آپہنچے ہیں۔ اب صورت حال مختلف ہوگئی۔ مسلمانوں کو اب ابوسفیان کے تیس یا چالیس محافظوں ہی سے مقابلہ درپیش نہ تھا کہ آسانی سے ان پر قابو پالیتے بلکہ اب تو تمام اکابر قریش اور اہل مکہ سے تصادم کی نوبت آپہنچی تھی۔ اگر مسلمان ابوسفیان کے قافلے کو لوٹ لیتے اور کچھ لوگوں کو قیدی بنا کر اپنے ہمراہ واپس لے جاتے تو اس صورت میں بھی یہ خطرہ تھا کہ قریش تعاقب کریں گے اور جنگ چھڑے بغیر نہیں رہے گی۔ اس عالم میں حضور ﷺ مدینہ کو مراجعت فرماتے تو مسلمانوں کی آبروریزی اور ان کی سبکی یقینی تھی۔ مزید برآں یہودیوں کی نظر میں بھی ان کا وقار باقی نہ رہتا اور مجبوراً نبی کریم ﷺ کو یہودیوں سے صلح کرنی پڑتی۔ اعلائے کلمۃ الحق اور دین اسلام کی فتح مندی کا سوال ہی پیدا نہ ہوسکتا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے اس سلسلے میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ اپنی اپنی رائے کا اظہار کر چکے تو مقداد بن عمروؓ نے کہا: ''یارسول اللہ! جو کچھ اللہ نے آپ پر ظاہر کیا ہے اس کے مطابق اقدام کیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم ہم بنی اسرائیل نہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ سے کہہ دیا تھا کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ لیکن ہم تو یہ کہتے ہیں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کا خدا جا کر لڑیں ہم بھی دونوں کے ساتھ ساتھ جدال و قتال میں برابر کا حصہ لیں گے۔''

دوسرے صحابہؓ پر سکوت طاری تھا۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''حضرات! آپ بھی تو اپنی اپنی رائے کا اظہار کریں۔'' دراصل آپ ﷺ کا روئے سخن انصار کی جانب تھا جنھوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم آپ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتے ہیں لیکن انھوں نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم کسی فوجی اقدام میں بھی آپ ﷺ سے تعاون کریں گے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ کی تقریر

حضرت سعدؓ بن معاذ انصار کے علم بردار تھے۔ انھوں نے عرض کیا: ''آپ کا روئے سخن کیا ہماری جانب ہے؟'' حضور ﷺ نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر حضرت سعدؓ نے ان الفاظ میں انصار کے جذبات کی ترجمانی کی: ''ہم آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ ہم نے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی اور یہ شہادت دی کہ آپ کا دین برحق ہے۔ آپ ﷺ سے ہم نے یہ عہد بھی کیا کہ ہم آپ کی اطاعت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ کا جو ارادہ ہو کیجیے۔ ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہیں۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ ﷺ کو رسالت کے منصب پر فائز کیا اگر آپ ﷺ سمندر میں بھی کود دیں گے تو ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ چھلانگ لگائیں گے اور ہم میں سے کسی ایک کو بھی آپ ﷺ ساحل پر نہیں پائیں گے۔ ہم دشمن کے مقابلے میں بے خوف ڈٹ کر لڑیں گے۔ ہم رزم میں ثابت قدم اور بزم میں راست گفتار ہیں۔ شاید خدا ہماری روش سے آپ ﷺ کو مطمئن و مسرور کرے اور ہمیں ہدایت دے اور اپنی برکات سے نوازے۔''

ابھی حضرت سعدؓ کی تقریر مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ نبی کریم ﷺ کا چہرہ فرطِ مُسرت سے دمک اٹھا اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''آگے بڑھو اور فضل خداوندی کے امیدوار رہو کیوں کہ اس نے مجھے قریش کے دو گروہوں میں سے ایک پر غلبہ و نصرت عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے اور مجھے نظر آرہا ہے کہ وہ کہاں کہاں اپنے کیفر کردار کو پہنچیں گے۔'' صحابہؓ کی جمعیت اس مقام سے روانہ ہوئی اور اس نے بدر کے مقام پر پڑاؤ کیا۔ یہاں نبی کریم ﷺ کو ایک بوڑھا آدمی نظر آیا۔ آپ ﷺ نے اس سے قریش کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں۔ بوڑھے کے جواب سے آپ ﷺ کو یہ علم ہوا کہ قافلہ قریش کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

پیغمبرانہ فراست

بوڑھے سے قافلہ قریش کی آمد سے متعلق اطلاع پا کر نبی کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو چند اصحاب کے ہمراہ چاہ بدر کی جانب بھیجا تاکہ وہ وہاں جا کر خبر لائیں۔ یہ جماعت تھوڑی دیر بعد واپس آئی اور اپنے ہمراہ دو غلام لائی۔ رسول کریم ﷺ نے ان غلاموں سے قافلے کا مقام اور ان کی تعداد پوچھی۔ غلام اس سوال کا صحیح جواب نہ دے سکے تو آپ نے ان سے دریافت کیا ''اچھا یہ بتاؤ کہ ان کے یہاں ہر روز کتنے اونٹ ذبح ہوتے ہیں؟'' غلاموں نے جواب دیا کہ کسی دن نو اور کسی دن دس اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں۔ اس جواب سے آپ ﷺ کو یہ اندازہ ہوگیا کہ قریش کی تعداد ایک ہزار کے قریب ہے۔ غلاموں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ تمام اکابر قریش مسلمانوں کی مزاحمت کے لیے مکہ سے نکل آئے ہیں۔ قریش کے بارے میں اہم اور کارآمد معلومات حاصل کرنے کے بعد آپ ﷺ نے صحابہؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''لیجیے' مکہ نے اپنے جگر گوشوں کو تمھاری طرف بھیج دیا۔''

اس طرح نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو قریش سے جنگ کے لیے آمادہ کر دیا حالانکہ قریش تعداد میں ان سے تین گنا تھے۔ آپ ﷺ نے ان کی قوت ارادی کو مضبوط اور ان کے عزائم کو قوی کر دیا کیوں کہ ہولناک معرکہ درپیش تھا اور اس میں

وہی لوگ فاتح و کامران ہو سکتے تھے، جنہیں اپنی قوت ایمانی پر اعتماد اور نصرتِ الٰہی کا یقین ہو۔ دو مسلمان پھر بدر کی جانب گئے اور حالات کا جائزہ لینے کی خاطر کنوئیں کے قریب جا بیٹھے۔ یہاں انھوں نے دو کنیزوں کو مصروف گفتگو پایا۔ ایک کنیز نے دوسری کنیز سے اپنے قرض کا مطالبہ کیا تو دوسری کنیز نے جواب دیا کہ کل یا پرسوں یہاں ایک قافلہ پڑاؤ کرے گا۔ اہلِ قافلہ کے پاس محنت مزدوری کر کے میں تیرا قرض بے باق کر دوں گی۔ ان دونوں مسلمانوں نے جو کچھ ان کنیزوں سے سنا تھا، اس سے نبی کریم ﷺ کو مطلع کیا۔

ابوسفیان کا فرار

ابوسفیان کو یہ خدشہ تھا کہ مبادا مسلمان اس کے قافلے پر چھاپہ ماریں، اس اندیشے سے وہ حالات کی جانچ پڑتال کے لیے قافلے سے آگے بڑھ آیا اور بدر کے پاس پہنچ کر مجدی بن عمرو (جو اس وقت وہاں موجود تھا) سے دریافت کیا، تم نے کسی کو یہاں آتے جاتے دیکھا تو نہیں؟ مجدی نے کہا: ''ابھی ابھی دو سوار آئے تھے اور کنوئیں کے پاس تھوڑی دیر ٹھہر کر چلے گئے۔''

ابوسفیان احتیاطاً اس جگہ پہنچا جہاں ان دو سواروں نے اپنے اونٹ ٹھہرائے تھے، اور آثار و قرائن سے یہ بھانپ لیا کہ یہ اونٹ یثرب ہی کے ہو سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر فوراً قافلے میں جا شامل ہوا اور اس کی راہ تبدیل کر کے ساحل سمندر کی جانب رخ بدلا اور اس تدبیر سے اپنے قافلے کو صاف بچا لے گیا۔ دوسرے دن مسلمانوں کو قافلے کی آمد کا انتظار تھا، لیکن خبر ملی کہ قافلہ تو گزر گیا ہے، البتہ سواران قریش قریب آ پہنچے ہیں۔ اس اطلاع سے ان لوگوں کی امیدوں پر پانی پھر گیا جو یہ خیال کر رہے تھے کہ ابوسفیان کے قافلے کا مال ہمارے ہاتھ آئے گا۔ بعض نے آنحضرت ﷺ کو مدینہ واپس ہو جانے کی رائے دی تا کہ قریش سے جنگ کی نوبت نہ آئے۔ اس حالت میں سورۂ انفال کی آیت 7 نازل ہوئی:

﴿وَ اِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ۝﴾ (الانفال: 7)

''یاد کرو وہ موقع جب کہ اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک تمھیں مل جائے گا۔ تم چاہتے تھے کہ کم زور گروہ تمھیں ملے، مگر اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو حق کر دکھائے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے تا کہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے، خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی نا گوار ہو۔''

اس آیت میں دو گروہوں سے مراد ایک تو قریش کا تجارتی قافلہ جو شام کی طرف سے واپس آ رہا تھا اور دوسرا قریش کا لشکر جو مکہ سے آ رہا تھا۔

اس طرف تو مسلمانوں کا یہ حال تھا اور دوسری طرف قریش بھی تذبذب میں تھے اور دل میں سوچتے تھے کہ ہمارا قافلہ تو سلامتی سے گزر گیا ہے، پھر ہم کیوں لڑیں۔ مسلمان خود مایوس ہو کر مدینہ واپس چلے جائیں گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم جس راہ سے آئے ہیں، اسی سے واپس چلے جائیں۔ ابوسفیان نے بھی قریش کو پیغام بھیجا کہ تم قافلے کی حفاظت کے لیے آئے تھے، خدا نے اس خطرے سے نجات دلا دی ہے، اس لیے واپس چلے جاؤ۔ قریش کی اکثریت کا یہی خیال تھا، لیکن ابوجہل نے کہا: ''خدا کی قسم، بدر تک پہنچے بغیر ہم واپس نہیں جائیں گے۔ وہاں تین دن ہمارا قیام رہے گا۔ اس قیام کے دوران میں ہم خوب رنگ رلیاں منائیں۔ ناچیں گے۔ گائیں بجائیں گے، شراب پئیں گے۔ عرب کے لوگوں میں ہمارے جشن کا چرچا ہو گا اور برسوں تک اس کے افسانے زبانوں پر رہیں گے۔''

بدر کا مقام عرب میں کئی اعتبار سے مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ ابوجہل کا خیال تھا کہ اگر ہم یہاں سے یوں ہی واپس چلے گئے تو لوگوں میں یہ افواہیں گرم ہوں گی کہ ہم نبی کریم ﷺ اور ان کے ساتھیوں سے خوف زدہ اور مرعوب ہو گئے ہیں اور اس طرح نبی کریم ﷺ کی دھاک بیٹھ جائے گی اور اس سے ان کی دینی دعوت کا دائرہ بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ جب سے سریہ نخلہ میں عبداللہؓ بن جحش کے فوجی دستے نے کارروان قریش لوٹا اور دو آدمیوں کو قیدی بنایا اور عمرو بن حضرمی کو قتل کیا، اس وقت سے قریش کو زوالِ اقتدار کا خدشہ لاحق تھا۔ قریش اس حیص بیص میں تھے کہ ہم ابوجہل کے مشورے پر عمل کریں یا واپس مکہ جائیں، کیوں کہ قافلہ واقعی سلامتی سے گزر چکا تھا۔ چناں چہ بنی زہرہ کی جماعت اپنے سردار اخنس بن شریق کی رائے سے مکہ واپس چلی گئی۔ دوسرے لوگوں نے ابوجہل کے مشورے پر عمل کو ترجیح دی اور انھوں نے جنگ کے ارادے سے عروۃ القصویٰ کی طرف کوچ کیا اور ریت کے ایک ٹیلے کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔

بدر میں مسلمانوں کی آمد

جب مسلمانوں نے دیکھا کہ قافلہ بچ نکلا ہے تو دشمنوں کے مقابلے کے لیے آپس میں مشورے کرنے لگے۔ چناں چہ اس خیال سے انھوں نے بدر کا رخ کیا اور پانی کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ حضرت حبابؓ بن منذر بدر اور اس کے گرد و پیش سے باخبر تھے۔ انھوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: ''آیا یہ مقام آپ ﷺ نے اپنے اختیار سے پسند فرمایا ہے یا خدا نے وحی کے ذریعے سے آپ کو یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا ہے۔'' رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ''اگر کوئی مصلحت ہو تو مقام کی تبدیلی میں کوئی مضائقہ نہیں۔'' حضرت حبابؓ نے گزارش کی کہ لوگوں کو یہ حکم دیجیے کہ یہاں سے چل کر اس پانی کے نزدیک پہنچ جائیں جو دشمنوں سے نزدیک تر ہے۔ ہم اس جگہ پڑاؤ کر لیں گے اور اس کے عقب میں جتنے کنوئیں ہیں، انھیں پانی سے پر کر لیں گے۔ اس تدبیر سے ہمارے پاس تو پانی وافر ہو گا، لیکن دشمن کو میسر نہ آ سکے گا اور اسے سخت دشواری پیش آئے گی۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت حبابؓ کی رائے کو صائب سمجھ کر منظور کر لیا اور اعلان کیا کہ میں بھی تمھاری طرح بشر ہوں۔ ہمارے تمام کام صلاح مشورے کے بغیر طے نہیں پا سکتے۔ میں بھی کسی کا قصد نہیں کروں گا، جب تک مشورہ نہ کر لوں۔

عریش (سائبان کی تعمیر)

مسلمانوں نے پانی کے قریب پہنچ کر ایک حوض بنالیا اور جب یہ کام ہو چکا تو حضرت سعدؓ بن معاذ نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گزارش کی کہ ہم آپ ﷺ کے لیے سائبان بنائے دیتے ہیں اور اس کے قریب ہی آپ ﷺ کے لیے سواریاں بھی ہم وقت تیار رہیں گی۔ ہم خود بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اگر خدا نے ہمیں فتح ونصرت عطا کی، تو پھر کیا ہی بات ہے۔ اگر معاملے کی صورت دوسری ہوئی تو آپ ﷺ اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ واپس ہو جائیں۔ ہم میں سے جو لوگ مدینہ میں رہ گئے ہیں، وہ بھی ہماری طرح آپ ﷺ سے محبت کرتے ہیں۔ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ جنگ کی نوبت آئے گی تو وہ ہرگز مدینہ میں نہ رہتے۔ اگر انھیں یہ معلوم ہوگا کہ آپ جہاد کا عزم رکھتے ہیں تو وہ آپ ﷺ سے تعاون کرنے میں پہلوتہی نہ کریں گے، بلکہ آپ ﷺ کے دوش بدوش دادِ شجاعت دیں گے۔ خدا آپ کو ان کے ذریعے سے نصرت عطا کرے گا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے حق میں تعریفی کلمات ارشاد فرمائے اور ان کے حق میں دعائے خیر بھی فرمائی۔ غرض نبی کریم ﷺ کے لیے ایک سائبان بنایا گیا، تاکہ آپ ﷺ وہاں قیام کریں اور شکست کی صورت میں مدینہ واپس تشریف لے جائیں۔

مسلمانوں کی قوت ایمانی

اس مقام پر انسان مسلمانوں کی قوت ایمانی اور اس محبت سے جو انھیں حضور ﷺ سے تھی، مبہوت ہو جاتا ہے۔ مسلمان یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ قریش ان سے تعداد میں تین گنا زیادہ ہیں، لیکن اس کے باوجود ان سے جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ابوسفیان کا قافلہ بچ نکلا ہے، اور اب ہم اس کے مال پر دسترس نہیں پا سکتے، لیکن پھر بھی وہ سرفروشی اور جاں بازی کے لیے آمادہ تھے۔ انھیں یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ جنگ میں انھیں فتح نصیب ہوگی یا شکست۔ تاہم وہ رسول کریم ﷺ کو دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لیے جنگ پر گرم جوشی سے تلے ہوئے تھے اور اس خیال سے انھوں نے آپ ﷺ کی باسلامت واپسی کا بندوبست بھی پہلے ہی کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ قوت ایمانی کا مظاہرہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

قریش بھی میدانِ جنگ میں آموجود ہوئے۔ اور انھوں نے کسی مخبر کو بھیج کر لشکر اسلام کی تعداد دریافت کی۔ مخبر نے اطلاع دی کہ مسلمان تین سو کے قریب ہیں اور ان کے پاس کوئی کمین گاہ بھی نہیں ہے۔ تاہم وہ ایسے اور اس انداز کے مجاہد ہیں جو اپنی تلوار کے سوا کسی اور پناہ کے طالب نہیں ہیں اور ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جو اپنے مقابل کو ہلاک کیے بغیر جان دے۔ چوں کہ تمام اکابر قریش اس لشکر میں شریک تھے اس لیے بعض دوراندیش لوگوں کو خوف تھا کہ ان میں سے اکثر مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے اور اس سے مکہ کی قدر و منزلت میں فرق آئے گا، لیکن ساتھ ہی یہ لوگ ابوجہل کی تند خوئی اور تنگ مزاجی سے بھی ڈرتے تھے، اور اس بات سے سہمے ہوئے تھے کہ وہ ہمیں بزدل اور کم حوصلہ کہے گا۔ اس کے باوجود عتبہ بن ربیعہ نے سرداران قریش سے کہا کہ اگر تم نے محمد ﷺ پر غلبہ پالیا اور ان کے دوستوں اور ساتھیوں کو ہلاک کر دیا تو ہمارے ہاتھوں سے اپنے ہی رشتہ داروں اور عزیزوں کا خون ہوگا۔ آؤ واپس چلیں اور محمد ﷺ کو عرب قبائل کے حوالے کر دیں۔ اگر انھوں نے آپ ﷺ پر غلبہ پالیا تو ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا، ورنہ محمد ﷺ سے ہمیں کسی نقصان اور شر کا اندیشہ نہیں۔ ابوجہل عتبہ کی بات سن کر آگ بگولہ ہو گیا اور کسی شخص کو عامر بن حضرمی کے پاس بھیج کر یہ پیغام دیا کہ تمھارا دوست لوگوں کو واپسی کا مشورہ دیتا ہے۔ (عامر بن حضرمی عمرو بن حضرمی کا بھائی تھا جسے سریہ نخلہ میں قتل کیا گیا تھا) تو نے اپنے بھائی کے قاتل واقد بن عبداللہ کو دیکھا ہے۔ اٹھ اور اس کا انتقام لے۔ عامر نے ابوجہل کی رائے کے مطابق اٹھ کر فریاد کی اور اپنے مقتول بھائی کے قتل کے انتقام کے سلسلے میں ''واعمراہ، واعمراہ'' کی صدائیں بلند کیں۔ عامر کے اس اقدام سے جنگ ناگزیر ہو گئی اور اس سے مفر کی کوئی سبیل نہ رہی۔

جنگ کا آغاز

اصل غزوہ 17 رمضان المبارک سن دو ہجری بروز جمعہ برپا ہوا۔ یہ پہلا پہلا رمضان تھا۔ گزشتہ رات بارش ہو جانے سے میدان جنگ کا نقشہ مسلمانوں کے حق میں ہو گیا تھا۔ اسود مخزومی قریش کی صفوں سے نکل کر مسلمانوں کی طرف بڑھا اور اس نے اس حوض کو خراب کرنے کا ارادہ کیا جو مسلمانوں نے اپنے لیے بنایا تھا۔ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب نے اس کے پاؤں پر وار کیا، جس کے صدمے سے وہ گر گیا اور اس کے پاؤں سے خون جاری ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت حمزہؓ نے دوسرے وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ بہتے ہوئے خون اور مقتول کی تڑپتی ہوئی لاش کے منظر سے زیادہ کوئی چیز انسان کو جنگ کے لیے آمادہ نہیں کرتی۔ اسود مخزومی کے ہلاک ہوتے ہی عتبہ بن ربیعہ اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو ہمراہ لے کر قریش کی صفوں سے نکلا اور اس نے اپنی مقابل فوج سے مبارزت طلب کی۔ مدینہ کے چند نوجوان ان کی طرف بڑھے لیکن عتبہ نے انھیں پہچان کر کہا: ''ہمیں تمھاری ضرورت نہیں، ہم اپنے آدمیوں سے نبرد آزما ہونے چاہتے ہیں۔'' عتبہ کے ساتھیوں میں سے کسی نے پکار کر کہا: ''(حضرت) محمد! ایسے لوگوں کو ہمارے مقابلے میں بھیجئے جو ہمارے ہم سر ہوں۔'' حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبیدہؓ لشکر اسلام سے ان کے مقابلے کے لیے نکلے۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے شیبہ اور ولید کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد انھوں نے عتبہ کی جانب رخ کیا، اس لیے کہ وہ حضرت عبیدہؓ پر غالب آ چلا تھا۔ یہ دیکھ کر قریش حملے کے لیے بڑھے۔ مسلمانوں نے بھی حرکت کی۔ غرض دونوں لشکر دست بدست جنگ میں مصروف ہو گئے۔

بارگاہِ الٰہی میں دعا

نبی کریم ﷺ نے اپنے لشکر کی صفیں درست کیں، لیکن اس موقع پر آپ ﷺ کو اس خیال سے کہ لشکرِ اسلام مختصر ہے، اور طاقت میں بھی لشکرِ قریش سے بڑھا ہوا نہیں، یہ اندیشہ لاحق ہوا، کہیں مسلمانوں کو شکست نہ ہو جائے۔ بیم ورجا کی اس ذہنی کش مکش

میں کہ دیکھیے آج کیا صورت پیش آتی ہے اگر مسلمانوں کو فتح نصیب نہ ہوئی تو اسلام کا کیا حشر ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے عریش کا رخ کیا۔ حضرت ابوبکر بھی آپ ﷺ کی معیت میں تھے۔ عریش میں پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے قبلے کی جانب رخ کر کے خشوع و خضوع سے دعا مانگی: ''اے اللہ! قریش لاؤلشکر سمیت ٹوٹ پڑے ہیں۔ یہ تیرے رسول ﷺ کی تکذیب پر تلے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! وعدہ نصرت فرما۔ اگر یہ گنتی کے چند مسلمان ہلاک ہو گئے تو پھر تیری پرستش کون کرے گا۔''

آپ یہ دعا بار بار دہرا رہے تھے اور وارفتگی کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ کی چادر کندھوں پر سے سرک کر گر جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ چادر پھر کندھوں پر ڈال دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ عرض کرتے تھے:

"یا نبی اللہ لقد سمع بعض منا شد تك فان اللہ منجز لك ما وعدلك ."

''اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے آپ کی التجا سن لی ہے۔ وہ اپنا وعدہ پورا کر کے رہے گا۔''

خود فراموشی کے اس عالم میں حضور ﷺ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور اس حالت میں آپ ﷺ نے نصرت الٰہی کے جلوے اور تائید ایزدی کے نظارے دیکھے۔ ایک دو لمحوں کے بعد آپ ﷺ پر سے بے خودی کی کیفیت دور ہوئی۔ سر اٹھایا اور ان الفاظ میں مسلمانوں کو بشارت دی:

"والذی نفس محمد بیدہ لا یقاتلھم الیوم رجل فیقتل صابرا محتسبا مقبلا غیر مدبرا الا ادخله الله الجنة ."

''اور اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے' آج جو شخص بھی کفار کے ساتھ صبر و استقلال' ایمان و احتساب کے ساتھ اس عالم میں شہید ہو گا کہ اس نے دشمنوں کا مقابلہ ڈٹ کر کیا ہو اور پیٹھ نہ پھیری ہو' اللہ تعالیٰ اسے جنت میں جگہ دے گا۔''

حضور ﷺ کی تقریر نے مسلمانوں کے دل و دماغ میں ایک نئی روح پھونک دی اور ان کا مستقبل اور فتح پر یقین محکم ہو گیا۔ میدان جنگ میں نبی کریم ﷺ کی ترغیب سے مسلمانوں کی روحانی طاقت بھی بڑھی اور اس بڑھی ہوئی روحانی طاقت نے تعداد کی قلت اور ساز و سامان کی قلت کی تلافی بھی کر دی۔ چناں چہ رسول مقبول ﷺ اور ان کے صحابہؓ کے بارے میں سورۂ انفال کی آیات 65 اور 66 نازل ہوئیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ (الانفال: 65تا66)

''اے نبی' مومنوں کو جنگ پر ابھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرین حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے' کیوں کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو عقل و فہم نہیں رکھتے۔ لیجیے' اب اللہ نے مسلمانوں کا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور ان کی ضعف کا اسے اندازہ ہو گیا ہے۔ اب اگر مسلمانوں میں سے سو آدمی صابر ہوں تو دو سو پر حاوی ہو جائیں گے اور اگر ایک ہزار صابر ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غلبہ پائیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

امیہ بن خلف کا انجام

میدانِ بدر میں حضرت بلالؓ بن رباح نے امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو دیکھا چند مسلمان اس کے گرد جمع تھے۔ امیہ بن خلف وہی شخص تھا جو مکہ میں حضرت بلالؓ کو انسانیت سوز اذیت دیا کرتا تھا۔ گرمی کے موسم میں انھیں تپتی ہوئی ریت پر لٹاتا اور ان کے سینے پر گرم پتھر رکھ دیتا' تاکہ وہ اسلام سے منحرف ہو جائیں' لیکن حضرت بلالؓ اس حال میں ''احد' احد'' پکارتے تھے۔ امیہ بن خلف کو دیکھ کر حضرت بلالؓ نے پکار کر کہا: ''یہ کافروں کا سردار ہے' بچ کر نہ جانے پائے۔'' بعض مسلمان جو اس کے قریب تھے یہ چاہتے تھے کہ اسے ہلاک کرنے کے بجائے اسیر کر لیں۔ حضرت بلالؓ نے ان کے ارادے کا بدلا ہوا رخ دیکھ کر' پھر بلند آواز سے کہا: ''یہ کافروں کا سرخیل ہے۔ اسے زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے۔'' یہ کہ کر خود امیہ کی طرف بڑھے اور اس پر پے در پے وار کیے' یہاں تک کہ اسے ہلاک کر دیا۔

حضرت معاذ بن عمرو بن جموح نے ابوجہل کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حضرت حمزہؓ' حضرت علیؓ اور دوسرے مسلمان مجاہد اس بے جگری سے لڑ رہے تھے کہ انھیں اپنی تعداد کی کمی کا خیال تک بھی نہیں آتا تھا۔ اسی اثنا میں سخت آندھی آئی اور اس سے فضا تاریک ہو گئی۔ سرداران قریش ایک ایک کر کے اپنے کیفر کردار کو پہنچ رہے تھے۔ ان کی ہلاکت سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہوتے جاتے تھے اور ان کی زبانوں پر ''احد' احد'' کے نعرے ہوتے تھے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نگاہوں کے سامنے زمان و مکاں کے حجابات چاک ہو گئے ہیں اور خدا نے ان کی تائید و نصرت کے لیے فرشتوں کی فوج بھیج دی ہے' اور وہ اس لیے کہ مسلمانوں کو بشارت دے اور ایمان کو قوی کر دے۔ یہ نظر آ رہا تھا کہ مسلمان اپنی طاقت سے نہیں' بلکہ خدائی طاقت سے مصروف جنگ ہیں۔

رسول کریم لشکر اسلام کے مرکز میں تھے اور دیکھ رہے تھے کہ فرشتۂ موت کفار کی روحیں قبض کرنے میں مصروف ہے۔ اس حالت میں آپ ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں اٹھا کر قریش پر ایک نظر ڈالی اور فرمایا:

"شَاهَتِ الْوُجُوهُ ."

''تمھاری صورتیں مسخ ہو جائیں۔''

مشرکین میں سے کوئی بھی نہیں تھا جس کی دونوں آنکھیں' نتھنے اور منہ میں اس ایک مٹھی مٹی میں سے کچھ نہ کچھ گیا نہ ہو۔ پھر حضور ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ

پوری قوت سے کفار پر ٹوٹ پڑو۔ مسلمانوں نے قلت تعداد کے باوجود حملہ کر دیا۔ اگر اللہ کی تائید اور اس کی توفیق شاملِ حال نہ ہوتی تو مسلمان قریش پر کبھی غالب نہ آتے' نہ انھیں ہلاک کر سکتے نہ قیدی بنا سکتے۔ اس ضمن میں سورۂ انفال کی آیت 12 نازل ہوئی:

﴿اِذْ یُوْحِیْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّیْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَ اضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ﴾ (الانفال: 12)

''اور وہ وقت جب آپ کے رب نے فرشتوں کو وحی بھیجی کہ میں تمھارے ساتھ ہوں' ان لوگوں کو جو ایمان لائے' ثابت قدم رکھو' میں ابھی ان کافروں کے دلوں میں رعب ڈالے دیتا ہوں۔ پس تم ان کی گردنوں پر ضرب اور جوڑ جوڑ پر چوٹ لگاؤ۔''

اور آیت 17 بھی نازل ہوئی:

﴿فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى وَ لِیُبْلِیَ الْمُؤْمِنِیْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ (الانفال: 17)

''پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا' بلکہ اللہ نے انھیں قتل کیا۔ اور جب آپ نے کنکریاں پھینکیں تو آپ نے نہیں پھینکیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکیں۔''

یہ اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم تھا کہ اس نے مسلمانوں کی بے سروساماں اور قلیل جماعت کو اسلحے سے لیس اور تعداد میں اپنے سے تین گنا زیادہ دشمن پر فتح یاب کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی احسان کو غزوۂ احد کے موقع پر یاد دلایا:

﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (آل عمران: 123)

''یقیناً اللہ نے بدر میں تمھاری مدد کی' جب تم کمزور تھے تو اللہ سے ڈرو' تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ۔''

لڑائی کے بعد آنحضرت ﷺ کفار کی لاشوں کے قریب تشریف لائے۔ لاشیں اسی جگہ پڑی تھیں' جس جگہ کی نشان دہی حضور ﷺ نے معرکے سے ایک دن قبل فرمائی تھی۔ حضور ﷺ نے کفار کی لاشوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''کسی نبی کے لیے اس کے قرابت دار جس درجہ بُرے ہو سکتے ہیں' تم اپنے نبی کے لیے ایسے ہی بُرے ثابت ہوئے۔ تم نے مجھے جھٹلایا اور دوسرے لوگوں نے میری صداقت کی گواہی دی۔ تم نے مجھے وطن سے نکالا اور دوسرے لوگوں نے مجھے اپنے پاس جگہ دی۔ تم میرے خلاف لڑنے اٹھے اور دوسرے لوگوں نے مجھے اپنا تعاون پیش کیا۔''

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے کفار کی لاشوں کو دفن کرنے کا حکم دیا' چناں چہ چوبیس سرداران قریش کو ایک کنوئیں میں اور باقی کفار کو دوسرے کنوئیں میں زیر خاک کر دیا گیا۔ تیسرے روز نبی اکرم ﷺ اس جگہ تک تشریف لے گئے جہاں سرداران قریش کے ناپاک جسم دفنائے گئے تھے۔ حضور ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا:

''اے کنوؤں میں دبے ہوئے قریشیو! اے عتبہ بن ربیعہ' اے شیبہ بن عقبہ' اے امیہ بن خلف' اے ابوجہل بن ہشام' اے فلاں' اے فلاں! اللہ نے جو تمھارے بابت کہا تھا' کیا اسے تم نے ٹھیک پایا۔ مجھے تو جو اللہ نے وعدہ فرمایا تھا' میں نے تو اسے بالکل درست دیکھ لیا۔''

صحابہؓ نے آپ ﷺ سے عرض کیا' یارسول اللہ! کیا آپ ﷺ مردوں سے باتیں کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''مردے بھی تمھاری طرح باتیں سنتے ہیں' لیکن انھیں جواب دینے پر قدرت نہیں۔''

آنحضور ﷺ نے عتبہ بن ربیعہ کے فرزند ابوحذیفہؓ کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار نمایاں دیکھے تو فرمایا: ''ابوحذیفہؓ! کیا تم اپنے باپ کے انجام سے کبیدہ خاطر ہو؟'' ابوحذیفہؓ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم مجھے اپنے باپ کے مقتول ہونے کا ملال نہیں۔ البتہ یہ غم ضرور ہے کہ جو کچھ ہوا' میری توقع کے خلاف ہوا۔ میں اپنے باپ کو دانشمند سمجھتا تھا اور مجھے امید تھی کہ خدا اسے ہدایت نصیب کرے گا' لیکن یہ دیکھ کر کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہوا' مجھے واقعی قلق ہوا۔'' رسول اللہ ﷺ نے ابوحذیفہؓ کے جذبات کی قدر کی اور ان کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔

مالِ غنیمت کی تقسیم

اگلے دن صبح کو جب مسلمانوں نے مدینہ کو واپسی کا ارادہ کیا تو ان کے درمیان مال غنیمت کی ملکیت سے متعلق اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ جن لوگوں نے یہ مال جمع کیا تھا' وہ کہتے تھے کہ مال ہمارا ہے۔ جن لوگوں نے دور تک قریش کا تعاقب کیا تھا' ان کا خیال یہ تھا کہ ہم اس مال کے حق دار ہیں۔ اگر ہم نہ ہوتے تو یہ مال کسی کے ہاتھ نہ آتا۔ جو اصحابؓ جنگ کے دوران میں نبی کریم ﷺ کے نزدیک آپ کی حفاظت پر متعین رہے' ان کا دعویٰ تھا کہ ہم سے زیادہ مال غنیمت کا استحقاق اور کسی کو نہیں۔ ہم بھی دشمن پر حملہ کر سکتے تھے اور مال غنیمت بھی جمع کر سکتے تھے لیکن ہمیں اندیشہ تھا کہ دشمن کہیں نبی کریم ﷺ پر حملہ نہ کر دیں' اس لیے ہم ان کے پاس سے نہیں ہٹے۔ نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ جس نے جو مال جمع کیا ہے' واپس کر دے۔ ہم یہ سب مال لے کر مدینہ واپس چلتے ہیں۔ امید ہے کہ تقسیم غنیمت کے سلسلے میں کوئی تصفیہ ہو جائے گا یا خود خدا کوئی فیصلہ کر دے گا۔ وحی کے نزول نے اس جھگڑے کا فیصلہ کر دیا:

''آپ ﷺ سے یہ مال غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں' کہہ دیں کہ مال غنیمت اللہ اور رسول کے لیے ہے۔ (سورۂ انفال۔ آیت ا)

آنحضرت ﷺ نے عبداللہؓ بن رواحہ' زیدؓ بن حارثہ کو مدینہ روانہ کیا کہ وہاں جا کر مسلمانوں کو فتح و ظفر کی خوش خبری سناؤ اور خود بھی صحابہؓ کی معیت میں مال غنیمت اور اسیران بدر کو لیے ہوئے عازم مدینہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے مال غنیمت پر عبداللہؓ بن کعب کو نگران مقرر کیا۔

اثنائے راہ میں صفرا سے گزرنے کے بعد آپ ﷺ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور مال غنیمت مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ پہلے آپ ﷺ نے مال غنیمت میں سے خمس (پانچواں حصہ) نکال لیا تھا' کیوں کہ اللہ

تعالیٰ نے قرآن حکیم (سورۂ انفال۔ آیت 41) میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى وَ الْیَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِیْنِ وَ ابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۝﴾ (الانفال: 41)

''اور تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو غنیمت تم نے حاصل کی ہے' اس کا پانچواں حصہ اللہ' پیغمبر' قرابت داروں' یتیموں' محتاجوں اور مسافروں کا حق ہے۔ اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر' اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز یعنی دونوں فوجوں کے مقابلے کے دن ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی (فتح و نصرت) تو اس تقسیم پر تمھیں خوشی سے متفق ہونا چاہیے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اکثر سیرت نگاروں کی یہ رائے ہے کہ یہ آیت غزوہ بدر اور تقسیم غنیمت کے بعد نازل ہوئی۔ حضور ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان مالِ غنیمت کی مساوی تقسیم کی۔ گھوڑے کا بھی اتنا ہی حصہ قرار دیا جتنا سوار کا۔ شہدا کے حصے کا مالِ غنیمت ان کے ورثا کے حوالے کیا گیا۔ ان لوگوں کا بھی حصہ مقرر کیا گیا جو مدینے میں مسلمانوں کے لیے اہم انتظامات پر مامور تھے یا کسی معقول عذر کی بنا پر غزوے میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ صرف وہی لوگ غنیمت کے مستحق نہیں قرار دیے گئے جو جنگ میں شریک تھے' بلکہ ان تمام لوگوں کو بھی غنیمت میں سے حصہ ملا' جنھوں نے اس غزوے میں مسلمانوں کی مدد کی تھی' اگرچہ یہ لوگ خود جنگ میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔

دو اسیروں کا قتل

لشکرِ اسلام فتح کے بعد مدینہ جا رہا تھا کہ راستے میں دو اسیرانِ جنگ کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ ان میں ایک نضر بن حارث تھا اور دوسرا عقبہ بن ابی معیط۔ اس وقت تک نبی کریم ﷺ نے اسیرانِ جنگ کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا تھا اور یہ بات طے نہیں پائی تھی کہ انھیں قتل کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے یا غلام بنا لیا جائے۔ یہ دونوں اسیر قیامِ مکہ کے دوران میں مسلمانوں کو سخت اذیتیں دیا کرتے تھے اور انھوں نے مسلم آزاری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ لشکرِ اسلام جب اثیل کے مقام پر پہنچا اور اسیرانِ جنگ آپ ﷺ کے سامنے سے گزرے تو آپ ﷺ نے نضر بن حارث کو غضب ناک نگاہوں سے دیکھا۔ نضر کانپ گیا اور اپنے قریب کے ایک شخص سے کہنے لگا' خدا کی قسم! (حضرت) محمد ﷺ مجھے ضرور ہلاک کر دیں گے۔ انھوں نے مجھے قہر آلود نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس شخص نے جواب دیا: ''تمھارا یہ خیال خوف کا نتیجہ ہے۔''

نضر بن حارث نے حضرت مصعبؓ بن عمیر سے (جو اس کے نزدیکی رشتہ دار تھے) کہا: ''آپ اپنے رفیق سے کہیں کہ مجھے بھی اپنے اصحاب میں شامل فرما لیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو وہ مجھے ضرور ہلاک کر دیں گے۔''

حضرت مصعبؓ بن عمیر نے فرمایا: ''تو کتاب اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ناروا باتیں کیا کرتا تھا اور تو نے ہمیشہ ان کے دوستوں کو اذیتیں دی ہیں۔

اس پر نضر نے کہا: ''مصعبؓ! اگر قریش آپ کو قید کر لیتے تو میرے جیتے جی کسی کی مجال نہ تھی کہ آپ کی طرف قتل کے ارادے سے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکتا۔''

حضرت مصعبؓ نے جواب دیا: ''تو غلط کہتا ہے۔ میری حیثیت وہ نہیں ہے' جو تیری ہے۔ اسلام نے وہ عہد و پیمان جو اس سے پہلے کیے گئے تھے' کالعدم قرار دے دیے ہیں۔''

نضر بن حارث کو حضرت مقدادؓ نے اسیر کیا تھا اور انھیں امید تھی کہ نضر کے رشتہ دار فدیہ دے کر اسے رہا کرا لیں گے' لیکن اب یہ دیکھ کر کہ نضر کو قتل کے منصوبے ہو رہے ہیں' پکار کر کہا: ''نضر کو میں نے اسیر کیا ہے۔''

حضور ﷺ نے نضر کی گردن مارنے کا حکم صادر کیا اور اس کے ساتھ ہی حضرت مقدادؓ کے حق میں یہ دعا کی: ''اَللّٰهُمَّ اَغْنِ الْمِقْدَادَ مِنْ فَضْلِكَ......''

''اے اللہ! مقدادؓ کو اپنے فضل و کرم سے غنی کر دے۔''

حضرت علیؓ نے حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل میں تلوار کے ایک ہی وار سے نضر بن حارث کا سر تن سے جدا کر دیا۔

لشکرِ اسلام عرق انطبیہ کے مقام پر پہنچا تو حضور ﷺ نے عقبہ بن ابی معیط کے قتل کا بھی حکم صادر کیا۔ حضرت علیؓ یا حضرت عاصمؓ بن ثابت نے عقبہ کو تہ تیغ کیا۔

مدینے میں فتح کی خوش خبری

فتح مند لشکرِ اسلام کی آمد مدینہ سے ایک روز پیش تر حضرت عبداللہؓ بن رواحہ اور حضرت زیدؓ بن حارث فتح کی خوش خبری لے کر مدینہ پہنچ چکے تھے۔ دونوں جدا جدا راہوں سے بستی میں داخل ہوئے تھے۔ ایک طرف حضرت عبداللہؓ بن رواحہ انصار کو لشکرِ اسلام کی فتح کی خبر سنا رہے تھے اور دوسری طرف حضرت زیدؓ بن حارث (جو اس وقت نبی کریم کے اونٹ پر سوار تھے) مسلمانوں کی فتح و نصرت اور قریش کے نقصان جان و مال کی سرگزشت بیان کر رہے تھے۔ مسلمان لشکرِ اسلام کی فتح مندی کا حال سن کر بہت خوش ہوئے' لیکن یہودیوں' بت پرستوں اور منافقوں کو اس خبر سے تردد ہوا اور انھوں نے مسلمانوں کی خوشی کو غم میں تبدیل کرنے کے لیے یہ افواہ اڑائی کہ (حضرت) محمد ﷺ ہلاک ہو گئے ہیں (نعوذ باللہ) اور ان کے ساتھیوں کو شکست ہوئی۔ ان مفسدہ پردازوں نے اپنی بات کو زیادہ وزنی کرنے کے لیے یہ بھی کہا کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ جس اونٹ پر سوار ہیں وہ نبی کریم ﷺ کا ہے۔ اگر وہ فاتح ہوتے تو اپنا یہ اونٹ دوسرے کو نہ دیتے۔ زیدؓ کی زبان سے جو باتیں سننے میں آ رہی ہیں' ان میں صداقت نہیں' بلکہ یہ باتیں ہذیان کا نتیجہ ہیں۔ وہ شکست کے باعث ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔

کچھ دیر بعد فتح کی تصدیق ہو گئی اور اس سے مسلمانوں کی طبیعت باغ باغ ہو گئی' لیکن اس خوشی میں ایک غم بھی شامل تھا' اور وہ یہ کہ جب حضور ﷺ بدر کی جانب روانہ ہو رہے تھے تو آپ ﷺ کی صاحب زادی حضرت رقیہ سخت علیل تھیں اور

آپ ﷺ ان کے شوہر حضرت عثمانؓ بن عفان کو ان کے علاج اور تیمارداری کے لیے مدینہ میں چھوڑ گئے تھے۔ حضرت رقیہؓ کے حق میں یہ بیماری مرض الموت ثابت ہوئی اور انھوں نے حضور ﷺ کے ورود مدینہ سے پیش تر ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

اسیرانِ بدر

لشکرِ اسلام اسیران جنگ کی آمد سے ایک روز بعد پہنچا۔ حضور ﷺ نے اسیرانِ جنگ کو اصحاب میں تقسیم کر دیا اور یہ حکم دیا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ بعدازاں آپ ﷺ کے سامنے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ ان قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ یہ خیال بھی دامن گیر تھا کہ اگر فدیہ لے کر رہا کر دیا جاتا ہے تو ان میں سے بعض کینہ جوئی اور انتقام پر کمربستہ ہو کر دوبارہ مسلمانوں کے مقابلے میں آئیں گے اور اگر انھیں ہلاک کر دیا جاتا ہے تو ان کے ورثاء کے دلوں میں عداوت کے نقش اور گہرے ہو جائیں گے اور وہ اس واقعے کو دل سے نہیں بھلائیں گے۔

حضور ﷺ نے صحابہؓ سے اسیرانِ بدر کے متعلق مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ بعض اسیران جنگ نے جو گراں قدر فدیہ پیش کر سکتے تھے، کسی شخص کو حضرت ابوبکرؓ کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان رشتے اور قرابت داریاں ہیں، اپنے رفیق نبی کریم ﷺ سے سفارش کیجیے کہ از راہِ احسان ہمیں رہا کر دیں یا ہم سے فدیہ قبول کر لیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے سفارش کا وعدہ تو کر لیا، لیکن آپ سمجھتے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ اس کی تائید نہیں کریں گے۔

حضرت ابوبکرؓ نے کسی کو اسیران جنگ کا یہ پیغام دے کر حضرت عمرؓ کے پاس بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے یہ بات سنی تو برافروختہ ہو گئے۔ آخر حضرت ابوبکرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ عرض کیا کہ اسیران جنگ سب کے سب ہمارے رشتہ دار ہیں، انھیں فدیہ لے کر رہا کر دیا جائے، شاید کہ اللہ انھیں آتشِ دوزخ سے نجات دے اور ان کے دل اسلام کی جانب مائل ہو جائیں۔

آنحضور ﷺ نے اس سفارشی مشورے پر خاموشی اختیار کی۔ حضرت ابوبکرؓ اٹھ کر چلے آئے۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اسیران جنگ اللہ اور رسول کے دشمن ہیں۔ انھوں نے آپ ﷺ کی تکذیب کی ہے۔ آپ ﷺ کے ساتھ جنگ کی ہے اور آپ ﷺ کو مکہ سے دیس نکالا دیا ہے۔ یہ لوگ کفر و شرک کے پتلے ہیں۔ انھیں قتل کرا دیجیے، تاکہ اسلام کی سربلندی ہو اور کفر کی ذلت و خواری۔ اسی اثنا میں حضرت ابوبکرؓ پھر حاضر ہوئے اور انھوں نے پھر عرض کیا کہ اسیران جنگ کی رہائی کا حکم صادر فرما دیجیے، شاید خدا انھیں ہدایت نصیب کرے، لیکن حضرت عمرؓ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ اسیرانِ بدر حُسنِ سلوک کے مستحق ہرگز نہیں ہیں۔

آنحضرت ﷺ دونوں کی باتیں سننے کے بعد اپنے حجرۂ اقدس میں تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر بعد واپس آئے۔ صحابہؓ ابھی تک اسیران جنگ کے بارے میں گفتگو اور ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ کچھ حضرت ابوبکرؓ کے ہم خیال تھے اور کچھ حضرت عمرؓ کے ہم نوا۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”بات دراصل یہ ہے کہ تم میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے کچھ احتیاج نہ ہو، اس لیے مناسب یہ ہے کہ ان اسیرانِ بدر کو فدیہ لے کر رہا کر دو اور جو ان میں سے فدیہ نہ دے، اسے قتل کر ڈالو۔“

اسیران بدر میں ابوعزہ عمرو بن عبداللہ بن عمیر جمحی نام ایک شاعر بھی تھا۔ اس نے صحابہؓ کو مختلف الرّائے پایا تو موقع غنیمت جان کر عرض کیا: ”اے محمد ﷺ میری پانچ بیٹیاں ہیں، جن کے پاس کوئی بھی اثاثہ نہیں۔ مجھے ان کے طفیل فدیہ سے مستثنیٰ قرار دے دیجیے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ پھر کبھی آپ ﷺ سے لڑنے کے لیے نہیں آؤں گا، نہ کسی کو جنگ کے لیے آمادہ کروں گا۔ نبی کریم ﷺ نے اسے فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا۔ صرف یہی ایک ایسا قیدی تھا جس نے اس طرح رہائی پائی، لیکن اس نے عہد شکنی کی اور پھر غزوۂ احد میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے لشکر کفار میں شامل ہوا۔ اس دفعہ پھر اسے قید کر لیا گیا اور کچھ کہے سنے بغیر تہ تیغ کر دیا گیا۔

باہمی مشورے سے طے ہوا کہ فدیہ کے بعد قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ فدیہ کی رقم حیثیت کے مطابق مقرر ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ رقم کی مقدار چالیس اوقیہ مقرر کی گئی۔ اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہوتا تھا۔ پہلا قیدی جس نے فدیہ ادا کیا، وہ ابووداعہ حارث تھا۔ جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے، لیکن زرفدیہ ادا کرنے سے قاصر تھے، ان کی آزادی کی شرط حضور ﷺ نے تعلیم دینا قرار دی۔ مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو انھیں رہا کر دیا جائے گا۔ چناں چہ زیدؓ ابن ثابتؓ ان بچوں میں سے ایک تھے، جنھوں نے قیدیوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ دو قیدی مطلب بن منطب اور صیفی بن ابی رفاعہ بالکل ہی نادار تھے۔ ان کا سر بہا معاف کر دیا گیا۔

حضرت عباسؓ نے کہا کہ میں مفلوک الحال ہوں۔ فدیہ کہاں سے ادا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا: ”وہ مال کہاں ہے جو آپ اور ام فضل (بیوی) نے مل کر دفن کیا ہے۔ یہ سن کر حضرت عباس حیران ہو گئے اور شہادت دی کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔ ان کا سر بہا ایک سو اوقیہ، عقیل بن ابی طالب کا 80 اوقیہ مقرر کیا گیا۔ عقیل نے عرض کیا، وہ 30 اوقیہ سونا جو بوقت گرفتاری لیا گیا، اسے اس میں محسوب کر لیا جائے۔ ارشاد ہوا، یہ تو آپ نے کافروں کے لشکر کے لیے رکھا تھا، اور یہ غنیمت کا مال ہے۔

اس طرح نوفل بن حارث سے سر بہا طلب کیا گیا تو اس نے بھی ناداری کا عذر پیش کیا۔ فرمایا، وہ نیزے جو جدہ میں رکھ آئے ہو، ان میں سے دو۔ غیب کی یہ باتیں سن کر اس نے بھی اللہ کے رسول ﷺ ہونے کی گواہی دی۔ نوفل نے ایک ہزار نیزے فدیہ میں دیئے، جن سے جنگ احد میں کام لیا گیا۔

حضورؐ کے داماد ابوالعاص کے فدیہ میں آپ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینبؓ نے مکہ سے ماں کی شادی میں دیا ہوا ہار بھجوایا۔ جب یہ پیش ہوا تو حضورؐ کو ایک دم حضرت خدیجہؓ یاد آ گئیں اور آپ آبدیدہ ہو گئے۔ صحابہؓ سے فرمایا کہ یہ ایک ماں کی نشانی ہے۔ اس ہار کو بھی واپس کر دو اور زینبؓ کے قیدی کو بھی چھوڑ دو۔ البتہ ابوالعاص

سے وعدہ لیا گیا کہ جاتے ہی زینب کو مدینہ بھیج دیں گے۔ یہ وعدہ انھوں نے پورا کیا۔

قیدیوں میں ابوسفیان کا بیٹا عمرو بھی تھا۔ ابوسفیان نے اس کا سر بہا دینے سے انکار کر دیا۔ ایک انصاری سعدؓ بن نعمان عمرے پر مکہ گئے تو انھیں قید کر لیا گیا۔ انصار کی درخواست پر ان سے عمرو کا تبادلہ کیا گیا۔ یہ قیدیوں کا پہلا تبادلہ تھا۔

قیدیوں میں سہیل بن عمرو بھی تھا' جو بڑا زبان آور خطیب تھا۔ حضرت عمرؓ نے کہا ''اے اللہ کے رسول! سہیل بن عمرو کے اگلے دو دانت تڑوا دیجیے۔ اس کی زبان لپٹ جایا کرے گی اور وہ کسی جگہ خطیب بن کر آپ کے خلاف کبھی کھڑا نہ ہو سکے گا'' لیکن رسول اللہ نے عمرؓ کی یہ گزارش مسترد کر دی' کیوں کہ یہ مثلے کے ضمن میں آتا تھا' جس پر قیامت کے روز اللہ کی طرف سے گرفت کا خطرہ تھا۔

غرضیکہ قریش کے لوگ مکہ سے فدیہ کی رقم لے کر مدینہ آئے اور اپنے اپنے قیدی چھڑا کر لے جاتے۔ اس طرح مسلمانوں کو زرِ فدیہ میں تقریباً ڈھائی لاکھ درہم ملے۔

فدیہ لینے کے فیصلے پر سورۂ انفال کی آیات 67 اور 68 نازل ہوئیں' جن میں فرمایا گیا:

﴿مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾

(الانفال: 67تا68)

''کسی نبی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں' جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے۔ تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو' حالانکہ اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم لوگوں نے لیا ہے' اس کی پاداش میں تمھیں بڑی سزا دی جاتی۔''

مکہ میں شکست کی خبر

مدینہ میں مسلمان مسرور و شاداں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ میں فتح و نصرت عطا کی اور اس کے ساتھ ہی بہت سا مال و متاع غنیمت میں ملا' لیکن ادھر حیسمان خزاعی نے اہل مکہ کو شکست کی خبر دی۔ اہل مکہ کو اس شخص کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ سرداران قریش نے نہ صرف شکست کھائی' بلکہ انھیں ہلاک بھی کیا گیا۔ پہلے تو انھیں اس خبر کی صحت و صداقت پر یقین نہ آیا لیکن حیسمان خزاعی نے یہ تمام واقعات جس غم کینے اور دل سوزی کے ساتھ سنائے' اس سے انھیں اندازہ ہو گیا کہ یہ خبر درست ہے اور قریش نے واقعی شکست کھائی ہے۔ اہل مکہ کو اس واقعے سے صدمہ ہوا۔ ابولہب کو اس صدمے سے بخار چڑھ گیا اور اسی مرض میں سات دن تک مبتلا رہ کر جان دی۔

مقتولینِ بدر کے ورثا نے یہ فیصلہ کیا کہ صف ماتم ہرگز نہ بچھے' ورنہ مسلمانوں کو اس سے خوشی ہوگی۔ اور نہ کسی کو اسیرانِ جنگ کی خبر گیری کے لیے مدینہ روانہ کیا جائے۔ اس صورت میں مسلمان زیادہ سے زیادہ زرِ فدیہ کا مطالبہ کریں گے۔ اس کے باوجود قریش کو غزوۂ بدر کی شکست کا غم فراموش نہیں ہوا تھا۔ عورتیں ایک ماہ کے برابر ماتم کرتی رہی تھیں۔ دستور یہ تھا کہ مقتول کا گھوڑا یا اونٹ لایا جاتا اور لوگ اس کے گرد جمع ہو کر نوحہ سرائی کرتے۔ عتبہ کی بیٹی ہند اس ماتم میں شامل نہ ہوئی۔ کچھ عورتیں اس کے پاس گئیں اور اس سے کہا: ''اپنے باپ' بھائی' چچا اور دوسرے رشتہ داروں کا ماتم نہیں کرو گی؟'' ہند نے جواب دیا: ''اگر میں ماتم کروں گی تو اس کی خبر (حضرت) محمد ﷺ اور ان کے اصحاب کو پہنچے گی اور وہ مسرور ہوں گے' اور بنی خزرج کی عورتیں بھی میرا مذاق اڑائیں گی۔ خدا کی قسم! جب تک میں ان سے انتقام نہیں لوں گی' ماتم نہ کروں گی اور اس وقت تک سر پر تیل لگانا بھی میرے لیے حرام ہے۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ رونے سے غم غلط ہو جائے گا تو میں ضرور روتی اور ماتم بھی کرتی' لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے غم کی آگ صرف انتقام کے چھینٹے ہی سرد کر سکتے ہیں۔'' ہند نے اپنی ضد میں نہ سر پر تیل لگایا اور نہ ابوسفیان کو اپنی خوابگاہ تک آنے کا موقع دیا۔ ابوسفیان نے بھی یہ عہد کیا تھا کہ جب تک میں مقتولین بدر کا انتقام نہیں لے لوں گا' اپنی جنسی خواہش کی تسکین کا سامان نہیں کروں گا۔

شہدائے بدر

غزوۂ بدر میں جن مسلمانوں نے جام شہادت پیا' ان کی تعداد چودہ ہے' جن میں سے چھے مہاجر اور آٹھ انصار تھے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں (ان کے حالات کتاب پنجم بہ عنوان ''اصحاب رسول ﷺ'' میں تفصیل سے درج ہیں):

- حضرت مِہجع بن صالحؓ
- حضرت عبیدہ بن حارث بن مطلبؓ
- حضرت عمیرؓ بن ابووقاص
- حضرت عاقلؓ بن عبدیالیل
- حضرت عمیرؓ بن عبد عمیر
- حضرت عوف یا عوذ بن عفراء
- حضرت معوذؓ بن عفراء
- حضرت حارثؓ بن سراقہ
- حضرت یزیدؓ بن حارث
- حضرت رافعؓ بن معلّی
- حضرت عمیرؓ بن حمام
- حضرت عمارؓ بن زیاد
- حضرت سعد بن خیثمہ
- حضرت مبشرؓ بن عبدالمنذر

عقیدے کی فضیلت

غزوۂ بدر میں چشم فلک نے یہ بھی دیکھا کہ مدمقابل ایک دوسرے سے خون رشتے میں پروئے ہوئے۔ نسب ایک' وطن ایک' زبان ایک' لیکن عقیدہ مختلف۔ ایک

برحق، دوسرا ناحق۔

	لشکر کفار		لشکر اسلام
باپ	عتبہ بن ربیعہ	بیٹا	ابوحذیفہؓ بن عتبہ
بیٹا	عبدالرحمٰن بن ابوبکر	باپ	ابوبکرؓ بن قحافہ
باپ	عبداللہ بن جراح	بیٹا	ابوعبیدہؓ ابن الجراح
چچا	عمیر بن عثمان	بھتیجا	طلحہؓ بن عبداللہ
بھائی	عباس بن عبدالمطلب	بھائی	حمزہؓ ابن عبدالمطلب
بھائی	عقیل بن ابی طالب	بھائی	علی بن ابوطالب
بھائی	ولید بن عتبہ	بھائی	ابوحذیفہؓ بن عتبہ
بھائی	ابوعزیز بن عمیر	بھائی	مصعبؓ بن عمیر
بھائی	ابوجہل ابن ہشام	بھائی	عیاش بن ابی ربیعہ
ماموں	عاصی بن ہاشم بن مغیرہ	بھانجا	عمرؓ ابن خطاب
داماد	ابوالعاص بن ربیع	خسر	حضرت محمد ﷺ
چچا	حضرت عباس	بھتیجا	حضرت محمد ﷺ

غزوہ بنی سلیم

بدر سے فاتحانہ لوٹے مشکل سے چھے سات دن گزرے تھے کہ اطلاع ملی کہ قبیلہ غطفان کی شاخ بنوسلیم کے لوگ مدینے پر چڑھائی کے لیے فوج جمع کر رہے ہیں آپ ﷺ نے حضرت ابن ام مکتوم کو مدینے میں اپنا قائم مقام مقرر فرمایا (بعض مورخین نے حضرت سباع بن عرفطہ غفاری کا نام لکھا) اور خود دو سو سواروں کے ساتھ ان کے مقابلے کے لیے مقام الکدر تک پہنچ گئے۔ حضرت علیؓ علم اٹھائے ہوئے تھے۔ یہ اس قبیلے کے چشموں میں سے ایک کا نام ہے۔ یہ مقام مکہ اور مدینہ کے درمیان بئر معونہ کے قریب ہے۔ مدینہ سے کوئی 92 میل کے فاصلے پر ہے۔ بنوسلیم میں اس اچانک حملے سے بھگدڑ مچ گئی اور وہ افراتفری کے عالم میں وادی کے اندر پانچ سو اونٹ چھوڑ کر بھاگ گئے جس پر لشکرِ مدینہ نے قبضہ کر لیا اور رسول اللہ نے اس کا خمس نکال کر بقیہ مال غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔ ہر ایک کے شخص حصے میں دو دو اونٹ آئے۔ اس غزوے میں لیسار نامی ایک غلام ہاتھ آیا جسے آپ ﷺ نے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ وہاں تین روز قیام فرما کر مدینہ لوٹ آئے۔

پہلی عید الفطر

رمضان کے ختم ہونے میں صرف دو دن باقی تھے کہ صدقہ فطر (فطرانہ) اور نماز عید کا حکم ہوا اور سورۃ الاعلیٰ کی آیات 14 اور 15 نازل ہوئیں:

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝﴾ (الاعلیٰ: 14تا15)

''تحقیق فلاح پائی اس شخص نے جو باطنی نجاستوں اور کدورتوں سے پاک ہوا اور اللہ کا نام لیا اور (عید کی) نماز پڑھی۔''

آنحضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ دور جاہلیت میں تم جو دو دن خوشیاں منایا کرتے تھے ان کی حقیقت اور حیثیت کیا ہے؟ عرض کیا، ہم اس سے پہلے تہوار بالکل اسی طرح منایا کرتے تھے جواب بھی رائج ہیں۔ فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اُن دو تہواروں سے بہتر دن تمھارے لیے مقرر فرمائے ہیں صحابہ کرامؓ نے بصد اشتیاق پوچھا، کونسے دن یا رسول اللہ؟ حضور ﷺ نے فرمایا، عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ ان دنوں میں کوئی روزہ نہ رکھے، بلکہ کھائے پیئے اور خوشیاں منائے۔ ان دونوں عیدوں میں آپ ﷺ عید گاہ تشریف لے جاتے۔ عید گاہ مدینے کے مشرقی حصے کی طرف تھی۔ آپ عید کے دن عید گاہ ایک راستے سے تشریف لے جاتے اور دوسرے راستے سے واپس ہوتے تھے۔ اس سے جلوس کی شکل ہو جاتی اور غیر مسلموں پر رعب طاری ہوتا۔ ایک بار عید الفطر کی نماز آپ نے مسجد نبوی میں پڑھائی، کیوں کہ اس نماز کے وقت بارش بہت تیز ہوئی تھی۔

حضور ﷺ نماز عید کی تیاری کے لیے غسل فرماتے۔ عمدہ لباس زیب تن فرماتے۔ سبز یا سرخ دھاری دار یمنی چادر اوڑھتے۔ عید کی نماز کے لیے جب عید گاہ کی جانب تشریف لے جا رہے ہوتے تو حضرت بلال حبشیؓ آپ ﷺ کے آگے آگے نجاشی کا روانہ کردہ نیزہ لیے ہوئے چلتے۔ عید گاہ پہنچ کر قبلے کی جانب بطور سترہ گاڑ دیتے۔ یہی مقام حضور ﷺ کا مصلیٰ ہوتا۔ عید الفطر میں حضور ﷺ طاق تعداد میں کھجوریں کھا کر گھر سے نکلتے۔ پا پیادہ عید گاہ جاتے۔ عید الفطر کی نماز میں تاخیر فرماتے۔ اس میں کوئی اذان یا اقامت نہ ہوتی۔ نماز کے بعد کھڑے ہو کر لوگوں کی طرف رخ کر کے خطبہ دیتے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر دوسرا خطبہ ارشاد فرماتے۔ منبر نہ ہوتا، زمین پر کھڑے ہو کر تقریر فرماتے اور نمازیوں کو صدقہ خیرات کی تاکید فرماتے۔ صدقہ فطر نماز سے پہلے ادا کرنے کا حکم ہے۔ مستحقین تک صدقہ فطر عید سے قبل پہنچانا قبولیت صوم کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔

ازدواج حضرت علیؓ و فاطمۃ الزہرا

اسی ماہ میں حضرت فاطمہؓ کی رخصتی ہوئی۔ حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے حضرت عائشہ کی رخصتی کے ساڑھے چار ماہ بعد، اور پھر رخصتی ساڑھے سات ماہ بعد ہوئی۔ گویا حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی کے ایک سال بعد حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی رخصتی ہوئی۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے۔ کتاب چہارم بہ عنوان ''اہل بیت'')

غزوہ بنی قینقاع

بنی قینقاع، بنی قریظہ اور بنی نضیر یہودیوں کے تین قبیلے تھے۔ ان میں بنی قینقاع سب سے زیادہ بہادر، دلیر اور دولت مند تھے۔ ساتھ ہی شریر اور فتنہ انگیز بھی تھے۔ مدینہ کے اندر ہی گڑھیاں بنا کر رہتے تھے۔ ''قین'' کے معنی ہیں لوہار۔ ''قاع'' قابل کاشت زمین کو کہتے ہیں، لیکن ان کی زمینیں نہیں تھیں، بلکہ یہ پیشے کے اعتبار سے دست کار، سنار، لوہار اور ظروف ساز تھے۔ بنی قینقاع کا بازار سونے اور چاندی کی تجارت کے لیے بہت مشہور تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن سلام انھی کے قبیلے کے علما میں سے تھے جو حضورؐ کی ہجرت کے ابتدائی دنوں میں ایمان لائے۔

جب اللہ تعالیٰ نے میدان بدر میں مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کیا تو ان کی سرکشی میں شدت آ گئی۔ انھوں نے شرارتوں، خباثتوں اور لڑانے بھڑانے کی حرکتوں میں وسعت اختیار کر لی اور خلفشار پیدا کرنا شروع کر دیا۔ چناں چہ جو مسلمان ان کے بازار میں جاتا، اس وہ اُس سے مذاق اور استہزا کرتے اور اسے اذیت پہنچاتے، حتیٰ کہ انھوں نے مسلمان خواتین سے بھی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

حضورؐ ابھی بدر ہی میں تھے کہ بازار قینقاع میں ایک حادثہ ہو گیا۔ ایک مسلمان خاتون بنی قینقاع کے یہودیوں کے بازار میں ایک سنار کے پاس کوئی چیز خریدنے گئیں۔ یہودی اس کی صورت بے نقاب دیکھنا چاہتے تھے، لیکن اس نے نقاب نہیں سرکایا۔ ایک یہودی نے عورت کے پیچھے پہنچ کر اس کے دوپٹے کا ایک پلو ایک کانٹے سے قمیص کے ساتھ ٹاک دیا۔ عورت کو پتا بھی نہ چلا۔ جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو اس کے جسم کا ایک حصہ نمایاں ہو گیا۔ عورت نے شور مچایا۔ کچھ مسلمان جمع ہو گئے۔ ایک مسلمان نے بڑھ کر یہودی سنار کو مار ڈالا۔ اس پر یہودیوں نے جمع ہو کر اس مسلمان کو شہید کر دیا۔ مقتول مسلمان کے رشتہ داروں نے شور بپا کیا اور مسلمانوں سے مدد طلب کی نتیجے میں فساد اور بلوہ ہو گیا۔

مسلمان بدر سے واپس آئے تو یہودیوں کی اس شرارت کا علم ہوا۔ آپ ﷺ نے انھیں قینقاع کے اسی بازار میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ جب جمع ہو گئے تو انھیں سمجھایا ''اے گروہ یہود! اللہ سے ڈرو۔ اگر تم نے مسلمانوں کی ایذا رسانی سے ہاتھ نہ روکا اور معاہدے (میثاق مدینہ) پر عمل پیرا نہ رہے تو کہیں قریش کی طرح سزا کا نشانہ نہ بن جاؤ۔ اسلام لے آؤ تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں اللہ کا نبی ہوں جس کا تذکرہ تمھاری کتاب میں ہے۔''

یہودیوں نے حضور ﷺ کی اس تنبیہ کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے کہا: ''ہمیں قریش کی طرح کم زور نہ سمجھیے۔ آپ نے اُن لوگوں سے جنگ کی جو فن حرب سے ناآشنا تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ نے ان پر غلبہ پایا۔ اگر ہم سے جنگ کی نوبت آئی تو ہم آپ پر یہ بات واضح کر دیں گے کہ ہم کیا ہیں اور کس قسم کے لوگ ہیں؟''

اس دھمکی کے بعد سوائے جنگ کے کوئی چارہ کار نہ رہا۔ یہ لوگ مسلمانوں کی ہر بات کی اطلاع قریش کو دیا کرتے تھے اور اب کھل کر عہد شکنی پر اتر آئے۔

شوال سن دو ہجری کی پندرہویں تاریخ تھی کہ حضور ﷺ نے حضرت ابولبابہؓ بن منذر کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا اور ان کی سرکوبی کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ حضرت حمزہؓ علم اٹھائے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کو دیکھ کر وہ لوگ اپنی گڑھیوں میں قلعہ بند ہو گئے۔ مسلمان محاصرہ کیے رہے، یہاں تک کہ پندرہ دن گزر گئے۔ وہ کسی یہودی کو گھر سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ نہ کسی کو محصورین تک خوراک لے جانے دیتے تھے۔ آخر تنگ آ کر ان سب نے اطاعت قبول کر لی اور اپنے آپ کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا، اور ہتھیار ڈال دیے۔ نبی کریم نے صحابہؓ سے مشورے کے بعد طے کیا کہ ان یہودیوں کو تہ تیغ کر دیا جائے۔

بنی قینقاع بنی خزرج کے حلیف تھے، اس لیے عبداللہ ابن ابی سلول (راس المنافقین) سے ان کے گہرے تعلقات تھے۔ گویا اس کا یہودیوں اور مسلمانوں دونوں کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا۔ اسے بظاہر اسلام قبول کیے مشکل سے ایک مہینہ ہوا تھا۔ وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ''اے محمد ﷺ میرے دوستوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیئے۔''

حضور ﷺ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہے۔ عبداللہ بن ابی نے پھر وہی بات دہرائی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اب اس نے آپ ﷺ کی زرہ کی جیب پکڑ لی۔ اس حرکت سے آپ ﷺ کو غصہ آ گیا۔ فرمایا ''مجھے چھوڑ''، پھر فرمایا: ''تجھ پر حیف! مجھے چھوڑ۔'' عبداللہ بن ابی نے کہا: ''خدا کی قسم، میں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا، جت تک آپ ﷺ میرے دوستوں کو معاف نہیں کریں گے۔ یہ لوگ ہر اچھے اور بُرے وقت میں میری مدد کرتے رہے ہیں۔ کیا آپ ﷺ ایک ہی دن میں انھیں کاٹ کر رکھ دیں گے؟ ان میں چار سو حاسر (بے زرہ سپاہی) اور تین سو دراع (زرہ والے) سپاہی ہیں۔ بخدا میں سخت ہراساں اور خوف زدہ ہوں۔''

عبداللہ بن ابی کا اصرار جاری تھا کہ حضرت عبادہؓ بن صامت بھی آ گئے اور وہ بھی یہی بات کہنے لگے جو عبداللہ بن سلول کہہ رہا تھا۔ آخر رسول کریم ﷺ نے فیصلہ کیا کہ یہودیوں کی جان بخشی اس شرط پر کی جاتی ہے کہ وہ مدینے سے نکل جائیں۔ گھریلو اشیا میں سے جس قدر لے جا سکتے ہیں، ساتھ رکھ لیں۔ البتہ جنگی سامان ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ چناں چہ انھوں نے اونٹوں پر گھر کے دروازے تک اکھاڑ کر رکھ لیے۔ حضرت عبادہؓ بن صامت نے انھیں مدینہ سے باہر ذباب نامی پہاڑ تک خود پہنچایا۔ پھر وہ وادیٔ القریٰ میں جا آباد ہوئے اور مدتوں وہاں رہے۔ بعد ازاں شام کی حدود میں اقامت اختیار کی۔ غالباً شام کی جانب ان کی نقل مکانی اس لیے تھی کہ کبھی نہ کبھی ہم ارض موعود تک جا پہنچیں گے۔

مالِ غنیمت میں بہت سا اسلحہ اور سامان ملا، جس میں سے ایک خمس نکال کر بقیہ چار حصے مجاہدین میں تقسیم کیے گئے۔ یہ غزوۂ بدر کے بعد حاصل ہونے والا پہلا خمس تھا۔ مالِ غنیمت سے حضور ﷺ نے اپنے لیے تین کمانیں لیں جن کے نام یہ تھے: کتوم، روحہ اور بیضا۔ ان میں سے کتوم غزوہ احد میں ٹوٹ گئی۔ کتوم بانس کی بنی ہوئی تھی اور بیضا صنوبر کی لکڑی سے بنائی گئی تھی۔ آپ ﷺ نے دو زرہیں لیں صغدیہ اور فضہ۔ صغدیہ خیبر کے معرکے میں اور فضہ احد کے موقع پر زیب تن فرمائی تھیں۔ حضور ﷺ نے تین تلواریں اور تین نیزے بھی پسند فرمائے۔ حضرت محمد ﷺ بن مسلمہ اور حضرت سعدؓ بن معاذ کو بھی ایک ایک زرہ عطا فرمائی۔

غزوۂ سویق

بدر کے شکست خوردہ قریش جب مکہ پہنچے تو اہل مکہ کی تسکین کی خاطر ابوسفیان نے قسم کھائی کہ جب تک مدینے پر حملہ نہ کر لوں گا، غسل جنابت نہ کروں گا۔ ساتھ ہی اس نے قریش میں یہ پروپیگنڈا بھی شروع کر دیا کہ قریش میں بھی کس بل موجود ہیں

اور وہ چاہیں تو اب بھی جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھا سکتے ہیں۔

غرض وہ ذی الحج میں دو سو سواروں کو اپنے ہم راہ لے کر چھپتے چھپاتے عازمِ مدینہ ہوا۔ حتیٰ کہ وادی قناۃ کے سر پر واقع شیب نامی پہاڑ کے دامن میں خیمہ زن ہوا۔ اس مقام سے مدینہ صرف بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔

اتنی ہمت نہ تھی کہ مدینے پر حملہ کرتا۔ ساتھیوں کو وہیں ٹھہرایا اور خود یہودیوں سے ساز باز کے لیے تنہا روانہ ہوا۔ سب سے پہلے حیی بن اخطب کے گھر پہنچا لیکن اس نے انجام سے ڈر کر دروازہ تک نہ کھولا۔ اب وہ بنی نضیر کے سردار سلام بن مشکم کے پاس گیا۔ اس نے اس کی پذیرائی کی اور شراب و کباب سے آؤ بھگت کی۔ نیز مدینہ کے دوران میں خانہ رازوں سے بھی واقف کیا۔

رات کے پچھلے پہر اپنے ساتھیوں میں واپس ہوا۔ اپنی نذر پوری کرنے مدینہ سے تین میل پر ایک وادی عریض (جہاں مسلم آبادی تھی) کے کھیتوں میں کام کرنے والے ایک انصاری حضرت معبدؓ بن عمرو اور ان کے اجیر کو شہید کیا۔ دو گھر جلا ڈالے۔ کچھ کھیت تباہ کیے۔ چند کھجور کے درخت کاٹے۔ نخلستان میں آگ لگائی اور مکہ لوٹنے لگا۔ اس واردات کی اطلاع مدینے میں ہوئی تو حضور ﷺ نے حضرت ابولبابہؓ بن عبدالمنذر کو اپنا نائب مقرر فرمایا اور دو سو صحابہ کے ساتھ تیزی سے ان کا تعاقب کیا۔

ابوسفیان کے ساتھی راستے میں اپنا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے ستو کی بوریاں پھینکتے ہوئے گئے تھے۔ مسلمانوں کو یہ بوریاں نظر آئیں تو انھوں نے اٹھا لیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس خیال سے کہ قریش کا تعاقب لاحاصل ہے، مدینہ واپسی کا ارادہ کیا۔ اس غزوے کا نام "سویق" اسی اعتبار سے رکھا گیا ہے کہ "سویق" عربی زبان میں ستو کو کہتے ہیں۔

ابوسفیان کے ناکام تصادم اور راہِ فرار اختیار کرنے کی خبر عرب کے طول و عرض میں پھیل گئی، لیکن جو عرب قبائل مدینے سے فاصلے پر تھے، وہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی سرگرمیوں کو چنداں اہمیت نہ دیتے تھے۔

پہلی عیدالاضحیٰ

ذی الحجہ کی 9 تاریخ تھی کہ رسول اللہ غزوہ سویق سے مدینہ لوٹے۔ دوسرے دن مسلمانوں کو عید کی دو رکعت نماز پڑھائی۔ یہ مسلمانوں کی پہلی بقرعید تھی جو آپ ﷺ نے صحابہؓ کو پڑھائی۔ پھر عید گاہ ہی میں اپنے ہاتھ سے دو مینڈھے ذبح فرمائے۔ مسلمانوں کو بھی قربانی کا حکم دیا۔ چناں چہ صحابہ میں جو مال دار تھے، انھوں نے بھی قربانیاں کیں۔ حضرت عبداللہؓ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ہجرت کے بعد حضور اکرم ﷺ نے دس سال مدینہ طیبہ میں قیام فرمایا اور آپ ﷺ ہر سال قربانی کرتے رہے۔ عیدالاضحی کے دن آپ ﷺ بغیر کچھ کھائے نماز کے لیے تشریف لے جاتے۔ نماز کے بعد قربانی فرماتے اور اس کا گوشت تناول فرماتے۔

درود شریف

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صلوٰۃ و سلام پڑھنے کا حکم بھی سن دو ہجری میں نازل ہوا۔ یہ دراصل ایک اعلیٰ درجے کی دعا ہے اور نبی کریم ﷺ کی ذات پاک سے اپنی ایمانی وابستگی، عقیدت اور محبت کا والہانہ اظہار ہے۔

اس کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو دیا گیا ہے۔ سورۂ احزاب کی آیت 56 میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (الاحزاب: 56)

"اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ مومنو، تم بھی پیغمبر پر درود اور سلام بھیجا کرو۔"

غزوۂ غطفان

اسے غزوۂ ذی امر اور انمار بھی کہتے ہیں۔ بنو غطفان علاقہ نجد کا بہت بڑا جنگ جو قبیلہ تھا ان کے قریب بنو سلیم بھی بستے تھے۔ یہ بھی لڑاکا اور تعداد میں زیادہ تھے۔ مکہ والوں سے ان کے تعلقات بہت قدیمی اور حلیفانہ تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مکہ سے عراق جانے والا تجارتی راستہ ان کے علاقوں سے گزرتا تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خائف بھی تھے، اس لیے کھل کر میدان میں آنے سے گریز کرتے تھے۔

آنحضور ﷺ غزوۂ سویق سے واپسی کے بعد بقیہ ذی الحج مدینہ منورہ ہی میں مقیم رہے۔ اطلاع موصول ہوئی کہ بنی ثعلبہ اور بنی محارب (قبیلۂ غطفان کی شاخیں) نجد میں جمع ہو رہے ہیں اور اپنے سرداروں عثور غطفان کی قیادت میں اطراف مدینہ میں لوٹ مار کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ انھوں مدینے کے محاصرے کا منصوبہ بنایا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو اپنا نائب مقرر فرمایا اور 450 سواروں کے ساتھ نجد کی طرف خروج فرمایا۔ حضور ﷺ کی آمد کی خبر سن کر غطفان قبائل پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔ صرف بنو ثعلبہ کا ایک شخص جبار نامی صحابہؓ کے ہاتھ لگا۔ آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی، اس نے اسلام قبول کر لیا۔ آپ ﷺ نے اسے حضرت بلالؓ کی رفاقت میں دے دیا۔

دشمن کے راستوں کی تلاش اور نشان دہی میں جبار نے مسلمانوں کی مدد کی۔ حضور ﷺ نے صفر کا تقریباً پورا مہینہ وہیں گزارا۔ آخر ربیع الاول میں جدال و قتال کے بغیر مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

اس غزوے کا ایک اہم واقعہ قابل ذکر ہے۔ بارش کی وجہ سے صحابہؓ کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ حضور ﷺ نے بھی اپنے کپڑے سکھانے کے لیے ایک درخت سے لٹکا دیئے اور اس کے سایے میں آرام فرمانے لگے۔ پہاڑ پر سے دعثور دیکھ رہا تھا کہ آپ ﷺ تنہا ہیں۔ فوراً تلوار لے کر سرہانے آ موجود ہوا اور کہنے لگا: "اب آپ ﷺ کو مجھ سے کون بچائے گا؟"

حضور ﷺ نے فرمایا "اللہ۔"

اس پُر اعتماد جواب سے وہ تھرا اٹھا اور اس کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی۔ حضور ﷺ نے اسے اٹھا لیا اور اس سے وہی سوال دہرایا: "اب تجھے مجھ سے کون

بچائے گا؟''

وعثور نے جواب دیا: ''کوئی نہیں۔''

اس نے کلمۂ شہادت پڑھا اور اپنی قوم میں تبلیغ کا فرض سنبھالا۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر پیش آیا تھا۔

سریہ محمد بن مسلمہؓ (قتل کعب بن اشرف) 14 ربیع الاول اگست 426ء

کعب بن اشرف ایک یہودی تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ طے کی شاخ نبہان سے تھا۔ اس کی ماں قبیلہ بنی نضیر سے تھی۔ وہ شاعر ہونے کے علاوہ بڑا دولت مند تھا۔ اسے اسلام اور مسلمانوں سے نہایت سخت عداوت اور جلن تھی۔ میثاق مدینہ کے وقت جب رسول کریم ﷺ نے کم تر سمجھے جانے والے بنی قریظہ کو بنی نضیر اور بنی قینقاع کے یہودیوں کے برابر درجہ عطا فرمایا تو کعب بن اشرف کو یہ بہت برا لگ تھا۔ وہ حضور ﷺ کو سخت تکلیف دیتا تھا اور آپ ﷺ کے خلاف جنگ کی کھلم کھلا دعوت دیتا پھرتا تھا۔ اس کا قلعہ مدینے کے جنوب میں بنونضیر کی آبادی کے پیچھے واقع تھا۔

مدینہ میں جب فتح بدر کی خوش خبری پہنچی تو کعب یہودی کو سخت صدمہ ہوا اور کہا ''اگر یہ خبر صحیح ہے کہ مکہ کے بڑے بڑے سردار اور اشراف مارے گئے ہیں' تو پھر زمین کی پشت سے زمین کا بطن بہتر ہے (یعنی جینے سے مرنا بہتر ہے) تا کہ اس ذلت و رسوائی کا منظر آنکھیں نہ دیکھیں' اور جب اس خبر کی تصدیق ہوگئی تو مقتولین بدر کی تعزیت کے لیے مکہ روانہ ہوا۔ اور وہاں عبدالمطلب بن ابی دواعہ سہمی کے گھر مہمان ہوا۔ مکہ میں مشرکین کی غیرت بھڑکانے' انکی آتش انتقام تیز کرنے اور انھیں نبی ﷺ کے خلاف آمادہ جنگ کرنے کے لیے اشعار کہہ کر ان سردارانِ قریش کا نوحہ و ماتم شروع کر دیا جنھیں میدان بدر میں قتل کیے جانے کے بعد کنوئیں میں پھینک دیا گیا تھا۔ ابوسفیان اور مشرکین نے اس سے دریافت کیا کہ ہمارا دین تمھارے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے یا محمد ﷺ اور اس کے اصحاب کا؟ اور دونوں میں سے کون سا فریق زیادہ ہدایت یافتہ ہے؟ کعب یہودی نے کہا: ''تم لوگ ان سے زیادہ ہدایت یافتہ اور افضل ہو'' اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ نسا کی آیت 51 نازل فرمائی:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا﴾ (النساء: 51)

''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھیں کتاب علم میں سے کچھ حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت (فال گیری) اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ مومنوں سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہیں۔''

علمائے یہود کی ہٹ دھرمی یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ جو لوگ حضور ﷺ پر ایمان لائے تھے انھیں وہ مشرکین کی نسبت زیادہ گم راہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو یہ مشرکین ہی زیادہ راہ راست پر ہیں' حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے جس میں شرک کا شائبہ تک نہیں' اور دوسری طرف صریح بت پرستی اور شرک ہے۔

کعب یہودی مشرکین میں آتش انتقام بھڑکانے کے بعد مدینہ واپس آیا تو یہاں آ کر صحابہؓ کرام کی عورتوں کے بارے میں واہیات اشعار کہنے لگا اور ایک ایک بی بی کا نام لے لے کر عاشقانہ اشعار کہنے لگا۔ اس کی زبان درازی' بدگوئی اور ہرزہ سرائی نے مدینہ کا سارا ماحول پراگندہ کر دیا اور سخت تکلیف دہ صورت حال پیدا ہوگئی۔

تب حضور ﷺ نے تنگ آ کر فرمایا: ''کون ہے جو مجھے اس شخص کے شر سے نجات دلوائے؟'' بنی عبدالاشہل کے حضرت محمدؓ بن مسلمہ نے حامی بھری۔ قتل کا منصوبہ بنایا گیا۔ محمدؓ بن مسلمہ' عبادؓ بن بشر' کعب کے رضاعی بھائی سلکانؓ بن سلامہ' جن کی کنیت ابونائلہ تھی۔ حارثؓ بن اوس اور ابوعبسؓ بن جبیر نے اپنی خدمات پیش کیں۔

منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سب سے پہلے حضرت ابونائلہؓ کعب بن اشرف کے پاس پہنچے۔ کعب کا اپنا ایک قلعہ تھا۔ وہ اس قلعے کے اندر مقیم تھا۔ دن کے وقت اس کے پاس محفل جمی رہتی تھی۔ اس کے قلعے کے اردگرد یہودیوں کی بستیاں آباد تھیں۔ قلعہ میں جا کر یہودیوں کی بستی میں کعب بن اشرف کو قتل کرنا بہت مشکل تھا اس لیے اسے قلعے سے باہر لا کر دور لے جا کر قتل کرنا منصوبے کا حصہ تھا۔ قلعے سے باہر لے جانے کے لیے کسی ترغیب کی ضرورت تھی۔

جب حضرت ابونائلہ کعب بن اشرف کے پاس پہنچے تو اس وقت وہ اپنی قوم کی مجلس میں بٹھا ہوا تھا۔ حضرت ابونائلہ نے کہا: ''میں ایک کام سے آیا ہوں۔''

کعب بن اشرف نے انھیں اپنے پاس بٹھالیا۔ وہ دونوں باتیں کرنے اور ایک دوسرے کو شعر سنانے لگے۔ کعب جب بھی ان سے پوچھتا' کس کام سے آئے ہو؟ جواب ٹال دیتے۔ آخر کعب نے کہا: ''کیا تو اپنا کام اس لیے نہیں بتاتا کہ کچھ لوگ یہاں بیٹھے ہیں؟''

جو لوگ کعب کی محفل میں بیٹھے ہوئے تھے' وہ اٹھ کر چلے گئے' تا کہ دونوں تنہائی میں بات کر سکیں۔

''میں ان لوگوں کے سامنے بات نہیں کر سکتا تھا'' حضرت ابونائلہؓ نے بات شروع کی: ''یہ شخص (محمد ﷺ) جب سے آیا ہے' ہم پر مصیبت نازل ہوگئی ہے۔ سارے عرب ہمارے دشمن ہو گئے ہیں اور سب مل کر ہم سے لڑنے لگے ہیں۔ ہمارے سب راستے مسدود ہو گئے ہیں۔ ہم نے مصائب برداشت کیے ہیں۔ ہمارے عیال ضائع ہو گئے ہیں اور صدقہ لینے کی حالت کو پہنچ گئے ہیں اور ہمیں پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔''

''میں ابن اشرف ہوں' ابن سلامہ! بخدا میں پہلے بھی یہی بات تجھے سمجھاتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہی ہونے والا تھا۔ اب تو ریاست اور حکمرانی اسی کو مل رہی ہے'' کعب بن اشرف نے کہا۔

''کچھ اور اصحاب بھی میرے خیال ہیں۔ میں چاہتا ہوں' انھیں بھی بلالوں۔ ہم غلہ اور کھجور خریدنا چاہتے ہیں۔ اس کے عوض ہم جو تو چاہے' رہن رکھیں گے اور تیری

ے مطابق عمل کریں گے، مگر تو ہم پر احسان کرنا۔''

کعب نے کہا: ''میرے پاس کھجور کا وافر ذخیرہ ہے۔ اعلیٰ قسم کی عجوہ کھجوریں ہیں۔ ابونائلہ میں تجھے اس قسم کی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ تو میرے لیے بہت ہی محترم ہے۔ تو میرا دودھ شریک بھائی ہے۔''

ابونائلہ نے کہا: ''میں نے تجھ سے محمد ﷺ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔''

کعب نے کہا: ''مگر یہ تو بتا کہ محمد ﷺ کے بارے میں تیرا کیا ارادہ ہے؟''

ابونائلہ نے جواب دیا: ''میں تو اس سے کنارہ کشی کرنا چاہتا ہوں''

''تو کیا تم اپنی خواتین اور بیٹے میرے پاس رہن کے طور پر رکھو گے؟'' کعب نے موضوع بدل کر پوچھا۔

''کیا تو ہمیں رسوا کرنا چاہتا ہے؟ اس سے تو ہمارے ساتھ تیرا تعلق بھی اوروں پر ظاہر ہو جائے گا۔ ہم رہن میں تیرے پاس اپنے ہتھیار رکھیں گے جتنے تو چاہے ابونائلہ نے جواب دیا دراصل حضرت ابونائلہ چاہتے تھے کہ کسی طرح انھیں ہتھیار لے کر کعب کے پاس آنے کا بہانہ مل جائے۔

کعب نے جواب دیا: ''ہاں ہتھیار رکھنا وفاداری کا ثبوت ہوگا۔''

عرب جب کسی کے پاس اپنے ہتھیار جمع کرا دیتے تھے تو یہ دونوں فریقوں کے درمیان دوستانہ معاہدے کی علامت ہوتی تھی۔

ابونائلہؓ نے کعب بن اشرف کے ساتھ معاملہ طے کر لیا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے واپس آ گئے۔ انھوں نے اپنے ساتھیوں کو منصوبے سے آگاہ کیا۔

عشاء کے وقت وہ سب ہتھیار لگا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ حضور ﷺ بقیع تک ان کے ساتھ تشریف لے گئے اور انھیں کہا'' جاؤ اللہ کے توکل پر۔ اللہ تمھاری مدد کرے اور برکت دے'' اس دعا کے ساتھ رخصت کیا۔

وہ چاندنی رات تھی۔ کعب بن اشرف کے قلعے کے نیچے پہنچ کر حضرت ابونائلہؓ نے اسے آواز دی۔ اس کی نو بیاہتا بیوی نے اسے روکتے ہوئے کہا: ''اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ تم جنگ جو آدمی ہو۔ جنگ جو آدمی کے بہت سے دشمن ہوتے ہیں۔ اسے رات کے وقت باہر نہیں جانا چاہیے۔''

کعب نے جواب دیا: ''ابونائلہ میرا بھائی ہے اور اس نے مجھ سے آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ میں سو رہا ہوں تو ہرگز مجھے بے آرام کرنا پسند نہ کرتا اور بہادر آدمیوں کو تو برچھیوں کے سامنے بلایا جائے تو اسے وہاں بھی بلا تامل حاضر ہونا چاہیے۔'' بیوی کو اتنا کہہ کر وہ قلعے سے باہر آ گیا۔

وہ سب قلعے کی دیوار کے پاس بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ جب کعب ان کی گفتگو سے خوش ہو گیا تو انھوں نے کہا: ''کعب بن اشرف کیا تو ہمارے ساتھ شعب عجوا (آبادی کے باہر ایک جگہ) تک نہیں چلتا کہ وہاں بیٹھ کر باتیں کر سکیں۔''

''کیوں نہیں، چلو چلتے ہیں'' کعب نے جواب دیا۔

وہ ہنستے ہوئے جا رہے تھے تو حضرت ابونائلہؓ نے کعب کے سر کو ہاتھ لگا کر پیار سے کہا: ''کعب تو نے یہ کیسی خوش بو لگا رکھی ہے۔ رات بھی معطر ہو رہی ہے۔''

کعب اس تعریف سے خوش ہو گیا۔ تھوڑی دور چل کر حضرت ابونائلہ نے پھر کعب کے سر میں ہاتھ ڈال کر خوش بو کی تعریف کی۔ کعب اور بھی خوش ہو گیا۔ تھوڑی دور اور چل کر حضرت ابونائلہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کے لمبے بالوں کو گرفت میں لے لیا اور ساتھیوں سے کہا: ''لے لو اللہ کے اس دشمن کو۔''

سب صحابہؓ نے بیک وقت اپنی اپنی تلواریں اس پر ماریں، مگر سب کی تلواریں آپس میں ٹکرا گئیں اور کسی کا وار بھی کارگر نہ ہوا۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ کے پاس چھری تھی۔ انھوں نے چھری اس کے پیٹ میں گھونپ دی۔ کعب نے چیخ ماری۔ اس کی چیخ پر یہودیوں کی بستی میں لوگ بیدار ہو گئے۔ انھوں نے خطرے کی نشانی کے طور پر اپنی گڑھی پر آگ جلا دی۔ صحابہؓ نے کعب کا سر کاٹ کر ساتھ لیا اور یہودیوں کے علاقے سے تیزی سے نکلنے کے لیے چل پڑے۔ کارروائی کے دوران میں حضرت حارثؓ ابن اوس زخمی ہو گئے تھے اور ان کے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ چناں چہ واپسی میں جب یہ دستہ حرہ عریض کے ٹیلے تک پہنچا تو دیکھا کہ حارثؓ ساتھ نہیں ہیں۔

اس لیے سب لوگ وہیں رک گئے۔ تھوڑی دیر بعد حارث بھی ان کے نشانات قدم دیکھتے ہوئے آن پہنچے۔ وہاں سے لوگوں نے انھیں اٹھا لیا۔ اور بقیع کے قریب پہنچ کر سب نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ حضور ﷺ سمجھ گئے کہ کعب اپنے انجام کو پہنچا ہے۔ پھر صحابہؓ نے آپ ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر اس ''طاغوت'' کا سر حضور ﷺ کے سامنے رکھ دیا۔ آپ ﷺ نے اس کے قتل پر اللہ کی حمد وثنا کی اور حارث کے زخموں پر لعاب مبارک لگایا، جس سے ان کی تکلیف دور ہو گئی۔

اگلی صبح یہودی اور ان کے ساتھی مشرکین ایک وفد لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شکایت کی کہ ہمارا سردار کعب بن اشرف رات اپنے گھر سے نکلا تو اسے کسی جرم اور خطا کے بغیر ناگہانی قتل کر دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ بھی اپنے ہم عقیدہ لوگوں کی مانند'' عہد'' پر قائم رہتا تو اس طرح نہ مارا جاتا۔ اس نے عہد شکنی کر کے ہمیں اذیت پہنچائی اور ہمارے خلاف اشعار لکھے۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو جمع کیا اور انھیں ایسی حرکتوں سے باز رہنے کو کہا تو ان سب نے ایک دستاویز سے اتفاق کیا اور نئے سرے سے وعدہ کیا کہ وہ سب دستور ریاست کی پابندی کریں گے اور اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں لکھ دیا کہ جو کوئی بغاوت کے راستے پر نہیں چلے گا، اسے امان ہوگی۔ یہ دستاویز دستور مدینہ کی پابندی کے عہد نامے کی حیثیت رکھتی تھی۔ گویا کعب بن اشرف کی سرگرمیاں ریاست کے خلاف بغاوت تھی اور یہودیوں نے اسے تسلیم کر لیا تھا۔

غزوہ بحران

نبی کریم ﷺ نے ماہ ربیع الاول مدینہ میں گزارا۔ اوائل ربیع الثانی میں حضور ﷺ کو خبر ملی کہ مقام بحران، جو حجاز کا ایک معدنی مقام ہے، وہاں بنی سلیم مسلمانوں کی مخالفت پر جمع ہو رہے ہیں۔ حضور ﷺ مدینے میں عبداللہ بن ام مکتومؓ کو اپنا نائب مقرر کر کے تین سو صحابہؓ کے ساتھ بنو سلیم کے مقابلے کی نیت سے نکلے۔ بنی سلیم حضور ﷺ کی آمد کی خبر سنتے ہی منتشر ہو گئے اور آپ ﷺ چند روز وہاں قیام فرما کر جدال و قتال کے بغیر مدینہ واپس آ گئے۔

سریہ زید بن حارثہؓ (سریہ قردہ)

کعب بن اشرف کے قتل کے بعد یہودی بہت زیادہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔ اکثر اوقات وہ اپنے گھروں کی چار دیواری میں محصور رہتے تھے۔ چوں کہ بنی قینقاع کے محاصرے کے بعد حضور ﷺ نے یہودیوں کی خون ریزی جائز قرار دے دی تھی، اس وجہ سے ان پر اور بھی زیادہ خوف چھایا ہوا تھا۔ یہودیوں کے ساتھ ساتھ قریش بھی سہم گئے تھے۔ انھیں زیادہ خدشہ اپنی تجارت کا تھا۔ اگر تجارت کی راہیں مسدود ہو جاتیں تو اہل مکہ کہیں قحط میں مبتلا ہوتے اور کہیں بھوکوں مرتے۔ نبی کریم ﷺ چاہتے تھے کہ قریش کی تجارتی راہیں مسدود کر دیں اور مکہ کو حصار میں لے کر اس کی مرکزی حیثیت ختم کر دیں۔

ایک روز صفوان بن امیہ نے قریش سے کہا: ''محمد ﷺ اور ان کے ساتھی ہماری تجارت میں رکاوٹیں ڈال دینا چاہتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ ساحلی علاقوں میں بھی اپنا اثر و رسوخ قائم کریں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ہم اس مزاحمت کا مقابلہ کیسے کریں۔ (حضرت) محمد ﷺ نے ساحلی علاقوں میں رہنے والوں سے عہد و پیمان کر لیے ہیں۔ اگر ہم گھروں میں بیٹھے رہے تو سرمایہ کم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گا۔ ہماری زندگی کا دارومدار گرمیوں میں شام کی تجارت سے اور سردیوں میں حبشہ کی تجارت سے وابستہ ہے۔''

اسود بن مطلب نے کہا: ''بہتر یہ ہے کہ بحرہ احمر کی ساحلی راہ چھوڑ کر عراق کی راہ اختیار کی جائے۔''

فرات بن حیان کو، جو قبیلہ بنی بکر کا ایک فرد تھا، انھوں نے اجرت پر اپنے ہم راہ لیا۔ فرات بن حیان نے کہا کہ (حضرت) محمد ﷺ کے اصحاب کو یہ جرات ہرگز نہ ہوگی کہ وہ عراق کا رخ کریں، کیوں کہ یہ کوہستانی علاقہ ہے اور یہاں بڑے بڑے صحرا ہیں۔ صفوان کو صحرا کا کوئی اندیشہ نہ تھا، کیوں کہ سردیوں کا موسم تھا اور پانی کی ضرورت زیادہ پیش نہ آتی تھی۔ اس تجویز کے مطابق ایک قافلہ ترتیب دیا گیا۔ اس کے مال تجارت کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی۔ قافلے میں دیگر قریش مکہ کے علاوہ ابوسفیان بن حرب، صفوان بن امیہ، حویطب بن عبدالعزیٰ اور عبداللہ بن ابی ربیعہ بھی شامل تھے۔

جس زمانے میں قریش قافلے کی ترتیب اور اس کے متعلق انتظامات میں مصروف تھے، اتفاق سے مدینے کا ایک شخص نعیم نامی وہاں مقیم تھا، جب وہ مدینہ واپس آیا تو اس نے باتوں باتوں میں ایک مسلمان سے قریش کے منصوبے کا ذکر کیا۔ اس مسلمان نے فوراً رسول کریم ﷺ کو اس بات سے مطلع کر دیا۔ چناں چہ حضور ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو سو صحابہؓ کی معیت میں قافلہ قریش کی روک تھام کے لیے روانہ فرمایا۔ حضرت زیدؓ نجد کے ایک چشمے کے پاس پہنچے جو سر راہ واقع تھا۔ قریش کا قافلہ وہاں پہنچا تو مسلمانوں کو دیکھ کر راہ فرار اختیار کر لی۔ اس کے مال و اسباب پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ پہلی بڑی غنیمت تھی جو مسلمانوں کے قبضے میں آئی۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ مدینہ واپس آئے اور غنیمت کا خمس (بیس ہزار درہم) نکال کر اس کی تقسیم صحابہ میں کر دی گئی۔ حضرت زیدؓ فرات بن حیان کو بھی گرفتار کر لائے تھے۔ اسے اسلام کی دعوت دی گئی۔ چناں چہ وہ مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

ام المومنین حضرت حفصہؓ سے عقد

حضرت عمر فاروقؓ کی دختر حضرت حفصہؓ سے نبی کریم ﷺ کا عقد شعبان ۳ ہجری میں ہوا۔ حضرت حفصہؓ کے پہلے شوہر خنیس بن حذافہ سابقون الاولون میں تھے) سات مہینے پیش تر داعیٔ اجل کو لبیک کہ چکے تھے۔ اس رشتے سے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا تعلق پہلے سے بھی زیادہ استوار ہو گیا۔ اس سے پیش تر رسول کریم ﷺ اپنی دختر حضرت فاطمہؓ کو حضرت علیؓ کے نکاح میں دے چکے تھے۔ حضور ﷺ کی دختر حضرت رقیہ جو حضرت عثمان غنیؓ کی زوجۂ حیات تھیں، اس جہان فانی سے چل بسیں تو آپ ﷺ نے دوسری دختر حضرت ام کلثومؓ کا عقد بھی ان کے ساتھ کر دیا۔ اس طرح حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ سے حضور ﷺ کی محبت و یگانگت کا تعلق گہرا ہو گیا۔

غزوۂ احد

غزوۂ بدر کے بعد قریش آرام سے نہیں بیٹھے تھے۔ غزوۂ سویق سے بھی ان کے جذبۂ انتقام کی تسکین نہ ہو سکی تھی۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ نے قریش کے تجارتی قافلے کو جس طرح نقصان پہنچایا، اس نے آتش انتقام پر اور تیل چھڑک دیا تھا۔ مقتولین بدر کی یاد ان کے دل سے محو نہ ہوئی تھی، کیوں کہ وہ لوگ قوم کے سردار، پیشوا اور اشراف تھے۔ قریش کی ہر عورت اپنے بھائی اور شوہر وغیرہ کی یاد میں آنسو بہاتی اور نوحہ کرتی تھی۔ جو لوگ بدر کے میدان سے جان سلامت لے گئے تھے، انھوں نے قافلہ ابوسفیان کے مال کو (غزوۂ بدر اس مال کی بنا پر ہوا تھا) دارالندوہ میں محفوظ کر دیا تھا۔ اکابر قریش کی رائے تھی کہ یہ سامان فروخت کرنے کے بعد اس کی قیمت سے فوج بھرتی کی جائے اور مسلمانوں کے مقابلے میں صف آرا ہونے کے لیے تمام عرب قبائل کو دعوت دی جائے۔ ابوعزہ شاعر، جسے نبی کریم ﷺ نے غزوۂ بدر کے بعد فدیہ کے بغیر رہا کر دیا تھا، ان لوگوں سے آملا تھا۔ قریش نے حبشی النسل عربوں سے بھی مدد کی درخواست کی تھی۔ قریش کی عورتیں میدان جنگ میں شرکت کے لیے اصرار کر رہی تھیں۔ لوگوں کی رائیں اس باب میں مختلف تھیں۔ ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ عورتوں کا ہم راہ جانا نا مناسب ہے، کیوں کہ وہ مردوں کو بہتر انداز میں جنگ کی ترغیب دے سکتی ہیں اور

مقتولین بدر کی یاد بھی تازہ کرسکتی ہیں۔ ہم لوگ تو جان سے ہاتھ دھو چکے ہیں یا انتقام لیں گے یا اسی کوشش میں جان دے دیں گے۔ گھروں کو واپسی کا ہمارا ارادہ ہی نہیں۔ دوسرا گروہ یہ کہتا تھا کہ عورتوں کی معیت ہرگز مناسب نہیں ہے۔ ممکن ہے، ہمیں جنگ میں شکست ہو اور ہماری عزت و ناموس بھی خطرے میں پڑ جائے۔ جو لوگ عورتوں کو ہم راہ لے جانے کی مخالفت کر رہے تھے اُن سے ابوسفیان کی بیوی ہند نے کہا: ''تم لوگ بدر کے دن صحیح سلامت رہے تھے اور خیریت سے اپنے اپنے گھر واپس آ گئے تھے' لیکن اب ہمارا ارادہ شرکت جنگ کا ہے تو تم ایسی باتیں کرتے ہو۔ ہم ضرور چلیں گے۔ ہمیں کوئی واپس جانے اور مکہ میں ٹھہرے رہنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ تم لوگوں نے بدر کے موقع پر جحفہ کے مقام سے لوٹا دیا تھا' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے اعزہ و اقارب مارے گئے' کیوں کہ میدان جنگ میں کوئی نہ تھا جو انھیں جنگ کی ترغیب دیتا۔

اکابر قریش کا جلسہ

قریش کے سردار دارالندوہ میں سر جوڑ کر بیٹھے۔ ان میں اسود بن مطلب بن اسد' جبیر بن مطعم' صفوان بن امیہ' عکرمہ بن ابوجہل' حارث بن ہشام' عبداللہ بن ابی ربیعہ' حویطب بن عبدالعزیٰ اور حجر بن ابی اہاب شامل تھے۔ سب ایک بات پر متفق ہوئے اور ابوسفیان بن حرب کے پاس پہنچے۔ کہا، وہ قافلہ جس کا مال تجارت اور منافع تم نے روک رکھا ہے، اہل مکہ اور بدر میں مارے جانے والے سرداروں کا حصہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کے منافع سے ایک لشکر مقتولین بدر کے انتقام کے لیے تیار کیا جائے۔ ابوسفیان نے کہا کہ اگر سب کی مرضی یہی ہے تو میں اس کا ماننے والا پہلا شخص ہوں۔ بنی عبد مناف بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ بات طے ہو گئی اور جنگ کا ساز و سامان تیار ہونے لگا۔ قافلے کے ہزار اونٹ تھے۔ انھیں فروخت کیا گیا تو پچاس ہزار دینار ملے۔ اسی قدر رقم مال تجارت کی فروخت سے حاصل ہوئی۔ اس فروخت میں ان کی شرح منافع ایک دینار کے مال پر ایک دینار ہوئی تھی۔ اسی طرح اصل تو مالکوں کو دے دیا گیا اور منافع جنگ کی تیاری کے لیے روک لیا گیا۔

اطراف و جوانب کے قبائل سے امداد اور نفری جمع کرنے کے لیے بااثر لوگوں پر مشتمل وفد بنایا گیا، جس میں عمرو بن العاص، مسافع بن عبد مناف، ہبیرہ بن وہب، عبداللہ بن زبعری اور آتش بیاں شاعر ابوالعزہ شامل تھے۔ ابوالعزہ نے لاکھ انکار کیا کہ مجھے (حضرت) محمد ﷺ نے اس وعدے پر بلا فدیہ احسان کے ساتھ چھوڑ دیا تھا کہ آئندہ کسی جنگ میں حصہ نہ لوں گا، مگر صفوان بن امیہ نے اس کا کوئی عذر قبول نہ کیا۔ اسے سبز باغ دکھائے۔ انھوں نے بنی ثقیف، اہل تہامہ اور بنو کنانہ کو ہر طرح کی مدد کے لیے آمادہ کیا۔

جنگ جو قبائل ''احابیش''، جنھیں بدر میں نہیں لے جاسکتے تھے، بطور خاص انھیں ساتھ لیا۔ جبیر بن مطعم نے اپنے حبشی غلام وحشی کو اپنے چچا طعمہ بن عدی کے انتقام کے عوض آزادی کا مژدہ سنایا۔ وحشی کو سانگ (چھوٹا نیزہ) پھینکنے میں مہارت حاصل تھی۔ طعمہ بن عدی کو بدر میں حضرت حمزہؓ نے قتل کیا تھا۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے بھی وحشی کو مال و دولت دینے کا وعدہ کیا، بشرطیکہ وہ اُس کے باپ اور چچا کے قاتل حضرت حمزہؓ کو ہلاک کرے۔ خفیہ ریشہ دوانیوں سے مدینے کے یہودیوں اور منافقوں سے رابطہ پیدا کیا گیا۔

لشکر قریش کی حرکت

قریش مکہ سے روانہ ہوئے۔ ان کے ساتھ تین علم تھے اور ان کی فوج تین ہزار کے قریب افراد پر مشتمل تھی۔ بنی ثقیف کے دو سو افراد کے علاوہ باقی سب اہل مکہ تھے۔ لشکر کے پاس سامان حرب کی فراوانی تھی۔ ستر اشخاص زرہ پوش، دو سو گھوڑے اور تین ہزار اونٹ تھے۔ ابوسفیان کو سپہ سالار بنایا گیا۔ حمیت اور جوش بڑھانے کے لیے قریش کی پندرہ معزز منتخب عورتیں بھی لشکر میں شامل تھیں۔ ان میں قابل ذکر یہ ہیں:

1۔ **ہندہ بنت عتبہ**: ابوسفیان کی بیوی۔ اپنے باپ اور چچا کا بدلہ لینے کے لیے بے قرار تھی۔

2۔ **فاطمہ بنت ولید**: حضرت خالدؓ بن ولید کی بہن جو ابوجہل کے بھائی حارث بن ہشام کی بیوی تھی۔ اسے اپنے باپ ولید کا انتقام لینے کی آرزو تھی۔

3۔ **ام حکیم بنت حارث**: یہ عکرمہ کی بیوی، ابوجہل کی بہو اور بھتیجی تھی۔ اپنے خسر کے جوش انتقام سے لبریز تھی۔

4۔ **ریطہ بنت منبہ بن حجاج**: عمرو بن العاص کی بیوی تھی۔ اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے آمادہ ہوئی۔

5۔ **خناس بنت مالک**: حضرت مصعبؓ بن عمیر کی مشرک ماں تھی۔ اپنے بیٹے ابوعزیز بن عمیر کے ساتھ آئی۔

6۔ **برزہ بنت مسعود ثقفی**: اپنے خسر امیہ بن خلف کے بدلے کے لیے آئی تھی۔ صفوان بن امیہ کی بیوی تھی۔

7۔ **سلافہ بنت سعد**: یہ طلحہ بن ابی طلحہ علمبردار کی بیوی تھی۔ اس کے چار بیٹے مارے گئے تھے۔

نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ بھی لشکر قریش میں شامل تھے اور ان کے تمام منصوبوں سے باخبر تھے۔ عباسؓ نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن اس کے باوجود نبی کریمؐ کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے اور غزوۂ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے ان سے جو حُسنِ سلوک کیا تھا، انھیں اس کا اعتراف تھا۔ لشکر قریش کوچ کے لیے تیار تھا۔ اس موقع پر حضرت عباسؓ نے آنحضرت ﷺ کو ایک خط لکھا، جس میں قریش کے لشکر کی تعداد اور سامانِ جنگ وغیرہ کی تفصیل درج تھی۔ یہ خط انھوں نے ایک قاصد کے ذریعے اس ہدایت کے ساتھ مدینہ بھیجا کہ اسے نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچا دیا جائے۔ لشکر قریش مکہ سے روانہ ہو کر منزلیں مارتا ہوا ابواء کے مقام پر پہنچا اور رسول کریم ﷺ کی والدہ ماجدہ کی قبر کے پاس سے گزرا۔ بعض لوگوں نے جو زیادہ غضب آلود اور کمینہ خصلت تھے، کہا کہ آمنہ کی قبر اکھاڑ دی جائے، لیکن اکابرِ قریش نے اس ناشائستہ فعل کی اجازت نہ دی اور کہا کہ عرب میں رسم

بدشروع ہو جائے گی اور بنی بکر اور بنی خزاعہ کے لوگ ہمارے بزرگوں کی ہڈیاں اکھاڑ پھینکیں گے۔ غرض وہ لوگ اس بے جا حرکت سے باز رہے۔ قریش کا لشکر مقام ابواء سے چل کر مقام عقیق میں پہنچا جو کوہ احد کے دامن میں مدینہ سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

حضرت عباسؓ کا قاصد

حضرت عباس کا قاصد مدینہ پہنچ کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ اس وقت قبا میں تھے اور مسجد سے نکل کر اونٹ پر سوار ہوا ہی چاہتے تھے۔ قاصد نے خط پیش کیا۔ حضرت ابیؓ بن کعب نے پڑھ کر سنایا۔ آنحضور ﷺ نے ابیؓ بن کعب کو ہدایت کی کہ خط کا مضمون ابھی مخفی رکھیں اور کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں۔ بعد ازاں نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے۔ آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ بن ربیع کے مکان میں پہنچ کر انھیں بھی اس خط کے سلسلے میں اپنا ہم راز بنایا، لیکن ساتھ ہی انھیں بھی ہدایت کی کہ خط کا مضمون خفیہ رکھیں۔ لیکن حضرت سعدؓ بن ربیع کی زوجہ گھر میں موجود تھیں اور یہ باتیں سن رہی تھیں، اس لیے راز مخفی نہ رہ سکا۔ آنحضرت ﷺ نے فضالہ کے فرزندوں انسؓ اور مونسؓ کو اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ قریش کی نقل و حرکت سے مطلع کریں۔

انسؓ اور مونسؓ نے لشکر قریش کو مدینہ سے باہر خیمہ زن پایا۔ اہلِ لشکر نے اونٹوں اور گھوڑوں کو کھیتوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت حبابؓ بن منذر کو لشکر قریش سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت حبابؓ نے واپسی پر جو کچھ بیان کیا، اس میں اور حضرت عباس کے مضمون میں مطابقت تھی۔

اس لیے آنحضرت ﷺ کو حیرت ہوئی۔ حضرت حبابؓ کے بعد حضرت سلمہؓ بن سلامہ لشکر قریش کے تجسس میں پہنچے۔ انھوں نے قریش کے ہراول کو دیکھا کہ مدینے کے قریب آ پہنچا ہے اور قریب ہے کہ بستی میں داخل ہو جائے۔ یہ دیکھ کر وہ فوراً واپس آئے اور انھوں نے جو کچھ دیکھا تھا اس سے مسلمانوں کو مطلع کیا۔ اوس و خزرج کے قبائل اور دوسرے اہل مدینہ ہونے والی جنگ کے انجام سے خائف تھے، اس لیے کہ قریش نے جنگ کی تیاری پر اپنی پوری طاقت اور اپنا پورا سرمایہ صرف کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی ایک مسلح جماعت اس اندیشے سے کہ مبادا قریش آنحضرت ﷺ کی آرام گاہ پر حملہ کر دیں، اس رات مسجد میں رہی اور بستی کے لوگ بھی ہوشیار اور بیدار رہے۔ صبح کے وقت نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو اور ان لوگوں کو جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، طلب کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کس نوعیت اور کس صورت سے کرنا چاہیے؟

محاذِ جنگ کے سلسلے میں اختلاف

آنحضرت ﷺ کی یہ رائے تھی کہ مدینے میں محصور و قلعہ بند ہو کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے، کیوں کہ اس صورت میں حملہ آوروں کو پسپا کیا جا سکے گا۔ عبداللہ بن ابی نے اس رائے کی تائید کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم ہمیشہ مدینہ میں محصور ہو کر جنگ کرتے رہے ہیں۔

عورتوں اور لڑکوں کو چھتوں پر بٹھا دیتے اور ان کے پاس سنگریزے جمع کر دیتے اور فصیل کو مستحکم کر دیتے تھے تاکہ قلعے کا کام دے۔ اگر دشمن حملہ آور ہوتا تو اوپر سے عورتیں اور لڑکے سنگ باری کرتے تھے اور گلیوں میں نوجوان تلواروں کے جوہر دکھاتے تھے۔ آج تک کوئی دشمن مدینہ کی حدود میں داخل نہیں ہو سکا اور جو کوئی اس ارادے سے آیا، مغلوب ہوا، لیکن جب بھی ہم دشمن کے مقابلے کے لیے باہر نکلے تو ضرور ہم نے شکست کھائی۔ اس لیے مناسب ہے کہ آپ میری بات پر عمل کریں۔ میں نے قوم کے بزرگوں اور تجربہ کار لوگوں سے یہ باتیں سنی ہیں۔

اکابر اسلام رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی رائے سے متفق تھے، لیکن کچھ جوشیلے نوجوان جو غزوۂ بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے، یہ سمجھتے تھے کہ ہم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا۔ ان کی رائے تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ دشمن کو یہ گمان نہ ہونا چاہیے، کہ ہم ڈر کے مارے مدینہ کی حدود سے باہر نہیں نکلتے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ غزوہ بدر کی نسبت ہماری طاقت کہیں زیادہ ہے کیوں کہ وہ (غزوۂ بدر) مدینے سے فاصلے پر وقوع پزیر ہوا تھا، اور اس موقع پر اہل مدینہ اپنے لوگوں کی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے یہ بھی کہا "میں اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ قریش واپس جا کر اپنے لوگوں سے کہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کو مدینہ میں محصور کر لیا تھا اور اس طرح قریش ہم پر دلیر ہو جائیں گے۔ قریش ایک سال کی جنگی تیاریوں کے بعد یہاں آئے ہیں، ہمارے لیے مناسب نہیں کہ گھروں میں بیٹھے رہیں اور قریش صحیح سالم چوٹ کھائے بغیر واپس چلے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو قریش کے حوصلے بڑھ جائیں گے اور وہ جب چاہیں گے ہم پر چڑھ دوڑیں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ ہم پر ہماری راہیں مسدود کر دیں گے۔ مدینے سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے حامی یہ بھی کہتے تھے کہ اگر خدا نے ہمیں فتح عطا کی تو ہم اپنی مراد کو پہنچیں گے اور شکست کھا کر مارے گئے تو بہشت میں جگہ پائیں گے۔

جب یہ اندازہ ہو گیا کہ مدینے سے باہر نکل کر لڑنے والوں کی اکثریت ہے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں تمھیں شکست نہ ہو جائے۔" لیکن اس کے باوجود اکثریت کے عزائم میں فرق نہ آیا۔ چناں چہ آپ ﷺ نے امر مجبوری رائے عامہ پر اتفاق کیا اور اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا، کیوں کہ جب تک وحی نازل نہ ہو، کوئی قدم مشورے کے بغیر اٹھایا نہیں جا سکتا تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ آنحضرت ﷺ نے نماز جمعہ مسلمانوں کے ساتھ ادا کی اور یہ فرمایا کہ اگر تم صبر و تحمل سے کام لو گے تو فتح ہی فتح ہے۔ بعد ازاں آپ ﷺ نے حکم دیا کہ دشمن کے مقابلے کے لیے تیاریاں کی جائیں۔ نماز عصر کے بعد آپ ﷺ حجرہ اقدس میں تشریف لے گئے۔ زرہ پہنی اور تلوار پہلو سے لٹکائی۔ اس اثناء میں مسلمانوں کے مابین پھر بحث چھڑ گئی۔ حضرت سعدؓ بن معاذ نے جو مدینے کی حدود میں رہ کر لڑنے کے حامی

ے، دوسری جماعت سے خطاب کیا:

''تم لوگوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ آنحضرت ﷺ قلعہ بندی کی حمایت میں ہیں، مدینہ کی حدود سے باہر نکل کر لڑنے پر اصرار کیا۔ بہر حال اب بھی موقع ہے، معاملہ خود آپ ﷺ کی رائے پر چھوڑ دینا چاہیے، وہ جیسے چاہیں کریں، اور جو حکم دیں، دیں۔ ہمیں ہر حال میں ان کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے۔''

جب حضور ﷺ زرہ پہن کر واپس تشریف لائے تو انھوں نے عرض کیا کہ ہم نے آپ ﷺ کی مرضی کے خلاف اصرار کیا۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ آپ ﷺ جو مناسب خیال فرمائیں، قدم اٹھائیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کسی نبی کے لیے جائز نہیں کہ ہتھیار سجا کر اتار دے، جب تک اللہ اس کے اور دشمنوں کے درمیان فیصلہ نہ کردے۔ اب اللہ کا نام لے کر چل پڑو۔ جو میں کہوں، اس پر عمل کرو۔ صابر اور ثابت قدم رہو گے تو اللہ کی نصرت اور فتح تمھارے ساتھ ہوگی۔''

اس کے بعد نبی ﷺ نے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کیا:

مہاجرین کا دستہ۔ اس کا علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو عطا ہوا۔

قبیلہ اوس (انصار) کا دستہ۔ اس کا علم حضرت اسید بن حضیر کو عطا ہوا۔

قبیلہ خزرج (انصار) کا دستہ۔ اس کا علم حضرت حبابؓ بن منذر کو عطا ہوا۔

پورا لشکرِ اسلام ایک ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا، جن میں ایک سو زرہ پوش اور پچاس شہسوار تھے۔ خود گھوڑے پر سوار ہوئے (گھوڑے کا نام سکب تھا)۔ کمان کندھے پر ڈال۔ نیزہ ہاتھ میں لیا۔ حضرت ابن ام مکتومؓ کو مدینے میں اپنا نائب مقرر کیا۔ اس کے بعد کوچ کا اعلان فرمایا۔ حضرت سعدؓ بن معاذ اور سعد بن عبادہؓ زرہ پہنے حضور ﷺ کے آگے آگے چل رہے تھے۔

مدینے کے نواحی علاقے ''شیخان'' میں پڑاؤ ڈالا گیا۔ یہ جگہ مدینے اور اُحد کے درمیان واقع ہے۔ یہاں آپ نے لشکر کا معائنہ فرمایا۔ ایک دستہ نظر آیا جو نہایت عمدہ ہتھیار پہنے ہوئے تھے اور پورے لشکر سے الگ تھلگ تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ (رأس المنافقین) عبداللہ بن ابی کے حلیف یہودی ہیں۔ فرمایا، تمھاری مدد اسی صورت میں قبول ہے کہ اسلام لاؤ ورنہ اپنے گھروں کا راستہ لو۔ یہ سن کر وہ چلے گئے۔ یہ دشمن کے جاسوس بھی ہوسکتے تھے۔

لشکر کے معائنے کے دوران میں چند نوعمر، کم سن صحابہ بھی نظر آئے جو بہت چھوٹے تھے، اس لیے انھیں واپس کر دیا۔ ان کی تعداد سترہ بتائی جاتی ہے، جن کی عمر چودہ سال سے کم تھی۔ ان میں قابل ذکر یہ ہیں:

- حضرت اسامہ بن زیدؓ
- حضرت ابوسعید خدریؓ
- حضرت عرابہ بن اوسؓ
- حضرت عمرو بن حزمؓ
- حضرت زید بن ثابتؓ
- حضرت عبداللہ بن عمرؓ
- حضرت سعید بن جبیرؓ
- حضرت اسیدؓ بن ظہیر

البتہ کم سنی کے باوجود رافع بن خدیجؓ اور سمرہ بن جندبؓ کو جنگ میں شرکت کی اجازت مل گئی۔ جب حضور ﷺ لشکر کا معائنہ فرما رہے تھے تو رافعؓ پنجوں کے بل کھڑے ہوگئے تاکہ اصلی عمر ظاہر نہ ہو۔ پکڑے گئے، لیکن ثابت کر دیا کہ بہت اچھے تیر انداز ہیں، اس لیے جہاد میں شریک ہونے کی اجازت مل گئی۔ اس پر سمرہ بن جندبؓ کہنے لگے کہ میں رافعؓ سے زیادہ طاقت ور ہوں، اور میں اسے پچھاڑ سکتا ہوں۔ چناں چہ حضور ﷺ نے اپنے سامنے دونوں سے کشتی لڑوائی اور سمرہؓ نے رافع کو پچھاڑ دیا۔ لہٰذا انھیں بھی اجازت مل گئی۔

شیخان کے مقام پر رات گزاری گئی۔ پہرے کے لیے پچاس صحابہؓ منتخب فرمائے۔ ان کے نگران محمد بن مسلمہ انصاری تھے، جنھوں نے کعب بن اشرف یہودی کو ٹھکانے لگانے والے دستے کی قیادت کی تھی۔ حضرت ذکوانؓ بن عبداللہ خاص رسول اللہ کے خیمے پر متعین تھے۔ انھوں نے زرہ پہنی۔ ہاتھ میں ڈھال پکڑی اور ساری رات لشکر میں چکر لگاتے رہے۔

عبداللہ بن ابی کی منافقانہ چال

طلوعِ فجر سے کچھ پہلے آپ ﷺ پھر چل پڑے اور مقام قنطرہ (بعض مورخین مقام شوط لکھا ہے) پر حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم ہوا۔ اصحاب نے صفیں سیدھی کیں اور فجر کی نماز ادا کی۔ دشمن اتنا قریب تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اسی مقام پر رأس المنافقین عبداللہ بن ابی نے بغاوت کر دی۔ اس نے کہا: ''آنحضرت نے نافرمانی کی اور میری رائے قبول نہ فرمائی۔ ہم بے وجہ اپنی جانوں کو کیوں ہلاکت میں ڈالیں۔ یہ جنگ نہیں ہے، اگر ہم اسے جنگ سمجھتے تو تمھارا ساتھ دیتے۔''

وہ کوئی ایک تہائی لشکر یعنی تین سو افراد کو لے کر واپس مدینہ چلا گیا۔ عبداللہ بن ابی کے یوں اچانک اور عین میدان جنگ میں لوٹنے کو ایک مذموم نفسیاتی چال ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس پر مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے خوب تبصرہ کیا ہے:

''یقیناً اس علیحدگی کا سبب وہ نہیں تھا جو اس منافق نے ظاہر کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بات نہیں مانی اور دوسروں کی بات مان لی، کیوں کہ اس صورت میں جیش نبوی ﷺ کے ساتھ یہاں تک اس کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے لشکر کی روانگی کے پہلے قدم ہی پر الگ ہو جانا چاہیے تھا۔ اس لیے حقیقت وہ نہیں جو اس نے ظاہر کی تھی، بلکہ حقیقت یہ تھی کہ وہ اس نازک موڑ پر الگ ہو کر اسلامی لشکر میں ایسے وقت اضطراب اور کھلبلی مچانا چاہتا تھا، جب دشمن اس کی ایک ایک نقل و حرکت دیکھ رہا ہو، تاکہ ایک طرف تو عام فوجی نبی کریم ﷺ کا ساتھ چھوڑ دیں اور جو باقی رہ جائیں، ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں اور دوسری طرف اس منظر کو دیکھ کر دشمن کی ہمت بندھے اور اس کے حوصلے بلند ہوں۔ لہٰذا یہ کارروائی نبی ﷺ اور ان کے مخلص ساتھیوں کے

خاتمے کی ایک موثر تدبیر تھی، جس کے بعد اس منافق کو توقع تھی کہ اس کی اور اس کے رفقا کی سرداری وسربراہی کے لیے میدان صاف ہو جائے گا۔''

(الرحیق المختوم: صفحہ 346)

قریب تھا کہ عبداللہ بن ابی اپنے مقاصد کی برآوری میں کام یاب ہو جاتا، کیوں کہ مزید دو جماعتوں یعنی قبیلہ اوس میں سے بنو حارثہ اور قبیلہ خزرج میں سے بنو سلمہ کا ایمان بھی ڈگمگا گیا تھا اور وہ بھی مدینہ واپسی کی سوچ رہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی دست گیری کی اور یہ دونوں جماعتیں اضطراب کے بعد جم گئیں۔ ان دونوں جماعتوں کے متعلق سورۂ آل عمران کی آیت 122 میں ارشاد ہے:

﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَo﴾ (آل عمران: 122)

''یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے، حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔''

عبداللہ بن ابی جب تین سو منافقین کو اپنے ساتھ لے کر راستے سے پلٹنے لگا تو بعض مسلمانوں نے جا کر اسے سمجھانے اور ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا چاہا۔ انھیں ان کا فرض یاد دلایا اور کہا، آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفاع کرو۔ مگر اس نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ جنگ نہیں ہوگی، اس لیے ہم جا رہے ہیں۔ ان منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَo﴾ (آل عمران: 167)

''وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر کی) مدافعت ہی کرو، تو کہنے لگے، اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور ساتھ چلتے۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے، اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے تھے، جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں، اللہ اسے خوب جانتا ہے۔''

شیخان (یا شیخین) کے مقام پر حضور ﷺ نے رات کے ابتدائی حصے میں آرام فرمایا پچھلے پہر بیدار ہوئے اور لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ مجاہدین فوراً تیار ہو گئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''ہمارے رہبر کہاں ہیں؟ کون ایسا ہے جو ہمیں اس ٹیلے کی ایسی جانب سے لے جائے کہ کافر ہمیں دیکھ نہ سکیں۔''

ابوخیثمہؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ، میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

چناں چہ وہ رسول اللہ ﷺ کو اور لشکر کو لے کر بنو حارثہ قبیلے کے کھیتوں اور پتھریلے میدان کے درمیان سے گزرے۔ ایک شخص مربع بن قیظی کا باغ راستے میں پڑتا تھا۔ یہ بد باطن منافق تھا اور نابینا تھا۔ وہ زمین سے مٹی اٹھا اٹھا کر مسلمانوں کے چہروں پر پھینکنے لگا اور بولا: ''اگر آپ اللہ کے رسول ہیں تو میں آپ کو اجازت نہیں دیتا کہ آپ میرے باغ اور مکانوں کے درمیان سے گزریں'' لوگ دوڑے کہ گستاخ کو قتل کر دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''اسے قتل نہ کرو۔ یہ آنکھ اور دل دونوں کا اندھا ہے۔''

اس وقت کا مدینہ

پھر نبی کریم ﷺ نے آگے بڑھ کر وادی کے آخری سرے پر واقع احد پہاڑ کی گھاٹی میں نزول فرمایا اور وہیں اپنے لشکر کا کیمپ لگوایا۔ سامنے مدینہ تھا اور پیچھے احد کا بلند و بالا پہاڑ، اس طرح دشمن کا لشکر مسلمانوں اور مدینے کے درمیان حد فاصل بن گیا۔

میجر جنرل محمد اکبر خان ''حدیث دفاع'' میں لکھتے ہیں: ''عہد نبوی ﷺ میں مدینے کی آبادی موجودہ زمانے کی آبادی سے بالکل مختلف تھی۔ اس وقت نہ عالی شان مکانات تھے نہ گنجان محلے۔ مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے سے ایک ایک دو فرلانگ پر چھوٹی چھوٹی بستیوں میں رہتے تھے۔ اس طرح مدینہ اس مجموعہ دیہات کا نام تھا جن میں بت پرست، یہودی اور مسلمان سب آباد تھے، اور جوف مدینہ تقریباً دس ساڑھے دس میل لمبے اور دس میل چوڑے میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ میدان چاروں طرف سے پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ ان میں اُحد کا پہاڑ شمال میں تقریباً تین میل کے فاصلے پر شرقاً غرباً پھیلا ہوا ہے۔ اس کی شمالی چوٹی جبل ثور کہلاتی ہے۔ جنوب میں جبل عیر ہے۔ مدینے کی آبادی جبل ثور سے جبل عیر تک پھیلی ہوئی تھی۔

''آنحضرت کے مدینے تشریف لانے سے پہلے، پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس طویل وعریض میدان کو ''جوفِ مدینہ'' کہتے تھے۔ آپ ﷺ نے ہجرت کے بعد اسے حرم قرار دیا اور اب یہ حرمِ مدینہ کہا جانے لگا۔ میدان کے چاروں طرف ایک دوسری سے متصل بلند پہاڑیوں کا سلسلہ بہت دور تک چلا گیا ہے، جس کی وجہ سے آمد ورفت کے راستے تنگ وادیوں میں سے ہو کر گزرتے ہیں۔ حرم مدینہ کا میدان بھی ہموار نہیں، بلکہ اس میں بھی جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جو جنگ میں حملے اور دفاع کے اعتبار سے بہت زیادہ اہم ہیں۔

قبائل کی بستیوں میں آب رسانی کاریزوں سے ہوتی ہے یا قریب کی وادیوں میں کنوئیں کھودے گئے ہیں۔ ہر بستی میں ایک یا دو ایسے سنگی مکانات بنے ہوئے تھے، جن میں جنگ کے موقع پر عورتیں اور بچے پناہ لے سکتے تھے۔ اس قسم کی پناہ گاہوں کا رواج عرب سے لے کر پاکستان کے صوبہ سرحد تک تھا اور سرحدی پٹھانوں میں اب تک ہے۔ یہ مینار نما ہوتے تھے، جن پر چڑھ کر دشمن پر گوپیوں سے پتھر وغیرہ پھینکے جاتے تھے، اب گولا اندازی کی جاتی ہے۔ عرب میں ان محفوظ مکانوں کو ''آطام'' کہتے ہیں جس قبیلے کی بستی میں آطام زیادہ ہوتے تھے، وہ طاقت ور اور آسودہ حال تصور کیا جاتا تھا۔ آطام عموماً دو منزلہ بنائے جاتے تھے، مگر بعض قبائل سہ منزلہ اور

زلہ بھی بناتے تھے۔ چوں کہ مدینے کے قرب و جوار میں لاوا کے سیاہ پتھر بکثرت ملتے ئے، اس لیے آطام کی نچلی منزل سیاہ پتھر کی بنی ہوئی ہوتی تھی۔ سنگی ہونے کی وجہ سے ن اس میں آگ نہیں لگا سکتا تھا۔ قبائلی بستیاں عام طور پر وادیوں کے قریب ہوتی یں، اس لیے پانی آسانی سے مل جاتا تھا۔ اسی وجہ سے بستیوں کے چاروں طرف غات ہوتے تھے، جن کی حفاظت کے لیے پتھر کی چار دیواری ہوتی تھی۔

ہجرت کے بعد آنحضرت ﷺ نے جس بستی میں قیام فرمایا، وہ ان ساری ستیوں کے وسط میں تھی۔ اس کا نام یثرب تھا اور اسی کے نام پر بستیوں کا سارا مجموعہ ثرب کہلاتا تھا۔ باغات اور گنجان آبادیاں اس کے مغرب، جنوب اور شمال مشرق میں قع تھیں۔ مشرق کی طرف قبا سے احد کے قریب تک شمالاً جنوباً زیادہ تر یہودی آباد تھے، جن کے محلے گنجان اور دور دور تک مسلسل چلے گئے تھے۔ یثرب کے شمال مغرب یں بئر رومہ تک وادی العقیق کے کناروں پر بہت سے باغات تھے۔ بئر رومہ کا یہ علاقہ بھی یہودیوں کے قبضے میں تھا یہ علاقہ بہت زرخیز تھا۔ اس میں ہر قسم کے پھل اور اناج کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔

''شمالی علاقہ کھلا ہوا تھا، مگر اس میدان کی زمین شور ہونے کی وجہ سے اس میں زراعت نہیں ہو سکتی۔ مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر اسی راستے سے حملے کا ارادہ کیا اور جنوب کے راستے کو، جو دشوار گزار وادیوں اور گھاٹیوں میں سے گزرتا ہے، استعمال نہیں کیا۔ اس میں لاوے کے پتھر اس طرح حائل ہیں کہ قافلے والے بھی اسے استعمال نہیں کرتے۔ پانی کی کمیابی اور پتھروں کے تپ جانے کی وجہ سے گرمی ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ پرانے زمانے میں قافلے جبل عیر کے مغرب سے وادئ العقیق کے ریتلے راستے سے بئر رومہ کے شمال میں غابہ کے قریب جنوب کی طرف مڑ کر وادی قناۃ میں آتے تھے۔ وہاں سے وادی بطحاء کے ریت بھرے نالوں میں چل کر مدینے میں داخل ہوتے تھے، تاکہ اونٹوں کے پاؤں زخمی نہ ہوں۔

جبل احد مدینے کے شمال میں شرقاً غرباً کئی میل تک پھیلا ہوا ہے اور وادئ قناۃ اس کے دامن میں ہے۔ اس پہاڑ سے صرف ایک دشوار گزار پگڈنڈی گزرتی ہے، جو نعل کی شکل کی وادی سے ہو کر اس کی بلند چوٹیوں تک چلی گئی ہے۔ یہ وادی ایک سطح مرتفع میدان ہے جس میں دو چشمے بہتے ہیں۔ اسی وادی میں ایک چھوٹا سا پہاڑی ٹیلہ ہے جسے غالباً ان دو چشموں کی وجہ سے ''جبل عینین'' کہتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس ٹیلے پر تیر اندازوں کا دستہ متعین فرمایا تھا۔'' (اب اسے جبل رماۃ کہتے ہیں)

دفاعی مورچہ

جبل عینین کا جغرافیائی مقام اور عسکری پوزیشن بڑی اہم اور کلیدی تھی۔ اس راہ سے دشمن کے اچانک حملے کا خطرہ تھا۔ آپ ﷺ نے بڑی تیزی سے نقل و حرکت کر کے اس مقام کو دفاعی مورچہ بنا کر دشمن کو اس اہم عسکری جگہ سے محروم کر دیا۔ حضور ﷺ نے اس اہم مورچے پر بنی عمرو بن عوف کے حضرت عبداللہ بن جبیر بن نعمان انصاری کی قیادت میں پچاس تیر اندازوں کو مقرر فرمایا اور ہدایت فرمائی کہ خواہ کچھ بھی ہو، اسلامی لشکر کو فتح ہو یا شکست، وہ اپنا مورچہ نہ چھوڑیں اور بائیں بازو سے حملہ کرنے والوں کو روکے رکھیں۔ آپ ﷺ نے انھیں تاکید فرمائی:

''اگر دشمن کے گھڑ سوار اس طرف سے ہم پر حملہ کریں تو ان پر چوڑے پھل والے تیروں کی بوچھاڑ کر دینا، تاکہ وہ اس طرف سے ہو کر ہم پر عقب سے حملہ نہ کر سکیں۔ ہم دشمن پر فتح پا لیں تب بھی تم اپنے مورچے پر ڈٹے رہنا۔ تمھاری طرف سے دشمن ہم پر حملہ نہ کرنے پائے۔ اگر تم دیکھو کہ ہم نے مشرکین کو شکست دے دی ہے اور ہم ان کے لشکر میں گھس کر انھیں بے دریغ تہ تیغ کر رہے ہیں، تب بھی تم اپنی جگہ نہ چھوڑنا اور اگر تم دیکھو کہ پرندے ہمیں اچک کر لے جا رہے ہیں اور دشمن ہمیں تہ تیغ کر رہے ہیں، تب بھی ہماری مدد کے لیے مت آنا۔ ہمارا دفاع ہرگز نہ کرنا۔ اپنے مورچوں کو ہرگز نہ چھوڑنا۔ جب تک میں تمھاری طرف اپنا خصوصی پیغام نہ بھیجوں، دشمن پر تیروں کی موسلا دھار بارش کرتے رہنا، کیوں کہ جہاں تیر برس رہے ہوتے ہیں، وہاں گھوڑے پیش قدمی نہیں کرتے۔ کان کھول کر سن لو، جب تک تم اپنی جگہ پر ڈٹے رہو گے، ہم غالب رہیں گے۔ اے اللہ! گواہ رہنا میں نے انھیں سمجھانے میں اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔''

کتنے واضح احکام ہیں۔ اس مورچے کی اہمیت کی طرف حضور ﷺ نے کیسے صاف شفاف الفاظ میں بار بار توجہ دلائی ہے۔ آپ ﷺ نے تیر اندازوں کو سمجھانے میں اپنا حق ادا کر دیا، حتیٰ کہ یہ بھی وضاحت فرما دی کہ اگر اس حکم کی بجا آوری میں ذرا بھی کوتاہی کی گئی تو نتیجہ بڑا ہولناک ہوگا۔

اہلِ ایمان کی صف بندی

میدانِ جنگ کا بہتر استعمال، لڑائی کے لیے اپنی پسند کی جگہ کا انتخاب، دشمن کے مقابلے میں کم نفری سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا اور حریف کی زیادہ فوج کو بیکار اور تماشائی بنا دینا غزوۂ احد کے اہم خدوخال ہیں۔ اس کی بہترین تشریح بریگیڈیئر گلزار احمد اپنی تصنیف ''غزواتِ رسول ﷺ'' میں یوں بیان کرتے ہیں:

''جبل احد داہنی طرف تھا۔ بائیں طرف وادئ قناۃ کا عمودی کنارہ تھا جو جبلِ عینین پہنچنے سے قبل پوری رکاوٹ کا کام دے رہا تھا۔ اس جانب سے بھی نہ تو سوار اور نہ ہی پیادہ پہلوی حملہ کر سکتے تھے۔ جبل عینین پر متعین تیر انداز عقب کی جانب سے پورا تحفظ مہیا کر رہے تھے۔ جبلِ احد کے اسپنے اور وادی قناۃ کے درمیان تقریباً چار سو گز کا فاصلہ ہے۔ اسے پر کرنے کے لیے 650 مجاہد رہ گئے تھے۔ (پچاس تیر انداز متعین کیے جا چکے تھے)۔ چودہ مجاہد حضور ﷺ کی حفاظت پر مامور تھے۔ چار سو گز پر کرنے کے لیے صرف 618 مجاہد رہ جاتے ہیں۔ تلوار چلانے، نیزہ پھینکنے، ڈھال پر وار روکنے کے لیے فی کس ایک گز فاصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح ساری جگہ اسلامی فوج نے پر کر لی۔ اب مکی فوج کا کمانڈر اپنے رسالے کو مدنی لشکر کا پہلو الٹنے (Roll Up The Flank) کے لیے استعمال کر سکتا تھا۔ اس پوزیشن میں رسالے کا استعمال ناممکن بنا دیا گیا۔ مکی رسالے کے دوسرا استعمال عقبی راستہ تھا، جہاں تیر انداز موجود

تھے۔ جہاں تک دشمن کی عددی برتری کا سوال ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ جبل احد اور وادی قنات کے کنارے، محاذ کو اس قدر محدود کر دیا گیا تھا کہ اسلامی فوج تو محاذ کو مکمل طور پر سنبھال سکتی تھی، مگر مکی لشکر کے زائد افراد کو پہلی صف کے پیچھے کھڑا رہنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، یعنی 218 سے زیادہ تعداد اگلی صف میں کھڑا نہ کر سکتی تھی۔ غرضیکہ جغرافیہ کو تدبیرات کے مطابق استعمال کرنے سے دشمن کی عددی برتری مکمل طور پر ناکارہ بنا دی گئی۔ اس طرح محاذ کو اس حد تک محدود کر دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا لشکر تو پوری طرح استعمال ہو سکتا تھا، مگر دشمن کی فوج استعمال نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ وہ اصول جنگ تھا کہ ''ایسی جگہ دشمن کو لڑنے پر مجبور کیا جائے جو ہمارے لیے مفید ہو۔''

حضور ﷺ نے اسلامی لشکر کی ترتیب یوں مقرر فرمائی: مقدمۃ الجیش (سب سے آگے کے دستے) کی کمان حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو دی گئی۔ دائیں بازو پر حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو اور بائیں بازو پر حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو متعین کیا گیا۔

- میمنہ پر حضرت عکاشہؓ بن محصن اسدی کو مقرر کیا گیا۔
- میسرہ پر حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد کو رکھا گیا۔
- قلب فوج میں ایک طرف حضرت علیؓ اور دوسری جانب حضرت زبیرؓ بن عوام تھے۔ وسط میں غیر زرہ پوش مجاہدوں کے سالار امیر حمزہؓ تھے۔ دو سو مجاہد ایسے تھے جن کے پاس زرہیں تھیں۔ خود رسول ﷺ کے جسم مبارک پر دو زرہیں تھیں۔
- محفوظ دستے (ریزرو) کا کام حضرت محمدؓ بن مسلمہ کے پچاس پہرے داروں سے لیا گیا۔
- ساقہ پر حضرت مقدادؓ ابن عمرو تھے۔
- عَلَم حضرت مصعبؓ بن عمیر اٹھائے ہوئے تھے، جو قریش کے عَلَم برداروں کے خاندان بنی عبدالدار کے فرد تھے۔

دھوپ اور ہوا کے رخ کا خیال رکھا گیا۔ صف بندی اور شعار (کوڈ ورڈ) تو غزوہ بدر ہی سے مسلمانوں نے اپنا لیے تھے۔ غزوہ احد کا کوڈ ورڈ ''امت امت'' یعنی مارو مارو تھا۔ خواتین کی کافی تعداد زخمیوں کی خدمت اور پانی پلانے کے لیے ہم راہ تھی۔

رسول اللہ کے کمان روم میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ فاروق اور حضرت سعدؓ بن معاذ کے علاوہ چند اور مجاہد بھی تھے۔ کمان اور کنٹرول روم کے محافظ اور نگران، حفاظت اور نگرانی کی ڈیوٹی دینے کے ساتھ ساتھ میدان جنگ میں لڑنے والوں تک پیغام رسانی، اور بوقت ضرورت کسی جگہ پر فوری مدد پہنچانے کا فریضہ بھی انجام دیا کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے محافظ دستے میں سے حضرت عاصمؓ اور حضرت طلحہؓ نے قریش کے علم برداروں سے مقابلہ بھی کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے لشکر کی ایک ایک صف کا معائنہ فرمایا اور انھیں تیر کی مانند سیدھا کھڑا کیا۔ کسی ایک بھی مجاہد کا کندھا یا بازو صف سے تھوڑا سا بھی آگے نظر نہیں آتا تھا۔

خطبۂ رسول ﷺ

لشکر کو ترتیب دینے کے بعد حضورؐ نے مجاہدین سے خطاب فرمایا۔ اس خطبے کا اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ترجمہ: محترم پیر محمد کرم شاہ الازہری)

''اے لوگو! میں تمھیں اس چیز کی وصیت کرتا ہوں جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی کتاب میں دیا ہے کہ میں اس کی اطاعت کروں اور حرام کاموں سے بچوں آج کے دن تم خیرِ کثیر اور اجرِ عظیم کے مقام پر کھڑے ہو جس نے اپنے اس مقام کو یاد رکھا اور پھر اس نے اپنے نفس کو صبر، یقین، جہد مسلسل اور خوش دلی کا خوگر بنایا کیوں کہ دشمن سے جہاد کرنا بہت مشکل کام ہے کم لوگ ہیں جو اس صبر آزما مرحلے میں ثابت قدم رہتے ہوں بجز ان لوگوں کے، جنھیں اللہ تعالیٰ سیدھی راہ پر پختہ کر دیتا ہے بے شک اللہ اس کا مددگار ہے جو اس کا فرماں بردار ہے اور شیطان اس کے ساتھ ہوتا ہے جو اللہ کا نافرمان ہوتا ہے آج صبر کے ساتھ، اپنے عمل کا آغاز جہاد سے کرو اور اس کے ذریعے اپنے اللہ سے وہ چیز طلب کرو۔ جس کا اس نے تم سے وعدہ فرمایا ہے۔ جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے تمھیں حکم دیا ہے۔ اس کی پابندی لازم جانو۔ بلاشبہ میں تمھاری ہدایت پانے پر بہت حریص ہوں باہمی اختلاف، جھگڑا اور بزدلی عجز اور ایمان کی کم زوری کی علامتیں ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اور اس پر کسی کو فتح اور کام یابی سے نہیں نوازتا اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے یہ بات از سر نو میرے دل میں ڈال دی ہے کہ جو شخص حرام کام کرتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے اور اس کے درمیان جدائی کر دیتا ہے اور جو شخص اللہ کی رضا کی خاطر حرام کاموں سے منہ موڑتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اس پر دس بار درود بھیجتے ہیں جو شخص احسان کرے کسی مسلمان پر یا کافر کے ساتھ اس کا اجر اللہ تعالیٰ پر لازم ہو جاتا ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر جمعہ فرض ہے، بجز نابالغ، عورت، بیمار اور غلام کے جو شخص نماز سے بے پروائی کرے گا اللہ تعالیٰ اس سے بے پروائی کرے گا اور اللہ غنی ہے میں کوئی ایسا عمل نہیں جانتا جو تمھیں اللہ کے قریب کر دے مگر میں نے تمھیں اس کا حکم بجا لانے کے لیے کہا ہے اور میں کوئی ایسا عمل نہیں جانتا جو تمھیں آتش دوزخ کے قریب کر دے مگر میں نے تمھیں اس سے منع کیا ہے میرے دل میں جبرئیل امین نے یہ بات ڈال دی ہے کہ کوئی آدمی اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ اپنے رزق کا آخری لقمہ بھی پورا حاصل کر لے، اور اس سے ذرا بھی کم نہیں پس اللہ تعالیٰ جو تمھارا پروردگار ہے، اس سے ڈرتے رہو اور رزق طلب کرنے میں خوب صورت ذرائع (حلال) اختیار کرو رزق کے ملنے میں تاخیر تمھیں اس بات پر برانگیختہ نہ کرے کہ تم اللہ کی نافرمانی کر کے اسے طلب کرو کیوں کہ جو چیز اللہ کے پاس ہے وہ اس کی فرماں برداری ہی سے حاصل کی جا سکتی ہے اللہ تعالیٰ نے حلال و حرام کی وضاحت کر دی ہے ان کے علاوہ ان کے درمیان مشتبہ چیزیں بھی ہیں۔ جو شخص ان مشتبہ چیزوں کا ارتکاب کرتا ہے وہ اس چرواہے کی طرح ہے جو کسی محفوظ چراگاہ کے کنارے پر پہنچ جاتا ہے قریب ہے کہ

محفوظ چراگاہ میں داخل ہو جائے خبردار! اللہ تعالیٰ کی محفوظ چراگاہیں اس کے محارم ہیں ایک مومن دوسرے مومنوں کے لیے اس طرح ہے جیسے سر جسم کے لیے جب سر بیمار ہوتا ہے تو سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے اور تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی ہو۔"

اس تاریخ ساز اور ایمان افروز خطبے کے بعد آنحضرت ﷺ نے مجاہدین کے لیے اللہ تعالیٰ سے سلامتی کی دعا کی اور فرمایا: "جب تک میں حکم نہ دوں، کوئی شخص لڑائی کا آغاز نہ کرے۔"

حضور ﷺ کی تلوار

اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور فرمایا: "کون ہے جو اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ قبول کرے؟"

"یا رسول اللہ، اس تلوار کو لینے کا کیا حق ہے؟" صحابہ نے عرض کیا۔

"دشمن پر اس قدر چلانا کہ یہ تلوار ٹیڑھی ہو جائے" رسول اللہ نے فرمایا۔

"یا رسول اللہ، مجھے عنایت فرمائیں" حضرت عمر فاروقؓ نے عرض کیا۔

رسول اللہ نے تلوار انھیں نہیں دی۔

حضرت زبیرؓ نے عرض کیا، مگر رسول اللہ ﷺ نے انھیں بھی تلوار نہیں دی

"یا رسول اللہ، یہ تلوار مجھے عنایت فرمائیں" حضرت ابودجانہؓ نے درخواست کی

رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلوار انھیں عنایت فرما دی۔

حضرت ابودجانہؓ رسول اللہ ﷺ کی تلوار پا کر بہت خوش ہوئے۔ ان کے پاس سرخ رنگ کا ایک پٹکا تھا۔ اسے لوگ موت کا پٹکا کہتے تھے۔ ابودجانہؓ لڑائی کے وقت نشانی کے طور پر وہ پٹکا اپنے سر پر باندھ لیتے تو لوگ کہتے، کہ اب رقصِ مرگ شروع ہو جائے گا۔

انھوں نے وہی پٹکا نکالا۔ اسے سر پر باندھا اور بڑے فخر سے اکڑ کر چلنے لگے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس طرح اترا اترا کر چلنے کو ناپسند فرماتے ہیں، لیکن موقع ایسا ہے کہ اس طرح چلنا پسندیدہ ہے۔"

مشرکین کی صف آرائی

بارہ دن کا سفر طے کر کے تین ہزار کا قریشی لشکر مدینے کے نواح میں پہنچا۔ وہ بدھ کے دن مدینے پہنچے۔ انھوں نے تین دن تک آرام کیا۔ اپنے گھوڑے اور اونٹ کھیتوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیے، جنھوں نے فصلوں کا ناس کر دیا۔

☆ قریشی لشکر کے سپہ سالار ابوسفیان نے صف آرائی کی اور کوڈ ورڈ "یاللعزیٰ یاللھبل" مقرر کیا، یعنی اپنے سب سے بڑے بتوں عزیٰ اور ہبل کو اس جنگ میں پکارا گیا۔

☆ میمنہ کی کمان خالد بن ولید کے سپرد کی گئی۔ عمرو بن العاص ان کے پیچھے درہ کوہ کے مقابل تھے۔

☆ میسرہ کی قیادت عکرمہ بن ابوجہل کو تفویض ہوئی۔

☆ قلب میں صفوان بن امیہ کو مامور کیا گیا۔

☆ تیراندازوں کے دستے کی کمان عبداللہ بن ربیعہ کر رہا تھا

☆ مشرکین کے لشکر کا علم بردار طلحہ بن ابی طلحہ تھا جو بنوعبدالدار کا فرد تھا۔

ابوسفیان صفوں میں چکر لگاتے ہوئے جب طلحہ کے پاس سے گزرا تو اس نے کہا،

"اے بنی عبدالدار، ہم خوب جانتے ہیں کہ میدان جنگ میں قوم کا جھنڈا تھامنے کا حق تمھارا ہے۔ یہ تمھارے خاندان کا قدیم سے حق رہا ہے۔" علم برداری کا منصب انھیں اس وقت سے حاصل تھا، جب بنوعبدمناف نے قصی سے وراثت میں پائے ہوئے مناصب کو باہم تقسیم کیا تھا۔ باپ دادا سے جو دستور چلا آ رہا تھا، اس کے پیشِ نظر کوئی شخص اس منصب کے بارے میں ان سے نزاع نہیں کر سکتا تھا، لیکن یہ کہہ کر ابوسفیان ان کے جذبات میں انتقام کی آگ بھر دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے انھیں یاد دلایا

"جنگ بدر میں بھی پرچم بردار نضر بن حارث بنوعبدالدار سے تھا اور اس کی وجہ سے قریش کو کن حالات سے دوچار پڑا تھا اور ہم پر کیسی قیامت ٹوٹی تھی۔ وہاں بھی جھنڈا تمھارے پاس ہی تھا۔ درحقیقت فوج پر جھنڈے ہی کی جانب سے زد پڑتی ہے۔ اگر جھنڈا گر جائے تو لڑنے والے حوصلہ ہار جاتے ہیں اور میدانِ جنگ سے فرار ہو جاتے ہیں۔ پس اب کی بار آپ لوگ یا تو ہمارا جھنڈا ٹھیک طور سے سنبھالیں یا ہمارے اور جھنڈے کے درمیان سے ہٹ جائیں۔ ہم اس کا انتظام خود کر لیں گے۔"

بنی عبدالدار نے طیش میں آ کر کہا: کیا ہم اپنا جھنڈا تمھارے حوالے کر دیں۔ ناممکن۔ کل تمھیں پتہ چل جائے گا کہ ہم جھنڈے کی حفاظت کیوں کر کرتے ہیں۔

ابوسفیان کا مقصد پورا ہو گیا۔ بدر کی لڑائی میں قریش کے دو علم بردار کے بعد دیگرے مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔ آج احد میں ابوسفیان انھیں غیرت دلا کر جھنڈے کی حفاظت کے ان کے قومی جذبے کو ابھارنا چاہتا تھا۔ قریش کا جھنڈا بنی عبدالدار کے طلحہ بن ابی طلحہ نے اٹھایا اور اپنے دو بھائیوں اور چار بیٹوں کو ساتھ لے کر اپنے خاندانی وقار کی حفاظت کے لیے میدان میں داخل ہوا۔ اسلامی فوج کے علم بردار حضرت مصعبؓ بن عمیر کا تعلق بھی اسی خاندان بنی عبدالدار سے تھا۔

ابوسفیان کی چال

آغاز جنگ سے پہلے ابوسفیان نے مسلمانوں کی صف میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس نے انصار کے دونوں قبیلوں اوس اور خزرج کو پیغام بھیجا کہ ہمارے تمھارے دیرینہ دوستانہ تعلقات ہیں، ہمارے معاشی مفادات بھی ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ہمیں ہرگز یہ بات پسند نہیں کہ ہم تم سے جنگ کریں۔ ہمارے وہ قریبی رشتہ دار جو اپنے وطن کو چھوڑ کر تمھارے پاس آ گئے ہیں۔ انھیں ہم سے جنگ کرنے دو۔ تم بیچ سے ہٹ جاؤ۔ ہمارے دل میں تمھاری دیرینہ دوستی کا از حد احترام ہے۔ ہم لوگ تم پر ہرگز ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔

ابوسفیان اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ انصار اس کی باتوں کے فریب میں آ کر میدان جنگ سے واپس چلے جائیں گے، لیکن انصار نے اسے نہایت سخت جواب دیا

اور کڑوی کسیلی سنائیں۔

ابو عامر......راہب فاسق

مدینہ میں آنحضور ﷺ کی آمد سے پہلے قبیلہ اوس کا ایک فرد ابو عامر مذہبی پیشوا تھا۔ انصار اس کا بہت احترام کرتے تھے اور اسے ''راہب'' کہا جاتا تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس کا نام ''فاسق'' رکھ دیا تھا۔ جب انصار کے دونوں قبیلے اوس اور خزرج حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے تو ابو عامر مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا گیا اور وہیں آباد ہو گیا۔ غزوۂ احد میں بھی وہ مشرکین کے ساتھ آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ انصار اب بھی حسب سابق میرا احترام کریں گے اور میری ہر بات تسلیم کریں گے۔ اس خوش فہمی کی بنا پر اس نے مشرکین کو یقین دلا رکھا تھا کہ اگر میں نے انصار کو محمد ﷺ کا ساتھ چھوڑ دینے کا کہہ دیا تو ان میں سے ایک آدمی بھی میرے حکم سے سرتابی نہیں کرے گا۔ چناں چہ جب لڑائی شروع ہوئی تو ابو عامر صفوں سے برآمد ہوا اور قبیلہ اوس کو مخاطب کر کے بولا:

''اے اوس کے لوگو! مجھے پہچانتے ہو، میں کون ہوں؟ میں ابو عامر ہوں۔''

اس کا خیال تھا کہ یہ سنتے ہی اوس میرے ہاتھ پاؤں چومنے کے لیے دوڑ پڑیں گے، مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اوس نے بھی چلا کر کہا: ''او بدکار، خدا تیری آنکھوں کو کبھی ٹھنڈا نہ کرے۔''

اوس کا یہ جواب سن کر ابو عامر کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ کہنے لگا: ''میرے بعد میری قوم برائی میں مبتلا ہو گئی ہے۔''

پھر غصے میں پتھر اٹھا کر مسلمانوں کو مارنے لگا۔ اس کے غلام بھی اپنے آقا کو سنگ باری کرتے دیکھ کر اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔ جواباً مسلمانوں نے بھی از راہ تفنن انھیں پتھر مارنا شروع کر دیے۔ پتھروں کی بارش سے گھبرا کر یہ لوگ جلد ہی بھاگ اٹھے اور مشرکین کے لشکر میں پناہ گزیں ہو گئے۔

قریش کے علم بردار

جنگ کے آغاز ہی میں یوں لوگوں کا بھاگ اٹھنا کوئی اچھا شگون نہ تھا۔ اس سے باقی فوج کے حوصلے بھی پست ہونے کا خطرہ تھا، اس لیے مشرکین کا علم بردار طلحہ بن ابو طلحہ جوش اور جذبے سے جھنڈا اٹھائے آگے بڑھا تو قریش کی خواتین دف بجاتی ہوئی لشکر کی صفوں سے آگے نکل آئیں۔ ان خواتین میں اسلامی لشکر کے علم بردار حضرت مصعبؓ بن عمیر کی مشرک والدہ حناس بھی شامل تھی جو اپنے دوسرے بیٹے ابو عزیز کو بھی مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لیے ساتھ لائی تھی۔ خواتین جنگ بدر میں قتل ہو جانے والے قریش کے سرداروں کے نام لے لے کر اپنی سپاہ کو غیرت دلا رہی تھیں۔ ان کی قیادت ابو سفیان کی بیوی ہندہ کر رہی تھیں۔

''آگے اور آگے!

عبدالدار کے بیٹو آگے بڑھو

عقب میں آنے والو!

اپنی تیز دھار تلواریں نکال لو

اور کاٹ ڈالو، کاٹ ڈالو''

قریش کی خواتین گا رہی تھیں۔ طلحہ بن ابو طلحہ کی بیوی سلافہ بنت سعد بھی دف بجانے اور غیرت دلانے والیوں میں شامل تھی۔ اس کا تعلق مدینہ کے قبیلے اوس سے تھا۔ خواتین گاتی ہوئی اور دف بجاتی ہوئی اسلامی لشکر کے بہت قریب تک گئیں۔ کبھی رومانی اور شہوانی نغمے الاپنے لگتیں۔ ان کے رزمیہ نغمے مشرکوں کا خون گرما رہے تھے اور جذبات کو برانگیختہ کر رہے تھے۔ بول تھے:

چلتی ہیں قالینوں پہ ہم
جیسے چلیں کبک دری
رکھتی ہیں سرسینوں پہ ہم
بصد ادائے دلبری
دکھلاؤ گے جرأت اگر
لاؤ گے انسانوں کے سر
حُسنِ نظر کی آبرو
مانگیں ہماری مشک بو
رکھے جو بستر کی طلب
وہ جنگ کی سختی سہے
سینے پہ چڑھ کے کھاؤ گے
ہم سے گلے مل جاؤ گے
گر بزدلی دکھلاؤ گے
آغوش بستر پاؤ گے
اجڑی ہوئی آبادیاں
ہم ہیں ستارہ زادیاں
افلاک کی شہزادیاں

اُدھر ابو عامر اور اس کے غلاموں کے فرار کے بعد قریش کے علم بردار طلحہ بن ابو طلحہ نے آگے بڑھ کر چیلنج دیا: ''اصحاب محمد ﷺ، تمھارا دعویٰ ہے کہ جسے تم قتل کر دو، وہ جہنم میں جاتا ہے اور جو ہماری تلوار سے قتل ہو، اللہ تعالیٰ اسے جنت دیتے ہیں۔ کون ہے جو اپنی تلوار سے مجھے جہنم میں پہنچائے گا۔''

لشکر اسلام سے حضرت علیؓ تلوار تولتے ہوئے بڑھے۔ ایک ہی وار میں پاؤں کاٹ دیا۔ دوسری ضرب نے سر کے دو ٹکڑے کر دیے۔ مسرت سے حضور ﷺ نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا مسلمانوں نے دہرایا۔ طلحہ کا بھائی عثمان رجز گاتا ہوا آگے بڑھا اور اپنی قوم کا گرا ہوا علم اٹھا لیا۔ حضرت حمزہؓ مقابلے کے لیے آگے بڑھے۔ عثمان ایک بازو شانے سے صاف ہوا تو اس نے قریش کا جھنڈا دوسرے ہاتھ میں لے لیا۔ حضرت حمزہؓ نے دوسرا بازو بھی صاف کر دیا۔ قریش کا علم ایک بار پھر زمین پر گر پڑا۔ جبلِ اُحد ایک بار پھر ''اللہ اکبر'' کے نعروں سے گونج اٹھا۔

طلحہ کے دوسرے بھائی ابوسعید نے آگے بڑھ کر جھنڈا اٹھالیا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا ایک تیر اس کے حلق سے پار ہوگیا۔ ان کی زبان لٹک گئی۔ حضرت سعدؓ نے اسے بھی جہنم کا راستہ دکھایا۔

طلحہ کا دوسرا بیٹا حارث تیار کھڑا تھا۔ اس نے دوڑ کر جھنڈا اٹھایا تو حضرت عاصمؓ نے اسے بھی جہنم واصل کر دیا۔ قریش کا جھنڈا ایک بار پھر گر گیا۔

طلحہ کا تیسرا بیٹا کلاب آگے بڑھا۔ اس نے قریش کا علم اٹھا کر بلند کر دیا۔ حضرت زبیرؓ بن عوام نے اسے زمین بوس کیا۔

طلحہ کے چوتھے بیٹے جلاس نے علَم سنبھالا۔ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ نے اس کا خاتمہ کیا۔

طلحہ کے بھائی اور بیٹے ختم ہو چکے تو ارطاۃ بن شرجیل نے جھنڈا اٹھایا لیکن ایک مجاہد نے اسے بھی ختم کر دیا۔ جھنڈا ایک بار پھر گر گیا۔ اب شریح بن قارط نے علم اٹھا کر اپنی موت کو دعوت دی۔

بنی عبدالدار نے قوم سے جو وعدہ کیا تھا، اسے پورا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کوشش میں اس کے دس افراد یکے بعد دیگرے جہنم رسید ہو گئے تھے۔

بنی عبدالدار میں کوئی علَم اٹھانے والا باقی نہ رہا تو ان کے ایک غلام صواب نے یہ فرض اپنے ذمے لے لیا۔ قزمان اس کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے صواب کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا، تو اس نے علَم گرنے نہیں دیا۔ فوراً بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ وہ بھی کٹ گیا تو جھک کر علَم سینے اور گردن سے لگا کر کٹے ہوئے بازوؤں کی مدد سے اسے تھام لیا اور بلند آواز میں چلایا "میرے خدایا، کیا میں نے لاج رکھ لی ہے۔"

قریش مکہ کے گیارہ علَم بردار ان کی آنکھوں کے سامنے کٹ گئے تھے اور اہل ایمان میں سے کسی کو زخم تک نہیں آیا تھا۔ قریش کا جھنڈا ایک بار نہیں گیارہ مرتبہ گر پڑا تھا۔ مسلسل علَم برداروں کے قتل اور بار بار جھنڈے کے گرنے سے فوج میں پست ہمتی کے آثار پیدا ہوئے۔ انھوں نے پسپائی اور فرار کی راہ اختیار کرنی شروع کی۔ کفار کی جانب سے ایک للکار سنائی دی۔ یہ عبدالرحمٰن حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بیٹے تھے۔ اس کے مقابلے کے لیے خود حضرت ابوبکرؓ تلوار سونت کر نکلے۔ حضور ﷺ نے انھیں جانے سے روکا اور فرمایا: "تم مجھے اپنی ذات سے متمتع ہونے دو۔"

میدان کارزار

یہ ہفتہ کا دن تھا۔ شوال کی سات تاریخ۔ سن تین ہجری۔ عیسوی تقویم کے مطابق 23 مارچ 625ء۔

باقاعدہ عام جنگ کا آغاز ہوا۔ بنی ہوازن کے مشرک تیرانداز تیزی سے بڑھے تو مسلمان تیراندازوں نے تیروں کی بوچھاڑ سے ان کا منہ پھیر دیا۔ اس پر گھڑسوار اور پیدل دستوں نے عام دھاوا بول دیا۔ مسلمان تیراندازوں نے اپنا کمال دکھایا۔ تیروں کی بارش سے سوار لہرا کر گرنے لگے اور گھوڑے رخ پھیر کر اپنے ہی پیدلوں کو کچلنے لگے۔ یہ موقع تھا کہ دو بدو لڑائی شروع ہوئی۔ امیر حمزہ، حضرت علیؓ، حضرت زبیر، حضرت عبداللہ بن جحش، مصعبؓ بن عمیر، طلحہؓ بن عبید اللہ، سعدؓ بن ابی وقاص اور ابودجانہؓ دشمن کی صفوں میں دراتے ہوئے گھس پڑے۔ جدھر جاتے، صفوں کی صفیں الٹ دیتے۔

ابودجانہؓ سرخ پٹکا سر سے باندھے، جدھر سے بھی گزرتے، کشتوں کے پشتے لگا دیتے، یہاں تک کہ دشمن کی صفیں درہم برہم ہوگئیں۔ اسی اثناء میں آپ نے دیکھا کہ لشکرِ قریش کا ایک سپاہی مسلمانوں پر بڑھ بڑھ کر حملے کر رہا ہے۔ آپ شمشیر بکف اس کی طرف جھپٹے تو وہ عورتوں کی طرح چلانے لگا۔ آپؐ نے غور سے دیکھا تو وہ ابوسفیان کی بیوی ہندہ تھی۔ آپ نے اس سے منہ پھیر لیا اور رسول اللہ کی تلوار کو عورت کے خون سے رنگین کرنا گوارا نہ کیا۔ قریش مقتولین بدر کا انتقام لینے کی خاطر بڑی شدت وحدت سے نبرد آزما تھے۔ دونوں فوجوں کے مقاصد جداگانہ تھے۔ ایک فوج جو تعداد میں کہیں زیادہ تھی، جذبۂ انتقام کی تسکین کے لیے سردھڑ کی بازی لگا رہی تھی اور دوسری فوج جس کی تعداد کہیں کم تھی، اپنے ایمان اور وطن کی حفاظت کی خاطر دادِ شجاعت دے رہی تھی۔

قریش کے لشکر کے پیچھے عورتوں کی صفیں تھیں جو مردوں کو غزوۂ بدر کے انتقام پر ابھار رہی تھیں۔ یہ عورتیں جس شخص کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے بھیجتی تھیں، اس سے وعدہ کرتی تھیں کہ اگر تم نے ہمارے رشتہ داروں کے قاتلوں سے انتقام لے لیا تو تمھیں اتنا کچھ ملے گا کہ تم مالا مال ہو جاؤ گے۔ حضرت حمزہؓ نے غزوۂ بدر میں ہندہ کے باپ عتبہ اور دوسرے عزیزوں کو تہ تیغ کیا تھا۔ میدان احد میں آپ ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح بڑی قیامت سامانی کے ساتھ دشمنوں کا خون بہا رہے تھے۔ ادھر ہندہ نے ایک حبشی غلام "وحشی" سے یہ بات طے کر رکھی تھی کہ اگر تو نے حمزہؓ کو ہلاک کر دیا تو میں تجھے مالا مال کر دوں گی۔ اس حبشی غلام کے آقا جبیر بن مطعم (اس کا چچا غزوۂ بدر میں کام آیا تھا) نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر تو حمزہؓ کے قتل میں کامیاب ہوگیا تو میں تجھے آزاد کر دوں گا۔

حضرت حمزہؓ کی شہادت

جب حضرت حمزہؓ لشکرِ کفار کے ایک علم بردار ارطاط بن عبد شرجیل کو تہ تیغ کر چکے تو ان کا سامنا ایک اور مشرک سباع بن عبدالعزیٰ سے ہوا۔ اس نے آپؐ کو دعوت مبارزت دی تو آپ نے اسے للکارا اور پکارا: "اے لڑکیوں کے ختنے کرنے والی کے بیٹے، آ اور حمزہ کا مقابلہ کر۔" جب سباع سامنے آیا تو آپ نے ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ وحشی حضرت حمزہؓ کی تاک میں ایک پتھر کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ جب حمزہؓ ادھر سے گزرے تو وحشی نے پیچھے سے ناف پر نیزہ مارا جو پار ہوگیا۔ حضرت حمزہ چند قدم چلے، لڑکھڑا کر گرے اور شہادت پائی۔

وحشی نے آپ کو شہید کرنے کے بعد آپ کا پیٹ چاک کیا۔ آپ کا کلیجہ نکالا اور ہندہ کے پاس لے آیا۔ اور کہا، "یہ حمزہؓ کا کلیجہ ہے۔" اس نے چبایا، نگلنا چاہا لیکن نگل نہ سکی۔ ہندہ نے زیور اتار کر وحشی کو بطور انعام دیے اور وعدہ کیا کہ مکہ جا کر اسے مزید انعام دے گی پھر اسے کہا چلو میرے ساتھ اور مجھے حمزہ کی لاش دکھاؤ۔ وہاں پہنچ کر اس

سنگدل عورت نے آپ کے کان ناک کاٹے۔ پھر انھیں پرویا۔ اس کے کڑے، بازو بند اور پازیب بنائے جب مکہ میں داخل ہوئی تو یہ زیور پہن کر داخل ہوئی۔

لشکرِ اسلام کے جاں باز مجاہدوں نے عزم واستقلال سے کافروں کا شیرازہ کچھ ایسا منتشر کر دیا تھا کہ اس کے اجزا کی یک جائی دشوار ہوگئی تھی۔ لشکر قریش میں مسلمانوں کی بے پناہ تیغ زنی سے بدحواسی پھیل گئی تھی۔ ان کے گیارہ علم بردار یکے بعد دیگرے کھیت رہے تھے۔ جس نے بھی علم برداری کی جرات کی، وہی تہ تیغ ہوا۔ مختصر یہ ہے کہ مشرکین مکہ کے پاؤں اکھڑ گئے تھے۔ ان کی عورتیں حصار میں لے لی گئی تھیں، اور جس بت کو وہ برکت وسعادت کے لیے اپنے ساتھ لائے تھے، وہ بھی منہ کے بل اوندھا زمین پر پڑا ہوا تھا۔ میدانِ احد میں لشکرِ اسلام کی فتح ہوئی۔

اس اثناء میں جب مکے کے سپاہی پسپائی اختیار کرتے ہوئے اپنے خیموں کے پاس پہنچے تو انھیں ان عورتوں کا سامنا کرنا پڑ گیا جو ان کے ہم راہ میدان جنگ تک آئی ہوئی تھیں۔ عرب میں قدیم زمانے سے یہ دستور چلا آ رہا تھا کہ عورتیں بھی مردوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں حاضر ہوتی تھیں تا کہ ان کا حوصلہ بڑھائیں اور ان کی غیرت بھڑکا کر انھیں پائیداری کے ساتھ مقابلہ کرنے پر اکساتی رہیں۔ اس سلسلے میں ایک عرب شاعر کہتا ہے: ''جب ہم جنگ کرتے ہیں تو ہماری عورتیں میدان جنگ میں نظارہ گر ہوتی ہیں اور ان کی آنکھیں کسی الاؤ کی طرح ہمارے خون کو جوش دلاتی رہتی ہیں۔

ایسی جنگوں میں جہاں مردوں کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ پسپائی اختیار کرنے لگتے تو عرب عورتیں جو فوج کے ہم راہ میدان جنگ تک آتی تھیں، اپنے بال بکھیر لیتیں۔ گریبان چاک کر لیتیں اور تقریباً نیم عریاں حالت میں اپنے دشمن کی طرف دوڑنا شروع کر دیتی تھیں، تا کہ اپنے مردوں کو غیرت دلائیں اور انھیں ڈٹ کر مقابلہ کرنے پر اکسائیں۔''

رومانیہ کے فاضل مستشرق مسٹر کونسٹن ورجیل جورجیو لکھتے ہیں:

''اس دن اُحد کے میدان میں بھی ایسا ہی ہوا۔ قریش کی عورتوں نے جب یہ دیکھا کہ ان کے مرد مسلمانوں کے سامنے ہزیمت اٹھا رہے ہیں تو انھوں نے عمرہ علقمہ نامی بلند قامت عورت کی سرکردگی میں اپنے بال کھول لیے اور اپنے کپڑے کچھ اس طرح پھاڑ لیے کہ انھیں تقریباً عریاں کہا جا سکتا تھا۔''

عمرہ علقمہ نے قریش کے مردوں کو مخاطب کرتے ہوئے بانگ لگائی کہ ''کیا ہوئی تمھاری غیرت؟ کہاں گئی تمھاری حمیت؟ اگر تم گنتی کے چند مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو بھاگنے سے یہی بہتر ہے کہ مزاحمت کرو اور میدانِ جنگ میں عزت سے مر جاؤ، کیوں کہ جو شخص میدان جنگ میں لڑتے ہوئے مارا جائے تو اس پر انگلی نہیں اٹھتی، کیوں کہ وہ اپنا فرض پورا کر چکا ہوتا ہے اور کوئی اسے سرزنش نہیں کرتا کہ تو نے فتح حاصل نہیں کی، لیکن جو مرد اپنی جان کے خوف سے اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے سے بھاگ نکلے تو اسے چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جانا چاہیے اور عورتوں کی طرح بچے سنبھالنے اور کھانا پکانے کی مشق کرنی چاہیے۔ اے بزدلو! تم جاؤ گھروں میں بیٹھو اور گھر سنبھالو۔ ہم تمھاری جگہ میدان جنگ میں جا کر لڑتی ہیں۔''

(عکس سیرت نمبر۔ سیارہ ڈائجسٹ)

لشکر اسلام کی فتح

مسلمانوں کو اپنے سے پانچ گنا فوج کے مقابلے میں جو فتح نصیب ہوئی، اس میں حضور ﷺ کی بے مثال قیادت کے علاوہ اسلام کی روحانی طاقت اور ایمانی قوت کو بھی دخل تھا، کیوں کہ جس شخص کے دل میں عزم ویقین کی قوت ہوتی ہے، وہ مادی قوت کی کثرت سے ہرگز مرعوب نہیں ہوتا۔ بے نظیر سپہ سالاری اور جنگی مہارت ہی فتح کے لیے کافی نہ تھی، ایمانی قوت بھی ضروری تھی۔ تیر اندازوں کا وہ مختصر دستہ جسے گھاٹی پر متعین کیا گیا تھا، صرف پچاس اشخاص پر مشتمل تھا۔ اگر دشمن کے تین سو سپاہی اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے گھاٹی کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتے تو وہ یقیناً اس دستے پر غالب آ سکتے تھے، لیکن ایمان ہی وہ بنیادی طاقت ہے جو کسی صاحبِ ایمان کو مغلوب ہونے نہیں دیتی۔ تیر اندازوں نے بھی جنگ کی رفتار مسلمانوں کے موافق چلانے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔ مکی شہسواروں نے خالد بن ولید کی قیادت میں اور ابو عامر فاسق کی مدد سے اسلامی فوج کا بایاں بازو توڑ کر، مسلمانوں کی پشت تک پہنچنے اور ان کی صفوں میں کھلبلی مچا کر بھرپور شکست دینے کے لیے تین مرتبہ پرزور حملے کیے۔ لیکن مسلمان تیر اندازوں نے انھیں اس طرح تیروں سے چھلنی کیا کہ ان کے تینوں حملے ناکام ہوگئے۔

مسلمانوں نے بھاگتے ہوئے قریش کا دور تک تعاقب کیا تھا، اور جب انھوں نے دیکھا کہ کفار شکست کھا کر بھاگ گئے ہیں اور انھیں فتح حاصل ہوئی ہے تو وہ مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ مال وزر کی طمع نے فتح کو شکست میں بدل دیا۔

فتح کے بعد شکست

تیر اندازوں کے اس دستے نے، جو حضور ﷺ کی ہدایت کے بموجب گھاٹی پر حفاظت کے لیے متعین تھا، جب یہ دیکھا کہ دوسرے مسلمان مالِ غنیمت جمع کر رہے ہیں تو آپس میں ایک دوسرے سے کہا: ''ہم یہاں بے فائدہ کیوں کھڑے رہیں۔ خدا نے دشمنوں کو شکست دے دی ہے، اور ہمارے رفقا اُن کے خیمے لوٹ رہے ہیں۔ ہم بھی چلیں اور مالِ غنیمت جمع کرنے میں شریک ہو جائیں۔''

ان میں سے ایک نے کہا: ''نبی کریم ﷺ کا حکم تو یہ ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہلنا، اگر تم دیکھو کہ ہمیں قتل کیا جا رہا ہے تو ہماری مدد کے لیے ہرگز نہ آنا، اور اگر دیکھو کہ ہم مالِ غنیمت جمع کر رہے ہیں تو اس کام میں ہمارا ہاتھ نہ بٹانا۔''

دوسروں نے اس پر یہ جواب دیا: ''اس فرمان سے یہ مقصود ہرگز نہیں کہ ہم دشمن کی شکست اور پامالی کے بعد بھی، بے مقصد یہاں کھڑے رہیں۔''

اس بات پر اختلاف رائے ہوگیا۔ ان کے قائد حضرت عبداللہ بن جبیرؓ نے کہا: ''نبی اکرم ﷺ کے فرمان کی مخالفت ہمیں کسی بھی صورت میں نہیں کرنی چاہیے۔'' لیکن ان لوگوں نے اس کی پروانہ کی اور مالِ غنیمت کی طمع انھیں کشاں کشاں میدان کی طرف لے گئی۔ جو تیر انداز گھاٹی پر رہ گئے، ان کی تعداد دس سے زیادہ نہ تھی۔

حضور ﷺ کے فرمان کی سرتابی ایسی سنگین غلطی تھی جس نے فتح کو شکست میں بدل دیا۔ خالد بن ولید نے جو دیکھا کہ عینین کی پہاڑی تیر اندازوں سے تقریباً خالی ہو چکی ہے تو اس نے اور عکرمہ نے گھڑ سوار دستوں کو لے کر جبلِ اُحد کا چکر کاٹا اور مسلمانوں پر ان کی پشت سے ہلہ بول دیا۔ حضرت عبداللہؓ بن جبیر اور ان کے ساتھیوں نے مزاحمت کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ ایک ایک کر کے جامِ شہادت نوش کر گئے۔ خالد بن ولید کے دستوں نے حضرت عبداللہؓ اور ان کے ساتھیوں کی لاشوں کو نیزوں کے چرکے دے دے کر خستہ حال کر دیا۔ ان کے لباس اتار کر انھیں برہنہ کر دیا۔ ان کی آنکھیں نکال دیں اور کان کاٹ لیے۔ سینے چاک کر دیے۔ ان کی آنتیں باہر لٹکنے لگیں۔ سب سے زیادہ انھوں نے عبداللہ کی نعش مبارک کی توہین کی اور اسے بوٹی بوٹی کر دیا، لیکن اللہ نے آل عمران کی آیات 169، 170 نازل کر کے انھیں رہتی دنیا تک زندہ کر دیا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (آل عمران: 169 تا 170)

”جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انھیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انھیں دیا ہے، اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں، اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں، ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔“

مسلمانوں کو کچھ خبر نہ تھی، وہ تو مالِ غنیمت جمع کرنے میں مصروف تھے۔ ان کی صفیں درہم برہم ہو چکی تھیں۔ اچانک خالد بن ولید اور عکرمہ اپنے سواروں سمیت "یَالَلْعُزّٰی یَالَلْهُبَل" کے فلک شگاف نعرے لگانے لگے۔ مقصد یہ تھا کہ بھاگتے ہوئے منتشر کفار کو پھر سے جمع کیا جائے۔ جب کفار نے اپنے نعرے سنے اور پلٹ کر دیکھا تو یہاں منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ اب وہ بھی پلٹ کر آنے لگے اور ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کا قتلِ عام کرنے لگے۔ مالِ غنیمت جو مسلمانوں نے اکٹھا کیا تھا۔ وہ واپس لینے لگے۔ جن کفار کو قیدی بنایا گیا تھا، انھیں رہا کروایا گیا۔ زمانے کی چکی الٹی چل پڑی تھی۔ مسلمان، جنھوں نے کفار کو میدانِ جنگ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا، اب خود شکست کھا کر راہِ فرار ڈھونڈ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کی تصویر کشی سورۂ آل عمران کی آیت 152 میں ہوئی ہے:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (آل عمران: 152)

”اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا۔ وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی انھیں قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے بزدلی دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جوں ہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے۔ (یعنی مالِ غنیمت)، تم اپنے سردار (رسول ﷺ) کے حکم کے خلاف ورزی کر بیٹھے، اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے، تب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا، تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمھیں معاف ہی کر دیا، کیوں کہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے۔“

افراتفری کے اس عالم میں کسی شیطان صفت نے چیخ چیخ کر یہ اعلان بار بار دہرایا (نعوذ باللہ) حضور ﷺ کو قتل کر دیا گیا ہے۔ اس جانکاہ خبر سے مسلمان مزید حواس باختہ ہو گئے۔ ایک گروہ تو بھاگ کر مدینہ کی گلیوں میں داخل ہوا۔ سامنے سے ام ایمنؓ آ رہی تھیں۔ انھوں نے جب ان بھگوڑوں کو دیکھا تو زمین سے مٹی اٹھا اٹھا کر ان کے چہروں پر پھینکنے لگیں ”یہ لو چرخہ۔ تم سوت کاتو۔ ہمیں اپنی تلواریں دو۔ ہم دشمنوں سے خود لڑ لیں گی۔“

جان بازوں کی ایک جماعت نے اپنے پریشان حال ساتھیوں کو للکارا کہ آؤ، ہم بھی اس دین کی بقا کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں، جس کی خاطر حضور ﷺ نے جامِ شہادت نوش کیا ہے۔

ادھر سرورِ کائنات ﷺ اپنی کمان سے دشمن پر تیر چلا رہے تھے کہ کمان کا چلا ٹوٹ گیا۔ حضرت عکاشہؓ نے مرمت کی۔ حضور ﷺ پھر تیر برسانے لگے، حتیٰ کہ وہ چلہ کئی جگہ سے ٹوٹ گیا۔ اس اثنا میں حضرت ابوطلحہؓ انصاری حضور ﷺ کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے رہے، تاکہ دشمن کا کوئی تیر حضور ﷺ کو نہ لگے۔ یہاں تک کہ وہ کمان بالکل بے کار ہو گئی۔ حضرت قتادہؓ بن نعمان نے اسے حضور ﷺ سے مانگ لیا اور اپنے پاس بطور تبرک حفاظت سے رکھ لیا۔

کمان کے ٹوٹنے کے بعد پھر حضور ﷺ نے کفار پر پتھر برسانے شروع کر دیے۔ اس وقت حضور ﷺ کے ارد گرد پندرہ جان نثار حصار باندھے سیسہ پلائی ہوئی دیواروں کی طرح کھڑے رہے۔ ان میں سے آٹھ مہاجر اور سات انصار تھے۔ ان وفاشعاروں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

حضرات ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر، عبداللہ بن عوف، سعد بن ابی وقاص، ابوعبیدہ بن جراح، اور سات انصار تھے۔ حباب بن منذر، ابودجانہ، عاصم بن ثابت، حارث بن الصمہ، سہیل بن حنیف، سعد بن معاذ، سعد بن عبادہ اور محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہم۔

رحمت للعالمین پر کفار کا حملہ

کفار نے پرا باندھ کر حضور ﷺ پر اس عزم کے ساتھ ہلہ بول دیا کہ (نعوذ باللہ) زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بدبخت عتبہ بن ابی وقاص نے اوپر تلے چار پتھر مارے۔ ایک پتھر لگنے سے حضور ﷺ کے سامنے والے دو اوپر کے اور دو نیچے کے

دانت شہید ہو گئے۔ جڑ سے نہیں اکھڑے۔ ان کا اوپر کا حصہ الگ ہو گیا اور نیچے والا ہونٹ مبارک زخمی ہو گیا۔

حضور ﷺ کے چہرۂ انور پر عبداللہ بن شہاب زہری کی ضرب سے زخم آیا اور ریش مبارک خون سے رنگین ہو گئی۔ (یہ بعد میں مشرف بہ اسلام ہوا)

عبداللہ بن قمیہ نے حضور ﷺ کا رخسار زخمی کر دیا۔ خود کی دو کڑیاں رخسار میں گھس گئیں۔ پھر وہ تلوار کا وار کرنے لگا۔ حضور ﷺ اس کا حملہ روکنے کے لیے آگے بڑھے کہ سامنے ایک گڑھا تھا۔ اس میں گر پڑے۔ یہ گڑھا ان گڑھوں میں سے ایک تھا جو ابو عامر فاسق نے میدان جنگ میں جگہ جگہ کھدوائے تھے تاکہ مسلمان بے خبری میں ان میں گریں۔ حضرت علیؓ نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ حضرت طلحہؓ نے نیچے اتر کر سہارا دیا۔ تب حضور ﷺ گڑھے سے باہر تشریف لائے۔ آپ ﷺ کے چہرے سے جب خود کی دو کڑیاں نکالی گئیں تو خون کا فوارہ بہنے لگا۔ حضرت مالکؓ بن سنان نے آگے بڑھ کر زخم پر اپنا منہ رکھ دیا اور ابلتا خون چوسنا شروع کر دیا۔

حضرت ابو دجانہؓ میدان جنگ میں مختلف مقامات پر دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ دشمنوں نے حضور ﷺ کا محاصرہ کر رکھا ہے تو آپ دوڑے ہوئے آئے۔ وہاں اس وقت پہنچے جب حضور ﷺ پر چاروں طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ابو دجانہؓ ڈھال بن کر حضور ﷺ کے روبرو کھڑے ہو گئے اور آنے والے تیروں کو اپنی پشت پر لیتے رہے۔ ساری پیٹھ تیروں سے بھر گئی۔ لیکن یہ جاں نثار اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نبی اکرم ﷺ کے قدموں میں کھڑے ہو کر کفار سے جو کھمی لڑتے رہے۔ ان کے سامنے والے دانت ٹوٹ گئے۔ بیس سے زیادہ کاری زخم لگے، لیکن پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آئی۔ ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے لنگڑے ہو گئے اور ساری عمر لنگڑا کر چلتے رہے۔

اسی طرح سعد بن ابی وقاص نے سرورِ عالم ﷺ کو کفار کے حملوں سے بچانے کے لیے جان لڑا دی۔ دشمن کے کسی بڑے سے بڑے شجاع کو مجال نہ ہوئی کہ پھر قریب پھٹک سکے۔ امام ذہبی کی روایت ہے کہ اس روز حضرت سعد نے ایک ہزار تیر کفار کے لشکر پر برسائے۔ حضور ﷺ کی خادمہ ام ایمن مشکیزہ کندھوں پر اٹھائے مجاہدین کو پانی پلا رہی ہیں۔ اچانک حبان کا تیر ام ایمن کے دامن پر آ کر لگتا ہے اور ان کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔ وہ بد باطن ایک خاتون کی ہتک کر کے خوشی کے مارے قہقہے لگاتا ہے سرورِ عالم ﷺ کو اپنی خادمہ کی توہین شاق گزرتی ہے۔ حضور ﷺ حضرت سعدؓ کو ایک ایسا تیر دیتے ہیں جس پر پھل نہیں ہے، اور اسے چلانے کا حکم دیتے ہیں۔ وہ تیر سیدھا حبان کے گلے میں جا لگتا ہے۔ وہ بے تاب ہو کر زمین پر گر جاتا ہے۔

حضرت طلحہ کا سارا جسم زخموں سے چھلنی تھا۔ ان کے زخموں کا شمار کیا گیا تو وہ ستر سے بھی زیادہ تھے، جن میں کچھ تلواروں کے، کچھ نیزوں کے اور کچھ تیروں کے تھے۔ ان کی ایک انگلی بھی کٹ گئی تھی۔ ان کے زخموں کے مرہم پٹی کی گئی۔ ان کے سر پر تیروں کے بہت زخم لگے تھے، جس سے بہت خون بہا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے ان کے منہ پر پانی چھڑکا تو انھیں ہوش آیا۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ پوچھا: ''حضور ﷺ کا کیا حال ہے؟'' بتایا گیا کہ الحمدللہ، خیریت سے ہیں۔'' یہ سن کر حضرت طلحہؓ نے بے ساختہ کہا: ''شکر ہے۔ حضور ﷺ سلامت ہیں۔ آپ ﷺ کے ہوتے ہوئے کوئی مصیبت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔''

مسلم خواتین میدانِ احد میں

حضرت ام عمارہ انصاری اسی روز صبح کو مدینہ سے پانی کا ایک مشکیزہ ساتھ لے کر میدان جنگ میں آئی تھیں اور مسلمانوں کو پانی پلاتی پھرتی تھیں۔ جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تو انھوں نے مشکیزہ پھینک کر تلوار اٹھا لی اور حضور ﷺ کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہو گئیں۔ تیر بھی پھینکتی تھیں اور تلوار بھی چلاتی تھیں، یہاں تک کہ زخم خوردہ ہو کر گر گئیں۔ ام عمارہ اور خانوادۂ نبوت کی مستورات کے علاوہ دیگر خواتین بھی اس معرکہ حق و باطل میں عملاً شامل تھیں۔ ان کی تعداد چودہ تھی۔ ان میں حضرت عائشہؓ، سیدہ فاطمہؓ، ام سلمہؓ، ام سلیطؓ، ربیع بنت مسعودؓ، حمنہؓ بنت جحش، ام ایمنؓ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے صرف ام عمارہ نے قتال میں حصہ لیا۔

یا معشر المسلمین

قریش یہ جان کر بہت خوش تھے کہ نبی کریم ﷺ بھی ہلاک ہو گئے ہیں (نعوذ باللہ)۔ ابو سفیان مقتولین میں آپ ﷺ کو تلاش کرنے چلا۔ نبی کریم ﷺ کی حفاظت جو صحابہ کر رہے تھے، وہ ہلاکت کی غلط افواہ کی تردید اس لیے نہیں کرتے تھے کہ کہیں قریش آپ ﷺ پر حملہ نہ کر دیں۔ اس اثنا میں حضرت کعبؓ بن مالک اس مقام پر آ نکلے، جہاں ابو دجانہ، طلحہ، اور دوسرے صحابہؓ آنحضرت ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے۔ حضرت کعبؓ نے آپ کو پہچان لیا اور پکار کر بآوازِ بلند کہا:

''يَا مَعْشَرَ الْمُسْلِمِيْنَ اَبْشِرُوْا هٰذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ.''

''مسلمانو! خوش خبری ہو کہ رسول اللہ یہاں موجود ہیں۔''

آنحضور ﷺ نے انھیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ان کا خود جو زرد رنگ کا تھا، اپنے سرِ اقدس پر پہن لیا اور اپنا خود اتار کر کعب کے سر پر رکھ دیا۔ مسلمانوں نے حضرت کعبؓ کی بات سن لی تھی۔ سب اس مقام پر پروانہ وار جمع ہو گئے اور آنحضرت ﷺ کو کوہِ احد کی ایک گھاٹی پر لے گئے۔ اس وقت حضور ﷺ کے ہم راہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ، زبیرؓ بن عوام، حارث بن الصمہ اور چند اور صحابہ موجود تھے۔

حضور ﷺ کے زخموں کی مرہم پٹی

حضور ﷺ جب احد کی گھاٹی میں پہنچے تو کفار کے حملوں سے قدرے سکون ملا۔ حضرت علیؓ نے زخموں کی مرہم پٹی کی طرف توجہ کی، جن سے اب تک خون بہہ رہا تھا۔ پہلے اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لائے، تاکہ حضور ﷺ نوش فرمائیں، لیکن اس پانی سے ایک خاص قسم کی بو آ رہی تھی۔ حضور ﷺ نے پینا گوارا نہ کیا۔ پھر

حضور ﷺ کے چہرے پر لگا ہوا خون صاف کیا گیا۔ سر مبارک پر پانی ڈالا گیا۔ محمدؓ بن مسلمہ نے محسوس کیا کہ حضور ﷺ کو پیاس لگی ہوئی ہے۔ چناں چہ وہ پانی کی تلاش میں پہلے ان خواتین کے پاس گئے، جو مشکیں بھر بھر کر اپنے کندھوں پر اٹھائے زخمیوں کو پانی پلاتی رہی تھیں۔ شاید ان کے پاس حضور ﷺ کے پینے کے لیے پانی ہو، لیکن ان سب کے مشکیزے خالی تھے۔ پھر قنات کے نالے پر گئے وہ صاف پانی سے بھرا ہوا بہہ رہا تھا۔ وہاں سے برتن میں پانی بھرا۔ یہ پانی بہت ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ سرور عالم ﷺ نے اسے نوش فرمایا، اور دعائے خیر فرمائی۔

سہیلؓ بن سعد سے روایت ہے کہ جب جنگ رک گئی تو سیدہ فاطمۃ الزہراؓ، جو پہلے مجاہدین کو پانی پلا رہی تھیں، تشریف لے آئیں اور حضور ﷺ کے گلے لپٹ گئیں اور زخم دھونے لگیں۔ حضرت علیؓ پانی ڈالتے جا رہے تھے اور سیدہ زخم دھو رہی تھیں۔ خون صاف کر رہی تھیں، لیکن خون رکنے میں نہیں آ رہا تھا، بلکہ تیزی سے بہنے لگا تھا۔ حضرت سیدہؓ نے چٹائی کا ایک ٹکڑا لیا۔ جلایا۔ جب اس کی راکھ بن گئی تو اسے زخموں پر چھڑکا۔ وہ راکھ زخموں پر چپک گئی، اور خون رسنا بند ہو گیا۔ مرہم پٹی کے بعد حضور ﷺ اٹھے، تاکہ اس گھاٹی کے ٹیلے پر چڑھ کر بلندی سے میدان جنگ کا مشاہدہ فرمائیں۔ چوٹی کافی اونچی تھی۔ اوپر چڑھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ آگے بڑھے اور اکڑوں ہو کر بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ نے اپنا قدم مبارک ان کی پیٹھ پر رکھا اور انھیں جنت کی خوش خبری دیتے ہوئے بلندی پر چڑھ گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "اَوْجَبَ طَلحۃ" یعنی طلحہ نے اپنے آپ کو جنت کا حق دار بنالیا ہے۔

زخموں کی وجہ سے رحمت عالم ﷺ نے ظہر کی نماز بیٹھ کر پڑھی۔ صحابہ کرامؓ نے بھی حضور ﷺ کی اقتدا میں بیٹھ کر نماز ادا کی۔ اس کی وجہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرامؓ بھی اس جنگ میں شدید زخمی ہوئے تھے۔ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی سکت نہ تھی۔

سنگ دلی کی انتہا

ابوسفیان کی بیوہ ہندہ اور مکہ کی دوسری عورتوں کی آتش انتقام ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی۔ جب جنگ کی شدت کم ہوئی اور اس کے اختتام کے آثار نظر آنے لگے تو ہندہ اپنی سہیلیوں کو ہم راہ لے کر مسلمان شہدا کی نعشوں پر گئی اور ان کا بڑی بے دردی سے مثلہ کیا۔ ان کی ناک اور کان کاٹ لیے۔ ان کی آنکھیں نکال لیں۔ حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کیا۔ ان کا دل اور جگر نکالا۔ جگر کچا چبانے کی مذموم کوشش بھی کی، لیکن نگل نہ سکیں اور لاچار تھوکنا پڑا۔ اللہ تعالیٰ کے جن مقبول بندوں کے انھوں نے ناک اور کان کاٹے تھے، انھیں زمین میں دفن نہیں کیا۔ انھیں کہیں پھینک نہیں دیا، بلکہ ان کے ہار پروئے، گجرے بنائے۔ ان کے بازو بند اور چوڑیاں پروئیں۔ پھر گلوں میں ہاروں کی طرح پہنا۔ بازوؤں پر باندھا اور کلائیوں کو ان کے کنگنوں سے آراستہ کیا۔ یہ سب کچھ اس ہندہ نے کیا اور کروایا، اس کو ابھی تھوڑی دیر پہلے حضرت ابودجانہؓ نے اپنی (رسول اللہ کی) تلوار کی زد میں لا کر معاف کر دیا تھا کہ مبادا حضور ﷺ کی تلوار ایک عورت کے خون سے رنگین ہو۔

ابوسفیان اور حضرت عمرؓ آمنے سامنے

جب جنگ بند ہو گئی اور دونوں لشکر الگ الگ ہو گئے اور مشرکین نے واپسی کی تیاری مکمل کر لی تو ابوسفیان اپنے گھوڑے پر سوار، جبل احد پر نمودار ہوا اور آواز بلند بولا "کیا تم میں محمد ﷺ ہیں؟" لوگوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اس نے دوسرا سوال کیا: "کیا تم میں ابوقحافہ کے بیٹے (ابوبکرؓ) ہیں۔" لوگوں نے اس دفعہ بھی جواب نہیں دیا۔ تیسرا سوال اس نے یہ پوچھا کہ "تم میں خطاب کے بیٹے عمر موجود ہیں۔" لوگوں نے اب کی مرتبہ بھی جواب نہ دیا، کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو جواب دینے سے منع فرمایا تھا۔ بہرحال جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے کہا، چلو ان تینوں کو فرصت ہوئی۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ ضبط نہ کر سکے، اور بولے: "او اللہ کے دشمن، جن کا تو نے نام لیا ہے، وہ سب زندہ ہیں۔ تجھے ذلیل و رسوا کرنے کے لیے اللہ نے ہمیں باقی رکھا ہے۔"

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا: "ہمارے لوگوں نے تمھارے مقتولین کے اعضاء کی قطع و برید کی ہے، لیکن خدا کی قسم، مجھے اس حرکت سے کوئی خوشی نہیں ہوئی، میں نے اس چیز کا نہ تو کسی کو حکم دیا تھا اور نہ پھر کسی کو اس فعل سے روکا۔" پھر اس نے نعرہ لگایا: "اعلیٰ ھُبَل" (ہبل بلند ہوا)۔

نبی ﷺ نے فرمایا: "تم لوگ جواب کیوں نہیں دیتے؟" صحابہؓ نے عرض کیا: "کیا جواب دیں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: "کہو "اللّٰہ اعلیٰ وَ اَجلّ" (اللہ اعلیٰ اور برتر ہے)

پھر ابوسفیان نے نعرہ لگایا: "لنا عُزّیٰ ولا عُزّیٰ لکم" (ہمارے لیے عزیٰ ہے، اور تمھارے لیے عزیٰ نہیں)

نبی ﷺ نے فرمایا: "جواب کیوں نہیں دیتے۔" صحابہؓ نے عرض کیا: "کیا جواب دیں؟" آپ نے فرمایا: "کہو "اللّٰہ مَولانَا وَلَا مَولیٰ لکم" (اللہ ہمارا مولا ہے اور تمھارا کوئی مولا نہیں)

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا: "کتنا اچھا کارنامہ رہا۔ آج کا دن بدر کے دن کا بدلہ ہے اور لڑائی کا ڈول ہے۔"

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "برابر نہیں۔ ہمارے مقتولین جنت میں ہیں اور تمھارے مقتولین جہنم میں۔"

ابوسفیان اور اس کے رفقا واپس ہونے لگے تو ابوسفیان نے کہا: آئندہ سال بدر میں پھر لڑنے کا وعدہ ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا: "کہ دو، ٹھیک ہے۔ اب یہ بات ہمارے اور تمھارے درمیان طے رہی۔"

کفار کے رویے کی تحقیق

ابوسفیان نے واپس آ کر اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ آنحضرت ﷺ کو خدشہ

ہوا کہ کہیں ابوسفیان مدینہ پر چڑھائی نہ کر دے۔ اس طرح بچوں اور خواتین کی زندگیوں کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ چناں چہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو لشکر کفار کی نقل و حرکت کی نگرانی کا حکم دیا۔ فرمایا: ''ان کے پیچھے پیچھے جاؤ اور دیکھو وہ کیا کر رہے ہیں اور ان کا ارادہ کیا ہے؟ اگر انھوں نے گھوڑے پہلو میں رکھے ہوں اور اونٹوں پر سوار ہوں تو ان کا ارادہ مکہ کا ہے، اور اگر وہ گھوڑوں پر سوار ہوں اور اونٹ ہانک کر لے جائیں تو مدینے کا ارادہ ہے۔'' پھر فرمایا: ''اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر انھوں نے مدینے پر چڑھائی کی تو میں فوراً ان کے تعاقب میں جاؤں گا اور مدینے جا کر ان سے جنگ کروں گا۔''

حضرت علیؓ وادی عقیق تک ان کی نقل و حرکت دیکھنے کے بعد واپس آئے اور آ کر عرض کی کہ وہ اونٹوں پر سوار ہوئے ہیں اور گھوڑوں کو پہلو میں رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند سر پھروں نے یہ مشورہ دیا کہ مدینہ خالی ہے۔ اسے لوٹتے چلیں، لیکن صفوان بن امیہ نے انھیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ اس نے کہا کہ اپنی بنی بنائی بات کیوں بگاڑتے ہو۔ خاموشی سے نکل جاؤ اور اسے غنیمت جانو۔''

شہیدوں اور زخمیوں کی خبر گیری

لڑائی کا ہنگامہ ختم ہوا اور قریش مکہ ابوسفیان کی سربراہی میں مکہ جانے والی شاہ راہ پر رخصت ہوئے تو مسلمان اپنے شہیدوں اور زخمیوں کی خبر گیری کے لیے فارغ ہو گئے۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہوا کہ ''کوئی ہے جو مجھے سعدؓ بن ربیع کی خبر لا کر دے۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ نیزہ برداروں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ انھیں میرا اسلام کہنا اور یہ کہنا کہ رسول اللہ ﷺ دریافت کر رہے ہیں کہ تم اپنے آپ کو کیسا پا رہے ہو؟''......

یہ سن کر حضرت زیدؓ بن ثابت اٹھے اور شہیدوں کے لاشے ٹٹولنے لگے لیکن سعدؓ کہیں نہ ملے۔ ایک جگہ جہاں لاشوں کا ڈھیر تھا، حضرت زیدؓ نے صدا دی: ''میں رسول اللہ کی طرف سے آیا ہوں۔ اگر سعد زندہ ہوں تو جواب دیں۔'' ایک کم زور سی آواز سنائی دی کہ میں یہاں ہوں۔ حضرت سعدؓ آخری سانس لے رہے تھے۔ انھیں نیزے، تلوار اور تیر کے ستر سے زیادہ زخم آئے تھے۔

حضرت زیدؓ نے کہا: ''اے سعد، رسول اللہ ﷺ آپ کو سلام کہتے ہیں اور دریافت فرما رہے ہیں کہ مجھے بتاؤ، اپنے آپ کو کیسا پا رہے ہو؟'' انھوں نے نحیف آواز میں کہا: ''رسول اللہ ﷺ کو میرا اسلام۔ آپ ان سے عرض کرو کہ یارسول اللہ ﷺ، جنت کی خوش بو پا رہا ہوں۔ اور ہاں میری طرف سے انصار بھائیو کو پیام دینا کہ اگر خدانخواستہ ہمارے رسول ﷺ آج کے دن شہید کر دیے گئے اور تم میں سے ایک بھی زندہ رہا تو تم اللہ کو منہ نہ دکھا سکو گے۔ ہم نے عقبہ کی رات جان نثاری کا عہد کیا تھا۔ اس بیعت کا پاس رکھنا۔'' یہ کہتے کہتے دم توڑ دیا۔ حضرت زیدؓ نے یہ ماجرا حضور ﷺ کو سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سعد پر رحم فرمائے۔ وہ زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا خیر خواہ تھا۔''

حضرت عبداللہ بن عمرو بن حزام قبیلہ خزرج کی شاخ بنو سلمہ کے نقیب تھے۔ جس صبح اُحد میں میدانِ کارزار گرم ہونے والا تھا، اپنے بیٹے جابر سے فرمایا: ''بیٹے، میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اس غزوے میں سب سے پہلے مجھے شہادت نصیب ہوگی۔ دوسرے دن وہ شہادت کا رتبہ پانے والے پہلے مجاہد تھے۔ مشرکین نے قتل ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ نعش کا مثلہ بھی کیا۔ جب شہداء کی لاشیں اکٹھی کی گئیں تو عرض کیا گیا کہ یہ آج کے معرکے کا پہلا شہید ہے۔ مثلہ شدہ لاش پر چادر ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت جابرؓ آئے تو کپڑا ہٹا کر باپ کی صورت دیکھی۔ بے اختیار رونے لگے۔ قریب سے ایک خاتون نے بھی دل دوز چیخ ماری۔ معلوم ہوا، شہید کی بہن فاطمہ بنت عمرو ہے۔ ارشاد ہوا: ''تم روؤ یا نہ روؤ۔ جب تک جنازہ رکھا رہے گا۔ فرشتے پروں سے سایہ کیے رہیں گے۔''

اہلِ خانہ نے آبائی قبرستان میں لے جانے کی اجازت چاہی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ اُحد کے گنج شہیداں ہی میں دفن ہوگا۔''

ابو عامر فاسق کا بیٹا حنظلہؓ مسلمان تھا۔ انھوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: ''اجازت ہو تو اپنے باپ کا خاتمہ کر دیں۔'' رحمت عالمؐ نے اجازت نہیں دی کہ بیٹے کے ہاتھوں باپ کا قتل ہو۔ حضرت حنظلہؓ اُحد کے دن ابوسفیان کے مقابل ہوئے۔ قابو پا کر قتل کرنا چاہتے تھے کہ اپنے باپ ابو عامر فاسق کے کھدوائے ہوئے گڑھے میں گھات میں بیٹھے شداد بن اسود لیثی نے جھپٹ کر شہید کر دیا۔ اس پر ابوسفیان نے کہا: ''حنظلہؓ کے بدلے میں حنظلہ۔'' اشارہ تھا اپنے بیٹے حنظلہ کی طرف جو بدر کی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ حضرت حنظلہؓ مسلمانوں کے وہ واحد شہید ہیں جن کی میت کا مثلہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ ان کے باپ ابو عامر فاسق کا کفار کی جانب ہونا تھا۔ شہداً کے لاشوں کی تلاش کے وقت ان کی لاش غائب تھی۔ ایک جگہ ایسی حالت میں ملی کہ زمین سے کچھ اونچی تھی اور اس سے پانی ٹپک رہا تھا۔ حضور ﷺ نے دیکھا تو فرمایا ''یہ حنظلہ سے کیا خاص معاملہ ہے کہ انھیں ملائکہ غسل دے رہے ہیں۔''

گھر پر دریافت سے ان کی بیوی جمیلا نے (جو رأس المنافقین عبداللہ ابن ابی کی بہن تھی) بتایا کہ جب انھیں احد میں مسلمانوں پر نازک وقت کی خبر پہنچی تو وہ بغیر غسل جنابت کیے، تلوار نکال کر میدان جنگ کی طرف بھاگے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''جب ہی فرشتے انھیں غسل دے رہے ہیں۔'' اس دن سے وہ ''غسیل الملائکہ'' کہلانے لگے۔

لوگوں نے زخمیوں میں اصیرمؓ کو بھی پایا جن کا نام عمرؓو بن ثابت تھا۔ ان کا تعلق عبدالاشہل سے تھا۔ ان میں زندگی کی تھوڑی سی رمق باقی تھی۔ اس سے قبل انھیں اسلام کی دعوت دی جاتی تھی، مگر وہ قبول نہیں کرتے تھے۔ اس لیے لوگوں نے حیرت سے کہا کہ یہ اصیرم کیسے آیا؟ اس تو ہم نے اس حالت میں چھوڑا تھا کہ وہ اس دین کا انکاری تھا۔ چناں چہ ان سے پوچھا گیا کہ تمھیں یہاں کیا چیز لے آئی؟ اپنی قوم کی حمایت کا جوش یا اسلام کی رغبت؟ انھوں نے کہا: ''اسلام کی رغبت۔ درحقیقت میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آیا اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی حمایت

شریک جنگ ہوا، یہاں تک کہ اب اس حالت سے دو چار ہوا جو آپ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہے۔'' اور اسی وقت ان کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ جنتیوں میں سے ہے۔''

ابوہریرہؓ کہتے ہیں: ''حالانکہ اس نے اللہ کے لیے ایک وقت کی بھی نماز نہیں پڑھی تھی۔'' کیوں کہ اسلام لانے کے بعد ابھی کسی نماز کا وقت آیا ہی نہ تھا کہ شہید ہو گئے۔ ابوہریرہؓ اکثر لوگوں سے سوال کیا کرتے: ''بتاؤ وہ کون خوش قسمت ہے جس نے نہ ایک روزہ رکھا نہ ایک نماز پڑھی، مگر جنت کا حق دار ہو گیا؟ جب کوئی بتا نہ سکتا تو خود ہی کہتے: ''وہ اصیرمؓ ہیں۔''

انھی زخمیوں میں ایک قزمان ملا۔ اس نے جنگِ اُحد میں خوب دادِ شجاعت دی تھی اور تنہا سات آٹھ مشرکین کو تہ تیغ کیا تھا۔ وہ جب ملا تو زخمیوں سے چور تھا۔ لوگ اسے اٹھا کر بنوظفر کے محلے میں لے گئے۔ مسلمانوں نے اسے خوش خبری سنائی کہ آج تمھاری آزمائش ہو گئی۔ تمھیں جنت مبارک ہو۔ اس نے جواب دیا: ''تم مجھے کس بات کی بشارت دیتے ہو۔ مَیں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے قتال نہیں کیا۔ میری جنگ تو محض اپنی قوم کے ناموس کے لیے تھی۔ اور اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں لڑائی ہی نہ کرتا۔ بعدازاں جب اس کے زخموں نے شدت اختیار کر لی تو اس نے خود کشی کر لی۔

رسول اللہ ﷺ سے جب بھی اس کا ذکر کیا جاتا تھا تو فرماتے تھے کہ وہ جہنمی ہے۔ یہ منافق تھا اور قوم کی خاطر مرا۔ اللہ اور رسول ﷺ کی نظر میں شہید وہ ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کرے۔ وطنیت اور قومیت یا ایسی ہی کسی دوسری راہ میں لڑنے والوں کا انجام یہی ہے۔

''میثاقِ مدینہ'' کی رو سے بیرونی حملے کی مدافعت میں یہودی مدد دینے کے پابند تھے۔ چناں چہ جس وقت جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے تو بنوثعلبہ کے ایک یہودی مخیریق نے اپنی قوم سے کہا: ''خدا کی قسم، تم جانتے ہو کہ اس وقت محمد ﷺ کی مدد کرنا ہم پر فرض ہے۔'' یہودنے کہا: ''مگر آج سبت (ہفتے) کا دن ہے۔'' اس نے کہا: ''ایسے موقع پر ہفتے کے دن کی کوئی قید نہیں۔'' جب دیکھا کہ لوگ آمادہ نہیں ہوتے تو خود تلوار لی۔ ساز و سامان اٹھایا اور بولا: ''اگر میں مارا جاؤں تو میرا مال محمد ﷺ کے لیے ہے۔ وہ جس طرح چاہیں، خرچ کریں۔'' اس کے بعد وہ لڑائی میں قریش سے جنگ کرتے ہوئے قتل ہوئے۔ حضور ﷺ نے سنا تو فرمایا: ''مخیریق بہترین یہودی تھا۔''

ابن حزم کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے بعض صدقات جو مدینہ میں کیے، وہ ان کے مال میں سے تھے۔ ان کی جائداد میں سات باغ تھے۔ یہ اسلام کا پہلا وقف تھا۔ کہتے ہیں کہ علمائے یہود میں حضرت عبداللہؓ ابن سلام کے بعد مخریق ایمان لائے تھے۔

اسلامی لشکر کے علم بردار مصعبؓ بن عمیر کا جنازہ نماز کے لیے لایا گیا تو اللہ کے رسول ﷺ نے دیکھا کہ دونوں ہاتھ کٹے ہوئے، پیٹ پھٹا ہوا، اور چہرہ خاک و خوں میں غلطاں ہے۔ بے اختیار سورۂ احزاب کی آیت 23 پڑھی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَ مِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَ مَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا﴾ (الاحزاب: 23)

''مومنین میں سے ایسے لوگ موجود ہیں، جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچ کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انھوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

پھر حضور ﷺ نے آب دیدہ ہو کر ارشاد فرمایا: ''مکہ میں تم سا خوش رو اور خوش لباس کوئی نہ تھا۔ آج دیکھتا ہوں کہ تمھارے بال گرد آلود اور الجھے ہوئے ہیں۔ جسم پر صرف ایک چادر ہے۔ بے شک اللہ کا رسول ﷺ گواہی دیتا ہے کہ تم لوگ قیامت کے دن بارگاہِ خداوندی میں حاضر رہو گے۔''

کفن کی چادر اتنی چھوٹی تھی کہ سر ڈھانپتے تو پاؤں خالی رہ جاتے اور پاؤں چھپاتے تو چہرہ کھل جاتا۔ ارشاد ہوا کہ سر چھپا دیا جائے اور پاؤں پر اذخر گھاس ڈال دی جائے۔

حضرت حمزہؓ کی نعش کی تلاش میں رسول اکرم ﷺ خود نکلے۔ بطن وادی میں ان کا مُثلہ شدہ لاشہ پایا۔ یہ دل خراش منظر دیکھ کر بے اختیار دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، یہاں تک کہ ہچکی بندھ گئی۔ فرمایا: ''مجھے معلوم ہے، تم بڑے مخیّر اور صلہ رحمی کرنے والے تھے۔ اگر تمھاری بہن صفیہؓ کے دکھ کا خیال نہ ہوتا تو میں تمھیں اسی حال میں چھوڑ دیتا کہ تمھارا جسدِ خاکی درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں میں پہنچ جائے۔ قیامت کے دن تم ان کے شکم سے اٹھتے۔ اس کے بعد نعش پر نظر ڈالی اور رقت و جلال کا عالم میں فرمایا: ''کل کے دن جب اللہ مجھے غلبہ عطا فرمائے گا تو ان کے بدلے میں ستر کافروں کا مثلہ کروں گا۔''

حضور ﷺ ابھی اس جگہ سے ہٹنے بھی نہ پائے تھے کہ وحی کا نزول ہوا، اور سورۂ النحل کی آیات 126 اور 127 نازل ہوئی:

﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ۝ وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ۝﴾ (النحل: 126 تا 127)

''اور اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ جتنا تمھیں تکلیف پہنچائی گئی تھی۔ اور اگر صبر کرو تو البتہ وہ بہتر ہے صبر کرنے والوں کے لیے اور صبر ہی کرو اور تمھارا صبر بھی اللہ ہی کی مدد سے ہے، اور ان کے بارے میں غم نہ کرو، اور جو یہ بداندیشی کرتے ہیں، اس سے تنگ دل نہ ہو۔''

پس آپ ﷺ نے صبر اختیار کیا۔ ارشاد ہوا: ''قیامت کے دن حمزہؓ ''سید الشہدا'' ہوں گا۔ انؓ کی لاش کو ایک چادر میں لپیٹنے کا حکم ہوا۔ دوسرے شہدا کی بھی لاشیں اکٹھی ہو گئیں تو سب سے پہلے سات تکبیروں سے حضرت حمزہؓ کی نماز جنازہ پڑھی۔ ان کا جنازہ وہیں رکھا رہا، اور ایک ایک شہید ان کے بازو میں رکھا گیا۔ اس طرح انؓ پر 72 بار نماز جنازہ پڑھی گئی۔ حضور ﷺ نے حضرت زبیرؓ ابن عوام سے

فرمایا کہ اپنی والدہ کو بھائی کی لاش دیکھنے نہ دو۔ انھیں صدمہ ہوگا۔ حضرت صفیہؓ (آنحضور ﷺ کی پھوپھی) نے کہا: ''مجھے معلوم ہے کہ میرے بھائی کا مثلہ کیا گیا ہے، لیکن یہ اللہ کی راہ میں ہوا ہے۔ اس لیے جو کچھ ہوا، ہم اس پر پوری طرح راضی ہیں میں ثواب سمجھتے ہوئے ان شاء اللہ ضرور صبر کروں گی۔''

اس کے بعد وہ حضرت حمزہؓ کی نعش پر آئیں۔ انھیں دیکھا۔ ان کے لیے دعا کی۔ اللہ سے مغفرت کی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ انھیں حضرت عبداللہؓ بن جحش کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ وہ حضرت حمزہؓ کے بھانجے تھے اور رضاعی بھائی بھی۔

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہؓ پر جس طرح روئے، اس سے بڑھ کر روتے ہوئے ہم نے آپ ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے انھیں قبلے کی طرف رکھا۔ پھر ان کے جنازے پر کھڑے ہوئے اور اس طرح روئے کہ آواز بلند ہوگئی۔''

حضرت خباب بن ارت کا بیان ہے کہ حضرت حمزہؓ کے لیے ایک سیاہ دھاریوں والی چادر کے سوا کوئی کفن نہ مل سکا۔ یہ چادر سر پر ڈالی جاتی تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں پر ڈالی جاتی تو سر کھل جاتا۔ بالآخر چادر سے سر ڈھک دیا گیا۔ اور پاؤں پر اذخر گھاس ڈال دی گئی۔

یہ ایک خوش بودار گھاس ہوتی ہے۔ بہت سے مقامات پر چائے میں ڈال کر پکائی بھی جاتی ہے۔ عرب میں اس کا پودا ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ سے لمبا نہیں ہوتا، جب کہ ہندوستان میں ایک میٹر سے بھی لمبا ہوتا ہے (الرحیق المختوم۔ صفحہ 383)

شہدا کی تدفین

شہدا کے جسموں پر جو اسلحہ اور زرہیں وغیرہ تھیں، وہ اتار لی گئیں۔ پھر خون آلود جسم خون میں تر بتر کپڑوں میں یوں ہی دفن کر دیے گئے۔ دو دو شہیدوں کو ایک ہی چادر کا کفن دیا گیا، دو دو اور تین تین شہیدوں کو ایک ہی قبر میں سپرد خاک کیا جاتا۔ جن صحابہ میں آپس میں دوستی اور محبت تھی، انھیں ایک ساتھ دفن کیا گیا۔ جیسے حضرت حمزہؓ کے ساتھ عبداللہؓ بن جحش کو، عبداللہؓ بن عمرو بن حزام کے پہلو میں حضرت عمروؓ بن جموح، خارجہؓ بن زید کے پہلو میں سعدؓ بن ربیع کو، اور نعمانؓ بن مالک، عبداللہ بن خشخاس اور مخدرؓ بن زیاد تینوں کو اکٹھا دفن کیا گیا۔ لوگوں سے دریافت کیا جاتا کہ ان میں کس کو قرآن زیادہ حفظ تھا؟ اسے صف میں آگے رکھنے کا حکم فرماتے۔ شہدا کو غسل نہیں دیا گیا۔ خون آلود کپڑوں ہی میں دفن کیے گئے۔ ارشاد فرمایا: ''قیامت کے دن یہ اس طرح اٹھائے جائیں گے کہ ان کے زخموں سے لہو بہتا ہوگا۔ خون کا رنگ تو یہی ہوگا، لیکن اس کی مہک مشک جیسی ہوگی۔''

ایک روایت ہے کہ نماز پڑھی گئی۔ سب سے پہلے حضرت حمزہؓ کی نماز جنازہ پڑھی گئی۔ پھر ان کے برابر ایک ایک شہید رکھا جاتا اور ان کی نماز ادا کی جاتی۔

دوسرے دن مدینہ واپس ہونے سے پہلے حکم ہوا کہ شہدائے احد کی آخری زیارت کر کے ان پر سلام بھیجو؟

شہدا کی تعداد

عام روایت کے مطابق مسلمانوں میں سے 70 افراد نے جام شہادت نوش کیا۔ ان میں چار مہاجر، ایک یہودی، 14 خزرج کے اور 24 قبیلہ اوس کے انصار تھے۔ چار مہاجروں میں حضرت امیر حمزہؓ، عبداللہ بن جحش، مصعبؓ بن عمیر اور شماسؓ بن عثمان بن ثرید ہیں۔

اس جنگ میں مشرکین کے قتل ہونے والوں کی تعداد 22 تھی، بعض مؤرخین یہ تعداد 27 لکھی ہے۔

جنگ کا پانسہ پلٹنے اور حضور ﷺ کی شہادت کی افواہ عام ہونے کے بعد بددل ہو کر جو صحابہؓ میدان جنگ سے لوٹے، ابن اسحاق کی روایت کے مطابق، ان میں حضرت عثمان بن عفان اور عثمان بن عبیداللہ انصاری تھے۔ بعض مورخین نے مزید دو نام عقبہؓ بن عثمان اور سعد بن عثمان لکھے ہیں۔ یہ لوگ لوٹ کر مقام جلب تک پہنچے۔ وہاں تین دن قیام کے بعد حضور ﷺ سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا قصور معاف فرمایا۔ اور درگزر کی آیت 155 سورۂ آل عمران میں نازل ہوئی:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَ لَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾

(آل عمران: 155)

''جو لوگ تم میں سے (احد کے دن) جب کہ دو جماعتیں ایک دوسرے سے جنگ میں گتھ گئیں، بھاگ گئے تو ان کے بعض افعال کے سبب شیطان نے انھیں پھسلا دیا، مگر اللہ نے ان کا قصور معاف فرما دیا۔ بے شک اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔''

اُحد سے واپسی کے وقت دعائے نبوت

رسول اللہ ﷺ جب اپنے شہید صحابہ کو دفن کرنے سے فارغ ہوئے تو اپنے گھوڑے پر سوار ہوئے اور مسلمان حضور ﷺ کے اردگرد حلقہ بنائے ہوئے نکلے۔ ان میں سے اکثر زخمی تھے۔

حضور ﷺ کے ساتھ چودہ خواتین بھی تھیں۔ جب یہ قافلہ کوہِ اُحد کے دامن پر پہنچا تو رحمت للعالمین ﷺ نے حکم دیا کہ سب صفیں باندھ کر کھڑے ہو جاؤ، تاکہ میں اپنے بزرگ و برتر پروردگار کی حمد و ثنا کروں۔ اس حکم پر صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کے پیچھے صفیں باندھ لیں، اور آپ ﷺ نے یوں فرمایا:

''اے اللہ، ساری تعریفیں تیرے لیے ہیں اے اللہ، جسے تو کشادہ کر دے، اسے کوئی قبض کرنے والا نہیں اور جسے تو تنگ کر دے، اسے کشادہ کرنے والا کوئی نہیں جسے تو گم راہ کر دے، اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں اور جسے تو ہدایت دے، اسے کوئی گم راہ کرنے والا نہیں جس چیز کو تو روک دے، اسے کوئی دے نہیں سکتا اور جو چیز تو عطا فرمائے اسے کوئی روک نہیں سکتا جسے تو دور کر دے، اسے کوئی قبول کرنے والا نہیں اور جسے تو قریب کر دے، اسے کوئی دور کرنے والا نہیں۔ یا اللہ! اپنی رحمتیں، اپنی برکتیں اپنا فضل اور اپنا رزق ہم پر کشادہ کر دے۔ اے اللہ! ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں ایک

جنگ احد میں شریک ہونے کے خواہش مند بعض کم سن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شجرہ نسب

نوح علیہ السلام

سام

- **عدنان**
  - مضر
    - میلان ← قیس ← غطفان ← ریث ← بغیض ← ذبیان ← فزارہ ← مرہ ← حریج ← ہلال ← جندب ← سمرہ رضی اللہ عنہ
    - فہر ← لوئی ← کعب ← عدی ← رزاح ← قرط ← عبداللہ ← ریاح ← عبدالعزیٰ ← نفیل ← خطاب ← عمر رضی اللہ عنہ ← عبداللہ رضی اللہ عنہ
- **قحطان**
  - سبا ← حمیر ← مالک ← مالک ← قو[illegible] ← کناف ← عبدالعزیٰ ← شراحیل ← حارثہ ← زید رضی اللہ عنہ ← اسامہ رضی اللہ عنہ
  - کہلان
    - حارثہ
      - **خزرج**
        - عمرو ← ثعلبہ ← تیم اللہ (نجار) ← مالک ← غنم ← عوف ← ثابت ← زید رضی اللہ عنہ
        - حارث
          - حارثہ ← جشم ← یزید (زید) ← عمرو
            - زید ← عدی ← رافع
              - ظہیر رضی اللہ عنہ ← اسید رضی اللہ عنہ
              - خدیج ← رافع رضی اللہ عنہ
            - قیظی ← اوس ← عرابہ رضی اللہ عنہ
          - عوف ← الابجر (خدرہ) ← ثعلبہ ← عبید ← سنان ← مالک ← ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ
          - خزرج ← کعب ← ثعلبہ ← مالک الاغر
            - زید ← خلاس ← ثعلبہ ← سعد ← بشیر رضی اللہ عنہ ← نعمان رضی اللہ عنہ
            - نعمان ← قیس ← زید ← ارقم ← زید رضی اللہ عنہ
      - **اوس**
        - مالک
          - عمرو ← خزرج اصغر ← حارث ← حارثہ ← عازب ← براء رضی اللہ عنہما
          - عوف ← عمرو
            - سعد بن بجیر بن معاویہ بن قحافہ حلیف عمرو بن عوف لوی
            - عوف ← مالک ← زید ← ضبیعہ ← العطاف ← مجمع ← عامر ← حارثہ ← زید رضی اللہ عنہ

میدان احد میں جانثاری اور سرفروشی دکھانے والے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شجرہ

- ثعلبہ
  - حارثہ
    - خزرج
      - عوف
        - عمرو
          - عوف
            - غنم
              - مالک
                - دخشم
                  - مالک رضی اللہ عنہ
              - زید
                - عجلان
                  - مالک
                    - نضلہ
                      - عبادہ
                        - عباس رضی اللہ عنہ
      - حارث
        - خزرج
          - کعب
            - ثعلبہ
              - مالک الاغر
                - نعمان
                  - قیس
                    - زید
                      - ارقم
                        - اوس رضی اللہ عنہ
                - امرؤ القیس
                  - مالک
                    - ابی زہیر
                      - زید
                        - خارجہ رضی اللہ عنہ
                      - عمرو
                        - ربیع
                          - سعد رضی اللہ عنہ
                            - ام سعد رضی اللہ عنہا
      - عمرو
        - ثعلبہ
          - تیم اللہ (نجار)
            - مازن
              - غنم
                - عمرو
                  - مبذول
                    - عوف
                      - عمرو
                        - کعب
                          - عبداللہ رضی اللہ عنہ
                          - عاصم
                            - زید
                              - ام عمارہ کے خاوند عبداللہ رضی اللہ عنہ
                          - ام عمارہ رضی اللہ عنہا (نسیبہ)
            - مالک
              - عمرو
                - عدی
                  - زید (مناۃ)
                    - عمر
                      - حرام
                        - الاسود
                          - سہل
                            - زید ابوطلحہ رضی اللہ عنہ

خالد بن ولید کی قیادت میں گھڑسوار مشرکین کا دھاوا

جبل احد

وادی اضم (العقیق)

نبی کریم ﷺ کا پڑاؤ

تیراندازوں کی پہاڑی

جبل عینین

وادی قناۃ

قیادت کے گرد مجاہدین کا اجتماع اور بھرپور مقابلہ

- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور رسول اللہ ﷺ پر خالد بن ولید کے حملے
- مسلمانوں کا دامن کوہ میں پناہ لینا
- کفار کی رسول اللہ ﷺ پر یلغار
- مجاہدین کا مدینہ کی طرف جانا اور پھر واپس پلٹنا
- کفار کی حتمی پسپائی

جنگ اُحد کے لیے مسلمانوں کے خلاف اکٹھے ہونے والے سردارانِ مکہ کا شجرہ

- فہر (قریش)
  - لؤیّ
    - کعب
      - مُرّہ
        - کلاب
          - قصی
            - عبدمناف
              - نوفل
                - عدی
                  - مطعم
                    - جبیر رضی اللہ عنہ
                - عامر
                  - حارث
                  - جحیر بن ابواباب تمیمی (بنو حارث کا حلیف)
            - عبدالعزیٰ
              - اسد
                - مطلب
                  - اسود رضی اللہ عنہ
        - یقظہ
          - مخزوم
            - عمر
              - عبداللہ
                - مغیرہ
                  - ہشام
                    - ابوجہل
                      - عکرمہ رضی اللہ عنہ
                    - حارث رضی اللہ عنہ
                  - ابوربیعہ
                    - عبداللہ رضی اللہ عنہ
      - ہصیص
        - عمرو
          - جمح
            - حذافہ
              - وہب
                - خلف
                  - امیہ
                    - صفوان رضی اللہ عنہ
    - عامر
      - حسل
        - مالک
          - نصر
            - عبدود
              - ابوقیس
                - عبدالعزیٰ
                  - حویطب رضی اللہ عنہ

نعمت کا، جو ہمیشہ رہنے والی ہو اور جو پھرے نہیں اور زائل نہ ہو۔ اے اللہ، ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں فقر کے دن مدد کا اور خوف کے دن امن کا۔ اے اللہ! ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں جو کچھ تو نے ہمیں دیا ہے، اس کے شر سے اور جو کچھ نہیں دیا اس کے بھی شر سے۔ اے اللہ، ایمان کو ہمارے نزدیک محبوب کر دے اور اسے ہمارے دلوں میں خوشنما بنا دے اور کفر، فسق اور نافرمانی کو ہمارے لیے ناگوار بنا دے اور ہمیں ہدایت یافتہ لوگوں میں کر دے۔ اے اللہ، ہمیں مسلمان رکھتے ہوئے وفات دے اور مسلمان ہی رکھتے ہوئے زندہ رکھ اور رسوائی اور فتنے سے دوچار کیے بغیر صالحین میں شامل فرما۔ اے اللہ! تو ان کافروں کو مار اور ان پر سختی اور عذاب نازل کر جو تیرے پیغمبروں کو جھٹلاتے اور تیری راہ سے روکتے ہیں۔ اے اللہ، ان کافروں کو بھی مار جنھیں کتاب دی گئی۔ اے سچے رب، ہماری اس دعا کو قبول فرما۔"

مدینے کو واپسی

رسول اللہ جب احد سے مدینہ لوٹے تو ہر محلے کے مردوں اور عورتوں نے آپ ﷺ کا استقبال کیا۔ آپ ﷺ کے صحیح سالم واپس آنے پر بے حد مسرت و خوشی کا اظہار کیا۔ سب سے پہلے راستے میں ایک مسلم خاتون سے ملاقات ہوئی جن کا نام حمنہ بنت جحش ہے۔

حضور ﷺ نے ان سے فرمایا: یَا حِمَّا اِحتَسِبِی "اے حمنہ، اپنی مصیبت کا اجر اپنے رب سے طلب کرو۔"

خاتون نے پریشان ہو کر پوچھا: "کس کی موت پر صبر کا اجر اپنے رب سے طلب کروں؟"

فرمایا: "تیرے ماموں حمزہ بن عبدالمطلب شہید ہو چکے ہیں۔"

یہ اندوہناک خبر سن کر اس خاتون نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔ "اللہ ان کی مغفرت کرے، اور یہ شہادت انھیں خوشگوار ہو۔"

حضور ﷺ نے دوبارہ فرمایا: اِحتَسِبِی "(اپنی مصیبت کا اجر اپنے رب سے طلب کرو")

خاتون نے پوچھا: "کس کی موت پر صبر کا اجر اپنے رب سے طلب کروں؟"

فرمایا: "تیرا بھائی عبداللہ بن جحش شہید ہو چکے ہیں۔"

حمنہ نے پڑھا: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔ "اللہ ان کی مغفرت کرے، اور یہ شہادت انھیں خوشگوار ہو"

حضور ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا: اِحتَسِبِی "(اپنی مصیبت کا اجر اپنے رب سے طلب کرو)

حمنہ نے پوچھا: "کس کی موت پر صبر کا اجر اپنے رب سے طلب کروں؟"

حضور ﷺ نے فرمایا: "تیرے شوہر مصعبؓ بن عمیر شہید ہو چکے ہیں۔"

یہ سن کر حمنہ تڑپ کر چیخ اٹھیں اور دھاڑیں مار کر رونے لگیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "عورت کے دل میں اس کا شوہر ایک خصوصی درجہ رکھتا ہے۔" رونے کا سبب دریافت کیا تو حمنہ نے کہا: "مجھے ان کے بیٹوں کا یتیم ہونا یاد آیا تو میں خوف زدہ ہو گئی۔ حضور ﷺ نے حمنہ کے لیے اور ان کے بچوں کے لیے دعا مانگی کہ ان پر اللہ تعالیٰ اپنا فضل واحسان فرمائے۔

حضور ﷺ اپنے لشکر کے ہم راہ آگے بڑھے اور بنی عبدالاشہل کی بستی تک پہنچے۔ اس قبیلے کے بہت سے بہادر شہید ہوئے تھے۔ لوگ اپنے اپنے شہیدوں کی رحلت پر رو رہے تھے۔ حضور ﷺ کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔ پھر فرمایا: "لیکن میرے چچا حمزہؓ پر کوئی دو آنسو بہانے والا بھی نہیں۔" اس قبیلے کی تمام خواتین حضور ﷺ کو سلام عرض کرنے کے لیے نکل آئیں۔ حضور ﷺ کو بخیر و عافیت دیکھ کر انھیں اپنے اپنے دکھ بھول گئے۔ بے ساختہ ام عامر کی زبان سے نکلا "حضور ﷺ سلامت ہیں تو پھر ہر مصیبت ہیچ ہے۔"

حضور ﷺ کے صحابہ کا قافلہ بنی دینار کی اس خاتون کے پاس سے گزرا احد کی جنگ میں جس کے باپ، بھائی اور شوہر تینوں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ جب اسے تینوں کی شہادت کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے کہا، انھیں رہنے دو۔ مجھے بتاؤ کہ میرے آقا کا کیا حال ہے۔ بتایا گیا کہ حضور ﷺ بالکل بخیر و عافیت ہیں۔ کہنے لگی، مجھے دکھاؤ، میرے آقا کہاں ہیں، تاکہ میں روئے زیبا دیکھ کر تسلی کر لوں۔ اشارہ کر کے بتایا گیا کہ دیکھو، حضور ﷺ وہ کھڑے ہیں۔ حضور ﷺ کو بخیریت دیکھ کر اس مومنہ کی زبان سے نکلا: "حضور ﷺ سلامت ہیں تو ہر مصیبت ہیچ ہے۔"

مدینہ میں حضور ﷺ کی خیریت کی خبر پہنچنے میں تاخیر ہوئی تو مدینے کی خواتین حضور ﷺ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے مدینے سے باہر نکل آئیں۔ سامنے سے ایک اونٹ آ رہا تھا، جس پر دو شہیدوں کی لاشیں تھیں۔ انصار کی ایک خاتون نے پوچھا کہ دو لاشیں کن کی ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ فلاں فلاں کی ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک اس کا شوہر تھا اور ایک اس کا بیٹا۔ اس نے کہا، انھیں چھوڑو، مجھے یہ بتاؤ، میرے آقا کا کیا حال ہے۔ بتایا گیا کہ حضور ﷺ خیریت سے ہیں۔ کہنے لگی: "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض کو شہادت کا درجہ دے دیتا ہے۔" اس وقت سورۂ آل عمران کی آیت 140 نازل ہوئی:

﴿وَ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ یَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ﴾

(آل عمران: 140)

اور "تاکہ اللہ انھیں جان لے جو ایمان لائے اور تم میں سے شہادتِ حق دینے والوں کو منتخب کرے۔"

"حضور ﷺ اپنے گھوڑے پر سوار تھے۔ گھوڑے کی لگام حضرت سعدؓ بن معاذ تھامے ہوئے تھے۔ اس اثنا میں حبشہ بنت رافع حاضر خدمت ہوئیں۔ وہ حضرت سعدؓ بن معاذ کی ماں تھیں۔ سعدؓ عرض کرتے ہیں: "میرے آقا، یہ میری ماں ہے۔" فرمایا: "مرحبا" وہ قریب آ گئیں اور حضور ﷺ کو بڑے غور سے دیکھنے لگیں۔ پھر عرض کیا: "حضور ﷺ کی زیارت کے بعد ہر مصیبت ہیچ نظر آنے لگی ہے۔ ان کے بیٹے عمرو

بن معاذ نے جنگ احد میں شہادت پائی تھی۔ حضور ﷺ نے ان کی والدہ سے تعزیت کی۔ پھر فرمایا: ''اے سعد کی ماں! تمھیں خوش خبری ہو، اور اپنے گھر والوں کو بھی خوش خبری سنا دو کہ جنگ اُحد کے سب شہید جنت میں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ انھوں نے پنے اہل وعیال کے بارے میں شفاعت کی ہے جو قبول کر لی گئی ہے۔''

اس خاتون نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ، ہم اپنے رب کی اس مہربانی پر بہت خوش ہیں اور اب ان مقتولوں پر کون روئے گا۔'' پھر عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ پسماندگان کے لیے دعا فرمایئے۔''

حضور ﷺ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: ''اے اللہ، ان کے دلوں کا غم دور کر۔ ان کی مصیبت کی تلافی کر دے، اور پس ماندگان کو اپنے پیشروؤں کے لیے بہتر کر دے۔''

اسی روز شنبہ، سات شوال سن تین ہجری کو سرشام رسول اللہ مدینہ پہنچے۔ گھر پہنچ کر تلوار سیدہ فاطمہؓ کو دی اور فرمایا: ''بیٹی، اس کا خون دھو دو۔ خدا کی قسم، آج اس نے حق ادا کر دیا۔'' پھر حضرت علیؓ نے بھی تلوار لپکائی اور فرمایا: ''اس کا بھی خون دھو دو۔ واللہ، اس نے بھی اپنا حق ادا کر دیا۔''

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے علی! اگر آج تم نے جنگ کرنے کا حق ادا کیا ہے تو تمھارے ساتھ سہلؓ بن حنیف اور ابودجانہؓ نے بھی لڑنے کا حق ادا کیا ہے۔'' حضور ﷺ نماز عشاء کے بعد جب اپنے حجرے کی طرف جانے لگے تو مردوں نے محراب مبارک سے حجرے تک دورویہ فصلیں بنالیں۔ حضور ﷺ خود چلتے ہوئے ان کے درمیان سے گزرے اور گھر تشریف لے گئے۔

آٹھ شوال تین ہجری شنبہ و یک شنبہ کی درمیانی رات مدینے میں مسلمانوں نے ہنگامی حالت میں گزاری۔ جنگ نے انھیں چور چور کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود وہ رات بھر مدینے کے راستوں اور گزرگاہوں پر پہرہ دیتے رہے اور اپنے سپہ سالار اعظم رسول اکرم ﷺ کی خصوصی حفاظت پر تعینات رہے، کیوں کہ انھیں ہر طرف سے خدشات لاحق تھے۔

غزوہ احد کے نتائج

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا نتائج ہیں جو اس جنگ میں دفاعی حدیث کی حیثیت سے ہماری راہ نمائی کر سکتے ہیں۔ ان نتائج کا ایک جامع تجزیہ میجر جنرل محمد اکبر خان نے اپنی معروف تصنیف ''حدیث دفاع'' میں بڑی خوب صورتی سے کیا ہے جو یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

''سب سے پہلا سبق جو ہمیں ملتا ہے یہ ہے کہ دفاعی منصوبہ اپنے ذرائع و وسائل کے مطابق مرتب کرنا چاہیے یعنی نہایت دور اندیشی و حوصلہ مندی سے اپنے وسائل کو مدنظر رکھ کر دفاعی منصوبہ ایسا بنایا جائے جو بساط سے باہر نہ ہو۔ اپنی بساط سے آگے بڑھنا اور اس سے زیادہ کے خواب دیکھنا بسا اوقات خطرناک نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ دانائی اور ہوشمندی کا اقتضاء یہ ہے کہ صرف ان وسائل کی بنا پر منصوبہ تیار کیا جائے جن پر اپنی دست رس ہو یا ہو سکتی ہو۔ موہوم امیدوں پر ہوائی قلعے تعمیر کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ تقدیر پر بھروسہ کے معنی یہ نہیں کہ تدبیر نہ ہو۔ اگر اس اعتماد پر ضرورت سے زیادہ امیدوں کے محل استوار کیے جائیں گے تو نتیجہ عموماً مایوسی اور ناکامی کی صورت میں برآمد ہوگا۔ وسائل آج کی مشینی دنیا میں انجن کے تیل کی مانند ہیں اور تقدیر و بساط سے زیادہ اعتماد کو بیٹری اور موٹر کا پٹرول کہہ سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسے موٹر کو چلانا چاہتے ہیں جس کے انجن میں تیل بہت کم ہے تو موٹر بیٹری اور پٹرول کی وجہ سے چلنے تو لگے گا مگر اس کا انجن جلدی ہی بند ہو جائے گا کیوں کہ اس کے پسٹن تیل کم ہونے کی بنا پر جل جائیں گے اور وہ موٹر باوجود پٹرول اور نئی بیٹری کے نہ چل سکے گی۔ دفاعی منصوبے کے موٹر میں انجن کے تیل کا حکم اپنے وسائل اور اپنے افسر و سپاہی ہیں۔ جب ان میں سے کسی میں کمی ہو جاتی ہے تو نتیجہ اچھا نہیں ہوتا اور منصوبہ کا موثر نہیں چلتا۔

آنحضرت ﷺ نے اس جنگ میں اپنا دفاعی مقصد دشمن کی شکست بنایا تھا۔ آپ ﷺ کو دشمن کی طاقت اور اس کے منصوبے کا علم خفیہ نویسوں سے ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس دشمن نے آنحضرت کے دفاعی منصوبے کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ مشرکین سمجھتے تھے کہ آنحضرت ﷺ عبداللہ بن ابی سلول منافق کے مشورہ پر عمل فرمائیں گے۔ اس خبر پر اعتماد کر کے وہ احد کے درہ کے جنوب میں جمع ہو گئے تاکہ مدینے سے لشکر اسلام کے نکلتے ہی رسالہ سے اس پر حملہ کیا جائے اور اس کی طاقت کو ختم کر دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اپنے پرچہ نویسوں کے ذریعہ سارے منصوبوں کی مکمل اطلاعات مل چکی تھیں لہٰذا آپ ﷺ نے رات کے وقت مدینے سے نکل کر نہایت پیچیدہ اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا یعنی جس راستہ کو مشرکین نے ناممکن تصور کر رکھا تھا اسی سے روانہ ہوئے۔ عبداللہ بن ابی سلول منافق نے جب یہ دیکھا کہ وہ مشرکین کے منصوبے کے خلاف دوسرے راستے پر جا رہے ہیں۔ جسے نہ وہ سمجھ سکا تھا اور نہ معلوم کر سکا تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر الگ ہو گیا تاکہ اگر مشرکین کے ساتھ ایفائے عہد نہ کر سکے تو ان کے خلاف بھی نہ لڑے۔ وہاں سے آپ ﷺ بنو حارثہ کی بستی میں تشریف لے جاتے ہیں جس کے دو مقصد ہو سکتے ہیں۔ اول دشمن کو اپنی نقل و حرکت سے بے خبر رکھنا۔ دوسرے بنو حارثہ کے بعض کم زور دل اور پست حوصلہ لوگوں کے حوصلے بلند کرنا اور لشکر اسلام کی قوت و عظمت کا اثر قائم کرنا۔ چناں چہ یہی ہوا۔ یہاں سے آپ نے اور زیادہ خفیہ راستہ اختیار کیا اور ایسی جگہ مورچہ لگایا جہاں دشمن کے سوار رسالہ کی فوقیت ختم ہو گئی اور اپنے تیر اندازوں سے نہایت موثر طریقے پر کام لے سکتے تھے۔ آپ ﷺ نے دیکھ لیا تھا کہ ہوا پہاڑی درہ سے میدان کی طرف آئے گی اس لیے اس سے جہاں مسلم تیر اندازوں کے تیر دور تک جائیں گے وہاں دشمن کے تیر اندازوں کو مخالف ہوا میں تیر چلانے پڑیں گے۔ اس کے علاوہ تیر اندازوں کو بلندی پر تعینات کرنے سے ان کے تیروں کی پرواز اور بھی لمبی ہو گئی۔ پھر آپ نے انھیں یہ ہدایت کی کہ تیر دشمن پر 60 درجے کے زاویے سے چلائیں تاکہ خاتمہ پرواز پر عموداً یعنی 90 درجہ کا زاویہ بناتے ہوئے گریں۔ اس طرح وہ مشرکین بھی

ان کی زد میں آ گئے جو چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی آڑ میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ فی الحقیقت یہی وہ اصول ہے جس پر آج کل ٹرنچ مارٹر یعنی خندقوں پر گولے برسانے والی توپ بنائی گئی ہے۔ آپ نے اپنے تیر اندازوں کو یہ بھی حکم دیا کہ خواہ جنگ کے حالات کچھ ہی ہوں وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ تیر اندازوں کی حفاظت کے لیے آپ نے ایک دستہ جبل احد کے دوسری جانب درہ کی پگڈنڈی پر تعینات کیا۔ گویا زمانہ جدید کے حربی اصولوں کے مطابق ایسے مضبوط مورچے Strong Point یا Pivots Of Manouvre قائم کیے جن کے بل پر آنحضرت ﷺ کی فوج حملے کے وقت بحفاظت نقل و حرکت کر سکے اور شکست ہو تو ہاری ہوئی فوج انہی مورچوں پر جمع ہو کر دشمن پر دوبارہ جوابی حملہ کر کے اسے تباہ کر سکے۔

دوسرے لفظوں میں جہاں آنحضرت ﷺ نے اپنے دفاعی منصوبہ میں اپنی بساط کو مدنظر رکھ کر دور اندیشی سے کام لیا وہاں مشرکین نے اس کے برعکس طاقت کے پندار میں حربی اصولوں کو پس پشت ڈال دیا۔ اگر مسلم تیر انداز اپنی جگہ نہ چھوڑ جاتے تو احد کا میدان مشرکین کے لیے بدر سے بدتر ثابت ہوتا۔ اسی طرح اگر استخلاص کشمیر کی جنگ میں آزاد کشمیر کا لشکر سری نگر کے پاس لوٹ مار کرنے کے بجائے دشمن کی ہوائی فوج کو اترتے وقت دبوچ لیتا تو جنگ کشمیر کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ آزاد کشمیر کے لشکریوں نے جب لوٹ کا موقع دیکھا تو دشمن کی فوج کو تباہ کرنا بھول گئے۔ مجاہدین کی اس فوج کے افسر خام و ناتجربہ کار تھے۔ لہٰذا سری نگر کی شکست کے بعد ہندی فوج نے آزاد کشمیر کی فوج کو بہت دور تک دھکیل دیا اور میلوں تک دم نہیں لینے دیا۔ مگر خوش قسمتی سے ہندی فوج کا سپہ سالار ابوسفیان کی طرح عزم و شجاعت نہ رکھتا تھا جس کی وجہ سے یہ فوج تباہی سے بچ گئی ورنہ اس کا زندہ بچ نکلنا دشوار تھا۔

احد میں چوں کہ آنحضرت ﷺ جیسے قابل جرنیل کی کمان تھی لہٰذا آپ ﷺ نے جنگ کا پانسہ پلٹتے دیکھ کر نہایت مستقل مزاجی اور اولوالعزمی سے دفاعی منصوبہ کے دوسرے حصے پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ آپ ﷺ عام سالاروں کی طرح امان حاصل کرنے کے لیے درے کی طرف نہیں بڑھے بلکہ پہاڑ کی چوٹیوں کی طرف رخ کیا تا کہ آپ ﷺ کی فوج خالد بن ولید کے رسالے سے محفوظ ہو جائے اور قبل اس کے کہ مشرکین کی پیادہ فوج اس بلندی پر پہنچے انھیں اپنے بکھرے ہوئے آدمیوں کو جمع کرنے کا موقع مل جائے اور وہ اپنے مورچے کو مستحکم کر لیں۔ چناں چہ یہی ہوا اور وہ کام یاب ہوئے۔ یعنی آنحضرت ﷺ نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے دفاعی منصوبہ کو تبدیل کیا اور وہ نہایت نازک موقعہ پر اس میں کام یاب ہوئے اور اس لیے کام یاب ہوئے کہ یہ منصوبہ سادہ اور لچکدار تھا۔ آپ ﷺ جانتے تھے کہ حصول مقصد کے طریقے ایک سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ان کا باہم توازن کر کے ترک و اختیار کا فوری فیصلہ کیا اور مشرکین کی طرح یہ غلطی نہ کی کہ خواہ کچھ کیوں نہ ہو۔ جنگ ضرور کریں گے۔ اس طرح مشرکین اس فوقیت کو کھو بیٹھے جو انھیں حاصل ہو گئی تھی۔ گو ابتدا میں ان کا منصوبہ صحیح اور صائب تھا مگر جب آنحضرت ﷺ کی جنگی چال نے انھیں الجھن میں ڈال دیا تو وہ گھبرا گئے۔ آنحضرت ﷺ نے ایسی جنگی چال چلی جس کا انھیں وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا یعنی بقول نپولین ”دشمن کو جھانسہ دے کر ایسے شش و پنج میں مبتلا کر دینا کہ وہ بدحواسی میں غلط چال چلے اور اس غلط چال سے اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دے۔“

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن نے ایسے میدانِ جنگ کا انتخاب کیا جو رسالے کی لڑائی کے لیے بہترین سمجھا جا سکتا ہے (آج کل اسے ٹینکوں کی لڑائی کے لیے موزوں ترین تصور کرنا چاہیے) یعنی کفار کا خیال یہ تھا کہ جبل احد ہمارے مورچہ کی پشت پر ہوگا، وادی قناۃ اور مدینے کے درمیانی علاقے کی ناہموار زمین میں رسالے کو مسلمانوں پر اچانک حملہ کرنے کا موقع مل جائے گا، ایسی صورت میں ان کی کام یابی یقینی تھی بالخصوص اس لیے کہ ان کے رسالے کا سالار خالد بن ولید تھا۔ علاوہ ازیں انھیں عبداللہ بن ابی بن سلول کی منافقت اور غداری پر کافی بھروسہ تھا۔ مگر آنحضرت ﷺ نے ان کی اس جنگی چال کو اپنی دفاعی سیاست سے بالکل مات کر دیا۔ پھر درے کے پانی کے چشموں پر قبضہ کر کے مشرکوں کو پانی سے محروم کر دیا۔ جس کی وجہ سے انھیں اپنے جانوروں کو پانی پلانے کے لیے کئی میل دور سے جا کر پانی لانا پڑتا تھا۔ تین ہزار فوج، اس کی بار برداری اور رسالے کے جانوروں کو جمع کیا جائے تو ان کی تعداد چار ہزار سے کم نہ ہو گی۔ ان کے لیے روزانہ چارہ اور پانی کی فراہمی ایک بڑا اہم مسئلہ تھا۔ یہ بھی آنحضرت ﷺ کے دفاعی منصوبہ کی کام یابی تھی۔ بقول سقراط آپ نے دشمن کی فوج کے سامان رسد کے انتظامات کو پیش نظر رکھ کر ایسا دفاعی منصوبہ بنایا اور اس پر اس طرح عمل کیا کہ دشمن کی عددی فوقیت خاک میں مل کے رہ گئی۔

آغاز جنگ سے قبل آپ ﷺ نے فوج کی تقسیم و ترتیب اس طرح فرمائی کہ میمنہ، میسرہ اور عقب سب محفوظ ہو گئے۔ اگرچہ آپ ﷺ کے پاس سوار کم تھے لیکن چوں کہ موسم اور فضا کی حالت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا لہٰذا آپ ﷺ نے سراب صحرا سے پورا فائدہ اٹھایا۔ رسالے کے دو حصے کر کے ایک حصہ زبیرؓ کے ماتحت گھاٹی میں چھپا دیا، دوسرے حصے کے ”سراب“ سے یہ فائدہ اٹھایا کہ اس کی طاقت اصل سے کئی گنا زیادہ معلوم ہونے لگی۔ اس کے لیے آپ ﷺ نے اس کی نقل و حرکت اس طرح رکھی کہ دشمن نے سمجھا کہ وہ اس کے میسرہ کی طرف بڑھ رہا ہے حالانکہ وہ برساتی نالوں میں سے ہو کر دوسرے دستے کے قریب دشمن کے پہلو پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے جو فن سپہ گری کے ماہر تھے خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل کو شش و پنج میں ڈال دیا۔ خالد بن ولید یہ سمجھا کہ میدان صاف ہے لہٰذا اس نے حملہ کر دیا تا کہ پیدل مسلم فوج کے میسرہ (بائیں پہلو) کو بیکار کر دے۔ عکرمہ مسلم رسالے کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے ٹھہر گیا۔ یہ اس کی بڑی حماقت تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد کے رسالے پر جو مسلمانوں کے میسرہ پر حملہ کرنے کے لیے بڑھ رہا تھا پہلے تو دو طرف سے تیروں کی سخت بوچھاڑ ہوئی اس کے بعد زبیرؓ کے سواروں نے خالد کے رسالے کے دونوں پہلوؤں میمنہ اور میسرہ پر اچانک حملہ کر

دیا۔ رسالے کو اس مشکل میں پھنسا دیکھ کر خالد نے اپنی غلطی کو محسوس کیا لہٰذا فوراً اسے وادی قناۃ کی طرف لاکر واپس لوٹ گیا۔ اس نرغہ سے نکل جانا خالد جیسے بہادر ہی کا کام تھا اور شاید اسی جنگ کے ان مشاہدات نے آنحضرت ﷺ کو خالد کی حربی مہارت کا مداح بنا دیا تھا کہ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو اسلامی فوج کے بڑے حصے کے سپہ سالار مقرر کیے گئے۔

اس کے بعد زبیرؓ کے سواروں نے عکرمہ کے رسالے پر حملہ کر کے اسے درہم برہم کر دیا پھر پیادہ لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ یہ لڑائی رسالہ (ٹینک) کی جنگ کا بہترین نمونہ ہے۔ کیوں کہ مسلم رسالے کے اس حملے نے دشمن کے رسالوں اور پیدل فوج سب میں انتشار پیدا کر دیا۔ مسلم پیادہ فوج نے جو اپنے رسالے کے منصوبے سے اچھی طرح واقف تھی اس کے ساتھ ہی حملہ کر کے دشمن کو شکست دے دی۔

یہاں تک تو جنگ آنحضرت ﷺ کے حکم اور آپ ﷺ کے منصوبے کے مطابق لڑی گئی مگر اس کے بعد دو غلطیاں ہوئیں۔ ایک لوٹ مار جس پر تبصرہ کیا جا چکا ہے، دوسرے دشمن کی پسپائی کے وقت اس کا تعاقب نہ کرنا۔ لوٹ مار کی ہوس میں تیر انداز اپنی جگہ سے ہٹ گئے اور اس طرح دشمن کو اپنی فوج پر حملہ کرنے کا موقع دے دیا اور پیدل فوج نے دشمن کا تعاقب نہ کر کے دفاعی سیاست کے ایک اہم اصول کی خلاف ورزی کی۔ فاتح فوج کے لیے لازمی ہے کہ جس وقت میدان سے دشمن کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ تو تعاقب کر کے اس کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ مگر اس میں کام یابی اسی وقت ہوتی ہے جب دشمن کا عزم و بے باکی اور حوصلہ مندی سے تعاقب کیا جائے ورنہ ذرا سی کوتاہی اور غلطی سے بوکھلائے ہوئے دشمن کو سنبھلنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ مشرکین کی یہی غلطی تھی کہ جنگ کا پانسہ پلٹنے پر انھوں نے مسلم فوج کا تعاقب نہیں کیا اور بالآخر یہ غلطی ان کی بربادی کا باعث بن کر رہی۔ دوسری جنگ عظیم میں یہی غلطی ہٹلر نے کی کہ اس نے اتحادی فوجوں کو ڈنکرک سے بچ کر نکل جانے کا موقع دے دیا۔ اور پہلی عالم گیر جنگ میں اس کا ارتکاب اتحادیوں نے کیا تھا کہ 1918ء میں جرمن فوج کو ہنڈنبرگ لائنز سے نکال دیا۔ اگرچہ فتح ان کی ضرور ہوئی اور جرمنی صلح کی درخواست کرنے پر بھی مجبور ہوا۔ مگر اس کی فوج موجود و محفوظ رہی۔ اس نے شکست قبول نہیں کی۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ کے بعد جرمن فوج کا عزم و حوصلہ بلند تھا کیوں کہ جہاں اس نے شکستیں کھائی تھیں وہاں اتحادیوں کو شکستیں دی تھیں۔ صلح نامہ پر دستخط کے وقت تک اس کے قبضے میں فرانس کا خاصہ حصہ تھا۔ اتحادی فوج کے کسی سپاہی کا قدم جرمنی کی سرزمین پر نہ پہنچا تھا۔ بالکل اسی طرح اُحد میں مسلم فوج کو وقتی طور پر نقصان ضرور پہنچا تھا۔ مگر چوٹ برابر کی تھی۔ جہاں مشرکین کے دل میں جذبہ تھا کہ ان مسلم دیوانوں سے لڑ کر مفت میں جانیں گنوا رہے ہیں وہاں مجاہدین کے دلوں میں عدول حکمی کی تقصیر پر ندامت تھی اور وہ اس داغِ تقصیر کو جلد سے جلد دھو دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا جان کی بازی لگانے پر تلے ہوئے تھے۔ ایسے موقع پر فوج کو جانی نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں رہتا اور وہ انتہائی استقلال و پامردی سے لڑتی ہے۔

ایسے حالات کے بارے میں نپولین کی رائے یہ ہے کہ ان کے ماتحت جنگ کی تقدیر بعض اوقات سالار کی تدبیر کو مات کر دیتی ہے کیوں کہ جس فوج کے سپاہی حوصلہ کھو بیٹھتے ہیں اس کے سالار کی تدبیر بیکار ہو جاتی ہے اور اس طرح تقدیر تدبیر پر حاوی ہو جاتی ہے۔

ان واقعات اور شواہد سے ظاہر ہے کہ میدانِ جنگ میں صرف اسی فوج کو فتح حاصل ہوتی ہے جو عزم و ہمت کے ساتھ حملہ کرتی ہے اور کام یاب ہونے پر بلا تاخیر دشمن کا تعاقب کر کے اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

ناگہانی حملہ جنگ کا نہایت کارگر حربہ ہے جو فوج اسے استعمال کرتی ہے کام یابی اسی کے قدم چومتی ہے۔ ناگہانی حملہ سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے موقع شناسی کی سخت ضرورت ہے اور موقع شناسی وہی سالار کر سکتا ہے جو میدان جنگ میں مناسب موقع پر خود موجود ہو۔ پھر ماتحت سالاروں کو اپنے سالارِ اعلیٰ پر پورا اعتماد ہونا چاہیے مثلاً جب مسلم فوج کو آنحضرت ﷺ کی حکم عدولی کی پاداش میں شکست ہونا شروع ہوئی تو آنحضرت ﷺ پہاڑ کی بلندی کی طرف بڑھے۔ حضرت حمزہؓ نے جوابی حملہ کیا۔ حضرت علیؓ نے درے پر قبضہ کر کے دشمن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا اور اس طرح ہزیمت خوردہ مسلم فوج میں دوبارہ ہمت و حوصلہ پیدا ہو گیا۔ بالفاظِ دیگر سالار اور ماتحت سالار اپنے دفاعی منصوبے کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے۔ ایسے نازک اور خطرناک موقعہ پر حالات کا سنبھال لینا صرف اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ مسلم سپہ سالار کی شخصیت ان کا عزم و حوصلہ مندی اور خوش تدبیری اور اختراعی ملکہ حریف و مقابل سالار سے بہت اعلیٰ وارفع تھا اور اس سے آپ نے پورا پورا کام لیا۔

غزوۂ اُحد پر قرآن کا تبصرہ

اس غزوے کے متعلق سورۂ آل عمران کی ساٹھ آیات (آیت 121 تا 180) نازل ہوئیں۔ اس جنگ کے لیے نبی ﷺ کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینے سے نکلے تھے، مگر راستے سے تین سو منافق یکا یک الگ ہو کر مدینے کی طرف پلٹ گئے اور سات سو آدمی آپ ﷺ کے ساتھ رہ گئے تھے، ان میں بھی منافقین کی ایک چھوٹی سی جماعت شامل رہی، جس نے جنگ کے دوران میں مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ پہلا موقع تھا، جب معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اپنے گھر میں اتنے زیادہ مارِ آستین موجود ہیں اور وہ اس طرح باہر کے دشمنوں کے ساتھ مل کر خود اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے پر تلے ہوئے ہیں۔

غزوہ احد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی، اس میں اگرچہ منافقین کی تدبیروں کا ایک بڑا حصہ تھا، لیکن اس کے ساتھ مسلمانوں کی اپنی کم زوریوں کا حصہ بھی کچھ کم نہ تھا اور یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ایک خاص طرزِ فکر اور نظامِ اخلاق پر جو جماعت ابھی تازہ ہی بنی تھی، جس کی اخلاقی تربیت ابھی مکمل نہ ہو سکی تھی، اور جسے اپنے عقیدہ و مسلک کی حمایت میں لڑنے کا یہ دوسرا موقع ہی پیش آیا تھا، اس کے کام میں بعض

وریوں کا ظہور بھی ہوتا، اس لیے یہ ضرورت پیش آئی کہ جنگ کی پوری سرگزشت پر
ک مفصل تبصرہ کیا جائے، اور اس میں اسلامی نقطۂ نظر سے جو کمزوریاں مسلمانوں کے
در پائی گئی تھی، ان میں سے ایک ایک کی نشان دہی کر کے اس کی اصلاح کے متعلق
دایات دی جائیں۔ اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اس غزوے پر
رآن کا تبصرہ ان تبصروں سے کتنا مختلف ہے جو دنیوی جنرل اپنی لڑائیوں کے بعد کیا
کرتے ہیں۔

سورۂ آلِ عمران کی آیت 152 قرآنی تبصرے کا خلاصہ ہے، جس کا اردو ترجمہ یہ
ہے: "اللہ نے (تائید و نصرت) کا جو وعدہ تم سے کیا تھا، وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا
یں اس کے حکم سے تم ہی انھیں قتل کر رہے تھے، مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے
کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمھیں دکھائی جس کی محبت میں تم
گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت)، تم اپنے سرداروں کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے، اس
لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے،
ب اللہ نے تمھیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا، تاکہ تمھاری آزمائش کرے۔
ور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمھیں معاف ہی کر دیا، کیوں کہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر
عنایت رکھتا ہے۔"

پھر آخر میں اس غزوے کے نتیجے اور حکمت پر ایک جامع روشنی ڈالی گئی۔ آیت
179 میں ارشاد ہوا:

﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ اِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ٥﴾ (آل عمران: 179)

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ مومنوں کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس میں تم اس وقت پائے
جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا، مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں
ہے کہ تمھیں غیب پر مطلع کر دے۔ غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسولوں میں
سے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہٰذا (غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسول
پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور تقویٰ کی روش پر چلو گے، تو تمھیں بڑا اجر ملے گا۔"

غزوۂ حمراء الاسد

اس غزوے کا ذکر اگرچہ ایک مستقل نام سے کیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ کوئی
مستقل غزوہ نہ تھا، بلکہ غزوۂ احد ہی کا تتمہ اور اسی کے صفحات میں سے ایک صفحہ تھا۔

دراصل مشرکین جب احد سے واپس چلے گئے اور مدینے سے 26 میل دور مقام
روحا پر پہنچ کر پڑاؤ ڈالا تو ایک دوسرے پر لعنت ملامت کرنے لگے کہ جب ہمیں فتح
حاصل ہو چکی تھی اور ہم تقریباً مکمل غلبہ پا چکے تھے تو ہم محمد ﷺ اور اس کے ساتھیوں
کو قتل کیے بغیر کیوں واپس چلے آئے۔ ہمیں تو چاہیے تھے کہ اس موقع سے خوب فائدہ
اٹھاتے اور مسلمانوں کا قصہ تمام کر کے لوٹتے۔

چناں چہ ان میں اختلاف رائے ہو گیا۔ اکثریت کا خیال تھا کہ ہمیں دوبارہ
مدینے پر حملہ کر دینا چاہیے، اور اس سے پہلے کہ مسلمان تازہ دم ہو کر ہمارے مقابلے پر
آ جائیں، انھیں تہ تیغ کر دینا چاہیے۔ لیکن ان کے ایک ذمہ دار افسر صفوان بن امیہ کی
رائے یہ تھی کہ مسلمان اس وقت سخت غصے کے عالم میں ہیں، اور وہ جوشِ انتقام سے
بھرے ہوئے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ جو مسلمان کل احد نہیں آئے تھے، وہ بھی اب
تمھارے خلاف جمع ہو جائیں گے۔ اگر ہم نے انھیں دوبارہ چھیڑا تو چھوٹے بڑے
سر بکف ہو کر میدان میں اتر آئیں گے۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ہماری یہ فتح شکست
میں بدل جائے۔ مجھے خطرہ ہے کہ مدینے پر چڑھائی کرو گے تو ہمیں بدر کی طرح رسوا
ہو کر بھاگنا پڑے گا۔"

سرورِ دو عالم ﷺ کو مشرکین کے اس اختلاف رائے کی اطلاع پہنچی۔
آپ ﷺ پہلے ہی اس فکر میں غلطاں تھے کہ مشرکین مدینے کی طرف پلٹنے کی بات
ضرور سوچیں گے۔ آپ ﷺ نے احد کے دن کی رات (سات شوال کی رات)
جنگ سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرتے ہوئے گزاری تھی۔ آپ ﷺ کو
اندیشہ تھا کہ مشرکین پلٹ کر مدینے پر دوبارہ حملہ کر دیں گے۔ چناں چہ جب ان کے
اختلاف رائے کی اطلاع پہنچی تو ثابت ہوا کہ آپ ﷺ کا اندیشہ بالکل حق تھا۔

چناں چہ معرکہ احد کے دوسرے دن یعنی یک شنبہ (اتوار) آٹھ شوال تین ہجری
کو علی الصباح حضور ﷺ نے فرمادیا کہ دشمن کے مقابلے کے لیے چلنا ہے اور ساتھ
ہی اعلان بھی فرمایا کہ ہمارے ساتھ صرف وہی آدمی چل سکتا ہے جو معرکہ احد میں
موجود تھا۔ اس تحدید کا ثبوت بھی مل گیا جب رأس المنافقین عبداللہ بن ابی نے ساتھ
چلنے کی اجازت چاہی، مگر آپ ﷺ نے اجازت نہ دی۔

اس وقت جنگ کے دوسرے ہی دن جنگ کے لیے نکلنا بہت مشکل تھا، کیوں کہ
مجاہدین ابھی پوری طرح آرام بھی نہیں کر پائے تھے اور وہ زخموں سے چور تھے۔ ایک
ایک مجاہد کے بدن پر بیس بیس اور تیس تیس گہرے گھاؤ لگے تھے، جن کی ابھی مرہم پٹی بھی نہ
ہوئی تھی اور جن سے ابھی تک خون رس رہا تھا، مگر حضور ﷺ کا فرمان سنتے ہی سب
اٹھ کھڑے ہوئے اور میدان کارزار کی طرف جانے کے لیے کمربستہ ہو گئے۔

رسول اللہ اپنے مجاہدوں کو ہم راہ لے کر روانہ ہوئے اور مدینے سے آٹھ میل دور
حمراء الاسد کے مقام پر پہنچ کر خیمہ زن ہوئے۔ یہاں قیام کے دوران میں قبیلہ خزاعہ کا
رئیس معبد بن ابی معبد آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہوا
(اور کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے شرک ہی پر قائم تھا، لیکن نبی ﷺ کا خیر خواہ تھا)۔ معبد
نے دل جوئی کے انداز میں کہا: "یا محمد ﷺ آپ پر اور آپ کے اصحاب پر جو
مصیبت گزری ہے، اس کا ہمیں بہت دکھ ہوا ہے۔ ہم تو دل سے چاہتے ہیں کہ اللہ
تعالیٰ آپ ﷺ کو عزت اور سربلندی نصیب کرے۔"

اس اظہارِ ہمدردی پر حضور ﷺ نے معبد سے فرمایا: "ابوسفیان کے پاس جاؤ
اور اس کی حوصلہ شکنی کرو۔"

ابوسفیان اور اس کے فوجی ابھی روحا میں پڑاؤ ڈالے پڑے تھے کہ معبد وہاں پہنچ گیا۔ ابوسفیان نے پوچھا: ''پیچھے کی کیا خبر ہے؟''

معبد نے کہا: ''مسلمانوں کے تیور انتہائی خطرناک ہیں۔ وہ سب لوگ بڑی جمعیت بنا کر تم لوگوں کے تعاقب میں چل پڑے ہیں۔ ان کے غصے کا یہ عالم ہے کہ گویا ان کے سینوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ اوس و خزرج کے جو لوگ کل جنگ میں شامل نہیں ہوئے تھے، اب وہ بھی مسلمانوں کے ساتھ مل گئے ہیں، اور یہ عہد کر کے مدینے سے نکلے ہیں کہ یا انتقام لیں گے یا سب کٹ مریں گے۔''

مشرکین تو یہ سننا چاہتے تھے کہ مسلمان غم واندوہ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ زخموں سے کراہ رہے ہیں اور سخت مایوس و دل گرفتہ ہیں۔ معبد کی زبانی یہ باتیں سن کر انھیں سخت حیرت ہوئی۔ ابوسفیان بولا: ''کیا کہہ رہے ہو معبد! ہم تو واپس جا کر دوبارہ حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور تم حوصلہ شکن خبریں سنا رہے ہو۔''

معبد نے جواب دیا: ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ جو صحیح صورت حال تھی وہ میں نے بیان کر دی ہے، اس لیے فی الحال مسلمانوں کو چھیڑنے کا خیال بھی دل میں مت لانا۔''

مشرکین میں صفوان کی پہلے ہی یہ رائے تھی۔ معبد کی باتوں سے اس کی مزید تائید ہو گئی۔ اب مکی لشکر کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ ان پر رعب اور گھبراہٹ طاری ہو گئی اور انھیں اسی میں عافیت نظر آئی کہ مکے کی جانب اپنی واپسی جاری رکھیں۔

اتفاق سے قبیلہ عبدالقیس کا ایک قافلہ روحا سے گزرا۔ ابوسفیان نے ان سے کہا: ''اگر تم لوگ میرا یہ پیغام محمد ﷺ کو پہنچا دو گے کہ قریش جمع ہو کر مدینے پر حملے کے لیے آ رہے ہیں، تو میں تمھارا اونٹ میلا عکاظ میں کشمش سے بھر دوں گا۔'' جب یہ قافلہ حمراء الاسد میں نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے پاس سے گزرا تو انھوں نے ابوسفیان کا پیغام پہنچا دیا (جس کی حیثیت ایک نفسیاتی حربے سے زیادہ نہ تھی)۔ مسلمانوں نے جواباً کہا:

﴿حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

''اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔''

رسول اللہ اتوار کے دن حمراء الاسد تشریف لے گئے تھے۔ پیر، منگل اور بدھ یعنی 9، 10، 11 تک وہیں مقیم رہے۔ قیام کے دوران میں حضرت سعدؓ بن عبادہ نے رسد کا انتظام کیا۔ تیس اونٹ کھجوروں سے لدے ہوئے ساتھ تھے۔ تین اونٹ روزانہ ذبح کیے جاتے۔

تین دن کے قیام کے بعد مسلمان مدینہ لوٹ رہے تھے کہ راستے میں دو کافر گرفتار ہوئے۔ ان میں ایک ابوعزہ جمحی تھا۔ وہی شعلہ بیان شاعر، جو بدر کی جنگ میں بھی گرفتار ہوا تھا۔ اور اسے مفلسی اور لڑکیوں کی کثرت کے سبب اس شرط پر بلا فدیہ چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے خلاف کسی سے تعاون نہیں کرے گا، لیکن اس نے بدعہدی کی اور اپنے اشعار کے ذریعے رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے خلاف لوگوں کے جذبات بھڑکائے۔ اور اب مسلمانوں سے لڑنے کے لیے احد میں چلا آیا تھا۔ اب پھر اپنی بیٹیوں کے واسطہ دے کر عہد کرنا چاہا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اب یہ نہیں ہو سکتا کہ تم مکے جا کر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرو اور کہو کہ میں نے محمد ﷺ کو دو مرتبہ دھوکہ دیا۔ مومن ایک سوراخ سے دوبارہ نہیں ڈسا جا سکتا۔'' اس کے بعد حضرت زبیرؓ یا حضرت عاصمؓ بن ثابت نے آپ ﷺ کے حکم پر اس کی گردن ماردی۔

دوسرا شخص مکے کا ایک جاسوس معاویہ بن مغیرہ بن ابی العاص تھا۔ یہ شخص مدینہ میں جاسوسی کر کے واپس ہو رہا تھا۔ حضرت زیدؓ بن حارثہؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسر نے اس کا تعاقب کیا اور تہ تیغ کر دیا۔

سال تین ہجری کو بعض مورخین ''سن تمحیص'' یعنی آزمائش کا سال کہا ہے۔ اسی سال 15 رمضان کو حضرت امام حسنؓ کی ولادت ہوئی۔ اسی سال وراثت کے بارے میں احکام نازل ہوئے اور ذوی الارحام کے حقوق کی تفصیل آئی۔ جنگ اُحد کے بعد حضور ﷺ نے ام المومنین حضرت زینبؓ بنت خزیمہ سے نکاح فرمایا۔ آپ ﷺ کے پہلے شوہر کا نام عبداللہؓ بن جحش تھا، جو حضورؐ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے۔ جنگ احد میں شہید ہوئے۔

۴ ہجری......13 جون 625ء......یکم جون 626ء (عمر مبارک 56 سال)

سریہ ابوسلمہؓ......یکم محرم 4 ہجری۔ 626ء

عبداللہ بن انیس کی مہم......5 محرم، ۴ ہجری۔ 626ء

بئر معونہ کا المناک المیہ

(70 صحابہؓ و قراء کی شہادت)......صفر 4 ہجری۔ 626ء

قنوت نازلہ......4 ہجری۔ 626ء

غزوہ بنونضیر......ربیع الاول، 4 ہجری۔ 626ء

شراب کی حرمت......ربیع الاول، 4 ہجری۔ 626ء

ام المومنین ام سلمہؓ سے نکاح......ربیع الاول، 4 ہجری۔ 626ء

غزوہ بدر (دوم) صغریٰ......شعبان، 4 ہجری۔ 626ء

حکم حجاب (پردہ)......جمعہ، یکم ذی قعدہ۔ 4 ہجری۔ 626ء

سریہ ابوسلمہؓ مخزومی

مسلمان جب مدینہ پہنچے تو نقشہ بدلا ہوا تھا اور حالات دگرگوں پائے۔ اگرچہ غزوۂ اُحد کے بعد لشکر قریش کا تعاقب کر کے واپس آئے تھے، اور ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کو دوبارہ لوٹ کر ان پر حملہ کرنے کی جرات نہ ہوئی تھی۔ تاہم احد کی شکست سے مسلمانوں کی ہوا اکھڑ گئی تھی، اور یہ بھی اندیشہ تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے عرب قبائل بھی ان سے مقابلے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ اس خیال سے آپ ﷺ نے عرب قبائل کے حالات کی تفتیش کی اور مسلمانوں کے اقتدار کی بحالی کے سلسلے میں غور و خوض کیا۔

نبی کریم ﷺ کو غزوۂ احد کے اختتام کے دو ماہ بعد، یکم محرم کو یہ خبر ملی کہ خالد کے لڑکے طلحہ اور سلمہ جو بنی اسد کے سردار تھے، اپنے قبیلے کے لوگوں کو مدینہ پر

کرنے اور مسلمانوں کا مال و متاع لوٹنے کی ترغیب دے رہے ہیں، اور یہ جرأت انھیں اس خیال سے ہوئی ہے کہ غزوہ احد کے بعد مسلمانوں کے کس بل نکل گئے ہیں اور ان میں مقابلے کی طاقت نہیں رہی۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد کو ڈیڑھ سو مجاہدین کی ایک جمعیت کے ساتھ قبیلہ بنی اسد کی طرف جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ رات کو سفر جاری رہے اور دن میں نقل و حرکت کا راز پوشیدہ رہے۔ غیر معروف راستے سے سفر کرنا چاہیے۔

ابوعبیدہ، سعدؓ بن ابی وقاص اور اسیدؓ بن حضیر بھی اس غزوے میں شریک تھے۔

حضرت ابوسلمہؓ نے نبی کریم ﷺ کی ہدایات پر عمل کیا اور ایک دن بے خبری کے عالم میں بنی اسد پر ہلہ بول دیا۔ بنی اُسَد مقابلے کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلے۔ ابوسلمہؓ خود وہیں ٹھہرے اور مسلمانوں کی ایک جماعت کو مفرورین کے تعاقب کے لیے بھیجا۔ بنی اُسَد کے کچھ لوگ گرفتار کر لیے گئے اور ان کا مال قبضے میں لے لیا گیا۔ خمس نکال کر غنیمت کا مال تقسیم کر دیا گیا۔ یوں ہر غازی کے حصے میں سات اونٹ اور چند بکریاں آئیں۔ اس واقعے سے مسلمانوں نے کسی حد تک اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا۔

چند روز کے بعد حضرت ابوسلمہؓ نے وفات پائی۔ وہ حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے اور رضاعی بھائی بھی۔ اسلام لانے والوں میں ان کا نمبر گیارھواں ہے۔ غزوۂ احد میں ان کے شانے پر ایک گہرا زخم آیا تھا جو اگرچہ بظاہر اچھا ہو گیا تھا، لیکن سفر کی صعوبت سے زخم کھل گیا اور پھر سے خون جاری ہو گیا۔ اسی عالم میں آئندہ ماہ صفر میں آپ اللہ کو پیارے ہوئے۔ آپؓ کی اہلیہ بعد میں حضور ﷺ کے عقد میں آئیں اور ام المومنین بنیں۔

عبداللہؓ بن انیس کی مہم

اس ماہ محرم کی پانچ تاریخ کو یہ خبر ملی کہ خالد بن سفیان ہذلی مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے فوج جمع کر رہا ہے۔ یہ شخص مکہ کے قریب وادی عرنہ میں رہتا تھا اور مختلف قبائل میں اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ غزوۂ احد کے بعد اس نے متعدد قبائل کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور مدینے پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔

چوں کہ اس تمام شر انگیزی کا روحِ رواں یہی ایک شخص تھا، اس لیے حضور ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو اس کا کام تمام کرنے کا حکم دیا۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اس کی کوئی نشانی بتائیے، کیوں کہ میں تو اسے پہچانتا ہی نہیں۔

حضور ﷺ نے بتایا: ''اس کی نشانی یہ ہے کہ اسے دیکھتے ہی تم پر ہیبت اور خوف چھا جائے گا۔''

حضرت عبداللہؓ نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ، میں تو آج تک کبھی کسی سے ڈرا نہیں ہوں۔''

''اس کے باوجود اس کی نشانی یہی ہے کہ اسے دیکھ کر تم خوف زدہ ہو جاؤ گے۔'' آنحضور ﷺ نے پھر وہی نشانی بیان فرمائی۔

بہرحال حضرت عبداللہ روانہ ہو گئے۔ طویل سفر طے کر کے اس کے مستقر وادی عرنہ پہنچے، اور جب اس پر نظر پڑی تو حضور ﷺ کی صداقت ظاہر ہو گئی۔ حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ اسے دیکھ کر میں واقعی ڈر گیا اور مجھ پر اس کی ہیبت چھا گئی۔ تاہم جُرأت کر کے آگے بڑھا ملاقات کی اور اس کی من پسند باتیں شروع کر دیں۔

خالد ہذلی کے پاس کئی عورتیں تھیں اور وہ مکان کی تلاش میں تھا۔ خالد ہذلی نے حضرت عبداللہؓ سے پوچھا: ''آپ کون ہیں؟''

حضرت عبداللہ: ''میں ایک عرب ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ نبی کریم ﷺ سے جنگ کے لیے فوجی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

خالد ہذلی جواب دیا: ''ہاں، مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ ترتیب دے رہا ہوں۔''

حضرت عبداللہ کا بیان ہے ''اس کو میری گفتگو بہت پسند آئی، اور مجھے اپنے خیمے میں لے گیا۔ رفتہ رفتہ اس کے آدمی اور محافظ رخصت ہو گئے اور ہم رات گئے دیر تک باتیں کرتے رہے۔ جب میں نے محسوس کیا کہ لوگ سو گئے ہیں اور میدان صاف ہے تو میں نے ایک ہی وار سے گردن ماردی اور اس کا سر کاٹ کر خیمے سے نکل آیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے قتل کا پتا چل گیا اور اس کے پیروکار میری تلاش میں چاروں طرف پھیل گئے۔''

حضرت عبداللہ ایک غار میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ لوگوں نے آپ کا تعاقب کیا اور غار تک آئے، مگر قدرتِ حق سے وہ آپ کی تلاش میں ناکام رہے۔ بعدازاں آپ غار سے نکل کر عازمِ مدینہ ہوئے۔ آپ رات چلتے اور دن کو پوشیدہ ہو جاتے۔ اس طرح منازل طے کرتے ہوئے، اٹھارہ روز باہر رہ کر 23 محرم کو واپس مدینہ پہنچے اور بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر خالد کا سر حضور ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا۔ حضور ﷺ اس مہم کی کامیابی پر بہت خوش ہوئے اور حضرت عبداللہؓ کو ایک عصا انعام میں دے کر ارشاد فرمایا: ''یہ میرے اور تمھارے درمیان قیامت کے روز نشانی رہے گا۔'' حضرت عبداللہ ساری عمر اس عصا کی حفاظت کرتے رہے۔ مرتے وقت وصیت کی کہ یہ عصا بھی ان کے ساتھ ان کے کفن میں لپیٹ دیا جائے۔

رجیع کا حادثہ

اگلے ماہ صفر میں قبیلہ عضل اور قارہ کے کچھ لوگ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لہٰذا چند لوگ ہمارے ساتھ کر دیجیے جو ہمیں قرآن حکیم پڑھائیں اور اسلام کی تعلیم دیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کی درخواست قبول فرماتے ہوئے حضرت مرثد ابن ابیؓ مرثد، حضرت خالدؓ بن بکیر، حضرت عاصمؓ بن ثابت، حضرت خبیبؓ بن عدی، حضرت زیدؓ دثنہ بن معاویہ، اور عبداللہ بن طارق کو ان کے ہم راہ کیا۔ جماعت صحابہؓ کے امیر مرثد ابن ابی مرثد یا حضرت عاصمؓ بن ثابت تھے۔ بعض مورخین نے مبلغین صحابہ کی تعداد چھے کے بجائے دس لکھی ہے۔

یہ لوگ جب مقامِ رجیع پر پہنچے جو مکہ اور عسفان کے درمیان واقع ہے، تو ان غداروں نے مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کی اور آواز دے کر بنی ہذیل کو بلایا۔ بنی ہذیل دوسو آدمی لے کر، جن میں سے سو آدمی تیرانداز تھے، مسلمانوں کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ جب وہ قریب پہنچے تو حضرت عاصمؓ مع اپنے رفقا کے، ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور لڑائی پر آمادہ ہوئے۔

بنوہذیل، عضل اور قارہ کے مشرکین نے کہا کہ آپ لوگ ٹیلے سے نیچے اتر آئیں ہم آپ کو امان دیتے ہیں۔ ہمارا مقصد لڑائی کرنا نہیں، بلکہ صرف تمھیں آزمانا تھا کہ اگر اہل مکہ سے مقابلہ ہوجائے تو تم لوگ ان کے مقابلے پر ٹھہر سکو گے یا نہیں۔ مگر مرثدؓ، خالدؓ اور عاصمؓ نے کہا کہ ہم مشرکین کا عہد قطعاً قبول نہیں کریں گے اور پھر ترکش سے تیر نکال کر مقابلہ کیا۔ جب تیر ختم ہو گئے تو تینوں صحابہؓ نے نیزے سنبھال لیے۔ حضرت عاصمؓ نے جوش میں آکر ساتھیوں سے کہا: ''تمھارے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شہادت کو غنیمت جانو۔ تمھارا محبوب تمھارے ساتھ ہے اور جنت کی حوریں تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔''

یہ الفاظ سنتے ہی صحابہؓ نہایت بے جگری سے لڑے، حتیٰ کہ جب نیزے ٹوٹ گئے تو تلواریں نکال لیں، مگر کفار کی تعداد زیادہ ہونے کے باعث کچھ پیش نہ گئی اور تینوں شہید ہو گئے۔ شہادت کے وقت حضرت عاصمؓ نے دعا کی: ''یا اللہ، اپنے رسول ﷺ کو ہمارے حال سے آگاہ فرمادے۔''

اللہ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور اسی وقت آنحضور ﷺ کو اس واقعے کا علم ہو گیا۔ حضرت عاصمؓ یہ سن چکے تھے کہ سلافہ نے میرے کاسۂ سر میں شراب پینے کی منت مانی ہے، کیوں کہ اس کے دو بیٹوں کو حضرت عاصمؓ نے غزوہ احد میں قتل کیا تھا، اس لیے دمِ آخر یہ دعا بھی کی کہ: ''یا اللہ، میرا سر تیرے راستے میں کاٹا جا رہا ہے، سو تو ہی اس کا محافظ ہے۔''

اللہ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ چناں چہ شہادت کے بعد جب کفار نے آپؓ کا سر کاٹنے کا ارادہ کیا تو شہد کی مکھیوں اور ایک روایت کے مطابق بھڑوں کے ایک غول نے آپ کے جسدِ خاکی کو گھیر لیا۔ کفار نے خیال کیا کہ رات کے وقت جب یہ اڑ جائیں گی تو سر کاٹ لیں گے۔ مگر رات کو زبردست بارش کا ایک ریلا نعش بہا کر لے گیا اور آپ کے کاسۂ سر میں شراب پینے کی حسرت کفار کے دل ہی میں رہ گئی۔

باقی تین صحابہ یعنی خبیبؓ، زیدؓ، اور عبداللہؓ بن طارق کے ساتھ کفار نے پھر عہد و پیمان کیا، کہ تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو۔ ہم تمھارے ساتھ قطعی بدعہدی نہیں کریں گے۔ صحابہؓ نے کفار کے عہد کا یقین کر لیا اور ٹیلے سے نیچے اتر آئے مشرکین نے حسب عادت عہد توڑ ڈالا اور تینوں کو رسیوں سے جکڑ لیا۔ جب یہ لوگ مقام ظہران پر پہنچے تو حضرت عبداللہ بن طارق کسی طرح آزاد ہو گئے اور مقابلہ کرنے کے لیے تلوار نکال لی، مگر کفار نے دور سے پتھر مار کر شہید کر دیا اور آپ کی شہادت گاہ ہی آپ کا مدفن بنی۔

مشرکین حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ کو رسیوں میں جکڑا ہوا مکہ لے گئے اور اپنے دو آدمیوں کے بدلے میں، جو قریش کے پاس قید تھے، دونوں صحابہ کو قریش کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ قریش نے ایک سو اونٹ کے عوض حارث کے قتل کا انتقام لینے کے لیے حضرت خبیبؓ کو عتبہ بن حارث بن ربیعہ کے لیے خریدا۔ اور حضرت زیدؓ بن ادثنہ کو پچاس اونٹوں کے عوض صفوان بن امیہ کے لیے خریدا، تاکہ وہ اپنے باپ امیہ بن خلف کے قتل کا انتقام لے سکے۔

صفوان بن امیہ نے حضرت زیدؓ کو حرم کے باہر مقام تنعیم پر اپنے غلام نسطاس کے ہاتھوں قتل کرا دیا۔ حضرت زیدؓ کے قتل کا تماشا دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ جمع تھے، جن میں ابوسفیان بھی تھا۔ کہتے ہیں کہ قتل سے پہلے ابوسفیان نے حضرت زیدؓ سے پوچھا: ''اے زید، کیا تم پسند کرتے ہو کہ تمھیں چھوڑ دیا جائے، تاکہ تم خوشی خوشی اپنے اہل وعیال میں رہو اور تمھاری جگہ محمد ﷺ کی گردن ماردی جائے۔''

عاشق رسول ﷺ حضرت زیدؓ نے جواب دیا: ''واللہ ہمیں یہ بھی پسند نہیں کہ ہم آزاد ہوں اور اپنے اہل وعیال میں رہیں اور محمد ﷺ جہاں بھی ہوں، انھیں ایک کانٹا بھی چبھے۔''

یہ سن کر ابوسفیان نے کہا: ''مَیں نے کسی کو کسی کا ایسا محب نہیں پایا، جیسا کہ محمد ﷺ کے اصحاب محمد ﷺ کو محبوب رکھتے ہیں۔''

آخر حضرت زیدؓ کو بھی اذیتیں دے دے کر شہید کر دیا گیا۔ ان کی زبان سے ادا ہونے والا آخری جملہ ''اللہ اکبر'' تھا۔

حضرت خبیبؓ کچھ عرصہ اہل مکہ کی قید میں رہے۔ انھیں موہب کے گھر میں قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ موہب اور ان کی اہلیہ ماریہ دونوں بعد میں مسلمان ہو گئے تھے۔ ماریہ نے بیان کیا کہ ''قید کے دوران میں تہجد کے وقت خبیب ایسے پرسوز لہجے میں قرآن پڑھا کرتا تھا کہ جہاں تک اس کی آواز پہنچتی تھی، سننے والوں کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے، اور خواتین پر تو انتہائی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ ایک دن مَیں نے خبیب سے کہا کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو بتاؤ۔

خبیبؓ نے کہا: ''ضرورت تو کوئی نہیں۔ البتہ میری تین خواہشیں ہیں، اگر پوری کر سکو تو۔ ایک یہ کہ غیراللہ کے نام پر ذبح کیے گئے جانور کا گوشت مجھے نہ کھلانا۔ دوسری یہ کہ پینے کے لیے صاف اور میٹھا پانی دینا۔ تیسری یہ کہ جب میرے قتل کا فیصلہ ہو جائے تو مجھے بتا دینا۔''

جب سولی پر چڑھانے کا وقت آیا تو انھوں نے فرمایا ''مجھے چھوڑ دو۔ ذرا دو رکعت نماز پڑھ لوں۔'' مشرکین نے چھوڑ دیا اور آپ نے دو رکعت نماز پڑھی۔ جب سلام پھیر چکے تو فرمایا: ''بخدا، اگر تم لوگ یہ نہ کہتے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، گھبراہٹ کی وجہ سے کر رہا ہوں تو میں کچھ اور طول دیتا۔''

خبیبؓ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اس ہولناک تشدد سے حواس کھو بیٹھتا، مگر سخت حیرت ہوتی ہے کہ اس پیکرِ استقامت نے اس حال میں بھی ایک شاہکار نظم کہہ ڈالی، حالانکہ

شعر کہنے کے لیے انتہائی یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ نظم تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ترجمہ قاضی عبدالدائم دائم کی کاوش ہے۔ عربی متن کے لیے انھی کی تصنیف ملاحظہ ہو "سیّد الوریٰ ﷺ"۔

میرے گرد کئی گروہ جمع ہو گئے ہیں وہ اپنے قبیلوں کو بھی ساتھ لے آئے ہیں اور بڑا مجمع اکٹھا کر لیا ہے یہ سب کے سب دشمنی ظاہر کر رہے ہیں اور اذیت رسانی کی کوشش کر رہے ہیں کیوں کہ میں اس ہلاکت گاہ میں بندھا ہوا ہوں انھوں نے اپنے بیٹوں اور بیویوں کو بھی جمع کر لیا ہے اور مجھے ایک لمبی اور اونچی لکڑی کے پاس لے آئے ہیں انھوں نے مجھے کفر اختیار کرنے کا مشورہ دیا ہے حالانکہ اس سے تو موت بہتر ہے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہیں لیکن غم اور بے صبری کی وجہ سے نہیں (یعنی خوشی کے آنسو ہیں) میں دشمن کے سامنے نہ تو عاجزی کا مظاہرہ کروں گا نہ کوئی فریاد کروں گا کیوں کہ میں اللہ کی طرف لوٹ کر جا رہا ہوں مجھے موت کا کوئی ڈر نہیں ہے کیوں کہ مرنا تو بہرحال ہے ہی البتہ مجھے نارِ جہنم کے شعلوں سے خوف آتا ہے عرش والے نے ہی مجھے ان کے بُرے ارادوں کے مقابلے میں صبر کی طاقت دی ہے، ورنہ انھوں نے تو میرا گوشت بوٹی بوٹی کر دیا ہے اور میرے زندہ رہنے کی آس ٹوٹ گئی ہے اپنی غریب الوطنی کا، اپنی تکلیف کا قتل ہوتے وقت اذیت دینے کا جو انتظام انھوں نے کیا ہے، اس کا شکوہ میں اللہ ہی سے کرتا ہوں جب مجھے اسلام پر ثابت قدم رہنے پر قتل کیا جا رہا ہے تو پھر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ اللہ کی راہ میں مرنے کے بعد میں کس پہلو پر گروں گا اور یہ سب کچھ میں اپنے معبود کے لیے برداشت کر رہا ہوں اور اگر وہ چاہے تو کٹے ہوئے جسم کے ایک ایک عضو پر اپنی برکتیں نازل فرما دے۔

اس کے بعد مشرکین نے انھیں سولی پر لٹکا دیا اور ان کی لاش کی نگرانی کے لیے آدمی مقرر کر دیے، لیکن حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ تشریف لائے اور رات میں جھانسہ دے کر لاش اٹھا لے گئے اور اسے دفن کر دیا۔ حضرت خبیبؓ کا قاتل عقبہ بن حارث تھا، جس کے باپ حارث کو حضرت خبیبؓ نے جنگِ بدر میں قتل کیا تھا۔

ان قبیلوں نے چھے مسلمانوں پر جو ظلم کیا، حالانکہ یہ محض ایک تبلیغی مشن پر تھے، تو اس کی اطلاع سے مدینہ کے تمام مسلمانوں کو صدمہ ہوا۔ حضرت حسان بن ثابت نے دردانگیز اشعار میں حضرت زیدؓ اور حضرت خبیبؓ کا مرثیہ لکھا۔ نبی کریم ﷺ کو اندیشہ ہوا، مبادا اس قسم کے مزید واقعات ظہور میں آنے لگیں اور اس سے مسلمانوں کی شان و شوکت کا آفتاب گہن میں آ جائے۔

سریہ بئر معونہ

لیکن جس مہینے رجیع کا حادثہ پیش آیا تھا، ٹھیک اسی مہینے بئرِ معونہ کا المیہ بھی پیش آیا جو رجیع کے حادثے سے بھی زیادہ سنگین تھا، اور یوں حضور ﷺ کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔

اس واقعے کا خلاصہ یہ ہے کہ ابو براء عامر بن مالک مدینہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ ملاعب الاسنۃ (نیزوں سے کھیلنے والا) کے لقب سے مشہور تھا۔ آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی۔ وہ نہ تو مسلمان ہوا اور نہ اسلام سے کسی نفرت کا اظہار ہی کیا، بلکہ عرض کی: "اگر حضور ﷺ اپنے دینِ اسلام کی دعوت کے لیے اپنے اصحاب کو نجد بھیجیں تو مجھے امید ہے کہ وہ لوگ یہ دعوت قبول کر لیں گے۔"

آنحضرت ﷺ نے اس خیال سے کہ کہیں اہلِ نجد بھی مسلمانوں سے وہی سلوک نہ کریں جو بنی ہذیل نے کیا تھا، اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔

ابو براء نے کہا: "آپ اپنے اصحاب کو شوق سے روانہ فرما دیجیے۔ میں انھیں پناہ دوں گا۔ ابو برا صاحبِ اثر و رسوخ تھا، اور جسے اس کی پناہ حاصل ہو جاتی تھی، وہ لوگوں کے ظلم و ستم کے پنجے سے محفوظ رہتا تھا۔ ابو برا کے ضمانت لینے پر حضور ﷺ مسلمانوں کی ایک جماعت تبلیغ و دعوت کی غرض سے نجد بھیجنے پر آمادہ ہو گئے اور حضرت منذرؓ بن عمرو ساعدی کو امیر مقرر کر کے ستر صحابہ کو ان کے ہم راہ کر دیا۔

یہ ستر صحابہ کون تھے؟ یہ لوگ فضلاء اور سادات و اخیارِ صحابہ تھے۔ مدینہ میں دن میں لکڑیاں کاٹ کر اس کے عوض اہلِ صفہ کے لیے غلہ خریدتے اور قرآن پڑھتے پڑھاتے تھے اور رات کو اللہ کی بارگاہ میں نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔

ان صحابہؓ کی روانگی کے وقت حضور ﷺ نے ایک خط ابو برا کے بھتیجے اور بنی عامر کے رئیس عامر بن طفیل کے نام لکھوا کر حضرت انسؓ کے ماموں حرام بن ملحانؓ کے سپرد فرمایا۔ جب قرا کی جماعت بئرِ معونہ پہنچی تو حرام بن ملحان آنحضرت ﷺ کا خط لے کر عامر بن طفیل کے پاس گئے۔ اس ملعون نے حضور ﷺ کا خط دیکھنے سے پہلے ہی ایک شخص کو اشارہ کر کے حضرت حرامؓ کو قتل کرا دیا۔ پھر اس بدبخت نے بنی عامر کو باقی صحابہؓ کے قتل پر ابھارا، مگر عامر کے چچا ابو براء کے پناہ دے دینے کی وجہ سے بنی عامر نے عامر بن طفیل کی امداد سے انکار کر دیا۔ جب عامر اپنی قوم سے ناامید ہو گیا تو اس نے بنی سلیم سے امداد چاہی۔ بنی سلیم کے تین قبیلوں عصیہ، رعل اور ذکوان نے اس پر لبیک کہا اور جھٹ آ کر ان صحابہؓ کرام کا محاصرہ کر لیا۔ جواباً صحابہ کرامؓ نے بھی لڑائی کی، مگر سب کے سب شہید ہو گئے۔ صرف کعبؓ بن زید انصاری زندہ بچے۔ ابھی ان میں زندگی کی کچھ رمق باقی تھی۔ کفار نے انھیں مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ بعد ازاں آپ ہوش میں آ گئے اور ایک مدت زندہ رہنے کے بعد غزوہ خندق میں شہادت پائی۔

ان کے علاوہ دو شخص یعنی حضرت منذرؓ بن عقبہ بن عامر اور حضرت عمروؓ بن امیہ ضمری اونٹ چرا رہے تھے۔ ان حضرات نے جب دور سے معرکے کی جگہ پرندے منڈلاتے دیکھے تو انھیں شبہ گزرا اور فوراً جائے وقوعہ پر پہنچے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے ایک عبرت ناک منظر دیکھا کہ تمام رفقاء خون میں نہائے، شہادت گاہِ الفت میں سوئے پڑے ہیں۔ دونوں نے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ عمرو بن امیہ نے مدینہ چل کر حضور ﷺ کو خبر دینے کے متعلق رائے دی، مگر حضرت منذرؓ نے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنے کی ٹھانی اور لڑ کر شہید ہو گئے۔ عمروؓ بن امیہ کفار کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ عامر نے ان کے بال کاٹے اور یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی، لہٰذا میں اس نذر میں تمھیں آزاد کرتا ہوں۔

حضرت عمروؓ بن امیہ اس دردناک المیے کی خبر لے کر مدینے پہنچے۔ ان ستر فضلاء کی شہادت کے المیے نے جنگ احد کا چرکہ تازہ کر دیا، اور یہ اس لحاظ سے زیادہ المناک تھا کہ شہدائے احد تو ایک کھلی اور دو بدو جنگ میں مارے گئے تھے، مگر یہ بے چارے ایک شرمناک غداری کی نذر ہو گئےؓ۔

حضرت عمروؓ واپسی میں وادیٔ قناۃ کے سرے پر واقع مقام قرقرہ پہنچے تو ایک سایہ دار درخت کے نیچے قیام کیا۔ وہیں بنو کلاب کے دو آدمی بھی آ کر اترے رہے۔ جب وہ دونوں سو گئے تو حضرت عمروؓ بن امیہ نے ان دونوں کا صفایا کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اپنے ساتھیوں کا بدلہ لے رہے ہیں، حالانکہ ان دونوں کے پاس رسول اللہؐ کی طرف سے عہد تھا، مگر حضرت عمروؓ جانتے نہ تھے۔ چناں چہ جب مدینے آ کر انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو اپنی اس کارروائی کی خبر دی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے ایسے دو آدمیوں کو قتل کیا ہے، جن کی دیت مجھے لازماً ادا کرنی ہے۔ اس کے بعد حضور ﷺ مسلمانوں اور ان کے حلیف یہود سے دیت جمع کرنے میں مشغول ہو گئے (یہی واقعہ غزوۂ بنی نضیر کا سبب بنا)

رسول اللہ ﷺ کو معونہ اور رجیع کے ان المناک واقعات سے، جو چند دنوں میں آگے پیچھے پیش آئے تھے، اس قدر رنج پہنچا اور آپ ﷺ اس قدر غمگین ہوئے کہ جن قوموں اور قبیلوں نے ان صحابہ کرامؓ کے ساتھ ظلم و قتل کا یہ سلوک کیا تھا، آپ ﷺ نے ان پر ایک مہینے تک بد دعا فرمائی۔ آپ ﷺ نماز فجر میں رعل، ذکوان، لحیان اور عصیہ پر بد دعا کرتے تھے قنوت ایک خاص دعا تھی جو دراصل بد دعا کی طرح اس طرح تھی:

''اے اللہ، مضر پر اپنی گرفت مضبوط کر دے۔ اے اللہ، یوسف کے قحط کی طرح ان پر قحط نازل فرما۔ اے اللہ، بنی لحیان، عضل، قارہ، رعل، عصیہ اور ذکوان کی گرفت کر، کہ انھوں نے تیری اور تیرے رسول ﷺ کی نافرمانی کی۔''

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ اس واقعے سے پہلے ہم نے کبھی قنوت نہیں پڑھے تھے۔ اسی واقعے سے قنوت کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے فجر میں کبھی قنوت نہ کیا، حتیٰ کہ آپ ﷺ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

رجیع اور بئر معونہ کے واقعات نے مدینہ کے منافقین اور یہودیوں کی نگاہ میں مسلمانوں کا وزن ہلکا کر دیا تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک بات یہی ہو سکتی تھی کہ اہلِ مدینہ کی نظر میں ان کا وقار نہ رہے۔ اگر نواحِ مدینہ کے عرب قبائل کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اہلِ مدینہ میں باہمی اختلاف ہیں تو وہ مسلمانوں پر یقیناً ٹوٹ پڑتے اور اس صورت میں یہ بھی اندیشہ تھا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے۔

سریہ بئر معونہ کے آخر میں حضرت عمروؓ بن امیہ مقام قرقرہ میں دو اشخاص کو قتل کر کے مدینہ پہنچ گئے تھے۔ یہاں پہنچ کر حضرت عمروؓ نے دو آدمیوں کے قتل اور دیگر حالات آنحضرت ﷺ کو گوش گزار کیے تو حضور ﷺ نے سن کر فرمایا کہ دونوں مقتول قبیلہ بنی کلاب کے آدمی تھے جو ہمارا حلیف قبیلہ ہے، اس لیے ان کی دیت دینی ہوگی۔ یہودیوں کا قبیلہ بنی نضیر بھی چوں کہ بنی کلاب کا حلیف تھا، اس واسطے آنحضرت دیت کے متعلق گفتگو کرنے کو بنی نضیر کے پاس تشریف لے گئے۔ حضور ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ بھی تھے۔ بنی نضیر بظاہر آپ ﷺ سے بڑے اخلاق سے ملے اور حضور ﷺ کو ایک دیوار کے پاس بٹھایا، لیکن پوشیدہ طور پر ایک شخص کو بھاری پتھر دے کر چھت پر چڑھانے کا مشورہ کیا کہ جس وقت حضور ﷺ دیت کے متعلق گفتگو میں مصروف ہوں، اس وقت پتھر گرا کر آپ ﷺ کا کام تمام کر دیا جائے۔

جب سلام بن مشکم یہودی کو اس مشورے کی خبر ملی تو اس نے اہل یہود سے کہا:
''ایسا ہرگز نہ کرو۔ خدا کی قسم، اس کا رب اسے خبر دے گا۔ نیز یہ بدعہدی ہے۔''

مگر اہلِ یہود نے اس بات کی پروا نہ کی اور عمرو بن حجاش کو پتھر حضور ﷺ کے جسم مبارک پر گرانے کے لیے چھت پر چڑھا دیا۔ اسی اثنا میں حضور ﷺ کو بذریعہ وحی الٰہی یہودیوں کی باہم مشورت و سازش سے آگاہی ہوگئی۔ حضور ﷺ وہاں سے فوراً اٹھ کر مدینہ تشریف لے آئے۔ حضور ﷺ وہاں سے اس طرح اٹھے تھے، جیسے کوئی کسی اہم ضرورت کے تحت اٹھتا ہو، اس لیے صحابہؓ وہیں بیٹھے رہے۔ یہود کو جب حضور ﷺ کے چلے جانے کا علم ہوا تو بہت نادم ہوئے۔ کنانہ بن حویرا یہودی نے کہا: ''تمھیں معلوم نہیں کہ محمد ﷺ کیوں اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ خدا کی قسم انھیں تمھاری غداری کا علم ہو گیا ہے۔ بخدا وہ اللہ کے رسول ہیں۔''

اصحاب حضور ﷺ کے منتظر تھے، اور حیران بھی کہ آپ ﷺ اب تک کیوں واپس نہیں آئے۔ جب انتظار نے طول کھینچا تو آپ ﷺ کی تلاش کے لیے اٹھنے لگے۔ اس اثنا میں ایک شخص ملا جو مدینہ سے آ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو مسجد میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ یہ سنتے ہی اصحابؓ نے مدینے کی راہ لی۔ مدینہ پہنچے تو آنحضرت ﷺ نے وہ تمام باتیں بیان فرمائیں جو آپ ﷺ نے یہودیوں سے سنی تھیں۔ صحابہؓ نے بھی جو کچھ وہاں دیکھا اور سنا تھا، عرض کیا۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت محمد بن مسلمہؓ کو بلایا اور یہ حکم دیا کہ ''بنی نضیر کے یہودیوں کے پاس جاؤ اور ان سے کہو'' مجھے رسول اللہ نے بھیجا ہے اور ان کا یہ حکم ہے کہ تم میری سرزمین سے نکل جاؤ۔ تم مجھ سے خیانت اور معاہدہ شکنی کرنا چاہتے تھے۔ تمھیں دس دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ اگر اس مدت کے بعد تم میں سے کوئی نظر آیا، اسے تہ تیغ کر دیا جائے گا۔''

یہودیوں کو اس حکم سے بڑی حیرت ہوئی اور کوئی جواب نہ بن پڑا۔ انھوں نے صرف یہ بات کہی کہ ہمیں یہ گمان تک نہ تھا کہ قبیلہ اوس کا کوئی شخص اس قسم کا پیغام لے کر ہمارے پاس آئے گا (اس میں اس معاہدے کی طرف اشارہ تھا جو ہجرت

پہلے خزرج کے قبیلے اوس اور یہودیوں کے مابین ہوا تھا)۔ ابن مسلمہ نے یہ جواب سن کر کہا: "دل بدل گئے ہیں۔"

چند روز بعد جب یہودی مدینے سے جانے کی تیاریاں کرنے لگے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا قاصد ان کے پاس یہ پیغام لے کر آیا کہ ترک وطن نہ کرو۔ گھروں میں جمے رہو اور اپنے اموال واملاک ہرگز نہ چھوڑو۔ میں تمھاری مدد کے لیے دو ہزار آدمی بھیجوں گا جو تم سے ہر قسم کا تعاون کریں گے۔ جب تک ان میں سے ایک بھی زندہ رہے گا، تم پر کسی کو بھی دست درازی کی جرات نہ ہوگی۔ اپنی جگہ برقرار رہو۔ ڈٹ جاؤ اور گھر بار نہ چھوڑو۔ اور بنی قریظہ اور بنوغطفان جو تمھارے حلیف ہیں، وہ بھی تمھاری مدد کریں گے۔

یہ پیغام سن کر عام یہودی شش و پنج میں پڑ گئے، کیوں کہ ان میں سے بعض کو عبداللہ کی باتوں پر قطعاً کوئی اعتماد نہ تھا۔ ان سے پیش تر بنی قینقاع کے یہودیوں سے بھی مدد کا وعدہ کیا تھا، لیکن جب ان پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا تو اُس نے اپنی راہ لی تھی اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ یہودیوں کو معلوم تھا کہ بنی قریظہ کے یہودی ہماری مدد کو نہیں آئیں گے، کیوں کہ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان دوستی کا معاہدہ قائم ہے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر ہم مدینہ سے نکل کر خیبر یا اس کے قریب کسی جگہ پر جا کر مقیم ہوجائیں تو کھجوروں کی فصل میں مدینہ آسکتے ہیں اور باغات کی پیداوار لے کر واپس جاسکتے ہیں۔ اسی صورت میں کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچے گا۔

یہودی اسی فکر میں غلطاں تھے کہ ان کے سردار حیی بن اخطب نے اپنا فیصلہ سنادیا کہ عبداللہ بن ابی نے جو وعدہ کیا ہے، وہ پورا کرے گا۔ اسد نے جواب میں نبی کریم ﷺ کو یہ پیغام بھجوادیا کہ ہم یہاں سے ہرگز نہیں نکلیں گے اور نہ اپنے املاک واموال سے دست بردار ہوں گے۔ آپ سے جو بن پڑے، کیجیے۔

اس نے یہودیوں کو یقین دلایا کہ ہم اپنے قلعوں کی مرمت کریں گے۔ اپنے مورچوں کو مستحکم کریں گے اور سنگریزے جمع کر رکھیں گے۔ ایک سال کے لیے ہمارے پاس غلہ موجود ہے۔ پانی کی بھی کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ محمد ﷺ ایک سال تک ہمارا محاصرہ کرنے سے رہے۔ غرض دس روز کی مہلت ختم ہوگئی اور یہودی اپنے گھروں سے نہیں نکلے۔

آنحضور ﷺ نے بنی نضیر کے انکار اور دس روزہ مہلت ختم ہونے کے بعد، حملے کی تیاری کا حکم دیا۔ حضرت عبداللہ ابن مکتومؓ کو اپنے پیچھے مدینے کا عامل مقرر کر کے بنی نضیر کی طرف روانہ ہوئے۔ اس غزوے میں اسلام کا جھنڈا حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تھا۔ یہودیوں کی بستی کا محاصرہ بیس روز تک جاری رہا۔ اس اثنا میں مسلمان جب کسی عمارت یا مکان پر قابض ہوجاتے تو یہودی اسے ویران و مسمار کر کے دوسرے مکان یا عمارت میں محصور ہوجاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے کھجوروں کے درخت کاٹ کر جلادیے جائیں، تاکہ مالی نقصان کے غم سے ان کی ہمتیں پست ہوجائیں۔ یہودی مسلمانوں کے اس اقدام سے بہت زیادہ مضطرب ہوئے اور فریاد کی: "اے محمد ﷺ، آپ تو فساد سے روکتے اور مفسدین پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ اب کھجوروں کے باغ کیوں کاٹے اور جلائے جارہے ہیں۔ اس کے متعلق سورۂ حشر کی آیت 5 نازل ہوئی:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ۝﴾ (الحشر: 5)

"تم لوگوں نے کھجوروں کے جو درخت کاٹے یا جنھیں اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا۔ یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا۔ اور اللہ نے یہ اذن اس لیے دیا کہ فاسقوں کو ذلیل وخوار کرے۔"

یہودیوں کو عبداللہ بن ابی اور بنی قریظہ اور بنوغطفان کے تعاون کی امید نہ رہی، اور یہ خوف غالب ہوا کہ محاصرے نے مزید طول کھینچا تو اس کا انجام ہمارے حق میں کچھ بہتر نہ ہوگا۔ آخر انھوں نے سرور کونین ﷺ سے امان طلب کی اور کہا کہ ہم مدینہ سے جانے کے لیے تیار ہیں۔ یہ درخواست منظور کرلی گئی، مگر اس شرط کے ساتھ کہ تین تین یہودی ایک ایک اونٹ پر جو سامان لاد کر لے جاسکتے ہیں، لے جائیں۔ باقی اس کے سوا انھیں یہیں چھوڑ کر جانا ہوگا۔

یہودی حیی بن اخطب کی راہ نمائی میں مدینہ سے نکلے۔ ان میں سے کچھ تو خیبر میں مقیم ہوگئے اور کچھ شام کی طرف چلے گئے۔ صرف دو آدمیوں یعنی یامینؓ بن عمرو اور ابوسعیدؓ بن وہب نے اسلام قبول کیا۔ لہٰذا ان کے مال کو ہاتھ نہیں لگایا گیا۔

نبی اکرم ﷺ نے بنونضیر کے ہتھیار، زمین، گھر اور باغات اپنے قبضے میں لے لیے۔ ہتھیار میں پچاس زرہیں، پچاس خود اور تین سو چالیس تلواریں تھیں۔ بنونضیر کے یہ باغات، زمین اور مکانات خالص رسول اللہ کا حق تھا۔ آپ ﷺ کو اختیار تھا کہ آپ ﷺ اسے اپنے لیے محفوظ رکھیں یا جسے چاہیں دیں۔ چناں چہ آپ ﷺ نے مال غنیمت کی طرح ان اموال کا خمس (پانچواں حصہ) نہیں نکالا، کیوں کہ اسے اللہ نے آپ ﷺ کو بطور فے دیا تھا۔ مسلمانوں نے اس پر گھوڑے اور اونٹ دوڑا کر اسے بزورِ شمشیر فتح نہیں کیا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اپنے اس اختیارِ خصوصی کے تحت اس پورے مال کو صرف مہاجرین اول پر تقسیم فرمایا۔ ان زمینوں کے دستیاب ہونے کے بعد مہاجرین، انصار کی مدد سے بے نیاز ہوگئے اور ان کی مالی حیثیت بھی بڑھ گئی۔ انصار کو ان زمینوں میں سے کچھ نہ ملا، البتہ دو انصاری صحابہ یعنی ابودجانہؓ اور سہل بن حنیف کو ان کے فقر کے سبب اس میں سے کچھ عطا فرمایا۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ نے ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنے لیے محفوظ رکھا، جس میں سے آپ اپنی ازواج مطہرات کا سال بھر کا خرچ نکالتے تھے اور اس کے بعد جو کچھ بچتا تھا، اسے جہاد کی تیاری کے لیے ہتھیار اور گھوڑوں کی فراہمی میں خرچ فرمادیتے تھے۔

غزوہ بنی نضیر ربیع الاول، 4 ہجری، اگست 625ء میں پیش آیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس تعلق سے پوری سورۂ حشر نازل فرمائی۔ ابن عباسؓ اس سورت کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ اسے سورۂ بنی نضیر کہنا چاہیے۔

آنحضور ﷺ کا کاتب

بنی نضیر کے یہودی کی جلاوطنی سے قبل حضور ﷺ کا کاتب ایک یہودی تھا، وہ عبرانی اور سریانی زبانوں میں آپ ﷺ کے خطوط تحریر کرتا تھا۔ یہودیوں کے اخراج کے بعد آپ نے یہ مناسب سمجھا کہ کتابت کی خدمت کسی مسلم سے لی جائے اور اسے راز کی باتیں بتائی جائیں۔ چناں چہ آپ ﷺ کے حکم سے حضرت زیدؓ بن ثابت نے عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھ لیں اور کتابت کی ذمہ داری کا بار اپنے کاندھوں پر لے لیا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت وہی صحابی ہیں، جنھوں نے ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں جمع قرآن کی خدمت انجام دی تھی، اور جب حضرت عثمانؓ کے عہد میں اختلاف قرآن کی صورت پیش آئی تو انھی کی نگرانی میں قرآن کی ترتیب عمل میں آئی اور اس ترتیب کے بعد دوسرے تمام نسخے نذرِ آتش کر دیے گئے۔

شراب کا قطعی حکم

سیرت نگاروں کو ابن اسحاق کی اس تصریح سے اتفاق ہے کہ شراب کی حرمت کا حکم جو تدریجی تھا، اسی غزوہ بنی نضیر میں مکمل ہوا۔

ابتدائے اسلام میں عام رسومِ جاہلیت کی طرح شراب نوشی بھی عام تھی۔ آنحضرت ﷺ جب مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ میں بھی شراب نوشی اور قمار بازی کی عادت اہلِ مکہ سے کم نہ تھی۔ مگر بعض صحابہؓ ان ہردو عادات کو اس قدر نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے کہ انھوں نے حلال ہونے کے زمانے میں بھی کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔ چناں چہ مدینہ میں حضور ﷺ کی ہجرت کے بعد جب اسلام کی سچی تعلیم میں ڈھلا ہوا ایک معاشرہ قائم ہوا اور پیغمبر اسلام کے قرب نے اہل ایمان کے قلوب کو مزید جلا بخشی تو ان پاکیزہ اور سعید طبیعتوں میں اسلامی معاشرہ کو ہر قسم کے مفاسد سے پاک کرنے کا احساس پیدا ہوا۔ اسی احساس کے تحت حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ چند انصاری صحابہ کی معیت میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور شراب نوشی کے بارے میں حضور ﷺ کا فتویٰ دریافت کیا، اس سوال کے جواب میں ارشاد باریٰ ہوا:

﴿يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا﴾ (البقرہ: 219)

''پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ کہو کہ ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔ اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔''

اس آیت میں صاف طور پر شراب کو حرام تو نہیں کیا گیا، مگر اس کی خرابیاں اور مفاسد بیان کر دیے گئے ہیں۔ اس میں صرف یہ ظاہر کر کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ شراب بری چیز ہے، اللہ کو پسند نہیں۔ چناں چہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا، مگر بہت سے لوگ اسے بدستور استعمال کرتے رہے تھے، حتیٰ کہ بسا اوقات نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے تھے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے تھے۔ سیرت نگاروں نے ایک واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک روز حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے چند احباب کی دعوت کی۔ کھانے کے بعد حسبِ دستور شراب کا دور چلا اور اسی حالت میں نمازِ مغرب کا وقت آ گیا۔ اہلِ مجلس نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور اپنے میں سے ایک صاحب کو امامت کے لیے آگے بڑھایا۔ انھوں نے نشے میں سورۃ ''قل یا ایّھا لکفرون'' کو غلط پڑھا، اس لیے سورۂ نسا آیت 43 کے ذریعے دوسرا حکم آیا:

﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ﴾ (النساء: 43)

''اے ایمان والو! تم نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیے جب تم جانو کہ کیا کر رہے ہو۔''

اس آیت کریمہ میں نماز کے اوقات میں شراب کو قطعی حرام کر دیا گیا، مگر باقی اوقات میں اجازت رہی۔ چناں چہ کچھ حضرات اوقات نماز کے علاوہ شراب پیتے رہے، یہاں تک کہ ایک اور واقعہ پیش آیا جس کی بنا پر حضور ﷺ کی دعا کے نتیجے میں شراب کی قطعی حرمت کا حکم نازل ہوا۔ واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عتبانؓ بن مالک نے چند صحابہؓ کی دعوت کی، جن میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص بھی تھے۔ کھانے کے بعد حسب دستور شراب پی گئی۔ پھر اسی حالت میں شعر و شاعری اور اپنے اپنے مفاخر کا بیان شروع ہوا۔ نشے کی حالت میں حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک قصیدہ پڑھا، جس میں اپنی قوم کی تعریف اور انصار مدینہ کی ہجو بیان کی گئی تھی۔ اس پر ایک انصاری نوجوان کو غصہ آ گیا اور اس نے اونٹ کے جبڑے کی ہڈی حضرت سعدؓ کے سر پر دے ماری، جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے۔ حضرت سعدؓ نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں اس انصاری نوجوان کی شکایت کی۔ آنحضور ﷺ نے شکایت سن کر دعا فرمائی:

''یا اللہ، شراب کے بارے میں ہمیں کوئی واضح بیان اور قانون عطا فرما دے۔''

اس پر شراب کی حرمت کے بارے میں تیسرا اور قطعی حکم نازل ہوا۔

﴿يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝﴾

(المائدہ: 90تا91)

''اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تمھیں فلاح نصیب ہوگی۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمھیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بات مانو اور باز آ جاؤ، لیکن اگر تم

نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول ﷺ پر بس صاف صاف حکم پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔“

جب یہ حکم نازل ہوا تو بعض صحابہؓ نے چلا کر کہا: ”خداوندا، ہم باز آ گئے۔“

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ کچھ لوگ حضرت ابوطلحہؓ کے گھر بیٹھے تھے، اور وہ (حضرت انسؓ) انھیں شراب پلا رہے تھے کہ حرمت شراب کی منادی ہونے لگی۔ ابوطلحہؓ نے سنتے ہی کہ دیا کہ جتنی شراب باقی ہے، اسے باہر پھینک دیا جائے۔ اس دن مدینے کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خم الٹائے جا رہے تھے اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی۔

سورۂ مائدہ کی آیات میں آخری حکم کے آنے سے پہلے حضور ﷺ نے ایک خطبے میں لوگوں کو متنبہ فرما دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو شراب سخت ناپسند ہے۔ بعید نہیں کہ اس کی قطعی حرمت کا حکم آ جائے۔ لہٰذا جن جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہو تو وہ اسے فروخت کر دیں۔ اس کے کچھ مدت بعد یہ آیت نازل ہوئی اور آپ نے اعلان کرایا کہ اب جن لوگوں کے پاس شراب موجود ہے، وہ نہ اسے پی سکتے ہیں، نہ فروخت کر سکتے ہیں، بلکہ وہ اسے ضائع کر دیں۔ چناں چہ اسی وقت مدینہ کی گلیوں میں شراب بہا دی گئی۔ بعض لوگوں نے پوچھا، ہم یہودیوں کو تحفۃً کیوں نہ دے دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جس نے یہ چیز حرام کی ہے، اس نے اسے تحفتاً دینے سے بھی منع کر دیا ہے۔“ بعض لوگوں نے پوچھا: ”ہم شراب کو سرکے میں کیوں نہ تبدیل کر دیں؟“ آپ نے اس سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ ”نہیں، اسے بہا دو۔“ ایک صاحب نے باصرار دریافت کیا کہ دوا کے طور پر تو استعمال کی اجازت ہے؟“ فرمایا: ”نہیں۔ وہ دوا نہیں ہے، بلکہ بیماری ہے۔“

ایک اور صاحب نے عرض کیا: ”یا رسول اللہ! ہم ایک ایسے علاقے کے رہنے والے ہیں، جو نہایت سرد ہے، اور ہمیں محنت بھی کرنی پڑتی ہے۔ ہم لوگ شراب سے تکان اور سردی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”جو چیز تم پیتے ہو، وہ نشہ کرتی ہے؟“ انھوں نے عرض کیا: ”ہاں۔“ فرمایا تو اس سے پرہیز کرو۔ انھوں نے عرض کیا، مگر ہمارے علاقے کے لوگ تو نہیں مانیں گے۔ فرمایا، اگر وہ نہ مانیں تو ان سے جنگ کرو۔

ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب پر اور اس کے پینے والے پر اور پلانے والے پر اور بیچنے والے پر اور خریدنے والے پر، اور کشید کرنے والے پر اور کشید کرانے والے پر اور ڈھو کر لانے والے پر، اور اس شخص پر جس کے لیے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔“

اکثر مفسرین کے نزدیک شراب کے بارے میں تین احکام کے بجائے چار احکام نازل ہوئے۔ انھوں نے مذکورہ بالا آیات کے علاوہ حرمت شراب کی طرف پہلا قدم یا پہلا حکم جس آیت کو قرار دیا ہے، وہ سورۂ نحل کی آیت 67 ہے:

﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ﴾ (النحل: 67)

”اور کھجور اور انگور کے میوے دیئے۔ تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے۔ عقل سے کام لینے والوں کے لیے۔“

اس آیت میں کھجور اور انگور سے فقط شراب بنانے کا ذکر ہے۔ شراب کی مخالفت نہیں۔ البتہ نشہ کو ’رزق حسن‘ کے مقابلے میں رکھ کر یہ لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ نشہ ”رزقِ حسن“ نہیں۔ یہ ارشاد شراب کی کراہت اور ناپسندیدگی کی طرف پہلے مرحلے یا پہلے حکم کی حیثیت رکھتا ہے، جس نے بالآخر ایک قطعی حکم کی شکل اختیار کی اور بتدریج شراب مطلقاً حرام ہو گئی۔

غزوۂ بدر ثانی

غزوۂ اُحد کو ایک سال بیت چکا تھا۔ اس غزوے سے لوٹتے وقت ابوسفیان نے کہا تھا کہ بدر کے مقتولین کا بدلہ تو ہم نے لے لیا، اب اگلے سال ہم تم سے نمٹ لیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ابوسفیان نے مسلمانوں کو دوبارہ بدر کے میدان میں نبرد آزمائی کی دعوت دی تھی۔ اسی سال بارش کم ہوئی تھی۔ ابوسفیان چاہتا تھا کہ جنگ کو اور ایک سال التوا میں رکھا جائے۔ تاہم اس نے مدینے میں کسی کی زبانی یہ پیغام بھیجا کہ قریش نے ایسا لشکر جرار تیار کیا ہے کہ کوئی اس کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا۔ یہ لشکر مسلمانوں کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا اور ایسی سخت لڑائی ہوگی کہ اس کے مقابلے میں معرکہ احد کی حیثیت بھی ایک افسانے کی سی نظر آئے گی۔ بعض مسلمان اس خطرے سے بچنا اور مدینے میں رہنا چاہتے تھے، لیکن حضور ﷺ کو ان کا یہ تذبذب ناگوار گزرا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خدا کی قسم، اگر میں تنہا بھی رہ جاؤں تو پھر بھی بدر کا رخ ضرور کروں گا۔“

ابوسفیان کا مقصد یہ تھا کہ جب ایسی خبریں مشہور ہوں گی تو نفسیاتی طور پر مسلمان خوف زدہ ہو جائیں گے اور جنگ سے گریز کریں گے، مگر اس پروپیگنڈے کا نتیجہ اس کے اپنے خیال کے برعکس نکلا۔ قریش مکہ کی اس تیاری کی خبر سن کر مسلمانوں کے جوش ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔

چناں چہ شعبان چار ہجری، جنوری 626ء میں رسول اللہ ﷺ نے مدینے کا انتظام حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو سونپ کر اس طے شدہ جنگ کے لیے بدر کا رخ کیا۔ آپ ﷺ کے ہم راہ ڈیڑھ ہزار کی جمعیت اور دس گھوڑے تھے۔ فوج کا علم حضرت علیؓ کے سپرد تھا۔ بدر پہنچ کر مشرکین کے انتظار میں خیمہ زن ہو گئے۔

دوسری طرف ابوسفیان بھی پچاس گھڑ سواروں سمیت دو ہزار مشرکین کی جمعیت لے کر روانہ ہوا اور مکہ سے مقام ظہران تک آیا، لیکن حوصلہ ہار کر واپسی کے بہانے سوچنے لگا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ”قریش کے لوگو! جنگ اس وقت موزوں ہوتی ہے جب شادابی اور ہریالی ہو کہ جانور بھی چر سکیں اور تم بھی دودھ پی سکو۔ اس وقت خشک سالی ہے۔ لہٰذا میں واپس جا رہا ہوں۔ تم بھی واپس چلو۔“

آنحضور ﷺ نے بدر میں آٹھ روز تک لشکر کفار کا انتظار کیا، مگر جب ابوسفیان نہ آیا۔ تو آپ ﷺ مع مجاہدوں کے مدینہ لوٹ آئے۔

اس غزوے کو غزوہ بدر ثانی، غزوہ بدر، غزوہ بدر صغریٰ اور غزوہ بدر موعد بھی کہتے ہیں۔

پانچ ہجری کے متفرق واقعات

مورخ مسعودی نے ہجرت کے چوتھے سال کو سن ترفیہ لکھا ہے، جس کے معنی ہیں امن وخوش حالی کا سال۔

اسی سال شعبان کی چار تاریخ کو حضرت امام حسینؓ کی ولادت ہوئی۔ وہ حضرت حسن سے دس ماہ بعد پیدا ہوئے۔ چند ماہ بعد ان کی دادی یعنی حضرت علیؓ کی والدہ فاطمہؓ بنت اسد کا انتقال ہوا۔

شوال میں حضور ﷺ نے اپنے رضاعی بھائی عبداللہ بن اسد ابوسلمہ کی بیوہ ام سلمہ سے نکاح کیا۔ جنگ احد میں حضرت عبداللہ کو کاری زخم آیا تھا۔ سریہ ابی سلمہ میں امیر بنا کر بھیجے گئے۔ واپسی کے بعد جمادی الثانی میں انتقال کیا۔

غزوہ دومتہ الجندل......25 ربیع الاول۔ فروری 626ء غزوہ بنی مصطلق

تیمم کی سہولت......شعبان

حضرت جویریہؓ سے نکاح......شعبان۔ جنوری 627ء

حضرت زینب بنت جحش سے نکاح......شعبان۔ جنوری 627ء

حجاب......شعبان۔ جنوری 627ء

غزوہ خندق......شوال۔ ذی قعدہ۔ مارچ اپریل 627ء

غزوہ بنی قریظہ......ذی قعدہ، ذوالحج۔ اپریل 627ء

غزوہ دومتہ الجندل

مسلمان غزوہ بدر ثانیہ سے واپس ہوئے تو ہر طرف ان کا رعب چھایا ہوا تھا۔ امن وامان کی فضا قائم ہوئی۔ چھ ماہ تک آپ ﷺ نے مدینہ میں قیام فرمایا۔ ماہ ربیع الاول میں یہ خبر ملی کہ بعض بدوی قبائل دومتہ الجندل کے مقام پر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ان کا مقصد مدینہ پر حملہ کرنا ہے۔ راستے سے گزرنے والے شتر سواروں اور مسافروں پر ظلم کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے ان کی سرکوبی کا ارادہ کیا۔

دومتہ الجندل موجودہ شام اور عرب کی آخری سرحد پر واقع ہے۔ مدینہ سے پندرہ اور دمشق سے پانچ راتوں کی مسافت پر ہے۔ دومتہ الجندل کا حاکم اکیدر بن عبدالملک عیسائی تھا اور روم کے بادشاہ ہرقل کا فرمان بردار تھا۔ یہ پہلا غزوہ ہے جو آپ ﷺ نے رومیوں کے مقابلے میں فرمایا۔ ان عیسائیوں کے بھڑکانے میں مدینے سے نکالے ہوئے یہودیوں کی ریشہ دوانیاں کام کر رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے مناسب سمجھا کہ نئے فتنے کے سر اٹھانے سے پہلے ہی اسے دبا دیا جائے۔

ان سے مقابلے کے لیے 25 ربیع الاول کو روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے حضرت سباعؓ بن عرفطہ غفاری یا عبداللہ بن ام مکتوم کو نائب مقرر فرمایا۔ آپ ﷺ کے ساتھ ایک ہزار مجاہد، جن میں سوار اور پیادہ شامل تھے، راتوں کو سفر کرتے اور دن میں چھپ جاتے۔ آپ نے بنی عذرا کے ایک شخص کو راستہ بتانے پر مقرر فرمایا۔ اس اچانک اور غیر متوقع آمد پر اکٹھے ہونے والے قبائل گھبرا کر منتشر ہو گئے۔ آپ ﷺ نے ان کے میدان میں چند دن قیام فرمایا اور مختلف سمتوں میں ان کے تعاقب میں دستے روانہ فرمائے۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ کے ہاتھوں ایک شخص گرفتار ہوا اور اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے عیینہ بن حصن فزاری سے چراگاہوں کے بارے میں ایک معاہدہ بھی طے کیا۔ اس طرح شام کی سرحد پر مسلمانوں کا رعب قائم کر کے 20 ربیع الثانی کو مدینہ واپسی ہوئی۔

غزوہ خندق

مدینہ سے بنی نضیر کے اخراج، غزوہ بدر ثانی، غزوہ غطفان اور غزوہ دومتہ الجندل کے بعد مسلمانوں کو مدینہ میں امن وسکون اور اطمینان وفراغت سے زندگی بسر کرنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ ان غزوات میں شرکت کے سبب انھیں تجارت وزراعت ایسی معاشی سرگرمیوں کے لیے وقت نہیں ملا، اور نہ اس دوران میں ان آمدنی کے شعبوں سے انھیں کوئی یافت ہوئی، تاہم غنیمت میں جو مال انھیں ملا تھا، اس کے سہارے وہ اپنی زندگی فارغ البالی سے بسر کر سکتے تھے۔ آنحضور ﷺ بھی اگرچہ دوسروں کی طرح اپنی معاش کی جانب سے مطمئن تھے (بالخصوص بنی نضیر سے کچھ زمینیں ملنے کے بعد) لیکن آپ ﷺ کو ہر وقت یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ دشمنوں نے کہیں مکر وفریب کے جال نہ بچھائے ہوں۔ چناں چہ آپ ﷺ اپنے جاں نثاروں کو وقتاً فوقتاً مختلف اطراف میں بھیجتے رہتے تھے، تاکہ دشمن اور اس کی جنگی تیاریوں سے باخبر رہیں، اور دشمن کے جارحانہ اقدام سے پیش تر آپ کو اتنا موقع اور مہلت مل سکے کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو مدافعت کے لیے کیل کانٹے سے لیس کر سکیں۔

غزوہ احزاب یا خندق کی تحریک بنی نضیر کے ان یہودی لیڈروں نے کی تھی جو مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر میں مقیم ہو گئے تھے۔ جب انھیں غزوہ احد میں قریش مکہ کے غلبہ کی خبر ملی اور یہ معلوم ہوا کہ ابوسفیان نے پھر جنگ کی دھمکی دی ہے تو سلام بن مشکم، حیی ابن اخطب، کنانہ بن ربیع، ہوذہ بن قیس اور ابوعمارہ وغیرہ کچھ اور سرکردہ لوگوں کے ساتھ وفد بنا کر مکہ گئے اور اپنی امداد کا یقین دلا کر قریش کو رسول اللہ ﷺ سے جنگ کرنے کی ترغیب دی، جس پر قریش تیار ہو گئے۔ مزید برآں یہودیوں کے بیس سردار عرب کے گوشے گوشے میں پھیل گئے، یہاں تک کہ دس ہزار، سے زیادہ کفار کا ایک لشکر جرار، مسلمانوں کے مقابلے کے لیے جمع ہو گیا۔

قبائل عرب کی اتنی بڑی جمعیت اس چھوٹی سی بستی پر حملہ آور ہو گئی جو اس سے پہلے عرب میں کبھی جمع نہ ہوئی تھی۔ اس میں شمال کی طرف سے بنی نضیر اور بنی قینقاع کے وہ یہودی آئے جو مدینے سے جلاوطن ہو کر خیبر اور وادیٔ القریٰ میں آباد ہو گئے تھے۔ مشرق کی طرف سے بنی غطفان کے قبائل نے پیش قدمی کی، اور جنوب کی طرف سے قریش اپنے حلیفوں کی ایک بھاری جمعیت لے کر آگے بڑھے۔

حضور ﷺ کو جب یہ خبریں پہنچیں تو حضور ﷺ نے اپنے اصحابؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ ایرانی ہونے کے باعث خندق کے طریقے

واقف تھے۔ انھوں نے رائے دی کہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرنے کے بجائے ایک محفوظ مقام میں اسلامی لشکر جمع کیا جائے اور اس کے گرد خندق کھودی جائے۔ آنحضور ﷺ اور دیگر صحابہؓ نے اس رائے کو پسند کیا۔

جدید تحقیق سے ایک نئی بات معلوم ہوئی ہے (اور یہاں "سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ" مؤلفہ شاہ مصباح الدین شکیل سے منقول ہے)۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے مکتوبات نبوی ﷺ میں جو سیاسی وثیقہ جات کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کیے ہیں، ابوسفیان کا خط اور حضور اکرم ﷺ کا جواب دونوں موجود ہیں، جن سے ظاہر ہے کہ خندق کھودنے کا مشورہ سلمان فارسیؓ نے نہیں دیا تھا، بلکہ یہ وحی الٰہی سے تھا۔

من جانب ابوسفیان بن حرب۔

بخدمت محمد بن عبداللہ (ﷺ)

اپنے بتوں، لات، عزیٰ، منات، نائلہ اور ہبل کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اپنے ہم راہ وہ بے کراں لشکر لے کر آ رہا ہوں جو مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتا ہے۔

مَیں نے آپ کے حوصلے دیکھ لیے۔ مقابلے کی تاب نہ لا کر شہر کے اردگرد خندق کھدوائی۔ آپ تو یہ طریقہ جانتے نہ تھے۔

اگر اس مرتبہ ہم مدینہ سے ناکام واپس لوٹے تو جس طرح احد میں ہم نے آپ کو پامال کیا تھا اور آپ کے لشکریوں کی گرفت سے ہم اپنی عورتوں کو بچالائے، کسی وقت احد کی مانند پھر آپ کو نرغے میں لے کر پیس دیں گے۔"

رسول کریم ﷺ کے پاس یہ خط پہنچا۔ آپ ﷺ نے ابی بن کعب کو اپنے خیمے میں لے جا کر ان سے سنا اور مندرجہ ذیل جواب لکھوایا:

من جانب محمد رسول اللہ ﷺ

بنام ابوسفیان بن حرب

واضح ہو۔ تمھارا خط ملا۔ میں جانتا ہوں کہ تم ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کے خلاف غرور میں مبتلا ہو۔ یہ جو تم نے مدینہ پر ایسا حملہ کرنے کا ذکر کیا ہے، جس میں تمھارے ہم راہ لشکر جرار ہوگا اور کہتے ہو کہ تمھاری فوج مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجادے گی، تو یہ خدا کی مرضی پر منحصر ہے۔ وہ اگر چاہے تو تم لوگوں سے لات وعزیٰ کا نام لینے کی طاقت سلب کر سکتا ہے۔ اور یہ جو تم نے لکھا ہے کہ مجھے خندق کھودنے کا طریقہ یاد نہ تھا، تو یہ طریقہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس وقت القا فرمایا، جب تمھارا اور تمھارے ہم راہیوں کا غیظ وغضب یہاں تک پہنچا کہ تم لوگ مدینے کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تل گئے۔

سنو! تمھاری خام امیدوں کا پورا ہونا تو کجا، وقت آ گیا ہے کہ لات وعزیٰ ومنات اور نائلہ ایک ایک کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔"

قبل اس کے کہ کفار کا لشکرِ جرار مدینہ پہنچتا، آپ ﷺ نے چھے دن کے اندر مدینہ کے شمال مغربی رخ پر ایک خندق کھدوائی اور کوہِ سلع کو پشت پر لے کر تین ہزار فوج کے ساتھ خندق کی پناہ میں مدافعت کے لیے تیار ہو گئے۔ مدینہ کے جنوب میں باغات اس کثرت سے تھے (اور اب بھی ہیں) کہ اس جانب سے کوئی حملہ اس پر نہ ہو سکتا تھا۔ مشرق میں حرات (لاوے کی چٹانیں) ہیں، جن پر سے کوئی اجتماعی فوج کشی آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ یہی کیفیت مغربی جنوبی گوشے کی بھی ہے۔ اس لیے حملہ صرف احد کے مشرقی اور مغربی گوشوں سے ہو سکتا تھا اور اسی جانب حضور ﷺ نے خندق کھدوا کر شہر کو محفوظ کر لیا تھا۔ یہ چیز سرے سے کفار کے جنگی نقشے میں تھی ہی نہیں کہ انھیں مدینہ کے باہر خندق سے سابقہ پیش آئے گا، کیوں کہ اہلِ عرب اس طریقِ دفاع سے ناآشنا تھے۔ ناچار انھیں جاڑے کے زمانے میں ایک طویل محاصرے کے لیے تیار ہونا پڑا، جس کے لیے وہ گھروں سے تیار ہو کر نہ آئے تھے۔

خندق کھودنے کا کام چھے دن میں تین ہزار ہاتھوں سے مکمل ہوا۔ حضور ﷺ نے خندق کی حدود خود قائم کیں اور دس دس آدمیوں کو دس دس گز خندق کھودنے کا کام سپرد کیا۔ خندق کی گہرائی پانچ گز تھی۔ خندق کھودنے، پتھر توڑنے اور مٹی ڈھونے میں حضور ﷺ نے حسب سابق پورا حصہ لیا۔ خندق کھودتے وقت حضور ﷺ کے موئے مبارک مٹی سے اٹ گئے۔ ان دنوں میں آپ ﷺ نے پیٹ پر پتھر باندھ کر تین تین دن فاقے سے گزارے۔

حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول ﷺ کے ساتھ خندق میں تھے۔ لوگ کھدائی کر رہے تھے اور ہم کندھوں پر مٹی ڈھو رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اللھم لا عیش الا عیش الآخرة
فاغفر للمهاجرین والأنصار

"اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ پس مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔"

حضرت براء بن عازبؓ سے مروی ہے کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ خندق سے مٹی ڈھو رہے تھے، یہاں تک کہ گرد وغبار نے آپ کے شکم کی جلد ڈھانک دی تھی۔ آپ ﷺ کے بال بہت زیادہ تھے۔ مَیں نے اسی حالت میں آپ ﷺ کو عبداللہ بن رواحہؓ کے رجزیہ کلمات کہتے ہوئے سنا۔ آپ ﷺ مٹی ڈھوتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے:

"اے اللہ، اگر تو نہ ہوتا تو ہم ہدایت نہ پاتے۔ نہ صدقہ دیتے نہ نماز پڑھتے۔ پس ہم پر سکینت نازل فرما، اور اگر ٹکراؤ ہو جائے تو ہمارے قدم ثابت رکھ۔ انھوں نے ہمارے خلاف لوگوں کو بھڑکایا ہے۔ اگر انھوں نے کوئی فتنہ چاہا تو ہم ہرگز سر نہیں جھکائیں گے۔"

مسلمان ایک طرف اس گرم جوشی کے ساتھ کام کر رہے تھے تو دوسری طرف اتنی شدت کی بھوک برداشت کر رہے تھے کہ اس کے تصور سے کلیجہ شق ہوتا ہے۔ چناں چہ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ اہل خندق کے پاس دو مٹھی جو لایا جاتا تھا اور بودار چکنائی کے ساتھ بنا کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا جاتا تھا۔ لوگ بھوکے ہوتے تھے اور اس کا ذائقہ حلق کے لیے ناخوشگوار ہوتا تھا۔ اس سے بدبو اٹھ رہی ہوتی تھی۔

کفار کے لشکر جرار کے پہنچنے سے پہلے مدینے کی دیواروں تک مقررہ پروگرام کے مطابق خندق تیار ہو گئی۔ ادھر قریش اپنا چار ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پہنچے تو رومہ، جرف

اور زغابہ کے درمیان خیمہ زن ہوئے، اور دوسری طرف سے غطفان اور ان کے نجدی ہم سفر چھے ہزار کی نفری لے کر آئے تو احد کے مشرقی کنارے خیمہ زن ہوئے۔

رسول اکرم ﷺ نے مدینے پر ابن ام مکتومؓ کو منتظم مقرر کیا۔ عورتوں اور بچوں کو گڑھیوں میں محفوظ کیا۔ پھر تین ہزار کا لشکر لے کر نکل پڑے اور جبل سلع کو پشت پر کر کے قلعہ بندی کی شکل اختیار کر لی۔ سامنے خندق تھی جو مسلمانوں اور کفار کے درمیان حائل تھی۔

جب مشرکین حملے کی نیت سے مدینے کی طرف بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چوڑی سی خندق ان کے اور مدینے کے درمیان حائل ہے۔ مجبوراً انھیں محاصرہ کرنا پڑا، حالانکہ وہ گھروں سے چلتے وقت اس کے لیے تیار ہو کر نہیں آئے تھے، کیوں کہ دفاع کا یہ منصوبہ (خود ان کے بقول) ایک ایسی چال تھی جس سے عرب کو واقفیت ہی نہ تھی، لہٰذا انھوں نے اس معاملے کو سرے سے اپنے حساب میں داخل نہ کیا تھا۔

مشرکین خندق کے پاس پہنچ کر غیظ وغضب سے چکر کاٹنے لگے۔ انھیں ایسے کم زور نقطے کی تلاش تھی جہاں سے وہ اتر سکیں۔ ادھر مسلمان ان کی گردش پر پوری پوری نظر رکھے ہوئے تھے اور ان پر تیر برساتے رہتے تھے، تاکہ انھیں خندق کے قریب آنے کی جرات نہ ہو۔ وہ اس میں نہ کود سکیں اور نہ مٹی ڈال کر عبور کرنے کے لیے راستہ بنا سکیں۔

ادھر قریش کے شہسواروں کو گوارا نہ تھا کہ خندق کے پاس محاصرے کے نتائج کے انتظار میں بے فائدہ پڑے رہیں۔ یہ ان کی عادت اور شان کے خلاف بات تھی۔ چناں چہ ان کی ایک جماعت نے جن میں عمرو بن عبدود، عکرمہ بن ابی جہل اور ضرار بن خطاب وغیرہ تھے، ایک تنگ مقام سے خندق پار کر لی اور ان کے گھوڑے خندق اور سلع کے درمیان میں چکر کاٹنے لگے۔ ادھر سے حضرت علیؓ چند مسلمانوں کے ہم راہ نکلے اور جس مقام سے انھوں نے گھوڑے کدائے تھے، اسے قبضے میں لے کر ان کی واپسی کا راستہ بند کر دیا۔ اس پر عمرو بن عبدود نے مبارزت کے لیے للکارا۔ حضرت علیؓ دو دو ہاتھ کرنے کے لیے مقابلے میں آ گئے۔ اور ایک ایسا فقرہ چست کیا کہ وہ طیش میں آ کر گھوڑے سے کود پڑا۔ اس کی کوچیں کاٹیں۔ اس کے چہرے کو مارا اور حضرت علیؓ کے دو بدو آ گیا۔ بڑا بہادر اور شہ زور تھا۔ دونوں میں پُر زور ٹکر ہوئی۔ ہر ایک نے دوسرے پر بڑھ بڑھ کر وار کیے۔ بالآخر حضرت علیؓ نے اس کا کام تمام کر دیا۔ باقی مشرکین بھاگ کر خندق پار چلے گئے۔ وہ اس قدر مرعوب تھے کہ عکرمہ نے بھاگتے ہوئے اپنا نیزہ بھی چھوڑ دیا۔

مشرکین کی طرف سے خندق عبور کرنے کی کوششیں اور مسلمانوں کی طرف سے پیہم دفاع کئی روز تک جاری رہا، مگر چوں کہ دونوں فوجوں کے درمیان خندق حائل تھی، اس لیے دست بدست اور خون ریز جنگ کی نوبت نہ آ سکی، بلکہ صرف تیر اندازی ہوتی رہی۔ اسی تیر اندازی میں فریقین کے چند افراد مارے بھی گئے، لیکن انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، یعنی چھے مسلمان اور دس مشرک، جن میں سے ایک یا دو آدمی تلوار سے قتل کیے گئے تھے۔ اسی تیر اندازی کے دوران میں حضرت سعد بن معاذؓ کو بھی ایک تیر لگا جس سے ان کے بازو کی بڑی رگ کٹ گئی۔

سردیوں کا خوف

ابوسفیان اور اس کے ساتھیوں کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ خندق کی صورت میں ہم برسوں تک بھی اپنے مقصد میں کام یاب نہیں ہو سکتے۔ ایک تو موسم کی شدت اور دوسرے سن کر دینے والی ٹھنڈی ہوائیں، اور ان پر مستزاد یہ کہ ان ایام میں مہاوٹیں بھی برستی تھیں۔ ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ اس کے سر پر موت کی گھٹائیں تلی کھڑی ہیں۔ اہل مکہ اور بنی غطفان اپنے اپنے گھروں میں تو اس کڑاکے کی سردی سے محفوظ رہ سکتے تھے، لیکن یثرب کی کھلی فضا میں خندق کے کنارے انھوں نے جو خیمے نصب کیے تھے، ان میں سردی سے امن نصیب نہ ہو سکتا تھا۔ جب یہ لوگ عازم مدینہ ہوئے تھے، تو ان کا خیال یہ تھا کہ جنگ میں ایک دن سے زیادہ صرف نہ ہو گا اور یہ فتح کے بعد شادمانی کے گیت گاتے ہوئے مال غنیمت لے کر لوٹ آئیں گے۔ یہودیوں نے بنی غطفان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر جنگ میں فتح نصیب ہوئی تو ہم خیبر کے کھیتوں اور باغوں کی ایک سال کی فصل تمھیں دے دیں گے۔ اب انھیں نظر آ رہا تھا کہ خندق کے درمیان میں ہوتے ہوئے اور اتنی سخت سردی میں فتح کی کوئی صورت نہیں ہے۔ غالب خیال یہ تھا کہ بنی غطفان محض محصول کی معافی کے لالچ میں سرما کی شدت ہرگز گوارا نہ کریں گے اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی راہ لے گا۔

قریش کے دل میں اگرچہ مسلمانوں کی طرف سے حد درجہ بغض تھا، اور وہ اس لیے کہ بدر اور اس کے بعد کی لڑائیوں میں انھیں مسلمانوں کے ہاتھوں خاصی زک اٹھانی پڑی تھی۔ تاہم اس صورت میں کہ خندق درمیان میں حائل تھی اور بنی قریظہ ان کی مدد کر رہے تھے، انھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ ہم کئی ماہ تک بھی یہ مہم سر نہ کر سکیں گے۔ اس لیے ان کا خیال تھا کہ ہمیں اور قبائل عرب کے فوجی دستوں کو لوٹ جانا چاہیے، جنگ قرین مصلحت نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انھیں یہ خیال بھی آتا کہ دوسری بار اتنی بڑی فوج آسانی سے جمع نہیں ہو سکتی۔ اس دفعہ تو یہودیوں نے (بنی نضیر کے بڑے مجرم) حیی بن اخطب کی سرکردگی میں گھوم پھر کر مسلمانوں کے خلاف قبائل عرب کو جمع کر لیا ہے، تاکہ وہ مسلمانوں سے انتقام لیں۔ اگر یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور قبائل عرب منتشر ہو گئے تو پھر کبھی میسر نہیں آئے گا۔ اگر اس دفعہ حضرت محمد ﷺ کا پلہ بھاری رہا اور قبائل عرب نے اپنی اپنی راہ لی تو یہودیوں کا حشر بہت بُرا ہو گا۔

حیی ابن اخطب کی چال

ابن اخطب ان حالات سے بے خبر نہ تھا۔ اسے یہ اندیشہ تھا کہ نتائج کہیں خلاف توقع بر آمد نہ ہوں۔ اس نے حالات پر قابو پانے کے لیے ایک آخری تدبیر سوچی، چناں چہ اس نے عرب فوج کے دستوں سے کہا کہ میں بنی قریظہ (مدینے کے حلیف یہودیوں) کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ نقض عہد کریں۔ اگر مسلمانوں سے کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے مسلمانوں کو رسد و کمک نہیں ملے گی۔ خندق کھودنے کے سلسلے میں جن آلات، کدال

غزواتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

روم
قبرص
بحیرۂ روم
دمشق
موتہ
ایلہ
دریائے فرات
دریائے دجلہ
فارس
جنگ موتہ... حضرت زیدؓ بن حارثہ کا راستہ ۶۲۹ء
دومۃ الجندل
تبوک
بنو اسد
حضور اکرمؐ کا قصد تبوک ۶۳۰ء
خیبر
بنو غطفان
احد
خیبر کے علاقے میں یہودیوں کی سرکوبی ۶۲۸ء
بدر
مدینہ
بنو لحیان
بنو خزاعہ
فتح مکہ جنوری ۶۳۰ء
حدیبیہ
مکہ
حنین
طائف
بنو کنانہ
صلح حدیبیہ فروری ۶۲۸ء
بحرین
خلیج فارس
بحیرۂ احمر
ربع خالی
یمن
حضر موت
عدن
حبشہ
بحرِ ہند

غزوہ تبوک کے زمانے کا عرب

روم
شام
بحرابیض
فلسطین
مملکت بنی غسان
موتہ
ایلہ
مقنا
بنو جذام
تبوک
دولت روم کے زیراثر علاقہ
دومۃ الجندل
بنوکلب
بنوجدیلہ
بنوایاد
بنوتغلب
دریائے فرات
دریائے دجلہ
ایران
دولت ایران
دولت ایران کے زیراثر علاقہ
شمال
بنوعبس ومرہ وذبیان
تیماء
مدائن صالح
العلاء
فدک
خیبر
بنوطے
بنواسد
غطفان، اشجع، مرہ وفزارہ
بنوضبہ
بنوعامر
بنوتمیم
خلیج فارس
عمان
بواط
مدینہ
بئرمعونہ
حمراء الاسد
بنوسلیم
بنومزینہ
یمامہ
بنوعبدالقیس
مرالظہران
مکہ
طائف
بنوخزاعہ
بنوثقیف
بنوہوازن
اوطاس
بنولحیان
بنودیل
بنوخثعم
بنوالازد
بنوہمدان
بنوکندہ
مہرہ
بحراحمر
بنومراد
نجران
حضرموت
بنوبجیلہ
مارب
یمن
خلیج عدن
بحرعرب
حبش

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ۱۲ انصاری نقیب

حارثہ (بن ثعلبہ بہلول بن عمرو مزیقیا بن عامر ماالسماء بن حارثہ الغطریف)

اوس — بنو اوس کا جد امجد

مالک

- عوف ← عمرو ← عوف ← مالک ← زید ← زبیر ← عبدالمنذر ← رفاعہ رضی اللہ عنہ
- عمرو (نبیت) ← خزرج الاصغر ← حارث ← جشم ← عبدالاشہل ← نضیر ← اُسید رضی اللہ عنہ
- امرؤالقیس ← سلم ← غنم ← حارثہ ← مالک ← حارث ← خثیمہ ← سعد رضی اللہ عنہ

خزرج الاکبر — بنو خزرج کا جد امجد

- جشم
  - تزید ← شاردہ (سارد) ← اسد ← علی ← سعد ← سلمہ ← کعب ← غنم
    - عدی ← عُبید ← سنان ← خنساء ← صخر ← معرور ← براء رضی اللہ عنہ
    - کعب ← ثعلبہ ← حرام ← عمرو
      - منذر رضی اللہ عنہ
      - عبداللہ رضی اللہ عنہ
  - غضب ← مالک ← عبد حارثہ ← زریق ← عامر ← زریق ← عامر ← عمرو ← عجلان ← مالک ← رافع رضی اللہ عنہ
- حارث ← خزرج ← کعب ← ثعلبہ ← مالک الاغر ← امرؤالقیس
  - عمرو ← امرؤالقیس ← ثعلبہ ← رواحہ ← عبداللہ رضی اللہ عنہ
  - مالک ← ابی زہیر ← عمرو ← ربیع ← سعد رضی اللہ عنہ
- عوف ← عمرو ← عوف ← غنم (قوقل) ← قیس ← صامت ← عبادہ رضی اللہ عنہ
- کعب ← ساعدہ ← خزرج ← طریف ← ثعلبہ ← خزیمہ ← حرام ← حارثہ ← دلیم ← عبادہ ← سعد رضی اللہ عنہ
- عمرو ← ثعلبہ ← تیم اللہ (نجار) ← مالک
  - عدی ← غنم ← عامر ← خداش ← حرام ← لبید ← زید ← عمرو ← سلمیٰ (زوجۂ ہاشم) ← عبدالمطلب ← عبداللہ
  - غنم ← ثعلبہ ← عبید ← عدس ← زرارہ ← اسعد رضی اللہ عنہ

پھاوڑے وغیرہ کی ضرورت تھی، وہ سب مسلمانوں کو بنی قریظہ ہی نے فراہم کیے تھے)۔ اور اس طرح مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے بھی ہمیں راستہ مل جائے گا۔ قریش و غطفان نے یہ بات سنی تو ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

غرض ابن اخطب اپنی سازشانہ تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس پہنچا۔ شروع شروع میں تو کعب نے اس کے لیے اپنے قلعے کا دروازہ نہ کھولا، کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اگر مسلمان جنگ میں ہار گئے تو یہود بنی قریظہ کی غداری خود ان کے اپنے اور دوسرے یہودیوں کے لیے خود بخود سود مند ثابت ہوگی، لیکن اگر اس کے برخلاف قبائلِ عرب کی شکست ہوئی اور وہ ہزیمت خوردہ ہو کر مدینے سے چلے گئے تو مسلمان اس غداری کی سزا بنی قریظہ کو اتنی سخت دیں گے کہ یہودیوں کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔

ابن اخطب کے پیہم اصرار پر کعب ابن اسد نے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اس نے کعب سے کہا: ''بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں تو قریش و غطفان اور ان کے سرداروں کو لایا ہوں اور انھوں نے مجھ سے پیمانِ وفا باندھا ہے کہ ہم یہاں سے ایک قدم تک نہیں ہٹائیں گے، جب تک حضرت محمد ﷺ اور ان کے رفقاء کو تہس نہس کر کے نہ رکھ دیں، اور تم ہو کہ قلعے کا دروازہ کھولنے پر بھی آمادہ نہیں ہو۔

کعب بن اسد کو ابن اخطب کا منشا معلوم ہوا تو اس نے اخطب کی بات ماننے سے انکار کر دیا، کیوں کہ وہ یہ جانتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کا معاملہ اس کے اور بنی قریظہ کے ساتھ صدق و وفا کا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے اس کام کے انجام کا خوف بھی دامن گیر تھا، لیکن ابن اخطب نے گفتگو کے دوران میں عہد شکنی پر زور ڈالا اور کعب بن اسد پر یہ حقیقت واضح کی کہ یہودی کتنے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں اور اگر عرب فوج مغلوب ہو گئی تو پھر انھیں کتنی رسوائی ہوگی اور وہ کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔

بعد ازاں ابن اخطب نے قبائلِ عرب کی فوجی طاقت کا نقشہ کھینچا اور بتایا کہ اگر خندق درمیان حائل نہ ہوتی تو قبائل کے فوجی دستے تھوڑی سی مدت میں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نابید کر دیتے۔ ابن اخطب کے اصرار سے کعب بھی اخطب کا ہم خیال ہو گیا، لیکن اس نے اخطب سے یہ سوال ضرور کیا کہ اگر قبائلِ عرب کے فوجی دستے ناکام لوٹ گئے تو ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اخطب نے کعب سے عہد کیا کہ اگر قریش و غطفان بے نیلِ مرام لوٹے تو وہ خود قلعے میں اپنی مرضی سے تمھارے ساتھ آملے گا اور اس مصیبت کا مزا چکھے گا جو تم پر نازل ہوگی۔ یہودی فطرت کعب پر غالب آئی اور اس نے ابن اخطب کی بات مان لی۔ نبی کریم ﷺ سے اس نے جو عہد و پیمان کر رکھے تھے، وہ اس نے توڑ ڈالے۔

قاصدانِ رسول ﷺ بنی قریظہ کی طرف

آنحضرت ﷺ اور آپ کے جاں نثاروں کو بنی قریظہ کی عہد شکنی کی خبر ہو گئی۔ اس سے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے صحابہؓ کو بڑا تردد ہوا۔ زیادہ تشویش انجام کی تھی۔ حضور ﷺ نے اوس کے سردار سعدؓ بن معاذ اور خزرج کے سردار سعدؓ بن عبادہ کو دوسرے دو اشخاص کے ہم راہ بنی قریظہ کے پاس بھیجا، تاکہ حقیقت آشکارا ہو جائے۔ حضور ﷺ نے اپنے قاصدوں سے یہ بھی فرمایا کہ اگر عہد شکنی کی خبر درست نکلے تو واپسی پر دوسروں کے سامنے اس کا ذکر نہ کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان وحشت زدہ اور مضطرب ہوں۔ جب دربارِ رسول ﷺ کے یہ قاصد بنی قریظہ کی اقامت گاہ میں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ جو کچھ سننے میں آیا ہے، حالات اس سے بھی بدتر ہیں۔ انھوں نے کعب سے گفتگو کی اور یہ چاہا کہ وہ پھر مسلمانوں سے عہد استوار کرے، لیکن کعب نے کہا: ''تم بنی نضیر کو جو ہمارے دینی بھائی ہیں، مدینہ میں واپس بلا لو۔ اسی وقت عہد و پیمان کی تجدید سے متعلق گفت و شنید ہو سکتی ہے۔''

سعدؓ بن معاذ نے، جن کے قبیلے اوس سے بنی قریظہ کے دوستانہ مراسم تھے، بنی قریظہ کو عہد شکنی کے انجام سے ڈرایا، لیکن ان کی باتوں سے یہودیوں کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، بلکہ انھوں نے نبی کریم ﷺ شان کے خلاف طعن و تشنیع کی زبان درازی کی۔ کعب نے کہا: ''پیغمبر کو ہم کیا سمجھتے ہیں؟ محمد ﷺ سے ہمارا کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔''

قبائلِ عرب کے حوصلے

قاصدانِ رسول ﷺ لوٹ آئے اور جو کچھ انھوں نے دیکھا آنحضرت ﷺ سے بیان کیا۔ حالات کچھ اتنے پیچیدہ ہو گئے کہ ان کے سلجھاؤ کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی تھی۔ مسلمانوں پر خوف اور دہشت کی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ اہلِ مدینہ کو صاف نظر آ رہا تھا کہ عرب فوج بنی قریظہ کی طرف سے مدینہ پر ٹوٹ پڑے گی اور قتلِ عام کا ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ یہ ذہنی الجھن وہم و قیاس کی بنیاد پر نہ تھی، بلکہ یہ حقیقت تھی کہ بنی قریظہ نے رسد و کمک کا سلسلہ فوراً منقطع کر دیا تھا۔ دوسری طرف انھیں یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ قریش و غطفان کو بنی قریظہ کی عہد شکنی اور ان کے تعاون کی اطلاع مل چکی ہے اور اس سے ان کے حوصلے اور بھی زیادہ بلند ہو گئے ہیں اور وہ جنگ کے لیے زور شور سے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ بنی قریظہ نے عرب قبائل سے دس روز کی مہلت طلب کی تھی کہ اس اثناء میں وہ اپنے آپ کو جنگ کے لیے تیار کر لیں گے، لیکن شرط یہ ہے کہ عرب فوج اس مدت میں برابر جنگ میں مصروف رہے۔ عربوں نے یہ شرط پوری کی۔ انھوں نے مسلمانوں سے لڑنے کے لیے تین دستے ترتیب دیئے اور ان میں سے ہر دستے نے جداگانہ اطراف سے مسلمانوں پر حملے جاری رکھے۔

مسلمانوں کی تشویش

مدینہ میں محصور مسلمانوں پر چہار اطراف سے غم و الم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ دشمن کی یلغار کے خطرے سے مسلمانوں کے جذبات پر کچھ اوس سی پڑ گئی تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان محصورین میں منافقین کا جو گروہ شامل تھا، اس نے یہ کہ کر زخموں پر نمک چھڑکنا شروع کر دیا کہ ہم سے تو نبی کریم ﷺ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ قیصر و کسریٰ کے محلات اور ان کے خزائن پر ہمارا تسلط ہوگا۔ یہاں نقشہ یہ ہے کہ ہم رفعِ حاجت کے لیے بھی گھروں سے باہر نہیں نکل سکتے۔ ان میں ایک تعداد ایسے لوگوں کی بھی تھی جن کی

آنکھیں جنگ جو عرب فوج کے نظارے سے پتھرا سی گئی تھیں۔ ان میں سے بعض وہ بھی تھے جن کے دل ڈوبے جا رہے تھے۔ ان لوگوں کی نظر میں قریش و غطفان کی چمکتی ہوئی تلواریں آگ برسا رہی تھیں۔ بعض لوگوں کو بنی قریظہ کے نقضِ عہد پر غصہ آ رہا تھا اور وہ دانت پیس پیس کر یہودیوں کو کوس رہے تھے۔ ان کی زبانوں پر یہ فقرے تھے: ''اے یہود، تمھارا برا ہو۔ کیا اچھا ہوتا کہ رسول کریم ﷺ بنی نضیر کو دیس نکالا دینے کے بجائے قتل کر دیتے تو آج حالات کی یہ نوعیت نہ ہوتی۔ افسوس، اے حیی بن اخطب، تجھے اس لیے زندہ رہنے دیا گیا کہ تو قریش اور عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف ابھارے۔ اب اگر اس حادثۂ عظیم سے کوئی چیز ہمیں بچا سکتی ہے تو وہ صرف خدا کی پناہ اور اس کی زبردست قوت ہے۔''

ایک طرف اسلامی لشکر کا یہ حال تھا۔ دوسری طرف رسول اللہ ﷺ کی یہ کیفیت تھی کہ آپ ﷺ نے بنو قریظہ کی بدعہدی کی خبر سن کر اپنا سر اور چہرہ کپڑے سے ڈھک لیا اور دیر تک چت لیٹے رہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر لوگوں کا اضطراب اور زیادہ بڑھ گیا، لیکن اس کے بعد آپ ﷺ پر امید و یقین کی روح غالب آ گئی اور آپ ﷺ اللہ اکبر کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''مسلمانو! اللہ کی مدد اور فتح کی خوش خبری سن لو۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے پیش آمدہ حالات سے نمٹنے کا پروگرام بنایا اور اسی پروگرام کے ایک جزو کے طور پر مدینے کی نگرانی کے لیے فوج میں سے کچھ محافظ بھیجتے رہے، تاکہ مسلمانوں کو غافل دیکھ کر یہود کی طرف سے عورتوں اور بچوں پر اچانک کوئی حملہ نہ ہو جائے۔ لیکن اس موقع پر ایک فیصلہ کن اقدام کی ضرورت تھی، جس کے ذریعے دشمن کے مختلف گروہوں کو ایک دوسرے سے بےتعلق کر دیا جائے۔

اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے سوچا کہ بنو غطفان کے دونوں سرداروں عیینہ بن حصن اور حارث بن عوف سے مدینے کی ایک تہائی پیداوار پر مصالحت کر لیں، تاکہ یہ دونوں سردار اپنے قبیلے کے لوگوں کو لے کر واپس چلے جائیں اور مسلمان تنہا قریش پر، جن کی طاقت کا بار بار اندازہ لگایا جا چکا تھا، ضرب کاری لگانے کے لیے فارغ ہو جائیں۔ اس تجویز پر گفت و شنید اور باضابطہ معاہدہ لکھا بھی گیا، لیکن معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے حضور ﷺ نے حضرت سعدؓ بن معاذ اور حضرت سعدؓ بن عبادہ (یعنی اوس و خزرج کے سرداروں کو) بلوا کر مصالحت کے بارے میں مشورہ فرمایا۔ دونوں صحابہؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ، اگر یہ خدا کی طرف سے حکم آیا ہے، تب تو بلا چون و چرا تسلیم ہے، اور اگر محض آپ ﷺ ہماری خاطر ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔'' جب ہم لوگ اور یہ لوگ دونوں مشرک و بت پرست تھے، تب تو یہ لوگ میزبانی یا خرید و فروخت کے سوا کسی اور صورت سے ایک دانے کی بھی طمع نہیں کر سکتے تھے، تو بھلا اب جب کہ اللہ نے ہمیں ہدایتِ اسلام سے سرفراز فرمایا ہے اور آپ ﷺ کے ذریعے عزت بخشی ہے، ہم انھیں اپنا مال کیوں دیں گے؟ واللہ ہم تو انھیں صرف اپنی تلواریں دیں گے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کی رائے کو درست قرار دیا اور فرمایا کہ جب میں نے دیکھا کہ سارا عرب ایک کمان کھینچ کر تم پر پل پڑا ہے تو محض تمھاری خاطر میں نے یہ کام کرنا چاہا تھا۔ پھر مصالحت کی تحریر حضور ﷺ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کے حوالے کر دی، جسے انھوں نے ضائع کر دیا۔

یہودیوں کی شرارت

بنی قریظہ کی عہد شکنی کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلِ عرب کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انھوں نے آگ کے شعلے مشتعل کیے تاکہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شراروں سے مسلمانوں کو مرعوب کریں اور ان کے دلوں میں خوف و دہشت کی بجلیاں دوڑائیں۔ بنی قریظہ کے سورما یہودی اپنی پناہ گاہوں سے نکلے اور انھوں نے مسلمانوں کی اقامت گاہوں کی جانب نقل و حرکت شروع کی، تاکہ خانہ نشینوں کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہیں۔ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب (حضور ﷺ کی پھوپھی) حضرت حسانؓ بن ثابت کی پناہ گاہ میں تھیں۔ حضرت حسان کے اہل و عیال بھی یہیں تھے۔ ایک یہودی اس پناہ گاہ کے پاس سے گزرا اور اس کے اردگرد چکر کاٹنے لگا۔ حضرت صفیہؓ نے حضرت حسانؓ سے کہا: ''یہ یہودی ہماری اقامت گاہ کے گرد منڈلا رہا ہے۔ کیا عجب ہے کہ دوسرے یہودیوں کو بھی اتا پتا دے، اس لیے بہتر ہے کہ اس صورت میں حضور ﷺ اور ان کے صحابہؓ دوسرے کاموں میں مشغول ہیں آپ ﷺ جائیں اور اس یہودی کو ٹھکانے لگا دیں۔'' حضرت حسانؓ نے کہا ''اے عبدالمطلب، خدا آپ کی مغفرت فرمائے۔ آپ جانتی ہیں، میں اس میدان کا مرد نہیں ہوں۔'' چناں چہ حضرت صفیہؓ نے ایک موٹی سی بلی سنبھالی اور اپنی پناہ گاہ سے نیچے کر اس زور سے یہودی کے سر پر دے ماری کہ اس کا کام تمام ہو گیا۔

جب آپ ﷺ یہ کارنمایاں سرانجام دے کر لوٹیں تو آپ ﷺ نے حسانؓ سے کہا: ''جاؤ اس کا لباس ہی اتار لاؤ۔ چوں کہ یہ مرد تھا، اس لیے میں نے اس کا لباس اتارنا مناسب نہیں سمجھا۔'' حضرت حسانؓ نے جواب دیا: ''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔''

نعیمؓ بن مسعود کی سیاسی تدبیر

صحابہؓ بڑی سخت مصیبت میں گھرے ہوئے تھے۔ کفار کا ہر طرف سے دباؤ بڑھ رہا تھا۔ بظاہر کوئی امید افزا حالت نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی زبوں حالی پر رحم فرمایا اور ایک ایسا ذریعہ مہیا کر دیا کہ مصائب کے بادل چھٹ گئے اور امن و سلامتی کا سورج طلوع ہوا۔ اس غیبی امداد کی تفصیل یہ ہے کہ بنو غطفان کے ایک شخص، جن کا نام نعیمؓ بن مسعود تھا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اسلام قبول کر چکا ہوں، لیکن میری قوم کو میرے اسلام لانے کی خبر نہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ مجھے کوئی حکم فرمائیے۔'' حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم فقط ایک آدمی ہو۔ (لہٰذا کوئی فوجی اقدام تو نہیں کر سکتے) البتہ جس قدر ممکن ہو، ان کی حوصلہ شکنی کرو، کیوں کہ جنگ تو حکمتِ عملی کا نام ہے۔''

چناں چہ حضرت نعیمؓ بن مسعود بنی قریظہ کے پاس پہنچے۔ وہ قبول اسلام سے پہلے یہودیوں سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے اور انھیں یہ خبر نہ تھی کہ انھوں نے اسلام قبول

لیا ہے۔ غرض وہ بنی قریظہ کے پاس ایک دوست اور بہی خواہ کی حیثیت سے پہنچے۔ پہلے تو انھوں نے اپنے پرانے دوستانہ تعلقات کی یاد تازہ کی۔ پھر کہا کہ تم نے محمد ﷺ کو چھوڑ کر قریش اور غطفان سے ساز باز کر لی ہے۔ بہت ممکن ہے، زیادہ عرصے تک ان کے قدم یہاں نہ جم سکیں اور وہ تمھیں محمدؐ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کی راہ لیں۔ حضرت نعیمؓ نے انھیں مشورہ دیا کہ انجام کار سے اطمینان کی صورت یہی ہے کہ تم مسلمانوں کے ساتھ نبرد آزما ہونے سے قبل قریش و غطفان کے چند اشخاص کو اپنے پاس بطور ضمانت رکھو، تاکہ تمھیں خطرے کی دلدل میں پھنسا کر وہ اپنی راہ نہ لے سکیں۔ بنی قریظہ کو حضرت نعیمؓ کا معقول مشورہ پسند آ گیا۔

بنی قریظہ کو مشورہ دینے کے بعد نعیمؓ نے قریش کی جانب رخ کیا اور ان سے کہا کہ بنی قریظہ اپنے کیے پر نادم ہیں، اور اب وہ یہ چاہتے ہیں کہ قریش کے چند آدمیوں کو اپنے قبضے میں لے کر حضرت محمد ﷺ کو سونپ دیں، تاکہ وہ ان کا خون بہائیں۔ لہٰذا اگر یہودی تمھارے پاس یہ پیغام بھیجیں کہ ہمارے پاس اپنے کچھ آدمی بطور یرغمال بھیج دو تو کہیں اپنے آدمی بھیج نہ دینا۔

اب نعیم بن مسعودؓ اس کے بعد بنی غطفان کے پاس پہنچے اور جو باتیں قریش سے کی تھیں، ان سے بھی کہیں۔ غطفان حضرت نعیمؓ بن مسعود کی باتوں سے شش و پنج میں پڑ گئے اور انھوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ غرض اس معاملے کی تصدیق کے لیے ابوسفیان نے بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس اپنے کسی آدمی کے ذریعے سے یہ پیغام بھیجا کہ ہمارے محاصرے نے طول کھینچا ہے اور یہاں ٹھہرے ہوئے ہمیں خاصے دن گزر چکے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم کل ہی ایک طرف سے حملہ کر دو۔ ہم بھی تمھاری پشت پناہی کے لیے آ پہنچیں گے۔ ابوسفیان کا قاصد بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد سے یہ جواب لے کر واپس آیا کہ کل یومِ سبت ہے۔ ہم اس دن جنگ میں شریک ہونے سے معذور ہیں۔ ابوسفیان کو اس جواب سے غصہ آیا، اور اسے یقین آ گیا کہ نعیم بن مسعود نے ہمیں جو اطلاع دی ہے، وہ درست ہے۔

ابوسفیان نے دوبارہ کعب کے پاس پیغام بھیجا کہ اس شنبے کی معذوری کو اگلے شنبے پر ملتوی کر دو اور کل ضرور جنگ میں حصہ لو۔ اگر ہم جنگ میں مشغول ہو گئے اور تم نے ہم سے تعاون نہ کیا تو ہم تمھارے پیمان کو کالعدم سمجھیں گے اور تمھارے خلاف بھی ہماری تلواریں اٹھیں گی۔

جس وقت یہودیوں نے ابوسفیان کا دوسرا پیغام سنا تو انھوں نے کہا، ہم یوم سبت کو ہرگز تلوار نہیں اٹھا سکتے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی اس جماعت پر، جس نے یوم سبت کا احترام نہیں کیا تھا، اپنا عذاب نازل کیا تھا اور وہ سوروں اور بندروں میں تبدیل کر دیے گئے تھے۔ اس جواب کے ضمن میں انھوں نے قریش سے پھر یہ مطالبہ کیا کہ وہ ہماری تسلی اور اطمینان کے لیے اپنے کچھ آدمی یرغمال کے طور پر ہمارے پاس چھوڑ دیں۔"

ابوسفیان نے یہ تمام باتیں سنیں تو اسے نعیم بن مسعود کی باتوں پر حرف بہ حرف یقین آ گیا۔ اب ابوسفیان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ ہمیں ان حالات میں کیا راہ عمل اختیار کرنی چاہیے۔ اس نے بنی غطفان سے بات چیت کی تو انھیں بھی آنحضور ﷺ کے اس پیغام کے نتیجے میں کہ مدینے کی پیداوار کا ایک ثلث انھیں صلے میں ملے گا، متردد اور متذبذب پایا حالانکہ ایک ثلث پیداوار کی واگزاری کی بات پختہ نہ تھی، بلکہ جو معاہدہ لکھا گیا تھا، وہ دستخطوں سے پہلے ہی رد ہو چکا تھا۔

اس طرح دونوں فریقوں کا اعتماد ایک دوسرے سے اٹھ گیا۔ ان کی صفوں میں پھوٹ پڑ گئی اور ان کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ اس دوران میں مسلمان اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہے تھے "اے اللہ ہماری پردہ پوشی فرما اور ہمیں خطرات سے مامون کر دے" اور رسول اللہ دعا فرما رہے تھے: "اے اللہ، کتاب اتارنے والے اور جلد حساب لینے والے، ان لشکروں کو شکست دے۔ اے اللہ! انھیں شکست دے اور جھنجھوڑ کر رکھ دے۔"

طوفان باد و باراں

بالآخر اللہ نے اپنے رسول ﷺ اور مسلمانوں کی دعائیں سن لیں۔ چناں چہ مشرکین کی صفوں میں پھوٹ پڑ جانے اور پست ہمتی سرایت کر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر تند ہواؤں کا طوفان بھیج دیا۔ رات ہوئی تو اس قیامت کا طوفان باد و باراں اٹھا کہ کفار کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ بجلی کی تڑپ اور بادل کی گرج نے ہوش اڑا دیئے۔ خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ جن دیگوں میں کھانا تیار کیا گیا تھا، کہیں سے کہیں اوندھی جا گریں۔ عرب فوج کو یہ خدشہ لاحق ہوا کہ اس افراتفری میں اگر مسلمانوں نے موقع غنیمت جان کر حملہ کر دیا تو بہت بڑا حشر ہو گا۔ طلیحہ بن خویلد نے چلا کر کہا: "یہ سب کچھ محمد ﷺ کی طرف سے ہے۔ اپنے بچاؤ کی جلد از جلد فکر کرو۔"

ابوسفیان نے کہا: "اے قریش، ہمارا یہاں ٹھہرے رہنا بے سود ہے۔ ہمارے مویشی ضائع ہو گئے ہیں۔ بنی قریظہ نے ہم سے بد معاملگی کی اور عین موقع پر منہ پھیر لیا۔ جیسا کہ نظر آ رہا ہے، طوفان نے ہمیں چکر میں ڈال دیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اپنی راہ لو۔ میں بھی چلتا ہوں۔" غرض قریش اپنے ساز و سامان سے ہلکی پھلکی چیزیں لے کر لوٹے۔ قبائل عرب بھی ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ جہاں تک میدان خالی ہو چکا تھا وہاں آدم تھا نہ آدم زاد۔ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے مدینے کی اطراف کا جائزہ لیا اور اس موقع پر خداوند قدوس کا شکر ادا کیا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے لشکر کو عزت بخشی۔ اپنے بندے کی مدد کی، اور اکیلے ہی سارے لشکروں کو شکست دی۔ چناں چہ اس کے بعد آپ ﷺ مدینہ واپس ہو گئے۔

غزوہ خندق یا غزوہ احزاب شوال پانچ ہجری میں پیش آیا تھا اور مشرکین نے تقریباً ایک ماہ تک رسول اللہ اور مسلمانوں کا محاصرہ جاری رکھا تھا۔ یہ جنگ درحقیقت جان و مال کے نقصان کی جنگ نہ تھی بلکہ اعصاب کی جنگ تھی۔ اس میں کوئی خون ریز معرکہ پیش نہیں آیا، لیکن پھر بھی یہ تاریخ اسلام کی ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔

چناں چہ اس کے نتیجے میں مشرکین کے حوصلے ٹوٹ گئے اور یہ واضح ہو گیا کہ عرب کی کوئی بھی قوت مسلمانوں کی اس چھوٹی سی طاقت کو، جو مدینے میں نشو و نما پا رہی

ہے، ختم نہیں کر سکتی، کیوں کہ غزوہ خندق میں جتنی بڑی طاقت فراہم ہوگئی تھی، اس سے بڑی طاقت فراہم کرنا عربوں کے بس کی بات نہ تھی۔ اس لیے رسول اللہ نے احزاب کی واپسی کے بعد فرمایا: ''اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے۔ وہ ہم پر چڑھائیں نہ کریں گے۔ اب ہمارا لشکر ان کی طرف جائے گا۔''

قبائلِ عرب کی متحدہ افواج کی روانگی بلکہ پسپائی کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان حالات پر غور کیا جو مستقبل قریب میں پیش آسکتے تھے۔ آپ ﷺ نے سوچا کہ اللہ نے دشمنوں کو تو راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا، لیکن خطرہ ابھی باقی ہے کہ یہودی دوبارہ موسم سرما گزارنے کے بعد قبائلِ عرب کو جنگ کے لیے ابھاریں گے۔ اگر اس موقع پر عرب فوج نے راہِ فرار اختیار نہ کی ہوتی اور ان کے درمیان پھوٹ نہ پڑ جاتی تو بنی قریظہ کے یہودی ضرور مدینہ پر چڑھائی کرتے اور مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے ارادے سے دشمن کو بھی یقیناً امداد دیتے۔ یہودیوں کی حیثیت زخم خوردہ سانپ کی سی ہے۔ کسی وقت اور کسی صورت بھی بغض و عناد کی روش، جو ان کی سرشت میں داخل ہے، جا نہیں سکتی، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ان یہودیوں کو قرار واقعی سزا دی جائے۔

چناں چہ آنحضرت ﷺ نے اس مقصد کے پیش نظر ایک صحابی سے منادی کرادی کہ جو شخص اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کا دم بھرتا ہے، نماز عصر بنی قریظہ کی بستی میں ادا کرے۔ حضور ﷺ نے مدینے کا انتظام حضرت ابن ام مکتومؓ کو سونپا اور حضرت علیؓ کو جنگ کا پھریرا دے کر آگے روانہ فرما دیا۔ اس کے باوجود کہ مسلمان محاصرہ کے طول پکڑ جانے سے خستہ اور درماندہ ہو گئے تھے، اس جنگ کے لیے جس کے نتیجے سے وہ مطمئن تھے، فوراً آمادہ ہو گئے۔ اگر چہ یہود بنی قریظہ مضبوط قلعوں میں زندگی بسر کرتے تھے، لیکن یہ قلعے صرف دفاعی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ان میں محصور رہتے ہوئے مسلمانوں پر حملہ نہ کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں عرب فوج کے چلے جانے سے مسلمانوں کے قبضے میں خاصا سامان رسد آیا تھا، اس لیے انھوں نے خوشی خوشی اور کامل اطمینان سے بنی قریظہ کے مقابلے کے لیے اپنی آمادگی ظاہر کی، اور حضرت علیؓ کے پیچھے پیچھے انھوں نے بنی قریظہ کی بستی کا رخ کیا۔ جب مسلمان وہاں پہنچے تو انھوں نے دیکھا اور سنا کہ یہودی حیی ابن اخطب سے مصروف گفتگو ہیں اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں نازیبا کلمات استعمال کر رہے ہیں۔ وہ آپ ﷺ کو دروغ گو کہہ رہے تھے اور آپ ﷺ کی عزت و ناموس پر بھی حملے کر رہے تھے۔ لشکرِ کفار کی واپسی کے بعد انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ ان کا حشر بہت بُرا ہو گا، اس لیے جو کچھ ان کے منہ میں آتا تھا، کہتے تھے۔

جب آنحضرت ﷺ وہاں پہنچے تو حضرت علیؓ نے آپ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ یہودیوں کے قلعوں کے نزدیک تشریف نہ لے جائیں'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''کیوں۔ کیا بات ہے؟ معلوم ہوتا ہے، تم نے ان کی زبان سے میرے بارے میں کچھ ناشائستہ الفاظ سنے ہیں۔''

حضرت علیؓ نے اثبات میں جواب دیا۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب وہ مجھے دیکھیں گے تو ان کی زبانوں پر ایسی ویسی باتیں نہیں آئیں گی۔'' چناں چہ جب آپ ﷺ یہودیوں کے قلعوں کے نزدیک پہنچے تو آپ ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا: ''بندروں کے بھائی بندرو۔ کیا خدا نے تمھیں ذلیل و خوار نہیں کیا تھا، اور کیا اس نے تم پر اپنا قہر نازل نہیں کیا تھا۔'' یہودیوں نے جواب دیا: ''اے ابوالقاسم! آپ تو ہم سے اور ہمارے حالات سے بے خبر نہیں۔''

شام ہونے تک مسلمان گروہ در گروہ بنی قریظہ کی بستی میں جمع ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے انھیں یہ حکم دیا کہ یہودیوں کو حصار میں لے لیا جائے۔

بنی قریظہ کا محاصرہ

یہ محاصرہ پچیس روز تک مسلسل رہا۔ محاصرے کے دوران میں چند مرتبہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کی جانب پتھروں اور تیروں کی بارش ہوئی، لیکن یہودیوں کو یہ جرات نہ ہوئی کہ وہ اپنے قلعوں سے نکل کر دو بدو مسلمانوں سے مقابلہ کریں۔ آخر کار انھیں یہ پورا یقین ہو گیا کہ محاصرہ خواہ کتنا ہی طول کیوں نہ پکڑے، مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ضرور ہو کر رہیں گے۔ اس غرض سے انھوں نے اپنے ایک آدمی کے ذریعے سے یہ پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ ہمارے پاس ابولبابہؓ کو بھیج دیجیے کہ ان سے ہم اپنے معاملے میں کوئی فیصلہ کن بات کریں۔ ابولبابہؓ اوسی کا یہودیوں سے عہد و پیمان تھا۔

جس وقت یہودیوں نے ابولبابہؓ کو دیکھا۔ مرد، عورتیں اور بچے ان کے گرد جمع ہو گئے اور اتنی گریہ وزاری کی کہ خود ان پر بھی رقت طاری ہو گئی۔ بعد ازاں انھوں نے ابولبابہؓ سے دریافت کیا: ''آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا ہمیں اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دینا چاہیے یا نہیں؟'' ابولبابہؓ نے جواب دیا ''ہاں ایسا ہی مناسب ہے'' پھر اپنے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا: ''اگر تم نے اپنے آپ کو حوالے نہ کیا تو تمھارے سر قلم کر دیے جائیں گے۔''

کعب بن اسد کی رائے

جب ابولبابہؓ یہودیوں سے رخصت ہوئے تو ان کے سردار کعب بن اسد نے یہودیوں سے کہا: ''بہتر ہے کہ تم محمد ﷺ کا دین قبول کر کے مسلمان ہو جاؤ۔ اس صورت میں تمھاری جان و مال اور بیوی بچوں کو کوئی گزند نہ پہنچے گا اور تم محفوظ و مامون ہو جاؤ گے۔'' یہودیوں نے کعب کا مشورہ قبول نہ کیا اور چلا کر کہا: ''ہم تورات کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے اور اسے پس پشت ڈال کر اور کوئی چیز قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔'' پھر کعب نے مشورہ دیا: ''اچھا تو یہ کرو کہ اپنے بیوی بچوں کو خود اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتار دو اور تلواریں سونت کر محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑو، تاکہ خدا ہمارے اور ان کے درمیان کوئی آخری فیصلہ کر دے۔ اگر ہم میدان میں مارے گئے تو ہمیں اپنے متعلقین کی کوئی فکر نہ ہو گی اور اگر بصورت دیگر ہم نے غلبہ پا لیا تو بیوی بچے دوبارہ بھی میسر آ سکتے ہیں۔'' یہودیوں نے کعب کی یہ بات بھی نہ مانی اور یہ کہا: ''ہم اپنے اہل و عیال کو، جو ہمارے رحم و کرم پر ہیں، کیوں

کریں۔ ان کے بعد ہماری زندگی کس کام کی؟" پھر کعب نے کہا: "اگر تمھیں ان میں سے کوئی بات بھی منظور نہیں ہے تو پھر یہی بہتر ہے کہ اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دو۔ ورنہ تم نے ابولبابہؓ سے سن ہی لیا ہے کہ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو تم سے کیا معاملہ ہو گا؟" غرض یہودیوں نے آپس میں مشورے کیے۔ ان میں سے ایک نے کہا: "ہمارا حشر بنی نضیر جیسا نہ ہوگا۔ ہمارے اوسی حلیف ہمیں کوئی گزند نہ پہنچنے دیں گے۔ اور اگر ہم نے محمد ﷺ سے یہ درخواست کی کہ ہمیں شام کی طرف جانے دیا جائے تو ہمیں امید ہے، کہ یہ درخواست مسترد نہ ہوگی۔"

غرض بنی قریظہ نے کسی کو آنحضور ﷺ کے پاس بھیجا اور یہ درخواست کی کہ آپ ﷺ ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے مال و منال چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر جائیں۔" آنحضرت ﷺ نے یہ درخواست مسترد کر دی اور فرمایا: "تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کرو۔" یہ جواب پا کر یہودیوں نے قبیلہ اوس کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور یہ پیغام دیا "آیا جس طرح خزرجیوں نے اپنے دوستوں کی حمایت کی، تم ہماری حمایت نہ کرو گے۔"

قبیلہ اوس کی ایک جماعت آنحضرت ﷺ کے پاس یہ سفارش لے کر پہنچی کہ اے پیغمبر خدا! بنی قریظہ سے ہمارے دوستانہ مراسم ہیں۔ ان سے بھی وہی معاملہ کیا جائے جو آپ ﷺ نے اس سے قبل خزرج کے دوستوں یعنی بنی نضیر سے کیا ہے۔"

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اے اوسیو! کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ میرے اور اپنے دوستوں کے درمیان اپنے قبیلے میں سے کسی کو ثالث قرار دو؟"

انھوں نے کہا: "بے شک، ہم اس بات کے لیے تیار ہیں۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "تم اپنے دوست یہودیوں سے کہو کہ وہ قبیلہ اوس میں سے جسے چاہیں، اپنا ثالث منتخب کر لیں۔"

یہودیوں نے اتفاق رائے سے حضرت سعدؓ بن معاذ کو اپنا ثالث تسلیم کیا۔ تقدیر ترانھوں نے نقض عہد کیا تھا اور دشمنوں سے ساز باز کر لی تھی تو حضرت سعدؓ بن معاذ ہی ان کے پاس گئے تھے اور انھیں اس عہد شکنی کے انجام سے ڈرایا تھا، لیکن انھوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی بات نہ مانی تھی بلکہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں پر فقرے اور آوازے بھی کسے تھے۔

غرض حضرت سعد نے ثالث کی حیثیت سے اپنے اختیارات سے کام لیا اور یہ حکم دیا کہ یہودی قلعوں سے باہر نکلیں اور اپنا اسلحہ وہیں چھوڑ دیں۔ یہودیوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ پھر حضرت سعدؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی قریظہ کے جنگ جو مردوں کو تہ تیغ کر دیا جائے اور ان کے اموال و املاک مسلمانوں میں تقسیم کر دیے جائیں۔ ان کی عورتوں اور بچوں کو قید کر لیا جائے۔

نبی کریم ﷺ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کا حکم سنا تو ارشاد فرمایا: "قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، خدا، رسول اور جملہ مسلمان تمھارے اس فیصلے سے راضی اور متفق ہیں۔ مجھے بھی اس نوعیت کا حکم ملا تھا۔"

بعد ازاں حضور ﷺ مدینے کے بازار میں تشریف لائے اور حکم دیا کہ چند گڑھے کھودے جائیں۔ جب گڑھے کھودے جا چکے تو یہودیوں کو لایا گیا اور ان کے سر قلم کیے گئے اور ان کی لاشیں گڑھوں میں داب دی گئیں۔

بنی قریظہ کو حضرت سعدؓ بن معاذ سے، جو ان کے حلیف تھے، اس قسم کے حکم کی توقع نہ تھی، بلکہ ان کا خیال یہ تھا کہ جس طرح عبداللہ بن ابی نے بنی قینقاع کی حمایت کی تھی اور انھیں قتل سے نجات دلائی تھی، حضرت سعدؓ بھی ان کی حمایت کریں گے۔ بات یہ ہے کہ حضرت سعدؓ نے سوچا کہ اگر عرب فوج بنی قریظہ کی عہد شکنی کے نتیجے میں مدینہ پر چڑھائی کر دیتی تو مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا جاتا اور اس فوج کے سپاہیوں کو مسلمانوں کے اعضاء کی قطع برید میں بھی کوئی پس و پیش نہ ہوتا، اس لیے حضرت سعدؓ نے بنی قریظہ کا وہی حشر کرایا جو بصورت دیگر ان کی شرارت و سازش سے مسلمانوں کا ہوتا۔

یہودیوں کی دیدہ دلیری

یہودیوں نے اپنی موت کا مقابلہ مردانگی سے کیا۔ اس کا ثبوت وہ گفتگو ہے جو حیی بن اخطب نے اپنی موت سے پہلے کی۔ جس وقت اسے گردن زدنی کے لیے لایا گیا تو آنحضرت ﷺ نے اسے دیکھا اور اس سے کہا: "کیا خدا نے تجھے ذلیل و خوار نہیں کیا؟"

ابن اخطب نے جواب دیا: "موت کے پنجے سے کسی کو بھی رہائی نصیب نہیں ہو سکتی۔ میری عمر کی ایک میعاد مقرر ہے۔ اس سے تجاوز میں کیسے کر سکتا ہوں، لیکن پھر بھی مَیں نے آپ ﷺ کے خلاف جو قدم اٹھایا، اس پر مجھے ندامت نہیں ہے۔ پھر اس نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: "حکم الٰہی سے ہراساں نہ ہونا چاہیے۔ بنی اسرائیل پر خدا کے حکم سے مصائب و حوادث کے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔"

حیی بن اخطب بھی اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔ اسے جس وقت خدمت نبوی میں لایا گیا تو ایک جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھا، جسے خود ہی ہر جانب سے ایک ایک انگل پھاڑ رکھا تھا، تاکہ اسے مال غنیمت میں نہ رکھوایا جائے۔ اس کے دونوں ہاتھ گردن کے پیچھے رسی سے یک جا بندھے ہوئے تھے۔

حضرت ثابتؓ بن قیس نے چاہا کہ زبیر بن باطا اور اس کے اہل و عیال کو مسلمانوں کی قید سے آزاد کرائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زبیر نے ثابتؓ پر کچھ احسانات کیے تھے۔ ثابت نے زبیر سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمھیں اور تمھارے اہل و عیال کو میرے لیے ہبہ کر دیا ہے۔ لیکن جب زبیر کو معلوم ہوا کہ اس کی قوم قتل کر دی گئی ہے تو اس نے حضرت ثابتؓ سے کہا: "میری خواہش ہے کہ مجھے بھی ان مقتولین میں شامل کر دیا جائے۔ ان کے بعد زندگی کا کیا لطف۔ مجھے اس وقت تک ایک لمحہ بھی چین نہ آئے گا جب تک کہ میں اپنے دوستوں میں شامل نہ ہو جاؤں۔"

مسلمان کبھی جنگ میں عورتوں اور بچوں پر تلوار نہ اٹھاتے تھے، لیکن اس دن اس عورت کو بھی، جس نے چکی کا پاٹ پھینک کر حضرت خلادؓ بن سوید کو قتل کر دیا تھا، تہ تیغ

کیا گیا۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ فرماتی ہیں کہ مجھے وہ عورت کبھی نہیں بھول سکتی، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اسے تہ تیغ کر دیا جائے گا، لیکن اس کے باوجود وہ ہنس رہی تھی اس کے چہرے پر مسرت وشادمانی کے آثار تھے۔ اس موقع پر چار یہودیوں نے اسلام قبول کیا۔

بنی قریظہ کے اموال کی تقسیم

حضرت عبداللہؓ بن سلام کو مالِ غنیمت جمع کرنے کا حکم دیا گیا۔ مال غنیمت میں اسلحہ، گھوڑے، اونٹ، دیگر مویشی، گھریلو اسباب، کپڑا اور شراب سے بھرے مٹکے شامل تھے۔ شراب ضائع کر دی گئی۔

اسلحہ میں تلواریں ۱۵۰۰، زرہ بکتر ۳۰۰، نیزے ۲۰۰۰ ڈھالیں ۱۵۰۰ تھیں۔ تقسیم کی ترتیب یہ تھی کہ سوار کے دو حصے، گھوڑے کا ایک حصہ اور پیادہ کا ایک حصہ۔ حضرت انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ فتح کے بعد بنی قریظہ کے بہت سے باغات قبضے میں آئے تو آپ ﷺ نے انصار کے عطیات کو انھیں واپس کرنا شروع کیا۔ حضرت انسؓ کے گھر والوں کا عطیہ حضور ﷺ نے اپنی کھلائی حضرت ام ایمن کو عطا فرمایا تھا۔ انھوں نے حضرت انسؓ کی گردن میں کپڑا ڈال کر کہا کہ وہ عطیہ رسول اللہ ﷺ ہرگز واپس نہیں کریں گے۔ وہ تو آپ ﷺ مجھے دے چکے۔ حضور ﷺ نے انھیں راضی کرنے کے لیے اس سے دس گنا بڑا حصہ حضرت ام ایمن کو عطا فرمایا اور اصلی حصہ حضرت انسؓ کے گھر والوں کو واپس کر دیا۔ انصار نے جو کھجور کے درخت حضور ﷺ کو ہبہ کیے تھے یا مہاجرین کو دیئے تھے، ان میں سے بہت سے تو بنونضیر کی فتح کے موقع پر واپس کر دیئے تھے اور باقی جو رہ گئے، اب انصار کو لوٹا دیئے۔

خمس میں ریحانہ بنت عمر بن حنانہ آنحضور ﷺ کے حصے میں آئی تھی۔ اس کا تعلق بنی قریظہ سے تھا۔ آپ ﷺ نے اسے اسلام کی دعوت دی، لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ حضور ﷺ چاہتے تھے کہ اس سے عقد کر لیں۔ اس نے کہا، بہتر یہ ہوگا کہ آپ مجھے کنیز بنا لیں۔ یہ میرے حق میں بھی بہتر ہے اور آپ کے حق میں بھی۔ غالباً ریحانہ نے اپنی قومی عصبیت کی بنا پر ازدواج کے لیے آمادگی ظاہر نہ کی، یا یہ کہ لیجئے کہ اس کے دل میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کی طرف سے کدورت تھی۔ سیرت نگاروں میں اس امر سے متعلق اختلاف ہے کہ آیا ریحانہ آنحضور ﷺ کی دیگر ازواج مطہرات کی طرح پردہ کرتی تھی یا عرب کی ان تمام عورتوں کی طرح جو کھلے منہ پھرتی تھیں، ریحانہ بھی بے پردہ تھی۔ ریحانہ آخر دم تک حضور ﷺ کی کنیز رہی۔ جب حضور ﷺ حجۃ الوداع سے واپس تشریف لائے تو اس کا انتقال ہو گیا۔

غزوہ بنی قریظہ ذی قعدہ میں پیش آیا۔ پچیس روز تک محاصرہ رہا۔ اللہ نے اس غزوہ اور غزوۂ خندق کے متعلق سورۂ احزاب میں بہت سی آیات نازل فرمائیں اور دونوں کی اہم جزئیات پر تبصرہ فرمایا۔

معاشرتی اصلاحات

غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب کے درمیان، دو سال کا یہ زمانہ اگرچہ ایسے ہنگاموں کا زمانہ تھا جن کی بدولت حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کو ایک دن کے لیے بھی امن و اطمینان نصیب نہ ہوا، لیکن اس پوری مدت میں نئے مسلم معاشرے کی تعمیر اور ہر پہلو میں زندگی کی اصلاح کا کام برابر جاری رہا۔ یہی زمانہ تھا، جس میں مسلمانوں کے قوانین نکاح وطلاق قریب قریب مکمل ہو گئے۔ وراثت کا قانون بنا۔ شراب اور جوئے کو حرام کیا گیا۔ اور معیشت و معاشرت کے دوسرے بہت سے پہلوؤں میں نئے ضابطے نافذ کیے گئے۔

اس سلسلے کا ایک اہم مسئلہ جو اصلاح کا تقاضا کر رہا تھا، متبنیٰ (گود لینے یا بیٹا بنانے) کا مسئلہ تھا۔ عرب کے لوگ جس بچے کو متبنیٰ بنا لیتے تھے، وہ بالکل ان کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اسے وراثت ملتی تھی۔ اس سے منہ بولی ماں اور منہ بولی بہنیں وہی فلا معاملہ رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور بھائی سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا اور اس باپ کے مرجانے کے بعد اس کی بیوہ کا نکاح اس طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا، جس طرح سگی بہن اور حقیقی ماں کے ساتھ کسی کا نکاح حرام ہوتا ہے، اور یہی معاملہ اس صورت میں بھی کیا جاتا تھا جب منہ بولا بیٹا مر جائے یا اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ منہ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہو کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم قدم قدم پر نکاح اور طلاق اور وراثت کے ان قوانین سے ٹکراتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ اور سورۂ نسا میں مقرر فرمائے تھے۔ ان کی رو سے جو لوگ حقیقت میں وراثت کے حق دار تھے، یہ رسم ان کا حق مار کر ایک ایسے شخص کو دلواتی تھی، جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ اسلام کی رو سے جن عورتوں اور مردوں کے درمیان رشتہ نکاح حلال تھا، یہ رسم ان کے باہمی نکاح کو حرام کرتی تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلامی قانون جن بداخلاقیات کا سدباب کرنا چاہتا تھا، یہ رسم ان کے پھیلنے میں مددگار تھی کیوں کہ رسم کے طور پر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدس پیدا کر دیا جائے بہرحال منہ بولی ماں، منہ بولی بہن اور منہ بولی بیٹی حقیقی ماں، بہن اور بیٹی کی طرح نہیں ہو سکتی۔ ان مصنوعی رشتوں کے رسمی تقدس پر بھروسا کر کے مردوں اور عورتوں کے درمیان جب حقیقی رشتہ داروں کا سا خلا ملا ہو تو وہ برے نتائج پیدا کیے، بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان وجوہ سے اسلامی نکاح وطلاق، قانون وراثت اور قانون حرمتِ زنا کا یہ تقاضا تھا کہ منہ بولے بیٹے (متبنیٰ) کو حقیقی بیٹے کی طرح سمجھنے کے تخیل کا قطعی استیصال کر دیا جائے۔

لیکن یہ تخیل محض ایک قانونی حکم کے طور پر اتنی سی بات کہ دینے سے ختم نہیں ہو سکتا تھا کہ ''منہ بولا رشتہ کوئی حقیقی رشتہ نہیں ہے۔'' صدیوں کے جمے ہوئے تعصبات اور اوہام محض اقوال سے نہیں بدل جاتے۔ حکماً لوگ اس بات کو مان بھی لیتے کہ یہ رشتے حقیقی رشتے نہیں ہیں، پھر بھی منہ بولی ماں اور منہ بولے بیٹے کے درمیان منہ بولے بھائی اور بہن کے درمیان، منہ بولے باپ اور بیٹی کے درمیان، منہ بولے خسر اور بہو کے درمیان نکاح کو لوگ مکروہ ہی سمجھتے رہتے۔ نیز ان کے درمیان خلا ملا بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ جاتا۔ اس لیے ناگزیر تھا کہ یہ رسم عملاً توڑی جائے اور خود رسول اکرم ﷺ بہ نفس نفیس اسے توڑیں۔ کیوں کہ جو کام حضور ﷺ نے خود کیا ہو، اس

کے حکم سے کیا ہو، اس کے متعلق کسی مسلمان کے ذہن میں کراہت کا تصور باقی نہ رہ جاتا تھا۔ اسی بنا پر جنگ احزاب سے کچھ پہلے حضور ﷺ کو اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا گیا کہ آپ اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارثہ کی مطلقہ بیوی زینبؓ بنت جحش سے خود نکاح کرلیں اور اس حکم کی تعمیل آپ نے بنی قریظہ کے محاصرے کے زمانے میں فرمائی۔ غالباً تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ عدت ختم ہونے کا انتظار تھا اور اس اثناء میں غزوہ احزاب اور غزوہ بنی قریظہ کی جنگی مصروفیات پیش آگئی تھیں۔

حضرت زینبؓ کا نکاح اور مخالفین کا پروپیگنڈا

ذی قعدہ پانچ ہجری میں حضرت زینبؓ سے نکاح ہوتے ہی حضور ﷺ کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک طوفان یک لخت اٹھ کھڑا ہوا۔ مشرکین اور منافقین اور یہود سب آپ ﷺ کی پے در پے کامیابیوں سے جلے بیٹھے تھے۔ احد کے بعد احزاب اور بنی قریظہ تک دو سال کی مدت میں جس طرح وہ زک پر زک اٹھاتے چلے گئے تھے، اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں آگ لگ رہی تھی۔ وہ اس بات سے بھی مایوس ہوچکے تھے کہ اب وہ کھلے میدان میں لڑ کر کبھی آپ ﷺ کو زیر کرسکیں گے۔ اس لیے انھوں نے اس نکاح کے معاملے کو اپنے لیے ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ اب ہم حضرت محمد ﷺ کی اس اخلاقی برتری کو ختم کرسکیں گے جو ان کی طاقت اور ان کی کامیابیوں کا اصل راز ہے۔ چناں چہ یہ افسانے تراشے گئے کہ محمد ﷺ بہو کو دیکھ کر عاشق ہوگئے تھے (معاذ اللہ)۔ بیٹے کو اس تعلق کا علم ہوگیا اس نے بیوی کو طلاق دے دی، اور باپ نے اس کے بعد بہو سے بیاہ رچالیا۔ حالانکہ یہ بات صریحاً لغو تھی۔
حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر آپ ﷺ کے سامنے گزری تھی۔ کسی وقت انھیں دیکھ کر عاشق ہوجانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آپ ﷺ نے خود اصرار کرکے حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح کرایا تھا۔ ان کا سارا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اتنے اونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے۔ خود حضرت زینبؓ بھی اس رشتے سے ناخوش تھیں، مگر حضور ﷺ کے حکم سے سب مجبور ہوگئے اور حضرت زیدؓ کے ساتھ ان کی شادی کرکے عرب میں اس امر کی پہلی مثال پیش کردی گئی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اٹھا کر شرفائے قریش کے برابر لے آیا ہے۔ اگر فی الواقع حضور ﷺ کا کوئی میلان حضرت زینبؓ کی جانب ہوتا تو زیدؓ بن حارثہ سے ان کا نکاح کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ آپ ﷺ خود ان سے نکاح کرسکتے تھے، لیکن بے حیا مخالفین نے ان سارے حقائق کے موجود ہوتے ہوئے، یہ عشق کے افسانے تصنیف کیے۔ خوب نمک مرچ لگا لگا کر ان کی تشہیر کی اور اس پروپیگنڈے کو ایسے موثر طریقے سے چلایا کہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ان کی گھڑی ہوئی روایات پھیل گئیں۔

حضور ﷺ کی نجی زندگی کے معاملات

اس زمانے میں دو مسئلے اور بھی توجہ طلب تھے۔ اگرچہ بظاہر ان کا تعلق نبی کریم ﷺ کی خانگی زندگی سے تھا، مگر جو ذات اپنی جان خدا کے دین کو پروان چڑھانے کے لیے کھپا رہی تھی اور ہمہ تن اس کار عظیم میں منہمک تھی، اس کے لیے خانگی زندگی کا سکون فراہم کرنا اور اسے پریشانیوں سے بچانا، اور اسے لوگوں کے شکوک وشبہات سے محفوظ رکھنا بھی خود دین ہی کے مفاد کے لیے ضروری تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر ان دونوں مسئلوں کو بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔
پہلا مسئلہ یہ تھا کہ حضور ﷺ اس وقت مالی حیثیت سے انتہائی تنگ حال تھے۔ مدینہ میں ابتدائی چار سال تک تو آپ ﷺ کا کوئی ذریعہ آمدنی تھا ہی نہیں۔ چار ہجری میں بنی نضیر کی جلاوطنی کے بعد ان کی متروکہ زمینوں کا ایک حصہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ ﷺ کی ضروریات کے لیے مختص کردیا گیا، مگر وہ آپ ﷺ کے کنبے کے لیے کافی نہ تھا۔ ادھر منصب نبوت کے فرائض اتنے بھاری تھے کہ وہ آپ ﷺ کے جسم اور دل ودماغ کی ساری طاقتیں اور آپ کے اوقات کا ایک ایک لمحہ صرف کیے ہوئے تھے، اور آپ ﷺ اپنی معاش کے لیے ذرہ برابر بھی کوئی فکر یا کوشش نہ کر سکتے تھے۔ ان حالات میں جب آپ ﷺ کی ازواج مطہرات خرچ کی تنگی کے باعث آپ کے سکونِ طبع میں خلل انداز ہوتی تھیں تو اس سے آپ ﷺ کے ذہن پر دہرا بار پڑ جاتا تھا۔
دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کرنے سے پہلے آپ ﷺ کی چار بیویاں موجود تھیں۔ حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت ام سلمہؓ۔ ام المومنین حضرت زینبؓ آپ کی پانچویں بیوی تھیں۔ اس پر مخالفین نے یہ اعتراض اٹھایا، اور مسلمانوں کے دلوں میں بھی اس سے شبہات ابھرنے لگے کہ دوسروں کے لیے تو بیک وقت چار سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ٹھہرا دیا گیا ہے، مگر خود نبی کریم ﷺ نے یہ پانچویں بیوی کیسے کرلی۔
ان تمام مسائل ومباحث کا بیان سورۂ احزاب میں تفصیل سے درج ہے۔ پہلے رکوع کو پڑھتے وقت صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کے وقت حضرت زیدؓ بن حارثہؓ حضرت زینبؓ کو طلاق دے چکے تھے۔ حضور ﷺ اس ضرورت کو محسوس فرما رہے تھے کہ متبنیٰ کے بارے میں جاہلیت کے تصورات اور اوہام رسوم کو مٹایا جائے اور آپ ﷺ کو یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ لوگ منہ بولے رشتوں کے معاملے میں محض جذباتی بنیادوں پر جس قسم کے نازک اور گہرے تصورات رکھتے ہیں، وہ اس وقت تک ہرگز نہ مٹ سکیں گے، جب تک آپ خود آگے بڑھ کر اس رسم کو نہ توڑ دیں، لیکن اس کے ساتھ ہی آپ ﷺ اس بنا پر سخت فکر مند تھے۔ اور قدم بڑھاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے کہ اگر اس موقع پر آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی سے نکاح کیا تو اسلام کے خلاف ہنگامہ اٹھانے کے لیے منافقین، مشرکین اور یہود کو، جو پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں، ایک زبردست شوشہ ہاتھ آجائے گا۔ آیت 5 میں واضح حکم ہوا:

﴿ادْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ هُوَ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ فَإِنْ لَمْ تَعْلَمُوا آبَاءَهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ وَمَوَالِيكُمْ﴾ (الاحزاب: 5)

"منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ

منصفانہ بات ہے۔ اور اگر تمھیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں، تو وہ تمھارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔''

جیسا کہ پہلے بیان ہوا، اس زمانے میں حضور ﷺ کی مالی حیثیت اچھی نہ تھی حضور ﷺ کی ازواج اس تنگی اور عسرت کے زمانے میں بے صبر ہو رہی تھیں۔ اس پر آیت 28 اور 29 میں حکم آیا:

﴿اِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا وَ زِيۡنَتَهَا فَتَعَالَيۡنَ اُمَتِّعۡكُنَّ وَ اُسَرِّحۡكُنَّ سَرَاحًا جَمِيۡلًا ○ وَ اِنۡ كُنۡتُنَّ تُرِدۡنَ اللّٰهَ وَ رَسُوۡلَهٗ وَ الدَّارَ الۡاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلۡمُحۡسِنٰتِ مِنۡكُنَّ اَجۡرًا عَظِيۡمًا ○﴾

(الاحزاب: 28 تا 29)

''اے نبی ﷺ، اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور دارِ آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر رکھا ہے۔''

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ آپ ﷺ کی ازواج آپ کے گرد بیٹھی ہیں اور آپ ﷺ خاموش ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو خطاب کر کے فرمایا: ''یہ میرے گرد بیٹھی ہیں جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو۔ یہ مجھ سے خرچ کے لیے روپیہ مانگ رہی ہیں۔'' اس پر دونوں صاحبوں نے اپنی اپنی بیٹیوں کو ڈانٹا اور ان سے کہا کہ تم رسول اللہ ﷺ کو تنگ کرتی ہو اور وہ چیز مانگتی ہو جو آپ ﷺ کے پاس نہیں ہے۔''

اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ اس وقت کیسی سخت مالی مشکلات میں مبتلا تھے اور کفر و اسلام کی انتہائی شدید کش مکش کے زمانے میں خرچ کے لیے ازواجِ مطہرات کے تقاضے مزاجِ مبارک پر کیا اثر ڈال رہے تھے۔

حضرت زینبؓ بنت جحش سے نکاح کے سلسلے میں مخالفین کے تمام اعتراضات کا جواب آیت 36 سے 48 تک کے مضامین میں دیا گیا ہے۔ ان تمام شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ مسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ حضور ﷺ کا مرتبہ و مقام کیا ہے اور حضور ﷺ کو کفار و منافقین کے جھوٹے پروپیگنڈے پر صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ منافقین نے حضرت زینبؓ سے نکاح پر 'پانچویں بیوی' کر لینے پر جو شدید اعتراض کیے گئے تھے، ان کا جواب سورۂ احزاب کی آیت 50 تا 52 میں دیا گیا اور یہ بات واضح کر دی گئی کہ حضور ﷺ ان متعدد پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں جو ازدواجی زندگی کے معاملے میں عام مسلمانوں پر عائد کی گئی ہیں۔ معترضین کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے کہ اے نبی ﷺ! تمھاری یہ پانچوں بیویاں، جنھیں مہر دے کر تم اپنے نکاح میں لائے ہو، ہم نے تمھارے لیے حلال کی ہیں۔ اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کے لیے چار کی قید لگانے والے بھی ہم ہی ہیں اور اپنے نبی کو اس قید سے مستثنیٰ کرنے والے بھی ہم خود ہیں۔ اگر وہ قید لگانے کے مجاز ہم تھے تو اس استثنا کے مجاز بھی ہم ہیں۔

آیتِ حجاب (پردہ)

جس روز حضرت زینبؓ بنت جحش سے شادی کا ولیمہ ہوا، اسی روز سے حجاب کا حکم ہوا۔ سورۂ احزاب کی متعلقہ آیت 53 کو اسی لیے آیت حجاب کہا جاتا ہے کہ اس میں خواتین کے لیے پردے کا حکم آیا۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اس آیت کے نزول سے پہلے متعدد بار حضور ﷺ سے عرض کر چکے تھے کہ یارسول اللہ، آپ کے ہاں بھلے اور بُرے سب ہی قسم کے لوگ آتے ہیں۔ کاش آپ اپنی ازواجِ مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دے دیتے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ازواجِ مطہرات سے کہا: ''اگر آپ کے حق میں میری بات مانی جائے تو کبھی میری نگاہیں آپ کو نہ دیکھیں۔'' لیکن چوں کہ قانون سازی میں خود مختار نہ تھے، اس لیے آپ ﷺ ارشادِ الٰہی کے منتظر رہے۔ آخر کار یہ حکم آ گیا:

''اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، نبی ﷺ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمھیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔ مگر جب کھانا کھا لو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمھاری یہ حرکتیں نبی ﷺ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبی ﷺ کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔'' (سورۂ احزاب۔ آیت 53)

اس حکم کے بعد ازواجِ مطہرات کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکا دیے گئے، اور چوں کہ حضور ﷺ کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا، اس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔

اس کے بعد امہات المومنین کے آبا اور عزیزوں نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ ہمارے بارے میں حجاب کے کیا احکام ہیں؟ کیا ہم لوگ بھی پردے کی اوٹ سے بات کر سکیں گے۔ اس پر سورۂ نور کی آیت 30، 31 نازل ہوئیں:

''اور اے نبی ﷺ! مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں، بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔ وہ اپنا بناؤ سنگھار ظاہر نہ کریں، مگر ان لوگوں کے سامنے شوہر، باپ، شوہروں کے باپ، اپنے بیٹے، شوہروں کے بیٹے، بھائی، بھائیوں کے بیٹوں، بہنوں کے بیٹے، اپنے میل جول کی عورتیں، اپنے مملوک، وہ زیردست مرد جو کسی اور قسم کی غرض نہ رکھتے ہوں، اور وہ بچے جو عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے ابھی واقف نہ ہوئے ہوں۔ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انھوں نے چھپا رکھی ہو اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔''

الغرض! حکم ہوا کہ مخصوص رشتہ داروں کے سوا مسلم خواتین کسی کے سامنے نہ ہوں اور پردے کے بغیر کسی سے بات نہ کریں۔ اپنی زینت چھپائے رکھیں۔ اپنی عفت

عصمت کی حفاظت کریں اور نظریں نیچی رکھیں۔ پاؤں جھٹک کر نہ چلیں اور اپنے سینوں پر دوپٹے کا آنچل ڈال لیا کریں، مگر سیرت نگاروں کی بعض تصریحات سے پتا چلتا ہے کہ مشرکین مسلم خواتین کو بعض وقت راستے میں چھیڑا کرتے تھے، اور جب پوچھا جاتا تو عدم شناخت کا بہانہ بنا دیتے۔ چناں چہ اس قباحت کو روکنے کے لیے سورۂ احزاب کی آیت 59 میں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا:

''اے نبی، اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہل ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے، تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی جائیں۔''

''پہچان لی جائیں'' سے مراد یہ ہے کہ انھیں اس سادہ اور حیادار لباس میں دیکھ کر ہر دیکھنے والا جان لے کہ شریف، پاکدامن اور باعصمت عورتیں ہیں۔'' نہ ستائی جائیں'' سے مراد یہ ہے کہ انھیں نہ چھیڑا جائے۔ ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

6 ہجری--23 مئی 727ء تا 10 مئی 628ء

غزوہ بنو قریظہ کے بعد مسلمانوں کو مزید کئی عسکری کارروائیاں انجام دینی پڑیں۔ ان میں زیادہ اہم اور قابل ذکر یہ ہیں:

ابو رافع کا قتل

ابو رافع سلام بن ابی الحقیق حجاز کا تاجر اور خیبر کے یہود کا رئیس تھا اور ان بڑے مجرمین میں سے ایک تھا، جنھوں نے اہل مدینہ کے خلاف جماعتوں کو ورغلانے اور لانے کا کام کیا تھا۔ چناں چہ جب مسلمان غزوۂ خندق اور غزوۂ بنی قریظہ سے فارغ ہو چکے تو خزرج کے پانچ آدمی اس شخص کو قتل کرنے کے لیے تیار ہوئے، تاکہ جو شرف قبیلہ اوس نے کعب بن اشرف کو قتل کر کے حاصل کیا تھا، ویسا ہی شرف خزرج کو بھی حاصل ہو سکے۔

پھر یہ لوگ خیبر کے اطراف میں واقع اس قلعے کے پاس پہنچے۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ ان کے قائد عبداللہ بن عتیکؓ نے کہا: ''تم لوگ یہیں ٹھہرو۔ میں جاتا ہوں اور دروازوں کے پہرے دار کے ساتھ کوئی لطیف حیلہ اختیار کرتا ہوں۔ ممکن ہے، اندر داخل ہو جاؤں۔''

اس کے بعد وہ تشریف لے گئے اور دروازے کے قریب جا کر، سر پر کپڑا ڈال کر یوں بیٹھ گئے، گویا رفع حاجت کر رہے ہوں۔ پہرے دار نے زور سے پکار کر کہا: ''او اللہ کے بندے! اگر اندر آنا ہے تو آجا۔ ورنہ میں دروازہ بند کرنے جا رہا ہوں۔''

عبداللہؓ بن عتیک اندر داخل ہو گئے۔ جب لوگ سو گئے تو انھوں نے کنجیاں لیں اور دروازہ کھول دیا، تاکہ بوقت ضرورت بھاگنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد انھوں نے ابو رافع کے حجرے کا رخ کیا۔ ادھر جاتے ہوئے جو دروازے کھولتے، اسے اندر سے بند کر لیتے تاکہ لوگوں کو اگر ان کا پتا لگ بھی جائے تو لوگوں کے پہنچنے سے پہلے وہ ابو رافع کو ٹھکانے لگا دیں۔ جب اس کے حجرے میں پہنچے تو وہ اپنے بال بچوں کے درمیان تاریکی میں سویا ہوا تھا اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ لہٰذا انھوں نے آواز دی ''ابو رافع!''

اس نے کہا: ''کون ہے؟''

انھوں نے آواز کا رخ کیا اور تلوار کی ایک ضرب لگائی، لیکن چوں کہ ہڑبڑائے ہوئے تھے، اس لیے کاری ضرب نہ لگی اور اس نے زور کی چیخ ماری۔ وہ جھٹ باہر نکل گئے اور آواز بدل کر آئے۔ گویا مدد کرنے آئے ہیں۔ کہا: ابو رافع! یہ کیسی آواز تھی؟''

اس نے کہا: ''تیری ماں برباد ہو۔ ابھی ایک آدمی نے مجھے تلوار ماری ہے۔''

اب انھوں نے دوبارہ تلوار کی ایسی زوردار ضرب لگائی کہ وہ خون میں لت پت ہو گیا، لیکن اب بھی قتل نہ ہو سکا، اس لیے انھوں نے اس کے پیٹ پر تلوار رکھ کر دبا دی اور وہ پیٹھ تک چلی گئی۔ اس کے بعد انھوں نے ایک ایک دروازہ کھولا اور باہر نکلے۔ چاندنی رات تھی اور ان کی نگاہ کم زور۔ انھوں نے سمجھا، زمین تک پہنچ چکے ہیں۔ پاؤں بڑھایا تو سیڑھی سے نیچے آ رہے اور پاؤں میں چوٹ آ گئی۔ انھوں نے پگڑی سے باندھا اور دروازے کے پاس چھپ رہے۔ جب مرغ نے آواز دی تو ایک آدمی نے قلعے کی دیوار پر کھڑے ہو کر اعلان کیا: ''میں حجاز کے تاجر ابو رافع کی موت کی اطلاع دیتا ہوں۔'' عبداللہ بن عتیک اپنے ساتھیوں کے پاس آئے اور سب نے مدینے کی راہ لی۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچ کر واقعہ بیان کیا۔ آپ ﷺ نے پاؤں پر دست مبارک پھیرا اور انھیں ایسے لگا کہ گویا کبھی کوئی تکلیف ہوئی ہی نہیں۔

سریہ محمد بن مسلمہؓ انصاری

گیارہ محرم 6 ہجری (یکم جون 667ء) کو حضور ﷺ نے قبیلہ بنی بکر کی ایک شاخ قرطا کی سرکوبی کے لیے حضرت محمد بن مسلمہؓ انصاری کی قیادت میں تیس سواروں پر مشتمل ایک دستہ روانہ فرمایا۔ مسلمانوں نے وہاں پہنچتے ہی اہل قرطا پر چھاپہ مارا اور دس آدمی قتل کیے۔ باقی بھاگ گئے۔ اس سریے میں ڈیڑھ سو اونٹ اور تین ہزار بکریاں غنیمت میں ہاتھ آئیں، جنھیں لے کر مسلمان انیس دن کے بعد یعنی 29 محرم الحرام کو مدینہ پہنچے۔ حضور ﷺ ے مال غنیمت میں سے خمس نکال کر باقی مجاہدین پر تقسیم فرما دیا۔

ثمامہؓ بن اثال کا قبول اسلام

ثمامہ بن اثال نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے دین اسلام کو سخت ناپسند کرتے تھے وہ یمامہ کے علاقے کے سردار تھے۔ چناں چہ محرم میں مسیلمہ کذاب کے حکم سے بھیس بدل کر نبی کریم ﷺ کو قتل کرنے نکلے۔ جب محمد بن مسلمہؓ قرطا کی سرکوبی سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں ثمامہ کو پا لیا۔ چناں چہ انھیں گرفتار کر کے مدینہ لے آئے اور مسجد نبوی ﷺ کے ایک ستون سے باندھ دیا۔

یہ شخص تین دن تک مسجد نبوی ﷺ میں قید رہے۔ اس دوران میں حضور ﷺ نے ان کی بہت خاطر مدارت کی اور صبح و شام اپنی خاص اونٹنی کا دودھ ان کے لیے بھیجتے رہے۔ روزانہ اس سے یہ بھی دریافت کرتے ''تمھاری کیا رائے ہے؟''

ثمامہ کہتے: ''اگر آپ ﷺ مجھے قتل کریں گے تو ایک معزز انسان کو قتل کریں

گے، اور اگر احسان کریں گے تو ایک سپاس گزار شخص پر احسان کریں گے، اور اگر میری رہائی کے عوض رقم طلب کریں گے تو مہیا کر دی جائے گی۔''

تیسرے دن حضور ﷺ نے فرمایا کہ ثمامہ کو آزاد کر دو۔ چناں چہ صحابہ کرامؓ نے اسی وقت انھیں رہا کر دیا۔ اب ثمامہ کا جسم آزاد تھا، لیکن دل حضور ﷺ کی محبت میں یوں اسیر ہو چکا تھا کہ انھوں نے رہائی کے بعد مسجد سے باہر جا کر غسل کیا اور واپس آ کر بغیر کسی تمہید کے کلمہ شہادت پڑھا۔ آنحضور ﷺ حضرت ثمامہؓ کی صداقت اور کایا پلٹ سے بہت مسرور ہوئے اور انھیں دنیا و آخرت کی بھلائی کا مژدہ سنایا۔

حضرت ثمامہؓ نے عمرہ کے لیے جانے کی اجازت چاہی۔ حضور ﷺ نے بخوشی اجازت دے دی۔ جب وہ "لبیك اللھم لبیك" پڑھتے ہوئے مکہ میں داخل ہوئے تو اہل مکہ نے پوچھا: ''کیا تم بے دین ہو گئے ہو کہ اللہ کو لاشریک کہہ رہے ہو۔

انھوں نے کہا: ''نہیں، بے دین نہیں ہوا، بلکہ دین دار ہو گیا ہوں، یاد رکھو، آیندہ تمھیں گندم کا ایک دانہ بھی نہیں ملے گا، جب تک رسول ﷺ حکم نہیں دیں گے۔''

اہل مکہ کے لیے جو غلہ آتا تھا، وہ یمامہ سے گزر کر آتا تھا۔ حضرت ثمامہؓ نے واپس جا کر حسب وعدہ غلہ بند کر دیا اور اہل مکہ بھوک سے بلبلا اٹھے۔ چناں چہ ابوسفیان مدینہ آیا اور حضور ﷺ سے کہا: ''کیا تم اپنے آپ کو رحمت للعالمین نہیں کہتے۔''

''کہتا ہوں'' حضور نے فرمایا:

''مگر ہمارے ساتھ آپ کا سلوک مختلف ہے'' ابوسفیان بولا: ''تم نے ہمارے بڑوں کو تلوار سے مار ڈالا اور اب بچوں کو فاقوں سے مار رہے ہو۔ میں تمھیں اللہ کا اور رشتہ داری کا واسطہ دیتا ہوں کہ ہمارے حال پر رحم کرو۔''

حضور ﷺ کو دشمن اسلام ابوسفیان کی حالت زار پر رحم آ گیا۔ آپ ﷺ نے حضرت ثمامہؓ کو لکھ بھیجا کہ اہل مکہ کا غلہ واگزار کر دیا جائے۔ اس طرح آپ ﷺ کے بدترین دشمن بھی آپ ﷺ کے رحمت للعالمین ہونے سے فیض یاب ہوئے۔

غزوہ بنی لحیان

بنی لحیان وہی ہیں جنھوں نے مقام رجیع میں دس صحابہ کرامؓ کو دھوکے سے گھیر کر آٹھ کو قتل کر دیا تھا اور دو کو اہل مکہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا جہاں وہ بے دردی سے قتل کر دیے گئے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان شہدا کے قصاص کی نیت سے ربیع الاول میں دو سو صحابہؓ کی معیت میں ان کا رخ کیا۔ مدینے میں حضرت ابن ام مکتوم کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ جنگی مصلحت سے آپ ﷺ نے کسی پر یہ راز منکشف نہ ہونے دیا کہ رخت سفر کس مقام کے لیے باندھا جا رہا ہے۔ بظاہر آپ ﷺ نے اپنے جاں نثاروں سمیت شام کا قصد کیا اور جب کچھ منزلیں طے کرنے کے بعد آپ ﷺ کو یہ اطمینان ہو گیا کہ کفار قریش ہمارے عزائم سے بے خبر ہیں تو آپ ﷺ نے لشکر اسلام کا رخ مکہ کی جانب پھیر دیا۔ یہ لشکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا بنی لحیان کی وادی میں جا پہنچا۔ عجیب بات یہ ہے کہ لشکرِ اسلام نے جس مقام پر منزل کا رخ بدلا تھا، بنی لحیان کے کسی فرد نے تاڑ لیا اور پہلے ہی اپنے قبیلے کو پیش آمدہ خطرے سے خبردار کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں بنی لحیان اپنے مواشی اور ضروری سامان خورد و نوش لے کر پہاڑ کے دامن میں روپوش ہو گئے تھے۔ لشکر اسلام وہاں پہنچا تو میدان صاف پایا۔ رسول اللہ نے ان مفرورین کے تعاقب میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مع لشکر عسفان تک جانے کا حکم دیا۔ اس دستے کو بھی بنولحیان کا سراغ نہ ملا۔ آخر چودہ دن باہر گزار کر مدینہ واپس آ گئے۔ موسم گرما کی شدت پورے زوروں پر تھی۔ لشکر اسلام جب مدینہ کی حدود میں داخل ہوا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''ہم اپنے رب کی حمد و ثنا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں اپنے وطن کو مراجعت کی توفیق دی۔ زحمت سفر، آزار بازگشت اور مال و اہل و عیال کے ناخوش نظارے سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں'' یہ غزوہ یکم ربیع الاول کو پیش آیا۔

غزوہ ذی قرد یا غابہ

یہ غزوہ ربیع الثانی، چھٹے ہجری میں پیش آیا۔ اسے غزوہ غابہ بھی کہا جاتا ہے۔ غابہ کے اطراف سرسبز چراگاہ تھی جو کہ کوہ سلع کے قریب واقع تھی۔ اس میں آنحضرت کی بیس اونٹنیاں، (جو کہ گابھن اور دودھ دینے والی تھیں) رکھی گئیں۔ حضرت ابوذرؓ کے صاحب زادے ذرؓ اس کے نگران تھے۔ قبیلہ غطفان کا عیینہ بن فزاری چالیس سواروں کے ساتھ حملہ آور ہوا اور انھیں قتل کر کے اونٹنیاں ہانک کر لے گیا۔ ساتھ ہی وہ حضرت ذرؓ کی بیوی لیلیٰ کو بھی اٹھا کر لے گئے۔ اتفاق سے حضرت سلمہؓ بن اکوع اور ایک غلام رباحؓ نے اسے دیکھ لیا۔ حضرت ابن اکوعؓ نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر ''یاصباحا'' کا نعرہ تین بار لگایا جو خطرے کی گھنٹی تھی۔ رباحؓ کو اطلاع دینے مدینہ بھیجا اور خود تن تنہا ان کا پیچھا کیا۔ وہ خود بڑے اچھے تیر انداز تھے۔ انھوں نے دوڑ کر حملہ آوروں کو چشمے پر جا لیا۔ وہ تیر چلاتے اور کہتے جاتے تھے:

''میں اکوع کا بیٹا ہوں۔ آج کے دن معلوم ہو جائے گا کہ کس نے شریف ماں کا دودھ پیا ہے اور کون کمینہ ہے۔''

یہاں تک کہ حملہ آوروں سے تمام اونٹنیاں چھڑا لیں، اور انھیں مدینہ کی طرف ہانک دیا۔ خود تعاقب میں آگے بڑھتے رہے۔ دشمن چادر اور نیزے گراتے گئے، تاکہ حضرت اکوعؓ کو اس میں مشغول کر دیں۔ حضرت اکوعؓ چادر پر نیزے رکھ دیتے، تاکہ اڑے نہیں اور پھر تعاقب کرتے۔ اس طرح انھوں نے تیس نیزے اور تیس یمنی چادریں حاصل کیں۔ حضرت ذرؓ کی بیوی لیلی کو بھی آزاد کرا لیا۔

نبی کریم ﷺ نے ان کی مدد کے لیے چند سواروں کو فوراً روانہ فرما دیا، جن میں محمد بن مسلمہؓ، اخرمؓ اسدی، ابوقتادہؓ، مقدادؓ بن اسود کندی تھے۔ پھر خود سات سو مجاہدوں کے ساتھ اس مہم پر نکلے۔ یہاں تک کہ ذی قرد کے مقام پر آ پہنچے۔ عیینہ بن حصن فزاری اپنے دستے کے ہم راہ آن پہنچا۔ لڑائی میں حضرت خرمؓ اسدی ایک کافر عبدالرحمٰن بن حصین کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ حضرت ابوقتادہؓ نے اسے جہنم واصل کیا۔ دشمن کے دو آدمی مارے گئے۔ اس اثنا میں آنحضور ﷺ مع مجاہدین آتے دکھائی دیے۔ دشمن نے ذی قرد کے چشمے پر جمع ہوا پانی پینا چاہا، لیکن مسلم شہسواروں نے انھیں

دم لینے نہ دیا۔ اُن کے دو گھوڑے بھی ہتھیا لیے۔ غرض وہ ایسے بھاگے کہ بنی غطفان کے ٹھکانوں پر جا کر دم لیا۔ مسلم شہسوار لوٹ کر ذی قرد کے چشمے پر حضور اکرم ﷺ سے آ ملے اور حملے کی اجازت طلب کی۔ حضور ﷺ نے انھیں اس ارادے سے باز رکھا اور ارشاد فرمایا کہ تعاقب سے اب کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ بنی غطفان کی بستی میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ غرض مسلمان مدینہ واپس چلے آئے اور ان کے ہم راہ سرور دو عالم ﷺ بھی۔ مقتول گلہ بان کی اہلیہ جس اونٹ پر سوار ہو کر مدینہ آئی، اس نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اس اونٹ نے مجھے صحیح سالم مدینہ پہنچا دیا تو میں اللہ کی راہ میں اسے قربان کردوں گی۔ اس منت کی خبر حضور ﷺ کو ہوئی تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تجھے اس اونٹ کے ذریعے دشمن کے پنجوں سے چھڑایا ہے اور تو اسے قربان کرنے پر آمادہ ہوگئی ہے۔ ایسی نذر کوئی حقیقت نہیں رکھتی، جس سے اللہ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو۔ اس شے کی نذر بھی قبول نہیں کی جا سکتی جو اپنی ملکیت میں نہ ہو۔''

سریہ عکاشہؓ بن محصن

اسی ماہ ربیع الثانی میں آنحضور ﷺ نے حضرت عکاشہؓ بن محصن کو چالیس آدمیوں کے ساتھ بنی اسد کے مقابلے کے لیے غمر بھیجا۔ ان کے ہم راہ حضرت ثابتؓ بن ارقم اور حضرت سباع بن وہبؓ بھی تھے۔ جب مسلمان غمر کے قریب پہنچے تو بنی اسد مکانوں کو خالی چھوڑ کر پہاڑوں میں چھپ گئے۔ جب وہاں کوئی نہ ملا تو امیر لشکر حضرت عکاشہؓ بن محصن ان کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ صرف ایک شخص ہاتھ لگا جس نے بنی اَسد کے مویشیوں اور چراگاہ کا پتا دیا۔ وہاں پہنچ کر مجاہدین نے چھاپہ مارا۔ دو سو اونٹ مالِ غنیمت میں ملے، جنھیں ہانک کر مدینہ لے آئے۔

سریہ ذی القصہ

انھی دنوں آنحضرت ﷺ نے حضرت محمد بن مسلمہؓ کی نگرانی میں دس آدمیوں کا ایک دستہ ذی القصہ کی جانب روانہ کیا۔ یہ مقام بنو ثعلبہ کے دیار میں واقع تھا۔ مسلمان رات کے وقت اس مقام پر پہنچے۔ غنیم کو جب مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ہوئی تو پہاڑوں میں چھپ گئے۔ مگر رات کو جب صحابہؓ بے خبر سو رہے تھے، انھوں نے شب خون مارا، اور سب صحابہؓ کو شہید کر دیا۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ بھی شدید زخمی ہوئے اور کفار انھیں مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ ایک مسلمان اتفاق سے ادھر سے گزرا جو آپ ﷺ کو اٹھا کر مدینہ لایا۔ اس سریہ میں نو مسلمان شہید ہوئے اور ایک زخمی ہوا۔ مورخین کے نزدیک بنی ثعلبہ کی تعداد ایک سو کے قریب تھی۔

سریہ بنو ثعلبہ

اسے سریہ ذی القصہ ثانی بھی کہتے ہیں۔ محمد بن مسلمہؓ کے نو رفقا کی شہادت کے بعد ربیع الثانی چھٹے ہجری ہی میں حضور ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو بنی ثعلبہ سے انتقام لینے کے لیے چالیس مجاہدین کی ہم راہی میں ذی القصہ روانہ فرمایا۔ مجاہدین اسلام رات کے اندھیرے میں وہاں پہنچے، اور صبح کے وقت ان پر حملہ کر دیا۔ وہ لوگ حملے کی تاب نہ لا کر پہاڑوں میں چھپ گئے۔ صرف ایک آدمی پکڑا گیا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ البتہ مویشی اور بکریاں پکڑ کر مدینہ لے آئے۔

سریہ جموم

اسی ماہ آنحضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو بنی سلیم کے مقابلے کے لیے جموم کی جانب بھیجا۔ جموم مدینے سے چار کوس کے فاصلے پر بطن نخلہ کے پاس (موجودہ وادیٔ فاطمہ) ایک چشمے کا نام ہے۔ جب حضرت زیدؓ وہاں پہنچے تو قبیلہ مزینہ کی ایک عورت گرفت میں آ گئی۔ اس کا نام حلیمہ تھا۔ اس نے بنی سلیم کے ایک مقام کا پتا بتایا جہاں ان کے جانور رہتے تھے۔ حضرت زیدؓ کو اس مقام سے بہت سے اونٹ، بکریاں اور قیدی ملے۔ ان قیدیوں میں حلیمہ کا شوہر بھی تھا۔ ان سب کو مدینہ لایا گیا۔ آنحضور ﷺ نے حلیمہ اور اس کے شوہر کو آزاد کر دیا۔

سریہ عیص

آنحضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آ رہا ہے جس کی قیادت رسول اللہ ﷺ کے داماد حضرت ابوالعاصؓ کر رہے ہیں۔ اس اطلاع کے ملنے پر آنحضور ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو تقریباً ایک سو ستر سواروں کے ساتھ مقام عیص کی طرف روانہ کیا۔ یہ مقام مدینہ سے چار دن کی مسافت پر ساحل سمندر کے قریب واقع تھا۔ یہاں سے قریش کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔

مسلمانوں نے وہاں پہنچ کر اہل قافلہ کو گرفتار اور ان کے مال و متاع پر قبضہ کر لیا ابوالعاص گرفتار تو نہ ہو سکے۔ لیکن بھاگ کر سیدھے مدینے پہنچے اور حضرت زینبؓ کی پناہ لے کر ان سے کہا کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے کہ کر قافلے کا مال واپس دلا دیں۔ حضرت زینبؓ نے آنحضور کے سامنے یہ بات پیش کی تو آپ ﷺ نے کسی طرح کا دباؤ ڈالے بغیر صحابہؓ کرام سے ارشاد کیا کہ مال واپس کر دیں۔ صحابہؓ کرام نے چھوٹا بڑا، سارا سامان جو کچھ تھا، سب واپس کر دیا۔ ابوالعاصؓ سارا مال لے کر مکہ پہنچے۔ امانتیں مالکوں کے حوالے کیں۔ پھر مسلمان ہو کر مدینہ تشریف لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے والے نکاح کی بنیاد پر حضرت زینبؓ کو ان کے حوالے کر دیا (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب چہارم: اہل بیت)

سریہ طرف

یہ سریہ بھی حضرت زید بن حارثہؓ کی قیادت میں جمادی الثانی میں طرف نامی مقام کی طرف روانہ کیا گیا۔ یہ مقام بنو ثعلبہ کے علاقے میں تھا۔ حضرت زیدؓ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے، لیکن بدوؤں نے خبر پاتے ہی راہِ فرار اختیار کی۔ انھیں خطرہ تھا کہ رسول اللہ تشریف لا رہے ہیں۔ حضرت زیدؓ کو چار اونٹ ہاتھ لگے اور وہ چار روز بعد واپس آئے۔

سریہ وادیٔ القریٰ

یہ سریہ بارہ آدمیوں پر مشتمل تھا اور اس کے کمانڈر بھی حضرت زید بن حارثہؓ ہی

تھے۔ وہ رجب 6 ہجری میں وادیٔ القریٰ کی جانب روانہ ہوئے۔ مقصد دشمن کی نقل و حرکت کا پتا لگانا تھا، مگر وادیٔ القریٰ کے باشندوں نے ان پر حملہ کر کے نو صحابہؓ کو شہید کر دیا اور صرف تین بچ سکے، جن میں ایک خود حضرت زیدؓ بن حارثہؓ بھی تھے۔

غزوہ بنی مصطلق یا غزوہ مریسیع

اس غزوے کی تاریخ انعقاد کے بارے میں مورخین اور سیرت نگاروں کے درمیان اختلاف ہے۔ پورے ایک سال کا فرق ہے۔ بعض اہل سیر شعبان پانچ ہجری اور بعض شعبان چھٹے ہجری قرار دیتے ہیں۔ اس اختلاف وفرق کا عقدہ محترم مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''الرحیق المختوم'' میں ان دلیلوں کے ساتھ حل کیا ہے۔ فرماتے ہیں: اس غزوے سے واپسی میں افک (حضرت عائشہؓ پر جھوٹی تہمت لگائے جانے) کا واقعہ پیش آیا۔ اور معلوم ہے کہ یہ واقعہ حضرت زینبؓ سے نبی ﷺ کی شادی اور مسلمان خواتین کے لیے پردے کا حکم نازل ہو چکنے کے بعد پیش آیا تھا۔ چوں کہ حضرت زینبؓ بنت جحش کی شادی پانچ ہجری کے بالکل اخیر میں یعنی ذی قعدہ یا ذی الحج میں ہوئی تھی، اور اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ غزوہ شعبان ہی کے مہینے میں پیش آیا تھا، اس لیے یہ سن پانچ ہجری کا شعبان نہیں، بلکہ سن چھٹے ہجری ہی کا شعبان ہوسکتا ہے۔

دوسری طرف جو لوگ اس غزوے کا زمانہ شعبان پانچ ہجری بتاتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ حدیثِ افک کے اندر اصحابِ افک کے سلسلے میں حضرت سعدؓ بن معاذ اور سعد بن عبادہؓ کے درمیان سخت کلامی کا ذکر موجود ہے، اور معلوم ہوا ہے کہ سعد بن معاذؓ غزوہ بنو قریظہ کے بعد پانچ ہجری کے اخیر میں انتقال کر گئے تھے، اس لیے واقعۂ افک کے وقت ان کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ، اور یہ غزوہ، سن چھٹے ہجری میں نہیں، بلکہ پانچ ہجری میں پیش آیا۔

اس کا جواب فریق اول نے یہ دیا ہے کہ حدیثِ افک میں حضرت سعدؓ بن معاذ کا ذکر روایت کرنے والے کا وہم ہے، کیوں کہ یہی حدیث حضرت عائشہؓ سے ابن اسحاقؒ نے بہ سند زہری عن عبداللہ بن عتبہ عن عائشہؓ روایت کی ہے تو اس میں سعد بن معاذؓ کے بجائے اسید بن حضیرؓ کا ذکر ہے۔ چناں چہ امام ابو محمد بن حزم فرماتے ہیں کہ بلاشبہ یہی صحیح ہے، اور سعدؓ بن معاذ کا ذکر وہم ہے (زاد المعاد۔ جلد دوم۔ صفحہ 115)

''راقم (مولانا صفی الرحمٰن) عرض پرداز ہے کہ گو فریق اول کا استدلال خاصا وزن رکھتا ہے، اور اسی لیے ابتدا میں ہمیں بھی اسی سے اتفاق تھا، لیکن غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس استدلال کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ نبی ﷺ سے حضرت زینبؓ کی شادی سن پانچ ہجری کے اخیر میں ہوئی تھی، حالانکہ اس پر بعض قرائن کے سوا کوئی ٹھوس شواہد موجود نہیں ہے۔ جب کہ واقعہ افک میں اور اس کے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ (متوفی پانچ ہجری) کی موجودگی متعدد روایات سے ثابت ہے، جنھیں وہم قرار دینا مشکل ہے، اس لیے ایسا کیوں نہیں ہوسکتا کہ حضرت زینبؓ کی شادی پانچ ہجری کے اوائل میں ہوئی ہو اور افک (اور غزوہ بنی مصطلق) شعبان پانچ ہجری میں پیش آیا۔

یہ غزوہ جنگی نقطہ نظر سے کوئی بھاری بھرکم غزوہ نہیں ہے، مگر ارباب سیرت اور مورخین کے نزدیک خصوصیت سے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت کے وجوہ واسباب یہ ہیں:

1: اس غزوے کے بعد مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ آنحضور ﷺ نے نہایت خوب صورتی سے بیچ بچاؤ کرا دیا اور بات بڑھنے نہ پائی۔

2: اہمیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس موقع پر آنحضور ﷺ کا عقد حضرت جویریہؓ بنت حارث سے ہوا۔ اس عقد سے مفید نتائج برآمد ہوئے۔

3: اس غزوے کے بعد ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر خواہ مخواہ کی بہتان تراشی کی گئی، جو واقعہ افک کے نام سے حیات الرسول ﷺ اور تاریخ اسلام میں مشہور ہے۔

مدینہ سے نو منزل پر مکہ کے قریب قدید کے نواحی ساحل پر ایک کنواں یا تالاب تھا جسے مریسیع کہا جاتا تھا۔ یہاں بنو خزاعہ کا ایک شخص آباد تھا۔ اس کا نام خزیمہ بن سعد اور لقب مصطلق تھا۔ اس کے نام پر یہ قبیلہ بنو مصطلق کہلانے لگا۔ یہ قریش کا حلیف تھا۔ اس کے سردار حارث بن ابی ضرار نے از خود یا اپنے حلیف کے اشارے سے مسلمانوں پر حملے کی تیاریاں شروع کیں۔ یہ اطلاع مدینہ پہنچی تو حضور ﷺ نے حضرت بریدہؓ بن حصیب اسلمی کو تصدیق کے لیے روانہ فرمایا۔ انھوں نے قبیلے میں جا کر حارث بن ابی ضرار سے ملاقات اور گفتگو کی اور واپس آ کر رسول اللہ ﷺ کو حالات سے باخبر کیا۔

اس موقع پر حضور ﷺ نے مدینہ میں زیدؓ بن حارثہ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ دوسری روایت کے مطابق حضرت ابوذر غفاریؓ کو یہ شرف حاصل ہوا۔ پھر بنو مصطلق کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئے۔ اسلامی لشکر میں مہاجرین کے علم بردار حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے اور انصار کے حضرت سعدؓ بن عبادہ۔ یہ لشکر مریسیع کے متصل ٹھہرا تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مجاہدین نے دشمنوں کو حصار میں لے لیا۔ اس موقع پر ان لوگوں نے، جو ان میں سے نہ تھے بلکہ ان کی ترغیب سے ان میں شامل ہو گئے تھے، راہِ فرار اختیار کی۔ اس غزوے میں مسلمانوں کے ہاتھوں مخالفین کے دس آدمی آئے۔ ایک مسلمان جن کا نام ہشامؓ بن صبابہ تھا، شہید ہوئے۔ انھیں ایک انصاری نے دشمن کے دھوکے میں تہ تیغ کیا تھا۔ بنی مصطلق نے کچھ دیر تک تو مقابلے میں تیر چلائے، لیکن جب انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ گریز وفرار کی کوئی صورت نہیں تو انھوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ ان کی عورتیں، بچے اور اونٹ اور مویشی اور دوسرا مال اسباب بھی مسلمانوں کے تصرف میں آیا۔

غزوے سے پہلے منافقین کا رویہ

مدینہ میں رسول اللہ کی ہجرت سے پہلے اوس اور خزرج کے قبیلے آپس کی خانہ جنگیوں سے تھک کر ایک شخص کی قیادت وسیادت پر قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اسے اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاج پوشی

رسم ادا کریں، حتیٰ کہ اس کے لیے موتیوں کا تاج بنا بھی لیا گیا تھا۔ یہ قبیلہ خزرج کا رئیس عبداللہ بن ابی بن سلول تھا۔ اس کی بزرگی بالکل متفق علیہ تھی اور اوس و خزرج اس سے پہلے کبھی ایک شخص کی قیادت پر جمع نہیں ہوئے تھے۔

غزوہ بنی مصطلق کے بعد اس شخص نے جو فتنے برپا کیے، ان کی تفصیل میں جانے سے پہلے ضروری معلوم ہے کہ منافقوں کے اس سردار کے طریقۂ واردات پر روشنی ڈالی جائے۔ اس کے لیے یہاں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مقالے سے استفادہ کیا جا رہا ہے جو انھوں نے ''سورۃ منافقون'' کے دیباچے کے طور پر تحریر کیا ہے۔ مولانا صاحب لکھتے ہیں:

''جب عبداللہ کو بادشاہت کا تاج پہنایا جانے والا تھا تو اس صورت حال میں اسلام کا چرچا مدینے پہنچا اور ان دونوں قبیلوں کے بااثر آدمی مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر جب رسول ﷺ کو مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی جا رہی تھی، اس وقت حضرت عباس بن عبادہ بن نضلہؓ انصاری اس دعوت کو صرف اس مصلحت سے موخر کرنا چاہتے تھے کہ عبداللہ بن ابی بھی بیعت اور دعوت میں شریک ہو جائے، تاکہ مدینہ مکمل اتفاق رائے سے اسلام کا مرکز بن سکے۔ لیکن جو وفد بیعت کے لیے حاضر ہوا تھا، اس نے اس مصلحت کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے تمام شرکاء، جن میں دونوں قبیلوں کے 75 آدمی شامل تھے، ہر خطرہ مول لے کر حضور ﷺ کو دعوت دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

اس کے بعد جب حضور مدینے پہنچے تو انصار کے ہر گھرانے میں اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ عبداللہ بن ابی بے بس ہو گیا اور اسے اپنی سرداری بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔ چناں چہ وہ اپنے ان بہت سے حامیوں کے ساتھ، جن میں دونوں قبیلوں کے شیوخ اور سردار شامل تھے، داخل اسلام ہو گیا، حالانکہ دل ان سب کے جل رہے تھے، اور خاص طور پر ابن ابی کو اس بات کا سخت غم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کی بادشاہی چھین لی ہے۔ کئی سال تک اس کا یہ منافقانہ ایمان اور اپنی ریاست چھن جانے کا یہ غم طرح طرح کے رنگ دکھاتا رہا۔ ایک طرف حال یہ تھا کہ ہر جمعہ کو جب رسول اللہ ﷺ خطبہ فرمانے کے لیے بیٹھتے تو عبداللہ بن ابی اٹھ کر کہتا کہ ''حضرات، یہ اللہ کے رسول آپ کے درمیان موجود ہیں جن کی ذات سے اللہ نے آپ کو عزت اور شرف بخشا ہے، لہٰذا آپ ان کی تائید کریں اور جو کچھ یہ فرماتے ہیں اسے غور سے سنیں اور ان کی اطاعت کریں۔'' (ابن ہشام، ج 3، ص111) دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ روز بروز اس کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا چلا جا رہا تھا اور مخلص مسلمانوں پر یہ بات کھلتی چلی جاتی تھی کہ وہ اور اُس کے ساتھی اسلام اور رسول اللہ ﷺ اور گروہِ اہلِ ایمان سے سخت بغض رکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ ابن ابی نے آپ ﷺ کے ساتھ بدتمیزی کی۔ آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ بن عبادہ سے اس کی شکایت فرمائی تو انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ، اس شخص کے ساتھ نرمی برتیے آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کے لیے تاج شاہی تیار کر رہے تھے، اب یہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے۔''

جنگ بدر کے بعد جب یہود بنی قینقاع کی صریح بدعہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسول اللہ ﷺ نے ان پر چڑھائی کی تو یہ شخص ان کی حمایت پر اٹھ کھڑا ہوا اور حضور ﷺ کی زرہ پکڑ کر کہنے لگا کہ ''یہ سات سو مردانِ جنگی، جو ہر دشمن کے مقابلے میں میرا ساتھ دیتے رہے ہیں، آج ایک دن میں آپ انھیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم، میں آپ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا جب تک آپ میرے ان حلیفوں کو معاف نہ کر دیں گے۔''

جنگ احد کے موقع پر اس شخص نے صریح غداری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدان جنگ سے الٹا واپس آ گیا۔ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینے پر چڑھ آئے تھے، اور رسول اللہ ﷺ ان کے مقابلے میں صرف ایک ہزار آدمی لے کر مدافعت کے لیے نکلے تھے۔ ان ایک ہزار میں سے بھی یہ منافق تین سو آدمی توڑ لایا اور حضور ﷺ کو صرف سات سو کی جمعیت کے ساتھ تین ہزار دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد مدینے کے عام مسلمانوں کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شخص قطعی منافق ہے اور اس کے وہ ساتھی بھی پہچان لیے گئے جو منافقت میں اس کے شریک کار تھے۔ اسی بنا پر جنگ اُحد کے بعد جب پہلا جمعہ آیا اور یہ شخص حضور ﷺ کے خطبہ سے پہلے حسب معمول تقریر کرنے کے لیے اٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کر کہا ''بیٹھ جاؤ، تم یہ باتیں کرنے کے اہل نہیں ہو۔'' مدینے میں یہ پہلا موقع تھا کہ علانیہ اس شخص کی تذلیل کی گئی۔ اس پر برہم ہو کر وہ لوگوں کی گردنوں پر سے کودتا پھاندتا مسجد سے نکل گیا۔ مسجد کے دروازے پر بعض انصاریوں نے اس سے کہا ''یہ کیا حرکت کر رہے ہو، واپس چلو اور رسول اللہ ﷺ سے استغفار کی درخواست کرو۔'' اس نے بگڑ کر جواب دیا ''میں ان سے کوئی استغفار نہیں کرانا چاہتا۔''

پھر 4ھ میں غزوہ بنی النضیر پیش آیا اور اس موقع پر اس شخص نے اور اس کے ساتھیوں نے اور بھی زیادہ کھل کر اسلام کے خلاف اعدائے اسلام کی حمایت کی۔ ایک طرف رسول اللہ ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ ان یہودی دشمنوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے، اور دوسری طرف یہ منافقین اندر ہی اندر یہودیوں کو پیغام بھیج رہے تھے کہ ڈٹے رہو، ہم تمھارے ساتھ ہیں، تم سے جنگ کی جائے گی تو ہم تمھاری مدد کریں گے اور تمھیں نکالا جائے گا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے۔ اس خفیہ ساز باز کا راز اللہ تعالیٰ نے خود کھول دیا، جیسا کہ سورۂ حشر کے دوسرے رکوع میں اس کا ذکر موجود ہے۔

لیکن اس کی اور اس کے ساتھیوں کی اتنی پردہ دری ہو جانے کے باوجود جس وجہ سے رسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرما رہے تھے وہ یہ تھی کہ منافقین کا ایک بڑا جتھا اس کے ساتھ تھا۔ اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے بہت سے سردار اس

کے حامی تھے۔ مدینے کی آبادی میں کم از کم ایک تہائی تعداد اس کے ساتھیوں کی موجود تھی، جیسا کہ غزوۂ احد کے موقع پر ظاہر ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ باہر کے دشمنوں سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اندر کے ان دشمنوں سے بھی جنگ مول لے لی جائے۔ اسی بنا پر ان کی منافقت کا حال جانتے ہوئے بھی حضور ﷺ ایک مدت تک ان کے ساتھ ان کے ظاہری دعوائے ایمان کے لحاظ سے معاملہ فرماتے رہے۔ دوسری طرف یہ لوگ بھی نہ اتنی طاقت رکھتے تھے، نہ ہمت کہ علانیہ کافر بن کر اہل ایمان سے لڑ لیتے، یا کسی حملہ آور دشمن کے ساتھ کھلم کھلا میدان میں آ جاتے۔ بظاہر وہ اپنا ایک مضبوط جتھا بنائے ہوئے تھے مگر ان کے اندر وہ کمزوریاں موجود تھیں جن کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ حشر کی آیات 12۔14 میں صاف صاف کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے وہ مسلمان بنے رہنے میں ہی اپنی خیر سمجھتے تھے۔ مسجدوں میں آتے تھے۔ نمازیں پڑھتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دے ڈالتے تھے۔ زبان سے ایمان کے وہ لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے جن کے کرنے کی مخلص مسلمانوں کو کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ان کے پاس اپنی ہر منافقانہ حرکت کے لیے ہزار جھوٹی توجیہیں موجود تھیں جن سے وہ خاص طور پر اپنے ہم قبیلہ انصار کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کرتے رہتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے آپ کو ان نقصانات سے بھی بچا رہے تھے جو انصار کی برادری سے الگ ہو جانے کی صورت میں انھیں پہنچ سکتے تھے، اور فتنہ پردازی کے ان مواقع سے بھی فائدہ اٹھا رہے تھے جو اس برادری میں شامل رہ کر انھیں مل سکتے تھے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی منافقین کو غزوہ بنی المصطلق کی مہم میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا، اور انھوں نے بیک وقت دو ایسے عظیم فتنے اٹھا دیے جو مسلمانوں کی جمعیت کو بالکل پارہ پارہ کر سکتے تھے۔ مگر قرآن پاک کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے اہل ایمان کو جو بہترین تربیت ملی تھی اس کی بدولت ان دونوں فتنوں کا بروقت قلع قمع ہو گیا اور یہ منافقین الٹے خود ہی رسوا ہو کر رہ گئے۔

بنی المصطلق کو شکست دینے کے بعد ابھی لشکر اسلام اس بستی میں ٹھہرا ہوا تھا جو مریسیع نامی کنویں پر آباد تھی کہ یکا یک پانی پر دو صاحبوں کا جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک کا نام جہجاہ بن مسعود غفاری تھا جو حضرت عمرؓ کے ملازم تھے اور ان کا گھوڑا سنبھالنے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ اور دوسرے صاحب سنان بن وبر الجہنی تھے جن کا قبیلہ خزرج کے ایک قبیلے کا حلیف تھا۔ زبانی ترش کلامی سے گزر کر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی اور جہجاہ نے سنان کے ایک لات رسید کر دی جسے اپنی قدیم یمنی روایات کی بنا پر انصار سخت توہین و تذلیل سمجھتے تھے۔ اس پر سنان نے انصار کو مدد کے لیے پکارا، اور جہجاہ نے مہاجرین کو آواز دی۔ ابن ابی نے اس جھگڑے کی خبر سنتے ہی اوس اور خزرج کے لوگوں کو بھڑکانا اور چیخنا شروع کر دیا کہ دوڑو اور اپنے حلیف کی مدد کرو۔ ادھر سے مہاجرین بھی نکل آئے قریب تھا کہ بات بڑھ جاتی اور اسی جگہ انصار و مہاجرین آپس میں لڑ پڑتے جہاں ابھی ابھی وہ مل کر ایک دشمن قبیلے سے لڑے تھے اور اسے شکست دے کر ابھی اسی کے علاقے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن یہ شور سن کر رسول اللہ ﷺ نکل آئے اور آپ نے فرمایا: ((مابالدعوی الجاهلية ؟ مالكم والدعوة الجاهلية ؟ دعوها فانها منتنة)) ''یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ تم لوگ کہاں اور یہ جاہلیت کی پکار کہاں؟ اسے چھوڑ دو، یہ بڑی گندی چیز ہے۔'' اس پر دونوں طرف کے صالح لوگوں نے آگے بڑھ کر معاملہ رفع دفع کرا دیا اور سنان نے جہجاہ کو معاف کر کے صلح کر لی۔

اس کے بعد ہر وہ شخص جس کے دل میں نفاق تھا عبداللہ بن ابی کے پاس پہنچا اور ان لوگوں نے جمع ہو کر اس سے کہا کہ ''اب تک تو تم سے امیدیں وابستہ تھیں اور تم مدافعت کر رہے تھے، مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمارے مقابلے میں ''ان کنگلوں کے مددگار بن گئے ہو۔'' ابن ابی پہلے ہی کھول رہا تھا۔ ان باتوں سے وہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا کہنے لگا ''یہ سب کچھ تمھارا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے ان لوگوں کو اپنے ملک میں جگہ دی، ان پر اپنے مال تقسیم کیے، اور یہاں تک کہ اب یہ پھل پھول کر خود ہمارے ہی حریف بن گئے۔ ہماری اور ان قریش کے کنگلوں (یا اصحاب محمد ﷺ) کی حالت پر یہ مثل صادق آتی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرتا کہ تجھی کو پھاڑ کھائے۔ تم لوگ ان سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ خدا کی قسم، مدینے واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔''

مجلس میں اتفاق سے حضرت زید بن ارقم بھی موجود تھے جو اس وقت ایک کم عمر لڑکے تھے۔ انھوں نے یہ باتیں سن کر اپنے چچا سے ان کا ذکر کیا، اور ان کے چچا نے جو انصار کے رئیسوں میں سے تھے، جا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور ﷺ نے زید کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے جو کچھ سنا تھا من وعن دہرا دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا شاید تم ابن ابی سے ناراض ہو۔ ممکن ہے تم سے سننے میں کچھ غلطی ہو گئی ہو۔ ممکن ہے تمھیں شبہ ہو گیا ہو کہ ابن ابی یہ کہہ رہا ہے۔ مگر زید نے عرض کیا نہیں حضور، خدا کی قسم میں نے اسے یہ باتیں کہتے سنا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے ابن ابی کو بلا کر پوچھا تو وہ صاف مکر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ میں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کیں۔ انصار کے لوگوں نے بھی کہا کہ حضور ﷺ لڑکے کی بات ہے، شاید اسے وہم ہو گیا ہو۔ یہ ہمارا شیخ اور بزرگ ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک لڑکے کی بات کا اعتبار نہ فرمایئے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے زید کو بھی ملامت کی اور وہ بیچارے رنجیدہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ مگر حضور ﷺ زید کو بھی جانتے تھے اور عبداللہ بن ابی کو بھی، اس لیے آپ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے آ کر عرض کیا: ''مجھے اجازت دیجیے اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ یا اگر مجھے یہ اجازت دینا مناسب خیال نہیں فرماتے تو خود انصار ہی میں سے معاذ بن جبل، یا عباد بن بشر، یا سعد بن معاذ، یا محمد بن مسلمہ کو دیجیے کہ وہ اسے قتل کر دیں۔'' مگر حضور ﷺ نے فرمایا ''ایسا نہ کرو، لوگ کہیں گے

محمد اپنے ساتھیوں ہی کو قتل کر رہا ہے۔'' اس کے بعد آپ نے فوراً ہی کوچ کا حکم دے دیا، حالانکہ حضور ﷺ کے معمول کے لحاظ سے وہ کوچ کا وقت نہ تھا۔ مسلسل 30 گھنٹے چلتے رہے یہاں تک کہ لوگ تھک کر چور ہو گئے۔ پھر آپ نے ایک جگہ پڑاؤ کیا اور تھکے ہوئے لوگ زمین پر کمر ٹکاتے ہی سو گئے۔ یہ آپ نے اس لیے کیا کہ جو کچھ مریسیع کے کنوئیں پر پیش آیا تھا اس کے اثرات لوگوں کے ذہن سے محو ہو جائیں۔

راستے میں انصار کے ایک سردار حضرت اسیدؓ بن حضیر آپ سے ملے اور عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ آج آپ نے ایسے وقت کوچ کا حکم دیا جو سفر کے لیے موزوں نہ تھا اور آپ کبھی ایسے وقت میں سفر کا آغاز نہیں فرمایا کرتے تھے؟'' حضور ﷺ نے جواب دیا ''تم نے سنا نہیں کہ تمھارے ان صاحب نے کیا گوہر افشانی کی ہے؟'' انھوں نے پوچھا کون صاحب؟ فرمایا عبداللہ بن ابی۔ انھوں نے پوچھا: اس نے کیا کہا؟ فرمایا ''اس نے کہا ہے کہ مدینہ پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔'' انھوں نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! خدا کی قسم، عزت والے تو آپ ہیں اور ذلیل وہ ہے، آپ جب چاہیں اسے نکال سکتے ہیں۔''

رفتہ رفتہ یہ بات تمام انصار میں پھیل گئی اور ان میں ابن ابی کے خلاف سخت غصہ پیدا ہو گیا۔ لوگوں نے ابن ابی سے کہا کہ جا کر رسول اللہ ﷺ سے معافی مانگو۔ مگر اس نے تڑخ کر جواب دیا: ''تم نے کہا کہ ان پر ایمان لاؤ۔ میں ایمان لے آیا تم نے کہا کہ اپنے مال کی زکوٰۃ دو۔ میں نے زکوٰۃ بھی دے دی۔ اب بس یہ کسر رہ گئی ہے کہ میں محمد ﷺ کو سجدہ کروں۔'' ان باتوں سے اس کے خلاف مومنین انصار کی ناراضی اور زیادہ بڑھ گئی اور ہر طرف سے اس پر پھٹکار پڑنے لگی۔ جب یہ قافلہ مدینہ طیبہ میں داخل ہونے لگا تو عبداللہ بن ابی کے صاحب زادے، جن کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، تلوار سونت کر باپ کے آگے کھڑے ہو گئے اور بولے ''آپ نے کہا تھا کہ مدینہ واپس پہنچ کر عزت والا ذلیل کو نکال دے گا، اب آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ عزت آپ کی ہے یا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی۔ خدا کی قسم، آپ مدینہ داخل نہیں ہو سکتے جب تک رسول اللہ ﷺ آپ کو اجازت نہ دیں۔'' اس پر ابن ابی چیخ اٹھا ''خزرج کے لوگو! ذرا دیکھو، میرا بیٹا ہی مجھے مدینہ میں داخل ہونے سے روک رہا ہے۔'' لوگوں نے یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچائی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''عبداللہ سے کہو، اپنے باپ کو گھر آنے دے۔'' عبداللہؓ نے کہا ''ان کا حکم ہے تو اب آپ داخل ہو سکتے ہیں۔'' اس وقت حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا ''کیوں عمر، اب تمھارا کیا خیال ہے؟ جس وقت تم نے کہا تھا کہ مجھے اسے قتل کرنے کی اجازت دیجیے اس وقت اگر تم اسے قتل کر دیتے تو بہت سی ناکیں اس پر پھڑکنے لگتیں۔ آج اگر میں اس کے قتل کا حکم دوں تو اسے قتل کیا جا سکتا ہے۔'' حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''خدا کی قسم اب مجھے معلوم ہو گیا کہ اللہ کے رسول کی بات میری بات سے زیادہ مبنی بر حکمت تھی۔''

پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کی اجازت غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر دی گئی تھی، جس کے آداب وطریق سورۂ نسا، آیت 43 میں مذکور ہیں۔

واقعۂ افک

غزوہ بنی مصطلق سے واپسی کے وقت ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جو شروع میں تو کچھ زیادہ اہم نہ تھا، لیکن کچھ ہی دنوں کے بعد بعض عاقبت اندیش اشخاص کی چہ میگوئیوں سے اس نے ایک ہنگامے کی شکل اختیار کر لی۔ بات یہ ہے کہ جب آنحضور ﷺ کسی غزوے میں شرکت فرماتے تھے تو اپنی ازواج مطہرات میں سے کسی نہ کسی کو قرعہ اندازی سے اپنی رفاقت کا شرف بخشتے تھے، چناں چہ غزوہ بنی مصطلق میں حضرت عائشہؓ کو آپ ﷺ کی رفاقت نصیب ہوئی۔ عائشہؓ ہلکے پھلکے جسم کی تھیں۔ ہودج دہلیز کے پاس لایا جاتا۔ آپؓ اس میں قدم رنجہ فرماتیں تو اٹھاتے وقت ساربان کو احساس بھی نہ ہوتا کہ ہودج میں کوئی ہے بھی۔

غزوے کے بعد واپسی کے سفر میں ایک مقام پر لشکر کو شب کے وقت پڑاؤ کا حکم ہوا۔ جب لشکری کچھ ستا لیے تو سفر پھر شروع ہوا۔ عین آغازِ سفر کے وقت (یہ نہ جانتے ہوئے کہ لشکر آمادہ عزمِ سفر ہے)، حضرت عائشہؓ کسی طبعی ضرورت سے کچھ فاصلے پر چلی گئی تھیں۔ واپس ہونے لگیں تو پتا چلا کہ گلے کا ہار کہیں گر پڑا ہے۔ اس لیے پھر لوٹیں۔ ہار کی تلاش میں کچھ دیر ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ تھکے ماندے جسم میں نیند نے غلبہ پا لیا ہو۔ غرض ہار تو دستیاب ہو گیا، لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب انھوں نے دیکھا کہ پڑاؤ پر لشکر کا نام ونشان بھی نہیں۔ بات یہ ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کے جاں نثاروں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ اُم المومنین ہودج میں ہیں، خالی ہودج اٹھا کر اونٹ پر رکھ لیا تھا اور لشکر کے ہم راہ روانہ ہو گئے تھے۔ ادھر ام المومنین کا یہ خیال تھا کہ جب لشکری مجھے نہ پائیں گے تو مجھے لینے کے لیے واپس ضرور ہوں گے، اس لیے آپؓ نے پڑاؤ پر ٹھہرنا مناسب خیال کیا۔ صحرا میں تنہا سفر کرنے میں آپ نے کوئی مصلحت نہ سمجھی۔ غرض آپ نے چادر سے اپنے جسم کو لپیٹ لیا اور وہیں لیٹ گئیں۔

اتفاق کی بات اس سفر میں صفوان بن معطل سلمیؓ بھی کسی ضرورت کے تحت قافلے سے بچھڑ گئے تھے۔ ان کا گزر اس طرف سے ہوا جہاں حضرت عائشہؓ موجود تھیں۔ انھوں نے آپ ﷺ کو پہچان لیا، کیوں کہ حجاب کے نزول سے قبل اُم المومنینؓ کو انھوں نے دیکھا تھا۔ ام المومنین کو اس عالم میں تن تنہا پایا تو ہکا بکا رہ گئے ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' کہا اور بولے: ''ام المومنین! آپ اور اس صحرا میں تن تنہا! قافلے سے آپ کی علیحدگی کا سبب کیا ہے؟'' آپ ﷺ خاموش رہیں اور کوئی جواب نہ دیا۔ صفوانؓ نے اپنا اونٹ بٹھا کر آپ سے درخواست کی کہ اس پر سوار ہو جائیے۔ خود ذرا پیچھے ہٹے تا کہ حیا وحجاب دامن گیر نہ ہو۔ آپؓ سوار ہو گئیں تو صفوانؓ نے اونٹ کی رفتار تیز کر دی، تا کہ قافلے کے قریب پہنچ سکیں، لیکن قافلہ اس سرعت سے منزلیں طے کر رہا تھا کہ اس نے مدینہ پہنچ کر ہی دم لیا۔ صفوانؓ اپنے اونٹ پر آپؓ کو بٹھائے ہوئے مدینہ پہنچے تو دن کی روشنی خاصی پھیل چکی تھی۔ لوگوں نے آپ ﷺ کو صفوانؓ کے اونٹ پر سوار دیکھا۔ صفوانؓ نے حضور ﷺ کے دولت خانے کے قریب آپؓ کو اتارا اور آپؓ تشریف لے گئیں۔ اس موقع پر کسی کے دل میں نہ کوئی وسوسہ تھا اور نہ زبان پر کوئی ایسا

فقرہ جس سے یہ اندازہ ہوتا کہ لوگوں میں بدگمانی راہ پا چکی ہے۔ حضور ﷺ کو بھی اس قسم کا کوئی خیال نہ آیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی کے بارے میں ایسا خیال آ بھی نہ سکتا تھا۔

ام المومنین حضرت جویریہؓ

مدینہ میں لشکرِ اسلام کی آمد کے کچھ ہی دیر بعد حضرت عائشہؓ بھی تشریف لے آئی تھیں، اس لیے بدگمانی اور بدظنی کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ جب آپؓ نے اپنی قیام گاہ پر قدم رنجہ فرمایا تو اس وقت آپ کے چہرے کی بشاشت کہے دے رہی تھی کہ کوئی ایسا واقعہ سرے سے ظہور میں آیا ہی نہیں جو وجہ اضطراب ہو۔ چوں کہ کوئی ایسی ویسی بات نہ تھی، اس لیے معمول کے مطابق نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ غنیمت کی تقسیم میں مصروف ہو گئے جو غزوہ بنی مصطلق میں دستیاب ہوا تھا۔

بنی مصطلق کے جو اسیر لشکرِ اسلام کے قبضے میں آئے تھے، ان میں سردارِ قبیلہ حارث کی بیٹی جویریہ بھی تھیں۔ یہ خاتون حسن و جمال میں اپنی نظیر آپ تھیں۔ تقسیم غنیمت کے نتیجے میں یہ ایک انصاری کے حصے میں آئی تھیں۔ انھوں نے اپنی رہائی کے سلسلے میں انصار صحابہ سے فدیہ کی بات چیت کی تو انصار نے اس خیال سے کہ یہ خاتون سردار قبیلہ کی دختر ہے اور اس کا باپ اس قابل ہے کہ فدیہ میں بڑی سے بڑی رقم دے سکے، فدیہ کی رقم بڑھا چڑھا کر بتائی۔ حضرت جویریہؓ نے امداد و اعانت کے ارادے سے آنحضور ﷺ سے رجوع کیا۔ جس وقت حضرت جویریہؓ آنحضور ﷺ کی خدمت میں پہنچیں، اس وقت حضور ﷺ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں رونق افروز تھے۔ انھوں نے عرض کیا: ''میں بنی مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی ہوں۔ میں جس الجھن میں مبتلا ہوں، اس سے آپ ﷺ بخوبی واقف ہیں۔ آپ ﷺ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوئی ہوں کہ آپ ﷺ زرِ فدیہ کے سلسلے میں میری اعانت فرمائیں۔ میں جس شخص کے حصے میں آئی ہوں، اس سے میں نے فدیہ کے عوض رہائی کے بارے میں بات چیت کر لی ہے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بہتر صورت یہ ہے کہ میں زرِ فدیہ ادا کیے دیتا ہوں اور تم سے عقد بھی کرتا ہوں۔'' صحابہؓ کو جب یہ معلوم ہوا کہ بنی مصطلق سے آنحضور ﷺ نے رشتہ داری استوار کر لی ہے تو انھوں نے احتراماً زرِ فدیہ لیے بغیر تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس موقع پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ''جویریہ سے زیادہ کوئی عورت اپنی قوم کے حق میں مبارک ثابت نہیں ہوئی۔''

افک کی داستان طرازی

جن دنوں حضرت جویریہؓ امہات المومنین کے حلقے میں شامل ہوتی ہیں، یہ سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ حضرت عائشہؓ قافلے سے بچھڑ کیوں گئی تھیں، اور مدینہ میں صفوانؓ ایسے جوان اور خوش رو کی معیت میں ان کے آنے کا کیا سبب ہے؟ مسلمانوں میں سے ام المومنین حضرت زینب بنت جحشؓ کی ہمشیرہ حمنہ، جو پہلے ہی حضرت عائشہؓ سے اس بنا پر جلتی تھیں کہ حضور ﷺ کی نظر میں آپ ﷺ کا مقام ان کی بہن سے زیادہ بلند کیوں ہے، اس جھوٹی افواہ کو ہوا دینے میں پیش پیش تھیں۔ حضرت حسانؓ بن ثابت بھی بی بی حمنہ کے ہم نوا تھے۔ عبداللہ ابن ابی منافق ایسے موقع پر اپنی خباثت سے کیسے باز آ سکتا تھا۔

اسے تو سنہری موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس نے خوب اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ اس نے کہا تھا: ''خدا کی قسم، یہ بچ کر نہیں آئی ہے۔ لو دیکھو، تمھاری نبی کی بیوی نے رات ایک اور شخص کے ساتھ گزاری اور اب وہ اسے علانیہ لیے چلا آ رہا ہے۔'' بنی اوس کے انصار صحابہؓ نے جب یہ افواہیں سنیں تو انھوں نے اپنے ایمان کی پختگی کا ثبوت دیا اور اس اعتماد کی بنا پر جو انھیں حضرت عائشہؓ کی عفت و عصمت پر تھا، ان سرگوشیوں کی تردید میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، لیکن اس کے باوجود بات چل نکلی اور اس نے فتنے کی صورت اختیار کر لی۔

آنحضور ﷺ کی تشویش

یہ افواہیں آنحضور ﷺ کے گوش گزار ہوئیں تو آپ کو سخت حیرت ہوئی۔ آپ ﷺ ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گئے کہ یہ افواہیں کیسے درست ہو سکتی ہیں؟ مجھے عائشہؓ سے یہ امید ہرگز نہیں کہ اس نے مجھ سے خیانت کی ہو۔ ایسا اقدام ناممکن ہے۔ پھر ایک بلند و بالا مرتبے پر فائز ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قسم کی بات ظہور میں آئے۔ آنحضور ﷺ کو حضرت عائشہؓ پر اتنا اعتماد تھا کہ اس قسم کی بدگمانیاں راہ نہ پا سکتی تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کو یہ خیال بھی تھا کہ عورتوں کے اسرار درونِ پردہ کی تہ تک کون پہنچ سکتا ہے؟ عائشہؓ کی عمر ہی کیا ہے؟ اگر ہار گم ہو گیا تھا تو اس کی تلاش میں آدھی رات گئے انھیں صحرا میں دور جانے کی کیا ضرورت تھی؟ لشکر گاہ میں قافلے کی روانگی سے قبل یہ بات انھیں مجھ سے کرنی چاہیے تھی۔ ایسا انھوں نے کیوں نہیں کیا؟ حضور ﷺ کے دل و دماغ میں یہ خیالات گشت کر رہے تھے اور آپ قطعیت سے دوٹوک فیصلہ نہ کر سکتے تھے۔

حضرت عائشہؓ کی علالت

یہ افواہیں پھیلی ہوئی تھیں، لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ کسی کو بھی اتنی جرأت نہ ہو سکی کہ وہ براہِ راست حضرت عائشہؓ سے تذکرہ کرے، اس لیے انھیں کانوں کان بھی یہ خبر نہ ہو سکی کہ شہر میں ان کے خلاف کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ ہاں البتہ حضور ﷺ کی پھری ہوئی نگاہیں آپ ﷺ کے حق میں بلائے بے درماں تھیں۔ اس کا آپ ﷺ کو اتنا ملال تھا کہ بیمار پڑ گئیں۔ تیمارداری کے لیے آپؓ کی والدہ ہمہ وقت قریب رہتیں۔ کبھی کبھی حضور ﷺ بھی مزاج پرسی کے لیے تشریف لاتے۔ آپ ﷺ کے الفاظ صرف یہ ہوتے: ''طبیعت کا کیا حال ہے؟'' حضور ﷺ کی بے رخی سے حضرت عائشہؓ کے مرض کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ آپ نے اپنے طور پر یہ سمجھا کہ ہو نہ ہو، حضور ﷺ کی مجھ سے بے توجہی اور بے نیازی ضرور جویریہؓ سے تعلقِ خاطر کی وجہ سے ہے۔ چناں چہ ایک دن آپؓ نے صورتِ حال سے پریشان ہو کر حضور ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے اس وقت تک کے لیے، جب

کہ پوری طرح صحت بحال نہ ہو، اپنے ماں باپ کے یہاں جا کر رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ غرض آپؓ اپنے والدین کے گھر تشریف لے آئیں۔ اس اجازت سے حضرت عائشہؓ کے دل پر حضور ﷺ کی بے رخی کا نقش اور بھی جم گیا۔ لگاتار 29 دن کی بیماری نے آپؓ کی جان کھینچ لی اور آپؓ بے حد لاغر اور کمزور ہو گئیں، لیکن ابھی تک آپ کو یہ علم نہ ہو سکا کہ ان پر بہتان باندھا گیا ہے۔

انھی دنوں آنحضرت ﷺ نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا: ''مسلمانو! کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے۔ بخدا میں نے نہ تو اپنی بیوی میں کوئی برائی دیکھی ہے، اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔''

اس پر قبیلہ اوس کے سردار اسید بن حضیرؓ نے اٹھ کر کہا: ''یا رسول اللہ! اگر وہ ہمارے قبیلے اوس کے آدمی ہیں تو ہم ان کی گردن مار دیں گے۔ اور اگر ان کا تعلق بنو خزرج سے ہے تو آپ ﷺ ان کے بارے میں اپنے احکام صادر فرما دیجیے۔ خدا کی قسم، وہ واجب القتل ہیں۔''

یہ سنتے ہی رئیس خزرج، سعدؓ بن عبادہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے: ''جھوٹ کہتے ہو تمھاری زبان سے خزرج کے بارے میں یہ فقرہ اس لیے نکلا ہے کیوں کہ تمھیں پتا ہے کہ سرگوشیوں میں جن لوگوں نے حصہ لیا ہے، وہ زیادہ تر خزرجی ہیں۔ اگر ان لوگوں کا تعلق قبیلہ اوس سے ہوتا تو ایسی باتیں تمھاری زبان سے ہرگز نہ نکلتیں۔''

سعدؓ بن عبادہؓ کی اس گفتگو سے لوگوں میں ہیجان پیدا ہو گیا اور اگر اس موقع پر آنحضرت ﷺ پیغمبرانہ بصیرت سے کام نہ لیتے تو فتنہ و فساد کا سیلاب پھوٹ نکلتا۔

حضرت عائشہؓ کو تہمت کی اطلاع

ایک انصاری خاتون نے نیک نیتی کی بنا پر حضرت عائشہؓ کو لوگوں کی بہتان طرازیوں سے آگاہ کیا۔ یہ سنتے ہی ان کا دل ڈوبنے لگا۔ اتنا روئیں کہ روتے روتے آواز بھرا گئی۔ بستر سے اٹھیں اور اپنی والدہ سے لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگیں۔ ذرا کچھ ہوش آیا تو اپنی والدہ سے یہ شکایت کی ''امی جان، آپ نے سب کچھ سنا ہوگا، لیکن یہ کیا بات ہے کہ آپ نے مجھ پر یہ راز آشکار نہیں ہونے دیا؟'' ان کی والدہ نے کہا تو صرف یہ کہ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کی پیاری ہو اور اس کی سوکنیں اس سے جلن نہ رکھیں۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے۔

حضرت عائشہؓ اپنی والدہ کے تسلی آمیز الفاظ سے مطمئن نہ ہوئیں۔ جب آپؓ یہ سوچتیں کہ حضور ﷺ کے دل میں میری طرف سے میل ہے تو ان کی افسردگی میں اور اضافہ ہو جاتا۔ کبھی یہ خیال آتا کہ حضور ﷺ تشریف لائیں تو قسمیں کھا کھا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دوں۔ یہ بھی سوچتیں کہ جو تہمتیں میرے خلاف تراشی جا رہی ہیں، ان کی اصلیت واضح کر دوں۔ کبھی آپ کے ذہن میں یہ بات بھی آتی کہ میں حضور ﷺ کے ساتھ کیوں نہ اسی انداز کی بے رخی کا برتاؤ کروں، جس کا اظہار آپ ﷺ کے رویے سے ہو رہا ہے۔ اس تذبذب کے دوران میں انھوں نے یہ بھی سوچا کہ حضور ﷺ اللہ کے بزرگ و برتر رسول ہیں، ان کا مقام عام سطح سے بہت بلند ہے۔ میرے خلاف بہتان طرازیوں کا جو طوفان لوگوں نے اٹھایا ہے۔ انھیں اس بات سے کہ میں قافلے سے جدا ہو کر صفوان کے اونٹ پر مدینہ آئی ہوں، میرے خلاف چہ میگوئیوں کا موقع مل گیا، حضور ﷺ کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔

آخر ام المومنین نے اللہ کی بارگاہ میں دعا کی کہ یا اللہ میری امداد کر اور کوئی ایسی صورت پیدا کر کہ رسول کریم ﷺ پر میری بے گناہی آشکارا ہو جائے اور ان کی پھری ہوئی نگاہیں پھر میری جانب مائل ہو جائیں۔

حضور ﷺ تحقیق حال کی خاطر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے یہاں تشریف لے گئے آپ ﷺ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ اور علیؓ بن ابی طالب کو، جن پر آپ ﷺ کو پورا پورا اعتماد تھا، طلب فرمایا اور ان دونوں اصحاب سے اس بہتان سے متعلق مشورہ کیا۔ حضرت اسامہؓ نے نہایت صفائی اور پورے اخلاص سے حضرت عائشہؓ کی عصمت کی شہادت دی۔ دراصل حضور ﷺ کا خیال بھی یہی تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا تو انھوں نے جب حضور ﷺ کو بہت زیادہ پریشان دیکھا تو حضور ﷺ کے مشورے لینے پر عرض کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں آپ ﷺ پر تنگی تو نہیں رکھی ہے۔ عورتیں بہت ہیں۔ آپ چاہیں تو عائشہؓ کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر سکتے ہیں۔ (اس کے معنی ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ نے اس الزام کی تصدیق فرمائی تھی جو حضرت عائشہؓ پر لگایا جا رہا تھا۔ ان کا مقصد صرف آنحضرت کی پریشانی کو رفع کرنا تھا) حضرت علی نے یہ مشورہ دیا کہ بہتر یہ ہوگا کہ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کی کنیز سے بھی دریافت فرما لیں۔ کنیز نے اپنے بیان میں کہا کہ ام المومنین تو پاک دامن ہیں۔

حضرت عائشہؓ سے باز پرس

آخر میں حضرت عائشہؓ سے باز پرس کی نوبت آئی۔ آنحضور ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر تشریف فرما ہوئے۔ اس موقع پر ام المومنین اور ان کے والدین کے علاوہ ایک انصاریہ بھی موجود تھیں۔ آنحضور ﷺ نے جب حضرت عائشہؓ سے تہمت کے متعلق باز پرس کی تو ان کی چیخیں نکل گئیں۔ انصاری خاتون بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ حضرت عائشہؓ کی از خود رفتگی کا سبب یہ تھا کہ اس باز پرس سے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ان کے ذہن میں پچھلی صحبتوں کے نقش ابھر آئے اور ساتھ ہی اس تاثر کا نقش بھی کہ اب باز پرس تک نوبت آ پہنچی ہے۔

جی کڑا کر کے حضور ﷺ کی جانب متوجہ ہوئیں تو آنسو رک گئے۔ آنحضور ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: ''عائشہؓ، خشیت اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو۔ اگر تہمت درست ہے تو اس کی بارگاہ میں توبہ کرو۔ اللہ تواب الرحیم ہے۔'' آنحضور ﷺ جب یہ الفاظ ارشاد فرما چکے تو ام المومنینؓ کو جلال آ گیا۔ انھوں نے باری باری اپنے

والد اور اپنی والدہ کی طرف دیکھا تو دونوں ساکت و صامت تھے۔ ام المومنینؓ نے دونوں سے شکایت کی۔ کیا آپ چپ ہی رہیں گے؟ اس پر دونوں کا جواب یہ تھا کہ معاملے کی نوعیت سے ہم بالکل بے خبر ہیں۔ یہ کہا اور دونوں نے اپنی گردنیں جھکا لیں والدین کے اس تاثر سے حضرت عائشہؓ پر پھر رقت طاری ہوگئی۔ انھوں نے اس عالم میں حضور ﷺ سے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ آپ جو یہ فرما رہے ہیں کہ میں توبہ کروں تو آخر کس لیے؟ جب مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہی نہیں ہوا، بداندیشوں نے جو بہتان باندھے ہیں، اس کی اصلیت سے میں بے خبر نہیں۔ اگر میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں تو لاحاصل ہے، اس لیے کہ پروردگار پر ہر بات روشن ہے، اور اگر میں لوگوں کے سامنے اپنی پاک دامنی کا ثبوت دوں تو وہ میرے بیان کی تصدیق کہاں کریں گے؟''

قدرے تامل کے بعد عائشہؓ نے کہا، میں اپنے حق میں وہی الفاظ دہرائے دیتی ہوں جو حضرت یعقوبؑ نے فرمائے تھے: (سورۂ یوسف۔ آیت:18)

﴿قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ (یوسف: 18)

یہ سن کر ان کے باپ (حضرت یعقوبؑ) نے کہا: ''بلکہ تمھارے نفس نے تمھارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ لہٰذا صبر ہی بہتر ہے۔ بخوبی صبر کروں گا۔ تم جو باتیں بنا رہے ہو، اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جاسکتی ہے۔''

نزولِ آیات

اس گفت و شنید کے بعد حاضرینِ مجلس پر کچھ ایسا سکوت طاری ہوا کہ کسی کو یہ ہوش ہی نہ رہا کہ ہم کس عالم میں ہیں۔ اثنا میں حضور ﷺ پر نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا۔ حاضرین نے آپ ﷺ کا چہرہ مبارک چادر سے ڈھانپ دیا۔ سرہانے تکیہ رکھ دیا گیا، تاکہ آپ ﷺ اس سے ٹیک لگا سکیں۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اس موقع پر مجھے اپنی بے گناہی کے سبب قطعاً یہ شبہ نہ تھا کہ پروردگار میرے معاملے میں انصاف نہیں فرمائے گا، لیکن میرے والدین پر یہ عالم گزر رہا تھا، جیسے ان کی روحیں قبض کی جا رہی ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ تھا کہ الزام و اتہام کی تصدیق کہیں وحی سے نہ ہوجائے۔ جب آنحضور ﷺ نزولِ وحی سے فارغ ہوئے اور اپنی پیشانی سے آپ ﷺ نے پسینے کے قطرات پونچھے تو اُس وقت میرے والدین کا اضطراب دیدنی تھا۔ آخر حضور ﷺ نے مجھ سے خطاب کیا:

"البشر يا عائشه: قد انزل الله برأتك ."

(اے عائشہ، مبارک ہو، اللہ تعالیٰ نے تمھاری برأت میں آیات نازل کی ہیں)

حضرت عائشہؓ نے اپنی زبان سے صرف الحمد للہ کہا اور خاموش ہوگئیں۔ آنحضور ﷺ اسی وقت مسجد نبوی میں تشریف لائے اور واقعہ افک سے متعلق جو آیات نازل ہوئی تھیں، وہ مجمع عام میں تلاوت کیں۔ سورۂ نور کی دس آیات (11 تا 20) ہیں۔ جن کا اردو میں ترجمہ یہ ہے:

''جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں، وہ تمھارے ہی اندر کا ایک ٹولہ ہیں۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو، بلکہ یہ بھی تمھارے لیے خیر ہی ہے۔ جس نے اس میں جتنا حصہ لیا، اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا، اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا، اس کے لیے تو عذاب عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا، اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے؟ وہ لوگ اپنے الزام کے ثبوت میں، چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اب کہ وہ گواہ نہیں لائے، اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں۔ اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے، ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمھیں آلیتا۔ ذرا غور تو کرو، اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے، جب کہ تمھاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جارہی تھی، اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جارہے تھے، جس کے متعلق تمھیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔

کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ''ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا۔ سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتان عظیم ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا، اگر تم مومن ہو۔ اللہ تمھیں صاف صاف ہدایات دیتا ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں فحش پھیلے، وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا اور یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ بڑا شفیق و رحیم ہے، (تو یہ چیز جو ابھی تمھارے اندر پھیلائی گئی تھی) بدترین نتائج دکھا دیتی۔

پاک دامن عورتوں پر جو بہتان باندھتے ہیں، ان کی سزا کے بارے میں سورۂ نور کی آیت چار میں فیصلہ ہوا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَّاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾ (النور: 4)

''اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں۔ پھر چار گواہ لے کر نہ آئیں، انھیں اسی کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو، اور وہ خود ہی فاسق ہیں۔''

اس کے بعد بہتان طرازی اور تہمت تراشی کے جرم میں قرآنی حکم کے مطابق مسطح بن اثاثہ، حسانؓ بن ثابت اور حمنہ بنت جحشؓ کو اسی اسی کوڑے مارے گئے۔ البتہ خبیث عبداللہ بن ابی کی پیٹھ اس سزا سے بچ گئی، حالانکہ تہمت تراشوں میں وہی سرفہرست تھا۔ اسے سزا نہ دینے کی وجہ مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری کے بقول: ''یا تو یہ تھی کہ جن لوگوں پر حدود وقائم کردی جاتی ہیں، وہ ان کے لیے اخروی عذاب کی تخفیف اور گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں اور عبداللہ بن ابی کو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں ''عذاب عظیم'' دینے کا اعلان فرما دیا تھا۔ یا پھر وہی مصلحت کارفرما تھی، جس کی وجہ سے اس کی اسلام دشمنی کے باوجود اسے قتل نہیں کیا گیا۔

اس طرح ایک ماہ کے بعد مدینے کی فضا شک و شبے اور قلق و اضطراب سے

بادلوں سے صاف ہوگئی اور عبداللہ بن ابی اس طرح رسوا ہوا کہ دوبارہ سر نہ اٹھا سکا۔
اس کے بعد جب وہ کوئی گڑبڑ کرتا تو خود اس کی قوم کے لوگ اسے عتاب کرتے، اس کی گرفت کرتے اور اسے سخت سست کہتے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے کہا: ''اے عمرؓ، کیا خیال ہے؟ دیکھو، اگر تم نے اس شخص کو اس دن قتل کر دیا ہوتا جس دن تم نے مجھ سے اسے قتل کرنے کی بات کہی تھی، تو اس کے بہت سے ہمدرد اٹھ کھڑے ہوتے، لیکن اگر آج انھیں ہمدردوں کو اس کے قتل کا حکم دیا جائے تو وہ اسے قتل کر دیں گے۔'' حضرت عمرؓ نے کہا: ''میری سمجھ میں خوب آ گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معاملہ میرے معاملے سے زیادہ بابرکت ہے۔''

ان آیات کے نزول کے بعد حضرت عائشہؓ کو حسب سابق عزت و احترام کا مقام حاصل ہوگیا۔ آنحضور ﷺ انھیں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھنے لگے اور وہ اپنے والدین کے گھر سے کاشانہ نبوت میں تشریف لے آئیں۔

حسان بن ثابتؓ اسی کوڑوں کی سزا پانے کے بعد پھر حسب سابق آنحضور ﷺ کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ آنحضور ﷺ کے ایما پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی مسطح بن اثاثہ سے پہلے کی طرح ہمدردی کا سلوک کیا اور نئے سرے سے ان کے وظیفے کا اجرا کر دیا۔ مدینہ میں واقعہ افک سے جو ہیجان برپا ہوگیا تھا، آہستہ آہستہ ختم ہوا۔ ام المومنین کے وقار اور ان کی عزت کا نقش پہلے کی طرح پھر لوگوں کے دل و دماغ پر بیٹھ گیا۔ آنحضرت ﷺ پوری سرگرمی اور کامل انہماک سے اسلام کی تبلیغ کی جانب متوجہ ہوئے اور وہ حالات پیدا ہوگئے جن کی بدولت صلح حدیبیہ کے لیے زمین ہموار ہوئی، یعنی وہ قرارداد جو ''فتح مبین'' کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

سریہ دومتہ الجندل

یہ سریہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی قیادت میں شعبان 6 ہجری میں بھیجا گیا اسے سریہ دیار بنی کلب بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کے مطابق آنحضرت مع حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، اور دیگر جلیل القدر صحابہ کے، مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ایک انصاری حاضر ہوا اور سلام کر کے مجلس میں بیٹھ گیا۔ چندے توقف کے بعد اس نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا:
''یارسول اللہ! سب سے بہتر مسلمان کون ہے؟''
حضور ﷺ نے فرمایا: ''جس کے اخلاق سب سے بہتر ہیں۔''
پھر انصاری نے عرض کیا: ''کون مسلمان سب سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار ہے۔''
حضور ﷺ نے فرمایا: ''جو سب سے زیادہ موت کو یاد کرنے اور کہنے والا اور موت آنے سے پہلے سب سے زیادہ موت کی تیاری کرنے والا ہے۔ ایسے ہی لوگ سمجھدار اور ہوشیار ہیں۔''
حضور ﷺ کی مبارک زبان سے یہ ارشادات سننے کے بعد انصاری خاموش ہوگئے۔ پھر حضور ﷺ حاضرین مجلس کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، پانچ خصلتیں نہایت خطرناک ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمھیں ان سے پناہ دے اور ان کے دیکھنے سے محفوظ فرمائے یعنی:

1: جس قوم میں کھلم کھلا بے حیائی پھیل جائے تو اس قوم میں طاعون اور وہ بیماریاں پھیلتی ہیں جو پہلے ظاہر نہ ہوئی تھیں۔
2: جو قوم ناپ اور تول میں کمی کرتی ہے، وہ مال کے قحط اور مشقتوں میں مبتلا ہوتی ہے اور ظالم بادشاہ اس پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔
3: جو قوم اپنے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتی، اس سے بارش روک لی جاتی ہے۔ اگر جانور نہ ہوتے تو بارش سے بالکل محروم کر دی جاتی۔
4: جو قوم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے عہد توڑتی ہے، اس قوم پر اللہ تعالیٰ اجنبی دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے، جو اس قوم سے ہر چیز چھین لیتے ہیں۔
5: جب پیشوا اور حکام کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرنے لگیں اور مغرور و سرکش ہو جائیں، تو اللہ تعالیٰ ان میں پھوٹ ڈال دیتا ہے۔

ان ارشادات کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عوفؓ سے فرمایا کہ میں آج یا کل تمھیں ایک مہم پر بھیجنے والا ہوں، تم تیار ہو جاؤ۔ دوسری صبح نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو بلا کر اپنے سامنے بٹھایا اور اپنے دستِ مبارک سے ان کے سر پر عمامہ باندھ کر فرمایا: ''اے ابن عوف، اس طرح عمامہ باندھا کرو۔ یہ تمھیں بھلا لگتا ہے۔''

پھر حضور ﷺ نے حضرت بلالؓ کو جھنڈا لانے اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو دینے کا حکم فرمایا، جس کی تعمیل کی گئی۔ ازاں بعد حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی۔ پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے مخاطب ہو کر فرمایا ''یہ جھنڈا لے کر اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے جاؤ۔ جن لوگوں نے اللہ کے ساتھ کفر کیا، ان سے قتال کرو۔ خیانت اور غدر نہ کرنا، کسی کی ناک اور کان نہ کاٹنا، کسی بچے کو قتل نہ کرنا۔ یہ اللہ کا عہد اور اس کے نبی ﷺ کی سنت ہے۔''

اس ہدایت کے بعد آپ ﷺ نے انھیں سات سو صحابہ کے ساتھ دومتہ الجندل کی طرف جانے کا حکم دیا اور ارشاد فرمایا: ''وہ اگر تمھاری دعوت قبول کر کے اسلام لے آئیں تو وہاں کے رئیس کی بیٹی سے نکاح کرنے میں تامل نہ کرنا۔''

حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ روانہ ہوئے اور دومتہ الجندل پہنچ کر لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ آپ تین روز تک مسلسل اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ تیسرے روز دومتہ الجندل کے عیسائی رئیس اصبغ بن عمر نے اسلام قبول کیا۔ اس کے ساتھ اور بہت سے لوگ بھی مسلمان ہوگئے۔

فرمان رسول کے مطابق حضرت عبدالرحمٰن بن عوف دومتہ الجندل کے رئیس کی بیٹی تماضر سے نکاح کر کے اسے مدینہ لے آئے۔ حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالرحمٰن بن عوفؓ جو کبار تابعین اور جلیل القدر صحابہؓ میں ہیں، انھی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

سریہ فدک

یہ سریہ بھی شعبان چھٹے ہجری میں حضرت علی کی سرکردگی میں روانہ کیا گیا۔

حضور ﷺ کو خبر ملی کہ خیبر کے یہودیوں کی مدد کے لیے بنی سعد بن بکر نے فدک کے قریب لشکر جمع کیا ہے۔ حضور ﷺ کے حکم سے حضرت علیؓ دو سو آدمیوں کے ساتھ فدک کی جانب روانہ ہوئے۔ آپ رات کو سفر کرتے اور دن کو چھپ جاتے۔ راستے میں ایک جاسوس گرفت میں آیا اور اس نے اقرار کیا کہ بنی سعد نے خیبر کی کھجوروں کے عوض امداد فراہم کرنے کی پیش کش کی ہے۔ اس جاسوس نے یہ بھی بتایا کہ بنوسعد کا اجتماع کس مقام پر ہے۔ چناں چہ حضرت علیؓ نے ان پر شب خون مارا اور پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں بطورِ مالِ غنیمت لے کر مدینہ تشریف لے آئے۔ اس سریے میں مسلمانوں کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

سریہ ام قرفہ

یہ سریہ حضرت ابوبکر صدیقؓ (یا حضرت زید بن حارثہؓ) کی قیادت میں رمضان چھے ہجری میں روانہ کیا گیا۔ اسے سریہ وادیٔ القریٰ بھی بعض مورخین نے لکھا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بنوفزارہ کی ایک شاخ نے دھوکے سے آنحضور ﷺ کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ حضرت سلمہ بن اکوعؓ کا بیان ہے کہ اس سریہ میں بھی آپؓ کے ساتھ تھا۔ جب ہم صبح کی نماز پڑھ چکے تو آپ کے حکم سے ہم لوگوں نے چھاپہ مارا اور چشمے پر دھاوا بول دیا۔ ابوبکر صدیقؓ نے کچھ لوگوں کو قتل کیا۔ مَیں نے ایک گروہ کو دیکھا جس میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ لوگ مجھ سے پہلے پہاڑ پر نہ پہنچ جائیں۔ مَیں نے انھیں پکڑنے کی کوشش کی اور ان کے اور پہاڑ کے درمیان ایک تیر پھینکا۔ تیر دیکھ کر یہ لوگ ٹھہر گئے۔ ان میں ام قرفہ نامی عورت بھی تھی جو ایک پرانی پوستین اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی بھی تھی جو عرب کی خوب صورت ترین عورتوں میں سے تھی۔ میں ان سب کو کھینچتا ہوا ابوبکر صدیقؓ کے پاس لے آیا۔ انھوں نے وہ لڑکی مجھے عطا کی۔ مَیں نے اس کا کپڑا تک نہ کھولا تھا کہ بعد میں حضور ﷺ نے یہ لڑکی مجھ (سلمہؓ بن اکوع) سے لے کر مکہ بھیج دی، اور اس کے عوض وہاں کے متعدد مسلمان قیدیوں کو رہا کرا لیا۔

ام قرفہ ایک شیطان صفت عورت تھی۔ حضور ﷺ کے قتل کی تدبیریں کیا کرتی تھی اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنے خاندان کے تیس شہسوار بھی تیار کیے تھے۔ لہٰذا اسے ٹھیک بدلہ مل گیا اور اس کے تیسوں سوار مارے گئے۔

سریہ عبداللہ بن رواحہ

یہ سریہ بھی شوال چھے ہجری میں ہوا تھا۔ اہل یہود نے ابورافع کے قتل کے بعد اسیر بن رزام کو اپنا سردار بنا لیا تھا۔ اسیر نے حضور ﷺ سے جنگ کرنے کے لیے قبیلہ بنی غطفان اور دیگر قبائل کو اپنی حمایت پر آمادہ کیا۔ حضور ﷺ کو جب اس صورت حال کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو تحقیق حال کے لیے روانہ فرمایا۔ انھوں نے واپس آ کر خبر دی کہ واقعہ صحیح ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہ ہی کو تیس آدمیوں کے ساتھ روانہ فرمایا کہ وہ اسیر کو ہم راہ لے آئیں تا کہ اس سے زبانی گفتگو ہو سکے۔

اسیر بن رزام بھی اپنے ہم راہ تیس آدمی لے کر حضرت عبداللہؓ کے ساتھ روانہ ہوا۔ ایک ایک اونٹ پر دو دو آدمی سوار تھے، یعنی ایک مسلمان اور ایک یہودی۔ راستے میں اہل یہود کی نیت میں فتور آ گیا۔ اسیر بن رزام اور حضرت عبداللہؓ ایک اونٹ پر سوار تھے۔ اسیر نے بدنیتی سے دو دفعہ تلوار چلانی چاہی، مگر حضرت عبداللہؓ نے درگزر کیا۔ جب تیسری باری اسیر نے یہی حرکت کی تو طرفین میں جنگ چھڑ گئی۔ مسلمانوں نے اللہ کی امداد سے یہودیوں کو قتل کر دیا۔ صرف ایک آدمی زندہ بچا جو بھاگ گیا۔

مسلمانوں میں صرف حضرت عبداللہؓ زخمی ہوئے۔ باقی تمام اللہ کے فضل سے محفوظ رہے۔ جب یہ لوگ مدینہ واپس آئے اور تمام حالات حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیے تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تمھیں ظالموں سے نجات دی۔''

حضور ﷺ نے اپنے لعاب مبارک حضرت عبداللہؓ کے زخم پر لگایا، جس سے وہ صحت یاب ہو گئے۔ پھر حضرت عبداللہؓ کے چہرے پر اپنا دست مبارک پھیر کر ان کے حق میں دعا فرمائی۔

سریہ عرنیین

یہ سریہ بھی شوال چھے ہجری میں حضرت کرز بن جابر الفہری کی قیادت میں روانہ کیا گیا، اور انھی کی شخصیت کی نسبت سے سریہ کرز بن جابر الفہری بھی کہلاتا ہے۔ یہ وہی حضرت ہیں جنھوں نے غزوۂ بدر سے پہلے غزوہ صفوان میں مدینہ کے مویشیوں پر چھاپہ مارا تھا۔ بعد میں انھوں نے اسلام قبول کیا اور فتح مکہ کے موقع پر شہید ہوئے۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ قبیلہ عکل اور عرینہ کے چند افراد نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ مدینہ ہی میں قیام کیا، لیکن مدینہ کی آب و ہوا انھیں راس نہ آئی، اور خلاف عادت آبادی میں رہنے کی وجہ سے ان کے پیٹ پھول گئے اور رنگ زرد ہو گئے۔ انھوں نے درخواست کی کہ انھیں اپنی ابتدائی پرورش کے مطابق میدانوں میں رہنے اور جانوروں کا دودھ پینے کی اجازت فرمائی جائے۔

آنحضور ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور شہر سے باہر چراگاہ میں رہنے اور دودھ پینے کی اجازت دے دی۔ اس چراگاہ میں صدقات کے اونٹ رہتے تھے۔ یہاں چند روز رہنے کے بعد جب وہ لوگ تن درست و توانا ہو گئے تو اسلام سے پھر گئے۔ ازاں بعد چرواہے کو قتل کر کے اس کے ہاتھ، پاؤں، ناک اور کان کاٹے، آنکھوں میں کانٹے چبھوئے اور اونٹوں کو بھگا کر لے گئے۔

حضور ﷺ کو جب یہ خبر ملی تو آپ ﷺ نے حضرت کرز بن جابر الفہری کو بیس آدمیوں کے ساتھ ان کے تعاقب میں روانہ فرمایا۔ حضور ﷺ نے یہ دعا فرمائی کہ خداوندا، ان لوگوں پر راستہ تنگ کر دے۔ آخر یہی ہوا، یہ لوگ راستہ بھول گئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ جب مدینہ لائے گئے تو حضور ﷺ نے ان سے قصاص اور بدلہ لینے کا حکم دیا۔ چناں چہ یہ لوگ اسی طرح قتل کیے گئے، جس طرح ان لوگوں نے چرواہے کو قتل کیا تھا، لیکن آیندہ کے لیے یہ حکم ہو گیا کہ کوئی مجرم خواہ کتنا ہی سخت جرم کیوں نہ کرے، اسے ہرگز ایسی سزا نہ دی جائے۔ غرضیکہ قصاص اور انتقام میں بھی

مثلہ (قطع اعضا) حرام ہو گیا۔ یعنی اگر کوئی کافر کسی مسلمان کو قتل کر کے مثلہ کرے تو اس کے قصاص میں کافر کا قتل تو جائز ہو گا لیکن مثلہ نہیں کیا جائے گا۔

سریہ عمر بن امیہ

سیرت نگاروں نے ایک اور سریہ کا بھی ذکر کیا ہے جسے حضرت عمر بن امیہ ضمری ؓ نے حضرت سلمہؓ بن ابی سلمہ کی رفاقت میں شوال چھے ہجری میں سر کیا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ غزوہ خندق سے ابوسفیان اس طرح خائب و خاسر لوٹا تھا کہ اب وہ اپنی کامیابی سے مایوس ہو گیا اور اس کی یہ امید منقطع ہو گئی کہ اب وہ اپنی جنگی طاقت سے اسلام اور مسلمانوں کا استیصال کر سکیں گے۔ اسی بنا پر ابوسفیان نے لوٹتے وقت نہ انتقام کی قسم کھائی نہ دوبارہ حملہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، نہ مسلمانوں کو چیلنج کیا بلکہ خاموشی کے ساتھ پسپا ہو گیا۔ مکہ آ کر بھی اس کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ قریش اور دیگر قبائل کو مسلمانوں کے مقابلے کے لیے اکسائے اور جنگ پر آمادہ کرے۔ بنو قریظہ کے انجام سے ان کے سامنے بُرے بُرے خواب پیش آنے لگے، لیکن اسلام دشمنی کا جذبہ اپنی جگہ پر بے کم وکاست باقی تھا۔ اب مایوسی کے عالم میں اس نے یہ طے کیا کہ قوت سے نہیں تو دھوکے سے محمد ﷺ کو قتل کرا دو۔

ابوسفیان نے قریش کے چند آدمیوں کو مجلس میں کہا کہ کوئی محمد ﷺ کو دھوکے سے قتل کر دے۔ آخر وہ بازاروں میں تو چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ ایک بدوی نے اس کا ذمہ لیا کہ میں دھوکے سے قتل کر دوں گا، بشرطیکہ میری مدد کی جائے۔ میرے پاس خنجر ہے، جس سے میں حملہ کروں گا۔ پھر کسی قافلے میں مل جاؤں گا۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ جاؤں گا۔ میں راستے سے اچھی طرح واقف ہوں اور خوب جانتا ہوں۔

ابوسفیان نے اسے زادِ راہ اور سواری دی، اور وہ مدینہ روانہ ہو گیا اور اس قدر تیزی کے ساتھ گیا کہ چھٹے دن پہنچ گیا۔ حضور ﷺ کو پوچھتا ہوا آیا۔ لوگوں نے آپ کی نشان دہی کر دی۔ وہ اپنی سواری باندھ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف آیا۔ آپ ﷺ اس وقت بنو عبدالاشہل کی مسجد میں تشریف فرما تھے۔

جب رسول اللہ نے اسے دیکھا تو اس کے تیور سے پہچان لیا کہ یہ شخص بدعہدی کا ارادہ رکھتا ہے۔ جب وہ حضور ﷺ کی طرف حملے کے لیے بڑھا تو حضرت اسیدؓ بن حضیرؓ نے اس کا تہ بند پکڑ کر کھینچا تو خنجر ہاتھ میں آ گیا۔ اب وہ گھبرا کر کہنے لگا: ''میرا خون، میرا خون۔''

حضور ﷺ نے دریافت فرمایا تو اس نے ابوسفیان کی ساری سازش اگل دی۔ آپ ﷺ نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔

اس پر حضور ﷺ نے ابوسفیان کی تادیب کے لیے عمر بن امیہ ضمری کو ایک اور آدمی کے ساتھ مکہ بھیجا۔ یہ مکہ پہنچے اور رات کو بیت اللہ کا طواف کرنے لگے۔ معاویہ بن ابی سفیان نے دیکھ لیا اور پہچان کر قریش کو خبر کر دی۔ راز فاش ہو گیا تو مجبوراً تادیب کے بغیر واپس آئے، لیکن عمر بن امیہ ضمری کے اس جرات مندانہ اقدام سے اہلِ مکہ پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔

غزوہ حدیبیہ

ہجرتِ نبوی ﷺ کے بعد چھے سال اس عالم میں گزرے کہ کبھی قریش سے تصادم ہوا تو کبھی یہودیوں سے جنگ و جدال تک نوبت پہنچی، لیکن اس بحرانی دور میں بھی اسلام کی نشر و اشاعت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی اجتماعی قوت بھی ترقی کرتی گئی۔ ہجرت کے سالِ اول ہی میں مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس کی بجائے بیت الحرام یا کعبہ قرار پایا۔ گویا مسلمانوں نے اس بیت اللہ کی جانب منہ کر کے نمازیں پڑھنی شروع کیں جس کی بنیاد حضرت ابراہیمؑ نے مکہ مکرمہ میں رکھی تھی اور جس کی تعمیر جدید میں خود آنحضور ﷺ نے عہدِ شباب میں حصہ لیا تھا بلکہ حجر اسود کی تنصیب کا شرف بھی اتفاق رائے سے آپ ﷺ ہی کو حاصل ہوا تھا۔ یہ واقعہ ان ایام سے تعلق رکھتا ہے جب کہ نہ خود آپ ﷺ کے اور نہ دوسروں کے دل میں کبھی خیال گزرا تھا کہ آپ ﷺ منصبِ نبوت پر سرفراز ہونے والے ہیں۔

مسجد حرام یعنی کعبہ سال ہا سال سے عرب کی مشہور عبادت گاہ تھا۔ ان مہینوں میں، جن کی حرمت مسلم تھی، لوگ خانہ خدا کی زیارت کے لیے کشاں کشاں آتے تھے اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جو شخص اس گھر میں داخل ہو جاتا ہے، دشمن اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ اگر حرم کی حدود میں کسی کا سخت ترین دشمن سے بھی آمنا سامنا ہو جاتا تو اسے یہ جرات نہ ہوتی کہ تلوار نیام سے باہر نکالے اور حریف پر حملہ آور ہو۔

اپنی روایات کے برخلاف قریش نے اس موقع پر، جب کہ مسلمانوں نے آنحضرت کی معیت میں مکہ سے ہجرت کی، اپنے دل میں یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو، ہم مسلمانوں کو کعبے کی حدود میں داخل نہیں ہونے دیں گے، اور نہ انھیں دیگر قبائل عرب کی طرح زیارت کی سہولت دی جائے گی۔ اسی سلسلے میں ہجرت کے پہلے سال یہ آیت (بقرہ۔217) نازل ہوئی:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (البقرہ: 217)

''(اے رسول ﷺ) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو اس میں لڑنا بہت بُرا ہے، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے اور فتنہ قتل سے شدید تر ہے۔''

غزوۂ بدر کے بعد سورۂ انفال کی آیات 34 تا 36 نازل ہوئیں جن کا ترجمہ یہ ہے: ''اور ان کے اندر ایسی کون سی بات ہے کہ اللہ انھیں عذاب نہ دے، جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ وہ مسجد حرام کا راستہ روکتے ہیں، حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں۔ اس کے جائز متولی تو صرف اہل تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں، مگر اکثر لوگ اس بات کو نہیں جانتے۔ بیت اللہ کے پاس ان لوگوں کی نماز کیا ہوتی ہے۔ بس سیٹیاں بجاتے اور

تالیاں پیٹتے ہیں۔ پس اب لو، اس عذاب کا مزا چکھو اپنے اس انکارِ حق کی پاداش میں جو تم کرتے رہے ہو۔ جن لوگوں نے حق کو ماننے سے انکار کیا ہے، وہ اپنے مال خدا کے راستے سے روکنے کے لیے صرف کر رہے ہیں اور ابھی اور خرچ کرتے رہیں گے۔ مگر آخر کار یہی کوششیں ان کے لیے پچھتاوے کا سبب بنیں گی۔ پھر وہ مغلوب ہوں گے۔ اور قیامت کے دن کافر جہنم کی طرف ہانکے جائیں گے۔''

اس آیت میں یہ بنیادی نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ وہ اس مسجد حرام کے جائز متولی نہیں ہیں بلکہ اس کے جائز متولی تو صرف اہل تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں۔'' یہ حقیقت ہے کہ کعبے پر صرف قریش ہی کا نہیں بلکہ پورے عرب کا حق تھا۔ قریش کے فرائض میں تو سقایت (حاجیوں کو پانی پلانا)، حجابت (کعبے کی نگہداشت) اور زائرین کی خبر گیری ایسے امور داخل تھے۔ بات یہ تھی کہ عرب قبائل میں سے ہر قبیلے کے بت جدا جدا تھے، وہ انھی کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے تھے۔ دوسرے بتوں سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا، لہٰذا قریش کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ کسی قبیلے کو کعبے کی زیارت، طواف یا اپنے معبود کی پرستش سے روکیں۔ آنحضرت ﷺ بت پرستی سے اجتناب اور شرک و منافقت سے بیزاری کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ ﷺ کی دینی دعوت کا مقصد تقویٰ اور روحانی ترقی کا حصول تھا۔ حج اور عمرہ بھی اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں، اس لیے ایک نئے دین کے پیروکاروں کو اس اہم فریضے کی ادائیگی سے روکنا نہایت نازیبا اور ناشائستہ روش تھی۔ ادھر قریش کو یہ اندیشہ تھا کہ اگر کہیں آنحضرت ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ (جو ہیں بھی کعبے کے باشندے)، زیارتِ کعبہ کے لیے آئے تو مکے کے اکثر و بیشتر لوگ ان کے دین میں شامل ہو جائیں گے اور ان پر مظالم کی حقیقت واضح ہو جائے گی جو ان پر جلا وطنی اور اعزہ و اقربا سے دوری کی شکل میں توڑے گئے ہیں اور اس کا نتیجہ سوائے خانہ جنگی کے کچھ اور نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں امرائے قریش اور سرداران مکہ کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ شام سے ان کی تجارتی آمد و رفت کی راہیں حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے پیروؤں کی دخل اندازی سے مسدود ہوئی ہیں، اس لیے ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غیظ و غضب کی بھٹی دہک رہی تھی۔ اس آگ کے شعلے اس تصور سے ہرگز سرد نہ ہو سکتے تھے کہ کعبہ خدا کا گھر ہے اور تمام قبائل عرب کا اس پر حق ہے اور قریش پر صرف اس کی نگہداشت اور زائرین کی حفاظت وضیافت کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

آنحضور ﷺ کا خواب

ہجرت پر چھے بہاریں بیت چکی تھیں اور مسلمان کعبے کی زیارت اور حج و عمرہ کی ادائی کے لیے بے تاب تھے۔ ایک روز رسول اللہ نے خواب میں دیکھا کہ آپ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ تشریف لے گئے ہیں اور وہاں عمرہ ادا کیا ہے۔ پیغمبر کا خواب ظاہر ہے کہ محض خواب وخیال نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ تو وحی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے۔ سورۂ فتح کی آیت 27 میں اس کا ذکر موجود ہے:

﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ فَعَلِمَ مَالَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾ (الفتح: 27)

''فی الواقع اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا تھا جو ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق تھا۔ ان شاء اللہ تم ضرور مسجد حرام میں پورے امن کے ساتھ داخل ہو گے، اپنے سر منڈواؤ گے اور بال ترشواؤ گے اور تمھیں کوئی خوف نہ ہوگا۔ وہ اس بات کو جانتا تھا جسے تم نہ جانتے تھے، اس لیے وہ خواب پورا ہونے سے پہلے اس نے یہ قریبی فتح تمھیں عطا فرما دی۔''

جوں ہی مسلمانوں نے یہ بشارت سنی، انھوں نے سجدہ شکر ادا کیا اور یہ خبر آناً فاناً مدینے کے طول و عرض میں پھیل گئی، لیکن مسلمان اس سوچ میں تھے کہ مسجد حرام میں ان کا داخلہ کیسے ممکن ہے؟ کیا انھیں اس مقصد کے لیے ہتھیار اٹھانے ہوں گے؟ کیا وہ قریش کو مکہ سے نکال باہر کرنے میں کام یاب ہو جائیں گے؟ یا قریش خود اپنی مرضی سے ان کی اطاعت کا جوا اپنی گردن میں ڈال کر بیت اللہ کے دروازے ان پر کھول دیں گے۔

مسلمانوں میں روانگی کا اعلان

اس مقصد کے حصول کے لیے جنگ ناگزیر نہ تھی۔ حضور ﷺ نے اعلان کر دیا کہ مسلمان ذی قعدہ میں سفرِ حج کے لیے تیار ہو جائیں۔ اس ضمن میں آپ ﷺ نے عرب قبائل کو بھی پیغام بھیجا کہ وہ بھی بیت اللہ کی طرف آپ ﷺ کی معیت میں رخ کریں۔ جنگ کے ارادے سے نہیں، بلکہ امن وسلامتی اور صلح و آشتی کی نیت سے۔ اس دوران میں آپ ﷺ کی خواہش تھی کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں آپ ﷺ کے ساتھ شریک سفر ہوں، تا کہ قبائل عرب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ آپ نے جنگ کے ارادے سے نہیں، بلکہ فریضہ حج کی بجا آوری کے لیے مکہ کے لیے رختِ سفر باندھا ہے، جسے اسلام میں بھی عرب کے دیگر مذاہب کی طرح فرض کی حیثیت حاصل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کے ہم راہ دوسرے مذاہب کے پیرو بھی شامل ہیں تا کہ وہ بھی اس فرض سے سبک دوش ہو سکیں۔ اگر اس صورت میں بھی قریش ماہِ حرام میں جنگ پر آمادہ ہوں گے، اور اس فرض کی ادائی میں رکاوٹ ڈالیں گے، جس پر عقائد کے اختلاف کے باوجود تمام عرب کا ایمان ہے تو مستقبل میں عرب قبائل کا تعاون انھیں حاصل نہ ہو سکے گا اور اگر مسلمانوں سے جنگ چھڑی تو کوئی قبیلہ قریش کا ساتھ نہ دے گا، کیوں کہ مسلمانوں اور دوسرے قبائل کو بیت اللہ کے حج و طواف سے باز رکھنے کے معنی یہ لیے جائیں گے کہ قریش لوگوں کو دین اسماعیلؑ اور اپنے جد ابراہیمؑ کی ملت سے منقطع کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ عرب قبائل ان کے خلاف دوبارہ محاذ قائم نہ کریں گے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان لوگوں کی نظر میں اسلام کی اہمیت بڑھ جائے گی جو ابھی تک اس کے پیرو نہیں۔ علاوہ ازیں قریش ان لوگوں کو کیا جواب دیں گے جو احرام باندھے اور تلواریں نیام میں داخل کیے ہوئے اس عالم میں مکہ مکرمہ جائیں گے کہ ان کے ہم راہ قربانی کے جانور ہوں گے اور ان کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ وہ بیت اللہ کا طواف

کریں جو تمام عرب کی مشترکہ زیارت گاہ ہے۔

آپ ﷺ نے مدینہ پر ابن ام مکتوم کو اپنا جانشین مقرر فرمایا اور اپنی قصویٰ نامی اونٹنی پر سوار ہو کر یکم ذی قعدہ چھے ہجری روز دوشنبہ کو روانہ ہو گئے۔ آپ کے ہم راہ تقریباً پندرہ سو صحابہ کرام تھے۔ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ بھی ہم راہ تھیں۔ قربانی کے لیے ستر اونٹ بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے عمرے کے لیے احرام باندھا تا کہ سب پر یہ بات کھل جائے کہ آپ ﷺ کا ارادہ جنگ کا نہیں ہے، بلکہ آپ ﷺ صرف عمرے کی نیت اور خانہ کعبہ کے طواف کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ جب آپ ﷺ مقام ذوالحلیفہ پہنچے تو سب نے عمرے کا احرام باندھا۔ یہ مقام مدینے سے مکے کی جانب تقریباً چھے میل کے فاصلے پر ہے۔ اب اسے بئر علی کہتے ہیں اور مدینہ منورہ کے حاجی اسی مقام سے حج اور عمرے کا احرام باندھتے ہیں۔ اسی مقام سے آپ ﷺ نے بنی خزاعہ کے ایک شخص بشر بن سفیان کو سراغ رسانی کے لیے پہلے بھیج دیا کہ وہ قریش مکہ کا ارادہ معلوم کر کے آنحضور ﷺ کو مطلع کرے۔

اس وقت مکہ اور مدینے کے تعلقات کی جو نوعیت تھی، عرب کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔ ابھی پچھلے سال ہی تو شوال پانچ ہجری میں قریش نے قبائل عرب کی متحدہ طاقت کے ساتھ مدینے پر چڑھائی کی تھی اور غزوہ خندق کا مشہور معرکہ پیش آیا تھا۔ اس لیے جب نبی کریم ﷺ اتنے بڑے قافلے کے ساتھ اپنے خون کے پیاسے دشمنوں کے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو پورے عرب کی نگاہیں اس عجیب سفر کی طرف مرکوز ہو گئیں، اور لوگوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ یہ قافلہ لڑنے کے لیے نہیں جا رہا ہے بلکہ ماہِ حرام میں، احرام باندھ کر، ہدی کے اونٹ ساتھ لیے ہوئے بیت اللہ کا طواف کرنے جا رہا ہے اور قطعی طور پر مسلح ہے۔

قریش مکہ کو حضور ﷺ کے اس اقدام نے سخت پریشانی میں ڈال دیا۔ ذی قعدہ کا مہینہ ان حرام مہینوں میں سے تھا جو صدیوں سے عرب میں حج و عمرے کے لیے محترم سمجھے جاتے تھے۔ اس مہینے میں جو قافلہ احرام باندھ کر حج یا عمرے کے لیے جا رہا ہو، اسے روکنے کا کسی کو حق نہ تھا، حتیٰ کہ کسی قبیلے سے اس کی دشمنی بھی ہو تو عرب کے مسلمہ قوانین کی رُو سے وہ اپنے علاقے سے اس کے گزرنے میں مانع نہ ہو سکتا تھا۔ قریش کے لوگ اس الجھن میں پڑ گئے کہ اگر ہم مدینے کے اس قافلے پر حملہ کر کے اسے مکہ معظمہ میں داخل ہونے سے روکتے ہیں تو پورے ملک میں اس پر شور مچ جائے گا۔ عرب کا ہر شخص پکار اٹھے گا کہ یہ سراسر زیادتی ہے۔ تمام قبائل عرب یہ سمجھیں گے کہ ہم خانہ کعبہ کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ ہر قبیلہ اس تشویش میں مبتلا ہو جائے گا کہ آئندہ کسی کو حج اور عمرہ کرنے دینا یا نہ کرنے دینا اب ہماری مرضی پر موقوف ہے۔ جس سے بھی ہم ناراض ہوں گے، اسے بیت اللہ کی زیارت کرنے سے اسی طرح روک دیں گے، جس طرح آج مدینے کے ان زائرین کو روک رہے ہیں۔ یہ ایسی غلطی ہوگی جس سے سارا عرب ہم سے منحرف ہو جائے گا، لیکن اگر محمد ﷺ کو اتنے بڑے قافلے کے ساتھ بخیریت اپنے شہر میں داخل ہونے دیتے ہیں تو پورے ملک میں ہماری ہوا اکھڑ جائے گی اور لوگ کہیں گے کہ ہم محمد ﷺ سے مرعوب ہو گئے۔ آخر کار بڑی کشش و پیچ کے بعد ان کی جاہلانہ حمیت ہی ان پر غالب آ کر رہی اور انھوں نے اپنی ناک کی خاطر یہ فیصلہ کر لیا کہ کسی قیمت پر بھی اس قافلے کو اپنے شہر میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

جب حضور ﷺ عسفان پہنچے تو بشر بن سفیان نے آ کر آپ ﷺ کو اطلاع دی کہ قریش کے لوگ پوری تیاری کے ساتھ ذی طویٰ کے مقام پر پہنچ گئے ہیں اور خالد بن ولید کو انھوں نے دو سو سواروں کے ساتھ کراع الغمیم کی طرف آگے بھیج دیا ہے، تا کہ وہ آپ ﷺ کا راستہ روکیں۔ یہ مقام مکہ سے باہر عسفان کے راستے پر واقع ہے۔ قریش کی چال یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح آنحضرت ﷺ کے ساتھیوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے انھیں اشتعال دلائیں اور پھر اگر لڑائی ہو جائے تو پورے ملک میں یہ مشہور کر دیں کہ یہ لوگ دراصل آئے تھے لڑنے کے لیے، مگر بہانہ انھوں نے عمرے کا کیا تھا، اور احرام محض دھوکا دینے کے لیے باندھ رکھا تھا۔

حضور ﷺ نے یہ اطلاع پاتے ہی فوراً راستہ بدل دیا اور ایک نہایت دشوار گزار راستے سے سخت مشقت اٹھا کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچ گئے جو عین حرم کی سرحد پر واقع تھا۔ یہاں بنی خزاعہ کا سردار بدیل بن ورقا اپنے قبیلے کے چند آدمیوں کے ساتھ آپ ﷺ کے پاس آیا اور اس نے پوچھا کہ آپ ﷺ کس غرض سے یہاں آئے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے۔ صرف بیت اللہ کی زیارت اور اس کا طواف ہمارے پیش نظر ہے۔''

قبیلہ بنی خزاعہ رسول اللہ ﷺ کا خیر خواہ تھا۔ بدیل نے کہا: ''میں کعب بن لوی کو دیکھ کر آ رہا ہوں کہ وہ حدیبیہ کے فراواں پانی کے پاس پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ ان کے ہم راہ عورتیں اور بچے بھی ہیں۔ وہ آپ ﷺ سے لڑنے اور آپ ﷺ کو بیت اللہ سے روکنے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے ہیں۔ قریش کو لڑائیوں نے تھکا دیا ہے، اور سخت نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے اگر وہ چاہیں تو ان سے ایک مدت طے کر لوں اور وہ میرے اور لوگوں کے درمیان سے ہٹ جائیں۔ پھر میرے غلبے کی صورت میں جس چیز (اطاعت) میں لوگ داخل ہوں گے، اس میں وہ بھی داخل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ مدت کے اختتام تک وہ تازہ دم تو ہو ہی چکے ہوں گے اور انھیں جنگ کے سوا کچھ اور منظور نہیں تو اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! میں اپنے دین کے معاملے میں ان سے اس وقت تک لڑتا رہوں گا جب تک کہ میری گردن جدا نہ ہو جائے یا جب تک اللہ اپنا امر نافذ نہ کر دے۔''

یہی بات بدیل قریش کے ایلچی نے جا کر قریش کے سرداروں کو بتا دی اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ ان زائرین کا راستہ نہ روکیں۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اب قریش نے مکرز بن حفص کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آپ ﷺ نے اس سے وہی بات کہی جو بدیل اور اس کے رفقا سے کہی تھی۔ اس نے واپس جا کر قریش کو

پوری بات سے آگاہ کیا۔

پھر قریش نے احابیش کے سردار حلیس بن علقمہ کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا۔ احابیش اطرافِ مکہ میں رہنے والے چند قبائل کا مجموعہ تھا جس سے قریش کے حلیفانہ تعلقات تھے۔ قریش کا مقصد یہ تھا کہ جب محمد ﷺ اس کی بات نہ مانیں گے تو وہ ان سے ناراض و مایوس ہو کر لوٹے گا اور پھر احابیش قبائل کی پوری طاقت ہمارے ساتھ ہوگی۔ مگر جب حلیس نے آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ سارا قافلہ احرام باندھے ہوئے ہے۔ ہدی (قربانی) کے اونٹ سامنے کھڑے ہیں، جن کی گردنوں میں قلاوے پڑے ہوئے ہیں، اور یہ لوگ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بیت اللہ کا طواف کرنے کے لیے آئے ہیں تو وہ حضور ﷺ سے کوئی بات کیے بغیر مکہ کی طرف پلٹ گیا اور اس نے جا کر قریش کے سرداروں سے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ لوگ بیت اللہ کی عظمت مان کر اس کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ اگر تم انھیں روکو گے تو احابیش اس کام میں تمھارا ساتھ ہرگز نہ دیں گے۔ ہم تمھارے حلیف اس لیے نہیں بنے ہیں کہ تم حرمتوں کو پامال کرو اور ہم اس میں تمھاری حمایت کریں۔

بدیل کا بیان سننے کے بعد عروہ بن مسعود ثقفی نے کہا کہ اگر یہ باتیں محمد ﷺ نے کہی ہیں تو نہایت پسندیدہ ہیں اور قبول کر لینی چاہئیں، مگر مجھے اجازت دو کہ میں خود جا کر محمد ﷺ سے ملوں اور دیکھوں کہ یہاں ان کے آنے کی غرض کیا ہے؟

عروہ نے اپنے طور پر بڑی اونچ نیچ سمجھا کر رسول کریم ﷺ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ آپ مکہ میں داخل ہونے کے ارادے سے باز آجائیں، مگر آپ ﷺ نے اسے بھی وہی جواب دیا جو بنی خزاعہ کے سردار بدیل کو دیا تھا کہ ہم لڑائی کے ارادے سے نہیں آئے ہیں، بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔

واپس جا کر عروہ نے قریش کے لوگوں سے کہا ”میں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں میں بھی گیا ہوں، مگر خدا کی قسم، مَیں نے اصحاب محمد ﷺ کو جس طرح محمد ﷺ کا فدائی دیکھا ہے، ایسا منظر کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے ہاں بھی نہیں دیکھا۔ ان لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ محمد ﷺ وضو کرتے ہیں تو ان کے اصحاب پانی کا ایک قطرہ تک زمین پر نہیں گرنے دیتے اور سب اپنے جسم اور کپڑوں پر مل لیتے ہیں۔ اب تم لوگ سوچ لو کہ تمھارا مقابلہ کس سے ہے۔

خفیہ حملہ

اس دوران میں جب کہ ایلچیوں کی آمد و رفت اور گفت و شنید کا یہ سلسلہ جاری تھا، قریش کے لوگ بار بار یہ کوشش کرتے رہے کہ چپکے سے حضور ﷺ کے کیمپ پر چھاپے مار کر صحابہ کو اشتعال دلائیں اور کسی نہ کسی طرح ان سے کوئی ایسا اقدام کرا لیں جس سے لڑائی کا بہانہ ہاتھ آجائے، مگر ہر مرتبہ صحابہ کے صبر و ضبط اور حضور ﷺ کی حکمت و فراست نے ان کی ساری تدبیروں کو ناکام کر دیا۔ ایک دفعہ ان کے چالیس پچاس آدمی رات کے وقت آئے اور مسلمانوں کے پڑاؤ پر پتھر اور تیر برسانے لگے۔ صحابہ نے ان سب کو گرفتار کر کے حضور ﷺ کے سامنے پیش کر دیا، مگر آپ نے ان سب کو چھوڑ دیا۔ ایک اور موقع پر تنعیم کی طرف سے ستر اسی آدمی عین نمازِ فجر کے وقت آئے اور انھوں نے اچانک چھاپہ مار دیا۔ یہ لوگ بھی پکڑے گئے، مگر حضور ﷺ نے انھیں بھی رہا کر دیا۔ اس طرح قریش کو اپنی ہر چال اور ہر تدبیر میں ناکامی ہوتی گئی۔

اسی کے بارے میں سورۂ فتح کی آیت 24 نازل ہوئی:

﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرًا﴾

(الفتح: 24)

”وہی ہے جس نے مکہ کی وادی میں ان کے ہاتھ تم سے اور تمھارے ہاتھ ان سے روک دیئے، حالانکہ وہ ان پر تمھیں غلبہ عطا کر چکا تھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے، اللہ اسے دیکھ رہا تھا۔“

حضرت عثمانؓ کی سفارت

آخر کار حضور ﷺ نے خود اپنی طرف سے حضرت عثمان کو ایلچی بنا کر مکہ بھیجا اور ان کے ذریعے سے سردارانِ قریش کو یہ پیغام دیا کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ زیارت کے لیے آئے ہیں، مگر وہ لوگ نہ مانے اور حضرت عثمانؓ کو مکے ہی میں روک لیا۔ اہل مکہ نے حضرت عثمانؓ کو اجازت دی کہ اگر وہ چاہیں تو اکیلے طواف کر سکتے ہیں، مگر حضرت عثمانؓ نے قریش کی اس پیشکش کو قبول نہیں کیا اور کہا: ”میں بغیر رسول اللہ ﷺ کے کبھی طواف نہ کروں گا۔“ قریش یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے، مگر حضرت عثمانؓ کو وہیں روک لیا۔ حضرت عثمانؓ کے دیر تک رکے رہنے کی وجہ سے مسلمانوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ انھیں قتل کر دیا گیا ہے۔

بیعت رضوان

اب مزید تحمل کا کوئی موقع نہ تھا۔ مکہ میں داخلے کی بات تو دوسری تھی۔ اس کے لیے طاقت کا استعمال ہرگز پیشِ نظر نہ تھا، مگر جب نوبت سفیر کے قتل تک پہنچ گئی تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ باقی نہ رہا کہ مسلمان جنگ کے لیے تیار ہو جائیں چناں چہ رسول کریم ﷺ نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور ان سے اس بات پر بیعت لی کہ یہاں سے ہم مرتے دم تک پیچھے نہ ہٹیں گے۔ موقع کی نزاکت نگاہ میں ہو تو آدمی سمجھ سکتا ہے کہ یہ کوئی معمولی بیعت نہ تھی۔ مسلمان صرف پندرہ سو تھے اور کسی سامانِ جنگ کے بغیر آئے تھے۔ اپنے مرکز سے ڈھائی سو میل دور، عین مکہ کی سرحد پر ٹھہرے ہوئے تھے، جہاں دشمن اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان پر حملہ آور ہو سکتا تھا اور گرد و پیش سے اپنے حامی قبیلوں کو لا کر بھی انھیں گھیر سکتا تھا۔ اس کے باوجود ایک منافق شخص جد بن قیس کے سوا پورا قافلہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر مرنے مارنے کی بیعت کرنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے ایمانی اخلاص اور راہِ خدا میں ان کی فدائیت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے ابوسنانؓ عدی نے بیعت کی اور پھر باری باری سب صحابہؓ۔ حضرت سلمہؓ بن اکوع نے تین بار بیعت کی۔ حضرت عثمانؓ چوں کہ موجود نہیں تھے، اس

لیے حضور ﷺ نے اپنے بائیں ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ کہہ کر اپنے دائیں ہاتھ میں رکھا اور فرمایا کہ یہ بیعت عثمانؓ کی طرف سے ہے۔ پھر جب بیعت مکمل ہو چکی تو حضرت عثمانؓ بھی آ گئے اور انھوں نے بھی بیعت کی۔

رسول اللہ نے یہ بیعت ایک درخت کے نیچے لی۔ حضرت عمرؓ آپ کا دست مبارک تھامے ہوئے تھے اور حضرت معقل بن یسارؓ نے درخت کی بعض ٹہنیاں پکڑ کر رسول اللہ ﷺ کے اوپر سے ہٹا رکھی تھیں۔ اسی بیعت کا نام بیعت رضوان ہے۔ اس کے متعلق سورۂ فتح کی آیات 18 اور 19 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًاo وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً يَّاْخُذُوْنَهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًاo﴾ (الفتح: 18تا19)

''اللہ مومنوں سے خوش ہو گیا، جب وہ درخت کے نیچے تم سے بیعت کر رہے تھے ان کے دلوں کا حال اسے معلوم تھا، اس لیے اس نے سکینت اور طمانیت نازل فرمائی۔ انھیں انعام میں قریبی فتح بخشی، اور بہت سا مالِ غنیمت انھیں عطا کر دیا جسے وہ عن قریب حاصل کریں گے۔ اللہ زبردست اور حکیم ہے۔''

صلح نامہ حدیبیہ

حضرت عثمانؓ کے پیچھے قریش کی طرف سے سہیل بن عمرو کی قیادت میں ایک وفد بھی صلح کی بات چیت کرنے کے لیے حضور ﷺ کے کیمپ میں پہنچ گیا۔ اب قریش اپنی اس ضد سے ہٹ گئے تھے کہ وہ حضور ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو سرے سے مکہ میں داخل ہی نہ ہونے دیں گے۔ البتہ اپنی ناک بچانے کے لیے انھیں صرف یہ اصرار تھا کہ آپ اس سال واپس چلے جائیں، آیندہ سال آپ عمرے کے لیے آ سکتے ہیں۔ طویل گفت و شنید کے بعد جن شرائط پر صلح کی دفعات طے ہوگئیں، وہ یہ تھیں:

(1)......دس سال تک فریقین کے درمیان جنگ بند رہے گی اور ایک دوسرے کے خلاف خفیہ اور علانیہ کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔

(2)......اس دوران میں قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر بھاگ کر محمد ﷺ کے پاس جائے گا، اسے آپ ﷺ واپس کر دیں گے، اور آپ ﷺ کے اصحاب میں سے جو شخص قریش کے پاس چلا جائے گا، اسے وہ واپس نہ کریں گے۔

(3)......قبائل عرب میں سے جو قبیلہ بھی فریقین میں سے کسی ایک کا حلیف بن کر اس معاہدے میں شامل ہونا چاہے گا، اسے اس کا اختیار ہوگا۔

(4)......محمد ﷺ اس سال واپس جائیں گے اور آیندہ سال وہ عمرے کے لیے آ کر تین دن مکہ میں ٹھہر سکتے ہیں۔ ان کے ساتھ سوار کا ہتھیار ہوگا۔ تلواریں میانوں میں ہوں گی اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ ہوگا۔ ان تین دنوں میں اہل مکہ ان کے لیے شہر خالی کر دیں گے تاکہ کسی تصادم کی نوبت نہ آئے، مگر واپس جاتے ہوئے وہ یہاں کے کسی شخص کو اپنے ساتھ لے جانے کے مجاز نہ ہوں گے۔

صلح نامے کی شرائط طے ہونے کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو بلایا کہ تحریر لکھ دیں، اور یہ املا کرایا: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اس پر سہیل نے کہا: ''ہم نہیں جانتے، رحمٰن کیا ہے، رحیم کیا ہے؟ آپ یوں لکھیے: 'باسمك اللّٰهم' (اے اللہ تیرے نام سے)۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو حکم دیا کہ جیسا یہ کہہ رہے ہیں، وہی لکھو، اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ املا کرایا: ''یہ وہ بات ہے جس پر محمد رسول اللہ ﷺ نے مصالحت کی۔'' اس پر سہیل نے کہا: ''اگر ہم جانتے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں تو پھر ہم نہ تو آپ ﷺ کو بیت اللہ سے روکتے اور نہ جنگ کرتے، لہٰذا آپ محمد بن عبداللہ لکھوائیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں اللہ کا رسول ہوں، اگرچہ تم لوگ جھٹلاؤ گے۔ پھر حضرت علیؓ کو حکم دیا محمد بن عبداللہ'' لکھیں اور لفظ رسول اللہ'' مٹا دیں، لیکن حضرت علیؓ نے گوارا نہ کیا کہ اس لفظ کو مٹائیں۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ اس کے بعد پوری دستاویز لکھی گئی۔

اہل قافلہ کا اضطراب

جس وقت اس معاہدے کی شرائط طے ہو رہی تھیں، مسلمانوں کا پورا قافلہ سخت مضطرب تھا۔ کوئی شخص بھی ان مصلحتوں اور حکمتوں کو نہیں سمجھ رہا تھا، جنھیں نگاہ میں رکھ کر نبی کریم ﷺ یہ شرائط قبول فرما رہے تھے۔ کسی کی نظر اتنی دور رس نہ تھی کہ اس صلح کے نتیجے میں جو خیر عظیم رونما ہونے والی تھی، اسے دیکھ سکے۔ کفار قریش اسے اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے اور مسلمان اس بات پر بے تاب تھے کہ ہم آخر دب کر یہ ذلیل شرائط کیوں قبول کریں۔ حضرت عمرؓ جیسے بالغ نظر مدبر تک کا یہ حال تھا کہ وہ خود کہتے ہیں: ''مسلمان ہونے کے بعد کبھی میرے دل میں شک نے راہ نہ پائی تھی، مگر اس موقع پر میں بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔''

حضرت عمرؓ بے چین ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس گئے اور کہا: ''کیا حضور ﷺ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟ کیا ہم مسلمان نہیں؟ کیا یہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟ پھر آخر ہم اپنے دین کے معاملے میں یہ ذلت کیوں اختیار کریں؟''

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: ''اے عمر، وہ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ انھیں ہرگز ضائع نہ کرے گا۔'' پھر حضرت عمرؓ سے صبر نہ ہوا۔ جا کر یہی سوالات خود حضور ﷺ سے بھی کیے اور حضور ﷺ نے بھی انھیں ویسا ہی جواب دیا جیسا حضرت ابوبکرؓ نے دیا تھا۔ بعد میں حضرت عمرؓ مدتوں اس گفتگو پر نادم رہے جو انھوں نے اس موقع پر حضور ﷺ سے کی تھی اور صدقات و نوافل ادا کرتے رہے تاکہ اللہ تعالیٰ انھیں معاف فرما دے۔

سب سے زیادہ دو باتیں اس معاہدے میں لوگوں کو بری طرح کھل رہی تھیں۔ ایک شرط نمبر دو، جس کے متعلق لوگ کہتے تھے کہ یہ صریح نامساوی شرط ہے۔ اگر مکہ سے بھاگ کر آنے والوں کو ہم واپس کریں تو مدینے سے بھاگ کر جانے والوں کو وہ کیوں واپس نہ کریں؟ حضور ﷺ نے اس پر فرمایا: ''جو ہمارے ہاں سے بھاگ کر ان کے پاس چلا جائے، وہ آخر ہمارے کس کام کا ہے؟ اللہ اسے ہم سے دور ہی

رکھے۔اور جوان کے ہاں سے بھاگ کر ہمارے پاس آجائے، اسے اگر ہم واپس کر دیں گے تو اللہ اس کے لیے خلاصی کی کوئی اور صورت پیدا فرمادے گا۔'' دوسری بات جو لوگوں کے دلوں میں کھٹک رہی تھی، وہ چوتھی شرط تھی۔مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ اسے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ تمام عرب کے سامنے گویا ہم ناکام واپس جارہے ہیں، مزید برآں، یہ سوال بھی دلوں میں خلش پیدا کررہا تھا کہ حضور ﷺ نے تو خواب میں یہ دیکھا تھا کہ ہم مکہ میں طواف کررہے ہیں، مگر یہاں تو ہم طواف کیے بغیر واپس جانے کی شرط مان رہے ہیں۔حضور ﷺ نے اس پر لوگوں کو سمجھایا کہ خواب میں آخر اسی سال طواف کرنے کی صراحت تو نہ تھی۔صلح نامہ کی شرائط کے مطابق اگر اس سال نہیں تو اگلے سال ان شاء اللہ طواف ہوگا۔

ابوجندلؓ کی واپسی

عین اس وقت جب صلح نامہ لکھا جارہا تھا، سہیل بن عمرو کے اپنے صاحب زادے ابوجندلؓ، جو مسلمان ہوچکے تھے اور کفارِ مکہ نے قید کررکھا تھا، کسی نہ کسی طرح بھاگ کر حضور ﷺ کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ان کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں اور جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔وہ زیریں مکہ سے نکل کر آئے تھے۔انھوں نے یہاں پہنچ کر اپنے آپ کو مسلمانوں کے درمیان ڈال دیا۔سہیل نے کہا:''یہ پہلا شخص ہے جس کے متعلق میں آپ ﷺ سے معاملہ کرتا ہوں کہ آپ اسے ازروئے معاہدہ واپس کردیں۔'' حضور ﷺ نے فرمایا:''ابھی تو ہم نے تحریر بھی مکمل نہیں کی ہے۔''اس نے کہا:''تب میں آپ ﷺ سے کسی بات پر صلح کا کوئی معاملہ ہی نہ کروں گا۔'' حضور ﷺ نے فرمایا:''اچھا تو تم اسے میری خاطر چھوڑ دو۔''اس نے کہا:''میں آپ ﷺ کی خاطر بھی نہیں چھوڑ سکتا۔'' حضور ﷺ نے فرمایا:''نہیں نہیں، اتنا تو کرہی دو۔''اس نے کہا:''نہیں نہیں، میں نہیں کرسکتا۔'' پھر سہیل نے اپنے بیٹے ابوجندلؓ کے چہرے پر چانٹا رسید کیا اور مشرکین کی طرف واپس کرنے کے لیے ان کے کرتے کا گلا پکڑ کر گھسیٹا۔ابوجندلؓ زور زور سے چیخ کر کہنے لگے:''مسلمانو! کیا مجھے مشرکین کی طرف واپس کیا جائے گا کہ وہ مجھے میرے دین کے متعلق فتنے میں ڈالیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''ابوجندلؓ! صبر کرو اور اسے باعثِ ثواب سمجھو۔اللہ تمھارے لیے اور تمھارے ساتھ جو دوسرے کم زور مسلمان ہیں، ان سب کے لیے کشادگی اور پناہ کی جگہ بنائے گا۔ہم نے قریش سے صلح کرلی ہے اور ہم نے انھیں اور انھوں نے ہمیں اس پر اللہ کا عہد دے رکھا ہے، اس لیے ہم بدعہدی نہیں کرسکتے۔''

اس کے بعد حضرت عمرؓ اچھل کر ابوجندلؓ کے پاس پہنچے۔وہ ان کے پہلو میں چلتے جارہے تھے اور کہتے جارہے تھے:''ابوجندل، صبر کرو۔یہ لوگ مشرک ہیں۔ان کا خون تو بس کتے کا خون ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تلوار کا دستہ بھی ان کے قریب کرتے جارہے تھے۔حضرت عمرؓ کا بیان ہے:''مجھے امید تھی کہ وہ تلوار لے کر اپنے باپ سہیل کو اڑادیں گے، لیکن انھوں نے اپنے باپ کے بارے میں بخل سے کام لیا اور معاہدہ نافذ ہوگیا۔''

عمرے کے لیے قربانی

رسول اللہ ﷺ صلح نامہ لکھوا کر فارغ ہوچکے تو فرمایا، اٹھو اور اپنے اپنے جانور قربان کرو۔سرمنڈواؤ اور احرام ختم کرو۔مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔حضور ﷺ نے تین مرتبہ حکم دیا، مگر صحابہؓ پر اس وقت رنج و غم اور دل شکستگی کا ایسا شدید غلبہ تھا کہ انھوں نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کی۔حضور ﷺ کے پورے دورِ رسالت میں اس ایک موقع کے سوا کبھی یہ صورت پیش نہیں آئی کہ آپ ﷺ صحابہؓ کو حکم دیں اور وہ اس کی تعمیل کے لیے دوڑ نہ پڑیں۔حضور ﷺ کو اس پر سخت صدمہ ہوا اور آپ ﷺ نے اپنے خیمے میں جاکر ام المومنین حضرت ام سلمہؓ سے اپنی کبیدہ خاطری کا ذکر کیا۔انھوں نے عرض کیا کہ آپ بس خاموشی کے ساتھ تشریف لے جاکر خود اپنا اونٹ ذبح فرمائیں اور حجام کو بلوا کر اپنا سر منڈوالیں۔اس کے بعد لوگ خود بخود آپ کے عمل کی پیروی کریں گے اور سمجھ لیں گے کہ جو فیصلہ ہوچکا ہے، وہ اب بدلنے والا نہیں ہے۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا اور آپ ﷺ کے عمل کو دیکھ کر لوگوں نے بھی قربانیاں کرلیں، سر منڈوالیے اور احرام سے نکل آئے، مگر ان کے دل غم سے کٹے جارہے تھے۔اس موقع پر گائے اور اونٹ سات سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کیے گئے۔آپ ﷺ نے وہ اونٹ ذبح کیا جو کسی زمانے میں ابوجہل کے پاس تھا۔اس کی ناک میں چاندی کا ایک حلقہ تھا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ مشرکین جل بھن کر رہ جائیں۔پھر حضور ﷺ نے سر منڈوانے والے کے لیے تین بار مغفرت کی دعا کی اور قینچی سے حجامت کرانے والوں کے لیے ایک بار۔

مہاجر خواتین کی واپسی سے انکار

صلح حدیبیہ کے بعد شروع شروع میں تو مسلمان مرد مکہ سے بھاگ بھاگ کر مدینہ آتے رہے اور انھیں اس معاہدے کے مطابق واپس کیا جاتا رہا۔پھر مسلمان خواتین کے آنے کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور سب سے پہلے ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط ہجرت کرکے مدینے پہنچیں۔کفار نے معاہدے کا حوالہ دے کر ان کی بھی واپسی کا مطالبہ کیا اور ام کلثوم کے دو بھائی ولید بن عقبہ اور عمارہ بن عقبہ انھیں واپس لے جانے کے لیے مدینے پہنچ گئے۔حضور ﷺ نے ان کا یہ مطالبہ اس دلیل کی بنا پر مسترد کردیا کہ اس دفعہ کے متعلق معاہدے میں جو لفظ لکھا گیا تھا، وہ یہ تھا:

"على ان لا يأتيك منا رجل وإن كان على دينك الا رددته الينا."

''اور یہ کہ تمھارے پاس ہم میں سے کوئی مرد بھی آئے، اگرچہ وہ تمھارے دین ہی پر ہو، تم اسے ہماری طرف واپس کروگے۔''

ہوسکتا ہے کہ سہیل بن عمرو نے رجل (مرد) کا لفظ ''شخص'' کے معنی میں استعمال کیا ہو، لیکن یہ اس کی ذہنی مراد ہوگی۔معاہدے میں جو لفظ لکھا گیا تھا، وہ ''رجل'' ہی تھا جو عربی زبان میں مرد کے لیے بولا جاتا ہے، آدمی کے لیے نہیں۔اسی بنا پر جب ام کلثوم کی واپسی کا مطالبہ لے کر ان کے بھائی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر

ہوئے تو حضور ﷺ نے انھیں واپس کرنے سے یہ کہ کر انکار فرمایا کہ ''شرط مردوں کے بارے میں تھی نہ کہ عورتوں کے بارے میں۔''

اس وقت تک خود قریش کے لوگ بھی اس غلط فہمی میں تھے کہ معاہدے کا اطلاق ہر طرح کے مہاجرین پر ہوتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، مگر جب حضور ﷺ نے انھیں معاہدے کے ان الفاظ کی طرف توجہ دلائی تو وہ دم بخود رہ گئے اور انھیں ناچار اس فیصلے کو تسلیم کرنا پڑا۔

معاہدے کی اس شرط کے لحاظ سے مسلمانوں کو حق تھا کہ جو عورت بھی مکہ چھوڑ کر مدینہ آتی، خواہ وہ کسی غرض سے آتی، اسے واپس دینے سے انکار کر دیتے۔ لیکن اسلام کو صرف مسلم خواتین کی حفاظت سے دلچسپی تھی۔ ہر طرح کی بھاگنے والی عورتوں کے لیے مدینہ کو پناہ گاہ بنانا مقصود نہ تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سورۂ ممتحنہ کی آیت 10 میں حکم دیا کہ: ''اے اہل ایمان! جو مومن عورتیں ہجرت کر کے تمھارے پاس آئیں تو ان کے مومن ہونے کی جانچ پڑتال کر لو اور ان کے ایمان کی حقیقت اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمھیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انھیں کفار کی طرف واپس نہ کرو۔ نہ وہ کفار کے لیے حلال ہیں اور نہ کفار ان کے لیے حلال۔ ان کے کافر شوہروں نے جو مہر انھیں دیئے تھے، وہ انھیں لوٹا دو۔ اور ان سے نکاح کر لینے میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جب کہ تم ان کے مہر ادا کر دو۔ اور کافرہ عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو۔ جو مہر تم نے اپنی کافرہ بیویوں کو دیئے تھے، وہ تم واپس مانگ لو اور جو مہر کافروں نے اپنی مسلمان بیویوں کو دیئے تھے، انھیں وہ واپس مانگ لیں۔ یہ اللہ کا حکم ہے۔''

پھر سورۃ الممتحنہ ہی کی اگلی آیت 12 میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آئی کہ خواتین سے بیعت لیتے وقت ان کا امتحان کس طرح لینا چاہیے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے نبی، جب تمھارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لیے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔ اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان گھڑ کر نہ لائیں گی، اور کسی امر معروف میں تمھاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان سے بیعت لے لو اور اُن کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کرو، یقیناً اللہ غفور رحیم ہے۔''

چناں چہ جو خواتین اس آیت میں ذکر کی ہوئی شرائط کی پابندی کا عہد کرتیں، آپ ﷺ ان سے فرماتے کہ میں نے تم سے بیعت لے لی۔ پھر انھیں واپس نہ کرتے۔ اس حکم کے مطابق مسلمانوں نے اپنی کافرہ بیویوں کو طلاق دے دی۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی زوجیت میں دو عورتیں تھیں جو شرک پر قائم تھیں۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کو طلاق دے دی۔ پھر ایک سے معاویہ نے شادی کر لی اور دوسری سے صفوان بن امیہ نے۔

فتح مبین

اس کے بعد حضور ﷺ کا قافلہ حدیبیہ کی صلح کو اپنی شکست اور ذلت سمجھتا ہوا مدینے کی طرف واپس جا رہا تھا، اس وقت مکہ سے تقریباً 25 میل کے فاصلے پر مقام ضجنان کے مقام پر سورۃ ''الفتح'' اس واضح اعلان کے ساتھ نازل ہوئی:

﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًاo لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًاo﴾

(الفتح: 1تا2)

''اے نبی، ہم نے تمھیں کھلی فتح عطا کر دی، تاکہ اللہ تمھاری اگلی پچھلی ہر کوتاہی سے درگزر فرمائے اور تم پر اپنی نعمت کی تکمیل کر دے اور تمھیں سیدھا راستہ دکھائے۔''

صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں کو ''فتح مبین'' کا یہ مژدہ سنایا گیا تو لوگ حیران تھے کہ آخر اس صلح کو فتح کیسے کہا جا سکتا ہے۔ ایمان کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو مان لینے کی بات تو دوسری تھی۔ مگر اس کے فتح ہونے کا پہلو کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ آیت سن کر پوچھا: ''یارسول اللہ ﷺ، کیا یہ فتح ہے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں۔''

ایک اور صحابی حاضر ہوئے۔ انھوں نے بھی یہی سوال کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے۔ یقیناً یہ فتح ہے۔''

مدینہ پہنچ کر ایک اور صاحب نے اپنے ساتھیوں سے کہا: ''یہ کیسی فتح ہے۔ ہمیں بیت اللہ جانے سے روک دیا گیا۔ ہماری قربانی کے اونٹ بھی آگے نہ جا سکے۔ رسول اللہ ﷺ کو حدیبیہ ہی میں رک جانا پڑا، اور اس صلح کی بدولت ہمارے دو مظلوم بھائیوں (ابوجندل اور ابوبصیر) کو ظالموں کے حوالے کر دیا گیا۔'' حضور ﷺ تک یہ بات پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا ''بڑی غلط بات کہی گئی ہے یہ۔ حقیقت میں تو یہ بہت بڑی فتح ہے۔ تم مشرکوں کے عین گھر میں پہنچ گئے اور انھوں نے آیندہ سال عمرہ کرنے کی درخواست خود کر کے تمھیں واپس جانے پر راضی کیا۔ انھوں نے تم سے خود جنگ بند کر دینے اور صلح کرنے کی خواہش کی، حالانکہ ان کے دلوں میں تمھارے لیے جیسا کچھ بغض ہے، وہ معلوم ہے۔ اللہ نے تمھیں ان پر غلبہ عطا کر دیا ہے۔ کیا وہ دن بھول گئے جب احد میں تم بھاگے جا رہے تھے اور میں تمھیں پیچھے سے پکار رہا تھا؟ کیا وہ دن بھول گئے جب جنگ احزاب میں ہر طرف سے دشمن چڑھ آئے تھے اور کلیجے منہ کو آ رہے تھے؟''

مگر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس صلح کا فتح ہونا بالکل عیاں ہوتا چلا گیا اور ہر خاص و عام پر یہ بات پوری طرح کھل گئی کہ فی الواقع اسلام کی فتح کا آغاز صلح حدیبیہ ہی سے ہوا تھا۔ سورۃ الفتح کے نازل ہونے کے بعد حضور ﷺ نے مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا، آج مجھ پر وہ چیز نازل ہوئی ہے، جو میرے لیے دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ سورۃ تلاوت فرمائی اور خاص طور پر حضرت عمرؓ کو بلا کر سنایا، کیوں کہ وہ سب سے زیادہ رنجیدہ تھے۔

معاہدۂ حدیبیہ کے فوائد

اگرچہ اہلِ ایمان تو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سن کر ہی مطمئن ہو گئے تھے، مگر کچھ زیادہ

مدت نہ گزری تھی کہ اس صلح کے فوائد ایک ایک کر کے کھلتے چلے گئے، یہاں تک کہ کسی کو بھی اس امر میں شک نہ رہا کہ فی الواقع یہ صلح ایک عظیم فتح تھی۔ اس سے مسلمانوں کو جو نفسیاتی و حقیقی فوائد حاصل ہوئے، ان پر مولانا مودودی نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔ (از تفہیم القرآن، جلد پنجم، صفحہ 40)

(1)...... اس میں پہلی مرتبہ عرب میں اسلامی ریاست کا وجود باقاعدہ تسلیم کیا گیا۔ اس سے پہلے تک عربوں کی نگاہ میں حضرت محمد ﷺ اور آپ کے صحابہؓ کی حیثیت محض قریش اور قبائل عرب کے خلاف خروج کرنے والے ایک گروہ کی تھی اور وہ انھیں برادری باہر (Outlaw) سمجھتے تھے۔ اب خود قریش ہی نے آپ ﷺ سے معاہدہ کر کے اسلامی سلطنت کے مقبوضات پر آپ ﷺ کا اقتدار تسلیم کر لیا، اور قبائل عرب کے لیے دروازہ بھی کھول دیا کہ ان دونوں سیاسی طاقتوں میں سے جس کے ساتھ چاہیں، حلیفانہ معاہدات کر لیں۔

(2)...... مسلمانوں کے لیے بیت اللہ کی زیارت (عمرے) کا حق تسلیم کر کے قریش نے خود بخود گویا یہ بھی مان لیا کہ اسلام کوئی بے دینی نہیں ہے، جیسا کہ وہ اب تک کہتے چلے آ رہے تھے، بلکہ عرب کے مسلمہ مذاہب میں سے ایک ہے اور دوسرے عربوں کی طرح اس کے پیرو بھی حج و عمرہ کے مناسک ادا کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اس سے اہل عرب کے دلوں کی وہ نفرت کم ہو گئی جو قریش کے پروپیگنڈے سے اسلام کے خلاف پیدا ہو گئی تھی۔

(3)...... دس سال کے لیے جنگ بندی کا معاہدہ ہو جانے سے مسلمانوں کو امن میسر آ گیا اور انھوں نے عرب کے تمام اطراف و نواح میں پھیل کر اس تیزی سے اسلام کی اشاعت کی کہ صلح حدیبیہ سے پہلے پورے 19 سال کے دوران میں اتنے آدمی مسلمان نہ ہوئے تھے جتنے صلح حدیبیہ کے بعد دو سال کے اندر ہو گئے۔ یہ ایسی صلح کی برکت تھی کہ یا تو وہ وقت تھا جب حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ صرف ڈیڑھ ہزار مسلمان آئے تھے یا دو ہی سال کے بعد جب قریش کی عہد شکنی کے نتیجے میں حضور ﷺ نے مکہ پر چڑھائی کی تو دس ہزار کا لشکر آپ ﷺ کے ہم رکاب تھا۔

(4)...... قریش کے طرف سے جنگ بند ہو جانے کے بعد حضور ﷺ کو یہ موقع مل گیا کہ اپنے مقبوضات میں اسلامی حکومت کو اچھی طرح تسلیم کر لیں اور اسلامی قانون کے اجرا سے مسلم معاشرے کو ایک مکمل تہذیب و تمدن بنا دیں۔ یہی وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے سورۂ مائدہ کی آیت 3 میں فرمایا: "آخر میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔"

(5)...... قریش سے صلح کے بعد جنوب کی طرف سے اطمینان نصیب ہو جانے کا فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں نے شمالی عرب اور وسط عرب کی تمام مخالف طاقتوں کو بآسانی مسخر کر لیا۔ صلح حدیبیہ پر تین مہینے ہی گزرے تھے کہ یہودیوں کا سب سے بڑا گڑھ خیبر فتح ہو گیا اور اس کے بعد فدک، وادی القریٰ، تیما اور تبوک کی یہودی بستیاں اسلام کی زیرنگین آتی چلی گئیں۔ پھر وسط عرب کے وہ تمام قبیلے بھی، جو یہود اور قریش کے ساتھ گٹھ جوڑ رکھتے تھے، ایک ایک کر کے تابع فرمان ہو گئے۔ اس طرح حدیبیہ کی صلح نے دو ہی سال کے اندر عرب میں قوت کا توازن اتنا بدل دیا کہ قریش اور مشرکین کی طاقت دب کر رہ گئی اور اسلام کا غلبہ یقینی ہو گیا۔

یہ تھیں وہ برکات جو مسلمانوں کو صلح حدیبیہ سے حاصل ہوئیں، جسے وہ اپنی ناکامی اور قریش اپنی کامیابی سمجھ رہے تھے۔

ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح

حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان صخر بن حرب بن امیہ بن عبدالشمس کا اصل نام رملہ تھا، مگر آپ اپنی بیٹی حبیبہ کے نام سے ام حبیبہ مشہور ہوئیں۔ آپ کی والدہ کا نام صفیہ بنت ابی العاص بن امیہ تھا جو حضرت عثمانؓ کی سگی پھوپھی تھیں۔ آپ کا پہلا نکاح عبیداللہ بن جحش بن رئاب سے ہوا، جو بنی اسد بن خزیمہ کے خاندان سے تھا۔ آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ اسلام قبول کیا اور اس کے ساتھ ہی ہجرت کر کے حبشہ گئیں۔ حبشہ میں آپ کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام حبیبہ تھا۔ کچھ دنوں کے بعد عبیداللہ نے اسلام ترک کر کے عیسائی مذہب اختیار کیا۔ چوں کہ رندانہ زندگی بسر کرتا تھا، اس لیے شراب نوشی کے عالم میں مرگیا۔ ام حبیبہ اپنے شوہر کے مرتد ہونے کے باوجود مسلمان رہیں۔ حضور ﷺ سے آپ کا عقد ذوالحج چھے ہجری۔ اپریل 628ء میں ہوا (ان کے مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب۔ چہارم بہ عنوان "اہل بیت")

11ہجری - 11 مئی 628ء تا 30 اپریل 629ء

سلاطین عصر کو دعوت اسلام

صلح حدیبیہ سے جب آنحضرت ﷺ کو کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو مسلمانوں کو اسلامی دعوت پھیلانے اور تبلیغ کرنے کا اہم موقع ہاتھ آ گیا تھا، اس لیے اس میدان میں ان کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں جو جنگی سرگرمیوں پر غالب رہیں۔ یہ وقت آ گیا تھا کہ اسلام کا پیغام پوری انسانیت تک پہنچایا جائے۔ اس بنا پر حضور ﷺ نے ایک دن صحابہ کرامؓ کو جمع فرمایا اور خطبہ دیا کہ "اے لوگو! مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام دنیا کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو۔"

عالمی دعوت کے خطوط حضور ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد اور غزوہ خیبر سے پہلے مدینہ کے ان تین دنوں کے قیام میں لکھوائے، جب کہ آپ ﷺ غزوہ غابہ سے واپس آ کر مدینہ میں سہ روزہ قیام کے لیے ٹھہرے تھے۔ غزوہ غابہ سے متعلق یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ واقعہ حدیبیہ سے واپسی پر اور غزوہ خیبر سے پہلے کا ہے۔ حالانکہ اس وقت سے دعوت کے اسلامی ضمن میں نامہ پیام کا سلسلہ یوں تو آئندہ تین برس تک جاری رہا، لیکن ابتدا میں پہلے ہی روز یکم محرم سات ہجرت کو چھے خطوط مندرجہ ذیل بادشاہوں کے نام ارسال کیے گئے:

1: اصحم نجاشی (حبش)

ہرقل (روم)

خسرو پرویز (ایران)

جریج بن متی مقوقس (مصر)

حارث بن ابی شمرہ غسانی (دمشق)

ہوذہ بن علی حنفی (یمامہ)

یہ خطوط معاہدۂ حدیبیہ کے فوراً بعد ذوالحج میں لکھوائے گئے، اور قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی تحقیق کے مطابق یکم محرم سات ہجری کو روانہ کیے گئے۔

(ان تمام مراسلات اور مکاتیب کی تفصیل "سیرت ﷺ انسائیکلوپیڈیا" کی جلد میں پیش کی گئی ہے)۔

غزوہ غابہ یا غزوہ ذی قرد

حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے پہلے یہ پہلا اور واحد غزوہ ہے جو رسول کریم ﷺ کو پیش آیا۔ یہ غزوہ خیبر سے صرف تین روز پہلے پیش آیا تھا۔ اس غزوے کے ہیرو حضرت سلمہؓ بن اکوع سے جو روایات "صحیح بخاری" میں مروی ہیں، ان کا خلاصہ انھی کی زبانی یہ ہے:

"ہم لوگ حدیبیہ سے جب مدینے لوٹے تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دودھیل اونٹنیاں اپنے غلام رباحؓ اور ایک چرواہے کے ہم راہ چرنے کے لیے بھیجی تھیں، اور میں بھی ابوطلحہؓ کا گھوڑا لیے ان کے ساتھ تھا کہ اچانک صبح دم عبدالرحمٰن فزاری نے اونٹنیوں پر چھاپہ مارا اور ان سب کو ہانک لے گیا اور چرواہے کو قتل کر دیا۔ میں نے رباحؓ سے کہا: یہ گھوڑا لو۔ اسے حضرت ابوطلحہ تک پہنچا دو، اور رسول اللہ ﷺ کو خبر کر دو کہ ان کی اونٹنیوں کو لوگوں نے لوٹ لیا ہے۔

میں نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر مدینہ کی طرف رخ کیا اور تین مرتبہ پکارا: "یا صباحاہ" (ہائے صبح کا حملہ)۔ پھر میں حملے آوروں کے تعاقب میں، ان کے نشان قدم پر چلا۔ میں ان پر تیر برساتا جاتا تھا اور یہ رجز پڑھتا جاتا تھا:

"انا ابن الاكوع واليوم يوم الرضع ."

"میں اکوع کا بیٹا ہوں، اور آج کا دن دودھ پینے والے کا دن ہے (یعنی آج پتا لگ جائے گا کہ کس نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے)۔"

حضرت سلمہؓ بن اکوع کہتے ہیں کہ بخدا میں انھیں مسلسل تیروں سے چھلنی کرتا رہا۔ جب کوئی سوار میری طرف پلٹ کر آتا تو میں کسی درخت کی اوٹ میں بیٹھ جاتا۔ پھر اسے تیر مار کر زخمی کر دیتا۔ یہاں تک کہ جب یہ لوگ پہاڑ کے تنگ راستے میں داخل ہوئے تو میں پہاڑ پر چڑھ گیا اور ان پر پتھر مارنے لگا۔ میں نے اس طرح مسلسل ان کا تعاقب جاری رکھا، یہاں تک کہ رسول اللہ کے جتنی بھی اونٹنیاں تھیں، میں ان سب کو اپنے پیچھے چھوڑ گیا، اور ان لوگوں نے میرے لیے ان سب کو آزاد چھوڑ دیا، لیکن میں نے پھر بھی ان کا تعاقب جاری رکھا اور ان پر تیر برساتا رہا۔ یہاں تک کہ بوجھ کم کرنے کے لیے انھوں نے تیس سے زیادہ چادریں اور تیس سے زیادہ نیزے پھینک دیئے۔ وہ لوگ جو کچھ بھی پھینکتے تھے، میں اس پر بطور نشان تھوڑے سے پتھر ڈال دیتا تھا تا کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے اصحاب پہچان لیں کہ یہ دشمن سے چھینا ہوا مال ہے۔

اس کے بعد وہ لوگ ایک گھاٹی کے تنگ موڑ پر بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھانے لگے۔ میں بھی ایک چوٹی پر جا بیٹھا۔ یہ دیکھ کر ان کے چار آدمی پہاڑ پر چڑھ کر میری طرف آئے۔ میں نے کہا: "تم لوگ مجھے پہچانتے ہو؟ میں سلمہ بن اکوع ہوں۔ تم میں سے جس کسی کے پیچھے دوڑوں گا بے دھڑک پا لوں گا اور جو کوئی میرے پیچھے دوڑے گا، ہرگز نہ پا سکے گا۔ میری یہ بات سن کر چاروں واپس چلے گئے اور میں اپنی جگہ جما رہا، یہاں تک کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے سواروں کو دیکھا کہ درختوں کے درمیان سے چلے آ رہے ہیں۔ سب سے آگے اخرمؓ تھے۔ ان کے پیچھے ابوقتادہؓ اور ان کے پیچھے مقدادؓ بن اسود۔

عبدالرحمٰن فزاری اور حضرت اخرمؓ میں ٹکر ہوئی۔ حضرت اخرمؓ نے عبدالرحمٰن کے گھوڑے کو زخمی کر دیا، لیکن عبدالرحمٰن نے نیزہ مار کر حضرت اخرمؓ کو قتل کر دیا اور ان کے گھوڑے پر جا بیٹھا، مگر اتنے میں حضرت ابوقتادہؓ عبدالرحمٰن کے سر پر جا پہنچے اور اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا، بقیہ حملہ آور بھاگے میں ان کے پیچھے پیدل دوڑ رہا تھا۔ سورج ڈوبنے سے کچھ پہلے ان لوگوں نے اپنا رُخ ایک گھاٹی کی طرف موڑا، جس میں ذی قرد نام کا ایک چشمہ تھا۔ یہ لوگ پیاسے تھے اور وہاں پانی پینا چاہتے تھے، لیکن میں نے انھیں چشمے سے پرے ہی رکھا اور وہ ایک قطرہ بھی نہ چکھ سکے۔ رسول اللہ ﷺ اور شہ سوار صحابہؓ دن ڈوبنے کے بعد میرے پاس پہنچے۔ میں نے عرض کیا: "یا رسول اللہ، یہ سب پیاسے تھے۔ اگر مجھے سو آدمی دے دیں تو میں زین سمیت ان کے تمام گھوڑے چھین لوں میں کفار کے تعاقب میں جاؤں گا اور سب کو قتل کر دوں گا۔ کوئی خبر دینے والا بھی باقی نہیں رہے گا۔ حضور ﷺ ہنس پڑے اور فرمایا: "کیا تم واقعی ایسا کرنا چاہتے ہو؟" میں نے عرض کیا: "ہاں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "وہ لوگ اس وقت غطفان کے مہمان ہیں۔"

اس غزوے پر حضور ﷺ نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: "آج ہمارے سب سے بہتر شہسوار ابوقتادہؓ اور سب سے پیادہ سلمہؓ ہیں۔ اور آپ ﷺ نے مجھے دو حصے دیئے۔ ایک پیادہ کا حصہ اور ایک شہسوار کا حصہ، اور مدینہ واپس ہوتے ہوئے مجھے یہ شرف بخشا کہ اپنی عضباء نامی اونٹنی پر اپنے پیچھے سوار فرمالیا۔

اس غزوے کے دوران میں رسول اللہ نے مدینے کا انتظام حضرت ابن ام مکتوم کو سونپا تھا اور اس غزوے کا پرچم حضرت مقداد بن عمروؓ کو عطا فرمایا تھا۔

غزوۂ خیبر

جب رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ کے نتیجے میں جنگ خندق کے تین بازوؤں میں سے سب سے مضبوط بازو (قریش) کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہو گئے تو آپ ﷺ نے چاہا کہ بقیہ دو بازوؤں یعنی یہود اور قبائل نجد سے بھی حساب کتاب چکالیں، تا کہ ہر جانب سے مکمل امن و سلامتی حاصل ہو جائے اور پورے علاقے میں

سکون کا دور دورہ ہو اور مسلمان ایک پیہم خون ریز کش مکش سے نجات پا کر اللہ کی پیغام رسانی اور اس کی دعوت کے لیے فارغ ہو جائیں۔

یاد رہے کہ اہل خیبر ہی تھے جو جنگ خندق میں مشرکین کے تمام گروہوں کو مسلمانوں پر چڑھا لائے تھے۔ پھر یہی تھے جنھوں نے بنو قریظہ کو غدر و بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ نیز یہی تھے جنھوں نے اسلامی معاشرے کے پانچویں کالم، منافقین سے اور جنگ احزاب کے تیسرے بازو (بنو غطفان اور بدوؤں) سے پیہم رابطہ قائم کر رکھا تھا اور خود بھی جنگ کی تیاریاں کر رہے تھے اور اپنی کارروائیوں کے ذریعے مسلمانوں کو آزمائشوں میں ڈال رکھا تھا، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کو بھی شہید کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔

یہ درست ہے کہ صلح حدیبیہ کی بنا پر آپ ﷺ قریش کی دست درازیوں سے محفوظ تھے اور جنوبی علاقوں کی طرف سے بھی کسی یورش کا خطرہ نہ تھا، لیکن اندیشہ تھا تو صرف شمال کی جانب خیبر کے یہودیوں سے، اور وہ یہ کہ عین ممکن ہے ہرقل روم یا خسرو فارس ان سے ساز باز کر لیں اور ان کے دلوں میں بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی قینقاع کے ان یہودیوں کی یاد تازہ کر کے، جنھیں نبی کریم ﷺ نے ان کے وطن مدینہ سے دیس نکالا دے دیا تھا، آتش انتقام مشتعل کر دیں۔ قریش کی نسبت یہود کو آنحضرت ﷺ سے زیادہ عناد تھا، کیوں کہ ایک تو انھیں اپنے مذہب سے بہت زیادہ وابستگی تھی اور دوسرے ان میں عقل و فراست کا مادہ بھی قریش سے کچھ زیادہ ہی تھا، یہودیوں سے کوئی ایسا معاہدہ، جو صلح حدیبیہ جیسی شرائط پر مشتمل ہو، کوئی آسان بات نہ تھی۔ ان کی جانب سے اطمینان بھی نہ ہو سکتا تھا، کیوں کہ یہودیوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں کئی بار شکست اٹھانی پڑی تھی، لہٰذا کچھ بعید نہ تھا، اگر ہرقل کی طرف سے انھیں مدد مل جاتی تو وہ انتقام لینے کی خاطر مسلمانوں سے جنگ کے لیے آمادہ ہو جاتے۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ یہودیوں کی ہستی ہمیشہ کے لیے ختم کر دی جائے، تاکہ آیندہ جزیرہ عرب میں ان کے قدم نہ جم سکیں۔ یہ معاملہ فوری توجہ کا محتاج تھا، تاکہ یہودیوں کو اتنی مہلت ہی نہ مل سکے کہ وہ قبائل غطفان یا دیگر عرب قبائل سے مدد لے سکیں جو آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے دشمن اور یہودیوں کے دوست تھے۔

غزوہ خندق میں ہزیمت اور پسپائی کے باوجود خیبر کے یہود ایک مستقل اکائی تھے۔ بنی قریظہ کے انجام نے در پردہ انتقام پر آمادہ کیا۔ بنو نضیر کے سربرآوردہ جو خیبر کے کرتا دھرتا بن گئے، ان میں ابورافع، سلام بن ابی الحقیق بھی تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ اب خیبر کی سیاست میں ایک بہت بڑی تبدیلی آئی۔ قیادت بنو نضیر کے ہاتھوں سے نکل گئی جو قریش کے حامی تھے۔ نیا سردار اسیر بن رازم منتخب ہوا۔ اس نے یہودی قبائل کو جمع کر کے کہا: ''میرے پیش روؤں نے محمد ﷺ کے مقابلے میں جو تدبیریں اختیار کیں، وہ غلط تھیں۔ صحیح تدبیر یہ ہے کہ خود محمد ﷺ کے دارالریاست مدینہ پر حملہ کیا جائے اور میں یہی طریقہ اختیار کروں گا۔''

اس مقصد کے لیے اس نے قبیلہ غطفان کا دورہ کیا۔ انھیں خوب بھڑکایا۔ ان کے علاوہ کئی دوسرے قبائل کو بھی آمادہ کر لیا۔ اس غرض سے بیس پچیس ہزار کی فوج بھی جمع کر لی۔ روزانہ دس ہزار سپاہی قلعوں سے باہر نکل کر صف بندی (پریڈ) کرتے اور کہتے کہ محمد ﷺ ہم پر کس طرح فتح حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ راس المنافقین عبداللہ بن ابی نے یہودیوں کو مدینے پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ وہ مسلمانوں کے عسکری رازوں سے انھیں باخبر کرتا تھا۔ اس طرح وہ ان کا جاسوس اور ایجنٹ تھا۔ جب یہ اطلاعیں مدینہ پہنچیں تو آنحضور ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو تحقیق کے لیے خیبر روانہ فرمایا۔ انھوں نے چھپ کر یہودیوں کی سازشوں کو سنا اور واپس آ کر تصدیق کی۔

اب حضور ﷺ انھیں نے دوبارہ (اخیر چھٹے ہجری میں) تیس آدمیوں کے ساتھ روانہ فرمایا۔ ان لوگوں نے اسیر بن رازم سے ملاقات کی۔ اس سے کہا کہ اگر تم چل کر رسول اللہ سے مل لو تو مدینہ میں تمھاری سرداری کا اعلان کیا جائے گا اور حکومت بھی تم ہی کو دے دی جائے گی۔ وہ تیار ہو گیا اور اپنے ہم راہ بھی تیس آدمی لیے۔ راستے بھر اس طرح چلے کہ ہر مسلمان کے ساتھ ایک یہودی تھا۔ جب قرقرہ کے مقام پر پہنچے تو اسیر بن رازم کی نیت بدل گئی اور اس نے اپنے ساتھی مسلمان حضرت عبداللہ بن انیس کی تلوار چھیننی چاہی۔ وہ چوکنے تھے۔ اس کی بدعہدی محسوس کی تو تلوار کی ایک ہی ضرب سے اس کی ران کاٹ دی۔ وہ گھوڑے سے گرتے گرتے حضرت عبداللہ پر وار کر گیا۔ اس طرح لڑائی چھڑ گئی۔ ایک یہودی کے سوا کوئی زندہ نہ بچا۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں تھا، بلکہ یہود کی سوچی سمجھی تدبیر تھی۔

ان حالات میں مناسب سمجھا گیا کہ اس سیلاب کو امڈنے سے پہلے روک دیا جائے۔ حدیبیہ سے لوٹ کر ذی الحج میں حضور ﷺ نے کوئی بیس دن مدینہ میں قیام فرمایا۔ دوران میں قیام آپ ﷺ نے شاہان وقت کو اسلامی دعوت کے لیے خطوط لکھے۔ محرم سات ہجری میں منادی کی گئی کہ صرف حدیبیہ میں جو لوگ حاضر تھے، وہی جہاد کی تیاری کریں۔ اس اعلان کے پیش نظر صرف حدیبیہ میں ''بیعت رضوان'' کے شرکاء نے کمر باندھی۔ ام المومنین ام سلمہؓ بھی چوں کہ غزوہ حدیبیہ میں شریک تھیں، اس لیے وہ بھی اس میں شامل رہیں۔ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب بھی شامل تھیں۔ ان کے علاوہ بیس خواتین بھی ساتھ تھیں۔

الغرض آنحضور ﷺ حضرت سباعؓ بن عرفطہ غفاری کو اپنے پیچھے جانشین مقرر فرما کر چودہ سو پیدل اور دو سو سوار صحابہؓ کے ساتھ خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔ اسلامی جھنڈا حضرت علیؓ کے ہاتھ میں تھا۔

خیبر کا سرسبز و شاداب علاقہ مدینہ کے شمال مشرق میں تقریباً سو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں ہر طرف لاوے کے جلے ہوئے حرے (پہاڑیاں) ہیں۔ ان کے درمیان سات وادیاں ہیں جن میں پانی کے سوچشمے ہیں۔ خیبر یہودیوں کا سب سے بڑا اور سب سے مضبوط گڑھ تھا۔ یہاں یہودی کب آئے؟ کچھ یہودی تو حضرت موسیٰ

وفات کے بعد آئے۔ کچھ جب بخت نصر نے بابل اور بیت المقدس کو تاخت و تاراج کیا تو سن ستر عیسوی میں آئے۔ خیبر کے یہود شجاعت، کثرت اور استقلال کے لحاظ سے تمام یہودیوں پر فوقیت رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے اوس خزرج کی جنگوں میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ غیر جانب دار رہے۔ حضور ﷺ کی مدینہ تشریف آوری سے لے کر سن چار ہجری تک بھی ان کی کوئی شرارت سامنے نہیں آئی۔ جب بنی نضیر مدینہ سے نکالے گئے تو انھوں نے خیبر کے قرب وجوار میں پناہ لی۔ اس کے بعد وہ سازشوں کا مرکز بن گیا۔ خیبر کے قرب وجوار میں فدک، وادی القریٰ اور تیما میں بھی یہود کی بڑی بستیاں تھیں۔

خیبر کے معنی ہیں قلعہ۔ یہاں یہودیوں کے چھوٹے چھوٹے قبائلی محلے تھے ان کے اپنے کھیت، چشمے، چراگاہیں، گڑھیاں اور قلعے تھے۔ اپنی جگہ وہ خود کفیل اور حفاظتی اعتبار سے بجائے خود مستحکم تھے۔ خیبر کی آبادی میں یہودی سرداروں کے کئی بڑے اور چھوٹے قلعے بنے ہوئے تھے۔ یہ قلعے وادی کے دونوں جانب اس طرح تعمیر کیے گئے تھے کہ بجائے خود ایک دفاعی مرکز بھی تھے اور ایک دوسرے کو کمک بھی دے سکتے تھے۔ اطم (برج) کی جمع آطام ہے۔ حصن کے معنی قلعے کے ہیں۔ قلعوں کے نام با معنی تھے۔ جن چودہ قلعوں کے نام تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

1. ناعم (آسودہ زندگی)
2. قموص (آرام دہ شہر)
3. الشق (ہر چیز کا آدھا)
4. نطاۃ (کچی کھجور کا غلاف)
5. سالم (حاجت پڑنے پر وسیلہ)
6. الوطیح (مٹی۔ کھریا)
7. الکتیبہ (سواروں کا دستہ)
8. صعب بن معاذ (سخت دشوار)
9. قلہ یا قلعہ الزبیر (چوٹی)
10. حصن ابی (ابی کا قلعہ)
11. حصن البر (خشک زمین)
12. مربطہ (جانوروں کے باندھنے کی جگہ)
13. حصن نزار (نزار کا قلعہ)
14. حصن قصارہ (کشادہ مضبوط مکان)

یہ چودہ قلعے تین حلقوں میں واقع تھے: حلقہ النطاۃ۔ حلقہ الشق۔ حلقہ الکتیبہ۔

عسکری و حربی تدبیریں

حضور ﷺ نے ہمیشہ کی طرح اپنا ہدف خفیہ رکھا۔ راستہ ایسا تھا کہ بنو غطفان اور خیبر دونوں کی طرف جاتا تھا۔ جونہی مسلمان مدینے سے نکلے، عبداللہ بن ابی سلول نے اس کی اطلاع خیبر بھیجی اور یہ پیغام بھی کہ تم لوگ سامانِ حرب اور تعداد میں زیادہ ہو۔ مسلمانوں سے قلعوں سے باہر مقابلہ کرو۔ خیبر کے سردار سلام بن مشکم نے عبداللہ سے اتفاق نہیں کیا اور قلعوں میں محصور ہونے میں عافیت سمجھی۔ خیبر کے یہود نے اپنے دو آدمی کنانہ ابن ابی حقیق اور ہودہ بن قیس کو بنو غطفان کے سردار عیینہ بن حصن اور بنو اسد کے سردار طلحہ بن خویلد کے پاس مدد کے لیے بطور خاص بھیجا اور یہ بھی لالچ دیا کہ اگر خیبر میں ہم جیت گئے تو آدھی پیداوار تمھیں دیتے رہیں گے اور پہلے سے بھی امداد کی توقع تھی۔ حضور ﷺ نے خیبر پر جنوب کے بجائے شمال سے حملے کا حکم دیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہودی قلعہ خالی کر کے شام کی جانب جانا چاہیں تو انھیں روکا جا سکے۔ یہ بہت بڑی جنگی چال تھی، اور ایک سیاسی کارنامہ بھی کہ یہود اپنے حلیفوں کی مدد سے محروم ہو گئے۔

مقام صہباء میں پہلا پڑاؤ کیا۔ یہاں حضور ﷺ نے ستو کا کھانا تناول فرمایا۔ وضو کر کے عصر کی نماز ادا فرمائی۔ رہبروں کو طلب کر کے فرمایا، اس وقت ہم غطفان اور خیبر کے درمیان ہیں۔ احتیاط سے راستہ بتاؤ۔ کچھ دور چل کر راہنما نے عرض کیا، یہاں سے بہت سے راستے نکلتے ہیں۔ ایک راستے کا نام لیا گیا ارشاد ہوا، یہ بھی نہیں۔ عرض کیا، حاطب۔ حضور ﷺ نے یہ راستہ بھی ناپسند فرمایا۔ رہبر نے کہا، چوتھا راستہ مرحب ہے۔ فرمایا، اس پر چل پڑو۔ راستے میں نگران لشکر حضرت عبادؓ بن بشر نے یہودیوں کے ایک جاسوس کو پکڑا۔ دریافت کرنے پر جاسوس نے بتایا کہ دس ہزار غطفانی لشکر خیبر کی مدد کو چل پڑا ہے۔ حضرت عبادؓ نے اس پر سختی کی تو اس نے جان کی امان طلب کی۔ پھر بتایا کہ یہودی سخت خوف زدہ ہو کر قلعوں میں بند ہو گئے ہیں۔ نگران لشکر اسے لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ارشاد ہوا، اسے قید رکھو۔

وادیٔ خیبر میں

مسلمان وادیٔ حوصہ سے خیبر میں داخل ہوئے۔ مجاہدین کو حکم ہوا کہ دعا پڑھیں (ترجمہ): ''اے اللہ! ہم تجھ سے اس بستی کی، بستی والوں کی اور جو کچھ اس میں ہے، اس کی بھلائی چاہتے ہیں۔ بستی کی برائیوں اور بستی والوں کی برائیوں، اور جو کچھ اس میں ہے، اس کی بُرائیوں سے پناہ مانگتے ہیں۔''

نبی کریم ﷺ نے خود بھی دعا فرمائی اور کہا: ''اللہ کی برکت کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔'' رات کا وقت تھا۔ مقام ''منزلہ'' پر تہجد پڑھی۔ اہل خیبر بے خبر سو رہے تھے۔ صبح ہوئی تو کسان ہل، مویشی، پھاؤڑے اور کدال لے کر کھیتوں میں کام کرنے کے لیے نکلے۔ آگے بڑھے تو وہ منظر دیکھا کہ آنکھوں پر یقین ہی نہ آتا تھا۔ انتہائی خوف کے عالم میں الٹے پاؤں قلعوں میں واپس ہوئے۔ زبانوں پر تھا: ''محمد ہیں، واللہ محمد ہیں، اپنی پوری فوج کے ساتھ۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ اکبر۔ خیبر برباد ہو گیا، اور ہم جب بھی کسی قوم کے میدان میں اترتے ہیں تو وہ صبح کافروں کے لیے بہت بُری ہوتی ہے۔'' مسلمانوں نے نماز فجر خیبر میں ادا کی۔

خیبر کا سردار سلام بن مشکم بیمار تھا۔ جب یہ اطلاع اسے ملی تو اس نے کہا کہ جنگ میں قتل ہونا قیدی ہونے سے بہتر ہے۔ انتظامات کو آخری شکل دیتے ہوئے اس نے

عورتوں اور بچوں کو قلعہ کتیبہ میں منتقل کیا۔ سپاہیوں کو قلعہ نطاۃ اور قوص میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ آنحضور ﷺ نے اس موقع پر جھنڈے تقسیم کیے۔ میدان جنگ میں بڑے بڑے علم لے کر نکلنے کا یہ پہلا موقع تھا، ورنہ پہلے چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں استعمال ہوتی تھیں۔ حضور ﷺ کا جھنڈا ''عقاب'' سیاہ تھا جو حضرت عائشہؓ کی چادر سے بنایا گیا تھا۔ ایک جھنڈا حضرت حبابؓ بن منذر، دوسرا حضرت سعدؓ بن عبادہ اور تیسرا سفید رنگ کا حضرت علیؓ کو عطا ہوا۔ مسلمانوں کا شعار اس جنگ میں ''یا منصور امت امت'' تھا یعنی فتح یاب، مارو مارو۔

رجیع کا ہیڈ کوارٹر

دن بھر یہودی اپنے قلعوں سے تیر اور پتھر پھینکتے رہے۔ مسلمان انھی تیروں کو جمع کر کے ان کا جواب دیتے رہے۔ حضرت حبابؓ بن منذر نے عرض کیا کہ ہم جس مقام پر ہیں، وہ قلعہ نطاۃ سے بہت قریب ہے۔ بلندی سے تیر ہم تک بہ آسانی آ جاتے ہیں۔ ہمارے تیر وہاں تک نہیں پہنچ پاتے۔ وہ اوپر سے ہماری نقل و حرکت پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں، لیکن ہم انھیں نہیں دیکھ سکتے۔ درختوں کی وجہ سے ہوا بھی بدبودار ہے۔ ارشاد ہوا، تمھاری رائے درست ہے۔ کوئی اور جگہ تلاش کرو۔ انھوں نے محمد بن مسلمہ کے ساتھ اطراف و جوانب کا جائزہ لیا۔ کافی تلاش کے بعد مقام رجیع کو پسند کیا۔ دن بھر کی تیر اندازی میں پچاس مسلمان زخمی ہوئے۔

حضرت حباب بن منذرؓ نے مشورہ دیا کہ کھجوروں کے درخت کاٹ دیئے جائیں، کیوں کہ یہودی انھیں اپنے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ قلعہ نطاۃ کے علاوہ دوسرے قلعوں کے درخت بھی کاٹ دیئے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر کی فتح کا وعدہ فرمایا ہے۔ لہٰذا یہ نقصان ہمارا اپنا زیاں ہے۔ بقیہ درخت کاٹنے کا کام روک دیا گیا۔ چار سو درخت کاٹے گئے تھے کہ یہ حکم واپس لے لیا گیا۔

رات آئی تو لشکر کو مقام رجیع پر پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا گیا۔ حضرت عثمانؓ بن عفان کو کیمپ کا نگران مقرر کیا گیا۔ یہ مقام بنو غطفان اور خیبر کے درمیان واقع تھا۔ عسکری اعتبار سے بہت ہی موزوں جگہ تھی کہ بیک وقت دونوں دشمنوں پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ بنو غطفان نے اپنی چار ہزار فوج اہل خیبر کی مدد کے لیے حرکت میں لائی ہے۔ ایک ہی منزل آگے بڑھے تھے کہ انھیں رجیع میں پڑاؤ کی خبر ملی۔ بنو غطفان کو اپنے لوگوں اور آبادیوں کی فکر دامن گیر ہوئی تو پیش قدمی روک کر اپنی بستیوں میں واپس چلے گئے اور یہود کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

رجیع کا ہیڈ کوارٹر بہت موثر ثابت ہوا۔ فوری طور پر یہاں ایک مسجد بھی تعمیر کر لی گئی۔ روزانہ مجاہد یہاں سے جاتے اور خیبر کے قلعوں پر یلغار کرتے۔ یہودیوں کو بنو غطفان کے علاوہ شام کی رومی حکومت سے بھی امداد کی توقع تھی۔ حضور ﷺ نے خیبر پر جنوب کی بجائے شمال سے حملے کا حکم دیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہودی قلعہ خالی کر کے شام کی جانب جانا چاہیں تو انھیں روکا جا سکے۔ یہ بہت بڑی جنگی تدبیر تھی، اور ایک سیاسی کارنامہ بھی کہ یہود اپنے حلیفوں کی مدد سے محروم ہو گئے۔

(1) قلعہ ناعم

یہ قلعہ دفاعی نقطہ نظر اور محل وقوع کے لحاظ سے یہودیوں کا مضبوط ترین قلعہ تھا۔ حضرت محمود بن مسلمہ حملہ آور دستے کے کمانڈر بنائے گئے۔ وہ مسلسل پانچ دن تک قلعے پر حملہ کرتے رہے۔ چھٹے روز گرمی کی شدت سے پریشان ہو کر کچھ دیر کے لیے آرام کی غرض سے قلعے کی دیوار کے سایے لیٹ گئے۔ انھیں دیکھ کر کنانہ بن حقیق نے اوپر سے پتھر گرایا۔ جوان کے سر پر گرا۔ چوٹ بہت شدید تھی جس کی وجہ سے وہ شہید ہو گئے۔ ان کی لاش رجیع میں دفن کی گئی۔ فوج کی کمان ان کے بھائی محمد بن مسلمہؓ نے سنبھالی اور قلعہ فتح کر لیا گیا۔ اس طرح سب سے پہلے جو قلعہ فتح ہوا، وہ ناعم تھا۔ اس میں افرادی قوت کم اور مال و متاع بہت زیادہ تھا۔ یہ مرحب کا قلعہ تھا لیکن وہ خود اس میں موجود نہ تھا۔ اس کی ڈیوٹی قلعہ قوص پر تھی۔ اس قلعے پر زبردست لڑائی ہوئی۔ کئی یہودی مارے گئے۔ مسلمانوں کا زور دیکھ کر وہ یہاں سے قلعہ صعب منتقل ہو گئے۔ اس طرح قلعہ ناعم مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔

(2) قلعہ صعب بن معاذ

یہ دوسرا مضبوط اور مستحکم قلعہ تھا۔ محاصرہ طویل ہونے لگا تو مسلمانوں کو خوراک کی قلت کا احساس ہوا۔ حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! کوئی بڑا قلعہ فتح ہو، تاکہ لشکر کی خوراک کا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ ﷺ نے تمام لشکر کو ایک جگہ جمع کیا اور جھنڈا حضرت حبابؓ بن منذر کو عطا فرمایا اور اور یک بارگی حملے کا حکم ہوا۔ اللہ کے فضل سے قلعہ فتح ہو گیا اور بہت سا خورد و نوش کا سامان ہاتھ لگا۔ قلعہ شکن دبابے اور منجنیقیں بھی ملیں جو قلعہ البر کو فتح کرنے میں کام آئیں۔

اس روز رسول اکرم ﷺ نے دیکھا کہ لشکر میں ہر طرف آگ جل رہی ہے اور ہانڈیوں میں گوشت پکایا جا رہا ہے۔ پوچھا ''یہ گوشت کس کا ہے؟'' عرض کیا ''پالتو گدھوں کا۔'' فرمایا ''نجس ہے۔ گوشت پھینک دو اور برتن توڑ ڈالو۔'' عرض کیا گیا ''اگر برتن خوب دھو لیں تو کیا پاک ہو جائیں گے۔'' فرمایا: ''ہاں۔''

(3) قلعہ نطاۃ

ایک رات حضرت عمرؓ لشکر کے نگہبان تھے کہ ایک یہودی گرفتار ہوا۔ اس کا سر قلم کرنے کا ارادہ کیا۔ تو اس نے کہا کہ مجھے اپنے نبی ﷺ کے پاس لے چلو۔ جب شخص حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچا تو عرض کیا کہ اگر جان کی امان پاؤں ایک راز بتاؤں۔ فرمایا ''امان ہے۔'' عرض کیا ''آج رات قلعہ نطاۃ سے سب لوگ قلعہ شق میں منتقل ہو رہے ہیں۔ صبح ہوتے ہی اس پر قبضہ کر لینا۔'' فتح کے بعد اس۔ وہ تہ خانہ بھی بتایا، جہاں نقد و جنس چھپایا گیا تھا۔ یہ بھی بتایا کہ قلعہ شق میں قلعہ شکنی کے بہت سے آلات موجود ہیں۔

(4) قلعہ ابی

حضرت حبابؓ بن منذر کی سرکردگی میں قلعے پر حملے شروع ہوئے۔ عزدان

یہودی مقابلے کے لیے نکلا۔ حضرت حبابؓ نے ایک ہی وار میں اس کا دایاں بازو الگ کر دیا۔ دوسرا یہودی آگے بڑھا اور ایک مسلمان کو شہید کر دیا۔ حضرت ابودجانہؓ نے لپک کر اسے قتل کر دیا۔ اب کسی یہودی نے آگے بڑھنے کی جرات نہ کی۔ اللہ اکبر کے دل ہلا دینے والے نعروں کی گونج میں حضرت ابودجانہؓ مسلمانوں کو لے کر قلعے کی دیواروں پر چڑھ گئے۔ قلعے کے اندر زبردست دو بدو لڑائی ہوئی۔ یہودی حوصلہ ہار کر پیچھے ہٹنے لگے۔ آخر جان بچا کر قلعہ نزار میں بھاگ گئے۔ قلعہ ابی فتح ہو گیا۔ بھیڑ، بکریاں، کپڑا اور بہت سا سامان ہاتھ آیا۔

(5) قلعہ البر

قلعہ ابی کو فتح کر کے اب مسلمانوں نے قلعہ البر کا محاصرہ کر لیا۔ اندر سے بے شمار پتھر اور تیر برسائے گئے۔ یہ دیکھ کر قلعہ صعب بن معاذ سے منجنیقوں کو لایا گیا۔ ان سے قلعے کی دیواریں گرائی گئیں۔ اس طرح یہ قلعہ بھی فتح ہو گیا۔

(6) قلعہ قلہ یا قلعہ زبیر

یہ قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ قلہ یعنی چوٹی۔ تقسیم غنیمت میں حضرت زبیرؓ بن عوام کو عطا ہوا۔ مسلمان تین دن تک اس کا محاصرہ کیے رہے، لیکن قلعہ فتح نہ کر سکے۔ ایک یہودی عزال نامی آیا اور کہا: ''اے ابوالقاسم! (یہودی اس کنیت سے حضور ﷺ کو مخاطب کیا کرتے تھے)۔ اگر آپ ﷺ ایک ماہ بھی ٹھہرے رہیں گے، تب بھی اہل قلعہ کو پروا نہیں۔ ان کے چشمے زمین کے نیچے ہیں۔ وہ رات میں پانی لے کر قلعے میں چلے جاتے ہیں۔ اگر آپ ﷺ اُن کا پانی بند کر دیں تو وہ مجبور ہو جائیں گے۔ چناں چہ پانی کاٹ دیا گیا۔ انھوں نے قلعے سے نکل کر سخت جنگ کی۔ دس یہودی مارے گئے۔ کچھ مسلمان شہید ہوئے۔ بالآخر قلعہ سر ہو گیا۔

(7) قلعہ قموص

خیبر کے قلعوں میں یہ سب سے زیادہ مستحکم اور مضبوط تھا۔ جن دنوں اس کا محاصرہ جاری تھا، حضور ﷺ کو درد شقیقہ (آدھے سر کا درد) لاحق تھا۔ محاصرہ طویل ہوا لیکن قلعہ تھا کہ کسی طرح سر نہ ہوتا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''کل صبح جھنڈا میں اس شخص کو دوں گا جو اللہ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ بھی اسے دوست رکھتا ہے اور ان شاء اللہ اس کے ہاتھ سے کل قلعہ فتح ہو گا۔''

یہ رات تمام صحابہؓ نے انتہائی بے چینی کے عالم میں گزاری کہ کون وہ خوش نصیب ہو گا جسے کل حضور ﷺ کے دستِ مبارک سے پرچم عطا ہو گا۔ صبح ہوئی تو حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو حضرت عائشہؓ کی سیاہ چادر سے تیار کردہ علم ''عقاب'' عطا کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''قتال سے پہلے انھیں اسلام کی دعوت دو۔ اگر ان میں سے ایک شخص بھی ہدایت پا گیا تو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔'' حضرت علیؓ ''عقاب'' لے کر روانہ ہوئے۔

قلعہ قموص کا یہودی کمانڈر مرحب تھا۔ وہ انتہائی شجاع اور ہزار سواروں کے برابر بہادر سمجھا جاتا تھا۔ بیس روز سے وہ قلعہ فتح نہ ہونے دیتا تھا۔ ایک دن رجز پڑھتا ہو نکلا۔ مرحب کے رجز کے بول تھے: ''شیر مشتعل ہو کر میری طرف بڑھتے ہیں تو کبھی نیزہ بھونکتا ہوں۔ کبھی تلوار چلاتا ہوں۔ میری چراگاہ تو وہ ہے جس کے قریب کوئی نہیں آ سکتا۔ اہلِ خیبر کو معلوم ہے کہ میں مرحب ہوں، بہادر ہوں، تجربہ کار ہوں اور سلاح پوش۔

مرحب نے مبارزت طلب کی تو حضرت عامرؓ بن اکوع بڑھے۔ مرحب کا وار ڈھال پر روکا۔ اپنی تلوار چلائی تو وہ گھوم کر خود اُن کے پاؤں پر لگی۔ اس زخم سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ان کے بھائی سلمہؓ بن اکوع نے سمجھا، چوں کہ وہ خود اپنی تلوار کا نشانہ بنے ہیں، اس لیے ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو انگلیاں اکٹھی کر کے فرمایا: ''اُن کا اجر دوہرا ہے۔ وہ بڑا جانباز مجاہد تھا۔ ان جیسا کوئی عرب روئے زمین پر نہ چلا ہو گا۔ وہ شہید ہے۔'' ان کی نماز جنازہ حضور ﷺ نے خود پڑھائی اور رجیع میں محمود بن سلمہؓ کے ساتھ دفن کیا۔

اب باری تھی حضرت علیؓ کی۔ انھوں نے رجز پڑھا: ''میں وہی ہوں جس کی ماں نے نام حیدر (شیر) رکھا۔ جنگ کے شیر کی طرح نہایت مہیب۔'' دونوں برق و بلا کی طرح پینترے بدل بدل کر لڑتے رہے۔ شیر خدا نے تلوار تول کر مرحب پر ایک بھرپور وار کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے غرور و نخوت کا پہاڑ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

مرحب کا بھائی یاسر منہ سے کف تھوکتا، تلوار لہراتا بڑھا تو حضرت زبیرؓ بن عوام مقابلے کے لیے نکلے۔ ان کی والدہ حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب نے حضور ﷺ سے پوچھا: کیا میرا بیٹا مارا جائے گا؟'' فرمایا: ''ان شاء اللہ تمھارا بیٹا اسے قتل کر دے گا۔'' ان کی زبان پر رجز کے بول تھے: ''خیبر جانتا ہے کہ میں زبیر ہوں۔ سردار قوم۔ شرفا کی اولاد۔ نہ نکمانہ بھاگنے والا۔ اے یاسر! تجھے کافروں کی جماعت دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ تو سراب کی طرح غائب ہونے والے ہیں۔'' دونوں دلاور ایک دوسرے پر پل پڑے۔ کانٹے کی لڑائی ہوئی اور بالآخر حضرت زبیرؓ نے اسے شمشیر کی نوک پر دھر لیا۔ اب جو شیر خدا نے قموص پر دھاوا کیا تو قلعے کا دروازہ گرا دیا۔ مسلمانوں نے ناقابل تسخیر قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اسی قلعے سے سردار بنی نضیر حیی بن اخطب کی بیٹی اور کنانہ بن ربیع کی بیوی صفیہ اور ان کی دونوں چچازاد بہنیں گرفتار ہوئیں۔ صفیہؓ کو ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔

(8) قلعہ نزار کی فتح

یہ بھی مضبوط قلعوں میں شمار ہوتا تھا، اسی لیے اس میں حفاظت کی خاطر عورتوں اور بچوں کو رکھا گیا تھا۔ اس کی حفاظت کی خاطر انھوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مسلمان مجاہد بھی بڑھ بڑھ کر حملہ کر رہے تھے، لیکن داخلے کی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی۔ ان میں باہر نکل کر دو بدو ہونے کی جرات نہ تھی۔ جب فتح کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی تو حضور اکرم ﷺ نے قلعہ صعب بن معاذ سے حاصل شدہ منجنیقیں اور دبابوں کو کام میں لانے کا حکم دیا۔ ان سے پتھر برسائے گئے تو قلعے کی دیواروں میں شگاف پڑ گئے۔ مجاہدین داخل ہوئے اور بڑی سخت دست بدست لڑائی ہوئی۔ عورتوں اور بچوں کی خاطر یہودی بھی جان پر کھیل گئے۔ بالآخر انھیں شکست فاش ہوئی۔ عورتوں اور بچوں

کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خیبر کے دوسرے قلعے کتیبہ میں جا کر پناہ لی۔

(9) کتیبہ، وطیح وسلالم

جب دیگر قلعوں پر قبضہ ہو گیا تو مسلمان آخر میں وطیح اور سلالم کی جانب بڑھے۔ یہود ہر طرف سے سمٹ سمٹا کر یہاں جمع ہو گئے۔ چودہ دن تک محاصرہ رہا۔ آخر حضور ﷺ نے منجنیقیں استعمال کرنے کا حکم دیا۔

صلح کی بات چیت

پہلے ابن ابی حقیق گفتگو کے لیے آیا۔ صلح کے لیے بات چیت ہوئی۔ صلح کی شرائط یہ طے ہوئیں:

قلعے میں جو فوج ہے، اس کی جان بخشی کر دی جائے گی اور ان کے بال بچے انھی کے پاس رہیں گے (یعنی انھیں غلام اور کنیز نہیں بنایا جائے گا، بلکہ وہ اپنے بال بچوں کو لے کر خیبر کی سرزمین سے نکل جائیں گے) اور اپنے اموال، باغات، زمینیں، سونے، چاندی، گھوڑے، زرہیں رسول اللہ ﷺ کے حوالے کر دیں گے۔ صرف اتنا کپڑا لے جائیں گے جتنا ایک انسان کی پشت اٹھا سکے۔ رسول اللہ نے فرمایا: ''اور اگر تم لوگوں نے مجھ سے کچھ چھپایا تو پھر اللہ اور اس کا رسول ﷺ بری الذمہ ہوں گے۔'' یہود نے یہ شرط منظور کر لی اور مصالحت ہو گئی۔ اس مصالحت کے بعد تینوں قلعے مسلمانوں کے حوالے کر دیئے گئے اور اس طرح خیبر کی فتح مکمل ہو گئی۔

یہود کی خیانت اور بدعہدی

یہود نے اپنی فطرت سے مجبور ہو کر اس موقع پر بھی خیانت کی۔ ابوحقیق کے دونوں بیٹوں نے حیی بنی نضیر کے سردار حیی بن اخطب کی زر و جواہر سے بھری ہوئی مشک غائب کر دی۔ یہ مشک حیی بن اخطب مدینہ سے جلاوطنی کے وقت اپنے ہم راہ لایا تھا۔ مال چھپانے کی گواہی کنانہ بن ابوحقیق کے چچیرے بھائی نے دی۔ اس نے اطلاع دی کہ کنانہ روزانہ اس ویرانے کا چکر لگاتا ہے جہاں خزانہ چھپا ہوا ہے۔ خزانے کے بارے میں جب کنانہ سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ سامانِ جنگ فراہم کرنے میں خرچ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے کنانہ سے فرمایا: ''اگر یہ خزانہ تمھارے پاس سے برآمد ہوا تو پھر تمھیں قتل کر دیا جائے گا۔'' اس نے کہا ''جی ہاں۔''

آنحضور ﷺ نے ویرانہ کھودنے کا حکم دیا اور اس سے خزانہ برآمد ہوا، معاہدے کی خلاف ورزی کے جرم میں کنانہ کو حضرت زبیرؓ کے حوالے کر دیا اور فرمایا ''اسے سزا دو، یہاں تک کہ اس کے پاس جو کچھ ہے، وہ سب کا سب ہمیں حاصل ہو جائے۔'' پھر اسے آنحضور ﷺ نے محمد بن مسلمہؓ کے حوالے کر دیا اور انھوں نے اپنے بھائی محمودؓ بن مسلمہ کے قصاص میں اس کی گردن مار دی۔ کنانہ کی بیوی صفیہؓ کو قیدیوں میں شامل کر لیا گیا۔

یہودیوں کی درخواست

اب یہودیوں نے درخواست کی کہ ''اے محمد ﷺ! ہمیں اس سرزمین میں رہنے دیجیے۔ ہم اس کی دیکھ بھال کریں گے، کیوں کہ آپ لوگوں سے زیادہ ہمیں اس کی معلومات ہیں۔'' ادھر حضور ﷺ اور صحابہؓ کے پاس اتنے ملازم نہ تھے جو اس زمین کی دیکھ بھال اور جوتنے بونے کا کام کر سکتے اور نہ خود صحابہؓ کو اتنی فرصت تھی کہ یہ کام سرانجام دے سکتے۔ اس لیے حضور ﷺ نے خیبر کی زمین مندرجہ ذیل شرائط پر یہود کے حوالے کر دی:

1: یہودی آیندہ قلعوں میں سکونت اختیار نہیں کریں گے۔
2: ساری کھیتی اور تمام پھلوں کی پیداوار کا نصف حصہ یہود کو دیا جائے گا۔
3: جب تک رسول اللہ کی مرضی ہو گی، اس پر برقرار رکھیں گے اور جب چاہیں گے، جلاوطن کر دیں گے۔
4: اگر یہودی ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو جو سامان انھیں بخشا گیا ہے، وہ واپس لے لیا جائے گا۔

اس معاہدے پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت زبیرؓ نے بطور گواہ دستخط کیے۔ اس معاہدے کے بعد حضرت عبداللہؓ بن رواحہ خیبر کی پیداوار کا تخمینہ لگایا کرتے تھے۔ بٹائی کا وقت آتا تو حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو خیبر روانہ کیا جاتا۔ وہ پیداوار کے ڈھیر لگا کر دو حصے کرتے اور یہودیوں کو اختیار دیتے کہ وہ اپنی مرضی سے جو حصہ چاہیں، پسند کر لیں۔ ایک دفعہ یہودی نے تخمینہ کی شکایت کی اور پھر اپنی عورتوں کا زیور جمع کر کے انھیں رشوت دینا چاہی۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول کے دشمنو! تم لالچ دیتے ہو۔ میں اس شخص کی طرف سے آیا ہوں، جسے میں دنیا میں سب سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں۔ مجھے تم سے بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ نفرت ہے۔ تم سے نفرت اور حضور ﷺ سے محبت حُسنِ عدل سے نہیں روک سکتی۔'' حضرت عبداللہ بن رواحہ کی شہادت کے بعد پیداوار کے تخمینے کے کام پر حضرت عبداللہ بن سہیل انصاری کو مقرر کیا گیا۔ انھیں یہودیوں نے شہید کر دیا۔ حضور ﷺ نے ان کی دیت میں سو اونٹ ان کے ورثا کو عطا فرمائے۔ ان کے بعد حضرت جبارؓ بن صخر یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم

خیبر کے اموالِ غنیمت کی تقسیم اس طرح کی گئی کہ اسے 36 حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ ہر حصہ ایک سو حصوں کا جامع تھا۔ اس طرح کل 3600 حصے ہوئے۔ اس میں سے نصف یعنی 1800 حصے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے تھے۔ عام مسلمانوں کی طرح رسول اللہ ﷺ کا بھی صرف ایک ہی حصہ تھا۔ باقی یعنی اٹھارہ سو حصوں پر مشتمل دوسرا نصف رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی اجتماعی و فلاحی ضروریات حاجات کے لیے الگ کر لیا تھا۔ اٹھارہ سو حصوں پر خیبر کی تقسیم اس لیے کی گئی کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل حدیبیہ کے لیے ایک عطیہ تھا۔ جو موجود تھے ان کے لیے بھی اور جو موجود نہ تھے، ان کے لیے بھی۔ اور اہل حدیبیہ کی تعداد چودہ سو تھی، جو خیبر آتے ہوئے اپنے ساتھ دو سو گھوڑے لائے تھے۔ چوں کہ سوار کے علاوہ خود گھوڑے کا بھی حصہ ملتا ہے اور گھوڑے کا حصہ ڈبل یعنی دو فوجیوں کے برابر ہوتا ہے اس لیے خیبر

اٹھارہ سو حصوں میں تقسیم کیا گیا تو دو سو شہ سواروں کو تین تین حصے کے حساب سے چھے سو ملے تھے اور بارہ سو پیدل فوج کو ایک ایک حصے کے حساب سے بارہ سو ملے تھے۔

خیبر کے اموالِ غنیمت کی کثرت کا اندازہ ابن عمرؓ کی اس روایت سے ہوتا ہے کہ انھوں نے فرمایا: ''ہم لوگ آسودہ نہ ہوئے، یہاں تک کہ ہم نے خیبر فتح کیا۔'' اسی طرح حضرت عائشہؓ سے روایت ہے: ''جب خیبر فتح ہوا تو ہم نے کہا، اب ہمیں پیٹ بھر کر کھجور ملے گی۔'' نیز جب رسول اللہ ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو مہاجرین نے انصار کو کھجوروں کے وہ درخت واپس کر دیئے جو انصار نے امداد کے طور پر انھیں دے رکھے تھے، کیوں کہ اب ان کے لیے خیبر میں مال اور کھجور کے درخت ہو چکے تھے۔ یہودیوں سے حُسنِ سلوک کی دلیل یہ ہے کہ غزوہ خیبر میں مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو اس میں تورات کے چند اوراق بھی تھے۔ یہودیوں نے ان کی واپسی کا مطالبہ کیا تو حضور ﷺ نے یہ اوراق واپس کر دیئے اور ان سے ان رومیوں کا سا برتاؤ نہ کیا جنھوں نے یروشلم کی فتح کے موقع پر کُتبِ مقدسہ کو نذرِ آتش کر دیا تھا۔ عیسائیوں کا سا سلوک بھی روا نہ رکھا، جنھوں نے اندلس میں یہودیوں پر غلبہ پانے کے بعد تورات کے اوراق جلا کر راکھ کر دیئے تھے۔

حضرت صفیہؓ سے نکاح

مالِ غنیمت میں ایک سترہ سالہ خوب صورت لڑکی زینب بھی شامل تھی۔ باپ بنو نضیر کا سردار حیی بن اخطب تھا اور اس کی والدہ بنو قریظہ کے سردار کی بیٹی تھی۔ مالِ غنیمت کا بہترین حصہ امام یا بادشاہ کے لیے مختص کیا جاتا تھا، جسے ''صفی'' کہتے تھے، اس لیے آپ کو صفیہ کہا گیا۔ آپ کا پہلا نکاح سلام بن مشکم قرظی سے ہوا جو ایک مشہور سردار تھا۔ اُس سے طلاق ہو جانے کے بعد کنانہ بن ابی حقیق سے عقد ہوا۔ کنانہ خیبر کے قلعہ قموص کا سردار تھا جب کنانہ کو خزانہ چھپانے کے جرم میں قتل کر دیا گیا تو بیوی صفیہؓ سمیت اس کے تمام اہل وعیال قید ہو گئے۔ صفیہؓ کے والد اور بھائی بھی اس غزوے میں ہلاک ہو گئے تھے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت حضرت دحیہ کلبیؓ نے آنحضرت ﷺ سے ایک کنیز کی درخواست کی۔ حضور ﷺ کے حکم کے تحت حضرت دحیہؓ نے حضرت صفیہؓ کا انتخاب کیا، مگر چوں کہ عزت و وقار اور حسب نسب کے لحاظ سے حضرت صفیہؓ زیادہ ذی وقعت تھیں، اس لیے بعض صحابہؓ نے دربارِ رسالت میں عرض کیا کہ حضرت صفیہؓ بنو نضیر اور بنو قریظہ کی رئیسہ ہونے کی بنا پر حضور ﷺ کے لیے مناسب ہیں۔ حضور ﷺ نے یہ مشورہ قبول فرماتے ہوئے حضرت دحیہ کلبیؓ کو دوسری کنیز عنایت فرمائی اور حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے خود نکاح کر لیا۔

(مفصل حالات کے لیے ملاحظہ ہو: کتاب چہارم۔ عنوان اہل بیت)

زہر آلود گوشت

خیبر اور دیگر مقامات کے یہودی اطاعت گزار تو ہو گئے تھے، لیکن شکست خوردگی کا احساس ان میں اس شدت سے تھا کہ ان کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے بغض و عناد کی آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ انھیں یہ فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح آنحضرت ﷺ اور صحابہؓ سے انتقام لیا جائے۔ خیبر کی فتح کے بعد جب حالات خاصی حد تک پرسکون ہو چکے تھے، سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے بھنی ہوئی بکری کا ہدیہ بھیجا۔ اس نے پوچھ رکھا تھا کہ رسول اللہ کونسا عضو پسند کرتے ہیں، اور اسے بتایا گیا تھا کہ دستی۔ اس لیے اس نے دستی میں خوب زہر ملا دیا تھا، اور اس کے بعد بقیہ حصہ زہر آلود کر دیا تھا۔ پھر اسے لے کر وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور آپ ﷺ کے سامنے رکھا تو آپ نے دستی اٹھا کر اس کا ایک ٹکڑا چبایا، لیکن نگلنے کے بجائے تھوک دیا۔ پھر فرمایا کہ یہ ہڈی مجھے بتلا رہی ہے کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے۔ آپ ﷺ کی دیکھا دیکھی بشرؓ بن براء نے آپ ﷺ کی طرح ایک ٹکڑا دانتوں سے کاٹا اور نگل لیا۔ زینب کو بلایا گیا۔ اس نے اپنی کارستانی کا اقبال کیا اور کہا: ''جو کچھ میری قوم کے ساتھ ہوا ہے، وہ آپ ﷺ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ مَیں نے دل میں سوچا تھا کہ اگر آپ ﷺ محض بادشاہ ہیں تو مجھے آپ ﷺ کی موت سے راحت نصیب ہو جائے گی اور اگر پیغمبر ہیں تو آپ کو میری حرکت کا علم ہو جائے گا۔''

بشر بن براء تو اس زہر آلود گوشت کی سمیت سے ہلاک ہو گئے۔ روایات میں اختلاف ہے کہ حضور ﷺ نے اس عورت کو معاف کر دیا تھا یا قتل کر دیا تھا۔ تطبیق اس طرح دی گئی ہے کہ پہلے تو آپ ﷺ نے معاف کر دیا تھا، لیکن جب حضرت بشر بن براء کی موت واقع ہو گئی تو پھر قصاص کے طور پر قتل کر دیا گیا۔

حبشہ سے مسلمانوں کی واپسی

غزوے کے اختتام پر حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اپنے ساتھیوں کے ہم راہ حبشہ سے خیبر آئے۔ اس اثنا میں حضور ﷺ کے بھیجے ہوئے قاصد بھی اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کے بعد لوٹ آئے۔ مدینہ میں صحابہ کو بیتابی سے اس وقت کا انتظار تھا کہ معاہدے کے بموجب جب عازمِ مکہ ہوں اور بیت اللہ کی زیارت کا شرف حاصل کریں۔ حضرت جعفرؓ سے ملتے وقت حضور ﷺ نے ان کی آنکھوں کے درمیان پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا: ''واللہ، میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کس بات کی خوشی زیادہ ہے۔ خیبر کی فتح یا جعفر کی آمد کی۔''

اگر چہ یہ صحابہؓ فتح خیبر کے بعد پہنچے تھے۔ تاہم حضور ﷺ نے مالِ غنیمت میں انھیں حصہ دیا، مگر اور کسی شخص کو جو غزوہ خیبر میں شریک نہ ہوا، حصہ نہیں دیا گیا۔ یاد رہے کہ حبشہ سے ان لوگوں کو بلانے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمروؓ بن امیہ ضمری کو نجاشی کے پاس بھیجا تھا اور اس سے کہلوایا تھا کہ وہ ان لوگوں کو آپ ﷺ کے پاس روانہ کر دے۔ چناں چہ نجاشی نے دو کشتیوں پر سوار کر کے انھیں روانہ کر دیا۔ یہ کل سولہ آدمی تھے اور ان کے ساتھ ان کے باقی ماندہ بچے اور عورتیں تھیں۔ بقیہ لوگ اس سے پہلے مدینے آ چکے تھے۔

اشعری صحابہ کی آمد

غزوہ خیبر کے موقع پر اشعری مسلمان بھی خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے۔

اشعری یمن کا ایک معزز اور بہت بڑا قبیلہ تھا، جو اپنے جد امجد اشعر کی طرف منسوب ہے۔ اس قبیلے کو اشعر اس لیے کہا جاتا ہے کہ جب اشعر پیدا ہوئے تو ان کے جسم پر بال بکثرت تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری اسی قبیلے سے تھے اور آپ اپنے لوگوں اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کے ہم راہ حبشہ سے ایک ہی کشتی میں آئے تھے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری کا بیان، بحوالہ امام بخاری، ہے کہ ''یمن میں ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ظہور کا علم ہوا تو ہم لوگ یعنی میں اور میرے دو بھائی اپنی قوم کے پچاس آدمیوں سمیت اپنے وطن سے ہجرت کر کے ایک کشتی پر سوار آپ ﷺ کی خدمت میں روانہ ہوئے، لیکن ہماری کشتی نے ہمیں نجاشی کے ملک میں پھینک دیا۔ وہاں حضرت جعفرؓ اور ان کے رفقاء سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بھیجا ہے اور یہیں ٹھہرے رہنے کا حکم دیا ہے، اور آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ ٹھہر جائیے۔ چناں چہ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ٹھہر گئے اور خدمت نبوی ﷺ میں اس وقت پہنچ سکے جب آپ ﷺ خیبر فتح کر چکے تھے۔ آپ ﷺ نے ہمارا بھی حصہ لگایا، لیکن ہمارے علاوہ کسی بھی شخص کا، جو فتح خیبر میں موجود نہ تھا، کوئی حصہ نہیں لگایا۔ صرف جنگ کے شرکاء کا حصہ لگایا۔ البتہ حضرت جعفرؓ اور ان کے رفقا کے ساتھ ہماری کشتی والوں کا بھی حصہ لگایا اور ان کے لیے بھی مالِ غنیمت تقسیم کیا۔''

فدک ---- مالِ فے

مدینہ سے دو یا تین دن کی مسافت پر شمالی حجاز میں خیبر کے قریب فدک ایک بستی تھی۔ جو آج کل حائل کے علاقے میں حائط کے نام سے معروف ہے۔ یہاں پانی کے چشمے تھے۔ کھجور اور اناج کافی مقدار میں پیدا ہوتا تھا۔ کمبل بھی بنے جاتے تھے۔ یہودیوں کی اس بستی کا سردار یوشع بن نون تھا۔

خیبر پہنچ کر حضور ﷺ نے حضرت محیصہؓ بن مسعودؓ کو فدک کے یہود کے پاس بھیجا کہ انھیں اسلام کی دعوت دیں، مگر انھوں نے فیصلہ کرنے میں تاخیر کی، لیکن جب خیبر کی فتح کا حال سنا تو ان پر رعب طاری ہو گیا اور انھوں نے پیغام دیا کہ ان کے ساتھ بھی اہل خیبر جیسا معاملہ کیا جائے۔ حضور ﷺ نے آدھی زمین اور نخلستان کی پیداوار کے نصف حصے پر مصالحت کر لی۔ اس طرح آدھا فدک حضور ﷺ کے لیے خالص ہو گیا۔ یہ شرط بھی رکھی گئی کہ ہم جب چاہیں گے، تمھیں زمینوں سے بے دخل کر دیں گے۔ چوں کہ اس کے حصول کے لیے مسلمانوں نے گھوڑے اور اونٹ نہیں دوڑائے تھے، اس لیے یہ ان میں تقسیم نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے بغیر جنگ وجدال یہ زمین بطورِ فے اپنے رسول ﷺ کو عطا فرمائی۔ حضور ﷺ کی زندگی میں یہ زمین اور نخلستان آپ کے لیے مخصوص رہے۔ اس کی آمدنی سے اہل بیت اور مسافروں اور حاجت مندوں کے اخراجات پورے ہوتے۔

غزوہ وادیٔ القریٰ

آنحضور ﷺ نے مدینہ واپس جاتے وقت وادیٔ القریٰ کا راستہ اختیار کیا۔ یہاں یہود کی کئی بستیاں تھیں۔ قدیم زمانے میں عاد اور ثمود یہیں آباد تھے، جن کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ وہاں کے یہودی اسلام دشمن تھے اور انھوں نے کچھ عربوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ مسلمان جب وہاں پہنچے اور ابھی اطمینان سے رکنے بھی نہ پائے تھے کہ یہودیوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے، جس کے نتیجے میں حضور ﷺ کے ایک غلام، جن کا نام مدعم تھا، شہید ہو گئے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے صف قتال درست فرمائی۔ پھر آپ ﷺ نے وادیٔ القریٰ کے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیں تو ان کے مال و جان سے کوئی تعرض نہ ہو گا اور ان کے معاملہ خدا کے ساتھ رہے گا، لیکن وہ برسرِ مقابلہ ہوئے اور ان میں سے ایک شخص دعوت مبارزت دیتا ہوا باہر نکلا، جسے حضرت زبیرؓ بن عوام نے قتل کر دیا۔ دوسرا بھی انھی کے ہاتھوں کیفر کردار کو پہنچا اور تیسرا حضرت علیؓ کی تلوار سے واصل جہنم ہوا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے اس روز گیارہ آدمی قتل کیے گئے۔ حضور ﷺ ہر آدمی کے قتل کے بعد انھیں اسلام کی دعوت دیتے۔

اس دن جب نماز کا وقت ہوتا تو آپ ﷺ صحابہ کرام کو نماز پڑھاتے، اور پلٹ کر یہود کے بالمقابل چلے جاتے اور انھیں اسلام کی دعوت دیتے۔ اس طرح لڑتے لڑتے شام ہو گئی۔ دوسرے دن صبح آپ ﷺ پھر تشریف لے گئے، لیکن ابھی سورج نیزہ برابر بھی بلند نہ ہوا ہو گا کہ ان کے ہاتھ میں جو کچھ تھا، اسے آپ ﷺ کے حوالے کر دیا۔ یعنی آپ ﷺ نے بزورِ قوت فتح حاصل کی اور اللہ نے ان کے اموال آپ ﷺ کو غنیمت میں دیئے۔ صحابہ کرامؓ کو بہت سارا ساز و سامان ہاتھ آیا۔

رسول کریم ﷺ نے وادیٔ القریٰ میں چار روز قیام فرمایا اور جو مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اسے صحابہ کرامؓ پر تقسیم فرما دیا۔ البتہ زمین اور کھجور کے باغات کو یہود کے ہاتھ میں رہنے دیا، اور اس کے متعلق ان سے بھی اہل خیبر جیسا معاملہ کر لیا۔

تیما کے یہودیوں کا معاملہ

تیما خیبر سے کچھ دور اور وادیٔ القریٰ کے قریب واقع ہے۔ یہود یہاں قدیم زمانے سے آباد تھے۔ انھیں جب خیبر، فدک اور وادیٔ القریٰ کے باشندوں کی شکست کی اطلاع ملی تو وہ بہت خوف زدہ ہوئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کی محاذ آرائی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے از خود آدمی بھیج کر صلح کی پیش کش کی۔ حضور ﷺ نے ان کی پیش کش قبول فرمائی۔ اس کے متعلق آپ ﷺ نے ایک تحریر بھی عنایت فرما دی تھی، جو یہ تھی:

''یہ تحریر ہے محمد ﷺ رسول اللہ کی طرف سے بنوعادیا کے لیے۔ ان کے لیے ذمہ ہے، اور ان پر جزیہ ہے۔ ان پر نہ زیادتی ہو گی، نہ انھیں جلاوطن کیا جائے گا۔ یہ معاہدہ ہو گا اور یہ تحریر خالدؓ بن سعید نے لکھی۔''

واقعہ لیلۃ التعریس

وادیٔ القریٰ اور تیما کی فتح کے بعد جب آپ ﷺ مدینہ واپس تشریف لا رہے تھے تو ایک بار رات بھر سفر جاری رکھنے کے بعد آپ ﷺ نے اخیر رات راستے میں کسی جگہ پڑاؤ ڈالا اور حضرت بلالؓ کو یہ تاکید کر کے سو رہے کہ صبح ہو

ز کے لیے بیدار کر دینا، لیکن حضرت بلالؓ کی بھی آنکھ لگ گئی۔ اتفاق سے کوئی بھی بیدار نہ ہوا، حتیٰ کہ لوگوں پر دھوپ آ گئی۔ سب سے پہلے حضور ﷺ بیدار ہوئے اور گھبرا کر اٹھے۔ پھر صحابہؓ کو جگایا اور وادی سے کوچ کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہاں شیطان ہے۔ پھر حضور ﷺ نے اس وادی سے نکل کر حضرت بلالؓ کو اذان کا حکم دیا۔ حضور ﷺ نے جماعت کرائی اور نماز قضا کر کے پڑھی۔

سریہ ابان بن سعید

یہ سریہ صفر سات ہجری میں بھیجا گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ حرام مہینوں کے خاتمے کے بعد مدینہ کو مکمل طور پر خالی چھوڑ دینا تدبر اور دوراندیشی کے خلاف ہے، حالانکہ مدینہ کے گرد و نواح میں ایسے بدو مقیم ہیں جو لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کے لیے مسلمانوں کی غفلت کے منتظر رہتے ہیں، اسی لیے جن ایام میں آپ ﷺ خیبر تشریف لے گئے تھے، انھی ایام میں آپ ﷺ نے بدوؤں کو خوف زدہ کرنے کے لیے حضرت ابانؓ بن سعید کی کمان میں نجد کی جانب ایک سریہ بھیج دیا تھا۔ وہ اپنا فرض ادا کر کے واپس آئے تو نبی ﷺ سے خیبر میں ملاقات ہوئی۔ اس وقت آپ ﷺ خیبر فتح فرما چکے تھے۔

غزوہ ذات الرقاع

رقاع رقعہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں پیوند۔ اس غزوے میں اسلامی پرچم میں پیوند لگائے گئے تھے، اس لیے اس کا نام رقاع پڑا۔ اس غزوے میں پیدل چلنے سے مجاہدینؓ کے پاؤں پھٹ گئے تھے۔ ایڑیاں چھد گئی تھیں۔ بعض کے ناخن تک گر گئے تھے، اس لیے ان پر دھجیاں باندھ لی گئی تھیں۔ یہ غزوہ رقاع نام سے مشہور ہے یعنی کپڑوں کی دھجیوں والی لڑائی۔

آنحضور ﷺ نے بنوغطفان کی دو شاخوں بنی ثعلبہ اور بنی محارب کے اجتماع کی خبر سن کر مدینہ کا انتظام حضرت ابوذر غفاریؓ یا حضرت عثمانؓ بن عفانؓ کے حوالے کیا اور چند سو صحابہ کرامؓ کی معیت میں بلادِ نجد کا رخ کیا۔ پھر مدینے سے دو دن کے فاصلے پر مقام نخل پہنچ کر بنوغطفان کی ایک جمعیت سے سامنا ہوا، لیکن جنگ نہیں ہوئی البتہ آپ ﷺ نے اس موقع پر صلوٰۃ خوف (حالت جنگ والی نماز) پڑھائی۔ صلوٰۃ خوف کی متعلقہ آیت سورۂ نسا کی آیت 102 ہے۔

عام اہلِ مغازی نے اس غزوے کا تذکرہ چار ہجری میں کیا ہے، لیکن امام بخاری نے اس کا زمانہ وقوع سات ہجری بتایا ہے۔ چوں کہ اس غزوے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت ابوہریرہؓ نے شرکت کی تھی، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ غزوہ، غزوہ خیبر کے بعد (غالباً ربیع الاول میں) پیش آیا تھا۔ ابوہریرہؓ اس وقت مدینہ پہنچ کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے، جب رسول اللہ ﷺ خیبر کے لیے مدینہ سے جا چکے تھے۔ پھر حضرت ابوہریرہؓ مسلمان ہو کر سیدھے خدمتِ نبوی ﷺ میں پہنچے تو خیبر فتح ہو چکا تھا۔ اس طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری حبشہ سے اس وقت خدمتِ نبوی ﷺ میں پہنچے جب خیبر فتح ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس غزوے میں ان دونوں صحابہؓ کی شرکت اس بات کی دلیل ہے کہ یہ غزوہ خیبر کے بعد ہی کسی وقت سن سات ہجری میں پیش آیا تھا۔

غزوہ ذات الرقاع کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری (صاحب الرحیق المختوم) رقم طراز ہیں: ''سنگ دل اعراب کو مرعوب اور خوف زدہ کرنے میں اس غزوے کا بڑا اثر رہا۔ ہم اس غزوے کے بعد پیش آنے والے سرایا کی تفصیلات پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ غطفان کے ان قبائل نے اس غزوے کے بعد سر اٹھانے کی جرات نہ کی، بلکہ ڈھیلے پڑتے پڑتے سپر انداز ہو گئے اور بالآخر اسلام قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ ان اعراب کے کئی قبائل ہمیں فتح مکہ اور غزوہ حنین میں مسلمانوں کے ساتھ نظر آتے ہیں اور انھیں غزوہ حنین کے مالِ غنیمت سے حصہ دیا جاتا ہے۔ پھر فتح مکہ سے واپسی کے بعد ان کے پاس صدقات وصول کرنے کے لیے اسلامی حکومت کے عمال بھیجے جاتے ہیں اور وہ باقاعدہ اپنے صدقات ادا کرتے ہیں۔ غرض اس حکمت عملی سے وہ تینوں بازو، جو غزوہ خندق میں مدینہ پر حملہ آور ہوئے تھے اور اس کی وجہ سے پورے علاقے میں امن و سلامتی کا دور دورہ ہو گیا۔ اس کے بعد بعض قبائل نے بعض علاقوں میں جو شور و غوغا کیا، اس پر مسلمانوں نے بڑی آسانی سے قابو پا لیا۔''

سات ہجری کے چند سرایا

واپس آ کر آنحضور ﷺ نے شوال سات ہجری تک مدینہ میں قیام فرمایا اور اس دوران میں متعدد سرایا روانہ کیے۔ بعض کی تفصیل یہ ہے:

سریہ کدید

صفر کے مہینے میں آنحضور ﷺ نے حضرت غالب بن عبداللہ کلبیؓ کو ساٹھ سواروں کے ساتھ بنی الملوح کی جانب کدید (قدید) بھیجا۔ وہاں پہنچ کر مسلمانوں نے حارث بن مالک بن البرصا اللیثی کو گرفتار کر لیا۔ اس نے کہا، ہم تو مسلمان ہونے کے لیے آئے ہیں۔ حضرت غالبؓ نے کہا، ایسا ہی ہے تو ایک دن رات ٹھہرنے میں کیا نقصان ہے۔ چناں چہ اسے باندھ کر اور چند حبشی اس کی نگرانی پر مقرر کر کے اسے وہیں چھوڑ دیا۔

مجاہدینِ اسلام عصر کے وقت کدید میں پہنچے۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو مجاہدین نے کفار پر دھاوا بول دیا۔ جو سامنے آیا قتل ہوا۔ پھر مویشیوں کو ہانک کر چل پڑے۔ کفار نے قوم کو آواز دی اور پھر سب نے اکٹھا ہو کر مسلمانوں کا تیزی سے پیچھا کیا۔ جب مسلمانوں اور کفار کے درمیان وادی کدید رہ گئی، تو قدرت حق سے یکایک وادی میں سیلاب آ گیا، جس کی وجہ سے دشمن اس کنارے پر رہ گیا۔ مسلمان گرفتار قیدی حارث بن مالک اور دوسرا تمام مالِ غنیمت لے کر سلامتی سے مدینہ پہنچ گئے۔

سریہ حسمی

یہ سریہ جمادی الثانی میں روانہ ہوا۔ حضور ﷺ کے قاصد حضرت دحیہ کلبی قیصرِ روم کے پاس اسلامی دعوت کا خط لے کر گئے ہوئے تھے۔ وہ جب قیصر کے تحائف کے ساتھ واپس ہوئے تو حسمی نے راستہ روکا اور تمام تحائف چھین لیے۔ جب انھوں

نے مدینہ پہنچ کر حضور ﷺ کو اس واقعے کی خبر دی تو آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو حضرت دحیہ کلبیؓ کے ہم راہ حسمی کی طرف بھیجا۔ حضرت زیدؓ نے جا کر انتقام لیا۔ انھوں نے تحائف بھی چھین لیے اور ہزاروں مویشی اور سیکڑوں قیدی گرفتار کر کے مدینے لے آئے۔ اس سریے میں پانچ سو مجاہدین بھی حضرت زیدؓ بن حارثہ کے ساتھ تھے۔

سریہ تربہ

یہ سریہ بھی جمادی الثانی میں روانہ ہوا۔ انھی ایام میں آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کو تیس سواروں کے ساتھ بنوہوازن کی جانب روانہ فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے پہنچنے پر وہ لوگ بھاگ گئے۔ ایک دوسری مخالف جماعت کا پتا ملا، مگر حضرت عمرؓ نے کہا کہ ان سے لڑنے کا ہمیں حضور ﷺ کی طرف سے حکم نہیں ملا ہے، اس لیے جنگ کیے بغیر مدینہ لوٹ آئے۔

سریہ بنوکلاب

جمادی الثانی۔ انھی دنوں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضور ﷺ نے بنوکلاب کی طرف بھیجا۔ آپؓ کے ساتھ حضرت سلمہؓ بن اکوع بھی تھے۔ اس سریہ میں مسلمان کام یاب رہے۔ دشمن کے کچھ لوگ قتل ہوئے اور کچھ گرفتار کر لیے گئے۔

سریہ اطرافِ فدک

شعبان۔ آنحضور ﷺ نے حضرت بشیرؓ بن سعد انصاری کو تیس مجاہدین کے ساتھ بنی مرہ کی تادیب کے لیے فدک روانہ کیا۔ مجاہدین نے وہاں پہنچتے ہی ان کے مال پر دھاوا بول دیا اور ان کے اونٹ اور بکریاں وغیرہ ہنکا کر لے آئے۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کا تعاقب کیا۔ راستے میں آمنا سامنا ہو گیا۔ کفار کچھ بھاگ گئے اور کچھ گرفتار ہوئے۔ مسلمان مالِ غنیمت لے کر مدینہ پہنچ گئے۔ تصادم میں حضرت بشیر بن سعدؓ زخمی ہونے کی وجہ سے واپس فدک چلے گئے۔ وہاں ایک یہودی کے ہاں رہے اور صحت یاب ہو کر مدینہ واپس ہوئے۔ (اس سریے کو سریہ بنی مرہ بھی کہتے ہیں)

سریہ خربہ

رمضان المبارک، جنوری 629ء۔ آنحضرت ﷺ نے قبیلہ جہینہ کی طرف حضرت اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ایک سریہ بھیجا۔ وہ لوگ جمع ہو کر رات کو مقابلے پر آئے۔ حضرت اسامہؓ نے انھیں سمجھایا کہ وہ اطاعت اختیار کریں اور مخالفت سے باز رہیں، مگر وہ جنگ پر آمادہ رہے۔ تب حضرت اسامہؓ نے مسلمانوں کو منظم کر کے ان پر زبردست حملہ کیا۔ دریں اثنا حضرت اسامہؓ نے ایک شخص نہیک بن مرداس کا تعاقب کیا۔ اس کے قریب پہنچ کر جب آپ نے تلوار اٹھائی تو اس شخص نے "لا الٰہ الا اللّٰہ" کہا، مگر حضرت اسامہؓ نے اسے قتل کر دیا۔ جب حضور ﷺ کو اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ بہت رنجیدہ خاطر ہوئے اور حضرت اسامہؓ سے فرمایا: ''کیا تو نے اسے "لا الٰہ الا اللّٰہ" کہنے کے بعد قتل کر دیا؟'' حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ، اس نے محض جان بچانے کے لیے ایسا کہا تھا۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''تو نے اس کا دل چاک کر کے تو نہیں دیکھا تھا کہ اس نے دل سے کہا یا نہیں۔''

حضرت اسامہؓ بن زید اس بات پر بہت متاسف ہوئے اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! اب کسی ایسے شخص کو قتل نہ کروں گا جو "لا الٰہ الا اللّٰہ" پڑھ لے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا کہ میرے بعد؟ حضرت اسامہؓ نے عرض کیا، آپ ﷺ کے بعد بھی۔ (اسے سریہ میفعہ بھی کہتے ہیں)۔

سریہ خیبر

شوال سات ہجری۔ یہ سریہ تیس سواروں پر مشتمل تھا، اور حضرت عبداللہ بن رواحہ کی قیادت میں بھیجا گیا تھا۔ ہوا یہ کہ اسیر یا بشیر بن رزام بنوغطفان کو مسلمانوں پر چڑھائی کے لیے جمع کر رہا تھا۔ مسلمانوں نے اسیر کو یہ امید دلا کر کہ رسول اللہ ﷺ اسے خیبر کا گورنر بنا دیں گے، اس کے تیس رفقا سمیت اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا لیکن قرقرہ نیار پہنچ کر فریقین میں بدگمانی پیدا ہو گئی، جس کے نتیجے میں اسیر اور اس کے تیس ساتھیوں کو لڑائی میں جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔

سریہ یمن وجبار

شوال۔ سات ہجری۔ یہ بنوفزارہ اور بنوعذرہ کے علاقے کا نام ہے۔ یہاں حضرت بشیر بن کعب انصاریؓ کو تین سو مسلمانوں کی معیت میں روانہ کیا گیا۔ مقصود ایک بڑی جماعت کو منتشر کرنا تھا، جو مدینے پر حملہ آور ہونے کے لیے جمع ہو رہی تھی۔ مسلمان راتوں رات سفر کرتے اور دن میں چھپ رہتے تھے۔ جب دشمن کو حضرت بشیرؓ کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ حضرت بشیرؓ نے بہت سے مویشیوں پر قبضہ کیا۔ دو آدمی بھی قید کر لیے اور جب ان دونوں کو لے کر خدمت نبوی ﷺ میں مدینہ پہنچے تو دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔

سریہ بشیر بن سعد انصاریؓ

شوال سات ہجری۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حسیل بن نویرہ نے حاضر ہو کر عرض کی کہ غطفان اور حیان کے لوگ جمع ہیں اور عیینہ نے انھیں کہلا بھیجا ہے کہ تم آتے ہو کہ ہم آئیں۔ ان کا ارادہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمرؓ سے مشورے کے بعد حضرت بشیر بن سعدؓ کو تین سو مجاہدین کے ساتھ روانہ فرمایا۔ مجاہدین نے وہاں پہنچتے ہی غارت ڈالی۔ دشمن اس خوف سے ہی منتشر ہو گیا۔ مجاہدین ان کے مویشیوں کو لے کر چلے۔ راستے میں عیینہ کا جاسوس ملا، جسے قتل کر دیا گیا، پھر اس کی جماعت ملی، مگر وہ ان حالات سے بے خبر ہونے کے باعث کسی تصادم کے بغیر آگے بڑھ گئی۔ مسلمانوں کو اسی جماعت کے دو آدمی علیحدہ ملے جنھیں پکڑ کر وہ مدینہ لے آئے۔ یہاں پہنچ کر دونوں مسلمان ہو گئے۔

عمرۃ القضاء

اسے کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ عمرۃ القضیہ، عمرۃ الصلح اور عمرۃ الحدیبیہ۔ گزشتہ سال ذی قعدہ سن چھے ہجری میں کفار مکہ نے مسلمانوں کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا تھا۔ یہ اس عمرہ کے قضا ہونے کی وجہ سے عمرۃ القضاء کہلاتا ہے۔

فتح خیبر کے بعد یہودیوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا کہ اب وہ کوئی شرارت نہیں کر پائیں گے۔ دیگر قبائل بھی فتح خیبر سے مرعوب ہو گئے تھے، اس لیے ان کی جانب سے بھی کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔ چناں چہ حضور ﷺ نے سال پورا ہونے پر ذی قعدہ سات ہجری میں عمرے کا ارادہ ظاہر فرمایا اور کہا کہ جو لوگ صلح حدیبیہ میں شامل ہوئے تھے، وہ ضرور ساتھ جائیں۔ یہ بھی حکم دیا کہ ہر فرد کو پوری طرح مسلح ہونا چاہیے۔ اس حکم سے صحابہ کرامؓ کو حیرت ہوئی اور عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ، معاہدے میں تو یہ طے ہوا تھا کہ کوئی شخص بھی مکہ میں ہتھیار بند ہو کر داخل نہیں ہو گا۔''

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہم حسبِ معاہدہ اپنے ہتھیار مکہ سے باہر ہی چھوڑ دیں گے، لیکن اسلحہ ہماری دست رس میں تو ہونا چاہیے، تاکہ اگر دشمن بدعہدی کرے اور ہمیں غیر مسلح دیکھ کر حملہ کر دے تو ہم اپنا دفاع کر سکیں۔''

روانگی سے قبل حضور ﷺ نے مسجد نبوی ﷺ سے احرام باندھا۔ قربانی کے لیے ساٹھ اونٹ لیے اور ان کے گلے میں پٹے وغیرہ نشانی کے لیے ڈال دیے، تاکہ دیکھنے والوں کو پتا چلتا رہے کہ یہ قربانی کے جانور ہیں۔ قربانی کے اونٹوں پر حضرت ناجیہؓ اسلمی کو گھوڑوں پر حضرت محمد بن مسلمہؓ کو، اور ہتھیاروں پر حضرت عبداللہ بن رواحہ کو نگران مقرر فرمایا۔ حضور ﷺ نے اس موقع پر حضرت ابوذر غفاریؓ کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا۔

ذوالحلیفہ پہنچ کر حضور ﷺ نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کی قیادت میں گھڑ سواروں کا ایک دستہ آگے روانہ کیا اور خود دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ بعد میں عازمِ سفر ہوئے۔

حضرت محمدؓ بن مسلمہ تیزی سے سفر کرتے ہوئے مکہ کے قریب مرالظہران نامی جگہ پر پہنچے تو وہاں قریش کے چند افراد پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو پوری طرح مسلح دیکھا تو ان کا ماتھا ٹھنکا کہ کہیں مسلمان مکہ پر حملہ آور تو نہیں ہو رہے۔ چناں چہ انھوں نے حضرت محمدؓ بن مسلمہ سے حضور ﷺ کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ وہ بھی بہت سے اصحاب کے ہم راہ تشریف لا رہے ہیں۔ ان شاء اللہ کل تک پہنچ جائیں گے۔

معاہدے میں ہتھیار ساتھ نہ رکھنے کی شرط تھی۔ اس لیے مکہ سے آٹھ میل دور بطن یاجج میں انھیں چھوڑ دیا گیا۔ حضرت اوس خولی انصاری کی قیادت میں دو سو افراد کا ایک دستہ حفاظت پر مامور کیا گیا، البتہ سوار کا ہتھیار یعنی میان میں رکھی ہوئی تلوار ساتھ تھی۔

اہلِ مکہ کو جب اطلاع ہوئی کہ مسلمان قریب پہنچ گئے ہیں تو انھوں نے مکرز بن حفص کو دریافتِ حال کے لیے بھیجا۔ بتایا گیا کہ عمرے کے لیے آئے ہیں۔ احتیاط کے خیال سے ہتھیار ساتھ ہیں۔ اکثر لوگوں نے شہر خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلے گئے۔ کچھ مسلمانوں کو دیکھنے کے لیے جبل قعیقعان پر جمع ہو گئے۔ کچھ حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے۔

دارالندوہ سے صحابہ کرام کو صفیں باندھ کر نظم و ضبط کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے کا حکم ہوا۔ رسول کریم ﷺ جب حرم کی جانب بڑھ رہے تھے تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ آپ ﷺ کی اونٹنی قصویٰ کی مہار تھامے ہوئے تھے۔ مسلمان تلبیہ پڑھتے ہوئے حرم میں داخل ہوئے۔ ان کے گلوں میں نیام میں پڑی ہوئی تلواریں تھیں۔

حضور ﷺ نے قصویٰ پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف شروع کیا۔ اپنی چادر دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر ڈال دی۔ سواری ہی پر سے اپنی موٹھ کی لکڑی سے حجر اسود کا استلام (بوسہ) فرمایا۔

کفار آپس میں طنزاً کہنے لگے کہ مدینے کی آب و ہوا نے انھیں کم زور کر دیا ہے۔ یہ لوگ مشقت اور تنگی سے ناتواں ہو گئے ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ طواف کے تین چکروں میں ''رمل'' کرو، یعنی اکڑ اکڑ کر کندھوں کو کھول کر تیز تیز چلو۔ یہ سنت آج تک جاری ہے۔ حکم ہوا کہ مطاف میں پھیل کر طواف کرو، تاکہ قوت و طاقت کا مظاہرہ ہو۔

حضور ﷺ نے مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر آپ ﷺ صفا و مروہ کے درمیان سعی کے لیے تشریف لے گئے۔ اس موقع پر کفار کی بہت بڑی تعداد آپ ﷺ کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئی۔ حتیٰ کہ لڑکیاں بھی باہر نکل آئیں۔ آپ ﷺ نے نہ ان لوگوں کو ہٹایا نہ کسی کو دھکا دیا، لیکن جب ہجوم زیادہ ہو گیا تو سواری پر بیٹھ گئے۔

ارکانِ عمرہ سے فراغت کے بعد قربانی کے اونٹ جو پہلے ہی سے ذی طویٰ میں موجود تھے، طلب فرمائے اور انھیں مروہ پر ذبح کیا۔ ارشاد ہوا: ''مروہ اور مکہ کے تمام گلی کوچے قربان گاہ ہیں۔ اسی جگہ آپ ﷺ نے سر منڈوایا۔ جو صحابہؓ عمرہ کر چکے تھے، ان میں سے ایک جماعت کو بطن یاجج بھیج دیا گیا۔ سامان کی حفاظت کرنے والوں کو عمرہ ادا کرنے کے لیے بلوایا گیا۔ بیت اللہ میں داخل ہوئے اور ظہر تک اندر رہے۔ حضرت بلالؓ نے کعبے کی چھت پر اذان کہی۔ آپ ﷺ نے مکہ میں کسی مکان میں قیام نہیں فرمایا۔ آپ ﷺ کے لیے ریتلی زمین پر چمڑے کا خیمہ نصب کیا گیا۔ روانگی تک آپ ﷺ نے یہیں قیام فرمایا۔

تین شب و روز کا قیام مکمل ہو گیا تو سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبدالعزیٰ آئے۔ اس وقت آپ ﷺ انصار کے درمیان تشریف فرما تھے۔ کہا ہم اللہ اور عہد کا واسطہ دیتے ہیں، کیا تم ابھی تک ہماری سرزمین سے رخصت نہیں ہوئے، حالانکہ تین دن گزر چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے اسی وقت حضرت ابورافع کو کوچ کی منادی کا حکم دے دیا۔ اعلان ہوا کوئی مسلمان وہاں شام نہ کرے۔

اہلِ مکہ نے پہاڑوں سے اتر کر اپنے گھروں کا جائزہ لیا تو ایک تنکا بھی ادھر کا ادھر نہ پایا۔ ذرہ برابر بھی کسی چیز کو نقصان نہ پہنچا تھا۔ یہی اخلاقی کردار اور بلندی کردار کے ثبوت تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس اعلیٰ حسن کردار سے کفار متاثر نہ ہوئے ہوں گے؟ خاموش لمحوں میں کیا اس طرزِ عمل نے دل کے نرم گوشوں میں سر نہ اٹھایا ہو گا؟

اسی عمرے کے دوران میں نبی کریم ﷺ نے حضرت میمونہ بنت حارث عامریہ سے شادی کی۔ میمونہؓ کی کئی بہنیں تھیں جو قریش کے معزز افراد سے بیاہی گئی

تھیں۔ام الفضلؓ حضرت عباسؓ کی زوجیت میں تھیں۔ ایک بہن خالد بن ولید کی ماں تھیں۔ حضرت میمونہ بیوہ ہوگئی تھیں اور حضرت عباس کی نگرانی میں رہ رہی تھیں۔ عمرہ کے موقع پر حضور ﷺ نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کو ان کے پاس نکاح کا پیام دے کر روانہ کیا۔ انھوں نے یہ اختیار حضرت عباسؓ کو دیا۔ انھوں نے بعوض چار سو درہم نکاح پڑھایا۔ رسم عروسی ادا نہ ہوئی تھی کہ قریش نے مکہ خالی کرنے کا تقاضا کیا۔ آپ ﷺ نے اپنے غلام ابورافعؓ کو پیچھے چھوڑ دیا کہ وہ حضرت میمونہ کو سوار کر کے آپ ﷺ کی خدمت میں لے آئیں۔

چناں چہ مکہ سے دس میل دور سرف کے مقام پر عروسی فرمائی۔ حضرت میمونہؓ کے حالات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب چہارم۔ عنوان ''اہل بیت'')

سریہ ابوالعوجاء

عمرۃ القضاء سے واپسی پر اسی ماہ یعنی ذوالحج سات ہجری میں حضور ﷺ نے قبیلہ بنی سلیم کی طرف ایک سریہ بھیجا۔ یہ صرف پچاس جان بازوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا دستہ تھا۔ اس سریے کے قائد حضرت ابوالعوجاءؓ تھے۔ جب بنوسلیم کو اسلام کی دعوت دی گئی تو انھوں نے جواب میں کہا کہ تم جس بات کی دعوت دیتے ہو، ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پھر انھوں نے سخت لڑائی کی، جس میں ابوالعوجاءؓ زخمی ہو گئے۔ تاہم مسلمانوں نے دشمن کے دو آدمی قید کیے۔

خالد بن ولید کا قبولِ اسلام

دن گزرتے گئے اور واقعات نے یہ ثبوت بہم پہنچا دیا کہ آپ ﷺ کا اندازہ درست تھا۔ آپ ﷺ کو مدینہ پہنچے ہوئے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ خالدؓ بن ولید نے، جو قریش کا مشہور شہسوار تھا، اور جس نے غزوہ احد میں بہادری کے ساتھ کفار کی حمایت میں جنگ کی تھی، اپنے حلقہ احباب میں کہا: ''ہر دانشمند شخص پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ آنحضرت ﷺ ساحر ہیں نہ شاعر۔ ان کی باتیں خدا کی باتیں ہیں۔ ہر عقل مند کا فرض ہے کہ وہ ان کی پیروی کرے۔''

عکرمہ بن ابی جہل نے یہ بات سنی تو وحشت زدہ ہو گیا اور اس نے کہا: ''اے خالد، کیا تو صابی ہو گیا ہے؟''

خالد بن ولید نے جواب دیا: ''صابی نہیں، بلکہ مَیں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔''

عکرمہ نے کہا: ''قریش میں سے جس شخص کی زبان سے ایسے الفاظ کی توقع نہ تھی، وہ تو تھا۔''

خالد نے دریافت کیا: ''آخر اس کا سبب؟''

عکرمہ نے کہا: ''کیوں کہ پیغمبر اسلام نے تیرے باپ کو زخمی بھی کیا اور ذلیل و خوار بھی، اور جنگ بدر میں تیرا چچا اور اس کا بیٹا مسلمانوں کے ہاتھوں تہ تیغ کیے گئے۔ بخدا! اگر تیری جگہ میں ہوتا تو ہرگز اسلام نہ لاتا اور نہ اس قسم کے الفاظ میری زبان سے نکلتے۔ تو نہیں جانتا کہ قریش اس سے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔''

خالد بن ولید نے جواب دیا: ''یہ معاملہ ایام جاہلیت کی عصبیت اور حمیت پر مبنی ہے، لیکن بخدا اب کہ مجھ پر حقیقت آشکارا ہو چکی ہے، مَیں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔''

خالدؓ بن ولید نے چند گھوڑے آنحضرت ﷺ کے پاس روانہ کیے اور اپنے قبول اسلام کی اطلاع بھی بھیجی۔ جب ابوسفیان کو خالدؓ بن ولید کے قبول اسلام کی خبر ملی تو اس نے انھیں بلا بھیجا اور پوچھا: ''تمھارے متعلق جو افواہیں گرم ہیں، کیا ان میں کچھ صداقت ہے؟''

خالدؓ نے کہا: ''ہاں ہاں، جو کچھ تم نے سنا ہے، وہ درست ہے۔''

ابوسفیان نے طیش میں آ کر کہا: ''لات و عزیٰ کی قسم! اگر مجھے یہ بات یقین سے معلوم ہو گئی کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو، سچ ہے، تو میں محمد ﷺ سے قبل، تم سے دو دو ہاتھ کروں گا۔''

خالد بن ولیدؓ نے کہا: ''بخدا، یہ سچ ہے کہ مَیں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ جنھیں یہ پسند نہ ہو، وہ بے شک خفا ہو جائیں۔''

اس پر ابوسفیان سخت غصے میں آ کر خالد بن ولید پر ٹوٹ پڑا، مگر عکرمہ نے جو وہاں موجود تھا، اسے روکا اور کہا: ''اے ابوسفیان! ٹھہرو۔ بخدا، مجھے بھی یہی خدشہ ہے جو تمھیں ہے، ورنہ میں بھی وہی بات کہتا جو خالدؓ نے کہی ہے۔ اور میں بھی اسلام قبول کر لیتا۔ تم خالدؓ کو اس عقیدے کی بنا پر، جو اس نے اختیار کیا ہے، قتل کر دینا چاہتے ہو۔ تمھیں شاید یہ معلوم نہیں کہ قریش کے تمام لوگوں کا زاویہ نظر بدل چکا ہے، اور وہ بھی کچھ اس قسم کے خیالات دلوں میں لیے بیٹھے ہیں۔ بخدا مجھے خطرہ ہے کہ ایک سال بھی نہیں گزرنے پائے گا کہ تمام اہل مکہ اسی عقیدے کے پیرو ہو جائیں گے۔''

اس کے بعد خالدؓ بن ولید مکہ سے چل کر مدینہ آ گئے اور مسلمانوں کی جماعت میں آ شامل ہوئے۔

حضرت عمروؓ بن العاص اور عثمانؓ بن طلحہ کا اسلام

حضرت خالدؓ بن ولید کے بعد عمروؓ بن عاص اور کعبے کے پاسبان حضرت عثمانؓ بن طلحہ بھی اسلام لے آئے۔ ان کے قبولِ اسلام سے بہت سے اہل مکہ حلقہ اسلام میں داخل ہوئے، جس سے اسلام کی قوت اور اس کے شکوہ میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ ان حالات کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ عن قریب وہ وقت آ رہا ہے، جب مکہ کے دروازے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں پر کھل جائیں گے۔

جب قریش کے لوگوں نے صُلح حدیبیہ کا معاہدہ توڑ دیا تو رسول کریم ﷺ نے مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں، مگر چند مخصوص صحابہ کے سوا کسی کو یہ نہ بتایا کہ آپ کس مہم پر جانا چاہتے ہیں۔ اتفاق سے اُسی زمانے میں مکہ معظمہ سے ایک عورت آئی جو پہلے بنی عبدالمطلب کی لونڈی تھی اور پھر آزاد ہو کر گانے بجانے کا کام کرتی تھی۔ اس نے آ کر حضور ﷺ سے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی اور کچھ مالی مدد مانگی۔ آپ نے بنی عبدالمطلب اور بنی المطلب سے اپیل کر کے اس کی حاجت پوری

کردی۔ جب وہ مکہ جانے لگی تو حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ اس سے ملے اور اسے چپکے سے ایک خط بعض سردارانِ مکہ کے نام دیا اور دس دینار دیے تا کہ وہ راز فاش نہ کرے اور چھپا کر یہ خط اُن لوگوں تک پہنچا دے۔ ابھی وہ مدینہ سے روانہ ہی ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو اس پر مطلع فرما دیا۔ آپ ﷺ نے فوراً حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ بن اسود کو اس کے پیچھے بھیجا اور حکم دیا کہ تیزی سے جاؤ، روضۂ خاخ کے مقام پر (مدینہ سے 12 میل بجانب مکہ) تمھیں ایک عورت ملے گی جس کے پاس مشرکین کے نام حاطب کا ایک خط ہے۔ جس طرح بھی ہو اس سے وہ خط حاصل کرو۔ اگر وہ دے دے تو اسے چھوڑ دینا۔ نہ دے تو اسے قتل کر دینا۔ یہ حضرات جب اس مقام پر پہنچے تو عورت وہاں موجود تھی۔ انھوں نے اس سے خط مانگا۔ اس نے کہا میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ انھوں نے تلاشی لی۔ مگر کوئی خط نہ ملا۔ آخر کو انھوں نے کہا خط ہمارے حوالے کرو ورنہ ہم برہنہ کر کے تیری تلاشی لیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اپنی چوٹی میں سے وہ خط نکال کر انھیں دے دیا اور یہ اسے حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ کھول کر پڑھا گیا تو اس میں قریش کے لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ تم پر چڑھائی کی تیاری کر رہے ہیں۔ مختلف روایات میں خط کے الفاظ مختلف نقل ہوئے ہیں، مگر مدّعا سب کا یہی ہے)۔ حضور ﷺ نے حضرت حاطبؓ سے پوچھا، یہ کیا حرکت ہے، انھوں نے عرض کیا آپ میرے معاملہ میں جلدی نہ فرمائیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اس بنا پر نہیں کیا ہے کہ میں کافر و مرتد ہو گیا ہوں اور اسلام کے بعد اب کفر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اقرباء مکہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے قبیلہ کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں۔ مہاجرین میں سے دوسرے جن لوگوں کے اہل و عیال مکہ میں ہیں انھیں تو ان کا قبیلہ بچا لے گا۔ مگر میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے جسے کوئی بچانے والا ہو۔ اس لیے میں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش والوں پر میرا ایک احسان رہے جس کا لحاظ کر کے وہ میرے بال بچوں کو نہ چھیڑیں۔ (حضرت حاطب کے بیٹے عبدالرحمٰن کی روایت یہ ہے کہ اُس وقت حضرت حاطبؓ کے بچے اور بھائی مکہ میں تھے، اور خود حضرت حاطبؓ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ماں بھی وہیں تھیں)۔ رسول اللہ ﷺ نے حاطبؓ کی یہ بات سن کر حاضرین سے فرمایا قَدْ صدقکم "حاطب نے تم سے سچی بات کہی ہے"، یعنی ان کے اِس فعل کا اصل محرک یہی تھا، اسلام سے انحراف اور کفر کی حمایت کا جذبہ اس کا محرک نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اُٹھ کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں، اس نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا "اس شخص نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ تمھیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بدر کو ملاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ بھی کرو، میں نے تمھیں معاف کیا۔" (اس آخری فقرے کے الفاظ مختلف روایات میں مختلف ہیں۔ کسی میں ہے قد غفرت لکم میں نے تمھاری مغفرت کردی۔ کسی میں ہے انی غافر لکم میں تمھیں بخش دینے والا ہوں اور کسی میں ہے سَاَغفر لکم میں تمھیں بخش دوں گا)۔ یہ بات سن کر حضرت عمرؓ رو دیے اور انھوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی سب سے زیادہ جانتے ہیں۔

8 ہجری ...... یکم مئی 629ء تا 19-اپریل 630ء

سریہ موتہ	جمادی الاولیٰ۔اگست، ستمبر 629ء	سریہ خالد بن ولید	شوال
سریہ ذات السلاسل	جمادی الآخر۔ستمبر، اکتوبر 629ء	غزوۂ حنین (اوطاس یا ہوازن)	شوال
سریہ سیف البحر (سریہ خبط)	رجب۔اکتوبر، نومبر 629ء	غزوۂ طائف	شوال
فتح مکہ	10 رمضان۔یکم جنوری 630ء	جعرانہ میں آمد	ذی قعد
سریہ خالد بن ولید (بت شکنی)	25 رمضان	وفد ہوازن کا قبول اسلام	ذی قعد
سریہ عمرو بن العاص (بت شکنی)	25 رمضان	عمرۂ جعرانہ	ذی قعد
سریہ سعد بن زید اشہلی	26 رمضان	وفد صدآء کا قبول اسلام	ذی قعد

سریہ موتہ

خیبر، وادیٔ القریٰ اور فدک کی فتح سے ریاست مدینہ کی حدود وسیع ہوگئی تھیں۔ شام کی سرحد کے ساتھ آباد بنوغسان اور ان کے زیر اثر عرب قبائل ریاست مدینہ کو اپنے سیاسی اور معاشی مفادات کے لیے بہت بڑا خطرہ سمجھنے لگے تھے۔ بنوغسان رومیوں کے حامی تھے۔ ان کے ہم مذہب تھے۔ قیصر روم نے غسانی حاکموں کو داخلی خودمختاری دے رکھی تھی اور بہت سے غسانی شہزادوں کو اپنے علاقے میں اہم عہدوں پر فائز کر رکھا تھا۔ اس طرح رومیوں اور غسانیوں کے مذہبی، سیاسی، معاشی اور تجارتی مفادات مشترکہ تھے۔ جنوبی عرب سے مکہ اور مدینہ ہوتے ہوئے جو تجارتی قافلے بصریٰ جاتے تھے، ان سے انھیں بہت زیادہ آمدنی ہوتی تھی۔ بصریٰ سے آگے مال تجارت دمشق، فلسطین، مصر اور یورپی ممالک تک رومیوں کی نگرانی میں جایا کرتا تھا، اور اب صدیوں کے جمے جمائے حالات بدلنے لگے تھے۔ مکہ اور بصریٰ کے درمیان ایک نئی اور منظم سیاسی اور مذہبی قوت پیدا ہوگئی تھی۔ رومیوں اور غسانیوں کا اس اسلامی قوت اور ریاست مدینہ کو اپنے مفادات کے لیے خطرہ سمجھنا ایک فطری امر تھا۔ ریاست مدینہ ان کے مذہب کے لیے بھی خطرہ تھی، مالی مفادات کے لیے بھی اور سیاسی مفادات کے لیے بھی۔

رسول کریم ﷺ کی طرف سے اسلام کی دعوت قبول کرنے کا نامۂ مبارک موصول ہونے کے بعد سے قیصر روم ہرقل اس خطرے کو شدت سے محسوس کرنے لگا تھا اور اسلامی ریاست کی سرحد پر فوجیں جمع کر رہا تھا۔ ہرقل ریاست مدینہ پر خود حملہ کرنا چاہتا تھا یا اپنے زیر اثر عرب قبائل کی پشت پناہی کر کے انھیں ریاست مدینہ کے خلاف متحد و متحرک کرنا چاہتا تھا۔ شام کی سرحد کے ساتھ آباد غسانی ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ یثرب میں ان کا اثر و رسوخ قائم ہو جائے۔ بنوغسان دراصل یثرب کے دونوں قبیلوں بنوخزرج اور بنواوس کے ہم نسل تھے۔ غسانی بادشاہ ابوجبیلہ نے فوجی قوت کے ذریعے بنوخزرج اور بنواوس کو یثرب کے یہودیوں کی حاکمانہ گرفت سے آزادی دلائی تھی۔ یہودیوں کے خلاف شاہ غسان سے مدد حاصل کرنے بنوخزرج کا جو سردار گیا تھا، اس کا نام مالک بن عجلان تھا۔ یہودیوں سے آزادی کے بعد مالک بن عجلان نے شاہ غسان کی سرپرستی میں یثرب پر اپنی حاکمیت قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں ناکامی کے بعد وہ یثرب چھوڑ کر شاہ غسان کے پاس چلا گیا تھا اور وہیں فوت ہوا تھا اور اب اسی یثرب میں ایک ایسی ریاست قائم ہو گئی تھی، جس کا سربراہ انھیں اور ان کے ہرقل اعظم کو اسلام کی دعوت دینے لگا تھا۔

ادھر رومیوں اور غسانیوں کے زیر اثر عرب قبائل باہمی اتحاد ریاست مدینہ کے لیے مسائل پیدا کر سکتا تھا اور ان کا مخالفانہ رویہ دین حنیف کے مشن کی تکمیل میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ ہرقل کی طرف سے ان قبائل کی پشت پناہی سے اس مشن کی تکمیل کی راہ میں حائل رکاوٹوں میں اضافہ ہو سکتا تھا، اس لیے حضور ﷺ نے ان عرب قبائل اور غسانیوں کی طرف ایک بڑا لشکر روانہ فرمایا۔

لشکر کشی کی فوری وجہ یہ ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے حارث بن عمیر ازدیؓ کو اپنا خط دے کر حاکم بصریٰ کے پاس روانہ کیا تو انھیں ہرقل کے گورنر شرجیل بن عمرو غسانی نے، جو بلقا پر مامور تھا، گرفتار کر لیا اور مضبوطی سے باندھ کر قتل کر دیا۔ سفیروں اور قاصدوں کا قتل بدترین جرم تھا، جو اعلانِ جنگ کے برابر بلکہ اس سے بھی بڑھ کر سمجھا جاتا تھا، اس لیے جب رسول اللہ ﷺ کو اس واقعے کی اطلاع دی گئی تو آپ ﷺ پر یہ بات سخت گراں گزری اور آپ ﷺ نے اس علاقے پر فوج کشی کے لیے تیار

ہزار کا لشکر تیار کیا۔ یہ سب سے بڑا اسلامی لشکر تھا جو اس سے پہلے جنگ خندق کے علاوہ کسی اور جنگ میں فراہم نہ ہو سکا تھا۔

تین ہزار مجاہدین کے اس لشکر پر حضرت زید بن حارثہؓ کو سپہ سالار مقرر کر کے ارشاد فرمایا، اگر زیدؓ شہید ہو جائیں تو اسلامی علم جعفرؓ بن ابی طالب کو سونپ دیا جائے۔ اگر جعفرؓ بھی شہادت پائیں تو پھر عبداللہؓ بن رواحہ کو سالاری کا منصب سونپا جائے۔ ابن رواحہؓ بھی شہید ہو گئے تو پھر مسلمانوں کو اختیار ہے کہ وہ جسے چاہیں، اپنا امیر چن لیں۔ جب یہ لشکر روانہ ہوا تو خالدؓ بن ولید اپنی مرضی سے اس لشکر میں شامل ہوئے۔ یہ لشکر بڑے اہتمام سے روانہ کیا گیا۔ خود آنحضور ﷺ مدینہ کے باہر ثنیۃ الوداع تک اسے رخصت کرنے کے لیے تشریف لائے۔ اپنے الوداعی خطبے میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پہلے اس مقام پر جانا، جہاں ہمارے سفیر حارثؓ بن عمیر کو شہید کیا گیا۔ قاتل کو اسلام کی دعوت دینا۔ اگر قبول کر لے تو خیر۔ ورنہ اللہ تعالیٰ سے نصرت اور فتح کی دعا کرنا اور قتال کرنا۔ اہل لشکر کو مخاطب کرتے ہوئے نصیحت کی: ''ہر حال میں تقویٰ ملحوظ رکھو۔ اللہ کی راہ میں اللہ کے نام پر کفر کرنے والوں سے جہاد و قتال کرو۔ اس میں عذر اور خیانت مت کرو۔ اپنے رفقاء کا خیال رکھو۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی کرو۔ کسی بوڑھے، بچے اور عورت کو قتل نہ کرو۔ عبادت گاہوں میں رہنے والوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ سایہ دار اور پھل دار درخت نہ کاٹو۔ کسی عمارت کو نہ گراؤ۔''

حضرت عبداللہ بن رواحہ کی حالت

روانگی کے وقت حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی حالت بہت غیر تھی۔ بار بار پلٹ کر کبھی مدینہ کی طرف دیکھتے اور کبھی رسول اللہ ﷺ کی جانب۔ دونوں آنکھوں کی ٹھنڈک۔ آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ لوگوں نے پوچھا، کیا بات ہے۔ انھوں نے کہا: ''خدا کی قسم! اس کا سبب دنیا کی محبت یا گھر بار چھوڑنے یا تمھارے ساتھ تعلق خاطر چھوٹنے کا غم نہیں ہے۔ دراصل میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک آیت پڑھتے سنا ہے جس میں جہنم کا ذکر ہے:

﴿وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾

(مریم: 71)

''تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم پر وارد نہ ہو، یہ تو ایک طے شدہ بات ہے جسے پورا کرنا تیرے رب کا ذمہ ہے۔''

میں نہیں جانتا کہ جہنم پر وارد ہونے کے بعد کیسے پلٹ سکوں گا؟ بس جب یہ خیال آتا ہے تو دل بھر آتا ہے اور رونے لگتا ہوں۔''

جب اہل ایمان نے دیکھا کہ ان پر غیر معمولی خوف خدا طاری ہے تو تسلی دی۔ دعا بھی کی کہ صحیح سلامت واپس آ جاؤ۔ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے دعا کے جواب میں فی البدیہ یہ اشعار پڑھے، جن کا ترجمہ یہ ہے:

''لیکن میں تو اللہ رحمٰن سے مغفرت کا طلب گار ہوں
اور ایسے گھاؤ کا، جس سے خون کے پھوارے پھوٹ رہے ہوں
یا حاسد دشمن کے نیزے کے ایسے مہلک وار کا
جو میری آنتوں اور جگر سے پار ہو جائے
اور پھر جب لوگ میری قبر کے پاس سے گزریں تو کہ اٹھیں
یہ وہی مجاہد ہے جو حق کے سیدھے راستے کا شہید ہے۔''

جمادی الاول، آٹھ ہجری مطابق اگست، ستمبر 629ء میں اسلامی لشکر آنحضور ﷺ کی دعاؤں کے زیر سایہ روانہ ہوا اور شمال کی طرف بڑھتا ہوا معان پہنچا۔ یہ مقام شمالی حجاز سے متصل شامی (اردنی) علاقے میں واقع ہے۔ یہاں لشکر نے پڑاؤ ڈالا اور یہیں جاسوسوں نے اطلاع پہنچائی کہ ہرقل بلقاء کے علاقے میں مآب کے مقام پر ایک لاکھ رومیوں کا لشکر لے کر خیمہ زن ہے اور اس کے جھنڈے تلے لخم، جذام، وائل، بکر، بلقین، بہرا اور بلی کے عرب قبائل کے بھی مزید ایک لاکھ جنگجو یہاں جمع ہیں۔

مسلمانوں نے یہ سوچا بھی نہ تھا کہ دو لاکھ کی ٹڈی دل فوج سے مقابلہ ہوگا۔ وہ حیران و پریشان تھے، اور اسی کیفیت میں وہ وہاں دو راتیں ٹھہرے اور یہی سوچتے رہے کہ دو لاکھ کے ٹھاٹھیں مارتے لشکر کے مقابلے پر ہم پر کیا بنے گی۔ کسی نے مشورہ دیا کہ ہم آنحضرت ﷺ کو بذریعہ تحریر دشمن کی کثرت تعداد کے بارے میں اطلاع دیتے ہیں۔ وہ یا تو مزید کمک بھیج کر ہماری مدد کریں گے یا ہمیں نیا حکم دیں گے جس کے مطابق ہم عمل کریں گے۔ قریب تھا کہ سب اس رائے سے متفق ہو جائیں، کہ حضرت عبداللہؓ بن رواحہ نے، جو ایک بہادر اور شجاع جنگجو ہونے کے علاوہ بہت اچھے شاعر بھی تھے، سب سے مخاطب ہو کر کہا:

''دوستو! جس چیز سے تم بچ رہے ہو، بخدا یہی تو ہے جس کی جستجو تمھیں یہاں تک لے آئی ہے یعنی شہادت! ہم دشمنوں سے سامانِ جنگ یا طاقت یا کثرتِ تعداد کی بنا پر جنگ آزما نہیں ہوتے، بلکہ ہم تو صرف اس دین کے اعتماد پر جنگ کرتے ہیں جو خدا نے ہمیں عطا کیا ہے، اس سے بہتر ہے کہ دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کرو، کیوں کہ دو فائدوں میں سے ایک فائدہ تو ضرور حاصل ہوگا: غلبہ یا شہادت!''

اس بہادر شاعر کا جذبۂ حمیت تمام لشکر پر اثر انداز ہوا اور سب بیک آواز بول اٹھے: ''بخدا، ابن رواحہؓ سچ کہ رہا ہے۔''

چنانچہ انھوں نے کوچ بول دیا۔ جب وہ بلقا کے علاقے میں پہنچے تو ایک بستی مشارف کے قریب انھیں ہرقل کی فوجیں ملیں۔ جب دشمن قریب آیا تو مسلمان موتہ کی بستی میں جمع ہو گئے، کیوں کہ وہاں مشارف کی نسبت حفاظت سے رہ سکتے تھے۔ موتہ مدینہ سے گیارہ سو کلومیٹر (تقریباً 670 میل) شمال میں واقع تھا۔ اس زمانے میں موتہ تلواریں بنانے کا بڑا اہم مرکز ہوتا تھا۔ موتہ کی بنی ہوئی تلواریں ''مشرفیہ'' کہلاتی تھیں۔ اس زمانے میں یہ علاقہ رومیوں کے قبضے میں تھا اور بلقاء کہلاتا تھا۔ بائبل میں بلقاء کو ''موآب'' لکھا گیا ہے، جب کہ اسلامی تاریخوں میں اسے ''مآب'' لکھا جاتا ہے۔ موآب یا مآب حضرت لوطؑ کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔ اسی کے حوالے سے اس

علاقے کو موآب یا بلقاء کہا جاتا تھا۔ مآب بحیرہ لوط کے جنوبی سرے تک پھیلا ہوا تھا اور موتہ اس علاقے کے جنوبی سرے پر جزیرہ نمائے عرب کی طرف واقع تھا۔ آج کل قصبہ موتہ اردن میں شامل ہے اور المزار سے دو تین میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف برلب سڑک واقع ہے۔ قصبہ موتہ سے متصل وہ وسیع میدان اب تک موجود ہے جس میں رومیوں اور صحابہ کرامؓ کے درمیان جنگ ہوئی تھی۔ اس میدان کے ایک حصے کا نام الشہداء یا مشہد ہے، جہاں معرکہ موتہ میں شہید ہونے والے بہت سے صحابہ کرامؓ مدفون ہیں۔ غزوہ موتہ کے موقع پر صحابہ کرامؓ کی لشکر گاہ اس جگہ تھی، جہاں اب المزار کا شہر آباد ہے۔ یہاں حضرت جعفر طیارؓ، عبداللہ بن رواحہؓ، زید بن حارثہؓ اور بہت سے دوسرے صحابہ کرامؓ کی قبریں موجود ہیں اور انھی کی وجہ سے ''المزار'' (زیارت گاہ) کا شہر آباد ہوا۔

زیدؓ بن حارثہ کی شہادت

موتہ کے مقام پر ہرقل کی دو لاکھ کی فوج اور مسلمانوں کی تین ہزار فوج کے درمیان گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے زیدؓ بن حارثہ علم نبوی ﷺ ہاتھ میں لے کر میدانِ جنگ میں پوری جواں مردی سے کود دے۔ انھیں یقین تھا کہ موت سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں، لیکن اس موقع پر جو موت آئے گی، وہ موت نہیں، شہادت ہوگی، اور شہادت کی حیثیت بھی فتح و نصرت سے کم نہیں۔ زیدؓ اپنی جان ہتھیلی پر لیے ہوئے شہ زوری سے لڑتے رہے، یہاں تک کہ دشمن کے نیزوں نے ان کا جسم چھلنی کر دیا۔ ان کی شہادت کے وقت ان کی عمر صرف 33 سال کی تھی۔

جعفرؓ بن ابی طالب کی شہادت

ان کی شہادت کے بعد حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے علم سنبھالا اور بے نظیر جنگ شروع کر دی۔ اپنے ''شقرا'' نامی سرخ گھوڑے پر سوار دشمن پر پل پڑے۔ رومیوں نے ان کے گھوڑے کو نرغے میں لے لیا۔ آپؓ جوش و خروش میں گھوڑے سے کود پڑے۔ خیال آیا کہ کہیں دشمن گھوڑے کا فائدہ نہ اٹھائے۔ خود ہی اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ یوں اپنے آپ پر فرار کا راستہ بھی بند کر دیا۔ خود تیر کی طرح خم ٹھونک کر سیدھے کھڑے ہو گئے اور دشمن کے قلب میں گھس کر، ان کے سروں پر تلوار کے وار پر وار کرتے رہے اور روکتے رہے، یہاں تک کہ دشمن کی ضرب سے دایاں ہاتھ کٹ گیا۔ اس کے بعد انھوں نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا اور اسے مسلسل بلند رکھا، یہاں تک کہ بایاں ہاتھ بھی کاٹ دیا گیا۔ پھر دونوں باقی ماندہ بازوؤں سے جھنڈا آغوش میں لے لیا اور اس وقت تک بلند رکھا، جب تک کہ جام شہادت نہ پی لیا۔ کہتے ہیں کہ ایک رومی نے انھیں ایسی تلوار ماری کہ ان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اللہ نے انھیں ان کے دونوں بازوؤں کے عوض جنت میں دو باز و عطا کیے، جن کے ذریعے وہ جہاں چاہتے ہیں، اڑتے ہیں۔ اسی لیے ان کا لقب جعفر طیار اور جعفر ذوالجناحین پڑ گیا۔ (طیار معنی اڑنے والا اور ذوالجناحین معنی دو بازوؤں والا)۔ شہادت کے بعد ان کے جسم پر نیزے، تلوار اور تیر کے پچاس سے زیادہ زخم پائے گئے۔ ان میں سے کوئی بھی زخم پیچھے نہیں لگا تھا۔

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کی شہادت

جب جعفر طیارؓ نے بھی شہادت پائی تو پرچم ابن رواحہؓ نے سنبھالا اور گھوڑے پر سوار ہو کر آگے بڑھے۔ ابتدا میں انھیں کسی قدر ہچکچاہٹ ہوئی اور ان کے بلند حوصلے نے گریز بھی کیا، لیکن اس کے بعد جلد ہی اپنے آپ کو سنبھالا اور یہ اشعار پڑھے (ترجمہ):

اے نفس، تجھ کو قسم ہے
گھوڑے سے اتر
دشمن سے قتال کر
چاہے خوشی سے اتر، چاہے ناگواری سے
آج تو قتل نہ ہوا
تو کبھی نہ کبھی مرے گا ضرور
جس چیز کی تو نے تمنا کی
وہ سامنے ہے
زیدؓ و جعفرؓ کی راہ پر چلا
تو ہدایت پائے گا''

گھوڑے سے اتر کر تلوار لہرائی۔ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے بڑھتے ہی گئے، یہاں تک کہ جام شہادت نوش کیا۔

اس موقع پر قبیلہ بنو عجلان کے ایک صحابی ثابتؓ بن ارقم نے لپک کر جھنڈا اٹھا لیا اور آواز دی: ''مجاہدو! میں علم سنبھالے ہوئے ہوں۔ بہتر ہے، تم کسی کو اپنا امیر منتخب کر لو۔'' مجاہدوں نے کہا: ''تم ہی ہمارے سردار ہو۔ اللہ نے یہ جھنڈا تمھارے ہاتھ میں بلند کروایا ہے۔'' حضرت ثابتؓ نے جواب دیا: ''میں اس کا اہل نہیں ہوں۔'' پھر انھوں نے جھنڈا حضرت خالد بن ولیدؓ کے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ فنونِ حرب کے ماہر ہیں۔ حضرت خالدؓ نے تامل کیا، اس لیے کہ اس سے پہلے انھوں نے کبھی مسلمانوں کی قیادت نہیں کی تھی۔ تمام مسلمانوں نے جب اصرار کیا تو اس اتفاقِ رائے پر انھوں نے علم نبوی ﷺ ہاتھ میں لے لیا۔

حضرت خالدؓ رات بھر جنگ کے نقشے پر غور کرتے رہے۔ وہ ایسی جنگی چال کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس کے ذریعے رومیوں کو مرعوب کر کے اتنی کامیابی کے ساتھ مسلمانوں کو پیچھے ہٹالیں کہ رومیوں کو تعاقب کی ہمت نہ ہو، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر مسلمان بھاگ کھڑے ہوئے اور رومیوں نے تعاقب شروع کر دیا تو مسلمانوں کو ان کے پنجے سے بچانا سخت مشکل ہوگا۔

جب دوسرے دن صبح ہوئی تو انھوں نے لشکر کی ہیئت اور وضع تبدیل کر دی اور لشکر کی ترتیب ہی بدل ڈالی۔ میمنہ کی جگہ میسرہ والوں کو کھڑا کیا۔ میسرہ والے میمنہ پر پہنچے۔ ساقہ (عقب) کے مجاہدوں کو مقدمہ (سامنے) میں جگہ دی۔ مقدمہ والے ساقہ

پر آئے۔ انھیں لشکر کے اگلے حصے کو گھیرے جانے سے بچانے کی ڈیوٹی سپرد کی۔ دشمن اب سامنے آیا تو نئے چہرے اور نئی صف بندی دیکھ کر سمجھا کہ تازہ کمک آ گئی۔ پچھلی صفوں میں وقفے وقفے سے بلند اور پر جوش آوازوں میں نعرہ تکبیر اس خیال کو تقویت دینے لگا۔ ان کے دلوں پر رعب چھا گیا۔ حضرت خالدؓ نے خود کمان سنبھال لی۔ بار بار ہدایات سے مجاہدوں کا دل بڑھایا۔ خود بھی پیش پیش رہے۔ اس دن ان کے ہاتھ پر نو تلواریں ٹوٹیں۔ ان کے ہاتھ میں صرف ایک یمنی بانا (چھوٹی سی تلوار) باقی بچا اور اس نے جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔

ادھر رسول اللہ ﷺ نے جنگ موتہ کے روز، جب کہ ابھی میدانِ جنگ سے کسی قسم کی اطلاع نہیں آئی تھی، وحی کی بنا پر فرمایا کہ زیدؓ، جعفرؓ اور ابن رواحہؓ شہید کر دیئے گئے۔ اس دوران حضور ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ فرمایا: ''اور اب ''سیف من سیوف اللّٰہ'' اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار یعنی خالدؓ بن ولید نے اسلام کا پرچم سنبھالا۔'' پھر دعا فرمائی: ''اے اللہ! خالد تیری تلواروں میں سے ایک تلوار ہے۔ پس تو ہی اس کی مدد فرما۔''

میدانِ جنگ میں جب دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا اور کچھ دیر تک جھڑپ ہو چکی تو حضرت خالدؓ نے اپنے لشکر کا نظام محفوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کو تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹانا شروع کیا، لیکن رومیوں نے اس خوف سے ان کا پیچھا نہ کیا کہ مسلمان دھوکا دے رہے ہیں اور کوئی چال چل کر انھیں صحرا کی پہنائیوں میں پھینک دینا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن اپنے علاقے میں واپس چلا گیا اور مسلمانوں کے تعاقب کی بات نہ سوچی۔ ادھر مسلمان کامیابی اور سلامتی کے ساتھ پیچھے ہٹے اور پھر مدینہ واپس آ گئے۔

جب خالدؓ بن ولید اور ان کی فوج مدینہ پہنچی تو آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں نے ان سے ملاقات کی۔ لوگوں نے فوج کی طرف مٹی کی مٹھیاں بھر بھر کر پھینکیں اور کہا: ''اے بھگوڑو! تم نے میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کی'' لیکن حضور ﷺ نے فرمایا: ''یہ بھگوڑے نہیں، بلکہ ان شاء اللہ یہ پھر حملہ آور ہوں گے۔'' اگرچہ حضور ﷺ نے موتہ سے واپس آنے والی فوج کو تسلی دلا سا دیا تھا، تاہم مسلمان پھر بھی یہ خیال کرتے تھے کہ اس فوج نے ناقابلِ معافی جرم کا ارتکاب کیا ہے، حتیٰ کہ مسلمہؓ بن ہشام مسلمانوں کے ساتھ مل کر نماز بھی نہ پڑھتے تھے، کیوں کہ انھیں یہ ڈر تھا کہ جو شخص انھیں دیکھے گا، پھر ان سے کہے گا ''اے بھگوڑو، تم نے جہاد سے راہِ فرار اختیار کی۔'' بعد ازاں جنگ موتہ کے یہ مجاہدین اور خصوصیت سے خالدؓ بن ولید اگر شجاعت و بہادری کے جوہر نہ دکھاتے تو جنگ موتہ سے گریز و فرار کا داغ بدنامی ہمیشہ ان کی پیشانی پر رہتا۔

آنحضور ﷺ زیدؓ بن حارثہ اور جعفر طیارؓ کی تعزیت کے لیے ان کے گھروں میں تشریف لے گئے۔ جعفر طیارؓ کی بیوی اسماءؓ بنت عمیس نے آٹا گوندھ رکھا تھا اور اپنے بیٹوں کو نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنا رکھے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جعفرؓ کے بیٹوں کو میرے پاس لاؤ۔'' جب یہ بچے آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ان کے سروں پر دستِ شفقت پھیرا اور آپ ﷺ کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئیں۔ اسماء بنت عمیسؓ یہ دیکھ کر غمگین ہوئیں اور عرض کرنے لگیں: ''یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں۔ بھلا آپ ﷺ کیوں آنسو بہاتے ہیں؟ کیا آپ کو جعفرؓ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کوئی اطلاع ملی ہے؟'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، انھوں نے شہادت پائی ہے۔'' یہ فرما کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اسماءؓ کی چیخیں نکل گئیں اور بہت سی عورتیں وہاں جمع ہو گئیں۔ آپ ﷺ وہاں سے تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ سے فرمایا: ''آلِ جعفرؓ کے خورد و نوش کا بندوبست کرو، کیوں کہ وہ اپنے سرپرست کی دائمی جدائی کے غم میں ہیں۔''

آنحضور ﷺ نے اپنے مولیٰ زیدؓ کی بیٹی کو آتے ہوئے دیکھا تو آپ ﷺ نے اس کے شانے پر از راہ ہمدردی تھپکی دی اور آپ ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ بعض لوگ شہدائے موتہ پر آپ ﷺ کی اشک فشانی سے حیرت زدہ تھے۔ آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: ''آخر اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ یہ تو صرف ایک دوست کے آنسو ہیں جو کسی دوست کی جدائی میں بہائے جاتے ہیں۔''

جنگِ موتہ میں آنحضور ﷺ نے شرکت نہیں کی، لیکن محدثین اسے غزوہ کا نام دیتے ہیں۔ اس جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے مقرر کردہ تین امرائے لشکر سمیت چودہ صحابہ کرامؓ نے شہادت پائی۔

جنگِ موتہ سے مسلمانوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ رومی طاقت اور ان کے جنگی طریقہ کار کا اندازہ ہوا اور اہلِ ایمان کے دلوں سے رومیوں کی طاقت کا خوف نکل گیا۔ پہلے ہی تصادم کے بعد مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انھیں شام کی زمینوں، آب و ہوا اور جغرافیائی کا علم ہو گیا۔ آنے والے دنوں میں مسلمان بڑی بے جگری سے رومیوں کے مدِّ مقابل ہوئے اور فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔ رومی سلطنت کے شہر یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آنے لگے۔ حربی اور عسکری فوائد کے مقابلے میں مسلمانوں کا نقصان بہت معمولی تھا۔ عددی اعتبار سے 66:1 (دولاکھ کے مقابلے میں تین ہزار) کا مقابلہ تھا۔ دشمن کے جانی نقصان کے بارے میں کتابوں میں اعداد و شمار نہیں ملتے۔ تاہم خیال ہے کہ مسلمانوں سے کئی گنا زیادہ ہوگا۔

اس معرکے میں مسلمانوں کو کچھ غنیمت کا مال بھی ہاتھ آیا۔ قبیلہ حمیر کے ایک مجاہد نے ایک رومی کو قتل کیا۔ اس نے مقتول کا سارا سامان لینا چاہا، لیکن امیر لشکر نے کچھ روک لیا۔ اس پر حضرت عوفؓ بن مالک نے حضرت خالدؓ بن ولید کو بتایا کہ نبی کریم ﷺ مجاہد کو مقتول کا تمام سامان عطا فرماتے ہیں۔ حضرت خالدؓ نے جواب دیا: ''بے شک آپ درست کہتے ہیں، لیکن مجھے یہ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔'' جب مدینہ واپسی ہوئی تو حضرت عوفؓ نے معاملہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آنحضور ﷺ نے حضرت خالدؓ سے دریافت فرمایا اور ان کا جواب سننے کے بعد ارشاد ہوا کہ مجاہد کو تمام سامان دے دو۔ حضرت خالدؓ تعمیل کے لیے اٹھے۔ جب حضرت عوفؓ کے سامنے سے گزرے تو انھوں نے حضرت خالدؓ کی چادر کھینچ کر کہا:

''وہی ہوا نا جو میں نے کہا۔'' یہ بات حضور ﷺ نے سن لی اور ناراضگی کے لہجے میں فرمایا: ''اے خالد، اسے کچھ نہ دو، رہنے دو۔ تم لوگ میرے امرا کو بھی نہیں چھوڑتے'' (یعنی ان کی توہین کرتے ہو)۔

ابن اسحاق کا بیان ہے کہ معان کا حاکم فردہ ابن عمرو جنگ موتہ کے بعد مسلمان ہو گیا۔ اس نے حضور ﷺ کی خدمت میں تحائف بھیجے۔ رومی حکام کو پتہ چلا تو اسے قتل کر دیا۔ رومی مؤرخ تھیوفیس نے لکھا ہے کہ شام کے عربی قبائل کو رومی حکام نے انعام و اکرام دینے سے انکار کیا تو انھوں نے بگڑ کر مسلمانوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ جنگِ موتہ کے بعد اکثر عرب قبائل اسلام کی طرف مائل ہوئے جن میں بنوسلیم، بنواشجع، بنولحیان، بنوغطفان، بنوفزارہ قابل ذکر ہیں۔

سریہ ذات السلاسل

جنگ موتہ سے چند ہفتوں کے بعد آنحضرت ﷺ کو خبر ملی کہ بنی قضاعہ کی ایک جماعت سلسل میں مدینہ کے اطراف پر حملہ کرنے کے لیے جمع ہوئی ہے۔ سلسل ایک چشمہ تھا جو وادیٔ القریٰ اور مدینہ منورہ کے درمیان دس دن کی مسافت پر شام کا دیہاتی علاقہ تھا۔ آنحضور ﷺ نے جمادی الآخر آٹھ ہجری میں حضرت عمروؓ بن العاص کو امیر بنا کر سفید علم عطا فرمایا۔ حضرت عمروؓ تین سو مجاہدین اور تیس گھوڑوں کا مختصر سا لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ اس لشکر میں بڑے بڑے مہاجرین وانصار صحابہؓ شامل تھے۔ لشکر رات کو منازل طے کرتا اور دن کو چھپ جاتا۔ جب مسلمان قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت رافع بن مکیث جہنیؓ کو مزید کمک کی درخواست کے ساتھ مدینہ بھیجا گیا۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ ابن جراحؓ کو علیحدہ علم عنایت فرما کر دوسو آدمیوں کے ساتھ امداد کے لیے بھیجا۔ ان صحابہؓ میں دوسرے مہاجرین وانصار صحابہؓ کے علاوہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ بھی تھے۔ حکم ہوا کہ عمروؓ بن العاص سے جا ملو۔ آپس میں اختلاف نہ کرنا اور اتحاد قائم رکھنا۔

جب دونوں لشکر ملے اور نماز کا وقت آیا تو امامت پر کچھ اختلاف ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے نماز کی امامت کرنا چاہی۔ حضرت عمروؓ بن العاص نے کہا کہ آپ میری مدد کے لیے آئے ہیں۔ امیر نہیں ہیں؟ حضرت عبیدہؓ نے آنحضور ﷺ کے ارشاد کے بموجب اختلاف سے پرہیز کیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے امامت کے فرائض انجام دیئے، اور پھر انھی کی اقتدا میں صحابہؓ نمازیں ادا کرتے رہے۔

متحدہ لشکر اسلام نے بنی قضاعہ کا سارا علاقہ طے کیا۔ آخری حد پر بنی قضاعہ کی ایک جماعت ملی جس پر مسلمانوں نے حملہ کیا اور انھیں منتشر کر دیا۔ ان حالات کی خبر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حضرت عوفؓ بن مالک اشجعی کے ذریعے پہنچائی گئی۔

اگلے ماہ رجب آٹھ ہجری مطابق اکتوبر، نومبر 629ء میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو تین سو مہاجرین وانصار کے ساتھ قبیلہ جہینہ پر حملہ کرنے کے لیے سیف البحر (ساحلِ بحر) کی جانب روانہ فرمایا۔ اس لشکر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ روانگی کے وقت آنحضور ﷺ نے زادِ راہ کے طور پر صحابہؓ کو ایک تھیلا کھجوروں کا مرحمت فرمایا۔ جب یہ کھجوریں ختم ہو گئیں تو صحابہؓ نے ہر روز دو تین اونٹ ذبح کر کے دو تین روز تک گزارہ کیا، لیکن جب حضرت ابوعبیدہؓ نے اونٹ ذبح کرنے سے منع کر دیا اور خوراک کے لیے کسی کے پاس کچھ بھی نہ رہا تو مجاہدین نے درختوں کے پتے توڑ توڑ کر کھانے شروع کیے۔ مجاہدین نے کچھ دن اس حالت میں گزارے کہ دریا سے ایک تودہ جتنی بڑی مچھلی کنارے آ لگی۔ پہلے تو اسے مردہ سمجھ کر مسلمانوں نے کھانے سے گریز کیا، مگر جب حالت اور زیادہ خراب ہو گئی، تو پھر اس بات پر سب متفق ہو گئے کہ ایسی حالت میں تو مردہ بھی جائز ہے۔ مسلمانوں نے اٹھارہ روز اسی کے گوشت پر گزر اوقات کی۔ روزانہ ایک بیل جتنا ٹکڑا کاٹتے اور کھاتے۔ رات کو اسی کی چربی جلا کر خیمے روشن کرتے۔ جب مسلمان مدینہ لوٹ کر آئے اور رسول کریم ﷺ سے تذکرہ کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ اللہ نے تم لوگوں کے لیے رزق بھیجا تھا۔ اگر اس میں سے کچھ گوشت ہو تو لاؤ۔ چنانچہ حضور ﷺ کو وہ گوشت پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس میں سے تناول فرمایا۔

اس سریہ میں چوں کہ مسلمانوں نے درختوں کے پتے جھاڑ کر اور پانی میں تر کر کے کھائے تھے، اس لئے اسے ''سریہ خبط'' بھی کہتے ہیں۔ ''خبط'' کے لغوی معنی ''جھاڑنے'' کے ہیں۔

فتح مکہ

''صلح حدیبیہ'' کے معاہدے کی ایک دفعہ کے تحت طے پایا تھا کہ جو قبیلہ یا شخص نبی کریم ﷺ سے عہد و پیمان کرنا چاہے، اسے آزادی ہے اور جو شخص قریش سے قول و قرار کرنا چاہے، اسے بھی اختیار ہوگا۔ چنانچہ اس معاہدے کے مطابق بنی خزاعہ نے نبی کریم ﷺ سے اور بنی بکر نے قریش سے دوستی کا معاہدہ کر لیا تھا۔

بنی خزاعہ مکہ کے نواح میں آباد تھے۔ حضرت عبدالمطلب کے زمانے سے بنی ہاشم اور بنی خزاعہ کا حلیفی معاہدہ تھا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر اس کا اعلان اسی قدیم تعلق کی بنا پر تھا۔ عہدِ قدیم میں یہ قبیلہ بیت اللہ کا متولی بھی رہ چکا تھا۔ اس منصب کے لیے قریش سے ان کے درمیان لڑائی بھی ہوئی تھی۔ یہی دیرینہ دشمنی تھی کہ جس کے سبب بنی خزاعہ مسلمانوں کی طرف مائل تھے۔ قریش کی سرگرمیوں کی خبریں خفیہ طور پر مدینہ کرتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ خندق سے پہلے ان کی تیاریوں کی اطلاع دینے والے یہی تھے۔

بنی بکر تہامہ، یمامہ اور بحرین میں پھیلے ہوئے قبائل کا ایک گروہ تھا۔ یہ قبائل قتل و غارت اور لوٹ مار کے لیے مشہور تھے۔ بنی تغلب سے ان کی بڑی طویل لڑائیاں تھیں، جن کی طرف مولانا حالی نے ''مسدس'' میں اشارہ کیا ہے:

وہ بکر اور تغلب کی باہم لڑائی
صدی جس میں آدھی انھوں نے گنوائی

اسلام کی عداوت میں دونوں قبیلے قریش کے ساتھ ہو گئے۔ ان کا باہمی نفاق دب گیا۔ صلح حدیبیہ کے نتیجے میں حالات پرامن ہو گئے تو بنی بکر کی آتش انتقام پھر بھڑکنے لگی اور اب تو انھیں قریش کی تازہ حلیفی کا بھی زعم تھا۔

فوری سبب

فوری سبب یہ ہوا کہ ایک دن بنی بکر کے ایک دریدہ دہن شخص نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کی اور ہجو بکنے لگا۔ قبیلہ بنی خزاعہ کا ایک شخص وہاں موجود تھا۔ اس نے اسے ہجو سے منع کیا۔ اس پر وہ اور بھی مشتعل ہو کر بدزبانی کرنے لگا۔ بنی خزاعہ کے شخص کو بھی غصہ آ گیا اور اس نے شاتم رسول ﷺ کا سر پھوڑ دیا۔ وہ فریاد کرتا ہوا بنی بکر کی ایک شاخ نفاثہ کے پاس پہنچا۔ بنی نفاثہ اس کی حمایت میں لڑنے کے لیے تیار ہو گئے، بلکہ قریش سے بھی مدد طلب کی۔ قریش کے دل میں تو بنی خزاعہ کے خلاف آتش عناد برسوں سے پرورش پا رہی تھی۔ اس کے چند افراد فتنہ و فساد پر آمادہ ہو گئے۔ انھیں یہ خبریں بھی موصول ہوئیں کہ جنگ موتہ کے بعد مسلمان کم زور پڑ گئے ہیں۔ قریش کو یہ گمان ہو گیا کہ مسلمانوں کا پہلا سا وقار قائم نہیں رہا ہے۔ اس لیے یہ موقع سے فائدہ اٹھانے کا بہترین وقت ہے۔ انھوں نے بنی بکر کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا۔ انھیں اکسانے میں عکرمہ بن ابوجہل کی تدبیروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ قریش نے اپنے حلیف قبائل کو ابھار کر مسلمانوں کے حلیف قبائل کے افراد کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

قتل و قتال کی ابتدا

وادی مکہ کے اسفل میں بنی خزاعہ کا ایک چشمہ ''وتیر'' نامی تھا۔ ایک رات جب وہ اس چشمے پر آرام کر رہے تھے تو قریش کی ترغیب پر بنو نفاثہ کے لوگوں نے شب خون مارا اور بیس افراد کو قتل کر دیا۔ باقی خزاعی وہاں سے بھاگ گئے، لیکن بنی بکر نے ان کا تعاقب کر کے انھیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ یہ شعبان سات ہجری کا واقعہ ہے۔ عکرمہ بن ابوجہل کی کوشش سے قدیم دشمنانِ اسلام صفوان بن امیہ، شیبہ بن عثمان، سہیل بن عمرو، حویطب بن عبدالعزیٰ اور مکرز بن حفص بھی بھیس بدل کر اس قتل و قتال میں شریک ہو گئے (ان میں سے بعض معاہدہ حدیبیہ پر دستخط کرنے والے تھے)۔ بنو خزاعہ کے لوگوں نے دارالامن حرم کعبہ میں پناہ لی۔ بنو بکر کے لوگوں نے اپنے سردار نوفل بن معاویہ سے کہا: ''یہ حرم شریف کی سرزمین ہے۔ اس میں خوں ریزی سے گریز کرو اور اپنے اللہ سے ڈرو۔''

اس موقع پر نوفل کا پلہ بھاری تھا۔ جوش انتقام میں کہا: ''آج کوئی اللہ نہیں ہے۔ ہم اپنا بدلہ ضرور لیں گے..... اے بنی بکر! جب تم حرم میں چوریاں کر سکتے ہو تو کیا خون ریزی نہیں کر سکتے۔ آج اس پرانے دشمن کا صفایا کرنے کا بہترین وقت ہے۔ یہ وقت خدا ترسی کا نہیں۔''

نوفل بن معاویہ کی اشتعال انگیزی پر حرم کی حدود میں بنی خزاعہ کا خون بہایا گیا۔ یہ بات روایات کے خلاف تھی، لیکن حرم کے متولی قریش خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ روکتے کیا، یہ چنگاری کو خود ہوا دے رہے تھے۔ آخر مجبور ہو کر ان لوگوں نے بھاگ کر مکہ میں بدیل بن ورقا خزاعی اور اپنے ایک آزاد کردہ غلام رافع کے گھر میں پناہ لی۔ جوشِ انتقام میں قریش اور بنی بکر یہ بھول گئے کہ بنی خزاعہ نبی کریم ﷺ کے حلیف ہیں۔

اب بنو خزاعہ کے پاس اپنے حلیف کی طرف رجوع کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ چنانچہ معاہدے کی خلاف ورزی کی شکایت لے کر ان کا سردار مسلمانوں کے پاس مدینہ روانہ ہوا۔ اس کے ہم راہ چالیس اونٹوں پر قبیلہ خزاعہ کے فریادی تھے۔ وہ سیدھے مسجد نبوی ﷺ پہنچے جہاں صحابہ کرام کے ساتھ حضور ﷺ تشریف فرما تھے۔ بنی خزاعہ کے سردار اور نمائندے عمرو بن سالم خزاعی نے عرض کیا (ترجمہ):
''اے پروردگار! میں محمد ﷺ سے ان کے عہد اور ان کے والد کے قدیم عہد کی دہائی دے رہا ہوں۔ آپ لوگ اولاد تھے اور ہم جننے والے۔ پھر ہم نے تابع داری اختیار کی اور کبھی دست کش نہیں ہوئے۔ اللہ آپ ﷺ کو ہدایت دے۔ آپ ﷺ بھرپور مدد کیجیے۔ اور اللہ کے بندوں کو پکاریئے۔ وہ مدد کو آئیں گے، جن میں اللہ کے رسول ﷺ ہوں گے ہتھیار پوش اور چودھویں کے چاند کی طرح گورے اور خوبصورت۔ اگر ان پر ظلم اور ان کی توہین کی جائے تو چہرہ تمتما اٹھتا ہے۔ آپ ایک ایسے لشکر جرار کے اندر تشریف لائیں گے جو جھاگ بھرے سمندر کی طرح متلاطم ہوگا۔ یقیناً قریش نے آپ ﷺ کے عہد کی خلاف ورزی کی ہے اور آپ ﷺ کا پختہ پیمان توڑ دیا ہے۔ انھوں نے میرے لیے کداء میں گھات لگائی اور یہ سمجھا کہ میں کسی کو مدد کے لیے نہ پکاروں گا، حالانکہ وہ بڑے ذلیل اور تعداد میں قلیل ہیں۔ انھوں نے چشمہ وتیر پر رات میں حملہ کیا اور ہمیں رکوع و سجود کی حالت میں قتل کیا۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اے عمرو بن سالم، بے شک ہم اپنے معاہد کی مدد کریں گے۔'' اس وقت آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا دکھائی دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:
''یہ بادل بنی کعب (خزاعہ) کی بشارت سے دمک رہا ہے۔''

تین شرطیں

آپ ﷺ نے چالیس شتر سوار فریادیوں سے دریافت فرمایا: ''کیا بنی بکر کے تمام قبیلے اس غارت گری میں شریک تھے؟'' عرض کیا گیا: ''نہیں، صرف بنو نفاثہ اور بنو بدیل۔ ان کا سرغنہ نوفل بن معاویہ ہے۔'' یہ سن کر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:
''اے ابن سالم! اطمینان رکھو۔ ہم تمھاری مدد کے لیے تیار ہیں۔'' یہ اطمینان حاصل کرنے کے بعد وہ واپس لوٹ گئے۔

ان کی واپسی کے بعد بدیل بن ورقا خزاعی چند آدمیوں کے ساتھ مدینہ آئے اور سیدھے حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں پہنچے۔ انھوں نے بنو بکر اور قریش کی ہولناک ستم رانیوں کی لرزہ خیز داستان دہرائی۔ حضور ﷺ نے ان سے بھی مدد کا

وعدہ فرمایا۔

معاملہ بہت سنگین تھا۔ حضور ﷺ نے اپنا ایک ایلچی حضرت ضمرہؓ قریش کے پاس بھیجا۔ اس نے قریش کے سامنے تین شرطیں پیش کیں:

1- خزاعہ کے مقتولین کی دیت ادا کی جائے۔

2- یا بنونفاثہ کی حلیفی سے علیحدہ ہو جائیں۔

3- یا پھر معاہدہ حدیبیہ کی تنسیخ کا اعلان کر دیں۔

سفیر رسول ﷺ نے قریش کو جب یہ پیغام پہنچایا تو انھوں نے جواب دیا کہ پہلی اور دوسری شرط نامنظور۔ ہاں معاہدہ حدیبیہ کی منسوخی پر ہم راضی ہیں۔ حضرت ضمرہؓ یہ سن کر مدینہ واپس آ گئے۔ کہنے کو تو چند شعلہ مزاج لوگوں نے معاہدے کی منسوخی کا اعلان کر دیا، لیکن اپنے فیصلے پر بہت پچھتائے۔ معاہدہ حدیبیہ کی رو سے جو بدیانتی ہوئی، اس میں ابوسفیان کے سوا تمام قریشی سردار شریک تھے۔ اب دارالندوہ میں مجلس مشاورت منعقد ہوئی۔ چند ذی فہم لوگوں نے بنی بکر سے علیحدگی کی تجویز کی حمایت کی۔ بعض جوشیلے جوانوں نے مقابلے پر اصرار کیا۔ آخر دانائے قریش کی اس تجویز کو منظور کیا گیا کہ ہم اس ذمہ داری ہی سے انکار کر دیں گے کہ قریش عہد شکنی اور معاہدے کی خلاف ورزی میں شریک ہیں۔ سب نے ابوسفیان کی تجویز کو پسند کیا اور درخواست کی کہ وہ خود مدینہ جا کر معاملات کو سلجھائے۔ معاہدے کی نہ صرف تجدید کرے، بلکہ مدت میں بھی توسیع کی کوشش کرے۔

ابوسفیان مدینے میں

سردار قریش ابوسفیان بھاری ذمہ داری کے ساتھ مدینہ روانہ ہوا تو راستے میں عسفان کے مقام پر بدیل بن ورقا خزاعی اور اس کے ساتھیوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ابوسفیان کو خدشہ لاحق ہوا کہ شاید بدیل نے مدینہ پہنچ کر پہلے ہی آنحضرت ﷺ کو تمام حالات سے باخبر کر دیا ہے، اور اگر یہ بات ہے تو پھر معاہدے کی مدت میں توسیع کی بات بنتی نظر نہیں آتی۔ بدیل سے دریافت کیا تو اس نے اس بات کا انکار کیا کہ اس نے پیغمبر ﷺ اسلام سے ملاقات کی ہے۔ جب ان کا قافلہ چلا گیا تو ابوسفیان نے ان کے اونٹوں کی مینگنیاں توڑ کر دیکھیں۔ ان میں سے کھجور کی گٹھلیاں دیکھیں جو مدینہ کا چارہ تھیں۔ اب ابوسفیان کو یقین ہو گیا کہ بدیل نے حضور ﷺ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اسی فکر و تجسس میں مدینے کی سرحدوں کے قریب پہنچا۔ خیال آیا کہ اپنے داماد تاجدارؐ مدینہ کے پاس جانے سے پہلے اپنی بیٹی سے کیوں نہ مل لوں۔ ابوسفیان کی مسلمان بیٹی رملہ (امِ حبیبہ) جو مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلی گئی تھیں اور وہاں سے ابھی چند ماہ قبل فتح خیبر کے دن مدینہ پہنچی تھیں۔ اس خیال سے ابوسفیان کو کچھ طمانیت ہوئی۔ سیدھا بیٹی کے گھر پہنچا۔ تیرہ برس کے بعد باپ بیٹی کی ملاقات ہوئی تھی۔ حجرے میں ایک جانب بستر بچھا ہوا تھا۔ ابوسفیان نے چاہا کہ اس پر بیٹھ کر آرام سے باتیں کرے۔ بیٹی نے باپ کا ارادہ بھانپ لیا اور بڑھ کر بستر لپیٹ دیا۔ ابوسفیان نے کہا: ''کیا تم نے اپنے باپ کو اس لائق بھی نہیں سمجھا کہ وہ بستر پر بیٹھ سکے؟'' امِ حبیبہؓ نے جواب دیا: ''یہ رسول اللہ ﷺ کا بستر ہے اور تم ابھی شرک کی نجاست سے آلودہ ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ تمھارے بیٹھنے سے اس بستر کے تقدس میں فرق آئے۔''

ابوسفیان غصے میں بڑبڑاتا ہوا اپنی بیٹی کے پاس سے اٹھ کھڑا ہوا اور باہر چلا آیا۔ بعدازاں اس نے آنحضور ﷺ سے گفتگو کی۔ آپ ﷺ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، بلکہ منہ پھیر لیا۔ ابوسفیان اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے پاس گیا اور کہا: ''تم میری طرف سے گفتگو کرو۔'' مگر حضرت ابوبکرؓ نے صاف انکار کر دیا۔ پھر وہ حضرت عمرؓ کے پاس گیا اور درخواست کی۔ انھوں نے سختی سے جواب دیا اور کہا: ''کیا میں حضور ﷺ سے تمھاری سفارش کروں؟ بخدا اگر چیونٹی اور صرف چیونٹی ہی میری پشت پناہ رہ جائے اور کوئی بھی مدد و معاون نہ ہو، اس صورت میں بھی میں تم سے لڑے بغیر نہ رہوں گا۔''

پھر ابوسفیان حضرت علیؓ کے پاس آیا۔ حضرت فاطمہؓ بھی وہاں موجود تھیں۔ ابوسفیان نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا اور رسول کریم ﷺ کے پاس سفارش کی درخواست کی۔ حضرت علیؓ نے اسے نہایت نرم لہجے میں سمجھایا: ''حضور ﷺ کو کوئی شخص ان کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتا۔'' ابوسفیان نے حضرت فاطمہؓ سے اس امر کی سفارش چاہی کہ ان کا فرزند حسنؓ ابوسفیان کو لوگوں کے سامنے اپنی امان میں لے۔ حضرت فاطمہؓ نے فرمایا: ''کوئی شخص کسی کو پیغمبر کی مرضی اور اجازت کے بغیر امان نہیں دے سکتا۔'' غرض ابوسفیان بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ آخر اس نے حضرت علیؓ سے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت دریافت کی۔ حضرت علیؓ نے کہا: ''بخدا، مجھے ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی جو تمھارے لیے مفید ثابت ہو۔ ہاں ایک بات ہے، اور وہ یہ کہ تم بنی کنانہ کے سردار ہو، لہٰذا خود ہی اپنے لوگوں سے جا کر یہ کہو کہ میں امان دیتا ہوں اور خود بھی امان کا طالب ہوں، اور اپنے وطن کی راہ لو۔'' حضرت علیؓ نے یہ بھی فرمایا: ''مجھے امید نہیں کہ یہ طریقہ کارگر کچھ کارآمد ہو، لیکن اس کے سوا کوئی اور صورت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔''

ابوسفیان نے مسجد میں جا کر لوگوں کے سامنے اعلان کر دیا کہ وہ اپنی طرف سے امان دیتا ہے اور امان کا طالب ہے۔ اس نے یہ الفاظ کہے اور مکہ کی راہ لی۔ اس کا دل اس ندامت اور خفت سے ڈوبا جا رہا تھا جو اسے مدینے میں اٹھانی پڑی تھی، بالخصوص ان لوگوں کے ہاتھوں جو ہجرت سے قبل مدینہ میں اس کی عنایت کے طالب اور اس کی خوشنودی کے خواستگار رہا کرتے تھے۔

مکہ واپس آ کر ابوسفیان نے پوری سرگزشت سنائی اور یہ بھی کہا کہ میں نے حضرت علیؓ کے مشورے سے لوگوں کے سامنے آ کر امان دی ہے۔ نیز یہ کہ نبی کریم ﷺ نے میری امان کو معتبر نہیں سمجھا۔ اہل مکہ نے کہا: ''تیرا خانہ خراب ہو۔ اس (علیؓ) نے تجھ سے مذاق کیا ہے۔'' اس کے بعد وہ باہمی صلاح مشورے میں مشغول ہو گئے۔

إنا فتحنا لك فتحا مبينا

حامد ١٣٨٢

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

خیر متاع الدنیا المرأة الصالحة

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ

ففروا إلى الله

كتبه محمد أوزچاي غفر الله ذنوبه آمين سنة ١٤٢٦

كتبه محمد أوزچاي غفر الله ذنوبه آمين سنة ١٤٢٣

محمد رسول الله

والذين معه أشداء على الكفار رحماء بينهم

سیرۃ النبی الامی صلی اللہ علیہ وآلہ واہل بیتہ وسلم

إن الله وملائكته يصلون على النبي يا أيها الذين آمنوا صلوا عليه وسلموا تسليما

محمد

اللهم صل علی محمد و آل محمد

لا اله الا الله محمد رسول الله

بسم الله الرحمن الرحيم

محمد رسول الله ﷺ

خفیہ منصوبہ بندی

آنحضور ﷺ نے مناسب خیال کیا کہ اہلِ مکہ کو اتنی فرصت نہ دی جائے کہ وہ آپ ﷺ کے مقابلے کی تیاری کر سکیں۔ اگرچہ آپ ﷺ اپنی فوجی طاقت اور خدائی امداد سے مطمئن تھے، تاہم ان کی خواہش تھی کہ اہل مکہ پر ناگہانی حملہ کر دیا جائے تاکہ انھیں مدافعت کا موقع ہی نہ ملے اور وہ کشت و خون کے بغیر ہتھیار ڈال دیں، چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو حکم دیا کہ سامانِ سفر اور ہتھیار درست کرو، لیکن اس کا کسی کو پتا نہ چلے۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکرؓ بیٹی عائشہؓ کے گھر آئے تو پوچھا، یہ کیسی تیاری ہے؟ عرض کیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا: ''کیا سفر کا ارادہ ہے؟'' فرمایا، ہاں۔ عرض کیا۔ ''کیا میں بھی تیاری کروں۔'' ارشاد ہوا ''ہاں۔'' پوچھا، ''کیا مکہ پر حملے کا قصد ہے؟'' فرمایا: ''ہاں، لیکن اسے اپنے تک محدود رکھنا۔''

پھر رمضان کے ابتدائی دنوں میں کمال رازداری کی غرض سے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوقتادہؓ انصاری کی قیادت میں آٹھ آدمیوں کا ایک سریہ بطن اضم کی طرف روانہ فرمایا۔ یہ مقام ذی خشب اور ذی المروۃ کے درمیان مدینے سے مشرق میں تقریباً 36 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ خبر اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ آپ مشرق کا رخ کریں گے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اتنا اہتمام شاید رومیوں سے دوبارہ مقابلے کی خاطر ہو رہا ہے۔ لیکن یہ سریہ جب اپنے مقررہ مقام پر پہنچ گیا تو اسے خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ مکے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں، چنانچہ یہ بھی آپ ﷺ سے جاملا۔

حاطب بن ابی بلتعہ کا خفیہ خط

حضور نے اپنے منصوبے کو خفیہ اس لیے رکھا تھا کہ اہل مکہ ہمارے عزائم سے آگاہ نہ ہو سکیں۔ مزید احتیاط کے طور پر مکہ جانے والے راستوں پر پہرہ بھی بٹھا دیا تھا، تاکہ اگر یہودی یا مشرکین اہل مکہ کو اطلاع دینا چاہیں تو نہ دے سکیں۔

لیکن دشمن کو اطلاع پہنچانے کی غلطی ایک صحابی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ سے سرزد ہو گئی۔ حضرت حاطبؓ بڑی سوجھ بوجھ کے مالک مہاجر صحابیؓ تھے۔ انھوں نے غزوۂ بدر میں حصہ لیا تھا۔ انھیں شاہ مصر مقوقس کے پاس بطور سفیر جانے کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنی فراست سے اندازہ لگا لیا کہ حضور ﷺ حملے کی تیاریاں فرما رہے ہیں۔ انھوں نے ایک خط مکہ کے ذی اثر سرداروں میں سے صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو اور عکرمہ بن ابوجہل کے نام لکھا، اور مکہ کی ایک مغنیہ سارہ کو دیا۔ یہ عورت مکہ معظمہ سے مدینہ آئی ہوئی تھی۔ پہلے بنی عبدالمطلب کی کنیز تھی اور پھر آزاد ہو کر گانے بجانے کا کام کرتی تھی۔ اس نے مکہ سے آ کر حضور ﷺ سے اپنی تنگ دستی کی شکایت کی اور کچھ مالی مدد مانگی۔ آپ ﷺ نے بنی عبدالمطلب سے اپیل کر کے اس کی حاجت پوری کر دی۔ جب وہ مکہ جانے لگی تو حضرت حاطبؓ اس سے ملے اور چپکے سے وہ خط، جو انھوں نے سردارانِ مکہ کے نام لکھا تھا، اسے دیئے اور دس دینار دیئے، تاکہ وہ راز فاش نہ کرے اور چھپا کر یہ خط ان لوگوں تک پہنچا دے۔ ابھی وہ مدینہ سے روانہ ہی ہوئی تھی کہ آنحضور ﷺ کو اس کا علم ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فوراً حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ بن اسود کو اس کے پیچھے بھیجا اور حکم دیا کہ تیزی سے جاؤ۔ روضۂ خاخ کے مقام پر (مدینہ سے بارہ میل بجانب مکہ) تمھیں ایک عورت ملے گی، جس کے پاس مشرکین کے نام حاطب کا ایک خط ہے۔ جس طرح بھی ہو، اس سے وہ خط حاصل کرو۔ اگر وہ دے دے تو اسے چھوڑ دینا۔ نہ دے تو اسے قتل کر دینا۔

یہ حضرات جب اس مقام پر پہنچے تو عورت وہاں موجود تھی۔ انھوں نے اس سے خط مانگا۔ اس نے کہا، میرے پاس کوئی خط نہیں ہے۔ انھوں نے تلاشی لی، مگر خط نہ ملا۔ آخر کو انھوں نے کہا، خط ہمارے حوالے کرو، ورنہ برہنہ کر کے تلاشی لیں گے۔ جب اس نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے تو اپنی چوٹی میں سے وہ خط نکال کر انھیں دے دیا، اور یہ اسے حضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ کھول کر پڑھا گیا۔ اس میں تحریر تھا: ''امابعد، اے جماعتِ قریش، رسول اللہ ﷺ تمہارے پاس رات کی مانند تم پر ایک ہولناک لشکر لے کر آنے والے ہیں جو سیلاب کی طرح رواں ہو گا، بخدا اگر حضور ﷺ تن تنہا بھی تمھارے پاس آ جائیں تو اللہ ان کی مدد کرے گا اور ان سے اپنا وعدہ پورا کرے گا، لہٰذا تم لوگ اپنے متعلق سوچ لو۔''

آنحضور ﷺ نے حضرت حاطبؓ سے پوچھا: ''یہ کیا حرکت ہے؟'' انھوں نے عرض کیا: ''آپ ﷺ میرے معاملے میں جلدی نہ فرمائیں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، اس بناء پر نہیں کیا ہے کہ میں کافر و مرتد ہو گیا ہوں اور اسلام کے بعد اب کفر کو پسند کرنے لگا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرے اقرباء مکہ میں مقیم ہیں۔ میں قریش کے قبیلے کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ بعض قریشیوں کی سرپرستی میں وہاں آباد ہوا ہوں۔ مہاجرین میں سے دوسرے جن لوگوں کے اہل و عیال مکہ میں ہیں، انھیں تو ان کا قبیلہ بچالے گا، مگر میرا کوئی قبیلہ وہاں نہیں ہے، جسے کوئی بچانے والا ہو۔ اس لیے میں نے یہ خط اس خیال سے بھیجا تھا کہ قریش والوں پر میرا ایک احسان رہے، جس کا لحاظ کر کے وہ میرے بال بچوں کو نہ چھیڑیں (اس وقت حضرت حاطبؓ کے بچے اور بھائی، اور ایک روایت کے مطابق ان کی والدہ بھی مکہ میں تھیں)

آنحضور ﷺ نے حاطبؓ کی یہ بات سن کر حاضرین سے فرمایا: ''حاطب نے تم سے سچی بات کہی ہے'' یعنی ان کے اس فعل کا اصل محرک یہی تھا۔ اسلام سے انحراف اور کفر کی حمایت کا جذبہ اس کا محرک نہ تھا۔

حضرت عمرؓ نے اٹھ کر عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ! مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس منافق کی گردن مار دوں، اس نے اللہ اور اس کے رسول اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس شخص نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ تمھیں کیا خبر، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو دیکھ کر کہا ہو کہ ''تم خواہ کچھ بھی کرو۔ میں نے تمھیں معاف کیا۔''

یہ سن کر حضرت عمرؓ کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور انھوں نے کہا: ''اللہ اور اس کے رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔''

اس طرح اللہ نے جاسوسوں کو پکڑ لیا اور مسلمانوں کی جنگی تیاریوں کی کوئی خبر قریش تک نہ پہنچ سکی۔ اس واقعے کے بارے میں سورۂ ممتحنہ کی ابتدائی تین آیات نازل ہوئیں (ترجمہ):

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمھارے پاس آیا ہے، اسے ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں، اور ان کی روش یہ ہے کہ رسول ﷺ کو اور خود تمھیں صرف اس قصور پر جلاوطن کرتے ہیں کہ تم اپنے رب، اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم خفیہ طور پر انھیں دوستانہ پیغام بھیجتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم چھپا کر کرتے ہو اور جو علانیہ کرتے ہو، ہر چیز کو میں خوب جانتا ہوں۔ جو شخص بھی تم میں سے ایسا کرے، وہ یقیناً راہ راست سے بھٹک گیا۔ ان کا رویہ تو یہ ہے کہ اگر تم پر قابو پا جائیں تو تمھارے ساتھ دشمنی کریں اور ہاتھ اور زبان سے تمھیں تکلیف دیں۔ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔ قیامت کے دن نہ تمھاری رشتہ داریاں کسی کام آئیں گی نہ تمھاری اولاد۔ اس روز اللہ تمھارے درمیان جدائی ڈال دے گا اور وہی تمھارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔''

سوئے مکہ معظمہ

10۔ رمضان المبارک آٹھ ہجری بمطابق یکم جنوری 630ء کو جانب مکہ روانہ ہوئے۔ مدینہ پر ابورہمؓ کلثوم غفاری کو عامل مقرر کیا۔ لشکر کی مجموعی تعداد دس ہزار تھی۔ مدینہ سے نکلتے وقت تعداد سات ہزار کے لگ بھگ تھی۔ راستے میں دیگر قبائل کی شمولیت کے باعث دس ہزار ہوگئی۔ ازواجِ مطہرات میں سے ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ ساتھ تھیں۔

روانگی سے قبل منادی کرادی گئی تھی کہ جس کا دل چاہے، وہ روزہ رکھے، اور جس کا دل نہ چاہے، وہ روزہ نہ رکھے، لیکن حضور ﷺ اور بعض صحابہؓ روزے رکھ رہے تھے۔ جب آپ ﷺ قدید اور عسفان کے درمیان کدید کے چشمے پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ روزہ دار پیاس سے نڈھال ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ان سے کہو، روزے توڑ ڈالیں۔''

عرض کیا گیا: ''یارسول اللہ ﷺ، لوگ تو آپ کی تقلید کریں گے۔'' کہنے والے کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ ﷺ نے روزہ برقرار رکھا، اور دوسروں کو روزہ توڑنے کی اجازت دے بھی دی تو وہ تمام مشکلات کے باوجود اس اجازت و رخصت پر عمل کرنے کے بجائے آپ ﷺ کی پیروی کو ترجیح دیں گے۔

بات درست تھی، اس لیے حضور ﷺ نے سواری پر بیٹھے بیٹھے، پیالہ ہاتھ میں لے کر اونچا کیا تاکہ سب لوگ دیکھ لیں۔ جب آپ ﷺ نے دیکھا کہ سب لوگوں کی نظریں میری طرف اٹھ گئی ہیں تو آپ نے پیالہ منہ سے لگایا اور پانی پی کر اپنا روزہ ختم کیا۔

حضور ﷺ کو پانی پیتا دیکھ کر سب نے روزے توڑ دیئے اور جی بھر کے پیاس بجھانے لگے۔ مگر اس کے باوجود بعض صحابہؓ نے یہ سمجھا کہ آپ ﷺ کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ روزہ ضروری نہیں ہے، نہ یہ کہ روزہ رکھنا ممنوع ہے۔ چنانچہ وہ بدستور روزے سے رہے۔ مگر پیاس کی شدت سے یہ حال ہوگیا کہ حضور ﷺ نے ایک جگہ بہت سے آدمیوں کا ہجوم دیکھا۔ انھوں نے ایک شخص پر چادر تان رکھی تھی۔ حضور ﷺ نے اس شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ''اسے کیا ہوا ہے؟''

لوگوں نے بتایا کہ روزے دار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ایسے سفر میں روزہ رکھنا نیکی نہیں۔'' جن لوگوں نے حکم نبوی ﷺ کے باوجود روزہ نہیں توڑا تو ان کے بارے میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''وہ نافرمان ہیں۔'' اس کے بعد اس سفر میں آپ ﷺ نے آخر رمضان تک روزے نہیں رکھے۔

بنی ہاشم کا اسلام

ذی الحلیفہ کے قریب مکہ سے اونٹوں پر ایک مختصر سا قافلہ آتا دکھائی دیا جو جحفہ میں لشکر اسلام سے آ کر مل گیا۔ انھیں دیکھ کر رسول اکرم ﷺ بہت خوش ہوئے اور ارشاد فرمایا: ''میں آخر الانبیاء ہوں۔ اور آپ آخر المہاجرین۔'' یہ حضور ﷺ کے تایا عباسؓ بن عبدالمطلب اور ان کے اہل وعیال تھے۔ انھوں نے کئی بار ہجرت کا ارادہ ظاہر کیا، مگر حضور ﷺ نے اجازت نہ دی، کیوں کہ حضرت عباسؓ اہل مکہ کے ارادوں سے حضور ﷺ کو باخبر رکھتے تھے اور یوں حضور ﷺ حالات کے مطابق پیش بندی کر لیتے تھے، مگر اب مسلمان اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ انھیں مشرکین مکہ سے چنداں خطرہ لاحق نہ تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عباسؓ کو معلوم ہوگیا تھا کہ حضور ﷺ لشکر کے ہم راہ مکہ آ رہے ہیں۔ بہرصورت حضرت عباسؓ مع اہل وعیال ہجرت کر کے مدینہ کی طرف چل پڑے۔ انھیں اس امر کا اندازہ نہ تھا کہ حضور ﷺ سے اتنی جلد ملاقات کا شرف حاصل ہو جائے گا۔

حضور ﷺ سے ملاقات کے بعد حضرت عباسؓ نے اپنے اہل وعیال مدینہ بھیج دیئے اور خود حضور ﷺ اور لشکرِ اسلام کے ہم راہ مکہ کی جانب روانہ ہوگئے۔

غالباً بنی ہاشم کے چند نفوس کو کسی نہ کسی ذریعے سے لشکرِ اسلام کی نقل وحرکت کا علم ہوگیا تھا۔ اس لیے انھوں نے چاہا کہ مخالفین کے ہاتھوں انھیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ انھوں نے بہتری اسی بات میں سمجھی کہ پہلے ہی آنحضور ﷺ کے پاس پہنچ کر محفوظ ہو جائیں۔ حضرت عباسؓ کے علاوہ ابو سفیان بن حارث بن عبدالمطلب (آنحضور ﷺ کے تایا زاد) اور عبداللہ بن ابی امیہ بن مغیرہ (آپ ﷺ کی پھوپھی کے فرزند) بھی مکہ سے نکلے اور لشکرِ اسلام میں آ شامل ہوئے۔ اس وقت لشکر نے نیق العقاب کے مقام پر پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ عبداللہ بن ابی امیہ تو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے سوتیلے بھائی تھے جو اس وقت حضور ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ ان دونوں نے باریابی کی اجازت طلب کی تو رحمتِ عالم ﷺ نے ملنے سے انکار کر دیا۔

ابوسفیان آنحضور ﷺ کے رضاعی بھائی تھے اور انھوں نے بھی حضرت حلیمہ سعدیہؓ کا دودھ پیا تھا۔ اعلانِ نبوت تک ابوسفیان دل و جان سے فدا اور حد درجہ محبت کرنے والوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، لیکن بعثت کے ساتھ ہی یہ شخص آنحضور ﷺ کا جانی دشمن بن گیا۔ بیس سال تک اس نے اپنے اس جلیل القدر بھائی اور داعی اسلام کی ہجو میں شعروں کے ایسے تیر ونشتر چلائے کہ قلبِ رسول ﷺ چھلنی ہو گیا۔

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے دونوں کی سفارش کی: ''یارسول اللہ ﷺ! یہ دونوں آپ کے قریبی رشتہ دار ہیں۔ ایک تایا کا بیٹا ہے، دوسرا پھوپھی کا۔''

ابوسفیان بن حارث نے دل برداشتہ ہو کر کہا: ''اگر میرا قصور معاف نہ ہوا تو میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ صحرا میں نکل جاؤں گا اور بھوک پیاس سے تڑپ تڑپ کر جان دے دوں گا۔''

حضرت علیؓ نے انھیں مشورہ دیا کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کی طرح سامنے جا کر اسی انداز سے وہی کچھ کہو، جو انھوں نے کہا تھا۔ اس طرح شاید رحمت عالم ﷺ کے دل میں تمھارے لیے محبت پیدا ہو جائے۔ دونوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اور اپنے سر جھکا کر عرض کیا:

﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِئِيْنَ﴾ (یوسف: ۹۱)

''قسم ہے اللہ کی۔ بے شک اللہ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی اور بلاشبہ ہم خطا کار تھے۔''

رحمت عالم ﷺ کا دریائے کرم جوش میں آیا۔ آپ ﷺ نے حضرت یوسفؑ ہی کے الفاظ میں جواب دیا:

﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۝﴾ (یوسف: ۹۲)

''آج تم پر کوئی گرفت نہیں۔ اللہ تمھیں معاف کرے۔ وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔''

اس واقعے کے بعد زندگی بھر دونوں نے آنکھ اٹھا کر حضور ﷺ کو نہیں دیکھا۔ ہمیشہ محفل میں ندامت سے سر جھکائے، نظریں نیچے کیے، پشیمان و نادم بیٹھا کرتے۔

صحرا کو آگ لگ گئی

لشکر اسلام مقام کدید سے چل کر شام ہوتے ہوتے مرا الظہران پہنچا، جس کا موجودہ نام ''وادیٔ فاطمہ'' ہے۔ یہ مکہ سے تقریباً دس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ مسلمان خیمہ زن ہو گئے اور راتوں رات ویرانے میں ایک شہر بس گیا تو دنیا کے بے مثال جرنیل کی طرف سے حکم آیا: ''خوب الاؤ روشن کرو۔'' رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمرؓ کو پہرے پر مقرر فرمایا۔

حضور ﷺ کا منشا یہ تھا کہ ہر شخص اپنا علیحدہ چولہا جلائے۔ رمضان کی اکیسویں تاریخ تھی۔ اندھیرے میں کوئی دس ہزار چولہے روشن ہوئے تو جنگل میں منگل کا سماں معلوم ہونے لگا۔ اہل مکہ نے دیکھا کہ پہاڑوں کے پیچھے اس قدر زبردست چراغاں ہو رہا ہے تو اب انھیں فکر ہوئی کہ معلوم کیا جائے، یہ کیا معاملہ ہے۔ ابوسفیان رئیسِ اعظم اور سردارِ قوم تھا۔ خوب غور سے اس روشنی کو دیکھتا رہا۔ کوئی اور ہوتا تو نورِ ایمان کی جھلک دیکھ لیتا، لیکن ابھی اس کے قلب پر جہل و کفر کی سیاہیاں چھائی ہوئی تھیں۔ اپنے ساتھیوں سے بولا: ''یہ تو عرفہ کی شان معلوم ہوتی ہے، حالانکہ یہ زیارتِ کعبہ کا موقع نہیں۔''

ابوسفیان کے ساتھ بدیل بن ورقہ بھی تھا۔ اب تو اس سے تعلقات رکھنا ضروری تھا، کیوں کہ وہ مسلمانوں کا حلیف تھا۔ بدیل نے کہا: ''کہیں یہ بنی عمرو کا پڑاؤ تو نہیں۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ بنی خزاعہ لڑنے کے لیے نکل آئے ہیں، ہوشیار ہو جاؤ۔ تم نے خانہ کعبہ میں بھی ان کا خون بہایا تھا۔''

ابوسفیان نے بدیل کا مطلب سمجھ لیا۔ بولا: ''نہیں یہ بنی خزاعہ نہیں ہو سکتے۔ کہاں یہ لاؤ لشکر اور کہاں بنی خزاعہ۔ یہ تو برسات کے جگنوؤں کی طرح ہیں۔''

ابوسفیان سمجھ گیا کہ یہ مسلمان ہیں۔ وہ اس وقت سخت پریشان تھا اور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مسلمان کس طرف جائیں گے۔ ہوازن اور ثقیف لڑائی کی تیاریاں کیے بیٹھے تھے (جن سے آیندہ ماہ حنین اور طائف میں مسلمانوں کا مقابلہ ہوگا)۔ کیا مسلمان یہاں سے ان کی طرف بڑھ جائیں گے؟ اس وقت تین آدمی روشنی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قریش سخت خطرے میں گھر گئے تھے اور قوم کا سردار چاہتا تھا کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ اس کی عزت قائم رہے۔ اس موقع پر بدیل کے علاوہ حکیم بن حزام بھی ابوسفیان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ حکیم حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے بھتیجے تھے، جنھوں نے تھوڑے سے گیہوں اپنی پھوپھی کے پاس اس وقت بھیجے تھے، جب حضور اکرم ﷺ شعب ابی طالب میں پناہ گزیں تھے اور قریش مکہ نے سارے خاندان کی ایسی ناکہ بندی کر رکھی تھی کہ دانے دانے کی محتاجی ہو گئی تھی۔ گھاس پھوس جڑیں پکائی جاتی تھیں۔ چمڑا ابال کر کھا لیا جاتا تھا کہ کسی طرح بھوک مٹے۔ ایسے موقع پر ابن حزام کے تھوڑے سے گیہوں نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھے۔ اب اس موقع پر حکیم ابن حزام کی موجودگی شاید قریش کی مصیبتوں کو ہلکا کرنے کا سبب بن جائے، اس لیے ابوسفیان نے انھیں بھی ساتھ لے لیا تھا۔

پروفیسر عبدالرحمن عبد نے اپنی مشہور تصنیف ''آنحضور ﷺ کے نقش قدم پر'' (جلد سوم، بہ عنوان حرمِ مکہ) میں چشم تصور سے ان تینوں کی باہمی گفتگو کا سماں باندھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''سردارِ مکہ ابوسفیان بن حرب اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا۔ اس کے ذہن پر فکر فردا کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ بے کلی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بدیل بن ورقہ اور حکیم بن حزام کو ان کے گھروں سے ساتھ لیا اور طریق مدینہ پر اس طرف نکل آیا، جدھر آج کل مسجد تنعیم ہے (اہل مکہ عمرہ کے لیے یہاں آ کر احرام باندھتے ہیں)۔ شام ڈھل چکی تھی۔ اگر ہمارے اور ان کے درمیان وقت کا حجاب نہ ہوتا اور ہم ان تینوں حضرات کے قریب ہوتے تو انھیں حالاتِ حاضرہ پر کچھ اس طرح تبصرہ کرتے ہوئے سنتے:

''برا ہو عکرمہ کا'' ابوسفیان کہتا ہے: ''اس نے بنی ویل (بنی بکر کی ایک شاخ) کو

اکسایا کہ وہ بنی خزاعہ سے انتقام لیں۔ بنی بکر کے بڑوں کو بھی سوچنا چاہیے تھا کہ ہم ان کے حلیف ہیں۔ کوئی اقدام کرنے سے پہلے انھیں ہم سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔ بس اٹھے اور ''الوتیر'' چشمے پر حملہ کرکے بنی خزاعہ کے آدمیوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔''

حکیم بن حزام نے کہا: ''ہم نے غلطی کی کہ جنگ موتہ کی وجہ سے مسلمانوں کو کم زور جانا، حالانکہ خیبر کی فتح اور دولت سے نہ صرف مسلمان مضبوط ہوئے ہیں بلکہ انھیں شمال کی طرف سے حملے کا کوئی خطرہ بھی نہیں رہا ہے، اور وہ واحد محاذ کی برتری کی بناء پر بلا جھجک جنوب میں مکہ پر کسی وقت بھی حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ حدیبیہ کی تنسیخ ہمارے لیے تباہی لے کر آئی ہے۔''

بدیل نے کہا: ''حدیبیہ کے بعد اس ڈیڑھ سال میں محمد ﷺ کے پیروکاروں میں ہزاروں کا اضافہ ہوا ہے۔ احزاب کے موقع پر ابوسفیان تم نے عرب کے سارے قبائل کو محمد ﷺ کے خلاف جمع کر لیا تھا، لیکن صرف تین سال میں حالات کس طرح الٹے ہیں کہ اب ہم اپنے دفاع کے لیے پورے عرب میں کیسی کو پکاریں تو ہماری صدائے بازگشت تک نہیں آئے گی۔''

ابوسفیان نے کہا: ''میں تو یثرب کا وہ دن یاد کرتا ہوں جب تجدید معاہدہ کے لیے گیا تھا تو مجال ہے کسی نے مجھ سے آنکھ ملا کر بات کی ہو، اور جب میری اپنی بیٹی امِ حبیبہؓ نے مجھے اپنے بستر تک پر بیٹھنے سے یہ کہ کر روک دیا کہ تم ابھی شرک کی نجاست سے آلودہ ہو اور اس بستر پر اللہ کے رسول ﷺ تشریف فرما ہوتے ہیں، تو میں خجالت سے پانی پانی ہو کر رہ گیا تھا۔''

سورج غروب ہو چکا تھا اور صحرا نے تاریکی کی گہری سیاہ چادر تان لی تھی۔ یہ تینوں اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑنے لگے تھے کہ ابوسفیان نے شمال کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا ''وہ سامنے دُور آگ سی کیسی ہے؟''

تجسس کے مارے یہ تینوں اس سمت بڑھتے گئے تو آگ سے روشن افق کی لکیر دائیں سے بائیں پھیلتی چلی گئی۔ اس انوکھے منظر سے ان کے حیرت و استعجاب میں دم بہ دم اضافہ ہو رہا تھا۔ حیرت نے ان کے ہونٹوں پر تالے لگا دیے تھے۔ اور قریب ہوئے تو تینوں نے اپنے گھوڑے روک لیے اور سانس بھی روک لیے، کیوں کہ قضائے مبرم آ پہنچی تھی۔ سامنے ایک بہت بڑا فوجی کیمپ تھا، جس میں ترتیب کے ساتھ لمبی قطار میں دو ہزار کے لگ بھگ خیمے تھے۔ ان خیموں سے اور دس ہزار مجاہدین سے ریگ زار کی پوری سطح ڈھانپی جا چکی تھی۔ پورے کیمپ میں اسلحہ لے کر چلتے پھرتے ہوئے ہزاروں مجاہدین اتنی دور سے صاف نظر آ رہے تھے، کیوں کہ سارے کیمپ پر بیس ہزار روشن مشعلیں دھڑا دھڑ جل رہی تھیں اور ان کی روشنی اتنی زیادہ تھی کہ اس نے رات کی تاریکی کافور کر کے دن کا سماں بنا دیا تھا۔ حکیم بن حزام کے منہ سے بے اختیار نکلا: ''یہ تو گویا صحرا کو آگ لگی ہوئی ہے۔'' اس موقع پر ابوسفیان کے ادا کیے ہوئے الفاظ تاریخ میں محفوظ ہیں: ''میں نے کسی رات اس قسم کی روشن آگ اور اتنی بھاری فوج نہیں دیکھی۔''

اہل مکہ اور ان کے سردار ابوسفیان کے دل میں یہی تاثر قائم کرنے کے لیے حضور ﷺ نے یہ بیس ہزار مشعلوں والی تدبیر کی تھی اور حضور ﷺ کی یہ جنگی تدبیر تیر بہ ہدف ثابت ہوئی۔ حضور ﷺ چاہتے تھے کہ حرمِ مکہ کے تقدس اور حرمت کے پیش نظر جس حد تک ممکن ہو، وہ مکہ میں خون بہائے بغیر داخل ہوں۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ اہل مکہ کو مدافعت کا موقع ہی نہ دیا جائے۔

ابوحنظلہ سے ابوالفضل کی ملاقات

اس تاریخی ملاقات کا حال شاہ بلیغ الدین نے اپنی گراں قدر تالیف ''رزم حق و باطل'' میں یوں بیان کیا ہے: ''اسلامی لشکر کے حفاظتی انتظامات مکمل تھے۔ جاگنے والے پہرہ دینے والے اپنی اپنی جگہ چوکس تھے۔ یہ تینوں ٹوہ لینے آگے بڑھے تو ایک جگہ حفاظتی دستے نے انھیں پکڑ لیا اور کشاں کشاں خدمتِ نبوی ﷺ میں لے جانے لگے۔ اتنے میں کوئی خچر پر سوار اس طرف آنے لگا۔ اراک نامی جگہ پر آنے والے اور جانے والوں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ دن کا وقت ہوتا تو دور سے دکھائی دیتا کہ یہ حضور کی سواری کا خچر ''بیضا'' ہے۔ سوار نے دور سے کچھ انسانی پرچھائیاں دیکھیں تو خود بھی بڑے تجسس سے خچر کو آگے بڑھایا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور اس سوار کو اس بات کی تلاش تھی کہ مکے کی سمت جاتا ہوا کوئی آدمی مل جائے، کوئی لکڑہارا، کوئی گوالا، کوئی چرواہا، کوئی بھی! وہ اراک تک اسی دھن میں نکل آیا تھا کہ یہاں یہ سائے نظر آئے۔ قریب پہنچ کر جب بیضا کے سوار نے آنے والوں کی آوازیں سنیں تو اس کا دل خوش ہو گیا۔ عجیب اتفاق تھا۔ ناممکن بات ممکن ہو گئی تھی۔ جسے پیام بھیجنا تھا، وہی یہاں موجود تھا۔ معلوم نہیں کس طرح اور کیوں یہاں پہنچا۔ بیضا کے سوار نے اپنے دوستوں کی آواز پہچان کر آواز دی ''ابوحنظلہ۔''

یہ آواز ڈوبتے کے لیے ایک تنکے کا سہارا تھی۔ جواب میں اس نے پکارا: ''ابوالفضل۔''

ابوحنظلہ ابوسفیان تھا اور ابوالفضل حضرت عباسؓ۔

حضرت عباسؓ جب مکے کی طرف جانے کے لیے حضور اکرم ﷺ کے ذاتی خچر پر سوار ہو کر نکلے تھے تو یہ سفر یونہی نہ تھا۔ انھوں نے حضور ﷺ نے پوچھا تھا: ''جب آپ ﷺ مکے پر قبضہ فرما لیں گے تو وہاں والوں کے ساتھ آپ ﷺ کا کیا رویہ ہوگا؟''

رحمت عالم ﷺ کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ وہ قریش کے پاس، ان کے سردار ابوسفیان کے پاس حضور اکرم ﷺ کے شخصی قاصد بن کر تشریف لے جا رہے تھے۔ اس سفارت کا مقصد یہ تھا کہ سردارانِ قریش کو آگاہ کر دیا جائے کہ مقابلے کی کوشش نہ کریں، ورنہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔

رات بھیگ رہی تھی۔ الاؤ بھڑک رہے تھے۔ مشعلیں روشن تھیں۔ اہل ایمان حکم نبوی ﷺ کے انتظار میں رات آنکھوں میں کاٹ رہے تھے کہ حضرت عباسؓ نے ابوسفیان سے کہا: ''دیکھتے ہو، کیا رنگ ہے۔'' ابوسفیان نے جواب دیا: ''میرے ماں

باپ تم پر نثار ہوں، کوئی مشورہ دو۔'' حضرت عباسؓ نے کہا: ''اس خچر پر میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ میں تمھارے لیے حضورِ اکرم ﷺ سے امان لے لوں، ورنہ مجھے ڈر ہے کہ فتح مکہ کے بعد سب سے پہلے تمھاری گردن اڑا دی جائے گی۔''

ابوسفیان نے چپکے سے ان کے کہے کی تعمیل کی اور دونوں بیضاء پر سوار آگے بڑھے۔ کس ظالم کے حصے میں کیا سعادت آئی تھی۔ سرورِ کونین ﷺ کی سواری کا خچر بیضاء اور ابوسفیان۔

جس خیمے، جس الاؤ کے سامنے سے ہو کر یہ دونوں سوار گزرتے، لوگ انھیں آگے جانے کا موقع دے دیتے۔ سب دیکھ رہے تھے کہ حضورِ اکرم ﷺ کا خچر ہے اور حضرت عباسؓ اس پر سوار ہیں۔ ابوسفیان کو کسی نے پہچانا اور کسی نے نہ پہچانا۔ جب خچر حضرت عمرؓ کے الاؤ کے سامنے سے گزرا تو انھوں نے دیکھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی سواری کا خچر بیضاء آ رہا ہے، لیکن اس پر سوار کوئی اور ہے۔ ذرا قریب آنے پر معلوم ہوا کہ ابوالفضل سوار ہیں تو ان کا تجسس بڑھا، اس لیے کہ اس رات پہرہ کے انتظامات انھی کے سپرد تھے۔ حضرت عباسؓ اس وقت تنہا نہیں تھے، بلکہ پیچھے کوئی اور بھی بیٹھا تھا۔ جب اس شخص پر نظر پڑی تو کسی کے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ حضرت عمرؓ نے سمجھ لیا کہ حضرت عباسؓ ابوسفیان کو امان دلانا چاہتے ہیں۔ دنیا جانتی تھی کہ ابوسفیان ان دشمنانِ خدا میں تھا جو ابوجہل اور ابولہب کی طرح ہمیشہ اسلام کی تباہی کے درپے رہے۔ اس نے اپنی قوتِ بازو سے، روپے پیسے سے، اثر و رسوخ سے ہر طرح اہلِ ایماں کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ مسلسل اور پیہم کوشش۔ حضرت عمرؓ خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑے۔

ابوسفیان کا قبولِ اسلام

بارگاہِ نبوی ﷺ میں پہنچ کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ابوسفیان اللہ کا دشمن، آج ہمارے قبضے میں ہے۔ مجھے اجازت دیجیے، اس کی گردن مار دوں؟

حضرت عباسؓ نے یہ کیفیت دیکھی تو بولے: ''اے اللہ کے رسول! اسے میں نے امان دی ہے۔''

حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''یہ کسی امان کا مستحق نہیں ہوسکتا۔''

حضرت عباسؓ نے کہا: ''اے عمرؓ، اگر بنوعدی کا کوئی آدمی ہوتا تو تم اتنا اصرار نہ کرتے۔''

حضرت عمرؓ نے کہا: ''اے عباس، خدا کی قسم تمھارا اسلام میں آنا میری نظر میں اپنے باپ خطاب کے اسلام سے زیادہ پسندیدہ ہے، اس لیے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کی خوشی کا باعث ہے۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''اے عباسؓ! ابوسفیان کو اپنے خیمے پر لے جاؤ۔ صبح پھر انھیں لے کر میرے پاس آیئے۔''

بات کچھ کھل کر سامنے نہ آئی۔ صبح تک امان تھی یا زندگی کی امان؟

ابوسفیان نے رات جاگتے کاٹی۔ نہ جانے کن کن وسوسوں نے اسے مارے رکھا۔ صبح ہونے کو آئی تو لشکرِ اسلام میں ہلچل پیدا ہوئی۔ نیند کے مارے جاگ اٹھے۔ حضرت بلالؓ نے لحنِ داؤدی میں مسلمانوں کو پکارا: ''نماز نیند سے بہتر ہے۔ اٹھو مسلمانو! اور صلاح و فلاح کی طرف آؤ۔'' مسلمان اٹھے۔ وضو کر کے ایک مرکز پر، ایک صف میں جمع ہو گئے۔

ابوسفیان نے پہلی بار یہ شاندار نظارہ دیکھا تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ چہل پہل کیوں ہے؟ اس کا ذہن تو کسی اور ہی طرح کام کر رہا تھا۔ سمجھا، امان کی رات گزری۔ اب موت کا پیام آنے کو ہے۔ اس نے حضرت عباسؓ سے پوچھا: ''سچ بتاؤ، کیا یہ میرے قتل کی تیاریاں ہیں؟'' یہ اس کے مجرم ضمیر کی آواز تھی۔

حضرت عباسؓ نے کہا: ''ابوحنظلہ، مسلمان بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہونے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

خدا کی دین کا وقت اب آیا تھا۔ نمازِ فجر سے پہلے حضرت عباسؓ اسے اپنے ساتھ لے کر خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے۔

نبی کریم ﷺ نے دریافت فرمایا: ''ابوسفیان، تیرا برا ہو۔ کیا اب بھی تجھ پر یہ حقیقت روشن نہیں ہوئی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔''

ابوسفیان نے جواب دیا: ''میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں۔ آپ ﷺ کتنے متحمل، کریم النفس، اور اقربا نواز ہیں۔ بخدا میرا خیال ہے کہ اگر اللہ کے ماسوا کوئی اور معبود بھی ہوتا تو اب تک معاملہ کسی نہ کسی انتہا کو پہنچ چکا ہوتا۔'' یہ اقرار ابوسفیان کے ''لا الہ الا اللہ'' کی منزل پر فائز ہونے کی دلیل ہے۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے ابوسفیان، تیرا برا ہو۔ کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو جان لے، میں اللہ کا رسول ہوں؟''

ابوسفیان بولا: ''میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان ہوں۔ بے شک آپ متحمل، شریف النفس اور صلۂ رحمی کرنے والے ہیں۔ رہ گئی نبوت تو ابھی اس میں ذرا تردد ہے۔''

حضرت عباسؓ نے کہا: ''اے ابوسفیان! قبل اس کے کہ تمھارا سر قلم کر دیا جائے، تمھیں چاہیے کہ تم توحید و رسالت کا اقرار کر کے اسلام لے آؤ۔''

ان حالات میں ابوسفیان کے لیے چارۂ کار نہ تھا۔ حضرت عباسؓ نے آنحضرت ﷺ سے مخاطب ہو کر یہ بات کہی: ''یارسول اللہ! ابوسفیان ایسا شخص ہے جو سرداری اور سربلندی پسند کرتا ہے، اس لیے مناسب ہے کہ آپ ﷺ اس کی اس کمزوری کا لحاظ رکھیں۔''

اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگا، اسے امان دے دی جائے گی، اور جو شخص اپنے گھر میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لے گا، اس کے لیے بھی امان ہے۔ جو شخص کعبے میں داخل ہوگا، اسے بھی امان ہے۔''

مکہ کی جانب روانگی

اسی صبح، سترہ رمضان آٹھ ہجری، بروز منگل، رسول اکرم ﷺ مرالظہران سے

مکہ روانہ ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے حضرت عباسؓ کو حکم دیا کہ ابوسفیانؓ کو پہاڑ کی تنگ وادی میں، جس کا رخ مکہ کے جانب تھا، روک رکھیں، تا کہ وہ لشکر اسلام کو وہاں سے گزرتا ہوا دیکھ سکے، اور ان کی کثرت اور بے پناہ قوت کا تذکرہ قریش سے کرے۔ اگر ابوسفیان کو یہ سب کچھ دیکھے بغیر مکہ جانے دیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ اہل مکہ تیاری میں مصروف ہو جاتے۔

حضرت عباسؓ نے حضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل کی۔ قبائل اپنے اپنے پرچم لیے گزر رہے تھے۔ جب وہاں سے کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیانؓ پوچھتا کہ عباسؓ، یہ کون لوگ ہیں؟

جواب میں حضرت عباسؓ کہتے: ''بنوفلاں (مثلاً بنوسلیم)

ابوسفیان کہتا: ''مجھے بنوفلاں سے کیا واسطہ؟''

پھر کوئی اور قبیلہ گزرتا تو ابوسفیان پوچھتا کہ اے عباسؓ، یہ کون لوگ ہیں؟

وہ کہتے: ''مزینہ ہیں''

ابوسفیان کہتا: ''مجھے مزینہ سے کیا مطلب۔''

یہاں تک کہ سارے قبیلے ایک ایک کر کے گزر گئے۔ جب بھی کوئی قبیلہ گزرتا تو ابوسفیانؓ حضرت عباسؓ سے اس کے متعلق ضرور دریافت کرتا اور جب وہ اسے بتاتے تو وہ کہتا کہ مجھے بنی فلاں سے کیا واسطہ؟ حتیٰ کہ رسول کریم ﷺ اپنے سبز دستے کے جلو میں تشریف لائے۔ آپ ﷺ مہاجرین وانصار کے درمیان فروکش تھے۔ یہاں انسانوں کے بجائے صرف لوہے کی باڑھ دکھائی دے رہی تھی۔ ابوسفیانؓ نے کہا: ''سبحان اللہ، اے عباسؓ، یہ کون لوگ ہیں۔''

حضرت عباسؓ نے کہا: ''یہ انصار و مہاجرین کے جلو میں رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں۔''

ابوسفیان نے کہا: ''بھلا، ان سے محاذ آرائی کی طاقت کسے ہے؟'' اس کے بعد اس نے مزید کہا: ''ابوالفضل، تمھارے بھتیجے کی بادشاہت تو واللہ! بڑی زبردست ہوگئی۔''

حضرت عباسؓ نے کہا: ''ابوسفیان، یہ نبوت ہے۔''

ابوسفیان نے کہا: ''ہاں، اب تو یہی کہا جائے گا۔''

پھر انصار کا دستہ گزرا، جس کا پرچم حضرت سعدؓ بن عبادہ کے پاس تھا۔ انھوں نے کہا: ''ابوسفیان! آج خون ریزی اور مار دھاڑ کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کیا جائے گا۔'' آج اللہ نے قریش کی ذلت مقدر کر دی ہے۔

اس کے بعد جب وہاں سے نبی کریم ﷺ گزرے تو ابوسفیان نے کہا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ، آپ ﷺ نے وہ بات نہیں سنی جو سعدؓ نے کہی ہے؟''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''سعد نے کیا کہا ہے؟''

ابوسفیان نے کہا، یہ اور یہ بات کہی ہے۔ یہ سن کر حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! ہمیں خطرہ ہے کہ کہیں سعدؓ قریش کے اندر مار دھاڑ نہ کر دیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، بلکہ آج کا دن وہ دن ہے جس میں کعبے کی تعظیم کی جائے گی۔ آج کا دن وہ دن ہے جس میں اللہ قریش کو عزت بخشے گا۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ کے پاس آدمی بھیج کر جھنڈا ان سے لے لیا اور ان کے صاحب زادے قیس کے حوالے کر دیا۔ گویا جھنڈا حضرت سعدؓ کے ہاتھ سے نہیں نکلا۔

خندمہ کی پہاڑی پر

جب رسول اللہ ﷺ ابوسفیان کے پاس سے گزر چکے تو حضرت عباسؓ نے اس سے کہا: ''اب دوڑ کر اپنی قوم کے پاس جاؤ۔ اگر تمھارے بھائی بندوں نے کسی قسم کی کوئی حماقت کی تو پھر خیر نہیں۔ تم سب کچھ اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔ ابوسفیانؓ جیسے ہی مکے کی حدود میں داخل ہوئے، لوگوں نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ پوچھا، یہ گرد و غبار کیسا ہے؟ ابوسفیان نے کہا: ''اے قریش، حضرت محمد ﷺ ایک ایسا طاقت ور لشکر لے کر آ رہے ہیں جس کے مقابلے کی طاقت تم میں نہیں۔ آج جو میرے گھر میں داخل ہو جائے گا، اسے امان ہے۔ یہ سن کر اس کی بیوی ہند بنت عتبہ اٹھی اور اس کی مونچھ پکڑ کر بولی، مار ڈالو اس مشک کی طرح چربی سے پھولے ہوئے پتلی پنڈلیوں والے کو۔ برا ہو ایسے پیش رو خبر رساں کا۔

لوگوں نے کہا، تمھارے گھر میں کتنے لوگ سما سکیں گے۔

ابوسفیان نے اعلان کیا، جو مسجد حرام میں پناہ لے، اسے امان ہے۔ جو شخص اپنے گھر میں دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے گا، اسے بھی امان ہے۔ ہتھیار پھینک دینے والے کو بھی امان ہے۔ یہ سن کر لوگ اپنے اپنے گھروں اور مسجد حرام کی طرف بھاگے۔ البتہ اپنے کچھ اوباشوں کو لگا دیا اور کہا کہ ہم انھیں آگے کیے دیتے ہیں۔ اگر قریش کو کچھ کامیابی ہوئی تو ہم ان کے ساتھ ہو رہیں گے اور اگر ان پر ضرب لگی تو ہم سے جو کچھ مطالبہ کیا جائے گا، منظور کر لیں گے۔ قریش کے یہ اوباش عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو کی کمان میں خندمہ کی پہاڑی پر جمع ہوئے اور مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے لیے مورچے سنبھالنے لگے۔ مکے کا نشیبی (جنوبی) علاقہ مسلم دشمن عناصر سے بھرا تھا۔ اسے بھی اسلام دشمن سرپھروں نے اپنا مرکز بنا لیا۔

اسلامی لشکر ذی طویٰ میں

آنحضرت ﷺ نے ہر ممکن تدبیر اختیار فرمائی کہ معاملات جنگ کے بغیر طے ہو جائیں اور خون ریزی نہ ہو۔ ایک طرف مجاہد ہر طرح مقابلے کے لیے تیار تھے اور دوسری طرف اہل مکہ کو ہر طرح جان و مال کی ضمانت دی گئی، بشرطیکہ تلوار نہ اٹھائیں۔

مکہ معظمہ ایک ایسی وادی ہے جس کے چاروں طرف اونچے اونچے اور دشوار گزار پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ ایک بڑی تجارتی شاہراہ ہے، جو شہر کے درمیان سے گزرتی تھی۔ یہی شمال میں شام اور جنوب میں یمن کو ملاتی تھی۔ دو راستے شہر سے نکل کر شاہراہ سے جا ملتے تھے۔ ایک طریق حجون اور دوسرا طریق کداء۔

جب آنحضرت ﷺ مقام ذی طویٰ میں پہنچے اور یہ دیکھا کہ اہل مکہ کا خیال

مقابلے کا نہیں تو آپ نے اپنے فوجی دستوں کو ٹھہرنے کا حکم دے دیا اور اپنی سواری ہی پر سجدۂ شکر ادا کیا۔ اس ذات کے آگے سرِ تسلیم خم کیا، جس نے آپ ﷺ کے اور آپ کے پیروؤں کے لیے مکہ مکرمہ کے دروازے کھول دیئے تھے، تا کہ وہ امن و سکون سے اس میں داخل ہو جائیں۔ شہر مکہ میں داخل ہونے سے تھوڑی دیر پیشتر منادی نے آواز لگائی کہ مسلمان رک جائیں، حضورِ اکرم ﷺ نئے سرے سے فوج کو ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ یہی موقع تھا کہ بوقبیس کی پہاڑی پر ایک بوڑھے نے چڑھنا شروع کیا۔ بنی تیم کے یہ بزرگ آنکھوں سے نابینا تھے۔ ایک لڑکی نے ان کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جو ان کی پوتی تھی۔ عمر ایسی تھی کہ کمر سے جھک گئے تھے، لیکن ایک شوق تھا کہ کشاں کشاں پہاڑی پر لیے جا رہا تھا۔ اوپر پہنچے تو اس طرف جا کھڑے ہوئے جدھر منیٰ کی گھاٹی تھی۔ پوتی سے بولے: ''ہاں بیٹی، ذرا دیکھ کر بتانا، اب تیری آنکھوں کے آگے کیا منظر ہے؟''

پوتی نے دادا سے کہا: ''مجھے تو حدِ نظر تک انسانی سروں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ موج در موج انسانوں کا دریا دکھائی دیتا ہے۔''

مرد بزرگ نے کہا: ''ہزاروں ہی لوگ ہیں کیا۔ اور ہاں بیٹی، دیکھنا، کیا یہ سیدھے اسی طرف آ رہے ہیں۔''

پوتی نے کچھ دیر تک غور سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بولی: ''نہیں دادا ابا، اب تو یہ لوگ ایک جگہ رک گئے ہیں، ذی طویٰ کے پاس۔''

بزرگ نے پوچھا: ''بھلا یہ سیلاب کیوں رک گیا بیٹی؟''

پوتی نے بتایا: ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ادھر ادھر بٹ رہا ہے۔''

آنکھوں کے سامنے جو کچھ گزر رہا تھا۔ پوتی اپنے دادا سے بیان کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں آنحضرت ﷺ نے لشکر کے بائیں بازو کا سالار زبیرؓ بن العوام کو مقرر کر کے انھیں شمال کی جانب سے مکہ میں داخلے کا حکم دیا۔ دائیں بازو کا سالار خالدؓ بن ولید کو مقرر کیا گیا اور انھیں مکے کی جنوبی سمت سے، لیط کی جانب سے شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا گیا۔ قیس بن سعد بن عبادہؓ کو انصار کا سالار مقرر کر کے حکم دیا گیا کہ وہ مغربی گوشے سے شہر میں داخل ہوں۔ ابو عبیدہؓ بن جراح آپ ﷺ کے حکم سے مہاجرین کے سالار مقرر ہوئے اور انھیں یہ حکم دیا گیا کہ بالائی حصے سے کوہ ہند کے بالمقابل مکے میں داخل ہوں۔

اب لڑکی نے بتایا: ''چوتھا حصہ بھی چل پڑا، اذاخر کی طرف۔''

بزرگ نے پوچھا: ''غالباً فوج کی زیادہ تعداد اسی حصے میں ہے۔''

پوتی نے جواب دیا: ''ہاں۔''

''اور یہ لوگ ہماری طرف ہی آ رہے ہیں؟'' مرد بزرگ نے پوچھا۔ پھر کچھ سوچ کر انھوں نے کہا: ''کچھ پہچان سکتی ہو بیٹی، اس حصے کے سالار کون ہیں؟''

پوتی نے جواب دیا: ''نہیں۔''

بزرگ بولے: ''بیٹی مجھ سے سن لو۔ اسی حصے میں ابو بکر بھی ہوگا۔''

سچ دادا ابا! لڑکی نے بڑی خوشی سے پوچھا اور اس کی آنکھیں انھیں ڈھونڈنے لگیں۔ دادا کی بوڑھی آنکھوں نے بہت سے نشیب و فراز دیکھے تھے۔ اب اپنی نوعمر پوتی سے انھوں نے کہا: ''اس حصے کی کمان ایک ایسی ہستی کے ہاتھ میں ہے جس کی قدر و قیمت ہم نے ابھی نہیں پہچانی۔ آؤ، جلدی کرو۔ اب ہم یہاں سے اتر چلیں۔ یہ لوگ کوئی دم میں شہر میں داخل ہو جائیں گے۔''

پوتی اور دادا جلد از جلد گھر پہنچنے کی فکر میں لگ گئے۔ گھر میں داخل ہو کر وہ انتظار میں بیٹھ گئے۔ یہ ابو قحافہ تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کے والد۔ بیانوے چورانوے برس کی عمر تھی۔ ابھی ایمان نہ لائے تھے۔ اسی روز فتح مکہ کا حال سنا تو حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور ایمان لے آئے۔

ذی طویٰ کے مقام پر اسلامی لشکر چار حصوں میں بٹ کر چلا تو حضورِ اکرم ﷺ کی مصلحت یہ تھی کہ شرپسندوں میں سے کوئی بچ کر شہر کے باہر نہ نکل سکے، ورنہ ممکن تھا کہ عرب کے جنوبی حصے میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ یہ بڑا مدبرانہ فیصلہ تھا۔

اسلامی لشکر کے چاروں حصوں کو سختی سے حکم دے دیا گیا تھا کہ: ''کوئی بھی تلوار میان سے باہر نہ نکالے۔ مسلمان اس وقت تک لڑائی نہ کریں، جب تک کافروں کی طرف سے حملے کی ابتدا نہ ہو۔ بتا دیا گیا تھا کہ لڑائی کی صورت میں مکے کے بالائی حصے میں ابو سفیان کا مکان پناہ گاہ ہے۔ جو اس میں چلا جائے گا، مسلمان اس کا پیچھا نہ کریں گے۔ اسی طرح مکے کے جنوبی حصے میں حکیم بن حزامؓ کا گھر پناہ گاہ قرار دیا گیا۔ یہ مکان شاید ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کا آبائی مکان تھا۔

لشکر کے اگلے حصے پر ابو عبیدہؓ کو سالار بنا کر، حضرت زبیر بن عوامؓ سب سے پہلے نکلے۔ انھیں حکم تھا کہ مکہ کی مغربی سمت سے شہر میں داخل ہوں۔ انھیں یہ بھی حکم تھا کہ کداء کی طرف سے ہو کر حجون پہنچیں اور یہاں حضورِ اکرم ﷺ کا خاص جھنڈا نصب کر دیں۔ پھر اس وقت تک انتظار کرتے رہیں، جب تک حضور ﷺ خود بہ نفسِ نفیس وہاں نہ پہنچ جائیں۔

مکے کی بڑی سڑک ایک ہی تھی جو شمال سے جنوب کی طرف آتی تھی۔ اس پر کداء اور حجون کے راستے تھے۔ حضرت زبیرؓ نے ایک راستے سے انصار کو اور دوسرے راستے سے مہاجرین کو داخل کیا۔ اس طرح ایک تو وادیٔ فاطمہ کی طرف بھاگ کر ساحلِ سمندر پر پہنچنے کا راستہ کافروں پر بند ہو گیا۔ دوسری جانب یمن جانے والے راستے پر بھی مسلمانوں نے پہرہ بٹھا دیا۔ اب ان راستوں سے مشرکین مکہ کے لیے کوئی بھی مدد نہ آ سکتی تھی۔

انصار مغربی سمت سے جبل عمر کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے اور حضرت ابو عبیدہؓ مہاجرین کے ساتھ بالائی حصے سے آئے، جبل ہندی کے آگے سے۔

حضرت خالدؓ کو حکم تھا کہ شہر میں داخل ہو کر، اپنی فوج کے ساتھ مکے کے بالائی حصے کی طرف آ جائیں۔ یہیں مسلمانوں کا مرکزی اجتماع ہوگا۔

فوجوں کی تقسیم اور ان کے راستوں کی نگرانی کے لیے حضورِ اکرم ﷺ نے خاص انتظامات کیے تھے۔ اس غرض کے لیے آپ ﷺ نے ایک جداگانہ افسر مقرر

کیا تھا جسے اصطلاح میں وارع کہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے اس موقع پر ایک خاص شعار (کوڈ ورڈ) بھی مقرر کر دیا تھا، تاکہ اسلامی لشکر جو مختلف حصوں میں بٹ گیا تھا، قبیلہ اوس کے لیے ''یا بنی عبید اللہ'' اور قبیلہ خزرج کے لیے ''یا بنی عبد اللہ'' کا شناختی نعرہ مقرر کیا گیا تھا۔

خندمہ ایک پہاڑی کا نام ہے جو مکہ معظمہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔ اس کے آگے بوقبیس کا پہاڑ ہے۔ یہاں عکرمہ بن ابوجہل، مقیس، صفوان بن امیہ، سہیل بن عمرو (جس نے قریش کی طرف سے حدیبیہ کے معاہدے پر دستخط کیے تھے) وغیرہ جمع تھے اور قریش کے سرپھرے اوباشوں کی راہ نمائی کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو ابو سفیان کے فیصلے سے سخت اختلاف تھا اور یہ لوگ چاہتے تھے کہ ہر قیمت پر مسلمانوں کو مکے میں داخل ہونے سے روکا جائے۔

جماش بن قیس بن خالد بھی اس گروہ کے سرغنوں میں تھا۔ اس نے حضور ﷺ کے مکہ پہنچنے سے پہلے ہی ہتھیار جمع کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ڈھیر سارے ہتھیار دیکھ کر ایک مرتبہ اس کی بیوی نے پوچھا: ''تم اس قدر اسلحہ کیوں جمع کر رہے ہو؟''

اس نے جواب دیا: ''تجھے نہیں معلوم کہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔''

بیوی نے کہا: ''ان کا حملہ ہوگا تو پھر یہ تمھارے ہتھیار تو کسی کام نہ آئیں گے۔''

جماش نے سمجھ لیا کہ بیوی طنز کر رہی ہے۔ بولا: ''نیک بخت، ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ تیرے لیے بہت سے غلام پکڑ لائیں گے۔''

شرپسندوں کی اس جماعت میں حبشی نامی پہاڑی کے دامن میں رہنے والے تیر اندازوں کے علاوہ بنی بکر اور قبیلہ حارث کے لوگ بھی شریک تھے۔ یہ لوگ اپنی جارحانہ تیاریوں میں مشغول تھے کہ مسلمانوں میں سے دو آدمی ان کے قریب سے گزرے۔ یہ کرز بن جابر الفہری اور حبیش بن اشعر تھے۔ یہ دونوں اپنی جمعیت سے آگے آگے آ رہے تھے، بلکہ اس حد تک آگے تھے کہ ان سے بچھڑ گئے تھے۔ جب یہ لوگ عکرمہ اور اس کے ساتھیوں سے قریب ہوئے تو ان لوگوں نے بڑھ کر ان پر حملہ کر دیا۔ حبیشؓ ان کی زد میں تھے، مارے گئے، لیکن کرزؓ سینہ تان کر ڈٹ گئے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ کیا ہوگا۔ سوال ذات کا نہیں۔ سوال حق و باطل کا تھا۔ انھوں نے حبیشؓ کی لاش کو گھسیٹ کر چشم زدن میں اپنے پیروں میں کر لیا، تاکہ دشمن اس پر قبضہ نہ کر لیں، شاید یہ خیال ہو کہ حبیش کی لاش دشمن کے ہاتھ لگ گئی تو وہ لاش کی بے حرمتی کریں گے۔ کرزؓ بھی مردانہ وار مقابلہ کر کے اللہ کو پیارے ہوئے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ وہاں پہنچے تو دشمنوں نے ان پر تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ حضور نبی کریم ﷺ کا حکم تھا کہ دشمن کی طرف سے لڑائی میں پہل ہو تو ضرور مقابلہ کیا جائے۔ حضرت خالدؓ نے انھیں تلواروں کی نوک پر دھر لیا۔ خالدؓ ایک مشہور جرنیل، یہ اٹھائی گیرے، مقابلہ کیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بدبخت بھاگے اور ایسے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بھاگنے والوں میں آگے آگے وہی تھے جو لڑنے میں بھی پیش پیش تھے۔ ان میں سہیل بن عمرو، عکرمہ، صفوان بھاگے تو ایسے بھاگے کہ مکہ چھوڑ کر چلے گئے اور ساحل سمندر پر جدہ پہنچ کر فرار ہونے کی فکر میں لگ گئے۔

یہی تاریخ اسلام میں مشرکین مکہ سے آخری جھڑپ تھی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے غالب آ جانے کے بعد اگر مسلمان چاہتے تو مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ چُن چُن کر اپنے ایک ایک دشمن کو ختم کر دیتے، لیکن رحمتِ عالم ﷺ نے اپنے دشمنوں کی اس شر انگیز کوشش کو بھی معاف فرما دیا۔ اس موقع پر مشرکین کے تیرہ اور دوسری روایت کے مطابق اٹھائیس آدمی مارے گئے۔

جب حضورِ کریم ﷺ مہاجرین کے ساتھ اذاخر کی وادی سے مکے کے بالائی حصے میں داخل ہو رہے تھے تو آپ ﷺ نے بلندی سے نشیبی حصے کی طرف دیکھا۔ ادھر کچھ تلواروں کی چمک دکھائی دی تو آپ ﷺ کو بڑا افسوس ہوا۔ منشائے نبوی ﷺ یہ تھا کہ آج ایک قطرۂ خون بھی نہ بہنے پائے۔ فوری تحقیقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ابتدا مشرکین مکہ کی طرف سے ہوئی ہے۔ مسلمانوں نے صرف مدافعت کی ہے۔ اس پر ارشاد ہوا: ''جو کچھ اللہ کو منظور ہے، اسی میں بہتری ہے اور اسی میں مصلحت ہے۔''

دربارِ نبوت کا محکمہ اطلاعات پوری طرح مستعد تھا۔ فوراً ہر طرف کی خبریں آ گئیں۔ معلوم ہوا کہ ہر طرف امن ہے۔ مکہ کے جنوبی حصے میں بھی امن ہو گیا ہے اور حضرت خالدؓ کی کمال ہوشیاری سے معاملہ نبٹا کر لیط کی طرف سے مکے میں داخل ہو رہے ہیں۔

جبلِ ہندی کے سامنے نبی ﷺ کے لیے ایک خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ یہیں قریب ہی حضرت ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مزار تھے۔ بعض جاں نثاروں نے عرض کیا: ''اگر اجازت ہو تو آپ ﷺ کے آبائی دولت کدے میں آرام فرمانے کا اہتمام کیا جائے؟'' فرمایا: ''نہ میں اپنے آبائی گھر میں اترنا چاہتا ہوں، نہ میرے مہربانوں نے اسے میرے لیے باقی رہنے دیا ہے۔''

اس کے بعد آپ ﷺ اپنے مختصر سے خیمے میں تشریف لے گئے۔ دل بے حد خوش تھا۔ آپ ﷺ ہر سانس پر اللہ رحیم و کریم کا شکر بجا لا رہے تھے۔ اللہ عزوجل شکر ہے۔ وہی شہر جو میرے لیے رنج و محن کا گھر تھا، جس کے رہنے والوں کو ہجرت کرنی پڑی تھی، آج انھی بے کس اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ اس شہر میں عدیم المثال شان و شوکت کے ساتھ داخل فرمایا۔

ختمِ رسل ﷺ نے متشکر نگاہوں سے پہاڑی کی بلندی سے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو نظر شعب ابی طالب پر رکی۔ قریش مکہ سے مکمل مقاطعے کا زمانہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ یہاں سے نظر ہٹی تو ابوقبیس کی پہاڑی پر آ کر رکی۔ اسی پہاڑی کے غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی۔

ان اونچی نیچی پہاڑیوں کے دامن میں بیت اللہ پر نگاہ پڑی تو اللہ تعالیٰ کے احسانات و عنایات، رحمت و برکت کے تصورات سے دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو

اظہار تشکر کی صورت میں اس طرح برسنے لگے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ہو۔ لرزتے ہونٹوں پر دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی: ''بے شک، ہر کام کی ابتدا اور انتہا اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ واختیار میں ہے۔''

بت پرستی کا خاتمہ

آج جمعہ ہے۔ 20۔ رمضان 8 ہجری۔ 11۔ جنوری 630ء۔

نبی مکرم ﷺ نے اپنے خیمے میں تھوڑی دیر آرام فرمایا۔ پھر غسل کیا اور تیار ہو کر باہر تشریف لائے۔ باہر ہزاروں جاں نثار مؤدب اور خاموش کھڑے آپ ﷺ کا انتظار کر رہے تھے۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے خیمے کے قریب آپ ﷺ کی اونٹنی قصویٰ بٹھا رکھی تھی۔ اس پر حضور ﷺ سوار ہو گئے۔ حضرت محمد بن مسلمہؓ نے مہار تھام لی۔ اب سوئے کعبہ روانہ ہوئے۔ سواری ہی پر کعبے کے سات طواف فرمائے۔ اپنی خم دار دستے والی چھڑی کی نوک کو رکن یمانی سے چھو کر، چھڑی ہی کے ذریعے استلام کیا۔

آپ ﷺ نے طواف اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر فرمایا تھا اور حالت احرام میں نہ ہونے کی وجہ سے صرف طواف ہی پر اکتفا کیا تھا۔ تکمیل طواف کے بعد حضرت عثمانؓ بن طلحہ کو بلا کر ان سے کعبے کی کنجی لی۔ پھر آپ ﷺ کے حکم سے خانہ کعبہ کھولا گیا۔ کعبے میں داخل ہوئے تو آپ ﷺ نے کعبے کی دیواروں پر فرشتوں اور پیغمبروں کی تصاویر کندہ پائیں۔ آپ ﷺ نے حضرت ابراہیمؑ کی ایک تصویر دیکھی، جس کے ہاتھ میں جوئے اور فال کے تیر تھے۔ آپ ﷺ نے ایک کبوتر کی تصویر بھی دیکھی جو لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اسے اپنے ہاتھ سے توڑ کر زمین پر گرا دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی تصویر کو آپ ﷺ نے بغور دیکھا اور فرمایا: ''خدا انھیں غارت کرے۔ اس میں ہمارے جدِ اعلیٰ کو جوا کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بھلا حضرت ابراہیمؑ کو جوئے کے تیروں سے کیا تعلق؟ حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے نہ عیسائی، بلکہ آپ تو ایک راست باز مسلمان تھے۔ آپ ﷺ کا مشرکین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ فرشتوں کی تصویریں خوبصورت عورتوں کے مشابہ بنائی گئی تھیں۔ آپ ﷺ نے ان تصاویر کو بھی ناپسند فرمایا اور کہا کہ فرشتوں میں نر اور مادہ نہیں ہوتے۔ آپ ﷺ نے تمام تصاویر کے مٹا ڈالنے کا حکم صادر فرمایا۔ کعبے کے گرد وہ بت بھی تھے جن کی قریش عبادت کرتے تھے۔ یہ بت دیواروں سے مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھے۔ ہبل بھی کعبے کے اندر رکھا ہوا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک کمان تھی اور بیت اللہ کے گرد اور اس کی چھت پر تین سو ساٹھ بت تھے۔ آپ ﷺ اسی کمان سے ان بتوں کو ضرب مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا۝﴾ (الاسراء: ۸۱)

''حق آ گیا اور باطل چلا گیا۔ باطل جانے والی چیز ہے۔''

عام معافی کا اعلان

اس کے بعد آپ ﷺ نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ حضرت اسامہؓ اور بلالؓ بھی اندر ہی تھے۔ پھر دروازے کے مقابل کی دیوار کا رخ کیا۔ جب دیوار صرف تین ہاتھ کے فاصلے پر رہ گئی تو وہیں ٹھہر گئے۔ دو کھمبے آپ ﷺ کے بائیں جانب تھے۔ ایک کھمبا داہنے جانب اور تین کھمبے پیچھے (ان دنوں خانہ کعبہ میں چھ کھمبے تھے)۔ پھر وہیں آپ ﷺ نے نماز پڑھی۔ اس کے بعد بیت اللہ کے اندرونی حصے کا چکر لگایا۔ تمام گوشوں میں تکبیر و توحید کے کلمات کہے۔ پھر دروازہ کھول دیا۔ قریش سامنے مسجد حرام میں صفیں لگائے کھچا کھچ بھرے تھے۔ انھیں انتظار تھا کہ آپ ﷺ کیا کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے دروازے کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ قریش نیچے تھے۔ انھیں یوں مخاطب فرمایا:

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا سارے جتھوں کو شکست دی۔ سنو، بیت اللہ کی کلید برداری اور حاجیوں کو پانی پلانے کے علاوہ سارا اعزاز، یا کمال، یا خون میرے ان دونوں قدموں کے نیچے ہے۔ اے قریش کے لوگو! اللہ نے تم سے جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا پر فخر کا خاتمہ کر دیا۔ سارے لوگ آدمؑ سے ہیں اور آدمؑ مٹی سے۔

اس کے بعد سورۂ حجرات کی آیت 13 تلاوت فرمائی:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ۝﴾ (الحجرات: ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمھیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔''

اس کے بعد حضور کریم ﷺ نے فرمایا: ''قریش کے لوگو! تمھارا کیا خیال ہے۔ میں تمھارے ساتھ کیسا سلوک کرنے والا ہوں؟''

اہل مکہ کے وکیلِ حدیبیہ سہیل بن عمرو نے عرض کیا: ''آپ ﷺ ہمارے مشفق بھائی ہیں اور مشفق بھائی کے فرزند ہیں۔ ہمیں آپ ﷺ سے حسنِ سلوک ہی کی توقع ہے۔''

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو میں تم سے وہی بات کہہ رہا ہوں جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہی تھی کہ ((لا تثريب عليكم اليوم)) ''آج تم پر کوئی سرزنش نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔''

اذانِ بلالی

اب ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ کعبہ بتوں کی نجاست سے پاک وصاف ہو گیا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ بیت اللہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دیں۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ لوگوں نے آپ ﷺ کی امامت میں نماز پڑھی۔ اس دن سے آج تک چودہ صدیاں گزر جانے کے باوجود یہ سلسلہ جاری ہے۔ بلالؓ اور ان کے بعد بلالؓ کے جانشین دن میں پانچ مرتبہ مسجدِ حرام کی چھت پر اذان کہتے چلے آئے ہیں اور نمازیں برابر اسی سنت کے اتباع میں ہو رہی ہیں۔ دنیا بھر میں مسلمان اپنے دل و دماغ کو ذاتِ باری کی جانب متوجہ کر کے بیت اللہ کی طرف رخ

کرتے ہیں جسے آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے موقع پر بتوں کی نجاست سے ہمیشہ کے لیے پاک وصاف کیا تھا۔

اسی روز رسول کریم ﷺ ام ہانیؓ بنت ابی طالب کے گھر تشریف لے گئے۔ وہاں غسل فرمایا اور ان کے گھروں ہی میں آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ یہ چاشت کا وقت تھا۔ اس لیے کسی نے اسے چاشت کی نماز سمجھا اور کسی نے فتح کی نمازِ شکرانہ۔ ام ہانیؓ نے اپنے دو دیوروں کو پناہ دے رکھی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے ام ہانی، جسے تم نے پناہ دی۔ اسے ہم نے بھی پناہ دی۔ اس ارشاد کی وجہ یہ تھی کہ ام ہانیؓ کے بھائی حضرت علیؓ ان دونوں کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ام ہانیؓ نے ان دونوں کو چھپا کر گھر کا دروازہ بند کر رکھا تھا۔ جب حضور ﷺ تشریف لے گئے تو ان کے بارے میں سوال کیا اور مذکورہ جواب سے بہرہ ور ہوئیں۔

نا قابلِ معافی

مکہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمن تو سب ہی تھے، لیکن کچھ دشمن ایسے تھے جن کے جرائم بہت سنگین تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کے روز ایسے مجرموں کے خلاف سخت اقدام کا حکم دیا تھا۔ ایسے مجرموں کی تعداد میں مؤرخین کے مابین اختلاف رائے ہے۔ کوئی سولہ بتاتا ہے، کوئی چودہ، کوئی نو۔ بہرصورت یہاں ایسے مجرمین اور ان کے جرم کی نوعیت کا مختصر حال بیان کیا جاتا ہے:

عبداللہ بن خطل

نبی مکرم ﷺ نے حکم دیا کہ عبداللہ بن خطل جہاں بھی ملے، قتل کر دیا جائے۔ آپ ﷺ کو بتایا گیا کہ وہ تو کعبے کے پردوں سے لپٹا ہوا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، اسے وہیں قتل کر دیا جائے۔ وہ مرتد تھا۔ قاتل تھا اور اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی توہین کیا کرتا تھا۔ اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا تو رسول کریم ﷺ نے اسے عامل مقرر کر دیا اور صدقات وصول کرنے بھیجا۔ ایک صحابیؓ اور ایک غلام کو اس کے ہم راہ کر دیا۔ اس نے کھانا پکانے میں تاخیر پر غلام کو قتل کر دیا اور صدقے کے اونٹ اور مال لے کر مکہ بھاگ گیا تھا۔ وہاں وہ اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف شعر کہتا تھا اور اس کی لونڈیاں اس کے اشعار قریش کی مجلسوں میں بطور ہجو گایا کرتی تھیں۔ آنحضور ﷺ کے حکم پر حضرت سعدؓ بن حریث اور ابو برزہ اسلمیؓ نے اس دشمن اسلام کی گردن اڑا دی۔

قرتنی اور قریبہ

یہ دونوں عبداللہ بن خطل کی لونڈیاں تھیں۔ دونوں قریش کی مجلسوں میں ناچ گا کر اسلام اور رسول کریم ﷺ کے خلاف ہجویہ اشعار گایا کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک قتل کر دی گئی۔ دوسری نے امن اور معافی کی درخواست کی۔ رسول کریم ﷺ نے اسے معاف کر دیا۔ اس نے اسلام قبول کر لیا۔

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح

یہ حضرت عثمان بن عفانؓ کا رضاعی بھائی تھا، اور اسلام کے بعد مرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا تھا۔ فتح مکہ کے دن چھپ گیا۔ پھر حضرت عثمانؓ سے پناہ کی درخواست کی۔ حضرت عثمانؓ نے خدمتِ نبوی ﷺ میں لے جا کر جان بخشی کی سفارش کی اور آپ ﷺ نے اس کی جان بخشی فرماتے ہوئے اس کا اسلام قبول کر لیا، لیکن اس سے پہلے آپ ﷺ کچھ دیر تک اس امید میں خاموش رہے کہ کوئی صحابیؓ اٹھ کر اسے قتل کر دیں گے، کیوں کہ یہ شخص اس سے پہلے بھی ایک بار اسلام قبول کر چکا تھا اور ہجرت کر کے مدینہ آیا تھا، لیکن پھر مرتد ہو کر بھاگ گیا تھا۔ اب حضرت عثمانؓ کی درخواست پر آپ ﷺ نے ابی سرح سے بیعت لی، تو بعد میں حضور ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا: ''تم میں کوئی اتنا عاقل نہیں تھا کہ جب میں نے عبداللہ سے بیعت لینے سے توقف کیا اور ہاتھ روک لیا تھا تو اسے قتل کر دیتا۔''

صحابہؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ، آپ ہمیں اشارہ کر دیتے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کے نبی کے لیے اشارہ بازی زیبا نہیں'' (دوبارہ اسلام قبول کرنے کے بعد ابی سرح کا کردار عین اسلام کے مطابق رہا)

عکرمہ بن ابو جہل

عکرمہ کوہ خندمہ پر شکست کھا کر بھاگ گیا تھا۔ اس کی بیوی رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عکرمہ کے لیے معافی کی درخواست کی۔ رسول کریم ﷺ نے اسے امان دے دی۔ اس کی بیوی خوش خبری لے کر تلاش میں نکلی تو ساحل پر مل گیا۔ وہ یمن کے لیے کشتی پر سوار ہونے کو تھا۔ اس کی بیوی ام جمیل اسے ساتھ لے کر آئی۔ اس نے حضور ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی اور اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد اس کا کردار بھی عین اسلام کے مطابق رہا۔

ہبار بن اسود

رسولِ کریم ﷺ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ جب مکہ سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئی تھیں تو جن اوباشوں نے ان کا تعاقب کیا تھا، ان میں ہبار بھی تھا۔ اس نے اونٹ کو نیزہ مارا تو حضرت زینبؓ ہودج سے ایک چٹان پر جا گری تھیں اور ان کا حمل ضائع ہو گیا تھا اور وہ اسی مرض سے فوت ہو گئی تھیں۔ رسول اللہ نے اسے قتل کر دینے کا حکم دیا تھا اور وہ بھاگ کر کہیں چھپ گیا۔ رسولِ کریم ﷺ طائف سے واپس جعرانہ آئے تو ہبار آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مسلمان ہوا، اور اس کے اسلام کی کیفیت اچھی رہی۔

حویرث بن نقید

بدزبان شاعر تھا۔ داد کی خاطر رسولِ کریم ﷺ اور دینِ اسلام کے خلاف نظمیں لکھ کر گایا کرتا تھا۔ حضرت علیؓ نے اسے قتل کر دیا۔

سارہ

بنو ہاشم کی وہ باندی جو مدینہ میں رسولِ کریم ﷺ کی خدمت میں مدد کی درخواست لے کر حاضر ہوئی تھی اور آپ ﷺ نے اس کی مدد فرمائی تھی۔ واپسی پر حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہؓ کا خط قریش کے لیے بالوں میں چھپا کر لے جا رہی تھی

...نے اپنے رسول ﷺ کو اس کی خبر کر دی تھی اور حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ نے ...ن کی سلامتی کے وعدے پر اس سے وہ خط حاصل کر لیا تھا۔ سارہ کے بارے میں ...ایات میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ مسلمان ہوگئی تھی اور حضرت عمرؓ کے عہد ...فت تک زندہ تھی۔ بعض کے مطابق اسے بھی قتل کر دیا گیا تھا۔

...س بن صبابہ

یہ بھی مرتد اور قاتل تھا۔ ایک غزوے میں غلطی سے اس کا بھائی ایک انصاری کے ...وں مارا گیا تھا۔ مقیس نے اسلام کا دعویٰ کر کے اپنے بھائی کی دیت کا دعویٰ پیش کیا ...سولِ کریم ﷺ نے اس کے بھائی کی دیت ادا کر دی تھی۔ دیت وصول کرنے ...باوجود مقیس نے اس انصاری کو قتل کر دیا تھا اور مکہ بھاگ آیا تھا۔ فتح مکہ کے روز ...ار میں جاتا ہوا گرفتار ہوا اور مارا گیا۔

...ب بن زہیر

اللہ کے دین اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف شعر کہنے والوں میں کعب بن ...یر بھی تھا۔ اس کا بھائی مسلمان ہو گیا تو کعب اس کی مذمت میں بھی شعر کہنے لگا۔ اللہ ...رسول ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا تو وہ بھاگ گیا۔ اس کے بھائی نے اسے ...افی مانگنے کو لکھا تو وہ قبیلہ مزینہ کے ایک شخص کے پاس گیا جو اسے مدینہ لے آیا اور ...رت ابو بکر صدیقؓ سے درخواست کی کہ کعب کو معافی دلا دیں۔ صدیق اکبرؓ اسے ...ول اللہ کے پاس لے گئے اور کہا: ''یا رسول اللہ، کعب بیعت کے لیے حاضر ہوا ...ے۔'' رسول اللہ نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ بیعت کے بعد کعب بن زہیر نے ایک قصیدہ ...ش کیا جو ''بانت سعاد'' کے نام سے مشہور ہوا۔ رسول اللہ نے اسے اپنی چادر انعام ...ں عطا کی۔ کعب نے وہ چادر عمر بھر پاس رکھی۔ کہتے ہیں، اس کی وفات کے بعد وہ ...ادر امیر معاویہؓ نے بیس ہزار درہم میں اس کے وارثوں سے خرید لی تھی۔ ان کے بعد ...و بھی بادشاہ بنتا، اسے وہ چادر اوڑھائی جاتی تھی۔

...بداللہ بن زبعری

یہ بھی اللہ کے دین اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن شاعر تھا۔ فتح مکہ کے دن ...ھاگ گیا۔ کچھ عرصہ نجران میں رہا۔ پھر رسول کریم ﷺ کی خدمت میں پیش ہو کر اسلام قبول کیا۔

...ارث بن ہشام اور زہیر بن ابی اُمیہ

حارث بن ہشام ابو جہل کا بھائی تھا اور زہیر بن ابی امیہ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کا بھائی تھا۔ دونوں دینِ اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن تھے۔ حارث بدر کے میدان سے بھی بھاگ آیا تھا اور قریش کو ابو جہل کا انتقام لینے پر اکسایا کرتا تھا۔ فتح مکہ کے روز دونوں نے بھاگ کر امِ ہانی کے ہاں پناہ لی تھی۔ ام ہانی نے درخواست کی تو رسولِ کریم ﷺ نے ان دونوں کو پناہ دے دی۔ حضرت علیؓ انھیں قتل کرنا چاہتے تھے۔

ہبیرہ بن ابی وہب

یہ امِ ہانی کا شوہر تھا۔ شاعر تھا۔ اللہ کے دین اور رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخانہ شعر کہا کرتا تھا۔ فتح مکہ کے دن بھاگ کر نجران پہنچ گیا۔ نجران ہی میں کفر کی حالت میں مر گیا۔

صفوان بن اُمیہ

حضرت خالد بن ولیدؓ کے دستے کے مقابلے میں شکست کے بعد صفوان بھی بھاگ گیا تھا۔ اگرچہ اس کا خون رائیگاں نہیں قرار دیا گیا تھا، لیکن قریش کا ایک بڑا لیڈر ہونے کی حیثیت سے اسے اپنی جان کا خطرہ تھا، اسی لیے وہ بھی بھاگ گیا۔ اس کا چچا زاد عمیر بن وہب رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صفوان کے لیے امان طلب کی۔ آپ ﷺ نے امان دے دی اور علامت کے طور پر عمیرؓ کو اپنی وہ پگڑی بھی دے دی جو مکہ میں داخلے کے وقت آپ ﷺ نے سر پر باندھ رکھی تھی۔ عمیرؓ صفوان کے پاس پہنچے تو وہ جدہ سے یمن جانے کے لیے سمندر پر سوار ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔ عمیرؓ اسے واپس لے آئے۔ اس نے رسولِ کریم ﷺ سے کہا: ''مجھے دو مہینے کا اختیار دیجیے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''تمھیں چار مہینے کا اختیار ہے۔'' اس کے بعد صفوان نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کی بیوی پہلے ہی مسلمان ہو چکی تھی۔ آپ ﷺ نے دونوں کو پہلے نکاح ہی پر برقرار رکھا۔

فضالہ بن عمیر

وہ ایک جری آدمی تھا۔ جس وقت رسولِ کریم ﷺ طواف کر رہے تھے، وہ قتل کی نیت سے آپ ﷺ کے پاس آیا، لیکن رسولِ کریم ﷺ نے بتا دیا کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ اس پر وہ مسلمان ہو گیا۔

سہیل بن عمرو

خطیبِ قریش سہیل بن عمرو بھی حضرت خالدؓ بن ولید کے دستہ کا مقابلہ کرنے والوں میں تھا۔ شکست ہوئی تو بھاگ کر چھپ گیا۔ اس کا بیٹا عبداللہ مسلمان تھا جو بدر کے میدان میں مشرکین کے لشکر سے بھاگ کر اللہ کے لشکر میں شامل ہو گیا تھا، اس نے رسولِ کریم ﷺ سے اپنے باپ کے لیے امان کی درخواست کی تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس کے لیے امن ہے۔ اسے کہو، سامنے آئے چھپنے کی ضرورت نہیں۔''

عبداللہ اپنے باپ کو امن کی خبر دینے چلا گیا تو رسولِ کریم ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا: ''جو کوئی سہیل بن عمرو کو ملے، اسے کڑوی نظروں سے نہ دیکھے۔ زندگی کی قسم سہیل عاقل اور شریف ہے۔ ایسا شخص زیادہ عرصہ اسلام سے دور نہیں رہ سکتا۔''

عبداللہؓ نے اپنے باپ کو امن کی خبر دی تو اس نے کہا: ''بخدا، وہ چھوٹی عمر میں بھی احسان کرنے والے تھے اور بڑی عمر میں بھی احسان کرنے والے ہیں۔''

سہیل بن عمرو اپنے آبائی دین پر رہا۔ اس نے اللہ کے رسول ﷺ کے لشکر کے ساتھ غزوۂ حنین اور طائف میں شرکت کی۔

ابولہب کے بیٹے

نبی مکرم ﷺ نے اپنے چچا عباسؓ سے کہا: ''ابولہب کے بیٹے عتبہ اور معتب مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ تمھارے وہ دونوں بھتیجے کہاں ہیں؟''

حضرت عباسؓ نے عرض کیا: ''جو مشرک بھاگ گئے ہیں، وہ دونوں بھی ان کے ساتھ کہیں دور نکل گئے ہیں۔'' رسول اللہ نے فرمایا: ''ان دونوں کو میرے پاس لاؤ۔''

حضرت عباسؓ انھیں ڈھونڈنے نکل پڑے۔ وہ دونوں عرنہ میں مل گئے۔ عباسؓ ان دونوں کو مکہ لے آئے اور رسولِ کریم ﷺ کے حضور پیش کر دیا۔ رسول اللہ نے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ وہ دونوں بھائی مسلمان ہو گئے اور رسول ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ آپ ﷺ ان دونوں کے ہاتھ پکڑ کر بابِ کعبہ کے قریب ملتزم پر تشریف لے گئے اور دیر تک دعا مانگتے رہے۔ واپس آئے تو آپ ﷺ بہت خوش تھے۔

حضرت عباسؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، آپ کو اللہ ہمیشہ خوش رکھے۔ میں آپ ﷺ کا چہرہ مسرور دیکھتا ہوں۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں نے اپنے رب سے دعا کی تھی کہ وہ مجھے میرے چچا کے دونوں بیٹے عطا کر دے۔ اللہ نے میری دعا قبول کر لی اور یہ دونوں مجھے ہبہ کر دیئے ہیں۔''

دوسرے دن کا خطبہ

فتح مکہ کے روز تمام مسلمان رسولِ کریم ﷺ کے ساتھ عشاء سے فجر تک خانہ کعبہ میں تکبیر و تسبیح، تحمید و تحلیل اور طوافِ کعبہ میں مصروف رہے۔ دوسرے دن حضور ﷺ کی خدمت میں یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ قبیلہ خزاعہ کے آدمیوں نے انتقامی کارروائی کے طور پر بنی لیث کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ یہ خبر سنتے ہی آپ ﷺ قصویٰ پر سوار ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

''اب ہجرت نہیں رہی، لیکن جہاد باقی ہے۔ ہجرت کی نیت باقی رہے گی۔ جب تمھیں جہاد کے لیے بلایا جائے تو نکل کھڑے ہوا کرو۔ بے شک اللہ نے اس شہر کو اس دن سے حرمت دی ہے جس دن آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور وہ اللہ کی دی ہوئی حرمت کی وجہ سے قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ بے شک اللہ نے مکہ سے ہاتھی والوں کو روک دیا تھا، لیکن اللہ نے اپنے رسول ﷺ اور مسلمانوں کو اہلِ مکہ پر تسلط دے دیا۔ خبردار ہو جاؤ، نہ مجھ سے پہلے کبھی کسی کے لیے یہاں خون ریزی حلال ہوئی اور نہ میرے بعد کسی کے لیے حلال ہو گی۔ خبردار ہو جاؤ، میرے لیے بھی کچھ دیر کے لیے حلال ہوئی تھی۔ خبردار ہو جاؤ، اب اس گھڑی وہ بدستور قیامت تک کے لیے حرام ہے۔ نہ یہاں کا کانٹا توڑا جائے، نہ درخت کاٹا جائے۔ نہ شکار بھگایا جائے، اور نہ یہاں کی گری پڑی چیز اٹھائی جائے۔ البتہ اس کا اعلان کرنے والا اٹھا سکتا ہے۔ جس شخص کا کوئی عزیز قتل ہو جائے تو اسے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہے۔ خواہ بدلہ لے لے یا خوں بہا لے لے۔''

حضرت عباسؓ نے عرض کیا: ''اذخر گھاس کاٹنے کو مستثنیٰ فرما دیجیے، کیوں کہ وہ ہمارے گھروں، لوہاروں اور قبروں کے کام آتی ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر کے سکوت کے بعد فرمایا: ''مگر اذخر، اذخر۔''

خطاب ختم ہوا تو یمن کا ایک شخص ابوشاہ آگے بڑھا اور درخواست کی: ''یارسول اللہ، یہ خطبہ مجھے لکھوا دیجیے۔'' ارشاد ہوا: ''یہ خطبہ اسے لکھ کر دے دو۔''

اہلِ مکہ سے بیعت

جب اللہ تعالیٰ نے رسول کریم ﷺ اور مسلمانوں کو مکہ کی فتح عطا فرمادی تو اہلِ مکہ پر حق واضح ہو گیا اور وہ جان گئے کہ اسلام کے سوا کامیابی کی کوئی راہ نہیں اس لیے وہ اسلام کے تابع فرمان بنتے ہوئے بیعت کے لیے جمع ہو گئے۔ رسول کریم ﷺ نے صفا پر بیٹھ کر لوگوں سے بیعت لینی شروع کی۔ حضرت عمرؓ آپ کے نیچے تھے اور لوگوں سے عہد و پیمان لے رہے تھے۔ لوگوں نے حضور ﷺ سے بیعت کی کہ جہاں تک ہو سکے گا، آپ ﷺ کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔

جب نبی کریم ﷺ مردوں کی بیعت سے فارغ ہو چکے تو وہیں صفا پر عورتوں سے بیعت لینی شروع کی۔ حضرت عمرؓ آپ ﷺ سے نیچے بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کے حکم پر عورتوں سے بیعت لے رہے تھے اور انھیں آپ ﷺ کی باتیں پہنچا رہے تھے۔ اسی دوران میں ابوسفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ بھیس بدل کر آئی۔ دراصل حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ اس نے جو حرکت کی تھی، اس کی وجہ سے خوف زدہ تھی کہ کہیں رسول اللہ اسے پہچان نہ لیں۔ ادھر رسولِ کریم ﷺ نے بیعت شروع کی تو فرمایا: ''میں تم سے اس بات پر بیعت لیتا ہوں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گی۔'' حضرت عمرؓ نے یہی بات دہراتے ہوئے عورتوں سے اس بات پر بیعت لی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی۔ پھر رسول اللہ نے فرمایا، اور چوری نہ کرو گی۔ اس پر ہندہ بول اٹھی: ''ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔ اگر میں اس کے مال میں سے کچھ لے لوں تو؟'' ابوسفیان نے، جو وہیں موجود تھے، کہا: ''تم جو کچھ لے لو، وہ تمھارے لیے حلال ہے۔'' رسول اللہ مسکرانے لگے۔ آپ ﷺ نے ہندہ کو پہچان لیا تھا۔ فرمایا: ''اچھا تو تم ہو ہندہ۔'' وہ بولی: ''ہاں، اے اللہ کے نبی، جو کچھ گزر چکا، اسے معاف فرما دیجیے۔ اللہ آپ کو معاف فرمائے۔''

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: ''اور زنا نہ کرو گی۔'' اس پر ہندہ نے کہا: ''بھلا کہیں حرۃ (آزاد عورت) بھی زنا کرتی ہے؟'' پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ''اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی۔'' ہندہ نے کہا: ''ہم نے تو بچپن میں انھیں پالا پوسا، لیکن بڑے ہونے پر آپ لوگوں نے انھیں قتل کر دیا۔ اس لیے آپ ﷺ اور وہ ہی بہتر جانیں۔'' یاد رہے کہ ہندہ کا بیٹا حنظلہ بن ابی سفیان بدر کے دن قتل کیا گیا تھا۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ بہت ہنسے اور رسول اللہ نے بھی تبسم فرمایا۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: ''اور کوئی بہتان نہ گھڑو گی۔'' ہندہ نے کہا: ''واللہ، بہتان بڑی بری بات ہے اور آپ ﷺ ہمیں واقعی رشد اور مکارمِ اخلاق کا حکم دیتے ہیں۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اور کسی معروف بات میں رسول ﷺ کی نافرمانی نہ کرو گی۔'' ہندہ نے کہا: ''خدا کی قسم، ہم اپنی اس مجلس میں اپنے دل کے اندر یہ بات لے کر نہیں بیٹھی ہیں کہ آپ ﷺ کی نافرمانی بھی کریں گی۔''

اس کے بعد حضرت عمرؓ کو حکم ہوا کہ بقیہ عورتوں سے بیعت لیں۔ بیعت کے

یہ تھے: ''اللہ تعالیٰ کا کسی کو شریک نہ بناؤ گی۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی۔ چوری اور کرو گی۔'' ہندہ نے واپس ہو کر اپنا بت توڑ دیا۔ وہ اسے توڑتی جا رہی تھی اور کہتی جا تھی: ''ہم تیرے متعلق دھوکے میں تھے۔''

مکہ میں رسول اللہ ﷺ نے انیس روز قیام فرمایا۔ اس دوران میں ﷺ شعائرِ اسلام کی تجدید کرتے رہے اور لوگوں کو ہدایت و تقویٰ کی تلقین تے رہے۔ انھی دنوں آپ ﷺ کے حکم سے حضرت ابو اسیدؓ خزاعی نے نئے ے سے حدودِ حرم کے کھمبے نصب کیے۔ آپ ﷺ نے اسلام کی دعوت اور مکہ کے پاس بتوں کو توڑنے کے لیے متعدد سرایا بھی روانہ کیے اور اس طرح سارے بت ڈالے گئے۔ آپ ﷺ کے منادی نے مکے میں اعلان کیا کہ جو شخص اللہ اور ت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، وہ اپنے گھر میں کوئی بت نہ چھوڑے بلکہ اسے ڈالے۔

یہ خالدؓ بن ولید

فتح مکہ سے یکسو ہو جانے کے بعد رسول کریم ﷺ نے مکہ سے باہر کے بتوں انہدام کا اہتمام فرمایا۔ چنانچہ لات، منات اور عزیٰ وغیرہ کو منہدم کرنے کے لیے ور ﷺ نے آدمی بھیجے۔ حضور ﷺ کے حکم سے مکہ کے گلی کوچوں میں یہ منادی دی گئی کہ جو شخص اللہ واحد اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، وہ اپنے گھر میں کوئی بت نہ نے دے۔

نخلہ میں عرب کی نامی اور مشہور دیوی عُزیٰ کا صنم خانہ تھا۔ حضور ﷺ نے رت خالدؓ کو تیس سواروں کے ساتھ عُزیٰ کو منہدم کرنے کے لیے بھیجا۔ حضرت خالدؓ ب یہ کام پورا کر کے واپس آئے تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ تم نے وہاں کچھ یکھا۔ حضرت خالدؓ نے عرض کیا، نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تب تو صنم خانہ ابھی نہدم نہیں ہوا ہے۔ جاؤ اسے پھر منہدم کرو۔ حضرت خالدؓ غصے میں ننگی تلوار لیے وہاں پہنچے تو ایک بکھرے بالوں والی سیاہ فام برہنہ عورت نکلی۔ صنم خانے کا خادم شور مچانے گا۔ حضرت خالدؓ نے عورت کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس واقعے کی خبر دی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں یہ عزیٰ تھی اور اب تمھارے ملک میں اس کی پرستش نہ ہوگی۔''

سریہ عمرو بن العاصؓ

25۔ رمضان ہی کو آنحضور ﷺ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو قبیلہ ہذیل کا مشہور بت سواع منہدم کرنے کے لیے بھیجا۔ جب یہ وہاں پہنچے تو صنم خانے کے خادم نے کہا کہ اگر اسے منہدم کیا گیا تو یہ مزاحمت کرے گا۔ حضرت عمر بن العاصؓ نے خادم کی اس بات پر بڑا افسوس کیا اور پھر بت کے قریب جا کر اسے پاش پاش کر دیا۔ آپ کے ساتھیوں نے بیت خزانہ کو گرایا، مگر وہاں سے کچھ نہ ملا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے خادم سے کہا کہ کیا تم نے بت کا ٹکڑے ٹکڑے ہونا دیکھ لیا؟ اس نے کہا، ہاں بے شک۔ اور پھر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

سریہ سعد بن زید اشہلیؓ

آنحضرت نے حضرت سعد بن زید اشہلیؓ کو اگلے روز 26 رمضان کو مشہور بت منات ڈھانے کے لیے بھیجا۔ یہ بت قبائل اوس، خزرج اور غسان کا معبود تھا۔ اس بت کا صنم خانہ قدید (کدید) کے قریب تھا۔ حضرت سعدؓ کے ساتھ بیس سوار تھے۔ جب آپ وہاں پہنچے تو صنم خانے کے خادم نے آنے کی وجہ پوچھی۔ آپ نے کہا کہ میں منات کو منہدم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ خادم نے کہا: ''تم جانو اور وہ۔'' حضرت سعدؓ منات کو ڈھانے کے لیے بڑھے تو ایک برہنہ عورت، جس کے بال بکھرے ہوئے تھے، سینہ کوبی کرتی ہوئی نکلی۔ خادم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''منات، یہ تیرے نافرمان بندے ہیں۔'' حضرت سعدؓ نے آگے بڑھ کر عورت کو قتل اور منات کو منہدم کر دیا۔

سریہ خالد بن ولیدؓ

آئندہ ماہ شوال کے آغاز میں، عُزیٰ کے انہدام کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو تین سو پچاس مہاجر و انصار اور بنی سلیم کے ساتھ دعوت اسلام کے لیے بنی جذیمہ کی طرف بھیجا۔ مقاتلہ کا انھیں حکم نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر ان لوگوں سے حضرت خالدؓ نے پوچھا کہ تم لوگ کیا ہو، کون ہو؟ وہ لوگ صاف طور پر یہ بیان نہ کر سکے کہ وہ مسلمان ہیں، بلکہ یہ کہا کہ وہ صابی ہیں۔ یہ اس لیے کہ جو شخص مسلمان ہوتا؛ قریش اسے صابی کہتے تھے۔ بہر کیف حضرت خالدؓ نے انھیں قتل کیا اور جو باقی رہے، انھیں گرفتار کر کے اپنے لوگوں میں حفاظت کے لیے بانٹ دیا۔ دوسرے دن آپ نے قیدیوں کے قتل کا حکم دیا۔ انصار و مہاجرین نے قیدیوں کو قتل نہ کیا، بلکہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے، مگر بنی سلیم نے حضرت خالدؓ کے حکم کی تعمیل میں اپنی نگرانی میں دیئے گئے قیدیوں کو قتل کر دیا۔

آنحضرت ﷺ کو جب حقیقتِ حال کا علم ہوا تو بے چین ہو گئے اور فرمایا: ''خداوندا، میں اس سے بری ہوں جو خالدؓ نے کیا۔ خداوندا، میں اس سے بری ہوں جو خالد نے کیا۔''

اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر بنی جذیمہ کے مقتولوں کی دیت ادا کی اور جن لوگوں کا مال ضائع ہوا تھا، ان کے نقصان کی تلافی کی۔ اس معاملے میں حضرت خالدؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے درمیان کچھ سخت کلامی اور کشیدگی ہو گئی تھی۔ اس کی خبر رسول اللہ کو ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''خالد! ٹھہر جاؤ۔ میرے رفقا کو کچھ کہنے سے باز رہو۔ خدا کی قسم، اگر اُحد پہاڑ سونا ہو جائے اور وہ سارا کا سارا تم اللہ کی راہ میں خرچ کر دو، تب بھی میرے رفقا میں سے کسی ایک آدمی کی ایک صبح کی عبادت یا ایک شام کی عبادت کو نہیں پہنچ سکتے۔''

فتح مکہ کے اسباق

میجر جنرل محمد اکبر خان نے اپنی تصنیف ''حدیث دفاع'' میں فتح مکہ کے سلسلے میں چند اسباق کی طرف توجہ دلائی۔ وہ لکھتے ہیں کہ: ''آنحضرت ﷺ نے آج سے

ساڑھے تیرہ سو سال پہلے دفاعی سیاست پر اس طرح عمل فرمایا کہ عقل حیران ہے۔
آپ ﷺ نے پہلے قریش کو میدان جنگ میں شکست دی۔ پھر قریش کے معاونین کو ان سے الگ کیا۔ صلح حدیبیہ کے ذریعے ان کا رہا سہا وقار ختم کر دیا۔ اس کے بعد مکے کی فتح پکے ہوئے پھل کی مانند ہو گئی جو ذرا سی جنبش سے گود میں آ گرا۔ مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے قریش کو تباہ نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے انھیں ذلیل و خوار نہیں کیا، بلکہ چند افراد کے سوا سب کو فوراً آزاد کر دیا۔ نہ کسی کی جان اور آبرو سے تعارض کیا نہ مال سے، اور یہ اس لیے کہ آپ ﷺ کا مقصد اصلاح و تعمیر تھا نہ کہ تخریب و انتقام۔ آپ ﷺ ان کو محافظ مکہ رکھنا چاہتے تھے اور ان سے دوسرے کام لینے والے تھے۔ اگر انھیں اس درجہ گرایا جاتا کہ اسلامی معاشرے پر بوجھ بن جاتے تو فتح بجائے رحمت کے، مصیبت بن جاتی۔ مگر آپ ﷺ نے اس طرح کام کیا کہ سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹی۔

دشمن کو کم زور کرنے کے تین طریقے ہیں:

1- مادی نقصان پہنچا کر اس کی ہمت کو پست کرنا۔
2- اخلاقی طور پر شکست دینا۔
3- ذہنی شکست دینا۔

ان تینوں میں سب سے کم اہمیت کی چیز مادی نقصان ہے۔ اس کم زوری کو یا تو دشمن خود موقع پا کر پورا کر لیتا ہے یا اس کے اتحادی اپنے مفادات کو مدِ نظر رکھ کر اسے تباہ ہونے سے بچا لیتے ہیں۔ مالی و مادی شکست کے مقابلے میں اخلاقی شکست کہیں زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ نپولین نے اسے ایک اور تین کی نسبت سے تعبیر کیا ہے۔ مالی اور مادی نقصان کی جلد یا بدیر تلافی ہو سکتی ہے، مگر اخلاقی شکست کی تلافی ناممکن ہے۔ مگر ذہنی شکست سب سے زیادہ مہلک ہے۔ جب ذہنی شکست طاری ہو جاتی ہے تو پھر زندگی نہیں رہتی۔

آنحضرت ﷺ نے دشمن کو پہلے بدر میں مالی شکست دی۔ پھر جنگِ خندق میں اخلاقی شکست دی اور صلح حدیبیہ میں ذہنی شکست دے کر بالکل مجبور و بے بس بنا دیا۔
صلح حدیبیہ نے کفار کو مسلمانوں کے ساتھ ملنے جلنے، اسلام، پیغمبرِ اسلام اور مسلمانوں کے سمجھنے، ان کے اخلاق و کردار کو جاننے اور خوب و زشت میں امتیاز کرنے کا موقع دیا اور اس سے مکے کی فتح آسان ہو گئی۔

ممکن ہے، بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ جب آنحضرت ﷺ کو مکے کی فتح کا یقین تھا تو آپ ﷺ نے اتنے زبردست پیمانے پر جنگی تیاری کیوں کی اور اتنا بڑا لشکر لے کر کیوں گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اہل مکہ کو کم سے کم نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ اگر وہ کمتر تیاری اور کم تر تعداد فوج کے ساتھ جاتے تو قریش جنگ کیے بغیر نہ رہتے اور اس جنگ میں جانی و مالی دونوں قسم کے نقصان ہوتے اور اس کے بعد ان کی مزاحمت ختم ہوتی، لیکن عظیم الشان لشکر کو دیکھ کر قریش اور ان کے حلیفوں کے اوسان جاتے رہے اور ذہنی شکست ایسی طاری ہوئی کہ مقابلے کی ہمت نہ رہی۔ گویا فتح مکہ کے وقت آنحضور ﷺ کی حیثیت اس جراح کی سی تھی جو آپریشن سے پہلے یہ یقین کر لیتا ہے کہ اوزار درست ہیں، آپریشن کا موقع ٹھیک ہے اور مریض آپریشن کے لیے تیار ہے۔ ایسے موقعے پر عموماً بے ہوشی کی دوا سنگھا دی جاتی ہے۔ مکہ میں آنحضرت ﷺ جراح یا سرجن تھے۔ اہل مکہ مریض اور اسلامی لشکر کے دستے، جنھیں مختلف سمتوں سے شہر میں داخل ہونے کے لیے روانہ کیا گیا، بے ہوش کرنے والی دوا تھے، جنھوں نے مریض یعنی مکے والوں کو بے حس و حرکت بنا دیا۔

قابل جرنیل وہ ہے جو اپنی فوج کا کم سے کم نقصان کر کے دشمن پر زیادہ سے زیادہ گہرا اثر قائم کرے۔ فتح مکہ تاریخ عالم میں اس عسکری قابلیت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ آنحضرت ﷺ دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ قابل جرنیل۔"

فتح مکہ کے نتائج

قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری رحمہ اللہ نے فتح مکہ کے نتائج پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے: "فتح مکہ کے بعد (جو صلح اور معافی سے ہزار درجہ بڑھ کر ہے) اسلام لانے والوں کی تعداد کثیر ہو گئی تھی۔ اس کے چند اسباب یہ ہیں:

1- بہت سے قبائل اسلام سے اس لیے رکے ہوئے تھے کہ وہ قریش کے مقابلے میں بہت کم زور تھے، مگر ان کے تعلقات یا رشتہ داری قریش کے ساتھ وابستہ تھی اور ان کا خیال تھا کہ اسلام لانے سے وہ تعلقات بھی منقطع ہو جائیں گے اور لوگ قریش کے غیظ و غضب کے مورد بھی بن جائیں گے۔
2- بہت سے قبائل کی رائے تھی کہ مسلمانوں کا مکہ پر قابض ہو جانا ہی صحیح نشان ان کی صداقت کا اور مقبولِ خدا ہونے کا ہو سکتا ہے، کیوں کہ سیکڑوں سال سے قدیم روایات ان میں چلی آتی تھیں، کہ مکہ پر کوئی ایسا شخص فتح نہیں پا سکتا، جس کے ساتھ رب العالمین کی نصرت و تائید نہ ہو۔ صحیح بخاری میں عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "وہ قبائل کہا کرتے تھے کہ اسے اپنی قوم سے سلجھ لینے دو۔ اگر وہ اپنی قوم پر غالب آ گیا تو ضرور سچا نبی ہے۔"
3- ہنوز مختلف قبائل میں بیسیوں بوڑھے ایسے موجود تھے، جنھوں نے فاتح ابرہہ حبشی کے چالیس ہزار لشکر جرار کو مکہ پر حملہ آور ہوتے دیکھا تھا۔ اس لشکر میں ہاتھی بھی تھے اور ابرہہ کی خاص سواری کا ہاتھی محمود ہاتھیوں کی ایک عظیم الجثہ نسل سے تھی جو اب دنیا سے ناپید ہو گئی ہے۔ انگریزی زبان میں اس نسل کا نام namatl ہے۔ عربوں نے اسی کو معرب کر کے محمود بنا لیا ہے۔ نسل کا تھا۔
ان بوڑھوں نے اپنی آنکھ سے آج سے ساٹھ برس پیشتر ان حبشیوں کو مکہ پر حملہ کرتے بھی دیکھا تھا اور یہ بھی دیکھا تھا کہ اہل مکہ ان کے ڈر سے گھر بار کو چھوڑ کر پہاڑیوں کی چوٹیوں پر جا رہے تھے اور شہر میں ایک بھی حملہ آور فوج کا مقابلہ کرنے والا نہ رہ گیا تھا۔ بایں ہمہ انھوں نے دیکھا تھا کہ فوج خستہ و برباد ہوئی اور فوج کا سردار بحال تباہ و خراب ایسی حالت میں بھاگا کہ نہ فوج ساتھ تھی نہ ہاتھی، بلکہ سب کی لاشے مکہ سے چار کوس پرے سڑ رہے تھے۔

ان بوڑھوں کو اب تک عبدمناف اور ابرہہ کی گفت وکلام بھی یاد تھی کہ جب ابرہہ لشکر مکہ کی سرحد پر آ اترا تو انھوں نے اہل مکہ کے مویشی، جو جنگل میں چر رہے تھے، [پکڑ] لیے۔ ان میں عبدمناف کے بھی سو اونٹ تھے۔ عبدمناف ہمارے نبی ﷺ کے [دادا] تھے اور اس وقت مکہ کے سردار وہی تھے۔ خوب لمبے چوڑے، سرخ وسفید، شکل سے [شوکت] ورعب برستا تھا۔ یہ خود حبشیوں کے لشکر میں گئے اور سردار فیل خانہ کی وساطت سے ابرہہ کو ملے۔ اس نے تعظیم دی۔ برابر بٹھایا اور پوچھا، کس طرح تشریف لائے۔ عبدمناف نے کہا، ہمارے مویشی آپ کی فوج نے پکڑ لیے ہیں۔ براہ مہربانی ان کے چھوڑ دینے کا حکم دیجیے۔

ابرہہ بولا: ''جب آپ آئے تھے تو میرے دل میں آپ کی بڑی وقعت پیدا ہوئی تھی، لیکن آپ کی باتیں سن کر اب نہ وہ وقعت قائم رہی نہ عزت۔''

عبدمناف نے پوچھا: ''یہ کیوں؟''

ابرہہ بولا: ''دیکھو، میں اس لیے آیا ہوں کہ تمھارے اس عبادت خانے کو گرا دوں، جسے تم سب سے زیادہ مقدس مکان سمجھتے ہو، اور جس کے سامنے میرے تعمیر کردہ کلیسا کی وقعت وعزت عرب کی نگاہ میں اب تک کچھ بھی نہیں ہوئی۔ تم اپنے اس مقدس مکان کے بچاؤ کا ذرا بھی ذکر نہیں کرتے اور اپنے مویشیوں کو اس سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہو۔''

عبدمناف نے کہا: ''نہیں۔ میں مویشیوں کو اس سے بڑھ کر نہیں سمجھتا۔ بات یہ ہے کہ میں مویشیوں کا مالک ہوں اور مجھے ان کی فکر ہے۔ اور اس گھر کا مالک ایک اور ہے۔ اسے اپنے گھر کا خود ہی خیال ہوگا۔ مجھے اس کی فکر کی ضرورت نہیں۔''

الغرض جب مکہ پر مسلمانوں کا ایسی کامیابی اور آسانی کے ساتھ قبضہ ہوا تو اسلام لانے والوں کے سامنے سے معاہدات کی روک اٹھ گئی۔ قریش کا دباؤ اور رعب بھی جاتا رہا اور مسلمانوں کا مقبول خدا ہونا بھی انھوں نے اپنے مقرر کردہ معیار کے موافق دیکھ لیا، اور ان وجوہات سے اسلام لانے والوں کی اکثریت ہوگئی۔

4- سب سے آخری اور چوتھی وجہ یہ ہے کہ اب اسلام کی حقیقت کے سمجھانے اور اسلام کی تبلیغ کرنے میں واعظین اسلام کے سامنے کوئی روک ٹوک اور دقت باقی نہ رہی تھی۔ واعظ آزادی سے منادی کرتے تھے۔ سامعین آزادی واطمینان سے وعظ سنتے تھے، اور اسلام کی کشش کامل لوگوں کو اپنی جانب خود بخود کھینچ لیتی تھی۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری اپنی تصنیف ''الرحیق المختوم'' میں فتح مکہ کا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں: ''اس فیصلہ کن غزوے نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور ان پر پڑا ہوا وہ آخری پردہ ہٹا دیا جو قبول اسلام کی راہ میں روک بنا ہوا تھا۔ فتح مکہ کے بعد پورے جزیرۃ العرب کے سیاسی اور دینی افق پر مسلمانوں کا سورج چمک رہا تھا اور اب دینی سربراہی اور دنیوی قیادت کی زمام ان کے ہاتھ میں آچکی تھی۔

''گویا صلح حدیبیہ کے بعد جو مسلمانوں کے حق میں مفید تغیر شروع ہوا تھا، اس فتح کے ذریعے مکمل اور تمام ہوگیا، اور اس کے بعد ایک دوسرا دور شروع ہوا جو پورے طور پر مسلمانوں کے حق میں تھا اور جس میں پوری صورت حال مسلمانوں کے قابو میں تھی، اور عرب اقوام کے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ وفود کی شکل میں رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کرلیں، اور آپ ﷺ کی دعوت لے کر چار دانگ عالم میں پھیل جائیں۔ اگلے دو برسوں میں اس کی تیاری کی گئی۔''

غزوۂ حنین

فتح مکہ کے بعد مسلمانوں نے مکہ میں دس دن قیام کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ انیس روز رہے۔ رسول کریم ﷺ نے معاذ بن جبلؓ کو اہل مکہ کے لیے اپنا نائب مقرر کیا۔ انھیں لوگوں کو دین کی باتیں بتانے اور قرآن سکھانے کا حکم دیا۔ اکیس سالہ عتاب بن اسیدؓ کو مکے کا والی مقرر فرمایا اور ان کا روزینہ ایک درہم قرار پایا۔ اس انتظام کے بعد بارہ ہزار اہل ایمان کے ساتھ رسول کریم ﷺ نے حنین کی جانب پیش قدمی کی، جہاں بنی ہوازن مسلمانوں سے مقابلے کے لیے جمع ہو رہے تھے۔

فتح مکہ کے بعد جہاں دیگر قبائل کو اسلام کی حقانیت کا یقین ہوگیا اور وہ اس کے دامن حفظ وامان میں پناہ ڈھونڈنے لگے، وہاں قبائل ہوازن وثقیف کا حسد اور بڑھ گیا اور وہ اپنی مشترکہ طاقت سے اسلام کو مٹانے کی فکر کرنے لگے۔ جب رسول کریم ﷺ کی مدینہ سے روانگی کی خبر انھیں ملی تو انھوں نے سمجھا کہ حملے کا رخ ان کی طرف ہے۔ چنانچہ وہ لڑائی کے لیے تیار ہوگئے، مگر جب مکہ فتح ہوا اور ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا تو انھوں نے اس تیاری کو کارآمد بنانے اور مسلمانوں کے متوقع حملے کے تدارک کے لیے آگے بڑھ کر مسلمانوں پر خود حملہ آور ہونے کا منصوبہ بنایا۔ قبیلہ ہوازن کا سردار مالک بن عوف نصری تھا۔ اس کی آواز پر قبیلہ ہوازن وثقیف کی تمام شاخوں کے لوگ جمع ہوگئے، البتہ بنی کعب اور بنی کلاب نے شرکت نہیں کی۔

غزوۂ حنین اور غزوۂ ہوازن ایک ہی غزوے کے نام ہیں۔ ہوازن کہاں واقع تھا؟ اس کا محل وقوع عموماً مکہ اور طائف کے درمیان سمجھا جاتا تھا اور اسی مناسبت سے وادی اوطاس بھی اسی جانب تلاش کی جاتی رہی ہے جو درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کے صحیح محل وقوع کا پتا چلانے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ خیال ہے کہ یہ غزوہ جبل اوطاس کی پرپیچ وادیوں میں ہوا۔ جبل اوطاس طائف کے شمال مشرق میں کوئی تیس چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

ہوازن وہ قبیلہ ہے جس کی شاخ بنو سعد بن بکر ہے، جس میں رسول کریم ﷺ کا بچپن گزرا۔ یہ لوگ مکہ کی مشرقی پہاڑیوں کے ڈھلوان پر آباد تھے جو مکہ سے تین دن کی مسافت پر تھا۔ عکاظ کا مشہور بازار ہوازن کی بستی سے زیادہ دور نہ تھا۔ سیرت کی کتابوں میں ننھے حضور ﷺ کے اپنی رضاعی ماں حضرت حلیمہؓ سعدیہ کے ساتھ عکاظ کے میلے میں جانے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ وہ بستی جہاں حضرت حلیمہؓ کا قیام تھا، آج بھی آباد ہے۔ (بحوالہ سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ تصنیف شاہ مصباح الدین شکیل)

ہوازن کا قبیلہ سرکشی، دلیری اور بہادری کے اعتبار سے نام ور تھا۔ اس کا تیر اندازی اور تیر افگنی کا دُور دُور تک شہرہ تھا۔ ہوازن کے سردار مالک بن عوف

نے بنی ہوازن اور بنی ثقیف کو جمع کیا۔ بنی نصر اور بنی جشم بھی ان میں شامل ہو گئے۔ بنی کعب اور بنی کلاب کے سوا کوئی قبیلہ پیچھے نہ رہا۔ بنی جشم میں درید بن صمہ بھی تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہو چکا تھا، اور اس قابل نہ تھا کہ لڑائی میں حصہ لے، لیکن چوں کہ سال ہا سال تک اس کی عمر جنگ کے میدانوں میں گزری تھی، اس لیے وہ اپنے تجربے کی بنا پر مفید رائے دے سکتا تھا۔ یہ سب قبائل اپنے اہل وعیال اور مال و دولت کے ساتھ جمع ہو گئے۔ (جب وہ اوطاس کے میدان میں جا کر اترے تو ان کا اجتماع پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ جب درید نے اونٹوں کے بلبلانے، گدھوں کے رینگنے، بچوں کے چیخنے اور بکریوں کے ممیانے کی آوازیں سنیں تو اس نے مالک بن عوف سے پوچھا: ''جنگجو اپنے مال مویشی اور اہل وعیال کو کس لیے ہم راہ لائے ہیں؟''

مالک نے جواب دیا: ''یہ اس لیے کہ جنگجو بہادروں کو غیرت وحمیت دلائی جا سکے۔''

درید نے کہا: ''کیا بھگوڑوں کو بھی کوئی چیز روک سکتی ہے؟ اگر جنگ کا فیصلہ تمھارے حق میں ہوا تو شمشیر زنوں اور نیزے بازوں کے سوا، کوئی بھی کار آمد نہ ہو گا، اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا اور تمھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا تو تمھارے اہل وعیال اور مال پر دشمن کا قبضہ ہو گا اور اس میں تمھاری رسوائی ہو گی۔''

لیکن مالک نے یہ مشورہ مسترد کر دیا اور کہا: ''خدا کی قسم، میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تم بوڑھے ہو چکے ہو اور تمھاری عقل بھی بوڑھی ہو چکی ہے۔ یا تو ہوازن میری اطاعت کریں یا میں اس تلوار پر ٹیک لگا دوں گا اور یہ میری پیٹھ کے آر پار نکل جائے گی۔''

درحقیقت مالک کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اس جنگ میں درید کا بھی نام یا مشورہ شامل ہو۔ ہوازن نے کہا: ''ہم نے تمھاری اطاعت کی۔'' اس پر درید نے کہا: ''یہ ایسی جنگ ہے جس میں، میں نہ شریک ہوں اور نہ بالکل الگ ہوں۔ کاش میں اس میں جوان ہوتا۔ تنگ وتاز اور بھاگ دوڑ کرتا۔ ٹانگ کے لمبے، بالوں والے اور میانہ قسم کی بکری جیسے گھوڑے کی قیادت کرتا۔''

لوگوں نے مالک کی رائے کو ترجیح دی اور اسی پر عمل کیا۔ مالک بن عوف تیس سال کی عمر کا جوان تھا اور لوگ اسے پختہ ارادے اور محکم رائے کا مالک سمجھتے تھے۔ لہٰذا درید بھی کثرت رائے کی مخالفت پر نہ جم سکا اور اپنی تجربہ کاری کے باوجود چار و ناچار اسے بھی ان سے متفق ہونا پڑا۔

ہوازن کی گروپ بندی

مالک بن عوف نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ وہ حنین کی چوٹیوں اور وادی کے درّے میں جمع ہو جائیں۔ جونہی مسلمان یہاں پہنچیں، سب کے سب آن کی آن میں ان پر ٹوٹ پڑیں اور ان کی صفیں درہم برہم کر دیں، تاکہ وہ بدحواسی میں آپس میں ایک دوسرے سے الجھ پڑیں، اور مجبور از چج ہو کر راہِ فرار اختیار کریں۔ نیز فتح مکہ سے انھیں اپنی طاقت پر جو زعم ہو گیا ہے، اس کا طلسم بھی پاش پاش ہو جائے۔ اس طرح بلادِ عرب میں قبائلِ حنین کو یہ فخر حاصل ہو جائے گا کہ انھوں نے اس قوت کو زیر کر لیا جو تمام بلادِ عرب پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ تمام قبائل نے مالک کے حکم کی تعمیل کی اور وادیٔ حنین کے درّے میں روپوش ہو کر بیٹھ گئے۔

مکہ سے حنین کی طرف

مسلمان جب مدینہ سے فتح مکہ کے لیے روانہ ہوئے تھے تو ان کی تعداد دس ہزار تھی۔ مکہ فتح ہوا تو دو ہزار افراد ایمان لائے۔ حضور ﷺ نے حنین کی جانب پیش قدمی کا ارادہ ظاہر فرمایا تو یہ بھی لشکر میں شامل ہو گئے۔ ان میں جو مسلح نہ تھے، ان کے لیے ہتھیار درکار تھے۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ صفوان بن اُمیہ ''کثیر السلاح'' مشہور ہے۔ آپ ﷺ نے اس کے پاس اسلحے کے لیے پیغام بھجوایا۔ وہ ابھی مشرک تھا۔ اسلام قبول کرنے کے لیے حضور ﷺ نے اسے چار ماہ کی مہلت عطا فرمائی تھی۔ وہ سمجھا کہ اس طرح اسلحہ غصب ہو جائے گا۔ اس نے واپسی کی ضمانت طلب کی۔ ارشاد ہوا کہ مال تمھارا ہے، چاہے دو یا نہ دو۔ ہمیں عاریتاً چاہیے، واپسی کا میں ضامن ہوں۔ یہ جواب پا کر وہ مطمئن ہو گیا اور اسی دن سو زرہیں اور متعلقہ آلات اوزار اُدھار دے دیے۔ حضور ﷺ نے رسد اور سامانِ جنگ کی فراہمی کے لیے تین ہزار درہم عبداللہ بن ربیعہ سے قرض لیے۔

رسول کریم ﷺ نے حضرت عتابؓ بن اسید کو مکہ میں گورنر مقرر فرمایا۔ فتح مکہ کے 19 دن بعد 6 شوال 8 ہجری بروز ہفتہ بارہ ہزار کا لشکر صف بہ صف نکلا۔ حضور ﷺ نے لوا (جھنڈیاں) اور رایت (جھنڈے) مجاہدین میں تقسیم فرمائے۔ مہاجرین کا لوا حضرت علیؓ کو عطا ہوا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عمرؓ کو رایت اٹھانے کا حکم ہوا۔ قبیلہ اوس کا لوا، اسیدؓ بن حضیر، خزرج کا لوا حضرت سعدؓ بن عبادہ اور دوسرا حضرت حبابؓ بن منذر کو عطا ہوا۔ اسی طرح دیگر قبائلِ عرب کے نامزد افراد لوا اور رایت اٹھائے ہوئے تھے۔ مقدمہ لشکر پر حضرت خالدؓ بن ولید کو مقرر فرمایا۔ بنی سلیم کے علاوہ ان کے ساتھ قریش کے نومسلم اور بہت سے غیر مسلح افراد بھی تھے۔ مسلمانوں کے اس لشکر میں اُسی مشرک بھی تھے۔

لشکر کی کثرتِ تعداد پر بعض مجاہدوں کی زبان پر بے اختیار یہ جملہ آیا کہ آج ہم پر کون غالب آ سکتا ہے؟ یہ تکبر حضور ﷺ کو پسند نہ آیا۔

مکہ کو میدانِ کارزار بنانا حرم شریف کے تقدس کے منافی تھا، اس لیے رسول کریم ﷺ نے خود پیش قدمی فرمائی اور مکہ کے نشیبی علاقے کداء کی طرف سے نکلے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے خیال میں یہ نقل وحرکت حضور ﷺ کی جنگی حکمت عملی ''توریہ'' (دکھاوا) کے عین مطابق تھی کہ دشمن کو تذبذب میں مبتلا رکھا جائے اور دوسری سمت میں پیش قدمی کر کے غیر معروف راستوں پر چل کر اچانک یلغار کر دی جائے۔

لشکر بنی ہوازن کی طرف چلا تو راستے میں بیر کا ایک بڑا سا ہرا درخت نظر آیا جسے ''ذات انواط'' کہا جاتا تھا۔ مشرکین ہر سال اس پر اپنے ہتھیار لٹکاتے تھے۔ اس کے پاس جانور ذبح کرتے تھے اور وہاں درگاہ اور میلہ لگاتے تھے۔ برکت کی نیت سے ایک دن قیام کرتے۔ بعض فوجیوں نے حضور ﷺ سے کہا: ''آپ ﷺ ہمارے لیے بھی ایک ذات انواط مقرر فرما دیجیے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم نے تو ویسی

بات کہی جیسی موسیٰ کی قوم نے کہی تھی'' ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دیجیے جس طرح ان کے لیے معبود ہیں۔'' قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ تم لوگ ان کا راستہ اختیار کرو گے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ خبردار، ایسے خیالات کو اپنے دل میں جگہ نہ دینا۔''

اسلامی لشکر پر اچانک حملہ

اسلامی لشکر منگل اور بدھ کی درمیانی شب 10- شوال کو حنین پہنچا۔ سنت نبوی ﷺ ہے کہ رات کے وقت حملہ نہ کیا جائے، انھوں نے وادی سے باہر پڑاؤ ڈال دیا اور صبح تک وہیں ٹھہرے رہے۔ ادھر مالک بن عوف یہاں پہلے ہی پہنچ کر اور اپنا لشکر رات کی تاریکی میں اس وادی کے اندر اتار کر اسے راستوں، گزرگاہوں، گھاٹیوں، پوشیدہ جگہوں اور دروں میں پھیلا اور چھپا چکا تھا، اور اسے یہ حکم دے چکا تھا کہ مسلمان جونہی نمودار ہوں، انھیں تیروں سے چھلنی کر دینا۔ پھر ان پر یک دم اکٹھے ٹوٹ پڑنا۔

صبح سویرے مسلمانوں نے آگے بڑھ کر وادی حنین میں قدم رکھا۔ وہ دشمن کے وجود سے قطعی بے خبر تھے۔ انھیں مطلق علم نہ تھا کہ اس وادی کے تنگ دروں کے اندر ہوازن اور ثقیف کے جیالے ان کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ جونہی اسلامی لشکر وادی حنین کے درے سے داخل ہو کر تہامہ کی ایک وادی میں اترا اور وادی میں قدم جمائے، مخالفین نے مالک بن عوف کی ہدایت کے بموجب ان پر اچانک حملہ کر دیا اور تیروں کی بارش شروع کر دی۔ مسلمان اس ناگہانی حملے سے حواس باختہ ہو گئے اور اتنی بوکھلاہٹ طاری ہوئی کہ بھگدڑ مچ گئی۔ ابوسفیان ان لوگوں کی کمزوری پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا، جنھوں نے ابھی ابھی قریش مکہ پر فتح پائی تھی۔ وہ کہنے لگا: ''یہ مفرورین سمندر کے ساحل سے ورے نہیں ٹھہر سکیں گے۔'' شیبہ بن عثمان بن ابی طلحہ نے کہا: ''آج میں محمد ﷺ سے انتقام لوں گا۔'' اس کا باپ غزوۂ احد میں مارا گیا تھا۔ کلدہ بن حنبل نے کہا: ''آج ان کا جادو ٹوٹ گیا۔'' اس کے بھائی صفوان نے اسے جواب دیا: ''خاموش رہ۔ خدا تیرا منہ بند کرے۔ بخدا، اگر قریش کا کوئی ایک شخص مجھ پر فرماں روائی کرے تو اس سے بہتر ہے کہ مجھ پر ہوازن کے کسی شخص کی حکومت ہو۔'' یہ باتیں ہو رہی تھیں اور مسلمانوں کی فوج درہم برہم ہو رہی تھی۔ آنحضور ﷺ فوج کے آخر میں تھے۔ مفرورین یکے بعد دیگرے پیٹھ پھیر کر بھاگے جاتے تھے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

حضور ﷺ کی ثابت قدمی

نبی مکرم ﷺ اپنی جگہ ثابت قدم رہے۔ مہاجرین وانصار اور آپ ﷺ کے اہل بیت آپ کے اردگرد تھے۔ جب لوگ آپ کے پاس سے بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے تو آپ ﷺ نے انھیں پکارا: ''لوگو! کہاں جاتے ہو'' لیکن لوگوں پر اتنی دہشت طاری تھی کہ وہ کچھ نہ سنتے تھے اور ان کے دلوں میں سوائے اس کے اور کوئی خیال نہ تھا کہ بنی ہوازن اور بنی ثقیف پہاڑ کی چوٹیوں میں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر ان کا تعاقب کریں گے۔ ان کا یہ خیال غلط بھی نہ تھا، کیوں کہ بنی ہوازن واقعی اپنی کمین گاہوں سے سیلاب اور طوفان کی طرح نکل آئے تھے۔ ان کے آگے آگے ایک شخص سرخ اونٹ پر سوار تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بلند نیزے پر سیاہ پرچم بندھا ہوا تھا۔ اس کی نظر جس مسلمان پر پڑتی، وہ اس پر نیزے سے وار کرتا۔ اس کے پیچھے پیچھے بنی ہوازن اور بنی ثقیف اپنے مددگاروں کے ساتھ، نیزوں سے حملے کرتے ہوئے چلے آتے تھے۔ حضور ﷺ جذبہ حمیت ابھرا اور آپ ﷺ نے اپنے سفید خچر کے ذریعے سے دشمنوں کے اس بے پناہ سیلاب کو روکنا چاہا، تاکہ جو خدا کو منظور ہے، ہو جائے۔ ان نازک ترین لمحات میں نبی کریم ﷺ کی بے نظیر شجاعت کا ظہور ہوا، یعنی اس شدید بھگدڑ کے باوجود آپ ﷺ کا رخ کفار کی طرف تھا اور آپ ﷺ پیش قدمی کے لیے اپنے خچر کو ایڑ لگا رہے تھے اور فرما رہے تھے:

انا النبی لا کذب — انا ابن عبدالمطلب

میں نبی ہوں، یہ جھوٹ نہیں — میں عبدالمطلب کا بیٹا ہوں

اس وقت ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب نے آپ ﷺ کے خچر کی لگام پکڑ رکھی تھی، اور حضرت عباسؓ نے رکاب تھام رکھی تھی۔ دونوں خچر کو روک رہے تھے کہ کہیں تیزی سے آگے نہ بڑھ جائے۔ اس کے بعد حضور ﷺ نے اپنے چچا عباسؓ کو، جن کی آواز خاصی بلند تھی، حکم دیا کہ صحابہ کرامؓ کو پکاریں۔ حضرت عباسؓ نے اپنی آواز کی پوری گونج اور کڑک سے کہا: ''اے گروہ انصار! تم نے آنحضرت ﷺ کو پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ اے مہاجرین! تم وہی تو ہو جنھوں نے درخت کے نیچے اپنے پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ پیغمبر اسلام بقید حیات ہیں۔ ادھر آؤ۔'' حضرت عباسؓ نے یہ الفاظ بار بار دہرائے، یہاں تک کہ وادی کے تمام گوشے گونج اٹھے۔ اس وقت گویا ایک معجزہ نما نقشہ نگاہوں کے سامنے آیا۔ جن لوگوں نے مقام عقبہ پر بیعت کی تھی، انھوں نے عقبہ کا نام سنا تو انھیں اپنا عہد و پیمان اور اپنے فضائل یاد آ گئے۔ اسی طرح مہاجرین نے جب آپ ﷺ کا اسم گرامی سنا تو انھیں اپنی فداکاریاں اور اپنی دوسری فضیلتیں یاد آ گئیں۔ سب جماعتوں نے جان لیا کہ پیغمبر اسلام ﷺ مہاجرین وانصار کی مختصر سی جماعت کے ہم راہ اپنی پامردی اور ثابت قدمی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ انھیں غزوۂ اُحد میں بھی اس چیز کا مشاہدہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے خیال کیا کہ اگر ہم آپ ﷺ کو اس وقت تنہا چھوڑ جائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرکین اللہ کے سچے دین پر غلبہ پالیں گے۔ اس دوران میں حضرت عباسؓ کی آواز متواتر ان کے کانوں میں گونج رہی تھی اور اس سے ان کے دلوں کے تار جنبش میں آ رہے تھے۔ چنانچہ وہ اطراف سے بلند آواز سے پکار اٹھے: ''لبیک، لبیک۔'' اور نہایت جوش و خروش سے پھر میدان جنگ میں لوٹ آئے۔

لشکر اسلام کی فتح

جب آنحضور ﷺ نے مسلمانوں کو واپس آتے دیکھا تو آپ ﷺ کو اطمینان نصیب ہوا۔ اس وقت تک بنی ہوازن اپنی کمین گاہوں سے نکل کر وادی کے میدان میں مسلمانوں کے بالمقابل آ کھڑے ہوئے تھے۔ سورج طلوع ہو گیا تھا۔

مسلمانوں نے آپ ﷺ کے گرد جمع ہو کر مخالف قبائل کا مقابلہ کیا اور ان کے سامنے ڈٹے رہے۔ لحظہ بہ لحظہ واپس آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جن لوگوں کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں۔ ان کے لوٹ آنے سے قوی ہو گئیں۔ انصار آپس میں بلند آواز سے پکارے: ''اے گروہ انصار'' پھر وہ پکارے: ''اے گروہ خزرج۔''

رسولِ کریم ﷺ طرفین کی جنگ آزمائی کا منظر دیکھتے رہے۔ جب آپ ﷺ نے اندازہ کیا کہ معرکہ سخت ہو گیا ہے اور مسلمان بھی بلند ہمتی سے مقابلہ کر رہے ہیں، اور دشمنوں کے پرے کے پرے صاف ہو رہے ہیں تو آپ ﷺ پکار اٹھے: ''اب جنگ اپنے پورے شباب پر آ ئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے جو وعدہ کیا ہے، اس کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔''

حضور ﷺ نے حضرت عباسؓ سے کنکریوں کی ایک مٹھی لے کر دشمنوں پر پھینکی اور فرمایا: ''چہرے بدہئیت ہو گئے۔'' مسلمان بڑھ بڑھ کر دادِ شجاعت دے رہے تھے اور اللہ کی راہ میں موت انھیں حقیر سی چیز نظر آ رہی تھی۔ انھیں یقین ہو چلا تھا کہ انجام کار جیت ہماری ہے اور ہم میں سے جو شخص جامِ شہادت نوش کرے گا، اس فتح میں اس کا حصہ زندہ رہنے والے سے بھی زیادہ ہو گا۔ جنگ زوروں پر جاری تھی۔

جب بنی ہوازن اور بنی ثقیف نے دیکھا کہ مقابلہ مفید نہیں ہے، اور یہ خطرہ ہے کہ وہ سب کے سب فنا کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے تو وہ شکست کھا کر ایسے بھاگے کہ انھوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اپنی عورتوں، بچوں اور مال کو پیچھے چھوڑ گئے جس پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ مالِ غنیمت میں بائیس ہزار اونٹ، چالیس ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی شامل تھی۔ قیدیوں کی تعداد چھ ہزار تھی۔ انھیں حفاظت سے وادیٔ جعرانہ میں منتقل کر دیا گیا، جہاں انھیں اس وقت تک زیرِ حراست رکھا گیا، جب تک مسلمان دشمن کے تعاقب اور طائف میں بنی ثقیف کے محاصرے سے فراغت پا کر واپس آئیں۔

بنی ہوازن کا تعاقب

مسلمانوں نے دشمن کا تعاقب گرم جوشی سے کیا۔ آنحضرت ﷺ نے اعلان فرما دیا تھا کہ جو مسلمان کسی مشرک کو تہ تیغ کرے گا، اس کا سامان اور اسلحہ اس کی ملکیت قرار دیے جائیں گے۔ اس اعلان کے سبب مسلمانوں نے تعاقب میں اور زیادہ سرگرمی دکھائی۔ ربیعہ بن دغنہ نے ایک اونٹ دیکھا جس پر ایک پالکی نما ہودج رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے عورت خیال کیا اور اس کے مال پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اس نے اونٹ کو بٹھایا تو اس پر ایک بوڑھے شخص کو سوار دیکھا جسے وہ نہ پہچانتا تھا۔ یہ بوڑھا شخص درید بن صمّہ تھا۔

درید نے ربیعہ سے پوچھا: ''تم کیا چاہتے ہو؟'' اس نے کہا، میں تمھیں قتل کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہ کر اس پر تلوار سے پے در پے حملے کیے، لیکن درید پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ درید نے کہا، تمھاری ماں نے تمھیں اچھے ہتھیار نہیں پہنائے۔ میرے کجاوے کے پیچھے سے تلوار لو اور اس سے وار کرو، لیکن ہڈیوں سے اوپر اور دماغ سے نیچے ضرب لگاؤ۔ میں بھی اسی طرح لوگوں پر وار کیا کرتا تھا۔ جب تم اپنی ماں کے پاس جاؤ تو اس سے کہنا، میں نے درید بن صمّہ پر قتل کیا ہے۔ بخدا میں نے بہت سی جنگوں میں تمھارے قبیلے کی عورتوں کو بچایا ہے۔ جب ربیعہ اپنی ماں کے پاس گیا اور اسے یہ سرگزشت سنائی تو اس نے کہا: ''خدا تیرا ہاتھ جلائے۔ یہ بات اس نے اس لیے کہی تھی کہ وہ ہمیں اپنے احسانات یاد دلائے جو اس نے ہم پر کیے ہیں۔ بخدا، اس نے ایک دن میں تیری تین ماؤں (مجھے، میری ماں کو اور تیرے باپ کی ماں کو) آزاد کرایا تھا۔

مسلمانوں نے بنو ہوازن کا تعاقب کیا، حتیٰ کہ وہ اوطاس تک جا پہنچے۔ وہاں انھوں نے ان کا خوب مقابلہ کیا اور انھیں مغلوب کر دیا۔ ان کی عورتوں کو گرفتار کر کے اور خاصا مالِ غنیمت لیے ہوئے آنحضرت ﷺ کے پاس آئے۔ مالک بن عوف نصری کچھ دیر تو مقابلہ کرتا رہا۔ اس کے بعد وہ اور اس کے اہلِ خانہ بنی ہوازن کے ہم راہ فرار ہو گئے۔ مقامِ نخلہ پر پہنچ کر وہ بنی ہوازن سے الگ ہو گیا اور اس نے طائف کا رخ کیا۔ وہیں اسے پناہ ملی۔

غرض مسلمان فاتح اور مشرکین مفتوح ہوئے۔ اس افراتفری کے بعد، جو مشرکین کے ناگہانی حملے اور مسلمانوں کی صف شکنی کے باعث مچی تھی، صرف آپ کی ثابت قدمی اور مسلمانوں کی مختصر سی جماعت کی استقلال مزاجی سے لشکر اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ سورۂ توبہ کی آیات 25 تا 28 جنگ حنین سے متعلق نازل ہوئیں:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (التوبہ: ۲۵ تا ۲۸)

''اللہ اس سے پہلے بہت سے مواقع پر تمھاری مدد کر چکا ہے۔ ابھی غزوۂ حنین کے روز (اس کی دست گیری کی شان تم دیکھ چکے ہو)۔ اس روز تمھیں اپنی کثرت تعداد کا غرور تھا، مگر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول ﷺ پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تمھیں نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہ بدلہ ہے ان لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔ پھر (تم یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ) اس طرح سزا دینے کے بعد اللہ جسے چاہتا ہے، توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے ایمان والو! مشرکین ناپاک ہیں، لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔ اور اگر تمھیں تنگ دستی کا خوف

ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمھیں اپنے فضل سے غنی کر دے، اللہ علیم و حکیم ہے۔''

ان آیات میں دو مقامات ایسے ہیں جن کی تشریح ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ''اللہ جسے چاہتا ہے، توبہ کی توفیق بھی بخش دیتا ہے۔'' مولانا مودودیؒ اس کی تشریح میں لکھتے ہیں: ''غزوۂ حنین میں فتح حاصل کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے شکست خوردہ دشمنوں کے ساتھ جس فیاضی اور کریم النفسی کا برتاؤ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بیش تر آدمی مسلمان ہو گئے۔ اس مثال سے مسلمانوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ تم نے یہی کیوں سمجھ رکھا ہے کہ بس اب سارے مشرکین عرب تہس نہس کر ڈالے جائیں گے۔ نہیں، پہلے کے تجربات کو دیکھتے ہوئے تو تمھیں یہ توقع ہونی چاہیے کہ جب نظامِ جاہلیت کے فروغ و بقا کی کوئی امید لوگوں کو باقی نہ رہے گی اور وہ سہارے ختم ہو جائیں گے، جن کی وجہ سے یہ اب تک جاہلیت کو چمٹے ہوئے ہیں تو خود بخود یہ اسلام کے دامن رحمت میں پناہ لینے کے لیے آ جائیں گے۔

دوسرا تشریح طلب مقام وہ ہے جہاں کہا گیا ہے کہ ''مشرکین ناپاک ہیں۔ لہٰذا اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں۔'' مولانا مودودیؒ اس کی شرح یوں کرتے ہیں: ''آیندہ کے لیے ان کا حج اور ان کی زیارت ہی بند نہیں، بلکہ مسجد حرام کے حدود میں ان کا داخلہ بھی بند ہے، تاکہ شرک و جاہلیت کے اعادے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ ''ناپاک'' ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ بذات خود ناپاک ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعتقادات، ان کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کے جاہلانہ طریق زندگی ناپاک ہیں، اور اسی نجاست کی بنا پر حدودِ حرم میں ان کا داخلہ بند کیا گیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ حج اور عمرہ اور مراسم جاہلیت ادا کرنے کے لیے حدودِ حرم میں نہیں جا سکتے۔ امام شافعی کے نزدیک اس حکم کا منشا یہ ہے کہ وہ مسجد حرام میں جا ہی نہیں سکتے۔ اور امام مالک یہ رائے رکھتے ہیں کہ صرف مسجد حرام ہی نہیں، بلکہ کسی مسجد میں بھی ان کا داخل ہونا درست نہیں، لیکن یہ آخری رائے درست نہیں ہے، کیوں کہ نبی کریم ﷺ نے خود مسجد نبوی میں ان لوگوں کو آنے کی اجازت دی تھی۔

فتح کی قیمت

غزوۂ حنین میں فتح کی کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ اس کی وضاحت میں ڈاکٹر محمد حسین ہیکل لکھتے ہیں: ''تاہم مسلمانوں کو یہ شاندار فتح کچھ کیے دھرے بغیر حاصل نہ ہو سکی، بلکہ اس کے لیے انھیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اگر وہ پہلی بار میدان سے فرار اختیار نہ کرتے تو شاید انھیں اس قسم کا خمیازہ بھگتنا نہ پڑتا، جسے دیکھتے ہوئے ابو سفیان کو بھی یہ کہنے کی جرات ہوئی کہ اب یہ سمندر سے ورے نہ رک سکیں گے۔ مسلمانوں کو یہ فتح حاصل کرنے کے سلسلے میں کئی مردوں اور کئی بہادروں کی جانیں قربان کرنا پڑی تھیں۔ اگرچہ کتب سیرت میں اس جنگ کے تمام مقتولین کی تعداد نہیں بتائی گئی ہے، لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے دو پورے کے پورے قبیلے تقریباً فنا ہو گئے تھے۔ آنحضور نے ان کے حق میں جنت کی دعا کی۔ تاہم مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور ایسی مکمل فتح کہ مسلمانوں نے دشمنوں پر غلبہ پا لیا۔ ان کے ہاتھ اتنے قیدی اور اتنا مالِ غنیمت آیا کہ اس سے پہلے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کسی معرکے سے غرض اور کسی جنگ کا مقصد صرف فتح ہی ہوتی ہے، خواہ اس کے حصول کے لیے کوئی قیمت ادا کرنی پڑے۔ مسلمان اس انعام پر جو اللہ نے انھیں عطا کیا تھا، بہت خوش تھے۔''

آنحضرت ﷺ کے پیش نظر اس سے بھی زیادہ مہتم بالشان فتح کا تصور تھا۔ مالک بن عوف ہی نے تمام قبائل کو جنگ کے لیے جمع کیا تھا اور شکست کے بعد بنی ثقیف کے ہم راہ طائف میں اسی نے پناہ لی تھی۔ مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ محاصرۂ طائف کے بعد مسلمان اپنے ان دشمنوں کو اپنی گرفت میں لیں۔ نبی کریم ﷺ نے غزوۂ احد کے بعد اہل خیبر سے اور غزوۂ خندق کے بعد بنی قریظہ سے یہی رویہ اختیار کیا تھا۔ غالباً اس موقع پر نبی کریم ﷺ کی آنکھوں کے سامنے اس زمانے کی تصویر پھر گئی تھی۔ جب آپ ﷺ ہجرت سے چند سال قبل طائف میں لوگوں کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے آپ ﷺ کا مذاق اڑایا تھا اور ان کے بچوں نے آپ ﷺ پر سنگ باری کی تھی، آپ ﷺ نے ان کی ایذا رسانی سے تنگ آ کر انگوروں کے ایک باغ میں پناہ لی تھی۔ شاید اس مرحلے پر آپ ﷺ نے یہ بھی سوچا ہو کہ آپ ﷺ گزشتہ ایام میں جب طائف گئے تھے تو صرف تن تنہا تھے۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کے علاوہ آپ ﷺ کے اگر کوئی مددگار تھا تو وہ ایمان کی زبردست اور بے پناہ قوت تھی، ایسی قوت جو پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کر دیتی ہے۔ زمانے کا انقلاب دیکھیے کہ آج سفر طائف میں آپ ﷺ کے ہم راہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد تھی کہ اس کی نظیر عرب کی گزشتہ تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔

سریہ طفیل بن عمرو دوسی

حنین سے طائف روانہ ہونے سے پہلے رسول کریم ﷺ نے حضرت طفیل بن عمرو دوسی کو ذی الکفین کا بت خانہ منہدم کرنے کے لیے بھیجا۔ حکم ہوا: ''اس کام سے فارغ ہو کر طائف میں آملو۔'' ذی الکفین عمرو بن شمہ دوسی کا بت تھا جو لکڑی سے تراشا گیا تھا۔ اس کام میں انھیں اپنے قبیلے سے امداد لینے کی بھی ہدایت فرمائی۔

حضرت طفیلؓ بن عمرو نے ذی الکفین کے منہ کو آگ لگائی۔ اسے جلاتے جاتے اور یہ شعر پڑھتے جاتے: ''اے ذی الکفین! میں تیرا بندہ نہیں ہوں۔ میری پیدائش تیری آفرینش سے عظیم ہے۔ میں نے تیرے دل میں آگ لگائی ہے۔''

بت خانہ منہدم کر کے اپنے قبیلے کے چار سو افراد کے ساتھ طائف کا رخ کیا۔ رسول کریم ﷺ کو طائف پہنچے چار دن گزر چکے تھے۔ اپنے ساتھ دبابہ (قلعہ شکن آلہ) اور منجنیق (پتھر پھینکنے کا آلہ) بھی لائے جن سے محاصرۂ طائف میں مدد لی گئی۔ خیبر میں یہودیوں کے قلعہ صعب بن معاذ سے مسلمانوں کو پہلی بار دبابے اور منجنیق ملے تھے، جنھیں خیبر ہی میں قلعہ البر کے مسمار کرنے میں استعمال کیا گیا تھا۔ اس طرح مسلمان اس کے استعمال کا تجربہ رکھتے تھے۔ مشرکوں کے خلاف استعمال ہونے والی یہ

پہلی منجنیق تھی۔ حضور ﷺ نے پوچھا: ''تمہارا علم بردار اب کون ہوگا؟'' حضرت طفیلؓ نے کہا: ''وہی جو حالتِ کفر میں جھنڈا اٹھاتا تھا، یعنی نعمان بن باز۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم نے حق بات کہی!''

غزوۂ طائف

حنین میں شکست کھانے کے بعد ہوازن وثقیف کے بیش تر شکست خوردہ افراد اپنے جنرل کمانڈر مالک بن عوف کے ساتھ بھاگ کر طائف ہی آئے تھے اور یہیں قلعہ بند ہو گئے تھے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ نے حنین سے فارغ ہو کر اور جعرانہ میں مالِ غنیمت جمع فرما کر اسی ماہ شوال 8 ہجری میں طائف کا قصد فرمایا۔ اس مقصد کے لیے خالد بن ولیدؓ کی سرکردگی میں ایک ہزار فوج کا ہراول دستہ روانہ کیا گیا۔ پھر آپ ﷺ نے خود طائف کا رخ کیا۔

طائف مکہ کے جنوب مشرق میں کوئی تین منزل کی مسافت پر واقع ہے۔ عرفات اور وادئ نعمان کے پہاڑی راستے سے ایک رات کی مسافت پر ہے اور موٹر سے 75 میل کا راستہ ہے۔ یہاں انگور اور پھلوں کے باغات کثرت سے ہیں جو چشموں اور کاریز (زمین دوز نہروں) سے سیراب ہوتے ہیں۔ یہ علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ آب و ہوا نہایت خوش گوار ہے۔ طائف کی پیداوار مکہ میں فروخت ہوتی ہے۔ اس وقت طائف میں قریش مکہ کی رشتہ داریاں تھیں۔ بنی ثقیف کا سردار عروہ بن مسعود بنی اُمیہ کے ابوسفیان بن حرب کا داماد تھا۔ قریش اور مسلمانوں کی لڑائیوں میں طائف نے ہمیشہ اہل مکہ کا ساتھ دیا۔ ثقیف کا قبیلہ قریش سے ہمسری کا دعویٰ کرتا تھا۔

طائف ایک مضبوط شہر تھا اور اس زمانے کے اکثر عرب شہروں کی طرح اس کے دروازے بھی تھے، جنھیں بوقت ضرورت بند کیا جا سکتا تھا۔ وہاں کے لوگ محاصرہ بندی کے سلسلے میں خاصا تجربہ رکھتے تھے اور ان کی مالی حیثیت بھی بہت اچھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے مضبوط قلعے بنا رکھے تھے۔ مسلمان طائف کی جانب روانہ ہوئے۔ اثنائے راہ میں وہ لیّہ کے مقام سے گزرے، جہاں مالک بن عوف کا ایک خاص قلعہ تھا۔ اسے مسلمانوں نے گرا کر مسمار کر دیا تھا۔ راستے میں بنی ثقیف کے ایک شخص کی چار دیواری تھی۔ انھوں نے اسے بھی برباد کر دیا تھا۔

جب مسلمان طائف پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے اپنے لشکر کو شہر کے قریب پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اب کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔ جوں ہی بنی ثقیف نے اپنے قلعوں کی نظارہ گاہوں سے مسلمانوں کو دیکھا، ان پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی، جس سے چند مسلمان شہید ہو گئے۔ مسلمانوں کے لیے ان مضبوط قلعوں میں داخلہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ مجبوراً ان وسائل کے علاوہ کوئی اور وسیلہ اختیار نہ کرتے، جن سے بنی قریظہ اور اہل خیبر کے محاصروں کے سلسلے میں انھوں نے کام لیا تھا۔ اگر وہ صرف محاصرے ہی پر اکتفا کرتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ بنی ثقیف کو تنگ کر کے اپنے آگے سر تسلیم خم کر دینے پر مجبور کر دیتے؟ ان پر حملہ کرنے کے لیے نئے وسائل کیا اختیار کیے جا سکتے تھے؟ ان امور پر غور و خوض کی ضرورت تھی۔ ایسے حالات میں کہ قلعوں کے اوپر سے تیروں کی بارش ہو رہی تھی، مسلمانوں کو مخالفین کے تیروں کی زد سے دور رہنا چاہیے تھا، تاکہ وہ نشانہ نہ بنیں اور ان کی جانیں ضائع نہ ہوں۔

آخر کار غور و خوض کے بعد آنحضور ﷺ نے لشکر اسلام کو حکم دیا کہ وہ تیروں کی زد سے دور ہٹ کر اس جگہ قیام کریں جہاں طائف کی فتح اور اہل طائف کے قبول اسلام کے بعد مسجد تعمیر ہوئی تھی۔ اس صورت کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا، کیوں کہ بنی ثقیف کے تیروں سے اٹھارہ مسلمان جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ بہت سے مسلمان زخمی بھی ہوئے تھے۔ ان مجروحین میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ایک لختِ جگر بھی شامل تھا۔ اسی مقام کی ایک جانب آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات حضرت ام سلمہؓ اور حضرت زینبؓ کے لیے سرخ رنگ کے چمڑے کے دو خیمے بھی نصب کیے گئے تھے۔ یہ دونوں ازواجِ مطہرات اس وقت سے جب سے آپ ﷺ نے مدینہ سے عزم سفر کیا تھا، ان تمام ہنگاموں میں آپ ﷺ کے ہم راہ چلی آئی تھیں۔ آپ ﷺ ان دونوں خیموں کے درمیان نماز پڑھا کرتے تھے۔ غالباً مسجد طائف اسی جگہ تعمیر کی گئی۔

جب محاصرہ طول پکڑ گیا اور قلعہ قابو میں آتا نظر نہ آیا اور مسلمانوں پر تیروں کی بارش اور گرم لوہوں کی زد پڑی اور ادھر اہل قلعہ نے سال بھر کا سامان خورد و نوش بھی جمع کر لیا، تو رسول کریم ﷺ نے نوفل بن معاویہ دیلی سے مشورہ طلب کیا۔ اس نے کہا: ''بنی ثقیف اپنے قلعوں میں اس طرح ہیں جس طرح لومڑی اپنے بھٹ میں ہوتی ہے۔ اسے باہر نکالنے میں خاصے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اگر آپ اسے نکالنے پر ڈٹے رہیں تو پکڑ لیں گے اور اگر چھوڑ کر چلے گئے تو وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

آنحضور ﷺ کو یہ امر ناگوار تھا کہ بنی ثقیف کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر واپس آئیں۔ بنی دوس کے لوگ جو مکے کے زیریں حصے میں رہتے تھے، منجنیق کے استعمال اور دبابوں کے ذریعے سے قلعوں کا محاصرہ کرنے میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ اس قبیلے کا سردار طفیل عمرو دوسی، جسے ذی الکفین کا بت منہدم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ اب طائف آ کر محاصرہ توڑنے کی مہم میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے آدمی منجنیق اور دبابوں سے مسلح تھے۔ جب طفیل اور اس کے آدمی طائف پہنچے تو محاصرے کو چار دن گزر چکے تھے۔

غرض مسلمانوں نے طائف پر منجنیق کے ذریعے حملے کیے اور دبابے بھی استعمال کیے، جن کے نیچے چند مسلمان چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے دبابوں کے ذریعے طائف کی چار دیواری پر تابڑ توڑ حملے کیے، تاکہ اس میں شگاف ڈال سکیں، لیکن اہل طائف بھی جنگ میں کچھ کم ماہر نہ تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو بھاگ کر پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اہل طائف نے یہ کیا کہ لوہے کے چند ٹکڑے آگ میں تپا اور پگھلا کر دبابوں پر پھینکے اور ان میں سوراخ ڈال دیئے۔ جو مسلمان ان کے نیچے چھپے بیٹھے تھے، جل جانے کے خوف سے نکل بھاگے۔ بنی ثقیف نے ان پر تیر برسا کر ان میں سے چند ایک کو ہلاک کر دیا۔ آخر یہ کوشش بھی کارگر ثابت نہ ہوئی اور مسلمان طائف کے مضبوط

قلعوں پر غلبہ نہ پا سکے۔

آنحضور ﷺ دیر تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ آخر یہ تدبیر ذہن میں آئی کہ کیوں نہ یہاں بھی وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو بنی نضیر پر قابو پانے کے سلسلے میں اختیار کیا گیا تھا۔ یعنی یہ کہ ان کے نخلستانوں کو نذرِ آتش کر کے ان پر غلبہ پایا تھا۔ طائف کے انگوروں کے باغ بنی نضیر کے نخلستانوں سے بھی زیادہ قیمتی تھے۔ حسب الحکم مسلمانوں نے انگوروں کی بیلوں کو کاٹنا اور جلانا شروع کر دیا۔ بنی ثقیف نے جب یہ منظر دیکھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ انھوں نے آپ ﷺ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ ﷺ چاہیں تو یہ باغ اپنے تصرف میں لے لیں یا خدا کے لیے اس رشتے کی بنا پر جو ان کے اور آپ ﷺ کے درمیان ہے، خود ہمارے لیے چھوڑ دیں۔ اس پیغام کے بعد آپ ﷺ نے اپنے آدمیوں کو اس کام سے روک دیا اور بنی ثقیف سے بآوازِ بلند کہا: ''اہل طائف میں سے جو شخص ہمارے پاس آ جائے گا، اس کے لیے امان ہے اور وہ آزاد ہو گا۔'' اس اعلان پر طائف کے قریباً بیس آدمی قلعے سے نکل کر آپ ﷺ کے پاس آ گئے۔ ان کی باتوں سے آپ ﷺ کو علم ہوا کہ قلعوں میں اتنا سامان خورد و نوش جمع ہے جو مدت دراز تک کافی ہو سکتا ہے۔ اس سے آپ ﷺ نے سمجھ لیا کہ یہ محاصرہ طول کھینچے گا، اور اسلامی لشکر کے ارادے یہ ہیں کہ وہ جلد سے جلد لوٹے اور مال غنیمت تقسیم کرے۔ حضور ﷺ نے سوچا کہ اگر محاصرے پر اصرار کیا گیا تو ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں اشہر حرم قریب آ گئے تھے جن میں جنگ اور خوں ریزی جائز نہیں ہے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے یہ پسند کیا کہ فی الحال محاصرہ ختم کر دیا جائے۔ آپ ﷺ لشکر کے ہم راہ عمرہ بجا لانے کے لیے واپس آ گئے اور یہ فرمایا کہ اشہر حرم ختم ہوتے ہی پھر اہل طائف سے جنگ ہو گی۔

بنی ہوازن کا وفد

آنحضور ﷺ مجاہدین اسلام کی معیت میں طائف سے مکہ معظمہ واپس آ گئے اور جعرانہ کے مقام پر، جہاں انھوں نے ہوازن کے قیدی اور مالِ غنیمت جمع کر دیا تھا، اترے اور وہاں مال غنیمت کی تقسیم شروع کی۔ حضور ﷺ نے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ اپنے لیے علیحدہ کر کے باقی مال اپنے صحابہؓ میں تقسیم کر دیا۔ مسلمان ابھی جعرانہ ہی میں تھے کہ بنی ہوازن کے جو لوگ اسلام قبول کر چکے تھے، ان کا ایک وفد اس امید پر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپ ﷺ انھیں ان کا مال، عورتیں اور بچے، جو اتنی مدت سے ان سے بچھڑے ہوئے ہیں اور خاصی تکالیف برداشت کر چکے ہیں، انھیں واپس کر دیں۔ یہ وفد آپ ﷺ سے ملا اور ان میں سے ایک نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ، اسیروں میں آپ ﷺ کی پھوپھیاں، خالائیں اور دایاں بھی ہیں جو آپ کی پرورش کیا کرتی تھیں۔ اگر ہماری عورتوں نے حارث بن ابی شمر یا نعمان بن منذر کو دودھ پلایا ہوتا اور پھر اسے ہمارے اوپر وہی اختیار ہوتا جو آج آپ ﷺ کو ہم پر حاصل ہے تو ہمیں اس سے مہر و کرم کی توقع ہوتی اور آپ ﷺ تو پھر بہترین ضامن ہیں۔ ان لوگوں نے آپ ﷺ سے رشتہ اور قرابت جتانے میں مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔

قیدیوں میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی جس پر مسلمانوں نے سختی کی تھی۔ اس نے یہ کہا تھا کہ میں تمھارے رسول ﷺ کی رضاعی بہن ہوں تو مسلمانوں کو اس پر یقین نہ آیا تھا۔ وہ اسے آنحضور ﷺ کے روبرو لے آئے تھے۔ یہاں یہ پتا چلا کہ وہ حارث بن عبدالعزیٰ کی بیٹی شیماء تھی۔ اس نے حضور ﷺ سے کہا کہ میں آپ ﷺ کی رضاعی بہن ہوں۔ فرمایا، کوئی ثبوت؟ عرض کیا، ایک دفعہ جب آپ ﷺ چھوٹے تھے تو میں نے کھیل میں آپ کو بہت تنگ کیا تھا۔ آپ نے میرے شانے پر کاٹ لیا تھا۔ وہ نشان اب بھی موجود ہے۔ حضور ﷺ کو اپنے بچپن کا یہ واقعہ یاد آ گیا۔ حضور ﷺ نے احترام سے اپنی چادر بچھائی اور محبت سے بٹھایا۔ حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے بارے میں پوچھا۔ بتایا گیا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ اپنی رضاعی والدہ کو یاد کر کے آبدیدہ ہو گئے۔ فرمایا: ''میرے پاس رہنا چاہو تو عزت سے رکھا جائے گا۔ انھوں نے اپنے قبیلے میں رہنے کو ترجیح دی۔ آپ ﷺ نے انھیں کچھ اونٹ، بکریاں، ایک غلام اور ایک باندی عطا فرمائی، اور اپنی رضاعی بہن کو بحفاظت ان کے قبیلے میں بھجوا دیا۔

یہ قدرتی بات تھی کہ آپ ﷺ بنی ہوازن کے ان لوگوں میں سے، جو قبول اسلام کے بعد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، حسن سلوک سے پیش آتے اور ان کے جائز مطالبات تسلیم کر لیتے، کیوں کہ ہر اس شخص سے جس نے آپ ﷺ سے کبھی کوئی اچھا سلوک کیا ہو، آپ ﷺ کا ہمیشہ سے یہی برتاؤ تھا۔ حق شناسی اور دردمندوں کی چارہ جوئی آپ ﷺ کی سرشت میں داخل تھی۔ جب آپ ﷺ نے ان کی بات سنی پوچھا: ''تمھیں اپنے بچوں اور عورتوں سے زیادہ محبت ہے یا اپنے مال و منال سے؟'' انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ، آپ نے ہمیں اہل و عیال اور مال و منال میں سے ایک چیز کا اختیار دیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ ﷺ ہمارے اہل و عیال واپس کر دیں، کیوں کہ وہ ہمیں زیادہ عزیز ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، جو چیز میری اور بنی عبدالمطلب کی ہے، اس پر تمھارا حق ہے۔ جب میں ظہر کی نماز پڑھا چکوں تو تم کھڑے ہو کر یہ کہنا: ''ہم پیغمبر کو مسلمانوں کے سامنے اور مسلمانوں کو پیغمبر کے سامنے اپنے اہل و عیال کی واپسی کے لیے سفارشی پیش کرتے ہیں۔ میں اس وقت تمھیں اپنا حصہ بھی دے دوں گا اور مسلمانوں سے بھی کہوں گا کہ وہ تمھیں اپنا اپنا حصہ واگزار کر دیں۔''

بنی ہوازن کے قیدیوں کی واپسی

بنی ہوازن نے حضور ﷺ کی ہدایت پر عمل کیا۔ حضور ﷺ نے انھیں یہ جواب دیا کہ جو چیز میری ہے، اور جو بنی عبدالمطلب کا حصہ ہے، میں تمھیں بخشتا ہوں۔ مہاجرین نے اس پر کہا، ہم بھی اپنا حصہ رسول ﷺ کی نذر کرتے ہیں۔ انصار نے بھی یہی بات کہی، لیکن اقرع بن حابس نے (جو بنی تمیم میں سے تھا) اور

عیینہ بن حصن نے اپنا حصہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح عباس بن مرداس نے بنی سلیم کی جانب سے انکار کر دیا، لیکن بنی سلیم نے عباس کے انکار کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص ان اسیروں میں سے اپنا حق چھوڑنا نہیں چاہتا، اسے اس شرط پر کہ وہ ان اسیروں کو چھوڑ دے، آیندہ قابو میں آنے والے قیدیوں میں سے چھ چھ قیدی دیئے جائیں گے، اور یہ ان اسیروں میں سے صرف ایک ایک اسیر کا بدلہ ہوگا۔ اس طرح ہوازن کے ان لوگوں کو جو اسلام لے آئے تھے، ان کے اہل وعیال واپس کر دیئے گئے۔

حضور ﷺ نے ہوازن کے وفد سے مالک بن عوف نصری کا حال پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ابھی تک بنی ثقیف کے ساتھ طائف میں مقیم ہے۔ آپ ﷺ نے ان سے کہا کہ اسے میرا پیغام پہنچا دو کہ اگر وہ بھی اسلام قبول کر لے تو میں اسے اس کے اہل وعیال کے علاوہ سو اونٹ بھی دوں گا۔ جب مالک بن عوف کو آپ ﷺ کے اس وعدے کی اطلاع ملی تو وہ فوراً اپنے گھوڑے پر زین کس کر بنی ثقیف سے بچ بچا کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اس نے آ کر اسلام قبول کر لیا اور اپنے اہل وعیال اور مال ومنال کے علاوہ سو اونٹ بھی لے لیے۔ مسلمانوں کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا کہ اگر پیغمبر اسلام ﷺ تمام ایسے لوگوں پر، جو آپ ﷺ کے پاس آتے رہے، نوازشیں فرماتے رہے تو مال غنیمت میں سے ان کا حصہ کم ہو جائے گا، اس لیے انھوں نے اصرار کیا کہ ہر شخص مال غنیمت میں سے اپنا اپنا حصہ لے لے۔ اس سلسلے میں ان کے درمیان سرگوشیاں ہونے لگیں۔ جب حضور ﷺ کو ان سرگوشیوں کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے ایک اونٹ کے قریب کھڑے ہو کر، اس کے کوہان سے تھوڑی سی پشم اپنے ہاتھ میں لی اور اپنا ہاتھ اونچا کر کے فرمایا:

''بخدا، اس مالِ غنیمت اور اس پشم میں میرا صرف پانچواں حصہ ہے، اور میں وہ پانچواں حصہ بھی تمھیں واپس کیے دیتا ہوں۔ ہر شخص اپنی اپنی غنیمت کا مال واپس کر دے، تاکہ اسے انصاف سے تقسیم کیا جائے۔ جو شخص عدل وانصاف کے بغیر کوئی چیز لے گا، خواہ وہ ایک سوئی کے برابر ہی کیوں نہ ہو، قیامت تک اس کے گھر والوں کے لیے وہ چیز ننگ ورسوائی کا باعث ہوگی۔''

آپ ﷺ نے یہ الفاظ قدرے خفگی کے عالم میں فرمائے، کیوں کہ اس سے پہلے انھوں نے آپ ﷺ کی چادر لے لی تھی، لیکن جب آپ ﷺ نے پکار کر کہا: ''لوگو! میری چادر تو مجھے واپس کر دو۔ بخدا اگر تہامہ کے درختوں کے برابر بھی بھیڑ بکریاں ہوتیں تو اس صورت میں بھی میں تمھارے درمیان تقسیم کر دیتا۔'' اس پر انھوں نے آپ ﷺ کی چادر واپس کر دی۔ بعدازاں آپ ﷺ نے مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ لے لیا اور اس پانچویں حصے میں سے کچھ مال آپ ﷺ نے ان لوگوں کو جو چند روز قبل تک آپ ﷺ کے بدترین دشمن تھے، دے دیا اور یہ عطیہ ان کے اپنے حاصل کردہ حصے کے علاوہ تھا۔ چنانچہ ابوسفیان، اس کے بیٹے معاویہ، حارث بن حارث بن کلاہ، حارث بن ہشام، سہیل بن عمرو، حویطب بن عبدالعزیٰ اور دیگر بزرگان قریش اور سرداران قبائل میں سے ہر ایک کو، جو فتح مکہ کے بعد اسلام لائے تھے، سو سو اونٹ عطا کیے گئے۔ جو لوگ رتبے اور درجے کے لحاظ سے ان سے کم تھے، ان میں سے ہر ایک کو پچاس پچاس اونٹ دیئے۔ ایسے لوگوں کی تعداد جنھیں آپ ﷺ نے اپنا حصہ عطا کیا، دس تک پہنچ گئی تھی۔

اس روز آپ ﷺ نے بے مثال جود وسخا کا مظاہرہ کیا، جس کی بناء پر وہ لوگ جو کل تک آپ ﷺ کے دشمن تھے، آپ ﷺ کی تعریف وتوصیف کے گن گانے لگے۔ آپ ﷺ نے ان نو واردانِ بساطِ اسلام کی ہر خواہش پوری کی۔ آپ ﷺ نے عباس بن مرد کو چند اونٹ دیئے، مگر اسے اطمینان نہ ہوا، اور اس نے یہ گلہ کیا کہ آپ ﷺ نے عیینہ اور اقرع وغیرہ کو مجھ پر ترجیح دی ہے اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسے لے جاؤ اور اتنا دو کہ اس کی زبان بند ہو جائے۔'' چنانچہ اسے اتنا مال دیا گیا، جس سے اس کی زبان سل گئی اور اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔''

انصار کا اضطراب

مالِ غنیمت کی یہ تقسیم حکیمانہ سیاست پر مبنی تھی، کیوں کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنی عقل کے راستے سے نہیں، بلکہ پیٹ کے راستے سے حق پر لائے جاتے ہیں۔ یہ سیاست پہلے پہل سمجھی نہ جا سکی، اس لیے کچھ زبانوں پر حرف اعتراض آ گیا۔ انصار اضطراب وتشویش میں مبتلا ہو گئے۔ کیوں کہ وہ سب کے سب حنین کے ان عطایا سے بالکل محروم رکھے گئے، حالانکہ مشکل کے وقت انھی کو پکارا گیا تھا۔ انھوں نے رسول ﷺ کے ساتھ مل کر اس طرح جنگ کی تھی کہ فاش شکست شاندار فتح میں تبدیل ہو گئی تھی، لیکن اب وہ دیکھ رہے تھے کہ بھاگنے والوں کے ہاتھ پُر ہیں اور وہ خود محروم اور تہی دست ہیں۔

انصار آپس میں کہنے لگے، بخدا حضور ﷺ نے اپنی قوم کی جھولیاں بھر دی ہیں اور انھیں بہت کچھ دیا ہے۔ سعدؓ بن عبادہ نے انصار کی جانب سے یہ بات آنحضور ﷺ کے گوش گزار کی اور خود بھی ان کے مؤقف کی تائید میں اظہار خیال کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، انصار کو اس احاطے میں جمع کر دو۔ سعدؓ نے انھیں جمع کیا تو آپ ﷺ ان کے پاس آئے اور فرمایا: ''اے گروہ انصار! کیا یہ بات سچ ہے کہ جو میں نے تمھارے بارے میں سنی ہے؟ شاید تمھارے دلوں میں کوئی گرہ پڑ گئی ہے۔ یہ حقیقت نہیں کہ میں نے تمھیں گمراہ پایا تھا اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں ہدایت دی؟ اور تم مفلس نہ تھے، اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں خوشحال کر دیا؟ کیا تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے؟ اور اللہ تعالیٰ نے تمھیں ایک دوسرے کا دوست بنا دیا؟''

انصار نے کہا: ''کیوں نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم پر بہت احسانات کیے ہیں۔''

رسول کریم نے فرمایا: ''اے انصار! کیا تم مجھے جواب نہیں دو گے؟''

انصار نے دریافت کیا: ''یارسول اللہ! آپ ﷺ ہم سے کس قسم کا جواب چاہتے ہیں؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم پر واقعی احسانات کیے ہیں۔''

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "بخدا! اگر تم چاہتے ہو تو جواب دے سکتے تھے، اور یہ جواب درست ہوتا اور اس کی تصدیق بھی کی جاتی۔ مثلاً تم یہ کہ سکتے تھے کہ "تو اس حالت میں آیا تھا کہ لوگ تیری تکذیب کرتے تھے، مگر ہم نے تیری تصدیق کی۔ تجھ سے سب نے منہ موڑ لیا تھا، مگر ہم نے تیری نصرت کی۔ تجھے وطن سے بے وطن کر دیا گیا تھا، لیکن ہم نے تجھے پناہ دی۔ تو مفلس تھا، مگر ہم نے تجھ سے ہمدردی کی۔" اے انصار! کیا تم دنیا کے اس مختصر سے مال پر، جو میں نے نو مسلموں کی دل جوئی اور تالیف قلب کی خاطر انھیں دیا ہے، دل پر میل لاتے ہو؟ حالانکہ میں نے تمھاری ایمانی پختگی پر پورا پورا اعتماد کیا ہے۔ اے انصار! کیا تم اس بات سے مسرور و مطمئن نہیں ہو کہ لوگ تو اپنے ہم راہ اونٹ، بکریاں اور بھیڑیں لے جائیں گے اور تمھارے ہم راہ اللہ کے رسول ﷺ ہوں گے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں بھی انصار میں سے ایک فرد ہوتا۔ اگر باقی لوگ ایک راہ پر چلیں اور انصار دوسری راہ پر، تو میں بھی انصار کی راہ پر چلوں گا۔ اے اللہ، انصار پر، انصار کے بیٹوں پر، اور ان کے بیٹوں پر رحم فرما۔"

آپ ﷺ نے انصار سے یہ باتیں کچھ اتنی دل سوزی سے کیں کہ انصار پر ان کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ خطاب سن کر لوگ اس قدر روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں تر ہو گئیں، اور کہنے لگے: "ہم راضی ہیں کہ ہمارے حصے اور نصیب میں رسول اللہ ﷺ ہوں۔" اس کے بعد رسول اللہ واپس ہو گئے اور لوگ بھی بکھر گئے۔

نماز عشاء جعرانہ میں ادا کرنے کے بعد حضور ﷺ عمرہ کرنے کے لیے مکہ روانہ ہوئے اور نمازِ فجر کے وقت مکہ روانہ ہوئے اور نماز فجر کے وقت بیت اللہ پہنچے۔

مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ روانہ ہونے سے پیش تر حضور ﷺ نے عتاب بن اسیدؓ کو مکہ کا والی مقرر فرمایا اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو تعلیم دین کے لیے ان کے پاس چھوڑا۔ ان انتظامات سے فارغ ہونے کے بعد حضور ﷺ معہ صحابہ کرامؓ مکہ سے روانہ ہوئے اور 27 ذی قعد کو مدینہ پہنچے۔ حضور ﷺ اپنے صحابہؓ کے ہم راہ دس رمضان المبارک 8 ہجری کو مدینہ سے روانہ ہوئے تھے۔ اس حساب سے آنحضور ﷺ تقریباً دو ماہ اور سترہ دن مدینہ منورہ سے باہر رہے۔

تنظیم زکوٰۃ

فتح مکہ کے بعد تقریباً تمام عرب اسلام کے زیر نگیں آ گیا تھا۔ اب حالات کا تقاضا تھا کہ اسلامی سلطنت کے نظم و نسق کی طرف توجہ کی جائے۔ آنحضور ﷺ نے مکہ مکرمہ سے واپس مدینہ منورہ پہنچتے ہی ادھر توجہ فرمائی اور 9 ہجری کے شروع ہوتے ہی مختلف قبائل سے صدقات و زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے آپ ﷺ عُمّال بھیجتے رہے۔ وفود کا استقبال فرماتے رہے، اور جن لوگوں کو اسلام کو تسلیم کرنے میں تکبر مانع تھا، انھیں سرنگوں کرنے کے لیے سرایا روانہ کرتے رہے۔ پہلے یہاں ان عُمّال کی فہرست دی جا رہی ہے جو 9 ہجری کا ہلال محرم طلوع ہوتے ہی آپ ﷺ نے قبائل کے پاس صدقات و زکوٰۃ کی وصولی کے لیے روانہ فرمائے۔ یہ سارے عُمّال محرم ہی میں روانہ نہیں کر دیئے گئے تھے، بلکہ بعض کی روانگی اس کے بعد بھی ہوتی رہی جیسے:

	عامل	قبیلہ / مقام
1-	عیینہ بن حصنؓ فزاری	بنو تمیم کی طرف
2-	یزید بن الحصینؓ	بنو اسلم و غفار
3-	عباد بن بشر اشہلیؓ	سلیم و مزینہ
4-	رافعؓ بن مکیث	بنو جہینہ
5-	عمروؓ بن العاص	بنو فزارہ
6-	ضحاک ابن سفیانؓ	بنو کلاب
7-	بشیر بن سفیانؓ	بنو کعب
8-	عبداللہ ابن اللتبیہ ازدی	بنو ذبیان
9-	مہاجر بن ابی اُمیہ	صنعاء
10-	زیاد بن لبید انصاری	حضرموت
11-	عدیؓ بن حاتم	بنو طے اور بنو اسد
12-	مالکؓ بن نویرہ	بنو حنظلہ
13-	علاء بن حضرمیؓ	بحرین
14-	علیؓ بن ابی طالب	نجران
15-	زبرقانؓ بن بدر	بنو سعد
16-	قیس بن عاصم	بنو اسد
17-	بریدہؓ بن حصیب	بنو اسلم

آنحضور ﷺ اعمال کو روانگی کے وقت ہدایت فرمایا کرتے کہ لوگوں کے اچھے اور معیاری مال لینے سے گریز کرو۔ مسلمانوں سے فرماتے کہ جب عمال تمھارے پاس آئیں تو انھیں اور اپنے مال کو آزاد چھوڑ دو۔ اگر انھوں نے عدل سے کام لیا تو اپنے لیے، اور اگر زیادتی کی تو ان پر وبال ہوگا۔

عبداللہ بن اللتبیہ ازدی کو آزاد کر کے بنی ذبیان کا عامل مقرر فرمایا۔ جب وہ لوٹ کر آئے تو زکوٰۃ کا مال علیحدہ رکھا اور کچھ حصہ اپنے لیے جدا رکھا اور عرض کیا، یہ مجھے بطورِ ہدیہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ سن کر حضور ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: "ایک شخص آیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ مال تمھارا ہے اور یہ ہدیہ میرے واسطے ہے۔ وہ اپنے ماں باپ کے گھر کیوں نہ بیٹھ رہا، تاکہ معلوم ہو جاتا کہ اسے کون ہدیہ دیتا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی، جس کے قبضے میں میری جان ہے، جو بھی اس مال زکوٰۃ میں سے کچھ لے گا، تو وہ قیامت میں اسے اٹھا کر لائے گا۔ اگر وہ اونٹ ہوگا تو بلبلائے گا، گائے ہوگی تو آواز دے گی، اور اگر بکری ہوگی تو ممیائے گی۔"

اس ارشاد کے بعد دونوں ہاتھ اٹھائے اور فرمایا: "الٰہی! میں تیری تبلیغ کر چکا۔ الٰہی میں تیری تبلیغ کر چکا۔"

سریہ عیینہ بن حصن

آنحضور ﷺ نے حضرت بشر بن سفیان عدویؓ کو صدقات کی وصولی کے لیے

روانہ فرمایا۔ لوگ زکوٰۃ دینے کے لیے تیار ہو گئے، مگر بنو تمیم مزاحم ہوئے اور کہا: ''خدا کی قسم، یہاں سے ایک اونٹ بھی نہ جائے گا۔'' پھر تلواریں سونت کر لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت بشرؓ یہ حال دیکھ کر واپس آ گئے۔ اس پر آپ ﷺ نے حضرت عیینہ بن حصنؓ فزاری کو پچاس سواروں کے ساتھ بنو تمیم کی طرف روانہ فرمایا۔ یہ لوگ جحفہ سے سترہ میل کے فاصلے پر مقام سقیا میں رہتے تھے۔ حضرت عیینہؓ نے رات کو وہاں پہنچ کر ان لوگوں پر چھاپہ مارا۔ گیارہ مرد، اکیس عورتیں اور تیس بچے گرفتار کر کے مدینہ لے آئے۔ آخر بنی تمیم نے مجبور ہو کر دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد حضور ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا، جس میں عطارد بن حاجب، زبرقان بن بدر، قیس بن عاصم اور اقرع بن حابس بھی تھے۔ جب یہ لوگ مدینہ پہنچے تو حضور ﷺ کے حجرۂ مبارک کے پیچھے کھڑے ہو کر آپ ﷺ کو آوازیں دینے لگے:

''اے محمد ﷺ، باہر آؤ تا کہ ہم آپ ﷺ سے مفاخرہ اور شاعری میں مقابلہ کریں۔ ہماری مدح زینت ہے اور ہماری مذمّت عیب ہے۔''

ان لوگوں کا ایسی بے عقلی سے پکارنا اور آواز دینا اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوا۔ چنانچہ اس بدتمیزی سے پکارنے کی ممانعت میں سورۂ الحجرات کی آیات 4 اور 5 نازل ہوئیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''اے نبی ﷺ، جو لوگ تمھیں حُجروں کے باہر سے پکارتے ہیں، ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ اگر وہ تمھارے برآمد ہونے تک صبر کرتے تو انھی کے لیے بہتر تھا، اللہ درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔''

بہر کیف حضور ﷺ حجرے سے باہر تشریف لائے اور اسی وقت حضرت بلالؓ نے ظہر کی اذان دی۔ حضور ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے۔ نمازِ ظہر پڑھنے کے بعد حضور ﷺ مسجد کے صحن میں تشریف فرما ہوئے۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہم مفاخرت کے لیے آئے ہیں۔ آپ ﷺ ہمارے خطیب اور شاعر کو کچھ کہنے کی اجازت دیجیے۔ حضور ﷺ نے اجازت فرمائی۔ وفد بنو تمیم کے عطارد بن حاجب نے خطبہ پڑھا جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''حمد ہے اس ذات پاک کی، جس نے ہمیں فضیلت دی، اور بادشاہ بنایا اور مال و دولت دی، جسے ہم نیک کاموں میں صرف کرتے ہیں، اور ہمیں اہلِ مشرق میں سے سب سے زیادہ عزت والا اور کثرت والا اور قوت و شوکت والا بنایا۔ پس لوگوں میں ہم جیسا کون ہے۔ کیا ہم لوگوں کے سردار اور اُن سے بالاتر نہیں۔ پس جو ہم سے فخر میں مقابلہ کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ ہمارے جیسے مفاخر اور مناقب شمار کرے، جیسے ہم نے اپنے مفاخر بیان کیے ہیں، اور اگر ہم چاہیں تو اپنے مفاخر کے بارے میں طویل تقریر کر سکتے ہیں، لیکن ہمیں اپنے مفاخر بیان کرنے سے شرم آتی ہے۔ میں نے یہ اس لیے کہا ہے کہ اگر کوئی اس کے مثل یا اس سے بہتر لا سکے تو لائے۔''

جب عطارد بن حاجب خطبہ دے کر بیٹھ گیا تو آنحضور ﷺ کے حکم سے حضرت ثابت بن قیس بن شماسؓ انصاری کھڑے ہوئے اور فرمایا: ترجمہ: ''حمد ہے اس ذات پاک کی، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور اپنا حکم اس میں جاری کیا۔ اس کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ جو کچھ بھی ہے، وہ اس کے فضل سے ہے۔ پھر اس کی قدرت نے ہمیں بادشاہ بنا دیا اور بہترین خلائق رسول ﷺ بنا کر بھیجا، جو تمام مخلوق میں حسب و نسب میں سب سے بڑھ کر ہے اور اللہ نے ان پر ایک کتاب نازل کی اور انھیں تمام مخلوق پر امین بنایا۔ پس وہ تمام جہانوں میں سب سے زیادہ اللہ کے پسندیدہ بندے ہیں۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ نے تمام لوگوں کو ایمان کی دعوت دی۔ پس اس رسول ﷺ پر سب سے پہلے مہاجرین ایمان لائے جو آپ ﷺ کے قوم کے لوگ ہیں اور آپ ﷺ کے رشتہ دار ہیں اور حسب و نسب اور وجاہت میں سب سے بڑھ کر ہیں اور افعال و اعمال کے اعتبار سے بھی سب سے بہتر ہیں۔ پھر مہاجرین کے بعد ہم انصار رسول کریم ﷺ کی دعوت قبول کرنے میں اور لوگوں سے مقدم ہیں۔ ہم انصار اللہ کے دین کے مددگار ہیں اور رسول ﷺ اللہ کے وزیر ہیں۔ ہم لوگوں سے اُس وقت تک جہاد و قتال کرتے ہیں کہ جب تک وہ ایمان نہ لائیں، لیکن جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آئے، اس نے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا۔ اور جس نے کفر کیا، اس سے ہم خدا کی راہ میں جہاد و قتال کریں گے اور اس کا قتل ہم پر آسان ہے۔ مجھے یہی کہنا تھا اور میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمام مؤمنین اور مؤمنات کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں، والسلام۔''

جب حضرت ثابت بن قیسؓ انصاری خطبہ دے کر بیٹھے تو بنو تمیم کا شاعر زبرقان بن بدر کھڑا ہوا اور اپنے قومی فخر و مباہات کا قصیدہ پڑھا۔ حضور ﷺ نے حسان بن ثابت کو جواب دینے کا حکم دیا۔ انھوں نے فی البدیہ جواب میں ایک زبردست قصیدہ پڑھا۔ وفد تمیم کے ایک رکن اقرع بن حابس نے کہا: ''بخدا، رسول اللہ کا خطیب ہمارے خطیب سے اور حضور ﷺ کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے۔''

پھر سب نے اسلام قبول کر لیا۔ رسول اللہ نے انھیں بہترین تحائف سے نوازا اور ان کی عورتیں اور بچے واپس کر دیئے۔

سریہ قطبہ بن عامرؓ

صفر 9 ہجری میں آنحضور ﷺ نے قطبہ بن عامرؓ کو بیس آدمیوں کے ساتھ مقام تبالہ کی طرف بھیجا، جہاں خثعم کا ایک قبیلہ رہتا تھا۔ مجاہدین نے وہاں پہنچ کر ایک شخص کو پکڑا اور اس سے کچھ باتیں دریافت کیں۔ وہ شخص پہلے تو گونگا بن گیا، مگر تھوڑی دیر بعد چیخ چیخ کر اپنے لوگوں کو متنبہ کرنے لگا۔ مجاہدین اسے قتل کر کے وہیں ٹھہرے رہے۔ جب قبیلے کے لوگ سو گئے تو مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ بڑی خون ریز لڑائی ہوئی۔ فریقین کے کافی لوگ زخمی و قتل ہوئے۔ مسلمانوں کے امیر حضرت قطبہ بن عامرؓ نے بھی جامِ شہادت نوش کیا۔ آخر مجاہدین نے دشمن پر غلبہ حاصل کر لیا اور ان کی عورتیں، اونٹ اور بکریاں پکڑ کر مدینہ لے آئے۔

سریہ ضحاک بن سفیان کلبی

نبی مکرم ﷺ نے ربیع الاول 9 ہجری میں ضحاک بن سفیانؓ بن عوف کلبی

دت میں مسلمانوں کی ایک جماعت بنوکلب کی طرف بھیجی۔ اس جماعت میں اسیدؓ سلمہ بھی شامل تھے۔ زج کے مقام پر فریقین کے درمیان جنگ میں کفار کو شکست ئی۔ اس مقام پر ایک کنواں تھا۔ اس پر حضرت اصید بن مسلمہؓ اپنے والد سلمہ سے ملے۔ حضرت اسیدؓ نے سلمہ کو اسلام کی دعوت دی، مگر سلمہ نے اس کے جواب میں حضرت اسیدؓ اور ان کے دین کو گالی دی۔ اس پر حضرت اسیدؓ نے سلمہ کے گھوڑے پر وار سے وار کیا۔ گھوڑا گر گیا اور خود سلمہ نیزے کے بل پانی پر جا پڑا۔ حضرت اسیدؓ نے اپنے والد کو وہیں روکے رکھا، حتیٰ کہ ایک دوسرے مسلمان نے آگے بڑھ کر اسے قتل کر دیا۔

سریہ علقمہ بن مجزز مدلجیؓ

رسول اللہ ﷺ کو خبر ملی کہ جدہ میں کچھ حبشی آئے ہیں، جو بحری ڈاکو ہیں اور مدینہ پر حملے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ حضور ﷺ نے تین سو آدمیوں کے ساتھ علقمہؓ کو ان حبشیوں کے تعاقب میں روانہ فرمایا۔ حبشیوں کو جب مسلمانوں کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بھاگ گئے اور جزیرے میں جا کر کہیں روپوش ہو گئے۔

مسلمان جب وہاں سے واپس آئے تو فوج کے کچھ لوگوں نے واپسی میں عجلت کی۔ حضرت علقمہؓ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے آگ جلا کر عجلت کرنے والے مسلمانوں کو اس میں کود جانے کا حکم دیا۔ بعض اصحاب جب تعمیل حکم پر آمادہ ہو گئے، تو حضرت علقمہؓ نے اسے محض مذاق کہ کر انھیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ ان لوگوں میں عبداللہ بن حذافہ القرشیؓ بھی تھے۔ مدینہ واپس پہنچ کر جب مسلمانوں نے اس بات کا ذکر حضور ﷺ کی خدمت میں کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو تمھیں معصیت کا حکم دے۔ اس کا حکم نہ مانو۔ یہ سریہ ربیع الثانی 9۔ ہجری میں روانہ کیا گیا تھا۔

سریہ بنو طے

یہ سریہ بھی اسی ماہ میں آنحضور ﷺ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کو ڈیڑھ سو مجاہدین کے ساتھ قبیلہ طے کا مشہور بت قلس (کلیسا) منہدم کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔ مسلمانوں نے وہاں پہنچ کر فجر کے وقت قبیلہ طے پر حملہ کیا اور بت خانہ منہدم کر کے عورتیں، اونٹ اور بکریاں گرفتار کر لیں۔ قیدی عورتوں میں مشہور سخی حاتم طائی کی بیٹی سفانہ بھی تھیں۔ ان کے بھائی عدی بن حاتم لشکرِ اسلام کی خبر سنتے ہی شام بھاگ گئے تھے۔

قیدی گرفتار کر کے جب مدینہ لائے گئے تو مسجد کے قریب خطیرہ میں اتارے گئے۔ آنحضور ﷺ جب ادھر سے گزرے تو حاتم طائی کی بیٹی نے کھڑے ہو کر عرض کیا: ''یارسول اللہ، میرے والد کا انتقال ہو گیا اور خبر گیر چھوڑ کر غائب ہو گیا۔ میں ضعیفہ ہوں اور کسی خدمت کے لائق نہیں۔ مجھ پر احسان فرمایئے۔ خدا آپ ﷺ پر احسان کرے گا۔'' حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تیرا خبر گیر اور سرپرست کون تھا؟ سفانہ نے عرض کیا: ''میرا بھائی عدی بن حاتم۔'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''وہی جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بھاگا ہے۔ اچھا، میں تجھ پر احسان کرتا ہوں۔ مگر جانے میں جلدی نہ کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری قوم کا کوئی قابل اطمینان شخص مل جائے تو اس کے ہم راہ تمھیں بھیج دوں۔'' چنانچہ دو تین ہی روز کے بعد قبیلہ طے کے کچھ آدمی مل گئے جو شام جا رہے تھے۔ حضور ﷺ نے از راہ لطف و کرم زاد سفر، سواری اور کچھ جوڑے دے کر انھیں رخصت کیا۔ سفانہ بنت حاتم مشرف بہ اسلام ہو گئیں، اور حضور ﷺ کی عنایات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کرنے لگیں: ''خدا کرے وہ ہاتھ تیرا ہمیشہ شکر گزار رہے، جو خوشحالی کے بعد فقیر اور خالی ہو، اور وہ ہاتھ آپ ﷺ پر کبھی قابو نہ پائے جو فقر کے بعد امیر ہوا ہو اور خدا کرے آپ ﷺ کو کبھی کسی کمینہ سے کوئی ضرورت نہ پیش آئے اور خدا کسی شریف کی نعمت سلب نہ کرے، مگر آپ ﷺ کو اس کی واپسی کا وسیلہ اور ذریعہ بنائے۔''

سفانہ جب شام پہنچ کر اپنے بھائی سے ملی اور تمام حالات بیان کیے تو عدی بن حاتم نے اپنے متعلق بہن کی رائے پوچھی۔ سفانہ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم، میں یہ مناسب سمجھتی ہوں کہ تم جلد از جلد جا کر ان سے ملو۔ اگر وہ نبی ہیں تو ان کی طرف دوڑنا اور سبقت کرنا باعث فضیلت ہے، اور اگر بادشاہ ہیں تو ہمیشہ کے لیے باعثِ عزت ہے، اور تُو تُو، تُو ہی ہے۔''

عدی بن حاتم نے یہ سن کر کہا: ''خدا کی قسم، رائے تو یہی ہے۔''

بعد ازاں عدی بن حاتم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

غزوۂ تبوک

رومی سلطنت کے ساتھ کشمکش کی ابتدا فتح مکہ سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ آنحضور ﷺ نے حدیبیہ کے بعد اسلام کی دعوت پھیلانے کے لیے جو وفود عرب کے مختلف حصوں میں بھیجے تھے، ان میں سے ایک شمال کی طرف سرحدِ شام سے متصل قبائل میں بھی گیا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر عیسائی تھے اور رومی سلطنت کے زیر اثر تھے۔ ان لوگوں نے ذات اطلح کے مقام پر اس وفد کے پندرہ آدمیوں کو قتل کر دیا اور صرف رئیس وفد کعب بن عمیر غفاری بچ کر واپس آئے۔ اسی زمانے میں حضور ﷺ نے بصریٰ کے رئیس شرجیل بن عمرو کے نام بھی اسلامی دعوت کا پیغام بھیجا تھا، مگر اس نے آپ ﷺ کے ایلچی حارث بن عمیر کو قتل کر دیا۔ یہ رئیس بھی عیسائی تھا اور براہ راست قیصرِ روم کے احکام کا تابع تھا۔

ان وجوہ سے آنحضور ﷺ نے جمادی الاول 8۔ ہجری میں تین ہزار مجاہدین کا ایک لشکر سرحد شام کی طرف بھیجا، تاکہ آیندہ کے لیے یہ علاقہ مسلمانوں کے لیے پرامن ہو جائے اور یہاں کے لوگ مسلمانوں کو بے زور سمجھ کر ان پر زیادتی کرنے کی جرات نہ کریں۔ یہ فوج جب معان کے قریب پہنچی تو معلوم ہوا کہ شرجیل بن عمرو ایک لاکھ کا لشکر لے کر مقابلے پر آ رہا ہے۔ خود قیصر روم حمص کے مقام پر موجود ہے اور اس نے اپنے بھائی تھیوڈور کی قیادت میں ایک لاکھ کی مزید فوج روانہ کی ہے، لیکن ان خوفناک اطلاعات کے باوجود تین ہزار سرفروشوں کا یہ مختصر دستہ آگے بڑھتا چلا گیا اور

موتہ کے مقام پر شرجیل کی ایک لاکھ فوج سے جا ٹکرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مجاہدین اسلام بالکل پس جاتے، لیکن سارا عرب اور تمام شرق اوسط یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور 33 کے اس مقابلے میں بھی کفار مسلمانوں پر غالب نہ آ سکے۔ یہی چیز تھی جس نے شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد عربی قبائل کو، بلکہ عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل کو بھی، جو کسریٰ (خسرو) کے زیر اثر تھے، اسلام کی طرف متوجہ کر دیا اور وہ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بنی سلیم (جن کے سردار عباس بن مرداس تھے) اور اشجع اور غطفان اور ذبیان اور فزارہ قبائل اسی زمانے میں داخل اسلام ہوئے۔ اور اسی زمانے میں سلطنت روم کی عربی فوجوں کا ایک کمانڈر فروہ بن عمرو جذامی مسلمان ہوا، جس نے اپنے ایمان کا ایسا زبردست ثبوت دیا کہ گرد و پیش کے سارے علاقے اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ قیصر کو جب فروہ کے قبول اسلام کی اطلاع ملی تو اس نے انھیں گرفتار کرا کے اپنے دربار میں بلوایا اور ان سے کہا کہ دو چیزوں میں سے ایک کو منتخب کر لو۔ یا ترک اسلام، جس کے نتیجے میں تمھیں نہ صرف رہا کیا جائے گا، بلکہ تمھیں اپنے عہدے پر بھی بحال کر دیا جائے گا، یا اسلام جس کے نتیجے میں تمھیں سزائے موت دی جائے گی۔ انھوں نے ٹھنڈے دل سے اسلام کو چن لیا اور راہ حق میں جان دے دی۔ یہی واقعات تھے جنھوں نے قیصر کو اس ''حقیقی خطرے'' کی اہمیت محسوس کرائی جو عرب سے اٹھ کر اس کی سلطنت کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دوسرے ہی سال قیصر نے مسلمانوں کو غزوۂ موتہ کی سزا دینے کے لیے شام کی سرحد پر فوجی تیاریاں شروع کر دیں اور اس کے ماتحت غسانی اور دوسرے عرب سردار فوجیں اکٹھی کرنے لگے۔ حضور ﷺ اس سے بے خبر نہ تھے۔ آپ ﷺ ہر وقت ہر اس چھوٹی سے چھوٹی بات سے بھی خبردار رہتے تھے، جس کا اسلامی تحریک پر کچھ بھی موافق یا مخالف اثر پڑتا ہو۔ آپ ﷺ نے ان تیاریوں کے معنی فوراً سمجھ لیے اور بغیر کسی تامل کے قیصر روم کی عظیم الشان طاقت سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس موقع پر ذرہ برابر بھی کم زوری دکھائی جاتی تو سارا بنا بنایا کام بگڑ جاتا۔ ایک طرف عرب کی دم توڑتی ہوئی جاہلیت، جس پر حنین میں آخری ضرب لگائی جا چکی تھی، پھر جی اٹھتی۔ دوسری طرف مدینہ کے منافقین، جو ابو عامر راہب کے ذریعے غسان کے عیسائی بادشاہ اور خود قیصر کے ساتھ اندرونی ساز باز رکھتے تھے، اور جنھوں نے اپنی ریشہ دوانیوں پر دین داری کا پردہ ڈالنے کے لیے مدینہ سے متصل ہی ''مسجد ضرار'' تعمیر کر رکھی تھی، بغل میں چھرا گھونپ دیتے۔ سامنے سے قیصر، جس کا دبدبہ ایرانیوں کو شکست دینے کے بعد تمام دور و نزدیک کے علاقوں پر چھا گیا تھا، حملہ آور ہو جاتا۔ اور ان تین زبردست خطروں کی متحدہ یورش میں اسلام کی جیتی ہوئی بازی یکایک مات کھا جاتی۔ اس لیے باوجود اس کے کہ ملک میں قحط سالی تھی، گرمی کا موسم پورے شباب پر تھا، فصلیں پکنے کے قریب تھیں، سواریوں اور سروسامان کا انتظام سخت مشکل تھا، سرمایے کی بہت کمی تھی اور دنیا کی دو سب سے بڑی طاقتوں میں سے ایک کا مقابلہ درپیش تھا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے یہ دیکھ کر کہ یہ دعوت حق کے لیے زندگی و موت کے فیصلے کی گھڑی ہے، اسی حال میں جنگ کی تیاری کا اعلان عام کر دیا۔ پہلے تمام غزوات میں تو حضور ﷺ کا قاعدہ تھا کہ آخر وقت تک کسی کو نہ بتاتے تھے کہ کدھر جانا ہے اور کس سے مقابلہ درپیش ہے، بلکہ مدینہ سے نکلنے کے بعد بھی منزل مقصود کی طرف سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے پھیر کی راہ سے تشریف لے جاتے تھے، لیکن اس موقع پر آپ ﷺ نے یہ پردہ بھی نہ رکھا اور صاف صاف بتا دیا کہ روم سے مقابلہ ہے اور شام کی طرف جانا ہے۔

اس موقع کی نزاکت کو عرب میں سب ہی محسوس کر رہے تھے۔ قدیم جاہلیت کے بچے کھچے عاشقوں کے لیے یہ ایک آخری شعاع امید تھی اور روم و اسلام کی اس ٹکر کے نتیجے پر وہ بے چینی کے ساتھ نگاہیں لگائے ہوئے تھے، کیوں کہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ اس کے بعد پھر کہیں سے امید کی جھلک نہیں دکھائی دے گی۔ منافقین نے بھی اپنی آخری بازی اسی پر لگا دی تھی اور وہ اپنی مسجد ضرار بنا کر اس انتظار میں تھے کہ شام کی جنگ میں اسلام کی قسمت کا پانسہ پلٹے تو ادھر اندرون ملک میں وہ اپنے فتنہ کا پرچم بلند کریں۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس مہم کو ناکام کرنے کے لیے تمام ممکن تدبیریں بھی استعمال کر ڈالیں۔ ادھر مومنین کو بھی پورا احساس تھا کہ جس تحریک کے لیے وہ بائیس سال سے سر بکف رہے ہیں، اس وقت اس کی قسمت ترازو میں ہے۔ اس موقع پر جرأت دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ اس تحریک کے لیے ساری دنیا پر چھا جانے کا دروازہ کھل جائے، اور کم زوری دکھانے کے معنی یہ ہیں کہ عرب میں بھی اس کی بساط الٹ جائے۔ چنانچہ اسی احساس کے ساتھ ان فدایانِ حق نے انتہائی جوش و خروش سے جنگ کی تیاری کی۔ سروسامان کی فراہمی میں ہر ایک نے اپنی بساط سے بڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوف نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی عمر بھر کی کمائی کا نصف حصہ لا کر رکھ دیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری پونجی مدد کر دی۔ حضور ﷺ نے اپنے رفیق غار سے پوچھا: ''کیا اپنے اہل و عیال کے لیے بھی کچھ چھوڑا ہے؟'' حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''بس اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت۔'' غریب صحابیوں نے محنت مزدوری کر کر کے جو کچھ کمایا، حاضر کر دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور اتار اتار کر دے دیئے۔ سرفروش والنٹیروں کے لشکر ہر طرف سے اُمنڈ اُمنڈ کر آنے شروع ہوئے اور انھوں نے تقاضا کیا کہ اسلحہ اور سواریوں کا انتظام ہو تو ہماری جانیں قربان ہونے کو حاضر ہیں۔ جنھیں سواریاں نہ مل سکیں وہ روتے تھے اور اپنے اخلاص کی بے تابیوں کا اظہار اس طرح کرتے تھے کہ رسول پاک ﷺ کا دل بھر آتا تھا۔ انھی لوگوں کی شان میں سورہ توبہ کی آیت 92 نازل ہوئی۔ ترجمہ: ''ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض کا موقع نہیں ہے، جنھوں نے خود آ کر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں، اور جب تم نے کہا کہ میں تمھارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انھیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی قدرت نہیں رکھتے۔''

منافقین اپنی چالوں میں مصروف تھے۔ وہ اکثر اپنی مجلسوں میں بیٹھ کر رسولِ کریم ﷺ اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے اور اپنی تضحیک سے ان لوگوں کی ہمتیں پست کرنے کی کوشش کرتے تھے، جنھیں وہ نیک نیتی کے ساتھ جہاد پر آمادہ پاتے۔ چنانچہ روایات میں ان لوگوں کے بہت سے اقوال منقول ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک محفل میں چند منافق بیٹھے گپ لڑا رہے تھے۔ ایک نے کہا: ''اجی کیا رومیوں کو بھی تم نے کچھ عربوں کی طرح سمجھ رکھا ہے؟ کل دیکھ لینا کہ یہ سب سورما جو لڑنے کے لیے تشریف لائے ہیں، رسیوں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔'' دوسرا بولا: ''مزا ہو جو اوپر سے سو سو کوڑے بھی لگانے کا حکم ہو جائے۔'' ایک اور منافق نے حضور ﷺ کو جنگ کی سرگرم تیاریاں کرتے دیکھ کر اپنے یار دوستوں سے کہا: ''آپ ﷺ کو دیکھیے، آپ ﷺ روم و شام کے قلعے فتح کرنے چلے ہیں۔'' ایک منافق کے متعلق مروی ہے کہ اس نے اپنے عزیزوں میں سے ایک مسلمان نوجوان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے کہا: ''اگر واقعی سب کچھ برحق ہے جو یہ شخص (یعنی نبی ﷺ) پیش کرتا ہے تو ہم سب گدھوں سے بھی بدتر ہیں۔''

جو منافق بہانے کر کر کے پیچھے ٹھہر جانے کی اجازت مانگ رہے تھے، ان میں سے بعض ایسے بے باک بھی تھے جو راہ خدا سے قدم پیچھے ہٹانے کے لیے مذہبی و اخلاقی نوعیت کے حیلے تراشتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص جد بن قیس نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کیا کہ میں ایک حسن پرست آدمی ہوں۔ میری قوم کے لوگ میری اس کمزوری سے واقف ہیں کہ عورت کے معاملے میں مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں رومی عورتوں کو دیکھ کر میرا قدم پھسل نہ جائے۔ لہٰذا آپ ﷺ مجھے فتنے میں نہ ڈالیں اور اس جہاد کی شرکت سے مجھے معذور رکھیں۔'' ایسے ہی لوگوں کے بارے میں سورۂ توبہ کی آیت میں آیا ہے: ''ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ مجھے رخصت دے دیجیے اور مجھے فتنے میں نہ ڈالیے۔ سن رکھو، فتنے ہی میں تو یہ لوگ پڑے ہوئے ہیں اور جہنم نے ان کافروں کو گھیر رکھا ہے۔''

منافقین جہاد سے بے رغبتی پھیلانے کے لیے کہتے پھرتے تھے۔ شدت کی گرمی ہے۔ راستے میں مرکھپ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا: ''اور انھوں نے کہا، گرمی میں جنگ کے لیے نہ نکلو۔ آپ ﷺ کہہ دیجیے، جہنم کی آگ زیادہ گرم ہے۔ اگر وہ سمجھیں تو ہنسیں کم اور روئیں زیادہ۔ یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔'' (سورہ توبہ۔ آیت 81، 82)

کچھ منافقین سویلم نامی یہودی کے مکان میں جمع ہوئے اور لوگوں کو غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہونے کی ترغیب دی۔ سویلم یہودی کا مکان جاسوم کے پاس تھا۔ آنحضور ﷺ نے اس اطلاع پر حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کو چند آدمیوں کے ساتھ بھیجا کہ وہ بیت سویلم کو آگ لگا دیں۔ صحابہؓ نے وہاں پہنچ کر جب اس مکان کو نذرِ آتش کیا تو ضحاک بن خلیفہ نے دیوار پھاند کر بھاگنے کی کوشش کی، جس سے اس کا پاؤں ٹوٹ گیا، مگر اس کے دوسرے ساتھی کود کر بھاگ گئے۔

بعض منافقین نے بناوٹی عذرات پیش کر کے نبی ﷺ سے رخصت مانگی تھی اور حضور ﷺ نے بھی اپنی طبعی بردباری کی بنا پر یہ جاننے کے باوجود کہ وہ محض بہانے کر رہے ہیں، انھیں رخصت عطا فرما دی تھی۔ اسے اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں فرمایا اور آپ ﷺ کو تنبیہ کی کہ ایسی نرمی مناسب نہیں ہے۔ سورہ توبہ کی آیت 43 اور 44 میں آیا ہے: ''اے نبی ﷺ، اللہ تمھیں معاف کرے، تم نے کیوں انھیں رخصت دے دی؟ (تمھیں چاہیے تھا کہ خود رخصت نہ دیتے) تاکہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انھیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔''

مکمل تیاری کے بعد اب تبوک کی جانب روانگی کا وقت آ گیا تھا۔ تبوک مدینہ سے دمشق کی راہ پر تقریباً وسط میں واقع ہے۔ مدینہ سے کم و بیش 700 کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ یہ اس وقت سعودی عرب کا شام کی سرحد پر تقریباً آخری حصہ ہے جو مقامِ تیما سے 30 میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اب بھی تبوک ہی کے نام سے موسوم ہے۔ آنحضور ﷺ کے زمانہ مبارک میں اس علاقے سے دوسری طرف بزنطینی (رومی) سلطنت کی حد شروع ہو جاتی تھی۔ گویا تبوک اسلامی سلطنت اور بزنطینی سلطنت کا سرحدی شہر تھا۔ غزوۂ تبوک کو اور بھی کئی ناموں سے یاد کیا جاتا ہے، جیسے ''جیشِ عُسرت''، ''غزوۃ العُسر'' اور ''غزوۂ فاضحہ۔''

غزوۂ فاضحہ اس لیے کہ اس کے دوران میں منافقین کی فضیحت ہوئی اور وہ خوب پہچانے گئے۔

غزوۃ العُسر، اس لیے کہ پانی، خوراک اور اونٹوں کی سخت کمی تھی۔ تنگی و عسرت کا یہ عالم تھا کہ اٹھارہ مجاہدوں میں ایک اونٹ تھا۔ باری باری سواری کرتے تھے۔ پانی کی قلت کی وجہ سے جان بچانے کے لیے اونٹ ذبح کر کے ان کی اوجھ میں جمع شدہ پانی سے منہ تر کیا جاتا۔ کرم خوردہ کھجور، گھن لگے جو، بدبودار چربی اور درختوں کے پتوں پر گزر اوقات کرتے۔

''جیشِ عسرت'' کہنے کی یہ وجہ بھی ہے کہ قحط کے دن تھے۔ موسم شدید گرمی کا تھا۔ نئی فصل کے پھلوں کے پکنے اور کھجور اتارنے کے دن تھے۔ ایسے سخت حالات میں حضور ﷺ نے اہل ایمان کو جہاد کے لیے نکلنے کا حکم دیا۔

مدینہ کی آبادی سے باہر فوج جمع ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضور ﷺ کی عدم موجودگی میں نماز میں امامت کے فرائض انجام دیئے، کیوں کہ آپ ﷺ تاحال مدینے میں داخلی نظام سے متعلق اہتمام فرما رہے تھے۔ آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہؓ کو اپنی غیر حاضری کے دوران میں اپنا خلیفہ مقرر کیا اور حضرت علیؓ کو بھی اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ ازواجِ مطہرات اور دیگر اہلی و عائلی معاملات کی نگہداشت رکھیں۔ ان ہر دو صحابہ کو آپ ﷺ نے مناسب ہدایات دیں۔ بعد ازاں آپ ﷺ فوج میں تشریف لائے اور ان کی امارت کی باگ ڈور سنبھالی۔ عبداللہ بن

ابی اپنے قبیلے کے کچھ آدمیوں کو لے کر فوج میں شامل ہونے کے لیے آیا، لیکن آپ ﷺ نے اسے اور ان کے آدمیوں کو فوج میں شامل نہ کیا، کیوں کہ آپ ﷺ کو اس پر اعتماد نہ تھا، اور نہ آپ ﷺ اس کے ایمان و اسلام کی صحت سے مطمئن تھے۔

حضور ﷺ کے ساتھ تیس ہزار صحابہؓ اور دس ہزار گھوڑے تھے۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ سے چل کر ثنیۃ الوداع میں قیام کیا اور فوج کا مقدمہ، میمنہ اور میسرہ مرتب کیے اور علَم تقسیم فرمائے۔ مخلص مسلمانوں میں سے بھی چند صحابہؓ اس غزوے میں شرکت سے رہ گئے تھے۔ ایسے صحابہؓ کی تعداد پانچ ہے۔ ان کے نام یہ ہیں: کعب بن مالکؓ، ہلال بن امیہؓ، مرارہ بن ربیعؓ، ابوخیثمہؓ اور ابوذر غفاریؓ۔ ان صحابہؓ میں سے ابوخیثمہؓ اور ابوذر غفاریؓ بعد میں جا کر شریک ہو گئے، لیکن تین صحابیؓ نہ گئے۔ ان تینوں کی عدم شرکت ان کے لیے کسی قدر پریشانی کا سبب بنی (اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا)۔

لشکر اسلام منافقین کی ریشہ دوانیوں کے باوجود تبوک کے لیے روانہ ہو گیا اور اگر چہ منافقین اپنا سا منہ لے کر رہ گئے تھے۔ تاہم انھیں اپنے کیے پر کوئی ندامت نہ ہوئی اور حضرت علیؓ کے متعلق (جو اہل بیت کی نگہداشت کے لیے پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے) کہنا شروع کیا کہ نبی ﷺ کو علیؓ کی طرف سے کچھ گرانی تھی، اس لیے انھیں یہاں ہی چھوڑ دیا۔ حضرت علیؓ کو جب منافقین کے اس پروپیگنڈے کا علم ہوا تو آپ ﷺ فوراً مسلح ہو کر مقام جرف پہنچے اور رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر منافقین کے پروپیگنڈے کا ذکر کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ منافقین جھوٹ کہتے ہیں۔ میں نے تمھیں اس لیے چھوڑا تھا کہ میرے اہل اور اپنے اہل میں میرے قائم مقام رہو۔ پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اے علیؓ! کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ تم میرے لیے ایسے بنو جیسے ہارون موسیٰؑ کے لیے، البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔'' یہ ارشاد نبوی سننے کے بعد حضرت علیؓ مطمئن ہو کر اسی مقام سے مدینہ واپس آ گئے۔

تبوک کی راہ میں لشکر کا گزر حجر یعنی دیار ثمود سے ہوا۔ ثمود وہ قوم تھی جس نے وادیٔ القریٰ کے اندر چٹانیں تراش تراش کر مکانات بنائے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے وہاں کے کنوئیں سے پانی لے لیا تھا، لیکن جب چلنے لگے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم یہاں کا پانی نہ پینا اور اس سے نماز کے لیے وضو نہ کرنا اور جو آٹا تم لوگوں نے گوندھ رکھا ہے، اسے جانوروں کو کھلا دو۔ خود نہ کھاؤ۔'' آپ ﷺ نے یہ بھی حکم دیا کہ لوگ اس کنوئیں سے پانی لیں جس سے صالحؑ کی اونٹنی پانی پیا کرتی تھی۔

جب رسولِ کریم ﷺ حجر سے گزرے تو فرمایا: ''ان ظالموں کی جائے سکونت میں داخل نہ ہونا کہ کہیں تم پر بھی وہی مصیبت نہ آن پڑے جو ان پر آئی تھی، ہاں مگر روتے ہوئے۔'' پھر آپ ﷺ نے اپنا سر ڈھکا اور تیزی سے چل کر وادی پار اتر گئے۔

جب اسلامی لشکر تبوک کے قریب پہنچا تو آپ ﷺ نے اہل لشکر کو ہدایت فرمائی کہ اگر کوئی شخص چشمہ تبوک پر پہلے پہنچ جائے تو وہ میرے پہنچنے تک پانی کو ہاتھ نہ لگائے۔ اتفاق سے وہاں دو شخص پہلے پہنچ گئے۔ رسول کریم ﷺ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ چشمے سے پانی کی ایک پتلی سی دھار بہہ رہی ہے۔ حضور ﷺ نے ان دو اشخاص سے پوچھا کہ کیا تم نے پانی کو ہاتھ لگایا ہے؟ دونوں نے اثبات میں جواب دیا۔ یہ سن کر حضور ﷺ ان سے ناراض ہوئے۔ پھر حضور ﷺ نے پانی کو تھوڑا تھوڑا کر کے جمع کیا اور اس سے ہاتھ منہ دھو کر، پھر اسے واپس چشمے میں پھینک دیا۔ قدرت حق سے چشمے میں پانی اس قدر زور سے بہنے لگا کہ سب لوگوں نے اس سے پیاس بجھائی اور اپنی ضروریات پوری کیں۔ آنحضور ﷺ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا: ''اے معاذ، اگر تمھاری عمر زیادہ ہوئی تو دیکھو گے کہ اس کے پانی سے یہاں تمام باغات بھر جائیں گے۔''

خطبۂ تبوک

تبوک کے قریب ایک رات سفر کی تھکن سے رسول کریم ﷺ دیر تک سوتے رہے۔ جب بیدار ہوئے تو سورج نیزے برابر بلند ہو چکا تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو آواز دی اور فرمایا: ''میں نے تمھیں نماز فجر کے لیے بیدار کرنے کو کہا تھا۔'' انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ، آپ ﷺ کی طرح مجھے بھی نیند نے غافل کر دیا۔ فوری طور پر وہاں سے کوچ فرمایا۔ کچھ دور جا کر اترے اور قضاء نماز ادا کی۔ پھر دن بھر چلتے رہے۔ دوسری صبح تبوک پہنچ کر آنحضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے سامنے ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد صرف پچاس فقروں پر مشتمل ہے۔ یہ حضور ﷺ کی پیغمبرانہ فصاحت وبلاغت کا شاہکار ہے۔ فصاحت ایسی کہ ہر لفظ ایک گوہر آبدار، بلاغت ایسی کہ انسانی فطرت کا کوئی گوشہ چھوٹنے نہیں پایا۔ اصل خطبہ ''زاد المعاد'' سے نقل کر کے ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد نے شائع کیا ہے۔ خطبے کا ترجمہ درج ذیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد ہوا:

1- بلاشبہ سب سے زیادہ سچی بات اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔
2- اور سب سے مضبوط حلقہ زنجیر تقویٰ کا ایک لفظ ہے۔
3- اور بہترین ملت، ابراہیمؑ کی ملت ہے۔
4- اور بہترین سنت، محمد ﷺ کی سنت ہے۔
5- اور سب سے اشرف بات اللہ کی یاد ہے۔
6- اور سب سے اچھا قصہ قرآن ہے۔
7- اور سب سے اچھا کام وہ ہے جو صحیح طور پر پوری توجہ کے ساتھ کیا جائے۔
8- اور سب سے برا کام وہ ہے جو اصل کام پر نیا اضافہ (بدعت) ہو۔
9- اور سب سے اچھی راہ انبیا کی راہ ہے۔
10- اور سب سے زیادہ باعزت موت شہیدوں کی ہے۔
11- سیدھی راہ پا لینے کے بعد گمراہی سب سے بڑی بے بصری ہے۔
12- سب سے اچھا عمل وہ ہے جو نفع پہنچائے۔

13- اور سب سے اچھا طریقہ وہ ہے جس کی اتباع کی جائے۔
14- اور بہت ہی بُری نابینائی ہے، یعنی دل کی بینائی۔
15- اور اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے ہاتھ (لینے والا) سے بہتر ہے۔
16- جو مال کم ہو اور ضرورت کے لیے کافی ہو جائے، وہ اس مال سے بہتر ہے جو بہت ہو اور غافل کر دے۔
17- انتہائی بری توبہ اس وقت کی توبہ ہے جب موت سامنے آجائے۔
18- اور سب سے بُری ندامت وہ ہے جو قیامت کے دن ہوگی۔
19- اور کچھ لوگ وہ ہیں جو جمعہ میں نہیں آتے، مگر بڑی دیر سے۔
20- اور کچھ لوگ ہیں جو اللہ کو یاد نہیں کرتے، مگر کبھی کبھی۔
21- اور بہت بڑے گناہوں میں سے جھوٹ بولنے والی زبان۔
22- اور بہترین بے نیازی نفس کی بے نیازی ہے۔
23- اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔
24- اور دانائی کا سب سے اونچا درجہ خوفِ خدا ہے۔
25- اور بہترین چیز جو دل میں جاگزیں ہو، یقین ہے۔
26- اور شک وشبہ کفر کی ایک قسم ہے۔
27- اور نوحہ کرنا دورِ جاہلیت کے اعمال میں سے ایک عمل ہے۔
28- اور غلول جہنم کی تپش میں سے ہے (غلول کا مطلب ہے اپنی منفعت کے لیے کوئی چیز چھپا لینا)
29- اور نشہ جہنم کی آگ سے داغ ہے۔
30- اور شعر ابلیس کی طرف سے ہے۔
31- اور شراب تمام گناہوں کا مجموعہ ہے۔
32- اور بہت ہی بُرا کھانا ہے یتیم کا کھانا۔
33- اور خوش نصیب وکامیاب وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔
34- اور بد بخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں بد بخت ہو گیا۔
35- اور تم میں سے ہر شخص آخر کار چار ہاتھ زمین ہی تک پہنچتا ہے اور معاملہ آخرت کے سپرد ہو جاتا ہے۔
36- اور عمل کی حقیقت اس کے آخری حصے ہوتے ہیں۔
37- اور بہت ہی بُرا خواب ہے، جھوٹا خواب۔
38- اور جو کچھ آنے والا ہے، وہ قریب ہے۔
39- کسی صاحبِ ایمان کو گالی دینا فسق ہے۔
40- اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔
41- اور اس کی غیبت کرنا اللہ کی نافرمانیوں میں سے ہے۔
42- اور اس کے مال کی حرمت اس کے خون کی حرمت کے برابر ہے۔
43- اور جو اللہ کی قسم کھاتا ہے اور پھر اسے جھٹلا دیتا ہے۔
44- اور جو بخش دیتا ہے، اسے بخش دیا جائے گا۔
45- اور جو معاف کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔
46- اور جو غصہ پی جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اجر دے گا۔
47- اور جو حق تلفی پر صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے معاوضہ دے گا۔
48- اور جو شہرت کے پیچھے پڑ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بدنام کر دیتا ہے۔
49- اور جو نقصان کے مقابلے میں ثابت قدم رہتا ہے، اللہ اسے دوگنا عطا کرتا ہے۔
50- اور جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، اللہ اسے عذاب میں ڈالے گا۔

اس کے بعد تین بار استغفر اللہ فرمایا اور خطبہ ختم کر دیا۔

رومی فوج کی واپسی

مقام تبوک پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ رومی فوج واپس چلی گئی ہے۔ رومیوں کو اسلامی لشکر کی بے پناہ قوت کی اطلاع مل چکی تھی، اس لیے انھوں نے واپسی ہی میں مصلحت سمجھی۔ رومیوں نے شام کے اندرونی علاقے میں جو قلعے تھے، ان میں پناہ لی۔ جب مسلمان تبوک پہنچے اور آنحضور ﷺ کو رومیوں کی خوف زدگی کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے اندرونِ ملک میں بھی ان کا تعاقب کیا۔ آپ ﷺ سرحد کے قریب مدت تک ٹھہرے رہے، تا کہ اگر کوئی مقابلے پر آنا چاہے تو بے شک آئے۔ اس اثنا میں آپ ﷺ نے حفظِ ماتقدم کے طور پر احتیاطی تدابیر اختیار کیں، تا کہ آیندہ کسی کو قدم اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکے۔ ایلہ کے حاکم یوحنا بن روبا اُن سرداروں میں سے تھا جو سرحد کے قریب رہتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس کی طرف پیغام بھیجا کہ تم یا تو ہماری اطاعت قبول کر و یا ہم سے لڑو۔ یوحنا اپنے سینے پر سونے کی صلیب لٹکائے ہوئے، کچھ تحائف لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اطاعت قبول کر کے جزیے کی شرط پر آپ ﷺ سے مصالحت کر لی۔ جرباء اور اذرح کے باشندوں نے بھی خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہو کر جزیہ دینا منظور کیا۔ (جربا شام میں عمان کے مضافات میں ایک بستی ہے۔ اذرح بلقاء اور عمان کے گرد و نواح میں ایک شہر ہے)

پیغمبرِ اسلام نے ان سرداروں کو امان نامے تحریر کر دیے۔ ایک امان نامہ جو آپ ﷺ نے یوحنا کو لکھ کر دیا، اس کے الفاظ یہ تھے: ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ اللہ اور محمد ﷺ کی طرف سے جو اللہ کا رسول اور نبی ہے، یوحنا بن روبہ اور اہلِ ایلہ کے حق میں ان کی کشتیوں اور ان کے قافلوں کے بارے میں، جو خواہ خشکی پر ہوں، خواہ سمندر میں، امان ہے۔ وہ اور اہلِ شام، اہلِ یمن اور بحری علاقوں کے وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں، سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پناہ میں ہوں گے۔ ان میں سے اگر کوئی شخص کسی جُرم کا مرتکب ہوگا تو اس کا مال، اس کی جان کی حفاظت کا ضامن نہ ہوگا۔ محمد ﷺ کے لیے لوگوں میں سے اسے گرفتار کر لینا روا ہوگا۔ یہ لوگ جس چشمے پر جائیں یا جس راہ پر خشکی یا سمندر میں سفر کریں، انھیں روکنا جائز نہیں۔“

اس معاہدے سے فریقین نے کامل اتفاق کیا۔ نشانی کے طور پر آپ ﷺ نے

ایک یمنی چادر یُوحنّا کو ہدیہ کی، اور اس سے ہر قسم کی رعایت کی۔ اتفاق رائے سے طے پایا کہ اہلِ ایلہ تین سو دینار سالانہ جزیہ ادا کیا کریں گے۔

سریہ دومتہ الجندل

رومیوں کی واپسی اور اہلِ سرحد سے معاہدوں کے بعد جنگ کا سوال ہی نہ رہا۔ آپ ﷺ مطمئن تھے کہ رومیوں کی فوج دوبارہ معرکہ آرائی کی جرات نہ کرے گی، لیکن آپ ﷺ کو یہ خدشہ پھر بھی لاحق تھا کہ اگر رومیوں نے دومتہ الجندل کی جانب سے حملہ کیا تو وہاں کا حاکم اکیدر بن عبدالملک جو عیسائی تھا، اور ہرقل کی طرف سے دومتہ الجندل کا حاکم تھا، بغاوت پر کمربستہ ہو کر ان کی مدد کرے گا۔ پیش بندی کے طور پر آپ ﷺ نے خالد بن ولیدؓ کو پانچ سو سواروں کے ہم راہ اس کی طرف روانہ کیا اور خود باقی فوج کے ساتھ مدینے کو مراجعت فرمائی۔

خالد بن ولیدؓ نے یہ کیا کہ برق رفتاری سے دومتہ الجندل کا رخ کیا اور راتوں رات وہاں پہنچ کر دم لیا۔ اکیدر ان تمام حالات سے بے خبر چاندنی رات میں اپنے بھائی حسّان کے ساتھ نیل گائے کے شکار کے لیے نکلا تھا۔ خالد بن ولیدؓ نے حملہ کیا تو حسّان مارا گیا اور اکیدر قیدی ہوا۔ خالد بن ولیدؓ نے اسے دھمکی دی کہ اگر شہر کے دروازے نہ کھولے گئے تو اسے بھی تہ تیغ کر دیا جائے گا۔ اہلِ شہر نے اپنے حاکم کی جاں بخشی کی خاطر شہر کے دروازے کھول دیئے۔ خالد بن ولیدؓ نے دو ہزار اونٹ، آٹھ سو بکریاں، چار سو وسق گندم اور چار سو زرہیں بطورِ غنیمت حاصل کیں۔ یہ مالِ غنیمت لے کر خالد بن ولیدؓ اکیدر کو قید کر کے مدینے کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے اکیدر کی جاں بخشی کی۔ اس نے بھی جزیہ دینے کا اقرار کیا اور اس سے بھی اہلِ ایلہ کے شرائط کے مطابق معاملہ طے کیا۔

جزیہ لینے کا حکم

علمائے دین کا اس پر اتفاق ہے کہ جزیہ سے متعلق آیاتِ کریمہ کا نزول غزوۂ تبوک کے دوران میں ہوا۔ اگرچہ بعض کے نزدیک جزیے کا حکم 8 ہجری میں نازل ہوا اور بعض نے اس حکم کا نزول غزوہ بنی قریظہ اور غزوہ بنی نضیر کے وقت لکھا ہے۔ مگر کسی راوی نے بھی ایسی روایت کا حوالہ نہیں دیا، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ غزوۂ تبوک سے پہلے آنحضرت ﷺ نے کسی سے جزیہ لیا ہو۔ اسی وجہ سے سیرت نگاروں کے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اس وقت جب حضور ﷺ نے تبوک پر حملے کا ارادہ کیا یا تبوک ہی میں اس حکم کا نزول ہوا۔

جزیہ سے متعلق حکمِ الٰہی سورۃ توبہ کی آیت 29 میں آیا ہے۔ یاد رہے کہ غزوۂ تبوک سے متعلق بہت سی آیات سورہ توبہ میں ہیں۔ کچھ روانگی سے پہلے، کچھ روانگی کے بعد دورانِ سفر، اور کچھ مدینہ واپس آنے کے بعد۔ ان آیات میں غزوے کے حالات ذکر کیے گئے ہیں۔ منافقین کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ مخلص مجاہدین کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور مؤمنین صادقین جو غزوے میں گئے تھے، اور جو نہیں گئے تھے، ان کی توبہ کی قبولیت کا ذکر ہے۔ جزیہ سے متعلق آیت کا ترجمہ یہ ہے:

”جنگ کرو اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں لاتے، اور جو کچھ اللہ، اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے، اسے حرام نہیں کرتے، اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ ان سے لڑو، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔“

جزیہ بدل ہے اس امان اور اس حفاظت کا جو ذمیوں کو اسلامی حکومت میں عطا کی جائے گی۔ نیز وہ علامت ہے اس امر کی کہ یہ لوگ تابع امر بننے پر راضی ہیں۔ ”ہاتھ سے جزیہ دینے“ کا مفہوم مطیعانہ شان کے ساتھ جزیہ ادا کرنا ہے، اور چھوٹے بن کر رہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین میں بڑے وہ نہ ہوں، بلکہ وہ اہلِ ایمان بڑے ہوں جو خلافتِ الٰہی کا فرض انجام دے رہے ہوں۔“ ابتدا میں یہ حکم یہود و نصاریٰ کے متعلق گیا تھا، لیکن آگے چل کر خود نبی ﷺ نے مجوس سے جزیہ لے کر انھیں ذمی بنایا اور اس کے بعد صحابہ کرامؓ نے بیرونِ عرب کی تمام قوموں پر اس حکم کو عام کر دیا۔

مسجد ضرار

رسول اکرم ﷺ جب غزوۂ تبوک کے لیے روانہ ہونے لگے تو چند اشخاص نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ہم نے ضعیف و معذور لوگوں کی سہولت کی خاطر، نیز بارش وغیرہ کے دنوں میں نماز ادا کرنے کے لیے مسجد قبا کے نزدیک ایک مسجد تعمیر کی ہے۔ حضور ﷺ چل کر اس میں نماز پڑھائیں تا کہ افتتاح ہو جائے۔ آنحضور ﷺ اس وقت چوں کہ غزوہ پر جانے کے لیے تیار تھے، اس ارشاد فرمایا کہ تبوک سے واپسی کے بعد دیکھا جائے گا۔

سورۂ توبہ کی آیات 107 اور 108 میں اس مسجد کا ذکر آیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے:

”کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے ایک مسجد اس غرض کے لیے بنائی کہ دعوتِ حق کو نقصان پہنچائیں اور اللہ کی بندگی کرنے کی بجائے، کفر کریں، اور اہل ایمان میں پھوٹ ڈالیں اور (اس بظاہر عبادت گاہ کو) اس شخص کے لیے کمین گاہ بنائیں جو اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔ وہ ضرور قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہمارا ارادہ تو بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا نہ تھا۔ مگر اللہ گواہ ہے کہ وہ قطعی جھوٹے ہیں۔ تم ہرگز اس عمارت میں کھڑے نہ ہونا۔ جو مسجد اوّل روز سے تقویٰ پر قائم کی گئی تھی، وہی اس کے لیے زیادہ موزوں ہے کہ تم اس میں عبادت کے لیے کھڑے ہو۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنا پسند کرتے ہیں، اور اللہ کو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہی پسند ہیں۔“

ان آیات کی تشریح میں مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں:

”نبی کریم ﷺ کے مدینے تشریف لے جانے سے پہلے قبیلہ خزرج میں ایک شخص ابو عامر نامی تھا جو زمانۂ جاہلیت میں عیسائی راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار علمائے اہلِ کتاب میں ہوتا تھا اور رہبانیت کی وجہ سے اس کے علمی وقار کے ساتھ ساتھ اس کی درویشی کا سکہ بھی مدینے اور اطراف کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ نبی ﷺ مدینے پہنچے تو اس کی مشیخت وہاں خوب چل رہی تھی، مگر یہ علم اور یہ در

اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کی بجائے الٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن گئی اور اس حجاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور ﷺ کی تشریف آوری کے بعد وہ نعمت ایمانی سے محروم نہ رہا، بلکہ آپ ﷺ کو اپنی مشیخت کا حریف اور اپنے کاروبارِ درویشی کا دشمن سمجھ کر آپ ﷺ کی اور آپ کے کام کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگیا۔ پہلے دو سال تک تو اسے یہ امید رہی کہ کفارِ قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹانے کے لیے کافی ثابت ہوگی، لیکن جنگِ بدر میں جب قریش نے شکست فاش کھائی تو اسے یارائے ضبط نہ رہا۔ اسی سال وہ مدینہ سے نکل کھڑا ہوا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف تبلیغ شروع کردی۔

جنگ اُحد جن لوگوں کی سعی سے برپا ہوئی، ان میں یہ ابو عامر راہب بھی شامل تھا اور کہا جاتا ہے کہ اُحد کے میدانِ جنگ میں اسی نے وہ گڑھے کھدوائے تھے، جن میں سے ایک میں نبی ﷺ گر کر زخمی ہوئے۔ پھر جنگ خندق میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھ آئے تھے، انھیں چڑھا لانے میں بھی اس کا حصہ نمایاں تھا۔ اس کے بعد جنگ حنین تک جتنی لڑائیاں مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان ہوئیں، ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سرگرم حامی رہا۔ آخر کار اسے اس بات سے مایوسی ہوگئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی۔ اس لیے اس نے عرب کو چھوڑ کر روم کا رخ کیا، تاکہ قیصر کو اس "خطرے" سے آگاہ کرے جو عرب سے سر اٹھا رہا تھا۔ یہ وہی موقع تھا جب مدینہ میں یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے، اور اسی کی روک تھام کے لیے نبی ﷺ کو تبوک کی مہم پر جانا پڑا۔

ابو عامر راہب کی ان تمام منافقانہ سرگرمیوں میں مدینہ کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ سازش میں شریک تھا اور اس آخری تجویز میں بھی یہ لوگ اس کے ہم نوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصرِ روم اور شمالی عرب کی عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو اس کے اور ان منافقوں کے درمیان یہ قرارداد ہوئی کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک الگ مسجد بنا لیں گے، تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافق مسلمانوں کی گروہ بندی اس طرح کی جاسکے کہ اس پر مذہب کا پردہ پڑا رہے اور آسانی سے اس پر کوئی شبہ نہ کیا جا سکے، اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہوسکیں اور آیندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کرسکیں، بلکہ ابو عامر راہب کے پاس سے جو ایجنٹ خبریں اور ہدایات لے کر آئیں، وہ بھی غیر مشتبہ فقیروں اور مسافروں کی حیثیت سے اس مسجد میں ٹھہر سکیں۔ یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے تحت وہ مسجد تیار کی گئی تھی۔

مدینہ میں اس وقت دو مسجدیں تھیں۔ ایک مسجدِ قبا جو شہر کے مضافات میں تھی۔ دوسری مسجدِ نبوی جو شہر کے اندر تھی۔ ان دو مسجدوں کی موجودگی میں ایک تیسری مسجد بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی، اور وہ زمانہ ایسی احمقانہ مذہبیت کا نہ تھا کہ مسجد کے نام سے ایک عمارت بنا دینا بجائے خود کارِ ثواب ہو، خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو، بلکہ اس کے برعکس ایک نئی مسجد بننے کے معنی یہ تھے کہ مسلمانوں کی جماعت میں خواہ مخواہ تفریق رونما ہو، جسے ایک صالح اسلامی نظام کسی طرح گوارا نہیں کرسکتا۔ اسی لیے یہ لوگ مجبور ہوئے کہ اپنی علیحدہ مسجد بنانے سے پہلے اس کی ضرورت ثابت کریں۔ چنانچہ انھوں نے نبی ﷺ کے سامنے اس تعمیرِ نو کے لیے یہ ضرورت پیش کی کہ بارش میں اور جاڑے کی راتوں میں عام لوگوں کو اور خصوصاً ضعیفوں اور معذوروں کو، جو ان دونوں مسجدوں سے دور رہتے ہیں، پانچوں وقت حاضری دینی مشکل ہوتی ہے، لہٰذا ہم محض نمازیوں کی آسانی کے لیے یہ ایک نئی مسجد تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

ان پاکیزہ ارادوں کی نمائش کے ساتھ جب یہ "مسجدِ ضرار" بن کر تیار ہوئی، تو یہ ضرار و اشرار نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ ایک مرتبہ خود نماز پڑھا کر ہماری مسجد کا افتتاح فرما دیں، مگر آپ ﷺ نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس وقت میں جنگ کی تیاری میں مشغول ہوں اور ایک بڑی مہم درپیش ہے۔ اس مہم سے واپس آکر دیکھوں گا۔ اس کے بعد آپ ﷺ تبوک کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور آپ ﷺ کے پیچھے یہ لوگ اس مسجد میں اپنی جتھہ بندی اور سازش کرتے رہے، حتٰی کہ انھوں نے یہاں تک طے کرلیا کہ ادھر رومیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا قلع قمع ہو اور ادھر یہ فوراً ہی عبداللہ ابن ابی کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیں، لیکن تبوک میں جو معاملہ پیش آیا، اس نے ان کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ واپسی پر جب نبی ﷺ مدینہ کے قریب ذی اوان کے مقام پر پہنچے جو مدینہ سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا تو حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی مسجد کے بانیوں کی نیت سے مطلع فرما دیا۔ چنانچہ حضور ﷺ نے مالک بن الدخشمؓ (جو بنی سلمہ بن عوف کے ایک بزرگ تھے) اور حضرت معنؓ بن عدی کو بلا کر حکم دیا کہ جاؤ اور منافقین کی تعمیر کردہ مسجد منہدم کر کے تمام سامان کو آگ لگا دو۔ یہ حضرات حکم ملتے ہی بہ عجلت محلہ بنی سلم بن عوف میں آئے اور مسجد کو گرا کر آگ لگا دی۔

منافقین کی سازشیں غزوۂ تبوک تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ تبوک سے مدینے تک کے سفر کے دوران میں بھی انھوں نے سازشوں کا جال بچھائے رکھا۔ واپسی میں جب مسلمانوں کا لشکر ایک ایسے مقام کے قریب پہنچا، جہاں سے پہاڑوں کے درمیان راستہ گزرتا تھا تو بعض منافقین نے آپس میں طے کیا کہ رات کے وقت کسی گھاٹی میں سے گزرتے ہوئے نبی ﷺ کو کھڈ میں پھینک دیں گے۔ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوگئی۔ آپ ﷺ نے تمام اہلِ لشکر کو حکم دیا کہ وادی کے راستے سے نکل جائیں، اور آپ خود صرف عمار بن یاسرؓ اور حذیفہ بن یمانؓ کو لے کر گھاٹی کے اندر سے ہو کر چلے۔ اثنائے راہ میں یکایک معلوم ہوا کہ دس بارہ منافق ڈھاٹے باندھے ہوئے پیچھے پیچھے آرہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت حذیفہؓ ان کی طرف لپکے، تاکہ ان کے اونٹوں کو مار مار کر ان کے منہ پھیر دیں، مگر وہ دور ہی سے حضرت حذیفہؓ کو آتے دیکھ کر ڈر گئے، اور اس خوف سے کہ کہیں ہم پہچان نہ لیے جائیں، فوراً بھاگ نکلیں۔ اس کے بعد رسول اللہ نے ان بارہ منافقین کے نام بتائے اور ان کے ارادے سے باخبر کیا۔ اسی

لیے حضرت حذیفہؓ کو رسول ﷺ کا ''راز داں'' کہا جاتا ہے۔ اسی واقعے سے متعلق سورۂ توبہ کی آیت 74 میں اللہ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ:

﴿وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا﴾

''انھوں نے اس کام کا قصد کیا، جسے وہ نہ پا سکے۔''

خاتمہ سفر پر جب دُور سے نبی ﷺ کو مدینہ کے نقوش دکھائی پڑے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ رہا طابہ، اور یہ رہا احد۔ یہ وہ پہاڑ ہے جو ہم سے محبت کرتا ہے اور جس سے ہم محبت کرتے ہیں۔'' ادھر مدینہ میں آپ ﷺ کی آمد کی خبر پہنچی تو عورتیں، بچے اور بچیاں باہر نکل پڑیں اور زبردست اعزاز کے ساتھ لشکر کا استقبال کرتے ہوئے یہ نغمہ گنگنایا:

طلع البدر علینا	من ثنیات الوداع
وجب الشکر علینا	ما دعا للہ داع

''ہم پر ثنیۃ الوداع سے چودہویں کا چاند طلوع ہوا۔ جب تک پکارنے والا اللہ کو پکارے، ہم پر شکر واجب ہے۔''

نبی ﷺ تبوک کے لیے رجب میں روانہ ہوئے تھے اور واپس آئے تو رمضان کا مہینہ تھا۔ اس سفر میں پورے پچاس روز صرف ہوئے۔ بیس دن تبوک میں اور تیس دن آمد و رفت میں۔ یہ آپ ﷺ کی حیات طیبہ کا آخری غزوہ تھا جس میں آپ ﷺ نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔

متخلفین کی معذرت

غزوۂ تبوک اپنے مخصوص حالات کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک سخت آزمائش بھی تھا، جس سے اہل ایمان اور دوسرے لوگوں میں تمیز ہو گئی، اور اس قسم کے موقع پر اللہ تعالیٰ کا دستور بھی یہی ہے۔ غزوۂ اُحد کے بعد کے حالات کا نتیجہ نکالتے ہوئے سورۂ آل عمران، آیت 179 میں ارشادِ الٰہی نازل ہوا:

''اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا، جس میں تم اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔'' یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی جماعت کو اس حال میں دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ ان کے درمیان سچے اہل ایمان اور منافق، سب خلط ملط رہیں۔''

چنانچہ غزوۂ تبوک میں سارے کے سارے مومنین صادقین نے شرکت کی اور اس سے غیر حاضری نفاق کی علامت قرار پائی۔ چنانچہ کیفیت یہ تھی کہ اگر کوئی پیچھے رہ گیا تھا اور اس کا ذکر رسولِ کریم ﷺ سے کیا جاتا تو آپ ﷺ فرماتے کہ اسے چھوڑو۔ اگر اس میں خیر ہے تو اللہ اسے جلد ہی تمھارے پاس پہنچا دے گا، اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اللہ نے تمھیں اس سے راحت دے دی ہے۔ غرض اس غزوے سے یا تو وہ لوگ پیچھے رہے جو معذور تھے یا وہ لوگ جو منافق تھے، جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا تھا اور اب جھوٹا عذر پیش کر کے غزوے میں شریک نہ ہونے کی اجازت لے لی تھی اور پیچھے بیٹھ رہے تھے یا سرے سے اجازت لیے بغیر ہی بیٹھے رہ گئے تھے۔ ہاں تین آدمی ایسے تھے جو سچے اور پکے مومن تھے، اور کسی وجہ جواز کے بغیر پیچھے رہ گئے تھے۔ اللہ نے انھیں آزمائش میں ڈالا اور پھر ان کی توبہ قبول کی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ واپسی پر رسولِ کریم ﷺ مدینہ میں داخل ہوئے تو حسبِ معمول سب سے پہلے مسجدِ نبوی میں تشریف لے گئے۔ وہاں دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر لوگوں کی خاطر بیٹھ گئے۔ ادھر منافقین نے جن کی تعداد 80 سے کچھ زیادہ تھی، آ کر عذر پیش کرنے شروع کر دیئے اور قسمیں کھانے لگے۔ آپ ﷺ نے ان کا ظاہر قبول کرتے ہوئے بیعت کر لی اور دعائے مغفرت کی اور ان کا باطن اللہ کے حوالے کر دیا۔

باقی رہے تینوں مومنین صادقین یعنی کعبؓ بن مالک، مرارہؓ بن ربیع اور بلالؓ بن امیہ، تو انھوں نے سچائی اختیار کرتے ہوئے اقرار کیا کہ ہم نے کسی مجبوری کے بغیر غزوے میں شرکت نہ کی تھی۔ اس پر نبی ﷺ نے صحابہؓ کرام کو حکم دیا کہ ان تینوں سے بات چیت نہ کریں۔ چنانچہ ان کے خلاف سخت بائیکاٹ شروع ہو گیا۔ لوگ بدل گئے۔ زمین بھیانک بن گئی اور کشادگی کے باوجود تنگ ہو گئی۔ خود ان کی جان پر آ بنی۔ سختی یہاں تک بڑھی کہ چالیس روز گزرنے کے بعد حکم دیا گیا کہ اپنی عورتوں سے بھی الگ رہیں۔ جب بائیکاٹ پر پچاس روز پورے ہو گئے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کیے جانے کا مژدہ نازل کیا۔ ارشاد ہوا:

﴿وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى إِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّا اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ٥﴾ (التوبہ: 118)

''اور ان تینوں کو بھی اللہ نے معاف کیا، جن کے معاملے کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جب زمین اپنی ساری وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی اپنی جانیں بھی ان پر بار ہونے لگیں اور انھوں نے جان لیا کہ اللہ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ خود اللہ ہی کے دامنِ رحمت کے سوا نہیں ہے، تو اللہ اپنی مہربانی سے ان کی طرف پلٹا، تاکہ وہ اس کی طرف پلٹ آئیں۔ یقیناً وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔''

اس فیصلے کے نزول پر مسلمان عموماً اور یہ تینوں صحابہؓ بے حد و حساب خوش ہوئے۔ لوگوں نے دوڑ دوڑ کر بشارت دی۔ خوشی سے چہرے کھل اٹھے اور انعامات اور صدقے دیئے۔ درحقیقت یہ ان کی زندگی کا سب سے باسعادت دن تھا۔

اسی طرح جو لوگ معذوری کی وجہ سے غزوۂ تبوک میں شریک نہ ہو سکے تھے، ان کے بارے میں اللہ نے فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (التوبہ: 91)

''کمزوروں پر، مریضوں پر اور جو لوگ خرچ کرنے کے لیے کچھ نہ پائیں، ان

حرج نہیں، جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خیر خواہ ہوں۔''

ایسے لوگ جو دین کی خدمت کے لیے بے تاب ہوں اور اگر کسی حقیقی مجبوری کے سبب سے یا ذرائع نہ پانے کی وجہ سے عملاً خدمت نہ کر سکیں تو ان کے دل کو اتنا ہی سخت صدمہ ہو، جتنا کہ کسی دنیا پرست کو روزگار چھوٹ جانے یا کسی بڑے نفع کے موقع سے محروم رہ جانے کا ہوا کرتا ہے۔ ان کا شمار اللہ کے ہاں خدمت انجام دینے والوں ہی میں ہوگا، اگرچہ انھوں نے عملاً کوئی خدمت انجام نہ دی ہو، اس لیے کہ وہ چاہے ہاتھ پاؤں سے کام نہ کر سکے ہوں، لیکن دل سے تو وہ برسرِ خدمت ہی رہے ہیں۔

یہی بات ہے جو غزوۂ تبوک سے واپسی پر مدینہ کے قریب پہنچ کر آنحضور ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی: ''مدینہ میں کچھ ایسے لوگ ہیں کہ تم نے جس جگہ بھی سفر کیا، اور جو وادی بھی طے کی، وہ تمھارے ساتھ ساتھ رہے۔'' جنھیں عذر نے روک رکھا تھا۔ لوگوں نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ، وہ مدینہ میں رہتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ تھے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، مدینہ میں رہتے ہوئے بھی۔''

غزوۂ تبوک کے اثرات ونتائج

غزوۂ تبوک کے اثرات ونتائج کے بارے میں شاہ مصباح الدین شکیل لکھتے ہیں (حوالہ سیرت احمد مجتبیٰ ﷺ۔ جلد سوم۔ صفحہ 491):

1- تبوک کا عزمِ سفر دشمن کو حد درجہ مرعوب کر گیا۔ اس قدر اچانک اور غیر متوقع پیش قدمی نے اسے حیران کر دیا۔
2- لاکھوں کی تعداد میں مسلح اور تربیت یافتہ رومی فوج کے مقابلے سے پہلوتہی کرنا مسلمانوں کی عسکری برتری کا موجب بنا۔
3- سرحدی نیم آزاد عربی قبائل اسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ معاہدوں کے ذریعے باجگزار بن گئے۔ ان کی حیثیت رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان حاجز ریاستوں (بفر سٹیٹ) کی سی ہوگئی۔
4- خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر بصیرتِ نبوی ﷺ نے فتح کے تمام فوائد حاصل کیے۔
5- بنی ہوازن پر حنین میں آخری ضرب کے بعد جزیرہ عرب میں دینِ حق پوری طرح نفوذ کر دیا گیا۔ تبوک سے کامیاب واپسی نے تمام قبائل کو اسلام کی بالادستی قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ دُور دراز علاقوں سے وفود پر وفود آ کر حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے۔
6- مجاہدوں کا حوصلہ بلند ہوا۔ انھیں نامساعد حالات میں بھی جہاد کے لیے وسیع پیمانے پر تربیت حاصل ہوئی۔
7- اسلام قبول نہ کرنے والے جزیہ دینے پر مجبور ہوئے۔
8- بین الاقوامی سطح پر اسلام کی اشاعت کے دور کا آغاز ہوا۔ اس سلسلے میں روم اور ایران کی سلطنتوں سے مسلح تصادم ناگزیر تھا۔ عہدِ نبوی ﷺ ہی میں اس کی بنیاد رکھ دی گئی۔

مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری اس غزوے کے اثر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں (حوالہ: الرحیق المختوم، صفحہ 590): ''غزوہ تبوک جزیرۃ العرب پر مسلمانوں کا اثر پھیلانے اور اسے تقویت پہنچانے میں بڑا مؤثر ثابت ہوا۔ لوگوں پر یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی کہ اب جزیرۃ العرب میں اسلام کی طاقت کے سوا اور کوئی طاقت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس طرح جاہلین اور منافقین کی وہ بچی کھچی آرزوئیں اور امیدیں بھی ختم ہوگئیں جو مسلمانوں کے خلاف گردشِ زمانہ کے انتظار میں ان کے نہاں خانہ دل میں پنہاں تھیں، کیوں کہ ان کی ساری امیدوں اور آرزوؤں کا محور رومی طاقت تھی اور اس غزوے میں اس کا بھی بھرم کھل گیا تھا، اس لیے ان حضرات کے حوصلے ٹوٹ گئے اور انھوں نے امر واقعہ کے سامنے سپر ڈال دی کہ اب اس سے بھاگنے اور چھٹکارا پانے کی کوئی راہ ہی نہیں رہ گئی تھی۔

اور اسی صورت حال کی بنا پر اب اس کی بھی ضرورت نہیں رہ گئی تھی کہ مسلمان، منافقین کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں، لہٰذا اللہ نے ان کے خلاف سخت رویہ اختیار کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہاں تک کہ ان کے صدقے قبول کرنے، ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے، ان کے لیے دعائے مغفرت کرنے اور ان کی قبروں پر کھڑے ہونے سے روک دیا، اور انھوں نے مسجد کے نام پر سازش اور دسیسہ کاری کا جو گھونسلا تعمیر کیا تھا، اسے ڈھا دینے کا حکم دیا۔ پھر ان کے بارے میں ایسی ایسی آیات نازل ہوئیں کہ وہ بالکل ننگے ہوگئے اور انھیں پہچاننے میں کوئی ابہام نہ رہا۔ گویا اہلِ مدینہ کے لیے ان آیات نے ان منافقین پر انگلیاں رکھ دیں۔

''اس غزوے کے اثرات کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ فتح مکہ کے بعد (بلکہ اس سے پہلے بھی) عرب کے وفود اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آنا شروع ہو گئے تھے، لیکن ان کی بھرمار اس غزوے کے بعد ہی ہوئی۔''

حضرت ابوبکرؓ کی امارتِ حج

وفود پے در پے مدینے آتے رہے اور اس طرح کئی ماہ گزر گئے، یہاں تک کہ حج کا زمانہ قریب آ گیا۔ اس وقت تک رسولِ کریم ﷺ نے فریضۂ حج کے تمام مناسک و مراسم اس طرح ادا نہ کیے تھے، جس طرح آج مسلمان ادا کرتے ہیں۔ کیا اس سال آپ ﷺ کو تشکر واطمینان کے اظہار کے لیے عازمِ حج ہونا چاہیے تھا؟ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو روم پر فتح عطا کی تھی اور عروہؓ بن مسعود کی شہادت کے بعد طائف کے لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ نیز دُور دراز سے وفود کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ابھی جزیرۂ عرب میں ایسے لوگ باقی تھے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہ لائے تھے۔ ابھی کفار کے علاوہ یہود ونصاریٰ بھی پائے جاتے تھے۔ کفار ابھی ایامِ جاہلیت کے مطابق مقدس اور محترم مہینوں میں حج بیت اللہ کی رسوم ادا کرتے تھے، حالانکہ ان کی نجاست میں کوئی کلام نہ تھا۔ ان حالات کی بنا پر آپ ﷺ نے مناسب خیال کیا کہ آپ ﷺ ابھی مدینے میں قیام پزیر رہیں۔

حتیٰ کہ اللہ کی بات پوری ہو جائے اور اللہ آپ ﷺ کو بیت اللہ کے حج کی اجازت دے اور اس سال امارتِ حج کے فرائض حضرت ابوبکرؓ انجام دیں۔

چنانچہ اسی سال ذی قعدہ یا ذی الحجہ 9 ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے مناسک حج قائم کرنے کی غرض سے حضرت ابوبکرؓ کو امیر الحج بنا کر روانہ فرمایا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ تین سو مسلمانوں کی معیت میں حج کے ارادے سے عازم مکہ ہوئے۔ مشرکین سال ہا سال سے بیت اللہ کا حج کرتے چلے آتے تھے۔ کیا نبی ﷺ اور لوگوں کے درمیان یہ عہد و پیمان نہ ہو چکا تھا کہ ہر اس شخص کو جو بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے گا، روکا نہ جائے گا اور مقدس و محترم مہینوں میں کسی کو خوف زدہ نہ کیا جائے گا۔ کیا آپ ﷺ کے اور قبائل عرب کے درمیان مقررہ اوقات پر قرار دادیں پاس نہ ہو چکی تھیں؟ جب تک یہ قرار دادیں برقرار تھیں، اس وقت تک وہ لوگ بھی بیت اللہ کی زیارت کر سکتے تھے جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراتے یا اس کے علاوہ کسی اور چیز کی عبادت کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے کہ کعبے میں ایام جاہلیت کے مطابق عبادت کے مراسم بجا لائے جاتے ہیں، لیکن وہ خاص خاص قرار دادوں اور عہد و پیمان کی بنا پر کسی کو کعبے کی زیارت اور عبادت سے باز رکھنے کے مجاز نہ تھے۔ اب جب کہ عربوں کے بہت سے بت توڑ ڈالے گئے تھے اور کعبے کے اندر یا ارد گرد کے تمام بت بھی نیست و نابود ہو چکے تھے تو خداوند قدوس کے گھر میں شرک و بت پرستی کے مخالفین کا مشرکین اور کفار کے ساتھ اجتماع ایک ناقابل فہم اور متناقض امر تھا۔ یہودی اور عیسائی دونوں مل جل کر اگر بیت المقدس کا حج کریں تو یہ بات عقلاً درست سمجھی جا سکتی تھی، کیوں کہ بیت المقدس یہودیوں کے خیال میں وہ سرزمین تھی جس کی حیثیت ان کے لیے ارضِ موعود کی تھی، اور نصاریٰ کی نظر میں یہ مقام حضرت عیسیٰؑ کی جائے پیدائش تھا۔ یہ اجتماع تو اتنا عجیب نہ تھا، لیکن اس عبادت گاہ کے گرد جہاں بت توڑ ڈالے گئے تھے، انھی بتوں کی عبادت ایک عجیب معاملہ تھا۔ اس لیے یہ ایک قدرتی بات تھی کہ مشرکین کو اس عبادت گاہ کے قریب جانے سے روک دیا جائے جسے شرک اور بت پرستی کی تمام آلودگیوں سے پاک و صاف کر دیا گیا تھا۔ سورۂ برأۃ کی ابتدائی آیات (1 تا 36) اس بارے میں نازل ہوئیں۔ اس سورۃ کا یہ نام ہی مشرکین سے بریٔ الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔ دوسری طرف حج کا موسم شروع ہو چکا تھا اور مشرکین مختلف اطراف سے مراسمِ حج کی ادائی کے لیے آ چکے تھے۔ اس موقع پر مناسب تھا کہ مشرکین کو اللہ کا فرمان پہنچا دیا جائے، اور ان پر یہ بات واضح کر دی جائے کہ مؤمنین اور مشرکین کے درمیان جو عہد و پیمان قائم تھے، وہ اب ٹوٹ چکے ہیں۔ ہاں، البتہ جو عہد و پیمان کسی مقررّہ مدت کے لیے باندھے گئے تھے، وہ اپنی مدت کے اختتام تک برقرار رہیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ کی روانگی کے بعد سورۃ برأۃ کا ابتدائی حصہ نازل ہوا، جس میں مشرکین سے کیے گئے عہد و پیمان کو برابری کی بنیاد پر ختم کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس حکم کے آ جانے کے بعد آنحضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو روانہ فرمایا، تاکہ وہ آپ ﷺ کی جانب سے اس کا اعلان کر دیں، ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ خون اور عہد و پیمان کے سلسلے میں عرب کا یہی دستور تھا کہ آدمی یا تو خود اعلان کرے یا اپنے خاندان کے کسی فرد سے اعلان کرائے۔ خاندان سے باہر کے کسی آدمی کا کیا ہوا اعلان تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ سے حضرت علیؓ کی ملاقات عرج یا وادی ضجنان میں ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا کہ امیر بنا کر بھیجے گئے ہو یا مامور؟ حضرت علیؓ نے کہا: ''مامور کی حیثیت میں آیا ہوں۔''

پھر دونوں آگے بڑھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو حج کرایا۔ جب دسویں تاریخ یعنی قربانی کا دن آیا تو حضرت علیؓ نے جمرہ کے پاس کھڑے ہو کر لوگوں میں اعلان کیا، جس کا حکم رسول ﷺ نے دیا تھا۔ ابو ہریرہؓ بھی حضرت علیؓ کی ایک جانب موجود تھے۔ حضرت علیؓ نے با آواز بلند سورۂ برأۃ (سورۂ توبہ) کی ابتدائی 36 آیات تلاوت کی۔

ان آیات کی تلاوت کے بعد کچھ دیر حضرت علیؓ نے سکوت فرمایا۔ پھر با آواز بلند یہ ارشاد کیا: ''اے لوگو، کوئی کافر جنت میں داخل نہ ہوگا۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لیے نہ آئے۔ اور کوئی برہنہ شخص کعبے کا طواف نہ کرے۔ پیغمبر ﷺ سے جس شخص کا بھی عہد و پیمان ہے، وہ اپنی مقررّہ مدت تک قائم رہے گا۔ حضرت علیؓ نے چاروں باتوں کا لوگوں میں اعلان کر دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے چار مہینے مہلت دی، تاکہ تمام لوگ اپنی اپنی پناہ گاہوں اور شہروں کو واپس چلے جائیں۔ اس دن سے کوئی مشرک حج کے لیے نہیں آیا، اور نہ کسی برہنہ شخص نے کعبے کا طواف کیا۔ اس روز سے دولتِ اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی۔

حضرت علیؓ کے اس اعلان کا نتیجہ بہت اچھا برآمد ہوا اور ان قبائل کے دل و دماغ سے ہر قسم کا تردد رفع ہو گیا جو دعوتِ اسلام پر لبیک کہنے میں ابھی تک سستی کر رہے تھے۔ یمن، مرہ، بحرین اور یمامہ کے علاقے اسلام کے زیرنگیں آ گئے اور چند لوگوں کے سوا، جو اپنے اوپر نازاں تھے۔ اور جنھیں غرورِ جاہ قبولِ اسلام سے روکے ہوئے تھا، کوئی بھی آپ ﷺ کا مخالف نہ رہا۔

عامر بن طفیل

ایسے لوگوں میں سے ایک عامر بن طفیل تھا۔ وہ بنی عامر کے ایک وفد کے ہمراہ قبولِ اسلام کے ارادے سے مدینے آیا تھا۔ جب یہ وفد آنحضور ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو عامر نے اسلام قبول نہ کیا، بلکہ اس نے آپ ﷺ کی ہمسری پر کمر باندھی۔ آپ ﷺ نے اسے قبولِ اسلام پر آمادہ کرنا چاہا، مگر وہ انکار پر مصر رہا اور یہ کہہ کر چلا گیا: ''بخدا، میں تم سے لڑنے کے لیے اس شہر کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں گا۔'' آپ ﷺ نے دعا کی ''یا اللہ، مجھے عامر بن طفیل کے شر سے بچا۔'' وہ اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اس کی گردن میں طاعون کی گلٹی نکل آئی۔ بنی سلول کی ایک عورت کے یہاں اسے موت نے آ دبایا۔ مرتے وقت اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: ''اے بنی عامر، کیا میں اونٹ کی مانند گردن

اعون کی گلٹی لیے ہوئے ایک سلولی عورت کے گھر میں جان دے دوں گا۔"

ربد بن قیس

اسی گروہ میں سے ایک اور شخص اربد بن قیس نے بھی قبول اسلام سے انکار کردیا۔ ہ بھی بنی عامر کی جانب واپس آ گیا، لیکن زیادہ دن نہ گزرنے پائے کہ وہ اونٹ پر وار ہوکر اسے فروخت کرنے جا رہا تھا کہ اس پر بجلی گری اور وہ جل مرا۔ عامر اور اربد کے انکار کے باوجود ان کی قوم اسلام لے آئی، اور ان کے عزم میں اس انکار سے مطلق رق نہ آسکا۔

مسیلمہ بن حبیب

ان سے بھی زیادہ گراہوا ایک اور شخص مسیلمہ بن حبیب تھا۔ یہ اہل یمامہ میں سے تھا۔ بنی حنیفہ کے وفد کے ہم راہ مدینے آیا۔ قوم کے لوگ اسے مال اسباب کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کر کے خود رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ آپ ﷺ نے ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عطیہ مرحمت فرمایا۔ انھوں نے آپ ﷺ سے مسیلمہ کا ذکر بھی کیا۔ آپ ﷺ نے اسے بھی کچھ عطا کر دیا اور فرمایا: وہ تم سے کم رتبہ نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ وہ ان لوگوں کے سامان کی حفاظت کے لیے پیچھے رہ گیا تھا۔ جب مسیلمہ نے اپنی قوم کی زبانی حضور ﷺ کی یہ بات سنی تو اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا، اور کہا: خدا نے مجھے محمد ﷺ کے ساتھ نبوت میں شریک کر دیا ہے۔ پھر وہ اپنی قوم کے سامنے مسجع کلام پڑھنے لگا اور قرآنِ مجید کے جواب میں یہ کہنے لگا:

ترجمہ: "خدا نے حاملہ عورت پر احسان کیا، اس نے اس کے پیٹ کی جھلی اور انتڑیوں سے ایک جاندار کو نکالا جو دوڑتا پھرتا ہے۔"

مسیلمہ نے شراب خوری اور زنا کاری کو جائز و حلال قرار دے دیا اور اپنی قوم کو نماز کی معافی بھی دے دی۔ اس نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ معدودے چند افراد کے ماسوا باقی قبائل تمام اطراف سے جوق در جوق مدینے میں آ کر مشرف بہ اسلام ہونے لگے۔ ان جماعتوں کے پیشوا بڑے بڑے لوگ مثلاً عدی بن حاتم، عمرو بن معدی کرب وغیرہ تھے۔ حمیر کے امرا نے ایک قاصد کے ذریعے سے رسول ﷺ کے پاس خط بھیج کر اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا۔ آپ ﷺ نے انھیں ایک تحریر کے ذریعے سے اسلام کے مقرر کیے ہوئے حقوق و فرائض سے آگاہ کیا۔

وفود

فتح مکہ کا واقعہ حالات کو تبدیل کرنے میں، اسلام کو قوت بخشنے میں، اہل عرب کا مؤقف متعین کرانے میں اور اسلام کے سامنے انھیں سپر انداز کرنے میں کتنے گہرے اور دُور رس اثرات رکھتا تھا۔ یہ کیفیت غزوۂ تبوک کے بعد پختہ سے پختہ تر ہوگئی۔ 9-اور 10-ہجری ان دو برسوں میں مدینہ آنے والے وفود کا تانتا بندھا ہوا تھا اور لوگ اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہو رہے تھے، یہاں تک کہ وہ اسلامی لشکر جو فتح مکہ کے موقع پر دس ہزار سپاہ پر مشتمل تھا، اس کی تعداد غزوۂ تبوک میں (جب کہ ابھی فتح مکہ پر پورا ایک سال بھی نہیں گزرا تھا) اتنی بڑھ گئی کہ وہ تیس ہزار فوجیوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں تبدیل ہوگیا۔ پھر ہم حجۃ الوداع میں دیکھتے ہیں کہ ایک لاکھ 24 ہزار یا ایک لاکھ 44 ہزار اہل اسلام کا سیلاب اُمڈ پڑا ہے، جو رسول ﷺ کے گرداگرد اس طرح لبیک پکارتا، تکبیر کہتا اور حمد و تسبیح کے نغمے گنگناتا ہے کہ آفاق گونج اٹھتے ہیں اور وادی و کوہسار نغمۂ توحید سے معمور ہو جاتے ہیں۔

ابن ہشام نے سن 9 ہجری کو اور طبری نے سن 10 ہجری کو "عام الوفود" کا نام دیا ہے۔ ان وفود کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں کا اختلاف ہے۔ ابن اسحاق کے پاس پندرہ وفود کا ذکر ہے۔ حافظ ابن قیم نے "زاد المعاد" میں 34 وفود کا حال لکھا ہے۔ ابن سعد نے "طبقات" میں 70 وفود کا حال بیان کیا ہے۔ "طبقات" میں تو ان وفود کا ذکر پچاس صفحات میں کیا ہے۔ یہاں صرف ان کے اسماء کی فہرست دی جا رہی ہے۔

مزینہ۔ اسد۔ تمیم۔ عبس۔ فزارہ۔ مرہ۔ ثعلبہ۔ محارب۔ سعد بن بکر۔ کلاب۔ روَاس ابن کلاب۔ عقیل بن کعب جعدہ۔ قشیر بن کعب۔ بنی البکاء۔ کنانہ۔ اشجع۔ باہلہ۔ سلیم۔ ہلال بن عامر۔ عامر بن صعصعہ۔ ثقیف۔ عبدالقیس۔ بکر بن وائل۔ تغلب۔ حنیفہ۔ شیبان۔ طے۔ تجیب۔ خولان۔ جعفی۔ صدا۔ مراد۔ زبید۔ کندہ۔ صدف۔ خشین۔ بلّی۔ سعد ہزیم۔ عذرہ۔ سلاماں۔ جہینہ۔ کلب۔ جرم۔ ازد۔ غسان۔ حارث بن کعب۔ ہمدان۔ سعد العشیرہ۔ عنس۔ داریتین۔ غامد۔ نخع۔ بجیلہ۔ خثعم۔ اشعرین۔ حضر موت۔ ازدعمان۔ غافق۔ بارق۔ دوس۔ ثمالہ۔ حدان۔ اسلم۔ جذام۔ مہرہ۔ حمیر۔ نجران۔ جشیان۔

(تاریخی اہمیت کے وفود کے تذکرے کے لیے ملاحظہ ہو کتاب 13 بہ عنوان "اشاعت پیغام رسول ﷺ")

9 ہجری کے متفرق واقعات

(1) ابراہیم بن رسول ﷺ کی ولادت

سیدنا ابراہیم ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے پیدا ہوئے۔ جب ولادت کی اطلاع سلمیٰ دایہ کے شوہر ابو رافعؓ نے حضور ﷺ تک پہنچائی تو حضور ﷺ نے اس خوش خبری پر انھیں ایک غلام عطا فرمایا اور بچے کا نام اپنے جدِّ بزرگوار حضرت ابراہیمؑ کے نام پر "ابراہیم" رکھا۔ ابراہیم ابھی ایام رضاعت میں تھے، اٹھارہ ماہ کی عمر میں وفات پائی۔ (ان کے پورے ذکر کے لیے ملاحظہ ہو کتاب پنجم بہ عنوان "اہل بیت")

(2) لعان

اسی سال عورتوں پر لعان کا حکم آیا۔ سورۂ نُور میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ حضرت عویمرؓ بن حارث عجلانی اور حضرت خولہؓ بنت قیس کے درمیان لعان واقع ہوا۔ حضرت عویمرؓ اپنے چچازاد بھائی حضرت عاصم بن عدی کے پاس گئے اور کہا، کوئی آدمی

اپنی بیوی کے پاس غیر مرد کو دیکھے تو کیا کرے؟ حیا کی وجہ سے حضرت عاصمؓ سے کہا کہ حضور ﷺ سے دریافت کریں۔ وہ گئے، مگر شرم مانع ہوئی۔ آخر حضرت عویمرؓ نے خود پوچھا۔ اس پر سورۂ نور کی آیات 6 تا 9 نازل ہوئیں۔

ترجمہ: ''جو لوگ اپنی بیویوں کو تہمت لگائیں اور بجز ان کی ذات کے کوئی گواہ نہ ہو، تو پس ان کی گواہی چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دینا ہے۔ یہ کہ دے کہ بے شک میں سچا ہوں اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں، اور اس کے بعد اس عورت سے سزا (حدِ زنا) اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار بار قسم کھا کر کہے کہ بے شک یہ مرد جھوٹا ہے، اور پانچویں بار کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ہو، اگر یہ سچا ہو۔''

(3) ایلا، تخییر اور تحریم کے واقعات

یہ تینوں واقعات بھی سن 9 ہجری میں آنحضور ﷺ کی حیات طیبہ میں پیش آئے۔ ایلا کے معنی ہیں، شوہر کا بیوی کے قریب نہ جانے کی قسم کھانا۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی ازواج سے ایلا فرمایا۔ قسم کھائی کہ ایک ماہ تک ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔

ایلاء کے علاوہ تخییر اور تحریم کے واقعات میں بھی ازواج مطہرات سے تعلقات میں آنحضور ﷺ کی کشیدہ خاطری کے پہلو شامل ہیں جنھیں بھڑکانے میں منافقین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کتاب پنجم بہ عنوان ''اہل بیت'')

(4) وفات نجاشی

شاہ حبشہ اصحمہ نجاشی نے وفات پائی۔ مدینہ سے باہر نکل کر سب نے چار تکبیروں سے حضور ﷺ کی امامت میں نجاشی کی نمازِ جنازہ پڑھی۔

(5) ام کلثوم کی وفات

بنت رسول ﷺ حضرت امِ کلثوم، زوجہ حضرت عثمان بن عفان کی وفات۔ ان کی وفات پر آپ ﷺ کو سخت غم ہوا اور آپ نے حضرت عثمانؓ سے فرمایا کہ اگر میرے پاس تیسری لڑکی ہوتی تو اس کی شادی بھی تم سے کر دیتا۔

(6) عبداللہ بن ابی کی موت

تبوک سے رسول ﷺ کی واپسی کے بعد راس المنافقین عبداللہ بن ابی نے وفات پائی۔ حضور ﷺ نے اس کے لیے دعائے مغفرت کی اور حضرت عمرؓ کے روکنے کے باوجود اس کی نمازِ جنازہ پڑھی۔ بعد میں وحی نازل ہوئی اور اس میں حضرت عمرؓ کی موافقت اور تائید کرتے ہوئے منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے سے منع کر دیا گیا۔

(7) غامدیہ عورت کا اعتراف گناہ

قبیلہ غامد کی ایک عورت نے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بدکاری کا اقرار کیا تھا۔ اسے رجم کیا گیا۔ اس عورت نے بچے کی پیدائش کے بعد جب دودھ چھڑا لیا، تب اسے رجم کیا گیا تھا۔

حجۃ الوداع

گزشتہ سال 9 ہجری کے حج کے موقع پر حضرت علیؓ بن ابی طالب نے مسلم زائرین بیت اللہ اور مشرکین کے سامنے سورہ براءۃ کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی تھی اور منیٰ میں انھوں نے آنحضور ﷺ کے چار نکاتی فرمان سے مطلع کیا تھا کہ جنت میں کسی کافر کا داخلہ ممکن نہیں۔ کسی مشرک کو اس سال کے بعد حج کی اجازت نہ ہوگی۔ کوئی شخص برہنگی کی حالت میں طواف نہ کر سکے گا، اور جس شخص کا رسول ﷺ سے کوئی معاہدہ ہے، مقررہ مدت تک باقی رہے گا۔

ان حالات میں تمام مشرکین عرب کو اس بات کا پختہ یقین ہو گیا تھا کہ اب بت پرستی کا وجود باقی نہیں رہ سکتا، اور اگر وہ اپنی قدیم روش پر جمے رہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ خدا اور رسول ﷺ سے برسرِ پیکار ہیں۔ یہ ان لوگوں کے خیالات تھے جو عرب کے جنوبی علاقے یعنی یمن اور حضرموت میں مقیم تھے، کیوں کہ حجاز اور اس سے متصل شمالی علاقے کے لوگ اسلام قبول کر کے نئے دین کی پناہ میں آ چکے تھے لیکن جنوبی علاقے میں مشرکین اور عیسائیت کے پیرو موجود تھے۔ مشرکین تو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہو رہے تھے اور وہ مدینے میں اپنے وفود بھیج کر اسلام کی جانب مائل ہو رہے تھے، لیکن یمن کے یہودیوں اور عیسائیوں کے دل اب تک صاف نہیں ہوئے تھے۔ البتہ یمن کے بعض وفود کے آنے اور حلقہ بگوش اسلام ہونے سے وہاں بھی اسلام کی اشاعت ہونے لگی۔

حضرت معاذؓ بن جبل کی تقرری

حجۃ الوداع سے پہلے آنحضور ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو یمن کے زیریں حصے پر، اور حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا حاکم مقرر کیا۔ امارتِ یمن پر روانگی سے پہلے حضرت معاذؓ رخصتی سلام کے لیے حاضر ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے کچھ دور تک ان کی مشایعت کی۔ حضرت معاذؓ اونٹ پر سوار تھے اور رسول ﷺ پاپیادہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سواری سے اترنا چاہا تو منع فرما دیا۔

حضور ﷺ نے دریافت کیا: ''معاذ، اب تمھیں گوناگوں اور پیچیدہ مسائل سامنا ہوگا۔ بتاؤ، فیصلہ کس طرح کرو گے؟''

عرض کیا: ''کتاب اللہ کے مطابق۔''

فرمایا: ''فرض کرو، اگر کتاب اللہ میں کوئی واضح حکم نہ ملے تو؟''

عرض کیا: ''سنت رسول ﷺ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔''

فرمایا: ''اور اگر وہ معاملہ ان میں سے نہ ہو، جس کا فیصلہ رسول ﷺ نے کیا ہو؟''

عرض کیا: ''ایسی صورت میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ اس میں کوئی کوتاہی نہیں کروں گا۔''

یہ جواب سن کر رسول اللہ ﷺ نے خوش ہو کر اپنا دست مبارک ان کے سینے پر پھیر کر فرمایا: ''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جس نے رسول ﷺ کے نمائندے کو اس چیز کی توفیق دی جس سے اللہ اور اس کا رسول ﷺ راضی ہے۔''

وداع کے وقت فرمایا، تم اہل کتاب میں سے جس قوم میں پہنچو، پہلے اس

اللہ نے تجھ پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اور جب وہ یہ بات مان لیں پھر کہنا کہ اللہ نے تم پر سال بھر میں، ماہ رمضان کے روزے فرض کیے ہیں، اور جب یہ مان لیں تو کہنا کہ اہل استطاعت پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے۔ یہ بھی مان لیں تو کہنا کہ اللہ نے تمھارے اموال پر صدقہ فرض کیا ہے جو تمھارے امرا سے لے کر تمھارے غربا کو دیا جائے گا، اور جب یہ بات بھی مان لیں تو پھر اس قوم کی قیمتی جائیدادوں کی حفاظت اور اس کے مظلوموں کی دادرسی تم پر فرض ہے۔ مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا، کیوں کہ پھر اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب اور پردہ نہیں ہوگا۔''

حضور ﷺ نے معاذؓ سے جو آخری بات فرمائی، وہ یہ تھی: ''اے معاذ! غالباً تم مجھ سے اس سال کے بعد نہ مل سکو گے، بلکہ غالباً میری اس مسجد اور میری قبر کے پاس سے گزرو گے؟'' یہ سن کر حضرت معاذؓ رونے لگے۔

فرمایا: ''رو مت۔ رونا شیطانی حرکت ہے۔ جاؤ، اللہ تمھیں ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ اہل یمن کو ایک فرمان میں لکھا: ''میں اپنے لوگوں میں سے بہترین شخص کو تمھارے لیے بھیجتا ہوں۔''

مدینہ میں آخری وفد کی آمد

یمن کا ایک قبیلہ نخع ابھی تک اسلام سے برگشتہ تھا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے اس قبیلے کو یہ امر مانع تھا کہ اب تک اہل یمن حجاز پر حملے کرتے رہے تھے۔ حجاز نے اب تک ان پر چڑھائی نہ کی تھی، اس لیے ان کے دلوں میں اپنی برتری کا احساس پیدا ہو گیا تھا، اور وہ اسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ رسول کریم ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت دینے کے لیے حضرت علیؓ کو روانہ فرمایا۔ پہلے تو یہ لوگ حضرت علیؓ سے بڑی سرکشی سے پیش آئے اور جنگ کے لیے آمادہ ہو گئے۔ حضرت علیؓ کی عمر اگرچہ اس وقت زیادہ نہ تھی اور آپ ﷺ کے ہم راہ کل تین سو سوار تھے، لیکن آپؓ نے دلیری سے ان کا مقابلہ کیا اور ان کی جمعیت کو منتشر کر دیا۔ یہ لوگ دوبارہ اکٹھے ہوئے اور ایک بار پھر منظم ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ حضرت علیؓ نے ہمت نہ ہاری اور انھیں گھیرے میں لے کر تہ تیغ کرنا شروع کیا۔ حضرت علیؓ کا یہ حملہ اتنا سخت تھا کہ انھیں مجبوراً مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ پھر حضرت علیؓ کی دعوت کے نتیجے میں وہ لوگ اسلام لے آئے اور ثابت قدمی سے اسلام پر قائم رہے۔ حضرت علیؓ اپنا مفوضہ کام ختم کر کے واپس آ گئے اور ان لوگوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری حضرت معاذؓ نے اٹھائی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کا بھی ایک وفد رسول کریم ﷺ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوا۔ یہ آخری وفد تھا جو حضور ﷺ کی زندگی میں مدینہ آیا۔

حجۃ الوداع کی تیاری

اس سال کا بیش تر حصہ وفود کی آمد، اُن کے استقبال اور ان کی تعظیم و تعلیم میں گزر چکا تھا۔ ماہ ذی قعدہ بھی ختم ہونے کے قریب تھا۔ آنحضرت ﷺ ہجرت کے بعد دو مرتبہ عمرہ کر کے حج اصغر تو بجا لا چکے تھے، لیکن حج اکبر کی ادائیگی کا اب تک موقع نہ آیا تھا۔ لیکن قدرت نے اب آپ کو یہ موقع فراہم کر دیا تھا۔ درحقیقت اللہ چاہتا تھا کہ اپنے پیغمبر ﷺ کو اس دعوت کے ثمرات دکھلا دے جس کی راہ میں آپ ﷺ نے بیس برس سے زیادہ عرصے تک طرح طرح کی مشکلات اور مشقتیں برداشت کی تھیں، اور اس کی صورت یہ ہو کہ آپ ﷺ حج کے موقع پر اطرافِ مکہ میں قبائل عرب کے افراد اور نمائندگان کے ساتھ جمع ہوں، پھر وہ آپ ﷺ سے دین کے احکام و شعائر حاصل کریں اور آپ ﷺ ان سے یہ گواہی لیں کہ آپ ﷺ نے امانت ادا کر دی، اللہ کے پیغام کی تبلیغ فرما دی اور امت کی خیر خواہی کا حق ادا فرما دیا۔

حضور ﷺ کے اعلان حج کی خبر قبائل میں پھیلی اور ساتھ ہی رسول ﷺ کا یہ ارشاد لوگوں تک پہنچا کہ انھیں بھی اس سال اللہ کے رسول ﷺ کے ہم راہ فریضہ حج ادا کرنا چاہیے، تمام جزیرہ عرب میں ہلچل مچ گئی۔ لوگ پہاڑوں اور وادیوں، میدانوں اور صحراؤں کو عبور کرتے ہوئے مدینہ کا رخ کرنے لگے۔ مدینہ کے گرد خیموں کا ایک شہر آباد ہو گیا، جس میں ایک لاکھ سے زیادہ ایسے اشخاص سکونت پزیر تھے جو رسول ﷺ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آپ ﷺ کے ہم راہ فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے جمع ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر اللہ کی قدرت پر ایمان لانا پڑتا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو کچھ عرصہ قبل ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، لیکن آج دین اسلام کی برکت سے ان کے درمیان سگے بھائیوں سے بھی زیادہ محبت پیدا ہو چکی تھی۔ ہر شخص رسول ﷺ کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہونے پر شاداں و فرحاں نظر آتا تھا۔ ان کا یہ بابرکت اجتماع اسلام کی صداقت کا زندہ ثبوت تھا۔ دشمنانِ اسلام نے اس نئے دین کو مٹانے کی خاطر کیا کیا کوششیں نہ کیں، لیکن ان کی یہ کوششیں رائیگاں ثابت ہوئیں۔ حق و صداقت کی فتح ہوئی۔ اللہ کا نور سرزمین عرب کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک پھیل گیا، اور وہ عرب جو پہلے ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، اسلام سے وابستہ ہو کر دشمنانِ دین کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد ہو گئے۔

مدینہ منورہ سے روانگی

پھر ہفتے کے دن، جب کہ ذی قعدہ میں چار دن باقی تھے۔ رسول کریم ﷺ نے کوچ کی تیاری فرمائی۔ بالوں میں کنگھی کی۔ تیل لگایا۔ تہبند پہنا۔ چادر اوڑھی۔ قربانی کے جانوروں کو قلاوہ پہنایا۔ چار رکعت نماز ظہر مسجد میں ادا کی۔ ظہر کے بعد مدینہ سے روانہ ہوئے۔ جب مدینہ سے چند میل باہر ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو قیام فرمایا، اور عصر کی نماز قصر کر کے پڑھی۔ اس دن کے بعد سے اہل مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ میقات مقرر ہوا۔ رات بھر یہیں خیمہ زن رہے۔

ذوالحلیفہ میں آپ ﷺ چار نمازیں ادا کر چکے تھے۔ عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں اس مبارک وادی میں پانچ نمازیں پوری کرنے کے لیے آپ ﷺ نے ظہر کے بعد تک روانگی ملتوی کر دی۔ ذوالحلیفہ کے قیام کے دوران اسماء بنت عمیس کے ہاں محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ آپ ﷺ کو اطلاع ملی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''وہ غسل کر کے لنگوٹ کی طرز پر کپڑا باندھ لیں۔ اور پھر احرام کے کپڑے پہن کر تلبیہ کہیں اور حج کا سفر جاری رکھیں۔''

رسول ﷺ کی تمام ازواج مطہرات بھی اللہ کے گھر کے حاجیوں میں شامل تھیں۔ آپ ﷺ باری باری ان میں سے ہر ایک کے خیمے میں گئے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے غسل فرمایا۔ حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ کے جسم مبارک پر خوشبو لگائی۔ آپ ﷺ نے تہبند باندھ کر احرام کی دوسری چادر اوڑھ لی۔ دو رکعت ظہر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد مصلے ہی پر حج اور عمرہ دونوں کا ایک ساتھ احرام باندھتے ہوئے صدائے لبیک بلند کی۔ پھر باہر تشریف لائے۔ قصویٰ اونٹنی پر سوار ہوئے اور دوبارہ صدائے لبیک بلند کی۔ اس کے بعد اونٹنی پر سوار کھلے میدان میں تشریف لے گئے تو وہاں بھی لبیک پکارا:

لبيك۔ اللهم لبيك۔ لبيك لا شريك لك لبيك
الحمد ولنعمته والشكر لك لبيك۔ لبيك لا شريك لك لبيك۔

ترجمہ: ''اے اللہ! ہم تیرے حضور حاضر ہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ ہر قسم کی تعریف تیرے ہی لیے سزاوار ہے۔ عطائے نعمت تیرے ہی کرم سے وابستہ ہے۔ ہر قسم کا شکر تیرے ہی لیے واجب ہے۔ اے خدائے واحد ولاشریک، ہم تیرے حضور حاضر ہیں۔''

رسول کریم ﷺ کی اقتدا میں مسلمانوں نے بھی بلند آواز سے اِن تکبیرات کو اس طرح ادا کیا کہ دشت وجبل گونج اٹھے۔

مکہ معظمہ میں داخلہ

سفر کے نویں دن یعنی 4 ذوالحج کو صبح کے وقت حضور ﷺ ذی طویٰ میں تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ خاندانِ بنو ہاشم کے لڑکوں نے جب حضور ﷺ کی مبارک آمد کی خبر سنی تو خوشی سے باہر نکل آئے۔ حضور ﷺ نے فرطِ مسرت سے کسی بچے کو اپنی ناقہ کے آگے اور کسی کو پیچھے سوار فرمالیا۔

جب حضور ﷺ کی نظر کعبے پر پڑی تو فرمایا: ''اے خدا، اس گھر کو اور زیادہ عزت اور شرف دے۔''

پھر آپ ﷺ نے کعبے کا طواف کیا۔ طواف سے فارغ ہو کر مقام ابراہیم پر دوگانہ ادا کیا۔ اور سورۃ بقرہ کی آیت 125 پڑھی: ﴿واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى﴾

''اور مقام ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ۔''

پھر حضور ﷺ حجر اسود کی طرف لوٹے اور اسے بوسہ دیا۔ اس کے بعد مسجد کے دروازے ''باب الصفا'' سے باہر تشریف لائے۔ جب وہ صفا کے قریب پہنچے تو بقرہ کی آیت 158 تلاوت فرمائی:

﴿إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾

''صفا اور مروہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔''

جب صفا سے بیت اللہ پر نظر پڑی تو فرمایا:

((لا اله الا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد يحيى و يميت و هو على كل شيئى قدير۔ لا اله الا الله وحده۔ انجز وعده نصر عبده، هزم الا احزاب وعده .))

''اللہ کے سوا اور کوئی معبود اور آقا نہیں ہے۔ عبادت اور بندگی کی مستحق وہی ایک ذات ہے۔ عبادت اور بندگی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ فرماں روائی صرف اسے سزاوار ہے، اور حمد وستائش صرف اسے ہی زیبا ہے۔ وہی ہمیں حیات بخشتا اور موت دیتا ہے۔ وہ ہر کام کی طاقت اور قدرت رکھتا ہے۔ کوئی معبود نہیں اللہ کے سوا۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اس کی مخالف طاقتوں کو تنہا شکست دی۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ((ابداء بما بدا الله به)) ''میں بھی اسی چیز سے ابتدا کرتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ نے ابتدا فرمائی ہے۔''

پھر حضور ﷺ صفا سے اترے اور مروہ کی طرف چلے۔ جب حضور ﷺ بطن وادی میں پہنچے تو دوڑنا شروع کیا، اور جب وادی کی چڑھائی پر چڑھنا شروع کیا تو حضور ﷺ نے رفتار سست کر دی۔ حتیٰ کہ آپ ﷺ مروہ پر پہنچ گئے۔ مروہ پر آپ نے وہی عمل کیا جو صفا پر کیا تھا۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ آخری سعی ختم کر کے مروہ پر پہنچے۔ مروہ پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے لوگوں سے خطاب فرمایا۔ اس وقت لوگوں کا ایک انبوہ کثیر مروہ کے نیچے کھڑا آپ کا خطاب سن رہا تھا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر یہ بات، جو مجھے اب معلوم ہوئی ہے، پہلے معلوم ہوتی تو میں قربانی کے جانور ساتھ نہ لاتا، اور اپنے حج کو عمرے میں تبدیل کر دیتا۔'' حضور ﷺ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''تم لوگوں میں سے جو لوگ قربانی کے جانور ساتھ نہیں لائے ہیں، وہ حج کو عمرہ میں تبدیل کر کے احرام کھول سکتے ہیں۔''

یہ سن کر حضرت سراقہ بن جعشمؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، یہ حکم اس سال کے لیے ہے یا ہمیشہ کے لیے۔''

حضور ﷺ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر فرمایا: ''عمرہ حج میں داخل ہوا۔'' حضور ﷺ نے یہ الفاظ دو بار دہرائے۔ پھر فرمایا: ''یہ حکم صرف اس سال کے لیے نہیں، بلکہ ہمیشہ کے لیے ہے۔''

حضرت علیؓ یمن سے سیدھے، قربانی کے جانور ساتھ لیے، مکہ معظمہ تشریف لائے۔ آنحضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے احرام باندھتے وقت کیا نیت کی تھی۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ میں نے اس طرح نیت کی تھی:

((اللهم انى اهل بما اهل به رسولك .))

''اے اللہ، میں بھی اسی چیز کا احرام باندھتا ہوں، جس کا احرام رسول ﷺ باندھا ہے۔''

حضور ﷺ نے یہ سن کر حضرت علیؓ سے فرمایا: ''پس تم بھی میری طرح حلال ہو۔'' یعنی حج سے فراغت تک احرام باندھے رہو۔ دیگر لوگوں نے جو قربانی کے جا

ساتھ نہیں لائے تھے، احرام کھول دیئے۔

یوم ترویہ یعنی آٹھ ذوالحجہ کو حضور ﷺ نے منیٰ کی طرف جانے کا قصد فرمایا۔ ان صحابہؓ نے احرام کھول دیئے تھے، انھوں نے حج کا احرام باندھا اور حضور ﷺ کے سامنے منیٰ کو روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ اپنی ناقہ قصویٰ پر سوار منیٰ پہنچے اور رات کو یہیں قیام فرمایا۔

عرفات کو روانگی

جمعتہ المبارک، 9۔ذی الحجہ کی صبح تک حضور ﷺ منیٰ ہی میں قیام پزیر رہے۔ آپ ﷺ نے 9 ذی الحجہ کی نمازِ فجر تک منیٰ میں پانچ نمازیں ادا فرمائیں۔ جب سورج نکل آیا تو حضور ﷺ نے وادیٔ نمرہ میں خیمہ نصب کرنے کا حکم دیا۔ حضور ﷺ کے لیے جو خیمہ نصب کیا گیا، وہ ایک کمبل کا تھا۔ پھر حضور ﷺ منیٰ سے روانہ ہوئے۔ قریش کا خیال تھا کہ آنحضرت عرفات میں پہنچنے سے پہلے مزدلفہ میں مشعر الحرام کے قریب قیام فرمائیں گے، کیوں کہ زمانۂ جاہلیت میں قریش کا یہی دستور تھا، مگر حضور ﷺ اس دستور کے برعکس وادیٔ نمرہ میں تشریف لائے اور فرمایا:

((قفوا على مشاعركم فانكم على ارث من ارث ابيكم ابراهيم .))

"اپنے مقدس مقامات میں ٹھہرو، کیوں کہ تم اپنے باپ ابراہیمؑ کی میراث پر ہو۔"

خطبہ حجتہ الوداع

اس وادی کے ایک جانب عرفات اور دوسری جانب مزدلفہ ہے۔ حضور ﷺ نے دن ڈھلے تک خیمے میں قیام فرمایا۔ پھر قصویٰ پر سوار ہو کر عرفات میں تشریف لائے۔ آج ذوالحجہ کی نو تاریخ اور جمعہ کا دن تھا۔ تمام میدان سرتاسر لوگوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر شخص خداوندِ عالم کی حمد وثنا میں مصروف تھا۔ اس وقت سوا لاکھ سے بھی زائد لوگوں کا اجتماع احکامِ الٰہی کی تعمیل کے لیے ہمہ تن حاضر تھا۔ آنحضرت ﷺ نے پہاڑی پر چڑھ کر خطبے کا آغاز فرمایا:

ترجمہ: "اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ یکتا ہے۔ کوئی اس کا ساجھی نہیں۔ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ اس نے اپنے بندے (رسول ﷺ) کی مدد فرمائی اور تنہا اسی کی ذات نے باطل کی ساری مجتمع قوتوں کو زیر کیا۔

لوگو! میری بات غور سے سنو۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس سال کے بعد کبھی حج کے اس اجتماع میں، میں اور تم سب یکجا ہو سکیں گے۔

لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جا سکو۔ تم میں زیادہ عزت والا خدا کی نظروں میں وہی ہے جو خدا سے ڈرنے والا ہے۔" اب نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر، نہ کالا گورے سے افضل ہے، نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ صرف تقویٰ ہے۔

سارے انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔ اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے، خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں۔ بس بیت اللہ کے انتظام اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات باقی رہیں گی۔

قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ اللہ کے حضور تم اس طرح آؤ، کہ تمھاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہوا اور دوسرے لوگ سامانِ آخرت لے کر پہنچیں۔ دیکھو، اگر ایسا ہوا تو میں اللہ کے سامنے تمھارے کچھ بھی کام نہ آ سکوں گا۔

قریش کے لوگو! اللہ نے تمھاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمھارے فخر ومباہات کی اب کوئی گنجائش نہیں۔ لوگو! تمھارے خون اور تمھارے مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کر دی گئیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ تمھاری جان و مال اور آبرو کی اہمیت ایک دوسرے کے لیے ایسی ہی ہے جیسی تمھارے اس دن یعنی یومِ حج کی اور اس ماہ مبارک یعنی ذی الحجہ کی، خصوصاً اس شہر یعنی مکہ مکرمہ میں ہے۔ تم سب اللہ کے آگے جاؤ گے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی باز پرس فرمائے گا۔

دیکھو! کہیں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس ہی میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔ اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت اس کے مستحق تک بحفاظت پہنچا دے۔

لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو۔ ہاں غلاموں کا خیال رکھو۔ انھیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو۔ ایسا ہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو۔

زمانۂ جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں تلے روند دیا۔ زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں، میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن حارث کے (بنوسعد کے ہاں) دودھ پیتے بیٹے کا خون، جسے بنو ہذیل نے مار ڈالا تھا، اب میں معاف کرتا ہوں۔

دورِ جاہلیت کا سُود اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ پہلا سُود جسے میں چھوڑتا ہوں، عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سود ہے، اب یہ ختم ہو گیا۔

لوگو! اللہ نے ہر وارثِ حق دار کو اس کا حق (ورثہ) خود دے دیا۔ اب کوئی کسی وارث کے حق میں وصیت نہ کرے۔

بچہ اسی کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو، اس کی سزا رجم ہے۔ حساب کتاب خدا کے ہاں ہوگا۔

جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام جو اپنے آقا کے معاملے میں کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے گا، اس پر خدا کی لعنت!

قرض قابلِ ادائی ہے۔ مُستعار لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہیے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے، وہ تاوان ادا کرے۔

کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے کہ جس پر اس کا بھائی راضی ہو اور خوشی خوشی دے۔ خود پر اور ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔

عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی بغیر اجازت کسی کو دے۔

دیکھو! تمھارے اوپر تمھارے عورتوں کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح ان پر بھی تمھارے حقوق واجب ہیں۔ عورتوں پر تمھارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے گھروں میں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں، جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ خیانت کا کوئی کام نہ کریں۔ کوئی کام کھلی بے حیائی کا نہ کریں، اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انھیں معمولی جسمانی سزا دو اور وہ باز آ جائیں تو انھیں دستور کے مطابق کھلاؤ پلاؤ۔

عورتوں سے اچھا سلوک کرو، کیوں کہ وہ تو بس تمھاری پابند ہیں اور خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو کہ تم نے انھیں اللہ کے نام پر حاصل کیا اور اس کے نام پر وہ تمھارے لیے حلال ہوئیں۔ لوگو! میری بات سمجھ لو، میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔

میں تمھارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو گے، اگر اس پر قائم رہے اور وہ اللہ کی کتاب ہے، اور ہاں دیکھو دین کے بارے میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ ایسی باتوں کے سبب ہلاک کر دیے گئے۔

شیطان کو اب اس بات کی کوئی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ اب اس کی اس شہر میں عبادت کی جائے گی، لیکن اس کا امکان ہے کہ ایسے معاملات میں، جنھیں تم کم اہمیت دیتے ہو، اس کی بات مان لی جائے اور وہ اسی پر راضی ہے، اس لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرتے رہنا۔

لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرو۔ مہینے بھر کے روزے رکھو۔ اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی کے ساتھ دیتے رہو۔ اپنے اللہ کے گھر کا حج کرو اور اپنے اہل امر کی اطاعت کرو تو اپنے ربّ کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اب مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمے دار ہوگا، اور نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا، نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔

سنو! جو لوگ یہاں موجود ہیں، انھیں چاہیے کہ یہ ہدایتیں اور یہ باتیں ان لوگوں کو بتا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو۔

لوگو! تم سے میرے بارے میں اللہ کے ہاں سوال کیا جائے گا۔ بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟

لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی گواہی دیں گے کہ آپ ﷺ نے امانت دین پہنچا دی، حق رسالت ادا فرما دیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔

یہ سن کر حضور ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی جانب اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا: ''اللہ گواہ رہنا۔ اللہ گواہ رہنا۔ اللہ گواہ رہنا۔''

جب خطبہ ختم ہوا تو حضور ﷺ نے حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا اور دو رکعت نماز آہستہ قرأت کے ساتھ پڑھی۔ اگرچہ اس دن جمعہ تھا، مگر حضور ﷺ نے جمعہ نہ پڑھا۔ پھر دوسری اقامت کے ساتھ آپ ﷺ نے عصر کی بھی دو رکعت نماز پڑھی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضور ﷺ موقف میں تشریف لائے۔ پہاڑ کے نیچے صخرات کے پاس قبلہ رو ہو کر کھڑے ہوئے۔ جبل مشاۃ آپ ﷺ کے سامنے تھا۔ حضور اونٹ پر سوار تھے اور نہایت گریہ وزاری کے ساتھ غروب آفتاب تک دعا کرتے رہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہم نے اس جگہ وقوف کیا، مگر تمام عرفہ موقف ہے اور فرمایا: ''حج یوم عرفہ ہے اور بہترین دعا یوم عرفہ کی دعا ہے۔''

اسی مقام پر سورۂ مائدہ کی تیسری آیت نازل ہوئی:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدہ: ۳)

ترجمہ: ''آج ہم نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا۔ تمھارے اوپر اپنی نعمت پوری کی اور تمھارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔''

حضرت عمرؓ نے یہ آیت سنی تو رونے لگے۔ دریافت کیا گیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ فرمایا، اس لیے کہ کمال کے بعد زوال ہی تو ہے۔

یہ آیت بالاتفاق قرآن حکیم کا آخری نزول تھا۔ اس آیت کریمہ کا نزول اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو جس مقصد کے لیے دنیا میں بھیجا تھا، وہ پورا ہو چکا۔ اور جو احکام خداوندی آپ ﷺ کے ذریعے آنے تھے، وہ آ گئے، اس لیے دنیا میں آپ ﷺ کے رہنے کی ضرورت باقی نہ رہی۔

سورج غروب ہونے لگا۔ تھوڑی زردی ختم ہوئی۔ پھر سورج غائب ہو گیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو پیچھے بٹھایا اور وہاں سے روانہ ہو کر مزدلفہ تشریف لائے۔ مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک اذان اور دو اقامت سے پڑھیں۔ درمیان میں کوئی نفل نماز نہیں پڑھی۔ اس کے بعد آپ ﷺ لیٹ گئے اور طلوع فجر تک آرام کیا۔ صبح نمودار ہوتے ہی اذان و اقامت کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد قصویٰ پر سوار ہو کر مشعر حرام تشریف لائے۔ اور قبلہ رخ ہو کر اللہ سے دعا کی اور اس کی تکبیر و تہلیل اور توحید کے کلمات کہے۔ یہاں اتنی دیر تک ٹھہرے رہے کہ خوب اجالا ہو گیا۔ اس کے بعد سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے منیٰ کے لیے روانہ ہو گئے۔ اب کی بار حضرت فضلؓ بن عباس کو اپنے پیچھے سوار کیا، اور حضرت اسامہ بن زید پیدل۔ راستے میں حضور ﷺ تلبیہ کرتے رہے۔

جب حضور ﷺ بطن محسر میں پہنچے تو اونٹ کو تیز کر دیا۔ آپ کا قاعدہ تھا کہ جب کبھی ایسے مقام پر پہنچتے، جہاں کسی قوم پر عذاب الٰہی نازل ہوا ہو تو وہاں سے

گزرتے وقت عجلت فرماتے۔ وادی محسر منیٰ اور مزدلفہ کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ وادی نہ منیٰ کا جز ہے اور نہ مزدلفہ کا۔ یہاں اصحاب فیل پر عذاب الٰہی نازل ہوا تھا۔

آنحضور ﷺ یہاں سے درمیانی راستے سے چلے جو جمرۂ کبریٰ کے پاس پہنچتا تھا۔ جب حضور ﷺ منیٰ میں تشریف لائے تو اسفل وادی میں ٹھہرے۔ منیٰ کو آپ ﷺ نے اپنے داہنے کیا، اور بیت کو بائیں اور جُمرۂ کی طرف رخ کیا۔ پھر اونٹ کے اوپر ہی سے آپ ﷺ نے سات کنکریاں ماریں۔ حضور ﷺ ایک ایک کنکری مارتے اور ہر کنکری کے ساتھ تکبیر کہتے جاتے تھے۔ کنکریاں چھوٹی چھوٹی تھیں، جنھیں چٹکی میں لے کر چلایا جاسکتا تھا۔

اس کے بعد آپ ﷺ قربان گاہ تشریف لے گئے اور اپنے دست مبارک سے 63 اونٹ ذبح کیے۔ پھر حضرت علیؓ کو سونپ دیا اور انھوں نے بقیہ 37 اونٹ ذبح کیے۔ اس طرح سو اونٹ کی تعداد پوری ہوگئی۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھی اپنی ہدی (قربانی) میں شریک فرمالیا تھا۔ اس کے بعد آپ ﷺ کے حکم سے ہر اونٹ کا ایک ایک ٹکڑا کاٹ کر ہانڈی میں ڈالا گیا اور پکایا گیا۔ پھر آپ ﷺ نے اور حضرت علیؓ نے اس گوشت میں سے کچھ تناول فرمایا اور اس کا شوربہ پیا۔

بعدازاں رسول ﷺ سوار ہوکر مکہ تشریف لے گئے۔ بیت اللہ کا طواف فرمایا، اور مکہ ہی میں ظہر کی نماز ادا فرمائی۔ پھر چاہ زمزم پر بنوعبدالمطلب کے پاس تشریف لے گئے۔ وہ حجاج کرام کو زمزم کا پانی پلا رہے تھے۔ انھوں نے آپ ﷺ کو ایک ڈول پانی دیا اور آپ ﷺ نے اس میں سے حسب خواہش پیا۔

آج یوم النحر تھا، یعنی ذی الحج کی دس تاریخ تھی۔ رسول کریم ﷺ نے آج بھی دن چڑھے ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ خطبے کے وقت آپ ﷺ خچر پر سوار تھے، اور حضرت علیؓ آپ ﷺ کے ارشادات صحابہؓ کو سنا رہے تھے۔ صحابہؓ کرام کچھ بیٹھے اور کچھ کھڑے تھے۔ سوا لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کا اجتماع ہمہ تن گوش تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

''زمانہ گھوم پھر کر اپنی اسی دن کی ہیئت پر پہنچ گیا ہے، جس دن اللہ نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔ سال بارہ مہینے کا ہے، جن میں چار مہینے حرمت کے ہیں۔ تین تو متواتر مہینے ہیں، ذی قعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ اور چوتھا رجب مضر کا مہینہ جو جمادی الثانی اور شعبان کے بیچ میں ہے۔''

ازاں بعد لوگوں سے مخاطب ہوکر پوچھا: ''آج کونسا دن ہے؟''
لوگوں نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔''
حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا آج قربانی کا دن نہیں؟''
لوگوں نے عرض کیا: ''بے شک، اے اللہ کے رسول ﷺ!''
پھر ارشاد نبوی ﷺ ہوا: ''یہ کونسا مہینہ ہے؟''
لوگوں نے عرض کیا: ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔''

حضور ﷺ نے لوگوں سے پوچھا: ''کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟''
''ہاں، بے شک اے اللہ کے رسول ﷺ۔'' حاضرین نے جواب دیا۔
''یہ کونسا شہر ہے؟'' نبی آخرالزماں ﷺ نے ارشاد فرمایا۔
لوگ خاموش رہے۔
حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں؟''
''بے شک'' لوگوں نے جواب دیا۔

جب سامعین کے دل پر آج کے دن، اس مہینے اور خود اس شہر مکہ معظمہ کے احترام و اکرام کا خیال پوری طرح جاگزیں ہوگیا اور یہ بات ہر شک و شبے سے بالاتر ہوگئی کہ اس دن اور اس مقام میں جنگ اور خون ریزی جائز نہیں تو آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''تو تمھارا خون، تمھارا مال اور تمھاری آبرو (تا قیامت) اسی طرح محترم ہے، جس طرح یہ دن اس مہینے میں اور اس شہر میں محترم ہے۔''

''ہاں میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ خود ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ تمھیں خدا کے سامنے حاضر ہونا پڑے گا اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔ ہاں، مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے۔ ہاں، باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں، اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔''

''اگر کوئی حبشی بنی بریدہ غلام بھی تمھارا امیر ہو اور وہ تمھیں اللہ کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو۔ ہاں، شیطان اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ اب تمھارے اس شہر میں اسکی پرستش قیامت تک نہ کی جائے گی، لیکن البتہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی پیروی کی جائے گی اور وہ اسی سے خوش ہو گا۔''

''اور تم لوگ بہت جلد اپنے پروردگار سے ملوگے، اور وہ تم سے تمھارے اعمال کے متعلق پوچھے گا۔ لہٰذا دیکھو، میرے بعد پلٹ کر گمراہ نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ بتاؤ، کیا میں نے تبلیغ کردی؟''

صحابہ نے کہا: ''ہاں۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ، گواہ رہ۔ جو شخص موجود ہے، وہ غیر موجود تک میری باتیں پہنچا دے، کیوں کہ بعض وہ افراد جن تک یہ باتیں پہنچائی جائیں گی، وہ بعض موجودہ سننے والے سے ان باتوں کی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔''

بعدازاں حضور ﷺ ایام تشریق یعنی 11، 12 اور 13 ذی الحجہ کو منیٰ میں مقیم رہے۔ اس دوران آپ ﷺ حج کے مناسک بھی ادا فرما رہے تھے اور لوگوں کو شریعت کے احکام بھی سکھا رہے تھے۔ اللہ کا ذکر بھی فرما رہے تھے۔ 13-ذی الحج بروز منگل، ظہر کے بعد حضور ﷺ منیٰ سے روانہ ہوکر محصّب میں آئے، جسے ابطح اور خیف کنانہ بھی کہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بعثت کے ابتدائی وقت قریش اور بنی کنانہ نے بنی ہاشم اور بنی المطلب کے خلاف قطع تعلق کا معاہدہ کیا تھا۔ حضرت ابورافعؓ

نے محصب میں پہلے پہنچ کر اپنی مرضی سے قُبّہ نصب کر دیا تھا۔ آنحضور ﷺ جب تشریف لائے تو وہاں قیام فرمایا۔ ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں وہیں ادا فرما کر آرام کیا۔ پچھلے پہر اُٹھ کر مکہ معظمہ تشریف لائے اور طوافِ وداع کیا۔ مکہ میں نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد مہاجرین وانصار کے ہم راہ مدینہ مراجعت فرمائی۔ راستے میں جحفہ سے تین میل پر واقع مقام غدیر خم پر پہنچے تو آپ ﷺ نے تمام صحابہؓ کو جمع فرما کر ایک مختصر سا خطبہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد آپ ﷺ نے صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''لوگو! میں بھی بشر ہوں، ممکن ہے کہ اللہ کا فرشتہ جلد آ جائے اور مجھے قبول کرنا پڑے (یعنی وصالِ حق)۔ میں تمھارے درمیان دو بھاری چیزیں چھوڑتا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب جس کے اندر ہدایت اور روشنی ہے۔ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رکھو۔ دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمھیں اللہ کی یاد دلاتا ہوں۔''

اس مقام سے روانہ ہو کر آنحضرت ﷺ ذوالحلیفہ میں پہنچے اور یہیں رات بسر فرمائی۔ صبح کے وقت ایک طرف سے آفتاب طلوع ہوا اور دوسری طرف سے آفتاب نبوت۔ حضور ﷺ مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ جب شہر مدینہ پر رحمت للعالمین ﷺ کی نگاہ پڑی تو فرمایا: ''اللہ بزرگ وبرتر ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ بس اسی کی سلطنت ہے۔ اسی کے لیے حمد وستائش ہے۔ وہ ہر بات پر قادر ہے۔ واپس آ رہے ہیں توبہ کرتے ہوئے، فرماں برداری سے، زمین پر پیشانی رکھ کر، اور اپنے رب کی مدح وستائش میں مصروف ہو کر۔ اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔ اس نے اپنے بندے کی نصرت کی اور تمام قبائل کو تنہا شکست دی۔''

سریہ اسامہ بن زیدؓ

اگرچہ تبوک میں رومیوں نے اسلامی فوج کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنی فوجوں کو سرحدوں سے پیچھے ہٹا لینے اور اندرونی قلعوں میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تاہم اس کے باوجود رسول ﷺ شمالی جانب سے بے پروا نہ تھے۔ آپ ﷺ کو ہمہ وقت اس امر کا خدشہ تھا کہ نجران اور عرب کے دیگر علاقوں کے جلاوطن عیسائیوں کی انگیخت پر رومی سلطنت مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور اسلامی علاقوں کو تاخت وتاراج کرنے کی کوشش کرے گی۔ لہٰذا حجۃ الوداع سے واپس آتے ہی حضور ﷺ نے شام بھیجنے کے لیے ایک لشکر کی روانگی کی تیاری شروع کر دی۔ اس لشکر میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے علاوہ اور بھی جلیل القدر اور اولین صحابہ کرامؓ شامل تھے۔ لشکر کا سردار آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ بن زید بن حارثہ کو بنایا۔

حضرت اسامہؓ اس زمانے میں جوانی کی ابتدائی منزلوں میں تھے اور ان کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ انھیں مہاجرین اولین اور کبار صحابہؓ کا سردار بنا دینا مسلمانوں کو بڑا عجیب معلوم ہوا اور اگر انھیں رسول ﷺ پر ایمان صادق نصیب نہ ہوتا تو یقیناً وہ اس تقرری کو قبول نہ کرتے۔ حضرت اسامہؓ کو شام جانے والی فوج کا سردار مقرر کرنے میں رسول ﷺ کے پیش نظر کئی مصلحتیں تھیں۔ اوّل یہ کہ اسامہؓ کے والد حضرت زیدؓ بن حارثہ، جنھیں حضور ﷺ بے حد عزیز رکھتے تھے، جنگ موتہ میں رومیوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے تھے۔ حضور ﷺ کو ان کی شہادت کا بے حد رنج تھا، اسی لیے آپ ﷺ نے اسامہؓ کو سردار بنایا، تاکہ وہ اپنے والد کا کما حقہ، انتقام لے سکیں۔ دوسری مصلحت یہ تھی کہ اس طرح آپ ﷺ نوجوانوں میں عزم وحوصلہ کی روح پھونکنا اور انھیں مصائب وشدائد برداشت کرنے کا خوگر بنانا چاہتے تھے۔

حضور ﷺ نے اسامہؓ کو حکم دیا کہ وہ فلسطین پہنچ کر موتہ کے قریب بلقاء اور داروم کی سرحد پر حملہ کریں، جہاں ان کے والد شہید ہوئے تھے۔ حملہ صبح سویرے کریں اور دشمنوں میں سے، جس جس پر ان کا قابو چل جائے، اسے قتل کر دیں۔ سارا سفر بہت ہی خاموشی سے طے کریں، تاکہ دشمنوں تک اس فوج کشی کی اطلاع نہ پہنچ سکے، ورنہ وہ ہوشیار ہو کر پہلے سے اپنے بچاؤ کا سامان کر لیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ انھیں فتح سے ہمکنار کر دے تو زیادہ عرصہ وہاں نہ ٹھہریں اور بہت جلد مدینہ پہنچ جائیں۔

مرضِ الموت کا آغاز

حضرت اسامہؓ نے رسول کریم ﷺ کے آغازِ مرض سے ایک روز قبل، 28 صفر 11 ہجری کو، مدینہ کے قریب مقام جرف میں پہنچ کر روانگی کے انتظامات شروع کر دیے۔ ابھی انتظامات پورے طور پر مکمل نہ ہوئے تھے کہ رسول ﷺ کی علالت کی خبر پہنچی۔ ایک دو روز بعد معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی بیماری شدت اختیار کر گئی ہے۔ یہ خبر سن کر لشکر کی روانگی ملتوی ہو گئی۔ مسلمانوں کو یہ بات کسی طرح گوارا نہ تھی کہ رسول ﷺ کی بیماری کی حالت میں وہ مدینہ چھوڑ کر اتنا لمبا سفر اختیار کریں۔ حضور ﷺ کی ذات گرامی انھیں ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ ایسی بیماری میں حضور ﷺ کو چھوڑ کر کس طرح جا سکتے تھے، جس کا انجام انھیں سامنے نظر آ رہا تھا۔

اب تک رسول کریم ﷺ صرف دو مرتبہ بیمار ہوئے تھے۔ پہلی مرتبہ 6 ہجری میں بھوک کی شدت کے باعث حضور ﷺ کی طبیعت ناساز ہوئی تھی اور بعض لوگوں نے غلط طور پر یہ سمجھ لیا تھا کہ حضور ﷺ پر یہود نے جادو کر دیا ہے۔ دوسری مرتبہ سات ہجری میں، جب کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر ایک یہودی عورت نے آپ ﷺ کو گوشت میں زہر ملا کر کھلا دیا تھا اور علاج کے طور پر حضور ﷺ کو فصد کھلوانی پڑی تھی۔

رسول ﷺ کی طرزِ زیست، طرزِ معاشرت اور تعلیمات پر نظر دوڑا کر بھی بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ حضور ﷺ قابلِ رشک صحت کے مالک ہوں گے اور آپ ﷺ کا جسم آئے دن کی بیماریوں سے قطعی محفوظ ہو گا۔ آپ ﷺ کی خوراک بہت کم اور لباس بہت سادہ ہوتا تھا۔ جسمانی صفائی کا آپ ﷺ بے حد خیال رکھتے تھے۔ اول تو خود وضو ہی صفائی کا بہترین ذریعہ ہے، لیکن آپ ﷺ وضو ہی پر اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ منہ اور دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کا التزام بھی

لکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر امت پر بار نہ ہوتا تو میں لوگوں کو ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب رسول ﷺ پر اچانک بیماری کا حملہ ہوا تو سارے مدینہ میں تشویش اور اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔

11ہجری کے آغاز ہی سے حضور ﷺ کے الوداعی آثار نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے، جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اب آپ ﷺ اس حیاتِ مستعار کو الوداع کہنے والے ہیں، مثلاً:

1. آپ ﷺ نے رمضان 10ہجری میں، جو آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا آخری رمضان المبارک تھا، بیس دن اعتکاف فرمایا، حالانکہ اس سے قبل حضور ﷺ دس دن کا اعتکاف کیا کرتے تھے۔
2. حضرت جبریلؑ نے آپ ﷺ کو اس سال دو مرتبہ قرآن کا دورہ کرایا، جب کہ ہر سال ایک ہی مرتبہ دورہ کرایا کرتے تھے۔
3. آپ ﷺ نے حجۃ الوداع میں فرمایا: ''مجھے معلوم نہیں۔ شاید میں اس سال کے بعد اپنے اس مقام پر تم لوگوں سے کبھی نہ مل سکوں۔''
4. جمرۂ عقبہ کے پاس فرمایا: ''مجھ سے اپنے حج کے اعمال سیکھ لو، کیوں کہ میں اس سال کے بعد غالباً حج نہ کر سکوں گا۔''
5. حجۃ الوداع میں وقوفِ عرفہ کے دن آخری نزولِ وحی میں صاف بتا دیا گیا تھا: ﴿الیوم اکملت لکم دینکم﴾ ''آج ہم نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا''۔ اس آیت میں واضح اشارہ موجود تھا کہ آپ ﷺ بہت جلد اپنے مالکِ حقیقی سے ملنے والے ہیں۔
6. حجۃ الوداع کے بعد ایامِ تشریق کے دوران حضور ﷺ کے وصال سے تقریباً تین ماہ قبل سورۂ نصر نازل ہوئی، جس سے آپ ﷺ نے سمجھ لیا کہ اب دنیا سے روانگی کا وقت آن پہنچا ہے اور یہ موت کی اطلاع ہے۔

یہی وہ الوداعی آثار و قرائن تھے، جن کی وجہ سے آپ ﷺ ماہِ صفر کے شروع میں ایک روز اُحد تشریف لے گئے۔ شہدائے اُحد کے گنجِ شہیداں پر نماز پڑھی اور آٹھ برس کے بعد شہدائے اُحد کو اپنی زیارت سے مشرف فرمایا اور ان کے لیے دعائے خیر کی۔ حضور ﷺ نے اس رقت انگیز طریقے سے شہدائے اُحد کو وداع کیا: ''جس طرح ایک مرنے والا اپنے زندہ اعزہ کو وداع کرتا ہے۔'' وہاں سے واپس آ کر حضور ﷺ نے سرِ منبر فرمایا:

''میں تمھارا امیر کارواں ہوں اور تم پر گواہ ہوں۔ میں اس وقت اپنا حوض (کوثر) دیکھ رہا ہوں۔ اس کی وسعت اتنی ہے جتنی ایلہ سے جحفہ تک۔ مجھے تمام دنیا کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ مجھے یہ خوف نہیں کہ میرے بعد تم شرک کرو گے، بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ تم دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور دنیا طلبی میں آپس میں کشت و خون نہ کرو، اور اسی طرح ہلاک ہو جاؤ، جس طرح تم سے پہلی قومیں ہلاک ہوئیں۔''

پھر ایک شب حضور ﷺ کو نیند نہ آئی۔ سخت اضطراب میں بستر سے اٹھے۔ اپنے غلام ابو مویہبہؓ کو ساتھ لیا اور شہر سے باہر بقیع الغرقد تشریف لے گئے جو مسلمانانِ مدینہ کا قبرستان تھا۔ قبروں کے درمیان کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے اہلِ قبور کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اے اہلِ قبور، تم پر سلامتی ہو۔ جس حالت میں تم ہو، یہ تمھیں مبارک رہے۔ یہ حالت اس حالت سے بہت بہتر ہے جس میں لوگ گرفتار ہیں۔ دیکھو، فتنے اس طرح یکے بعد دیگرے چلے آ رہے ہیں، جس طرح اندھیری رات کے پردے۔ ایک کے بعد دوسرا، اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ آخر کا فتنہ پہلے فتنے سے بدرجہا بڑھ کر ہوگا۔''

ابو مویہبہؓ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھے بلایا اور فرمایا: ''مجھے بقیع کے مدفونین کے لیے دعائے مغفرت کا حکم دیا گیا ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔''

چنانچہ میں حضور ﷺ کے ساتھ قبرستان گیا۔ وہاں آپ ﷺ نے اہلِ قبور کے لیے دعائے مغفرت فرمائی۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر فرمایا: ''اے ابو مویہبہ! مجھے اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ میں دنیا کے خزانوں، حیاتِ جاودانی اور جنت میں سے کسی ایک کو پسند کروں۔ چنانچہ میں نے اپنے رب کی ملاقات اور جنت کو پسند کر لیا ہے۔''

میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر فدا ہوں۔ حضور پہلے دنیا کے خزانوں اور دنیا کی زندگی کو اختیار فرمائیں۔ اس کے بعد اپنے رب سے ملاقات اور جنت کی خواہش کریں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''نہیں۔ میں نے تو اللہ ہی کی ملاقات کو اختیار کیا ہے۔''

29۔ صفر بروز دوشنبہ رسول ﷺ ایک جنازے میں بقیع تشریف لے گئے۔ واپسی پر راستے ہی میں دردِ سر شروع ہو گیا، اور حرارت اتنی تیز ہو گئی کہ سر پر بندھی ہوئی پٹی کے اوپر سے محسوس کی جانے لگی۔ یہ آپ ﷺ کے مرض الموت کا آغاز تھا۔ آپ ﷺ نے اسی حالت میں گیارہ دن نماز پڑھائی۔ مرض کی کل مدت تیرہ یا چودہ دن تھی۔

آخری ہفتہ

جس دن آنحضور ﷺ کی طبیعت ناساز ہوئی، اس دن آپ ﷺ نے اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کے ہاں قیام فرمانا تھا۔ مرض کے ابتدائی پانچ ایّام میں حضور ﷺ حسبِ دستور باری باری ایک ایک زوجہ محترمہ کے حجرے میں تشریف لے جاتے رہے۔ اس دوران میں آپ ﷺ ازواجِ مطہرات سے پوچھتے رہتے تھے کہ میں کل کہاں رہوں گا، میں کل کہاں رہوں گا۔ ازواجِ مطہرات نے حضور ﷺ کا مقصود و منشا سمجھ کر اور شدّتِ مرض کے پیشِ نظر عرض کیا کہ حضور ﷺ جہاں چاہیں، قیام فرمائیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ منتقل ہوتے ہوئے حضرت فضلؓ بن عباس اور علیؓ بن ابی طالب کا سہارا لے کر درمیان میں چل رہے تھے۔ سر پر پٹی بندھی تھی اور پاؤں زمین پر

گھست رہے تھے۔ اس کیفیت کے ساتھ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کے مکان میں تشریف لائے اور پھر حیاتِ طیبہ کا آخری ہفتہ وہیں گزارا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب حضور ﷺ بیمار ہوا کرتے تھے تو یہ دعا پڑھ کر ہاتھ اپنے جسم پر پھیر لیا کرتے: اذھب الباس رب الناس واشف انت الشافی لا شفاء الا شفاءك شفاء لا یغادر سقما "اے انسانوں کے پالنے والے، خطر کو دور فرما دے اور شفا عطا کر۔ شفا دینے والا تو ہی ہے اور اسی شفا کا نام شفا ہے جو تو عطا کرتا ہے۔ ایسی شفا دے کہ کوئی تکلیف باقی نہ رہے۔"

حضرت عائشہ رسول کریم ﷺ سے حفظ کی ہوئی دعائیں پڑھ کر آپ ﷺ پر دم کرتی رہتی تھیں اور برکت وصحت کی امید میں آپ ﷺ کا ہاتھ آپ ﷺ کے جسم مبارک پر پھیرتی رہتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ اپنی وفات سے پہلے "سبحنك اللھم وبحمدك استغفرك و اتوب الیك" کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ، یہ کیسے کلمات ہیں جو آپ نے اب پڑھنے شروع کر دیے ہیں؟ فرمایا، میرے لیے ایک علامت مقرر کر دی گئی ہے کہ جب میں اسے دیکھوں تو یہ الفاظ کہا کروں اور وہ ہے ﴿اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح﴾

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر آپ ﷺ کے آخری ایام میں اٹھتے بیٹھتے یہ الفاظ جاری رہتے "سبحن اللّٰہ وبحمدہ۔"

وصال سے پانچ دن پہلے

وصال سے پانچ دن پہلے، بدھ کو جسم کی حرارت میں مزید شدت آ گئی، جس کی وجہ سے تکلیف بھی بڑھ گئی۔ آپ ﷺ کو شدید بخار چڑھا ہوا تھا، لیکن آپ ﷺ نے اسی حالت میں مسجد میں لے جانے کا ارادہ کر لیا۔ آپ ﷺ نے ازواج سے کہا کہ مجھ پر مختلف کنوؤں کے پانی کی سات مشکیں ڈال دو۔ میں باہر جا کر لوگوں سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں، چنانچہ سات مختلف کنوؤں سے پانی لایا گیا۔ آپ ﷺ حضرت حفصہؓ کے ٹب میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد آپ ﷺ نے انھیں پانی ڈالنے سے روک دیا۔ کپڑے پہنے۔ سر پر پٹی باندھی اور مسجد میں جا کر منبر پر جلوہ افروز ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی۔ پھر فرمایا:

"تم سے پہلے ایک قوم ہوئی ہے جو انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بناتی تھی۔ تم ایسا نہ کرنا..... یہود ونصاریٰ پر اللہ کی لعنت کہ انھوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا..... تم لوگ میری قبر کو بت نہ بنانا کہ اس کی پوجا کی جائے..... اس قوم پر اللہ کا سخت غضب ہے۔ جنھوں نے قبور انبیا کو مساجد بنایا۔"

وصال سے چار یوم قبل

9- ربیع الاول، بروز جمعرات جب مرض کی شدت بڑھ گئی تو حضور ﷺ نے حاضرین مجلس سے فرمایا: "میرے پاس دوات اور کاغذ لاؤ۔ میں تمھیں ایسی تحریر لکھا دوں جس پر عمل کرنے سے تم کبھی گمراہ نہ ہو گے۔"

یہ سن کر حاضرین میں سے بعض نے کہا (اور بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ وہ شخص حضرت عمرؓ تھے): "رسول اللہ سخت تکلیف میں مبتلا ہیں۔ اس حالت میں آپ ﷺ کو مزید تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔ ہمارے پاس قرآن کریم موجود ہے، اور وہی ہمارے لیے کافی ہے۔"

اس پر حاضرین میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا کہ رسول ﷺ کے ارشاد کی ضرور تعمیل ہونی چاہیے، تاکہ بعد میں گمراہی کا خدشہ باقی نہ رہے، لیکن بعض لوگوں نے اپنی اسی بات پر اصرار کیا کہ اس حالت میں رسول ﷺ کو تکلیف دینا ٹھیک نہیں۔ ہماری ہدایت کے لیے قرآن کافی ہے۔

جب رسول کریم ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو فرمایا: "میرے پاس سے اٹھ کھڑے ہو۔ نبی کے سامنے اس قسم کا مناقشہ ٹھیک نہیں۔"

بعد میں حضرت ابن عباسؓ کہا کرتے تھے: "لوگوں نے رسول ﷺ کے ارشاد کی تعمیل نہ کر کے بہت کچھ ضائع کر دیا، لیکن حضرت عمرؓ ان کی رائے تسلیم نہ کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ﴾ (الانعام:28) یعنی ہم نے اس کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں رکھی۔

اس روز مغرب تک سب نمازیں حضور ﷺ نے پڑھائیں۔ نمازِ مغرب میں سورۂ "والمرسلات" قرأت فرمائی۔ نمازِ عشاء کے لیے آپ ﷺ نے مسجد میں تین بار جانے کا عزم فرمایا۔ ہر دفعہ جب وضو کے لیے بیٹھے، غش آ گیا۔ تیسری بار جب افاقہ ہوا تو ارشاد ہوا، ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔ (اس حکم کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ کی زندگی میں سترہ نمازوں کی امامت فرمائی)

حضرت عائشہؓ کی خواہش تھی کہ حضور ﷺ خود نماز پڑھائیں، کیوں کہ نماز پڑھانا بھی ایک طرح صحت کی علامت ہے۔ انھوں نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ، ابوبکرؓ رقیق القلب آدمی ہیں۔ جب قرآنِ کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو زار وقطار رونے لگتے ہیں۔ جب وہ نماز پڑھائیں گے تو حسبِ عادت رونے لگیں گے اور لوگوں کی نماز خراب ہو گی۔"

لیکن رسول کریم ﷺ نے ان کی بات کی طرف التفات نہ کیا اور دوبارہ فرمایا: "ابوبکرؓ سے کہو، وہ نماز پڑھائیں۔"

حضرت عائشہؓ نے پھر اپنی بات پر اصرار کیا۔ اس پر حضور ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا: "تم سب عورتیں یوسف والیاں ہو۔ ابوبکرؓ کو حکم دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔"

وصال سے دو دن پہلے

آپ ﷺ کے اہل خانہ نے جب حضور ﷺ کی یہ تشویش ناک حالت دیکھی تو انھیں علاج معالجے کی طرف توجہ پیدا ہوئی۔ اُمّ المؤمنین حضرت میمونہؓ کی ایک رشتہ دار اسماء نے ایک شربت تیار کیا، جسے بنانے کی ترکیب انھوں نے ہجرت حبشہ کے زمانے میں معلوم کی تھی۔ وہی شربت غشی کی حالت میں حضور ﷺ کے حلق میں ٹپکا دیا گیا۔ جب آپ ﷺ ہوش میں آئے تو شربت کی تلخی محسوس کر کے دریافت

فرمایا کہ مجھے یہ شربت کیوں پلایا گیا تھا۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں آپ کو ذات الجنب (نمونیہ) نہ ہو۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ذات الجنب میں مبتلا ہونے سے محفوظ کیا ہے۔''

اس کے بعد حکم دیا کہ عباسؓ کے سوا باقی تمام لوگوں کو جو گھر میں موجود ہیں، یہ تلخ شربت پلایا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

وہ رات رسول اللہ ﷺ نے اطمینان وسکون سے بسر کی۔ بخار بھی اتر گیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ اس دوا کا اثر ہے۔ آپ ﷺ ظہر کی نماز کے وقت حضرت علیؓ اور حضرت فضلؓ بن عباس کا سہارا لے کر مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ جب مسلمانوں نے رسول ﷺ کو تشریف لاتے دیکھا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ آپ ﷺ کے لیے راستہ بنانے کی خاطر ادھر ادھر سرکنے لگے۔ آنحضور ﷺ نے انھیں اشارہ کیا کہ وہ اپنی اپنی جگہ پر کھڑے رہیں۔ مسلمانوں کو نماز میں مشغول دیکھ کر حضور ﷺ بھی بہت مسرور ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو بھی آہٹ سے اس بات کا احساس ہوا کہ جناب رسول ﷺ تشریف لا رہے ہیں اور لوگ آپ ﷺ کے لیے راستہ بنا رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی جگہ سے ہٹ کر پچھلی صف میں آنے کا ارادہ کیا، لیکن رسول ﷺ نے ان کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''لوگوں کو تم ہی نماز پڑھاؤ۔'' خود ابوبکرؓ کے دائیں پہلو میں بیٹھ گئے اور ان کی امامت میں نماز ادا کی۔

نماز کے بعد آنحضور ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا جو آپ ﷺ کی زندگی کا آخری خطبہ تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ خواہ وہ دنیا کی نعمتوں کو قبول کرے یا اللہ کے پاس آخرت میں جو کچھ ہے، اسے قبول کرلے، لیکن اس نے اللہ ہی کے پاس کی چیزیں قبول کیں۔''

یہ فرما کر خاموش ہوگئے۔ اس اثنا میں تمام لوگ اس طرح خاموش بیٹھے رہے، گویا ان کے سروں پر پرندے ہیں اور انھیں ڈر ہے کہ اگر انھوں نے ذرا بھی حرکت کی تو وہ اڑ جائیں گے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے سمجھ لیا کہ ایک بندے سے رسول ﷺ کی مراد خود ان کی اپنی ذات ہے اور حضور ﷺ اس جہان فانی سے ملاءِ اعلیٰ کو کوچ کرنے کی تیاری فرما رہے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی ان پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ وہ اپنے آپ پر ضبط نہ کرسکے اور روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اسی حالت میں انھوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، ہماری جانیں اور ہماری اولاد آپ ﷺ پر نثار ہونے کے لیے تیار ہے۔''

رسول ﷺ کو خدشہ محسوس ہوا کہ ابوبکرؓ کے رونے سے کہیں دوسرے لوگ بھی متاثر نہ ہو جائیں اور اس طرح مسجد آہ وبکا کی مجلس میں تبدیل ہو جائے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو خاموش ہونے کا ارشاد فرمایا اور حکم دیا کہ ابوبکرؓ کے دریچے کے سوا مسجد کے تمام دریچے بند کر دیئے جائیں۔ جب تمام دریچے بند کر دیئے گئے تو سلسلۂ خطاب جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''سب سے زیادہ میں جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں، وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکرؓ کو بناتا، لیکن اسلام کا رشتہ دوستی کے لیے کافی ہے، یہاں تک اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پاس اکٹھا کردے۔''

یہ خطبہ فرما کر منبر پر سے اترے اور حضرت عائشہؓ کے حجرے کی طرف قدم بڑھائے کہ واپس آ گئے اور فرمایا: ''اے گروہ مہاجرین! تم انصار سے اچھا سلوک کرنا، کیوں کہ دوسرے لوگ بڑھتے جائیں گے، لیکن انصار کی تعداد میں اضافہ نہ ہوگا۔ انصار میرے محرم ہیں، جن کے دامن میں مجھے پناہ ملی ہے۔ لہٰذا ان کی خوبیوں کی قدر کرنا اور ان کی غلطیوں سے درگزر کرنا۔''

ایک دن پہلے

وفات سے ایک دن پہلے بروز اتوار رسول ﷺ نے اپنے تمام غلاموں کو آزاد کر دیا۔ اپنے ہتھیار مسلمانوں کو ہبہ فرما دیئے۔ رات میں چراغ جلانے کے لیے حضرت عائشہؓ نے تیل پڑوسن سے ادھار لیا۔ آپ ﷺ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع (تقریباً 75 کلو) جو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ کے پاس سات دینار نقد موجود تھے۔ آپ ﷺ کو خدشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ میں تو دنیا سے رخصت ہو جاؤں اور یہ دینار اسی طرح پڑے رہیں۔ آپ ﷺ نے اہل خانہ کو ہدایت کی کہ انھیں صدقہ کر دیا جائے، لیکن بیماری کی شدت، گھبراہٹ، حضور ﷺ کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں حد درجہ منہمک ہونے کے باعث اہل خانہ کے ذہن سے یہ بات نکل گئی۔ اتوار کے روز جب حضور ﷺ کو غشی سے کسی قدر افاقہ ہوا تو آپ ﷺ دریافت فرمایا کہ ان دیناروں کا کیا ہوا؟ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ وہ ابھی میرے پاس ہی ہیں۔ رسول ﷺ نے انھیں لانے کا حکم دیا۔ جب دینار آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیئے گئے تو آپ ﷺ نے انھیں ہاتھ میں لے کر فرمایا: ''اگر یہ دینار اسی طرح رہ جاتے تو میں اپنے رب کے پاس کیا گمان لے کر جاتا؟'' اس کے بعد اسی وقت انھیں مسلمان فقراء میں تقسیم کر دیئے۔

حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات

پیر کی صبح کو حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے وہ پردہ اٹھایا جو حضرت عائشہؓ کے حجرے اور مسجد طیبہ کے درمیان پڑا ہوا تھا۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ کی امامت میں نماز فجر ادا ہو رہی تھی۔ حضور ﷺ اس مقدس نظارے کو، جو آپ ﷺ کی تعلیمات کا حاصل تھا، ملاحظہ فرماتے رہے۔ اس روح پرور نظارے سے رُخ انور پر شگفتگی اور ہونٹوں پر تبسم تھا۔ مسلمان اس قدر خوش ہوئے کہ چاہتے تھے کہ آپ ﷺ کی مزاج پرسی کے لیے نماز توڑ دیں، لیکن رسول اللہ نے اپنے ہاتھ کے اشارے سے فرمایا کہ اپنی نماز پوری کرلو۔ پھر حجرے کے اندر تشریف لے گئے اور پردہ گرا لیا۔

اس نماز کے بعد کسی دوسری نماز کا وقت حضور ﷺ سرورِ دو کائنات کی حیاتِ اقدس میں نہیں آیا، اور یہ آخری نماز تھی جس کا حضور ﷺ نے نظارہ فرمایا۔

دن چڑھے چاشت کے وقت حضور ﷺ نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہؓ کو اپنے قریب بلایا اور ان سے کچھ سرگوشی کی۔ وہ رونے لگیں۔ آپ ﷺ نے انھیں پھر بلایا اور کچھ سرگوشی کی تو وہ ہنسنے لگیں۔ بعد میں حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو حضرت فاطمہؓ نے بتایا: "پہلی دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا۔ جب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تم مجھ سے آ کر ملو گی تو ہنسنے لگی۔"

اسی روز حضور ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو سیدہ النساء العالمین (تمام خواتین عالم کی سردار) ہونے کی بشارت بھی دی۔

دن جیسے جیسے چڑھتا جاتا تھا، حضور ﷺ پر بار بار غشی طاری ہوتی تھی اور پھر افاقہ ہو جاتا تھا۔ حضرت فاطمہؓ نے جب حضور ﷺ کو ایسی حالت میں دیکھا تو بے ساختہ پکار اٹھیں: "واکرب اجساہ" (ہائے میرے باپ کی بے کلی)۔۔۔۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہارے باپ پر آج کے بعد کوئی تکلیف نہیں۔"

پھر حضور ﷺ نے اپنے دونوں نواسوں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کو بلایا۔ دونوں کو چوما اور ان کے بارے میں خیر کی وصیت فرمائی۔ ازواج مطہرات کو بلایا اور نصیحتیں کیں۔ ازاں بعد حضرت علیؓ کو بلایا۔ انھوں نے حضور ﷺ کا سر مبارک اپنی گود میں رکھا۔ انھیں بھی نصیحت فرمائی۔

آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: "عائشہ! خیبر میں جو کھانا میں نے کھالیا تھا، اس کی تکلیف برابر محسوس کر رہا ہوں۔ اس وقت مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس زہر کے اثر سے میری رگ جاں کٹی جا رہی ہے۔"

حضور ﷺ نے صحابہ کرام کو بھی وصیت فرمائی: "الصلاۃ الصلاۃ وما ملکت ایمانکم" (نماز، نماز اور تمھارے زیر دست یعنی لونڈی، غلام)۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ الفاظ کئی بار دہرائے۔

پھر حضور ﷺ پر نزع کی کیفیت شروع ہوگئی۔ اس وقت حضور ﷺ کو حضرت عائشہؓ آپ کو سہارا دیئے ہوئے بیٹھی تھیں۔ پانی کا پیالہ حضور ﷺ کے سرہانے رکھا تھا۔ حضور ﷺ ہاتھ پیالے میں ڈالتے اور چہرہ مبارک پر پھیر لیتے۔ رخ انور کبھی سرخ ہو جاتا اور کبھی زرد پڑ جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ "اللہ کی ایک نعمت مجھ پر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرے گھر میں، میری باری کے دن میرے سینے سے ٹیک لگائے وفات پائی۔ ہوا یہ کہ عبدالرحمٰن بن ابی بکر آپ ﷺ کے پاس تشریف لائے۔ ان کے ہاتھ میں مسواک تھی اور رسول اللہ مجھ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ مسواک کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ آپ ﷺ مسواک چاہتے ہیں۔ میں نے پوچھا، آپ ﷺ کے لیے لے لوں؟ آپ نے سر کے اشارے سے فرمایا، ہاں۔ میں نے مسواک لے کر آپ ﷺ کو دی تو آپ ﷺ کو سخت محسوس ہوئی۔ میں نے کہا، اسے آپ ﷺ کے لیے نرم کر دوں؟ آپ ﷺ نے سر کے اشارے سے کہا، ہاں۔ میں نے مسواک نرم کر دی اور آپ ﷺ نے نہایت اچھی طرح مسواک کی۔"

مسواک سے فارغ ہوتے ہی آپ ﷺ نے انگلی اٹھائی۔ چھت کی طرف بلند کی۔ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ "میں نے محسوس کیا کہ حضور ﷺ کا جسم اچانک بھاری ہو گیا ہے۔ میں نے آپ ﷺ کے چہرے پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ آپ ﷺ کی آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں اور آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ جاری تھے:

"بل الرفیق الاعلیٰ۔"

"اب تو اپنے رفیق اعلیٰ کے پاس ہی جانا چاہتا ہوں۔"

حضور ﷺ نے یہ جملہ تین بار دہرایا۔ اسی وقت ہاتھ جھک گیا اور آپ ﷺ رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون۔ یہ واقعہ 12 ربیع الاول 11 ہجری، بروز پیر، چاشت کی شدت کے وقت پیش آیا۔ اس وقت رسول کریم کی عمر 63 سال چار دن ہو چکی تھی۔

مسلمانوں کا اندوہ واضطراب

جب مسلمانوں کو مسجد میں اس حادثۂ فاجعہ کی خبر پہنچی تو وہ حیران و ششدر رہ گئے کیوں کہ انھوں نے تھوڑی دیر پہلے فجر کی نماز میں حضور ﷺ کی زیارت کی تھی اور آپ ﷺ کی ظاہری حالت (تبسم اور شگفتگی) سے پتا چلتا تھا کہ آپ ﷺ کی طبیعت صحت وشفا کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ کسی کو اس بات کا سان گمان بھی نہ تھا کہ رسول ﷺ انھیں اس قدر جلد چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ جیسے فدائی بھی کچھ دیر کے لیے اپنی بیوی حبیبہ بنت خارجہ کے پاس مقام سخ میں چلے گئے تھے جو مدینہ کا نواحی گاؤں تھا۔

حضرت عمرؓ کا موقف

جب رسول اللہ کی وفات کی خبر لوگوں میں مشہور ہوئی تو حضرت عمرؓ فوراً اس جگہ آئے جہاں حضور ﷺ پرنور کا جسد اطہر رکھا ہوا تھا۔ انھیں کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ حضور ﷺ فوت ہو چکے ہیں۔ انھوں نے چہرے پر سے کپڑا ہٹایا تو جسم میں حرکت کے آثار مطلق نظر نہ آئے، لیکن انھوں نے اس حالت کو بے ہوشی سے تعبیر اور یہ سمجھا کہ حضور ﷺ بہت جلد ہوش میں آ جائیں گے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ انھیں سمجھانے کی بہت کوشش کی، لیکن بے سود۔ مغیرہؓ کے اصرار پر انھوں نے کہا: "جھوٹ کہتے ہو" اور باہر آ کر مسجد میں ایک تقریر کی، جس میں کہا:

"بعض منافقین یہ خبر اڑا رہے ہیں کہ رسول ﷺ ہو گئے، لیکن یہ بالکل [illegible] ہے۔ وہ حضرت موسیٰ بن عمران کی طرح اپنے رب کے پاس گئے ہیں۔ حضرت موسیٰ بھی چالیس دن تک اپنی قوم سے غیر حاضر رہے تھے اور ان کی غیر حاضری میں لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ فوت ہو گئے، لیکن جس طرح حضرت موسیٰ واپس آئے اسی طرح رسول ﷺ بھی واپس آئیں گے، اور جو لوگ آپ ﷺ کی وفات کی خبر مشہور کر رہے ہیں، ان کے ہاتھ پاؤں قلم کریں گے۔"

مسلمان اس وقت عجیب سراسیمگی اور ہیجان کی حالت میں تھے۔ ایک طرف حضرت عائشہؓ کے حجرے سے عورتوں کے گریہ و بکا کی آوازیں آ رہی تھیں، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ حضور ﷺ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ دوسری طرف حضرت عمرؓ مسجد میں برملا اعلان کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر منافقین نے اڑائی ہوئی ہے، اور عن قریب حضور ﷺ رب کے پاس سے واپس آ کر ان منافقین کے ہاتھ پیر قلم کریں گے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس بات کا یقین کریں اور کس کا نہ کریں۔ وہ اسی پریشانی، اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں حضرت عمرؓ کے گرد اکٹھے ہو گئے اور ان کی باتیں سننے لگے۔ واقعی صورت حال ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے ذہن رسول اللہ کی وفات کا تصور کے لیے تیار ہی نہ ہوتے تھے، کیوں کہ ابھی چند روز پیشتر وہ آپ ﷺ کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے۔ انہیں یہ خیال بھی آتا تھا کہ ابھی حضور ﷺ کی پیش گوئیوں کے مطابق قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی تسخیر باقی ہے۔ ان عظیم الشان بادشاہتوں کو زیرنگیں لائے بغیر رسول ﷺ کس طرح وفات پا سکتے ہیں۔ یہی خیالات تھے جن کی بناء پر انھیں آہستہ آہستہ حضرت عمرؓ کی باتوں کا یقین آتا گیا اور یہ امید بڑھتی گئی کہ عنقریب حضور ﷺ واپس تشریف لے آئیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ کا موقف

اسی دوران میں حضرت ابوبکرؓ بھی اس حادثۂ فاجعہ کا علم ہونے پر سُنح سے واپس آ گئے۔ انھوں نے مسجد نبوی ﷺ میں حضرت عمرؓ کو تقریر کرتے اور مسلمانوں کو ان کی تقریر غور سے سنتے ہوئے دیکھا، لیکن انھوں نے ان کی طرف التفات نہ فرمایا، بلکہ سیدھے حضرت عائشہؓ کے حجرے کے دروازے پر پہنچے اور اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عائشہؓ نے جواب دیا کہ آج کسی شخص کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے اندر داخل ہو کر رسول اللہ ﷺ کی نعش مبارک پر سے کپڑا ہٹایا اور پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا: ”کیا ہی بابرکت تھی آپ ﷺ کی زندگی اور کیا ہی پاکیزہ ہے آپ ﷺ کی موت۔“

اس کے بعد آپ ﷺ کا سر مبارک تکیے سے ذرا سا اٹھا کر، غور سے چہرے کی طرف دیکھا جو اسی طرح تر و تازہ تھا، جس طرح زندگی میں رہتا تھا، اور کہا: ”میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان! خدا کی طرف سے جو موت آپ ﷺ کے لیے مقدر تھی، وہ تو ہو چکی۔ اب اللہ تعالیٰ اس کے بعد کبھی آپ ﷺ پر موت وارد نہ کرے گا۔“

یہ کہہ کر سر مبارک دوبارہ تکیے پر رکھ دیا اور چہرۂ مبارک پر چادر ڈال کر مسجد میں آئے۔ ابھی تک حضرت عمرؓ بدستور لوگوں کو یہ یقین دلانے میں مصروف تھے کہ رسول ﷺ فوت نہیں ہوئے۔ لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ کو دیکھ کر ان کے لیے راستہ صاف کر دیا۔ وہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے اور کہا: ”عمرؓ، خاموش ہو جاؤ۔“ لیکن حضرت عمرؓ نے سنی ان سنی کر دی اور اپنی تقریر میں منہمک رہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں، اسے غور سے سنو۔ بھلا کون شخص تھا جو حضرت ابوبکرؓ کی باتوں پر دھیان نہ دیتا۔ لوگ حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر فوراً ان کی طرف ہو گئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: ”اے لوگو! تم میں سے جو شخص محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا، وہ سن لے کہ محمد ﷺ تو فوت ہو گئے ہیں، لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا تھا، تو یقیناً اللہ تعالیٰ زندہ ہے۔ اس پر کبھی موت وارد نہ ہو گی۔“
اس کے بعد سورۂ آل عمران کی آیت 144 تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ﴾ (آل عمران:144)

”محمد اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں۔ اگر محمد ﷺ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں، تو کیا تم اپنی ایڑیوں کے بل (کفر کی جانب) پھر جاؤ گے؟ اور جو شخص اپنی ایڑیوں کے بل پھر جائے، وہ اللہ کو ذرا سا بھی ضرر نہیں پہنچا سکتا اور عنقریب اللہ شکر گزاروں کو نیک بدلہ دے گا۔“

حضرت عمرؓ نے جب لوگوں کو ہمہ تن حضرت ابوبکرؓ کی طرف متوجہ دیکھا، تو وہ خود بھی اپنی تقریر ختم کر کے آپؓ کی باتیں سننے لگے۔ جب حضرت ابوبکرؓ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی تو حضرت عمرؓ کے دل و دماغ پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا اور بالآخر انھیں یقین ہو گیا کہ واقعی رسول اللہ فوت ہو چکے ہیں۔ اس یقین کا ان کے دل پر اتنا گہرا اور شدید اثر ہوا کہ ان کی ٹانگیں ان کا بوجھ نہ سہار سکیں اور وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑے۔ دوسرے لوگوں نے بھی یہ آیت سن کر محسوس کیا، جیسے انھوں نے اس سے قبل یہ آیت سنی ہی نہ تھی۔ اس طرح ان کے دلوں سے تمام شکوک و شبہات زائل ہو گئے اور انھیں یقین کامل ہو گیا کہ رسول اللہ اس دنیا سے منہ موڑ کر دوسرے جہان میں اپنے رب کے حضور پہنچ چکے ہیں۔

سقیفہ بنوساعدہ میں مشاورت

مسلمان اس وقت سخت پریشانی کے عالم میں تھے۔ جب انھیں حضرت ابوبکرؓ کے ذریعے رسول اللہ کی وفات کا یقینی علم ہو گیا تو وہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ البتہ انصار کا ایک قبیلہ سیدھا سقیفہ بنوساعدہ میں اپنے سردار سعدؓ بن عبادہ کے پاس پہنچا۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت زبیرؓ بن العوام اور حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ حضرت فاطمہؓ کے گھر جا کر ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ مہاجرین اور ان کے ساتھ اسیدؓ بن حضیر محلہ بنوعبدالاشہل میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس چلے گئے۔ اسی دوران میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو یہ خبر ملی کہ سعدؓ بن عبادہ کو رسول اللہ کا جانشین بنانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور انصار سقیفہ بنوساعدہ میں جمع ہو کر اس بارے میں صلاح مشورہ کر رہے

ہیں۔ خبر لانے والے نے یہ بھی کہا کہ اگر آپ لوگوں کو امت کے مصالح سے کوئی دل چسپی ہے تو انصار کے کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے پہلے سقیفہ بنو ساعدہ میں پہنچ جائیے۔

ابھی تک رسول اللہ کی تجہیز و تکفین عمل میں نہیں آئی تھی اور آپ ﷺ کے اہل خانہ نے حجرے کا دروازہ بند کیا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کو انصار کے اس اجتماع کی خبر سن کر بے حد تشویش لاحق ہوئی۔ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ ہمیں ابھی انصار کی طرف چلنا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ دونوں بعض مہاجرین کے ہم راہ اسی وقت سقیفہ بنی ساعدہ کی جانب روانہ ہوگئے۔

راستے میں انھیں انصار کے دو اشخاص ملے۔ انھوں نے ان سے پوچھا: ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' جب انھیں معلوم ہوا کہ یہ لوگ سقیفہ بنو ساعدہ جا رہے ہیں تو انھوں نے کہا: ''مناسب یہی ہے کہ آپ وہاں نہ جائیں بلکہ اپنا معاملہ علیحدہ طے کریں۔'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''نہیں، ہمیں وہاں ضرور جانا ہے۔'' چنانچہ وہ سقیفہ پہنچے۔ وہاں ایک صاحب کمبل اوڑھے ہوئے لیٹے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: ''یہ کون ہیں؟'' لوگوں نے کہا: ''یہ سعدؓ بن عبادہ ہیں اور بیماری کے سبب لیٹے ہوئے ہیں۔''

جب مہاجرین بیٹھ گئے تو انصار میں سے ایک شخص نے اٹھ کر تقریر شروع کی اور کہا: ''ہم اللہ کے انصار ہیں اور ہمیں اسلامی لشکر کی حیثیت حاصل ہے۔ تم اے مہاجرین! ہماری فوج کا ایک دستہ ہو، لیکن تم نے مدینہ ہی میں ہماری جڑیں کاٹ کر ہمیں اپنے ماتحت رکھنے کے منصوبے بنانے اور ہمارے حقوق غصب کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔''

رسول کریم ﷺ کے زمانے میں بھی بعض انصار اسی قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے تھے۔ لہٰذا جوں ہی حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ سنے، انھوں نے جواب دینے کا ارادہ کیا۔ چوں کہ حضرت ابوبکرؓ کو احساس تھا کہ حضرت عمرؓ کی طبیعت میں بلا کی سختی ہے، اس لیے انھوں نے انھیں خاموش رہنے کی ہدایت کی اور خود انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

انصار سے حضرت ابوبکرؓ کا خطاب

''اے لوگو! ہم مہاجرین اولین اشخاص ہیں جو اسلام لائے۔ حسب و نسب اور عز و شرف کے لحاظ سے بھی ہم تمام عربوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ان تمام باتوں کے علاوہ ہمیں رسول اللہ کے قریبی رشتہ دار ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ ہم تم سے پہلے ایمان لائے اور قرآن میں بھی ہمارا ذکر تم سے مقدم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوا باحسان﴾

ترجمہ: ''ہم مہاجرین ہیں اور تم انصار۔ تم دین میں ہمارے بھائی، غنیمت میں ہمارے شریک اور دشمنوں کے مقابلے میں ہمارے مددگار رہو۔ باقی تم نے اپنی فضیلت کا جو ذکر کیا ہے، اس سے ہمیں انکار نہیں۔ تم واقعی اس کے اہل ہو اور روئے زمین پر سب سے زیادہ تعریف کے مستحق، لیکن عرب اس بات کو کبھی نہ مانیں گے کہ سلطنت قریش کے سوا کسی اور قبیلے کے ہاتھ میں رہے۔ اس لیے امارت تم ہمارے سپرد کر دو اور وزارت خود سنبھال لو۔''

حضرت ابوبکرؓ کی تقریر ختم ہونے پر ایک انصاری نوجوان کھڑا ہوا اور جوش سے کہا: ''یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم تمھاری ماتحتی گوارا نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ رعایت ہم تمھیں یہ دے سکتے ہیں کہ ایک امیر ہم میں سے ہو جائے اور ایک تم میں سے۔''

حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ''نہیں، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، امیر بہر حال ہم میں سے ہوگا اور تمھیں ہمارے وزیر کی حیثیت حاصل ہوگی۔ یہ عمرؓ اور ابو عبیدہؓ بیٹھے ہیں۔ ان میں سے جس کی بیعت چاہو، کر لو۔''

اس وقت شور و شغب بہت بڑھ گیا اور اختلاف کا سخت خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس حضرت عمرؓ نے بلند آواز سے کہا: ''ابوبکرؓ اپنا ہاتھ بڑھائیے۔''

حضرت ابوبکرؓ نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ حضرت عمرؓ نے فوراً ان کی بیعت کر لی اور کہا: ''ابوبکر! کیا آپ کو رسول اللہ نے حکم نہ دیا تھا کہ آپ ﷺ مسلمانوں کو نماز پڑھائیں، اس لیے آپؓ ہی خلیفۃ اللہ ہیں۔ ہم آپؓ کی بیعت کرتے ہیں، اس لیے کہ آپ ہم سب سے زیادہ رسول اللہ کے محبوب تھے۔''

مسجد نبوی میں بیعت عامہ

حضرت عمرؓ کی یہ بات تمام حاضرین کے دل کو لگی اور انھیں فوراً اس امر کا احساس ہو گیا کہ رسول اللہ نے اپنی جگہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امام الصلوٰۃ مقرر کر کے دراصل اپنی زندگی ہی میں اپنے جانشین کا فیصلہ فرما دیا تھا، کیوں کہ امامت جانشینی کا اولین مظہر ہے۔ چنانچہ مہاجرین اور انصار سب نے صدقِ دل سے آپؓ کی بیعت کر لی۔

سقیفہ بنو ساعدہ میں بیعت ختم ہونے پر مسلمان مسجد نبوی میں واپس آ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے اور پچھلے روز کے واقعے پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا:

میں نے تم سے کل ایسی بات کہی تھی جو نہ کتاب اللہ میں پائی جاتی ہے اور نہ میں نے رسول اللہ سے کبھی سنی تھی۔ لیکن میں اپنی محبت کے جوش میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ ﷺ ہمیشہ زندہ رہیں گے، اور ہمارے تمام کاموں کی نگرانی بہ نفس نفیس فرماتے رہیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے وہ کتاب باقی رکھی ہے جس سے خود رسول کریم ﷺ نے ہدایت حاصل کی۔ پس اگر تم اسے مضبوطی سے تھامے رکھو گے تو اسی طرح ہدایت پاؤ گے جس طرح حضور ﷺ نے پائی۔ اللہ نے تمھارا خلیفہ اس شخص کو بنایا ہے جو تم میں سب سے بہتر ہے۔ یہ رسول ﷺ کا مقرب ہے اور یہی ہے جسے غارِ ثور میں آپ ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔ اس لیے اٹھو اور

صلی اللہ علیہ
و آلہ وسلم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد مصطفیٰ

صلی اللہ علیہ وسلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد رسول اللہ

اللّٰھُمّ صَلِّ علیٰ سیّدنا محمّدٍ وّسلّم

وُہ دانائے سُبُل ختمُ الرُّسُل ﷺ مولائے کُل جس نے

غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا (اقبالؔ)

اللهم صل علی سیدنا محمد وسلم

محمد

صلی اللہ علیہ وسلم

ماذا أقول لأرض كنت فلذتها

كانت بلا بسمة واليوم تبتسم

كانت لنا الأم رغم الجوع ترضعنا

واليوم فاض على أفواهنا الدسم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ

وَلَٰكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ

وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

بیعت کرو۔"

چنانچہ اس وقت مسجد نبوی میں عام بیعت ہوئی، جب کہ سقیفہ بنوساعدہ کی بیعت میں صرف خاص خاص لوگ شریک تھے۔

حضرت ابوبکرؓ کا پہلا خطبہ

بیعت عامہ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کھڑے ہوئے اور خطبہ دیا، جسے حکمت وموعظت کا شاہکار ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ آپؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد فرمایا:

"اے لوگو! میں تمھارا حاکم تو بنایا گیا ہوں، لیکن تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں نیک کام کروں تو اس میں میری مدد کرو، اور اگر برا کام کروں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت، تمھارا کمزور شخص میرے نزدیک قوی ہے، جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تمھارا قوی آدمی میرے نزدیک کمزور ہے، جب تک اس کے ذمے جو حق ہے، وہ اس سے نہ لے لوں۔ جو قوم اللہ کے راستے میں جہاد ترک کر دیتی ہے، اس پر اللہ ذلت وخواری مسلط کر دیتا ہے۔ اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر بلائیں اور عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں، لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔ اب نماز کے لیے کھڑے ہو۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔"

اس سارے کام میں پیر کا باقی ماندہ دن گزر گیا اور رات آگئی۔ لوگ نبی ﷺ کی تجہیز وتکفین کے بجائے اس دوسرے کام میں مشغول رہے۔ پھر رات گزری اور منگل کی صبح ہوئی۔ اس وقت تک آپ ﷺ کا جسد مبارک ایک دھاری دار یمنی چادر سے ڈھکا بستر ہی پر رہا۔ اہل خانہ نے باہر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

تدفین کی تیاریاں

بیعت کے اختتام کے بعد رسول اللہ ﷺ کی تدفین کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ اس موقع پر مہاجرین میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض کا خیال تھا کہ حضور ﷺ کو مکہ لے جا کر دفن کیا جائے جو آپ ﷺ کا پیدائشی وطن تھا اور جہاں آپ کے بہت سے اعزا واقربا رہائش رکھتے تھے۔ بعض نے بیت المقدس کی صلاح دی، جہاں آپ ﷺ سے پیشتر بہت سے انبیا مدفون ہو چکے تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے نہ اس رائے پر اتفاق کیا اور نہ وہ حضور ﷺ کی نعش مبارک کو مکہ لے جانے پر راضی ہوئے، بلکہ مدینہ ہی میں دفن کرنے کی صلاح دی، جہاں حضور ﷺ کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر پناہ گزیں ہوئے تھے، اور جہاں کے لوگوں نے ہر طرح آپ ﷺ کی مدد ونصرت کی تھی۔

مقام کی تعیین کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوا کہ تدفین کس جگہ عمل میں لائی جائے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ حضور ﷺ کو مسجد نبوی میں منبر کے قریب دفن کیا جائے، جہاں آپ ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے اور نماز پڑھاتے تھے، لیکن بہت جلد یہ رائے ترک کر دی گئی، کیوں کہ حضرت عائشہؓ نے یہ حدیث بیان کی کہ مرض الموت میں حضور ﷺ چہرے پر ایک سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی۔ مرض کی شدت میں حضور ﷺ کبھی اسے اتار دیتے تھے اور کبھی چہرے پر ڈال لیتے تھے۔ اسی حالت میں آپ نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس قوم پر لعنت کرے جس نے اپنے انبیا کی قبروں کو مسجد میں بنا لیا۔"

اس معاملے کا تصفیہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا۔ آپؓ نے بیان فرمایا: "میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جو اسی جگہ دفن نہ کیا گیا ہو، جہاں اس کی وفات ہوئی تھی۔" چنانچہ فیصلہ ہوا کہ حضور ﷺ کی قبر اسی جگہ کھودی جائے جہاں آپ ﷺ کی وفات ہوئی تھی۔

غسل

منگل کے روز آپ ﷺ کو کپڑے اتارے بغیر غسل دیا گیا۔ غسل آپ ﷺ کے قریبی عزیزوں حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ کے دونوں لڑکوں فضلؓ اور قثمؓ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ نے دیا۔ اسامہؓ اور رسول ﷺ کے آزاد کردہ غلام شقران حضور ﷺ کے جسم اطہر پر پانی ڈالتے جاتے تھے اور حضرت علیؓ غسل دیتے جاتے تھے۔ حضرت عباسؓ، فضلؓ اور قثمؓ آپ ﷺ کی کروٹ بدل رہے تھے۔ رسول ﷺ کے جسم مبارک پر ایک قمیص تھی۔ بعض لوگوں نے اسے اتار دینے کا مشورہ دیا، لیکن حضرت علیؓ نے انکار کر دیا۔ غسل کے بعد آپ ﷺ کو کفن پہنایا گیا جو ایک دھاری دار اور دو یمنی چادروں پر مشتمل تھا۔ ایک قمیص پہلے ہی زیب تن تھی۔

رسول اللہ کی نماز جنازہ

تجہیز وتکفین مکمل ہونے کے بعد جنازہ چارپائی پر رکھ دیا گیا، تاکہ عاشقان رسول ﷺ آپ کے آخری دیدار سے مشرف ہو سکیں۔ مسلمان مسجد کی جانب سے باری باری دس دس کی تعداد میں حجرے میں داخل ہوتے۔ حضور ﷺ کے چہرۂ مبارک پر الوداعی نظر ڈالتے۔ آپ ﷺ پر درود بھیجتے اور غم واندوہ کے جذبات لیے ہوئے دوسرے دروازے سے نکل جاتے۔

جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نماز جنازہ پڑھنے کے لیے آئے تو تمام حجرہ لوگوں سے بھر گیا۔ رسول ﷺ کی نمازِ جنازہ صحابہؓ نے علیحدہ علیحدہ ادا کی۔ باجماعت نماز ادا نہیں ہوئی۔ جب حجرہ لوگوں سے بالکل پُر ہو گیا اور خاموشی چھا گئی تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بلند آواز سے کہا:

"السلام علیک یارسول اللہ ورحمت اللہ وبرکاتہ۔ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے نبی اور رسول تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے رب کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کر دی اور اس کے راستے میں اس وقت تک جہاد میں مشغول رہے جب تک اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو کامل فتح عطا نہ فرما دی۔ ہم اس بات پر بھی گواہ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے رب کے ساتھ جو عہد باندھا تھا، وہ پورا کر کے دکھا دیا اور لوگوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ اللہ واحد و لاشریک کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں۔"

مسلمان حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہر جملے پر بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ آمین کہتے تھے۔ جب مرد نماز جنازہ سے فارغ ہو گئے تو عورتیں آنا شروع ہوئیں۔ عورتوں کے بعد بچوں کی باری آئی اور انھوں نے بھی اپنے محبوب رسول ﷺ کے آخری دیدار کا شرف حاصل کیا۔ رسول ﷺ کی جدائی کے باعث ہر شخص اندوہ وغم کی مکمل تصویر بنا ہوا تھا اور کوئی فرد بشر ایسا نہ تھا جس کے چہرے سے اداسی اور بے چارگی نہ ٹپکتی ہو۔

قبر کی کھدائی

عرب میں گورکنی کے دو طریق تھے۔ ایک طریق اہل مکہ کا تھا۔ وہ صندوقی قبر کھودتے تھے۔ دوسرا طریق اہل مدینہ کا تھا جو بغلی قبر کھودتے تھے۔ مدینہ میں دو شخص قبر کھودنے کے ماہر تھے۔ حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح جو اہل مکہ کے دستور کے مطابق قبر کھودتے تھے اور حضرت ابوطلحہؓ زیدؓ بن سہل، جو اہل مدینہ کے دستور کے مطابق قبر کھودتے تھے۔ لوگوں میں اختلاف ہوا کہ کس قسم کی قبر کھودی جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، اختلاف مناسب نہیں۔ دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجا جائے۔ جو پہلے آجائے، وہ اپنے طریق کے مطابق قبر کھودے۔ لوگوں نے اس رائے کو پسند کیا۔ چنانچہ حضرت عباسؓ نے دونوں صاحبوں کے پاس آدمی بھیجے۔ اتفاق سے حضرت ابوعبیدہؓ گھر پر موجود نہ تھے۔ ابوطلحہؓ آئے اور انھوں نے مدینہ کے رواج کے مطابق قبر کھودی جو لحدی یعنی بغلی تھی۔

تدفین

نماز جنازہ پڑھنے میں منگل کا پورا دن گزر گیا۔ 14 ربیع الاول، بدھ کی رات آ گئی۔ نصف شب کے قریب اہل بیت نے حضور ﷺ کو دفن کرنے کا ارادہ کیا۔ قبر میں انھوں نے وہ سرخ چادر بھی بچھا دی جو رسول ﷺ اوڑھا کرتے تھے۔ جسد مبارک کو حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت فضلؓ، حضرت قثمؓ، حضرت اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے لحد میں اتارا۔ لحد کو کچی اینٹوں سے ڈھانپ دیا گیا اور پھر مٹی ڈال کر کوہان کی شکل میں تُربت تیار کی اور پانی چھڑکا۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ بیان کرتی ہیں کہ نصف شب کے قریب کدالوں کی آواز سن کر ہمیں معلوم ہوا کہ رسول اللہ کو دفن کر دیا گیا ہے۔

حیات رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک نظر میں

دنیا میں عظیم کارنامے انجام دینے والی ہستیاں (خصوصاً انبیاء علیہم السلام) ہمیشہ غیر معمولی درجے کی شخصیتوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اصلاح کے کام، تحریکوں کی راہ نمائی، تہذیبوں کی تعمیر نو کرنے والوں کی اصل قوت ان کی شخصیت ہی ہوتی ہے جو خاص طرح کے افکار و کردار سے بنتی ہے۔ سیرت پاک کے مطالعہ کی ایک غایت یہ بھی ہے کہ محسن انسانیت ﷺ کی شخصیت کو سمجھا جائے۔

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے میں اس کی وجاہت بہت بڑی مدد دیتی ہے۔ آدمی کا سراپا، اس کے بدن کی ساخت، اس کے اعضا کا تناسب خاص، اس کے ذہنی، اخلاقی اور جذباتی رویہ، اس کے مرتبے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خصوصاً چہرہ ایک ایسا قرطاس ہوتا ہے جس پر انسانی کردار اور کارناموں کی ساری داستان لکھی ہوتی ہے اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہم کسی کے مقام کا تصور کر سکتے ہیں۔

ہم بعد کے لوگوں کی یہ کوتاہی قسمت ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کا روئے زیبا ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ ہم عالمِ واقعہ میں سر کی آنکھوں سے زیارت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم حضور ﷺ کے حُسن و جمال کی جو کچھ بھی جھلک پا سکتے ہیں، وہ حضور کے پیغام اور کارنامے کے آئینے ہی میں پا سکتے ہیں۔

حضور ﷺ کی کوئی حقیقی شبیہ یا تصویر موجود نہیں ہے۔ خود ہی حضور ﷺ نے امت کو اس سے باز رکھا کیوں کہ تصویر کا فتنہ شرک سے ورے نہ رک سکتا۔ حضور ﷺ کی اگر کوئی تصویر موجود ہوتی تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا کیا کرامات اور اعجاز منسوب ہو جاتے اور اس کے اعزاز کے لیے کیسی رسمیں اور تقریبیں نمودار ہو چکی ہوتیں بلکہ بعید نہ تھا کہ اس کی پرستش ہونے لگتی۔ یورپ میں حضور ﷺ کی فرضی تصاویر بنائی جاتی رہی ہیں لیکن کون سا آرٹسٹ ایسا ہے کہ جو حضور ﷺ کے عالم خیال اور کردار کا شوشہ بہ شوشہ کامل اور جامع تصور رکھتا ہو اور پھر اس تصور کو لکیروں اور رنگوں میں پوری طرح جلوہ گر کر سکے۔ فرضی تصویریں جو کچھ بھی بنتی ہیں وہ اس مخصوص پیکر کی نہیں ہوتیں جس کا اسم مبارک محمد ﷺ تھا بلکہ کسی موہوم وجود کا خاکہ گھڑ کر اسے حضور ﷺ کا نام دے دیا جاتا ہے۔ معاملہ دیانت کے تابع بھی نہیں رہتا بلکہ دانستہ ایسی تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن سے ایک کم زور اور ناقص شخصیت کا تصور پیدا ہو۔ ان تصاویر کے لیے رنگ انھی متعصبانہ تصانیف اور تذکروں سے لیا جاتا ہے جو عناد اور کج فہمی اور حقیقت ناشناسی کی مظہر ہیں۔ انبیا اور صلحا کی فرضی تصاویر بنانے یا ان کے کردار ڈراموں میں لانے سے نقصان یہی ہے کہ ان کے اصل کردار ان پردوں کے پیچھے بالکل گم ہو کے نہ رہ جائیں۔

لیکن حضور ﷺ کے صحابیوں نے کم سے کم پردۂ الفاظ میں حضور ﷺ کی شبیہ کو مرتب کر دیا ہے اور اسے محفوظ حالت میں اصحاب روایت نے ہم تک پہنچا دیا ہے یہاں ہم ان کی لفظی شبیہ کو پیش کرتے ہیں تا کہ قارئین حضور ﷺ کے کردار کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس عظیم انسان کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ یہ گویا ایک نوع کی ملاقات ہے...... ایک تعارف!!

حضور ﷺ کے چہرۂ اقدس، قد و قامت، خد و خال، چال ڈھال اور وجاہت کا جو عکس صدیوں کے پردوں سے چھن کر ہم تک پہنچتا ہے وہ بہر حال ایک ایسے انسان کا تصور دلاتا ہے جو ذہانت، شجاعت، صبر و استقامت، راستی و دیانت، عالی ظرفی، سخاوت، فرض شناسی، وقار و انکسار اور فصاحت و بلاغت جیسے اوصاف حمیدہ کا جامع تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ حضور ﷺ کے جسمانی نقشے میں روحِ نبوت کا پرتو دیکھو جا سکتا ہے اور آپ ﷺ کی وجاہت خود آپ کے مقدس مرتبہ کی ایک دلیل تھی۔ اس موقع پر آپ ﷺ کا ایک ارشاد یاد آیا، فرمایا:

"و ان تقوی الله تبیض الوجوه."

"خدا کا تقویٰ ہی چہروں کو روشن کرتا ہے۔"

نبوت تو ایمان و تقویٰ کی معراج ہے۔ نبی کا چہرہ تو نور افشاں ہونا ہی چاہیے۔

سو یہ ہے اس آفتابِ حق کی ایک جھلک!

وجاہت:

"میں نے جوں ہی حضور ﷺ کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپ ﷺ کا چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔" (عبداللہ بن سلام)

یہود کے ایک بڑے عالم تھے جن کا نام حُصَین تھا۔ سرورِ عالم کے مدینہ آنے پر دیکھنے کو گئے، دیکھتے ہی انھیں جو تاثر ہوا، بعد میں اسے انھوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایمان لائے اور عبداللہ نام تجویز ہوا۔

(سیرۃ المصطفیٰ، مولانا ادریس کاندھلوی ج اص 349-350)

"میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حاضر ہوا تو لوگوں نے دکھایا کہ یہ ہیں رسولِ خدا! دیکھتے ہی میں نے کہا واقعی یہ اللہ کے نبی ہیں۔" (ابو رمثہ تیمی)

"مطمئن رہو، میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ کبھی تمھارے ساتھ بد معاملگی کرنے والا شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا آدمی (اونٹ کی رقم) ادا نہ کرے تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گی۔"

(ایک معزز خاتون)

''ہم نے ایسا خوب رُو شخص اور نہیں دیکھا' ہم نے اس کے منہ سے روشنی سی نکلتی دیکھی ہے۔'' (ابو قرصافہ کی والدہ اور خالہ)

''حضور ﷺ سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا گویا آفتاب چمک رہا ہے۔'' (ابو ہریرہؓ)

''اگر تم حضور ﷺ کو دیکھتے تو سمجھتے سورج طلوع ہو گیا ہے۔'' (ربیع بنت معوذ)

''دیکھنے والا پہلی نظر میں مرعوب ہو جاتا۔'' (حضرت علیؓ)

''میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور ﷺ کو دیکھ رہا تھا' آپ ﷺ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کیے ہوئے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپ ﷺ کو' بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ حضور اکرم ﷺ چاند سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔''
(حضرت جابر بن سمرہ)

''خوشی میں حضور ﷺ کا چہرہ ایسا چمکتا گویا چاند کا ٹکڑا ہے۔ اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپ کی خوشی کو پہچان جاتے تھے۔'' (کعب بن مالک)

''چہرے پر چاند کی سی چمک تھی۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

چہرہ......

''بدر کی طرح گولائی لیے ہوئے تھا۔'' (براء بن عازب)

''چہرہ بالکل گول نہیں تھا' ہلکی گولائی لیے ہوئے۔'' (حضرت علیؓ)

''پیشانی کشادہ' ابرو خمدار' باریک اور گنجان' دونوں جدا جدا' دونوں کے درمیان میں ایک رگ کا ابھار جو غصہ آنے پر نمایاں ہو جاتا۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

''مسرت پیشانی سے جھلکتی تھی۔'' (کعب بن مالک)

''نہ چونے کی طرح سفیدی' نہ سانولہ پن۔ گندم گوں جس میں سفیدی غالب تھی۔''
(حضرت انسؓ)

''سفید سرخی مائل۔'' (حضرت علیؓ)

''سفید مگر ملائمت دار۔'' (ابو الطفیل)

''سفید' چمک دار'' (ہند بن ابی ہالہ)

''گویا کہ چاندی سے بدن ڈھلا ہوا تھا۔'' (حضرت ابو ہریرہؓ)

آنکھیں

''آنکھیں سیاہ......پلکیں دراز'' (حضرت علیؓ)

''پتلیاں سیاہ' نظریں نیچی' گوشۂ چشم سے دیکھنے کا حیادارانہ انداز!'' (ہند بن ابی ہالہ)

''سفید حصے میں سرخ ڈورے' آنکھوں کا خانہ لمبا' قدرتی سرگیں۔'' (جابر بن سمرہ)

ناک

''بلندی مائل......اس پر نورانی چمک......جس کی وجہ سے ابتدائی نظر میں بڑی معلوم ہوتی۔''
(ہند بن ابی ہالہ)

رخسار

''ہموار اور ہلکے......نیچے کو ذرا سا گوشت ڈھلکا ہوا۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

دہن

''فراخ۔'' (جابر بن سمرہ)

''بہ اعتدال فراخ'' (ہند بن ابی ہالہ)

دندانِ مبارک

''باریک......آبدار......سامنے کے دانتوں میں خوشنما ریخیں۔''
(حضرت ابن عباسؓ)

''تکلم فرماتے تو دانتوں سے چمک سی نکلتی ہوتی۔'' (حضرت انسؓ)

ریش

''بھرپور اور گنجان بال۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

گردن

''پتلی' لمبی......جیسے مورتی کی طرح خوبصورتی سے تراشی گئی ہو۔''

''گردن کی رنگت چاندی جیسی اجلی اور خوشنما۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

سر

''بڑا......مگر اعتدال اور مناسبت کے ساتھ۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

بال

''قدرے خمدار!'' (حضرت ابو ہریرہؓ)

''نہ بالکل سیدھے تنے ہوئے......نہ زیادہ پیچ دار۔'' (قتادہؓ)

''ہلکا خم لیے ہوئے۔'' (حضرت انسؓ)

''گنجان......کبھی کبھی کانوں کی لو تک لمبے' کبھی شانوں تک۔'' (براء بن عازب)

''درمیان سے نکلی ہوئی مانگ!'' (ہند ابی ہالہ)

''بدن پر بال زیادہ نہ تھے......سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر۔''
(حضرت علیؓ۔ ہند بن ابی ہالہ)

''کندھوں' بازوؤں اور سینہ کے بالائی حصہ پر تھوڑے سے بال تھے۔''
(ہند بن ابی ہالہ)

مجموعی ڈھانچہ

''بدن گٹھا ہوا......اعضا کے جوڑوں کی ہڈیاں بڑی اور مضبوط۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

''بدن موٹا نہیں تھا۔'' (حضرت علیؓ)

''قد......نہ زیادہ لمبا' نہ پست! میانہ'' (حضرت انسؓ)

''قامت مائل بہ درازی......مجمع میں ہوں تو دوسروں سے قد نکلتا ہوا معلوم ہوتا۔''
(براء بن عازب)

''پیٹ باہر کو نکلا ہوا نہ تھا۔'' (ام معبد)

''دنیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والوں سے حضور ﷺ کا جسم (باوجود فقر فاقہ کے) زیادہ تروتازہ اور توانا تھا۔'' (المواہب ج اص ۳۱۰)

''میں نے رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر کوئی بہادر اور زور آور نہیں دیکھا۔'' (ابن عمر)

مشہور واقعہ ہے کہ حضور ﷺ نے عمرہ کیا تو سو اونٹ بہ نفسِ نفیس ہانکے اور ان میں سے 63 کو بدستِ خود نحر کیا اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔

مکہ میں رکانہ نامی ایک پہلوان تھا جو اکھاڑوں میں کشتیاں لڑتا۔ ایک دن حضور ﷺ کی ملحقہ وادی میں اس سے ملے اور اپنی دعوت دی۔ اس نے دعوت کے لیے کوئی معیارِ صدق طلب کیا۔ اس کے ذوق کے پیشِ نظر حضور ﷺ نے کشتی کرنا پسند کر لیا۔ تین بار کشتی ہوئی اور تینوں بار آپ نے اسے پچھاڑ لیا۔ اسی رکانہ پہلوان کے بیٹے ابوجعفر محمد کی یہ روایت حاکم نے مستدرک میں سے لی ہے اور ابوداؤد اور ترمذی نے اسے پیش کیا ہے اور بیہقی نے سعید بن جبیر سے دوسری روایت کی ہے جس میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی کشتی میں پچھاڑا ہے جن میں ایک ابوالاسود جمحی بھی ہے۔ (المواہب اللدنیہ ج ا ص ۳۰۲-۳۰۲)

کندھے اور سینہ

''سینہ چوڑا...... سینہ اور پیٹ ہموار۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

''سینہ چوڑا۔'' (براء بن عازب)

''مونڈھوں کا درمیانی فاصلہ عام پیمانے سے زیادہ۔''

(ہند بن ابی ہالہ، براء بن عازب)

''کندھوں کا درمیانی حصہ پُر گوشت۔'' (حضرت علیؓ)

بازو اور ہاتھ

''کلائیاں دراز...... ہتھیلیاں فراخ...... انگلیاں موزوں حد تک دراز۔''

(ہند بن ابی ہالہ)

''ریشم کا دبیز یا باریک کوئی کپڑا یا کوئی اور چیز ایسی نہیں جسے میں نے چھوا ہو اور وہ حضور ﷺ کی ہتھیلیوں سے زیادہ نرم و گداز ہو۔'' (حضرت انسؓ)

قدم

''پنڈلیاں پُر گوشت نہ تھیں...... ہلکی ہلکی سی ہوئی۔'' (جابر بن سمرہ)

''ہتھیلیاں اور پاؤں پُر گوشت...... تلوے قدرے گہرے...... قدم چکنے کہ پانی نہ ٹھہرے۔'' (ہند بن ابی ہالہ)

''ایڑیوں پر گوشت بہت کم۔'' (جابر بن سمرہ)

ایک جامع لفظی تصویر

یوں تو حضور ﷺ کے متعدد رفقا نے حضور ﷺ کی شخصیت کے مرقعے لفظوں میں پیش کیے ہیں لیکن اُمِ معبدؓ نے جو تصویر مرتّب کی ہے اس کا جواب نہیں۔ وادی ہجرت کا سفر طے کرتے ہوئے مسافرِ حق جب اپنی منزلِ اوّل (غارِ ثور) سے چلا تو پہلے ہی روز قوم خزاعہ کی اس نیک نہاد بڑھیا کا خیمہ راہ میں پڑا۔ حضور ﷺ اور آپ کے ہم راہی پیاسے تھے فیضانِ خاص تھا کہ مریل سی بھوکی بکری نے اس لمحہ وافر مقدار میں دودھ دیا۔ حضور ﷺ نے بھی پیا، ہم راہیوں نے بھی، اور کچھ بچ رہا۔ اُمِ معبد کے شوہر نے گھر آ کر دودھ دیکھا، تو اچنبھے سے پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا؟ اُمِ معبد نے سارا حال بیان کیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ اچھا اس قریشی نوجوان کا نقشہ تو بیان کرو۔ یہ وہی تو نہیں جس کی تمنا ہے۔ اس پر اُمِ معبد نے حسین ترین الفاظ میں تصویر کھینچی۔ اُمِ معبد کو نہ تو کوئی تعارف تھا، نہ کسی طرح کا تعصب، بلکہ جو کچھ دیکھا من و عن کہہ دیا۔ اصل عربی میں دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کا جو ترجمہ مولفِ ''رحمۃ للعٰلمین'' نے کیا ہے اسی کو ہم یہاں لے رہے ہیں۔

''پاکیزہ رو، کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو، نہ پیٹ باہر نکلا ہوا نہ سر کے بال گرے ہوئے زیبا، صاحبِ جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے اور گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک، سرگیں چشم، باریک و پیوستہ ابرو، سیاہ گھنگھریالے بال، خاموش وقار کے ساتھ، گویا دل بستگی لیے ہوئے، دور سے دیکھنے میں زیبندہ و دلفریب، قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین، شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کمی و بیشی الفاظ سے معرا، تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی، میانہ قد کہ کوتاہی نظر سے حقیر نظر نہیں آتے، نہ طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرتی۔ زیبندہ نہال کی تازہ شاخ، زیبندہ منظر والا قد، رفیق ایسے کہ ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں، جب حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں، مخدوم، مطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو۔''

لباس

آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے اس کی وضع قطع، قصر و طول، رنگت، معیار، صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں ملبوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے لباس کے بارے میں حضور کے رفقاء نے جو معلومات دی ہیں وہ بڑی حد تک حضور کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضور ﷺ نے لباس کے معاملہ میں درحقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی ہے:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ﴾ (الاعراف: 26)

''اے اولادِ آدم! ہم نے تمھارے ستر ڈھانکنے والا اور تمھیں زینت دینے والا لباس تمھارے لیے مقرر کیا ہے۔ اور لباس تقویٰ بہترین لباس ہے۔''

دُوسرا پہلو لباس کا "سرابیل تقیکم الحرو سرابیل تقیکم بأسکم" (تمھیں گرمی سے بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لیے قمیضیں اور زرہیں فراہم کیں۔ النحل) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔

سو حضور ﷺ کا لباس ساتر تھا، زینت بخش تھا اور بایں ہمہ لباس تقویٰ تھا۔ اس میں ضرورت کا بھی لحاظ تھا، وہ چند کڑے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا مظہر بھی تھا اور ذوقِ سلیم کا ترجمان بھی۔ حضور کو کبر و ریا سے بُعد تھا اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا ناپسند تھا۔ فرمایا:

"انما انا عَبْدٌ البس کما یلبسُ العبد."

''میں تو بس خدا کا ایک بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں۔''

ریشم، دیبا اور حریر کو مردوں کے لیے آپ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی قبا پہنی اور پھر فوراً اضطراب کے ساتھ اتار پھینکی (مشکوٰۃ) تہ بند، قمیص اور عمامہ کی لمبائی چوں کہ علامتِ کبر تھی اور یہ طریق لباس متکبرین میں رائج تھا اس لیے اس سے سخت تنفر تھا۔ دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص فیشنوں کی تقلید اور نقالی کو بھی حضور ﷺ نے ممنوع ٹھہرایا تا کہ امت میں اپنی خودی اور عزت و نفس برقرار رہے، نیز فیشن اور لباس کی تقلید نظریات و کردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اسلامی تمدن کے تحت فیشن، آداب اور ثقافت کا ایک نیا ذوق پیدا کر دیا۔ لباس میں موسمی تحفظ، ستر، سادگی، نظافت و نفاست اور وقار کا حضور ﷺ کو خاص لحاظ تھا۔ اگر ہم حضور ﷺ کے لباس کو وقت کے تمدنی دور، عرب کی موسمی اور جغرافیائی اور تمدنی ضروریات و مروجات کے نقشے میں رکھ کر دیکھیں تو بڑے معیاری ذوق کا آئینہ دار ہے۔ آیئے حضور ﷺ کے لباس پر ایک نگاہ ڈالیں۔

کرتا (قمیص) بہت پسند تھا۔ کرتے کی آستین نہ زیادہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھلی، درمیانی ساخت پسند تھی۔ آستین کلائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی۔ سفر (خصوصاً جہاد) کے لیے جو کرتا پہنتے اس کے دامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا۔ قمیص کا گریبان سینہ پر ہوتا جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے) سے کُھلا بھی رکھتے اور اسی حالت میں نماز پڑھتے، کُرتا پہنتے ہوئے سیدھا ہاتھ ڈالتے، پھر الٹا۔ رفیقوں کو اسی کی تعلیم دیتے (داہنے ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کا استعمال حضور ﷺ کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔)

عمر بھر تہ بند (لنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرا نیچے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) سامنے کا حصہ قدرے زیادہ جھکا رہتا۔

پاجامہ (سراویل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپ ﷺ کے صحابی پہنتے تھے۔ ایک بار خود خرید فرمایا۔ (اختلاف ہے کہ پہنا یا نہیں) اور وہ آپ ﷺ کے ترکے میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصہ دلچسپ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو ساتھ لیے ہوئے حضور ﷺ بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے۔ چار درہم پر پاجامہ خریدا۔ بازار میں اجناس کو تولنے کے لیے ایک خاص وزّان مقرر تھا۔ وزن کرانے گئے اور اس سے کہا کہ اسے تولو (اتزن وارجح) وزّان کہنے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سنے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے توجہ دلائی (الاتعرف نبیک؟ تم اپنے نبی پاک کو پہچانتے نہیں) وہ ہاتھ چومنے کو بڑھا تو آپؐ نے روکا کہ یہ عجمیوں کا (یعنی غیر اسلامی) طریقہ ہے۔ بہرحال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ

کیا آپ اسے پہنیں گا؟ تعجب غالباً اس بنا پر ہوا ہو گا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی۔ دوسرے پاجامہ اہلِ فارس کا لباس تھا اور تشبہ سے حضور کا اجتناب (حالانکہ دوسرے تمدنوں کے اچھے اجزا کو حضور ﷺ قبول فرماتے تھے)

آپ ﷺ نے جواب دیا ہاں پہنوں گا سفر میں بھی، حضر میں بھی، دن کو بھی، رات کو بھی، کیوں کہ مجھے حفظِ ستر کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی اور نہیں۔

سر پر عمامہ باندھنا پسندِ خاص تھا، نہ بہت بھاری ہوتا تھا نہ چھوٹا۔ ایک روایت کے لحاظ سے ۷ گز لمبائی ہوتی تھی۔ عمامہ کا شملہ بالشت بھر ضرور چھوڑتے جو پیچھے کی جانب دونوں شانوں کے درمیان اڑس لیتے۔ تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے شملہ پھیلا کر سر پر ڈال لیتے۔ اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے۔ کبھی عمامہ نہ ہوتا تو کپڑے کی ایک دھجی (رومال) پٹی کی طرح سر سے باندھ لیتے۔ بربنائے نظافت عمامہ کو تیل کی چکنائی سے بچانے کے لیے ایک خاص کپڑا (عربی نام "قناع") بالوں پر استعمال کرتے، جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوپیوں کے اندر کاغذ یا سلولائیڈ کا ٹکڑا رکھ لیتے ہیں۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا حال یہ تھا کہ (روایات میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندا نہیں دیکھا گیا۔ سفید کے علاوہ زرد (غالباً مٹیالا، خاکستری مائل یا شتری) رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے۔ اور فتح مکہ کے موقع پر سیاہ بھی استعمال فرمایا۔ عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال میں رہی۔ اور اسے پسند فرمایا۔ نیز روایات کے بہ موجب عمامہ کے ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال گویا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا۔ اور اسے آپ ﷺ مشرکین کے مقابلے پر امتیازی فیشن قرار دیا۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے۔ گھر میں اوڑھنے کی ٹوپی سر سے چپٹی ہوئی ہوتی۔ سفر پر نکلتے تو اٹھتی ہوئی باڑ دار ٹوپی استعمال فرماتے۔ سوزنی نما ہوئے کپڑے کی دبیز ٹوپی بھی پہنی ہے۔

اوڑھنے کی چادر 4 گز لمبی، سوا دو گز چوڑی ہوتی تھی۔ کبھی لپیٹ لیتے، کبھی ایک پلو سیدھے بغل سے نکال کر الٹے کندھے پر ڈال لیتے۔ یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے اور بعض مواقع پر اسے تہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لیے چادر اتار کر بچھا بھی دیتے۔ یمن کی چادر جسے حِبَرہ کہا جاتا تھا بہت پسند تھی، اس میں سرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ کے لیے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی بنوائی گئی اسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بُو دینے لگی۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے پھر اسے نہیں اوڑھا۔

نیا کپڑا خدا کی حمد اور شکر کے ساتھ بالعموم جمعہ کے روز پہنتے۔ فاضل جوڑے بنوا کر نہیں رکھتے تھے۔ کپڑوں میں پیوند لگاتے تھے۔ ان کی مرمت کرتے، احتیاطاً میں دیکھ لیتے کہ مجمع میں بیٹھنے کی وجہ سے (مجالس اور نمازوں میں میلے کچیلے لوگ بھی آتے تھے اور صفائی کا عام معیار بھی آپ ﷺ ہی نے مسلسل تربیت کر کے برسوں میں بلند کیا) کوئی جوں وغیرہ نہ آگھسی ہو۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی وہ شان تھی وہاں دوسری طرف آپ ﷺ رہبانیت کا سدِ باب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا کہ "اللہ تعالیٰ یہ بات پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں

"، سو حضور ﷺ نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیب تن فرمایا۔ آپ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہا پسندی سے اُمت کو بچانا مطلوب تھا۔ چنانچہ تنگ آستین کا رومی جُبہ بھی پہنا۔ (بخاری مسلم) سُرخ دھاری کا اچھا جوڑا بھی زیب بدن کیا۔ طیلسانی قسم کا کسروانی جُبہ بھی کبھی کبھی پہنا۔ (المواہب اللدنیہ) جس کے گریبان کے ساتھ ریشمی گوٹ لگی تھی۔ ایک بار 27 اونٹنیوں کے بدلے میں ایک قیمتی جوڑا خرید فرمایا اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔ یہ تفسیر تھی اس قولِ قرآنی کی کہ "پوچھو کون ہے اللہ کی عطا کردہ زینت کو حرام کرنے والا"۔ بس یہ ہے کہ معمولِ عام سادگی تھا۔

کپڑوں کے لیے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوب خاطر تھا۔ فرمایا: "حق یہ ہے کہ تمھارے لیے مسجدوں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس سفید لباس ہے۔" فرمایا: "سفید کپڑے پہنا کرو اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مُردوں کو کفن دو کیوں کہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں۔"

سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا۔ لیکن بالعموم اس شکل میں کہ ہلکی سبز دھاریاں ہوں۔ اسی طرح خالص شوخ سرخ رنگ بہت ہی ناپسند تھا لباس کے علاوہ بھی اس کے استعمال کو بعض صورتوں میں ممنوع فرمایا لیکن ہلکے سرخ رنگ کی دھاریوں والے کپڑے آپ ﷺ نے پہنے ہلکا زرد (مٹیالا یا شتری) رنگ بھی لباس میں دیکھا گیا۔

حضور ﷺ کا جوتا مروجہ عربی تمدن کے مطابق چپل یا کھڑاؤں کی سی شکل کا تھا جس کے دو تسمے تھے ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا دوسرا چھنگلیا اور اس کے ساتھ والی انگلی کے بیچ میں۔ جوتے پر بال نہ ہوتے تھے جیسے کہ معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ ایک بالشت اور دو انگل لمبا تھا۔ تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا اور دونوں تسموں کے درمیان پنجے پر سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر پہنتے کبھی بیٹھ کر بھی پہنتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے پھر بایاں اور اتارتے ہوئے پہلے بایاں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔

جرابیں اور موزے بھی استعمال میں رہے۔ سادہ اور معمولی بھی اور اعلیٰ قسم کے بھی۔ شاہ نجاشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے انھیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ اسی طرح دحیہ کلبی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کیے تھے انھیں آپ ﷺ نے پھٹنے تک استعمال فرمایا۔

چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی جس میں کبھی چاندی کا نگینہ ہوتا تھا کبھی حبشی پتھر کا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا پتر یا پالش چڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ لوہے کی انگوٹھی (اور زیور) سے آپ نے کراہت فرمائی ہے۔ انگوٹھی بالعموم داہنے ہی ہاتھ میں پہنی کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درمیانی اور شہادت کی انگلی میں نہ پہنتے۔ چھنگلیا میں پہننا پسند تھا۔ نگینہ اوپر کی طرف رکھنے کی بجائے ہتھیلی کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں میں کندہ تھے۔ اس سے حضور ﷺ خطوط پر مُہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرین صحت ہے کہ انگوٹھی مہر کی ضرورت سے بنوائی تھی۔ اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس کا استعمال ضروری تھا۔

وضع قطع اور آرائش

حضور ﷺ اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے۔ ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے کنگھا کرتے مانگ نکالتے لبوں کے زاید بال تراشنے کا اہتمام تھا۔ ڈاڑھی کو بھی طول و عرض میں قینچی سے ہموار کرتے۔ اس معاملہ میں رفقاء کو تربیت دیتے۔ مثلاً ایک صحابی کو پراگندہ مُو دیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابی کی ڈاڑھی کے زاید بال بہ نفسِ نفیس تراشے۔ فرمایا کہ جو شخص سر یا ڈاڑھی کے بال رکھتا ہو اسے چاہیے کہ انھیں سلیقے اور شائستگی سے رکھے۔ مثلاً ابوقتادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "اکرِ مھا" (ان کو سنوار کے رکھو۔)

یہ تاکیدیں حضور ﷺ نے اس لیے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی و شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں خصوصاً رنگ تصوف جب بڑھتا ہے اور رہبانیت ابھرتی ہے تو غلیظ رہنا علوِ مرتبت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس خطرے کا سدِ باب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور بستر کے قریب:

1: تیل کی شیشی
2: کنگھا (ہاتھی دانت کا بھی)
3: سرمہ دانی (سیاہ رنگ کی)
4: قینچی
5: مسواک
6: آئینہ
7: لکڑی کی ایک پتلی کھپچی

سُرمہ رات کو سوتے ہوئے (تاکہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں لگاتے۔ آخر رات میں حاجات سے فارغ ہو کر وضو کرتے لباس طلب کرتے اور خوشبو لگاتے ریحان کی خوشبو پسند تھی۔ مہندی کے پھول بھی بھینی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے۔ مُشک اور عُود کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گھر میں خوشبو دار دھونی لیا کرتے۔ ایک عطر دان تھا جس میں بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حضرت عائشہ اپنے دست مبارک سے خوشبو لگاتیں۔) مشہور بات یہ ہے کہ آپ ﷺ جسے چے سے گزر جاتے تھے دیر تک اس میں مہک رہتی تھی اور فضائیں بتاتی تھیں کہ:

گزر گیا ہے ادھر سے وہ کاروان بہار"

خوشبو ہدیہ کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرتا تو ناپسند فرماتے۔ اسلامی ثقافت کے مخصوص ذوق کے باتحت آپ نے مردوں کیلیے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ مخفی رہے اور مہک پھیلے اور عورتوں کے لیے وہ جس

کا رنگ نمایاں ہو، مہک مخفی رہے۔

رفتار

حضور ﷺ کی چال عظمت' وقار' شرافت اور احساس ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے۔ ڈھیلے ڈھالے طریق سے قدم گھسیٹ کر نہیں۔ بدن سمٹا ہوا رہتا۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر چلتے۔ قوت سے آگے کو قدم اٹھاتے۔ قامت میں آگے کی طرف قدرے جھکاؤ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اونچائی سے نیچے کو اُتر رہے ہیں۔ ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں ''گویا زمین آپ ﷺ کی رفتار کے ساتھ ساتھ لپٹتی جا رہی ہے۔'' رفتار تیز ہوتی' قدم کھلے کھلے رکھتے۔ آپ معمولی رفتار سے چلتے مگر بقول حضرت ابو ہریرہؓ ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے۔'' حضور ﷺ کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ ''زمین میں گھمنڈ کی چال نہ چلو۔'' (سورۂ لقمان)

تکلم

تکلم انسان کے ایمان' کردار اور مرتبے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ موضوعات اور الفاظ کا انتخاب' فقروں کی ساخت' آواز کا اتار چڑھاؤ' لہجہ کا اسلوب اور بیان کا زور' یہ ساری چیزیں واضح کرتی ہیں کہ متکلم کس پائے کی شخصیت کا علمبردار ہے۔

حضور ﷺ کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت پر ڈالا گیا ہوتا تو وہ تفکرات میں ڈوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہو جاتی۔ لیکن حضور ﷺ کے کمالاتِ خاص میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایک طرف آپ ﷺ تفکرات اور مسائل مہمہ کا پہاڑ اٹھائے ہوئے ہوتے اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گزرتے۔ لیکن دوسری طرف لوگوں میں خوب گھلنا ملنا بھی رہتا اور دن رات گفتگوؤں کا دور چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسم و مزاح اپنی جگہ۔ اضداد میں عجیب توازن تھا جس کی مظہر حضور ﷺ کی ذات تھی۔ ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری' ایک سلطنت کے مسائل' ایک جماعت اور معاشرہ کے معاملات اور پھر اپنے خاصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں جنھیں حضور ﷺ کے کندھے اٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسنؓ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ ''اللہ کے رسول ﷺ متواتر پریشانیوں میں رہتے۔ ہمیشہ مسائل پر غور کرتے' کبھی آپ کو بے فکری کا کوئی لمحہ نہ ملا۔ دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلاضرورت فضول بات چیت نہ کرتے۔''

لیکن آپ ﷺ ایک داعی تھے' اور ایک تحریک کے سربراہ' اس لیے تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لیے لوگوں سے رابطہ ضروری تھا جس کے لیے سب سے اہم ذریعہ تکلم ہے۔ لہٰذا دوسری صورتِ حال حضرت زیدؓ بن ثابت کے الفاظ میں یوں رہتی کہ ''جب ہم دنیوی معاملات کا ذکر کر رہے ہوتے تو حضور ﷺ بھی اس ذکر میں حصہ لیتے' جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضور ﷺ بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر تکلم فرماتے۔ اور جب ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضور ﷺ بھی اس میں شامل رہتے۔'' اس کے باوجود آپ ﷺ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوتی۔ قرآن نے بھی **وما ینطق عن الھوٰی** کی گواہی دی۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گنے جا سکتے تھے۔ اُم معبد نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ ''گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروئی ہوئی۔'' الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ...... نہ کوتاہ سخن نہ طویل گو۔'' تاکید' تفہیم اور تسہیل حفظ کے لیے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دُہراتے بھی تھے۔ بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کنایہ میں فرماتے' مکروہ اور فحش اور غیر حیادارانہ کلمات سے تنفر تھا۔ گفتگو میں بالعموم ایک مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبداللہ بن حارث کا بیان ہے کہ ''میں نے حضور ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا۔'' یہ مسکراہٹ حضور ﷺ کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی۔ اور رفقاء کے لیے وجہ جاذبیت ہوتی' بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لیے ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے اور خاص جملوں کو بار بار دہراتے۔ حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زمین پر ہاتھ مارتے۔ بات کی وضاحت کے لیے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات (GESTURES) سے بھی مدد لیتے۔ مثلاً دو چیزوں کا باہم اکٹھا ہونا واضح کرنے کے لیے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو ملا کر دکھاتے' کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم وگر آر پار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے' کسی شے یا سمت میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے' کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو سیدھے ہاتھ کو الٹے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو الٹ دیتے' کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی الٹے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے پر مارتے' کبھی سر ہلاتے اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے' کبھی ہاتھ کو ران پر مارتے۔

قریش مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ ممتاز فرد قبیلہ بنو سعد کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ تو تھا ہی' وحی کی لسان مبین نے حسن گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ حق یہ ہے کہ حضور ﷺ افصح العرب تھے۔ حضور ﷺ کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا وہاں اس میں عام فہمی اور سادگی بھی تھی اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی گھٹیا اور بازاری لفظ استعمال میں نہیں لیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی۔ کہنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا کی تھی' ایک اسلوب بنایا تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ کے ایک قول (الحرب خدعة) پر بحث کرتے ہوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ "ھی لغة النبی ﷺ" یہ نبی اکرم ﷺ کی مخصوص زبان تھی' بے شمار اصطلاحات بنائیں' تراکیب پیدا کیں' تشبیہیں اور تمثیلیں وضع کیں' خطابت کا نیا انداز نکالا اور بہت سے مروج الفاظ و اسالیب کو متروک کیا۔ ایک مرتبہ بنو فہد کے لوگ آئے تو گفتگو ہوتی رہی۔ جس

دوران میں آنے والوں نے تعجب سے کہا: ''اے اللہ کے نبی! ہم آپ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں' ایک ہی مقام میں پرورش پائی ہے' پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ ﷺ ایسی عربی میں بات کرتے ہیں کہ جس (کی لطافتوں) کو ہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے؟'' فرمایا اور خوب فرمایا: "ان اللّٰہ عزّوجل ادّبنی فاحسن ادبی و نشاتُ فی بنی سعد بن بکر" (میری لسانی تربیت خود اللہ عزّ وجل نے فرمائی ہے اور میرے ذوق ادب کو خوشتر بنا دیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے۔) ایک موقعے پر کسی ملاقاتی سے بات ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ تعجب سے سن رہے تھے۔ پوچھا' اس شخص نے آپ سے کیا کہا اور آپ نے کیا فرمایا؟ حضور ﷺ نے اس کی وضاحت کی۔ اس پر جناب صدیقؓ کہنے لگے: ''میں عرب میں گھوما پھرا ہوں اور فصحائے عرب کا کلام سنا ہے لیکن آپ ﷺ سے بڑھ کر کلام فصیح کسی اور سے نہیں سنا۔'' یہاں بھی وہی بات حضور ﷺ فرماتے ہیں: "ادّبنی ربی و نشأت فی بنی سعد" اسی طرح حضرت عمرؓ ایک بار کہنے لگے: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا بات ہے کہ آپ ﷺ فصاحت میں ہم سب سے بالاتر ہیں' حالانکہ آپ ﷺ ہم سے کبھی الگ نہیں ہوئے۔'' فرمایا: ''کانت لغتی لغت اسمٰعیل' قد درست فجاء نی بھا جبریل فسغظینھا'' (میری زبان اسماعیل علیہ السلام کی زبان ہے جسے میں نے خاص طور سے سیکھا ہے۔ اسے جبریل مجھ تک لائے اور میرے ذہن نشین کر دی۔) مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی زبان معمولی عربی نہ تھی بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی جس کا جوڑ اسماعیلی زبان سے ملتا تھا' اور جبریل جس زبان میں قرآن لاتے تھے وہ بھی وہی پیغمبرانہ زبان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہیے کہ اکابر تاریخ خصوصاً انبیاء جو ایک مشن لے کر ماحول سے کشمکش کرتے ہیں اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اٹھتی ہیں۔ وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے' مخلصانہ جذبے اسے ادبی چاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔

حضور ﷺ کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپ ﷺ کو ''جوامع الکلم'' عطا کیے گئے تھے۔ خود فرمایا کہ "اعطیت بجوا مع الکلم"

جوامع الکلم حضور ﷺ کے وہ مختصر ترین کلمے ہیں جو معنوی لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے میں سرورِ عالم ﷺ اپنی مثال آپ تھے۔ اور اسے خصوصی عطیات رب میں شمار کیا۔

یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے:

1: "المرء مع من احبّ" آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہو۔

2: "اَسْلِمْ تَسلِم" تم اسلام لاؤ تو سلامتی پاؤ گے۔

3: "انما الاعمال بالنیات" اعمال نیتوں پر منحصر ہیں۔

4: "لیس للعامل من عمله الا مانواہ" کسی عمل کرنے والے کو اپنے عمل میں سے بجز اس کے کچھ نہیں ملتا ہے جو کچھ اس نے نیت کی ہے۔

5: "الولد للفراش وللعاهر الحجز" بیٹا اس کا جس کے بستر پر (گھر میں) ولادت پائے اور زانی کے لیے پتھر۔

6: "الحرب خدعة" جنگ چالوں سے لڑی جاتی ہے۔

7: "لیس الخبر کالمُعَاینَة" شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔

8: "المجالس بالامانة" مجالس کے لیے امانت (رازداری) لازم ہے۔

9: "ترك الشر صدقة" برائی سے باز آنا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔

10: "سیّد القوم خادمهم" قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے۔

11: "کل ذی نعمة محسود" ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے۔

12: "الکلمة الطیبة صدقة" حسن گفتار بھی ایک صدقہ (نیکی) ہے۔

13: "من لا یرحم لا یرُحم" جو (مخلوق پر' خصوصاً انسانوں پر) رحم نہیں کرتا اس پر (خدا کی بارگاہ سے) رحم نہ کیا جائے گا۔

ارشاداتِ رسالتمآب بلحاظ الفاظ' بلحاظ اسلوب' بلحاظ روح بالعموم پہچانے جاتے ہیں۔ اور احادیث اور سیرت کے ریکارڈ میں حضور ﷺ کے جو اجزئے کلام ہیں' وہ موتیوں کے سے معانی رکھتے ہیں۔ تھوڑے الفاظ' ان کا خوش آئند گٹھاؤ' ان میں معنوی گہرائی' دل پر اثر کرنے والی روح اخلاص کلام نبوی ﷺ امتیازات میں سے ہے۔ مناسب ہوگا کہ دو تین پارہ ہائے فصاحت یہاں درج کیے جائیں۔

''میں تمھیں اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں' نظام اجتماعی کے لیے سمع وطاعت کی تاکید کرتا ہوں' خواہ (اسے چلانے کے لیے) کوئی حبشی غلام ہی (برسر قیادت) کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات سے دوچار ہوں گے۔ پس (ایسے حالات میں) تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرو۔ اسے مضبوطی سے تھاموا سے ڈاڑھوں سے پکڑے رکھو۔ خبردار! دین میں نئے نئے شگوفے چھوڑنے سے پرہیز کرنا کیوں کہ ہر نیا شگوفہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔''

عمرو بن عبسہ نے حضور ﷺ سے کچھ باتیں کیں۔ جن کے بہت ہی مختصر مگر جامع جوابات حضور ﷺ نے دیئے۔ اس چھوٹے سے مکالمے کو ملاحظہ کیجیے:

''اس (دعوت وتحریک کے) کام میں ابتدا میں کون کون آپ ﷺ کے ساتھ تھا؟''

''ایک مردِ آزاد (مراد حضرت ابوبکرؓ) اور ایک غلام (مراد حضرت بلالؓ)''

''اسلام (کی اخلاقی حقیقت) کیا ہے؟''

''پاکیزہ گفتار اور (بھوکوں کو) کھانا کھلانا۔''

''ایمان (کا جوہر) کیا ہے؟''

''صبر اور سخاوت۔''

''کیسا اسلام افضل (معیاری) ہے؟''

''اس شخص کا جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کی زیادتیوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔''

''کیسا ایمان افضل (معیاری) ہے؟''
''جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے۔''
''کیسی نماز افضل (معیاری) ہے؟''
''جس میں دیر تک عاجزی سے قیام کیا جائے۔''
''کیسی ہجرت افضل (معیاری) ہے؟''
''ایسی کہ تم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمھارے پروردگار کو ناپسند ہیں۔''
''کیسا جہاد افضل (معیاری) ہے؟''
''اس شخص کا جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور خود بھی شہادت پائے۔''
''کون سی گھڑی (عبادت کے لیے) سب سے بڑھ کر ہے؟''
''رات کا پچھلا پہر۔''

ایک بار دریافت کیا گیا کہ انسانوں کو دوزخ تک پہنچانے کے موجبات زیادہ تر کیا ہیں؟ فرمایا: "الفم و الفرج۔"

یعنی دہن اور شرمگاہ۔ دہن سے اشارہ ہے کلام اور طعام دو چیزوں کی طرف۔ شرم گاہ سے اشارہ ہے جنسی داعیات کی طرف۔ یعنی کلام کا فاسد ہونا' روزی کا ناپاک ہونا' اور جنسی جذبات کا بے راہ رو ہونا انسانوں کی عاقبت کو سب سے زیادہ برباد کرنے والا ہے۔ بیش تر جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں اور ظلم بھی انھی خرابیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

حضرت علیؓ نے ایک بار سوال کیا کہ آپ ﷺ اپنے مسلک کی وضاحت کریں۔ آپ ﷺ نے مختصراً جس فصیح انداز سے جواب دیا اور اس جواب میں اپنے طرزِ فکر' اپنے کردار اور اپنی روحانیات کی جامع تصویر کھینچ دی وہ بجائے خود انسانی کلام کی تاریخ میں ایک اعجاز ہے۔ ملاحظہ ہو:

"المعرفةُ اِس مالی' والعقل اصل دینی' والحب اساسی' والشوق مركبی' وذكر الله انيسی' والثقة كنزی' والحُزن رفيقی' والعلم سلاحی' والصبر ردائی' والرضا غنيمتی' والعجز فخری' والزُهد حِرفتی' واليقين قوّتی' والصّدقُ شفيعی' والطّاعة حسبی' والجهاد خُلقی' وقُرّةُ عينی فی الصَّلٰوة."

''عرفان میرا سرمایہ ہے' عقل میرے دین کی اصل ہے' محبت میری بنیاد ہے' شوق میری سواری ہے' ذکر الٰہی میرا مونس ہے' اعتماد میرا خزانہ ہے' حُزن میرا رفیق ہے' علم میرا ہتھیار ہے' صبر میرا لباس ہے' خدا کی رضا میری غنیمت ہے' عاجزی میرے لیے وجہ اعزاز ہے' زُہد میرا پیشہ ہے' یقین میری طاقت ہے (لفظ قوت ہو تو غذا ہے) صدق میرا سفارشی ہے' طاعت میرا بچاؤ ہے' جہاد میرا کردار ہے اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''

حُسن تمثیل کی بے شمار زرّیں مثالیں آپ کے کلام میں محفوظ ہیں جن کی مدد سے بڑے بڑے حقائق آپ ﷺ نے بدوؤں کے ذہن نشین کرا دیے۔ ان میں یہاں ایک ہی کو لیجیے۔

''مجھے خدا نے ہدایت اور علم کا جو کچھ سرمایہ دے کر اٹھایا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین پر مُوسلا دھار بارش ہو' پھر اس زمین کا جو ٹکڑا بہت ہی زرخیز ہے اس نے پانی کو پوری طرح جذب کیا اور مرجھایا ہوا سبزہ اس سے تروتازہ ہو گیا اور نئی بوٹیاں کثرت سے اُگ آ گئیں۔ پھر زمین کا کچھ سخت حصہ ایسا بھی تھا جس نے پانی کو اپنے اندر جمع کر رکھا اور اللہ نے اسے لوگوں کے لیے مفید بنایا۔ انھوں نے اسے پیا پلایا' اور کھیتیوں کو اس سے سیراب کیا۔ پھر یہ پانی ایک اور قطعہ پر برسا جو چٹیل میدان تھا اور نہ اس نے پانی جمع کر کے رکھا' نہ جذب کر کے روئیدگی دکھائی۔ پس اس میں ایک مثال تو ان لوگوں کی ہے جنھوں نے علم دین میں سوجھ بوجھ پیدا کی اور جو کچھ ہدایت مجھے دے کر اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے اس سے اسے فائدہ پہنچا۔ اس نے خود علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا۔ دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جنھوں نے اس دعوت کو سن کر سر نہیں اٹھایا۔ اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جو میرے ذریعے بھیجی گئی ہے۔''

آپ ﷺ کے اندازِ گفتگو کا کوئی عنوان باندھا جا سکتا ہے تو قرآن کے اس جملے سے کہ:

﴿قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾
''لوگوں کو حسن تکلم سے خطاب کرو۔''

آپ کا حسن کلام سادگی کی شان لیے ہوئے تھا۔ بناوٹی کلام سے آپ ﷺ کو بعد تھا۔ فرمایا:

"ابعدُ كم منی يوم القيٰمة الثرثارون المتشدّقون المتفيهقون."
''تم میں سے قیامت کے روز وہ لوگ مجھ سے انتہائی دوری پر ہوں گے جو بڑے بول بولنے والے باتونی اور گھمنڈ جتانے والے ہیں۔''

اس طرح آپ کو سنجیدگی اور پاکیزگی کی حدود سے نکل کر فحش کے دائرے میں داخل ہونے والی گفتگو سخت ناپسند تھی۔ حضور ﷺ کے چمن زارِ تکلم میں ہمیشہ تبسم کی شبنم لمعانی دکھاتی تھی۔ سب سے بڑھ کر خندہ روئی سے آپ ﷺ ہی کا چہرہ آراستہ رہتا تھا' باوجودیکہ ذمہ داریوں اور مشکلات و مصائب ہر آن کی پریشانیوں کے خارزار درپیش تھے۔

خطابت

تکلم ہی کا ایک اہم جز خطابت ہے۔ محسن انسانیت ﷺ ایک عظیم پیغام کے حامل تھے۔ اور اس کے لیے خطابت ناگزیر ضرورت تھی۔ خطابت یوں بھی عربوں کی دولت تھی۔ پھر قریش تو اس صفت سے خاص طور پر مالا مال تھے۔ عرب اور قریش کے خطیبانہ ماحول سے بہت بلند رہ کر فریضہ قیادت نے جب بھی تقاضا کیا آپ ﷺ کی زبان کبھی نسیم سحر کی طرح' کبھی آب جو کی طرح اور کبھی تیغ برق دم کی طرح متحرک ہو جاتی۔

وعظ و تقریر کی کثرت سے آپ ﷺ نے پرہیز کیا اور معاشرہ کی ضروریات اور اس کے ظرف کو دیکھ کر اعتدال سے قوتِ خطابت کا استعمال کیا۔ مسجد میں خطابت فرماتے تو اپنی چھڑی پر سہارا لیتے اور میدانِ جنگ میں تقریر فرمانا ہوتی تو کمان پر ٹیک لگاتے۔ کبھی کبھی سواری پر سے خطاب کیا ہے۔ تقریر میں جسم دائیں بائیں جھوم جاتا۔ ہاتھوں کو حسبِ ضرورت حرکت دیتے۔ تقریر میں بعض مواقع پر والذی نفسی بیدہ یا والذی نفس محمد بیدہٖ (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے' یا محمد ﷺ کی جان ہے) کہہ کر قسم کھاتے' لہجے میں بھی اور چہرے پر بھی دل کے حقیقی جذبات جھلکتے اور سامعین پر اثر انداز ہوتے۔ اس انسان اعظم ﷺ کے خطابات دلوں کو ہلا دیتے تھے۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں دیں گے۔ حنین و طائف کے معرکہ کے بعد حضور ﷺ نے مالِ غنیمت تقسیم کیا تو مولفۃ القلوب کی قرآنی مد کے تحت نو مسلم رؤسائے مکہ کو اس میں بہت سا حصہ دیا تا کہ ان کے دل مزید نرم ہوں اور وہ احسان کے رشتے سے اسلامی ریاست کے ساتھ مربوط تر ہو جائیں۔ انصار میں کچھ لوگوں نے عجیب سے احساسات کی رَد دوڑا دی' کہا گیا کہ:

"رسول اللہ ﷺ نے قریش کو خوب انعامات دیئے اور ہمیں محروم رکھا' حالانکہ ہماری تلواروں سے اب تک خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔"

"مشکلات میں ہم یاد آتے ہیں اور حاصلِ غنیمت دوسرے لوگ لے جاتے ہیں۔"

یہ چرچے حضور ﷺ کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا اور اس میں انصار کا اجتماع بلایا گیا۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں؟ جواب ملا کہ "آپ ﷺ نے جو سنا وہ صحیح ہے۔ مگر یہ باتیں ہم میں سے ذمہ دار لوگوں نے نہیں کہیں' کچھ نوجوانوں نے ایسے فقرے کہے ہیں۔"

واقعہ کی تحقیق کے بعد آپ ﷺ نے یہ تقریر کی:

"کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم لوگ پہلے گمراہ تھے' خدا نے میرے ذریعے سے تمھیں ہدایت دی؟ تم منتشر اور پراگندہ تھے' خدا نے میرے ذریعے سے تمھیں متحد اور متفق کیا؟ تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے سے تمھیں آسودہ حال کیا؟ (ہر سوال پر انصار کہتے جاتے تھے کہ بلاشبہ اللہ اور رسول ﷺ کا بہت بڑا احسان ہم پر ہے۔) "نہیں' تم یہ جواب دو کہ اے محمد! تمھیں جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تمھاری تصدیق کی' تمھیں جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی' تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح مدد کی۔ تم جواب میں یہ کہتے جاؤ' اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ ہاں تم سچ کہتے ہو' لیکن اے گروہ انصار! کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمد ﷺ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ۔

کلام کا اتار چڑھاؤ دیکھیے' خنجر خطابت کی اس دھار کو دیکھیے جو نازک جذبات سے صیقل کی گئی تھی' پھر اس کی روانی دیکھیے' مطالب کے موڑ دیکھیے' پھر یہ غور کیجیے کہ کس طرح خطیب نے بالآخر مطلوبہ کیفیت سامعین میں پوری طرح ابھار دی۔ انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ "ہم کو صرف محمد ﷺ درکار ہیں۔"

ابتدائی دورِ دعوت میں کوہِ صفا کے خطبہ کے علاوہ متعدد بار آپ ﷺ نے قریش کے سامنے تقاریر فرمائی ہیں۔ اس دور کے ایک خطبہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"اِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ اَهْلَهٗ وَ اللّٰهِ لَوْ كَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا كَذَبْتُكُمْ وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا غَرَرْتُكُمْ وَ اللّٰهِ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنِّيْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَ اِلَى النَّاسِ كَافَّةً وَ اللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ وَلَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَ لَتُجْزَوْنَ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّ بِالسُّوْءِ سُوْٓءً وَ اِنَّهَا لَجَنَّةٌ اَبَدًا اَوْ لَنَارٌ اَبَدًا۔"

"قافلے کا دیدبان اپنے ساتھیوں کو کبھی غلط اطلاع نہیں دیا کرتا۔ خدا کی قسم اگر (بفرض محال) میں اور سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار بھی ہو جاتا تا تب بھی تم سے غلط بات ہرگز نہ کہتا۔ اگر (بفرض محال) میں دوسرے تمام لوگوں کو ہلاکت و خطرہ سے دوچار کر دیتا تو بھی تمھیں کبھی خطرہ میں مبتلا نہ کرتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا اور کوئی الٰہ نہیں میں تمھاری طرف خصوصیت سے اور تمام انسانوں کی طرف جامع طور سے خدا کا مقرر کردہ رسول ہوں۔ بخدا تمھیں لازماً مرنا ہے جیسے کہ تم سو جاتے ہو' اور پھر مرنے کے بعد تمھیں جی اٹھنا ہے' جیسے کہ تم نیند سے بیدار ہو جاتے ہو' تم سے لازماً تمھارے کاموں کا حساب لیا جانا ہے اور تمھیں بھلے کا بدلہ بھلا اور برے کا بدلہ برا ضرور ملنا ہے۔ پھر یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی یا ہمیشہ کے لیے دوزخ۔"

کیا ہی سادہ اندازِ بیان ہے' کتنی عقلی اور جذباتی اپیل ہے۔ داعی کی خیر خواہی ایک ایک لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے۔ پھر یقین کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چھوٹے سے اس خطبے میں تمثیل سے بھی کام لیا گیا ہے۔ توحید' رسالت اور آخرت کی بنیادی دعوت پوری طرح سموئی ہوئی ہے۔

حضور ﷺ کے معرکۃ الآرا خطبے دو اور ہیں جن میں سے ایک فتح مکہ کے موقع پر اور دوسرا حجۃ الوداع کے موقع پر دیا۔ ان خطبوں کا مزاج انتہائی انقلابی ہے اور ان میں ایمان' اخلاق اور اقدار تینوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ حجۃ الوداع کا خطبہ تو گویا ایک دورِ نو کے افتتاح کا اعلان ہے۔

عام سماجی رابطہ

بڑے بڑے کام کرنے والے لوگ بالعموم رابطۂ عام کے لیے وقت نہیں نکال سکتے اور نہ ہر طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ بعض بڑے لوگوں میں خلوت پسندی اور خشکی مزاجی پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ کبر کا شکار ہو کر اپنے لیے ایک عالمِ بالا بنا لیتے ہیں مگر حضور ﷺ انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہو کر اور تاریخ کا رخ بدلنے والے کارنامے انجام دے کر عوامی حلقوں سے پوری طرح مربوط تھے۔ اور جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور نجی تعلق رکھتے تھے۔ علیحدگی پسندی یا کبر یا یبوست کا شائبہ تک نہ تھا۔ در حقیقت آپ ﷺ نے جس نظامِ اخوت کی تاسیس فرمائی تھی' یہ اس کا اہم تقاضا تھا کہ لوگ باہم دگر مربوط رہیں۔ ایک دوسرے کے کام آئیں اور ایک

دوسرے کے حقوق پہچانیں بخلاف اس کے آج جو تمدن مغرب میں نشو ونما پا گیا ہے۔ اس میں "کسے رابا کسے کارے نباشد" کی فضا بڑی انسانیت کش ہو گئی ہے۔ محمد ﷺ کی راہ نمائی میں اس فضا کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ آیئے ہم حضور ﷺ کو عام سماجی رابطوں کے دائرے میں دیکھیں۔

آپ ﷺ کا معمول تھا کہ راستہ میں ملنے والوں سے سلام کہتے اور سلام کہنے میں پہل کرتے۔ کسی کو پیغام بھجواتے تو ساتھ سلام ضرور کہلواتے۔ کسی کا سلام پہنچایا جاتا تو بھیجنے والے کو بھی اور لانے والے کو بھی جُدا جُدا اسلام کہتے۔ ایک بار لڑکوں کی ٹولی کے پاس سے گزرے تو انھیں سلام کیا۔ عورتوں کی جماعت کے قریب سے ہو کر نکلے تو انھیں سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور گھر سے نکلتے ہوئے گھر والوں کو بھی سلام کہتے۔ احباب سے معانقہ بھی فرماتے اور مصافحہ بھی۔ مصافحہ سے ہاتھ اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک دوسرا خود ہی اپنا ہاتھ الگ نہ کرتا۔

مجلس میں جاتے تو اس امر کو ناپسند کرتے کہ صحابہ تعظیم کے لیے کھڑے ہوں، مجلس کے کنارے ہی بیٹھ جاتے۔ کندھوں پر سے پھاند کر بیچ میں گھسنے سے احتراز فرماتے۔ فرمایا:

"اَجْلِسُ كما يجلس العبد ." (اسی طرح اٹھتا بیٹھتا ہوں، جس طرح خدا کا ایک بندہ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ (روایت عائشہؓ)

اپنے زانو ساتھیوں سے بڑھا کر نہ بیٹھتے، کوئی آتا تو اعزاز کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔ آنے والا جب تک خود نہ اٹھتا آپ مجلس سے الگ نہ ہوتے۔

اہلِ مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے بلکہ جو سلسلہ کلام چل رہا ہوتا اسی میں شامل ہو جاتے۔ چنانچہ نمازِ صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں صحابہ سے خوب باتیں ہوتیں۔ جاہلیت کے قصے چھڑ جاتے اور ان پر خوب ہنسی بھی ہوتی۔ صحابہ شعر بھی پڑھتے۔ جس موضوع سے اہلِ مجلس کے چہروں پر اُکتانے کا اثر محسوس ہوتا اسے بدل دیتے۔ ایک ایک فرد مجلس پر توجہ فرماتے تا کہ کوئی یہ نہ محسوس کرے کہ کسی کو اس پر آپ ﷺ نے فوقیت دی ہے۔ دورانِ تکلم کوئی شخص غیر متعلق سوال چھیڑ دیتا تو اسے نظر انداز کر کے گفتگو جاری رکھتے اور سلسلہ پُورا کر کے پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اس وقت تک رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ پھیر لیتا۔ کان میں کوئی سرگوشی کرتا تو جب تک وہ بات پوری کر کے منہ نہ ہٹا لیتا آپ ﷺ برابر اپنا سر اسی کی طرف جھکائے رکھتے۔ کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے۔ اِلاّ یہ کہ حق کے خلاف ہو۔ اس صورت میں یا تو ٹوک دیتے یا چہرے پر ناگواری آ جاتی۔ یا اٹھ کر چلے جاتے۔ ناپسند تھا کہ کھڑے کھڑے کوئی اہم بحث چھیڑ دی جائے۔ ناپسندیدہ باتوں سے یا تو اعراض فرماتے ورنہ گرفت کرنے کا عام طریقہ یہ تھا کہ براہِ راست نام لے کر ذکر نہ کرتے، بلکہ عوامی انداز میں اشارہ کرتے یا جامع طور پر نصیحت کر دیتے۔ انتہائی تکدر کی صورت میں جو فقط دینی امور میں ہوتا تھا احباب کو احساس دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ طریق اظہار تھا کہ یا تو شخصِ متعلق کے آنے پر سلام قبول نہ کرتے یا عدمِ التفات دکھاتے۔ ناپسندیدہ آدمی کے آنے پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ چنانچہ ایک بار کوئی آیا جسے آپ ﷺ "بئس اخوا العشيره يا بئس ابن العشيره" (اپنے گروہ کا برا آدمی) سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے بے تکلفی سے بات چیت کی۔ حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: "قسم ہے کہ قیامت کے دن خدا کے حضور وہ شخص بدترین مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے ڈر سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔"

کسی کی ملاقات کو جاتے تو دروازے کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کر اطلاع دینے اور اجازت لینے کے لیے تین مرتبہ سلام کہتے۔ جواب نہ ملتا تو بغیر کسی احساسِ تکدر کے واپس چلے آتے۔ رات کو کسی سے ملنے جاتے تو اتنی آواز میں سلام کہتے کہ اگر وہ جاگتا ہو تو سن لے اور سو رہا ہو تو نیند میں خلل نہ آئے۔

بدن یا لباس سے کوئی شخص تنکا یا مٹی وغیرہ ہٹاتا تو شکریہ ادا کرتے ہوئے فرماتے: مَسَحَ اللّٰه عنك ما تكره (خدا تم سے ہر اس شے کو دور کرے جو تمھیں بُری لگے) ہدیہ قبول کرتے اور جواباً ہدیہ دینے کا خیال رکھتے۔ کسی شخص کو اتفاقاً کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو اسے بدلہ لینے کا حق دیتے اور کبھی عوض میں کوئی ہدیہ دیتے۔ کوئی شخص نیا لباس پہن کر سامنے آتا تو فرماتے: حَسَنَةٌ حَسَنَةٌ اهلِ واخلقِ (یعنی خوب ہے خوب دیر تک پہنو، بوسیدہ کرو) بدسلوکی کا بدلہ بُرے سلوک سے نہ دیتے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے۔ دوسرے کے قصور معاف کر دیتے تو اطلاع کے ساتھ اپنا عمامہ علامت کے طور پر بھیج دیتے۔ کوئی پکارتا تو خواہ وہ گھر کا آدمی ہو یا رفقاء میں سے ہمیشہ "لبیک" (حاضر ہوں) کہتے۔

بیماروں کی عیادت کو اہتمام سے جاتے۔ سرہانے بیٹھ کر پوچھتے: "كَيْفَ تَجِدُكَ؟" (تمہاری طبیعت کیسی ہے؟) بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے۔ کبھی سینے اور پیٹ پر دستِ شفقت پھیرتے اور کبھی چہرے پر۔ کھانے کو پُوچھتے۔ بیمار کسی چیز کی خواہش کرتا تو اگر مضر نہ ہوتی تو منگوا دیتے۔ تسلی دیتے اور فرماتے۔ "لابأس ان شاء اللّٰهُ طَهُورٌ" (فکر کی کوئی بات نہیں خدا نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو گے) شفا کے لیے دعا فرماتے۔ حضرت سعدؓ کے لیے تین بار دُعا کی۔ مشرک چچاؤں کی بیمار پرسی بھی کی۔ ایک یہودی بچے کی عیادت بھی فرمائی (جو ایمان لے آیا) اس کام کے لیے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا۔ جب بھی اطلاع ملتی اور وقت ملتا تشریف لے جاتے۔

ایک بار حضرت جابرؓ بیمار پڑے۔ رسول خدا ﷺ اپنے رفیق خاص حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ لیے ہوئے پیدل خاصی دوری تک چل کر گئے (مدینہ کی آبادی پھیلی ہوئی تھی) حضرت جابرؓ بے ہوش پڑے تھے۔ آپ ﷺ نے دیکھا، پھر وضو کا پانی کے چھینٹے دیئے، دعا کی اور مریض کی حالت سنبھلنے لگی۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے بات چیت کی اور اپنے ترکہ کے متعلق مسائل پُوچھے۔

تواضع کی انتہا یہ تھی کہ منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی تک کی عیادت فرمائی۔ جب کسی شخص کی وفات ہو جاتی تو تشریف لے جاتے، عالم نزع میں بلایا جاتا

خود اطلاع پا کر پہنچتے تو توحید اور توجہ الی اللہ کی تلقین کرتے۔ میت کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار فرماتے' صبر کی نصیحت کرتے اور چلانے اور بکا کرنے سے روکتے۔ سفید کپڑوں میں اچھا کفن دینے کی تاکید کرتے اور تجہیز و تکفین میں جلدی کراتے۔ جنازہ اٹھتا تو ساتھ ساتھ چلتے۔ مسلمانوں کے جنازے خود پڑھاتے اور مغفرت کے لیے دعا کرتے۔ کوئی جنازہ گزرتا...... تو چاہے وہ غیر مسلم کا ہو...... کھڑے ہو جاتے (بیٹھے رہنے کی روایت بھی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ قیام کا طریقہ منسوخ ہو گیا تھا۔ (ملاحظہ ہو زاد المعاد' ج ا' ص ۱۴۵) تلقین فرماتے کہ میت کے گھر والوں کے لیے لوگ کھانا پکوا کر بھجوائیں (کجا آج یہ الٹی رسم مسلط ہے کہ میت والے گھر میں دوسروں کی ضیافت ہوتی ہے) ناپسند تھا کہ باقاعدہ مجلسِ تعزیت کا سلسلہ ایک رسمی ضابطے کے طور پر کئی روز جاری رہے۔

کوئی مسافر سفر سے واپس آتا اور حاضری دیتا تو اس سے معانقہ کرتے' بعض اوقات پیشانی چوم لیتے۔ کسی کو سفر کے لیے رخصت فرماتے تو کہتے کہ بھائی' ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

محبت آمیز بے تکلفی میں کبھی کبھی احباب کے ناموں کو مختصر کر کے بھی پکار لیتے' جیسے یا ابا ہریرہ کے بجائے "اباھر" حضرت عائشہؓ کو کبھی کبھار "عائش" کہ کر پکارتے۔

بچوں سے بہت دل چسپی تھی۔ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے' پیار کرتے' دعا فرماتے' ننھے بچے لائے جاتے تو انھیں گود میں لے لیتے۔ انھیں بہلانے کے لیے عجیب سے کلمے فرماتے یعنی خرقة خرقة فی عین کلّ بقه ایک معصوم بچے کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا اِنَّھُمْ لَمِنْ رَیْحَانِ اللّٰہِ (یہ بچے تو خدا کے باغ کے پھول ہیں) بچوں کے نام تجویز کرتے بچوں کو قطار میں جمع کر کے انعامی دوڑ لگواتے کہ دیکھیں کون ہمیں پہلے چھو لیتا ہے بچے دوڑتے ہوئے آتے تو کوئی سینہ پر گرتا' کوئی پیٹ پر۔ بچوں سے دل لگی بھی کرتے۔ مثلاً حضرت انسؓ کو کبھی کبھی پیار سے اس طرح بلاتے "یَا ذَا الْاُذُنَیْن" (او دو کانوں والے) حضرت انسؓ کے بھائی ابو عمیر کا پالا ہوا ممولا مر گیا۔ تو وہ اداس بیٹھا تھا۔ حضور ﷺ آئے تو پکار کر کہا "یا ابا عمیر ما فعل النُّغَیر (ابو عمیر! تمھارے ممولے کو کیا ہوا) عبداللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجے۔ صاحب زادے میاں راستہ میں کھا گئے۔ بعد میں معاملہ کھلا تو آپ ﷺ پیار سے عبداللہ کے کان پکڑ کر کہتے "یا غدر! یا غدر!" (او دھوکے باز' او دھوکے باز) سفر سے آ رہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا اسے سواری پر بٹھا لیتے۔ چھوٹا ہوتا تو آگے' بڑا ہوتا تو پیچھے۔ فصل کا میوہ پہلی بار آتا تو دعائے برکت مانگ کر کم عمر بچے کو دے دیتے۔ آپ ﷺ کے پیش نظر تھا کہ یہی نئی پود آئندہ تحریک اسلامی کی علمبردار ہوگی۔

بوڑھوں کا احترام فرماتے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق اپنے ضعیف العمر والد کو (جو بینائی سے بھی محروم ہو چکے تھے) بیعتِ اسلام کے لیے آپ کی خدمت میں لائے۔ فرمایا: انہیں کیوں تکلیف دی' میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

مروّت کی انتہا یہ تھی کہ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا آتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے کچھ کہنا ہے آپ ﷺ اسے فرماتے ہیں کہ تم چلو، کسی کوچے میں انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ اس کی بات جا کر سنی اور اس کا کام کر کے دیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ عدی بن حاتم نے دیکھا تھا اور حضور ﷺ کی مروّت کو نبوت کی علامت کے طور پر لیا۔

میل جول کی زندگی میں آپ ﷺ کے حسن کردار کی تصویر حضرت انسؓ نے خوب کھینچی ہے وہ فرماتے ہیں:

"میں دس برس تک حضور ﷺ کی خدمت میں رہا اور آپ نے مجھے کبھی اف تک نہ کہی۔ کوئی کام جیسا بھی کیا' نہیں کہا کہ یہ کیوں کیا' اور کوئی کام نہ کیا تو نہیں کہا کہ کیوں نہیں کیا۔ یہی معاملہ آپ ﷺ کا خادموں اور کنیزوں کے ساتھ رہا۔ آپ ﷺ نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں مارا اس کی تصدیق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ازواج یا خادموں میں سے نہ کبھی کسی کو مارا، نہ کسی سے کوئی ذاتی انتقام لیا۔ بجز اس کے کہ آپ ﷺ خدا کے راستے میں جہاد کریں یا قانون الٰہی کے تحت اس کی مقرر کردہ حرمتوں کے تحفظ کے لیے کارروائی کریں۔

خالص نجی زندگی

اکثر بڑے لوگ وہ کہلاتے ہیں جو پبلک لائف کے لیے ایک مصنوعی کردار کا چغہ پہنے رکھتے ہیں جو نجی زندگی میں اتر جاتا ہے۔ باہر دیکھیے تو بڑی آن بان ہے' گھر پہنچے تو انتہائی پستی میں جا گرے۔ باہر سادگی اور تواضع دکھائی دی' گھر کو پلٹے تو عیش و تنعم میں ڈوب گئے۔ پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کسی شخص کے ہاں جتنا زیادہ اختلاف اور فاصلہ ہوتا ہے اتنا ہی اس کا مرتبہ ادنیٰ ہوتا ہے۔ حضور کو دیکھیے تو ایک ہی رنگ گھر میں بھی ہے اور گھر سے باہر بھی۔

حضرت عائشہؓ سے کسی نے دریافت کیا کہ "رسول خدا ﷺ اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا: آپ ﷺ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے۔ اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود ہی کر لیتے (کہ ان میں کوئی جوں وغیرہ نہ چڑھ آئی ہو) بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنی ضرورتیں خود ہی پوری کر لیتے۔ نیز اپنے کپڑوں کو خود ہی پیوند لگا لیتے' اپنے جوتے کی مرمت کر لیتے اور یہ کہ اپنے ڈول کو ٹانکے لگا لیتے' بوجھ اٹھاتے' جانوروں کو چارہ ڈالتے' کوئی خادم ہوتا تو اس کے ساتھ مل کر کام کرا دیتے۔ (مثلاً) اسے آٹا پسوا دیتے' کبھی اکیلے ہی مشقت کر لیتے' بازار جانے میں عار نہ تھی' خود ہی سودا سلف لاتے اور ضرورت کی چیزیں ایک کپڑے میں باندھ کر اٹھا لاتے۔

لوگوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ رسول خدا ﷺ جب گھر میں ہوتے تو کیا رنگ رہتا؟ حضرت عائشہؓ بتاتی ہیں اَلْیَنَ النَّاس بساماً ضحاکاً۔ (سب سے زیادہ نرم خو' متبسم' خندہ جبین) اور اس لینت کی شان یہ تھی کہ "کبھی کسی خادم کو جھڑکا نہیں۔" حق یہ ہے کہ رسول خدا ﷺ سے بڑھ کر کوئی بھی اپنے اہل و عیال کے لیے شفیق نہ تھا۔ (مسلم)

ایک بار حضرت امام حسینؓ کے پوچھنے پر حضرت علیؓ نے بیان کیا کہ رسولِ خدا ﷺ گھر میں آتے تو اپنا وقت تین طرح کی مصروفیتوں میں صرف کرتے۔ کچھ وقت خدا کی عبادت میں صرف ہوتا' کچھ وقت اہل وعیال کے لیے تھا اور کچھ وقت اپنے آرام کے لیے۔ پھر انھی اوقات میں سے ایک حصہ ملاقاتیوں کے لیے نکالتے جن میں مسجد کی عام مجالس کے علاوہ خصوصی گفتگو کرنے والے احباب یا مہمان آ آ کر ملتے یا کچھ لوگ ضروریات وحاجات لے کر آتے۔ دیکھا جائے تو آرام کے لیے بہت ہی کم وقت رہ جاتا تھا۔

ازواجِ مطہرات کے نان ونفقہ اور مختلف ضروریات کا انتظام بھی آپ ﷺ کو کرنا ہوتا۔ پھر ان کی تعلیم وتربیت بھی آپ ﷺ کے ذمے تھی۔ پھر انھی کے ذریعے طبقۂ خواتین کی اصلاح کا کام جاری رہتا۔ عورتیں اپنے مسائل لے کر آتیں اور ازواج مطہرات کی معرفت دریافت کرتیں۔ اس کے باوجود گھر کی فضا کو آپ ﷺ نے کبھی خشک اور بوجھل نہ بننے دیا۔ اور نہ اس میں کوئی مصنوعی انداز پیدا ہونے دیا۔

گھر ایک عام انسانی گھر کی طرح تھا جس کی فضا میں فطری جذبات کا مدوجزر رہتا۔ اس میں آنسوؤں کی چمک بھی ہوتی' اور تبسّموں کی لمعانی بھی' محبتیں بھی کارفرما تھیں اور کبھی کبھار رشک کا کھچاؤ بھی پیدا ہوتا۔ پریشانیاں بھی رہتیں۔ اور تفریح کے لمحات بھی آتے۔ حضور ﷺ اس باغ میں آتے تو نسیم کے جھونکے کی طرح آتے اور ایک عجیب شگفتگی پھیل جاتی۔ بات چیت ہوتی' کبھی کبھار قصہ گوئی بھی ہوتی' اور دل چسپ لطائف بھی وقوع میں آتے۔ مثلاً اپنا ایک واقعہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خزیرہ (گوشت کا قیمہ کر کے پانی میں پکاتے اور پھر اس پر آٹا چھڑکتے جو ساتھ ہی پکتا) تیار کیا۔ حضرت سودہؓ بھی موجود تھیں اور رسول خدا ﷺ دونوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ بے تکلفی کی فضا تھی۔ میں نے سودہؓ سے کہا کہ کھاؤ۔ انھوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ تمھیں ضرور کھانا ہوگا۔ انھوں نے پھر انکار کیا۔ ادھر سے پھر کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ ورنہ میں اٹھا کر تمہارے مُنہ پر مل دُوں گی۔ حضرت سودہؓ نے بھی ہٹ دکھائی حضرت عائشہؓ نے خزیرہ میں ہاتھ ڈالا اور واقعی حضرت سودہؓ کے چہرے پر لیپ دیا۔ اس بے تکلفی پر حضور ﷺ خوب ہنسے اور سودہؓ سے کہا کہ تم اس کے منہ پر ملو تا کہ حساب برابر ہو جائے۔ چنانچہ سودہؓ نے ایسا ہی کیا۔ حضور ﷺ مکرر ہنسے۔

ایک موقع پر حضرت ابوبکرؓ آئے تو حضرت عائشہؓ کو حضور ﷺ کے ساتھ شوخی سے بات کرتے پایا' غضبناک ہو کر مارنے کو چلے۔ حضور ﷺ نے انھیں ٹھنڈا کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اسی غصے میں جناب صدیقؓ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپؐ نے بڑے تیکھے انداز میں حضرت عائشہؓ سے کہا: دیکھا! ہم نے تمھیں اس شخص سے کیسے بچالیا۔

گھریلو زندگی کے اس فطری اتار چڑھاؤ کو بعض لوگ اسلامیت کے تصور سے فروتر پاتے ہیں' اور خصوصاً نبی کریم ﷺ کے گھر کا نقشہ کچھ ایسا ذہن میں رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی غیر انسانی پتلے رہتے تھے جن میں نہ کوئی جذبہ تھا' نہ خواہش...... حالانکہ وہ گھر انسانوں کا گھر تھا۔ اور اس میں سارے انسانی جذبات کام کرتے تھے۔ مگر اس گھر میں معصیت نہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ نمونے کا گھر تھا۔ راتوں کو جب حضور ﷺ بستر پر ہوتے تو اہل وعیال سے عام باتیں ہوتیں۔ کبھی گھریلو امور پر' کبھی عام مسلمانوں کے مسائل پر۔ یہاں تک کہ کبھی قصہ کہانی بھی سناتے۔ ایک بار آپ ﷺ نے حضرت عائشہ سے ام زرع کی کہانی بیان کی۔ اس کہانی میں گیارہ عورتیں اپنے اپنے خاوند کا کردار آپس میں بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت ام زرع اپنے خاوند ابوزرع کا من موہنا کردار پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی ادبی لحاظ سے بڑی دل چسپ ہے۔ خاتمے پر حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں بھی تمھارے حق میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ ابوزرع ام زرع کے لیے تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے موقع پر کوئی قصہ سنایا تو سننے والیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ تو خرافہ کے قصوں جیسا ہے (عرب میں خرافہ کی ایک روایتی شخصیت تھی جس سے بہت سے حیرت ناک قصے منسوب تھے) حضور ﷺ نے کہا کہ جانتی بھی ہو کہ خرافہ کی کیا حقیقت تھی۔ پھر آپ ﷺ نے خرافہ کی روایتی شخصیت کا قصہ بھی بیان کیا کہ بنو عذرہ کے اس آدمی کو جن پکڑ کر لے گئے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد واپس چھوڑ گئے۔

عمر بھر معمول رہا کہ رات کے دوسرے نصف حصے کے اوائل میں بیدار ہو کر مسواک اور وضو کے بعد تہجد ادا فرماتے۔ قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہوئے بعض اوقات اتنا لمبا قیام فرماتے کہ قدم مبارک متورم ہو جاتے۔ صحابہؓ نے اس مشقت پر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ ﷺ کو غفران خاص سے نوازا ہے قَدْ غَفَرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاخَّرَ۔ پھر اس قدر حضور ﷺ جان کیوں گھلاتے ہیں۔ فرمایا: اَفَلَا اَكُوْنُ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ (کیا میں خدا کا احسان شناس اور شکر گزار بندہ نہ بنوں)

گھر اور اس کے ساز وسامان کے متعلق آپ ﷺ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زندگی اس طرح گزاری جائے جیسے مسافر گزارتا ہے۔ فرمایا کہ میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سائے میں آرام کرے اور پھر اپنی راہ لے۔ مراد یہ ہے کہ لوگ آخرت کو منتہا بنائیں اور دنیوی زندگی کو ادائے فرض یا امتحان کے طور پر گزاریں اور جنھیں یہاں کسی بڑے نصب العین کے لیے جدوجہد کرنی ہو ان کے لیے کیا موقع ہے کہ اعلیٰ درجہ کے مسکن بنائیں اور انھیں ساز وسامان سے آراستہ کریں' اور پھر ان میں مگن رہ کر لطف اٹھائیں۔ چنانچہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھیوں نے نہ اعلیٰ درجہ کی عمارتیں بنائیں اور نہ ان میں اسباب جمع کیے اور نہ ان کی زینت و آرائش کی۔ ان کے گھر بس ''بہترین مسافرانہ قیام گاہیں تھیں۔'' ان میں گرمی سردی سے بچاؤ کا اہتمام تھا' جانوروں کی مداخلت سے بچاؤ کا انتظام تھا' پردہ داری (PRIVACY) کا بندوبست تھا اور حفظان صحت کے ضروری پہلو ملحوظ تھے۔ حضور ﷺ نے مسجد کے ساتھ ازواج کے لیے حجرات (چھوٹے چھوٹے کمرے) بنوا لیے تھے۔ بجز صفائی

اور کسی طرح کی آرائش نہ تھی۔ صفائی میں ذوقِ نبوت یہاں تک تھا کہ صحابہؓ کو تاکید فرمائی: ''گھروں کے آنگن صاف رکھو۔''

سازوسامان میں چند برتن نہایت سادہ قسم کے تھے۔ مثلاً ایک لکڑی کا پیالہ (بادیہ) تھا' جس پر لوہے کے پتر لگے تھے اور کھانے پینے میں اس کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ خوراک کا سامان جمع تو کیا ہوتا' روز کا روز بھی کافی مقدار میں میسر نہ ہوا۔ بستر چمڑے کے گدے پر مشتمل تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی رکھتے۔ ٹاٹ کا بستر بھی استعمال میں رہا' جو دوہرا کر کے بچھایا جاتا۔ ایک بار چوہرا کر کے بچھایا گیا تو صبح دریافت کیا کہ آج کیا خصوصیت تھی کہ مجھے گہری نیند آئی اور تہجد چھوٹ گئی۔ معلوم ہونے پر حکم دیا کہ بستر کو پہلے ہی حال پر رہنے دیا جائے۔ زمین پر چٹائی بچھا کر بھی لیٹنے کا معمول تھا۔ بعض اوقات کھری چارپائی کے نشانات بدن پر دیکھ کر رفقائے خاص (مثلاً حضرت عمرؓ و عبداللہ بن مسعود) رو دیئے۔

ذرا حضرت عمرؓ کا چشم دید نقشہ سامنے لایئے۔ واقعہ ایلاء کے زمانے میں انھوں نے حضور ﷺ کو اس عالم میں دیکھا کہ آپ کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور جسم پر نشان پڑ گئے ہیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے ہیں' ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کیلی سے لٹک رہی ہے' یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضور ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا تو عرض کی کہ ''قیصر و کسریٰ تو عیش کریں اور آپ ﷺ کا حال یہ رہے۔'' فرمایا: عمر! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ وہ لوگ دنیا لے جائیں اور ہمیں آخرت ملے۔''

اکل و شرب

کھانے پینے کا ذوق بہت نفیس تھا۔ گوشت سے خاص رغبت تھی۔ زیادہ ترجیح دست' گردن اور پیٹھ کے گوشت کو دیتے۔ نیز پہلو کی ہڈی پسند تھی۔ ثرید (گوشت کے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر یہ مخصوص عربی کھانا تیار کیا جاتا تھا) تناول فرمانا مرغوب تھا۔ پسندیدہ چیزوں میں شہد' سرکہ' خربوزہ' ککڑی' لوکی' کھچڑی اور مکھن وغیرہ اشیاء شامل تھیں۔ دودھ کے ساتھ کھجور (بہترین مکمل غذا بنتی ہے) کا استعمال بھی اچھا لگتا اور مکھن لگا کے کھجور کھانا بھی ذوق میں شامل تھا۔ کھرچن (تہ دیگی) سے بھی انس تھا۔ ککڑی نمک لگا کر اور خربوزہ شکر لگا کر بھی کھاتے۔ مریضوں کی پرہیزی غذا کے طور پر حریرہ کو اچھا سمجھتے اور تجویز بھی فرماتے۔ میٹھا پکوان بھی مرغوب تھا۔ اکثر جو کے ستو بھی استعمال فرماتے۔ ایک مرتبہ بادام کے ستو پیش کیے گئے تو یہ کہ کر انکار کر دیا کہ یہ امرا کی غذا ہے۔ گھر میں شوربا پکتا تو کہتے کہ ہمسائے کے لیے ذرا زیادہ بنایا جائے۔

پینے کی چیزوں میں نمبر ایک پر میٹھا پانی تھا۔ اور بطور خاص دو دو روز کی مسافت سے منگوایا جاتا۔ دودھ' پانی ملا دودھ (جسے کچی لسی کہا جاتا ہے) اور شہد کا شربت بھی رغبت سے نوش فرماتے۔ غیر نشہ دار نبیذ بھی قرین ذوق تھی۔ مشکیزے یا پتھر کے برتن میں پانی ڈال کر کھجور بھگو دی جاتی اور اسے متواتر دن بھر استعمال کرتے۔ لیکن وقت زیادہ ہونے پر چوں کہ نشہ ہونے کا اندیشہ ہو جاتا لہٰذا پھینکوا دیتے۔ بہ روایت ابو مالک اشعری یہ بھی فرمایا کہ میری اُمت میں سے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل کر کچھ اور رکھ دیں گے۔ (چنانچہ سلاطین مابعد نے نبیذ کے نام سے منشیات کا استعمال کیا۔)

افراد کا الگ الگ بیٹھ کر کھانا ناپسند تھا' اکٹھے ہو کر کھانے کی تلقین فرمائی۔ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی شانِ فقر کے خلاف سمجھتے' اسی طرح دسترخوان پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں اور طشتریوں میں کھانا رکھا جانا بھی خلافِ مزاج تھا۔ سونے چاندی کے برتنوں کو بالکل حرام فرما دیا تھا۔ کانچ' مٹی' تانبے اور لکڑی کے برتنوں کو استعمال میں لاتے رہے۔ دسترخوان پر ہاتھ دھونے کے بعد جوتا اتار کر بیٹھتے۔ سیدھے ہاتھ سے کھانا لیتے اور اپنے سامنے کی طرف سے لیتے۔ برتن کے وسط میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ ٹیک لگا کر کھانا پینا بھی خلافِ معمول تھا' دوزانو یا اکڑوں بیٹھتے۔ ہر لقمہ لینے پر بسم اللہ پڑھتے۔ ناپسندیدہ کھانا بغیر عیب نکالے خاموشی سے چھوڑ دیتے۔ زیادہ گرم کھانا نہ کھاتے۔ کبھی کبھار چھری سے پکا ہوا گوشت کاٹ کاٹ کر بھی کھایا ہے۔ مگر یہ پُرتکلف طریقہ مرغوب نہ تھا۔ کھانا ہمیشہ تین انگلیوں سے لیتے اور انھیں لتھڑنے نہ دیتے۔ کبھی کبھار میوہ یا پھل کھڑے ہو کر یا چلتے ہوئے بھی کھا لیا۔ دو پھل اکٹھے بھی کھائے۔ مثلاً ایک ہاتھ میں خربوزہ لیا اور دوسرے میں کھجور۔ کھجور کی گٹھلی الٹے ہاتھ سے پھینکتے۔ دعوت ضرور قبول فرماتے اور اگر اتفاقاً کوئی دوسرا آدمی (بات چیت کرتے ہوئے یا کسی اور سبب سے) ساتھ ہوتا تو اسے لے تو جاتے مگر صاحب خانہ سے اس کے لیے اجازت لیتے۔ مہمان کو کھانا کھلاتے تو بار بار اصرار سے کہتے کہ اچھی طرح بے تکلفی سے کھاؤ۔ کھانے کی مجلس سے بہ تقاضائے مروّت سب سے آخر میں اٹھتے۔ دوسرے لوگ اگر پہلے فارغ ہو جاتے تو ان کے ساتھ ہی آپ ﷺ بھی اٹھ جاتے۔ فارغ ہو کر ہاتھ ضرور دھوتے۔ دعا کرتے جس میں خدا کی نعمتوں کے لیے ادائے شکر کے کلمات ہوتے۔ نیز طلب رزق فرماتے اور صاحبِ خانہ کے لیے برکت چاہتے۔ کھانے کی کوئی چیز آتی تو حاضر دوستوں کو باصرار شریک کرتے اور غیر حاضر دوستوں کا حصہ رکھ دیتے۔ پھل وغیرہ کھانے کی مجلس میں ایک ایک دانہ لینے کی تربیت آپ ﷺ نے دی۔ پانی غٹ غٹ کی آواز نکالے بغیر پیتے اور بالعموم تین بار پیالہ منہ سے الگ کر کے سانس لیتے اور ہر بار آغاز ''بسم اللہ'' اور اختتام ''الحمدللہ والشکر للہ'' پر کرتے۔ عام طریقہ بیٹھ کر پانی پینے کا تھا۔ مگر کبھی کبھی کھڑے ہو کر بھی پیا ہے۔ پینے کی چیز مجلس میں آتی تو بالعموم داہنی جانب سے دور چلاتے اور جہاں ایک دور ختم ہوتا دوسرا وہیں سے شروع کرتے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو ترجیح دیتے' مگر داہنے ہاتھ والوں کے مقررہ استحقاق کی بنا پر ان سے اجازت لے کر ہی ترتیب توڑتے۔ احباب کو کوئی چیز پلاتے تو خود سب سے آخر میں پیتے اور فرماتے ''ساقی آخر میں پیا کرتا ہے۔''

کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک مارنا یا انھیں سونگھنا ناپسند تھا۔ سانس میں بُو کا ہونا چوں کہ خلافِ مزاج تھا اس لیے کچی پیاز اور لہسن کا استعمال ہمیشہ ناپسند رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں کو ڈھانکنے کا حکم دیا ہے۔ کوئی نیا کھانا سامنے آتا تو کھانے سے پہلے اس کا نام معلوم فرماتے۔ زہر خورانی کے واقعہ کے بعد معمول ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اجنبی شخص

کھانا کھلاتا تو پہلے ایک آدھ لقمہ خود اسے کھلاتے۔

ذوق کی اس نفاست کے ساتھ دوسری طرف اکثر اوقات فقر و فاقہ کا عالم درپیش رہا۔ جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ دیں گے۔ فرمایا:

"آکل کما یاکل العبد."

(میرا کھانا پینا ایسا ہے جیسے (خدا کے) کسی بندے کا ہونا چاہیے۔

نشست و برخاست

کبھی اکڑوں بیٹھتے، کبھی دونوں ہاتھ زانوؤں کے گرد حلقہ زن کر لیتے، کبھی ہاتھوں کے بجائے کپڑا (چادر وغیرہ) لپیٹ لیتے۔ بیٹھے ہوئے ٹیک لگاتے تو بالعموم الٹے ہاتھ پر۔ فکر یا سوچ کے وقت بیٹھے ہوئے زمین کو لکڑی سے کریدتے۔ سونے کے لیے سیدھی کروٹ سوتے اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا رخسار رکھ لیتے۔ کبھی چت لیٹتے اور پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیتے۔ مگر ستر کا اہتمام رکھتے۔ پیٹ کے بل اوندھا لیٹنا سخت ناپسند تھا اور اس سے منع فرماتے تھے۔ ایسے تاریک گھر میں سونا پسند نہ تھا جس میں چراغ نہ جلایا گیا ہو۔ کھلی چھت پر، جس کی پردے کی دیوار نہ ہو سونا اچھا نہ سمجھتے، وضو کر کے سونے کی عادت تھی اور سوتے وقت مختلف دعائیں پڑھنے کے علاوہ آخری تین سورتیں (سورۂ اخلاص، اور معوذتین) پڑھ کر بدن پر دم کر لیتے۔ سوتے ہوئے ہلکی آواز سے خراٹے لیتے۔ رات میں قضائے حاجت کے لیے اٹھتے تو فارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ ضرور دھو لیتے۔ سونے کے لیے ایک تہ بند علیحدہ تھا۔ کرتہ اتار کر ٹانگ دیتے۔

بشری حاجات

ضرورت کے لیے چوں کہ اس دور میں گھروں میں بیت الخلاء نہ تھے اس لیے حضور جنگل جاتے۔ عموماً اتنی دور تک جاتے (دو دو میل تک) کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ ایسی نرم زمین تلاش کرتے کہ چھینٹے نہ اڑیں۔

غسل کے لیے پردہ ضروری قرار دیا تھا۔ گھر میں نہاتے تو کپڑے کا پردہ تانا جاتا۔ کبھی بارش میں نہاتے تو تہ بند باندھ لیتے۔

چھینک پست آواز سے لیتے اور ہاتھ یا کپڑا منہ پر رکھ لیتے۔

سفر

سفر کے لیے جمعرات کو روانگی زیادہ پسند تھی۔ سواری کو تیز چلاتے، پڑاؤ سے صبح کے وقت کوچ کرنا معمول رہا۔ سفر (CAMP LIFE) میں جو اجتماعی کام درپیش ہوتے ان میں ضرور حصہ لیتے۔ چنانچہ ایک بار کھانا تیار کرنے کی مہم تھی۔ سارے ساتھیوں نے کام تقسیم کیے۔ آپ ﷺ نے بھی لکڑیاں چننا اپنے ذمہ لیا۔ کہا گیا کہ آپ ﷺ تکلیف نہ کریں، ہم سب اس کام کے لیے کافی ہیں۔ فرمایا کہ مجھے امتیاز پسند نہیں۔ سفر میں اپنی سواری پر باری باری کسی نہ کسی پیادہ ساتھی کو شریک کرتے سفر میں رات میں واپس آنا پسند نہ تھا۔ آتے تو سیدھے گھر جانے کے بجائے مسجد میں جا کر نفل ادا کرتے۔ گھر میں اطلاع ہو جانے کے بعد اطمینان سے جاتے۔

جذبات

انسانیت کا کوئی تصور ہم جذبات کو الگ رکھ کر نہیں کر سکتے۔ حضور ﷺ میں بھی انسانی جذبات کے بہترین اسلوب پر کار فرما تھے۔ آپ ﷺ بہت ہی صاحب احساس ہستی تھے اور خوشی میں خوشی اور غم میں غم سے متاثر ہوتے۔

حضور ﷺ ان نام نہاد بڑے لوگوں میں سے نہ تھے جو دنیا جہان کے غم میں گھلے جاتے ہیں۔ لیکن گھر کے لیے سنگدل اور تغافل کیش ثابت ہوتے ہیں۔ باہر کی زندگی پُر ہنگامہ ہوتی ہے گھر کی پھیکی اور بدمزہ۔ آپ ﷺ کو ازواج کے ساتھ سچی محبت تھی۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ایک ہی پیالہ میں پانی پیتے اور جہاں وہ منہ لگاتیں وہیں منہ لگاتے۔ انصار کی بچیوں کو بلواتے تاکہ وہ ان کے ساتھ کھیلیں۔ حبشیوں کے ورزشی کرتب اس انداز سے دکھائے کہ حضرت عائشہؓ کی ٹھوڑی آپ ﷺ کے کندھے پر تھی۔ بار بار پوچھتے کہ "کیا تم سیر ہو گئی ہو؟" وہ کہتیں: "ابھی نہیں" دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت صفیہؓ کو اونٹ پر سوار کرانے کے لیے آپ ﷺ اپنا گھٹنا بڑھا دیتے اور اس پر آنجنابؐ اپنا پیر رکھ کر سوار ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ سفر میں ناقہ کا پاؤں پھسلا اور حضورؐ اور جناب صفیہؓ دونوں گر پڑے۔ ابوطلحہ ساتھ تھے۔ دوڑے ہوئے آپ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: پہلے خاتون کی طرف توجہ کرو۔ ایک بار ساربان نے اونٹوں کو تیز چلایا تو فرمانے لگے: "دیکھو! آبگینے ہیں آبگینے! ذرا احتیاط سے۔ اسی محبت کی وجہ سے ایک بار شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی جس پر عتاب آیا کہ "حلال شے کو حرام نہ کرو۔"

اپنے بچوں کے لیے بھی حضور ﷺ کے جذبات بڑے گہرے تھے۔ حضرت ابراہیم کو رضاعت کے لیے ایک لوہار کے گھر میں مدینہ کے بالائی حصے میں رکھا گیا تھا انھیں دیکھنے کے لیے خاصہ فاصلہ چل کر تشریف لے جاتے۔ گھر میں دھواں بھرا ہوتا مگر وہاں بیٹھتے اور بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔

حضرت فاطمہؓ آتیں تو اٹھ کر استقبال کرتے۔ خود تشریف لے جاتے۔ اپنی کہتے ان کی سنتے۔ ان کے صاحب زادوں امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے بہت ہی پیار تھا۔ انھیں گود میں لیتے، انھیں کندھوں پر سوار کرتے، ان کے لیے گھوڑا بنتے۔ حالت نماز میں بھی انھیں کندھوں پر بیٹھنے دیتے۔ ایک بار اقرع بن حابس نے آپ ﷺ کو جناب حسنؓ کا بوسہ لیتے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے تو دس بیٹے ہیں میں نے کبھی کسی کو پیار نہیں کیا مگر آپ ﷺ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

ابراہیم صاحب زادے کی وفات ہوئی تو صدمہ سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسی طرح ایک صاحب زادی کی وفات آپ ﷺ کی موجودگی میں ہوئی۔ ام ایمن (کنیز) چلا چلا کر رونے لگیں۔ حضور ﷺ نے منع فرمایا، تو کہنے لگیں کہ آپ خود بھی تو رو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا رونا منع نہیں ہے۔ یہ رونا اس رقت کی وجہ سے ہے وہ اللہ کی ایک رحمت ہے۔ اپنی صاحب زادی ام کلثوم کی قبر پر کھڑے ہوئے اس وقت بھی آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عثمان بن مظعون

میت کے سامنے بھی آپ ﷺ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور آپ ﷺ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اپنے رونے کی کیفیت کو خود بیان فرمایا "آنکھیں اشک آلود ہیں دل غمزدہ ہے' مگر ہم اپنی زبان سے اس کے ماسوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہے۔" غم کی حالت میں اکثر زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے:

"حسبی الله نعم الوکیل."

رونے میں اونچی آواز نہ نکلتی بلکہ ٹھنڈا سانس لیتے اور ہانڈی کے ابلنے جیسی آواز سینے سے نکلتی۔

یہ دل حساس جب اپنے خدا کے حضور میں عرض و نیاز کر رہا ہوتا یا قرآن ورد زبان ہوتا تو ایسی حالت میں بسا اوقات پلکوں پر موتی چمکنے لگتے۔ ایک بار عبداللہ ابن مسعودؓ سے فرمائش کر کے قرآن سنا۔ وہ جب سورۂ نساء کی اس آیت پر پہنچے "فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا..." (اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تمھیں گواہ بنا کے لائیں گے۔) تو آنکھوں سے سیلِ اشک رواں ہو گیا۔

یہ رقت سرچشمہ ہے ان جذبات ہمدردی و شفقت کا جو حضور ﷺ کو ساری انسانیت سے تھی اور خصوصاً اسلامی جماعت کے افراد سے! حیرت ہے کہ اس نزاکت احساس کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ نے مشکلات و مصائب کے مقابلے میں کس درجہ کے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

ذوقِ مزاح

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ رسول خدا ﷺ خندہ روئی کی صفت سے متصف تھے۔ بلکہ فرمایا:

"وتبسّمك وجه اخیك صدقة."

"تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی ایک کارِ خیر ہے۔"

آپ ﷺ کی یہ شان بھی بیان ہو چکی ہے کہ کان بساماً ضاحکاً۔ عظیم کارنامے انجام دینے والی شخصیت کے لیے یہ ایک لازمی وصف ہے کہ وہ فرائض حیات کے بوجھ کو اپنے تبسم سے گوارا بنا دے اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کر لے۔ آپ ﷺ کا یہ حال تھا کہ "قد كان يباسط اصحابه بما يولج جتهه' فی القلوب۔" یعنی آپ ﷺ ایسے بے تکلفانہ انداز مزاح سے پیش آتے تھے کہ رفقا کے دلوں میں آپ ﷺ کی محبت رچ بس گئی تھی۔ آپ ﷺ ہنسی' دل لگی کی باتیں کرتے۔ اور مجلس میں شگفتگی کی فضا پیدا کر دیتے۔ مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا مزاح کا رنگ آٹے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلاف حق کبھی کوئی بات شامل ہوتی نہ کسی کی دلآزاری کی جاتی اور نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسنا معمول تھا۔ غنچوں کا سا تبسم ہوتا جس میں زیادہ سے زیادہ دانتوں کے کیلے دکھائی دیتے۔ حلق نظر نہ آتا۔

ایک بار تعجب سے حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ "آپ ﷺ کو ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں؟" ارشاد فرمایا: ہاں! مگر خلافِ حق کوئی بات نہیں کہتا۔"

یہاں ہم حضور پاک ﷺ کے مزاح کے چند نمونے درج کرتے ہیں جو سنت کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔

☆ کسی سائل نے سواری کا اونٹ مانگا۔ فرمایا: ہم تمھیں اونٹنی کا ایک بچہ دیں گے۔ سائل نے حیرت سے کہا کہ میں اسے لے کر کیا کروں گا۔ فرمایا: ہر ایک اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔

☆ ایک بڑھیا نے آ کر عرض کی کہ میرے لیے دعا کیجیے کہ خدا مجھے جنت عطا فرمائے۔ حضور ﷺ نے مزاحاً کہا: "اے ام فلاں! جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جا سکتی۔ وہ روتی ہوئی اٹھ کر جانے لگی۔ حاضرین سے فرمایا: اسے کہو کہ خدا تعالیٰ اسے بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں لے جائے گا' بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا مراد یہ کہ جنت میں جانے والیوں کو اللہ تعالیٰ جوانی سے سرفراز فرمائے گا۔

☆ زاہر (یا زہیر) نامی ایک بدوی تھے۔ ان سے بے تکلفی تھی۔ آپ ﷺ اپنے اس بدوی دوست کو شہر سے متعلق کاموں میں امداد دیتے اور وہ دیہات سے متعلق حضور ﷺ کے کام کرا لاتا۔ نیز مخلصانہ جذبے سے ہدیے دیتا (جن کی قیمت حضور ﷺ باصرار ادا فرماتے) چنانچہ فرماتے کہ زاہر دیہات میں ہمارا گماشتہ ہے اور ہم شہر میں اس کے گماشتہ ہیں۔ یہی زاہر ایک دن بازار میں اپنا کچھ سودا بیچ رہے تھے حضور ﷺ نے پیچھے سے جا کر چپکے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور پوچھا بتاؤ میں کون ہوں۔ وہ پہلے تو کچھ نہ سمجھے پھر جب معلوم ہوا تو فرطِ اشتیاق میں حضور ﷺ کے سینے سے اپنے کندھے ملتے رہے۔ پھر حضور ﷺ نے مزاحاً کہا کہ کون اس غلام کو خریدتا ہے۔ زاہر کہنے لگے: یا رسول اللہ! مجھ جیسے نا کارہ غلام کو جو خریدے گا' گھاٹے میں رہے گا۔ فرمایا: تم خدا کی نگاہ میں نا کارہ نہیں ہو۔

☆ ایک موقع پر مجلس میں کھجوریں کھائی گئیں۔ آپ ﷺ مزاح کے طور پر گٹھلیاں نکال نکال کر علیؓ کے آگے ڈالتے رہے۔ آخر میں گٹھلیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے ان سے کہا کہ تم نے تو بہت کھجوریں کھا لیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے گٹھلیوں سمیت نہیں کھائیں۔

☆ غزوۂ خندق کے موقع پر ایک واقعہ کی وجہ سے حضور ﷺ خوب ہنسے اور آپ ﷺ کے دانت (نواجذ) تک دکھائی دیئے۔ ہوا یہ کہ عامر کے والد سعد تیر پھینک رہے تھے ایک دشمن فرد ذرد پر تھا' وہ ڈھال بڑی پھرتی سے چہرے کے سامنے رکھ لیتا۔ سعد کے تیر کاری نہیں بیٹھ رہے تھے۔ آخری بار سعد نے تیر کمان چڑھایا اور تاک میں رہے کہ موقع ملے تو چھوڑیں۔ اس نے جوں ہی ڈھال سے سر نکالا' تیر سیدھا پیشانی میں پیوست ہو گیا۔ اس بُری طرح چکرا کر گرا کہ ٹانگیں اُوپر کو اٹھ گئیں۔

بعد کے لوگوں کو اس رنگِ مزاح کا حال سن کر تعجب ہوتا تھا' کیوں کہ ایک تو مذہب کے ساتھ تقشف کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے اور خدا پرستوں اور متقیوں کی ہمیشہ رونی صورتیں اور خشک طبیعتیں لوگوں کے سامنے رہی ہیں' دوسرے حضور ﷺ کی عبادت رب' حضور ﷺ کی خشیت' حضور ﷺ کی بھاری ذمہ داریوں اور حضور ﷺ کے تفکرات کا خیال کرتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس نمونۂ انسانیت نے ان مسکراہٹوں کے لیے زندگی کے نقشے میں کیسے جگہ پیدا کی۔ چنانچہ ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ''کیا رسول اللہ کے رفقاء بھی ہنسا کرتے تھے؟'' انھوں نے فرمایا: ''ہاں ہنستے تھے اور ان کے دلوں میں پہاڑ سے زیادہ بڑا ایمان تھا۔ (یعنی ہنسی دل لگی ایمان وتقویٰ کی نقیض نہیں ہے) تیروں کا نشانہ (بطور مشق) کرتے ہوئے دوڑتے تھے اور باہم دگر ہنستے تھے۔'' (روایت قتادہ)

یہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نمازِ صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں جاہلی دور کی باتیں بھی چھڑتیں اور صحابہؓ کے ساتھ رسول اکرم ﷺ بھی خوب ہنستے۔ بچوں سے آپ ﷺ کی دل لگی کرنے کے واقعات بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر میں ازواج کے ساتھ ہنسنے ہنسانے کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔

تفریحات

متوازن زندگی کا لازمی جزء تفریحات (جائز حدود میں) بھی ہیں مزاح کی طرح یہ جزء ساقط ہو جائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور جس نظامِ حیات میں تفریحات کی گنجائش نہ رکھی گئی ہو اسے کوئی معاشرہ دیر تک اٹھا نہیں سکتا۔ حضور ﷺ کو بھی بعض تفریحات پسند تھیں اور جائز حدوں میں ان کے لیے راستے نکالے۔

شخصی طور پر آپ ﷺ کو باغوں کی سیر کا شوق تھا' کبھی تنہا اور کبھی رفقاء کے ساتھ باغوں میں چلے جاتے اور وہیں مجلس آرائی بھی ہو جاتی۔

تیرنے کا مشغلہ بھی تھا اور احباب کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے۔ دو دو ساتھیوں کے جوڑ بنائے جاتے اور پھر ہر جوڑ کے ساتھی دور سے تیر کر ایک دوسرے کی طرف آتے۔ ایک موقع پر اپنا ساتھی حضور ﷺ نے جناب ابوبکر صدیقؓ کو پسند کیا۔

وقفے کے بعد بارش پڑتی تو تہ بند باندھ کر پھوار میں نہایا کرتے۔ کبھی تفریحاً کسی کنویں میں پاؤں لٹکا کر اس کے دہانے پر بیٹھتے۔

دوڑوں اور تیر اندازی کے مقابلے کراتے اور اکھاڑے میں خود پوری دل چسپی سے شریک رہتے۔ ایسے موقع پر ہنسی بھی ہوتی۔

مسرت کے موقعوں پر پسند تھا کہ دف بجائی جائے یا بچیاں گیت گالیں۔ چنانچہ عید کی تقریب پر حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں گیت گا رہی تھیں حضور ﷺ قریب ہی لیٹے تھے۔ ابوبکر صدیقؓ آئے تو غصے میں ڈانٹا کہ خدا کے رسول ﷺ کے گھر میں یہ کیا شیطانی ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ انھیں گانے دو۔

شادی بیاہ کے لیے بھی فرمایا کہ ایسے موقعوں پر دف بجائی جائے۔ (روایت عائشہ و محمد بن الحاطب الجمحی) حضرت عائشہؓ ہی بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک انصاری لڑکی رہتی تھی میں نے اس کا نکاح کر کے دیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''عائشہؓ! تم گانے کا انتظام نہیں کراتیں حالانکہ قبیلہ انصار گانے کو پسند کرتا ہے۔'' ایک دوسری روایت میں (غالباً اسی موقع سے متعلق) یہ آتا ہے کہ ''تم لوگ کسی گانے والی کو لڑکی کے ساتھ بھیجتے جو کہتا "اَتَیْنَا کُمْ اَتَیْنَا کُمْ فَحَیَّانَا وَحَیَّاکُمْ" (ہم تمھارے پاس آئے' ہم تمھارے پاس آئے' پس تم بھی سلامت رہو' ہم بھی سلامت رہیں)۔ ایسی ہی ایک بزمِ عروسی میں بچیاں کچھ گا رہی تھیں۔ حضرت عامر بن سعد نے بعض حاضرین سے بطور اعتراض کہا کہ ''اے صحابیانِ رسول! اے شرکائے بدر! تمھارے سامنے یہ کچھ ہو رہا ہے؟'' جواب ملا: جی چاہے تو بیٹھ کر سنو ورنہ چلے جاؤ' ہمیں رسول اللہ ﷺ نے اس کی اجازت دی ہے۔

ازانجملہ حضور ﷺ نے شعر سے بھی دل چسپی لی ہے۔ عرب میں جو شعر پرستی رائج تھی اس سے تو آپ ﷺ کو بُعد تھا۔ آپ ﷺ کو نغمۂ الہام کی جاذبیتیں اتنا موقع ہی نہ دیتی تھیں کہ شعر وسخن کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ مگر دوسری طرف ذوقِ شعر سے قدرت نے محروم نہیں رکھا۔ اچھے شعر (بلحاظ مقصد) کی قدر فرماتے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ حضور ﷺ نے ایک نیا ذوق معاشرے کو دیا۔ اور ایک نیا معیارِ نقد مقرر فرمایا۔ جابر بن سمرہؓ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں ایک سو سے زیادہ مجالس میں شریک ہوا ہوں جن میں جاہلیت کے قصے بھی ہوتے تھے۔ اور صحابہ شعر بھی سُنایا کرتے۔ شاعرانِ عرب کے کلام میں سے ایک بار لبید کا یہ مصرع پسندیدگی سے پڑھا:

"اَلَا کُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰه بَاطِل۔"

''آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے۔''

دوسرا مصرع ہے:

"وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَا مَحَالَةَ زَائِل۔"

''دنیا کی ساری نعمتیں زائل ہو جانے والی ہیں۔''

حضرت شرید سے ایک سفر میں یکے بعد دیگرے فرمائش کر کر کے امیہ بن ابی صلت کے سو شعر سنے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ شخص اسلام لانے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بعض اوقات خود بھی (خصوصاً میدان جنگ میں) بلا ارادہ شعر کے انداز پر کلمات فرمائے ہیں۔ حضرت حسان اور کعب بن مالک سے دشمنانِ اسلام کے ہجویہ اشعار کے جواب میں شعر کہلاتے اور کبھی کبھی حضرت حسان کو اپنے منبر پر بٹھا کر ان سے پڑھواتے اور کہتے کہ ''یہ اشعار دشمنوں کے حق میں تیر سے زیادہ سخت ہیں۔''

یہ بھی فرمایا کہ:

''مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی۔''

چند متفرق ذوقیات

آخر میں ہم بعض ایسے خاص ذوقیات واطوار کا ذکر کرتے ہیں جنھیں کسی دوسرے عنوان کے تحت نہیں لیا جاسکا۔

☆ کسی سے چیز لیتے تو سیدھے ہاتھ سے لیتے اور کوئی چیز دیتے تو سیدھے ہاتھ سے دیتے۔

☆ خطوط لکھواتے تو سب سے پہلے بسم اللہ لکھواتے۔ پھر مرسل کا نام اور اس کے نیچے مرسل الیہ کا نام ہوتا۔ اس کے بعد اصل مضمون لکھا جاتا۔ خاتمے پر مہر لگواتے۔

☆ حضور ﷺ اوہام پسندی سے پاک تھے اور شگون نہ لیتے تھے۔ البتہ اشخاص اور مقامات کے اچھے نام پسند آتے۔ برے نام پسند نہ کرتے۔ سفر میں اقامت کے لیے ایسا ہی مقام انتخاب کرتے جس کے نام میں خوشی یا برکت یا کامیابی کا مفہوم ہوتا۔ اسی طرح جس شخص کے نام میں لڑائی جھگڑے یا نقصان کا معنیٰ شامل ہوتا اسے کام نہ سونپتے۔ ایسے آدمیوں کو نامزد کرتے جن کے ناموں میں خوشی یا کامیابی کا مفہوم پایا جائے۔ بہت سے ناموں کو تبدیل بھی فرمایا۔

☆ سواریوں میں سے گھوڑا بہت پسند تھا۔ فرماتے: گھوڑے کے ایال میں قیامت تک کے لیے خیر و برکت ہے۔ گھوڑے کی آنکھ منہ ناک کو اہتمام سے اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے۔

☆ شور ہنگامہ اور ہڑبونگ اچھی نہ لگتی۔ ہر کام میں سکون و وقار اور نظم و ترتیب چاہتے۔ نماز تک کے بارے میں کہا کہ بھاگم بھاگ نہ آؤ "علیکم بالسکینة" (تمہارے لیے سکون و وقار لازم ہے)۔ یوم عرفہ کو ہجوم تھا بڑا شور و ہنگامہ تھا۔ لوگوں کو اپنے تازیانہ سے اشارہ کرتے ہوئے نظم و سکون کا حکم دیا اور فرمایا:

"فان البر لیس بالایضاع ." (جلدی مچانے کا نام نیکی نہیں ہے)

اخلاق

حضور پاک ﷺ کے اخلاق کا بیان یہاں کسی ضمنی عنوان کے تحت کیا نہیں جاسکتا۔ وہاں تو پوری زندگی حسن خلق ہی کی تفسیر ہے۔ جس کے متعلق حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا: "کان خلقه القراٰن۔" انس بن مالک کا یہ قول بہت ہی جامع ہے کہ "کان احسن الناس و کان اجود الناس و کان اشجع الناس" احسن الناس ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ کسی کو عمر بھر تکلیف نہیں پہنچائی (ماسوا ان باتوں کے جو حکم الٰہی کے تحت تھیں) اور دوسروں کی زیادتیوں پر کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہر کسی سے عفو فرمایا۔ یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے بیدادگروں کو معاف کیا اور منافقین و اشرار سے درگزر کیا۔ اجود الناس ہونے کا عالم یہ تھا کہ جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے جو کچھ بھی کسی نے مانگا آپ نے کبھی نہ نہیں کی۔ (موجود ہوا تو دے دیا، کبھی قرض لے کر دیا، نہیں موجود ہوا تو دوسرے وقت آنے کو کہا، یا سکوت اختیار کیا) اشجع الناس ہونے کے لیے فی الجملہ یہ امر کافی ہے کہ نظریۂ حق کو لے کر تن تنہا اٹھے اور زمانے بھر کی مخالفتوں اور مظالم کے مقابلے میں جمے کھڑے رہے۔ کبھی کسی خطرناک ترین موقع پر بھی خوف یا کم زوری کا اظہار نہ کیا۔ غارِ ثور ہو یا احد و حنین کے معرکے، ہر موقع پر یقین محکم کا مظاہرہ کیا۔ (تحریر: مولانا نعیم صدیقی)

آنحضور ﷺ کی مکی زندگی

حضرت رسولِ خدا احمد مجتبیٰ ﷺ کے ساتھ مسلمانوں کی جو عقیدت ہے سو ہے' ایک بے عقیدہ انسان کا بھی یہ ضروری فرض ہے' اس عظیم شخصیت کے حالات غور اور توجہ کے ساتھ پڑھے' جس نے پوری دنیا کے فکر و تصور کا انداز بدل دیا۔ عرب جیسی ایک قوم کو سارے جہاں کی سیادت بخش دی۔ آخر یہ تو دیکھنا ہی چاہیے' اس ذات نے کیا کر دکھایا' جس کی وجہ سے اس کی بارگاہ میں صرف جنید و شبلی ہی نہیں' ابن سینا اور فارابی بھی باادب سر بزانو نظر آتے ہیں۔ ایک ان پڑھ' اونٹ اور بکریوں کے چرواہے نے ایک کتاب دی' ایک دین عطا کیا' ایک طرز حیات سکھائی' ایک نئی سیاست دی' نیا نظام حکومت دیا' ایک زندہ حکمت اور سرگرم عمل دانش بخشی۔ ایسے ضوابط دیئے جو پوری دنیا میں انسانوں کے ایک گروہ کا چودہ سو برسوں تک ہر مشکل اور تاریخ کے ہر نئے موڑ پر ساتھ دیتے رہے۔ آخر کیا بات ہے کہ دنیا کی ہر ملت کے مصلحین تو یہ کہتے ہیں کہ ماضی میں کچھ دھرا نہیں ہے' حال کو دیکھو اور مستقبل کی تصنیف کرو۔ لیکن اس مصلح کے ماننے والوں کو نہ صرف اس کے معتقدین بلکہ انسانیت کے بہی خواہ و دیگر مفکرین بھی پندرہ سو برس پیچھے ہی کی طرف مڑنے کی رائے دیتے ہیں۔

دنیا کے اور تمام بانیانِ مذاہب کی سیرتیں بھولے بسرے ماضی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں روپوش ہیں۔ حضرت موسیٰؑ' حضرت داؤدؑ' حضرت عیسیٰؑ کی سیرتیں ہی نہیں بلکہ ان کے واقعی کبھی وجود ہونے تک کی شہادتیں محفوظ نہیں ہیں۔ لیکن دنیا میں ایک ہی قابل اقتدا ہستی ایسی گزری ہے جو تاریخ کے روز روشن میں گزری' اس کے سارے احوال مستند طور پر محفوظ ہیں۔ وہ دنیا کا کامیاب ترین انسان تھا۔ اس کی سیرت کسی ہومر' کسی بیاس اور کسی والمیک کے شاعرانہ تخیلات کی مخلوق نہیں ہے بلکہ خود اس کے ساتھ رہنے سہنے والوں اور اس کے سوانح حیات میں برابر کے شریک کئی ہزار انسانوں کی زندہ شہادتوں سے ثابت ہے۔ ہمارے اور اس کے درمیانی زمانہ میں جتنے رواۃ گزرے' سب کو ایک شخص بخوبی جان اور پہچان سکتا ہے۔ دنیا میں ایک ہی شخص کی سیرت ایسی ہے جس کی صداقت پر پورا وثوق کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ہمیں ایک ایسی کتاب دی ہے' جو پندرہ صدیوں تک ہماری تمام معاشی' معاشرتی' سیاسی' علمی اور فکری ضرورتوں میں کام دیتی رہی ہے۔ اس ہادیِ اقوام کے علاوہ کسی اور ہادی کی سیرت کو اٹھائیں' تو وہ معجزات اور کرامات کا انبار نظر آئے گی۔ ان خارق عادت کارناموں کو سن کر ہم حیرت کر سکتے ہیں' ان کی تعظیم کر سکتے ہیں' ان پر ایمان لا سکتے ہیں' مگر ان کی تقلید نہیں کر سکتے۔ حضرت مسیحؑ کے معجزے ہم نہیں دکھا سکتے' لیکن حضرت رسولِ خدا ﷺ کے احوال پر جب ہم غور کریں گے' تو ہمیں ان کی زندگی میں قابل عمل اسباق ملیں گے۔

اس لیے ایک انسان اگر بے عقیدہ ہے' تب بھی اسے چاہیے کہ اس سراپا اعجاز سیرت پر غور کرے۔ آپ کی سیرت خود اپنے ہر قاری کو اپنی طرف کھینچ لینے کی طاقت رکھتی ہے۔ بدعقیدہ سے بدعقیدہ انسان بھی اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی سوانح حیات کو پڑھے گا اور آپ ﷺ کی تعلیمات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا' تو وہ ہرگز بدعقیدہ نہیں رہ سکے گا۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور آپ کی تعلیمات کا ہر پہلو بذاتِ خود ایک مستقل موضوع سخن بن سکتا ہے۔ ذیل کی سطروں میں ہم کسی مخصوص پہلو کو نمایاں کرنا نہیں چاہتے۔ آپ کی مکی زندگی کے چند حوادث کو تاریخی ترتیب سے پیش کر دینے پر اکتفا کریں گے تاکہ ایک نظر میں ایک شخص آپ کی ابتدائی زندگی کا خاکہ اپنے ذہن میں محفوظ کر لے۔ پھر بطور خود آپ ﷺ کو اور آپ کے حالات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ میرے اس مضمون کے مخاطب نہ خوش عقیدہ لوگ ہیں' نہ بدعقیدہ لوگ' میں صرف خالی الذہن افراد کی توجہ ایک قابلِ غور زندگی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

ایامِ قبلِ نبوت

کسی شخص کے حالات بخوبی سمجھنے کے لیے اس شخص کے ملک اور زمانہ کے عام حالات کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے لیکن بخوفِ طوالت اس پر مفصل گفتگو کو ہم یہاں چھوڑ دیتے ہیں۔

آج سے 435 برس پہلے مکہ میں دوشنبہ 12 ربیع الاول 53 ق۔ ھ کی صبح کو ایک خوش خبری نے قریش کے ایک ایک فرد کا چہرہ روشن کر دیا۔ عربی دستور کے مطابق ایک نوجوان ابھی ایک یا ڈیڑھ سال پہلے دیوتا کے حضور ذبح کیا جانے والا تھا۔ اس نوجوان پر اہل مکہ کو ترس آ گیا۔ ایک کاہنہ کے مشورہ سے اونٹوں پر اور اس نوجوان پر قرعہ ڈالا گیا۔ کئی بار کے قرعہ کے بعد طے کیا گیا کہ اس جوان کے بدلے سو اونٹ قربان کر دیئے جائیں تو دیوتا راضی ہو جائے گا۔ اس نوجوان کا نام عبداللہ بن عبدالمطلب تھا۔ اس واقعہ کے بعد اس نوجوان کی شادی ایک شریف خاتون آمنہ بنت وہب سے ہوئی۔ بی بی کو حاملہ چھوڑ کر یہ نوجوان شام کو گیا، لیکن پھر زندہ لوٹنا نصیب نہ ہوا۔ اس نوجوان کی وفات کے چند ہی دنوں بعد یتیم عبداللہ کے پیدا ہونے کی خوش خبری اہل مکہ نے سنی اور تقریباً ہر شخص کی زبان پر یہ ترانہ تھا۔

بارك فيك اللّٰه من غلام
يا ابن الذى من حومة الحمام
نجا بعون الملك العلام

فردی غداة الضرب بالسهام
بمائة من اهل سوام

"تو نہایت ہی مبارک لڑکا ہے' اے اس شخص کے بیٹے' جو موت کے مُنہ سے خداوند قدوس کی اعانت سے بچ گیا تھا۔ قرعہ کے روز اس کے فدیہ میں سو اونٹ قربان کیے گئے۔"

یہ فرزند عبداللہ اپنی صورت شکل سے بعینہٖ وہ شخص تھا' جس کا حُلیہ سنا کر حضرت سلیمان نے فرمایا تھا:

ہُلّو محمدیم زہ دودی
و زہ روعی بنوت یروشلیم

"وہ سراپا ستودہ ہے' یہ ہے میرا محبوب' اور یہ ہے میری جان' اے یروشلم کی بیٹیو!"

اس بشارت کو نہ جانتے ہوئے اتفاق سے ماں اور دادا دونوں نے اس مولود مسعود کا نام محمد رکھا۔ دادا نے صورت دیکھتے ہی خوش ہو کر پیش گوئی کر دی کہ اِنّ لابنی هذا لشاناً (میرا یہ بیٹا ایک شاندار ہستی ہوگا۔)

عرب کے شرفاء کے دستور کے مطابق آپ ﷺ کو اپنی ماں کا دودھ تو نصیب ہی نہ ہوا یا محض چند یوم۔ سب سے پہلے آپ ﷺ کو آپ ﷺ کے سب سے بڑے چچا ابولہب کی لونڈی ثوبیہ نے دودھ پلایا' جسے اس خوشی میں ابولہب نے آزاد بھی کر دیا۔ پھر آپ ﷺ کو بنو سعد بن بکر کی ایک خاتون حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے حوالہ کیا گیا' وہ آپ ﷺ کو لے کر اپنی وادی میں چلی گئیں۔ یتیم عبداللہ کی فطرت میں خدا نے عدل رکھ دیا تھا۔ حضرت حلیمہؓ کو نہایت حیرت تھی کہ عجیب بچہ ہے۔ آپ ﷺ نے کبھی دونوں چھاتیوں کو منہ نہ لگایا۔ ایک چھاتی ہمیشہ اپنے دودھ شریک بھائی کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ حضرت حلیمہؓ سے مروی ہے کہ دودھ چھڑانے کے بعد آپ ﷺ نے جب بامعنی جملے بولنے شروع کیے' تو سب سے پہلے جو بول آپ ﷺ کی زبان سے نکلے' وہ یہ تھے:

"الله اكبر كبيرا. والحمدلله كثيرا. سبحان الله بكرة واصيلا."

نہایت حیرت کی بات یہ تھی کہ ایامِ جاہلیت میں یہ فقرے کسی کی زبان سے نہیں نکلے تھے۔ سب سے پہلے یتیم عبداللہ کی زبان سے یہ کلمے ادا ہوئے۔ ان کلموں کو ادا کرتے وقت آپ ﷺ کی عمر صرف دو یا ڈھائی سال تھی۔ دودھ چھڑانے کے بعد حضرت حلیمہؓ آپ ﷺ کو آپ کی والدہ کے پاس لے گئیں مگر مکہ کی آب و ہوا ان دنوں خراب تھی' اس لیے حضرت آمنہؓ نے آپ ﷺ کو حضرت حلیمہؓ کے ساتھ دوبارہ واپس کر دیا۔ حضرت حلیمہؓ کو دودھ پلانے اور آپ ﷺ کی پرورش کی اجرت دی جاتی تھی۔ اس لیے آپ ﷺ سے حضرت حلیمہؓ کوئی کام نہ لے سکتی تھیں۔ لیکن تین سال کے بچے کی غیرت قابل توجہ ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت حلیمہؓ کو مجبور کر کے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے بھائی اور بہن تو دن بھر بکریاں چراتے پھریں اور میں ان کی محنت میں شریک نہ ہوں۔ مجبوراً آپ ﷺ کو بکریاں چرانے کی اجازت دی گئی۔ آپ ﷺ کا بکریوں کے ساتھ چراگاہوں میں جانے کا سلسلہ شروع ہوتے ہی حلیمہؓ کی بکریوں کی تعداد روز افزوں ہوتی گئی۔ دودھ دینے والی بکریاں زیادہ دودھ دینے لگیں' بکرے تروتازہ ہونے لگے۔ چراگاہ کی ہریالی بھی قدرتاً بڑھنے لگی اور بنو سعد خوش ہو گئے:

لقد بلغت بالهاشمي حليمة
مقاماً علا في ذروة العز والمجد
وزادت مواشيها واخصب ربعها
فقد عم هذا السعد كل بني سعد

"اس ہاشمی کی برکت سے حلیمہؓ نے عزت و شرف کا اونچا مقام پالیا۔ اس کے مویشی زیادہ ہوئے' اس کا گھر سدھر گیا اور یہ خوش بختی تمام بنی سعد کو عطا ہوئی۔"

عمر شریف جب چھ برس کی ہوئی' تو حضرت آمنہؓ نے اپنے پاس بلایا اور آپ ﷺ کو اپنے ساتھ لے کر مرحوم شوہر کی قبر دیکھنے کے لیے مدینہ گئیں۔ ان کے ساتھ آپ ﷺ کی خادمہ امّ ایمن بھی تھیں۔ محلّہ بنی نجار میں جہاں حضرت عبداللہ کی قبر تھی' ایک ماہ قیام کیا۔ واپسی میں بمقام ابواء ماں نے بھی داغِ مفارقت دے دیا' وہیں مدفون ہوئیں۔ حضرت امّ ایمن آپ ﷺ کو مکہ میں واپس لائیں۔ حضرت عبدالمطلبؓ جو آپ ﷺ کے دادا تھے' اب ماں کے فرائض بھی انجام دینے لگے۔

عمر شریف سات برس کی ہوئی' تو آپ ﷺ کو آشوبِ چشم ہو گیا۔ عکاظ کے پاس ایک راہب رہتا تھا' علاجِ چشم کے لیے مشہور تھا۔ حضرت عبدالمطلبؓ آپ ﷺ کو اس راہب کے پاس لے گئے۔ راہب نے دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ لڑکا تو ہو بہو وہی ہے جسے حضرت سلیمانؑ ہُلّو محمدیم کا لقب دے چکے تھے' اس نے حضرت عبدالمطلبؓ سے کہا کہ اس بچے کا خاص خیال رکھنا کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ خدا نے اسے ایک عظیم الشان کام کے لیے جنم دیا ہے' جو کام سابق انبیا انجام دیتے تھے۔

48 ق ھ میں جب آپ ﷺ کی عمر شریف آٹھ برس تھی' آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلبؓ نے بھی وفات پائی اور آپ ﷺ کی پرورش کا بار حضرت ابوطالب کو اٹھانا پڑا۔ حضرت ابوطالب تمام بنو عبدالمطلب میں سب سے کم آمدنی اور زیادہ خرچ والے تھے۔ اگرچہ وہ آپ ﷺ کو اپنی اولاد سے زیادہ چاہتے تھے اور آپ سے کوئی مشکل کام نہ لینا چاہتے تھے مگر آٹھ سال کے بچے کی ہمت قابل داد ہے۔ آپ ﷺ نے غریب چچا پر اپنا پورا بار ڈالنا پسند نہ کیا۔ چچا سے باصرار اجازت لے کر رؤسائے قریش کی بکریاں اُجرت پر چرانا شروع کیں۔ ہر بکری کی چرائی آپ کو ایک قیراط چاندی ملا کرتی تھی مگر نہیں معلوم کہ یہ قیراط ماہوار ملتی تھی یا سالانہ۔ اس طرح آپ ﷺ آٹھ برس کی عمر ہی سے چچا کے مالی بوجھ کو ہلکا کرنے میں شریک تھے۔

43 ق ھ میں آپ ﷺ کو ایک عجیب صورت حال کا احساس ہوا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے ایک روز حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا چیز آپ نے سب سے پہلے دیکھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری عمر دس سال اور چند ماہ کی تھی اور میں ایک صحرا

میں تھا' دو شخص نظر آئے' ان کے جیسے چہرے اور ان کا جیسا لباس میں نے کبھی نہ دیکھا' ان کے بدن سے جیسی خوشبو پھیلتی تھی اس قسم کی خوشبو میں نے کبھی نہ سونگھی تھی' ایک نے دوسرے سے کہا کیا یہ شخص وہی ہے۔ پھر دونوں نے میرے پاس آ کر میرے بازوؤں کو پکڑا مگر ان کی گرفت مَس میں نے محسوس نہ کیا۔ پھر انھوں نے مجھے لٹایا' مگر میں نے لٹانے کا دباؤ محسوس نہ کیا۔ پھر ایک نے کہا کہ اس کا سینہ چاک کرو' دوسرے نے سینہ چاک کیا' لیکن مجھے چیرنے پھاڑنے کا درد محسوس نہ ہوا اور نہ خون نکلا' پھر اس نے کہا کہ اس کے اندر سے غل وحسد یعنی کینہ اور ڈر نکال دو۔ اس نے جمے ہوئے لہو کا سا ایک لوتھ نکال کر پھینک دیا۔ پھر پہلے نے کہا کہ اس کی جگہ رافت ورحمت رکھ دو۔ اس نے چاندی جیسی ایک چیز اندر رکھ دی۔ پھر دونوں نے میرے پاؤں کے انگوٹھے کو جھٹکا دیا اور کہا کہ اٹھ کر دوڑو۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ اس کے بعد میں اپنے دل میں چھوٹے پر ترس اور بڑے پر رحم محسوس کرنے لگا۔ یہ تھا آپ ﷺ کا سب سے پہلا احساس' جسے بعد میں آپ ﷺ کے امر نبوت کا پہلا شعور قرار دیا' لیکن ابھی تک آپ کو اس کا وہم تک نہ تھا کہ میں خدا کا نبی مقرر ہونے والا ہوں۔

انھی دنوں میں ایک اور عجیب واقعہ یہ ہے کہ بوانہ نام ایک بُت کی پرستش کا دن آیا۔ قریش سال میں ایک دن رات بھر اس بُت کے گرد بیٹھ کر جاگا کرتے اور تبرک کے لیے اسے چھوتے اور قربانیاں گزارتے تھے' آپ ﷺ کی عمر اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ اب آپ ﷺ کو بھی اس مذہبی رسم میں شریک ہونا چاہیے تھا۔ ابوطالب وغیرہ نے آپ ﷺ کو ساتھ لے جانا چاہا۔ آپ ﷺ نے جانے سے انکار کیا۔ لوگ زبردستی آپ ﷺ کو ساتھ لے گئے۔ بُت کے قریب جانے ہی کو تھے کہ آپ ﷺ کی حالت غیر ہوگئی اور بیہوشی سی طاری ہوگئی۔ بعد میں آپ ﷺ نے اپنے چچاؤں کو بتایا کہ گورے رنگ کے ایک مرد طویل کو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے ڈانٹ رہا ہے اور کہتا ہے کہ محمد! دور ہی رہنا' قریب نہ آنا' اسے ہرگز نہ چھونا۔ لوگ آپ ﷺ کو اٹھا کر گھر لے آئے۔ پھر کسی نے آپ ﷺ کو ایسی رسموں میں شرکت کے لیے نہیں کہا۔

40 یا 41 ق ھ میں جب کہ عمر شریف تیرہ یا چودہ برس کی تھی' ایک قافلہ تجار قریش کا شام کو روانہ ہونے لگا۔ اس قافلے میں حضرت رسولِ خدا ﷺ کے چچا حارث بن عبدالمطلب اور حضرت ابوطالب بھی روانہ ہونے لگے۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوطالب کی اونٹنی کی مہار تھام لی اور کہا: ''چچا جان! آپ مجھے کس سہارے پر چھوڑے جاتے ہیں؟ میرا نہ تو باپ زندہ ہے نہ ماں۔'' یہ سن کر حضرت ابوطالب نے آپ ﷺ کو اپنی اونٹنی پر بٹھالیا۔ شام کی طرف روانہ ہوئے۔ بصریٰ پہنچے' وہاں ایک خانقاہ تھی جو دیرِ بحیرا کہلاتی تھی' اس میں ایک راہب رہا کرتا تھا جسے بحیرا کہا جاتا تھا۔ یہ نام نہ تھا' عبرانی لفظ بحیر کی بدلی ہوئی صورت ہے جس کے معنی وہی ہیں جو عربی میں مصطفیٰ یا مرتضیٰ کے ہیں۔ کسی بڑے عہدہ کے لیے جو منتخب کیا جاتا تھا اسے بحیر کہا جاتا تھا۔ اس راہب کا نام جرجیس تھا' وہ نسلاً عرب تھا اور بنو عبدالقیس میں سے تھا اور نصرانی مذہب کا تھا' اس کی خانقاہ کے سامنے ایک سایہ دار درخت تھا۔ قریش کا قافلہ تجارت یہاں دم لیا کرتا تھا۔ اس سال سے پہلے کبھی اس راہب نے قافلہ قریش تک آ کر ان سے بات چیت نہیں کی تھی۔ لیکن اب کی بار وہ اپنے دَیر سے نکل کر خود قافلہ میں آیا اور اہل قافلہ کو اپنی ضیافت میں شرکت کی دعوت دی۔ عربی دستور تھا کہ لوگ ضیافتوں میں کم عمر بچوں کو اپنے ساتھ نہیں لے جاتے تھے آپ ﷺ کو سامانِ قافلہ کے پاس چھوڑ کر خانقاہ میں گئے' تو جرجیس نے پوچھا' کیا سب اہلِ قافلہ آ گئے؟ لوگوں نے کہا' ہاں۔ البتہ ایک کم عمر چھوکرے کو سامان کے پاس چھوڑ دیا گیا ہے۔ جرجیس نے کہا: میں سمجھتا ہوں کہ وہ لڑکا تم ہی لوگوں میں سے ہے۔ لوگوں نے کہا بنی عبدالمطلب میں سے ایک ہے۔ تب جرجیس نے کہا: میرے لیے یہ شرم کی بات ہے کہ ایک عالی نسب لڑکا میرے دسترخوان سے الگ رہے۔ حارث بن عبدالمطلب اٹھے اور آپ کو بھی لے آئے۔ آپ ﷺ جب آئے تو اس نے بہت غور سے آپ ﷺ کو دیکھا اور بار بار دیکھا' تو قریش کہنے لگے کہ نہایت عجیب بات ہے۔ "ان لمحمد عند الراهب لقدرا" یعنی اس راہب کے دل میں محمد ﷺ کی بڑی قدر ہے۔ جب لوگ واپس جانے لگے' تو اس نے آپ ﷺ کو روک لیا۔ حضرت ابوطالب بھی رک گئے۔ راہب نے آپ ﷺ کو اور زیادہ غور سے دیکھا۔ آنکھ' کان' ناک پر غور کرنے کے بعد پشت کھولنے کے لیے کہا۔ پشت مبارک پر دونوں مونڈھوں کے درمیان ایک بڑا مسّا تھا' جسے بالوں نے چھپا رکھا تھا' جو اس مسّے کے گرد اُگے ہوئے تھے۔ اس مہر کو غور سے دیکھا۔ پھر اس مسّے کا بوسہ لے لیا۔ حضرت رسول اللہ ﷺ سے اس نے مختلف باتیں پوچھیں' خصوصاً آپ ﷺ کی نیند کا حال پوچھا۔ سوال کرتے وقت اس نے آپ ﷺ کو لات وعزیٰ کی قسم دی کہ جو پوچھوں ٹھیک ٹھیک بتانا۔ آپ ﷺ نے لات وعزیٰ کے نام سے سخت نفرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ مجھے نہ معلوم کیوں ان بتوں اور دیوتاؤں سے سخت نفرت محسوس ہوتی ہے۔ پھر اس نے حضرت ابوطالب سے پوچھا کہ اس لڑکے سے تمھارا کیا رشتہ ہے؟ حضرت ابوطالب آپ ﷺ کو برابر میرا بیٹا کہا کرتے تھے۔ آپ نے یہی جواب دیا تو جرجیس نے کہا: یہ نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ شخص وہی ہے' جو میں خیال کرتا ہوں تو اس کے باپ اور ماں میں سے کسی کو اس وقت زندہ نہ ہونا چاہیے۔ تب حضرت ابوطالب نے اپنا صحیح رشتہ بتایا اور آپ ﷺ کے حالات سنائے۔ جرجیس نے کہا: بالکل ٹھیک۔ ابو طالب میں تمھیں صلاح دیتا ہوں کہ اپنے بھتیجے کو لے کر فوراً مکہ واپس چلے جاؤ کیوں کہ تمھارے بھتیجے کو ایک بڑی شان حاصل ہونے والی ہے' اگر اسے کچھ یہود نے دیکھ لیا' اور وہ بات جان لی' جو میں جان گیا ہوں' تو اسے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

اس روایت کی بنا پر بعض یورپی قیاس باز یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن میں کتبِ سابقہ کے جس قدر مضامین اور قصے ہیں' وہ سب آپ کو اسی راہب سے معلوم ہوئے آدمی کتنا احمق ہوتا ہے۔ مخالفت پر اترتا ہے تو ایسی ایسی باتوں کو واقعہ مان لیتا ہے'

ناقابلِ تصور رہونے کے باوجود اس کی مخالفانہ ذہنیت کی بھی ہم نوائی کر سکتی ہوں۔ چند ساعت میں بحیرا نے تمام کتب سماویہ کے اسرار بارہ تیرہ برس کے ایک کم عمر چرواہے کو سکھا دیے اور اس نے سیکھ لیے۔ کس قدر ناممکن تصور ہے۔ بعض یورپ زدہ ''مسٹر'' قسم کے مدعیان عقل وزیرکی اس روایت کو اس لیے غلط بتاتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بحیرا نے صورت دیکھتے ہی یہ جان لیا ہو کہ یہ شخص آئندہ نبی مبعوث ہونے والا ہے اور یہ کیسے اس نے جان لیا کہ یہود اس لڑکے کو دیکھیں گے تو مار ہی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ آخر کیوں مار ڈالنا چاہتے تھے؟ ایسے ''عقل پرستوں'' کو معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت سلیمان نے اپنے محبوب کا حلیہ بیان کر کے اسے خلومحمدیم (سراپا محمد) کا نام دیا تھا اور فرمایا تھا کہ:

''عینی تشنه ولبی عرقول دودی .''

یعنی میرا محبوب کہے گا کہ:

''میری آنکھ سوتی ہے اور میرا دل جاگتا ہے۔''

اس جواب کو سننے کے لیے بحیرا نے آپ ﷺ سے آپ کی نیند کا حال دریافت کیا تھا۔ آپ ﷺ کی پشت مبارک پر جو ایک خاص شناخت تھی جس کا ذکر آپ ﷺ کا جسمانی حلیہ بیان کرنے والے خاتمِ نبوت کے نام سے کرتے ہیں۔ اس نے خصوصیت کے ساتھ اس پر اس لیے غور کیا کہ حضرت یشعیاہ نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ خدا اب بنی اسرائیل سے اپنا منہ چھپالے گا (یشعیاہ 7۔8) وہ تاریکی میں کھدیرے جائیں گے۔

لیکن وہ لوگ جو تاریکی میں چلتے ہیں' بڑی روشنی دیکھیں گے اور ارض صلموت کے باشندوں پر نور چمکے گا (۲:۹) ہمارے لیے ایک لڑکا تولد ہوگا ہمیں ایک بیٹا دیا جائے گا۔

''ویھی همشره عل شکمو ویقرا شموفلئ یو عصرال حبّو رابی عد شد شلوم .''

''اور نشانِ حکومت اس کے شانوں کے درمیان ہوگا۔ اس کا نام ہوگا عجیب واعظ خداوند جبار کا۔ ہدایت کا باپ' سلامتی کا شہزادہ۔'' (2:9)

اس کی سلطنت کے اقبال اور سلامتی کی حد نہ ہوگی۔ وہ تختِ داؤد کا اور اس کی مملکت کا تب سے ابد تک بندوبست کرے گا اور صداقت اور عدالت سے اسے قیام بخشے گا۔ رب الافواج کی غیرت مندی ایسا کرے گی۔ (7:9)

مشرہ اسم آلہ شرہ (شری سیادت) کا شکم مونڈھوں کے درمیان کا حصہ۔ آج کل کے مترجمین مشرہ کا ترجمہ حکومت اور شکم کا ترجمہ کاندھا کرتے ہیں۔ بحیرا نے دیکھا کہ اس کے سامنے ہو بہو حضرت سلیمان کا محبوب بیٹھا تھا جسے انھوں نے خلومحمدیم کا نام دیا تھا۔ اس لڑکے کا نام بھی محمد تھا۔ اس کے شانوں کے درمیان ہمشرہ موجود تھا۔ بحیرا کو معلوم تھا کہ آلِ داؤد میں سے وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جو یہویقیم کی نسل سے ہیں اور یرمیاہ 19:23' 30:22 و 30:37 کے مطابق نسل یہویقیم ہمیشہ کے لیے تختِ داؤد سے محروم ہو چکی ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ تختِ داؤد کا موعود وارث خداوند جبار کا عجیب واعظ' امن وسلام کا شہزادہ ابی عد یہی لڑکا ہے' جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہود اسے دیکھیں گے' تو حسد سے مجبور ہو کر اسے مار ڈالنے کی کوشش کریں گے جس طرح ان کے اسلاف کئی انبیا کو قتل کر چکے ہیں۔

روایت ہے کہ حضرت ابوطالب آپ ﷺ کو واپس لے جا چکے' تو کچھ یہود بھی اس راہ سے گزرے' بحیرا سے ملے۔ آپ ﷺ کا ذکر مذکور چھیڑا۔ انھوں نے باتوں باتوں میں اپنے ارادۂ قتل کو بھی ظاہر کیا۔ جرجیس نے انھیں سمجھایا کہ اس ارادہ سے باز آؤ کیوں کہ اگر واقعی یہ لڑکا وہی ہے' تو تم اسے قتل نہ کر سکو گے۔ اور اگر یہ وہ نہیں ہے' تو پھر قتل کی وجہ کیا ہے۔ جرجیس کے سمجھانے سے یہودیوں کا وہ طبقہ بات مان گیا اور انھوں نے آپ ﷺ کا پیچھا نہ کیا۔

38ق۔ھ میں جب کہ آپ ﷺ کی عمر 16 برس کی ہوئی' تو اب آپ نے تجارت میں حصہ لینا شروع کیا۔ 15 برس کی عمر تک آپ ﷺ بکریاں اور اونٹ اجرت پر چراتے تھے اور یہی آپ ﷺ کا ذریعہ معاش تھا۔ ۱۶ برس کی عمر میں سب سے پہلا تجارتی سفر آپ ﷺ نے اپنے چچا زبیر بن عبدالمطلب کے ہم راہ یمن کی طرف کیا۔ اس سفر میں آپ کے ساتھیوں نے بہت کامیاب تجارت کی۔ آپ ﷺ کے تجارتی مشاغل نے آپ ﷺ کو ان بہت سی خرابیوں سے واقف کرا دیا جو عربی اصول تجارت میں داخل تھیں۔ احادیث میں بیع وشرا سے متعلق جو اوامر ونواہی ملتے ہیں' ان کے پس پشت آپ ﷺ کے تاجرانہ تجربات بھی جھانکتے نظر آتے ہیں۔ اس سفر کے بعد آپ نے اور بھی سفر کیے ہوں گے مگر ان سفروں کا حال ہمیں نہیں معلوم۔ 34ق ھ جب کہ آپ کی عمر 20 برس کی تھی' حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ جن کی عمر اس وقت 18 برس کی تھی' آپ نے ملک شام کی طرف دوسری بار بغرض تجارت سفر کیا۔ اسی سفر نے حضرت ابوبکرؓ کو آپ ﷺ کا زندگی بھر کا رفیق بنا دیا۔ اب کے سفر میں یہ خاص واقعہ پیش آیا کہ آپ ﷺ ایک درخت کے نیچے بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کسی ضرورت سے آپ سے الگ ایک طرف کو جا رہے تھے' ادھر سے ایک راہب آ رہا تھا' اس نے حضرت ابوبکرؓ سے پوچھا کہ وہ صاحب جو درخت کے تلے بیٹھے ہیں' ان کا کیا نام ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب۔ راہب نے کہا: بالکل ٹھیک ہے۔ انھیں محمد ﷺ ہی ہونا چاہیے۔ غالباً اس نے بھی آپ کی صورت اور حلیہ دیکھ کر پہچان لیا تھا کہ یہ شخص حضرت سلیمان کا ''خلو محمدیم'' ہی ہو سکتا ہے۔

34ق ھ میں ایک روز حضرت رسولِ خدا ﷺ نے حضرت ابوطالب سے کہا: چچا جان! کئی راتوں سے مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ دو شخص آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''یہ تو وہی ہے مگر ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔'' حضرت ابوطالب نے آپ کو تسکین دی کہ یہ محض خواب ہے۔ پھر آپ ﷺ کو ایک شب ایسا محسوس ہوا کہ ان دونوں نے آپ ﷺ کا سینہ چیر کر قلب مبارک کو دیکھا۔ پھر کہا' یہ قلب تو بالکل پاک صاف ہے۔ حضرت ابوطالب سے اس کا بھی ذکر کیا۔ اب حضرت ابو طالب گھبرا گئے۔

آپ ﷺ کو لے کر ایک راہب کے پاس علاج کے لیے گئے۔ اس راہب نے آپ ﷺ کے قدموں کو غور سے دیکھا۔ پھر پشت کھول کر اس چیز کو غور سے دیکھا جس کا ذکر سفر یشعیاہ میں ہمشرہ کے نام سے آیا ہے۔ راہب نے کہا: عبد مناف! تمھارا فرزند اچھا خاصا ہے۔ اسے کوئی مرض نہیں۔ اسے جو شخص نظر آیا ہے' وہ کوئی شیطان نہیں ہے بلکہ دلوں کو ٹٹولنے والا فرشتہ ہے۔ جاؤ اطمینان رکھو۔ تمھارا فرزند ایک عظیم انسان ہونے والا ہے۔

28ق ھ میں حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کی خدمات مستعار لیں اور اپنا مال تجارت آپ کے حوالے کیا اور اپنے غلام میسرہ کو آپ کے ساتھ شام کی طرف روانہ کیا۔ اس سفر میں بھی آپ نے اسی درخت کے پاس قیام کیا جہاں پہلے قیام کیا تھا اور بحیرا سے ملاقات ہوئی تھی۔ اب کے بار ایک دوسرے راہب سے ملاقات ہوئی' جس کا نام نسطور تھا۔ اس نے بھی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ سے وہی باتیں دریافت کیں' جو بحیرا نے پوچھی تھیں۔ پھر وہ کہنے لگا: ''وہی' وہی قسم ہے انجیل کی۔'' پھر آپ ﷺ کو غور سے دیکھنے لگا۔ خزیمہ بن حکیم السلمیٰ کو کچھ بُرے ارادہ کا خوف ہوا اور تلوار سونت کر راہب کی طرف لپکے۔ راہب اپنے صومعہ میں بھاگ گیا اور دروازہ بند کر کے اس نے اہل قافلہ سے کہا: تم لوگ ناحق ڈر گئے۔ واللہ میں اس شخص کا دشمن نہیں ہوں بلکہ مجھے اس شخص سے بڑی محبت ہے۔ اس کی بابت جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔ اس شخص کو بہت جلد ایک بڑا رتبہ حاصل ہونے والا ہے۔ اس سفر سے واپسی کے بعد میسرہ سے آپ ﷺ کی بابت بہت سی باتیں معلوم کرنے کے بعد حضرت خدیجہؓ نے جو کہ 40 برس کی تھیں اور بیوہ تھیں' پیغام نکاح بھیجا اور حضرت ابو طالب کے مشورہ سے آپ نے حضرت خدیجہؓ کو ام المومنین ہونے کے شرف سے نوازا۔

آغازِ نبوت

شادی کے بعد جس طرح ہر شخص کی زندگی کا رخ بدل جایا کرتا ہے' اسی طرح اس واقعہ کے بعد آپ ﷺ کی زندگی نے ایک نیا موڑ بدلا۔ اب تک آپ اُجرت لے کر لوگوں کی بکریاں اور اونٹ چراتے تھے۔ پھر اونٹ لے کر مکہ کے تاجروں کا مال لے کر ادھر ادھر سفر کرتے تھے اور مال فروخت کرتے تھے۔ اب یہ کام ترک کر دیے اور حضرت خدیجہؓ کی تجارت کی نگرانی فرمانے لگے اور مستقل طور پر مکہ میں قیام کیا۔ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ آپ ﷺ کی تمام اولادیں پیدا ہوئیں۔ اب آپ کا وقت زیادہ تر خدا کی طرف توجہ اور تبتل الی اللہ میں صرف ہونے لگا۔ مکہ میں درس و تدریس کا کوئی رواج نہیں تھا۔ آپ ﷺ کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کا کوئی موقع نہیں مل سکا۔ آپ ﷺ اگرچہ جبلی طور پر ایک موحد اور ایک مومن کامل تھے' لیکن آپ کو اس کا علم نہیں تھا کہ میرا جبلی میلان ہی سچا دین ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ ''اس (قرآن) سے پہلے تجھے نہیں معلوم تھا کہ الکتاب کیا ہے اور الایمان کیا ہے۔'' (شوریٰ) ''اس سے پہلے یقیناً تمھیں خبر نہ تھی۔'' (یوسف) ذریت ابراہیم کے ہر طبقے کے لیے جن میں قریش بھی داخل ہیں' یہ بات کلمہ باقیہ کی نوعیت رکھتی تھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ اللہ کی ذات کے سوا میں تمھارے تمام معبودوں سے بیزار ہوں (زخرف) اتنی بات آپ ﷺ کو بھی معلوم تھی اور آپ ﷺ کا طبعی میلان اسی کلمہ باقیہ کی طرف تھا۔ لیکن اللہ نے اب آپ ﷺ کو جبلی طور پر ان لوگوں میں داخل کر رکھا تھا' جن کے متعلق فرمایا تھا:

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں اور شب و روز کے آگے پیچھے آنے میں' ان اصحابِ دانش کے لیے نشانیاں ہیں' جو یاد رکھتے ہیں اللہ کو' کھڑے ہیں تو کھڑے' بیٹھے ہیں تو بیٹھے' بستروں پر ہیں تو بستروں پر اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے رہتے ہیں۔'' (آل عمران 190'191)

اطمینان کی زندگی نصیب ہونے کے بعد آپ ﷺ کاروبار سے فراغت کے اوقات میں اسی طریقہ پر عمل کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو بزم و انجمن سے الگ تنہائی میں تحنث (حنث: گناہ سے بچنے بچانے) کا شوق پیدا ہو گیا اور آپ ﷺ کئی راتوں کا توشہ لے کر غارِ حرا میں چلے جایا کرتے تھے اور وہاں تحنث فرمایا کرتے تھے۔

اللہ نے کوئی شے بے مقصد پیدا نہیں کی۔ ہر مخلوق کو خدا نے ایک نہ ایک کام کے لیے پیدا کیا ہے' جسے وہی جانتا ہے۔ اسی طرح ہر انسان کا مقصودِ خلقت دوسرے انسان کے مقصودِ تخلیق سے مختلف ہوتا ہے' جسے خدا ہی جانتا ہے۔ انبیا کے طبقہ کو اس نے ہدایت خلق کے لیے پیدا کیا۔ اس عمومی مقصودِ تخلیق کے علاوہ ہر نبی کا ایک جدا مقصود ہوتا ہے جس کا علم ابتدا میں خدا ہی کو ہوتا ہے۔ مگر جو کارنامے انجام دے کر نبی چل بستا ہے' وہ کارنامے اس مقصودِ ربانی کو ظاہر کر دیتے ہیں جس کے لیے ایک خاص نبی کو خدا نے پیدا کیا اور اسے تربیت دی۔ کوئی شے جسے کسی مصرف کے لیے بنایا جاتا ہے' وہ اپنے اطوارِ تخلیق کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچ کر ہی اس قابل ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقصدِ خلقت کو انجام دے۔ ہر نبی علم الٰہی میں ازل سے نبی ہوتا ہے' لیکن فرائضِ نبوت انجام دینے کی استعداد اسے زندگی کے ایک خاص نقطۂ عروج تک پہنچ کر حاصل ہوتی ہے۔ خدا نے ہر نبی کو ایک مخصوص درجہ کے علم لدنی اور حکمت لدنیہ سے نوازا ہے' فرمایا: ﴿كُلًّا اٰتَيْنَاهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا﴾ (انبیا) ہم نے ہر ایک کو دانش اور علم عطا کیا۔ حضرت یوسفؑ کے ذکر میں فرمایا:

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (یوسف: 22)

''اور جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا' تو ہم نے اسے ایک دانش اور ایک علم دیا اور یونہی ہم محسنوں کو جزا دیتے ہیں۔''

حضرت موسیٰؑ کے تذکرے میں فرمایا:

﴿وَ لَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ اسْتَوٰۤى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّ عِلْمًا ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (القصص: 14)

''اور جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا اور قوی ہو گیا' تو ہم نے اسے ایک دانش اور ایک علم دیا اور دیگر محسنوں کو بھی ہم یونہی اجر دیا کرتے ہیں۔''

ان آیتوں میں دانش و علم سے مراد وہ دانش و علم ہے' جو غیر نبی کو بھی نیکوکاری کے انعام کے طور پر یا موجودہ زمانے کے الفاظ میں عمدہ عملی تجربات کی وجہ سے عطا ہوتا ہے۔ حضرت رسول خدا ﷺ کو بھی ان آیتوں کے بنائے ہوئے قانون الٰہی کے مطابق اپنی توانائی کے ایک خاص مرحلہ تک پہنچنے پر خدا نے لاہوتی دانش و علم سے نوازا۔ آپ ﷺ کے پاس انسان کی لکھی ہوئی کتاب تو کوئی نہ تھی' لیکن کتاب قدرت کھلی ہوئی تھی۔ آسمان و زمین کی ساخت پر خدا کو یاد رکھتے ہوئے آپ نے غور کیا اور اللہ نے آپ ﷺ کو علم و دانش سے نوازا۔ حضرت موسیٰ کو علم و دانش سے نوازنے کے ذکر کے بعد خدا نے ان کی مدین روانگی کا ذکر کیا' جہاں وہ آٹھ یا دس برس بکریاں چراتے رہے۔ حضرت رسولِ خدا ﷺ نے تین برس کی عمر سے تیرہ برس کی عمر تک بکریاں چرائیں۔ حضرت موسیٰ کو یہ کام بھرپور جوانی کے ایام میں کرنا پڑا۔ آٹھ یا دس برس بعد جب وہ مصر کو واپس ہونے لگے تو خدا نے کوہ طور پر انھیں پیغمبری سے نوازا اور ان سے کلام کرتے ہوئے ان سے فرمایا کہ تمھارے اوپر میں نے فلاں فلاں مہربانیاں کی ہیں:

﴿فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰي وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ (طٰہٰ:40)

''پھر تو کئی برس مدین والوں میں مقیم رہا' پھر تو اے موسیٰ ایک انداز پر آیا اور میں نے تجھے اپنے لیے چن لیا۔''

حضرت موسیٰ کو ایک خاص عمر تک پہنچنے پر روحانی توانائی کا وہ مرتبہ حاصل ہوا' جس کے بعد آپ بار نبوت کو اٹھانے اور اپنے مقصود تخلیق کو انجام دینے کے قابل ہوئے۔ دوشنبہ 17 رمضان 13 ق ھ کو حضور ﷺ کے روحانی قویٰ نے اس مقررہ حد کمال کو حاصل کر لیا جس کے بعد آپ ﷺ بار نبوت کو اٹھانے اور اپنے مقصود تخلیق کو انجام دینے کے قابل ہو گئے اور غارِ حرا کے اندر آپ ﷺ پر قرآن کی پہلی وحی نازل ہوئی۔ آپ ﷺ سے ''جئت علی قدرٍ یا محمد'' فرمانے کی بجائے خدا نے فرمایا:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ (القدر: 1)

''ہم نے اسے قدر کی رات میں اتارا۔''

قدر کی رات سے مراد آپ ﷺ کی زندگی کی وہ رات ہے' جس میں آپ نے بار نبوت اٹھانے کے لیے درکار توانائی اور صلاحیت کاملہ حاصل کر لی۔ اس رات کی بات کافی طویل بحث کی جا سکتی ہے' جسے ہم اس موقع پر زیر بحث لانا نہیں چاہتے۔

پہلی وحی سورۂ علق آیات 1 تا 15 ہے۔ توراۃ میں جہاں جہاں حضرت ابراہیمؑ کی نماز کا ذکر ہے' ان الفاظ میں ہے کہ ویقرا یشم یہوہ (تکوین: پرانا عہد نامہ) عربی میں اس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے ''اقرا باسم ربہ'' یعنی اس نے رب کا نام پڑھا۔ علق کی پہلی آیت اسی سنت ابراہیمؑ کے احیاء کا حکم دیتی ہے۔ خلاصہ اس سورت کا یہ ہے: اپنے رب کا نام پڑھ' نماز سے جو منع کرتا ہے' اس کا کہنا مان بلکہ اپنے رب کو سجدہ کر اور اس کا تقرب حاصل کر۔ اگرچہ علق کی باقی چودہ آیتیں بہت بعد میں اتریں مگر ربطِ آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقراء باسم ربک دراصل حکمِ نماز ہے۔

ایام وحی والہام

حضور ﷺ نے دوشنبہ 17 رمضان 13 ق ھ سے دوشنبہ 12 ربیع الاول 11ھ تک 9 یوم کم 63 برس کی عمر پائی۔ جملہ ایام حیات 22317 دن تھے' ان میں سے 14357 دن نزول قرآن سے پیشتر گزرے۔ نزول قرآن کی جملہ مدت 7950 یوم تھی۔ ان ایام میں 4417 یوم آپ ﷺ مکہ میں قیام پزیر رہے۔ روزِ ہجرت سے لے کر وفات تک جملہ تعداد ایام 3543 یوم تھی۔ اس مضمون میں ان آخری دنوں کے احوال پر ہی ہم نظر ڈالیں گے۔

بعض روایات کی بنا پر جن پر تبصرہ کرنے کا محل نہیں ہے' یہ مشہور ہے کہ علق 1 تا 5 کے بعد کچھ عرصہ وحی رکی رہی۔ پھر سورۂ مدثر کی ابتدائی آیتیں اتریں لیکن واقعہ کچھ اور ہے۔ ابتدائی آیتوں کے اترنے کے بعد آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کو غارِ حرا کا ماجرا سنایا اور تشویش ظاہر کی۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ ﷺ کو تسلی دی کہ آپ ﷺ میں فلاں فلاں اخلاقی خوبیاں ہیں۔ اس لیے خدا ہرگز آپ کو خائب و خاسر نہ کرے گا۔ پھر وہ آپ کو اپنے ابن عم حضرت ورقہ کے پاس لے گئیں' جو ایام جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے۔ عبرانی میں انجیل لکھا کرتے تھے۔ ان کے سامنے آپ نے غارِ حرا کا ماجرا سنایا کہ ایک فرشتہ سامنے کھڑا ہے۔ اس نے تین بار کہا کہ اقراء (پڑھ)۔ آپ ﷺ نے ہر بار جواب دیا کہ میں قاری نہیں ہوں۔ تینوں بار آپ ﷺ کا جواب سن کر اس نے آپ ﷺ کو چمٹایا اور زور سے معانقہ کیا۔ چوتھی بار اس نے علق 1 تا 5 پڑھ کر سنائی۔ حضرت ورقہ نے تمام حالات سن کر فرمایا کہ یہ تو وہی ناموس تھا جو حضرت موسیٰ کے پاس بھی آیا تھا اور پیش گوئی کی اور وعدہ کیا کہ ایک وقت آئے گا جب آپ ﷺ کی قوم آپ ﷺ کو جلاوطن ہونے پر مجبور کر دے گی' میں اس وقت زندہ اور قوی رہا تو آپ کی ضرور مدد کروں گا۔ حضرت ورقہ اس کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہے۔

آغازِ دعوت

ان آیتوں کے اترنے کے بعد آپ ﷺ عموماً مکہ سے نکل کر غاروں میں چلے جاتے اور وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ حضرت علی بن ابی طالب ان دنوں دس برس کے لڑکے تھے اور آپ ﷺ کے زیرِ تربیت تھے' وہ بھی آپ ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے۔ ایک روز حضرت ابو طالب نے اپنے دہ سالہ فرزند اور چہل سالہ بھتیجے کو ایک غار میں چھپ کر نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ پوچھا: یہ کیا دین ہے' جس کا میں تم دونوں کو عامل دیکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ہمارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے۔ ہم دونوں ملتِ ابراہیمؑ کے مطابق خدا کی پرستش کرتے ہیں۔ حضرت ابو طالب نے حضرت علیؓ سے کہا کہ تم اپنے ابنِ عم کی روش پر ہو' اچھی بات ہے۔ مجھے امید ہے کہ تمھارا ابن عم تمھیں خیر ہی کی تعلیم دے گا۔ اس کے بعد بتدریج مکہ والوں کو علم ہو گیا کہ

محمد بن عبداللہ بھی جنھیں کسی نے آج تک دیوتا کو پوجتے نہیں دیکھا' غاروں میں چھپ چھپ کر ایک نادیدہ خدا کو پوجتے ہیں۔ جب تک لوگ آپ ﷺ کو محض صابی (بے دین) باور کرتے تھے۔ کسی نے آپ کو دین اشیاع پر عمل کی طرف دعوت نہ دی۔ لیکن یہ معلوم کر لینے کے بعد محمد بن عبداللہ بھی ایک معبود کے پرستار ہیں تو لوگ آپ ﷺ کو اپنے دیوتاؤں کی طرف بلانے لگے۔ اسی سلسلے میں سورۂ کافرون اور بعض دیگر سورتوں کی آیتیں' جو سورۂ کافرون کی ہم مضمون ہیں' نازل ہوئیں۔ سورۂ کافرون میں خدا نے فرمایا:

﴿وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ﴾

"یعنی اور نہ تم پوجو گے اسے جسے میں پوجتا ہوں۔"

مشرکین کے لیے یہ نہایت حیرت کی بات تھی کہ وہ کون دیوتا ہو سکتا ہے' جسے پوجنے سے ہم انکار کر سکتے ہیں۔ انھوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ نسب لنا ربك۔ یعنی ہمیں اپنے رب کا نسب سناؤ۔ خدا نے حکم نازل فرمایا:

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۝ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ (الاخلاص)

"جواب دے کہ وہ اللہ ہے اکیلا ہے' اللہ حاجت روا ہے حاجت ہے' نہ کسی کا باپ ہے' نہ بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کی برابری والا ہے۔"

اس مختصر سی سورۃ میں عزیر پرستوں' مسیح پرستوں' ملائک پرستوں' جنات پرستوں' اولیاء پرستوں' کواکب پرستوں' غرض دنیا کے تمام مذاہب کو حرفِ باطل قرار دے دیا۔ شیخ سعدی نے غالباً اسی سورۂ کی وجہ سے کہا تھا:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست
کتب خانۂ چند ملت بشست

یعنی ایک یتیم نے' جو ابھی قرآن ختم نہ کر چکا تھا' کئی ملتوں کے کتب خانے بے کار اور ناخواندنی بنا کر رکھ دیے۔

پہلا مسلمان

اب کفار نے طرح طرح کی باتیں کرنی شروع کیں اور ان کے جواب میں آیتیں اترنے لگیں۔ ان مباحث کے دوران میں بتدریج کئی صالح افراد نے حضرت رسول خدا ﷺ کے مسلک کو قبول کر لیا۔ اہل علم کے درمیان بحثیں ہیں کہ سب سے پہلے کون مسلمان ہوا۔ حضرت علیؓ کو ناز تھا کہ حضرت رسول خدا ﷺ کے بعد پہلا مسلمان میں ہوں۔ ان کا ناز غلط نہ تھا' لیکن چوں کہ وہ بچے تھے' اہل مکہ نے ان کے اسلام کو کوئی اہمیت نہ دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے واقعی حضرت علیؓ اور زید بن حارثہ کے بعد اسلام قبول کیا۔ لیکن خود عہد صحابہ میں انھی کو "اول الناس صدق الرسلا" کہا جاتا تھا' یعنی پہلا شخص جس نے رسولوں کی تصدیق کی۔ پہلے مرد مسلم جنھوں نے علانیہ دلیری کے ساتھ اپنے اسلام کا اعلان کیا' حضرت ابوبکرؓ ہی تھے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے روزِ اوّل ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے دل نے چپکے سے پہلی ہی وحی سن کر آپ ﷺ کی تصدیق کر دی ہو لیکن اس تصدیق کو زبان سے ظاہر کرنے میں انھوں نے بھی کچھ دنوں تامل سے کام لیا۔ سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ کے مضمون سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی جدوجہد ایک زمانہ تک بظاہر ناکام ثابت ہو رہی تھی اور حضور ﷺ کو اس کا دکھ تھا۔ سورۂ اعلیٰ میں خدا نے حضور ﷺ کو تسلی دی اور فرمایا:

﴿فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝﴾ (الاعلیٰ: 9تا10)

"سو تو سمجھاتا رہ سمجھانے سے ضرور فائدہ ہوگا۔ جو خدا ترس ہے وہ ضرور سمجھے گا۔"

اس آیت کے نزول کے بعد سب سے پہلے جس شخص نے پیغمبر ﷺ کے دین و مسلک کو قبول کرنے کا اعلان کیا' وہ حضرت ابوبکرؓ تھے۔ دل سے تو کئی افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ مگر اقرار اسلام میں متامل تھے اور عذر پیش کرتے تھے کہ:

﴿اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ مِنْ اَرْضِنَا﴾ (القصص)

"اگر آپ کے ساتھ جو ہدایت ہے' اس کا ہم اتباع کر لیں' تو ہمیں ہماری زمین سے اچک لیا جائے گا۔"

حضرت ابوبکرؓ بھی دل سے قبول اسلام کے بعد کچھ دنوں متامل رہے۔ یہاں تک کہ وہ چالیس برس کے ہو گئے۔ حضرت ابوبکرؓ 51ق ھ میں پیدا ہوئے۔ 11ق میں چالیس برس کے ہوئے' تو انھوں نے علانیہ اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ ان کے اسلام کی داستان روایتوں کی سند سے پیش کرنے کے بجائے قرآن مجید کی ایک آیت پیش کرنا مناسب ہے' جس میں خدا نے فرمایا ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ۝ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (لقمان: 14تا15)

"اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے ساتھ احسان کا حکم دیا ہے (کیوں کہ) اس کی ماں دکھ کے ساتھ اسے پیٹ میں لیے رہی اور اس نے دکھ کے ساتھ اسے جنا اور اس کے حمل کی اور دودھ چھڑانے کی مدت تیس ماہ تھی۔ پھر جب وہ اپنی توانائی کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا تو اس نے دعا کی کہ میرے پروردگار! مجھے توفیق و تربی[illegible] دے کہ میں تیرے اس احسان کا شکر بجا لاؤں' جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں اور باپ پر کیا ہے اور یہ کہ میں کوئی بھلا کام کروں' جس سے تو راضی ہو جائے اور میری خاطر اولاد کو سدھار دے۔ میں نے تیری طرف توجہ کی اور میں مسلمانوں میں سے ایک ہوں۔"

اس آیت میں صریحاً ایک ایسے انسان کا ذکر ہے جس نے چالیس برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے سوا شرکائے بدر میں کوئی ایسا نہ تھا جس کی عمر ابتدا

بلیغ میں چالیس برس کی رہی ہو۔ ان کی دعا کا حضرت سلیمان کی دعا سے مقابلہ جو نمل 19 میں ہے۔ "ربّ اوزعنی" سے لے کر "ترضٰہ" کے الفاظ بالکل ہیں۔ "واصلح" سے "المسلمین" تک کے بجائے حضرت سلیمانؑ نے "خلنی برحمتك فی عبادك الصالحین" کہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی اور اپنے اسلام کا اظہار کرنے کے بعد اپنی اولاد کے لیے دُعا کی تھی کہ انھیں صالح ے۔ والدین ان کے صالح تھے، دل سے اسلام قبول کر چکے تھے البتہ ابھی علانیہ کیا تھا۔ اولاد نے ابھی تک اسلام نہیں قبول کیا تھا۔ لیکن خدا نے آپ کی دعا قبول۔ چنانچہ یہی ایک گھرانہ تھا، جس کے تمام افراد نے اسلام قبول کیا۔ حضرت سلیمانؑ خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے کوئی نیک کام کرنے کی توفیق دے جس سے تو راضی ہو ئے، تو اللہ نے انھیں ملکہ سبا کو مسلمان بنا لینے کی توفیق دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے بھی دعا کی اور اللہ نے آپ کو بھی یہ توفیق دی کہ آپ نے کئی افراد کو زمرۂ مسلمین میں ل کیا۔

سابقین اوّلین

خود حضرت رسول خدا ﷺ کے براہِ راست سمجھانے سے حضرت خدیجہؓ رت علیؑ حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت ابوبکرؓ مسلمان ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان اسلام کے بعد حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت عثمانؓ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، رت سعدؓ بن ابی وقاص، حضرت طلحہؓ کو مسلمان کیا۔ پھر ان لوگوں کے اسلام کے بعد رت عثمان بن مظعون، حضرت ابوعبیدہؓ حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد اور حضرت ارقمؓ بن ابی الارقم مسلمان ہوئے۔ انھیں ایام میں حضرت بلالؓ حضرت خبابؓ رت صہیبؓ حضرت عمارؓ ان کی ماں سُمیہؓ اور ان کے باپ یاسر مسلمان ہوگئے۔ یک عرصہ تک قریش کو صرف حضرت ابوبکرؓ کے اسلام کی خبر تھی دیگر اصحاب نے اپنے سلام کو مخفی رکھا اور غالباً رسول اللہ ﷺ کے ایماء سے ایسا کیا۔ رفتہ رفتہ قریش کو اس کا پتا چل گیا کہ کئی اشخاص مسلمان ہوگئے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بعد سب سے پہلے حضرت بلالؓ حضرت خبابؓ حضرت صہیبؓ حضرت عمارؓ حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیہؓ نے دلیری دکھائی اور علانیہ اسلام کو قبول کیا۔ اب کفار کو فکر لاحق ہوئی کہ اس نئے مذہب کو کسی نہ کسی طرح دبا دینا ضروری ہے۔ ابتدا میں محض استہزاء اور مذاق کے زور سے تحریکِ اسلامی کو مٹا دینا چاہا تھا کہ وہ:

﴿كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۝ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝﴾ (المطففین: 29 تا 32)

"مومنوں پر ہنستے تھے، ان کے پاس سے گزرتے تھے تو آنکھیں مارتے تھے۔ اپنے اہل وعیال کے پاس لوٹتے تو گپیں مارتے لوٹتے تھے اور جب انھیں دیکھتے تھے کہتے کہ یہ گمراہ لوگ ہیں۔"

لیکن زیادہ دن نہیں گزر پائے تھے کہ:

﴿فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ﴾ (البروج)

"مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستانے لگے۔"

مسلمانوں کو قبول اسلام کی وجہ سے جو مصیبتیں اٹھانی پڑیں، ان کی تفصیل کے لیے یہ مضمون کافی نہیں ہے۔ بس اتنا سمجھئے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنا معمولی قسم کے دلیر کا کام نہ تھا۔ یہ کلمہ وہی شخص زبان سے ادا کر سکتا تھا، جسے ماں سے، باپ سے، بھائی سے، بیٹے سے، بی بی سے، پورے قبیلے سے کٹ جانے کی جرأت ہوتی۔ مال ومتاع سے محروم ہونے کی ہمت ہوتی۔ موت قبول کرنا عرب کے لیے کوئی مشکل امر نہ تھا لیکن طرح طرح کی اذیتوں، ذلتوں کو سہنے کے لیے تیار ہو کر ہی ایک شخص یہ کلمہ علانیہ زبان پر لا سکتا تھا۔

انذارِ عشیرہ

حضرت رسولِ خدا ﷺ کی جدّ وجہد سے بہتیرے افراد نے اسلام قبول کرلیا۔ آپ کا اپنا گھرانا تقریباً چالیس افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں سے ایک حضرت علیؑ کے سوا جنھیں بچے ہونے کی وجہ سے قریش کوئی اہمیت نہ دیتے تھے، اب تک کسی نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اس کا آپ کو بے حد رنج تھا۔ 10 ق ھ میں سورۂ شعراء نازل ہوئی، جس کی ابتدا میں خدا نے فرمایا:

﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (الشعراء: 3)

"شاید تو اس غم میں اپنا گلا گھونٹ لے گا کہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے۔"

اس سورۃ میں آپ کو تسلی دینے اور غیر مسلموں کی بعض باتوں کے جواب دینے کے بعد خدا نے فرمایا:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾

(الشعراء: 214 تا 216)

"اور اپنے نہایت قریبی خاندان والوں کو خبردار کر اور مومنوں میں سے جو تیرا تابعدار ہو جائے، اس کے لیے اپنے بازو جھکا دے۔ لیکن اگر وہ نہ مانیں، تو بس اتنا کہہ دے کہ میں تمھارے اعمال سے بیزار ہوں۔"

ان آیتوں کے نزول کے بعد آپ نے پہلے حضرت عبدالمطلب کی تمام اولاد کو اپنے گھر میں دعوت دی اور انھیں سمجھایا مگر ایک حضرت علیؑ کے سوا کسی نے اسلام اس وقت قبول نہ کیا۔ لیکن اس مجلس میں جتنے شریک تھے، ان میں سے ابولہب، عتیبہ بن ابی لہب اور طالب بن ابی طالب کے علاوہ ہر شخص کو خدا نے کلمۂ اسلام قبول کرنے کی ایک نہ ایک وقت توفیق دی۔ حضرت ابوطالب کی بابت اختلاف ہے کہ انھوں نے اسلام کے کلمہ پر وفات پائی یا کلمۂ کفر پر۔ اگرچہ زیادہ مستند روایتیں ان کے اسلام قبول نہ کرنے کی شاہد ہیں۔ مگر میرا میلانِ طبعی شیعی روایتوں کی صحت کی طرف ہے۔ آلِ رسول ﷺ کی طرف جتنی روایتیں منسوب ہیں، وہ اسی بات کی تصدیق کرتی ہیں۔ حضرت ابوطالب نے حضور ﷺ کی پرورش آپ کی نو برس کی عمر سے کی۔

آپ کی عمر جب 50 برس کی ہوئی' اس وقت تک برابر آپ کے لیے سینہ سپر تھے۔ حضرت علیؑ کو اسلام پر قائم رہنے کی وصیت انھوں نے کی تھی۔ آپ کے ساتھ انھیں بے حد محبت تھی۔ اپنے ایمان کو مصلحتاً عوام سے وہ چھپاتے رہے ہوں' تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ جن روایتوں سے ان کا کفر ثابت ہوتا ہے' ان کی تاویل ہم کر سکتے ہیں کہ مومن آل فرعون کی طرح وہ اپنا ایمان چھپاتے تھے۔ بہرصورت چار افراد خاندان کے علاوہ' جن میں عبدالمطلب کے بیٹے' پوتے' پوتی' بیٹی' نواسا' نواسی وغیرہ 36 افراد خاندان کو خدا نے اسلام کی توفیق دی ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت جعفر بن ابی طالب کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو اس مجلس میں تو نہیں تھے مگر اس کے بعد چند ہی دن گزرے تھے کہ مسلمان ہو گئے۔

اس مجلس کے چند ہی دن گزرے تھے کہ آپ نے کوہ صفا پر چڑھ کر قریش کے ایک ایک فرد کو آواز دے کر بلایا۔ ہر خاندان سے لوگ آ گئے۔ آپ نے پوچھا کہ بتاؤ اگر میں تمھیں خبر دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک فوج آ رہی ہے' جو تم پر حملہ کرنے والی ہے تو کیا تم لوگ یقین کرو گے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ ضرور یقین کریں گے' کیوں کہ تمھاری کوئی بات ہمارے علم میں آج تک جھوٹی نہیں ثابت ہوئی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تب میں تمھیں ایک عذاب شدید سے آگاہ کرتا ہوں اور آپ نے عذابِ آخرت کی تشریح کی۔ ابولہب نے کہا: تبا لك الهذا دعوتنا یعنی برا ہو تیرا کیا تو نے ہمیں اسی لیے بلایا ہے۔ پھر وہ سب کو ساتھ لے کر چل دیا۔ اس واقعہ کے بعد سے کفار نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اپنی ظالمانہ کارروائیوں کی انتہا کر دی۔ بہتیرے مسلمانوں کے لیے ایمان کو سلامت رکھتے ہوئے اپنے گھروں میں رہنا ناممکن ہو گیا۔

رجب 9 ق ھ میں آپ نے اجازت دی اور حضرت عثمانؓ بن مظعون کی قیادت میں گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا ایک قافلہ حبش روانہ کیا۔ قریش نے اس قافلے کا پیچھا کیا کہ سب کو گرفتار کرلائیں۔ لیکن ساحل پر پہنچنے کے ساتھ مسلمانوں کو ایک جہاز مل گیا اور پیچھا کرنے والوں کے ساحل تک پہنچنے سے پہلے یہ لوگ حبش کو روانہ ہو چکے تھے۔ شعبان یا رمضان میں سورۂ نجم نازل ہوئی جس کے اندر واقعۂ معراج کا ذکر ہے۔ یہ سورۂ مجمع عام میں پوری سنائی گئی۔ آخری آیت سن کر مسلمانوں کے جس قدر افراد مکہ میں رہ گئے تھے انھوں نے سجدہ کیا۔ ان کے ساتھ ایک کافر کے علاوہ دوسرے تمام کفار نے بھی سجدہ کیا۔ قصہ طویل ہے۔ یہ مضمون تطویل کا متحمل نہیں کیوں کہ باوجود اختصار طویل ہوتا جا رہا ہے۔ اس واقعہ کی خبر حبش میں سارے اہل مکہ کے مسلمان ہو جانے کی نوید بن کر پہنچی۔ شوال 9 ق ھ میں مہاجرین حبش واپس آ گئے۔ مگر یہاں آنے پر معلوم ہوا کہ مکہ کی سرزمین مسلمانوں کے لیے پہلے سے زیادہ انگارا بنی ہوئی تھی۔ اس لیے 9 ق ھ کے خاتمہ سے پہلے ہی دوبارہ ان لوگوں کو حبش جانا پڑا۔ اب کی بار چالیس سے کچھ کم مردوں اور گیارہ عورتوں کا قافلہ حبش کو روانہ ہو گیا۔ جہاں کچھ لوگ 1ھ تک اور کچھ 6ھ تک مقیم رہے۔ اب کی بار قافلۂ مہاجرین کے سردار حضرت علیؑ

کے بڑے بھائی حضرت جعفرؓ بن ابی طالب تھے۔ ان لوگوں کے حبش پہنچتے ہی عبد[اللہ] بن ابی زمعہ اور عمرو بن عاص کی قیادت میں قریش کا ایک وفد دربار نجاشی میں حاضر [ہوا] اور درخواست کی کہ ہمارے کچھ مجرمین آپ کے ملک میں بھاگ آئے ہیں ان[ھیں] گرفتار کر کے ہمارے حوالے کیا جائے۔ نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر ان سے ان کا [حال] پوچھا' تو حضرت جعفرؓ نے ایک نہایت بلیغ تقریر کی۔ ایام جاہلیت کے احوال بیان کیے۔ پھر حضرت رسول خدا ﷺ کا حال بیان کیا۔ آپ کی تعلیمات کا خلاصہ [بتایا] اور کہا کہ ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے خدا کو واحد بے شریک مان لیا۔ اس رسول ﷺ پر ایمان لائے۔ جن خبیث کاموں کے ہم عادی تھے' ان سے توبہ [کی]۔ ہماری قوم چاہتی ہے کہ ہم پھر اسی خبیث مسلک پر لوٹ جائیں جس کے ہم [عادی] تھے۔ اس لیے انھوں نے ہمیں ستایا' دکھ دیا' مجبور کیا اور اپنے نئے مسلک پر قائم [رہتے] ہوئے اپنے گھروں میں رہنا ہمارے لیے ناممکن ہو گیا' تو ہمارے نبی ﷺ نے [ہمیں آپ] کے سایۂ عاطفت میں پناہ لینے کا حکم دیا۔ نجاشی نے قریش کے وفد سے پوچھا کہ [اس] کے علاوہ ان کا کوئی اور جرم بھی ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ پھر پوچھا [کہ ان] میں سے کوئی غلام تو نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ تب اس نے قریش سے کہا [کہ جب] یہ آزاد ہیں' تو پھر آزاد ہیں' میں انھیں تمھارے حوالہ نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں سے [کہا] اذھبو افانتم الطلقاء (جاؤ تم لوگ آزاد ہو) قریش نے کہا کہ یہ لوگ حضرت [عیسیٰ] کے حق میں جو مانتے ہیں' وہ بھی تو ان سے پوچھیے؟ نجاشی نے حضرت جعفرؓ سے کہا اچھا بتاؤ کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق تمھارا کیا عقیدہ ہے؟ حضرت جعفر طیارؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی 40 آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ نجاشی اور اس کے دربار کے کئی آدمیوں [کا] یہ حال تھا کہ ان کے آنسوؤں سے ان کی ڈاڑھیاں تر بتر ہو رہی تھیں۔ اسی واقعہ کی طرف سورۂ قصص میں خدا نے یہ فرما کر اشارہ کیا ہے:

﴿الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖٓ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَآ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِيْنَ﴾

(القصص 5[2])

"جن لوگوں کو اس کے قبل سے ہم نے کتاب (کی سمجھ) دی ہے' وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جب وہ کتاب انھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمارے رب کی جانب سے سچی بات یہی ہے۔ ہم تو اس کے قبل سے مسلمان ہیں۔"

نجاشی کا نام اصحمہ تھا۔ رجب 9ھ میں اس نے وفات پائی۔ عین بروز وفات خدا نے حضرت رسول خدا ﷺ کو اور آپ نے مسلمانان مدینہ کو نجاشی کے جاں بحق ہونے کی خبر دی۔ آپ نے میدان میں نکل کر اپنے صحابہ کے ساتھ اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔ تاریخ اسلام میں پہلی غائبانہ نماز جنازہ یہی تھی۔ اس نماز جنازہ میں جو لوگ شریک تھے' ان میں حسب ذیل اصحاب کے نام معلوم ہیں:

حضرت ابوہریرہؓ، حضرت بریدہؓ، حضرت زیدؓ بن ثابت' حضرت عامرؓ بن ربیعہ

ت ابوقتادہؓ، حضرت سہیلؓ بن حنیف، حضرت عبادہؓ بن صامت اس باب میں ایک ت یہ بھی ہے کہ جب آپ ﷺ نے نجاشی کے مرنے کی خبر دی تو بہتوں کو ایسا س ہوا کہ اللہ نے پردہ اٹھا دیا۔ مدینہ میں بیٹھے ہوئے لوگ تخت حبش پر نجاشی کو بیٹھا ہے تھے۔ یہ کوئی معجزہ نہ تھا۔ 5ھ نبوت کا منظر لوگوں کی آنکھوں میں 18 برس بعد ہو گیا تھا۔

وفد قریش حبش سے ناکام واپس آیا۔ قریش کا قہر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ڑک گیا۔ لوگوں نے کہا کہ یہ تو غضب ہو گیا۔ نجاشی تک محمد ﷺ کا مرید ہو گیا ۔ اب اسلام سے نجات کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پیغمبر کو ہی قتل کر ائے لیکن بنو عبد مناف سے خطرہ تھا کہ وہ ثار (خون کے بدلے خون) کا مطالبہ یں گے۔ بنو عبد مناف کے گھرانے چار تھے۔ ۱۔ بنو ہاشم ۲۔ بنو مطلب ۳۔ بنو اُمیہ بنو نوفل۔ قریش نے ان چاروں گھروں سے کہا، یا تو محمد ﷺ کو قتل ہونے کے لیے ے حوالے کر دو، یا ہم سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بنو امیہ اور بنو نوفل نے عام ں قریش کی حمایت اور دوستی کو ترجیح دی مگر بنو ہاشم اور بنو مطلب میں سے ایک ہب کے علاوہ ہر شخص نے اعلان کر دیا:

"و اللہ نسلمہ لقوم ولمّا نقض فیھم بالسیوف۔"

"ہم ہے خدا کی تلواروں سے فیصلہ کیے بغیر اسے ہم کسی قوم کے حوالے نہ کریں گے۔"

اب طے پایا کہ کوئی ایک شخص قتل کی ذمہ داری تنہا اپنے اوپر اٹھا لے تاکہ ایک ن کا بدلہ ایک ہی خون ہو۔ اس کام کی ذمہ داری عقبہ بن ابی معیط نے اٹھائی۔ ایک ن اس نے آپ کو تنہا دیکھ لیا، اپنی چادر کو رسّی جیسا بنایا اور پھانسی کا پھندا بنا کر پ ﷺ کے گلے میں ڈال دیا اور پھندے کو کسنے لگا۔ اتفاق سے حضرت ابوبکرؓ گئے، لپک کر عقبہ بن ابی معیط کو دھکا دیا، وہ گر پڑا اور آپ ﷺ کی گردن سے ھندا نکال دیا۔ کچھ مسلمان اور پہنچ گئے اور آپ ﷺ کو ارقم بن ابی ارقم کے گھر لے کر چل دیے۔ عقبہ بن ابی معیط کے طرف داروں نے اب حضرت ابوبکرؓ کو مارنا شروع کیا یہاں تک کہ آپ بیہوش ہو کر گر گئے۔ آپ کے خاندان بنو تیم کو خبر ہوگئی، وہ آئے اور آپ کو اٹھا کر آپ کے گھر پہنچا دیا۔ حالت ایسی تھی کہ سب نے یقین کر لیا کہ تھوڑی ہی دیر بعد جاں بحق ہو جائیں گے۔ لیکن بالآخر آپ کو ہوش آ گیا۔ ہوش آتے ہی آپؓ نے سب سے پہلے رسول خدا ﷺ کی خیریت دریافت کی اور اپنی والدہ کو، جو مسلمان تو تھیں مگر اعلان اسلام نہیں کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی بہن کے پاس، جو مسلمان ہو چکی تھیں، مگر ابھی کسی کو ان کے اسلام کی خبر نہ تھی، بھیج کر حضرت رسول خدا ﷺ کا خفیہ مستقر معلوم کر کے دار الارقم میں حاضر ہوئے اور آپ کے ساتھ یہیں ٹھہر گئے۔ ایک ماہ تک آنحضرت ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ اسی گھر میں روپوش رہے۔

دار الارقم

قدیم تاریخ مسلمانوں اور اسلام کی ہمیں کو بتاتی ہے کہ اسلام نے ہمیشہ مظلومی کے زمانہ میں ترقی پائی ہے۔ سچائی کو جتنا دبایا جاتا ہے، اتنی ہی ابھرتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد سے اسلام کی قوت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ جو لوگ سختی سے اسلام کی بیخ کنی میں حصہ لیتے تھے، ان کے دلوں میں بھی اسلام کو سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب آپ ﷺ دار الارقم میں داخل ہوئے تو مشکل سے آٹھ نو آدمی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ 30 یوم آپ ﷺ نے یہاں قیام کیا۔ اس مدت میں شرکائے دار الارقم کی تعداد 38 ہوگئی۔ گویا ہر روز ایک مسلمان کا اضافہ ہونے لگا۔ پہلے خود حضرت رسول خدا ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ ایک ایک مرد صالح کی تلاش میں نکلتے تھے اور جب کوئی سعید روح مل جاتی تھی تو اسے سمجھا بجھا کر مسلمان کرتے تھے۔ لوگ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی کچھ دنوں اعلان سے احتیاط برتتے تھے کیوں کہ ان دنوں لا الٰہ الا اللہ بولنا معمولی دل اور گردے والے کا کام نہ تھا۔ یہ کلمہ بولنا صرف جان کے لیے خطرناک نہ تھا بلکہ انسان کو اپنے ماں باپ، بھائی، اولاد سب سے کٹ جانا ہوتا تھا۔ خود اپنی کمائی کے مال و متاع سے بھی محروم ہو جانا پڑتا تھا۔ موروثی مال کا تو ذکر ہی کیا۔ اپنے سارے دوستوں کو دشمن بنا لینا تھا۔ اس لیے لوگ قبول اسلام کے بعد بھی اعلان سے محتاط رہتے تھے۔ مگر اس واقعہ نے ہر سعید روح کے اندر مردانہ ہمت پیدا کر دی۔ پہلے کنواں پیاسے کے پاس جاتا تھا، اب پیاسا کنوئیں کے پاس آنے لگا۔ لوگ چپکے چپکے آنحضرت کا پتا دریافت کرتے تھے اور دار ارقم میں آ کر مسلمان ہو جاتے تھے اور اسی گھر کو اپنا مسکن بنا لیتے تھے۔ اس لیے کہ حضرت رسول خدا ﷺ کے اوپر قربان ہو سکنے کے شرف کا جب موقع ملے، قربان ہو جائیں۔ دار ارقم مسلمانوں کا پہلا دار الاجتماع کوہ صفا پر تھا۔ یہ تیس دن مسلمانوں کے لیے نہایت مبارک ثابت ہوئے۔ حضرت رسول خدا ﷺ کے ساتھ ہر گھڑی بیٹھے اور دین اسلام کے نکات کو سمجھنے کا روزانہ موقع ملا۔ ڈر اور خوف نے دلوں کو خالی کر دیا۔ ایمانوں میں جرأت پیدا ہوئی۔ روزانہ لوگ حضور ﷺ سے اجازت مانگتے تھے کہ ہم کھل کر نکلیں اور دھڑلے سے تبلیغ کریں۔ لیکن حضرت رسول خدا ﷺ ان کو ابھی کچھ دنوں اور محتاط رہنے کی ہدایت دیتے تھے۔

اسلام حمزہؓ

ایک دن ایسا ہوا کہ ابوجہل نے حضرت رسول خدا ﷺ کو تنہا دیکھ لیا، آپ ﷺ کے ساتھ نہایت بدتمیزی سے پیش آیا۔ کیا باتیں کیں؟ یہ معلوم نہیں، مگر حضرت صفیہ بنت عبد المطلب کی ایک لونڈی سن رہی تھی اس نے جا کر حضرت حمزہؓ کو ساری باتیں سنائی۔ حضرت حمزہؓ جواب تک نہایت خاموشی سے دشمنانِ رسول ﷺ کی باتوں اور کارروائیوں کو برداشت کرتے تھے، یہ باتیں سن کر غصہ آ گیا۔ ابوجہل کے پاس پہنچے اور اسے بُری طرح ڈانٹا اور اسے کہا کہ اب کبھی ایسی جرأت نہ کرنا، کیوں کہ تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں بھی مسلمان ہوں۔ یہ کلام ان کی زبان سے غصہ میں نکل گیا تھا۔ پھر اپنے دل کو ٹٹولا، تو معلوم ہوا کہ وہ واقعی ان کے دل کی آواز تھی۔ اس لیے خوشی کے ساتھ دار ارقم میں آ کر کلمۂ اسلام پڑھ کر مسلمان ہو گئے اور اپنے اسلام کا اعلان حسب ذیل اشعار کی صورت میں کیا:

حمدت اللّٰہ حین ہدی فوادی
الی الاسلام والدین الحنیفی
الدین جاء من رب عزیز
خبیر بالعباد بہم لطیف
اذا تلیت رسائلہ علینا
تذرن دمع ذی اللیب الحصیف
واحمد مصطفی فینا مطاع
فلا تغشوہ بالقول العنیف

''خدا کا شکر ہے اس نے میرے دل کو ہدایت دی میں نے اسلام اور دین حنیف قبول کر لیا۔ یہ دین پروردگار تو اللہ نے بھیجا ہے جو اپنے بندوں کا خبر گیر ہے ان پر مہربان ہے جب اس کے رسالے ہمیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں استوار دانش والے کا آنسو بہنے لگتا ہے اور احمد ﷺ ہمارے درمیان برگزیدہ ہے قابل اطاعت ہے اس لیے دیکھو اسے کبھی سست نہ کہنا۔''

اسلامِ عمرؓ

حضرت حمزہؓ کے اسلام نے دارارقم کے شرکا کی تعداد 39 کر دی۔ جن غلاموں نے اسلام قبول کیا تھا چوں کہ اپنے آقاؤں کا ساتھ نہ چھوڑ سکتے تھے وہ دارارقم میں نہ تھے۔ حضرت حمزہؓ کے اسلام کے بعد قریش کو حمزہؓ ہی جیسے بہادر کی فکر ہوئی تا کہ وہ شخص حضور ﷺ کا سر کاٹ لائے۔ اس کام کے لیے حضرت عمرؓ کو تیار کیا گیا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ کسی قدر طویل اور بہت دل چسپ ہے۔ مگر مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ اسلام کی حقانیت کے وہ اب سے پہلے قائل ہو چکے تھے مگر آبائی دین کی محبت ابھی غالب تھی۔ اس لیے تلوار سونت کر وہ آپ کو قتل کرنے کے لیے نکلے۔ راہ میں انھیں خبر ہو گئی کہ ان کی بہن اور بہنوئی بھی مسلمان ہو چکے ہیں پہلے ان کا قصہ تمام کر دینا چاہا۔ بہن کے گھر پہنچے اور بہن اور بہنوئی کو مار مار کر زخمی کر دیا۔ لیکن بہن کو لہولہان دیکھ کر دل نرم پڑ گیا۔ بہن نے کہا: مار ڈالو مگر کلمہ لا الٰہ الا اللّٰہ اور محمد رسول اللّٰہ سے نہیں پھر سکتی۔ اب حضرت عمرؓ کا دل اور ہی ہو گیا بہن سے وہ صحیفہ مانگا جو وہ پڑھ رہی تھیں۔ بہن نے کہا: تم ناپاک ہو اور یہ صحیفہ ناپاکوں کو نہیں دیا جا سکتا۔ اٹھے اور فوراً غسل کیا۔ پھر صحیفہ لے کر پڑھا اور بے ساختہ کلمۂ شہادت زبان سے نکل گیا۔ حضرت خبابؓ بن الارت جو کہ انھیں قرآن پڑھا رہے تھے اور حضرت عمرؓ کو دیکھ کر ایک کوٹھڑی میں چھپ گئے تھے باہر نکل آئے اور فرمایا: ابھی کل حضرت رسول خدا ﷺ نے دعا کی تھی خدایا! عمر بن خطاب یا عمر بن ہشام (ابو جہل) دو میں سے کسی کو اسلام کی عزت عطا کر کے میری مدد فرما۔ خدا نے آپ کے حق میں یہ دعا قبول کر لی۔ پھر وہ حضرت عمرؓ کو لے کر دارارقم میں پہنچے اور کارکنانِ قضا و قدر نے غلغلہ بلند کیا:

آمد آں یارے کہ ما مے خواستیم

عمر نکلے تھے کہ فرزند عبداللہ کا سر کاٹ لیں مگر اب خود عمر کے لب تھے اور فرزند عبداللہ کا پاؤں۔ سورۂ انفال مدنی سورہ ہے اس میں خدا نے فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (الانفال: 64)

''اے نبی تیرے لیے اللہ کافی ہے اور جتنے مومنوں نے تیرا اتباع کیا۔''

غالباً یہ آیت بھی مدنی ہے۔ لیکن مفسروں کی روایت کے مطابق یہ آیت حضرت عمرؓ کے اسلام کے عین بعد نازل ہوئی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

غلاموں کی رہائی

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کے اسلام کا زمانہ 8 ق ھ کے ابتدائی ایام کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے اسلام کے بعد مسلمانوں نے علانیہ تبلیغ شروع کر دی۔ [illegible] تک آپ کا دائرۂ تبلیغ صرف شہر مکہ تک محدود تھا۔ خدا نے ام القریٰ و من حولہا یعنی مکہ اور ارد گرد والوں کو سمجھانے کا حکم سورۂ قصص اور سورۂ انعام میں اتارا۔ سب سے زیادہ مصیبت میں وہ مسلمان تھے جو آزاد نہ تھے اب "فك رقبه" (غلاموں کی آزادی) کے لیے جدوجہد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی ساری دولت اس کے لیے وقف کر دی اور تمام غلاموں کو جو مسلمان ہو چکے تھے ان کے مالکوں سے خرید کر آزاد کر دیا۔ ان آزاد ہونے والے غلاموں میں سب سے محترم نام حضرت بلالؓ کا ہے۔ انھیں گرم ریت پر لٹا کر ان کے سینے پر تپتا ہوا پتھر رکھ دیا جاتا تھا کوڑے مارے جاتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ توحید سے انکار کرنے ہی پر جاں بخشی ہو سکتی ہے۔ مگر [illegible] خدا احد احد چلاتا تھا۔ پانی بھی پینے کی خواہش ظاہر نہیں کرتا تھا۔ حضرت رسول خدا ﷺ کا اپنے ماننے والوں پر جو اثر تھا اس کا مقابلہ ان بزرگوار پر مسیحیت کے اثر سے کیجیے جنھیں عیسائیوں کے خیال کے مطابق آسمان کی اور جنت کی کنجیاں دی گئی ہیں۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ حضور ﷺ افضل انبیاء ہیں بے بنیاد نہیں ہے۔ کہاں کوئی مصیبت سہے بغیر محض مصیبت کے خوف سے حضرت [illegible] کے خلاف کلمۂ کفر بول کر جان بچانا اور کہاں تپتی ریت پر تپتے پتھر سے دبے ہوئے کوڑے کھانے والے کا احد احد پکارنا۔ حضرت پطرسؓ کو ہم برا نہیں کہتے کیوں کہ اس کی نظیر ہمیں حضرت عمارؓ بن یاسر میں ملتی ہے لیکن پھر بھی فرق ہے۔ کیوں کہ حضرت عمارؓ نے باپ اور ماں کی مظلومانہ موت دیکھی۔ اسی مظلومانہ موت کے منہ میں پھنس کر جان بچانے کے لیے کلمۂ کفر زبان سے کہہ دیا جسے خدا نے جیسا کہ سورۂ نحل میں ہے معاف کر دیا۔ حضرت پطرسؓ کو حضرت مسیحؑ کے اٹھ جانے کے بعد تو ضرور بلالی ایمان عطا ہوا لیکن حضرت مسیحؑ کے زمانے میں ان کا ایمان حضرت عمار کے ایمان جیسا بھی نہ تھا۔ لیکن اگر ہم آج کے مسلمانوں کا ایمان بالرسول اور نصرانیوں کا ایمان بالمسیح ایک [illegible] پر رکھیں اور ہمیں شرم اور غیرت خدا نے دی ہو تو شاید مر ہی جانا پڑے گا۔

حصار شعب

8 ق ھ اگرچہ مسلمانوں کے لیے نہایت سخت دور تھا لیکن اب سب مومنوں کے دل بلالؓ کے سے ہو گئے تھے اب کوئی مصیبت ان کے لیے مصیبت نہ تھی۔

ام کا پرجوش مبلغ تھا۔ اطراف واکناف سے لوگ اسلام کی حقیقت معلوم کرنے کو
لگے۔ قریش کو نہایت فکر لاحق ہوگئی۔ محرم 7ق ھ میں تمام اہل مکہ نے جن
بنوامیہ اور بنونوفل دوخاندان بنوعبدمناف کے بھی شریک تھے مسلمانوں اور بنوہاشم
بنومطلب سے جو مسلمان نہ ہونے کے باوجود حضرت رسول خدا ﷺ کے حامی رہتے تھے
ان کے تعلقات منقطع کرلیے اور ان سب کو شعب ابی طالب میں قید ہوجانے پر مجبور
دیا اور ایک عہد نامہ مقاطعہ لکھ کر خانہ کعبہ میں اسے لٹکا دیا۔ دوسال تک انھیں
ب ابی طالب میں قید رہنا پڑا۔ اس زمانہ میں جو شدتیں اور تکلیفیں انھیں برداشت
نی پڑیں ان کی تشریح طویل ہے۔ صرف ایام حج میں ان لوگوں کو شعب سے نکلنے کا
قع تھا۔ ایام حج میں چوں کہ کسی پر ظلم کرنا مشرکین مکہ بھی ناروا سمجھتے تھے اس لیے
لمانوں کو اسلام کی تبلیغ کا اچھا موقع ملتا تھا۔ دُور دُور سے حج کے لیے جو لوگ آتے
وہ بھی اس نئے دین کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے تھے۔ شعب ابی طالب کے زمانہ
ں خدا نے دوسورتیں نازل کیں جن میں ان تمام لوگوں کو اسلام کی طرف بلانے کا حکم
گیا ہے جن کے پاس کوئی الہامی نوشتہ نہ تھا۔ شعب ابی طالب سے رہائی کے بعد
ں کتاب کے درمیان بھی تبلیغ کے احکام نازل ہوئے۔

حصارِ شعب کے ٹوٹنے کی صورت یہ ہوئی کہ ایک روز رسول خدا ﷺ نے
لاع دی کہ قریش نے جو معاہدہ لکھ کر خانہ کعبہ کے اندر محفوظ کر رکھا ہے اللہ کے نام
ے علاوہ تحریر کا ایک ایک حرف دیمک نے چاٹ لیا ہے۔ حضرت ابوطالب ہمت کر
ے شعب میں سے نکلے خانہ کعبہ کے پاس آئے۔ قریش نے سمجھا کہ اب ہمت
واب دے چکی ہے ہماری شرطیں مان لیں گے لہٰذا خوشی سے ان کا استقبال کیا۔
ضرت ابوطالب نے حضرت رسول خدا ﷺ کا بیان انھیں سنایا۔ قریش نے کہا: اگر
یہ بیان غلط ثابت ہوا تو تمھیں ہماری شرط ماننا پڑے گی۔ اور صحیح ثابت ہوا تو آج سے
مقاطعہ ختم کر دیا جائے گا کیوں کہ یہ خدائی فیصلہ ہے۔ کاغذ تلاش کیا گیا تو خبر حرف
بحرف صحیح تھی اس لیے معاہدہ منسوخ کیا گیا۔ محرم 5ق ھ میں حصار شعب سے لوگ
باہر نکلے۔

انشقاق قمر

انبیا اور اولیاء کے تذکروں میں عموماً معجزات اور کرامات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ حضرت رسول خدا ﷺ کے بھی بہت سے معجزات کتب سیرت میں مروی ہیں، لیکن قرآن پاک کے اندر خدا نے معجزوں کو دلیلِ نبوت نہیں قرار دیا ہے۔ بہت سی آیتوں سے پتا چلتا ہے کہ کفار بار بار معجزوں کا مطالبہ کرتے تھے۔ لیکن اس مطالبہ کو کسی نہ کسی جواب کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے بہت سے اصحاب ان آیتوں کی دلیل سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آپ نے کوئی معجزہ نہیں دکھایا۔ لیکن یہ بات غلط ہے۔ کیوں کہ سورۂ انعام میں خداوند عالم نے فرمایا:

﴿وَ قَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (الانعام: 38)

''اور انھوں نے کہا: اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی (معجزانہ) آیت کیوں نہ اتاری گئی۔ جواب دے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ کوئی آیت نازل کر دے لیکن بیشتر لوگ نہیں جانتے۔ (کہ کیا بات کس بات کی دلیل ہوتی ہے۔)''

﴿وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ مَا يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾

(الانعام: 109)

''اور ان لوگوں نے اللہ کی پکی قسمیں کھائیں کہ اگر ان کے پاس کوئی (معجزہ) آیت آ جائے گی تو وہ اس پر ایمان لائیں گے اور تم لوگ نہیں جانتے کہ جب وہ آئے گی تب بھی وہ ایمان نہ لائیں گے۔''

﴿وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ (الانعام: 124)

''اور جب ان کے پاس آیت آ گئی تو کہنے لگے ہم اب بھی نہ مانیں گے یہاں تک کہ ہمیں بھی اس کا مثل دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔''

ان آیتوں کے باوجود جو لوگ اس بات کے منکر ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے بھی معجزے سرزد ہوئے وہ غلطی پر ہیں۔ البتہ خدا نے معجزوں کو دلیل نبوت نہیں مانا ہے۔ کیوں کہ مُردہ جلا دینا جس طرح کسی کے اچھے وکیل ہونے کی دلیل نہیں اسی طرح مُردہ نہ جلا دینا اس بات کی بھی دلیل نہیں کہ میں جو تعلیم دیتا ہوں وہ برحق ہے۔ دلیل اور مدلول میں رابطہ ہونا چاہیے۔ مُردہ جلانا اس بات کی دلیل ہے کہ اسی طرح قیامت کے دن مردوں کو زندہ کر دے گا مگر اس بات کی دلیل نہیں کہ جھوٹ بولنا بُری بات ہے۔ حضور ﷺ سے جو معجزے سرزد ہوئے ان میں سے ایک کی طرف قرآن میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ خدا نے فرمایا:

﴿اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ۝﴾ (القمر: 1تا2)

''قیامت کی گھڑی قریب آ گئی اور چاند میں شگاف پڑ گیا۔ اور اگر یہ لوگ کوئی آیت دیکھیں گے تب بھی اعتراض کریں گے اور کہیں گے کہ چلتا ہوا جادو ہے۔''

اس آیت کی بنا پر کفار نے وہ قسم کھائی تھی جو انعام 110 میں مذکور ہے۔ ان کے قسم کھانے کے بعد ایک رات حضرت رسول خدا ﷺ نے لوگوں کو بلا کر چاند کی طرف انگلی کی اور فرمایا: دیکھو تو۔ لوگوں نے دیکھا کہ چاند پھٹ کر دو ہو گیا ہے۔ یہ واقعہ 5ق ھ کا ہے۔ روایتوں میں اس واقعہ کی تفصیلات ملیں گی۔

قرآن کا دعویٰ تھا کہ چاند میں شگاف پڑ گیا ہے۔ یہ دعویٰ نہ تھا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ جرم فلک کا حادثہ صرف یہ تھا کہ اس میں کسی زلزلہ کی وجہ سے شگاف پڑ گیا۔ لیکن جب لوگوں نے اس کا قابل دید ثبوت مانگا تو آپ ﷺ نے چاند کی طرف اشارہ کیا تو انھیں ایسا نظر آیا کہ چاند پھٹ کر دو چاند ہو گیا۔ جرم فلک پر گزرنے والے حادثے کا آنکھوں سے نظر آنے والا منظر ایک ثبوت تھا۔ جرم فلک میں جب شگاف

پڑا تو اس کے اندر کوئی چیز دخان جیسی نکل کر متموج ہوگئی اور اس کے تموج نے چاند کو دو کر کے دکھا دیا۔ اس موقع پر ایک شعر نقل کرنے کو جی چاہتا ہے' جسے میری چشم دید گواہی سمجھیے:

تیری موجوں میں چھپا ہے راز و انشق القمر
رود گنگا تیری گودوں میں بکھر جاتا ہے چاند

4ق ھ میں حضرت ابوطالبؓ اور حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ رسولِ خدا ﷺ نے اس سال کو عام الحزن کا نام دیا۔ شوال یا ذی قعد 4ق ھ میں آپ نے زید بن حارثہ کو ساتھ لیا اور بغرضِ تبلیغ طائف کو روانہ ہوئے۔ لیکن سرزمینِ طائف آپ کے لیے مکہ سے بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ بنو ثقیف نے آپ کی باتیں سننے سے انکار کر دیا اور کہا: ''کیا اللہ کو رسول بنانے کے لیے کوئی اور شخص نہیں ملا، پھر انھوں نے چھوکروں کو اکسا دیا کہ یہ شخص مجنون ہے' اب تم جانو اور یہ مجنون جانے۔ آپ ﷺ جدھر سے گزرتے لونڈے آپ کو پتھر مارتے تھے۔ حضرت زیدؓ نے حضور ﷺ سے بددُعا کے لیے عرض کی۔ آپ ﷺ نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھایا اور خدا سے عرض کی:

''میرے پروردگار! میری قوم کو راہ راست دکھادے کیوں کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔''

لونڈوں سے جان بچا کر کسی طرح ایک باغ کی دیوار کے زیر سایہ بیٹھ گئے۔ اس باغ کے مالک دو مکی رئیس تھے۔ عتبہ بن ربیعہ اور شیبہ بن ربیعہ۔ کفر شدید کے باوجود آپ ﷺ کی حالت زار پر انھیں رحم آ گیا۔ باغ کے مالی عداس کو' جو ان کا غلام تھا' انھوں نے ایک طبق میں کچھ خوشے انگور کے آپ ﷺ تک لے جانے کو کہا۔ جناب عداس ایک نصرانی عالم تھے۔ بدقسمتی سے غلام بن کر پلے تھے۔ یہ بزرگ جب خوشہ لے کر آپ ﷺ کے پاس پہنچے تو عتبہ اور شیبہ نے حیرت کے ساتھ دیکھا۔ جناب عداس آپ ﷺ کے سر کو' ہاتھوں کو اور پاؤں کو بوسہ دے رہے ہیں۔ دونوں نے عداس کو بلا کر سوال کیا کہ عداس تم یہ کیا کر رہے تھے۔ عداس نے جواب دیا:

''میرے آقا! روئے زمین پر آج اس شخص سے اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس نے مجھے وہ بات بتائی ہے' جو ایک نبی ہی بتا سکتا ہے۔''

اس کے بعد آپ ﷺ وہاں سے مکہ کو لوٹ آئے۔

3ق ھ کے ماہِ حج سے اسلام کی تاریخ کا نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ مدینہ سے آ کر چھ افراد نے ایک کھائی کے اندر اسلام قبول کیا۔ 2ق ھ کے ماہ حج میں یہ لوگ تجدید بیعت کے لیے چھ مزید مسلمانوں کو اپنے ساتھ لے آئے اور ان لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا' اور آنحضرت ﷺ نے ان کے ساتھ تعلیم قرآن کے لیے حضرت مصعب بن عمیر کو روانہ کیا۔ اق ھ کے ماہِ حج میں 70 انصار نے اسلام قبول کیا اور مسلمانوں نے مکہ سے ہجرت کر کے مدینے چلے آنے کی دعوت دی اور مکہ سے لوگوں نے یکے بعد دیگرے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ چند دنوں کے بعد خود حضور ﷺ کو حکم ﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا﴾ اور آپ نے جمعہ یکم ربیع الاول اھ کو مکہ چھوڑ دیا۔ تین یوم آپ ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ غار ثور میں چھپے رہے۔ دوشنبہ 5 ربیع الاول اھ کو غار سے نکلے اور دوشنبہ 12 ربیع الاول 1ھ کو مدینہ پہنچے۔ اس روز اسلامی تاریخ کا کچھ اور ہی رنگ ہو گیا۔ (ابوالجلال ندوی)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی

جنھیں تاہ بینوں نے ''دل'' کا اقرار کیا تھا' لیکن ''دماغ'' پر انھیں اب تک شک تھا' اب انھی تنگ نظروں کے لیے دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے' جس میں ''دل'' سے زیادہ ''دماغ'' ہی کی نمائش ہوگی تا کہ وہ وہمی شوشہ بھی مٹ جائے جس کے آڑ میں جاننے کے بعد نہ جاننے کے لیے چھپنے والے چھپ رہے ہیں۔

اور دیکھو کہ دماغی تجربات بینہ کی اسی کشمکش سے وہ تُرشی بھی نچوڑی جائے گی جس سے ان خود بینوں کا نشہ پھاڑا جائے گا' پھٹ جائے گا' جن کے پاؤں ''سر بلندی وعلو'' کے خمار کے ہاتھوں جاننے کے بعد بھی ماننے سے اب تک ڈگمگا رہے ہیں' تا کہ حجت پوری ہو۔

﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ (القرآن)

''جو مرنا چاہے وہ کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر مرے اور جو جینا چاہے وہ بھی کھلے بندوں سب کچھ دیکھ کر جیے۔''

مدنی زندگی کے شروع میں جو یہ دکھایا گیا ہے کہ "هو انی علی الناس" کے فریادی کو ''الناس'' اور ''ناس'' کے ساتھ جو کچھ ہیں سب پر انھیں وزن بخشا جا رہا ہے۔ یا طائف کی گلیوں میں جو رد کیا گیا تھا' سلع پہاڑ کے دامن میں سب اسی پر رد کیے جا رہے ہیں' بھوکوں کے لیے روٹی لے کر دوڑے آتے ہیں' پیاسوں کے لیے پانی لے کر دوڑے آتے ہیں' گاتے ہیں' بجاتے ہیں' باہم ایک دوسرے کو للکارتے ہیں' ابھی ابھی جس کی جمادی چٹانیں هلم الیّ یا رسول اللّٰہ کے ساتھ پکار رہی تھیں' اسی کو انسانی زبانیں آگے آگے بڑھ بڑھ کر ٹھیک اسی طرح:

"یا رسول اللّٰہ هلم ء الی القوۃ والمنة ."

''اے اللہ کے رسول! زور اور حفاظت کی طرف آیئے۔''

عرض کرتے ہوئے جان حاضر کرتے ہیں' مال حاضر کرتے ہیں' تو یہ مدینہ کا نہیں بلکہ قرن الثعلب کے موڑ پر طائف سے نکلتے ہوئے جس کا ردعمل ''ملاءِ اعلیٰ'' سے شروع ہوا تھا۔ یہ اسی تسخیری قوت کا ظہور ہے جو ''مکہ'' میں بھی ظاہر ہوا' ''ثور'' میں بھی ظاہر ہوا۔

''ثور'' سے نکلنے کے بعد بھی ظاہر ہوا' ''قبا'' میں بھی ظاہر ہوا' جہاں خالق کا جو دروازہ مخلوقات کے لیے بند تھا' صدیوں کے بعد پہلی دفعہ قبا کی مسجد بنا کر کھولا گیا تا کہ جس کسی کو جہاں کہیں زمین پر قابو بخشا جائے پہلا کام یہی کرے' اور اب مدینہ میں بھی اسی ردِّعمل کا ظہور ہو رہا ہے' آیندہ ہوتا رہے گا' اسی کا ظہور ''کوفہ'' بھی ہوگا' ''دمشق'' میں بھی ہوگا۔ ''بغداد'' میں بھی ہوگا۔ ''غرناطہ'' میں بھی ہوگا۔ ''قاہرہ'' میں بھی ہوگا۔ ''غزنی'' میں بھی ہوگا ''دہلی'' میں بھی ہوگا اور کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں ہوگا' کب تک ہوگا' بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابد تک اب تو صرف اسی کا ظہور ہے' اسی کی نمود ہے' اسی لیے ''مدنی زندگی'' کے اصلی عناصر یہ واقعات نہیں ہیں' بلکہ یہ تو ''مکہ'' ہی کے آثار ہیں جنھیں تم اب ''مدینہ'' میں دیکھ رہے ہو' بلکہ ''مدنی'' زندگی میں تمھیں وہ باتیں تلاش کرنی چاہئیں جن میں ''دل'' سے زیادہ ''دماغ'' کا ''اخلاق' سے زیادہ ''عقل'' کا تجربہ ہو۔

''مکہ'' میں جس طرح دیکھا گیا تھا کہ اس ''دل'' سے بہتر کوئی دل نہیں' اسی طرح ان باتوں کا مطالعہ ''مدینہ'' میں کرو' جنھیں دیکھ کر کہا جائے کہ اس ''دماغ'' سے بہتر کوئی ''دماغ'' نہیں۔ ظاہر ہے کہ مدینہ میں سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ مسجد نبوی بنائی گئی اور اس کے ساتھ ''صفہ'' کا مدرسہ بنایا گیا' لیکن کیا صرف مسجد نبوی بنائی گئی اور مدرسہ بنایا گیا' مسجد اور مدرسہ کون نہیں بناتا اور کہاں نہیں بنتے' پھر اس میں بڑائی کیا ہے' باوجود استطاعت وقدرت کے پختہ اینٹ کے اور پتھر سے نہیں بنائی گئی' بلکہ کھجور کے تنوں اور شاخوں اور کچی اینٹوں سے بنائی گئی' بلاشبہ اس میں یہ نمونہ ضرور ہے کہ مسلمان جس آبادی میں پہنچیں' سب سے پہلے وہ اپنے گھر سے بھی پہلے' وہاں خدا کی عبادت کی مسجد کی نیو کھودیں کہ مسجد ہی اسلام کی میخ ہے' اسلامی آبادی بناتے ہوئے سب سے پہلے چاہیے کہ اس میخ کو ہر مسلمان اس جگہ گاڑ دے جہاں وہ آباد ہوتا ہے' تعمیری تکلفات کی وجہ سے دقت نہ ہو اس لیے سب سے پہلی مسجد کا نمونہ وہ رکھا گیا جسے ہر شخص گاڑ سکتا ہے' ہر جگہ گاڑ سکتا ہے' آخر تعمیری سامان کے لحاظ سے جو مسجد بھی ہوگی اس سے کیا کم ہوگی جو مسلمانوں کی سب سے پہلی مسجد تھی اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسجد مدرسہ کے ساتھ ہو ''علم دین'' ہے' ''دین علم'' ہے' عملاً اس نمونہ سے اس کی تعلیم دی گئی۔ میں نہیں کہتا کہ اس مسجد و مدرسہ کے بنانے میں یہ مصالح بھی پیش نظر نہیں تھے' یا آیندہ مسلمانوں کو اس نمونہ کے پیچھے نہیں چلنا چاہیے' لیکن دیکھا گیا پر سوچا نہیں گیا' آخر مسجد عرب میں بنتی ہے' عرب میں کعبہ موجود تھا' جو صرف عرب جاہلیت ہی میں نہیں بلکہ اسلام میں بھی محترم تھا' لیکن بایں ہمہ اس مسجد کا قبلہ عرب سے باہر فلسطین کے سلیمانی ہیکل کو کیوں ٹھہرایا جاتا ہے۔

لوگ سمجھے کہ صرف قبلہ مقرر ہوا' لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ ''وطنیت'' کا جو بت عرب میں صدیوں سے پوجا جاتا تھا' اور اس زور وشور سے پوجا جاتا تھا کہ اس کا پجاری اپنے سوا سب کو ''عجم'' اور گونگا سمجھتا تھا' دیکھو کہ صرف ایک اسی مخفی ضرب نے اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ جب قرآن میں ہے کہ ابتداءً عربوں پر یہ ''غیر ملکی'' قبلہ گراں

گزارتو یہی غور کرنا تھا کہ کیوں گراں گزرا؟ لیکن اب تو گرانیوں کے برداشت کا انھوں نے عہد کیا تھا' جھجکے مگر اسی کے ساتھ ہی آگے بھی بڑھ گئے' اور جولا دا گیا لا دلیا' سترہ مہینے تک اس وطنیت شکنی کی مشق نے جب ان کے لیے عرب اور غیر عرب کو ایک بنا دیا تو اس سے بھی عجیب اور عجیب تر تماشا پیش ہوتا ہے۔

بیت المقدس کو قبلہ بنا کر عرب کے باشندے الگ کیے گئے' لیکن اب عرب نہیں بلکہ عرب اور غیر عرب خدا کی ساری زمین سے یہ عرب اور غیر عرب کا قصہ ہی ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جاتا ہے' سترہ مہینے کے بعد قبلہ بدلتا ہے' اور بجائے سلیمان کی ہیکل کے سلیمانؑ و داوٗدؑ اسحاق و اسماعیلؑ کے باپ ابراہیمؑ کے بنائے کعبہ کو قبلہ ٹھہرا کر حکم دیا جاتا ہے:

﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ﴾

''اور جہاں سے تم نکلے اسی جگہ سے تم اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف موڑ دو' اور جہاں کہیں (اے مسلمانو!) تم ہو اپنے چہروں کو اس طرف موڑ دو۔''

کیا مقصد ہے اس کا؟ یہی کہ جو کعبہ سے باہر کیے گئے ہیں وہ بھی کعبہ کے اندر ہیں اور جو کعبہ سے باہر تھے اپنے کو کعبہ کے اندر سمجھیں' پہلے غیر عرب کو عرب کا قبلہ بنایا گیا' اور جب یہ ہو چکا تو پھر عرب اور غیر عرب سب کو مٹا کر نہ عرب ہی رہا نہ غیر عرب رہا بلکہ خدا کی جو ایک دنیا تھی وہ ایک ہی دنیا کی شکل میں واپس آ گئی' کعبہ دنیا کی مسجد کی دیوار ٹھہرایا گیا اور بسیط زمین اسی دیوار کا صحن قرار پایا' یہی ہر مسلمان سمجھتا ہے اور اسی کے مطابق عمل کرتا ہے' وہ افریقہ کو بھی کعبہ میں سمجھتا ہے اور امریکہ کو بھی اسی کے صحن کا ایک حصہ قرار دیتا ہے' ایشیا بھی اسے کعبہ کی دیواروں کے نیچے نظر آتا ہے۔ یورپ میں بھی جب اسے نماز کی ضرورت ہوتی ہے تو کعبہ کے آنگن میں کھڑا ہو کر وہ اپنی نماز ادا کرتا ہے' ایورسٹ اسی کے صحن کا ایک ٹیلہ ہے' اور ''بحر محیط'' اسی صحن کا ایک حوضِ، بحر قلزم اسی صحن کی ایک نالی ہے' ایک مسلمان اپنی زندگی کے ہر دن میں پانچ وقت اس نظریہ کی عملی شکل میں مشق کرتا ہے' اسے یہی بتایا گیا ہے' صحیح حدیث میں ہے:

"جعلت لی الارض مسجداً."

''پوری زمین میری مسجد بنائی گئی ہے۔''

''وطنیت'' کے اس صنم اکبر کو توڑنے کے ساتھ اب ''قومیت'' اور ''نسلیت'' کا بت سامنے آتا ہے' کس قدر سرسری طور سے لوگ گزر جاتے ہیں' جب سنتے ہیں یا کہتے ہیں کہ ''مدینہ'' میں انصار اور مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ کرایا گیا تھا' ان میں عقد مواخات قائم کیا گیا تھا' لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا' مہاجرین قریش اور قریشی نسل کے ساہوکار کعبہ کے کلید بردار تھے' اور انصار قبیلہ اوس و خزرج کے کسان اور کاشتکار تھے' حالانکہ دونوں انسان تھے لیکن جس طرح آریائی نسل والوں نے سامی نسلوں کو اور سامی نسلوں نے تورانی نسلوں کو یا برہمنوں نے شودروں کو بے رنگوں نے رنگینوں کو پھیکوں نے نمکینوں کو آدمی کی نہیں بلکہ گھوڑوں کی اولاد، بیل کی نسل سمجھا' اور اسی قسم بلکہ اس سے بدتر سلوک انھوں نے ان لوگوں کے ساتھ روا رکھا جو ان کے ہم نسل ہم قوم نہ تھے۔

قریش کو اپنے نسب پر اپنے حسب پر بڑا ناز تھا' نسبی فخر ایک دیوتا تھا' جو صدیوں سے ان میں پوجا جاتا تھا' اور اس طرح پوجا جاتا تھا کہ غیر قریشی عربوں کے ساتھ یہ لوگ حج کرنے میں بھی اپنی اہانت محسوس کرتے تھے' جس طرح آج بھی اچھلے کالوں کے ساتھ دُعا تک مانگنے میں اپنی ذلّت سے ڈرتے ہیں' قریشی اس قبرستان میں بھی دفن ہونا ننگ خیال کرتے تھے' جس میں کوئی غیر قریشی بیچارہ دفن ہوتا' جس طرح آج بھی شودروں کی مسان برہمنوں' چھتریوں کے مرگھٹ سے دور ہوتی ہے' یہی مواخات کا گُزرتھا' جس نے اس بُت کو بھی ڈھیر کر کے رکھ دیا۔ قریشی سردار انصاری کسان کے آگے جھکا ہوا تھا' وہ اس کے ہاتھ چومتا تھا' اور یہ ان کے قدم لیتا تھا' یہ اسے اپنا سب کچھ بلکہ تم نے سنا ہوگا طلاق دے کر ایک بیوی تک دینے پر اصرار کرتا تھا اور وہ شکریہ کے ساتھ انکار کرتا تھا۔

اور یوں مخلوقات بلکہ اپنے خود ساختہ مخلوقات کے پنجوں سے آزاد ہو کر مدینہ والوں نے اپنے کھوئے ہوئے ربّ قیوم کو پالیا تھا اسی کے بعد منادی کرادی گئی کہ اب دنیا ایک ہے' اس کا معبود ایک ہے' ان کا رسول ایک ہے' ان کی کتاب ایک ہے' ان کا کعبہ ایک ہے۔

اور دیکھو کہ دن کے پانچ وقتوں میں کڑک کڑک کر گرج گرج کر بلند میناروں سے پکارنے والے مشرق میں مغرب میں' زمین کے آخری کناروں تک یہی پکار رہے ہیں' پکارتے رہیں گے' کیا ناقوس سے' بوق سے' قرنا سے' گھنٹوں سے' طبل سے' نقاروں سے یہ بات ممکن تھی' جس کی ابتدا اذان کے عجیب وغریب ندائی طریقہ سے اسی کے بعد زمین پر اسلام کی سب سے پہلی مسجد میں کی گئی' متعدد وطنوں کا بُت ٹوٹ گیا' متعدد نسلوں کا صنم بت چُور چُور ہو گیا۔

جو توڑے گئے جٹ گئے' جو بکھیرے گئے تھے سمٹ گئے' الغرض جو ایک تھے وہ ایک ہی ہو گئے اور اسی یکتائی کا خلاصہ وہ ہے جس کا اعلان اذان کی شکل میں پانچوں وقت کیا جاتا ہے' محض فکر و خیال میں نہیں' بلکہ واقع میں عملی طور پر مدینہ میں دنیا کا یہ نقشہ قائم ہو گیا' انسانیت کی آزادی کا یہی عالمگیر نقشہ تھا جسے عالم پر منطبق کرنے کے لیے "كافة للناس" "كابشير و نذيرا" "كافة الناس" کی طرف بڑھتا ہے۔ ﷺ

اس کو اختیار تھا کہ ''قرن الثعلب'' کے پاس اسے جو اخشبین (2 پہاڑ) دیے گئے تھے' انھی کو لے کر آگے بڑھتا' لیکن یہ تو پھر دل کا امتحان ہو جاتا' حالانکہ اب تو صرف ''دماغ'' ہی کا تجربہ کرانا مقصود ہے' دکھایا جاتا ہے کہ جس کے دماغ کے یہ کارنامے ہیں' اسے مجنوں کہنے والے کیا خود مجنوں نہیں ہیں' جس کی عقل' جس کے فہم کے یہ کرشمے ہیں' اس کے عقلی توازن میں نقص نکالنے والے کیا ایسے بدبخت خود عقلی توازن سے محروم نہیں ہیں۔

راستہ اگر صاف ہوتا تو اس وقت جو کچھ دکھانا ہے' کامل طور پر دکھایا نہیں جا سکتا'

دیکھو! راہ میں کانٹوں کے جو گھنے جنگل چپ و راست اوپر اور نیچے ہر طرف سے رے ہوئے ہیں وہ قصداً انھی میں گھس کر نکلتا ہے' اور کتنے شاندار طریقہ سے نکلتا۔ بیابان کے ایک نخلستانی قصبہ کے ان کسانوں کی آبادی سے یہ تحریک عالم کی ف یلغار کرتی ہے' جو یہودی ساہوکاروں کے سود در سود کے بوجھ کے نیچے دبے ے ہیں' ان کی زمینوں میں پیدا ہی کیا ہوتا ہے' لیکن جو کچھ بھی پیدا ہوتا ہے' پیدا نے کے ساتھ یہودی قرض خواہوں کے گھر اٹھ کر چلا جاتا ہے' زیادہ دن نہیں ہوئے ہ کہ اس چھوٹی سی آبادی کے دو خاندان اپنی خانہ جنگی میں رہے سہے جوانوں اور داروں کو بھی کھو چکے ہیں' ان کے ساتھ اپنے دھن سے وطن سے بچھڑے ہوئے کچھ ب اور بھی شریک ہیں' جن کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہے' ان کا یہ حال ہے' دوسری رف سارا عرب ایک کمان بن کر اس تحریک کو اور تحریک والوں کو نشانہ بنائے ہوئے یشہ کے لیے نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے' یہودی اپنی مہاجنی کساد بازاری سے گھبرا کر ان تمام قلعوں اور قلعوں والوں کو مخالفت کے نقطہ پر جمع کر رہے ہیں' جن کا سلسلہ دینہ سے شروع ہو کر شام کے حدود تک پھیلا ہوا ہے' مشکلات کا خاتمہ اسی پر نہیں ہو جاتا ہے' بلکہ بتدریج مخالفت کی یہ آگ بڑھتے بڑھتے اس وقت کی سب سے بڑی مشرقی طاقت (ایران) اور سب سے بڑی مغربی قوت (روم) دونوں طاقتوں کو مدینہ کی بربادی پر آمادہ کر دیتی ہے۔

رومیوں کے گھوڑے مدینہ سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر غسانیوں کے حدود پر ہنہنا رہے ہیں اور کسریٰ کے چپراسی وارنٹ لیے مدینہ پہنچ کر دھمکا رہے ہیں کہ مدینہ کے کسانوں کے سردار کو دربار شاہی میں گرفتار کر کے حاضر کیا جائے۔'' یہ ان کے شہنشاہ کا فرمان ہے' جو یمن کے گورنر باذان کے توسط سے مدینہ تک پہنچا ہے۔

یہ اس وقت کا سماں ہے' جس وقت مدینہ میں ''دماغ'' کے تجربہ کے لیے نسلِ انسانی کو دعوت دی جاتی ہے' پھر کیا ہوتا ہے۔

قیدار کی ساری حشمت جیسا کہ یسعیاہ نبی نے کہا تھا کہ ایک سال ٹھیک مزدوروں کے ایک سال کے اندر بھس کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہے' علو و کبریائی کا جو نشہ ان کے قدم کو جمنے نہیں دیتا تھا پھٹ کر ہوا ہو گیا' جو سب سے بڑا تھا' سب سے چھوٹے کے ہاتھوں قتل ہوا قریش کے ستر سورما مارے گئے اور یوں قیدار کی حشمت خاک میں مل گئی۔ وہی عرب جو ایک کمان سے تیر بن کر اس سینے کے پتھر پر گرے تھے' جیسا کہ کہا گیا تھا جو اس پر گرتا ہے' چُور چُور ہو جاتا ہے' چُور چُور ہو کر اس طرح بدلے کہ جو دشمن تھے' وہ دوست ہو گئے۔

جن پر تلوار چلائی وہ نہیں' بلکہ جنھوں نے تلوار چلائی انھوں نے مسلمان ہو کر ان جھوٹوں کو جھٹلایا' جنھوں نے بازاروں میں پھیلایا تھا کہ جو کچھ پھیلایا گیا ہے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا' مکہ میں جن سے چھینا گیا تھا' سب کچھ چھینا گیا' پانی چھینا گیا' کھانا چھینا گیا' گھر چھینا گیا' در چھینا گیا اور آخر میں جینے کا حق بھی چاہا گیا تھا کہ چھینا جائے' اور کتنوں سے چھینا گیا' دہکتی ہوئی آگ' چمکتی ہوئی تلواروں' کھنچے ہوئے کمانوں کے نیچے سے بھاگے ہوئے' پھر چمکتی ہوئی تلواروں اور کھنچی ہوئی کمانوں' تنے ہوئے نیزوں کے ساتھ فتح کا پھریرا اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہوتے ہیں لیکن لیتے ہوئے نہیں' دیتے ہوئے' اکڑتے ہوئے نہیں جھکے ہوئے' بدلہ چکاتے ہوئے نہیں حطّ و عفو کرتے ہوئے۔

﴿ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ (البقرہ: 58)

''شہر کے دروازہ میں سر جھکائے اور حطّہ (یعنی گناہوں اور قصوروں کو جھاڑتے ہوئے معاف کرتے ہوئے) داخل ہونا۔''

کی تعمیل کرتے ہوئے' تفسیر کرتے ہوئے' رحم و کرم' صفح و اعراض' مغفرت و درگزر' امن و امان کے پھول برساتے ہوئے۔

"الیوم یوم بر و وفاء الیوم انتم الطلقاء."

''آج صلہ رحمی اور وفا کرنے کا دن ہے آج تم لوگ آزاد کیے گئے۔''

کے موتی نچھاور کرتے ہوئے زمین پر انسانوں کے لیے جو پہلا گھر' مخلوق کی نہیں' بلکہ خالق کی' صرف خالق کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا' اس میں لا الٰـہ الا اللّٰـہ الـحمدللّٰہ وحدہ نصر عبدہ و حزب الاحزاب وحدہ' کہتے ہوئے سربسجود ہو گئے۔ ابراہیمؑ کا بیت ایل پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کی گندگی سے پاک ہو گیا' اور حیرت ہے کہ بکھرا ہوا وحشی عرب جس میں وثنی' بت پرست' یہودی' عیسائی' صابی' عقل پرست سبھی ہیں' ان مختلف اقوام و قبائل کے باہمی انتشار' جنگ و جدال کو ختم کر کے ایک پُر امن آئینی نظام سلطنت کے ساتھ وابستہ کرنے میں جھوٹوں نے جس قدر بھی جھوٹ چاہا پھیلا دیا' لیکن واقعہ صرف اس قدر اور اسی قدر ہے کہ دس لاکھ مربع میل کی طویل و عریض سرزمین کا پایۂ تخت جس وقت کسانوں کا وہی قصبہ ہو گیا تو دس سال کی اس لمبی اور دراز مدت میں وثنیوں (عربی ہندوؤں) یہودیوں' عیسائیوں' مسلمانوں سب میں سے امن و امان کی اس جدوجہد میں طرفین کے جتنے آدمی کام آئے ان کی تعداد کروڑ لاکھ کیا بلکہ دو ہزار چار ہزار بھی نہیں' اتنی بھی نہیں جتنی ''نیویارک'' کی سڑکوں پر' لندن' کی شاہراہوں پر موٹر کے نیچے سے روزانہ اٹھائے جاتے ہیں' یا ہندوستان کی معمولی جھڑپوں میں لاشوں کی جو فہرست تیار ہوتی ہے' بلکہ کل لے دے کر سب کی کل تعداد ایک ہزار اٹھارہ ہے' یہ ہے ''خونی پیغمبر'' کا بہایا ہو خون یا قصابوں کی وہ دکان جس کے شور سے گنبد گرداں بھی تھرا اٹھا ہے' غیر تو غیر اپنے بھی پریشان ہیں۔

اُف! برکندہ باد آنکھوں سے بداندیشوں کو صرف وہیں خون نظر آیا جہاں سے انسانیت کی مردہ لاش میں زندگی کا خون دوڑایا گیا' جہاں موت ہے' مُردوں کو دل کے مُردوں کو وہاں زندگی نظر آ رہی ہے اور جہاں سے صرف زندگی بٹی' بٹ رہی ہے' انصاف کرنے والوں نے کیسا انصاف کیا' جب موت کی وادی کے نام سے انھوں نے دنیا میں اس کا پروپیگنڈا کیا' ایک ہزار اٹھارہ تعداد تو اس وقت ہے جب اس میں بلاوجہ بنی قریظہ کے ان یہودیوں کو بھی شریک کر لیا جائے' جنھیں خود ان کی کتاب اور ان کی

شریعت نے انھی کی مرضی سے اپنے ہی قانون کی رو سے اس وقت ناپید کیا' جب سمجھا گیا کہ اس چھوٹی سی جماعت کی زندگی سے سارے عرب بلکہ ممکن ہے کہ عرب کے اطراف کی بڑی جماعت کی موت پیدا ہوگی' آخر جب کروڑوں مقتولوں والی عالمگیر جنگ کی آگ یہودی پھونک کر سلگائی ہوئی مانی جاتی ہے' تو اگر انھی یہودیوں کے متعلق یہ سمجھا گیا تو کیا غلط سمجھا گیا اور صرف یہی نہیں' اسی ایک ہزار اٹھارہ میں بیچارے ان شہید معلموں کو بھی شمار کرلیا گیا ہے' جنھیں نجد والے اپنے ملک میں وعظ و تلقین' تعلیم وتذکیر کے لیے لے گئے' اور معونہ نامی کنویں پر ستر آدمیوں کو شہید کر دیا گیا انھی میں وہ دس مبلغ بھی ہیں جنھیں بے دردی کے ساتھ بلا وجہ رجیع کے مقام پر ذبح کر دیا گیا' یہ تو مسلمانوں کی طرف سے شہید ہوئے' اسی طرح فریق ثانی کے ان مقتولوں کو بھی اسی تعداد میں شریک کرلیا گیا ہے جو بجرم قصاص یا ڈاکہ یا چوری مارے گئے یا گرفتاری کے سلسلہ میں قتل ہوئے' لوگ سوچتے نہیں' ورنہ دس سال کی اس طویل مدت میں اگر جنگ کا اطلاق کسی معرکہ یا مہم پر ہوسکتا ہے' تو وہ ''بدر'' ہے' جس میں بائیس مسلمانوں اور ستر قریش کے' اسی طرح ''اُحد'' میں ستر مسلمانوں اور تیس قریشیوں کے آدمی کام آئے بشرطیکہ ہزار پندرہ سو آدمیوں کے مجمع اور ان کی باہمی آویزش کا نام بجائے جھڑپ کے جنگ اور ''بیٹل'' رکھا جائے۔

بہر حال قریشیوں سے جو کچھ چھیڑ چھاڑ ہوئی' وہ اسی پر ختم ہوگئی نہ ''خندق'' میں بازار قتال گرم ہوا' نہ مکہ میں خون ریزی ہوئی اس کے بعد ایک دو معرکے یہودیوں سے ہوئے' جن میں خیبر سب سے اہم ہے' اس میں اٹھارہ مسلمان شہید اور ترانوے یہودی مارے گئے۔ ''عیسائیوں'' سے ''موتہ'' میں گھسان کی جنگ ہوئی' لیکن اس گھسان میں بھی مسلمانوں کے کل بارہ شہیدوں کا حال معلوم ہوا' اس کے سوا کچھ ڈاکوؤں کا تعاقب ہے' چوروں کا پیچھا کیا گیا' باغیوں کی سرکوبی کے لیے کوئی دستہ روانہ کیا گیا تھا' جس میں اکثر مواقع میں جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی' بہر حال اگر خالص لڑائی اور جہاد کے شہیدوں اور مقتولوں کا حساب کیا جائے تو ان کی تعداد پانچ چھ سو سے زیادہ اس کل دس سال کی مدت کے اندر سارے ملک عرب میں ان شاء اللہ ثابت نہ ہوگی' حالانکہ مقابلہ میں عرب کے وحشی قبائل' طاقت ور جمہوریتیں اور بعض سلاطین بھی تھے لیکن جسے طائف کے بعد سب کچھ دے دیا گیا تھا' کیوں سوچا جاتا ہے کہ اسے کیوں کر ملا' اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا' جس کی زندگی کا ہر واقعہ اس کے کلمۂ دعوت و دعویٰ لا الٰہ الا اللّٰہ کی دلیل ہے' آخر ان واقعات میں بھی اسے کیوں ڈھونڈا جاتا۔

الغرض یہ ہیں کل دس سال اور وہ سارے جنگ و جدال جن کے خون کا افسانہ ہزار ہا بوقلموں رنگوں سے رنگین کر کے دنیا کو سنایا جاتا ہے۔

اب دیکھو کہ جہاں انسان مسجود ملائکہ انسان کی جان ایک مچھر اور مکھی سے بھی زیادہ قیمت نہیں رکھتی تھی' اس کی جان تو بڑی چیز ہے' اس کے کپڑے کا دھاگا بھی رات کی اندھیریوں میں کوئی نکال نہیں سکتا' امن وامان کا دور دورہ ہے۔ عالم پر منطبق کرنے کے لیے انسانی زندگی کے جس آئین و دستور کا نقش مدینہ کے پرچم میں گاڑا گیا تھا اس کے نیچے چلے آتے ہیں' بے تابانہ چلے آتے ہیں' آدم کے بچے ہر چہار طرف سے چلے آتے ہیں' فوج در فوج چلے آتے ہیں' وفود کا تانتا بندھ جاتا ہے۔

پھر کیا مدینہ میں جو پایۂ تخت قائم ہوا' وہاں منبر کی جگہ تخت بچھایا گیا' وہی منبر ہے' وہی مسجد ہے' وہی جھونپڑے ہیں' وہی چمڑے کا اکہرا گدا ہے' نہ حاجب ہیں نہ دربان ہیں' امیر بھی آتے ہیں' اور غریب بھی آتے ہیں' دونوں کے ساتھ ایک معاملہ ہے' عجب! دربار سلاطین کہتے ہیں' شاہی دربار تھا کہ فوج تھی' علم تھا' پولیس تھی' جلاد تھے' محتسب تھے' گورنر تھے' کلکٹر تھے' منصف تھے' ضبط تھا' قانون تھا۔

مولوی کہتے ہیں' مدرسہ تھا کہ درس تھا' وعظ تھا' افتا تھا' قضا تھا' تصنیف تھی' تالیف تھی' محراب تھی' منبر تھا۔

صوفی کہتے ہیں' خانقاہ تھی کہ دعا تھی' جھاڑ تھا' پھونک تھا' ورد تھا' وظیفہ تھا' ذکر تھا' شغل تھا' تخت (چلہ) تھا' گریہ تھا' بکا تھا' وجد تھا' حال تھا' کشف تھا' کرامت تھی' فقر تھا' فاقہ تھا' زہد تھا' قناعت تھی' کنکریاں دی جاتی تھیں کہ کھارے کنوؤں کا پانی میٹھا ہو جائے گا' بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے' جسے جو کہ دیا جاتا ہے پورا ہوتا ہے۔

مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ سب کچھ تھا' اس لیے کہ وہ سب کے لیے آیا تھا۔ آئندہ جس کسی کو چلنا تھا' جہاں کہیں چلنا تھا' جس زمانہ میں چلنا تھا' اسی روشنی میں چلنا تھا۔

یہ تو عرب کے لیے ہوا' عرب ہی کے اندر دیکھو کہ عرب کے باہر کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ اسی دس سال کے عرصے میں مشرق کی سب سے بڑی قوت ''پرشین ایمپائر'' اور مغرب کی سب سے بڑی طاقت ''رومن امپائر'' کے ساتھ اطراف و جوانب کے سلاطین کو بھی چونکا دیا جاتا ہے کہ وقت سے پہلے جاگ جاؤ' جو جاگا اس نے پایا' جو سویا اس نے کھویا' ''کسریٰ'' نے خط پھاڑا' اس کا ملک پھاڑ دیا گیا' ''قیصر'' بھی پھاڑ دیتا' اور خدا کرتا کہ وہ پھاڑ دیتا تو وہ بھی پھٹ جاتا' لیکن معاملہ کو ملتوی کر کے اس نے اپنی قوم اور اپنے ملک کی موت کو ملتوی کرا لیا۔ اور اتنا ملتوی کیا کہ گویا وہ فوج آج تک واپس نہیں ہوئی۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ کب واپس ہوگی' جسے رومیوں کی طرف روانہ کر کے دماغ کے ان عجیب و غریب تجربات دینے والا پاک وجود پھر ''دل'' کے حالات میں مستغرق ہو کر اس بستر پر لیٹ گیا جس پر لیٹنے کے بعد پھر اٹھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے' اللھم صل علیہ وسلم۔

دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ اس بستر پر لیٹنے کی جو آخری رات تھی اس کے روشن کرنے والے چراغ میں تیل کسی غریب پڑوسی سے قرض لے کر آیا تھا' اور جو چادر اس وقت مرض واپسیں کے مریض پر پڑی ہوئی تھی' جب بعد کو دیکھا گیا تو صرف پھٹا ہوا ایک سیاہ کمبل تھا' جس کے اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے اس کی زرہ تیس صاع جو پر ایک یہودی ساہوکار کے یہاں گروی تھی۔

جاننے کے بعد نہ ماننے کے لیے جھوٹ کے بلوں میں پناہ پکڑنے والو! سوچو جسے دیکھ رہے ہو' جو اس بستر پر لیٹا ہوا ہے' انصاف کے خونیو! کیا یہی مکہ کا وہ فقیر ہے جس کے متعلق تمھاری گندی زبانوں نے غل مچایا کہ وہ مدینہ کا بادشاہ ہو گیا تھا اور کیا

آج ہی اس کا یہ حال ہے' دس سال کی اس مدت میں کس نے اس کے گھر سے روز دھواں اٹھتے دیکھا؟ ایسے بادشاہ کس دنیا میں گزرے ہیں جن کے منہ کو جو کے بے چھنے آٹے کی روٹی بھی میسر نہ آئی؟ فقیروں نے بھی کبھی دو دو تین تین مہینے تک صرف پانی اور خشک چھوہاروں پر زندگی گزاری ہے؟ فاقہ مستوں نے بھی کبھی بھوک کی شدت میں پیٹ پر دو دو پتھر باندھے ہیں؟ بادشاہوں کی لڑکیوں کے ہاتھ میں پیسنے کا گٹھا اور گردن میں پانی بھرنے کے نشان دیکھے گئے؟ ایسی شاہزادی زمین کے کس خطہ میں پائی گئی' جسے جس کے بچوں کو دو دو تین تین دن بھوک کی شدت میں دن کو رات اور رات کو دن کرنا پڑا ہے؟

بادشاہوں کا قصر کیا اسی کو کہتے ہیں' جن کے کھجوروں کے پتوں کی چھت سے بھی آدمی کا سر لگتا ہو؟

''مدینہ'' کے بادشاہ کا شاہی محل تو اس وقت بھی موجود ہے' اس کے طول وعرض کو تو اب بھی ناپ سکتے ہو' باہر میں اس کے کچھ بھی ہو' لیکن اندر تو اس کا وہی ہے' جو پہلے تھا۔

بہر حال دس سال تک ''دماغ'' کا بھی اسی طرح کھلی روشنی میں تجربہ کرایا گیا' جس طرح تیرہ سال تک ''دل'' کے مشاہدات پیش کیے گئے۔

اور تم دیکھو کہ اسی عرب میں ایک طرف ان کا نشہ اتارا گیا' جن کی بڑائی میں خدا کی کبریائی کی بھی گنجائش نہ تھی' تو دوسری طرف انھی میں ایک اور نشہ پیدا ہو گیا کہ خدا کی بڑائی کے سوا ان کے اندر کسی کی بڑائی باقی نہ رہے' یہی وہ گروہ تھا' جو ''سینا'' کی روشنی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملائکہ قدوسیوں کی شکل میں نظر آیا' وہی دعویٰ جس کی دلیلیں مسلسل خود اپنے اندر سے اس دعوے کے مدعی اعلان سے پہلے چکا رہا تھا' اسی دعوے کے نسخہ کو ان پر بھی پیش کیا گیا' جنھوں نے جان کر اسے مانا تھا' یہ نسخہ انھیں پلایا گیا۔

اور کسی جنگل یا پہاڑ کے غاروں میں نہیں' تلوار کی چھاؤں میں اس کی مشق کرائی گئی۔ پلا کر بھی دکھایا جاتا تھا' اور چھڑا کر بھی دکھایا جاتا تھا' ''بدر'' میں جب پی کر اترے تو اس کے نتائج بھی ان کے سامنے تھے اور ''احد'' میں جو کچھ ہوا انھی کی بدولت ہوا جن سے پینے میں کچھ کوتاہی ہوئی' مکہ جب فتح ہوا تو سب اسی نشہ میں سرشار تھے۔ ''حنین'' میں جب میدان چھوٹا' تھوڑی دیر کے لیے چھوٹا' تو تم اس کے میدان کے نقشے میں اور اس کی گھاٹیوں' پہاڑیوں میں اس کے اسباب کو کھوجو۔ لیکن میں کیا کروں کہ قرآن نے اس نشہ کی کمی کا ان میں نشان دیا ہے' جس کا انھیں تجربہ کرایا جا رہا تھا۔

تم کہتے ہو کہ وہ ان تیر اندازوں سے بھاگے جو اندر نہیں بلکہ باہر گھاٹیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اور قرآن کہتا ہے' کہ وہ ''مجاریٔ'' اور اکثریت کے اس اعتماد سے بھاگے جو ان کے اندر چھپا ہوا تھا۔

﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا﴾

(التوبہ: 25)

''اور حنین کے دن جب اپنی کثرتِ تعداد نے تمھیں مغرور کر دیا' لیکن یہ کثرتِ تعداد تمھیں فائدہ نہ پہنچا سکی۔''

کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے؟

اگر یہ مقصود نہ تھا تو جسے طائف سے واپسی کے بعد سب کچھ مل چکا تھا' اسے اس ''لاؤ'' اور اس ''لشکر'' کی کیا ضرورت تھی' یوں بھی تو اس کا داہنا ہاتھ عجیب وغریب کمالات دکھاتا تھا' یہ غرض نہ ہوتی تو کیا صرف اسی سے وہ سب کچھ نہیں کر سکتا تھا' اور جب جی چاہا تو کیا خاک کی مٹھی سے اسی نے وہی کام نہیں لیا جو ''ہوئٹزز'' کے لوگوں سے لیا جاتا ہے۔

اندھے ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ خون بہاتا تھا' جس کا خون بہایا گیا' جس کی ڈاڑھی خون سے دھوئی گئی' جس کے دانت توڑے گئے' جس کی پیشانی میں ''زرہ'' کی کڑیاں چھپائی گئیں' نابینو! اسی پر الزام دھرتے ہو کہ اس نے خون بہایا۔

چورو! کوتوال ہی کو الٹے ڈانٹتے ہو' بکف چراغ ہو کر ڈانٹتے ہو' حالانکہ تریسٹھ سال کی طویل مدت عمر میں کیا کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ خونیوں میں پلنے والے اس انسان نے خون تو کیا کسی کا بال بھی توڑا تھا۔

اُف! اگر وہ خون بہانا چاہتا تو پھر ہزاروں کے خون کو صرف ایک کے خون سے کیوں بچاتا' قطرہ بہا کر سمندر کو کیوں باندھتا' یہی یہودی جن کا خون ہر زمانہ اور ہر ملک میں تقریباً ہر صدی میں ارزاں رہا ہے اور اب تک ہے' جب خون کے مستحق ہو چکے تھے' اور ہر اعتبار سے ہو چکے تھے' لیکن ان کے ہزاروں کے خون کو صرف کعب بن اشرف اور رافع بن حقیق' دو ہی آدمیوں کے خون سے کیوں محفوظ کر دیا گیا' بہت بڑا خیر وہ شر ہے' جس کے ذریعہ سے کسی عظیم وجلیل شر کا سدباب ہوتا ہو' قصاص میں زندگی ہے' آخر اس قانون میں اور کیا ہے' بلاشبہ ان دونوں کی موت میں ان تمام یہودیوں کی زندگی کی ضمانت تھی' جو ان کے بعد زندہ رہے' پھلے پھولے' ورنہ جو منصوبے ان دونوں نے پکائے تھے' اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عرب سے یہودیوں کا اسی وقت نام ونشان جاتا رہتا' جیسا کہ ہمیشہ اسی قسم کے بدباطن یہودیوں نے اپنی قوم پر ہر ملک میں ہر زمانہ میں زندگی تلخ کی ہے۔ جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے' بلکہ سچ یہ ہے کہ بنی قریظہ کی چھوٹی جماعت اگرچہ انھی کی شریعت انھی کے حکم سے مٹائی گئی لیکن اسی کے ساتھ کیا اس چھوٹی جماعت کی موت میں عرب کے سارے یہودیوں کی زندگی مستور نہ تھی' سنگ دل اور ظالم ہے وہ جراح جس نے ایک انگلی کے لیے پورے جسم کو سڑنے دیا۔

آخر میں ان تجربات کے سلسلہ میں نادر ترین تجربہ یہ ہے کہ یہی دس سال کا زمانہ ہے' اس کے بھی چند سال گزر چکے ہیں' اور اب وہی جو عرب کے لیے بھی تھا' عجم کے لیے بھی تھا' مردوں کے لیے بھی تھا اور عورتوں کے لیے بھی تھا' زندگی کے آخری دنوں میں ارادہ فرمایا جاتا ہے کہ جس طرح مردوں میں قدوسیوں کی یہ آخری جماعت پیدا کی گئی ہے' سارے جہاں کی عورتوں کے لیے قیامت تک نسلِ انسانی میں جو عورتیں پیدا ہونے والی ہیں ان سب کے لیے ان کی تعلیم کے لیے تربیت کے لیے ان کے نمونہ کے لیے عورتوں کی بھی ایک جماعت تیار کی جائے' شاید یہ قدرت کی طرف سے تھا اور اس

کی کون سی بات قدرتی نہ تھی کہ جہاں سے دنیا کے اس عالمگیر نقشے اور حیات انسانی کے کامل دستور العمل کا جھنڈا اٹھایا جاتا ہے' وہ نہ ''لندن'' ہے نہ ''پیرس'' حتّٰی کہ ''بمبئی'' بھی نہیں اور ''کلکتہ'' بھی نہیں بلکہ سوچو تو بیابان کی اسے ردہ آبادی کی تمدنی وعمرانی لحاظ سے وہ حیثیت بھی نہیں جو ہندوستان کے معمولی اضلاعی شہروں اور قصبوں کی ہے' لیکن دنیا کے اسی دُور افتادہ' ویران' ریگستان' نخلستان میں حیرت ہے کہ سارے جہان کے ''مذاہب و ادیان'' اس لیے اس کے آگے پیش ہو جاتے ہیں کہ تردید و تکذیب نہیں بلکہ سب کی تصدیق' سب کی تصحیح' سب کی تکمیل عملی شکل میں ممکن ہو کہ وہ ''مکذب'' نہیں بلکہ ''مصدق'' تھا اور یہی اس کے دعویٰ کا سب سے بڑا امتیازی نشان ہے۔

ہندو مذہب تو ''وثنیت'' کی شکل میں ''مکہ'' ہی میں موجود تھا۔ ''مدینہ'' آنے کے بعد اس کے آگے دنیا کا دوسرا عالمگیر مذہب ''یہودیت'' بھی سامنے آ گیا۔ اس کے ساتھ خود ''مدینہ'' میں اطراف ''مدینہ'' میں وہ ''نصرانیت'' بھی موجود تھی جس کے زیر اثر دنیا کی آبادی کا بڑا حصہ اس وقت بھی تھا اور اس وقت بھی ہے' اس کے حلقہ میں ''مجوسی'' اور ایران کے آتش پرست زردشتی بھی شریک تھے' اور اردگرد میں ایک فرقہ ''صابئوں'' کا بھی تھا' جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ عرب کے ان ''صابئوں'' کا تعلق ''بودھ مذہب'' کے ''سادھوؤں'' سے تھا' یا ان کے سوا کوئی اور فرقہ تھا جسے دنیا اب نہیں جانتی ہے۔

الغرض! کوہستان کی اس چھوٹی سی بستی میں یہودیت' عیسائیت' ہندویت' یا وثنیت' مجوسیت' اور اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ بودھیت اپنے ان تمام مفاسد کے ساتھ موجود تھی' جن کے دھونے اور جن سے پاک کرنے کے لیے وہ اٹھایا گیا تھا' پس اس نے ان سب کو دھویا' ان سب کو پاک کیا' صاف کیا' جس میں جو کمی تھی سب کو پورا کیا اور قیامت تک کے لیے پورا کیا۔

اور جس طرح دنیا کے ہر مذہب کے مردوں میں قدرت نے اسے کچھ لوگ دیئے دیکھو کہ قریب قریب کچھ اسی طرح سے زندگی کے آخری دنوں میں تقریباً دنیا کے ان تمام بڑے مذاہب کی عورتوں میں سے ایک ایک نمایندہ اس کی خدمت میں قدرت ہی کی جانب سے حاضر کی جاتی ہے' عورتیں اس کی خدمت میں اگر عورتوں کی حیثیت سے آتیں تو کیا وجہ تھی کہ جب مکہ میں ہر قسم کی یہی عورتیں اس کے آگے پیش کی گئیں تو اس بزرگ خاتون کے مقابلہ میں جو عمر میں ان سے پندرہ سال بڑی تھیں' پچاس سال کی عمر تک کسی کو پسند نہیں کیا' پچیس سال کی جوانی سے پچاس سال کی عمر تک تم میں کون نہیں جانتا کہ بجز حضرت خدیجہؓ کے آپ نے کسی سے نکاح نہیں فرمایا' جو نکاح کے وقت چالیس سال کی ہو چکی تھیں اور اس سے پیشتر ان کے دو شوہروں کا انتقال ہو چکا تھا' جو عورت کو عورت کی حیثیت سے اپنے گھر میں لاتا ہے' کیا چالیس سال کی بیوہ کے ساتھ پچاس سال کی پوری زندگی گزار سکتا ہے' ہاں! جب سب کچھ ہو چکا ''دل'' کا بھی تجربہ ختم ہو چکا ''دماغ'' کے تجربات بھی دنیا کے سامنے آ چکے قتل و خون' فتنہ و فساد کا متلاطم سمندر ملک عرب' امن و امان' راحت و آسائش کی چھاؤں کے نیچے زندگی کی قیمت حاصل کرنے لگا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اگرچہ عرب کا اکثر حصہ ہمیشہ سے کسی غیر عرب کا محکوم نہ تھا' لیکن باہم ان میں بڑوں نے چھوٹوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور پھر سب مل کر وہمی مخلوقات کی غلامی کی رسیوں میں گھسٹ رہے تھے' اس غلامی سے انھیں حقیقی آزادی میسر آئی' انسانیت اپنے فطری مقام سے ہٹ کر موچ کھائی ہوئی ہڈی کی مانند بے چین تھی' بے کل تھی' پھر اسے اپنا وہ اصلی مقام نصیب ہوا جس پر پہنچے بغیر قلوب انسانی مطمئن نہیں ہو سکتے ایسی صورت میں پھر یہ کیسا بد اندیشہ اور خبیث خیال ہے کہ آزادی کی اس نعمت سے ایک پورے طبقہ' نصف حصہ کو محروم رکھا جاتا' یہ سچ ہے کہ ان کا' ان بے زبانوں کا کسی نے خیال نہیں کیا' رحم کی نگاہ کسی کی ان پر نہیں پڑی' لیکن کیا کہتے ہو' کہ ''رحمتہ للعالمین'' کی نظر کرم سے بھی یہ بے چاریاں محروم رہتیں' جس طرح اب تک تھیں' ایسا نہیں ہو سکتا تھا' جو سب کے لیے تھا' وہ سب ہی کے لیے ہوا' اور یہ ہو بھی چاہیے تھا' اس نے بے سمجھ' خام فہم' ناتجربہ کار عورتوں انتخاب نہیں کیا کہ انھیں دوسروں کے لیے نمونہ بناتا تھا' اور دیکھو! وقت بھی کم ہے' فرصت تنگ ہو رہی ہے' شاید یہی وجہ ہے کہ چن چن کر مختلف طبائع اور مزاج' مختلف مذاہب اور ادیان کی سن رسیدہ فہمیدہ و سنجیدہ بیوہ عورتیں جو زندگی کے سرد و گرم کا تجربہ کر چکی تھیں' ان کی ایک برگزیدہ پاک منتخب جماعت کو مختلف اسباب و وجوہ کے پردہ میں قدرت نے اس کی خدمت میں اس وقت مہیا کیا' جب اپنے فرض سے سبکدوشی کا وقت آخر ہو رہا تھا' اس کی زندگی کا یہ آخری کارنامہ تھا' کھل چکا تھا' کہ مکہ فتح ہوتا ہے' خدا کی زمین کا ''مرکز'' جھوٹے خداؤں کی نجاست سے پاک ہوتا ہے' جس کے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ ''غیب'' اور اس کے ''آیاتِ کبریٰ'' جس وقت کھولے گئے تھے' آخر میں بانی ''کعبہ'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دیکھنا اس کی دلیل تھی کہ کعبہ کی تطہیر اس کا آخری کام ہوگا ''مرکز اور ام القریٰ'' پر قبضہ دلانا اصل کام تھا اس کے بعد مفصلات اور ''ام القریٰ'' کے ''قری'' جو کعبہ کے چاروں طرف زمین کے آخری حدود تک پھیلے ہوئے ہیں' ان کا کام آنے والوں کے سپرد کر دیا جائے گا اور اسی غیبی مکاشفہ میں نہیں' بلکہ مسلسل ایسے مکاشفے مختلف پیرایوں میں ہو رہے تھے' جن کا مطلب یہی تھا کہ کام ختم ہو رہا ہے' پس اس کام کو کامل طور پر ختم کرنے کے لیے مردوں کے ساتھ چند عورتوں کی تعلیم و تربیت کا کام اپنی آخری زندگی میں اسے اپنے سر لینا پڑا' یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عورتیں خدمت مبارک میں اسی حیثیت سے رہتیں جس حیثیت سے مردوں کی ایک منتخب اور چیدہ جماعت ساتھ رہتی تھی' لیکن ''دماغ'' کی بیداری کا یہ کیسا روشن تجربہ ہے کہ اس نے مصنوعی مذہبی مقتداؤں اور روحانی پیشواؤں کی ان مجرمانہ پیش قدمیوں کا راستہ ان عورتوں سے نکاح کر کے ہمیشہ کے لیے مسدود کر دیا' ہیکل کی خدمت کے لیے عمران کی عورت نے صرف ایک لڑکی پیش کی تھی' دیکھو! اس ایک کنواری کے آڑ میں چرچوں پر' گرجاؤں پر' ان کے اماموں پر' خطیبوں پر' رہبانوں پر' بطریقوں پر کتنی کنواریاں روز بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ خدانخواستہ کسی ایک اجنبی عورت کو نزدیکی کی وہ حیثیت دی جاتی جو باہر میں مردوں کو حاصل تھی

کون اندازہ کرسکتا ہے کہ بعد کو آدم روا ابلیسوں کے لیے قرب و نزدیکی کا یہ حیلہ کن خباثتوں اور شرارتوں کی بنیاد بن جاتا' جب کوئی نمونہ نہیں موجود ہے' اس وقت تو بغیر نمونہ کے زندگی گزارنے والوں نے فتنے برپا کیے' خدانخواستہ اگر ''نیم بیضہ'' بھی میسر ہو جاتا تو پھر بیچ میں کتنے ہزار مرغ گھسے جاتے' اس کا کون اندازہ کرسکتا ہے؟

الغرض ان عورتوں کو ''بیوی'' کا مقام عطا کیا اور جسے انسان سوچ نہیں سکتا' اس حد تک ان کے ساتھ حقیقی عدل اور برابری کا نمونہ اس نے پیش کیا' جس کا ''دماغ''، عالمگیر حکومت' عالمگیر سیاست' ہمہ گیر تعلیم و تربیت کی الجھی ہوئی پیچ در پیچ گتھیوں کے سلجھانے میں اسی وقت مصروف تھا' جس وقت ''عائلی'' اور ''خانگی'' زندگی کی ژولیدگیوں کو بھی بہ کشادہ پیشانی حل کررہا تھا' اور اس آسانی کے ساتھ حل کررہا تھا کہ خواہ اس کی مدت کتنی ہی کم ہو' لیکن بداندیشوں یا وہ خیالوں کو دور سے زندگی ایسی سلجھی ہوئی خوش گوار لذیذ نظر آئی کہ بدبختوں نے اپنے اندر برے خیالات پکائے' گویا سچ مچ اس خیر میں کوئی شر نہیں' اور اس راحت میں کوئی زحمت نہیں تھی' ایک بیوی کے تعلقات کی شیرینی کو مسلسل تلخیوں سے بدلنے والے کیا یہ سوچ سکتے ہیں؟ البتہ اس کا اندازہ وہ ضرور کرسکتے ہیں کہ چند بیویوں کے تعلقات کو خوش گوار رکھنا فطرت انسان کا اعجاز نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ بلاشبہ یہی ایک ''عائلی'' تجربہ بھی ان بد دماغوں اور بدعقلوں کے لیے کافی ہے' جو جاننے کے بعد ماننے سے اس لیے ہچکچاتے تھے کہ ''دل'' میں تو نہیں لیکن ''عقل'' اور ''دماغ'' کے نظم میں انھیں بدنظمی کا اندیشہ ہوا' جس کی زندگی کا ہر شعبہ شخصی' عائلی' خاندانی' قومی' سیاسی' صرف ضبط اور نظم ہے' اس کے متعلق یہ وسوسہ خود سوچنے والوں کی کیا عقلی بدنظمی کی کھلی دلیل نہیں ہے؟ یہی نہیں بلکہ سچ یہ ہے کہ زندگی کے اس قلیل حصہ کا کوئی دقیقہ' کوئی نکتہ ایسا نہ تھا جو نگاہ سے اوجھل ہو۔ دیکھ چکے کہ دنیا کی عورتوں کے لیے جو نمونہ بنائی گئیں' ان میں سے سب کی سب سن رسیدہ تجربہ کار بیوہ عورتیں ہیں' جیسا کہ مردوں کے لیے جو جماعت نمونہ بنائی گئی ان میں بھی زیادہ تر تجربہ کار' سرگرم چشیدہ لوگ تھے' ایک ایک ان میں ایسا تھا جو ملکوں پر بھاری' قوموں پر گراں ثابت ہوا۔

لیکن دقیقہ سنجیوں' نکتہ نوازیوں کے اس سلسلہ میں انتہا اس وقت ہوتی ہے' جب کہ ایک طرف اگر مردوں کے نمونہ میں ایک ایسا نمونہ ہے' جس کا ''دل'' جس کا ''دماغ'' جس کا ''ظاہر'' جس کا ''باطن'' ہر قسم کے اجنبی اثرات سے قطعاً آزاد ہے' اسی صحبت میں اس نے آنکھیں کھولیں' انھی کی گود میں اس نے ہوش سنبھالا۔ آخر وقت تک وہ اسی حال میں رہا۔

پھر جس طرح مردوں کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شکل میں ایسا نمونہ دیا گیا جو دو سال کی عمر سے اس وقت خدمت مبارک سے علیحدہ ہوئے جب لوگوں نے مرقد انور سے انھیں نکلتے دیکھا' کیا ظلم نہ ہوتا اگر بے زبان عورتوں کو اس بے نظیر' ناگزیر نمونہ سے محروم رکھا جاتا' یہی وجہ ہے کہ تم دیکھتے ہوئے کہ سن رسیدہ اور ادھیڑ بلکہ بعض بوڑھی عورتوں کے اسی مجمع میں' ایک وہ طاہرہ طیبہ' صدیقہ' کنواری بیوی صاحبہ بھی ہیں جنھیں آپ نے اپنے زیر اثر سات ہی سال کی عمر سے لے لیا تھا' اور قبل اس کے کہ ان کا ''دل'' ان کا ''دماغ'' کسی غیر نبوی اثرات کو غیر شعوری طور پر جذب کرئے نویں سال کی عمر میں اپنی رفاقت میں لے لیا' عموماً سفر و حضر میں ساتھ رکھا' پھر دیکھو کہ جس طرح مردوں کے اس ''مظہر عجائب و غرائب'' وجود سے دنیا کو اگر وہ سب کچھ ملا جو کسی دوسرے سے نہیں ملا تو کیا ٹھیک اسی طرح اس عجیب و غریب ذہن و ذکا' فضل و کمال' تقویٰ و عفت کے سرچشمہ سے دنیا کو جو دولت تقسیم ہوئی صرف عورتوں ہی میں نہیں کہ وہ تو ان کا گروہ ہی تھا' غالباً مردوں کو بھی کسی دوسرے سے اتنا نہیں ملا؟

محدثین سے پوچھو! وہ کیا کہتے ہیں۔

الغرض ہر قسم کے شکوک شبہات' وساوس و اوہام کی تاریکیوں' ادنیٰ سے ادنیٰ تاریکیوں کو چیرتا پھاڑتا ہوا دعوے کا وہ آفتاب جس کی صبح کا سپیدہ حراء کے دامن سے پھوٹا تھا' ''مکہ'' کے افق سے چڑھتا ہوا تئیس سال کی مدت میں مدینہ کے سمت الراس پر پہنچ کر انتہائی کمال و جمال کے ساتھ دیکھو کہ کس شان' کس آن کے ساتھ چمک رہا ہے' آفتاب! دعویٰ کا یہ عجیب و غریب آفتاب جس کے طلوع سے پہلے بھی روشنی تھی' اور جس کے ساتھ بھی روشنی ہے' جس کے باہر بھی روشنی ہے' جس کے اندر بھی روشنی ہے' وہ خود بھی نور ہے' جس سے نکلا وہ بھی نور ہے۔ ''نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ'' کا یہی نورانی نظارہ جسے دنیا کی آنکھوں کے نور نے کبھی نہیں دیکھا تھا' لیکن اب ہمیشہ دیکھتی رہے گی' سب کو دکھایا جائے گا' سب دیکھ رہے ہیں' ''ظاہر'' کے ''باطن'' کے ''دل'' کے ''دماغ'' کے تجربات بینہ کی شعاعوں سے ''آسمانی علم'' اور ''لاہوتی عرفان'' کا یہ آفتاب دمک رہا ہے' چمک رہا ہے' بلکہ سچ پوچھو! تو بھبک رہا ہے' لہک رہا ہے' چھلک رہا ہے۔

عرب کا وسیع صحراء اس کے لیے تنگ ہے' وہ بڑھنا چاہتا ہے' طوفان کی طرح بڑھنا چاہتا ہے' آندھی کی طرح بڑھنا چاہتا ہے' اور دیکھو کہ وہ بڑھ گیا' چڑھ گیا' ساری دنیا پر پھیل گیا اور اب تک اسی آب و تاب جاہ و جلال کے ساتھ کائنات' ساری کائنات کے افق پر اسی طرح چمک رہا ہے' جس طرح وہ اس وقت چمک رہا تھا' جب وہ عرب سے نکلا تھا' یقین و قطعیت کی تیز اور ٹھنڈی روشنی میں اسے آج والے بھی اسی طرح پا رہے ہیں' جس طرح کل والوں نے اسے اس وقت دیکھا تھا' جس وقت وہ انھیں' ان کی ایک بڑی جماعت کو اپنی زندگی کے عمیق سے عمیق' باریک سے باریک پہلوؤں کا کھلے بندوں علانیہ تجربہ کرا رہا تھا۔

گلیلی جھیل کے چند ماہی گیر یا مگدھ دیش کے گداگر بھکشو نہیں بلکہ ہزارہا انسان ایسے انسان جن پر اس عہد کی ساری بڑائیاں ختم ہوتی تھیں' ان میں بادشاہ بھی تھے اور دنیا کے سب سے بڑے بادشاہ ان میں کمانڈر بھی تھے' اور دنیا کے سب سے بڑے کمانڈر، ان میں دماغ والے بھی تھے' سب سے زیادہ بیدار دماغ والے' ان میں دل والے بھی تھے' سب سے زیادہ روشن دل والے' الغرض انسانیت کی جتنی اونچی سی منزلیں سوچی جاسکتی ہیں۔

تجربہ کاروں کی یہ جماعت ان کی آخری بلندیوں پر ساری دنیا کے آگے مضبوطی،

کے ساتھ قدم جما کر اس کا ثبوت پیش کر رہی تھی کہ اس وقت کی دنیا میں ان سے اونچا کوئی نہیں ہے کہیں نہیں ہے۔

نبوت! اور کیسی عجیب نبوت! تجربہ! اور کیسا عجیب تجربہ! کتنا روشن تجربہ، کتنا نکھرا ہوا صاف تجربہ، ہر قسم کی آلائشوں اور کدورتوں سے پاک وصاف تجربہ، کتنی عظیم دانائیوں کا پرکھا ہوا تجربہ، کتنی نازک ذہانتوں کا جانچا ہوا تجربہ، کتنی روشن فطرتوں کا ناپا ہوا تجربہ، کتنی بے رعب، بے جھجک طبیعتوں کا بے لاگ تجربہ، کتنے متوازن معتدل دماغوں کا ناپا تلا تجربہ، چند نہیں، فوج در فوج، نسل آدم کی غٹ کی غٹ، جوق در جوق افراد کا تجربہ، اتنے افراد کا تجربہ کہ دنیا کے کسی مسئلہ یا حقیقت کے لیے نہ آج تک انسانوں کی اتنی بڑی جماعت اکٹھی ہوئی، اور نہ شاید آئندہ ہو سکتی ہے۔

تجربات ومشاہدات کا یہی حیرت انگیز ذخیرہ تھا جس کی حفاظت ونگرانی کا فرض کسی خانقاہ کے درویشوں یا کسی مدرسہ کے معلموں یا کسی انجمن کے ممبروں یا کانفرنس کے دفتریوں یا کسی افسانہ نگار مورخ کی انگلیوں کے سپرد نہیں کیا گیا، بلکہ سب جانتے ہیں کہ زمین پر روئے زمین پر اس زمانہ کی جو سب سے بڑی قاہرہ سلطنت تھی اس نے اپنا پہلا فریضہ بھی اسی کی حفاظت وتبلیغ قرار دیا: اور اس کا آخری فریضہ بھی یہی تھا، درمیان کے جتنے مقدمات تھے وہ صرف اسی مقصد کے حصول کے ذرائع تھے، دنیا کی اس سب سے بڑی سلطنت نے اپنی ہر قسم کی قوتوں کو صرف اسی کی نگرانی اور نشرو اشاعت کے لیے مخصوص اور محدود کر دیا۔

طاقت کی ان آہنی زنجیروں کی بندش میں حکومت ہی کی سر پرستی میں اس کی تاریخ کا آغاز ہوا، اور دیکھو کہ مسلسل اسی طرح ایک حکومت دوسری حکومت کو یہ ودیعت سونپتی چلی آئی حالانکہ زمانہ کی اس طویل ودراز مدت میں زمین کے مختلف علاقوں میں باہم ان سلطنتوں کے دوسرے اغراض ومقاصد میں خواہ جس قدر بھی اختلاف رہا ہو، لیکن اس ''آسمانی ودیعت''، ان درخشاں تجربات ''بینہ'' ان ''عینی مشاہدات'' کی غور و پرداخت، تبلیغ وحفاظت میں، سب کے نقاط وارادے قطعی طور پر متحد تھے، بلکہ ہر حکومت نے کوشش کی کہ سعادت کے اس سلسلہ میں جتنا زیادہ حصہ اسے مل سکے اس کے حصول میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا جائے، اس کے لیے مدارس کھولے گئے، خانقاہوں کا جال بچھایا گیا، مجلسیں ترتیب دی گئیں، حلقے قائم ہوئے، تصنیف وتالیف کا باب کھولا گیا، اور بڑے بڑے عظیم پیمانوں پر کھولا گیا، ایسے پیمانوں پر کھولا گیا کہ شاید دنیا کے کسی ایک فن، ایک علم کے متعلق نہ کبھی دنیا میں اتنے بڑے بڑے عظیم الشان مدرسے کھلے نہ تصنیفی کوششوں کا اتنا عظیم حصہ انسانی تاریخ میں کسی ایک علم یا فن کو ملا، جتنا کہ اس عجیب و غریب نبوت کے تجربات ومشاہدات کو ملا، اور یوں ہی مسلسل بغیر کسی انقطاع اور کسی وقفہ کے ایک قرن سے دوسرے قرن تک، ایک نسل سے دوسری نسل تک نبوت کا یہ لازوال ابدی، سرمدی، قیم خزانہ منتقل ہوتا رہا، اور اس وقت تک ہو رہا ہے، ہوتا چلا جائے گا، صرف یہی نہیں بلکہ ہر پچھلے طبقہ میں تم دیکھو گے کہ نبوت کے اس تجربہ کی گواہی ادا کرنے والوں میں اضافہ ہوتا رہا، اور کیسا اضافہ؟ ایک اور دو کی نسبت نہیں، ایک اور تین کی نسبت نہیں، دگنے اور تگنے کی حد تک کا اضافہ نہیں، بلکہ بلا مبالغہ ایک اور لاکھ کی نسبت سے یہ اضافہ بتدریج بڑھتا رہا، اور بڑھ رہا ہے، بڑھتا رہے گا، تا ایں کہ ساری نسلِ انسانی اس کی گواہ بن جائے۔

اور اسی تدریجی اضافہ کی نسبتوں کے ساتھ سلطنتوں کے پرجلال پرشوکت جلو، بادشاہوں کے شاہانہ اور کڑے پہرے، علماء کی سخت ترین ماہرانہ چوکسی، فقر صوفیہ کی باوقار پرعظمت نگرانی اور امت مرحومہ اسلامیہ کی فطری بیدار دماغی، طبعی ذکاوتِ حسی کے حصار میں صدیوں اور سالوں کا کیا ذکر ہے، بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے اور کہنا چاہیے، اس کے سوا جو کچھ کہا جائے گا، جھوٹ ہوگا کہ ایک لحہ، ایک پل کے ادنیٰ ترین حصہ کے انقطاع کے بغیر ٹھیک اسی آن بان، اسی سج دھج کے ساتھ امت کے ان افراد کو ملتا رہا، اس وقت تک مل رہا ہے، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے رسول کی صحبت سے فیض یاب نہیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ نہ ان کا رسول ﷺ ایک سیکنڈ کے لیے ان سے اوجھل ہوا اور نہ وہ اپنے رسول ﷺ سے غائب ہوئے۔ سعادت صحبت سے بہرہ مند اگر کہ سکتے تھے اور ان کو کہنے کا حق تھا کہ وہ اپنی نمازوں میں وہی پڑھتے ہیں، جو ان کا رسول پڑھتا تھا (ﷺ) وہ اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں جس طرح وہ پیشانی رکھتا تھا، تو قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ جنھیں یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی، ہر قرن، ہر صدی بلکہ اس وقت بھی جہاں کہیں ہیں قسم کھا کر کہ سکتے ہیں کہ وہ بھی وہی پڑھتے ہیں جو ان کا رسول ﷺ پڑھتا تھا، اسی طرح کھڑے ہوتے ہیں جس طرح وہ کھڑا ہوتا تھا، اسی طرح جھکتے ہیں جس طرح وہ جھکتا تھا، اسی طرح زمین پر پیشانی رکھتے ہیں جس طرح وہ رکھتا تھا، سبھوں نے تو خدا کی تصویر کھینچی، لیکن ایسا کون ہے، جس کی بندگی کی تشکیل اس طرح کی گئی، ''ہو بہو''، ''من وعن''، جیسا کہ وہ تھا وہ متشکل کیا گیا، کیا جا رہا ہے اور کامل یقین کے ساتھ کیا جا رہا ہے کہ اس کے ساتھ قطعاً وہ واقعات پیش نہیں آئے، ہاں! جس طرح پہلوں کی کتاب چھن گئی۔ انھیں ان کے رسولوں اوتاروں سے جدا کیا گیا، کیا کوئی دکھا سکتا ہے، ان کے ساتھ بھی سال دو سال کے لیے نہیں روز دو روز، گھنٹے دو گھنٹے، سیکنڈ دو سیکنڈ کے لیے بھی (لا فعلہ اللّٰہ) ایسا واقعہ پیش آیا، اور جس نے دنیا کے کسی گوشہ میں کبھی ایسا ارادہ کیا، کیا مسلسل نہیں دیکھا گیا کہ جس نے چھیننا چاہا، وہی چھینا گیا، جس نے جدا کرنے کا خیال پکایا، وہی جدا کیا گیا، یہی ہوتا رہے گا، جس پر یہ گریں گے وہ بھی ٹوٹے گا، اور جو ان پر گرے گا وہ چکنا چور ہوگا، پھٹے ہوئے نہیں بلکہ تاریخ کے کھلے ہوئے مسلسل اوراق میں یہی لکھا ہوا ہے یہی لکھا جائے گا۔ بہر حال یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا، تا ایں کہ بالآخر تاریخ کے اس عجوبہ طراز عہد میں نسلِ انسانی داخل ہو گئی، جس میں ہر بعید قریب، ہر دور نزدیک بلکہ شاید ہر غائب حاضر ہو گیا، مکانی فاصلے حذف ہو گئے اور وہی دنیا جو کبھی متعدد دنیا سمجھی جاتی تھی، ایک دنیا بلکہ اگر کہو تو کہ سکتے ہو کہ ایک بستی ہو گئی، زمانی مسافتیں کم ہو گئیں بلکہ شاید زمانہ کے تین قسموں اور تین حصوں میں سے

حصہ ماضی کا تقریباً قابلِ ذکر نہیں رہا کہ اب جو گزرتا ہے وہ نہیں گزرتا ہے اور جو اب ہوتا ہے حاضر ہی رہتا ہے وہی نہیں جنھیں دنیا میں کچھ اہمیت حاصل ہے بلکہ دنیا ادنیٰ ادنیٰ پیداوار جو کبھی پیدا ہونے کے ساتھ ہی مٹ جاتی تھی وہ بھی ان مٹ ہوگئی ہے۔ قدرت نے اپنی پوشیدہ طاقتوں کا خزانہ پریس، تار برق، لاسلکی فون وغیرہ کی شکلوں میں اسی کے ساتھ وقف عام فرما دیا ہے آخر آج کون گن سکتا ہے ان ذرائع اور وسائل کو جن کے ذریعہ سے دنیا کے حوادثات و واقعات، تحریریں، تقریریں محفوظ ہو رہی ہیں، ان و بازار میں آج یہ چیزیں ماری پھرتی ہیں اور ہر اعلیٰ و ادنیٰ کو میسر ہیں آج کوئی امانت کی اندر سبھا اور ''شرر'' کے ناول کو مٹا نہیں سکتا پھر یہ اندیشہ اب کون کر سکتا ہے کہ تجربات کے ان ذخیروں کو اب دنیا کا کوئی حادثہ فنا کر سکتا ہے؟

ان ساز و سامانوں کے بعد کس قدر عجیب ہے اگر کہا جائے کہ جو رسول ﷺ عرب میں پیدا ہوئے تھے وہ عرب ہی میں پیدا ہوئے تھے اور جس کی ولادت چھٹی صدی ہجری میں ہوئی تھی وہ چھٹی صدی ہی میں ہوئی تھی۔

اس زمانہ کے جب ہر غائب کو حاضر اور ہر بعید کو قریب سمجھا جاتا ہے کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ پھر ان تمام غائبوں میں جو سب سے زیادہ حاضر اور ایسا حاضر کہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اتنا حضور ہم میں سے کسی کو خود اپنے سامنے نہیں ان تمام بعیدوں میں جو سب سے زیادہ قریب اور اتنا قریب ہے کہ خود ہم اپنے سامنے اپنے کو اس قدر قریب نہیں پاتے۔

آخر ہم میں کون ہے جس کے دماغ میں اپنی پیدائش، طفولیت، شباب، کہولت، خلوت، جلوت کے تمام واقعات اور اس کے تمام پہلو اتنی صفائی کے ساتھ موجود ہوں جتنی تابناکی کے ساتھ دنیا اس شخص کے متعلق جانتی ہے جو اگرچہ آج سے صدیوں پہلے عرب میں ظاہر ہوا لیکن جس کے ظہور کی شدت ہر پچھلی صدی میں پہلی سے زیادہ محسوس کی گئی کی جا رہی ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ اسی بڑھتی ہوئی اشتدادی کیفیت کے ساتھ محسوس کی جائے گی کہ قدرت نے اب جن سامانوں کو پیدا کیا ہے ان کا یہ لازمی نتیجہ ہے اور شاید اس ہستی مبارک کے اسی غیر منقطع ارتقائی تسلسل کا نتیجہ ہے کہ اس کے بعد نبوت کا دعویٰ دور از کار ہے اس دعویٰ کا ہر مدعی فالتو اور زمین کی پشت کا بالکل غیر ضروری بار ٹھہرایا گیا چھٹی صدی عیسوی کے بعد زمانہ کے ہر حصہ میں ٹھہرایا گیا دنیا کے ہر خطہ میں ٹھہرایا گیا۔

اور جن بدبختوں کے دل میں کبھی اس منصب کی جھوٹی ہوک اٹھتی ہے یا اٹھوائی جاتی ہے تم دیکھو! خلاف دستور بنی آدم کتنی بدسلوکیوں کے ساتھ آخر وقت تک اسے دُردُراتے دھتکارتے رہے اٹھنے کو تو یہ اٹھ جاتے ہیں لیکن چند مغالطی پینتروں کے بعد ہی انھیں خود یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں کوئی کام نہیں بنی آدم کی بستیوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے پھریوں ہی بازاری بے روزگاروں کی طرح بالآخر سرگردانی کے ساتھ بھٹکتے بھٹکاتے بہ ہزار حسرت و ناکامی نامرادی کے گڑھوں میں ہمیشہ کے لیے مدفون ہو گئے تاریخ شاہد ہے کہ بوالہوسیوں کے بھپھاروں سے بے چین و مدہوش ہو ہو کر اگر کوئی نبوت کا نام لے کر کبھی اٹھا بھی تو قدرت کے انھیں ہاتھوں نے جلتی ہوئی گھاس کے خاکستر کے مانند اسے وہیں بٹھا دیا چودہ سو سال کا یہ تجربی مشاہدہ ہے حالانکہ اس سے پہلے تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا کہ چار پانچ سو سال کے اندر کوئی نبی نہ آیا ہو اس کی ضرورت نہ پیدا ہوئی ہو۔

اگرچہ کھلے کھلے صاف غیر مبہم لفظوں میں بار بار اس کی منادی بھی کر دی گئی تھی اور نبوت و رسالت کے سلسلہ میں یہ پہلی منادی تھی کہ اب آسمان کا پیغام لے کر زمین والوں کے پاس کوئی نہیں آئے گا یہی وجہ ہے کہ ختم نبوت کی اس سنگین مہر سے جو بھی ٹکراتا ہے وہی پاش پاش ہو جاتا ہے اور قدرت کی چٹان پر سر مارنے کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ بالفرض اگر یہ اعلان نہ بھی ہوتا جب بھی آخر دنیا کیا کرتی۔ آنے والے تو ہمیشہ اسی وقت آتے ہیں ان میں آتے ہیں جب جانے والا بھی جا چکے لیکن ایسا آنے والا جو اس شان کے ساتھ آیا کہ بجائے جانے کے وہ آگے ہی بڑھتا رہا بڑھ رہا ہے گنجائش ہی کیا ہے کہ اس کی جگہ دوسرا آئے۔

جس طرح وہ بھیجا گیا جس صفات و کمالات کے ساتھ بھیجا گیا اسی شان اسی آن کے ساتھ چمکتے ہوئے آفتاب اور دمکتے ہوئے سورج کے مانند ہم میں وہ اسی طرح موجود ہے ہر جگہ موجود ہے ہر خطے میں موجود ہے اس کا وجود مغرب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح مشرق میں وہ آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے شاہوں کے قصور اور غریبوں کے کلبہائے دیجور دونوں کو روشنی بانٹ رہا ہے اور یکسانی کے ساتھ بانٹ رہا ہے وہ سب کے لیے برابر ہے سب کے لیے یکساں ہے وہ فضا میں بھری ہوئی ہوا ہے جس میں سب سانس لیتے اور وسعت کون و مکان کا وہ نور ہے جس میں سب چلتے ہیں پلتے ہیں پھولتے ہیں پھلتے ہیں یقیناً اس کی ضرورت جتنی چھٹی صدی کے باشندوں کو تھی اتنی ہی ضرورت اس وقت تک باقی ہے پھر جب تک پیاس ہے پانی چھلکے گا اور جب تک بھوک ہے روٹی معدوم نہ ہوگی آخر اس وقت تک کیا تھا جواب نہیں ہے یہ سچ ہے کہ دنیا اپنے خالق سے ٹوٹ کر اس زمانہ میں مخلوقات کے اندر غرق تھی لیکن کیا آدم کی اولاد تباہی کے اس گرداب سے نجات پا چکی؟

بلاشبہ جنھیں اس کی برکت میسر آئی ہے ان میں اکثروں کا ان کا جو مرتد یا منافق نہیں ہیں ان کا بیڑہ خطرہ سے ان شاء اللہ نکل چکا ہے لیکن کون کہتا ہے کہ سب کا نکل چکا ہے؟ پھڑ پھڑا رہے ہیں ہندوستان کے ایک قطعہ اراضی میں اتنے پھڑ پھڑا رہے ہیں کہ ان کا شمار صد و ہزار سے نہیں بلکہ کروڑوں سے کیا جاتا ہے اور یہ تو صرف ہندوستان کا حال ہے اس ملک سے باہر بھی کیا کام پورا ہو گیا ہے؟

آباد جزیروں کے اس جنگل میں جہاں آفتاب نکلتا ہے اور مشرق کا وہ گنجان خطہ جہاں بنی نوع انسان کی سب سے بڑی آبادی ہے کیا چین و جاپان کے ان باشندوں کی اپنے مالک سے صلح ہو چکی ہے؟ یقیناً ایک گروہ وہاں بھی ایسا پایا ہو چکا ہے جس نے مخلوقات کی بندگی کا جوا گردن سے پھینک کر حقیقی اور سچی زندگی حاصل کی ہے لیکن کون نہیں جانتا کہ ان ممالک کی اکثریت ابھی اسی طرح اپنے مالک سے روٹھی ہوئی ہے

جس طرح اس کے آباء اجداد روٹھے ہوئے تھے۔ غریب مشرق تو پسماندگان کا ملک ہے' لیکن جن کی پیش گامیوں کا ڈھنڈورا اس زور سے پیٹا جارہا ہے' کیا یورپ کے ان باشندوں کی سمجھ سیدھی ہو چکی ہے۔ ''باپ بیٹے'' کے قدیم افسانے کو تو چھوڑ و' لیکن جن خلقتوں کی ''ایجاد و تخلیق کی انھیں توفیق بخشی گئی' بجائے توفیق بخشنے والے کے خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ان مخلوقات کو اپنے دلوں میں نہیں بٹھائے ہوئے ہیں؟ یقیناً ان کے قلوب ان جدید مخلوقات کی انتہائی عظمت سے اسی طرح لبریز ہیں' جس طرح ان کے بزرگوں کے دل پرانی مخلوقات کے احترام سے معمور تھے۔

پہلوں کی عقل کو سورج کی شعاعوں' اور آگ کے شعلوں نے خیرہ کیا تھا' تو کیا پچھلوں کے سینوں میں برق کی قوتوں' اسٹیم کی طاقتوں' پٹرول کی توانائیوں نے چکا چوند نہیں لگائی ہے' بزرگوں کے کارناموں' سورماؤں کی اولوالعزمیوں نے اگر پہلوں کو ان بزرگوں کی پتھر کی کھودی ہوئی مورتیوں کے آگے جھکایا تھا' تو پچھلوں کے لیڈروں' زعیموں اور قائدوں کے کاموں نے ان کے اسٹیچو اور فوٹو کے ساتھ ان کی ساری قومی عزت وفلاح کو وابستہ نہیں کیا ہے؟

پرانوں کے دیوتاؤں کی گنتیوں کو سن کر تم قہقہے لگاتے ہو' ہنستے ہو' جب سنایا جاتا ہے کہ احمق ہندوستان خالق سے ٹوٹ کر چالیس کروڑ دیوتاؤں اور معبودوں کے ساتھ جکڑا ہوا تھا' مگر کوئی ہوتا جو ان نت نئے دیوتاؤں کی فہرست بتاتا' جن کے ساتھ فرزانہ دانا یورپ کی روح اس طرح خالق سے بیگانہ ہو کر ڈوبی ہوئی ہے' آخر بتایا جائے' ان دونوں نئے اور پرانے طبقوں میں کیا فرق ہے' خالق سے یہ بھی دور وہ بھی دور' مخلوقات کے بوجھ سے یہ بھی چور وہ بھی چور' کچھ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر ہے کہ پرانوں کے معبود بھی پرانے تھے اور نیؤں کے معبود بھی نئے ہیں' پرانوں کے معبودوں میں عجائب وغرائب اور نت نئے فوائد نظر آئے تھے' اور نیؤ کو نئی مخلوقات میں عجائب وغرائب نت نئے فوائد نظر آرہے ہیں' مظاہر احترام اور تعظیم کے بیرونی قالبوں کی خصوصیتوں سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو ناپ لیا جاسکتا ہے' اگر قلبی احساسات' اور ذہنی کیفیات کے ناپنے کا کوئی آلہ ہوتا کہ پرانوں کے دلوں میں پرانے معبودوں کے متعلق جو کچھ تھا' نیؤ کے قلوب میں معبودوں کے متعلق وہی کچھ بلکہ شاید کہ اس سے زیادہ ہو۔

پرانے بھی تنہا خدا کے نام پر بھر جاتے تھے' نیؤ کے سامنے جا کر آج خدا کا تنہا کیا بلکہ ان معبودوں کے ساتھ ملا کر بھی نام لو' پھر دیکھو کہ ان کی پیشانی کی کھال کس طرح سکڑتی ہے' اور منہ سے کتنے تولے کف کے اڑ اڑ کے بیچارے نام لینے والے کے چہرے پر پڑتے ہیں' تحریروں میں' تقریروں میں' گفتگوؤں میں' تذکروں میں' کیا نیؤ کا یہ گروہ اپنے معبودوں کا نام لیے بغیر کبھی گزرتا ہے' برق کا' بھاپ کا' تارکا' ریل کا' سیاروں کا' طیاروں کا' فیکٹریوں کا' ملوں کا' بینکوں کا' سرمایوں کا ان کی مختلف شکلوں مثلاً انشورنسوں' ریسوں اور خدا جانے کن کن خداؤں کا نام آج دل چسپی کے ساتھ جس ذوق' شوق کے ساتھ لیا جاتا ہے' مشکل ہے کہ خالق کے پوجنے والوں نے اتنے ذوق وشوق کے ساتھ بسم اللہ' سبحان اللہ' الحمد للہ' لا الٰہ الا اللہ کا ذکر کبھی کیا ہو۔

یہ حمد بھی کرتے ہیں تو انھی خداؤں کی' نعت بھی لکھتے ہیں تو انھی کی' پھر میں کیا غلط سمجھا جب میں نے کہا کہ جو پرانے تھے' وہی نئے ہیں' چند مخلوقات کے گرد پالتیاں مارے وہ بھی بیٹھے تھے اور ٹھیک اسی طرح فطرت کے چند نوامیس وقوانین کے آگے بھی محو رقص ورامشگری ہیں وہ ان کا بھجن گاتے تھے' یہ ان کا شکر کرتے ہیں:

﴿اَتَوَاصَوْا بِهٖ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ﴾ (الذّاریات: 53)

تم کہتے ہو کہ پہلوں نے انسانیت کو ذلیل کیا' جو سب سے اونچا تھا وہ سب سے نیچا اور اسفل سافلین کے درجہ پر پہنچایا گیا۔

بلاشبہ یہی ہوا' یہی ہونا بھی چاہیے کہ خالق ایک ہے اور مخلوقات لامحدود ہیں' جس نے ایک کو چھوڑا' اسے ہر ایک سے جوڑنا پڑے گا' جو ایک سے نہیں ڈرے گا' ہر ایک سے ڈرنا پڑے گا جو جھکنے ہی کے لیے ہے' اسے جھکنا ہی پڑے گا۔

لیکن ایک کے آگے جھکا تو سب اس کے آگے جھکیں گے اور جس نے ایک کے آگے سر ٹیکنے سے انکار کیا' دیکھو! وہ ہر ایک کے آگے سر ٹیکے پڑے ہیں' ملائکہ کے آگے جن کے آگے' انس کے آگے' حیوانات کے آگے' نباتات کے آگے' جمادات کے آگے اور میں کیا دکھاؤں کہ جو دیکھا نہیں جاسکتا' اس کے آگے۔

یہی وہ عذاب ہے' جو آخرت سے پہلے انھیں دنیا میں چکھنا پڑا چکھ رہے ہیں' برضا ورغبت چکھ رہے ہیں۔

مگر کیا انسانیت کی یہ توہین صرف پہلوں میں تھی' پرانوں نے خالق کے منکر ہونے سے انکار کیا' بیشک اس کے صلہ میں انھیں بندروں کو مسجود بنانا پڑا لیکن جن لوگوں نے اپنے تئیں خدا کی مخلوق ہونے میں شک کیا تھا' آج بندر کے مولود ہونے کا زبانوں میں کیوں اقرار کررہے ہیں' جس نے بندر کو معبود بنایا' کیا شبہ ہے کہ اس نے انسانیت کو رسوا کیا' لیکن جس نے خدا کی مخلوق ہونے سے انکار کرکے بندر کے مسعود ہونے پر فخر کیا' کتابیں لکھیں' دلائل قائم کیے' کررہے ہیں' کیا انسانیت کی خواری میں انھوں نے کوئی کمی کی ہے اور صحیح تو یہ ہے جو ہر چیز کی قیمت لگاتے ہوئے یکا یک چیخ اٹھتے ہیں کہ نفسانیت کی کوئی قیمت نہیں ہے' سب انسان کے لیے ہیں' پر انسان کسی کے لیے نہیں' کسی مقصد کے لیے نہیں' کیا اس نے انسانیت کو ان عفونتوں اور غلاظتوں سے بدتر نہیں ٹھہرایا' جن سے انسانوں کے کتنے مقاصد وابستہ ہیں' انھوں نے کہا کہ انسان اپنے خدا اور خالق کے لیے نہیں ہے' تو کیا اس کے بعد یہ شبہ کرسکتے ہیں کہ انسان کسی کے لیے بھی ہے' پانی کا کیا بگڑے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ ہوا کیوں رک جائے گی' اگر آدمی نہ ہوں؟ آفتاب میں کیا داغ آجائے گا اگر آدمی نہ ہوں؟ حتیٰ کہ سڑک کے کسی سنگریزہ' اور جنگل کے کسی تنکے کا کیا نقصان ہے' اگر کوئی تمھارے بڑے نہ ہوں' چھوٹے نہ ہوں کوئی نہ ہو' بے شک سب ان کے لیے ہیں لیکن مخلوقات کے اس طویل وعریض سلسلہ میں انسان کسی کے لیے نہیں' اب خالق کے لیے ہی نہیں ہے تو اس سے زیادہ عبث وبے نتیجہ فضول ومہمل' بیہودہ

کس کی ہو سکتی ہے؟ اس رسوائی سے بڑی رسوائی اس ہتک سے بڑی ہتک اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور یہ ایمان کا حال ہے' عمل کے میدان میں ان جاہلوں کے پاس کیا تھا' جو آج عالموں کے پاس نہیں ہے۔

عرب کے جہل نے کیا پیدا کیا تھا جو آج کے علم سے نہیں پیدا ہو رہا ہے' جاہل شراب پیتے تھے' مردار کھاتے تھے' زنا کرتے تھے' سود خور تھے' جواری تھے' ایک کا خون دوسرا پیتا تھا' املاق وافلاس کے اندیشہ سے لڑکوں لڑکیوں کو گور میں زندہ دفن کر دیتے تھے' لیکن یہ قصہ کن کا سنایا جا رہا ہے' کیا عرب کے جاہلوں کا' یا یورپ کے عالموں کا؟ وہاں کیا دکھاتے ہو جسے یہاں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں' عرب سے باہر ایران میں ایک طرف ''مزدک'' زر' زمین' زن کو سب سے چھین کر سب کو دے رہا تھا اور دوسری طرف ''مانی'' اور اس کے شاگرد ہاتھوں میں استرے لیے پھرتے تھے کہ جس راہ سے یہ برائیاں آئی ہیں' انھی کا قلع قمع کر دیا جائے وہ انسانوں کو انسانوں میں آنے سے روکتے تھے' یہی ان کا فلسفہ تھا' لیکن یہ تو ایران میں ہو رہا تھا' آج یورپ کے ایک حصہ میں پھر وہی ''مزدک'' زندہ ہو کر ''بالشویک'' کے نام سے کیا وہی سب کچھ نہیں کر رہا ہے' جو اس نے کیا تھا' اور دوسری طرف ''برتھ کنٹرول'' کے نام سے اسی طرح انسانوں کو انسانوں کی سوسائٹی میں شریک ہونے سے روکا نہیں جا رہا ہے؟

ایک راستوں کو ڈھاتا اور دوسرا بند کرتا ہے' اس کے سوا اور کیا فرق ہے؟ صحیح ہے کہ ہندوستان میں بدھ مت کے فلسفہ نفس کشی نے بڑی گندی شکلیں اختیار کی تھیں۔ ''وام مارگی'' پیدا ہوئے تھے' ''مانگ و دیا دام مارگی'' تک پائے جاتے تھے۔ ''اگھوری'' ہونا آتما کی بڑی پاکی تھی' لیکن آج گندگیوں میں صفائی کے مدعی بن کر جولت پت ہیں' ''اگھوریوں'' کو بھی تے ہو اگر ان کا حال سنایا جائے' بے پردگی و عریانی نے جنسی لذتوں کو جس حد تک بے جان کیا ہے' اس میں جان ڈالنے کے لیے آج مغرب کا ''اگھوری'' جو کچھ کر رہا ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس کے سامنے مشرق کا اگھوری بھی شرمندہ ہے' الحاصل جو کچھ اس وقت تھا' جہاں تک سوچو گے کسی نہ کسی شکل میں تم اس وقت بھی اسے پاؤ گے' پس آنے والا کیسے جا سکتا تھا' جب تک کہ وہ سب نہ جاتے' جس کے لیے وہ آیا تھا' بلکہ اس کی ضرورت تو اس کے بعد بھی رہے گی کہ یہ تو تخریب ہے' لیکن کیا تعمیر بغیر معمار کے ممکن ہے؟ اور یہی میرا مقصد تھا' جب میں نے کہتے ہوئے سب سے پہلے کہا تھا کہ ''یہی وہ آنے والا ہے' جو آنے ہی کے لیے آیا''

پھر جس طرح آج وہ ہم میں موجود ہے' اس کی ضرورت موجود ہے' انھیں دیکھ کر اب بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ آنے کے بعد وہ نہیں گیا' اور جب تک اس کی ضرورت ہے' نہیں جائے گا' تھا' ہے' رہے گا' ابد تک رہے گا اور اس کے لیے یہی مقدر ہے۔

''اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِكْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ النَّبِیِّ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَزْوَاجِهٖ اُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَعَلٰی ذُرِّیَّتِهٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ كَمَا صَلَّیْتَ وَبَارَكْتَ عَلٰی سَیِّدِنَا اِبْرَاهِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا اِبْرَاهِیْمَ فِی الْعَالَمِیْنَ اِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ۔''

پس اے اخوان عزیز!

﴿وَ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِیْكُمْ اِبْرٰهِیْمَ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِیْ هٰذَا لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ اعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ﴾ (الحج: 78)

''کوشش کرو اللہ کی طرف بلانے میں کوشش کا پورا حق ادا کرتے ہوئے اسی نے (اے امت اسلامیہ) تمھیں چن لیا ہے اور تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں فرمائی' یہ تمھارے باپ ابراہیمؑ کا دین ہے' اسی نے تمھارا نام ''مسلمین'' رکھا' پہلے بھی اور اس میں بھی (کوشش کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا) کہ رسول تمھارے نگراں رہیں گے اور تم دنیا کے نگراں رہو گے' پھر لوگو! نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو اور زور سے پکڑ لو اللہ کو' وہی تمھارا آقا ہے' پھر کتنا اچھا آقا ہے' کتنا اچھا مددگار۔''

جب جانے کے لیے آنے والے آتے رہے' اشخاص چنے جاتے تھے' لیکن جب وہ آیا جو آنے ہی کے لیے آیا تو اسؐ کے طفیل میں اس کے ساتھ شخص نہیں بلکہ ایک امت ہی چنی گئی' پہلے نبی مبعوث ہوتے تھے' اب ایک امت ہی مبعوث ہے' یہی اس امت کا ''اصل اور فرض حقیقی ہے جب تک وہ اس منصب'' پر قائم رہیں گے اور انسانوں کی نگرانی کریں گے اس وقت تک ان کے رسول ﷺ بھی اس امت کے نگراں رہیں گے' لیکن جب تم اپنے منصب سے ہٹے' اگر رسول کی نگرانی کو نہیں محسوس کرتے تو کیا یہی وعدہ نہیں تھا۔

یہ امت مجتبیٰ و مبعوثہ ہر قوم میں ہے' ہر ملک میں ہے' پس جو جہاں ہے وہ وہیں مبعوث ہے' اس کی قوم اسی ملک کے باشندے ہیں' مصیبت کی گھڑی وہی تھی جب اپنی قوم کو ہم نے اپنی قومیت سے نکالا اسی کے ساتھ ان کا درد بھی دل سے نکلا' حالانکہ اگر حضرت نوحؑ کے منکر ان کی قوم تھی' حضرت ہودؑ کے کافر ان کی قوم تھی' قریش رسول خاتم ﷺ کی قوم کے لوگ تھے تو کس نے کہا کہ ہندوستان کے ہندو ہندوستان کے مسلمانوں کی قوم نہیں' مصریوں کی قوم مصر کے قبطی نہیں' یورپ کے عیسائی یورپ میں رہنے والے ترکوں کی قوم نہیں ہیں' پس جب تک:

﴿حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال: 39)

اور قتال کرتے رہو ان سے حتیٰ کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو کر رہ جائے۔ فتنہ ختم ہونے تک تھک کر نہ بیٹھے۔

کے کیا معنی ہو سکتے ہیں' وثیقہ ہے کہ:

﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (التوبہ: 33)

''اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ سارے

دین پر وہ غالب ہو۔''

اور دیکھو کہ لامذہبیت پر مذہبیت غالب ہے' چند پیشہ ور کتاب سازوں یا سبق فروش معلموں کو جانے دو'جو وساوس بافی کی روٹی کھاتے ہیں' عام فطرت انسانی پر مذہب کی گرفت اسی طرح سخت ہے' جس طرح ہمیشہ سے تھی آخر اگر مذہبیت کا اسی قدر زور ہو گیا ہے' تو جس یورپ کے متعلق یہ سنایا جاتا ہے' کیوں نہیں وہاں کے باشندوں نے لامذہب ہونے کا اعلان کیا ہے۔

سچ یہ ہے کہ انسانی دماغ کی جو ذہنی ساخت ہے اس میں اتنی تنگی یا پستی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے' کہ ماضی و مستقبل کے انجام کے فیصلہ کے بغیر وہ اپنی زندگی گزارے' کہاں سے آیا ہوں' کہاں جا رہا ہوں؟ کیوں آیا ہوں؟ چلنے والے کے سامنے ان سوالات کے جواب نہیں ہیں' کیا وہ ایک قدم بھی آگے بڑھ سکتا ہے۔

بہرحال کم از کم اس وقت تک تو دنیا میں لامذہبوں سے زیادہ' بہت زیادہ' بہت ہی زیادہ تعداد مذہبی لوگوں کی ہے' اور مذاہب میں ہر حیثیت سے جو وزن اسلام کو حاصل ہے' کسی کو نہیں ہے۔ پس اس کا منطقی نتیجہ کیا یہی نہیں ہوا کہ لامذہبیت پر مذہب غالب اور تمام مذاہب پر اسلام غالب' اس لیے سب پر اسلام غالب ہے۔

جب مسلمان اپنی نگرانی دوسروں کے سپرد کر کے رسول علیہ السلام کی نگرانی سے اس وقت محروم ہیں' اس زمانہ میں بھی اسلام کے غلبہ کا یہ حال ہے' تو کیا حال ہو گا جب دنیا کے نگران بن کر پھر رسول کی نگرانی کی سعادت مسلمان حاصل کر لیں گے' کچھ نہیں' کوئی کام نہیں' جب تک اصل کام نہ ہو گا' کسی کام میں کوئی برکت نہ ہو گی' بہت آرام لے چکے' تھکن مٹ چکی' کام بہت باقی ہے' ہوتا کہ چونکنے والے چونکتے' اور ''درا'' کی اس ''بانگ'' پر چل پڑتے:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد ﷺ سے اجالا کر دے
وقتِ فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

(اقبال)

(تحریر: سید مناظر احسن گیلانی)

النبی الامی ﷺ

اُمّی یہ محقق ہے کہ سیدنا مولانا محمد المصطفیٰ ﷺ کے سوا الرَّسُوْل النَّبِیُّ الاُمِّیّ اور کسی نبی کا لقب نہ تھا۔ حضور ﷺ کا یہی لقب انبیا کرام کو اور سابقہ امم کو بتلایا گیا ہے۔ علماء نے اسم اُمّی کے متعلق جو پاکیزہ خیالات ظاہر فرمائے ہیں۔ ناظرین کے لیے ان پر عبور موجب فرح و سرور ہوگا۔

(الف) اُمّی۔ ام القریٰ کی نسبت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مکہ معظمہ کا نام ام القریٰ فرمایا ہے۔

﴿وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا﴾ (انعام۔92) کہ تو ام القریٰ کو اور اس کے گرداگرد کی بستیوں کو ڈرائے۔ جرمن مؤرخ سپرینجر اور سکریدر کا قول ہے کہ ان محققین کی رائے بالکل درست ہے۔ جو اولاد سام کا اصلی وطن ملک عرب کو قرار دیتے ہیں۔ اسلامی روایات صحیحہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں سب سے پہلی آبادی (بلدۂ مکہ معظمہ) ہے جہاں خانہ بدوش قوموں نے قیام کیا اور بربریت و توحش کو چھوڑ کر عمران و تمدن کی زندگی میں داخل ہوئے۔

الغرض تاریخ اور روایت کے مجموعی اتفاق سے ثابت ہے کہ مکہ ام القریٰ ہے۔ اب سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی طرف توجہ کرنا چاہیے جو انھوں نے بنائے مکہ کے وقت کی۔

﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ﴾

(البقرہ:126)

''اے رب! اس جگہ کو امن والا شہر بنائیو اور یہاں والوں کو میوہ جات کھلایا کرنا۔''

دعا کے الفاظ یہ بھی ہیں۔

﴿وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (البقرہ 129)

''ان کو ایک شاندار رسول بھی جو انھیں سے ہو مبعوث کیجیو۔''

دعائے خلیل میں دو باتیں عجیب ہیں۔

(1)...... اس بستی میں رہنے والوں کے لیے جہاں کی زمین ناقابل زراعت ہے، میوہ جات و ثمرات بکثرت ملنے کی استدعا۔ ان الفاظ کی برکت آج بھی نظر آ رہی ہے کہ مکہ کے بازار سبزیوں، ترکاریوں اور گوناگوں میوہ جات سے بھرے نظر آتے ہیں۔ یہ علاماتِ ظاہری اس امر پر دال ہیں کہ رب العالمین نے فی الواقع اپنے خلیل کی دعا کو من وعن شرف قبولیت بخشا۔

(2)...... یہی دعا بوضوح بتلا رہی ہے کہ صرف خوراک جسمانی یا لذائذ کام و دہن تک اس کا اثر محدود نہ تھا بلکہ روحانیت کے لیے دعا کے الفاظ پُر زور تھے۔ وعدہ کا رسول ﷺ اور دعائے خلیلؑ کا رسول ﷺ مبعوث ہوا اور کس شان کے ساتھ مبعوث ہوا۔ اس کے نسلی اور نسبی تعلقات انھی لوگوں کے ساتھ تھے جو اس بستی کے سردار تھے۔ لہٰذا ام القریٰ سے اُسے اُمّی کہنا درست ٹھہرا۔

(ب) اسم اُمّی۔ امت کی طرف نسب رکھتا ہے اور اس کے معانی ایسا نبی ہے جو امت کثیرہ کا مخدوم و مطاع ہو۔ امت کی ت بوقت نسبت گر گئی ہے جیسے مکہ سے مکی۔ اندریں صورت اسم امّی اس حدیث صحیحہ کی تفسیر ہے جو صحیح مسلم میں بروایت انسؓ موجود ہے۔

"اَنَا اَكْثَرُ الْاَنْبِيَآءِ تَبْعاً."

''کثرت امت کے لحاظ سے میں تمام نبیوں سے بڑھا ہوا ہوں۔''

(ج) اسم امی۔ ام کی طرف منسوب ہے۔ اس اعتبار سے کہ نبی اکرم ﷺ بوجہ پاکی فطرت وعصمت منجانب رب العزت جملہ عیوب و نقائص سے ایسے ہی پاک و صاف ہیں جیسا کہ ماں کے پیٹ سے پیدا شدہ بچہ ہوتا ہے۔ ام المومنین عائشہ طیبہ نے انھی معانی پر نظر رکھتے ہوئے اشعار ذیل نبی ﷺ کی شان میں پڑھے تھے اور ان اشعار کو سن کر آقائے نامدار نہایت مسرور الوقت ہوئے تھے:

وَمُبَرَّءٌ مِنْ كُلِّ غُبَّرِ حَيْضَةٍ
وَاِذَا انْظُرْنَ اِلَى اَسْرَةِ وَجْهِهِ
وَفَسَادِ مُرْضِعَةٍ وَّدَاءِ مُخْيِلِ
بَرَقَتْ بُرُوْقَ الْعَارِضِ الْمُتَهَلِّلِ

(د) امّی ام کی طرف منسوب ہے۔ اس اعتبار سے کہ حضور ﷺ نے ولادت کے بعد اکتسابِ علم وفنون کی جانب کوئی رغبت نہ کی تھی اور حضور کی لوح قلب پر تقریراً یا تحریراً کسی ایک حرف کا نقش بھی ثبت نہ ہوا تھا۔

ملک عرب کی حالت بھی یہی تھی کہ وہ لکھنے پڑھنے سے عاری ہوتے تھے اور اپنی تمام عمر اسی حالت میں پوری کر دیا کرتے، جو ایک ایسے بچے کی ہوتی ہے جو نہ مکتب گیا اور نہ درس لیا۔ نہ قلم ہاتھ میں پکڑا، نہ سبق زبان پر جاری ہوا۔ یہودیوں نے اسی لیے اہل عرب کا نام امیّون رکھ دیا تھا۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾

(آل عمران:75)

''یہودی کہتے ہیں کہ ہم ان امّی لوگوں کے ساتھ خواہ کچھ ہی برتاؤ کریں ہم پر کچھ مواخذہ نہ ہوگا۔''

یہی نام اہلِ عرب کے لیے معرفہ بن گیا تھا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا﴾ (الجمعہ: 2)
''اللہ وہ ہے جس نے امیوں کے اندر شاندار رسول کو مبعوث فرمایا۔''
﴿وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ﴾ (البقرہ: 78)
''یہودیوں میں ایسے ناخواندہ بھی ہیں جنھیں کتاب کا کچھ علم نہیں۔''

الغرض! لفظ اُمّی سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی ﷺ طرز وطریق خواندگی اہل دنیا سے بالاتر تھے۔اللہ نے اس مضمون کو دوسری جگہ اس طرح ظاہر فرمایا ہے:
﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ (العنکبوت: 48)
''اے رسول ﷺ! قرآن سے پہلے تو تم نہ کسی کتاب کو پڑھا کرتے تھے اور تمھارے دست راست نے کبھی کوئی خط کھینچا تھا۔تب تو یہ بطلان والے شک بھی کر سکتے۔''

معنی بالا کے لحاظ سے اسم نبی الامی حضور ﷺ کا ایک بڑا معجزہ ہے۔
واضح ہو کہ نبی نباء سے ہے اور نباء واقعۂ عظیم اور اعلام ذوالاہتمام کو کہتے ہیں۔ یعنی نبی وہ ہے جو علوم عالیہ اور وقائع عظیمہ کی اطلاع اہلِ عالم کو دیتا ہو اور جب یہ لفظ اللہ کی طرف مضاف ہوتا ہے۔تب اس کے معنی یہ ہیں کہ نبی وہ ہے جو علوم عالیہ اور شرائع عالیہ اور نوامیس ربانیہ کی اطلاع براہ راست اللہ تعالیٰ سے کرتا ہو۔

نبی کو نبادۃ سے بھی مشتق بتایا گیا ہے۔نبادۃ کے معنی مقامِ مرتفع ہیں اور نبی وہ ہے جو اس مقام علیہ پر فائز ہو۔جہاں کوئی انسان اکتساب ومحنت وریاضت سے نہیں پہنچ سکتا اور اس مقام پر اس کے فائز ہونے کا سبب محض استغناء ربانی ہوتا ہے۔

نبی الامی کے وصف نے بتلا دیا کہ حضور حرف شناسی وخط کشی سے تو دور ہیں اور بااین ہمہ علومِ عظیمہ وآیاتِ کاملہ کا صدور حضور سے برابر ہوتا رہا۔

اہل سیرت جانتے ہیں کہ حضور کو نبی الامی سے یاد کیا جاتا' بلایا جاتا اور حضور اسی طرز خطابت سے خرسند ومسرور ہوا کرتے تھے۔اب اہلِ زمانہ کا حال دیکھو کہ جوں ہی کسی شخص کو ذرا شد بد کہنے کی لیاقت پیدا ہوئی وہ اپنے لیے فاضل' اکمل' لوذعی' علامہ وغیرہ الفاظ سننا اور کہلانا پسند کرتا ہے اور یہ ہر صاحبِ قلم وزبان آور کا فطری خاصا سا ہو گیا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ اصلیت سے بڑھ کر اس کے علم وفضل کا اندازہ لگایا جائے لیکن ایک سیّدنا محمد ﷺ ہیں جنھیں ہر وقت ناخواندگی کا اعتراف اور امی ہونے کا اقرار ہے۔اس اعتراف و اقرار پر بھی ہزاروں علماء' سیکڑوں فلاسفر حاضر ہوتے' زانوئے ادب تہ کرتے اور اقرار کرتے کہ ان لوگوں کا علم وفہم اور حضور ﷺ کا عرفان قطرہ وقلزم کی مثال رکھتے ہیں۔

غور کرو کہ جو شخص دنیا میں کسی کا شاگرد نہیں تھا وہ تمام دنیا کا استاد بنا ہوا ہے۔ محاسنِ اخلاق' محامد اعمال تدبیر منزل' سیاست مدن' اقتصادیات' سیاسیات' عمرانیات کے درس اور دماغ کو روشن' قلب کو مجلّٰی' روح کو منور بنا دینے والی تعلیم دے رہا ہے۔ اس کی درس گاہِ قدس کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔وہاں ایک صحرا نشین اور ایک شہری' ایک فلاسفر اور ایک بدوی پہلو بہ پہلو بیٹھے ہوئے ہیں۔اور ہر آن واحد اپنی اپنی استعداد وقابلیت کے موافق مستفیض ومستفید ہو رہے ہیں۔اندریں صورت امی لقب سے عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ وَ اَحْسَنَ تَادِيْبِيْ کا نور ظہور بخش ہے اور يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ کا دعویٰ محقق ہو رہا ہے۔

(ھ) لقب امی کی وجہ یہ ہے کہ اول الانبیا ابوالبشر آدم علیہ السلام سے لے کر آخر الانبیا بنی اسرائیل عبداللہ عیسیٰؑ بن مریم تک جملہ انبیا والمرسلینؑ نے حضور کے نعوتِ عالیہ اور اوصاف جلّیہ بیان کیے۔الف سے آدم' میم سے مسیح اور یائے اس راز کی کاشف ہے۔

امی	و	گویا	بزبان فصیح
از	الف	آدم	و میم مسیح

(تحریر: سید سلیمان ندوی)

النبی الامی ﷺ

قرآن مجید میں آنحضرت ﷺ کا بکثرت ذکر آتا ہے۔ کہیں تو آپ کے ب کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ کہیں پ ﷺ کے اخلاق حسنہ اور خصائل حمیدہ کا ذکر فرمایا' کہیں آپ کی عبادات کا ذکر کہیں آپ ﷺ کو رحمت عالم فرمایا کہیں گھریلو معاملات کی طرف اشارات کہیں آپ ﷺ کے جنگی معرکوں کی تفصیلات بیان فرمائیں' کہیں آپ ﷺ القاب کا ذکر فرمایا۔ اسی طرح چند ایک مقامات پر آنحضرت ﷺ کو اُمّی لقب بھی یاد کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿لَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا نْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ﴾ (اعراف:157)

بنی وہ لوگ جو حضرت محمد ﷺ کی جو امی نبی ہیں پیروی کرتے ہیں' جن کے ساف کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں۔'' (اعراف:157)

بنی اے لوگو! خدا پر اور اس کے رسول امّی نبی پر جو خدا پر اور اس کے تمام کلام پر ان رکھتے ہیں' ایمان لاؤ اور ان کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پاؤ۔''

(اعراف:158)

یعنی وہی ذات تو ہے جس نے ان پڑھوں میں انھی میں سے حضرت محمد ﷺ کو یغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور انھیں قرآن و سنت کی علیم دیتے ہیں اور اس سے پہلے یہ لوگ صریح گمراہی میں تھے۔'' (جمعہ۔2)

اس کے علاوہ قرآن مجید نے امّی کا لفظ سورۂ بقرہ میں آیت نمبر 78 میں ذکر کیا۔ سورۂ آل عمران آیت نمبر 20 اور آیت نمبر 75 میں بھی ذکر فرمایا۔

ارشاد ہوتا ہے:

''یعنی بعض ان میں اَن پڑھ ہیں کہ اپنے خیالاتِ باطل کے سوا خدا کی کتاب سے واقف ہی نہیں اور وہ صرف ظن سے کام لیتے ہیں۔'' (البقرہ:78)

سورۂ آل عمران کے مقامات بھی ملاحظہ ہوں آیت نمبر 20 میں فرمایا

﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ﴾ (آل عمران:20)

''یعنی اہل کتاب اور ان پڑھ لوگوں سے کہو کہ کیا تم بھی اسلام لائے ہو؟''

پھر آیت نمبر 75 میں فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾

(آل عمران:75)

یعنی اہل کتاب امانت میں خیانت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ امّی لوگوں کے بارے میں ہم سے مواخذہ اور باز پرس نہیں ہوگی۔

ان مقامات کو پیش نظر رکھتے ہوئے لفظ امی کی تشریح و توضیح کے لیے کتب لغت' تفسیر' حدیث اور تاریخ و سیرت کی ورق گردانی کرنی چاہیے۔

عربی زبان کی سب سے مستند اور ضخیم لغت ابن منظور افریقی کی ''لسان العرب'' ہے۔ یہ لغت اتنی بڑی ہے کہ شاید ہی کسی اور زبان کی لغت اس کی وسعت اور پھیلاؤ کا مقابلہ کر سکے۔ لسان العرب (جلد 12' صفحہ 34) میں اَلْاُمِّی کی تشریح کرتے ہوئے مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مفاد درج ذیل ہے۔:

''اَلْاُمِّيُّ الَّذِيْ لَايَكْتُبُ .''

''یعنی امی وہ ہے جو لکھنا نہ جانے۔''

پھر اور وضاحت کی کہ یہ لکھنا اکتسابی ہے۔ بعد ازاں حدیث سے سند پیش کرتے ہوئے عبارت نقل کرتے ہیں۔

1: ''اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ' لَانَكْتُبُ وَلَا نَحْسَبُ .''

یعنی ہم ان پڑھ لوگ ہیں' نہ لکھنا جانتے ہیں نہ حساب۔

2: ''بُعِثْتُ اِلٰى اُمَّةٍ اُمِّيَّةٍ .''

یعنی میں ایک ان پڑھ قوم میں مبعوث ہوا ہوں۔

پھر لسان العرب کے مصنف لکھتے ہیں کہ عربوں کو اس لیے امّی کہتے تھے کہ ان میں لکھنے کا رواج بڑا نادر تھا۔

بعد ازاں اپنی تائید میں ﴿بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ والی قرآنی آیت پیش کرتے ہیں اور اس کی تفسیر و تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سیّدنا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو بھی امّی لقب سے یاد کیا جاتا ہے کیوں کہ عرب قوم لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا اور آپ ﷺ بھی لکھ پڑھ نہیں سکتے تھے۔ ﴿وَبَعَثَهُ اللّٰهُ رَسُوْلًا وَهُوَ لَايَكْتُبُ وَلَا يَقْرَاُ مِنْ كِتَابٍ﴾ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے ابن منظور لکھتے ہیں کہ البتہ تلاوت قرآن آپ ﷺ کا ایک معجزہ تھا۔ جب بھی آپ تلاوتِ فرماتے' نہ تو کبھی الفاظ کا ردوبدل ہوتا اور نہ زبر زیر میں فرق آتا۔

صاحبِ لسان العرب کی اس وضاحت کے بعد آیئے قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے مفسروں سے پوچھیں کہ ان کے ذہن میں امّی کا کیا مفہوم ہے؟

ہمارے قدیم ترین مفسروں میں علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی 310ھ) کے نام نامی سے کون واقف نہیں۔ ان کی تفسیر ''جامع البیان فی تفسیر القرآن'' تفسیر

علوم کا خزانہ ہے۔ امام ابن جریر طبری اُمِّیُّوْنَ (جمع اُمّی کی) کا مفہوم یوں قلمبند کرتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ لَایَکْتُبُوْنَ وَلَا یَقْرَءُ وْنَ (جلد ۲ صفحہ 247) یعنی وہ لوگ جو نہ لکھ سکیں نہ پڑھ سکیں۔ اسی جلد کے صفحہ 259 پر لکھتے ہیں اَلْاُمِّیُّ عِنْدَ الْعَرَبِ ھُوَ الَّذِیْ لَایَکْتُبُ یعنی عربوں کے نزدیک امی وہ شخص ہے جو لکھنا نہ جانتا ہو۔

مصر جدید کے دو جید عالم محمود محمد شاکر اور احمد محمد شاکر اتنے فضیلت مآب اور وسیع النظر بزرگ ہیں کہ اس دور میں ان کی نظیر عالم اسلامی میں ملنی محال ہے‘ یہ عقابی نگاہ رکھنے والے عالمانِ دین تفسیر طبری (طبع جدید) کے حاشیہ میں اس امر کی تحقیق وضاحت کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ لکھنا پڑھنا قطعاً نہ جانتے تھے۔

(ملاحظہ ہو جلد 2‘ صفحہ 258)

ابن جریر طبری کے بعد علامہ جار اللہ زمخشری (متوفی 538ھ) بڑا جید عالم اور عالی مرتبہ مفسر گزرا ہے۔ زمخشری اپنے زمانے میں تفسیر لغت‘ ادب اور نحو کا امام تھا۔ اس نے اپنی شہرہ آفاق تفسیر الکشاف میں لفظ اُمّی کی تفسیر یوں کی ہے۔

"اَلْاُمِّیُّ مَنْسُوْبٌ اِلَی الْعَرَبِ لِاَنَّھُمْ کَانُوْا لَایَکْتُبُوْنَ وَلَا یَقْرَءُ وْنَ مِنْ حَیْثِ الْاُمَمِ." (تفسیر کشاف جلد4‘ صفحہ 9 طبع مصر 1354ھ)

"یعنی امی کی نسبت عربوں کی طرف ہے کیوں کہ وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔"

سورۃ الجمعہ کی اسی آیت کے سلسلے میں ﴿یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیٰتِہٖ﴾ رقمطراز ہیں کہ نبی کریم ﷺ باقی عربوں کی طرح امی ہونے کے باوجود ان کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کرتے ہیں۔ حالانکہ عربوں کو معلوم تھا کہ آپ پڑھ نہیں سکتے اور نہ کبھی کسی استاد سے پڑھنا سیکھا تھا اور اُمّی آدمی کا پڑھنا‘ سیکھے بغیر تلاوت کر لینا ایک معجزہ ہے۔ (حوالہ مذکور)

اندلس کا شہرۂ آفاق مفسر قرآن امام ابو عبداللہ محمد ابن احمد انصاری قرطبی (متوفی 671ھ) اپنی ضخیم تفسیر "جامع الاحکام القرآن" میں وَمِنْھُمْ اُمِّیُّوْنَ (سورۃ بقرہ:78) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اَیْ مَنْ لَایَقْرَأُ وَلَا یَکْتُبُ واحدھم اُمِّیٌّ‘ مَنْسُوْبٌ الی الامۃ الامیۃ ھِیَ عَلٰی اَصْلِ وِلَادَۃِ اُمَّھَاتِھَا‘ لَمْ تَتَعَلَّمِ الْکِتَابَۃَ وَلَا قِرَائَتَھَا. (تفسیر قرطبی‘ جلد 2‘ صفحہ 5)

یعنی امی وہ جو نہ پڑھ سکے‘ نہ لکھ سکے۔ امی کا لفظ ان پڑھ لوگوں کی طرف منسوب ہے۔ اُمّی وہ لوگ ہیں جو اسی حالت پر ہوں جس حالت میں ماؤں نے انھیں جنم دیا۔ انھوں نے نہ لکھنا سیکھا نہ پڑھنا۔

امام قرطبی سورۂ اعراف کی آیت 157 کی تفسیر کرتے ہوئے امی کی یہی تشریح لکھ کر فرماتے ہیں:

"وقال ابن عباس رضی اللہ عنہ: کَانَ نَبِیُّکُمْ صلی اللہ علیہ وسلم اُمِّیًّا لَایَکْتُبُ وَلَایَقْرَأُ وَلَایَحْسُبُ‘ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: وَمَاکُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِہٖ مِنْ کِتَابٍ وَّلَاتَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ."

(قرطبی‘ جلد 7 صفحہ 298)

"یعنی حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تمھارے پیغمبر ﷺ امی تھے آپ ﷺ لکھنے پڑھنے اور حساب سے ناواقف تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا کہ اے پیغمبر! تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ لکھنا جانتے تھے‘ اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل جو آپ کو جھٹلاتے ہیں ضرور شک کرنے لگتے۔" (العنکبوت:48)

امام بیضاوی (قاضی عبداللہ بن عمر) (متوفی 685ھ) اپنی مشہور و معروف تفسیر میں سورۃ الجمعہ والی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فِی الْاُمِّیّٖنَ کی توضیح یوں کرتے ہیں اَیْ فِی الْعَرَبِ لِاَنَّ اَکْثَرَھُمْ لَایَکْتُبُوْنَ وَلَایَقْرَءُوْنَ یعنی اللہ نے آنحضرت ﷺ کو عربوں میں مبعوث فرمایا کیوں کہ ان کی اکثریت لکھنا پڑھنا نہ جانتی تھی۔ پھر "رَسُوْلًا مِّنْھُمْ" کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مِنْ جُمْلَتِھِمْ اُمِّیًّا مِثْلَھُمْ یعنی انھی عربوں میں سے انھی جیسا امی۔

(تفاسیر اربع ج6‘ صفحہ 257‘ طبع مصر 1320ھ)

تفسیر خازن میں اسی آیت کے ضمن میں فاضل مفسر یوں رقم طراز ہے:
"العرب‘ وَکَانَتِ الْعَرَبُ اُمَّۃً اُمِّیَّۃً‘ لَا تَکْتُبُ وَلَا تَقْرَاءُ..... اَلْاُمِّ ھُوَ الَّذِیْ عَلٰی مَاخُلِقَ عَلَیْہِ‘ کَاَنَّہٗ مَنْسُوْبٌ اِلٰی اُمِّہٖ."

یعنی اللہ نے آنحضرت ﷺ کو عربوں میں مبعوث فرمایا‘ عرب ان پڑھ تھی‘ نہ لکھنا جانتے تھے نہ پڑھنا۔ امی ماں کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ امی وہ پیدائشی صلاحیتوں اور خصلتوں پر قانع رہے۔ پھر رَسُوْلًا مِّنْھُمْ کی تفسیر بیان کر ہیں: یعنی محمد ﷺ یَعْلَمُوْنَ نَسَبَہٗ" وَ ھُوَ مِنْھُمْ۔ وَقِیْلَ اُمِّیًّا مِثْلَھُمْ۔ اِنَّمَا کَانَ اُمِّیًّا لِاَنَّ نَعْتَہٗ فِیْ کُتُبِ الْاَنْبِیَاءِ: اَلنَّبِیُّ الْاُمِّیُّ۔ وَکَوْ بِھٰذِہِ الصِّفَۃِ اَبْعَدُ مِنْ تَوَھُّمِ الْاِسْتِعَانَۃِ بِالْکِتَابَۃِ عَلٰی مَااَتٰی بِہٖ مِ الْوَحْیِ وَالْحِکْمَۃِ. (تفاسیر اربع ج6 صفحہ 257 مصری)

یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو انھی عربوں میں سے رسول ﷺ بنا بھیجا۔ وہ آپ ﷺ کے حسب نسب سے خوب واقف ہیں۔ نیز انھیں جیسا اُ آپ ﷺ اس لیے تھے کہ گزشتہ انبیا کی کتابوں میں آپ کی ایک صفت "امی" بھی درج تھی۔ اور آپ ﷺ کا اُمّی ہونا اس بات کی قطعی شہادت تھی کہ قرآ سنت وحی الٰہی ہے‘ آپ ﷺ نے خود نہیں لکھا۔ آپ ﷺ کے امی ہونے کی سے خود لکھ لینے کے وہم کا ازالہ ہو گیا۔

تفسیر مدارک میں بھی اسی آیت کے ضمن میں فاضل مصنف نے یوں تحریر کیا ہے:
"اَیْ بَعَثَ رَجُلًا اُمِّیًّا فِیْ اُمِّیّٖنَ..... وَالْاُمِّیُّ مَنْسُوْبٌ اِلٰی اُمَّۃِ الْعَرَ لِاَنَّھُمْ کَانُوْا لَایَکْتُبُوْنَ وَلَا یَقْرَءُوْنَ مِنْ بَیْنِ الْاُمَمِ."

(تفاسیر اربع ج 6 صفحہ 57)

"یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک امی آدمی کو ان پڑھ لوگوں میں نبی بنایا۔ اور امی کی نسبت ع قوم کی طرف ہے کیوں کہ وہ باقی قوموں کی نسبت لکھنے پڑھنے سے ناواقف تھے"

امام شوکانیؒ نے اپنی قابل قدر تفسیر "فتح القدیر" میں لفظ امی کی تشریح بھی

طرح کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ اُمّی کا لفظ ''اُمتِ اُمّیّہ'' کی طرف منسوب ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو ایسے ہی رہیں جیسے ان کی ماؤں نے انھیں جنم دیا ہو۔ وہ نہ تو لکھنا سیکھیں اور نہ لکھا ہوا پڑھ سکیں۔ آنحضرت ﷺ کی حدیث بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

"اِنَّا اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ لَانَكْتُبُ وَلَانَحْسُبُ." (جلد اول صفحہ 87)

پھر سورۃ آل عمران کی آیت نمبر ۲۰ کی تفسیر کے سلسلے میں لفظ اُمِّیّیْن کا مفہوم لکھتے ہوئے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھتے ہیں: هُمُ الَّذِيْنَ لَايَكْتُبُوْنَ (جلد اول صفحہ 297) یعنی امّی وہ لوگ ہیں جو لکھنا نہیں جانتے۔

اسی طرح شیخ علی المہائمی اپنی نادر تفسیر تبصیر الرحمٰن میں رقم طراز ہیں کہ امّی لوگوں کو رسول ﷺ کی زیادہ ضرورت تھی اور امّی نبی سے بلند مرتبہ علوم کا اظہار بطور معجزہ تھا تا کہ لوگ یقین کر لیں کہ یہ تعلیم الٰہی ہے، انسان کو اس میں کوئی دخل نہیں۔

(جلد دوم صفحہ 341 طبع مصر 1295ھ)

اب تک تو گفتگو نامور متقدمین اور متاخرین مفسروں کے گرد گھومتی رہی اور ان سب کا ایک مرکزی نقطے پر اتفاق ہے۔ آئیے اب ذرا دورِ حاضر کے جانے پہچانے مفسروں سے بھی استصواب رائے کر لیں۔ بیسویں صدی کی مشہور عربی تفسیروں میں ''تفسیر المنار'' سرفہرست ہے یہ تفسیر درحقیقت مفتی محمد عبدہٗ کی تفسیر ہے جسے ان کے شاگرد رشید سید رشید رضا نے مرتب کیا ہے۔ اس تفسیر میں مرقوم ہے کہ النبی الْاُمِّيُّ نِسْبَةٌ اِلَى اُمٍّ وَالْمُرَادُ الَّذِيْ لَايَقْرَأُ وَلَايَكْتُبُ (تفسیر المنار جلد 9 صفحہ 224) یعنی امّی کی نسبت اُم (ماں) کی طرف ہے۔ مراد ہے وہ شخص جو لکھ پڑھ نہ سکے۔ پھر صفحہ 225 پر فرماتے ہیں:

"اَلْاُمِّيَّةُ آيَةٌ مِنْ اَكْبَرِ آيَاتِ نبوة."

''یعنی آنحضرت ﷺ کا اُمّی ہونا آپ ﷺ کی نبوت کا بہت بڑا معجزہ ہے۔''

دورِ حاضر کی دوسری مشہور اور ہر دلعزیز تفسیر ''المراغی'' کی ہے۔ علامہ مراغی مرحوم جامع ازہر کے شیخ الشیوخ اور ناظم اعلیٰ رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

1: ''اُمِّيٌّ وَهُوَ مَنْ لَايَقْرَأُ وَلَايَكْتُبُ."

(تفسیر المراغی جلد 1 صفحہ 144)

''یعنی امّی وہ ہے جو لکھ پڑھ نہ سکے۔''

2: ''فَاِنَّ رَجُلًا اُمِّيًّا لَايَقْرَءُ وَلَايَكْتُبُ وَلَمْ يَتَعَلَّمِ الْعِلْمَ وَلَمْ يُدَارِسْ اِنْسَانًا مَدَىٰ حَيَاتِهِ يَاْتِيْ بِهٰذِهِ الْحُكْمِ وَالْاَحْكَام."

(جلد 21 صفحہ ۲)

یعنی ایک امّی آدمی جو نہ لکھ سکے نہ پڑھ سکے اور کوئی علم بھی حاصل نہ کیا ہو اور عمر بھر کسی انسان کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہہ نہ کیا ہو، ایسا امّی ایسے حکم احکام لائے تو اس کی نبوت میں کون اور کیوں کر شک کر سکتا ہے۔

جلد 9 صفحہ 81 پر اُمیّت کو نبوّت کا معجزہ قرار دیا ہے۔

عصر حاضر کی ایک مختصر مگر بڑی مقبول تفسیر مصر کے تین علماء محمود حمزہ، حسن علوان اور احمد برانق نے ''تفسیر القرآن الکریم'' کے نام سے شائع کی ہے۔ اس تفسیر میں مرقوم ہے:

"اَلْاُمِّيُّ الَّذِيْ لَايَقْرَأُ وَلَايَكْتُبُ." (جلد 9 صفحہ 58/60:)

''امّی وہ ہے جو لکھ پڑھ نہ سکے۔''

عصرِ حاضر کا ایک اور نامور مصری عالم اور شہرہ آفاق مصنف استاد ابوزہرہ ہے جو بہت سی کتابوں کا مصنف ہے اور جس کی کئی ضخیم کتابوں کے اردو تراجم لاہور سے شائع ہو چکے ہیں، مصر کے کلیۃ الحقوق (لا کالج) میں اسلامی فقہ کا مشہور استاد ہے یہ مصری عالم اپنی ایک گرانقدر تصنیف میں ضمناً امّی کے معانی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

1: ''فَاَسَا سُهَا اَنَّ الْقُرْآنَ الْكَرِيْمَ تَقُوْلُ فِيْ قَوْمٍ اُمِّيِّيْنَ لَا يَقْرَءُ وْنَ وَلَايَكْتُبُوْن." (مصادر الفقہ الاسلامی صفحہ 13)

اس عبارت میں بھی امّی کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ جو لکھ پڑھ نہ سکے۔

۲: ''وَكُلُّ هٰذَا جَاءَ عَلٰى لِسَانِ اُمِّيٍّ لَايَقْرَأُ وَلَايَكْتُبُ، لَمْ يَجْلِسْ اِلٰى مُعَلِّمٍ." (حوالہ مذکور صفحہ 21، 23) یعنی یہ سب کچھ اس امّی کی زبان سے نکلا جو لکھ پڑھ نہ سکتا تھا اور نہ کسی استاد کے پاس بیٹھتا تھا۔)

3: ''وَهٰذَا كُلُّهُ، جَاءَ عَلٰى يَدِ اُمِّيٍّ لَمْ يَقْرَأْ وَلَمْ يَكْتُبْ'' (صفحہ 25) یہ سب کارنامہ اس امّی کا ہے جو لکھ پڑھ نہ سکتا تھا۔

بخاری، مسلم، ابوداؤد اور نسائی وغیرہ کتب احادیث میں بھی اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اوپر ایک دو احادیث کا ذکر آ چکا ہے۔ اب ذرا سیرت کی کتابوں کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ سیرت النبی ﷺ لکھنے والے مورخ کس چیز کی شہادت ہم پہنچاتے ہیں۔ ابن حزم اندلسی (384۔456ھ) مشہور سیرت نگار، حدیث دان اور فقیہ ہے۔ وہ اپنی سیرت میں یوں قمطراز ہے:

"وهو صلی الله علیه وسلم اُمِّيٌّ لَايَقْرَأُ وَلَا يَكْتُبُ وَنَشَاءَ فِيْ بِلَادِ الْجَهْلِ وَ الصَّحَارِيْ." (جوامع السيرة طبع مصر صفحه43)

''آنحضرت ﷺ امی تھے، آپ لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے، آپ نے جاہل ملک اور صحراؤں میں نشوونما پائی۔''

علامہ سہیلی (متوفی 581ھ) مشہور امام، محدث، اور فقیہ ہیں۔ اپنی مشہور و معروف کتاب ''الروض الانف'' میں صلح حدیبیہ (6ھ) کے ذکر میں آنحضرت ﷺ کے امی ہونے پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے رسول اللہ کا لفظ اپنے ہاتھ سے مٹا کر محمد بن عبداللہ لکھنے کا حکم دیا۔ (جلد دوم صفحہ 230۔ طبع مصر 1914ء)

یہاں یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ حدیث اور تاریخ کی بعض کتابوں جن میں بخاری اور ابن خلدون بھی شامل ہیں کَتَبَ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ امام سہیلی نے صاف لکھ دیا ہے کہ کَتَبَ کا مفہوم ہے اَمَرَ اَن يُكْتَبَ یعنی جہاں کہیں ''لکھا'' مرقوم ہے۔ اس سے مراد محض یہ ہے کہ حکم دیا کہ لکھا جائے۔ اس کی تائید امام قرطبی نے بھی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب حدیبیہ کا صلح نامہ لکھا جانے لگا تو قریش کے نمائندہ

سہیل بن عمرو نے ''محمد رسول اللہ'' کے جملے پر اعتراض کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے یہ جملہ اپنے ہاتھ سے مٹا دیا۔ اور اس کی جگہ محمد بن عبداللہ لکھا گیا۔

(تفسیر قرطبی جلد 13 صفحات 351۔353)

امام ابن حزم نے بھی یہی لکھا ہے کہ آپ ﷺ نے ''محمد رسول اللہ'' اپنے ہاتھ سے مٹا دیا اور کاتب کو حکم دیا کہ وہ محمد بن عبداللہ لکھے۔ (جوامع السیرۃ صفحہ 209)

تمام مؤرخوں اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے۔

علامہ زرقانی کے شرح مواہب اللدنیہ میں اس موضوع پر بڑی طویل اور عالمانہ بحث کی ہے۔ اس دل چسپ اور محققانہ بحث کا مفاد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ امی تھے۔ آپ ﷺ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقعے پر حضرت علیؓ کے بتانے پر آپ ﷺ نے ''رسول اللہ'' کے الفاظ مٹا کر ابن عبداللہ لکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے عبارت یوں بنادی۔ محمد بن عبداللہ۔

پھر وہ ایک دل چسپ واقعہ لکھتے ہیں کہ امام بخاریؒ کی ایک روایت کے ظاہر الفاظ کی بنا پر اندلس کے ایک عالم ابوالولید باجی (403۔474ھ) نے اس بات کا اظہار کیا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ابن عبداللہ تحریر فرمایا تھا۔ بس اتنا کہنا تھا کہ اندلس میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا اور علمائے اندلس نے اس پر زندیق کا فتویٰ لگاتے ہوئے اس کے اس عقیدے کو قرآن مجید کے صریح خلاف قرار دیا۔ چنانچہ ابوالولید باجی نے اس موضوع پر ایک خط کے ذریعے مصر، شام اور عراق کے علماء سے فتویٰ پوچھا۔ اس کے جواب میں جمہور علماء نے یہ فتویٰ دیا کہ آنحضرت ﷺ نے اپنے ہاتھ سے قطعاً نہیں لکھا تھا بلکہ بخاری کے الفاظ بطریق مجاز ہیں یعنی لکھنے کا حکم دیا تھا۔

نویں صدی ہجری میں مصر کے مشہور مورخ و سیرت نگار اور محدث و فقیہ علامہ سخاوی بھی اپنی نادر کتاب الاعلام (صفحہ 16) میں امام ابواسحاق احمد بن محمد الثعالبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ امّی تھے۔ آپ ﷺ نے کسی مؤدب اور معلّم کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا تھا۔ مکہ مکرمہ سے باہر بھی کسی شخص سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے گزشتہ انبیا اور امم سابقہ کے احوال قرآن مجید میں ذکر کیے تو عرب کے عقلمند لوگوں نے غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ حالات اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی والہام آپ پر نازل ہوئے ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ آپ ﷺ پر ایمان لائے اور آپ کی تصدیق کرنے لگے اور یہ بھی معجزات نبوت میں سے ہیں۔

ان ساری معروضات کا خلاصہ یہ ہے:

1: امی کا مفہوم ہے ایسا شخص جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔
2: عرب قوم کی بھاری اکثریت لکھنے پڑھنے سے عاری تھی۔
3: آنحضرت ﷺ بھی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔
4: تمام مفسروں، مورخوں اور سیرت نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے۔

ان حالات کے پیش نظر یہ بات کتنی قابل اعتنا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایسی ان پڑھ قوم کو کتنے علوم کا حامل بنا دیا۔ علم کا شوق دلایا۔ لکھنے پڑھنے کو رواج دیا۔ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی بنیاد رکھ کر بام عروج تک پہنچایا۔ نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ علم و فن کا وہ کون سا گوشہ ہے جس میں امّی نبی کی امت نے گہرے نقوش مرتسم نہیں کیے۔ (پروفیسر عبدالقیوم)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کا قصہ

(1)......کسی سچے مسلمان کا تو یہ کام نہیں کہ جناب پیغمبر کی نسبت ایسا کہے کہ ان پر کبھی ایک منٹ کے لیے بھی جادو کا اثر ہوا۔ یہ بات تو کافروں ہی کو زیبا تھی اور انھوں نے ہی کہی تھی کہ یہ نبی تو جادو کا مارا ہوا ہے۔ اور اس تہمت نالائق کو خدا نے بھی جھٹلایا۔ چنانچہ سورۂ فرقان اور اسریٰ کی آیت کو ہم نے اس بیان کے عنوان میں لکھ دیا ہے۔ مگر ایک عرصہ سے مسلمانوں میں سے ایسی حمیت جاتی رہی وہ اس کی تو کچھ پروا نہیں کرتے بلکہ ایسے مضمون کی حمایت کرتے ہیں۔

(2)......مسلمان محدثوں نے اس مضمون کی ایک عجیب وغریب روایت کی ہے کہ ایک یہودی نے جناب پیغمبر پر جادو کر دیا تھا اور وہ چالیس دن تک یا چھ مہینے یا برس دن تک اس میں مبتلا رہے۔ ابی حمزہ کی روایت میں تو چالیس دن ہیں اور وہب کی روایت میں چھ مہینے۔ مگر زہری کی روایت میں برس دن ہے۔ علامہ ابن حجر نے اسی کو معتمد قرار دیا ہے۔ سبحانك هذا بهتان عظيم۔

(3)......اس سحر کا اثر (دروغ برگردنِ راوی) یہاں تک ہو گیا تھا کہ معاذ اللہ جناب پیغمبر کے دماغ میں خلل آ گیا تھا۔

(4)......ایسے لغو اور واہی خیالوں کو تو قرآن مجید جھٹلا چکا۔ پس جو روایتیں بھی اس مضمون کی ہوں گی وہ کب لائق التفات ہوں گی۔ وہ راوی بھی انھیں کافروں کی کہی ہوئی بات کہتے ہیں۔

(5)......اگرچہ جھوٹی روایتیں سچی ہوں تو پھر نبی کی بات پر کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ بہت سی وحی کی باتیں بھی صرف ان کے تغیر دماغ کی وجہ سے خیال میں آ گئی ہوں گی۔ حدیث کی شرح کرنے والے ایک عجیب مخمصے میں گرفتار ہیں۔ نہ تو ان سے اس روایت باطلہ کی تکذیب کرتے بنتا ہے اور نہ منکروں کو جواب دیتے بنتا ہے۔ قاضی عیاض الغرناطی نے (476-544ہجری) کتاب شفائی تعریف حقوق المصطفیٰ میں (ص 299و300) اس اعتراض کے اٹھانے کی کوشش کی ہے مگر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جادو کا اثر جناب پیغمبر کے دل اور اعتقاد اور عقل پر نہ تھا۔ صرف ظاہر میں ہاتھ پیر پر ہوا تھا مگر بخاری ومسلم کی روایتوں کے مقابلے میں وہ تاویلیں پیش نہیں کی جاتیں اور اصل سحر کے مان لینے سے کچھ مفر نہیں ملتا۔ اور مسحور وہی ہے جس کی عقل میں خلل آ گیا ہو۔

(6)...... بخاری اور مسلم کی روایتوں میں یہ قول تو حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب ہے کہ جناب پیغمبر پر ایک یہودی نے جادو کر دیا تھا اور اس قول کے بعد ایک قصہ ہے کہ جس میں اختلاف الفاظ اور کسی قدر اختلاف مضمون بھی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جناب پیغمبر نے فرمایا کہ دو آدمی میرے پاس آئے اور ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ اس شخص کا (یعنی پیغمبر ﷺ کا) کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہ شخص مطبوب ہے اس کا ترجمہ حدیث کی شرح کرنے والوں نے مسحور کیا ہے یعنی جادو کا مارا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ کس نے جادو کیا؟ تب اس نے جواب دیا کہ لبید بن اعصم نے جادو کیا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کاہے کا جادو کیا ہے؟ اس نے کہا کہ کنگھی اور سر کے ٹوٹے ہوئے بال اور کھجور کے درخت کا گابہ۔ پھر اس نے پوچھا وہ کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ذروان کے کنویں میں۔ تب جناب پیغمبر اور اصحاب وہاں تشریف لے گئے اور وہاں سے آ کر حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اس کنویں کا پانی سرخ سا تھا اور درخت وہاں کے ایسے تھے جیسے سانپ کی سر یا بدصورت الخ۔

(7)...... یہ ایسی روایت ہے کہ جسے اگر صحیح وقطعی تسلیم بھی کر لیا جاوے تو بھی کسی ذی عقل اور صاف طبیعت آدمی کی نظر میں اس میں کچھ خلاف حقیقت نہیں ہے مگر جو لوگ جاہلی طبیعت کے ہیں اور دیو بھوت اور جادو کو مانتے ہیں وہ اس روایت کے مضمون کو اپنے ڈھنگ پر لے جاتے ہیں اور کچھ تحریف اور تاویل کر کے نبی کو جادو کا مارا ہوا بنا لیتے ہیں۔ ذلك ظن الذين كفروا۔

(8)......اس روایت کی تفسیر ہمارے مذاق پر تو یہ ہے کہ ہمیں اس امر سے تو انکار نہیں ہے کہ کوئی شخص جادو نہیں کرتا یا کوئی شخص کسی کو جادو کا مارا ہوا نہیں سمجھتا بلکہ ہمارا قول صرف یہی ہے کہ ہمیں جادو کے تحقق سے انکار ہے۔ یعنی جادو کبھی چلتا نہیں اس کا اثر کسی پر ہوتا نہیں۔ "لا يفلحُ الساحر حيث أتىٰ" گو وہ لاکھ پڑا کہا کرے کہ میں نے اس شخص پر جادو کر دیا ہے اور جس شخص کی نسبت جادو کرنے والا یا جادو کرنے کا دعویٰ کرنے والا یہ کہے کہ میں نے اس پر جادو کر دیا ہے تو عرف میں اسے مسحور یا جادو کا مارا ہوا بھی کہیں گے تو حقیقت میں اس مسحور پر کچھ جادو کا اثر نہ ہوا ہو جیسے عموماً کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کا معشوق ہے حالانکہ شخص عاشق کے عشق کا اس پر درحقیقت کچھ بھی اثر نہیں ہوا کرتا۔

عرب میں اور یہودیوں میں سحر اور ساحری کا بڑا چرچا تھا ایسا ہوا ہوگا کہ لبید بن اعصم یہودی نے اسی خیال باطل یعنی جادو کے کارگر ہونے کی بنا پر جناب پیغمبر کی نسبت جادو کا عمل کیا ہو اور کنگھی اور سر کے بال کسی درخت کی چھال میں لپیٹ کر ذروان کے کنویں میں داب دیئے ہوں گے۔ اس معاملہ کا چرچا لوگوں میں ہوتا ہوگا۔ ان میں سے دو آدمی، جنھوں نے یہ بات سنی ہوگی جناب پیغمبر ﷺ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے ہوں گے کہ لبید نے ان پر (اپنے زعم میں) فلانے کنویں میں جادو کیا۔

اس بات کو سن کر جناب پیغمبر ﷺ اس کنویں پر خود گئے یا کسی کو بھیجا ہو، کیوں کہ اور روایتوں میں ہے۔ "عند ابن سعد من حديث ابن عباس فبعث الى علی و عمار فامر هما ان ياتيا البير ." کہ اپنے اصحاب کو بھیجا تھا اور یا یہ ہُوا ہو کہ اصحاب میں سے کوئی خود ہی چلے گئے ہوں۔

(9)......پس اس روایت میں کوئی بات جادو کے تحقق کی نہیں نکلتی۔ سب سے زیادہ مشکل اور باطل قول یہ ہے کہ سحر رسول اللہ الخ یہ اگر ان معنوں میں لیا جاوے کہ لبید نے پیغمبر ﷺ کی نسبت جادو کا عمل کیا تو کچھ بھی دقت نہیں ہاں اگر یہ مراد ہو کہ درحقیقت پیغمبر پر کسی کے جادو کا عمل چل گیا اور جادو ان میں موثر ہو گیا اور ان کے دماغ میں خلل آ گیا اور عقل میں فتور پڑ گیا تو یہ بالکل جھوٹ اور باطل ہے۔ یقیناً راویوں کے دماغ میں فتور آ گیا ہو گا یا محدثوں کی عقل میں خلل آ گیا ہو گا۔ کیوں کہ کسی شخص کے جادو کے مارے ہوئے ہونے پر گواہی دینا ایک ایسے امر پر شہادت دینا ہے جو قابل حس نہیں ہے۔ کسی کو مسحور سمجھنا امر حسی نہیں ہے پس اس پر کوئی گواہی نہیں ہو سکتی۔

(10)......عوام نے اس روایت کے مضمون سمجھنے میں چند غلطیاں کی ہیں۔

اول تو یہ کہ سحر رسول اللہ الخ کو حقیقی اور واقعی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ایسے ہی ثابت ہے کہ کوئی کہے کہ زید پر گولی چلی۔ گو زید اس گولی کے اثر سے بالکل محفوظ ہو۔ یا کوئی کہے کہ ہندہ تو خالد کی معشوق ہے۔ گو ہندہ کو خالد سے کچھ بھی واقفیت نہ ہو یا اس کے عشق کا اثر ذرا بھی اس میں نہ ہوا ہو۔

دوم یہ کہ وہ جو دو شخص پیغمبر کے پاس آ کے بیٹھے تھے اُن میں سے اُن لوگوں نے ایک کو تو جبریل بنالیا اور ایک کو میکائیل۔ حالانکہ بخاری و مسلم کی روایتوں میں "رجلان" کا لفظ صاف موجود ہے (یعنی دو آدمی) جو روایتیں ان صحیحین کے درجہ سے گھٹی ہوئی ہیں ان کے راویوں نے اپنے دل سے "رجلان" کی جگہ "ملکان" یعنی دو فرشتے کر دیا۔ جیسا کہ طبرانی کی روایت میں ہے اور جن راویوں نے اور بھی زیادہ آزادی برتی اور روایت بالمعنی پر کفایت نہ کی وہ اس سے بھی بڑھ گئے اور صاف صاف "جبرائیل و میکائیل" ہی کہ دیا جیسا کہ ابن سعد کی ایک منقطع روایت میں ہے۔

سوم یہ کہ ان دونوں آدمیوں نے جو یقیناً لبید کے ہمراز تھے جناب پیغمبر ﷺ کو مطبوب بتلایا۔ اس لفظ کو شارحین نے مسحور کے معنی میں قرار دیا ہے حالانکہ یہ بھی ایک زبردستی سی ہے۔ قسطلانی شارح بخاری نے اس کنایہ کو صرف تفاول کے طریق پر قرار دیا ہے اور قرطبی نے کچھ اور ہی لکھا۔ "انما قيل للسحر الطب لان اصل الطب الحذق والتفطن له فلما كان كل من علاج المرض والسحر انما ياتى عن فتنة وحذق اطلق على كل منهما هذا الاسم ." جب طب کا لفظ ایسا عام ہے تو اس سے خاص مسحر سمجھنا خلل دماغ سے خالی نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے یہ امر تسلیم کر لیا ہے کہ جادو کا اثر ضرور متحقق ہوتا ہے پس اب جو کوئی خبر جادو کی روایت میں آوے گی وہ ضرور تسلیم کی جاوے گی حالانکہ اس کا تحقق محض ایک وہم اور خیال ہے اور معتزلہ کو جو مسلمانوں میں ایک حکیمانہ خیال کا فرقہ ہے، جادو کے تحقق سے انکار ہے۔

(11)......اگر ضابطہ فن روایت کی رو سے اس روایت پر نظر کی جاوے تو یہ کسی طرح صحیح و ثابت و یقینی و قطعی نہیں ٹھہر سکتی۔

اوّل تو یہ ایک خبر واحد ہے اور اخبار احاد سے کسی امر کی نسبت جس کی وہ خبر دیتے ہیں، یقین نہیں حاصل ہوتا۔ پس یہ خبر بھی سچی اور یقینی نہیں ہو سکتی۔

دوم یہ کہ اس روایت میں عنعنہ ہے یعنی عیسیٰ بن یونس اور ابن نمیر اور ہشام بن عروہ اور عروہ بن زبیر نے حدثنا یا اخبرنا کہ کر روایت نہیں کی جس سے اتصال پایا جاتا بلکہ عن عن کہ کر روایت کی ہے، جس میں احتمال ہے کہ ایک نے دوسرے سے بگوش خود سنا ہو یا اوروں سے سنا ہو جن کا نام ظاہر نہیں کیا اور ایسی روایت جس کا کوئی راوی بھی مجہول یعنی نامعلوم رہ جاوے صحیح اور سندی نہیں ہو سکتی۔

اس باب میں جو کچھ حجتیں اور تقریریں ہیں وہ ہمیں معلوم ہیں۔ علی ابن المدینی (استاد بخاری) اور بخاری اور ابوبکر صیرفی اور شافعی کا یہ مذہب ہے کہ روایت معنعن کو متصل سمجھا جاوے گا جب کہ دونوں راوی ایک ہی زمانہ میں ہوں اور ان میں باہم ملاقات ہونا بھی ثابت ہو اور وہ لوگ مدلس بھی نہ ہوں اور مسلم وغیرہ کا یہ مذہب ہے کہ دونوں راویوں کا صرف ایک زمانہ میں ہونا چاہیے تا کہ ملاقات ممکن ہو اور ملاقات کو ثابت ہونا شرط نہیں ہے۔ مسلم نے مقدمہ صحیح میں اپنے مخالف کی بڑی فضیحت کی ہے اور ایک طولانی تقریر کی ہے مگر محی الدین نووی نے منہاج شرح صحیح مسلم بن حجاج میں (باب ماتصح به رواية الرواة بعضهم عن بعض) لکھا ہے کہ جس باب کی طرف مسلم گیا ہے محققوں نے اس سے انکار کیا ہے اور اسے ضعیف بتلایا ہے اور جس بات کو مسلم نے ردّ کیا ہے اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں تو ان دونوں مذہبوں میں ایک گونہ سہل انگاری اور مسامحت ہے کیوں کہ ان میں سے جس نے زیادہ تشدد کیا ہے وہ صرف یہی کہتا ہے کہ صرف ان دونوں راویوں کا جو عنعنہ کرتے ہیں باہم ملاقات کا ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک مرتبہ شاید تمام عمر میں ملاقات کا ہو جانا بھی ثابت ہونا چاہیے۔ اور یہ اصول پھر بھی ناقص ہے کیوں کہ جب تک ہر ہر خبر میں بالمشافہ سنی ہونے کی تصریح نہ ہوگی ہمیشہ وہی احتمال ارسال قائم رہے گا۔ ہم روز کے تجربہ سے یہ بات ثابت پاتے ہیں کہ گو زید و خالد دونوں راوی ایک ہی شہر میں رہتے ہوں اور ملاقات بھی ہوا کرتی ہو تا ہم زید کا ہر عنعنہ خالد سے بلا واسطہ اور بالمشافہ نہیں ہوتا چہ جائیکہ کتب احادیث کے راوی جن میں سے ایک تو خراسانی ہے اور ایک بصری اور ایک کوفی ہے تو ایک مصری اور پھر ان کی معنعن روایتیں اتصال پر حمل کی جاتی ہیں یہ عجب قاعدہ ہے۔

مسلم نے اپنے قول کی تائید میں انھیں راویوں کا حوالہ دیا ہے جن پر ہم بحث کر رہے ہیں یعنی ہشام بن عروة عن ابيه عن عائشة چنانچہ لکھا ہے بيقين تعلم ان هشاماً قد سمع من ابيه وان اباه قد سمع من عائشة رضى الله عنها الخ مگر جب تک ایک خاص خبر میں بالمشافہ سننا ثابت نہ ہو

تب تک عام طور کا سماع کچھ مفید نہ ہوگا۔

غرض کہ اس میں نہایت شبہ ہے کہ عیسیٰ بن یونس اور ابن نمیر نے ہشام سے یہ روایت بلاواسطہ سنی یا بالواسطہ اور ایسے ہی ہشام نے عروہ سے بالمشافہ سنی یا کسی اور واسطے سے اور ایسے ہی عروہ نے اُمّ المومنین عائشہؓ کے رُوبرو یہ روایت سنی یا اور کے ذریعہ سے۔ پس اس وجہ سے یہ روایت نا قابل اعتبار ہے۔

سوم یہ کہ اس روایت کا ایک راوی ہشام بن عروہ ہر چند کہ عموماً ممدوح اور ثقہ اور معتبر ہے مگر امام مالک نے اسے جھوٹا یعنی کذاب کہا ہے پس یہ راوی مقدوح ٹھہرا اور روایت کم سے کم ضعیف ٹھہرے گی۔

اگر ہمارے جواب میں یہ کہا جاوے کہ یہ روایت ایک خبر واحد ہے اس پر یقین نہیں ہوتا تو ہم کہیں گے کہ پیغمبر ﷺ پر جادو ہو جانے کی روایت بھی تو خبر واحد ہے اس پر بھی یقین نہ کیجیے۔

چہارم یہ کہ حضرت ام المومنین عائشہؓ کا یہ فرمانا کہ سحر النبی الخ ضابطہ فن درایت کے موافق تو قابل قبول نہیں ہے کیوں کہ اس میں کسی امر حسی کی خبر نہیں ہے۔ پس جیسا کہ راوی کا ثقہ اور عادل ہونا ضرور ہے ویسا ہی یہ بھی ضرور ہے کہ اس نے امر حسی یا واقعہ چشم دید کی خبر دی ہو نہ کہ امر عقلی یا خیالی یا وہمی اور اعتقادی کی۔ ہم ان راویوں کے مشاہدات پر اعتبار کرتے ہیں مگر ان کی رائے اور خیالات کو نہیں مانتے۔ رائے تو صرف شخص معصوم صاحب الوحی کی مانی جاتی ہے۔

پس ان وجوہ سے یہ خبر نا قابل قبول اور لائق اعتبار نہیں ہے۔

(نواب اعظم یار جنگ، مولوی محمد چراغ علی خان؛ ماخوذ نقوش؛ رسول نمبر جلد چہارم)

جنات / بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں

صاحب ہدیٰ للعالمین رحمتہ للعالمین علیہ التحیۃ والسلام کی بارگاہِ ہدایت سے نہ صرف انسان نے شرف ہدایت پایا بلکہ "جنات" نے بھی آپ کی بارگاہ رسالت کی صداقت پر سر تسلیم خم کیا۔

قرآن مجید میں سورۂ جن میں جنات کی آمد قرآن حکیم کی سماعت اور تصدیق رسالت وہدایت کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا ہے۔

﴿قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا﴾

"کہ دیجے مجھے بذریعہ وحی اطلاع دی گئی۔ جنات کی ایک جماعت نے قرآن مجید سنا اور (اس کی معجز بیانی اور مضامین) کے اثرات پر تعجب کا اظہار کیا۔"

﴿یَّهْدِیْ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾

"جو راہ راست سمجھاتا ہے اور ہم نے اس کی ہدایات کو تسلیم کر لیا (ایمان لے آئے۔)"

﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا﴾

"اب ہم اپنے وحدہٗ لاشریک رب کا کسی کو حصہ دار نہیں مانیں گے۔"

﴿وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰی جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا﴾

"بے شک ہمارا رب بڑی شان والا ہے۔ نہ اس کی بیوی ہے نہ اس کی اولاد۔"

﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ یَقُوْلُ سَفِیْهُنَا عَلَی اللّٰهِ شَطَطًا﴾

"یقیناً ہم میں سے بے وقوفوں نے اللہ تعالیٰ سے جھوٹی باتیں وابستہ کر رکھی ہیں۔"

﴿وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَی اللّٰهِ كَذِبًاo وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا﴾

"اور ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ انسانوں اور جنوں میں سے کسی کی مجال ہی نہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں جھوٹے الزام تراشے انسانوں میں سے کچھ انسانوں نے جنوں سے پناہ مانگی جس کے سبب جنات میں جذبہ سرکشی اور بڑھ گیا۔"

﴿وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا﴾

"اور بلاشبہ تمھاری طرح انسانوں نے بھی گمان کر لیا کہ اب اللہ کسی "ہادی" کو نہیں بھیجے گا۔"

﴿وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّشُهُبًا﴾

"ہم نے آسمان کو چھو کر دیکھا تو اسے سخت پہرے اور خطرناک شعلوں میں بھرا پایا۔"

﴿وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا﴾

"اور ہم اس سے پہلے آسمان میں جگہ جگہ باتیں سننے کے لیے بیٹھ جایا کرتے تھے لیکن اب جو کان لگائے تو ایک شعلہ اپنی تاک میں پایا۔"

﴿وَّاَنَّا لَا نَدْرِیْٓ اَشَرٌّ اُرِیْدَ بِمَنْ فِی الْاَرْضِ اَمْ اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾

"اور ہم نہیں جانتے کہ زمین والوں سے کسی بُرے ارادہ کا فیصلہ کیا گیا ہے یا ان کا رب ان سے کسی بھلائی کا ارادہ کر چکا ہے۔"

﴿وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ كُنَّا طَرَآئِقَ قِدَدًا﴾

"اور بلاشبہ ہم میں بعض نیکوکار ہیں اور بعض اس کے سوا بھی۔ ہم مختلف فریق ہیں۔"

﴿وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًاo وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓی اٰمَنَّا بِهٖ فَمَنْ یُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًاo وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًاo﴾

"اور ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو زمین میں عاجز نہیں کر سکیں گے اور نہ ہم بھاگ کر اسے مات دے سکتے ہیں۔ ہم تو ہدایت سنتے ہی مسلمان ہو گئے! اور ہم سے بعض بے انصاف بھی ہیں۔ طے شدہ بات ہے جو مسلمان ہو گئے۔ انھوں نے صحیح راستہ کا انتخاب کیا۔"

﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًاo﴾

"اور ظالم جہنم کا ایندھن بن گئے۔"

﴿وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَی الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًاo﴾

"اور اے نبی یہ بھی کہ دو اگر لوگ راہ راست پہ قائم رہتے تو ہم انھیں پانی بھر کر پلاتے۔"

جنات کا قرآن مجید سننا' اس کی اثر انگیزی اور مطالب ہدایات بحوالہ توحید کو دل سے تسلیم کرنے کے بعد اپنے باقی جنات کو جا کر ان کا اظہار توحید اقرار توحید اور پھر اس کی تبلیغ کے بارے میں حضور اکرم ﷺ کو علم نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی (بحوالہ ابن کثیر)

ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ جب شیاطین جو اس سے پہلے آسمان کے ان حصوں میں جا کر بیٹھ سکتے تھے۔ مگر کچھ دنوں سے ان مقامات پر پہنچتے ہی انھیں آگ کے شعلوں نے طمانچے مارنا شروع کر دیے، جو ان کے لیے بڑی حیران کن بات تھی۔ آسمان پہ رونما ہونے والے اس بالکل نئے حادثے کے بارے میں سب جن پریشان ہو گئے۔ آپس میں مشورہ ہونے لگا۔ دانشوروں کی جماعت اکٹھی ہوئی۔ بحث مباحثہ

کے بعد جنات نے اپنے سب سے بزرگ اور بڑے جن (شیطان) ابلیس کے سامنے مسئلہ پیش کیا۔ اس نے کہا:

میرے خیال میں روئے زمین پر کوئی غیر معمولی انقلاب انگیز شخصیت پیدا ہوئی ہے۔ جاؤ دنیا کے کونے کونے میں پھیل کر پتہ لگاؤ۔ سمجھ میں نہ آئے تو ہر خطہ کی مٹھی بھر مٹی اپنے ساتھ لے آؤ۔

چنانچہ یہی ہوا۔ شیطانوں (جنات) کی ٹولیاں دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلیں اور حسب حکم مٹی لے آئیں۔ بزرگ شیطان نے مختلف علاقوں سے لائی ہوئی مٹی کو سونگھنا شروع کیا۔ لیکن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی مٹی سونگھتے ہی اس کے چہرہ کی رنگت بدل گئی۔ آنکھوں میں غم کی اندھیری رات چھا گئی۔ انتہائی دل شکستہ آواز میں اعلان کیا۔ یہ انقلاب انگیز شخصیت مکہ معظمہ کی سرزمین میں پیدا ہوئی ہے۔ سب کے سب چونکے اور اپنی دشمن اس شخصیت کی طرف اس لیے بڑھے کہ وہ اسے جانیں۔ اسے سمجھیں اور پھر اگر ان کے بزرگ ابلیس کے خلاف' یا نسل آدم کی بھلائی میں اس کا عمل کوشاں ہو تو ہم اس کی پرزور مخالفت کریں۔ اسے پھلنے پھولنے سے پہلے مسل دیں۔ (نعوذ باللہ)

چنانچہ اس مقصد کے لیے جنات کی ایک جماعت اس وقت مکہ معظمہ میں پہنچی۔ جب کہ آنحضرت ﷺ بازار عکاظ کی طرف جاتے ہوئے مقام نخلہ میں اپنے اصحاب کے ساتھ نماز پڑھ رہے تھے۔ جنات کی اس جماعت نے حضور اکرم ﷺ کی زبان اقدس' آواز رحمت و برکت سے قرآن حکیم کی آیات ''نور علی نور'' سنیں تو سب کے سب حیرت میں ڈوبے' شان رسالت کے سامنے دم بخود۔ بغیر آداب سلام کہے اپنی جماعت جنات میں لوٹے۔ اور انھیں خبر دی! ہمارے بھائیو! ہم نے اس بے مثال شخصیت انقلاب آفریں کی زبان سے ایسی عجیب وغریب کلام سنی (قرآن مجید) اس نے ہم پر بڑی اہم حقیقت کا انکشاف کیا۔ ہمارے ضمیر تو اسی وقت اس کی صداقت کو مان گئے اور اب ہم اعلان کرتے ہیں کہ نبی آخر الزمان ختم المرسلین ﷺ سچے' قرآن سچا۔ آج سے ہم اللہ وحدہ' لاشریک کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ نہ ہی اسے کسی نے پیدا کیا ہے۔

یہ تھی جنات کی سب سے پہلی دانشوروں کی جماعت' جن کی عقل نے صداقت رسالت ﷺ کو تسلیم کیا اور زبان سے بے باک اعلان کیا جس سے جنات کی دنیا میں بھی تہلکہ مچ گیا۔ تعلیم نبوی ﷺ کے مبلغ جنوں میں بھی پیدا ہو گئے' ابلیس سٹپٹایا۔ غصہ میں تھرتھرایا' انھیں ڈرایا دھمکایا۔ مگر سب بے سود! سچائی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور جب یہ کسی کے دل میں ''ایمان'' کے ساتھ جاگزیں ہو جائے تو پھر...... ناقابل تسخیر قوت بن جاتی ہے۔

ابلیس نے اپنے ہم عقیدہ جنات کو یہ کام سونپا کہ تم احکامات الٰہیہ کو سنو۔ اور اس میں ایسی تبدیلیاں کر دو کہ حقیقت' خرافات میں ڈوب جائے۔ غرض ادھر ابلیس کی کارروائیاں تیز تر ہو گئیں۔ ادھر ایمان لانے والے جنات کا عمل دوسرے جنات کو متاثر کرنے لگا۔ بارگاہ نبوی ﷺ میں گروہ در گروہ جنات تعلیم کے لیے حاضر ہوتے لیکن آپ ﷺ ان کے لیے الگ اور مخصوص مقامات پر درس فرماتے! عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ایک بار آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ آج کی رات تم میں سے جو بھی چاہے۔ ''جنات'' کو تعلیم دینے کے سلسلہ میں میرے ساتھ چلے! سب کے سب خاموش رہے لیکن میں نے اظہار معیت کیا۔

چنانچہ اس رات شفیع المذنبین ہدی للعالمین ﷺ جب پہاڑی کے ایک بلند حصہ پہ پہنچے تو مجھے اپنے قدم مبارک سے ایک گول دائرہ کھینچ کر حکم فرمایا کہ تم یہیں اس حدود میں بیٹھ کر دیکھتے رہو۔ میں بیٹھ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے ایک بلند جگہ پر کھڑے ہو کر قرآن پاک کی تلاوت شروع کی تو دیکھتے ہی دیکھتے مختلف سمت سے غول درغول جماعتیں انتہائی ادب کے ساتھ آپ ﷺ کی بارگاہ میں چاروں طرف سے آئیں اور بیٹھ گئیں۔ میں تو قرآن حکیم (اور پھر تلاوت کرنے والے رسول اکرم ﷺ) کی حلاوتوں میں کھو گیا۔ اثرات نے دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیا لیکن جیسے ہی آپ ﷺ کی زبان مبارک خاموش ہوئی تو میں نے دیکھا۔ بادل کے چھٹتے ہوئے ٹکڑوں کی طرح جنات گروہ در گروہ مختلف سمت بکھر گئے۔ اب صبح ہو چکی تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا۔ تم نے کیا دیکھا؟

میں نے عرض کیا۔ میں نے دیکھا۔ سیاہ رنگ' بھیانک چہرے اور سفید لباس میں ملبوس مخلوق۔

آپ ﷺ نے فرمایا۔ ہاں۔ یہ مختلف قبیلوں اور مقامات سے آئے تھے۔ انھوں نے مجھ سے انسانوں کے ساتھ مساجد میں نماز پڑھنے کی درخواست کی لیکن میں نے انھیں منع کر دیا۔ اتفاقاً نماز پڑھ لیں تو جائز ہے لیکن مستقل اختلاط یعنی گھل مل جانے سے منع کر دیا۔ اسی طرح ایک بار حضرت عکرمہؓ کو بارگاہ نبوی میں جنات کے مجمع کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا تو وہ کہتے ہیں۔

مجھے حضور اکرم ﷺ نے ایک گول دائرہ کی حدود میں بیٹھنے کا حکم فرمایا۔ اور خود ایک اونچے مقام پر کھڑے ہو کر قرآن حکیم کے اوامر و نواہی پہ مبنی آیات تلاوت فرمانا شروع کیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک جم غفیر نے آپ ﷺ کو چاروں طرف سے ایسے گھیرا جیسے چاند بادلوں میں گھر جائے۔ مجمع کا شور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' لیکن اس مہیب صورت مخلوق میں آپ ﷺ کو غائب دیکھ کر میں گھبرا گیا۔ لیکن میں نے دیکھا آپ ﷺ ان کو چھڑی سے بیٹھنے کا حکم دے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اختتام پر جب حضور ﷺ تشریف لائے۔ جنات چلے گئے تو میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان لوگوں میں ایک قتل کا واقعہ ہو گیا تھا۔ دونوں فریق اپنے اپنے دلائل پیش کر رہے تھے۔ میں نے ان کا فیصلہ کر دیا۔

ابو ہریرہؓ اپنے حوالے سے ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ جنات نے مجھ سے توشہ مانگا تو میں نے انھیں اللہ تعالیٰ کے نام پر مذبوح جانوروں کی ہڈیاں اور گھوڑوں کی لید تجویز کی ہے اور انھیں بتایا کہ ان ہڈیوں کو ان کے

ہاتھ میں لیتے ہی اللہ تعالیٰ ویسا ہی گوشت پوست دے دیں گے جیسا کہ پہلے تھا۔ اسی طرح گھوڑوں کی لیدان کی غذا کی صورت میں بالکل وہی وجود اختیار کرلے گی جو گھوڑوں کے معدوں میں جانے سے پہلے تھا (یعنی دانے یا غذا کی دوسری اصلی صورت)۔

اس لیے آج سے ہم تمام امت مسلمہ کے لیے ہڈیوں اور گوبر سے نجاست صاف کرنا ممنوع قرار دیتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ انسانوں کی طرح ان میں بھی کم زور اور طاقت ور ہیں۔ قتل اور جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں بھی صالح اور متقی اور نیک جن موجود ہیں۔ ان میں بھی شر پسند، ایذا پسند اور فساد پسند جن موجود ہیں۔

ان میں بھی ایک گروہ شرک میں مبتلا ہے اور ایک گروہ آسمانی کتابوں کے احکام کی اتباع کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمانِ جلیل کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ انسانوں کی طرح جن بھی عبادات کے مکلف قرار دیے گئے ہیں۔

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ (الذاریات: 56)

''ہم نے انسانوں اور جنوں کا مقصود حیات اللہ جل شانہ کی ''عبادت'' (فرماں برداری) قرار دیا ہے۔''

ایک اور جگہ ''سورۂ احقاف چھبیسواں پارہ'' قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَاِذْ صَرَفْنَا اِلَيْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْآنَ﴾

''اور ہم نے جنات کی ایک جماعت کی توجہ تمھاری طرف مبذول کی۔ انھوں نے قرآن حکیم سنا۔''

﴿فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْا اَنْصِتُوْا﴾

''اور جب وہ حاضر ہوئے تو دوران سماعت انھوں نے ایک دوسرے کو مؤدب خاموشی کا حکم دیا۔''

﴿فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ﴾

''اور جب تلاوت اختتام کو پہنچی تو یہ جماعت اپنے دوسرے افراد کی طرف لوٹی اور انھیں بھی ان احکامات سے آگاہ کیا۔''

﴿قَالُوْا يَا قَوْمَنَا اِنَّا سَمِعْنَا كِتَابًا اُنْزِلَ مِنْ م بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

''اے ہماری قوم ہم نے وہ کتاب سنی جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی اور وہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ کتاب حق اور ایک سیدھی راہ کی طرف راہ نمائی کرتی ہے۔''

﴿يَا قَوْمَنَا اَجِيْبُوْا دَاعِيَ اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ﴾

''اے ہماری قوم والو اللہ کی طرف بلانے والے ﷺ کی دعوت قبول کرلو۔ اور اس پر یقین محکم (ایمان لے آؤ)''

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ﴾

''اس کے نتیجہ میں تمھارے تمام سابقہ گناہوں کو بخش دیا جائے گا۔ اور دردناک عذاب سے بچالیا جائے گا۔''

﴿مَنْ لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءُ﴾

اور اگر تم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سچے داعی ﷺ کی بات نہ مانی تو پھر یقین کرلو تمھارا روئے زمین میں کسی حصہ میں بھاگ جانا تمھیں نجات نہیں دے سکے گا۔ اسے اگر مدد مل سکتی ہے تو صرف بارگاہِ الٰہی سے اولٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِيْنٍ اور یہ بھی یقین کرلو ایسی کوشش کرنے والا کھلی گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا کچھ نہیں۔

ارشاداتِ ربانی کے ان ارشادات سے ''جنات'' کے اعمال ذہن اور پھر ان میں پھیلی ہوئی گمراہی کا ہر پہلو کھلی کتاب کی طرح سامنے آجاتا ہے۔ اور پھر ایمان لانے والے جنات کی آنحضرت ﷺ کی رسالت اور توحید کی تصدیق کے ساتھ ان کی تعلیمات کی تبلیغ کا عمل کن عقائد پر مبنی ہے وہ بھی عیاں ہے۔

قرآن مجید میں اس کے بعد کفار جنوں کا ردعمل کیا ہوا۔ اس کا ذکر تو نہیں لیکن احکاماتِ الٰہیہ کے پیغام کو جب آنحضرت ﷺ کفار کے سامنے لب کشا ہوئے کس طرح کا ردعمل ہوا۔ تاریخ کی اور سیرت کی کتابوں میں ان کی وضاحت موجود ہے۔ ظاہر ہے جنات میں بھی کفار جنوں کا وہی ردعمل ہوگا۔

ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کفار جنات آیاتِ الٰہیہ کو سنتے تو اس میں اپنی طرف سے عبارات کو بڑھا کر اس کے مفہوم کو غلط ملط کرتے تاکہ حقیقت خرافات میں کھو جائے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ شیطان (ابلیس) نے جو سب سے پہلا حربہ استعمال کرنے کے لیے جن جنات کو استعمال کیا وہ اس کا دانشور پڑھا لکھا گروہ تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اس کا فوری انسداد فرمادیا۔ اور انھیں آیاتِ الٰہیہ کی سماعت سے محروم کردیا گیا۔ ابن جریر میں مرقوم ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے نصیبین کے رہنے والے سات جنوں کو جنات کی مختلف بستیوں کی طرف تبلیغ دین کے لیے بھیجا۔ ان کی تعداد نو اور اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں بھی یہ سلسلہ مرقوم ہے۔

قرآن مجید کے ارشادات کی روشنی میں تھوڑی سی اور وضاحت:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ﴾ (الانعام: 112)

''اور اسی طرح ہم نے شیطان سیرت انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنادیا تھا اور دھوکہ دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ایسے خیالات میں مدد کرتے مخالف میں کارگر ہوں اور ایک دوسرے کے قول کو غرور بخش انداز میں سراہتے اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو ایسا نہ ہوتا، لہٰذا ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دیجیے۔''

اس آیہ کریمہ میں شیطان کے تابع جن انبیا سے دشمنی کا طریقہ کار کا جو انداز اختیار کرتے اور اس دشمنی میں انسانوں کے دانشور طبقہ کو کس طرح استعمال کرتے

کی نشان دہی واضح ہے۔

دوسری آیات سورۂ انعام آیت 128:

﴿وَ یَوْمَ یَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ﴾

''اور جس دن وہ سب (جن وانس) کو جمع کرے گا اور پھر فرمائے گا۔اے گروہ جنات تم نے انسانوں سے بہت سے فائدے حاصل کیے۔''

﴿وَ قَالَ اَوْلِیٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّ بَلَغْنَاۤ اَجَلَنَا الَّذِیْۤ اَجَّلْتَ لَنَا﴾

''اور جو انسانوں میں سے ان کے دوست ہوں گے وہ بھی اقرار کریں گے ہاں پروردگار ہم ایک دوسرے سے فائدہ حاصل کرتے رہے اور آخر کار ہم اس وقت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا۔''

﴿قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ اِنَّ رَبَّكَ حَكِیْمٌ عَلِیْمٌ﴾

''حکم الٰہی ہوگا۔اب تمھارا ٹھکانا دوزخ ہے، ہمیشہ اس میں جلتے رہو گے مگر اللہ تعالیٰ جو چاہیں۔تمھارا رب بڑا صاحب اور حکمت والا اور علم والا ہے۔''

جنوں کی پیدائش

﴿وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ۝﴾ (الحجر: 25تا26)

''ہم نے انسان کو کھنکھناتے ہوئے سڑے ہوئے گارے سے پیدا کیا۔اور جنوں کو اس سے بھی پہلے بے دھویں کی آگ سے پیدا کیا۔''

جن اور انسان کی تخلیق میں بنیادی فرق کی وضاحت کر دی گئی۔

ایک اور آیہ کریمہ سورۂ نمل آیت 39:

﴿قَالَ عِفْرِیْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ وَ اِنِّیْ عَلَیْهِ لَقَوِیٌّ اَمِیْنٌ﴾ (النمل: 39)

سلیمان علیہ السلام کو ایک قوی ہیکل جن نے کہا۔اس سے قبل کہ آپ اپنی جائے نشست سے اٹھیں، میں اسے (ملکہ سبا کے تخت کو) آپ کے پاس حاضر کر سکتا ہوں مجھے اس پر قدرت بھی حاصل ہے اور میں قابل اعتماد بھی ہوں۔

اس آیہ کریمہ میں اس بات کی تصدیق ہے کہ جن اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے مطیع تھے۔ایک اور بات جو اس ضمن میں خیال رکھنا ضروری ہے وہ یہ کہ جن، انسان پر غالب ہیں، یا انسان کو ان پر قدرت حاصل ہے۔انسان اشرف واکرم ہے یا جن۔اس کی وضاحت آدم علیہ السلام کے یوم آفرینش کے اس واقعہ سے آئینہ کی طرح صاف ہے جب فرشتوں اور جنوں کے بزرگ ابلیس کو آدم علیہ السلام کے حضور سجدہ کرنے کا حکم دیا اور پھر فرمایا: ﴿اِنَّا خَلَقْنَا كُمْ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾

اے آدم ہم نے تمھیں انتہائی بہترین پیدائش سے نوازا ہے۔ثابت ہوا جن انسان پر کسی قسم کا جبر نہیں کر سکتے۔انسان کو اپنے تابع بنانے کی قدرت نہیں رکھتے!

لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر کوئی انسان ان سے دوستی کرنا چاہے، یا نھیں اپنی قوت ارادی سے اپنا مطیع بنانا چاہے تو ایسا ممکن ہو سکتا ہے۔اور ایسا ہوا ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے، جیسے کسی ماہر نفسیات کے زیر علاج مریض جب تک معالج سے تعاون نہ کرے، کسی ہپناٹسٹ کا مفعول اس سے اثر پذیری کا خواہش مند نہ ہو تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔چنانچہ قبل اسلام نہ صرف عرب بلکہ دنیا کے اور بہت سے ممالک میں جنات اور انسانوں کے باہمی رابطے کے واقعات ملتے ہیں۔اور آج بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن کا ذکر ہم آگے کریں گے۔!

پہلے حضور اکرم ﷺ کے جنات کے بارے میں اپنے مشاہدہ کا تاثر پڑھ لیجیے۔

(بحوالہ ترمذی شریف)

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے صحابہ کرام کے سامنے سورۂ رحمٰن تلاوت فرمائی اور صحابہ کرامؓ سے فرمایا۔کیا بات ہے۔تم لوگ خاموش ہی رہے۔تم سے جن بہت اچھا جواب دینے والے ثابت ہوئے۔جب بھی میری زبان سے ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ﴾ سنتے تو جواب میں بے ساختہ کہتے۔

''وَلَا بِشَیْءٍ مِنْ اٰلَائِكَ اَوْنِعْمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ . ''

یہ استدلال جنات کا مومن ہونا۔بارگاہ نبوی میں حاضری اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے اپنے دینی ذہن اور فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔

جنات میں اللہ کی وحدانیت اور محمد ﷺ کی تصدیق سے پہلے کی شریعتوں کو تسلیم کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا ثبوت اس عام تاثر کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ جن سبھی کے سبھی ''شیطان'' کے تابع یا مکمل شر و فساد ہی ہیں۔

ابن کثیرؒ نے اپنی کتاب السیرۃ میں جنات کے بارہ میں کچھ تفصیلی حوالے دیئے ہیں۔ورنہ اکثر سیرت کی کتابوں میں جنات کے موضوع کو صرف قبل اسلام عرب شعراء اور قبائل کے جنات سے گہرے رابطوں، عقیدوں کے بارے میں تذکرہ ضرور کیا ہے۔شبلی نعمانیؒ نے اپنی سیرت کی چوتھی جلد میں ''ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت'' کے عنوان دادہ باب میں جن شیاطین اور بھوت پریت کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے۔

جن، شیاطین، بھوت پلید کو اشغال اور اشکال کے لحاظ سے تو مختلف سمجھتے تھے لیکن ان کے اعتقاد کے مطابق یہ ایک ہی خاندان تھا۔اسی طرح ان کے بسیروں کے حوالے سے جو جنگلوں میں رہتے ہیں ان کا نام غول تھا۔ان کے خیال کے مطابق ان کا کام مسافروں کو ڈرانا اور دھوکہ دینا ہوتا تھا۔ان میں مونث اور مذکر دونوں ہوتے تھے:

وَغُـولاً قُـفـرَةً ذَكَـرٌ وَأُنْثٰـى
كَـانَ عَـلَيْـهَـا قِطَعَ الْبُجَارُ

''اور بیابان کے دو غول مرد اور عورت بھی گویا ان دونوں پر کمبل کے دو ٹکڑے پڑے ہیں۔''

اذَلَّ وَسُعْلاۃَ و غولَ بُقفرۃَ

اذالیل واری الجنُّ فِیہِ اَونت

''میں بیابان میں پھلتا ہوں اور چڑیل (مونث) غول (مرد جن) جب رات پردہ پوش ہوئی تھی تو بھوت اس میں آوازیں دیتے تھے۔ پھر یہ جن صحرانشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوئے جاڑوں میں جب بدو آگ جلاتے تو یہ آگ تاپتے مگر کھانے میں شریک ہونے سے انکار کرتے ہوئے کہتے ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھاتے۔''

اَتَـوْنَـارِیْ فَـقُـلْـتُ مَـنُـونَ اَنْتُـمْ؟

فَـقَـالُـو الـجِـنَّ قُلْتُ عـمـر اَظْلامَـا

''وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے۔ میں نے کہا تمھیں ن ہو؟ انھوں نے کہا ہم جن ہیں۔ میں نے کہا اس تاریکی میں خوش رہو۔ یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا۔ اسے بھی اٹھا کر لے گئے لیکن کئی برسوں کے بعد جدنیجہ ابرش کو لا کر دے گئے۔''

اسی طرح علامہ جاحظ نے اپنی تصنیف ''کتاب الحیوان'' میں تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ابوالبلاد طہوی ایک شاہ نے لکھا ہے کہ میں غول بیابانی سے ملا۔ جو رات کے اندھیروں میں چلتے ہیں۔

چنانچہ اس وقت کے کاہن جو پیش گوئیاں کرتے تھے ان کی زبان انتہائی بلیغ اور مسجع ہوتی تھی۔ وہ آسمانی چیزیں بھی بتاتے تھے۔ ان کا یہی دعویٰ ہوتا تھا کہ ان کا دوست ایک جن ہے۔ جو انھیں القا کرتا ہے۔ وہ اپنی صورت اور لباس ایسا اختیار کرتے تھے کہ لوگ انھیں دیکھتے ہی پہچان لیتے تھے۔ ایک دن حضرت عمرؓ کے پاس سے ایک آدمی گزرا۔ آپ نے قیافہ سے اسے پہچان لیا۔ اسے بلا کر پوچھا۔ تیرے جن نے سب سے زیادہ کون سی عجیب بات کہی؟ تو اس نے بوکھلا کر کہا: اَلَمْ تَـرَ اِلَی الْـجِـنِّ وَابـلا سِهَاْ وَجَاسِهَاْ مِنْ بَعْدِ الكَاسِهَا والحرقها بالقاس وَاَحلاسَهــا کیا تم جنوں کی سراسیمگی ان کی ناامیدی ان کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یہ ٹھیک کہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی پیدائش کا شیطان کو سب سے زیادہ غم ہوا۔ کیوں کہ۔ یہی ذات رحمت وشفقت ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم یہی ذات رؤف الرحیم ہے...... یہی وہ ذات عفو درگزر ہے یہی وہ غم خوار انسانیت ہے۔ یہی وہ محسن انسانیت ہے' یہی وہ محسن کائنات ہے جس سے زیادہ نسل آدم کا کوئی ہمدرد نہیں' غمخوار نہیں' محبت کرنے والا شفقت کرنے والا نہیں۔ یہی وہ ذات افضل البشر علیہ التحیۃ والسلام ہے جو غم آدمیت' احترام آدمیت میں بار بار اشک بار ہوئی۔ اتنی فکر مند ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کو اسے بار بار کہنا پڑا۔ تم ان کے غم میں اتنا کیوں تڑپتے ہو!...... یہ ہماری بھی تو مخلوق ہے۔ لیکن معراج کی بلندیاں ہیں تو وہاں بھی۔ اپنے ساتھ عبادہ الصالحین نہیں بھولے۔ شیطان جو آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا پہلے ہی دن سے دشمن ہوا اور پھر کھل کر دشمنی کا اعلان کیا اسے اس سے بڑھ کر اور کیا غم ہوسکتا تھا کہ رحمت للعالمین علیہ السلام آ گئے۔ شفیع المذنبین' سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام جلوہ افروز ہوئے اور ان زندگی بخش جلووں نے شیطان اور اس کے مطیع جنوں میں اپنی ہلاکت اور موت، اپنے ارادوں میں شکست اور اپنی چالوں میں ناکامیاں نظر آنے لگیں' اس کی نسل میں سے بہت سے اس کے فریب سے نکل کر ایمان لے آئے۔ اس طرح انسانوں کو گمراہ کرنے کا کاروبار سرد پڑ گیا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ ایک روز میں زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا۔ ایک آدمی نے گائے کا بچھڑا ذبح کیا۔ اس کے بعد ایک شخص اس کے پاس آ کر زور زور سے چلایا۔

یا جلیح' امر نجیع' رجل فصیح یقول لا اِلٰہ الاّ اللّٰہ۔ اے جلیح' امر نجیح ایک فصیح شخص لاالٰہ الااللہ کہتا ہے۔ چنانچہ اس سے چند ہی دنوں بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی۔

کاہنوں کے علاوہ عرب شعراء کی نسبت بھی لوگوں کا یہی خیال تھا بلکہ ہر شاعر خود کہتا تھا کہ میرا دوست ایک جن ہے۔ اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا۔ اس کے شیطان کا نام مسحل تھا۔ اعشیٰ خود کہتا ہے

دعـون خـلـيـلـی مـحـلاً و دعـوالـه

بَـجـهـنـامِ يـدعـی لـلـهـجـيـن الـمـذمـم

''میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا۔ اور انھوں نے اس کے لیے جہنام کو پکارا۔ (حریفوں نے) اور یہ کمینہ (جہنام) بد اطوار کے لیے بلایا جاتا ہے۔'' ابوالنجم کہتا ہے:

انـی وکـل شـاعـر مـن الـبـشـر

شیـطـانـہ انثیٰ و شیـطـانـی ذکـر

''ہر شاعر کا شیطان تو مونث ہے مگر میرا شیطان تو مذکر ہے۔''

یہ تو عرب شعراء کی زبانی اپنے اپنے جن کی دوستی کا حال آپ نے پڑھا۔ اب ایک ابتدائی ایام میں مشہور کاہن اور بعد میں مسلمان ہونے والے سواد بن قارب کی اپنی زبانی ایک ایسے جن کی تفصیل سنیے جو مبلغ اسلام تھا۔ جسے ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''تفسیر ابن کثیر'' میں سورۂ احقاف کی تفسیر میں مرقوم کیا ہے اور ہمارا ماخذ امین دیدار کی صُدَرُ مِنْ حیاۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم مطبوعہ دارالمعارف القاہرہ ہے۔

حافظ ابویعلی الموصلی محمد بن کعب القرظی سے روایت کرتے ہیں۔

ایک دن ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھے تھے۔ ایک شخص گزرا تو میں نے کہا' یا امیر المومنین اس راہ گیر کو آپ نے پہچانا ہے۔ انھوں نے فرمایا: یہ کون تھا؟ ہم نے کہا یہ سواد بن قارب ہے۔

قبل از اسلام یہ وہی شخص ہے جس کا مطیع ایک جن تھا۔ جو اسے غیب کی خبریں بتانے میں مدد دیتا تھا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کسی آدمی کو اس کے تعاقب میں بھیج کر اسے بلایا اور دریافت کیا۔ کیا تمھی سواد بن قارب ہو۔ اس نے جواب دیا۔ ہاں۔ میں ہی سواد بن قارب کاہن تھا۔ مگر اب میں مسلمان ہو چکا ہوں۔ بحمد للہ! عمر فاروقؓ نے

فرمایا۔ سبحان اللہ۔ میں تم سے زمانہ کہانت کی باقی آپ بیتی نہیں پوچھوں گا۔ مگر اتنا بتا دو کہ تمہارے دوست جن نے تمہیں حضور اکرم ﷺ کے بارے میں کیا بتایا تھا۔ سواد نے کہا۔ تو سنیئے امیر المومنینؓ۔

ایک رات میں نیم خوابی کی حالت میں تھا کہ میرے مطیع جن نے میرے پاؤں جھجھوڑے اور کہا:

"قم یا سواد بن قارب واسمع مقالتي۔ واعقل ان کنت تعقل......"

"اٹھو سواد بن قارب اور میری بات سنو! اور اگر تم عقلمند ہو تو عقل مندی سے کام لو۔"

انه قد بعث رسول من لؤی بن غالب، یدعوالی الله والی عبادته، ثم انشاء بقول۔"

"بلاشبہ لوی بن غالب میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو چکی ہے۔ وہ اللہ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے ہیں اور پھر انتہائی کیفیت میں جھوم کر یہ شعر پڑھنے لگا:

عجبت للجن ولطلا بها
وَشدّ العیس بأنتا بها

"میں جنوں کے دور دراز سفر کے لیے بوریا بستر باندھنے پہ تعجب کر رہا ہوں۔"

تهوی إلی مکة تبغی الهدیٰ
ما صادق الجنّ ککذابها

"اگر تم ہدایت کے طلبگار ہو تو مکہ مکرمہ کی طرف جلدی چلو اور یاد رکھو سچا جن جھوٹے جن کی طرح ناقابل اعتماد نہیں ہوتا۔"

فارحل الی العفوۃ من هاشم
لیس قدا ماها کانا خابها

"جا جلدی جا اور ایک بار بنو ہاشم کے اس جمیل چہرہ کو ایک نظر دیکھ تو سہی۔ ویسا جمال تم نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔"

میں نے اسے کہا۔ دعنی انام۔ چل بھاگ سونے دے! لیکن دوسری رات کو پھر اس نے میرے پاؤں جھنجھوڑے۔ پھر وہی الفاظ دہراتے ہوئے وجدانی کیفیت میں شعر کہنے لگا:

وارحل الصفوة من هاشم
بین رو اجیها و احجارها

"بنو ہاشم کے عظیم صفت اللہ کے منتخب ﷺ کی زیارت سے اپنا دل منور کر لے۔"

تیسری رات بھی اس نے یہی عمل کیا اور تینوں بار اس نے یہ بات ضرور کہی۔

عجبت الجنّ وتحّاسنها
وَاشدها العیس باحلاسها

مجھے اپنی جن برادری کی (مکہ مکرمہ) کو جلد سے جلد روانگی پہ تعجب ہے۔ ہر ایک اپنے اونٹوں کے پلان اور کجاوے کسے ہوئے نظر آ رہا ہے اور تو اگر عقلمند ہے ہدایت کا طالب ہے تو اٹھ جلدی کر۔

جلدی سے بنو ہاشم کے نور نظر کی خدمت میں حاضر ہو۔ اس کے انوار بابرکات سے اپنے دل اپنی آنکھوں کو منور کر لے۔

اس کے بعد میرا دل بھی بے چین ہوا۔ میں نے تیز تر سواری کا اہتمام کیا اور پھر رات دن ریگستانی طوفان اور پتھریلی چٹانوں کو چیرتا ہوا مکہ معظمہ پہنچا تو ہادی الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے اصحاب کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ میں باادب ان کے قریب گیا اور عرض کی۔ یارسول اللہ ﷺ میں اپنی معروضات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں! آپ ﷺ نے اجازت مرحمت فرمائی تو میں نے دھڑکتے دل اور نمناک آنکھوں سے عرض کیا۔

(ترجمہ:) میرا جن میرے پاس انتہائی سچی خبر لے کر تین رات تک مسلسل آتا رہا اور ہر بار ہر رات وہ یہی کہتا رہا۔ لوی بن غالب "خاندان شرفا" کے صدر نشین خاندان کے ہاں اللہ کا رسول ﷺ مبعوث ہو چکا ہے۔ آخر کار اس کی سچائی نے میرے ضمیر کو جگایا۔ میں نے بھی سفر کی تیاری کی۔ جلد سے جلد سفر طے کرنے کی خواہش میں تیز اور بہت تیز راہوں کو لپیٹتا ہوا حاضر خدمت ہوا ہوں۔

اب میں اس سچائی کا اقرار و اعلان کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی رب نہیں معبود نہیں۔ اور آپ اللہ تعالیٰ کے امانت دار (امین) رسول اکرم ﷺ ہیں۔ اور آپ سے اس دن شفاعت کا طالب ہوں جب عزیز و اقارب، احباب و آشنا سب میں سے کسی کی کچھ نہیں چلے گی۔ اس دن اپنی شفاعت سے نوازیئے گا۔ اے بہترین اخلاق سے سنورے ہوئے بزرگوں اور نیک طینت خاندان کے چشم و چراغ، اے تمام رسولوں سے افضل رسول ﷺ آپ کی بارگاہ میں وعدہ کرتا ہوں جو حکم آسمانی (الٰہی) آپ مجھ تک پہنچائیں گے۔ وہ کتنا ہی مشکل اور طبیعت کے خلاف کیوں نہ ہو، اسے ٹالا نہیں جائے گا۔ لیکن اس گناہ گار کی ایک التجا قبول فرما لیجیے۔ یوم جزا سواد بن قارب کا آپ کے سوا کوئی آسرا نہیں ہوگا۔ اس یوم جزا و سزا کے مشکل ترین دن میری سفارش ضرور فرمایئے گا۔

یہ سن کر رحمت دو عالم ﷺ مسکرائے اور پھر فرمایا۔ آج سے خیر و بھلائی ایمان کا نور تمہارا مقدر ہو گیا۔ سواد بن قارب!

بس "امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ! ان سعادت مند گھڑیوں میں جو ایمان کی دولت سے جھولی بھری تو اب تک اسے سنبھالے پھرتا ہوں۔"

عمر فاروقؓ نے فرمایا اللہ تمہیں مبارک کرے یہ سعادت اور اسے اپنے اعمال کے قلعہ میں محفوظ رکھنے کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین، ثم آمین

سواد بن قارب کو ابدی سعادتوں سے مالا مال کرنے کا سبب ایک جن بنا۔ جن کے اشعار اس کی کیفیات کے بدرجۂ اتم ترجمان ہیں۔

جن کا خاندان چوں کہ اس سربراہ یا بزرگ سے تعلق رکھتا ہے۔ جو بارگاہ الٰہی سے مردود ہونے کی بدبختی کا مالک بنا۔ اپنی تخلیق کے غرور نے اس کی عقل کو ایک لمحہ کے

لیے قتل کر دیا۔ اور پھر آدم کی اولاد سے اس کی دشمنی کا آغاز رونما ہوا۔

تکبر عزازیل راخوار کرد۔ بزندان لعنت گرفتار کرد

اس دشمنی کے آغاز کا ذکر قرآن حکیم میں کئی جگہ ارشاد فرمایا۔ لیکن ہر جگہ مفہوم ایک ہی ہے۔ "ابیٰ داستکبر" سجدہ سے انکار کیا اور تکبر کا اظہار کیا۔ اس تکبر اور انکار پر اللہ جل شانہٗ کا جلال حق بجانب ہے۔ ابلیس، اللہ جل شانہٗ کی زبان مبارک سے آدم کی عظمت کے دلائل فرشتوں سے بیان کرتے ہوئے سن چکا تھا۔

﴿اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ .... تا آخر

جب تمھارے رب نے فرشتوں کے سامنے اپنی زمین کی خلافت سونپی جانے والی شخصیت کا اظہار فرمایا تو اس کی تخلیق میں متضاد جبلتوں' غصہ' حمیت' شجاعت' جبن' حرص' ایثار' نفرت' محبت علی ہذا القیاس۔ اسی طرح آگ' پانی' مٹی' ہوا' عناصر کا مجموعہ دیکھ کر انھوں نے اپنی رائے میں خرابی کے امکانات کی توقع ظاہر کی جس کے جواب یا صفائی میں رب جلیل نے علم الاسماء کی برتری حاصل کردہ "آدم" کی عظمت کا فرشتوں کو معترف کروالیا۔ ان دلائل کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے "آدم" کے سامنے سجدہ تعظیم بجالانے کا حکم صادر فرمایا تو "فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ" سب نے سجدہ کیا لیکن ابلیس (عزازیل) نے حکم عدولی کی۔ تکبر آمیز وجوہات بیان کیں۔ از خود عقل کی گمراہی کے ہاتھوں طوق لعنت گلے میں ڈال لیا۔

حسد نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ قیامت تک کی زندگی اس چیلنج کے ساتھ اللہ سے مانگی کہ جس آدم کی وجہ سے میں ذلیل ہوا ہوں۔ اس سے اس کی اولاد سے اس کے ذہنی اور فکری اغوا سے انتقام لوں گا۔ مجھے زندگی دے تو دیکھنا کہ میں ان کے شعور اور عقل کو ایسا ورغلاؤں گا کہ یہ تیرے ہی خلاف برسرِ پیکار ہوں گے۔ احکم الحاکمین ملیك مقتدر فعال لما یرید ذو العرش المجید نے ناراضی کے باوجود اپنا اصول نہیں توڑا۔ جو اس نے مانگا اسے دیا۔ اور ساتھ ہی فرمایا۔ وفا و عہد کے پکے میرے بندے تیری گرفت میں نہیں آئیں گے۔

شیطان کی عقل نے جس منطق کا سہارا لیا وہ تھی ﴿اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ﴾ میں اس سے تخلیق میں اس لیے بہتر ہوں کہ تو نے مجھے آگ سے اور اسے (آدم) کو مٹی سے پیدا کیا ہے۔

گویا شیطان کی عقل مٹی کی ظاہر صورت کے چکر میں پھنس کر چکرا گئی۔ اس کی نگاہ بصیرت یہ نہ دیکھ سکی۔ اس مٹی میں ملبوس نور ہدایت بھی ہے۔ منبع علم و حکمت بھی ہے۔ تمام کائنات کی شرافت و تکریم بھی ہے۔ ثوابت و سیار کو مسخر کرنے کی قوت بھی ہے۔

میرے یقین کے مطابق چاند اور ستاروں کی تسخیر اسی دن ہو گئی تھی جب افضل البشر نے فرمایا: میرے مہربان چچا۔ اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ چاند اور بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر سورج بھی رکھ دیں تو بھی میں اپنے موقف یعنی نیابت الٰہیہ سے بال برابر بھی نہیں ہٹ سکتا۔ اس کی بصیرت یہ نہ دیکھ سکی۔ اس مٹی میں ملبوس صاحب معراج بھی ہے۔ صاحب قاب قوسین بھی ہے' سورج اور چاند کی طنابوں کو گرفت میں لینے والی قوت بھی' صبر و استقلال' عفو و درگزر' رحمت و شفقت کا جمال بھی ہے۔ عدل' شجاعت' تہور' تدبر تمدن و تہذیب کا نکھار جلال بھی ہے۔

عقل پر شیطان کا ہی تصرف ہے جو انسان نے ہمیشہ ان تمام حقیقتوں کے وجود سے انکار کر دیا جو اسے نظر نہیں آتیں یا اس کے دائرہ احساس سے باہر ہیں:

خوگر پیکر محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

جب آسمانوں پر جنات کے گھات لگا کر بیٹھنے کا انکشاف فرمایا تو اس گروہ کی عقل ہنسی۔ مگر آج اسی عقل کے چیلوں نے خلابازوں کو خلا میں چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھا تو مان لیا یہ ممکن ہے۔

آج مدار میں چھوڑے گئے مصنوعی سیاروں سے نظر میں نہ آنے والی حقیقت کو حقیقت مان لیا گیا۔ اسی طرح قدیم زمانے کے ایک گروہ نے وحی اور جنوں کے وجود سے انکار کر دیا اور آج بھی اپنی عقل کی ہمہ دانی کے زعم میں اسے مفروضہ حیات جاتا ہے۔ ہمارا موضوع جنات کے وجود یا عدم وجود پہ بحث نہیں بلکہ اپنے اللہ رسول ﷺ کے ارشادات کی صداقت جسے ہماری عقل' ادراک' عرفان اور علم اللہ کی استعانت اور تعلیم نبوی ﷺ کے نور ہدایت کے تعاون سے تسلیم کیا ہے، اس کا اظہار ہے۔

اس نظر نہ آنے والے دشمن کے طریقہ واردات کی نشان دہی خود قرآن کرتا ہے جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہمارے پیارے نبی ﷺ کے ذریعے اس آیت کے ان الفاظ میں دی ہے۔

﴿یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾

"شیطان اور اس کے دوست یا تصرف میں آنے والے انسان تمھارے سینوں (یا دل میں) وساوس (شبہ) تشکیک خوف ڈالتے ہیں۔"

عربی میں وساوس کے معنی (بحوالہ منجد) وسوسہ ڈالنا' عقل کی خرابی سے باتیں کرنا۔ آہستہ بولنا۔ وسوسه به کلا کا مختلط ہونا۔ دل میں آنے والی بری یا بے نفع بات ان معانی کے مفہوم کے بعد اب بحوالہ لغات القرآن الوسوس' اس کا مصدر وسوسہ بھی ہے۔ رباعی مجرد کے ابواب میں سے ہے۔ معنی ہیں۔ کسی بری چیز کا دل میں ڈالنا۔ عقل کا اغوا کر لینا۔ کتے اور شکاری کی آواز' ہوا کے جھونکے سے درختوں میں پیدا ہونے والی ہلکی سی آواز سرسراہٹ' اسے اغوائے قلبی بھی کہا جا سکتا ہے۔

منجد کا مصنف عیسائی ہے۔ لہٰذا اس کی نظر میں انسان کی کل کائنات عقل ہے اس لیے اس نے اغوائے عقل یا گمراہی عقل کا عمل جو نظر نہ آئے یہ معنی کیا ہے "لغات القرآن" دین کے معلم حضور اکرم ﷺ کے مطابق ہے۔ انسان کی کائنات صرف دل ہے۔ فرمایا۔ انسان کے پہلو میں گوشت کا لوتھڑا (دل) اگر درست ہے تو انسان کی ساری کائنات فکری و عملی درست ہے۔ اگر یہ بگڑ جائے تو پورا جسم یا پورا نظام بگڑ گیا۔

مقصود عرض یہ ہے کہ شیطان کا طریقہ واردات نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ اس یے اس کے عمل کے تاثرات کی نشاندہی کے ساتھ معالج حقیقی، مزکی نفس ﷺ نے رمایا۔ یہ غصہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب دل میں غصہ سر اٹھائے تو اگر کھڑے ہو کر تو ٹھ جاؤ۔ بیٹھے ہو تو اٹھ جاؤ اور ساتھ ہی پڑھو لاحول وَلاقوۃ الّاباللّٰہ العلی لعظیم' اسی طرح اس کے عمل کی مثال PSYCHO VIBRATIONS کے عمل ے دی جاسکتی ہے۔ HYPNOTIST کے عمل HYPNOTISM سے دی جاسکتی ہے۔ لہٰذا خیالات میں جب بھی اللہ اور اس کے رسولُ ﷺ کے ارشادات کی الفت رینگنے لگے تو سمجھ لو اس میں جنات کے اس گروہ کا ہاتھ ہے جو شیطان کے یروکار ہیں۔ غالب نے ایک شعر میں کہا ہے آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال ہں۔ یہ غیب سے آنے والے مضامین اگر اپنے سفر میں شیطان کے ہاتھوں اغوا ہوجائیں تو ان سے ایسی تحریر ایسے شعر فصاحت و بلاغت میں انتہائی اعلیٰ محاسن کلام میں سب سے اچھے بن کر شاعر اور مصنف کے خیال میں سموتے ہیں کہ انھیں سننے والا اور پڑھنے والا سر دھن کر رہ جاتا ہے۔ جنسی تلذذ' جمالیاتی تلذذ میں ایسے رس گھول دیتا ہے کہ:

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

اور پھر وہ حقیقت زندگی اور فرائض زندگی سے گریز کر کے کہتا ہے:

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

جن اچھے ہوں یا بدکردار۔ انسان سے نہ ہی وہ افضل ہیں اور نہ ہی وہ انسان پر جبراً تصرف کر سکتے ہیں۔ انکا تصرف جاہل اور بے شعور افراد پر زیادہ ہوتا ہے۔

جس طرح انسان کی عقل نے اسرار کائنات کی دریافت میں انسان کو سمجھنے میں ارتقاء پایا ہے۔ اور انسان کے ہر کام کا طریقہ کار بدل گیا ہے اسی طرح شیطان اور اس کے پیروکار نے بھی اپنے طریقہ واردات میں نکھار پیدا کر لیا ہے۔

اس کا سب سے بڑا اور اہم مرکز نسل انسانی کے دہ گروہ ہیں جن کا لوگوں کے اذہان بنانے میں مضبوط ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر ہمارے ذہن تعلیم نبوی ﷺ سے بنیادی خمیر حاصل نہ کریں تو انھیں اغوا کرنا شیطان کے لیے بہت آسان کام ہے۔

عقل کی اہمیت تدبر اور تفکر کی دعوت' شعور کے استعمال پر بتکرار زور قرآن مجید میں موجود ہے۔ ''افلا یعقلون' افلا تبصرون' افلا یشعرون'' لیکن ان اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں کے استعمال میں اس نور کی ضرورت ضرور ہے جو دربار نبوی ﷺ کی احادیث اور اسوۂ حسنہ میں ہی دستیاب ہوسکتی ہیں۔ سیّد جن و بشر کے فرمودات سے ہی میسر ہوسکتی ہیں۔ (محمد مسعود عبدہٗ)

رسالت نامہ

ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی القرشی البغدادی 511ھ۔597ھ اپنے زمانے کے بہت بڑے فقیہ، ادیب، مورخ، مفسر اور محدث تھے۔ آپ کی ساری زندگی تالیف و تدریس میں بسر ہوئی۔ آپ کی تصانیف ایک سوتیس کے قریب ہیں۔ ان میں سے ایک "تلقیح" ہے جس میں آپ نے حیات رسول ﷺ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ 384 صفحات کی اس کتاب میں اس قسم کے سیکڑوں عنوان ہیں۔ یعنی حضور ﷺ کی دادیوں کے نام، حضور کی دائیوں کے نام، حضور کی کنیزوں کے نام، حضور ﷺ کی پھوپھیوں کے نام، حضور ﷺ کی ازواج کے نام، حضور ﷺ کی تلواروں کے نام، حضور ﷺ کی ڈھالوں کے نام، حضور ﷺ کی مہمات کے نام۔ وقس علی ھٰذا:

ذیل کے عنوانات وتفصیلات ابن جوزی کی محولہ کتاب سے ماخوذ ہیں:

22 اپریل 571 — ولادت (9 ربیع الاول ا) عام الفیل (مطابق یکم جیٹھ سمت 628 بکرمی) بعد از صبح صادق، قبل از طلوع بروز سوموار

تقریباً ایک ہفتہ بعد — حلیمہ سعدیہؓ کی آغوش رضاعت میں

پانچ سال کی عمر میں — پھر آغوش مادر میں

چھ سال کی عمر میں — والدہ ماجدہ کا انتقال

آٹھ سال کی عمر میں — دادا (عبدالمطلب) کی وفات

بارہ سال کی عمر میں — شام کا پہلا تجارتی سفر

25 سال کی عمر میں — حضرت خدیجہؓ سے نکاح

30 سال کی عمر میں — قوم کی طرف سے الامین کا خطاب

35 سال کی عمر میں — تمام قبائل کی طرف سے حکم (ثالث) دیوار کعبہ میں حجر اسود نصب کرنے کے وقت

37 سال کی عمر میں — غار حرا میں خلوت اور عبادت وتفکر
حضرت علیؓ کی کفالت

40 سال کی عمر میں — نزول وحی

3 نبوی 43 سال کی عمر — چالیس زن ومرد کا اسلام قبول کرنا

5 نبوی 45 سال کی عمر — حبشہ کی طرف ہجرت کے لیے صحابہؓ کو حکم

6 نبوی 46 سال کی عمر — حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا اسلام قبول کرنا

7 نبوی 47 سال کی عمر میں — کفار قریش کی جانب سے بائیکاٹ اور شعب ابی طالب میں محصور ہونا

10 نبوی 50 سال کی عمر — معاشرتی مقاطعہ (بائیکاٹ) کا خاتمہ
چچا ابوطالب کا انتقال، حضرت خدیجہ کی وفات، تبلیغ اسلام کے لیے طائف کا سفر، حضرت عائشہؓ سے نکاح، رخصتی چار سال بعد ہوئی تھی، معراج کا واقعہ۔

11 نبوی 51 سال کی عمر — یثرب (مدینے) کے چھ آدمیوں کا قبول اسلام

12 نبوی 52 سال کی عمر — یثرب (مدینے) کے بارہ آدمیوں کا قبول اسلام

13 نبوی 53 سال کی عمر — یثرب (مدینے) کے 72 آدمیوں کا قبول اسلام

1 ہجری 54 سال کی عمر — مدینے کے شہری نظم ونسق کی دیکھ بھال

2 ہجری 55 سال کی عمر — کفار کا پہلا حملہ (واقعہ بدر) کفار کی تعداد تقریباً ایک ہزار اور مسلمان 313 تھے۔

3 ہجری 56 سال کی عمر — کفار کا دوسرا حملہ (واقعہ احد)

4 ہجری 57 سال کی عمر — بنی عامر کی چالبازی اور قاریوں کی شہادت

5ھ 58 سال کی عمر — کفار کا تیسرا حملہ (واقعہ خندق) حملہ آوروں کی تعداد 12 اور 15 ہزار کے درمیان تھی

6ھ 59 سال کی عمر — صلح حدیبیہ حضور ﷺ کے ہمراہ 1800 صحابہ تھے۔

7ھ 60 سال کی عمر — فتح خیبر بادشاہوں کو دعوت نامے

8ھ 61 سال کی عمر — موتہ کا واقعہ، فتح مکہ اور حنین کا واقعہ

9ھ 62 سال کی عمر — واقعہ تبوک مسلمانوں کا حج ادا کرنا، وفود کی آمد

10ھ 63 سال کی عمر — حج الوداع اور مشہور آخری خطبہ

11ھ 63 سال کی عمر — علالت ورحلت

نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات

ازواج مطہرات کی تعداد میں مؤرخین میں بڑا اختلاف ہے، مگر 12 امہات المومنین میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ ان میں سے دو کا حضور ﷺ کے سامنے انتقال ہوگیا تھا یعنی حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینب بنت خزیمہ اور 10 حضور ﷺ کی وفات کے وقت موجود تھیں۔

امہات المؤمنین / ازواج مطہرات

حضرت خدیجہؓ بنت خویلدؓ	قریش کے قبیلہ بنو اسد سے تعلق رکھتی تھیں۔ وفات 10ھ میں
حضرت سودہ بنت زمعہؓ	قریش سے تھیں
حضرت عائشہ صدیقہؓ	قریش کے قبیلہ بنو تمیم سے تھیں ان کے والد حضرت ابوبکرؓ تھے۔
حضرت حفصہ بنت عمرؓ	حضرت عمر فاروقؓ کی بیٹی تھیں۔ 54ھ میں وفات پائی
حضرت زینبؓ بنت خزیمہؓ	بنو بکر بن ہوازن سے تھیں۔ ام المساکین کے لقب سے مشہور ہوئیں۔
حضرت ام سلمہؓ بنت ابی امیہؓ	قریش کے مشہور قبیلے بنو مخزوم سے ان کا تعلق تھا
حضرت جویریہ بنت حارثؓ	بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں
حضرت زینب بنت جحشؓ	بنو اسد بن خزیمہ سے تھیں
حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیانؓ	قریش کے مشہور قبیلہ بنو امیہ کے رئیس ابوسفیان کی بیٹی تھیں
حضرت صفیہ بنت حیی بن اخطبؓ	ان کا تعلق یثرب کے یہودی قبیلہ بنی نضیر سے تھا
حضرت میمونہ بنت حارثؓ	ان کا انتقال 61ھ میں ہوا
حضرت ماریہ قبطیہؓ	انھیں مقوقس شاہ مصر نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا' حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ان کا انتقال ہوا۔

آپ کے صاحب زادیاں اور صاحب زادے

آنحضرت ﷺ کی چار صاحب زادیاں تھیں اور تین صاحب زادے تھے۔

سیّدہ زینب رضی اللہ عنہا

آپ کی صاحب زادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان کی شادی ان کی ماں حضرت خدیجہؓ نے اپنی خالہ کے لڑکے ابوالعاص بن ربیعؓ الاموی کے ساتھ کردی۔ ان کا انتقال 8ھ میں مدینہ منورہ میں ہوا۔ ان کے بطن سے ایک فرزند اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

سیدہ رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

یہ سیدہ زینب سے چھوٹی تھیں۔ ان کی شادی قبل از اسلام ابولہب کے لڑکے عتبہ کے ساتھ ہوئی۔ ظہور اسلام کے بعد ابولہب نے اپنے بیٹے سے طلاق دلوادی اور سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت عثمان بن عفانؓ سے ہوگئی۔ 2ھ میں وفات پائی۔ ان کے بطن سے ایک لڑکا ہوا۔ جس کا نام عبداللہ تھا۔

سیدہ ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا

سیدہ رقیہؓ سے چھوٹی تھیں۔ ان کی شادی بھی ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ کے ساتھ قبل از اسلام ہوئی تھی اور انھیں بھی ابولہب نے عتیبہ سے طلاق دلوادی تھی۔ سیدہ رقیہؓ کے انتقال کے بعد آنحضرتؐ نے ان کی شادی بھی حضرت عثمانؓ کے ساتھ کردی۔ اسی لیے عثمان غنیؓ کو ذوالنورین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ 9ھ میں بمقام مدینہ منورہ انتقال فرمایا۔

سیدۃ النساء حضرت فاطمہ زہراؓ

آنحضرت ﷺ کی سب سے چھوٹی صاحب زادی تھیں۔ ان کا نکاح حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ہوا۔ انھوں نے حضرت ﷺ کے وصال کے چھ ماہ بعد 3 رمضان 11ھ کو انتقال فرمایا۔ ان کے بطن سے دو صاحب زادے حضرت امام حسنؓ اور حضرت حسینؓ اور دو لڑکیاں حضرت زینبؓ اور حضرت ام کلثومؓ پیدا ہوئیں۔ حضرت ام کلثومؓ کی شادی فاروق اعظمؓ سے ہوئی۔

حضور اکرم ﷺ کے تین صاحب زادے تھے جن کے نام ابراہیم' طاہر اور قاسم تھے۔ انھوں نے عالم طفولیت ہی میں انتقال فرمایا۔ طاہر اور قاسم حضرت خدیجہؓ کے بطن سے اور ابراہیم حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے تھے۔

آپ ﷺ کا لباس

آپ ﷺ سفید لباس بے حد پسند فرماتے۔ زیادہ تر روئی کا لباس پہنتے تھے۔ صوف اور کتان کا لباس بھی کبھی کبھی پہن لیتے تھے۔ جبّہ' قبا' قمیص' ازار' عمامہ' ٹوپی' چادر' حلّہ' موزہ یہ سب آپ ﷺ نے پہنے ہیں۔ سبز رنگ کی یمنی چادر آپ ﷺ کو بہت پسند تھی۔ جو بردیمانی کے نام سے مشہور تھی۔ سرخ لباس کو منع فرماتے تھے۔ کبھی کبھی سیاہ عمامہ آپ ﷺ نے باندھا ہے۔ ٹوپی بھی پہنا کرتے تھے اور اسے عمامہ کے نیچے پہننے کی تاکید کرتے تھے۔

حضور ﷺ کا اسلحہ

تلواریں:

آپ ﷺ کے پاس 9 تلواریں تھیں' جن کے نام یہ ہیں: ماثور' العضب' قلعی' البتار' الحتف' الرسوب' المخزم اور ذوالفقار۔

زرہیں

ان کی تعداد سات تھی' ذات الفضول لوہے کی زرہ تھی' جسے آپ نے ایک یہودی کے پاس گروی رکھا تھا اور اس سے تین صاع غلہ اپنے عیال کے لیے قرض لیے تھے۔ اس کے علاوہ ذات الوشاح' السوریہ' ذات الحواشی' فضہ' البتراء' الخرنق تھیں۔

کمانیں

چھ تھیں جن کے نام یہ ہیں: الزوراء' الروحاء' الصفراء' البیضاء' الکتوم اور شوخط۔

ڈھالیں

دو تھیں: الزلوق' الفتق

عہد نبوی ﷺ کی مساجد

آنحضرت ﷺ نے مساجد کی تعمیر پر بھی زور دیا تھا اور اس امر کی تاکید فرمائی کہ جو معلم ہو وہ اپنے مقام پر عبادت کے لیے ایک مسجد فوراً تیار کرے۔ آپ

کے مبارک عہد میں بڑی بڑی آبادیوں میں کئی مساجد تھیں۔ صرف مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ﷺ کے علاوہ 9 مساجد تیار ہو چکی تھیں۔ جن میں علیحدہ علیحدہ پانچوں وقت نماز ہوتی تھی: مسجد بنو عمرؓ، مسجد بنو ساعدہ، مسجد بنو عبید، مسجد بنو زریق، مسجد بنو سلمہ، مسجد بنو غفار، مسجد بنو اسلم، مسجد بنو جہینہ، مسجد بنو بیاضہ۔

آنحضرت کے مؤذنین

آنحضرت ﷺ کے چار مؤذن تھے۔ دو مدینہ طیبہ میں، بلال بن رباحؓ اور عمرو بن ام مکتوم قرشی العامریؓ نابینا۔ ایک قبا میں سعد القراظؓ اور ابو مخدورہ اور اوس بن مغیرہ بن جحیؓ مکہ میں۔

آپ ﷺ کی سواری کے جانور

گھوڑے: آپ ﷺ کے سات گھوڑے تھے اور کسی صفت خاص کی وجہ سے ان کے مختلف نام تھے۔ سکب، لحیف، شجا، ظرب، لزاز، مرتجز اور الورد۔

خچر: پانچ خچر تھے، ایک دلدل نامی جو مقوقس شاہ مصر نے، دوسرا نضہ نامی فروۃ الجذامی نے تیسرا صاحب ایلہ نے، چوتھا دومتہ الجندل کے حکمران نے اور پانچواں نجاشی شاہ حبش نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

گدھے: تین تھے، ایک یعفور جو مقوقس شاہ مصر نے بھیجا تھا، دوسرا فروۃ الجذامی اور تیسرا حضرت سعد بن عبادہ الخزرجیؓ نے ہدیتاً پیش کیا تھا۔

اونٹ: ان کی تعداد تین بتائی جاتی ہے جن میں سے ایک کا نام القصویٰ تھا، جس پر آپ نے ہجرت فرمائی تھی۔

بکریاں: آپ ﷺ کی ملک میں ایک سو بکریاں تھیں سو سے زیادہ ہوتیں تو انھیں ذبح کر دیتے اور پوری ایک سو رکھتے۔

سرور کونین ﷺ کے قاصد

1۔ حضرت عثمان بن عفانؓ الاموی	قریش مکہ کی جانب
2۔ حضرت عمرو بن اُمیہ الضمریؓ	نجاشی شاہ حبش کے پاس بھیجے گئے
3۔ حضرت دحیہ بن خلیفہ کلبیؓ	ہرقل قیصر روم
4۔ حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ	خسرو پرویز شاہ ایران
5۔ حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ	مقوقس شاہ مصر
6۔ حضرت شجاع بن وہب الاسدیؓ	حارث ابی شمر شاہ غسان
7۔ حضرت سلیط بن عمروؓ	ہوزہ بن علی اور ثمامہ بن اثال کی جانب
8۔ حضرت عمرو بن العاص السہمیؓ	جیفر بن الجلندی اور عبدا بن الجلندی الازدی رئیسان عمان
9۔ حضرت علاء بن الحضرمیؓ	منذر بن ساوی حاکم بحرین
10۔ حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومیؓ	حارث بن کلال حمیری
11۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ	یمن
12۔ حضرت معاذ بن جبلؓ	یمن
13۔ حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ	ذوالکلاع الحمیری
14۔ حضرت عیاش بن ربیعہ المخزومیؓ	حارث، مسروح اور نعیم بن عبد الکلال کی طرف
15۔ حضرت حارث بن عمیرؓ	بصریٰ کے حاکم

مقرر کردہ محصلین

وہ صحابہ کرامؓ جنھیں آنحضرت نے مختلف قبائل اور علاقوں کا انتظام سونپ دیا تھا جو جزیہ، صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ وصول کرتے۔

1۔ حضرت صفوان بن صفوانؓ	بنو عمرو پر
2۔ حضرت عدی بن حاتمؓ	بنو طے و بنو اسد پر
3۔ حضرت عمر فاروقؓ	مدینہ منورہ پر
4۔ حضرت ابو جہم بن حذیفہؓ	بنو لیث پر
5۔ حضرت بریدہ بن حصیب السلمیؓ	بنو غفار و اسلم پر
6۔ حضرت عباد بن بشیرؓ	بنو سلیم و مزینہ پر
7۔ حضرت ضحاک بن سفیانؓ	بنو کلاب پر
8۔ حضرت رافعؓ	بنو جہینہ
9۔ حضرت قیس بن عاصمؓ	بنو سعد پر
10۔ عمرو بن العاصؓ	بنو خزارہ پر
11۔ حضرت بشر بن سفیانؓ	بنو کعب پر
12۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراحؓ	نجران پر
13۔ عبداللہ بن رواحہؓ	خیبر پر
14۔ زیاد بن لبیدؓ	حضر موت پر
15۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ	یمن پر
16۔ عمرو بن سعید بن العاصؓ	تیماء پر
17۔ ابان بن سعیدؓ	بحرین پر
18۔ حضرت عبداللہ بن لیثؓ	بنو ذیبان پر

مدینہ میں نائبین

وہ صحابہ کرامؓ جنھوں نے مدینہ میں آپ کی نیابت کی:

1۔ حضرت سعد بن عبادہ الخزرجیؓ	غزوۂ ابواء کے موقع پر
2۔ حضرت سعد بن معاذ الاوسیؓ	غزوۂ بواط کے موقع پر
3۔ حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسدؓ	غزوۂ عشیرہ کے موقع پر
4۔ حضرت زید بن حارثؓ	غزوۂ سفوان کے موقع پر
5۔ حضرت ابولبابہ بشیر بن عبد المنذرؓ	غزوۂ بدر کے موقع پر

6۔حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوۂ بنوسلیم کے موقع پر
7۔حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذرؓ	غزوۂ بنوقینقاع کے موقع پر
8۔حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذرؓ	غزوۂ سویق کے موقع پر
9۔حضرت عثمان بن عفانؓ	غزوۂ بنوغطفان کے موقع پر
10۔حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوۂ بحران کے موقع پر
11۔حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوۂ احد کے موقع پر
12۔حضرت عثمان بن عفانؓ	غزوۂ ذات الرقاع کے موقع پر
13۔حضرت عبداللہ بن عبداللہؓ	غزوۂ بدر الصغریٰ کے موقع پر
14۔حضرت سباع بن عرطفہ الغفاریؓ	غزوۂ دُومۃ الجندل کے موقع پر
15۔حضرت ابوذر غفاریؓ	غزوۂ بنومصطلق کے موقع پر
16۔حضرت نمیلہ بن عبداللہؓ	غزوۂ خیبر کے موقع پر
17۔حضرت ابورہم کلثوم بن حصین غفاریؓ	فتح مکہ کے وقت
18۔حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ	غزوۂ تبوک کے موقع پر

عمال نبوی ﷺ (گورنر)

حضرت باذان بن ساسانؓ	والی یمن
حضرت شہر باذانؓ	والی صنعاء
حضرت علاء بن الحضرمیؓ	والی بحرین
حضرت علی بن ابوطالبؓ	والی اخماس یمن
حضرت خالد بن سعیدؓ	والی صنعا
حضرت مہاجر بن ابی امیہ مخزومیؓ	والی کندہ
حضرت عمرو بن العاصؓ	والی عمان
حضرت ابوسفیان بن حربؓ	والی نجران
حضرت یزید بن ابوسفیانؓ	والی تیمابہ
حضرت عتاب بن اُسیدؓ	والی مکہ
حضرت معاذ بن جبلؓ	والی جند
حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ	والی ما رب
حضرت زیاد بن لبیدؓ	والی حضرموت

بیعت عقبہ اولیٰ کے چھ افراد

عقبہ کے مقام پر یثرب کے ان چھ افراد نے آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام لائے۔

1۔ابوامام اسعد بن زرارہؓ	2۔عوف بن حارثؓ
3۔رافع بن مالکؓ	4۔قطبہ بن عامر بن حدیدہؓ
5۔عقبہ بن عامر بن نابیؓ	6۔جابر بن عبداللہؓ

رسول اکرم ﷺ کے مدنی نقیب

ہجرت سے پہلے مدینے کے جن بارہ اصحاب کو حضور ﷺ نے نقیب بنایا تھا ان میں نو خزرج کے تھے اور تین اوس کے اور یہ سب قبائل مدینہ کے رؤسا تھے۔

1۔اسید بن حضیرؓ	2۔ابوالہیثم بن التیہانؓ
3۔سعد بن خیثمہؓ	4۔سعد بن زرارہؓ
5۔سعد بن الربیع	6۔عبداللہ بن رواحہؓ
7۔سعد بن عبادہؓ	8۔منذر بن عمروؓ
9۔براا بن معرورؓ	10۔عبداللہ بن عمروؓ

11۔عبادہ بن الصامتؓ 12۔رافع بن مالکؓ

حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام

زید بن حارثؓ ابورافع اسلمؓ ثوبانؓ ابوکبشہ شقران رباحؓ یسا نذغمؓ ذکوانؓ افلحؓ ابومویہبہؓ آنسہؓ ضمیرہ بن ابی ضمیرہؓ عبیداللہ بن اسلمؓ عبید بن عبدالغفارؓ فضالہ الیمانیؓ ابوعسیب احمرؓ اسامہ بن زیدؓ افلحؓ ایمن بن اُم ایمنؓ زید بن بولاؓ سابقؓ سالمؓ سلمان فارسیؓ مہرانؓ ابوعبدالرحمٰنؓ نافعؓ واقدؓ ابواثیلہؓ ابوالحمراءؓ ابوالسمعؓ ابوعبیدؓ حنینؓ بدرؓ حاتمؓ باذامؓ دوسؓ رویفعؓ سعدؓ سعیدؓ غیلانؓ کریبؓ محمدؓ ناہیبہؓ کحولؓ نہیکؓ نفیعؓ وردانؓ ابوصیفہؓ ابوقیلہؓ ابوالقیطؓ وغیرہ وغیرہ کل 66۔ (ابن الجوزی: تلقیح ص 18)

حضور ﷺ کے کاتبانِ وحی

ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ علیؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابت انصاریؓ، معاویہؓ، حنظلہ بن الربیع الاسیدیؓ ابان بن سعیدؓ، خالد بن سعید بن العاصؓ، علا بن حضرمیؓ رضوان اللہ علیہم اجمعین (تلقیح ص 37)

حضور ﷺ کے محافظ

سعد بن ابی وقاصؓ سعد بن معاذؓ عبّاد بن بشرؓ ابوایوب انصاریؓ ذکوان بن عبد قیس انصاریؓ محمد بن مسلمہ انصاری بلال رضی اللہ عنہم۔

وہ لوگ جن کی شکل وصورت حضور ﷺ سے ملتی تھی

1۔جعفر بن ابی طالبؓ	2۔حسین بن علیؓ
3۔قثم بن عباسؓ	4۔ابوسفیان بن حارثؓ
5۔سائب بن عُبیدؓ	6۔مسلم بن مُعتّبؓ

7۔کابس بن ربیعہ بن مالکؓ (تلقیح ص ۳۸)

حضور ﷺ کے خُدّام

1۔انسؓ	آپ کے گھر میں کام کرتا
2۔ربیعہ بن کعبؓ	وضو کراتا
3۔ابن مسعودؓ	جوتے پہناتا
4۔عقبہ بن عمروؓ	خچر کی دیکھ بھال کرتا
5۔بلالؓ	

6۔سعدؓ
7۔عامرؓ
8۔بکیرؓ
9۔اسود بن مالکؓ
10۔ایمنؓ
11۔ثعلبہؓ
12۔سالمؓ
13۔سابقؓ
14۔ہلال بن حارثؓ

اور25 دیگر مختلف کام کرتے تھے۔(کل 39۔تلقیح ص17)

عہدِ رسول ﷺ کے مفتی

خلفائے اربعہؓ عبدالرحمٰن بن عوفؓ ابی بن کعبؓ، عبداللہ بن مسعودؓ معاذ بن جبلؓ عمار بن یاسرؓ حذیفہؓ زید بن ثابتؓ ابوالدرداءؓ ابوموسیٰ اشعریؓ۔(ایضاً ص225)

ہجرت

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ ہجرت کے لیے مکہ سے بارہ ربیع الاول کو سوموار کی شام کو نکلے تھے اور اگلے سوموار کو قبل از دوپہر مدینہ میں وارد ہوئے تھے۔ پہلے قباء میں کلثوم بن الہدم کے ہاں ٹھہرے۔اس کی جلد وفات ہوگئی اور آپ سعد بن خیثمہ کے ہاں منتقل ہوگئے۔ تین دن کے بعد مدینہ میں بنی سالم کے ہاں چلے گئے۔ وہاں اپنی زندگی کا پہلا جمعہ ادا فرمایا۔ یہ مدنی زندگی کا بھی پہلا جمعہ تھا۔ بعد از جمعہ حضور ﷺ ناقہ پر سوار ہوگئے اور ناقہ چل پڑی۔ بنونجار کے مساکن میں حضرت ابوایوب انصاری کے گھر کے سامنے جا بیٹھی۔ حضور ﷺ اتر کر ابوایوبؓ کے گھر چلے گئے۔ مسجد نبوی اور حضور ﷺ کے حجرے تیار ہونے تک وہیں رہے۔

بعد از ہجرت پہلے سال حضور ﷺ نے انصار و مہاجرین کے درمیان سلسلۂ مواخات قائم کیا۔ دوسرے سال کعبہ کو قبلہ بنایا گیا۔ تبدیلی قبلہ کا حکم 15 رمضان کو نماز ظہر کے دوران دوسری رکعت میں آیا تھا۔ اسی سال حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی۔ غزوہ بدر ہوا۔ تیسرے سال حضرت حفصہؓ اور زینبؓ بنت خزیمہ حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت حسن بن علیؓ پیدا ہوئے۔ چوتھے سال حسینؓ بن علیؓ کی ولادت ہوئی۔ حضرت عائشہؓ کے ہار ٹوٹنے کا واقعہ پیش آیا۔ پانچویں سال دومتہ الجندل' خندق اور بنو قریظہ کے غزوات ہوئے۔ اسی سال زینبؓ بنت جحش حضور ﷺ کے نکاح میں آئی۔ چھٹے سال معاہدۂ حدیبیہ ہوا۔ ساتویں سال غزوۂ خیبر ہوا۔ اسی سال سلام بن مشکم کی بیوی زینب نے حضور ﷺ کو زہر آلود بکری کا گوشت کھلایا نیز ام حبیبہ' میمونہ بنت حارث اور صفیہ بنت حیی حضور کے حرم میں داخل ہوئیں۔ اسی سال ابوہریرہؓ اسلام لائے اور شاہِ مقوقس سے تین تحائف دُلدل' یعفور (گدھا) اور حضرت ماریہ قبطیہؓ موصول ہوئے۔

آٹھویں سال میں جنگِ موتہ ہوئی۔ خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن عاصؓ اسلام لائے۔ مکہ فتح ہوا۔ غزوۂ حنین پیش آیا۔ ماریہ سے ابراہیم کی ولادت اور حضور ﷺ کی دختر زینبؓ کی وفات ہوئی۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہؓ کو اسلام لانے کی سعادت نصیب ہوئی۔

نویں برس میں غزوۂ تبوک ہوا۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیر حج بنا کر حج کے لیے بھیجا۔ حضور ﷺ کی بیٹی ام کلثوم کی وفات ہوگئی۔ اس سال میں قبائل کے وفود اسلام و متابعت کا پیغام لے کر مدینہ پہنچے۔ اسی سال مسجد ضرار گرائی گئی۔

دسویں سال میں حضور ﷺ نے حجتہ الوداع کیا۔ مشہور خطبہ ارشاد فرمایا۔ بعد ازاں 12 ربیع الاول کو پیر کے دن حضور ﷺ کو اللہ نے بلا لیا۔

ابن الجوزی اور سوانح رسول ﷺ

جلد اول

ابن الجوزی کا پورا نام ابوالفرج عبدالرحمٰن جمال الدین بن علی بن محمد القرشی البکری الحنبلی (510۔597ھ=1116۔1200ء) تھا۔ آپ بغداد کے ایک محلہ جوزہ میں سکونت پزیر تھے اور اسی نسبت سے جوزی کہلاتے تھے۔ مختلف اساتذہ سے درس لیا اور رفتہ رفتہ اپنے مطالعہ و محنت کی بدولت تمام معاصرین سے سبقت لے گئے۔ آپ ایک فصیح البیان واعظ' بلند پایہ محقق اور عظیم المرتبت مصنف تھے۔ اندازاً تین سو کتابیں لکھیں' جن میں سے المنتظم فی تاریخ الملوک الامم' کتاب صِفۃ الصَّفوہ (اولیاء وصوفیہ کے حالات)' کتاب القُصاص (داستان سراؤں کا ذکر)' سیرۃ عمر بن عبدالعزیز' الوفاء فی فضائل المصطفیٰ' قصص الانبیاء' مولد النبی ﷺ' فی مفردات القرآن بہت وقیع واہم ہیں۔ آپ نے ایک کتاب تلقیح فُہوم الاثر کے نام سے حضور ﷺ کے حالات پر بھی لکھی تھی جسے مولانا محمد یوسف بریلوی نے 1286ھ=1869ء میں مفید حواشی کے ساتھ شائع کیا۔ یہ جید برقی پریس دہلی میں چھپی تھی۔

یہ کتاب 384 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ایک ہزار کے قریب عنوانات ہیں۔ ان میں سے چند عنوانات کا ملخص حاضر ہے۔

حضور ﷺ کی ولادت

اس بات پر تو سب سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ حضور ﷺ ماہِ ربیع الاوّل میں سوموار کو پیدا ہوئے تھے لیکن تاریخ میں اختلاف ہے۔ کوئی 2 ربیع الاول بتاتا ہے' کوئی آٹھ' کوئی دس اور کوئی بارہ۔ حضور ﷺ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب کی وفات حضور ﷺ کی ولادت سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ ایک اور روایت کے مطابق اس وقت آپ کی عمر 2 ماہ تھی۔ بعض سیرت نگار سات ماہ بتاتے ہیں اور بعض دیگر دو سال چار ماہ۔ لیکن پہلا قول صحیح تر سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی وفات پر حضرت آمنہؓ (والدہ رسول مقبول) نے ایک مرثیہ کہا تھا' جس کا ایک شعر یہ تھا:

دَعَتْهُ الْمَنَايَا دَعْوَةً فَأَجَابَهَا
وَمَا تَرَكَتْ فِي النَّاسِ مِثْلَ ابْنِ هَاشِم

''موت نے اسے دعوت دی اور اس نے قبول کر لی۔ اب دنیا میں ابن ہاشم عبداللہ کی نظیر باقی نہیں رہی۔''

حسب ونسب

حضور ﷺ کا نسب نامہ اکیس پشتوں یعنی عدنان تک تو متفق علیہ ہے لیکن بعد کے ناموں میں اختلاف ہے متفق علیہ نسب نامہ (بریکٹ میں اصلی نام درج ہے۔)

محمد بن عبد 1 اللہ بن عبدالمطلب 2 (اصلی نام عامر یا شیبہ) بن ہاشم 3 (عمرو) بن عبدِ مناف 4 (مغیرہ) بن قُصَی 5 (زید) بن کلاب 6 بن مُرّہ 7 بن کعب 8 بن لوئ 9 بن غالب 10 بن فہر 11 بن 12 مالک بن نضر 13 بن کنانہ 14 بن خزیمہ 15 بن مدرکہ 16 بن الیاس 17 بن مضر 18 بن نزار 19 بن معد 20 بن عدنان 21 عدنان کے بعد ناموں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہ تین کالم ملاحظہ فرمائیے۔

تلقیح کے مطابق	''نسب نامہ رسول'' کے مطابق (اختلافات عربی رسم الخط میں)	بائبل کے مطابق ابراہیم وآدم کے درمیان ناموں کا اختلاف
عدنان بن اُدَدْ بن زید	عدنان بن اَدٗ بن اُدَدْ	
بن یقدد بن یقدم	بن ہمیع بن سلامان	
بن الہمیسع بن نبت	بن ثابت بن حمل	
بن قیدار بن اسماعیل	بن قیذار بن اسماعیل	
بن ابراہیم بن تارح	بن ابراہیم بن آزر	
بن ناحور بن ساروع	بن ناخور بن شاروخ	اردو بائبل میں ناحور
بن ارعو بن فالغ	بن ارعو بن فالغ	اردو بائبل میں ارغو
بن عابر بن شالخ	بن غابر بن شالخ	اردو بائبل میں عابر
بن ارفخشذ بن سام	بن ارفخشذ بن سام	
بن نوح بن ملک	بن نوح بن لامک	
بن متوشلخ بن اخنوخ	بن متوشلخ بن اخنوخ	
بن البرد بن مہلائیل	بن بیارد بن مہلائیل	اردو بائبل میں یارد
بن قینن بن انوس	بن قینان بن انوش	
بن شیث بن آدم علیہ السلام	بن شیث بن آدمؑ	

حضور ﷺ کی والدہ، نانیاں اور دادیاں

حضور ﷺ کی والدہ کا اسم مبارک آمنہ بنتِ وہب بن عبد مناف بن زہرہ بن کلاب بن مُرّہ تھا۔ والدہ کی طرف سے شجرہ یوں چلتا ہے:

آمنہ بنت مُرّہ بنتِ اُمِ حُبَیب بنتِ برّہ بنتِ قلابہ بنتِ ہند۔

حضور ﷺ کی چند دادیاں یہ تھیں:

1: فاطمہ بنتِ عمر بن عائذ والدہ حضرت عبداللہ
2: صخرہ بنتِ عبد بن عمران والدہ فاطمہ
۳: تخمر بنتِ عبد بن قصی والدہ صخرہ

حضور ﷺ کی رضاعی مائیں

سب سے پہلے حضور ﷺ کو ابولہب کی ایک کنیز ثویبہ نے دودھ پلایا تھا۔ پھر آپ حلیمہ بنت عبداللہ السعد یہ کے سپرد ہو گئے۔ حلیمہ آپ کو اپنے قبیلے میں لے گئی اور اڑھائی برس کے بعد واپس لائی۔ ابن قتیبہ دیناوری (828ء-898ء) لکھتے ہیں کہ پانچ برس بعد واپس لائی تھی۔

حضرت آمنہ کی وفات اور مابعد

حضور ﷺ چھ برس کے تھے کہ حضرت آمنہ اپنے بعض اقارب کو ملنے کے لیے مدینہ گئیں وہاں ایک ماہ رہیں۔ حضور ﷺ بھی ساتھ تھے۔ واپسی پر اَبْوَاء (مدینہ کے جنوب میں اسی میل دور) میں بیمار پڑ گئیں۔ چند روز بعد اللہ سے جا ملیں۔ اور ابواء ہی میں دفن ہوئیں۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو آپ کے دادا عبدالمطلب نے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ تقریباً دو برس بعد آپ کے دادا بھی چل بسے اور آپ ﷺ اپنے چچا ابوطالب کے سپرد ہو گئے۔

تجارتی سفر

جب آپ ﷺ کی عمر بارہ برس دو ماہ اور دس دن ہوئی تو ابوطالب آپ کو ایک تجارتی سفر میں اپنے ہم راہ لے گئے۔ جب مدینہ سے کوئی دو سو میل شمال کی طرف ایک بستی تیماء میں وارد ہوئے تو وہاں کے راہب نے کہا کہ آپ اپنے اس بھتیجے کے ہم راہ شام میں پہنچے تو وہاں کے یہود اسے قتل کر ڈالیں گے کیوں کہ اس میں آنے والے نبی کی تمام علامات پائی جاتی ہیں اور یہود کبھی برداشت نہیں کریں گے کہ وہ عرب میں ظہور پزیر ہو۔ چنانچہ ابوطالب وہیں سے واپس لوٹ آئے۔

پچیس برس کی عمر میں آپ حضرت خدیجہ کا مالِ تجارت لے کر شام کی طرف گئے اور اتنے کامیاب رہے کہ حضرت خدیجہ نے آپ کو نکاح کا پیغام بھیج دیا جو آپ نے منظور فرما لیا۔ اور ابوطالب نے نکاح کا خطبہ پڑھا۔ جب آپ کی عمر 39 سال 8 ماہ اور 11 دن ہوئی تو ابوطالب وفات پا گئے اور صرف تین دن (اور بروایتے پانچ یوم) بعد حضرت خدیجہؓ بھی دارالخلد کو روانہ ہو گئیں۔ آپ کو معراج کی سعادت پچاس سال اور تین ماہ کی عمر میں نصیب ہوئی تھی اور 83 برس کی عمر میں ہجرت فرمائی۔

حضور ﷺ کے چچے

حضور ﷺ کے گیارہ چچے تھے۔

1: سب سے بڑا حارث تھا۔ اس نے چاہِ زمزم کھودنے میں اپنے والد کی مدد کی تھی۔
2: ابوطاہر زُبیر۔ جو شجاعت اور گھڑ سواری میں مشہور تھا۔
3: ابوطالب۔ آپ کا اصلی نام عبد مناف اور کنیت ابوعتبہ تھی۔ حضرت علیؓ آپ ہی

کے فرزند تھے۔

4: حضرت ابو یعلیٰ حمزہؓ، جو غزوہ احد میں ایک غلام وحشی بن حرب کی ضرب سے شہید ہوئے تھے۔

5: ابولہب کا اصلی نام عبدالعزیٰ تھا۔ یہ حضور ﷺ کا شدید دشمن تھا۔ جب بدر میں کفارِ مکہ کو شکست ہوئی تو یہ غم اور صدمے سے صرف سات دن بعد مر گیا۔

6: غیداق حَجل بن عبدالمطلب جو فیاضی میں مشہور تھا۔

7: المُقوّم، جو حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گیا تھا۔

8: صفار۔ یہ بھی اسلام آنے سے پہلے مر گیا تھا۔

9: حضرت عباسؓ۔ یہ اسلام و جاہلیت ہر دور میں حاجیوں کو پانی پلانے (سقایہ) کا انتظام کیا کرتے تھے۔ آپ کا جنازہ حضرت عثمانؓ نے پڑھایا تھا۔

10: قُثم۔ ان کے حالات ہم تک نہیں پہنچے۔

11: حَجل۔ ان کے حالات ہم تک نہیں پہنچے۔

حضور ﷺ کی پھوپھیاں

حضور ﷺ کی چھ پھوپھیاں تھیں: یعنی ا۔ اُم حکیم البیضاء۔ 2۔ بَرّہ 3۔ عاتکہ 4۔ صفیہ 5۔ اَروئ اور 6۔ امیمہ۔ ان میں صرف حضرت صفیہ اسلام لائی تھیں۔

حضور ﷺ کی کنیزیں

حضور ﷺ کی کنیزیں یہ تھیں۔

1: ماریہ قبطیہ، جو آپ کی خدمت میں اسکندریہ کے امیر مُقوقِس نے بھیجی تھی۔

2: ریحانہ بنتِ زید بن عَمْر و بنونضر سے تعلق رکھتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق حضور ﷺ نے اسے آزاد کر کے زوجیت میں لے لیا تھا۔

3: بعض سیرت نگار اس فہرست میں جمیلہ، میمونہ، اُمِ ایمن، خضرہ، خولہ، اُمَیمہ، رُقیہ اور صفیہ کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔

حضور ﷺ کے خُدّام و غلام

سیرت نگاروں نے غلاموں اور خادمانِ رسول کی ایک لمبی فہرست دی ہے۔ یہ لوگ مختلف اوقات پر حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے تھے۔ ان سب کو حضور ﷺ نے آزاد کر دیا تھا۔ ان کے نام یہ ہیں:

ابو رافع اسلم (جو حضور ﷺ کو حضرت عباسؓ نے دیا تھا)، احمر، اسامہ بن زید، اَفلح، اَیمن، ثوبان، ذکوان، رافع، رباح الاسود، زید بن حارثہ (جو آپ کو حضرت خدیجہؓ نے دیا تھا)، سابق، سالم، سلمان الفارسی، سُلیم الدّوسی، سعید بن کندیر، شقران صالح (جو آپ کو عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے پیش کیا تھا)، ضمیرہ، عبیداللہ بن اسلم، عبید بن عبدالغفار، فضالہ یمانی، فضالہ، مدعم، نافع، نفیع، نبیہ، واقد، وردان، ہشام، یسار (یہ حضور کے اونٹ چراتا تھا)، ربیعہ (آپ کو وضو کراتا تھا)، ابن مسعود (آپ کے جوتوں کا خیال رکھتا تھا)، عقبہ (خچر پر متعین تھا)، ابو اُمَیلہ، ابو الحمراء، ابو رافع، ابو السمح، ابو ضمیرہ، ابو عبید، ابو مُوَیہبہ اور ابو واقد، بعض سیرت نگاروں نے کچھ اور نام بھی لکھے ہیں، مثلاً بکیر، ثعلبہ، ہلال بن حارث وغیرہ۔

لیکن ہم انھی ناموں پہ اکتفا کرتے ہیں۔ ان کی کل تعداد اسی کے قریب تھی۔

حضور ﷺ کی اولاد

آپ کی اولاد کے متعلق سیرت نگاروں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ہَیثم بن عدی، ہشام بن عروہ سے روایت کرتا ہے اور یہ اپنے والد سے، کہ حضور ﷺ کے تین بچے تھے: عبد مناف، عبدالعزیٰ اور قاسم۔ باقی سیرت نگار ہیثم کو کذاب قرار دیتے ہیں۔ بایں دلیل کہ جس رسول نے زندگی بھر توحید کا درس دیا ہو وہ اپنے بچوں کو مشرکانہ نام کیسے دے سکتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق حضور ﷺ کے چار بیٹے تھے۔ قاسم، طاہر، عبداللہ اور مُطَیَّب (یا طَیِّب)۔ بعض کے ہاں طاہر ہی کا دوسرا نام طیب تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ طَیّب مطیب توام بھائی تھے اور اسی طرح طاہر و مطہر بھی۔ زیادہ قابلِ اعتماد روایت یہ ہے کہ حضرت خدیجہ کے بطن سے تین ہی بیٹے تھے۔ قاسم جو دو سال زندہ رہا۔ عبداللہ اور طیب، یہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ حضور ﷺ کا چوتھا فرزند ابراہیم ماریہ قبطیہ کے بطن سے تھا۔ وفات کے وقت اس کی عمر سولہ یا اٹھارہ ماہ تھی۔

آپ ﷺ کی چار بیٹیاں تھیں۔ سب کی سب حضرت خدیجہؓ کی اولاد۔ سب سے بڑی کا نام زینب تھا، جس کی شادی حضرت خدیجہ کے بھانجے ابوالعاص بن ربیع سے ہوئی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اُمامہ جو بعض اوقات نماز میں حضور ﷺ کی پیٹھ پر سوار ہو جاتی تھی، زینب ہی کی بیٹی تھی۔ غزوۂ بدر میں ابوالعاص بھی کفارِ مکہ کے ہم راہ شریک ہوا تھا اور قید ہو گیا۔ حضرت زینب نے انھیں رہا کرانے کے لیے اپنا ہار بطور فدیہ حضور ﷺ کے پاس بھیجا تھا۔ حضور ﷺ نے اس ہار کو دیکھا تو اس قدر رقت طاری ہوئی کہ آنسو ٹپکنے لگے۔ آپ نے ابوالعاص کو رہا کر دیا۔ ہار واپس بھیج دیا اور ابوالعاص سے کہا کہ یا تو اسلام لاؤ اور یا میری بیٹی کو میرے پاس بھیج دو۔ چنانچہ اس نے یہ بات مان لی۔ حضور ﷺ نے زید بن حارثہ کو اس کے ساتھ کر دیا اور وہ چند روز بعد حضرت زینبؓ کو مدینے میں لے آیا۔ زینبؓ کی وفات 8ھ میں ہوئی تھی اور خود حضور ﷺ نے اسے قبر میں اتارا تھا۔

دوم: اُمِ کلثوم، جس کا نکاح ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوا، ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ آیت ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ﴾ (ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ خود ہلاک ہو) نازل ہوئی۔ ابولہب نے بیٹے کو حکم دیا کہ محمد (ﷺ) کی دونوں بیٹیوں رقیہ اور امّ کلثوم، جن سے تمھارا نکاح ہو چکا ہے، کو طلاق دے دو۔ اور اس نے تعمیل کی۔ رُقیہ کا نکاح چوتھے سالِ نبوت میں حضرت عثمانؓ سے ہوا تھا۔ آپ کا ایک ہی بیٹا تھا، نام عبداللہ۔ دس سال کے بعد آپ بیمار پڑ گئیں اور ہجرت کے سترہویں ماہ میں جب حضور ﷺ غزوہ بدر سے واپس آ رہے تھے، فوت ہو گئیں۔ حضور ﷺ مدینہ میں داخل ہوئے تو آپ دفن ہو چکی تھیں۔

سوم: رقیہ کی وفات کے بعد حضور ﷺ نے اِمِ کلثوم بھی حضرت عثمانؓ کے نکاح میں دے دی۔ آپ کی وفات شعبان 9 ہجری میں ہوئی تھی۔

چہارم: فاطمۃ الزہراء، جنھیں بعض سیرت نگار رقیہ سے دو سال بڑی قرار دیتے ہیں۔ آپ کی ولادت بعثت سے پانچ سال پہلے یعنی ۶۰۵ء میں ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ سے آپ کا نکاح ۲ھ میں ہوا۔ آپ کی چار اولادیں تھیں: حسنؓ، حسینؓ، زینبؓ اور امِ کلثوم۔ بعض نے محسن اور رقیہ کا نام بھی لیا ہے۔ لیکن ان کی روایات قابل اعتماد نہیں ہیں۔ امِ کلثوم کا نکاح حضرت فاروق اعظم عمرؓ بن خطاب سے ہوا تھا۔ اس سے زید پیدا ہوا۔ فاروق اعظمؓ کی وفات کے بعد عون بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ اس کی وفات کے بعد محمد بن جعفر سے نکاح ہوا۔ یہ بھی جلد وفات پا گئے اور آخر میں عبداللہ بن جعفر کے نکاح میں آئیں۔ حضرت فاطمہؓ کی وفات رحلتِ رسول سے چھ ماہ بعد اور بروایتے تین ماہ بعد ہوئی تھی۔ اس وقت آپ کی عمر 29 برس (قمری) کے قریب تھی۔ آپ کو حضرت علیؓ نے غسل دیا اور حضرت ابوبکرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ بعض روایات میں حضرت عباسؓ کا نام آیا ہے اور بعض میں خود حضرت علیؓ کا۔ لیکن پہلا قول صحیح تر ہے۔

حضور ﷺ کے مرکب

مرکب سے مراد سواری کا جانور ہے، خواہ وہ گھوڑا، خچر اور اونٹ ہو یا خر۔ آپ ﷺ نے زندگی میں صرف سات گھوڑوں پر سواری کی تھی۔ ان کے نام یہ ہیں:

1: اَلسَّکْب۔ یہ حضور ﷺ کا پہلا گھوڑا تھا۔
2: مُرْتَجِز۔ یہ ایک اعرابی سے خریدا تھا۔
3: لزاز۔ یہ اسکندریہ کے بادشاہ مُقَوقِس نے بھیجا تھا۔
4: اَلظَّرِب۔ جو ربیعہ بن البراء نے پیش کیا تھا۔
5: اَلْوَرْد۔ جو تمیم الداری نے بطور ہدیہ بھیجا تھا۔
6: نُحَیف یا لُحَیف
7: یَعْسُوب

اونٹ

8۔ قَصْویٰ۔ اسے عَضباء اور جَدعاء بھی کہتے ہیں۔ یہ حضورؐ نے ابوبکرؓ سے سو درہم میں خریدی تھی۔ اور اسی پر سوار ہو کر ہجرت فرمائی تھی۔

خچر اور گدھا

9، 10۔ مُقَوقِس نے حضور ﷺ کی خدمت میں ایک خچر بھیجا تھا، جس کا نام تھا شُہباء یا دُلدُل۔ اور ایک گدھا جو یعفور کہلاتا تھا۔

حضور کے دُدھیالے جانور

حضور ﷺ نے دودھ کی خاطر کئی جانور پال رکھے تھے۔ ان میں کچھ اونٹنیاں تھیں اور کچھ بھیڑ بکریاں۔ اونٹنیوں کے نام یہ تھے:

عَجْوَہْ۔ زَمْزَمْ۔ سُقْیَا۔ بَرْکَہْ۔ وَرْسَہْ۔ اَطْلَال۔ اَطْراف۔ غَوثَہ (یا غُیَثَہ)۔ یَمْن۔ قَمَر۔ حَنّاء۔ سَمْراء۔ غَرِیْس۔ سَعْدِیَہ۔ یَسِیرَہ۔ بُغُوم۔ رَیَا۔ مَہْرَہ۔ شَعْراء اور بُردہ۔

حضور ﷺ کی تلواریں

آپ ﷺ کی تلواروں کے نام یہ تھے۔ قلعیًا، جو صحرا کے یک گاؤں قلع سے آئی تھی۔ بتار۔ حَتْف۔ مِخْذَم۔ رَسُوب۔ عَضْب اور ذوالفقار جو آپ ﷺ نے علیؓ کو عنایت کر دی تھی۔

حضور ﷺ کی کمانیں

روحاء، بیضاء، صفراء (یا شوحط)، اَلکَتُوم، زَوراء، سداد۔

طبقات کے مصنف ابن سعد لکھتے ہیں کہ جب حضور ﷺ کو مدینہ کے ایک یہودی قبیلہ قینقاع سے لڑنا پڑا تو وہاں سے آپ ﷺ کو تین نیزے اور تین کمانیں ملیں۔ کمانوں کے نام بیضاء، صفراء اور روحاء تھے۔

حضور ﷺ کے نیزے

آپ ﷺ کے پاس کل چار نیزے تھے۔ یعنی اَلْمُثْوِیْ، اَلْمُتَثَنّیْ۔ باقی دو کے نام معلوم نہیں ہو سکے۔

حضور ﷺ کی ڈھالیں

آپ ﷺ کے پاس تین ڈھالیں تھیں۔ الزَّلُوق۔ اَلْفُتَق اور تیسری کا نام معلوم نہیں۔

حضور ﷺ کی زرہیں

سَعْدِیَہ، فِضَّہ، ذاتُ الفُضول، ذاتُ الوِشاح، ذات الحواشی، بَتْراء، سُغْدِیَہ اور خِرْنِق

(ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

سیرتِ نبوی ﷺ کی ترتیب زمانی

کتاب کے اصل مباحث میں جہاں بڑے پیمانے پر فی الجملہ ترتیب زمانی ملحوظ رہی ہے، وہاں تفاصیل میں اسے نظرانداز کر کے موضوعات و مباحث کے تحت مختلف زمانوں کا واقعاتی مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے لیکن تاریخ اور سیرت و سوانح کے میدان میں واقعات کی ترتیب زمانی کو بجائے خود بڑی اہمیت حاصل ہے' لہٰذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ذیل کا نقشہ بطور ضمیمہ شامل کتاب کیا جا رہا ہے۔ اس نقشہ کی بڑی افادیت یہ ہے کہ ایک نظر میں سیرت پاک کے جملہ اہم واقعات سامنے آجاتے ہیں۔

واضح رہے کہ مختلف اہم تاریخوں اور دنوں کے تعین میں حسب ذیل وجوہ سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔

بعثت سے قبل کے واقعات کو عام الفیل یا حضور ﷺ کے سال میلاد سے بیان کیا جاتا ہے اور ان سالوں کو عیسوی شمسی سے تطبیق دی جاتی ہے۔ عام الفیل 1 اور سال میلاد اگرچہ فی الجملہ منطبق ہیں لیکن عام الفیل کا آغاز واقعہ فیل کے دن (۷ محرم بروز جمعرات) سے ہوتا ہے اور سال میلاد سے ۵۰ یا ۵۵ روز (تقریباً دو ماہ بعد) شروع ہوتا ہے' ہر دو سنین کے اس فرق کو مورخین اور راویان یا تو سرے سے نظرانداز کر جاتے ہیں یا یہ واضح نہیں کرتے کہ انھوں نے سال کا کون سا آغاز اختیار کیا ہے۔ پھر ایک طرف سال کا آغاز ربیع الاول سے ہو رہا ہے اور دوسری طرف مروجہ قمری سال محرم سے محسوب ہوتا ہے۔ اس طرح حسابی الجھنیں بڑھ جاتی ہیں۔ مثلاً اگر میلادی سلسلہ سنین محرم سے شمار کریں تو ہجرت چودھویں میلادی سال میں ہوئی لیکن اگر سال ربیع الاول سے محسوب کریں تو تیرھویں سال میلاد میں ہوئی' مورخین نے دونوں ہی سال لکھے ہیں۔

ہجری تقویم کو باقاعدہ طور پر حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں (بتاریخ 20 جمادی الاخری 17ھ بروز جمعرات) اختیار کیا۔ اس سے قبل ہجری تقویم نہ تو منضبط تھی اور نہ واقعات کا تعین وقت اس کے مطابق کرنے کا اہتمام تھا۔ چنانچہ صحاح کے دفاتر ہجری تقویم سے بے نیاز ہیں۔ ہجری تقویم کو اختیار کرنے کے بعد سابق واقعات کی ترتیب زمانی اس کے تحت متعین کی جانے لگی۔

پھر ہجرت سے جو قمری سال شروع ہوتا ہے وہ بھی دو طرح محسوب کیا جا سکتا ہے۔ ایک یوں کہ ماہ ہجرت (ربیع الاول) سے شمار کریں اور دوسرے یوں کہ سالوں کی گنتی اگرچہ ہجرت کے سال سے کی جائے لیکن سال کی ابتدا قمری سال کے مروجہ ماہ آغاز (محرم) ہی سے کی جائے' یعنی اولین سال ہجرت صرف دس ماہ کا گنا جائے (ربیع الاول تا ذی الحجہ) محدثین' سیرت نگاروں اور تاریخی ماخذ میں سال ہجری کو ان دونوں صورتوں میں لیا گیا ہے لیکن اس امر کی تصریح کم ہی صورتوں میں کی گئی ہے کہ سال کو کس نہج سے محسوب کیا گیا ہے۔

پھر بعض روایات میں تاریخ کے ساتھ جو یوم مذکور ہے ان کا باہمی انطباق نہیں ہوتا۔ دونوں میں سے جس پہلو سے وثوق یا روایات کا اتفاق پایا جاتا ہے اسے بنیاد بنا کر دوسرا پہلو حساب سے طے کیا جاتا ہے۔

سب سے بڑی مشکل تقویموں اور مختلف سلسلہ سنین کے انطباق سے پیدا ہوتی ہے' کیوں کہ مآخذ میں کسی ایک تقویم یا سلسلہ سنین کی پابندی نہیں کی گئی۔ تقویموں کا یہ ہیر پھیر اس وجہ سے بھی بڑھ جاتا ہے کہ متعدد شمسی تقویموں کے علاوہ خود عیسوی تقویمیں بھی دوہری رائج رہ چکی ہیں۔ ایک شمسی' دوسری قمری' مزید مشکل یہ کہ عیسوی اور دوسری تقویموں کے نظام تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ اب کئی صدی بعد جب تاریخوں اور دنوں کی تطبیق کا حساب لگایا جاتا ہے تو متعدد پہلوؤں سے اختلاف کی راہیں نکل آتی ہیں۔

بعض واقعات اور اقدامات کو زمانی تعین کے ساتھ اہم روایات میں بیان ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآن اور حدیث شریف کے دفاتر کی روشنی میں صرف اتنی ہی بات طے ہو سکتی ہے کہ کوئی واقعہ فلاں واقعہ سے پہلے یا بعد رونما ہوا لیکن متعدد واقعات (مثلاً تیمّم کی اجازت' متعہ کی حرمت' احکام حجاب کے نفاذ اور بعض غزوات و سرایا و معاہدات) کے متعلق بلاتعین تاریخ محض سرسری ترتیب زمانی قائم کرنے میں بھی روایات متبائن ہیں۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیرت پاک کے جملہ تفصیلی واقعات کی ترتیب زمانی کا قطعی تعین تاریخ کے ساتھ پیش کرنا مشکل ہے۔ بڑے بڑے محققین جن میں صرف سیرت نگار ہی نہیں' مفسرین' محدثین اور فقہاء بھی شامل ہیں' بکثرت اختلافات رکھتے ہیں اور ہر نقطہ نظر کے حق میں اور اس کے خلاف لمبی چوڑی مدلل بحثیں موجود ہیں۔

مولف محسن انسانیت ﷺ نے اپنے مطالعہ کی حد تک ان اختلافات اور تقویمی حسابات میں کاوش کر کے کوئی ایک صورت اس نقشے میں طے کر دی ہے اور اختلافات کو اشارۃً درج کر دیا ہے لیکن نہ تو پورے اختلافی نقطہ ہائے نظر کو یہاں درج کر کے قاری کو پریشان کرنا مناسب تھا اور نہ ہی گنجائش تھی کہ متقدمین اور متاخرین کی تفصیلی بحثیں پیش کی جائیں۔ یہ کام اگر کیا بھی جائے تو بالکل الگ سے کرنے کا ہے۔

اس نقشہ میں ہجرت سے قبل کے واقعات کو یا تو عام الفیل اور سال میلاد کے حساب سے درج کیا گیا ہے یا سال بعثت کے حساب سے۔ کہیں کہیں حضور ﷺ کی عمر مبارک ہی کو تعین وقت کا پیمانہ بنایا گیا ہے۔

۱۔ پیدائش حضور ﷺ موسم بہار میں دوشنبہ کے روز (اس دن پر اتفاق ہے) بتاریخ ۹ ربیع الاول عام الفیل (واقعہ فیل سے 50 روز بعد) مطابق 22 اپریل 571 یکم جیٹھ سمت بکرمی بوقت صبح صادق (قبل از طلوع آفتاب) مشہور عالم 12 ربیع الاول ہے طبری و ابن خلدون نے 12 ربیع الاول اور ابو المقداد نے 10 تاریخ کی روایت کی ہے مگر چوں کہ دن کے دوشنبہ ہونے پر اتفاق ہے اور دوشنبہ 9 ہی کو آتا ہے اس لیے محمد طلعت بک عرب (مولف تاریخ دول العرب والاسلام) کی تائید قاضی سلیمان منصور پوری (مولف رحمۃ للعالمینؒ) نے تقویموں کے تطابق سے کی ہے۔
مولف رحمۃ للعالمین) نے تقویموں کے حساب میں عرق ریزی کرتے ہوئے 9 ربیع الاول ہی کے حق میں رائے دی ہے۔ مصر کے مشہور ہیئت دان محمود پاشا نے ریاضیاتی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حضور ﷺ کا یوم ولادت 9 ربیع الاول ہے جسے پاشائے موصوف نے 20 اپریل 571ء سے مطابقت دی ہے۔ علامہ شبلی نے بھی اسی تحقیق کو قبول کیا ہے۔

22 اپریل کا تعین گرگورین رول کے مطابق ہے جس کے تحت ستمبر 1752ء سے نئی عیسوی تقویم کا حساب چلا۔ قدیم تقویمی قاعدہ کے مطابق اس دن 19 اپریل 5284 سن جولین کی تاریخ متعین ہوئی ہے۔ ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ ولادت حضور ﷺ واقعہ عام الفیل سے 50 روز بعد ہوئی یا 55 روز بعد۔ بظاہر حساب 50 روز کے حق میں ہے۔

مولانا عبدالرؤف دانا پوری (مؤلف اصح السیر) نے 8 یا 12 ربیع الاول دو تاریخیں لکھی ہیں۔ مگر نہ تو مآخذ روایت پر گفتگو کی ہے نہ تقویموں کے سلسلہ میں تفحص پیش کیا ہے۔ بعض نے یکم محرم کا تعین بھی کیا ہے اور عیسوی تقسیم کے لحاظ سے 12 اور 15 فروری کی تاریخیں ذکر کی ہیں۔

ابن اسحاق کے نزدیک ربیع الاول کی بارھویں رات گزرنے پر حضور ﷺ کی ولادت ہوئی۔

ہماری رائے میں محققین کا پلہ 9 تاریخ کے حق میں بھاری ہے۔

2۔ رضاعت
بہ عمر چار ماہ — پیدائش کے 2، 3 روز بعد سے ثوبیہ (جو ابولہب کی کنیز تھی) کا دودھ حضور ﷺ نے کچھ وقت پیا۔ باقاعدہ دور رضاعت آپ ﷺ نے دائی حلیمہ سعدیہ کے صحرائی گھر میں گزارا۔

3۔ حضور ﷺ کی والدہ کا انتقال — بہ عمر 6 سال

4۔ حضور ﷺ کے دادا کا انتقال — بہ عمر 8 سال 2 ماہ 10 دن

5۔ پہلا سفر شام بمعیت جناب ابوطالب۔ — بہ عمر 12 سال 2 ماہ
بحیرا راہب کا واقعہ اسی سفر سے متعلق مشہور ہے

6۔ حرب فجار میں شرکت بار اول — بہ عمر 15 سال (یا کچھ زائد)

7۔ حرب فجار میں شرکت بار دوم — کچھ عرصہ بعد، وقت کا تعین نہیں

8۔ حلف الفضول (ایک اصلاحی انجمن) میں شرکت — بہ عمر 16 سال

9۔ دوسرا سفر شام تاجرانہ حیثیت میں — بہ عمر 23 سال 24 دن

10۔ ازدواج (حضرت خدیجہؓ سے) — بہ عمر 25 سال 2 ماہ 10 دن

11۔ غیبی اسرار کے ظہور کا آغاز — 7 سال قبل بعثت بہ عمر 33 سال

12۔ تحکیم — بہ عمر 35 سال
تعمیر حرم کے سلسلے میں حجر اسود نصب کرنے پر جھگڑا ہوا، تو سب نے حضور ﷺ کو امین قرار دیتے ہوئے حکم بنایا اور معاملہ بخوبی طے ہوگیا۔

13۔ بعثت
بہ عمر 40 سال 11 دن 9 ربیع الاول 41 سال میلاد مطابق 12 فروری 610ء بروز دوشنبہ

اس تاریخ کے تعین میں بھی خاصا اختلاف ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ بہ عمر 40 سال 6 ماہ 16 دن (قمری تقویم) اور 39 سال 3 ماہ 12 دن (شمسی تقویم) بعثت کا فرمان حرا میں نازل ہوا۔ چنانچہ بعض نے 25 رمضان اور بعض نے 13 ربیع الاول کی تاریخیں دی ہیں اور عیسوی تقویم کے لحاظ سے 12 فروری کے بالمقابل 6 اگست 610ء کی تاریخ بھی مذکور ہے۔ مگر یہ سارے اختلافات تقویمی حسابات کی پیچیدگی سے پیدا ہوئے ہیں۔ نیز التباس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فرمان بعثت اور آغازِ نزول قرآن کے زمانے روایات میں گڈ مڈ ہوگئے ہیں، صاحب زاد المعاد نے 8 تاریخ لکھی ہے مگر دوشنبہ تقویمی حسابات سے 9 تاریخ کو پڑتا ہے۔ فرمان بعثت کی صورت یہ ہوئی کہ روح الامین نے غار میں سامنے آکر مخاطب کیا کہ "بشارت قبول فرمایئے! آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبرائیل ہوں۔" اسی واقعہ پر آپ ﷺ کو اضطراب ہوا اور حضرت خدیجہؓ نے تسکین دی۔

واقعہ	تاریخ	تفصیل
14۔ فرضیت نماز (فجر و عصر کی دو دو رکعتیں)	9 ربیع الاول بروز بعثت	
15۔ آغاز نزول قرآن	18 رمضان 1 سال بعثت بروز جمعہ (بوقت شب) مطابق 17 اگست 610ء	اس موقع پر سورۂ علق نازل ہوئی۔ طبری نے 17 یا 18 دونوں تاریخیں لکھی ہیں مگر تقویمی حساب سے جمعہ 18 ہی کو آتا ہے۔
16۔ خفیہ دعوت کا دور	1 تا 3 بعثت	خانہ ارقم مخزومی واقع کوہ صفا تحریک اسلامی کا مرکز بنا اور تقریباً 40 افراد اس دور میں اسلام لائے۔ نماز شہر سے باہر خفیہ طور پر پڑھی جاتی۔
17۔ اعلان نبوت (پہلا خطاب عام)	3 بعثت (اواخر میں)	
18۔ مخالفت کا پہلا دور (استہزاء و پروپیگنڈا اور ہلکا تشدد)	3 تا 5 بعثت	اس دور میں ابوطالب پر دباؤ ڈالنے کے لیے قریش کے وفود گفت و شنید کرتے رہے اور مخالفت کے لیے مجالس خاص میں تدابیر سوچی جاتی رہیں۔
19۔ شدید مخالفت کا دوسرا دور (عام مظالم)	5 تا 7 بعثت	
20۔ ہجرت حبشہ	رجب 45 میلاد 5 بعثت	
21۔ حضرت حمزہؓ و حضرت عمرؓ کا قبول اسلام	6 بعثت	حضرت عمرؓ حضرت حمزہؓ کے تین روز بعد اسلام لائے۔ بقول بعض حضرت حمزہؓ 2 بعثت میں ایمان لائے۔
22۔ حضور ﷺ کی خاندان بنو ہاشم سمیت نظر بندی (مقاطعہ) شعب ابی طالب میں	یکم محرم 47 میلاد 7 بعثت بروز سہ شنبہ	
23۔ مقاطعہ و نظر بندی کا خاتمہ	9 بعثت کا اواخر یا 10 بعثت کے اوائل میں 10 بعثت	
24۔ عام الحزن جناب ابوطالب و حضرت خدیجہؓ کی وفات	10 بعثت	ابوطالب کی وفات کے 3 یا 5 روز بعد حضرت خدیجہؓ نے ماہ رمضان میں داعی اجل کو لبیک کہی۔
25۔ سفر طائف	جمادی الاخریٰ 50 میلاد 10 بعثت بروز دوشنبہ (شب)	دوسری روایت 26۔27 شوال 10 بعثت کی ہے۔
26۔ معراج	27 رجب □ 50 میلاد 10 بعثت بروز دوشنبہ (شب)	
28۔ مدینہ میں اسلام کا آغاز	ذی الحجہ 50 میلاد 10 بعثت	ایاس بن معاذ نے اسلام قبول کیا۔
29۔ وفد مدینہ (6 افراد) کا قبول اسلام	ذی الحجہ 51 میلاد 11 بعثت	
30۔ بیعت عقبہ اولیٰ (12 افراد)	ذی الحجہ 51 میلاد 12 بعثت	
31۔ بیعت عقبہ ثانیہ (175 افراد)	ذی الحجہ 53 میلاد 13 بعثت	
32۔ ہجرت: مکہ سے غار ثور	27 صفر (شب) 53 میلاد 13 بعثت	واضح رہے کہ حضور ﷺ کی عمر مبارک اس واقعہ کے وقت ربیع الاول میں 53 سال پوری ہوئی اور سال 54 شروع ہوا۔ اسی طرح تیرہواں سال بعثت تکمیل پا کر چودھویں کا آغاز کیا۔
(ب) غار ثور سے روانگی		یکم ربیع الاول بروز دوشنبہ مطابق 13 ستمبر 622ء
(ج) قبا میں ورود		8 ربیع الاول 53 میلاد 13 بعثت مطابق 23 ستمبر 622 بعثت بروز دوشنبہ
(د) قبا سے مدینہ کو روانگی، مدینہ میں داخلہ	12 ربیع الاول 1ھ 14 بعثت بروز جمعہ	جمعہ بنو سالم کی بستی میں ادا کیا گیا۔ ایک قوی روایت یہ بھی ہے کہ قبا میں 14 روز قیام رہا۔ صحیح بخاری میں قیام مدت "بضع عشرۃ لیلۃ" مذکور ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں مدینہ پہنچنے کی تاریخ 22 ربیع الاول آتی ہے۔
33۔ تاسیس مسجد نبوی		ربیع الاول 1ھ
34۔ فرض نماز میں اضافہ	ربیع الثانی 1ھ	ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں فرض ہوئیں۔
35۔ مہاجرین و انصار میں مواخات		

اجتماعی مواخات، برمکان حضرت انس — اس میں حضور ﷺ کے سامنے 90 مہاجرین وانصار حاضر تھے۔

۔ اسلامی ریاست کا قیام مدینہ کی وسط 1ھ — وادی کا دستوری معاہدہ — ۔ نظام دفاع برسر عمل ہوا

1ھ ہجرت کے ساتویں ماہ کے — فوجی مظاہرہ اور طلایہ گردی کے لیے پے در پے تین دستے روانہ کیے گئے

(1) ساتویں ماہ 30 افراد کا دستہ حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی سرکردگی میں مقام سیف البحر تک گیا۔
(2) آٹھویں ماہ (شوال) 60 یا 80 سواروں کا دستہ عبیدہ بن الحارث کی سرداری میں بہ جانب رابغ بھیجا گیا۔
(3) نویں ماہ (ذی قعدہ) سعد بن وقاصؓ 20 سواروں کا دستہ لے کر خرار تک گئے۔ اس کے بعد ودان کی جانب حضور ﷺ بہ نفس نفیس ایک جماعت کے ساتھ تشریف لے گئے۔

اس عملی و واقعاتی صورت حالات کے پیش نظر ہم اس نظریہ سے اتفاق نہیں کر سکے کہ اذن جہاد کی مشہور آیت 2ھ میں نازل ہوئی۔ درحقیقت 2ھ میں عملاً قتال کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اس سے قبل عملی تصادم سے اجتناب رہا۔ لیکن نظام دفاع کی تشکیل کے لیے کسی نہ کسی فرمان الٰہی کو لازماً محرک اول ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اذن جہاد کی آیت کا نزول ہجرت سے قبل قرار دیتے ہیں۔ اس کا مدعا یہ تھا کہ اسلامی جماعت کا ذہن دعوت کے دور صبر سے آنے والے دور جہاد کی ذمہ داریوں کی طرف منتقل ہوا اور وہ نئے مرکز میں پہنچ کر فوراً دفاعی تنظیم کا آغاز کر دیں۔

38۔ حضور ﷺ کے حرم میں حضرت عائشہؓ کی تشریف آوری — شوال 1ھ

39۔ دو اکابر کا قبول اسلام
1۔ عبداللہؓ بن سلام — 1ھ
2۔ ابوقیس صرمہ بن ابی انس (سابق عیسائی راہب)

40۔ فرمان جہاد (عملی کارروائی کرنے کی اجازت) — 12۔صفر 2 یا ہجرت کے 1 سال 2 ماہ ایک یوم بعد

41۔ حضور ﷺ کا اولین فوجی و سیاسی سفر غزوہ ودان — صفر 2ھ ہجرت کے بارہویں ماہ میں

42۔ بیرونی قبائل سے معاہدانہ تعلقات بنی ضمرہ، باشندگان بواط، بنو مدلج — صفر تا جمادی الاخری 2ھ — مورخین کے بیانات سے یہ بھی متبادر ہوتا ہے کہ مجدی، جہینی رئیس جہینہ سریہ بنی ضمرہ سے قبل مدینہ سے حلیفانہ رابطہ رکھتا ہے۔

43۔ کرز بن جابر فہری کی ڈاکہ زنی (دشمن کی اولین دراز دستی) — ربیع الاول 2ھ

44۔ واقعہ نخلہ (اسلامی فوجی دستے کی پہلی سرحدی جھڑپ) — اواخر رجب 2ھ — ایک کافر عمرو بن حضرمی مارا گیا۔ دو قیدی اونٹوں اور اسباب سمیت مدینہ لائے گئے۔ حضور ﷺ نے اس تصادم پر ناراضی کا اظہار کیا۔

45۔ سلمان فارسی کا اسلام — 2ھ
46۔ اذان کا آغاز — 2ھ
47۔ فرضیت زکوٰۃ — 2ھ
48۔ تحویل کعبہ — 15 شعبان 2ھ بروز شنبہ
49۔ فرضیت صوم ماہ رمضان — یکم رمضان 2ھ چہار شنبہ رمضان — چوں کہ معرکہ بدر کی تاریخ یعنی 17 رمضان کو زیادہ تر روایات سے جمعہ کا دن ثابت ہے اس لیے حساب سے یکم کو چہار شنبہ ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم نے وہ روایت چھوڑ دی ہے جس میں یکم رمضان کو یک شنبہ محسوب کیا جاتا ہے۔

50۔ عید الفطر کی نماز باجماعت کی ادائی وصدقہ فطر کے حکم کا نفاذ — یکم شوال 2ھ

51۔ معرکہ بدر (پہلی باقاعدہ جنگ) مدینہ سے روانگی، معرکہ کارزار، مدینہ میں فاتحانہ داخلہ

8 رمضان 2ھ بروز چہار شنبہ یا عجیب الجھن ہے کہ معرکہ کے دن اور 12 رمضان 2ھ بروز جمعہ 20 (یا 17) تاریخ پر تو زیادہ تر اتفاق ہے لیکن رمضان 2ھ بروز دوشنبہ مدینہ سے روانگی کی تاریخ بعض نے 12 قرار دی ہے، بعض نے 8، جنھوں نے 8 تاریخ لکھی ہے وہ دوشنبہ (پیر) کا دن ذکر کرتے ہیں حالانکہ 17 کو جمعہ ہو تو 8 کو کسی طرح پیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم نے 7 رمضان کی روایت میں چہار شنبہ اور 12 کی روایت میں یک شنبہ درج کیا ہے۔ البتہ اگر اس روایت کو اہمیت دی جائے جس کی رو سے 17 رمضان کو سہ شنبہ قرار دیا گیا ہے تو یکم اور آٹھ کو یک شنبہ کا دن ہونا چاہیے۔

52۔ از دواج حضرت علیؓ وفاطمہؓ — جنگ بدر کے بعد 2ھ

53۔ محاصرہ بنو قینقاع — وسط شوال تا اوائل ذیقعدہ 2ھ

54۔ حضور ﷺ کا نکاح حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ سے — 3ھ

55۔ از دواج حضرت عثمان وام کلثوم بنت محمد ﷺ — 3ھ

56۔ امتناع شراب کا ابتدائی حکم — 3ھ

57۔ کعب بن اشرف کا خاتمہ — 3ھ

58۔ ولادت جناب امام حسنؓ — 3ھ

59۔ غزوہ احد..... مدینہ سے روانگی 5 شوال 3ھ بعد نماز جمعہ 6 شوال بروز معرکہ کارزار، حمراء الاسد تک شنبہ لشکر ابوسفیان کا تعاقب — 7 شوال بروز یک شنبہ

60۔ سود خواری کے ترک کے لیے ابتدائی تلقین — غزوہ احد کے متصلاً بعد (ملاحظہ ہو: آل عمران 130)

یتامی کے بارے میں احکام — غزوہ احد کے بعد

61۔ وراثت کے مفصل قانون کا اجراء — 3ھ معرکہ احد کے بعد

63۔ قانون از دواج، حقوق الزوجین، مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت — 3ھ

64۔ حضور ﷺ کا نکاح زینب بنت خزیمہ ام المساکین سے — اواخر 3ھ، یوم احد کو بیوہ ہوئی تھیں، ان کی عدت 3ھ میں جبھی پوری ہو سکتی ہے جب کہ حمل کی صورت ہو۔

65۔ حادثہ رجیع (دس ارکان کے دعوتی وتعلیمی وفد کا قتل) — صفر 4ھ

66۔ غزوہ بنو نضیر — ربیع الاول 4ھ

67۔ ام المومنین زینب بنت خزیمہ کا انتقال — 4ھ اوائل یہ از دواج نبوی ﷺ میں صرف دو تین ماہ رہیں

68۔ حکم حجاب کا نفاذ — یکم ذیقعدہ 4ھ بروز جمعہ

69۔ حرمت شراب کا قطعی قانون نافذ ہوا — 4ھ

70۔ غزوہ بدر الاخریٰ — ذیقعدہ 4ھ — ابوسفیان اپنے چیلنج کے مطابق مقابلہ پر نہ آیا

71۔ غزوہ دومتہ الجندل — ربیع الاول 5ھ (تصادم نہیں ہوا)

73۔ حکم تیمّم کا نزول — غزوہ بنو مصطلق کے سفر میں

74۔ حضور ﷺ کا از دواج حضرت جویریہ سے — شعبان 5ھ

76۔ زنا، قذف اور لعان کے فوجداری قوانین (نیز پردے کے تفصیلی احکام) — 5ھ (واقعہ کے بعد)

77۔ غزوہ احزاب — شوال یا ذی قعد 5ھ

78۔ وفد دوس کی مدینہ میں آمد 5ھ — یہ 70-80 مسلم خاندانوں کا عظیم وفد تھا

79۔ بنو قریظہ کی سرکوبی — ذوالحجہ 5ھ

80۔ حضور ﷺ کا از دواج جناب زینب بنت جحش سے — 5ھ

81۔ ثمامہ بن اثال حنفی رئیس نجد کا قبول اسلام — 6ھ

82۔ معاہدہ حدیبیہ — ذیقعدہ 6ھ

83۔ حدیبیہ سے مدینہ میں واپسی — ذی الحجہ 6ھ

واقعہ	تاریخ	کیفیت
8_خالد بن ولید اور عمرو بن العاص کا قبول اسلام	6ھ	
8_بین الاقوامی دعوت کا آغاز (سلاطین کے نام خطوط)	یکم محرم 7ھ بروز چہار شنبہ	
8_غزوہ خیبر	محرم 7ھ	
8_حضور ﷺ کا نکاح حضرت صفیہؓ سے	محرم 7ھ	
88_مراجعت مہاجرین حبشہ	فتح خیبر کے موقع پر 7ھ	
89_آزاد مسلم کیمپ کا قیام (بمقام سیف البحر)	7ھ کے آغاز میں	مکہ میں جو مسلم نوجوان ستائے جارہے تھے، معاہدہ حدیبیہ کے مطابق انھیں حضور ﷺ مدینہ میں جگہ نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ پہلے ابوجندل و ابوبصیرؓ اور بعد میں دوسرے لوگ بھاگ کر سیف البحر کے مقام پر جا پہنچے اور وہاں آزاد مسلم کیمپ قائم کیا۔
90_سیف البحر کا قریشی قافلے پر چھاپہ	صفر 7ھ	
91_عمرۃ القضاء	ذی قعدہ 7ھ	
92_نکاح وطلاق کے تفصیلی قوانین کا نفاذ	7ھ	
93_حضور ﷺ کا نکاح حضرت میمونہ سے (مکہ میں)	7ھ	
94_جبلہ غسانی کا اسلام	7ھ	
95_غزوہ موتہ	جمادی الاول 7ھ	
96_مشرکین مکہ کی طرف سے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی	رجب 8ھ	
97_غزوہ فتح مکہ مدینہ سے روانگی	10 رمضان 8ھ بروز چہار شنبہ	
مکہ میں فاتحانہ داخلہ	20 رمضان	دوسری طرف خاص مضبوط روایت یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ 18 رمضان تک مدینہ میں تھے۔ اس حساب سے داخلہ مکہ 29 یا 30 کو ہونا چاہیے۔
سریہ خالد برائے ہدم بت خانہ عزیٰ نخلہ واقع	اغلباً 25 رمضان	
سریہ عمرو بن العاص برائے ہدم بت خانہ سواع	رمضان 8ھ	
سریہ سعد اشہلی برائے ہدم بت خانہ مناۃ قیام مکہ	9 شوال تک (بروایت دیگر 18 شوال تک)	
غزوہ حنین (طائف پہنچنے تک)	اواخر شوال تا اوائل ذیقعدہ تقریباً 18 یا 20 روز (مکحول کی روایت کے مطابق 40 روز محاصرہ جاری رہا۔	
جعرانہ میں تقسیم غنائم کے بعد عمرہ جعرانہ	ذی قعدہ 8ھ	
98_سود کے قطعی انسداد کا قانون	بہ موقع فتح مکہ 8ھ	سودی مطالبات قانوناً کالعدم کر دیئے گئے (ملاحظہ ہو: البقرہ 278)
99_وفد صداء کی مدینہ میں آمد	8ھ	
100_حضرت زینب بنت حضور ﷺ کا انتقال	8ھ	
جناب ابراہیم فرزند حضور ﷺ کا انتقال	8ھ	
101_تنظیم زکوٰۃ محصلین صدقہ کا اولین تقرر	ابتدائے محرم 9ھ	
102_غزوۂ تبوک: جیش عسرت کی روانگی	رجب 9ھ مطابق نومبر 635 مدینہ سے روانگی بروز جمعرات	
103_جزیہ کا حکم	بہ زمانہ تبوک	ایک روایت کے مطابق 8ھ میں غزوۂ تبوک سے قبل یہ حکم آیا۔
104_مسجد ضرار جلادی گئی		غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد
105_الیدر لوائی دومتہ الجندل کا اسلام	9ھ	
106_کعب بن زہیر کی عفوطلبی اور قبول اسلام	9ھ	(قصیدہ "بانت سعاد" لکھ کر پیش کیا)
107_چند وفود جو اس سال مدینہ آئے (وفد عذرہ)	صفر 9ھ	
وفد بلی	ربیع الاول 9ھ	

وفد خولان	شعبان 9ھ	
وفد ثقیف	9ھ	

108۔ فرضیت حج: اولین حج (بامارت حضرت ابوبکر صدیقؓ)

9 ذی الحجہ 9ھ دوشنبہ یا سہ شنبہ	فرضیت حج کے تعین وقت میں بھی روایات 6ھ‘ 7ھ‘ 8ھ‘ 9ھ‘ 10ھ کے بارے میں موجود ہیں مگر ہم نے اپنی دانست میں مرجح صورت کو لے لیا ہے۔ ایک دل چسپ صورت یہ بھی ہے کہ یہ حج کفار کے تقویمی نظام کے تحت نون (یا نوند) کے مہینوں کی وجہ سے ذی قعدہ میں ہوا تھا۔ لیکن اس روایت کا پہلو کم زور ہے۔ اعلان براءت سے متعلق بھی اختلاف ہے کہ یوم عرفہ کو ہوا یا یوم نحر کو۔ ہمارے نزدیک یوم الحج الاکبر کے قرآنی الفاظ کافی ہیں۔ احادیث کو دیکھیں تو بھی یوم النحر کے حق میں پلڑا بھاری ہے۔

109۔ اعلان براءت بذریعہ حضرت علیؓ کفار کے غیر موقت معاہدات کا خاتمہ (اعلان براءت کے مطابق)	10 ربیع الثانی 10ھ	
110۔ وفد محارب‘ وفد محامد	10ھ	بقیہ وفود میں سے اکثر 10ھ میں اور کچھ 9ھ میں مدینہ آئے مگر ان کی آمد کے وقت کا صحیح تعین مشکل ہے
وفد خولان	شعبان 10ھ	
وفد غیسان	رمضان 10ھ	
وفد بنی حارث بن کعب	شوال 10ھ	
وفد سلامان	شوال 10ھ	
111۔ حضور ﷺ کا آخری رمضان میں 20 روزہ اعتکاف	رمضان 10ھ	
112۔ حضور ﷺ سے مسلیمہ کذاب کی مراسلت	10ھ	
113۔ حجۃ الوداع: مدینہ سے روانگی	26 ذی قعدہ 10ھ بروز شنبہ مابین ظہر وعصر	اس معاملے میں بھی اختلاف ہے مگر ہم نے صحیح ترین روایت اختیار کی ہے۔
ذوالحلیفہ میں قیام	شنبہ و یک شنبہ کی درمیانی شب	
احرام بندی	یک شنبہ (بوقت ظہر)	
ذی طویٰ میں نزول وقیام	شب یک شنبہ 4 ذی الحجہ	
ذی طویٰ میں مکہ کو روانگی	5 ذی الحجہ نماز صبح کے بعد	ثنیۃ العلیا کی طرف سے جو حجون کی بلندی پر ہے حضور ﷺ مکہ میں داخل ہوئے۔
مسجد حرام میں داخلہ	5 ذی الحجہ بوقت ضحیٰ	باب بنی عبد مناف (باب بنی شیبہ) سے حضور ﷺ داخل ہوئے
مکہ سے باہر قیام	8 ذی الحجہ تک	جملہ اصحاب حضور ﷺ کے ساتھ مقیم رہے۔ قیام شبانہ منیٰ میں فرمایا
منیٰ کو روانگی	8 ذی الحجہ بروز جمعرات بوقت ضحیٰ	
منیٰ سے عرفہ کو روانگی	9 ذی الحجہ بروز جمعہ‘ طلوع آفتاب کے بعد	براستہ ضب قریہ نمرہ (عرفات سے بجانب مشرق) تشریف لے گئے وہیں قبہ کھڑا کیا گیا۔ قصویٰ نامی ناقہ پر سے یہ عظیم خطبہ نشر فرمایا۔
خطبہ حج (عرفہ)	9 ذی الحجہ بروز جمعہ بعد زوال آفتاب	
وقوف عرفہ	9 ذی الحجہ بروز جمعہ بعد نماز ظہر وعصر	یہاں حضور ﷺ نے گریہ و زاری سے مغرب تک دعا فرمائی۔
عرفہ سے روانگی	9 ذی الحجہ بروز جمعہ بعد غروب آفتاب	مازمین کے راستہ سے واپسی فرمائی
منزدلفہ سے مشعر حرام	9 ذی الحجہ بروز شنبہ نماز صبح کے بعد	یہاں حضور ﷺ نے گریہ و زاری کے ساتھ تسبیح‘ تکبیر اور تہلیل فرمائی۔
مشعر حرام سے منیٰ کو روانگی	10 ذی الحجہ قبل طلوع آفتاب	
رمی جمار	10 ذی الحجہ بعد طلوع آفتاب تا بہ ضحیٰ	اس دوران میں دھوپ میں تیزی آ گئی تھی۔

واقعہ	تاریخ	تفصیل
[..]یہ منیٰ (یوم النحر)	یوم 10 ذی الحجہ بوقت ضحیٰ	
[..]بانی		
[..]خطبہ		قربانی کے یک صد اونٹوں میں سے ۶۳ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کیے اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔ اس کے بعد حلق رأس کرایا۔
[..]ی سے مکہ کو روانگی	[1]0 ذی الحجہ بعد حلق رأس	مکہ میں پہنچ کر ظہر سے قبل طواف افاضہ فرمایا۔ شب منیٰ میں گزاری
[..]کہ سے منیٰ کو واپسی		آخری یوم
[..]وسرا خطبہ منیٰ	[..]م الرؤس (11 ذی الحجہ)	اس خطبہ کا ذکر ابوداؤد کی روایت میں ہے
منیٰ سے محصب یا ابطح کو روانگی	[1]3 ذی الحجہ بروز سہ شنبہ ابطح کو روانگی	رات کو مکہ جا کر طواف وداع ادا فرمایا
[..]کہ سے واپسی		13، 14 کی درمیانی شب
114۔ وفد نخع	وسط محرم 11ھ	یہ آخری وفد تھا جو حضور ﷺ کی زندگی میں آیا
115۔ جیش اسامہ کی ترسیل کا حکم	26 صفر 11ھ	یہ آخری فوجی مہم ہے جس کے لیے حضور ﷺ نے حکم دیا
116۔ حضور ﷺ کے مرض وفات کا آغاز	اواخر صفر 11ھ (اغلباً 29 کو)	مختلف روایات میں سے صحیح ترین یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضور ﷺ کی مدت علالت 13 روز تھی۔
117۔ اشتداد مرض کا زمانہ (حضرت عائشہؓ کے حجرے میں وفات تک کے سات دن اقامت)		
118۔ مسجد میں آخری نماز باجماعت و آخری خطاب	وفات سے 5 روز قبل بروز جمعرات نماز عصر	روایات میں متعدد خطابات کا ذکر ہے مگر اغلب یہ ہے کہ مختلف امور اسی خطبہ میں ارشاد فرمائے گئے۔
119۔ وصال	12 ربیع الاول 11ھ دوشنبہ بوقت چاشت	پیر کا دن متفق علیہ ہے مگر تاریخوں میں اختلاف ہے۔ یکم و دو بھی مروی ہیں اور ایک حساب سے 3۔ بھی نکلتی ہے۔ اصل اشکال یہ ہے کہ 9 ذی الحجہ کو جمعہ کا دن قطعاً ثابت ہے۔ اور اس لحاظ سے حساب لگائیں تو 2۔ ربیع الاول کو ماسوا اس نادر صورت کے دوشنبہ کسی طرح نہیں ہوسکتا کہ متواتر تین مہینے تیس تیس دنوں کے ہوں۔ لیکن ایک رائے یہ ہے کہ بطور شاذ ایسا بھی ہوسکتا ہے اور دوسری تاویل یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ میں موسمی وجوہ سے رویت ایک دن آگے پیچھے ہوسکتی ہے۔
120۔ تدفین	13 ربیع الاول بروز سہ شنبہ و 14 ربیع الاول چہارشنبہ کی درمیانی شب	حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں قبر مبارک بنی۔

مولانا نعیم صدیقی

ماخوذ: محسن انسانیت

اولیات وتقدمات

☆ پہلا حکم بعثت...... مورخہ 9 ربیع الاول 41 سال میلاد
☆ اولین نزول قرآن...... سورۂ علق مورخہ 18 رمضان ا سال بعثت کو نازل ہوئی۔
☆ راہ حق میں حضورؐ کا اولین حلقہ رفاقت......
1: خواتین میں سے حضرت خدیجہؓ طاہرہ کو مقام سبقت حاصل ہوا۔
2: پختہ شعور آزاد مردوں میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اولیت کا شرف پایا۔
3: نوخیز جوانوں میں سے حضرت علیؓ پیش پیش رہے۔
4: زیر نگین طبقے میں سے حضرت زیدؓ بن حارثہ (حضورؐ کے آزاد کردہ غلام) کو تقدم ملا۔
☆ حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلی خاتون جو اسلامی تحریک کے دائرہ میں داخل ہوئیں...... لبابہ بنت الحارث زوجہ حضرت عباسؓ
☆ دارارقم کے دورِ دعوت میں اولین بیعت اسلام کرنے والے صحابی...... عاقل بن بکیرؓ۔
☆ اولین مرکز تحریک...... دارارقم واقع بہ کوہ صفا۔
☆ سب سے پہلا خطاب عام...... کوہ صفا پر (3 سال بعثت)
☆ سب سے پہلی آیت جس پر کفار میں شدید برہمی پیدا ہوئی۔
"انکم وماتعبدون من دون الله حصب جهنم."
☆ حضورؐ کے بعد سب سے پہلے اسلام کا اظہار کرنے والے صحابی...... حضرت خبابؓ بن الارت تمیمی
☆ سب سے پہلا اسلامی گھرانا...... خانہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ
☆ سب سے پہلی خاتون جو مسلم والدین کے سائے میں بچپن ہی سے اسلام کی اٹھان اٹھیں...... حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا
☆ اسلام کی حمیت کے تحت پہلا اتفاقی قتل...... حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے ہاتھوں ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ شہر سے باہر مسلم جماعت مصروف نماز تھی اور کفار نے شرارت کی۔ حضرت سعدؓ نے ایک ہڈی اٹھا کر ان کی طرف پھینکی، وہ ایک کافر کو جا کر لگی اور وہ ختم ہو گیا۔
☆ سب سے پہلا جوڑا جو (بالفاظ حضورؐ حضرت لوط و ابراہیم علیہم السلام کے بعد) خدا کی راہ میں ہجرت کے لیے نکلا...... حضرت عثمانؓ وحضرت رقیہ رضی اللہ عنہما اسلام کی خاطر حبشہ روانہ ہوئے۔
☆ اسلامی تحریک کی تاریخ میں اولین جھنڈا لہرایا گیا...... بریدہ اسلمی کے ہاتھوں، سفر ہجرت میں۔
☆ کعبۃ اللہ میں سب سے پہلے کلمہ اسلام کو آواز بلند پکار کر مار کھانے والے صحابی...... حضرت ابوذرؓ غفاری

☆ وہ ہستی جس نے پہلی بار اپنے اسلام کا پرزور طریق سے اعلان کرایا...... حضرت عمرؓ
☆ وہ ہستی جس کے قبول اسلام سے پہلی بار کعبۃ اللہ میں ادائے نماز کا آغاز ہوا...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ
☆ وہ ہستی جس کے قبول اسلام پر کفار نے پہلی بار محسوس کیا کہ تحریک اسلامی زور پکڑ گئی ہے...... حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ
☆ سب سے پہلا مسلم انصاری سردار جس نے مکہ والوں کے ہاتھوں مار کھائی...... حضرت سعدؓ بن معاذ
☆ اولین جان جو مسجد الحرام میں راہ حق میں قربان ہو گئی...... حارث بن ابی ہالہ
☆ اولین خاتون جو انتہائی مظلومانہ انداز سے اسلام پر قربان ہوئی...... حضرت سمیہ (حضرت یاسرؓ کی اہلیہ اور حضرت عمارؓ کی والدہ)
☆ سب سے پہلا شخص جس نے بنو ہاشم کے مقابلے میں قریش کے معاہدہ مقاطعہ کو ختم کرانے کی تحریک کی...... ہشام بن عمرو بن ربیعہ
☆ اولین مرد مومن جس نے اپنی ایک آنکھ صداقت کے لیے قربان کر دی...... عثمانؓ بن مظعون (قریش کی مجلس میں انھوں نے لبید کے سامنے اس کے ایک مصرعہ سے اختلاف کیا۔ اس پر ان کی آنکھ پھوڑ دی گئی)۔
☆ سب سے پہلا مہاجر مدینہ...... حضرت ابوسلمہؓ
☆ اولین حادثہ ارتداد...... عبید بن جحش حبشہ میں ہجرت کر کے جانے کے بعد عیسائی ہو گیا۔
☆ اسلام کے لیے سب سے پہلا تیر چلانے والے...... حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے سریہ عبدالحارث میں بمقام ثنیہ المرہ دشمن پر تیر پھینکا، مگر دشمن بچ نکلا۔
☆ اسلام کی حمایت میں سب سے پہلے تلوار اٹھانے والے...... حضرت زبیرؓ بن العوام
☆ ہجرت حبشہ ثانیہ میں اولین مہاجر...... حضرت جعفرؓ بن ابی طالب
☆ مدینہ کا پہلا نوجوان جو حضورؐ کی دعوت سے متاثر ہوا...... سویدؓ بن صامت
☆ اولین انصاری صحابی جن کا مدینہ میں (ہجرت کے بعد) انتقال ہوا...... کلثوم بن الہدم جن کے مکان واقع قبا میں حضورؐ نے ہجرت کے بعد چند روز قیام فرمایا۔
☆ سب سے پہلے مہاجر جن کا مدینہ میں انتقال ہوا...... حضرت عثمانؓ بن مظعون
☆ حمیت اسلام کے تحت پہلا شخصی قتل (عورت)...... اسماء بنت مروان خطمیہ کو، جو نبی اکرمؐ کے خلاف بھڑکاتی تھی اور بدگوئی کرتی تھی۔ اس کے نومسلم بھائی حضرت عمیرؓ بن عدی الخطمی نے کسی موقع پر جوش میں آ کر اس کا خاتمہ کیا۔ (رمضان 2ھ)

حمیت اسلام کے تحت پہلا شخصی قتل۔ (مرد)...... ابوعفلہ یہودی حضورؐ اور مسلمانوں کے خلاف بدزبانی کر کے لوگوں کو اشتعال دلاتا تھا۔ عالمؓ بن عمیر انصاری نے غیرت میں آ کر اس کا خاتمہ کر دیا۔

مدینہ میں اولین معلم اسلام کی ماموریت...... حضرت مصعب بن عمیرؓ کو (ابن ام مکتومؓ کی معیت میں) حضورؐ نے وفد انصار کے ساتھ روانہ کیا۔ (14 سال بعثت)

بیعت عقبہ ثانیہ میں سب سے پہلے بیعت کرنے والے انصاری صحابی...... براءؓ بن معرور

مدینہ میں پہلا اجتماعی درس قرآن ...... مسجد بنی زریق میں دیا گیا (غالباً یہ باقاعدہ مسجد نہ تھی بلکہ عبادت کے لیے اک جگہ مقرر کر لی گئی تھی۔)

سب سے پہلے باقاعدہ مسجد کی تعمیر...... مسجد قبا جو مورخہ 8 تا 11 ربیع الاول 13 سال بعثت 1 بعثت میں تعمیر ہوا۔

اولین جمعہ جو حضور ﷺ کی امامت میں ہوا...... مورخہ 12 ربیع الاول 1ھ کو بنی سالم کی آبادی میں پہلا جمعہ پڑھا گیا جس میں یک صد علمبرداران اسلام شریک تھے۔

مدینہ کا قبیلہ جو پورے کا پورا بیکدم اسلام میں داخل ہوا...... بنی عبدالاشہل (صرف ایک آدمی اس سعادت سے بعد میں ہمکنار ہوا)

سب سے پہلا فوجی دستہ جو اسلامی ریاست کی طرف سے طلایہ گردی کے لیے نکلا...... حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی کمان میں پہلا دستہ ہجرت کے ساتویں ماہ کے اوائل میں بھیجا گیا اور سیف البحر تک گیا۔

☆ نظام دفاع کے تحت پہلا فوجی علم اٹھانے والے صحابی...... ابی مرثد الغنوی برائے سریہ سیف البحر (مذکورہ بالا)

☆ حضورؐ کی رکاب میں اولین شرف علمبرداری...... حضرت حمزہؓ (بہ غزوہ ودان)

☆ قریش کی طرف سے اسلامی ریاست پر پہلی بار دراز دستی...... کرز بن جابر فہری کا فوجی ڈاکہ (ربیع الاول 2ھ)

☆ پہلی سرحدی جھڑپ جس میں اسلامی فوجی دستے کے ہاتھوں ایک دشمن فرد ہلاک ہوا...... سریہ نخلہ وقوعہ ماہ رجب 2ھ (واقد بن عبداللہ تمیمی کے تیر سے)

☆ پہلا موقع جب کہ مال غنیمت اور قیدی مدینہ میں لائے گئے...... سریہ نخلہ (مذکورہ بالا)

☆ طریق اذان کا آغازہ...... 2ھ

☆ کعبۃ اللہ میں سب سے پہلی اذان...... فتح مکہ (8ھ) کے موقع پر بلالؓ نے کہی۔

☆ سب سے پہلا کذاب جس نے حضورؐ کے مقابلے پر جھوٹی نبوت کا علم بلند کیا...... مسیلمہ کذاب

☆ اولین تحریری امان نامہ جو حضورؐ کی طرف سے جاری ہوا...... سراقہ بن مالک جعشم کے لیے (سفر ہجرت میں)

☆ دنیا کا پہلا باقاعدہ تحریری وفاقی دستور...... 1ھ مدینہ میں حضورؐ کی قیادت میں مرتب و نافذ ہوا۔

☆ مدینہ سے باہر اسلامی ریاست کا پہلا حلیفانہ معاہدہ...... بنی ضمرہ کے سردار عمرو ضمری سے...... یا...... قبیلہ بنی ضمرہ بن بکر بن عبد مناف سے۔

☆ اولین صلیب جو قبول اسلام کے مقدس جرم میں دی گئی...... حضرت خبیبؓ بن عدی و زید بن دثنہ کو (بمقام تنعیم متصل بہ مکہ)

☆ مدینہ میں یہود کی پہلی باغیانہ و غدارانہ کارروائی...... بنو قینقاع نے ایک مسلم خاتون کو سر بازار برہنہ کر دیا اور بلوہ ہو گیا۔

☆ پہلا آزاد اسلامی کیمپ...... سیف البحر میں حضرت ابو بصیرؓ و ابو جندلؓ نے قائم کیا۔

☆ فتح مکہ کے موقع پر اولین شخص جو اسلام میں داخل ہوا...... ابوسفیانؓ بن حارث بن عبدالمطلب۔

☆ پہلا غزوہ جس میں مہاجرین کے ساتھ انصار بھی شامل تھے...... غزوہ بدر

☆ میدان بدر میں اسلامی لشکر کے تین اولین مبارز...... حضرت علیؓ حضرت حمزہؓ حضرت عبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب

☆ معرکہ بدر کا سب سے پہلا دشمن مقتول...... اسود بن عبدالاسد (مبارزت سے قبل)

☆ معرکہ بدر کا سب سے پہلا مسلم شہید...... مہجعؓ مولا عمرؓ بن الخطاب

☆ مدینہ میں فتح بدر کا مژدہ پہنچانے والا اولین قاصد...... زیدؓ بن حارثہ

☆ پہلی بار دوگانہ عید الفطر پڑھا گیا...... یکم شوال 2ھ

☆ اسلامی ریاست کا پہلا سفیر جسے راستہ میں شہید کیا گیا...... حارثؓ بن عمیر ازدی کو موتہ کے شامی حاکم شرجیل بن عمرو غسانی نے قتل کر دیا۔

☆ بہادری کا اولین خطاب جو حضورؐ کی طرف سے ارزانی ہوا...... حضرت خالدؓ کو "سیف اللہ" کا خطاب دیا گیا۔ (جنگ موتہ جمادی الاولیٰ 8ھ)

☆ سرکاری مکاتیب اور دستاویزوں پر مہر کے استعمال کی ابتدا...... یکم محرم 7ھ۔

☆ اسلامی نظام کے تحت پہلا سیاسی واقعہ تحکیم...... اسلامی ریاست اور بنو قریظہ کے درمیان (5ھ)

☆ اسلامی دور میں پہلے صحابی جو حکم بنائے گئے...... سعد بن معاذؓ۔

☆ حضورؐ کے لیے اولین شاہی ہدیہ...... شاہ نجاشی نے روانہ کیا۔

☆ مشرکین عرب میں سے اولین شخص جس کا ہدیہ حضورؐ نے قبول فرمایا...... ابوسفیان (بہ زمانہ صلح حدیبیہ)۔

☆ پہلا سابق غلام جسے سالار لشکر بنایا گیا...... زیدؓ بن حارثہ (سریہ موتہ)

☆ پہلا غزوہ جس میں بیت المال کا خمس نکالا...... غزوہ بنو قینقاع یا غزوہ بنو قریظہ

☆ لا الہ پکارنے والے دشمن کے قتل کا اولین حادثہ...... سریہ جہینہ (رمضان 7ھ) میں اسامہؓ بن زید کے ہاتھوں نہیک بن مرداس کی جان گئی۔

☆ پہلا موقع جب کہ جماعت کی بھاری اکثریت وقتی طور پر بے اطمینانی میں مبتلا

ہوئی۔۔۔۔۔صلح حدیبیہ۔

☆ حضورؐ کے ہاتھوں پہلا زخمی ومقتول۔۔۔۔۔حارث بن الصمہ (غزوہ احد)

☆ پہلا شہید جنتی جس نے کوئی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا۔۔۔۔۔اصیرمؓ (بنی عبدالاشہل) غزوہ احد کے روز ایمان لا کر سیدھے شریک جہاد ہوئے اور شہادت پائی۔

☆ پہلا شہید راہ حق جس نے موت سے قبل نماز ادا کرنے کی سنت کا آغاز کیا۔۔۔۔۔ حضرت خبیبؓ

☆ واقعہ بئر معونہ کے سب سے پہلے شہید۔۔۔۔۔حرامؓ بن ملحان (انسؓ کے ماموں)

☆ سب سے پہلی صلوٰۃ خوف پڑھی گئی۔۔۔۔۔غزوہ عسفان۔۔۔۔۔یا۔۔۔۔۔غزوہ ذات الرقاع

☆ پہلا نمازی جس نے تین تیر کھائے مگر نماز نہیں توڑی۔۔۔۔۔عبادؓ بن بشر (غزوہ ذات الرقاع)

☆ مدینہ میں ارتداد کا اولین حادثہ۔۔۔۔۔حارث بن سوید بن صامت اگرچہ معرکہ احد میں بہ حیثیت مسلم شریک ہوا مگر مجذر بن زیاد بلوی کو قتل کر کے مکہ بھاگ گیا۔ بعد میں مدینہ آیا اور گرفتار ہو کر قتل ہوا۔

☆ پہلا مسلمان جو غلطی سے میدان جنگ میں مسلمان کے ہاتھ مارا گیا۔۔۔۔۔ ہشام بن اصابہ (عبادہؓ بن صامت کے ہاتھوں)

☆ پہلی بار دشمن کا جاسوس گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔۔۔۔۔غزوہ بنی مصطلق میں۔

☆ پہلا نوجوان جس نے اپنے منافق باپ کو قتل کرنے کی پیشکش حضور کے سامنے کی۔۔۔۔۔طلحہ بن عبداللہ بن ابی

☆ حضرت عائشہؓ کو قصہ افک سے مطلع کرنے والا اولین ذریعہ۔۔۔۔۔ام مسطح بن اثاثہ۔

☆ حضرت عائشہؓ کی عصمت وعفت کی پہلی شہادت۔۔۔۔۔مردوں میں سے۔۔۔۔۔ اسامہ بن زیدؓ

☆ عورتوں میں سے۔۔۔۔۔بریرہؓ۔۔۔۔۔ازواج میں سے۔۔۔۔۔حضرت زینبؓ بنت جحش

☆ قذف کی اولین حد جاری کی گئی۔۔۔۔۔حسانؓ بن ثابت، مسطح بن اثاثہ، حمنہؓ بنت جحش پر۔

☆ معرکہ جس میں پہلی بار متعدد نمازیں پے در پے قضا ہوئیں۔۔۔۔۔غزوہ خندق۔

☆ دشمن کا زور توڑنے کے لیے پہلی بار کامیاب سفارتی تدبیر۔۔۔۔۔نعیمؓ بن مسعود کے ذریعے غزوہ خندق میں زیر عمل آئی۔

☆ پہلا تیرانداز جس نے تن تنہا ڈاکوؤں کی جماعت کو بے بس کر دیا۔ جدید اصطلاح میں پہلے اسلامی گوریلا سپاہی یا کمانڈو۔۔۔۔۔سلمہؓ بن الاکوع۔

☆ پہلا موقع جب کہ حضور ﷺ کی زبان بے ساختہ رجز صادر ہوا۔۔۔۔۔غزوہ حنین میں لشکر میں سراسیمگی پھیلی اور حضورؐ تنہا رہ گئے تو سفید خچر کی پشت پر سے آپ نے پکارا۔۔۔۔۔"انا النبی لاکذب . انا ابن عبدالمطلب"

☆ پہلی بار مستقل عاملین صدقہ کا تقرر۔۔۔۔۔محرم 9ھ میں۔

☆ پہلی بار اسلامی فوج نے قلعہ شکنی کے لیے منجنیق کا استعمال کیا۔۔۔۔۔غزوہ طائف میں۔

☆ قیدیوں کا اولین تبادلہ جو اسلامی حکومت اور اہل مکہ کے درمیان ہوا۔۔۔۔۔سریہ نخلہ کے دو مشرک قیدیوں عتاب بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کے بدلے میں سعدؓ بن ابی وقاص اور عتبہؓ بن غزوان کو رہائی دلوائی گئی۔

☆ پہلا غزوہ جس میں گھوڑوں کے سہام مجاہدین کو دیئے گئے۔۔۔۔۔غزوہ بنی قریظہ۔

☆ پہلی بار جزیہ لینے کا حکم نازل ہوا۔۔۔۔۔غزوہ تبوک سے کچھ قبل۔

☆ جزیہ کا اولین معاملہ طے پایا۔۔۔۔۔حاکم دومۃ الجندل سے (بہ سفر غزوہ تبوک)

☆ جزیہ کی پہلی بڑی مقدار طے پائی۔۔۔۔۔نجران کے عیسائیوں نے اسلامی حکومت کو دو ہزار حلہ سالانہ اور بوقت ضرورت جنگی سامان عاریتاً دینے کا معاملہ طے کیا۔

☆ اولین اور واحد ہستی جسے صلح حدیبیہ کے معاملہ میں پورا اطمینان حاصل رہا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

☆ اولین ہستی جس نے صلح حدیبیہ کے بعد نحر وحلق میں جماعت کے تامل کے وقت حضورؐ کی ہمت بندھائی۔۔۔۔۔ام المومنین حضرت ام سلمہؓ

☆ اولین موقع جب کہ بارگاہ رسالت سے شاعر نے انعام حاصل کیا۔۔۔۔۔فتح مکہ کے بعد کعب بن زہیر نے حاضر ہو کر عفو طلبی کے لیے قصیدہ بانت سعاد پڑھا تو حضورؐ نے اپنی رداء عطیہ کے طور پر دی۔

☆ اولین موقع جب کہ حضورؐ نے قنوت نازلہ پڑھی۔۔۔۔۔رجیع اور بئر معونہ کے حادثوں کے بعد جن میں تعلیمی وفود کے بیش قیمت افراد کو دشمن نے شہادت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ (4ھ)

☆ پہلا موقع جب کہ مسلم خواتین میدان جنگ میں پہنچیں۔۔۔۔۔غزوہ احد 3ھ

☆ پہلا حکمران جو حلقہ بگوش اسلام ہوا۔۔۔۔۔اصم بن ابجر شاہ حبش۔

☆ پہلا شخص جو حضور کی نگاہ میں سنی ہوئی تعریفوں سے بھی بلند تر نکلا۔۔۔۔۔قبیلہ طے کا سردار زید الخیر (سابق نام زید الخیل)

☆ پہلا غیر عرب نو مسلم افسر جو اسلام لانے کی وجہ سے صلیب پر لٹکایا گیا۔۔۔۔۔فروہ بن عمر والجذامی، گورنر حکومت روم برائے شمالی عرب مامور بہ مقام معان۔

☆ معرکہ اُحد کے مبارزت میں مسلمانوں کے اولین فاتح۔۔۔۔۔حضرت سعدؓ بن ابی وقاص

☆ معرکہ اُحد میں مبارزت کا چیلنج قبول کرنے والا پہلا مجاہد۔۔۔۔۔حضرت علی رضی اللہ عنہ

☆ اُحد کا پہلا دشمن مقتول۔۔۔۔۔طلحہ بن ابی طلحہ۔

☆ پہلا اظہار فخر جو حضور کی نگاہ میں مقبول ٹھہرا۔۔۔۔۔احد میں ابو دجانہ کا حضور کی تلوار لے کر اکڑ کر چلنا۔

☆ اسلام میں پہلا حج۔۔۔۔۔9ھ بامارت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ۔

☆ پہلی غیر ملکی جنگ۔۔۔۔۔جنگ موتہ۔ جمادی الاخری 8ھ۔

☆ ثقیف میں سے اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اولین شخص مدینہ آیا۔ عروہؓ بن مسعود ثقفی۔

مولانا نعیم صدیقی (ماخوذ: محسن انسانیت)

حیاتِ طیبہ کا عددی نشو ونما

☆ حضور ﷺ کی اسلامی تنظیم کا اولین حلقہ رفاقت۔
(1) حضرت خدیجہؓ (2) حضرت ابوبکرؓ (3) حضرت علیؓ (4) حضرت زیدؓ بن حارثہ۔

☆ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مساعی دعوت سے مرحلہ اول میں قبول کرنے والے پانچ رفقاء۔
(1) حضرت زبیرؓ بن العوام (2) حضرت عثمانؓ بن عفان (3) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف (4) حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ (5) حضرت سعدؓ بن ابی وقاص۔

☆ دعوت کے ابتدائی سہ سالہ دور میں حلقہ اسلامی میں داخل ہونے والے 46 سابقون الاولون۔

1: خباب بن الارت تمیمی
2: سعیدؓ بن زید (دارارقم کے دور سے پہلے مسلمان ہوئے۔)
3: فاطمہؓ بنت الخطاب
4: لبابہ بنت الحارث زوجہ حضرت عباسؓ (حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والی خاتون)
5: عبداللہؓ بن مسعود (قبول اسلام میں بعض روایات کے بموجب چھٹا نمبر تھا)
6: عثمانؓ بن مظعون (قبول اسلام میں چودھواں نمبر تھا)
7: ارقمؓ بن ابی الارقم (قبول اسلام میں گیارھواں نمبر یا بارھواں نمبر مگر حاکم کی روایت کے لحاظ سے ساتواں نمبر) مخزومی (درحقیقت یہ صحابی عثمانؓ بن مظعون، عبیدہ بن الجون، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور ابوسلمہؓ کے ساتھ اکٹھے ہی دارارقم میں اسلام لائے تھے۔ (بروایت ابن حجر)
8: ابوسلمہؓ بن عبدالاسد مخزومی
9: ابوعبیدہؓ بن عامر بن الجراح (حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہوئے)
10: قدامہؓ بن مظعون
11: عبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب
12: جعفرؓ بن ابی طالب
13: اسماءؓ بنت عمیس
14: عبداللہؓ بن جحش
15: ابواحمدؓ بن جحش
16: سائبؓ بن عثمانؓ بن مظعون
17: مطلبؓ بن ازہر
18: رملہ بنت ابی عوف اہلیہ مطلب بن ازہر
19: حضرت عمیرؓ بن ابی وقاص (سعد بن ابی وقاص کے بھائی)
20: اسماءؓ بنت ابی بکر
21: عائشہؓ بنت ابی بکر
22: حضرت عیاشؓ بن ابی ربیعہ (ابوجہل کے بھائی)
23: اسماءؓ اہلیہ عیاش
24: سلیطؓ بن عمرو (حضرت ابوبکرؓ کی روایت کے بموجب دارارقم کے دور سے پہلے اسلام لائے)
25: مسعودؓ بن ربیعہ (بروایت ابن اسحاق دارارق کے دور سے قبل مسلمان ہوئے)
26: خنیسؓ بن حذافہ
27: عامرؓ بن ربیعہ
28: حاطبؓ بن الحرث جمحی
29: فاطمہؓ بنت محلل اہلیہ حاطب
30: خطابؓ بن الحارث
31: فکیہہؓ اہلیہ خطاب
32: معمرؓ بن حارث (حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہوئے اور یہی ان کی ہمشیرہ کو قرآن پڑھاتے تھے۔ واقدی کی روایت کے بموجب دس آدمیوں کے بعد اور بروایت ابن خزیمہ 38 افراد کے بعد ایمان سے بہرہ ور ہوئے)
33: نعیمؓ بن عبداللہ اخو بنی عدی (چوتھے یا پانچویں نمبر پر اسلام لائے مگر باپ کے ڈر سے ایمان کو مخفی رکھا)
34: خالدؓ بن سعید ابن العاص (بروایت امام زہری اسلام لانے میں ۴۴ واں نمبر)
35: امینہؓ (یا ہمینہ) بنت خلف اہلیہ خالدؓ بن سعید
36: حاطبؓ بن عمرو
37: ابوحذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ (گیارھواں نمبر) (بروایت امام زہری اسلام لانے میں ۴۴ واں نمبر)
38: واقدؓ بن عبداللہ حلیف بنی عدی
39: خالدؓ بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے)

40: عامرؓ بن مالک (دار ارقم میں سب سے پہلی بیعت انھوں نے کی۔)
41: عاقلؓ بن بکیر (35 واں یا 36 واں نمبر)
42: خالدؓ بن بکیر
43: عامرؓ بن بکیر
44: عمارؓ بن یاسر (انھوں نے اپنے والد یاسر کے ساتھ ہی بیعت کی)
45: سمیہؓ والدہ عمارؓ
46: صہیبؓ بن سفان رومی مولی بن جذعان۔

☆ ہجرت حبشہ اولیٰ کے لیے مکہ سے جانے والوں کی تعداد

12 مرد اور 4 خواتین' جملہ 16 نفوس۔

☆ ہجرت حبشہ ثانیہ کے وقت کل تعداد مہاجرین۔

83 نفوس۔

اس وقت مکہ میں رہ جانے والوں کی تعداد کم سے کم مہاجرین حبش کے برابر ضرور ہوگی اس لیے مجموعی تعداد سو ہوگی۔

☆ مدینہ میں دعوت حق کے اولین علمبرداروں کا حلقہ۔

یہ کل 8 افراد تھے جنھوں نے پہلے پہلے حضورؐ سے بیعت کی۔ (1) براءؓ بن معرور (2) کعبؓ بن مالک (3) ابوالہیثمؓ مالک بن تیہان (4) اسعدؓ بن زرارہ (5) رافعؓ بن مالک بن عجلان۔ (6) قطبہؓ بن عامر بن حدیدہ (7) عقبہؓ بن عامر بن زید (8) جابرؓ بن عبداللہ۔

عام روایت کے بموجب عقبہ کے مقام پر اولین بیعت اسلام 6 افراد نے کی تھی۔ واقدی کی روایت ہے کہ اسعدؓ بن زرارہ اور ذکوانؓ بن عبدالقیس عقبہ اولیٰ سے قبل اسلام لا چکے تھے۔

☆ دوسری بیعت عقبہ کے شرکاء۔

کل 12 افراد اس مبارک موقع پر فیض یاب ہوئے۔ بجز جابر بن عبداللہ کے مذکورہ بالا انصاری بھی دوبارہ آئے اور اپنے ساتھ مزید پانچ افراد کو لائے۔ نئے آنے والے یہ تھے۔ (1) معاذ بن حارث (2) عوف بن حارث (3) ذکوان بن عبدالقیس (4) یزید بن ثعلبہ (5) عویمر بن مالک۔

☆ تیسری بیعت عقبہ کے شرکاء۔

اس موقع پر 73 مرد و زن حضور کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامی تحریک کا علمبردار بنے۔

☆ مکہ کے آخری دور (بہ زمانہ بیعت عقبہ ثالثہ) میں علمبرداران حق کی کل تعداد (تقریباً) مہاجرین حبشہ 83 اور بیعت عقبہ کے انصاری شرفاء 73 کے علاوہ مسلمانوں کی کچھ تعداد مکہ میں موجود تھی۔ اسی طرح مدینہ میں چند ایسے مسلمان بھی ہو سکتے ہیں جو 13 سال بعثت کے حج میں شریک نہ ہو سکے ہوں۔ اس طرح اندازاً کل تعداد ڈھائی سو قرار پا سکتی ہے۔ اس میں اگر نجران اور قبیلہ غفار (آدھا قبیلہ جلد ہی اسلام میں داخل ہوا) اور یمن کے نو مسلمانوں کی تعداد بھی شامل کر لی جائے تو سرزمین عرب میں اسلامی انقلاب کے داعی کسی طرح تین صد سے کم نہ ہوں گے۔

☆ ہجرت کے فوراً بعد مدینہ کی جماعت اسلامی کی تعداد (اندازاً)

یہ ثابت ہے کہ بنو سالم کی آبادی میں اولین جمعہ پڑھا گیا تو یک صد مسلمان اس میں شریک ہوئے تھے۔ شریک نہ ہو سکنے والوں (خصوصاً عورتوں اور مریضوں) کی تعداد کا تصور بھی رکھیں تو کم سے کم تین صد مسلمان مدینہ کی آبادیوں میں موجود ہونے چاہئیں۔

یہ بھی ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے مہاجرین و انصار کی مواخات بالکل ابتدائی دور میں قائم کی اور اس کے لیے پہلا اجتماع جو طلب کیا گیا اس میں 90 افراد شریک تھے۔ جن میں دونوں فریق تقریباً نصف نصف شریک تھے۔ اس اجتماع میں انصار میں سے اغلباً صاحب حیثیت رفقاء کو لیا گیا تھا جو اپنے معاشی حالات میں ایک ایک مہاجر کے لیے گنجائش نکال سکتے ہوں۔ علاوہ ازیں اس میں خواتین شریک نہ تھیں۔ اس اجتماع سے بھی اوپر ہی کے اندازے کی تصدیق ہوتی ہے۔

☆ غزوۂ بدر کے وقت مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد کا کل اندازہ۔

یہ معلوم ہے کہ انصار میں اسلام نہایت تیزی سے پھیلا اور کوئی خاص مزاحمت اوس و خزرج کے قبائل میں موجود نہ تھی' نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ہجرت سے غزوہ بدر تک کے درمیانے عرصے میں اکا دکا مہاجرین برابر آتے رہے اور ان کی تعداد بھی کچھ نہ کچھ رہی۔ یہاں تک کہ غزوہ بواط (یا بواۃ) میں دو صد مہاجرین حضور ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ اسی طرح غزوہ ذوالعشیرہ میں بھی روایات کی رو سے تعداد ڈیڑھ اور دو صد کے درمیان تھی۔ ان ابتدائی مہمات میں حضورؐ صرف مہاجرین ہی کو لے کے نکلا کرتے تھے۔ کیوں کہ بیعت عقبہ کے ماتحت انصار صرف مدینہ میں بچاؤ کرنے کے مکلف تھے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر مہاجرین میں سے دو صد مجاہد نکلتے تھے تو جملہ تعداد کچھ زائد ہوگی۔ کم از کم ڈھائی سو کا اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ انصار کی تعداد مقابلتاً دگنی ہونی چاہیے۔ یعنی جملہ تعداد 7'8 صد ہوگی۔ [1]

[1] مورخین کی روایات مدینہ میں تین مردم شماریوں کا پتا دیتی ہیں جو حضور ﷺ نے وقتاً فوقتاً کرائی تھیں۔ پہلی مرتبہ تعداد 5 سو تھی۔ دوسری مرتبہ 7'8 سو اور تیسری مرتبہ ہزار یا قدرے زائد۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اولین مردم شماری یا تو مہاجرین کی نو آبادکاری کے وقت کی گئی ہوگی یا دفاعی تنظیم کا آغاز کرنے کے وقت۔ اس کے بعد مردم شماری یا تو مہاجرین کی نو آبادکاری کے وقت کی گئی ہوگی یا دفاعی تنظیم کا آغاز کرنے کے وقت۔ اس کے بعد کوئی بڑا عملی اقدام کرنے سے پہلے (جس کا وقت قریش کے شامی قافلہ سے تعرض کرنے کا ہی ہو سکتا ہے) پھر قوت کا جائزہ لیا گیا ہوگا تیسرا جائزہ غالباً ایک سال بعد (جب کہ ابوسفیان کی طرف سے انتقامی حملے کے چیلنج کا وقت قریب ہوگا) لیا گیا ہوگا۔ واللہ اعلم۔

غزوہ بدر کے شرکاء کی تعداد بعض اصحاب کے لیے مغالطہ کا موجب ہو سکتی ہے۔
ہماری تحقیق کے بموجب حضورؐ جب مدینہ سے چلے تو کوئی باقاعدہ جنگی معرکہ پیش نظر نہ تھا۔ بلکہ اصل مدعا قافلہ کی مزاحمت تھا۔ نیز جلدی میں اقدام کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سواریوں کی تعداد کے علاوہ اسلحہ کی مقدار انتہائی کم تھی۔ حالانکہ مدینہ کی مسلم آبادی اس سے کئی گنا زیادہ سواریوں اور اسلحہ کا انتظام بآسانی کر سکتی تھی۔ پس فوجی دستہ بھی ممکن الحصول تعداد سپاہ سے بہت کم تھا۔ یہ حقیقت اسی بات سے ظاہر ہے کہ اس میں کل 86 مہاجر شریک تھے۔ حالانکہ طلایہ گردی کی سابق مہمات میں ان کی تعداد 200 تک سامنے آتی ہے۔ پس یوں تو کسی آبادی کے مردوں کا حربی تناسب 1:4 اور 1:5 ہونا چاہیے۔ مگر دو اہم امتیازی حقیقتیں مہاجرین اور مدینہ کے معاملے کو مختلف بنا دیتی ہیں۔ اولاً یہ کہ عرب میں یوں بھی قبائل کے مردوں میں سے ہر کوئی سپاہی ہوتا تھا اور استثنیٰ بہت کم نفوس کو حاصل ہوتا تھا۔ پھر مہاجرین تو ایک ایمانی و انقلابی روح سے مالا مال تھے جس کی خاطر وہ اپنے آپ کو زندگی و موت کی فیصلہ کن کشمکش سے دوچار پاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں مستثنیٰ افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوگی۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ جملہ مہاجرین کے پورے اہل و عیال ساتھ نہ تھے، خواتین کا تناسب بھی کم تھا اور بڑے بوڑھے بھی زیادہ تر مکہ میں رہ گئے تھے۔ ان وجوہ سے ہم نے اوپر کا اندازہ قائم کیا ہے۔

ہمارے اندازے کے مطابق غزوہ بدر کے متصل زمانے میں مدینہ مسلم آبادی کی تعداد 7، 8 سو کے لگ بھگ تھی۔ جس میں سے 4، 5 سو مردان جنگی نکالے جا سکتے تھے۔ لیکن معرکہ بدر میں پوری جنگی تعداد اس لیے شریک نہ ہو سکی تھی کہ نفیر عام نہ تھی۔ بلکہ فوری طور پر ایک دستہ نسبتاً محدود مقصد کے لیے حضور ﷺ کے ساتھ روانہ ہوا۔

ہمارے اس تخمینے کا ثبوت غزوہ بنوقینقاع سے بھی ملتا ہے۔ غزوہ بدر کے فوراً بعد (شوال 2ھ) اس گستاخ اور بغاوت پسند یہودی قبیلہ کا محاصرہ کیا گیا اور عاجز ہو کر انھوں نے حدود مدینہ سے نکل جانا قبول کیا۔ روایات سے ظاہر ہے کہ اس قبیلہ کی جنگی قوت 600 جوانوں پر مشتمل تھی۔ انھیں پندرہ روز محاصرے میں رکھ کر پوری طرح زچ کر دینے کے لیے اسلامی فوج ایک مناسب تعداد پر مشتمل ہونی چاہیے۔ کم سے کم اندازہ ۴، ۵ سو مردان جنگی کا لگایا جا سکتا ہے۔

☆ معرکہ بدر کے دور میں کرہ ارضی پر مسلمانوں کی مجموعی تعداد (تخمیناً)

مدینہ کے سات آٹھ سو نفوس کے ساتھ اگر ہم حبشہ میں مقیم مہاجرین حبشہ کے تھوڑے سے نومسلموں، نجران، یمن، قبیلہ غفار، بحرین اور دوسرے قبائل میں پائے جانے والے متفرق مسلمانوں کی تعداد سامنے رکھیں تو اغلباً جملہ عددی قوت ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد ہوگی۔

☆ مختلف معرکوں اور مہمات میں علمبرداران اسلام کی عددی قوت۔ ❶

غزوۂ احد 650 تا 700 (باختلاف روایات) ❷
غزوۂ بدر الاخریٰ (تصادم کے بغیر) 1501
غزوہ دومتہ الجندل (تصادم کے بغیر) 1000
غزوہ احزاب 3000
سفر حدیبیہ 1400
غزوہ خیبر 1420 (20 خواتین شریک تھیں)
سریہ موتہ (3000)
غزوہ فتح مکہ 10000
غزوہ حنین ومحاصرہ طائف (12000)
غزوہ تبوک (30000)
شرکائے حجتہ الوداع 124000 یا 114400

تحریک اسلامی کے عددی نشوونما کا جائزہ لیتے ہوئے اس اہم پہلو پر لازماً توجہ جاتی ہے کہ حضور ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں خواتین شروع سے حصہ دار رہی ہیں اور انھوں نے تاریخ کا رخ موڑنے کے لیے ہر مرحلے میں اپنا فرض سرانجام دیا ہے۔ مکہ کے سنگین ابتلا میں وہ شریک تھیں، ہجرتوں میں مردوں کے ہم سفر ہیں، معرکہ ہائے جہاد میں انھوں نے اپنا سا حصہ ادا کیا۔ بلکہ خواتین کے لیے یہ بات بہت بڑا سرمایہ فخر ہے کہ حضور ﷺ پر سب سے پہلے ایمان لانے، حضور ﷺ کی ڈھارس بندھانے اور حضور ﷺ کو پورا تعاون پیش کرنے والی ہستی بھی ایک خاتون ہی کی تھی، یعنی حضرت خدیجہؓ حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ جس ہمہ گیر اساسی تبدیلی کو رونما کرنے اٹھے تھے وہ بغیر خواتین کے تعاون کے پوری شان سے بہ مشکل ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ گھروں کا محاذ اگر کسی جدوجہد سے بے تعلق ہو تو کام کی رفتار بے حد گر جاتی ہے۔ حضور ﷺ کی تحریک اسلامی نے مردوں کی طرح عورتوں سے جذبات، اموال، محنتوں اور قربانیوں کا بھرپور خراج وصول کیا۔ ابتدائی 3 سال کے سابقون الاولون (کل تعداد 56) میں سے 12 خواتین تھیں۔ ہجرت حبشہ اولیٰ وثانیہ میں علی الترتیب ان کی تعداد 5، 17 تھی۔ بیعت عقبہ ثالثہ کی مجلس میں 2 انصاری خواتین شامل تھیں۔ حضور ﷺ سے قبل مدینہ کو ہجرت کرنے والے مہاجرین میں کم از کم 10 خواتین کا شامل ہونا ثابت ہے۔

مولانا نعیم صدیقی
ماخوذ: محسن انسانیت

---

❶ اسلامی تحریک کی عددی قوت کا اندازہ بعد کے ادوار میں مہمات اور معرکوں کے شرکاء کی تعداد ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔
❷ عبداللہ بن ابی کے تین سو نفاق زدہ ساتھیوں کے الگ ہو جانے کے بعد۔

مزید ضروری معلومات

وہ صحابہ کرامؓ جنھوں نے مدینہ میں آپ ﷺ کی نیابت کی:

1	حضرت سعد بن عبادہ الخزرجیؓ	غزوہ ابواء کے موقع پر
2	حضرت سعد بن معاذ الاوسیؓ	غزوہ ابواء کے موقع پر
3	حضرت ابوسلمہ بن عبدؓالاسد	غزوہ عشیرہ کے موقع پر
4	حضرت زید بن حارثؓ	غزوہ سفوان کے موقع پر
5	حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذرؓ	غزوہ بدر کے موقع پر
6	حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوہ بنوسلیم کے موقع پر
7	حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذرؓ	غزوہ بنوقینقاع کے موقع پر
8	حضرت ابولبابہ بشیر بن عبدالمنذرؓ	غزوہ سویق کے موقع پر
9	حضرت عثمان بن عفانؓ	غزوہ بنوغطفان کے موقع پر
10	حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوہ بحران کے موقع پر
11	حضرت ابن ام مکتومؓ	غزوہ احد کے موقع پر
12	حضرت عثمان بن عفانؓ	غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر
13	حضرت عبداللہ بن عبداللہؓ	غزوہ بدر الصغریٰ کے موقع پر
14	حضرت سباح بن عرفطہ الغفاریؓ	غزوہ دومۃ الجندل کے موقع پر
15	حضرت ابوذر غفاریؓ	غزوہ بنومصطلق کے موقع پر
16	حضرت نمیلہ بن عبداللہؓ	غزوہ خیبر کے موقع پر
17	حضرت ابورہم کلثوم بن حصین غفاریؓ	فتح مکہ کے موقع پر
18	حضرت محمد بن مسلمہ انصاریؓ	غزوہ تبوک کے موقع پر

عمالِ نبوی ﷺ (گورنر)

حضرت باذان بن ساسانؓ	والی یمن
حضرت شہر باذانؓ	والی صنعاء
حضرت علاء بن الحضرمیؓ	والی بحرین
حضرت علی بن ابوطالبؓ	والی اخماس یمن
حضرت خالد بن سعیدؓ	والی صنعاء
حضرت عمرو بن العاصؓ	والی عمان
حضرت مہاجر بن ابی اُمیہ مخزومیؓ	والی کندہ
حضرت ابوسفیان بن حربؓ	والی نجران
حضرت زید بن ابوسفیانؓ	والی تیماء
حضرت عتاب بن اُسیدؓ	والی مکہ
حضرت معاذ بن جبلؓ	والی جند
حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ	والی مآرب
حضرت زیاد بن لبیدؓ	والی حضرموت

مقرر کردہ محصلین

وہ صحابہ کرامؓ جنہیں آنحضرت ﷺ نے مختلف قبائل اور علاقوں کا انتظام سونپ دیا تھا، جو جزیہ صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ وصول کرتے۔

1	حضرت صفوان بن صفوانؓ	بنوعمرو پر
2	حضرت عدی بن حاتمؓ	بنوطے و بنواسد پر
3	حضرت عمر فاروقؓ	مدینہ منورہ پر
4	حضرت ابوجہم بن حذیفہؓ	بنولیث پر
5	حضرت بریدہ بن حصیب السلمیؓ	بنوغفار و اسلم پر
6	حضرت عباد بن بشیرؓ	بنوسلیم و عزینہ پر
7	حضرت ضحاک بن سفیانؓ	بنوکلاب پر
8	حضرت رافعؓ	بنوجہینہ پر
9	حضرت قیس بن عاصم	بنوسعد پر
10	عمرو بن العاصؓ	بنوخزارہ پر
11	حضرت بشیر بن سفیان	بنوکعب پر
12	حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ	نجران پر
13	عبداللہ بن رواحہؓ	خیبر پر
14	زیاد بن عبیدؓ	حضرموت پر
15	حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ	یمن پر
16	عمرو بن سعید بن العاصؓ	تیماء پر
17	ابان بن سعیدؓ	بحرین
18	حضرت عبداللہ بن لیثؓ	بنودیان

بیعت عقبہ اولیٰ کے چھ افراد

عقبہ کے مقام پر یثرب کے ان چھ افراد نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی

سلام لائے۔

1۔ابوامامہ اسعد بن زرارہؓ۔ 2۔عوف بن حارثؓ۔ 3۔رافع بن مالکؓ۔ ۴۔قطبہ بن عامر حدیدہؓ۔۵۔عقبہ بن عامر بن نابیؓ۔6۔جابر بن عبداللہؓ۔

رسول اکرم ﷺ کے مدنی نقیب

ہجرت سے پہلے مدینے کے جن بارہ اصحاب کو حضور ﷺ نے نقیب بنایا تھا،ان میں نوخزرج کے تھے اور تین اوس کے اور یہ سب قبائل مدینہ کے روسا تھے۔

1۔اسید بن حضیرؓ۔ابوالہیثم بن التیہانؓ۔ 3۔سعد بن نشیمہؓ۔ 4۔سعد بن زرارہؓ۔5۔سعد بن الربیع۔6۔عبداللہ بن رواحہؓ 7۔سعد بن عبادہؓ۔ 8۔منذر بن عمروؓ۔9۔براء بن معرورؓ۔10۔عبداللہ بن عمروؓ۔11۔عبادہ بن الصامتؓ۔12۔رافع بن مالکؓ۔

حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام

زید بن حارث،ابورافع اسلم،ثوبان،ابوکبشہ،شقران،رباح،یسا،مدغم،ذکوان، افلح،ابومویہبہ،آنسہ ضمیرہ بن ابی ضمیرہ،عبیداللہ بن اسلم،عبید بن عبدالغفار،فضالہ الیمانی،ابوعسیب احمر۔اُسامہ بن زید،افلح،ایمن بن اُم ایمن،زید بن بولا،سابق، سالم،سلمان فارسی مہران ابوعبدالرحمٰن نافع۔ وافذ،ابواشیلہ،ابوالحمراء۔ابوالسح، ابوعبید،حنین،بدر،حاتم،باذام،دوس،رُوبفع،سعد،سعید،غیلان،کریب،محمد،نابیہ، کحول،نہیک،نفیع وردان،ابوصفیہ،ابوقیلہ،ابوالقیط،وغیرہ وغیرہ کل 66۔

(ابن الجوزی۔تلقیح 18)

سرورِکونین کے قاصد

1	حضرت عثمان بن عفانؓ الاموی	قریش مکہ کی جانب
2	حضرت عمرو بن اُمیہ الضمریؓ	نجاشی شاہ حبش کے پاس
3	حضرت وحیہ بن خلیفہؓ	ہرقل قیصر روم
4	حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ	خسرو پرویز شاہ ایران
5	حضرت حاطب بن ابی بلتعہ اللخمیؓ	مقوقش شاہ مصر
6	حضرت شجاع بن وہب الاسدیؓ	حارث ابی شمر شاہ غسان
7	حضرت سلیط بن عمروؓ	ہوزہ بن علی اور ثمامہ بن اثال کی جانب
8	حضرت عمرو بن العاصؓ السہمی	جیفر بن الجلندری اور عبد ابن الجلندریؓ الازوری رئیسان عمان
9	حضرت علا بن الحضرمیؓ	منذر بن ساوی حاکم بحرین
10	حضرت مہاجرین ابی امیہ مخزومیؓ	حارث بن کلال الحمیری
11	حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ	یمن
12	حضرت معاذ بن جبلؓ	یمن
13	حضرت جریر بن عبداللہ البجلیؓ	ذوالکلاع الحمیری
14	حضرت عیاش بن ربیعہ المخزومیؓ	حارث، مسروح اور نعیم بن عبدالکلال کی طرف
15	حضرت حارث بن عمیرؓ	بصریٰ کے حاکم

عہدِ نبوی کی مساجد

آنحضرت ﷺ نے مساجد کی تعمیر پر بھی زور دیا تھا اور اس امر کی تاکید فرمائی کہ جو معلم ہو، وہ اپنے مقام پر عبادت کے لیے ایک مسجد فوراً تیار کرے۔ آپ ﷺ کے مبارک عہد میں بڑی بڑی آبادیوں میں کئی مساجد تھیں صرف مدینہ منورہ میں مسجد نبوی ﷺ کے علاوہ 9 مساجد تیار ہو چکی تھیں۔جن میں علیحدہ علیحدہ پانچوں وقت نماز ہوتی تھی۔ مسجد بنو عمروؓ، مسجد بنو ساعدہ، مسجد بنوعبیدہ، مسجد بنو زریق، مسجد بنوسلمہ، مسجد بنوغفار، مسجد بنواسلم، مسجد بنوجہینہ، مسجد بنو بیاضہ۔

آنحضرت ﷺ کے موذنین

آنحضرت ﷺ کے چار موذن تھے دو مدینہ طیبہ میں، بلال بن رباحؓ اور عمرو بن ام مکتوم قرشی العامریؓ نابینا۔ایک قبا میں سعد القراظؓ اور ابومحذورہ اوس بن مغیرہ بن مجحیؓ مکہ میں۔

آپ ﷺ کی سواری کے جانور

گھوڑے: آپ ﷺ کے سات گھوڑے تھے اور کسی صفت خاص کی وجہ سے ان کے مختلف نام تھے، سکب لُحیف،شجا،ظرب،لزاز،مرتجز اور الورد

خچر: پانچ خچر تھے، ایک دلدل نامی جو مقوقش شاہ مصر نے، دوسرا نضہ نامی فروۃ الجذامی نے تیسرا صاحب ایلہ نے، چوتھا دومتہ الجندل کے حکمران نے اور پانچواں نجاشی شاہ حبش نے آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔

گدھے: تین تھے، ایک یعفور جو مقوقس شاہ مصر نے بھیجا تھا، دوسرا فروۃ الجذامی نے اور تیسرا حضرت سعد بن عبادہ الخزرجیؓ نے ہدیتہً پیش کیا تھا۔

اونٹ: ان کی تعداد تین بتائی جاتی ہے جن میں سے ایک کا نام القصویٰ تھا۔جس پر آپ نے ہجرت فرمائی تھی۔

بکریاں: آپ ﷺ کی ملک میں ایک سو بکریاں تھیں سو سے زیادہ ہوتیں تو انھیں ذبح کر دیتے اور پوری ایک سو رکھتے۔

حضور ﷺ کے کاتبانِ وحی

ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابت انصاریؓ، معاویہؓ، حنظلہ بن الربیع الاسیدیؓ، ابان بن سعیدؓ خالد بن سعید بن العاصؓ۔ علاء بن حضرمی، رضوان اللہ علیہم اجمعین۔(تلقیح 37)

وہ لوگ جن کی شکل وصورت حضور ﷺ سے ملتی تھی

1۔جعفر بن ابی طالبؓ 2۔حسین بن علیؓ

3۔قثم بن عباسؓ 4۔ابوسفیان بن حارثؓ
5۔سائب بن عبیدؓ 6۔مسلم بن مُعثؓ
7۔کابس بن ربیعہ بن مالک السامیؓ (تلقیح 38)

حضور ﷺ کے خُدام

1	انسؓ	آپ کے گھر میں کام کرتا
2	ربیعہ بن کعبؓ	وضو کراتا
3	ابن مسعودؓ	جوتے پہناتا
4	عقبہ بن عمروؓ	خچر کی دیکھ بھال کرتا

5۔بلالؓ 6۔سعد 7۔عامر 8۔بکیرؓ 9۔اُسود بن مالکؓ 10۔ایمنؓ
11۔ثعلبہؓ 12۔سالمؓ 13۔سابقؓ 14۔ہلال بن حارثؓ اور 25 دیگر مختلف کرتے تھے۔

عہدِ رسول ﷺ کے مفتی

خلفائے اربعہ۔عبدالرحمٰن بن عوفؓ، اُبی بن کعبؓ۔عبداللہ بن مسعودؓ۔معاذ بن جبلؓ۔عمار بن یاسرؓ۔حذیفہؓ۔زید بن ثابتؓ۔ابوالدرداءؓ۔سلمانؓ۔ابوموسیٰ اشعریؓ۔

حضور ﷺ کا اسلحہ

تلواریں: آپ کے پاس 9 تلواریں تھیں جن کے نام یہ ہیں، ماثور، العضب، قلعی، البتار، الحتف، الرسوب، المخزم اور ذوالفقار۔

زرہیں: ان کی تعداد سات تھی، ذات الفضول لوہے کی زرہ تھی۔ جسے آپ نے ایک یہودی کے پاس گردی رکھا تھا اور اس سے تین صاع غلہ اپنے عیال کے لیے قرض لیے تھے۔ اس کے علاوہ ذات الوشاح، السوریہ، ذات الحواشی فضہ۔البتر الخرنق تھیں۔کمانیں: چھ تھیں۔جن کے نام یہ ہیں: الزورا، الروحا، القصف را، البیضا، الکتوم اور شوخط۔ڈھالیں: دو تھیں، اُلزُلوق، الفق

(مرتبہ: ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

مراجع

۱:	سیرۃ النبی ﷺ	علامہ شبلی نعمانی/مولانا سیّد سلیمان ندوی
۲:	رحمت للعالمین ﷺ	جسٹس شاہ محمد سلیمان، سلمان منصور پوری
۳:	سیرۃ المصطفیٰ ﷺ	مولانا محمد ادریس کاندھلوی
۴:	نبی رحمت ﷺ	مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی
۵:	روحِ اسلام	جسٹس سیّد امیر علی
۶:	سیرتِ سرورِ دوعالم ﷺ	مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی
۷:	نشر الطیب فی ذکر النبی حبیب	مولانا اشرف علی تھانوی
۸:	سیرتِ خاتم الانبیاء ﷺ	مولانا مفتی محمد شفیع
۹:	سیرتِ رسول اللہ ﷺ	پروفیسر سیّد نواب علی
۱۰:	النبی الخاتم ﷺ	سیّد مناظر احسن گیلانی
۱۱:	رحمت عالم ﷺ	مولانا سیّد سلیمان ندوی
۱۲:	سیرتِ احمد مجتبیٰ	شاہ مصباح الدین شکیل
۱۳:	الرحیق المختوم	مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری
۱۴:	ضیاء النبی ﷺ	پیر محمد کرم شاہ الازہری
۱۵:	حیاتِ رسالت مآب ﷺ	راجہ محمد شریف
۱۶:	محسنِ انسانیت ﷺ	مولانا نعیم صدیقی
۱۷:	انسانِ کامل ﷺ	ڈاکٹر خالد علوی
۱۸:	سیّد الوریٰ	قاضی عبدالدائم
۱۹:	پیغمبرِ عالم ﷺ	مولانا عبدالصمد رحمانی
۲۰:	الامین ﷺ	محمد رفیق ڈوگر
۲۱:	تاجدارِ رحمت ﷺ	خورشید عالم گوہر قلم
۲۲:	حیاتِ رسول اُمی ﷺ	خالد مسعود
۲۳:	رزمِ حق و باطل	شاہ بلیغ الدین
۲۴:	طوبیٰ	شاہ بلیغ الدین
۲۵:	پیغمبرِ صحرا ﷺ	کے ایل گابا، ترجمہ: پروفیسر احمد الدین مارہروی، جنرل)
۲۶:	حیات و عہدِ نبوی ﷺ	جنرل گلب پاشا (ترجمہ: حبیب حیدر آبادی)
۲۷:	محمد رسول اللہ	ڈاکٹر محمد حمید اللہ (نذیر حق)
۲۸:	سیرۃ الرسول	محمد حسن ہیکل (ترجمہ: مولانا محمد وارث کامل)
۲۹:	حیاتِ سرورِ کائنات	ابوبکر سراج الدین (مارٹن لنگز) (ترجمہ: سیّد معین الدین احمد قادری)

پانچویں کتاب:

اہل بیتؓ

آنحضورؐ کی سوتیلی اولاد

اہل بیتؓ

اہل بیتؓ

اہل بیت سے کیا مراد ہے؟

قرآن مجید میں ''اہل بیت'' کی ترکیب تین مرتبہ آئی ہے:

سورۂ ہود میں جب فرشتے حضرت ابراہیمؑ کو بیٹے کی پیدائش کی بشارت دیتے ہیں تو ان کی اہلیہ اسے سن کر تعجب کا اظہار کرتی ہیں کہ بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے ہاں بچہ کیسے ہوگا۔ اس پر فرشتے کہتے ہیں:

﴿قَالُوْٓا اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ﴾ (ہود 11: 73)

''کیا تم اللہ کے حکم پر تعجب کرتی ہو؟ ابراہیمؑ کے گھر والو، تم پر تو اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔''

سورۂ قصص میں جب حضرت موسیٰؑ ایک شیر خوار بچے کی حیثیت سے فرعون کے گھر میں پہنچتے ہیں اور فرعون کی بیوی کو کسی ایسی انا کی تلاش ہوتی ہے جس کا دودھ بچہ پی لے تو حضرت موسیٰؑ کی بہن جا کر کہتی ہیں:

﴿هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰٓى اَهْلِ بَيْتٍ يَّكْفُلُوْنَهٗ لَكُمْ﴾ (القصص 28: 12)

''کیا میں تمھیں ایسے گھر والوں کا پتا دوں جو تمھارے لیے اس بچے کی پرورش کا ذمہ لیں۔''

سورۂ احزاب کی آیت 33 میں رسول ﷺ کی ازواج مطہرات سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ (الاحزاب 33: 33)

''اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی ﷺ سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کر دے۔''

''اہل بیت'' کا لفظ عربی زبان میں ٹھیک انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جن میں ہم ''اہل خانہ'' یا ''گھر والوں'' کا لفظ بولتے ہیں۔ اہل خانہ میں آدمی کی بیوی اور اس کے بچے دونوں شامل ہوتے ہیں۔ صرف ''بیوی'' یا صرف بچوں کو ذہن میں رکھ کر ''اہل خانہ'' کا لفظ کوئی نہیں بولتا۔ قرآن مجید کی مذکورہ تینوں آیات میں ''اہل بیت'' کے مفہوم میں بیوی شامل، بلکہ مقدم ہے، بلکہ سورۂ احزاب کا اصل خطاب بیویوں سے ہے اور ''اولاد'' اس میں لفظ کے وسیع مفہوم کے اعتبار سے شامل قرار پاتی ہے۔ اسی بناء پر بعض علما کے نزدیک اس آیت میں ''اہل بیت'' سے مراد صرف رسول ﷺ کی ازواج ہیں۔

بعض علما نے لکھا ہے کہ ''بیت'' سے آنحضور ﷺ کا گھر مراد ہے، جس میں ازواج مطہرات سکونت پزیر تھیں۔ یہ علما اپنے خیال کی تائید میں سورۂ احزاب کی آیت 34 میں لفظ ''بیوت'' کا حوالہ دیتے ہیں۔

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَ الْحِكْمَةِ﴾ (ہود 33: 34)

''یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمھارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔''

اس آیت میں، ان علما کے نزدیک، نبی کریم ﷺ کے ان حجروں کا ذکر ہے جن میں آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رہتی تھیں۔

دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ سورۂ احزاب کی آیت 33 میں جن اہل بیت کا ذکر ہے، ان سے مراد صرف حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ ہیں۔ حضرت امّ سلمہؓ سے روایت ہے کہ یہ آیت میرے گھر میں نازل ہوئی۔ اس وقت یہ چاروں افراد موجود تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان چاروں کو اپنی چادر میں لے کر فرمایا کہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔

علامہ قرطبی اور حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اہل بیت میں ازواج مطہرات کے ساتھ یہ چاروں افراد بھی شامل ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے حضرت زینبؓ کی شادی کے واقعے کے سلسلے میں منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ حضرت عائشہؓ کے حجرے میں تشریف لے گئے اور فرمایا: "السلام علیکم اھل البیت" اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی شامل ہیں۔

درود میں ''آل'' کا لفظ استعمال ہوا ہے: "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ ﷺ" اور آل بھی اصل میں ''اہل'' ہے۔ چوں کہ اہل کی ایک شکل ''آل'' بھی ہے، اس لیے عموماً اہل بیت کی تشریح میں آل کے مختلف معانی کی تشریح لازمی ہے جو اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے یوں پیش کی ہے:

''امام راغب نے لکھا ہے کہ بعض لوگ آل نبی سے حضور ﷺ کے قرابت دار مراد لیتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس سے وہ اہل علم مراد ہیں، جنھیں آپ ﷺ کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ امام راغب کے نزدیک اہل دین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو علم و عمل کے لحاظ سے راسخ العقیدہ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے آل رسول و امت دونوں

لفظ استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کا علم سرتاسر تقلیدی ہوتا ہے۔ انھیں امت محمد ﷺ تو کہا جا سکتا ہے لیکن آل محمد ﷺ نہیں کہہ سکتے۔ راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام جعفر صادق سے کسی نے دریافت کیا کہ بعض لوگ تمام مسلمانوں کو آل رسول ﷺ میں داخل سمجھتے ہیں تو انھوں نے فرمایا: ''یہ صحیح بھی ہے اور غلط بھی۔ غلط تو اس لیے کہ تمام امت آل رسول ﷺ میں شامل نہیں، اور صحیح اس لیے کہ اگر وہ شریعت کے پوری طرح پابند ہو جائیں تو انھیں آل رسول ﷺ کہا جا سکتا ہے۔''

شیعہ اہل بیت سے مراد ''اہل الکسا'' یا ''اہل عبا'' (چادر والے) لیتے ہیں۔ یہ لقب حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کو اس لیے دیا گیا ہے کہ 10 ہجری میں، جب ایک روز نجران کا وفد مدینہ منورہ آیا ہوا تھا اور مباہلہ کا قصہ ہوا تھا، آنحضرت ﷺ اپنے گھر سے باہر تشریف لائے۔ اس وقت آپ ﷺ ایک چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ باہر تشریف لانے سے پہلے حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ آپ ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے ان سب کو چادر کے اندر لے لیا اور سورۂ احزاب کی آیت 33 پڑھی۔ ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا﴾

ایک روایت یہ بھی ہے کہ آنحضرت نے اپنے چچا حضرت عباسؓ اور ان کے بیٹوں کے اوپر اپنی چادر ڈال دی اور فرمایا: ''اے اللہ انھیں دوزخ کی آگ سے اس طرح چھپائے رکھیو جیسے میں نے انھیں اپنی چادر میں چھپا لیا ہے۔''

سورۂ احزاب کی آیت 33 کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ''اہل بیت'' کی بھی وضاحت کی ہے: ''اس کے مفہوم میں آدمی کی بیوی اور بچے دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ ''اہل بیت'' کا لفظ صرف ازواج کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس میں دوسرا کوئی داخل نہیں ہو سکتا تو یہ بات بھی غلط ہوگی۔ صرف یہ نہیں کہ ''اہل بیت'' میں آدمی کے سب اہل و عیال شامل ہوتے ہیں، بلکہ نبی ﷺ نے خود تصریح فرمائی ہے کہ وہ بھی شامل ہیں۔ ابن ابی حاتم کی روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے ایک مرتبہ حضرت علیؓ کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا: ''تم اس شخص کے متعلق پوچھتے ہو جو رسول ﷺ کے محبوب ترین لوگوں میں سے تھا اور جس کی بیوی حضور ﷺ کی وہ بیٹی تھی جو آپ ﷺ کو سب سے بڑھ کر محبوب تھی۔'' اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے یہ واقعہ سنایا کہ حضور ﷺ نے حضرت علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا اور ان پر ایک کپڑا ڈال دیا اور دعا فرمائی: ''خدایا، یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے گندگی کو دُور کر دے اور انھیں پاک کر دے۔'' حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: ''میں بھی تو آپ ﷺ کے اہل بیت میں سے ہوں (یعنی مجھے بھی اس کپڑے میں داخل کر کے میرے حق میں دعا فرمائیے)، تو حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم الگ رہو، تم تو خیر ہو ہی۔''

اس سے ملتے جلتے مضمون کی بکثرت احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول ﷺ نے حضرت علیؓ فاطمہؓ اور ان کے دونوں صاحب زادوں کو اپنا ''اہل بیت'' قرار دیا۔ لہٰذا ان لوگوں کا خیال غلط ہے جو ان چاروں کو ''اہل بیت'' سے خارج کرتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں کی رائے بھی غلط ہے جو ان احادیث کی بنیاد پر ازواج مطہرات کو اہل بیت سے خارج ٹھہراتے ہیں۔ اول تو جو چیز صراحت سے قرآن سے ثابت ہو، اسے کسی حدیث کے بل پر رد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے خود ان احادیث کا مطلب بھی وہ نہیں ہے جو ان سے نکالا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض روایات میں جو یہ بات آئی ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کو رسول کریم ﷺ نے اس چادر کے نیچے نہیں لیا جس میں حضور ﷺ نے ان چاروں افراد کو لیا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اہل بیت میں سے نہیں تھے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیویاں اہل بیت میں شامل تھیں ہی، کیوں کہ قرآن نے سورہ احزاب میں انھی کو مخاطب کیا تھا لیکن حضور ﷺ کو اندیشہ ہوا کہ ان دوسرے اصحاب کے متعلق ظاہر قرآن کے لحاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ یہ اہل بیت سے خارج ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے تصریح کی ضرورت ان کے حق میں محسوس فرمائی نہ کہ ازواج مطہرات کے حق میں۔

یہاں آنحضور ﷺ کی ازواج مطہرات، آپ ﷺ کی اولاد، بالخصوص بیٹیوں کے حالات زندگی اختصار کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں۔ نیز مناسب معلوم کہ امہات المومنین کی اولاد، جو سابقہ شوہروں سے تھی، اور جن کی پرورش کا شا نبوت میں ہوئی، ان کا ذکر بھی یہیں ہو جانا چاہیے۔

(1) حضرت خدیجۃؓ الکبریٰ

اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ قریش کے ممتاز خاندان بنو اسد بن عبدالعزیٰ سے تھیں۔ بنو اسد بن عبدالعزیٰ قریش کے ان نو ممتاز خاندانوں میں سے تھا جن میں دس قومی اور ملکی اعزازات منقسم تھے۔ اس خاندان میں ''مشورہ'' تھا اور اسی نسبت سے ''دارالندوہ'' کا انتظام اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''مشورہ'' سے مُراد یہ ہے کہ قومی و ملکی مسائل جب قریش کو درپیش ہوتے اور وہ اتفاق رائے سے کوئی کام کرنا چاہتے صلاح و مشورے کے لیے اس قبیلے کے پاس آتے۔

سلسلۂ نسب یہ ہے: خدیجہ بنت خویلد بن اسد بن عبدالعزیٰ بن قصی بن کلاب۔ اکیس پشت تک ان کا صحیح ترین نسب نامہ موجود ہے جس میں اتنی پشتوں تک ان کی دادیوں اور نانیوں کے نام بھی درج ہیں۔ قصی پر پہنچ کر ان کا خاندان رسول ﷺ کے خاندان سے مل جاتا ہے۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت زائدہ تھا اور وہ لوی بن غالب کے دوسرے بیٹے عامر کی اولاد تھیں۔

حضرت خدیجہؓ کے دادا اسد بن عبدالعزیٰ کی کئی اولادیں تھیں۔ سب سے بڑے مُطلب تھے۔ خویلد حضرت خدیجہؓ کے والد تھے۔ نوفل جن کے صاحب زادے ورقہ حال آگے آئے گا۔ حضرت خدیجہؓ کے چچا تھے۔ ورقہ کی ایک بہن بھی تھیں۔ حارث عمرو۔ ام حبیب۔ یہ حضرت خدیجہؓ کی پھوپھی تھیں۔

حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد بن اسد صاحب اولاد تھے اور حرب فجار میں ا قبیلے کے قائد تھے۔ ان کے سب سے بڑے بیٹے حزام تھے۔ ان کے صاحب زاد

نام دارالندوہ کی عمارت کے مہتمم و نگران تھے اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ (2) دوسری اولاد خود حضرت خدیجہؓ تھیں۔ (3) عوام، جو حضرت زبیرؓ کے والد تھے۔ ان سے حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب یعنی رسول ﷺ کی پھوپھی اور حضرت حمزہؓ کی حقیقی بہن منسوب تھیں (4) حضرت ہالہؓ، حضرت ابوالعاصؓ بن ربیع کی والدہ۔ حضرت ابوالعاصؓ حضور ﷺ کے سب سے بڑے داماد اور حضرت زینبؓ بنت رسول ﷺ کے شوہر تھے۔ (5) رقیقہ، حضرت اُمیّہ کی والدہ۔ ان پانچ بھائی بہنوں میں حزام، عوام اور رقیقہ نے اسلام کا زمانہ نہیں پایا۔ حضرت خدیجہؓ، ان کی بہن ہالہؓ اور ان کی بھانجی اُمیّہ بنت رقیقہ نے قبول اسلام کی سعادت حاصل کی۔ آبائی سلسلۂ نسب کے لحاظ سے حضرت خدیجہؓ رسول کریم ﷺ کی پھوپھی ہوتی تھیں۔ آغازِ نبوت میں انھوں نے اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل سے آنحضرت ﷺ کی نسبت سے جو یہ فقرہ کہا تھا ''اپنے برادرزادہ کی باتیں سنیے'' یہ اسی رشتے کی بنا پر تھا۔

حضرت خدیجہؓ عام الفیل سے پندرہ سال قبل 555ء میں پیدا ہوئیں۔ وہ رسول کریم ﷺ سے اسی قدر عمر میں بڑی تھیں۔ ان کی کنیت اُمّ ہند تھی۔ ان کے پہلے شوہر ابو ہالہ سے ان کا ایک لڑکا ''ہند'' نامی تھا۔ اسی کے نام پر یہ کنیت تھی۔ حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ حضرت خدیجہؓ کے پہلے لڑکے اور پہلی اولاد تھے۔ ان کی تربیت آنحضور ﷺ کے کاشانۂ مبارک میں ہوئی۔ ہندؓ بن ابو ہالہ مشرف بہ اسلام ہو کر غزوات بدر و احد میں شریک ہوئے اور بعد میں بصرے میں وفات پائی۔

حضرت خدیجہؓ کا پہلا نکاح ابو ہالہ سے ہوا۔ ان کا اصل نام نباش بن زرارہ بن نباش بن عدی تھا۔ ابو ہالہ کے دادا یعنی نباش اپنی قوم میں بہت معزز آدمی تھے۔ وہ مکہ آ کر مقیم ہوئے اور بنو عبدالدار بن قصی سے حلف کا تعلق قائم کیا۔ قریش کا دستور تھا کہ حلیفوں سے شادی بیاہ کر لیتے تھے۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ کا ابو ہالہ سے رشتہ ہو گیا، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ بنو تمیم قریش کے ہم جد تھے۔ وہ بھی قبائل مضر میں تھے۔ اس لیے قریش کا ان سے قرابت کرنا باعث ننگ و عار نہ تھا۔ اس شوہر سے حضرت خدیجہؓ کے تین بیٹے ہوئے، ہند، ہالہ اور طاہر۔

پہلے شوہر ابو ہالہ کی وفات کے بعد حضرت خدیجہؓ کا دوسرا نکاح عتیق بن عائذ مخزومی سے ہوا اور ان کی ایک لڑکی حضرت خدیجہؓ کے بطن سے پیدا ہوئی جس کا نام ہند تھا اور جو اُم محمد کی کنیت سے مشہور ہوئی۔ عتیق بنو مخزوم سے تھے اور ابو جہل، اُم المومنین ام سلمہؓ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کے چچیرے بھائی تھے۔ اس خاندان کی ایک اور قرابت حضرت خدیجہؓ کے خاندان سے یہ تھی کہ حضرت ام سلمہؓ کی ہم شیر قریبہؓ بنت ابی امیہ، زمعہ بن اسود کو بیاہی ہوئی تھی جس سے حضرت یزید بن زمعہؓ پیدا ہوئے۔

ایک روایت کے مطابق حضرت خدیجہؓ کا تیسرا نکاح ان کے چچازاد صفی بن اُمیہ کے ساتھ ہوا جو حرب الفجار میں مارے گئے تھے۔

خاندانی اعزاز کے علاوہ حضرت خدیجہؓ دولت مند بھی تھیں اور حُسنِ صورت کے اعتبار سے بھی خواتین قریش میں آپ کو امتیازی درجہ حاصل تھا۔ مزید برآں آپ سگھڑ، سلیقہ شعار اور اعلیٰ درجے کی منتظمہ بھی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت خدیجہؓ میں اتنی خوبیاں جمع کر دی تھیں کہ قریش کے کئی سرداروں نے نکاح کا پیغام بھجوایا، یہاں تک کہ ایک سردار نے تو پیام نکاح کے ساتھ مہر کے طور پر ایک ہزار اونٹ بھی دینا قبول کیا، مگر حضرت خدیجہؓ نے انکار کر دیا۔ فی الحقیقت حضرت خدیجہؓ کو دنیا سے کچھ ایسے بے زاری ہو گئی تھی کہ آپ نے بقیہ عمر بیوگی کی حالت ہی میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنا کچھ وقت خانۂ کعبہ میں گزارتیں اور کچھ وقت معمر زکا ہنہ عورتوں میں صرف کرتیں اور ان سے زمانے کے حالات پر وقتاً فوقتاً بحث کیا کرتیں۔

حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد جب ضعیفی کے باعث محنت کے قابل نہ رہے اور تجارت کے بکھیڑوں سے کچھ گھبرا گئے، تو تمام کاروبار بیٹی کے سپرد کر کے خود گوشہ نشین ہو گئے۔ حضرت خدیجہؓ کی عمر تقریباً 35 برس تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اس صورت حال نے حضرت خدیجہؓ کو نہ صرف مکہ بلکہ سارے حجاز میں امیر ترین عورت کا درجہ عطا کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ کا مالِ تجارت اگرچہ ان کے غلام سال میں دو دفعہ باہر کی منڈیوں میں لے جایا کرتے اور معقول منافع کما کر لاتے۔ تاہم کاروبار کی وسعت کے پیش نظر حضرت خدیجہؓ کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو نہایت دیانت داری کے ساتھ ان کے کاروبار کو نمایاں ترقی دے سکے۔

حضور ﷺ کی عمر مبارک جب چوبیس پچیس سال تھی تو آپ ﷺ کے مثالی کردار اور اعلیٰ اخلاق و صلاحیت کی شہرت ہر طرف پھیل چکی تھی اور عرب کے کونے کونے میں لوگ آپ ﷺ کو امین یعنی ایمان دار کے لقب سے پکارتے تھے۔

حضرت خدیجہؓ کو اپنے کاروبار میں مدد دینے کے لیے ایسے ہی قابل اعتبار اور ایماندار شخص کی ضرورت تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ حضور ﷺ ان کے تجارتی امور و معاملات میں ہاتھ بٹانے پر تیار ہو جائیں۔ لہٰذا انھوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ اگر ان کا مال تجارت ملک شام لے جا کر فروخت کرنے پر تیار ہوں تو وہ نہ صرف آپ ﷺ کو دوسروں سے دوگنا معاوضہ ادا کریں گی، بلکہ اپنے غلام میسرہ کو بھی آپ ﷺ کی معاونت کے لیے ہم راہ بھیجنے پر رضامند ہیں۔

ادھر آنحضور ﷺ نے بھی اپنے سرپرست اور چچا ابو طالب کی زبانی حضرت خدیجہؓ کے کاروبار کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ لہٰذا آپ ﷺ نے چچا کی اجازت سے ان کی درخواست منظور فرمالی اور مال تجارت لے کر بصرہ روانہ ہوئے اور وہاں نہایت معقول منافع کمایا۔ واپسی پر جب حساب کتاب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس مرتبہ سابقہ کے مقابلے میں دوگنا منافع ہوا ہے۔ حضرت خدیجہؓ کو آپ ﷺ کے اس حسن عمل اور کاروباری لین دین سے بڑی مسرت ہوئی اور آپ نے حضرت کو مقررہ معاوضے سے زائد رقم ادا فرمائی۔

اس دوران میں حضرت خدیجہؓ کو آنحضور ﷺ کی ذات کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں۔ ان کی نگاہوں میں حضور ﷺ کی قدر و منزلت روز بروز بڑھتی گئی، بلکہ ان کا دل بھی خود بخود آنحضور ﷺ کی طرف مائل ہونے لگا۔ چنانچہ

سفر شام سے واپسی کے دو تین ماہ بعد حضرت خدیجہؓ نے اپنی باندی نفیسہ کے ذریعے آنحضور ﷺ کو نکاح کا پیام دیا، جسے آپ ﷺ نے اپنے چچا ابو طالب کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد قبول فرما لیا۔ آپ ﷺ کا مثبت جواب ملنے پر حضرت خدیجہؓ نے اپنے چچا امر بن اسد کو بلا بھیجا اور ان سے آنحضور ﷺ کے رشتے کے بارے میں ذکر کیا۔ اس وقت تک حضرت خدیجہؓ کے والد انتقال کر چکے تھے، لہٰذا ان کے سرپرست چچا ہی تھے۔ چنانچہ نکاح کے لیے حضور ﷺ اپنے چچا ابوطالب، چچا حمزہؓ اور بعض رؤساء قریش کے ہم راہ حضرت خدیجہؓ کے مکان پر جمع ہوئے۔ پانچ سو درہم طلائی مہر مقرر ہوا۔ وقتِ نکاح حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس سال اور حضور ﷺ کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ رسم نکاح 27 قبل ہجرت، 11 ستمبر 595ء میں ہوئی۔

نکاح کا خطبہ ابوطالب نے پڑھا۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہے: ''حمد وثنا اسی خدا کے لیے ہے، جس نے ہمیں ابراہیمؑ کے فرزند اور اسماعیلؑ کی ذُرّیات میں بنایا۔ ہمیں معد اور مضر کے پاک اصل سے باہر لایا۔ اپنے گھر کا نگہبان اور اپنے حرم کا پیشوا بنایا۔ ایسا گھر ہمیں عطا فرمایا کہ اطراف و جوانب کے لوگ اس کی زیارت کے قصد سے آتے ہیں۔ ایسا حرم عنایت فرمایا کہ جو شخص وہاں آ جائے، امان میں ہو جاتا ہے اور ہمیں لوگوں پر حاکم مقرر کیا۔

امابعد، یہ میرے بھائی کا بیٹا محمد ﷺ بن عبداللہ ہے۔ یہ ایک ایسا جوان ہے کہ قریش کے کسی شخص کا اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں مال اس کے پاس کم ہے، لیکن مال ڈھلتی چھاؤں ہے، اور ایک بدلنے والی چیز ہے۔ محمد ﷺ وہ شخص ہے جس کی میرے ساتھ قرابت و یگانگت کو تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ خدیجہؓ بنت خویلد کو چاہتا ہے، اور میرے مال میں سے بیس اونٹ مہر مقرر کرتا ہے، اور اس کا مستقبل خدا کی قسم عظیم الشان اور جلیل القدر ہے۔''

ابوطالب کے خطبے کے بعد حضرت خدیجہؓ کے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل نے بھی خطبہ پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے:

''حمد وثنا خدا کے لیے ہے، جس نے ہمیں ویسا ہی بنایا جیسا کہ ابوطالب نے ذکر کیا اور ہمیں وہ تمام فضیلتیں عطا فرمائیں، جنھیں آپ نے گنوایا ہے۔ پس ہم لوگ تمام عرب کے پیشوا اور سردار ہیں، اور آپ لوگ تمام فضائل کے اہل ہیں۔ کوئی جماعت آپ کے فضائل کا انکار نہیں کر سکتی، اور کوئی شخص آپ کے فخر و شرف کو رد نہیں کر سکتا، اور بے شک ہم لوگوں نے نہایت رغبت سے آپ کے ساتھ شامل ہونے اور ملنے کو پسند کیا۔ پس اے قریش، گواہ رہو کہ خدیجہ بنت خویلد کو مَیں نے محمد ﷺ بن عبداللہ کی زوجیت میں دیا، چار سو مثقال کے بدلے۔''

نکاح کے بعد حضور ﷺ اکثر گھر سے باہر رہنے لگے۔ کئی کئی روز مکہ کے پہاڑوں میں جا کر تنہائی میں غور و فکر اور اللہ کی عبادت کرتے۔ اکثر اوقات حضرت خدیجہؓ بھی اپنے شوہر کے ہم راہ غارِ حرا تشریف لے جایا کرتیں۔ ایک رات غارِ حرا میں حضور ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی ''اقرا باسم ربک الذی خلق''، تو حضور ﷺ سہمے ہوئے گھر تشریف لائے اور فرمانے لگے: ''مجھے کپڑا اڑھاؤ، مجھے کپڑا اڑھاؤ۔'' اس عظیم خاتون نے تعمیل ارشاد کی اور آپ ﷺ کو تسلی تشفی دی اور فرمایا: ''آپ ﷺ کی گھریلو زندگی صاف ستھری اور بیرونی زندگی نہایت شریفانہ اور شفقت آمیز ہے۔ آپ ﷺ ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ غریبوں کی دست گیری کرتے ہیں۔ صلہ رحمی کرتے ہیں۔ امانت گزار ہیں۔ آپ نے ہمیشہ اللہ کی عبادت واطاعت کی ہے۔ لہٰذا اللہ آپ کو تنہا نہ چھوڑے گا۔''

پھر حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کو ساتھ لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو زمانہ جاہلیت میں بت پرستی ترک کر کے عیسائی ہو گئے تھے اور اپنے وقت کے عالم فاضل تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے تمام واقعہ جو حضور ﷺ کو پیش آیا تھا، ان کے سامنے بیان کیا۔ ورقہ نے کہا: ''یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ پر اُترا تھا۔ اے کاش، میں اس زمانے تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو وطن سے نکال دے گی۔'' آنحضور ﷺ نے دریافت کیا: ''کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟'' ورقہ نے کہا: ''ہاں۔ جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے، جب کسی پر نازل ہوتا ہے تو دنیا اس کی مخالف ہو جاتی ہے۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو آپ ﷺ کی بھرپور مدد کروں گا۔''

ورقہ بن نوفل کی باتیں سن کر حضرت خدیجہؓ کو یقین کامل ہو گیا کہ حضور ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ انھوں نے آنحضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ''بے شک آپ ﷺ اللہ کے منتخب بندے ہیں۔ آپ ﷺ پر رحمت ہو۔ کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔'' اس طرح خدیجہؓ پہلی ہستی تھیں جو اسلام میں داخل ہوئیں۔

حضرت خدیجہؓ کی ازدواجی زندگی پچیس سال تک نہایت مطمئن اور پرسکون گزری۔ 65 سال کی عمر میں ان کا وصال ہو گیا۔ اس عرصے میں پہلے پندرہ سال حضور ﷺ کی نبوت سے پیش تر اور بقیہ دس سال نبوت ملنے کے بعد گزرے۔ پرسکون ازدواجی زندگی کی وجہ سے حضور ﷺ کو عبادتِ الٰہی اور معاشرتی انقلاب کی خاطر غور و فکر کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا۔

اس وقت تک نماز پنج گانہ فرض نہ تھی۔ آنحضور ﷺ نوافل پڑھا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ بھی آپ ﷺ کے ساتھ نوافل میں شرکت کرتی تھیں، بلکہ دونوں ایک عرصے تک خفیہ طور پر نماز پڑھتے رہے۔ ابن سعد نے ''طبقات'' میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ: ''عفیف کندی ایک مرتبہ سامان خریدنے مکہ آئے اور حضرت عباسؓ کے ہاں قیام کیا۔ ایک دن صبح کے وقت کعبے کی طرف نظر تھی۔ دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر قبلہ رُخ کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک لڑکا اس کے دائیں طرف آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک خاتون آئیں اور ان دونوں کے پیچھے کھڑی ہو گئیں اور نماز پڑھ کر یہ تینوں چلے گئے۔'' عفیف کندی نے حضرت عباسؓ سے ان کے بارے میں دریافت کیا اور کہا ''معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی نیا دین ایجاد کر لیا ہے۔'' حضرت عباسؓ نے جواب دیا: ''بے شک ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ کیا تم جانتے ہو، یہ لوگ کو

؟ نوجوان میرا بھتیجا محمد ﷺ ہے۔ یہ لڑکا دوسرا بھتیجا علی ہے، اور یہ محمد ﷺ کی
ی خدیجہ ہے۔ میرے بھتیجے کا خیال ہے کہ اس کا دین سچا ہے اور وہ جو کچھ بھی کرتا
ہے، اللہ کے حکم سے کرتا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، دنیا میں اس دین کے صرف یہی
ن اشخاص ہیں۔'' یہ واقعہ متعدد راویوں نے بیان کیا ہے جن میں امام بخاری بھی
مل ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نے صرف نبوت کی تصدیق ہی نہیں کی بلکہ آغازِ اسلام میں
نحضور ﷺ کی سب سے بڑی مددگار اور رفیق ثابت ہوئیں۔ حضور ﷺ کو جو
ند سال تک کفار مکہ اذیت دیتے ہوئے جھجکتے تھے، اس میں بڑی حد تک حضرت
دیجہؓ کا اثر کام کر رہا تھا۔ نبوت کے بالکل آغاز میں جب حضور ﷺ کی زبان سے
الفاظ نکلے کہ ''مجھے خوف ہے'' تو انھوں نے کہا کہ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ اللہ آپ کا
اتھ نہ چھوڑے گا۔'' دعوت اسلام کے سلسلے میں جب مشرکین نے آپ ﷺ کو
رح طرح کی اذیتیں پہنچائیں تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی اور تشفی دی۔
نحضور ﷺ کو مشرکین کی تردید یا تکذیب سے جو کچھ صدمہ پہنچتا، حضرت خدیجہؓ
کے پاس آ کر دُور ہو جاتا تھا، کیوں کہ وہ آپ ﷺ کی باتوں کی تصدیق کرتی تھیں
ور مشرکین کے معاملے کو آپ ﷺ کے سامنے ہلکا کر کے پیش کرتی تھیں۔

سن سات نبوی میں قریش نے اسلام کے تباہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مقصد کے
لیے انھوں نے بنو ہاشم کے مقاطعے کا فیصلہ کیا کہ جب تک حضور ﷺ کو اُن کے سپرد
نہ کیا جائے، مقاطعہ جاری رہے گا۔ چنانچہ ابو طالب مجبور ہو کر تمام بنو ہاشم کے ساتھ
شعب ابو طالب میں پناہ گزیں ہوئے۔ آنحضور ﷺ کے ساتھ آپؐ کی زوجہ حضرت
خدیجہؓ بھی تھیں۔ تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار کی سختیاں برداشت کیں۔ یہ زمانہ
ایسا سخت گزرا کہ محض درختوں کی چھال اور پتے کھا کر گزارہ کیا۔ تاہم اس زمانے
میں بھی کبھی کبھی حضرت خدیجہؓ کے اثر سے کھانا پہنچ جاتا تھا۔ چنانچہ ایک دن حکیم بن
حزام نے، جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے، تھوڑے سے گیہوں اپنے غلام کے ہاتھ
حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے۔ راستے میں ابو جہل نے دیکھ لیا اور چھین لینا چاہا۔
اتفاق سے ایک شخص ابوالبختری کہیں سے آ گیا۔ وہ اگرچہ کافر تھا، لیکن اسے رحم آیا۔
اس نے ابو جہل سے کہا، ''ایک شخص اپنی پھوپھی کو کچھ کھانے کے لیے بھیجتا ہے تو
تُو کیوں روکتا ہے۔''

ازواج مطہرات میں حضرت خدیجہؓ کو بعض امتیازی خصوصیات حاصل ہیں۔ وہ
آنحضور ﷺ کی پہلی بیوی ہیں۔ وہ جب عقدِ نکاح میں آئیں تو ان کی عمر چالیس
برس کی تھی، لیکن آنحضور ﷺ نے ان کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی۔ ابراہیم
کے سوا حضور ﷺ کی تمام اولاد انھی سے پیدا ہوئی۔ ان کی عظمت و فضیلت کا اندازہ
اس سے ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ نے جب فرضِ نبوت ادا کرنا چاہا تو فضائے عالم
سے ایک آواز بھی آپ ﷺ کی تائید میں نہ اٹھی۔ کوہ حرا، وادیٔ عرفات، جبل
فاران، غرض تمام جزیرۃ العرب آپ ﷺ کی آواز پر ایک پیکر تصویر بنا ہوا تھا، لیکن

اس عالم گیر خاموشی میں صرف ایک آواز تھی جو فضائے مکہ میں تموج پیدا کر رہی تھی۔ یہ
آواز حضرت خدیجہ طاہرہؓ کے قلب مبارک سے بلند ہوئی تھی، جو اس ظلمت کدۂ کفر و
ضلالت میں انوار الٰہی کی دوسری تجلی گاہ تھی۔

حضرت خدیجہؓ وہ مقدس خاتون ہیں جنھوں نے نبوت سے پہلے ہی بت پرستی
ترک کر دی تھی۔ چنانچہ مسند ابن حنبل میں روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے
حضرت خدیجہؓ سے فرمایا: ''بخدا میں کبھی لات و عزیٰ کی پرستش نہ کروں گا۔'' انھوں نے
جواب دیا: ''لات کو جانے دیجیے۔ عزیٰ کو جانے دیجیے۔'' یعنی ان کا ذکر بھی نہ کیجیے۔
آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کی صدا بلند کی تو سب سے پہلے انھی نے اس پر لبیک
کہا۔ رسول اللہ ﷺ اور اسلام کو ان کی ذات سے جو تقویت تھی، وہ سیرتِ
نبوی ﷺ کے ایک ایک صفحے سے نمایاں ہے۔ حضور ﷺ سے انھیں بے پناہ محبت
تھی۔ دولت و ثروت کے باوجود جو انھیں بچپن سے حاصل تھی، وہ حضور ﷺ کی
خدمت خود کرتی تھیں۔

حضور ﷺ کو حضرت زید بن حارثہؓ سے بہت محبت تھی، لیکن وہ مکہ میں غلام کی
حیثیت سے رہتے تھے۔ حضرت خدیجہؓ نے انھیں آزاد کیا اور اب وہ کسی دنیاوی رئیس
کے خادم ہونے کی بجائے اللہ کے آخری رسول ﷺ کے غلام تھے۔ آنحضور ﷺ
کو بھی حضرت خدیجہؓ سے بے انتہا محبت تھی۔ آپ ﷺ نے ان کی زندگی تک
''دوسری شادی'' نہیں کی۔ ان کی وفات کے بعد آپ ﷺ کا معمول تھا کہ جب
گھر میں کوئی جانور ذبح ہوتا تو آپ ﷺ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی سہیلیوں کے پاس
گوشت بھجواتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ اگرچہ میں نے خدیجہؓ کو نہیں دیکھا، لیکن
مجھے جس قدر رشک ان پر آتا تھا، کسی اور پر نہیں آتا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ
حضور ﷺ اکثر ان کا ذکر کیا کرتے تھے۔

ایک دفعہ جب حضرت خدیجہؓ کی ہم شیر ہالہ تشریف لائیں اور دروازے کے باہر
کھڑے ہو کر اندر آنے کی اجازت طلب کی تو دونوں بہنوں کی آواز کی یکسانیت کی
وجہ سے حضور ﷺ پر کپکپی طاری ہو گئی اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ ہالہ کی آواز
ہے۔'' حضرت عائشہؓ نے اس موقع پر آنحضور ﷺ سے فرمایا کہ آپ ﷺ کیا
ایک بڑھیا کی یاد کیا کرتے ہیں جو مر چکی ہیں، جب کہ اللہ نے آپ ﷺ کو اتنی
اچھی بیویاں دی ہیں۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا، ''نہیں عائشہ نہیں۔ یہ بات نہیں
ہے۔ مجھے خدیجہؓ سے بہتر رفیقۂ حیات کوئی نہیں ملی، کیوں کہ جب لوگوں نے مجھے
کاذب کہا تو انھوں نے میری تصدیق کی۔ جب لوگ کافر تھے تو وہ اسلام لائیں۔
جب کسی نے میری مدد نہیں کی اس وقت انھوں نے میرا ہاتھ تھاما۔ ان کے بطن سے اللہ
نے مجھے صاحب اولاد کیا اور مجھے ان کی محبت عطا کی۔'' حضرت عائشہؓ نے اس کے
بعد طے کر لیا کہ وہ ان کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کریں گی۔

قبولِ اسلام کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر پچپن سال تھی۔ یہ مسلّم ہے کہ حضرت
خدیجہؓ کے قبول اسلام سے اسلام کی اشاعت پر بڑا خوش گوار اثر پڑا۔ ان کے خاندان

اور اعزہ واقارب میں سے بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔ بنواسد بن عبد العزیٰ کے یہ مشہور افراد آغازِ اسلام کے وقت موجود تھے:

نوفل بن خویلد۔ حضرت خدیجہؓ کا بھائی۔ اسود بن نوفل۔ زبیر بن العوام اور حکیم بن حزام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے)۔ ابوالبختری عاص بن ہشام۔ عمرو بن امیہ (ابوالبختری کے چچازاد بھائی) عقیل۔ زمعہ بن اسود۔ عبداللہ بن زمعہ۔ حارث بن زمعہ۔ یزید بن زمعہ۔ عبداللہ، خالد، یحییٰ، ہشام۔ بن حکیم۔

ان پندرہ افراد میں پانچ کافر رہے جو غزوۂ بدر میں مارے گئے۔ ان کے نام یہ ہیں: نوفل، حضرت خدیجہؓ کا بھائی۔ زمعہ۔ عقیل جو حضرت خدیجہؓ کا رشتے کا بھتیجا تھا۔ حارث بن زمعہ۔ ابوالبختری عاص، رشتے کا بھتیجا۔

باقی دس حضرات اسلام سے مشرف ہوئے ان میں سب سے مقدم حضرت زبیرؓ بن العوام حقیقی بھتیجے تھے۔ آپ نبوت کے آٹھویں روز مشرف بہ اسلام ہوئے۔ دوسرے حقیقی بھتیجے حضرت اسودؓ بن نوفل نے بھی اسلام قبول کیا۔ یہ دونوں بزرگ مہاجرین حبشہ میں شامل تھے۔ دو اور بزرگ بھی مہاجرین حبشہ میں تھے (1) حضرت عمروؓ بن اُمیہ بن حارث بن اسد۔ حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی اُمیہ کے فرزند (2) حضرت یزیدؓ بن زمعہ بن اسود بن مطلب بن اسد۔ حضرت خدیجہؓ کے دوسرے چچازاد بھائی، اسود کے پوتے، جن کے پاس مشورے کا عہدہ تھا۔ انھیں ابن سعد نے فتح مکہ کے زمانے میں ایمان لانے والوں میں شمار کیا ہے۔ اب رہے حضرت عبداللہ بن زمعہ تو ان کے حالات زیادہ معلوم نہیں۔ وہ ہجرتِ نبوی ﷺ کے وقت پانچ سال کے تھے۔ اگر اپنے بھائی (یزید بن زمعہ) کے ساتھ رہتے تھے تو اسلام کی آغوش میں آنکھیں کھولی ہوں گی۔ اگر باپ کے ساتھ تھے تو دو برس کے بعد 2 ہجری میں سات سال کی عمر میں مدینہ آئے ہوں گے اور اس وقت کلمۂ توحید سے آشنا ہوئے ہوں گے۔ بقیہ پانچ افراد میں حضرت خدیجہؓ کے حقیقی بھتیجے حضرت حکیم بن حزام اور ان کے چاروں بیٹے، فتح مکہ کے زمانے میں اسلام لائے۔ ان تمام ناموں میں سب سے زیادہ اثر حضرت خدیجہؓ کا حضرت زبیر بن العوام پر پڑا جو نبوت کے آٹھویں دن بارہ سال کی عمر میں مشرف بہ اسلام ہوئے، لیکن ان کے اسلام لانے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا ہاتھ بھی تھا، جیسا کہ ابن ہشام میں تصریح ہے۔ حضرت زبیرؓ کے علاوہ حضرت زیدؓ بن حارثہ، حضرت علیؓ اور آنحضور ﷺ کی تین صاحب زادیوں (حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ) کا تعلق براہ راست حضرت خدیجہؓ سے تھا۔ حضرت زیدؓ ان کے آزاد کردہ غلام تھے اور اس وقت زید بن محمد ﷺ کہلاتے تھے۔ حضرت علیؓ ان کی تربیت میں تھے۔ صاحب زادیاں بھی ان کے زیر تربیت تھیں۔ ان سب کو حضرت خدیجہؓ ہی نے کلمہ پڑھایا۔ ان میں حضرت زیدؓ اور حضرت علیؓ ان بزرگوں میں ہیں جنھیں بعض روایات میں پہلا مسلمان قرار دیا گیا ہے۔ حضرت زیدؓ اس وقت تیس سال کے تھے، جس کی انھوں نے خود تصدیق کی۔ حضرت علیؓ دس سال کے تھے۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت خدیجہؓ کی دولت وثروت اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے وقف ہوگئی۔ اب آنحضور ﷺ تجارت وکاروبار چھوڑ کر عبادت الٰہی اور تبلیغ اسلام کے کاموں میں مصروف ہو گئے تھے۔ آمدنی بند ہو جانے کے سبب سے اندوختے پر بسر اوقات تھی۔ پہلے فرزند قاسمؓ انتقال کر چکے تھے۔ لڑکیوں کے فرض سے وہ سبک دوش ہو چکی تھیں۔ سب کی شادی ہوگئی تھی۔ حضرت زینبؓ کا بیاہ حضرت ابوالعاص سے ہوگیا تھا جو حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت رقیہؓ اور حضرت کلثومؓ ابولہب کے دو بیٹوں کو بیاہی گئی تھیں۔ رقیہؓ اور ام کلثومؓ ابھی رخصت نہیں ہوئی تھیں کہ دونوں کا نکاح منسوخ کر دیا گیا۔ چوں کہ ان میں رقیہؓ بڑی تھیں، حضور ﷺ نے ان کا نکاح حضرت عثمانؓ سے پڑھا دیا۔ وہ آغازِ اسلام یا اس کے ایک دو برس بعد شوہر کے گھر رخصت کر دی گئیں۔ اس وقت حضرت ام کلثومؓ چار سال کی تھیں اور حضرت فاطمہؓ ایک سال کی۔ حضرت عبداللہ بعثت کے ایک سال بعد پیدا ہوئے۔ علاوہ ازیں دو بچے پہلے شوہر ابوہالہ کے تھے۔ انھوں نے بھی کاشانۂ نبوت میں تربیت پائی۔ اسی لیے وہ ربیب رسول ﷺ کہلاتے ہیں۔ ان کے نام ہیں ہالہ اور ہند۔ حضرت خدیجہؓ ان سب بچوں کی دیکھ بھال، پرورش ونگہداشت اور خانگی کاموں میں مصروف رہنے لگیں۔

جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا، کفار قریش سے مخالفت بڑھتی جاتی تھی، حضرت خدیجہؓ کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ صبر واستقامت سے زیادہ کام لیتی تھیں۔ آنحضور ﷺ کو مشرکین کی تردید یا تکذیب سے جو کچھ صدمہ پہنچتا، حضرت خدیجہؓ کے پاس آ کر دور ہو جاتا تھا، کیوں کہ وہ آپ ﷺ کو تسلی دیتیں اور حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ آپ ﷺ کی باتوں کی تصدیق کرتی تھیں اور مشرکین کی زیادتیوں اور بدسلوکیوں کو آپ ﷺ کے سامنے ہلکا کر کے پیش کرتی تھیں۔

زمانۂ نبوت میں حضرت خدیجہؓ کو دوسرے صاحب زادے حضرت عبداللہ کا داغ مفارقت اٹھانا پڑا۔ ان کی ولادت بعثت کے ایک سال بعد ہوئی تھی۔ ان کی پیدائش سے پہلی اولاد اور بڑے بیٹے قاسمؓ کی وفات کا غم غلط ہوگیا تھا، لیکن افسوس کہ خاندانِ نبوت کے اس چشم وچراغ نے بھی داغ مفارقت دیا۔

رجب 5 نبوی میں ہجرت حبشہ پیش آئی۔ اس موقع پر حضرت خدیجہؓ کو اپنی بیٹی سے علیحدہ ہونا پڑا۔ حضرت رقیہؓ نے اپنے شوہر حضرت عثمانؓ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی۔ یہ زمانۂ مفارقت طویل ہوا۔ تقریباً 9 اور 10 نبوت کے درمیان وہ حبشہ سے مکے واپس آئیں۔ کم وبیش چار سال والدہ ماجدہ سے علیحدہ رہیں۔ بارہ سال کی عمر میں صاحب زادی ماں سے جدا ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اتنی چھوٹی عمر کی اولاد کو اتنے دور دراز سفر کی اجازت دینا بڑے دل گردے کے والدین کا کام تھا۔

8 نبوت میں حضرت رقیہؓ کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ اس کے ایک سال بعد 9 نبوت میں حضرت خدیجہؓ کے پہلے نواسے، خاندان نبوت کے چشم وچراغ حضرت عبداللہ بن عثمانؓ حبشہ میں پیدا ہوئے۔ نانا اور نانی اس وقت وہاں نہ تھے، لیکن چند ماہ بعد

ب حضرت رقیہؓ اپنے شوہر کے ساتھ مکہ پہنچیں تو اپنے نورِ نظر کو دیکھ کر حضرت خدیجہؓ کی ھیں روشن ہوئیں۔ اب صاحب زادی، داماد اور نواسے نظر کے سامنے تھے۔

ہجرت حبشہ کے بعد سے کفار کا سلوک رسول ﷺ کے ساتھ زیادہ سخت ہو گیا اور اذیتیں بڑھ گئی تھیں۔ محرم 7 نبوی میں آپ کو شعب ابی طالب میں محصور ہونا ۔ تین برس تک مسلسل آنحضور ﷺ حضرت خدیجہؓ اور تمام بنو ہاشم نے مصائب لیے۔ بالآخر 10 نبوی میں یہ معاشرتی بائیکاٹ ختم ہوا۔ شعب ابی طالب سے نکلنے کے ر روز بعد اور نماز فرض ہونے یعنی واقعہ معراج سے قبل، حضرت خدیجہؓ نے 1 رمضان 10 نبوت (دسمبر 619ء)، نزول وحی کے دسویں برس، 65 سال کی عمر میں معظمہ میں انتقال کیا۔ یہ ہجرتِ نبوی ﷺ سے تین سال پہلے کا سانحہ ہے۔ ں کہ اس وقت تک نماز کے لیے حکم نہیں آیا تھا، لہٰذا آپ کو نماز جنازہ پڑھائے بر دفن کر دیا گیا۔ حضور ﷺ بذات خود قبر میں اُترے اور اپنی زوجہ کو لحد میں رکھا۔ ان کے قبرستان میں عبدالمطلب کی قبر سے ذرا فاصلے پر دفن کی گئیں۔ اب اس برستان کو "جنت المعلیٰ" کہا جاتا ہے۔ مزار اب تک موجود ہے اور حج کے موقع پر گ قبر کی زیارت کرتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد کا زمانہ مسلمانوں کے لیے انتہائی پُر آشوب ابت ہوا۔ ان کی وفات سے کچھ دن قبل حضور ﷺ کے چچا اور سرپرست ابو طالب نتقال فرما گئے تھے۔ حضور ﷺ نے اس سال (10 نبوی) کو "عام الحزن" یعنی غم و ندوہ کا سال قرار دیا۔

حضرت خدیجہؓ کے فضائل و مناقب میں بہت سی حدیثیں مروی ہیں۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے "عالم میں افضل ترین عورت مریم اور خدیجہ ہیں۔" ایک مرتبہ حضرت جبرائیلؑ آنحضور ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ خدیجہؓ آئیں تو فرمایا: "ان کو جنت میں ایک ایسا گھر ملنے کی بشارت سنا دیجیے جو موتیوں کا ہو گا اور جس میں شور و غل اور محنت مشقت نہ ہو گی۔"

حضرت خدیجہؓ کی متعدد اولادیں ہوئیں۔ پہلے شوہر ابو ہالہ سے تین بیٹے ہوئے ہند، ہالہ اور طاہر اور ایک لڑکی زینب۔ دوسرے شوہر عتیق سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام ہند تھا۔ تیسرے شوہر صفی بن امیہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ چوتھے شوہر یعنی رسول ﷺ کے صلب سے دو بیٹے قاسم اور عبداللہ، اور چار بیٹیاں زینب، رقیہ، اُم کلثوم اور فاطمہ رضی اللہ عنہن پیدا ہوئیں۔ (ان سب کا الگ الگ تذکرہ "حضور ﷺ کی اولاد" والے علیحدہ باب میں آگے چل کر ہو گا)

(2) حضرت سودہؓ

اُم المومنین حضرت سودہؓ بنت زمعہ بن قیس، آنحضرت ﷺ کی دوسری بیوی۔ حضرت خدیجہؓ کے بعد اور حضرت عائشہؓ سے پہلے کاشانۂ نبوت میں آئیں۔ ان کا خاندان عامر بن لوی کے بیٹے حسل سے چلتا ہے۔ عامر، کعب کے بھائی تھے۔ کعب بن لوی آنحضور ﷺ کے جدِ اعلیٰ تھے۔ حضرت سودہؓ کی والدہ شموس بنت قیس بن عمر نجاری تھیں۔

حضرت سودہؓ کا نکاح پہلے سکرانؓ بن عمرو سے ہوا۔ وہ ان کے ساتھ اسلام لائیں اور انھی کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ حضرت سکرانؓ جب حبشہ سے واپس آئے تو ان کے ساتھ ان کی بیوی سودہؓ بھی تھیں۔ سکرانؓ چند دنوں کے بعد مکہ مکرمہ میں وفات پا گئے۔ حضرت سودہؓ نبوت کے دسویں سال حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں۔

حضرت خدیجہؓ نے 10 رمضان 10 نبوی میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد حضور ﷺ نہایت مغموم اور پریشان خاطر رہنے لگے۔ آپ ﷺ پر گھر بار کا تمام بوجھ آن پڑا تھا۔ آپ ﷺ تن تنہا گھر کے کام کاج کرتے۔ کپڑے دھوتے، برتن مانجھتے، بچوں کی نگہداشت کرتے اور دیگر امور سرانجام دیتے۔

ایک مرتبہ خولہؓ بنت حکیم زوجہ عثمان بن مظعونؓ حضور ﷺ سے ملنے تشریف لائیں۔ انھوں نے آپ ﷺ کو گھر کے کام کاج میں اس قدر مشغول پایا تو انھیں آپ ﷺ پر بڑا ترس آیا اور عرض کیا کہ آپ ﷺ کو ایک ساتھی یعنی بیوی کی ضرورت ہے۔ انھوں نے دو نام تجویز کیے۔ ایک سودہؓ اور دوسرے عائشہ۔ حضور ﷺ نے سودہؓ کے لیے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

حضرت خولہؓ سیدھی زمعہؓ بن قیس کے پاس گئیں جو حضرت سودہؓ کے والد تھے۔ سلام دعا کے بعد حضور ﷺ کی جانب سے پیغام دیا۔ حضرت زمعہؓ یہ سن کر بہت خوش ہوئے، لیکن انھوں نے کہا کہ سودہؓ ایک بیوہ اور پختہ عمر عورت ہے، لہٰذا اس کی رائے لینا بھی ضروری ہے۔ اس پر حضرت خولہؓ نے بذات خود حضرت سودہؓ سے ملاقات کی اور حضور ﷺ کی جانب سے ان کے رشتے کی خواہش کا اظہار کیا اور بتایا کہ وہ اس نکاح کے لیے ان کے والد سے منظوری حاصل کر چکی ہیں۔

جب سب راتب طے ہو گئے تو آنحضور ﷺ اپنے چچا حمزہؓ، حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کی ہم راہی میں حضرت سودہؓ کے مکان پر عروسی جوڑا لے کر تشریف لے گئے۔ وقتِ نکاح حضرت سودہؓ کی عمر 55 سال تھی اور وہ حضور ﷺ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھیں۔ نکاح حضرت سودہؓ کے والد حضرت زمعہؓ نے پڑھا۔ حضور ﷺ نے چار سو درہم بطور مہر ادا کیے اور رواج کے مطابق حضرت سودہؓ اپنے شوہر کے مکان منتقل ہو گئیں۔ یہ واقعہ آخر رمضان المبارک سن دس نبوی (فروری 619ء) میں پیش آیا۔

اس نکاح سے ایک مرتبہ پھر حضور ﷺ کے گھر میں خوشیاں اور چہل پہل لوٹ آئی اور حضرت فاطمہؓ اور حضرت اُم کلثوم کو دوبارہ ماں کی مامتا مل گئی۔ حضرت سودہؓ نے بھی ان دونوں بچیوں سے بے پناہ محبت کا اظہار کیا اور دیکھنے والوں کو مشکل سے یقین آتا تھا کہ وہ آپ کی اولاد نہیں۔

حضرت سودہؓ کے بھائی عبداللہ بن زمعہ ابھی اسلام نہیں لائے تھے اور کفر کی حالت میں تھے۔ انھیں جب اپنی ہم شیر کے حضور ﷺ سے نکاح ہو جانے کا علم ہوا تو انھیں بے حد رنج ہوا۔ انھوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار کرنے کے لیے اپنے سر پر

خاک ڈالی، تاکہ اس طرح خود کو مطعون کر سکیں۔ بعد ازاں جب انھوں نے خود اسلام قبول کر لیا تو اپنے عمل پر بہت پچھتاتے تھے۔

ہجرت کے بعد حضور ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو مدینہ منورہ سے مکہ بھیجا، تاکہ وہ ان کے اہل خاندان کو وہاں سے لے آئیں۔ حسب ارشاد حضرت زیدؓ حضرت سودہؓ اور فاطمہؓ کو اپنے ہم راہ لے کر مدینہ آ گئے۔

حضرت سودہؓ طویل قامت اور بھاری جسم کی مالک تھیں اور تیزی سے چل پھر نہیں سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر انھیں مزدلفہ سے روانگی سے پیش تر جانے کی اجازت دے دی، تاکہ وہ حاجیوں کے ہجوم سے قبل روانہ ہو جائیں اور تکلیف اور پریشانی سے محفوظ رہیں۔ دیگر ازواج مطہرات میں آپ کا قد زیادہ لمبا تھا اور بقول حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کو ان کے قد کی وجہ سے کسی مجمع میں تلاش کرنا آسان تھا۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''سودہؓ کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ کاش میری روح ان کے قالب میں ہوتی۔''

حضرت سودہؓ اپنے احساسِ ذمہ داری اور فرماں برداری میں نہایت درجہ منہمک رہتی تھیں۔ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے لیے روانہ ہونے سے پیش تر اپنی ازواج مطہرات کو ہدایت کی کہ میری وفات کے بعد تم لوگ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنا۔ حضرت سودہؓ نے اس ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کر کے دکھایا۔ کبھی گھر سے باہر قدم رکھا اور نہ حج یا عمرے کے لیے تشریف لے گئیں۔ فرماتی تھیں کہ میں نے حج اور عمرہ کر لیا ہے اور اب حکمِ خداوندی کے تحت گھر سے قدم نہیں نکالوں گی۔

آنحضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ میں سخاوت کا بڑا دخل تھا اور اس کا اثر آپ ﷺ کے صحابہ کرامؓ اور اہل خاندان پر بھی نمایاں تھا۔ بلکہ جو شخص آپ ﷺ سے زیادہ قریب رہا، وہ ان اطوار کا زیادہ کار بند رہا۔ لہٰذا آپ ﷺ کی ازواج مطہرات میں بھی ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا جذبہ موج زن رہا۔ حضرت سودہؓ میں بھی یہ صفات کُوٹ کُوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ آپ سخی بھی تھیں، مہمان نواز بھی، رحم دل اور شفیق بھی، اور صرف حضرت عائشہؓ اس معاملے میں آپ سے بڑھ کر تھیں۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک مرتبہ آپ کی خدمت میں درہم سے بھری ہوئی تھیلی بھجوائی تو آپ نے بلاتوقف وہ تمام رقم خیرات میں تقسیم کر دی۔ حضرت سودہؓ کھالوں سے چمڑا بنایا کرتی تھیں۔ اس کا منافع خیرات کر دیتی تھیں۔

حضرت سودہؓ کو غصہ بہت جلد آ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب کہ ابھی عورتوں کے لیے پردے کا حکم نہیں آیا تھا اور ازواج مطہرات بھی قدیم دستور کے مطابق حوائج ضروری سے فارغ ہونے شہر سے باہر جایا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ راستے میں حضرت عمرؓ مل گئے۔ چوں کہ حضرت سودہؓ کا قد نمایاں تھا۔ انھوں نے پہچان لیا۔ حضرت عمرؓ کو ازواج مطہرات کا باہر نکلنا پسند نہ تھا، اور وہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں پردے کی تحریک کر چکے تھے، اس لیے بولے، سودہؓ، تمھیں ہم نے پہچان لیا۔ حضرت سودہؓ کو یہ سخت ناگوار ہوا۔ حضور ﷺ کے پاس حضرت عمرؓ کی شکایت کی۔ اسی واقعے کے بعد آیت حجاب نازل ہوئی۔

طبیعت میں غصہ ہونے کے باوجود ظرافت اس قدر تھی کہ کبھی کبھی اس انداز چلتی تھیں کہ آپ ﷺ ہنس پڑتے تھے۔ ایک مرتبہ کہنے لگیں کہ کل رات کو میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔ آپ ﷺ نے اس قدر دیر تک رکوع کیا کہ مجھے نکسیر پھوٹنے کا شبہ ہو گیا۔ اس لیے میں دیر تک ناک پکڑے رہی۔ آپ ﷺ ا کی یہ بات سن کر مسکرانے لگے۔

دجّال کے تو نام سے بھی بہت ڈرتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ پاس آئیں۔ دونوں نے مذاق کے لہجے میں کہا، تم نے کچھ سنا؟ بولیں، کیا؟ ک دجال نے خروج کیا ہے۔ حضرت سودہ یہ سن کر گھبرا گئیں ایک خیمہ جس میں کچھ آگ سلگا رہے تھے، قریب تھا۔ فوراً اس کے اندر داخل ہو گئیں۔ حضرت عائشہؓ حفصہؓ ہنستی ہوئی آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچیں اور آپ ﷺ کو اس مذاق بارے میں بتایا۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور خیمے کے دروازے پر کھڑے فرمایا کہ ابھی دجال نہیں آیا ہے۔ یہ سن کر حضرت سودہؓ باہر آئیں تو مکڑی کا جالا بد لگا ہوا تھا۔ اسے باہر آ کر صاف کیا۔

ایک دفعہ جب ازواج مطہرات آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر تھ انھوں نے آپ ﷺ سے سوال کیا کہ ہم میں سب سے پہلے کون مر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں۔ سننے والیوں نے ظا معنی سمجھے۔ ہاتھ ناپے گئے تو سب سے لمبے ہاتھ حضرت سودہؓ کے تھے۔ لیکن حضرت زینبؓ کی وفات ان سے پہلے ہوگئی تو انھیں پتا چلا کہ حضور ﷺ کا ہاتھ لمبائی سے مقصد سخاوت اور فیاضی تھا۔ حضرت سودہؓ کی وفات حضرت عمرؓ کے اخیر خلافت میں بتائی جاتی ہے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت 23 ہجری میں ہوئی، لہٰذا حض سودہؓ کا سن وفات 22 ہجری ہو سکتا ہے۔

حضرت سودہؓ کے بطن سے حضور ﷺ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ پہلے ر حضرت سکرانؓ نے ایک لڑکا یادگار چھوڑا، جس کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ انھوں نے جلولا (فارس) میں شہادت حاصل کی۔

حضرت سودہؓ سے صرف پانچ حدیثیں مروی ہیں، جن میں سے بخاری میں ایک ہے۔ صحابہ کرامؓ میں ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ، یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن اسعد بن نے ان سے روایت کی ہے۔

(3) حضرت عائشہ صدیقہؓ

آنحضرت ﷺ کی شریکِ حیات۔ نام عائشہ، لقب صدیقہ اور حمیرا۔ کنیت عبداللہ جو آپ کی بڑی ہم شیر حضرت اسماء کے صاحب زادے کے نام پر ہے۔ و ہ کا نام زینب تھا۔ اُمّ رومان کنیت تھی اور قبیلہ غنم بن مالک سے تھیں۔

حضرت ابوبکرؓ آپ کی والدہ اُمّ رومان کے دوسرے شوہر تھے اور اس شادی

نتیجے میں آپ اور آپ کے بھائی عبدالرحمٰن پیدا ہوئے۔ آپ بعثت کے چار برس بعد شوال کے مہینے میں پیدا ہوئیں۔ وائل کی بیوی نے دودھ پلایا۔ وائل کے بھائی افلح آپ کے رضاعی چچا کبھی کبھی ملنے آیا کرتے تھے اور رسول کریم ﷺ کی اجازت سے آپ ان کے سامنے آتی تھیں۔ رضاعی بھائی بھی کبھی کبھی ملنے آتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گھرانا اس لحاظ سے انتہائی خوش نصیب ہے کہ اسے سب سے پیش تر اسلام کی روشنی سے منور ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اس بنا پر حضرت عائشہؓ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کے کانوں نے کبھی کفر و شرک کی آواز نہیں سنی۔ خود فرماتی ہیں کہ جب سے مَیں نے اپنے والدین کو پہچانا، انھیں مسلمان پایا۔

غیر معمولی ذہین بچے اپنی ذہانت و فطانت کا اظہار ابتدائی عمر ہی سے کرنے لگتے ہیں اور حضرت عائشہؓ کا شمار بھی ایسے ذہین و فطین بچوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی قوت ادراک اور قدرتی صلاحیت نے آپ کو اپنے ہم عمر بچوں میں منفرد و ممتاز کر دیا تھا۔ اپنی کم سنی میں بھی جب آپ گڑیوں سے کھیلا کرتی تھیں تو آپ کو ہمیشہ انسانی اقدار، وقار، تہذیب اور بڑوں کے ادب آداب کا خیال رہتا تھا۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ جب آپ کھیل میں مصروف ہوتیں تو آنحضور ﷺ ادھر آ نکلتے۔ آپ فوراً احتراماً اپنی گڑیاں چھپا دیتیں اور سہیلیوں کو وہاں سے ہٹا دیتیں۔ اس پر حضور ﷺ، جنھیں بچوں سے بے حد پیار تھا، اس کھیل پر معترض نہ ہوتے اور تمام بچوں کو پھر سے اپنے کھیل میں لگ جانے کی تاکید کرتے۔

حضرت عائشہؓ کو گڑیوں کا کھیل اور جھولا جھولنا بہت پسند تھا۔ ایک مرتبہ جب آپ گڑیوں کے کھیل میں مصروف تھیں، حضور ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا۔ حضور ﷺ نے ان کے کھلونوں میں ایک گھوڑا دیکھا جس کے بازو لگے ہوئے تھے۔ اس پر حضور ﷺ نے عائشہؓ سے پوچھا، کیوں عائشہ، کیا گھوڑے کے بھی پر ہوتے ہیں۔ آپ نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں، کیوں نہیں ہوتے۔ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑے کے بھی پردار بازو تھے۔ حضور ﷺ اس برجستہ اور پُر مزاح جواب سے محظوظ ہوئے اور مسکرانے لگے۔ اس ایک واقعے سے حضرت عائشہؓ کی ذہانت، وجدان اور دینی معلومات پر عبور کا پتا چلتا ہے۔ بچپن میں آپ دبلی پتلی اور کم زور تھیں، لیکن عنفوانِ شباب تک پہنچتے پہنچتے آپ کے جسم پر گوشت چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ آپ کے خدوخال دل کش تھے اور آپ کا رنگ گلابی مائل سفید تھا۔

تمام ازواجِ مطہرات میں یہ شرف صرف حضرت عائشہؓ کو حاصل ہے کہ وہ آنحضرت ﷺ کی کنواری بیوی تھیں۔ حضور ﷺ سے آپ کے نکاح کا واقعہ بھی خاصا دل چسپ ہے۔ حضرت خدیجہؓ کے انتقال کے بعد حضور ﷺ نہایت غم گین اور افسردہ رہنے لگے تھے۔ گھربار کا سارا بوجھ اور بچوں کی دیکھ بھال بھی آپ ﷺ کے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔ آپ کی پریشانی کو محسوس کرتے ہوئے خولہؓ بنت حکیم نے تجویز پیش کی کہ آپ ﷺ عائشہؓ اور سودہؓ میں سے کسی ایک سے نکاح فرما لیں، جس پر حضور ﷺ نے حضرت سودہؓ سے نکاح کرنا منظور کر لیا، اور خولہؓ نے عائشہؓ کے لیے بھی حضور ﷺ کی اجازت حاصل کر لی۔ چنانچہ انھوں نے دونوں جگہ رشتے کا سوال ڈال دیا۔ حضرت سودہؓ سے نکاح فوراً ہو گیا، لیکن عائشہؓ کے ہاں معاملہ کسی قدر پیچیدہ تھا۔ اس وقت حضرت عائشہؓ کی نسبت جُبیر بن مطعم سے قرار پا چکی تھی۔ جُبیر کے گھر والے ابھی تک اپنے موروثی مذہب یعنی کفر پر قائم تھے۔ لہٰذا وہ ایک دین دار مسلمان کی اولاد کو اپنے گھر میں لانا اس لیے مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ اس کی موجودگی سے افرادِ خانہ پر بُرا اثر پڑے گا اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے خود عائشہؓ سے منگنی توڑ دی اور یوں وہ حضور ﷺ سے نکاح کرنے کے لیے آزاد ہو گئیں۔ چنانچہ آپ کا نکاح آنحضور ﷺ سے شوال کے مہینے میں، نبوت کے دسویں سال عمل میں آیا اور اس توہم کا خاتمہ ہوا جو شوال میں شادیاں نہ کرنے کے بارے میں عربوں میں رائج تھا۔ آپ کا مہر پانچ سو درہم مقرر ہوا۔ نکاح کے وقت آپ کی عمر چھے سال تھی، اس لیے آپ کی رخصتی سنِ بلوغ تک مؤخر کر دی گئی۔

یہ نکاح اسلام کی سادگی کی حقیقی تصویر تھا۔ عطیہؓ اس کا واقعہ اس طرح بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہؓ لڑکیوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ ان کی انا آئی اور انھیں لے گئی۔ اور لے جا کر ان کے والد کے سامنے پیش کیا، جنھوں نے ان کا نکاح حضور ﷺ سے کر دیا اور خود ہی نکاح کا خطبہ پڑھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ خود مجھے پتا نہیں چلا کہ میرا نکاح ہو گیا ہے۔ بعد میں جب میری والدہ نے مجھے باہر نکلنے سے منع کیا اور مجھے بتایا کہ اب میرا نکاح ہو گیا ہے، تب مجھے احساس ہوا کہ میں شادی شدہ خاتون ہو گئی ہوں۔

اُس نکاح کے بعد مکہ میں آنحضور ﷺ کا قیام تین سال تک رہا۔ 13 نبوی میں آپ ﷺ نے مدینہ کی جانب ہجرت کی تو حضرت ابوبکرؓ ساتھ تھے اور اہل و عیال کو دشمنوں کے نرغے میں چھوڑ آئے تھے۔ جب مدینہ میں اطمینان ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ بن اریقط کو مکہ بھیجا کہ ان کی زوجہ اُمّ رومانؓ، اور دونوں بیٹیوں اسماؓ اور عائشہؓ کو لے آئیں۔ مدینہ میں آ کر حضرت عائشہؓ سخت بخار میں مبتلا ہوئیں جس کی وجہ سے سر کے بال جھڑ گئے۔ صحت یاب ہونے کے بعد آپ کی والدہ اُمّ رومانؓ کو خیال پیدا ہوا کہ اب آپ کی رخصتی کی رسم سرانجام دے دینی چاہیے۔ ایک روز جب کہ آپ کی عمر نو سال کی تھی، آپ کی والدہ نے آپ کو بلوایا۔ آپ اس وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود میں مصروف تھیں۔ آپ کو ذرا بھی معلوم نہ تھا کہ کیوں طلب کیا گیا ہے۔ آپ کی والدہ نے نہلایا دھلایا۔ بال درست کیے۔ گھر میں لے گئیں۔ کچھ انصار خواتین موجود تھیں۔ انھوں نے آپ کو مبارک باد دی۔ تھوڑی دیر بعد خود آنحضور ﷺ بھی وہاں تشریف لے آئے۔ آپ کا نکاح شوال میں ہوا تھا اور رُخصتی بھی شوال ہی میں ہوئی۔

حضرت عائشہؓ کے نکاح سے عرب کے بعض توہمات کا بھی خاتمہ ہوا، مثلاً:

(1)......عربوں میں منہ بولے بھائی کی لڑکی سے شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی بنا پر جب خولہؓ بنت حکیم نے آنحضور ﷺ کے رشتے کے لیے حضرت ابوبکرؓ

سے ذکر کیا تو انھوں نے یہی فرمایا تھا کہ ''وہ میرے دینی بھائی ہیں۔ کیا یہ جائز ہے۔ عائشہؓ تو رسول اللہ ﷺ کی بھتیجی ہے۔ یہ نکاح کیسے ہو سکتا ہے۔'' اس پر آنحضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اسلام ایسے دینی رشتوں میں شادی کی ممانعت نہیں کرتا۔

(2)......اسی طرح اہل عرب شوال میں شادی نہیں کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی تھی کہ اس ماہ میں، قبل اسلام زبردست طاعون کی وبا پھوٹ پڑی تھی، لیکن آنحضور ﷺ کا نکاح اور رخصتی دونوں اسی مہینے میں پیش آئیں۔

سن پانچ ہجری میں غزوۂ مصطلق میں حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کے ساتھ تھیں۔ غزوے سے واپسی پر راستے میں کہیں حضرت عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا۔ پورے قافلے کو اترنا پڑا۔ اس جگہ پانی نہ تھا اور نہ اہل قافلہ کے پاس پانی تھا۔ لوگوں کو وضو کے لیے سخت پریشانی ہوئی۔ کچھ لوگ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور ان کی بیٹی عائشہؓ کی شکایت کی کہ انھوں نے رسول کریم ﷺ اور صحابہؓ کو ایسی جگہ روک دیا، جہاں پانی میسر نہیں۔ اسی پریشانی میں صبح ہوگئی، کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی پریشانی دور فرماتے ہوئے آیت تیمم نازل فرمائی اور حکم دیا: (سورۂ مائدہ، آیت 6 کا ترجمہ):

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جب تم نماز کے لیے اٹھو تو چاہیے کہ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور پاؤں ٹخنوں تک دھولیا کرو۔ اگر جنابت کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔ اگر بیمار ہو یا سفر کی حالت میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص رفع حاجت کر کے آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمھیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح یعنی تیمم کر لو۔ اللہ تم پر کسی قسم کی تنگی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے، تا کہ تم شکر کرو۔''

صحابہؓ نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تیمم کر کے نمازِ فجر ادا کی۔ تمام صحابہؓ اس آیت کے نزول سے بہت خوش ہوئے۔ حضرت اسید بن حضیرؓ نے جوش مسرّت سے کہا: ''اے آلِ ابوبکر! یہ تم لوگوں کے لیے سرمایۂ برکت ہو۔ تیمم کا حکم تمھاری پہلی برکت نہیں، بلکہ تمھاری برکت سے اور بھی بہت سی سہولتوں اور آسانیوں کے احکام نازل ہو چکے ہیں۔'' اس کے بعد جب روانگی کے لیے حضرت عائشہؓ کے اونٹ کو کھڑا کیا گیا تو ہار اس کے نیچے سے مل گیا۔

واقعہ افک

غزوہ بنی مصطلق ہی میں واقعہ افک پیش آیا۔ اس واقعے کی تفصیل خود حضرت عائشہؓ نے بیان کی ہے۔ اس بیان کا ترجمہ یہاں تفہیم القرآن، جلد سوم سے نقل کیا جاتا ہے بیچ بیچ میں تشریح طلب اُمور قوسین میں بڑھا دیئے گئے ہیں تا کہ جناب عائشہؓ کے تسلسل بیان میں خلل واقع نہ ہو: ''رسول اللہ ﷺ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر پر جانے لگتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپ ﷺ کی بیویوں میں سے کون آپ ﷺ کے ساتھ جائے۔ غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپ کے ساتھ گئی۔ واپسی پر جب ہم مدینے کے قریب تھے، ایک منزل پر رات کے وقت رسول ﷺ نے پڑاؤ کیا، اور ابھی رات کا کچھ حصّہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ میں اٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئی، اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی اور اتنے میں قافلہ روانہ ہو گیا۔ (یہ وہی ہار تھا جس کی وجہ سے آیت تیمم نازل ہوئی تھی) قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے ہودے میں بیٹھ جاتی تھی اور چار آدمی اُسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے۔ ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے سبب سے بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ میرا ہودہ اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہودہ اونٹ پر رکھ کر روانہ ہو گئے۔ میں جب ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جا کر جب یہ لوگ مجھے نہ پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں گے۔ اسی حالت میں مجھے نیند آ گئی۔ صبح کے وقت صفوان بن معطل سلمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے، کیوں کہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے (یہ صاحب بدری صحابہ میں سے تھے۔ انھیں صبح دیر تک سونے کی عادت تھی، اس لیے یہ بھی لشکر گاہ میں کہیں پڑے سوتے رہ گئے تھے اور اب اٹھ کر مدینے جا رہے تھے[1] بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان کے سپرد یہ خدمت کی تھی کہ وہ لوگوں کی روانگی کے بعد آئیں تا کہ اندھیرے میں کسی کی گری پڑی چیز رہ گئی ہو تو وہ لیتے آئیں)۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' رسول اللہ کی بیوی یہیں رہ گئیں۔'' اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ اور مَیں نے اٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ لا کر اپنا اونٹ میرے پاس بٹھا دیا اور الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے قریب ہم نے لشکر کو جا لیا، جب کہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھہرا ہی تھا اور لشکر والوں کو ابھی یہ پتا نہ چلا تھا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں۔ اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتان اٹھا دیئے اور ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن ابی تھا، مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔

(دوسری روایات میں آیا ہے کہ جس وقت صفوان کے اونٹ پر حضرت عائشہؓ لشکر گاہ میں پہنچیں اور معلوم ہوا کہ آپ اس طرح چھوٹ گئی ہیں، اسی وقت عبداللہ بن ابی پکار اُٹھا کہ ''خدا کی قسم یہ بچ کر نہیں آئی ہے۔ لو دیکھو، تمھارے نبی کی بیوی نے رات ایک اور شخص کے ساتھ گزاری اور اب وہ اسے علانیہ لیے چلا آ رہا ہے'')

''مدینے پہنچ کر مَیں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اُڑ رہی تھیں۔ رسول ﷺ کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی، مگر مجھے کچھ پتا نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی، وہ یہ کہ رسول ﷺ کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ ﷺ گھر میں آتے تو بس گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے کیف تیکم (کیسی ہیں یہ؟)۔ خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپ سے اجازت

لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تا کہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں۔

''ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی۔ اس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلا نہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مسطح بن اثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں (دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکرؓ نے اپنے ذمّے لے رکھی تھی، مگر اس احسان کے باوجود مسطح بھی ان لوگوں میں شریک ہو گئے تھے جو حضرت عائشہؓ کے خلاف اس بہتان کو پھیلا رہے تھے)۔ راستے میں انھیں ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا، غارت ہو مسطح۔ مَیں نے کہا، اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو، اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگ بدر میں حصّہ لیا ہے۔ انھوں نے کہا: ''بیٹی، کیا تجھے اس کی باتوں کا کچھ علم نہیں۔'' پھر انھوں نے سارا قصّہ سنایا کہ افترا پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں (منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے، ان میں مسطح، مشہور شاعر اسلام حسان بن ثابت اور حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ بنت جحش کا حصّہ سب سے نمایاں تھا)۔ یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی۔ سیدھی گھر گئی اور رات رو رو کر کاٹی۔''

آگے چل کر حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: ''میرے پیچھے رسول اللہ ﷺ نے علیؓ اور اسامہؓ بن زید کو بلایا اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ اسامہ نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا اور عرض کیا ''یا رسول اللہ، بھلائی کے سوا آپ ﷺ کی بیوی میں کوئی چیز ہم نے نہیں پائی۔ یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے جو اُڑایا جا رہا ہے۔'' رہے علیؓ تو انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ، عورتوں کی کمی نہیں ہے۔ آپ ﷺ اس کی جگہ دوسری بیوی کر سکتے ہیں، اور تحقیق کرنا چاہیں تو خدمت گار لونڈی کو بلا کر حالات دریافت فرمائیں۔'' چنانچہ خدمت گار کو بُلایا گیا اور پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے کہا: ''اس خدا کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، مَیں نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی جس پر حرف رکھا جا سکے۔ بس اتنا عیب ہے کہ میں آٹا گوندھ کر کسی کام کو جاتی ہوں اور کہہ جاتی ہوں کہ بیوی ذرا آٹے کا خیال رکھنا، مگر وہ سو جاتی ہیں اور بکری آ کر آٹا کھا جاتی ہے۔'' اسی روز رسول اللہ ﷺ نے خطبے میں فرمایا: ''مسلمانو، کون ہے جو اس شخص کے حملوں سے میری عزّت بچائے جس نے میرے گھر والوں پر الزامات لگا کر مجھے اذیت پہنچانے کی حد کر دی ہے۔ بخدا مَیں نے نہ تو اپنی بیوی ہی میں کوئی برائی دیکھی ہے، اور نہ اس شخص میں جس کے متعلق تہمت لگائی جاتی ہے۔ وہ تو کبھی میری غیر موجودگی میں میرے گھر آیا بھی نہیں۔'' اس پر اسید بن حضیر (بعض روایات میں سعد بن......) نے اٹھ کر کہا: ''یا رسول اللہ، اگر وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے تو ہم اس کی گردن مار دیں، اور اگر ہمارے بھائی خزرجیوں میں سے ہے تو آپ ﷺ حکم دیں، ہم تعمیل کے لیے حاضر ہیں۔'' یہ سنتے ہی سعد بن عبادہ، رئیس خزرج اٹھ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ''جھوٹ کہتے ہو، تم ہرگز اسے نہیں مار سکتے۔ تم اس کی گردن مارنے کا نام صرف اس لیے لے رہے ہو کہ وہ خزرج میں سے ہے۔ اگر وہ تمھارے قبیلے کا آدمی ہوتا تو تم کبھی یہ نہ کہتے کہ ہم اس کی گردن مار دیں گے۔''

حضرت سعد بن عبادہ اگرچہ نہایت صالح اور مخلص مسلمانوں میں سے تھے، نبی کریم ﷺ سے گہری عقیدت و محبت رکھتے تھے، اور مدینے میں جن لوگوں کے ذریعے سے اسلام پھیلا تھا، ان میں ایک نمایاں شخص وہ بھی تھے، لیکن ان سب خوبیوں کے باوجود ان کے اندر قومی یعنی قبائلی حمیت بہت زیادہ تھی۔ اسی وجہ سے انھوں نے عبداللہ بن ابی کی پشت پناہی کی، کیوں کہ وہ ان کے قبیلے کا آدمی تھا۔ اسی وجہ سے فتح مکہ کے موقع پر ان کی زبان سے یہ فقرہ نکل گیا: ''آج کشت و خون کا دن ہے۔ آج یہاں کی حرمت حلال ہو جائے گی، آج اللہ نے قریش کی ذلت مقدر کر دی ہے۔'' اور اس پر عتاب فرما کر حضور ﷺ نے ان سے لشکر کا جھنڈا واپس لے کر ان کے فرزند قیسؓ بن سعد کو دے دیا تھا۔ پھر آخر کار یہی وہ سبب تھا جس کی وجہ سے انھوں نے حضور ﷺ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں یہ دعویٰ کیا کہ خلافت انصار کا حق ہے، اور جب ان کی بات نہ چلی اور انصار و مہاجرین سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو تنہا وہی ایک تھے، جنھوں نے بیعت سے انکار کر دیا اور مرتے دم تک قریشی خلیفہ کی خلافت تسلیم نہ کی۔

''اسید بن حضیر نے جواب میں کہا: ''تم منافق ہو، اسی لیے منافقوں کی حمایت کرتے ہو۔'' اس پر مسجد نبوی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ منبر پر تشریف رکھتے تھے۔ قریب تھا کہ اوس اور خزرج مسجد ہی میں لڑ پڑتے، مگر رسول اللہ ﷺ نے انھیں ٹھنڈا کیا اور پھر منبر سے اتر آئے۔''

حضرت عائشہؓ نے مزید فرمایا: ''اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اُڑتی رہیں۔ رسول ﷺ سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ مَیں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضور ﷺ تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے۔ اس پوری مدّت میں آپ ﷺ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور اُمّ رومان نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: عائشہ، مجھے تمھارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو اُمید ہے کہ اللہ تمھاری برأت ظاہر فرما دے گا۔ اور اگر واقعی تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو۔ بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے۔ مَیں نے اپنے والد سے عرض کیا، آپ رسول ﷺ کی بات کا جواب دیں۔ انھوں نے فرمایا، بٹی میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ مَیں نے اپنی والدہ سے کہا، آپ ہی کچھ کہیں۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ میں حیران ہوں، کیا کہوں۔ اس پر میں بولی: ''آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں، اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں، تو آپ لوگ نہ مانیں گے۔ اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی

بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی، اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی، تو آپ لوگ مان لیں گے۔ میں نے اس وقت حضرت یعقوبؑ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی، مگر یاد نہ آیا۔ آخر میں نے کہا: اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؑ کے والد نے کہی تھی کہ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ یہ کہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی۔ میں اس وقت اپنے دل میں کہ رہی تھی کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میرے حق میں وحی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کم تر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ میرا یہ گمان تھا کہ رسول ﷺ کوئی خواب دیکھیں گے، جس میں اللہ تعالیٰ میری برات ظاہر فرما دے گا۔ اتنے میں یکا یک حضور ﷺ پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی، حتّٰی کہ سخت جاڑے کے زمانے میں بھی موتی کی طرح آپ ﷺ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہوگئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں ہو نہیں۔ وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ جب یہ کیفیت دور ہوئی تو حضور ﷺ بے حد خوش تھے۔ آپ ﷺ نے ہنستے ہوئے پہلی بات جو فرمائی، وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ، اللہ نے تمھاری برأت نازل فرما دی اور اس کے بعد حضور ﷺ نے دس آیات سنائیں۔ میری والدہ نے کہا کہ اٹھو اور رسول ﷺ کا شکریہ ادا کرو۔ میں نے کہا، میں نہ ان کا شکریہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا، بلکہ اللہ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری برأت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا۔''

وہ گیارہ آیات سورۂ نور کی 11 تا 21 ہیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''جو لوگ یہ بہتان گھڑ لائے ہیں، وہ تمھارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں۔ اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو، بلکہ یہ بھی تمھارے لیے خیر ہی ہے، جس نے اس میں جتنا حصّہ لیا، اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا، اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصّہ اپنے سر لیا، اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے۔ جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا، اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہ دیا کہ یہ صریح بہتان ہے۔''

بہتان گھڑنے والوں کے صرف چند آدمیوں کے نام روایات میں ملتے ہیں جو یہ افواہیں پھیلا رہے تھے۔ عبداللہ بن ابی، زید بن رفاعہ (جو غالباً رفاعہ بن زید یہودی منافق کا بیٹا تھا)، مسطح بن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حمنہ بنت جحش۔ ان میں سے پہلے دو منافق تھے اور باقی تین مومن تھے جو غلطی اور کم زوری سے اس فتنے میں پڑ گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے واقعہ افک جیسے بہتان طرازی کے واقعے کو بھی، جس نے براہ راست آنحضور ﷺ کی عزت و ناموس کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا، خیر کا سبب بنا دیا، جیسا کہ مذکورہ آیت میں آیا ہے: ''اس واقعے کو اپنے حق میں شر نہ سمجھو، بلکہ یہ بھی تمھارے لیے خیر ہی ہے۔'' اس موقع پر ایک طرف حضور ﷺ نے، دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ اور ان کے خاندان والوں نے، اور تیسری طرف عام اہل ایمان نے جو طرزِ عمل اختیار کیا، اس سے یہ بات روز روشن کی طرح ثابت ہوگئی کہ یہ لوگ برائی سے کس قدر پاک، کیسے ضابط و متحمل، کیسے انصاف پسند اور کس درجہ کریم النفس واقع ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ کا ایک اشارہ ان لوگوں کی گردنیں اڑا دینے کے لیے کافی تھا، جنھوں نے آپ ﷺ کی عزت و ناموس پر یہ حملہ کیا تھا، مگر مہینا بھر تک آپ ﷺ صبر سے سب کچھ برداشت کرتے رہے۔

اور جب اللہ کا حکم آ گیا تو صرف ان تین مسلمانوں کو، جن پر جرم قذف ثابت تھا، حد لگوا دی۔ تینوں کو اسّی اسّی دروں کی سزا دی گئی۔ منافقین کو پھر بھی کچھ نہ کہا۔ حضرت ابوبکرؓ کا اپنا رشتہ دار (مسطح بن اثاثہ)، جس کی اور جس کے گھر والوں کی وہ کفالت بھی فرماتے تھے، ان کے دل و دماغ پر یہ تیر چلاتا رہا، مگر اللہ کے اس نیک بندے نے اس پر بھی نہ برادری کا تعلق منقطع کیا، نہ اس کی اور اس کے خاندان کی مدد ہی بند کی۔ ازواجِ مطہرات میں سے کسی نے بھی سوکن کی بدنامی میں ذرّہ برابر حصّہ نہ لیا، بلکہ کسی نے اس پر ادنیٰ درجے میں بھی اپنی رضا اور پسند کا، یا کم از کم قبولیت کا اظہار تک نہ کیا۔ حتّٰی کہ حضرت زینبؓ کی سگی بہن حمنہ محض ان کی خاطر ان کی سوکن کو بدنام کر رہی تھیں، مگر خود انھوں نے سوکن کے حق میں کلمہ خیر ہی کہا۔ حضرت عائشہؓ کی اپنی شرافتِ نفس کا حال یہ تھا کہ حضرت حسان بن ثابتؓ نے انھیں بدنام کرنے میں نمایاں حصّہ لیا، مگر وہ ہمیشہ ان کے ساتھ عزت و تکریم ہی سے پیش آتی رہیں۔ لوگوں نے یاد دلایا کہ یہ تو وہ شخص ہے جس نے آپ کو بدنام کیا تھا، تو یہ جواب دے کر ان کا منہ بند کر دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو دشمنِ اسلام شعرا کو رسول ﷺ اور اسلام کی طرف سے منہ توڑ جواب دیا کرتا تھا۔ یہ تھا ان لوگوں کا حال، جن کا اس معاملے سے براہ راست تعلق تھا۔ اس طرح منافقین جو کچھ چاہتے تھے، نتیجہ اس کے بالکل برعکس نکلا اور مسلمانوں کا اخلاقی تفوق پہلے سے زیادہ نمایاں ہوگیا۔

پھر اس میں خیر کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ یہ واقعہ اسلام کے قوانین احکام اور تمدنی ضوابط میں بڑے اہم اضافوں کا موجب بن گیا۔ اس کی بدولت مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ہدایات حاصل ہوئیں جن پر عمل کر کے مسلم معاشرے کو ہمیشہ کے لیے برائیوں کی پیداوار اور ان کی اشاعت سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے، اور پیدا ہو جائیں تو ان کا بروقت تدارک کیا جا سکتا ہے۔

مزید برآں اس میں خیر کا پہلو یہ بھی تھا کہ تمام مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی کہ رسول ﷺ غیب داں نہیں ہیں۔ جو کچھ اللہ بتاتا ہے، وہی کچھ جانتے ہیں۔ اس کے ماسوا آپ کا علم اتنا ہی کچھ ہے جتنا ایک بشر کا ہو سکتا ہے۔

واقعۂ افک کے سلسلے میں سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کے خلاف بہتان گھڑنے والوں میں بنی امیہ نے حضرت علیؓ کو بھی شامل کیا ہے، حالانکہ حضرت علیؓ کا سرے سے اس فتنے میں کوئی حصّہ نہ تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ انھوں نے جب

حضور ﷺ کو بہت پریشان دیکھا تو حضور ﷺ کے مشورہ لینے پر عرض کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں آپ پر کوئی تنگی تو نہیں رکھی ہے۔ عورتیں بہت ہیں۔ آپ چاہیں تو عائشہؓ کو طلاق دے کر دوسرا نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ حضرت علیؓ نے اس الزام کی تصدیق فرمائی تھی جو حضرت عائشہؓ پر لگایا جا رہا تھا۔ ان کا مقصد صرف آنحضرت ﷺ کی پریشانی کو رفع کرنا تھا۔

ایلا اور تخییر

9 ہجری میں تحریم، ایلا اور تخییر کے واقعات پیش آئے جن کا حضرت عائشہؓ کی زندگی سے گہرا تعلق تھا۔ واقعہ تحریم کی تفصیل حضرت حفصہؓ کے حالات میں آئے گی، البتہ ایلا اور تخییر کے واقعات کی تفصیل یہاں بیان کی جاتی ہے۔

آنحضور ﷺ زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ دو دو مہینے گھر میں آگ نہ جلتی تھی اور تمام افراد خانہ کو بسااوقات فاقہ کشی کی وجہ سے بھوکا پیاسا رہنا پڑتا تھا۔ حضور ﷺ کی تعلیمات اور رفاقت نے اگرچہ ازواج مطہرات کو صابر و شاکر بنا دیا تھا، لیکن بالآخر وہ انسان تھیں اور دنیاوی حالات سے اثر قبول کرنا فطری اور بشری تقاضا تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ اسلامی فتوحات کے سبب مال غنیمت اور خراج کی وجہ سے حکومت کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور اس میں سے معمولی رقم بھی ان کے اخراجات کے لیے اور زندگی کی ضروری احتیاجات کے لیے کافی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ بیچ میں آپ ﷺ تشریف فرما ہیں۔ اردگرد بیویاں بیٹھی ہیں اور حضور ﷺ سے گزارے کے لیے نفقہ میں اضافے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ بھی موجود تھیں۔ لہٰذا ان دونوں حضرات نے اپنی بیٹیوں کو منع کیا کہ وہ حضور ﷺ سے اس سلسلے میں اصرار نہ کریں۔ ان دونوں ازواج مطہرات نے وعدہ کیا کہ وہ آیندہ نفقہ کے بارے میں حضور ﷺ کو مجبور نہیں کریں گی، لیکن دیگر ازواج مطہرات نے ان سے اتفاق نہیں کیا، اور اپنے مطالبے پر قائم رہیں۔

اس صورت حال سے حضور ﷺ نہایت مضطرب ہوئے۔ مزید برآں اسی زمانے میں آپ ﷺ گھوڑے سے گرنے کے باعث ٹانگ میں چوٹ آنے سے اپنا بیشتر وقت بالاخانے میں صرف کرتے (جو ذخیرہ خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا)۔ جب تک حضور ﷺ بالاخانے میں رہتے تھے، آپ کا غلام رباح آستانے پر بیٹھا رہتا تھا۔ آپ ﷺ کھجور کے ایک تنے کے سہارے بالا خانے میں آتے جاتے تھے جس سے آپ ﷺ کو دشواری ہوتی تھی۔ آپ ﷺ کی خلوت پسندی کی وجہ سے لوگوں کو خیال گزرا کہ شاید آپ ﷺ نے بیویوں کو طلاق دے دی ہے۔ اس خیال سے لوگ اُداس تھے اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ایک موقع پر حضرت عمرؓ بالا خانے میں آئے تو گرد و پیش پر ایک نظر ڈال کر رو پڑے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اے ابن خطاب، روتے کیوں ہو؟'' حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر روئے تھے کہ حضور ﷺ کھجور کی ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے اور کھجور کے ریشوں سے آپ ﷺ کے جسم پر بدھیاں پڑ گئی تھیں۔ بالا خانے میں ایک مٹھی جو، کچھ ببول کی پھلیاں اور چمڑے کی کھال کے سوا، جو دیوار پر لٹک رہی تھی اور کچھ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے رونے کا سبب بتایا تو حضور ﷺ نے انھیں دنیا سے بے رغبتی اور زہد کی تلقین فرمائی جس سے انھیں کچھ تسلی ہوئی۔ بعدازاں حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، آپ ﷺ اپنی ازواج کے سلسلے میں کیوں پریشان ہیں؟ اگر آپ ﷺ نے انھیں طلاق دے دی ہے تو اللہ، اس کے فرشتے، یہ ناچیز، ابوبکرؓ اور تمام مسلمان آپ ﷺ کے ساتھ ہیں۔'' حضرت عمرؓ دیر تک آپ سے ہم کلام رہے، حتٰی کہ آپ ﷺ کا غصہ ٹھنڈا ہوا اور آپ ﷺ ہنس پڑے۔ جب حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ کو اس خوش مزاجی کے عالم میں پایا تو انھوں نے یہ ذکر کیا کہ مسلمان مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے طلاقِ ازواج کے سلسلے میں باتیں کر رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، میں نے اپنی ازواج کو طلاق نہیں دی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اجازت چاہی کہ مسلمانوں کو یہ خوش خبری سنا دیں، کیوں کہ وہ ابھی تک مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھے ہوئے کسی نہ کسی فیصلے کے منتظر تھے۔ غرض اجازت ملنے پر وہ مسجد نبوی میں آئے اور پکار کر اعلان کیا کہ آپ ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق نہیں دی ہے۔

حضور ﷺ نے ایک ماہ کی قسم کھائی تھی۔ جب ایلا کی ایک ماہ کی مدت ختم ہوئی تو آنحضور ﷺ گوشۂ تنہائی سے باہر آئے اور پہلے حضرت عائشہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ انھیں شدت سے ایک ماہ کے ختم ہونے کا انتظار تھا، چوں کہ حضور ﷺ 29 روز کے بعد باہر تشریف لائے تھے، اس لیے انھوں نے بے ساختہ فرمایا: ''یارسول اللہ، آپ نے ایک ماہ تنہائی میں رہنے کی قسم کھائی تھی۔''

حضور ﷺ نے جواب دیا: ''بعض اوقات مہینا 29 دن کا بھی ہوتا ہے۔''

اس واقعے سے متصل سورۂ احزاب کا نزول ہوا جس کی آیت 28 اور 29 میں تخییر کا حکم آیا۔ شریعت کی اصطلاح میں تخییر کا مطلب ہے بیوی کو اس امر کا اختیار دینا کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے یا اس سے جدا ہو جانے کے درمیان کسی ایک چیز کا خود فیصلہ کر لے۔ اس آیت کے نزول کے وقت حضور ﷺ کے نکاح میں چار بیویاں تھیں یعنی حضرت سودہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ۔ ابھی حضرت زینبؓ سے حضور ﷺ کا نکاح نہیں ہوا تھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ سے گفتگو کی اور فرمایا: ''میں تم سے ایک بات کہتا ہوں، جواب دینے میں جلدی نہ کرنا۔ اپنے والدین کی رائے لے لو۔ پھر فیصلہ کرو۔'' پھر حضور ﷺ نے انھیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آیا ہے، اور یہ آیات انھیں سنا دیں:

﴿یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ (الاحزاب 33: 28، 29)

''اے نبی ﷺ اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمھیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے

رسول ﷺ اور دار آخرت کی طالب ہوتو جان لوکہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں، اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔''

حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: ''اس معاملہ کو مَیں اپنے والدین سے کیوں پوچھوں۔ مَیں تو اللہ اور اس کے رسول اور دارِ آخرت کو چاہتی ہوں۔'' اس کے بعد حضور ﷺ باقی ازواجِ مطہرات میں سے ایک ایک کے ہاں گئے اور ہر ایک سے یہی بات فرمائی، اور ہر ایک نے وہی جواب دیا جو حضرت عائشہؓ نے دیا تھا۔

حضور ﷺ تیرہ دن بیمار رہنے کے بعد ربیع الاول 11 ہجری کو رحلت فرما گئے، جن میں سے آٹھ دن حضرت عائشہؓ کے حجرے میں اقامت فرمائی۔ خلقِ عمیم کی بنا پر ازواجِ مطہرات سے صاف طور پر تو اجازت طلب نہیں کی، بلکہ پوچھا کہ کل کس کے گھر میں رہوں گا۔ دوسرا دن شنبہ حضرت عائشہؓ کے ہاں قیام فرمانے کا تھا۔ ازواجِ مطہراتؓ نے حضور ﷺ کی مرضی سمجھ کر عرض کی کہ آپ ﷺ جہاں چاہیں، قیام فرمائیں۔ ضعف اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ چلا نہیں جاتا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ دونوں بازو تھام کر بمشکل حضرت عائشہؓ کے حجرے میں لائے۔

وصال سے پانچ روز قبل جمعرات کو حضور ﷺ کو یاد آیا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس کچھ اشرفیاں رکھوائی تھیں۔ دریافت فرمایا کہ عائشہ، وہ اشرفیاں کہاں ہیں؟ کیا محمد ﷺ خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا۔ جاؤ انھیں خدا کی راہ میں خیرات کر دو۔

اپنی زندگی کے آخری دن، بروز دوشنبہ، آپ ﷺ کی طبیعت وقت فجر قدرے بہتر تھی، لیکن جوں جوں دن چڑھتا گیا، آپ ﷺ کو اکثر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تن درستی کی حالت میں حضور ﷺ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیا کو اس دنیا اور دوسری دنیا، دونوں میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا اختیار دیا ہے۔ اب بیماری کی حالت میں آپ ﷺ فرمایا کرتے کہ ان لوگوں کے ساتھ جنھوں نے اللہ تعالیٰ سے عزت پائی۔ اور کبھی یہ فرماتے: اَللّٰھُمَّ الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی رفیقِ اعلیٰ کے بار بار دہرانے سے حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں کہ اب صرف اللہ کی رفاقت مطلوب ہے اور اب آپ ﷺ کا وقتِ رخصت قریب آ گیا ہے۔

آپ ﷺ کی وفات سے قبل حضرت ابوبکرؓ کے صاحب زادے عبدالرحمٰنؓ خدمتِ اقدس میں آئے۔ آپ ﷺ حضرت عائشہؓ کی آغوش میں سر رکھے آرام فرما رہے تھے۔ حضور ﷺ نے ان کے ہاتھ میں مسواک دیکھی۔ حضرت عائشہؓ نے خیال کیا کہ شاید آپ منہ اور دندان مبارک صاف کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے بھائی عبدالرحمٰن سے مسواک لے کر، اپنے دانتوں میں چبا کر حضور ﷺ کو پیش کی۔ آپ ﷺ نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور ایک صحت مند شخص کی مانند مسواک استعمال کی۔ حضرت عائشہؓ یہ بات فخریہ بیان کرتی تھیں کہ تمام ازواجِ مطہرات میں صرف انھیں یہ اعزاز حاصل ہوا کہ حضور ﷺ نے آخر وقت میں بھی میرا جھوٹا اپنے منہ میں لگایا۔

اب وفات کا وقت قریب آ رہا تھا۔ نزع کی کیفیت طاری تھی۔ حضرت عائشہؓ آپ کو سنبھالے بیٹھی تھیں کہ دفعتہً بدن کا بوجھ محسوس ہوا۔ دیکھا تو آنکھیں پھٹ کر چھت سے لگ گئی تھیں اور روح پاک عالم بالا میں پرواز کر گئی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے آہستہ سے سرِ اقدس تکیے پر رکھ دیا اور رونے لگیں۔

حضرت عائشہؓ کے منفرد اعزازات میں، سب سے زرین باب یہ ہے کہ ان کے حجرے کو آنحضرت ﷺ کا مدفن بننا نصیب ہوا۔ حضور ﷺ کے انتقال کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر تقریباً 25 سال تھی۔ چوں کہ وحی الٰہی کے بموجب ازواج کا عقد ثانی ممنوع تھا، اس لیے آپ کی عمر کے بقیہ 48 سال بیوگی کی زندگی میں بسر ہوئے۔ اس دوران میں آپؓ قرآن مجید اور حدیث کا درس دیتی رہیں۔

رسولِ کریم ﷺ کے وصال کے تقریباً دو سال بعد 13 ہجری میں حضرت ابوبکر صدیقؓ بھی اللہ کو پیارے ہوئے۔ اس وقت حضرت عائشہؓ پدرانہ شفقت سے محروم ہو گئیں۔

حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپؓ حضرت عائشہؓ کا بے حد احترام کرتے، جس کا اعتراف خود حضرت عائشہؓ نے ان الفاظ میں فرمایا: ''ابن خطاب نے مجھ پر بے شمار احسانات کیے ہیں، خصوصاً حضور ﷺ کے انتقال کے بعد۔'' حضرت عمرؓ نے ازواجِ مطہرات کے لیے دس ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا، لیکن حضرت عائشہؓ کے لیے بارہ ہزار درہم مقرر کیے اور اس کی وجہ ان کا رسول ﷺ سے انتہائی قرب تھا۔

جب حضرت عثمانؓ مدینہ میں شہید کر دیے گئے تو اس وقت حضرت عائشہؓ مکہ میں مقیم تھیں۔ حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ نے مدینہ سے جا کر انھیں واقعات سے آگاہ کیا تو دعوتِ اصلاح کے لیے بصرہ گئیں اور وہاں حضرت علیؓ سے جنگ پیش آئی جو ''جنگ جمل'' کے نام سے مشہور ہے۔ جمل اونٹ کو کہتے ہیں، چوں کہ حضرت عائشہؓ ایک اونٹ پر سوار تھیں، اور اس نے اس جنگ میں بڑی اہمیت حاصل کی تھی، اس لیے یہ جنگ بھی اسی کی نسبت سے مشہور ہو گئی۔ یہ جنگ اگرچہ بالکل اتفاقی طور پر پیش آ گئی تھی، تاہم حضرت عائشہؓ کو اس کا ہمیشہ افسوس رہا۔

اپنی وفات سے پیش تر حضرت عائشہؓ نے اپنی اس غلطی کے اعتراف کے طور پر وصیت کی تھی کہ چوں کہ وہ حضرت علیؓ کے مقابلے پر صف آرا ہوئیں اور حضور ﷺ کی وفات کے بعد گھر سے نکلیں، لہٰذا انھیں حضور ﷺ کے روضہ مبارک میں دفن نہ کیا جائے، بلکہ عام قبرستان میں اُمہات المومنین کے برابر جگہ دے دی جائے۔ جب وہ سورۂ احزاب کی یہ آیت پڑھتی تھیں: ''وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ'' (اے نبی کی بیویو، تم اپنے اپنے گھروں میں وقار اور عظمت کے ساتھ بیٹھی رہو) تو اس قدر روتی تھیں کہ آنچل تر ہو جاتا تھا۔

حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت کے اخیر زمانے میں 17 رمضان المبارک 58 ہجری کو 73 سال کی عمر میں آپؓ کا وصال ہوا۔ آپؓ کی وصیت کے مطابق آپ کو جنت البقیع میں رات کے وقت سپرد خاک کیا گیا۔ قاسم بن محمد، عبداللہ بن عبدالرحمٰنؓ

عبداللہ بن ابی عتیقؒ، عروہ بن زبیرؒ اور عبداللہ بن زبیرؓ نے قبر میں اتارا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے، جو اس وقت مروان بن حکم کی طرف سے مدینہ کے حاکم تھے، نماز جنازہ پڑھائی۔

حضرت عائشہؓ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ابن العربی نے لکھا ہے کہ ایک ناتمام بچہ ساقط ہوا تھا۔ حضرت عائشہؓ کی کنیت اُم عبداللہ تھی جو ان کے بھتیجے عبداللہ بن زبیرؓ کے تعلق سے تھی، جنھیں انھوں نے متبنیٰ بنایا تھا۔

حضرت عائشہؓ عقلیت پسندی کی زبردست علَم بردار تھیں۔ مذہبی امور کے پیچیدہ مسائل کو سلجھانے اور شریعت وسنتِ رسول کے معاملات میں آپؓ کا زبردست مرتبہ و مقام ہے اور اس لحاظ سے آپؓ کو فقیہ اور ماہرِ قانون کا درجہ حاصل ہے۔ علمی لحاظ سے آپ کو نہ صرف عورتوں پر، نہ صرف دوسری امہات المومنین پر، نہ صرف خاص خاص صحابیوں پر، بلکہ باستثنائے چند تمام صحابہ کرامؓ پر فوقیت حاصل تھی۔ حضور ﷺ کی گھریلو زندگی کی تفصیلات ہم تک پہنچانے میں حضرت عائشہؓ کا کردار بھی سب سے زیادہ اوراہم ہے۔

جامع ترمذی میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے: ''ہم کو کبھی کوئی ایسی مشکل بات پیش نہیں آئی جسے ہم نے عائشہؓ سے پوچھا ہو اور ان کے پاس اس کے متعلق کچھ معلومات نہ ملی ہوں۔''

امام زہری جو سرخیل تابعین تھے، فرماتے ہیں: ''عائشہؓ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عالم تھیں۔ بڑے بڑے اکابر صحابہؓ اُن سے مسئلے پوچھا کرتے تھے۔''

حضرت عروہ بن زبیرؒ کا قول ہے: ''قرآن، فرائض، حلال وحرام، فقہ، شاعری، طب، عرب کی تاریخ، سلسلۂ نسب اور حرام وحلال کے بارے میں مسائل پر پورا عبور حاصل تھا۔''

امام زہری ایک جگہ ان کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں: ''اگر تمام مردوں کا اور اُمہات المومنین کا علم ایک جگہ جمع کیا جائے تو حضرت عائشہؓ کا علم وسیع تر ہوگا۔''

حضرت عائشہؓ کا شمار مجتہدین صحابہؓ میں ہے، اور اس حیثیت سے وہ اس قدر بلند پایہ ہیں کہ بے تکلف ان کا نام حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فتوے دیتی تھیں۔ اکابر صحابہؓ پر انھوں نے جو دقیق اعتراضات کیے ہیں، انھیں علامہ سیوطی نے ایک رسالے میں جمع کر دیا ہے۔ اس رسالے کا نام ''عین الاصابہ فی ما استدرکتہ عائشہؓ علی الصحابہ'' ہے۔

حضرت عائشہؓ سے 2210 احادیث مروی ہیں، جن میں سے 174 حدیثوں پر خلفائے راشدین نے اتفاق کیا ہے۔ امام بخاری نے آپؓ سے 54 احادیث اور امام مسلم نے 68 احادیث منقول کی ہیں، بلکہ کچھ حضرات کا یہاں تک کہنا ہے کہ احکامِ شریعت کے چوتھائی فیصلے حضرت عائشہؓ کے مرہونِ منت ہیں۔

علم کلام کے متعدد مسائل ان کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔ چنانچہ وجود باری تعالیٰ، علم غیب، عصمت انبیا، معراج، ترتیب خلافت، سمع الموتہ وغیرہ کے متعلق انھوں نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں، انصاف یہ ہے کہ ان میں ان کی دقت نظر کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔

علم اسرارِ دین کے متعلق بھی ان سے بہت سے مسائل مروی ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کی ترتیب نزول، مدینہ میں اسلام کی کامیابی کے اسباب، غسل جمعہ، نماز قصر کی علت، صوم عاشورہ کا سبب، حج کی حقیقت اور ہجرت کے مفہوم ومقصود کی انھوں نے خاص تشریحیں کی ہیں۔

طب کے متعلق وہی عام معلومات تھیں، جو گھر کی عورتوں کو عام طور پر ہوتی ہیں۔ البتہ تاریخ عرب میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت کے حالات، عربوں کے رسم ورواج، ان کے انساب اور ان کے طرزِ معاشرت کے متعلق انھوں نے بعض ایسی باتیں بیان کی ہیں جو دوسری جگہ نہیں مل سکتیں۔ اسلامی تاریخ کے متعلق بھی بعض اہم واقعات ان سے منقول ہیں، مثلاً آغازِ وحی کی کیفیت، ہجرت کے واقعات، واقعہ افک، نزولِ قرآن اور اس کی ترتیب، نماز کی صورتیں، آنحضور ﷺ کے مرض الموت کے حالات، غزوۂ بدر، اُحد، خندق، قریظہ کے واقعات، غزوہ ذات الرقاع میں نماز خوف کی کیفیت، فتح مکہ میں عورتوں کی بیعت، حجۃ الوداع کے ضروری حالات، آنحضور ﷺ کے اخلاق وعادات، حضرت ابوبکرؓ کی خلافت، حضرت فاطمہؓ اور ازواج مطہرات کا دعویٰ میراث، حضرت علیؓ کا ملال خاطر اور بیعت کے تمام مفصل حالات حضرت عائشہؓ کے ذریعے ہی سے ہم تک پہنچے ہیں۔

آنحضور ﷺ کی وفات کے بعد کچھ صحابہ کرامؓ نے اختلافی مسائل کو اٹھایا اور انھیں الٰہیات کی روشنی میں منطقی دلائل سے حل کرنے کی کوشش کی۔ حضرت عائشہؓ نے اس بارے میں اہم کردار ادا کیا اور انھیں عقلی دلائل سے ایسا عام فہم بنایا کہ معمولی سوجھ بوجھ کا آدمی بھی آسانی سے قبول کر سکتا تھا۔ مثال کے طور پر آپ کا عقیدہ تھا کہ مردہ شخص سے ہم کلام ہونا ممکن نہیں۔ اس کا سبب وہ روایت تھی جسے سمع الموتہ کہا جاتا ہے اور اس کا ماخذ حضور ﷺ سے منسوب یہ واقعہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے جنگ بدر کے دوران میں کفار مکہ کی لاشوں سے خطاب کرتے ہوئے ان سے پوچھا تھا کہ ''کیا تم نے دیکھ لیا کس طرح تمھارے رب نے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا۔'' اس پر حضرت عمرؓ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا: ''یارسول اللہ، کیا آپ ﷺ ان مُردوں سے بھی گفتگو کر سکتے ہیں جو ہماری باتیں نہیں سن سکتے۔'' اس روایت کی بنیاد اس نظریے پر تھی کہ آیا مُردوں میں سماعت کی اہلیت ہوتی ہے، لیکن حضرت عائشہؓ نے یہ روایت قبول کرنے سے انکار کیا اور اپنے انکار کے جواز میں قرآنی آیت پیش کی:

''دیکھو تم مُردوں سے کلام نہیں کر سکتے۔'' (نمل۔ آیت 80)

یا ''تم کیسے انھیں اپنی بات سنا سکتے ہو جو کہ قبر میں چلے گئے۔'' (فاطر:22)

اسی طرح حضرت عائشہؓ نے اس نظریے کو بھی غلط قرار دیا کہ اعزہ واقربا کی سینہ کوبی اور ماتم گساری سے ان کے مُردہ عزیز کو سزا ملتی ہے، اور اپنے خیال کی تائید میں سورۂ فاطر کی آیت 18 پیش کی۔

ترجمہ: ''اور کوئی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا، اور کوئی بوجھ میں دبا ہوا اپنا بوجھ بٹانے کو کسی کو بلائے تو کوئی اس میں سے کچھ نہ اٹھائے گا، اگرچہ قرابت دار ہی ہو۔''

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کو آیندہ پیش آنے والے واقعات کا علم ہو جاتا تھا نیز آپ ﷺ علم الغیب بھی رکھتے تھے۔ حضرت عائشہؓ نے اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ جو شخص بھی اس بات کا اظہار کرے کہ حضور ﷺ کو مستقبل کے حالات کا علم ہے تو وہ غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ آیاتِ قرآنی میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ تمام آسمانوں اور زمین کی مخلوقات کو آیندہ کا کچھ علم نہیں، ماسوائے اس ذات کے جو ان کی خالق ہے (سورہ نمل۔ آیت 5)

ایک دوسری آیت کا مطلب ہے: ''کسی شخص کو پتا نہیں کہ اللہ کل کیا کرنے والا ہے۔''

حضرت عائشہؓ کی عقلیت پسندی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ قرآن مجید پر ایمان اور کامل عبور رکھتی تھیں اور تمام نزاعی اُمور کا تصفیہ اسی کی روشنی میں کرتی تھیں، اگرچہ وہ اس امر سے بے خبر نہ تھیں کہ بعض خصوصی وہنگامی حالات میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کو، موقع کی مناسبت سے پیشگی اطلاع دیتا رہا ہے۔

حضرت عائشہؓ ایک نہایت دانا اور زیرک خاتون تھیں اور ہمیشہ علم وعرفان کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھیں اور اپنے شوق کی تشنگی بجھانے کے لیے آپ حضور ﷺ سے مشکل مسائل، ناقابل فہم معاملات اور پیچیدہ اُمور پر سوالات کرنے یا بحث کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتی تھیں اور جب تک آپ کی تشفی نہ ہو جاتی، آپ برابر پوچھتی رہتی تھیں (بخاری)۔ آنحضور ﷺ ہمیشہ نہایت خنداں پیشانی سے آپ کے سوالات کا جواب دیتے، تا آں کہ آپ کی تسلی وتشفی ہو جائے۔ اس کا مقصد نہ صرف حضرت عائشہؓ کی معلومات میں اضافہ کرنا مقصود ہوتا بلکہ اس سے دوسری خواتین تک ان احکامات اور اُمور کا پہنچانا مقصود ہوتا۔

حضرت عائشہؓ کا طرز زیست نہایت سادہ اور راحت وآسائش سے، بہت دُور تھا۔ آپ کی منگنی اور نکاح دونوں سادگی کا مثالی نمونہ تھے جس میں کوئی نام ونمود، دکھاوا اور تصنع نہ تھا۔

آپ ﷺ کی رہائش جس حجرے میں تھی، وہ مختصر اور مٹی کی دیواروں سے بنا ہوا تھا، جسے اوپر سایے کے لیے اوپر سے کھجور کے پتوں اور شاخوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ بارش سے بچانے کے لیے اس کے اوپر ایک چادر پھیلائی گئی تھی۔ کمرے کا سائز کوئی چھے یا سات مربع فٹ ہوگا اور چھت کی اونچائی انسانی قد کے برابر تھی۔ اس کمرے میں صرف ایک کواڑ والا دروازہ تھا جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔

آپؓ کی اشیائے صرف میں ایک چٹائی، بستر، پلنگ، ایک تکیہ جس میں چھال بھری تھی، اور دو برتن جس میں آٹا اور کھجور رہتی تھیں اور پانی کا برتن اور پانی پینے کا ایک پیالہ، یہی کل کائنات تھی (سیرت عائشہؓ۔ مصنفہ سید سلیمان ندوی)

اس حجرے کے مکینوں کو اکثر وبیش تر چراغ جلانے کا تیل بھی میسّر نہ تھا اور چالیس روز تک روشنی کے بغیر اندھیرے میں گزر جاتے تھے۔ ان کے یہاں گھر کا کام کاج بہت ہی مختصر تھا، کیوں کہ اکثر اوقات کھانا پکانے کی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

حضرت عائشہؓ کے قول کے مطابق، حضور ﷺ کے اہل خانہ کو پیٹ بھر کھانا بمشکل میسّر آتا اور مہینوں گھر میں چولھا جلانے کی نوبت نہیں آتی تھی اور ہماری گزر اوقات کھجوروں اور پانی پر ہوتی تھی۔

اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ مملکت اسلامیہ میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوا، لیکن حضور ﷺ اور ان کے اہل خاندان کی ساری عمر عُسرت میں بسر ہوئی، اور جس روز حضور ﷺ کا وصال ہوا، اس روز حضرت عائشہؓ کے ہاں اس روز کا کھانا بھی موجود نہ تھا (ترمذی)۔

خلفائے راشدین کے زمانے میں حضرت عائشہؓ کو بیت المال سے بارہ ہزار درہم وظیفہ ملنے لگا تھا، لیکن آپؓ وہ تمام رقم اسی روز تقسیم کر دیا کرتی تھیں اور شام تک آپؓ کے پاس اپنے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہتا تھا۔ اس کی وجہ حضور ﷺ کا وہ فرمان تھا کہ انسان کو اپنی ضروریات ترک کر کے دوسروں کی مدد کرنا چاہیے۔ یہ آپ ﷺ ہی کی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ حضرت عائشہؓ کی زندگی انتہائی سادہ اور آسائشات سے مبرا تھی۔ آپؓ کا لباس سادہ ہوتا تھا۔ آپؓ کو سرخ لباس پسند تھا جس پر ایک کالی چادر اوڑھتی تھیں۔ آپؓ نے قناعت کی وجہ سے ہمیشہ اپنے استعمال کے لیے ایک ہی جوڑا پسند فرمایا۔

حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے بعد خطابت میں حضرت عائشہؓ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ جنگ جمل کے دوران میں آپؓ کی تقریریں نہایت پُرزور، پُراثر، اچھوتی اور نہایت شان دار ثابت ہوئیں۔ مثلاً ایک تقریر میں فرمایا:

''لوگو! خاموش، خاموش! تم پر میرا مادری حق ہے کہ میری بات غور سے سنو۔ مجھے نصیحت کرنے کی عزت حاصل ہے۔ سوائے اس شخص کے جو اللہ کا فرماں بردار نہیں ہے، کسی کو مجھ پر کوئی الزام دینے کی جسارت نہیں ہو سکتی۔ آنحضرت ﷺ نے وفات پائی تو ان کا سر میرے سر پر تھا۔ میں آپ ﷺ کی محبوب ترین زوجہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دوسروں سے ہر طرح محفوظ رکھا۔ میری ذات سے مومن ومنافق میں تمیز ہوئی، اور میرے ہی سبب سے تم پر اللہ نے تیمّم کی فضیلت عطا کی۔

''پھر میرا باپ دنیا میں تیسرا مسلمان ہے، اور غار حرا میں دو کا دوسرا تھا اور پہلا شخص تھا جو صدیق کے لقب سے مخاطب ہوا۔ آنحضور ﷺ نے اس سے خوش ہو کر، اپنی وفات سے پیش تر آپ کو اپنی جانشینی سے نوازا۔ اس کے بعد جب مذہب اسلام کی رسی ہلنے ڈولنے لگی تو میرا ہی باپ تھا جس نے اس کے دونوں سرے تھام لیے، جس نے نفاق کی باگ روک دی، جس نے ارتداد کا سرچشمہ خشک کر دیا، جس نے یہودیوں کی آتش افروزی سرد کی۔ تم لوگ اس وقت آنکھیں بند کیے غدر وفتنہ کے منتظر تھے اور شور وغوغا پر گوش برآواز تھے۔ اس نے شگاف برابر کیا۔ بیکار کو درست کیا۔ گرتوں کو سنبھالا۔ دلوں کی مدفون بیماریوں کو دور کیا۔ جو پانی سے سیراب ہو چکے تھے، انھیں تھان تک پہنچایا۔ جو پیاسے تھے، انھیں گھاٹ پر لے آیا، اور جو ایک بار پانی پی چکے تھے،

دوبارہ بلایا۔ جب وہ نفاق کا سر کچل چکا اور اہل شرک کے لیے آتش جنگ مشتعل کر چکا اور تمھارے سامان کی گٹھڑی کو ڈوری سے باندھ چکا تو اللہ نے اسے اٹھالیا......
ہاں میں سوال کا نشانہ بن گئی ہوں کہ کیوں فوج لے کر نکلی؟ میرا مقصد اس سے کی تلاش اور فتنہ وفساد کی جستجو نہیں ہے جسے میں پامال کرنا چاہتی ہوں۔ جو کچھ کہ رہی ہوں، صداقت اور انصاف کے ساتھ تنبیہ اور اتمام حجت کے لیے۔''

حضرت عائشہؓ اگرچہ شعر نہیں کہتی تھیں، تاہم شعر کا ذوق اس قدر عمدہ پایا تھا کہ حضرت حسانؓ بن ثابت، جو عرب کے مسلم الثبوت شاعر تھے، ان کی خدمت میں اپنا کلام سنانے کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کو کعب بن مالک کا پورا قصیدہ یاد تھا۔ اس قصیدے میں کم وبیش چالیس شعر تھے۔ کعب کے علاوہ انھیں دیگر جاہلی اور اسلامی شعرا کے اشعار بھی بکثرت یاد تھے، جنھیں وہ مناسب موقعوں پر پڑھا کرتی تھیں۔ چنانچہ وہ احادیث کی کتابوں میں منقول ہیں۔

حضرت عائشہؓ نہ صرف علوم کی ماہر تھیں، بلکہ دوسروں کو بھی ماہر بنا دیتی تھیں، چنانچہ ان کے دامن تربیت میں جو لوگ پرورش پا کر نکلے، اگرچہ ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے، لیکن ان میں جنھیں زیادہ قرب واختصاص حاصل تھا، وہ حسب ذیل ہیں:

عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن، مسروق، عمرۃ، صفیہ بنت شیبہ، عائشہ بنت طلحہ، معاویہ عرویہ۔

نہایت متقی اور عبادت گزار تھیں۔ چاشت کی نماز برابر پڑھتیں۔ فرماتی تھیں کہ اگر میرا باپ بھی قبر سے اٹھ آئے اور مجھے منع کرے، تب بھی میں باز نہ آؤں گی۔ آنحضرت کے ساتھ راتوں کو اٹھ کر تہجد کی نماز ادا کرتی تھیں اور اس کی اس قدر پابند تھیں کہ آنحضرت ﷺ کے بعد جب کبھی یہ نماز قضا ہو جاتی تو نمازِ فجر سے پہلے اٹھ کر پڑھ لیتی تھیں۔ رمضان میں تراویح کا خاص اہتمام کرتی تھیں۔ ان کا غلام ذکوان امامت کرتا، اور وہ مقتدی ہوتیں۔ اکثر روزے رکھا کرتی تھیں۔ حج کی بھی سخت پابند تھیں اور ہر سال یہ فریضہ ادا کرتی تھیں۔ غلاموں پر شفقت کرتیں اور خرید کر آزاد کرتی تھیں۔ ان کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد 67 ہے۔

حضور ﷺ کے وصال کے وقت آپ کی عمر 25 سال تھی اور آپؓ نے بیوگی کے 48 سال گزارے۔ اس دوران میں چاروں خلفائے راشدین کے عہد حکومت دیکھے۔ حضرت عمرؓ آپؓ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ آپؓ نے نہ صرف وظیفے میں اضافہ فرمادیا تھا، بلکہ آپ کو دوسری ازواج مطہرات کے مقابلے میں ترجیح دیتے تھے۔ عراق کی فتح کے بعد مال غنیمت میں دیگر سامان کے ساتھ ایک ڈبہ بھی تھا جس میں موتی بھرے ہوئے تھے۔ آپ نے عوام سے منظوری لے کر وہ ڈبا حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بھجوادیا، جس پر آپؓ نے مسرت وخوشی کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں اور خلیفہ ثانی کے لیے دعائیہ کلمات میں فرمایا: ''ابن خطاب نے میرے ساتھ بے حد احسانات کیے ہیں اور اب پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، لہٰذا میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اب مزید احسانات کا بوجھ اٹھانے کے لیے زندہ نہ رکھے اور اپنے پاس بلا لے۔''

(4) حضرت حفصہؓ

حفصہؓ نام۔ حضرت عمر فاروقؓ کی صاحب زادی۔ والدہ کا اسم گرامی زینب بنت مظعون جو مشہور صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون کی ہم شیر تھیں اور خود بھی صحابیہ تھیں۔ آپ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ سگے بہن بھائی ہیں۔ آنحضور ﷺ کی نبوت سے پانچ سال پیش تر پیدا ہوئیں۔ اس وقت قریش خانہ کعبہ کی تعمیر میں مصروف تھے۔

آپ کا پہلا نکاح خنیسؓ بن خذافہ سے ہوا جو قبیلہ بنو سہم سے تھے۔ آپ کا قبول اسلام کا زمانہ وہی ہے جب ان کے والد حضرت عمرؓ، والدہ حضرت زینب اور ان کے شوہر نے اسلام قبول کیا تھا۔ شوہر کے ساتھ مدینے کو ہجرت کی۔ آپ کے شوہر حضرت خنیسؓ نے غزوۂ بدر میں شرکت کی۔ زخمی ہوئے اور واپس مدینہ آ کر زخموں ہی کی وجہ سے شہادت پائی۔

عدت پوری ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی بیٹی کے نکاح ثانی کی فکر ہوئی، جو اس وقت 19 برس کی تھیں۔ اسی زمانے میں حضرت رُقیہ کا انتقال ہوا تھا جو حضور ﷺ کی دختر اور حضرت عثمانؓ کی اہلیہ تھیں۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ پہلے حضرت عثمانؓ سے ملے اور ان سے حضرت حفصہؓ کے نکاح کی خواہش کی۔ انھوں نے کہا، مَیں اس پر غور کروں گا، چند دن کے بعد ملاقات ہوئی تو صاف انکار کر دیا۔ تب حضرت عمرؓ نے مایوس ہو کر حضرت ابو بکرؓ سے ذکر کیا۔ انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ حضرت عمرؓ کو ان کی بے التفاتی سے رنج ہوا۔ بعد ازاں آنحضور ﷺ نے از خود حضرت حفصہؓ سے نکاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ نکاح ہو جانے کے بعد حضرت ابو بکرؓ جب حضرت عمرؓ سے ملے تو انھوں نے بتایا کہ تم نے مجھ سے حفصہؓ کے نکاح کی خواہش کی اور میں خاموش رہا تو تمھیں ناگوار گزرا تھا، لیکن مَیں نے اسی بنا پر خاموشی اختیار کر لی تھی کہ رسول اللہ نے ان کا ذکر کیا تھا، میں ان کا راز فاش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر حضور ﷺ کا ان سے نکاح کا قصد نہ ہوتا تو میں اس کے لیے آمادہ تھا۔

حضرت حفصہؓ کو جلد غصہ آ جاتا تھا اور آپ ترکی بہ ترکی جواب دیا کرتی تھیں، جس کا مظاہرہ اکثر وبیش تر بحث مباحثوں کے دوران میں نظر آتا تھا۔ ان کی یہ روش قبل اسلام کے دور کی روایات سے مختلف تھی، جب کہ خواتین کا حجت کرنا یا معقولیت پسندی کی بات کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آپ بسا اوقات آنحضور ﷺ سے بھی دو بدو گفتگو کرتیں اور برابر کا جواب دیتی تھیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں خود حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ ''ہم لوگ جاہلیت میں عورتوں کو ذرّہ برابر بھی وقعت نہ دیتے تھے۔ اسلام نے انھیں درجہ دیا اور قرآن میں ان کے متعلق آیات اُتریں تو ان کی قدر ومنزلت معلوم ہوئی۔ ایک دن میری بیوی نے کسی معاملے میں مجھے رائے دی۔ مَیں نے کہا: ''تمھیں رائے ومشورہ سے کیا تعلق؟'' بولیں: ''ابن خطاب، تمھیں ذرا سی بات کی برداشت نہیں، حالانکہ تمھاری بیٹی آنحضور ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہے، یہاں تک کہ حضور ﷺ پورا پورا دن رنجیدہ رہتے ہیں۔'' اس پر میں اُٹھا اور حفصہؓ کے پاس آیا۔ مَیں نے کہا، بیٹی مَیں نے سنا ہے، تم رسول ﷺ کو برابر کا جواب دیتی ہو۔

بولیں: ''ہاں''، میں نے کہا: ''خبردار، میں تمھیں عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں۔ تم عائشہؓ کی ریس نہ کرو، جو حضور ﷺ کی زیادہ محبوب اور چہیتی زوجہ ہونے کی وجہ سے زیادہ حق دار ہیں۔''

ایک دفعہ حضرت صفیہؓ رو رہی تھیں۔ حضور ﷺ تشریف لائے اور رونے کی وجہ پوچھی۔ انھوں نے کہا: ''مجھے حفصہؓ نے کہا کہ تم یہودی کی بیٹی ہو۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''حفصہؓ، خدا سے ڈرو۔'' پھر حضرت صفیہؓ سے ارشاد ہوا: ''تم نبی کی بیٹی ہو۔ تمھارا چچا پیغمبر ہے اور تمھارا شوہر پیغمبر ہے۔ حفصہؓ تم پر کس بات پر فخر کر سکتی ہے'' (اس روایت میں حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰؑ کی طرف اشارہ ہے)۔

مزاج کی تندی کے باوجود حضرت حفصہؓ نہایت مہذب اور زیرک خاتون تھیں اور اپنے عظیم شوہر کی پوری اطاعت کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے حضور ﷺ کے آرام کی خاطر نرم بستر بچھا دیا جس پر حضور ﷺ ساری رات سوئے رہے۔ اٹھنے پر حضرت حفصہؓ سے فرمایا کہ تم میرے بستر کو اتنا نرم نہ بناؤ کہ میں پوری رات سویا رہوں اور میری نماز تہجد قضا ہو جائے۔

واقعہ تحریم

آنحضور ﷺ کی دوسری زوجین سے حضرت حفصہؓ کے مراسم نہایت خوش گوار تھے، خصوصاً حضرت عائشہؓ سے بہت راز داری اور قربت تھی، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دو مقتدر صحابہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی بیٹیاں تھیں، اس لحاظ سے دونوں کے مدارج دوسری ازواج مطہرات کے مقابلے میں زیادہ تھے، اور اس اعتبار سے دونوں میں ہم خیالی اور ہم آہنگی بھی مقابلۃً زیادہ تھی۔ لیکن ازواج مطہرات کے مابین کبھی کبھی ازروئے فطرت رشک و رقابت کا اظہار ہوتا تھا جس کی ایک مثال واقعہ تحریم ہے۔ متعدد کتب حدیث میں خود حضرت عائشہؓ سے یہ واقعہ جس طرح نقل ہوا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کریم ﷺ بالعموم ہر روز عصر کے بعد تمام ازواج مطہرات کے ہاں چکر لگاتے تھے۔ ایک موقع پر ایسا ہوا کہ آپ ﷺ حضرت زینبؓ بنت جحش کے ہاں جا کر زیادہ دیر تک بیٹھنے لگے، کیوں کہ ان کے ہاں کہیں سے شہد آیا ہوا تھا اور حضور ﷺ کو شیرینی بہت پسند تھی، اس لیے آپ ﷺ ان کے ہاں شہد کا شربت نوش فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ مجھے اس پر رشک لاحق ہوا اور میں نے حضرت حفصہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت صفیہؓ سے مل کر یہ طے کیا کہ ہم میں سے جس کے پاس بھی آپ ﷺ آئیں، وہ آپ ﷺ سے یہ کہے کہ آپ ﷺ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے۔ مغافیر ایک قسم کا پھول ہوتا ہے جس میں کچھ بساند ہوتی ہے، اور اگر شہد کی مکھی اس سے شہد حاصل کرے تو اس کے اندر بھی اس بساند کا اثر آ جاتا ہے۔ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ حضور ﷺ نہایت نفاست پسند ہیں اور آپ ﷺ کو اس سے سخت نفرت ہے کہ آپ ﷺ کے اندر کسی قسم کی بدبو پائی جائے۔ اس لیے آپ ﷺ کو حضرت زینبؓ کے ہاں ٹھہرنے سے روکنے کی خاطر یہ تدبیر کی گئی اور یہ کارگر ہوئی۔ جب متعدد بیویوں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے تو آپ ﷺ نے عہد کر لیا کہ اب یہ شہد استعمال نہیں فرمائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اب میں ہرگز اسے نہ پیوں گا، میں نے قسم کھائی ہے۔'' اس پر سورۂ تحریم 66 کی پہلی آیت ہی میں حضور ﷺ سے کہا گیا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ﴾

''اے نبی ﷺ، تم کیوں اس چیز کو حرام کرتے ہو جو اللہ نے تمھارے لیے حلال کی ہے۔ کیا اس لیے کہ تم اپنی بیویوں کی خوشی چاہتے ہو۔''

یعنی بیویوں کی خوشی کی خاطر ایک حلال چیز کو حرام کر لینے کا جو فعل آپ ﷺ سے صادر ہوا ہے، یہ اگرچہ آپ ﷺ کے اہم ترین ذمہ دارانہ منصب کے لحاظ مناسب نہ تھا، لیکن یہ کوئی گناہ بھی نہ تھا کہ اس پر مؤاخذہ کیا جائے۔ اس لیے اللہ تعا نے صرف ٹوک کر اس کی اصلاح کر دینے پر اکتفا فرمایا اور آپ ﷺ کی اس لغزش معاف کر دیا۔

حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ میں رشک و رقابت کا اظہار اور صورتوں میں بھی ہو جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ دونوں آنحضور ﷺ کے ہم راہ سفر میں تھیں۔ آنحضور ﷺ راتوں کو حضرت عائشہؓ کے اونٹ پر چلتے تھے اور ان سے باتیں کرتے تھے۔ ایک دن حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ آ رات کو تم میرے اونٹ پر اور میں تمھارے اونٹ پر سوار ہوں، تا کہ ذرا مختلف منا دیکھنے میں آئیں۔ حضرت عائشہؓ راضی ہو گئیں۔ آنحضور ﷺ حضرت عائشہؓ اونٹ کے پاس آئے، جس پر حفصہؓ سوار تھیں۔ جب منزل پر پہنچے اور حضرت عائشہؓ نے آپ ﷺ کو نہیں پایا تو اپنے پاؤں کو اذخر (ایک گھاس) کے درمیان لٹکا کر کہ لگیں: ''خداوندا! کسی بچھو یا سانپ کو متعین کر جو مجھے ڈس لے۔''

علم کی جستجو اور طلب میں حضرت حفصہؓ کا درجہ حضرت عائشہؓ کے بعد دوسر نمبر پر آتا ہے۔ آپ کو حضرت عمر فاروقؓ نے آپ کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ ساتھ ہر قسم کی تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا اور آپ کا بیش تر وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نازل شدہ آیات کو حضور ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب سے درج کر لیا کرتے تھے اور وہ مسودہ پھر حضرت عثمانؓ کو بحفاظت ا پاس رکھنے کو دے دیا کرتے۔ حضرت عثمانؓ وہ مسودہ حضرت حفصہؓ کے حوالے کر د تھے اور اس طرح آپ کو قرآن شریف کے پہلے محافظ ہونے کا شرف حاصل ہے، ب میں یہی جمع شدہ مسودات قرآن مجید کی موجودہ صورت میں عام ہوئے۔

حضرت حفصہؓ نے اپنے مکان پر درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپؓ شاگردوں میں یہ نمایاں حضرات شامل ہیں: عبداللہ بن عمرؓ، حمزہ بن عبداللہؓ، صفیہ بنت بید (حضرت عبداللہ بن عمر کی اہلیہ یعنی حضرت حفصہؓ کی بھابھی) حارثہ بن وہا مطلب بن ابی وداعہ، ام مبشر انصاریہ، عبدالرحمن بن حارث بن ہشام، عبداللہ صفوان بن امیہ۔

آنحضور ﷺ آپ سے وحی الٰہی کی بابت ذکر فرماتے رہتے تھے، اور آپ
ے مختلف دینی اور سماجی مسائل پر بھی گفتگو فرماتے۔ حضرت حفصہؓ کو بھی ان معاملات
ے بے حد دل چسپی تھی اور بسا اوقات ان کی خاطر اپنے آرام کو بھی قربان کر دیتی
ہیں۔ آنحضور ﷺ نے آپ کو دینی و دنیاوی معاملات پر اس قدر حاوی کر دیا تھا
۔ آپؓ کی ذات ایک راہ نُما اور ایک معلم کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ آپ کے ذوق و
ق کے مدنظر آنحضور ﷺ بھی انھیں خصوصی دل چسپی سے سکھایا اور سمجھایا کرتے
ے۔ ایک صحابی حضرت شفاؓ کو کیڑوں کے کاٹے کا دم کرنا (رقی) آتا تھا۔ ایک دن وہ
ھر پر آئے تو آنحضور ﷺ نے کہا کہ تم حفصہؓ کو وہ دم کرنا سکھا دو۔ حضرت حفصہؓ
ے 60 حدیثیں منقول ہیں جو انھوں نے آنحضور ﷺ اور حضرت عمرؓ سے سنی تھیں۔

حضرت حفصہؓ کا وصال شعبان 45 ہجری میں مدینہ میں ہوا۔ یہ امیر معاویہؓ کی
لافت کا زمانہ تھا۔ مروان نے جو اس وقت مدینہ کا گورنر تھا، نمازِ جنازہ پڑھائی اور کچھ
ور تک جنازے کو کندھا دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے آپ کا جنازہ قبرستان تک پہنچایا۔
پ کے بھائی حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور ان کے بیٹوں عاصم، سالم، عبداللہ اور حمزہ نے
بر میں اُتارا۔ حضرت حفصہؓ نے وفات کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو وصیت کی
ن کی تمام جائداد فقرا اور حاجت مندوں میں تقسیم کر دی جائے۔ آپ ﷺ کے بطن
ے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

5) حضرت زینبؓ

اُمّ المساکین۔ آنحضور کی پانچویں زوجہ۔ شجرۂ نسب یہ ہے: زینب بنت خزیمہ
بن حارث بن عبداللہ بن عمرو بن عبد مناف بن ہلال بن عامر۔ ان کا تعلق نجد کے بہت
بڑے قبیلے بنو عامر ابن صعصعہ سے تھا۔ وہ ابتدا ہی سے نہایت فیاض، کشادہ دست اور
فراخ دل تھیں۔ غریبوں اور مسکینوں کی بے دریغ اعانت فرماتیں اور اسی وجہ سے
اُم المساکین کے لقب سے مشہور ہوئیں۔

ان کا پہلا نکاح طفیل بن حارث سے ہوا لیکن کچھ عرصے کے بعد طفیل نے انھیں
طلاق دے دی۔ دوسرا نکاح طفیل کے چھوٹے بھائی حضرت عبیدہؓ بن حارث سے
ہوا۔ یہ دونوں نبی کریم کے عم زاد تھے یعنی حارث بن عبدالمطلب کے فرزند تھے۔

نبوت کے ساتویں سال جب بنو ہاشم اور بنو مطلب نے شعب ابی طالب میں
پناہ لی تھی تو عبیدہؓ بن حارث کے ہم راہ ان کی زوجہ زینبؓ بھی تکلیفیں جھیلنے کے لیے
موجود تھیں۔ جب آنحضور ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو مدینے کی طرف ہجرت کرنے
کی اجازت دی تو سیدہ زینبؓ بھی اپنے شوہر حضرت عبیدہؓ کے ہم راہ مکہ سے ہجرت کر
کے مدینہ پہنچیں۔ رمضان المبارک دو ہجری میں غزوۂ بدر میں حضرت عبیدہؓ سخت زخمی
ہوئے۔ ان کی پنڈلی سے گودا بہنے لگا۔ انھیں اسی حالت میں میدان جنگ سے اٹھا کر
آنحضور ﷺ کی خدمت میں لایا گیا۔ لشکر اسلام میدانِ بدر سے مدینے کی طرف
فتح و نصرت کے جھنڈے لہراتا ہوا واپس ہوا۔ راستے میں وادیٔ صفرا کے مقام پر حضرت
عبیدہؓ کا آخری وقت آن پہنچا۔ اسی وادی کو اس شہید حق کی آخری آرام گاہ ہونے کا
شرف حاصل ہوا۔

عدت کی میعاد گزر جانے کے بعد سیدہ زینبؓ کا نکاح حضرت عبداللہ بن جحش
سے ہوا۔ وہ قدیم الاسلام تھے۔ انھوں نے اللہ کی راہ میں پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی
اور پھر مدینہ کی طرف۔ وہ آنحضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور اسلام کے پر جوش
مجاہد تھے۔ انھوں نے غزوۂ اُحد میں شہادت پائی۔

شوہر کی شہادت کے بعد اُمّ المساکین نے مدینہ میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ
مسلمان تھیں اور نجد میں اپنے قبیلے میں جانا نہیں چاہتی تھیں جو اسلام نہیں لایا تھا۔ اس
وقت مسلمانوں اور نجد کے اس طاقت ور قبیلے کے درمیان تعلقات بہت زیادہ بگڑ چکے
تھے۔ اس قبیلے کے لوگوں نے دھوکے سے بئر معونہ کے مقام پر مسلمان مبلغوں کے
ایک وفد کو شہید کر دیا تھا۔ ان حالات کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لیے فوری طور پر
کچھ کرنا ضروری تھا۔ رسول کریم ﷺ نے خیال کیا کہ اگر وہ زینبؓ سے نکاح کر لیں
تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کے متعلق اس قبیلے کی معاندانہ روش میں نرمی پیدا ہو جائے۔
حقیقت تو یہ ہے کہ اپنے قبیلے میں زینبؓ کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ وہ اتنی سخی اور فیاض
تھیں کہ قبولِ اسلام سے قبل ہی انھیں ''اُمّ المساکین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی شہادت کے بعد آپ آنحضور ﷺ کے نکاح میں
آئیں۔ ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی یعنی 480 درہم مہر مقرر ہوا۔ ان کی عمر اس وقت
تیس سال تھی۔ شادی کے دو تین ماہ بعد ہی اس دنیا سے رحلت کر گئیں۔ آنحضور ﷺ
نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں دفن فرمایا۔

حضرت زینبؓ کو یکے بعد دیگرے دو مجاہدین اسلام اور شہیدان حق، اور اللہ کے
آخری رسول ﷺ کی زوجیت اور رفاقت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا۔ انھیں یہ
امتیاز بھی حاصل ہے کہ ان کی ایک ماں جائی بہن کو بھی اُمّ المومنین بننے کا اعزاز حاصل
ہوا یعنی حضرت میمونہؓ کو جو سات ہجری میں عمرۃ القضا کے موقع پر حرمِ نبوی میں
داخل ہوئیں۔

(6) حضرت اُمِ سلمہؓ

ان کا حقیقی نام ہند تھا۔ کنیت ام سلمہ۔ سلسلۂ نسب مخزوم خاندان سے تھا جو قریش
کی ایک شاخ تھی۔ وہ خالد بن ولید کی قریبی عزیزہ تھیں۔ ان کے والد ابو اُمیہ اپنے
قبیلے کے سردار اور زبردست شاہ سوار مانے جاتے تھے اور اسی لیے ''زادالراکب'' کے
لقب سے مشہور تھے۔ مکہ کے مشہور مخیّر اور فیاض تھے۔ سفر میں جاتے تو تمام قافلے
والوں کی کفالت خود کرتے تھے۔ حضرت اُمّ سلمہؓ کی والدہ ماجدہ کا نام عاتکہ بنت عامر
تھا۔ اسی متمول اور خوش حال گھرانے میں اور اعلیٰ اوصاف کے حامل والدین کے
ہاتھوں اُم سلمہؓ کی تربیت ہوئی۔

حضرت ام سلمہؓ کا پہلا نکاح عبداللہ بن الاسد سے ہوا جو زیادہ تر ابو سلمہؓ کے نام
سے مشہور ہیں، اور جو اُمّ سلمہؓ کے عم زاد اور آنحضور ﷺ کے رضاعی بھائی تھے۔ ان
کا شمار ایسے حضرات میں ہوتا ہے جو شروع زمانے ہی میں اسلام لے آئے تھے اور

قریش کے ظلم وتشدد کی وجہ سے حبشہ کی طرف ہجرت فرما گئے تھے۔ دوران ہجرت ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سلمہ رکھا گیا، جس کے نام پر باپ نے ابوسلمہ اور ماں نے اُم سلمہ کی کنیت اختیار کی تھی سلمہ کے بعد ایک بیٹا عمر اور ایک بیٹی درۃ بھی ہوئی۔ یہ سب حبشہ سے مکہ آئے اور مدینہ جانا چاہتے تھے کہ ایک عبرت انگیز واقعہ پیش آیا۔

اُمّ سلمہؓ کے والدین نے انھیں زبردستی مکہ میں روک لیا، البتہ ان کے شوہر ابوسلمہ مدینہ چلے گئے۔ ادھر ان کے بچوں کو ابوسلمہؓ کے والدین یعنی ان کے نانا نانی نے چھین لیا، تاکہ وہ مدینہ نہ جاسکیں۔ اب اُمّ سلمہؓ دوہرے عذاب میں مبتلا ہوگئیں۔ بچے کے لیے والدین سے اُمّ سلمہ کی جدوجہد کے دوران میں بچے کا ایک بازو اکھڑ گیا اور عمر بھر کے لیے بیکار ہوگیا۔ ام سلمہ کے والدین اور اہل خاندان انھیں مدینہ جانے سے روک سکتے تھے، مگر زبان بند رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ وہ روزانہ گھبرا کر گھر سے نکل جاتیں اور ابطح میں بیٹھ کر رویا کرتی تھیں۔ اور بلند آواز سے اپنے خاندان کے لیے بددعا کرتیں: ''خدا کرے گدھ آسمانوں سے اُتریں اور پورے خاندان کو ہضم کر جائیں۔'' ہفتہ عشرہ یہی حالت رہی اور خاندان والوں کو احساس تک نہ ہوا۔ ایک دن ابطح (مکہ کی ایک بستی) سے ان کے خاندان کا ایک شخص نکلا اور ام سلمہ کو بے چارگی سے روتے ہوئے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا۔ وہ گھر آ کر ابوسلم اور ام سلم کے خاندان والوں سے ملا اور کہا کہ کیوں اس غریب پر اتنا ظلم کرتے ہو۔ وہ اگر اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہے تو جانے دو اور اس کے بچے اس کے حوالے کردو۔

وہ لوگ راضی ہوگئے اور ام سلمہؓ کو نہ صرف ان کا بیٹا واپس دے دیا بلکہ ہجرت کی بھی اجازت مل گئی۔ انھوں نے تن تنہا ایک اُونٹ پر مدینہ کا سفر شروع کیا۔ تنعیم میں عثمان بن طلحہ (کلید بردار کعبہ) کی نظر پڑی تو پوچھا: ''کدھر کا قصد ہے؟'' کہا، ''مدینے کا۔'' پوچھا: ''کوئی ساتھ بھی ہے۔'' انھوں نے جواب دیا: ''خدا اور یہ بچہ۔'' عثمان نے کہا: ''یہ نہیں ہوسکتا۔ آپ تنہا اتنا لمبا سفر طے نہیں کرسکتیں۔ میں آپ کو پہنچا کر آؤں گا۔'' آپ نے ان کے اونٹ کی مہار پکڑی اور انھیں مدینے کی طرف لے چلے۔ دوران سفر میں وہ اُونٹ بٹھانے کے بعد کسی اوٹ والی جگہ چلے جاتے، تاکہ ام سلمہؓ اتر کر آرام کرلیں۔ روانگی کا وقت آتا تو اونٹ پر کجاوہ رکھ کر ایک طرف ہٹ جاتے اور اُمّ سلمہؓ سے کہتے کہ سوار ہو جایئے۔ حضرت اُم سلمہؓ فرماتی ہیں کہ مَیں نے ایسا شریف آدمی کبھی نہیں دیکھا۔

غرض مختلف منزلوں پر قیام کرتا ہوا یہ مختصر قافلہ مدینہ پہنچا۔ قبا کی آبادی نظر پڑی تو عثمان نے کہا، اب تم اپنے شوہر کے پاس چلی جاؤ۔ وہ یہیں مقیم ہیں۔ یہ قبا کی طرف آ گئیں اور عثمان نے واپس مکہ کا راستہ لیا۔ قبا پہنچیں تو لوگ ان کا حال پوچھتے تھے، اور جب یہ اپنے والد کا نام بتاتیں تو لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا۔ یہ حیرت ان کے تنہا سفر کرنے پر تھی۔ شرفا کی عورتیں اس طرح باہر نکلنے کی جرأت نہیں کرتی تھیں اور ام سلمہؓ مجبوراً خاموش ہوتی تھیں۔ لیکن جب کچھ لوگ حج کے ارادے سے مکہ روانہ ہوئے اور انھوں نے اپنے گھر رقعہ بھجوایا تو اس وقت لوگوں کو یقین ہوا کہ وہ واقعی ابواُمیّہ کی بیٹی ہیں۔ ابواُمیّہ چوں کہ مخزوم کے نہایت مشہور اور معزز شخص تھے، اس لیے حضرت ام سلمہؓ کو بڑی وقعت اور تکریم کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

کچھ عرصہ شوہر ابوسلمہؓ کا ساتھ رہا۔ وہ بڑے شاہ سوار تھے۔ بدر اور اُحد میں شریک ہوئے۔ غزوۂ اُحد میں ایک مہلک زخم کندھے پر آیا تھا جو بظاہر اچھا ہوگیا تھا، مگر محرم چار ہجری کے سریہ ابوسلمہؓ میں پھر تازہ ہوگیا جس کے باعث انھوں نے جمادی الثانی چار ہجری میں وفات پائی۔ اُم سلمہؓ آنحضور ﷺ کی خدمت میں پہنچیں اور وفات کی خبر سنائی۔ آنحضرت ﷺ خود ان کے مکان پر تشریف لائے۔ گھر میں کہرام مچا تھا۔ ام سلمہ ؓ بین کرتی تھیں: ''ہائے پردیس میں یہ کیسی موت ہوئی۔'' آنحضرت ﷺ نے انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ''صبر کرو۔ ان کی مغفرت کی دعا مانگو اور یہ کہو کہ خداوندا، ان سے بہتر ان کا جانشین عطا کر۔'' اس کے بعد آنحضور ﷺ ابوسلمہؓ کی نعش پر تشریف لائے۔ نماز جنازہ اہتمام سے پڑھی گئی۔ آنحضور ﷺ نے نو تکبیریں کہیں۔ نماز کے بعد لوگوں نے پوچھا، یارسول اللہ آپ کو سہو تو نہیں ہوا۔ فرمایا، یہ ہزار تکبیروں کے مستحق تھے۔ وفات کے وقت ابوسلمہؓ کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے خود دست مبارک سے آنکھیں بند کیں اور ان کی مغفرت کی دعا مانگی۔

حضرت ابوسلمہؓ کے انتقال کے بعد ام سلمہؓ مدینہ میں بالکل یکہ وتنہا اور بے یار و مددگار ہوگئیں۔ اب نہ تو ان کا کوئی ذریعہ معاش تھا اور نہ وہ اپنے (ناراض) والدین کے پاس واپس جاسکتی تھیں۔ پھر ایک بڑی اُلجھن یہ بھی تھی کہ ابوسلمہؓ کی وفات کے وقت اُم سلمہ حاملہ تھیں۔ اس صورت حال سے حضور ﷺ باخبر تھے اور ان کی تکالیف ومصائب کم کرنے کے خواہاں۔ بچے کی ولادت اور عدت کی مدت پوری ہونے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے نکاح کا پیغام دیا، لیکن حضرت ام سلمہؓ نے انکار کیا۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ آنحضور ﷺ کا پیغام لے کر پہنچے جس کے جواب میں ام سلمہؓ نے چند عذر پیش کیے:

1: مَیں سخت غیور عورت ہوں۔
2: صاحب عیال ہوں۔ خیر سے میرے چار بچے ہیں۔
3: میری عمر زیادہ ہوگئی ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ان تمام زحمتوں کو گوارا فرمایا، جس کے نتیجے میں حضرت ام سلمہؓ نکاح ثانی پر رضامند ہوگئیں۔ انھوں نے اپنے بیٹے عمر بن عبداللہ سے کہا، اٹھو اور رسول ﷺ سے میرا نکاح کرو۔ چنانچہ شوال چار ہجری میں آپ کی رسم ازدواج ادا ہوئی۔ آنحضرت ﷺ نے انھیں دو چکیاں، ایک گھڑا، ایک چمڑے کا تکیہ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، عنایت فرمایا۔ یہی سامان دوسری ازواج مطہرات کو بھی دیا گیا تھا۔

روایت ہے کہ ایک بار حضرت ام سلمہؓ نے اپنے شوہر ابوسلمہؓ سے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اگر کسی عورت کے شوہر کو اللہ تعالیٰ جنت عطا فرمائے اور عورت اس کے

ح ثانی نہ کرے تو اللہ اس عورت کو شوہر کے ساتھ جنت میں جگہ فرماتا ہے اور یہی عورت مرد کے لیے ہے۔ اس بنا پر ہم دونوں کو انتقال کے بعد عقد ثانی نہ کرنے کا عہد کر لینا چاہیے۔" یہ سن کر ابوسلمہؓ نے کہا "کیا تم میری اطاعت کرو گی؟" ام سلمہؓ نے کہا، ہاں۔ ابوسلمہؓ نے کہا: "جب میں مر جاؤں تو میرے بعد نکاح کر لینا۔ پھر حضرت ابوسلمہؓ نے دعا مانگی: "یا اللہ، میرے بعد ام سلمہؓ کو مجھ سے بہتر جانشین عطا فرما۔" حضرت ام سلمہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ جب ابوسلمہؓ انتقال کر گئے تو میں اپنے دل میں خیال کرتی کہ ابوسلمہؓ سے بہتر کون ہوگا۔ پھر کچھ عرصہ بعد حضور ﷺ سے میرا نکاح ہو گیا۔

شروع شروع میں بہت حجاب کرتی تھیں۔ جب آنحضور ﷺ ان کے پاس تشریف لاتے تو وہ حیاداری سے اپنی چھوٹی بیٹی زینب کو گود میں بٹھا لیتیں۔ حضور ﷺ یہ دیکھ کر واپس جاتے۔ حضرت عمار بن یاسرؓ جو ام سلمہؓ کے رضاعی بھائی تھے، کو معلوم ہوا تو بہت ناراض ہوئے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ بات کم ہوتی گئی اور اس طرح دوسری ازواج رہتی تھیں، وہ بھی رہنے لگیں۔

آنحضور ﷺ کو ان سے بے حد محبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک موقع پر جب تمام ازواج مطہرات کو (سوائے حضرت عائشہؓ کے) آنحضور ﷺ کی خدمت میں کچھ عرض کرنا تھا تو انھوں نے حضرت ام سلمہؓ ہی کو اپنا سفیر بنا کر حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ازواج مطہرات کے دو گروہ تھے۔ ایک میں حضرت عائشہؓ، حفصہؓ، صفیہؓ، سودہؓ شامل تھیں۔ دوسرے میں حضرت ام سلمہؓ اور باقی ازواج تھیں۔ چوں کہ آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کو زیادہ محبوب رکھتے تھے، اس لیے لوگ انھی کی باری میں ہدیے بھیجتے تھے۔ حضرت ام سلمہؓ کی جماعت نے آپ ﷺ سے کہا، حضرت عائشہؓ کی طرح ہم بھی سب کی فلاح کی خواہاں ہیں۔ اس بنا پر رسول ﷺ جس بیوی کے مکان میں بھی ہوں، لوگوں کو وہیں ہدیہ بھیجنا چاہیے۔ جب حضرت ام سلمہؓ نے آپ ﷺ سے یہ شکایت کی تو آپ ﷺ نے دو مرتبہ نظر انداز کیا۔ تیسری مرتبہ کہا: "ام سلمہ، عائشہ کے معاملے میں مجھے اذیت نہ پہنچاؤ، کیوں کہ ان کے سوا تم میں کوئی بیوی ایسی نہیں ہے، جس کے لحاف میں میرے پاس وحی آئی ہو۔" حضرت ام سلمہؓ نے کہا: "میں پناہ مانگتی ہوں اس بات سے کہ آپ ﷺ کو اذیت پہنچاؤں۔"

حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں حضور ﷺ شب باش ہوتے تو ان کا بستر حضور ﷺ کی جانماز کے سامنے بچھتا تھا، آنحضرت نماز پڑھا کرتے اور یہ سامنے ہوتی تھیں۔ وہ حضور ﷺ کے آرام کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ حضرت سفینہؓ جو آنحضور ﷺ کے مشہور غلام ہیں۔ وہ دراصل پہلے حضرت ام سلمہؓ کے غلام تھے، انھیں آزاد کیا تو یہ شرط کی کہ جب تک حضور ﷺ زندہ ہیں، تم پر ان کی خدمت لازمی ہوگی۔

حضرت ام سلمہؓ کی زندگی کے مشہور واقعات یہ ہیں۔ غزوۂ خندق کے دوران میں اگرچہ انھوں نے براہ راست جنگ میں حصہ نہیں لیا، لیکن وہ حضور ﷺ کے اتنے قریبی فاصلے پر تھیں کہ آپ ﷺ کی اور صحابہؓ کے مابین ہونے والی گفتگو اچھی طرح سنتی تھیں۔ فرماتی ہیں کہ مجھے وہ وقت خوب یاد ہے کہ جب سینہ مبارک گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا، چہرے پر پسینا تھا اور آپ ﷺ لوگوں کو اینٹیں اٹھا اٹھا کر دیتے اور ہمت افزائی کے لیے رزمیہ اشعار بھی پڑھتے جاتے۔ اچانک حضور ﷺ کی نظر حضرت عمار بن یاسرؓ پر پڑی، جس پر آپ ﷺ نے فرمایا، افسوس، ابن سمیہ تمھاری شہادت ایک باغی گروہ کے ہاتھوں ہوگی۔

پانچ ہجری میں یہود سے گفتگو کرنے کے لیے آنحضرت ﷺ نے حضرت ابولبابہؓ کو بھیجا تھا۔ اثنائے مشورہ میں ابولبابہؓ نے ہاتھ کے اشارے سے بتلایا کہ تم لوگ قتل کیے جاؤ گے۔ لیکن بعد میں اسے افشائے راز سمجھ کر اس قدر نادم ہوئے کہ اپنے آپ کو مسجد کے ستون سے باندھ لیا۔ چند دنوں تک یہی حالت رہی۔ پھر توبہ قبول ہوئی۔ اس وقت آنحضور ﷺ ام سلمہؓ کے مکان میں تشریف فرما تھے کہ صبح کو مسکراتے ہوئے اٹھے۔ ام سلمہؓ نے کہا: "اللہ آپ کو ہمیشہ ہنسائے۔ اس وقت ہنسنے کا کیا سبب ہے؟" حضور ﷺ نے فرمایا: "ابولبابہ کی توبہ قبول ہو گئی۔" عرض کی: "تو کیا میں انھیں یہ مژدہ سنا دوں۔" فرمایا: "ہاں اگر چاہو۔" حضرت ام سلمہؓ اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑی ہوئیں اور پکار کر کہا: "ابولبابہ، مبارک ہو۔ تمھاری توبہ قبول ہو گئی۔" اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ پورا مدینہ اُمڈ آیا۔

سن پانچ ہجری ہی میں آیت حجاب نازل ہوئی۔ اس سے پیش تر ازواج مطہرات بعض دُور کے رشتہ داروں کے سامنے آیا کرتی تھیں۔ اب خاص خاص اعزہ کے سوا سب سے پردہ کرنے کا حکم ہوا۔ حضرت ابن ام مکتومؓ قریش کے ایک معزز صحابی اور بارگاہ نبوی ﷺ کے مؤذن تھے اور چوں کہ نابینا تھے، اس لیے ازواج مطہرات کے حجروں میں آیا کرتے تھے۔ آیت حجاب کے نزول کے بعد آئے تو آنحضور ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ اور حضرت میمونہؓ سے فرمایا: "ان سے پردہ کرو۔" وہ کہنے لگیں "وہ تو نابینا ہیں۔" فرمایا: "تم تو نابینا نہیں ہو۔ تم تو انھیں دیکھتی ہو۔"

ام سلمہؓ صلح حدیبیہ میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھیں۔ عام مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کی شرائط ناپسند تھیں، کیوں کہ ان کے خیال میں یہ کفار کے لیے سُودمند تھیں۔ ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اس سال مسلمان مکہ معظمہ نہ جائیں بلکہ حج کیے بغیر لوٹ جائیں۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے تمام صحابہؓ کو ہدایت کی کہ وہ حدیبیہ کے مقام پر قربانی کریں اور یہیں سے گھروں کو لوٹ چلیں۔ چوں کہ مسلمانوں کو سخت صدمہ تھا، اس لیے انھوں نے حضور ﷺ کی بار بار تاکید کے باوجود اس پر عمل نہیں کیا۔ حضور ﷺ کو ان کی یہ حرکت ناگوار گزری، جس کی بابت آپ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی۔ انھوں نے حضور ﷺ کو مشورہ دیا کہ اب مزید تاکید نہ کریں اور ان لوگوں سے کچھ نہ کہیں، بلکہ خود پہل کر کے، ان سب کے سامنے کھلی جگہ پر قربانی کریں اور سر منڈوائیں اور احرام کھول دیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے اپنی زوجہ کے مشورے کے مطابق عمل کیا، جسے تمام لوگوں نے دیکھا اور سمجھ گئے کہ ان احکام کی

پابندی لازمی ہے۔ لہٰذا سب مسلمانوں نے حضور ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے قربانی کی اور اپنے سروں پر استرہ پھروایا، بلکہ اس کام میں عجلت کی خاطر انھوں نے ایک دوسرے کے سر مونڈنا شروع کر دیے، تاکہ اس کام سے جلد از جلد فارغ ہو جائیں (صحیح بخاری)۔ صرف اسی واقعے سے حضرت اُمّ سلمہؓ کی فراست اور دانائی کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ انسانی فطرت و نفسیات کا کتنا گہرا شعور رکھتی تھیں۔ امام الحرمین کے بقول صنف نازک کی پوری تاریخ اصابتِ رائے کی ایسی عظیم الشان مثال پیش نہیں کرسکتی۔

9 ہجری میں ایلا کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حفصہؓ کو تنبیہ کی، تو بعد میں حضرت ام سلمہؓ کے پاس بھی آئے۔ وہ ان کی عزیز بھی تھیں۔ ان سے بھی تنبیہ کے انداز میں گفتگو کی۔ حضرت ام سلمہؓ نے جواب دیا: ''عمرؓ، تم ہر معاملے میں دخل دینے لگے ہو۔ یہاں تک کہ اب رسول اللہ اور ان کی ازواج کے معاملوں میں بھی دخل دیتے ہو۔'' چوں کہ جواب انتہائی خشک تھا، اس لیے حضرت عمرؓ چپ ہو گئے اور اٹھ کر چلے آئے۔ رات کو یہ خبر مشہور ہوئی کہ حضور ﷺ نے ازواج کو طلاق دے دی۔ صبح کو حضرت عمرؓ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور تمام واقعہ بیان کیا۔ جب حضرت اُمِّ سلمہؓ کا قول نقل کیا تو حضور ﷺ مسکرائے۔

حجۃ الوداع میں جو 10 ہجری میں ہوا، اگرچہ اُمّ سلمہؓ علیل تھیں، تاہم ساتھ آئیں۔ بنہان (غلام) اونٹ کی مہار تھامے تھا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جب غلام مکاتب کے پاس اس قدر مال موجود ہو کہ وہ اسے ادا کر کے آزاد ہوسکتا ہو تو اس سے پردہ ضروری ہو جاتا ہے۔ طواف کے متعلق فرمایا کہ جب نمازِ فجر قائم ہو، تم اونٹ پر سوار ہو کر طواف کرنا۔ چنانچہ حضرت ام سلمہؓ نے ایسا ہی کیا۔

حضرت اُمّ سلمہؓ نے غزوۂ خیبر میں بھی شرکت کی اور مرحب سے اپنے مقابلے کا ذکر سنایا جو یہودی تھا۔ آپ فرماتی ہیں کہ جب میری تلوار مرحب کے چہرے پر پڑی تو اس کے منہ سے دانت جھڑنے لگے اور ایک عجیب سی بھیانک آواز اس کے منہ سے نکلی جو مجھے عرصے تک یاد رہی۔

حضرت اُمّ سلمہؓ نے اور بھی کئی غزوات میں رسول کریم ﷺ کے ہم راہ شرکت کی تھی۔ ان غزوات کے دوران میں حضور ﷺ کو خواتین کی حفاظت اور سلامتی کی بے حد فکر دامن گیر رہتی تھی۔ ایک مرتبہ جب ایک ساربان نے مشہور رزمیہ گیت ''حدی'' شروع کیا، جسے سن کر اونٹ تیز دوڑنے لگتے تھے، تو حضور ﷺ نے یہ گیت سنا اور اونٹوں کی تیز رفتاری کی وجہ سے پریشان ہونے لگے کہ کہیں خواتین گر نہ پڑیں۔ اس پر حضور ﷺ نے اس حدی خواں کو مخاطب کر کے فرمایا، دیکھو خیال رکھنا، تمھارے اونٹوں پر نازک اشیا لدی ہوئی ہیں، کہیں اس تیز رفتاری سے انھیں زک نہ پہنچے اور وہ ٹوٹ پھوٹ نہ جائیں۔ حضور ﷺ کا اشارہ ان خواتین کی طرف تھا جو ان اونٹوں پر سوار تھیں۔ حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ بہترین سپاہی تھے اور میدان جنگ میں بے جگری سے مقابلہ کرتے، لیکن جنگ کے بعد آپ ﷺ مفتوح لوگوں سے نہایت رحم دلی کا سلوک کرتے، خصوصاً جنگی قیدیوں سے نرم اور مشفقانہ رویہ اختیار کرتے۔

حضور ﷺ کی ازواج مطہرات میں حضرت اُمّ سلمہؓ کا درجہ حصول علم و فضل میں حضرت عائشہؓ کے بعد آتا ہے۔ حضرت محمود بن لبید فرماتے ہیں کہ یوں تو تمام امہات المومنین احادیث کا مخزن تھیں، تاہم عائشہؓ اور ام سلمہؓ کا کوئی حریف و مقابل تھا، مروان بن حکم ان سے مسائل دریافت کرتا اور علانیہ کہتا تھا: ''آنحضور ﷺ کی ازواج کے ہوتے ہوئے ہم دوسروں سے کیوں پوچھیں۔''

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی حالانکہ خود نہایت اعلیٰ پایے کے عالم و فاضل شمار ہوتے تھے، لیکن وہ بھی ازواج مطہرات کے ذاتی علم اور معلومات سے استفادہ کرتے تھے۔ علاوہ ازیں اکثر و بیشتر تابعین نے بھی ان خواتین کے علم و فضل، تجربات اور تبحر علمی سے فائدہ اٹھایا۔

حضرت اُمّ سلمہؓ قرآن مجید کی باقاعدگی سے تلاوت کرتی تھیں۔ ان کا انداز قرات حضور ﷺ کے طرز پر ملتا جلتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ حضور ﷺ کیوں کر قرأت کرتے تھے؟ بولیں کہ ایک ایک آیت الگ الگ کر کے پڑھتے تھے، اس کے بعد خود پڑھ کر بتلایا۔

حدیث کے معاملے میں حضرت عائشہؓ کے سوا ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ان سے 378 حدیثیں مروی ہیں۔ اس بنا پر وہ محدثین صحابہؓ کے تیسرے طبقے میں شامل ہیں۔ حدیث سننے کا بڑا شوق تھا۔ ایک دن بال گندھوا رہی تھیں کہ آنحضور ﷺ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ زبان مبارک سے ''ایھا الناس'' (لوگو!) کا لفظ نکلا تو فوراً بال باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور کھڑے ہو کر پورا خطبہ سنا۔

آپؓ علمی قابلیت و صلاحیت کے علاوہ معاملہ فہمی اور عملی و تجربی زندگی سے بھی مالا مال تھیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ جنابت کی حالت میں روزہ رکھنا جائز نہیں۔ جب کسی شخص نے اس بارے میں حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے تصدیق چاہی تو انھوں نے جائز قرار دیا اور استفسار کرنے والے سے کہا کہ خود آنحضرت ﷺ نے جنابت کی حالت میں روزے رکھے ہیں۔ اس پر حضرت ابو ہریرہؓ کو ندامت محسوس ہوئی اور انھوں نے فرمایا کہ اس بارے میں روایت مَیں نے فضل بن عباسؓ سے سنی تھی، ان دونوں محترم خواتین کا بیان قابل اعتبار اور درست تسلیم کرتا ہوں۔

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ بعد عصر دو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے، جس پر مروان بن حکم نے ان سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے فرمایا کہ مَیں نے اس کے متعلق حضرت عائشہؓ سے سنا ہے اور انھوں نے اسے حضرت ام سلمہؓ سے نقل کیا ہے۔ لہٰذا جب ایک شخص کو اس کی تصدیق کے لیے حضرت ام سلمہؓ کی خدمت میں بھیجا تو انھوں نے فرمایا: ''اللہ عائشہؓ کو معاف فرمائے۔ دراصل انھوں نے میری بات غلط سمجھا ہے۔ مَیں نے تو یہ کہا تھا کہ حضور ﷺ نے بعد عصر نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔''

علامہ ابن قیم کا خیال تھا کہ اگر حضرت ام سلمہؓ کے تمام اقوال کا مجموعہ مرتب کیا

جائے تو وہ ایک ضخیم رسالہ بن جائے۔

حضرت اُمّ سلمہؓ کی زندگی نہایت پاکیزہ اور گوشہ نشینی میں بسر ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے گلے میں ایسا ہار پہن لیا جس میں کچھ سونے کی مقدار بھی شامل تھی۔ جب حضور ﷺ کی اس پر نگاہ پڑی تو آپ ﷺ نے اس پر اعتراض فرمایا۔ انھوں نے فوراً وہ ہار اپنے گلے سے اُتار دیا۔ ان کا معمول تھا کہ مہینے میں تین دن (پیر، منگل اور جمعہ) روزے رکھا کرتی تھیں۔ پہلے شوہر ابوسلمہ کے چاروں بچے بھی آپ کے ہم راہ رہائش پزیر تھے اور آپ ان کا پورا خیال رکھتیں۔ ایک مرتبہ آپ نے حضور ﷺ سے دریافت کیا، آیا انھیں اس کا کوئی اجر دوسری دنیا میں بھی ملے گا یا نہیں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے اثبات میں جواب دیا، یعنی ضرور ملے گا۔

آنحضور ﷺ پر آیت تطہیر اس وقت نازل ہوئی جب آپ ﷺ حضرت اُم سلمہؓ کے مکان پر فروکش تھے۔ اس آیت کے بموجب حضور ﷺ نے اپنی صاحب زادی، داماد حضرت علیؓ اور ان کے دونوں فرزندوں امام حسنؓ اور امام حسینؓ کو طلب فرمایا اور انھیں ایک چادر اڑھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ انھیں پاک صاف فرما دے، کیوں کہ یہ اہل بیت ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ نے آپ ﷺ کی یہ دعا سنی تو فرمایا کہ اس دعا میں ہماری ذات بھی شامل ہے یا نہیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا، تمھارا اپنا ایک مقام ہے اور وہ اعلیٰ مقام ہے۔

گیارہ ہجری میں آنحضور ﷺ علیل ہوئے۔ مرض نے طول کھینچا تو آنحضرت ﷺ حضرت عائشہؓ کے مکان میں منتقل ہو گئے۔ اُمّ سلمہؓ اکثر حضور ﷺ کو دیکھنے کے لیے جایا کرتی تھیں۔ ایک دن طبیعت زیادہ علیل ہوئی تو ام سلمہؓ چیخ اٹھیں۔ آنحضور ﷺ نے منع کیا کہ یہ مسلمانوں کا شیوہ نہیں۔ ایک دن مرض میں شدت پیدا ہوئی تو ازواج نے دوا پلانا چاہی۔ چوں کہ حضور ﷺ کو گوارا نہ تھی، اس لیے آپ ﷺ نے انکار فرما دیا۔ لیکن جب غشی طاری ہو گئی تو حضرت ام سلمہؓ اور اسماءؓ بنت عمیس نے دوا پلا دی (بعض روایات میں ہے کہ ان دونوں نے صرف اس کا مشورہ دیا تھا)۔ حضور ﷺ کی علالت کے دوران میں ایک روز حضرت اُم سلمہؓ اور ام حبیبہؓ نے جو حبشہ ہو آئی تھیں، وہاں کے عیسائی معبدوں کا (جو غالباً رومن کیتھولک گرجے ہوں گے) اور ان کے مجسموں اور تصویروں کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ان لوگوں میں جب کوئی نیک آدمی مرتا ہے تو اس کے مقبرے کو عبادت گاہ بنا لیتے ہیں اور اس کا بُت بنا کر اس میں ایستادہ کرتے ہیں۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں یہ لوگ بدترین مخلوق ہوں گے۔

وفات سے پہلے آنحضور ﷺ نے حضرت فاطمہؓ سے کان میں باتیں کی تھیں۔ حضرت عائشہؓ اسی وقت بے تابی سے پوچھنے لگیں، لیکن حضرت ام سلمہؓ نے توقف کیا اور آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد پوچھا۔

61 ہجری میں امام حسینؓ نے شہادت پائی۔ حضرت ام سلمہؓ نے خواب میں دیکھا کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے ہیں۔ نہایت پریشان ہیں۔ سر اور ڈاڑھی غبار آلود ہے۔ پوچھا، یارسول اللہ، کیا حال ہے۔ ارشاد ہوا، حسینؓ کے مقتل سے آرہا ہوں۔ ام سلمہؓ بیدار ہوئیں تو آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسی حالت میں زبان سے نکلا، اہل عراق نے حسینؓ کو قتل کیا۔ خدا انھیں قتل کرے۔ انھوں نے حسینؓ کو ذلیل کیا، خدا ان لوگوں پر لعنت کرے۔

63 ہجری میں واقعہ حرہ کے بعد شامی لشکر مکہ گیا۔ جہاں ابن زبیرؓ پناہ گزیں تھے۔ چوں کہ آنحضور ﷺ نے ایک حدیث میں ایسے لشکر کا تذکرہ فرمایا تھا، بعض کو شبہ ہوا۔ انھوں نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا۔ انھوں نے بتایا کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ایک شخص مکہ میں پناہ لے گا۔ اس کے مقابلے میں جو لشکر آئے گا، بیابان میں وہیں دھنس جائے گا۔ ام سلمہؓ نے پوچھا، جو لوگ زبردستی شریک کیے گئے ہوں گے، کیا وہ بھی؟ فرمایا، ہاں، لیکن قیامت میں اپنی نیتوں کے مطابق اٹھیں گے۔

جس سال حرہ کا واقعہ ہوا یعنی 63 ہجری۔ اسی سال حضرت اُمّ سلمہؓ نے انتقال فرمایا۔ اس وقت 84 برس کا سن تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور بقیع میں دفن کیا۔ اس وقت ولید بن عتبہ (ابوسفیان کا پوتا) مدینہ کا حاکم تھا۔ حضرت اُمّ سلمہؓ کی وصیت تھی کہ ان کی نماز جنازہ ولید نہ پڑھائے، اس لیے وہ جنگل کی طرف نکل گیا اور اپنے بجائے حضرت ابو ہریرہؓ کو بھیج دیا۔

حضرت ام سلمہؓ کے پہلے شوہر ابوسلمہؓ سے چار بچے پیدا ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں:

سلمہؓ۔ حبشہ میں پیدا ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے ان کا نکاح حضرت حمزہؓ کی لڑکی امامہ سے کیا تھا۔

عمرؓ۔ آنحضور ﷺ سے اپنی والدہ کا نکاح انھوں نے ہی کیا تھا۔ حضرت علیؓ کے زمانہ خلافت میں فارس اور بحرین کے گورنر تھے۔

درہ۔ ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ نے آنحضور ﷺ سے کہا، ہم نے سنا ہے کہ آپ ﷺ درہ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا، یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ اگر میں نے اسے پرورش نہ بھی کیا ہوتا، تب بھی وہ میرے لیے کسی طرح حلال نہ تھی، کیوں کہ وہ میرے رضاعی بھائی کی لڑکی ہے۔

زینب۔ اصلی نام برہ تھا۔ حضور ﷺ نے زینب رکھا۔

(7) حضرت زینبؓ بنت جحش

نام زینبؓ اور کنیت ام الحکم ہے۔ تعلق خاندانِ اسدیہ سے تھا۔ نسب یہ ہے: زینبؓ بنت جحش بن رباب بن یعمر بن صبیرہ بن مرہ بن کثیرہ بن غنم بن دودان بن اسد بن خزیمہ الاسدی۔

والدہ کا نام امیمہ بنت عبدالمطلب ہے جو حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب کی سگی بہن تھیں۔ اس رشتے سے حضرت زینبؓ آنحضور ﷺ کی حقیقی پھوپھی زاد بہن تھیں۔

ان کا پہلا نکاح حضرت زیدؓ بن حارثہ سے ہوا جو آنحضرت ﷺ کے آزاد کردہ

غلام اور متبنّیٰ تھے۔ حضرت زیدؓ زندگی کے ہر دور سے گزر کر ایک ارفع و اعلیٰ مقام تک پہنچے تھے۔ جب یہ آٹھ سال کے بچے تھے، اس وقت ان کی ماں انھیں اپنے میکے لے کر گئیں۔ وہاں ایک گروہ نے ان کے پڑاؤ پر حملہ کیا اور لوٹ مار کے ساتھ وہ جن آدمیوں کو پکڑ کر لے گئے، ان میں حضرت زیدؓ بھی تھے۔ پھر انھوں نے طائف کے قریب عکاظ کے میلے میں لے جا کر انھیں فروخت کر دیا۔ خریدنے والے حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام تھے۔ انھوں نے مکہ لا کر اپنی پھوپھی صاحبہ کی خدمت میں نذر کر دیا۔ نبی کریم ﷺ سے حضرت خدیجہؓ کا جب نکاح ہوا تو حضور ﷺ نے ان کے ہاں زید کو دیکھا اور ان کی عادات و اطوار آپ ﷺ کو اس قدر پسند آئیں کہ آپ ﷺ نے انھیں حضرت خدیجہؓ سے مانگ لیا۔ اس طرح یہ خوش قسمت لڑکا اس خیر الخلائق ہستی کی خدمت میں پہنچ گیا جسے چند سال بعد اللہ تعالیٰ نبی بنانے والا تھا۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر پندرہ سال تھی۔ کچھ مدت بعد ان کے باپ اور چچا کو پتا چلا کہ ہمارا بچہ مکہ میں ہے۔ وہ انھیں تلاش کرتے ہوئے آنحضور ﷺ تک پہنچے اور عرض کیا کہ آپ ﷺ جو فدیہ چاہیں، ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ آپ ﷺ ہمارا بچہ ہمیں دے دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں لڑکے کو بلاتا ہوں اور اسی کی مرضی پر چھوڑے دیتا ہوں کہ وہ تمھارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا میرے پاس رہنا پسند کرتا ہے۔ اگر وہ تمھارے ساتھ جانا چاہے گا تو میں کوئی فدیہ نہ لوں گا اور اسے یوں ہی چھوڑ دوں گا، لیکن اگر وہ میرے پاس رہنا چاہے تو میں ایسا آدمی نہیں ہوں کہ جو شخص میرے پاس رہنا چاہتا ہو، اسے خواہ مخواہ نکال دوں۔ انھوں نے کہا، یہ تو آپ ﷺ نے انصاف سے بھی بڑھ کر درست بات فرمائی ہے۔ آپ بچے کو بلا کر پوچھ لیجیے۔ حضور ﷺ نے زید کو بلایا اور ان سے کہا، ان دونوں صاحبوں کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، جی ہاں، یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، تم انھیں بھی جانتے ہو اور مجھے بھی۔ اب تمہیں پوری آزادی ہے کہ چاہو تو ان کے ساتھ چلے جاؤ اور چاہو تو میرے ساتھ رہو۔ انھوں نے جواب دیا، میں آپ ﷺ کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جانا چاہتا۔ ان کے باپ اور چچا نے کہا، زید، کیا تو آزادی پر غلامی کو ترجیح دیتا ہے اور اپنے ماں باپ اور خاندان کو چھوڑ کر غیروں کے پاس رہنا چاہتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اس شخص کے جو اوصاف دیکھے ہیں، ان کا تجربہ کر لینے کے بعد میں اب دنیا میں کسی کو بھی اس پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ زید کا یہ جواب سن کر ان کے باپ اور چچا بخوشی راضی ہو گئے۔ حضور ﷺ نے اسی وقت زید کو آزاد کر دیا اور حرم میں جا کر قریش کے مجمع عام میں اعلان فرمایا کہ آپ سب لوگ گواہ رہیں، آج سے زید میرا بیٹا ہے۔ یہ مجھ سے وراثت پائے گا اور میں اس سے۔ اسی بنا پر لوگ انھیں زید بن محمد ﷺ کہنے لگے۔ یہ سب واقعات نبوت سے پہلے کے ہیں۔ پھر جب نبی ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب نبوت پر سرفراز ہوئے تو چار ہستیاں ایسی تھیں جنھوں نے ایک لمحہ شک و تردد کے بغیر آپ ﷺ سے نبوت کا دعویٰ سنتے ہی اسے تسلیم کر لیا۔ ایک حضرت خدیجہؓ، دوسرے حضرت زیدؓ، تیسرے حضرت علیؓ اور چوتھے حضرت ابوبکرؓ۔ اس وقت حضرت زیدؓ کی عمر 30 سال تھی اور انھیں حضور ﷺ کی خدمت میں رہتے ہوئے پندرہ سال گزر چکے تھے۔ حضور ﷺ کے سایہ عاطفت میں ان کی تربیت و پرورش ہی اعلیٰ و ارفع نہیں تھی، بلکہ وہ حسب و نسب کے لحاظ سے بھی نجیب الطرفین تھے۔ والد کی جانب سے ان کا سلسلۂ نسب قضاعہ تک پہنچتا ہے اور والدہ کا نسب بنی معن بن طی سے ملتا ہے۔

ہجرت کے بعد 4 ہجری میں نبی کریم ﷺ نے حضرت زیدؓ کے لیے اپنی پھوپھی امیمہ کی بیٹی زینبؓ کے ساتھ نکاح کا پیغام دیا۔ حضرت زینبؓ نے کہا ''میں ان سے نسب میں بہتر ہوں۔ میں اسے اپنے لیے پسند نہیں کرتی۔ میں قریش کی شریف زادی ہوں۔'' اسی طرح کا اظہار ناراضامندی ان کے بھائی عبداللہؓ بن جحش نے کیا کہ وہ اپنی بہن کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام سے کیوں کریں۔ دوسرے رشتہ داروں کو بھی یہ بات سخت ناگوار گزری کہ اتنے اونچے گھرانے کی لڑکی، اور وہ بھی کوئی نہیں، بلکہ حضور ﷺ کی اپنی پھوپھی زاد بہن ہے، اور اس کا پیغام آپ ﷺ اپنے آزاد کردہ غلام کے لیے دے رہے ہیں۔ لیکن پیغمبر اسلام نے اخوت و مساوات کی جو بہترین مثال قائم کرنے کا ارادہ فرما لیا تھا، اس پر برابر قائم رہے، حتیٰ کہ قرآن نے اس کا قطعی اعلان فرما دیا:

﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۗ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا﴾ (الاحزاب 33:36)

''کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملے کا فیصلہ کر دے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔''

یہ وحی سنتے ہی حضرت زینبؓ اور ان کے سب خاندان والوں نے بلا تامل سر اطاعت خم کر دیا۔ اس کے بعد نبی ﷺ نے ان کا نکاح پڑھایا۔ خود حضرت زید کی طرف سے دس دینار اور ساٹھ درہم مہر ادا کیا۔ چڑھاوے کے کپڑے دیئے اور کچھ سامان خوراک گھر کے خرچ کے لیے بھجوا دیا۔

یہ آیت اگرچہ حضرت زینبؓ اور ان کے رشتہ داروں کے انکار سے متعلق ایک خاص موقع پر نازل ہوئی ہے، مگر جو حکم اس میں بیان کیا گیا ہے، وہ اسلامی آئین کا اصل الاصول ہے اور اس کا اطلاق پوری اسلامی زندگی پر ہوتا ہے۔ اس کی رو سے کسی مسلمان فرد یا قوم یا ادارے یا عدالت یا پارلیمنٹ یا ریاست کو حق نہیں پہنچتا کہ جس معاملے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی حکم ثابت ہو، اس میں وہ خود اپنی آزادئ رائے استعمال کرے۔ مسلمان ہونے کے معنی اللہ اور رسول ﷺ کے آگے اپنے آزادانہ اختیار سے دست بردار ہو جانے کے ہیں۔ کسی شخص کا مسلمان بھی ہونا اور اپنے لیے اس اختیار کو محفوظ بھی رکھنا، دونوں ایک دوسرے کی نفی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے
ابوسلمہ و ام سلمہ رضی اللہ عنہما کا نسبی رشتہ

کعب

مُرّہ

کلاب	یقظہ	
قُصیّ	مخزوم	
عبد مناف	عمر	
ہاشم	عبداللہ	
عبدالمطلب	مغیرہ	ہلال
عبداللہ	ابوامیہ	عبدالاسد
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	ام سلمہ رضی اللہ عنہا	ابوسلمہ عبداللہ رضی اللہ عنہ

شجرہ اولادِ فاطمہ وعلی رضی اللہ عنہم

عبدالمطلب

عبداللہ — ابوطالب

محمد ﷺ

فاطمہ رضی اللہ عنہا — علی رضی اللہ عنہ

حسن رضی اللہ عنہ — حسین رضی اللہ عنہ — محسن رضی اللہ عنہ — زینب رضی اللہ عنہا — ام کلثوم رضی اللہ عنہا

علی اصغر — علی اکبر — جعفر — عبداللہ — سکینہ — فاطمہ — زینب — علی الاوسط (زین العابدین) — محمد

اسماعیل — محمد — یعقوب — حسن المثنیٰ — زید — طلحہ — قاسم

ابوبکر — عبداللہ — عبدالرحمٰن — حسین — ام حسن — رملہ — ام حسین

ام عبداللہ — ام سلمہ — فاطمہ — حمزہ — جعفر — عمر

کرتے ہیں۔ کوئی ذی عقل انسان ان دونوں رویوں کو جمع کرنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ جسے مسلمان رہنا ہو، اسے لازماً اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے آگے جھک جانا ہوگا اور جسے نہ جھکنا ہو، اسے سیدھی طرح ماننا پڑے گا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔

ارشادِ الٰہی اور منشائے نبوت کے مطابق یہ نکاح ہونے کو تو ہو گیا اور تقریباً ایک سال تک دونوں نے اس رشتے کو نباہا بھی، مگر اس کے بعد ناگواریاں بڑھنے لگیں۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت زیدؓ نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت زینبؓ کے رویے کی شکایت کی اور کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ انھیں طلاق دے دوں۔ یہ سن کر آنحضور ﷺ نے انھیں سمجھایا کہ وہ طلاق نہ دیں۔ قرآن حکیم میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

''اے نبی یاد کرو وہ موقع جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے، جس پر اللہ نے اور تم نے احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو نہ چھوڑ اور اللہ سے ڈر۔'' (سورۂ احزاب 37:33)

حضرت زینبؓ نے اگرچہ اللہ اور رسول ﷺ کا حکم مان کر حضرت زیدؓ کے نکاح میں جانا قبول کر لیا تھا، لیکن وہ اپنے دل سے اس احساس کو کسی طرح نہ مٹا سکیں کہ زیدؓ ایک آزاد کردہ غلام ہیں، ان کے اپنے خاندان کے پروردہ ہیں، اور وہ عرب کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی ہونے کے باوجود کم تر درجے کے آدمی سے بیاہی گئی ہیں۔ اس احساس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں انھوں نے کبھی حضرت زیدؓ کو اپنے برابر کا نہ سمجھا اور اسی وجہ سے دونوں کے درمیان تلخیاں بڑھتی چلی گئیں۔

اسی بنا پر جب حضرت زیدؓ نے بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اللہ سے ڈرو اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دو۔ مگر حضرت زیدؓ نے روز بروز بڑھتی ہوئی چپقلش اور ناگواری کے پیش نظر بالآخر طلاق دے دی۔

جب حضرت زینبؓ طلاق کی عدت پوری کر چکیں تو حضور ﷺ نے اس خیال سے کہ وہ آپ ہی کے زیر تربیت سن شعور کو پہنچی تھیں اور آپ ہی کے حکم سے حضرت زیدؓ سے نکاح پر راضی ہوئی تھیں، ان کی دل جوئی کے لیے خود نکاح کرنا چاہا، مگر اس وقت چوں کہ زمانۂ جاہلیت کی رسومات کا اثر باقی تھا، جن کے تحت متبنیٰ (لے پالک) کو حقیقی بیٹے کا درجہ حاصل تھا، اس لیے منافقین کے اعتراض کا خیال وجہِ تامل ہوا۔

حضور ﷺ کے تامل کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں عرب کے لوگ جس بچے کو متبنیٰ بنا لیتے تھے، وہ بالکل ان کی حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ اسے وراثت ملتی تھی۔ اس سے منہ بولی ماں اور منہ بولی بہنیں وہی میل جول رکھتی تھیں جو حقیقی بیٹے اور بھائی سے رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ منہ بولے باپ کی بیٹیوں کا اور اس باپ کے مر جانے کے بعد اس کی بیوہ کا نکاح اسی طرح ناجائز سمجھا جاتا تھا، جس طرح سگی بہن اور حقیقی ماں کے ساتھ کسی کا نکاح حرام ہوتا ہے۔ اور یہی معاملہ اس صورت میں بھی کیا جاتا تھا، جب منہ بولا بیٹا مر جائے یا اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ منہ بولے باپ کے لیے وہ عورت سگی بہن کی طرح سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم قدم قدم پر نکاح، طلاق اور وراثت کے ان قوانین سے ٹکراتی تھی جو اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ اور سورۂ نسا میں مقرر فرمائے تھے۔ ان کی رو سے جو لوگ حقیقت میں وراثت کے حق دار تھے، یہ رسم ان کا حق مار کر ایک ایسے شخص کو دلواتی تھی جو سرے سے کوئی حق نہ رکھتا تھا۔ ان کی رو سے جن عورتوں اور مردوں کے درمیان رشتہ نکاح حلال تھا، یہ رسم ان کے باہمی نکاح کو حرام کرتی تھی، اور سب سے زیادہ یہ کہ اسلامی قانون جن بداخلاقیوں کا سدباب کرنا چاہتا تھا، یہ رسم ان کے پھیلنے میں مددگار تھی۔ کیوں کہ رسم کے طور پر منہ بولے رشتے میں خواہ کتنا ہی تقدس پیدا کر دیا جائے، بہرحال منہ بولی ماں، منہ بولی بہن اور منہ بولی بیٹی حقیقی ماں، بہن اور بیٹی کی طرح نہیں ہو سکتی۔ ان مصنوعی رشتوں کے رسمی تقدس پر بھروسا کر کے مردوں اور عورتوں کے درمیان جب حقیقی رشتہ داروں کا سا میل جول ہو تو وہ بُرے نتائج پیدا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ان وجوہ سے اسلامی قانون نکاح وطلاق، قانون وراثت اور قانون حرمت زنا کا یہ تقاضا تھا کہ متبنیٰ کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھنے کے تخیل کا قطعی استیصال کر دیا جائے۔

اس لیے ناگزیر تھا کہ یہ رسم عملاً توڑی جائے اور خود رسول ﷺ بہ نفس نفیس اسے توڑیں، کیوں کہ جو کام حضور ﷺ نے خود کیا ہو اور اللہ کے حکم سے کیا ہو، اس کے متعلق کسی مسلمان کے ذہن میں کراہت کا تصور باقی نہ رہ سکتا تھا۔ اسی بنا پر جنگ احزاب سے کچھ پہلے نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ کیا گیا کہ آپ ﷺ اپنے منہ بولے بیٹے زیدؓ بن حارثہ کی مطلقہ بیوی سے خود نکاح کر لیں اور اس حکم کی تعمیل آپ ﷺ نے محاصرۂ بنی قریظہ کے زمانے میں فرمائی۔

قرآنِ حکیم میں بہت پہلے سے یہ نازل ہو چکا تھا: ''مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ'' ''محمد ﷺ تم مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں ہیں۔'' (احزاب۔40) اور اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ مومنو، لے پالکوں کو ان کے اصل باپوں کے نام سے پکارا کرو۔ اللہ کے نزدیک یہی بات درست ہے۔''
(الاحزاب 5:33)

ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دل سے یہ خطرہ نکال دیا۔ دوسری طرف چوں کہ حکم الٰہی ہو چکا تھا اور اب کوئی امر مانع نہ رہا تھا، عدت کی مدت بھی پوری ہو چکی تھی، اس لیے حضور ﷺ نے حضرت زیدؓ کو نکاح کا پیام دے کر حضرت زینبؓ کے پاس بھیجا۔ جب زیدؓ ان کے گھر آئے تو وہ آٹا گوندھنے میں مصروف تھیں۔ چاہا ان کی طرف دیکھیں، لیکن پھر کچھ سوچ کر منہ پھیر لیا اور کہا: ''زینب، رسول ﷺ کا پیغام لایا ہوں۔'' جواب ملا، میں بغیر استخارہ کیے، کوئی رائے قائم نہیں کرتی۔ یہ کہا، اور مصلے پر کھڑی ہو گئیں۔ ادھر رسول ﷺ پر وحی آئی:

﴿فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ﴾

''پھر جب زید اس سے اپنی حاجت پوری کر چکا تو ہم نے اس (مطلقہ خاتون) کا تم سے نکاح کر دیا، تاکہ مومنوں پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہے۔'' (الاحزاب 37:33)

اور نکاح ہو گیا۔ حضور ﷺ حضرت زینبؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ دن چڑھے دعوتِ ولیمہ ہوئی۔ ولیمے میں روٹی اور گوشت کے سالن کا انتظام تھا۔ حضرت اُم سلیمؓ نے، جو حضور ﷺ کی خالہ اور حضرت انسؓ کی والدہ تھیں، مالیدہ بھیجا تھا۔ غرض سب چیزیں جمع ہو گئیں تو حضور ﷺ نے حضرت انسؓ کو لوگوں کے بلانے کے لیے بھیجا۔ تقریباً تین سو آدمی ضیافت میں شریک ہوئے۔ کھانے کے وقت آنحضور ﷺ نے دس دس آدمیوں کی ٹولیاں کر دی تھیں، باری باری آتے اور کھانا کھا کر واپس جاتے تھے۔

مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ حضرت زینبؓ کے ولیمے کے روز آیتِ حجاب نازل ہوئی اور اسی روز سے حجاب یعنی خواتین کے لیے پردے کا حکم ہوا۔ اس آیت کے نزول کا پس منظر حضور ﷺ کے خادم خاص حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ رات کے وقت ولیمے کی دعوت تھی۔ عام لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے، مگر دو تین حضرات بیٹھ کر باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔ تنگ آکر حضور ﷺ اٹھے اور ازواجِ مطہرات کے ہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ ﷺ پھر پلٹ گئے اور حضرت عائشہؓ کے حجرے میں جا بیٹھے۔ اچھی خاصی رات گزر جانے پر جب آپ ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں، تب آپ ﷺ حضرت زینبؓ کے مکان میں تشریف لائے۔

آیت حجاب سورۂ احزاب کی آیت 53 ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نبی ﷺ کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔ نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمھیں کھانے پر بُلایا جائے تو ضرور آؤ، مگر جب کھانا کھا لو تو منتشر ہو جاؤ۔ باتیں کرنے میں نہ لگے رہو۔ تمھاری یہ حرکتیں نبی ﷺ کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے، اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبی کی بیویوں سے اگر تمھیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔''

اس آیتِ کریمہ کے نزول کے ساتھ ہی آنحضور ﷺ نے اپنے مکان کے دروازے پر پردہ لٹکا لیا اور لوگوں کو اندر جانے کی ممانعت ہو گئی۔

آنحضور ﷺ سے حضرت زینبؓ کے نکاح کی چند خصوصیات ہیں جو اور کہیں نظر نہیں آتیں۔ اول یہ کہ اس نکاح سے منہ بولے بیٹے (متبنّٰی) کی حیثیت سگے بیٹے سے مختلف قرار پائی۔ دوم اس سے عدم مساوات کو یک سر ختم کرنے کا موقع ملا، یعنی غلاموں اور آزاد افراد میں کوئی تفریق ان کی سماجی حیثیت کے لحاظ سے باقی نہ رہی۔ پردے کا رواج شروع ہوا۔ اس نکاح کی اجازت یا حکم بذریعہ وحی نازل کیا گیا۔ ولیمے میں تکلف ہوا جس کی وجہ سے حضرت زینبؓ دوسری ازواج کے مقابلے میں فخر کیا کرتی تھیں۔

ازواجِ مطہرات میں جو حضرت عائشہؓ کی ہم سری کا دعویٰ رکھتی تھیں، ان میں حضرت زینبؓ خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھیں۔ خود حضرت عائشہؓ کہتی ہیں: ''ازواج میں سے وہی رسول اللہ کی نگاہ میں عزت و مرتبہ میں میرا مقابلہ کرتی تھیں۔''

آنحضرت ﷺ کو بھی ان کی خاطر داری منظور رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب چند ازواج نے حضرت فاطمہ زہراؓ کو سفیر بنا کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا اور وہ ناکام واپس آئیں تو سب نے اس خدمت (سفارت) کے لیے حضرت زینبؓ کا انتخاب کیا، کیوں کہ وہ اس خدمت کے لیے زیادہ موزوں تھیں۔ انھوں نے بڑی دلیری سے پیغام دیا اور بڑے زور کے ساتھ یہ ثابت کرنا چاہا کہ حضرت عائشہؓ اس رتبے کی مستحق نہیں ہیں۔ حضرت عائشہؓ خاموشی سے سن رہی تھیں اور رسول ﷺ کے چہرے کی طرف دیکھتی جاتی تھیں۔ جب حضرت زینبؓ تقریر کر چکیں تو مرضی پا کر کھڑی ہوئیں، اور اس زور شور کے ساتھ تقریر کی کہ حضرت زینبؓ لاجواب ہو کر رہ گئیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا، کیوں نہ ہو، ابوبکرؓ کی بیٹی ہے۔

آپؓ سے بہت تھوڑی احادیث منقول ہیں۔ روایتیں کم کرتی تھیں۔ کتبِ حدیث میں ان سے صرف گیارہ حدیثیں منسوب کی جاتی ہیں۔ حضرت زینبؓ کوتاہ قامت لیکن خوب صورت اور موزوں و متناسب اعضا کی مالکہ تھیں۔ اچھے اخلاق و عادات و اطوار کی حامل تھیں۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھیں۔ حضرت عائشہؓ ان کے بارے میں فرمایا کرتیں: ''مَیں نے حضرت زینبؓ سے زیادہ متقی، پرہیزگار، صادق، سخی، خوف خدا رکھنے والا شخص نہیں دیکھا۔ ان میں صرف ایک کمی تھی، اور وہ یہ کہ انتہائی حساس اور نازک مزاج تھیں، لیکن اس کے باوجود اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کبھی کوتاہی نہ کرتی تھیں اور اظہارِ ندامت فرمایا کرتیں۔'' (صحیح مسلم)

حضرت زینبؓ نماز کی بے حد پابند تھیں۔ آپ کی صداقت اور بے لاگ رائے کا اظہار اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ آپ نے واقعہ افک میں اپنی ہم شیر کے مقابلے میں حضرت عائشہؓ کی صحیح تعریف و توصیف فرمائی اور ان کے الزامات کو رد کر دیا۔ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے آپ سے حضرت عائشہؓ کے بارے میں دریافت فرمایا۔ آپ نے بے ساختہ ارشاد فرمایا کہ مَیں نے حضرت عائشہؓ میں سوائے خوبیوں کے میں نے کچھ نہیں دیکھا۔

آنحضور ﷺ نے ایک دفعہ اپنی ازواج سے باتیں کرتے ہوئے فرمایا تھا: ''تم میں سے وہ مجھ سے جلد ملے گی جس کے ہاتھ لمبے ہوں گے۔'' یہ فیاضی کی طرف اشارہ تھا، لیکن ازواجِ مطہرات حدیث کے لفظی معنی ملحوظ رکھتے ہوئے جب کبھی یک جا ہوتیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ ناپا کرتیں، اور جب تک حضرت زینبؓ کی وفات نہ ہوئی، کسی کو آنحضور ﷺ کے ارشاد کا حقیقی مفہوم معلوم نہ ہو سکا۔ چنانچہ حضرت زینبؓ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ نے اس حدیث کی تشریح میں فرمایا: ''ہم میں سب سے زیادہ لمبے ہاتھ والی حضرت زینبؓ تھیں، کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ کی کمائی سے صدقہ کرتی تھیں۔''

حضرت زینبؓ ہنر مند خاتون تھیں۔ انھیں چمڑا رنگنے میں مہارت حاصل تھی۔ آپ اپنی تمام آمدنی غربا و مساکین میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔

ازواجِ مطہرات میں سب سے پہلے انتقال کیا۔ کفن کا سامان خود تیار کر لیا تھا اور وصیت کی تھی کہ حضرت عمرؓ بھی کفن دیں تو ان میں سے ایک کو صدقہ کر دینا۔ چنانچہ

وصیت پوری کی گئی۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد ازواج مطہرات سے دریافت کیا گیا کہ قبر میں کون داخل ہوگا۔ انھوں نے کہا، وہ شخص جوان کے گھر میں داخل ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ اسامہ بن زیدؓ، محمد بن عبداللہ بن جحش، عبداللہ بن ابی احمد بن جحش نے انھیں قبر میں اُتارا اور جنت البقیع میں سپرد خاک کیا۔

آپؓ کی وفات 20 ہجری میں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر 53 سال تھی۔ آپ نے اپنے اثاثے میں صرف ایک رہائشی مکان چھوڑا جو بعد میں ان کے وارثوں سے خلیفہ ولید بن عبدالملک نے پچاس ہزار درہم کے عوض خرید کر مسجد نبوی کی توسیع میں شامل کر دیا۔

(8) حضرت جویریہؓ

اصل نام بّرہ تھا۔ آنحضور ﷺ نے اس نام کو ناپسند کرتے ہوئے ان کا نام جویریہ رکھ دیا۔ ان کے والد حارث بن ابی ضرار بنو مصطلق کے سردار تھے۔ ان کا پہلا نکاح اپنے ہی قبیلے میں مسافع بن صفوان سے ہوا تھا۔

حضرت جویریہؓ کے والد اور شوہر دونوں دشمن اسلام تھے۔ چنانچہ حارث نے قریش کے اشارے سے یا خود مدینہ پر حملے کی تیاریاں شروع کی تھیں۔ آنحضور ﷺ کو خبر ملی تو مزید تحقیقات کے لیے بریدہ بن حصیبؓ اسلمی کو روانہ کیا۔ انھوں نے واپس آ کر خبر کی تصدیق کی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کو تیاری کا حکم دیا۔ 2۔ شعبان 5 ہجری کو اسلامی لشکر مدینے سے روانہ ہوا اور مریسیع میں، جو مدینہ سے نو منزل پر ہے، پہنچ کر قیام کیا، لیکن حارث کو یہ خبریں پہلے سے پہنچ چکی تھیں، اس لیے اس کی جمعیت منتشر ہوگئی اور وہ خود بھی کسی طرف نکل گیا، لیکن مریسیع میں جو لوگ آباد تھے، انھوں نے صف آرائی کی اور دیر تک جم کر تیر برساتے رہے۔ مسلمانوں نے اچانک ایک ساتھ حملہ کیا تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ دس گیارہ آدمی مارے گئے اور باقی گرفتار ہوگئے جن کی تعداد تقریباً 600 تھی۔ غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔

قیدیوں میں جویریہؓ بھی تھیں۔ ان کے شوہر مسافع بن صفوان غزوہ مریسیع میں قتل ہوگئے تھے۔ جب مالِ غنیمت تقسیم ہوا تو وہ حضرت ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئیں۔ انھوں نے حضرت ثابتؓ سے درخواست کی کہ مکاتبت کر لو، یعنی مجھ سے کچھ روپیہ لے کر چھوڑ دو۔ اسلام میں یہ اجازت ہے کہ اگر آقا راضی ہو تو کنیز یا غلام کچھ رقم دے کر اپنے آپ کو آزاد کرا سکتے ہیں۔ اس طریقے کو فقہ کی اصطلاح میں ''کتابت'' کہتے ہیں۔ اسی اصول کے تحت حضرت جویریہؓ مکاتبہ بن گئیں۔ آپ کو اس شرط کے مطابق نو اوقیہ سونا ادا کرنا تھا، لیکن اس کی ادائیگی آپ کی طاقت سے باہر تھی۔ چنانچہ آپ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ میں بنو مصطلق کے سردار حارث کی بیٹی ہوں۔ جو مصائب مجھ پر ٹوٹے ہیں، حضور ﷺ سے پوشیدہ نہیں۔ میں مالِ غنیمت کے طور پر ثابت بن قیسؓ کے حصے میں آئی ہوں اور نو اوقیہ سونے پر ان سے عہدِ مکاتبت کیا ہے، لیکن میں یہ رقم ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتی۔ آپ ﷺ میری امداد فرمائیے۔ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں تمھارا زرِ کتابت ادا کر دوں اور تم سے نکاح کر لوں۔'' حضرت جویریہؓ راضی ہوگئیں۔ پھر آنحضور ﷺ نے زرِ کتابت دے کر نکاح کر لیا۔

مولانا سعید انصاری اپنی تصنیف ''سیر الصحابیات'' میں رقم طراز ہیں: ''لیکن دوسری روایت میں اس سے زیادہ واضح بیان مذکور ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضرت جویریہؓ کا باپ حارث آنحضور ﷺ کی خدمت میں آیا اور کہا، میری بیٹی کنیز نہیں بن سکتی۔ میری شان اس سے بالاتر ہے۔ میں اپنے قبیلے کا سردار اور رئیس عرب ہوں۔ آپ ﷺ اس کو آزاد کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ یہ معاملہ خود جویریہؓ کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ حارث نے جا کر جویریہؓ سے کہا کہ محمد ﷺ نے تیری مرضی پر رکھا ہے۔ دیکھنا مجھے رسوا نہ کرنا۔ انھوں نے کہا ''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہنا پسند کرتی ہوں۔'' چنانچہ آنحضور ﷺ نے ان سے شادی کر لی۔'' ابن سعد نے ''طبقات'' میں روایت کی ہے کہ حضرت جویریہؓ کے والد نے ان کا زرِ فدیہ ادا کیا اور جب وہ آزاد ہوگئیں تو آنحضور ﷺ نے بنو مصطلق کی تالیفِ قلب اور تکریم کی خاطر سردارِ قوم کی بیٹی جویریہؓ کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔

اس معزز ناتے کی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے بنو مصطلق کے تمام قیدیوں کو آزاد کر دیا۔ یہ رشتہ بنو مصطلق کے تمام خاندانوں کے حق میں بابرکت اور موجب رحمت ثابت ہوا اور یہ بات ان کے لیے قابل فخر ہوگئی کہ ان کی اپنی آزادی اور ان کی قوم کے ایک سو افراد کی آزادی ان کے مہر کے قائم مقام بنی، یہاں تک کہ جویریہؓ کے والد حارث بھی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے کسی عورت کو جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے حق میں مبارک نہیں دیکھا۔ ان کی وجہ سے بنو مصطلق کے سیکڑوں گھرانے آزاد کر دیئے گئے۔

حضرت جویریہؓ سے صرف سات حدیثیں مروی ہیں جن میں سے ایک صحیح بخاری میں اور دو صحیح مسلم میں ہیں۔ وہ زاہدانہ زندگی بسر کرتی تھیں۔ ایک دن صبح کو مسجد میں دعا کر رہی تھیں۔ حضور ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا اور دیکھتے ہوئے چلے گئے۔ دوپہر کے وقت تشریف لائے، تب بھی انھیں اسی حالت میں پایا۔

جمعہ کے دن حضور ﷺ ان کے گھر تشریف لائے تو وہ روزے سے تھیں۔ حضرت جویریہؓ سے دریافت کیا کہ کیا کل روزے سے تھیں؟ بولیں کہ نہیں۔ دریافت فرمایا، کل رکھو گی؟ جواب ملا، نہیں۔ ارشاد ہوا ''تو پھر تمھیں افطار کر لینا چاہیے۔'' دوسری روایتوں میں ہے کہ حضور ﷺ مہینے میں تین دن روزہ رکھتے تھے، جن میں سے ایک دن جمعہ کا ضرور ہوتا تھا۔ اس لیے تنہا جمعہ کے دن ایک روزہ رکھنے میں علما کا اختلاف ہے۔ حنفیہ کے نزدیک جائز ہے۔ امام مالک بھی جائز سمجھتے ہیں۔ شافعیہ نے اس سے روکا ہے۔ امام ابو یوسف کے نزدیک احتیاط اس میں ہے کہ جمعہ کے روزے کے ساتھ ایک روزہ اور ملا لیا جایا کرے۔ یہ بحث صرف جمعہ کے دن روزہ رکھنے کے

متعلق ہے۔

حضرت جویریہؓ نے 71 برس کی عمر میں ربیع الاول 56 ہجری میں امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں انتقال فرمایا۔ والی مدینہ مروان بن حکم نے نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

(9) حضرت اُمّ حبیبہؓ

ام المومنین حضرت اُمّ حبیبہؓ بنت ابوسفیان صخر بن حرب بن اُمیہ بن عبدالشمس کا اصل نام رملہ تھا، مگر اپنی بیٹی حبیبہ کے نام سے اُمّ حبیبہؓ مشہور ہوئیں۔ آپ کی والدہ کا نام صفیہ بنت ابوالعاص بن امیہ تھا جو حضرت عثمانؓ کی سگی پھوپھی تھیں۔

آپ بعثت نبوی سے سترہ سال قبل پیدا ہوئیں۔ آپ کا پہلا نکاح عبیداللہ بن جحش بن رباب سے ہوا جو بنی اسد بن خزیمہ کے خاندان سے تھے اور حرب بن اُمیہ کے حلیف تھے۔ آپ نے اپنے شوہر کے ساتھ اسلام قبول کیا اور ان کے ساتھ ہی ہجرت کر کے حبشہ چلی گئیں۔ حبشہ میں آپ کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، جس کا نام حبیبہ تھا۔ عبیداللہ نے اسلام ترک کیا اور عیسائی ہو کر بالکل آزادانہ زندگی بسر کرنا شروع کی۔ شراب نوشی کے عالم ہی میں مرگیا۔ اُمِ حبیبہ اپنے شوہر کے مرتد ہونے کے باوجود مسلمان رہیں۔

نبی کریم ﷺ کو جب آپ کی بیوگی اور غریب الوطنی کا علم ہوا تو حضور ﷺ نے نکاح کا پیغام دینے کے لیے عمرو بن اُمیہ ضمریؓ کو نجاشی شاہ حبش کے پاس بھیجا۔ ان کے پہنچتے ہی نجاشی نے اپنی کنیز ابرہہ کے ذریعے حضرت اُمِ حبیبہؓ کے پاس رسول کریم ﷺ کا پیغام پہنچایا اور یہ بھی بتایا کہ آنحضور ﷺ نے مجھے آپ کے نکاح کے لیے لکھا ہے۔ لہٰذا آپ اپنا وکیل مقرر کریں کہ یہ تقریب انجام پائے۔ حضرت اُمِ حبیبہؓ نے اس صلے میں ابرہہ کو دو چاندی کے کنگن، دو پاؤں کے چھلے اور چاندی کی انگوٹھیاں عنایت کیں۔ خالد بن سعید کو حضور ﷺ کے پیغام کی اطلاع دے کر انھیں اپنا وکیل بنایا۔ شام کے وقت نجاشی نے وہاں کے مسلمانوں اور حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کو بلا کر خود نکاح پڑھایا اور چار سو دینار بطور مہر آنحضور ﷺ کی طرف سے خالد بن سعید کو ادا کیے۔ جب مراسم نکاح سے فراغت ہوئی اور لوگ اٹھ کر جانے لگے تو خالد بن سعید نے لوگوں کو ٹھہرالیا کہ انبیا کی سنت یہ ہے کہ نکاح کرتے ہیں تو کھانا بھی کھلاتے ہیں۔ پھر سب کو کھانا کھلا کر رخصت کیا۔

اُمّ حبیبہؓ بڑے مستحکم ایمان کی خاتون تھیں اور اس خصوصیت میں وہ اپنے کسی عزیز رشتہ دار کی رعایت نہ کرتی تھیں۔ کفر کے زمانے میں ان کے والد ابوسفیان آنحضور ﷺ کے پاس مدینہ آئے کہ صلح حدیبیہ کے متعلق جو تعطل پیدا ہو گیا تھا، اسے ختم کرنے کے لیے حضور ﷺ سے درخواست کریں۔ مدینہ پہنچ کر وہ اپنی بیٹی کو دیکھنے بھی گئے۔ جب وہ آنحضور ﷺ کے بستر پر بیٹھنے لگے تو اُمِ حبیبہؓ نے بستر الٹ دیا۔ ابوسفیان کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ انھوں نے شکوے کے انداز میں حضرت اُمِ حبیبہ سے کہا: ”تجھ کو بچھونا اتنا عزیز ہے کہ میرے رشتے کا لحاظ نہ رکھا۔“ اُمّ حبیبہؓ نے جواب دیا: ”یہ رسول اللہ کا بستر ہے۔ آپ چوں کہ مشرک ہیں، اس لیے ناپاک ہیں۔“ ابوسفیان نے کھسیانا ہو کر کہا، بیٹی تو ہم سے جدا ہو کر بگڑ گئی۔

ام حبیبہؓ حدیث پر بہت پابندی سے عمل کرتی تھیں اور دوسروں کو بھی اس پابندی کی تاکید کرتی رہتی تھیں۔ ایک بار آپ کے بھانجے ابن سعید آئے اور انھوں نے ستو کھا کر کلی کی، تو بولیں ”تمھیں وضو کرنا چاہیے، کیوں کہ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس چیز کو آگ پکائے، اس کے استعمال سے وضو لازم آتا ہے۔“

آپ نے امیر معاویہؓ کے عہد خلافت میں 44 ہجری میں تقریباً 74 سال کی عمر میں انتقال کیا اور مدینے میں دفن ہوئیں۔ وفات سے قبل آپ نے حضرت عائشہؓ کو بلا کر کہا: ”مجھ میں اور آپ میں سوکنوں کے تعلقات تھے۔ اگر کوئی لغزش ہوئی ہو تو معاف کر دیجیے اور میرے لیے دعائے مغفرت کیجیے۔“

حضرت عائشہؓ نے دعا کی تو بولیں: ”آپ نے مجھے خوش کیا، اللہ آپ کو خوش کرے۔“

قبر کے متعلق اس قدر معلوم ہے کہ حضرت علیؓ کے مکان میں تھی۔ امام زین العابدین بن امام حسینؓ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ مَیں نے اپنے مکان کا ایک گوشہ کھدوایا تو ایک کتبہ برآمد ہوا، جس پر لکھا تھا: ”یہ رملہ بنت صخر کی قبر ہے۔ چنانچہ اسے مَیں نے اسی جگہ رکھ دیا۔“

حضرت اُمّ حبیبہؓ کے سگے بھائی کا نام یزید بن ابوسفیان ہے جو یزید الخیر کے نام سے مشہور ہیں اور فتح مکہ کے دن مسلمان ہوئے تھے۔ آپ کے دوسرے بھائی امیر معاویہؓ دوسری ماں سے تھے۔ آپؓ کے والد ابوسفیان فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے اور 33 ہجری میں چھیانوے سال کی عمر میں انتقال کیا۔

حضور ﷺ سے آپؓ کا نکاح ذوالحجہ 6 ہجری میں ہوا۔ نکاح کے بعد جب آپ حبشہ سے مدینہ پہنچیں، اس وقت حضور ﷺ خیبر میں تشریف فرما تھے۔ غزوۂ خیبر کی تاریخ محرم سات ہجری ہے۔

پہلے شوہر سے اُمّ حبیبہؓ کے ایک لڑکا عبداللہ اور ایک لڑکی حبیبہؓ پیدا ہوئیں۔ حبیبہ نے آغوشِ نبوت میں تربیت پائی اور داؤد بن عروہ بن مسعود سے منسوب ہوئیں، جو قبیلہ ثقیف کے رئیس اعظم تھے۔

(10) حضرت صفیہؓ

اصل نام زینب تھا، لیکن چوں کہ وہ غزوۂ خیبر (محرم 7 ہجری) میں خاص آنحضور ﷺ کے حصے میں آئی تھیں، اور عرب میں غنیمت کے ایسے حصے کو جو امام یا بادشاہ کے لیے مخصوص ہوتا تھا، صفیہ کہتے تھے، اس لیے وہ بھی صفیہ کے نام سے مشہور ہو گئیں۔

حضرت صفیہؓ کو باپ اور ماں دونوں کی طرف سے سیادت حاصل ہے۔ باپ کا نام حیی بن اخطب تھا جو قبیلہ بنونضیر کا سردار تھا اور والدہ بنوقریظہ کے سردار کی بیٹی تھیں اور یہ دونوں خاندان (نضیر اور قریظہ) بنواسرائیل کے ان تمام قبائل سے ممتاز سمجھے جاتے تھے، جنھوں نے زمانہ دراز سے عرب کے شمالی حصوں میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

آپ کا پہلا نکاح سلام بن مشکم قرظی سے ہوا جو ایک مشہور شاعر اور سردار تھا

ں سے طلاق ہو جانے کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق سے عقد ہوا، جو ابو رافع تاجر حجاز اور
بس خیبر کا بھتیجا تھا اور خیبر کے قلعہ قموص کا سردار تھا اور اسی قلعے میں اہل و عیال سمیت
ہائش رکھتا تھا۔ غزوۂ خیبر میں صفیہ کے باپ، بھائی اور شوہر کنانہ بھی مارے گئے۔
فیہ گرفتار ہوئیں۔

غنیمت کی تقسیم کے وقت حضرت دحیہؓ کلبی نے آنحضور ﷺ سے ایک
نڈی کی درخواست کی۔ آنحضور ﷺ نے انتخاب کرنے کی اجازت دے دی۔
ھوں نے صفیہؓ کو منتخب کیا، لیکن چوں کہ عزت و وقار کے لحاظ سے حضرت صفیہؓ زیادہ
ی وقعت تھیں، اس لیے بعض صحابہؓ نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا کہ حضرت صفیہؓ
نو نضیر اور بنو قریظہ کی رئیسہ ہونے کی بنا پر حضور ﷺ کے لیے مناسب ہیں۔
حضور ﷺ نے یہ مشورہ قبول کرتے ہوئے حضرت دحیہ کلبیؓ کو دوسری لونڈی عطا
فرمائی اور حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے خود نکاح کر لیا۔ نکاح کے بعد خیبر سے روانگی
ہوئی۔ مقام صہبا میں رسم عروسی ادا ہوئی اور اسی مقام پر دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا گیا۔
یہاں سے چلتے وقت حضور ﷺ نے حضرت صفیہؓ کو اپنے اونٹ پر سوار فرمایا اور خود
اپنی عبا سے ان پر پردہ کیا، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ حضرت صفیہؓ ازواجِ
مطہرات میں داخل ہو گئی ہیں۔

حضرت صفیہؓ بڑی حلیم الطبع اور بے انتہا ضابط خاتون تھیں۔ جس وقت قلعہ قموص
فتح ہوا اور خیبر پر اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا، اور حضرت بلالؓ حضرت صفیہؓ کو
آنحضور ﷺ کی خدمت میں لے چلے تو راستے میں آپ کا گزر یہودیوں کی لاشوں
پر سے ہوا۔ انھی مقتولین میں حضرت صفیہؓ کے شوہر کی نعش بھی تھی، مگر آپ کی جبیں پر
شکن تک نہ آئی۔

حضرت صفیہؓ کے واقعاتِ زندگی میں سے ایک اہم واقعہ حج کا سفر ہے جو انھوں
نے آنحضور ﷺ کے ساتھ کیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کے ایامِ محاصرہ میں جو 35 ہجری
میں ہوا تھا، حضرت صفیہؓ نے ان کی بے حد مدد کی تھی۔ جب حضرت عثمانؓ پر ضروریات
زندگی مسدود کر دی گئیں، اور ان کے مکان پر پہرہ بٹھا دیا گیا تو وہ خود خچر پر سوار ہو کر
ان کے مکان کی طرف چلیں۔ غلام ساتھ تھا۔ اُشتر کی نظر پڑی تو انھوں نے آ کر خچر کو
مارنا شروع کیا۔ حضرت صفیہؓ نے کہا، مجھے ذلیل ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں واپس
جاتی ہوں، تم خچر کو چھوڑ دو۔ گھر واپس آئیں تو حضرت حسنؓ کو اس خدمت پر مامور کیا۔
وہ ان کے مکان سے حضرت عثمانؓ کے پاس کھانا اور پانی لے جاتے تھے۔

حضرت صفیہؓ آنحضور ﷺ کو بہت محبوب رکھتی تھیں۔ جب حضور ﷺ
علیل ہوئے اور تمام ازواج مطہرات عیادت کے لیے تشریف لائیں تو حضرت صفیہؓ
بصد حسرت و یاس فرمانے لگیں کہ اے اللہ کے نبی ﷺ! کاش کہ آپ ﷺ کی
تمام تکالیف مجھے مل جائیں۔ یہ سن کر دیگر ازواج مطہرات ایک دوسرے کو دیکھنے
لگیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''واللہ وہ سچی ہیں۔''

حضرت صفیہؓ سخی اور فیاض تھیں۔ آپ کا ایک ذاتی مکان تھا۔ وہ بھی آپ نے
زندگی میں صدقہ کر دیا تھا۔ حضرت صفیہؓ اسلام سے بے پناہ عقیدت رکھتی تھیں۔ ایک
دفعہ آپ کی ایک لونڈی حضرت عمر فاروقؓ کے پاس یہ شکایت لے کر آئی کہ حضرت
صفیہؓ سبت (ہفتہ، یہودیوں کا متبرک دن) کی عزت کرتی ہیں اور سبت کے دن
یہودیوں کو عطیات دیتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان سے اس امر کے متعلق دریافت کیا۔
آپ نے کہلا بھیجا کہ خدا نے جب سے جمعہ عطا فرمایا ہے، سبت کو کبھی پسند نہیں کیا۔
رہے یہودی، تو ان سے میرے قرابت کے تعلقات ہیں اور اس بنا پر میں انھیں ضرور
عطیات دیتی رہتی ہوں۔ بعد میں حضرت صفیہؓ نے لونڈی سے دریافت کیا کہ تمھیں
ایسی شکایت کرنے کے لیے کس نے کہا۔ اس نے کہا، مجھے شیطان نے بہکا دیا تھا۔
آپ چپ ہو گئیں اور اس لونڈی کو آزاد کر دیا۔

آپ نے ساٹھ سال کی عمر میں رمضان المبارک 50 ہجری میں انتقال فرمایا اور
جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

(11) حضرت میمونہؓ

آپ کا اصل نام برہ تھا، لیکن حضور ﷺ کی زوجیت میں آنے کے بعد آپ کو
میمونہ کا نام دیا گیا۔ آپ قبیلہ قریش سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ کے والد حارث بن
حزن، اور والدہ ہند بنت عوف کا تعلق قبیلہ حمیر سے تھا۔ آپ کی ہمشیر اُم الفضل لبابہ
صغریٰ آنحضور ﷺ کے چچا حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کی زوجہ تھیں۔ حضرت
زینبؓ اُم المساکین آپ کی سوتیلی بہن تھیں۔

وہ نو بہنیں تھیں اور سبھی کی شادی مختلف قبائل کے سرداروں سے ہوئی تھی۔ حضرت
میمونہؓ کا پہلا نکاح مسعود بن عمیر ثقفی سے ہوا، لیکن کسی وجہ سے علیحدگی ہو گئی۔ پھر
ابورہم بن عبدالعزیٰ کے نکاح میں آئیں، جن کا انتقال سات ہجری میں ہوا۔ اس
وقت آپ کی عمر اکیاون سال تھی۔

جب رسول کریم ﷺ سات ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد عمرہ ادا کرنے کے
لیے مکہ گئے، تو حضرت عباسؓ نے اپنی بیوہ سالی کے لیے نکاح کے لیے گزارش کی۔
دوسرے رسول اللہ ﷺ حضرت میمونہ کے قبیلے امیر ابن صعصعہ اور ان تمام قبائل
سے قریبی تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے جن کے سرداروں سے حضرت میمونہؓ کی بہنیں
بیاہی ہوئی تھیں۔ ان دنوں حضرت زینبؓ کا انتقال ہو چکا تھا۔ چنانچہ آنحضور ﷺ
نے احرام کی حالت میں بہ عوض پانچ سو درہم حضرت میمونہؓ سے نکاح کیا۔ اتفاق سے
ان دنوں اہلِ مکہ سے مسلمانوں کی صلح ہو چکی تھی۔ صلح نامہ حدیبیہ کے مطابق
حضور ﷺ کو مکہ میں صرف تین دن قیام کرنا تھا۔ چنانچہ مقررہ مدت ختم ہونے کے
بعد کفار مکہ کا ایک وفد حضور ﷺ کے پاس آیا اور مطالبہ کیا کہ آپ ﷺ مکہ سے
چلے جائیں۔ حضور ﷺ نے اہل مکہ سے کہا ''اگر میں کچھ دیر اور قیام کر لوں تو تمھارا
کیا بگڑتا ہے۔ میں نے ابھی شادی کی ہے اور میں پورے شہر کو دعوتِ ولیمہ میں مدعو کرنا
چاہتا ہوں'' مگر کفار مکہ نے کہا کہ وہ ضیافت کھانا نہیں چاہتے۔ رسول ﷺ نے اپنی
سی کوشش کی، مگر وہ کفار مکہ کو قائل نہ کر سکے۔

جب حضور ﷺ نے عُمرے سے فارغ ہو کر مکہ سے مدینہ کے راستے میں سرف کے مقام پر قیام فرمایا (جو مکہ سے دس میل پر ہے) تو آپ ﷺ کے خادم ابورافع حضرت میمونہؓ کو لے کر سرف پہنچے اور یہیں رسم عروسی ادا ہوئی۔

یہ رسول پاک ﷺ کی گیارہ ازواج مطہرات تھیں۔ حضرت میمونہؓ سب سے آخری زوجہ تھیں۔ دو کا قبل ازیں انتقال ہو چکا تھا۔ تاہم ایک وقت میں نبی ﷺ کی ازواج کی تعداد نو سے زیادہ نہیں رہی۔

حضرت میمونہؓ سے کوئی 46 احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسی احادیث ہیں، جنھیں پڑھ کر آپ کی فہم و فراست اور فقہی مسائل پر گہری نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ حضرت ابن عباسؓ کو تردد تھا کہ دوران حیض میں کیا بیوی اپنے شوہر کو ہاتھ لگا سکتی ہے؟ اس پر حضرت میمونہؓ نے انھیں سمجھایا کہ ایسی حالت میں عورت اپنے شوہر کو ہاتھ لگا سکتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آنحضور ﷺ ہماری گود میں سر رکھ کر لیٹتے تھے اور قرآن پڑھتے تھے اور ہم اسی حالت (ماہواری) میں ہوتی تھیں۔ یہ بھی بتایا کہ ازواج مطہرات اس حالت میں جانماز لے کر مسجد نبوی میں چلی جایا کرتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت میمونہؓ انتہائی خدا ترس خاتون تھیں اور اپنے اہل خاندان کا بے حد خیال رکھتی تھیں۔ انھیں غلام آزاد کرنے کا ہمیشہ خیال رہتا تھا۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنی ایک خادمہ کو آزاد کیا تو آنحضور ﷺ نے اس موقع پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم پر رحمتیں نازل فرمائے اور تمھیں اس کا اجر دے۔

حضرت میمونہؓ کبھی کبھی قرض لیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ زیادہ رقم قرض لی تو کسی نے کہا، اتنی بڑی رقم آپ کیسے ادا کریں گی؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص ادا کرنے کی نیت رکھتا ہے، اللہ خود اس کا قرض ادا کر دیتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ حضرت میمونہؓ کی وفات بھی اسی مقام یعنی سرف پر ہوئی جہاں ان کا حضور ﷺ سے عقد ہوا تھا۔ ان کا انتقال 51 ہجری میں ہوا۔ حضرت ابن عباسؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جنازہ قبرستان لے جاتے وقت حضرت ابن عباسؓ نے کہا: ''یہ رسول ﷺ کی زوجہ ہیں۔ جنازے کو زیادہ حرکت نہ دو۔ باادب آہستہ سے چلو۔''

یہ گیارہ بیویاں ہوئیں جو رسول اللہ ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں اور آپ ﷺ کی صحبت و رفاقت میں رہیں۔ ان میں سے دو بیویاں یعنی حضرت خدیجہؓ اور حضرت زینبؓ اُمّ المساکین کی وفات آپ ﷺ کی زندگی ہی میں ہوئی اور نو بیویاں آپ ﷺ کی وفات کے بعد زندہ رہیں۔ صاحب ''الرحیق المختوم'' مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری رقم طراز ہیں: ''ان کے علاوہ دو اور خواتین جو آپ ﷺ کے پاس رخصت نہیں کی گئیں، ان میں سے ایک قبیلہ بنو کلاب سے تعلق رکھتی تھیں، اور ایک قبیلہ کندہ سے۔ یہی قبیلہ کندہ والی خاتون جونیہ کی نسبت سے معروف ہیں۔ ان کا آپ ﷺ سے عقد ہوا تھا یا نہیں اور ان کا نام و نسب کیا تھا، اس بارے میں اہل سیر کے درمیان بڑے اختلافات ہیں۔ جہاں تک لونڈیوں کا معاملہ ہے تو مشہور یہ ہے کہ آپ ﷺ نے دو لونڈیوں کو اپنے پاس رکھا: ''ایک ماریہؓ قبطیہ اور دوسری ریحانہؓ بنت زید۔''

(12) حضرت ریحانہ بنت شمعونؓ

ریحانہ نام۔ یہود کے خاندان بنو قریظہ سے تعلق تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: ریحانہ بنت شمعون بن زید بن خنافہ۔ بعض روایتوں میں ان کا سلسلۂ نسب اس طرح درج ہے ''ریحانہ بنت زید بن عمر بن خنافہ بن شمعون بن زید۔ لیکن جمہور سیرت نگاروں کے نزدیک پہلا سلسلہ نسب معتبر ہے۔ ان کے والد کا نام شمعونؓ بن زید ہی ہے، جنھیں صحابیت، سماع اور روایت کا شرف حاصل ہے۔

حضرت ریحانہؓ کا نکاح بنو قریظہ کے ایک شخص حکم سے ہوا۔ غزوۂ بنو قریظہ کے بعد جن یہودیوں کو قتل کیا گیا، ان میں حکم بھی شامل تھا۔ اور جن یہودی عورتوں کو اسیر کیا گیا، ان میں ریحانہؓ بھی شامل تھیں۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے انھیں حضرت اُمّ المنذرؓ بنت قیس کے گھر میں ٹھہرایا۔ ان کے قبول اسلام کے بارے میں دو روایتیں ہیں۔ پہلی روایت یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم چاہو تو اسلام قبول کر لو اور چاہو تو اپنے مذہب (یہودیت) پر قائم رہو۔ انھوں نے اپنے مذہب کو ترجیح دی۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم اسلام قبول کر لو تو میں تمھیں اپنے پاس رکھوں گا۔'' لیکن وہ اپنی بات پر قائم رہیں۔ حضور ﷺ کو ان کے رویے سے رنج ہوا اور ریحانہؓ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ ایک دن آپ ﷺ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے درمیان رونق افروز تھے کہ کسی شخص کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ حضور ﷺ کے روئے مبارک پر بشاشت پھیل گئی اور آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ ثعلبہؓ بن سعید ہیں جو ریحانہ کے قبول اسلام کی خوش خبری لے کر آ رہے ہیں۔ ابن ہشام نے لکھا ہے کہ ثعلبہؓ نے بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر آہستہ سے حضور ﷺ کو حضرت ریحانہؓ کے قبول اسلام کی خوش خبری سنائی۔ حضور ﷺ بہت خوش ہوئے۔

دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت ریحانہؓ اسیر ہو کر آئیں تو حضور ﷺ نے ان سے فرمایا ''اگر تم اللہ اور رسول ﷺ کو اختیار کر لو تو میں تمھیں اپنے لیے خاص کر لوں گا۔'' انھوں نے عرض کیا، میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو اختیار کرتی ہوں۔ قبول اسلام کے بعد حضور ﷺ نے انھیں اپنی ملک میں رکھا اور بعض روایتوں کے مطابق آپ ﷺ نے انھیں آزاد کر دیا اور پھر ان سے نکاح فرما کر ازواج مطہرات میں شامل کر لیا۔ بہر صورت وہ باپردہ رہتی تھیں اور ان کی بھی باری کا دن مقرر تھا۔ حضور ﷺ کو ان سے بڑی محبت تھی اور آپ ﷺ ان کی ہر فرمائش پوری کرتے تھے۔ ان کی مستقل قیام گاہ دار قیس بن فہد میں تھی۔ حسن صورت کے ساتھ نہایت پاکیزہ اخلاق کی مالک تھیں۔

ابن سعد کے مطابق حضرت ریحانہؓ کا نکاح ماہ محرم 6 ہجری میں پیش آیا اور آنحضور ﷺ کے وصال سے چند ماہ قبل وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

(1) حضرت ماریہ قبطیہؓ

صلح حدیبیہ (6 ہجری) کے بعد آنحضور ﷺ نے مختلف ممالک کے بادشاہوں اور سربراہوں کو مختلف قاصدوں کے ہاتھ دعوتی مراسلات ارسال کیے تھے۔ رومیوں کے نائب السلطنت، اور قبطی عیسائیوں کے سردار مقوقس کے نام آنحضور ﷺ کا نامہ مبارک حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ لے کر مصر گئے تھے اس وقت مقوقس اسکندریہ میں تھا۔ حضرت حاطبؓ کی آمد کی اطلاع ملی تو فوراً دربار میں بلالیا۔ بڑے احترام سے دربار میں جگہ دی۔ مقوقس نے رسول اللہ کا نامۂ مبارک چوما، آنکھوں سے لگایا۔ اس نے نامۂ مبارک بڑے احترام کے ساتھ ہاتھی دانت کے ایک ڈبے میں رکھ کر اسے سر بمہر کرادیا اور ڈبا ایک کنیز کے حوالے کر کے حکم دیا کہ اسے محفوظ کرلیا جائے۔ پھر اس نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں ایک خط لکھوایا: ''میں نے آپ ﷺ کا مکتوب پڑھا ہے۔ اس میں جس بات کا ذکر ہے اور جو دعوت دی گئی ہے۔ اسے سمجھا۔ مجھے علم ہے کہ ایک نبی کو ابھی آنا ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ نبی ملک شام سے ظاہر ہوگا۔ میں نے آپ ﷺ کے قاصد کی تکریم کی ہے۔ میں آپ ﷺ کی خدمت میں دو کنیزیں بھیج رہا ہوں جنھیں قبطیوں میں بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ خلعت اور حضور ﷺ کی سواری کے لیے ایک خچر بھی پیش کر رہا ہوں۔''

ان کنیزوں میں سے ایک کا نام ماریہؓ اور دوسری کا نام سیرینؓ تھا۔ یہ دونوں شمعون کی بیٹیاں تھیں۔ خچر نہایت کم یاب نسل کا اور سفید رنگ کا تھا۔ اس کے مقابلے میں سارے عرب میں کوئی خچر نہ تھا۔ اس کا نام دلدل تھا جو امیر معاویہؓ کے دور تک زندہ رہا۔ جنگ حنین میں آپ ﷺ اسی پر سوار تھے۔

یہ دونوں کنیزیں جب حضرت حاطبؓ کے ہم راہ مدینے کی طرف چلیں تو اثنائے راہ میں ان کی تبلیغ ودعوت سے متاثر ہو کر انھوں نے اسلام قبول کرلیا۔ آنحضور ﷺ نے سیرین کو اپنے صحابی حضرت حسان بن ثابتؓ کو عطا فرمایا، جن کے بطن سے عبدالرحمٰن بن حسانؓ پیدا ہوئے۔ حضرت ماریہؓ کو اپنے حرم میں داخل فرمایا۔ مؤرخین میں اس امر پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے کہ آیا حضور ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا تھا یا محض انھیں کنیز کی حیثیت حاصل رہی۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی ''سیرت النبی ﷺ'' میں لکھتے ہیں: ''حضرت حاطبؓ کی تعلیم سے دونوں خاتونیں خدمت نبوی ﷺ میں پہنچنے سے پہلے اسلام قبول کرچکی تھیں۔ اس واقعے کو اس حیثیت سے دیکھنا چاہیے کہ یہ دونوں خاتونیں لونڈیاں نہ تھیں اور اسلام قبول کرچکی تھیں۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ماریہؓ سے نکاح کیا ہوگا نہ کہ لونڈی کی حیثیت سے وہ آپ ﷺ کے حرم میں آئیں۔''

مزید برآں آنحضور ﷺ بھی سیاسی طور پر مصر کے قبطی بادشاہ مقوقس سے قریبی تعلقات استوار کرنا چاہتے تھے، جس نے اپنے جوابی مکتوب میں دونوں خواتین کے بڑے مرتبے کے بارے میں خصوصی طور پر توجہ دلائی تھی۔ اس لیے بھی قرین قیاس یہی ہے کہ آپ ﷺ نے ماریہؓ کو یقیناً باندی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اہلیہ کی حیثیت سے قبول فرمایا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ماریہؓ کو بالائی مدینہ میں ایک اچھے مکان میں رہائش دی گئی جس میں باغ بھی تھا۔ سیرت نگار مارٹن لنگز (ابوبکر سراج) اپنی مشہور تصنیف ''محمد ﷺ'' میں رقم طراز ہیں کہ: ''حضرت ماریہؓ کو حضرت صفیہؓ کے اس مکان کے قریب ہی ایک مکان میں ٹھہرایا گیا جہاں وہ مسجد نبوی ﷺ سے متصل اپنا حجرہ تعمیر ہونے تک رہائش پزیر تھیں۔ آنحضور ﷺ وہاں حضرت ماریہؓ سے ملنے کے لیے صبح بھی آتے اور شام کو بھی۔ ان سے حضور ﷺ کی اتنی قربت کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسری ازواج مطہرات (بالخصوص عائشہؓ اور حفصہؓ) ان سے علانیہ حسد کرنے لگیں، جس پر حضرت ماریہؓ بھی رنجیدہ رہنے لگیں۔ اس کشمکش سے بچنے کے لیے آنحضور ﷺ نے حضرت ماریہؓ کو بالائی مدینہ میں ایک مکان میں ٹھہرا دیا۔ شروع شروع میں عائشہؓ اور دیگر ازواج کو اطمینان ہوا، لیکن انھیں جلد ہی احساس ہوگیا کہ فائدہ تو کچھ بھی نہ ہوا، کیوں کہ اب آنحضور ﷺ ان کے پاس جاتے تھے تو فاصلہ لمبا ہونے کی وجہ سے زیادہ دیر قیام فرماتے تھے۔''

اہل سیر کا بیان ہے کہ آنحضور ﷺ جیسا مرحمانہ سلوک ازواج مطہرات سے کرتے تھے، ویسا ہی حضرت ماریہؓ سے کرتے تھے اور انھیں بھی پردے میں رہنے کا حکم دیتے تھے۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''قبطیوں (مصر کے عیسائیوں) کے ساتھ حسن سلوک کرو، اس لیے کہ ان سے عہد اور نسب دونوں کا تعلق ہے۔ ان سے نسب کا تعلق تو یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی والدہ اور میرے فرزند ابراہیم کی والدہ، دونوں اسی قوم سے ہیں۔ (اور عہد کا تعلق یہ ہے کہ ان سے معاہدہ ہوچکا ہے)

اللہ تعالیٰ نے حضرت ماریہؓ کو حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے نوازا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ جتنا رشک مجھے ماریہؓ پر آتا ہے، کسی دوسرے پر نہیں آتا۔

8 ہجری میں ان کے بطن سے حضور ﷺ کے دوسرے صاحب زادے ابراہیم پیدا ہوئے اور تقریباً ڈیڑھ سال کی عمر میں داغ مفارقت دے گئے۔ حضرت ماریہؓ ان کی وفات پر بے اختیار رونے لگیں اور حضور ﷺ بھی اشک بار ہوگئے (حضرت ابراہیمؓ کا ذکر آگے چل کر ''اولاد نبوی ﷺ'' کے باب میں آئے گا)

آنحضور ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے بھی حضرت ماریہؓ قبطیہ کا اعزاز واکرام برقرار رکھا۔ انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں محرم 16 ہجری میں وفات پائی۔ امیر المومنین نے تمام اہل مدینہ کو جمع کیا اور خود نماز جنازہ پڑھا کر جنت البقیع میں سپرد خاک کیا۔

ایک طرف عموماً مستشرقین اور دوسرے غیر مسلم اور ان کے ہم نوا آزاد خیال حضرات کی نظروں میں حضور ﷺ کا بیک وقت متعدد بیویاں رکھنا بہت کھٹکتا ہے، اور دوسری طرف خود مسلمان حضور ﷺ کی صحیح پوزیشن کو نہ سمجھنے کے باعث ہر حال میں تعداد ازواج کو ایک ''سنت'' قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں نظریے نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ ان پر جناب محمد جعفر شاہ پھلواری نے ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تعدد ازواج

متعدد شکوک

تعدد ازواج پر ایک شبہ یہ پیدا کیا جاتا ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری سوکن لانا ایک بے رحمی کا پہلو رکھتا ہے، کیوں کہ عورت اسے کبھی ٹھنڈے دلوں گوارا نہیں کرتی۔ ہم یہاں پہلے ایک عقلی سوال پیش کرنا چاہتے ہیں۔ فرض کیجیے کہ ایک شخص کی بیوی موجود ہے اور اسے کوئی دوسری عورت بُری طرح دل دے بیٹھتی ہے۔ اب دیکھیے، اگر وہ اسے حبالہ عقد میں لے آتا ہے تو بیوی کی دل شکنی ہوتی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں کرتا تو دوسری عورت کی زندگی خراب ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں ایک ایک خرابی لازم ہے۔ لہٰذا کسی ایک کو ''کم تر برائی'' کے طور پر اختیار کرنا پڑے گا اور ایسے مواقع پر صحیح راہ عمل یہی ہوگی کہ بیوی کا حق چوں کہ مقدم ہے، اس لیے دوسری عورت کی دل شکنی یا اس کی زندگی کی خرابی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگر خود مرد کا اپنی بیوی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے اسی طرح کا قلبی تعلق پیدا ہو جائے تو اس صورت میں بھی اسے اپنی بیوی کی خاطر اپنے تمام جذبات کو دبانا چاہیے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس طرح مذکورہ صورت میں بیوی کے مقابلے میں اپنی یا دوسری عورت کی رعایت نہ کرنا ''کم تر برائی'' ہے۔ اسی طرح کسی موقع پر خود بیوی کی رعایت نہ کرنا ''کم تر برائی'' ہوسکتا ہے یا نہیں؟ ہماری عقل کہتی ہے کہ ہوسکتا ہے (یہ ضرورتیں کیا ہوسکتی ہیں، ان کا ذکر آگے آئے گا۔)

دوسرا شبہ

حضور ﷺ کے تعدد ازواج پر غیر مسلموں کا ایک ناگفتہ الزام یہ بھی ہے کہ خاکم بدہن اس کا سبب ہوائے نفسانی کا غلبہ تھا۔ ذرا سوچیے:

(الف) کیا اس انسان کے متعلق ہوائے نفسانی سے مغلوب ہونے کا وہم بھی ہو سکتا ہے، جس نے پچیس سال کا زمانہ تجرد کمال عفت و پاک بازی سے گزارا ہو، اور پچیس سال کی عمر میں نکاح بھی کیا ہو تو ایک ایسی عورت سے جو اس سے پندرہ سال بڑی یعنی چالیس سال کی ہے، جو پہلے دو شوہروں کی بیوی رہ چکی ہے اور صاحب اولاد بھی ہے، اور جو خود نکاح کا پیغام دیتی ہے؟

(ب) اسے ایک دوشیزہ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں، کیوں کہ وہ خود تندرستی اور جمال میں یگانہ روزگار ہے۔ ساری قوم کا محبوب ہے۔ خاندانی وقار کا مالک ہے۔ عرب میں عورت کی کوئی قدر و قیمت نہیں اور جس کا جی چاہے، دس دس عورتیں رکھ لیتا ہے۔

(ج) پچاس سال کی عمر تک یعنی پورے پچیس سال اسی ایک بوڑھی، صاحب اولاد اور گزشتہ دو شوہروں کو دیکھنے والی عورت کی رفاقت پر قانع رہتا ہے اور اشارۃً بھی کسی دوسری رفیقۂ حیات کی خواہش نہیں کرتا۔

(د) اس رفیقہ (حضرت خدیجہؓ) کی وفات کے بعد اپنی عمر کے پچاسویں سال بالکل اپنی ہم سن پچاس سال کی بڑھیا (سودہؓ) سے نکاح کرتا ہے اور اپنی عمر کے پچپن سال تک اسی ایک بوڑھی عورت کا رفیق بنا رہتا ہے اور کسی دوسری کی طرف رخ بھی نہیں کرتا۔

(ہ) اس کے بعد پچپن سال کی عمر سے انسٹھ سال کے درمیان میں جو نو عورتیں حبالہ عقد میں آتی ہیں، ان میں سوائے ایک کے ساری عورتیں ایسی ہیں جو ایک، دو اور تین تین شوہروں کی بیویاں رہ چکی ہیں۔

کیا ان تمام حقائق پر نگاہ رکھتے ہوئے یہ گمان بھی کیا جاسکتا ہے کہ اس انسان میں غلبہ نفسانی کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی موجود تھا؟ کیا یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ 55 سال کی عمر سے پہلے تک اور پھر 59 سال کی عمر کے بعد (63 سال کی عمر تک) تو ہوائے نفسانی کا شائبہ بھی موجود نہ ہو اور صرف 55 سال سے 59 سال تک کے درمیان فقط پانچ سال کے لیے ساری ہوس ناکیاں دفعۃً پیدا ہوگئیں؟ کیا نفسانی ہیجان صرف 55 سال سے 59 سال کی عمر تک ہوا کرتا ہے؟ نہ پہلے نہ بعد میں؟

(و) پھر یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ہوائے نفسانی کی تکمیل کا تو بہترین موقع اسی وقت تھا جب (5 یا 6 نبوی میں) تبلیغ دین روک دینے کے عوض میں ساری قوم دولت سیادت اور حسین ترین عورتیں پیش کر رہی تھی۔ اس سے بہتر موقع ہوائے نفسانی کی تکمیل کا اور کیا ہوسکتا تھا؟ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت حرم سرائے نبوت میں ایک ساٹھ سال کی صاحب اولاد بڑھیا (خدیجہؓ) کے سوا اور کوئی بھی موجود نہیں۔

(ح) ایک اور بات بھی قابل غور ہے کہ جن لوگوں کو حضور ﷺ سے واسطہ تھا ان میں عربی و عجمی، دوست و دشمن، جاہل و متمدن سب ہی قسم کے لوگ تھے حضور ﷺ میں اگر ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ ہوس ناکی کا ہوتا، تو دشمن کو اس سے بہتر پروپیگنڈے کا اور کیا حربہ ہاتھ آ سکتا تھا؟ انھوں نے شاعر کہا، مجنون کہا، خواہش مند اقتدار ہونے کا طعنہ بھی دیا۔ سارے الزام لگائے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کوئی سخت سے سخت دشمن بھی نفسانی ہوس ناکیوں کا الزام نہیں لگاتا۔ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے حضور ﷺ نے تعدد ازواج فرمایا تھا، وہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ اونچا انسان مغلوب النفس نہیں ہوسکتا، بلکہ اس کی مصلحتیں وہی ہوسکتی ہیں، جو اس کی ساری زندگی کے حرکت و سکون میں جھانکتی ہیں۔

تیسرا شبہ

ایک شبہ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ امت کے لیے تو مثنیٰ وثلث وربع کے نزول کے بعد چار تک کی تحدید کر دی گئی اور جن امتیوں کے پاس چار سے زائد بیویاں تھیں، ان سے چار کے علاوہ کو جدا کر دیا گیا۔ لیکن خود حضور ﷺ نے اس پر عمل نہیں فرمایا، بلکہ نزول آیت کے وقت جو نو بیویاں تھیں، وہ بدستور رہیں۔ اپنے لیے یہ رعایت اور امت کو اس رعایت سے محروم رکھنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔

بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے لیے یہ رعایت ہے اور امت اس رعایت سے محروم ہے، لیکن دراصل معاملہ برعکس ہے۔ مندرجہ ذیل حقائق پر غور فرمایئے:

(الف) ہر مسلمان کے لیے چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ کی بیٹیوں سے نکاح جائز ہے۔ لیکن حضور ﷺ کے لیے ان میں سے اسی صورت میں نکاح جائز ہے، جب کہ ان عورتوں نے ہجرت کی ہو۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَبَنٰتِ عَمِّكَ وَبَنٰتِ عَمّٰتِكَ وَبَنٰتِ خَالِكَ وَبَنٰتِ خٰلٰتِكَ الّٰتِيْ هَاجَرْنَ مَعَكَ﴾ (الاحزاب 33: 50)

"اور تمھاری وہ چچا زاد اور پھوپھی زاد اور ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں، جنھوں نے تمھارے ساتھ ہجرت کی ہے، تمھارے لیے حلال ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ کے سگے اور مہربان چچا ابو طالب کی بیٹی اُمّ ہانی حضور ﷺ کے لیے حلال نہ تھیں، کیوں کہ وہ ایمان ہی فتح مکہ کے بعد لائی تھیں، جب کہ ہجرت ختم ہو چکی تھی۔

(ب) ہر امتی بشرط عدل وضرورت چار بیویاں رکھ سکتا تھا، لیکن قانوناً وہ ان سب کو یا بعض کو الگ کر کے دوسری عورتوں کو حبالۂ عقد میں لا سکتا تھا۔ وہ اس طرح قانون سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے سیکڑوں نکاح کر سکتا تھا، لیکن رسول ﷺ کے لیے ان نو عورتوں کے بعد ہمیشہ کے لیے نکاح کا دروازہ بند ہے۔ ارشاد قرآنی ہے:

﴿لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ﴾ (الاحزاب 33: 52)

"اے رسول ﷺ! اب ان موجودہ ازواج کے بعد آپ ﷺ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں اور نہ انھیں الگ کر کے دوسری ازواج کرنا حلال ہے۔ اگرچہ ان دوسری عورتوں کا حسن بھی آپ کو بھاتا ہو۔"

ان آیات سے جو واضح نتیجہ نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ:

1: اُمت کا کوئی فرد ایک بیوی کی وفات کے بعد یا ضرورت ہو تو زندگی میں دوسری، اور یوں ہی تیسری، چوتھی، جتنی بھی چاہے، بیویاں کر سکتا ہے، لیکن رسول ﷺ کے لیے اُمّ المومنین میمونہؓ کے بعد یہ دروازہ بند ہے۔

2: امت کے لیے ناموافقت مزاج یا کسی دوسری عورت کی کششِ حسن، تبدیلی زوج کا بہانہ بن سکتی ہے، لیکن رسول ﷺ کے لیے یہ راہ بھی مسدود ہے۔

3: ذرا انصاف سے دیکھیے، رعایتیں اُمت کے لیے ہیں یا رسول ﷺ کے لیے؟ یہاں زیادہ سے زیادہ چار کی تحدید ہے، لیکن زوجہ کی موت، ناموافق مزاج اور کسی کی کشش حسن تبدیل وتجدید ازواج کے بہانے بن جاتے ہیں، لیکن وہاں ایک کے سوا، ساری عورتیں سن رسیدہ بیوہ ہونے کے باوجود نہ تجدید بعد الموت کی اجازت ہے نہ تبدیل بعد الطلاق کی، اور نہ نو بیویوں پر کسی اضافے کی۔ غور سے دیکھیے، رعایت اُمت کے لیے زیادہ ہے یا خود رسول ﷺ کے لیے؟

یہ بتانے کے بعد کہ حضور ﷺ کے تعدّد ازواج میں ہوائے نفسانی کے غلبے کا کوئی شائبہ تک نہ تھا، اب ہم ان مصالح کا ذکر کریں گے؛ جن کی وجہ سے حضور ﷺ کو متعدد نکاح کرنا پڑے۔ یہ مصالح ذاتی نہ تھے، سراسر قومی ودینی تھے۔ ان کا افادی پہلو صرف اس قدر نہ تھا کہ کرنے میں ملی فائدے تھے بلکہ اس کا دوسرا پہلو یہ بھی تھا کہ نہ کرنے میں بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ ہم بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ کسی اہم واقعہ پر غور کرتے وقت اپنا ماحول پیش نظر رکھتے ہیں حالانکہ ہر واقعے کو اس کے اپنے زمان ومکان اور اپنے احوال وظروف کی Setting میں رکھ کر دیکھنا ہے۔ اب امہات المومنین کے مصالح عقد پر غور کیجیے:

(1) حضرت سودہؓ

ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو بن عبدود سے ہوا تھا۔ یہ اپنے شوہر سے پہلے ایمان لے آئی تھیں اور انھی کی ترغیب سے ان کے شوہر بھی اسلام لے آئے۔ حضرت سودہؓ نے اپنے خاوند اور والدہ کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ ادھر سکران کا حبش میں اور ادھر حضرت خدیجہؓ کا مکے میں انتقال ہوا۔ اس وقت ان کی عمر بھی پچاس سال کی تھی اور حضور ﷺ کی عمر بھی اتنی ہی تھی۔ حضور ﷺ نے ان کی قربانیوں کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے مصائب کو ختم کرنے کے لیے اپنے نکاح میں لے لیا۔ ہر ذی عقل سمجھ سکتا ہے کہ ایک پچاس سال کی ہم عمر اور بیوہ عورت سے یہ نکاح صرف سودہؓ اور ان کے خاندان کی قربانیوں، سبقت الی الاسلام اور ہجرت حبشہ وغیرہ ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ نفسانیت کا تو اس میں شائبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت سودہؓ کا یہ حال تھا کہ انھوں نے صاف لفظوں میں فرما دیا کہ مجھے حضور ﷺ کی کنیزی کا شرف بہت کافی ہے۔ اس لیے میں اپنی باری عائشہؓ کو دیتی ہوں۔

(2) حضرت عائشہ صدیقہ

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد باوجود اس کے کہ پچاس سال کی بوڑھی حضرت سودہؓ سے نکاح کر لیا تھا، لیکن حضرت خدیجہؓ کی جدائی سے حضور اکرم ﷺ مغموم سے رہتے۔ کیوں کہ یہ سن میں حضور ﷺ سے پندرہ سال بڑی ہونے کے باوجود اوّل مؤمنہ تھیں۔ زندگی بھر مالی ایثار کرتی رہیں اور ہر سرد وگرم کو جھیلتی رہیں۔ ایسی رفیقۂ حیات کی جدائی سے حضور ﷺ کا ملول ہونا قدرتی بات تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اسے بھانپ لیا اور اپنی لختِ جگر کو حضور ﷺ کی کنیزی میں دینے کی درخواست کی۔ کیا حضور ﷺ اس صدیق کی درخواست کو رد فرما سکتے تھے، جس نے اسلام

لانے میں سب سے پہلے قدم بڑھایا۔ متعدد سعید رُوحوں کو اسلام کی رغبت دلائی اور ہر ہر قدم پر ایثار میں سب سے بڑھ کر حصّہ لیا اور رفاقت میں ''ثانی اسلام و غار و بدر و قبر'' ثابت ہوا۔

(3) حفصہ بنت عمرؓ بن الخطاب

پہلا نکاح خنیس ابن حذافہ سلمی سے ہُوا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد حضرت عمرؓ کو فطرتاً ان کے عقدِ ثانی کا خیال ہوا۔ پہلے آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے نکاح کر لینے کو کہا، مگر آپ خاموش رہے۔ پھر حضرت عثمانؓ سے ذکر کیا۔ اس وقت حضرت عثمانؓ کی پہلی بیوی رقیہؓ بنت رسول اللہ ﷺ قضا کر چکی تھیں۔ اس لیے حضرت عمرؓ کو خیال تھا کہ شاید یہ ضرور حفصہؓ سے رشتہ کر لیں گے۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے ٹال دیا۔ اس سے حضرت عمرؓ کو کچھ ملال ہوا اور حضور ﷺ سے اس ملال کا ذکر کیا۔ حضور ﷺ نے ایک عجیب بلیغ جملہ فرمایا کہ: يتزوج عثمان من هو خير من حفصة و يتزوج حفصة من هو خير من عثمان ۔یعنی حضرت عثمانؓ کو حفصہؓ سے بہتر بیوی اور حفصہ کو عثمان سے بہتر شوہر ملے گا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کا حضور ﷺ نے اپنی دوسری دختر حضرت ام کلثومؓ سے نکاح کر دیا اور حضرت حفصہؓ کو اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ جب تم نے مجھ سے حفصہؓ کا ذکر فرمایا، تو میں خاموش رہا تھا، جس سے شاید تمھیں کچھ خیال پیدا ہوا ہو۔ لیکن بات یہ تھی کہ مجھے پہلے ہی حضور ﷺ کے عندیے کا پتا چل چکا تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا کہ جب تک حضور ﷺ صاف لفظوں میں انکار یا اقرار نہ فرما لیں، میں بھی انکار یا اقرار نہ کروں۔ حضرت حفصہؓ بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح کچھ تیز مزاج سی تھیں اور حضرت عثمانؓ نے غالباً اسی وجہ سے ان سے نکاح کرنا پسند نہ کیا ہوگا۔ بہرکیف حالات یہ تھے کہ حضرت حفصہ کو کوئی معقول رشتہ نہ ملتا تھا اور باپ کو فطرتاً اس کی فکر تھی۔ باپ بھی ایسا، جو زندگی بھر اسلام کی راہ میں ہر ایثار کے لیے وقف رہا۔ اس کی دلداری کا اس سے بہتر اور کیا سامان ہو سکتا تھا جو حضور ﷺ نے کر دیا۔

(4) حضرت زینبؓ بنت خزیمہ

ان کا پہلا نکاح طفیل بن حارث بن عبدالمطلب سے، دوسرا عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب سے اور تیسرا نکاح عبداللہ بن جحش سے ہوا تھا۔ یہ عبداللہ بن جحش ام المومنین زینب بنت جحش (جن کا ذکر آگے آئے گا) کے بھائی اور حضور ﷺ کے پھوپھی زاد برادر ہیں۔ یہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے، تو حضور ﷺ نے نہ فقط قرابت کا لحاظ فرمایا بلکہ شہادتِ اُحد سے پیدا ہونے والی ملی پیچیدگی کو دور فرمانے کے لیے ان سے نکاح فرما لیا۔ یہ دراصل قدردانی تھی۔ ان جاں نثاروں کی قربانیوں کی تاکہ راہِ خدا میں جان دینے والوں کے اہل و عیال بے سہارا نہ رہیں اور دوسروں کو بھی اس نوع کی قدردانی کی ترغیب ہو۔

(5) حضرت ام سلمیٰؓ

ان کا پہلا نکاح ابوسلمہ سے ہوا تھا۔ یہ حضور ﷺ کے رضاعی بھائی ہیں اور گیارہویں مسلمان ہیں۔ انھوں نے ہجرتِ حبشہ بھی کی تھی اور پھر کے واپس آ کر ہجرت مدینہ سے بھی سرفراز ہوئے۔ جب یہ ہجرتِ مدینہ کے لیے روانہ ہوئے تو ان کے بچے سلمہ کو اور ان کی بیوی اُمّ سلمہ کو ام سلمہ کے خاندان والوں نے یہ کہ کر چھین لیا کہ تم جہاں چاہو، جاؤ مگر ہم اپنے خاندان کے کسی فرد کو تمھارے ساتھ نہ جانے دیں گے۔ ابوسلمہ نے اس کے باوجود عزمِ ہجرت کو پورا کیا۔ اُمّ سلمہ ہر روز شام کو اُس مقام پر آ کر رویا کرتی تھیں، جہاں ان کے شوہر سے انھیں چھینا گیا تھا۔ ایک سال تک وہ اسی طرح روتی رہیں مگر ترکِ اسلام کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ آخر سنگ دلوں کے دل بھی پسیج گئے اور وہ بھی مدینے پہنچ گئیں۔ ان کے شوہر ابوسلمہؓ بدری ہیں اور غزوۂ اُحد میں بھی شریک ہوئے، جہاں زخمی ہوئے اور جانبر نہ ہو سکے۔ وفات کے وقت انھوں نے دعا کی کہ اللّٰهُمَّ اخْلُفْنِيْ فِيْ اَهْلِيْ بِخَيْرٍ (خداوندا میرے کنبے کی اچھی طرح نگہداشت فرما) دو خُردسال لڑکے عمر و اور سلمہ چھوڑے اور دو لڑکیاں زینب اور درہ۔ غور کیجیے، رضاعی بھائی ہے، جس نے سبقت الی الاسلام بھی کی اور حبشہ و مدینہ دونوں کی ہجرتوں سے بھی سرفراز ہوا۔ ہجرتِ مدینہ کے وقت کڑی آزمائشوں میں پڑا اور کھرا اُترا۔ وہ چار بچے چھوڑ کر مرتا ہے اور بیوی اُمّ سلمہ کی قربانیاں بھی کم نہیں۔ ابوسلمہ اور اُمّ سلمہ کی ان قربانیوں کا کیا صلہ ہونا چاہیے تھا اور معصوم بچوں کی کفالت کی کیا شکل پیدا کرنی چاہیے تھی۔ جس کے لیے ابوسلمہ نے مرتے وقت دعا بھی کی تھی؟ انھی اہم سوالوں کا جواب تھا اُمّ سلمہ کا اُمّ المومنین بن جانا۔

(6) حضرت زینب بنت جحش

یہ حضور ﷺ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ان کا پہلا نکاح زید بن حارثہ کے ساتھ حضور ﷺ نے خود کر دیا تھا تاکہ زید کے ساتھ مصنوعی غلامی کی جو حقارت بلاوجہ وابستہ ہے، وہ ختم ہو جائے اور ساتھ ہی خاندانی تفاخر کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ زید کا پہلا نکاح ایک حبشی الاصل خاتون حضرت اُمّ ایمن سے ہوا تھا جو زید سے دوچند بڑی تھیں۔ ان دونوں کی زندگی خوش گواری کے ساتھ گزری۔ لیکن زینب بنت جحش زید کے ساتھ نہ نباہ سکیں۔ نوبت طلاق تک پہنچ گئی۔ حضور ﷺ اگر زینب سے خود نکاح فرمانا چاہتے تو ہزاروں جان سے زینب اسے منظور فرما لیتیں اور حضور ﷺ کنوارے ہی میں ان سے نکاح فرما لیتے۔ لیکن حضور ﷺ تو صرف غلام و آزاد کی اونچ نیچ کے فرق کو مٹانا چاہتے تھے۔ اس لیے زید سے زینب کو بیاہ دیا لیکن طلاق کی نوبت آنے کے بعد زینب کے ٹوٹے ہوئے دل کو کس طرح جوڑا جا سکتا تھا؟ اور اس سے زیادہ اہم ایک اور چیز بھی سامنے آ گئی۔ عرب کے دستور کے مطابق منہ بولا بیٹا حقیقی فرزند کی طرح حقوق رکھتا تھا۔ وہ وارث بھی ہوتا تھا اور اس کی بیوی حقیقی بہو کی طرح باپ پر حرام سمجھی جاتی تھی۔ حضور ﷺ کو جہاں زینب کی طلاقی تحقیر کو عزت سے بدل کر اشک شوئی کرنا تھی وہاں ہمیشہ کے لیے ایک قانون بھی دینا تھا کہ منہ بولے فرزند رشتہ حقیقی فرزند جیسا نہیں ہوتا، جو اس کی بیوی منہ بولے باپ پر حرام ہو جائے۔ معاملہ اتنا اہم تھا کہ ازواج مطہرات میں صرف زینب ہی ایسی عورت ہیں جن کے لیے

قرآن میں زَوَّجۡنٰکَھَا (ہم نے انھیں تم سے بیاہا ہے) کا لفظ آیا ہے اور تنہا زید ہی ایک ایسے صحابیؓ ہیں، جن کا نام بھی قرآن میں آیا ہے۔ اس بے معنی رسم تبنیت اور اس مصنوعی تعمیر قرابت و وراثت وغیرہ کو توڑنے کے لیے ایک زبردست عملی نمونے کی ضرورت تھی اور یہی ضرورت نکاح زینب کا باعث ہوئی۔ ورنہ اگر صرف زینب کی چاہت ہوتی تو نکاح زید سے پہلے ہی اس سے کون سی چیز روک سکتی تھی؟

(7) حضرت جویریہؓ بنت الحارث

یہ بنوخزیمہ یعنی بنومصطلق کے خاندان سے تھیں۔ یہ غزوہ مریسیع یعنی غزوۂ مصطلق میں اسیر ہو کر آئی تھیں اور ثابت بن قیس بن شماس کے حصے میں آئیں۔ ان کا پہلا نکاح ایک مصطلقی فرد مسافع بن صفوان سے ہوا تھا۔ ثابت سے انھوں نے رہا کر دینے کی درخواست کی مگر انھوں نے زرفدیہ طلب کیا۔ یہ حضور ﷺ کے پاس آئیں اور (مدارج النبوۃ) کی روایت کے مطابق اسلام بھی لے آئیں اور حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں سردارِ قوم حارث بن ابی ضرار کی بیٹی ہوں۔ لہٰذا مجھ سے بہتر سلوک کیا جائے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا یہ بہتر سلوک نہ ہوگا کہ میں تمھاری طرف سے زرِ فدیہ دے کر آزاد بھی کر دوں اور تمھیں اپنی زوجیت میں لے لوں؟ حضرت جویریہؓ نے اسے بخوشی منظور کر لیا۔ یہ بھنک پہنچتے ہی تمام لوگوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اگر جویریہؓ کو اُمّ المؤمنین بننے کا شرف حاصل ہوا تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصہار (سسرالی رشتہ داروں) کو بطور اسیر نہیں رکھیں گے۔ بنومصطلق کے قیدی چھے سو کی تعداد میں تھے، جن میں سیکڑوں جویریہؓ کے رشتہ دار تھے۔ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اگر حضور ﷺ ان سے نکاح کے خواہش مند ہوتے، تو ثابت بن قیس کے حصے میں انھیں دینے کے بجائے خود ہی اپنے حصے میں لے سکتے تھے۔ لیکن اب معاملے میں پیچیدگی یوں پیدا ہوگئی کہ اگر انھیں زرفدیہ دے کر آزاد کر دیا جاتا ہے، تو یہ تنہا آزاد ہو کر گھر چلی جاتی ہیں۔ لیکن اگر حضور ﷺ سے نکاح ہو جاتا ہے تو از خود ان کے سیکڑوں رشتے دار اور ساتھ ہی دوسرے قیدی (جنھیں ملا کر چھے سو قیدیوں کی تعداد ہوتی ہے) ایک لمحے میں آزادی کی سانس لیتے ہوئے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔ خود سوچیے کہ انسانیت اور اس کی اقدار کی محافظت کا ایسے موقع پر کیا تقاضا ہونا چاہیے تھا؟ یہ نکاح انسانیت کے لیے اتنا بابرکت تھا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

"ما رأینا امرأۃ کانت اعظم برکتہ علیٰ قومھا منھا." (رواہ ابو داؤد)

"اپنی قوم کے لیے جویریہ جیسی بابرکت عورت میں نے کوئی نہیں دیکھی۔"

(8) ام حبیبہؓ

یہ ابوسفیان بن حرب کی صاحب زادی ہیں۔ باپ آخری وقت تک حضور ﷺ کی دشمنی کرتا رہا، مگر یہ مومنہ تھیں اپنے پہلے شوہر عبیداللہ بن جحش کے ساتھ حبشہ کو ہجرت کر گئیں۔ عبیداللہ دائم الخمر تھا اور عیسائیوں کی صحبت میں عیسائی ہو گیا۔ ایک عورت جو محض اسلام کی خاطر خویش و اقارب اور وطن کو چھوڑ کر حبشہ آئی تھی، ارتداد شوہر کی وجہ سے بے سہارا ہو گئی مگر ترک اسلام کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل میں نہیں آیا۔ اس غریب الدیار کی ان قربانیوں اور استقامت علی الدین کا اسے کیا صلہ ملنا چاہیے تھا؟ حضور ﷺ نے اسی خیال سے عمرو بن اُمیہ ضمری کو بھیجا اور شاہ حبشہ نے ایک باندی کو بھیج کر حضور ﷺ کا پیغام دیا۔ اُمّ حبیبہ نے مارے خوشی کے اپنے سارے زیور جو اس وقت زیب تن تھے، اتار کر اس باندی کو انعام میں دے دیے۔ اب اس سے اس مسرت کا اندازہ کرنا دشوار نہیں، جو انھیں ارتدادِ شوہر کے صدمے کے بعد بطورِ تلافی حاصل ہوئی ہوگی۔

ان کے ایمان اور ادب رسول ﷺ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب ان کا باپ ابوسفیان تجدید معاہدہ حدیبیہ کے لیے مدینہ آیا، تو اسے آتا دیکھ کر اُمّ حبیبہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا بستر لپیٹ کر الگ رکھ دیا تھا۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ تو مجھے بستر سے دور رکھنا چاہتی ہے یا مجھ سے بستر کو؟ اُمّ حبیبہؓ نے جواب دیا کہ تو ابھی مشرک ہے اور تو اس قابل نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے بستر پر بیٹھ سکے۔

(9) حضرت صفیہؓ

ان کا پہلا نکاح سلام بن مشکم سے اور دوسرا کنانہ بن ابی الحقیق سے ہوا تھا۔ کنانہ غزوۂ خیبر میں مارا گیا تھا اور صفیہ بطور اسیر آئی تھیں اور دحیہ کلبی کی درخواست پر انھیں دینے کا ارادہ فرمایا۔ اس پر لوگوں نے چہ میگوئیاں کیں کہ یہ ایک بڑے یہودی سردار حیی بن اخطب کی بیٹی ہیں، جو بنوقریظہ اور بنونضیر دونوں کا سردار تھا۔ لہٰذا اسے کسی بڑے سردار ہی کے پاس جانا چاہیے اور حضور ﷺ سے بڑا سردار کون ہو سکتا تھا۔ اس پر حضور ﷺ نے صفیہ کو پہلے آزاد کر دیا۔ اس کے بعد اُمّ المؤمنین ہونے کا شرف بخشا۔

اس دو شوہروں کو دیکھنے والی عورت کو اگر حضور ﷺ پہلے ہی لینا چاہتے، تو دحیہ کلبی کے حوالے کرنے کا ارادہ بھی نہ فرماتے لیکن بات یہ تھی، ایک اسیرہ جو ایک سردار کی بیٹی بھی ہے اور اس کا شوہر ابھی جنگ میں مارا بھی گیا ہے، کے احترام کو باقی رکھتے ہوئے اس کے ٹوٹے ہوئے دل کا اور کوئی سہارا اس کے سوا نہ تھا، کہ وہ اُمّ المؤمنین بننے کا ابدی شرف حاصل کریں۔ پھر دیکھیے حضور ﷺ نے انھیں پہلے آزاد فرما دیا۔ جس کے بعد وہ مختار تھیں کہ خواہ حضور ﷺ کے پیامِ نکاح کو قبول کریں یا نہ کریں۔ اس کے بعد ان کا پیغام نکاح کو بخوشی قبول کر لینے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حضور ﷺ سے بہتر اور کوئی پناہ گاہ ان کی نظروں میں نہ تھی۔

(10) حضرت میمونہؓ

یہ عبداللہ بن عباس اور خالدؓ بن ولید کی خالہ ہیں۔ اسما بنت عمیس (جو یکے بعد دیگرے جعفرؓ طیار، ابوبکر صدیقؓ اور علی مرتضیٰؓ کی بیوی بنیں) ان کی اخیافی بہن ہیں نیز حضرت حمزہؓ کی بیوی سلمٰی بنت عمیس اور اُمّ المؤمنین زینب بنت خزیمہ کی بھی اخیافی بہن ہیں۔ میمونہ کا پہلا نکاح حویطب بن عبدالعزیٰ سے اور دوسرا ابورہم بن عبدالعزیٰ سے ہوا۔ یہ دوسرے نکاح کے بعد جب بیوہ ہو گئیں، تو حضرت عباس بن عبدالمطلب نے ان کی بیکسی کا ذکر فرمایا اور حضور ﷺ نے ان سے نکاح فرما لیا۔

ان تمام نکاحوں پر ایک غائر نظر ڈالیے، تو بات صاف ہو جائے گی کہ:

1: ان میں سے ایک کے سوا ساری عورتیں وہ ہیں، جس کا ایک یا دو یا تین نکاح پہلے ہو چکے ہیں۔
2: یہ نکاح اس لیے کیے گئے کہ ان عورتوں یا ان کے رشتہ داروں کی قربانیاں فراموش نہیں کی جا سکتی تھیں۔
3: یا اس لیے کہ ان کا روحانی سہارا حضور ﷺ سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔
4: یا اس لیے کہ ان کی اور ان کی اولاد کی معاشی کفالت کا سامان کرنا تھا۔
5: یا اس لیے کہ ان کا خاندانی احترام باقی رکھنا مقصود تھا۔

دیگر مصالح

لیکن بات یہیں نہیں ختم ہو جاتی۔ مصالح اور بھی ہیں، جن میں ایک حصّہ مُتاہِل لوگوں کے لیے درسِ معاشرت کا ہے اور دوسرا حصّہ قیمتی نتائج کا حامل ہے۔ پہلے ان شاندار نتائج کو دیکھیے، جو ان نکاحوں کے بعد ظاہر ہوئے۔ ان میں چند خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہیں:

(1) توسیعِ دین

ازدواج کے بعد اصہار یعنی سسرالی رشتے داروں سے حسنِ تعلقات و ہمدردی کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہے اور اس سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ کے ان نکاحوں سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ مختلف قبائل سے راہ و رسم پیدا ہو گئی اور ان کے قریب ہو جانے سے وہ تمام غلط فہمیاں دور ہو گئیں، جو دشمنوں کے جھوٹے پروپیگنڈے سے یا کھنچے کھنچے رہنے سے پیدا ہو گئی تھیں۔ اس طرح نظامِ حق کی اشاعت و توسیع کے لیے مختصر مدّت میں زمین ہموار ہو گئی۔ حضور ﷺ کی کوئی دو زوجہ بھی ایک خاندان کی نہ تھیں۔ حضرت اُمّ حبیبہؓ بنت ابوسفیان بنو اُمیّہ سے ہیں اور نسباً سب سے قریب۔ حضرت میمونہؓ بنت حارث بنو عیلان سے ہیں اور نسب میں سب سے زیادہ دُور۔ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد بنی عزّیٰ سے ہیں، حضرت سودہؓ بنت زمعہ بنی عامر سے ہیں۔ حضرت عائشہؓ بنت ابی بکر بنی تمیم سے ہیں، حضرت حفصہؓ بنت عمر بنی عدی سے ہیں، حضرت زینبؓ بنت جحش بنی اسد سے ہیں، حضرت اُمّ سلمہؓ بنت ابی امیہ بنی مخزوم سے ہیں، حضرت جویریہؓ بنت حارث بنی مصطلق سے ہیں، حضرت صفیہؓ بنت حیی خاندان سیدنا ہارون سے ہیں اور حضرت زینبؓ بنت خزیمہ بنی ہلال سے ہیں۔ عرب کی قبائلیت اور اس کے مؤثرات سے جو لوگ واقف ہیں، ان کے لیے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ عرب کے اتنے مختلف قبائل اور ان کی شاخوں سے خوش گوار صہری تعلقات قائم ہونے کے بعد ملنے جلنے کے کس قدر مواقع پیدا ہوئے ہوں گے اور ان صہری تعلقات کی وجہ سے کم از کم مدّت میں نظامِ حق کی توسیع میں کتنی مدد ملی ہوگی۔

(2) اصلاح و قیامِ امن

اسی کا نتیجہ تھا کہ اُمّ المومنین حضرت اُمّ حبیبہؓ بنت ابی سفیان کے ازدواج 6ھ کے بعد ابوسفیان کی مخالفت ڈھیلی پڑ گئی اور کچھ دنوں کے بعد یہ اور ان کے دونوں فرزند معاویہ و یزید ایمان لے آئے۔ اُمّ المومنین حضرت جویریہؓ بنت حارث کے نکاح 8ھ کے بعد حارث اور ان کا سارا خاندان مصطلق پیشہ راہ زنی سے تائب ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ اُمّ المومنین حضرت صفیہؓ بنت حیی ہارونیہ کے ازدواج 7ھ کے بعد یہود نے پھر کسی سازش میں حصّہ نہ لیا۔ اُمّ المومنین حضرت میمونہؓ بنت حارث کے نکاح 7ھ کے بعد نجد کے سارے فتنے ختم ہو گئے۔ غرض جس قبیلے یا ملک کی عورت آئی، وہاں کے فتنے سلامتی سے، وہاں کا افتراق اتحاد و اتفاق سے اور وہاں کی بدامنیاں امن سے بدل گئیں۔ کون ہے، جو ان خوش گوار نتائج امن و اصلاح کو دیکھتے ہوئے ان نکاحوں کی اہمیت سے انکار کر سکتا ہے؟

(3) آدھی دنیا کی تعلیم

ان ازواجِ مطہرات کے ذریعے جس بڑے مقصد کی تکمیل ہوئی، وہ نصف انسانی دنیا کی تعلیم ہے قرآن نے اصولی طور پر عورتوں کے ضروری مسائل بتا دیئے ہیں، لیکن بے شمار جزئیات ایسے ہیں، جن کی تشریح حضور ﷺ کو فرمانا پڑی۔ تعلیم نسا کا یہی انداز بہتر ہو سکتا تھا اور ہُوا کہ امہات مؤمنین نے حضور ﷺ سے وہ مسائل معلوم کیے اور ان سے دوسری عورتوں نے حاصل کیے۔ نسائی مسائل کی بہت سی گتھیوں کو سلجھانے میں ازواجِ مطہرات کا غیر معمولی دخل ہے اور انھی سے ایسے بہتیرے مسائل مروی ہیں۔

نصف دین کی تکمیل

اب ایک دشواری پر بھی نظر ڈالیے۔ ایک طرف حضور ﷺ کی حیا کا یہ عالم ہے کہ روایتوں میں ہے کہ حضور ﷺ کنواری پردہ نشین سے بھی زیادہ باحیا تھے۔ نیز حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

"الحياء شعبة من الايمان ."

"شرم و حیا ایمان کا ایک حصہ ہے۔"

روایتوں میں ہے کہ نبوت سے بہت پہلے حضور ﷺ ایک بار محض بے ستری کے خوف سے بیہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ حیائے نبوی ﷺ حرم سرا کے اندر بھی کبھی بے نقاب نہ ہوئی۔ کیا اس قدر غیر معمولی حیا کے ہوتے ہوئے حضور ﷺ سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ برسرِ منبر حضور ﷺ ان مسائل کو کھول کھول کر بیان فرماتے ہوں گے کہ جنھیں پڑھاتے ہوئے آج بھی طلبہ و مدرسین آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں؟ یہ طہارت و نجاست کے مسائل ہیں، حیض و نفاس کے وقائق ہیں، آداب و مواصلت کی پابندیاں ہیں، شکست صوم و صلوٰۃ کی نزاکتیں ہیں جن کا جاننا زن و مرد کے لیے ضروری ہے۔ ایک طرف ان مسائل کا علم ضروری اور دوسری طرف ان کے اظہار سے حیا مانع۔ اس پیچیدگی کا حل اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا تھا کہ ازواج مطہرات کے ذریعے عورتوں کو اور ان عورتوں کے وسیلے سے مردوں کو مسائل ضروریہ کی تعلیم حاصل ہو۔ بلاشبہ حرم سرائے نبوت کے اندر بھی حضور ﷺ کی حیا، اسی طرح پردۂ حجاب میں رہتی تھی۔ لیکن بہر حال اپنی بیویوں سے حیادارانہ مسائل کا اظہار مشکل نہ تھا۔ آدھے معمورہ عالم اور نصف دنیا کی تعلیم اور نصف دین کی تکمیل کی اس سے بہتر کیا شکل ہو سکتی

تھی؟ واقعات شاہد ہیں کہ عبداللہؓ بن عباس کی فقاہت، علی مرتضیٰؓ کی دیقہ رسی، صدیقؓ فاروقؓ کی عقدہ کشائی جن مسائل میں آ کر اٹک جاتی تھی، وہاں ان کی گرہ کشائی کے لیے بعض ازواج النبی ﷺ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ کیوں کہ خلوت گاہِ نبوت کا رازدار امہات مومنین کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ شمع نبوت کے پروانے جلوت کی زندگی سے ناواقف نہ تھے اور اُمہات مؤمنین حقائق خلوت کی بھی راز دار تھیں۔ ہم تو یہاں تک دیکھتے ہیں کہ بعض امہات تفسیر و فقہ کے حقائق و قائق بھی ان واقف کارانِ جلوت کو بتاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ نصف دین کی تکمیل اور دنیا کی آدھی آبادی کی تعلیم کا یہ عظیم الشان کام ایک دو عورتوں سے نہیں چل سکتا تھا۔

صرف نو کی تعداد کو دیکھ کر جس کا جی چاہے شبہات پیدا کر لے۔ لیکن اس کا یہ روشن و عیاں پہلو ایسا ہے، جس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا مصلح بھی گزرا ہے، جس نے اپنی بیوی کو مصلحات امت، مبلغات دین، معلمات مسائل اور مدرسات فقہ بنا کر پیش کیا ہو اور نصف دین کی تکمیل انھی کے ذریعہ کرائی ہو؟

ذرا ان روایات کے اعداد و شمار کو دیکھیے، جو ازواجِ مطہرات سے مروی ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے دو ہزار دو سو دس روایات مروی ہیں۔ حضرت ام سلمہؓ سے تین سو اٹھتر، حضرت میمونہؓ سے چھہتر۔ حضرت ام حبیبہؓ سے پینسٹھ، حضرت حفصہؓ سے ساٹھ، حضرت صفیہؓ سے دس اور حضرت سودہؓ سے پانچ روایتیں مروی ہیں۔ یہ صرف وہ روایات ہیں، جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ نہ پہنچ سکنے والی روایات کے شمار کا اللہ کو علم ہے۔ پھر زینب بنت جحش کی مرویات اس فہرست میں موجود نہیں ہیں، حالانکہ 5ھ میں انھیں شرفِ زوجیت حاصل ہوا اور 20ھ تک زندہ رہیں۔ ابطال تبنیت سے متعلق جتنے مسائل ہیں، جو بسلسلۂ واقعہ زید بن حارثہ ظہور میں آئے، ان سب کا تعلق انھی زینب بنت جحش سے ہے۔ قرآن میں اس واقعہ کا صراحتاً ذکر ہے۔ پھر ان سے کسی روایت کا نہ ہونا مشکل سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ یقیناً دیگر امہات مومنین کی طرح ان سے بھی صحابہؓ وصحابیاتؓ نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ بہر حال یہ فہرست صرف انھی روایات کی ہے، جو ہم تک پہنچ سکی ہیں۔ ان کے علاوہ اور معلوم نہیں کتنی روایتیں ہوں گی جو ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ ام المومنین حضرت زینبؓ بنت خزیمہ تو صرف تین سال زندہ رہیں اور حضرت خدیجہؓ روایات کے دور سے پہلے ہی رحلت فرما چکی تھیں۔ اس لیے ان دونوں سے روایات کا نہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے۔ لیکن زینب بنت جحش سے کسی روایت کا نہ ہونا قابل غور ہے۔

بہر کیف کہنا یہ ہے کہ ان روایات میں بے شمار نسائی مسائل بھی ہیں اور بلاشبہ شطر دنیا کی تعلیم اور نصف دین کی تکمیل کا بوجھ انھی امہات المومنین کی گردن پر تھا، جس کا اٹھانا ایک دو کے بس کی بات نہ تھی۔ اب دوسری نوع کے مصالح پر غور کیجیے۔

ن معاشرت کا درس

حضور ﷺ کی سیرت کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی زندگی سراپا عمل ہے۔ محض وعظ و نصائح نہیں۔ حضور ﷺ کی زندگی سے ہر کہ و مہ، ہر شاہ و گدا، ہر اسود و احمر، ہر عربی و عجمی اور ہر جماعت و فرد یکساں طور پر اپنی زندگی کے لیے نمونہ عمل حاصل کر سکتا ہے۔ معاشرے کے لیے سب سے پہلا سنگِ بنیاد ازدواجی زندگی ہے، جس مصلح میں تاہل اور ازدواجی زندگی کا نمونہ نہ ہو، وہ کامل لیڈر نہیں بن سکتا۔ عیسائی اپنی کم زوری کو محسوس کرنے پر مجبور ہیں۔ کیوں کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی زندگی میں ایک متاہل کے لیے کوئی عملی نمونہ موجود نہیں۔ نہ انھوں نے شادی بیاہ کیا، نہ اپنا کوئی گھر بنایا۔ عیسائیوں کو اس خلا کو پُر کرنے اور اسی کم زوری کو چھپانے کی صرف یہی تدبیر نظر آئی کہ حضور ﷺ کے تعدد نکاح پر تمام مصالح کی طرف سے آنکھیں بند کر کے صرف تعدد پر اعتراضات اور حملے کیے جائیں۔ ان سے پوچھیے کہ اگر نسلِ انسانی کا خاتمہ مقصود نہ ہو، تو نمونہ کس کی زندگی ہے؟ بے زوج انسان کی یا متعدد ازواج رکھنے والے کی؟ پھر ان سے یہ بھی دریافت کیجیے کہ تم ان انبیا کے متعلق کیا کہتے ہو، جنھوں نے ایک سے زیادہ نکاح کیے؟ ذرا ملاحظہ ہو:

سیدنا ابراہیمؑ کی تین بیویاں تھیں: ہاجرہ، سارہ اور قتورہ۔

(پیدائش 24:16، 1:25 & 15:18)

سیدنا یعقوبؑ کی چار بیویاں تھیں: لیاہ، زلفہ، زاخل اور بلہاہ۔

(پیدائش 23، 24، 28، 29)

سیدنا موسیٰؑ کی بھی چار بیویاں تھیں: صفورہ، حبشیہ، قینی اور بنت حباب۔

(خراج 2:2، 31، قاضیوں 16:1 ` 16:4)

ان چار کے علاوہ بھی حضرت موسیٰؑ کے متعلق "خداوند اُن کے خدا" کا فرمان سنیے:

"جب تو اپنے دشمنوں سے جنگ کرنے کو نکلے اور خداوند تیرا خدا انھیں تیرے ہاتھ میں کر دے اور تو انھیں اسیر کر لائے۔ اور اسیروں میں کسی خوب صورت عورت کو دیکھ کر تو اس پر فریفتہ ہو جائے اور اسے بیاہ لینا چاہے۔ تو تُو اسے اپنے گھر لے آنا اور وہ اپنا سر منڈائے اور اپنے ناخن ترشوائے۔ اور اپنی اسیری کا لباس اتار کر تیرے گھر میں رہے اور ایک مہینے تک اپنے ماں باپ کے لیے ماتم کرے۔ اس کے بعد تُو اس کے پاس جا کر اس کا شوہر ہونا اور وہ تیری بیوی بنے۔ (استثنا 10:21 تا 13)

سیدنا داؤدؑ کی نو بیویوں کے نام تو سیموئیل 27:18 اور سیموئیل 2:3 تا 5 اور 26:11 وغیرہ میں ہیں۔ ان کے علاوہ دس اور حرموں اور جوروؤں کا ذکر سیموئیل 13:5 میں ہے۔

سیدنا سلیمانؑ کے متعلق بھی کچھ سن لیجیے:

اس کے پاس سات سو شاہ زادیاں اس کی بیویاں اور تین سو حرمیں تھیں۔

(سلاطین 3:11)

دوسرے غیر مسلم

اسی طرح بدھسٹوں سے دریافت کیجیے کہ ایک متاہل اور صاحب اہل و عیال

انسان کے لیے مہاتما بدھ کی زندگی اُسوہ و نمونہ بن سکتی ہے۔ جنھیں بال بچوں میں رہ کر تلاشِ حقیقت ناممکن نظر آئی اور جنھوں نے آخر کار اپنی بیوی اور بچے پر ایک آخری حسرت بھری نگاہ ڈال کر جنگل کی راہ لی۔

یوں ہی ہنود سے سوال کیجیے کہ کیا بال بچوں والے انسان کے لیے رام چندر جی مہاراج کی زندگی نمونہ بن سکتی ہے، جنھوں نے چودہ سال بن میں ساتھ دینے والی وفادار بیوی کو جدا کر دیا۔ ان سے یہ بھی پوچھیے کہ وہ راجا دسرتھ کے متعلق کیا کہتے ہیں، جن کی تین بیویاں تھیں: پٹ رانی کوشیلا، رانی ست مہری اور رانی کیکئی۔ اور ان کا کیا خیال ہے سر کرشن جی کی بابت، جن کی گوپیوں کی تعداد وہم و خیال سے بھی زیادہ بتائی جاتی ہے؟

ہم امید کرتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی یا ہنود اگر انھیں اپنے بزرگوں کی تعداد ازواج پر کوئی اعتراض نہیں تو ایک ایسے پیغمبر کے احترام کو بھی قائم رکھیں گے، جس کے ساتھ نکاحوں کے بے شمار انسانی مصالح وابستہ ہیں اور جس کے خوش گوار نتائج سے کوئی انصاف پسند آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ان کی تشریح کچھ اوپر گزر چکی ہے اور باقی کا ذکر آگے آتا ہے۔

حسن معاشرت کا سبق

اوپر ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضور ﷺ کی زندگی جہاں ہر شعبۂ حیات کے لیے زندہ نمونہ ہے، وہاں ازدواجی زندگی رکھنے والوں کے لیے بھی حسن معاشرت کا اعلیٰ اُسوہ ہے اور چوں کہ تاہل کی زندگی ہی معاشرے کا پہلا سنگ بنیاد ہے، اس لیے کوئی ایسا شخص دنیا کا کامل لیڈر نہیں ہو سکتا، جس کی زندگی اس خاص شعبۂ حیات میں بھی اعلیٰ نمونہ نہ رکھتی ہو۔ حضور ﷺ کا اسی سلسلے میں ایک دُوسرا کمال دیکھیے کہ کن کن جہتوں سے حضور ﷺ کی زندگی تمام انسانوں کے لیے واحد نمونہ ہے۔ ایک عفاف پسند مجرد انسان کے لیے حضور ﷺ کی زندگی نمونہ ہے کہ عرب جیسے بے لگام ملک میں پچیس سال تک کمال عفت و عصمت کی زندگی گزارتے ہیں پھر اپنی اصل ازدواجی زندگی ایک بیوہ صاحب اولاد اور اپنے سے پندرہ سال بڑی عورت (خدیجہؓ) کے ساتھ پچاس سال کی عمر تک گزارتے ہیں اور اس دوران میں اعلیٰ سے اعلیٰ پیش کش کے باوجود کسی دوسری عورت کی طرف رخ بھی نہیں فرماتے۔ اس ایک رفیقۂ زندگی کے ساتھ حُسنِ سلوک اور حُسنِ معاشرت کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ ساری عمر میں کبھی کوئی تلخی نہیں پیدا ہوئی۔ بیوی نہ فقط قربان ہوتی رہی بلکہ حیرت یہ ہے کہ اس فلک نیلگوں کی چھت کے نیچے اور اس زمین کی پُشت پر سب سے پہلے جو ہستی حضور ﷺ کی نبوت پر ایمان لاتی ہے، وہ یہی خدیجہؓ ہے۔ بیوی اپنے شوہر کے تمام رازہائے درون پردہ سے واقف ہوتی ہے۔ اس کی نگاہوں سے شوہر کا کوئی عیب و ہنر پوشیدہ نہیں ہوتا۔ نبوت تو بڑی چیز ہے، وہ تو معمولی ولایت کی بھی کبھی قائل نہیں ہوتی۔

کردار یا معاشرت کی معمولی کم زوری بھی ہو، تو کسی دعوے کے جواب میں عورت دھجیاں بکھیر کر رکھ دے، لیکن ذرا نگاہِ غور سے دیکھیے خدیجہؓ دو شوہروں کو پہلے بھی دیکھ چکی ہیں اور اب پندرہ سال مسلسل حضور ﷺ کی ایک ایک ادا کا تجربہ کر چکی ہیں، زندگی کے ایک ایک گوشے میں حضور ﷺ کو پرکھ چکی ہیں۔ کتنا بلند کردار رکھنے والا اور کیسے عدیم النظیر حسن معاشرت کا مالک ہوگا۔ وہ انسان جس کے متعلق خدیجہؓ صرف انسانیت کی قائل نہیں ہوتی بلکہ نبوت پر ایمان لے آتی ہے اور اپنی عمر کے بقیہ دس سال اس طرح ساتھ دیتی ہے کہ جان و مال سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ ہر امتحان میں کھری اترتی ہے، ہر خطرے کا مقابلہ کرتی ہے اور ایمان میں ایک لحظے کے لیے بھی کبھی تزلزل نہیں آیا۔ کیا یہ حسن معاشرت انسان کا آخری کمال نہیں؟ اور کیا ازدواجی زندگی کے لیے یہ سب سے اعلیٰ نمونہ نہیں؟

پھر اس کے بعد دوسرا نمونہ یہ ہے کہ پیغمبر ﷺ اس اصلی رفیقۂ زندگی کی رحلت کے بعد نکاح کرتا ہے تو بالکل اپنی ہم عمر پچاس سال کی سودہؓ سے۔ کیا یہ بجائے خود عفاف کا اعلیٰ نمونہ نہیں۔ اس رفیقۂ زندگی کو اپنے شوہر پر کتنا زبردست اعتماد تھا کہ اس نے اپنے دل سے سوت پن کی تمام آلائشوں کو باہر نکال کر اپنی باری ایک دوسری بیوی کو بخش دی۔ کیا یہ اعتماد حسنِ معاشرت کے بغیر ہی حاصل ہو گیا۔

آگے چلنے سے پہلے اپنی زندگی کا جائزہ لیجیے۔ اپنی پسند سے ایک بیوی لانے والوں کا بھی یہ حال ہے کہ عمر میں کوئی ہفتہ باہمی نوک جھونک سے خالی نہیں جاتا اور خدانخواستہ ایک سے زیادہ رفیقۂ زندگی ہوں، تو ایک کے ہاتھ میں سر کے بال دوسری کے ہاتھ میں ڈاڑھی کے بال ہوتے ہیں۔ لیکن اس انسان کی عظمت محبوبیت کردار بلند اور حسن معاشرت کا اندازہ کیجیے، جس کے پاس پچپن سال کی عمر کے بعد ایسی بیویاں یک جا ہو جاتی ہیں، جو مختلف عمر کی ہیں، مختلف قبائل کی ہیں، مختلف تمدن کی ہیں، مختلف مزاج کی ہیں اور گھروں میں فقر و فاقہ ایک مسلسل مشغلہ ہے لیکن ساری زندگی میں باہمی تلخی کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ صرف ایک ہی لطیف سی جھلک نظر آتی ہے جس کے بعد ایلا کا مسئلہ رحمت الٰہی بن کر نازل ہوا، ورنہ اس سے پہلے ایلا اور طلاق ایک ہی چیز متصور ہوتی تھی۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ان ازواجِ مطہرات میں کس کس نوع کی بیویاں ہیں۔ ان میں عائشہؓ جیسی کنواری بھی ہے، ان میں سودہؓ، حفصہؓ، ام سلمہؓ، جویریہؓ اور امّ حبیبہؓ جیسی ایک ایک شوہر کی بیوائیں بھی ہیں۔ ان میں خدیجہؓ، میمونہؓ جیسی دو دو شوہروں کی بیوائیں بھی ہیں۔ انھی میں زینبؓ بنت خزیمہ جیسی تین تین شوہروں کی بیوہ بھی ہیں اور انھی میں زینبؓ بنت جحش جیسی مطلقہ بھی ہے۔ پھر ان کے قبائل، ان کے تمدن، ان کے مزاج اور ان کی عمریں متفاوت اور مختلف ہیں۔ کسی کو شاہانہ اخراجات نہیں ملتے، بلکہ بعض اوقات کئی کئی مہینے کھجور اور پانی پر گزارہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حسن معاشرت کیسا زبردست اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ جب کثرت غنائم کو دیکھ کر امہات مومنین مزید گزارے کا مطالبہ کیا، تو ایک ہی حکم (مسئلہ تخییر) نازل ہونے کے بعد سب اپنے مطالبے واپس لے لیے۔ کیا یہ انسانیت کا معمولی کمال ہے؟ اور کیا کسی بڑے سے بڑے انسان کی زندگی میں حسنِ معاشرت کے ایسے نمونے مل سکتے ہیں کہ ہر [illegible] کی عورت ایک ساتھ ہونے کے باوجود اس کا حسنِ معاشرت سارے عالم کے [illegible]

نمونہ بن سکے؟ یہ حقیقت آخر کیوں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا صرف یہی انسان کامل ہے، جو یہ اعلان کر سکے کہ خَیْرُکُمْ لِاَھْلِہٖ وَاَنَا خَیْرُکُمْ لِاَھْلِی (یعنی تم میں بہترین انسان وہ ہے، جو اپنے اہل وعیال کے لیے سب سے بہتر ہو، اور میں اس لحاظ سے تم سب میں بہتر ہوں) ہم نے بڑے بڑے مصلحین کو دیکھا، جو ایک رفیقۂ زندگی سے بھی نہ نباہ سکے، اسے اپنا ہم نوا نہ بنا سکے۔ بعض تو ساری عمر بیوی سے مقدمہ بازی کرتے رہے۔ پس کیا نو مختلف ازواج سے ایسا غیر معمولی نباہ اس انسان کا آخری کمال نہیں اور کیا کسی ایک نوع کی رفیقۂ زندگی رکھنے والے کے لیے حضور ﷺ کی زندگی ایک بہترین نمونہ نہیں؟ پھر وہ بھی ایسی حالت میں کہ حضور ﷺ کو تنہا یہی ایک کام نہیں کرنا تھا بلکہ ایک طرف ساری امت کی اصلاح کا کمر کو توڑنے والا بوجھ بھی ہے اور ساری ساری رات خدا کی بندگی کا فرض بھی ادا کرنا ہے۔

خانگی زندگی کی سچی شہادت

یہ نکتہ کبھی فراموش نہیں ہونا چاہیے کہ حقیقی مصلح وہی ہے، جس کے ظاہری اور باطنی دونوں کردار آئینے کی طرح عیاں ہوں۔ ہمارے موجودہ دورِ قیادت میں پبلک لائف اور پرائیویٹ لائف کے دو حصّوں میں زندگی کو تقسیم کر دیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پبلک سٹیج پر اپنی زندگی کا کوئی خوش گوار پہلو پیش کر دینا مصلح کے لیے مشکل نہیں۔ مکمل قیادت کا صحیح پتا اس وقت چلتا ہے، جب اس کی اندرونی زندگی بھی آئینے کی طرح سامنے آ جائے۔ یوں تو حضور ﷺ کی خانگی زندگی کی شہادت کے لیے تنہا خدیجہؓ ہی کافی ہو سکتی تھیں، لیکن اس تنہا شہادت پر بیسیوں شبہے وارد ہو سکتے تھے مگر ان نو مشاہدات عادلات میں سے کس کس کی گواہی پر شبہے کیے جا سکتے ہیں؟

اسلام نے کسی بات کے ثبوت کے لیے گواہوں کی جو بڑی سے بڑی تعداد رکھی ہے، وہ چار مردوں، دوسرے لفظوں میں آٹھ عورتوں کی گواہی ہے۔ لیکن جن امور شنیعہ کے ثبوت کے لیے گواہوں کی یہ تعداد مقرر کی گئی، ان سے حضور ﷺ کی پاک ترین اخلاقی زندگی اس درجے بعید ہے کہ تعداد کی برابری بھی سوءِ ادب ہے۔ اس لیے آٹھ عورتوں کی بجائے نو عورتوں کی شہادت تاریخ کے سامنے ہے۔ تاریخ ان نو 9 مشاہدات عادلات سے دریافت کرے کہ حضور ﷺ کی پرائیویٹ اور خلوتی زندگی کیا تھی۔ خلوتی زندگی کا پتا نہ بیٹی دے سکتی ہے، نہ فرزند، نہ خادم و خادمہ، نہ دوست، نہ دشمن، نہ داماد، نہ بہو، نہ معتقد، نہ شاگرد، یہاں سچی اور کھری گواہی بیوی ہی دے سکتی ہے۔ کیوں کہ خلوت کی زندگی کی صحیح راز دار یہی ہوتی ہے۔ یہ بتا سکتی ہے کہ اس کا شوہر کیا کیریکٹر رکھتا ہے؟ اہل وعیال سے اس کا سلوک کیسا ہے؟ اس کی راتیں کس طرح گزرتی ہیں؟ اسے اپنے مقصد کے ساتھ کتنی لگن ہے؟ اس کی زندگی کا کیا نقشہ ہے؟ اپنوں اور پرائیوں کے ساتھ اس کے انسانی تعلقات کیسے ہیں؟ اور خود خدا کے ساتھ اسے کیا وابستگی ہے؟ ان تمام سوالات کا جواب اگر نو شاہدات عادلات یک زبان ہو کر دیں اور وہ بھی وہ، جن سے اندرونی زندگی کا کوئی راز چھپا ہوا نہ ہو، تو دنیا کی کون سی عدالت اسے رد کر سکتی ہے؟ کثیر الازواج مصلحین تو دنیا میں اور بھی بہت سے گزرے ہیں، لیکن کسی ایسے مصلح کا نام لیجیے، جس کی اتنی بیویاں اس کے پرائیویٹ اخلاق کی ایسی ہی گواہ ہوں، جن کے نکاح سے ہزار انسانی مصالح وابستہ ہوں اور جو مصلحات امت بنا کر پیش کی گئی ہوں۔

ان تمام تصریحات مذکورہ بالا کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ کے تعدد ازواج کا مقصد کچھ قربانیوں کی قدر دانی و حوصلہ افزائی تھی، یا بیواؤں اور یتیموں کی خبر گیری یا خاندانی احترام کی بقا اور اس کے ساتھ ہی حسنِ معاشرت کا عملی درس دینا۔ صنفِ ضعیف کے درجے کو بلند کرنا، انھیں معلماتِ امت بنانا، معاشرے کی اصلاح کرنا، صہری تعلقات کے ذریعے دین کی توسیع کرنا اور امن و امان قائم کرنا وغیرہ۔ ان انسانی مصالح کے بغیر ہی مطلق تعدّد ازواج کو سنت قرار دینا درست نہیں۔ سنت صرف تعدّد ازواج ہی نہیں حضور ﷺ کی پوری زندگی ہے۔ حضور ﷺ کی دوسری "کڑوی" سنتوں سے اعراض برت کر صرف "میٹھی" سنتوں کو اختیار کرنا معاشرے کو جتنا فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس سے زیادہ مفاسد پیدا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضور ﷺ کی اصل اور آئیڈیل ازدواجی زندگی وہی ہے، جو حضرت خدیجہؓ کے ساتھ بسر ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ساری مناکحتیں ایک ہنگامی اور ناگزیر قومی و ملی مصالح کے تحت ہوئی تھیں اور ایسے وقت میں ہوئی تھیں، جب کہ حضور ﷺ اس کی بشری ضرورت نہ رکھتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بجز خدیجۃ الکبریٰؓ کے اور کسی اُمّ المومنین سے حضور ﷺ کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

ہمیں بعض لوگوں کا یہ انداز دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہ تعدد ازواج النبی ﷺ کی تاریخی حقیقت کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ قرآن چوں کہ چار سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتا اور حضور ﷺ قرآن کے خلاف نہیں جا سکتے تھے، اس لیے یہ قصہ ہی غلط ہے کہ حضور ﷺ کی نو بیویاں تھیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تاریخی حقائق کو اس طرح جھٹلانے سے قرآن کی کیا خدمت ہو سکتی ہے۔ واقعہ صرف اتنا ہے کہ قرآن کا رجحان توحدِ زوج ہی کی طرف ہے، کیوں کہ وہ عدلِ بین النساء کو ضروری قرار دینے کے ساتھ اس عدل کو انسانی طاقت سے باہر بھی بتاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایسی لچک بھی رکھی ہے کہ ملّت کی ہنگامی ضرورتوں کے وقت تعدّد ازواج مستحب بلکہ ضروری بھی ہو جاتا ہے۔ انھی ضرورتوں کے تحت حضور ﷺ نے نو ازواج ایک ساتھ رکھیں اور چوں کہ قرآن نے انھیں الگ کرنے کی صریح ممانعت کر دی تھی، اس لیے حضور ﷺ کا ان سب کو زوجیت میں باقی رکھنا بھی ناگزیر تھا۔ اِن مادرانِ اُمّت کو فرزندانِ اُمت کے حوالے نہیں کیا جا سکتا تھا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد

مؤرخین کی اکثریت کا اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی چھ اولادیں ہوئیں، جن میں دو فرزند اور چار دختر ہوئیں۔ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ایک فرزند حضرت قاسمؓ اور چار بیٹیاں حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ تولد ہوئیں۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے ایک فرزند حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے۔ آپ ﷺ کے دونوں فرزند شیرخوارگی ہی میں وفات پا گئے، لیکن بیٹیاں زندہ رہیں اور ان کی شادیاں بھی ہوئیں، لیکن تین بیٹیاں آنحضور ﷺ کی زندگی ہی میں وفات پا گئیں۔ صرف حضرت فاطمہؓ حضور ﷺ کے وصال کے بعد تک زندہ رہیں۔

حضرت قاسمؓ

آنحضور ﷺ کی سب سے پہلی اولاد۔ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے نبوت سے گیارہ سال پہلے پیدا ہوئے۔ ابن سعد کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو سال تک زندہ رہے۔ مجاہد کے بقول عالمِ شیرخوارگی میں انتقال کیا، جب کہ ابن فارس کے قول کے مطابق سن بلوغ کو پہنچ گئے تھے۔ آنحضور ﷺ کی کنیت ''ابوالقاسم'' انھی کے نام سے منسوب ہے۔ حضور ﷺ اس کنیت کو بہت پسند فرماتے تھے۔ صحابہ بھی جب محبت سے آپ ﷺ کا نام لیتے تو ''ابوالقاسم'' ہی کہتے۔ ایک دن حضور ﷺ بازار سے گزر رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے ''یا ابوالقاسم'' کہہ کر آواز دی۔ آپ ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو اس نے کہا: ''یارسول اللہ ﷺ، میں اسی نام کے ایک اور شخص کو پکار رہا ہوں۔'' آپ ﷺ نے اشتباہ دُور کرنے کے لیے آیندہ اپنے لیے یہ کنیت استعمال کرنے سے منع فرمایا۔ بلکہ اکثر روایات کے مطابق دوسروں کو یہ کنیت رکھنے سے منع فرمایا تھا اور کہا تھا کہ میرے نام پر نام رکھو مگر میری کنیت پر کنیت نہ رکھو۔

حضرت عبداللہؓ

ابن سعد نے ''طبقات'' میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے ایک اور فرزند عبداللہ پیدا ہوئے، جنھیں طیب اور طاہر کے ناموں سے بھی پکارتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت قاسمؓ کے کچھ عرصہ بعد حضرت عبداللہ بھی مکہ ہی میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔ یہ دونوں سانحے اوپر تلے پیش آئے، جس پر حضور ﷺ کے دشمن ہرزہ گوئی کیا کرتے تھے۔ ان پر ملامت کے لیے سورہ الکوثر نازل ہوئی۔ چوں کہ اس سورہ کا تعلق آنحضور ﷺ کی اولاد سے بھی ہے، اس لیے اس کی شانِ نزول کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے:

جس شخص کی اولادِ نرینہ مرجائے، اسے عرب ''ابتر'' کہا کرتے تھے، یعنی مقطوع النسل۔ جس وقت نبی کریم ﷺ کے فرزند قاسم یا عبداللہ کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تو کفارِ مکہ آپ ﷺ کو ''ابتر'' کہہ کر طعنے دینے لگے۔ خصوصاً مکہ کے سردار عاص بن وائل سہمی کے سامنے جب رسول کریم ﷺ کا ذکر کیا جاتا تو وہ کہتا: ''ان کی بات چھوڑو۔ وہ تو ایک ابتر (جڑ کٹے) آدمی ہیں۔ ان کی کوئی اولادِ نرینہ نہیں۔ مرجائیں گے تو کوئی ان کا نام لیوا بھی نہ ہوگا۔'' عقبہ بن ابی معیط بھی ایسی ہی باتیں حضور ﷺ کے متعلق کہا کرتا تھا۔ ایک دفعہ مدینہ کا یہودی سردار مکہ آیا تو قریش کے سرداروں نے اس سے کہا: ''آپ اس نوجوان کو نہیں دیکھتے جو اپنی قوم سے کٹ گیا ہے، اور سمجھتا ہے کہ وہ ہم سے بہتر ہے، حالانکہ ہم حاجیوں کی خدمت کرنے والے، بیت اللہ کی حفاظت کرنے والے اور لوگوں کو پانی پلانے والے ہیں۔'' ابن سعد، ابن عساکر کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول کریم ﷺ کے سب سے بڑے صاحب زادے قاسمؓ تھے۔ ان سے چھوٹی حضرت زینبؓ تھیں، ان سے چھوٹے حضرت عبداللہؓ تھے۔ پھر علی الترتیب تین صاحب زادیاں ام کلثومؓ، فاطمہؓ اور رقیہؓ تھیں۔ ان میں سے پہلے حضرت قاسمؓ کا انتقال ہوا، اور پھر حضرت عبداللہؓ نے وفات پائی۔ اس پر عاص بن وائل نے کہا: ''ان کی نسل ختم ہوگئی۔ اب وہ ابتر ہیں۔'' ابن عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے صاحب زادے عبداللہ کی وفات پر ابوجہل نے بھی ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ عطا کی روایت ہے کہ جب حضور ﷺ کے دوسرے صاحب زادے کا انتقال ہوا تو حضور ﷺ کا اپنا چچا ابولہب، جس کا گھر حضور ﷺ کے گھر سے متصل تھا، دوڑا ہوا مشرکین کے پاس گیا اور انھیں یہ خوش خبری دی کہ ''آج رات محمد ﷺ لاولد ہوگئے یا اُن کی جڑ کٹ گئی۔''

آپ ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والوں اور بیٹے کے انتقال پر ایک دُکھی باپ کو مزید دکھ پہنچانے والوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اس مختصر ترین سورۃ الکوثر کے ایک فقرے میں وہ خوش خبری دی جس سے بڑی خوش خبری دنیا کے کسی انسان کو نہیں دی گئی۔ ''اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ'' (تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے)۔ مولانا مودودیؒ نے اس سورہ کی تفسیر کے اختتام پر نتیجہ نکالا ہے: ''پھر وہ ایسے بے نام ونشان ہوئے کہ ان کی اولاد اگر دنیا میں باقی رہی بھی، تو ان میں سے آج کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ ابوجہل یا ابولہب یا عاص بن وائل یا عقبہ بن ابی معیط وغیرہ اعدائے اسلام کی اولاد میں سے ہے، اور جانتا بھی ہو تو کوئی یہ کہنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ اس کے اسلاف یہ لوگ تھے۔ اس کے برعکس رسولِ کریم ﷺ کی آل پر آج دنیا بھر میں دُرود بھیجا جا

ہے۔ کروڑوں مسلمانوں کو آپ ﷺ سے نسبت پر فخر ہے۔ لاکھوں انسان آپ ﷺ ہی سے نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے خاندان اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کے خاندانوں تک سے انتساب کو باعث عزو شرف سمجھتے ہیں۔ کوئی سیّد ہے، کوئی علوی ہے، کوئی عباسی ہے، کوئی ہاشمی ہے کوئی صدیقی ہے، کوئی فاروقی، کوئی عثمانی، کوئی زبیری اور کوئی انصاری۔ مگر نام کا بھی کوئی ابوجہلی یا ابولہبی نہیں پایا جاتا۔ تاریخ نے ثابت کر دیا کہ ابتر حضور ﷺ نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے دشمن ہی تھے اور ہیں۔'' آپ ﷺ کی نسل نسبی بھی ان شاء اللہ تا قیامت باقی رہے گی، اگرچہ دختری اولاد سے ہو، اور نسل معنوی یعنی آپ ﷺ پر ایمان لانے والے تو اس کثرت سے ہوں گے کہ پچھلے تمام انبیائے کرامؑ کی اُمتوں سے بھی بڑھ جائیں گے۔

حضرت زینبؓ

آنحضور ﷺ کی سب سے بڑی صاحب زادی۔ حضرت خدیجہؓ کے بطن سے حضرت قاسمؓ کے بعد پیدا ہوئی تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی ابن کلبی کی سند پر لکھتے ہیں کہ آپ ﷺ تمام بچوں میں سب سے بڑی تھیں۔ آپ کی ولادت بعثت سے دس برس پہلے ہوئی، جس وقت آنحضور ﷺ کی عمر تیس سال تھی۔

آپ کا نکاح آپ کے خالہ زاد بھائی ابوالعاص بن ربیع لقیط سے ہوا۔

نبوت کے تیرہویں سال جب آنحضور ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو اہل وعیال مکہ میں رہ گئے تھے۔ حضرت زینبؓ بھی اپنے سسرال میں تھیں۔ غزوۂ بدر میں ابوالعاص کفار کی طرف سے شریک ہوئے تھے۔ عبداللہ بن جبیرؓ انصاری کے ہاتھوں گرفتار ہوئے، اہل مکہ نے جب یہ خبر سنی تو قیدیوں کے رشتہ داروں نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں اپنے عزیزوں کی رہائی کے لیے زرِ فدیہ بھیجا۔ حضرت زینبؓ نے بھی مکہ سے اپنے دیور عمرو بن ربیع کے ہاتھ یمنی عقیق کا ایک ہار اپنے شوہر کی رہائی کے لیے بھیجا۔ یہ ہار حضرت زینبؓ کو ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ نے شادی کے وقت جہیز میں دیا تھا۔ جب حضور ﷺ کی خدمت میں یہ ہار پیش کیا گیا تو حضور ﷺ کو حضرت خدیجہؓ یاد آ گئیں اور آپ ﷺ آبدیدہ ہو گئے۔

حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اگر مناسب سمجھو تو یہ ہار زینبؓ کو واپس بھیج دو۔ یہ اس کی ماں کی نشانی ہے۔ ابوالعاصؓ کا فدیہ صرف یہ ہے کہ وہ مکہ جا کر حضرت زینبؓ کو فوراً مدینہ بھیج دیں۔'' صحابہؓ نے ارشاد نبوی ﷺ کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ حضرت ابوالعاص نے بھی یہ شرط قبول کر لی اور رہا ہو کر مکہ پہنچے۔ رسول کریم ﷺ نے ان کے ہم راہ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو بھیجا کہ وہ بطن یاجج کے مقام پر ٹھہر کر انتظار کریں۔ جب زینبؓ مکہ سے وہاں پہنچیں تو انھیں ساتھ لے کر مدینہ آ جائیں۔ حضرت ابوالعاصؓ نے وعدے کے مطابق اپنے چھوٹے بھائی کنانہ کے ہم راہ حضرت زینبؓ کو مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ کر دیا۔ کفارِ مکہ نے کنانہ اور حضرت زینبؓ کا تعاقب کیا اور مقام ''ذی طویٰ'' میں انھیں جا گھیرا۔ حضرت زینبؓ اونٹ پر سوار تھیں۔ کفار کی جماعت میں سے ہبار بن اسود نے حضرت زینبؓ کو اپنے نیزے سے زمین پر گرا دیا۔ وہ حاملہ تھیں۔ سخت چوٹ آئی اور حمل ساقط ہو گیا۔ کنانہ طیش میں آ گئے۔ ترکش سے تیر نکالے اور انھیں کمان پر چڑھا کر للکارے کہ خبردار، اب تم میں سے کوئی آگے بڑھا تو اسے چھلنی کر دوں گا۔ کفار رک گئے۔ ابوسفیان نے آگے بڑھ کر کہا ''بھتیجے، اپنے تیر روک لو۔ میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔'' کنانہ نے پوچھا: ''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' ابوسفیان نے ان کے کان میں کہا: ''محمد ﷺ کے ہاتھوں ہمیں جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا ہے، تم اس سے بخوبی آگاہ ہو۔ اگر تم اس کی بیٹی کو اس طرح کھلم کھلا ہمارے سامنے لے جاؤ گے تو ہماری بڑی سبکی ہو گی۔ بہتر یہ ہے کہ تم اس وقت زینبؓ کے ہم راہ مکہ لوٹ جاؤ اور پھر کسی وقت خفیہ طور پر زینبؓ کو لے جانا۔'' کنانہ نے یہ بات مان لی اور حضرت زینبؓ کو لے کر مکہ واپس آ گئے۔ چند دن بعد وہ رات کے وقت چپکے سے حضرت زینبؓ کو ہم راہ لے کر بطن یاجج پہنچے اور انھیں حضرت زیدؓ بن حارثہ کے سپرد کر کے مکہ واپس چلے گئے۔ حضرت زیدؓ حضرت زینبؓ کو ساتھ لے کر مدینہ پہنچے۔

حضرت ابوالعاصؓ کو حضرت زینبؓ سے بہت محبت تھی۔ بعثت نبوی کے بعد کفارِ مکہ نے نبی کریم ﷺ اور اسلام قبول کرنے والوں پر بے پناہ مظالم ڈھانا شروع کر دیے تھے۔ حضور ﷺ کی دو صاحب زادیاں رقیہؓ اور ام کلثومؓ ابولہب کے دو بیٹوں کے نکاح میں تھیں، تاہم رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ ان دونوں نے اپنے باپ کے کہنے پر دونوں صاحب زادیوں کو طلاق دے دی۔ ابوالعاص کو بھی کفار نے بہت اکسایا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دے دیں، لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا اور حضرت زینبؓ سے محبت والفت کا سلوک کرتے رہے۔ آنحضور ﷺ نے ابوالعاص کے اس طرز عمل کی ہمیشہ تعریف کی۔ اتنی شرافت اور نیک نفسی کے باوجود حضرت ابوالعاصؓ نے اپنا آبائی مذہب ترک نہ کیا، حتیٰ کہ رسولِ کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے۔ حضرت زینبؓ ان دنوں اپنے سسرال میں تھیں۔

حضرت ابوالعاصؓ بڑے دیانت دار اور شریف النفس آدمی تھے۔ لوگ ان کے پاس امانتیں رکھواتے، وہ نہایت دیانت کے ساتھ ان کی حفاظت کرتے اور مالکوں کے طلب کرنے پر فوراً واپس کر دیتے تھے۔ مکّے میں ان کی اس قدر ساکھ تھی کہ لوگ اپنا مال تجارت انھیں دے کر فروخت کے لیے دوسرے ملکوں میں بھیجا کرتے تھے۔ 6 ہجری میں ابوالعاص ایک تجارتی قافلے کے ہم راہ شام جا رہے تھے کہ عیص کے مقام پر مجاہدین اسلام نے قریش کے قافلے پر چھاپا مارا اور تمام مال واسباب پر قبضہ کر لیا۔ حضرت ابوالعاصؓ بھاگ کر مدینہ چلے گئے اور وہاں حضرت زینبؓ کی پناہ لی۔ حضرت زینبؓ نے رسول کریم ﷺ سے سفارش کی کہ ابوالعاصؓ کا مال انھیں واپس کر دیا جائے۔ آنحضور ﷺ ابوالعاصؓ کا لحاظ کرتے تھے۔ صحابہؓ سے فرمایا: ''اگر تم ابوالعاص کا مال واپس کر دو گے تو میں ممنون احسان ہوں گا۔''

چنانچہ صحابہؓ نے تمام مال واسباب حضرت ابوالعاصؓ کو واپس کر دیا۔ وہ مکہ پہنچے اور تمام لوگوں کی امانتیں واپس کر دیں۔ پھر اہل مکہ سے مخاطب ہو کر کہا: ''اے اہل

قریش، اب میرے ذمّہ کسی کی کوئی امانت تو نہیں ہے؟'' اہل مکہ نے یک زبان ہو کر کہا: ''بالکل نہیں۔ خدا تمھیں جزائے خیر دے۔ تم ایک نیک نفس اور باوفا شخص ہو۔''

حضرت ابوالعاصؓ نے کہا: ''تو سُن لو کہ میں مسلمان ہوتا ہوں۔ خدا کی قسم، اسلام قبول کرنے میں مجھے صرف یہ امر مانع تھا کہ تم لوگ مجھے خائن نہ سمجھو۔'' یہ کہ کر کلمۂ شہادت پڑھا اور اس کے بعد ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے آئے۔ یہ محرم 7 ہجری کا واقعہ ہے۔

چوں کہ حضرت زینبؓ نے انھیں شرک کی حالت میں چھوڑا تھا، اس لیے دونوں میں تفریق پیدا ہو گئی تھی۔ جب ابوالعاصؓ مشرف بہ اسلام ہو کر مدینہ پہنچے تو حضور ﷺ نے حضرت زینبؓ کو پہلے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کر کے حضرت ابوالعاصؓ کے گھر بھجوا دیا۔ اس کے بعد حضرت زینبؓ زیادہ عرصہ زندہ نہ رہیں اور 8 ہجری میں انتقال کیا۔ حضرت ام ایمنؓ، حضرت سودہؓ، حضرت اُمّ سلمہؓ اور اُمّ عطیہؓ نے غسل دیا۔ آنحضور ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ خود قبر میں اُترے اور اپنی دختر کو خاک کے سپرد کیا۔ اس وقت حضور ﷺ کے چہرۂ مبارک پر حزن وملال کے آثار نمایاں تھے۔

حضرت زینبؓ کی دو اولادیں تھیں، ایک بیٹی امامہ اور ایک بیٹا علی۔ ایک روایت ہے کہ علی تو عالم طفلی میں وفات پا گئے، لیکن عام روایت یہ ہے کہ سن رشد کو پہنچے۔ ابن عساکر نے لکھا ہے کہ یرموک کے معرکے میں شہادت پائی۔ فتح مکہ کے وقت جب حضور ﷺ شہر میں داخل ہوئے تو اس وقت ان کے نواسے علی بن زینبؓ اپنے نانا جان کے ہم راہ اونٹ پر سوار تھے۔

حضرت امامہؓ نے طبعی عمر پائی۔ حضور ﷺ ان سے بے حد محبت اور شفقت کرتے تھے۔ معتبر روایات کے مطابق حضور ﷺ اکثر وبیشتر اپنی ننھی نواسی امامہ کو اپنے کندھے پر سوار فرما کر نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور جس وقت رکوع میں جاتے تو انھیں اتار دیتے۔ خلیفہ چہارم حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت امامہؓ سے عقد فرما لیا تھا۔ آپ نے اپنے انتقال کے وقت وصیت فرمائی تھی کہ میرے بعد حضرت مغیرہ ان سے نکاح کر لیں، جس کی تعمیل ہوئی۔

حضرت رُقیہؓ

رسولِ کریم ﷺ کی دوسری صاحب زادی تھیں۔ والدہ حضرت خدیجہؓ تھیں۔ بعثت نبوی سے سات سال پہلے پیدا ہوئیں۔ آنحضور ﷺ کی عمر اس وقت 33 سال تھی۔ حضرت رقیہ حضرت زینبؓ سے تین برس چھوٹی تھیں۔

ان کا پہلا نکاح ابولہب کے بیٹے عقبہ سے ہوا۔ یہ قبل نبوت کا واقعہ ہے۔ حضور ﷺ کی تیسری صاحب زادی اُمّ کلثومؓ کا نکاح ابولہب کے دوسرے لڑکے عتیبہ سے ہوا تھا۔ دونوں کی رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ نبوت کے بعد جب حضور ﷺ نے اسلام کی طرف دعوت دینا شروع کی تو اس شخص نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے، اگر تم محمد ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ آنحضور ﷺ نے مکہ ہی میں حضرت رُقیہؓ کی شادی حضرت عثمانؓ سے کر دی۔ اس سے پیش تر حضرت رقیہ اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کے ہم راہ اسلام قبول کر چکی تھیں۔

نبوت کے پانچویں سال حضرت عثمانؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت رُقیہؓ بھی ان کے ساتھ گئیں۔ کچھ عرصہ بعد جب واپس آئیں تو مکہ کی سرزمین پہلے سے زیادہ خوں خوار تھی۔ چنانچہ دوبارہ ہجرت کی۔ ایک مدت تک آنحضور ﷺ کو ان کا کچھ حال معلوم نہ ہوا۔ اتفاق سے ایک حبشی خاتون آپ ﷺ کے پاس آئیں تو آپ ﷺ نے ان سے بیٹی اور داماد کی خیریت معلوم کی اور جب انھوں نے بتایا کہ دونوں خوش وخرم ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ ان پر رحم فرمائے۔ مزید فرمایا کہ ابراہیمؑ اور لوطؑ کے بعد عثمان پہلے شخص ہیں جنھوں نے بیوی کے ہم راہ ہجرت کی ہے۔

دوسری مرتبہ حبشہ میں زیادہ عرصے تک مقیم رہیں۔ جب یہ خبر پہنچی کہ آنحضور ﷺ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے والے ہیں تو چند بزرگ، جن میں حضرت عثمانؓ اور حضرت رقیہ بھی تھیں، مکہ آئے اور آنحضور ﷺ کی اجازت سے مدینہ کو ہجرت کی، جہاں انھوں نے حضرت حسانؓ کے بھائی اوس بن ثابتؓ کے گھر قیام کیا۔

2 ہجری میں، جو غزوۂ بدر کا سال تھا، حضرت رُقیہ کے چیچک کے دانے نکلے، نہایت سخت تکلیف ہوئی۔ حضور ﷺ اس زمانے میں بدر کی تیاریاں کر رہے تھے۔ غزوے کو روانہ ہوئے تو حضرت عثمانؓ کو تیمار داری کے لیے چھوڑ دیا۔ جس دن زید بن حارثہ نے مدینہ میں آ کر فتح کی خوش خبری سنائی، عین اسی دن حضرت رُقیہؓ نے وفات پائی۔ حضور ﷺ غزوے کی وجہ سے ان کے جنازے میں شریک نہ ہو سکے، لیکن جب واپس آئے اور اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو نہایت رنجیدہ ہو کر قبر پر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: ''عثمانؓ بن مظعون جا چکے۔ اب تم بھی ان کے پاس چلی جاؤ۔'' اس فقرے نے عورتوں میں کہرام برپا کر دیا۔ حضرت عمرؓ کوڑا لے کر مارنے کے لیے اٹھے۔ آپ ﷺ نے ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: ''رونے دو۔ دل اور آنکھ کے رونے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن نوحہ وبین شیطانی حرکت ہے۔ اس سے قطعاً بچنا چاہیے۔''

حضرت فاطمہؓ بھی اپنی بڑی بہن کی قبر پر تشریف لائیں اور قبر کے کنارے بیٹھ کر رونے لگیں۔ حضور ﷺ اپنی چادر مبارک کے کناروں سے ان کے آنسو پونچھتے تھے۔

حبش کے زمانۂ قیام میں حضرت رُقیہؓ کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا تھا۔ ان کا نام عبداللہ رکھا گیا تھا۔ انھی صاحب زادے کے نام کی نسبت سے حضرت عثمانؓ نے کنیت ابوعبداللہ اختیار کی تھی۔ عبداللہ کی عمر ابھی چھے برس کی تھی کہ ایک مرغ نے ان کی آنکھ پر چونچ ماری جس سے تمام چہرہ متورم ہو گیا اور اسی تکلیف سے جمادی الاولیٰ 4 ہجری میں وفات پائی۔

حضرت اُمّ کلثومؓ

آنحضور ﷺ کی تیسری صاحب زادی ہیں اور کنیت ہی کے ساتھ مشہور ہیں۔ ان کا پہلا نکاح ابولہب کے بیٹے عتیبہ سے ہوا تھا۔ جیسا کہ حضرت رقیہ کے حالات

ں بیان کیا گیا، نبوت سے پہلے رسول کریم کی صاحب زادیاں حضرت رُقیہؓ اور حضرت اُمّ کلثومؓ ابولہب کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے بیاہی ہوئی تھیں۔ ان کا نکاح ہو چکا تھا اور رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ نبوت کے بعد جب حضور ﷺ نے اسلام کی طرف دعوت دینا شروع کی تو ابولہب نے اپنے دونوں بیٹوں سے کہا کہ میرے لیے تم سے ملنا حرام ہے، اگر تم محمد ﷺ کی بیٹیوں کو طلاق نہ دے دو۔ چنانچہ دونوں نے طلاق دے دی۔ اور عتیبہ تو جہالت میں اس قدر آگے بڑھ گیا کہ ایک روز حضور ﷺ کے سامنے آکر اس نے کہا کہ میں النجم اذا ھویٰ اور الذی دنا فتدلیٰ کا انکار کرتا ہوں۔ اور یہ کہ کر اس نے حضور ﷺ کی طرف تھوکا جو آپ ﷺ پر نہیں پڑا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، خدایا، اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتے کو مسلط کر دے۔ اس کے بعد عتیبہ اپنے باپ کے ساتھ شام کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دورانِ سفر میں ایک ایسی جگہ قافلے نے پڑاؤ کیا، جہاں مقامی لوگوں نے بتایا کہ راتوں کو درندے آتے ہیں۔ ابولہب نے اپنے ساتھی اہلِ قریش سے کہا کہ میرے بیٹے کی حفاظت کا کچھ انتظام کرو، کیوں کہ مجھے محمد ﷺ کی بددعا کا خوف ہے۔ اس پر قافلے والوں نے عتیبہ کے گرد ہر طرف اپنے اونٹ بٹھا دیئے اور پڑ کر سو رہے۔ رات کو ایک شیر آیا اور اونٹوں کے حلقے میں سے گزر کر اس نے عتیبہ کو پھاڑ کھایا۔

شروع 3 ہجری میں جب حضرت رقیہؓ کا انتقال ہوا تو ربیع الاول میں حضرت عثمانؓ نے حضرت اُمّ کلثومؓ کے ساتھ نکاح کر لیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب حضرت حفصہؓ بیوہ ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے اپنی صاحب زادی کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کرنے کا پیغام دیا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے اس وجہ سے یہ رشتہ قبول کرنے میں تامل کیا کہ آپ نے سنا تھا کہ حضور ﷺ بذاتِ خود حضرت حفصہؓ سے نکاح کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ جب آنحضور ﷺ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا، کیا میں حفصہؓ کے لیے ایک بہتر شوہر اور عثمانؓ کے لیے ایک بہتر بیوی تجویز نہ کر دوں۔ اس طرح آپ ﷺ نے خود کو حضرت حفصہؓ سے اور حضرت عثمانؓ کا نام اُمّ کلثومؓ سے نکاح کرنے کے لیے پیش کیا۔

ابھی شادی کو پانچ سال گزرے تھے کہ شعبان 9 ہجری میں وفات پائی۔ انصاری خواتین نے اُمِّ عطیہ کے ہم راہ غسل دیا۔ آنحضور ﷺ کو سخت صدمہ ہوا۔ قبر پر بیٹھے تو آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آپ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت ابوطلحہؓ، حضرت علیؓ، حضرت فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ نے قبر میں اُتارا۔ حضرت اُمّ کلثوم کی کوئی اولاد نہیں ہے۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ

رسول کریم ﷺ کی چوتھی اور سب سے چھوٹی صاحب زادی تھیں۔ والدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ تھیں۔ سیدہ النساء العالمین، البضعۃ النبویہ (جگر گوشہ رسول)، سیدۃ النساء اہلِ جنت، زہرا، بتول، طاہرہ، مطہرہ، راضیہ، مرضیہ اور زاکیہ ان کے مشہور القاب ہیں۔ آپ کا نام فاطمہ اور کنیت اُمِّ محمد ﷺ ہے۔

حضرت فاطمہؓ 20 جمادی الثانی، 5 بعثتِ نبوی کو مکہ مکرمہ میں متولد ہوئیں۔ اس وقت آنحضور ﷺ کی عمر مبارک 45 برس کی تھی۔ انھوں نے حضرت خدیجہؓ اور رسالت مآب کی آغوش میں بڑے لاڈ پیار سے پرورش پائی۔ یکم محرم 7 بعثت کو رسول اللہ، حضرت خدیجہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ، حضرت فاطمہ بنت اسد اور بنی ہاشم کے متعدد افراد شعبِ ابی طالب میں پناہ گزیں ہوئے۔ تین سال کی کم سن فاطمہ شعبِ ابی طالب کی سختیوں میں محترم والدین اور بزرگانِ خاندان کے ساتھ، جہاد کے کٹھن مرحلے میں شریک رہیں۔ محاصرہ ختم ہوا تو رمضان 10 بعثت میں فاطمہؓ سایہ مادری سے محروم ہو گئیں۔ گھر کے بزرگ سردار ابوطالب کا سایہ شفقت بھی اٹھ گیا۔ حضرت علیؑ اور ان کی والدہ دونوں مرحومین کی جگہ آئے۔ فاطمہ بنت اسد نے اب سے چالیس سال قبل رسولِ کریم ﷺ کو پالا تھا۔ اب فاطمہؓ کی نگہداشت میں مصروف تھیں۔ سات برس کی عمر میں فاطمہؓ گھر کے کام کاج اور والد کی خدمت انجام دینے لگیں۔

آنحضور ﷺ نے سیدہ فاطمہؓ کی تربیت اور نگہداشت کے خیال سے حضرت سودہؓ سے نکاح کر لیا۔ حضور ﷺ کی حیات مبارکہ یک سر تبلیغ حق کے لیے وقف تھی، لیکن جب بھی آپ ﷺ کو فرصت ملتی، آپ ﷺ فاطمہؓ کے پاس تشریف لاتے۔ انھیں دلاسا دیتے اور قیمتی نصائح سے نوازتے۔

تنہائی کے اوقات میں حضرت حفصہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت اسماؓ بنت ابوبکر اور فاطمہ بنت زبیرؓ وغیرہ سیدہ فاطمہؓ کے پاس وقتاً فوقتاً آ بیٹھتیں اور ان کی غم گساری اور دل جوئی کرتیں۔ تبلیغِ حق کے جرم میں مشرکین رسول کریم ﷺ کو بڑی تکلیفیں پہنچاتے۔ کبھی سرِ اقدس پر خاک ڈالتے۔ کبھی راستے میں کانٹے بچھاتے۔ جب حضور ﷺ گھر تشریف لاتے تو حضرت فاطمہؓ انھیں تسلی دیا کرتیں۔ کبھی وہ خود بھی اپنے جلیل القدر والد کی مصیبتوں پر اشک بار ہو جاتیں۔ اس وقت حضور ﷺ انھیں تسلی دیتے اور فرماتے: "میری بچی گھبراؤ نہیں، خدا تمھارے باپ کو تنہا نہ چھوڑے گا۔"

کتب صحاح و تاریخ میں ہے کہ ایک دن رسول کریم ﷺ مسجد الحرام میں مصروف عبادت تھے۔ ابوجہل کچھ لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کا تمسخر کرنے لگا اور کسی سے کہا کہ فلاں محلے میں اونٹ ذبح ہو رہے ہیں، کوئی وہاں سے اوجھڑی اٹھا لائے۔ ایک شخص گیا اور وہ غلاظت سے بھری ہوئی اوجھڑی اٹھا لایا۔ جب آنحضور ﷺ سجدہ ریز ہوئے تو اس بدبخت نے آپ ﷺ کی پشت مبارک پر وہ چیز رکھ دی۔ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو خبر ہوئی۔ بے چین ہو گئیں۔ دوڑتے ہوئے کعبہ پہنچیں اور حضور ﷺ کی گردن مبارک پر سے اوجھڑی ہٹائی۔ کفار ارد گرد کھڑے ہنستے اور تالیاں بجاتے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے ایک نگاہ خشم آلود ان پر ڈالی اور فرمایا: "شریرو، احکم الحاکمین تمھیں ان شرارتوں کی سزا ضرور دے گا۔" خدا کی قدرت چند سال بعد یہ سب غزوۂ بدر میں ذلت کے ساتھ مارے گئے۔

جب کفارِ مکہ کی شرانگیزی اور ایذا رسانی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو بارگاہِ الٰہی سے رسول کریم ﷺ کو ہجرت کا حکم ہوا۔ 13- بعد بعثت میں حضور ﷺ ایک رات

حضرت علیؓ کو اپنے بستر مبارک پر سُلا کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی معیت میں عازم مدینہ ہوئے۔ مدینہ پہنچنے کے کچھ دن بعد حضور ﷺ نے اپنے اہل وعیال کو لانے کے لیے اپنے غلام حضرت ابورافعؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کو مکہ بھیجا۔ ان دونوں حضرات کے ہم راہ حضرت فاطمہؓ، حضرت اُمّ کلثومؓ، حضرت سودہؓ بنت زمعہ، حضرت اُمّ ایمنؓ اور اسامہ بن زیدؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ مدینہ پہنچ کر حضرت سودہؓ اور بنات طاہراتؓ رسول کریم ﷺ کے پاس اپنے نئے گھر میں قیام پزیر ہوئیں۔

آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کی رخصتی سے چار مہینے بعد اوائل محرم 2 ہجری میں حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے کیا۔ سلیمان بن ابراہیم نے اپنی تصنیف ''سید مکی مدنی العربی ﷺ'' میں ان کی شادی کی تفصیل بڑے دل چسپ پیرائے میں بیان کی۔ لکھتے ہیں: ''ایک روز حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ نے دیکھا کہ حضرت علیؓ ایک کنوئیں سے پانی نکالنے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے آپ کو اس کام سے روک کر ان کی ایک دیرینہ خواہش یاد دلائی، جب آپ حضرت فاطمہؓ سے شادی کرنے کے آرزومند تھے۔ حضرت علیؓ کو غصہ آ گیا۔ آپ نے فرمایا: ''آپ لوگ جانتے ہیں، میں کس قدر غریب ہوں۔ مجھے وہ خواب مت یاد کرائیے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔''

دونوں حضرات نے یقین دلایا کہ ان کی خدمات اس معاملے میں حاضر ہیں۔ حضرت علیؓ نے ہمت سے کام لے کر تلوار، زرہ بکتر اور گھوڑے کی زین اپنے ساتھ لے لی کہ یہی آپ کا کل سرمایہ تھا۔ پھر آنحضور ﷺ کے در پر جا کر دستک دی۔

محمد ﷺ نے علیؓ کو ان الفاظ کے ساتھ خوش آمدید کہا: ''میرے روبرو اس وقت ایک ایسا شخص کھڑا ہے جو مجھے ہر ایک سے زیادہ عزیز ہے۔'' علیؓ سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ رسول اللہ نے حکم دیا ''کہو، کیا کہنا چاہتے ہو؟'' حضرت علیؓ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آنحضرت ﷺ سے یوں ہم کلام ہوئے: ''اے پیغمبر خدا ﷺ، میں ایک یتیم لڑکا تھا کہ آپ ﷺ نے میری پرورش کی اور مجھے شفقت پدری سے نوازا۔ اب میں عمر کے اس حصے میں ہوں جب ہر شخص کا اپنا گھر ہونا چاہیے۔ ایک بار اور مجھے حضور ﷺ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں آپ ﷺ کے پاس درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں کہ از راہ لطف وکرم مجھے اپنی دختر فاطمہؓ نکاح میں دے دیجیے۔''

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا جہیز لائے ہو؟''

حضرت علیؓ نے جواب دیا: ''آپ ﷺ تو میری غربت سے واقف ہیں۔ پھر بھی جو کچھ میرے پاس تھا، لے آیا ہوں'' پھر تلوار، زرہ بکتر اور زین حضور ﷺ کے قدموں میں رکھ دیے۔

''تمہاری تلوار تو تمہارے دین کی امانت ہے، اس لیے یہ تو مجھے قبول نہیں۔ لیکن چوں کہ تمہارا سیدھا ہاتھ تمہارے سینے کی حفاظت زرہ بکتر سے زیادہ بہتر طریقے سے کرسکتا ہے، اس لیے جاؤ اپنی زِرہ بیچ کر اس کی قیمت میرے پاس لے آؤ۔ یہی میری بیٹی کا جہیز تصوّر رہوگا۔''

حضرت علیؓ کو یوں لگا جیسے ان کی زندگی کی ساری آرزوئیں پوری ہوگئی ہیں۔ ا[illegible] خریدار تلاش کیا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے زرہ کی اچھی قیمت لگائی اور اسے خرید کر د[illegible] واپس علیؓ کو اس اصرار کے ساتھ لوٹا دی کہ وہ اسے ان کی طرف سے شادی کا تحفہ سمجھ[illegible] قبول کرلیں۔

جلد ہی شادی کے انتظامات مکمل ہو گئے تھے۔ آنحضور ﷺ نے اس منظوری دیتے ہوئے علیؓ سے فرمایا: ''بے شک اللہ نے تجھے میری بیٹی، اس دنیا[illegible] میری طرف سے دینے سے پہلے ہی جنت میں دے دی تھی۔''

مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد حضرت بلالؓ کے بلاوے پر جمع ہوگئی تھی، تا ک[illegible] ہادی ﷺ کا خطبہ سن سکیں، جو اپنی بیٹی کی علیؓ سے شادی کے موقع پر وقت نکاح[illegible] کو آگاہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ بلالؓ کے ذمے یہ اہم کام لگایا گیا تھا[illegible] گرہستی کے لیے جن سادہ سی اور بہت ضروری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ[illegible] آئیں۔ جہیز کی رقم میں سے نصف رقم تو ایک چٹائی، کھجور کے درخت کے ریشوں[illegible] تیار کردہ تکیہ، پانی کے لیے مشک اور چند مٹی کے برتن خریدنے پر صرف ہوئی[illegible] نصف رقم سے مکھن، کھجوریں اور آٹا خریدا گیا جو بڑی کفایت شعاری کے ساتھ[illegible] کے کھانے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔''

ایک پیالہ اور ایک چکی بھی بعض مورخین نے حضرت فاطمہؓ کے جہیز میں[illegible] بتائی ہے۔ تمام عمر ان کے گھریلو سامان میں صرف یہی چیزیں زیر استعمال تھیں۔

حضرت علیؓ اب تک آنحضور ﷺ ہی کے پاس رہتے تھے۔ شادی[illegible] ضرورت ہوئی کہ الگ گھر لیں۔ حارثہؓ بن نعمان انصاری کے متعدد مکانات تھے، ان میں سے وہ کئی آنحضرت ﷺ کو نذر کر چکے تھے۔ حضرت فاطمہؓ نے آنحضور ﷺ سے کہا کہ انھی سے کوئی مکان دلوا دیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کہاں تک۔ اب ان سے کہتے شرم آتی ہے۔ حارثہؓ نے سنا تو دوڑے آئے کہ حضور ﷺ، میں اور میرے پاس جو کچھ ہے، سب آپ کا ہے۔ خدا کی قسم، میرا جو مکان آپ ﷺ لے لیتے ہیں، مجھے اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ وہ میرے پاس رہ جائے۔ غرض انھوں نے اپنا ایک مکان خالی کر دیا۔

حضرت فاطمہؓ جب نئے گھر میں جا بسیں تو آنحضرت ﷺ ان کے[illegible] تشریف لے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اذن مانگا۔ پھر اندر آئے۔ ایک برتن[illegible] پانی منگوایا۔ دونوں ہاتھ اس میں ڈالے۔ اور حضرت علیؓ کے سینے اور بازوؤں پر چھڑکا۔ پھر حضرت فاطمہؓ کو بلایا۔ وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں۔ ان پر بھی پانی[illegible] اور فرمایا کہ میں نے اپنے خاندان میں سب سے بہتر شخص سے تمھارا نکاح کیا ہے۔

حضرت فاطمہؓ کی عمر 29 سال کی تھی کہ جناب رسول کریم ﷺ نے[illegible] فرمائی۔ حضرت فاطمہؓ آنحضور ﷺ کی محبوب ترین اولاد تھیں اور اب صرف[illegible] باقی رہ گئی تھیں، اس لیے انھیں صدمہ بھی اوروں سے زیادہ ہوا۔ وفات سے پہلے[illegible] دن آنحضور ﷺ نے انھیں بلا بھیجا۔ تشریف لائیں تو ان سے کان میں کچھ[illegible]

کیں وہ رونے لگیں۔ پھر بلا کر کچھ کان میں کہا تو ہنس پڑیں۔ حضرت عائشہؓ نے دریافت کیا تو کہا، پہلی دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اسی مرض میں انتقال کروں گا۔ ب میں رونے لگی تو فرمایا کہ میرے خاندان میں سب سے پہلے تم ہی مجھ سے آ کر ملو گی، تو ہنسنے لگی۔''

فات سے پہلے جب بار بار حضور ﷺ پر غشی طاری ہوئی تو حضرت فاطمہؓ یہ دیکھ کر بولیں ''ہائے میرے باپ کی بے چینی۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''تمہارا باپ آج کے بعد بے چین نہ ہوگا۔'' حضور ﷺ کا انتقال ہوا تو حضرت فاطمہؓ پر ایک غم ٹوٹ پڑی۔ اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ جب تک زندہ رہیں، کبھی تبسم نہیں بخاری میں لکھا ہے کہ جب صحابہؓ نعش مبارک کو دفن کر کے واپس آئے تو حضرت نے حضرت انسؓ سے پوچھا کہ کیا تمھیں رسول اللہ پر مٹی ڈالتے اچھا معلوم ہوا؟''

آنحضرت ﷺ کے انتقال کے بعد میراث کا مسئلہ پیش ہوا۔ حضرت عباسؓ، علیؓ، ازواج مطہرات، یہ تمام حضرات میراث کے مدعی تھے۔ حضرت فاطمہؓ دعویٰ موجود تھا۔ چوں کہ آنحضور ﷺ کی جائداد خالصہ جائداد تھی، اور اس نون وراثت جاری نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں رسول کے اعزہ کو اپنے اعزہ سے زیادہ محبوب رکھتا ہوں، لیکن دقت یہ ہے کہ خود رت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ انبیا جو متروکہ چھوڑتے ہیں، وہ پورا کا پورا ہوتا ہے، اور اس میں وراثت جاری نہیں ہوتی، اس بنا پر میں اس جائداد کو کیوں یم کر سکتا ہوں۔ البتہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں اہل بیت جس حد تک اس فائدہ اٹھاتے تھے، اب بھی اٹھا سکتے ہیں۔ صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ اس گفتگو سے رت فاطمہؓ کو سخت قلق ہوا اور وہ حضرت ابوبکرؓ سے اس قدر ناراض ہوئیں کہ آخر تک ان سے گفتگو نہیں کی۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت فاطمہؓ بعد کو حضرت رؓ سے راضی ہوگئی تھیں۔

آنحضرت ﷺ کے انتقال کو چھے ماہ گزرے تھے کہ رمضان 11 ہجری میں رت فاطمہؓ نے وفات پائی، اور آنحضرت ﷺ کی یہ پیش گوئی کہ میرے خاندان سب سے پہلے تم ہی مجھ سے آ کر ملوگی، پوری ہوئی۔ یہ منگل کا دن اور رمضان کی ری تاریخ تھی۔ اس وقت ان کی عمر 29 سال 6 ماہ کی تھی۔

حضرت فاطمہؓ کی تجہیز و تکفین میں خاص جدت کی گئی۔ عورتوں کے جنازے پر ج کل جو پردہ لگانے کا دستور ہے، اس کی ابتدا انھی سے ہوئی۔ اس سے پیش تر ورت اور مرد سب کا جنازہ کھلا ہوا جاتا تھا۔ چوں کہ حضرت فاطمہؓ کے مزاج میں انتہائی شرم و حیا تھی، اس لیے انھوں نے حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے کہا کہ کھلے جنازے میں عورتوں کی بے پردگی ہوتی ہے، جسے میں ناپسند کرتی ہوں۔ اسماءؓ نے کہا کہ جگر گوشہ رسول! میں نے حبش میں ایک طریقہ دیکھا ہے۔ آپ کہیں تو اسے پیش کروں۔ یہ کہ کر کھجور کی چند شاخیں منگوائیں اور ان پر کپڑا تانا جس سے پردے کی صورت پیدا ہوگئی۔ حضرت فاطمہؓ بے حد مسرور ہوئیں کہ یہ بہترین طریقہ ہے۔

حضرت فاطمہؓ کے بعد حضرت زینبؓ کا جنازہ بھی اسی طریقے سے اٹھایا گیا۔

حضرت فاطمہؓ کا حلیہ جناب رسول کریم ﷺ سے ملتا جلتا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ فاطمہؓ کی گفتگو، لب ولہجہ اور نشست و برخاست کا طریقہ بالکل آنحضرت ﷺ کا طریقہ تھا، اور رفتار بھی بالکل آنحضرت ﷺ کی رفتار تھی۔

حضرت فاطمہؓ سے کتب حدیث میں اٹھارہ روایتیں منقول ہیں، جنھیں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ نے ان سے روایت کیا ہے۔ حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت امِ کلثوم، حضرت سلمیٰؓ، ام رافعؓ اور حضرت انسؓ بن مالک ان سے احادیث روایت کرتے ہیں۔

ان کے تفقہ پر واقعات ذیل شاہد ہیں:

حضرت علیؓ کسی سفر میں گئے تھے۔ واپس آئے تو حضرت فاطمہؓ نے قربانی کا گوشت پیش کیا۔ انھیں عذر رہا۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا، اس کے کھانے میں کچھ ہرج نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس کی اجازت دے دی ہے۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ ان کے ہاں گوشت تناول فرما رہے تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ آنحضور ﷺ اسی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔ چوں کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس لیے حضرت فاطمہؓ نے دامن پکڑا کہ وضو کر لیجیے۔ ارشاد ہوا، بیٹی۔ وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام اچھے کھانے آگ ہی پر تو پکتے ہیں۔

حضرت فاطمہؓ آنحضور ﷺ کی محبوب ترین اولاد تھیں۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: ''فاطمہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے۔ جو اسے ناراض کرے گا، مجھے ناراض کرے گا۔''

ابوجہل کی لڑکی کو حضرت علیؓ نے نکاح کا پیغام بھیجا تھا۔ بارگاہ نبوت میں اطلاع ہوئی تو حضور ﷺ منبر پر آئے اور حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا: ''آلِ ہشام، علی بن ابی طالب سے اپنی بیٹی کا عقد کرنا چاہتی ہے، اور مجھ سے اجازت مانگتی ہے، لیکن میں اجازت نہ دوں گا، اور کبھی نہ دوں گا۔ البتہ ابن ابی طالب میری بیٹی کو طلاق دے کر ان کی لڑکی سے نکاح کر سکتے ہیں۔ فاطمہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے، جس نے اسے اذیّت دی، مجھے اذیّت دی۔''

(اس کے بعد ابوالعاص بن ربیع کا، جو آپ ﷺ کے داماد تھے، ذکر فرمایا کہ) اس نے مجھ سے جو بات کہی، اسے سچ کر کے دکھلا دیا، اور جو وعدہ کیا، وفا کیا، اور میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرنے نہیں کھڑا ہوا، لیکن خدا کی قسم، ایک پیغمبر اور ایک دشمنِ خدا کی بیٹیاں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔''

اس کا یہ اثر ہوا کہ سیدہ فاطمہؓ کی حیات تک حضرت علیؓ نے دوسری شادی نہیں کی۔

حضرت فاطمہؓ کا شمار آنحضرت ﷺ نے ان چند مقدس خواتین میں فرمایا ہے، جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک برگزیدہ قرار پائی ہیں، جیسا کہ حدیث (ترمذی۔ کتاب المناقب) میں آیا ہے: ''تمہاری پیروی کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں

مریم، خدیجہ، فاطمہ اور آسیہ کافی ہیں۔"

زُہد وتقویٰ کی یہ کیفیت تھی کہ گو فاطمہؓ آنحضور ﷺ کی محبوب ترین اولاد تھیں، اور اسلام میں رہبانیت کا قلع قمع بھی کر دیا گیا تھا اور فتوحات کی کثرت مدینے میں مال وزر کے خزانے لٹا رہی تھی، لیکن جگر گوشہ رسول ﷺ کی سادہ زندگی کا یہ عالم تھا:

سیدہ فاطمہؓ کی خانگی زندگی یہ تھی کہ چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ مشک میں پانی بھر بھر کر لانے سے سینے پر گھٹے پڑ گئے تھے۔ گھر میں جھاڑو دیتے دیتے کپڑے چیکٹ ہو جاتے تھے۔ چولھے کے پاس بیٹھتے بیٹھتے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہو جاتے تھے، لیکن بااین ہمہ جب انھوں نے آنحضرت ﷺ سے ایک بار گھر کے کاروبار کے لیے ایک لونڈی مانگی اور ہاتھ کے چھالے دکھائے تو ارشاد ہوا کہ جانِ پدر، بدر کے یتیم تم سے پہلے اس کے مستحق ہیں۔

ایک دفعہ آپ ﷺ حضرت فاطمہؓ کے پاس تشریف لائے۔ دیکھا کہ انھوں نے ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹا اوڑھا ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں، اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ ہو جاتا ہے۔

صرف یہی نہیں کہ آنحضور ﷺ خود انھیں آرائش یا زیب وزینت کی کوئی چیز نہیں دیتے تھے، بلکہ اس قسم کی جو چیزیں انھیں دوسرے ذرائع سے ملتی تھیں، انھیں بھی ناپسند فرماتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے انھیں سونے کا ہار دیا۔ حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا: "کیوں فاطمہ! کیا لوگوں سے کہلوانا چاہتی ہو کہ رسول اللہ کی لڑکی آگ کا ہار پہنتی ہے۔" حضرت فاطمہؓ نے اسے فوراً بیچ کر اس کی قیمت سے ایک غلام خرید لیا۔

ایک دفعہ حضور ﷺ کسی غزوے سے تشریف لائے۔ حضرت فاطمہؓ نے بطور خیر مقدم، گھر کے دروازے پر پردے لگائے اور اپنے صاحب زادوں حسنؓ اور حسینؓ کو چاندی کے کنگن پہنائے۔ آپ ﷺ حسب معمول حضرت فاطمہؓ کے ہاں آئے تو اس دنیوی ساز وسامان کو دیکھ کر واپس آ گئے۔ حضرت فاطمہؓ کو آپ ﷺ کی ناپسندیدگی کا حال معلوم ہوا تو پردے ہٹا دیئے اور بچوں کے ہاتھ سے کنگن نکال ڈالے۔ بچے آپ ﷺ کی خدمت میں روتے ہوئے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ میرے اہل بیت ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مکروہات سے آلودہ ہوں۔ اس کے بدلے فاطمہؓ کے لیے ایک عصیب کا ہار اور ہاتھی دانت کے کنگن خرید کر لا دو۔"

صدق وراستی میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: "میں نے فاطمہؓ سے زیادہ کسی کو صاف گو نہیں دیکھا۔ البتہ ان کے والد ﷺ اس سے مستثنیٰ ہیں۔" حد درجہ حیادار تھیں۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نے انھیں طلب فرمایا تو وہ شرم سے لڑکھڑاتی ہوئی آئیں۔ اپنے جنازے پر پردہ کرنے کی جو وصیت کی تھی، وہ بھی اس بنا پر تھی۔

آنحضور ﷺ سے نہایت محبت کرتی تھیں۔ جب وہ کم سن تھیں، اور آپ ﷺ مکہ میں مقیم تھے تو عتبہ بن ابی معیط نے نماز پڑھنے کی حالت میں ایک مرتبہ آپ ﷺ کی گردن پر اونٹ کی اوجھڑی لا کر ڈال دی۔ قریش خوشی کے مارے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ کسی نے جا کر حضرت فاطمہؓ کو خبر کی۔ وہ اگرچہ اس وقت صرف پانچ چھ برس کی تھیں، لیکن جوشِ محبت سے دوڑی آئیں، اور اوجھڑی ہٹا کر عتبہ کو بُرا بھلا کہا اور بددُعائیں دیں۔

آنحضرت ﷺ بھی ان سے نہایت محبت کرتے تھے۔ معمول تھا کہ جب کبھی سفر پر جاتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہؓ کے پاس جاتے اور سفر سے واپس تشریف لاتے تو جو شخص سب سے پہلے باریابِ خدمت ہوتا، وہ بھی حضرت فاطمہؓ ہی ہوتیں۔ حضرت فاطمہؓ جب آپ ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے۔ ان کی پیشانی چومتے اور اپنی نشست سے ہٹ کر اپنی جگہ پر بٹھاتے۔

آنحضور ﷺ ہمیشہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کے تعلقات میں خوش گواری پیدا کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ چنانچہ جب حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ میں کبھی خانگی معاملات کے متعلق رنجش ہو جاتی تھی، تو حضور ﷺ دونوں میں صلح کرا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا حضور ﷺ گھر میں تشریف لے گئے اور صلح صفائی کرا دی۔ گھر سے مسرور نکلے۔ لوگوں نے پوچھا، آپ ﷺ گھر میں گئے تھے تو اور حالت تھی۔ اب آپ اس قدر خوش کیوں ہیں؟ فرمایا، میں نے اُن دو شخصوں میں مصالحت کرا دی ہے جو مجھے محبوب تر ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے ان پر کچھ سختی کی۔ وہ آنحضور ﷺ کے پاس شکایت لے کر چلیں۔ پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی آئے۔ حضرت فاطمہؓ نے شکایت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا، بیٹی تمھیں خود سمجھنا چاہیے کہ کون شوہر اپنی بی بی کے پاس خاموش چلا آتا ہے۔ حضرت علیؓ پر اس کا یہ اثر ہوا کہ انھوں نے حضرت فاطمہؓ سے کہا "اب میں تمھارے خلافِ مزاج کوئی بات نہ کروں گا۔"

حضرت فاطمہؓ کے پانچ اولادیں ہوئیں: حسنؓ، حسینؓ، محسنؓ، اُمِ کلثومؓ اور زینبؓ۔ محسنؓ نے بچپن ہی میں انتقال کیا۔ باقی چاروں تاریخ اسلام میں اہم واقعات کے لحاظ سے مشہور ہیں۔ آنحضور ﷺ کو ان سب سے نہایت محبت تھی، اور حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ بھی انھیں بہت محبوب رکھتے تھے۔ آنحضور ﷺ کی صاحب زادیوں میں صرف حضرت فاطمہؓ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان سے آپ ﷺ کی نسل باقی رہی۔

آنحضور ﷺ کی سوتیلی اولاد

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی سوتیلی اولاد کا ذکر بھی اہل بیت کے ساتھ کیا جائے۔ کاشانۂ نبوت میں پروردہ ازواجِ مطہرات کی سابقہ اولاد تاریخ وسیر میں "ربائب النبی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ربائب جمع ہے ربیبہ کی، جس کے معنی ہیں سوتیلا لڑکا یا سوتیلا باپ۔ ربیب کی تانیث ہے ربیبہ، جس مطلب ہے: سوتیلی لڑکی یا سوتیلی ماں۔

ازواج مطہرات میں سے حضرت عائشہؓ، حضرت جویریہؓ اور حضرت ماریہؓ

چھ کر، باقی سب یا تو مطلقہ تھیں، یا بیوہ، جن میں سے حضرت خدیجہؓ، حضرت ام سلمہؓ، دت سودہؓ اور ام حبیبہؓ آنحضور ﷺ کی زوجیت میں آنے سے پہلے صاحب ا تھیں۔ ان بچوں کی کفالت اور تربیت کا ذمہ وقت نکاح آنحضور ﷺ نے قبول ز لیا تھا۔ ان بچوں کی تعداد دس ہے۔ تفصیل یہ ہے:

رت خدیجہؓ کے تین بیٹے اور ایک بیٹی:

- حضرت ہند بن نباش بن ابی زرارہ تمیمی
- حضرت ہالہ بن نباش
- حضرت طاہر بن نباش
- ر بنت عتیق

رت ام سلمہؓ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں یعنی:

- حضرت سلمہ بن عبداللہ بن عبدالاسد (یہ ابوسلمہ کی کنیت سے معروف ہیں)
- حضرت عمر بن ابی سلمہ
- حضرت ورہ بنت ابی سلمہ
- حضرت زینب بنت ابی سلمہ

حضرت سودہؓ کا بیٹا حضرت عبدالرحمٰن بن سکران بن عمرو

حضرت ام حبیبہؓ کی بیٹی حضرت حبیبہ بنت عبداللہ بن جحش

ازواج مطہرات کی مذکورہ بالا اولاد کی مکمل نگہداشت و پرداخت، تعلیم و تربیت ور کفالت و ذمہ داری کا بار آنحضور ﷺ ہی نے برداشت کیا تھا، اور اس حسن وخوبی کے ساتھ پرورش کی گئی تھی کہ ان میں سے ہر ایک صحابیت کے جلیل القدر منصب پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کا داعی و مبلغ، میدان کارزار کا مجاہد، اسلامی تعلیمات اور ارشادات نبوی ﷺ کا ناشر، مزاج نبوت کا رمز شناس اور زبان و بیان نبوی کا پیروکار نظر آتا ہے۔ یہاں ان کے حالات زندگی فرداً فرداً اختصار کے ساتھ پیش کیے جا رہے ہیں:

ہند بن نباش

حضرت خدیجہؓ کی پہلی اولاد ہیں جو بعثتِ نبوی سے تقریباً پچیس سال قبل نباش بن زرارہ کے صلب سے پیدا ہوئے۔ جب حضرت خدیجہؓ حضور ﷺ کے نکاح میں داخل ہوئیں تو ہند بھی اپنی والدہ کے ساتھ حضور ﷺ کی کفالت میں آ گئے اور آپ ﷺ ہی کے زیر سایہ تربیت پانے لگے، جس کا اثر ان کی زندگی میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ ہند کو آپ ﷺ سے غایت درجہ محبت تھی اور آپ ﷺ بھی شفقت پدری کا بھرپور اظہار فرماتے رہے۔ جب اسلام کا باقاعدہ اعلان ہوا تو حضرت ہند نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی۔ بدر اور اُحد کے غزوات میں حضور ﷺ کے ساتھ شریک تھے۔ حضور ﷺ کے شمائل بیان کرنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ شمائل کا بیان بے حد تعلق و قربت اور رفاقت و ہم نشینی کے بغیر ممکن نہیں اور یہ حضرت ہند کے اوصافِ حمیدہ کا ایک روشن باب ہے۔ ان کے اخیافی بھانجے حضرت حسن بن علیؓ، جو بڑے فخر سے انھیں ''میرے ماموں'' کہا کرتے تھے، ان کے متعلق فرماتے ہیں:

''میں نے اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے، جو شمائل نبی ﷺ کے بیان کرنے میں یدطولیٰ رکھتے تھے، سوال کیا کہ وہ آنحضور ﷺ سے متعلق کچھ بیان فرمائیں۔ تو انھوں نے کہا، اس کے بعد پوری تفصیل بیان کی ہے۔''

حضرت علیؓ سے بھی ان کا خاص تعلق تھا۔ جنگِ جمل میں ان کی حمایت میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کی اولاد میں ہند (ان کا نام بھی باپ کے نام پر ہند ہی تھا) بڑے محدث اور فقیہ گزرے ہیں۔ ان کی روایت کا بڑا حصہ ان کے والد ہند بن نباش ہی سے مروی ہے، اور وہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ ان کا انتقال بصرہ میں ہوا۔ جنازے میں لوگوں کی زبان پر آہ و بکا کے ساتھ یہ جاری تھا کہ آج ربیبِ رسول ﷺ کا بیٹا دنیا سے رخصت ہو گیا۔ آہ ہند بن ہند کا انتقال ہو گیا۔

ہالہ بن نباش

حضرت خدیجہؓ کی دوسری اولاد۔ یہ بھی نباش بن زرارہ کے صلب ہی سے پیدا ہوئے جو انھی کے نام سے کنیت کرتے ہوئے تاریخ و سیر میں ابو ہالہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ بڑے بھائی ہند کی طرح ان کی بھی پرورش آنحضور ﷺ ہی کے زیر سایہ ہوئی۔ ان کی شخصیت میں ان کی والدہ حضرت خدیجہؓ کی بہت سی مشابہتیں اور خصلتیں پائی جاتی تھیں، جس کی وجہ سے آنحضور ﷺ ہالہ کو زیادہ چاہتے تھے۔ صاحب استیعاب نے امام طبرانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ آرام فرما رہے تھے کہ حضرت ہالہ در دولت پر حاضر ہوئے۔ آہٹ پا کر آنحضور ﷺ بیدار ہو گئے اور فرطِ محبت سے حضرت ہالہ کو سینے سے لگا لیا اور فرمانے لگے، ہالہ آ گئے، ہالہ آ گئے۔

طاہر بن ابی ہالہ

علامہ ابن کثیر نے ''اسد الغابہ'' میں ابن زرارہ کے صلب سے صرف دو لڑکوں کا ذکر کیا ہے، یعنی ہند اور ہالہ، لیکن علامہ ابن عبدالبر طاہر بن ابی ہالہ کو بھی حضرت خدیجہؓ کی اولاد بتاتے ہیں۔ اس کی تائید حضرت قتادہ کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت طاہر بن ابی ہالہ کو بھی آغوشِ نبوت میں تربیت پانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ آنحضور ﷺ کے مقرب و مقلد تھے۔ فتنہ ارتداد کے موقع پر مرتدین کی سرکوبی کے لیے جن پانچ لوگوں کو روانہ کیا تھا، ان میں طاہر بن ابی ہالہ بھی شامل تھے۔ انھوں نے نہایت دلیری اور جرأت کے ساتھ مرتدین کا مقابلہ کیا اور فتح و کامرانی سے سرفراز ہوئے۔

ہند بنت عتیق

آنحضور ﷺ کے عقد میں داخل ہونے سے قبل حضرت خدیجہؓ کی ایک لڑکی جو ان کے دوسرے شوہر عتیق بن عائذ مخزومی کے صلب سے تھیں اور آنحضور ﷺ سے نکاح کے وقت یہ چاروں بچے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ''سیرت النبی ﷺ'' میں ہند بنت عتیق کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت خدیجہؓ ''اُمّ ہند'' کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ سید ظہورالحسن ''ازواج النبی ﷺ'' میں لکھتے ہیں: ''ہند بنت عتیق نے ایک عرصے تک آغوشِ رسالت میں تربیت حاصل کی اور

نبوت کے پہلے ہی سال حلقہ بگوش اسلام ہو کر صحابیات کے رجسٹر میں اپنا نام لکھوالیا۔''

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ، جن کا اصل نام ہند تھا اور قریش کے خاندان مخزوم سے تھیں، ان ازواج مطہرات میں سے ہیں، جو اپنے چار بچوں کے ساتھ آنحضور ﷺ کے نکاح میں داخل ہوئیں۔ ان کی پہلی شادی حضرت عبدالمطلب کی دوسری صاحب زادی برہ کے فرزند عبداللہ بن عبدالاسد سے ہوئی تھی جو ان کے چچازاد بھائی تھے اور آغاز اسلام ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ان کے ساتھ ام سلمہ بھی مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ اس طرح دونوں کو سابقون الاولون میں شمار ہونے کا شرف حاصل ہوا، اور آنحضور ﷺ کے اذن سے حبشہ کی طرف پہلی ہجرت کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ پھر بعد میں مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی ابوسلمہؓ نے غزوۂ اُحد میں گہرا زخم لگنے کی وجہ سے مدینہ میں انتقال فرمایا۔

انھی کے صلب سے اُمّ سلمہؓ کی چار اولادیں پیدا ہوئیں۔ ان کے انتقال کے بعد جب اُمّ سلمہؓ آنحضور ﷺ کے عقد میں آئیں تو یہ چاروں بچے بھی آنحضور ﷺ کی کفالت میں آگئے۔ شرائط نکاح میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان چاروں کی کفالت آنحضور ﷺ کی ذمہ داری ہوگی۔

سلمہ بن عبداللہ

حضرت سلمہؓ پہلی ہجرت کے دوران میں حبشہ میں حضرت عبداللہ بن عبدالاسد کے صلب سے پیدا ہوئے۔ انھی سے کنیت کرتے ہوئے ماں اور باپ دونوں ابوسلمہ اور اُمّ سلمہ کے نام سے تاریخ میں یاد کیے جاتے ہیں۔

حضرت اُمّ سلمہؓ کی ہجرتِ مدینہ کا واقعہ نہایت عبرت انگیز ہے، جس کی تفصیل حضرت ام سلمہؓ کے حالات میں بیان کی گئی ہے۔ حضرت ام سلمہؓ اپنے شوہر کے ہم راہ ہجرت کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے بچے بھی ساتھ تھے، لیکن حضرت ام سلمہؓ کے قبیلے نے مزاحمت کی تھی، اس لیے حضرت ابوسلمہؓ بیوی بچوں کو چھوڑ کر اکیلے مدینہ چلے گئے تھے۔ اور سلمہؓ کو ابوسلمہؓ کے خاندان والے حضرت اُمّ سلمہؓ کے پاس سے چھین لے گئے تھے۔ بعد میں بچے کے فراق میں حضرت ام سلمہؓ کی آہ و بکا سن کر بچہ انھیں واپس کر دیا گیا تھا۔ اس طرح وہ اپنے بچوں کے ساتھ مدینہ میں داخل ہوئیں۔

حضرت ابوسلمہؓ کے انتقال کے بعد جب حضرت ام سلمہؓ عقد نبوی ﷺ میں داخل ہوئیں تو حضور ﷺ نے ان چاروں بچوں کی پرورش فرمائی تھی۔ آپ ﷺ نے حضرت سلمہؓ کی شادی اپنی چچازاد بہن امامہ بنت حمزہؓ (سیدالشہدا) سے فرمائی۔ ابن اسحاق کی روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے ان کا نکاح امامہ سے اسی وقت کر دیا تھا جب دونوں چھوٹے تھے۔ حضرت سلمہؓ اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کی خلافت تک زندہ رہے۔ گویا 4 ہجری سے وفات نبوی ﷺ تک حضرت سلمہؓ کو آنحضور ﷺ سے استفادہ کرنے اور آپ ﷺ کی نگرانی میں پروان چڑھنے کا بھرپور موقع ملا۔

عمر بن ابوسلمہؓ

ان کی کنیت ابوحفص تھی۔ 2 ہجری میں حبشہ میں پیدا ہوئے۔ غزوۂ خندق کے موقع پر عمر بن ابوسلمہؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ حضرت حسانؓ کے گھر میں تھے۔ حضرت عمر بن ابوسلمہؓ کا حضرت علیؓ سے خاص تعلق تھا۔ حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں بحرین کا گورنر مامور کر دیا تھا۔ ''نہج البلاغہ'' میں ان کے نام حضرت علیؓ کا ایک مکتوب ہے جس میں ان کی انتظامی قابلیت اور اعلیٰ کارکردگی کا ذکر ملتا ہے۔ انھوں نے مدینہ منورہ میں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں 83 ہجری میں وفات پائی۔

درہ بنت ابوسلمہؓ

عمر میں اپنے دونوں بھائیوں سے چھوٹی تھیں۔ یہ بھی حبشہ ہی میں پیدا ہوئیں، اور والدہ کے ساتھ مدینہ ہجرت کی۔ ان کی پرورش بھی کاشانہ نبوت ہی میں ہوئی تھی۔ آنحضور ﷺ کی تربیت نے علم و حکمت کے اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا تھا۔ ذہانت ذکاوت اور فہم و فراست کا وافر حصہ ملا تھا، جس کی وجہ سے بعض امہات المومنین کو یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ کہیں آنحضور ﷺ انھیں اپنے حرم میں نہ داخل فرمالیں۔ اس گمان میں حضرت اُمّ حبیبہؓ پیش پیش تھیں، آنحضور ﷺ کو اس کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا، وہ میرے اُوپر حرام ہے۔ ''اصابہ'' میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر وہ میری ربیبہ نہ بھی ہوتی، تب بھی میرے اُوپر حرام تھی، اس لیے کہ وہ میری رضاعی بھتیجی ہے۔'' اس کی تشریح یہ ہے کہ حضرت ابوسلمہؓ نے بھی ابولہب کی کنیز ثویبہ کا دودھ پیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ آنحضور ﷺ کے پھوپھی زاد اور رضاعی بھائی ہو جاتے ہیں۔

زینب بنت ابوسلمہؓ

یہ اپنی بہن درہ سے چھوٹی تھیں۔ والدین نے ان کا نام برہ رکھا تھا، مگر آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا اور بدل کر زینب رکھ دیا۔ ان کی پیدائش کے سلسلے میں اختلاف ملتا ہے۔ بعض روایتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی پیدائش حبشہ ہی میں ہوئی تھی۔ بعض نے لکھا ہے کہ جس وقت ان کے والد کا انتقال ہوا، وہ شیر خوار تھیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے ''سیرۃ النبی'' میں لکھا ہے کہ والد کے انتقال کے وقت ماں کے پیٹ میں تھیں۔ وضع حمل کے بعد آنحضور ﷺ سے اُمّ سلمہؓ کا نکاح ہوا۔

آنحضور ﷺ سے ام سلمہؓ کے نکاح کے وقت زینبؓ کی شیر خوارگی مسند احمد اور طبقات ابن سعد کی اس روایت سے بھی مستند ہو جاتی ہے کہ: ''حضرت اُمّ سلمہؓ اپنی غایت درجہ حیا کی وجہ سے، حرم رسالت ﷺ میں داخل ہونے کے بعد بھی، جب آنحضور ﷺ گھر میں داخل ہوتے تو زینب کو گود میں لے کر دودھ پلانے لگتیں اور حضور ﷺ واپس ہو جاتے، جس پر ان کے رضاعی بھائی عمار بن یاسر سخت ناراض ہوئے اور زینب کو عارضی طور پر اپنے گھر لے گئے۔

رسولِ کریم ﷺ کو زینبؓ سے خاص تعلق تھا۔ حیاتِ نبوی ﷺ کی جتنی مدت بھی انھیں نصیب ہوئی، اس میں حضور ﷺ سے استفادہ کرنے اور تربیت پانے کا خاص موقع ملا۔ آنحضور ﷺ جب بھی حضرت ام سلمہؓ کے گھر تشریف

جاتے، وہاں حضرت زینب ضرور موجود ہوتیں۔ اسی صحبت کے فیض نے انھیں فضل و کمال کے اعلیٰ مرتبے پر پہنچا دیا۔ حافظ ابن حجر نے ابو رافع کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مَیں نے جب بھی مدینہ کی کسی فقیہ عورت کا ذکر کیا تو زینب بنت ابی سلمہ کو ضرور یاد کیا۔

ان کی شادی حضرت عبداللہ بن زمعہ بن اسود اسدی سے ہوئی، جن سے چھے لڑکے اور تین لڑکیاں پیدا ہوئیں، جن میں سے دو لڑکے 63 ہجری میں واقعہ حرہ میں شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے دس سال بعد 73 ہجری میں حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا۔

حضرت حبیبہ بنت عبید اللہ

اُن کی والدہ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ حبیبہ کا اصل نام رملہ بنت ابی سفیان تھا۔ آنحضور ﷺ کے عقد میں آنے سے قبل ان کا نکاح عبداللہ بن جحش سے ہوا۔ ان کے ساتھ ہی مسلمان ہوئیں اور حبشہ کو ہجرت کی۔ حبشہ میں جا کر عبیداللہ نے عیسائی مذہب اختیار کیا۔

اپنی زوجہ اُمّ حبیبہ پر بھی عیسائیت اختیار کرنے پر دباؤ ڈالا، لیکن وہ اسلام پر قائم رہیں۔ عبیداللہ نے عیسائی ہو کر بالکل آزادانہ زندگی بسر کرنا شروع کی۔ مے نوشی کی عادت ہوگئی۔ آخر ان کا وہیں انتقال ہوگیا۔

عبیداللہ کے صلب سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام حبیبہ رکھا گیا۔ اسی کنیت سے رملہ بنت ابی سفیان اُمّ حبیبہ سے جانی جانے لگیں۔ حضرت حبیبہؓ کی پیدائش مکہ میں ہوئی اور وہ اپنے والدین کے ہم راہ مکہ سے حبشہ کی طرف بعثت نبوی ﷺ کے چھٹے سال ہجرت کر گئی تھیں۔ وہیں ان کے والد عبیداللہ کی وفات کے بعد جب اُمّ حبیبہؓ حضور ﷺ کے عقد میں آگئیں اور غزوۂ خیبر کے موقع پر اُمّ المؤمنین کی حیثیت میں مدینہ منورہ تشریف لائیں تو ان کی بیٹی حبیبہ بھی ساتھ تھیں۔ ان کی کفالت بھی دیگر ازواج مطہرات کی اولاد کی طرح آپ ﷺ ہی کے ذمہ تھی اور آپ ﷺ نے ان کی پرورش و پرداخت اپنے سایۂ عاطفت ہی میں رکھ کر فرمائی۔ سنِ بلوغ کو پہنچنے کے بعد ان کی شادی عروہ بن مسعود سے ہوئی جو قبیلہ بنو ثقیف کے سردار تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سکران بن عمرو

اُمّ المؤمنین حضرت سودہؓ کی شادی آنحضور ﷺ سے پہلے حضرت سکران بن عمرو سے ہوئی تھی۔ حبشہ سے واپسی کے بعد حضرت سکران کی وفات ہوگئی۔ ان سے ایک لڑکا پیدا ہوا جن کا نام عبدالرحمٰن تھا۔ حافظ افروغ حسن نے اپنی کتاب ''ازواج مطہرات'' میں لکھا ہے: ''عہد فاروقی میں عراق کو طاغوتی قوتوں سے آزاد کرانے کی مہم میں مقام جلولا میں 61 ہجری میں جام شہادت نوش فرمایا۔''

ربائب کے ساتھ آنحضور ﷺ کا حسن سلوک

محسن انسانیت ﷺ نے اپنی ازواج کے ساتھ آنے والی اولاد کی جس طرح کفالت فرمائی اور ان کا احساسِ یتیمی دُور کرنے کے لیے جس شفقت و محبت کا اظہار کیا، وہ حیات طیبہ کا اَن مول حصہ ہے۔ ڈاکٹر سرور عالم ندوی (شعبہ عربی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) نے کتب احادیث کے ذخیروں سے ان مرویات کو اپنے تحقیقی مقالے میں جمع کیا ہے جو ان کی نگہداشت و پرداخت اور تعلیم و تربیت کے ضمن میں موثر ہیں۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''اپنی اولاد کے ساتھ اچھا معاملہ کرو اور انھیں حسن آداب سے آراستہ کرو۔'' ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے اولاد کی تربیت کے سلسلے میں فرمایا: ''جس نے اس دنیا میں دو معصوم بچیوں کی پرورش کی، یہاں تک کہ وہ دونوں سن شعور کو پہنچ جائیں، تو وہ اور مَیں جنت میں داخل ہوں گے۔'' نیز حضرت خالدؓ بن ولید کی مشہور روایت ہے: ''ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم اپنی اولاد کو سپہ گری اور قرآن کی تعلیم دیں۔''

جس ذات عالی نے فرزندان و دختران ملّت کی اصلاح و تربیت کے لیے ایسے گراں قدر ارشادات و احکام صادر فرمائے ہوں، اس نے خود ان نونہالوں کی تعلیم و نگہداشت میں کیا کردار ادا کیا ہوگا، جن کی کفالت خود ان کے دوش مبارک پر رہی ہو۔

آنحضور ﷺ کے مشفقانہ حُسنِ سُلوک سے حضرت خدیجہؓ کی اولاد کو دوسری ازواج مطہرات کی اولاد کے مقابلے میں مستفید ہونے کا موقع نسبتاً کم ملا، کیوں کہ جس وقت یہ بچے حضور ﷺ کی کفالت میں آئے، عمر کی اس منزل میں داخل ہو چکے تھے جو تعلیم و تربیت کے اس خصوصی انداز کو عبور کر چکی تھی، تاہم عُمر اور ذہن و مزاج کی پختگی کے اعتبار سے حضور ﷺ کا معاملہ ان کے ساتھ بھی مربیانہ اور مشفقانہ رہا۔ مثلاً حضرت ہند بن ابی ہالہ کی روایت ہے: ''مَیں نے دیکھا کہ جب نبی کریم ﷺ مروان کے باپ حکم کے پاس سے گزرے (جو آپ ﷺ کا شدید ترین مخالف تھا) تو وہ آپ ﷺ کو نشانہ لگانے اور انگلیوں سے اشارہ کرنے لگا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے اللہ، اس پر لرزہ طاری فرما دے۔ تو وہ اپنی جگہ پر ہی حیرانی کے ساتھ لرزنے اور کپکپانے لگا۔'' یہ روایت ظاہر کرتی ہے کہ حضرت ہند گھر کے علاوہ باہر بھی آپ ﷺ کے ساتھ رہتے اور ساتھ چلتے تھے۔ یہ واقعہ بعثت کے بعد ابتدائی زمانے کا ہے اور اس کی روایت صرف حضرت ہند سے ملتی ہے۔

اسی طرح حضرت عائشہؓ کا ارشاد ہے: ''آپ ﷺ گفتگو فرما رہے تھے کہ اس اثنا میں خدیجہ کے بیٹے ہالہ آئے۔ آپ نے اثنائے گفتگو میں ان کے آنے کی آہٹ سنی تو فرط محبت سے کہنے لگے ''ہالہ آگئے، ہالہ آگئے۔'' اس سے جہاں آپ ﷺ کی محبّت ظاہر ہوتی ہے، وہیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اس کے ذریعے تعلقات میں پختگی اور مضبوطی پیدا ہو۔ حضرت طاہر بن ابی ہالہ کو تو ابتدائی عمر ہی میں مرتدین کی سرکوبی کے لیے یمن کی طرف بھیجا گیا تھا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں مستقبل میں کسی بڑے مقصد کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔

لیکن ان کے برخلاف اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہؓ کے بچوں کے ساتھ آپ ﷺ کا معاملہ مختلف تھا، کیوں کہ جس وقت یہ بچے آپ ﷺ کی کفالت میں آئے، سب کے سب چھوٹے اور کم سن تھے، اس لیے ان کی تربیت بھی ان کی عمروں کے مطابق کی گئی۔ حضرت عُمر بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے: ''میں نبی اکرم ﷺ کی گود کا ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ میرا ہاتھ پلیٹ میں چاروں طرف پھر رہا

تھا۔ آپ ﷺ نے دیکھا تو مجھ سے فرمایا: ''اے بچے، بسم اللہ پڑھو۔ اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور جو کچھ تمھارے نزدیک ہے، وہ کھاؤ۔'' یہ روایت آپ ﷺ کی تربیت اور تعلیم کا دل کش اسلوب پیش کرتی ہے۔

اسی طرح حضرت ام سلمہؓ ہی کی سب سے چھوٹی اولاد زینب بنت ابی سلمہ کے ساتھ کھیلنا اور فرط محبت سے زینب کی بجائے زوینب، زوینب کہنا، جہاں آپ کا ان سے غایت درجہ تعلق و محبت کو ظاہر کرتا ہے، وہیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بچوں کی پرورش میں ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو ان کے مزاج و ذہن سے ہم آہنگ ہو۔ حضرت زینب ہی سے یہ روایت مروی ہے: ''جب آپ غسل فرماتے تو میری والدہ (ام سلمہؓ) کہتیں، آپ کے قریب جاؤ۔ جب میں جاتی تو آپ میرے چہرے پر پانی کے چھینٹے اچھالتے اور فرماتے، جاؤ جاؤ۔'' یہ واقعہ بھی ان سے آپ کی دل بستگی اور تعلق کا مظہر ہے۔

کم عمری ہی میں حضرت سلمہؓ بن ابی سلمہ کا اپنی چچازاد بہن امامہ بنت حمزہؓ سے نکاح فرما کر جہاں اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کی دل بستگی مقصود تھی، وہیں احساسِ ذمہ داری اور فرائض کی انجام دہی میں عجلت بھی متصور ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں ازواج مطہرات کی ان اولاد کا دوسری امہات المومنین سے ربط و تعلق، ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا، اور پھر ان تعلقات کی بنا پر روایت کرنا، یہ سب اعلیٰ مثالوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً حضرت حبیبہ بنت ام حبیبہ کا اُم المومنین حضرت زینبؓ بنت جحش سے روایت کرنا، حضرت زینب بنت ابی سلمہ کا حضرت اُمّ حبیبہ سے روایت کرنا، حضرت عائشہؓ کا ہالہ بن ابی ہالہ سے روایت کرنا، ان سب روایات میں آنحضور کی تعلیم و تربیت کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے، جس نے اپنے اور غیر کا فرق ختم کر کے تمام اُمّہات المومنین سے ربط و تعلق کو اس طرح استوار و مستحکم کر دیا تھا کہ ان میں سے کسی کے چہرے پر کسی وجہ سے بھی نہ تو ناگواری کی شکن ابھرتی اور نہ زبان پر حرف شکایت آتا۔

یہ سب کے سب رسول کریم کی تربیت و پرداخت کا کرشمہ ہیں۔ آنحضور نے ان کے اخلاق و اعمال کی درستی، فکر و نظر کی اصلاح اور علم و ادب سے وابستگی کی طرف راہ نمائی اس انداز سے فرمائی کہ ربائب النبی میں سے ہر ایک اخلاق و مروت، رشد و ہدایت، تبلیغ و دعوت اور فقہ و بصیرت کے بلند مقام پر فائز ہے۔ آغوش رسالت کے تربیت یافتہ اشخاص کو جن اوصاف و خصائل کا حامل ہونا چاہیے تھا، ربائب النبی میں سے ہر ایک، ان سے مکمل طور پر متصف تھا۔ علم و فضل، زہد و اتقا، فقہ و بصیرت، دعوت و تبلیغ، اور جذبۂ جہاد، ان میں سے ہر وصف و خصوصیت ان حضرات کے اندر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ان حضرات کو رسولِ کریم کی ذاتِ مبارک اور ان کے قول و فعل کو قریب سے دیکھنے سننے کا موقع ملتا تھا اور سوال و استفسار کے ذریعے اپنی دینی، علمی، فکری، تہذیبی اور اخلاقی ثقافت و تہذیب کو پروان چڑھانے کا موقع بھی۔

احادیث رسول کو حرزِ جاں بنانا اور انھیں اغیار تک پہنچانا صحابہ کرامؓ کا جو محبوب عمل تھا اور جسے اُمّتِ مسلمہ کے لیے نایاب سرمایہ اور ان کی اشاعت و تبلیغ اور ترویج و تشہیر کو دین کا اہم فریضہ تصور کیا جاتا رہا، اس سے بھی ربائب النبی بے بہرہ نہ تھے۔ احادیث نبوی سے ان کا شغف و شیفتگی ایک لازمی و فطری عمل تھا، کیوں کہ ان کے فکر و شعور نے جس فضا میں ترقی پائی، اور جس ماحول میں ان کی نشو و نما ہوئی، اس کا تقاضا یہ تھا کہ یہ ربائب النبی بھی اس مبارک عمل میں دیگر صحابہ کرامؓ کے دوش بدوش شریک ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ روایت حدیث کی مبارک فہرست بھی ان کے اسمائے گرامی سے خالی نہیں۔

چھٹی کتاب:

صحابہؓ وصحابیاتؓ (ردیف وار)

صحابہ رسول ﷺ

(ب، ت، ث)

(ج،ح،خ)

١٣٧١

بسم الله الرحمن الرحیم

بسم الله الرحمن الرحیم

قل إنما

قل إنما

قل إنما

أنا بشر مثلكم يوحى إلى أنما إلهكم إلهٌ واحد

فمن كان يرجوا لقاء ربه فليعمل عملا

صالحا ولا يشرك بعبادة ربه أحدا ۝

بسم الله الرحمن الرحیم

یا ایها النبی انا ارسلنک شاهدا و مبشرا و نذیرا

القرآن الکریم

ترجمہ: اے نبی! ہم نے تجھ کو بھیجا بتانے والا، اور خوشی سنانے والا، اور ڈرانے والا اور بلانے والا

کتبہ: ابن حضرت شاہ نفیس الحسینی مدظلہ العالی — انیس الحسینی غفر اللہ لہ ولوالدیہ

إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس

أهل البيت ويطهركم تطهيرا

١٣٢٧

إنما يريد الله ليذهب عنكم الرجس

أهل البيت ويطهركم تطهيرا

١٣٢٧

مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللّٰه

١٤١٧ھ

فتوكل على الله انك على الحق المبين

١٣٧١

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ

يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

بسم الله الرحمن الرحيم

وما ارسلناك الا رحمة للعالمين

اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم (اللہ) نے تمہیں تمام جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (الانبیاء: ۱۰۷)

فإذا عزمت فتوكل على الله

هاشم ١٣٨٣ م

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم

من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه

صدق رسول الله

بسم الله الرحمن الرحيم

انا فتحنا لك فتحا مبينا

١٣٤١

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

(ف تا ی)

صحابیاتِ رسول ﷺ

صحابۂ رسول ﷺ

ابان بن سعید بن العاصؓ

ان کا سلسلۂ نسب پانچویں پشت پر عبد مناف پر آنحضور ﷺ سے مل جاتا ہے۔ اسلام لانے سے قبل دوسرے اہلِ خاندان کی طرح آنحضور ﷺ اور مسلمانوں کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ جب اُن کے بھائی خالدؓ اور عمروؓ مشرف بہ اسلام ہوئے تو انھوں نے ناراضی کا اظہار کیا۔ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی حمایت میں اپنے بھائی عبیدہ اور عاص کے ساتھ لڑنے نکلے۔ عبیدہ اور عاص مارے گئے لیکن ابان بچ کر نکل گئے۔

صُلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضور ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو قریش کے پاس صُلح کی گفت وشنید کے لیے بھیجا تو وہ ابانھی کے ہاں مہمان ہوئے تھے، کیوں کہ یہ حضرت عثمانؓ کے عزیز تھے، اور انھی نے ان کی حفاظت کی ذمہ داری لی تھی۔ اسلام لانے کے بعد آنحضور ﷺ نے ایک سریہ کا امیر بنا کر نجد روانہ کیا۔ وہاں سے کامیاب لَوٹے تو خیبر فتح ہو چکا تھا۔ نجد کی مہم کے علاوہ حضرت ابانؓ کو دوسرے سرایا کی امارت بھی عطا کی گئی۔ آنحضور ﷺ نے علا بن حضرمی کو معزول کرنے کے بعد انھیں بحرین کے برّی اور بحری دونوں حصّوں کا عامل مقرر کیا۔ حضور ﷺ کی وفات تک یہ اپنے فرائض ذمہ داری سے انجام دیتے رہے۔ حضور ﷺ کی رحلت کی خبر سن کر مدینہ تشریف لائے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعتِ عام کے بعد قریش کے جو چند افراد کچھ دنوں تک اُن کی بیعت سے دست کش رہے ہیں، ان میں ابان بن سعید بھی تھے، لیکن جب بنو ہاشم نے بیعت کر لی تو اُن کو بھی کوئی عذر نہ ہُوا۔ حضرت ابوبکرؓ نے آنحضور ﷺ کے کسی عامل کو معزول نہیں کیا تھا۔ ابان بھی حضور ﷺ کے مقرر کردہ عامل تھے، اس لیے اُن سے دوبارہ بحرین واپس جانے کی خواہش کی، لیکن انھوں نے یہ کہ کر انکار کر دیا کہ میں آنحضور ﷺ کے بعد کسی کا مقررہ عہدہ قبول نہیں کر سکتا۔ لیکن زیادہ دنوں تک اِس عہد پر قائم نہیں رہے اور خلیفۂ اوّل کے اصرار پر یمن کی گورنری قبول کر لی۔

زمانۂ وفات میں اختلاف ہے۔ زیادہ معروف یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے آخر عہدِ خلافت میں جنگِ اجنادین میں شہادت پائی۔

ابرہہؓ

اِن کا شمار اہلِ کتاب صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ حبشہ کے رہنے والے عیسائی تھے۔ جب بہت سے صحابہؓ مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ گئے اور انھیں نجاشی کے دربار میں باریابی حاصل ہوئی اور اُن کے ذریعے اہلِ حبشہ کو اسلام سے واقف ہونے کا موقع ملا تو خود نجاشیؓ اور اُن کے بہت سے عیسائیوں نے اسلام قبول کیا۔ غالباً اِن ہی اسلام قبول کرنے والوں میں حضرت ابرہہؓ اور اُن کے دوسرے رفقا بھی تھے۔

اہلِ حبشہ میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اُن کے دل میں رسولِ کریم ﷺ کی زیارت کا بے حد اشتیاق تھا۔ اتفاق سے اسی دوران میں مہاجرین حبشہ حضرت جعفرؓ کے ساتھ مدینہ واپس آ رہے تھے۔ اسی قافلے کے ساتھ حضرت ابرہہؓ بھی مدینہ آئے اور زیارت نبوی ﷺ سے مشرف ہوئے۔

کسی غزوے میں اُن کی شرکت صحیح طور سے ثابت نہیں ہے، لیکن ''اسد الغابہ'' میں ہے کہ جب غزوہ بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور اُس کی خبر حبشہ تک پہنچی تو جو لوگ اہلِ حبشہ میں اسلام لا چکے تھے، انھوں نے مدینہ جا کر رسولِ کریم ﷺ کی زیارت کرنے کی خواہش نجاشی سے ظاہر کی۔ چنانچہ اجازت لے کر مدینہ آئے اور غزوۂ اُحد میں شرکت بھی کی۔ اس میں حضرت ابرہہ بھی تھے۔ سورۂ مائدہ کی آیات 82 تا 84 میں اگرچہ ان کے نام کی تصریح نہیں ہے، مگر مفسرین لکھتے ہیں کہ حبشہ سے نصاریٰ کا جو وفد مدینہ آیا تھا، اُسی کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں اور حضرت ابرہہؓ بہر حال اس وفد میں شامل تھے۔ اِن آیات کا ترجمہ یہ ہے:

''تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے، اور ایمان لانے والوں کے لیے دوستی میں قریب تر اُن لوگوں کو پاؤ گے جو اپنے آپ کو نصاریٰ کہتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا درویش پائے جاتے ہیں، اور اُن میں غرورِ نفس نہیں ہے۔ جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول ﷺ پر اترا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔ وہ بول اُٹھتے ہیں: ''پروردگار! ہم ایمان لائے۔ ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔'' اور وہ کہتے ہیں کہ: ''آخر کیوں نہ ہم اللہ پر ایمان لے آئیں، اور جو حق ہمارے پاس آیا ہے، اسے کیوں نہ مان لیں، جب کہ ہم اِس بات کی خواہش رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں صالح لوگوں میں شامل کرے۔''

ابن ابی اوفیؓ

علقمہ اور عبداللہ نام۔ ابو معاویہ کنیت۔ صُلح حُدیبیہ سے قبل مشرف بہ اسلام ہوئے۔ حدیبیہ میں آنحضور ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ بیعتِ رضوان میں شرفِ جاں نثاری حاصل کیا۔ غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے اور سب سے پہلے اسی میدانِ

جنگ میں اُترے۔ پھر حنین میں دادِ شجاعت دی۔ ہاتھوں میں کاری زخم لگا، جس کا نشان مدتوں باقی رہا۔ اسلام کے دفاع میں سات جنگوں میں ان کی تلوار بے نیام ہوئی، اور اس ایثار وقربانی کے ساتھ کہ بعض لڑائیوں میں بھوک مٹانے کے لیے صرف ٹڈی کھا کر بسر کرنا پڑا۔

عہد نبوی ﷺ سے حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانے تک مدینہ منورہ میں رہے۔ جب کوفہ آباد ہوا تو یہاں منتقل ہو گئے اور اپنے قبیلہ اسلم کے محلے میں گھر بنالیا۔ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں جب خارجیوں نے سر اٹھایا تو اُن کے مقابلے کو نکلے اور اپنے ساتھ اور مسلمانوں کو بھی اُن کے استیصال پر آمادہ کیا اور اُن کو لکھ بھیجا کہ: ''رسول اللہ ﷺ نے ایک جنگ کے موقع پر فرمایا تھا کہ لوگو، دشمن سے مقابلے کی آرزو نہ کیا کرو، اور اللہ سے امن وعافیت کی دُعا کیا کرو، لیکن جب مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو اور یقین رکھو کہ تلواروں کے سایے کے نیچے جنّت ہے۔''

انھوں نے کافی عمر پائی۔ بنواُمیّہ کے دور تک زندہ رہے۔ اخیر عمر میں آنکھوں سے معذور ہو گئے تھے۔ اسی حالت میں 86 اور 88 ہجری کے درمیان وفات پائی۔ صحابہؓ میں آخری بزرگ تھے جنھوں نے کوفہ میں انتقال کیا۔ اُن کی 59 مرویات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، جن میں سے دس متفق علیہ ہیں اور پانچ میں امام بخاری اور ایک میں امام مُسلم منفرد ہیں۔

ابنِ اُمِّ عبدؓ

اصل نام ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن مسعود۔ آنحضور ﷺ اُنھیں اکثر اُن کی والدہ اُمِ عبدؓ کی نسبت سے ابنِ اُمِ عبدؓ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اُن کے مفصل حالات کے لیے دیکھیے: ''عبداللہ بن مسعودؓ''

ابنِ اُمِّ مکتومؓ

اصل نام عبداللہ یا عمرو۔ اپنی والدہ عاتکہ (اُمِّ مکتومؓ) کی کنیت سے مشہور ہوئے۔ باپ کا نام قیس بن زائدہ تھا جو حضرت خدیجہؓ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ حافظ ابن حجر نے ''الاصابہ'' میں بیان کیا ہے کہ یہ اُم المومنین حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کی والدہ اُمّ مکتومؓ اور حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد آپس میں بہن بھائی تھے۔

بعثت کے ابتدائی زمانے میں ایک مرتبہ آنحضور ﷺ ایک مجلس میں روسائے قریش کو دعوتِ حق دے رہے تھے۔ مختلف روایات میں ان کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے، جن میں عُتبہ، شیبہ، ابوجہل، اُمیہ بن خلف، ابی بن خلف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول کریم ﷺ کے ساتھ ان لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کش مکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپ ﷺ کے ہاں اُن کی آمد ورفت اور آپ ﷺ کے ساتھ اُن کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔

دورانِ گفتگو میں حضرت ابن ام مکتومؓ بھی آ گئے اور آتے ہی چند مذہبی مسائل دریافت کرنا شروع کر دیئے۔ آنحضور ﷺ کو اُن کی یہ بے موقع گفتگو ناگوار ہوئی، اس لیے کہ اِس سے تبلیغ میں رکاوٹ پیدا ہوتی اور اُن کے دلوں میں تاثر کی بجائے تکدر پیدا ہوتا، اس لیے ابنِ ام مکتومؓ کی طرف التفات نہ فرمایا اور بدستور سلسلۂ گفتگو جاری رکھا۔ آنحضور ﷺ کا یہ طرزِ عمل اگرچہ دعوتِ اسلام کی سچی آرزو پر مبنی تھا، تاہم اللہ کے دربار میں ناپسندیدہ ہوا، جس پر سورہ عبس نازل ہوئی (ترجمہ): ''ترش رُو ہُوا اور بے رُخی برتی اِس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آ گیا۔ تمھیں کیا خبر، شاید وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے اعتنائی برتتا ہے، اُس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ اگر وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے۔ اور جو خود تمھارے پاس دوڑا آتا ہے، اور وہ ڈر رہا ہوتا ہے، اُس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔''

ان آیات کے نزول کے بعد رسولِ کریم ﷺ ابن ام مکتومؓ کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ وہ جب بھی کاشانہ نبوت میں تشریف لاتے، اُن کی بڑی خاطر مدارات ہوتی تھی۔ حضرت عائشہؓ انھیں لیموں اور شہد کھلایا کرتی تھیں، اور فرماتی تھیں کہ نزول آیہ کے بعد یہ ابن ام مکتومؓ کا روزینہ تھا۔ آنحضور ﷺ اُنھیں دیکھ کر فرمایا کرتے کہ اس شخص کو مرحبا ہو کہ اُس کی وجہ سے ربّ نے مجھے فہمائش کی۔

اذنِ ہجرت کے بعد حضرت ابن امّ مکتومؓ بھی مدینہ چلے گئے۔ جب حضور ﷺ خود ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو انھیں اذان دینے کا فرض تفویض فرمایا۔ رمضان المبارک میں اُن کی اذان سُن کر لوگ کھانا پینا بند کر دیتے تھے۔ گویا اُن کی اذان کو سحری کے اختتام کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔

ہجرت مدینہ کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، لیکن ابن امّ مکتومؓ اپنی معذوری کے باعث جہاد میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ جس وقت سورۂ نسا کی آیت ۹۵ نازل ہوئی کہ ''مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں، اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے۔'' اور آنحضور ﷺ کاتبِ وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو یہ آیت لکھوانے لگے تھے تو اُس وقت اتفاق سے ابن اُمّ مکتومؓ بارگاہِ رسالت میں موجود تھے۔ یہ آیت سنی تو بڑی حسرت کے ساتھ آنحضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: ''یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، اگر میں معذور نہ ہوتا تو ہرگز گھر پر نہ بیٹھا، بلکہ جہاد میں شریک ہوتا۔

اِس آیت کے نزول کے بعد حضرت ابن امّ مکتومؓ نابینا ہونے کی بنا پر جہاد میں شریک ہونے کے مُکلّف نہیں رہے تھے، لیکن جہاد کا ولولہ کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا۔ چنانچہ نابینا ہونے کے باوجود کبھی کبھی جنگ میں شریک ہوتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ مجھے علَم دے کر دونوں صفوں کے درمیان کھڑا کر دو۔ میں نابینا ہوں، اس لیے بھاگنے کا خطرہ نہیں ہے۔

جب آنحضور ﷺ اکابر صحابہؓ کے ہم راہ کہیں باہر تشریف لے جاتے تو ابنِ

ام مکتومؓ کو، امامت کی نیابت کا شرف عطا فرماتے تھے۔ چنانچہ غزوہ ابواء، بواط والعسیر، جہینہ، سویق، غطفان، حمراء الاسد، نجران، ذات الرقاع وغیرہ میں اُن کو یہ جلیل القدر منصب عطا ہوا۔ غزوہ بدر میں بھی کچھ دن اِس منصب کے حامل رہے، لیکن چند روز کے بعد یہ شرف ابولبابہ کی جانب منتقل ہوگیا۔ مجموعی طور پر انھیں تیرہ مرتبہ رسولِ کریم ﷺ کی نیابت کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت ابنِ اُمّ مکتومؓ نابینا تھے۔ اُن کا گھر مسجد نبوی سے دُور تھا۔ راستے میں جھاڑیاں پڑتی تھیں۔ کوئی راہ نُما بھی نہ تھا۔ ان دشواریوں کے باوجود نماز ہمیشہ مسجد نبوی ﷺ میں آ کر پڑھتے۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ سے گھر پر نماز پڑھنے کی اجازت چاہی، لیکن چوں کہ اذان اور اقامت کی آواز اُن کے گھر تک جاتی تھی، اس لیے حضور ﷺ نے اجازت نہ دی۔ چنانچہ اُسی حالت میں چھڑی سے راستہ ٹٹولتے ہوئے مسجد نبوی ﷺ آتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں اُن کا معقول وظیفہ مقرر کر دیا تھا اور گھر سے مسجد تک راہ نُمائی کے لیے ایک خادم بھی مقرر کر دیا تھا، لیکن شوقِ جہاد نے گھر میں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو عراق عرب کی تسخیر کے لیے روانہ کیا تو حضرت ابنِ اُمّ مکتومؓ بھی اپنی معذوری کے باوجود لشکرِ اسلام میں شامل ہوگئے۔ جنگِ قادسیہ میں زِرہ بکتر پہن کر، پرچم بلند کیے مجاہدینِ اسلام کی صفوں کے درمیان کھڑے ہوگئے۔ دورانِ جنگ صفوں کی ترتیب قائم نہ رہی۔ اِس افراتفری میں شہید ہوگئے۔ لیکن علامہ واقدی کا بیان ہے کہ عمر طبعی پا کر مدینہ میں وفات پائی، وہ حافظِ قرآن تھے اور مدینہ میں لوگوں کو قرأت سکھاتے تھے۔

اُن سے حضرت انسؓ اور رزبن حُبیش نے احادیث روایت کی ہیں۔

ابواحمد بن جحشؓ

عبد نام۔ ابواحمد کنیت۔ ان کی والدہ امیمہ حضرت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ اُم المومنین حضرت زینبؓ کے حقیقی بھائی اور آنحضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

وہ اپنے بھائی عبداللہ اور عبیداللہ کے ساتھ دعوتِ اسلام کے آغاز یعنی آنحضور ﷺ کے دارالارقم میں پناہ گزیں ہونے سے قبل مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنے بھائیوں ہی کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے اور مبشر بن عبدالمنذر کے گھر مہمان ہوئے۔

اُن کی ہجرت کے بعد ابوسفیان نے اُن کا گھر ابن علقمہ عامری کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ فتح مکہ کے وقت جب مسلمان فاتحانہ مکہ میں داخل ہوئے تو ابواحمد نے سب کے سامنے ابوسفیان سے اپنے مکان کا مطالبہ کیا، لیکن آنحضور ﷺ نے حضرت عثمانؓ کے ذریعے سے ایک خفیہ پیغام کہلوا دیا۔ اس کے بعد انھوں نے اخیر دم تک اپنے مکان کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا۔ بعد میں اُن کی اولاد سے معلوم ہوا کہ آنحضور ﷺ نے یہ پیغام بھجوایا تھا کہ اپنے مکان کو جانے دو اور اس کے عوض خلد بریں کا سودا کرو۔

حضرت ابواحمدؓ شاعر تھے۔ جب ابوسفیان نے اُن کا مکان فروخت کیا تو انھوں نے ایک منظوم شکایت لکھی۔ کوئی اولاد نہ چھوڑی۔ سن وفات متعین نہیں کیا جاسکتا، لیکن 20 ہجری سے قبل وفات پا چکے تھے، کیوں کہ اُس سال اُن کی ہم شیر حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا اور وہ بہن کی زندگی میں وفات پا چکے تھے۔

ابواسیدؓ ساعدی

مالک نام، ابواُسیدؓ کنیت، قبیلہ خزرج کے خاندان بنی ساعدہ سے تعلق تھا۔ ہجرت نبوی ﷺ سے قبل اسلام لائے۔ سب سے پہلے اُن کی تلوار بدر کے میدان میں چمکی۔ اُس کے بعد اُحد، خندق، غرضیکہ تمام غزوات میں شرکت کی۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ نے اُنھیں بنی ساعدہ کا پرچم مرحمت فرمایا۔ ۶۰ ہجری میں 78 سال کی عمر میں وفات پائی۔ غزوہ بدر میں شریک ہونے والے تمام صحابہؓ کے آخر میں سفرِ آخرت اختیار کیا۔ اُن کی وفات سے بدر کی آخری نشانی بھی روپوش ہوگئی۔ حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں اُن کی بینائی جاتی رہی تھی۔ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے چند حدیثیں روایت کیں۔ راویوں میں یہ اصحاب شامل ہیں:

انس بن مالکؓ، سہل بن سعدؓ، عباس بن سہلؓ، ابوسلمہؓ، ابرہیم بن سلمہؓ، عبدالملک بن سعیدؓ۔

ابوالعاص بن ربیعؓ

رسولِ کریم کے داماد، اُن کا تعلق قریش کے نہایت معزز خاندان بنوعبدشمس سے تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: ابوالعاص بن ربیعؓ بن عبدالعزیٰ بن عبدشمس بن عبدمناف بن قُصی۔

اُن کا سلسلہ نسب عبدمناف پر نبی کریم ﷺ کے نسب نامے سے مل جاتا ہے۔ والدہ کا نام ہالہؓ بنت خویلد تھا جو حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی حقیقی بہن تھیں۔ وہ اسلام اور صحابیت کے شرف سے بہرہ ور ہوئیں اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات تک زندہ رہیں۔

حضرت خدیجہؓ اپنے بھانجے ابوالعاصؓ سے بہت محبت کرتی تھیں۔ وہ عنفوانِ شباب ہی میں تجارت میں مشغول ہوگئے تھے اور خوش معاملگی کی بدولت وسیع کاروبار کے مالک ہوگئے تھے۔ بقول ابن اثیر وہ بھی حضور ﷺ کی طرح ''الامین'' کے لقب سے مشہور ہوگئے تھے۔

بعثت سے کچھ عرصہ پہلے آنحضور ﷺ نے اپنی بڑی صاحب زادی حضرت زینبؓ کا نکاح حضرت ابوالعاصؓ سے کر دیا۔ حضرت زینبؓ تو اپنی والدہ حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ہی مشرف بہ اسلام ہوگئیں، لیکن ابوالعاصؓ بعض موانع اور مصالح کی بنا پر اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ تاہم انھوں نے اسلام یا آنحضور ﷺ کے خلاف کسی سرگرمی میں کبھی کوئی حصّہ نہیں لیا۔

(اُن کے باقی حالات کے لیے ملاحظہ ہو کتاب ''اہل بیت'' میں حضرت زینبؓ کے احوال)

ابوالہیثم بن تیہانؓ

مالک نام، ابوالہیثم کنیت، قبیلہ اوس سے تعلق تھا۔ وہ جاہلیت ہی میں توحید کے قائل تھے۔ ذی الحجہ 11 بعثت میں مدینہ سے چھ آدمی اسعد بن زرارہ کی قیادت میں مکہ اس غرض سے آئے تھے کہ آنحضور ﷺ کی ذات اور اُن کے پیغام کے بارے میں معلومات حاصل کریں، لیکن وہ حضور ﷺ کی تبلیغ سے متاثر ہو کر اُسی وقت مسلمان ہوگئے۔ واپس مدینہ پہنچنے پر جب انھوں نے اپنے مسلمان ہونے کا قصہ بیان کیا تو جن اوّلین لوگوں نے اسلام قبول کیا، اُن میں ابوالہیثم پیش پیش تھے۔ اگلے برس جب بیعتِ عقبہ کے لیے بارہ آدمیوں کا وفد مکہ گیا تو ابوالہیثم اُس میں شامل تھے۔ آنحضور ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ دوسرے سال یعنی نبوت کے تیرھویں سال جب حضرت مصعبؓ کی ان تھک تبلیغی کوششوں سے اسلام کا چرچا انصار کے تمام قبائل میں پھیل گیا تو قبیلہ اوس اور خزرج میں سے تہتر مرد حضرت مصعبؓ کے ہم راہ حج ادا کرنے کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ ان میں ابوالہیثم بھی شامل تھے۔ جب آنحضور ﷺ نے بنو خزرج میں سے نو اور قبیلہ بنو اوس میں سے تین اشخاص کا انتخاب بطور نقیب کیا، تو بنو اوس کے تین ارکان میں سے ایک ابوالہیثم بھی تھے۔

حضرت ابوالہیثم مدینہ منورہ میں آنحضور ﷺ کے خارص تھے یعنی تخمینہ لگانے والے۔ کھجوروں کے باغات کا معاینہ کر کے پھل کا تخمینہ لگاتے تھے اور آنحضور ﷺ کو پھل کی مقدار سے مطلع کیا کرتے تھے، تاکہ اس حساب سے عُشر وغیرہ وصول کیا جا سکے۔ آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے بھی اُن کو خارص مقرر کرنا چاہا، مگر انھوں نے معذرت کر لی۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ''مگر رسول اللہ کے زمانے میں تو تم یہ کام کیا کرتے تھے۔ اب کیوں انکار کر رہے ہو؟'' حضرت ابوالہیثم نے جواب دیا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس دور میں جب میں تخمینہ لگا کر واپس آتا تھا اور آنحضور ﷺ کو مطلع کرتا تھا تو آپ ﷺ میرے لیے دُعا فرمایا کرتے تھے۔ میں یہ فریضہ محض اُس دُعا کی خاطر انجام دیا کرتا تھا۔ اب وہ باتیں کہاں۔''

حضرت ابوالہیثم غزوات میں سے کسی غزوے میں بھی شرکت سے محروم نہیں رہے۔ عثمان بن مظعونؓ سے کہ بڑے پایے کے مہاجر تھے، رشتہ مواخات قائم ہوا۔ ۲۰ ہجری میں حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

ابوالیسر کعبؓ بن عمرو انصاری

کعب نام۔ ابوالیسر کنیت۔ بنو خزرج کے خاندان بنو سلمہ سے تعلق رکھتے تھے اور انصار کے سابقون الاوّلون میں سے تھے۔ والدہ کا نام نسیبہ بنت از ہر تھا اور وہ بھی بنو سلمہ سے تھیں۔ 12 بعثت میں جب حضرت مصعبؓ بن عمیر اسلام کے مبلغ اوّل کی حیثیت سے مدینہ منورہ تشریف لائے اور اہلِ مدینہ کو حق کی طرف بلانا شروع کیا تو حضرت کعب نے بھی اسلام قبول کیا۔ اُس وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اگلے سال وہ مدینہ کے بہتر مَردوں کے ساتھ مکہ گئے اور بیعتِ عقبہ میں آنحضور ﷺ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔

غزوہ بدر میں نہایت جوش سے لڑے۔ مشرکین کا پرچم ابوعزیز بن عمیر کے ہاتھ میں تھا۔ ابوالیسر نے بڑھ کر چھین لیا۔ مشرکین کے ایک رئیس منبہ بن حجاج سہمی کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ پھر آنحضور ﷺ کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کو اسیر کر کے آنحضور ﷺ کے رُوبرو لائے۔ (وہ بھی قریش مکہ کے ساتھ آئے تھے)۔ آپ ﷺ نہایت متعجب ہوئے کہ اس چھوٹے سے قد کے آدمی نے عباسؓ جیسے ڈیل ڈول والے شخص کو کیسے گرفتار کر لیا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''عباس کو اسیر کرنے میں کسی فرشتے نے ابوالیسر کی مدد کی ہوگی۔''

غزوہ بدر کے بعد تمام غزوات میں شریک رہے۔ غزوہ خیبر میں جب صحابہ قلعوں کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ ایک شب حضور ﷺ نے دیکھا کہ یہودیوں کی بہت سی بکریاں ایک قلعے کے اندر جا رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''آج مجھے اِن بکریوں کا گوشت کون کھلائے گا؟'' ابوالیسر نے کہا: ''میں'' اور اُٹھ کر تیز دوڑتے ہوئے پہنچے اور دو بکریاں بغل میں داب کر لے آئے۔ صحابہؓ نے ذبح کیا اور اُن کا گوشت پکا کر حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔

جنگ صفین اور دوسری لڑائیوں میں حضرت علیؓ کے ہم رکاب تھے۔ 55 ہجری میں مدینہ میں انتقال کیا۔ مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ بڑھاپے میں خیبر والا واقعہ بیان کر کے رویا کرتے تھے اور لوگوں سے فرماتے تھے کہ مدینہ میں اب میں ہی باقی رہ گیا ہوں جس نے رسول اللہ ﷺ کا فیضان صحبت اٹھایا ہے۔ اس سے پہلے کہ میری زندگی کا چراغ بجھ جائے، مجھ سے جو فائدہ اٹھا سکتے ہو، اٹھا لو۔''

ابوایوب انصاریؓ

خالد نام، ابوایوب کنیت، قبیلہ خزرج کے خاندان نجار سے تھے۔ ۴۰ عام الفیل یعنی ۳۱ قبل ہجرت میں یثرب (مدینہ منورہ) میں پیدا ہوئے۔ والدہ کا نام ہند بنت سعد تھا۔ یہ حضرت ایوبؓ کے والد کی ماموں زاد بہن تھیں۔ حضرت ابوایوبؓ کا قبولِ اسلام بیعت عقبہ اوّل اور عقبہ ثانیہ کے درمیانی وقفے کا واقعہ ہے۔ سن بارہ نبوی میں جب حضرت مصعبؓ بن عمیر 73 انصاری مردوں کا قافلہ لے کر خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے تو حضرت ایوبؓ بھی اس میں شامل تھے۔ ابن ہشام نے شرکائے عقبہ کی پوری فہرست درج کی ہے، جس میں سب سے پہلا نام ابوایوب انصاریؓ ہے۔ آپ ہی کے مکان پر رسولِ کریم ﷺ نے مدینے میں ہجرت کے وقت مسجد نبوی اور اپنے مکان کی تعمیر سے پہلے قیام فرمایا تھا۔ اسی مکان میں آپ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زیدؓ بن حارث بھی فروکش تھے۔ 6 ربیع الاول کو جمعہ کے دن آنحضرت ﷺ مدینے پہنچے تھے، گویا اُسی دن سے حضرت ابوایوبؓ کو شرف میزبانی حاصل ہوا۔ آنحضور ﷺ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد مسجد نبوی ﷺ اور اپنا مکان بننے تک حضرت ابوایوبؓ ہی کے ہاں قیام پزیر رہے۔ ہجرت کے پانچ ماہ بعد رجب 1 ہجری میں نبی کریمؐ نے حضرت انسؓ کے مکان پر انصار و مہاجرین کو جمع کیا اور ان میں مواخات قائم کی۔ اس میں ابوایوبؓ کے بھائی مصعب بن عمیر

بنائے گئے تھے۔

حضرت ابوایوبؓ نے عہد نبوی ﷺ میں تمام غزوات و مشاہد میں حصہ لیا۔ حجۃ الوداع میں بھی وہ حضور ﷺ کے ہم راہ تھے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی تمام عمر جہاد میں مصروف رہے، یہاں تک کہ جنگِ قسطنطنیہ میں شہید ہوگئے۔ اُن کے مجاہدانہ سفروں میں ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظم شامل ہیں۔

جب 35 ہجری میں حضرت عثمانؓ کے گھر کا محاصرہ ہوا تو اُس وقت ابوایوبؓ مدینے ہی میں تھے، بلکہ اُس زمانے میں بعض اوقات مسجد نبوی ﷺ میں امامت بھی کرتے تھے۔ حضرت علیؓ کے عہد میں، حضرت علیؓ کے ساتھ نہروان کی جنگ (38 ہجری) میں شامل رہے اور سواروں کا رسالہ آپ کی رکاب میں تھا۔ اسی موقع پر ''رایۃ الامان'' بھی آپ کے سپرد کیا گیا۔ جنگ نہروان خوارج کے خلاف لڑی گئی۔ جنگ سے پہلے جن لوگوں نے خوارج کو سمجھانے کی کوشش کی، اُن میں ابوایوبؓ بھی تھے۔

36 ہجری میں جب حضرت علیؓ نے ہمیشہ کے لیے مدینہ چھوڑا تو بعد میں وہاں جو والی مقرر کیے، اُن میں سے ایک ابوایوب انصاریؓ بھی تھے۔ 17 رمضان 40 ہجری کو حضرت علیؓ کی شہادت ہوئی تو اُس وقت ابوایوبؓ وہاں موجود نہ تھے، بلکہ مدینے میں تھے۔ 42 ہجری میں بوزنطیوں (رومیوں) کے خلاف غزوات کا زور بڑھ گیا۔ تقریباً 75 برس کا یہ مجاہد بوزنطیوں کے خلاف خالد بن ولیدؓ کے بیٹے عبدالرحمٰن کے ہم راہ مصروفِ جہاد تھا۔ 46 ہجری میں بحری لڑائیوں میں شرکت کے لیے وہ مصر تشریف لے گئے۔

49 ہجری میں امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ پر حملے کی غرض سے ایک بیڑا تیار کیا تھا۔ یزید بن معاویہ اُس کا سپہ سالار تھا۔ ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابن زبیرؓ ایسے صحابہ کے علاوہ ابوایوبؓ بھی اس میں شامل تھے۔ چار سال تک آپ قسطنطنیہ پر حملوں میں شریک رہے۔ پھر آپ بیمار ہوگئے۔ یزید عیادت کے لیے آیا اور پوچھا: ''آپ کو کچھ کہنا ہے؟'' فرمایا: ''ہاں، یہ کہنا ہے کہ جب میں مرجاؤں تو میرا جنازہ اٹھا کر اُسے دشمن کی سرزمین میں جہاں تک لے جاسکو، لے جاؤ اور جب آگے بڑھنے کا امکان نہ رہے تو اُسی جگہ مجھے دفن کر دو۔'' چنانچہ 52 ہجری کی ایک رات آپ غالباً اسہال کی بیماری سے فوت ہوگئے۔ نماز جنازہ یزید نے پڑھائی اور قسطنطنیہ کی فصیل کے سامنے انھیں دفن کر دیا گیا۔

بوزنطی اس مزار کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور قحط کے ایام میں اس مقبرے کی زیارت کے لیے آتے تھے اور بارش کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ بوزنطیوں ہی نے سب سے پہلے اس مقام پر 55 ہجری کے بعد، جب اسلامی فوجیں واپس چلی آئی تھیں، عمارت تعمیر کی تھی۔

سلطان محمد فاتح نے 1556ء میں قسطنطنیہ فتح کیا۔ اس کے شیخ آق شمس الدین نے حضرت ابوایوبؓ کی قبر کا ذکر کیا تھا۔ روایت ہے کہ آق شمس الدین نے ایک جگہ نور دیکھا اور کہا کہ سرہانے کی طرف دو ہاتھ زمین کھودو۔ ایک پتھر نکلے گا، جس پر عبرانی خط میں کچھ لکھا ہوگا۔ چنانچہ ایک پتھر برآمد ہوا۔ اسے پڑھوایا گیا تو حضرت ابوایوبؓ کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ پتھر قبر سے باہر دیوار میں اب بھی لگا ہوا ہے۔ سلطان محمد فاتح نے اس جگہ عمارت تعمیر کروادی۔ قبر پر تابوت رکھا گیا، جس پر چاندی چڑھی ہوئی تھی۔ مزار کے ساتھ ایک جامع مسجد اور ایک مدرسہ بھی بنوایا گیا۔ بعد ازاں اِن مختلف وقتوں میں توسیع ہوتی رہی۔ 1723ء میں دو غلام گردشوں اور دو نئے میناروں کا اضافہ کیا گیا، اور یہی وہ مسجد ہے جہاں سلطان محمد ثانی نے رسول کریم ﷺ کے آثار متبرکہ، جو اُسے محلِ سلطان کے خزانے سے ملے تھے، محفوظ کرائے۔ اُس وقت سے اِس مزار کے تین حصے ہیں۔ جامع ایوب، مزار ایوب اور قبرستان ایوب۔ جامع کے ایک کمرے میں سبز چادر میں لپٹا ہوا ایک علم بھی ہے، جس کے متعلق کہا جاتا ہے، یہ وہ تاریخی علم ہے جسے حضرت ابوایوبؓ علم بردار کی حیثیت سے اٹھاتے تھے۔ سلطان محمد فاتح کے وقت سے اس مزار کو یہ اہمیت حاصل رہی کہ سلاطین عثمانیہ کی تاج پوشی کے موقع پر ہر سلطان یہاں آتا تھا اور شیخ الاسلام اس کی کمر میں بانی خاندان سلطان عثمان خان کی تلوار حمائل کرتا تھا۔ خود محمد فاتح کی کمر میں شیخ الاسلام آق شمس الدین نے یہ تلوار آویزاں کی تھی۔

حضرت ابوایوبؓ کا فضل و کمال اِس قدر مستند و مسلّم تھا کہ خود صحابہ کرامؓ اُن سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ حضرت ابن عباسؓ، ابن عمرؓ، براء بن عازبؓ، انس بن مالکؓ، ابوامامہؓ، زید بن خالدؓ جہنی، مقدادؓ بن معدی کرب، جابر بن سمرہؓ، عبداللہ بن یزید خطمی وغیرہ جو آنحضور ﷺ کے تربیت یافتہ تھے، حضرت ابوایوبؓ کے فیض سے بے نیاز نہ تھے۔ تابعین میں سے بھی اکثر حضرت ابوایوبؓ کے عام ارادت مندوں میں داخل تھے۔

حضرت ابوایوبؓ حافظِ قرآن تھے اور لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اُن کی طرف ڈیڑھ سو احادیث منسوب ہیں، جن میں سے پانچ متفق علیہ ہیں۔ مسند احمد بن حنبل میں اُن کی 112 روایات جمع ہیں۔ حضرت ابوایوبؓ انصاری کی حرکات و سکنات میں نبوت کے فیض یافتہ ہونے کا ثبوت ملتا تھا۔ حُبِ رسول ﷺ، جوشِ ایمان، حق گوئی، اتباعِ سنت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، جہاد، تواضع، آثار نبوی ﷺ کا ادب اُن کے اخلاق و عادات کے نمایاں پہلو تھے۔

ابو برزہؓ سلمی

نظلہ نام، ابو برزہ کنیت، سلسلہ نسب یہ ہے: نظلہؓ بن عبداللہ بن حارث بن خبال بن ربیعہ بن وعبل بن انس بن خزیمہ بن مالک بن سلامان بن اسلم بن افصیٰ بعثتِ نبوی کے ابتدائی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور ہجرتِ نبوی ﷺ کے بعد غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ تقریباً تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ہم رکاب رہے۔

فتح مکہ (۸ ہجری) کے موقع پر حضور ﷺ نے تمام دشمنانِ اسلام کے لیے عفو و درگزر کا اعلان فرما دیا تھا، لیکن چند معاندین کا عناد حد سے بڑھا ہوا تھا۔ ان میں ایک

عبداللہ بن خطل تھا۔ یہ شخص پہلے اسلام لا چکا تھا، مگر اُس نے اپنے ایک مسلمان خادم کو قتل کر دیا تھا، اور اسلامی قانونِ قصاص سے ڈر کر پھر مُرتد ہو کر مکہ بھاگ گیا تھا۔ اُس کی دشمنی کا یہ عالم تھا کہ اُس نے اپنی دو کنیزوں کو آنحضور ﷺ اور صحابہؓ کی ہجو کے اشعار حفظ کرا رکھے تھے اور وہ یہ اشعار بازاروں میں گاتی پھرتی تھیں۔ جب مکہ فتح ہوا تو وہ امان کے لیے خانۂ کعبہ کا غلاف پکڑ کر لپٹ گیا۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ امان کا مستحق نہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت ابو برزہؓ کو حکم دیا کہ اُسے قتل کر دیا جائے انھوں نے فوراً آگے بڑھ کر اُس کا کام تمام کر دیا۔

حضرت ابو برزہؓ کو آنحضور ﷺ کی ذات سے عشق تھا اور آپ ﷺ کے بارے میں کسی قسم کا طنز و تمسخر برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ایک دفعہ بصرہ کے گورنر عبیداللہ بن زیاد کو حوضِ کوثر کے متعلق کچھ پوچھنا تھا۔ اُس نے لوگوں سے پوچھا، حوضِ کوثر کے متعلق کون بتا سکتا ہے۔ انھوں نے ابو برزہؓ کا نام لیا۔ گورنر نے انھیں بلایا۔ وہ تشریف لائے تو انھیں دیکھ کر اُس نے ازراہِ استہزا کہا: ''یہ ہیں تمھارے...... محمدی ﷺ'' حضرت ابو برزہؓ نے ابن زیاد کی طنزیہ بات سُنی تو انھیں بڑا دُکھ ہوا اور انھوں نے بڑے پُر جلال انداز میں فرمایا: ''میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں کبھی اُن لوگوں کو بھی دیکھوں گا جو مجھے رسول اللہ ﷺ کے شرفِ صحبت پر عار دلائیں گے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر ابن زیاد کی مسند پر اُس کے برابر بیٹھ گئے۔ پھر ابن زیاد نے حوضِ کوثر کی حقیقت کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا آپ نے حوضِ کوثر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کو کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت ابو برزہؓ نے فرمایا: ''ہاں ہاں، ایک دفعہ نہیں، بلکہ کئی دفعہ، کہ جو شخص حوضِ کوثر کا انکار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اُس کو نہ اس کے قریب پھٹکنے دے گا، اور نہ اس کے پانی سے اسے سیراب کرے گا۔'' یہ فرما کر غصّے کی حالت میں فوراً وہاں سے چل دیئے۔

حضرت ابو برزہؓ کو فیضانِ نبوت سے بہرہ یاب ہونے کا کافی موقع ملا، اس لیے وہ علم و فضل کے اعتبار سے بڑا اونچا مقام رکھتے تھے۔ ان سے ۴۶ احادیث مروی ہیں۔ ان میں سے ۲۷ احادیث متفق علیہ ہیں۔

حضرت ابو برزہؓ نے پورا عہدِ رسالت مدینہ منورہ میں گزارا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد میں بھی یہیں قیام رہا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو انھوں نے بصرہ کی سکونت اختیار کر لی۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان اختلافات کا آغاز ہوا تو انھوں نے حضرت علیؓ کی پُر جوش حمایت کی اور جنگِ صفین میں شامی فوجوں کے خلاف لڑے۔ جنگِ نہروان میں خارجیوں کے خلاف دادِ شجاعت دی۔ خراسان کی فتوحات میں مجاہدانہ حصّہ لیا۔ حضرت ابو برزہؓ نے 65 ہجری میں وفات پائی۔

ابو بکر صدیقؓ

اصل نام عبدالکعبہ تھا۔ اسلام لانے کے بعد آنحضور ﷺ نے عبداللہ رکھ دیا۔ ابو بکر کنیت اور صدیق لقب تھا۔ باپ کا نام عثمان تھا اور کنیت ابو قحافہ۔ والدہ کا نام سلمیٰ تھا، مگر وہ بھی اپنی کنیت اُمّ الخیر سے زیادہ پکاری جاتی تھیں۔ دونوں ماں باپ قریش کی ایک شاخ بنی تیم سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ سے چھے پشت پیچھے کی طرف، قریش میں قصّی کے دادا کا نام مُرّہ تھا۔ مُرّہ پر پہنچ کر آپ اور آنحضور ﷺ کا شجرۂ نسب مل جاتا ہے۔ ''اشناق'' کا منصب اسی خاندان بنو تیم کے سپرد تھا، یعنی یہ لوگ خون بہا اور تاوان کی رقوم معین کرتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کو عتیق کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے، جس کی تشریح آنحضور ﷺ نے یہ فرمائی کہ وہ جہنم سے آزاد ہیں۔ قدیم عرب مورخوں نے ان کا نام ''عتیق'' ہی بتایا ہے۔ آپ عتیق اس لیے کہلاتے تھے کہ آپ شروع سے نیک چلے آتے تھے۔ بعد میں ''الصدیق'' کے لقب سے معروف ہوئے، جس کے معنی سچ بولنے والے، معاملے کے سچّے یا تصدیق کرنے والے ہیں۔

حضرت ابو بکرؓ کا سنِ ولادت 573ء کے قریب ہے۔ رسولِ کریم ﷺ سے ڈھائی سال چھوٹے تھے۔ گویا آپ عام الفیل کے ڈھائی برس بعد پیدا ہوئے یعنی ہجرت سے پچاس برس چھے مہینے پہلے۔ ان کی زندگی کے متعلق اسلام لانے سے پہلے کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے وقت آپ چالیس ہزار درہم کے سرمائے کے تاجر تھے۔ تجارت کے سلسلے میں مختلف مقامات کی آمد و رفت کے باعث مکہ سے باہر کے بہت سے لوگوں سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ پہلا سفر اٹھارہ برس کی عُمر میں کیا۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد بھی انھیں تجارت کے سلسلے میں بُصریٰ وغیرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور یہ کاروبار خوب نفع آور ثابت ہوا، چنانچہ آپ بہت دولت مند تھے۔ اس کی شہادت خود قرآن مجید (سورہ نُور۔ 22) میں موجود ہے۔ ابنِ ماجہ میں حضرت ابو بکرؓ کا یہ بیان موجود ہے کہ میں قریش کا سب سے بڑا اور متموّل تاجر تھا۔

حضرت ابو بکرؓ کو لکھنا پڑھنا بھی آتا تھا اور آپ عرب قبائل کے انساب کے بھی ماہر تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی آپ اخلاقِ حسنہ کا سرچشمہ تھے اور آپ کے اخلاق میں اخلاقِ محمدی ﷺ کا عکس نظر آتا تھا۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے آنحضور ﷺ کے متعلق آپ پر وحیِ نبوت کے آغاز کے وقت جو الفاظ استعمال کیے تھے، تقریباً وہی الفاظ ابن الدغنہ نے قریش مکہ کے سامنے حضرت ابو بکرؓ کی تعریف کرتے ہوئے استعمال کیے اور کہا، وہ فقرا و مساکین کے دستگیر ہیں، گم شدہ نیکیوں کو بجا لاتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمان نواز ہیں، حق کی راہ میں جو لوگ مصائب جھیلتے ہیں، اُن کے مددگار رہتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ نے جاہلیت ہی میں اپنے اوپر شراب حرام کر لی تھی۔ نبی کریم ﷺ سے آپ کے دوستانہ تعلقات آپ ﷺ کی رسالت سے پہلے ہی قائم ہو گئے تھے۔ رشتے میں وہ حضور ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ اخلاق و فضائل کی مماثلت نے تعلقات اس قدر بڑھا دیئے تھے کہ صبح شام دونوں وقت رسول کریم ﷺ آپؓ کے مکان پر ضرور تشریف لاتے تھے۔ یہ دستور مکی زندگی میں عرصے تک بعد اسلام کے بعد بھی قائم رہا۔

بالغ مردوں میں حضرت ابوبکرؓ، بچوں میں حضرت علیؓ اور عورتوں میں حضرت ...سب سے پہلے اسلام لائے۔ ایمان لانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنی تمام ...ت وقابلیت، سارا اثر ورسوخ، کُل مال ومتاع، جان اور اولاد، غرض جو کچھ آپ کے ...س تھا، وہ سب دین کی راہ میں وقف کر دیا۔ قبولِ اسلام کے بعد ان کی تمام زندگی ...اعت واستقامت کی داستان ہے۔ اسلام کی دعوت کفار کو ناپسند تھی اور وہ مسلمانوں ...نشانۂ ستم بناتے رہتے تھے۔ صحیح بخاری میں ایک مستقل باب (29) ان مصائب پر ...م ہے جو آنحضور ﷺ اور صحابہؓ نے مکے میں کفار کے ہاتھوں برداشت کیے۔ ...ضرت ابوبکرؓ بھی اپنی عظمت وجلالت، اثر ورسوخ اور مال ودولت کے باوجود اس سے ...ی طرح محفوظ نہ تھے۔ جب مصائب بہت بڑھ گئے تو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے ...مایا کہ حبشہ کو ہجرت کر جاؤ۔ چنانچہ دو مرتبہ مسلمان ہجرت کر کے حبشہ گئے۔ حضرت ...بکرؓ نے عرصہ دراز تک سختیاں برداشت کیں اور حضور ﷺ کا دامن نہ چھوڑا۔ ...ب انھیں عبادت تک سے روک دیا گیا تو اسلام کے مطابق آزادی سے عبادت بجا ...نے کے لیے گھر بار چھوڑ کر یمن کے راستے حبشہ کی راہ لی۔ پانچ منزلیں طے کر کے ...ک الغماد تک پہنچے تھے کہ القادہ کے سردار ابن الدغنہ سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے ...چھا: ''کہاں کا قصد ہے؟'' بولے: ''میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے۔ ارادہ ہے کہ ...ہیں الگ جا کر عبادت کروں۔'' ابن الدغنہ نے کہا: ''تم جیسا شخص نہ نکل سکتا ہے نہ ...کالا جا سکتا ہے'' اور آپ کو واپس مکہ لے آیا۔ آپ مکے ہی میں رہے، تا آنکہ ہجرت ...دینہ کا وقت آ گیا۔ حضرت ابوبکرؓ اب بھی اذیتیں سہ رہے تھے۔ آنحضور ﷺ نے جب صحابہؓ کو مدینے کی طرف ہجرت کی اجازت دی تو حضرت ابوبکرؓ نے اپنے لیے بھی آنحضور ﷺ سے اجازت مانگی۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''تم ابھی ٹھہرو، کیوں کہ امید ہے کہ مجھے بھی اجازت مل جائے گی'' آخر نبی کریم ﷺ کی زندگی کا سب سے خطرناک وقت آیا، اور یہ وہی وقت ہے جب سے حضرت ابوبکرؓ کے فضائل کا سب سے درخشاں باب شروع ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے مدینے کی جانب ہجرت کرتے وقت حضرت ابوبکرؓ کو اپنا رفیقِ سفر بنانے کے لیے منتخب کیا۔ اس اہم واقعے کا ذکر قرآن مجید (سورۂ انفال۔ 40) میں بھی آیا ہے۔ ہجرت کا واقعہ ایک پُرخطر راز تھا، لیکن ابوبکرؓ اور آپ کے خاندان کے سینے اِس راز کا مدفن بن گئے تھے۔ مدینے پہنچنے کے جلد ہی بعد اُن کا کنبہ، جو اُمِ رومانؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت اسماؓ اور شاید عبداللہؓ پر مشتمل تھا، ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے والد ابو قحافہؓ مکے ہی میں رہے اور اُن کے بیٹے عبدالرحمٰن نے تو بدر اور اُحد میں مسلمانوں کے خلاف جنگ بھی کی، اگرچہ فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر لیا۔ مدینے میں حضرت ابوبکرؓ کو بنو حارث بن خزرج کے درمیان ''السنح'' کے محلے میں ایک مکان ملا۔

مؤاخات میں آپ کے انصاری بھائی حضرت خارجہؓ بن زید تھے، جو بعد میں اُن کے خسر بھی ہو گئے۔ مدینے میں آنحضور ﷺ نے جو سب سے پہلی مسجد تعمیر کرائی، اُس کی زمین دو یتیم بچوں سہل اور سہیل کی ملکیت تھی۔ ہر چند کہ انھوں نے اسے خانۂ خدا کے لیے کسی صلے کے بغیر پیش کر دیا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے اس کی قیمت دلوائی۔ یہ رقم ان پانچ ہزار درہم میں سے ادا ہوئی جو حضرت ابوبکرؓ مکے سے لائے تھے۔

مسلمانوں میں ان کی مخصوص حیثیت اس سے اور نمایاں ہو گئی کہ رسولِ کریم ﷺ نے اُن کی صاحب زادی حضرت عائشہؓ سے نکاح کر لیا۔ وہ حضور ﷺ کے تمام غزوات ومشاہد میں شامل رہے اور ہمیشہ حضور ﷺ کے پہلو میں حاضر رہتے تھے۔ نازک اور پُرخطر لمحات میں حضرت ابوبکرؓ ایک چٹان کی طرح مستقل مزاج رہتے تھے اور کبھی ہمت نہ ہارتے تھے۔ رسول کریم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان حیرت انگیز اتفاق اور ہم آہنگی تھی۔ چنانچہ جب رسول اللہ ﷺ نے حُدیبیہ پر صلح کرنے اور طائف کا محاصرہ ترک کرنے کا فیصلہ کیا تو آپ ﷺ کے اِن فیصلوں پر اعتراض ہوا۔ جنھیں اس رائے سے اختلاف تھا، اُن میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے بلا تامّل اور پورے خلوص کے ساتھ ان فیصلوں کی تائید کی۔ یہ حضرت ابوبکرؓ ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے اس مُہم کی حقیقی غرض وغایت کو جان لیا جو 8۔ ہجری/630ء میں فتح مکہ پر منتج ہوئی۔ بالفاظِ دیگر وہ رسول اللہ ﷺ کے مشیرِ خاص تھے۔ سرایا میں سے چند ایک اُن کی امارت میں سرانجام پائے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر صُلح نامے پر مسلمانوں کی طرف سے آنحضور ﷺ کے بعد سب سے پہلا نام آپؓ ہی کا تھا۔ رمضان 8 ہجری میں مکہ فتح ہوا۔ اس موقع پر جب آنحضور ﷺ شہر میں داخل ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ بھی حضور ﷺ کے ساتھ قصوا نامی اونٹنی پر سوار تھے۔ 9۔ ہجری میں امیرِ حج مامور ہوئے۔ آنحضور ﷺ کی آخری بیماری کے دوران میں آپ نے مسجد نبوی میں نماز کی امامت کی۔

آنحضور ﷺ کی وفات کا دن نوزائیدہ اسلامی ریاست کے لیے ایک نازک دن تھا۔ انصارِ مدینہ نے اپنے میں سے کسی کو امیر بنانے کے لیے صلاح ومشورہ شروع کر دیا، لیکن حضرت عمرؓ اور بعض دیگر صحابہؓ نے اُنھیں حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کرنے پر آمادہ کر لیا۔ انھوں نے ''خلیفۃ رسول اللہ ﷺ'' یعنی رسول اللہ کا نائب کا لقب اختیار کیا اور چند روز بعد مدینے کے وسط میں ایک مکان میں منتقل ہو گئے۔

زمامِ خلافت سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے اُسامہ بن زیدؓ کے سریے کا معاملہ سامنے آیا۔ 8۔ ربیع الاول 11 ہجری کو جمعرات کے دن آنحضور ﷺ نے دستِ مبارک سے پرچم حضرت اسامہؓ کے ہاتھ میں دیا تھا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس لشکر میں اُن کے ساتھ بھیجا تھا۔ رسولِ کریم ﷺ کی وفات کی وجہ سے یہ مہم رُکی رہی۔ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو فتنۂ ارتداد اور مدعیانِ نبوت کی سرکشی کی وجہ سے صحابہ کرامؓ نے رائے دی کہ یہ مہم ملتوی کر دی جائے، لیکن حضرت ابوبکرؓ اس کام کو روکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، جس کا آغاز خود رسول کریم ﷺ نے کیا تھا۔ اس لیے صحابہؓ کی رائے کے خلاف، جن میں حضرت علیؓ بھی تھے، آپ نے کہا: ''بخدا، اگر

مدینہ اس طرح آدمیوں سے خالی ہو جائے کہ درندے آ کر میری ٹانگ کھینچ لیں، تب بھی اس مہم کو نہیں روک سکتا، جس کے بھیجنے کا رسول اللہ نے فیصلہ فرمایا ہے۔'' چنانچہ آپ نے یہ مہم روانہ کر دی۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا زمانہ، جو دو سال تین ماہ گیارہ روز تک رہا، زیادہ تر ارتداد کی تحریک سے نپٹنے میں گزرا۔ اتنی مختصر سی مدت میں ایسے عظیم الشان کارنامے انجام پائے، جن پر اسلام کی تاریخ کو ناز ہے۔ یہ تحریک عرب مورخین کے نزدیک ابتدا میں ایک مذہبی تحریک تھی، لیکن عہد حاضر کے یورپی ارباب علم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ تحریک حقیقت میں سیاسی تھی۔ اغلب یہ ہے کہ اس کی دونوں حیثیتیں تھیں۔ مدینہ ایک ایسے معاشرتی اور سیاسی نظام کا مرکز بن گیا تھا، جس کا ایک جزو لاینفک مذہب بھی تھا، لہٰذا یہ بات ناگزیر تھی کہ اس نظام کے خلاف جو ردِعمل پیدا ہو، وہ مذہبی رنگ اختیار کر لے۔ اس ردِعمل کے پیچھے بڑے بڑے مرکز تھے۔ ان میں سے چار مرکزوں میں تحریک کے قائدین مذہبی کردار کے حامل تھے، جنھیں عام طور پر ''جھوٹے نبی'' کہا جاتا ہے، یعنی یمن کا اسود عنسی، یمامہ کے قبیلہ حنفیہ میں مسیلمہ، اسد اور غطفان کے قبیلوں میں طلیحہ، قبیلہ تمیم کی کاہنہ سجاح، ارتداد کی صورتیں ہر مقام پر وہاں کے حالات کے مطابق مختلف تھیں۔ ان میں بنیادی طور پر مدینے کو محاصل بھیجنے اور مدینے کے بھیجے ہوئے عاملوں کا حکم ماننے سے انکار بھی شامل تھا۔ یمن میں ارتداد کی تحریک رسول کریم ﷺ کی رحلت سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی اور جب حضرت ابوبکرؓ مسندِ خلافت پر بیٹھے تو قیس بن مکشوح اسود عنسی کی جگہ لے چکا تھا۔ جن دنوں مسلمانوں کا بڑا لشکر اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ملک شام کو گیا ہوا تھا، تو بعض نواحی قبائل نے مدینے پر حملہ کرنے کی کوشش کی، لیکن بالآخر ذوالقصہ کے مقام پر انھیں شکست ہوئی۔ اسلامی لشکر شام کی مُہم سے واپس آ گیا تو خالد بن ولید کے زیرِ قیادت ایک بڑی فوج باغیوں کے مقابلے کے لیے بھیجی گئی۔ سب سے پہلے طلیحہ کو بزاخہ کی لڑائی میں شکست دی گئی اور اس علاقے کو از سرِ نو اسلام کا مطیع بنایا گیا۔ اس کے بعد جلد ہی قبیلہ تمیم نے سجاح کا ساتھ چھوڑ دیا اور حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت اختیار کر لی۔

ارتداد کی اہم ترین لڑائی جنگِ یمامہ تھی جو عقربا کے مقام پر لڑی گئی، جسے طرفین کے مقتولین کی کثرت کی وجہ سے ''حدیقۃ الموت'' (موت کا باغ) کہا جاتا ہے۔ یہ لڑائی ربیع الاول 12 ہجری، مئی 632ء میں لڑی گئی یہاں مسلمانوں کے سب سے خطرناک دشمن مسیلمہ نے شکست کھائی۔ وہ مارا گیا اور وسطی عرب کا علاقہ دوبارہ اُن کے زیرِ نگیں آ گیا۔ ازاں بعد خود خالد تو عراق کی طرف کوچ کرنے سے پہلے یمامہ میں امن قائم کرتے رہے اور ماتحت سپہ سالاروں کو ضمنی مہموں پر بحرین اور عمان کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ یمن اور حضرموت میں مرتدوں کو ایک اور سپہ سالار مہاجر بن ابی امیہ نے شکست دی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسیر سرداروں کے ساتھ نہایت نرمی اور ملاطفت کا سلوک کیا اور ان میں سے اکثر دینِ اسلام کے سرگرم حامی اور مؤید بن گئے۔ روایات سے پتا چلتا ہے کہ ارتداد کی تحریک 11 ہجری کے اختتام یعنی مارچ 633ء سے پہلے پہلے دبا دی گئی تھی۔

شام کی طرف جانے والی شاہ راہ پر رسول کریم ﷺ نے جس پیمانے پر لشکر کشی کی، اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ﷺ نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ عرب قبائل میں امن قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب کے سب حلقہ اسلام میں آ جائیں۔ حضرت ابوبکرؓ بھی جنگی اہمیت کے اِس نکتے سے بخوبی آگاہ تھے، چنانچہ اپنی خلافت کے ابتدائی دنوں میں اس امر کے باوجود کہ عرب میں بغاوتیں پھوٹ پڑنے کا خطرہ لاحق تھا، وہ رسول کریم ﷺ کی تجویز کے مطابق اسامہ بن زیدؓ کی سرکردگی میں ملکِ شام کی طرف ایک بڑی فوج بھیجنے کے ارادے پر جمے رہے۔ پھر جب وسطی عرب میں مسیلمہ کا خطرہ دُور ہو گیا تو خالد بن ولید کو عراق کی طرف بھیجنے میں ذرا بھی توقف سے کام نہیں لیا گیا۔ اس طرح حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں ''ملکوں کی عظیم فتح'' کا آغاز ہوا۔

حضرت ابوبکرؓ کی وفات کے وقت صورتِ حال بظاہر یہ تھی کہ خالد بن ولیدؓ بنو بکر بن وائل کے ایک لشکر کے ساتھ مل کر، جو مثنیٰ کی قیادت میں تھا، عراق میں پیش قدمی کر رہے تھے اور حیرہ کا قدیم شہر اُن کی زد میں آ گیا تھا۔ لیکن اس شہر کے لوگوں نے ساٹھ ہزار درہم دے کر امان پائی۔ پھر مثنیٰ تو اسی محاذ پر رکے رہے، لیکن خالدؓ نے دمشق کی طرف اپنی شہرہ آفاق یلغار کی اور اُن تین اسلامی دستوں سے جا ملے جو یزید بن ابی سفیان، شرجیل بن حسنہ اور عمرو بن العاص کے زیرِ قیادت فلسطین میں کام یابی سے لڑتے رہے تھے، لیکن اب ایک اپنے سے بڑے بوزنطی (رومی) لشکر کے مقابلے میں دب رہے تھے۔ مسلمانوں کی متحدہ افواج نے جمادی الاول کے آخر (جولائی 634ء) میں یروشلم اور غزہ کے درمیان اجنادین کے مقام پر دشمن کو شکست دی۔ اسی طرح ایرانی سلطنت میں اسلام کی توسیع و اشاعت کا آغاز بھی حضرت ابوبکرؓ ہی نے کیا، لیکن پھر بھی ان کی زیادہ تر توجہ شام ہی پر مرکوز تھی۔ یہ بات واضح نہیں کہ کس مرحلے پر ان ملکوں میں محض تاخت و تاراج کرنے کی بجائے انھیں فتح کر لینے کا فیصلہ کیا گیا۔

حضرت ابوبکرؓ پندرہ روز علیل رہ کر منگل کی رات 22 جمادی الآخر 13 ہجری بمطابق 23۔ اگست 634ء کو فوت ہوئے اور رسول کریم ﷺ کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ مصری مؤرخ محمود العقاد کے الفاظ میں: ''وہ زندگی اس دُنیا کو خیر باد کہہ گئی شرف و مجد اور تاریخ کا ہر کمال طے کر چکی تھی۔''

قرآن مجید ابتدائے عہدِ نبوت ہی سے اہتمام کے ساتھ لکھا جاتا تھا اور اس کی ترتیب بھی حضور ﷺ تلقین الٰہی کے مطابق قائم کرتے جاتے تھے اور فرما دیا کرتے تھے کہ فلاں آیت کو فلاں جگہ رکھو۔ اس کے لکھنے والوں میں عثمانؓ، علیؓ، خالدؓ بن سعید، ابانؓ بن سعید، علاؓ بن حضرمی، اُبیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن سعد، معاویہؓ بن ابی سفیان، حنظلہؓ وغیرہ تھے اور بہت سے صحابہؓ پورے قرآن کے حافظ بھی تھے۔ قرآن مجید چمڑے کے اوراق، شانے کی چوڑی ہڈیوں اور کھجور کی چھال پر لکھا ہوا اور حُفاظ کو اس کی ترتیب بھی یاد تھی۔ حضرت عمرؓ کی تحریک سے حضرت ابوبکرؓ نے پورے

قرآن مجید کو ایک مجموعے میں پھر سے لکھوا کر محفوظ کر لیا اور حضرت ابوبکرؓ کے ارشاد کے مطابق زیدؓ بن ثابت نے شہادتیں لے لے کر قرطاس پر ایک کتاب کی صورت میں لکھا۔ الکتاب کی یہ کاغذی صورت، جو عہد نبوی ﷺ کے مسودات کے مطابق اور حفاظ کی مستند شہادتوں کے ساتھ مرتب ہوئی تھی، حضرت ابوبکرؓ کی زندگی تک آپ کے پاس، پھر حضرت عمرؓ کے پاس، پھر ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس سرکاری نسخے کی حیثیت سے محفوظ رہی۔

حضرت ابوبکرؓ اُن ممتاز، متموّل اور ذی اثر لوگوں میں سے تھے جن سے مسلمانوں کو اخلاقی اور مادی دونوں طرح کی امداد ملی۔ اخلاقی امداد میں اشاعتِ اسلام اُن کا نہایت نمایاں کارنامہ ہے۔ ایسے وقت میں، جب کہ اسلام کی دعوت دینا حد درجہ خطرناک کام تھا، آپ نے سعدؓ بن ابی وقاص، عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح، عثمانؓ بن مظعون، ابوسلمہؓ، ابن عبدالاسدؓ اور خالدؓ بن سعید بن العاص جیسے لوگوں کو اسلام کے آستانے پر لا کھڑا کیا۔ یہ تمام حضرات مہاجرین اوّلین میں بھی سبقت اسلامی کے لحاظ سے بالکل ابتدائی صف میں تھے۔ گھر والوں پر آپ کا یہ اثر پڑا کہ والدہ اور والد بیعت سے مشرف ہوئے۔ آپ کے غلام عامرؓ بن فہیرہ نے بھی ابتدا ہی سے اسلام قبول کر لیا۔ اولاد میں حضرت اسماؓ اور عبداللہؓ بہت ہی قدیم الاسلام ہیں۔ اخلاقی امداد کے سلسلے میں اُن کا ایک کارنامہ خود نبی کریم ﷺ کی حفاظت ہے۔ مادی امداد میں وہ سرگرمی تھی جس نے سات صحابہ کبار (بلالؓ، عامرؓ بن فہیرہ، زنیرہؓ، اُن کی صاحب زادی نہدیہؓ، جاریہؓ بنت مومّل، امِ عبیسؓ اور لبینہؓ) کو اپنے پاس سے رقم ادا کر کے نجات دلائی۔ قبولِ اسلام کے وقت آپ کی تجارت میں چالیس ہزار درہم کا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ اُن میں سے 35 ہزار درہم مکے ہی میں اسلام پر صرف کر دیے اور باقی پانچ ہزار مدینے پہنچ کر، اور اس عرصے میں مزید جو روپیہ کمایا، وہ بھی سب کا سب محتاجوں کی مدد کے علاوہ اسلام کی راہ پر قربان کرنے کی سعادت حاصل کی۔ چنانچہ وفات کے وقت آپ کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ان دقیع اخلاقی اور مالی امدادوں کا اعتراف خود آنحضور ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں اس طرح فرمایا ہے: ''رفاقت اور مال میں مجھ پر سب سے بڑا احسان ابوبکرؓ کا ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ کا شجاعت وثبات میں بھی بڑا مقام ہے۔ تمام جنگوں میں آپؓ شانہ بشانہ آنحضور ﷺ کے ساتھ رہے۔ صحابہؓ کہتے ہیں ہم میں سے سب سے زیادہ جری وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضور ﷺ کے سب سے زیادہ قریب ہوتا تھا، کیوں کہ دشمنوں کا سب سے زیادہ زور آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ہوا کرتا تھا۔ غزوہ بدر میں حضرت ابوبکرؓ سے زیادہ کوئی شخص آنحضور ﷺ کے قریب نہ تھا۔ انھیں اس غزوے میں یہ امتیاز حاصل تھا کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ عریش کے اندر موجود تھے۔ غزوۂ اُحد میں اتفاقی طور سے کچھ وقت کے لیے لڑائی کا پانسا پلٹ جانے کے سبب بڑے بڑے جاں بازوں کے قدم اکھڑ گئے تھے، لیکن جو بارہ صحابیؓ آنحضور ﷺ کے پہلو میں پہاڑی پر موجود تھے، اُن میں ایک ابوبکرؓ تھے۔ ابوسفیان نے میدان خالی دیکھ کر سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر آواز دی، کیا محمد ﷺ موجود ہیں۔ جب آنحضور ﷺ ہی کی ہدایت کے مطابق جواب نہ ملا تو تین بار ابوبکرؓ کا نام پکارا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ کفار آنحضور ﷺ کے بعد ابوبکر صدیقؓ کو رئیسِ امت سمجھتے تھے۔ غزوہ ہوازن میں دشمنوں کی سخت تیراندازی کی بدولت لشکرِ اسلام میں ابتری پیدا ہوئی تو ان چند جاں بازوں میں جو آنحضور ﷺ کے پاس تھے، حضرت ابوبکرؓ بھی تھے۔

قرآن، حدیث اور فقہ کے غیر معمولی فہم وفراست کے علاوہ انھیں خطابت، شاعری، انساب اور تعبیر خواب میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ عہدِ اسلام میں آپ نے شعر کہنے چھوڑ دیے تھے۔ تاہم رسول کریم ﷺ کی وفات پر آپ نے تین مرثیے کہے جو ''طبقات ابن سعد'' میں منقول ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے زُہد وورع کا یہ عالم تھا کہ اپنا سارا مال راہ خدا میں لٹا دیا اور ایامِ خلافت میں بیت المال سے ضروریات کے لیے جو رقم لی، اُس کا اندازہ خود آپ کے اِن الفاظ سے ہو سکتا ہے: ''ہم نے مسلمانوں کے کھانے میں سے چونی بھوسی استعمال کی اور اُن کے موٹے جھوٹے کپڑوں سے تن ڈھانکا۔ مسلمانوں کے مالِ غنیمت میں سے ہمارے پاس تھوڑا یا بہت کچھ نہیں ہے۔'' قبولِ اسلام کے وقت وہ ہزاروں کے مالک تھے، لیکن بعدِ اسلام اُن کی جان نبی کریم ﷺ کے قدموں میں تھی اور مال اسلام کی ضرورتوں کے لیے وقف۔ اس کا مصرف آپ کی ذات اور اہل وعیال نہ تھے۔ غزوۂ تبوک پیش آیا تو وہ زمانہ بڑی ہی عُسرت اور تنگی کا تھا، لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور گھر کا سارا اثاثہ لا کر آنحضور ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا اور اس سوال پر کہ اپنے اور اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑا، فرمایا: ''اللہ اور اُس کا رسول ﷺ''۔ عمل بالقرآن کی فکر انھیں ہمہ وقت رہتی تھی۔ رسولِ کریم ﷺ کی محبت کے ساتھ ساتھ آپ کو اہلِ بیت سے بھی محبت کا گہرا تعلق تھا۔ وہ اپنے اعزہ و اقارب پر انھیں ترجیح دیتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ نے پانچ شادیاں کیں۔ 1 مکی قبیلہ عامر کی قتیلہ بنتِ عبدالعزیٰ سے، جن سے عبداللہؓ اور اسما پیدا ہوئے۔ اسما کی شادی زبیرؓ بن عوام کے ساتھ ہوئی۔ یہ مسلمان نہیں ہوئیں اور انھوں نے علیحدگی اختیار کر کے مکہ میں دوسری شادی کر لی۔ ایک موقع پر اپنے خاوند کے ہم راہ مدینے بھی گئی تھیں۔

2۔ قبیلہ کنانہ کی اُمّ رومان بنت عمر بن عامر، جن سے عبدالرحمٰن اور حضرت عائشہؓ پیدا ہوئے۔ یہ اُمّ رومان کی دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی طفیل بن سنجرہ سے ہوئی تھی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ عبداللہ اِس شادی سے پیدا ہوئے اور اس طرح وہ حضرت عائشہؓ کے اخیافی بھائی تھے۔

3۔ امّ بکر، جو قبیلہ کلب سے تھیں۔ نہ مسلمان ہوئیں نہ ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مدینہ گئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں طلاق دے دی تھی۔

4۔ قبیلہ خثعم کی اسما بنت عمیس، جن سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ حضرت جعفرؓ کی

شہادت (8 ہجری) کے بعد حضرت ابو بکرؓ سے شادی ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔

5۔ مدنی خاندان حارث بن خزرج کی حبیبہ بنت خارجہ، جن سے حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد امّ کلثوم پیدا ہوئیں۔

آخری دو شادیاں اُن کی زندگی کے آخری دور میں ہوئیں۔ پہلی دو شادیاں غالباً ایک ہی زمانے میں ہوئیں، کیوں کہ عبدالرحمٰن اُن کے سب سے بڑے بیٹے تھے، لیکن مدینے کی طرف ہجرت میں صرف ایک بیوی اُمّ رومان اُن کے ساتھ تھیں۔ حضرت ابو بکرؓ کے والد اور والدہ دونوں صحابیؓ تھے اور یہ آپ کی خصوصیت ہے کہ آپ کے خاندان کی چار پشتوں نے عہدِ رسالت دیکھا اور رسول کریم ﷺ کا فیضِ صحبت پایا۔

ابو بکرہؓ

پورا نام نفیع بن مسروح۔ ابو بکرہ لقب۔ حبشی تھے اور پہلے طائف میں ثقیف کے غلام تھے۔ 8 ہجری میں جب رسولِ کریم ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا تو ابو بکرہؓ ایک گھرنی کے ذریعے اتر کر مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور آنحضور ﷺ نے انھیں آزاد کر دیا۔ اسی لیے یہ اپنے آپ کو ''عتیق النبی'' کہتے تھے۔ بعدازاں طبابت کا پیشہ اختیار کیا۔ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد یمن میں قیام کیا اور بصرہ کی تاسیس میں حصّہ لیا، جہاں وہ سکونت پزیر ہو گئے تھے۔ 51 ہجری/671ء میں انتقال ہوا۔ حضرت عمرؓ نے مغیرہ بن شعبہ کے خلاف قذف کی شہادت کے سلسلے میں انھیں کوڑے لگوائے۔ اس کے بعد انھوں نے سیاست میں کوئی حصّہ نہ لیا۔ چنانچہ جنگِ جمل میں بھی علیحدگی اختیار کی، اور محض اُن زمینوں کی کاشت میں مصروف رہے جو انھیں حضرت عمرؓ نے دی تھیں اور حدیث روایت کرتے رہے، جس میں انھیں علمائے حدیث امام بخاری، مسلم اور ابوداؤد وغیرہم نے معتبر اور ثقہ تسلیم کیا ہے۔

ابو جندل بن سہیلؓ

اصل نام عاص۔ کنیت ابو جندل۔ ان کے والد سہیلؓ بن عمرو رؤسائے قریش میں سے تھے۔ وہ جس قدر اسلام کی مخالفت میں سرگرم تھے، اُسی قدر اُن کی اولاد اسلام کی سوالہ وشیدا تھی۔ ابو جندل کو اُن کے والد نے قبولِ اسلام کے جُرم میں یہ سزا دی کہ اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر قید خانے میں ڈال دیا، جہاں وہ کئی سال قید و بند کی سختیاں جھیلتے رہے، یہاں تک کہ حضور ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے گئے اور بدر، ''اُحد'' اور ''احزاب'' کے معرکے بھی گزر گئے۔

''حدیبیہ'' کے موقع پر ابو جندلؓ کے والد سہیل بن عمرو مشرکین مکہ کے نمائندے تھے اور مسلمانوں کی جانب سے حضرت علیؓ کو معاہدہ لکھنے کا حکم دیا گیا۔ معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ اہلِ مکہ میں سے جو شخص بھاگ کر مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا، خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، مسلمانوں کو اُسے قریش کے پاس واپس بھیجنا ہوگا اور اگر کوئی مسلمان اہلِ مکہ کے قبضے میں آ جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

مسلمانوں کو یہ شرط بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ انھیں یہ شرط منظور نہ تھی، لیکن سہیل بن عمرو کا اصرار تھا کہ یہ شرط ضرور لکھی جائے۔ ابھی فریقین میں یہ بحث جاری تھی کہ عین اُس وقت ابو جندلؓ کسی طرح قید خانے سے نکل کر گرتے پڑتے حدیبیہ آ پہنچے۔ اُن کے ٹخنوں اور پنڈلیوں سے خون رس رہا تھا۔ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور وہ مسلمانوں سے فریاد کر رہے تھے کہ ''مسلمانو! دیکھو اسلام لانے کے جرم میں کافروں نے مار مار کر میرا کیا حال کر رکھا ہے۔ کیا تم مجھے اسی حال میں چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟ کیا تم لوگ مجھے ایک بار پھر اُن ظالموں کے حوالے کر دو گے؟''

یہ ایسا دل دوز منظر تھا کہ بہت سے صحابہ کرامؓ کے لیے بھی ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ انھوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ کیا آپ اللہ کے سچے رسول نہیں ہیں؟

''بے شک، میں اللہ کا رسول ہوں''

''کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟''

''ہم یقیناً حق پر ہیں''

''پھر یارسول اللہ، ہم ایسی ذلّت آمیز شرائط کیوں مانیں؟''

''میں اللہ کا رسول ہوں، اور اُس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا''

''کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے''

''ضرور کہا تھا، مگر یہ تو نہیں کہا تھا کہ اسی سال کریں گے۔''

آنحضور ﷺ نے حضرت ابو جندلؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''ابو جندلؓ! صبر کرو۔ ہمارے طرزِ عمل کا نتیجہ بہت جلد ظاہر ہونے والا ہے۔ اللہ تمھارے اور دوسرے مظلوم انسانوں کے لیے کوئی راستہ پیدا کر دے گا۔'' غرض ابو جندلؓ اسی طرح پابہ زنجیر اُن کے والد سہیل بن عمرو کے حوالے کر دیئے گئے اور صلح نامہ حدیبیہ پر دستخط ہو گئے۔ آنحضور ﷺ عمرہ کیے بغیر ہی صحابہؓ کے ہم راہ عازمِ مدینہ ہوئے اور بارگاہِ الٰہی سے ارشاد ہوا: ''إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا'' (اے رسول، ہم نے تمھیں فتح مبین عطا کی)۔ یہ آیت دراصل اُن فتوحات اور کامرانیوں کی نوید تھی جو مسلمانوں کو آیندہ حاصل ہونے والی تھیں، ورنہ اکثر صحابہؓ سمجھ رہے تھے کہ انھوں نے دب کر صلح کی ہے۔ بعدازاں جب یہ شرط قریش کی درخواست پر منسوخ ہوئی تو حکمِ نبوی ﷺ کے مطابق ابو جندلؓ مدینہ چلے آئے۔ مدینہ آنے کے بعد حضرت ابو جندلؓ نے فتحِ مکہ، حنین، طائف اور تبوک وغیرہ تمام غزوات میں حضور ﷺ کی رفاقت کا شرف حاصل کیا۔ وہ حضور ﷺ کے وِصال تک مدینہ ہی میں رہے اور عہدِ صدیقی بھی یہیں گزارا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں شام جانے والے مجاہدین میں شامل ہو گئے اور رومیوں کے خلاف متعدد معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ 18 ہجری میں طاعون کی وبا پھیلی تو دوسرے ہزاروں مجاہدین کی طرح ابو جندلؓ بھی اُس کی لپیٹ میں آ گئے اور گھر سے سیکڑوں میل دُور میدانِ جہاد میں وفات پائی۔

ابو حذیفہؓ بن عتبہ

ہشیم نام، ابو حذیفہ کنیت، والد کا نام عتبہ بن ربیعہ بن عبد شمس بن عبد مناف۔

والدہ کا نام اُمِ صفوان تھا۔ اُن کے والد عتبہ ذی اثر رُؤسائے قریش میں سے تھے، جنھوں نے اسلام کی مخالفت میں اپنی پوری طاقت صَرف کر دی تھی۔ لیکن اُن کے فرزند ابوحذیفہؓ نے اُس وقت اسلام قبول کیا تھا جب ابھی رسولِ کریم ﷺ دارِارقم میں داخل نہ ہوئے تھے۔ ابوحذیفہؓ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ اُن کی بیوی سہلہ بنت سہیلؓ بھی رفیقِ سفر تھیں۔ محمد بن ابی حذیفہؓ حبش ہی میں پیدا ہوئے تھے۔

حبشہ سے مکہ واپس آئے۔ یہاں ہجرت کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اپنے غلام حضرت سالمؓ کو ساتھ لے کر مدینہ پہنچے اور حضرت عبادؓ بن بشر کے مہمان ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے ان دونوں میں مُواخات کرا دی۔ عہدِ نبوی ﷺ کے تمام اہم غزوات میں شریک ہوئے۔ خصوصاً ''غزوۂ بدر'' میں۔ کیسا عبرت انگیز منظر تھا کہ ایک طرف سے اُن کے والد اور دوسری طرف سے یہ جو ہر شجاعت دکھا رہے تھے۔ آنحضور ﷺ کی وفات کے بعد عہدِ صدیقیؓ میں مُسیلمہ کذّاب نے یمامہ میں علَمِ نبوت بلند کیا۔ مدینہ سے جو فوج اُس کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوئی، اُس میں آپ شریک ہوئے اور 54 سال کی عمر میں شہادت پائی۔

حضرت ابوحذیفہؓ نے تین شادیاں کیں۔ بیویوں اور اولاد کے نام یہ ہیں: سہلہؓ بنت سہیل، آمنہ بنت عمرو، ثبیتہ انصاریہ۔ محمد بن ابی حذیفہؓ حضرت سہلہؓ کے بطن سے حبش میں پیدا ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ امیر معاویہؓ کے حامیوں کے ہاتھ سے مصر میں قتل ہوئے۔ عاصم بن ابی حذیفہؓ حضرت آمنہ بنت عمروؓ سے پیدا ہوئے۔ حضرت سالمؓ حضرت ثبیتہ کے غلام تھے۔ اُنھوں نے انھیں آزاد کر دیا تو حضرت ابوحذیفہؓ نے اپنا متبنّٰی بنالیا۔ چنانچہ وہ عموماً سالم بن ابی حذیفہؓ کے نام سے مشہور تھے۔

ابوحمید ساعدیؓ

نام عبدالرحمٰن، کنیت ابوحمید، قبیلہ خزرج کے خاندان ساعدہ سے تعلق ہے۔ ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ غزوۂ اُحد اور بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ اُن کے سلسلے سے 26 احادیث مروی ہیں۔ روایتِ حدیث میں سخت محتاط تھے۔ ایک مرتبہ رسولِ کریم ﷺ کی ایک حدیث بیان کی تو فرمایا: ''یہ واقعہ میرے کانوں نے سُنا اور میری آنکھوں نے دیکھا۔ اسے زیدؓ بن ثابتؓ سے پوچھ سکتے ہو۔'' اس کا سبب جیسا کہ ابوحمید ساعدیؓ کی حدیث سے ثابت ہے: ''آنحضرت ﷺ نے فرمایا، جب تم کسی سے میری کوئی حدیث سُنو تو یہ دیکھو، تمھارا دل کیا گواہی دیتا ہے۔ اگر دل بول اُٹھے، نفس نرم ہو جائے اور عقلِ صحیح تسلیم کرنے تو میرا کلام ہونے میں کچھ شک نہیں، اور اگر دل کراہیت کرے، طبیعت متنفر ہو اور بعید از قیاس معلوم ہو تو میرا قول ہرگز نہیں ہو سکتا۔''

آنحضور ﷺ کی یہ حدیث درحقیقت احادیث پرکھنے اور جانچنے کی کسوٹی ہے۔ حضرت ابوحمید ساعدیؓ کے تمام اوصاف میں خدمتِ رسول ﷺ زیادہ نمایاں ہے۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں خالص دودھ ٹھنڈا کر کے پیالے میں لے کر آئے، لیکن پیالہ کھلا ہوا تھا۔ اس پر آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''دودھ ڈھانپ کر لاتے، خواہ لکڑی ہی رکھ کر۔'' حضرت ابوحمیدؓ کو رسول اللہ ﷺ کی نماز اچھی طرح یاد تھی۔ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ کے مجمع میں انھوں نے کہا: ''مجھے رسول اللہ ﷺ کی نماز تم سب سے زیادہ یاد ہے۔'' انھوں نے حضرت امیر معاویہؓ کے آخر عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

ابودجانہؓ انصاری

نام سماک، کنیت ابودجانہؓ، قبیلہ ساعدہ سے ہیں۔ سعد بن عبادہ سردار خزرج کے ابن عم ہیں۔ انھوں نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کیا۔ آنحضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو عتبہ بن غزوان سے اُن کی مواخات قائم کی۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ غزوۂ اُحد میں آنحضور ﷺ نے ایک تلوار ہاتھ میں لے کر کہا، کون ہے جو اس کا حق ادا کرے۔ ابودجانہؓ بولے، میں ادا کروں گا۔ حضرت ابودجانہؓ نے حسبِ معمول سر پر سُرخ پٹی باندھی اور اکڑتے ہوئے صفوں کے درمیان آ کر کھڑے ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا، یہ چال اگرچہ اللہ کو ناپسند ہے، لیکن ایسے موقع پر کوئی حرج نہیں۔ معرکے میں نہایت پامردی سے مقابلہ کیا اور بہت سے کافر قتل کیے اور رسولِ کریم ﷺ کی حفاظت میں بہت سے زخم کھائے لیکن میدان سے نہ ہٹے۔

آنحضور ﷺ ابودجانہؓ کی اِس جاں بازی سے نہایت خوش ہوئے۔ مکان پر تشریف لائے تو حضرت فاطمہؓ سے فرمایا، میری تلوار دھو ڈالو۔ حضرت علیؓ نے بھی آ کر یہی خواہش کی اور کہا، آج میں خُوب لڑا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم خوب لڑے تو سہل بن حنیف اور ابودجانہؓ بھی خوب لڑے۔''

غزوہ بنونضیر کا کل مال واسباب رسولِ کریم ﷺ کا حصہ تھا۔ تاہم آپ ﷺ نے چند مہاجرین اور انصار کو اس میں سے حصّہ عنایت فرمایا تھا۔ ابودجانہؓ کو بھی زمین دی تھی جو انھی کے نام سے مال ابن خرچہ مشہور تھی۔

حضرت ابودجانہؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں جنگِ یمامہ میں نہایت جاں بازی دکھائی۔ مدعی نبوت مسیلمہ کذاب سے مقابلہ تھا۔ وہ اپنے باغ کے اندر سے لڑ رہا تھا۔ مسلمان باغ میں داخل ہونا چاہتے تھے، لیکن اونچی دیوار حائل تھی۔ ابودجانہؓ تھوڑی دیر تک دیکھتے رہے۔ اس کے بعد کہا: ''مسلمانو، مجھے باغ میں پھینک دو۔'' اس طرح وہ اگرچہ دیوار پھاند گئے، لیکن پاؤں ٹوٹ گیا۔ تاہم وہ مشرکین سے دروازہ روکے کھڑے رہے اور جب تک مسلمان باغ میں داخل نہ ہو گئے، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ مسلمان باغ کے اندر پہنچ کر جوش وخروش سے لڑنے لگے۔ اگرچہ ابودجانہؓ کا پاؤں ٹوٹ چکا تھا تاہم وہ مسیلمہ کذاب کو مارنے کے لیے جھپٹے اور آخر خود بھی شہید ہو گئے۔

اگرچہ حضرت ابو دجانہؓ سے احادیث منقول نہیں، لیکن حُبِ رسول ﷺ کا اظہار غزوۂ اُحد میں ہوا۔ جس وقت تمام مجمع آنحضور ﷺ کے پاس سے منتشر ہو گیا اور صرف چند آدمی آپ کے پاس رہ گئے تھے، اُن میں دو آدمی آپ کی ڈھال بنے ہوئے تھے۔ مصعب بن عمیرؓ اور ابودجانہؓ۔ مصعب جان دے کر ہٹے اور ابودجانہ نے

کاری زخم کھا کر فدائیت کا ثبوت دیا۔ ابودجانہؓ لڑائی کے وقت سر پر سُرخ پٹی باندھتے تھے اور ناز وتکبر سے چلتے تھے۔

ابودرداؓ انصاری

نام عویمر، کنیت ابو درداؓ، قبیلہ خزرج کے خاندان عدی بن کعب سے ہیں۔ وہ آنحضور ﷺ کے ہم عصر تھے اور عُمر میں آپ ﷺ سے چھوٹے۔ انھوں نے 2 ہجری میں جنگِ بدر کے دن یا اس کے بعد اسلام قبول کیا تھا اور اس کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اپنے گھرانے میں وہ سب سے آخر میں ایمان لائے تھے (حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں صحابہؓ کے جو وظائف مقرر کیے تھے، اُن میں اُن کا وظیفہ اصحابِ بدر کے برابر تھا)۔ وہ غزوۂ اُحد میں بھی شریک تھے۔ میدان جنگ میں اُن کی جاں بازی کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''نعم الفارس عویمر'' یعنی عویمر کیا ہی اچھا سوار ہے۔

جب آنحضرت ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی تو وہ سلمان فارسیؓ کے بھائی کے طور پر منتخب ہوئے۔ اُن سے کچھ احادیث بھی مروی ہیں۔ صوفیہ انھیں ''اصحاب الصفہ'' میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے زُہد وتقوٰی کے موضوع پر بہت سے اقوال منقول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتب طبقات میں انھیں فقیہ، زاہد اور صاحبِ علم کہا گیا ہے۔ وہ دورِ اوّل میں ''حکیم الامت'' کے لقب سے معروف تھے۔ خود اُن سے یہ قول بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ ''میں ظہور اسلام سے پہلے تاجر تھا۔ دین قبول کرنے کے بعد مَیں نے دیکھا کہ تجارت عبادت میں پورے انہماک سے روکتی ہے، اس لیے مَیں نے تجارت چھوڑ دی۔'' لیکن اُن کی شہرت کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ حافظِ قرآن تھے اور قرآن کے بارے میں سند۔ اُن کا شمار اُن چند افراد میں ہوتا ہے جنھوں نے آنحضرت ﷺ کی زندگی ہی میں وحی کو جمع کیا تھا۔ آپ سے روایت شدہ چند مختلف قرأتیں قرأت کی کتابوں میں درج ہیں۔

حضرت ابو درداؓ نے آنحضرت ﷺ سے سنا تھا کہ فتنوں کی آندھی میں اللہ کا چراغ شام میں محفوظ رہے گا۔ اسی بنا پر انھوں نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے شام میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ قیامِ دمشق کے دوران میں، حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کی منظوری سے انھیں دمشق کا قاضی مقرر کیا۔ جب کبھی امیر معاویہؓ کو باہر جانے کی ضرورت پڑتی تو وہ اُن کو اپنا قائم مقام بناجاتے۔ دمشق میں قضا کا یہ پہلا عہدہ تھا۔ دمشق میں اُن کا یہ دستور تھا کہ جامع مسجد میں لوگوں کو جمع کرتے اور قرآن پاک کا درس دیتے۔ طلبہ کا درس میں اتنا ہجوم رہتا تھا کہ ایک روز شمار کرنے پر سولہ سو طلبہ حلقۂ درس میں نکلے۔ اس طرح آپ نے اُس دبستانِ دمشق کی بنا ڈالی جس کی ریاست وقیادت کا امتیاز بعد میں ابن عامر کو حاصل ہوا۔

حضرت ابو درداؓ نے 32 ہجری / 652 عیسوی میں یا اس کے لگ بھگ دمشق ہی میں وفات پائی اور وہاں کے ایک دروازے (باب الصغیر) کے قریب اُن کی اور اُن کی اہلیہ امِ الدردا کی قبریں بتائی جاتی ہیں۔ اُن کی پوری زندگی قرآن مجید اور سنت رسول اللہ کی تعلیم واشاعت میں گزری۔ انھوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی ام الدردا کبریٰ خیرہ بنت ابی حدادا اسلمی کے ساتھ اور دوسری ام الدردا صغریٰ ہجیمہ اوصابیہ کے ساتھ۔ یہ دونوں فضل وکمال میں ممتاز تھیں۔

ابوذر غفاریؓ

ان کا نام جُندب بن جنادہ تھا۔ اِن کا تعلق قبیلہ بنو غفار سے تھا۔ یہ قبیلہ کنانہ بن خزیمہ کی نسل سے تھا جو پندرھویں پشت میں رسول کریم ﷺ کے جدِ اعلیٰ تھے۔ حضرت ابوذرؓ کی ساتویں پشت میں ایک سربرآوردہ شخص غفار بن ملیل تھا۔ اُسی کے نام کی نسبت سے کنانی النسل عربوں کا یہ گروہ غفاری کہلانے لگا۔ بنو غفار کا مسکن مدینہ منورہ سے 80 میل کے فاصلے پر بدر کے نواح میں تھا۔ ان کے قریب ہی وہ کاروانی راستہ واقع تھا جو مکہ مکرمہ کو شام وفلسطین سے ملاتا تھا۔ بنو غفار بڑے مفلس لوگ تھے۔ تاہم انھوں نے مدتوں صبر وقناعت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

اسلام قبول کرنے سے پہلے بھی ابوذرؓ خدائے واحد کے پرستار تھے۔ انھیں جب حضرت محمد ﷺ کی بعثت کی اطلاع ملی تو اپنے بھائی انیس کو دریافتِ حال کے لیے مکہ بھیجا، اور کہا کہ وہ آنحضرت ﷺ سے مل کر آئے۔ انیس خود ایک مشہور شاعر تھا۔ بھائی کے حکم پر وہ مکہ آیا۔ نبی کریم ﷺ سے ملا اور پھر واپس مدینہ (یثرب) جاکر اپنے بھائی سے کہا کہ مَیں نے محمد ﷺ کو ایک ایسا شخص پایا جو نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ ابوذرؓ نے بھائی سے یہ باتیں سن کر کہا کہ صرف اتنی خبر کافی نہیں۔ میں خود جاکر حقیقتِ حال کا پتا لگاتا ہوں۔

آخر ابوذرؓ پیدل چل کر مکہ پہنچے۔ حضرت ابوذرؓ کو آنحضرت ﷺ کی شناخت نہ تھی اور وہ کسی سے دریافت بھی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ زم زم کا پانی پی کر کعبہ ہی میں لیٹ گئے۔ حضرت علی مرتضیٰؓ تشریف لائے اور حضرت ابوذرؓ کے پاس کھڑے ہوکر فرمایا کہ تم مسافر معلوم ہوتے ہو۔ ابوذرؓ نے جواب دیا، ہاں میں مسافر ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ چلو میرے ہاں رات بسر کرو۔ اِس پیش کش پر حضرت ابوذرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ ہولیے۔ تیسرے روز ابوذرؓ حضرت علیؓ کے ساتھ آنحضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے، اور عرض کیا، مجھے سمجھائیے کہ اسلام کیا ہے؟

آنحضرت ﷺ نے انھیں اسلام کی تلقین کی۔ ابوذرؓ اُسی وقت مسلمان ہو گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ابوذرؓ ابھی اس بات کو مخفی رکھو، اور اپنے وطن واپس چلے جاؤ۔ جب تمھیں ہمارے ظہور کی خبر مل جائے، تب آجانا'' حضرت ابوذرؓ نے عرض کیا: ''پہلے تو اس خیال سے اپنے آنے کا مقصد چھپایا تھا کہ دشمنوں کے ہاتھوں میں نہ پڑ جاؤں، اور سیدھا آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پہنچوں، لیکن اب کیا ڈر ہے۔ بخدا، میں تو ان دشمنوں میں اسلام کا اعلان کر کے ہی وطن جاؤں گا۔''

چنانچہ حضرت ابوذرؓ کعبہ میں آئے۔ وہاں قریش جمع تھے۔ حضرت ابوذرؓ نے سب کو سُنا کر بآوازِ بلند کلمۂ شہادت پڑھا۔ کفار نے کہا: ''مارو اس بے دین کو۔'' چنانچہ کفار اُن پر ٹوٹ پڑے اور حضرت ابوذرؓ کو نیچے گرالیا کہ حضرت عباسؓ نے دیکھ لیا

ر کہا: ''یہ تو قبیلہ غفار کا آدمی ہے جہاں تم تجارت کو جاتے اور کھجوریں لاتے ہو''۔
ں یہ سنتے ہی پیچھے ہٹ گئے۔ دوسرے دن پھر ابوذرؓ نے لوگوں کو سنا کر کلمہ پڑھا۔
گوں نے پھر مارا، اور حسب سابق حضرت عباسؓ نے اُن کی جاں بخشی کرائی۔ اس
رح دو دن تک کلمۂ حق کا اعلان کرنے اور لوگوں کی سختی برداشت کرنے کے بعد
حضرت ابوذرؓ اپنے وطن لوٹ گئے۔ آپ پہلے صحابی ہیں جنھوں نے کلمۂ اسلام بلند
واز سے پکار کر قریش سے مار کھائی اور اسلام کے لیے ہر سختی کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔

مشرف بہ اسلام ہونے کے کچھ دن بعد حضرت ابوذرؓ اپنے قبیلے بنو غفار میں
اپس تشریف لے گئے اور غزوۂ خندق تک وہیں مقیم رہے۔ گویا انھوں نے مدینہ منورہ
ہجرت فرمائی تو غزوۂ خندق کے بعد۔ یہاں آکر بھی غزوہ تبوک کے سوا انھوں نے کسی
ر غزوے میں حصہ نہیں لیا، کیوں کہ اُن کی طبیعت پر زہد اور تقشف کا غلبہ تھا۔ حضرت
بوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں تو اُن کا قیام مدینہ منورہ ہی
یں رہا، لیکن حضرت عثمانؓ کا دور آیا تو کچھ عرصے کے بعد وہ شام میں سکونت پزیر ہو
گئے، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت اسلامیہ میں ایک زبردست انقلاب کے آثار رونما
ہو رہے تھے، جس سے حضرت ابوذرؓ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ انھیں اہلِ شام
کی شان وشوکت، رئیسانہ ٹھاٹھ باٹ، اور دولت کی فراوانی پسند نہیں آئی۔ رفتہ رفتہ
انھوں نے حضرت امیر معاویہؓ پر بھی نکتہ چینی شروع کر دی، جس کی اطلاع جب
حضرت عثمانؓ کو کی گئی تو انھوں نے حضرت ابوذرؓ کو مدینے واپس بلا لیا، لیکن یہاں
آکر بھی وہ دولت اور مال وزر کے متعلق اپنے خیالات کی برابر اشاعت کرتے رہے، لہٰذا
حضرت عثمانؓ کے اشارے سے وہ مدینہ کے قریب ایک مقام الربذۃ میں خلوت نشین ہو
گئے اور یہیں 32 ہجری میں انتقال فرمایا۔ نمازِ جنازہ حضرت ابن مسعودؓ نے پڑھائی۔

حضرت ابوذر غفاریؓ بڑے زاہد و عابد، بڑے حلیم اور منکسر المزاج انسان تھے۔
اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وتقویٰ کے ساتھ ساتھ دین کا فہم بھی خوب عطا کیا تھا۔ چنانچہ کہا
جاتا ہے کہ اِس باب میں وہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے ہم پلّہ تھے۔ دولت اور اُس
کی تقسیم اور استعمال کے متعلق اُن کے نظریوں پر آج کل بالخصوص توجہ کی جا رہی ہے۔
ان سے 281 احادیث مروی ہیں، جن میں سے بخاری اور مسلم دونوں میں 31
احادیث مندرج ہیں۔ ابوذرؓ اگر چہ بدری نہ تھے لیکن حضرت عمرؓ نے اُن کا وظیفہ بھی
اصحابِؓ بدر کے برابر یعنی پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا تھا۔

ابو رافعؓ

نام اسلم، کنیت ابو رافع، آنحضور ﷺ کی غلامی کا شرف رکھتے تھے۔ ابتدا میں
حضرت عباسؓ کے غلام تھے۔ انھوں نے آنحضور ﷺ کی غلامی میں دے دیا۔
حضرت عباسؓ کے اسلام قبول کرنے کی خوشی میں آنحضور ﷺ نے انھیں آزاد کر
دیا۔ ابو رافعؓ کے اسلام قبول کرنے کے متعلق اُن کا اپنا بیان ہے: ''ایک مرتبہ مجھے
قریش نے آنحضرت ﷺ کے پاس کسی کام سے بھیجا آپ ﷺ کو دیکھتے ہی میرا
دل اسلام کی طرف ہو گیا۔ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ، اب میں واپس نہ جاؤں گا۔
آپ ﷺ نے فرمایا، میں قاصد کو نہیں روکتا اور عہد شکنی نہیں کرتا۔ فی الحال تم لوٹ
جاؤ اگر کچھ دن تک بدستور تمھارے دل میں اسلام کا جذبہ باقی رہا تو پھر چلے آنا۔''
چنانچہ اُس وقت تو وہ واپس چلے گئے، اور پھر دوبارہ حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوئے۔

لیکن بدر تک قریش کے مظالم وشدائد کے خوف سے اسلام کا اعلان نہیں کیا۔ بدر
کے بعد ہجرت کر کے مدینہ آ گئے اور آنحضور ﷺ کے ساتھ مقیم ہوئے۔ بدر کے
علاوہ اُحد، خندق وغیرہ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے حضرت
علیؓ کی امارت میں یمن کی طرف جو سریہ بھیجا تھا، اُس میں ابو رافعؓ بھی تھے۔ حضرت
علیؓ نے اپنی عدم موجودگی میں سریہ کی نگرانی اُن کے سپرد کی تھی۔

آزادی کے بعد آستانۂ نبوی ﷺ کی خدمت گزاری ترک نہ کی۔ اسی لیے
انھیں معمولات نبوی ﷺ کے متعلق بہت معلومات تھیں، جن کے لیے صحابہ کرامؓ
اُن سے استفادہ کرتے تھے۔ ابن عباسؓ اُن کے پاس ایک کاتب لے کر آتے تھے
اور سوال کرتے تھے کہ رسول اللہ نے فلاں دن فلاں موقع پر کیا کہا۔ ابو رافعؓ بیان
کرتے جاتے اور کاتب قلم بند کرتا جاتا۔ آنحضور ﷺ کے سفر میں ہم رکاب رہتے
اور خیمہ بھی نصب کرتے تھے۔ انھیں آنحضور ﷺ کے ساتھ غلامی کی نسبت بہت
محبوب تھی۔ ہمیشہ اپنے آپ کو آنحضور ﷺ کا غلام کہتے تھے۔ عمرو بن سعید بن
عاص نے مدینہ کی امارت کے زمانے میں اپنا غلام کہلوانا چاہا لیکن یہ برابر انکار کرتے
رہے، تا آنکہ سعید نے پانچ سو کوڑے لگوا کر زبردستی اپنا غلام کہلوایا۔

اسلام نے غلاموں کو ہر قسم کی ترقی کے جو مواقع عطا کیے ہیں، ابو رافعؓ اس کی
بہترین مثال تھے۔ اگر چہ یہ غلام تھے، لیکن فضل وکمال میں آزادوں کے ہم سر تھے۔
اُن سے 68 احادیث مروی ہیں۔ اُن میں سے ایک میں بخاری، اور تین میں مسلم منفرد
ہیں۔ اُن کے سرچشمۂ فضل سے سیراب ہونے والوں کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ چنانچہ
اُن کے بیٹوں میں حسن، رافع، عبیداللہ، معتمر، پوتوں میں حسن، صالح اور عام لوگوں
میں عطا بن یسار، ابو غطفان بن طریف، ابو سعید مقبری اور سلیمان بن یسار اُن کے
خوشہ چینوں میں تھے۔

ابو رہم اشعریؓ

مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری کے چھوٹے بھائی۔ نام مجدی، کنیت ابو رہم،
بڑے بھائی کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے، اور اُنھی کے ساتھ حبشہ گئے اور حضرت
جعفر طیارؓ کے ساتھ مدینہ آئے۔ یہ غزوۂ خیبر کا زمانہ تھا، مگر ابو رہم اس غزوے
میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ تاہم آنحضور ﷺ نے خیبر کے مالِ غنیمت میں اُن کا
حصہ بھی لگایا اور فرمایا، تم لوگ دُہرے مہاجر ہو۔ ایک مکہ سے حبشہ کی ہجرت، دوسری
حبشہ سے مدینہ کی ہجرت۔ اُن کی طبیعت میں ہنگامہ پسندی تھی۔ فتنہ وفساد کے زمانے
میں بہت نکلتے تھے اور حضرت ابو موسیٰ اشعری اُنھیں روکتے تھے۔

ابو رہم غفاریؓ

نام کلثوم، کنیت ابو رہم، لقب منحور۔ آنحضور ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے

بعد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ سب سے پہلے اُحد میں شریک ہوئے، اور ایک تیر سینے پر کھا کر نشانِ امتیاز حاصل کیا۔ حضور ﷺ نے زخم پر لعاب دہن لگایا۔ چوں کہ سینہ کو ''نحر'' کہتے ہیں، اس مناسبت سے لوگ اُنھیں ''منحور'' کہنے لگے۔ اس کے بعد غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے اور مالِ غنیمت میں سے آنحضور ﷺ نے اُن کو دُہرا حصّہ دیا۔ فتح مکہ میں شریک نہ ہو سکے تھے، لیکن بڑا شرف یہ حاصل ہوا کہ جب آنحضور ﷺ فتح مکہ کے لیے نکلے تو مدینہ میں اُنھیں اپنا قائم مقام بنا گئے۔ اس کے علاوہ عمرۃ القضا میں بھی یہ شرف حاصل ہوا تھا۔

حضرت ابورہمؓ طائف کے محاصرے میں بھی شریک تھے۔ واپسی کے وقت یہ واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ جب حضور ﷺ طائف سے واپسی کے بعد جعرانہ کی طرف چلے تو ابورہمؓ کی اونٹنی حضور ﷺ کی اونٹنی سے ٹکرا گئی، جس سے ابورہمؓ کے جوتے کی نوک حضور ﷺ کی ران سے رگڑ کھا گئی۔ اس خراش سے حضور ﷺ کو تکلیف ہوئی تو آپ ﷺ نے اُن کے پاؤں کو کوڑا مارتے ہوئے فرمایا: ''پاؤں ہٹاؤ، میری ران میں تکلیف ہے۔'' ابورہمؓ بہت خوف زدہ ہوئے۔ دوسری صبح آنحضور ﷺ نے اُنھیں یاد فرمایا: آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم نے مجھے تکلیف پہنچائی تھی۔ اس کے بدلے میں میں نے تمھارے پاؤں کو کوڑا مار کر ہٹایا تھا۔ اب اس کے عوض یہ بکریاں بطورِ انعام دے رہا ہوں۔'' حضرت ابورہمؓ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ کی اُس وقت کی رضامندی میرے لیے دنیا و مافیہا سے بہتر تھی۔

غزوۂ تبوک میں بھی شریک ہوئے اور آنحضور ﷺ کے ارشاد کی تعمیل میں بنوغفار کے بہت سے لوگوں کو شرکت پر آمادہ کیا۔ اتفاق سے اس مرتبہ بھی واپسی میں اُن کی اونٹنی آنحضور ﷺ کی اونٹنی کے پہلو میں تھی۔ رات کا وقت تھا۔ بار بار غنودگی طاری ہو جاتی تھی۔ اس لیے آنحضور ﷺ کی سواری سے بھڑ جانے کا خدشہ پیدا ہو جاتا تھا۔ لہٰذا جہاں ایسا موقع آتا، وہ فوراً اپنی سواری ہٹا لیتے۔ آپ کے انتقال کے بارے میں اربابِ سیر خاموش ہیں۔ البتہ کتبِ حدیث میں اُن سے دو حدیثیں مروی ہیں۔

ابوزیدؓ

نام قیس، کنیت ابوزید، لقب قاری، قبیلہ خزرج سے تعلق ہے۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ مشہور صحابی حضرت انسؓ بن مالک کے چچا تھے۔ حضرت عُمر فاروقؓ کے عہد میں جسر ابوعبید کے معرکے میں شرکت کی اور شہید ہوئے۔ یہ 15 ہجری کا واقعہ ہے۔ کوئی صلبی اولاد نہیں تھی، اس لیے حضرت انسؓ کو ترکہ پہنچا۔ حضرت ابوزیدؓ انصار کے اُن چار حفّاظ میں سے ہیں، جنھوں نے آنحضور ﷺ کی زندگی میں پورا قرآن یاد کر لیا تھا۔ اس بنا پر آج جس قدر حفاظِ قرآن موجود ہیں، اُن کا سلسلۂ روایت حضرت ابوزیدؓ تک پہنچتا ہے۔

ابوزید عمرو بن اخطبؓ

نام عمرو، کنیت ابوزید، ہجرت کے بعد اسلام قبول کیا۔ تیرہ غزوات میں شریک ہوئے۔ حُبِّ رسول ﷺ علانیہ نمایاں تھی۔ آنحضور ﷺ بھی اُن سے مُحبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جسدِ مبارک سے کُرتہ اُٹھا کر فرمایا: ''میری پیٹھ پر ہاتھ پھیرو۔'' حضرت ابوزیدؓ نے جسمِ اطہر کھجایا۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نے پانی طلب فرمایا۔ پیالے میں بال پڑا ہوا تھا۔ ابوزیدؓ نے بال جلدی سے نکالا۔ حضور ﷺ بہت خوش ہوئے۔ اُن کے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا، اسے صاحبِ جمال کر۔ چنانچہ لوگوں نے اُنھیں 94 سال کی عمر میں دیکھا، وہ بیان کرتے ہیں کہ سر اور ڈاڑھی کا ایک بال بھی سفید نہ ہوا تھا۔ وفات کے وقت عمر 120 سال تھی۔ تب سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔ عہدِ نبوت کے بعد بصرہ میں مقیم رہے اور یہیں وفات پائی۔

ابوسبرہ بن ابی رہمؓ

اِن کی والدہ برہ حضرت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں۔ اِس رشتے سے وہ حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ سابقون الاولون میں سے تھے۔ حبشہ کی دونوں ہجرتوں کا شرف حاصل کیا۔ دوسری ہجرت میں اُن کی بیوی کلثوم بنت سہیل بن عمرو بھی ساتھ تھیں۔ ہجرت نبوی ﷺ کے بعد دوسرے مہاجرین کے ساتھ حبشہ سے مدینہ آئے اور منذر بن محمد کے ہاں قیام کیا۔ آنحضور ﷺ نے مُسلمہ بن سلامہ کے ساتھ مواخات کرادی۔

مدینہ آنے کے بعد بدر، اُحد اور خندق وغیرہ، جس قدر غزوات ہوئے، سب میں شرکت کی۔ تاحیاتِ نبوی ﷺ مدینہ میں قیام رہا۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد مکہ چلے آئے۔ بدری صحابہؓ میں تنہا یہی ہیں، جنھوں نے مدینہ کا قیام ترک کر کے دوبارہ مکہ کی سکونت اختیار کی۔ مکہ ہی میں حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

ابوسعید خدریؓ

نام سعد، کنیت ابوسعید، خاندان خدرہ سے تعلق ہے۔ دادا سنان شہید کے لقب سے مشہور اور رئیسِ محلّہ تھے۔ والد مالک بن سنان نے ہجرت سے چند سال قبل ایک بیوہ سے نکاح کیا تھا۔ ابوسعیدؓ اُنھی کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہ ہجرت سے ایک برس پہلے کا واقعہ ہے۔ مدینہ میں تبلیغِ اسلام کا سلسلہ بیعت عقبہ سے جاری تھا۔ خود انصار داعی اسلام بن کر توحید کا پیغام اپنے قبیلوں کو پہنچاتے تھے۔ مالک بن سنان نے اُسی زمانے میں اسلام قبول کیا۔ شوہر کے ساتھ بیوی بھی اسلام لائیں، اس لیے حضرت ابوسعیدؓ نے مسلمان والدین کے دامن میں تربیت پائی۔

ہجرت کے پہلے برس مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر شروع ہوئی۔ حضرت ابوسعیدؓ نے تعمیر کے کاموں میں شرکت کی۔ غزوۂ اُحد میں والد کے ہم راہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ اُس وقت تیرہ برس کا سن تھا۔ آنحضور ﷺ نے سر سے پاؤں تک دیکھا، کم سن خیال کر کے واپس کیا۔ اُحد میں حضور ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا تو مالک بن سنان نے بڑھ کر خون پونچھا اور ادب کے خیال سے زمین پر پھینکنے کے بجائے پی گئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''اگر کسی کو ایسا شخص دیکھنے کی خواہش ہو جس کا خون میرے خون سے آمیز ہوا ہو تو مالک بن سنان کو دیکھے۔'' مالک بن سنان

جاں بازی سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔

حضرت ابوسعیدؓ نے غزوہ مصطلق، حدیبیہ، خیبر، فتح مکہ، حنین، تبوک میں شرکت کی۔صحیح بخاری کی روایت کے مطابق بارہ غزوات میں انھیں شرکت کا شرف حاصل تھا۔عہد نبوی ﷺ کے بعد مدینہ ہی میں قیام رہا۔حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں جنگ نہروان میں جوش وخروش سے حصہ لیا۔یزید کے مطالبۂ بیعت کے وقت جب امام حسینؓ نے مدینہ چھوڑنے کا ارادہ فرمایا تو اور صحابہؓ کی طرح حضرت ابوسعید خدریؓ نے بھی مدینہ ہی میں رہنے کا مشورہ دیا تھا، مگر امام حسینؓ نے نہ مانا۔61 ہجری میں یزید کی بداعمالیوں کی وجہ سے اہلِ حجاز نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے ہاتھوں پر، جو حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی کے فرزند تھے، بیعت کی۔حضرت ابوسعیدؓ بھی اُن میں شامل تھے۔63 ہجری میں اہلِ حرمِ رسول ﷺ نے علانیہ یزید سے فسخ بیعت کر کے حضرت عبداللہ ابن حنظلہ انصاری کے ہاتھ پر بیعت کی۔ابوسعیدؓ نے شامیوں کے مظالم سے تنگ آ کر یزید کی خلافت پر بیعت لی۔حضرت عبداللہ بن عمر کو معلوم ہوا تو اُن کے پاس جا کر باز پُرس کی کہ آپ نے دو امیروں کی بیعت کی ہے۔ آپ نے کہا، ہاں پہلے ابن زبیرؓ سے کی تھی۔پھر شامی مجھے گرفتار کر کے لے گئے اور مجبوراً یزید کی بیعت کی۔

74 ہجری میں جمعہ کے دن وفات پائی۔بقیع میں دفن کیے گئے۔وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔قرآن مجید ایک قاری سے پڑھا تھا۔حدیث وفقہ رسولِ کریم ﷺ اور صحابہؓ سے سیکھی تھی۔خلفائے راشدہ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے روایتیں کیں۔کثرت سے حدیثیں یاد تھیں۔ان کی روایات کی تعداد 1170 ہے۔اُن کا حلقہ درس ہر وقت آدمیوں سے بھرا رہتا تھا۔اگر کوئی شخص کوئی خاص سوال کرنا چاہتا تو اُسے بہت دیر سے موقع ملتا۔جس حدیث کے الفاظ پر اعتماد نہ ہوتا، اُس کے بیان میں احتیاط کرتے تھے۔

ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب

رسولِ کریم ﷺ کے عم زاد بھائی، نام مغیرہ تھا، انھیں عام طور پر ابوسفیان بن حرب بن اُمیہ کے ساتھ خلط ملط کر دیا جاتا ہے جو فتح مکہ تک اسلام کے دشمن رہے۔ ابوسفیان بن حارث بن عبدالمطلب بھی فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہوئے۔حنین اور طائف کے غزوات میں شریک رہے۔20 ہجری میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

ابوسفیان بن حرب بن اُمیہ

قریش کے ایک کنبے 'عبدشمس' کے فرد، جو مکے کے ایک ممتاز تاجر اور سرمایہ دار تھے۔اُن کا نام صخر تھا۔کنیت ابوحنظلہ تھی۔اُن کی ولادت عام الفیل سے دس سال قبل مکے میں ہوئی۔حرب فجار میں ابوسفیان اپنے والد حرب کے جھنڈے تلے لڑے تھے۔ خاندانِ عبدشمس کا سردار ہونے کی حیثیت سے ہجرت سے پہلے کے برسوں میں ابوسفیان رسول کریم ﷺ کی مخالفت میں پیش پیش تھے، لیکن اُن کی مخالفت اتنی شدید نہ تھی جتنی کہ ابوجہل کی۔

قریش کے قافلوں کی قیادت اکثر اوقات خود ابوسفیان کرتے تھے۔2 ہجری /624ء میں اُن کی قیادت میں ایک ہزار اونٹوں کا قافلہ شام سے مکے کو لوٹ رہا تھا۔ اُنھیں مسلمانوں کی طرف سے حملے کا خطرہ محسوس ہوا۔اہلِ مکہ نے ابوسفیان کی مدد کی درخواست پر ایک ہزار نفوس کا لشکر ابوجہل کی سرکردگی میں بھیجا۔ابوسفیان قافلے کو اپنی ہشیاری اور مستعدی کی بدولت مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچا لے گئے، لیکن ابوجہل مسلمانوں کے ساتھ لڑنے پر مُصر تھا۔چنانچہ وہ اہلِ مکہ پر جنگ بدر کی تباہی لانے کا موجب بنا۔ابوسفیان کے بیٹوں میں سے حنظلہ اِس جنگ میں مارا گیا اور دوسرا بیٹا عمرو گرفتار ہوا جو بعد میں رہا کر دیا گیا۔ابوسفیان کی بیوی ہند کا باپ عُتبہ بھی مارا گیا۔

جنگ بدر کا انتقام لینے کے لیے اہلِ مکہ نے جو تیاریاں کیں، اُن کے نگران بظاہر ابوسفیان ہی تھے۔اس کثیر لشکر کی سپہ سالاری، جو 3 ہجری/625ء میں مدینہ پر بھیجا گیا، غالباً موروثی حق (قیادۃ) کی بنا پر اُنھی کو دی گئی۔ابوسفیان جانتے تھے کہ جنگ اُحد کا نتیجہ قریش کے لیے تسلی بخش نہیں نکلا، لیکن صفوان بن اُمیہ نے ممکن ہے، حسد کی وجہ سے اُنھیں مدینہ کی خاص بستی پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ابوسفیان نے اُس بڑے وفاق (الاحزاب) کی تنظیم بھی کی تھی جس نے 5 ہجری میں مدینے کا محاصرہ کیا تھا۔ اس مہم کی ناکامی سے شاید ابوسفیان کی ہمت ٹوٹ گئی۔کم از کم مکے میں رسولِ کریم ﷺ کی مخالفت کی آیندہ قیادت مقابل جتھے کے حریف راہ نُماؤں صفوان بن اُمیہ، سہیل بن عمرو اور عکرمہ بن ابی جہل کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی۔

صلح حدیبیہ کے سلسلے میں ابوسفیان کا نام کہیں مذکور نہیں۔8 ہجری میں قریش اور اُن کے حلیفوں نے علی الاعلان عہد شکنی کی اور آنحضرت ﷺ کی پیش کردہ شرائط کے جواب میں معاہدہ حدیبیہ کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔بعدازاں جب قریش کو اپنے اِس فیصلے پر ندامت محسوس ہوئی تو انھوں نے ابوسفیان کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا تاکہ معاہدے کی تجدید ہو جائے، لیکن ابوسفیان کو اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی اور وہ مکے واپس آ گئے۔

جب رسولِ کریم ﷺ نے مکہ پر چڑھائی کی تو ابوسفیان اور حکیم بن حزام نے شہر سے باہر آ کر اور علی الاعلان اسلام قبول کر کے اطاعت قبول کر لی۔بارگاہ رسالت سے اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا یا ابوسفیان کے ہاں پناہ لے گا یا دروازہ بند کر لے گا یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا، اُسے امن دیا جائے گا۔اس طرح مکے کی پُرامن فتح عمل میں آئی۔

بعدازاں ابوسفیان نے غزوہ حنین اور پھر محاصرہ طائف میں شرکت کی، جس میں اُن کی ایک آنکھ جاتی رہی۔آنحضرت ﷺ نے ثقیف کا محاصرہ اٹھا کر مراجعت فرمائی اور جعرانہ پہنچ کر مالِ غنیمت تقسیم فرمایا۔اس موقع پر مکے کے اکثر نومسلم رؤسا کو، جن میں ابوسفیان بھی شامل تھے، گراں قدر عطیات ملے۔جب اہلِ طائف نے ہتھیار ڈالے تو ابوسفیان نے، جن کے اِس شہر سے خاندانی اور کاروباری تعلقات

رہے تھے، لات کا بت توڑنے میں مدد دی۔ روایت ہے کہ اُنھیں نجران اور شاید حجاز کا بھی والی مقرر کیا گیا تھا، مگر یہ امر متنازعہ فیہ ہے کہ یہ تقرر خود آنحضرت ﷺ نے کیا تھا یا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے۔

جنگ یرموک (15 ہجری/636ء) میں ابوسفیان شامل تھے، لیکن بظاہر اس لڑائی میں انھوں نے جوانوں کو ہمت دلانے سے زیادہ اور کچھ کام نہیں کیا ہوگا، کیوں کہ اُس وقت اُن کی عمر ستر سال کے قریب تھی۔ اس جنگ میں اُن کی دوسری آنکھ بھی جاتی رہی۔ انھوں نے 32 ہجری/653ء میں وفات پائی اس وقت اُن کی عمر 88 برس کی تھی۔ اُن کا بیٹا یزید ایک مسلمان سپہ سالار تھا۔ یزید نے 18 ہجری/639ء میں فلسطین میں ایک مسلمان سپہ سالار کی حیثیت سے وفات پائی، اور ابوسفیان کے دوسرے بیٹے حضرت معاویہؓ بنواُمیہ کے پہلے خلیفہ بنے۔ حضرت معاویہؓ کا بیٹا یزید تھا جس کے ساتھ امام حسینؓ اور اہلِ بیت کو کربلا کا اندوہ ناک واقعہ پیش آیا۔

ابوسلمہؓ مخزومی

نام عبداللہ، کنیت ابوسلمہؓ، والد کا نام عبدالاسد، والدہ کا نام برہ بنت عبدالمطلب۔ ان کی والدہ حضور ﷺ کی پھوپھی تھیں۔ اس لحاظ سے وہ آپ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی، نیز صحیح بخاری و مسلم کی روایت کے مطابق رضاعی بھائی تھے۔ آنحضور ﷺ کے دارالارقم میں پناہ گزیں ہونے سے پہلے اسلام لائے۔ اُن کی زوجہ اُمّ سلمہؓ بھی اُن کا ساتھ دیا۔ ابوسلمہؓ، عبیدہ بن حارثؓ، ارقم بن ابی ارقمؓ اور عثمان بن مظعونؓ ایک ساتھ ایمان لائے تھے۔

حضرت ابوسلمہؓ حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شریک تھے۔ اُن کی زوجہ اُم سلمہؓ بھی اُن کے ہم راہ تھیں۔ پھر حبشہ سے واپس آ کر سب سے پہلے مدینہ پہنچے۔ یہ محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ خاندان عمرو بن عوف نے اُنھیں دو ماہ یعنی آنحضور ﷺ کی تشریف آوری تک اپنا مہمان رکھا۔ آنحضور ﷺ نے ہجرت کے بعد ابوسلمہؓ کی مواخات حضرت سعد بن خثیمہ انصاریؓ سے کرا دی اور مستقل سکونت کے لیے ایک قطعۂ زمین مرحمت فرمایا۔

غزوۂ بدر میں سرگرم پیکار تھے۔ غزوہ اُحد میں ایک مُشرک ابواُسامہ جشمی نے تاک کر زہر میں بُجھا ہوا تیر اُن کے بازو میں مارا، جس سے وہ شدید زخمی ہو گئے۔ ایک ماہ کے علاج معالجے کے بعد بظاہر تن درست ہو گئے، لیکن تیر کا زہر اندر ہی اندر کام کرتا رہا۔ غزوۂ اُحد اور غزوۂ حمرا الاسد کے بعد آنحضور ﷺ بقیہ شوال اور ذی قعدہ مدینہ ہی میں مقیم رہے۔ یکم محرم 4 ہجری کو ایک شخص نے آ کر حضور ﷺ کو یہ خبر دی کہ خویلد کے بیٹے طلحہ اور سلمہ اپنی قوم کے علاوہ بنی اسد بن خزیمہ کو مسلمانوں سے جنگ پر آمادہ کر رہے ہیں۔ اس خبر کے ملتے ہی حضور ﷺ نے حضرت ابوسلمہؓ کو ڈیڑھ سو مہاجرین و انصار کے ساتھ مقابلے کے لیے روانہ فرمایا۔ مجاہدین میں ابوسبرہؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ بھی تھے۔

حضرت ابوسلمہؓ غیر معروف راستے سے یلغار کرتے ہوئے یکا یک بنواسد پر جا پڑے۔ وہ اس ناگہانی حملے سے بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ابوسلمہؓ دشمن کو دُور تک بھگا کر کثرت کے ساتھ اونٹ اور بھیڑ بکریاں چھین لائے جنھیں حضرت ابوسلمہؓ نے مدینہ پہنچ کر بطور مالِ غنیمت دربارِ نبوت میں پیش کیا۔ اس مُہم کو سریہ ابوسلمہ مخزومیؓ یا سریہ قطن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ قطن ایک پہاڑ کا نام ہے جس کا دامن بنواسد بن خزیمہ کا مسکن تھا۔

حضرت ابوسلمہؓ اِس مہم سے واپس آئے تو بازو کا پرانا زخم پھر عود کر آیا، اور ایک عرصے تک بیمار رہ کر 3 جمادی الثانی 4 ہجری کو وفات پائی۔ اتفاق سے آنحضور ﷺ عین حالتِ نزع میں عیادت کے لیے تشریف لائے تھے۔ جب رُوح نے جسم کا ساتھ چھوڑا تو حضور ﷺ نے دستِ مبارک سے دونوں آنکھیں بند کر کے فرمایا: "انسان کی رُوح جس وقت اُٹھائی جاتی ہے تو اُس کی آنکھیں اُس کے دیکھنے کے لیے رہ جاتی ہیں۔"

آنحضور ﷺ نے ان کے جنازے کی نماز پڑھائی اور تین تکبیروں کی بجائے بطور خاص نو تکبیریں ادا فرمائیں۔ حضرت ام سلمہؓ کی عدت پوری ہونے پر حضرت عمرؓ نے آنحضور ﷺ کی جانب سے نکاح کا پیغام دیا، جس کے جواب میں ام سلمہؓ نے چند عذر پیش کیے کہ آپ نہایت تنک مزاج اور خوددار ہیں، آپ کی چار اولادیں ہیں، آپ کی عمر بھی ڈھل چکی ہے۔ آنحضور ﷺ نے یہ سب عذر قبول کر لیے۔ حضرت ام سلمہؓ نے عربوں کے دستور کے مطابق اپنے بیٹے عمرؓ سے فرمایا کہ وہ حضورؐ سے ان کا نکاح پڑھا دیں۔ چنانچہ شوال 4 ہجری میں وہ امہات المومنین میں داخل ہو گئیں۔ اور یوں اللہ تعالیٰ نے اُنھیں اپنے شوہر ابوسلمہؓ سے جدائی کے غم کو ابدی راحت سے بدل کر اُنھیں رسول اللہ کی زوجیت میں دے دیا۔

ابوطالب

عبدمناف بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قُصّی بن کلاب۔ اُن کا اصلی نام عبدمناف تھا، لیکن کنیت ابوطالب نام پر غالب آ گئی۔ رسولِ کریم ﷺ کے چچا اور حضرت علیؓ کے والد۔ 85 قبل ہجرت/540 عیسوی میں مکے میں پیدا ہوئے اور 3 قبل ہجرت/620 عیسوی میں وہیں فوت ہوئے۔ والدہ کا نام فاطمہ بنت عمرو تھا۔ اُن کی ددھیال میں سقایہ اور ننھیال میں قبہ کے مناصب تھے۔ خطابت و شعر میں بھی اُن کا ایک مقام ہے۔ اُن کی طرف ایک چھوٹا سا دیوان بھی منسوب ہے۔

نبی کریم ﷺ کے تعلق سے ابوطالب کا ذکر سب سے پہلے اُس وقت آتا ہے جب حضور ﷺ کی عُمر آٹھ سال کی تھی۔ عبدالمطلب نے اپنی وفات کے وقت آپ ﷺ کی تربیت ابوطالب کے سپرد کی۔ ابوطالب نے یہ فرض ادا کرنے میں وہ بے مثال کردار ادا کیا کہ تاریخ اسلام ہمیشہ آپ کی مداح رہے گی۔ وہ آپ ﷺ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ ﷺ کے مقابلے میں اپنے بچوں کی بھی پروانہ کرتے تھے۔ تقریباً بارہ برس کی عمر میں آپ ﷺ نے ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ ابوطالب سفر کی تکلیف یا کسی اور وجہ سے نہیں چاہتے تھے کہ آپ ﷺ سفر میں ساتھ جائیں لیکن آپ کو بھتیجے سے اس درجہ محبت تھی کہ جب ابوطالب سفر کے لیے

چلنے لگے تو آپ ﷺ اُن سے لپٹ گئے۔ ابوطالب نے آپ ﷺ کی دل شکنی گوارا نہ کی اور ساتھ لے لیا۔

ابوطالب ہی نے حضرت خدیجہؓ کے ساتھ حضورؐ کے نکاح کا خطبہ پڑھا، اور آنحضرت ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد ہمیشہ مخالفوں کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ یکے بعد دیگرے قریش کی تین سفارشیں اُن کے پاس آئیں کہ یا تو اپنے بھتیجے کو تبلیغِ اسلام سے روکو یا میدان میں آ جاؤ۔ ہم اُس سے اور تم سے نپٹ لیں گے۔ آنحضرت ﷺ کا یہ جواب سن کر کہ بخدا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں میں چاند لا کر بھی رکھ دیں، تب بھی میں اِس کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ ابوطالب نے کہا: ''بھتیجے، جاؤ اور جس کام میں لگے ہوئے ہو، اُسے سرانجام دو۔ میں بھی تمھارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔'' اور قریشِ مکہ کو بھی اُن کی تمام تر ترغیب کے باوجود یہی جواب دیا۔

اب قریش نے آنحضرت ﷺ اور خاندان ہاشم و عبدالمطلب کے مقاطعے کا باہم معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ منصور بن عکرمہ نے لکھا جو عبدالدار بن قصّی کی اولاد میں سے تھا اور درِ کعبہ پر آویزاں کر دیا گیا۔ ابوطالب تمام خاندان ہاشم و عبدالمطلب کے ساتھ ابوقبیس کی پہاڑی کے ایک درّے پر محصور ہو گئے جو شعب ابی طالب کے نام سے موسوم ہے۔ تین سال تک آنحضور ﷺ اس میں محصور رہے۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزرا کہ افرادِ خاندان درختوں اور جھاڑیوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے۔ بچے جب بھوک سے روتے تھے تو کفار کو اس سے خوشی ہوتی تھی، لیکن بعض رحم دلوں کو ترس آ جاتا تھا اور وہ چوری چھپے کچھ اشیائے خورونوش بھیج دیتے تھے۔ آخر خود کفار ہی میں سے ہشام بن عمرو، زہیر بن ابی اُمیہ، مطعم بن عدی اور زمعہ بن اسود وغیرہ کی تحریک سے یہ مقاطعہ ختم ہوا اور مطعم بن عدی نے مقاطعے کی دستاویز چاک کر دی۔

اُس وقت ابوطالب بھی حرمِ کعبہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بعد بنو ہاشم کے حامی اُن کے پاس گئے اور اُنھیں درّے سے نکال لائے۔

اس واقعے کے جلد ہی بعد ابوطالب نے 10 نبوی، شوال کی پندرہ تاریخ کو انتقال کیا۔ حجون کے آبائی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ انھوں نے دو شادیاں کیں۔ پہلی بیوی کا نام فاطمہؓ بنت اسد بن ہاشم تھا۔ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ ان سے ابوطالب کی حسبِ ذیل اولاد ہوئی۔ طالب، امّ ہانی فاختہ، عقیل، جعفر، جمانہ، علی، ام طالب ریطہ، دوسری بیوی سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام طلیق تھا۔

ابوطلحہ انصاریؓ

نام زید بن سہل، کنیت ابوطلحہ۔ بنونجار کی شاخ عمرو بن مالک سے تعلق ہے۔ والدہ کا نام عبادہ ہے۔ قبل از اسلام ابوطلحہؓ بت پرست تھے۔ بڑے اہتمام سے شراب پیتے تھے۔ اُن کی عمر بمشکل بیس سال کی ہوگی کہ آفتابِ نبوت طلوع ہوا۔ انھوں نے امّ سلیمؓ (حضرت انس کی والدہ) کو نکاح کا پیغام دیا اور محترمہ نے نکاح کو اسلام کی شرط کے ساتھ وابستہ کر دیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ ابوطلحہؓ اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

یہ وہ وقت تھا جب مصعب بن عمیرؓ مدینہ میں اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے۔ مدینہ کا جو مختصر قافلہ بیعت کے لیے روانہ ہوا تھا، اُس میں ابوطلحہؓ بھی شامل تھے۔ اِس بیعت میں اُنھیں مزید یہ شرف حاصل ہوا کہ آنحضور ﷺ نے اُنھیں انصار کا نقیب تجویز فرمایا۔

بیعت کے چند ماہ بعد آنحضور ﷺ نے ہجرت کی۔ مہاجرین میں سے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو حضرت ابوطلحہؓ کا بھائی بنایا گیا۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوۂ اُحد میں جوش و خروش سے حصّہ لیا۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے جنگ کا پاسا پلٹ گیا تو حضرت ابوطلحہؓ حضور ﷺ کے آگے ڈھال بنے رہے۔ سینہ تانے کھڑے رہے، تاکہ جو تیر حضور ﷺ کی طرف آئے، اُسے اپنے سینے پر لیں۔ اُس وقت اُن کی زبان پر یہ شعر تھا:

نفسی لنفسك الفداء
ووجهی لوجهك الوقاء

''میری جان آپ کی جان پر قربان۔ میرا چہرہ آپ کے چہرے کی سپر۔''

حضرت ابوطلحہؓ بڑے تیرانداز تھے۔ اُس دن تین کمانیں یکے بعد دیگرے اُن کے ہاتھ سے ٹوٹیں۔ جس ہاتھ سے رسولِ کریم ﷺ کی حفاظت کی، وہ ہاتھ شل ہو گیا، مگر انھوں نے اُف تک نہ کی۔

غزوۂ اُحد کے بعد غزوۂ خندق اور دوسرے تمام غزواتِ نبوی ﷺ میں بھی ایک پُر جوش مجاہد کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ غزوۂ خیبر میں اُن کا اُونٹ حضور ﷺ کے اُونٹ کے بالکل برابر تھا۔ حضور ﷺ نے گدھے کا گوشت کھانے کی ممانعت کرنا چاہی تو آپ نے حضرت ابوطلحہؓ کو حکم دیا کہ بآوازِ بلند منادی کریں۔ غزوۂ حنین میں بیس اکیس کافروں کو قتل کیا۔ حجۃ الوداع میں وہ آنحضور ﷺ کے ہم راہ مکہ گئے اور وہاں اُنھیں ایک عظیم نعمت حاصل ہوئی۔ حضور ﷺ نے منیٰ میں حلق کرایا تو سرِ اقدس کی بائیں طرف کے تمام مُوئے مبارک آپ ﷺ نے ابوطلحہؓ کو عطا فرمائے۔ اِس نعمت کے حصول پر اُنھیں اِس قدر مسرت ہوئی کہ بار بار اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔

11 ہجری میں حضور ﷺ نے وصال فرمایا تو آپ کی بغلی قبرِ مبارک کھودنے کا شرف ابوطلحہؓ کو حاصل ہوا۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد شام چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی۔ عہدِ صدیقی اور عہدِ فاروقی کا بیش تر حصّہ انھوں نے وہیں گزارا اور اِس عہد کے بہت سے معرکوں میں شریک ہوئے۔ کبھی کبھی مدینہ منورہ آ جاتے اور حضور ﷺ کے روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر سکونِ قلب حاصل کرتے۔ حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو اتفاق سے ابوطلحہؓ مدینہ میں موجود تھے۔ اپنے جانشین کے انتخاب کے لیے حضرت عمرؓ نے چھے اصحاب کی جو مجلسِ شوریٰ نام زد کی، ابوطلحہؓ کو اُس کا نگران مقرر کیا اور اس سلسلے میں انھیں ضروری وصیتیں کیں۔ حضرت عمرؓ کی وفات کے بعد انھوں نے پورے خلوص کے ساتھ ان پر عمل کیا اور کسی ہنگامے کے بغیر حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔

ستر برس کی عمر میں ایک بحری جہاز میں رحلت فرمائی۔ جہاز سات روز بعد ایک جزیرے کے کنارے لگا۔ اس دوران میں لاش ویسی ہی پڑی رہی اور اس میں ذرّہ برابر تغیر نہ ہوا۔ لوگوں نے خشکی پر اتر کر اسی جزیرے میں آپؓ کی ابدی آرام گاہ بنائی۔ سالِ وفات کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ان میں سب سے معتبر روایت حضرت انسؓ بن مالک (حضرت ابوطلحہؓ کے سوتیلے بیٹے) کی ہے جس کے مطابق انھوں نے 51 ہجری میں وفات پائی۔ یہ امیر معاویہؓ کا عہد حکومت تھا۔ قیاس یہی ہے کہ ابوطلحہؓ اس بحری مہم میں شریک ہوئے جو امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ کی تسخیر کے لیے روانہ کی تھی۔

ابوعبسؓ بن جُبیر

نام عبدالرحمٰن، کنیت ابوعبس، قبیلہ اوس کے خاندان حارثہ سے ہیں۔ جاہلیت میں نام عبدالعزّٰی تھا۔ آنحضور ﷺ نے بدل کر عبدالرحمٰن رکھ دیا۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے اور ابو بردہؓ کو ہم راہ لے کر بنوحارثہ کے بُت توڑے۔ خنیس بن حذافہ سے مواخات قائم ہوئی۔ تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ غزوۂ بدر میں اُن کی عمر 48 سال تھی۔ بنونضیر میں کعب بن اشرف ایک یہودی تھا۔ رسولِ کریم ﷺ اور تمام مسلمان اُس سے سخت پریشان تھے۔ اس لیے انصار کی ایک جماعت اُس کے قتل کے لیے آمادہ ہوئی۔ ابوعبسؓ بھی ان میں شامل تھے۔ آنحضور ﷺ کی زندگی ہی میں اُن کی بینائی چلی گئی تھی۔ حضور ﷺ نے اُنھیں ایک عصا دیا تھا کہ اُسے لے کر چلنے میں روشنی معلوم ہوتی تھی۔ ایام جاہلیت ہی میں علم کا شوق تھا۔ عربی لکھ لیتے تھے۔ مسلمان ہو کر قرآن وحدیث سیکھی۔ اُن کے توسط سے پانچ احادیث ہم تک پہنچی ہیں۔

ابوعبیدہ بن الجراحؓ

عامر بن عبداللہ بن الجراح۔ امین الامّت لقب۔ اُن کی والدہ کا نام امیمہ بنت غنم بن جابر تھا۔ اُن کے باپ عبداللہ کفر کی حالت میں غزوۂ بدر میں بیٹے کے ہاتھوں مقتول ہوئے۔ ماں مسلمان ہوگئی تھیں اور اُن کا شمار صحابیات میں ہوتا ہے۔

غزوۂ بدر میں شرکت کے وقت اُن کی عمر اکتالیس سال تھی۔ اس طرح وہ گویا حضرت عمرؓ کے ہم سن تھے۔ اُن کا شمار اُن صحابہؓ میں ہوتا ہے جو اپنی کنیت سے مشہور ہوئے۔ وہ سابقون الاولون اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اُن کے لقب ''امین لامّت'' کا ذکر صحیح بخاری میں موجود ہے۔ انھوں نے عثمانؓ بن مظعون، عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور اُن کے رفقا کے ساتھ اسلام قبول کیا۔ انھوں نے مکہ معظمہ میں وہ سب اذیتیں برداشت کیں جو دوسرے مسلمانوں کو کفار کے ہاتھوں پہنچیں۔ مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو حضرت کلثومؓ بن ہدم کے ہاں قیام فرمایا۔ رشتۂ مواخات حضرت ابوطلحہؓ انصاری سے قائم ہوا۔

حضرت ابوعبیدہؓ نے غزوۂ اُحد میں پوری شان سے شرکت کی اور اُن کے پائے استقلال کی مطلق جنبش نہیں ہوئی۔ ربیع الاول 6 ہجری میں انھیں قبیلہ ثعلبہ وانمار کی سرکوبی پر مامور کیا گیا۔ یہ لوگ اطراف مدینہ میں غارت گری کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اُن کے مرکزی مقام ذی القصہ پر چھاپا مارا، جس سے غارت گروں کی یہ جمعیت پہاڑوں میں منتشر ہوگئی۔ البتہ ایک شخص گرفتار ہوا اور اُس نے اپنی رضا مندی سے اسلام قبول کرلیا۔ حُدیبیہ کے صُلح نامے (6 ہجری) میں بھی حضرت ابوعبیدہؓ کے دست خط بطور گواہ شامل تھے۔ انھوں نے ذات السلاسل (7 ہجری)، سیف البحر (رجب 8 ہجری) اور غزوہ الفتح (رمضان 8 ہجری) میں بھی حصّہ لیا۔ اِس آخری غزوے یعنی فتح مکہ کے موقع پر فوج کے ایک حصّے کی امارت اُن کے سپرد تھی۔ 9 ہجری میں جب وفد نجران یمن واپس گیا تو آنحضور ﷺ نے انھیں بھی تبلیغ اسلام اور صدقات کی وصولی کے لیے اُس کے ساتھ روانہ کیا۔ یہی موقع تھا جب آنحضور ﷺ نے انھیں ''امین الامّۃ'' کہا۔ پھر اُسی سال 9 ہجری میں اُنھوں نے جزیے کی وصولی کے لیے بحرین کا سفر کیا۔

رسولِ کریم ﷺ کی وفات پر جب انصار نے سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کا سوال اُٹھایا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ اُن سے گفتگو کرنے کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ یہیں سقیفہ میں تقریر کرتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا تھا: ''تم لوگ عمرؓ بن خطاب یا ابوعبیدہؓ میں سے کسی کی بیعت کرلو۔'' حضرت ابوعبیدہؓ کی یہ گفتگو بھی کتب سِیَر میں منقول ہے کہ جب زیادہ اختلاف پیدا ہوا اور شور وشغب بڑھا تو وہ اٹھے اور انصار سے فرمایا: ''اے گروہ انصار! تم نے سب سے پہلے امداد واعانت کا ہاتھ بڑھایا تھا، اس لیے تم اختلاف وافتراق کی طرح نہ ڈالو'' بالآخر جب حضرت ابوبکرؓ کی بیعت پر اجماع ہوا تو حضرت ابوعبیدہؓ بہتوں سے آگے تھے۔ صحیح بخاری، کتاب الحدود میں حضرت عمرؓ کی جو تقریر منقول ہے، اُس میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے بیعت کی تھی، پھر آپ کے بعد مہاجرین اور پھر انصار نے۔

13 ہجری کے آغاز میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شام پر لشکر کشی کی تو حضرت ابوعبیدہؓ نے بھی سات ہزار سپاہیوں کے ساتھ شام کا رخ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے انھیں حمص کی فتح کے لیے نام زد فرمایا تھا۔ انھوں نے تھوڑی دُور تک پیدل اُن کی مشایعت بھی کی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے یرموک سے گزرتے ہوئے اوّل بصریٰ کو محاصرے میں لے لیا، اور پھر جزیہ کی ادائیگی پر صلح کے بعد دمشق روانہ ہوئے، جہاں سب اسلامی فوجیں جمع ہورہی تھیں تاکہ قیصر رُوم کی جنگی تیاریوں کا مقابلہ کریں۔ پہلے اجنادین کا معرکہ پیش آیا، جس میں حضرت خالدؓ بن ولید بھی حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ شریک تھے، اور جس میں رومیوں کی شکست فاش کے بعد اسلامی فوجوں نے دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ جاری تھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے 22 جمادی الثانی، 13 ہجری کو وفات پائی۔ گویا دمشق حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں فتح ہوا۔ دورانِ محاصرہ میں جب ایک روز حضرت خالدؓ کمند کے ذریعے فصیل شہر پر چڑھ گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ شہر کے دروازے پر فوج لیے کھڑے تھے۔ اُدھر حضرت خالدؓ نے نیچے اتر کر دروازہ کھولا اور اُدھر حضرت ابوعبیدہؓ شہر میں داخل ہوگئے۔ اب اُن کی فوج سارے شہر میں پھیل رہی

تھی۔ اہلِ شہر نے یہ حالت دیکھی تو باقی دروازے بھی کھول دیئے اور اطاعت تسلیم کر لی (14ہجری)

حضرت عمرؓ کی خلافت کا آغاز رجب 13ہجری میں ہوا تھا۔ انھوں نے زمامِ خلافت ہاتھ میں لیتے ہی ایک فرمان جاری کیا، جس کی رُو سے حضرت ابوعبیدہؓ شام کے سپہ سالارِ اعظم مقرر ہوئے اور حضرت خالدؓ بن ولید کو، جواب تک اسلامی لشکروں کی قیادت فرما رہے تھے، اس عہدے سے معزول کر دیا گیا۔ ان کی معزولی کے بارے میں کوئی بھی رائے قائم کی جائے، اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت ابوعبیدہؓ نے اس منصب کے فرائض بڑی خوبی سے سرانجام دیئے۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ ان میں ویسی ہی جنگی اور انتظامی قابلیت اور وہی صفات موجود ہیں جو قیادت کا خاصہ ہیں۔ بحیثیت سپہ سالارِ شام انھوں نے سب سے پہلے اس رومی لشکر کو شکست فاش دی جو فحل میں جمع ہو رہا تھا اور پھر آگے بڑھ کر مرج الروم پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے حمص کا رُخ کیا اور شدید سردی اور برف باری کے باوجود اُسے محاصرے میں لے لیا۔ رومیوں کا خیال تھا کہ محاصرین شدید سردی کی تاب نہیں لا سکیں گے اس لیے وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ بایں ہمہ حضرت ابوعبیدہؓ کے پائے استقامت میں فرق نہیں آیا اور انھوں نے محاصرہ جاری رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہار کا آغاز ہوا تو محصورین کے دل ٹوٹ گئے اور انھوں نے ادائیگی جزیہ پر صلح کر لی۔ حمص فتح ہوا تو حمات، شیراز اور معرۃ النعمان نے بھی یکے بعد دیگرے اطاعت قبول کر لی۔ لاذقیہ بھی ایک معمولی سی مہم کے بعد فتح ہو گیا جس کی سرداری خود حضرت ابوعبیدہؓ نے کی۔ اُن کا خیال تھا کہ ہرقل کے پایۂ تخت پر حملہ کر دیا جائے، لیکن بارگاہِ خلافت سے حکم پہنچا کہ اس سال مزید پیش قدمی نہ کی جائے۔ لہٰذا حضرت ابوعبیدہؓ حمص واپس آ گئے اور 15 رجب تک، جب یرموک کی فیصلہ کن جنگ پیش آئی، وہیں مقیم رہے۔ اس جنگ میں شام کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ رومی جب شکست پر شکست کھا کر انطاکیہ پہنچے تو انھوں نے ہرقل سے فریاد کی کہ عربوں نے سارا شام فتح کر لیا ہے، انھیں روکنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔ اس پر قیصرِ روم نے جملہ مقبوضاتِ سلطنت مثلاً قسطنطنیہ، الجزیرہ، آرمینیا وغیرہ، غرض یہ کہ ہر کہیں سے فوجیں طلب کیں، تاکہ حملہ آوروں کی طاقت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جائے۔ ہرقل کا خیال شاید یہ تھا کہ عربوں کے قبضہ شام کی نوعیت محض فوجی ہے اور مقصد صرف غارت گری۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ انھیں شکست دے کر پھر صحرا میں واپس دھکیل دیا جائے۔ وہ گویا واقعات کا قیاس اس آویزش کی بنا پر کر رہا تھا جو ایران و روم میں صدیوں سے جاری تھی اور جس میں قبائلِ عرب کو اکثر عراق و شام پر یورش کا موقع ملتا۔ وہ نہیں سمجھا کہ تاریخ اپنا ورق الٹ چکی ہے اور امورِ عالم میں اب ایک نئے دور کا آغاز ہے۔ بہرحال حضرت ابوعبیدہؓ حمص ہی میں تھے جب انھیں ہرقل کے اس ارادے کی خبر پہنچی۔ لہٰذا باہم مشورہ ہوا اور طے پایا کہ جملہ اسلامی فوجیں دمشق میں جمع ہوں۔ چنانچہ حمص خالی کر دیا گیا اور حضرت ابوعبیدہؓ دمشق روانہ ہوئے۔ یہی موقع تھا جب اہلِ حمص کو جزیے کی وہ ساری رقم واپس کر دی گئی جو اُن سے وصول کی گئی تھی اور ایسے ہی اُن شہروں کو بھی جو خالی کیے جا رہے تھے، اس لیے کہ جزیے کی وصولی کے باوجود شہروں کو بے حفاظت چھوڑ دینا نقضِ عہد کے مترادف ہوتا۔ شرائطِ معاہدہ کی پابندی اور رواداری کی ایسی کوئی دوسری مثال تاریخ عالم میں شاید ہی ملے۔ لہٰذا کوئی تعجب نہیں، اگر باوجود اختلاف مذہب اہلِ شام نے مسلمانوں کو اپنے جابر اور مستبد حکمرانوں کے مقابلے میں نجات دہندہ تصور کیا اور جب ہرقل کی جنگی تیاریوں کی خبر پھیلی تو اُردن کے بعض اضلاع نے بغاوت کر دی۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے جب اِن سب واقعات کی اطلاع حضرت عمرؓ کو دی تو جواب ملا کہ اسلامی فوجیں ثابت قدم رہیں۔ انھوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کو اطمینان دلایا کہ کمک آ رہی ہے۔ یہ کمک اُس وقت پہنچی جب اسلامی فوجیں دمشق سے ہٹ کر دریائے یرموک پر صف آرا تھیں اور طرفین میں جنگ جاری تھی۔ بالآخر جنگِ یرموک کا خاتمہ مسلمانوں کی فتح پر ہوا اور ہرقل رومیوں کی شکست فاش اور مسلمانوں کی اِس فتح عظیم کی خبر سن کر شام کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہ کر قسطنطنیہ روانہ ہو گیا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے بارگاہِ خلافت میں نامۂ فتح ارسال کیا اور ایک سفارت بھی بھیجی جس میں حضرت حذیفہؓ بھی شامل تھے۔

یرموک کے بعد قنسرین فتح ہوا، پھر حلب، پھر انطاکیہ۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ بیت المقدس روانہ ہو گئے، جس کا حضرت عمرو بن العاص نے اُن کی آمد سے پہلے محاصرہ کر رکھا تھا۔ بیت المقدس حضرت عمرؓ کی تشریف آوری پر مسلمانوں کے حوالے کیا گیا۔ 17ہجری میں عیسائیوں نے حمص پر دوبارہ فوج کشی کی، لیکن ناکام رہے۔ یہ آخری معرکہ تھا جو حضرت ابوعبیدہؓ کو اپنی زندگی میں پیش آیا۔

بحیثیت امیرِ لشکر انھوں نے اپنی فوجی اور انتظامی ذمّے داریوں کے علاوہ اِس امر کا بھی بالخصوص خیال رکھا کہ اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ لوگوں کی تعلیم و تربیت سے غافل نہ رہیں، چنانچہ اُن کے اشارے سے بعض مفتوحہ شہروں میں حلقہ ہائے درس قائم ہوئے، جن میں صحابہؓ قرآن مجید کی تعلیم دیتے اور فقہی مسائل حل کرتے تھے۔ عام الرمادہ میں جب حضرت عمرؓ نے ہر طرف سے امداد طلب کی تو سب سے پہلے حضرت ابوعبیدہؓ ہی نے اُن کی آواز پر لبیک کہا اور غلّے سے لدے ہوئے چار ہزار اونٹ لے کر خود بارگاہِ خلافت میں حاضر ہوئے۔

اُسی سال (18ہجری) جب طاعونِ عمواس کی وبا پھیلی تو حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے تاکہ حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح اور اُن کے رفقا سے مشورے کے بعد یہ طے کر سکیں کہ وبا سے بچنے کے لیے کیا اقدام کرنا چاہیے اور حضرت ابوعبیدہؓ کہاں قیام پزیر ہوں۔ رائے یہ ہوئی کہ بہتر ہوگا اگر اسلامی فوجیں طاعون زدہ علاقوں سے ہٹ جائیں۔ حضرت عمرؓ کو اس رائے سے اتفاق تھا، لیکن حضرت ابوعبیدہؓ کو اختلاف۔ انھوں نے کہا: ''کیا آپ تقدیر الٰہی سے بھاگ رہے ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''ابوعبیدہؓ! کاش تمھارے علاوہ کسی اور نے یہ بات کہی ہوتی۔ ہم تقدیر الٰہی سے تقدیر الٰہی ہی کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ تمھی کہو، اگر تمھارے پاس کچھ اونٹ ہوں اور تم کسی ایسی وادی میں جا اُترو جس کے دو کنارے ہوں، ایک سرسبز و شاداب، دوسرا

بے آب و گیاہ، تو کیا سرسبز حصے میں اونٹ چرانا قضائے الٰہی کے موافق نہ ہوگا؟'' اس کے باوجود حضرت ابوعبیدہؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔

حضرت عمرؓ مدینہ منورہ واپس آ گئے اور حضرت ابوعبیدہؓ کو لکھا کہ وہ لشکر کو کسی بلند مقام پر لے جائیں، لیکن اس اثنا میں خود حضرت ابوعبیدہؓ پر وبا کا حملہ ہو چکا تھا اور انھوں نے اسی میں انتقال فرمایا اُن کی عمر اس وقت اٹھاون برس تھی۔ حضرت معاذؓ بن جبل نے تجہیز و تکفین کا سامان کیا اور ایک بڑی پُر درد تقریر کی۔ حضرت معاذؓ نے کہا: ''آج ہم میں سے ایک ایسا شخص اٹھ گیا ہے جس سے زیادہ صاف دل، زیادہ بے کینہ، زیادہ سیر چشم اور خلقِ خدا کے لیے زیادہ خیر خواہ، خدا کی قسم! میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ سب اس کے لیے رحم اور مغفرت کی دُعا کریں۔''

حضرت ابو عبیدہؓ کا شمار اُن صحابہؓ میں ہوتا ہے جن کی فطری صلاحیتیں آنحضرت ﷺ کے فیضِ تربیت سے اور زیادہ چمک اٹھیں۔ آنحضرت ﷺ کو اُن کی ذات پر جو اعتماد تھا، اُس کے لیے حضور ﷺ کے اس ارشاد کی طرف کہ ''ابوعبیدہؓ امین الامت ہیں'' اشارہ کر دینا ہی کافی ہے۔ وہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے دستِ راست تھے۔ اُن کی وجاہتِ ذات سے بھی انکار کرنا ممکن نہیں۔ محض یہ امر کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں خود حضرت ابوبکرؓ نے اُن کا نام خلافت کے لیے پیش کیا، اِس امر کی دلیل ہے کہ اُنھیں مہاجرین اور انصار میں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ مزید برآں سیاسی اور اجتماعی معاملات میں بھی اُن کی شخصیت کو بڑا دخل تھا۔ حضرت عمرؓ کے تو وہ معتمدِ خاص تھے اور وہ ان کی انتظامی اور جنگی قابلیت سے ہمیشہ مطمئن رہے۔

ابوعمرہؓ

نام بشیر، کنیت ابوعمرہ، قبیلہ خزرج کے خاندان بنونجار سے ہیں۔ والدہ کا نام کبشہ بنت ثابت تھا۔ وہ بھی بنونجار سے تھیں اور حضرت حسانؓ بن ثابت کی ہم شیر تھیں، گویا ابوعمرہؓ اُن کے بھانجے تھے۔ بیعت عقبہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بدر، اُحد اور تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ شرکت کی۔ ایک غزوہ میں اپنے بھائیوں کے ہم راہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے انھیں فی کس ایک حصہ اور گھوڑے کو دو حصے عطا فرمائے۔ معرکہ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور اس جنگ میں زرِ کثیر سے مالی اعانت بھی کی تھی۔ میدانِ جنگ میں ضعیفی کے باوجود تین تیر چلائے اور پھر خود روزے کی حالت میں جام شہادت نوش کیا۔ اُن کی بیوی مقوم بن عبدالمطلب کی بیٹی تھیں جو آنحضور ﷺ کے چچا تھے۔

ابوفکیہہؓ

نام یسار، کنیت ابوفکیہہؓ، نسبی تعلق قبیلہ ازد سے تھا۔ ابتدا میں بنوعبدالدار کے غلام تھے۔ دعوتِ اسلام کے ابتدائی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ آغازِ اسلام میں آزاد مسلمان بھی مشرکین مکہ کے ظلم وستم سے محفوظ نہ تھے۔ ابوفکیہہؓ تو بے یار و مددگار غلام تھے اور سنگ دل آقا خود آمادۂ ستم تھے، اس لیے اسلام لانے کے بعد ظلم وستم کا نشانہ بن گئے۔ بنوعبدالدار انھیں طرح طرح کی دردانگیز سزائیں دیتے تھے۔ ٹھیک دوپہر کو تپتی ہوئی ریت پر منہ کے بل لٹا کر پیٹھ پر ایک بھاری پتھر رکھ دیتے، تاکہ جنبش نہ کر سکیں اور اِس دردناک سزا کا سلسلہ اس وقت تک قائم رہتا جب تک ابوفکیہہؓ بے ہوش نہ ہو جاتے۔

ایک مرتبہ قبیلہ عبدالدار کے سردار اُمیہ نے اُن کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر گھسیٹ کر تپتی ہوئی ریت پر ڈال دیا۔ ادھر سے اُن کا بیٹا صفوان گزرا۔ وہ بھی ایک ظالم تھا۔ اُس نے اپنے باپ سے پوچھا: ''کیا اُمیہ تیرا رب نہیں ہے؟'' اس حالت میں بھی انھوں نے جواب دیا کہ ''میرا رب اللہ ہے'' اِس جواب پر صفوان نے غضب ناک ہو کر اُن کا گلا گھونٹنا شروع کیا۔ اُس کے دوسرے بھائی نے للکارا کہ ذرا اور زور سے۔ صفوان نے شکنجہ اور کس دیا، اور اُس وقت چھوڑا جب موت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ حسنِ اتفاق سے اُسی وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ اُدھر سے گزرے، انھوں نے اِس بے بسی کی حالت میں دیکھا تو خرید کر آزاد کر دیا۔

آزادی ملنے کے بعد ہجرتِ ثانیہ میں حبشہ چلے گئے، لیکن طرح طرح کے الم ناک عذاب سہتے سہتے قویٰ ضعیف اور اعضا کم زور ہو چکے تھے۔ اس لیے ہجرت کے بعد زیادہ دنوں تک زندہ نہ رہ سکے، اور غزوۂ بدر سے پہلے ہی وفات پائی۔

ابوقتادہؓ

نام حارث، کنیت ابوقتادہ، لقب فارس رسول اللہ۔ قبیلہ خزرج کے خاندان بنوسلمہ سے ہیں۔ ہجرت سے تقریباً دس سال پیش تر مدینہ میں پیدا ہوئے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد اسلام قبول کیا۔ ربیع الاول 6 ہجری میں غزوہ ذی قرد (غابہ) میں نمایاں طور پر شریک تھے۔ اس موقع پر آنحضور ﷺ نے اُن کے بارے میں فرمایا تھا: ''آج ابوقتادہؓ بہترین سوار تھے۔'' شعبان 8 ہجری میں آنحضور ﷺ نے نجد کے ایک مقام خضرہ کی جانب پندرہ آدمیوں کو قبیلہ غطفان کی غارت گری کو دبانے کے لیے بھیجا۔ ابوقتادہؓ ان کے امیر تھے۔ اس واقعے کے چند روز بعد رمضان کے مہینے میں آٹھ آدمیوں کا ایک سریہ بطن اخم کی طرف بھیجا۔ ابوقتادہؓ اس کے بھی سرگروہ تھے۔ غزوۂ حنین کے موقع پر ایک مشرک کو قتل کیا۔ اُس کا سارا مال و اسباب آنحضور ﷺ نے ابوقتادہؓ کو دلوایا۔ انھوں نے یہ مال فروخت کر کے بنوسلمہ میں ایک باغ خریدا۔ قبولِ اسلام کے بعد جائداد خریدنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں امارتِ مکہ پر نام زد ہوئے تھے، لیکن کسی وجہ سے قثم بن عباسؓ امیر بنائے گئے۔ 36 ہجری میں جنگِ جمل اور دوسرے سال صفین کا معرکہ ہوا۔ ابوقتادہؓ انصاری دونوں جنگوں میں شریک ہوئے۔ 38 ہجری میں خوارج نے علم بغاوت بلند کیا۔ حضرت علیؓ نے جس فوج کے ساتھ حملہ کیا تھا، اُس کے پیادہ دستے کے افسر حضرت ابوقتادہؓ تھے۔ 50 اور 60 ہجری کے درمیان کوفہ میں انتقال کیا۔ حضرت علیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت ابوقتادہؓ قرآن مجید اور احادیث نبوی ﷺ کی اشاعت کے فرض سے غافل نہیں رہے، لیکن روایتِ حدیث میں نہایت محتاط تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے آنحضور ﷺ سے کذب علی الرسول کی حدیث سنی تھی۔ اُس وقت سے وہ حدیث

کے بارے میں نہایت محتاط ہو گئے تھے۔ تابعین کی ایک مجلس میں حدیث کا چرچا تھا۔ ہر شخص قال اللہ کذا کہہ رہا تھا۔ حضرت ابوقتادہؓ نے سن کر فرمایا، بدبختو منہ سے کیا نکال رہے ہو۔ حضور ﷺ نے جھوٹی حدیث بیان کرنے والوں کو جہنم کی وعید سنائی ہے۔ اس احتیاط کے باوجود اُن کی روایات کی تعداد 170 ہے۔ راویوں میں صحابہ کبار اور تابعین عظام شامل ہیں۔

ابوقیس بن حارث سہمی

نام ابوقیس، ان کا تعلق قریش کے خاندان بنوسہم سے تھا۔ نسب نامہ یہ ہے: ابوقیس بن حارث بن قیس بن عدی۔ ان کا دادا قیس بن عدی قریش کے سرداروں میں سے تھا۔ باپ حارث بن قیس بھی مشرکین کا سرغنہ تھا۔ یہ اُن شریر لوگوں میں سے تھا جو قرآن کریم کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ حارث کے سات بیٹے تھے۔ چھ بیٹوں نے اسلام قبول کیا اور ہجرت کا شرف حاصل کیا۔ ابوقیسؓ نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ سن 6 نبوی میں ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ ان کے بھائی بھی ساتھ تھے۔ وہاں کئی سال گزارنے کے بعد غزوۂ اُحد سے پہلے مدینہ منورہ آ گئے اور اُحد، خندق، خیبر، فتح مکہ، حنین، تبوک تمام غزوات میں رسولِ کریم ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں جنگِ یمامہ میں، جو مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی، حضرت ابوقیسؓ بھی مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ ان کے بھائی عبداللہ بھی اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ اُن کے دوسرے بھائی بھی مختلف معرکوں میں شہید ہوئے۔ حضرت تمیمؓ جنگ اجنادین میں، حضرت سائبؓ جنگِ فحل میں، حضرت حجاجؓ اور حضرت سعیدؓ جنگ یرموک میں۔

ابوقیس صرمہ

نام صرمہ، کنیت ابوقیس۔ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی حضرت صرمہؓ اپنی قوم میں معزز تھے۔ انھوں نے دنیا ترک کی۔ راہب بنے۔ ٹاٹ پہنا۔ بت پرستی چھوڑی، جنابت سے غسل کیا۔ ایک عبادت گاہ بھی بنائی اور فرماتے تھے: ''میں ابراہیمؑ کے خدا کی پرستش کرتا ہوں''۔ اس معبد میں ناپاک مرد اور عورت کو جانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ خود بھی ایسے گھروں میں نہیں جاتے تھے جہاں جنب اور حائضہ عورت ہو۔

عالمِ پیری تھا کہ اسلام کا غلغلہ بلند ہوا اور رسولِ کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے حضرت صرمہؓ نے نہایت جوش سے خیر مقدم کرتے ہوئے اسلام قبول کیا اور چند اشعار بھی اظہارِ مسرّت کے طور پر لکھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے غزوات میں حصّہ نہیں لیا۔ وہ شاعر تھے اور اُن کا موضوع اخلاق و کردار تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اُن کے ہاں جاتے اور اُن سے اشعار لاتے تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد ضعف پیری کے باوجود روزہ رکھتے اور دن بھر کھیت میں کام کرتے۔

ابوکبشہؓ

نام سلیم، کنیت ابوکبشہ، غلام تھے۔ رسولِ کریم ﷺ نے خرید کر آزاد کر دیا۔ کفارِ قریش آنحضرت ﷺ کی شان میں طرح طرح کی گستاخیاں کرتے تھے۔ ایک گستاخی یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ کو نعوذ باللہ ابوکبشہ کا بیٹا کہتے تھے۔ سیرت نگار اس کی مختلف توجیہیں کرتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ابوکبشہؓ کے ننھیالی اجداد میں کوئی شخص ابوکبشہ گزرا تھا جو تمام عرب کے خلاف ''شعریٰ'' کی پرستش کرتا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے سرے سے بت پرستی کے خلاف آواز بلند کی تھی، اس لیے عربوں کی مخالفت کی اس وجۂ اشتراک کی بنا پر لوگ کہنے لگے کہ لو، اس کا دوسرا بیٹا پیدا ہوا۔ کفارِ قریش نے بات کو یوں ڈھال دیا کہ ''محمد ﷺ ابوکبشہ کے بیٹے ہیں۔'' مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ابوکبشہ نے سب سے پہلے بدری ہونے کا شرف حاصل کیا۔ پھر غزوۂ اُحد اور دوسرے غزوات میں بھی شریک ہوئے تھے۔

22 جمادی الثانی 13 ہجری کو، جس دن حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ ہوئے وفات پائی۔

ابولبابہؓ انصاری

نام رفاعہ بن عبدالمنذر۔ کنیت ابولبابہؓ۔ قبیلہ اوس کے خاندان عمرو بن عوف سے تعلق تھا۔ قیام قبا میں تھا۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں اسلام لائے اور نقیب بنائے گئے۔ ہجرت نبوی ﷺ سے پہلے جب حضور ﷺ کے ایما پر اکثر صحابہ کرامؓ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تو اُن مہاجرین اوّلین میں سے متعدد حضرات نے قبا پہنچ کر حضرت ابولبابہؓ کے ہاں قیام کیا۔

غزوہ بدر میں ابولبابہؓ کو خاص امتیاز حاصل ہوا۔ ہر اونٹ پر تین تین آدمی سوار تھے۔ ابولبابہؓ جس اونٹ پر سوار تھے، وہ رسول کریم ﷺ کا اونٹ تھا۔ حضرت علیؓ بھی اسی پر تھے۔ یہ تینوں باری باری چڑھتے اُترتے تھے۔ اسی سفر میں چشم فلک نے یہ عجیب نظارہ دیکھا کہ ابولبابہؓ اونٹ پر سوار ہیں اور رسولِ کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ساتھ ساتھ پیدل چل رہے ہیں۔ ابولبابہؓ بار بار عرض کرتے ہیں: ''یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ آپ سوار ہو جائیں، میں پیدل چلوں گا۔''

حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''نہیں بھائی، اب اونٹ پر سوار ہونے کی باری تمھاری ہے، اور تم مجھ سے زیادہ پیدل نہیں چل سکتے، اور پھر میں بھی تو راہِ حق میں پیدل چلنے کے ثواب سے بے نیاز نہیں ہوں۔''

لشکرِ اسلام جب مدینہ منورہ سے دو دن کی مسافت پر روحا کے مقام پر پہنچا تو آنحضور ﷺ نے ابولبابہؓ کو مدینہ پر اپنا نائب مقرر کر کے واپس کر دیا، اور غنیمت میں جس طرح مجاہدین کا حصّہ لگایا تھا، اُن کا بھی لگایا۔ غزوۂ بنی قینقاع اور غزوۂ سویق میں بھی انھیں مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کی نیابت کا شرف حاصل ہوا۔

5 ہجری میں غزوہ بنوقریظہ کے موقع پر ایک عجیب واقعہ ہوا جو حضرت ابولبابہؓ کی غیر معمولی شہرت کا باعث بن گیا۔ بنوقریظہ یہودی تھے اور قبیلہ اوس کے حلیف تھے۔ آنحضور ﷺ نے اُن کا محاصرہ کر لیا۔ پچیس دن کے محاصرے کے بعد اُن کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ انھوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ابولبابہؓ کو ہمارے پاس آنے کی اجازت دی جائے تا کہ ہم ان سے مشورہ کر سکیں۔ خاص طور پر ابوالبابہؓ کو بلانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے جن سے یہود کے قدیمی اور

حلیفانہ تعلقات تھے۔ حضور ﷺ کی اجازت سے حضرت ابولبابہؓ قلعہ کے اندر گئے تو انھوں نے یہودیوں کو ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا، لیکن ساتھ ہی اپنے حلق کی طرف اشارہ کیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ ہتھیار نہ ڈالے تو قتل کیے جاؤ گے۔ اشارہ تو کر دیا، لیکن یہ خیال کر کے سخت نادم ہوئے کہ اللہ اور رسول ﷺ کی خیانت ہوئی۔ سیدھے مسجد نبوی ﷺ میں پہنچے اور ایک زنجیر لے کر اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا۔ دن رات دُعا مانگتے رہے کہ اے غفور الرحیم، میری خطا بخش دے۔ کھانا پینا ترک ہو گیا۔ صرف نماز اور حوائج ضروریہ کے لیے زنجیر کھول لیتے اور فارغ ہونے کے بعد اپنے آپ کو اپنی لڑکی سے بندھوا لیتے۔ اسی حالت میں کئی روز گزر گئے۔ کان بہرے ہو گئے، نظر کم زور ہو گئی۔ ایک دن ضعف سے بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ اُس وقت رحمتِ الٰہی کو جوش آ گیا اور طلوعِ فجر سے پیش تر سورۂ انفال کی آیات 28,27 کا نزول ہوا۔

"اے ایمان والو! جانتے بوجھتے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ اپنی امانتوں میں غداری کے مرتکب نہ ہو، اور جان رکھو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد حقیقت میں فتنہ ہیں، اور اللہ کے پاس اجر دینے کے لیے بہت کچھ ہے۔ اے ایمان والو! اگر تم خدا ترسی اختیار کرو گے تو اللہ تمھارے لیے کسوٹی بہم پہنچا دے گا اور تمھاری برائیوں کو تم سے دُور کر دے گا، اور تمھارے قصور معاف کرے گا۔ اللہ بڑا فضل کرنے والا ہے۔"

نزولِ وحی کے وقت رسولِ کریم ﷺ حضرت اُمِّ سلمہؓ کے مکان میں تھے۔ آپ نے فرطِ مسرت سے تبسم فرمایا۔ حضرت اُمِّ سلمہؓ نے کہا، یا رسول اللہ، کیا بات ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ابولبابہؓ کی توبہ قبول ہو گئی۔ یہ خبر پورے مدینہ میں مشہور ہو گئی۔ صحابہ کرامؓ ابولبابہؓ کی زنجیر کھولنے آئے تو انھوں نے کہا کہ جب تک آنحضور ﷺ خود نہ کھولیں گے، میں اِس ستون سے بندھا رہوں گا۔

چنانچہ جب آپ ﷺ نماز فجر کے لیے تشریف لائے تو اپنے دست مبارک سے حضرت ابولبابہؓ کو کھولا وہ فرطِ مسرّت سے بے خود ہو گئے اور کہا: "یا رسول اللہ، میں اپنا سب گھر بار اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ ہمیشہ آپ کے قدموں میں رہوں گا۔"

حضور ﷺ نے فرمایا: "صرف ایک تہائی مال کا صدقہ کرو۔"

ذی قعد 6 ہجری میں حضرت ابولبابہؓ کو بیعتِ رضوان میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ 8 ہجری میں فتح مکہ میں انھیں یہ امتیاز حاصل ہوا کہ رسولِ کریم ﷺ نے انصار عمرو بن عوف کا علم انھیں مرحمت فرمایا۔ اس کے بعد وہ غزوۂ حنین، طائف اور تبوک میں شریک ہوئے۔ آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابولبابہؓ کافی عرصہ حیات رہے اور حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔

ابومحذورہؓ

نام میں اختلاف ہے۔ اپنی کنیت ابومحذورہ ہی سے مشہور ہیں۔ ان کا تعلق قریش کے خاندان بنوجمح سے تھا۔ ابومحذورہؓ کا شمار "طلقا" میں ہوتا ہے۔ طلقا مکہ کے وہ خوش باش اور شوخ و شنگ نوجوان تھے، جنھوں نے فتح مکہ کے بعد بھی اسلام قبول نہیں کیا تھا، لیکن آنحضور ﷺ نے تقریباً سبھی اہل مکہ کو یہ کہ کر معاف کر دیا تھا کہ جاؤ آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ جب آنحضور ﷺ مکہ سے حنین کی طرف تشریف لے گئے تو آپ ﷺ کے ساتھ خاصی تعداد میں طلقا بھی تھے۔ ان میں ابومحذورہؓ بھی شامل تھے، جن کی عمر اس وقت سولہ سترہ سال تھی۔ غزوۂ حنین سے فارغ ہو کر آنحضور ﷺ واپس مکہ تشریف لا رہے تھے تو راستے میں ایک مقام پر نماز کا وقت آ گیا۔ حضور ﷺ نے موذن کو اذان دینے کا حکم دیا۔ موذن اذان دے چکے تو وہ خوش باش نوجوان تمسخر کے طور پر اذان کی نقل اتارنے لگے۔ ان میں سے ابومحذورہؓ کی آواز بہت دل کش اور بلند تھی۔ حضور ﷺ نے انھیں اذان دینے کا حکم دیا۔ وہ تعمیل حکم کے لیے کھڑے تو ہو گئے لیکن اذان سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ اس لیے حضور ﷺ نے انھیں خود اذان بتانا شروع کیا۔ وہ آنحضور ﷺ کی زبان سے کلمات سنتے گئے اور دہراتے گئے۔ اذان ختم ہوئی تو ساتھ ہی ان کی قلب ماہیت ہو گئی۔ اسی وقت کلمہ شہادت پڑھا۔ آنحضور ﷺ نے اپنا دست مبارک نوجوان ابو محذورہؓ کے ماتھے، چہرے، سینے اور پیٹ پر پھیرا اور تین مرتبہ یہ دعا دی "بارك الله فيك و بارك الله عليك" (اللہ تیرے اندر برکت دے اور تجھ پر برکت نازل فرمائے)۔

حضرت ابومحذورہؓ عمر بھر مکہ میں مقیم رہے اور اذان دیتے اور یہیں 58 ہجری میں انتقال کیا۔ ان سے چند حدیثیں بھی مروی ہیں۔

ابو محجن ثقفیؓ

اصل نام میں اختلاف ہے۔ کنیت ابومحجن پر سب کا اتفاق ہے۔ اعلیٰ پایے کے شاعر تھے۔ غزوۂ حنین کے بعد رسول کریم ﷺ نے طائف کا محاصرہ کیا (8 ہجری) تو ابومحجن نے دوسرے اہل طائف کی طرح شہر کے دفاع میں پرزور حصہ لیا اور محاصرے کے دوران میں جب کبھی مسلمان مجاہدین نے شہر پر ہلّہ بولا، انھوں نے ان پر تیروں اور پتھروں کا مینہ برسا دیا۔ بلکہ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے فرزند عبداللہؓ کو تیر سے زخمی بھی کیا۔ اگلے برس 9 ہجری میں اسلام قبول کر لیا۔ چوں کہ وہ بہت آخر میں ایمان لائے تھے، اس لیے عہد نبوی ﷺ میں انھیں کسی غزوے میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا۔

البتہ عہد فاروقیؓ میں جنگِ قادسیہ میں شرکت کی۔ روایت ہے کہ اس جنگ میں شامل ہونے کے لیے وہ اپنے پہرے داروں کی نگرانی سے بھاگ نکلے، کیوں کہ حضرت عمرؓ نے انھیں جلاوطن کر کے حضوفہ بھیج دیا تھا، مگر پھر جوں توں کر کے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے اس لشکر سے جا ملے، جس نے قادسیہ میں ایران پر فیصلہ کن فتح حاصل کی۔ حضرت سعدؓ نے انھیں شراب نوشی کی پاداش میں قید کر دیا تھا۔ حضرت سعدؓ کی حرم محترم کی بدولت انھوں نے عارضی رہائی حاصل کر لی اور حضرت سعدؓ میدان جنگ میں ان کی کارگزاری دیکھ کر اس قدر خوش ہوئے کہ انھوں نے ان کا قصور معاف

کر لیا۔

جنگ قادسیہ کے بعد ابومحجن تاریخ کی پہنائیوں میں مستور ہو جاتے ہیں اور ان کی سرگرمیوں اور مشاغل کا پتا نہیں چلتا، یہاں تک کہ ان کا سال وفات بھی کسی نے بیان نہیں کیا۔ البتہ بہت سے اہل سیَر نے لکھا ہے کہ انھوں نے آذر بائیجان میں وفات پائی۔

ابن عساکر نے ابومحجن سے روایت کی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: (ترجمہ) میں اپنی امت کے بارے میں تین چیزوں سے خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ ...کا ظلم، نجوم پر ایمان اور قضا و قدر کی تکذیب۔ گویا ابومحجن ثقفی کا دامن روایت حدیث سے بھی خالی نہ تھا۔

مرثد غنویؓ

کنار نام، ابومرثد کنیت۔ والد کا نام حصین تھا۔ انھوں نے آغاز ہی میں اسلام قبول کیا، اور ہجرت کے بعد مدینہ گئے۔ آنحضور ﷺ نے ان میں اور عبادہ بن صامتؓ میں مواخات کرا دی۔ بدر، اُحد، خندق اور دوسرے غزوات میں شرکت کی۔ مشہور صحابی حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ ہجرت کر کے مدینہ آ گئے تھے، لیکن ان کے اہل و عیال مکہ ہی میں ان کے حلیف کی نگرانی میں تھے۔ جب رسول کریم ﷺ نے فتح مکہ کا ارادہ کیا تو حضرت حاطبؓ نے اپنے اہل خانہ کی حفاظت کے خیال سے اپنے حلیف کو اس کی خفیہ تحریری اطلاع دی۔ آنحضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے چند سوار حضرت علیؓ کی سرکردگی میں اس تحریر کی تلاش میں دوڑائے۔ ان سواروں میں ابومرثدؓ بھی تھے۔ ان لوگوں نے خاخ کے باغ میں خط لے جانے والی عورت کو گرفتار کر لیا اور جامہ تلاشی لے کر وہ تحریر برآمد کر لی۔ حضرت ابومرثدؓ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کے عہد خلافت میں 12 ہجری میں چھیاسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی۔

ابومسعودؓ بدری انصاری

عقبہ نام، ابومسعود کنیت۔ ان کا تعلق بنوخزرج سے تھا۔ عقبہ ثانیہ میں اسلام قبول کیا اور پھر اس دین کے پُرجوش داعی ثابت ہوئے۔ تمام غزوات میں شرکت کی۔ عہد نبوی ﷺ اور خلفائے ثلاثہ کے زمانے تک مدینہ میں اقامت پذیر رہے۔ کچھ عرصہ بدر میں بھی سکونت رکھی۔ حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں کوفہ میں منتقل ہو گئے اور یہاں مکان بنوا لیا تھا۔

حضرت ابومسعودؓ حضرت علیؓ کے خاص احباب میں سے تھے۔ جب حضرت علیؓ جنگ صفین کے لیے روانہ ہوئے تو ابومسعودؓ کو کوفہ میں اپنا جانشین بنا کر گئے۔ جنگ صفین کے بعد مدینہ واپس آ گئے۔ امر بالمعروف اور احکام رسول ﷺ کی پابندی ان کے خاص اوصاف تھے۔ حکم نبوی ﷺ کی پیروی کا یہ واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ اپنے غلام کو مار رہے تھے کہ انھیں اپنے پیچھے دُور سے آواز سنائی دی، لیکن وہ اس آواز کو پہچان نہ سکے۔ جب وہ آواز قریب ہوئی تو انھوں نے دیکھا کہ آواز دینے والے رسول کریم ﷺ ہیں۔ آپ نے ان سے قریب ہو کر مخاطب فرمایا: ''یہ غلام اتنا تیرے قابو میں نہیں، جتنا تو اللہ کے قابو میں ہے۔'' یہ ارشاد سن کر ابومسعودؓ کے ہاتھ سے کوڑا گر گیا اور انھوں نے ندامت سے عرض کیا: ''یارسول اللہ، میں آیندہ کبھی کسی غلام کو نہ ماروں گا اور اس غلام کو میں اللہ کے لیے آزاد کرتا ہوں۔''

نہایت حق گو اور بے باک تھے۔ ایک مرتبہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ والی کوفہ نے نمازِ عصر میں تاخیر کر دی۔ حضرت ابومسعودؓ نے انھیں برملا ٹوکا اور فرمایا کہ نماز صحیح وقت پر پڑھنی چاہیے، جیسا کہ رسول ﷺ پڑھتے تھے۔ ایک دن لوگوں سے کہا، تمھیں علم ہے کہ رسول کریم ﷺ کس طرح نماز ادا کرتے تھے۔ پھر خود نماز پڑھا کر بتایا کہ یہ طریقہ تھا حضور ﷺ کے نماز پڑھانے کا۔ لوگوں کو جلد بازی سے منع فرمایا کرتے تھے۔ مسند ابوداؤد میں ہے کہ ایک مرتبہ حلقہ قائم کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں دو آدمیوں نے آ کر کہا کہ اس حلقے میں کوئی ہمارا فیصلہ کر سکتا ہے؟ حلقے میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے کہا: ''میں کر سکتا ہوں۔'' اس پر حضرت ابومسعودؓ نے فرمایا: ''چپ، عجلت میں فیصلہ کرنا مکروہ ہے۔''

علم و فضل کے اعتبار سے بہت بلند مقام رکھتے تھے۔ ان کا شمار راویانِ حدیث صحابہؓ کے تیسرے طبقے میں ہوتا ہے۔ ان سے 102 احادیث مروی ہیں۔

حضرت ابومسعودؓ نے حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے امارت کوفہ کے زمانے میں وفات پائی۔ ان کی اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی کا پتا چلتا ہے۔ بیٹی امام حسینؓ سے منسوب تھیں۔ اس نسبت سے حضرت حسینؓ ان کے داماد اور حضرت علیؓ سمدھی۔ بیٹے کا نام بشیر تھا۔ وہ اخیر عہدِ رسالت میں یا اس کے کچھ بعد پیدا ہوئے تھے۔

ابوموسیٰ اشعریؓ

عبداللہ نام، ابوموسیٰ کنیت۔ والد کا نام قیس۔ والدہ کا نام طیبہ تھا۔ یمن کے اشعری خاندان کے ذی اثر رئیس تھے۔ 614ء میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے بہت سے رشتہ داروں اور افرادِ قبیلہ کے ساتھ یمن سے سمندر کے راستے روانہ ہوئے اور آنحضور ﷺ کی بارگاہ میں اس وقت حاضر ہوئے جب آپ ﷺ سات ہجری (628ء) میں یہود کے خلاف خیبر کے مشہور نخلستان میں صف آرا تھے۔ چنانچہ آپ بیعت کر کے خدامِ رسالت پناہ کی صف میں شامل ہو گئے۔ آٹھ ہجری میں وہ غزوۂ حنین میں شریک ہوئے۔ دس ہجری میں انھیں حضرت معاذ بن جبلؓ کے ساتھ یمن میں اشاعت اسلام کے لیے بھیجا گیا، اور اسی علاقے کے وہ آنحضور ﷺ کی جانب سے اور پھر حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے عامل رہے۔ 17 ہجری (638ء) میں حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ بن شعبہ کو معزول کرنے کے بعد انھیں کوفہ کا عامل مقرر کر دیا۔ اہل بصرہ کی درخواست پر حضرت عمرؓ نے انھیں 22 ہجری میں وہاں کا عامل مقرر کیا۔ اس عہدے پر وہ چند ماہ مامور رہے۔ پھر جب مغیرہ کو ان کے منصب پر بحال کر دیا گیا تو انھیں دوبارہ بصرہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ والی بصرہ کی حیثیت سے ابوموسیٰؓ نے خوزستان فتح کیا۔ انھوں نے الجزیرہ کی تسخیر میں بھی حصّہ لیا، اور اس مقصد کے لیے اپنی فوجوں کو عیاضؓ بن غنم کی فوجوں کے ساتھ ملا دیا۔ علاوہ ازیں وہ ایرانی شہروں کی فتح میں شریک

ہوئے۔ چنانچہ نہاوند کے معرکے میں وہ موجود تھے۔ اس علاقے کے بہت سے شہروں کی تسخیر انھی کی طرف منسوب ہے۔

644ء میں انھوں نے کردقبائل کی ایک زبردست بغاوت کو فرو کیا۔ اس اثنا میں کچھ لوگ ان کے مخالف ہو چکے تھے۔ ان کی شکایات دربارِ خلافت میں پہنچائی گئیں اور انھیں امیر المومنین کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنا پڑی۔ بعدازاں انھوں نے فارس پر چڑھائی کی اور بہت سے معرکوں میں عثمان بن ابی العاص کی مدد کی، جنھوں نے اس صوبے کی فتح کا آغاز بحرین اور عمان سے کر دیا تھا۔

اس موقع پر ایک ضمنی حادثے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوموسیٰ کے خلاف پہلے ہی سے عدمِ اطمینان کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا، جو درحقیقت 26 ہجری میں ظاہر ہوا۔ لیکن ان کی مزعومہ کوتاہیوں کے خلاف نہایت سنگین احتجاج وہ تھا جو اہلِ بصرہ کے ایک وفد نے 29 ہجری (649ء) میں مدینہ منورہ میں حاضر ہو کر کیا، جس پر حضرت عثمانؓ نے ان کی جگہ عبداللہ بن عامر کو مامور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے باوجود ابوموسیٰ کوفے کے لوگوں کے دلوں میں اس قدر گھر کر چکے تھے کہ انھوں نے 34 ہجری میں وہاں کے والی سعید بن العاص کو شہر سے نکال دینے کے بعد وہاں ابوموسیٰ کے دوبارہ تقرر کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ابوموسیٰ حضرت عثمانؓ کی شہادت تک برابر وہاں کے والی رہے۔

حضرت علیؓ کے انتخاب پر ابوموسیٰؓ نے کوفیوں کی طرف سے ان کی بیعت کی، جب کہ حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ دوسرے تمام عامل معزول کر دیئے گئے، لیکن جب حضرت علیؓ کی حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہ وزبیرؓ سے جنگ چھڑ گئی تو ابوموسیٰؓ نے اپنی رعایا کو غیر جانب دار رہنے کا حکم دیا اور پورا دباؤ پڑنے کے باوجود انھوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیعانِ علیؓ نے انھیں اولین موقع پر شہر بدر کر دیا اور امیر المومنین نے انھیں نہایت ہی تہدید آمیز الفاظ میں معزولی کا حکم بھیج دیا، مگر چند ماہ بعد انھیں امان دے دی گئی۔

حضرت ابوموسیٰؓ ان دو حَکَموں میں سے تھے جو جنگ صفین (37ہجری/657ء) میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین تنازع چکانے کے لیے مقرر کیے گئے تھے، بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ انھیں حضرت علیؓ کی طرف سے ثالث مقرر کیا گیا تھا، اس بنا پر کہ ان کے طرف داروں نے اصرار کیا تھا کہ ثالث ایک غیر جانب دار شخص ہونا چاہیے، کیوں کہ انھیں اپنے موافق فیصلے کا پورا پورا یقین تھا۔ اذرح کی مجلس کے بعد ابوموسیٰؓ مکہ معظمہ چلے گئے۔ پھر جب حضرت معاویہؓ نے بسر بن ابی ارطاہ کو 660ء میں حرمین پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا تو ابوموسیٰؓ کو خوف ہوا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لیا جائے، کیوں کہ انھوں نے اذرح میں حضرت معاویہؓ کے انتخاب کی مخالفت کی تھی۔ وہ وہاں سے چلے گئے۔ بسر نے انھیں ازسرِنو اطمینان دلایا اور ان کا خدشہ دُور کیا۔ اس کے بعد ابوموسیٰؓ نے ملکی سیاسیات میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

حضرت ابوموسیٰؓ کو بارگاہِ رسالت ﷺ میں خاص تقرب حاصل تھا۔ وہ ان چھ آدمیوں میں سے ایک تھے، جنھیں خود عہدِ نبوی ﷺ میں مسائل کے جواب اور فتویٰ دینے کی اجازت تھی۔ ایک مرتبہ حدیث کا ذکر ہو رہا تھا، حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا: ''آنحضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے قریب علم اٹھ جائے گا۔ جہالت کا دور دورہ ہوگا اور قتل وغارت کی گرم بازاری ہوگی۔'' ان کے درس کے طریقے مختلف تھے۔ مستقل حلقۂ درس کے علاوہ کبھی کبھی وہ خطبہ دیتے۔ ایک مرتبہ فرمایا: ''لوگو! شرک سے بچنے کی کوشش کرو کہ یہ چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ غیر محسوس ہے۔'' ایک مرتبہ لوگوں کو آنحضور ﷺ کی یہ حدیث سنائی:

''قیامت کے قرب میں ہرج زیادہ ہوگا۔ لوگوں نے پوچھا، ہرج کیا ہے؟ فرمایا: قتل اور جھوٹ۔ لوگوں نے کہا، کیا اس سے بھی زیادہ قتل ہوگا، جتنا ہم لوگ کرتے ہیں؟ فرمایا: اس سے مقصد کفار کا قتل نہیں، بلکہ باہمی خوں ریزی ہے، حتّٰی کہ پڑوسی پڑوسی کو، بھائی بھائی کو، بھتیجا چچا کو اور چچا بھتیجے کو قتل کرے گا۔ لوگوں نے کہا، کیا عقل و ہوش رکھتے ہوئے؟ فرمایا: کہاں عقل و ہوش۔ اس زمانے میں عقل و ہوش تو باقی رہے گا، حتّٰی کہ آدمی خیال کرے گا کہ وہ حق بات پر ہے، لیکن درحقیقت وہ کسی حق بات پر نہ ہوگا۔''

حضرت ابوموسیٰؓ کو قرآن مجید سے غیر معمولی شغف وانہماک تھا۔ فرصت کا وقت تلاوت اور اس کی تعلیم میں صرف ہوتا۔ قرآن نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ آنحضور ﷺ فرماتے تھے کہ ''انھیں لحن داؤدی سے حصہ ملا ہے۔'' آنحضور ﷺ کو ان کی قرأت بہت پسند تھی۔ جہاں انھیں قرأت کرتے ہوئے سنتے، کھڑے ہو جاتے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ کہیں تشریف لے جا رہے تھے کہ ابوموسیٰؓ کو قرآن پڑھتے ہوئے سنا۔ وہیں کھڑے ہو گئے اور قرآن سُن کر آگے بڑھے۔ دوسرے دن جب ابوموسیٰ حاضر ہوئے تو فرمایا کہ ابوموسیٰؓ کل تم قرآن پڑھ رہے تھے۔ ہم نے تمھاری قرأت سنی تھی۔ عرض کیا، یارسول اللہ، اگر مجھے حضور کی موجودگی کا علم ہوتا تو میں آواز میں اور دل کشی پیدا کر لیتا۔

قرآن کے ساتھ ساتھ انھیں حدیث کے علم سے بھی وافر حصّہ ملا تھا۔ حفظ حدیث کے اعتبار سے ان کا درجہ بہت بلند تھا۔ کوفہ میں مستقل حلقہ درس تھا، جس سے بڑے بڑے اربابِ کمال پیدا ہوئے۔ ان کی مرویات کی تعداد 360 تک پہنچتی ہے۔ ان میں 50 متفق علیہ ہیں۔ ان کی پوری زندگی حیاتِ نبوی ﷺ کا آئینہ تھی۔ وہ کوشش کرتے تھے کہ ان کی نقل وحرکت، قول وفعل ذاتِ نبوی ﷺ کا نمونہ بن جائے۔ رمضان کے روزوں کے علاوہ نوافل کے روزے محض اس لیے رکھتے تھے کہ آنحضور ﷺ رکھا کرتے تھے۔ عاشورہ کا روزہ آنحضور ﷺ برابر رکھا کرتے تھے۔ ابوموسیٰ بھی لوگوں کو تاکید کرتے تھے کہ عاشورہ کا روزہ رکھو۔ قربانی کا جانور آنحضور ﷺ کی تقلید میں اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے، بلکہ لڑکیوں تک کو حکم دیتے تھے کہ وہ اپنے ہاتھ سے ذبح کریں۔

ان کی وفات کے سن اور مقام میں مختلف روایات ہیں۔ زیادہ لوگ ان کی وفات کا مقام مکہ اور سن ذوالحج 44 ہجری بتاتے ہیں۔

ا ہریرہؓ

عمیر بن عامر بن عبد ذی الشری۔ ان کا شمار ان صحابہؓ میں ہے جو علم حدیث کے
طین سمجھے جاتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا: ''ابو ہریرہ علم کا
ف ہے۔'' ان کا نام پہلے عبدالشمس تھا۔ اسلام لانے پر بدل کر عمیر، عبداللہ یا
الرحمٰن کردیا گیا، لیکن ان ناموں کے علاوہ متعدد دوسرے نام بھی بتائے گئے ہیں۔
ں ابو ہریرہ اس لیے کہا جاتا تھا کہ اپنے قبیلے کی بکریاں چراتے وقت وہ دل بہلانے
لیے اپنے ساتھ ایک بلی کا بچہ رکھا کرتے تھے۔ وہ طفیل بن عمرو الدوسی کی تبلیغ سے
لمان ہوئے۔ جب ابو ہریرہؓ یمن کے اسی خانوادے کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے تو
حضور ﷺ خیبر کی مہم (7ہجری) پر گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ یہ قافلہ حضور ﷺ
ملاقات کے لیے خیبر گیا۔ اس وقت حضرت ابو ہریرہ کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر
ی۔ قبول اسلام کے بعد وہ آنحضرت ﷺ کی صحبت ہی میں رہے اور
پ ﷺ ہی کی داد و دہش پر ان کی بسر اوقات ہوتی تھی۔ وہ ان غریب و نادار لوگوں
ں سے تھے جو اہل صُفہ کہلاتے تھے۔ انھیں اپنی والدہ سے بڑی محبت تھی اور ان کی
غیب سے وہ بھی اسلام لے آئی تھیں۔

حضرت عمرؓ نے انھیں بحرین کا عامل مقرر کیا، مگر بعد میں انھیں معزول کر کے ان کا
ت سامان و دولت ضبط کرلیا۔ بعد ازاں جب حضرت عمرؓ نے انھیں ان کے منصب پر
ال کرنا چاہا تو انھوں نے انکار کردیا۔ مروان نے مدینہ منورہ سے اپنی غیر حاضری کے
مانے میں ابو ہریرہؓ کو اپنا نائب مقرر کیا تھا، لیکن ایک روایت یہ ہے کہ انھیں امیر
عاویہؓ نے اس منصب پر مامور کیا تھا۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے اگرچہ آنحضرت ﷺ کے وصال سے چار سال سے بھی
کچھ کم عرصہ پہلے اسلام قبول کیا تھا، تاہم وہ بہت سی احادیث کے راوی ہیں اور جو
روایات ان سے مروی ہیں، ان کی تعداد تقریباً پانچ ہزار تین سو چھہتر بتائی جاتی ہے۔
امام احمد بن حنبلؒ کی ''مسند'' میں ان کی روایات 213 صفحات میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن
لوگوں نے براہ راست ابو ہریرہؓ سے حدیث روایت کی ہے، ان کی تعداد آٹھ سو یا اس
سے کچھ زیادہ شمار کی گئی ہے۔ ایک روایت میں ابو ہریرہؓ نے اس امر کی توجیہ کی ہے کہ وہ
دوسروں کے مقابلے میں زیادہ احادیث کے راوی کیوں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب
دوسرے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے تو وہ بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر
رہتے تھے اور اس لیے انھیں دوسروں کے مقابلے میں آنحضور ﷺ کی باتیں سننے کا
زیادہ موقع ملتا تھا۔ ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہؓ نے آنحضور ﷺ سے عرض کی کہ میں
جو کچھ سنتا ہوں، بھول جاتا ہوں تو آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جب میں کچھ کہہ رہا
ہوں تو تم اپنا جُبہ پھیلا دو اور جب میں اپنا کلام ختم کر چکوں تو اسے گرد لپیٹ لو۔ چنانچہ
حضرت ابو ہریرہؓ نے ایسا ہی کیا اور اس کے بعد سے وہ آنحضرت ﷺ سے سنی ہوئی
کوئی بات نہیں بھولے۔ ان کی بہت سی روایات صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں درج ہیں۔
انھیں جو حدیثیں یاد تھیں، وہ انھوں نے لکھ بھی لی تھیں۔ چند روایات سے ظاہر ہوتا ہے
کہ بعض صحابہؓ ان کی بعض مرویات پر اعتراض کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ
انھیں حضرت ابو ہریرہؓ کے حفظ و امانت پر شک تھا، بلکہ ان کے تفقہ پر انھیں اعتراض
تھا۔ ابو ہریرہؓ کچھ فارسی بھی جانتے تھے۔ انھیں تورات کے مسائل سے بھی واقفیت تھی۔
ان کے خوفِ خدا، عبادت و ریاضت، عشقِ رسول ﷺ و آلِ رسول، والدہ کی
خدمت، اظہارِ حق میں جرأت، سادگی اور فیاضی کے جستہ جستہ واقعات مآخذ میں ملتے
ہیں۔ وہ اپنے تقویٰ اور ظرافتِ طبع کے لیے مشہور تھے۔

ان کا سن وفات 58 یا 59 ہجری بتایا جاتا ہے، لیکن اگر یہ روایت صحیح ہے کہ
ام المومنین حضرت عائشہؓ کی نماز جنازہ (58ہجری) میں شریک تھے تو ان کی وفات
اس کے بعد ہوئی ہوگی۔ انھوں نے 78 سال کی عمر پائی۔ ولید نے نماز جنازہ پڑھائی
اور وہ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

ابی بن کعب انصاریؓ

ابی نام، ابوالمنذر اور ابوالطفیل کنیت۔ سید القرا، سید الانصار اور سید المسلمین
القاب ہیں۔ قبیلہ نجار (خزرج) کے خانوادے بنو معاویہ سے تعلق تھا جو بنی حدیلہ کے
نام سے مشہور تھا۔ حضرت ابوطلحہؓ انصاری ان کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

ان کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ کی زبانی اتنا
معلوم ہوتا ہے کہ قبول اسلام سے پہلے مے نوشی ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی۔ حضرت
ابوطلحہؓ نے ندیموں کا جو حلقہ قائم کیا تھا، حضرت ابیؓ اُس کے ایک ضروری رکن تھے۔

حضرت ابیؓ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر آنحضور ﷺ کے دست مبارک پر
بیعت کر کے اسلام قبول کیا۔ ہجرت کے بعد سعید بن زید بن عمرو بن نفیل سے، جو عشرہ
مبشرہ میں تھے، ان کی مواخات ہوئی۔ حضرت ابی عہد نبوی ﷺ کے غزوات میں
بدر سے لے کر طائف تک کے تمام معرکوں میں شریک رہے۔ غزوۂ اُحد میں زخمی
ہوئے۔ انھوں نے عہد رسالت سے لے کر خلافت عثمانی تک اہم مذہبی اور قومی
خدمات انجام دیں۔ 9ہجری میں جب زکوٰۃ فرض ہوئی اور آنحضور ﷺ نے
صدقات کی وصولی کے لیے عرب کے صوبہ جات میں عمال روانہ فرمائے تو حضرت ابی
بھی عامل مقرر ہو کر گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں قرآن مجید کی ترتیب و تدوین کا اہم کام شروع ہوا تو
صحابہؓ کی جو جماعت اس خدمت پر مامور کی گئی تھی، حضرت ابیؓ اس کے سربراہ تھے۔ وہ
قرآن کے الفاظ بولتے اور دوسرے لوگ انھیں لکھتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک
مجلس شوریٰ قائم کی جو انصار و مہاجرین کے مقتدر اصحابؓ پر مشتمل تھی، جن میں
بنو خزرج کی طرف سے حضرت ابی بن کعبؓ بھی رکن تھے۔ حضرت عمرؓ کے پورے عہد
خلافت میں مسند افتا پر متمکن رہے۔ اس کے سوا حکومت کا کوئی منصب انھیں نہیں ملا۔
ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ آپ مجھے کسی جگہ کا عامل کیوں نہیں مقرر
فرماتے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں آپ کے دین کو دنیا میں ملوث نہیں دیکھنا
چاہتا۔ جب حضرت عمرؓ نے نمازِ تراویح کو باجماعت کیا تو حضرت ابیؓ کو امامت کے

لیے انتخاب فرمایا۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں قرآن مجید میں لب و لہجے کا اختلاف سامنے آیا تو آپ نے خود اصحاب قرأت کو طلب کر کے ہر شخص سے جُدا جُدا قرأت سنی۔ حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور معاذ بن جبلؓ، سب کے لہجے اور تلفظ میں فرق نظر آیا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے تمام مسلمانوں کو ایک تلفظ کے قرآن پر جمع کرنا چاہا۔ آپ نے قریش اور انصار کے بارہ اشخاص پر مشتمل ایک مجلس بنائی، جس کا سربراہ حضرت ابیؓ کو مقرر فرمایا۔ وہ قرآن کے الفاظ بولتے اور حضرت زیدؓ لکھتے جاتے۔ آج قرآن مجید حضرت ابیؓ ہی کی قرأت کے مطابق ہے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ رسولِ کریم ﷺ سے جس قدر قرأت پڑھتے تھے، گھر پر اسے قلم بند کرتے جاتے تھے۔ یہی قرآن ہے جو فن قرأت کی تاریخ میں ''مصحف اُبی'' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مصحف حضرت عثمانؓ کے عہد تک موجود تھا۔

حضرت ابی بن کعب کی زندگی کا ایک ایک لمحہ علم کے لیے وقف تھا۔ انصار میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، اور قرآن کے سمجھنے اور حفظ و قرأت میں انصار و مہاجرین دونوں میں ان کی فضیلت مسلّم تھی، یہاں تک کہ خود رسول اللہ ﷺ ان سے قرآن مجید پڑھوا کر سنتے تھے۔ علومِ اسلامیہ کے علاوہ کتب قدیمہ سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ تورات اور انجیل کے عالم تھے۔ آنحضور ﷺ کے متعلق ان کتابوں میں جو بشارتیں مذکور ہیں، وہ انھیں خاص طور پر معلوم تھیں۔ وہ اگرچہ مختلف علوم کے جامع تھے، لیکن وہ خاص فن جن میں انھیں امامت اور اجتہاد کا منصب حاصل تھا، قرآن، تفسیر، شانِ نزول، ناسخ و منسوخ، حدیث و فقہ تھے۔ ان کے حلقۂ درس میں تابعین سے زیادہ صحابہؓ کا مجمع ہوتا تھا۔ حضرت عمرؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ، حضرت عبادہ بن صامتؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ، حضرت انس بن مالکؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت سہل بن سعدؓ وغیرہم حضرت ابیؓ سے علمِ حدیث میں استفادہ کرتے تھے۔ روایتِ حدیث میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ ان کی مرویات کی تعداد 164 سے زیادہ نہیں ہے۔

39 ہجری میں عمر طبعی کو پہنچ کر حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ حضرت عثمانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ مدینہ منورہ میں دفن کیے گئے۔

اخرم اسدیؓ

محرز بن نضلہ نام۔ ان کا لقب اخرم اسدی۔ ان کا تعلق بنو اسد بن خزیمہ سے تھا۔ ایام جاہلیت میں ان کا خاندان بنو عبد شمس کا حلیف تھا۔ انھوں نے بعثت نبوی کی ابتدا ہی میں عین عنفوان شباب میں دعوتِ اسلام پر لبیک کہا۔ اس طرح انھیں سابقون الاولون کی جماعت کا رکن ہونے کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ جب آنحضور ﷺ نے اپنے صحابہ کو مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرنے کا اذنِ عام دیا تو اخرم سعدیؓ بھی مدینہ آ گئے۔ یہاں ان کا رشتۂ مواخات حضرت عمارہؓ بن خرم نجاری انصاری سے قائم ہوا۔ انھوں نے بدر، اُحد اور خندق کے غزوات میں شرکت کی۔ غزوۂ ذی قردہ کے موقع پر ربیع الثانی 6 ہجری میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت پائی۔

ارقمؓ بن ابی الارقم

ارقم نام، ابی الارقم کنیت۔ والد کا نام عبد مناف، والدہ کا نام امیمہ تھا۔ ان کا تعلق بنو مخزوم سے تھا۔ ہجرتِ نبوی سے تیس برس قبل 594ء میں پیدا ہوئے۔ اس حساب سے بعثتِ نبوی کے وقت ان کی عمر سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ سترہ یا اٹھارہ برس کی عمر میں بعثت کے بالکل ابتدائی زمانے میں نعمت ایمان سے بہرہ ور ہوئے۔

ان کے مکان ''دارارقم'' کو انتہائی نامساعد حالات میں دارالاسلام بننے کا عظیم شرف حاصل ہوا۔ شعب ابی طالب کی محصوری تک اسی مکان کو دعوت اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ آنحضور ﷺ اس زمانے میں ''دارارقم'' ہی میں تشریف فرما رہتے تھے۔ یہیں آ کر اہل حق آپ ﷺ کے پاس جمع ہوتے تھے اور مکان کا دروازہ بند کر کے نماز پڑھتے تھے۔ نئے لوگ بھی اسی جگہ اسلام قبول کرتے تھے۔

حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ نے اسی جگہ آ کر رحمت عالم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کر کے اسلام قبول کیا۔

بیعت عقبہ ثانی کے بعد ہجرت کا حکم ہوا تو حضرت ارقمؓ بھی دوسرے صحابہؓ کے ساتھ مدینہ پہنچے۔ یہاں حضرت ابوطلحہؓ زید بن سہل سے مواخات ہوئی۔ آنحضور ﷺ نے حضرت ارقمؓ کو مستقل قیام کے لیے مدینہ منورہ کے محلہ بنی زریق میں زمین کا قطعہ مرحمت فرمایا۔ غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو بدر، اُحد، احزاب، خیبر، حنین، کوئی ایسا معرکہ نہیں تھا، جس میں حضرت ارقمؓ نے سرفروشی کا حق ادا نہ کیا ہو۔ غزوۂ بدر میں آنحضور ﷺ نے انھیں ایک تلوار مرحمت فرمائی تھی، جس سے وہ میدان جنگ میں دادِ شجاعت دیتے رہے۔ آنحضور ﷺ نے انھیں زکوٰۃ و صدقات کی تحصیل کی خدمت تفویض کی تھی۔

حضرت ارقمؓ رحمتِ عالم ﷺ کے وصال کے بعد بیالیس سال حیات رہے۔ اس دوران میں خلافت راشدہ کا سارا دور گزر گیا، یہاں تک کہ سارے عالم اسلام پر امیر معاویہؓ کی حکومت قائم ہو گئی، لیکن اس طویل مدت میں حضرت ارقمؓ کی زندگی کا کوئی واقعہ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ انھوں نے 53 یا 55 ہجری میں 85 سال کی عمر میں وفات پائی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

''دارارقم'' کوہِ صفا کے نیچے ایسے مقام پر تھا کہ جو لوگ حج میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے تھے، وہ ٹھیک اس کے دروازے پر سے گزرتے تھے۔ حضرت ارقمؓ کو اس مکان کی اہمیت و فضیلت کا احساس تھا، اس لیے انھوں نے اسے وقف کی حیثیت دے دی، تاکہ بیع و وراثت کے تنازعوں سے محفوظ رہے۔ تاہم یہ مکان ان کی اولاد کے بعد ان کے خاندان کے قبضے میں رہا۔ 140 ہجری میں دوسرے عباسی خلیفہ منصور نے اسے حضرت ارقمؓ کے پوتے عبداللہ بن عثمان اور دوسرے ورثاء سے کے عوض خرید لیا۔ بعد میں یہ خلیفہ مہدی کی کنیز خیزران کے قبضے میں چلا گیا۔

منہدم کرا کر ازسرنو تیار کرایا۔ اگرچہ یہ مقدس مکان اب حرم پاک کا حصّہ بن گیا ہے، لیکن اس مکان کا نام ''دارِارقم'' قیامت تک باقی رہے گا۔

اُسامہ بن زیدؓ

اسامہ نام ہے، ابومحمد کنیت۔ حِبّ رسول اللہ یعنی محبوب رسول ﷺ لقب۔ شجرہ یوں ہے: اسامہ بن زید بن حارثہ بن شرجیل کلبی ہاشمی۔ حضرت امِ یمن کے بطن سے پیدا ہوئے جو آنحضور کی کھلائی تھیں۔ والد حضرت زید بن حارثہ آنحضور ﷺ کے محبوب اور منہ بولے بیٹے تھے۔ گویا آنحضور ﷺ کی محبوبیت کا شرف انھیں والدین سے ورثے میں ملا۔ آپ نے اسلام ہی میں آنکھ کھولی اور کفر و شرک کی آلودگیوں سے کبھی ملوث نہیں ہوئے۔

فتح خیبر کے بعد ان کا وظیفہ مقرر ہوگیا، یعنی رسول کریم ﷺ کو جو زمین فے میں ملی، اس کے ایک حصّے کے پھلوں اور غلّے کی پیداوار میں انھیں بھی حصّہ دیا گیا، جس کے انتظام کے لیے وہ اکثر وہاں تشریف لے جاتے۔ زندگی نہایت سادہ تھی۔ وفات پر کوئی مال و زر نہیں چھوڑا۔ عمر بھر دین کے خدمت گزار رہے۔ کسی فتنے سے آلودہ نہیں ہوئے۔ ہجرت کا شرف بھی رسولِ کریم ﷺ کی معیت میں حاصل کیا۔

غزوۂ اُحد پیش آیا تو ان کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ جہاد میں شرکت کے آرزومند تھے، لیکن کم عمری کے سبب اجازت نہ ملی۔ مکہ معظمہ فتح ہوا تو وہ آنحضور ﷺ کے ہم راہ بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ نبی کریم ﷺ ایک ناقہ پر سوار تھے۔ آپ ﷺ کے جلو میں حضرت بلالؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت طلحہؓ تھے اور ردیف میں حضرت اُسامہؓ۔

11 ہجری میں آنحضور ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو اُس جیش کا سردار مقرر فرمایا جو موتہ میں حضرت زیدؓ اور حضرت جعفر طیارؓ کی شہادت کے بعد تیار کیا گیا اور جس سے مقصود یہ تھا کہ اسلامی لشکر رومی علاقے میں یلغار کرے، تاکہ سرحد فتنہ و فساد سے محفوظ ہو جائے، لیکن صحابہؓ نے ان کی نوعمری کے باعث ان کی سرداری پر اعتراض کیا۔ آنحضور ﷺ کو خبر پہنچی تو علالت کے باوجود باہر تشریف لائے اور حضرت اُسامہؓ کے حق میں تقریر فرمائی۔ آپ ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو اپنے دست مبارک سے علم عطا کیا تھا، لیکن وہ ابھی اپنی پہلی منزل جُرف تک، جو مدینہ منورہ سے زیادہ دور نہیں، پہنچے تھے کہ آنحضور ﷺ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی۔ یہ خبر سن کر حضرت اسامہؓ لوٹ آئے، مگر جس روز مدینہ منورہ پہنچے، مرض میں افاقہ تھا، لہٰذا آنحضور ﷺ کے ارشاد پر وہ پھر اپنی مہم پر روانہ ہوگئے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراح اور متعدد صحابہ شریک لشکر تھے، لیکن حضرت اسامہؓ ابھی جُرف سے روانہ نہیں ہونے پائے تھے کہ حضرت امِ ایمن کی اطلاع پہنچی کہ رسول کریم ﷺ کی رحلت کا وقت قریب ہے، لہٰذا حضرت اسامہؓ مع لشکر مدینہ منورہ واپس آ گئے۔ انھوں نے حضور ﷺ کی تجہیز و تکفین میں شریک ہونے اور حضور ﷺ کا جسد اطہر قبر میں اتارنے کا شرف بھی حاصل کیا۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو جیسا کہ آنحضور ﷺ کا ارشاد تھا، آپ نے باوجود فتنۂ ارتداد کے، جس نے قبائل کو بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا، اسامہؓ کو لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ اگرچہ ان کی نوعمری اور نئے حالات کے سبب پھر اس کی مخالفت کی گئی۔ حضرت عمرؓ کی رائے تھی کہ اس مہم کو کسی آزمودہ کار صحابی کے سپرد کرنا چاہیے، لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ آنحضور ﷺ کا حکم ہے جس سے سرتابی ممکن نہیں۔ لہٰذا حضرت اسامہؓ پھر اس مہم پر روانہ ہوگئے اور ملک شام میں دور تک یلغار کرتے ہوئے مقام ابنی تک پہنچ گئے۔ یہ وہ قریہ ہے جسے آج کل خان الزیت کہتے ہیں۔ چند روز المزہ میں، کہ دمشق کے قریب ایک قریہ ہے، قیام فرمایا۔ اس کامیاب مہم پر کہ ایک طرح سے تسخیر شام کی تمہید تھی، مدینہ منورہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

حضرت اسامہؓ مدینہ منورہ واپس آئے اور کچھ دنوں کے بعد جب حضرت ابوبکرؓ فتنۂ ارتداد کے سلسلے میں الابرق تشریف لے گئے تاکہ باغی قبائل کی سرکوبی کریں تو انھوں نے حضرت اسامہؓ ہی کو اپنا جانشین مقرر کیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں جب حضرت اسامہؓ کا وظیفہ اپنے فرزند حضرت عبداللہؓ کی بہ نسبت زیادہ مقرر کیا اور حضرت عبداللہ کو اس پر اعتراض ہوا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''وہ رسول اللہ ﷺ کو تجھ سے زیادہ عزیز تھے اور ان کا باپ تیرے باپ سے زیادہ عزیز تھا۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں فتنہ و فساد کی تحریک ہوئی تو حضرت اسامہؓ از راہ احتیاط اس سے الگ رہے۔ انھوں نے حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی اور امیر معاویہؓ کے خلاف ان کی معرکہ آرائیوں سے بھی کنارہ کش رہے، لیکن حضرت علیؓ کو حق پر جانتے تھے اور بالآخر اپنی غیر جانب داری پر نادم بھی ہوئے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی وفات 54 ہجری میں یعنی امیر معاویہؓ کے آخری زمانے میں ہوئی، جب آپ جُرف میں مقیم تھے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے 58 ہجری میں انتقال فرمایا۔ مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے متعدد شادیاں کیں اور کثیر الاولاد تھے۔ فضائل اخلاق میں ان کا درجہ بڑا بلند ہے۔ زہد و تقویٰ میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما سے مشابہ تھے۔ ان کی ساری تربیت کاشانۂ نبوی ﷺ میں ہوئی۔ آنحضور ﷺ کے محبوب، راز دار اور معتمد علیہ تھے۔ لہٰذا صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کی ذات ایک طرح سے منفرد تھی۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ان کا بڑا احترام تھا۔ ان کی ذات سے حدیث کا معتد بہ حصہ اشاعت پذیر ہوا۔ ان کی مرویات کی تعداد 128 ہے، جن میں سے 15 متفق علیہ ہیں۔

اسعدؓ بن زرارہ انصاری

اسعد نام، ابوامامہ کنیت، خیر لقب، قبیلہ خزرج سے تھے اور خاندان نجّار سے وابستہ تھے۔ مبداء فیض سے صالح فطرت پائی تھی۔ وہ زمانۂ جاہلیت ہی میں بت پرستی

سے متنفر اور توحید کے قائل ہو گئے تھے۔ حضور ﷺ کی بعثت کے بعد ایک دفعہ حضرت اسعدؓ اور ذکوانؓ بن عبد قیس قومی مفاخرت کا مقابلہ کرنے کے لیے مکہ آئے اور رئیس قریش عتبہ بن ربیعہ کے ہاں قیام کیا۔ اثنائے گفتگو میں عتبہ نے اپنے مہمانوں کو بتایا کہ بنو ہاشم کے ایک نوجوان محمد ﷺ بن عبداللہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ ہمارے بتوں کی مذمت کرتا ہے، ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمیں ایک اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔

ذکوان نے یہ باتیں سن کر حضرت اسعدؓ سے کہا: "تمھیں جس دین کی تلاش تھی، وہ یہی دین ہے۔" حضرت سعدؓ اسی وقت اٹھ کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور اللہ کی وحدانیت اور حضور ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی۔ حضرت ذکوان بن عبد قیسؓ نے بھی اسی موقع پر اسلام قبول کیا۔ انصار میں جو شخص سب سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے، وہ حضرت اسعدؓ بن زرارہ ہیں۔ بیعت عقبہ اوّل کے دوسرے سال بارہ آدمیوں کے ساتھ مکہ آئے اور تیسرے سال عقبہ کبیرہ کی بیعت میں شرکت کی۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے بیعت کے لیے انھوں نے ہاتھ بڑھایا تھا۔ اس بیعت میں آنحضور ﷺ نے انھیں بنو نجار کا نقیب تجویز فرمایا۔ حضرت اسعدؓ نقیبوں میں سن ولادت کے لحاظ سے سب سے چھوٹے تھے۔

حضرت اسعدؓ نے باجماعت نماز کا انتظام کیا اور چالیس نمازیوں کے ساتھ جمعہ ادا فرمایا۔ حضرت کعب بن مالکؓ، جو اصحاب عقبہ میں تھے، جمعہ کی اذان سنتے تو حضرت اسعدؓ کے لیے دعائے مغفرت کیا کرتے تھے، کیوں کہ اس کارِ خیر کی بنیاد انھی کے ہاتھوں سے پڑی تھی۔ جب آنحضور ﷺ نے قرآن پڑھانے اور دین کی باتیں سکھانے کے لیے بطور معلم حضرت مصعبؓ بن عمیر کو یثرب (مدینہ) روانہ کیا تو حضرت اسعدؓ ہی نے انھیں اپنا مہمان بنایا اور حضرت مصعب نے انھی کے مکان کو مرکز بنا کر تعلیم و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کا کام شروع کیا تھا۔ ہجرت نبوی ﷺ کے بعد اگرچہ آنحضور ﷺ کا مامن حضرت ایوب انصاریؓ کا کاشانہ تھا، لیکن آپ کی ناقہ حضرت اسعدؓ کی مہمان تھی۔

مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے جو جگہ تجویز ہوئی تھی، وہ زمین سہل اور سہیل نامی دو یتیموں کی ملکیت تھی جو حضرت اسعدؓ کی نگرانی میں تربیت پاتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے ان کے مربی سے زمین کی قیمت دریافت کی تو یتیم بھائیوں نے عرض کیا کہ ہم صرف خدا سے اس کی قیمت چاہتے ہیں، لیکن چوں کہ آنحضرت ﷺ کو بلا قیمت لینا منظور نہ تھا، اس لیے حضرت ابوبکرؓ سے قیمت دلوائی۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت اسعدؓ نے ان یتیموں کو اپنا ایک باغ، اس زمین کے معاوضے میں دیا تھا۔

ابھی مسجد نبوی زیر تعمیر تھی کہ شوال، ایک ہجری میں وفات پائی۔ نمازِ جنازہ آنحضور ﷺ نے پڑھائی۔ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ہجرت کے بعد یہ پہلی موت تھی۔ یہ بھی خیال ہے کہ آنحضور ﷺ نے سب سے پہلی نماز جنازہ انھی کی پڑھی تھی۔ انصار کے خیال کے مطابق جنت البقیع میں سب سے پیش تر دفن ہونے والے مسلمان یہی تھے۔ حضرت سعدؓ نے دو لڑکیاں چھوڑیں اور آنحضور ﷺ سے ان کے متعلق وصیت کی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے ان کا ہمیشہ خیال رکھا اور دونوں کو سونے کی بالیاں پہنائیں جن میں موتی جڑے ہوئے تھے۔

اَسودؓ بن سریع

اسود نام، ابو عبداللہ کنیت۔ فتح مکہ کے بعد اسلام لائے۔ قبولِ اسلام کے بعد آنحضور ﷺ کا شرفِ ہم رکابی حاصل کیا۔ چنانچہ غزوۂ حنین میں ساتھ تھے۔ ان کا بیان ہے: "میں چار غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھا۔ کسی غزوے میں بعض لوگوں نے بچوں کو قتل کر دیا۔ آنحضور ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا، لوگوں کو کیا ہو گیا ہے، جو لڑائی میں بے گناہ بچوں اور جنگ جوؤں میں امتیاز نہیں کرتے۔" کسی نے عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ، کیا بچہ مشرک نہیں ہے؟" حضور ﷺ نے فرمایا: "اس طرح تو تمھارے بہترین لوگ بھی مشرک بچے ہیں۔ لڑکے دین فطرت پر پیدا ہوتے ہیں اور اس وقت تک اس دین پر رہتے ہیں، جب تک ان کی زبان نہیں پھوٹتی۔ اس کے بعد ان کے والدین انھیں یہودی یا نصرانی بناتے ہیں۔"

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد بال بچوں کو لے کر بصرہ چلے گئے اور یہیں اقامت اختیار کر لی۔ جامع بصرہ میں فرائض قضا انجام دیتے تھے۔ بصرہ ہی میں 40 ہجری میں وفات پائی۔ آٹھ حدیثیں بھی ان سے مروی ہیں۔ شاعری میں ممتاز تھے۔ کبھی کبھی دربار رسالت ﷺ میں حمد و نعت کی نذر پیش کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قبولِ اسلام کے ابتدائی زمانے میں حمد و نعت کہہ کر لائے اور عرض کیا: "یارسول اللہ ﷺ، خدا کی حمد اور حضور ﷺ کی مدح میں کچھ اشعار عرض کیے ہیں۔" فرمایا: "میری مدح سنانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ خدا کی حمد سناؤ۔" چنانچہ انھوں نے حمد سنانا شروع کی۔ اس درمیان میں ایک کشیدہ قامت شخص آ گیا۔ اسے دیکھ کر آنحضور ﷺ نے انھیں روک دیا۔ اس کے واپس جانے کے بعد پھر سننے لگے۔ دوبارہ پھر وہی شخص آیا۔ آپ ﷺ نے پھر اسودؓ کو خاموش کر دیا۔ اس کے واپس جانے کے بعد اسودؓ نے پوچھا: "یارسول اللہ ﷺ یہ کون شخص ہے، جس کے آنے پر آپ روک دیتے ہیں اور چلے جانے کے بعد پھر سنتے ہیں۔" فرمایا: "یہ عمر بن الخطابؓ ہیں۔ انھیں باطل اشیا سے کسی قسم کا لگاؤ نہیں۔"

اسیدؓ بن حضیر اشہلی

اسید نام، ابو یحییٰ اور ابو عتیک کنیت۔ قبیلہ اوس کے خاندان اشہل سے ہیں۔ اُن کے والد حضیر بن سماک قبیلہ اوس کے سپہ سالار تھے۔ وہ نہ صرف لکھنا پڑھنا جانتے تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے تیرانداز، شمشیر زن اور تیراک بھی تھے۔ ایامِ جاہلیت میں اوس و خزرج میں جو لڑائیاں ہوئیں، وہ حضیر ہی کی قیادت میں ہوئیں۔ جنگ بعاث میں، جو تمام لڑائیوں کی مرکزی لڑائی تھی، سپہ سالاری کا علم انھی کے ہاتھ میں تھا۔

بیعت عقبہ کے بعد حضرت مصعبؓ بن عمیر اشاعت اسلام کے لیے مدینہ

تشریف لائے، حضرت اسیدؓ اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ حضرت مصعبؓ نے حضرت اسعدؓ بن زرارہ کے مکان میں قیام کیا تھا۔ ایک روز حضرت مصعبؓ باغ میں مسلمانوں کو تعلیم دے رہے تھے کہ حضرت سعد بن معاذؓ اور اسیدؓ بن حُضیر کو خبر ہو گئی۔ حضرت سعدؓ نے اسید سے کہا کہ انھیں جا کر منع کرو۔ ہمارے محلّے میں آیندہ نہ آئیں۔ اگر سعدؓ بن زرارہ بیچ میں نہ ہوتے تو میں خود چلتا۔ ان کے کہنے پر اسید نیزہ اٹھا کر، اسلام کا قلع قمع کرنے، باغ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت اسعدؓ بن زرارہ نے اُن کو آتا دیکھ کر حضرت مصعبؓ سے کہا کہ یہ اپنی قوم کے سردار ہیں اور آپ کے پاس آ رہے ہیں۔ انھیں مسلمان بنا کر چھوڑیئے گا۔ اسیدؓ نے قریب پہنچ کر پوچھا: ''تم ہمارے کم زور لوگوں کو بے وقوف کیوں بناتے ہو۔ اگر اپنی خیریت چاہتے ہو تو ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔ حضرت مصعبؓ پر اس کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ فرمایا، آپ بیٹھ کر پہلے میری بات سُن لیں۔ اگر پسند ہو تو خیر، ورنہ جو مزاج میں آئے، کیجیے گا۔ حضرت اسیدؓ بیٹھ گئے اور مصعبؓ نے اسلام کی حقیقت بیان کی۔ قرآنِ مجید کی چند آیات پڑھیں، جنھیں سُن کر ان پر خاص اثر طاری ہوا اور بے اختیار منہ سے نکلا: ''اس دین میں کیوں کر داخل ہو سکتا ہوں؟'' جواب دیا: پہلے غسل ضروری ہے۔ پھر کپڑے پاک کرنا، کلمہ پڑھنا اور نماز پڑھنا۔'' اسیدؓ اٹھے اور غسل کر کے مسلمان ہو گئے۔ چلتے وقت کہا، میں جاتا ہوں اور دوسرے سردار کو بھیجتا ہوں۔ انھیں بھی مسلمان کرنا، اور وہاں سے لوٹ کر حضرت سعدؓ بن معاذ کو روانہ کیا۔

یہ واقعہ بیعت عقبہ ثانیہ سے پہلے کا ہے۔ بیعتِ عقبہ میں خود شریک ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے انھیں بنی عبدالاشہل کا نقیب تجویز کیا۔ ہجرت کے بعد آنحضور ﷺ نے ان کی مواخات حضرت زید بن حارث سے کی۔

غزوات میں سے بدر کی شرکت میں اختلاف ہے۔ اُحد میں شریک تھے اور زخمی ہوئے تھے۔ غزوۂ احزاب میں انھوں نے دو سو آدمی لے کر خندق کی حفاظت کی۔ غزوۂ غطفان، غزوۂ حدیبیہ، غزوۂ خیبر میں شریک تھے۔ فتح مکہ میں رسول کریم ﷺ مہاجرین اور انصار کے ساتھ تھے۔ حضرت اسیدؓ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آنحضرت ﷺ ان کے اور حضرت ابوبکرؓ کے درمیان تھے۔ غزوۂ حنین میں قبیلہ اوس کا جھنڈا اُن کے پاس تھا۔

رسول کریم ﷺ کے وصال کے بعد بیعت سقیفہ میں نمایاں حصہ لیا۔ بنو اوس سے کہا کہ خزرج سعدؓ بن عبادہ کو خلیفہ بنا کر سیادت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو تم پر ہمیشہ کے لیے برتری حاصل کر لیں گے اور تمھیں خلافت میں کبھی حصہ نہ دیں گے۔ میرے خیال میں ابوبکرؓ سے بیعت کر لینا بہتر ہے۔ یہ مشورہ دے کر سب کو حکم دیا کہ حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کر لیں۔ اوس کی رضا مندی کے بعد حضرت سعدؓ بن عبادہ کی قوت ٹوٹ گئی۔

فتح بیت المقدس میں کہ 16 ہجری کا واقعہ ہے، حضرت عمرؓ کے ہم راہ مدینہ سے شام گئے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے وصیت کی تھی کہ وہ جائداد اپنے ہاتھ میں لے کر قرض ادا کریں۔ آسان صورت یہ تھی کہ جائداد فروخت کر کے قرض ادا کر دیا جاتا لیکن حضرت عمرؓ نے ایسا نہیں کیا۔ قرض خواہوں کو بلا کر ایک ہزار درہم سالانہ پر راضی کیا۔ اس طرح چار برس تک پھل فروخت کر کے اُن کا کل قرضہ ادا کر دیا اور یوں ان کی جائداد بچ گئی۔ حضرت عمرؓ فرماتے تھے کہ میں اپنے بھائی کے بچوں کو محتاج نہیں دیکھنا چاہتا۔

دوسرے اکابرِ صحابہؓ کی طرح قرآن وحدیث کی نشر واشاعت میں حضرت اسیدؓ بن حُضیر کا بھی حصہ ہے۔ انھوں نے براہ راست آنحضور ﷺ سے روایت کی ہے۔ حضرت عائشہؓ، حضرت ابوسعید خُدریؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت ابولیلی انصاریؓ، حضرت کعب بن مالکؓ جیسے جلیل القدر صحابہ ان کے روایانِ حدیث کے سلسلے میں داخل ہیں۔ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ اسیدؓ انصار کے تین بہترین آدمیوں میں سے ایک ہیں۔ دوسرے دو آدمی حضرت سعدؓ بن معاذ اور عبادؓ بن بشر تھے۔ ان کے اثر واقتدار کا یہ حال تھا کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں جہاں پہلے سے تمام انصار حضرت سعد بن عبادہؓ کے خلیفہ بنانے پر اتفاق کر کے آئے تھے، ان کی ایک جنبشِ لب نے انصار کی سوچی سمجھی سکیم درہم برہم کر دی تھی۔

اصحاب بدرؓ

وہ صحابہ کرامؓ جنھوں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ شامل ہو کر مکہ مکرمہ کے شمال مغرب اور مدینہ منورہ کے جنوبِ مغرب کی طرف مقامِ بدر میں 17 رمضان دو ہجری 14۔ مارچ 624ء کو مشرکینِ مکہ کا مقابلہ کیا اور اللہ تعالیٰ کی نصرت وامداد سے مظفر ومنصور ہوئے۔

اصحابِ بدرؓ کا ذکر قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ ایک بار آل عمران، آیت 123 میں ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ﴾ (بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھیں بدرؓ کے مقام پر مدد دی جب کہ تم کم زور تھے) وارد ہوا ہے اور قرائن کے ساتھ بدر اور اصحاب بدرؓ کا ذکر متعدد بار آیا ہے (مثلاً سورۂ انفال میں بار بار، سورۂ توبہ، سورۂ دخان، سورۂ القمر، سورۂ الحدید)۔

غزوہ بدر کو ''یوم الفرقان'' (سورہ انفال، آیت 41 یعنی فیصلے کا دن) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، کیوں کہ اس روز حق وباطل کی کش مکش کا کھلا فیصلہ ہو گیا۔ اسے ''البطشة الکبری'' (سورہ الدخان، آیت 16 یعنی بڑی گرفت) بھی کہا گیا ہے۔ بعض مفسرین نے ''السابقون الاولون'' (سورۂ توبہ، آیت 100) سے مراد اصحاب بدر لی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اصحاب بدر سے وعدہ کیا کہ دو میں سے ایک گروہ پر وہ انھیں فتح و غلبہ عطا کرے گا، حق ثابت کر دے گا اور کافروں کی جڑ کاٹ دے گا (سورہ انفال، 8)۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہزار ملائکہ اصحاب بدرؓ کی مدد کے لیے بھیجنا منظور فرمایا (انفال، 9)، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ تین ہزار ملائکہ مدد کے لیے بھیج دیے جائیں گے یا پانچ ہزار ملائکہ (آل عمران، 124 تا 125)۔ قرآن کریم میں ایسی کوئی نص ناطق موجود نہیں کہ ملائکہ نے واقعی بدر میں جنگ کی۔ ابوبکر الاصم نے ملائکہ کے آسمان سے اتر کر مقاتلے

میں شرکت کرنے سے انکار کیا ہے۔ سرسید احمد خاں اور شیخ محمد عبدہٗ کا بھی یہی نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ جب کہ سورۂ انفال کی آیت 12 میں اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو حکم دیا کہ وہ اصحاب بدر کے دلوں کو ثابت و مضبوط کر دیں اور اللہ تعالیٰ نے خود کفار کے دلوں میں دہشت اور رُعب ڈال دیا۔ ملائکہ کو مزید حکم دیا کہ اہل بدر کے ساتھ ہو کر کفار کی گردنوں پر تلوار ماریں اور ان کی پور پور کاٹ ڈالیں۔

﴿إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (الانفال 8:26)

''اور اس حالت کو یاد کرو، جب کہ تم زمین میں قلیل تھے، کم زور شمار کیے جاتے تھے۔ اس اندیشے میں رہتے تھے کہ تمھیں لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں۔ سو اللہ نے تمھیں رہنے کی جگہ دی اور تمھیں اپنی نصرت سے قوت دی اور تمھیں نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تاکہ تم شکر کرو۔''

اس آیت کو بھی غزوۂ بدر سے متعلق بتایا ہے۔ اُن کے نزدیک اصحابِ بدر کو علم ہو چکا تھا کہ وہ طاقت اور تعداد میں قلیل ہیں اور ضعیف و مغلوب سمجھے جاتے ہیں۔ وہ ملک (مکہ) میں ڈرتے پھرتے ہیں، کہیں لوگ انھیں اچک نہ لے جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے انھیں قوت عطا کی اور پاکیزہ اور نفیس چیزیں عنایت فرمائیں۔

اصحابِ بدر کی تعداد میں اختلاف ہے۔ عام روایت یہ ہے کہ آنحضور ﷺ اس موقع پر تین سو تیرہ کے قریب مجاہدین لے کر چلے، جن میں سے 74 مہاجر اور باقی انصار تھے۔ ان میں سے آٹھ کو انھوں نے پیچھے چھوڑ دیا یا لوٹا دیا یا کسی اور مہم پر روانہ کر دیا۔ ان کے نام یہ ہیں:

عثمانؓ بن عفان، جنھیں ان کی اہلیہ محترمہ، یعنی نبی کریم ﷺ کی صاحب زادی رقیہؓ کی تیمارداری کے لیے مدینہ میں چھوڑ دیا گیا۔

طلحہؓ بن عبید اللہ اور سعیدؓ بن زید، جنھیں نبی کریم ﷺ نے ابوسفیان کے قافلے کی ٹوہ لینے کے لیے شام کی طرف روانہ کیا۔

ابولبابہ رفاعہ بن عبدالمنذر، جنھیں آنحضور ﷺ نے روحا کے مقام پر پہنچ کر مدینہ واپس بھیج دیا۔

عاصم بن عدی البلوی، جنھیں قبا اور عوالی کا امیر بنا کر پیچھے چھوڑ دیا گیا۔

حارث بن صِمّہ، جنھیں چوٹ لگ جانے کی وجہ سے روحا سے مدینے کو لوٹا دیا گیا۔ خوّات بن جُبیر، جن کے صُفرا کے مقام پر پہنچ کر پاؤں میں پتھر لگا اور آنحضور ﷺ نے انھیں مدینے واپس بھیج دیا۔ ان سب کو مالِ غنیمت کا حصہ دیا گیا اور آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ انھیں شرکت کا اجر و ثواب بھی ملے گا۔

بعض نے کہا ہے کہ اصحابِ بدر اصحابِ طالوت کی تعداد میں تھے یعنی 313۔ بعض نے 314 بتائے ہیں اور بعض نے 350 سے بھی اُوپر نام گنوائے ہیں۔ اس معرکے میں چودہ اصحابؓ شہید ہوئے۔ چھے مہاجر اور آٹھ انصار۔

اصحابِ بدر کا درجہ سب سے بلند و ارفع ہے۔ ان کا مرتبہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ (سورہ حدید، 10)۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اہلِ بدر سے فرمایا: ''فقد وجبت لکم الجنة (بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے جنت واجب کر دی ہے۔) چنانچہ اصحابِ بدر مغفور ہیں۔ اللہ نے ان کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیئے۔ 8 ہجری/629ء میں جب مکے پر حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور غنیم کو بے خبر رکھنے کے لیے تمام احتیاطی تدابیر عمل میں لائی جا رہی تھیں تو حاطب بن ابی بلتعہ نے مکہ میں مقیم اپنے احباب کو ایک خط لکھا کہ خبردار رہو، کہیں لشکرِ اسلام کی زد میں نہ آ جانا اور یہ خط ایک عورت کے ذریعے بھیجا۔ نبی کریم ﷺ نے قبل از وقت بتا دیا کہ کوئی خبر مکے کو جا رہی ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ، زبیرؓ بن عوام اور مقداد بن اسود کو تلاش کا حکم دیا۔ ان اصحاب نے بہت جستجو کے بعد حمراء الاسد کے قریب روضہ خاخ میں ایک عورت کو جا لیا اور اس سے وہ خط برآمد کر لیا۔

جب معاملہ نبی کریم ﷺ کے حضور میں پیش ہوا تو حاطبؓ نے عرض کی: ''یارسول اللہ! میرے معاملے میں عجلت نہ فرمایئے۔ قریش مکہ کے چند افراد کے ساتھ میرے روابط عرصۂ قدیم سے ہیں اور میں ان کا احسان مند ہوں۔ اب تک دیگر مہاجر بھی اپنے مکی اعزہ و اقارب کی حمایت و مساعدت کرتے رہے ہیں، اس لیے میں نے بھی اس احسان کا معاوضہ ادا کرنے کی خواہش کی جو میرے مکی دوست میرے رشتہ داروں کے ساتھ روا رکھتے ہیں، ورنہ ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں، اور نہ میں ارتداد کا مرتکب ہوا ہوں، نہ میں نے کفر کو اسلام پر ترجیح دی ہے۔'' حضرت عمرؓ نے انھیں خائن اور منافق قرار دے کر اجازت چاہی کہ ان کی گردن اڑا دی جائے، مگر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''کیا حاطبؓ معرکہ بدر میں شریک نہ تھے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے اصحابِ بدر سے جنت کا وعدہ نہ کیا تھا اور ان کے اگلے پچھلے گناہ معاف نہ کر دیئے تھے؟'' اس پر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت حاطبؓ سے پھر کسی نے تعرض نہ کیا۔ البتہ مسطحؓ بن اثاثہ نے بھی غزوۂ بدر میں شرکت کی تھی، لیکن وہ منافقوں کے دامِ فریب میں آ گئے اور قصہ افک میں ماخوذ ہوئے۔ چنانچہ ان پر حد جاری ہوئی۔

متعدد علما نے اصحابِ بدر کے فضائل، ان کے نام کی برکات و کرامات اور اس ضمن میں اپنے ذاتی تجربات کا ذکر کیا ہے۔ حضرت عمرؓ اصحاب بدر کا بہت احترام فرماتے اور انھیں حد درجہ محبوب جانتے تھے۔ چنانچہ جب انھوں نے ''دیوان'' مرتب کروایا تو اُم المومنین حضرت عائشہؓ کے بعد اصحاب بدر کو سرفہرست رکھا۔ اسی طرح حضرت علیؓ کو بھی اصحابِ بدر بہت محبوب تھے۔ چنانچہ حضرت عثمان بن عفان کی شہادت کے بعد مسندِ خلافت تین دن تک خالی رہی۔ لوگوں نے حضرت علیؓ سے بار بار درخواست کی اور اس منصب کو قبول کرنے کے لیے سخت اصرار کیا، لیکن انھوں نے اس بارِگراں کو اٹھانے سے انکار کیا۔ پہلے تو یہ کہا کہ میں کیوں کر آپ لوگوں سے بیعت

ی، جب کہ میرا بھائی ابھی تک خون میں لت پت پڑا ہے۔ اس پر لوگ حضرت عثمانؓ تجہیز و تکفین اور تدفین میں مصروف ہو گئے۔ اس کے بعد لوگوں نے پھر درخواست تو حضرت علیؓ نے کہا: ''میں ان لوگوں سے کیسے بیعت قبول کر سکتا ہوں، جو میرے ئی کے قاتل ہیں۔'' تیسرے روز شدید اصرار کی تاب نہ لا کر حضرت علیؓ نے اصحابِ ر کو طلب کیا اور پہلے ان سے بیعت لی۔ پھر دوسروں کو بیعت کی اجازت دی گئی۔
ک جمل میں لشکرِ علیؓ کے چار سو صحابہؓ میں سے 70 بدری تھے۔ واقعہ صفین میں حضرت ؓ کی طرف سے ستاسی بدری شریک ہوئے۔ جن میں 17 مہاجر اور 70 انصار تھے۔ ں موقع پر 25 بدری شہید ہوئے۔

صیرمؓ عبدالاشہل

عمرو نام، اصیرم لقب۔ قبیلہ اوس سے ہیں۔ ابتدا میں اسلام سے برگشتہ تھے۔ ان کے قبیلے کے تمام مرد وزن حضرت سعدؓ بن معاذ کے اشارے سے مسلمان ہو گئے تھے، لیکن یہ اپنے اسی آبائی مذہب پر قائم رہے۔ روایت ہے کہ ایامِ جاہلیت میں ان کا سودی لین دین تھا اور قرض داروں کے ذمے قرض بہت باقی تھا۔ یہ اپنا سارا روپیا وصول کر کے مسلمان ہونا چاہتے تھے، کیوں کہ اسلام میں سود کی ممانعت تھی۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر روپیا وصول ہو چکا تھا، اس لیے مسلمان ہونے کا عزم کر لیا۔ زرہ اور خود پہنی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اُحد کی طرف روانہ ہو گئے۔ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوچھا، لڑوں یا مسلمان ہو جاؤں؟ ارشاد ہوا، دونوں کام کرو۔ پہلے مسلمان ہو جاؤ، پھر جنگ میں شرکت کرو۔ عرض کیا، یارسول اللہ، میں نے تو ایک رکعت نماز بھی نہیں پڑھی۔ ایسی صورت میں اگر مارا گیا تو کیا میرے لیے بہتر ہوگا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا، ہاں۔ چنانچہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔

غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور زخموں کی تاب نہ لا کر میدان جنگ ہی میں شہادت کا درجہ پایا۔ آنحضور ﷺ کو معلوم ہوا تو فرمایا: ''اس نے عمل تھوڑا کیا، لیکن اجر بہت پایا۔''

چوں کہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب تھا، اس لیے لوگوں نے اسے یاد رکھنے میں خاص اہتمام کیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ اپنے شاگردوں سے دریافت فرماتے کہ کوئی ایسا شخص بتاؤ، جس نے ایک وقت بھی نماز نہ پڑھی ہو اور سیدھا جنت میں داخل ہو گیا ہو۔ جب لوگ جواب نہ دیتے تو فرماتے ''اصیرمؓ عبدالاشہل۔''

اقرعؓ بن حابس

فراس نام۔ سر کے بال اُڑ جانے کے باعث ''اقرع'' مشہور ہوئے۔ لنگڑا ہونے کے باعث ''اعرج'' بھی کہلائے۔ بنوتمیم سے تعلق ہے۔ اُن کا بھائی مرشد بن حابس تھا اور بہن لیلیٰ بنت حابس، جو مشہور شاعر فرزدق کی والدہ تھیں۔ اقرع کا ابن عم عیاض بن حمار بن عقال زمانۂ جاہلیت سے آنحضور ﷺ کا بڑا دوست اور حرمی تھا یعنی آنحضور ﷺ کا لباس مبارک پہن کر طوافِ کعبہ کیا کرتا تھا۔ عیاض کو آنحضور ﷺ کی صحبت اور تیس حدیثوں کی روایت کا شرف بھی حاصل ہے۔

حضرت اقرعؓ کا شمار زمانۂ جاہلیت کے عرب سربراہوں، ثالثوں اور حکما میں ہوتا ہے۔ جاہلی دور میں سوق عکاظ کے موقع پر ثالثی اور قضا کا شرف بنوتمیم کو حاصل تھا اور ظہورِ اسلام کے وقت یہ عہدہ اقرع بن حابس کے سپرد تھا۔ اقرع کو جرار یعنی ایک ہزار لشکریوں کی قیادت کرنے والا بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ انھوں نے یوم کلاب میں بنوحنظلہ کی قیادت کی تھی۔

اسلام لانے کے بعد بھی حضرت اقرعؓ کی عزت و شرافت مسلّم رہی۔ وہ ایمان و اسلام میں پختہ تھے۔ فتح مکہ، غزوۂ حنین اور محاصرۂ طائف میں شرکت کی۔ رسولِ کریم ﷺ نے انھیں ہوازن کے مالِ غنیمت میں سے ایک سو اونٹ عطا کیے تھے۔ ایک مرتبہ یمن سے کچھ سونا آیا تو نبی اکرم ﷺ نے چار صحابہ میں تقسیم فرما دیا، جن میں اقرعؓ بھی شامل تھے۔ آنحضور ﷺ نے انھیں بنودارم بن مالک بن حنظلہ کے صدقات کی فراہمی کے لیے عامل مقرر فرمایا۔ محرم 9 ہجری میں رسول کریم ﷺ نے عیینہ بن حصن الفرازی کی سرکردگی میں پچاس شاہ سواروں کا ایک رسالہ بنوتمیم کے ایک خانوادے بنوعنبر کے خلاف روانہ کیا۔ وہ لوگ لشکر دیکھ کر بھاگ گئے۔ مسلمان ان کے گیارہ مرد، اکیس عورتیں اور تیس بچے پکڑ کر مدینہ منورہ لے گئے۔ بنوتمیم کے سرکردہ لوگوں کا ایک وفد قیدیوں کی رہائی کے لیے حاضر ہوا، جس میں حضرت اقرعؓ بھی شامل تھے۔ قیدیوں میں اپنے بچے اور عورتیں دیکھ کر وفد بڑا بے قرار ہوا۔ اضطراب، گھبراہٹ اور جلدی میں آنحضور ﷺ کو آوازیں دے کر بلانا شروع کیا۔ اس پر سورۃ الحجرات کی پہلی چار آیات نازل ہوئیں۔

حضرت اقرعؓ نے بھی قیدیوں کی رہائی کی سفارش کی۔ ان کی رہائی کے بعد وفد بنوتمیم نے اسلام قبول کر لیا۔ آنحضور ﷺ نے انھیں انعام و اکرام سے خوب نوازا۔ اقرعؓ تو پہلے ہی ایمان لا چکے تھے۔ البتہ حضرت عمرؓ نے سفارش کی کہ اقرعؓ کو بنوتمیم کا سردار مقرر کر دیا جائے۔ جب آنحضور ﷺ کی خدمت میں وفد نجران آیا تو آپ ﷺ نے ایک عہد نامے کے ذریعے انھیں امان دی۔ اس عہد نامے کے گواہوں میں حضرت اقرعؓ بھی شامل تھے۔ حضرت اقرعؓ بن حابس کی فوجی خدمات بھی قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے خالد بن ولیدؓ کے ساتھ ہو کر جنگِ یمامہ وغیرہ میں شرکت کی۔ دومۃ الجندل کے معرکے میں حصہ لیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کے زیر قیادت اہل عراق کے خلاف صف آرا رہے اور فتح انبار کے وقت مقدمۃ الجیش کی قیادت کر رہے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت اقرعؓ کو سالارِ لشکر بنا کر خراسان کے محاذ پر بھیجا گیا۔ انھوں نے جوز جان فتح کیا۔ وہیں وفات پائی۔

انس بن مالکؓ

انس نام، ابوحمزہ کنیت، خادمِ رسول ﷺ لقب، قبیلہ نجار سے ہیں جو انصارِ مدینہ کا معزز ترین خاندان تھا۔ ہجرت سے دس سال پیش تر مدینہ میں پیدا ہوئے۔ آٹھ نو سال کی عمر تھی کہ والدہ نے اسلام قبول کیا، جس پر ان کے والد بیوی سے ناراض ہو کر شام چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ ماں نے دوسرا نکاح ابوطلحہؓ سے کر لیا جن کا شمار

بنوخزرج کے متمول اشخاص میں تھا اور اپنے ساتھ حضرت انسؓ کو ابوطلحہ کے گھر لے گئیں۔ حضرت انسؓ نے انھی کے گھر میں پرورش پائی۔

قبل اسلام عربوں کی جہالت کا نقشہ یہ تھا کہ باپ (ابوطلحہ) کی صحبت میں جب بادہ و جام کا دور چلتا تو بیٹا انسؓ ساقی گری کرتا۔ وہ پہلے دوسروں کو پلاتے اور پھر خود پیتے تھے۔ اس دس سالہ بچے کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر ابوطلحہ، والدہ ام سلیمؓ کے ہم راہ دس سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ آنحضور ﷺ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں اقامت فرمائی تو ابوطلحہؓ انس کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ انسؓ کو اپنی غلامی میں لے لیجیے۔ درخواست منظور ہوئی اور یوں حضرت انسؓ دس گیارہ سال کی عمر میں خادمانِ خاص کے زمرے میں داخل ہوئے۔ حضرت انسؓ ہمیشہ آنحضور ﷺ کے ساتھ رہتے تھے۔ سفر وحضر اور خلوت وجلوت کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ نزولِ حجاب سے پہلے وہ آنحضور ﷺ کے گھر میں آزادی کے ساتھ آتے جاتے تھے۔

غزوۂ بدر میں کم سنی کے باوجود شرکت کی۔ غزوۂ اُحد، حدیبیہ، بیعت رضوان میں شریک ہوئے۔ 7 ہجری میں آنحضور ﷺ نے عمرۃ القضا کیا۔ اس میں حضرت انسؓ تمام جاں نثاروں کی طرح آنحضور ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ غزوۂ خیبر میں حضرت انسؓ حضرت ابوطلحہؓ کے ساتھ اونٹ پر سوار تھے اور آنحضور ﷺ سے اس قدر قریب تھے کہ ان کا قدم آنحضور ﷺ کے قدم سے مس کر رہا تھا۔ 8 ہجری میں فتح مکہ اور طائف، 10 ہجری میں حجۃ الوداع، ان سب واقعات میں حضرت انسؓ نے شرکت کی۔

آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضرت انسؓ کو بحرین کا عامل مقرر کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت انسؓ کو تعلیم فقہ کے لیے ایک جماعت کے ساتھ بصرہ روانہ کیا۔ حضرت انسؓ نے مستقل طور پر بصرہ میں سکونت اختیار کی اور زندگی کا بقیہ حصہ یہیں بسر کیا۔ فتح تُستر میں شریک ہوئے اور وہاں کے حاکم ہُرمزان کو لے کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو بعد ازاں مسلمان ہو گیا تھا۔ محمد بن سیرین فارس میں ان کے کاتب رہے۔ حضرت عمرؓ نے انھیں اور ان کے بھائی براابن مالکؓ کو بصرے میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے ساتھ مغیرہ بن شعبہ کے خلاف ابوبکرہ کے الزامات کی تحقیق کے لیے مقرر کیا تھا۔ حضرت ابن زبیرؓ کے عہد میں کچھ دن بصرے کی امامت بھی کرائی۔ حجاج بن یوسف نے سختی کی تو خلیفہ عبدالملک نے معذرت کی اور حجاج کو ڈانٹا اور معافی مانگنے کا حکم دیا۔

براابن مالک اور عمرو بن مالک حضرت انسؓ کے بھائی تھے۔ ان کے چچا انس بن نضرؓ بن ضمضم غزوۂ اُحد میں بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے ستر، اسی زخم کھانے کے بعد شہید ہوئے تھے۔ ان کے ماموں حرام بن ملحان نے بیئر معونہ کے حادثے میں شہادت پائی تھی۔ ان کے والد مالک بن نضر کا شیریں پانی کا کنواں تھا، جس کا پانی آنحضرت ﷺ اکثر پیا کرتے تھے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ عمر بھر آنحضرت ﷺ نہ تو کبھی مجھ پر ناراض ہوئے اور نہ بُرا بھلا کہا، یہاں تک کہ کبھی یہ بھی نہ فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا اور یہ کیوں نہ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے لیے دعا کی تو ان کے مال وجان میں بڑی برکت ہوئی۔ انھوں نے ایک سو تین سال کی لمبی عمر پائی اور 93 ہجری میں بمقام بصرہ وفات پائی۔

حضرت انسؓ نے آنحضرت ﷺ اور کبار صحابہ کرامؓ سے بکثرت احادیث روایت کی ہیں اور تقریباً ایک سو راویوں نے ان سے روایت کی ہے۔ حضرت انسؓ کی مرویات کی تعداد 2286 ہے۔ متفق علیہ احادیث 180، صحیح بخاری میں منفرد 80 اور مسلم میں منفرد 70 ہیں۔ ان کی اولاد سے بھی احادیث کی بکثرت روایت ہوئی۔ مشہور بصری محدث ابوعمیر عبدالکبیر بن محمد بن عبداللہ بن حفص بن ہشام بھی انھی کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت انسؓ جب حدیث روایت کر چکتے تو احتیاطاً کہا کرتے تھے: "یا جیسے رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا۔"

انسؓ بن نضر

انس بن نضر بن ضمضم بن زید۔ حضرت انسؓ بن مالک کے چچا ہیں۔ خاندان نجار کے رئیس تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ غزوۂ اُحد میں شدید زخم کھانے کے بعد شہادت پائی۔ شمار کیا گیا تو 80 سے اوپر زخم نکلے۔ کفار نے لاش کا مثلہ کر دیا تھا، اس لیے شناخت نہ ہو سکی۔ ان کی بہن ربیع بنت نضر نے ان کی انگلی سے بھائی کی لاش کو پہچانا۔ ان کے جوشِ ایمان کا شاہد خود ان کی شہادت کا واقعہ ہے۔ غزوۂ اُحد کے متعلق جو آیات نازل ہوئیں، ان میں حضرت انسؓ جیسے بزرگوں کی نہایت مدح کی گئی ہے۔ ان کی بہن ربیع نے انصار کی ایک لڑکی کا دانت توڑ دیا تھا۔ اس کا خاندان قصاص کا طالب ہوا۔ آنحضور ﷺ نے قصاص کا فیصلہ کیا تو حضرت انسؓ بن نضر نے آ کر کہا: "یارسول اللہ، خدا کی قسم ربیع کا دانت نہ توڑا جائے گا۔" ارشاد ہوا "خدا کا یہی حکم ہے۔" حضرت انسؓ نے خدا کی قسم کھائی تھی، اس لیے یہ صورت نکالی کہ لڑکی کے ورثا دیت لینے پر راضی ہو گئے۔ اب ربیع قصاص سے بچ گئیں۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: "خدا کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ جب قسم کھاتے ہیں تو خدا اُن کی قسم پوری کرتا ہے۔" (صحیح بخاری)

اوسؓ بن ثابت انصاری

خزرج کے خاندان بنونجار سے تھے۔ شاعرِ رسول ﷺ حضرت حسانؓ بن ثابت کے علاتی (پدری) بھائی تھے۔ ان کے اجداد اپنے قبیلے کے رؤسا میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت اوسؓ ہجرتِ نبوی سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں شریک رہے۔ اس معاملے میں انھیں اپنے برادر بزرگ حضرت حسانؓ پر تقدم حاصل ہے۔

ہجرت مدینہ کے بعد آنحضور ﷺ نے حضرت اوسؓ کی مواخات حضرت عثمان ذوالنورینؓ سے کرائی۔ اس سے پہلے حضرت عثمان مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے تو حضرت اوسؓ ہی نے انھیں اپنا مہمان بنایا تھا۔ غزوہ بدر میں شریک ہوئے۔ غزوۂ اُحد میں کفار کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے رتبۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

بُدیلؓ بن ورقا

ان کا تعلق رسول اللہ کے صحابہ کے اس طبقے سے ہے جو فتح مکہ سے ذرا پہلے یا بعد مشرف بہ اسلام ہوا، لیکن شرف ہجرت سے محروم رہا۔

بدیل بن ورقا بنو خزاعہ کے رئیس تھے۔ یہ قبیلہ مکہ معظمہ کے قریب رہتا تھا۔ اگرچہ اس قبیلے نے اسلام قبول نہیں کیا تھا، تاہم وہ ان مخالفانہ منصوبوں سے مسلمانوں کو مطلع کرتا رہتا تھا جو کفار بالخصوص قریش تیار کرتے تھے۔ 6ہجری میں رسول کریم ﷺ عمرے کے قصد سے عازم مکہ ہوئے تو قریش نے احابیش کے اجتماع میں اعلان کیا کہ محمد ﷺ مکہ میں داخل نہیں ہو سکتے اور آپ ﷺ نے مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلے پر حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ یہاں بدیلؓ اپنے چند رفقا کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ کفار کے ارادوں اور تیاریوں کی تفصیل عرض کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے۔ محض عمرہ کرنے آئے ہیں اور اس کے بعد لوٹ جائیں گے۔ بہتر ہے کہ قریش ایک معینہ مدّت کے لیے صلح کا عہد و پیمان کر لیں، لیکن اگر وہ اس پر رضامند نہیں تو میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت پوری ہو۔"

بدیلؓ نے یہ پیغام قریش کو پہنچا دیا۔ پھر چند سفارتوں کے تبادلے کے بعد صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پا گیا، اس معاہدے کی رُو سے قریش مسلمانوں اور قبیلہ بنوخزاعہ پر، جو مسلمانوں کے حلیف ہو گئے تھے، کوئی زیادتی نہیں کر سکتے تھے، لیکن اس کی خلاف ورزی ہوئی۔ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کیا اور قریش نے بنوبکر کو علانیہ مدد دی، حتّٰی کہ حُدودِ حرم میں بھی بنوخزاعہ کا خون بہانے سے احتراز نہ کیا گیا۔ آنحضور ﷺ کو اطلاع پہنچی تو آپ ﷺ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا کہ یا تو مقتولوں کا خون بہا ادا کیا جائے یا قریش بنوبکر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں یا اعلان کر دیں کہ معاہدہ حدیبیہ کالعدم ہو چکا ہے۔ قریش نے تیسری شرط منظور کر لی، لیکن قاصد کے رخصت ہوتے ہی اپنے اس فیصلے پر پچھتانے لگے اور تجدید معاہدہ کے لیے ابوسفیان کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ راستے میں اس کی ملاقات بُدیل سے ہوئی اور انھیں یقین ہو گیا کہ وہ رسول کریم ﷺ کے پاس شکایت لے کر گئے تھے۔ وہ بہ عجلت مدینے پہنچا اور حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، علیؓ، فاطمہؓ کو بیچ میں ڈال کر تصفیہ کرنا چاہا، مگر ان بزرگوں نے کسی قسم کی سفارش کرنے سے انکار کر دیا اور ابوسفیان کو ناکام لوٹنا پڑا۔

فتح مکہ کے بعد بدیلؓ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ قبول اسلام کے وقت بدیلؓ بہت بوڑھے ہو چکے تھے، لیکن بال سیاہ تھے۔ آنحضرت ﷺ نے عمر پوچھی تو عرض کیا، ستانوے برس۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: "خدا تمھارے جمال اور بالوں کی سیاہی میں اور ترقی دے۔"

بُدیلؓ بڑے مدبر اور سیاست داں تھے۔ ابتدا سے آنحضور ﷺ کے حلیف تھے۔ فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے اعلان فرمایا کہ جو شخص ابوسفیان، حکیم بن حزام اور بدیلؓ بن ورقا کے گھروں میں داخل ہو جائے گا، اسے امن مل جائے گا۔ یہ تینوں حضرات اسلام لائے اور انھوں نے آپ ﷺ کی بیعت کی۔ آپ ﷺ نے ان تینوں کو اہل مکہ کی طرف مبلغ بنا کر بھیجا۔

فتح مکہ کے بعد حضرت بدیلؓ نے چند غزوات میں بھی شرکت کی۔ چنانچہ غزوۂ حنین (8ہجری) میں بنوہوازن کی شکست کے بعد مال غنیمت اور مشرک قیدیوں کی نگرانی انھی کے سپرد کی گئی تھی۔ حجۃ الوداع (10ہجری) میں بھی وہ رسول کریم ﷺ کے ہم رکاب تھے اور حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق منیٰ میں اعلان کرتے پھرتے تھے کہ آج روزہ نہ رکھا جائے۔

حضرت بدیلؓ نے آنحضور ﷺ کے وصال سے قبل وفات پائی۔ آنحضور ﷺ نے انھیں ایک مکتوب تحریر فرمایا تھا، جسے وہ بہت عزیز رکھتے اور باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔ ان کا ایک بیٹا عبداللہ حضرت علیؓ کی رفاقت میں جنگ صفین میں لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ دوسرا بیٹا نافعؓ بن بدیل بھی صحابی تھا جو بئر معونہ میں شہید ہوا۔ تیسرا بیٹا حضرت عثمانؓ کے محاصرین میں سے تھا۔ حضرت بدیلؓ سے تین حدیثیں مروی ہیں۔

بَراؓ بن عازبؓ

بن حارث اوسی انصاری، ابوعمارہ۔ غزوۂ بدر اور اُحد میں خردسالی کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، لیکن دوسرے پندرہ غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ رہے۔ بعد ازاں انھوں نے اسلامی جنگوں میں بھی حصّہ لیا۔ رے اور قزوین انھوں ہی نے اسلامی مملکت میں شامل کیے تھے۔ آگے چل کر وہ حضرت علیؓ کے حامی رہے اور جنگ جمل، نیز صفین اور نہروان میں بھی آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے لڑے۔ تین سو پانچ احادیث ان سے مروی ہیں، جن میں سے بائیس صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہیں۔ غدیر الخم کی مشہور حدیث انھی سے مروی ہے۔ ان کا شمار مفتی صحابہؓ میں ہوتا ہے۔ کوفے میں عزلت گزیں ہونے کے بعد آخری عمر میں ان کی بصارت جاتی رہی تھی۔ اسّی برس کی عمر میں 72ہجری 692ء میں وفات پائی۔ ان کے والد قدیم انصاری تھے اور چار بیٹے کوفے کے محدّثین میں شمار ہوتے ہیں۔ سونے کی انگوٹھی پہنتے تھے۔ سونا مردوں کے لیے شرعاً حرام ہے۔ لوگوں نے اعتراض کیا۔ فرمایا، پہلے واقعہ سن لو۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نے مال غنیمت تقسیم کیا۔ صرف یہ انگوٹھی رہ گئی۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر مجھے بلا کر فرمایا اسے پہنو۔ یہ خدا اور رسول ﷺ نے تمھیں پہنائی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ، جو چیز اللہ اور رسول ﷺ نے مجھے پہنائی ہو، اسے کیوں کر اتار پھینکوں۔

براءؓ بن مالک

بن نضر بن ضمضم، انصاری، نجّاری، مدنی۔ بڑے بہادر، نڈر، خطروں میں کود جانے والے مجاہد، بطل کرار، آنحضور ﷺ کے خادم انسؓ کے بھائی، غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور حدیبیہ میں درخت تلے بیعت کی۔ مسیلمہ کذاب سے جنگ کے دوران میں حضرت براؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اپنے نیزوں کی نوکوں پر ڈھال رکھ کر مجھے اس پر بٹھا کر دشمن کے باغ (حدیقہ) میں پھینک دو۔ چنانچہ وہ دشمنوں میں جا گھسے، سخت حملہ کیا اور بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے باغ کے دروازے پر قبضہ کر

لیا۔ اس دن انھیں 80 سے زیادہ زخم آئے اور حضرت خالد بن ولیدؓ مہینا بھر ان کی مرہم پٹی میں مصروف رہے۔ جب حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو لشکر دے کر بصرہ کے محاذ پر روانہ کیا تو اس میں حضرت براؓ بھی شامل تھے۔ 20 ہجری میں محاصرہ تُستر کے دوران لشکر کا میمنہ (دایاں بازو) حضرت براؓ کی قیادت میں تھا۔ جب مسلمانوں نے ایک زمین دوز نالی (سرنگ) کے ذریعے شہر میں داخل ہونے کی تدبیر کی تو حضرت براؓ حضرت مجزاۃؓ بن ثور کو ساتھ لیے اس سرنگ میں داخل ہو کر شہر کے وسط میں جا نکلے۔ حضرت مجزاۃؓ کو تو سرنگ سے باہر نکلتے ہی دشمنوں نے ایک بڑا پتھر مار کر شہید کر دیا، لیکن حضرت براؓ نے باہر نکل کر بڑی بے جگری سے لڑنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ بالآخر مسلمانوں نے شہر فتح کر لیا۔ حضرت براؓ نے گھمسان کے معرکوں میں بہت سے دشمنوں کو قتل کرنے کے علاوہ صرف مبارزت میں ایک سو بہادروں کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ اس کے بعد فوج لے کر خود حملہ کیا۔ زرارہ کا مرزبان کہ سلطنت فارس کے چیدہ امرا میں سے تھا، مقابلے پر آیا۔ انھوں نے اسے قتل کر کے سامان پر قبضہ کر لیا اور نہایت جوش سے مارتے دھاڑتے پھاٹک تک پہنچے۔ عین پھاٹک پر ہرمزان کا سامنا ہوا۔ دونوں میں شدید مقابلہ ہوا۔ حضرت براؓ شہید ہوئے، لیکن میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔

حضرت براؓ آنحضورﷺ کے خاص صحابہؓ میں تھے۔ وہ برسوں بساطِ نبوت کے حاشیہ نشیں رہے۔ سیکڑوں ہزاروں احادیث انھوں نے سُنی ہوں گی، لیکن تعجب یہ ہے کہ ان کی روایت کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ وہ انتہا درجے کے جری اور بہادر تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی وجہ سے انھیں کسی فوج کا افسر نہیں بناتے تھے، اور افسروں کو لکھتے کہ ''خبردار! براؓ کو امیر نہ بنانا۔ وہ آدمی نہیں، بلا ہیں۔ دشمن کے سامنے ہی چلے جائیں گے۔'' گانے کا بہت شوق تھا اور آواز اچھی پائی تھی۔ ایک سفر میں رجز پڑھ رہے تھے۔ آنحضورﷺ نے فرمایا: ''ذرا عورتوں کا خیال کرو۔'' اس پر انھوں نے سکوت اختیار کر لیا۔

برا ابن معرورؓ

بَرا نام۔ ابو بشر کنیت۔ قبیلہ خزرج کے خاندان سلمہ سے ہیں۔ والدہ کا نام رباب تھا جو حضرت سعدؓ بن معاذ سردارِ اوس کی حقیقی پھوپھی ہیں۔ حضرت برا اپنے قبیلے کے رئیس اور سردار تھے۔

622ء کے موسم گرما میں حج کے موقع پر بمقام عقبہ جو 75 انصار بارگاہِ نبوت میں رسولِ کریمﷺ سے بیعت کرنے آئے تھے، ان میں معمر برا بن معرور خزرجی کو خاص اہمیت حاصل تھی اور جب رسولِ کریمﷺ نے ان سے فرمایا کہ آپ ان لوگوں سے یہ بیعت لینا چاہتے ہیں کہ وہ آپﷺ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے اپنی ازواج و اولاد کی، تو حضرت برا نے آپﷺ کا ہاتھ تھام لیا۔ سب کی طرف سے آپﷺ کی حفاظت کا وعدہ کر کے معاہدے پر مہر ثبت کر دی۔ اسی مجلس میں، جو بیعت عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے، یثرب کی نئی آبادی کے بارہ سردار (نقیب) منتخب ہوئے اور اس موقع پر براؓ کو بنو سلمہ کا سردار مقرر کیا گیا۔

تاریخ اسلام میں ان کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ تحویل قبلہ سے پہلے ہی مکہ معظمہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب رسولِ کریمﷺ نے انھیں روکا اور فرمایا کہ بیت المقدس ہی صحیح قبلہ ہے تو انھوں نے آپﷺ کا کہا مان لیا، لیکن بستر مرگ پر وصیت کی کہ ان کی میت کا رخ مکہ معظمہ کی طرف رکھا جائے۔ ان کی وفات ماہ صفر میں آنحضورﷺ کی ہجرت مدینہ سے ایک ماہ قبل مدینہ منورہ ہی میں ہوئی۔ وہ قبلہ رُخ مرے اور پہلے شخص تھے جو قبلہ رخ دفن کیے گئے۔ جب آنحضورﷺ مدینے میں تشریف فرما ہوئے تو آپﷺ نے ان کی قبر پر جا کر دعائے مغفرت کی۔ وفات سے پہلے انھوں نے اپنی جائداد کا تیسرا حصہ رسول کریمﷺ کے نام وصیت کر دیا تھا، لیکن آپﷺ نے ان کے ورثا کو واپس کر دیا۔ ان کے بیٹے حضرت بشرؓ بن برا بدری صحابی تھے۔ آنحضورﷺ نے انھیں ان کے والد کی وفات کے بعد بنو سلمہ کا سردار نام زد فرمایا۔ حضرت بشرؓ نے آنحضرتﷺ کے ساتھ زہریلی بکری کا گوشت کھا لیا، جس کے باعث ان کی وفات ہو گئی تھی۔ برا کے بھائی قیسؓ بن معرور بھی صحابی تھے، جو حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔ ان کی بیٹی اُم بشرؓ بھی صحابیہ ہیں اور دو حدیثیں ان سے مروی ہیں۔

بریدہؓ بن حصیب

بریدہ نام، ابو عبداللہ کنیت بنو اسلم سے تعلق ہے۔ عین زمانۂ ہجرت میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے ساتھ بنو اسلم کے 80 خانوادے بھی اسلام لائے۔ بدر و اُحد کے معرکے گزر چکے تھے۔ سب سے پہلے صلح حدیبیہ میں شریک ہوئے اور بیعت رضوان کا شرف حاصل کیا۔ غزوۂ خیبر میں پیش پیش تھے۔ فتح مکہ میں بھی آنحضورﷺ کے ہم رکاب تھے۔ چنانچہ بیان کرتے تھے کہ فتح کے دن آنحضورﷺ نے کئی نمازیں ایک وضو سے پڑھیں۔ فتح مکہ کے بعد آنحضورﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی ماتحتی میں جو سریہ یمن بھیجا تھا، بریدہؓ بھی اس میں ساتھ تھے۔ آپﷺ نے اپنے مرض الموت میں اسامہؓ کی سرکردگی میں جو سریہ شام بھیجا تھا، اس میں بھی یہ شریک اور سریہ کے علم بردار تھے۔ آپﷺ کے وصال کے بعد جب حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں بصرہ آباد ہوا تو حضرت بریدہؓ دوسرے صحابہؓ کے ساتھ یہاں منتقل ہو گئے اور یہیں مستقل گھر بنا لیا۔

حضرت بریدہؓ کو بارگاہ نبویﷺ میں بڑی رسائی حاصل تھی۔ آنحضورﷺ ان سے بے تکلفانہ ملتے تھے۔ کبھی کبھی آپﷺ ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے نکلتے تھے۔ ان کے حافظے میں احادیث نبویﷺ کی کافی تعداد محفوظ تھی۔ ان کی مرویات کا شمار 164 حدیثوں تک پہنچتا ہے۔

بشرؓ بن برا

بنو خزرج کی شاخ بنو سلمہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے اور ان کے والد برا بن معرور دونوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور یہ ان 70 اہل مدینہ میں سے تھے

جو آنحضور ﷺ کے ساتھ بیعتِ عقبہ ثانیہ میں شامل تھے۔ بعد میں بشر نے بدر، اُحد، خندق اور خیبر کے غزوات میں حصّہ لیا۔ خیبر میں انھوں نے زہر آلود بکری کا گوشت کھایا، جسے ایک یہودی عورت نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ آنحضور ﷺ نے چکھ کر زہر معلوم کرلیا اور لقمے کو تھوک دیا، لیکن بشرؓ سے نگل گئے اور فوت ہوگئے۔

حضرت بشرؓ ایک مشہور تیر انداز اور پُرجوش مسلمان تھے۔ مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ ان کے مناظروں کا ذکر آتا ہے۔ آنحضور ﷺ انھیں بنوسلمہ کا ''سید'' (سردار) کے لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔

بشیرؓ بن سعد

مدنی صحابی۔ ان کا تعلق بنوخزرج سے تھا۔ ان کا شمار سابقون اولون میں ہوتا ہے۔ عقبہ کے مقام پر آنحضور ﷺ سے اہلِ یثرب کی دوسری ملاقات کے وقت وہ بھی موجود تھے۔ وہ ہجرتِ نبوی کے بعد ہونے والے تمام غزوات میں شریک ہوئے اور دو مہموں کی قیادت بھی کی۔ ان میں سے ایک تو شعبان 7 ہجری کو بنی مُرۃ کے خلاف فدک کی طرف بھیجی گئی تھی اور دوسری بنوغطفان کے ایک لشکر کے خلاف، جسے عینیہ بن حصن مدینے پر حملہ کرنے کی غرض سے وادی القریٰ اور فدک کے درمیان جمع کر رہا تھا۔ پہلی مُہم میں کامیابی نہیں ہوئی۔ خود حضرت بشیرؓ بڑی دلیری سے لڑے لیکن زخمی ہوئے اور دشمن انھیں مُردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ رات کے وقت وہ کسی نہ کسی طرح فدک میں ایک یہودی کے گھر پہنچے۔ وہاں چند روز تک پناہ گزیں رہے اور پھر مدینے واپس آئے۔ دوسری مہم، جس میں ان کے ساتھ تین سو آدمی تھے، کامیاب رہی۔ عینیہ کی فوج منتشر کردی گئی اور بہت سا مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ اسی سال جب آنحضور ﷺ صلح حدیبیہ کے مطابق عمرے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت بشیرؓ اس مسلح دستے کے سالار تھے جو آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے ساتھ گیا تھا، لیکن مکہ معظمہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔

آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد جب بعض اہلِ مدینہ نے سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوکر آپ ﷺ کی جانشینی کے لیے کسی انصاری کو منتخب کرنے کی کوشش کی تو حضرت بشیرؓ نے ان کے بجائے قریش کے دعوے کی حمایت کی۔ وہ پہلے شخص تھے یا پہلے اشخاص میں سے ایک تھے جنھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کرنے کا فیصلہ کن اقدام کیا۔ آگے چل کر وہ عراق کی مہم میں بھی شریک ہوئے اور جب حضرت خالد بن ولیدؓ نے حیرہ فتح کیا تو وہاں موجود تھے۔ حضرت بشیرؓ نے 12 ہجری/633ء میں عین التمر کے مقام پر رحلت فرمائی۔ وہ ان معدودے چند اصحابؓ میں سے تھے جو لکھنا جانتے تھے۔ وہ نعمانؓ بن بشیر کے والد تھے جو خود بھی آنحضور ﷺ کے صحابہؓ میں شامل تھے۔

بلالؓ بن رباح

نام عبداللہ، ابوعبداللہ کنیت۔ والد کا نام رباح۔ والدہ کا نام حمامہ تھا اور بعض دفعہ والدہ کی نسبت سے ابن حمامہ بھی کہلاتے تھے۔ مؤذنِ رسول ﷺ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ حضرت بلالؓ حبشی نژاد تھے۔ مکہ معظمہ میں قبیلہ بنوجمح کے درمیان مقامِ سراۃ میں غلام پیدا ہوئے۔ ان کا آقا امیہ بن خلف تھا۔ وہ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بالغوں میں حضرت ابوبکرؓ کے بعد یہی مسلمان ہوئے۔ ایک تو مسلمان، دوسرے غلام۔ دونوں حیثیتوں سے ان پر بہت سختیاں اور ظلم کیے گئے۔ تپتی ہوئی ریت، جلتے ہوئے سنگ ریزوں اور دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹائے گئے۔ مشرکین نے گلے میں رسیاں ڈال کر بازیچۂ اطفال بنایا۔ ابوجہل اُن کو منہ کے بل سنگ ریزوں پر لٹا کر اوپر سے پتھر کی چکی رکھ دیتا اور جب دھوپ کی شدّت بے قرار کردیتی تو کہتا: ''بلالؓ، اب بھی محمد ﷺ اور اس کے خدا سے باز آجا'' لیکن اس وقت بھی حضرت بلالؓ کے منہ سے یہی نکلتا: ''احد، احد۔'' اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔''

ستم پیشہ مشرکین میں اُمیہ بن خلف پیش پیش تھا۔ وہ اپنے ''غلام'' پر قابو پانے کے لیے ظلم و جفا کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتا۔ طرح طرح سے اذیتیں دیتا۔ کبھی گائے کی کھال میں لپیٹتا، کبھی لوہے کی زِرہ پہنا کر جلتی ہوئی دھوپ میں بٹھاتا اور کہتا ''تمہارا خدا تولات اور عزیٰ ہے۔'' لیکن حضرت بلالؓ کی زبان سے ''احد، احد'' کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلتا۔ بالآخر حضرت ابوبکرؓ ان کی نجات کا سبب بنے۔ آپ نے حضرت بلالؓ کو خرید کر آزاد کردیا۔ اس کے بعد بلالؓ ہمیشہ رسولِ کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں رہے۔

مدینہ منورہ کو ہجرت کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے بلالؓ اور رویحہؓ خثعمی کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم کردیا۔ یہ وہی ابورویحہؓ ہیں جنھیں بلالؓ نے شام کی مہم پر جاتے وقت اپنا وظیفہ لینے کا مجاز مقرر کیا تھا۔ اس رشتۂ مواخات کی بنا پر حضرت عمرؓ نے افریقہ کے وظیفہ لینے والوں کی فہرست قبیلہ خثعم کے ساتھ منسلک کردی تھی۔

ہجرت کے پہلے سال جب نماز سے پہلے اذان دینے کا فیصلہ ہوا تو حضرت بلالؓ مؤذن مقرر ہوئے۔ وہ تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے۔ غزوۂ بدر میں انھوں نے اپنے سابق آقا اُمیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو ٹھکانے لگایا۔ حضرت بلالؓ اگرچہ رسول کریم ﷺ کے مؤذن ہی کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں، تاہم وہ آنحضور ﷺ کے عصا بردار، خازن اور ذاتی خادم بھی تھے اور بعض اوقات آنحضور ﷺ کے معاون و پیش کار بھی ہوتے تھے۔ مؤذن کی حیثیت سے انھیں اُس وقت عروج حاصل ہوا جب مسلمانوں نے مکہ فتح کرلیا اور حضرت بلالؓ نے پہلی مرتبہ کعبے کی چھت پر سے مومنوں کو نماز کی طرف بلایا: ''حی علی الصلوٰۃ، حی علی الصلوٰۃ۔''

آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں بھی مؤذن رہنا منظور کرلیا، لیکن جب حضرت عمرؓ نے ان سے اس منصب پر قائم رہنے کو کہا تو وہ راضی نہ ہوئے اور شام کی مہموں میں جا ملے اور زندگی کا بقیہ حصّہ وہیں بسر

کیا۔ انھوں نے نبی کریم ﷺ کے وصال کے بعد صرف دو موقعوں پر اذان دی۔ پہلا موقع وہ تھا جب حضرت عمرؓ جابیہ (بیت المقدس) تشریف لے گئے اور دوسرا وہ جب خود بلالؓ بازدید کے لیے مدینہ آئے اور امام حسنؓ اور امام حسینؓ نے ان سے اذان دینے کی فرمائش کی۔ یہ دونوں موقعے رقّت انگیز تھے۔

حضرت بلالؓ کو ان کی زندگی ہی میں بڑی عزت حاصل ہوگئی تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے خالد بن ولیدؓ کے خلاف تحقیقات کرنے کے لیے اپنا ایک نمائندہ شام بھیجا تو حضرت بلالؓ نے خلیفہ کے نمائندے اور متامل سالار ابوعبیدہؓ دونوں کی مدد کی۔

ان کا حلیہ یہ بیان کیا جاتا ہے: قد لمبا اور کسی قدر خمیدہ، رنگ سیاہ، چہرہ پتلا، گھنے بال جن میں بہت سے سفید بال ملے ہوئے تھے۔ ساٹھ سال سے اوپر عُمر پائی۔ ان کی وفات 17ھ تا 21ھ کے درمیان بیان کی گئی ہے۔ دمشق میں باب الصغیر کے قریب مدفون ہوئے۔

حضرت بلالؓ نے متعدد شادیاں کیں۔ ان کی بعض بیویاں عرب کے نہایت شریف و معزز گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ حضرت ابوبکرؓ کی دُختر سے خود رسول کریم ﷺ نے نکاح کرا دیا تھا۔ بنی زہرہ اور حضرت ابوالدرداؓ کے خاندان میں بھی رشتہ ازدواج قائم ہوا تھا، لیکن کسی سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

تمیم داریؓ

تمیم بن اوس۔ شام کے رہنے والے تھے۔ عیسائیت کے پیروکار تھے۔ نسبی تعلق مشہور قبیلے لخم سے تھا۔ ان کے اَجداد میں سے ایک مقتدر شخص کا نام دار تھا۔ اسی کے تعلق سے داری مشہور ہوئے۔ ان کی کنیت ایک صاحب زادی کے نام پر ابورُقیہ تھی، اور اولاد نہ تھی۔

اسلام لانے سے پہلے اپنے تمام قبیلے کی طرح عیسائی تھے اور آپ کی زندگی ٹھیٹ مذہبی قسم کی تھی۔ چنانچہ آپ فلسطین والوں میں راہب اور عابد تھے، اور انجیل کے عالم تھے۔ حضرت تمیمؓ غزوۂ تبوک (9ہجری) سے ذرا پہلے اسی سال شام سے مدینے آئے۔ ان کے ساتھ قبیلے کے کئی آدمی تھے۔ سب نے اسلام قبول کیا اور عہدِ نبوی میں مدینے میں مقیم رہے۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت تک مدینے ہی میں رہے اور فتنۂ عثمانی کا مشاہدہ کیا اور 35ہجری کے بعد شام کی سکونت اختیار کی۔

شام کی فتوحات میں خاصا وقت صَرف ہوا تھا۔ فلسطین پر حملے کے لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓو بن العاص کو مامور فرمایا تھا، لیکن یہ علاقہ عہدِ صدیقی میں فتح نہیں ہوا تھا۔ غالبًا اسی لیے حضرت تمیمؓ مدینہ میں ٹھہرے رہے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں بیت المقدس فتح ہونے کے بعد حکومت کو استحکام میسّر آیا اور شوال 19ہجری میں حضرت معاویہؓ نے قیساریہ کو فتح کر کے اسے اسلام کے قلم رو میں داخل کر دیا تو شام کا مطلع بالکل صاف ہوگیا۔ فتوحات مکمل ہونے کے بعد حضرت عمرؓ (یا حضرت عثمانؓ) نے فرمانِ نبوی ﷺ کے مطابق حضرت تمیمؓ کو قریہ 'عینون' جاگیر میں دیا، اور چوں کہ وہ بیت المقدس کے قریب تھا، اس لیے حضرت تمیمؓ نے دین اور علم کی خدمت کے لیے بیت المقدس کو مرکز بنایا۔

حضرت تمیمؓ کی زندگی عہدِ نبوی اور دورِ خلافت میں ایک ہی نہج پر بسر ہوئی ہے۔ مدینے اور شام دونوں جگہ وہ زاہدانہ حیثیت سے رہے۔ مدینے کے قیام میں بسر اوقات کے لیے رسولِ کریم ﷺ کی وصیت کے مطابق (جو آنحضور ﷺ نے مرض الموت میں فرمائی تھی) خیبر سے کچھ مل جاتا تھا، اور شام پہنچ کر قریہ عینون کی آمدنی سے وہ زندگی بسر فرماتے تھے۔ بقیہ اوقات عبادت میں صَرف ہوتے تھے اور کبھی کبھی وعظ کا مشغلہ بھی رہتا تھا۔ عبادت کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات ایک ہی رکعت میں پورا قرآن ختم کر دیتے۔ تہجد کی نماز بہت پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ رات کو نماز پڑھتے ہوئے سورۂ جاثیہ کی آیت 21 پر پہنچے تو زار و قطار رونے لگے اور صبح تک اسی آیت کا وِرد کرتے رہے۔ بار بار رکوع کرتے، سجدہ کرتے اور روتے تھے۔

وعظ گوئی انھوں نے حضرت عمرؓ کے عہد میں اُن کی اجازت سے شروع کی تھی۔ لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ اسلام میں پہلے واعظ (قاص) تھے۔ قصص میں وہ قصّے شامل ہیں جن میں قیامِ قیامت، دجّال اور جساسہ کا ذکر آتا ہے۔ صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ آنحضور ﷺ نے تمیمؓ سے قصہ جساسہ روایت کیا اور اس منقبتِ شریفہ میں کوئی دوسرا تمیمؓ کے ساتھ شریک نہیں۔

حضرت تمیمؓ کی ایک دینی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے مسجدِ نبوی ﷺ میں قندیل لٹکا کر زیتون کے تیل کا چراغ جلایا۔ حضرت تمیمؓ خاص وضع کے بزرگ تھے۔ عابد و زاہد ہونے کی وجہ سے انھوں نے عام صحابہؓ کے برخلاف کوئی خاص زاہدانہ وضع اختیار کی تھی، اسی لیے اس کا ذکر صراحت سے کیا گیا ہے: "كان له هيته و لباس۔"

حضرت تمیمؓ داری اگرچہ دیر میں مشرف بہ اسلام ہوئے، تاہم چوں کہ وہ اپنے پرانے مذہب کے علما میں سے تھے، اس نئے مذہب میں داخل ہونے کے بعد علمی ذوق برابر قائم رہا۔ وہ اسلام کے اہلِ علم میں شمار ہوتے ہیں۔ ان سے بہت سے صحابہؓ نے روایتیں کی ہیں، جن میں حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، ابو ہریرہؓ، انس بنؓ مالک، زرارہؓ بن عوفی وغیرہ شامل ہیں۔ ان مرویات میں ایک خاص روایت وہ ہے جو رسول کریم ﷺ نے حضرت تمیمؓ سے نقل فرمائی ہے۔ اس سے علمائے حدیث نے یہ اصول نکالا ہے کہ متبوع کی تابع سے یا فاضل کی مفضول سے روایت جائز ہے۔ دوسرا اصول یہ نکلتا ہے کہ خبرِ واحد کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ یہ خصوصیت کہ رسولِ کریم ﷺ ایک صحابیؓ کے راوی ہیں، حضرت تمیمؓ کی عظیم الشان منقبت ہے۔

ثابت بن قیسؓ

ثابت نام، ابو محمد کنیت، خطیبِ رسول اللہ ﷺ ان کا لقب ہے۔ قبیلہ خزرج سے تعلق تھا۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ آنحضور ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کے خیر مقدم کے لیے پورا شہر اُمنڈ آیا تھا۔ اس موقع پر حضرت ثابت بن قیسؓ نے جو خطبہ دیا، اُس کا ایک فقرہ یہ تھا: "ہم آپ کی ہر اُس چیز سے حفاظت کریں گے جس سے اپنی جان اور اولاد کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن ہمیں

اس کا کیا معاوضہ ملے گا؟'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''جنت'' تو تمام مجمع پکار اٹھا: ''ہم سب راضی ہیں۔''

تمام غزوات میں شریک ہوئے۔ غزوہ مریسیع (5ہجری) میں حضرت جویریہؓ اسیر ہو کر حضرت ثابت بن قیسؓ انصاری کے حصے میں آئی تھیں۔ انھوں نے 9 اوقیہ سونے پر مکاتبہ بنایا۔ حضرت جویریہؓ نے آنحضور ﷺ سے مدد طلب کی۔ آپ ﷺ نے رقم مذکور ادا کر کے انھیں ہمیشہ کے لیے غلامی سے نجات دی اور اپنے حبالۂ عقد میں لے لیا۔

عام الوفود 9ہجری میں بنوتمیم کا وفد بڑے کروفر سے مدینہ آیا۔ انھوں نے آستانۂ نبوی ﷺ پر جا کر بدویانہ انداز میں آوازیں دینا شروع کیں: ''محمد ﷺ باہر آؤ اور ہماری بات سنو۔'' آنحضور ﷺ کو ان کا اکھڑپن ناگوار گزرا۔ اس کے باوجود باہر نکل کر بڑی خندہ پیشانی سے ملاقات فرمائی۔ وفد کے سربراہ اقرعؓ بن حابس نے کہا: ''ہم آپ سے مفاخرت چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہی اسلام کی بات ہوگی۔'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''میں مفاخرت اور شعر و شاعری کے لیے مبعوث نہیں ہوا ہوں۔ لیکن اگر تم یہی چاہتے ہو تو اللہ کے فضل سے ہم اس سے بھی باہر نہیں ہیں۔''

بنوتمیم میں ایک شخص عطارد بن حاجب تھے۔ وہ فصیح البیان خطیب تھے اور ایک دفعہ نوشیروان کے دربار میں اپنے زورِ خطابت کا مظاہرہ کر کے کمخواب کا خلعت حاصل کر چکے تھے۔ اپنے سردار اقرع بن حابس کے حکم پر کھڑے ہوئے اور مفاخرہ کا آغاز اس تقریر سے کیا:

''تعریف اس خدا کی جس نے اپنے فضل و کرم سے ہمیں تاج و تخت کا مالک بنایا۔ اہل مشرق میں ہمیں سب سے زیادہ معزز کیا۔ ہمارے خزانے سونے چاندی سے پُر ہیں، جنھیں ہم فیاضی سے خرچ کرتے ہیں۔ لوگوں میں ہمارا مثل و نظیر نہیں۔ کیا ہم آدمیوں کے سردار اور ان میں صاحب فضل نہیں ہیں۔ اگر کسی اور کو یہ دعویٰ ہو تو وہ سامنے آئے اور ہمارے قول سے اچھا قول اور ہمارے حالات سے اچھے حالات پیش کرے۔ اب مجھے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکا۔''

عطارد بن حاجب اپنی تقریر ختم کر کے بیٹھے تو آنحضور ﷺ نے حضرت ثابت بن قیسؓ کو حکم دیا: ''ثابتؓ اٹھو اور اس کا جواب دو۔''

حضرت ثابتؓ نے حسبُ الحکم عطارد کے جواب میں یہ تقریر کی: ''حمد و ستائش اس خدائے عزوجل کے لیے، جس نے زمین و آسمان پیدا کیے۔ ان پر اپنا حکم جاری کیا۔ اپنی کرسی اور اپنے علم کو وسعت دی۔ وہ قادرِ مطلق ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے، اسی کے حکم اور قدرت سے ہوتا ہے۔ اس کی قدرتوں میں سے ایک یہ ہے کہ اپنی مخلوق میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو سب سے زیادہ شریف النفس، سب سے بڑھ کر راست گو اور سب سے زیادہ بلند اخلاق ہے۔ پھر اس پیغمبر پر ایک کتاب نازل کی اور اپنی خلقت کو اس کا امانت دار بنایا۔ اور وہی ہستی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے سارے عالم سے برگزیدہ کیا اور سارے عالم کا خلاصہ بنایا۔ پھر اس نے لوگوں کو حق کی طرف بلایا تو اس کی قوم اور اقربا میں سے پہلے مہاجرین نے اس کی دعوت قبول کی جو نسب میں افضل ہیں۔ ان کے چہرے سب سے زیادہ روشن ہیں اور ان کے اعمال سب سے اچھے ہیں۔ پھر مہاجرین کے بعد سارے عرب میں سے ہم انصار نے دعوتِ حق پر لبیک کہی۔ لہٰذا ہمارا فخر صرف یہ ہے کہ ہم اللہ کے انصار اور رسول ﷺ کے وزیر ہیں۔ اور لوگ جب تک ایمان نہ لائیں اور لا الٰہ الا اللہ نہ کہیں، ہم ان سے لڑتے رہیں گے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ماننے سے انکار کرے گا، ہم اس کے خلاف راہ خدا میں جہاد کریں گے اور جہاد کرنا ہمارے لیے کوئی دُشوار کام نہیں ہے۔ پس مجھے جو کہنا تھا، کہہ چکا، اور اب میں تمام مؤمنین اور مؤمنات کے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعائے مغفرت کرتا ہوں۔''

اس کے بعد شعر و شاعری کا مقابلہ ہوا، جس میں بنوتمیم کی طرف سے زبرقان بن بدر اور آنحضور ﷺ کی طرف سے حضرت حسانؓ بن ثابت نے حصّہ لیا۔ مفاخرہ ختم ہوا تو اقرعؓ بن قیس نے جو خود بڑے شاعر اور خطیب تھے، بے اختیار پکار اٹھے: ''باپ کی قسم، محمد ﷺ کا خطیب ہمارے خطیب سے افضل اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے۔'' اہل وفد نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور سب اسی وقت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

اسی سال مسیلمہ کذاب، بنوحنیفہ کا ایک بڑا وفد لے کر مدینہ آیا۔ آنحضور ﷺ حضرت ثابتؓ بن قیس کو لے کر اس کے پاس تشریف لے گئے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ مسیلمہ کذّاب نے کہا ''اگر آپ اپنے بعد مجھے خلیفہ بنانے کا وعدہ کرو تو ابھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں۔''

آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''خلافت تو بڑی چیز ہے۔ میں تجھے یہ چھڑی دینا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اللہ نے تیرے لیے جو مقدر کر رکھا ہے، وہ ہو کر رہے گا۔ تیرا انجام مجھے خواب میں دکھا دیا گیا ہے۔ کچھ اور پوچھنا چاہو تو یہ ثابتؓ یہاں موجود ہیں۔ ان سے پوچھ۔ میں اب چلتا ہوں۔''

یہ فرما کر آنحضور ﷺ حضرت ثابت بن قیسؓ کو مسیلمہ سے نمٹنے کے لیے وہاں چھوڑ کر خود تشریف لے گئے۔

11ہجری میں آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد انصار حضرت سعدؓ بن عبادہ کو خلیفہ بنانے کی غرض سے سقیفہ بن ساعدہ میں جمع ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کو خبر ہوئی تو حضرت عمرؓ اور کچھ دوسرے مہاجرین کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے۔ اس موقع پر حضرت ثابتؓ نے انصار کے حقِ خلافت پر خطبہ دیا اور انصار کی خدمات اور قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم اللہ کے انصار اور اسلام کی فوج ہیں۔ مہاجرین تو معدودے چند ہیں۔ تعجب ہے کہ اس پر بھی کچھ لوگ ہمیں خلافت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔'' حضرت ابوبکرؓ نے حضرت ثابتؓ کی تقریر کے جواب میں انصار کی خدمات کا اعتراف کیا، لیکن قوی دلائل کے ساتھ قریش کو خلافت کا حق دار ثابت کیا۔

اسی زمانے میں فتنۂ ارتداد نے سر اُبھارا تو حضرت ثابتؓ نے اسے کچلنے کے

لیے جان کی بازی لگادی۔ حضرت ابوبکرؓ نے جب مشہور مرتد طلیحہ اسدی کی سرکوبی کے لیے مدینہ سے لشکر بھیجا تو حضرت ثابتؓ اس میں شامل ہو گئے۔ سالارِ لشکر حضرت خالدؓ بن ولید اور انصار کی عنان قیادت حضرت ثابتؓ کے ہاتھ میں تھی۔ طلیحہ اسدی نے اپنے کچھ ساتھیوں کے ہم راہ شام کی طرف راہِ فرار اختیار کی (خدا کی شان، یہی طلیحہ بعد میں اسلام کے زبردست مجاہد بنے۔)

12ہجری میں مسیلمہ کذّاب کے خلاف یمامہ کی خوں ریز جنگ پیش آئی۔ حضرت ثابتؓ اس میں والہانہ جوش وخروش کے ساتھ شریک ہوئے۔ آخر دشمنوں نے نرغے میں لے کر خطیبِ رسول اللہ ﷺ پر تلواروں اور برچھیوں کا مینہ برسا دیا اور یوں وہ رُتبہ شہادت پر فائز ہوگئے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ حضرت ثابتؓ کے جسم پر نہایت عُمدہ زِرہ تھی۔ ان کی شہادت کے بعد کسی مسلمان نے اُتار لی۔ ایک دوسرے مسلمان نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ثابتؓ ان سے کہہ رہے ہیں، میرے فلاں مسلمان بھائی نے میری زرہ اُتار لی ہے۔ آپ خالدؓ بن ولید سے کہیں کہ یہ اس سے واپس لے لیں۔ مجھ پر اتنا قرض ہے۔ یہ زرہ بیچ کر میرا قرض بے باق کر دیا جائے اور میرا فلاں غلام آزاد کر دیں۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے یہ زرہ واپس لے لی اور مدینہ پہنچ کر سارا واقعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے عرض کیا۔ انھوں نے حضرت ثابتؓ کی وصیت کے مطابق زِرہ سے ان کا قرض ادا کر دیا اور غلام بھی آزاد کر دیا۔

حضرت ثابت بن قیس سے چند احادیث بھی مروی ہیں۔

ثابتؓ بن دحداح

ثابت نام، ابوالدحداح کنیت۔ بنو اوس سے تعلق ہے۔ ہجرت کے بعد آنحضور ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو جو لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے، ان میں حضرت ثابتؓ بھی شامل تھے۔ غزوۂ اُحد (3ہجری) میں انھوں نے شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ جب ایک لغزش سے جنگ کا پاسا پلٹ گیا اور مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو حضرت ثابتؓ آگے بڑھے اور پکار کر کہا: ''اے گروہِ انصار ادھر آؤ ادھر۔ میں ہوں ثابتؓ بن دحداح۔ اگر رسول اللہ ﷺ شہید ہو گئے تو اللہ زندہ ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ تمھارا فرض ہے کہ دین کے لیے لڑو۔ اللہ تعالیٰ تمھیں غلبہ دینے والا ہے اور تمھاری مدد کرنے والا ہے۔''

حضرت ثابتؓ کی آواز سُن کر چند انصاری جاں باز ان کے گرد جمع ہو گئے اور سب نے مل کر مشرکین کے ریلے کو روکا۔ دوسری طرف سے ایک اور ریلا آیا جس میں خالد بن ولید، عکرمہ بن ابوجہل، ضرار بن خطاب اور عمرو بن العاص جیسے قریش کے نام ور جنگ جو شامل تھے۔ ان بہادروں نے انصاری جان بازوں کو گھیر لیا۔ حضرت ثابتؓ اور ان کے ساتھیوں نے جم کر مقابلہ کیا۔ اسی اثنا میں خالد بن ولید نے بڑھ کر حضرت ثابتؓ کو نیزہ مارا اور وہ شدید زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ علاج معالجے سے زخم بظاہر مندمل ہو گئے اور کئی سال تک وہ اچھے بھلے رہے، لیکن صلح حدیبیہ کے بعد ایک دن یہی زخم پھر عود کر آیا اور اسی کے صدمے سے انھوں نے وفات پائی۔ وفات کے وقت کوئی اولاد زندہ نہیں تھی اور غالباً اہلیہ بھی وفات پا چکی تھیں، اس لیے حضور ﷺ نے ان کا ترکہ ان کے بھانجے حضرت ابولبابہ رفاعہؓ بن عبدالمنذر کو عطا فرمایا۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ جب سورۃ الحدید (11:57) کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ﴾ (کون ہے جو اللہ کو قرض دے، قرضِ حسنہ، تاکہ اللہ اُسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اس کے لیے بہترین اجر ہے)۔ تو حضرت ثابتؓ بن دحداح آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''یارسول اللہ، کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں اے ابوالدحداح۔'' انھوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ، ذرا اپنا دستِ مبارک مجھے دکھایئے۔'' حضور ﷺ نے اپنا دستِ مبارک اُن کی طرف بڑھایا تو انھوں نے حضور ﷺ کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: ''یارسول اللہ ﷺ، میں اپنا باغ اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہوں۔'' اس باغ میں کھجور کے چھے سو درخت تھے اور اسی میں ان کا مکان تھا۔ آنحضور ﷺ سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور اپنی اہلیہ کو پکار کر کہا: ''دحداح کی ماں گھر سے نکل آؤ۔ میں نے یہ باغ اپنے ربّ کو قرض دے دیا ہے۔'' ان کی اہلیہ نے کہا: ''ابودحداح، تم نے نفع کا سودا کیا ہے۔'' یہ کہہ کر اپنا سامان اور بچے کو لے کر باغ سے باہر نکل آئیں۔

ثوبانؓ مولیٰ

ثوبان نام، ابوعبداللہ کنیت، تعلق یمن کے مشہور حمیری خاندان سے تھا۔ غلام تھے۔ آنحضور ﷺ نے خرید کر آزاد کر دیا، اور فرمایا، دل چاہے اپنے خاندان والوں کے پاس چلے جاؤ، اور دل چاہے میرے ساتھ رہو۔ میرے ساتھ رہو گے تو اہل بیت میں شمار ہوگا۔ انھوں نے خدمت نبوی ﷺ کی حاضری کو اہل خاندان پر ترجیح دی اور زندگی بھر خلوت و جلوت میں آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ آنحضور ﷺ کے خادم خاص تھے، اس لیے ہر وقت ساتھ رہنے کا موقع ملتا تھا۔ قدرتی بات ہے کہ حضرت ثوبانؓ علوم نبوی ﷺ سے زیادہ بہرہ ور ہوئے۔ چنانچہ ان سے 127 حدیثیں مروی ہیں۔ وہ حفظِ حدیث کے ساتھ اس کی اشاعت کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔ آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد کچھ دن تو مدینہ ہی میں رہے، پھر رملہ (شام) میں سکونت اختیار کر لی اور مصر کی فتوحات میں شریک ہوتے رہے۔ پھر رملہ سے منتقل ہو کر حمص میں اپنا گھر بنا لیا اور یہیں 54 ہجری میں وفات پائی۔

جابرؓ بن عبداللہ

جابر نام، ابوعبداللہ کنیت۔ بنوخزرج سے ہیں۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں اپنے والد کے ساتھ ایمان لائے۔ اُس وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کے والد عبداللہ نے غزوۂ اُحد میں شہادت حاصل کی۔ کافروں نے مُثلہ کر دیا تھا، اس لیے جنازہ کپڑوں میں اڑھا کر لایا گیا۔ حضرت جابرؓ نے کپڑا اٹھا دیا اور دیکھنا چاہا۔ لوگوں

نے منع کیا۔ آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر کپڑا اُٹھا دیا۔ بہن پاس کھڑی تھیں۔ بھائی کی حالت دیکھ کر چیخ ماری۔ آنحضور ﷺ نے پوچھا، کون ہے؟ لوگوں نے کہا، ان کی بہن۔ فرمایا، تم روؤ یا نہ روؤ۔

بدر اور اُحد میں تو حضرت جابرؓ اپنے والد کی ممانعت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے، لیکن باقی غزوات میں نہایت گرم جوشی سے شرکت کی۔ غزوۂ احزاب کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت جابرؓ خندق کھود رہے تھے۔ اس اثنا میں رسولِ کریم ﷺ خود کدال لے کر ایک سخت پتھر کو کھودنے کے لیے تشریف لائے۔ دیکھا تو شکم مبارک پر بھوک کی وجہ سے پتھر بندھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر حضور ﷺ سے اجازت لے کر گھر پہنچے اور بیوی سے کہا کہ آج ایسی بات دیکھی، جس پر صبر نہیں ہو سکتا۔ بکری کا ایک بچہ ذبح کر کے بیوی کو پکانے کے لیے دیا۔ پھر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ میرے ہاں چل کر ما حضر تناول فرمائیے۔ دعوت قبول ہوئی اور عام منادی کرا دی کہ جابرؓ نے سب لوگوں کی دعوت کی ہے۔ حضرت جابرؓ نے انتظام آپ کے اور دو تین آدمیوں کے لیے کیا تھا، اس لیے نہایت تنگ دل ہوئے، مگر ادب سے خاموش رہے۔ آنحضور ﷺ تمام مجمع کو لے کر ان کے مکان پر تشریف لے گئے۔ خود بھی کھانا نوش فرمایا اور لوگوں نے بھی کھایا۔ پھر بھی بچ رہا۔

6 ہجری میں بنو مصطلق کا غزوہ ہوا۔ آنحضور ﷺ جب روانگی کے قصد سے اُونٹ پر سوار ہوئے اور نماز پڑھنے لگے تو جابرؓ کو کسی کام سے بھیجا تھا۔ جب تک وہ واپس نہ آئے، اس وقت تک کوچ کا حکم نہ دیا۔ اسی سال آنحضور ﷺ عُمرے کی غرض سے مکہ روانہ ہوئے۔ پندرہ سو جاں نثار ہم رکاب تھے۔ بیعت رضوان کا واقعہ اسی سال پیش آیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ مشرف بہ بیعت ہوئے۔ بیعت کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ آنحضور ﷺ کا اور حضرت جابرؓ حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا، تم لوگ ساری دنیا سے بہتر ہو۔

اس کے بعد حضرت جابرؓ اور بھی غزوات میں شامل رہے۔ حنین اور تبوک میں ان کا نام صراحت سے آیا ہے۔ حجۃ الوداع میں بھی وہ شریک رہے۔ 37 ہجری میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی جنگ میں حضرت جابرؓ نے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا اور ان کی جانب سے صفین میں جا کر لڑے۔ اس کے بعد پھر مدینہ منورہ آ کر تعلیم و تعلم اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ تین سال بعد امیر معاویہؓ کی طرف سے بسر بن ابی ارطاۃ مدینہ کا عامل بن کر آیا تو اس نے اعلان کیا کہ بنو سلمہ کو (جن سے حضرت جابرؓ کا نسبی تعلق تھا) اس وقت تک امان نہیں مل سکتی جب تک حضرت جابرؓ امیر معاویہؓ کی بیعت نہ کر لیں۔ حضرت جابرؓ نے اُم المومنین حضرت اُم سلمہؓ سے مشورہ کیا اور بادلِ نخواستہ امیر معاویہؓ کی حکومت پر بیعت کر لی۔ یزید کے عہد حکومت (محرم 61 ہجری) میں کربلا کا واقعہ پیش آیا تو حضرت جابرؓ کو بے حد صدمہ پہنچا۔ ضعیف العمری کے باوجود کچھ لوگوں کے ساتھ کربلا پہنچے، تا کہ غم زدہ قافلے کو اپنے ساتھ مدینہ لائیں۔ یہ قافلہ جب حضرت نعمان بن بشیرؓ کی قیادت میں دمشق سے کربلا پہنچا تو حضرت جابرؓ نے آنسوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ حضرت زینبؓ نے بنو ہاشم اور حضرت جابرؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''اے بنی ہاشم تمھارا چاند غروب ہو گیا۔ اے میرے نانا کے صحابیؓ، تو نے جس بچے (حسینؓ) کو کبھی اپنے آقاؐ کے دوشِ مبارک پر سوار دیکھا تھا، اس کا جسم گھوڑوں کے سموں سے پامال ہو گیا۔''

حضرت جابرؓ اور دوسرے لوگ بے اختیار رونے لگے۔ اس کے بعد وہ اس مصیبت زدہ قافلے کے ساتھ مدینہ پہنچے اور جہاں تک ہو سکا، خاندان رسالت کے مظلوموں کی دل جوئی کرتے رہے۔

74 ہجری میں حجاج بن یوسف مدینہ منورہ کا عامل مقرر ہو کر آیا تو اس نے ایسے تمام لوگوں سے باز پُرس کی، جنھوں نے حضرت علیؓ کی پُر جوش حمایت کی تھی۔ ان میں متعدد جلیل القدر صحابہؓ بھی شامل تھے۔ حجاج نے ان کی گردنوں اور ہاتھوں پر مہریں لگوائیں۔ اس نے حضرت جابرؓ کے ہاتھ پر مہر لگوائی۔ اس وقت ان کی عمر 94 سال تھی۔ آنکھیں جواب دے چکی تھیں۔ سخت ضعیف اور ناتواں ہو چکے تھے اور بیعت عقبہ ثانیہ والے صحابہؓ میں سے صرف وہی حیات تھے۔ اس واقعے کے چند روز بعد انتقال کیا۔ حضرت عثمانؓ کے صاحب زادے ابانؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں سپردِ خاک ہوئے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ ان صحابہ میں سے تھے جو مدینہ منورہ میں فتویٰ دیا کرتے تھے اور ان کے فتوؤں پر پورا اعتماد کیا جاتا تھا۔ انھوں نے بارگاہِ رسالت میں سال ہا سال حاضر رہ کر بڑے ذوق و شوق سے دین کی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت معاذؓ بن جبل، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت اُم شریکؓ، حضرت اُم مالکؓ اور متعدد دوسرے صحابہؓ و صحابیاتؓ سے استفادہ کیا تھا۔

جبّار بن صخر انصاریؓ

جبّار نام، ابوعبداللہ کنیت، قبیلہ خزرج سے تعلق ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں اسلام قبول کیا۔ ہجرت کے بعد مواخات قائم ہوئی تو جبّار کو حضرت مقدادؓ بن اسود کا بھائی بنایا۔ حضرت جبارؓ نے بدر سے تبوک تک تمام غزوات میں شرکت کی۔ فتح خیبر کے بعد آنحضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو وہاں کے پھلوں کا تخمینہ کرنے کے لیے روانہ فرمایا تھا۔ 8 ہجری میں وہ غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے تو آنحضور ﷺ نے یہ خدمت حضرت جبارؓ کو تفویض فرمائی۔

مکہ معظمہ کے سفر میں آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی اثابہ جا کر پانی کا انتظام کرے۔ حضرت جبارؓ نے عرض کیا، میں جاتا ہوں۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر اِدھر اُدھر سے پتھر اکٹھے کر کے حوض بنایا اور اس میں قریبی چشمے یا کنوئیں سے پانی بھرا۔ کام ختم ہو گیا تو وہیں سو گئے۔ حضور ﷺ وہاں پہنچے تو فرمایا: ''اے حوض کے مالک، کیا اونٹ کو پانی پلا سکتا ہوں؟'' حضرت جبارؓ نے حضور ﷺ کی آواز پہچان کر عرض کیا، بسر وچشم۔ حضور ﷺ نے اُونٹ کو پانی پلایا اور پھر اسے بٹھا کر وضو کرنا چاہا۔ حضرت جبارؓ نے

حضور ﷺ کو وضو کرایا اور حضور ﷺ کی بائیں جانب کھڑے ہو گئے۔ حضور ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دائیں جانب کھڑا کر دیا اور پھر نماز ادا فرمائی۔

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں بھی پھلوں کے تخمینے پر مامور رہے۔ جب حضرت عمرؓ نے یہود کو خیبر سے جلاوطن کیا تو مہاجرین وانصار کو لے کر خیبر گئے تھے۔ اس سفر میں جبارؓ بھی ان کے ہم راہ تھے۔ 30 ہجری میں حضرت عثمانؓ کے عہد میں 62 سال کی عمر میں وفات پائی۔

جعفرؓ بن ابی طالب

انھیں جعفر طیارؓ بھی کہتے ہیں۔ کنیت ابو عبداللہ، والدہ کا نام فاطمہ۔ آنحضور ﷺ کے چچیرے بھائی۔ وہ حضرت علیؓ کے سگے بھائی تھے اور اُن سے دس سال بڑے تھے۔ جب ابو طالب تنگ دست ہو گئے تو جعفرؓ کے چچا حضرت عباسؓ انھیں اپنے گھر لے گئے تا کہ اپنے بھائی کے سر سے کچھ بوجھ ہلکا کریں۔ اسی طرح رسول کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو اور حضرت حمزہؓ نے حضرت عقیلؓ کو اپنی اپنی کفالت میں لے لیا۔ تھوڑے ہی دن بعد جعفرؓ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

حضرت جعفرؓ ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے مشرکین قریش کی زیادتیوں سے تنگ آ کر حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ ان کی زوجہ اسماؓ بنت عمیس بھی ان کے پیچھے ہجرت کر گئیں۔ جب قریش نے سُنا کہ یہ مہاجر حبشہ میں امن وسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں تو انھوں نے ابو ربیعہ، ابن مغیرہ مخزومی اور عمرو بن العاص کو گراں قدر تحائف دے کر نجاشی، شاہِ حبشہ کے پاس بھیجا تا کہ مہاجرین کو واپس کر دینے کا مطالبہ کریں۔

نجاشی کے طلب کرنے پر مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفرؓ نے عربوں کی جہالت اور رسولِ کریم ﷺ کی تعلیمات پر ایک فصیح وبلیغ تقریر کی اور سورۂ مریم کی کچھ آیات تلاوت کیں، جنھیں سُن کر نجاشی نے کہا: ''خدا کی قسم، یہ اور تورات ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔'' دوسرے روز سفرائے قریش نے نجاشی سے درخواست کی کہ مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ان کا کیا خیال ہے؟ حضرت جعفرؓ نے جواب دیا کہ ہم انھیں خدا کا بندہ، پیغمبر اور کلمۃ اللہ مانتے ہیں۔ نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا: ''واللہ! جو کچھ تم نے کہا، عیسیٰؑ ابن مریم اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں'' اور مسلمانوں کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی ہجرت کے دوران میں انھوں نے نجاشی کو مشرف بہ اسلام کر لیا تھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے نجاشی کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھی۔

حضرت جعفرؓ ہجرتِ نبوی ﷺ کے چھے سال بعد تک حبشہ ہی میں رہے اور اُس وقت مدینہ منورہ پہنچے، جب مسلمانوں نے خیبر پر قبضہ کیا اور عین فتح خیبر کے دن (7 ہجری / 628 عیسوی) آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے نہایت محبت سے انھیں گلے سے لگا لیا اور پیشانی چوم کر فرمایا۔

''میں نہیں جانتا کہ مجھے جعفرؓ کے آنے سے زیادہ خوشی ہوئی یا خیبر کی فتح سے۔''

حضرت جعفرؓ کا نام ایک اور واقعے کے ساتھ بھی وابستہ نظر آتا ہے۔ صلح حدیبیہ میں قریش سے معاہدے کے مطابق اگلے سال نبی کریم ﷺ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ واپسی کے وقت حضرت حمزہؓ کی کم سن صاحب زادی امامہؓ، جو مکہ میں رہ گئی تھیں، آنحضور ﷺ کے پاس دوڑی آئیں۔ ان کی ولایت کا حضرت علیؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ تینوں نے دعویٰ کیا۔ حضرت جعفرؓ اور حضرت علیؓ کو امامہؓ کے چچا زاد بھائی ہونے کا دعویٰ تھا، اور حضرت زیدؓ کہتے تھے کہ حضرت حمزہؓ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے اِن کا بھائی چارا کرا دیا تھا اور اسی رشتے سے امامہؓ ان کی بھتیجی ہے۔ آنحضور ﷺ نے سب کے دعوے مساوی دیکھ کر امامہ کو حضرت جعفرؓ کی زوجہ اسماؓ کی گود میں دے دیا، کیوں کہ وہ امامہ کی خالہ تھیں اور فرمایا کہ خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے۔

جمادی الاول 8ھ /629ء میں غزوۂ موتہ پیش آیا۔ آنحضور ﷺ نے جب قیصر روم، خسرو ایران، عزیز مصر اور دوسرے فرماں رواؤں اور رؤسا کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط ارسال فرمائے تو ایک خط شرجیل بن عمرو کے نام بھی بھیجا گیا، جو عرب وشام کی سرحد پر علاقہ بلقا کا رئیس اور قیصر کا ماتحت تھا۔ شرجیل نے رسولِ کریم ﷺ کے قاصد حارثؓ ابن عمیر کو قتل کر دیا۔ اس کے قصاص کے لیے آپ ﷺ نے تین ہزار فوج تیار کر کے شام کی طرف روانہ کی۔ اس کا سپہ سالار زیدؓ بن حارثہ کو مقرر کیا اور فرمایا کہ اگر زیدؓ کو دولتِ شہادت نصیب ہو تو ان کے جانشین جعفرؓ ہوں اور وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہؓ بن رواحہ ان کی جگہ سنبھالیں۔ موتہ پہنچ کر اُن کا مقابلہ شرجیل کی ایک لاکھ فوج سے ہوا۔ امیر لشکر زیدؓ شہید ہو گئے تو حضرت جعفرؓ نے پرچم سنبھالا اور غنیم کی صفیں چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ دشمنوں کا ہر طرف سے نرغہ تھا۔ ان کا تمام بدن زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ دونوں ہاتھ کٹ گئے، مگر انھوں نے علم سرنگوں نہ ہونے دیا اور کٹے ہوئے بازوؤں میں لے کر سینے سے چمٹائے رکھا۔ بالآخر وہ شہید ہو کر گر گئے تو عبداللہ بنؓ رواحہ اور ان کی شہادت کے بعد خالد بن ولیدؓ نے علم ہاتھ میں لے لیا اور مسلمانوں کو بچا لائے۔ زیدؓ، جعفرؓ اور عبداللہؓ تینوں ایک ہی قبر میں دفن کیے گئے، جس پر کوئی الگ الگ، امتیازی علامت نہیں بنائی گئی۔

شہادت کے وقت حضرت جعفرؓ کی عمر چالیس سال کے قریب تھی۔ کہا گیا ہے کہ انھوں نے لڑائی شروع ہونے سے پہلے اپنے گھوڑے کی کونچیں کاٹ دی تھیں، تا کہ ان کے پاس لڑائی سے بھاگنے کا کوئی ذریعہ ہی نہ رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ اسلام میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ایسا کیا۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر جو اس جنگ میں شریک تھے، فرماتے ہیں کہ میں نے جعفرؓ کی لاش کو تلاش کر کے دیکھا تو صرف سامنے کی طرف پچاس زخم تھے۔ تمام بدن کے زخموں کا شمار 90 سے زیادہ تھا، لیکن ایک بھی زخم پُشت پر نہ تھا۔ میدان جنگ میں جو کچھ ہو رہا تھا، اللہ کے حکم سے آنحضور ﷺ کے سامنے تھا۔ چنانچہ خبر آنے سے پہلے ہی آپ ﷺ نے حضرت جعفرؓ وغیرہ کی شہادت کا حال بیان فرما دیا۔ اس وقت آپ ﷺ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ آپ ﷺ کو عرصے تک شدید غم رہا، یہاں تک کہ روح الامین نے یہ بشارت دی

کہ خدا نے جعفرؓ کو دو کٹے ہوئے بازوؤں کے بدلے میں دو نئے بازو عنایت کیے ہیں، جن سے وہ ملائکہ کے ساتھ مصروفِ پرواز رہتے ہیں۔ چنانچہ طیارؓ اور ذوالجناحین ان کا لقب ہو گیا۔

حضرت جعفرؓ طیار آنحضور ﷺ کے اُن رشتہ داروں میں سے ہیں جو آپ ﷺ سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے تھے۔ خود آنحضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ جعفرؓ تم میری صورت اور سیرت دونوں میں مجھ سے مشابہ ہو۔ حضرت جعفرؓ کو ''ابوالمساکین'' کا لقب بھی دیا گیا تھا، کیوں کہ وہ بہت کشادہ دست اور فیاض تھے۔ غربا اور مساکین کو کھانا کھلانے میں انھیں خاص لطف حاصل ہوتا تھا۔ انھوں نے دو بار ہجرت کی، اس لیے ''ذوالہجرتین'' بھی کہلاتے ہیں۔ ایک حبشہ کی طرف اور ایک مدینے کی طرف۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ مواخات کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا، لیکن حضرت جعفرؓ کی ہجرت و قیامِ حبشہ کے پیشِ نظر انھیں حضرت معاذؓ بن جبل کے ساتھ اس رشتے میں منسلک کر دیا گیا۔

حضرت جعفرؓ کے فرزندوں میں سے، جو حضرت اسماؓ بنت عُمیس کے بطن سے پیدا ہوئے، عون اور محمد تو امام حسینؓ کے ساتھ کربلا میں شہید ہو گئے۔ فقط اُن کے فرزند عبداللہ سے اُن کی نسل چلی۔

جلیب رضی انصاریؓ

جلیب نام تھا۔ انصار کے کسی قبیلے سے تھے۔ سلسلۂ نسب معلوم نہیں۔ آنحضور ﷺ کے ہم راہ کسی غزوے میں شریک تھے کہ مالِ غنیمت آیا۔ ارشاد ہوا، دیکھو کون کون لوگ لاپتا ہیں۔ لوگوں نے چند آدمیوں کے نام گنائے۔ آپ ﷺ نے تین مرتبہ پوچھا اور وہی جواب ملا تو فرمایا: ''لیکن میں جلیب کو گم پاتا ہوں۔'' مسلمان حضرت جلیبؓ کی تلاش کو نکلے تو دیکھا کہ سات آدمیوں کے پہلو میں مقتول پڑے ہیں۔ آنحضور ﷺ کو خبر ہوئی۔ آپ ﷺ خود تشریف لائے اور لاش کے پاس کھڑے ہو کر فرمایا: ''سات کو قتل کر کے قتل ہوا۔ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔ یہ مجھ سے ہے اور میں اس سے ہوں۔'' اور جلیبؓ کی لاش کو اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لائے اور قبر کھدوا کر دفن کیا۔

حارثؓ بن ہشام مخزومی

ابوعبدالرحمٰن حارث بن ہشام بن مغیرہ مخزومی، دشمنِ اسلام ابوجہل کے حقیقی بھائی تھے۔ غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے ساتھ تھے۔ 8ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر حضرت حارث مخزومی اور زہیر بن امیہ مخزومی (یا عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی) نے آنحضور ﷺ کی چچازاد ہمشیر اُمِ ہانی کے گھر پناہ لی۔ حضرت علیؓ کو اطلاع ہوئی تو وہ اپنی بہن کے گھر پہنچے اور دونوں مخزومیوں کو قتل کرنا چاہا۔ حضرت اُمِ ہانی نے کہا کہ انھوں نے میرے ہاں پناہ لی ہے۔ میں ہرگز انھیں قتل نہ ہونے دوں گی۔ پھر اپنا دروازہ بند کر لیا۔ پھر دونوں مخزومیوں کو ہم راہ لے کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

''یارسول اللہ، مَیں نے ان دونوں کو پناہ دی ہے اور علیؓ انھیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''جسے تو نے پناہ دی، اسے مَیں نے بھی پناہ دی۔'' تب دونوں مخزومیوں نے آنحضور ﷺ کی شانِ سلوک دیکھ کر اسلام قبول کیا۔

حضرت حارثؓ نے قبولِ اسلام کے بعد غزوۂ حنین میں مسلمانوں کے ہم راہ شرکت کی۔ آنحضور ﷺ نے انھیں مالِ غنیمت سے سو اُونٹ عطا کیے۔ آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں شام میں رُومیوں سے کئی معرکے ہوئے، جن میں خصوصیت سے حضرت حارثؓ نے فحل اور اجنادین کے معرکوں میں دادِ شجاعت دی۔ یرموک کی خوں ریز جنگ میں شہید ہوئے۔

حضرت حارثؓ کی اہلیہ حضرت فاطمہؓ بنت ولید (حضرت خالد بن ولیدؓ کی ہم شیر) اور بیٹی اُمِ حکیم کا شمار جلیل القدر صحابیاتؓ میں ہوتا ہے۔

حارث بن صمّہ انصاریؓ

حارث نام، ابوسعید کنیت، قبیلہ خزرج کے خاندانِ نجّار سے ہیں۔ ہجرت سے قبل اسلام لائے۔ ہجرت نبوی ﷺ کے بعد جب مہاجرین اور انصار کے مابین مواخات قائم ہوئی تو آنحضور ﷺ نے حضرت حارثؓ کو حضرت صہیبؓ رومی کا اسلامی بھائی بنایا۔

غزوۂ بدر کے موقع پر راستے میں روحا نامی مقام پر حضرت حارثؓ کو چوٹ لگ گئی اور وہ لڑنے کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے انھیں واپس مدینہ بھیج دیا۔ تاہم انھیں بدر کے مالِ غنیمت سے حصّہ مرحمت فرمایا۔ اگلے سال غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے۔ قریش کے ایک جاں باز عثمان بن عبداللہ بن مغیرہ کو قتل کیا، حضور ﷺ نے مقتول کا سامان انھیں مرحمت فرمایا۔ 4ہجری میں بئرِ معونہ کا سانحہ پیش آیا۔ اس موقع پر حضور ﷺ نے ابوبراعامر بن مالک کی درخواست پر 70 مبلغین کی جو جماعت نجد کی طرف روانہ کی تھی، اس میں حضرت حارثؓ بھی شامل تھے۔ بئرِ معونہ کے مقام پر وہ حضرت عمروؓ بن امیہ کے ساتھ مویشی چرانے کے لیے گئے ہوئے تھے کہ بنو عامر کے سردار عامر بن طفیل نجدی نے بعض مشرک قبائل کو ساتھ لے کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور سب مبلغینِ اسلام کو ایک ایک کر کے شہید کر دیا۔ حضرت حارثؓ اور حضرت عمروؓ نے جوابی کارروائی کی، لیکن دشمنوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی۔ حضرت حارثؓ کا جسم چھلنی ہو گیا اور ان کی روح نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ ان کے ساتھی حضرت عمروؓ اسیر ہو گئے۔ سانحہ بئرِ معونہ میں جو مبلغ صحابہ شہید ہوئے، وہ اپنے شغفِ قرآن کی نسبت سے ''قرا'' مشہور تھے۔ حضرت حارثؓ کے مرتبے کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے۔

حارثہ بن سراقہؓ

حارثہ نام، قبیلہ خزرج کے خاندان نجّار سے تعلق تھا۔ والدہ کا نام ربیع بنت نضر تھا۔ وہ صحابیہؓ اور حضرت انسؓ بن مالک کی حقیقی پھوپھی تھیں۔ ان کے والد ہجرت سے قبل فوت ہو گئے تھے۔ حضرت حارثہؓ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ جس روز کوچ کا حکم ہوا، سب سے پہلے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے۔ آنحضور ﷺ نے انھیں ناظر و نگران

بنا کر ساتھ لیا۔ ایک حوض پر پانی پی رہے تھے کہ حبان بن عرفہ نے تیر مارا۔ حضرت حارثہؓ نے جامِ شہادت نوش کیا۔ انصار میں سب سے پہلے انھی کو شرف شہادت حاصل ہوا۔

بدر سے واپسی کے وقت حارثہؓ کی والدہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا، یارسول اللہ، آپ کو معلوم ہے، مجھے حارثہ سے کس قدر محبت تھی۔ اگر وہ جنت میں گئے ہیں تو خیر، صبر کرلوں گی۔ ورنہ آپ دیکھیں گے کہ میں کیا کرتی ہوں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جنّت ایک نہیں بلکہ کثرت سے ہیں، اور حارثہؓ تو جنت الفردوس میں ہیں۔'' ربیع یہ سن کر خوش ہوگئیں۔ مسکراتی ہوئی اٹھیں اور کہنے لگیں: ''واہ واہ اے حارثہؓ۔''

حاطب بن ابی بلتعہؓ

حاطب نام، ابومحمد یا ابوعبداللہ کنیت اور والد کا نام ابی بلتعہ تھا۔ اُن کا آبائی وطن یمن تھا۔ مکہ میں غلامی یا حلیفانہ تعلق کے باعث سکونت پزیر تھے۔ قبل از ہجرت ایمان لائے۔ جب مدینہ اسلام کا مرکز قرار پایا تو حاطبؓ بھی اپنے غلام حضرت سعدؓ کے ساتھ مدینہ آ گئے۔ یہاں حضرت منذر بن محمد انصاریؓ نے انھیں اپنا مہمان بنایا، اور حضرت خالد بن رخیلہؓ سے مواخات ہوئی۔

غزوۂ بدر، اُحد، احزاب اور تمام مشہور غزوات میں آنحضرت ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ غزوۂ حدیبیہ سے واپسی پر 6 ہجری میں آنحضور ﷺ نے انھیں مقوقس والی مصر کے پاس مبلغ اسلام بنا کر بھیجا۔ مقوقس نے حضرت حاطبؓ کو نہایت احترام سے رخصت کیا اور آنحضور ﷺ کے لیے گراں قدر تحائف ساتھ کر دیئے، جن میں ماریہ قبطیہ اور سیرین دو کنیزیں، دلدل نام کا ایک خچر اور بہت سے قیمتی کپڑے تھے۔

8 ہجری میں فتح مکہ کی تیاریاں ہوئیں اور قریش مکہ کو بے خبر رکھنے کے لیے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کی گئیں۔ حضرت حاطبؓ اگرچہ مکہ کے رہنے والے نہ تھے، تاہم جاہلیت کے ایّام میں قریش سے جو تعلقات پیدا ہو گئے تھے، ان کی وجہ سے اپنے قدیم احباب کی الفت و محبت کی ترغیب ہوئی۔ انھوں نے ان تیاریوں کے متعلق ایک خفیہ خط لکھ کر ایک عورت کی معرفت مکہ کی طرف روانہ کیا، لیکن غیب سے آنحضور ﷺ کو یہ راز منکشف ہوگیا۔ آنحضور ﷺ نے حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت مقدادؓ کو حکم دیا کہ مقام روضۂ خاخ کے پاس جا کر اس عورت سے خط چھین لیں۔ خط گرفتار ہو کر آیا اور پڑھا گیا تو حضور ﷺ نے تعجب سے دریافت کیا:

''حاطب! یہ کیا ماجرا ہے؟'' تو انھوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، میرے معاملے میں عجلت نہ فرمایئے۔ میں قریشی نہیں ہوں۔ تاہم ایّامِ جاہلیت میں ان سے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ چوں کہ تمام مہاجرین اپنے مکی اعزہ و اقارب کی حمایت کرتے رہتے ہیں، اس لیے مَیں نے بھی چاہا کہ اگر نسبی تعلق نہیں ہے تو کم از کم اس احسان کا معاوضہ ادا کردوں جو قریش میرے رشتہ داروں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ مَیں نے یہ کام مرتد ہو کر یا کفر کو اسلام پر ترجیح دے کر نہیں کیا ہے۔''

رسول کریم ﷺ نے حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جو کچھ سچی بات تھی، اِس نے ظاہر کر دی ہے، اس لیے اسے کوئی برا نہ کہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ ﷺ، یہ شخص اللہ اور رسول ﷺ اور مسلمانوں کی خیانت کا مرتکب ہوا ہے۔ اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔'' ارشاد ہوا: ''کیا وہ بدر میں شریک نہ تھا؟ اللہ کے حکم سے تمام اہل بدر کے لیے جنّت واجب ہو چکی ہے۔'' حضور ﷺ کی اس شانِ رحمت پر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

اس واقعے کے بعد اعدائے اسلام سے اُلفت و مودّت کی ممانعت کی گئی اور سورہ ممتحنہ کی پہلی آیت نازل ہوئی: ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے اور میری رضا جوئی کی خاطر نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان سے محبت کے ساتھ پیش آتے ہو، حالانکہ تمھارے پاس جو مذہبِ حق آیا ہے، وہ اسے ماننے سے انکار کر چکے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ کی رحلت کے بعد خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں دوبارہ مقوقس مصر کے دربار میں بھیج کر ان کی وساطت سے ایک معاہدہ ترتیب دیا جو حضرت عمرو بن العاصؓ کے حملہ مصر تک نافذ العمل رہا۔ ان کا انتقال 65 برس کی عمر میں 30 ہجری میں ہوا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے نماز جنازہ پڑھائی۔

حبابؓ بن منذر انصاری

حباب نام، ابوعُمر کنیت قبیلہ خزرج سے ہیں۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ تمام غزوات میں شرکت کی۔ غزوۂ بدر میں خزرج کا علم ان کے پاس تھا۔ بدر کے قریب پہنچ کر ایک مقام پر پڑاؤ ڈالا تو حبابؓ نے عرض کیا: ''اس مقام پر اترنے کے لیے حکمِ خداوندی ہے یا آپ کی ذاتی رائے؟'' فرمایا: ''میری ذاتی رائے ہے۔'' عرض کیا ''تو یہ موقع ٹھیک نہیں۔ ہمیں پانی کے پاس اُترنا چاہیے اور تمام کنوؤں پر قبضہ کر کے ایک حوض تیار کرنا چاہیے تا کہ ہمارے لشکر میں پانی کی قلت نہ ہو اور دشمن پیاس کی شدّت سے پریشان ہو جائے۔'' آنحضور ﷺ نے فرمایا، حباب صحیح کہتے ہیں۔ چنانچہ تمام لشکر کو لے کر چاہِ بدر پر رونق افروز ہوئے۔

غزوۂ اُحد میں قریش مکہ اس سروسامان سے نکلے تھے کہ مدینہ ہل گیا تھا۔ آنحضور ﷺ نے پہلے دو جاسوس بھیجے۔ ان کے بعد حبابؓ کو روانہ فرمایا۔ حضرت حبابؓ نے تمام لشکر میں گھوم کر مختلف اطلاعات حاصل کیں اور دشمن کی تعداد اور اسلحہ وغیرہ کا صحیح اندازہ کر کے آنحضور ﷺ کو خبر دی۔ غزوۂ اُحد میں بھی قبیلہ خزرج کا علم ان کے پاس تھا۔ غزوۂ خیبر میں ایک حصّے کا اور غزوۂ حنین میں تمام خزرج کا علم انھی کو تفویض ہوا تھا۔

آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کا معاملہ زیر بحث آیا تو حضرت حبابؓ حضرت سعد بن عبادہؓ کے سرگرم حامی تھے اور ان کے خلیفہ بنانے پر مُصر تھے۔ اس موقع پر انھوں نے دو خطبے دیئے تھے جن سے قوتِ خطابت اور زورِ بیان کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس مفہوم کو کہ انصار چاہیں تو خلافت کو نقصان پہنچا سکتے ہیں، بڑے بلیغ پیرائے میں ادا کیا۔ خلافت کو اُونٹ سے تعبیر کر کے کہتے ہیں کہ تم چاہو

تو میں اسے پانچ برس کا بچہ بنا سکتا ہوں۔ انھوں نے خطبے میں اپنے بارے میں یہ فقرہ کہا تھا: ''میں قوم کا معتمد ہوں اور لوگ میری رائے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔'' اس کے بعد یہ رائے پیش کی کہ دو امیر ہوں، ایک مہاجر اور ایک انصاری۔ حضرت عمرؓ نے برجستہ کہا، یہ ناممکن ہے۔ حضرت حبابؓ زمانہ خلافت میں پچاس برس کی عمر میں فوت ہوئے۔

حبیبؓ بن زید انصاری

حبیب بن زید بن عاصم۔ قبیلہ خزرج سے تعلق ہے۔ غزوۂ اُحد میں اپنی بہادر والدہ ام عمارہؓ اور بھائی عبداللہ کے ساتھ شریک ہوئے اور قیاس ہے کہ دوسرے غزوات میں بھی شامل ہوئے۔ آنحضور ﷺ کی رحلت کے بعد نبوت کے جھوٹے دعویدار مسیلمہ کذاب نے ان سے یہ کہنے اور ماننے کا مطالبہ کیا: ''مسیلمہ اللہ کا سچا رسول ہے۔'' حضرت حبیبؓ نے حقارت سے اس کی بات مسترد کر دی۔ مسیلمہ نے تلوار کے ایک وار سے ان کا ہاتھ شہید کر دیا اور کہا: ''اب میری بات مانو گے یا نہیں۔'' حضرت حبیبؓ نے جواب دیا ''ہرگز نہیں۔'' مسیلمہ نے اب ان کا دوسرا ہاتھ بھی شہید کر ڈالا اور کہا کہ اب بھی میری نبوت تسلیم کر لو۔ لیکن عاشقِ رسول ﷺ نے کہا، ہرگز نہیں۔ ظالم مسیلمہ نے حضرت حبیبؓ کے جسم کا ایک ایک جز کاٹ ڈالا وہ شہید ہو گئے لیکن راہِ حق سے ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ حضرت اُمِ عمارہ نے اپنے مجاہد بیٹے کی شہادت کی خبر سنی تو ان کی ثابت قدمی پر اللہ کا شکر ادا کیا اور دل میں عہد کر لیا کہ اللہ نے توفیق دی تو مسیلمہ سے اس ظلم کا بدلہ لے کر رہیں گے (مزید دیکھیے ''ام عمارہ''۔۔ در باب ''صحابیات رسول ﷺ'')

حرام بن ملحانؓ انصاری

حرام نام، قاری لقب، بنو نجارؓ سے تعلق ہے۔ حضرت اُمِ سلیمؓ کے بھائی تھے جو آنحضور ﷺ کی خالہ اور حضرت انسؓ بن مالک صحابی کی والدہ تھیں۔ انھوں نے ہجرت سے پہلے ہی اپنی بہنوں اُمِ سلیم اور اُمِ حرام کے ساتھ اسلام قبول کر لیا تھا۔ غزوۂ بدر اور اُحد میں شریک تھے۔ صفر 4 ہجری میں نجد سے کچھ لوگ یہ درخواست لے کر آئے کہ اشاعتِ اسلام کے لیے کچھ آدمی نجد بھیج دیجیے جو قرآن و سنت کی تعلیم دے سکیں۔ آنحضور ﷺ نے ستر صحابہؓ کو حضرت حرام بن ملحان کی قیادت میں نجد کی طرف بھیج دیا۔ ان میں زیادہ تعداد انصار اور اصحاب صُفّہ کی تھی جو قرآن کے حافظ تھے اور قرا کے لقب سے مشہور تھے۔ جب قرا کی جماعت بئر معونہ پہنچی تو حضرت حرامؓ آنحضور ﷺ کا خط لے کر سردارِ قبیلہ عامر بن طُفیل کے پاس گئے۔ اس نے حضور ﷺ کا خط دیکھنے سے پہلے ہی ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے پیچھے سے آ کر حضرت حرامؓ کو نیزہ مارا جو ان کے جسم کے آر پار ہو گیا۔ حضرت حرامؓ نے خون کا چلو بھر کر اپنے چہرے اور سر پر چھڑکا اور فرمایا: ''فُزْتُ وَرَبِّ الکعبۃ'' (ربِ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)۔ ساتھ ہی زمین پر گرے اور جامِ شہادت نوش کیا۔ آنحضور ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے ایک مہینا تک قاتلوں کے حق میں دعائے بد کی۔ حضرت حرامؓ قرآن قرأت سے پڑھا کرتے اور رات کے وقت اس کا درس دیتے تھے۔ اسی وجہ سے قاری لقب پڑ گیا تھا۔ رات کو نماز پڑھتے۔ دن کو مختلف کام کرتے۔ مسجد نبوی ﷺ میں پانی بھر کر رکھتے۔ لکڑی کاٹ کر فروخت کرتے اور اس کی آمدنی سے اصحاب صُفّہ اور دوسرے غریب اور محتاج مسلمانوں کے لیے خوراک کا بندوبست کرتے۔

حسان بن ثابتؓ

حسان بن ثابتؓ بن منذر بن حرام بن عمرو نجاری۔ اُن کی کنیت ابوالولید تھی۔ اپنے والد اور والدہ دونوں طرف سے قبیلہ خزرج سے تھے۔ ان کے دادا منذر نے اوس و خزرج کی جنگ میں ثالث کے فرائض انجام دیئے۔ ان کی ولادت 563ء کے قریب مدینہ منورہ میں ہوئی۔ اس طرح وہ عُمر میں آنحضور ﷺ سے تقریباً سات آٹھ برس بڑے تھے۔ حسان اپنے زمانے کے سب سے ممتاز حضری (شہری) شاعر تھے۔ وہ غسانی بادشاہوں کے درباری شاعر ہو گئے تھے۔ یہیں عرب کے مشہور شاعروں نابغہ اور علقمہ سے اُن کی ملاقات ہوئی اور اُن کی موجودگی میں عمرو بادشاہ کی مدح میں ایک قصیدہ پڑھنے کے صلے میں پنشن مل گئی۔ تاہم یہ قدر دانی انھیں حیرہ کے نعمان ابوقابوس کی ملاقات سے نہ روک سکی۔ اس ملاقات نے غسانی بادشاہ کے جذبۂ رقابت کو مشتعل کر دیا، لیکن حسان نے اس کے شبہات کامیابی سے رفع کر دیئے۔ جب نعمان دوبارہ نابغہ پر مہربان ہو گیا تو حسان مصلحت کے طور پر حیرہ سے چلے آئے۔

تقریباً ساٹھ برس کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ عہدِ رسالت میں حضرت حسانؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت کعب بن زہیرؓ مشہور صحابی شعرا تھے، لیکن آنحضور ﷺ کے لیے حضرت حسانؓ کی خدمات اس وجہ سے بیش قیمت تھیں کہ یہ شعرائے کفار کے ہجو یہ اشعار کا جواب دیا کرتے تھے۔

حضرت حسان بوجۂ پیری کسی غزوے میں شریک نہ ہو سکے، جب کہ بعض کے نزدیک فطرتاً دل کے کمزور تھے۔ لیکن غزوۂ خندق میں عورتوں کے ساتھ قلعہ میں تھے۔ آنحضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ بھی اسی قلعے میں تھیں۔ دراصل حضرت حسانؓ جان کی بجائے زبان سے جہاد کرتے تھے۔ غزوۂ بنو نضیر میں جب حضور ﷺ نے بنو نضیر کے درخت جلائے تو انھوں نے یہ شعر کہا:

فھان علی سراۃ بنی لوئی　　　حریق بالبویرۃ مستطیر

بنو نضیر اور قریش میں باہم نصرت و مدد کا معاہدہ تھا۔ اس بنا پر قریش کو غیرت دلاتے ہیں کہ تم بنو نضیر کی کچھ مدد نہ کر سکے، جس وقت کہ مسلمان ان کے باغ جلا رہے تھے۔ یہ شعر مکہ پہنچا تو ابوسفیان نے جواب دیا۔ (ترجمہ): ''خدا تمھیں ہمیشہ اسی کی توفیق دے، یہاں تک کہ آس پاس کے شعلوں سے خود مدینہ خاکستر ہو جائے اور ہم دُور بیٹھے بیٹھے تماشا دیکھیں۔''

پانچ ہجری میں غزوۂ بنو مصطلق سے واپسی کے وقت منافقین نے حضرت عائشہؓ پر تہمت لگائی۔ عبداللہ بن ابی سب میں پیش پیش تھا۔ مسلمانوں میں سے بھی چند آدمی اُس کے فریب میں آ گئے، جن میں حسان، مسطح بن اثاثہ اور حمنہ بنت جحش بھی شامل

تھیں۔ جب حضرت عائشہؓ کی برأت میں چند آیات اُتریں تو آنحضور ﷺ نے تہمت لگانے والوں پر، عفیفہ عورتوں پر تہمت لگانے کی، قرآن کی مقرر کردہ حد جاری رکھی۔ ایک مرتبہ حضرت حسانؓ حضرت عائشہؓ کو شعر سنا رہے تھے کہ مسروق بھی آ گئے اور کہا، آپ انھیں کیوں آنے دیتی ہیں، حالانکہ خدا نے فرمایا ہے کہ افک میں جس نے زیادہ حصہ لیا، اس کے لیے بڑا عذاب ہے۔ فرمایا، یہ اندھے ہو گئے ہیں، اس سے زیادہ اور کیا عذاب ہو گا۔ مزید فرمایا، بات یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے مشرکین کی ہجو کرتے تھے۔

9 ہجری میں بنو تمیم کا وفد مدینہ آیا اور مسلمانوں سے مفاخرہ کیا۔ ان کے شاعر زبرقانؓ بن بدر نے (جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) اپنی قوم کی تعریف میں بہت سے فصیح و بلیغ اشعار پڑھے۔ آنحضور ﷺ نے حسان کو حکم دیا کہ تم اُٹھ کر اس کا جواب دو۔ انھوں نے اُٹھ کر اسی ردیف و قافیہ میں فی البدیہہ ایسے شاندار اشعار کہے کہ رئیس بنی تمیم اقرعؓ بن حابس بے اختیار پکار اٹھے: "محمد ﷺ، باپ کی قسم تمھارا شاعر ہمارے شاعر سے اچھا ہے۔"

اسلام کے لیے ان کی شاید سب سے نمایاں خدمت بنو تمیم کو اپنے اشعار کے ذریعے، دائرۂ اسلام میں لانا تھی۔ آنحضور ﷺ کی مدح میں حضرت حسان نے سیکڑوں اشعار کہے، لیکن ایک شعر میں بھی کوئی خلافِ حقیقت بات نہ کہی۔ حضور ﷺ کے وصال پر انھوں نے ایسے مرثیے لکھے جو بیک وقت نعت بھی ہیں، مدح بھی اور مرثیے بھی۔ ایک مرثیے کے چند اشعار کا اردو ترجمہ:

میرے ماں باپ اس ذاتِ گرامی ﷺ پر قربان ہو جائیں
جن کے سانحۂ ارتحال کے وقت میں خود موجود تھا جو دوشنبہ کو پیش آیا
میں آپ ﷺ کی وفات کے بعد ہوش و حواس کھو بیٹھا
میں پریشان تھا، کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا
کیا آپ ﷺ کے بعد مَیں مدینہ میں لوگوں کے درمیان ٹھہر سکوں گا
کاش مارِ سیاہ مجھے ڈس لیتا اور میں مر جاتا
خدا کی قسم جب مَیں کسی مرنے والے کی خبر سنوں گا
تو نبی محمد ﷺ کی وفات پر روؤں گا جب تک زندہ ہوں
اللہ اور وہ پاک فرشتے جو اس کے عرش کو گھیرے ہوئے ہیں
احمد مجتبیٰ پر رحمت نازل کریں۔
آپ میری آنکھوں کی پتلی تھے، آپ کے بعد دنیا میرے لیے اندھیر ہو گئی
اب کوئی مرے یا جیے، مَیں تو صرف اسی برے دن سے ڈرتا تھا
کیا کسی ہلاک ہونے والے کی مصیبت اس دن کی مصیبت کا مقابلہ کر سکتی ہے
جس دن محمد ﷺ نے رحلت فرمائی
آپ ﷺ اللہ کی طرف اس شخص کی راہنمائی فرماتے تھے جو آپ کی پیروی کرتا تھا
اور رُسوائیوں سے بچاتے تھے اور راہِ حق کی طرف ہدایت فرماتے تھے
اے آنکھ! رسول اللہ پر آنسو بہا۔
مَیں نہیں سمجھتا کہ زمانہ میں کبھی تیرے آنسو خشک ہوں گے
تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو ان نعمتوں کو یاد کر کے نہیں روتی
جو لوگوں کو فیض یاب کیے ہوئے تھیں اور بے شمار تھیں
اے آنکھ رسول اللہ ﷺ پر آنسو بہا اور آہ و زاری کر
ایک ایسی ذات کے جانے پر
جواب زمانہ میں کبھی نہ پائی جائے گی
گزرے ہوئے لوگوں نے محمد ﷺ جیسی ہستی کبھی گم نہ کی
اور نہ ان جیسی ذاتِ گرامی اب قیامت تک گم کی جائے گی

حضرت حسانؓ کا دیوان ہندوستان، تیونس، انگلستان اور بعض دوسرے ملکوں میں طبع ہو چکا ہے۔ وہ اسلام کی مذہبی شاعری کے بانی تھے۔ ان کے اشعار میں قرآن سے اخذ کیے ہوئے جملے بکثرت پائے جاتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ان میں فخر بھی بہت نمایاں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے انھیں کچھ زمین اور ایک مصری کنیز بنام سیرین عطا کی تھی جو حضرت ماریہ قبطیہؓ کی بہن تھیں۔ حسانؓ نہ صرف رسول اللہ بلکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد تک زندہ رہے اور ان سب کے انتقال پر بلند پایہ مرثیے کہے۔ حضرت عثمانؓ سے انھیں خاص عقیدت تھی جو ہجرت کے بعد ان کے بھائی کے گھر میں رہ رہے تھے۔ انھوں نے 120 برس کی عمر میں امیر معاویہؓ کے عہد میں وفات پائی۔ آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی۔ ان کی ایک بیٹی تھی اور سیرینؓ کے بطن سے ایک بیٹا عبدالرحمٰن، دونوں شعر گوئی کا ذوق رکھتے تھے۔

حسن بن علیؓ

حسنؓ بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم۔ ابو محمد کنیت، رسول ﷺ کے بڑے نواسے، حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے پہلے صاحب زادے۔ 10۔ رمضان 3 ہجری / یکم۔ اپریل 625ء کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ حضرت علیؓ نے حرب نام رکھا تھا، مگر حضور ﷺ نے بدل کر حسن رکھا۔

ان کی کنیت ابو محمد بھی حضور ﷺ نے تجویز فرمائی، لیکن اس نام کا اُن کا کوئی فرزند نہ تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو امّ الفضلؓ نے اپنے بیٹے حضرت قثمؓ کے ساتھ اپنا دُودھ پلایا تھا۔ یوں حضرت قثمؓ رشتے میں حضرت حسنؓ کے چچا ہونے کے علاوہ رضاعی بھائی بھی تھے۔

حضرت ابوبکرہؓ ثقفی فرماتے ہیں: "مَیں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ ﷺ منبر پر تھے اور حسنؓ آپ کے پہلو میں بیٹھے تھے۔ آپ ﷺ ایک مرتبہ لوگوں کی طرف دیکھتے تھے اور ایک مرتبہ حسنؓ کی طرف۔ اسی حال میں فرمایا: "یہ میرا بیٹا سردار ہے اور اُمید ہے کہ خدا اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان صلح کرائے گا۔" آنحضور ﷺ انھیں "شباب اہل الجنۃ" بھی کہا کرتے

تھے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ کوئی شخص حسن بن علیؓ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ سے مشابہ نہ تھا۔ تاریخوں میں ان کے حسن و جمال کی بھی تعریف آئی ہے۔

ابتدائی زندگی بابرکت نانا اور والدین کے سایۂ عاطفت میں اطمینان سے گزری۔ عہدِ صدیقیؓ میں حضرت حسنؓ کی صغرسنی کا زمانہ تھا اور موصوف کے بارے میں حضرت صدیقؓ کا طرزِ عمل اُن کے ارشادات سے واضح ہے۔ ان کا عام ارشاد یہ تھا کہ اہل بیت کے معاملے میں حضور ﷺ کا خیال کرو۔ ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ بعدازاں حضرت صدیقؓ اور حضرت علیؓ اکٹھے مسجد سے نکلے۔ حضرت صدیقؓ نے حضرت حسنؓ کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو محبت و شفقت سے اپنے کندھوں پر اُٹھالیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں جب دیوان (دفتر) اور بیت المال قائم کیا اور مسلمانوں کے لیے حفظِ مراتب کے مطابق سالانہ وظیفے مقرر ہوئے تو سب سے زیادہ رقم ان بزرگوں کے لیے تجویز ہوئی جو غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ اگرچہ غزوۂ بدر کے وقت پیدا بھی نہ ہوئے تھے، تاہم حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں وہ دونوں بھی اتنا ہی (یعنی ہر ایک پانچ پانچ ہزار درہم) وظیفہ پاتے تھے جو غزوۂ بدر میں شریک ہونے والوں کو ملتا تھا۔ حضرت علیؓ اور خود حضرت عمرؓ کا وظیفہ بھی اتنا ہی تھا۔

حضرت عثمانؓ کا سلوک بھی حضرت حسنؓ کے ساتھ شفقت آمیز تھا۔ ان کے عہدِ خلافت میں وہ جوان ہو چکے تھے، اس لیے مجاہدات میں بھی شریک ہوئے۔ چنانچہ 30 ہجری میں سعید بن العاصؓ کی ماتحتی میں طبرستان پر فوج کشی ہوئی تو حضرت حسنؓ نے بھی اس میں حصہ لیا۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف فتنے کا طوفان اٹھا اور باغیوں نے مدینہ منورہ میں ان کے مکان کا محاصرہ کرلیا تو حضرت علیؓ نے حضرت حسنؓ کو حضرت عثمانؓ کی حفاظت کے لیے متعین کردیا۔ اس مدافعت میں حضرت حسنؓ زخمی بھی ہوئے۔ سارا بدن خون سے رنگین ہوگیا۔ باغی اس دروازے سے داخل نہ ہو سکے جہاں حضرت حسنؓ کا پہرہ تھا، تاہم وہ ایک دوسری دیوار پھاند کر اندر پہنچ گئے اور حضرت عثمانؓ کو بہ حالت تلاوتِ قرآن پاک شہید کردیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جانشینی کے متعلق رائیں مختلف تھیں، لیکن جو گروہ بَرسرِ اقتدار تھا، اس کی اکثریت حضرت علیؓ کے حق میں تھی اور انھی کی طرف سے قبولِ خلافت کے لیے زیادہ اصرار ہو رہا تھا۔ حضرت حسنؓ نے اس موقع پر والد ماجد کو مشورہ دیا کہ جب تک ممالک اسلامیہ کے لوگ آپ سے خلافت کی درخواست نہ کریں، اس وقت تک آپ اسے قبول نہ فرمائیں۔

حضرت علیؓ کی بیعت کے بعد جنگِ جمل پیش آئی۔ جب یہ اطلاع مدینہ منورہ میں پہنچی کہ حضرت عائشہؓ کی جماعت، جس میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی شامل تھے، مکہ معظمہ سے عراق کی طرف روانہ ہوگئی ہے تو حضرت علیؓ بھی عراق کے قصد سے روانہ ہوئے اور حضرت حسنؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ کو پیش تر کوفے بھیج دیا۔ صحیح بخاری سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حسنؓ مسجد کوفہ میں منبر کے سب سے اونچے مقام پر تھے اور حضرت عمارؓ ان سے نیچے کھڑے تھے اور انھوں نے تقریر کی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اہل کوفہ کو حضرت علیؓ کی امداد کے لیے آمادہ کریں۔ تاریخ کی کتابوں میں مزید تفصیلات ہیں، مثلاً یہ کہ حضرت حسنؓ نو ہزار چھ سو پچاس 9650 کوفیوں کو ساتھ لے کر ذی قار پہنچے جہاں حضرت علیؓ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جنگ جمل میں شرکت کے ذکر کے سوا حضرت حسنؓ کے متعلق مستند روایات میں کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

اس کے بعد 37ھ میں جنگ صفین پیش آئی۔ اس میں بھی بجز شرکت کے کوئی خاص عملی حصہ مستند روایات سے ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ التوائے جنگ کے لیے عہد نامہ لکھا گیا تو اس کے ایک گواہ حضرت حسنؓ بھی تھے۔

رمضان 40 ہجری میں ابن ملجم نے حضرت علیؓ پر مہلک وار کیا۔ زخمی ہونے کے بعد تین دن زندہ رہے۔ اِس اثنا میں حضرت حسنؓ کی جانشینی کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا: ''نہ میں حکم دیتا ہوں اور نہ روکتا ہوں۔'' بیعتِ خلافت ہوئی۔ بیعت کرنے والوں کی تعداد بیس ہزار سے اوپر تھی۔

بیعت سے چار ماہ بعد حضرت حسنؓ اہل عراق کو ساتھ لے کر اور حضرت معاویہؓ اہل شام کو ساتھ لے کر جنگ کے لیے نکلے۔ دونوں لشکر بمقام مسکن آمنے سامنے ہوئے۔ یہ ایک مقام کا نام بھی تھا اور ضلع کا نام بھی، جو دجلہ و فرات کے درمیان انبار سے اس مقام تک پھیلا ہوا تھا، جہاں بعد میں بغداد کی بنیاد رکھی گئی۔ اس وقت حضرت حسنؓ نے اندازہ فرمالیا تھا کہ دونوں میں کسی فریق کی شکست اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دوسرا فریق برباد نہ ہو جائے۔ یہی امر صلح کا محرک ہوا اور حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کو صلح کے لیے لکھا۔ عمرو بن سلمہ الارجی کو امیر معاویہؓ کے پاس اسی غرض سے بھیجا۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرہ اور عبداللہ بن عامرؓ کو حضرت حسنؓ کے پاس بھیجا۔ دونوں نے حضرت حسنؓ کی شرطیں مان لیں۔ پھر حضرت معاویہؓ اور حضرت حسنؓ ساتھ ساتھ کوفے میں داخل ہوئے۔ حضرت حسنؓ قصر میں اترے اور حضرت معاویہؓ نخیلہ میں۔

''الاخبار الطوال'' میں شرائطِ صلح یہ بیان ہوئی ہیں:

1: کوئی عراقی محض بغض و کینہ کی وجہ سے نہ پکڑا جائے گا۔
2: سب کو بلا استثنا امان دی جائے گی۔
3: صوبہ اہواز کا کل خراج حضرت حسنؓ کے لیے مخصوص کردیا جائے گا۔
4: حضرت حسینؓ کو دو لاکھ درہم سالانہ الگ دیئے جائیں گے۔
5: صلات و عطیات میں بنو ہاشم کو بنو اُمیہ پر ترجیح دی جائے گی۔

الاستیعاب اور الاصابہ میں صرف دوسری شرط یعنی بلا استثنا امان کے سوا کوئی شرط مذکور نہیں، البتہ ایک اور شرط درج ہے کہ حضرت معاویہؓ کے بعد حضرت حسنؓ خلیفہ ہوں گے، لیکن مسعودی، دینوری، یعقوبی، طبری، ابن اثیر وغیرہ میں یہ شرط مذکور نہیں۔

''الاخبار الطوال'' کا بیان ہے کہ حضرت حسنؓ نے یہ شرطیں عبداللہ بن عامر کے

حوالے کیں اور انھوں نے حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجیں۔ حضرت معاویہؓ نے تمام شرطوں کی منظوری کا خط لکھ کر اپنی مہر لگائی اور معززین وعمائد کی شہادتیں لکھوا کر کاغذ حضرت حسنؓ کے پاس واپس بھیج دیا۔

ابن اثیر کے نزدیک واقعے کی صورت یہ ہے کہ ادھر حضرت حسنؓ نے شرائط نامہ حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجا، ادھر حضرت معاویہؓ نے سادہ کاغذ پر مہر لگا کر اسے حضرت حسنؓ کے پاس بھیج دیا کہ جو شرطیں چاہیں، لکھ لیں، وہ سب منظور کر لی جائیں گی۔ طبریؒ کے بیان کے مطابق اس مضمون کی ایک تحریر بھی سادہ مہر زدہ کاغذ کے ساتھ بھیج دی گئی تھی۔

''الاستیعاب'' میں مذکور ہے کہ جب حضرت حسنؓ کی شرطیں حضرت معاویہؓ کے پاس پہنچیں تو انھوں نے لبیک کہا۔ ساتھ ہی کہا کہ دس آدمیوں کو امان نہ دوں گا۔ حضرت حسنؓ نے استفسار کیا تو کہا کہ میں قسم کھا چکا ہوں کہ قیس بن سعد پر قابو پاؤں گا تو اس کے ہاتھ اور زبان کٹوا دوں گا۔ اس پر حضرت حسنؓ نے لکھا کہ میں اس صورت میں کبھی مصالحت نہ کروں گا، چنانچہ حضرت حسنؓ کی بات مان لی گئی۔

کوفے میں داخلے کے بعد حضرت معاویہؓ کی بیعت ہوئی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کا مشورہ یہ تھا کہ حضرت حسنؓ سے مجمع عام میں دست برداری کا اعلان کرایا جائے تا کہ لوگ خود ان کی زبان سے یہ اعلان سن لیں اور کسی کے لیے غلط فہمی پیدا کرنے کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ حضرت معاویہؓ نے حضرت حسنؓ سے تقریر کی درخواست کی۔ آپ نے برجستہ فرمایا: ''لوگو! اللہ نے ہمارے اگلوں کے ذریعے سے تمھیں ہدایت دی اور پچھلوں کے ذریعے سے تمھاری خوں ریزی بند کرائی۔ ہاں دانائیوں میں سے بہترین دانائی تقویٰ ہے اور عجزوں میں سب سے بڑا عجز فجور ہے، اور یہ معاملہ (خلافت) جس میں میرے اور معاویہؓ کے درمیان اختلاف تھا، یا تو وہ اس کے مجھ سے زیادہ حق دار ہیں یا یہ میرا حق ہے جسے اللہ عزوجل کی خوشنودی کی خاطر اور امت محمدیہ کی بہتری اور تمھارے مابین خوں ریزی بند کرنے کی خاطر مَیں نے چھوڑا ہے۔''

مجمع عام کی اس تقریر کے علاوہ جو کوفے کی مسجد جامع میں ہوئی، حضرت حسنؓ نے ایک تقریر مدائن کے قصر میں رؤسائے عراق کو صلح پر راضی کرنے کی غرض سے بھی کی تھی۔ اس میں فرمایا: ''تم نے مجھ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ میں جس سے صلح کروں گا، صلح کرو گے اور جس سے لڑوں گا، لڑو گے تو مَیں نے معاویہؓ کی بیعت کر لی ہے تو ان کی فرماں برداری اور اطاعت کرو۔''

اس سلسلے میں بنو ہاشم سے بھی مشورہ ضروری تھا جن میں اس وقت حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؓ سے زیادہ با اثر شخص کوئی نہ تھا۔ حضرت حسنؓ نے ان سے کہا کہ مَیں نے ایک رائے قائم کی ہے، وہ یہ کہ میں مدینے چلا جاؤں اور وہیں قیام کروں۔ خلافت معاویہؓ کے حوالے کر دوں، اس لیے کہ فتنہ بہت لمبا ہو گیا ہے۔ خون بہنے سے راستے منقطع ہو چکے ہیں۔ حضرت عبداللہ نے جواب دیا، تمھیں خدا اُمت محمد ﷺ کی طرف سے جزائے خیر دے۔'' حضرت حسینؓ کے سامنے اپنا خیال ظاہر کیا تو انھوں نے فرمایا: ''خدا کی پناہ۔'' یعنی ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن حضرت حسنؓ نے انھیں بھی راضی کر لیا۔ یوں حضرت حسنؓ کے بارے میں رسولِ کریم ﷺ کی پیش گوئی پوری ہوئی کہ میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے خدا اس کے ذریعے سے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔ یہ سال مسلمانوں میں ''عام الجماعۃ'' کے نام سے مشہور ہوا، اس لیے کہ ان کا تفرقہ مٹ گیا تھا اور وہ متحد ہو کر ایک جماعت بن گئے تھے۔

کوفیوں میں سے بعض لوگوں نے صلح کرنے پر آپ کو طعنے بھی دیئے، لیکن آپ نے ہر طعنہ صبر سے برداشت کیا اور اپنی اس رائے پر قائم رہے، جس میں اُمت کی صلاح وفلاح کے سوا کچھ پیشِ نظر نہ تھا۔

آپ کی بیعت 20۔ رمضان 40 ہجری کو ہوئی اور 15۔ جمادی الاول 41ھ کو آپ دست بردار ہو گئے۔ اس طرح کل مدتِ خلافت سات ماہ اور چھبیس روز ہوتی ہے۔ صلح کے بعد حضرت حسنؓ مدینہ منورہ چلے گئے اور باقی عمر رسول اکرم ﷺ کے جوار میں گزار دی۔ وقت کا بڑا حصہ عبادتِ الٰہی میں صرف ہوتا تھا۔ حضرت معاویہؓ نے ایک شخص سے آپ کے حالات دریافت کیے تو اس نے کہا، فجر کی نماز کے بعد سے طلوع آفتاب تک مصلے پر رہتے ہیں۔ پھر ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور آنے جانے والوں سے ملتے ہیں۔ دن چڑھے چاشت کی نماز ادا کر کے اُمہات المؤمنین کی خدمت میں سلام کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔ مکہ معظمہ میں ہوتے تو معمول تھا کہ عصر کی نماز حرم پاک میں ادا کر کے طواف میں مشغول ہو جاتے۔

صدقہ وخیرات میں بڑے دریا دل تھے۔ تین مرتبہ کل مال کا نصف حصہ اللہ کی راہ میں دے دیا، یہاں تک کہ اگر دو جوڑے جوتے تھے تو ایک پاس رکھا اور دوسرا خیرات کر دیا۔ دو بار پورا مال اسباب اٹھا کر بانٹ دیا۔ دوسروں کی ضرورتیں پوری کرنا ان کے نزدیک عبادت تھی۔ ایک بار اعتکاف میں تھے۔ ایک سائل آیا تو اعتکاف کے دائرے سے نکل کر اس کی ضرورت پوری کر دی اور پھر معتکف ہو گئے۔ ایک مرتبہ طواف میں تھے، کسی نے اپنی ضرورت کے لیے ساتھ لے جانا چاہا، طواف چھوڑ کر ساتھ ہو گئے اور واپس آ کر طواف پورا کیا۔

15 ہجری سے آپ کے لیے پانچ ہزار درہم سالانہ وظیفہ مقرر تھا۔ اس وقت عمر مبارک بارہ برس کی تھی۔ یہ وظیفہ 40 ہجری تک جاری رہا۔ حضرت معاویہؓ سے صلح کے بعد عہد نامے کی رو سے اہواز کا خراج آپ کے لیے مخصوص ہو گیا، جس کی مقدار دس لاکھ درہم سالانہ تھی۔

وفات ربیع الاول 50 ہجری میں بمقام مدینہ منورہ ہوئی۔ آپ نے 47 سال کی عمر پائی۔ یہ بھی مذکور ہے کہ آپ کی وفات زہر سے ہوئی۔ اس سلسلے میں روایات مختلف ہیں۔ بعض میں زہر دینے یا دلانے والے یا والی کا نام نہیں۔ بعض میں یہ روایت ضعیف انداز میں بیان ہوئی ہے۔ بعض میں کہا گیا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے زہر دلوایا اور جعدہ بنت اشعث نے، جو امام حسنؓ کی زوجہ تھیں، دیا۔

بعض مصنفین کے نزدیک یہ روایتیں اس لیے ناقابل قبول ہیں کہ حضرت معاویہؓ

کو زہر دلوانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حضرت حسنؓ خلافت سے دست بردار ہو چکے تھے اور دس سال میں ان سے کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوئی تھی جو امن پسندی یا اتحاد مسلمین کے منافی ہوتی۔ الاصابہ اور الاخبار الطوال کے مطابق حضرت حسنؓ کی موت زہر سے نہیں، بلکہ کسی اور علالت سے ہوئی۔ اگر زہر خورانی کی روایت تسلیم کر لی جائے تو سمجھنا چاہیے کہ جعدہ نے سوتاپے کی بنا پر یہ حرکت کی۔

بعض روایتوں میں ہے کہ کئی بار زہر دیا گیا۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آخری علالت چالیس روز رہی۔ آخری بار جو زہر دیا گیا، وہ فیصلہ کن تھا۔ ایک روایت کے مطابق امام حسینؓ نے ان سے پوچھا کہ آپ کو زہر کس نے پلایا۔ فرمایا، پوچھ کر کیا کرو گے؟ جس کی نسبت میرا گمان ہے، اگر در اصل ایسا ہی ہے تو خدا اُس سے بدلہ لے گا۔ اگر وہ نہیں تو اپنے بدلے کسی بے گناہ کا مارا جانا مجھے پسند نہیں (بہر حال زہر خورانی کی روایت میں اختلاف ہے، مگر روایتیں ہیں ضرور)۔ نمازِ جنازہ مدینہ منورہ میں سعید بن العاصؓ اموی نے پڑھائی۔ امام حسینؓ نے خود انھیں آگے کیا اور فرمایا کہ سنت یہی ہے کہ امیر شہر نماز پڑھائے۔ جنازے پر بے شمار لوگ جمع ہو گئے تھے۔

بیویوں میں سے اُمِ بشیر بنتِ ابو مسعود انصاری اور خولہ کے نام یقینی طور پر معلوم ہیں۔ جعدہ بنتِ اشعث کا نام زہر خورانی کے سلسلے میں آیا ہے۔ ان تینوں کے علاوہ دو اور بیویوں کا ذکر آتا ہے، لیکن ان کے نام معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ایک فزاری قبیلے کی تھی اور دوسری اسدی قبیلے سے۔

تاریخ یعقوبی میں آپ کے بیٹوں کے نام یہ آئے ہیں: الحسن، زید، عمر، قاسم، ابوبکر، عبدالرحمٰن، طلحہ، عبداللہ۔

آپ نے چند حدیثیں بھی روایت کیں۔ فتوے بھی دیتے تھے، لیکن فتووں کی تعداد بہت کم ہے۔ جو تقریریں آپ سے منقول ہیں، ان سے واضح ہے کہ جوہر خطابت سے بھی آپ کو خاصا حصّہ ملا تھا۔

اوپر حضرت حسنؓ کے حالاتِ زندگی پر جو مضمون شائع ہوا، مولانا غلام رسول مہر کی تحریر ہے جو اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ہشتم میں چھپا ہے۔ اس کا دوسرا حصّہ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کی تحریر ہے جو در حقیقت شیعی نقطۂ نظر کی توضیح میں لکھا گیا۔ ذیل میں مولانا فاضل کا مضمون بھی، پیش کیا جاتا ہے۔

حضرات شیعہ کے نزدیک بارہ اماموں میں سے دوسرے امام معصوم ہیں۔ شیعہ حضرات آپ کو نافذ العمل، خلیفۂ رسول، جانشینِ علیؓ اور واجب الاتباع مانتے ہیں۔

امام حسنؓ کم و بیش آٹھ سال تک آنحضرت ﷺ کی آغوش مبارک میں رہے۔ اس زمانے میں رسولِ کریم ﷺ اپنے کاندھے پر بٹھا کر مدینے میں پھرتے۔ گود میں بٹھاتے اور پیار کرتے تھے۔ آپ نماز میں پشت پر بیٹھے تو حضور ﷺ نے سجدے کو اتنا طول دیا کہ امام حسنؓ خود اُتر آئے۔ صحابہؓ سے اپنی محبت بیان فرماتے اور ان سے محبت کی تاکید فرماتے تھے۔ چوں کہ بہت کم سن تھے، اس لیے غزوات میں شرکت کا سوال ہی نہ تھا، البتہ جب نجران کے عیسائیوں کو قرآنِ مجید (سورہ آل عمران، آیت 61) نے مباہلے کی دعوت دی تو آنحضرت ﷺ امام حسنؓ، حسینؓ، فاطمہؓ و علیؓ کو ساتھ لیے باہر تشریف لائے تھے۔ خانوادۂ نبوت کو یوں آتے دیکھ کر ان کے پادری نے کہا: ''میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو اپنی جگہ سے سرکا سکتی ہے۔ ان سے مباہلہ کر کے ہلاک نہ ہو، ورنہ ایک بھی نصرانی زمین پر باقی نہ رہے گا۔'' آخر انھوں نے مباہلہ چھوڑ کر جزیہ دینا قبول کر لیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔''

یہ واقعہ امام حسنؓ کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے۔ علامہ مجلسی کی روایت ہے کہ امام حسنؑ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور خطبات سن کر جب گھر میں آتے تھے تو اپنی والدہ ماجدہ کو سب کچھ سنا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ گوشے میں اپنے فرزند کی باتیں سننے بیٹھ گئے۔ امام حسنؑ مسجد سے تشریف لائے اور خطبہ نقل کرنا چاہا لیکن کچھ زحمت محسوس کی اور مادر گرامی سے عرض کی: ''شاید والد بزرگوار یہاں ہیں کہ میری زبان لکنت کر رہی ہے۔''

آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد وہ اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہے۔ سب صحابہؓ ان کی عزت کرتے رہے۔ حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں سب سے پہلے جنگ جمل کا معرکہ پیش آیا تو امام حسنؓ حضرت عمار بن یاسرؓ کے ہم راہ کوفے کے حالات کو قابو میں لانے کے لیے بھیجے گئے۔ انھوں نے متعدد مرتبہ عوام سے خطاب کیا اور حکام اور معززین شہر سے ملاقاتیں کر کے حالات استوار کیے اور نو ہزار سے زیادہ سپاہی لے کر ''ذی قار'' میں حضرت علیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بصرے میں جب میدان میں فوجیں صف آرا ہوئیں تو امام حسنؓ دائیں بازو کے قائد تھے۔ انھوں نے ایک موقع پر حریف پر جھپٹ کر حملہ کیا تھا اور اسے پیچھے دھکیل کر واپس آئے تھے۔

معرکہ صفین میں بھی وہ سالار میمنہ تھے۔ اس معرکے میں حضرت علیؓ نے دونوں صاحب زادوں کو لے کر حریف کے سپاہیوں پر حملہ کیا تھا۔ ایک مرتبہ امام حسنؓ فوج پر جھپٹ پڑے تو حضرت علیؓ نے بے چین ہو کر صدا دی: (ترجمہ) ''میری طرف سے اس جوان کو روک لو، کہیں اس کی موت مجھے دھچکا نہ پہنچائے۔ کیوں کہ میں ان دونوں (حسنؓ و حسینؓ) کو موت سے بچانا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے مرنے سے رسول اللہ ﷺ کی نسل منقطع ہو جائے۔'' اس کا مطلب یہ ہے کہ امیر المومنین نے اپنی زندگی میں اپنے دونوں صاحب زادوں کو جنگ میں حصّہ نہیں لینے دیا۔ لیکن جمل، صفین اور نہروان میں انھوں نے فوج کی مکمل دیکھ بھال کی ہے۔ جنگ صفین کے بعد حضرت علیؓ نے اپنی املاک موقوفہ کا متولی مقرر کیا تھا۔ وہ تولیت نامہ ''نہج البلاغہ'' میں موجود ہے۔ تولیت اوقاف کے علاوہ انھوں نے واضح طور پر اپنے بعد امام حسنؓ کے حق میں امامت کی وصیت فرمائی۔

حضرت علیؓ کی وفات (21 رمضان 40 ہجری) ہوئی تو امام حسنؓ نے تجہیز و تکفین کے بعد نمازِ جنازہ پڑھائی اور سپرد لحد فرمایا۔ 21 رمضان کو جمعے کا دن تھا۔ گویا نماز کے بعد انھوں نے خطبہ دیا اور والد بزرگوار کی شہادت پر اپنے تاثرات کا اظہار فرمایا۔ خطبے

کے بعد لوگ بیعت کو بڑھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے مختصر سا خطبہ دیا اور بیعت مکمل ہوئی۔ اس کے بعد امام حسنؓ نے حکومت کے مسائل کی طرف توجہ فرمائی۔ گورنروں کا تقرر، بگڑے ہوئے حالات پر خط وکتابت، فوج کی تنظیم اور دوسرے انتظامات کے بعد وہ مدائن تشریف لائے۔ شام کی طرف سے جنگ کی تیاریاں تھیں اور ان کے دشمن چھپے بیٹھے تھے۔ چنانچہ مدائن کے قریب ان پر حملہ بھی ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ مسلمانوں کی خوں ریزی سے بچا جائے اور لوگوں کو حق و باطل سمجھنے کی مہلت دی جائے۔

دینی منصب اور اس سے متعلق جو فرائض ہیں، وہ حکومت کے محتاج نہیں ہیں۔ لہٰذا انھوں نے امیر معاویہؓ کی طرف سے صُلح اور سمجھوتے کی پیش کش منظور فرمالی اور طے کیا کہ:

1: کتاب وسنت پر عمل کیا جائے گا۔ سَبِ علیؓ بند کی جائے گی۔

2: تمام ملک میں امن و امان رہے گا۔ امیر المومنین علی کے دوست داران کو کوئی تکلیف نہ دی جائے گی۔

3: ہر حق دار کو اس کا حق دیا جائے گا۔

یہ واقعہ ربیع الاول یا ربیع الثانی 41 ہجری کا ہے۔ اس کے بعد امام حسنؓ مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور باقی عُمر خدمتِ اسلام، تبلیغ احکام اور فرائض امامت ادا کرنے میں بسر کی۔

دشمنوں کی ریشہ دوانیاں اور زیادتیاں جاری تھیں۔ حد یہ ہے کہ انھیں بار بار زہر دیا گیا۔ آخر جعدہ بنت اشعث کے ہاتھوں زہر دیا گیا، اس نے انھیں مرتبۂ شہادت پر فائز کیا۔ امام حسینؓ نے تجہیز و تکفین کے بعد جنت البقیع میں سپرد لحد فرمایا۔

امام حسنؓ کے احادیث و مرویات کے معتدبہ ذخیرے کے علاوہ علما نے ان کے اشعار، خطبات، مکتوبات اور کلمات کو بکثرت نقل کیا ہے۔ تاریخ، مناقب، ادب اور حدیث کی کتابوں میں اس کے منتخبات بھی جمع کیے گئے ہیں۔

حسینؓ بن علیؓ

حسین بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قُصی القرشی الہاشمی، رسول اللہ کے محبوب نواسے۔ حضرت فاطمۃؓ زہرا اور حضرت علیؓ کے فرزند، سید الشہدا، امامیہ اثناعشریہ کے نزدیک تیسرے امام منصوص من اللہ۔ امام حسینؓ نے آنحضور ﷺ کی آغوش میں پرورش پائی۔ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ عام شہرت کی بنا پر تاریخ ولادت 3 شعبان 4 ہجری / جنوری 626ء مانی گئی ہے۔ ولادت کے بعد آنحضرت ﷺ نے مولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی اور بچے کو اپنے لعاب دہن کی پہلی غذا مرحمت کی۔ حسین نام رکھا اور ساتویں دن عقیقہ کیا۔ سر کے بال اتروائے۔ بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ کی۔ ایک یا دو مینڈھے ذبح کیے۔ امام حسینؓ کی کنیت ابوعبداللہ اور لقب سید الشہدا ہے۔

امام حسینؓ اپنے بھائی امام حسنؓ سے کچھ ہی چھوٹے تھے۔ آنحضور ﷺ دونوں سے یکساں محبت فرماتے تھے۔ دونوں فرزند نانا کی تصویر تھے۔ امام حسنؓ سر سے سینہ تک اور امام حسینؓ سینے سے قدم تک۔ امام حسینؓ کی پاکیزگی ذات وصفات کے لیے رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان کتبِ حدیث میں آیا ہے کہ ''حسینؓ مجھ سے ہے۔ میں حسینؓ سے ہوں۔ جو حسینؓ سے محبت کرے، اللہ اس سے محبت کرے۔ حسینؓ میری اولاد کی اولاد ہے۔''

اس کے علاوہ بھی آنحضور ﷺ کو امام حسینؓ سے جو گہری محبت تھی اور آپ ﷺ نے جس طرح ان کی فضیلت بیان کی، اس کی تفصیل سب کتب حدیث میں موجود ہے۔ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ اپنی دُختر حضرت فاطمہؓ کے گھر میں تشریف لائے اور حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ سب کو چادر میں لے کر فرمایا: ''پروردگار! یہ میرے اہل بیت ہیں۔ ان سے ہر قسم کے عیب ورجس دُور رکھنا اور انھیں کما حقہ پاک رکھنا۔'' اس کے بعد سورہ احزاب کی آیت 33 نازل ہوئی: ''اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہل بیت نبی ﷺ سے گندگی کو دور کرے اور تمھیں پوری طرح پاک کردے۔'' یہ واقعہ حدیث کسا (چادر) کے نام سے مشہور ہے اور اسی واقعے کی بنا پر آنحضور ﷺ، علیؓ، فاطمہؓ، حسنؓ اور حسینؓ کو ''اصحاب کسا'' کہا جاتا ہے۔

ذوالحجہ 10 ہجری / 631ء میں نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ منورہ میں وارد ہوا اور آنحضور ﷺ نے حضرت عیسیٰؑ پر گفتگو شروع کی۔ آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا، اس کا تذکرہ قرآن مجید (آل عمران۔ آیات 59 تا 61) میں موجود ہے۔ پھر ان کے انکار پر آنحضور ﷺ نے دعا کے ذریعے فیصلہ چاہا۔ اسے دعوتِ مباہلہ کہا جاتا ہے۔ اس دعوت کے بعد نجران کے وفد نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ بالفاظ مولانا شبیر احمد عثمانی آپ ﷺ، حضرت حسنؓ، حسینؓ، فاطمہؓ اور علیؓ کو لے کر باہر تشریف لا رہے تھے۔ یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا: ''میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں، جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا سکتی ہے۔ ان سے مباہلہ کرکے ہلاک نہ ہو۔'' گویا مباہلے میں امام حسینؓ بھی شریک ہوئے۔

ربیع الاول 11 ہجری / 632ء میں رسولِ کریم ﷺ نے رحلت فرمائی۔ 3 جمادی الآخر 11 ہجری کو امام حسینؓ کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہؓ نے رحلت کی۔ دونوں حادثے براہِ راست اہل بیت کے لیے انتہائی سخت تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے لیے پانچ پانچ ہزار درہم کا وظیفہ مقرر کیا۔ فتح ایران کے بعد یزدجرد کی لڑکیاں مدینے آئیں، جن میں سے ایک کو جناب امام حسینؓ سے منسوب کیا گیا اور دوسری محمد بن ابی بکر کو مرحمت فرمائی۔ امام حسینؓ کی زوجہ شہر بانو ہوئیں جن کے بطن سے 38 ہجری / 658ء میں امام زین العابدین پیدا ہوئے۔

35 ہجری / 655ء میں حضرت علیؓ کی بیعت عام ہوئی۔ اگلے برس آپ کو بصرے آنا پڑا۔ کوفے کو دارالخلافہ بنانے کے بعد امام حسینؓ مدینے سے کوفے تشریف لے آئے۔ جنگِ جمل میں امام حسین مَیسرہ (بائیں بازو) کی کمان کر رہے تھے۔ پھر صفین

کا معرکہ پیش آیا۔ اس میں بھی وہ اپنے والد کے ساتھ تھے۔ ایک موقع پر مروان نے کہا تھا: ''حضرت علیؓ حسنؓ و حسینؓ کو میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ وہ خود میدان میں آ کر لڑتے ہیں۔'' حضرت علیؓ دونوں کو اس لیے روکتے تھے کہ ان کی شہادت سے نسلِ رسول اللہ منقطع نہ ہو جائے۔ صفین کے بعد تحکیم حکمین، پھر معرکہ خوارج میں بھی امام حسینؓ اپنے والد بزرگوار و برادرِ نامدار کے ساتھ رہے۔

21- رمضان 40 ہجری کو حضرت علیؓ دنیا سے رخصت ہوئے تو امام حسینؓ کوفے میں موجود تھے اور والد بزرگوار کی تجہیز و تکفین میں امام حسنؓ کے ساتھ رہے۔ اس کے بعد امام حسنؓ کے معاملات پیش آئے۔ اس تمام رُوداد میں بھی امام حسینؓ سامنے رہے۔ امام حسنؓ کی صلح کے بعد تمام اہل بیت کوفے سے مدینے تشریف لے آئے۔

مدینے میں امام حسینؓ بھائی کے زمانے میں خاموشی کے ساتھ دینی خدمات بجا لاتے رہے۔ دونوں بھائیوں کے آداب میں یہ بات داخل تھی کہ امام حسینؓ امام حسنؓ کے سامنے اور محمد حنفیہ امام حسینؓ کے سامنے ادب سے بات کرتے تھے۔ اور امام حسنؓ اپنے چھوٹے بھائی کی تعظیم یوں کرتے تھے جیسے امام حسینؓ آپ سے بڑے ہیں۔ اس محبت و عقیدت کے ماحول میں امام حسنؓ زعیم کے فرائض انجام دیتے رہے، تا آنکہ 28 صفر 50 ہجری میں آپ نے شہادت پائی۔

51 ہجری میں حجر بن عدی کو امیر معاویہؓ نے قتل کیا تو امام حسینؓ نے ان سے ملاقات کے وقت سخت احتجاج کیا اور حالات و معاملات کی بگڑتی ہوئی صورت پر گفتگو کی۔ امام حسینؓ ابتدائی عمر ہی سے اصلاح و تعلیم کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ اکابر مدینہ اسلامی و دینی مسائل میں ان سے رجوع کرتے تھے۔ حضرت امام قرآن مجید کے مطالب اور رسول اللہ ﷺ احادیث بیان فرماتے تھے۔ عبادت و ریاضت آپ کا معمول تھا۔ بکثرت نوافل پڑھتے تھے۔ قیام اللیل آپ کا دستور تھا۔ روزے بکثرت رکھتے اور سادہ غذا سے افطار فرماتے تھے۔ پچیس حج کیے۔ رمضان المبارک میں کم از کم ایک مرتبہ قرآن مجید ضرور ختم کرتے۔

حسب و نسب کی کرامت و شرافت اور بلندیٔ مرتبت کے باوجود آپ میں حد درجہ کا تواضع و انکسار پایا جاتا تھا۔ کچھ غربا راستے میں کھانا کھا رہے تھے۔ انھوں نے آپ کو دیکھ کر اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ آپؓ سواری سے اُترے اور فرمایا: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُتَکَبِّرِیْنَ'' پھر بے تکلفی کے ساتھ بیٹھ کر شریکِ طعام ہوئے۔ فارغ ہو کر ان سب کو دعوت پر بلایا۔ جب وہ لوگ حاضر ہوئے تو آپ نے گھر والوں کو حکم دیا کہ جو کچھ ذخیرہ ہے، وہ سب بھجوا دو۔ انسان دوستی کے ایسے واقعات سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ غلاموں کی لغزشوں کو معاف کرنا، کنیزوں کی آزادی، فقرا سے حُسنِ سلوک، غربا کے گھروں پر کھانا پہنچانا، قرض داروں کے قرضوں کی ادائی، یہ آپ کا روزمرہ تھا۔ فصاحت و بلاغت اور علم و حکمت آپ کی خانہ زاد تھی۔ آپ کے مکتوبات، خطبات اور ملفوظات کے مجموعے اس کی شہادت دیتے ہیں۔

امام حسینؓ کا وہ واقعہ جس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی، وہ عاشورہ 61 ہجری/اکتوبر، 680ء کی قربانی ہے۔ امام حسینؓ نے اسلام کے ارتقا کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسلامی تاریخ کے جملہ واقعات ان کے سامنے ہوئے۔ امام حسینؓ نے تمام مراحل تبلیغ و دعوت کو آزمایا اور مسلمانوں کے رجحانات کا جائزہ لیتے رہے۔ 56 ہجری/676ء میں صورت حال بگڑ گئی۔ یہاں تک کہ یزید کو ولی عہد نامزد کر دیا گیا، جس کی امام حسینؓ نے سخت مخالفت کی۔ اس پر شام سے ان کی جواب طلبی ہوئی۔ اس کے جواب میں انھوں نے حکومت پر سخت تنقید کی اور اپنے خیالات واضح کرتے ہوئے یزید کی ولی عہدی کے ناجائز ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد رجب 60 ہجری میں یزید نے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا اور مدینہ منورہ میں اپنے والد کی وفات کا خط لکھا اور ایک مختصر حکم بھیجا: ''حسینؓ، عبداللہ بنؓ عمر اور عبداللہ بن زبیرؓ کو بیعت پر مجبور کرو اور پوری سختی کرو، یہاں تک کہ یہ لوگ بیعت کر لیں۔'' ولید بن عتبہ بن ابی سفیان مدینے کا گورنر تھا۔ اس نے امیر معاویہؓ کے اعلانِ وفات سے پہلے ہی شام کے وقت آدمی بھیجا۔ امام حسینؓ قاصد کا مطلب سمجھ گئے۔ آپ نے اپنے اعزہ و موالی کو طلب فرمایا اور انھیں مسلح ہو کر ساتھ چلنے کا حکم دیا اور فرمایا: ''مجھے ولید نے ابھی ابھی طلب کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ کوئی ایسا مطالبہ کرنے والا ہے جسے میں منظور نہ کر سکوں گا، لہٰذا تم لوگ دروازے پر ٹھہر جانا۔ اگر اثنائے گفتگو میں میری آواز بلند ہو تو اندر آ جانا اور ولید کو روکنا۔ حضرت اندر تشریف لے گئے۔ وہاں ولید کے برابر سابق گورنر مدینہ مروان بھی موجود تھا۔ امام حسینؓ نے فرمایا: ''اتحاد و اتفاق بہ نسبت نزاع و اختلاف کے بہتر ہے۔ خدا تم دونوں کے تعلقات کو خوش گوار بنائے۔ اس کا کوئی جواب نہ ملا، اور آپ بیٹھ گئے۔ ولید نے یزید کے خط کا مضمون سنایا۔ آپ نے فرمایا: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدا تم لوگوں کو اس مصیبت میں صبر عطا کرے۔ رہی بیعت تو شاید تم میرے ایسے شخص کی مخفی بیعت کو کافی نہ سمجھو گے، لہٰذا جب مجمع عام میں یہ مسئلہ رکھو گے تو مجھ سے مطالبہ کرنا۔ ولید نے کہا: ''درست ہے۔'' مروان نے بات کاٹی اور کہا: ''ولید! کیا غضب کرتے ہو۔ اگر حسینؓ اس وقت تمھارے ہاتھ سے نکل گئے اور بیعت نہ کی تو پھر ایسا موقع نہ مل سکے گا، جب تک فریقین کے بہت سے لوگ قتل نہ ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ انھیں گرفتار کر لو اور یہ تمھارے گھر سے جانے نہ پائیں، جب تک بیعت نہ کر لیں یا قتل نہ کر دیے جائیں۔'' یہ سن کر امام حسینؓ غضب ناک ہوئے۔

ولید سے امام کی ملاقات 27 رجب کو ہوئی۔ 28- رجب کو امام نے مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ کا رخ کیا۔ آپ کے ہم راہ آپ کے فرزند، بھتیجے اور دوسرے اہل بیت تھے۔ اس موقع پر محمد بن حنفیہ نے نئے اقدامات کے لیے پیش بندی کے مشورے دیے۔ امام حسینؓ نے شکریے کے ساتھ سب کچھ سُنا اور بھائی کو خدا حافظ کہا۔ پہلے امام حسینؓ رسول اللہ ﷺ کے مزار اور والدہ ماجدہ کی قبر پر آئے اور دل کھول کر زیارت کی۔ اس کے بعد مدینے سے عام شاہ راہ سے ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ میں 4 شعبان کو داخل ہوئے۔ مکہ میں آپ کا قیام ''شعب علی'' میں رہا۔ یہاں لوگ آپ سے ملنے آنے جانے لگے۔ ابن زبیر پہلے ہی سے یہاں موجود تھے۔ انھیں امام کی آمد کچھ گراں

گزری۔ انھیں یقین تھا کہ امام حسینؓ کے ہوتے ہوئے کوئی شخص ان کی بیعت نہیں کرے گا۔ ادھر عراق میں یزید کی حکومت کے خلاف بددلی پھیل گئی۔ کوفے کے لوگوں نے امام حسینؓ کو طلب کے خط لکھنا شروع کیے۔ امام حسنؓ کے بعد اہل عراق نے امام حسینؓ کو امیر معاویہؓ کے بارے میں خط لکھے تھے، مگر امام نے عہد نامے کی مدت تک خاموش رہنے کا حکم دیا تھا۔ اب کوفے والوں کے مطالبے اور وقت کی نزاکت کا تقاضا کچھ اور تھا، اس لیے انھوں نے ابتدا میں حضرت مسلمؒ بن عقیل کو عراق روانہ کیا۔ حضرت مسلم کوفے پہنچے تو وہاں ان کا زبردست استقبال ہوا اور لوگوں نے ان کے ہاتھ پر امام حسینؓ کے لیے بیعت کی، مگر یزید نے ابن زیاد کو بھیج کر ان کے حامیوں کو بے حد خوف زدہ کیا، بلکہ خاص خاص آدمیوں کو قید کر لیا اور حضرت مسلم بن عقیلؓ اور ہانی بن عروہؓ کو شہید کر دیا۔ ادھر یزید نے تدبیر کر لی تھی کہ حضرت امام کو خفیہ طریقے سے مدینے میں نہ سہی تو مکے میں قتل کر دیا جائے۔ اس نے عمرو بن سعید بن عاص کو بہت بڑی فوج کے ساتھ اس کام کے لیے روانہ کیا۔ حضرت امام نے صورتِ حال کا اندازہ کرنے کے بعد عین 8 ذی الحج کو اپنا حج عمرے سے بدلا۔ طواف کے بعد، جب حاجی عرفات و منیٰ کے لیے نکلے تو امام عراق جانے کے لیے مکے سے باہر آئے۔ عمرو بن سعید نے اپنے بھائی یحییٰ بن سعید کو ایک دستہ دے کر تعاقب کے لیے بھیجا۔ اس نے انھیں گرفتار کرنے کی کوشش کی، مگر حضرت امام نے دشمن کا منصوبہ خاک میں ملا دیا (عبداللہ بن عباسؓ، فرزدق شاعر اور دوسرے لوگوں نے انھیں سفر کوفہ ترک کرنے کا مشورہ دیا)۔ عبداللہ بن جعفر نے اپنے دو فرزندوں عون و محمد کے ساتھ امام سے ملاقات کی اور واپس چلنے کو کہا تو آپ نے فرمایا: ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا ہے اور اب میں ان کا حکم پورا کروں گا۔“ پوچھا، وہ خواب کیا تھا۔ فرمایا ”نہ وہ خواب میں نے بیان کیا ہے، نہ ملاقاتِ باری تعالیٰ تک کسی سے بیان کروں گا۔“ عبداللہ بن جعفر نے مجبور ہو کر خود واپسی کا ارادہ کیا اور اپنے دونوں فرزندوں کو ساتھ کر دیا۔

امام حسینؓ اپنے ارادے کے نتائج اور ان کے دینی فوائد سے باخبر تھے۔ آپ کو خدا پر بھروسا اور اپنے اقدام کے صحیح ہونے پر یقین تھا۔ آپ صفاح آ گئے اور وہاں سے تنعیم میں منزل کی۔ یہاں سفر کے لیے کچھ ناقے کرائے پر لیے اور ذات عرق تشریف لائے۔ وہاں سے بطن الرّمہ اور جز پہنچے۔ اس منزل سے قیس بن مسعر قاصد کو خط دے کر کوفے بھیجا۔ قیس قادسیہ ہی تک پہنچ سکے تھے کہ حصین بن نمیر کی فوج نے گرفتار کر کے ابن زیاد کے پاس بھیج دیا اور ابن زیاد نے قیس بن مسعر کو شہید کر دیا۔ امام حسینؓ یہاں سے آگے بڑھ کر ایک چشمے پر عبداللہ بن مطیع سے ملے۔ عبداللہ بن مطیع نے عراق کے حالات بتائے اور کوفے جانے سے منع کیا، مگر امام کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ آپ نے سفر کی پانچویں منزل زرود میں کی۔ اس چشمے پر زہیر بن قین سے ملاقات ہوئی اور کچھ باتیں کرنے کے بعد وہ امام کے ساتھ ہو گئے۔ زرود میں بنو اسد کا بکیر بن شعبہ ملا اور اس نے مسلم بن عقیلؓ اور ہانی بن عروہؓ کی شہادت کا چشم دید حال سنایا۔ امام نے ثعلبیہ میں قیام فرمایا تو عبداللہ بن سلیم اور منذر بن مشمعل نے امام کو حضرت مسلم اور ہانی کی شہادت کی خبر دی۔ آپ نے سابقہ خطرات و مصائب کی طرح یہ بات بھی سنی اور زبالہ کے لیے قافلے کو چلنے کا حکم دیا۔ زبالہ میں ایاس کے ہاتھوں محمد بن اشعث کا وہ خط ملا جس میں جناب مسلم بن عقیل کی وصیت کے مطابق امام کو کوفے آنے سے منع کیا گیا تھا۔ آپ نے وہ خط اور قیس بن مسعر کی خبرِ شہادت لوگوں کو سنائی اور انھیں بتایا کہ مسلم اور ہانی دونوں شہید ہو چکے ہیں۔ اس خبر کے بعد کم ہمت لوگ آپ سے رخصت ہو کر واپس چلے گئے اور آپ مخلصین کو لے کر وادیٔ عقیق کی طرف بڑھے۔ بطن عقیق یا عقبہ میں قبیلہ عکرمہ کا عمرو بن نوداں حاضرِ خدمت ہوا۔ اس نے قادسیہ کی ناکہ بندی اور اہل کوفہ کی بے وفائی کی خبر دی۔ غالباً امام حسینؓ قادسیہ کا راستہ بدل کر کربلا میں جا پہنچے۔

منزل شراف سے آگے شامی فوج کی نقل و حرکت دیکھی۔ منزل ذوحشم میں امام حسینؓ نے تحفظ کے لیے پہاڑ کو پشت پر لے کر خیمے لگائے اور حر بن یزید ریاحی کے ایک ہزار سپاہیوں کو پانی پلایا۔ حر بن یزید نے امام کی دریا دلی اور آپ کے مقاصد عالیہ سے آگاہی حاصل کی۔ امام حسینؓ نے یہاں نماز ظہر ادا کی۔ ظہر اور عصر کی نمازوں کے بعد حضرت نے تقریر کی اور اپنے آنے کا سبب بیان کیا۔ خلاصہ یہ ہے: ”میں نے اس وقت تک سفر اختیار نہیں کیا، جب تک کہ تمھارے خطوط اور قاصد میرے پاس نہیں پہنچے۔ اگر تم اس طرح میری اطاعت کرو کہ مجھے تمھارے قول و قرار پر اعتبار آ جائے تو ہم سب تمھارے شہر کو چل دیں گے اور اگر معاملہ برعکس ہو تو میں جدھر سے آیا ہوں، ادھر کو واپس چلا جاؤں گا۔“ ان لوگوں کے انکار اور اظہار لاعلمی پر آپ نے عقبہ بن سمعان سے خطوں کا تھیلا منگایا اور انھیں کوفے سے آئے ہوئے سیکڑوں خطوط دکھائے۔ حر نے کہا: ”ہم تو اس کے پابند ہیں کہ آپ کا محاصرہ کیے ہوئے عبیداللہ ابن زیاد کے پاس لے چلیں۔“ انھوں نے فرمایا: ”میں مر جاؤں گا، مگر یہ بات ہرگز قبول نہ کروں گا۔“

اس کے بعد حضرت امامؑ نے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے ساتھیوں سے کہا کہ ان بدلے ہوئے حالات میں شہادت نعمت ہے۔ زہیر بن قیس نے اصحاب و انصار کی طرف سے رفاقت میں رہنے اور ساتھ نہ چھوڑنے کا یقین دلایا۔ پھر نافع بن ہلال اور بُریر بن خضیر نے اپنی رفاقت کا یقین دلایا۔ اس مختصر سے اجتماع کے بعد لوگ آمادۂ سفر ہوئے۔ منزل بیضہ میں پھر امام حسینؓ نے اسلامی تعلیمات اور اپنے فرائض پر تقریر فرمائی۔ عذیب الحانات میں کوفے کے پانچ آدمی ملے۔ ان لوگوں نے کوفے کے حالات بیان کیے۔ قیس بن مسہر کی شہادت کا تذکرہ کیا، مگر امام حسینؓ بالکل خوفزدہ نہ ہوئے۔

2 محرم 61 ہجری/680ء کو امام حسین کربلا پہنچے۔ مکے سے کربلا تک کا فاصلہ بیس بائیس دن میں طے ہوا۔ امام منزل بہ منزل ٹھہرتے آئے، لیکن ساتھیوں کے اضافے اور فوج کی فراہمی کے بجائے قدم قدم پر لوگوں کو کم کرتے رہے۔ ہر منزل میں لوگ انھیں کوفہ و عراق کے حالات سے باخبر کرتے، مگر آپ خندہ پیشانی سے آگے بڑھتے

ہے اور موت کو خوش آمدید کہتے رہے۔

کوفے کی ناکہ بندی تھی اور حُر بن یزید تمیمی ایک ہزار سپاہیوں کے ساتھ امام کو گھیرے میں لے چکا تھا۔ 2 محرم کو امام حسینؓ کربلا میں اترنے پر مجبور ہو گئے۔ 3 محرم کو عمر بن سعد چار ہزار سواروں کے ساتھ آ گیا۔ اس نے امام حسینؓ سے بات چیت شروع کی تو امام حسینؓ نے فرمایا کہ اہل کوفہ کے پیغامات اور خطوط پہنچنے پر میں یہاں آیا تھا، مگر ان لوگوں نے غداری کی۔ لہٰذا میں نے چاہا کہ جدھر سے آیا ہوں، ادھر کو لوٹ جاؤں، لیکن حُر بن یزید نے مجھے روک دیا اور یہاں لا کر میرے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔ عمر بن سعد بھی حضرت امامؑ سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے یہ کیفیت ابن زیاد کو لکھ بھیجی، مگر ابن زیاد نے بیعت یزید کے لیے اصرار کیا تو امام حسینؓ نے فرمایا کہ ''میں بیعت کے مقابلے میں موت کو خوش کہتا ہوں۔''

ابن زیاد نے عمر بن سعد کی نرم روی اور امام کے ارادۂ راسخ کے پیشِ نظر خود تیاری کی اور ساتھیوں کو لے کر نخیلہ میں خیمہ زن ہوا اور حصین بن نمیر، حجار ابن ابجر، شبث بن ربعی اور شمر بن ذی الجوشن کو مزید آٹھ ہزار کے دستے دے کر کربلا بھیج دیا۔ اور سوید بن عبدالرحمٰن منقری کو ایک دستہ دے کر کوفے روانہ کیا، تاکہ وہ گلی گلی گشت کر کے ہر شخص کو فوج میں بھرتی کرے۔ جو بھاگے یا روپوش ہو، اسے گرفتار کرے۔

غرض 6 محرم تک فوج پر فوج آتی رہی۔ کربلا اور اس کے مضافاتی میدان میں ہر طرف سر ہی سر نظر آنے لگے۔

7 محرم کو عمرو بن حجاج پانچ سو سواروں کے ساتھ نہر فرات کے گھاٹ پر متعین کیا گیا کہ امام حسینؓ تک پانی نہ جا سکے۔

عمر بن سعد اور امام حسینؓ کے درمیان متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور صورتِ حال کچھ ایسی بنی کہ ابن زیاد نے بہت سخت خط لکھا: ''اے ابن سعد! ہم نے تجھے اتنی بڑی فوج دے کر اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ جنگ میں التوا ہو اور امن کی خواہش کی جائے اور تو امام سے نہ لڑنے کی سفارش کرے۔ اب امام حسینؓ کو میرے حکم کا پابند کر۔ اگر وہ مان لیں تو انھیں ان کے ساتھیوں سمیت میرے پاس بھیج دے۔ اگر انکار کریں تو حملہ کر دے۔ ان سے کوئی رشتہ و واسطہ نہیں اور اگر تجھ سے یہ نہیں ہو سکتا تو ہماری فوج سے الگ ہو جا اور قیادت شمر بن ذی الجوشن کے سپرد کر دے۔''

اب امام کی طرف سے امن کے تمام مراحل ختم ہو چکے تھے۔ دشمن مکمل طور پر حملہ کرنے پر آمادہ تھا۔ امام حسینؓ پہل کرنے کے حق میں نہ تھے۔ 9 محرم کو دشمن بے قابو ہو گیا اور عصر کے وقت فوج نے پیش قدمی کر دی۔ شمر فوج سے نکل کر آگے آیا اور حضرت عباسؓ بن علیؓ کو آواز دی۔ وہ فوج سے نکل کر اس کے پاس گئے۔ شمر نے انھیں اور ان کے بھائیوں کو امان پیش کی، لیکن انھوں نے یہ تجویز ٹھکرا دی۔ فوج قریب آ چکی تھی۔ امام حسینؓ نے حضرت عباسؓ بن علیؓ کو حکم دیا کہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر جائیں اور دشمن سے اس پیش قدمی کا مقصد پوچھیں۔ جواب ملا کہ امیر کا حکم آیا ہے کہ آپ لوگ امیر کا حکم مان لیں، ورنہ ہم جنگ شروع کر دیں۔ حضرت عباسؓ نے امام حسینؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔ انھوں نے فرمایا: ''ان لوگوں سے کہو، آج رات بھر کی مہلت دے دیں۔ ہم رات کو نمازیں پڑھنا اور عبادت کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ مجھے نماز و تلاوتِ قرآن اور کثرتِ دعا سے محبت ہے۔ کچھ بحث کے بعد جواب ملا کہ اچھا آج رات کی مہلت ہے۔ صبح کو تم لوگ ہمارے حکم کے آگے سپر انداختہ ہو جانا، ورنہ ہم تمھیں چھوڑیں گے نہیں۔''

غروب آفتاب کے بعد امام حسینؓ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا اور حمدِ خدا و نعت رسول ﷺ کے بعد تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''اپنے ساتھیوں سے زیادہ وفادار اور اچھے ساتھی میرے علم میں نہیں۔ نہ میرے اہل بیت سے زیادہ صلہ رحم اور نیکوکار، کسی اور کے گھر والے ہوں گے۔ خدا آپ سب کو میری طرف سے جزائے خیر مرحمت فرمائے۔ آگاہ رہو کہ کل دشمن ہم سے ضرور جنگ کرے گا۔ دیکھو! میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں۔ میں تم سب کو آزادی و اختیار دیتا ہوں۔ میری کوئی ذمہ داری تم پر نہ ہوگی۔ یہ رات کا وقت ہے، چلے جاؤ۔'' یہ سن کر سب نے اپنی حمایت و جاں نثاری کا اعلان کیا اور تقریریں کیں۔ اس کے بعد انھوں نے سب کے لیے دعا کی اور حکم دیا کہ سب خیمے ملا ملا کر نصب کریں اور ایک خیمے کی طنابیں دوسرے خیمے کی طنابوں سے ملا دیں اور حرم سرا کو پیچھے رکھیں اور اس کے پیچھے گڑھا کھود کر آگ روشن کر دیں کہ حملہ آور خواتین کے خیمے پر حملہ نہ کر سکیں۔

امام حسینؓ اور ان کے تمام ساتھی رات بھر نماز و دعا اور خضوع و خشوع کے ساتھ عبادت میں مصروف رہے۔ رات ختم ہوئی۔ صبح کو امام حسینؓ نے نماز پڑھائی۔ اس کے بعد انھوں نے حفاظتی اقدامات کے لیے اپنے تھوڑے سے ساتھیوں کی فوج مرتب کی۔ ان کے پاس بتیس سوار اور چالیس پیدل افراد تھے۔ دائیں بازو (میمنہ) کے سالار زہیر بن قینؓ، بائیں بازو (میسرہ) کے سردار حبیب بن مظاہرؓ بنے اور اپنے بھائی عباسؓ بن علیؓ کو علم دار بنایا۔ یوں دفاعی انتظام مکمل ہو گیا۔

عُمر بن سعد نے دایاں بازو عمرو بن حجاج اور بایاں بازو شمر بن ذی الجوشن کے سپرد کیا۔ گھڑ سوار عروہ بن قیس کی کمان میں اور پیدل شبث بن ربعی کے ماتحت کیے اور علم داری اپنے غلام زید کے حوالے کی۔ قلبِ لشکر میں امام مع اقربا تشریف فرما ہوئے۔ کل اکہتر بہتر کی سپاہ، خیموں کے سامنے صف باندھے کھڑی تھی۔ سامنے دشمنوں کا ٹڈی دل تھا۔ آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔ دعا کے بعد سواری طلب فرمائی اور سواری پر بیٹھ کر خطبہ دیا، جس میں پہلے وعظ و نصیحت کا حق ادا کیا۔ اس کے بعد دنیا و آخرت کا فرق اور توجہ الی اللہ کی دعوت دی۔ پھر اپنے حسب و نسب و فضائل کا تذکرہ فرمایا۔ اپنے حریف کے کردار پر روشنی ڈالنے کے بعد آپ سواری سے اتر آئے۔ اب اتمامِ حُجت کے لیے زہیر بن قین آئے۔ انھوں نے عمر بن سعد کی فوج کو سمجھایا بجھایا اور اپنے عقیدہ و ایمان کا اعلان کیا۔ زہیر اپنا فرض پورا کر چکے تو بریر بن حضیر نے تقریر کی۔

حُر بن یزید امام کے حالات اور خطبات سے متاثر ہو کر حاضرِ خدمت ہو چکے تھے۔ حُر نے معافی بھی حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے اجازت طلب کر کے حریفوں کو

للکارا۔ان کے ظلم کے سبب سے ان پر نفرین کی۔ پانی بند کرنے پر شرم دلائی۔

عمر بن سعد فوج سے نکل کر سامنے آیا۔کمان میں تیر جوڑا اور یہ کہہ کر تیر چھوڑا کہ لوگو، گواہ رہنا،مَیں نے سب سے پہلے تیر چلایا ہے۔ایک تیر کا چلنا تھا کہ نہ معلوم کتنی کمانیں کڑکیں اور تیر فضا میں تیرنے لگے۔اس وقت امامؑ کی استقامت اور اصحابؓ کی پامردی، تاریخ اسلام میں بے مثال تھی۔ بڑی دلیری اور جاں نثاری سے تیر وتلوار کے مقابلے میں ڈٹے رہے موت کے لیے تیار رہے۔ جب دشمن للکارتا تھا، ایک فداکار بڑھ کر جواب دیتا تھا۔

صبح سے ظہر تک یکے بعد دیگرے جاں نثاران امامؑ میدان میں آتے اور داد شجاعت دے کر جام شہادت پیتے رہے۔سب سے پہلے مبارز طلب کے مقابلے میں عبداللہ بن عمیر کلبی نکلے۔مقابلے میں مولیٰ زیاد و مولیٰ عبیداللہ ابن زیاد تھے۔کچھ دیر جھڑپ رہی۔پھر عبداللہ بن عمیر نے ایک ایک کر کے دونوں کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ خود لہولہان ہوگئے۔ان کی زوجہ اُمِ وہب بنت عبد، گرز لے کر میدان میں آ گئی تھیں۔ عبداللہ بن عمیر نے زخمی ہونے کے باوجود زوجہ کو خیمے میں پہنچایا اور خود بھی فاتحانہ انداز میں واپس آئے اور دوبارہ جنگ کی۔مسلم بن عوسجہؓ کے بعد شہید ہوئے۔

یزیدی فوج کے ایک افسر عمرو بن الحجاج نے اصحاب امامؑ کے میمنہ پر حملہ کیا تو انھوں نے گھٹنے ٹیک کر نیزے تان لیے۔کمان داروں نے تیر چھوڑے اور دشمن اپنے آدمیوں کو میدان میں تڑپتا چھوڑ کر بھاگے۔حُر نے اجازت حاصل کی اور شیرانہ حملہ کیا۔متعدد افراد ان کی تلوار سے مارے گئے۔وہ رجز پڑھتے رہے اور حملہ کرتے رہے، یہاں تک کہ یزید بن سفیان سامنے آیا اور قتل ہوا۔اس کے بعد دشمن سامنے سے ہٹ گیا۔آپ زخموں سے چور اپنے مرکز میں لوٹے اور بعدِ ظہر جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

ظہر تک ایک کے مقابلے میں ایک مجاہد آتے اور جنگ کرتے رہے۔امامؑ کے انصار کی حق پرستی و حوصلہ مندی کا جوش بڑھتا گیا اور دشمن فوج میں خوف و بدنظمی پھیلتی گئی۔تیس بتیس سوار جب سیکڑوں کے دستے پر جھپٹتے تھے تو لشکر یزید میں تہلکہ مچ جاتا تھا۔ظہر کے قریب عروہ بن قیس نے، عمر بن سعد کو جنگ کی صورت حال سے مطلع کیا کہ ''تھوڑے سے آدمیوں نے غضب کا ساکھا کیا ہے۔کچھ فوج اور تیر انداز معین کیے جائیں تو کام بنے۔'' چنانچہ تیر اندازوں کو حکم ہوا۔تیر چلے تو امام کے اصحاب نے اس کمال شجاعت سے مقابلہ کیا کہ دشمن کے دانت کھٹے ہو گئے۔اب حصین بن نمیر نے پانچ سو تیر انداز سامنے کھڑے کر دیئے۔اس حملے میں گھوڑے زخمی ہو گئے اور دشمن آگے بڑھے،لیکن زہیر بن قیس نے دس مجاہدوں کے ساتھ دشمن پر ایسا شیرانہ حملہ کیا کہ شمر بن ذی الجوشن کا دستہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔

پہلے حملے کے بعد شمر نے خیموں کو گرانے اور جلانے کا منصوبہ بنا کر دوبارہ پیش قدمی کی۔امام حسینؓ نے بڑھ کر شمر کو تنبیہ کی۔اس پر فوج کے سرداروں نے شمر کو ملامت کی اور بات ٹل گئی۔ابو ثمامہ صائدی نے عرض کی: ''دل چاہتا ہے کہ آخری نماز حضور کے ساتھ پڑھوں۔'' امام نے فرمایا: ''ہاں نماز کا وقت ہے۔خدا تمھیں نماز گزاروں میں محبوب فرمائے۔دیکھو، اگر یہ لوگ نماز کی مہلت دے دیں تو اچھا ہے۔'' حصین نے حملہ کر دیا۔حبیب بن مظاہر نے مقابلہ کیا۔ایک تمیمی نے انھیں نیزہ مار کر گرا دیا۔ بدیل تمیمی نے سر قلم کیا۔حصین نے سر اٹھا کر گھوڑے کے گلے میں ڈال کر میدان کے چکر لگائے۔اس کے بعد امام نے نمازِ ظہر ادا کی۔ زہیر بن قینؓ اور سعید بن عبداللہ آگے کھڑے تیر روکتے رہے۔امام نے نماز ختم کی اور سعید نے جان دے دی۔اس کے بعد کم وبیش 23 حضرات شہید ہوئے۔

اس کے بعد اقربا اور بنی ہاشم نے میدان گرم کیا۔علی اکبر سے لے کر علی اصغر تک سب نے جام شہادت نوش فرمایا۔

امام حسینؓ کو اس وقت دیکھنے والوں میں سے عبداللہ بن عمار کا بیان ہے کہ آج تک ایسا زخمی اور عزیزوں کا ماتم دار نہیں دیکھا گیا جو امام حسینؓ سے زیادہ مطمئن ہو۔ اگر فوج ان پر حملہ کرتی تھی تو وہ تلوار لے کر جھپٹتے تھے اور مجمع یوں بھاگتا تھا جیسے بکریوں کے ریوڑ میں بھیڑیا آ جائے۔آخر آپ خیمے میں آئے۔عزیز و انصار کی خواتین کو الوداع کہا، ایک بوسیدہ لباس زیب تن کیا، پھر میدان میں آئے۔تیر اندازوں نے تیر برسائے اور امام خون میں نہا گئے، مگر اب بھی یہ عالم تھا کہ سامنے آتے ہوئے لوگ کانپ رہے تھے۔امام نے دوبارہ حملہ کیا تو نہر فرات تک پہنچ گئے۔اس وقت حصین بن نمیر نے ایک تیر مارا جس سے دہان مبارک سے خون رواں ہوگیا۔اسی اثنا میں لشکرِ یزید کا ایک دستہ خیموں کی طرف بڑھا اور شمر نے پکار کر کہا: ''خیموں میں آگ لگا دو۔'' امامؑ نے دلیرانہ صدا دی، اور دشمن پلٹ آئے اور امامؑ کا محاصرہ کر لیا۔آپ فرما رہے تھے: ''یاد رکھو، اللہ میرے قتل سے انتہائی ناراض ہے۔میں بقسم کہتا ہوں کہ تمھارے ذلّت دینے سے اللہ مجھے عزّت دے گا، اور پھر میرا بدلہ تم سے اس طرح لیا جائے گا، جس کا تمھیں اس سے پہلے تصور بھی نہ ہوگا۔ یاد رکھو، مجھے قتل کرنے کے بعد خود تمھارے درمیان تفرقہ پڑ جائے گا، خانہ جنگیاں ہوں گی اور آخر کار تمھارا خون بھی بہایا جائے گا، اس کے بعد آخرت کی سزا، وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔''

عصر کا وقت تھا۔امام یادِ حق میں مصروف تھے۔کھڑے ہونے کی قوت جواب دے چکی تھی۔جسم پر تیروں کے سوفار اور سر مبارک زخموں سے خوں بار تھا۔لوگوں کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ وار کریں۔آخر شمر نے شہ دی اور مالک بن نسر، زرعہ بن شریک، سنان بن انس نے باری باری نیزہ وتلوار سے وار کیا اور آپ کا سر تن سے جُدا کر دیا گیا۔

حضرت امامؑ کی شہادت کے بعد خیمے لُوٹے اور جلائے گئے۔اہل بیت اسیر ہوئے۔شہیدوں کے سر مبارک اہل حرم کے ساتھ کوفے سے شام بھیجے گئے۔

آپ نے مختلف اوقات میں متعدد شادیاں کیں۔آپ کی ازواج میں لیلیٰ، شہر بانو، حباب، حرار، سکینہ اور غزالہ تھیں۔آپ کی اولاد میں صرف امام زین العابدین زندہ بچے تھے۔باقی سب لڑ کے میدانِ کربلا میں شہید ہو گئے تھے۔صاحب زادیوں میں سکینہ، فاطمہ اور زینب تھیں۔

آپ سے جو احادیث مروی ہیں، ان کی تعداد صرف آٹھ ہے، کیوں کہ آنحضور ﷺ کے زمانے میں نہایت کم سن تھے۔ البتہ بالواسطہ روایات کی تعداد بہت ہے۔ آپ نے جن بزرگوں سے حدیثیں روایت کی ہیں، ان میں حضرت علیؓ، حضرت فاطمہؓ، ہند بن ابی ہالہؓ، حضرت عمر بن خطابؓ وغیرہم ہیں۔

حمزہؓ بن عبدالمطلب

حمزہ نام، ابو عمارہ کنیت، اسد اللہ لقب۔ آنحضور ﷺ کے حقیقی چچا۔ ان کی والدہ ہالہ بنت وہب آنحضور ﷺ کی والدہ حضرت آمنہ کی چچا زاد بہن تھیں۔ حضرت حمزہؓ آپ ﷺ کے رضاعی بھائی بھی تھے۔ ابولہب کی کنیز حضرت ثوبیہؓ نے دونوں کو دودھ پلایا تھا۔ آنحضور ﷺ سے دو برس بڑے تھے۔ شمشیر زنی، تیر اندازی اور پہلوانی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ سیر و شکار سے بھی غیر معمولی دل چسپی تھی۔

اُن کے قبولِ اسلام کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ یہ اسلام کا وہ زمانہ تھا جب حضور ﷺ بن ارقم کے مکان میں پناہ گزیں تھے۔ ایک روز حسبِ معمول شکار سے واپس آ رہے تھے۔ کوہِ صفا کے پاس پہنچے تو ایک کنیز نے بتایا: ''ابو عمارہ، کاش تھوڑی دیر پہلے تم اپنے بھتیجے محمد ﷺ کا حال دیکھتے۔ وہ خانہ کعبہ میں اپنے مذہب کا وعظ کر رہے تھے کہ ابوجہل نے نہایت سخت گالیاں دیں اور بہت بری طرح ستایا، لیکن محمد ﷺ نے کوئی جواب نہ دیا اور بے بسی اور خاموشی کے ساتھ لوٹ گئے۔'' یہ سننا تھا کہ حمزہؓ کی رگِ حمیت میں جوش آ گیا۔ تیزی سے خانہ کعبہ پہنچ کر ابوجہل کے سر پر اپنی کمان زور سے دے ماری، جس سے وہ زخمی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بنو مخزوم کے چند آدمی ابوجہل کی مدد کے لیے دوڑے اور بولے: ''حمزہ، شاید تم بھی بے دین ہو گئے ہو۔'' فرمایا: ''جب حقانیت مجھ پر ظاہر ہو گئی تو کون مجھے اس سے باز رکھ سکتا ہے۔ ہاں، میں گواہی دیتا ہوں، محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور جو کچھ وہ کہتے ہیں، سب حق ہے۔ خدا کی قسم، اب میں اس سے نہیں پھر سکتا۔ اگر تم سچے ہو تو مجھے روک کر دیکھ لو۔'' ابوجہل نے کہا: ''ابو عمارہ کو چھوڑ دو۔ خدا کی قسم، مَیں نے ابھی اس کے بھتیجے کو سخت گالیاں دی ہیں۔''

حضرت حمزہؓ نے رسولِ کریم ﷺ کی شادی کے لیے حضرت خدیجہؓ کے والد خویلد بن اسد کے ساتھ بات چیت میں حصہ لیا اور اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کے سب سے بہادر حامیوں میں سے ہو گئے۔ ہجرت کے بعد مکہ کی مواخات میں حضرت زید بن حارثہؓ حضرت حمزہؓ کے اسلامی بھائی قرار پائے۔ حضرت حمزہؓ نے غزوات میں شرکت کر کے خوب دادِ شجاعت دی۔ یہودیوں کے قبیلے بنو قینقاع کے خلاف کارروائی میں حصہ لیا اور ساحلِ بحر کی طرف عیص کے مقام پر تیس مہاجروں کے ساتھ ایک مہم کی قیادت کی۔ راستے میں ابوجہل کے ساتھیوں سے ان کی مڈ بھیڑ ہو گئی، لیکن مجدی ابن عمرو الجہنی کی مداخلت کی وجہ سے کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ حضرت حمزہؓ غزوۂ بدر (2 ہجری) میں بڑی بہادری سے لڑے، کئی مشرکین پر مبارزت میں فوقیت حاصل کی، لیکن اگلے سال جب وہ غزوۂ اُحد میں بڑی دلیری سے لڑ رہے تھے، حبشی غلام وحشی نے انھیں شہید کر دیا۔ قریش کے ایک مشرک جبیر بن مطعم نے وحشی نام کے اس غلام کو اپنے چچا طعیمہ بن عدی کے انتقام پر (جسے حضرت حمزہؓ نے قتل کیا تھا) خاص طور پر تیار کیا تھا اور اس صلے میں آزاد کرنے کا لالچ دیا تھا۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر وہ ایک چٹان کے پیچھے گھات لگائے حضرت حمزہؓ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتفاق سے حضرت قریب سے گزرے تو اس نے اچانک عقب سے اپنا حربہ پھینک کر مارا جس سے حضرت دو ٹکڑے ہو کر گر پڑے اور وہیں کے وہیں واصل بحق ہوئے۔ اُن کی شہادت کی خبر سُن کر کفار کی عورتوں نے خوشی و مسرت کے ترانے گائے۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے ناک کان کاٹ کر زیور بنائے۔ نیز وحشیانہ طور پر پیٹ چاک کر کے جگر نکالا اور چبا چبا کر تھوک دیا۔ یہ واضح طور پر زمانہ جاہلیت کی عداوت کا اعادہ تھا۔

آنحضور ﷺ اِن جنگ میں اپنے چچا کی لاش پر تشریف لائے۔ اور لاش سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''تم پر خدا کی رحمت ہو، کیوں کہ تم رشتہ داروں کا سب سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ نیک کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔'' میدانِ اُحد میں حضرت حمزہؓ کی قبر آج تک زیارت گاہ عام و خاص ہے۔

حضرت حمزہؓ نے متعدد شادیاں کیں، لیکن سلسلۂ نسب شروع ہی میں منقطع ہو گیا۔

حنظلہؓ بن ابی عامر

حنظلہ نام، غسیل الملائکہ، قبیلہ اوس سے تعلق ہے۔ ان کا باپ ابو عامر قبیلہ اوس میں نہایت شریف اور بااثر شخص تھا۔ مذہبی جذبے کے تحت راہب بن گیا تھا۔ جب آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے اور مدینہ میں خلافت الٰہی کی بنیاد ڈالی گئی تو ابو عامر بھی جوشِ حسد میں ان کے ساتھ آیا۔ آنحضور ﷺ نے اس کے لیے ''فاسق'' کا لقب تجویز کیا، جس سے تاریخ اسلام میں وہ اب تک مشہور ہے۔ غزوۂ اُحد کے بعد پھر مکہ گیا اور وہیں مقیم رہا۔ 8 ہجری میں فتح مکہ کے بعد یہ زمین بھی اس پر تنگ ہو گئی تو مکہ سے نکل کر روم پہنچا اور ہرقل کے دامن میں پناہ لی اور اسی جگہ ایک دو سال کے بعد مر گیا۔

باپ کی شدتِ کفر کا تو یہ عالم تھا، اور اس کے بیٹے حنظلہ کی حرارت ایمانی کا یہ حال تھا کہ اسلام قبول کیا اور آنحضور ﷺ سے عرض کیا کہ حکم ہو تو اپنے باپ کا خاتمہ کر دوں، لیکن آنحضور ﷺ نے منظور نہیں کیا۔ عبداللہ بن ابی منافق کے فرزند حضرت عبداللہؓ نے بھی یہی درخواست کی تھی، انھیں بھی یہی جواب عنایت ہوا۔

غزوۂ بدر میں شریک نہ تھے۔ اُحد میں شرکت کی، جو ان کے لیے پہلا اور آخری غزوہ ثابت ہوا۔ بیوی سے ہم بستر تھے کہ نفیرِ عام سنی۔ اُسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے۔ غسلِ جنابت تک یاد نہ رہا۔ شمشیر بکف میدان میں پہنچے۔ ابوسفیان سے مقابلہ ہوا۔ اسے اٹھا کر دے مارنا چاہتے تھے کہ کام تمام کر دیں کہ شداد بن اسود لیثی (ابن شعوب) نے دیکھ لیا۔ جھپٹ کر بڑھا اور ایسا وار کیا کہ حنظلہ کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا۔ چوں کہ حالتِ جنابت میں شہید ہوئے تھے، انھیں ملائکہ نے غسل دیا۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کی بیوی سے دریافت کرو۔ بات کیا تھی۔ بیوی نے واقعہ بیان کیا۔ فرمایا، اسی وجہ سے فرشتے غسل دے رہے تھے۔ ''غسیل الملائکہ'' کا لقب اسی

وجہ سے اُن کو حاصل ہوا۔

خارجہؓ بن زید انصاری

خارجہ نام۔ قبیلہ خزرج سے ہیں۔ عقبہ میں بیعت کی۔ ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ نے مدینہ آ کر انھی کے ہاں قیام کیا تھا اور انھی سے مواخات ہوئی۔ غزوۂ بدر میں شریک تھے اور کئی آدمیوں کے ساتھ مل کر اُمیہ بن خلف کو مارا تھا۔ اُمیہ کے بیٹے صفوان نے اپنے باپ کے قاتلوں کو تاڑ لیا تھا۔ چنانچہ دوسرے سال غزوۂ اُحد ہوا تو اس نے انتقام کے لیے حضرت خارجہؓ پر شدید حملہ کیا۔ حضرت خارجہؓ دس سے زیادہ نیزوں کے زخم کھا کر زمین پر گر پڑے۔ صفوان نے ناک، کان اور دیگر اعضا کاٹ ڈالے اور کہا کہ اب میرا کلیجا ٹھنڈا ہوا۔ میرے ماں باپ کے عوض محمد ﷺ کے بڑے بڑے بہادر کام آئے۔ ان کے بھتیجے سعد بن ربیع بھی اس معرکے میں دادِ شجاعت دے کر شہید ہوئے تھے۔ چچا بھتیجے دونوں ایک قبر میں دفن کیے گئے۔ دو اولادیں چھوڑیں۔ ایک زید، جنھوں نے حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا۔ دوسری حبیبہؓ جو حضرت ابوبکرؓ سے منسوب تھیں۔ اُمِ کلثوم بنت ابی بکر انھی کے بطن سے تولد ہوئیں۔ اس بنا پر حضرت خارجہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اسلامی بھائی ہونے کے ساتھ خُسر بھی تھے۔

خالدؓ بن سعید بن العاص

خالد نام، ابو سعید کنیت۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: خالد بن سعید بن العاص بن اُمیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی قرشی اموی۔ ننھیالی رشتہ بنو ثقیف سے تھا۔

حضرت خالدؓ نے اس وقت اسلام قبول کیا جب مسلمانوں کی تعداد بہت قلیل تھی۔ قبول اسلام کا واقعہ قابل ذکر ہے۔ دعوتِ اسلام کے ابتدائی زمانے میں انھوں نے خواب دیکھا، جیسے یہ خود ایک آتشیں غار کے دہانے پر کھڑے ہیں اور ان کے والد انھیں اس میں دھکیل رہے ہیں، محمد ﷺ بن عبداللہ نے حضرت خالدؓ کا گریبان مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے اور انھیں غار میں گرنے سے بچا رہے ہیں۔ اس خواب پریشان کی وجہ سے اِن کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے یہ خواب حضرت ابوبکرؓ سے بیان کیا۔ وہ انھیں ہم راہ لے کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے دین اسلام کی دعوت دی اور اس دین کی حقانیت ان پر واضح کرنے کی کوشش کی۔ اسلامی تعلیمات سن کر انھوں نے اللہ کی توحید اور آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق دل کے ساتھ زبان سے بھی کر دی۔

اسلام لانے کے بعد گھر والوں سے چُھپ کر دعوت اسلام میں مصروف ہو گئے۔ ان کے والد ابواحیحہ بڑے جابر اور سخت گیر تھے۔ اہل مکہ نے انھیں ''ذوالتاج'' (تاج والے) کا خطاب دے رکھا تھا، اور جس کی دستار کی یہ شان تھی کہ کوئی دوسرا اس رنگ کی دستار اپنے سر پر نہیں رکھ سکتا تھا۔ انھیں اپنے بیٹے خالد کے کرتوت کا علم ہوا تو انھوں نے ان کے بھائیوں کو پکڑ کر لانے کے لیے بھیجا۔ وہ گرفتار کر کے لائے تو اسلام ترک کرنے کا مطالبہ ہوا، یہاں جواب صاف تھا کہ جان جائے لیکن دین محمدی ﷺ نہیں چُھوٹ سکتا۔ اس جواب پر پہلے زجر و توبیخ شروع ہوئی۔ جب یہ بے اثر ثابت ہوئی تو زدوکوب کی نوبت آئی۔ اس بے دردی سے مارے گئے کہ لکڑی سر پر پڑتے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ جب مارتے مارتے تھک گئے تو پھر باز پرس شروع ہوئی کہ تم نے محمد ﷺ کی حرکتوں کو جانتے ہوئے ان کا ساتھ کیوں دیا؟ تم دیکھ رہے ہو کہ وہ پوری قوم کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کے معبودوں اور ان کے آباؤ اجداد کو برا بھلا کہتے ہیں، پھر بھی تم ان کی ہم نوائی کرتے ہو۔ مگر اس جسمانی مار پیٹ کے بعد بھی حضرت خالدؓ کی زبان سے نکلا: ''خدا کی قسم! جو کچھ وہ کہتے ہیں، سچ کہتے ہیں، اور اس میں مَیں اُن کے ساتھ ہوں۔'' جب سنگ دل باپ ہر طرح سے تھک گیا تو عاجز ہو کر قید کر کے کھانا پینا بند کر دیا اور لوگوں کو منع کر دیا کہ کوئی شخص ان سے گفتگو نہ کرے۔ چنانچہ یہ تین دن تک بھوکے پیاسے قید تنہائی جھیلتے رہے۔ چوتھے دن موقع پا کر بھاگ نکلے اور اطرافِ مکہ میں رُوپوش ہو گئے۔

جب مسلمانوں کا دوسرا قافلہ ہجرت کر کے حبشہ جانے لگا تو یہ بھی اپنی بیوی امیمہ (یا ہمینہ) اور بھائی عمرو کو ساتھ لے کر حبشہ چلے گئے۔ یہیں ان کے صاحب زادے سعید اور صاحب زادی اُمِ خالد پیدا ہوئیں۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر حبشہ سے مدینہ آئے۔ حضرت خالد اگرچہ اس میں شریک نہیں ہوئے تھے، لیکن آنحضور ﷺ نے مالِ غنیمت میں ان کا حصّہ بھی لگایا۔ اس کے بعد عمرۃ القضا، فتح مکہ، غزوۂ حنین، طائف اور تبوک وغیرہ سب میں آنحضور ﷺ کے ہم رکاب رہے۔ مدینہ آنے کے بعد سے آنحضور ﷺ نے مراسلات کا عہدہ ان کے سپرد کر دیا تھا اور وہ تحریری نامہ و پیام کی خدمت انجام دیتے تھے۔ 9ہجری میں بنوثقیف کا جو وفد آیا تھا، اس کے اور آنحضور ﷺ کے درمیان گفتگو کی خدمت انھوں نے ہی انجام دی تھی، اور وفد کے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد معاہدہ بھی انھوں نے ہی تحریر کیا تھا۔

خالدؓ کے دونوں بڑے بھائیوں نے بھی، جو انھیں پکڑ کر اپنے باپ کے پاس لائے تھے، بعدازاں اسلام قبول کر لیا تھا۔ تینوں بھائیوں میں نظم و نسق کی بہت صلاحیت تھی، اس لیے آنحضور ﷺ نے تینوں بھائیوں کو حکومت کے عہدوں پر ممتاز کیا تھا۔ ابان بن سعید کو بحرین پر، عمرو بن سعید کو تیما پر اور خالدؓ کو یمن پر مامور کیا۔ یہ تینوں تاحیات نبوی ﷺ خوش اسلوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ ﷺ کی رحلت کی خبر سن کر یمن سے واپس آئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دوبارہ بھیجنا چاہا اور فرمایا کہ تم لوگ آنحضور ﷺ کے مقرر کردہ عامل ہو، تم سے زیادہ کون اس عہدے کا مستحق ہو سکتا ہے، لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ ہم آنحضرت ﷺ کے بعد کسی کے عامل نہ بنیں گے۔

حضرت خالدؓ کو ابتدا میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت سے اختلاف رہا۔ چنانچہ دو مہینے تک بیعت نہ کی۔ اور حضرت علیؓ اور عثمانؓ سے جا کر کہا کہ آپ لوگوں نے غیروں کی خلافت کس طرح ٹھنڈے دل سے قبول کر لی۔ حضرت ابوبکرؓ تو خاموش رہے، لیکن حضرت عمرؓ بہت برہم ہوئے۔ مگر پھر خالدؓ نے دو مہینے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے

حسن کردار واخلاق سے متاثر ہو کر بیعت کر لی۔

عہد صدیقیؓ میں فتنۂ ارتداد کی روک تھام میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ رومیوں کے خلاف شام کی فوج کشی میں شرکت کی۔ تیما کی امدادی فوج کے ایک دستے کے امیر بنائے گئے۔ باہان بطریق رومی سے جنگ آزمائی کی۔ جنگ فحل اور جنگ دمشق میں بڑی جاں بازی دکھائی۔ فحل کی مہم کے بعد اسلامی فوج نے مرج صفر کا رُخ کیا۔ اسی دوران میں حضرت خالدؓ نے اُمِ حکیم سے عقد کر لیا اور مرج صفر پہنچ کر بیوی سے ملنے کا قصد کیا۔ بیوی نے کہا، اس معرکے کے بعد اطمینان سے ملنا زیادہ بہتر ہے۔ اُنھوں نے جواب دیا، میرا دل کہتا ہے کہ اس لڑائی میں جام شہادت پیوں گا۔ غرض مرج صفر ہی میں بیوی سے ملاقات کی اور صبح کو دعوت ولیمہ کی۔ ابھی لوگ کھانے سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ رومی سپاہی میدان میں آ گئے۔ ایک رومی نے مبارزت طلبی کی۔ خالدؓ مقابلے کے لیے نکلے اور نکلتے ہی شہید ہو گئے۔ اُن کی عروس کا یہ سبق آموز واقعہ قابل ذکر ہے کہ آہ وزاری اور سوگ کے بجائے شوہر کے خون کا انتقام لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اور مردوں کے دوش بدوش لڑ کر سات رومیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

پہلی بیوی امیمہ (یا ہمینہ) کے بطن سے ایک بیٹا اور ایک بیٹی اُمّہ تولد ہوئے۔ بیٹے سعید حضرت خالدؓ کی زندگی میں باہان بطریق رومی سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اُمّہ حضرت زبیر بن عوامؓ سے بیاہی تھیں۔

خالد بن ولیدؓ

خالد بن ولید بن مغیرہ بن عبداللہ بن عمر بن مخزوم القرشی۔ اُن کی کنیت ابوسلیمان اور ابوالولید اور لقب سیف اللہ تھا۔ سلسلہ ءنسب ساتویں پشت میں حضرت ابوبکرؓ اور رسول کریمؐ سے جا ملتا ہے۔ ان کی والدہ لُبابہ صُغریٰ بنت حارث تھیں جو اُم المومنین حضرت میمونہ بنت حارث اور لبابہ کُبریٰ والدہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ہم شیر تھیں۔ اُن کے والد ولید بن مغیرہ قریش کے شرفا اور سرداروں میں سے تھے اور مکہ کے بڑے دولت مندوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ قبیلہ قریش کی مذہبی قیادت بنو ہاشم اور بنو عبدالدار کے ہاتھ میں، سیاسی قیادت بنو اُمیہ کے اور عسکری قیادت حضرت خالدؓ کے قبیلے بنو مخزوم کے پاس تھی۔ لشکری قوت کے دو منصب القبہ (قریش میں دستور تھا کہ جنگ کے لیے تیاری کے وقت ایک خیمہ لگایا جاتا، جس میں ہر شخص بقدر توفیق سامان حرب لا کر جمع کرتا تھا) اور الاعنہ (شاہ سوار فوجی دستہ) کی ذمہ داری اور قیادت کا شرف بھی اسی قبیلے کے حصے میں آیا تھا۔ حضرت خالدؓ کو یہ منصب ورثے میں ملے تھے۔ وہ شروع ہی سے بڑے محنتی، جفاکش اور سخت کوش واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کے والد مکے کے امیر ترین آدمی تھے اور انھوں نے خوش حال گھرانے میں ناز ونعمت کے ساتھ پرورش پائی تھی، لیکن انھوں نے راحت وآرام کی گم نام زندگی کے بجائے ہمت وجواں مردی کی حیات دوام کو ترجیح دی۔ چنانچہ کشتی اور فنون حرب میں کمال حاصل کرنے کو اپنا مطمح نظر بنا لیا اور یوں خالدؓ نے ''سیف اللہ'' کی حیثیت سے شہرت عام اور بقائے دوام حاصل کر لی۔

جب اسلام کا ظہور ہوا تو خالدؓ قبیلہ قریش کے ان لوگوں میں سے تھے، جنھوں نے پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کی شدید عداوت ومخالفت کو اپنا شیوہ بنایا۔ صلح حدیبیہ تک کفارِ مکہ نے اہل اسلام کے خلاف جتنی جنگیں لڑیں، ان میں وہ شریک تھے۔ جنگ اُحد میں ان کا سپاہیانہ کردار اسلام کی حربی تاریخ میں ایک اہم واقعہ ہے۔ اس جنگ میں وہ قریش مکہ کے شاہ سوار دستے کی قیادت کر رہے تھے۔ مسلمانوں کے ایک گروہ نے آنحضرت ﷺ کے حکم کے باوجود پہاڑی درے کے نہایت اہم فوجی مقام کو چھوڑ دیا۔ خالدؓ نے اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے عقب سے آکر لشکر اسلام پر حملہ کر دیا، جس سے جنگ کا پاسا پلٹ گیا۔ اس کے بعد غزوۂ خندق کے موقع پر بھی وہ لشکر کفار کے شاہ سوار دستے کی قیادت کر رہے تھے اور اہل اسلام کو ضرر پہنچانے کے لیے عمرو بن العاص کے ساتھ مل کر مختلف منصوبے بناتے رہے، مگر ناکام ہوئے۔ پھر حدیبیہ کے موقع پر وہ ایک شاہ سوار دستہ لے کر مسلمانوں کے خلاف نکلے۔ خالدؓ رسول کریم ﷺ کے عسکری نظم وضبط اور دفاعی حکمت وتدبر سے اتنے متاثر ہوئے کہ پیغمبر اسلام کی شخصیت ان کے دل میں گھر کر گئی جو بعد میں اسلام قبول کرنے کا نقطۂ آغاز ثابت ہوئی۔

عمرۃ القضاء کے موقع پر جب رسول اللہ اپنے صحابہ کرام کے ہم راہ مکے میں داخل ہوئے تو خالد بن ولید بھی ان لوگوں میں شامل ہو گئے جو اہل اسلام کے منظر کی تاب نہ لاتے ہوئے مکے سے باہر چلے گئے تھے۔ حضرت خالدؓ کے ایک بھائی حضرت ولیدؓ بن ولید مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔ عمرۃ القضاء کے موقع پر رسول کریم ﷺ نے ان سے خالد کے باہر چلے جانے پر افسوس کا اظہار کیا اور ان کے قبول اسلام کے لیے دُعا فرمائی۔ چنانچہ ولید نے اپنے بھائی کو دعوتِ اسلام دی۔ عظمت رسول ﷺ تو ان کے دل میں پہلے ہی گھر کر چکی تھی، اس لیے اپنے ایک ساتھی حضرت عثمانؓ بن طلحہ سے مشورہ کیا اور دونوں تلاش حق کے لیے مکے سے نکل کر مدینے کی راہ پر چل پڑے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نجاشی شاہ حبشہ کے ہاں سے صداقت اسلام کا یقین کر کے راہ یثرب پر جا رہے تھے۔ راستے میں حضرت خالدؓ اور حضرت عثمانؓ سے ملاقات ہو گئی اور تینوں ایک ساتھ حلقہ بگوش اسلام ہونے کے لیے چل پڑے۔ رسول اللہ نے ان تینوں کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور صحابہ کرام سے فرمایا: "رَمَتْكُم مَكّةُ بِأَفلاذِ كَبِدِها" (مکہ نے اپنے جگر گوشے تمھاری جانب پھینک دیے ہیں) سب سے پہلے حضرت خالدؓ نے آپ ﷺ سے بیعت کی اور بعد میں دوسرے ساتھیوں نے کلمہ شہادت پڑھا اور دست رسول ﷺ پر بیعت سے سرفراز ہوئے۔

قبول اسلام کے بعد حضرت خالدؓ نے عہد نبوت، عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں مختلف معرکوں میں لشکر اسلام کی قیادت کی اور شان دار جنگی کارنامے انجام دیے۔ جمادی الاول 8 ہجری میں غزوۂ موتہ میں آپ نے شرکت کی اور یکے بعد دیگرے تین سپہ سالاروں (حضرت زیدؓ بن حارثہ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت جعفر طیارؓ) کی شہادت پر لشکر اسلام کی قیادت سنبھالی۔ اس موقع پر پہلی بار حضرت خالدؓ کی جنگی

مہارت وصلاحیت اسلام کے کام آئی۔ وہ اعلیٰ ترین جنگی قیادت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف گھرے ہوئے مسلمان مجاہدوں کو دشمن کے نرغے سے نکال لائے، بلکہ رومیوں پر کاری ضربیں لگا کر ان کے دلوں میں اسلام کی عسکری قوت و برتری کا رعب بھی ڈال دیا۔ حضرت خالدؓ فرمایا کرتے تھے کہ غزوۂ موتہ میں نو تلواریں میرے ہاتھ میں ٹوٹ گئیں اور بالآخر ایک یمنی تلوار ہی باقی رہ گئی تھی۔

دس رمضان 9ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر حضرت خالدؓ عساکر نبوت میں شامل تھے۔ میمنہ کی قیادت آپ کے سپرد تھی۔ فتح مکہ کے بعد پانچویں روز رسول اللہ نے انھیں وادی نخلہ میں العزیٰ نامی بت کو مسمار کرنے کے لیے بھیجا اور وہاں سے فراغت کے بعد بنو جذیمہ کی تادیب کے لیے روانہ کیے گئے۔ غزوۂ حنین اور غزوۂ طائف کے موقع پر بھی آپ لشکر اسلام کے مقدمۃ الجیش کی قیادت کر رہے تھے جو سو شاہ سواروں پر مشتمل تھا۔ بنو مصطلق کی تادیب واصلاح کے لیے جو لشکر روانہ کیا گیا، اُس کی قیادت بھی حضرت خالدؓ کے سپرد تھی۔ ربیع الآخر 10ہجری میں آنحضور ﷺ نے انھیں اہل نجران کی جانب روانہ کیا۔ حضرت خالدؓ نے انھیں اسلام کی دعوت دی جسے انھوں نے بخوشی قبول کیا اور ان کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں حضرت خالدؓ نے داخلی اور خارجی محاذ پر جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، وہ بلاشبہ اسلامی تاریخ میں ایک سنہری باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلے جزیرہ عرب کے سرکش مُرتدین کے خلاف اور پھر روم و ایران کے مقابلے میں انھوں نے حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے۔ مُرتدین کے خلاف حضرت ابوبکرؓ نے جو افواج روانہ فرمائیں، ان میں سے ایک فوج کی قیادت حضرت خالدؓ کے سپرد فرمائی۔ اس فوج نے جھوٹے مدعی نبوت طلیحہ اسدی اور مالک بن نویرہ الیربوعی کی سرکوبی میں شان دار کامیابیاں حاصل کیں۔ طلیحہ بھاگ گیا اور مالک قتل ہوا۔ مالک کے قتل اور اس کے قبیلے کی سرکوبی کے بعد حضرت خالدؓ کو صفائی کے لیے مدینے طلب کیا گیا۔ خلیفۂ وقت نے انھیں بری الذمہ قرار دیا اور وہ مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ کے لیے روانہ کر دیئے گئے۔ شدید جنگ کے بعد مسیلمہ قتل ہو گیا اور اس کی قوم بنو حنیفہ داخل اسلام ہو گئی۔ مسیلمہ کذاب کا قتل دراصل حروب ارتداد کا خاتمہ تھا اور یوں خالدؓ کے ہاتھوں خلافت اسلامیہ کو ایک ہولناک داخلی فتنے سے مکمل نجات مل گئی۔

اسلام کی ابھرتی ہوئی نئی طاقت کو دو اطراف سے بیرونی خطرات بھی درپیش تھے۔ ایک طرف تو ایرانی شہنشاہیت اس بات کے لیے تیار نہ تھی کہ اسلام کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود جاہل بدو قوم اس کے مستقبل کے لیے خطرہ بن جائے۔ دوسری طرف سلطنت رومۃ الکبریٰ کو اپنا استعماری تسلط خطرے میں نظر آ رہا تھا۔ سلطنت روما عہد رسالت ﷺ میں بھی مسلمان مجاہدین سے ٹکر لے چکی تھی۔ داخلی فتنوں کو کچلنے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے جہاں رومیوں کے مقابلے میں شام و عراق میں افواج روانہ کیں وہاں حضرت خالد بن ولیدؓ کا رخ ایرانی سرکشوں کی طرف موڑ دیا۔

اُبلہ کے مقام پر ایرانی فوج اور مجاہدین اسلام کے درمیان حضرت خالدؓ کی قیادت میں سب سے پہلا معرکہ بپا ہوا، جس میں لشکر اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ اس کے بعد دوسرے مقامات پر مقابلے میں خالدؓ کے ہاتھوں شکست ہوئی جو حیرہ کی فتح کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ حیرہ کو مستحکم کرنے کے بعد عین التمر، دومۃ الجندل، حصید، خنافس، مصیخ، زمیل اور فراض کے معرکے سر کرتے ہوئے فاتحانہ آگے بڑھتے چلے گئے۔ فراض کی فتح کے بعد خالدؓ اپنے لشکر کو بتائے بغیر برق رفتاری سے فریضہ حج ادا کر کے واپس آ گئے۔ وہ ایک سال دو ماہ (محرم 12ھ سے صفر 13ھ تک) عراق میں رہے اور پندرہ جنگیں لڑیں اور سب میں فتح یاب ہوئے۔ یہاں سے انھیں تمام امرائے لشکر نے قائد اعلیٰ منتخب کیا اور رومی شہنشاہیت کے خلاف مجاہدین اسلام کے فیصلہ کن معرکہ سر کیا۔ اسی جنگ کے دوران میں حضرت خالدؓ کو دربار فاروقی سے معزولی کا حکم ملا، لیکن کسی قسم کے ملال کا اظہار کیے بغیر امین الامت حضرت ابوعبیدہؓ کی قیادت میں شریک جہاد رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں وہ فتوح الشام میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک جہاد رہے اور دمشق کے علاوہ فحل، مرج الروم، حمص، حاضر، قنسرین اور مرعش وغیرہ فتح ہوئے۔

حضرت خالدؓ کی زندگی کے دو واقعات بڑے اہم اور نازک ہیں، اس لیے گہری توجہ کے مستحق ہیں۔ ان میں سے ایک مالک بن نویرہ یربوعی کا قتل ہے اور دوسرا اسلامی لشکر کی قیادت سے معزولی ہے۔ پہلے واقعے کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ مالک کا قتل بنو یربوع کے قیدیوں کے بارے میں حضرت خالدؓ کے ایک حکم کے الفاظ کو غلط سمجھنے کے باعث ہوا۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ مالک کا قتل حضرت خالدؓ سے بدکلامی اور شان رسالت ﷺ میں گستاخانہ گفتگو کے نتیجے میں ہوا اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ مالک دوران گفتگو میں آنحضور ﷺ کے بارے میں "صَاحِبُکَ" کے الفاظ بار بار دُہرا کر اپنے آپ کو رسول کریم ﷺ سے لاتعلق ظاہر کرتا رہا، جس پر خالد نے اسے قتل کرا دیا۔ علاوہ ازیں وہ صدقے کا مال لوٹ چکا تھا اور لوگوں کو ارتداد و بغاوت پر اکساتا رہتا تھا۔ پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ حضرت ابوبکرؓ جیسی عظیم ہستی نے انھیں بری الذمہ قرار دے دیا تھا اور فرمایا تھا کہ مالک کا قتل خالدؓ کی اجتہادی غلطی ہے۔

جہاں تک معزولی کا تعلق ہے تو اس کا سبب بھی کوئی ذاتی عداوت یا انتقام نہ تھا، بلکہ دینی و ملی مصلحت پیش نظر تھی۔ حضرت خالدؓ کا خیال تھا کہ عمال و قائدین کو بعض معاملات میں کلی اختیار و اقتدار حاصل ہونا چاہیے، ہر بات میں خلیفۂ وقت سے مشورہ ضروری نہیں۔ اس کے علاوہ مسلسل فتوحات کے باعث سپاہی ان پر فریفتہ ہو گئے تھے اور سمجھنے لگے تھے کہ ان کے جھنڈے تلے جہاد میں شرکت فتح و نصرت کی ضمانت ہے۔ یہ چیز بلاشبہ ایک فتنہ و آزمائش کا باعث بن سکتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں معزول کر کے اس کا سد باب کرنا چاہا اور یہ بتایا کہ اسلام کی فتح دراصل اللہ کی مشیت و نصرت پر موقوف ہے، نہ کہ کسی کی محض تدبیر اور قوت بازو پر چنانچہ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے جو گشتی مراسلہ مختلف شہروں میں ارسال کیا، اس میں اس بات کی صراحت کر دی تھی کہ

خالدؓ کو کسی ناراضی یا انتقام کی وجہ سے نہیں، بلکہ فتنے سے بچنے کے لیے معزول کیا گیا۔

جنگی مہارت وصلاحیت کے سلسلے میں حضرت خالدؓ بن ولید کو دنیا کے تمام سوانح نگاروں اور مورخوں نے خراج تحسین ادا کیا ہے۔ ان کے جنگی کارنامے اور عسکری تدابیر نہ صرف اسلام کی حربی تاریخ، بلکہ دنیا کے عسکری قائدین اور ماہرین فنون کے سوانح کا ایک سنہرا اور قابل مطالعہ باب ہے۔ وہ اگرچہ فنون حرب کی کسی باقاعدہ درس گاہ کے تربیت یافتہ نہ تھے، مگر میدانِ جنگ میں ان کی مہارت، تدبیر اور صف آرائی پر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ عسکری قائدانہ اوصاف میں سے کوئی وصف ایسا نہ ہوگا جو حضرت خالدؓ میں نہ ہو۔ شجاعت، جواں مردی، حاضر دماغی، پھرتی اور قوت تاثیر میں لاثانی تھے اور دم کے دم میں جنگ کا پانسا پلٹ دینا اُن کے لیے ایک کھیل تھا۔

حضرت خالدؓ کی وفات 21 ہجری 642ء میں ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ساٹھ سال تھی۔ بعض روایات کی رو سے آپ حمص میں فوت ہوئے اور بعض کے نزدیک مدینہ منورہ میں۔ وفات کے وقت حضرت خالدؓ نے فرمایا: ''میں نے تقریباً تین سو جنگیں لڑی ہیں۔ میرے جسم کے ہر حصے میں کہیں تلوار، کہیں نیزے اور کہیں تیر کا زخم لگا ہے، مگر شہادت سے محروم رہا اور آج بستر پر مر رہا ہوں۔ خدا بزدلوں کو کبھی چین نصیب نہ کرے۔'' مرتے وقت آپ نے وصیت فرمائی کہ میرا اسلحہ اور سواری کا گھوڑا اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے وقف کر دیا جائے اور یہی ان کا سارا اثاثہ تھا: ایک غلام، ایک گھوڑا اور اسلحہ۔ حضرت خالدؓ کو رسول کریم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ خالدؓ کو اذیت نہ دینا، کیوں کہ وہ تو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہے، جسے اس نے کفار کے خلاف میان سے نکالا ہے، اور بقول عباس محمود العقاد: ''خالد اسلام میں داخل ہوئے تو عربوں کی قائدانہ حمیت کا حصہ وافر لے کر۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے اسلام کے لیے محیر العقول کارنامے انجام دینے کا سامان پیدا کیا۔ وہ جاہلیت واسلام دونوں زمانوں میں عربی عبقریت کا معیاری نمونہ تھے۔ (ڈاکٹر ظہور احمد اظہر)

خبابؓ بن ارت

خباب نام، ابو عبداللہ کنیت، قبیلہ بنو تمیم سے تعلق ہے۔ معلوم نہیں، زمانہ جاہلیت میں ان کے خاندان پر کیا افتاد پڑی کہ وہ غلام بنا کر مکہ میں فروخت کیے گئے۔ جناب طالب ہاشمی کی تحقیق کے مطابق وہ ام انمار بنت سباع خزاعیہ کے غلام تھے۔ مکہ پہنچ کر انھوں نے آہن گری کا پیشہ اختیار کیا اور تلوار بنا بنا کر فروخت کرنے لگے۔ اس طرح معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ انھوں نے دعوت اسلام کے بالکل ابتدائی زمانے میں زید بن ارقم کے گھر میں آنحضور ﷺ کے پناہ گزیں ہونے سے قبل اسلام قبول کیا۔ اس وقت تک صرف پانچ ہستیوں نے اسلام قبول کیا تھا (حضرت خدیجہؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت علیؓ، حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ)۔ اسلام لانے والوں میں خبابؓ کا چھٹا نمبر ہے، اسی لیے ''سادس الاسلام'' کہلاتے ہیں۔

اس زمانے میں اسلام کا اظہار ایسا شدید جرم تھا جس کی سزا میں مال و دولت، ننگ وناموس ہر چیز سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ خبابؓ تو غلام تھے، ان کا کوئی بھی حامی و مددگار نہ تھا، اس لیے کفار نے انھیں مشق ستم بنا لیا۔ انھیں بڑی دردناک سزائیں دیتے تھے۔ ننگی پیٹھ دہکتے انگاروں پر لٹا کر سینے پر ایک بھاری پتھر رکھ کر ایک آدمی اوپر سے مسلتا اور وہ اس وقت تک ان انگاروں پر کباب ہوتے رہتے، جب تک خود زخموں کی رطوبت آگ کو نہ بجھاتی، لیکن اس سختی کے باوجود زبان کلمۂ حق سے نہ پھرتی۔ رحمت للعالمین ﷺ اس کس مپرسی کی حالت میں تالیف قلب فرماتے تھے، لیکن ان کی مالک، اُم انمار اس قدر سنگ دل تھی کہ لوہا آگ میں تپا کر ان کا سر داغا گیا۔

ایک دن خبابؓ فریاد لے کر سرور کونین ﷺ کی خدمت میں پہنچے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور ﷺ اس وقت کعبے کی دیوار کے سائے میں چادر سر کے نیچے رکھے لیٹے ہوئے تھے۔ خبابؓ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ، آپ اللہ پاک سے ہمارے لیے دعا کیوں نہیں کرتے؟'' یہ سن کر حضور ﷺ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ کا چہرۂ اقدس سرخ ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے گزشتہ زمانے میں ایسے لوگ بھی ہوئے ہیں کہ لوہے کی کنگھیوں سے ان کا گوشت نوچ ڈالا گیا۔ سوائے ہڈیوں اور پٹھوں کے کچھ نہ چھوڑا گیا۔ ایسی سختیوں نے بھی ان کا دین پر اعتقاد متزلزل نہ کیا۔ ان کے سروں پر آرے چلائے گئے۔ چیر کر بیچ میں دو کر دیئے گئے۔ تاہم دین نہ چھوڑا۔ اللہ اس دین کو ضرور کامیاب کرے گا اور تم دیکھ لو گے کہ اکیلا سوار صنعا (یمن) سے حضر موت تک جائے گا اور سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈرے گا۔''

حضور ﷺ کے ارشاد سن کر حضرت خبابؓ کا حوصلہ دو چند ہو گیا اور وہ خاموشی سے اپنے گھر چلے گئے۔ جب ام انمار کی دی ہوئی سخت جسمانی سزا سے بھی آتش انتقام سرد نہ پڑی تو انھیں مالی نقصان پہنچانے کے لیے عہد شکنی سے بھی دریغ نہ کیا۔ مشہور مشرک عاص بن وائل کو حضرت خبابؓ کا کچھ قرض دینا تھا۔ یہ جب تقاضا کرتے تو وہ کہتا ''جب تک تم محمد ﷺ کا دین ترک نہ کرو گے، ایک کوڑی بھی نہ دوں گا۔'' خبابؓ فرماتے: ''جب تک تم دوبارہ زندہ ہو کر اس دنیا میں نہ آؤ گے، میں محمد ﷺ کا دامن نہیں چھوڑ سکتا۔''

عاص استہزائیہ انداز میں کہتا: ''اچھا میں مر کر پھر زندہ ہوں گا اور مجھے مال اور اولاد ملے گی۔ اس وقت تمھارا قرض دوں گا'' یہ دراصل مسلمانوں کے عقیدۂ آخرت پر طنز تھی۔ اس واقعے پر سورہ مریم کی آیات 77 تا 80 نازل ہوئیں (ترجمہ): ''(اے محمد ﷺ) پھر تو نے دیکھا اس شخص کو جو ہماری آیات کو ماننے سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تو مال اور اولاد سے نوازا ہی جاتا رہوں گا۔ کیا اُسے غیب کا پتا چل گیا ہے یا اس نے رحمان سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ ہرگز نہیں، جو کچھ یہ بکتا ہے، اُسے ہم لکھ لیں گے اور اس کے لیے سزا میں اور زیادہ اضافہ کریں گے۔''

خبابؓ ہجرت تک صبر واستقلال کے ساتھ یہ مصائب برداشت کرتے رہے۔ ہجرت کے بعد مدینہ میں آنحضور ﷺ نے خراش بن صمہ غلام تمیم سے مواخات کرا دی۔ شروع سے آخر تک تمام غزوات میں شریک رہے۔ کوفہ میں 37 ہجری میں

علالت کی وجہ سے وفات پائی۔ حضرت علیؓ جنگ صفین سے واپس ہو رہے تھے کہ حبابؓ کی وفات کی اطلاع ملی۔ چنانچہ آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ وفات کے وقت 72 سال کی عمر تھی۔ ان کی مرویات کی مجموعی تعداد 33 ہے۔ ان میں سے 3 متفق علیہ ہیں اور 2 میں امام بخاری اور ایک میں مسلم منفرد ہیں۔

خبابؓ مولیٰ عتبہ

خبابؓ نام، ابو یحییٰ کنیت۔ بنو نوفل بن عبد مناف کے حلیف اور مشہور صحابی حضرت عتبہؓ بن غزوان کے غلام تھے۔ اُن کے قبول اسلام کا زمانہ متعین نہیں، لیکن قیاس ہے کہ اپنے آقا حضرت عتبہؓ کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئے ہوں گے۔ انھی کے ساتھ انھوں نے ہجرت کی۔ آنحضور ﷺ نے ان میں اور تمیم کے غلام خراش ابن صمہ میں مواخاۃ کرادی۔ مدینہ آنے کے بعد غزوۂ بدر، اُحد، خندق اور دوسرے غزوات میں دادِ شجاعت دی۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں 19 ہجری میں مدینہ میں وفات پائی۔

خبیبؓ بن عدی انصاری

خبیب نام، قبیلہ اوس سے تعلق ہے۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئے۔ غزوۂ بدر میں شریک تھے اور مجاہدین کے اسباب و سامان کی نگرانی پر مامور تھے۔ اس غزوے میں انھوں نے قریش کے ایک سربرآوردہ رئیس حارث بن عامر بن نوفل کو جہنم واصل کیا۔ 3 ہجری میں غزوۂ رجیع ہوا۔ آنحضور ﷺ نے عاصمؓ بن ثابت انصاری کو دس آدمیوں پر امیر بنا کر جاسوسی کے لیے روانہ فرمایا۔ عسفان اور مکہ کے درمیان قبیلہ لحیان رہتا تھا۔ اس قبیلے کو خبر ہوگئی۔ چنانچہ ایک سو تیر اندازوں نے اس مختصر جماعت کو گھیر لیا۔ سات آدمی اسی جگہ لڑ کر شہید ہو گئے۔ تین اشخاص زندہ بچے۔ یہ تینوں جاں بخشی کے عہد و پیمان پر پہاڑی سے نیچے اترے، تیر اندازوں نے کمانوں کے تار کھول کر ان کے ہاتھ باندھے۔ ایک غیرت مند یہ بے عزتی گوارا نہ کر سکا اور مردانہ وار لڑ کر جان دے دی۔ اب صرف دو شخص باقی رہ گئے۔ حضرت خبیبؓ بن عدی اور حضرت زید بن الدثنہؓ۔ دونوں کو لے جا کر مکہ کے بازار میں فروخت کیا گیا۔ حضرت زید کو بنولحیان کے ایک سردار صفوان بن اُمیہ نے پچاس اونٹوں کے عوض خرید لیا، تاکہ انھیں باپ اُمیہ بن خلف مقتول بدر کے بدلے میں قتل کرے۔ حضرت خبیبؓ کو مقتول حارث بن عامر کے بیٹے عقبہ بن حارث نے سو اونٹوں کے عوض خریدا۔

عقبہ بن حارث نے انھیں اپنے گھر میں قید رکھا۔ ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پہنائیں اور اپنے ایک عزیز موہب کو مقرر کیا۔ عقبہ کی بیوی کھانا کھلاتے وقت ہاتھ کھول دیا کرتی تھی۔ کئی مہینے قید میں رہے۔ اشہر حرم گزر گئے تو قتل کی تیاریاں ہوئیں۔ حضرت خبیبؓ نے موہب سے تین باتوں کی درخواست کی تھی:

1: مجھے میٹھا پانی پلانا

2: جو جانور بتوں کے استھانوں پر ذبح ہوں، ان کا گوشت نہ کھلانا

3: قتل سے پہلے مجھے آگاہ کر دینا

یہ درخواست انھوں نے عقبہ بن حارث کی بیوی سے بھی کی تھی۔ قتل کا ارادہ ہوا تو عقبہ کی بیوی نے انھیں آگاہ کر دیا تھا۔ انھوں نے طہارت کے لیے استرہ مانگا۔ اس نے لا کر دے دیا۔ اس کا کم سن بچہ کھیلتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔ انھوں نے اسے اپنی ران پر بٹھایا۔ ماں کی نظر پڑی تو دیکھا کہ خبیب کے ہاتھ میں اُسترا ہے اور بچہ ان کے زانو پر ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ کانپ اٹھی۔ حضرت خبیبؓ نے فرمایا: ''میں وہ نہیں کہ اس بچے کو قتل کروں۔ ہمارے دین میں ایسا ظلم اور عہد شکنی روا نہیں ہے۔''

حضرت خبیبؓ کے قتل میں مشرکین نے خاص اہتمام کیا۔ حرم سے باہر تنعیم میں ایک درخت پر سولی کا پھندا لٹکایا گیا۔ مرد عورت، بوڑھے بچے، امیر غریب، غرض ساری خلقت تماشائی تھی۔ جب لوگ عقبہ کے گھر سے انھیں لینے کے لیے آئے تو فرمایا، ذرا ٹھہرو، دو رکعت نماز پڑھ لوں۔ نماز سے فارغ ہو کر مقتل کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے گلے میں پھندا ڈالا گیا۔ چند منٹ کے بعد سراقدس دار پر تھا۔

آنحضور ﷺ کو اس واقعہ فاجعہ کی خبر وحی کے ذریعے سے ہوئی تو فرمایا: ''اے خبیبؓ، تجھ پر سلام۔'' پھر حضرت عمروؓ بن اُمیہ ضمری سے فرمایا کہ مکہ جا کر خبیبؓ کی لاش کا پتا لگاؤ اور اُسے سولی سے اُتارو۔ حضرت عمروؓ دن رات ایک کر کے مکہ پہنچے اور رات کی تاریکی میں اس مقام پر گئے جہاں خبیبؓ کی لاش سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ انھوں نے درخت پر چڑھ کر سُولی کی رسّی کاٹی۔ لاش زمین پر گری۔ حضرت عمرؓ کا ارادہ تھا کہ حضرت خبیبؓ کا جسم اطہر مدینہ اٹھا لے جائیں، لیکن جب وہ درخت سے نیچے اُترے تو یہ دیکھ کر نقش بہ دیوار بن گئے کہ لاش غائب تھی۔ بولے ''کیا زمین نگل گئی۔'' اسی وجہ سے حضرت خبیبؓ کو ''بلیع الارض'' کے لقب سے پکارا جاتا ہے۔

خزیمہؓ بن ثابت

خزیمہ نام، ابو عمارہ کنیت۔ ذوالشہادتین لقب۔ اوس سے تعلق ہے۔ ہجرت سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے، اور عمیر بن عدی بن خرشہ کے ہم راہ اپنے قبیلے خطمہ کے بت توڑے۔ بدر اور تمام غزوات میں شریک تھے۔ جناب طالب ہاشمی کی تحقیق کے مطابق بدر میں شریک ہونا ثابت نہیں۔ فتح مکہ کے موقع پر بنوخطمہ کا علم ان کے پاس تھا۔

آنحضرت ﷺ نے ایک بدو سے گھوڑا خریدا اور دام طے کر کے چلے آئے۔ لوگوں کو اس کی خبر نہ تھی، اس لیے بدو نے قیمت بڑھادی۔ اس شخص نے آنحضرت ﷺ کو آواز دی کہ لینا ہو تو لو، ورنہ میں دوسرے سے سودا کر چکا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، تم تو میرے ہاتھ فروخت کر چکے ہو۔ بولا، واللہ میں نے نہیں بیچا اور اگر بیچا ہو تو کوئی گواہ لاؤ۔ مسلمان یہ گفتگو سن کر جمع ہو گئے اور کہا، رسول اللہ سچ کہتے ہیں۔ حضرت خزیمہ بھی پہنچ گئے اور کہا، میں گواہ ہوں۔ تم نے آنحضرت ﷺ کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ اس جرأت پر خود آنحضور ﷺ کو حیرت ہوئی۔ فرمایا: ''تم کس بنا پر گواہی دیتے ہو۔'' عرض کی: ''آپ کی بات کی تصدیق کر رہا ہوں۔'' آنحضرت ﷺ نے اس روز حضرت خزیمہ کی شہادت دو آدمیوں کی شہادت کے برابر کر دی اور ''ذوالشہادتین'' اُن کا لقب پڑ گیا۔

آپ حضرت علیؓ کی دونوں لڑائیوں میں ان کے طرف دار تھے۔ جنگ جمل میں محض رفاقت کی۔ جنگ صفین میں اولاً خاموش رہے، لیکن جب حضرت عمار بن یاسر افواج شام کے ہاتھ سے شہید ہوئے تو حضرت خزیمہؓ نے تلوار نیام سے نکالی اور اس معرکے میں شہادت حاصل کی۔ یہ 37 ہجری کا واقعہ ہے۔ ان کی مرویات حدیث کی تعداد 38 ہے۔

دحیہؓ بن خلیفہ الکلبی

رسول کریم ﷺ کے صحابی اور مال دار تاجر تھے۔ ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بڑے حسین وجمیل تھے اور مدینہ منورہ میں ان کے حسن وجمال کے چرچے تھے۔ حضرت جبرئیل ان کی صورت اختیار کر کے نبی کریم ﷺ کے پاس آیا کرتے تھے۔

حضرت دحیہؓ نے کئی غزوات میں شرکت کی۔ غزوۂ یرموک میں فوج کے ایک چھوٹے دستے کی کمال ان کے ہاتھ میں تھی۔ 5 ہجری میں انھیں ہرقل کے پاس رسول کریم ﷺ کا مکتوب گرامی پہنچانے کا کام سپرد کیا گیا تھا، جس میں ہرقل کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس وفد کے سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حضرت دحیہ کلبیؓ نے اپنا منصب بیان کرنے کے لیے اپنے آپ کو اللہ کے رسول کا پیغامبر (رَسُولِ رَسُولِ اللہ) قرار دیا۔ یہ خط بعض دوسرے خطوں کے ساتھ اب تک موجود ہے اور اس کی نقول بصورت فوٹو دست یاب ہیں اور اس کا مضمون بعینہٖ وہ ہے جو صحیح بخاری میں درج ہے۔ خط کا آغاز ''من محمد رسول اللہ'' سے کیا گیا تھا جو قیصر روم کے دربار میں ناپسند کیا گیا۔ البتہ یہ بات دل چسپی سے خالی نہیں کہ شاہ روم ہرقل نے حسب دستور پادری (اُسقف) کو اپنے دربار میں طلب کر کے اسے خط سنایا تو پادری خط سن کر کہنے لگا کہ بخدا یہ اللہ کا وہی رسول ہے جس کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ نے پیشین گوئی کی تھی۔ اس کے باوجود شاہ روم نے آپ ﷺ کی رسالت کو تسلیم نہ کیا، کیوں کہ اسے ڈر تھا کہ اس کی حکومت چھن جائے گی اور رومی اسے قتل کر دیں گے۔

ذکوان بن جندبؓ

ذکوان بن جندب بن عمیر۔ ان کا تعلق بنو اسلم سے تھا۔ ذی قعدہ 6 ہجری سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد وہ اپنے صحرائی وطن سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے۔ ذی قعدہ 6 ہجری میں آنحضور ﷺ نے چودہ سو شاروں کے ہم راہ خانہ کعبہ کی زیارت اور طواف کے لیے مکہ کا عزم فرمایا۔ ان میں حضرت ذکوانؓ بھی شامل تھے۔ حدیبیہ میں بیعت رضوان، عمرۃ القضاء، فتح مکہ، غزوۂ حنین اور حجۃ الوداع میں بھی شریک رہے۔ حضرت ذکوانؓ کو آنحضور ﷺ نے ایک نہایت اہم خدمت سپرد کر رکھی تھی، یعنی قربانی کے جانوروں کی نگرانی۔ ایسے جانوروں کو عربی زبان میں ''بُدن'' کہا جاتا ہے۔ اسی لیے حضرت ذکوان ''صاحب البدن رسول ﷺ'' کے لقب سے مشہور تھے۔ ''ناجیہ'' اُن کا خطاب تھا اور لوگ عام طور پر انھیں ''ذکوانؓ بن جندب'' کے بجائے ''ناجیہؓ بن نجیب'' کہہ کر پکارتے تھے۔

رافعؓ بن خدیج

رافع نام، ابوعبداللہ کنیت، قبیلہ اوس سے ہیں۔ غزوۂ بدر میں چودہ سال کا سن تھا۔ لڑائی میں شریک ہونے کے ارادے سے آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن آپ ﷺ نے کم سن خیال کر کے واپس کیا۔ آنحضور ﷺ کے سامنے انصار کے لڑکے ہر سال پیش ہوتے تھے۔ چنانچہ دوسرے سال رافع بھی پیش ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ سال تھی، اس لیے غزوہ میں شرکت کی اجازت مل گئی تو ایک دل چسپ واقعہ پیش آیا۔ ان کے ہم عمر سمرہ بن جندب بھی لڑکوں کی جماعت میں تھے۔ انھیں بھی آنحضرت ﷺ نے صغر سنی کی وجہ سے شامل نہیں فرمایا تھا۔ بولے کہ آپ نے رافع کو تو اجازت دے دی اور مجھے چھوڑ دیا، حالانکہ میں کشتی میں انھیں پچھاڑ دوں گا۔ آنحضرت ﷺ نے مقابلہ کرایا۔ سمرہ دیکھنے میں چھوٹے تھے لیکن طاقت ور تھے۔ رافع کو پچھاڑ دیا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے انھیں بھی شرکت جنگ کی اجازت دے دی۔ غزوے میں ان کے سینے پر ایک تیر لگا جو ہڈیوں کو توڑ کر اندر گھس گیا۔ لوگوں نے کھینچا تو نوک اندر رہ گئی۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، مَیں تمھاری نسبت قیامت میں شہادت دوں گا۔ چھیاسی برس کی عمر میں جب وفات پائی تو تیر کی جو نوک اندر رہ گئی تھی، اسی کے زخم سے جان دی۔ امیر معاویہؓ کے وقت میں فوت ہوئے۔ ان سے 78 احادیث کی روایت منقول ہے۔ راویوں میں صحابہ اور تابعین دونوں گروہ کے لوگ شامل ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی زمین کرایے پر اٹھاتے تھے، اور آنحضرت ﷺ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور امیر معاویہؓ کے ابتدائی زمانۂ خلافت تک ایسا کرتے رہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے اور رافعؓ کے پاس اس کی حدیث ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان کے پاس گئے اور حدیث سنی۔ اس کے بعد کرایہ لینا چھوڑ دیا۔ حضرت رافع غزوۂ خندق اور اکثر معرکوں میں شامل رہے۔ معرکۂ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔

رافعؓ بن مالک

رافع نام، ابو مالک وابو رفاعہ کنیت۔ قبیلہ خزرج سے ہیں۔ انصار میں بنونجار اور قبیلہ خزرج اسلام قبول کرنے میں سب سے آگے تھا۔ لیکن ان کی یہ فضیلت دو ہستیوں کی بدولت ہے۔ یہ دونوں بزرگ حضرت معاذ بن عفراؓ اور حضرت رافع بن مالکؓ ہیں۔ قبیلہ خزرج کے چھے آدمی، جن میں یہ دونوں بھی شامل تھے، عمرے کی غرض سے مکہ گئے تھے۔ آنحضرت ﷺ ان کی قیام گاہ پر بہ نفس نفیس تشریف لائے اور اسلام کی دعوت دی تو سب سے پہلے یہ دعوت حضرت رافعؓ نے اور پھر معاذ بن عفراؓ نے قبول کی۔ اسلام قبول کر کے مدینہ واپس آئے تو نہایت سرگرمی سے اشاعت اسلام کی خدمت انجام دی۔ تمام انصار میں اسلام پھیل گیا۔ اب وہاں کوئی گھر نہ تھا، جہاں رسول اللہ کا ذکر خیر نہ ہوتا ہو۔ دوسرے سال حضرت رافع بارہ آدمیوں کے ساتھ اور تیسرے سال 70 آدمیوں کے ساتھ مکہ گئے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں بنو رزیق کے نقیب

منتخب ہوئے۔

حضرت رافعؓ نے اشاعت اسلام کے علاوہ اور بھی متعدد مذہبی خدمات انجام دیں۔ سورۂ یوسف مدینہ میں سب سے پہلے انھی نے پہنچائی۔ مسجد بنی زریق میں مدینے کی تمام مسجدوں سے قبل قرآن مجید پڑھایا گیا۔ اس کے پہلے پڑھنے والے یہی حضرت رافعؓ تھے۔ بیعت عقبہ سے واپسی کے وقت آنحضرت ﷺ پر مکہ معظمہ میں جس قدر قرآن نازل ہوا تھا، لکھ کر ساتھ لیتے آئے تھے اور اپنی قوم کو جمع کر کے سنایا تھا۔ جب سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی تو لکھ کر مدینہ لائے۔ شوال 3 ہجری میں غزوۂ احد میں شہادت پائی۔ ان کے فرزند رفاعہ بن رافعؓ نے بھی بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا۔

رفاعہ بن رافعؓ

رفاعہ نام، ابومعاذ کنیت۔ حضرت رافع بن مالک کے فرزند۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں اپنے والد کے ساتھ مکہ جا کر آنحضرت ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی اور اسلام کی دولت سے بہرہ یاب ہو کر مدینہ واپس ہوئے۔ تمام غزوات میں شرکت کی۔ جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں حضرت علیؓ کے ہم رکاب تھے۔ 41 ہجری میں امیر معاویہؓ کے عہد میں وفات پائی۔ حضرت رفاعہؓ سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔ صحیحین میں چند احادیث ہیں جن میں سے تین میں امام بخاریؒ منفرد ہیں۔

زاہرؓ بن حرام اشجعی

دیہاتی صحابی۔ ہجرت کے ابتدائی زمانے میں نعمت اسلام سے بہرہ یاب ہوئے اور پھر غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ جب کبھی اپنے گاؤں سے حضور ﷺ کی خدمت میں آتے، اپنے ساتھ ضرور دیہات کا کوئی تحفہ لے کر آتے۔ حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ ہر شہری کا کوئی نہ کوئی دیہاتی دوست ہوتا ہے۔ آلِ محمد ﷺ کا دیہاتی دوست زاہرؓ بن حرام ہے۔ جب وہ حضور ﷺ سے رخصت ہوتے تو آپ ﷺ بھی انھیں کوئی نہ کوئی چیز ضرور عطا فرماتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو حضرت زاہرؓ سے بڑا اُنس اور لگاؤ تھا اور آپ ان سے کبھی کبھی مذاق بھی فرما لیتے تھے۔ ایک دن حضرت زاہرؓ مدینہ منورہ کے بازار میں کچھ فروخت کر رہے تھے۔ اتفاق سے سرورِ کائنات ﷺ ادھر سے گزرے۔ آپ ﷺ نے حضرت زاہرؓ کو دیکھا تو ان کی پشت کی طرف جا کر ان کی آنکھوں پر اپنے دست مبارک رکھ دیے اور فرمایا: ''اس غلام کو کون خریدتا ہے؟'' حضرت زاہرؓ نے آپ ﷺ کو پہچان لیا اور کہا: ''یا رسول اللہ، اس تجارت میں تو آپ مجھے نہایت کم قیمت پائیں گے۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، تو بارگاہِ الٰہی میں بہت قیمتی ہے۔'' حضرت زاہرؓ آخر عمر میں کوفہ جا کر آباد ہو گئے تھے۔ گویا حضور ﷺ کے وصال کے بعد وہ کافی عرصہ زندہ رہے۔

زبرقان بن بدر تمیمی

اصل نام حسین، کنیت ابوعیاش، لیکن اپنے عرف یا لقب زبرقان سے زیادہ مشہور ہیں۔ نہایت خوب صورت اور وجیہ شکل تھے اور اسی وجہ سے ''ماہ نجد'' کے لقب سے مشہور تھے۔ جب کبھی وہ اپنے وطن سے باہر کسی جگہ جاتے تو اپنے چہرے پر ڈھاٹا باندھ لیتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں بنوتمیم کے بادشاہ تھے۔ بعثت نبوی ﷺ کے وقت وہ ''بنوسعد'' کے سردار تھے۔ یہ وہی قبیلہ تھا جس سے حضور ﷺ کی دایہ بی بی حلیمہ کا تعلق تھا۔ زبرقان ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ بنوتمیم طویل عرصے تک تاج وتخت کے مالک رہے تھے، اسی لیے اُن کے دماغوں میں خاندانی فخر وغرور کا نشہ سمایا ہوا تھا، جس کے باعث انھیں پورے اکیس برس تک اسلام کی طرف راغب نہ ہونے دیا، لیکن آخر وہ وقت آ گیا جب دوسرے تمام قبائل کی طرح بنوتمیم بھی آستانہ نبوت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گئے۔

9 ہجری کو ''عام الوفود'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس سال مختلف قبائل کے وفود شرف اسلام سے بہرہ یاب ہونے کے لیے مدینہ منورہ آئے تھے۔ بنوتمیم نے بھی ستر اسّی آدمیوں پر مشتمل اپنا ایک وفد اسی سال مدینہ منورہ بھیجا۔ اس وفد میں بنوتمیم کی مختلف شاخوں کے بڑے بڑے رؤسا، شعلہ بیان خطیب اور بلند پایہ شاعر شامل تھے۔ حضرت زبرقانؓ بن بدر بھی اس وفد کے ایک رکن تھے۔

محرم 9 ہجری میں بنوتمیم کے ایک خانوادے بنوعنبر کے 62 افراد مسلمان گرفتار کر کے مدینہ لے آئے تھے، کیوں کہ انھوں نے خراج دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بنوتمیم کا وفد اقرع بن حابس کی قیادت میں اپنے قیدیوں کو چھڑانے کے لیے مدینہ آیا تھا۔ اقرع کاشانۂ نبوی کے سامنے پہنچ کر چلایا: ''اے محمد، باہر نکل کر ہمارے پاس آؤ۔'' حضور ﷺ نے ان کی گستاخی کے باوجود نہایت خنداں پیشانی سے ملاقات کی۔ اقرع کی مفاخرت طلبی پر شعر بازی کے مقابلے کی اجازت دے دی گئی۔ پہلے بنوتمیم کے شاعر عطارد بن حاجب کا موثر ومسکت جواب حضرت ثابتؓ بن قیس انصاری نے دیا۔ پھر بنوتمیم کی طرف سے زبرقان بن بدر مقابلے کے لیے کھڑے ہوئے۔ ان کے اشعار سن کر خود آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''اِنَّ مِنَ البَیانِ سِحراً'' (بعض تقریروں میں جادو ہوتا ہے)۔ زبرقانؓ بیٹھے تو حضور ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت کو حکم دیا کہ وہ ان کا جواب دیں۔ انھوں نے زبرقانؓ ہی کی بحر اور قافیہ میں فی البدیہہ ایسے فصیح وبلیغ اشعار سنائے کہ بنوتمیم انگشت بدنداں رہ گئے اور رئیس وفد اقرعؓ بن حابس کی زبان پر بے اختیار یہ الفاظ آ گئے: ''باپ کی قسم، محمد ﷺ کا خطیب ہمارے خطیب سے برتر ہے اور محمد ﷺ کا شاعر ہمارے شاعر سے بہتر ہے۔ ان کی آوازیں ہماری آوازوں سے زیادہ دل کش اور شیریں ہیں۔ میں شہادت دیتا ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ۔'' تمام اہل وفد نے یک زبان ہو کر کلمۂ شہادت پڑھ کر اپنے ہاتھ رحمت عالم ﷺ کے دست مبارک میں دے دیے۔ اس کے ساتھ ہی حضرت اقرعؓ کی سفارش پر حضور ﷺ نے بنوعنبر کے تمام قیدی بھی رہا کر دیے۔ یہ وفد مدینہ منورہ سے چلنے لگا تو حضور ﷺ نے حضرت زبرقان کو اپنی طرف سے بنوسعد کا امیر مقرر فرمایا۔ جو اعزاز انھیں دورِ جہالت میں حاصل تھا، ان کے قبول اسلام کے بعد بھی حضور ﷺ نے برقرار رکھا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں سارے عرب میں فتنہ ارتداد برپا ہوا۔ انصار، قریش اور بنوثقیف کے سوا عرب کا کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جو کسی نہ کسی حد تک اس فتنے سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بنوتمیم کی بہت سی شاخیں بھی اس کی لپیٹ میں آگئیں اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا، لیکن حضرت زبرقان نہایت ثابت قدمی کے ساتھ حق پر قائم رہے اور اپنے قبیلے بنوسعد کو بھی اس میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کا اعزاز اور منصب برقرار رکھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں بھی حضرت زبرقانؓ بنوسعد کی امارت پر فائز رہے۔ وہ امیر معاویہؓ کی خلافت تک زندہ تھے۔ اگر کبھی مکہ معظمہ جانے کا اتفاق ہوتا تو اپنے چہرے پر ڈھاٹا باندھ لیتے تھے تاکہ ان کے غیر معمولی حُسن وجمال پر لوگوں کی نظر نہ پڑے۔

زبیر بن عوامؓ

زبیر نام، ابوعبداللہ کنیت، حواری رسول اللہ لقب، والد کا نام عوام، والدہ کا نام صفیہ تھا۔ سلسلۂ نسب یہ ہے: زبیر بن عوام بن خویلد بن اسد بن عبدالعزّیٰ بن قصی بن کلاب۔ ان کی والدہ حضرت صفیہؓ حضرت عبدالمطلب کی بیٹی تھیں، گویا آنحضور ﷺ کی حقیقی پھوپھی۔ چنانچہ رشتے میں وہ حضرت محمد ﷺ کے ابن عم (پھوپھی کے بیٹے) تھے۔ اس کے علاوہ آنحضور ﷺ کی زوجہ محترمہ اُم المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھی حقیقی بھتیجے تھے، اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے داماد ہونے کے سبب سے وہ آنحضور ﷺ کے ساڑھو بھی تھے۔ اس طرح ذات نبوی ﷺ کے ساتھ انھیں کئی نسبتیں حاصل تھیں۔

حضرت زبیرؓ "السابقون الاولون" میں سے تھے۔ حدیث کے مطابق وہ پانچویں شخص تھے، جنھوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی۔ وہ بچپن ہی میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لے آئے تھے۔ وہ ان دس حضرات میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی آنحضور ﷺ نے بشارت دی تھی۔

ان کی ازواج میں سے حضرت اسماؓ بنت ابوبکرؓ اپنے اس عزم اور ہمت کی وجہ سے مشہور ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کے بارے میں کیا تھا۔ ان کے بطن سے زبیرؓ کے دوسرے بیٹے عروہ پیدا ہوئے۔ حضرت زبیرؓ کے تیسرے بیٹے، جنھوں نے تاریخ اسلام میں نمایاں کارنامے دکھائے، حضرت مصعبؓ تھے۔

حضرت زبیرؓ انتہائی مصائب اور تکالیف کے باوجود آنحضرت ﷺ کے دامن سے وابستہ رہے۔ انھوں نے حبشہ کی دونوں ہجرتوں میں شرکت کی۔ ہجرت مدینہ کے بعد آپ کا رشتہ مواخات ابن مسعودؓ اور بعض روایات کے مطابق طلحہ یا کعب بن مالک کے ساتھ باندھا گیا۔ بعد ازاں وہ نبی کریم ﷺ کی زندگی میں تمام بڑی بڑی لڑائیوں میں حصہ لیتے اور داد شجاعت دیتے رہے۔ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے لشکر میں دو شاہ سوار تھے۔ ایک حضرت زبیرؓ اور دوسرے حضرت مقداد بن اسودؓ۔ حضرت زبیرؓ میمنہ پر متعین تھے اور حضرت مقدادؓ میسرہ پر۔ سرور عالم ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو "حواری" کا لقب ان خدمات کے صلے میں عطا فرمایا تھا جو انھوں نے بنوقریظہ سے جنگ کے دوران میں بطور مخبر انجام دی تھیں۔ حضور ﷺ نے اس موقع پر یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے: "ہر نبی کا ایک حواری ہوتا ہے اور میرا حواری زبیر ہے۔" غزوۂ خندق میں آنحضور ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو بنوقریظہ کے حالات معلوم کرنے کے لیے تین مرتبہ بھیجا اور اسی جنگ کے موقع پر انھوں نے تیر اندازی کے خوب جوہر دکھائے۔ فتح مکہ کے دن حضرت زبیرؓ کے ہاتھ میں دو جھنڈے تھے۔ ان کا شمار بڑے بہادر اور دلیر صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔

احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی نظروں میں ان کی بڑی وقعت تھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک بار جناب رسول کریم ﷺ نے ان سے گفتگو کے دوران میں یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے: "فداك ابی و اُمّی" (تجھ پر میرے ماں باپ قربان)۔ کہا جاتا ہے کہ آنحضور ﷺ نے انھیں ایک ریشمی قبا عطا کی تھی جسے وہ جنگ کے وقت پہنا کرتے تھے۔ حضرت زبیرؓ بڑے مال دار اور مخیّر تھے۔ ان کے ایک ہزار مملوک تھے، جو انھیں خراج ادا کرتے تھے اور وہ خراج کا سارا روپیہ خیرات کر دیتے تھے۔ پھر بھی وفات کے بعد لاکھوں روپے کی جائداد اور نقدی چھوڑ گئے۔

حضرت زبیرؓ کی زندگی، وفات اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار خلافت میں ان کے کارناموں کے لیے، حضرت طلحہؓ کے حالات بھی دیکھیے، کیوں کہ جو کچھ ان کے متعلق بیان کیا گیا ہے، وہی حضرت زبیرؓ پر بھی صادق آتا ہے۔ انھوں نے جنگ جمل کے موقع پر شہادت پائی (نیز دیکھیے عبداللہ بن زبیرؓ، مصعب بن زبیرؓ)

زیادؓ بن سکن

زیاد بن سکن بن رافع بن امرالقیس بن زید بن عبدالاشہل۔ وہ قبیلہ اوس کے خاندان بنوعبدالاشہل کے چشم و چراغ تھے۔ السابقون الاولون میں سے ہیں۔ غزوۂ احد میں حضور کے ہم رکاب تھے۔ جب ایک اتفاقی غلطی سے مسلمانوں میں انتشار پھیل گیا تو ایک نازک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: "کون ہے جو میرے لیے اپنی جان اللہ کی راہ میں فروخت کرے۔" حضرت زیادؓ قریب ہی کھڑے تھے۔ جوں ہی ان کے کانوں میں حضور ﷺ کی آواز پڑی، وہ اپنے چار انصاری ساتھیوں کے ہم راہ لپک کر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے "ہم حاضر ہیں یا رسول اللہ۔" پھر وہ حضور ﷺ پر نرغہ کرنے والے مشرکین کے گروہ میں گھس گئے اور ایسی جاں بازی سے لڑے کہ مشرکین کا منہ پھر گیا، لیکن اس کش مکش میں حضرت زیادؓ شدید زخمی ہو کر گر پڑے۔ سرور عالم ﷺ نے انھیں پاؤں سے ٹیک لگا کر بٹھایا۔ اسی وقت حضرت زیادؓ نے آخری ہچکی لی اور اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

زیادؓ بن لبید انصاری

زیاد نام، ابوعبداللہ کنیت، قبیلہ خزرج سے ہیں۔ بیعت عقبہ میں شریک تھے۔ بدر، اُحد، خندق اور تمام غزوات میں شریک تھے۔ 9 ہجری میں آنحضرت ﷺ نے یمن کا حاکم بنایا۔ یہ ملک پانچ حصوں پر مشتمل تھا۔ حضرت زیادؓ حضر موت کے عامل تھے

اور صدقات کا محکمہ بھی ان کے زیر اہتمام تھا۔ آنحضور ﷺ کی رحلت کے بعد جب اہل یمن مرتد ہو گئے اور زکوٰۃ بند کر دی تو حضرت ابوبکرؓ نے زیادؓ کو اس سلسلے میں لکھا۔ انھوں نے کندہ پر شب خون مار کر فتح حاصل کی اور ان کے سردار اشعث بن قیس کا محاصرہ کر کے شکست دی، اور اسے گرفتار کر کے خلیفۃ الرسول کے پاس بھیج دیا۔ حضرت زیادؓ نے مرتدین کے استیصال کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتنے کا خاتمہ کر دیا۔ صدیق اکبر کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنے عہد خلافت میں حضرت زیادؓ کو حضرموت کی امارت پر قائم رکھا۔ اس منصب سے سبک دوش ہونے کے بعد انھوں نے کوفہ کی سکونت اختیار کر لی اور وہیں 41 ہجری میں وفات پائی۔

مدینہ منورہ میں حضور ﷺ کے مستقل قیام کے بعد حضرت زیادؓ بن لبید اکثر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے اور فیضان نبوی ﷺ سے خوب بہرہ یاب ہوتے۔ اس طرح ان کا شمار فضلا وفقہا صحابہؓ میں ہونے لگا۔ جامع ترمذی میں ہے کہ ایک مرتبہ سرور عالم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اب علم کے اٹھنے کا وقت آ پہنچا۔ حضرت زیادؓ کو بارگاہ نبوی ﷺ میں اتنا تقرب حاصل تھا کہ وہ بے تکلفی سے بات کر لیتے تھے۔ انھوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، اب تو علم لوگوں کے رگ وریشے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کے اٹھنے کا وقت کیسے آ گیا؟''

حضور ﷺ نے ان کی اس جسارت کو کم علمی پر محمول فرمایا اور ذرا سخت الفاظ میں یوں فہمائش کی: ''اے زیاد، تیری ماں تجھے روئے۔ میں تو تمھیں بہت دانا آدمی سمجھتا تھا۔ کیا تمھیں نظر نہیں آتا کہ یہود ونصاریٰ تورات اور انجیل پڑھتے ہیں، لیکن اس سے کچھ نفع حاصل نہیں کرتے۔'' حضرت زیادؓ اس فہمائش پر لرز اُٹھے اور عرض کیا: ''بے شک یارسول اللہ، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان آپ نے سچ فرمایا۔''

زید بن ارقمؓ

زید نام، ابوعمر کنیت۔ قبیلہ خزرج سے ہیں۔ ابھی بچے تھے کہ والد ارقم کا انتقال ہو گیا۔ ان کے رشتے کے چچا حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے ان کی پرورش کی۔ غزوۂ اُحد کے وقت کم سن تھے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے جنگ سے باز رکھا۔ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے اور پھر تمام غزوات میں شرکت کی۔ خلفائے راشدین میں حضرت علیؓ سے دوستانہ مراسم تھے۔ جنگ صفین میں ان کی حمایت میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور بنوکندہ کے محلے میں مکان بنایا تھا۔

غزوہ بنومصطلق کے بعد ایک مجلس میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی اپنے گروہ سے کہہ رہا تھا کہ تم لوگ مہاجرین کی مدد سے ہاتھ روک لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔ خدا کی قسم، مدینے واپس پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے، وہ ذلیل کو وہاں سے نکال کر باہر کرے گا۔ مجلس میں اتفاق سے حضرت زید بن ارقمؓ بھی موجود تھے جو اس وقت ایک کم عمر لڑکے تھے۔ انھوں نے یہ باتیں سُن کر اپنے چچا عبداللہ بن رواحہؓ سے ان کا ذکر کیا، اور ان کے چچا نے جو انصار کے رئیسوں میں سے تھے، جا کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور ﷺ نے زید کو بلا کر دریافت کیا تو انھوں نے جو کچھ سنا تھا، من وعن دُہرا دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا، شاید تم ابن ابی سے ناراض ہو۔ ممکن ہے، تم سے سننے میں کچھ غلطی ہو گئی ہو۔ ممکن ہے، تمھیں شُبہ ہو گیا ہو کہ ابن ابی یہ کہہ رہا ہے۔ مگر زید نے عرض کیا، نہیں حضور، خدا کی قسم مَیں نے اسے یہ باتیں کہتے سنا ہے۔ اس پر حضور ﷺ نے ابن ابی کو بلا کر پوچھا تو وہ صاف مکر گیا اور قسمیں کھانے لگا کہ مَیں نے یہ باتیں ہرگز نہیں کہیں۔ انصار کے لوگوں نے بھی کہا کہ حضور، لڑکے کی بات ہے۔ شاید اسے وہم ہو گیا ہو۔ یہ ہمارا شیخ و بزرگ ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک لڑکے کی بات کا اعتبار نہ فرمایئے۔ قبیلے کے بڑے بوڑھوں نے زید کو ملامت کی اور وہ بے چارے رنجیدہ ہو کر اپنی جگہ بیٹھ رہے۔ مگر حضور ﷺ زید کو بھی جانتے تھے اور عبداللہ بن ابی کو بھی، اس لیے آپ سمجھ گئے کہ اصل بات کیا ہے۔

انھی دنوں، غالباً حضور ﷺ کے مدینے واپس پہنچنے کے بعد سورۃ منافقون نازل ہوئی، جس کی آیات 7 اور 8 کا ترجمہ یہ ہے: ''یہ (منافق) کہتے ہیں کہ ہم مدینے واپس پہنچ جائیں تو جو عزت والا ہے، وہ ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے گا، حالانکہ عزت تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور مومنین کے لیے ہے، مگر یہ منافق جانتے نہیں ہیں۔'' جب یہ آیات نازل ہوئیں تو رسول کریم ﷺ نے حضرت زید کو بلا کر ہنستے ہوئے ان کا کان پکڑا اور فرمایا، لڑکے کا کان سچا تھا۔ اللہ نے اس کی خود تصدیق فرما دی (صحیح بخاری، مسند، ترمذی)

حضرت زیدؓ اپنے عہد کے بڑے عالم تھے۔ لوگ دور دور سے استفادے کے لیے آتے تھے۔ شائقین حدیث آپ کی جانب رجوع کرتے۔ لیکن آپ روایت حدیث میں بہت محتاط تھے۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں: ''ہم حدیث کی درخواست کرتے تو جواب ملتا کہ بڈھا ہو گیا ہوں اور بُھول گیا۔ رسول اللہ کی حدیث بیان کرنا بڑا شدید کام ہے۔'' ایک دفعہ سماع حدیث کے لیے کچھ لوگ حاضر خدمت ہوئے اور آپ کی تعریف وتوصیف کی۔ آپ نے رسول اللہ کا جمال دیکھا۔ ان کے ہم راہ غزوات میں شریک ہوئے۔ نمازیں پڑھیں۔ ان کی زبان مبارک سے حدیث سنی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا شرف ہو سکتا ہے۔ فرمایا: ''میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ وہ زمانہ گزر چکا۔ بہت سی باتیں خواب وخیال ہو گئیں۔ حدیثوں کا بڑا سرمایہ فراموش ہوا۔ اس لیے جو حدیث خود بیان کروں، وہ سُن لیا کرو۔ باقی روایت کی تکلیف دینا مناسب نہیں۔ مختار ثقفی کے دور امارت میں 68 ہجری میں کوفہ میں انتقال فرمایا۔

زید بن ثابتؓ

زید نام، ابوسعید، ابوخارجہ کنیت، مقری، فرضی، کاتب الوحی، حبر الامت القاب قبیلہ خزرج کے خاندان نجار سے ہیں۔ ان کی بطور صحابی زیادہ تر شہرت اس لیے ہے کہ انھوں نے جمع وتدوین قرآن میں حصہ لیا۔ ان کی عمر چھے سال تھی جب ہجرت سے پانچ سال قبل ان کے والد جنگ بعاث میں مارے گئے۔ ان کی پرورش والدہ کے زیر عاطفت

ہوئی۔ گیارہ برس کے ہوئے تو اسلام کی آواز کان میں پڑی۔ اس زمانے میں اسلام مدینہ میں مسافر کی حیثیت سے مقیم تھا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ توحید ورسالت کا وعظ کہہ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ پر حضرت زیدؓ نے گیارہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔

جب حضور ﷺ مدینہ منورہ میں قیام فرما ہوئے تو اس وقت زید جو ابھی لڑکے ہی تھے، کئی سورتیں یاد کر چکے تھے۔ ہجرت کے بعد وہ رسول اللہ کے کاتب وحی مقرر ہوئے اور قرآن مجید کو ضبط تحریر میں لائے۔ یہودیوں کے ساتھ خط و کتابت کے فرائض بھی زیدؓ ہی سرانجام دیتے تھے، جن کی نوشت وخواند سے انھوں نے آگاہی حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے سریانی زبان صرف سترہ دن میں سیکھ لی تھی۔ وہ فارسی، رومی، قبطی اور حبشی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ ان کے معاصران کی تیز فہمی، ذکاوت اور علم وفضل کی تعریف کرتے ہیں۔ وہ قرآن، فرائض، قضا اور فتوٰی میں نہایت ممتاز تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس انھیں راسخین فی العلم میں شمار کرتے تھے۔

غزوہ بدر کے وقت حضرت زیدؓ کی عمر تقریباً تیرہ سال تھی، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے انھیں جنگ میں شرکت کی اجازت نہ دی۔ غزوۂ خندق ان کا پہلا غزوہ تھا۔ غزوۂ تبوک میں اپنے قبیلے کے علَم بردار تھے۔ نبی کریم ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت زیدؓ نے کئی اہم خدمات انجام دیں۔ سقیفہ بن ساعدہ میں جب خلافت کا مسئلہ پیش ہوا تو حضرت زیدؓ پہلے انصاری تھے جنھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کی تجویز کی تائید کی۔ انھوں نے مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑائی میں بھی حصہ لیا۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں مدینہ منورہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ جب حج کے لیے تشریف لے جاتے تو مدینہ منورہ کی حکومت ان کے سپرد کر جاتے۔ وہ حضرت عمرؓ کے ساتھ شام بھی گئے تھے۔ جنگ یرموک میں جو مال غنیمت حاصل ہوا، اس کی تقسیم کے قواعد بھی حضرت زیدؓ ہی نے مقرر کیے۔ پھر جب حضرت عمرؓ نے دیوان قائم کیے تو ان لوگوں کی فہرست حضرت زیدؓ ہی نے تیار کی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں ناظر بیت المال کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت پر انھوں نے اگرچہ حضرت علیؓ کا ساتھ نہیں دیا، تاہم ان کا پورا احترام ملحوظ رکھتے تھے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، حضرت زیدؓ کا مشہور ترین کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے جمع وتدوین قرآن میں حصہ لیا۔ آنحضور ﷺ کے زمانے تک قرآن مجید ہڈی، کھال، کھجور کی شاخ اور مسلمانوں کے قلوب میں محفوظ تھا۔ بعض صحابہ کو حفظ قرآن کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ قرآن کے حافظ ہو چکے تھے۔ حضرت زید بھی ان حفاظ میں تھے۔ انحضور ﷺ کی رحلت کے بعد عرب کا ایک گروہ مُرتد ہو کر مسیلمہ کذاب سے مل گیا، جس نے یمامہ میں نبوت کا دعوٰی کیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس پر فوج کشی کی اور مسیلمہ شکست کھا کر مارا گیا، لیکن اس جنگ میں 70 حفاظ شہید ہو گئے۔ اس بنا پر حضرت عمرؓ کو قرآن محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ اگر حفاظ کی شہادت کی یہی حالت رہی تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا۔ اس لیے قرآن مجید کو جمع کر لیجیے۔ حضرت ابوبکرؓ نے منظور کیا اور حضرت زید کو بلا کر کہا کہ تم عقل مند اور جوان آدمی ہو، تمھاری طرف سے سب کو اطمینان ہے۔ تم نے رسول اللہ کے زمانے میں وحی لکھی تھی، اس لیے تم ہی اس کام کو انجام دو۔ حضرت زیدؓ نے یہ انتہائی اہم کام انجام دیا اور پورا قرآن لکھ لیا گیا۔ قرآن مجید کا یہ نسخہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پاس رکھا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ، اور ان کے بعد ام المومنین حضرت حفصہؓ کے مکان میں محفوظ رہا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب قرأت کا اختلاف ہوا تو حضرت حذیفہؓ بن یمان نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ قبل اس کے کہ اسلام میں یہود و نصاریٰ جیسا اختلاف پیدا ہو، آپ اس کا جلد تدارک کیجیے۔ انھوں نے بھی اس ضرورت کو محسوس کیا اور حضرت زیدؓ کا لکھا ہوا مصحف حضرت حفصہؓ سے طلب کیا، اور چار بزرگوں کو جن میں ایک زیدؓ بھی تھے، کتابت قرآن پر مامور کیا۔ ان بزرگوں نے مصحف صدیقی کی پانچ نقلیں کرائیں۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں اسلامی ممالک میں بھجوا دیا اور وہ مصحف صدیقی کو حضرت حفصہؓ کے پاس احتیاط سے واپس کیا۔

حضرت زید بن ثابتؓ قلم، دوات، کاغذ، چوڑی ہڈی یا پتلے پتلے پتھر لے کر رسول اللہ کے پاس بیٹھ جاتے تھے۔ جب وحی آتی، آپ ﷺ بولتے جاتے اور یہ لکھتے جاتے تھے۔ جہاں کہیں تحریر کے متعلق کوئی خاص ہدایت دینا ہوتی تو آپ ﷺ فرما دیتے اور حضرت زیدؓ اس کی تعمیل کرتے۔

حضرت زیدؓ نے 45 ہجری میں امیر معاویہؓ کے عہد میں وفات پائی۔ اس وقت مروان بن حکم مدینہ کا امیر تھا۔ اسی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے موت کی خبر سنی تو کہا، آج حبر الامت اُٹھ گیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی جنازے میں شریک تھے۔ قبر میں لاش اتاری گئی تو حضرت ابن عباسؓ نے نہایت حسرت سے کہا، دیکھو، علم اس طرح جاتا ہے۔ آج علم کا بڑا حصہ دفن ہو گیا۔ حسان بن ثابتؓ نے مرثیہ لکھا: حسان اور اس کے بیٹے کے بعد اور زید بن ثابت کے بعد معانی کا خاتمہ ہے

زیدؓ بن حارثہ

زید نام، ابواُسامہ کنیت، حب رسول ﷺ لقب، والد کا نام حارثہ بن شراحیل، والدہ کا نام سعدی بنت ثعلبہ تھا۔ بچپن ہی میں بنوقین کے غارت گروں نے انھیں چرا کر بازار میں بطور غلام فروخت کے لیے پیش کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام بن خویلد نے انھیں خرید لیا اور لے کر حضرت خدیجہؓ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے انھیں زمانہ بعثت سے قبل بطور ہدیہ آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کیا۔ زیدؓ کے والد حارثہ مکے پہنچے، تاکہ انھیں آزاد کرائیں، لیکن حضرت زیدؓ نے حضور ﷺ سے علیحدگی گوارا نہ کی۔ اس پر حضور ﷺ نے انھیں آزادی عطا کی اور اپنا متبنّٰی بنا لیا۔ یوں ان کا نام زید بن محمد ﷺ مشہور ہو گیا۔ اور وہ حضور ﷺ کے تجارتی کاروبار میں اکثر آپ کا ساتھ دیتے رہے۔

زیدؓ حضور رسالت مآب سے صرف دس سال چھوٹے تھے۔ ان کا شمار "سابقون الاولون" میں ہوتا ہے اور موالی میں سب سے پہلے انھوں نے ہی اسلام قبول کیا۔

مکے میں ان کا رشتہ مواخات حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کے ساتھ استوار کیا گیا تھا۔ ہجرت مدینہ کے بعد وہ پہلے ہی سال مکے گئے، تا کہ ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ اور آنحضرت ﷺ کی صاحب زادیوں کو اپنے ساتھ مدینے لے آئیں۔

حضرت زیدؓ کی شادی رسول کریم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ بنت جحش سے ہوئی، لیکن ناموافقت کے باعث طلاق ہوگئی (شادی اور علیحدگی کی تفصیل سورۃ احزاب کی آیات 36 تا 39 میں مذکور ہے)۔ حضرت زینبؓ کے بعد زیدؓ نے ام کلثوم بنت عقبہ سے شادی کی، جن کے بطن سے زید اور رقیہ پیدا ہوئے اور پھر دُرّۃ بنت ابی لہب سے، لیکن ان دونوں کو بھی انھوں نے طلاق دے دی۔ علاوہ ازیں انھوں نے ہند بنت العوام اور آنحضرت ﷺ کی آزاد کردہ حبشی کنیز اُمِ ایمنؓ سے بھی شادی کی تھی۔ اُمِ ایمن سے اُن کے ہاں اُسامہؓ پیدا ہوئے۔ حضرت اُسامہؓ کے علاوہ ان کی اولاد زندہ نہیں رہی، اور زید اور رُقیہ بچپن ہی میں فوت ہوگئے۔

حضرت زیدؓ تیر اندازی میں خاص کمال رکھتے تھے۔ بدر سے موتہ تک تمام اہم غزوات میں پامردی اور شجاعت سے شریک ہوئے۔ غزوہ مریسیع میں رسول اللہ نے انھیں مدینہ منورہ میں اپنی جانشینی کا فخر بخشا تو اس مہم میں حصہ نہ لے سکے۔ بیش تر سرایا ان کی سپہ سالاری میں سر ہوئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس فوج کشی میں زیدؓ شریک ہوتے، امارت کا عہدہ انھیں کو عطا ہوتا۔ اس طرح وہ نو مرتبہ سپہ سالار بنا کر بھیجے گئے۔

8 ہجری میں حضرت زیدؓ نے پچپن سال کی عمر میں شہادت پائی۔ اس وقت وہ غزوۂ موتہ میں مسلمانوں کی قیادت اور علم برداری کر رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو ان کی شہادت کا بے حد صدمہ ہوا۔ حجۃ الوداع سے واپس آنے کے بعد ان کے فرزند حضرت اسامہ بن زید کو ایک جمعیت کے ساتھ انتقام پر مامور فرمایا۔ وہ چوں کہ کم سن تھے، اس لیے بعض نے ان کی سیادت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''تم لوگ پہلے جس طرح اس کے باپ کی سرداری پر طعن وطنز کرتے تھے، اسی طرح اب اس کی امارت ناپسند کرتے ہو۔ خدا کی قسم، امارت کا مستحق اور محبوب ترین شخص تھا، اور اس کے بعد اُسامہؓ مجھے سب سے زیادہ محبوب ہے۔''

اسامہ بن زیدؓ کی مہم ابھی روانہ نہیں ہوئی تھی کہ رسول کریم ﷺ رحلت فرما گئے، لیکن خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں کوچ کا حکم دے دیا اور حضرت اُسامہؓ اپنے والد کے قاتلوں سے انتقام لے کر غیر معمولی کامیابی کے ساتھ مدینہ واپس آئے۔

حضرت زیدؓ کے صحیفۂ اخلاق میں وفا شعاری کا باب سب سے نمایاں ہے۔ آقائے نام دار کی رضا پسندی ان کا مقصد حیات تھا اور اسی بات نے انھیں اور ان کی اولاد کو آپ ﷺ کی نگاہ میں محبوب بنا دیا تھا۔ حضرت عائشہؓ کا قول ہے کہ اگر زیدؓ زندہ رہتے تو رسول اللہ انھی کو اپنا جانشین بناتے۔ حدیث میں بھی ان کا مقام بڑا بلند ہے۔ اور اس کا ایک سبب آنحضرت ﷺ کا قرب تھا۔

سالمؓ ابوعبداللہ

سالم نام، ابوعبداللہ کنیت، حضرت شبیتہ بنتؓ یعار انصاریہ کی غلامی میں مدینہ پہنچے۔ انھوں نے آزاد کر دیا تو حضرت ابوحذیفہؓ نے انھیں متبنّیٰ بنا لیا، اور اپنی بھتیجی فاطمہ بنت ولید سے بیاہ دیا، لیکن جب قرآن میں یہ آیت نازل ہوئی ''ادعُوھُم لِا بَـاھُم'' یعنی لوگوں کو اپنے اصل نسبی باپ کے انتساب سے پکارا کرو تو حضرت سالمؓ بھی ابن کی بجائے مولیٰ ابوحذیفہؓ کے لقب سے مشہور ہوئے۔

حضرت سالمؓ جوان ہوئے تو حضرت ابوحذیفہؓ کو ان کا زنان خانے میں آنا جانا ناگوار گزرنے لگا۔ چنانچہ ان کی بیوی سہلہ بنت سہیلؓ نے بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کی ''یارسول اللہ، سالم کو ہم اپنا بیٹا سمجھتے تھے اور وہ ہمیشہ گھر میں آتا جاتا تھا، لیکن اب ابوحذیفہؓ کو ناگوار گزرتا ہے۔'' ارشاد ہوا کہ اسے دودھ پلا دو تو وہ تمھارا محرم ہو جائے گا۔'' غرض اس طرح وہ ابوحذیفہؓ کے رضاعی فرزند ہو گئے، لیکن اُم المومنین حضرت سلمیٰؓ فرماتی ہیں کہ یہ سالمؓ کے لیے مخصوص اجازت تھی، ورنہ جوانی کی حالت میں رضاعت ثابت نہیں ہوتی۔

ہجرت نبوی کے موقع پر حضرت ابوحذیفہؓ کے ہم راہ تھے۔ مدینہ پہنچ کر حضرت عباد بن بشرؓ کے مہمان ہوئے اور حضرت معاذ بن ماعص انصاری سے مواخات ہوئی۔ بدر، اُحد، خندق اور تمام غزوات میں شریک تھے۔ عہد صدیقیؓ میں یمامہ کی مہم پر بھیجے گئے۔ مہاجرین کا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ ایک شخص نے نکتہ چینی کی اور کہا: ''ہمیں تمھاری طرف سے اندیشہ ہے، اس لیے ہم کسی دوسرے کو علم بردار بنائیں گے۔'' بولے ''اگر میں بُزدلی دکھاؤں تو میں سب سے زیادہ بدبخت حامل قرآن ہوں۔'' یہ کہ کر نہایت جوش کے ساتھ حملہ آور ہوئے۔ دایاں ہاتھ قلم ہوا تو بائیں ہاتھ میں پرچم سنبھال لیا۔ وہ بھی شہید ہوا تو دونوں بازوؤں کے حلقے میں پرچم لے لیا۔ زخموں سے چور چور ہو کر گرے تو پوچھا: ''ابوحذیفہؓ نے کیا کیا؟'' لوگوں نے بتایا ''شہید ہوئے۔'' پوچھا: ''اُس شخص نے کیا کیا، جس نے مجھ سے اندیشہ ظاہر کیا تھا؟'' جواب دیا گیا کہ وہ بھی شہید ہوئے۔ فرمایا: ''مجھے ان دونوں کے درمیان دفن کرنا۔''

سراقہ بن مالکؓ

سراقہ بن مالک بن جعشم، کنانہ کی شاخ، بنو مدلج سے تعلق تھا۔ اپنے قبیلے کے رئیس اور بڑے قد کاٹھ کے آدمی تھے۔ شعر و شاعری میں بھی درک رکھتے تھے۔ ان کی شجاعت اور شہ سواری کی دور دور تک دھوم مچی ہوئی تھی۔ بنو مدلج سخت بت پرست تھے اور انھوں نے ''لات'' کو اپنا معبود اعظم بنا رکھا تھا۔

14 بعد بعثت میں آنحضور ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور عامرؓ بن فہیرہ کی معیت میں سفر ہجرت کا آغاز فرمایا۔ کفار مکہ نے مکہ سے مدینہ تک ہر معروف اور غیر معروف راستے اور ان پر آباد بستیوں میں منادی کرا دی کہ ''جو شخص محمد ﷺ اور ابوبکرؓ کو زندہ گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دے یا انھیں قتل کرا کے ہمارا اطمینان کرا دے تو اسے ان میں سے ہر ایک کی پوری دیت دی جائے گی، یعنی سو سو اونٹ بطور انعام دیئے جائیں گے۔'' یہ اعلان سنتے ہی سراقہ حضور ﷺ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ جب وہ حضور ﷺ کے قریب پہنچے تو ان کا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ انھوں نے گر

کے بعد ترکش سے تیر نکالے اور سوچا کہ استعمال کیا جائے یا نہیں، لیکن چوں کہ انعام کا لالچ بہت تھا، اس لیے تیر زیادہ استعمال نہ کیے اور دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر حضور ﷺ کے تعاقب میں چلنے کی تیاری کرنے لگے، لیکن اس مرتبہ گھوڑے کے پاؤں ٹخنوں تک زمین میں دھنس گئے۔ چنانچہ وہ مجبوراً گھوڑے سے اترے اور فال نکالی۔ جواب نفی میں پا کر وہ سمجھ گئے کہ حضور ﷺ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا شامل ہے۔ چنانچہ فوراً حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر امان کی درخواست کی۔ حضرت ابوبکرؓ کے خادم عامرؓ بن فہیرہ نے چمڑے کے ٹکڑے پر "امان کا فرمان" لکھ دیا۔ حضور ﷺ نے سراقہ کو دیکھ کر فرمایا: "میں تمھارے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھتا ہوں۔"

حضرت عمرؓ فاروق کے دور خلافت میں ایران کا دارالسلطنت مدائن فتح ہوا اور کسریٰ کا خزانہ مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو اس میں کسریٰ کا تاج، زیور، لباس اور دوسرے شاہی لوازمات بھی تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت سراقہؓ کو کسریٰ کے کنگن پہنا کر فرمایا: "اے سراقہؓ اس غنیمت میں یہ کنگن تمھارے حصے میں آئے ہیں۔"

حضرت سراقہؓ نے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں 24 ہجری میں وفات پائی۔ ان سے 28 احادیث مروی ہیں۔

سعد بن ابی وقاصؓ

ابواسحٰق، القرشی، الزہری المکی، نام ور سپہ سالار۔ آپ کا شمار عشرہ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ آپ آنحضور ﷺ کی والدہ کے چچازاد بھائی تھے، اسی لیے کئی موقعوں پر رسول کریم ﷺ آپ کو ماموں کہہ کر بھی مخاطب کرلیا کرتے تھے۔ آپ اسلام کے آغاز ہی میں مسلمان ہوگئے تھے۔ قبولِ اسلام کے وقت آپ کی عمر صرف سترہ سال تھی۔

حضرت سعدؓ نہ صرف غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے، بلکہ بعد کے تمام غزوات میں بھی شریک ہوتے رہے۔ جب خالد بن ولید کے جانے کے بعد الحیرہ میں المثنیٰ بن حارثہ نے فوج کی قیادت سنبھالی اور اہل ایران کے ساتھ تصادم کے خطرے کی بنا پر حضرت عمرؓ سے کمک کا مطالبہ کیا تو حضرت عمرؓ پہلے خود فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لینے پر آمادہ ہوگئے۔ کبار صحابہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ آپ کا دارالخلافہ میں موجود ہونا ضروری ہے، اس لیے آخر کار حضرت عمرؓ نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور سعدؓ کو سپہ سالار اعظم کا عہدہ سونپ دیا۔ حضرت سعدؓ مکہ معظمہ کے ایک پُرانے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور آنحضور ﷺ کے بے حد جاں نثار مانے جاتے تھے۔ حضرت سعدؓ نے ایک بہت بڑی فوج کے ساتھ ایرانیوں پر چڑھائی کی اور قادسیہ کے مقام پر، جو ایران اور عرب کی سرحدوں پر واقع تھا، خیمہ زن ہوگئے۔ یہاں 16 ہجری کے نصف اوّل (637ء کے موسم گرما میں) بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لڑائی کئی دن جاری رہی۔ حضرت سعدؓ بیماری کی وجہ سے اس جنگ میں ذاتی طور پر حصہ لینے سے معذور رہے، لیکن وہ جنگی نقل و حرکت کے متعلق برابر ہدایات دیتے رہے، جو عربوں کے دستور کے لحاظ سے بالکل نئی بات تھی۔ ساسانی سردار رستم کے قتل کے بعد لڑائی فوراً ختم ہوگئی اور ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ اس کے بعد حضرت سعدؓ تمام عراق عرب پر قابض ہوگئے۔ ایرانی زیادہ عرصے تک مدائن پر بھی قابض نہ رہ سکے جو دریائے دجلہ کے مشرق میں واقع صوبوں کا دارالحکومت تھا۔ نوجوان ساسانی بادشاہ یزدگرد کو راہ فرار اختیار کرنا پڑی اور وہ اپنا دارالحکومت حضرت سعدؓ کے لیے خالی چھوڑ گیا۔ جب سعدؓ شہر میں داخل ہوئے تو انھوں نے بے شمار مالِ غنیمت حاصل کیا اور وقتی طور پر مدائن کو اپنا صدر مقام بنایا۔

اسی سال کے آخر میں ان کے بھتیجے ہاشم بن ابی وقاص نے ایرانیوں کو دوسری مرتبہ جلولا کے مقام پر تباہ کن شکست دی۔ نیز کوفے کا سنگ بنیاد بھی اسی زمانے میں رکھا گیا۔ حضرت سعدؓ کو اسی مقام پر ایک مضبوط فوجی چھاؤنی قائم کرنے کا فخر بھی حاصل ہے، جس نے رفتہ رفتہ ایک اہم شہر کی صورت اختیار کرلی۔ سعدؓ کو اس ترقی پزیر نوآبادی کا پہلا حاکم مقرر کیا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سعدؓ حضرت عمر فاروقؓ کے مسلک کے برعکس سادگی کے قدیم اصول کا زیادہ خیال نہ رکھ سکے، چنانچہ ہمیں پتا چلتا ہے کہ سعدؓ نے مدائن کے طاق خسرو کے نمونے پر کوفے میں ایک عظیم الشان محل تعمیر کروایا، لیکن جب عمرؓ نے، جنھیں عربوں کی سادہ عادات پر ایرانی عیش و عشرت کے خطرناک اثرات کا خوف تھا، یہ خبر سنی تو روایت ہے کہ انھوں نے سعدؓ کو بڑی زجر و توبیخ کی، پھر 30 ہجری (64 عیسوی) میں سعدؓ کو ان کے منصب سے برخاست کر دیا گیا، کیوں کہ متلوج مزاج اور شورش پسند اہل کوفہ (جن میں سبھی قسم کے لوگ تھے، یعنی عرب، ایرانی، یہودی، عیسائی) نے مل کر ان پر جابر اور متشدد ہونے کا الزام لگایا تھا۔ تاہم حضرت عمر فاروقؓ کے حکم سے محمد بن مسلمہ جب حضرت سعدؓ کے منصبی کام اور طرزِ عمل کی تحقیق کے لیے کوفے گئے تو صرف ایک یا دو آدمیوں نے ان کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت کی۔ اس کے باوجود حضرت سعدؓ کو برخاست کر دیا گیا اور حضرت عمار بن یاسرؓ ان کی جگہ مقرر ہوئے۔ وہ تھوڑے عرصے کے لیے اس عہدے پر متمکن رہے۔ ان کے بعد حضرت مغیرہ بن شعبہ ان کے جانشین ہوئے۔ ان باتوں کے باوجود بعد میں حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ کی عظیم الشان فوجی اور انتظامی خدمات کا شایانِ شان اعتراف کیا۔ چنانچہ جب حضرت عمرؓ بستر مرگ پر تھے اور آپ نے تین دن کے اندر اندر نئے خلیفہ کے انتخاب کے لیے چھے اصحاب کبار کو منتخب کیا تو ان میں سے ایک صحابی حضرت سعدؓ تھے۔ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر خود سعدؓ کو نہ چنا گیا تو وہ ہونے والے خلیفہ سے سفارش کریں گے کہ تلافی مافات کے طور پر سعدؓ کو پھر حاکم بنا دیا جائے، کیوں کہ وہ نا اہلیت یا غداری کی بنا پر اپنے عہدے سے معزول نہیں کیے گئے تھے۔ اس اشارے پر عمل کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ نے 25 ہجری (646 عیسوی) میں انھیں کوفہ کی گورنری پر بحال کر دیا، لیکن اس عہدے پر تھوڑے عرصے مامور رہنے کے بعد انھیں پھر برخاست کر دیا گیا، اور ان کی جگہ ولید بن عقبہ بن ابی معیط کو دے دی گئی۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت سعدؓ سے درخواست کی گئی کہ وہ بھی دعوائے خلافت

کریں، مگر انھوں نے انکار کر دیا، کیوں کہ اب وہ سکون کی زندگی بسر کرنے کے خواہش مند تھے۔ وہ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لینے کے لیے بھی کسی اقدام کی طرف مائل نہ ہوئے۔ جب حضرت علیؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو حضرت سعدؓ سیاسی اور عسکری زندگی سے کنارہ کش ہو کر اپنی جاگیر واقع العقیق میں خانہ نشین ہو گئے، جہاں انھوں نے تادم مرگ سیاست سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کی، جس کی وجہ سے ان کے ایک بیٹے نے ان پر طعن بھی کیا ہے۔ انھوں نے 50 ہجری، 671 عیسوی میں تقریباً ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بہت سا ترکہ چھوڑا۔ وہ مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں دفن ہوئے۔

حضرت سعدؓ کا علمی مرتبہ نہایت ارفع تھا۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ جب سعدؓ آنحضور ﷺ سے کوئی حدیث روایت کریں تو پھر اس کے متعلق کسی دوسرے سے نہ پوچھو۔ رسول کریم ﷺ سے تحصیل علم میں کبھی پس و پیش نہ کیا تھا۔ ایک دفعہ بارگاہ نبوت میں حاضر تھے۔ آنحضور ﷺ نے ایک جماعت کو کچھ عطیے مرحمت فرمائے، لیکن ایک شخص کو محروم رکھا۔ حضرت سعدؓ کو اس محرومی پر سخت تعجب ہوا۔ عرض کی، یارسول اللہ، میرا خیال ہے کہ یہ بھی مومن ہے، ارشاد ہوا: ''مومن یا مسلم''، لیکن حضرت سعدؓ کو تشفی نہ ہوئی۔ انھوں نے پھر اپنا وہی سوال دہرایا۔ آنحضور ﷺ نے اس مرتبہ بھی وہی جواب دیا۔ غرض حضرت سعدؓ نے بار بار دریافت کیا۔ یہاں تک کہ آنحضور ﷺ نے یہ فرما کر تشفی کر دی کہ ''بسا اوقات اس سے جسے عطیے دیتا ہوں، وہ شخص میرے نزدیک زیادہ محبوب ہوتا ہے، جسے کچھ نہیں دیتا۔''

حضرت سعدؓ تقریباً تمام غزوات میں آنحضور ﷺ کے ہم رکاب رہے۔ غزوۂ احد میں جب شکست رونما ہوئی اور تمام صحابہ پریشانی اور گھبراہٹ میں منتشر ہو گئے تو اس وقت تھوڑی دیر کے لیے حضرت سعدؓ اور حضرت طلحہؓ نے سرور کائنات کی حفاظت کا فرض انجام دیا تھا۔ سفر میں عموماً خود شوق سے رسول کریم کے خیمے کے گرد پوری رات پہرا دیتے تھے۔ وہ عتبہ بن ابی وقاصؓ کے حقیقی بھائی تھے۔ انھوں نے حالت کفر میں غزوۂ احد میں آنحضور ﷺ کا روئے مبارک زخمی کیا تھا۔ حضرت سعدؓ فرمایا کرتے تھے: ''واللہ میں عتبہ سے زیادہ کبھی کسی شخص کے خون کا پیاسا نہیں ہوا۔''

سعد الاسود سہمیؓ

اصل نام تو سعد تھا، لیکن ان کی غیر معمولی سیاہ رنگت کی وجہ سے لوگ انھیں ''سعد الاسودؓ'' یا اسود (کالا) کہہ کر پکارتے تھے۔ انھوں نے ہجرت نبوی ﷺ کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ اگرچہ انھوں نے قبول اسلام کے بعد اس دنیائے فانی میں بہت کم عرصہ قیام کیا، لیکن اس مختصر مدت میں انھوں نے اپنے جوش ایمان کے ایسے نقوش ثبت کیے جو امت مسلمہ کے لیے تاابد مشعل راہ بنے رہیں گے۔ وہ سیاہ فام ہونے کے ساتھ نہایت بے ڈول جسم اور بھدے خدوخال کے مالک تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، میں نہایت بدصورت اور سیاہ فام آدمی ہوں۔ لوگ مجھے دیکھ کر نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ کیا مجھ جیسا کریہ منظر آدمی بھی جنت میں داخل ہو سکے گا۔'' سرور کائنات نے ان پر لطف و کرم سے بھرپور نظر ڈالی اور بشارت دی: ''اس ذات کی قسم، جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، تمھیں تمھاری بدصورتی اور سیاہ رنگت جنت میں داخل ہونے سے ہرگز نہ روکے گی، لیکن شرط یہ ہے کہ اللہ سے ڈرو اور میری رسالت پر ایمان لاؤ۔''

ایک روز حضرت سعد الاسود نے بارگاہِ رسالت میں عرض کی: ''یارسول اللہ، میں نکاح کرنا چاہتا ہوں، لیکن کوئی شخص میری بدصورتی کے سبب مجھے رشتہ دینے پر راضی نہیں ہوتا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو پیام دیے، لیکن سب نے رد کر دیے۔ ان میں سے کچھ یہاں موجود ہیں اور کچھ غیر حاضر۔'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''سعد گھبراؤ نہیں، میں خود تمھاری شادی کا بندوبست کرتا ہوں۔ تم اسی وقت عمرؓ و بن وہب ثقفی کے گھر جاؤ اور سلام کے بعد ان سے کہو کہ رسول اللہ نے آپ کی بیٹی کا رشتہ میرے ساتھ کر دیا ہے۔''

حضور ﷺ کا ارشاد سن کر حضرت سعد الاسودؓ شاداں و فرحاں حضرت عمرؓ و بن وہب کے گھر کی طرف چل دیئے۔ حضرت سعدؓ نے آنحضور ﷺ کے فرمان سے مطلع کیا۔ انھوں نے بڑی سختی کے ساتھ واپس جانے کے لیے کہا اور بڑی رعونت سے ان کا پیام رد کر دیا۔ حضرت سعدؓ نے سارا واقعہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کر دیا۔ بعد میں عمرؓ و بن وہب نے آنحضور ﷺ سے معافی طلب کی اور کہا کہ یہ غلطی لاعلمی میں سرزد ہوئی۔ آنحضور ﷺ نے عمرؓ و بن وہب کا عذر قبول فرمایا اور حضرت سعدؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''سعد میں نے تمھارا عقد بنت عمرو بن وہب سے کر دیا۔ اب تم اپنی بیوی کے پاس جاؤ۔''

حضرت سعدؓ کو بے حد مسرت ہوئی۔ سیدھے بازار گئے اور ارادہ کیا کہ اپنی دلہن کے لیے کچھ تحائف خریدیں، ابھی کوئی چیز نہیں خریدی تھی کہ ان کے کانوں میں ایک منادی کی آواز پڑی: ''مسلمانو، جہاد کے لیے سوار ہو جاؤ اور جنت کی بشارت لو۔'' منادی کی آواز سن کر تمام جذبات پر جوش ایمانی غالب آ گیا اور نوعروس کے لیے تحائف خریدنے کا خیال دل سے کافور ہو گیا۔ گھوڑا، تلوار اور نیزہ خریدا اور سر پر عمامہ باندھ کر سرور عالم ﷺ کی قیادت میں غزوہ پر جانے والے مجاہدین میں جا شامل ہوئے۔ شہادت کا رتبہ پایا۔ حضور ﷺ ان کی لاش کے پاس تشریف لائے۔ ان کا سر اپنی آغوش میں رکھ کر دعائے مغفرت کی اور پھر فرمایا: ''میں نے سعد کا عقد عمرو بن وہب سے کر دیا تھا اس لیے اس کے متروکہ سامان کی مالک وہی لڑکی ہے۔ سعدؓ کے ہتھیار اور گھوڑا اسی کے پاس پہنچا دو اور اس کے ماں باپ سے جا کر کہہ دو کہ اب خدا نے تمھاری لڑکی سے بہتر لڑکی سعد کو عطا کر دی اور اس کی شادی جنت میں ہو گئی۔

سعدؓ بن ربیع انصاری

مدینہ منورہ کے قبیلہ خزرج کے خاندان بنو حارث بن خزرج (بنو حارثہ) سے تعلق رکھتے تھے۔ بیعت عقبہ اولیٰ میں مسلمان ہوئے۔ اس کے بعد انھیں ان چھ نفوس

(ا)ن میں شامل ہونے کا شرف حاصل ہوا، جنھوں نے بیعت عقبہ کبیرہ میں شرکت کی (تھی)۔ اس بیعت کے بعد سرور عالم ﷺ نے اہل مدینہ سے فرمایا کہ تم دینی امور کی (حفا)ظت کے لیے اپنے بارہ نقیب منتخب کرلو۔ چنانچہ شرکائے بیعت نے بارہ نقیب اتفاق (را)ئے سے منتخب کر لیے۔ ان میں سے نو قبیلہ خزرج اور تین قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے (تھے)۔ خزرجی نقیبوں میں سے ایک حضرت سعدؓ بن ربیع تھے۔ انھیں حضرت عبداللہؓ بن (رو)احہ کے ساتھ بنو حارثہ کا نقیب بنایا گیا۔ آنحضور ﷺ نے رشتہ مواخات میں (حض)رت سعدؓ بن ربیع کو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا اسلامی بھائی بنایا۔ ان کی دو (بیو)یاں تھیں۔ اپنے نصف مال واسباب کے علاوہ انھوں نے اپنے مہاجر بھائی حضرت (عب)دالرحمٰن بن عوف کو پیش کش کی کہ اگر وہ چاہیں تو ان کی ایک بیوی سے نکاح کر سکتے (ہی)ں جسے وہ طلاق دے دیں گے۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن نے انھیں بہت دعائیں دیں (اور اس ا)رشادی سے اور مال ومتاع سے انکار کر دیا۔

بدر کے بعد حضرت سعدؓ جنگ احد میں شریک ہوئے اور بڑی جاں بازی سے (لڑ)ے، یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کر گر پڑے۔ انھیں نیزوں سے بارہ شدید زخم (ل)گے۔ اس غزوے میں جام شہادت نوش کیا۔ انھیں ان کے چچا خارجہؓ بن ابی زبیر کے (س)اتھ ہی ایک قبر میں دفن کیا گیا۔

سعدؓ بن عائذ

آپ مشہور صحابی حضرت عمار بن یاسرؓ کے غلام تھے۔ حضور ﷺ نے انھیں (م)قام قبا میں مؤذن مقرر کیا۔ جب حضور ﷺ کا وصال ہو گیا تو حضرت بلالؓ نے اذان دینا ترک کر دیا۔ تب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں مسجد نبوی میں اذان دینے کا کام سونپ دیا۔ حضرت بلالؓ کے بعد وہ مسجد نبوی ﷺ میں اذان دینے والے دوسرے موذن تھے۔ بعض تاریخوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے انھیں اذان دینے کے لیے قبا سے مدینہ بلایا تھا۔

سعدؓ بن عبادہ ساعدی

کنیت ابوقیس بھی اور ابوثابت بھی۔ بڑے نام ور اور متمول آدمی تھے اور ان چند افراد میں سے تھے جو زمانہ جاہلیت میں عرب میں لکھنا جانتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک عمدہ تیراک اور تیرانداز کی حیثیت سے بھی مشہور تھے۔ تاریخ اسلام میں ان کے نام کا ذکر پہلی مرتبہ بیعت عقبہ کبیرہ کی کارروائی میں آتا ہے۔ وہ ان نو خزرجیوں میں بیان کیے گئے ہیں جو اس موقع پر نومسلموں کے نقیب منتخب ہوئے تھے۔ پھر وہ مکے والوں کے ہتھے چڑھ گئے اور انھوں نے ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ دو مکی دوستوں کی مداخلت سے، جن کی ایک بار انھوں نے بڑی خدمت کی تھی، وہ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

جب آنحضور ﷺ الابوا کے خلاف مہم پر تشریف لے گئے تو حضرت سعدؓ آپ کے نائب کی حیثیت سے مدینہ میں پیچھے رہے۔ انھوں نے غزوۂ بدر میں شرکت نہ کی تھی۔ غزوۂ احد میں موجود تھے، جہاں انھوں نے سعد بن معاذؓ سے مل کر آنحضور ﷺ کی تیمارداری کی، جو مجروح ہو گئے تھے۔ دوسرے غزوات میں بھی وہ اسلام کے پرجوش مجاہد ثابت ہوئے اور کئی مرتبہ علم برداری کے فرائض سرانجام دیے۔

انھیں سخاوت میں امتیاز خصوصی حاصل تھا۔ قبیلہ بنی نضیر کے محاصرے کے دوران میں انھوں نے اپنے خرچ پر مسلمانوں میں کچھ کھجوریں تقسیم کیں۔ بنو قریظہ کا محاصرہ کرنے والی فوجوں کو انھوں نے ہی سامان رسد بہم پہنچایا تھا، اور غزوۂ تبوک میں مسلمانوں کی امداد کے لیے خاص طور پر بڑا عطیہ دیا تھا۔ آنحضور ﷺ نے غزوۂ خندق میں قبیلہ غطفان کے دو سرداروں عینیہ بن حصن اور حارث بن عوف کے ساتھ سیاسی گفت وشنید شروع کی اور انھیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ اگر وہ واپس چلے جائیں تو کھجوروں کی آیندہ فصل کا ایک تہائی حصہ انھیں دے دیا جائے گا، لیکن حضرت سعد بن عبادہ، سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر مفاہمت کی اس کوشش کے حق میں نہ تھے، کیوں کہ بہادر اور غیور انصار کو اس قسم کے سیاسی سمجھوتے میں مسلمانوں کی کم زوری اور ذلت کا پہلو نظر آتا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اسلام کی سربلندی کے خواہاں تھے اور جان پر کھیل جانے کے لیے بالکل تیار۔ چنانچہ آنحضور ﷺ نے سرداران انصار کی رائے کو پسند فرما کر سمجھوتے کی گفتگو کو ختم کر دیا۔

عبداللہ بن ابی کی وفات کے بعد حضرت سعدؓ خزرجیوں کے بلا مقابلہ سردار بن گئے اور یہ بھی کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ لوگوں نے انھیں آنحضرت ﷺ کی جانشینی کے لیے بھی تجویز کیا تھا۔ جوں ہی آنحضرت ﷺ کی وفات کی خبر مدینے میں مشہور ہوئی، اوس اور خزرج کے قبائل جمع ہوئے۔ حضرت سعدؓ نے انھیں خطاب کر کے یہ سفارش کی کہ انصار میں سے کسی ایک کو چن لیا جائے۔ حاضرین میں سے کثرت رائے ان لوگوں کی تھی جو فوراً ان کی بیعت کر لینے پر تیار تھے۔ پھر دوسرے صحابہ کرام، بالخصوص حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ بھی وہاں تشریف لے گئے اور خاصی بحث وتمحیص اور غور وخوض کے بعد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت خلافت کی گئی۔ اس کے بعد سعد سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے اور بعد میں الحوران (شام) کی طرف چلے گئے، جہاں آپؓ نے حضرت عمرؓ کے مسند خلافت پر بیٹھنے کے اڑھائی سال بعد یعنی 15 ہجری، 636 عیسوی کے قریب وفات پائی۔

حضرت سعدؓ کو سرور کائنات ﷺ سے نہایت عقیدت اور محبت تھی۔ ہجرت کے بعد حضور ﷺ مدینہ تشریف لائے تو سعدؓ اکثر حضور ﷺ کی خدمت میں کھانا بھیجا کرتے تھے۔ کبھی کبھی بطور خاص بھی آپ ﷺ کی ضیافت کیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ ان کے مکان پر قدم رنجہ فرماتے تو وہ فرط احترام سے بچھ بچھ جاتے تھے۔ جب حضور ﷺ واپسی کا ارادہ فرماتے تو حضرت سعدؓ اپنے گدھے پر چادر بچھواتے اور اسے سواری کے لیے پیش کرتے۔ پھر اپنے فرزند حضرت قیسؓ کو حضور ﷺ کی ہم رکابی کا حکم دیتے۔ حضرت سعدؓ بن عبادہ انصاری کے مقام کا اندازہ کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے انھیں بارہا دعائے خیر وبرکت سے نوازا اور بارہا ان کے گھر کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف پایا۔

سعد بن معاذؓ

بن نعمان بن امرالقیس بن زید بن عبدالاشہل انصاری اوسی، مدینہ منورہ میں بنواوس کے ایک بڑے قبیلے بنوعبدالاشہل کے نام ور فرزند اور معزز سردار۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے حضرت سعدؓ کو اس وقت مشرف بہ اسلام کیا، جب اول الذکر یثرب کے بارہ حضرات کی معیت میں بیعتِ عقبہ اولیٰ کے بعد تبلیغ اسلام کے لیے یثرب میں تشریف لائے۔ مسلمان ہونے کے بعد حضرت سعدؓ نے اسلام کی نشرواشاعت کے لیے کامیاب کوشش کی اور اپنے سارے قبیلے کو دائرۂ اسلام میں داخل کر لیا۔ ابتدا ہی سے انھوں نے اسلام کے لیے بڑی گرم جوشی کا اظہار کیا اور جب آنحضرت ﷺ غزوۂ بواط پر روانہ ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت سعدؓ (یا ایک دوسری روایت کے مطابق) صائب بن عثمان بن مظعون کو مدینے میں اپنا نائب مقرر کیا۔ حضرت سعد بن معاذؓ جنگ بدر میں قبیلہ اوس کے عَلَم بردار تھے۔ جب آنحضور ﷺ غزوۂ اُحد میں زخمی ہو گئے تو سعد بن عبادہؓ کی معیت میں وہ بھی آنحضور ﷺ کی امداد کے لیے روانہ ہوئے۔ سعد بن عبادہؓ اور اُسید بن حضیرؓ کی طرح حضرت سعد بن معاذؓ نے بھی غزوۂ خندق میں غطفان سے گفت وشنید کے خلاف احتجاج کیا، لیکن اس کے فوراً بعد ہی ایک مشرک کے تیر سے ان کا ہاتھ بری طرح زخمی ہو گیا۔ حضرت سعدؓ اس زخم سے کچھ مدت بیمار رہے اور حضرت رفیدہ اُسلمیہ ان کی تیمارداری اور مرہم پٹی کرتی رہیں۔ بالآخر اسی زخم سے وہ شہید ہو گئے۔ (حضرت رفیدہ بڑی نیک دل خاتون تھیں اور بیماروں کی دیکھ بھال اور زخمیوں کی مرہم پٹی میں بڑی مہارت رکھتی تھیں)

قریش مکہ اور ان کے حلیف قبائل کی پسپائی کے بعد آنحضرت ﷺ نے منبع فساد یہودی بنوقریظہ کو سزا دینے کی ٹھانی، کیوں کہ ان لوگوں نے عہد شکنی اور غداری کی تھی۔ جب آپ ﷺ نے ان کے خلاف اقدام کرنا چاہا تو بنوقریظہ نے حضرت سعدؓ بن معاذ کو ثالث تسلیم کر کے یہ اعلان کر دیا کہ وہ جو فیصلہ کریں، انھیں منظور ہوگا۔ انھیں یہ اُمید تھی کہ وہ اپنے سابقہ اتحادیوں (قبیلہ اوس) کی مداخلت سے اپنی جان بچا سکیں گے۔ اس موقع پر حضرت سعدؓ زخموں سے گھائل صاحبِ فراش تھے اور حضرت رفیدہ ان کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔ حضرت سعدؓ کو بیماری کی حالت میں بنوقریظہ میں پہنچایا گیا۔ انھوں نے آنحضور ﷺ اور تمام حاضرین سے یہ وعدہ لینے کے بعد کہ ان کا فیصلہ غیر مشروط پر مانا جائے گا، یہ اعلان کیا کہ بنوقریظہ کے مردوں کو قتل کر دیا جائے، عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لیا جائے اور ان کی جائداد تقسیم کر دی جائے۔ اس فیصلے کی تعمیل دوسرے ہی دن کر دی گئی۔ سعد بن معاذؓ بھی اس کے جلد بعد اپنے زخم کی وجہ سے جاں بحق ہو گئے۔ احادیث میں انھیں ایک بڑے مجاہد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کا شمار ''اصحاب الفتیا'' میں ہوتا ہے۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ حضرت سعدؓ کی موت سے عرش عظیم جنبش میں آ گیا ہے۔ حضرت سعدؓ کے بھائی حضرت عمرو بن معاذؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تھے۔

حضرت سعدؓ بن معاذ کو صرف پانچ سال آنحضور ﷺ کی بابرکت صحبت میں رہنے کا شرف حاصل ہوا، لیکن اس قلیل مدت میں انھوں نے اپنی دینی خدمات، ایثار اور حب رسول ﷺ کی بدولت اتنا بلند درجہ حاصل کر لیا کہ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ ان پر رشک کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ کے بعد بنوعبدالاشہل میں سعد بن معاذؓ، اُسیدؓ بن حضیر اور عبادؓ بن بشر کو جو درجہ حاصل ہوا، کوئی دوسرا اس تک نہ پہنچ سکا۔ حضرت سعدؓ کی وفات کے بعد ایک دفعہ حضور ﷺ کے پاس کہیں سے حریر کا ایک جبہ آیا۔ لوگ اس کی ملائمت کو دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم اس کی نرمی پر متحیر ہو رہے ہو، حالانکہ جنت میں سعدؓ بن معاذ کے رومال اس سے کہیں زیادہ نرم اور ملائم ہیں۔''

ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر قبر کی تنگی سے کوئی نجات پا سکتا تو وہ سعدؓ بن معاذ ہوتے۔ خود حضرت سعدؓ نے ایک دفعہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کہ ویسے تو میں ایک معمولی آدمی ہوں، لیکن تین باتوں میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے خاص فضل سے نوازا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کی ہر حدیث منِ جانب اللہ خیال کرتا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ نماز میں کوئی وسوسہ پیدا نہیں ہوتا۔ تیسری بات یہ کہ جنازے کے ساتھ جاتا ہوں تو منکر نکیر کے سوال کی طرف دھیان رہتا ہے۔

سعید بن زیدؓ

سعید نام، کنیت ابوالاعور، والد کا نام زید اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے بھتیجے اور بہنوئی تھے۔ اُن کے والد زید بن عمرو عرب کے مشہور موحد تھے۔ انھیں ایام جاہلیت میں حق کا جلوہ نظر آیا تو بت پرستی سے دین ابراہیمی کی طرف رجوع کر لیا۔ صحیح بخاری میں دو حدیثیں درج ہیں۔ ایک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی، جو زید کے بھتیجے تھے۔ دوسری حضرت اسمؓا کی، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی صاحب زادی تھیں۔ یہ دونوں روایتیں سیرت النبی ﷺ میں ملتی ہیں۔ زید کا انتقال آنحضور ﷺ کی بعثت سے پانچ سال پہلے ہوا اور وہ کوہِ حرا کے نیچے دفن کیے گئے۔ اس زمانے میں قریش خانہ کعبہ کی تعمیر میں مصروف تھے۔

حضرت سعیدؓ اس قدر قدیم الاسلام صحابی ہیں کہ صحیح بخاری (کتاب مناقب الانصار) میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت ابوذر غفاریؓ کی طرح ان کے اسلام کا باب باندھا گیا ہے۔ اس میں حضرت سعیدؓ کی یہ حدیث درج ہے۔ قیس سے یہ روایت ہے کہ مَیں نے سعیدؓ بن زید سے کوفہ کی مسجد میں سنا۔ ''کہ رہے تھے: واللہ! مَیں نے اپنے کو اس حال میں دیکھا ہے کہ عمرؓ مجھے اسلام لانے کے جرم میں باندھ دیتے تھے۔ وہ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ اور اگر ان زیادتیوں پر جو تم لوگوں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ کی ہیں، کوہِ اُحد پھٹ جائے تو بالکل بجا ہے۔'' دوسری حدیث یوں ہے: ''سعیدؓ بن زید قوم سے کہ رہے تھے: ''مَیں نے دیکھا کہ اسلام لانے کے جرم میں عمرؓ مجھے اور اپنی بہن کو باندھ دیا کرتے تھے جب کہ وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے، اور تم نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی ہیں اگر ان کی وجہ سے اُحد پھٹ جائے تو اس کا پھٹ جانا بالکل بجا ہوگا۔'' دونوں روایتوں

کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سعیدؓ اور حضرت عمرؓ کی ہم شیر دونوں نے حضرت عمرؓ سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کی ہم شیر حضرت سعیدؓ کی بیوی تھیں۔ ان کا نام فاطمہ یا رملہ اور ام جمیل کنیت تھی۔ بعض تواریخ میں یوں بھی آیا ہے کہ نام فاطمہ تھا، امیمہ لقب اور اُم جمیل کنیت۔

ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ حضرت سعیدؓ نے رسول اکرم ﷺ کے دار الارقم میں داخل ہونے اور دعوت حق شروع کرنے سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا۔ قدما صحابہؓ کی جو فہرست سیرت النبی ﷺ میں درج کی گئی ہے، اس کے لحاظ سے حضرت سعیدؓ کا نمبر اٹھائیسواں اور ان کی بیوی کا ستائیسواں تھا۔ عجب نہیں کہ میاں بیوی دونوں ایک ساتھ آنحضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے ہوں، کیوں کہ دونوں کے لیے زید کی وجہ سے توحید کی آواز نامانوس نہ تھی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت سعیدؓ اور ان کی بیوی نے اسلام کی خاطر بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں۔

حضرت سعیدؓ کی شادی، اسلام لانے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ حضرت فاطمہؓ بنت خطاب، رشتے کی پھوپھی انھیں منسوب ہوئیں جس طرح حضرت عمرؓ کو عاتکہؓ بنت زید، حضرت سعیدؓ کی بہن منسوب تھیں، جو ان کے رشتے کی بھتیجی تھیں۔ عدی کے خاندان میں سفارت کا منصب ہونے کی وجہ سے چرچا تھا۔ خطاب مشہور خطیب تھے۔ حضرت عمرؓ اخطب العرب تھے۔ یہی اثر خاندان کے دوسرے ارکان میں پایا جاتا تھا۔ اس خاندان میں عورتیں تک لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ حضرت سعیدؓ اور حضرت فاطمہؓ دونوں نے اسلام سے پہلے غالباً لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کے قصے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ حضرت عمرؓ کے بہن اور بہنوئی (یعنی فاطمہؓ اور سعیدؓ) سورۃ طہٰ پڑھ رہے تھے، جو ان کے پاس لکھی ہوئی موجود تھی۔

حضرت عمرؓ کے رُعب اور اثر کی وجہ سے حضرت سعیدؓ کو حبشہ جانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ حضرت عمرؓ کے ساتھ مدینہ منورہ گئے۔ بیوی بھی ساتھ تھیں۔ یہ سب لوگ حضرت رفاعہ بن عبدالمنذر کے مہمان ہوئے، جن کا مکان قبا میں بنو عمرو بن عوف کے اندر تھا۔ مواخات میں حضرت سعیدؓ کے اسلامی بھائی رافع بن مالک زرقی بنائے گئے، جو انصار کے ابتدائی مسلمانوں اور بیعت عقبہ کے بارہ نقیبوں میں تھے۔ غزوۂ بدر کے علاوہ حضرت سعیدؓ نے غزوۂ اُحد، خندق اور تمام غزوات و مشاہد میں آنحضور ﷺ کے ساتھ شرکت کی۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں جب حضرت عمرؓ نے شام پر باقاعدہ فوج کشی کی تو معرکہ فحل (ذی قعدہ 14 ہجری) میں حضرت سعیدؓ کو پیدل فوج کی کمان ملی۔ کل فوج حضرت ابوعبیدہؓ کے ماتحت تھی۔

رجب 14 ہجری میں دمشق فتح ہوا۔ اس کے محاصرے میں سعیدؓ نے بھی پُر جوش حصہ لیا تھا۔ اثنائے جنگ میں حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت سعیدؓ کو دمشق کی گورنری پر مامور کیا۔ رجب 15 ہجری میں یرموک کا معرکہ ہوا۔ بازار قتال جب خوب گرم تھا، ابن قناطیر نے میسرہ پر حملہ کیا۔ چوں کہ اس حصے میں اکثر لخم اور غسان کے قبیلے کے مسلمان تھے، جن کے دلوں میں رومیوں کا رعب سمایا ہوا تھا، اس لیے پہلے ہی حملے میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، لیکن افسر جمے رہے۔ انھی میں حضرت سعیدؓ غصے میں گھٹنے ٹیکے کھڑے تھے۔ رومی ان کی طرف بڑھے تو وہ شیر کی طرح جھپٹے اور مقدمے کے افسر کو مار کر گرا دیا۔ فتح بیت المقدس کے ارادے سے جب حضرت ابوعبیدہؓ روانہ ہوئے تو دمشق پر حضرت سعیدؓ کو جانشین بنایا۔

23 ہجری میں حضرت عمرؓ کے زخمی ہونے کے بعد حضرت سعیدؓ ان کے گھر میں تھے اور عبداللہ بن عمرؓ بھی بیٹھے تھے۔ حضرت عمرؓ نے، جو ابن عباس سے ٹیک لگائے ہوئے تھے، ارشاد فرمایا: ''دیکھو، مَیں نے کلالہ کے متعلق کچھ نہیں کہا اور کسی کو اپنا خلیفہ نہیں بنایا، اور جو عرب اس وقت تک قیدی ہیں، وہ سب آزاد ہیں۔'' حضرت سعیدؓ بن زید بولے: ''اگر آپ کسی مسلمان کو نام زد کر دیں تو لوگ آپ پر اعتماد کریں گے۔'' فرمایا: ''لوگوں کو بری طرح طمع گھیرے ہوئے ہے، حالانکہ میں تو ان چھے شخصوں کے اندر خلافت کو رکھوں گا، جن سے رسول کریم ﷺ وقت کے وقت تک راضی رہے۔'' پھر فرمایا: ''اگر سالمؓ، مولیٰ ابی حذیفہؓ اور ابوعبیدہ بن جراح میں سے کوئی ایک بھی ہوتا تو میں اسے خلیفہ بنا کر مطمئن ہو جاتا۔'' یہاں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت سعیدؓ بن زید کو ان لوگوں کے ہم رتبہ ہونے کے باوجود حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے نام زد نہیں کیا، اور جو لوگ نام زد ہوئے، ان میں سے کوئی قبیلہ عدی کا نہ تھا۔

35 ہجری میں حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی۔ اس موقع پر کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت سعیدؓ بن زید نے جو گفتگو فرمائی، اس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر شرم دلائی ہے کہ حضرت عمرؓ کفر کی حالت میں انھیں اور اپنی بہن کو رسی سے باندھ دیا کرتے تھے، لیکن تم لوگوں نے مسلمان ہو کر حضرت عثمانؓ کے ساتھ جو زیادتیاں کی ہیں، وہ تو ایسی ہیں کہ کوہِ اُحد اگر شق ہو جائے تو بالکل بجا ہے۔

حضرت سعیدؓ بن زید عقیق میں رہتے تھے۔ جمعہ کے دن بیمار پڑے۔ حضرت ابن عمرؓ کے پاس خبر آئی تو وہ مدینہ چھوڑ کر عقیق تشریف لے گئے اور تجہیز و تکفین میں شریک ہوئے۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے غسل دیا۔ پھر خود نہائے۔ اس کے بعد مجمع سے کہا کہ مَیں نے گرمی کی شدت کے سبب غسل کیا ہے، نہ کہ میت کو چھو لینے کے سبب سے۔ جنازہ مدینہ لایا گیا اور یہیں دفن کیے گئے۔ حضرت سعدؓ اور ابن عمرؓ قبر میں اترے۔ حاضرین میں دو بزرگوں کے علاوہ متعدد صحابہ کرام، قریش اور بنو عدی کے سرکردہ افراد اور حضرت سعیدؓ کے تمام بیٹے تھے۔ یہ 50 یا 51 ہجری کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر ستر برس سے اوپر تھی۔ (تحریر: سعید انصاری)

سعیدؓ بن العاص

سعیدؓ بن العاص بن اُمیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی، والی کوفہ و مدینہ، نوعمر صحابی۔ عبد مناف پر ان کا سلسلہ نسب سرور عالم ﷺ سے جا ملتا ہے۔ آنحضور ﷺ کی وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً نو سال تھی۔ آپ کا والد یوم بدر میں مشرکین کی طرف سے لڑتے ہوئے قتل ہو گیا تھا۔ ماں کا نام اُمِ کلثوم تھا جو قریش کے خاندان سے تھیں۔ حضرت سعیدؓ کو براہ راست فیضان نبوی ﷺ سے بہرہ یاب ہونے کا وقت کم

ملا۔ تاہم حضور ﷺ کے وصال (11ہجری) کے بعد انھوں نے حضرت عائشہؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرام سے کسب فیض کیا اور فضلا صحابہؓ میں شمار ہونے لگے۔ ان کے بچپن کا ایک واقعہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی زبانی اس طرح نقل ہوا ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ کی خدمت میں ایک کپڑا پیش کیا اور ساتھ ہی عرض کی: ''یا رسول اللہ، مَیں نے یہ نیت کر رکھی تھی کہ یہ کپڑا عرب میں سب سے بزرگ ہستی کو دُوں گی۔ اب یہ آپ کی خدمت میں لائی ہوں۔'' اس وقت حضرت سعیدؓ بن عاص حضور ﷺ کے پاس کھڑے تھے۔ آپ ﷺ نے اس عورت کا ہدیہ قبول فرمایا اور کہا: ''یہ کپڑا اس لڑکے کو دے دے۔'' اس نے حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل کی۔ اس وجہ سے اس کپڑے کا نام ''سعدیہ'' مشہور ہوگیا۔

حضرت سعیدؓ عہد رسالت اور عہد صدیقی میں نابالغ تھے۔ عہد فاروقی میں جوان ہوئے، لیکن اس دور میں تحصیل علم کے سوا ان کی کسی دوسری سرگرمی کا سراغ نہیں ملتا۔ 24ہجری میں حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کے بعد حضرت عثمانؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو انھوں نے قرآن مجید کی کتابت پر خاص توجہ دی اور اس کے متعدد نسخے نقل کروانے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کی انجام دہی کے لیے انھوں نے جن صحابہ کرامؓ کو مامور فرمایا، ان میں حضرت سعیدؓ بن عاص بھی شامل تھے۔ 29ہجری میں حضرت عثمانؓ نے ولید بن عقبہ کی بجائے حضرت سعیدؓ کو کوفے کا گورنر مقرر کیا۔ اپنے زمانہ گورنری میں انھوں نے طبرستان اور جرجان کے خلاف مہمات سر کیں اور بدامنی کو دبایا، مگر وہ کوفے کے عوام میں غیر مقبول ہو گئے۔ کوفیوں نے خلیفۃ المسلمین کے پاس شکایت کی، جو بے اثر ثابت ہوئی۔ پھر کوفے کے دس آدمی بشمول مالک اُشتر حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سعیدؓ کی معزولی کا مطالبہ کیا، جو اس وقت خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں موجود تھے۔ حضرت عثمانؓ اس شکایت کو خاطر میں نہ لائے اور سعیدؓ کو اپنے عہدے پر فوراً واپس ہونے کا حکم دیا۔ اُشتر کی اس سے تسلی نہ ہوئی۔ وہ فوراً کوفے پہنچے اور زود اشتعال باشندوں کو برانگیختہ کر دیا۔ جب حضرت سعیدؓ کوفہ کو واپس جا رہے تھے تو اُشتر کے کارندوں نے ایک بڑی جمعیت کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا اور انھیں مدینہ کی جانب فوراً واپس جانے پر مجبور کیا۔ پھر اُشتر نے کوفے کی مسجد میں جا کر اپنی طرف سے ابوموسیٰ اشعریؓ کے حاکم ہونے کا اعلان کر دیا۔ حاضرین نے جب خلیفۃ المسلمین سے وفاداری کا حلف اٹھایا تو اشعریؓ عامل بن جانے پر رضامند ہو گئے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے ان کے تقرر کی توثیق کر دی۔ اس کے بعد سعیدؓ مدینے ہی میں رہے۔

جب باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر کے ان پر حملہ کر دیا تو سعیدؓ ان کی طرف سے لڑے، حتّٰی کہ شدید طور پر مجروح ہو گئے۔ جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ مکہ چھوڑ کر اپنے مشن کی خاطر بصرہ روانہ ہوئے تو پہلے تو سعیدؓ ان کے ہم راہ چل پڑے، مگر کچھ دور آگے جا کر ان سے الگ ہو گئے۔ انھوں نے دوسروں کو بھی اس منصوبے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مروان بن حکم نے ان کے خیالات کی تردید کی، مگر مغیرہ بن شعبہ ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت سعیدؓ مکہ میں سکونت پزیر ہو گئے اور انھوں نے نہ تو جنگ جمل میں حصہ لیا اور نہ جنگ صفین میں۔

امیر معاویہؓ کے عہد میں حضرت سعیدؓ اور مروان بن حکم یکے بعد دیگرے والی مدینہ رہے۔ انھوں نے مدینہ منورہ سے تین میل کے فاصلے پر عقیق کے مقام پر اپنی مملوکہ اراضی میں 59ہجری میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن کیے گئے۔

سلمان فارسیؓ

نسبی تعلق اصفہان کے آب الملک کے خاندان سے تھا۔ مجوسی نام مابہ تھا۔ اسلام لانے کے بعد سلمان رکھا گیا اور بارگاہِ رسالت سے ''سلمان الخیر'' لقب ملا۔ ابوعبداللہ کنیت ہے۔ ان کے والد ایک آتش کدے کے مہتمم اور اچھی خاصی زمین کے مالک تھے۔ ان کے قصبے کے لوگ آتش پرست تھے اور چتکبرے گھوڑے ''الخلیل البلق'' کی پوجا بھی کرتے تھے، لیکن حضرت سلمانؓ نے آگ کی پرستش کی، نہ گھوڑے کی پوجا۔

سلمانؓ کی پرورش میں بڑی احتیاط برتی گئی۔ ان کے والد ان سے بہت محبت کرتے تھے اور انھیں گھر ہی میں رکھ کر تربیت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ تعمیر مکان میں اُلجھ گئے۔ اپنی اراضی پر جانا ضروری تھا، اس لیے وہاں سلمان کو بھیجا اور جلد ہی واپس آنے کی تاکید کی۔ سلمانؓ نے راستے میں گرجا کے اندر عیسائیوں کو عبادت کرتے دیکھا۔ انھیں عیسائیوں کا انداز عبادت پسند آ گیا۔ وہ اس میں کچھ یوں محو ہوئے کہ گھر کی خبر نہ رہی۔ پھر لوگوں سے پوچھا کہ میں آپ کے مذہب سے دل چسپی رکھتا ہوں، اس مذہب کی تعلیمات حاصل کرنے کا کیا طریقہ ہے؟ ان لوگوں نے بتایا کہ عیسائیت کا مرکز شام ہے اور وہیں علما رہتے ہیں۔ یہ جواب سُن کر سلمان فارسی گھر واپس آئے اور والد سے اراضی پر نہ جانے اور راستے میں گرجا جانے، نیز اپنے تاثرات کا تذکرہ کیا۔ ان کے والد ناراض ہوئے اور گھر سے ان کا نکلنا بند کر دیا۔ سلمان نے عیسائیوں کو اپنے سفر شام کے ارادے سے آگاہ کیا اور پیغام بھجوایا کہ جب کوئی قافلہ شام جائے تو اطلاع دی جائے، میں بھی شریک سفر ہوں گا۔ عیسائیوں نے موقع پر اطلاع دی اور سلمان فارسی اس قافلے کے ہم راہ عیسائیت کے مرکز (شام) پہنچے۔ وہ متعدد راہبوں کے پاس گئے۔ متعدد پادریوں کے ساتھ رہے۔ راہبوں کی ریاضت دیکھی۔ ان کے علوم سیکھے اور علم و دانش کے تجربے حاصل کیے۔ انھیں راہبوں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ عیسائیوں کی کتابوں میں ایک پیغمبر کی آمد کا تذکرہ ہے۔ اس پیغمبر کے ظہور کا خطہ ارض حجاز ہوگا۔ حضرت سلمانؓ کے دل میں اس پیغمبر کی زیارت کی آرزو جاں گزیں ہوگئی۔ وہ حجاز کے لیے روانہ ہونے والے بنوکلب کے ایک قافلے کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ ان تاجروں نے نیک نفس اور پرہیزگار مسلمان کو کسی یہودی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

وادی القریٰ اور مدینہ کے اردگرد سلمان کو کھجور کے باغ نظر آئے تو راہبوں کی وہ پیشین گوئیاں بھی یاد آئیں اور اُمید کی راہ دکھائی دی کہ یہیں نبی آخرالزماں مبعوث ہو چکا ہے۔ سلمانؓ اپنی قسمت آزمائی کی خاطر ہر کشادہ پیشانی شخص کو غور سے دیکھتے اور

علامات نبوت تلاش کرتے رہے، مگر جن کی جستجو تھی، ان کے قدم چومنا نصیب نہ ہوئے۔ آخر ایک دن رسول کریم ﷺ کی قبا میں آمد کی خبر سنی۔ سلمانؓ کچھ صدقے کی کھجوریں لے کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے کھجوریں نوش فرمانے سے احتراز کیا۔ سلمانؓ نے سنا تھا کہ وہ رسول صدقے سے اجتناب کرے گا۔ اس پیش آمد سے ماتھا ٹھنکا، مگر خاموشی سے واپس آ گئے۔ ایک علامت انھیں مل گئی تھی۔ آنحضور ﷺ مدینہ میں قیام فرما ہوئے تو سلمانؓ نے پھر موقع نکالا اور کھجوروں کا ہدیہ لے کر حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے جب دریافت کرلیا کہ یہ صدقہ نہیں تو ان کھجوروں میں سے کچھ خود نوش فرمائیں، کچھ اصحاب کو دیں۔ سلمانؓ خوش واپس آئے۔ انھیں بڑی حد تک منزل کا یقین ہوگیا تھا۔ کچھ دن بعد انھیں وہ موقع بھی ملا کہ دوش نبوت کی زیارت کریں اور جو نشانات نبوت انھیں بتائے گئے تھے، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے بعد وہ ایمان لے آئے۔ آنحضور ﷺ نے سلمان کے خلوص و ایمان سے متاثر ہو کر انھیں یہودی کی غلامی سے معاوضہ ادا کر کے آزاد کرایا۔

حضرت سلمانؓ کو مواخات کے موقع پر ابوالدرداؓ کا بھائی بنایا گیا تھا۔ 5 ہجری میں سلمان فارسی ایک سرگرم مجاہد کی حیثیت سے تاریخ میں اُبھرے۔ غزوۂ احد کے بعد دو سال تک نئے معرکے کی پیش بندیاں کر کے یہود اور قریش اجتماعی طور پر حملے کے لیے تیار ہوئے تو حضور ﷺ مدینہ سے باہر حرتین میں پڑاؤ ڈالنے اور دشمن کو روکنے نکلے۔ اس موقع پر سلمان فارسیؓ کے مشورے سے خندق کھودنے کا اہتمام ہوا۔

حضرت سلمانؓ اصحاب صفہ کے رکن تھے۔ آنحضور ﷺ ان سے طویل گفتگو فرماتے تھے۔ کبھی کبھی رات کی نشست میں غیر معمولی دیر بھی ہو جاتی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے حذیفہؓ بن یمان کے بعد سلمان فارسیؓ کو مدائن کا گورنر بنایا تھا۔ حضرت سلمانؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں 36 ہجری میں مدائن ہی میں وفات پائی۔ ان کا مزار مدائن میں اب تک موجود ہے اور اس علاقے کو ''سلمان پاک'' کہتے ہیں۔ سلمان پاک کی بستی طاق کسریٰ سے تقریباً میل بھر کے فاصلے پر ہے۔ مزار میں حضرت حذیفہؓ یمانی کی قبر حضرت سلمانؓ کی قبر کے پہلو میں ہے اور کاظمین و عراق کے زائرین مزار سلمانؓ کی زیارت کے لیے ضرور جاتے ہیں۔

حضرت سلمانؓ نے مختلف مذاہب کے علوم حاصل کیے، اور وہ لکھنا بھی جانتے تھے۔ حضرت سلمانؓ زاہد تھے۔ ان کی غذا معمولی اور لباس سادہ تھا۔ وہ عموماً خیمے میں رہتے تھے۔ ساز و سامان اور گھر کا اثاثہ برائے نام تھا۔ وہ مدائن کے گورنر بن کر آئے تو لوگوں کو سواری اور حالت دیکھ کر تعجب ہوا۔ زمانہ گورنری میں بھی وہ جوتے بناتے اور محنت مزدوری کرتے تھے۔ ان کے نصیحت آمیز اور حکیمانہ اقوال زریں تصوف کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان کے مرویات بھی ہیں۔ ''نہج البلاغہ'' میں ان کے نام حضرت علیؓ کا ایک خط نقل کیا گیا ہے جس میں حضرت علیؓ نے انھیں دنیا سے بے تعلقی اور پریشانیوں میں نہ گھبرانے کا مشورہ دیا ہے۔ (مرتضیٰ حسین فاضل)

سلمہ بن اکوعؓ

سنان نام، ابوایاس کنیت۔ صحیح مسلم میں ان کا اصل نام سلمہ ہی دیا گیا ہے۔ 6 ہجری سے پہلے اسلام قبول کیا۔ پھر ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں آ بسے تھے۔ مدینہ آنے کے بعد قریب قریب تمام غزوات میں شریک رہے۔ سب سے پہلے غزوۂ حدیبیہ میں شریک ہوئے اور ''بیعت رضوان'' میں تین مرتبہ بیعت کی۔ پہلی مرتبہ سب سے اوّل جماعت کے ساتھ بیعت کر چکے تھے۔ دوبارہ حضور ﷺ کی نظر پڑی تو فرمایا، سلمہ بیعت کرو۔ عرض کی، یا رسول اللہ جاں نثار پہلے ہی بیعت کر چکا ہے۔ فرمایا، کیا حرج ہے، دوبارہ سہی۔ اس وقت سلمہؓ کہتے تھے۔ آنحضور ﷺ نے ایک ڈھال عنایت فرمائی۔ تیسری مرتبہ حضور ﷺ کی نظر پڑی تو فرمایا کہ سلمہؓ، بیعت نہ کرو گے۔ عرض کی، یا رسول اللہ، دو مرتبہ بیعت کر چکا ہوں۔ فرمایا، تیسری مرتبہ سہی۔ چنانچہ انھوں نے تیسری مرتبہ بیعت کی۔ آنحضور ﷺ نے دریافت کیا، ڈھال کہاں ہے؟ عرض کی کہ میرے چچا بالکل خالی ہاتھ تھے، انھیں دے دی۔ آپ ﷺ نے تبسم فرمایا اور کہا: ''تمھاری مثال اس شخص کی سی ہے کہ اس نے دعا کی کہ خدایا! مجھے ایسا دوست دے جو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہو۔''

مسلمانوں کا قافلہ مدینہ سے واپسی میں ایک پہاڑ کے قریب خیمہ زن ہوا۔ مشرکین کی نیت اچھی نہیں تھی۔ حضور ﷺ کو اس کی اطلاع ہوگئی اور پڑاؤ کی نگرانی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اس شخص کے لیے دعائے مغفرت کی جو پہاڑ پر چڑھ کر نگرانی کرے۔ حضرت سلمہؓ نے یہ سعادت حاصل کی اور ساری رات پہاڑی پر چڑھ کر نگرانی کرتے رہے۔

اسی سال غزوۂ ذی قردہ یا غابہ پیش آیا اور اسی نسبت سے حضرت سلمہؓ ''صاحب غابہ'' بھی کہلاتے ہیں۔ وہ اس غزوے کے بطل خاص متصور ہوئے۔ مدینہ منورہ سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر بنی غطفان کے علاقے کے قریب ذی قردہ ایک آبشار یا چشمہ تھا۔ اس سے متصل ایک وسیع جنگل یا غابہ تھا جس میں رسول کریم ﷺ کی اونٹنیاں چرا کرتی تھیں۔ 6 ہجری میں ایک دشمن اسلام عیینہ بن حصن فزاری نے چالیس سواروں کی جمعیت کے ساتھ غابہ کی چراگاہ پر چھاپا مارا اور گلہ بان حضرت ذرؓ بن ابوذر غفاریؓ کو شہید کر کے بیس شیر دار اونٹنیاں ہانک کر لے چلا۔ اتفاق سے حضرت سلمہؓ بن اکوع اور رسول کریم ﷺ کے مولیٰ حضرت رباحؓ گھوڑے پر سوار وہاں آ نکلے۔ حضرت سلمہؓ نے حضرت رباحؓ کو گھوڑے پر سوار کر کے حضور ﷺ کو اطلاع دینے کے لیے مدینہ کی طرف روانہ کیا اور خود تن تنہا مشرکین سے لڑنے مرنے کا عزم کرلیا۔ پہلے تو ایک قریبی ٹیلے پر چڑھ کر مدینہ کی طرف منہ کر کے تین مرتبہ ''یا صباحاہ'' کا نعرہ لگایا، اور پھر درختوں کی آڑ لے کر چھاپا ماروں پر تیروں اور پتھروں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ بڑے غضب کے تیرانداز تھے۔ جب تیر چلاتے تو للکار کر یہ رجز پڑھتے:

أَنَــا ابْــنُ الْاَكْــوَع   وَالْيَوْمُ يَوْمُ الرُّضَّع

میں ہوں اکوع کا بیٹا   یہ چھٹی کا دودھ یاد کرانے کا دن ہے

اوراس قدر تیر باری کی کہ ڈاکوؤں کو اُونٹ چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا اور وہ بدحواسی میں اپنی چادریں بھی چھوڑ گئے۔اس اثنا میں آنحضور ﷺ بھی لوگوں کو لے کر پہنچ گئے۔سلمہؓ نے عرض کیا، یارسول اللہؐ میں نے ان لوگوں کو پانی نہیں پینے دیا ہے۔اگر ابھی ان کا تعاقب کیا جائے تو مل جائیں گے،لیکن رحمت عالم ﷺ نے فرمایا کہ قابو پانے کے بعد درگزر کرو۔

اس واقعے کے چند روز بعد خیبر کی مہم میں داد شجاعت دی۔فتح خیبر کے بعد اس شان سے لوٹے کہ آنحضور ﷺ کے دست مبارک میں ہاتھ دیئے ہوئے تھے۔حضرت سلمہؓ نے چودہ غزوات میں شرکت کی۔ان میں سے سات میں آنحضور ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا اور سات وہ تھے جو آنحضور ﷺ نے مختلف اطراف میں بھیجے۔وہ آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد برابر مدینہ میں رہے۔حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مدینہ چھوڑ کر ربذہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔74ہجری میں پھر مدینہ واپس ہوئے اور اُسی سال وفات پائی۔

حضرت سلمہؓ بن اکوعؓ آنحضرت ﷺ کے شرف صحبت سے بھی فیض یاب تھے اور غزوات میں آنحضور ﷺ کے ہم رکاب رہنے کا زیادہ موقع ملا تھا اور آپ ﷺ کے خاص صحابہؓ سے بھی استفادہ کرتے تھے۔چنانچہ رسول اکرم ﷺ کے علاوہ حضرت عمرؓ،حضرت عثمانؓ اور حضرت طلحہؓ سے بھی روایتیں کی ہیں۔اس لیے ان کی مرویات کی تعداد 77 تک پہنچ جاتی ہے جن میں سے 16 متفق علیہ ہیں اور 5 میں صحیح بخاری اور 9 میں صحیح مسلم منفرد ہیں۔

سہلؓ بن حُنَیف انصاری

ان کا تعلق قبیلہ اوس سے تھا۔اپنے چھوٹے بھائی حضرت عثمانؓ بن حنیف کے ساتھ ہجرت نبوی ﷺ سے پہلے اسلام قبول کیا۔حضرت علیؓ ان کے مواخاتی بھائی تھے (لیکن جمہور کا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا بھائی قرار دیا)۔غزوۂ بدر میں شرکت کے بعد غزوۂ اُحد میں جب ایک ناگہانی اُفتاد سے مسلمانوں میں انتشار پھیلا اور سرور عالم ﷺ صرف چند جاں نثاروں کے ساتھ میدان کارزار میں رہ گئے تو حضرت سہلؓ یہ کہہ کر آگے بڑھے: ''یارسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ ﷺ میری آڑ میں رہیے۔خدا کی قسم، جب تک میری جان میں جان ہے۔میں آپ ﷺ کی حفاظت کروں گا، اور یہاں سے قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔'' مشرکین کی طرف سے حضور ﷺ کی طرف جو تیر آتا، وہ اسے روکتے اور جواب میں خود مشرکین پر تیر برساتے۔حضور ﷺ کو ان کا جذبہ فدویت بہت پسند آیا۔آپ ﷺ بار بار دوسرے صحابہؓ سے فرماتے: ''ان کو تیر دو، یہ سہل ہیں۔''

بیعت رضوان،غزوۂ احزاب، خیبر، فتح مکہ، حنین، طائف اور تبوک کے غزوات میں آنحضور ﷺ کے ہم رکاب رہے۔آنحضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت علیؓ کے عہد میں مختصر مدت کے لیے مدینہ کے امیر مقرر ہوئے۔جنگ جمل کے بعد حضرت علیؓ نے مختلف صوبوں میں ولاۃ کا تقرر کیا تو حضرت سہلؓ کو امیر معاویہؓ کی جگہ شام کا والی نامزد کیا،لیکن شام پر امیر معاویہؓ کی گرفت بہت مضبوط تھی۔حضرت سہلؓ نے واپس آکر حضرت علیؓ کو بتایا کہ امیر معاویہؓ نے آپ کی مخالفت کی راہ اختیار کی ہے اور اہل شام نے ان کی بیعت کر لی ہے۔اس واقعے کے بعد حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان جنگ صفین کا آغاز ہوا تو حضرت سہلؓ نے حضرت علیؓ کی طرف سے جنگ میں بھر پور حصہ لیا۔اس موقع پر جو وثیقہ تحکیم قلم بند کیا گیا تو جن بزرگوں نے حضرت علیؓ کی طرف سے اس پر شہادت ثبت کی، حضرت سہلؓ ان میں شامل تھے۔انھوں نے 38ہجری میں بمقام کوفہ وفات پائی۔حضرت علیؓ نے چھ تکبیروں کے ساتھ نماز پڑھائی۔ان کا شمار روایات حدیث میں ہوتا ہے۔ان سے چالیس احادیث مروی ہیں۔

سہیلؓ بن عمرو

سہیل بن عمرو بن عبد شمس، قرشی، عامری۔ان کا شمار قریش کے بااثر رؤسا میں ہوتا تھا۔آنحضور ﷺ نے دعوت اسلام کا آغاز فرمایا تو ابولہب، ابوسفیان، عتبہ بن ابی معیط، امیہ بن خلف وغیرہ دوسرے رؤسائے قریش کی طرح سہیل نے بھی آپ ﷺ کی شدید مخالفت کی۔وہ ایک شعلہ نوا مقرر اور سحر البیان خطیب تھے۔لیکن قدرت خداوندی سے ان کے دو جوان بیٹوں ابوجندلؓ اور عبداللہ نے ابتدائے بعثت ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔اسی طرح ان کی دو شادی شدہ بیٹیوں سہلہؓ اور ام کلثومؓ نے اپنے شوہروں (حضرت ابوحذیفہؓ اور ابوسبرہؓ بن ابی رہم) سمیت اسلام قبول کیا اور یہ سب سابقون الاولون میں شمار ہوئے۔باپ نے اپنے بیٹوں پر سخت تشدد کیا، بالخصوص ابوجندلؓ کو زنجیریں باندھ کر قید کر دیا۔

غزوۂ بدر، اُحد اور احزاب میں مشرکین کی طرف سے شریک ہوئے۔صلح حدیبیہ کے موقع پر مشرکین مکہ کے وکیل اور نمائندے کی حیثیت سے شریک ہوئے۔فتح مکہ کے موقع پر اپنے بیٹے ابوجندل کی سفارش پر اللہ کی امان میں آئے۔بعد ازاں آنحضور ﷺ نے سہیل بن عمرو کی سفارش پر ارشاد فرمایا: ''اے برادران قریش، میں آپ لوگوں سے وہی کہتا ہوں جو حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: ''لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ'' آج تم لوگوں پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔جائیے آپ سب آزاد ہیں۔''

چند دن بعد جب حضور ﷺ غزوۂ حنین سے واپس تشریف لا رہے تھے تو وہ جعفرانہ کے مقام پر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گئے۔آنحضور ﷺ نے انھیں تالیف قلب کے طور پر ہوازن کے مال میں سے سو اُونٹ مرحمت فرمائے۔اسلام لانے کے بعد وہ مثالی مرد مومن بن گئے تھے۔

نماز، روزہ، زکوٰۃ کی ادائیگی کا خاص خیال رکھتے۔کثرت عبادت سے ان کا بدن سوکھ گیا تھا۔اور رنگ سنولا گیا تھا۔اپنے گزشتہ اعمال کو یاد کر کے بہت رویا کرتے تھے۔حضور ﷺ کے وصال کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں ارتداد کے فتنے نے سارے عرب میں قیامت برپا کر دی تو حضرت سہیلؓ نے اپنی استقامت و جرأت اور خطابت کا مظاہرہ کیا کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔قریش مکہ کو اس موقع پر

راہِ راست پر رکھنا ان کا عظیم کارنامہ ہے۔ انھوں نے جنگ یرموک کے ایک معرکے میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔

شجاعؓ بن وہب

شجاع نام، ابو وہب کنیت۔ والد کا نام وہب تھا۔ انھوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور مشرکین کے ظلم و ستم سے مجبور ہو کر حبشہ کی دوسری ہجرت میں شریک ہوئے تھے۔ حبشہ میں جب یہ افواہ پھیلی کہ تمام قریش مکہ نے آنحضور ﷺ کے سامنے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے تو مکہ واپس آئے، لیکن یہاں پہنچ کر افواہ غلط ثابت ہوئی، اس لیے مدینہ پہنچے اور وہاں حضرت اوس بن خولیؓ سے مواخات ہوئی۔

بدر، اُحد اور دوسرے مشہور غزوات میں شریک ہوئے۔ ربیع الاوّل 8 ہجری میں بنو ہوازن کی ایک جماعت کی سرکوبی پر مامور ہوئے۔ حضرت شجاع نے مشرکین کو شکست فاش دی اور مالِ غنیمت کثرت سے حاصل کیا۔

صلح حدیبیہ سے واپس آنے کے بعد آنحضور ﷺ نے اکثر سلاطین کے پاس دعوتِ اسلام کے خطوط روانہ فرمائے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت شجاع کو بھی حارث ابن ابی شمر غسانی کے پاس (جو دمشق کے قریب مقام غوطہ کا رئیس تھا) سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ حارث کو اللہ نے دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق نہ دی، لیکن اس کے وزیر مری نے اسلام قبول کیا۔ حضرت شجاعؓ نے چالیس برس سے زیادہ عمر پائی۔ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے۔

شقرانؓ صالح

صالح نام، شقران لقب اور والد کا نام تھا۔ یہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے حبشی نژاد غلام تھے، لیکن اس غلامی میں بھی سیادت مقدر تھی۔ حضور ﷺ نے انھیں اپنی خدمت گزاری کے لیے پسند فرمایا اور حضرت عبدالرحمٰنؓ کو قیمت ادا کر کے خرید لیا۔

حضرت شقرانؓ غزوات میں عموماً مالِ غنیمت اور قیدیوں کی حفاظت پر مامور ہوتے تھے اور غنیمت میں حصہ پانے کے بجائے جن لوگوں کے قیدیوں کی نگرانی کرتے تھے، وہ بطور خود معاوضہ دیتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں انھیں اس قدر معاوضہ ملا کہ مالِ غنیمت میں حصہ پانے والوں سے بھی زیادہ نفع میں رہے۔ غزوۂ بدر میں انھوں نے اس احتیاط اور مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے کہ حضور ﷺ نے خوش ہو کر آزاد فرما دیا۔ حضور ﷺ ان کی خدمات سے اس قدر خوش تھے کہ وصال کے وقت آپ ﷺ نے خاص طور سے ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کی وصیت فرمائی۔ حضرت شقران رسول کریم ﷺ کی تجہیز و تکفین میں اہل بیت کے ساتھ شریک تھے۔ جائے وفات اور زمانہ متعین نہیں۔

صہیبؓ بن سنان رومی

صہیب نام، ابو یحییٰ کنیت، والد کا نام سنان۔ موصل کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے ابتدائی بچپن میں رومیوں نے علاقے پر چڑھائی کی اور دوسرے مال و اسباب کے ساتھ اس نونہال کو بھی ہم راہ لے گئے۔ وہ رومیوں ہی میں پرورش پا کر جوان ہوئے۔ بنی کلب نے انھیں خرید کر مکہ پہنچایا۔ مکہ میں اسلام کا غلغلہ پیدا ہوا تو تفتیش و تحقیق کے خیال سے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اتفاق سے عمار بن یاسر بھی اسی خیال سے آ رہے تھے۔ دونوں نے بیک وقت آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ حضرت صہیبؓ پہلے رومی تھے، جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ رسول کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ صہیبؓ روم کا پہلا پھل ہے۔ آپ اس وقت ارقم بن ابی ارقمؓ کے مکان میں پناہ گزیں تھے اور تیس سے زیادہ صحابہ کرام اس دائرے میں داخل ہو چکے تھے، جن میں سے اکثر نے مشرکین کے خوف سے اسے ظاہر نہیں کیا تھا۔ لیکن حضرت صہیبؓ نے ابتدا ہی میں اپنے تبدیل مذہب کا حال ظاہر کر دیا اور قریش مکہ کے مصائب و مظالم برداشت کیے۔

حضرت صہیبؓ سب سے آخری مہاجر تھے۔ وہ اپنے مال و متاع کے عوض متاعِ ایمان کا سودا خرید کر مدینہ پہنچے۔ حضور ﷺ قبا میں حضرت کلثوم بن ہدمؓ کے مہمان تھے۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ بھی حاضر خدمت تھے۔ کھجوروں کا نقل ہو رہا تھا کہ حضرت صہیبؓ پہنچے اور بھوک کی شدت سے بے تاب ہو کر کھجوروں پر ٹوٹ پڑے۔ چوں کہ سفرِ ہجرت میں ان کی ایک آنکھ آشوب کر آئی تھی، اس لیے حضرت عمرؓ نے تعجب سے کہا: ''یارسول اللہ، آپ صہیبؓ کو ملاحظہ نہیں فرماتے کہ ان کی آنکھ دکھ رہی ہے اور یہ کس شوق سے کھجوریں اُڑا رہے ہیں۔''

چوں کہ آشوب چشم کی حالت میں کھجور کھانا مضر ہوتا ہے، اس لیے حضور ﷺ نے حضرت صہیبؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''سبحان اللہ، تمھاری آنکھ آئی ہے اور کھجوریں کھا رہے ہو۔''

حضرت صہیبؓ نے عرض کیا: ''یارسول اللہ، مَیں اُس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جو اچھی ہے۔''

ان کا جواب سن کر سرورِ عالم ﷺ اس قدر ہنسے کہ دندان مبارک کا نور ظاہر ہونے لگا۔

کھجوروں سے فارغ ہو کر حضرت صہیبؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: ''واہ صاحب، آپ خود تو رسول اللہ کے ہم راہ آ گئے اور مجھے ساتھ نہ لیا۔''

پھر حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی: ''یارسول اللہ، میرے ماں باپ آپ پر قربان، آپ ﷺ نے بھی اس عاجز کا خیال نہ فرمایا۔ میں مکہ میں تنہا رہ گیا اور قریش مجھ پر چڑھ دوڑے۔ اپنا مال و اسباب سب کچھ انھیں دے کر بڑی مشکل سے جان چھڑائی اور آپ تک پہنچا۔''

حضور ﷺ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''ابو یحییٰ تم نے بڑی نفع مند تجارت کی۔ ابو یحییٰ، تم نے بڑی نفع مند تجارت کی۔ اس کے ساتھ ہی وحی الٰہی کے یہ الفاظ حضور ﷺ کی زبان پر جاری ہو گئے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ ۢ بِالْعِبَادِ﴾ (البقرہ: 207)

''لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اپنی جانیں اللہ کی رضا کے لیے بیچ دیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔''

حضرت صہیبؓ نے قبا میں حضرت سعدؓ بن خثیمہ اوسی کے ہاں قیام فرمایا۔ حضرت حارث بن صمہ بخاری انصاری سے مواخات ہوئی۔ غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو بدر سے تبوک تک تمام معرکوں میں حضور ﷺ کی ہم رکابی کا شرف حاصل کیا۔ انھیں تیراندازی اور تیغ زنی میں کمال درجے کی مہارت تھی۔ حضرت عمرؓ ان سے نہایت حسن ظن رکھتے تھے اور خاص لطف ومحبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے وفات کے وقت وصیت فرمائی کہ صہیبؓ ہی ان کی نماز جنازہ پڑھائیں، اور جب تک اہل شوریٰ مسئلہ خلافت کا فیصلہ نہ کریں، وہی امامت کا فرض دیں۔ چنانچہ انھوں نے تین روز تک نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ سہ روزہ خلافت کے فرائض سرانجام دیئے۔

حضرت صہیبؓ رومی نے اگرچہ سال ہا سال تک رسول کریم ﷺ کی صحبت بابرکات سے اکتساب فیض کیا، لیکن روایت حدیث میں حد درجہ محتاط تھے۔ اسی لیے ان کی مرویات کی تعداد بہت کم ہے۔ انھوں نے ماہ شوال 38 ہجری میں تقریباً 72 سال کی عمر میں وفات پائی۔ مدینہ منورہ میں جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

ضحاکؓ بن سفیان

نام ضحاک، لقب سیاف رسول ﷺ یعنی رسول اللہ کے شمشیر بردار محافظ۔ تعلق بنوکلاب سے تھا، اس لیے ضحاک کلابی بھی کہلاتے ہیں۔ اکثر تلوار اٹھائے حفاظت کی غرض سے رسول اکرم ﷺ کے پاس کھڑے رہتے تھے۔ فتح مکہ سے پہلے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ متعدد غزوات میں شریک ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے بنوقرطا کے خلاف ایک مہم روانہ فرمائی تو اس کی قیادت پر حضرت ضحاکؓ کو مامور فرمایا۔ غزوۂ حنین میں بنوسلیم کے مجاہدین کی کمان حضرت ضحاک کے سپرد تھی۔ آنحضور ﷺ نے جعرانہ سے واپسی پر حضرت ضحاک کو بنوکلاب سے زکوۃ وصول کرنے کی خدمت سپرد کی۔ ربیع الاول 9 ہجری میں آنحضور ﷺ نے خود حضرت ضحاک کے قبیلے بنوکلاب کی طرف ایک مہم روانہ فرمائی، جس کا مقصد بنوکلاب کے مشرکین کی تادیب کرنا اور انھیں تعلیم دینا تھا۔ حضور ﷺ نے اس مہم کا قائد حضرت ضحاک ہی کو بنایا اور یہ مہم انھی کے نام پر ''سریہ ضحاک کلابی'' سے مشہور ہوئی۔ 11 ہجری میں آنحضور ﷺ کی رحلت کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں جب فتنہ ارتداد اٹھا اور قبیلہ بنو سلیم بھی ارتداد کی لپیٹ میں آ گیا تو ان کی سرکوبی کے لیے حضرت ضحاک کو روانہ کیا گیا۔ وہ بنوسلیم کے مُرتدین کے خلاف بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ وہ بنیادی طور پر ایک سپاہی تھے، اس لیے انھیں حدیث بیان کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ صرف چار حدیثیں ان سے مروی ہیں۔

ضرار بن ازور اسدیؓ

ان کی کنیت ابوالازور اور ابوبلال تھی۔ اسلام لانے سے قبل بنواسد کے حریف شمار ہوتے تھے۔ ان کے ایک ہزار اونٹ تھے، جنھیں چرانے پر کئی چرواہے مقرر تھے، لیکن جب اللہ نے قبول اسلام کی توفیق بخشی اور رسولِ کریم ﷺ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے مدینہ منورہ میں وارد ہوئے تو اپنا مشہور ''لامیہ قصیدہ'' حضور کی خدمت میں پیش کیا۔ اس قصیدے کے جو اشعار سیرت نگاروں نے نقل کیے ہیں، ان کا مفہوم یہ ہے کہ میں دنیوی عیش وعشرت، مال و دولت اور اہل وعیال کو چھوڑ کر، مشرکین کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ میں شامل ہو گیا ہوں اور اگر خدا نے چاہا تو یہ سودا خسارے کا نہیں ہوگا۔

رسول کریم ﷺ نے اپنی رحلت سے قبل مختلف قبائلی سرداروں کے پاس جن لوگوں کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا، ان میں ضرار بھی تھے۔ انھیں قبیلہ بنواسد کی ایک شاخ بنوالصید اکے سردار عوف زرقانی کے پاس بھیجا گیا تھا۔ بنواسد کے طلیحہ بن خویلد اسدی نے مُرتد ہو کر جب نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا تو رسول اللہ کے حکم سے حضرت ضرار نے دربار رسالت ﷺ کے عمال کو بنواسد کی نگرانی کا کام جاری رکھنے کا مشورہ دیا، مگر وہ طلیحہ کے اقتدار اور قوت سے گھبرا گئے۔ اس موقع پر حضرت ضرارؓ نے واردات کے مقام پر بنواسد کے مسلمانوں کو طلیحہ کے خلاف جمع کیا، مگر طلیحہ پر کاری ضرب لگانے سے پہلے لوگوں میں حضور ﷺ کی رحلت کی خبر پھیل گئی اور سب طلیحہ کی طرف دوڑنے لگے۔ چنانچہ حضرت ضرار ﷺ رسول کریم ﷺ کے عمال کو ساتھ لے کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور انھیں صورت حال سے آگاہ کیا۔

جنگ ارتداد اور دیگر فتوحات میں وہ حضرت خالدؓ بن ولید کے لشکر میں شامل رہے اور ہر میدان میں بے مثال بہادری کا مظاہرہ کیا۔ حضرت خالدؓ نے بنوتمیم کو راہِ راست پر لانے کے لیے جو مختلف دستے متعدد اطراف میں روانہ کیے، ان میں سے ایک دستہ حضرت ضرار بن ازور کی قیادت میں روانہ ہوا، جس کا سامنا مالک بن نویرہ اور اس کے ساتھیوں سے ہوا۔ شدید لڑائی کے بعد ضرارؓ ان سب کو گرفتار کر لائے اور سب کی گردنیں ماردی گئیں۔ جنگ یمامہ کے موقع پر بھی وہ حضرت خالدؓ کے ساتھ تھے، جہاں انھوں نے خوب دادشجاعت دی، حتّٰی کہ میدان جنگ میں دونوں پنڈلیاں کٹ گئیں تو گھٹنوں کے بل چل کر لڑنے لگے اور کفار کے گھوڑے انھیں روندتے رہے اور بالآخر شہادت نصیب ہوئی۔ ان کی وفات 11 ہجری 633 عیسوی میں ہوئی۔ انھوں نے حیرہ، قادسیہ، یرموک، دمشق اور حلب کی فتوحات میں بھی شرکت کی تھی۔

ضمادُ الازدیؓ

ضماد نام، باپ کا نام ثعلبہ تھا۔ قبیلہ ازدشنوءہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جھاڑ پھونک اور طبابت کا کام کرتے تھے۔ قریش مکہ میں ان کی بڑی عزت وتکریم تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً مکہ آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں جنھیں قبول اسلام سے پہلے ہی آنحضور ﷺ کی دوستی کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔ بعثت نبوی ﷺ کے کچھ عرصہ بعد وہ کسی کام سے مکہ آئے۔ یہاں مشرکین نے مشہور کر رکھا تھا کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ مجنون ہو گئے ہیں اور بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ ضمادؓ یہ سن کر بہت پریشان

ہوئے۔ وہ بارگاہ رسالتؐ میں حاضر ہوئے اور کہا، محمد ﷺ آپ کو کیا ہوا ہے۔ میں آپ کا علاج کرتا ہوں۔ حضور ﷺ نے ان کے ہمدردانہ مشورے کے جواب میں پہلے کلمہ شہادت پڑھا۔ پھر اللہ کی حمد کی اور اس کے بعد کچھ کلمات ارشاد فرمائے (یا بقول بعض قرآن حکیم کی آیات پڑھیں)

ضمادؓ کو آنحضور ﷺ کی باتیں پسند آئیں۔ انھوں نے کہا کہ پھر پڑھیے۔ آپ ﷺ نے تین مرتبہ اعادہ کیا۔ ضمادؓ بے ساختہ پکار اٹھے، مَیں نے کاہنوں کا کلام سنا ہے، ساحروں کی سحر بیانی سنی ہے، شعرا کا کلام سنا ہے، مگر جو کچھ آپ سے سنا ہے، اس سے پہلے کبھی کسی سے نہیں سنا، یہ تو سمندروں کی تہ تک پہنچتا ہے۔ میں خدائے واحد پر ایمان لاتا ہوں اور شہادت دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ قبول اسلام کے بعد انھوں نے اپنی طرف سے اور اپنے قبیلے کی طرف سے حضور ﷺ کی بیعت کی اور پھر اپنے وطن چلے گئے۔ ان کے حالات زندگی اگرچہ دستیاب نہیں، لیکن ان کا یہ شرف کچھ کم نہیں کہ وہ محسن انسانیت کے دوست اور شیدائی تھے۔

طلحہؓ بن عبیداللہ

طلحہ نام، ابومحمد کنیت، فیاض اور خیر لقب۔ والد کا نام عبیداللہ اور والدہ کا نام صعبہؓ تھا۔ ان کا نسب چھٹی ساتویں پشت میں رسول کریم ﷺ سے مل جاتا ہے۔ وہ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، یعنی ان اصحابؓ میں سے، جن کے جنتی ہونے کا اعلان کیا گیا تھا۔ وہ قریش کے بنوتمیم بن مرہ میں سے تھے۔ ان کی کنیت اپنے بیٹے کی نسبت سے ابومحمد تھی۔ وہ اپنی نیکی کی وجہ سے مشہور تھے اور سب سے پہلے قاریوں میں سے تھے۔ دونوں باپ بیٹے 36 ہجری میں جنگ جمل میں شہید ہوئے۔

حضرت طلحہؓ اولین اسلام لانے والوں میں سے تھے۔ حدیث میں ہے کہ انھوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ قریش کی دھمکیاں اور بدسلوکیاں برداشت کیں۔ انھوں نے حضرت نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہجرت کی، اور تب سے ان کا شمار آپ ﷺ کے مشیروں اور جاں نثار صحابہ میں ہوتا ہے۔ غزوۂ بدر میں انھیں قریش مکہ کے کارواں کے نقل وحرکت معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس لیے وہ وقت پر نہ پہنچ سکے اور جنگ میں شریک نہ ہو سکے۔ تاہم انھیں دوسرے مہاجرین کی طرح مال غنیمت سے برابر کا حصہ ملا۔ غزوۂ احد میں انھوں نے خاص طور پر داد شجاعت دی اور خطرے کے وقت رسول کریم ﷺ کو بچانے کی خاطر برابر سینہ سپر رہے۔ انھیں چوبیس زخم آئے اور ایک ضرب سے تو ان کی دو انگلیوں کی نسیں ہی کٹ گئیں، جن کی وجہ سے ان کا ہاتھ شل ہو گیا۔ اس بہادری اور جاں نثاری کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی زندگی میں اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی ان کی بڑی قدر و منزلت رہی۔ غزوۂ احد کے بعد بھی حضرت طلحہؓ رسول کریم ﷺ کی رفاقت میں تمام غزوات میں نمایاں طور پر شریک رہے۔ بیعت رضواں میں بھی موجود تھے۔ فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین میں بھی بہادری اور جاں نثاری کے جوہر دکھائے۔

حضرت طلحہؓ جتنے صاحب ثروت اور دولت مند تھے، اتنے ہی فیاض اور سخی بھی تھے۔ ان کی شجاعت کے کارناموں کی وجہ سے آنحضور ﷺ نے انھیں "طلحة الخیر" کا لقب عطا کیا تھا اور چوں کہ وہ غزوات نبوی ﷺ کے مصارف کے لیے گراں قدر رقوم پیش کرتے رہے اور انھوں نے مسلمانوں کی ضرورت کے پیش نظر، پانی کا ایک چشمہ خرید کر وقف کر دیا تھا۔ غزوہ العسرة میں عام مسلمانوں کے کھانے کے اخراجات برداشت کیے تھے۔ غزوۂ تبوک کے سلسلے میں ہونے والے مصارف جنگ میں زر کثیر صرف کیا تھا۔ لہٰذا ان خدمات کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے انھیں طلحة الخیر اور طلحة الفیاض کے القاب سے نوازا۔ یہ القاب ان کی سخاوت اور فیاضی پر دلالت کرتے ہیں۔ حضرت قبیصہؓ بن جابر کہتے ہیں کہ مَیں ایک مدت تک حضرت طلحہؓ کے ساتھ رہا اور مَیں نے ان سے بڑھ کر کسی کو بغیر مانگے، مال کثیر دینے والا نہیں دیکھا۔

حضرت طلحہؓ بنوتمیم کے غریب اور محتاج لوگوں کی کفالت کرتے تھے۔ مقروضوں کے قرض ادا کر دیتے تھے اور قبیلے کے غریب خاندانوں کی لڑکیوں کی شادی کر دیتے تھے۔ انھیں حضرت عائشہؓ سے بھی بڑی عقیدت تھی اور وہ ہر سال ان کی خدمت میں دس ہزار درہم پیش کیا کرتے تھے۔

حضرت طلحہؓ کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں آ جانے کے بعد زراعت بھی شروع کر دی۔ خیبر کی جاگیر کے علاوہ عراق عرب میں متعدد قطعات اراضی حاصل کر لیے اور کاشت کاری کا وسیع پیمانے پر اہتمام کیا۔ بیسیوں اونٹ کھیتوں کی سیرابی کا کام کرتے تھے۔ ان کھیتوں کی پیداوار کی فراوانی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی روزانہ آمدنی کا اوسط ایک ہزار درہم تھا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں حضرت طلحہؓ ان کے خاص مشیروں میں شامل تھے اور ان کے مشوروں کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد وہ ان چھے بزرگ صحابہؓ میں شامل تھے، جنھیں خلیفہ منتخب کرنے کے لیے نام زد کیا گیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد وہ اور حضرت زبیرؓ دونوں حضرت عثمانؓ کے قاتلوں سے قصاص لینے کی مہم میں شامل ہو گئے اور غلط فہمیوں کے پھیل جانے سے نوبت جنگ جمل تک جا پہنچی اور اسی معرکے میں 36 ہجری میں حضرت طلحہؓ نے شہادت پائی۔

حضرت طلحہؓ نے مختلف اوقات میں کئی شادیاں کیں۔ ان کی ازواج میں حمنہؓ بنت جحش، ام کلثومؓ بنت ابی بکر صدیقؓ، سعدیؓ بنت عوف، ام ابانؓ بنت شیبہ بن ربیعہ اور خولہؓ بنت القعقاع کے اسمائے گرامی ملتے ہیں۔ ان ازواج سے دس بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ان کی اولاد کئی نسلوں تک بڑے بڑے منصبوں پر فائز رہی۔ ان کی ایک صاحب زادی ام اسحٰق حضرت حسنؓ بن علیؓ کے نکاح میں آئیں اور ان کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ بن علیؓ کے عقد نکاح میں آئیں اور انھی کے بطن سے فاطمہؓ بنت حسینؓ پیدا ہوئیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پوتے عبداللہ بن عبدالرحمٰن اور حضرت مصعب بن زبیرؓ بن العوام بھی حضرت طلحہؓ کے داماد تھے۔ مکہ مکرمہ میں حضرت طلحہؓ اور حضرت سعیدؓ بن زید کے درمیان مواخات قائم کی گئی اور مدینہ منورہ میں حضرت طلحہؓ اور

حضرت ابیؓ بن کعب کے درمیان۔

طفیلؓ بن عمر دوسی

طفیل نام، ذوالنور لقب، دوس کے قبیلے سے تھے۔ یہ قبیلہ یمن کے ایک گوشے میں آباد اور خاصا طاقت ور تھا۔ ایک قلعہ بھی ان کے پاس تھا۔ وہ تجارت پیشہ تھے اور تجارت کی غرض سے مکہ معظمہ آتے رہتے تھے۔ ہجرت سے دو سال قبل، جس زمانے میں آنحضور ﷺ مکہ معظمہ میں دعوت اسلام دے رہے تھے، اس زمانے میں طفیل کا مکہ آنا ہوا۔ اہل مکہ نے شہر سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔

طفیل کے اپنے بیان کے مطابق اہل مکہ نے اسے حضور ﷺ کے متعلق بتایا کہ ''یہ شخص جو ہم میں سے نکلا ہے، اس سے ذرا بچ کے رہنا۔ اسے جادو آتا ہے، جس کی وجہ سے باپ بیٹے، میاں بیوی اور بھائی بھائی میں جدائی ڈال دیتا ہے، اس نے ہمارے اتحاد اور یک جہتی کو درہم برہم اور ہمارے کاموں کو ابتر کر دیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمھاری قوم پر بھی ایسی ہی کوئی مصیبت پڑے، اس لیے ہماری نصیحت یہ ہے اس شخص کے پاس بھی نہ پھٹکنا، نہ اس کی بات پر دھیان دینا اور نہ خود بات چیت کرنا۔

طفیل کا کہنا ہے: ''یہ باتیں اہل مکہ نے ایسی عمدگی سے میرے ذہن نشین کر دیں کہ جب میں کعبے میں جانا چاہتا تو کانوں میں روئی ٹھونس لیتا، مبادا کہ محمد ﷺ کی آواز کی بھنک بھی میرے کانوں میں پڑ جائے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں علی الصباح خانہ کعبہ میں گیا۔ اس وقت نبی کریم ﷺ نماز پڑھ رہے تھے۔ چنانچہ خدا کی مرضی یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ کی آواز میرے کانوں تک ضرور پہنچے، اس لیے میں نے سنا کہ آپ ﷺ ایک نہایت ہی عجیب کلام پڑھ رہے ہیں۔ اس وقت میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا کہ میں خود شاعر ہوں، باعلم ہوں، اچھے بُرے کی تمیز رکھتا ہوں، پھر کیا وجہ ہے اور کون سی رکاوٹ ہے کہ میں آنحضرت ﷺ کی بات نہ سنوں۔ اگر اچھی بات ہوگی تو قبول کروں گا، ورنہ انکار کر دوں گا۔ میں اس ارادے سے ٹھہر گیا۔ آخر جب نبی کریم ﷺ گھر کو چلے تو میں بھی آپ کے پیچھے پیچھے چل پڑا اور جب مکان پر حاضر ہوا تو میں نے اپنا یہ تمام واقعہ حضور ﷺ کو سنایا، کہ میں کس طرح یمن سے مکہ آیا۔ لوگوں کے بہکانے سے کانوں میں رُوئی رکھ کر خانہ کعبہ میں آتا جاتا رہا، اور آج حضور ﷺ سے ایک عجیب پُر لطف کلام سنا، جو میرے دل میں گھر کر گیا ہے۔ میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے آپ ﷺ اپنی بات سنائیں۔ حضور ﷺ نے میری درخواست قبول کرتے ہوئے قرآن حکیم پڑھا۔ بخدا، میں نے ایسا پاکیزہ کلام کبھی سنا ہی نہ تھا، جو اس قدر نیکی اور انصاف کی ہدایت کرتا ہو۔''

الغرض طفیل نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔ یمن واپس پہنچ کر اپنے والد، بیوی اور دیگر ہم قبیلہ لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ادھر مکہ میں مشرکین کا جور و ستم بڑھتا جاتا تھا اور ذاتِ نبوی ﷺ کے ساتھ بھی گستاخیاں کرنے میں انھیں باک نہ تھا۔ طفیل نے آنحضور ﷺ کو اپنے مضبوط قلعے میں منتقل ہونے کی دعوت دی اور آپ ﷺ کی حفاظت کی ذمہ داری لی، لیکن یہ فخر انصار کے لیے مقدر ہو چکا تھا، اس لیے آپ نے ان کی دعوت قبول نہ فرمائی۔

ہجرت کے بعد اس وقت مدینہ آئے جب بدر، اُحد اور احزاب کی لڑائیاں ختم ہو چکی تھیں اور خیبر کی تیاریاں شروع تھیں۔ ان کے ہم راہ تقریباً 80 گھرانوں کے لوگ تھے۔ یہ پورا قافلہ خیبر روانہ ہو گیا اور غزوۂ خیبر میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد سے فتح مکہ تک آنحضور ﷺ کے ہم رکاب رہے۔ اگرچہ قبیلہ دوس کے اکثر خانوادے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے، تاہم مدتوں کے عقائد دفعۃً بدل نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ ''ذوالکفین'' نامی بت کا صنم کدہ باقی تھا اور بہت سے لوگ اس کی پوجا کرتے تھے، لیکن طفیلؓ دوس کے دامن پر شرک کا ایک داغ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے، اس لیے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ مجھے ذوالکفین گرانے کی اجازت مرحمت ہو۔ حضور ﷺ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ کچھ دوسیوں کو ہم راہ لے کر گئے اور بت کدہ ڈھا کر بت میں آگ لگا دی اور یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

یا ذوالکفین لست من عبادکا

میلادنا اقدم من میلادکا

انی حششت النار فی فوادکا

''اے دو ہاتھوں والے بت! اب میں تیرے پرستاروں میں نہیں ہوں۔ میری پیدائش تیری پیدائش سے قدیم ہے۔''

حضرت طفیلؓ غزوۂ طائف میں بھی شریک ہوئے۔ طائف سے واپسی کے بعد وہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں مستقل طور سے رہنے لگے اور تا وفات نبوی ﷺ آپ کے قدموں سے جُدا نہ ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں فتنہ ارتداد میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا اور طلیحہ و نجد کے فتنوں سے فراغت کے بعد جنگ یمامہ میں شریک ہوئے اور 11 ہجری میں اسی جنگ میں جام شہادت پیا۔

عاصمؓ بن ثابت

عاصم بن ثابت بن ابی افلح۔ ان کا تعلق انصار کے قبیلہ اوس سے تھا۔ جب حضرت مصعبؓ بن عمیر کی تبلیغ سے یثرب کے گھر گھر میں اسلام کا چرچا ہوا تو حضرت عاصمؓ نے بھی کسی تامل کے بغیر اسلام قبول کیا۔ وہ قدر اندازی، نیزہ بازی اور شمشیر زنی میں کمال درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ غزوۂ بدر کے دن آنحضور ﷺ نے انھیں مخاطب ہو کر دریافت فرمایا: ''تم دشمن سے کس طرح لڑو گے؟'' انھوں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ جب دشمن سو گز کے فاصلے پر ہوگا تو ہم اس پر تیر برسائیں گے۔ جب وہ آگے بڑھ کر نیزے کی زد میں آئے گا تو ہم نیزوں سے لڑیں گے اور جب اس سے بھی آگے آئے گا تو ہم تلواروں سے اس کا مقابلہ کریں گے۔'' حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں لڑنے کا یہی صحیح طریقہ ہے۔ تم لوگ اسی طرح لڑنا۔'' مشہور دشمن دین عتبہ بن ابی معیط کو، جس نے ایک دن حضور ﷺ کے دوش مبارک پر اس وقت اونٹ کی نجس اوجھ رکھی تھی جب آپ ﷺ مسجد حرام میں سربہ سجود تھے، حضرت عاصمؓ ہی نے ہلاک کیا تھا۔

صفر 4 ہجری میں ''رجیع'' کا دردناک سانحہ پیش آیا۔ بنو ہذیل اور قارہ کے کچھ لوگ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے قبیلے نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لہٰذا چند لوگ ہمارے ساتھ کر دیجیے، جو ہمیں قرآن حکیم پڑھائیں اور اسلام کی تعلیم دیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کی درخواست قبول فرماتے ہوئے حضرت عاصمؓ کی سرکردگی میں صحابہؓ کی ایک جماعت روانہ کی، جن کی تعداد چھے بتائی جاتی ہے۔ یہ لوگ جب مقام رجیع پر پہنچے جو مکہ اور عسفان کے مابین واقع ہے تو ان غداروں نے مسلمانوں کے ساتھ بدعہدی کی اور آواز دے کر بنی ہذیل کو بلایا۔ بنی ہذیل دو سو آدمی لے کر، جن میں سو آدمی تیرانداز تھے، مسلمانوں کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ جب وہ قریب پہنچے تو حضرت عاصمؓ اپنے رفقا کے ساتھ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور لڑائی پر آمادہ ہوئے۔

مشرکین نے کہا کہ آپ لوگ ٹیلے سے نیچے اتر آئیں۔ ہم آپ کو امان دیتے ہیں۔ ہمارا مقصود لڑائی کرنا نہیں، بلکہ صرف تمھیں آزمانا تھا کہ اگر اہل مکہ سے مقابلہ ہو جائے تو تم لوگ ان کے مقابلے پر ٹھہر سکو گے یا نہیں، مگر حضرت عاصمؓ اور ان کے دو ساتھیوں مرثدؓ اور خالدؓ نے کہا کہ مشرکین کا عہد قطعاً قبول نہ کریں گے اور پھر تیروں سے مقابلہ کیا۔ جب تیر ختم ہو گئے تو تینوں صحابہؓ نے نیزے سنبھال لیے۔ حضرت عاصمؓ نے جوش میں آ کر ساتھیوں سے کہا: ''تمہارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے، مگر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شہادت کو غنیمت جانو۔ تمھارا محبوب تمھارے ساتھ ہے اور جنت کی حوریں تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔'' یہ الفاظ سنتے ہی صحابہؓ نہایت بے جگری سے لڑے۔ حتٰی کہ جب نیزے ٹوٹ گئے تو تلواریں نکال لیں، مگر کفار کی تعداد زیادہ ہونے کے باعث کچھ پیش نہ گئی اور تینوں شہید ہو گئے۔ شہادت کے وقت حضرت عاصمؓ نے دعا کی: ''یا اللہ، اپنے رسول ﷺ کو ہمارے حال سے آگاہ فرما دے۔''

اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ دعا قبول فرمائی اور اسی وقت آنحضور ﷺ کو اس واقعے کا علم ہو گیا۔ حضرت عاصمؓ چوں کہ یہ بھی سن چکے تھے کہ سلافہ نے، جس کے دو بیٹوں کو حضرت عاصمؓ نے غزوۂ اُحد میں قتل کیا تھا، میرے کاسہ سر میں شراب پینے کی منت مانی ہے، اس لیے دم آخر اللہ سے یہ دعا بھی کی کہ ''یا اللہ، میرا سر تیرے راستے میں کاٹا جا رہا ہے۔ سو تو ہی اس کا محافظ ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ چنانچہ شہادت کے بعد جب کفار نے آپ کا سر کاٹنے کا ارادہ کیا تو اللہ کے حکم سے شہد کی مکھیوں (یا بھڑوں) کے ایک غول نے آپ کے جسد خاکی کو گھیر لیا۔ کفار نے خیال کیا کہ رات کے وقت جب یہ اڑ جائیں گے تو سر کاٹ لیں گے، مگر رات کو زبردست بارش کا ایک ریلا نعش بہا کر لے گیا اور آپ کے کاسہ سر میں شراب پینے کی حسرت کفار کے دل ہی میں رہ گئی۔

عاقلؓ بن ابی بکیر

حضرت عاقل چار بھائی تھے۔ عاقل، ایاس، خالد اور عامر۔ ان کے والد کا نام ابی بکیر تھا۔ ارقم کے گھر میں قبول اسلام کا آغاز انھی چار بھائیوں سے ہوا تھا۔ چنانچہ آنحضور ﷺ کے ارقم کے گھر میں تشریف لانے کے بعد سب سے پہلے یہی چاروں بھائی مشرف بہ اسلام ہوئے اور سب نے مال بچوں سمیت ایک ساتھ مدینے کی ہجرت کی اور مکہ میں گھر کا دروازہ بالکل بند ہو گیا۔ مدینہ آنے کے بعد چاروں رفاعہ بن عبدالمنذر کے ہاں اُترے۔ چاروں بھائی غزوات میں شریک ہوتے رہے۔ عاقل ان سب میں زیادہ خوش نصیب تھے۔ انھوں نے بدر میں مالک بن زبیر کے ہاتھوں حیات جاوید حاصل کی۔ اس کے بعد خالد نے بدر اور احد کے معرکوں میں شرکت کے بعد سریہ رجیع میں جام شہادت پیا۔ عامر بدر، احد اور خندق میں آنحضور ﷺ کے ہم رکاب رہے اور 13 ہجری میں حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں مُرتدوں کی سرکوبی پر مامور ہوئے اور اس سلسلے کی مشہور جنگ یمامہ میں شہادت حاصل کی۔ سب سے آخر میں ایاس، بدر، اُحد، احزاب، خیبر اور دوسری معرکہ آرائیوں میں شریک ہوتے رہے۔ 34 ہجری میں وفات پائی۔

عامر بن ابی وقاصؓ

عامر نام، والد کا نام ابی وقاص، ماں کا نام حمنہ تھا جو ابوسفیان کی دختر تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت عامر ابوسفیان کے نواسے، مشہور صحابی حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (فاتح ایران) کے حقیقی بھائی اور امیر معاویہؓ کے بھانجے تھے۔ حضرت عامر نے اس وقت اسلام قبول کیا جب مسلمانوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ ایک روایت کے مطابق اسلام لانے والوں میں ان کا دسواں نمبر تھا۔

اس وقت ان کی والدہ حمنہ زندہ تھیں۔ انھیں اپنے بیٹے کی اس ''بے راہ روی'' کا سخت صدمہ ہوا۔ انھوں نے قسم کھائی کہ جب تک عامر اسلام سے تائب نہ ہوں گے، اس وقت تک وہ نہ سایے میں بیٹھیں گی اور نہ کھانا کھائیں گی، اس وقت عامر کے بھائی حضرت سعدؓ بھی اسلام لا چکے تھے۔ ماں کی اس بے جا ضد پر بولے: ''اماں، آپ عامر کے لیے عہد کیوں کرتی ہیں، میرے لیے کیجیے۔'' انھوں نے کہا: ''کیوں؟'' کہا'' تاکہ اس وقت تک آپ نہ سایے میں بیٹھ سکیں اور نہ کھا سکیں، جب تک اپنی جائے قیام دوزخ کو نہ دیکھ لیں۔ انھوں نے جواب دیا ''میں تیرے لیے کیوں عہد کروں۔'' میں اپنے سعادت مند بیٹے کے لیے عہد کرتی ہوں۔ اس پر سورۂ لقمان کی آیت 15 نازل ہوئی (ترجمہ): ''اگر تیرے والدین تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے کو شریک کرے جسے تو نہیں جانتا تو ان کی بات ہرگز نہ مان۔ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ، مگر پیروی اس شخص کے راستے کی کر، جس نے میری طرف رجوع کیا ہے۔''

بالآخر حضرت عامر اپنی مشرک ماں کی بے جا ضد سے تنگ آ کر ہجرت ثانیہ میں حبشہ چلے گئے اور وہاں سے حضرت جعفر کے ساتھ مدینہ آ کر غزوۂ احد میں شریک ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں شام میں وفات پائی۔

عامر بن فہیرہؓ

عامر نام، ابوعمر و کنیت، والد کا نام فہیرہ تھا۔ فہیرہ طفیل بن عبداللہ کے غلام تھے جو حضرت عائشہؓ کے اخیافی بھائی اور قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ حضرت عامرؓ نے اس

وقت اسلام قبول کیا، جب ابھی آنحضرت ﷺ ارقمؓ کے مکان میں پناہ گزیں نہیں ہوئے تھے۔ حضرت عامرؓ نے بھی غلامانہ بے بسی کے ساتھ مشرکین مکہ کے مظالم برداشت کیے، لیکن آخر وقت تک استقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں غلامی سے نجات دلائی۔ ہجرت کے موقع پر جب حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ غار ثور میں پوشیدہ ہوئے تو حضرت عامر بن فہیرہؓ نے خدمت کا حق ادا کر دیا۔ وہ دن بھر مکہ کی چراگاہ میں حضرت ابوبکرؓ کی بکریاں چراتے۔ شام کو غار کے پاس لے آتے، یہاں ان کا دودھ دوہ کر استعمال کیا جاتا۔ صبح کے وقت حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ، جو عموماً رات کے وقت حاضر ہو کر مکہ کے حالات سنایا کرتے تھے، واپس جاتے تو بکریوں کو ان کے نشان قدم پر لے چلتے کہ مشرکین کو کچھ شبہ نہ ہو۔ غرض جب یہ قافلہ غار ثور سے آگے بڑھا تو حضرت ابوبکرؓ نے انھیں اپنے پیچھے بٹھالیا۔ مدینہ پہنچ کر وہ حضرت سعد بن خثیمہؓ کے مہمان ہوئے اور حضرت حارث بن اوسؓ کے اسلامی بھائی بنائے گئے۔

ابتدا میں مدینہ کی آب و ہوا جن لوگوں کو راس نہ آئی، ان میں سے ایک حضرت عامر بن فہیرہؓ بھی تھے۔ آنحضور ﷺ کو جب مہاجرین کی علالت کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے دعا فرمائی ''یا اللہ، تو مدینے کو مکے کی طرح یا اس سے بھی زیادہ ہمارے لیے پسندیدہ بنا اور اسے بیماریوں سے پاک کر۔'' دعا قبول ہوئی اور حضرت عامرؓ تندرست ہو گئے۔

حضرت عامر غزوۂ بدر و اُحد میں شریک تھے۔ 4 ہجری میں رسول کریم نے ستر قاریوں کی ایک جماعت کو مشرکین بیرمعونہ کی تبلیغ و تلقین پر مامور فرمایا۔ حضرت عامرؓ بھی اس میں شامل تھے۔ قبائل نے غداری کے ساتھ اس ساری جماعت کو شہید کر دیا۔ صرف حضرت عمرو بن امیہ ضمریؓ زندہ گرفتار ہوئے۔ حضرت عامرؓ اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ جب جبار بن سلمی کا نیزہ ان کے جگر سے پار ہوا تو ان کی زبان پر یہ کلمہ تھا: "نزت واللہ" (اللہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا)

عبادؓ بن بشر انصاری

ان کی کنیت ابورافع بھی تھی اور ابوبشر بھی۔ وہ قبیلہ اوس کے خاندان عبدالاشہل کے چشم و چراغ تھے۔ 12 بعثت نبوی میں حضرت مصعبؓ بن عمیر کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں بنو عبدالاشہل کے قبیلے کے سردار حضرت سعدؓ بن معاذ نے جس دن اسلام قبول کیا، اسی دن حضرت عبادؓ بھی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ہجرت کے بعد جب مواخات قائم ہوئی تو حضرت عبادؓ کو حضرت ابوحذیفہؓ بن عتبہ کا دینی بھائی بنایا گیا۔

حضرت عبادؓ غزوۂ بدر سے لے کر غزوۂ تبوک تک تمام غزوات و مشاہد میں شریک ہوئے۔ مدینے کے بااثر یہودی کعب بن اشرف کی فتنہ انگیزیوں کو ختم کرنے کے لیے جو صحابہ کرامؓ کا دستہ مامور ہوا تھا، ان میں حضرت عبادؓ بھی شامل تھے۔ کعب بن اشرف کے کیفر کردار تک پہنچنے پر حضرت عبادؓ نے چند اشعار بھی کہے تھے۔ غزوۂ احزاب میں حضرت عبادؓ ہر رات حضور ﷺ کی قیام گاہ پر پہرا دیتے تھے۔

غزوۂ ذات الرقاع (7 ہجری) کے موقع پر حضرت عبادؓ اور حضرت عمارؓ بن یاسر رات کو حضور ﷺ کی قیام گاہ کے پہرے پر مامور تھے۔ دونوں نے آپس میں طے کیا کہ ایک رات کے نصف اول میں بیدار رہے اور دوسرا نصف آخر میں۔ نصف اول کی باری حضرت عبادؓ کے حصے میں آئی۔ انھوں نے نماز کی نیت باندھ کر سورۂ کہف کی تلاوت شروع کی اور حضرت عمارؓ سو گئے۔ اتنے میں کسی کافر نے حضرت عبادؓ کے تیر مارا، جس سے خون بہ نکلا۔ پھر دو تیر اور لگے، لیکن انھوں نے نماز نہیں چھوڑی، مگر جب خون زیادہ ہی بہنے لگا تو انھوں نے سلام پھیر کر حضرت عمارؓ کو جگایا۔ حضرت عمارؓ نے کہا، خدا کے بندے، تم نے مجھے پہلے تیر پر ہی جگا دیا ہوتا۔ حضرت عبادؓ نے کہا، میں نے سورہ کہف شروع کر رکھی تھی۔ جی نہ چاہا کہ اسے موقوف کر دوں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں مرتدین کا قلع قمع کرنے کے لیے سب سے زیادہ خوں ریز لڑائی مسیلمہ کذاب کے خلاف یمامہ کے مقام پر لڑی گئی۔ اسی جنگ میں حضرت عبادؓ مردانہ وار لڑتے ہوئے 45 برس کی عمر میں شہید ہوئے۔ کوئی اولاد نہیں چھوڑی۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ انھیں انصار کے تین بہترین آدمیوں میں سے ایک قرار دیتی تھیں۔ دوسرے دو حضرت سعدؓ بن معاذ اور حضرت اسیدؓ بن حضیر تھے۔

عبادہؓ بن صامت انصاری

عبادہ نام، ابوالولید کنیت، قبیلہ خزرج کے خاندان سالم سے ہیں۔ بیعت عقبہ اول میں جن چھے حضرات نے آنحضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، حضرت عبادہؓ ان میں شامل تھے۔ بیعت عقبہ کبیر، جس میں 72 اشخاص شامل تھے، حضرت عبادہؓ اس میں بھی شریک تھے۔ اخیر بیعت میں انھیں یہ شرف حاصل ہوا کہ حضور ﷺ نے انھیں خاندان نوافل کا نقیب مقرر فرمایا۔

مکہ سے مسلمان ہو کر مدینہ پلٹے تو مکان پر پہنچتے ہی اپنی والدہ قرۃ العین کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ان کے دوست کعب بن عجرہ کے گھر میں ایک بڑا سا بت رکھا تھا، حضرت عبادہؓ نے وہ بت توڑ ڈالا اور کعب کو دائرہ اسلام میں شامل کیا۔ مواخات میں آنحضور ﷺ نے ابومرثد غنویؓ کو ان کا بھائی تجویز کیا۔ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے۔ اسی سال بنو قینقاع بغاوت پر آمادہ ہوئے۔ آنحضور ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا جائے۔ پندرہ دن کے محاصرے ہی میں ان لوگوں کے کس بل نکل گئے اور انھوں نے غیر مشروط اطاعت قبول کر لی، لیکن حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اب یہ لوگ مدینہ میں قیام تک نہیں کر سکتے۔ انھیں اپنے ہتھیار چھوڑ کر تین دن کے اندر مدینہ سے نکلنا ہو گا۔ حضور ﷺ نے ان کے اخراج کی نگرانی کے لیے حضرت عبادہؓ کو مقرر فرمایا۔ اس سے پہلے ان لوگوں سے حضرت عبادہؓ کے حلیفانہ تعلقات تھے، لیکن جب قرآن حکیم کا یہ حکم نازل ہوا کہ ''اے مسلمانو، یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ'' تو انھوں نے بنو قینقاع سے اپنا دیرینہ تعلق منقطع کر لیا، اور نہایت مستعدی سے ان لوگوں کے اخراج البلد کی نگرانی کی۔

حضرت عبادہؓ ''بیعت الرضوان'' میں بھی شریک تھے۔ خلافت صدیقی میں شام

کی بعض لڑائیوں میں شریک تھے۔ خلافت فاروقیؓ میں مصر کے فتح ہونے میں دیر ہوئی تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمرؓ کو مزید کمک کے لیے خط لکھا۔ حضرت عمرؓ نے چار ہزار فوج روانہ کی، جس میں ایک ہزار فوج کے افسر حضرت عبادہؓ تھے، اور جواب میں لکھا کہ ان افسروں میں ہر شخص ایک ہزار آدمیوں کے برابر ہے۔ یہ کمک مصر پہنچی تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے تمام فوج کو یک جا کر کے ایک پُر اثر تقریر کی اور حضرت عبادہؓ کو بلا کر کہا کہ اپنا نیزہ مجھے دیجیے۔ خود سر سے عمامہ اتارا اور نیزے پر لگا کر ان کے حوالے کیا کہ یہ سپہ سالار کا علم ہے، اور آج آپ سپہ سالار ہیں، خدا کی شان کہ پہلے ہی حملے میں فتح نصیب ہوئی۔

حضرت عبادہؓ کی خدمات کے سلسلے میں تین باتیں قابل ذکر ہیں۔ صدقات کی نگرانی، فلسطین کا عہدۂ قضا اور حمص کی امارت۔ آنحضور ﷺ نے اپنے آخیر عہد میں صدقے کے عمال تمام اضلاع عرب میں روانہ کیے تھے۔ حضرت عبادہؓ کو بھی ایک مقام کا عامل بنایا تھا۔ وصیت کے طور پر فرمایا ''اللہ سے ڈرنا، ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن چوپائے تک فریادی ہو کر آئیں۔ انھوں نے کہا، خدا کی قسم، میں دو آدمیوں پر بھی عامل بننے کا خواہش مند نہیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں انھیں فلسطین کا قاضی بنایا۔ اس زمانے میں یہ صوبہ امیر معاویہؓ کی ماتحتی میں تھا۔ کسی بات پر دونوں میں اختلاف ہو گیا، جس میں امیر معاویہؓ نے سخت کلامی کی تو حضرت عبادہؓ نے کہا کہ آئندہ جہاں تم ہو گے، وہاں میں نہ ہوں گا۔ ناراض ہو کر فلسطین سے مدینہ چلے آئے۔ حضرت عمرؓ کے دریافت کرنے پر سارا واقعہ دُہرایا تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ''آپ اپنی جگہ پر جائیے۔ دنیا آپ جیسے لوگوں ہی پر قائم ہے۔ جہاں آپ لوگ نہ ہوں گے، خدا اس زمین کو خراب کر دے گا۔''

پھر ایک خط امیر معاویہؓ کو لکھا کہ عبادہؓ کو تمھاری ماتحتی سے الگ کرتا ہوں۔

اسی زمانے میں امیر شام حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے حضرت عبادہؓ کو حمص کی نیابت پر مامور کیا۔ اپنے زمانۂ نیابت میں انھوں نے لاذقیہ فتح کیا۔ اس مہم کے دوران میں انھوں نے بڑے بڑے گڑھے کھدوائے جن میں ایک شخص اپنے گھوڑے سمیت بخوبی چھپ سکتا تھا۔

حضرت عبادہؓ تادم مرگ شام میں سکونت پزیر رہے۔ 34 ہجری میں انتقال ہوا۔ وہ فضلائے صحابہ میں تھے۔ قرأت ان کا خاص فن تھا۔ انھوں نے آنحضور ﷺ کی حیات میں پورا قرآن حفظ کر لیا تھا۔ اسلام کا پہلا مدرسۂ قرأت جو عہد نبوی ﷺ میں اصحابِ صفہ کے لیے قائم ہوا تھا، انھی کے زیر سیادت تھا۔ اہلِ صفہ ان سے تعلیم پاتے تھے۔ یہاں پڑھنے کے علاوہ لکھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ چنانچہ بہت سے لوگ قرأت اور کتابت سیکھ کر یہاں سے نکلے تھے۔

حدیث میں حضرت عبادہؓ بعض اولیات کے موجد ہوئے۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں رسول اکرم ﷺ تک سلسلہ حدیث پہنچانے کا یہ طرز تھا کہ صحابی کہتا تھا کہ مَیں نے اسے رسول اللہ سے سنا، لیکن بعض بزرگ ایسے بھی تھے جنھوں نے الفاظ کی روایت میں وہ مدارج قائم کیے جو بعد میں روایت حدیث کا جز قرار پا گئے۔ اشاعت حدیث میں خاص اہتمام تھا۔ مجامع وعظ، مجالس علم، نج کی صحبتیں، ہر جگہ اس کا چرچا رہتا تھا۔ کبھی گرجے میں جاتے تو وہاں بھی آنحضور ﷺ کا کلام مسلمانوں اور عیسائیوں کے گوش گزار کرتے تھے۔ مرویات کی تعداد 181 تک پہنچتی ہے۔ فقہ میں بھی کمال حاصل تھا اور تمام صحابہ اس کا اعتراف کرتے تھے۔ شام کے مسلمانوں کو قرآن اور فقہ کی تعلیم کی ضرورت ہوئی تو حضرت عمرؓ نے اس کام کے لیے انھی کا انتخاب کیا۔

حب رسول ﷺ کا یہ عالم تھا کہ بیعت کرنے کے بعد دو مرتبہ مکہ جا کر رسول کریم ﷺ کی زیارت کی۔ آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے تو کوئی غزوہ اور واقعہ ایسا نہ تھا، جس میں شریک نہ ہوئے ہوں۔ انھی وجوہ سے آنحضور ﷺ کو بھی ان سے خاص محبت تھی۔ ایک مرتبہ حضرت عبادہؓ بیمار ہوئے تو خود سرور کائنات ﷺ ان کی عیادت کو آئے۔ انصار کے کچھ لوگ ہم رکاب تھے۔ فرمایا، جانتے ہو، شہید کون ہے؟ لوگ خاموش رہے۔ حضرت عبادہؓ نے اپنی بیوی سے کہا کہ ذرا مجھے تکیے سے لگا کر بٹھاؤ۔ بیٹھنے کے بعد رسول ﷺ کے سوال کا جواب یوں دیا: ''جو مسلمان ہو، ہجرت کرے اور معرکے میں قتل ہو۔'' حضور نے فرمایا: ''نہیں۔ اس صورت میں تو شہیدوں کی تعداد بہت کم ہو گی۔ قتل ہونا، پیٹ میں مرنا، غرقاب ہونا اور عورت کا زچگی میں مرنا، یہ سب شہادت میں داخل ہے۔ رسول اکرم ﷺ علیل ہوئے تو حضرت عبادہؓ صبح شام عیادت کو جاتے تھے۔ حضور ﷺ نے اسی حالت میں انھیں ایک دعا بتائی اور فرمایا کہ مجھے جبرئیلؑ نے تلقین کی تھی۔

عباس بن عبد المطلبؓ

کنیت ابو الفضل، رسول اکرم ﷺ کے چچا۔ آپ ﷺ کے والد عبداللہ کے سوتیلے بھائی۔ ان کی والدہ قبیلہ النمر کی نتیلہ بنت جناب تھیں۔ خاندان عباسیہ جوان کے بیٹے عبداللہ کی اولاد سے ہے، انھی سے منسوب ہے۔ عہد عباسیہ کے مورخین ان کی بے حد تکریم و تعظیم کرتے تھے۔ حضرت عباسؓ تجارت کرتے تھے اور اپنے سوتیلے بھائی ابو طالب سے زیادہ خوش حال تھے۔ حضرت ابو طالب نے ایک قرض کی ادائی یوں کی کہ حاجیوں کو پانی پلانے (سقایہ) اور کھانا کھلانے (رفادہ) کا منصب بھی انھیں تفویض کر دیا تھا۔ اگرچہ طائف میں ان کا ایک باغ بھی تھا، پھر بھی دولت و ثروت میں وہ قبائل عبد شمس اور مخزوم کے سرکردہ لوگوں کے ہم سر نہ تھے۔

حضرت عباسؓ بڑے قد آور، بارعب، عقل مند اور جمیل و حسین آدمی تھے۔ آنحضرت ﷺ کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ آپ ﷺ سے تین سال بڑے تھے۔ بنو ہاشم کے لیے محتاجوں، یتیموں اور غریبوں کے لیے روٹی، کپڑا اور دیگر ضروریات کی فراہمی اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ انھوں نے رسول کریم ﷺ کی ہمیشہ حمایت کی تھی۔ غزوۂ بدر میں وہ قریش کی طرف سے لڑنے اور قید ہو گئے، لیکن بعد میں رہا کر دیے گئے۔

انھوں نے 8 ہجری میں فتح مکہ کے وقت اسلام کا کھلم کھلا اظہار کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرطِ مسرت سے ان کی پزیرائی کی اور فتح مکہ کے بعد سقایہ کا موروثی منصب انھی کے پاس رہنے دیا۔ انھوں نے غزوۂ حنین میں نہایت پامردی کا ثبوت دیا اور اپنے گرج دار نعرے سے جنگ کا پاسا پلٹ دیا۔ انھوں نے مدینہ منورہ میں اقامت اختیار کی اور غزوۂ تبوک کے لیے مالی امداد دی تھی۔ انھوں نے شام کی جنگوں میں حصہ لیا۔ جب حضرت عمرؓ فاروق نے مسجد نبوی ﷺ کی توسیع کرنا چاہی تو انھوں نے اپنا مکان اس مقصد کے لیے ان کی نذر کر دیا۔ رسولِ کریم ﷺ انھیں خیبر کی پیداوار میں سے سالانہ حصہ دیا کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے وظائف کی فہرست پر نظرثانی کر کے انھیں اصحاب بدر کے برابر کر دیا تھا۔ ان کا انتقال 32 ہجری، 653ء میں ہُوا۔

ان کے نام ور فرزند حضرت عبداللہؓ بن عباس کا مرتبہ صحابہ، فقہا اور مفسرین مدینہ میں بہت بلند تھا۔ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی ابتدائی تجاویز میں وہ بھی شامل تھے۔

عباسؓ بن مرداس

بن ابی عامر بن حارثہ۔ ایک عرب شاعر۔ ان کا شمار اصاغر صحابہ میں ہوتا ہے۔ انھوں نے شاہ سوار اور شاعر کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اگرچہ انھیں اپنی نام ور سوتیلی ماں یعنی الخنسا کی سی شہرت نصیب نہ ہوئی، تاہم شاعری میں وہ اپنے بہن بھائیوں سے، جو سب کے سب شاعر تھے، فائق تھے۔ ان میں سے ایک بھائی سراقہ بن مرداس اور بہن عمرة بنت مرداس ان کے بعد تک زندہ رہے اور انھوں نے ان کی موت پر مرثیے لکھے۔ مشہور ہے کہ انھیں اپنے باپ کے پاس ایک بت ملا تھا، جس کا نام ضمار تھا، اور جس کی پوجا وہ اور ان کے قبیلے کے لوگ کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آدھی رات کو انھیں اس بت کے اندر سے آواز سنائی دی اور دوسری بار ایک شخص نے کڑک کر انھیں سوتے سے جگایا اور دونوں مرتبہ انھیں پیغمبر حق ﷺ کے ظہور سے مطلع کیا گیا۔ اس اندرونی تحریک پر عباسؓ اسلام قبول کرنے کے لیے مدینہ پہنچے۔ آنحضرت ﷺ اس وقت فتح مکہ کی تیاری میں مصروف تھے۔ انھوں نے عباس کے لیے یہ تجویز فرمائی کہ وہ مع اپنے افراد قبیلہ حضور ﷺ سے القدید میں ملیں۔ عباس بنوسلیم کے پاس گئے اور انھوں نے اپنے بت کو جلا دیا۔ ان کی بیوی حبیبہ بنت ضحاک شوہر کی اس تبدیلی مذہب پر ان سے ناراض ہو کر اپنے خاندان والوں میں واپس چلی گئی۔

عباس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور فتح مکہ کے موقع پر اپنے قبیلے کے نوسو مسلح بہادر سواروں کے ہم راہ شریک ہوئے۔ وہ "مولفة القلوب" یعنی ان بارسوخ عرب سرداروں میں سے تھے، جن کے بارے میں آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا تھا کہ مدارات و عطا سے ان کی تالیف قلوب کریں، تاکہ دوسرے بھی اسلام کی طرف راغب ہوں۔ غزوۂ حنین کے موقع پر جب مسلمانوں میں وہ مال غنیمت تقسیم ہوا جو ہوازن سے ہاتھ آیا تھا تو اپنا حصہ دوسرے سرداروں کے مقابلے میں کم دیکھ کر عباسؓ نے ایک قصیدے میں شکوہ کیا۔ آنحضور ﷺ نے یہ اشعار سنے تو ان کے حصے میں اضافہ کر کے انھیں مطمئن کر دیا۔ فتح مکہ کے بعد وہ بنوسلیم کے علاقے میں واپس چلے گئے۔

حضرت عباسؓ، حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ خلافت تک زندہ رہے، جن کے سامنے کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے شاعر کے مدمقابل کی حیثیت سے پیش ہوئے۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ بصرے کے قریب آباد ہو گئے تھے اور اکثر شہر میں آتے رہتے تھے، جہاں اہل بصرہ ان سے حدیثیں سنا کرتے تھے۔ ان کے بیٹے جلھمة کا شمار بھی ان رواۃ حدیث میں ہے جنھوں نے آنحضرت ﷺ سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ ان کی اولاد بصرے اور اس کے قرب و جوار میں آباد ہو گئی تھی۔

شاعر کی حیثیت سے حضرت عباسؓ کی شہرت میں ان کے کلام کے محاسن کے دوش بدوش بظاہر ان کی شخصی وجاہت کو بھی دخل تھا۔ ان کے مشہور ترین قصائد یہ ہیں: (1) مہاجات، جو ان کے اور ان کے ہم قبیلہ خفاف بن ندبتہ کے درمیان ہوئی (2) قصیدہ: جو انھوں نے بت ضمار کو جلانے اور اسلام قبول کرنے کے متعلق لکھا (3) قصیدہ: جو انھوں نے مال غنیمت میں اپنے حصے کے کم ہونے پر لکھا (4) قصیدہ اصمعیات، جو اس موقع پر لکھا گیا جب انھوں نے یمن میں بنوزبید پر ایک کامیاب حملہ کیا تھا۔

عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ

کنیت ابوعبداللہ، ابومحمد، ابوعثمان۔ خلیفہ اوّل کے صاحب زادے۔ ان کی والدہ ام رومان تھیں، جن کے بطن سے ام المومنین حضرت عائشہؓ پیدا ہوئیں۔ اس لحاظ سے حضرت عبدالرحمٰن اور حضرت عائشہؓ حقیقی بھائی بہن تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا اصل نام عبدالکعبہ تھا، جسے ان کے قبول اسلام کے بعد نبی اکرم ﷺ نے عبدالرحمٰن سے بدل دیا۔ انھوں نے خاصی تاخیر سے اسلام قبول کیا تھا، چنانچہ غزوۂ بدر میں انھوں نے مشرکین مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی۔ غزوۂ اُحد میں بھی وہ مشرکین کے ساتھ تھے۔

حضرت عبدالرحمٰن صلح حدیبیہ کے موقع پر ایمان لائے اور مدینہ منورہ میں والد کے ساتھ رہنے لگے۔ اس کے بعد عہد نبوی ﷺ کے تمام معرکوں میں جاں بازی سے سرگرم رہے۔ جنگ جمل کے موقع پر وہ اپنی ہم شیر حضرت عائشہؓ کی معیت میں تھے۔ بعد میں وہ عمرو بن العاصؓ کے بھی ساتھ رہے، جب کہ حضرت عمروؓ نے ان کے بھائی محمد بن ابی بکر، والی مصر کے خلاف فوج کشی کی تھی، لیکن عبدالرحمٰن اپنے بھائی کی زندگی نہ بچا سکے۔ اس کے بعد عہد بنوامیہ میں انھوں نے حضرت حسینؓ ابن علی، عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا ساتھ دیا، جنھیں اہل مدینہ کے اس حزب اختلاف کا رئیس سمجھا جاتا تھا، جس نے یزید بن معاویہؓ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

حضرت عبدالرحمٰن نہایت شجاع اور بہادر تھے۔ تیراندازی میں انھیں کمال حاصل تھا، جس کا شان دار ثبوت جنگ یمامہ میں نظر آتا ہے۔ جنگ جمل میں وہ حضرت عائشہؓ کی طرف تھے اور ان کے بھائی محمد حضرت علیؓ کی طرف۔ انھوں نے 58 ہجری میں نواح مکہ میں وفات پائی۔ آپ حضرت ابوبکرؓ کی اولاد میں سب سے بڑے تھے۔ صحاح میں ان سے متعدد احادیث مروی ہیں۔ انھوں نے یزید کی ولی عہدی کی مخالفت

کی اور اسے ''ہرقلیت'' قرار دیا۔ ان کے گھر میں چار نسلیں صحابی تھیں، یعنی ان کے دادا، والد، وہ خود اور ان کے بیٹے محمد۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ

اصلی نام عبد عمرو۔ اسلامی نام عبدالرحمٰن، جو رسول کریم ﷺ نے رکھا۔ کنیت ابومحمد۔ ان کی والدہ بھی ان کے والد کی طرح بنوزہرہ سے تھیں۔ یہ دونوں چچازاد بھائی بہن تھے۔ چھٹی پشت میں کلاب پر وہ آنحضور ﷺ کی ددھیال سے مل جاتے ہیں اور اس رشتے سے وہ ان کے چچازاد بھائی ہوتے ہیں۔ آنحضور ﷺ سے ان کا ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ وہ آپ ﷺ کے ہم زلف تھے، لیکن قریش کے خاندانوں میں بنوزہرہ کثرت تعداد اور دولت وثروت کے لحاظ سے ممتاز نہ تھے، انھیں مناصب حرم میں سے کوئی منصب نہ مل سکا۔

حضرت عبدالرحمٰن کے والد عوف تجارت پیشہ تھے۔ ایک مرتبہ وہ عفان (حضرت عثمانؓ کے والد) اور فاکہ بن مغیرہ (حضرت خالد بن ولید کے چچا) کے ساتھ تجارت کے لیے یمن گئے۔ راستے میں بنوجذیمہ نے عوف اور فاکہ کو قتل کر دیا۔ عفان، حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بچ گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن نے اپنے والد کے قاتل کو وہیں ختم کر دیا۔

حضرت عبدالرحمٰن حضرت عمرؓ کے تقریباً ہم عمر تھے۔ بعثت نبوی ﷺ کے وقت حضرت عبدالرحمٰن ستائیس یا تیس برس کے تھے۔ وہ اپنی فطری سلامت روی اور پاکیزہ نفسی کی وجہ سے زمانہ جاہلیت ہی میں شراب چھوڑ چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کی دعوت پر انھوں نے اسلام قبول کیا۔ ایمان لانے والوں میں ان کا تیرھواں نمبر تھا۔ اس وقت تک آنحضور ﷺ دارالارقم میں پناہ گزیں نہیں ہوئے تھے اور وہاں سے دعوت شروع نہیں کی تھی۔

حضرت عبدالرحمٰن نے حبشہ اور مدینے کی ہجرتوں میں حصہ لیا۔ حبشہ کی ہجرت 5 نبوی میں ہوئی تھی۔ اس میں وہ پہلے پندرہ مہاجرین کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اگرچہ اس وقت ان کی دو بیویاں اور بچے موجود تھے، تاہم تنہا رہ گئے اور اہل وعیال کو گھر میں چھوڑ گئے۔ حبشہ سے پلٹ کر وہ مکے آئے اور پھر مدینہ کو 13 نبوی میں ہجرت کی۔ وہ چند مہاجرین کے ساتھ حضرت سعدؓ بن ربیع کے گھر میں اترے جو خزرج کے قبیلے سے تھے، اور انھی کے ساتھ مواخات ہوئی، جس کا مقصد مہاجرین کی اعانت تھی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ کے اسلامی بھائی نے اس مقصد کے لیے بے نظیر ایثار سے کام لینا چاہا، لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ کی بے نیاز اور غیور طبیعت نے شکریے کے ساتھ ان کی درخواست نامنظور کی۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ خود فرماتے ہیں: ''سعد بن ربیع نے کہا، میں انصار میں نہایت دولت مند ہوں۔ میں آدھا مال آپ کو دے دوں گا اور میری دو بیویوں میں سے ایک کو دیکھ کر پسند کر لیجیے تو میں اس سے دست بردار ہو جاؤں گا، اور پھر آپ اس سے نکاح پڑھا لیں۔'' حضرت عبدالرحمٰن نے جواب دیا: ''مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ خدا آپ کے اہل وعیال اور دولت و مال میں برکت دے۔ کیا یہاں کوئی بازار ہے جہاں کاروبار ہوتا ہو؟ حضرت سعدؓ نے کہا ''بازار قینقاع''۔ حضرت عبدالرحمٰن دوسرے دن صبح کو پنیر اور گھی لے کر وہاں گئے اور کاروبار شروع کر دیا۔ پھر تو یہ حالت ہوگئی کہ خود بیان کرتے ہیں کہ اگر پتھر بھی اٹھاتا تو یہ خیال ہوتا تھا کہ اس کے تلے سونا یا چاندی ملے گی۔ ایک بار ان کے مال تجارت کا قافلہ آیا تو مدینہ میں شور مچ گیا۔ اس میں غلے اور خوراک سے لدے ہوئے سات سو اونٹ تھے۔ انھوں نے تجارت کو فروغ دینے کے لیے امیہ بن خلف سے ایک معاہدہ بھی کیا تھا۔ یہ مدینہ آنے کے بعد لکھا گیا تھا۔

کاروبار شروع کرنے کے چند ہی روز بعد حضرت عبدالرحمٰنؓ نے انصار میں ایک شادی کی۔ ایک روز آنحضور ﷺ نے ان پر حجلہ عروسی کی بشاشت کا رنگ دیکھا تو پوچھا: ''خیر تو ہے؟'' عرض کی ''مَیں نے ایک عورت سے شادی کی ہے۔'' ارشاد ہوا: ''اسے کیا مہر دیا؟'' عرض کیا: ''کھجور کی گٹھلی کے برابر سونا'' فرمایا: ''ولیمہ کرو، خواہ ایک ہی بکری ہو۔''

حضرت عبدالرحمٰن نے تمام غزوات ومشاہد میں آنحضور ﷺ کے ساتھ شرکت کی۔ غزوۂ اُحد میں جب لوگوں نے پشت پھیری تو حضرت عبدالرحمٰن ان چند صحابہؓ کے ساتھ تھے جو آنحضور ﷺ کے گرداگرد جمع تھے۔ اس روز انھوں نے اکیس زخم کھائے۔ پاؤں میں ایسا زخم لگا کہ عمر بھر لنگڑا کر چلتے رہے۔ شعبان 6 ہجری میں ایک سریہ، حضرت عبدالرحمٰن کی امارت میں دومۃ الجندل روانہ ہوا۔ اس میں 700 آدمی تھے۔ امارت کے علاوہ اس میں آنحضرت ﷺ نے انھیں ایک اعزاز یہ بخشا کہ ان کا عمامہ کھول ڈالا اور خود دست مبارک سے ان کے سر پر سیاہ عمامہ باندھا، پیچھے شملہ چھوڑا اور ہاتھ میں علم عنایت فرمایا۔ دومۃ الجندل پہنچ کر حضرت عبدالرحمٰن نے تین دن تک دعوت اسلام دی۔ قبیلہ کلب کا سردار اصبغ بن عمرو، جو نصرانی مذہب رکھتا تھا، مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس کے ساتھ اس کے قبیلے کے بہت سے لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ آنحضور ﷺ کے حسب فرمان سردار اصبغ کی بیٹی تماضر سے حضرت عبدالرحمٰن نے شادی کی اور رخصت کرا کے مدینہ ساتھ لائے۔ ابوسلمہ، مشہور راوی حدیث، انھی کے بطن سے تھے۔

فتح مکہ کے بعد آنحضور ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو غزوۂ حدیبیہ میں صلح نامے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن کو بنوجذیمہ میں اشاعت اسلام کے لیے بھیجا۔ غزوۂ تبوک میں حضرت عبدالرحمٰن نے ایک روز فجر کی نماز پڑھائی تھی اور حضور ﷺ نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد جب انصار ومہاجرین میں خلافت کی نسبت تنازع پیدا ہوا تو اس جگہ عبدالرحمٰنؓ بھی موجود تھے اور کہا جاتا ہے کہ وہ بھی اولین بیعت کرنے والوں میں تھے۔

اُسامہ کے لشکر کو رخصت کرنے کے لیے جب حضرت ابوبکرؓ پڑاؤ پر تشریف لے گئے تو وہ پاپیادہ چل رہے تھے، اور ان کی سواری کی مہار حضرت عبدالرحمٰنؓ کے ہاتھ میں تھی۔ اسی حالت میں خلیفۃ الرسول ﷺ نے حضرت اسامہ کو نصیحتیں کیں اور الوداع کہا۔

فتنہ ارتداد کے انسداد کے بعد جب مدینے کے آس پاس امن قائم ہوا اور قبائل کے صدقات سرداروں کی معرفت آنا شروع ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ کو زبرقان کے آنے کی خوش خبری، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے سنائی تھی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ جب عمان سے پلٹ کر آئے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بھی اس جماعت میں تھے جو ان کی ملاقات کے لیے گئی تھی۔

11ہجری میں حضرت ابوبکرؓ حج کو نہ جا سکے۔ اس سال ان کی جگہ حضرت عبدالرحمٰنؓ کو امیر حج بنایا گیا۔ 12ہجری میں بھی وہی حج کے امیر تھے۔ 13ہجری میں حضرت ابوبکرؓ نے انتقال سے پیش تر حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین بنانا چاہا تو حضرت عبدالرحمٰن سے بھی مشورہ کیا۔ 13ہجری میں حضرت عمرؓ حج کو نہ جا سکے، اس لیے حضرت عبدالرحمٰنؓ کو امیرالحج بنا کر بھیجا۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں حضرت عثمانؓ کی طرح حضرت عبدالرحمٰنؓ بھی مقرب سمجھے جاتے تھے۔ امیرالمومنین سے لوگ کچھ پوچھنا چاہتے تو انھی دونوں میں سے کسی کو واسطہ بناتے تھے۔ اس زمانے میں جو مجلس شوریٰ قائم ہوئی، حضرت عبدالرحمٰنؓ اس کے مستقل اور سرگرم رکن تھے۔

14ہجری میں جب عراق پر فوج کشی کا مسئلہ سامنے آیا تو ایک عظیم الشان لشکر دارالخلافہ کے گرد جمع ہوا۔ حضرت عبدالرحمٰن اس لشکر میں میمنہ کے افسر بنائے گئے۔ لوگوں نے سپہ سالار کی حیثیت سے چلنے کے لیے خود امیرالمومنین پر زور دیا۔ اس موقع پر مجلس شوریٰ کا جو اجلاس منعقد ہوا، اس میں صرف حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف ہی تھے، جنھوں نے سختی کے ساتھ اس خیال کی مخالفت کی۔ انھوں نے کہا: ''اے امیرالمومنین! اس کی ذمہ داری مجھ پر ڈال لیجے۔ آپ یہیں ٹھہریے اور لشکر بھیج دیجیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ خدا آپ کے لشکروں کی کیسی مدد کرتا ہے۔ اگر لشکر نے شکست کھائی تو وہ آپ کی شکست نہ ہوگی۔ اور اگر آپ میدان میں کام آئے یا شکست کھا گئے تو مسلمانوں کی ترقی رک جائے گی اور اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔'' اس تقریر نے تمام اکابر صحابہ کی آنکھیں کھول دیں اور سب نے پُرزور الفاظ میں اس کی تائید کی، لیکن دقت یہ تھی کہ اس مہتم بالشان عہدے کے لائق کوئی شخص نہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے پھر سپہ سالار کا مسئلہ پیش کیا۔ یہ مشکل بھی حضرت عبدالرحمٰنؓ نے حل کر دی۔ انھوں نے اٹھ کر کہا: ''میں نے پا لیا۔'' حضرت عمرؓ نے پوچھا: ''کون؟'' بولے: ''سعد بن مالک۔'' اس حُسنِ انتخاب پر ہر طرف سے صدائے تحسین و آفریں بلند ہوئی۔ آگے کے واقعات نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب کس قدر موزوں تھا۔

یرموک کی تیاریوں کے سلسلے میں اگرچہ مہاجرین و انصارؓ کا جوش شباب پر تھا، لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ اس معاملے میں سب سے آگے بڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ مجلس شوریٰ کے جلسے میں انھوں نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ وہ سپہ سالار بنیں، لیکن اور صحابہؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا اور رائے یہ ٹھہری کہ مزید امدادی فوجیں بھیجی جائیں۔ اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰنؓ بھی شرکت جہاد کی نیت سے شام روانہ ہوئے۔

بیت المقدس کی فتح کے بعد جو معاہدہ تحریر ہوا، اس میں شاہد کی حیثیت سے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے دست خط کیے۔ یہ معاہدہ 15ہجری میں بمقام جابیہ، حضرت عمرؓ کی موجودگی میں لکھا گیا تھا۔ اسی سن میں جب دفتر (دیوان) میں لوگوں کے نام لکھے گئے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ مدینے میں تھے۔ انھوں نے اور حضرت علیؓ نے رائے دی کہ امیرالمومنین اپنے نام سے ابتدا کریں۔ ارشاد ہوا: ''نہیں! بلکہ میں رسول اللہ کے چچا (حضرت عباسؓ) سے ابتدا کروں گا، پھر جو اُن سے قریب ہوں۔''

طاعون عمواس کے زمانے میں وہ شام میں تھے۔ جب حضرت عمرؓ ملکی دورے کے سلسلے سے سرغ پہنچے تو امرائے افواج نے اطلاع دی کہ شام میں وبا پھیلی ہوئی ہے۔ حضرت عمرؓ پلٹنا چاہتے تھے، لیکن حضرت ابوعبیدہؓ وغیرہ مخالفت کر رہے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ اس وقت موجود نہ تھے۔ دوسرے دن جب حضرت عمرؓ نے پلٹنا طے کر لیا اور حضرت ابوعبیدہؓ نے مخالفت شروع کی تو حضرت عمرؓ نے انھیں جواب دینے کے بعد علیحدہ بلایا اور تخلیے میں سمجھانا شروع کیا۔ اتنے میں حضرت عبدالرحمٰنؓ آ گئے۔ حالات کو دیکھ کر پوچھا: ''کیا بات ہے؟'' لوگوں نے اطلاع دی تو فرمایا: ''میرے پاس اس کے متعلق علم ہے۔'' حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا: ''تم پر ہم سب کو اطمینان ہے اور تمھاری بات سب مانیں گے۔ بتاؤ؟'' انھوں نے کہا: ''میں نے رسول کریم ﷺ سے سنا ہے کہ جب تک کسی شہر میں وبا کی خبر سنو، تو وہاں نہ جاؤ اور اگر تم وہاں موجود ہو، اور وبا پیدا ہو جائے تو بھاگنے کی نیت سے وہاں سے نہ نکلو۔'' حضرت عمرؓ نے کہا: ''خدا کا شکر ہے۔ پلٹ چلو۔'' چنانچہ لوگوں کو لے کر وہاں سے واپس ہوئے۔ سالم بن عبداللہ کہتے ہیں کہ اس واپسی کی وجہ صرف حضرت عبدالرحمٰنؓ کی روایت کردہ حدیث تھی۔

معرکہ نہاوند کی نسبت مجلس شوریٰ کا جب اجلاس منعقد ہوا تو اہل الرائے صحابہؓ کی طرح حضرت عبدالرحمٰنؓ نے بھی تقریر کی، جس میں کہا کہ امیرالمومنین کو موقع جنگ پر نہیں جانا چاہیے، فتح الفتوح (نہاوند) کا مالِ غنیمت قاصد لے کر آیا اور گٹھڑیاں اونٹوں پر سے اتار کر مسجد نبوی ﷺ میں رکھی گئیں تو حضرت عمرؓ نے اس کے چوری ہو جانے کے ڈر سے صحابہؓ کا پہرا مقرر کیا۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن نے رات کو چند صحابہؓ کے ساتھ مل کر یہ خدمت انجام دی۔

23ہجری میں حضرت عمرؓ نے آخری حج کیا۔ اس سفر میں امہات المومنین کو بھی ساتھ لے گئے۔ ان کی حفاظت پر حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مامور تھے اور ان کی بیوی بھی ساتھ تھیں۔ چند ہی روز کے بعد 26 ذی الحجہ کو بدھ کے دن، نماز فجر پڑھانے کے لیے حضرت عمرؓ کھڑے ہوئے۔ اتنے میں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کے پارسی غلام فیروز ابولولو نے حضرت عمرؓ پر حملہ کر کے انھیں زخمی کر دیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے مختصر نماز پڑھائی۔ حضرت عمرؓ کو پانچ صحابہ (حضرت عثمانؓ، علیؓ، سعدؓ، زبیرؓ اور عبدالرحمٰنؓ) نے قبر میں اُتارا۔

جب حضرت عمرؓ کی تدفین سے فراغت ملی تو یہ جماعت (ارباب شوریٰ) جمع ہوئی، تاکہ خلافت کا مسئلہ حل کیا جا سکے۔ مسئلہ بڑا مشکل تھا، لیکن حضرت عبدالرحمٰنؓ نے

اسے بڑی خوش اسلوبی سے حل کر دیا۔ آخر حضرت عثمانؓ کے حق میں فیصلہ ہوا۔

24 ہجری میں، جو ''عام الرعاف'' کہلاتا ہے، حضرت عثمانؓ نکسیر پھوٹنے کی وجہ سے حج کو نہ جا سکے تو حضرت عبدالرحمٰنؓ کو امیر الحج بنایا گیا۔

حضرت عثمانؓ کے خلاف مصر، کوفے اور بصرے میں سازشوں کے جال بچھے ہوئے تھے۔ اس ساری فضا میں جہاں تک حضرت عبدالرحمٰنؓ سے ہو سکا، وہ حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیتے رہے اور خیر خواہی اور نیک مشورے سے تائید کرتے رہے۔ انھوں نے خلیفہ ثالث کا زمانہ مدینہ منورہ کی خاموش اور پُر امن فضا میں گزارا اور خلافت کے استحکام کے لیے کوشاں رہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے 32 ہجری میں وفات پائی۔ ان کا اصل ذریعہ معاش تجارت تھا۔ انھوں نے نہایت وافر دولت چھوڑی، لیکن ان کی فیاضی اور انفاق فی سبیل اللہ کے واقعات سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ان کے اوصافِ حمیدہ میں تقوٰی، حبِ رسول، صدق و صفا، فیاضی، اصابت رائے، ایثار، وفائے عہد، امانت، امر بالمعروف، رقت قلب، انکسار، اور شجاعت نمایاں ہیں۔ اصابت رائے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ انھیں حضرت عثمانؓ کی بیعت کے وقت حکم بنایا گیا تھا۔

ایثار کا یہ حال تھا کہ خلافت جیسے اہم اعزاز کو انھوں نے ہاتھ نہیں لگایا، حالانکہ چھ اربابِ شورٰی میں سے حضرت سعدؓ نے ان کے متعلق اپنی رائے دی تھی۔ اس لحاظ سے ان کا پلہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے برابر ہو گیا۔ اسی طرح ان کے دوسرے اوصاف تھے۔ انھوں نے وقتاً فوقتاً قومی اور مذہبی ضرورتوں کے لیے گراں قدر رقمیں دی تھیں۔ سورۂ براۃ کے نزول کے موقع پر چار ہزار دینار وقف کیے، جہاد کے لیے پانچ سو گھوڑے اور پانچ سو اونٹ حاضر کیے۔ ایک دفعہ اپنی ایک زمین چالیس ہزار دینار میں حضرت عثمانؓ کے ہاتھ فروخت کی اور ساری رقم فقرائے بنی زہرہ، اہل حاجت اور امہات المومنین میں تقسیم کر دی۔ وفات کے وقت پچاس ہزار گھوڑے راہ خدا میں وقف کیے اور اصحاب بدر میں سے ہر ایک کے لیے چار چار سو دینار کی وصیت کی (اس وقت سو اصحاب بدر بقید حیات تھے، جن میں حضرت عثمانؓ بھی تھے۔ یہ مجموعی رقم چالیس ہزار دینار ہوئی۔ امہات المومنین کے لیے ایک باغ کی وصیت کی، جو چار لاکھ درہم میں فروخت ہوا۔ عام صدقات و خیرات کا معاملہ اس سے الگ تھا۔

ان کا شمار عشرۂ مبشرہ میں ہوتا ہے۔ ان کا اصحاب شورٰی میں ہونا، حضرت سعد کا ان کی خلافت کے لیے رائے دینا، اصحاب شورٰی کا انھیں حکم بنانا، یہ تمام باتیں ان کی فضیلت ظاہر کرتی ہیں۔ میراث نبوی ﷺ کا معاملہ عہد صدیقی میں اٹھا تو حضرت عبدالرحمٰنؓ ہی کی رائے کو ترجیح دی گئی۔ جب ایران فتح ہوا اور حضرت عمرؓ کے سامنے یہ مسئلہ آیا کہ آتش پرستوں کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہیے تو اس وقت حضرت عبدالرحمٰنؓ ہی نے اس عقدے کو حل کیا اور بتایا کہ آنحضرت ﷺ نے ان لوگوں کے ساتھ اہل کتاب کی روش اختیار کی تھی اور انھیں ذمی قرار دیا تھا۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے علم و تفقہ سے خلفائے راشدین اور خلافت کو کیسے اہم اور ضروری موقعوں پر فائدہ پہنچا۔ ان کی اولاد میں بیس بیٹے اور آٹھ بیٹیاں بیان کی گئی ہیں۔

عبداللہ بن ابی بکر صدیقؓ

ذات النطاقین حضرت اسماءؓ بنت ابوبکر صدیقؓ کے سگے بھائی۔ ان کی والدہ کا نام قتیلہ بنت عبدالعزٰی تھا جن کا تعلق قبیلہ بنی عامر سے تھا۔ وہ اسلام سے مشرف نہیں ہوئیں اور اسی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے انھیں طلاق دے دی تھی۔ اہل سیر نے حضرت عبداللہ کے سال ولادت کی تصریح نہیں کی، لیکن اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ ہجرت نبوی ﷺ کے وقت وہ کسرتی بدن کے خوب رُو نوجوان تھے اور شرف اسلام سے بہرہ ور ہو چکے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے بڑے فرزند حضرت عبدالرحمٰنؓ تو صلح حدیبیہ تک کفر و شرک کی بھول بھلیاں میں بھٹکتے رہے، لیکن چھوٹے فرزند حضرت عبداللہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اوائل بعثت ہی میں اسلام لے آئے تھے۔

ہجرت کے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انھیں تاکید فرمائی کہ وہ قریش کے ارادوں اور مشوروں سے انھیں برابر آگاہ کرتے رہیں۔ حضرت عبداللہ نے یہ خدمت بخوشی اپنے ذمے لی اور اسے بطریق احسن بڑی راز داری کے ساتھ نباہا۔ وہ دن بھر قریش کے منصوبوں کا کھوج لگایا کرتے اور رات کو غار ثور میں پہنچ کر تمام خبروں سے سرور عالم ﷺ اور حضرت ابوبکرؓ کو آگاہ کر دیتے اور پھر وہیں سو جاتے۔ طلوع فجر سے پہلے اٹھ کھڑے ہوتے اور خاموشی سے مکہ واپس آ جاتے۔

مدینہ منورہ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد رحمت عالم ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ اور حضرت ابورافعؓ کو مکہ بھیجا، تاکہ وہ آپ ﷺ کے اہل و عیال کو وہاں سے مدینہ لے آئیں۔ ان دونوں کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ نے عبداللہ بن اُریقط کو اپنے فرزند عبداللہ کے نام خط دے کر بھیجا کہ وہ بھی اپنی سوتیلی والدہ ام رومان اور بہنوں (حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ) کو مدینہ لے آئیں۔ چنانچہ حضرت ام کلثومؓ کو اور اپنی اہلیہ حضرت اُم ایمن اور فرزند اُسامہؓ کو لے آئے اور حضرت عبداللہ حضرت اُم رومان، حضرت اسما اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کو ساتھ لے کر مدینہ پہنچے۔

حضرت عبداللہ بن ابی بکرؓ کے حالات زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ ان کی نماز جنازہ ان کے والد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پڑھائی۔ ان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر، حضرت عمر فاروق اور حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ قبر میں اُترے اور ظہر کی نماز کے بعد تدفین ہوئی۔ چوں کہ حضرت عبداللہ غزوۂ طائف میں زخمی ہونے کی وجہ سے فوت ہوئے تھے، اس لیے بعض اہل سیر نے انھیں شہدائے طائف میں شمار کیا ہے۔

عبداللہ بن عبدالمطلب

بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی۔ آنحضور ﷺ کے والد ماجد۔ ان کی اور ابوطالب کی والدہ فاطمہ بنت عمرو بن عائذ بن عمران مخزومی تھیں۔ جناب عبداللہ اور اُم الحکیم جڑواں پیدا ہوئے تھے۔ عبداللہ جناب عبدالمطلب کی آخری اولاد تھے۔ ان کے دس یا بارہ بھائی تھے۔ ان میں زبیر، ابوطالب، ابولہب، حمزہ اور حضرت عباسؓ کسی نہ

کسی خصوصیت اسلام یا کفر کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی ولادت غالباً 554ء / 24 جلوس نوشیروانی میں ہوئی۔ ان کی زندگی کے اہم واقعات میں ان کی قربانی کا واقعہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عبدالمطلب نے نذر مانی تھی کہ دس بیٹوں کو اپنے سامنے جوان دیکھ لیں گے تو ایک بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کر دیں گے۔ خدا نے یہ آرزو پوری کی تو انھوں نے قربانی کا عزم کیا۔ قرعہ عبداللہ کے نام نکلا۔ بعد میں بہنوں کی التجا اور قریش کی استدعا سے عبداللہ کی قربانی کی بجائے سو اونٹوں کی قربانی دی گئی۔ اسی کی بنا پر آنحضرت کو "ابن ذبیحین" (یعنی حضرت اسماعیل اور عبداللہ والد حضور سرور کائنات ﷺ کہا جاتا ہے۔

جناب عبداللہ کی شادی قبیلہ زہرہ کی ممتاز خاتون حضرت آمنہ بنت وہب بن عبد مناف سے ہوئی۔ قریش تجارت پیشہ لوگ تھے۔ عبدالمطلب کے بیٹوں کا بھی یہی مشغلہ تھا۔ جناب عبداللہ شادی کے بعد قریش کے قافلے کے ساتھ شام گئے جہاں قریش عموماً جایا کرتے تھے، مگر وہاں بیمار ہو گئے۔ واپسی پر چوں کہ کمزوری زیادہ تھی، اس لیے بوجہ علالت مدینے ہی میں ٹھہر گئے۔ وہ ایک مہینے تک علیل رہے۔ یہاں بنونجار نے تیمارداری کی۔ ادھر قافلے والوں نے مکے آ کر حضرت عبدالمطلب کو اطلاع دی۔ حضرت عبدالمطلب نے اپنے بڑے صاحبزادے حارث کو (اور بقول بعض زبیر کو) مدینے روانہ کیا، مگر وہ جب وہاں پہنچے تو عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ وہیں دفن ہوئے۔

وفات کے وقت عبداللہ کی عمر تقریباً 18 سال تھی۔ اس وقت شاید 570ء تھا۔

جناب عبداللہ کی واحد اولاد آنحضور ﷺ تھے جو وفات کے چھے ماہ بعد ربیع الاوّل، عام الفیل میں پیدا ہوئے۔ قرآن مجید میں آپ ﷺ کو یتیم کہا گیا ہے۔ سورہ الضحیٰ کی آیت 6 میں کہا گیا ہے: "اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی" جناب عبداللہ نے ترکے میں پانچ اونٹ، کچھ بکریاں، ایک تلوار اور ایک کنیز (اُم ایمن) چھوڑی تھی، جو آنحضور ﷺ کو ورثے میں ملیں۔

عبداللہ بن جحشؓ

قبیلہ بنو اسد بن خزیمہ سے تعلق تھا۔ یہ قبیلہ قریش کے بنو اُمیہ کا حلیف تھا۔ حضرت عبداللہؓ کی والدہ آنحضور ﷺ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب تھیں۔ وہ اپنے بھائیوں عبیداللہ اور ابواحمد کے ساتھ ابتدائی زمانے میں مسلمان ہو گئے تھے اور عبیداللہ کے ساتھ حبشہ کی طرف پہلی ہجرت میں شریک تھے۔ عبیداللہ نے وہاں دین عیسائیت قبول کر لیا اور وہیں فوت ہو گیا، لیکن حضرت عبداللہ مکے کو لوٹ آئے، جہاں وہ حلف (اتحاد قبائل) کے ایک گروہ کے ممتاز ترین فرد تھے۔ اس حلف میں ان کی ہمشیر زینب بھی شامل تھیں۔ ان سب نے مدینے کی طرف ہجرت کی۔ حضرت عبداللہ نخلہ کے سریہ کے قائد تھے۔ غزوۂ بدر میں بھی شریک تھے۔ غزوۂ احد میں شہادت کا رتبہ حاصل کرنے کے وقت ان کی عمر چالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔

عبداللہ بن زیدؓ انصاری

صاحب الاذان۔ تعلق خزرج کے خاندان حارث بن خزرج سے ہے۔ 13 نبوی میں حج کے موقع پر مکہ میں عقبہ ثانیہ میں آنحضور ﷺ کی بیعت سے مشرف ہوئے۔ حضور ﷺ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ تشریف لائے تو مسجد نبوی ﷺ کی تعمیر کے بعد حضرت عبداللہ کو "صاحب اذان" ہونے کا عظیم شرف حاصل ہے۔ جب مسجد تعمیر ہو چکی تو آنحضور ﷺ نے ضرورت محسوس کی کہ نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے عام مسلمانوں کو نماز کے وقت سے کچھ دیر پہلے اطلاع دینی چاہیے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ کسی نے عرض کیا کہ کسی بلند جگہ پر آگ روشن کر دی جایا کرے۔ کسی نے رائے دی کہ نماز کے وقت کے قریب مسجد پر جھنڈا بلند کر دیا جائے۔ کسی نے مشورہ دیا کہ جس طرح یہود و نصاریٰ اپنی عبادت گاہوں میں نرسنگھا یا ناقوس بجاتے ہیں، ہم بھی نماز کے اعلان کے لیے اسی طرح کیا کریں۔ لیکن حضور ﷺ ان میں سے کسی تجویز پر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ تاہم وقتی طور پر آپ ﷺ نے ناقوس بجانے والی تجویز کو منظور فرمالیا۔ ابھی اس تجویز پر عمل نہیں ہوا تھا کہ دوسرے دن علی الصباح حضرت عبداللہ بن زیدؓ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور یوں عرض کیا: "یا رسول اللہ، رات خواب میں میرے سامنے ایک شخص آیا، جس کے ہاتھ میں ناقوس تھا۔ مَیں نے اس سے کہا "اے اللہ کے بندے، یہ ناقوس بیچتے ہو" اس نے کہا: "تم اسے کیا لے کر کیا کرو گے؟" مَیں نے کہا: "ہم اسے بجا کر لوگوں کو نماز کے لیے بلائیں گے۔" اس نے کہا: "کیا میں تمھیں ایک ایسی چیز نہ بتا دوں جو اس مقصد کے لیے ناقوس بجانے سے بہتر ہے۔" مَیں نے کہا: "ہاں ضرور بتاؤ"

پھر اس شخص نے خواب میں حضرت عبداللہ بن زیدؓ کو پوری اذان سکھا دی۔ امام بخاری اور امام ترمذی کے نزدیک حضرت عبداللہ بن زیدؓ سے صرف ایک حدیث مروی ہے جو اذان کے بارے میں ہے۔ انھوں نے تمام غزوات میں شرکت کی۔ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ نے قبیلہ حارث بن خزرج کا پرچم حضرت عبداللہ کو مرحمت فرمایا تھا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور ﷺ نے اپنے بال منڈوائے تو ان میں سے چند بال حضرت عبداللہ کو مرحمت فرمائے۔ انھوں نے زندگی بھر یہ مقدس بال اپنے سینے سے لگائے رکھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے خاندان نے اس لازوال دولت کو تبرک کے طور پر اپنے پاس محفوظ رکھا۔ انھوں نے 32 ہجری میں حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں وفات پائی۔ حضرت عثمانؓ نے بہ نفس نفیس نماز جنازہ پڑھائی۔

عبداللہ بن حنظلہؓ

بن ابی عامر انصاری۔ اس انقلاب کے ایک سربراہ، جو مدینے میں یزید اوّل کی خلافت کے خلاف برپا ہوا تھا۔ وہ نبی اکرم ﷺ کے اس صحابی کا بیٹا تھا جو غزوۂ احد میں شہید اور "غسیل الملائکہ" کے لقب سے معروف ہوئے۔ عبداللہ اپنے والد کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ انھیں "ابن الغسیل" بھی کہا جاتا ہے۔ 62 ہجری میں مدینے کے والی عثمان بن محمد نے مدینے سے ان لوگوں کا ایک وفد دمشق بھیجا تھا جو نئے خلیفہ سے ناراض تھے، تا کہ ان کے اور بنو امیہ کے درمیان مصالحت کی کوئی سبیل نکل آئے۔ حضرت عبداللہ بھی اس وفد میں شامل تھے۔ یزید نے مدینے کے ان

...وں کی خاص طور پر خاطر مدارات کی، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس کی ...ذمت کی اور اسے خلافت کے نااہل قرار دیا۔ ابن الغسیل یزید پر اعتراضات کرنے میں پیش پیش تھے، لیکن تھوڑے دن بعد جب انصار نے یزید کے خلاف کھلم کھلا بغاوت کر دی تو انھوں نے اسے اپنا رئیس چنا، جب کہ قریش مدینہ کا قائد عبداللہ بن مطیع بنا۔ جب اموی خاندان کے افراد مدینے سے نکال دیے گئے تو خلیفہ مدینے کے باغیوں کی سرکوبی کے لیے فوجی طاقت استعمال کرنے پر مجبور ہو گیا۔ 63 ہجری کے آخر میں اس نے مسلم بن عقبہ کی سرکردگی میں مدینے کی طرف ایک فوج بھیجی جس نے مدینے کے مشرق میں حرہ کے محفوظ مقامات پر مورچے جما لیے اور تین دن انتظار کر کے اہل مدینہ سے خوں ریز جنگ کی جو مخالفوں کی شکست پر منتج ہوئی۔ عبداللہ بن حنظلہؓ نے جنگ کے دوران میں شجاعت کے خوب جوہر دکھائے، لیکن آخر شامی فوج کے حملوں سے زخمی ہو کر وفات پائی۔

عبداللہ بن رواحہؓ

انصاری، خزرجی، بدری، نقیب۔ جب نبوت کے بارہویں سال مدینے کے ستر انصار نے عقبہ ثانیہ کی بیعت میں شرکت کی تو حضرت عبداللہ بن رواحہ بھی ان میں شامل تھے۔ نیز وہ ان بارہ نقیبوں میں سے تھے جنھیں مدنی مسلمانوں نے آنحضور ﷺ کی خواہش کے مطابق منتخب کیا تھا۔ پھر جب رسول کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو یہ آپ ﷺ کے نہایت راست باز اور سخت کوش معاونین میں سے تھے۔

آنحضور ﷺ کی رائے حضرت عبداللہ کے متعلق بہت اچھی تھی۔ چنانچہ حضور ﷺ نے بارہا انھیں کئی اہم اور معزز کام سپرد کیے۔ جب 2 ہجری میں مسلمان معرکہ بدر میں ظفریاب ہوئے تو اہل مدینہ تک مژدۂ فتح پہنچانے کے لیے فوراً عبداللہ بن رواحہ اور زید بن حارثہؓ کو بھیجا گیا۔ ذی قعدہ 4 ہجری میں ''غزوۂ ثانیہ'' کے موقع پر حضور ﷺ انھیں اپنا نائب بنا کر مدینے میں چھوڑ گئے تھے۔ جب 5 ہجری میں مدینے کا محاصرہ ہوا اور آپ ﷺ کے حلیف یعنی بنو قریظہ کی وفاداری مشکوک نظر آنے لگی تو رسول اللہ نے اس قبیلے کے حقیقی جذبات معلوم کرنے کے لیے عبداللہؓ اور دیگر بارسوخ مدنی مسلمانوں کو روانہ کیا۔ 7 ہجری میں جب خیبر فتح ہو گیا اور اس کا علاقہ تقسیم کر دیا گیا تو وہاں کی پیداوار کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے حضور ﷺ نے حضرت عبداللہؓ ہی کو مامور فرمایا۔ جب 8 ہجری میں غزوۂ موتہ کے لیے فوج روانہ ہوئی تو رسول کریم ﷺ نے حضرت عبداللہؓ سپہ سالار کا دوسرا جانشین مقرر فرمایا۔ چنانچہ جب حضرت زیدؓ اور حضرت جعفرؓ دونوں شہید ہو گئے تو حضرت عبداللہ بھی اسلام کی خاطر لڑتے لڑتے اپنے شہید رفقا سے جا ملے۔ انھوں نے اسلام کا پرچم مرتے دم تک زخمی ہاتھوں سے گرنے نہیں دیا۔

عبداللہ بن زبیرؓ

حضرت زبیر بن العوام کے فرزند، جو قریش کی ایک شاخ عبدالعزیٰ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی والدہ کا نام اسما تھا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیٹی اور حضرت عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں۔ ان کی ولادت (تقریباً ذی قعدہ، 2 ہجری) ہجرت نبوی سے بیس ماہ بعد ہوئی۔ مدینے میں مہاجرین کے ہاں سب سے پہلے جو بچہ پیدا ہوا تھا، وہ عبداللہ ہی تھے۔ والد اور والدہ دونوں طرف سے ان کی رسول کریم ﷺ کے ساتھ قرابت تھی، اور یہی قرابت امویوں اور بظاہر علویوں کے مقابلے میں ان کی شہرت کا ایک سبب بن گئی تھی۔

وہ اپنے والد کے ہم راہ جنگ یرموک (رجب 15 ہجری) میں موجود تھے، اگرچہ اس وقت تک وہ لڑکے ہی سے تھے اور جب حضرت زبیر مصر میں حضرت عمرو بن العاصؓ کی فوج میں شامل ہوئے (19 ہجری) تو اس وقت بھی وہ اپنے والد کے ہم راہ تھے۔ وہ عبداللہ ابن سعد کی اس مہم میں شامل تھے جو 26 ہجری کو افریقہ میں بوزنطیوں کے خلاف روانہ ہوئی تھی۔ انھوں نے بوزنطی حاکم جرجیر (Gregory) کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا تھا۔ جب سعید بن العاص نے شمالی ایران پر چڑھائی کی (29 ہجری) تو حضرت عبداللہ بھی ان کے ساتھ تھے۔ بعد میں حضرت عثمانؓ نے انھیں اس مجلس کا رکن مقرر کر دیا جس کا کام قرآن مجید کا صحیح نسخہ تیار کرنا تھا۔

شہادتِ عثمانؓ کے بعد وہ اپنے والد اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ بصرے پہنچے اور وہاں جنگ جمل (36 ہجری) میں پیدل فوج کی قیادت کی۔ اس لڑائی کے بعد حضرت عائشہؓ کے ہم راہ مدینے میں واپس آ گئے اور بعد کی خانہ جنگی میں کوئی حصہ نہ لیا، سوائے اس کے کہ دومتہ الجندل کے محاکمے میں موجود تھے۔

امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سیاست سے کنارہ کش ہو گئے، لیکن انھوں نے یزید کو ولی عہد تسلیم کرنے کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا۔ امیر معاویہؓ کی وفات (60 ہجری) پر وہ اور حضرت حسینؓ ہر دو نے پھر یزید کی بیعت کرنے سے انکار کیا اور حاکم مدینہ مروان کی دھمکیوں سے بچنے کے لیے مکے چلے گئے جہاں انھیں کسی نے نہیں ستایا، لیکن جب معرکہ کربلا میں حضرت حسینؓ شہید ہو گئے اور ابن زبیرؓ خفیہ طور پر اپنے طرف داروں کی فوج تیار کرنے لگے تو انھیں گرفتار کرنے کے لیے ان کے بھائی عمرو کے تحت ایک چھوٹی سی فوج مدینے سے بھیجی گئی۔ عمرو کو شکست ہوئی۔ انھیں گرفتار کر لیا گیا اور کافی مار پیٹ کے بعد ایک تنگ کوٹھڑی میں محبوس کر دیا گیا، یہاں تک کہ وہ مر گئے اور ان کی لاش کو سولی پر لٹکا کر تشہیر کی گئی۔

اس کے بعد ابن زبیر نے کھلم کھلا یزید کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ مدینے کے انصار نے بھی ان کی مثال کی پیروی کی اور عبداللہ بن حنظلہ کو جو ''ابن الغسیل'' کے نام سے مشہور تھے، اپنا سردار چن لیا۔ یزید کو اب محسوس ہوا کہ اس نے ضرورت سے زیادہ ڈھیل دے رکھی تھی۔ چنانچہ اس نے ایک شاہی فوج مسلم بن عقبہ کے ماتحت روانہ کی۔ اس فوج نے اہل مدینہ کو جنگ حرہ میں (27 ذی الحج 64 ہجری) شکست دی اور مسلم بن عقبہ کی شہادت کے باوجود ابن زبیر کو گھیرنے کے لیے مکے کی طرف بڑھی۔ 24 دن بعد اس فوج کو یزید کے مرنے کی خبر ملی۔

یزید کی موت کے بعد شام میں بدنظمی اور خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ ابن زبیر نے اس موقع پر فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا۔ شام، مصر، جنوبی عرب اور کوفے کے مخالفین بنو امیہ نے انھیں خلیفہ تسلیم کر لیا، لیکن ان کا اقتدار محض برائے نام تھا۔ 68 ہجری کے حج کے موقع پر حاجیوں نے جن چار اماموں کی امامت میں حج کیا، وہ یہ تھے: ابن زبیر، ایک خارجی، ایک اموی اور محمد بن حنفیہ۔ جب 72 ہجری میں سارا عراق اموی اقتدار میں آ گیا تو خلیفہ عبدالملک نے مکے والوں سے نپٹنے کے لیے حجاج بن یوسف کو روانہ کیا۔ محاصرہ یکم ذی قعدہ 72 ہجری (25۔ مارچ 692ء) کو شروع ہوا اور چھے ماہ سے بھی کچھ زائد مدت تک جاری رہا۔ اس عرصے میں شہر مکہ اور بیت اللہ الحرام سنگ باری کی زد میں رہے۔ آخر میں جب ابن زبیرؓ کے حامی ہمت ہار گئے، یہاں تک کہ ان کے بیٹوں نے بھی حجاج کے آگے ہتھیار ڈال دیے تو وہ اپنی والدہ کی فہمائش پر دوبارہ میدان جنگ میں نکلے اور شہید ہو گئے۔ ان کی لاش کو عین اسی جگہ سولی پر لٹکا دیا گیا، جہاں کچھ عرصہ پہلے ان کے بھائی عمرو کی لاش کی تشہیر کی گئی تھی۔ کچھ عرصے بعد خلیفہ عبدالملک کے حکم سے لاش ان کی والدہ کو دے دی گئی اور انھوں نے اسے مدینے میں حضرت صفیہؓ کے گھر میں دفن کر دیا۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا شمار عہد صحابہ کے نام ور بہادروں میں ہوتا ہے۔ فتح افریقہ میں ان کی بہادری کے کارنامے قابل فخر ہیں۔ جنگ جمل میں انھیں چالیس سے زیادہ زخم آئے اور جس شخص نے ان کی سلامتی کی خبر حضرت عائشہ صدیقہؓ کو سنائی، اسے حضرت عائشہؓ نے دس ہزار درہم بطور انعام دیے۔ یزید بن معاویہؓ کی وفات کے بعد انھوں نے اپنی خلافت کی بیعت لی اور مصر، حجاز، یمن، خراسان، عراق اور شام کے بیش تر حصے پر اپنی حکومت کا اعلان کر کے مدینہ منورہ کو اپنا دارالخلافہ قرار دیا۔ جب حجاج بن یوسف نے ان کے خلاف فوج کشی کی تو وہ مدینے سے مکہ مکرمہ منتقل ہو گئے۔ ان کا عہد خلافت نو برس رہا۔ اس دوران میں انھوں نے اپنا سکہ رائج کیا اور تاریخ اسلام میں پہلی مرتبہ گول درہم بنائے۔ درہم کی ایک طرف "محمد رسول اللہ" نقش تھا اور دوسری طرف "امر اللہ بالوفا والعدل"۔ کتب حدیث میں ان سے 33 احادیث مروی ہیں۔ حضرت عبداللہ تلاوت قرآن مجید اور عبادت گزاری کے لیے بھی مشہور ہیں۔ وہ رات بھر قیام کرتے اور دن کو روزہ رکھتے۔ شوق عبادت اور مسجد سے دل بستگی کی بنا پر وہ "حمامۃ المسجد" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ دیباج کا غلاف کعبہ تیار کیا۔ 17 جمادی الاوّل 73 ہجری کو وفات پائی۔

عبداللہ بن سلامؓ

قبولِ اسلام سے پہلے مدینہ کے ایک یہودی تھے جو بنی قینقاع سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا اصلی نام الحصین تھا۔ جب انھوں نے اسلام قبول کیا تو آنحضور ﷺ نے ان کا نام بدل کر عبداللہ رکھ دیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے آنحضور ﷺ کی مدینے میں تشریف آوری کے فوراً بعد اسلام قبول کیا۔

آنحضور ﷺ کے عہد میں حضرت عبداللہ کا ذکر بعض غیر اہم امور کے سلسلے میں ملتا ہے۔ وہ جابیہ اور یروشلم میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے اور حضرت عثمانؓ کے خلاف بغاوت میں انھوں نے حضرت عثمانؓ کا ساتھ دیا اور باغیوں کو خلیفہ کے قتل سے روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انھوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہ کی اور جب حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ سے لڑنے کے لیے عراق کی طرف جانے لگے تو انھوں نے حضرت علیؓ سے مودبانہ عرض کیا کہ وہ یہ ارادہ ترک کر دیں۔ ان کا تعلق امیر معاویہؓ سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ ان کی وفات 43 ہجری میں ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن سلام یہودی اصحاب کتاب کے مثالی نمایندہ تھے جو حق کے آگے سر جھکاتے تھے، آنحضور ﷺ کو تورات کی بشارتوں کے مطابق رسول مانتے تھے اور اپنے ہم مذہب یہودیوں کی فتنہ سامانیوں سے آپ ﷺ کی حفاظت کرتے تھے۔ وہ سوالات جو انھوں نے آنحضور ﷺ سے پوچھے تھے، کتب احادیث میں ان کی طرف منسوب ہیں۔ حضرت عبداللہ کے ہم عصران کے یہودی الاصل ہونے کی وجہ سے اکثر ان کا خاص طرح تذکرہ کیا کرتے تھے۔ بعض ایسی احادیث بھی مشہور ہیں جن میں رسول کریم ﷺ نے انھیں جنت کی بشارت دی ہے یا آپ ﷺ صحابہ کبار نے ان کی تعریف کی ہے۔ بعض آیات قرآنی میں بھی ان کی طرف اشارہ بتایا جاتا ہے۔ جو سوالات انھوں نے رسول کریم ﷺ سے پوچھے تھے، انھیں بعد میں پھیلا کر پوری کتابوں کی شکل دے دی گئی۔ ان کی احادیث کو ان کے بیٹوں محمد اور یوسف کی طرح حضرت ابو ہریرہؓ اور انسؓ بن مالک نے بھی روایت کیا ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ

ابن عباس، ابو العباس، الملقب بہ الحبر یعنی علامہ یا البحر یعنی سمندر، اس لیے وہ ممتاز فقیہ اور مفسر تھے۔ رسول اللہ کے چچا حضرت عباسؓ کے فرزند تھے۔ اُم المومنین حضرت میمونہؓ ان کی سگی خالہ تھیں۔ ہجرت سے تین سال قبل مکہ میں پیدا ہوئے جب کہ بنو ہاشم شعب ابی طالب میں محصور ہو کر زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی والدہ نے ہجرت سے پہلے اسلام قبول کر لیا تھا، اس لیے وہ پیدائش کے وقت ہی سے مسلمان تسلیم کیے جاتے ہیں۔

انھیں دورِ اوّل کے مسلمانوں میں اگر سب سے بڑا عالم نہیں تو علمائے عظام میں سے ایک ضرور سمجھا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر میں مہارت و بصیرت کی وجہ سے انھیں "امام المفسرین" کہا گیا ہے۔ انھوں نے ایسے وقت میں قرآن مجید کی تفسیر کا کام اپنے ہاتھ میں لیا جب کہ مسلمانوں کے معاشرے میں گہری تبدیلیاں رونما ہونے کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ معاشرے کے نئے تقاضوں کے پیش نظر قرآن مجید کے مطالب و معانی کی تشریح کی جائے، اور انھوں نے اس کام کو بڑی قابلیت اور مہارت کے ساتھ سرانجام دیا۔

ان کی طبیعت میں لڑکپن ہی سے صحیح علمی تحقیق کا رُجحان موجود تھا۔ ان کے دل میں یہ خیال بہت جلد پیدا ہو گیا تھا کہ صحابہ کرامؓ سے استفسارات کر

آنحضور ﷺ کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں۔ ابھی وہ نوعمر ہی تھے کہ معلم بن گئے اور حصولِ علم کے خواہش مند لوگ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ ان کا علم وفضل محض حافظے پر مبنی نہ تھا، بلکہ ان کے پاس تحریری یادداشتوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی موجود تھا، چنانچہ انھوں نے عوام میں درس دینا شروع کر دیا، بلکہ تعلیم کے لیے باقاعدہ جماعتیں بنا دیں اور تقریباً معین نظام الاوقات کے مطابق ہفتے کے مختلف دنوں میں مختلف موضوعات، مثلاً تفسیر قرآن، فقہی مسائل، غزوات نبی، تاریخ زمانہ قبل از اسلام اور قدیم شاعری کا باقاعدہ درس دینے لگے۔

قرآن مجید کے الفاظ ومحاورات کی تشریح کرتے وقت ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے بیان کی تائید میں قدیم عرب شعرا کے اشعار پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے اس طریق کار کی وجہ سے مسلمان علمائے دین کے ہاں قدیم عرب شاعری کی اہمیت تسلیم کی گئی، چوں کہ انھیں ایک مستند عالم دین سمجھا جاتا تھا، لہٰذا لوگ ان سے فتوے لیا کرتے تھے۔ وہ اپنے بہت سے اہم فتاوٰی کے باعث بہت مشہور ہیں۔ بعض کی تائید میں انھیں بعد ازاں دلائل پیش کرنا پڑے۔ بعض صورتوں میں انھوں نے اپنے اس فیصلے سے رُجوع کر لیا تھا۔ مطالب قرآن کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ کی تشریحات کو جمع کر کے مجموعے تیار کر لیے گئے، جن کی سند اُن کے بلا واسطہ شاگردوں میں سے کسی شاگرد تک پہنچتی ہیں۔ اسی طرح ان کے فتاوٰی بھی جمع کر لیے گئے۔ آج اس تفسیر یا تفسیروں کے متعدد مخطوطات اور مطبوعہ نسخے موجود ہیں، جنھیں ان کی جانب منسوب کیا جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے عہد طفولیت سے وفات نبوی تک آٹھ دس سال کی مدت آنحضور ﷺ کی صحبت میں بسر کی۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کبارؓ کی صحبت اختیار کی اور ان سے حضور ﷺ کی احادیث سننے اور یاد کرنے کا خاص اہتمام کیا۔ کتب حدیث میں ان سے ایک ہزار 660 احادیث مروی ہیں۔ خوش اخلاقی، وجاہت اور تفقہ فی کتاب اللہ کے باعث حضرت عمرؓ ان کی بے حد قدر کرتے اور مشکل مسائل میں ان سے مشورے کیا کرتے تھے اور اکثر ان کی رائے پر عمل کرتے اور کہتے تھے کہ ابن عباسؓ سب سے بڑے عالم ہیں۔ وہ بوڑھوں کے جوان یا نوجوان بزرگ ہیں۔ ان کی زبان بکثرت سوال کرنے والی اور دل بڑا عاقل ہے۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ وہ تفسیر قرآن میں، یوں لگتا ہے کہ شفاف پردے کے پس منظر سے غیب کی چیزیں دیکھ رہے ہیں۔ ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ وہ بہترین ترجمان القرآن ہیں۔ ابن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ ”جو کچھ محمد ﷺ پر نازل ہوا، اُسے امتِ محمدی میں سے ابن عباسؓ سب سے زیادہ جانتے ہیں۔“ محمد حسین الذہبی نے اپنی تصنیف ”التفسیر والمفسرون“ میں حضرت ابن عباسؓ کی بلند مرتبہ علمیت کے پانچ اسباب بتائے ہیں:

1: رسول کریم ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی تھی کہ یا اللہ، اسے کتاب وحکمت کا علم، دین کی سمجھ اور تاویل قرآن کا فہم عطا کر
2: خانوادۂ نبوت میں تربیت پائی
3: صحابہ کبارؓ کی صحبت
4: زبردست قوت حافظہ کے ساتھ لغت وادب عرب کا حفظ ہونا (انھوں نے عمر بن ابی ربیعہ کے 80 اشعار صرف ایک مرتبہ سن کر یاد کر لیے تھے)
5: انھیں اجتہاد کا مرتبہ حاصل ہو گیا تھا

اسلامی افواج کے ساتھ بہت سے معرکوں میں بھی شامل ہوئے، مثلاً معرکہ مصر (20 ہجری)، معرکہ افریقیہ (27 ہجری)، معرکہ ہائے جرجان وطبرستان (30 ہجری) اور اس کے بہت دن بعد (49 ہجری) قسطنطنیہ کی مہم پر بھی گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی ان کے ساتھ تھے۔ جنگ جمل (36 ہجری) اور جنگ صفین (37 ہجری) میں وہ حضرت علیؓ کے لشکر میں ایک بازو کے سپہ سالار تھے۔ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے مشیروں میں سے تھے۔ وہ حضرت علیؓ اور ان کے فرزند الحسینؓ کے بھی مشیر تھے۔ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے سے پہلے سیاست میں کوئی دخل نہیں دیا، اور حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں بھی انھوں نے سیاست میں تین چار سال تک حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ نے انھیں اپنی خلافت کے آخر میں اس وقت امیر حج مقرر کیا جب وہ مدینہ میں اپنے مکان میں محصور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت ابن عباسؓ مدینے میں موجود نہ تھے۔ اس کے کچھ دن بعد جب وہ مدینہ لوٹے تو انھوں نے حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس وقت سے انھیں اہم سرکاری خدمات تفویض ہونے لگیں اور جب بصرہ پر قبضہ ہو گیا تو انھیں اس شہر کا والی مقرر کر دیا گیا۔

37 ہجری کے معاہدۂ صفین پر دستخط کرنے والوں میں سے ایک حضرت ابن عباسؓ بھی تھے، جس کی رو سے قرار پایا تھا کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے تنازعے کے فیصلے کے لیے دو حکم مقرر کیے جائیں۔ اہل حرورا سے بحث کے دوران میں انھوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ محاکمہ شرع کے مطابق تھا، لیکن کچھ عرصہ بعد بعض وجوہ کی بنا پر حضرت ابن عباسؓ اپنے مرکز حکومت بصرہ کو چھوڑ کر مکے میں جا بیٹھے۔ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد امام الحسنؓ نے انھیں اپنی فوج کا سالار مقرر کیا۔ اس اثنا میں انھوں نے امیر معاویہؓ کے ساتھ مصالحت کی کوشش کی۔ امیر معاویہؓ کے طویل عہد حکومت کے دوران میں حضرت ابن عباسؓ حجاز میں رہے۔ جب عبداللہ بن زبیرؓ نے بغاوت کا علم بلند کر کے متوازی خلافت قائم کر لی تو وہ ابن عباسؓ کے طرز عمل پر سخت برافروختہ ہوئے، کیوں کہ ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کے بیٹے ابن الحنفیہ نے انھیں خلیفہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ چنانچہ دونوں کو مکے سے جلاوطن کر دیا گیا۔ 64 ہجری میں جب شہر کا محاصرہ ہوا تو وہ مکے میں واپس آ گئے، لیکن انھوں نے عبداللہ بن زبیرؓ کی مخالفت جاری رکھی۔ اس کے نتائج افسوس ناک برآمد ہوئے، ان دونوں کو قید کر دیا گیا۔ جب المختار کو اس صورت حال کی اطلاع ملی تو اس نے کوفے سے سواروں کا ایک بڑا دستہ بھیجا۔ اس دستے نے اچانک چھاپا مار کر انھیں رہائی دلائی۔ اس بات کا سہرا حضرت ابن عباسؓ کے سر ہے کہ اس موقع پر مکہ معظمہ کا مقدس شہر خوں ریزی سے بچا رہا۔

زندگی کے آخری ایام میں ان کی بینائی جاتی رہی اور وہ طائف میں مقیم ہو گئے۔ یہیں 68ہجری میں فوت ہوئے۔

عبداللہ بن عمرؓ

حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند اور احادیث نبوی ﷺ کے شہرۂ آفاق راوی۔ وہ ہجرت سے تقریباً دس سال پہلے پیدا ہوئے اور اپنے والد کے ہم راہ اسلام لائے، لیکن والد سے کچھ پہلے ہجرت کی۔ جب وہ غزوۂ بدر اور اُحد میں جہاد کے لیے حاضر ہوئے، تو رسول اللہ ﷺ نے انھیں ان کی کم سنی کی وجہ سے واپس کر دیا، لیکن غزوۂ خندق کے موقع پر انھیں جہاد کی اجازت مل گئی۔ اس وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی۔ بعد کی مماثل صورتوں میں یہ واقعہ ایک نظیر بن گیا۔ بعدازاں وہ موتہ (7ہجری) کی سخت مہم اور فتح مکہ (8ہجری) میں شامل ہوئے۔ نیز جھوٹے مدعیان نبوت یعنی مسیلمہ کذاب اور طلیحہ کے خلاف جہاد (21ہجری) میں حصہ لیا۔ پھر مہم مصر (18 تا 21ہجری)، جنگ نہاوند (21ہجری)، مہم جرجان و طبرستان (30ہجری) اور یزید کی مہم قسطنطنیہ (49ہجری) میں شریک ہوئے۔

جہاں تک سیاسی معاملات کا تعلق ہے، وہ پہلی مرتبہ اس وقت نمایاں ہوئے جب حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی وفات سے پہلے انھیں اس مجلس شوریٰ کا مشیر مقرر کیا، جس کا کام اپنے ارکان میں خلیفہ کا انتخاب کرنا تھا، لیکن انھیں ووٹ دینے کا حق صرف اس وقت تھا جب بقیہ ارکان برابر برابر دو حصوں میں منقسم ہوں اور یہ بھی شرط تھی کہ ان کا ہرگز بطور خلیفہ انتخاب نہیں کیا جائے گا اور نہ وہ اپنے انتخاب کے لیے اپنا ووٹ استعمال کر سکتے ہیں، دیگر خلفا کے انتخاب میں انھوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی اکثریت کا ساتھ دیا، البتہ انھوں نے یزید کو ولی عہد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اس روش کے خلاف تھے جو امیر معاویہؓ نے جانشینی کے فیصلے میں اختیار کی تھی، لیکن جب حضرت معاویہؓ کی وفات ہوئی تو انھوں نے رفع فتنہ کی خاطر یزید کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں تامل نہیں کیا۔ وہ مملکت کے کسی بڑے انتظامی عہدے پر مقرر نہیں ہوئے۔ ہاں چند سفارتوں میں ضرور شامل ہوئے۔ ان اُمور سے وہ غالباً عمداً الگ رہے۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو حدیث میں سند تسلیم کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی مذہبی اور علمی مشاغل کے لیے وقف کر دی۔ ان سے دو ہزار 630 احادیث مروی ہیں۔ انھوں نے منصب قضا محض اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ کہیں احکامِ شریعت کی تعبیر میں ان سے کوئی غلطی نہ سرزد ہو جائے۔ حضرت ابن عمرؓ اتباع سنت کے لیے مشہور ہیں۔ وہ آنحضور ﷺ کی اکثر مجالس میں حاضر رہنے کی کوشش کرتے اور اگر کبھی غیر حاضر ہو جاتے تو حاضرین مجلس سے حضور ﷺ کے ارشادات دریافت کر لیتے۔

حضرت ابن عمرؓ نے 80 سال سے زائد کی عمر میں 73ہجری میں سمیّت خون سے وفات پائی۔ سمیّت کی وجہ یہ تھی کہ حج کے موقع پر جب حاجیوں کا ہجوم عرفات سے لوٹ رہا تھا تو حجاج بن یوسف کے ایک سپاہی نے ان کے پاؤں میں اپنے نیزے کی نوک چبھو دی تھی۔ جب حجاج ان کی عیادت کے لیے گیا اور پوچھا کہ کیا وہ اس سپاہی کی شناخت کر سکتے ہیں، تاکہ اُسے سزا دی جائے تو انھوں نے حجاج کو ملامت کی کہ اس نے اپنے سپاہیوں کو مقامات مقدسہ میں ہتھیار لے کر آنے کی اجازت ہی کیوں دے رکھی ہے۔

عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ

حضرت عبداللہ اپنے والد حضرت عمرو بن العاصؓ سے پہلے اسلام لائے۔ دربارِ نبوت میں اکثر حاضر رہتے تھے اور آنحضور ﷺ کی زبان مبارک سے جو کچھ سنتے، اسے لکھ لیتے تھے۔ آنحضور ﷺ کی مصاحبت سے جو وقت بچتا تھا، وہ یادِ الٰہی میں بسر ہوتا۔ دن عموماً روزوں میں بسر ہوتا اور رات عبادت میں گزر جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ مشغلہ اس قدر بڑھا کہ اہل وعیال اور تمام دنیاوی تعلقات سے کنارہ کش ہو گئے۔ ان کے والد نے آنحضور ﷺ سے ان کی اس راہبانہ زندگی کی شکایت کی تو آنحضور ﷺ نے انھیں بلا کر فرمایا: ''عبداللہ! روزے رکھو اور افطار کرو۔ نماز پڑھو اور آرام کرو۔ نیز بیوی بچوں کا حق ادا کرو۔ یہی میرا طریقہ ہے۔''

بعض غزوات میں شریک تھے۔ جہاد کے موقع پر عموماً سواری اور بار برداری کا اہتمام ان کے سپرد ہوتا تھا۔ جنگ یرموک میں ان کے والد حضرت عمرو بن العاصؓ نے اپنا علم قیادت ان کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ ان کے والد امیر معاویہؓ کے طرف دار تھے، چنانچہ جب واقعہ صفین پیش آیا تو انھوں نے بیٹے کو امیر معاویہؓ کی فوج میں شریک ہونے پر مجبور کیا، لیکن وہ اس خانہ جنگی سے سخت متنفر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے جنگ میں عملاً کوئی حصہ نہیں لیا اور بارہا اپنے والد کو اس سے کنارہ کش ہونے کا مشورہ دیا۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ اپنے علم وفضل کے لحاظ سے صحابہ کبارؓ میں خاص امتیاز رکھتے تھے۔ انھوں نے عربی زبان کے علاوہ عبرانی میں بھی خاص دست گاہ حاصل کی تھی اور تورات وانجیل کا غور سے مطالعہ کیا تھا۔ احادیثِ نبوی ﷺ کا جس قدر کثیر ذخیرہ ان کے پاس تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ تک کو اعتراف تھا کہ ''عبداللہ بن عمروؓ کو مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں، کیوں کہ وہ رسول کریم ﷺ سے جو کچھ سنتے تھے، لکھ لیتے تھے، اور میں لکھتا نہ تھا۔'' ان کی روایات کی تعداد سات سو ہے۔ انھوں نے 65ہجری میں فسطاط میں وفات پائی۔ لوگوں نے انھیں گھر ہی میں دفن کر دیا، کیوں کہ اس زمانے میں مروان بن الحکم اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی فوجوں میں نہایت شدید جنگ ہو رہی تھی، اور جنازے کا عام قبرستان تک پہنچانا سخت دشوار تھا۔

عبداللہ بن مسعودؓ

عبداللہ نام، ابوعبدالرحمٰن کنیت، والد کا نام مسعود اور والدہ کا نام ام عبد تھا۔ ایام جاہلیت میں بچپن میں بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ مکہ میں جب اسلام کا غلغلہ ہوا تو عقبہ بن معیط کی بکریاں ان کے سپرد تھیں۔ ایک روز آنحضور ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ اس طرف سے گزرے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: ''صاحب زادے! تمھارے پاس کچھ دودھ ہو تو پیاس بجھاؤ۔'' بولے ''میں آپ کو دودھ نہیں دے سکتا کیوں کہ یہ دوسرے کی امانت ہے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھارے پاس کوئی

ایسی بکری ہے جس نے بچے نہ دیے ہوں۔" عرض کیا، ہاں اور ایک بکری پیش کی۔ حضور ﷺ نے تھن پر ہاتھ پھیر کر دعا فرمائی، یہاں تک کہ وہ دودھ سے لبریز ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے دوہا تو اس قدر دودھ نکلا، تینوں نے یکے بعد دیگرے خوب سیر ہو کر نوش فرمایا۔ اس کے بعد رسول کریم ﷺ نے تھن سے فرمایا، خشک ہو جا، اور وہ پھر اپنی اصلی حالت پر عود کر آیا۔ آنحضور ﷺ کا یہ معجزہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے منسوب ہے جو عام طور پر "ابن مسعود" کی عرفیت سے مشہور ہیں۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود اولین صحابہ میں سے تھے، چنانچہ وہ فخریہ طور پر اپنے آپ کو چھے میں سے چھٹا (سادس ستہ) کہا کرتے تھے، وہ اس وقت اسلام لائے جب کہ ابھی آنحضرت ﷺ ارقم کے گھر میں نہیں گئے تھے، بلکہ وہ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے سے بھی پہلے ایمان لائے۔ قبول اسلام کے وقت ان کی عمر انیس بیس سال تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے مکے میں علی الاعلان قرآن مجید کی تلاوت کی، حالانکہ ان کے دوست انھیں اس کام سے روکتے تھے، کیوں کہ ان کی پشت پر ان کی حفاظت کرنے والا کوئی اپنا قبیلہ نہ تھا۔ چنانچہ اسی لیے قرآن پڑھنے پر ان سے بدسلوکی کی گئی۔ وہ یقیناً حبشہ گئے تھے، بلکہ دو مرتبہ۔

مدینے میں وہ مسجد نبوی کی پشت پر رہتے تھے اور وہ اور ان کی والدہ آنحضرت ﷺ کے گھر اس قدر کثرت سے آتے جاتے دکھائی دیتے تھے کہ ناواقف لوگ انھیں حضور ﷺ کے گھر کے آدمی سمجھتے تھے، لیکن حضرت عبداللہ محض "صاحب النعلین" کی حیثیت سے رسول کریم ﷺ کے وفادار خادم تھے۔ وہ ظاہری وضع قطع میں آنحضرت ﷺ کی تقلید کیا کرتے تھے، لیکن لوگ ان کی پتلی ٹانگوں پر اکثر ہنسا کرتے تھے۔ ان کے بال سُرخ اور لمبے تھے اور وہ ان میں خضاب نہ لگاتے تھے۔ ان کی یہ خصوصیت اور ان کا سفید لباس اور عطر کا متواتر استعمال، ان کے مذہبی عقائد کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ وہ زیادہ تر نماز پر زور دیا کرتے تھے اور اس کے برعکس نفلی روزے کم رکھتے تھے، تاکہ خدا کی خدمت کے لیے اپنی طاقت کو محفوظ رکھ سکیں۔

وہ تمام غزوات و مشاہد میں موجود تھے۔ غزوۂ بدر میں جب ابوجہل شدید مجروح ہو گیا تو حضرت عبداللہ اس کا سر کاٹ کر فاتحانہ انداز میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لائے، وہ مبشرہ بالجنت میں سے بھی تھے۔ فتنۂ ارتداد کے دوران میں جب حضرت ابوبکرؓ نے مدینے کو حفاظت کے خیال سے مستحکم کرنا چاہا تو حضرت عبداللہ ان لوگوں میں سے تھے، جنھیں آپ نے شہر کے کم زور مقامات کی نگرانی کے لیے منتخب کیا تھا۔ انھوں نے یرموک کی جنگ میں بھی حصہ لیا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں کوفے کے بیت المال کے انتظام اور اسلام کی تلقین کے لیے بھیجا۔ قرآن و سنت کا عالم ہونے کی وجہ سے لوگ اکثر ان سے مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ ان سے 848 احادیث مروی ہیں۔ ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ حضور ﷺ کی حدیث روایت کرتے وقت ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا، اور یہاں تک کہ ان کی پیشانی سے پسینا بہنے لگتا تھا۔ جو کچھ وہ بیان کرتے، نہایت احتیاط سے کرتے تاکہ کہیں کوئی غلط بات نہ کہہ دیں۔ حرمتِ شراب کی ایک نرم تعبیر کے لیے ان کی سند پیش کی جاتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں ان کے کوفے کے عہدے سے معزول کر دیا تھا۔ جب لوگوں کو یہ خبر ملی تو لوگوں نے انھیں روکنا چاہا، لیکن انھوں نے کہا: "مجھے جانے دو، کیوں کہ اگر فتنے برپا ہونے والے ہیں تو میں ان کا باعث نہیں بننا چاہتا۔ (ایک دوسری روایت میں ان کی معزولی حضرت عثمانؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے)۔ وہ کوفے سے مدینے واپس چلے آئے اور وہاں 32 ہجری میں ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر میں وفات پائی۔

جب وہ بستر مرگ پر تھے تو حضرت عثمانؓ ان سے ملنے آئے۔ ان کا حال دریافت کیا اور پوچھا کہ ان کی کیا خواہش ہے؟ تو انھوں نے اس قسم کے جوابات دیئے جو قدما کی پارسائی کے ساتھ اعلیٰ دین داری کا نمونہ تھے۔ حضرت عبداللہ کی شہرت زیادہ تر بہ حیثیت محدث و مفسر قرآن ہے۔

عتابؓ بن اسید

بن ابی العیص بن امیہ۔ اموی۔ فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ بڑے عاقل اور شجاع تھے۔ اس کے کچھ عرصے بعد غزوۂ حنین (8 ہجری) کے دوران میں آنحضور ﷺ نے انھیں مکے کا عامل مقرر کیا، جب کہ ان کی عمر بیس اکیس برس تھی۔ 8 ہجری کا حج انھی کی امارت میں ہوا۔ اس اعتبار سے وہ پہلے امیر الحج ٹھہرے۔ وہ اس عہدے پر حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بھی فائز رہے۔ وہ بڑے زاہد و عابد تھے۔ ان کا شمار صاحب افتا صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔

وہ جویریہ بنت ابی جہل سے شادی کرنے پر راضی ہو گئے تاکہ حضرت علیؓ بن ابی طالب کو حضرت فاطمہؓ پر سوکن لانے سے روکا جا سکے۔ انھوں نے ابوجہل کی بیٹی حنفا سے شادی کی۔ اس سے پہلے وہ سہیل بن عمرو کے عقد میں تھیں۔ ان کی وفات اس دن مکے میں ہوئی جس دن وہاں حضرت ابوبکرؓ کی وفات کی خبر پہنچی۔

عتبانؓ بن مالک

ان کا تعلق خزرج کے خاندان بنو سالم سے تھا۔ اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ انصار کے سابقون الاولون میں شامل تھے۔ جب حضور ﷺ مکے سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو آپ ﷺ کا پُرتپاک خیر مقدم کرنے والوں میں حضرت عتبان بھی شامل تھے۔ حضور ﷺ چند دن قبا میں قیام کرنے کے بعد مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہوئے تو راہ میں بنو سالم کا محلہ تھا۔ حضرت عتبانؓ نے آگے بڑھ کر حضور ﷺ کو قیام کے لیے اپنا مکان پیش کیا، لیکن یہ سعادت حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی، اس لیے حضور ﷺ انھیں دعائیں دیتے ہوئے آگے روانہ ہو گئے۔ ہجرت کے چند ماہ بعد مواخات میں حضرت عتبانؓ کو حضرت عمر فاروقؓ کا دینی بھائی بنایا۔

غزوۂ بدر میں شریک ہوئے، لیکن آنکھیں خراب ہونا شروع ہوئیں، کچھ عرصے

کے بعد نابینا ہو گئے۔ بارگاہ رسالت ﷺ میں پہنچے اور عرض کیا: ''یارسول اللہ، میں نابینا ہوں، کیا اس حالت میں اپنے مکان پر نماز پڑھ سکتا ہوں۔''

حضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا تمھارے کانوں میں اذان کی آواز پہنچتی ہے؟''

انھوں نے عرض کیا: ''ہاں، یارسول اللہ۔''

ارشاد ہوا: ''تو پھر مسجد میں آ کر نماز پڑھا کرو۔''

حضرت عتبانؓ کو آنحضور ﷺ نے بنوسالم کی مسجد کا امام مقرر فرمایا۔ چوں کہ ان کا مکان کاشانہ نبوی ﷺ اور مسجد نبوی ﷺ سے دو تین میل کے فاصلے پر تھا اور روزانہ آنے جانے میں دقت ہوتی تھی، اس لیے انھوں نے اپنے مواخاتی بھائی حضرت عمر فاروقؓ سے یہ طے کیا کہ دونوں باری باری رسول کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کریں۔ چنانچہ ایک دن حضرت عمرؓ حاضر رہتے اور احکام وحی اور ارشادات نبوی ﷺ سے بہرہ مند ہوتے۔ شام کو یہ تمام باتیں حضرت عتبانؓ تک پہنچا دیتے۔ دوسرے دن اپنی باری پر حضرت عتبانؓ بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے اور جو کچھ آنحضور ﷺ سے سنتے، حضرت عمرؓ تک پہنچا دیتے۔

''صحیح بخاری'' میں ہے کہ حضرت عتبان کے مکان اور مسجد کے درمیان ایک نشیبی جگہ تھی۔ بارش ہوتی تو تمام پانی وہاں جمع ہو جاتا تھا۔ نظر کی خرابی کی وجہ سے حضرت عتبانؓ کے لیے اس پانی میں سے گزر کر مسجد تک پہنچنا سخت مشکل تھا، اس لیے وہ بہ امر مجبوری گھر پر نماز پڑھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا: ''یارسول اللہ، جب کبھی بارش ہوتی ہے تو مسجد اور میرے مکان کے درمیان گہرا پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ میری نظر اس پانی سے گزر کر مجھے مسجد تک پہنچنے کی اجازت نہیں دیتی، اس لیے مجبوراً ایسی حالت میں گھر میں نماز ادا کر لیتا ہوں۔ اگر کسی دن حضور ﷺ میرے ہاں تشریف لا کر نماز پڑھا دیں تو اسی جگہ کو سجدہ گاہ بنا لوں۔''

آنحضور ﷺ نے وعدہ فرما لیا۔ دوسرے دن آپ ﷺ حضرت ابوبکرؓ کی معیت میں حضرت عتبانؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ان سے پوچھا کہ تم کہاں نماز پڑھتے ہو؟ انھوں نے وہ مقام جہاں وہ بارش کے دنوں میں نماز پڑھا کرتے تھے، بتا دی۔ حضور ﷺ نے اسی مقام پر دو رکعتیں ادا کیں۔ اس کے بعد کچھ دیر وہاں تشریف فرما رہے۔ حضرت عتبانؓ نے حضور ﷺ کی خدمت میں بُھنا ہوا گوشت پیش کیا۔ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ہم راہ اسے تناول فرمایا اور واپس تشریف لے گئے۔

حضرت عتبانؓ آخیر عمر تک مسجد بنوسالم کی امامت کرتے رہے۔ صحیح بخاری میں محمود بن ربیعؓ سے روایت ہے کہ میں 52 ہجری میں امیر معاویہ کے عہد میں قسطنطنیہ کی جنگ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا تو حضرت عتبانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت وہ بہت ضعیف العمر ہو چکے تھے۔ نابینا تھے اور بنی سلیم کے محلے کی مسجد کی امامت کرتے تھے۔

عتبہؓ بن غزوان

بن جابر بن وہب۔ کنیت ابوعبداللہ۔ نیز ابوغزوان۔ ان کا تعلق قبیلہ قیس عیلان سے تھا جو نوفل بن عبد مناف کا حلیف تھا۔ وہ رسول کریم ﷺ کے اولین صحابہؓ میں سے تھے اور انھیں ''السابعہ السبعہ الاولین'' کہا جاتا تھا، یعنی سب سے پہلے اسلام لانے والے سات اصحاب میں ان کا شمار ساتواں تھا اور مکے میں سابقون الاولون پر جو مصائب و مظالم آئے، وہ ان میں شریک تھے۔ انھوں نے دونوں ہجرتوں میں شرکت کی اور غزوۂ بدر اور دوسرے غزوات و سرایا میں بھی شریک رہے، لیکن ان کا نام بصرے کے بانی کی حیثیت سے زیادہ معروف ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں انھوں نے ایک فوجی مہم کی قیادت کی اور ابلہ فتح کر لیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے انھیں ارض الہند یعنی عرب اور ایران کے درمیانی علاقے کا عامل مقرر کر دیا اور حکم دیا کہ وہ سواد میں جنگ شروع کر دیں۔ انھوں نے الخربیہ نام ایک جھونپڑی کو اپنا مستقر بنا لیا اور وہاں فوجی مرکز کی ہر چیز تعمیر کی، مثلاً ایک مسجد، حاکم کے لیے ایک مکان، سپاہیوں اور ان کے مال بچوں کے لیے قیام گاہیں، غرض انھوں نے وہ تمام چیزیں تعمیر کرائیں جو ایک ترقی پزیر شہر کے لیے ضروری ہیں۔ یہ بصرہ کی ابتدائی صورت تھی۔

حج کے بعد انھوں نے حضرت عمرؓ سے اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کی اجازت چاہی، مگر حضرت عمرؓ نے انکار کر دیا۔ پھر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ وہ انھیں بصرے واپس لے جانے سے بچائے۔ واپسی پر راستے میں وہ اپنے اونٹ پر سوار ہی تھے کہ وفات پا گئے اور نیچے گر گئے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ بصرے میں ان کے جانشین ہوئے۔

عثمانؓ بن مظعون

ابوسائب کنیت تھی۔ ان کا شمار رسول کریم ﷺ کے قدیم ترین اور فاضل صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے۔ ان سے پہلے صرف تیرہ اشخاص ایمان لائے تھے۔ وہ حبشہ کی ہجرت میں شریک تھے اور دوسرے کئی مہاجروں کی طرح رسول اللہ اور کافروں کے درمیان صلح کی غلط خبر سننے پر واپس آ گئے تھے۔ وہ کچھ عرصے تک ولید بن مغیرہ کی پناہ و حمایت میں رہے، مگر جلد ہی یہ رعایت ترک کر دی، کیوں کہ اس ظلم و ستم کا تختہ مشق بننے کو بہتر سمجھتے تھے جو مکے میں ان کے ہم مذہبوں کے ساتھ روا رکھا جا رہا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے مدینے کو ہجرت کی۔ ان کے بیٹے سائب ان کے ہم راہ تھے۔ حضرت عثمانؓ کے بھائی قدامہ، عبداللہؓ اور سائب بھی مہاجر اور بدری ہیں۔ انھوں نے جنگ بدر میں شرکت کی اور اگلے سال 3 ہجری میں وفات پائی۔

وہ پہلے مسلمان تھے جو جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ آنحضور ﷺ کی نظر میں ان کی جو وقعت تھی، اس کا علم اس رنج و غم سے ہوتا ہے جس کا اظہار آپ ﷺ نے ان کی میت دیکھنے پر کیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے انھیں دفن کرنے کے بعد ایک پتھر ان کی قبر پر رکھ دیا، تاکہ ان کی قبر کی شناخت ہو سکے۔ بعد میں آپ ﷺ نے اپنے صاحب زادے حضرت ابراہیمؑ کو ان کی قبر کے پاس دفن کیا۔

حضرت عثمانؓ بڑے زاہد و عابد اور متقی انسان تھے۔ وہ عبادت و ریاضت میں مہ تھے۔ وہ شراب کے ممنوع قرار دیے جانے سے پہلے ہی اس سے اجتناب کرتے تے زہد و عبادت کا یہ حال تھا کہ رات بھر نوافل پڑھتے رہتے اور دن بھر روزہ رکھتے۔ یہاں تک کہ اپنی بیوی سے بھی تغافل برتنے لگے، جنھوں نے حضرت عائشہؓ سے شکایت کی، جس پر حضور ﷺ نے انھیں رہبانیت سے یہ سمجھا کر باز رکھنے کی کوشش کی کہ وہ آپ ﷺ کا اتباع کیا کریں۔ یہ روایت بھی عام ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ سے اپنے آپ کو خصی کر لینے کی اجازت چاہی تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام میں اس امر کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔ ارشاد ہوا: "کیا میری ذات تمھارے لیے اسوۂ حسنہ نہیں ہے؟ میں اپنی بیویوں سے ملتا ہوں۔ گوشت کھاتا ہوں۔ روزے رکھتا اور افطار کرتا ہوں۔ بے شک میری امت کا خصی ہونا صرف روزے رکھنا ہے، اس جو شخص خصی کرے گا یا خصی بنے گا، وہ میری امت میں سے نہیں ہے۔"

ۃؓ بن مسعود ثقفی

بنوثقیف کے اشراف میں سے ایک تھے۔ اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ نہایت دل، صائب الرائے اور دلیر آدمی تھے۔ قریش مکہ سے بھی ان کے گہرے مراسم اور مکہ میں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ 6 ہجری میں صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش سفیر تھے۔ انھوں نے خوں ریزی روکنے کے لیے مسلمانوں اور قریش کے مابین صلح لیے نہایت اخلاص اور دردمندی کے ساتھ سرتوڑ کوشش کی۔ انھوں نے قریش کو رہ دیا کہ مسلمانوں سے صلح کرلو اور انھیں مکہ میں داخل ہونے سے نہ روکو۔ قریش اس وقت تو ان کا مشورہ نہ مانا، لیکن بیعت رضوان کے بعد وہ صلح نامہ حدیبیہ پر خط کرنے پر مجبور ہو گئے۔

8 ہجری میں حضور ﷺ طائف سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ کو واپس تشریف لا ہے تھے کہ اثنائے راہ میں حضرت عروہ بن مسعودؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام قبول کیا۔ اس کے بعد انھوں نے عرض کی: "یا رسول اللہ مجھے اپنے قبیلے کو حق کی وت دینے کی اجازت دیجیے۔" حضور ﷺ نے فرمایا: "تمھاری سنگ دل قوم تم سے لڑے گی۔" حضرت عروہؓ طائف پہنچے۔ بنوثقیف کو اسلام کی دعوت دی۔ اس پر وہ بھڑک اٹھے اور حضرت عروہؓ کو سخت سست کہہ کر چلے گئے۔

دوسرے دن صبح کو حضرت عروہؓ نے اپنے مکان کے بالاخانے میں کھڑے ہو کر فجر کی اذان دی۔ اذان کی آواز سن کر بنوثقیف مشتعل ہو گئے اور حضرت عروہؓ پر تیر برسانا شروع کر دیے۔ ایک شخص اوس بن عوف نے تاک کر ایسا تیر مارا کہ پیغامِ اجل ثابت ہوا۔ جب ان کی جانبری کی کوئی اُمید نہ رہی تو ان کے اہل خاندان ہتھیار باندھ کر ان کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کا بدلہ ضرور لیں گے۔ جب تک ہم بنو مالک کے دس ہزار قتل نہ کر لیں گے، ہمیں چین نہ آئے گا۔"

حضرت عروہؓ بن مسعود نے فرمایا: "یہ تو اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص احسان ہے کہ اس نے رتبۂ شہادت پر مجھے فائز کیا۔ میرے بدلے میں کسی کو قتل نہ کرو۔ میں نے اپنا خون معاف کیا۔ میری تو اب صرف یہ آرزو ہے کہ مجھے رسول اللہ کے ان ساتھیوں کے پاس دفن کرنا جو محاصرۂ طائف کے دوران میں شہید ہوئے۔"

رحمت عالم ﷺ کو حضرت عروہؓ بن مسعود کی شہادت کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا "عروہ کی مثال صاحب یٰس جیسی ہے کہ انھوں نے اپنی قوم کو حق کی طرف بلایا اور قوم نے انھیں مار ڈالا۔" ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مجھے انبیا کی مثالی صورتیں دکھائی گئیں۔ ابراہیمؑ میرے ہم شبیہ تھے اور عروہؓ حضرت عیسیٰؑ کے ہم شکل تھے۔"

عشرہ مبشرہؓ

وہ دس جلیل القدر صحابہ، جن کے جنتی ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ یہ اصطلاح احادیث میں نہیں آئی، لیکن یہ تصور انھی سے ماخوذ ہے۔ اس قسم کی حدیثوں میں عموماً یہ الفاظ ملتے ہیں: عشرۃ فی الجنۃ"، دس حضرات جنت میں ہوں گے، جس کے بعد ان کے نام درج ہیں۔ مختلف فہرستوں میں ذیل کے صحابہ کرامؓ کے اسما مذکور ہیں: حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت سعید بن زیدؓ۔ بعض روایات میں ان نو حضرات سے پہلے خود آنحضرت ﷺ کا اسم مبارک ہے۔ دوسری روایات میں آنحضرت ﷺ کا اسم مبارک نہیں، بلکہ ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کا نام ہے۔

علیؓ بن ابی طالب

نام علیؓ، کنیت ابوالحسن و ابوتراب، لقب حیدر۔ سب سے پہلے ان کی والدہ ماجدہ نے ان کا نام اسد رکھا جو بعد میں ضرورت شعری کے طور پر حیدر یا حیدرہ مشہور ہو گیا۔ والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا۔

حضرت علی کی ولادت 10 قبل از نبوت، یعنی 23 ق ھ میں ہوئی۔ ان کی پیدائش کے وقت ابوطالب سخت معاشی مشکلات سے دوچار تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اپنے چچا کا مالی بوجھ کم کرنے کے لیے ننھے علیؓ کو اپنی آغوشِ تربیت میں لے لیا۔

حضرت علیؓ کا عہدِ طفولیت نبی کریم ﷺ کے آغوشِ تربیت میں گزرا۔ اس کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت علیؓ زمانہ جاہلیت میں بھی کسی بت کے سامنے جھکے اور نہ شرک و بدعت کی کسی رسم بد سے اپنے دامن کو آلودہ کیا۔ یہ اسی حسن تربیت کا نتیجہ تھا کہ حضرت علیؓ دس گیارہ سال کی عمر میں آنحضرت ﷺ پر ایمان لے آئے۔ حضرت علیؓ کی عمر بمشکل تیرہ برس کی تھی کہ آنحضرت ﷺ کو حکم ہوا کہ قریشی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت دیں تو آپ نے حضرت علیؓ کو اس مقصد کے لیے دعوت کا بندوبست کرنے کا حکم دیا۔ حضرت علیؓ نے کم سنی کے باوجود نہایت اچھا انتظام کیا۔ شرکا کی تعداد چالیس تھی۔ بعد از طعام آنحضرت ﷺ نے انھیں اسلام لانے کی دعوت دی مگر اس مجمع میں سے حضرت علیؓ کے سوا کسی نے آپ کی حمایت اور اسلام قبول کرنے کا اعلان نہ کیا۔

رسول اکرم ﷺ کے پاس مشرکین مکہ کی جو امانتیں تھیں، جب آپ ہجرت کر

کے مدینہ منورہ جانے لگے تو آپ نے امانتیں واپس کرنے کا کام حضرت علیؓ کے سپرد کیا اور فرمایا کہ تین دن بعد یہ امانتیں مالکوں کو واپس پہنچا کر مدینہ چلے آنا، چنانچہ حضرت علیؓ تین دن میں امانتیں واپس کر کے آنحضرت ﷺ سے قبا میں جا ملے۔

جب آنحضرت ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور آپ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتہ مواخات قائم کیا تو اس موقع پر آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنایا۔ دوسری روایات کے مطابق حضرت علیؓ کی مواخات سہل بن حنیف سے قائم کی گئی۔

2ھ میں آنحضرت ﷺ نے انھیں اپنی دامادی کا شرف بخشا یعنی اپنی صاحب زادی حضرت فاطمۃ الزہراؓ سے ان کا نکاح کر دیا۔ نکاح کے تقریباً دس گیارہ ماہ بعد پھر باقاعدہ رخصتی ہوئی۔ حضرت علیؓ اس سے پہلے آنحضرت کے ساتھ رہتے تھے۔ مگر اب ایک نئے مکان کی ضرورت پیش آئی چنانچہ حارث بن النعمان کا مکان ان کی نئی رہائش گاہ بنا۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے بطن سے حضرت علیؓ کے کئی بچے ہوئے جن میں امام حسن اور امام حسین ممتاز ہیں، حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہ الزہراؓ کی زندگی میں کوئی دوسری شادی نہیں کی۔

اسلام کے دفاع اور دشمنوں کی جارحیت کا راستہ روکنے کے لیے جتنی جنگیں لڑی گئیں حضرت علیؓ نے نہ صرف ان تمام میں شرکت کی بلکہ ان میں بہادری، شجاعت اور جواں مردی کی ایسی داستانیں رقم کیں، جو تاریخ اسلام میں ہمیشہ یادگار رہی ہیں۔ غزوۂ بدر میں حضرت علیؓ نے ابتدائی مقابلہ میں نہ صرف اپنے مدمقابل شیبہ کو لڑائی میں پچھاڑا، بلکہ حضرت ابوعبیدہؓ کی بھی ان کے مدمقابل کے خلاف مدد کی۔ غزوۂ اُحد میں حضرت مصعبؓ بن عمیر کی شہادت کے بعد علَم آپ نے سنبھالا۔

5ھ میں آنحضرت ﷺ نے بنوسعد کی سرکوبی کے لیے حضرت علیؓ کو ایک سو کی جمعیت کے ساتھ روانہ کیا۔ حضرت علیؓ نے حملہ کر کے انھیں منتشر کر دیا اور مال غنیمت کے ساتھ واپس آئے۔ صلح حدیبیہ (6ھ) میں معاہدہ کی عبارت حضرت علیؓ نے لکھی۔

7ھ میں غزوۂ خیبر پیش آیا جس میں حضرت علیؓ کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ خیبر کے سب سے مضبوط قلعہ کے سردار مرحب نامی یہودی سورما کو پہلے انفرادی جنگ میں قتل کر دیا۔

فتح مکہ (8ھ) کے بعد آنحضرت ﷺ نے بیت اللہ میں نصب شدہ پیتل کے ایک بت کو توڑنے کے لیے حضرت علیؓ کو اپنے مبارک کندھوں پر اُٹھایا اور حضرت علیؓ نے وہ بت پاش پاش کر دیا۔ غزوۂ تبوک میں آنحضرت ﷺ نے انھیں مدینے میں اپنے نائب کی حیثیت سے چھوڑا۔

فتح مکہ کے بعد بنوجزیمہ میں حضرت خالد بن ولید نے غلطی سے کچھ خوں ریزی کی تو تلافی کے لیے حضرت علیؓ ہی بھیجے گئے تھے۔

رمضان 10 ہجری میں انھیں یمن بھیجا گیا۔ وہاں ان کی تبلیغ سے سارا قبیلہ ایک ہی دن مسلمان ہو گیا اور انھوں نے زکوٰۃ بھی ادا کر دی۔ وہاں سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ مکہ مکرمہ گئے اور حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہے۔

آنحضرت ﷺ کی تدفین کے بعد کی بیعت عامہ میں بھی وہ شریک نہ ہو سکے اور بعد میں وجہ یہ بتائی کہ میں قرآن جمع کرنے میں مشغول تھا۔ بعد میں حضرت علیؓ نے اپنے تینوں پیش رو خلفا کے اہم ترین معاون اور مشیر کے طور پر جو خدمات انجام دیں، وہ تاریخ اسلام کا سنہری باب ہیں۔ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ کے مابین جو مثالی تعلقات تھے، اس کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اسی زمانے میں حضرت اُم کلثوم دختر حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ اس زمانے میں حضرت علیؓ مدینہ منورہ کے قاضی بھی رہے۔ حضرت عمرؓ اپنی غیر موجودگی میں مدینہ منورہ میں انھیں اپنا نائب بنا کر جاتے تھے۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں بھی حضرت علیؓ کی خصوصی اہمیت برقرار رہی۔ دونوں بزرگوں کے مابین باہمی تعلقات مثالی تھے۔ اسی لیے جب بلوائیوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا، تو حضرت علیؓ نے اپنے دونوں صاحب زادوں کو حضرت عثمان کی مدافعت پر مامور فرمایا۔

پھر جب باغیوں نے نوّے سالہ خلیفہ حضرت عثمان بن عفان کو شہید کر دیا تو رائے عامہ کے ردعمل سے گھبرا کر حضرت علیؓ کے پاس آئے، لیکن وہ گوشہ نشین ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر اہل مدینہ کے اصرار پر بہ امر مجبوری حضرت علیؓ نے خلافت کا منصب قبول فرمایا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ان سے زیادہ اس منصب جلیلہ کا کوئی اہل نہ تھا۔ جمعہ کے دن بیعت عام ہوئی۔ بیعت کے فوراً بعد حضرت علیؓ سے جب حضرت عثمانؓ کے قتل کے قصاص لینے کا مطالبہ کیا جانے لگا، جب کہ حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ حالات کو اعتدال پر آنے دیا جائے، تا کہ وہ بلوائیوں سے قصاص لے سکیں، مگر بعض نامور صحابہ کرام کا اصرار تھا کہ قصاص لینے میں جلدی کی جائے۔ حضرت علیؓ ان حالات میں نقل مکانی کر کے کوفہ چلے گئے، جہاں دونوں گروہوں کے مابین بصرہ کے قریب جنگ جمل کا افسوس ناک واقعہ پیش آیا، جس کی قیادت اُم المومنین حضرت عائشہؓ کر رہی تھیں۔

حضرت علیؓ نے جو فاتح تھے، اس موقع پر اسلامی رواداری اور شرافت کا ثبوت دیا۔ میدان سے بھاگنے والوں کے تعاقب سے روکا اور مجروحین کو قتل کرنے سے منع کیا۔ مزید برآں جنگ کے اختتام پر اپنے لوگوں کو حکم دیا کہ وہ کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کریں، کسی زخمی کو نشانہ نہ بنائیں اور لوگوں کے گھروں میں لوٹ مار کے لیے داخل نہ ہوں، بعد ازاں حضرت عائشہ صدیقہ کے ہودن کو مقتولین کے درمیان سے نکالا اور بحفاظت تمام بصرہ میں عبداللہ بن خلف الخزاعی کے مکان میں پہنچا دیا۔

حضرت علیؓ نے تین دن تک بیرون بصرہ میدان کارزار میں قیام فرمایا اور اصحاب الجمل کا جو سامان ملا اسے جمع کر کے جامع مسجد (بصرہ) میں لے جا کر رکھ دیا۔ سوائے ہتھیاروں کے تمام سامان مالکوں کو واپس کر دیا۔

حضرت عائشہؓ کو پوری عزت و تکریم سے ان کے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر

دیگر معتمد علیہ لوگوں کی حفاظت میں مدینہ منورہ واپسی کا انتظام فرمایا۔ حضرت عائشہؓ صدیقہ پہلے مکہ مکرمہ تشریف لے گئیں اور حج میں شرکت کے بعد مدینہ منورہ چلی گئیں۔ حضرت علی ام المومنین کو الوداع کہنے کے لیے دُور تک تشریف لے گئے۔ بعد ازاں حضرت علی کے بیٹے تمام دن حضرت صدیقہ کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ حضرت عائشہ حضرت علی کے اس حُسن سلوک سے بے حد متاثر ہوئیں۔ اس طرح ان دونوں عظیم المرتبت ہستیوں میں باہمی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوگیا۔

اس پہلی فتح پر حضرت علیؓ کی پوزیشن کافی مستحکم ہوگئی اور حرمین اور عراق کے علاوہ خراسان، آذربائیجان، بلاد الجبل (کوہستان)، یمن اور مصر نے بھی ان کی بیعت کر لی۔ حضرت علیؓ جب اس جنگ سے فارغ ہوگئے تو انھوں نے اپنی تمام تر توجہ دمشق کے امیر حضرت معاویہ کی طرف مبذول کر دی۔ ابتدا میں انھوں نے حضرت معاویہ کو جریر بن عبداللہ کے ذریعے ایک مکتوب ارسال کیا جس میں انھیں اپنی بیعت کرنے کی دعوت دی، مگر حضرت امیر معاویہ نے جواب میں بیعت سے پیش تر قاتلین عثمان سے قصاص لینے کا مطالبہ کیا۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ کو کچھ مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے وہ ان لوگوں کے خلاف کوئی فوری اقدام کرنے سے معذور تھے، لیکن مخالف فریق جس میں اکثریت بنوامیہ کی تھی، فوری قصاص کے مطالبے پر مصر تھے۔ اس صورت حال سے شورش پسندوں نے فائدہ اُٹھایا، ادھر حضرت علی کو یقین دلایا کہ امیر معاویہ ان کی شخصی مخالفت کر رہے ہیں اور دوسری جانب امیر معاویہ کو باور کرایا کہ حضرت علیؓ کی قصاص کے سلسلے میں ٹال مٹول بے معنی نہیں۔ یہ غلط فہمیاں تھیں جو ان کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع اور گہرا کرتی چلی گئیں اور بالآخر نتیجہ جنگ صفین کی صورت میں نکلا۔ جب حضرت علیؓ کے لشکر میں ایک روایت کے مطابق 80 بدری صحابہ اور 150 حدیبی (تحت الشجرہ بیعت کرنے والے) صحابہ شریک تھے صفین میں بالآخر حضرت علیؓ کو غلبہ حاصل ہوگیا اور قریب تھا کہ ان کی فتح پر جنگ ختم ہو جائے، تو اس وقت فریق ثانی نے مہلت حاصل کرنے کی ایک جذباتی تدبیر کی اور قرآن مجید کے کوئی پانچ سو نسخے سپاہیوں نے نیزوں کی نوک پر باندھ کر بلند کیے اور دمشق میں حضرت عثمانؓ کا روانہ کردہ مصحف اعظم بھی، جو اتنا بڑا تھا کہ پانچ نیزوں پر باندھا گیا، پانچ سپاہیوں نے اٹھا کر بلند کیا اور مطالبہ کیا کہ فریقین قرآن پر عمل کریں، یہ تدبیر کارگر ہوئی۔

جب انھوں نے مقدمۃ الجیش کے کمانڈر مالک بن الاشتر کو روکنے میں کامیابی حاصل نہ کی تو براہ راست حضرت علیؓ کو مجبور کیا کہ وہ انھیں روکیں۔ حضرت علی کی فوج میں اصل جوش و خروش یمن کے قرا اور خوارج میں تھا اور انھی کی جاں بازی سے حضرت علیؓ کو فتح حاصل ہو سکی تھی ان کے اس دین دارانہ مطالبے کو وہ اب رد نہیں کر سکتے تھے۔ انھیں سمجھانے کی کوشش میں جب وہ کام یاب نہ ہوئے تو مجبوراً مالک بن الاشتر کو ہتھیار روکنے اور واپس آنے کا حکم دے دیا۔ اشعث بن قیس کندی نے رواداری کر کے اور بیچ میں پڑ کر فریقین میں مصالحت کرا دی۔ وہ مصالحت یہ تھی کہ فریقین ایک ایک حکم نامزد کریں اور دونوں حَکم گفتگو کر کے قرآنی احکام کے مطابق فیصلہ سنائیں۔ عہد نامہ لکھا گیا تو فریقین کے ممتاز لوگوں نے اس پر دستخط کیے۔ اشعث نے بھی حضرت علیؓ کی طرف سے دستخط کرنے کی عزت حاصل کی۔ اس فیصلے کی رو سے حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوموسیٰ الاشعری کو اور حضرت امیر معاویہ کی جانب سے حضرت عمرو بن العاص کو حکم نامزد کیا گیا۔

تحکیمی فیصلہ سنانے کے لیے فریقین کے نمائندے جمع ہوئے۔ پہلے حضرت ابوموسیٰ نے اٹھ کر کہا کہ موجودہ دونوں امیدواروں کو معزول کر کے کسی تیسرے کا انتخاب کیا جائے۔ اس کے بعد حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ ابوموسیٰ کو صرف اپنے موکل کو معزول کرنے کا حق ہے اور میں اس پر صاد کرتا ہوں۔ رہا میں، میں اپنے موکل کو معزول نہیں کرتا، بلکہ انھیں برقرار رکھتا ہوں۔

حضرت علیؓ اور امیر معاویہ میں معاہدہ یہ ہوا تھا کہ تحکیم متفقہ ہو تو ان پر اس کی پابندی عائد ہوگی، تو چوں کہ وہ متفق علیہ نہ ہو سکی اس لیے ردّی کا کاغذ اور ناقابل نفاذ تھی اور جیسا کہ معاہدہ کی دفعہ 16 میں صراحت ہے، اس سے حضرت علیؓ کا کوئی نقصان نہ ہوا اور حالت سابقہ عود کر آئی۔

اعلان تحکیم کے بعد ظاہر ہے کہ حضرت ابوموسیٰ الاشعری سیاست سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین ہو گئے۔ حضرت معاویہ کی پوزیشن پہلے سے بہتر ہوگئی۔ تحکیم سے انھیں اخلاقی تقویت ملی ہو یا نہیں، جنگ صفین کے بعد کی مہلت میں ان کی فوجی حالت ضرور بہتر ہوگئی۔ حضرت علیؓ کے ہاں اسی زمانے میں پھوٹ پڑ گئی۔ خوارج نے اس نازک وقت میں اتحاد و تعاون کی جگہ ایسے مباحث چھیڑ دیے جو نہ علمی حیثیت سے معقول تھے اور نہ سیاسی نقطہ نظر سے۔ پھر یہ لوگ حضرت علیؓ کی فوج سے نکل کر ہر جگہ فساد کرنے لگے۔ ان کے بعض گروہ حضرت علیؓ نے منتشر کیے تو آخر وہ مقام ہندوان میں جمع ہونے لگے۔

ان حالات میں حضرت علیؓ امیر معاویہ سے فوراً جنگ نہ کر سکے۔ عراق ہی میں خوارج کی پیدا کردہ بدامنی دُور کرنے میں مشغول ہوگئے۔ یہ لوگ غیر خوارج مسلمان کے دودھ پیتے بچوں کو بھی قتل کرنے سے دریغ نہ کرتے تھے۔ حضرت علیؓ نے نہروان میں ان پر حملہ کر کے ان کا قتل عام کیا، چنانچہ کوئی دس ہزار میں سے بمشکل دس افراد بچ سکے۔ مگر سارے خوارج ہندوان میں نہ تھے۔ بعد ازاں بھی ان خارجیوں نے صدیوں مسلمان خلفا کی نیند حرام کیے رکھی۔

حضرت علیؓ نے جنگ ہندوان کے بعد شام جانا چاہا تو فوج کے لوگ سمٹنے لگے اور بمشکل ایک ہزار آدمی باقی رہ گئے۔ اس وقت اطلاع آئی کہ حضرت امیر معاویہ نے شہر انبار پر حملہ کر کے چھاؤنی کے لوگوں کو قتل کر دیا اور اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فوجی رضا کار طلب کیے لوگ پھر بھی نہ آئے۔ اس پر جبراً فوج میں بھرتی شروع کی گئی۔ ظاہر ہے کہ ایسی فوج کس کام آ سکتی ہے۔ اس مایوسی کے زمانے میں وہ بعض اوقات بلا اختیار کہا کرتے تھے: ''وہ بڑا شقی آخر کیا انتظار کر رہا ہے؟ (ابن

عبداللہ: الاستیعاب "مادہ علی") رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی تھی کہ حضرت علیؓ کو ایک بڑا شقی قتل کرے گا۔

خارجی اپنی انتہا پسند تقشف کی تحریک میں سب سے بڑی رکاوٹ تین اشخاص کو سمجھتے تھے، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاص۔ یہ لوگ حضرت علیؓ سے نہروان کے قتل عام کا انتقام بھی لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ تین خارجیوں نے باہم طے کیا کہ ان تینوں کو ایک ہی معین دن فجر کی نماز کے وقت مسجد میں قتل کر دیا جائے۔ حضرت عمرو بن العاص اتفاق سے اس دن نماز کی امامت کے لیے تشریف نہ لائے۔ ان کی جگہ جو شخص نماز کے لیے آیا وہ غلطی سے مارا گیا۔ حضرت معاویہؓ اور حضرت علیؓ دونوں زخمی ہوگئے۔ مگر حضرت معاویہ کا زخم کاری نہ تھا۔ حضرت علیؓ کے قاتل ابن ملجم کو بھی گرفتار کرلیا گیا اور حضرت علیؓ نے کہا: اسے قید رکھو، لیکن اذیت نہ دو۔ میں جانبر ہو گیا تو خود دیکھوں گا کہ معاف کروں یا کوئی سزا دوں اور اگر مر جاؤں تو اس سے قصاص لے لینا۔ پھر جب حضرت علی دار فانی سے روانہ ہوگئے تو امام حسن نے اسے قید خانہ سے نکالا اور عبرت ناک طریقے سے قتل کیا۔

حضرت علیؓ چار سال نو ماہ کی حکمرانی کے بعد 17۔ رمضان 40ھ کو چودہ لڑکے اور اُنیس لڑکیاں چھوڑ کر فوت ہوئے (طبقات ابن سعد)۔ ابن کثیر کے مطابق چار بیویاں اور اُنیس لونڈیاں گھر میں چھوڑیں۔ نیز چودہ بیٹے اور سترہ بیٹیاں۔ اُن کے خاندان میں ایک سندھی لڑکی بھی آئی اور اُس سے زیدؒ بن علی پیدا ہوئے (بلاذری، انساب)۔

ان کے ذہانت آمیز فتوے اور فیصلے رسول اللہ کی بھی تعریف حاصل کر چکے تھے اور خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کی بھی، خود ان کے زمانہ خلافت میں بھی اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔

اُنہیں حدیث نبوی ﷺ سے بڑی واقفیت تھی۔ ان کی روایتیں یک جا بھی مل سکتی ہیں۔ انھوں نے حدیثیں لکھائی بھی تھیں۔ ایک دن مسجد کوفہ میں کہا: کون ہے جو میرا علم ایک درہم میں حاصل کرنا چاہتا ہے؟ الحارث الاعور دوڑ کر بازار گیا اور ایک درہم کا کاغذ خرید کر لایا اور اس نے بہت سی چیزیں لکھیں۔ حر بن عدی کے پاس بھی حضرت علیؓ کو لکھائی ہوئی چیزوں کا ایک پورا رسالہ (صحیفہ) تھا۔ ان کے پاس چوں کہ رسول اکرم ﷺ کی ذاتی تلوار آ گئی تھی۔ اس لیے اس پر جو دستاویزیں رسول اللہ نے لپیٹ رکھی تھیں وہ بھی ان کے پاس تھیں اور وہ انھیں پڑھ کر سناتے اور کہا کرتے قرآن مجید اور ان دستاویزوں کے سوا میرے پاس کوئی اور لکھی ہوئی چیز نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں شہری مملکت مدینہ کا دستور اور حفاظتِ حُدُود، حرم مدینہ، نیز نصاب زکوٰۃ کی تفصیلیں شامل تھیں۔

عمار بن یاسرؓ

عمار نام، ابوالیقظان کنیت، والد کا نام یاسر اور والدہ کا نام سمیہ۔ حضرت عمار کے والد نے، جو ابوحذیفہ مخزومی کے مولیٰ تھے، اپنے مالک کی ایک کنیز سمیہؓ سے شادی کر لی تھی جسے آزاد کر دیا گیا۔ حضرت یاسرؓ اور ان کا کنبہ ابوحذیفہ کے پاس ہی رہے۔ یہ لوگ ابتدائی اسلام قبول کرنے والوں میں سے تھے اور انھوں نے سخت اذیتیں اٹھائیں۔ وہ آخر کار ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، لیکن خود آنحضور ﷺ کی ہجرت کے بعد وہ مدینہ واپس آ گئے۔

انھوں نے تمام ابتدائی غزوات میں شرکت کی اور بدر، اُحد، خندق اور بالعموم رسول کریم ﷺ کی سب لڑائیوں میں آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ آنحضور ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات کے وقت انھیں حذیفہؓ بن الیمان کا رفیق بنایا۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں یمامہ کی جنگ کے دوران میں ان کا ایک کان کٹ گیا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں کوفے کا حاکم بنایا۔ اس حیثیت میں انھوں نے خوزستان کی فتح میں حصہ لیا۔ وہ شروع ہی سے حضرت علیؓ کے طرف دار تھے اور 35ھ کے بعد سے وہ حضرت علیؓ کے خاص معتمد بن گئے۔ جنگ جمل سے پہلے حضرت عمار نے کوفے کی آبادی کو حضرت علیؓ کی حمایت میں مجتمع کرنے میں مدد کی۔ وہ 37ہجری میں انتہائی ضعیف العمری میں جنگ صفین میں شہید ہوئے۔ کئی صدیوں کے بعد تک بھی صفین کے نزدیک ان کے مقبرے کی نشان دہی کی جاتی تھی۔

حضرت عمار حدیث نبوی ﷺ کے اچھے عالم تھے۔ اس کے علاوہ ان کی شہرت ان کے زُہد وتقویٰ اور اسلام سے وفاداری کے باعث بھی تھی۔ کفار مکہ کو ظلم وستم ڈھاتے دیکھ کر آنحضور ﷺ حضرت عمار کو صبر واستقلال اور عزیمت کی تلقین فرمایا کرتے اور جنت کی بشارت سنایا کرتے تھے۔ رسول کریم ﷺ نے انھیں "الطیب والمطیب" کا لقب عطا فرمایا۔ حضرت عمار نے سب سے پہلے مدینہ منورہ میں ایک مسجد کی بنیا درکھی اور اس کا نام "مسجد قبا" رکھا۔

عمر بن خطابؓ

حضرت عمر بن الخطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن ریاح بن عبداللہ بن قرط بن رزاح بن عدی بن کعب، خلیفہ ثانی، مکہ مکرمہ کے قبیلہ قریش کی شاخ بنوعدی کی نسبت سے عدوی، مگر ماں، حنتمہ بنت ہاشم بن المغیرہ بن عبداللہ بن عمر کی نسبت سے مخزومی۔ ان کی ولادت حرب فجار اعظم سے چار سال پہلے ہوئی اور ذوالحجہ سنہ 6 نبوی، یعنی 7 قبل ہجرت میں چھبیس ستائیس سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ سے منسوب ہو کر ابوحفص کنیت اختیار کی۔ وفات یکم محرم سنہ 24ھ کو ہوئی، اگرچہ دو ایک دن پہلے کی بھی روایتیں ہیں۔

وہ گورے، بہت اونچے اور لحیم وشحیم آدمی تھے۔ بائیں ہاتھ سے بھی دائیں ہاتھ ہی کی طرح کام کر سکتے تھے۔ دوڑتے گھوڑے پر اُچک کر بیٹھ سکتے تھے۔ ابن سعد کے مطابق زمانہ جاہلیت میں عکاظ کے میلے میں دنگل میں کشتی بھی لڑا کرتے تھے۔ ابن عبدربہ نے شہری مملکت مکہ کی دس موروثی وزارتوں میں سے ایک، سفارت ومفاخرت پر ان کا نام لکھا ہے۔ کسی دوسرے قبیلے سے امن یا جنگ میں گفت وشنید کرنا ہوتی تو شہر کی طرف سے یہی جاتے اور کسی قبیلے سے باہمی فخر وفضیلت کی بحث چھڑتی تو بھی انھی کو بھیجا جاتا۔ بعد میں مدینے میں رسول اکرم ﷺ نے اسلامی مملکت قائم فرمائی تو اسی

خدمت پر بحال رہے۔ المسعودی کے مطابق جاہلیت میں عراق وشام وغیرہ کے بکثرت سفر کیے اور وہاں کے نیز عرب کے حکمرانوں سے بھی ملاقاتیں کی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان کے ہاں نو لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں، جن میں حضرت عبداللہ سب سے ممتاز اور بڑے عالم وفاضل اور متقی گزرے ہیں۔

شروع میں اسلام کے مخالف تھے اور مسلمان ہونے والوں، خاص کر اپنے قبیلے کے نومسلموں کی ایذا کے درپے رہا کرتے تھے۔ خود ان کے اسلام لانے کے متعلق ابن ہشام نے دو مختلف روایتیں درج کی ہیں۔ ایک یہ کہ آنحضرت ﷺ کے قتل کے ارادے سے نکلے تھے کہ راہ میں ایک رشتہ دار نے کہا: پہلے اپنے گھر یعنی بہن بہنوئی کی خبر لو، وہاں کچھ تکرار کے بعد قرآن کے کچھ اجزا دیکھے اور پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ ایک دن چھپ کر آنحضرت ﷺ کی نماز میں تلاوت قرآن سنی اور اس سے متاثر ہوئے۔ متعلقہ سورت کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ مگر سب ہی اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن پڑھ کر یا سن کر اسلام کی توفیق پائی اور یہ چیز ساری عمر ان میں دیکھی جاتی رہی کہ انتہائی خفگی کے وقت بھی کوئی قرآنی آیتیں پڑھ دیتا تو غصہ فوراً فرو ہو جاتا اور سکون سے باتیں کرنے لگتے۔ ابن سعد کے مطابق پینتالیس مرد اور گیارہ عورتوں کے بعد یہ مسلمان ہوئے۔

ان کی بیوی مسلمان نہ ہوئی تو قرآنی حکم کے مطابق اسے طلاق دے دی۔ ہجرت کے بعد کی مواخات میں عتبان بن مالک انصاری کے بھائی بنے اور انھی کے ساتھ مضافات میں مقیم ہوئے۔ ایک دن یہ مدینے آ کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں موجود رہتے اور وہ بھائی باغ بانی کرتے، دوسرے دن یہ باغ بانی کرتے اور بھائی مدینے آتا اور رات کو رسول اکرم ﷺ کے ہاں کی خبروں سے انھیں آگاہ کرتا، مگر جلد ہی انھوں نے اپنا الگ گھر بنا لیا جس کی زمین حضور اکرم ﷺ نے انھیں دے دی تھی۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے انھیں زکوٰۃ کا محصل مقرر فرمایا۔ یہ غالباً 10ھ کا واقعہ ہے کیوں کہ لکھا ہے کہ انھوں نے حضرت عباس سے بھی زکوٰۃ مانگی، مگر آنحضرت ﷺ نے اطلاع ہونے پر بتایا کہ حضرت عباس نے ایک سال قبل (غالباً جنگ تبوک کی تیاری کے لیے) زکوٰۃ پیشگی دے دی تھی۔

استانبول کے ترکی اسلامی آثار کے میوزیم میں قلمی قرآن کا ایک ورق محفوظ ہے جو حضرت عمر کی طرف منسوب ہے۔

خلافتِ صدیقی میں فتنہ ارتداد کے زمانے میں حضرت عمرؓ نے محض زکوٰۃ سے انکار کرنے والوں سے فی الوقت جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا، مگر حضرت ابوبکرؓ کے دلائل سن کر وہ ان کی رائے سے متفق ہو گئے۔

مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ میں بکثرت مسلمان شہید ہوئے جن میں قرآن کے بہترین قاری اور حافظ بھی تھے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کو بین الدفتین جمع کرنے کا مشورہ دیا، حضرت ابوبکر ہچکچائے مگر پھر مطمئن ہو گئے اور کاتب وحی حضرت زید بن ثابت اور ان کے رفقا کو اس کی تکمیل کا حکم دیا۔ اس طرح اسلام کا یہ بڑا کارنامہ انجام پایا۔

خلافت صدیقی میں حضرت عمر مدینے کے قاضی بنے مگر لوگوں کے اخلاق اتنے اچھے تھے کہ مہینے گزر جاتے اور ایک مقدمہ بھی نہ آتا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے دست راست اور مشیر خاص تھے۔ کبھی اختلاف رائے ہو جاتا تو باہم ایک دوسرے کی اتنی عزت کرتے تھے کہ اسے نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے بستر مرگ پر بلا تامل انھیں اپنا جانشین مقرر کر دیا، چنانچہ حضرت عثمانؓ کو بلا کر ایک وصیت نامہ املا کرایا، جس میں حضرت عمرؓ کی جانشینی کا ذکر تھا۔

حضرت عمرؓ نے دستوری، نہج میں کوئی تبدیلی نہ کی، البتہ حسب ضرورت عمومی مشاورت کے بعد اسے مکمل کرتے رہے۔ اس وقت اندرونی خلفشار (فتنہ ارتداد اور انکار زکوٰۃ) ختم ہو چکا تھا اور دونوں ہمسایہ عظیم سلطنتوں یعنی ایران اور بوزنطیہ (روم) سے مسلمان بیک وقت برسر پیکار تھے۔ ابتدائی فتوحات سے اہل اسلام کے حوصلے بھی بڑھ گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دونوں محاذوں کے سپہ سالار تو فوراً بدل دیے، لیکن جنگ جاری رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ پایا اور دنیا نے ششدر ہو کر دیکھا کہ جلدی ایک طرف عراق، ایران، ترکستان، افغانستان اور مغربی ہندوستان اور دوسری طرف شام، اناطولی، آرمینیا، مصر اور لیبیا تک اسلامی مملکت کی خبریں پھیل گئیں۔ ان کا طرز عمل ایسا تھا کہ ان ممالک کے حکمرانوں کو تو نہیں، لیکن رعایا کو اسلامی فتوحات، ظلم وستم سے خلاصی اور نجات معلوم ہوئیں اور صدیوں تک انھیں بغاوت کا خیال تک نہ آیا۔ شروع میں تو حضرت عمر جنگ کو طول دینے سے ہچکچاتے تھے، لیکن جب دیکھا کہ یزدگرد (آخری ایرانی حکمران) اسے کمزوری پر محمول کر کے مشکلیں پیدا کر رہا ہے تو امن قائم کرنے کے لیے دفاعی نوعیت کے علاقے فتح کرنے کا حکم دیا، خاص کر سنہ 18ھ میں وہ کہا کرتے تھے: کاش میرے اور خراسان کے بیچ میں ایک آگ کا سمندر حائل ہوتا۔ بہرحال دریائے جیحوں کو عبور کر کے ماوراء النہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ وہ مفتوحہ علاقوں کا استحکام چاہتے تھے اور دریائے جیحوں ایک اچھی سرحد تھی۔

حضرت عمرؓ کی اسلامی تربیت اتنی مکمل تھی کہ انھوں نے اپنے دور حکومت میں نسلی وقبائلی تعصبات کو نہیں ابھرنے دیا۔ ان کے فیصلے حق وصداقت اور حقیقت شناسی پر مبنی ہوتے تھے۔ انھوں نے عراق میں حضرت مثنیٰ شیبانی اور شام میں حضرت خالد بن ولیدؓ جیسے ہر دل عزیز سپہ سالاروں کو اپنی خلافت کے ابتدائی دنوں ہی میں معزول کر کے معمولی سپاہی بنا دیا۔

ابتدائی فتوحات ہی کے بعد جب یہ محسوس ہو گیا کہ اب مسلمانوں کو عرب واپس جانے کی ضرورت نہیں تو ایک بہت نازک مسئلہ پیش آیا: قرآن مجید نے مال غنیمت کے متعلق حکم دیا ہے کہ ایک خمس حکومت اور چار خمس فاتح فوجی دستے کو دیا جائے۔ (سورہ انفال، 4,1) مال منقولہ کی حد تک اس میں کوئی دشواری نہ تھی، لیکن مفتوحہ اراضی کا معاملہ دوسرا تھا۔ حضرت عمر نے اپنی فراست اور دانائی سے محسوس کیا کہ اگر اسلامی فوج کے سپاہیوں کو ہزاروں لاکھوں مربع میل کا علاقہ دے دیا گیا تو ایک طرف تو

دولت گنتی کے چند لوگوں کے ہاتھوں میں محصور ہو جائے گی جو قرآن مجید (سورہ حشر، آیت 7) کے فرمان کے خلاف ہے، دوسرے حکومت کی ضرورتیں صرف 1/5 علاقے اور مسلمانوں کی زکوٰۃ سے پوری نہ ہو سکیں گی۔ اس بارے میں بعض صحابہ کرام میں بھی اختلاف رائے تھا اور مہینا بھر بحث ہوتی رہی۔ آخر حضرت عمر نے قران مجید (سورۃ حشر آیات 7 تا 10) سے استدلال کیا کہ مفتوحہ اراضی صرف موجودہ لوگوں کے لیے نہیں بلکہ ان کے لیے بھی ہیں جو ان کے بعد ہوں گے۔ اور یہ قیامت تک آنے والوں پر حاوی ہے، اس لیے ساری زمینیں وقف ہو کر حکومت کے ہاتھ میں رہیں۔ اب کسی کو اختلاف نہ رہا اور مجمع عام کے اس اجماعی فیصلے سے تمام اسلامی سپہ سالاروں کو اطلاع دے دی گئی۔ حضرت عمرؓ کی فراست نے اسلام اور قرآن مجید کو قابل عمل چیز ثابت کر دیا، محکوم و مظلوم ہونے کے زمانے ہی میں نہیں بلکہ غالب اور تین براعظموں پر حکمرانی کے زمانے میں بھی۔

دولت کی اس ریل پیل کے زمانے میں اگر حضرت عمرؓ کی جگہ کوئی دنیادار حکمران ہوتا تو نو دولت عرب اصول و اخلاق بھی کھو دیتے اور جلدی ہی دنیا سے غائب ہو جاتے اور ان کے ساتھ ان کا دین بھی۔ حضرت عمرؓ نہ اپنی ذات پر اسراف کرتے تھے اور نہ سرکاری مال کا ایک حبہ بھی ناجائز ضائع ہونے دیتے۔ انھوں نے عورتوں کا مہر کم از کم رکھنے کا پُرزور مشورہ دیا۔ جس کی مصلحت اب ہمیں نظر آتی ہے۔ عالموں (گورنروں) پر انتہا کی شدید نگرانی رکھتے، تقرر کے وقت ان کی دولت کی مقدار معلوم کرتے، پھر وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کراتے اور اگر مشتبہ زیادتی نظر آتی تو نہ صرف معزول کرتے بلکہ نصف جائداد بھی ضبط کر لیتے۔ تقرر نامے میں صراحت سے شرط ہوتی کہ وہ شان دار ترکی گھوڑے (برزون) پر نہ بیٹھے، چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہ کھائے، باریک اور ملائم لباس نہ پہنے (چہ جائیکہ ریشمی لباس پہن سکے) دروازے کو بند کر کے چوکیدار نہ رکھے بلکہ ہر شخص ہر وقت اس سے ملاقات کر سکے۔ چنانچہ ان اصولوں کی خلاف ورزی پر انھوں نے کئی گورنروں کو نہ صرف معزول کیا، بلکہ انھیں حسب موقع سزائیں بھی دیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری زمینوں، سابق حکم ران کی صرف خاص کی جاگیروں اور مضروب یا مقتول زمین داروں کی اراضی ان کے بیگاری کسانوں کو حضرت عمرؓ نے زمین کا مالک بنا دیا اور عثمان بن حنیف کے ہاتھوں پیائش کرائی تو سواد عراق ہی میں 36 ملین جریب زمین مزروع پائی گئی۔ غیر مسلموں سے معین رقمی خراج پر صلح ہوئی تھی۔ اس کی وصولی کے لیے غیر مسلموں ہی کو عریف (ماہرین) مقرر کیا گیا۔ کسی کے لاوارث مرنے پر اس کی زمین اس کے اہل ملت ہی خریدنے میں ترجیح پاتے۔ اس طرح چھوٹی اور مفلس ملتوں کے مفاد کی حفاظت کی جاتی۔

مسلمانوں پر فوجی خدمت واجب تھی۔ غیر مسلم رعایا کو اس سے روکا تو نہ جاتا تھا، لیکن مجبور بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی سرفروشی کے زمانے میں یہ غیر مسلم رعیت اطمینان سے کمائی میں مشغول رہتی۔ فوجی مصارف میں ان کا حصہ لینا معقول تھا۔ یہی جزیہ ہے۔ عہد نبوی ﷺ کی محدود مثالوں میں ہر غیر مسلم پر یکساں جزیہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے تین مدارج مقرر کیے: غریب، متوسط اور مال دار، اس کی سالانہ مقدار شاید ایک خاندان کی ایک دن کی غذا کے مصارف کے مساوی کہی جا سکتی ہے۔ اس سے عورتوں، نابالغوں، بوڑھوں، اپاہجوں، راہبوں، نیز ہر اس غیر مسلم شخص کو مستثنیٰ کر دیا گیا جو کسی سال ایک مہم میں فوجی خدمت انجام دے۔

مال گزاری اور جزیہ کے حساب مقامی زبانوں میں لکھ کر غیر مسلم عریف مدینہ منورہ بھیجتے۔ مثال کے طور پر حضرت عمرؓ نے شام کے والی کو لکھا: ''ہمارے پاس ایک رومی (یعنی یونانی) کو بھیجو، جو ہمارے ٹیکسوں کا حساب ٹھیک رکھ سکے ہر سال ٹیکس کی وصولی کے بعد ہر صوبے سے وہاں کے ٹیکس دہندوں کا ایک وفد مدینے بلایا جاتا اور اس کا اطمینان کیا جاتا کہ وصولیوں میں ظلم نہیں ہوا ہے۔''

چنگی غیر مسلم اجنبیوں پر دس فی صد تھی، لیکن ایک بڑا اُصول یہ بھی تھا کہ ہر شخص سے وہی برتاؤ کیا جائے جیسا اس کے ملک میں مسلمانوں سے ہوتا ہو، جیسا کہ منبج کے افسر چنگی کو انھوں نے ہدایت بھیجی۔ ان کا برتاؤ غیر مسلموں سے عدل و احسان کا تھا۔ ان کے زمانے کے ایک نسطوری عیسائی کا خط محفوظ ہے، جس نے اپنے ایک دوست کو لکھا: ''یہ طائی (یعنی عرب)، جنھیں اللہ نے آج کل حکومت دی ہے، ہمارے بھی مالک (حاکم) بن گئے ہیں، لیکن وہ عیسائی مذہب سے جنگ نہیں کرتے، بلکہ وہ ہمارے ایمان کی حفاظت کرتے (اور ہمیں دوسرے فرقوں کی ایذا رسانی سے بچاتے) ہیں، ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں۔ اور ہمارے گرجاؤں اور راہب خانوں کو عطیے دیتے ہیں۔

عہد صدیقی و فاروقی میں جو برق آسا فتوحات ہوئیں ان کے باعث سب اہم مقاموں پر مسلمانوں کی چھاؤنیاں بسائی گئیں تا کہ ایک مقام کی ضرورت کے لیے دوسرے دور دراز مقام سے فوج بھیجنے کی ضرورت نہ رہے۔

والی، (گورنر) مسلمان ہوتا اور مرکز سے بھیجا جاتا اور اسے حق ہوتا کہ صوبے کے اضلاع اور شہروں میں خود ہی افسر نام زد کرے۔ مسلمان اور غیر مسلم سب ہی اس کی طرف رجوع کرتے، مگر حکومت کے فرائض محدود تھے۔ بیرونی دفاع اور اندرونی امن، بازار میں احتساب، تا کہ تاجر علانیہ بددیانتی نہ کر پائیں، پلوں، بندوں اور مماثل تعمیرات کا کام ساری رعایا کے لیے تھا، تعلیم بھی زیادہ تر اہل علم کا نجی کام تھا۔ حکومت قرآن کی تدریس کا البتہ مسلمانوں کے لیے انتظام کرتی تھی۔ ٹیکس کی وصولی کا انتظام بھی مرکز گریز تھا۔ مسلمانوں سے ہر قسم کے ٹیکس (زکوٰۃ الاموال، زکوٰۃ التجارۃ، زکوٰۃ المواشی، زکوٰۃ المعادن اور زکوٰۃ الارض وغیرہ جیسے جزیۃ الاموال، جزیۃ الارض وغیرہ بھی بطور مترادف کہا جاتا) حکومت براہ راست وصول کرتی، لیکن غیر مسلموں کے لوگ اپنے عریف خود ہی حسب معاہدہ منتخب کرتے اور حکومت ان عریفوں سے حساب لیتی۔ جزیہ بھی اس طرح وصول کیا جاتا۔

جہاں تک مقدموں اور جھگڑوں کا تعلق ہے، مرکزی اور مشترکہ عدالتوں کی جگہ قوم وار عدالتیں قائم کی گئیں۔ مسلمانوں کے قاضی عہد نبوی ﷺ کی طرح حکومت

ماًمور کرتی اور غیر مسلموں کی حد تک ہر قوم ہی نہیں، بلکہ ہر فرقہ کی عدالت الگ تھی اور اس فرقہ کے مذہبی راہ نُما (پادری وغیرہ) ہی افسر عدالت ہوتے اور اپنا دینی یا ملی قانون ہی نافذ کرتے، اسلامی قانون نہیں، اس تکثیر محاکم کی مصلحت یہ تھی کہ اگر اسلامی قانون سب پر نافذ کیا جاتا تو غیر مسلموں کی رنجش کا باعث ہوتا، یوں بھی مسلمانوں میں مقامی قانون اور مقامی زبانوں کے جاننے والے کوئی نہ تھے۔ ایک ہی حاکم ہونے کی صورت میں اسلامی قانون کے روز افزوں بیرونی قانونوں سے متاثر ہونے کا خطرہ تھا۔ غالباً ایک فریق مسلمان اور دوسرا غیر مسلم ہوتا تو صرف ایسا مخلوط مقدمہ لازمی طور پر قاضی کے پاس آتا اور اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ پاتا۔

عام انتظامات میں ان کی اولیت یہ تھی کہ سرکاری مراسلوں کو بند کر کے اس پر (لاکھ کی طرح کی) مٹی لگا کر اس پر سرکاری مہر لگاتے۔ ہجری تقویم بھی انھیں نے سنہ 16ھ میں شروع کی۔ کائتانی (L.Caetani) کو حیرت ہے کہ عیسوی تقویم حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ آٹھ سو سال بعد شارلیمان کے زمانے میں رائج ہو سکی، مگر مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کی وفات کے پانچ ہی سال بعد یہ کام کر لیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سنہ ہجری کا رواج تو عہد نبوی ﷺ ہی سے ہو گیا تھا، لیکن اس میں یکسانی نہ تھی۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ان تمام باتوں کی اصلاح کی گئی۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں سکہ سازی حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لی۔ عموماً پرانے غیر مسلم سکہ ساز ہی ملازمت میں برقرار رکھے گئے۔ حکومت بھی سکے ڈھالتی اور رعایا کو بھی حق تھا کہ سونا چاندی لا کر اور اجرت سکہ سازی ادا کر کے دارالضرب میں سکے ڈھلوا لیتی۔ یہ سکے ایران میں چاندی کے (درہم) ہوتے اور شام ومصر میں سونے کے (دینار)۔ حضرت عمرؓ کے زمانے کے کچھ سکے اب تک باقی ہیں اور مغربی عجائب خانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مصر کی فتح کے بعد پرانے نظام مال گزاری کو جو ظالمانہ تھا بدل دیا گیا اور بکثرت محصول برخاست کر دیئے گئے۔ حکومت نے مسلمانوں کی تعلیم کا جو بندوبست کیا تھا وہ زیادہ تر تفسیر، حدیث، فقہ اور سیرت النبی ﷺ پر مشتمل تھا۔ قرآن پڑھنے کی تشویق کے لیے حضرت عمرؓ نے طلبہ کے لیے وظیفے مقرر کیے۔ مدرسے الگ نہ تھے، تعلیم عموماً مسجدوں ہی میں ہوتی تھی۔ جب کوفہ بسا کر وہیں چھاؤنی قائم ہوئی تو گورنر کے دارالامارۃ کے سامنے جامع مسجد بھی بنی۔ اس میں تعلیم دینے کے لیے حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعود جیسے جلیل القدر صحابی کو بھیجا۔

ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ ایک استاد کافی نہ تھا۔ حضرت عمر کے زمانے میں کوفہ کی جامع مسجد میں صرف فقہ ہی کی تعلیم کے ایک سو حلقے ایک سو اساتذہ کے اردگرد ہوتے تھے۔ النووی کے مطابق حضرت عقیل بن ابی طالب مسجد نبوی میں انساب اور ایام العرب کا درس دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ عربی کی صرفی نحوی غلطی (لحن) کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود کو بھی ٹوکا کہ قرآن مجید ہذلی لہجے میں نہیں بلکہ فصیح قریشی لہجے میں پڑھیں۔ جاہلیت کی عربی شاعری کے مطالعے کی وہ بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے تا کہ قرآن مجید کا صحیح مفہوم سمجھا جا سکے۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ فصیح زبان کو مروج اور مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے ابوالاسود الدؤلی کو عربی صرف ونحو مدون کرنے کا حکم دیا۔ وہ طبابت کی خاص سرپرستی کرتے تھے اور ہر فوجی دستے میں ترجمان کی طرح طبیب بھی بھجواتے۔ گھوڑوں کی افزائش نسل کی بھی خاص حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ مدینہ منورہ میں وقتاً فوقتاً بازار کا دورہ کرتے اور شہر اور مضافات کا اکثر راتوں کو گشت کرتے اور فوری ضرورتیں پوری کرتے۔ ایک دن ایک نو وارد ناواقف غریب مسافر کی بیوی کی زچگی دیکھی۔ بھاگے ہوئے سرکاری اسٹور پر آئے اور غلہ لے کر جا کر خود پکا کر اسے کھلایا اور اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گئے کہ زچہ کو مدد دے جب اس نے اندر سے پکارا: امیر المومنین، اپنے دوست کو بیٹا ہونے کی خوش خبری دو تو اس وقت مسافر کو معلوم ہوا کہ یہ کون شخص ہے۔

وہ ہر نماز کے بعد کچھ دیر مسجد میں بیٹھے رہتے اور ہر شخص ان سے گفتگو اور فریاد کر سکتا۔ وہ اپنے آپ کو ہر فرد کے سامنے جواب دہ سمجھتے اور ہر شخص ان پر اعتراض یا سوال کر سکتا۔ رعایا پروری کے لیے جہاں وہ کاروانی راستوں میں سرکاری اسٹور جا بجا رکھواتے تا کہ مسافروں کو بروقت مدد ملے، وہیں وہ جانوروں کو بھی نہ بھولتے: ''نہ ان کے منہ پر مارو، نہ ان پر طاقت سے زیادہ بوجھ لادو۔'' انھوں نے جان داروں کو خصی کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔

بڑے انصاف پسند تھے اور اپنی تقصیر کو برملا قبول کر لیا کرتے تھے بلکہ ضرورت سے زیادہ ہی۔ ایک دن وہ نہا دھو کر جمعہ کی نماز کے لیے کپڑے پہن کر آ رہے تھے۔ حضرت عباسؓ کے گھر کے پاس سے گزرے تو اس کی اوپر کی منزل کے پرنالے سے ان پر گندہ پانی گرا۔ دفع مضرت عامہ کے اُصول پر حضرت عمر نے پرنالہ اکھڑوا دیا، لیکن جب حضرت عباس نے کہا کہ یہ پرنالہ رسول اکرم ﷺ نے خود اپنے دست مبارک سے نصب فرمایا تھا تو حضرت عمرؓ نے قسم دی کہ میرے کندھے پر چڑھ کر پرنالہ دوبارہ اس کی جگہ نصب کر دو۔

مسجد نبوی میں لوگ نماز کے بعد یا نماز کے انتظار میں بیٹھ کر نجی گفتگو بھی کر لیا کرتے تھے۔ اس پر سختی سے منع کرنے کے بجائے مسجد سے متصل ایک نشست گاہ بنائی اور کہا کہ گپ شپ اور شعر بازی کرنا ہو تو وہاں جا کر بیٹھو۔ مسجد کے نمازیوں اور قرآن خوانوں کے لیے باعث حرج نہ ہو۔

عہد نبوی کے قانون کی ''تبدیلی'' کی ایک اور مثال ابوعبید (کتاب الاموال) نے لکھی ہے۔ نبطی، جو شمالی عرب میں عراق اور شام کے مابین بستے تھے، غلہ اور زیتون کا تیل کاروانوں میں مدینے لایا کرتے تھے۔ مدینے میں گرانی بڑھی تو انھوں نے ان پر محصول درآمد (چنگی) کو آدھا، یعنی بجائے دس فی صد کے صرف پانچ فی صد کر دیا۔ ورنہ وہ غلے پر دس فی صد چنگی لیتے تھے۔

اسلامی قانون کا ارتقا عہد نبوی کے بعد فتوؤں سے ہوا۔ فتویٰ دینے کا حق ہر مسلمان عالم کو ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں نہ صرف عدل گستری بلکہ قانون سازی بھی

ہمیشہ حکومت سے آزاد رہی۔ مُفتیوں کا اختلاف آرا عہد فاروقی میں بھی رہا۔

ابولولو فیروز نامی ایک ایرانی (عیسائی یا مجوسی) غلام مدینے میں رہتا تھا۔ جب کبھی شہر میں کم عمر (ایرانی) غلام بچے دیکھتا تو آ کر ان کا سر ہلاتا اور رو کر کہتا: عربوں نے میرا جگر کھا ڈالا ہے۔ وہ کاری گر اور بڑا دست کار تھا۔ ایک دن اس نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ اس کے مالک نے اس پر جو روزانہ اجرت لگائی ہے وہ بہت سخت ہے۔ کاریگر سے اس کے پیشے کا سن کر فرمایا: یہ تو کچھ گراں نہیں، اس سے تو وعدہ نہ کیا، لیکن بروایت امام نجاری انھوں نے بعد میں اس کے لیے اس کے مالک سے سفارش کی۔ ابولولو حضرت عمر کے جواب سے مطمئن نہ ہوا۔ کچھ تلخ جواب دے کر اپنے بعض دیگر ہم وطنوں (ہرمزان اور جفینہ) کے پاس پہنچا اور ان لوگوں سے ایک خنجر مُستعار لیا۔ اِتفاق سے اس کی کانا پھوسی کے وقت ایک مسلمان کا وہاں سے گزر ہوا تو گھبرایا اور بے اختیار وہ خنجر اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ مسلمان نے اس وقت اسے کوئی اہمیت نہ دی اور چلا گیا۔ فجر کے وقت جب حضرت عمرؓ مسجد میں امامت کے لیے محراب کی طرف جا رہے تھے تو ابولولو نے آ کر انھیں مہلک طور پر زخمی کر دیا، اور جب گرفتار کر لیا گیا تو خود کشی کر لی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کی شہادت کو بعض جدید مؤرخین مثلاً محمد حسین ہیکل اور عباس محمود العقاد وغیرہ نے اہل فارس کی سازش قرار دیا ہے۔

زخمی ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو بلا بھیجا اور وصیت فرمائی کہ غیر مسلم رعیت کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے۔ بیت المال کا کچھ قرض تھا۔ بیٹے کو تاکید کی کہ وہ فوراً ادا کر دیا جائے۔

سب سے اہم مسئلہ جانشینی کا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ عشرہ مبشرہ میں سے جو لوگ زندہ ہیں (اور ایسے سات لوگ تھے لیکن ان میں سے اپنے رشتہ دار سعید بن زبیر کو خارج کر دیا) وہ اپنے میں سے ایک کا انتخاب کر لیں، یعنی حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ، سعدؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ۔ چوں کہ چھے ارکان میں مساوی آرا کی صورت میں پیچیدگی پڑ سکتی تھی، اس لیے اپنے بیٹے عبداللہ بن عُمر کو ساتواں رکن اس شرط سے مقرر کیا کہ وہ خود منتخب نہ کیے جائیں اور وہ خود رائے صرف اس وقت دیں جب رائیں برابر بٹ جائیں اور خود بیٹے کو ہدایت کی کہ ایسی صورت میں اپنی فیصلہ کن رائے اس امیدوار کو دینا جس کے لیے عبدالرحمٰن بن عوف نے رائے دی ہو۔ پھر خود ہی کہا کہ بیٹے کا یہ تقرر اس کے لیے تعزیت کے طور پر ہے۔ چنانچہ اس سات رکنی کمیٹی نے حضرت عثمان بن عفان کا انتخاب کیا۔

انھیں وفات کے بعد رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں حضرت ابوبکرؓ کے پاس دفن کیا گیا۔

عمرو بن اُمیہؓ

عمرو نام، ابواُمیہ کنیت۔ انھیں اسلام کا سب سے پہلا سفیر سمجھا جا سکتا ہے۔ بدر اور اُحد کے غزوات میں مشرکین کے ساتھ تھے اور مسلمانوں کے خلاف۔ 3 ہجری میں غزوۂ احد کے بعد اسلام قبول کیا۔ 4 ہجری میں جو 70 مبلغ بیرِ معونہ بھیجے گئے تھے، اور جنھیں عامر بن طفیل نے راستے میں غداری سے قتل کر دیا تھا، ان میں حضرت عمروؓ بھی شریک تھے اور وہ واحد شخص تھے جو زندہ بچے۔ عامر بن طفیل نے یہ کہ کر انھیں رہا کیا تھا کہ "میری ماں نے ایک غلام آزاد کرنے کی منت مانی تھی۔" وہ واپس پیدل مدینے آ رہے تھے کہ راستے میں بنوکلاب کے دو آدمی، جنھیں آنحضور ﷺ نے امان دی تھی، مگر عمروؓ کو اس کا علم نہ تھا، ملے۔ حضرت عمروؓ بن امیہ نے جوش انتقام میں انھیں قتل کر دیا۔ جب آنحضرت ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے مقتولوں کی دیت ادا فرمائی۔

6 ہجری میں مکے میں سخت قحط پڑا تھا، حتّٰی کہ لوگ ذبیحہ جانوروں کا خون تک پکا کر کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس موقع پر اہل مکہ کی دل دہی اور انسانی ہمدردی کے لیے آنحضرت ﷺ نے پانچ سو دینار کی خطیر رقم حضرت عمروؓ کے ہاتھ بھیجی کہ فقرائے مکہ میں تقسیم کریں۔ اس پر ابوسفیان نے جھنجلا کر کہا تھا: "محمد ﷺ ہمارے نوجوانوں کو ورغلانا چاہتا ہے۔"

6 ہجری کے اواخر میں حکمرانوں کے نام جو تبلیغی خطوط لکھے گئے، ان میں سے نجاشی (حبشہ) کے نام کا مکتوب نبوی ﷺ حضرت عمروؓ بن امیہ ہی کے ہاتھ بھیجا گیا اور اسی وقت ان کے ذمے یہ کام بھی کیا گیا کہ حبشہ میں ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان کا آنحضرت ﷺ سے غائبانہ عقد کرائیں اور انھیں نیز دیگر مسلمانوں کو، چاہے وہ مکی مہاجر ہوں یا نو مسلم حبشی، ساتھ لے کر مدینہ واپس آئیں۔ حضرت عمروؓ نے یہ فرائض حسن و خوبی سے انجام دیے۔

9 ہجری میں غزوۂ تبوک میں دومۃ الجندل کی مہم میں حضرت خالدؓ بن ولید کے ساتھ عمرو بن اُمیہ بھی موجود تھے۔ اکیدر کی گرفتاری کی خبر اور کچھ نفیس مال غنیمت حضور ﷺ تک پہنچانے کے فریضے پر حضرت خالدؓ نے انھی کو مامور کیا تھا۔

تقریباً 10 ہجری میں جب مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور آنحضور ﷺ کو ایک خط لکھا تو اس کا جواب پہنچانے کے لیے عمروؓ ہی مامور ہوئے۔ بعد ازاں انھوں نے مدینہ میں رہائش اختیار کر لی اور وہیں بڑی عمر میں وفات پائی۔

ان کی ہوشیاری ضرب المثل ہے۔ قریش مکہ انھیں نہایت چالاک، فطین اور فعال سمجھتے تھے اور ان سے بہت گھبراتے تھے۔ کہتے ہیں کہ مشہور "داستان امیر حمزہ" میں "عمرو عیار" کا کردار انھی کی شخصیت کی افسانوی پیش کش ہے۔

(تحریر: ڈاکٹر محمد حمیداللہ)

عمرو بن العاصؓ

السہمی، قریشی اور صحابی رسول ﷺ۔ وہ 8ھ /629-630ء میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس وقت وہ ضرور ادھیڑ عمر کے ہوں گے، کیوں کہ اپنی وفات کے وقت جو تقریباً 42ھ /663ء میں ہوئی، ان کی عمر 90 سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے مدبر سیاست دانوں میں شمار ہوتے تھے۔ مکہ والوں میں سے جو لوگ اوروں سے زیادہ صاحب نظر تھے انھوں نے غزوۂ احزاب میں مدینے کا محاصرہ ناکام

ہونے کے بعد ہی اسلام کی حقانیت کے بارے میں غور کرنا شروع کر دیا تھا اور اسلام کی صداقت پر انھیں یقین ہو گیا تھا۔ اسی لیے خالدؓ بن ولید، عثمان بن طلحہ، اور عمرو بن العاص جیسے آدمی فتح مکہ سے پہلے ہی اسلام لے آئے۔ بعض اس کے بعد۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کے زیر ہدایت اپنی خدمات کا آغاز کر دیا۔ چند چھوٹے چھوٹے معرکوں میں بھیجنے کے بعد آپ نے حضرت عمرو کو عمان روانہ کیا اور وہاں پہنچ کر انھوں نے دو بھائیوں جیفر اور عباد بن جلندی (الازدی) سے جو وہاں کے حاکم تھے سلسلہ گفت وشنید شروع کر دیا، چنانچہ وہ دونوں اسلام میں داخل ہو گئے۔ عمان جانے کے بعد انھیں رسول اللہ ﷺ کو دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد وہ مدینے واپس آ گئے، لیکن انھیں وہاں زیادہ عرصے ٹھہرنا نہ ملا۔ غالباً 12ھ /633ء میں حضرت ابوبکرؓ نے انھیں فوج دے کر فلسطین بھیج دیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ فتح شام کی کارروائی میں حضرت عمروؓ نے بہت نمایاں حصہ لیا تھا۔ دریائے اردن کے مغرب کے علاقے کی تسخیر بالخصوص انھیں کا کارنامہ تھا اور وہ جنگ اجنادین اور یرموک اور فتح دمشق میں بھی شامل تھے۔

پھر بھی ان کی اصل شہرت فتح مصر کی وجہ سے ہے۔ بعض ماخذ کی رو سے وہ اپنی فوج لے کر اپنی ذمہ داری پر وہاں گئے تھے، انھوں نے حضرت عمر کو اس مہم کی اطلاع دے دی تھی حضرت عمر کی جانب سے بہت جلد ان کے لیے حضرت الزبیر کی قیادت میں کمک بھیجی گئی۔ اس مہم میں 18ھ /640ء کے موسم گرما میں یونانیوں کو ہلیو پولیس (بعلبک) پر شکست ہوئی۔ 20ھ /641ء میں بابل پر عربوں کا قبضہ ہوا، 21ھ 642ء میں اسکندریہ ان کے زیر اقتدار آ گیا۔ لیکن حضرت عمروؓ کا کارنامہ فقط مصر کا فتح کرنا ہی نہیں تھا، انھوں نے اس کے نظام حکومت، محکمہ عدل وانصاف کے نظم ونسق اور ٹیکس عائد کرنے کے قواعد وضوابط بھی مقرر کیے۔ فسطاط کی بنیاد بھی انھیں نے رکھی، جسے بعد میں مصر کہا گیا اور جس کا نام چوتھی صدی ہجری / دسویں عیسوی میں قاہرہ ہو گیا۔

خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت کے شروع ہی میں حضرت عمرو بن العاصؓ کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو ان کی جگہ والی مقرر کر دیا۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص کاروبار حکومت سے کنارہ کش ہو گئے۔ جب حضرت عثمانؓ کے لیے فضا مکدر ہو گئی تو اس فتنے کے دوران میں وہ مکہ مکرمہ میں قیام پزیر رہے۔ جب جنگ جمل ختم ہوئی اور میدان خلافت میں حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہؓ صرف دو مد مقابل باقی رہ گئے تو صرف اس وقت ہی حضرت عمرو بن العاص دوبارہ میدان عمل میں آئے اور انھوں نے کھلم کھلا امیر معاویہ کا ساتھ دیا۔ معرکہ صفین میں وہ شامی سوار فوج کے قائد تھے۔ جب حضرت علی کی فتح ہوتی نظر آئی تو انھوں نے یہ کارگر حیلہ نکالا کہ اپنی فوج کے نیزوں پر قرآن کے اوراق بلند کر دیے۔ یہ تدبیر چل گئی اور لڑائی کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد دونوں فریق تحکیم پر متفق ہو گئے اور اس کے لیے دو حکم، حضرت ابوموسیٰ الاشعری اور عمرو بن العاص مقرر ہوئے۔ فیصلے کے لیے مقررہ دن کے آنے سے پہلے حضرت عمرو بن العاص نے امیر معاویہ کے حق میں یہ اہم اقدام کیا کہ مصر پر قبضہ کر کے اسے امیر معاویہ کے علاقے میں شامل کر دیا۔ حضرت علی کی طرف سے والی مصر اس وقت محمد بن ابی بکر تھے۔ عمروؓ نے محمد بن ابی بکر کو 38ھ /608ء میں شکست دی اور انھیں قتل کر دیا۔

مسئلہ تحکیم میں ان کی تدبیر سے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ نے کھڑے ہو کر اعلان کر دیا کہ وہ معاویہؓ اور علیؓ دونوں کو خلافت کے منصب اعلیٰ کے لیے نااہل سمجھتے ہیں، مگر حضرت عمروؓ نے اس سے صرف اس حد تک اتفاق کیا کہ وہ حضرت علی کی معزولی پر متفق ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علی کا موقف کمزور ہو گیا، لیکن حضرت معاویہ کو کوئی نقصان نہیں ہوا، کیوں کہ وہ تو محض حضرت عثمان کا قصاص طلب کرنے کے لیے لڑے تھے۔ حضرت عمرو اپنی وفات تک والی مصر رہے۔ 15 رمضان 40ھ 22۔ جنوری 661ء کو وہ محض اتفاق سے زادویہ کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ گئے، جو ان تین خارجیوں میں سے ایک تھا جنھوں نے بقول بعض اپنے مذہبی جنون کی بنا پر حضرت علی امیر معاویہ، اور حضرت عمرو تینوں راہ نماؤں کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس دن وہ بوجوہ صلوٰۃ الفجر کی امامت کرنے کے لیے نہ آ سکے اور انھوں نے اپنی جگہ خارجہ بن حذافہ کو نماز پڑھانے کے لیے مامور کر دیا اور خارجہ کو مہلک زخم لگایا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ بڑے خوش گفتار، مصاحب اور شیریں بیان خطیب، قادر الکلام مدبر، سیاستدان اور سپہ سالار تھے۔ رسول اکرم ﷺ عسکری مہموں میں ان پر اعتماد فرماتے، ان کی قدر کیا کرتے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے رحم وکرم کی دعا فرماتے تھے۔ ان سے 39 حدیثیں بھی مروی ہیں۔

فضل بن عباسؓ

فضل نام، ابومحمد کنیت۔ آنحضور ﷺ کے چچا عباسؓ بن عبدالمطلب کے فرزند تھے۔ اس لحاظ سے حضور ﷺ کے چچازاد بھائی تھے۔ والدہ کا نام لبابہ تھا۔ غزوۂ بدر سے قبل اسلام لے آئے تھے، لیکن قریش کے خوف سے اعلان نہیں کیا تھا۔ اپنے والد کے ساتھ ہجرت کی۔ فتح مکہ اور غزوۂ حنین میں شریک تھے۔ پھر حجۃ الوداع میں حضور ﷺ کے ساتھ اس شان سے نکلے کہ حضور ﷺ کی سواری پر سوار تھے، اسی دن سے "ردف رسول ﷺ" یعنی ہم رکاب رسول لقب ہو گیا۔ رمی جمار کے وقت حضور ﷺ کی پشت پر چادر آڑ کیے ہوئے سایہ کیے کھڑے تھے۔

حضرت فضلؓ نے آپ ﷺ کی آخری خدمت کی سعادت بھی حاصل کی۔ حضور ﷺ نے مرض الموت میں جو آخری خطبہ دیا تھا، اس کے لیے جن سعادت مند حضرات کے سہارے زنان خانے سے باہر تشریف لائے تھے، ان میں سے ایک حضرت فضلؓ تھے، اور انھی کے ذریعے سے حضور ﷺ نے خطبہ دینے کا اعلان کرایا تھا۔ سب سے آخری سعادت جسد مبارک کے غسل کی حاصل ہوئی۔ حضرت فضلؓ پانی ڈالتے تھے اور حضرت علیؓ نہلاتے تھے۔

حضرت فضلؓ بن عباسؓ اجنادین کے معرکے میں شہید ہوئے۔ اولاد میں صرف ام کلثوم تھیں، جن کے ساتھ بعد میں حضرت حسنؓ نے شادی کی اور ان سے طلاق کے

بعد ابوموسیٰ اشعریؓ کے عقد میں آئیں۔

کعب بن زہیرؓ

عرب کا مشہور ترین شاعر۔ قصیدہ بانت سعاد (یا قصیدہ بردہ) کا خالق۔ اس کے باپ کا نام زہیر بن ابی سلمٰی اور والدہ کا نام کبشہ بنت عمار تھا۔ اس خاندان کے گیارہ افراد کا کلام باقی رہ گیا ہے اور موجود ہے۔ کعب نے اپنے قبیلے کی جنگوں میں قبیلہ طی، قریش اور خزرج کے خلاف حصہ لیا، جیسا کہ اس کے دیوان کے بہت سے قصائد سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا بھائی بجیر حلقہ بگوش اسلام ہو گیا، مگر کعب کفر پر قائم رہا اور آنحضور ﷺ اور مسلمان خواتین کے خلاف یاوہ گوئی کرتا رہا۔ آنحضور ﷺ نے اس کے خون کو رائگاں اور باطل قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کعب کے لیے زمین تنگ ہو گئی۔

بالآخر اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا اور 9 ہجری میں اچانک مسجد نبوی ﷺ میں آ نکلا، جہاں رسول اللہ تشریف فرما تھے۔ اس نے آپ ﷺ کو اپنا مشہور قصیدہ ''بانت سعاد'' سنایا۔ نبی کریم ﷺ یہ قصیدہ سن کر خوش ہوئے اور اپنی دھاریوں والی چادر (البردہ) اسے عطا فرمائی۔ اسی وجہ سے اس قصیدے کا نام ''قصیدہ بردہ'' مشہور ہوا۔

قصیدہ ''بانت سعاد'' میں دینی شاعری کا کوئی خاص انداز و اسلوب نہیں ہے۔ اس کے جذبات جاہلی شاعری کے جذبات ہیں اور اس کی ابتدا رسمی ہے۔ بہرحال یہ قصیدہ اس عہد کی قصیدہ نگاری کی مستند ترین مثال ہے۔ موضوعات کے تنوع، عام مضامین کی تکرار، اسلوب بیان اور ذخیرۃ الفاظ کے اعتبار سے اس کا شمار روایتی شاعری کے اچھے نمونوں میں ہو سکتا ہے۔ اس میں پہلی صدی ہجری کے ربع اوّل میں مدح نگاری کے ضروری عناصر متعین کیے گئے ہیں۔

کعبؓ بن مالک

ابوعبداللہ کنیت تھی۔ تعلق بنوخزرج کے قبیلہ مسلمہ سے تھا۔ وہ عہد جاہلیت میں مدینہ منورہ کی خوں ریز قبائلی جنگوں میں حصہ لینے کے بعد ہجرت نبوی ﷺ سے پہلے اسلام لے آئے تھے۔ چنانچہ عقبہ ثانیہ کی بیعت میں وہ بھی شریک تھے۔ کعب شاعر تھے اور حسان بن ثابت اور عبدالرحمٰن بن رواحہ کی طرح حضور ﷺ کی فرمائش پر مسلمانوں کے جنگی کارناموں کا ذکر کرتے اور دشمنوں کے معاندانہ اشعار کے جواب میں شعر کہتے تھے۔ وہ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے، لیکن دوسرے متعدد غزوات میں حصہ لیا۔

غزوۂ اُحد میں اگرچہ انھیں زخم لگ چکے تھے، پھر بھی انھوں نے آنحضرت ﷺ کو، جن کے بارے میں خیال تھا کہ زخمی ہو کر شہید ہو گئے، تلاش کر لیا۔ اس کے باوجود وہ ان چند صحابہ میں سے تھے جو تبوک کے پُرخطر غزوے میں شریک نہ ہو سکے۔ اس پر انھیں سخت ندامت ہوئی۔ سخت آزمائش کے بعد انھیں معاف کر دیا گیا (سورہ توبہ)۔ یاد رہنا چاہیے کہ کعب ہی بنوغسان سے اپنے قبیلے کے تعلقات پر بار بار زور دیتے اور کعب ہی سے ایک غسانی سردار نے مدینہ منورہ اور حضور ﷺ سے تعلق قطع کرنے کے لیے کہا تھا۔

ان کی وفات 53 ہجری میں ہوئی، جب وہ اپنی بصارت کھو چکے تھے۔ ان کے کلام میں جذبہ حب الوطنی کے ساتھ اسلام کے لیے بھی حقیقی جوش پایا جاتا ہے۔

مصعبؓ بن عمیر

قریش کے خاندان عبدالدار کے ایک صحابی جو دولت مند والدین کے بیٹے تھے۔ وہ خوش رو نوجوان تھے اور ان کے مناسب و موزوں قد و قامت پر ہر ایک کی نظر پڑتی تھی۔ رسول کریم ﷺ کی تلقین و تبلیغ کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنی معاشرتی وجاہت کو خیرباد کہ کر آپ ﷺ کے کم زور و معتوب پیروؤں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔ روایات میں ان کی سابقہ ناز و نعمت کی زندگی اور بعد کے زمانے کی مفلوک الحالی کے تضاد کو بہت شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے، لیکن بیانات بالعموم ایسی دیگر روایتوں کی طرح کسی قدر مشتبہ ہیں، اگرچہ ناممکن نہیں، کیوں کہ مصعب کے زمانے میں لوگوں کے پاس زیادہ مال و دولت نہ تھا اور وہ اس قدر عیش و عشرت کی زندگی کے عادی نہ تھے۔

جب ان کے ماں باپ نے انھیں مسلمانوں کی طرح عبادت کرنے سے روکا تو وہ کئی اور مسلمانوں کے ہم راہ حبشہ چلے گئے، لیکن وہاں سے وہ ہجرت سے پہلے ہی واپس آ گئے۔ رسول کریم ﷺ ان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے اور عقبہ میں پہلی بیعت کے بعد حضور ﷺ نے انھیں مبلّغ کی حیثیت سے مدینے بھیج دیا، جہاں انھوں نے متعدد لوگوں کو حلقہ اسلام میں داخل کیا۔ وہ وہاں نماز جمعہ کی امامت کیا کرتے تھے، اور ان کی غیر حاضری میں حضرت اسعدؓ بن زرارہ نماز جمعہ پڑھاتے تھے۔

عقبہ کی پہلی بیعت میں صرف بارہ انصار شریک تھے، لیکن حضرت مصعبؓ نے ایک ہی سال میں تمام اہل مدینہ کو اسلام کا فدائی بنا دیا۔ چنانچہ دوسرے سال 73 اکابر کی جماعت اپنی قوم کی طرف سے تجدید بیعت اور رسول اللہ کو مدینے میں مدعو کرنے کے لیے روانہ ہوئی تو ان کے معلّم دین حضرت مصعبؓ بھی ساتھ تھے۔ انھوں نے مکہ پہنچتے ہی سب سے پہلے آستانہ نبوت پر حاضر ہو کر اپنی حیرت انگیز کامیابی کی داستان عرض کی۔ حضرت مصعبؓ کی والدہ نے بیٹے کے آنے کی خبر سنی تو کہلا بھیجا: ''اے نافرمان فرزند! کیا تو ایسے شہر میں آئے گا جس میں میں موجود ہوں اور تو پہلے مجھ سے ملنے نہ آئے۔''

حضرت مصعبؓ نے مکہ آنے کے بعد ذی الحج، محرم اور صفر کے مہینے آنحضور ﷺ ہی کی خدمت میں بسر کیے اور پہلی ربیع الاوّل کو سرور عالم ﷺ سے بارہ دن پہلے مستقل طور پر ہجرت کر کے مدینے کی راہ لی۔

غزوۂ بدر میں سب سے بڑا علم ان کے ہاتھ میں تھا۔ غزوۂ احد میں بھی اسلامی لشکر کا پرچم ان کے پاس تھا۔ مشرکین کے شاہ سوار ابن قمیہ نے بڑھ کر تلوار کا وار کیا، جس سے دایاں ہاتھ شہید ہو گیا، لیکن انھوں نے علم فوراً بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس وقت ان کی زبان پر سورۂ آل عمران کی یہ آیت جاری تھی: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ (اور محمد صرف رسول ﷺ ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔'') (144:3)

ابن قمیہ نے دوسرا وار کیا تو بایاں ہاتھ بھی قلم تھا، لیکن اس دفعہ دونوں بازوؤں نے حلقہ کر کے علم کو سینے سے چمٹا لیا۔ ابن قمیہ نے تلوار پھینک دی اور اس زور سے نیزہ تاک کر مارا کہ اس کی انی ٹوٹ کر سینے میں رہ گئی۔ حضرت مصعبؓ یہ آیت پڑھتے ہوئے اللہ کو پیارے ہوئے، لیکن اسلامی پرچم سرنگوں نہیں ہوا تھا۔ ان کے بھائی ابوالروم بن عمیرؓ نے بڑھ کر پرچم کو سنبھالا اور آخر وقت تک شجاعانہ مدافعت کرتے رہے۔

لڑائی کے خاتمے پر آنحضور ﷺ حضرت مصعب بن عمیر کی نعش کے قریب آئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ (الاحزاب: 33: 23) (مومنین میں سے چند آدمی ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا، اسے سچ کر دکھایا)

اس کے بعد حضور ﷺ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا: ''میں نے مکہ میں تمھارے جیسا حسین اور خوش لباس اور کوئی نہ دیکھا تھا، لیکن آج دیکھتا ہوں کہ تمھارے بال گرد آلودہ اور اُلجھے ہوئے ہیں اور تمھارے جسم پر صرف ایک چادر ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم لوگ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر رہو گے۔'' پھر حضور ﷺ نے حضرت مصعبؓ کی تکفین کا حکم دیا۔ شہید کی چادر اتنی چھوٹی تھی کہ سر ڈھانپا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر برہنہ ہو جاتا۔ بالآخر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''سر چادر سے ڈھانپ دو اور پاؤں کو اذخر گھاس سے چھپا کر سپرد خاک کر دو۔'' صحابہ نے حکم کی تعمیل کی۔ حضرت مصعبؓ کی شادی مشہور صحابیہ حضرت حمنہؓ بنت جحش (سرور عالم ﷺ کی پھوپھی زاد بہن) سے ہوئی تھی۔ ان سے ایک بچی زینب اپنی یادگار چھوڑی۔

معاذ بن جبلؓ

بن عمرو بن اوس، انصاری خزرجی، کنیت ابوعبدالرحمٰن۔ مدینے کے رہنے والے تھے۔ عالم شباب میں مسلمان ہوئے اور 72 اہل مدینہ کے ہم راہ مکہ مکرمہ میں آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت عقبہ میں شرکت کا شرف حاصل کیا۔

ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور معاذ بن جبلؓ کو رشتہ مواخات میں منسلک فرمایا۔ حضرت معاذؓ بیس برس کی عمر میں غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور اس کے بعد اکثر غزوات میں شرکت کی۔ قرآن مجید کے مستند قاری اور جید عالم تھے۔ عہد نبوی میں بعض دیگر صحابہ کرامؓ کے ساتھ انھیں بھی قرآن مجید جمع کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ چار حضرات یعنی ابن مسعود، ابیؓ بن کعب، معاذؓ بن جبل اور سالمؓ مولیٰ ابوحذیفہؓ سے قرآن مجید سیکھو۔

حضرت معاذؓ کا شمار عہد رسالت ﷺ کے مفتیوں میں ہوتا ہے۔ جب رسول کریم ﷺ فتح مکہ کے بعد غزوۂ حنین کے لیے روانہ ہوئے تو آپ ﷺ حضرت معاذؓ کو مکہ مکرمہ میں چھوڑ گئے تاکہ وہ اہل مکہ کو دین اسلام اور قرآن مجید کی تعلیم دیں۔ وہ یمن کے علاقے الجند میں حضور ﷺ کے مبلغ رہے۔ ان کی تبلیغی مساعی کے نتیجے میں یمن کے تمام سردار اور سربراہ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ جب آپ ﷺ نے حضرت معاذؓ کو یمن کا عامل بنا کر بھیجا تو نصیحت فرمائی کہ لوگوں کے لیے آسانی مہیا کرنا، مشکلات نہ پیدا کرنا، انھیں خوشی و مسرت کا پیغام سنانا اور کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ انھیں دین سے نفرت ہو جائے۔ نیز معاملات قضا کے لیے کتاب و سنت کی اطاعت کے ساتھ نئے مسائل میں اجتہاد کی اجازت فرمائی۔

حضرت معاذؓ آنحضور ﷺ کے وصال کے وقت یمن میں تھے، مگر حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں مدینے واپس آ گئے۔ وہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے مشیروں میں سے تھے۔ وہ ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کے مشوروں کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے یہاں تک فرما دیا کہ اگر معاذؓ نہ ہوتے تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔ اسی طرح ایک دن حضرت عمرؓ نے بمقام جابیہ ایک خطبے کے دوران میں فرمایا کہ جسے بھی دینی اور فقہی مسائل سیکھنے ہوں، وہ معاذؓ کی خدمت میں حاضر ہو۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح اور حضرت معاذؓ کو حکم لکھ بھیجا کہ نیک، موزوں اور صالح آدمیوں کو عہدۂ قضا کے لیے منتخب کر کے ان کی تنخواہ مقرر کر دو۔ شام کی مہموں اور جنگوں میں حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ اور ان کی وفات کے بعد قیادت سنبھالی۔ 18 ہجری میں اردن کے نواح میں طاعون عمواس سے وفات پائی۔

حضرت معاذؓ بڑے خوب رُو، خوش اخلاق، کشادہ دست، کریم النفس، خوش بیان اور شیریں کلام تھے۔ ان سے 157 حدیثیں مروی ہیں۔ ایک دن حضور ﷺ نے حضرت معاذؓ سے فرمایا، اے معاذ! فرض نمازوں کے بعد یہ دعا مانگا کرو: ''اَللّٰهُمَّ اَعِنِّی عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ'' یعنی اے اللہ! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیرا ذکر کروں شکر ادا کرتا رہوں اور تیری عبادت اچھی طرح کر سکوں۔

معاویہؓ بن ابی سفیان

ان کے والد کا نام ابوسفیان اور والدہ کا نام ہند بنت عقبہ تھا۔ سلسلہ نسب یہ ہے: معاویہؓ بن ابی سفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی القرشی اموی۔ اس طرح امیر معاویہؓ کا شجرۂ نسب پانچویں پشت پر آنحضور ﷺ سے جا ملتا ہے۔ ان کا خاندان بنوامیہ زمانہ جاہلیت سے قریش میں معزز و محترم مانا جاتا تھا۔ ان کے والد ابوسفیان ممتاز تاجر اور مال دار تھے۔ وہ قریش کی فوج کی قیادت بھی کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بڑے معاملہ فہم اور صاحب تدبیر و سیاست تھے۔ اس خاندانی وقار کی وجہ سے قدرتاً وہ جاہ پسند ہو گئے تھے۔

ابوسفیان آغاز اسلام سے فتح مکہ تک اسلام اور آنحضور ﷺ کے سخت دشمن بنے رہے۔ جب حضور ﷺ نے مکہ فتح کیا تو ابوسفیان نے باہر آ کر اطاعت قبول کی۔ دوسری روایت ہے کہ ابوسفیان اور معاویہؓ دونوں فتح مکہ کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے۔ امیر معاویہؓ قبول اسلام کے بعد حنین اور طائف کے غزوات میں شریک رہے اور اسی زمانے میں کتاب وحی کے منصب پر فائز ہوئے۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں شام کی فوج کشی میں امیر معاویہؓ کے بھائی یزیدؓ

بن ابی سفیان ایک دستے کے افسر تھے۔ جب رومیوں کی مدد کے لیے قسطنطنیہ سے امدادی فوجیں آئیں تو حضرت عمروؓ بن العاص نے مزید امداد طلب کی۔ اس امدادی دستے کے مقدمۃ الجیش کی کمان حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے اس مہم میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ دمشق کی تسخیر کے بعد جب اسلامی فوجیں دیگر مقامات کی طرف بڑھیں تو حضرت معاویہؓ ہراول دستے میں تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں امیر معاویہؓ نے قیساریہ کی مہم سر کی۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی تجربہ کاری کے پیش نظر سارے شام کا والی مقرر کر دیا۔ انھوں نے طرابلس الشام، عموریہ، شمشاط اور ملطیہ کے مقامات فتح کر لیے۔ قبرص فتح کیا اور افریقیہ کی بحری جنگ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت تک وہ شام میں رہے۔ حضرت علیؓ نے خلیفہ ہوتے ہی حضرت عثمانؓ کے زمانے کے تمام والیوں کو معزول کر دیا۔ ان میں امیر معاویہؓ بھی شامل تھے۔ لیکن وہ اپنا عہدہ آسانی سے چھوڑنے والے نہ تھے۔ انھیں حضرت مغیرہؓ بن شعبہ اور عمرو بن العاصؓ جیسے صاحبان تدبیر وسیاست کی تائید حاصل ہوگئی۔ خود امیر معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کے خون آلودہ کپڑے اور ان کی زوجہ حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی نمائش جامع اموی دمشق میں کر کے سارے شام میں آگ لگا دی۔ لوگ قاتلین عثمانؓ سے انتقام لینے کا پُر زور نعرہ لگانے لگے۔ محتاط صحابہؓ یہ صورت حالات دیکھ کر بیچ بچاؤ کی کوشش کرنے لگے۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان خط وکتابت ہوئی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اس کے بعد جنگ صفین کا قیامت خیز واقعہ پیش آیا۔ مسلسل خانہ جنگی سے تنگ آ کر حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ نے 40ہجری میں صلح کر لی، جس کی رُو سے شام کا علاقہ امیر معاویہؓ کے پاس رہا اور عراق حضرت علیؓ کے حصے میں آیا۔ اس کے علاوہ یہ شرط بھی تھی کہ فریقین میں سے کوئی ایک دوسرے کے علاقے میں دست اندازی نہ کرے گا۔ روز روز کے اس کشت وخون سے بعض خوارج کو خیال پیدا ہوا کہ ملت اسلامیہ کی باہمی خوں ریزی کے ذمہ دار حضرت معاویہؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ اور حضرت علیؓ تینوں ہیں، اس لیے اگر تینوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے تو مسلمانوں کو اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔ تین آدمیوں نے مل کر انھیں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ابن ملجم نے حضرت علیؓ کو شہید کر دیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ قاتلانہ حملے سے محفوظ رہے اور امیر معاویہؓ زخمی ہو کر علاج سے شفایاب ہوئے۔

حضرت علیؓ کی شہادت پر حضرت حسنؓ مسند آرائے خلافت ہوئے۔ وہ امن پسند تھے اور خانہ جنگی سے نفرت کرتے تھے۔ امیر معاویہؓ کو بھی یہ معلوم تھا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت علیؓ کی شہادت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوجی پیش قدمی شروع کر دی۔ اس اثنا میں اہل عراق میں بددلی اور کمزوری کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے اور خارجی بھی فتنہ انگیزی کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر حضرت حسنؓ نے چند شرائط پر امیر معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دست برداری اختیار کر لی اور امیر معاویہ بلاشرکت غیرے تمام عالم اسلام کے فرماں روا بن گئے۔

امیر معاویہؓ نے سب سے پہلے خارجیوں کی سرکوبی کی۔ 41ہجری میں بلخ، ہرات اور کابل کو مطیع کیا۔ اس کے بعد بُست سے طخارستان تک اور سجستان سے لے کر غزنہ تک پورا علاقہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔ ترکستان، خراسان، سمرقند اور قندھار بھی فتح ہوئے۔ 49ہجری میں امیر معاویہؓ نے بڑے ساز وسامان کے ساتھ ایک لشکر اپنے بیٹے یزید کی سرکردگی میں قسطنطنیہ روانہ کیا۔ اس لشکر میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے اکابر صحابہؓ شامل تھے۔ حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اس حملے میں وفات پائی اور ان کی میت کو ان کی وصیت کے مطابق، قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے لے جا کر دفن کر دیا گیا۔ ان کا مزار جلد ہی عیسائیوں کی زیارت گاہ بن گیا، جہاں وہ خشک سالی کے زمانے میں بارش کے لیے دعا مانگا کرتے تھے۔

56ہجری میں امیر معاویہؓ نے اکابر صحابہؓ کی مرضی کے خلاف عوام سے اپنے بیٹے یزید کی بیعت لے لی۔ اس بیعت کے دُور رس نتائج مرتب ہوئے۔ اب نظام خلافت موروثی سلطنت میں بدل گیا۔ انھوں نے رجب 60ہجری میں اٹھتر برس کی عمر میں وفات پائی۔ ان کی خلافت اگرچہ علیٰ منہاج النبوت نہ تھی، لیکن ان میں خلفائے راشدین کی چند خصوصیات موجود تھیں۔ وہ کاتب وحی تھے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن اور مسانید میں ان سے بہت سی احادیث مروی ہیں۔

معمرؓ بن عبداللہ

معمر نام، والد کا نام عبداللہ۔ قریش کے خاندان عدی سے تعلق تھا۔ ابتدا ہی میں اسلام لے آئے، اور ہجرت ثانیہ میں حبشہ گئے۔ مدینہ کی ہجرت میں تاخیر ہوئی اور بالکل آخر میں یہ شرف حاصل ہوسکا۔ مدینہ آنے کے بعد سب سے پہلے آنحضرت کے ساتھ حجۃ الوداع میں شریک ہوئے۔ اس سفر میں حضور ﷺ کی سواری مبارک کا اہتمام انھی کے سپرد تھا اور کجاوہ وغیرہ وہی کستے تھے۔ ایک دن کسی شخص نے دانستہ یا نادانستہ اسے ڈھیلا کر دیا۔ صبح کو آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''رات کو کجاوہ کا تنگ ڈھیلا معلوم ہوتا تھا۔'' حضرت معمرؓ کو بڑی ندامت ہوئی اور انھوں نے عرض کیا: ''رسول اللہ، مَیں نے تو حسب دستور کس کے باندھا تھا۔ شاید کسی نے اس خیال سے ڈھیلا کر دیا ہو کہ مجھ سے یہ شرف چھن جائے اور آپ ﷺ یہ خدمت کسی اور کے سپرد کر دیں۔''

حضور نے فرمایا: ''تم اطمینان رکھو، میں یہ خدمت تمھارے علاوہ کسی دوسرے کے سپرد نہ کروں گا۔'' حضور ﷺ کا ارشاد سن کر معمرؓ خوش ہوگئے۔ اسی حج میں انھیں آنحضور ﷺ کے موئے مبارک تراشنے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جب یہ اُسترہ لے کر تیار ہوئے تو حضور ﷺ نے مزاحاً فرمایا: ''تمھیں اللہ کے رسول نے اپنے کان کی لو پر اس حالت میں قابو دے دیا ہے کہ تمھارے ہاتھ میں اُسترہ ہے۔''

حضرت معمرؓ نے بے ساختہ کہا: ''خدا کی قسم، یا رسول اللہ، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت اور اس کا کتنا بڑا احسان ہے کہ مجھے حضور ﷺ کے بال تراشنے کا فخر حاصل ہو رہا ہے۔''

حضرت معمرؓ کا سالِ وفات معلوم نہ ہوسکا۔ ان سے دو حدیثیں مروی ہیں۔

مغیرہ بن شعبہؓ

مغیرہ نام، ابوعبداللہ کنیت۔ غزوۂ خندق کے سال 5 ہجری میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اور اسی زمانے میں ہجرت کر کے مدینہ آ گئے اور آنحضور ﷺ کے ساتھ قیام کیا۔ غزوۂ حدیبیہ میں حضور ﷺ کے ساتھ نکلے۔ قریش اس میں مزاحم ہوئے اور ان کی طرف سے عروہ بن مسعود ثقفی گفتگو کے لیے آیا اور عرب کے عام قاعدے کے مطابق دورانِ گفتگو میں بار بار آنحضور ﷺ کی ریش مبارک کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔ مغیرہؓ کو جو اس وقت ہتھیار لگائے ہوئے تھے، حضور ﷺ کی پشت کی جانب کھڑے تھے۔ یہ انداز گفتگو ناگوار ہوا۔ وہ ہر مرتبہ تلوار کے قبضے پر ہاتھ لے جاتے تھے۔ آخر ضبط نہ ہوسکا۔ ڈانٹ کر کہا، خبردار ہاتھ قابو میں رکھو۔

حدیبیہ کے بعد متعدد غزوات میں شرکت کی۔ آنحضرت ﷺ کی تجہیز وتکفین کے وقت موجود تھے۔ جب لوگ جسد مبارک کو قبر میں رکھ کر نکلے تو حضرت مغیرہؓ نے عمداً قبر میں اپنی انگوٹھی گرا دی۔ حضرت علیؓ نے کہا، نکال لو۔ انھوں نے قبر میں اُتر کر قدم مبارک کو ہاتھ سے مس کیا اور جب مٹی گرائی جانے لگی، تو اس وقت قبر سے نکلے۔ انھوں نے انگوٹھی اس لیے گرائی تا کہ یہ شرف ان کے ساتھ مخصوص ہو جائے کہ وہ ذات نبوی ﷺ سے یہ سب سے آخری جدا ہونے والے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ لوگوں سے فخریہ کہا کرتے تھے کہ میں تم سب میں حضور ﷺ سے آخری جُدا ہونے والا ہوں۔

زمانہ جاہلیت میں وہ ایک وفد کے ساتھ مقوقس شاہ مصر کے دربار میں گئے تھے۔ 5 ہجری میں اسلام قبول کیا۔ صلح حدیبیہ، یمامہ اور فتوح شام میں شامل رہے۔ جنگ یرموک میں ان کی ایک آنکھ جاتی رہی۔ بعد ازاں جنگ قادسیہ، نہاوند اور ہمدان وغیرہ میں بھی شریک رہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے انھیں بصرے کا والی مقرر کیا۔ اس زمانے میں انھوں نے متعدد علاقے فتح کیے۔ پھر انھیں کوفے کا والی مقرر کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد حکومت میں بھی وہ کوفے کے والی رہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے اختلافات کے زمانے میں پہلے تو گوشہ نشین رہے، مگر پھر امیر معاویہؓ کے ساتھ مل گئے۔ امیر معاویہؓ نے انھیں کوفے کا والی مقرر کر دیا، جس پر وہ اپنی وفات (50 ہجری) تک فائز رہے۔ حضرت مغیرہؓ عروہ بن مسعودؓ کے بھتیجے تھے جو آنحضرت ﷺ کے صحابی اور شہدائے اسلام میں سے ہیں۔

مقدادؓ بن عمرو

مقداد نام، ابوالاسود کنیت، عمرو کندی والد کا نام۔ انھوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ قریش کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ چلے گئے۔ کچھ دنوں کے بعد حبشہ سے واپس آئے تو مدینہ کی طرف ہجرت کی تیاریاں ہو رہی تھیں، لیکن وہ ایک عرصے تک اپنی بعض دشواریوں کے باعث مدینہ جانے سے مجبور رہے۔ بالآخر حضرت عتبہ بن غزوان کے ہم راہ موقع پا کر مدینہ پہنچے اور حضرت کلثوم بن ہدمؓ کے مہمان ہوئے۔ رسول کریم ﷺ نے انھیں بنی عدیلہ کے محلے میں مستقل سکونت کے لیے زمین مرحمت فرمائی، کیوں کہ حضرت ابی بن کعبؓ کی دعوت پر انھوں نے اسی حصے میں رہنا پسند کیا تھا۔

غزوۂ بدر پر روانہ ہونے سے پہلے حضرت مقدادؓ نے جس جوش اور وارفتگی کے ساتھ اپنی جاں نثاری کا ثبوت دیا، اس نے تمام فدائیوں کے جذبہ سرفروشی میں ہیجان برپا کر دیا۔ انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ، ہم وہ نہیں ہیں جو موسیٰؑ کی قوم کی طرح کہ دیں: ''تو اور تیرا رب جا کر لڑے، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔'' ہم تو کہتے ہیں، چلیے جدھر آپ کا رب آپ کو حکم دے رہا ہے، اس طرف چلیے۔ اس اللہ کی قسم، جس کے قبضہ قدرت میں ہماری جان ہے اور جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا ہے، ہم آپ کے دائیں لڑیں گے اور بائیں لڑیں گے، آگے لڑیں گے اور پیچھے لڑیں گے۔ واللہ جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کرتی ہے، آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔''

حضرت مقدادؓ کے اس سادہ لیکن پُر جوش اظہار فدویت سے آنحضور ﷺ اس قدر خوش ہوئے کہ فرطِ انبساط سے چہرۂ مبارک دمک اٹھا۔ حضرت مقدادؓ تیر اندازی، نیزہ بازی اور شاہ سواری میں کمال رکھتے تھے۔ محدثین کا عام طور پر اتفاق ہے کہ بدر میں ان کے سوا اور کسی کے پاس گھوڑا نہ تھا۔ اُحد، خندق اور دوسرے غزوات میں شریک رہے۔ فتح مصر میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے ہم راہ شامل تھے۔

ہجرت کے ابتدائی ایام حضرت مقدادؓ نے بڑی عسرت سے گزارے۔ رحمت عالم ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت مقدادؓ اور ان جیسے دو اور مفلوک الحال مہاجروں کی کفالت کا بار خود اٹھایا۔ صحیح مسلم میں حضرت مقدادؓ کی زبانی منقول ہے کہ: ''ایک دفعہ مجھ پر اور میرے دو ساتھیوں پر بڑا سخت وقت آیا۔ ہم سخت عسرت میں مبتلا ہو گئے، یہاں تک کہ ایک وقت کی روٹی کے لیے بھی ترستے تھے۔ جب مسلسل فاقوں تک نوبت پہنچی تو ہم نے صحابہؓ سے درخواست کی کہ وہ ہمارے کفیل بن جائیں، لیکن کسی نے ہماری کفالت کی حامی نہ بھری۔ بالآخر ہم رسول اللہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنی حالت بیان کی۔ حضور ﷺ ہم تینوں کو اپنے گھر لے گئے۔ اس وقت حضور ﷺ کے پاس صرف تین (یا چار) بکریاں تھیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان کا دودھ پیا کرو۔ چنانچہ ہم ان بکریوں کا دودھ دوہ کر پی لیتے اور حضور ﷺ کا حصہ رکھ چھوڑتے۔ حضور ﷺ رات کو تشریف لاتے۔ پہلے ہمیں آہستگی سے سلام کرتے، اس طرح کہ جو سوتا وہ جاگ نہ پڑے اور جو جاگتا ہو، وہ سن لے۔ پھر آپ ﷺ مسجد میں جا کر نماز پڑھتے۔ نماز سے فارغ ہو کر پھر تشریف لاتے اور اپنے حصے کا دودھ نوش فرماتے۔ ایک دن میں اپنے حصے کا دودھ پی چکا تو شیطان نے میرے دل میں وسوسہ ڈالا کہ حضور ﷺ اپنا بہت سا وقت انصار کے ہاں گزارتے ہیں۔ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں اشیائے خورونوش ہدیۃً پیش کرتے ہوں گے۔ آپ ﷺ تناول فرماتے ہوں گے، اور آپ ﷺ کو اس دودھ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ چنانچہ یہی تصور کر کے میں سارا دودھ پی گیا اور حضور ﷺ کے لیے کچھ بھی باقی نہ رکھا، لیکن دودھ پینے کے بعد خیال آیا کہ ممکن ہے، حضور ﷺ

بھوکے ہوں، اور آپ ﷺ جب اپنے حصے کا دودھ نہ پائیں تو مجھے بددعا دیں۔ اس طرح میرا دین اور دنیا دونوں برباد ہو جائیں گے۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ آنحضرت ﷺ تشریف لائے اور دودھ کی طرف بڑھے۔ دیکھا تو پیالہ خالی تھا۔ مجھے اپنی غلطی پر سخت ندامت ہوئی۔ خصوصاً جب کہ آپ نے کچھ کہنے کے لیے دونوں ہاتھ اٹھائے تو میرے خوف و ہراس کی کوئی انتہا نہ رہی اور اندیشہ ہوا کہ عن قریب آنحضرت ﷺ کی بددعا سے ہماری دنیا و آخرت تباہ ہو جائے گی، لیکن آپ نے فرمایا: ''خدایا، جو مجھے کھلائے، اسے کھلا۔ اور جو مجھے پلائے، اسے پلا۔''

اس دعا سے کچھ ہمت بڑھی۔ اٹھ کر بکریوں کے پاس گیا کہ شاید کچھ دودھ نکل آئے۔ لیکن خدا کی قدرت جس تھن پر ہاتھ پڑا، وہ دودھ سے لبریز نظر آیا۔ غرض کافی مقدار میں دوہ کر آنحضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''تم لوگ پی چکے ہو؟'' عرض کیا: ''یا رسول اللہ، آپ ﷺ پہلے نوش فرمالیں تو پھر مفصل واقعہ عرض کروں۔'' آنحضور ﷺ نے خوب سیر ہو کر دودھ نوش فرمالیا تو مجھے اپنی غلطی پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ''ابوالاسود، یہ کیا ہے؟'' میں نے تمام واقعہ بیان کیا تو ارشاد ہوا: ''یہ اللہ کی رحمت تھی۔ تم نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کیوں نہ بیدار کرلیا، کہ وہ بھی اس سے مستفید ہوتے۔''

حضرت مقدادؓ خوشامدانہ مداحی سے سخت متنفر تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ کے دربار میں چند آدمیوں نے ان کے روبرو تعریف و توصیف شروع کی۔ حضرت مقدادؓ اس خوشامد پر اس قدر برہم ہوئے کہ ان کے منہ پر خاک ڈالنے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے فرمایا: ''مقداد، یہ کیا ہے؟'' بولے: ''آنحضور ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ خوشامدیوں کے منہ میں خاک بھر دو۔''

بعض وجوہ کی بنا پر حضرت مقدادؓ کافی عرصے تک شادی نہ کر سکے تھے۔ ایک دن حضرت عبدالرحمٰن بن عوف پوچھ بیٹھے: ''مقدادؓ، تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔'' بے ساختہ جواب دیا: ''اپنی بیٹی بیاہ دو۔'' حضرت عبدالرحمٰن کو بڑا غصہ آیا اور انھیں بہت سخت سُست کہا: ''حضرت مقدادؓ نے بارگاہ نبوت میں شکایت کی تو آپ نے فرمایا: ''اگر کوئی تمھیں رشتہ دینے سے انکار کرتا ہے، تو کرتا رہے۔ میں تمھیں اپنی بنت عم سے بیاہ دوں گا۔''

چنانچہ حضور ﷺ نے اپنے چچا زبیر بن عبدالمطلب کی بیٹی ضباعہؓ سے حضرت مقدادؓ کا عقد کر دیا۔ 23 ہجری میں پیٹ کے ایک غلط عمل جراحی کی وجہ سے وفات پائی۔ خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت تھا۔ انھوں نے نماز جنازہ پڑھائی۔

نعمان بن بشیر انصاریؓ

خطیب، صاحب دیوان شاعر اور کوفے اور حمص کے عامل۔ پہلے انصاری تھے جو ہجرت نبوی ﷺ کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کے والد بشیرؓ بن سعد بن ثعلب آنحضور ﷺ کے ممتاز صحابہ میں سے تھے اور والدہ عمرہ بنت رواحہ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی بہن تھیں۔ انھیں حضرت عثمانؓ سے بڑی عقیدت تھی۔ انھوں نے جنگ صفین میں امیر معاویہؓ کا ساتھ دیا۔ 39 ہجری میں نعمانؓ نے امیر معاویہ کے حکم سے مالک بن کعب کے خلاف معرکہ آرائی کی، جس نے حضرت علیؓ کے نام پر عین التمر پر قبضہ کر لیا تھا۔ نعمان نے اس کا محاصرہ شروع کیا، لیکن ناکام واپس آئے۔ امیر معاویہؓ نے انھیں پہلے دمشق کا قاضی اور پھر یمن کا حاکم بنایا۔ اپنے آخری ایام 59 ہجری میں امیر معاویہؓ نے انھیں کوفہ کا والی مقرر کیا۔ تقریباً نو ماہ اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ یزید بن معاویہ نے معزول کر دیا۔ وہاں سے شام چلے گئے۔ بعد ازاں یزید نے حمص کا امیر مقرر کیا۔ وفات تک اس عہدے پر فائز رہے۔ خلیفہ مروان کے عہد میں عبداللہ بن زبیرؓ کی طرف داری کے جرم میں قتل ہوئے۔ آپ کی زوجہ اور دیگر اہل خانہ گرفتار ہوئے فقہ اور حدیث میں دست رس رکھتے تھے۔ آپ کے حوالے سے 124 احادیث محفوظ ہوئیں۔

نوفلؓ بن حارث

آنحضور ﷺ کے چچازاد بھائی۔ کنیت ابوحارث۔ اسلام لانے سے قبل ان کا رویہ آنحضور ﷺ کے بارے میں کرخت اور ظالمانہ تھا۔ غزوۂ بدر میں مشرکین کے مجبور کرنے پر شامل ہوئے، لیکن گرفتاری پر حضور ﷺ نے زرفدیہ کے عوض رہا کر دیا۔ اس پر وہ اسلام لے آئے۔ بعد میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں سے فتح مکہ کے بعد حضور ﷺ کے ہم راہ مدینہ آئے۔ طائف اور حنین کی جنگوں میں حصہ لیا۔ حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں مدینہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے۔ ایک عبداللہ بن نوفل جو امیر معاویہ کے عہد میں مکہ کے قاضی تھے اور دوسرے حضرت سعید قصیہ تھے۔

صحابیاتِ رسول ﷺ

اُروی ؓ بنت عبدالمطلب

آنحضور ﷺ کی حقیقی پھوپھی۔ ان کا نکاح عمیر بن وہب سے ہوا۔ ان کے بطن سے طلیبؓ پیدا ہوئے۔ حضرت طلیبؓ نے ابتدا ہی میں دارارقم میں جا کر اسلام قبول کیا اور واپس آ کر اپنی والدہ سے کہا: ''اماں جان میں اپنے (ماموں زاد) بھائی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر سچے دل سے ایمان لے آیا ہوں۔ وہ اللہ کے سچے رسول ہیں۔'' حضرت اُروی ؓ نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ انھوں نے اپنے فرزند سے کہا: بیٹے، تمھارا بھائی، آج دشمنوں اور مخالفتوں میں گھرا ہوا ہے۔ وہ مظلوم اور بے کس ہے اور واقعی تمھاری امداد کا مستحق ہے۔ اے کاش کہ مجھ میں مردوں جیسی قوت ہوتی تو اپنے یتیم بھتیجے کو ظالموں کی چیرہ دستی سے بچاتی۔'' طلیبؓ نے کہا: ''اماں، تو پھر آپ اسلام کیوں قبول نہیں کر لیتیں؟'' حضرت اُروی ؓ نے کہا: ''مجھے دوسری بہنوں کا انتظار ہے۔'' حضرت طلیبؓ نے کہا: ''اماں، اب انتظار کا وقت نہیں۔ خدا کے لیے میرے ساتھ بھائی کے پاس چلیں اور اسلام قبول فرمائیں۔'' حضرت اُروی ؓ مزید عذر نہ کر سکیں۔ اُسی وقت اپنے بیٹے کے ہم راہ دارارقم تشریف لے گئیں اور اپنے بھتیجے کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

حضرت اُروی ؓ کا بھائی ابولہب آنحضور ﷺ اور اسلام کا بدترین دشمن تھا۔ ایک دفعہ ابولہب نے چند مسلمانوں کو قید کیا تو حضرت طلیبؓ کو سخت غصہ آیا۔ انھوں نے اپنے ماموں کو خوب مارا پیٹا۔ اپنے سرغنہ کو پٹتے دیکھ کر بہت سے مشرکین حضرت طلیبؓ کو لپٹ گئے اور ابولہب کو چھڑا کر طلیبؓ کو باندھ دیا۔ چوں کہ معزز خاندان کے فرد تھے، اس لیے کچھ دیر بعد چھوڑ دیا۔ ابولہب نے اپنی بہن اُروی ؓ سے شکایت کی۔ انھوں نے جواب دیا: ''طلیبؓ کی زندگی کا بہترین وقت وہی ہے جب وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کرے۔''

ایک دفعہ حضرت طلیبؓ کو معلوم ہوا کہ ابواہاب عزیز داری نے حضور ﷺ کو شہید کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ انھوں نے چپکے سے جا کر اس کا سر قلم کر ڈالا۔ حضرت اُروی ؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اظہارِ خوشنودی کیا۔ 6 بعد بعثت کے آغاز میں حضرت طلیبؓ آنحضور ﷺ کے ایما پر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہاں سات سال قیام کرنے کے بعد حضور ﷺ کی ہجرتِ مدینہ کے کچھ عرصہ پہلے مکہ واپس آئے۔ حضرت اُروی ؓ نے اپنے فرزند کی جدائی کا یہ طویل زمانہ بڑے صبر واستقلال کے ساتھ گزارا۔ وہ حضور ﷺ کی وفات تک حیات تھیں اور حضور ﷺ کے وصال پر انھوں نے چند درد انگیز اشعار بھی کہے تھے۔ انھیں شعر وشاعری میں اچھا خاصا ملکہ تھا۔

اسماءؓ بنت ابی بکر

اسما نام، ذات النطاقین لقب، حضرت ابوبکرؓ کی صاحب زادی ہیں۔ ماں کا نام قتیلہ بنت عبدالعزیٰ تھا، ہجرت سے 27 سال قبل مکہ مین پیدا ہوئیں، حضرت زبیرؓ بن عوام سے نکاح ہوا۔

اپنے شوہر کی طرح انھوں نے بھی قبولِ اسلام میں سبقت کی۔ ابن اسحاق کے قول کے مطابق ان کا ایمان لانے والوں میں اٹھارھواں نمبر تھا۔

جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو حضرت ابوبکرؓ رفیقِ سفر تھے، آپ ﷺ دوپہر کو ان کے گھر تشریف لائے اور ہجرت کا خیال ظاہر فرمایا۔ حضرت اسماؓ نے سفر کا سامان کیا، دو تین دن کا کھانا ناشتہ دان میں رکھا۔ نطاق جسے عورتیں کمر میں لپیٹتی ہیں، پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا، یہ وہ شرف تھا جس کی بنا پر آج تک انھیں ''ذات النطاقین'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہجرت کے وقت کل روپیہ ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے والد ابوقحافہ کو معلوم ہوا۔ بولے کہ انھوں نے جانی اور مالی دونوں قسم کی تکلیف دی۔ حضرت اسماءؓ نے کہا، وہ کثیر دولت چھوڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر اٹھیں اور جس جگہ حضرت ابوبکرؓ کا مال رہتا تھا، بہت سے پتھر رکھ دیے اور ان پر کپڑا ڈال دیا۔ پھر ابوقحافہ کو لے گئیں اور کہا ٹٹول لیجیے، دیکھیے یہ رکھا ہے۔ ابوقحافہ نابینا ہو گئے تھے، اس لیے مان گئے اور کہا کھانے کے لیے بہت ہے۔ حضرت اسماؓ کا بیان ہے کہ میں نے صرف ابوقحافہ کی تسکین کے لیے ایسا کیا تھا، ورنہ وہاں ایک حبہ بھی نہ تھا۔

آنحضرت ﷺ نے مدینہ پہنچ کر مستورات کو بلوایا تو حضرت اسماؓ بھی آئیں، قبا میں قیام کیا۔ یہاں عبداللہ بن زبیرؓ پیدا ہوئے، انھیں لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں، آپ ﷺ نے عبداللہ کو گود میں لیا، گھٹی دی اور ان کے لیے دعا فرمائی۔ عبداللہ بن زبیرؓ جب جوان ہوئے تو حضرت اسماؓ ان کے پاس رہنے لگیں کیوں کہ حضرت زبیرؓ نے انھیں طلاق دے دی تھی۔

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے گھٹی میں آنحضرت ﷺ کا لعابِ مبارک پیا تھا۔ اس بنا پر جب سنِ شعور کو پہنچے تو فضائلِ اخلاق کے پیکر مجسم تھے۔ ادھر سلطنت بن امیہ کا فرماں روا (یزید) سرتاپا فسق وفجور تھا، حضرت عبداللہؓ نے اس کی بیعت سے انکار کیا۔ مکہ میں پناہ گزین ہوئے اور وہیں سے اپنی خلافت کی صدا بلند کی۔ چوں کہ

حضرت عبداللہ کی عظمت وجلالت کا ہر شخص معترف تھا، اس لیے تمام دنیائے اسلام نے اس صدا پر لبیک کہی اور ملک کا بڑا حصہ ان کے علم کے نیچے آ گیا۔ لیکن جب عبدالملک بن مروان تخت نشین ہوا تو اس نے اپنی حکمتِ عملی سے بعض صوبوں پر قبضہ کر لیا اور عبداللہ بن زبیرؓ کے مقابلہ کی تیاریاں کیں۔ شامی لشکر نے خانہ کعبہ کا محاصرہ کیا تو ابن زبیرؓ حضرت اسماؓ کے پاس آئے، وہ بیمار تھیں۔ پوچھا: ''کیا حال ہے؟'' بولیں: ''بیمار ہوں۔'' کہا: ''آدمی کو موت کے بعد آرام ملتا ہے۔'' حضرت اسماؓ نے کہا: ''شاید تمھیں میرے مرنے کی تمنا ہے، لیکن میں ابھی مرنا پسند نہیں کرتی۔ میری آرزو یہ ہے کہ تم لڑ کر قتل ہو اور میں صبر کروں، یا تم کامیاب ہو اور میری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔'' ابن زبیرؓ ہنس کر چلے گئے۔ شہادت کا وقت آیا تو دوبارہ ماں کی خدمت میں آئے۔ صلح کے متعلق مشورہ کیا، بولیں، بیٹا! قتل کے خوف سے ذلت آمیز صلح بہتر نہیں، کیوں کہ عزت کے ساتھ تلوار مارنا ذلت کے ساتھ کوڑا مارنے سے، بہتر ہے۔ حضرت زبیرؓ نے اس پر عمل کیا اور لڑ کر مردانہ وار شہادت حاصل کی۔ حجاج نے ان کی لاش کو سولی پر لٹکا دیا۔ تین دن گزرنے پر حضرت اسماؓ کنیز کو ساتھ لے کر اپنے بیٹے کی لاش پر آئیں۔ لاش الٹی لٹکی تھے۔ دل تھام کر اس منظر کو دیکھا اور نہایت استقلال سے کہا: ''کیا اس سوار کے گھوڑے سے اترنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔'' حجاج کو چھیڑ منظور تھی۔ آدمی بھیجا کہ انھیں جا کر لائے، حضرت اسماؓ نے انکار کیا۔ اس نے پھر آدمی بھیجا کہ ابھی خیریت ہے، ورنہ آیندہ جو شخص بھیجا جائے گا، وہ بال پکڑ کر گھسیٹ لائے گا۔ حضرت اسماؓ صرف خدا کی شان جباری کی معترف تھیں، جواب دیا میں نہیں جا سکتی۔ حجاج نے مجبوراً خود جوتا پہنا اور حضرت اسماؓ کی خدمت میں آیا اور حسبِ ذیل گفتگو ہوئی۔

حجاج نے کہا: ''کہیے مَیں نے دشمنِ خدا (ابن زبیرؓ) کے ساتھ کیا سلوک کیا۔''

حضرت اسماؓ بولیں ''تو نے ان کی دنیا بگاڑی اور انھوں نے تیری عاقبت خراب کی۔ مَیں نے سنا ہے کہ تو انھیں طنزاً ذات النطاقین کا بیٹا کہتا ہے، خدا کی قسم ذات النطاقین میں ہوں! مَیں نے نطاق سے آنحضرت ﷺ اور ابوبکرؓ کا کھانا باندھا تھا اور دوسرے کو کمر میں لپیٹتی تھی، لیکن یہ یاد رہے کہ مَیں نے آنحضرت ﷺ سے سنا ہے کہ ثقیف میں ایک کذاب اور ایک ظالم پیدا ہو گا۔ چنانچہ کذاب کو دیکھ چکی ہوں اور ظالم تُو ہے۔ حضور نے یہ حدیث سنی تو چپکا اٹھ کھڑا ہوا۔

چند دنوں کے بعد عبدالملک کا حکم پہنچا تو حجاج نے لاش اُتروا کر یہود کے قبرستان میں پھنکوا دی۔ حضرت اسماؓ نے لاش اٹھوا کر گھر منگوائی اور غسل دلوا کر جنازہ کی نماز پڑھی۔ حضرت زبیرؓ کا جوڑ جوڑ الگ تھا۔ نہلانے کے لیے کوئی عضو اٹھایا جاتا تو ہاتھ کے ساتھ چلا آتا تھا، لیکن حضرت اسماؓ نے یہ کیفیت دیکھ کر صبر کیا کہ خدا کی رحمت انھی پارہ پارہ ٹکڑوں پر نازل ہوتی ہے۔

حضرت اسماؓ دعا کرتی تھیں کہ جب تک میں عبداللہؓ کی لاش نہ دیکھ لوں، مجھے موت نہ آئے۔ چنانچہ ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ حضرت اسماؓ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ یہ جمادی الاولیٰ 73ھ کا واقعہ ہے۔ اس وقت ان کی عمر سو سال کی تھی۔ حسبِ ذیل اولاد ہوئی۔ عبداللہ، منزر، عروہ، مہاجر، خدیجۃ الکبریٰ، ام الحسن، عائشہ۔ حضرت اسماؓ سو برس کی تھیں لیکن ایک دانت بھی نہیں گرا تھا اور ہوش وحواس بالکل دُرست تھے۔ دراز قد اور لحیم شحیم تھیں، اخیر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی۔ آنحضرت ﷺ سے حضرت اسماؓ نے (56) حدیثیں روایت کی ہیں، جو صحیحین اور سنن میں موجود ہیں۔

حضرت اسماؓ بالطبع نیکی کی طرف مائل تھیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کسوف کی نماز پڑھا رہے تھے، نماز کو بہت طول دیا تو حضرت اسماؓ نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ ان کے پاس عورتیں کھڑی تھیں، جن میں ایک فربہ اور دوسری لاغر تھی، یہ دیکھ کر انھوں نے اپنے دل کو تسلی دی کہ مجھے ان سے زیادہ دیر تک کھڑا رہنا چاہیے۔ چوں کہ نماز کئی گھنٹے تک ہوئی تھی، حضرت اسماؓ کو غش آ گیا اور سر پر پانی چھڑکنے کی نوبت آئی۔ ابن ابی ملیکہ کا بیان ہے کہ ان کے سر میں درد ہوتا تو سر پکڑ کر کہتیں ''یہ میرا گناہ ہے اور جو گناہ خدا معاف کرتا رہتا ہے، وہ اس سے کہیں زیادہ ہیں۔''

حق گوئی ان کا خاص شعار تھا، اس کی متعدد مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ حجاج ابن یوسف جیسے ظالم اور جبار کے سامنے وہ جس صاف گوئی سے کام لیتی تھیں، وہ بجائے خود اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ ایک دن وہ منبر پر بیٹھا ہوا تھا، حضرت اسماؓ اپنی کنیز کے ساتھ آئیں اور دریافت کیا کہ امیر کہاں ہے؟ معلوم ہوا تو حجاج کے قریب گئیں۔ اس نے دیکھتے ہی کہا: ''تمہارے بیٹے نے خدا کے گھر میں الحاد پھیلایا تھا، اس لیے خدا نے اسے بڑا دردناک عذاب دیا۔'' حضرت اسماؓ نے برجستہ جواب دیا ''تُو جھوٹا ہے، وہ ملحد نہ تھا بلکہ صائم، پارسا اور شب بیدار تھا۔''

نہایت صابر تھیں۔ حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت ایک قیامت تھی جوان کے لیے قیامتِ کبریٰ بن گئی تھی لیکن اس میں انھوں نے جس عزم، جس استقلال، جس صبر اور جس تحمّل سے کام لیا، اس کی تاریخ میں بہت کم نظیریں ملتی ہیں۔ حد درجہ خوددار تھیں۔ حجاج بن یوسف جیسے امیر کی نخوت بھی ان کی خودداری کی چٹان سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتی تھی۔ نہایت متواضع اور خاکسار تھیں۔ محنت مشقت میں انھیں بالکل عار نہ تھا چنانچہ جب ان کا نکاح ہوا تو حضرت زبیرؓ کے پاس کچھ نہ تھا۔ صرف ایک اونٹ اور ایک گھوڑا تھا۔ وہ گھوڑے کو دانہ دیتیں، پانی بھرتیں اور ڈول سیتی تھیں۔ روٹی پکانا نہیں آتی تھی، اس لیے آٹا گوندھ کر رکھتیں اور انصار کی بعض عورتیں پکا دیتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو جو زمین عنایت فرمائی تھی، وہاں جا کر وہ چھوہاروں کی گٹھلیاں چنتیں اور تین فرلانگ سے سر پر لاد کر لاتی تھیں۔ ایک دن اسی حالت میں آ رہی تھیں کہ آنحضرت ﷺ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے اپنے اونٹ کو بٹھایا کہ سوار ہو جائیں، لیکن انھیں شرم معلوم ہوئی اور اونٹ پر نہ بیٹھیں۔ گھر آ کر حضرت زبیرؓ سے سارا قصہ بیان کیا۔ انھوں نے کہا: ''سبحان اللہ! سر پر بوجھ لادنے سے شرم نہیں آئی؟'' کچھ زمانہ کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے انھیں ایک غلام دیا جو گھوڑے کی تربیت اور پرداخت کرتا تھا۔ اس وقت حضرت اسماؓ کی مصیبت کم ہوئی۔ کہتی تھیں ابوبکرؓ نے مجھے آزاد کر دیا۔

غربت کی وجہ سے جو کچھ خرچ کرتیں، ناپ تول کر خرچ کرتی تھیں۔
نضرت ﷺ نے منع کیا کہ پھر خدا بھی ناپ کر دے گا۔ اس وقت سے یہ عادت
ڑ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمدنی وافر ہوگئی اور پھر کبھی تنگ دست نہیں ہوئیں۔

حد درجہ فیاض تھیں۔ عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے تھے کہ میں نے ان سے بڑھ کر کسی کو
نہیں دیکھا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنی وفات کے وقت ترکہ میں ایک جنگل چھوڑا تھا
ان کے حصہ میں آیا تھا، لیکن انھوں نے اسے لاکھ درہم پر فروخت کر کے کل رقم
یزوں میں تقسیم کر دی۔ بیمار پڑتیں تو اپنے تمام غلام آزاد کر دیتی تھیں۔ حضرت زبیرؓ
مزاج تیز تھا، اس لیے انھوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ میں بلا اجازت
کے مال سے فقرا کو خیرات دے سکتی ہوں؟ آنحضرت ﷺ نے اجازت دے دی۔

ایک مرتبہ ان کی والدہ مدینہ میں آئیں، اور ان سے روپیہ مانگا۔ حضرت اسماؓ نے
نحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ وہ مشرک ہیں، کیا ایسی حالت میں ان کی مدد کر
تی ہوں؟ ارشاد ہوا ''ہاں (اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو)۔''

حضرت اسماؓ نے کئی حج کیے۔ پہلا حج آنحضرت ﷺ کے ساتھ کیا تھا۔ اس
جو کچھ دیکھا تھا، انھیں بالکل یاد تھا۔ چنانچہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے بعد
ب حج کے لیے آئیں اور مزدلفہ میں ٹھہریں تو رات نماز پڑھی۔ پھر اپنے غلام سے
چھا چاند چھپ گیا۔ اس نے کہا نہیں۔ جب چاند ڈوب گیا، بولیں کہ اب رمی کے
یے چلو۔ رمی کے بعد پھر واپس آئیں اور صبح کی نماز پڑھی۔ اس نے کہا آپ نے بڑی
لت کی۔ فرمایا آنحضرت ﷺ نے پردہ نشینوں کو اس کی اجازت دی ہے۔ جب
بھی حجون سے گزرتیں، کہتیں کہ ہم آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یہاں ٹھہرے
تھے، اس وقت ہمارے پاس بہت کم سامان تھا، ہم نے اور عائشہؓ اور زبیرؓ نے عمرہ کیا تھا
ر طواف کر کے حلال ہوئے تھے۔

نہایت بہادر تھیں۔ اخلاقی جرأت کے چند واقعات اُوپر گزر چکے ہیں۔ سعید بن
عاص کے زمانہ حکومت میں جب اسلام میں فتنہ پیدا ہوا اور بدامنی شروع ہوگئی تو
انھوں نے ایک خنجر رکھا تھا۔ لوگوں نے پوچھا، اس کا کیا فائدہ؟ بولیں، اگر کوئی چور
آئے گا تو اس سے اس کا پیٹ چاک کروں گی۔

حضرت اسماؓ کے تقدس کا عام چرچا تھا۔ لوگ ان سے دعا کراتے تھے، جب کوئی
عورت بخار میں مبتلا ہوتی اور دعا کے لیے آتی تو اس کے سینہ پر پانی چھڑکتیں اور کہتیں
کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔ حضرت ابن عمرؓ اور
حضرت عائشہؓ نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ بخار آتشِ جہنم کی گرمی سے
ہے۔ اسے پانی سے ٹھنڈا کرو۔ گھر کا کوئی آدمی بیمار ہوتا تو آنحضرت ﷺ کا جبہ
(جسے حضرت عائشہؓ نے وفات کے وقت ان کے سپرد کیا تھا) دھوتی اور اُس کا پانی پلاتی
تھیں، اس سے بیمار کو شفا ہو جاتی تھی۔

اسماؓ بنت عمیس

اسماء نام، قبیلہ خثعم سے تھیں، حضرت جعفرؓ سے نکاح ہوا جو کہ حضرت علیؓ کے بھائی
تھے (اور دس برس بڑے تھے)۔ آنحضرت ﷺ کے خانۂ ارقم میں مقیم ہونے سے
قبل مسلمان ہوئیں، حضرت جعفرؓ نے بھی اسی زمانہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ حبشہ کی
ہجرت کی اور کئی سال تک مقیم رہیں۔ جب خیبر فتح ہوا تو مدینہ آئیں۔ حضرت حفصہؓ
کے گھر گئیں تو حضرت عمرؓ بھی آ گئے، پوچھا یہ کون ہیں۔ جواب ملا، اسماؓ۔ بولے ''کیا وہ
حبش والی، وہ سمندر والی''؟ حضرت اسماؓ نے کہا: ''ہاں، وہی۔'' حضرت عمرؓ نے کہا
ہمیں تم پر فضیلت ہے، اس لیے کہ ہم مہاجر ہیں۔ حضرت اسماؓ کو یہ فقرہ سن کر غصہ آیا،
بولیں، ''کبھی نہیں! تم آنحضرت ﷺ کے ساتھ تھے، بھوکوں کو کھلاتے تھے اور جاہلوں کو
پڑھاتے تھے، لیکن ہماری حالت جداگانہ تھی۔ ہم نہایت دور دراز مقام میں صرف خدا
اور رسول کی خوشنودی کے لیے پڑے رہے اور بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔''

آنحضرت ﷺ مکان پر تشریف لائے تو انھوں نے سارا قصہ بیان کیا۔ ارشاد
ہوا ''عمرؓ نے ایک ہجرت کی اور تم نے دو ہجرتیں کیں، اس لیے تمھیں زیادہ فضیلت
ہے۔'' حضرت اسماؓ اور دوسرے مہاجرین کو اس سے اس درجہ مسرت ہوئی کہ دنیا کی
تمام فضیلتیں ہیچ معلوم ہوتی تھیں۔ مہاجرینِ حبشہ جوق در جوق حضرت اسماؓ کے پاس
آتے اور یہ واقعہ دریافت کرتے تھے۔

8 ہجری غزوۂ موتہ میں حضرت جعفرؓ نے شہادت پائی۔ آنحضرت ﷺ کو خبر
ہوئی (حضرت اسماؓ فرماتی ہیں کہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی)، دیکھا
کہ حضور ﷺ آبدیدہ تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ آپ غمگیں
کیوں ہیں، کیا جعفرؓ کے متعلق کوئی اطلاع آئی ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ
ہاں، وہ شہید ہو گئے ہیں۔ بچوں کو نہلا دھلا کر ہم راہ لے گئی تھیں، حضور ﷺ نے بچوں کو
اپنے پاس بلایا اور میں چیخ اٹھی۔ آنحضرت ﷺ اپنے اہلِ بیت کے پاس تشریف
لے گئے اور فرمایا ''جعفرؓ کے بچوں کے لیے کھانا پکاؤ، کیوں کہ وہ رنج و غم میں ہیں۔''

اس کے بعد مسجد میں جا کر غم زدہ بیٹھے اور اس خبر کا اعلان کیا۔ اسی حالت میں
ایک شخص نے آ کر کہا کہ جعفرؓ کی مستورات ماتم کر رہی ہیں اور رو رہی ہیں۔ آپ
ﷺ نے انھیں منع کرنے بھیجا۔ وہ گئے اور واپس آ کر کہا کہ میں نے منع کیا لیکن وہ
باز نہیں آتیں۔ آپ ﷺ نے دوبارہ بھیجا۔ وہ پھر گئے اور واپس آ کر عرض کی کہ ہم
لوگوں کی نہیں چلتی۔ آپ نے ارشاد فرمایا ''تو ان کے منہ مین خاک بھر دو۔'' یہ واقعہ
حضرت عائشہؓ سے صحیح بخاری میں منقول ہے۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے کہ حضرت
عائشہؓ نے اس شخص سے کہا کہ ''خدا کی قسم تم یہ نہ کرو گے (منہ میں خاک ڈالنا) تو
آنحضرت ﷺ کو تکلیف سے نجات نہ ملے گی۔''

تیسرے دن آنحضرت ﷺ حضرت اسماؓ کے گھر تشریف لائے اور سوگ کی
ممانعت کی۔ تقریباً 6 مہینے کے بعد 8 ہجری میں غزوۂ حنین کا زمانہ تھا، آنحضرت ﷺ
نے حضرت ابوبکرؓ سے ان کا نکاح پڑھا دیا، جس کے دو برس بعد ذی القعدہ 10 ہجری
میں محمد بن ابوبکر پیدا ہوئے۔ اس وقت حضرت اسماؓ حج کی غرض سے مکہ آئی تھیں۔
چوں کہ محمد ذوالحلیفہ میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے اسماؓ نے دریافت کرایا کہ میں کیا

کروں؟ ارشاد ہُوا، نہاکر احرام باندھیں۔

آنحضرت ﷺ کے مرض الموت میں حضرت ام سلمہؓ اور اسماؓ نے ذات الجنب تشخیص کر کے دوا پلانا چاہی، چوں کہ گوارانہ تھی، آپ نے انکار فرمایا۔ اسی ممانعت میں غشی طاری ہوگئی، انھوں نے منہ کھول کر پلا دی، افاقہ کے بعد آپ کو احساس ہوا تو فرمایا ''یہ مشورہ اسماؓ نے دیا ہوگا، وہ حبشہ سے اپنے ساتھ یہی حکمت لائی ہیں، عباس کے علاوہ سب کو دوا پلائی جائے۔'' چنانچہ تمام ازواجِ مطہرات کو دوا پلائی گئی۔

13 ہجری میں حضرت ابوبکرؓ نے وفات پائی تو وصیت کی کہ اسماؓ غسل دیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے بعد اسماؓ حضرت علیؓ کے عقد میں آئیں۔ محمد بن ابوبکرؓ بھی ساتھ آئے اور حضرت علیؓ کے آغوشِ تربیت میں پرورش پائی۔ ایک دن عجیب لطیفہ ہوا، محمد بن جعفرؓ اور محمد بن ابوبکرؓ نے باہم فخریہ کہا کہ ہم تم سے بہتر ہیں، اس لیے کہ ہمارے باپ تمھارے باپ سے بہتر تھے۔ حضرت علیؓ نے حضرت اسماؓ سے کہا کہ اس جھگڑے کا فیصلہ کرو۔ بولیں کہ تمام نوجوانوں پر جعفرؓ کو، تمام بوڑھوں پر ابوبکرؓ کو فضیلت حاصل ہے۔ حضرت علیؓ بولے، پھر ہمارے لیے کیا رہا؟

38 ہجری میں محمد بن ابوبکرؓ مصر میں قتل ہوئے اور گدھے کی کھال میں ان کی لاش جلائی گئی۔ حضرت اسماؓ کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ واقعہ کیا ہوسکتا تھا۔ انھیں سخت غصہ آیا، لیکن نہایت صبر سے کام لیا اور مصلے پر کھڑی ہوگئیں۔

40 ہجری میں حضرت علیؓ نے شہادت پائی اور ان کے بعد حضرت اسماؓ کا بھی انتقال ہوگیا۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، حضرت اسماؓ نے تین نکاح کیے۔ چنانچہ حضرت جعفرؓ سے محمد، عبداللہ اور عون، حضرت ابوبکرؓ سے محمد اور حضرت علیؓ سے یحییٰ پیدا ہوئے۔

حضرت اسماؓ سے 60 حدیثیں مروی ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے براہِ راست تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے مصیبت اور تکلیف میں پڑھنے کے لیے انھیں ایک دعا بتائی تھی۔ حضرت اسماؓ کو خواب کی تعبیر میں بھی دخل تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اکثر ان سے خوابوں کی تعبیر پوچھتے تھے۔

اسماؓ بنت یزید

اسماء نام، ام سلمہ کنیت، اوس سے تعلق تھا، ہجرت کے بعد مسلمان ہوئیں اور چند عورتوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بیعت کے لیے آئیں، آپ ﷺ صحابہ کے مجمع میں تشریف فرما تھے۔ انھوں نے عرض کی کہ ''مسلمان عورتوں کی طرف سے ایک پیغام لے کر آئی ہوں۔ خدا نے آپ کو مرد و عورت، سب کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے۔ ہم نے آپ کی پیروی کی ہے اور آپ پر ایمان لائے ہیں لیکن ہماری حالت مردوں سے بالکل جداگانہ ہے۔ ہم پردہ نشین ہیں، اس لیے جمعہ اور جماعت میں شریک نہیں ہوسکتیں اور مرد جمعہ اور جماعت میں شریک ہوتے ہیں، مریضوں کی عیادت کرتے ہیں، نمازِ جنازہ پڑھتے ہیں، حج کو جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاد کرتے ہیں لیکن ان تمام صورتوں میں ہم گھر میں بیٹھ کر ان کی اولاد کو پالتی ہیں، گھروں کی حفاظت کرتی ہیں، کپڑوں کے لیے چرخہ کاتتی ہیں، تو کیا اس صورت میں ہمیں بھی کچھ ثواب ملے گا''؟ آنحضرت ﷺ نے سنا تو صحابہ سے فرمایا کہ تم نے کسی عورت سے ایسی گفتگو بھی سنی ہے؟ لوگوں نے کہا، نہیں۔ آپ ﷺ نے اسماؓ کو جواب دیا کہ عورت کے لیے شوہر کی رضا جوئی نہایت ضروری چیز ہے۔ اگر وہ فرائضِ زوجیت ادا کرتی ہے اور شوہر کی مرضی پر چلتی ہے تو مرد کو جس قدر ثواب ملتا ہے، عورت کو بھی اُسی قدر ملتا ہے۔

اس بیعت میں اسماؓ کی خالہ بھی شریک تھیں جو سونے کے کنگن اور انگوٹھیاں پہنے تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا، ان کی زکوٰۃ دیتی ہو؟ بولیں، نہیں۔ فرمایا، تو کیا تمھیں یہ پسند ہے کہ خدا آگ کے کنگن اور انگوٹھیاں پہنائے؟ حضرت اسماؓ نے کہا: ''خالہ انھیں اتار دو۔'' چنانچہ فوراً تمام چیزیں اُتار کر پھینک دیں۔ اسماؓ نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! ہم زیور نہ پہنیں گی تو شوہر بے وقعت سمجھے گا۔ ارشاد ہوا ''پھر چاندی کے زیور بنواؤ اور ان پر زعفران مل لو کہ سونے کی چمک پیدا ہوجائے۔'' غرض ان باتوں کے بعد جب بیعت کا وقت آیا تو آنحضرت ﷺ نے زبانی چند اقرار کرائے۔ حضرت اسماؓ نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! ہم آپ سے بیعت کرتے ہیں، اپنا ہاتھ بڑھائیے۔'' فرمایا ''میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔'' بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ کنگن کا واقعہ خود حضرت اسماؓ کا تھا۔

1 ہجری میں حضرت عائشہؓ کی رخصتی ہوئی اور وہ اپنے میکے سے کاشانہ نبوت میں آئیں تو جن عورتوں نے انھیں سنوارا تھا، ان میں حضرت اسماؓ بھی شامل تھیں۔ حضرت عائشہؓ کو جلوے میں بٹھا کر آنحضرت ﷺ کو اطلاع کی، آپ ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ کسی نے دودھ پیش کیا تو تھوڑا سا پی کر حضرت عائشہؓ کو دے دیا۔ انھیں شرم معلوم ہوئی اور سر جھکا لیا۔ حضرت اسماؓ نے ڈانٹا کہ رسول اللہ ﷺ جو دیتے ہیں، لے لو۔ حضرت عائشہؓ نے دودھ لے کر کسی قدر پی لیا اور پھر آنحضرت ﷺ کو واپس کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت اسماؓ کو دیا، انھوں نے پیالہ کو گھٹنے پر رکھ کر گردش دینا شروع کیا کہ جس طرف سے آنحضرت ﷺ نے نوش فرمایا تھا، وہاں بھی منہ لگ جائے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اور عورتوں کو بھی دو، لیکن سب نے جواب دیا کہ ہمیں اس وقت خواہش نہیں ہے۔ ارشاد ہوا، بھوک کے ساتھ جھوٹ بھی۔''

15 ہجری میں یرموک کا واقعہ پیش آیا، اس میں حضرت اسماؓ نے اپنے خیمہ کی لکڑی سے نو رومیوں کو قتل کیا۔ یرموک کے بعد مدت تک زندہ رہیں اور پھر وفات پائی۔ وفات کا سال معلوم نہیں ہے۔

حضرت اسماؓ نے آنحضرت ﷺ سے چند حدیثیں روایت کی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ ناقہ غضبا کی مہار تھامے تھیں کہ آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوئی۔ ان کا بیان ہے کہ وحی کا اتنا بار تھا کہ مجھے خوف ہوا کہ کہیں اونٹنی کے ہاتھ پاؤں نہ ٹوٹ جائیں۔

حضرت اسماؓ اکثر اوقات کاشانہ نبوت میں حاضر ہوتیں۔ ایک مرتبہ بیٹھی تھیں، آنحضرت ﷺ نے دجال کا ذکر فرمایا، گھر میں کہرام مچ گیا۔ آنحضرت دوبارہ

واپس آئے تو وہی حالت قائم تھی۔ فرمایا "کیوں روتی ہو"؟ حضرت اسماؓ نے کہا: "ہماری حالت یہ ہے کہ لونڈی آٹا گوندھنے بیٹھی ہے، ہمیں سخت بھوک ہوتی ہے، وہ پکا کر فارغ نہیں ہوتی کہ ہم بھوک سے بیتاب ہو جاتے ہیں۔ پھر دجال کے زمانہ میں قحط پڑے گا، اس پر ہم کیسے صبر کر سکیں گے (یعنی فوراً اس کے دام میں پھنس جائیں گے)۔" آنحضرت ﷺ نے فرمایا "اس دن تسبیح اور تکبیر بھوک سے بچائے گی۔" پھر کہا: "رونے کی ضرورت نہیں، اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو خود سینہ سپر ہوں گا، ورنہ میرے بعد خدا ہر مسلمان کی حفاظت کرے گا۔"

مہمان نواز تھیں۔ ایک بار حضرت شہرؓ بن حوشب آئے تو (انھوں نے) ان کے سامنے کھانا رکھا، حضرت شہرؓ بن حوشب نے انکار کیا تو آنحضرت ﷺ کا ایک واقعہ بیان کیا (جس سے یہ اشارہ مقصود تھا کہ انکار مناسب نہیں ہے)، انھوں نے کہا اب دوبارہ ایسی غلطی نہ کروں گا۔

امامہؓ بنت ابی العاص

آنحضور ﷺ کی نواسی، ان کی والدہ زینب بنت رسول تھیں اور والد ابوالعاصؓ بن ربیع، جو حضرت خدیجہؓ کے حقیقی بھانجے تھے، حضور ﷺ کو ان سے بہت محبت تھی۔ ایک دفعہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے ایک انگوٹھی حضور ﷺ کی خدمت میں بطور تحفہ بھیجی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: "یہ انگوٹھی میں اسے دوں گا جو مجھے سب سے بڑھ کر محبوب ہے۔" حضور ﷺ نے امامہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور وہ انگوٹھی ان کی انگلی میں پہنادی۔

ان کی والدہ حضرت زینبؓ نے 8 ہجری میں وفات پائی تو امامہؓ اپنے شفیق نانا کی سرپرستی میں آ گئیں۔ حضور ﷺ کے وصال کے وقت امامہؓ سنِ شعور کو پہنچ چکی تھیں۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت فاطمہؓ نے وفات پائی تو حضرت علیؓ نے حضرت امامہؓ سے نکاح کر لیا۔ 40 ہجری میں حضرت علیؓ نے شہادت پائی تو ان کی وصیت کے مطابق مغیرہ بن نوفلؓ (بن حارث بن عبدالمطلب) نے حضرت حسنؓ سے اجازت لے کر حضرت امامہؓ سے نکاح پڑھا لیا۔ حضرت امامہؓ نے مغیرہ بن نوفلؓ کی زندگی ہی میں وفات پائی۔ سالِ وفات اور مزید حالات معلوم نہیں۔

اُمِ ایمنؓ

برکۃ نام، اُمِ ایمن کنیت، اُمِ الظبا عرف۔ سلسلہء نسب یہ ہے، حبشہ کی رہنے والی تھیں اور آنحضور ﷺ کے والد حضرت عبداللہ کی کنیز تھیں۔ بچپن سے عبداللہ کے ساتھ رہیں اور جب انھوں نے انتقال کیا تو حضرت آمنہ کے پاس رہنے لگیں۔ ان کے بعد خود سرور کائنات ﷺ کے حلقہء غلامی میں داخل ہونے کا شرف حاصل کیا۔ آنحضرت ﷺ کی پرورش و پرداخت حضرت اُمِ ایمنؓ ہی نے کی۔

حارث بن خزرج کے خاندان میں عبید بن زید ایک شخص تھے، اُمِ ایمنؓ کا انھی کے ساتھ عقد ہوا لیکن جب انھوں نے وفات پائی تو آنحضرت ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کہ محبوبِ خاص تھے، نکاح پڑھا دیا۔ یہ بعثت کے بعد کا واقعہ ہے۔ حضرت زیدؓ چوں کہ مسلمان ہو چکے تھے، اُمِ ایمنؓ نے بھی اسلام قبول کیا، جب مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی تو وہ بھی گئیں اور وہاں سے ہجرت کے بعد واپس آئیں۔ غزوۂ اُحد میں شرکت کی۔ اس موقع پر وہ لوگوں کو پانی پلاتیں، زخمیوں کی تیمارداری کرتی تھیں۔ غزوۂ خیبر میں شریک نہیں ہوئیں۔

11 ہجری میں آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا۔ اُمِ ایمنؓ سخت مغموم تھیں اور رو رہی تھیں، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے سمجھایا کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے خدا کے پاس بہتر چیز موجود ہے۔ جواب ملا، یہ خوب معلوم ہے اور یہ رونے کا سبب بھی نہیں۔ رونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ پر اس جواب کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ بھی ان کے ساتھ مل کر زار وقطار رونے لگے۔

23 ہجری میں حضرت عمرؓ نے شہادت پائی۔ اُمِ ایمنؓ کو معلوم ہوا تو بہت روئیں، لوگوں نے کہا اب کیوں روتی ہو؟ بولیں، اب اس لیے کہ اسلام کمزور پڑ گیا۔

اُمِ ایمنؓ نے حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔ دو اولادیں ہوئیں۔ ایمنؓ اور اسامہؓ۔ ایمنؓ پہلے شوہر سے تھے، صحابی ہیں، خیبر میں شہادت پائی۔ اسامہؓ آنحضرت کے محبوبِ خاص تھے اور ان کے والد کو بھی یہی درجہ حاصل تھا۔ وہ جلیل القدر صحابی تھے، آنحضرت ﷺ کو ان سے بے انتہا محبت تھی۔

آنحضرت سے چند حدیثیں روایت کی ہیں، راویوں میں حضرت انسؓ بن مالک، حنشؒ بن عبداللہ صنعانی اور ابو یزیدؒ مدنی داخل ہیں۔ آنحضرت ﷺ ان کی نہایت عزت کرتے اور فرماتے تھے کہ "اُمِ ایمنؓ میری ماں ہیں۔" اکثر ان کے مکان پر تشریف لے جاتے۔ ایک مرتبہ تشریف لائے تو انھوں نے شربت پیش کیا۔ آنحضرت ﷺ (کسی وجہ سے) متردد ہوئے۔ اس پر اُمِ ایمنؓ ناراض ہوئیں (حضرت اُمِ ایمنؓ کو حضور ﷺ کی پرورش کرنے کی وجہ سے حضور ﷺ پر ایک قسم کا ناز تھا، یہ خفگی اسی محبت کی وجہ سے تھی)۔ انصار نے آنحضرت ﷺ کو بہت سے نخلستان دیے تھے۔ جب بنو قریظہ اور بنونضیر پر فتح حاصل ہوئی تو آپ ﷺ نے انصارؓ کو ان کے نخلستان واپس کرنا شروع کیے۔ حضرت انسؓ کے کچھ باغ بھی آنحضرت ﷺ کے پاس تھے اور آپ نے اُمِ ایمنؓ کو عطا فرمائے تھے، حضرت انسؓ آئے تو حضرت اُمِ ایمنؓ نے ان کے باغ واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مصر رہیں، آنحضرت ﷺ نے یہ دیکھ کر انھیں باغ سے دس گنا زیادہ عطا فرمایا۔

اُمِ ایوب انصاریہؓ

میزبانِ رسول ﷺ، حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اہلیہ تھیں۔ ہجرتِ نبوی سے قبل اپنے شوہر کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا۔ سرورِ عالم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو سات ماہ تک حضرت ابوایوبؓ کے گھر میں قیام فرمایا۔ اس دوران میں اُمِ ایوبؓ حضور ﷺ کا کھانا تیار کرتی تھیں۔ ابتدا میں حضور ﷺ نے حضرت ابوایوبؓ کے مکان کی زیریں منزل میں قیام فرمایا۔ میاں بیوی آنحضور ﷺ کی خواہش کے مطابق اُوپر کی منزل میں منتقل ہو گئے تھے، مگر دونوں کو ہر وقت یہ خیال

مضطرب رکھتا تھا کہ وہ تو بالائی منزل میں مقیم ہیں اور رسول اللہ نچلی منزل میں ہیں۔

ایک دن یہ اضطراب اتنی شدت اختیار کر گیا کہ دونوں میاں بیوی چھت کے ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھ گئے اور ساری رات اسی حالت میں جاگ کر گزار دی۔ صبح ہوئی تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی: ''یارسول اللہ! ہم ساری رات چھت کے ایک کونے میں بیٹھ کر جاگتے رہے۔'' حضور ﷺ نے سبب دریافت کیا تو عرض کیا: ''ہمارے ماں باپ آپ پر قربان، ہر لحظہ یہ خیال سوہانِ روح رہتا ہے کہ آپ ﷺ تو زیریں منزل میں تشریف رکھتے ہیں اور ہم بالا خانے میں مقیم ہیں۔ یارسول اللہ، آپ بالا خانے پر تشریف لے چلیے۔ حضور ﷺ کے غلاموں کے لیے آپ ﷺ کے قدموں کے نیچے رہنا ہی باعثِ سعادت ہے۔''

آنحضور ﷺ نے ان کی درخواست قبول کر لی اور دونوں میاں بیوی نچلی منزل میں آ گئے۔ حضور ﷺ اپنے مکان میں منتقل ہونے کے بعد بھی کبھی کبھی حضرت ابو ایوبؓ کے ہاں تشریف لاتے تھے۔ دونوں میاں بیوی ان کا پُرتپاک خیر مقدم کرتے تھے اور جو کچھ میسر ہوتا، حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیتے۔ ایک دن حضور ﷺ اپنے مکان سے نکلے، رستے میں حضرت ابوبکرؓ اور عمر فاروقؓ مل گئے۔ ان دونوں کو ساتھ لے کر حضرت ابو ایوبؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ اس وقت حضرت ابو ایوبؓ اپنے مکان سے متصل کھجوروں کے باغ میں تھے۔ حضرت اُمِ ایوبؓ نے حضور ﷺ کو اہلاً و سہلاً کہا۔ حضور ﷺ نے پوچھا: ''ابو ایوبؓ کہاں ہے''؟ حضرت ابو ایوبؓ نے حضور ﷺ کی آواز سنی تو کھجوروں کا ایک گچھا توڑ کر دوڑتے ہوئے گھر آئے اور یہ گچھا مہمانانِ عزیز کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے ساتھ ہی فوراً بکری ذبح کی۔ حضرت اُمِ ایوب نے آدھے گوشت کا سالن پکایا، آدھے کے کباب بنائے اور حضور ﷺ کی خدمت میں کھانا پیش کیا۔ حضور ﷺ نے ایک روٹی پر کچھ گوشت رکھ کر فرمایا: ''اسے فاطمہؓ کو بھیج دو۔ اس پر کئی دن کا فاقہ ہے۔'' حضرت ابو ایوبؓ نے تعمیلِ ارشاد کی اور حضور ﷺ نے اپنے رفقا کرامؓ کے ساتھ کھانا کھایا۔ حضرت اُمِ ایوب نے کئی اور موقعوں پر بھی اسی طرح حضور ﷺ کی خدمت کا شرف حاصل کیا۔ ان سے چند احادیث بھی مروی ہیں۔

اُمِ حرامؓ

نام معلوم نہیں، اُمِ حرام کنیت تھی، قبیلہء خزرج کے خاندانِ بنو نجار سے تعلق تھا۔ اُمِ حرام، حضرت اُمِ سلیمؓ کی بہن اور حضرت انسؓ کی خالہ ہوتی ہیں۔ آنحضور ﷺ سے بھی ان کا یہی رشتہ تھا۔ عمرو بن قیس انصاریؓ سے نکاح ہوا لیکن جب انھوں نے غزوۂ اُحد میں شہادت پائی تو حضرت عبادہؓ بن صامت کے عقدِ نکاح میں آئیں جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے۔

آنحضرت ﷺ جب کبھی قبا کی طرف تشریف لے جاتے تو حضرت اُمِ حرامؓ کے گھر آتے اور کھانا تناول فرماتے تھے۔ حجۃ الوداع کے بعد ایک روز آپ ﷺ تشریف لائے اور کھانا کھا کر آرام فرمایا تو حضرت اُمِ حرامؓ نے جوئیں دیکھنا شروع کیا۔ آپ ﷺ کو نیند آ گئی لیکن تھوڑی دیر کے بعد مسکراتے ہوئے اٹھے اور فرمایا: ''میں نے ایک خواب دیکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ میری اُمت کے کچھ لوگ سمندر میں غزوہ کے ارادہ سے سوار ہیں۔'' حضرت اُمِ حرامؓ نے کہا: ''یارسول اللہ (ﷺ)، دعا کیجیے کہ میں بھی ان میں شامل ہوں۔'' آپ ﷺ نے دعا کی اور پھر آرام فرمایا۔ کچھ دیر کے بعد پھر مسکراتے ہوئے اٹھے اور اسی خواب کا اعادہ کیا، حضرت اُمِ حرامؓ نے پھر اپنی شرکت کے لیے دعا کی درخواست کی۔ فرمایا: ''تم پہلی جماعت کے ساتھ ہو۔'' اس خواب کی تعبیر 38 ہجری میں پوری ہوئی۔

حضرت امیر معاویہؓ حضرت عمرؓ کی طرف سے شام کے حاکم تھے۔ انھوں نے متعدد بار جزائر پر حملہ کرنے کی خواہش ظاہر کی لیکن حضرت عمرؓ نے اجازت نہیں دی۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہء خلافت میں انھوں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اجازت ملی، انھوں نے جزیرۂ قبرص (سائپرس) پر حملہ کرنے کے لیے ایک بیڑا تیار کیا، اس حملہ میں بہت سے صحابی شریک تھے۔ حضرت ابو ذرؓ، حضرت ابو درداؓ، حضرت عبادہؓ اور حضرت اُمِ حرامؓ انھی میں شامل تھیں۔ بیڑا احمص کے ساحل روانہ ہوا اور قبرص فتح ہو گیا۔ واپسی میں حضرت اُمِ حرامؓ سواری پر چڑھ رہی تھیں کہ نیچے گریں اور جاں بحق تسلیم ہوئیں، لوگوں نے وہیں انھیں دفن کر دیا۔ حضرت اُمِ حرامؓ سے تین لڑکے پیدا ہوئے، پہلے شوہر سے قیس اور عبداللہ اور حضرت عبادہؓ سے محمد۔ آنحضرت ﷺ سے چند حدیثیں روایت کیں۔

اُمِ حکیمؓ

قریش کے خاندان مخزوم سے تھیں، باپ کا نام حارث بن ہشام ابن المغیرہ اور ماں کا فاطمہ بنت ولید تھا جو حضرت خالدؓ بن ولید کی ہم شیر تھیں۔ عکرمہ بن ابوجہل سے (جو ان کے ابن عم تھے) شادی ہوئی۔ غزوۂ اُحد میں کفار کے ساتھ شریک تھیں لیکن جب 8 ہجری میں مکہ فتح ہوا تو پھر اسلام کے سوا چارہ نہ تھا۔ ان کا خسر (ابوجہل) مکہ میں اسلام کا سب سے بڑا دشمن اور کفر کا سرغنہ رہ چکا تھا۔ شوہر (عکرمہ) کی رگوں میں بھی اسی کا خون دوڑتا تھا۔ ماموں (خالد) بھی مدت سے اسلام سے برسرِ پیکار رہ چکے تھے لیکن اس کے باوجود اُمِ حکیمؓ نے اپنی فطری سلامت روی کی بنا پر فتح مکہ میں اسلام قبول کرنے میں بہت عجلت کی۔ ان کے شوہر جان بچا کر یمن بھاگ گئے تھے۔ اُمِ حکیمؓ نے ان کے لیے امن کی درخواست کی تو رحمتِ عالم ﷺ کا دامنِ عفو کشادہ تھا۔ غرض یمن جا کر ان کو واپس لائیں اور عکرمہ نے صدق دل سے اسلام قبول کیا۔ حضرت عکرمہؓ نے مسلمان ہو کر اپنے تمام گناہوں کا کفارہ ادا کیا، نہایت جوش سے غزوات میں شرکت کی اور بڑی پامردی اور جاں بازی سے لڑے۔ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہء خلافت میں رومیوں سے جنگ چھڑی، حضرت عکرمہؓ، اُمِ حکیمؓ کو لے کر شام گئے اور اجنادین کے معرکہ میں دادِ شجاعت دے کر شہادت حاصل کی۔

حضرت اُمِ حکیمؓ نے عدت کے بعد خالد بن سعید بن العاص سے نکاح کیا، چار سو دینار مہر بندھا اور رسم عروسی ادا کرنے کی تیاریاں ہوئیں۔ چوں کہ نکاح مرج الصفر

ں ہوا تھا جو دمشق کے قریب ہے اور ہر وقت رومیوں کے حملے کا اندیشہ تھا، اس لیے حضرت خالدؓ نے کہا کہ "ابھی توقف کرو۔" لیکن خالدؓ نے کہا کہ مجھے اسی معرکہ میں اپنی شہادت کا یقین ہے، غرض ایک پل کے پاس، جواب قنطرۂ اُمِ حکیم کہلاتا ہے، رسمِ عروسی ادا ہوئی۔ دعوتِ ولیمہ سے لوگ فارغ نہیں ہوئے تھے کہ رومی آ پہنچے اور لڑائی شروع ہوگئی۔ خالدؓ میدانِ جنگ میں گئے اور شہادت حاصل کی۔ حضرت اُمِ حکیم اگرچہ عروس تھیں، تاہم اُٹھیں، کپڑوں کو باندھا اور خیمہ اکھاڑ کر کفار پر حملہ کیا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ انھوں نے اس چوب سے سات کافروں کو قتل کیا تھا۔ حضرت اُمِ حکیمؓ کی وفات کا زمانہ معلوم نہیں، اولاد کا بھی یہی حال ہے۔

اُمِ رومانؓ

نام معلوم نہیں، اُمِ رومان کنیت ہے، قبیلۂ کنانہ کے خاندانِ فراس سے تھیں، عبداللہ بن سخبرہ سے نکاح ہوا اور انھی کے ہم راہ مکہ آکر اقامت کی۔ عبداللہ حضرت ابوبکرؓ کے حلیف بن گئے تھے، اس بنا پر جب انھوں نے انتقال کیا تو حضرت ابوبکرؓ نے خود ان سے نکاح کر لیا۔ کچھ زمانے کے بعد مکہ سے اسلام کی صدا بلند ہوئی تو حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ انھوں نے بھی اس صدا کو لبیک کہا۔

ہجرت کے وقت حضرت ابوبکرؓ تنہا آنحضرت ﷺ کی معیت میں مدینہ کو روانہ ہو گئے تھے، لیکن ان کا خاندان مکہ میں مقیم تھا، مدینہ پہنچ کر تو وہاں سے زیدؓ بن حارثہ اور ابو رافع مستورات کو لانے کے لیے بھیجے گئے، اُمِ رومانؓ بھی انھی کے ہم راہ مدینہ میں آئیں۔

شعبان 6 ہجری میں افک کا واقعہ پیش آیا، اُمِ رومانؓ کے لیے یہ نہایت مصیبت کا وقت تھا۔ حضرت عائشہؓ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو آنحضرت ﷺ سے اجازت لے کر میکے آئیں، حضرت ابوبکرؓ بالا خانے پر تھے اور اُمِ رومانؓ نیچے بیٹھی تھیں، پوچھا کیسے آئیں؟ حضرت عائشہؓ نے سارا واقعہ بیان کیا۔ بولیں، بیٹی اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ جو عورت اپنے خاوند کو زیادہ محبوب ہوتی ہے اس کی سوتیں حسد کی وجہ سے ایسا کرتی ہیں لیکن حضرت عائشہؓ کو اس سے کچھ تسکین نہ ہوئی اور چیخ مار کر روئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے آواز سنی تو بالاخانہ سے اتر آئے اور خود رونے لگے، پھر ان سے کہا کہ تم اپنے گھر جاؤ، اس کے ساتھ ہی اُمِ رومانؓ کو لے کر خود بھی روانہ ہوئے۔ حضرت عائشہؓ کو چوں کہ اس صدمہ سے بخار آ گیا تھا، دونوں نے انھیں گود میں لٹایا۔ عصر پڑھ کر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: "عائشہ! اگر واقعی تم سے ایسی غلطی ہوئی تو خدا سے توبہ کرو۔" حضرت عائشہؓ نے والدین سے کہا کہ آپ لوگ جواب دیں لیکن جواب ملا کہ ہم کیا کہہ سکتے ہیں؟ غرض حضرت عائشہؓ نے خود جواب دیا۔ جب آنحضرت ﷺ پر وحی نازل ہوئی، جس میں ان کی صاف طور پر براءت کی گئی تھی، تو حضرت اُمِ رومانؓ بولیں کہ "تم اٹھ کر آنحضرت ﷺ کے پاس جاؤ۔" حضرت عائشہؓ نے کہا: "میں نہ ان کی شکر گزار ہوں اور نہ آپ کی، میں صرف اپنے خدا کا شکر ادا کرتی ہوں۔"

اسی سن کے اخیر میں مہمانوں کا واقعہ پیش آیا۔ حضرت ابوبکرؓ اصحاب صفہ میں سے تین صاحبوں کو اپنے گھر لائے تھے۔ آنحضرت ﷺ کے پاس گئے تو واپسی میں دیر ہوگئی، گھر آئے تو اُمِ رومانؓ نے کہا مہمانوں کو چھوڑ کر کہاں بیٹھ رہے؟ بولے تم نے کھانا نہیں کھلایا؟ جواب ملا، کھانا بھیجا تھا لیکن ان لوگوں نے انکار کیا، غرض کھانا کھلایا گیا اور اس قدر برکت ہوئی کہ نہایت افراط کے ساتھ بچ رہا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اُمِ رومانؓ سے پوچھا، اب کتنا ہے؟ بولیں، تین گنا سے زیادہ۔ چنانچہ سب اٹھوا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔

حضرت اُمِ رومانؓ نے 9 ہجری یا اس کے بعد انتقال کیا۔ آنحضرت ﷺ خود قبر میں اُترے اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت اُمِ رومانؓ نے دو نکاح کیے تھے۔ پہلے شوہر سے ایک لڑکا پیدا ہوا، جس کا نام طفیل تھا، حضرت ابوبکرؓ سے دو اولادیں ہوئیں، حضرت عبدالرحمٰنؓ اور حضرت عائشہؓ۔

اُمِ سلیمؓ

سہلہ یا رملہ نام، اُمِ سلیم کنیت، غیصا اور میصا لقب، سلسلۂ نسب یہ ہے، اُمِ سلیم بنت ملحان بن خالد بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی ابن نجار اور ماں کا نام ملیکۃ بنت مالک بن عدی بن زید مناۃ تھا، آبائی سلسلہ سے حضرت اُمِ سلیم سلمٰی بنت زید کی پوتی تھیں۔ سلمٰی، عبدالمطلب جدِ رسول اللہ ﷺ کی والدہ تھیں، اسی بنا پر اُمِ سلیمؓ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی مشہور ہیں۔

مالک بن نضر سے نکاح ہوا۔ مدینہ میں اوائل اسلام میں مسلمان ہوئیں۔ مالک چوں کہ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہتے تھے اور اُمِ سلیمؓ تبدیلیٔ مذہب پر اصرار کرتی تھیں، اس لیے دونوں میں کشیدگی پیدا ہوئی اور مالک ناراض ہو کر شام چلے گئے اور وہیں انتقال کیا۔ ابوطلحہ نے جو اسی قبیلہ سے تھے، نکاح کا پیغام دیا لیکن اُمِ سلیمؓ کو اب بھی وہی عذر تھا یعنی ابوطلحہ مشرک تھے، اس لیے وہ ان سے نکاح نہیں کر سکتی تھیں۔

غرض ابوطلحہ نے کچھ دن غور کر کے اسلام کا اعلان کیا اور اُمِ سلیمؓ کے سامنے کلمہ پڑھا۔ حضرت اُمِ سلیمؓ نے حضرت انسؓ سے کہا کہ اب تم ان کے ساتھ میرا نکاح کر دو، ساتھ ہی مہر معاف کر دیا اور کہا کہ میرا مہر اسلام ہے۔ حضرت انسؓ کہا کرتے تھے کہ یہ نہایت عجیب و غریب مہر تھا۔

نکاح کے بعد حضرت ابوطلحہؓ نے بیعتِ عقبہ میں شرکت کی اور چند ماہ کے بعد جنابِ رسالت مآب ﷺ مدینہ میں تشریف لائے۔ حضرت اُمِ سلیمؓ اپنے صاحب زادے (حضرت انسؓ) کو لے کر حضور ﷺ کے پاس مدینہ میں آئیں اور کہا: "انس کو آپ کی خدمت کے لیے پیش کرتی ہوں، یہ میرا بیٹا ہے، آپ ﷺ اس کے لیے دعا فرمائیں۔" آنحضرت ﷺ نے دعا فرمائی۔ اسی زمانہ میں آپ نے مہاجرین اور انصار میں مواخات کی اور یہ مجمع انھی کے مکان میں ہوا۔

غزوات میں حضرت اُمِ سلیمؓ نے نہایت جوش سے حصہ لیا، صحیح مسلم میں ہے کہ

''آنحضرت ﷺ، حضرت اُمِ سلیمؓ اور انصار کی چند عورتوں کو غزوات میں ساتھ رکھتے تھے جو لوگوں کو پانی پلاتی اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں کے جمے ہوئے قدم اکھڑ گئے تھے، وہ نہایت مستعدی سے کام کر رہی تھیں۔ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ میں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت اُمِ سلیمؓ کو دیکھا کہ مشک بھر بھر کر لاتی تھیں اور زخمیوں کو پانی پلاتی تھیں، مشک خالی ہو جاتی تھی تو پھر جا کر بھر لاتی تھیں۔

5 ہجری میں آں حضور ﷺ نے حضرت زینبؓ سے نکاح کیا، اس موقع پر حضرت اُمِ سلیمؓ نے ایک لگن میں مالیدہ بنا کر حضرت انسؓ کے ہاتھ بھیجا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ سے کہنا کہ یہ حقیر ہدیہ قبول فرمائیں۔

7 ہجری میں خیبر کا واقعہ ہوا۔ حضرت اُمِ سلیمؓ اس میں شریک تھیں، آنحضرت ﷺ نے حضرت صفیہؓ سے نکاح کیا تو حضرت اُمِ سلیمؓ ہی نے حضرت صفیہؓ کو آنحضرت ﷺ کے لیے سنوارا تھا۔

غزوۂ حنین میں وہ ایک خنجر ہاتھ میں لیے تھیں، ابوطلحہؓ نے دیکھا تو آنحضرت ﷺ سے کہا کہ اُمِ سلیم خنجر لیے ہیں۔ آپ ﷺ نے پوچھا کیا کرو گی؟ بولیں ''اگر کوئی مشرک قریب آئے گا تو اس سے اس کا پیٹ چاک کر دوں گی۔'' آنحضرت ﷺ یہ سن کر مسکرا دیئے۔ حضرت اُمِ سلیمؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ! مکہ کے جو لوگ فرار ہو گئے ہیں، ان کے قتل کا حکم دیجیے۔ ارشاد ہوا ''خدا نے خود ان کا انتظام کر دیا ہے۔''

حضرت اُمِ سلیمؓ کی وفات کا سال اور مہینا معلوم نہیں لیکن قرینہ یہ ہے کہ انھوں نے خلافتِ راشدہ کے ابتدائی زمانہ میں وفات پائی ہے۔ انھوں نے دو نکاح کیے تھے۔ پہلے شوہر سے حضرت ابوطلحہؓ کے دولڑکے پیدا ہوئے، ابوعمیر اور عبداللہ۔ ابوعمیر صغر سنی میں فوت ہو گئے اور عبداللہ سے نسل چلی۔

حضرت اُمِ سلیمؓ سے چند حدیثیں مروی ہیں جنھیں حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، ابوسلمہؓ اور عمروؓ بن عاصم نے ان سے روایت کیا ہے۔ لوگ ان سے مسائل دریافت کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور زید بن ثابتؓ میں ایک مسئلے میں اختلاف ہوا تو ان بزرگوں نے اُمِ سلیمؓ کو حکم مانا۔

حضرت اُمِ سلیمؓ کو مسائل کے پوچھنے میں کچھ عار نہ تھا، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آئیں اور کہا: ''یا رسول اللہ (ﷺ)! خدا حق بات سے نہیں شرماتا، کیا عورت پر خواب میں غسل واجب ہے؟ ام المومنین حضرت ام سلمہؓ یہ سوال سن رہی تھیں، بے ساختہ ہنس پڑیں کہ تم نے عورتوں کی بڑی فضیحت کی؟ بھلا کہیں عورتوں کو بھی ایسا ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''کیوں نہیں! ورنہ بچے ماں کے ہم شکل کیوں ہوتے ہیں۔''

حضرت اُمِ سلیمؓ میں بڑے بڑے فضائل اخلاق جمع تھے۔ جوشِ ایمان کا یہ عالم تھا کہ اپنے پہلے شوہر سے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ وہ اسلام قبول کرنے پر رضا مند نہ تھا۔ حضرت ابوطلحہؓ نے نکاح کا پیغام دیا تو محض اس وجہ سے رد کر دیا کہ وہ مشرک ہیں۔ اس موقع پر انھوں نے ابوطلحہؓ کو جس خوبی سے اسلام کی دعوت دی، وہ سننے کے قابل ہے، مسند احمد میں ہے: ''اُمِ سلیمؓ نے کہا، ابوطلحہ! تم جانتے ہو کہ تمھارا معبود زمین سے اُگا ہے؟ انھوں نے جواب دیا، ہاں۔ حضرت اُمِ سلیمؓ بولیں کہ تو پھر تمھیں درخت کی پوجا کرتے شرم نہیں آتی''؟ حضرت ابوطلحہؓ پر اس تقریر کا اتنا اثر ہوا کہ فوراً مسلمان ہو گئے۔

آنحضرت ﷺ سے حد درجہ محبت کرتی تھیں۔ آپ اکثر ان کے مکان پر تشریف لے جاتے اور دوپہر کو آرام فرماتے تھے۔ جب بستر سے اٹھتے تو وہ آپ ﷺ کے پسینے اور ٹوٹے ہوئے بالوں کو ایک شیشی میں جمع کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ان کی مشک سے منہ لگا کر پانی پیا تو وہ اٹھیں اور مشک کا منہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا کہ اس سے رسول اللہ ﷺ کا دہن مبارک مس ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بھی ان سے خاص محبت تھی۔ صحیح مسلم میں ہے: ''آنحضرت ﷺ ازواج مطہرات کے علاوہ اور کسی عورت کے ہاں نہیں جاتے تھے لیکن اُمِ سلیمؓ مستثنیٰ تھیں۔ لوگوں نے دریافت کیا تو فرمایا، مجھے رحم آتا ہے، ان کے بھائی (حرامؓ) نے میرے ساتھ رہ کر شہادت پائی ہے۔'' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اکثر اوقات حضرت اُمِ سلیمؓ کے مکان پر تشریف لے جاتے تھے۔

حضرت اُمِ سلیمؓ نہایت صابر اور مستقل مزاج تھیں۔ ابوعمیر ان کا بہت پیارا لاڈلا بیٹا تھا لیکن جب اس نے انتقال کیا تو نہایت صبر سے کام لیا اور گھر والوں کو منع کیا کہ ابوطلحہؓ کو اس واقعہ کی خبر نہ کریں۔ رات کو ابوطلحہؓ آئے تو انھیں کھانا کھلایا اور نہایت اطمینان سے بستر پر لیٹے، کچھ رات گزرنے پر اُمِ سلیمؓ نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا لیکن عجیب سے انداز سے بولیں اگر تمھیں کوئی شخص عاریتاً ایک چیز دے اور پھر اسے واپس لینا چاہے تو کیا تم اس کے دینے سے انکار کرو گے؟ ابوطلحہؓ نے کہا کبھی نہیں۔ کہا تو اب تمھیں اپنے بیٹے کی طرف سے صبر کرنا چاہیے اور ابوطلحہؓ یہ سُن کر غصہ ہوئے کہ پہلے سے کیوں نہیں بتلایا۔ صبح اٹھ کر آنحضرت ﷺ کے پاس گئے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، خدا نے اس رات تم دونوں کو بڑی برکت دی۔

اسی طرح ایک مرتبہ ابوطلحہؓ آئے اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ بھوکے ہیں، کچھ بھیج دو۔ حضرت اُمِ سلیمؓ نے چند روٹیاں ایک کپڑے میں لپیٹ کر حضرت انسؓ کو دیں کہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا کر پیش کر دیں۔ آپ ﷺ مسجد میں تھے اور صحابہ بھی بیٹھے ہوئے تے۔ حضرت انسؓ کو دیکھ کر فرمایا: ''ابوطلحہؓ نے تمھیں بھیجا ہے؟ بولے جی ہاں۔ فرمایا کھانے کے لیے؟ کہا، ہاں۔ آپ تمام صحابہؓ کو لے کر ابوطلحہؓ کے مکان پر تشریف لائے، ابوطلحہؓ گھبرا گئے اور حضرت اُمِ سلیمؓ سے کہا اب کیا کیا جائے؟ کھانا نہایت قلیل ہے اور آنحضرت ﷺ ایک مجمع کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ آنحضرت ﷺ اندر آئے تو حضرت اُمِ سلیمؓ نے وہی روٹیاں اور سالن سامنے رکھ دیا۔ خدا کی شان، اس میں بڑی برکت ہوئی اور سب لوگ کھا کر سیر ہو گئے۔

حضرت اُمِ سلیمؓ کے فضائل ومناقب بہت ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

کہ میں جنت میں گیا تو مجھے آہٹ معلوم ہوئی، مَیں نے کہا کون ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ انسؓ کی والدہ غمیصا بنت ملحان ہیں۔

اُمِ عطیہؓ

نسیبہ بنت حارث نام، انصار کے قبیلہ ابی مالک بنونجار، ہجرت سے قبل مسلمان ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انصار کی عورتوں کو ایک مکان میں بیعت کے لیے جمع کیا اور حضرت عمرؓ کو دروازہ پر بھیجا کہ ان شرائط پر بیعت لیں کہ شرک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، عورتوں نے یہ سب تسلیم کیا تو حضرت عمرؓ نے اندر کی طرف ہاتھ بڑھایا اور عورتوں نے اپنے ہاتھ باہر نکالے، جو بیعت کی علامت تھی۔ اس کے بعد حضرت اُمِ عطیہؓ نے پوچھا کہ اچھی باتوں سے انکار کرنے کے کیا معنی ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا، نوحہ اور بین کرنا۔

حضرت اُمِ عطیہؓ عہد رسالت کے ساتھ معرکوں میں شریک ہوئیں جن میں وہ مردوں کے لیے کھانا پکاتیں، ان کے سامان کی حفاظت کرتیں، مریضوں کی تیمارداری اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔

8 ہجری میں آنحضرت ﷺ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا تو حضرت اُمِ عطیہؓ اور چند عورتوں نے انھیں غسل دیا۔ آنحضرت ﷺ نے انھیں نہلانے کی ترکیب بتلائی۔

خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں ان کا ایک لڑکا کسی غزوہ میں شریک تھا، بیمار ہو کر بصرہ آیا۔ حضرت اُمِ عطیہؓ مدینہ میں تھیں، خبر ملی تو نہایت عجلت سے بصرہ روانہ ہوئیں لیکن پہنچنے کے ایک دو دن قبل وہ وفات پا چکا تھا۔ یہاں آ کر انھوں نے بنوخلف کے قصر میں قیام کیا، تیسرے روز انھوں نے خوش بُو منگا کر ملی اور کہا کہ شوہر کے علاوہ اور کسی کے لیے تین دن سے زیادہ سوگ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بعد بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

چند حدیثیں روایت کی ہیں۔ صحابہ اور تابعین ان سے میت کے نہلانے کا طریقہ سیکھتے تھے۔ آنحضرت ﷺ سے بہت محبت کرتی تھیں اور آپ ﷺ بھی ان سے محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے ان کے پاس صدقہ کی ایک بکری بھیجی تو انھوں نے اس کا گوشت حضرت عائشہؓ کے پاس روانہ کیا۔ آپ گھر تشریف لائے تو کھانے کے لیے مانگا۔ بولیں اور تو کچھ نہیں ہے البتہ جو بکری آپ نے نسیبہؓ کے پاس بھیجی تھی، اس کا گوشت رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا، لاؤ کیوں کہ وہ مستحق کے پاس پہنچ چکی۔ آنحضرت ﷺ کے ساتھ آپ کے اعزہ و اقارب سے بھی خاص تعلقات تھے۔ چنانچہ ابن سعد نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت عطیہؓ کے مکان میں قیلولہ فرماتے تھے۔

احکام نبوی کی پوری پابندی کرتی تھیں، آنحضرت ﷺ نے بیعت میں نوحہ کی ممانعت کی تھی، اس پر انھوں نے ہمیشہ عمل کیا۔ چنانچہ بیعت ہی کے وقت آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ فلاں خاندان کے لوگ میرے ہاں رہ چکے ہیں، اس لیے مجھے بھی ان کے ہاں جا کر رہنا ضروری ہے۔ آپ ﷺ اس خاندان کو مستثنیٰ کر دیجیے، چنانچہ آپ ﷺ نے مستثنیٰ کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت اُمِ عطیہؓ کو کوئی جواب نہیں دیا اور جن روایات سے یہ ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت اُمِ عطیہؓ کو کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ استثناء حضرت اُمِ عطیہؓ کے لیے خاص تھا ورنہ اصل مسئلہ کہ نوحہ جائز نہیں ہے، اپنی جگہ پر ثابت ہے۔ ان کی وفات کی تاریخ اور سن معلوم نہیں اور نہ اولاد کی تفصیل معلوم ہے۔

اُمِ عمارہؓ

نسیبہ نام، ام عمارہ کنیت، قبیلہ خزرج کے خاندان بنونجار سے ہیں۔ پہلا نکاح زید بن عاصم سے ہوا، پھر عربہ بن عمرو کے عقد نکاح میں آئیں اور انھی کے ساتھ بیعتِ عقبہ میں شرکت کی۔ سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ بیعتِ عقبہ میں 73 مرد اور دو عورتیں شامل تھیں، حضرت اُمِ عمارہؓ بھی ان میں شامل تھیں۔

غزوۂ اُحد میں شریک ہوئیں اور نہایت پامردی سے لڑیں۔ جب تک مسلمان فتح یاب تھے، وہ مشک میں پانی بھر کر لوگوں کو پلا رہی تھیں لیکن جب شکست ہوئی تو آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچیں اور سینہ سپر ہو گئیں۔ کفار جب آپ کی طرف بڑھتے تھے تو تیر اور تلوار سے روکتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ کا خود بیان ہے کہ میں احد میں انھیں اپنے دائیں اور بائیں لڑتے ہوئے دیکھتا تھا۔ ابن قمیہ جب دڑاتا ہوا آنحضرت ﷺ کے پاس پہنچ گیا تو حضرت اُمِ عمارہؓ نے بڑھ کر روکا۔ چنانچہ کندھے پر زخم آیا اور غار پڑ گیا۔ انھوں نے بھی تلوار ماری لیکن وہ دُہری زرہ پہنے ہوئے تھا، اس لیے کارگر نہ ہوئی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انھوں نے ایک کافر کو قتل کیا تھا۔ احد کے بعد بیعت الرضوان، خیبر اور فتح مکہ میں بھی شرکت کی۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں یمامہ کی جنگ پیش آئی۔ مسیلمہ کذاب سے جو مدعی نبوت تھا، مقابلہ تھا، حضرت اُمِ عمارہؓ اپنے ایک لڑکے (حبیب) کو لے کر حضرت خالدؓ کے ساتھ روانہ ہوئیں اور جب مسیلمہ نے ان کے لڑکے کو قتل کر دیا تو انھوں نے منت مانی کہ یہ مسیلمہ قتل ہوگا یا وہ خود جان دے دیں گی۔ یہ کہ کر تلوار کھینچ لی اور میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئیں اور اس پامردی سے مقابلہ کیا کہ 12 زخم کھائے اور ایک ہاتھ کٹ گیا۔ اس جنگ میں مسیلمہ بھی مارا گیا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کب تک زندہ رہیں۔ انتقال کے وقت چار اولادیں یادگار چھوڑیں، حبیب، عبداللہ (پہلے شوہر سے)، تمیم اور خولہ (دوسرے شوہر سے)۔

چند حدیثیں روایت کی ہیں جو عباد بن تمیم (پوتے) لیلٰے (کنیز) عکرمہ، حارث ابن کعب اور ام سعد بنت سعد بن ربیع سے مروی ہیں۔ آنحضرت ﷺ سے انھیں جو محبت تھی، اس کا اصلی منظر تو غزوۂ اُحد میں نظر آتا ہے لیکن اور چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ ان کے مکان میں تشریف لائے تو انھوں نے کھانا پیش کیا۔ ارشاد ہوا، تم بھی کھاؤ۔ بولیں، میں روزے سے ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے کھانا تناول فرمایا اور فرمایا کہ روزہ دار کے پاس بیٹھ کر اگر کچھ کھایا جائے تو اس پر

فرشتے درود بھیجتے ہیں۔

اُمِ الفضلؓ

لبابہ نام، اُم الفضل کنیت، کبریٰ لقب، والدہ کا نام ہند بنت عوف تھا اور قبیلۂ کنانہ سے تھیں۔ لبابہ کی حقیقی اور اخیافی کئی بہنیں تھیں جو خاندانِ ہاشم اور قریش کے دوسرے معزز گھرانوں میں منسوب تھیں۔ چنانچہ حضرت میمونہؓ آنحضرت ﷺ سے، لبابہؓ حضرت عباسؓ (عم رسول اللہ ﷺ) سے، سلمیٰؓ حضرت حمزہؓ (عم رسول اللہ ﷺ) کو اور اسماؓ حضرت جعفر طیارؓ سے منسوب تھیں۔ اسی بنا پر ان کی والدہ (ہند بنت عوف) کی نسبت مشہور ہے کہ سسرالی قرابت میں ان کا کوئی نظیر نہیں۔

اُمِ الفضل کا حضرت عباسؓ سے، جو آنحضرت ﷺ کے عم محترم تھے، نکاح ہوا۔ ہجرت سے قبل مسلمان ہوئیں۔ ابن سعد کا خیال ہے کہ انھوں نے حضرت خدیجہؓ کے بعد اسلام قبول کیا تھا۔ باقی اور عورتیں ان کے بعد ایمان لائیں، اس لحاظ سے ان کے ایمان لانے کا زمانہ بہت قدیم ہو جاتا ہے۔ اُمِ الفضلؓ نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ حج بھی کیا ہے۔ چنانچہ حجۃ الوداع میں جب لوگوں کو عرفہ کے دن آنحضرت ﷺ کے صائم ہونے کی نسبت شبہ ہوا اور ان کے پاس آ کر ذکر کیا تو انھوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں ایک پیالہ دُودھ بھیجا۔ چوں کہ آپ ﷺ روزہ سے نہ تھے، دودھ پی لیا اور لوگوں کو تشفی ہوگئی۔

اُمِ الفضلؓ نے حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں وفات پائی، اس وقت حضرت عباسؓ زندہ تھے۔ حضرت عثمانؓ نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ حضرت عباسؓ کی اکثر اولاد انھی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ چوں کہ سب بیٹے نہایت قابل تھے، اس لیے بڑی خوش قسمت سمجھی جاتی تھیں۔ فضل، عبداللہ، معبد، عبیداللہ، قثم، عبدالرحمٰن اور اُمِ حبیبہؓ انھی کی یادگار ہیں۔ ان میں حضرت عبداللہؓ اور عبیداللہؓ آسمانِ علم کے مہر و ماہ تھے۔

آنحضرت ﷺ سے تیس حدیثیں روایت کی ہیں۔ عابدہ اور زاہدہ تھیں، ہر دوشنبہ اور پنج شنبہ کو روزہ رکھتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ سے محبت کرتی تھیں۔ آپ ﷺ اکثر ان کے ہاں جاتے اور دوپہر کے وقت آرام فرماتے تھے۔

اُمِ کلثومؓ بنت عقبہ

اُمِ کلثوم کنیت، سلسلۂ نسب یہ ہے، اُم کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط ابن ابی عمرو بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف اور والدہ کا نام اُرویٰ بنت کریز تھا، اسی بنا پر حضرت عثمانؓ اور حضرت اُمِ کلثومؓ اخیافی بھائی بہن ہیں۔ اُمِ کلثومؓ کا باپ عقبہ بن ابی معیط قبیلۂ امیہ کا ایک ممتاز شخص تھا، اسے اسلام سے سخت عداوت تھی لیکن اس کی صاحب زادی حضرت اُمِ کلثومؓ مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

7 ہجری میں صلح حدیبیہ کے بعد حضرت اُمِ کلثوم نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ بنو خزاعہ کے ایک شخص کے ہم راہ مکہ سے پا پیادہ روانہ ہوئیں۔ چوں کہ بھاگ کر نکلی تھیں، اس لیے ان کے بھائی پیچھے سے آئے۔ مدینہ پہنچیں تو دوسرے دن وہ بھی پہنچ گئے۔ حضرت اُمِ کلثومؓ نے فرمایا کہ مجھے اپنے ایمان کا خوف ہے، میں عورت ہوں اور عورتیں کم زور ہوتی ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صلح نامہ میں یہ شرط کی تھی کہ قریش کا کوئی آدمی مدینہ آئے گا تو واپس کر دیا جائے گا، اس لیے آپ ﷺ کو فکر ہوئی لیکن چوں کہ اس میں عورتیں داخل نہ تھیں، اس لیے ان کے متعلق سورۃ الممتحنہ کی آیت نمبر 10 اُتری: ''مسلمانو! جب تمھارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو انھیں جانچ لو، خدا ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اب اگر تمھیں معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو انھیں کافروں کے ہاں واپس نہ بھیجو۔'' اور آپ ﷺ نے اس کے مطابق حضرت اُمِ کلثومؓ کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

حضرت اُمِ کلثومؓ اب تک کنواری تھیں، اس لیے حضرت زیدؓ بن حارثہ سے، جو کہ بڑے رُتبہ کے صحابی تھے، ان کا نکاح کیا گیا اور جب زیدؓ نے غزوۂ موتہ میں شہادت پائی تو حضرت زبیرؓ بن العوام کے عقدِ نکاح میں آئیں لیکن انھوں نے طلاق دے دی تو حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے نکاح ہوا۔ ان کی وفات کے بعد حضرت عمروؓ بن العاصؓ سے نکاح پڑھایا اور یہ آخری نکاح تھا۔

ایک مہینا کے بعد وفات پائی، اس زمانہ میں حضرت عمروؓ بن العاصؓ والیٔ مصر تھے۔ حضرت اُمِ کلثومؓ کے حضرت زیدؓ اور حضرت عمروؓ بن العاصؓ سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی لیکن حضرت زبیرؓ سے زینب اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف سے ابراہیم حمید، محمد اور اسمٰعیل پیدا ہوئے۔ حمید اور ابراہیم نے ان سے کچھ حدیثیں روایت کی ہیں۔

اُمِ معبد خزاعیہؓ

13۔ ربیع الاول بعثت میں آنحضور ﷺ نے مکہ معظمہ کو الوداع کہا اور تین راتیں غارِ ثور میں گزر کر عازمِ مدینہ ہوئے۔ اس وقت حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عامرؓ بن فہیرہ آپ ﷺ کے ہم رکاب تھے۔ حضور ﷺ ایک اونٹنی پر سوار تھے اور وہ دونوں دوسری اونٹنی پر۔ آگے آگے عبداللہ بن اُریقط لیثی پیدل چل رہا تھا۔ وہ غیر مسلم ہونے کے باوجود ایک قابلِ اعتماد شخص تھا اور مکہ مدینہ جانے والے تمام راستوں سے واقف تھا، اس لیے حضور ﷺ نے اسے راستہ بتانے کے لیے اُجرت پر اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

یہ مختصر قافلہ قُدید کے مقام پر پہنچا۔ حضرت اسماؓ بنت ابوبکرؓ نے جو کھانا ساتھ کیا تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اُمِ معبد کی شہرت سن رکھی تھی، جن کا خیمہ اسی مقام پر تھا۔ انھیں یقین تھا کہ اُمِ معبد کے پاس کھانے پینے کا کچھ انتظام ہو جائے گا۔ اس وقت وہ اپنے خیمے کے آگے بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دنوں خشک سالی نے سارے علاقے پر قیامت ڈھا رکھی تھی، اسی وجہ سے اُمِ معبد کے گھرانے میں بڑی تنگی ترشی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ حضور ﷺ نے اُمِ معبد سے فرمایا: ''دودھ، گوشت، کھجوریں، کھانے کی کوئی بھی چیز تمھارے پاس ہو تو ہمیں دے دو، ہم اس کی قیمت ادا کر دیں گے۔''

اُمِ معبد نے عرض کیا: ''خدا کی قسم! اگر ہمارے پاس کچھ ہوتا تو ہم آپ ﷺ کی خدمت دل و جان سے کرتے۔'' آنحضور ﷺ نے خیمے کے پاس ایک بکری دیکھی، آپ ﷺ نے پوچھا: ''یہ بکری کیسی ہے''؟ اُمِ معبد نے عرض کیا: ''یہ بکری

زوری کے باعث ریوڑ کے ساتھ نہیں جا سکتی اور اس کا دودھ خشک ہو چکا ہے۔''
حضور ﷺ نے اللہ کا نام لے کر بکری کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اُمِ معبد سے برتن لانے کو فرمایا۔ قدرتِ حق سے بکری نے اتنا دودھ دیا کہ برتن بھر گیا اور دودھ کا جھاگ برتن کے کناروں تک آ گیا۔ حضور ﷺ نے اپنے اصحابؓ کو بلایا اور دودھ کا برتن دے کر فرمایا کہ وہ سیر ہو کر پئیں۔ جب سارے رفقا جی بھر کے دودھ پی چکے تو آپ ﷺ نے نوش فرمایا۔ پھر آپ ﷺ نے دوبارہ دودھ نکالا، حتّٰی کہ دودھ برتن کے کناروں تک آ گیا۔ حضور ﷺ نے دودھ سے لبالب بھرا ہوا برتن اُمِ معبد کے حوالے کیا اور خود اپنے رفقا کے ہم راہ مدینے کے مقدس سفر پر روانہ ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اُمِ معبد کا شوہر اپنی مریل اور کم زور بکریوں کو ہنکاتا ہوا گھر پہنچا۔ جب اس نے خیمے میں دودھ سے بھرا ہوا برتن دیکھا تو سخت متعجب ہوا۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا: ''یہ دودھ کہاں سے آیا ہے''؟ اُمِ معبد نے کہا: ''ایک بابرکت انسان یہاں آیا تھا، یہ دودھ اسی کی مبارک آمد کا نتیجہ ہے۔'' اُمِ معبد کا شوہر بولا: ''یہ تو وہی شخص ہے جسے قریش تلاش کر رہے ہیں، تم ذرا اس شخص کا حلیہ تو بتاؤ۔'' اُمِ معبد نے کہا: ''میں اس مبارک انسان کی توصیف کن الفاظ میں بیان کروں! اس کا چہرہ تاباں اور اخلاق پاکیزہ، نہ توند نکلی ہوئی، نہ چندیا کے بال گرے ہوئے، زیبا صورت، صاحبِ جمال، آنکھیں فراخ اور سیاہ، بال کافی اور گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن پتلیاں، سرگیں آنکھیں، باریک و پیوستہ ابرو، خاموش، باوقار، گویا دل بستگی لیے ہوئے، دور کے دیکھنے میں دل کش، قریب سے نہایت شریں وکمال حسین، شریں مقال، واضح الفاظ، گفتگو الفاظ کی کمی بیشی سے معرّا، تمام گفتگو موتیوں کی پروئی ہوئی لڑی جیسی، کوئی آنکھ اس میں پستہ قدی کا عیب نہیں نکال سکتی اور نہ لمبے قد کا نقص تلاش کر سکتی ہے۔ وہ دو شاخوں کے درمیان ایسی شاخ ہے جو سب سے زیادہ تر و تازہ اور شگفتہ و دلفریب ہے۔ اس کے رفقا ایسے کہ ہر وقت گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب کوئی کچھ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں اور جب وہ حکم دیتے ہیں تو وہ تعمیل کے لیے لپکتے ہیں۔ مخدوم، مطاع، مالوف، نہ ادھوری بات کرنے والے اور نہ ضرورت سے زیادہ بولنے والے۔'' ابو معبد یہ صفات سن کر بول اٹھا کہ خدا کی قسم، یہ وہی صاحبِ قریش تھے، جن کا ذکر ہم سنتے رہتے ہیں۔ میں ان سے ضرور جا کر ملوں گا۔

ابو معبدؓ اور اُمِ معبدؓ دونوں مدینہ پہنچے اور رحمتِ عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دولتِ اسلام سے سرفراز ہوئے۔ دونوں کی زندگی کے مزید حالات تاریخ میں نہیں ملتے۔ تاہم ان کی زندگی کے ایک ہی واقعے نے انھیں شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں نہایت بلند مقام عطا کر دیا۔ اُمِ معبدؓ ان کی کنیت تھی۔ اصل نام عاتکہ تھا۔ ان کے شوہر تمیم بن عبد العزّٰی تھے۔ وہ چرواہے تھے۔ دونوں کا تعلق بنو خزاعہ کی شاخ بنی کعب سے تھا۔ دونوں غریب ہونے کے باوجود مہمان نواز تھے۔ وہ قُدید کے قریب سے گزرنے والے مسافروں کی نہایت خوش دلی سے میزبانی کیا کرتی تھیں۔ کسی شاعر نے حضور ﷺ کے واقعے سے متعلق عربی میں اشعار بھی کہے ہیں (ترجمہ):۔

''اللہ ان رفیقوں کو جزائے خیر دے جو اُمِ معبدؓ کے خیموں میں مقیم ہوئے۔ وہ نیکی سے ٹھہرے اور وہ تو اس کے خوگر ہیں۔ تو جو شخص محمد ﷺ کا رفیق ہوا، کام یاب ہوا۔ بنی کعب کو ایسی لڑکیاں مبارک ہوں جن کا مکان مسلمانوں کی جائے پناہ ہے۔''

اُمِ وَرقہؓ بنت عبد اللہ

نام معلوم نہیں، اُمِ ورقہ کنیت اور انصار کے کسی قبیلہ سے تھیں، ہجرت کے بعد مسلمان ہوئیں۔ غزوۂ بدر پیش آیا تو انھوں نے آنحضرت ﷺ سے شرکت کی اجازت مانگی کہ مریضوں کی تیمارداری کروں گی، ممکن ہے کہ اس سلسلہ میں شہادت نصیب ہو۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''تم گھر میں رہو، خدا تمھیں وہیں شہادت عطا فرمائے گا۔''

چوں کہ قرآن پڑھی ہوئی تھیں اور آنحضرت ﷺ نے انھیں عورتوں کا امام بنایا تھا، اس لیے درخواست کی کہ ایک مؤذن مقرر فرمایئے۔ چنانچہ مؤذن اذان دیتا اور یہ عورتوں کی امامت کرتی تھیں، راتوں کو قرآن پڑھا کرتیں۔ انھوں نے ایک لونڈی اور ایک غلام کو مُدبّر بنایا یعنی اس شرط پر آزادی کا وعدہ کیا تھا کہ میرے بعد تم آزاد ہو۔ ان بدبختوں نے اس وعدے سے (ناجائز) فائدہ اٹھانا چاہا اور رات کو ایک چادر ڈال کر ان کا کام تمام کر دیا، یہ خلافتِ فاروقی کا واقعہ ہے۔

صبح کو حضرت عمرؓ نے لوگوں سے پوچھا: ''آج خالہ کے پڑھنے کی آواز نہیں آئی، معلوم نہیں کیسی ہیں''؟ مکان میں گئے تو دیکھا کہ ایک چادر میں لپٹی پڑی ہوئی ہیں۔ نہایت افسوس ہوا اور فرمایا: ''خدا اور رسول نے سچ کہا تھا، آنحضرت فرمایا کرتے تھے کہ ''شہیدہ کے گھر چلو۔'' اس کے بعد منبر پر چڑھے اور کہا غلام اور لونڈی دونوں گرفتار کیے جائیں۔ چنانچہ وہ گرفتار ہو کر آئے تو حضرت عمرؓ نے انھیں سولی پر لٹکا دیا۔ یہ دونوں وہ پہلے مجرم ہیں جنھیں مدینہ منورہ میں سولی دی گئی۔

اُمِ ہانیؓ

فاختہ نام، اُمِ ہانی کنیت، ابو طالب (عم رسول اللہ ﷺ) کی دختر تھیں، ماں کا نام فاطمہ بنت اسد تھا۔ اس بنا پر حضرت علیؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور اُمِ ہانیؓ حقیقی بھائی بہن ہیں۔ ہبیرہ بن عمرو بن عائذ مخزومی سے نکاح ہوا۔

8 ہجری میں مکہ فتح ہوا، مسلمان ہوئیں۔ حضور ﷺ نے اس روز ان کے مکان میں غسل کیا تھا اور چاشت کی نماز پڑھی تھی، انھوں نے اپنے دو عزیزوں کو جو مشرک تھے، پناہ دے دی تھی، آنحضرت ﷺ نے بھی انھیں پناہ دی۔ ان کا شوہر ہبیرہ فتح مکہ میں نجران بھاگ گیا۔

حضرت اُمِ ہانیؓ سے 46 حدیثیں مروی ہیں، جن کے راوی حسبِ ذیل حضرات ہیں، جعدہ، یحییٰ، ہارون، ابو مرہ، ابو صالح، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، عبد اللہ بن حارث بن نوفل ابن ابی لیلیٰ، مجاہد، عروہ، عبد اللہ ابن عیاش شعبی عطا، محمد بن عقبہ۔ آنحضرت ﷺ سے کبھی کبھی مسائل دریافت کرتی تھیں، جس سے ان کی فقہ دانی کا پتا چلتا ہے۔ ایک مرتبہ اس آیت کی تفسیر پوچھی تھی '' وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْکُمُ الْمُنْکَرَ۔''

آنحضرت ﷺ سے انھیں جو عقیدت تھی، وہ اس سے ظاہر ہے کہ آپ ﷺ فتح مکہ کے زمانہ میں ان کے مکان پر تشریف لائے اور شربت نوش فرمایا، اس کے بعد انھیں دیا۔ انھوں نے کہا میں روزہ سے ہوں لیکن آپ ﷺ کا جھوٹا واپس نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انھوں نے پی لیا اور پھر خود ہی عرض کیا ''میں روزہ سے ہوں۔'' حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر روزہ رمضان کی قضا کا ہے تو کسی دوسرے روز رکھ لینا اور محض نفل ہے تو اس کی قضا کرنے یا نہ کرنے کا تمھیں اختیار ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بھی ان سے بہت محبت تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا: ''اُمِ ہانی! بکری لے لو، یہ بڑی خیر و برکت کی چیز ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ اب میں بوڑھی ہو گئی اور چلنے پھرنے مین ضعف معلوم ہوتا ہے، اس لیے ایسا عمل بتلایا جائے جسے بیٹھے بیٹھے انجام دے سکوں۔ آپ ﷺ نے ایک وظیفہ بتلایا، فرمایا کہ سُبحان اللہ ایک سو مرتبہ، الحمد للہ ایک سو مرتبہ اور لا الٰہ الا اللہ ایک سو مرتبہ پڑھ لیا کرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد مدت تک زندہ رہیں۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا۔

ثوبیہؓ

سرورِ عالمؐ اور اسلام کے دشمن ابولہب کی لونڈی تھیں۔ روایت میں ہے کہ حضرت ثوبیہؓ نے حضور ﷺ کی ولادت کی خبر ابولہب کو سنائی تو اس نے انھیں آزاد کر دیا۔ بعض روایات ایسی بھی ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابولہب نے حضرت ثوبیہؓ کو اس وقت آزاد کیا جب حضورؐ کی شادی حضرت خدیجہؓ سے ہو چکی تھی۔ ایک دفعہ حضرت خدیجہؓ نے ثوبیہ کو ابولہب سے خرید کر آزاد کرنا چاہا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بعد میں کچھ خیال آیا اور خود ہی آزاد کر دیا۔

آنحضور ﷺ کی ولادت کے بعد تین چار دن تک آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ نے آپ کو دودھ پلایا، پھر حضرت ثوبیہؓ، پھر حضرت حلیمہؓ نے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت ابو سلمہؓ بن عبدالاسد (حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی اور ام المومنین حضرت اُمِ سلمہؓ کے پہلے شوہر) نے بھی ان کا دودھ پیا تھا۔ نیز آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ اور حضور ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی حضرت عبداللہ بن جحش نے بھی حضرت ثوبیہؓ کا دودھ پیا تھا۔ ہجرت کے بعد حضور ﷺ مدینہ سے ان کے لیے کپڑا اور خرچ بھیجا کرتے تھے۔ انھوں نے 7 ہجری میں وفات پائی۔ ان کے ایک بیٹے مسروح تھے، جو حضور ﷺ کے رضاعی بھائی تھے۔ وہ والدہ کے سامنے فوت ہو گئے تھے۔ حضرت ثوبیہؓ نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

حلیمہ سعدیہؓ

حلیمہ نام، ابوذویب عبداللہ بن حارث کی بیٹی اور حارث بن عبدالعزیٰ بن رفاعہ کی اہلیہ، جن کا تعلق قبیلہ سعد بن بکر سے تھا جو قبیلہ ہوازن کی ایک شاخ تھا، فصاحت و بلاغت اور اپنے علاقے کے پانی کی شیرینی کی وجہ سے مشہور تھا۔

آنحضور ﷺ کی ولادت کے بعد چند روز آپ ﷺ کی والدہ حضرت آمنہؓ نے آپ ﷺ کو دودھ پلایا۔ پھر حضرت ثوبیہؓ نے چند دن دودھ پلایا۔ اسی اثنا میں قبیلہ بنی سعد کی چند عورتیں بچے لینے مکہ آئیں، ان میں حضرت حلیمہ بھی تھیں۔ عرب میں یہ دستور تھا کہ شرفا اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے دیہات میں بھیج دیتے تھے تاکہ دیہات کی صاف اور کھلی آب و ہوا میں ان کی پرورش ہو سکے اور زبان کی فصاحت اور اہلِ عرب کی دیگر خصوصیات اوائل عمری سے بچوں میں راسخ ہو جائیں۔ اس دستور کے مطابق سال میں دو مرتبہ بنی سعد کی عورتیں شیر خوار بچوں کی تلاش میں مکہ آیا کرتی تھیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کی پیدائش کے آٹھ دس روز بعد ان عورتوں کے ساتھ حلیمہ سعدیہ بھی مکہ تشریف لائیں۔

دوسری عورتوں کو تو مکہ کے اچھے خوش حال گھرانوں کے بچے پرورش کے لیے ملے مگر حلیمہؓ خالی ہاتھ رہ گئیں۔ آنحضور ﷺ کے یتیم ہونے کی وجہ سے چوں کہ انعام و اکرام کی توقع کم تھی، اس لیے کسی عورت نے ادھر توجہ نہ کی۔ آخر جب روانگی کا وقت آیا تو حلیمہؓ کو خالی ہاتھ جانا شاق گزرا۔ قدرتِ حق سے ان کا دل اس یتیم بچے کی طرف کھنچنے لگا۔ چنانچہ حلیمہ سعدیہؓ نے اپنے شوہر حارث سے جا کر کہا: ''خدا کی قسم، میں ضرور اس یتیم کے پاس جاؤں گی اور ضرور اسے لے کر آؤں گی۔'' شوہر نے جواب دیا: ''اگر تُو ایسا کرے تو کوئی حرج نہیں۔ اُمید ہے کہ وہ ہمارے لیے خیر و برکت کا سبب بنے گا۔''

جب قافلہ مکہ سے روانہ ہوا اور سب سوار ہو کر چل پڑے تو حلیمہ بھی محمد ﷺ کو گود میں لے کر سوار ہوئیں۔ حلیمہؓ کی وہ دبلی پتلی سواری جو دیکھنے میں مریل اور چلنے میں سب سے سُست رفتار تھی، یکا یک برق رفتار ہو گئی۔ یہ تبدیلی سب عورتوں کی نظر میں ایک معجزے سے کم نہ تھی، اور پھر آپ کے دم قدم سے حلیمہؓ کا گھر نیک بختی اور سعادت و برکت کا گہوارہ بن گیا۔

حضرت حلیمہؓ نے جب دو سال کے بعد آپ ﷺ کا دودھ چھڑایا تو وہ آپ ﷺ کو لے کر مکہ آئی تاکہ سیّدہ آمنہ کی امانت انھیں واپس کر دیں۔ اگرچہ حلیمہؓ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ آپ ﷺ کو اپنے سے جُدا کریں، مگر دستور کے مطابق دو سال بعد واپسی ضروری تھی۔ سیّدہ آمنہؓ اپنے نونہال کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں۔ اپنے فرزند کو خوب پیار کیا لیکن ان دنوں مکہ میں وبا پھیلی ہوئی تھی، سیدہ آمنہؓ ایسے مخدوش حالات میں اپنے دُرِ یتیم کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ حضرت حلیمہؓ آپ ﷺ کو لے کر پھر واپس اپنے قبیلے بنی سعد میں واپس آ گئیں۔

پانچ برس کی عمر تک آپ ﷺ نے حضرت حلیمہؓ کے پاس پرورش پائی، حتیٰ کہ شق الصدر کا واقعہ پیش آیا، جس کی کیفیت یوں ہے کہ ایک روز حضرت حلیمہؓ کے دو بچے دوڑے ان کے پاس آئے اور کہا کہ دو سفید پوش آدمی ہمارے قریشی بھائی کو پکڑ کر لے گئے اور اسے قتل کر دیا۔ حضرت حلیمہؓ اور ان کے شوہر اس طرف دوڑے، دیکھا کہ حضورؐ

صحیح سلامت ہیں لیکن چہرہ مبارک کا رنگ متغیر ہے۔ حضرت حلیمہؓ نے حضور ﷺ کو گلے لگایا اور پوچھا، کیا ہوا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ دو سفید پوش آدمی میرے پاس آئے اور مجھے چت لٹا کر میرا سینہ چاک کیا اور اس میں سے میرا دل باہر نکالا اور پھر اس میں سے کوئی چیز نکالی۔ پھر میرے دل کو سینے میں رکھ کر درست کر دیا۔

حضرت حلیمہؓ اور ان کے شوہر یہ واقعہ سن کر بہت حیران و پریشان ہوئے کہ کہیں بچے کو کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ چنانچہ باہم مشورہ کے بعد وہ حضور ﷺ کو ساتھ لے کر مکہ پہنچے اور عام الفیل کے چھٹے سال، حضور ﷺ کو ان کی والدہ ماجدہ کے سپرد کر دیا۔ اس وقت آپ ﷺ کی صحت بہت اچھی اور قابلِ رشک تھی۔ آپ ﷺ کے اخلاق آزاد اور اعلیٰ تھے۔ آپ ﷺ کی زبان میں فصاحت و بلاغت کی وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جو بنی سعد کی طرۂ امتیاز تھیں۔ اسی ابتدائی پرورش و تربیت کی بنا پر حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے: ''مَیں تم سب سے فصیح تر ہوں، کیوں کہ مَیں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنی سعد کی زبان ہے۔''

اس زمانے کے متعلق ایک دو واقعات سیرت کی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آنحضور ﷺ اپنی رضاعی ماں کا دودھ صرف ایک طرف سے پیا کرتے اور دوسری طرف کا دودھ اپنے رضاعی بھائی کے لیے چھوڑ دیتے۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب آپ ﷺ ذرا سیانے ہوئے تو نہ معلوم کس بات پر مچل کر اپنی بی بہن شیما سعدیہ بنتِ حارث کو، جو آپ ﷺ کو کھلایا کرتی تھیں، اس زور سے کندھے پر کاٹا کہ عمر بھر اس کا نشان رہ گیا۔ ایک غزوہ میں جب شیما گرفتار ہو کر آئیں تو یہی نشان ان کے حق میں مُفید ثابت ہوا۔

حضرت حلیمہؓ اس کے بعد عرصے تک زندہ رہیں۔ حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد ایک مرتبہ حضرت حلیمہؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنے علاقے میں خشک سالی کی شکایت کی۔ حضور ﷺ نے انھیں چالیس بکریاں اور سامان سے لدا ہوا اونٹ عطا فرمایا۔ ان کی وفات کا سال وسن معلوم نہیں۔

حمنہؓ بنت جحش

حمنہ نام، حضرت زینبؓ کی ہمشیر ہیں، حضرت مصعبؓ سے نکاح ہوا اور انھی کے ساتھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئیں۔

مدینہ کی ہجرت کا شرف حاصل کیا اور جب آنحضرت ﷺ نے مہاجرین اور انصار کی عورتوں سے بیعت لی تو اس میں یہ بھی شامل ہوئیں۔

غزوات میں سے اُحد میں نہایت نمایاں شرکت کی۔ وہ پانی پلاتیں اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں۔ ان کے علاوہ اور عورتیں بھی یہ خدمت انجام دے رہی تھیں، چنانچہ رفیدہؓ اور اُمِ کبشہؓ وغیرہ کی نسبت بھی اسی قسم کی تصریحات موجود ہیں۔ غزوۂ اُحد میں حضرت حمنہؓ کے شوہر حضرت مصعبؓ بن عمیر نے شہادت پائی، جن کے بعد انھوں نے حضرت طلحہؓ سے کہ عشرہ مبشرہ میں تھے، نکاح کیا۔

افک کے واقعہ میں منافقین کے ساتھ غلطی سے جو مسلمان شریک ہو گئے تھے، ان میں حضرت حسانؓ اور حضرت مسطحؓ کے ساتھ حضرت حمنہ بھی تھیں، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے: ''یعنی حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ برابر میرے خلاف رہیں، یہاں تک کہ اور اصحابِ افک کی طرح برباد ہوئیں۔

فتح الباری میں ہے کہ حضرت حمنہؓ کے شریک ہونے کی وجہ یہ تھی کہ حضرت عائشہؓ کو آنحضرت ﷺ کی نظروں سے گرا کر حضرت زینبؓ (اپنی بہن) کو بلند کریں لیکن تعجب ہے کہ خود حضرت زینبؓ نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

وفات کا سنہ صحیح طور پر معلوم نہیں، اتنا علم ہے کہ حضرت زینبؓ کی وفات تک زندہ تھیں، حضرت زینبؓ نے 20 ہجری میں وفات پائی ہے۔ حضرت طلحہؓ سے حضرت حمنہؓ کے دولڑکے پیدا ہوئے، محمد اور عمران۔ محمد کو سجاد کے لقب سے شہرت تھی۔

خولہؓ بنت ثعلبہ

ان کا تعلق انصار کے قبیلہ بنی عوف بن خزرج سے تھا۔ ان کا نکاح اپنے ابنِ عم حضرت اوس بن صامتؓ سے ہوا تھا جو حضرت عبادہؓ بن صامت کے بھائی تھے۔

حضرت خولہؓ بھی اپنے شوہر کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوئیں اور سرورِ عالم ﷺ کی بیعت کی سعادت حاصل کی۔ وہ ایک گھریلو خاتون تھیں اور گم نامی کی زندگی بسر کر رہی تھیں کہ اچانک ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے انھیں لازوال شہرت عطا کر دی۔

واقعہ یہ تھا کہ حضرت اوسؓ بن صامت بڑھاپے میں کچھ چڑچڑے ہو گئے تھے، ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے تھے۔ ایک دن شدید غصے میں اپنی اہلیہ حضرت خولہؓ سے کہہ دیا: ''اَنْـتِ کَـظَهْـرِ اُمِّـیْ'' یعنی تو میرے اوپر ایسی ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ۔'' کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تم مجھ پر میری ماں کی طرح حرام ہو۔ اس قسم کے فعل کا نام ''ظہار'' ہے۔ جب ان کا غصہ دُور ہوا تو سخت پریشان ہوئے کہ یہ کیا حرکت مجھ سے سرزد ہو گئی ہے۔ اب گھر کو بچانے کی کیا صورت ہو۔ خولہؓ بھی دم بخود تھیں۔ جب حضرت اوسؓ نے ان کے سامنے ندامت کا اظہار کیا تو بولیں: ''گو تم نے طلاق نہیں دی، لیکن میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ الفاظ کہنے کے بعد میرے اور تمھارے درمیان میاں بیوی کا رشتہ باقی رہ گیا ہے یا نہیں؟ تم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جاؤ اور اس بات کا فیصلہ کراؤ۔'' حضرت اوسؓ نے کہا: ''مجھے یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کرنے سے شرم آتی ہے، خدا کے لیے تم ہی حضور ﷺ سے اس کے متعلق فتویٰ لو۔''

چنانچہ حضرت خولہؓ آنحضورؐ کی خدمت میں پہنچیں، آپ ﷺ اس وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے گھر تشریف فرما تھے۔ خولہؓ نے سارا قصہ بیان کر کے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ﷺ، میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، کیا میری اور میرے بچوں کی زندگی کو تباہی سے بچانے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''میرا خیال ہے کہ تم اس پر حرام ہو گئی ہو۔'' ایک دوسری روایت کے مطابق حضور ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے: ''اس مسئلے میں ابھی تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی حکم نہیں دیا گیا۔''

بہر حال حضور ﷺ کا جواب سن کر حضرت خولہؓ نالہ و فریاد کرنے لگیں اور بار بار

حضور ﷺ سے عرض کرنے لگیں کہ ''اوسؓ میرا ابنِ عم ہے، اس کی تُند مزاجی اور بڑھاپے کا حال حضور ﷺ پر روشن ہے، اس نے غصے میں آ کر ایسی بات کہہ دی ہے جو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ طلاق نہیں ہے۔ خدارا، کوئی ایسی صورت بتائیں کہ میری اور میرے بوڑھے شوہر اور بچوں کی زندگی تباہ ہونے سے بچ جائے۔''

سرورِ عالم ﷺ اپنی رائے پر قائم رہے، لیکن خولہؓ مایوس نہ ہوئیں اور برابر حضور ﷺ کو قائل کرنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ''اے مولائے کریم، میں تجھ سے اپنی سخت ترین مصیبت کی فریاد کرتی ہوں۔ اے اللہ جو بات ہمارے لیے رحمت کا باعث ہوا سے اپنے نبی ﷺ کی زبان سے ظاہر فرما۔'' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ یہ منظر اتنا دردناک تھا کہ میں اور گھر کے سب لوگ اشک بار ہو گئے۔ اتنے میں آپ ﷺ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی اور سورۂ مجادلہ کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں: (ترجمہ) ''اللہ نے سن لی، اس عورت کی بات جو اپنے شوہر کے معاملے میں تم سے تکرار کر رہی ہے اور اللہ سے فریاد کیے جاتی ہے۔ اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا ہے، وہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔'' اس کے بعد حضور ﷺ نے خولہؓ سے کہا کہ ایک غلام آزاد کرنا ہوگا۔ انھوں نے اس سے معذوری ظاہر کی تو فرمایا، دو مہینے کے لگاتار روزے رکھنا ہوں گے۔ انھوں نے عرض کیا کہ اوسؓ کا حال تو یہ ہے کہ دن میں تین مرتبہ کھائیں پئیں نہیں تو ان کی بینائی جواب دینے لگتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا، پھر 60 مسکینوں کو کھانا دینا پڑے گا۔ انھوں نے عرض کیا، وہ اتنی مقدرت نہیں رکھتے، الاّ یہ کہ آپ ﷺ مدد فرمائیں۔ تب آپ نے انھیں اتنی مقدار میں سامانِ خوراک عطا فرمایا جو ساٹھ آدمیوں کی دو وقت کی غذا کے لیے کافی ہو۔

ابنِ سعد کا بیان ہے کہ حضرت خولہؓ آنحضور ﷺ سے رخصت ہو کر گھر آئیں تو حضرت اوسؓ کو دروازے پر اپنا منتظر پایا۔ پوچھا، کیوں خولہ، حضور ﷺ نے کیا حکم دیا۔ خولہؓ نے سارا ماجرا بیان کیا اور کہا: ''تم بہت خوش قسمت ہو، جاؤ اور اُمّ المنذرؓ بنت قیس سے ایک اُونٹ کھجوریں لے کر ساٹھ مسکینوں پر صدقہ کرو تاکہ تمھاری قسم کا کفارہ ادا ہو جائے۔'' حضرت اوسؓ کو اس فیصلے پر بے حد خوشی ہوئی اور انھوں نے کفارہ ادا کر کے آیندہ کے لیے ایسی بات منہ سے نہ نکالنے کے عہد کیا۔

ان صحابیہؓ کی فریاد کا بارگاہِ الٰہی میں مسموع ہونا اور فوراً ہی وہاں سے ان کی فریاد رسی کے لیے فرمانِ مبارک نازل ہو جانا ایک ایسا واقعہ تھے جس کی وجہ سے صحابہ کرامؓ میں انھیں ایک خاص قدر و منزلت حاصل ہو گئی۔ بعض اہلِ سیر نے اس ضمن میں کئی واقعات بیان کیے ہیں، مثلاً ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ نے راستے میں خولہؓ کو دیکھا تو انھیں سلام کیا، حضرت خولہؓ سلام کا جواب دینے کے بعد کہنے لگیں ''او ہو، اے عمر، ایک وقت تھا جو میں نے تمھیں بازارِ عکاظ میں دیکھا تھا، اس وقت لوگ تمھیں عمیر عمیر کہہ کر پکارتے تھے اور تم لاٹھی ہاتھ میں لے کر بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ پھر کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ تم عمرؓ کہلانے لگے۔ پھر ایک وقت آیا تم امیر المومنین کہے جانے لگے۔ ذرا رعیت کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرتا ہے، اس کے لیے دور کا آدمی بھی قریبی رشتہ داروں کی طرح ہوتا ہے اور جو موت سے ڈرتا ہے، اس کے حق میں اندیشہ ہے کہ وہ اسی چیز کو کھو دے گا، جسے بچانا چاہتا ہے۔'' اس پر جارود عبدی، جو حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے، بولے: ''اے عورت، تو نے امیر المومنین کے ساتھ بہت زبان درازی کی۔'' حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''انھیں کہنے دو۔ جانتے بھی ہو، یہ کون ہیں، ان کی بات تو سات آسمانوں کے اوپر سنی گئی تھی، عمر کو تو بدرجہء اولیٰ سننی چاہیے۔''

حضرت خولہؓ بنت ثعلبہ کا سالِ وفات اور دیگر حالات معلوم نہیں۔

خولہؓ بنت حکیم

خولہ نام، ام شریک کنیت، قبیلہء سلیم سے تھیں، آنحضرت ﷺ کی خالہ ہوتی ہیں، حضرت عثمانؓ بن مظعون سے جو بڑے رُتبہ کے صحابی تھے، نکاح ہوا۔

مسلمان ہو کر مدینہ کو ہجرت کی۔ 2 ہجری میں غزوۂ بدر کے بعد حضرت عثمانؓ بن مظعون نے وفات پائی تو حضرت خولہؓ نے دوسرا نکاح نہیں کیا، اکثر پریشان رہتی تھیں۔ صحیح بخاری میں روایت آئی ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

آنحضرت سے 15 حدیثیں روایت کیں۔ راویانِ حدیث میں حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، سعید بن مسیب، بشر بن سعید، عروہ اور ربیع بن مالک داخل ہیں۔

وہ ایک نیک بی بی تھیں۔ دن کو روزہ رکھتیں اور رات کو عبادت کرتی تھیں۔ ابتدا میں زیور کا بڑا شوق تھا، چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ اگر طائف فتح ہو تو آپ ﷺ مجھے فلاں عورت کا زیور دے دیجیے گا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا، اگر خدا اس کی اجازت نہ دے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔

خنساؓ بنت عمرو

تماضر نام، خنسا، قبیلہء قیس کے خاندان سلیم سے ہیں، نجد کی رہنے والی تھیں۔ پہلا نکاح قبیلہء سلیم کے ایک شخص رواحہ بن عبدالعزیٰ سے ہوا، اس کے انتقال کے بعد مرداس بن ابو عامر کے عقد نکاح میں آئیں۔ پیری کا زمانہ تھا کہ مکہ کے افق سے ماہتابِ رسالت طلوع ہوا۔ حضرت خنساؓ کو خبر ہوئی تو اپنی قوم کے کچھ لوگوں کے ساتھ مدینہ میں آئیں اور مشرف بہ اسلام ہوئیں۔ آنحضرت ﷺ دیر تک ان کے اشعار سنتے اور تعجب کرتے رہے، یہ ہجرت کے بعد کا واقعہ ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانہء خلافت میں جب قادسیہ (عراق) میں جنگ ہوئی تو حضرت خنساؓ اپنے چار بیٹوں کو لے کر میدان میں آئیں اور انھیں مخاطب کر کے یہ نصیحت کی: ''پیارے بیٹو! تم نے اسلام اور ہجرت اپنی مرضی سے اختیار کی ہے، ورنہ تم اپنے ملک کو بھاری نہ تھے اور نہ تمھارے ہاں قحط پڑا تھا، باوجود اس کے تم اپنی بوڑھی ماں کو یہاں لائے اور فارس کے آگے ڈال دیا۔ خدا کی قسم! تم ایک ماں اور باپ کی اولاد ہو، میں نے نہ تمھارے باپ سے خیانت کی اور نہ تمھارے ماموں کو رسوا کیا۔ تم

جانتے ہو کہ دنیا فانی ہے اور کفار سے جہاد کرنے میں بڑا ثواب ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا۔ اس بنا پر صبح اٹھ کر لڑنے کی تیاری کرو اور آخر وقت تک لڑو۔'' چنانچہ بیٹوں نے ایک ساتھ باگیں اٹھائیں اور نہایت جوش میں رجز پڑھتے ہوئے بڑھے اور شہید ہوئے۔ حضرت خنساؓ کو خبر ہوئی تو خدا کا شکر ادا کیا۔

حضرت عمرؓ ان کے لڑکوں کو دو سو درہم سالانہ وظیفہ عطا کرتے تھے، ان کی شہادت کے بعد یہ رقم حضرت خنساؓ کو ملتی رہی۔

اس واقعہ کے دس برس کے بعد حضرت خنساؓ نے وفات پائی، سالِ وفات 24 ہجری ہے۔ چار لڑکے تھے جو قادسیہ میں شہید ہوئے، ان کے نام یہ ہیں: عبداللہ، ابوشجرہ (پہلے شوہر سے تھے)، زید اور معاویہ (دوسرے شوہر سے)۔

اقسامِ سخن میں سے مرثیہ میں حضرت خنساؓ اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں۔ صاحبِ اسد الغابہ میں لکھتے ہیں: ''یعنی ناقدانِ سخن کا فیصلہ ہے کہ خنساؓ کے برابر کوئی عورت شاعر نہیں پیدا ہوئی۔''

لیلائے اخیلیہ کو شعرا نے تمام شاعر عورتوں کا سرتاج تسلیم کیا ہے، تاہم اس میں بھی حضرت خنساؓ مستثنیٰ رکھی گئی ہیں۔ بازارِ عکاظ میں جو شعرائے عرب کا سب سے بڑا مرکز تھا، حضرت خنساؓ کو یہ امتیاز حاصل تھا کہ ان کے خیمے کے دروازے پر ایک علم نصب ہوتا تھا، جس پر یہ الفاظ لکھے تھے، ارثی العرب یعنی عرب میں سب سے بڑی مرثیہ گو۔ نابغہ جو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا شاعر تھا، اسے حضرت خنساؓ نے اپنا کلام سنایا تو بولا کہ ''اگر میں ابوبصیر (اعشیٰ) کا کلام نہ سن لیتا تو تجھ کو تمام عالم میں سب سے بڑا شاعر تسلیم کرتا۔''

حضرت خنساؓ ابتدا میں ایک دو شعر کہتی تھیں لیکن صخر کے مرنے سے انھیں جو صدمہ پہنچا، اس نے ان کی طبیعت میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا، چنانچہ کثرت سے مرثیہ لکھے ہیں۔ ان کا دیوان بہت ضخیم ہے۔ 1888ء میں بیروت میں مع شرح کے چھاپا گیا ہے۔ اس میں حضرت خنساءؓ کے ساتھ ساٹھ عورتوں کے اور بھی مرثیے شامل ہیں۔ 1889ء میں اس کا فرنچ زبان میں ترجمہ ہوا اور دوبارہ طبع کیا گیا۔

دُرّہؓ بنت ابی لہب

آنحضور ﷺ کے چچا (اور دشمنِ اسلام) ابولہب کی بیٹی تھیں۔ ان کا نکاح حضور ﷺ کے چچازاد بھائی نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کے فرزند حارث سے ہوا۔ ان کے صلب سے تین بیٹے عقبہ، ولید اور ابومسلم پیدا ہوئے۔ ان کے شوہر اور خسر نے غزوۂ خندق سے پہلے اسلام قبول کیا۔ خسر (نوفلؓ بن حارث) نے ہجرت کا شرف حاصل کیا لیکن شوہر (حارث بن نوفل اس سعادت سے محروم رہے۔ البتہ حضرت دُرّہؓ نے ہجرت کی۔ جب وہ مدینہ پہنچ کر حضرت رافعؓ بن معلیٰ زرقی کے گھر اتریں، بنو زریق کی عورتیں ان سے ملنے آئیں اور کہا: ''تم کیا اسی ابولہب کی بیٹی ہو، جس کے بارے میں سورۃ تبت یدا ابی لہب نازل ہوئی، تمھیں ہجرت کا کیا ثواب ملے گا''؟

حضرت دُرّہ کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوا اور انھوں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ بیان کیا۔ حضور ﷺ نے انھیں تسلی دی اور کچھ دیر ٹھہرنے کا حکم دیا۔ پھر ظہر کی نماز پڑھ کر منبر پر رونق افروز ہوئے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''لوگو! تم میں سے بعض میرے خاندان کے بارے میں میری دل آزاری کرتے ہیں، حالانکہ خدا کی قسم، میرے اقربا کو میری شفاعت ضرور پہنچے گی، یہاں تک کہ صد، حکم اور سلہب (تین قبائل جن سے حضور ﷺ کی دور کی قرابت تھی) بھی اس سے مستفید ہوں گے۔''

حضرت دُرّہؓ سے کئی احادیث مروی ہیں، دو مشہور احادیث یہ ہیں:۔

ایک دفعہ کسی نے آنحضور ﷺ سے دریافت کیا کہ لوگوں میں بہتر کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس میں تقویٰ زیادہ ہو، جو لوگوں کو اچھے کاموں کا حکم کرتا، بُرے کاموں سے روکتا اور صلہء رحمی کرتا ہو۔''

رسول کریم ﷺ نے فرمایا ہے: ''کسی مردہ کے اعمال کے بدلے کسی زندہ کو اذیت نہیں دی جاسکتی۔''

حضرت دُرّہؓ کا سالِ وفات اور مزید حالات معلوم نہیں۔

ربیعؓ بنت معوذ

ربیع نام، قبیلہء خزرج کے خاندان نجار سے ہیں، سلسلہء نسب یہ ہے:۔ ربیع بنت معوذ بن حارث، والدہ کا نام ام تذید تھا، جو قیس بن زعورا کی بیٹی تھیں۔ حضرت ربیعؓ اور ان کے تمام بھائی عفرا کی اولاد مشہور ہیں، عفرا ان لوگوں کی دادی تھیں، ہجرت سے قبل مسلمان ہوئیں۔

یاس بن بکر لیثی سے شادی ہوئی۔ صبح کو آنحضرت ﷺ ان کے گھر تشریف لائے اور بستر پر بیٹھ گئے، لڑکیاں دف بجا بجا کر شہنشائے بدر کے مناقب میں اشعار پڑھ رہی تھیں، اس ضمن میں آنحضرت ﷺ کی شان میں بھی کچھ اشعار پڑھے جن میں ایک مصرع یہ تھا: ''اور ہم میں وہ نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔'' آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ یہ نہ کہو (اور اس کے سوا جو کہتی ہو، کہو)۔

غزوات میں شرکت کرتی تھیں، زخمیوں کا علاج کراتیں، لوگوں کو پانی پلاتی، مقتولوں کو مدینہ پہنچاتی اور فوج کی خدمت کرتی تھیں۔ غزوۂ حدیبیہ میں بھی موجود تھیں، جب بیعتِ رضوان کا وقت آیا تو انھوں نے بھی آ کر بیعت کی۔

35 ہجری میں اپنے شوہر سے علیحدہ ہوئیں، شرط یہ تھی کہ جو کچھ میرے پاس ہے، اسے لے کر مجھ سے دست بردار ہو جاؤ۔ چنانچہ اپنا تمام سامان انھیں دے دیا، صرف ایک کرتی رہنے دی، لیکن شوہر کو یہ بھی گوارا نہ ہوا، جا کر حضرت عثمانؓ کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا۔ چوں کہ ربیع نے کل چیزوں کی شرط کی تھی، حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ تمھیں اپنا وعدہ پورا کرنا چاہیے اور شوہر سے فرمایا کہ تم ان کے جُوڑا باندھنے کی دھجی تک لے سکتے ہو۔

حضرت ربیعؓ سے 21 حدیثیں مروی ہیں۔ علمی حیثیت سے ان کا یہ پایہ تھا کہ

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت زین العابدینؒ ان سے مسائل دریافت کرتے تھے۔

جوشِ ایمان اس سے ظاہر ہے کہ ایک مرتبہ اسما بنت مخربہ جو ابو ربیعہ مخزومی کی بیوی تھی اور عطر بیچتی تھی، چند عورتوں کے ساتھ ربیعؓ کے گھر آئی اور ان کا نام ونسب دریافت کیا۔ چوں کہ ربیعؓ کے بھائی نے ابوجہل کو بدر میں قتل کیا تھا اور اسما قریش کے قبیلے سے تھی، بولیں تو تم ہمارے سردار کے قاتل کی بہن ہو؟ حضرت ربیعؓ کو ابوجہل کی نسبت سردار کا لفظ نہایت ناگوار ہوا، بولیں، سردار نہیں بلکہ ''غلام کے قاتل کی بہن ہوں''۔ اسما کو ابوجہل کی شان میں یہ گستاخی پسند نہ آئی، جھنجھلا کر کہا کہ ''مجھے تمھارے ہاتھ سودا بیچنا حرام ہے۔'' حضرت ربیعؓ نے برجستہ کہا ''مجھے تم سے کچھ خریدنا حرام ہے، کیوں کہ تمھارا عطر، عطر نہیں بلکہ گندگی ہے۔''

آنحضرت ﷺ سے بے انتہا محبت تھی۔ آپ ان کے گھر تشریف لے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ ﷺ تشریف لائے اور ان سے وضو کے لیے پانی مانگا، ایک دو مرتبہ طباقوں میں چھوہارے اور انگور لے کر گئیں تو آپ ﷺ نے زیور یا سونا مرحمت فرمایا۔ آنحضرت ﷺ کا ایک مرتبہ کسی نے حلیہ پوچھا تو بولیں، بس یہ سمجھ لو کہ آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

زینبؓ بنت عبداللہ

زینب نام، رائطہ عرف، قبیلہء ثقیف سے تھیں۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے نکاح ہوا۔ چوں کہ ان کا کوئی ذریعہء معاش نہ تھا اور زینبؓ دست کار تھیں، اس لیے اپنے شوہر اور اولاد کی خود کفیل ہوئیں۔ ایک دن کہنے لگیں کہ تم نے اور تمھاری اولاد نے مجھے صدقہ وخیرات سے روک رکھا ہے، جو کچھ کماتی ہوں، تمھیں کھلا دیتی ہوں، بھلا اس میں میرا کیا فائدہ؟ حضرت ابن مسعودؓ نے جواب دیا تم اپنے فائدہ کی صورت نکال لو، مجھے تمھارا نقصان منظور نہیں۔ حضرت زینبؓ حضور ﷺ کے پاس پہنچیں اور عرض کی کہ میں دستکار ہوں اور جو کچھ اس ذریعہ سے حاصل کرتی ہوں، شوہر اور بال بچوں پر صرف ہو جاتا ہے کیوں کہ میرے شوہر کا کوئی ذریعہء معاش نہیں ہے، اس بنا پر میں محتاجوں کو صدقہ نہیں دے سکتی، اس حالت میں کیا مجھے کچھ ثواب ملتا ہے؟ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''ہاں، تمھیں ان کی خبر گیری کرنا چاہیے۔''

ابوعبیدہ جو اپنے زمانہ کے مشہور محدث گزرے ہیں، حضرت زینبؓ کے نورِ نظر تھے۔ انھوں نے آنحضرت ﷺ، حضرت عمرؓ اور ابن مسعودؓ سے چند حدیثیں روایت کیں۔ بارگاہِ نبوت میں انھیں مخصوص درجہ حاصل تھا، اکثر آپ ﷺ کے مکان میں آتی جاتی تھیں۔ ایک دن وہ آپ ﷺ کے سر میں جوئیں دیکھ رہی تھیں، مہاجرین کی عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں، ایک مسئلہ پیش ہوا تو انھوں نے اپنا کام چھوڑ کر بولنا شروع کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا تم آنکھ سے نہیں بولتی ہو، کام بھی کرو اور گفتگو بھی۔

زینبؓ بنت علیؓ

حضرت فاطمہؓ بنتِ رسول ﷺ کی بیٹی، ان کی ولادت 5 جمادی الاولیٰ (5 یا 6 ہجری) کو ہوئی۔ وہ حضرت علیؓ کی صاحب زادیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ رسول اللہ کا بھرا گھر، حضرتِ زینبؓ کا خاندان تھا۔ نانا محمد مصطفیٰ ﷺ، والد حضرت علیؓ، والدہ فاطمۃ الزہراؓ اور بھائی حسنؓ وحسینؓ تھے۔ ولادت کے بعد آنحضور ﷺ نے ان کا نام زینب رکھا۔ ساتویں دن حضور ﷺ نے عقیقہ فرمایا۔ حضرت زینبؓ نے انتہائی پاکیزہ وارفع ماحول میں چھے سات سال گزارے۔ پھر اپنے نانا، پھر اپنی والدہ کی جدائی کا داغ دیکھا۔

حضرت زینبؓ اپنی والدہ کے بعد خاندان میں حضرت علیؓ کی سب سے بڑی صاحب زادی ہونے کی بنا پر گھر کے تمام معاملات کی ذمہ دار قرار پائیں۔ دینی معاملات اور گھریلو مشاغل میں ہر ایک کی نظر ان پر جاتی تھی۔ ان دنوں ہر شخص حضرت فاطمہؓ کی اولاد کی زیادہ سے زیادہ عزت کرتا تھا۔ اس گھرانے میں تعلیماتِ رسول ﷺ کا عملی چرچا تھا۔ امام حسینؓ اپنی ہم شیر کی تعظیم فرماتے۔ جب وہ آتی تھیں تو کھڑے ہو جاتے اور اپنی جگہ بٹھاتے تھے۔

زینبؓ کے لیے رشتے کا سوال اٹھا تو حضرت علیؓ نے ہر درخواست کو مسترد کر کے اپنے بڑے بھائی حضرت جعفر طیارؓ کے فرزند عبداللہ کو دامادی کا شرف بخشا اور وہی مہر مقرر فرمایا جو حضرت فاطمہؓ کا مہر تھا۔ جناب عبداللہ بن جعفرؓ عرب کے مشہور جواد وکریم اور حضرت علیؓ کے جاں نثار تھے۔ حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے جو اولاد ہوئی، ان کے نام یہ ہیں:۔ علی، عون اکبر، عباس، اُمِ کلثوم، جعفر اکبر، محمد۔ ان حضرات میں جناب علی کی اولاد باقی رہی اور زینبی کہلائی۔ عون اکبر اور محمد، دو فرزند کربلا میں شہید ہوئے۔

حضرت زینبؓ واقعہ کربلا کے بعد دمشق میں اہلِ بیت کے ساتھ رہیں۔ پھر مدینے تشریف لے گئیں۔ انھوں نے کب وفات پائی، یہ سوال محلِ بحث ہے۔ ایک روایت کے مطابق 15 رجب 62 ہجری تاریخ وفات ہے۔

حضرت زینبؓ کو ''عقیلہء بنی ہاشم'' کہا جاتا ہے۔ اُمِ کلثوم واُمُ الحسن ان کی کنیت تھی۔ صدیقہء صُغریٰ ان کا لقب ہے۔ ان کی عظمت یہ بھی ہے کہ محدثین حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہوئے انھیں ''ابی زینب'' سے یاد کرتے تھے۔ یہ القاب شرف وعظمت کا مظہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جس آغوش میں پرورش پائی، اس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا۔ وحی وحدیث، اسلام اور ایمان کے گھر میں زندگی بسر کرنے والی سیّدہ کی عظمت یہ تھی کہ امام زین العابدینؒ نے فرمایا تھا (ترجمہ): ''اللہ کا شکر ہے کہ آپ وہ عالمہ ہیں جو استاد کی محتاج نہیں اور وہ صاحبِ ذہن رسا ہیں کہ سمجھانے والے کی حاجت مند نہیں۔ استقامت، عبادت، ایثار، جہاد اور حمایتِ دین کا جو مظاہرہ آپ نے فرمایا، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ان کا اپنے بھائی امام حسینؓ کے ساتھ مکے سے مدینے اور مدینے سے کربلا تک سفر، کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ پھر دس محرم 61 ہجری کو امام حسینؓ کی امداد اور بھرے گھر کے شہید ہو جانے کے بعد یتیموں، بیواؤں، بچوں، جوانوں، عورتوں اور مردوں کی نگرانی، دشمنوں کے مقابلے میں صبر وتحمل کا مظاہرہ، لٹے ہوئے قافلے کا قید ہونا اور کوفے میں ان کی لاجواب تقریریں اور عبیداللہ بن زیاد کی گستاخیوں کا جواب، اس کے بعد شام کا سفر، شام کے بازار اور یزید کے دربار میں اپنی حقانیت اور واقعاتِ

کربلا کا اعلان، فصیح وبلیغ خطبے اور برجستہ جوابات، ایسا معلوم ہوتا ہے حضرت علیؓ خطبے دے رہے ہیں۔ امام زین العابدینؒ کو ابن زیاد کے بے رحم ہاتھوں سے زندہ بچالانا بھی ان کی زندگی کا اہم کارنامہ ہے۔

دمشق سے رہا ہو کر مدینے تشریف لائیں تو واقعاتِ کربلا کو مؤثر انداز میں بیان فرمایا۔ ایک خاتون عالی نسب نے، جس کا پورا خاندان شہید ہو چکا تھا، جو طویل سفر اور شدید تکلیفوں کے بعد جابر حکمرانوں کے سامنے اظہارِ حق کرتی رہیں، خواتینِ عالم کے لیے درخشاں مثال پیش کی ہے، اور پھر ان کا دشمنوں کو رسوا کر کے پورے قافلے کو بچا لے جانا، عورتوں کے لیے فتح مندی، حق گوئی اور توکل وجہاد کی قابلِ تقلید مثال ہے۔

سخاوت کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب سیّدہ مدینے کے قریب پہنچیں تو انھوں نے لُوٹ کے واپس شدہ زیور اور سامان میں سے قیمتی چیزیں اُس شخص کو دیں جو شام سے مدینے تک بطور محافظ ساتھ آیا تھا اور معذرت فرمائی کہ ہمارے پاس مالِ دنیا سے کچھ نہیں، ورنہ ہم اور خدمت کرتے۔

سمیہؓ بنت خباط

اسلام کی پہلی شہید، خباط کی بیٹی اور حضرت عمار بن یاسرؓ کی والدہ ہیں، ابوحذیفہ بن مغیرہ مخزومی کی کنیز تھیں۔ یاسر عبسی سے کہ ابوحذیفہؓ کے حلیف تھے، نکاح ہوا۔ حضرت عمارؓ پیدا ہوئے تو ابوحذیفہؓ نے انھیں آزاد کر دیا۔

ایامِ پیری میں مکہ سے اسلام کی صدا بلند ہوئی تو حضرت سمیہؓ، یاسرؓ اور عمارؓ تینوں نے اس دعوت کو لبیک کہا۔ تاریخ میں ہے کہ حضرت سمیہؓ کا اسلام قبول کرنے والوں میں ساتواں نمبر تھا۔ کچھ دن اطمینان سے گزرے تھے کہ قریش کا ظلم وستم شروع ہو گیا اور بتدریج بڑھتا گیا۔ چنانچہ جو شخص، جس مسلمان پر قابو پاتا، طرح طرح کی دردناک تکلیفیں دیتا تھا۔ حضرت سمیہؓ کو بھی خاندانِ مغیرہ نے شرک پر مجبور کرنا چاہا لیکن وہ اپنے عقیدہ پر نہایت شدت سے قائم رہیں، جس کا صلہ یہ ملا کہ انھیں مکہ کی جلتی تپتی ریت پر لوہے کی زِرہ پہنا کر دھوپ میں کھڑا کرتے تھے لیکن ان کے عزم واستقلال کے چھینٹوں کے سامنے یہ آتش کدہ سرد پڑ جاتا تھا۔ آنحضرت ﷺ ادھر سے گزرتے تو یہ حالت دیکھ کر فرماتے: ''آلِ یاسر! صبر کرو، اس کے عوض تمھارے لیے جنت ہے۔''

دن بھر اس مصیبت میں رہ کر شام کو نجات ملتی تھی۔ ایک مرتبہ شب کو گھر آئیں تو ابوجہل نے انھیں گالیاں دینا شروع کیں اور پھر اس کا غصہ اس قدر تیز ہوا کہ اٹھ کر ایسی برچھی ماری کہ حضرت سمیہؓ جاں بحق تسلیم ہو گئیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔

حضرت عمارؓ کو اپنی والدہ کی اس بے کسی پر سخت افسوس تھا، آنحضرت ﷺ سے آ کر کہا کہ اب حد ہو گئی۔ آنحضرت ﷺ نے صبر کی تاکید فرمائی اور کہا: ''خداوندا! آلِ یاسر کو جہنم سے بچا۔'' یہ واقعہ ہجرتِ نبوی سے قبل کا ہے، اس بنا پر حضرت سمیہؓ اسلام میں سب سے پہلے شہید ہوئیں۔

غزوۂ بدر میں ابوجہل مارا گیا تو آنحضرت ﷺ نے حضرت عمارؓ سے فرمایا: ''دیکھو تمھاری ماں کے قاتل کا خدا نے فیصلہ کر دیا۔''

شفاؓ بنت عبداللہ

شفا نام، قبیلۂ قریش کے خاندان عدوی سے ہیں، والدہ کا نام فاطمہ بنت وہب، ابوحثمہ بن حذیفہ عدوی سے نکاح ہوا اور ہجرت سے قبل مسلمان ہوئیں۔

آنحضرت ﷺ سے انھیں بہت محبت تھی، آپ ﷺ کبھی ان کے گھر تشریف لا جاتے تو آرام فرماتے تھے۔ انھوں نے علیحدہ ایک بچھونا اور ایک تہ بند رکھ چھوڑا تھا۔ چوں کہ ان میں آنحضرت ﷺ کا پسینا جذب ہوتا تھا، یہ بڑی متبرک چیزیں تھیں۔ حضرت شفاؓ کے بعد ان کی اولاد نے ان تبرکات کو نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا لیکن مروان نے ان سے یہ سب چیزیں لے لیں۔

آنحضرت ﷺ نے انھیں ایک مکان بھی عنایت فرمایا تھا اور وہ اپنے بیٹے کے ساتھ اسی میں سکونت پزیر تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں ان کے ساتھ خاص رعایتیں کیں، چنانچہ ابن سعد میں ہے: ''حضرت عمرؓ انھیں رائے میں مقدم رکھتے، ان کی فضیلت کی رعایت کرتے اور انھیں بازار کا اہتمام سپرد کرتے تھے۔''

زمانۂ جاہلیت میں دو چیزوں میں مشہور تھیں، جھاڑ پھونک اور لکھنا۔ جھاڑ پھونک کے متعلق آنحضرت ﷺ سے انھوں نے استفسار کیا تھا، آنحضرت ﷺ نے اجازت دی تھی اور فرمایا تھا کہ حفصہؓ کو بھی سکھا دو۔ لکھنے کے متعلق بھی یہی ارشاد ہوا تھا۔ چیونٹی کے کاٹے میں یہ منتر پڑھتی تھیں "بسم الله صلوا صلب جبرا تعوذا من اُتوا هما فلا تضر احدا اللّٰهم اكشف الباس رب الناس ."

حضرت شفاؓ نے آنحضرت ﷺ اور حضرت عمرؓ سے چند حدیثیں روایت کی ہیں جن کی تعداد صاحبِ خلاصہ کے نزدیک بارہ ہے۔ راویوں میں ان کے بیٹے اور دو پوتے ابوبکر وعثمانؒ اور ابوسلمہ، حضرت حفصہؓ اور ابواسحاق شامل ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ انھیں بلا کر ایک چادر عنایت کی اور عاتکہ بنت اسید کو ان سے بہتر چادر دی تو بولیں، تمھارے ہاتھ غبار آلود ہوں، انھیں مجھ سے بہتر چادر دی حالانکہ میں ان سے پہلے مسلمان ہوئی، تمھاری بنتِ عم بھی ہوں، اس کے علاوہ تم نے مجھے طلب کیا تھا اور یہ خود چلی آئیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ میں تمھیں عمدہ دیتا لیکن جب یہ آ گئیں تو مجھے ان کی رعایت کرنا پڑی کیوں کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے نسب میں قریب تر ہیں۔

صفیہؓ بنت عبدالمطلب

صفیہ نام، عبدالمطلب جد رسول اللہ ﷺ کی دختر تھیں، ماں کا نام ہالہ بنت وہب تھا جو حضرت آمنہ (آنحضرت ﷺ کی والدہ ماجدہ) کی ہم شیر ہیں، اس بنا پر حضرت صفیہؓ آنحضرت ﷺ کی پھوپھی ہونے کے ساتھ آپ کی خالہ زاد بہن بھی تھیں۔ حضرت حمزہؓ عم رسول اللہ ﷺ بھی ہالہ سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے وہ اور حضرت صفیہؓ حقیقی بھائی بہن تھے۔

ابوسفیان بن حرب کے بھائی حارث سے شادی ہوئی، جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کے انتقال کے بعد حضرت خدیجہؓ کے بھائی عوام بن خویلد سے نکاح ہوا، جس

سے حضرت زبیرؓ پیدا ہوئے۔

چالیس برس کی عمر ہوئی تو آنحضرت ﷺ مبعوث ہوئے۔ اپنے بھتیجے کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

حضرت زبیرؓ کے ساتھ ہجرت کی۔ غزوۂ اُحد میں جب مسلمانوں نے شکست کھائی تو وہ مدینہ سے نکلیں، صحابہؓ سے عتاب آمیز لہجہ میں کہتی تھیں کہ ''رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کے چل دیئے''؟ آنحضرت ﷺ نے انھیں آتے ہوئے دیکھا تو حضرت زبیرؓ کو بلا کر ارشاد کیا کہ حمزہؓ کی لاش نہ دیکھنے پائیں۔ حضرت زبیرؓ نے آنحضرت ﷺ کا پیغام سنایا۔ بولیں کہ میں اپنے بھائی کا ماجرا سن چکی ہوں لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اجازت دی، لاش پر گئیں، خون کا جوش تھا، عزیز بھائی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے، لیکن انا للہ و انا الیہ راجعون کہہ کر چپ ہوگئیں اور مغفرت کی دعا کی۔ واقعہ چوں کہ نہایت دردانگیز تھا، اس لیے ایک مرثیہ کہا، جس کے ایک شعر میں آنحضرت ﷺ کو اس طرح مخاطب کرتی ہیں:

ان یوما اتی علیك لیوم
کورت شمسه و کان مضیاء

''آج آپ ﷺ پر وہ دن آیا ہے جس میں آفتاب سیاہ ہوگیا ہے، حالانکہ پہلے وہ روشن تھا۔''

غزوۂ اُحد کی طرح غزوۂ خندق میں بھی انھوں نے نہایت ہمت اور استقلال کا ثبوت دیا۔ انصار کے قلعوں میں فارع سب سے مستحکم قلعہ تھا اور حضرت حسانؓ کا تھا۔ یہ قلعہ یہود بنو قریظہ کی آبادی سے متصل تھا، مستورات اسی میں تھیں اور ان کی حفاظت کے لیے حضرت حسانؓ (شاعر) متعین کر دیے گئے تھے۔ یہود نے یہ دیکھ کر کہ تمام جمعیت آنحضرت ﷺ کے ساتھ ہے، قلعہ پر حملہ کر دیا۔ ایک یہودی قلعہ کے پھاٹک تک پہنچ گیا اور قلعہ پر حملہ کرنے کا موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ حضرت صفیہؓ نے دیکھ لیا، حسانؓ سے کہا کہ اُتر کر قتل کر دو ورنہ یہ جا کر دشمنوں کو پتا دے گا۔ حضرت حسانؓ کو ایک عارضہ ہوگیا تھا جس نے ان میں اس قدر جبن پیدا کر دیا تھا کہ وہ لڑائی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی بنا پر اپنی معذوری ظاہر کی اور کہا کہ میں اس کام کا ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا؟ حضرت صفیہؓ نے خیمہ کی ایک چوب اکھاڑ لی اور اُتر کر یہودی کے سر پر اس زور سے ماری کہ سر پھٹ گیا۔ حضرت صفیہؓ چلی آئیں اور حسانؓ سے کہا کہ ہتھیار اور کپڑے چھین لاؤ۔ حسانؓ نے کہا جانے دیجیے، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت صفیہؓ نے کہا اچھا جاؤ، اس کا سر کاٹ کر قلعہ کے نیچے پھینک دو تا کہ یہودی مرعوب ہو جائیں، لیکن یہ خدمت بھی حضرت صفیہؓ ہی کو انجام دینا پڑی۔ یہودیوں کو یقین ہوا کہ قلعہ میں بھی کچھ فوج متعین ہے، اس خیال سے پھر انھوں نے حملے کی جرأت نہ کی۔

11ہجری میں آنحضرت ﷺ نے انتقال فرمایا، حضرت صفیہؓ کو جو صدمہ ہوا ہو گا، ظاہر ہے، نہایت پُر درد مرثیہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے:

لفقد رسول الله اذهان یومه
فیا عین جودی بالدموع السواجم

''رسول اللہ کی وفات پر اے آنکھ خوب آنسو بہا۔''

حضرت صفیہؓ نے 20 ہجری میں وفات پائی اور بقیع میں دفن ہوئیں، اس وقت تہتر برس کا سن تھا۔

فاطمہؓ بنت اسد

فاطمہ نام، اسد بن ہاشم کی بیٹی اور عبدالمطلب جد رسول اللہ ﷺ کی بھتیجی تھیں اور آنحضور ﷺ کی چچی تھیں۔ ابو طالب بن عبدالمطلب سے نکاح ہوا، جن سے حضرت علیؓ پیدا ہوئے۔

آغاز اسلام میں خاندان ہاشم نے آنحضرت ﷺ کا سب سے زیادہ ساتھ دیا تھا اور ان میں اکثر مسلمان بھی ہو گئے تھے۔ حضرت فاطمہؓ بھی انھی لوگوں میں شامل تھیں اور گو ان کے شوہر ایمان نہیں لائے، تاہم وہ اور ان کی بعض اولاد مشرف بہ اسلام ہوئی۔ جب ابو طالب کا انتقال ہوا تو ان کے بجائے حضرت فاطمہؓ آنحضور ﷺ کی دست و بازو بنیں۔

جب مسلمان ہو کر ہجرت کی اجازت ملی تو حضرت فاطمہؓ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی، یہاں تک کہ حضرت علیؓ کا حضرت فاطمہؓ زہرا سے عقد ہوا تو حضرت علیؓ نے اپنی والدہ (حضرت فاطمہ بنت اسد) سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ کی صاحب زادی آتی ہیں۔ میں پانی بھروں اور باہر کا کام کروں گا اور وہ چکی پیسنے اور آٹا گوندھنے میں آپ کی مدد کریں گی۔

آنحضرت ﷺ کی زندگی میں وفات پائی۔ بعض کا خیال ہے کہ ہجرت سے قبل فوت ہوئیں، لیکن یہ صحیح نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی قمیص اُتار کر کفن دیا اور قبر میں اُتر کر لیٹ گئے، لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ ابو طالب کے بعد ان سے زیادہ میرے ساتھ کسی نے سلوک نہیں کیا تھا، اس بنا پر مَیں نے انھیں قمیص پہنائی کہ جنت میں انھیں جگہ ملے اور قبر میں لیٹ گیا کہ شدائد قبر میں کمی ہو۔

حسب ذیل اولاد چھوڑی، حضرت علیؓ، حضرت جعفر طیارؓ، طالب اور عقیل۔ اصابہ میں ہے: ''وہ نہایت صالح بی بی تھیں، آنحضرت ﷺ ان کی زیارت کو تشریف لاتے اور ان کے گھر میں آرام کرتے تھے۔''

فاطمہؓ بنت خطاب

فاطمہ نام، ام جمیل کنیت، حضرت عمرؓ کی ہم شیر ہیں۔ حضرت سعیدؓ بن زید سے نکاح ہوا اور انھی کے ساتھ مسلمان ہوئیں، یہ اوائل اسلام کا واقعہ ہے۔ ان کے کچھ دنوں کے بعد ان کے بھائی یعنی حضرت عمرؓ مسلمان ہوئے اور انھی کے سبب سے ہوئے۔ اس کا قصہ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے خود بیان کیا ہے، یہ ہے کہ حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ کے مسلمان ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ کے پاس جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک مخزومی صحابیؓ سے ملاقات ہوئی۔ پوچھا کہ تم نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر

ﷺ کا مذہب اختیار کیا ہے؟ بولے ہاں، لیکن پہلے اپنے گھر کی خبر لو، تمھاری بہن اور بہنوئی نے بھی محمد ﷺ کا مذہب قبول کرلیا ہے۔ حضرت عمرؓ سیدھے بہن کے گھر پہنچے، دروازہ بند تھا اور وہ قرآن پڑھ رہی تھیں، ان کی آہٹ پا کر چپ ہوگئیں اور قرآن کے اجزا چھپادیے لیکن آواز ان کے کان میں پڑ چکی تھی، پوچھا کہ یہ آواز کیا تھی؟ انھوں نے کہا کچھ نہیں، بولے میں سُن چکا ہوں کہ تم دونوں مُرتد ہوگئے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی سے دست و گریباں ہوگئے۔ حضرت فاطمہؓ بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبر لی، بال پکڑ کر گھسیٹے اور اس قدر مارا کہ ان کا بدن لہولہان ہوگیا۔ اسی حالت میں ان کی زبان سے نکلا، عمر! جو ہوسکے کرو، لیکن اب اسلام دل سے نہیں نکل سکتا، ان الفاظ نے حضرت عمرؓ کے دل پر ایک خاص اثر کیا، بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا، ان کے بدن سے خون جاری تھا۔ یہ دیکھ کر اور بھی رقت ہوئی، فرمایا کہ تم لوگ جو پڑھ رہے تھے، مجھے بھی سناؤ۔ فاطمہؓ نے قرآن کے اجزا لاکر سامنے رکھ دیے، حضرت عمرؓ انھیں پڑھتے جاتے تھے اور ان پر رعب چھاتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ایک آیت پر پہنچ کر پکار اٹھے، اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدًا رسول الله۔

اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کی۔ وفات کا سنہ اور مہینا معلوم نہیں۔ ایک لڑکا چھوڑا، عبدالرحمٰن نام تھا۔

فاطمہؓ بنتِ قیس

فاطمہ نام، ابوعمرو بن حفص بن مغیرہ سے نکاح ہوا، اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لائیں اور ہجرت کی۔

10 ہجری میں حضرت علیؓ ایک لشکر لے کر یمن گئے تھے، ابوعمرو بھی ان کے ساتھ تھے، چلتے وقت عیاش بن ابی ربیعہ کی معرفت اپنی بیوی کو آخری طلاق (دو طلاق پہلے دے چکے تھے) اور پانچ پانچ صاع جو اور خرمے بھیجے۔ حضرت فاطمہؓ نے کھانے اور مکان کا مطالبہ کیا تو عیاش نے کہا کہ جو کچھ دیا گیا، محض احسان ہے، ورنہ ہمارے ذمہ یہ بھی ضروری نہیں، اس جواب پر فاطمہؓ کو غصہ آیا اور اپنے کپڑے لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں گئیں۔ خالد بن ولیدؓ وغیرہ بھی پہنچے۔ آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ انھوں نے تمھیں کتنی مرتبہ طلاق دی۔ بولیں، تین مرتبہ۔ فرمایا: ''اب تمھیں نفقہ نہیں مل سکتا۔ تم ام سریکؓ کے ہاں عدت کے دن پورے کرو۔'' لیکن چوں کہ ام شریکؓ کے اعزہ واقارب ان کے مکان میں آتے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابن ام مکتومؓ نابینا اور تمھارے ابن عم ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ تم ان کے ہاں رہو۔'' عدت کا زمانہ پورا ہوا تو ہر طرف سے پیغام آئے۔ امیر معاویہؓ، ابوجہل اور اسامہ بن زیدؓ نے بھی پیام دیا لیکن آنحضرت ﷺ نے پہلے دوشخصوں کا پیغام اس لیے مسترد کردیا کہ اول الذکر مفلس اور دوسرے تندمزاج تھے۔ پھر فاطمہؓ سے فرمایا کہ تم اسامہ سے نکاح کرلو، چوں کہ فاطمہؓ کو خیال تھا کہ خود آنحضرت ﷺ انھیں اپنی زوجیت کا شرف عطا فرمائیں گے، اس لیے انکار کیا۔ ارشاد ہوا: ''خدا اور رسول کی اطاعت کرو، اس میں تمھارے لیے بھلائی ہے۔'' یہ سن کر فاطمہؓ مجبور ہوئیں اور حضرت اسامہؓ سے نکاح کر لیا، کہتی ہیں کہ پھر میں قابلِ رشک بن گئی۔

23 ہجری میں حضرت عمرؓ نے انتقال کیا تو مجلسِ شوریٰ کا اجلاس فاطمہ ہی کے مکان میں ہوتا تھا۔

54 ہجری میں حضرت اسامہؓ نے انتقال فرمایا، فاطمہؓ کو سخت صدمہ ہوا، دوسری شادی نہیں کی اور اپنے بھائی ضحاک کے ساتھ رہیں۔ جب یزید نے اپنے عہدِ حکومت میں انھیں عراق کا گورنر مقرر کیا، تو فاطمہؓ بھی ان کے ساتھ کوفہ چلی آئیں اور یہیں سکونت اختیار کی۔

وفات کا سال معلوم نہیں، حضرت ابن زبیرؓ کے زمانۂ خلافت تک زندہ تھیں۔

حضرت سعیدؓ بن زید کی صاحب زادی، عبداللہ بن عمرو (ابن عثمان) کو منسوب تھیں، انھوں نے انھیں تین طلاقیں دیں، فاطمہؓ ان کی خالہ ہوتی تھیں، کہلا بھیجا کہ میرے گھر چلی آؤ۔ مروان نے قبیصہ کو بھیجا کہ فاطمہؓ سے سبب دریافت کرو۔ قبیصہ نے آکر کہا کہ آپ ﷺ ایک عورت کو ایام عدت گزرنے سے قبل کیوں گھر سے نکالتی ہیں۔ بولیں، اس لیے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے یہی حکم دیا تھا، اس کے بعد اپنا واقعہ بیان کیا اور اس کی قرآن مجید کی سورۂ طلاق کی آیات سے تائید کی۔ ''جب تم عورتوں کو طلاق دو تو انھیں عدت کے وقت تک طلاق دو اور عدت کو شمار کرو اور خدا سے ڈرو اور انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ نکلیں، مگر یہ کہ کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوں۔'' اس بنا پر تین مرتبہ کے بعد پھر کسی صورت کا احتمال نہیں ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ چوں کہ تمھارے نزدیک عورت جب تک حاملہ نہ ہو، اس کا نفقہ نہ دینا چاہیے، اس لیے اسے روک رکھنا بالکل بیکار ہے (جب مروان کو حضرت فاطمہؓ کی اس گفتگو کی اطلاع ہوئی تو کہا کہ یہ ایک عورت کی بات ہے اور ان مطلقہ خاتون کو حکم دیا کہ اپنے گھر واپس آئیں، چنانچہ وہ واپس آئیں اور وہیں عدت گزاری)۔

حضرت فاطمہؓ نے آنحضرت ﷺ سے چند حدیثیں روایت کی ہیں، جو متعدد اشخاص کے ذریعہ سے مروی ہیں۔

ہندؓ بنت عتبہ

ہند نام، قبیلۂ قریش سے تھیں، سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ ابن عبدشمس ابن عبدمناف۔ ہند کا باپ قریش کا سب سے معزز رئیس تھا۔ فاکہ بن مغیرہ مخزومی سے نکاح ہوا لیکن پھر کسی وجہ سے جھگڑا ہوگیا تو ابوسفیان ابن حرب کے عقد میں آئیں جو قبیلۂ اُمیہ کے مشہور سردار تھے۔

ہند کا باپ عتبہ، ہند کا شوہر ابوسفیان اور ہند تینوں کو اسلام سے سخت عداوت تھی اور وہ اسلام کی غیر معمولی ترقی کو نہایت رشک سے دیکھتے تھے اور حتی الامکان اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ ابوجہل ان سب کا سردار تھا، لیکن جب بدر کے معرکہ میں جو اسلام اور کفر کا پہلا معرکہ تھا، قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے اور ابوجہل اور عتبہ وغیرہ بھی قتل ہوگئے تو ابوسفیان بن حرب نے جو عتبہ کے داماد تھے، اس کی جگہ لی اور ابوجہل کی طرح مکہ میں ان کی سیادت مسلم ہوگئی۔ چنانچہ بدر کے بعد سے

جس قدر معرکے پیش آئے، ابوسفیانؓ سب میں پیش پیش تھے، غزوۂ اُحد انھی کے جوشِ انتقام کا نتیجہ تھا۔ اس موقع پر ان کے ساتھ ان کی بیوی ہند بھی آئی تھیں، جس نے اپنے باپ کے انتقام میں سنگ دلی اور خوں خواری کا ایسا خوف ناک منظر پیش کیا، جس کے تخیل سے بھی جسم لرز اٹھتا ہے۔ حضرت حمزہؓ، حضور ﷺ کے چچا تھے، انھوں نے عتبہ کو قتل کیا تھا، ہندان کی فکر میں تھیں۔ چنانچہ انھوں نے وحشی بن حرب کو جو جبیر بن مطعم کے غلام اور حربہ اندازی میں کمال رکھتے تھے، حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا تھا (یہ وحشیؓ کے قبل از اسلام کا واقعہ ہے) اور یہ اقرار ہوا کہ اس کارگزاری کے صلہ میں وہ آزاد کر دیے جائیں گے۔ چنانچہ حضرت حمزہؓ جب ان کے برابر آئے تو وحشی نے حربہ پھینک کر مارا جو ناف میں لگا، آر پار ہو گیا۔ حضرت حمزہؓ نے اس حالت میں بھی وحشی پر حملہ کرنا چاہا لیکن لڑکھڑا کر گر پڑے اور رُوح پرواز کر گئی۔

خاتونانِ قریش نے انتقامِ بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا تھا، ان کے ناک، کان کاٹ لیے، ہند نے ان پھولوں کا ہار بنایا اور اپنے گلے میں ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئیں اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجا نکالا اور چبا گئیں لیکن گلے سے اُتر نہ سکا، اس لیے اگل دینا پڑا (حضرت ابوسفیانؓ اور ہندؓ کے یہ سب واقعات اسلام قبول کرنے سے پہلے کے ہیں۔) آنحضرت ﷺ کو اس فعل سے جس قدر صدمہ ہوا تھا، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ لیکن ایک اور چیز تھی جو ایسے نازک موقعوں پر بھی جبینِ رحمت کو شکن آلود نہیں ہونے دیتی تھی۔

چنانچہ جب مکہ فتح ہوا اور آنحضرت ﷺ لوگوں سے بیعت لینے کے لیے بیٹھے تو مستورات میں ہند بھی آئیں۔ شریف عورتیں عموماً نقاب پہنتی تھیں، ہند بھی نقاب پہن کر آئیں جس سے اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی انھیں پہچاننے نہ پائے۔

ہند: یارسول اللہ! آپ ہم سے کن باتوں کا اقرار لیتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ: خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے کا۔

ہند: یہ اقرار آپ ﷺ نے مردوں سے تو نہیں لیا، لیکن بہر حال ہمیں منظور ہے۔ رسول اللہ ﷺ۔ چوری نہ کرنا۔

ہند: میں اپنے شوہر کے مال میں سے کبھی کچھ لے لیا کرتی ہوں، معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟

رسول اللہ ﷺ: اولاد کو قتل نہ کرنا۔

ہند: ربیناھم صغار اوقتلتھم کبار افانت و ھم اعلم۔ ہم نے تو اپنے بچوں کو پالا تھا، بڑے ہوئے تو جنگِ بدر میں آپ نے انھیں مار ڈالا۔ اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں۔

(اس دیدہ دلیری کے باوجود) آنحضرت ﷺ نے ہند سے درگزر فرمایا۔

(ہند کے قلب پر اس کا بہت اثر ہوا) اور ان کے دل نے اندر سے گواہی دی کہ آپ ﷺ سچے پیغمبر ہیں۔ انھوں نے کہا، یارسول اللہ! اس سے پہلے آپ ﷺ کے خیمہ سے زیادہ میرے نزدیک کوئی مبغوض خیمہ نہ تھا، لیکن اب آپ کے خیمہ سے زیادہ کوئی محبوب خیمہ میرے نزدیک نہیں ہے۔

حضرت ہندؓ مسلمان ہو کر گھر گئیں تو وہ ہند نہ تھیں، ابن سعد نے لکھا ہے کہ انھوں نے گھر جا کر بت توڑ ڈالا اور کہا کہ ہم تیری طرف سے دھوکے میں تھے۔

فتحِ مکہ کے بعد اگرچہ اسلام کو علانیہ غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور اس لیے عورتوں کو غزوات میں شریک ہونے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، تاہم جب حضرت عمرؓ کے عہد میں روم و فارس کی مہم پیش آئی تو بعض مقامات میں اس شدت کا رن پڑا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی تیغ و خنجر سے کام لینا پڑا۔ چنانچہ شام کی لڑائیوں میں جنگ یرموک ایک یادگار جنگ تھی، اس میں حضرت ہندؓ اور ان کے شوہر حضرت سفیانؓ دونوں نے شرکت کی اور فوج میں رومیوں کے مقابلے کا جوش پیدا کیا۔

حضرت ہندؓ نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں انتقال کیا، اسی دن حضرت ابوبکرؓ کے والد ابو قحافہ نے بھی وفات پائی تھی۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ ان کی وفات حضرت عمرؓ کے زمانہ میں نہیں بلکہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہوئی۔ کتاب الامثال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ اس میں مذکور ہے کہ جب حضرت ابوسفیانؓ نے وفات پائی (ابوسفیانؓ نے حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت میں وفات پائی ہے) تو کسی نے حضرت امیر معاویہؓ سے کہا کہ مجھ سے ہندؓ کا نکاح کر دو، انھوں نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ اب انھیں نکاح کرنے کی ضرورت نہیں۔

اولاد میں حضرت امیر معاویہؓ زیادہ مشہور ہیں۔

مراجع

۱: سیر الصحابہ (مولانا شاہ معین الدین ندوی)
۲: حیات الصحابہؓ (مولانا محمد یوسف کاندھلوی)
۳: روشنی کے مینار (حافظ محمد ادریس)
۴: اصحابِ بدرؓ (قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری)
۵: رحمت دارینؐ کے سوشیدائی (طالب الہاشمی)
۶: سرورِ کائنات کے پچاس صحابہؓ (طالب الہاشمی)
۷: خیر البشر کے چالیس جاں نثار (طالب الہاشمی)
۸: تیس پروانے شمع رسالت کے (طالب الہاشمی)
۹: طوبیٰ (شاہ بلیغ الدین)
۱۰: سیر الصحابیاتؓ (مولانا سعید انصاری)
۱۱: اسوۂ صحابیاتؓ (مولانا عبد السلام ندوی)
۱۲: تذکارِ صحابیاتؓ (طالب الہاشمی)
۱۳: سیرت کبریٰ (مولانا ابوالقاسم رفیق دلاوری)
۱۴: خواتین اسلام کی بہادری (مولانا سید سلیمان ندوی)
۱۵: اُردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونی ورسٹی) (متفرق مضامین)

بسم الله الرحمن الرحیم

یٰبنی اقم الصلوٰة وامر بالمعروف وانه عن المنکر

واصبر علی ما اصابک ان ذلک من عزم الامور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیا ای ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتۂ شانِ جمالیم
دو حرفی بر مرادِ دل بگوئیم
بپای خواجہ چشمان را بمالیم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اقبال

کتبہ الفقیر نفیس الحسینی غفر لہ

المحرر: ۲۲ رجب المرجب ۱۳۹۶ھ

بپاس خاطر محترمی جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی
۱۹۷۶ء

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم

بسم الله الرحمن الرحيم

ابوبکر

عمر

محمد

عثمان

علی

وما ارسلناك الا رحمة للعالمين

ولسليمان الريح عاصفة تجري بأمره الى الارض التي باركنا فيها وكنا بكل شيء عالمين

بسم الله الرحمن الرحيم

عن علي رضي الله عنه كان إذا وصف النبي صلى الله عليه وسلم قال لم يكن بالطويل الممغط ولا بالقصير المتردد • كان ربعة من القوم • ولم يكن بالجعد القطط • ولا بالسبط • كان جعدا رجلا • ولم يكن بالمطهم ولا بالمكلثم • وكان في وجهه تدوير أبيض • مشرب بحمرة • أدعج العينين • أهدب الأشفار • جليل المشاش والكتد • أجرد • ذو مسربة • شثن الكفين والقدمين • إذا مشى تقلع كأنما يمشي في صبب • وإذا التفت التفت معا

محمد رسول الله

وما أرسلناك إلا رحمة للعالمين

بين كتفيه خاتم النبوة • وهو خاتم النبيين • أجود الناس صدرا • وأصدقهم لهجة • وألينهم عريكة • وأكرمهم عشرة • من رآه بديهة هابه • ومن خالطه معرفة أحبه • يقول ناعته لم أر قبله ولا بعده مثله صلى الله عليه وسلم

كتبه العبد محمد أوزجاي غفر الله ذنوبه آمين

سُبحانَ اللّٰه

الحَمدُ لِلّٰه

لا إلٰهَ إلّا اللّٰه

اللّٰهُ أكبَر

أستَغفِرُ اللّٰه

حَسبِيَ اللّٰه

محمد رسول الله

صلی الله علیه وسلم

حسن زبیری ۱۳۹۸ ھ

خیر الناس انفعهم للناس

محمد

صلی اللہ علیہ وسلم

خَيْرُ النَّاسِ أَنْفَعُهُمْ لِلنَّاسِ

خیر ناسه مرادڭ ایسه وقوف خیر ناسڭ حدیثڭ ایت اذعان:

خیر اولدر كه جمله دن افزون اولا خلق جهانه نفع رسان.

إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى

عمللرڭ قیمتی نیتلره باغلیدر

هر كسڭ نیتی نه ایسه النه جك او در

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ساتویں کتاب:

آنحضورؐ کا اسلوب دعوۃ وتبلیغ

پیامِ رسول ﷺ کی اشاعت عہدِ نبوی میں

(1)...... جب ایک طویل اندرونی اضطراب' روحانی بے چینی اور غارِ حرا میں روز و شب کے استغراق اور قلبی دعاؤں کے بعد آنحضورﷺ کو آخر کار اپنی نبوت کا یقین ہو گیا اور وحی الٰہی نے یاس و بیم کی حالت سے آپﷺ کو بیدار کیا اور حکم دیا کہ لوگوں میں اس حق کی تبلیغ کریں جو روز بروز آپﷺ کے دل پر قوت کے ساتھ منکشف ہو رہا تھا تو آپﷺ کی کوششیں پہلے اپنے ہی خاندان والوں کی طرف رجوع ہوئیں تاکہ اپنے دین کے برحق ہونے پر انھیں ترغیب و تحریص فرمادیں۔ اللہ کی وحدانیت کا یقین' بت پرستی سے نفرت اور انسان کا فرض کہ خالق کی مرضی پر توکل کرے' یہ حقائق تھے جنھیں آپﷺ تسلیم کرانا چاہتے تھے۔ سب سے پہلے جس نے آپﷺ کی دعوت کو قبول کیا' وہ آپﷺ کی ثابت قدم زوجہ حضرت خدیجہؓ تھیں جنھیں پندرہ برس ہوئے تھے کہ اپنے غریب رشتہ دار کے ساتھ' جس نے مضاربت کے طریقے پر ان کے مال کی اچھی تجارت کی تھی' شادی کر چکی تھیں اور یہ کلمات کہے تھے ''اے میرے قرابت مند! قرابت کے سبب سے' جو ہم میں ہے' اور تیری اُس تکریم و توقیر کے باعث' جس سے لوگ تجھ کو دیکھتے ہیں' اور دیانت و امانت' اور حسن سیرت و کردار اور صداقت کلام کے باعث تجھ سے الفت رکھتی ہوں' حضرت خدیجہؓ نے رسول کریمﷺ کو غربت و افلاس کی حالت سے نکالا اور اس قابل کیا کہ آپﷺ اس بلند مرتبے اور درجے پر رہیں' جس کے آپﷺ ہر لحاظ سے مستحق تھے۔ لیکن یہ باتیں اُس محبت اور فدائیت کے مقابلے میں' جن سے حضرت خدیجہؓ اپنے شوہر کے تفکرات کو بانٹ لیتی تھیں' اور اس دل سوزی اور تقویت کے سامنے جس سے یاس و نا اُمیدی کی حالت میں وہ آپﷺ کی معاونت کرتی تھیں' کچھ حقیقت نہیں رکھتیں۔ جب کہ ایک دفعہ ایک رُویا دیکھنے پر آنحضورﷺ مضطرب اور پریشان' خدیجہؓ کے پاس تسلی کے لیے گئے تو انھوں نے آپﷺ کی پریشانی یہ کہہ کر دور کی ''خوف نہ کر' کیوں کہ تو خوش خبری لایا ہے۔ میں اب سے تجھ کو اپنی قوم کا رسول مانوں گی۔ خوش ہو جاؤ۔ اللہ تجھ کو شرمندہ نہ کرے گا۔ کیا تو اپنے عزیزوں سے الفت نہ رکھتا تھا' اپنے ہمسایوں پر مہربان اور محتاجوں پر فیاض' کلام کا سچا اور ہمیشہ حق کا حامی نہ تھا۔'' اس طرح حضرت خدیجہؓ اپنی وفات تک جو حضورﷺ سے شادی کے پچیس برس بعد' 619ء میں ہوئی' جب کبھی رسول کریمﷺ دشمنوں کے ظلم و ستم سے ستائے گئے یا افکار و خیالات سے پریشان ہوئے' ہمیشہ ہمدردی کرنے' تسلی و تقویت دینے کے لیے تیار اور مستعد رہیں۔ آنحضرتﷺ کے سوانح لکھنے والا لکھتا ہے: ''اس طرح حضرت خدیجہؓ اس سچائی پر ایمان رکھتی اور گواہی دیتی تھیں جو اللہ کی طرف سے رسولﷺ کے پاس آئی۔ اس طرح اللہ نے پسند کیا کہ اپنے رسولﷺ کا بوجھ کم کر دے' کیوں کہ انھوں نے کوئی بات قوم کے انکار کی ایسی نہیں سنی جسے حضرت خدیجہؓ سے نہ کہا ہو' اور حضرت خدیجہؓ آپﷺ کو تسلی دیتیں' پھر یقین دلاتیں اور ان کی مدد کرتیں' سچ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی حسین اور کامل تصویروں میں سے یہ ایک تصویر ہے جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

(2)...... ابتدائی مسلمانوں میں رسول کریمﷺ کے متبنّیٰ زید بن حارثہ اور حضرت علیؓ بن ابی طالب اور آپﷺ کے قریبی دوست حضرت ابوبکرؓ تھے' جن کے بارے میں آنحضورﷺ نے بعد میں اکثر فرمایا: ''میں نے کسی سے اسلام کے لیے نہیں کہا' جس نے تردّد' تذبذب اور پریشانی ظاہر نہ کی ہو' مگر ابوبکرؓ نے نہ توقف کیا اور نہ پریشانی ظاہر کی' جب اسلام کی خبر میں نے اسے دی۔'' حضرت ابوبکرؓ دولت مند سوداگر تھے' جن کے متدین اوصاف و خصائل اور ذہانت و لیاقت کی وجہ سے شہر کے لوگ بہت عزت کرتے تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنی دولت کا بڑا حصہ مسلمان غلاموں کے خریدنے میں صرف کیا' جن پر ان کے آقا اس وجہ سے ظلم کرتے تھے کہ انھوں نے رسولﷺ کی دعوتِ حق کو قبول کر لیا تھا۔

(3)...... غالباً حضرت ابوبکرؓ کی کوشش سے پانچ بڑے اشخاص' جو ابتدائی زمانے ہی میں مسلمان ہوئے مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کا باعث بنے۔ ان بزرگ شخصوں کے نام یہ ہیں: سعد بن ابی وقاصؓ جو آیندہ چل کر اہل عجم کے فاتح ہوئے۔ زبیر بن العوامؓ جو رسولﷺ کے رشتہ دار تھے' طلحہؓ جو بعد میں بڑے نامی گرامی شجاع ہوئے' عبدالرحمن بن عوفؓ جو دولت مند سوداگر تھے' اور عثمان بن عفانؓ جو خلیفہ ثالث ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کو ابتدا میں بہت ایذائیں جھیلنی پڑیں۔ ان کے چچا نے انھیں پکڑا اور باندھا اور کہا: ''کیا تو نئے مذہب کو اپنے آبائی مذہب پر ترجیح دیتا ہے۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ جب تک تو اس نئے مذہب کو' جس کی تو پیروی کرتا ہے' ترک نہ کرے گا' میں تجھ کو نہیں چھوڑوں گا۔'' حضرت عثمانؓ نے جواب دیا: ''خدا کی قسم میں کبھی بھی اسے ترک نہ کروں گا'' حضرت عثمانؓ کے چچا نے جب یہ دیکھا کہ انھیں اپنے مذہب کے تعلق میں کیسا استحکام ہے تو انھیں چھوڑ دیا۔

(4)...... مزید اضافوں کے ساتھ جو خصوصاً غریبوں' مفلسوں اور غلاموں میں سے ہوئے' مسلمانوں کی تعداد نبوت کے تین برس کے اندر چالیس کے قریب ہو گئی۔

جب ان مجموعی کی کوششوں میں کام یابی ہوئی تو ہمت پیدا ہوئی اور آنحضور ﷺ نے دعوت اسلام کی اشاعت میں زیادہ عملی طریقے اپنانے کا قصد فرمایا۔ ارشاد ہوا: ''کسی عرب نے اپنی قوم کو ایسے بیش بہا فوائد پیش نہیں کیے جیسے کہ میں تمھارے لیے لایا ہوں۔ مَیں تمھیں اس دنیا میں اور آیندہ زندگی کی خوش خبری دیتا ہوں' تم میں سے کون اس کام میں میری مدد کرے گا؟'' سب خاموش رہے۔ حضرت علیؓ نے لڑکپن کے جوش میں بآواز بلند کہا: ''اے اللہ کے رسولؐ میں آپ ﷺ کی مدد کروں گا'' اس پر پورا مجمع ہنستا ہوا برخاست ہوا۔

اس وعظ کی ناکامی پر مایوس ہوئے بغیر' آنحضور ﷺ نے بار بار ان لوگوں کو کئی موقعوں پر جمع کیا' لیکن پیغام' دعوت اور ہدایت کے بدلے سوائے طنز وطعن اور استہزا کے' انھوں نے اور کچھ نہ کیا۔ فی الحقیقت یہ انھی لوگوں کی شدید مخالفت کا نتیجہ تھا کہ نبوّت کے چوتھے برس آنحضور ﷺ حضرت ارقمؓ کے گھر جا رہے جو شروع زمانے میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

(5)...... ارقمؓ کا گھر خانہ کعبہ کے سامنے ایسی جگہ پر تھا جہاں آمد ورفت زیادہ رہتی تھی اور یہاں رسول کریم ﷺ ان تمام لوگوں کو تلقین فرماتے اور قرآن سناتے تھے جو تحقیق کے لیے آپ ﷺ کے پاس حاضر ہوتے۔ اس طرح مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور دو برس کے اندر پچاس تک پہنچ گئی۔ قریش نے نئے مذہب کی اس ترقی کو بدظنی اور عداوت کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے ظلم وستم کے کئی طرح کے طریقے اختیار کیے' دھمکیاں دیں' وعدے کیے' برا کہا' دنیاوی عزت واقتدار کا لالچ دیا' تا کہ آپ ﷺ اس کام کو ترک کر دیں جو آپ ﷺ نے اختیار کیا ہوا تھا۔

(6)...... قریش مکہ نے کئی بار کوشش کی کہ آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کو' جو بنو ہاشم کے سردار تھے' اس بات کی ترغیب دیں کہ آپ ﷺ کو قریش کے آبائی مذہب پر حملے کرنے سے منع کریں۔ قریش نے دھمکی دی کہ اگر ایسا نہ کیا تو آپ ﷺ کے خلاف بے حد سختی برتی جائے گی۔ ابو طالب نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ اپنے اور اپنے خاندان پر آفت نہ لائیں۔ مگر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر سورج میرے دائیں ہاتھ پر رکھ دیا جائے اور چاند بائیں ہاتھ پر' اور مجھ سے کہا جائے کہ یہ کام ترک کر دے یا اس کے حصول میں ہلاک ہو جاؤں' تب بھی میں اسے نہ چھوڑوں گا۔'' ابو طالب یہ جواب سُن کر حیران رہ گئے اور آنحضور ﷺ سے کہا: ''پھر وعظ کر جیسے تیری مرضی ہو۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ کبھی تجھ کو تیرے دشمنوں کے ہاتھ میں اکیلا نہ چھوڑوں گا۔''

(7)...... جب تبلیغِ اسلام کو روکنے کے لیے پُر امن مذاکرات ناکام رہے تو قریش کا غیظ وغضب اور بھڑکا۔ وہ سمجھ گئے کہ اس نئے مذہب سے ان کے قومی مذہب کی بربادی ہے اور خانۂ کعبہ کے متولیوں کی دولت واقتدار کو خطرہ ہے۔ رسول کریم ﷺ ابو طالب کی حفاظت میں تھے اور بنی ہاشم اگرچہ اس مذہب سے موافقت نہ رکھتے تھے' جو ان کے قبیلے کا شخص پیش کرتا تھا' مگر ایک ہی قبیلے سے ہونے کا خیال' جو اہل عرب میں ہوا کرتا تھا' اس نے آنحضور ﷺ کو ان حملوں سے محفوظ رکھا جو آپ ﷺ کی جان لینے کے لیے ہوتے' اگرچہ مخالفین کی طعنہ زنی اور ایذا رسانی سے آپ ﷺ کو برابر سابقہ تھا۔

(8)...... لیکن غریبوں اور غلاموں کو' جن کا کوئی محافظ نہ تھا' سب سے زیادہ تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ ان کو قید کیا جاتا تھا اور سخت اذیتیں دی جاتی تھیں۔ کہا جاتا کہ اسلام ترک کر دیں۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے بلالؓ کو جو حبشی غلام تھے' خرید کر آزاد کر دیا اور آنحضور ﷺ نے انھیں حبشہ کا پہلا ثمر کہا۔ بلالؓ اسلامی دنیا کے پہلے مؤذّن تھے۔

(9)...... بلالؓ کو ہر روز سخت اذیتیں دی جاتیں۔ دھوپ میں جلتی ریت پر لٹا کر پیٹھ پر پتھر رکھ دیا جاتا اور کہا جاتا کہ یہاں پڑے پڑے مر جاؤ اور اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو محمد ﷺ کا دین چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرو۔ بلالؓ اس پر یوں گویا ہوتے ''احد' احد۔'' ''نہیں ہے خدا مگر ایک' نہیں ہے خدا مگر ایک'' دو شخص ایسی ہی سختیاں جھیلتے ہوئے خدا کو پیارے ہو گئے۔

(10)...... چوں کہ آنحضور ﷺ مظلوم مسلمانوں کو دشمنوں کے ظلم وستم سے نجات نہ دلا سکتے تھے' اس لیے آپ ﷺ نے انھیں مشورہ دیا کہ حبشہ میں جا کر پناہ لیں اور نبوت کے پانچویں برس (615ء) میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے سمندر پار کر کے حبشہ ہجرت کی۔ حبشہ کے عیسائی بادشاہ نجاشی نے مہاجرین کا خیر مقدم کیا۔

(11)...... مہاجرین حبشہ میں ایک شخص مصعب بن عمیرؓ تھے۔ انھیں خاص تکلیف اُٹھانا پڑی' جو مذہب تبدیل کرنے والے کیلیے بہت بڑی تکلیف ہوتی ہے یعنی ان لوگوں کی عداوت جو اسے پیارے ہوں۔ مصعبؓ نے دارالارقم میں آنحضور ﷺ کی زبان مبارک سے اسلام کی تلقین سُن کر اسلام قبول کیا تھا' لیکن اپنے مسلمان ہونے کی خبر کے افشا ہونے سے خائف تھے' کیوں کہ ان کی والدہ اور اہل قبیلہ جو ان کے ساتھ بہت الفت رکھتے تھے' اسلام کے سخت خلاف تھے۔ چنانچہ جب انھیں مصعبؓ کے مسلمان ہونے کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے انھیں گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا' لیکن مصعبؓ ان کی قید سے آزاد ہو کر حبشہ کو ہجرت کرنے میں کام یاب ہوئے۔

(12)...... قریش نے مہاجرین کا پیچھا حبشہ میں بھی نہ چھوڑا انھوں نے ایک سفارت بھیجی' کہ حبشہ کا بادشاہ مہاجروں کو اپنے ملک سے نکال دے اور ان کے پاس روانہ کرے' لیکن جب حبشہ کے بادشاہ نے خود مہاجروں کی زبان سے ان کا حال سنا تو اس نے انھیں نکالنے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کو اپنی حفاظت کا یقین دلایا گیا' کیوں کہ مہاجرین نے بادشاہ سے کہا کہ: ''ہم جہالت کے اندھیرے میں گھرے ہوئے تھے اور بتوں کو پوجتے تھے۔ خبیث خواہشوں میں مبتلا تھے۔ ہم کوئی قانون نہ جانتے تھے' جب کہ خدا نے ہماری ہی قوم میں سے ایک شخص کو رسول بنا کر بھیجا جو نسبؐ کا اونچا ہے اور جس کی نیکیوں کی وجہ سے ہم اسے جانتے اس کی عزت کرتے تھے۔ اس نے ہم سے کہا کہ توحید کا اقرار کرو اور صرف اللہ ہی کی عبادت کرو اور یہ کہ ہم اپنے آبائی عقائد کو چھوڑ دیں اور لکڑی اور پتھر کے خداؤں سے اجتناب کریں۔ اس نے

ہمیں حکم دیا کہ برائی سے بچو۔ بات کے سچے' وعدے کے پورے رہو۔ ماں باپ سے محبت رکھو اور ہمسائے پر مہربانی کرو۔ اس نے عورتوں کو عزت دی اور یتیموں کا مال کھانے سے منع کیا۔ نماز' روزہ اور زکوٰۃ کا حکم دیا۔ ہم اس کی رسالت پر ایمان لائے اور ہم نے ان احکام کو تسلیم کیا جو وہ ہمارے پاس اللہ کی طرف سے لایا' لیکن ہمارے اہل ملک ہمارے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہم پر ظلم ڈھانے لگے تاکہ ہم اسلام کو چھوڑ کر پھر بتوں کی پرستش کرنے لگیں۔ پس اپنے ملک میں امن نہ پا کر ہم نے تمھارے ملک میں پناہ لی ہے۔ تمھارے انصاف پر بھروسا کر کے ہم اُمید کرتے ہیں کہ تم ہمیں ہمارے دشمنوں کے ظلم سے بچاؤ گے۔'' بادشاہ نے مہاجروں کی درخواست کو سن کر قبول کر لیا اور قریش کی سفارت نامُراد واپس لوٹ گئی۔ اسی اثنا میں مکہ میں ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی کہ دولت اور اقتدار کا لالچ دے کر رسول کریم ﷺ کو اسلام کی تبلیغ و دعوت سے باز رکھیں' مگر یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

(13)...... جس وقت مکہ میں سفارت حبشہ کے نتیجے کا انتظار ہو رہا تھا' اس وقت ایک ایسے شخص نے اسلام قبول کیا جو آنحضور ﷺ کے سخت دشمنوں میں سے تھا اور ان سے سخت تعصب رکھتا تھا اور ہمیشہ رسول ﷺ خدا کی مخالفت پر کمر بستہ رہتا تھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے مسلمان اپنا نہایت سخت اور قہر آگیں دشمن خیال کرتے تھے' لیکن جب وہ ایمان لائے تو اسلامی تاریخ میں اسلام کو سب سے زیادہ زینت و شوکت عطا کرنے والوں میں سے ہوئے۔ یہ شخص عمر ابن الخطابؓ تھے۔ مسلمان ہونے سے پہلے ایک روز پیغمبر خدا ﷺ پر غضب ناک ہو کر' ہاتھ میں تلوار لیے آپ ﷺ کے قتل کے ارادے سے نکلے۔ راستے میں ایک عزیز ملا۔ اس نے پوچھا' کہاں جا رہے ہو۔ عمرؓ نے جواب دیا ''محمد ﷺ کو ڈھونڈتا ہوں تاکہ اُسے قتل کروں۔ وہ شہر کے لوگوں پر مصیبت اور فساد لایا ہے اور ہمارے خداؤں کو بُرا بھلا کہتا ہے اور ہمارے باپ دادا کی یادگار کو بے عزت کرتا ہے۔'' اس عزیز نے کہا: ''اپنے ہی خاندان کے لوگوں کو سزا کیوں نہیں دیتا' جنھوں نے تیری لاعلمی میں اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا ہے'' عمر نے پوچھا: ''میرے خاندان میں ایسے کون لوگ ہیں؟'' عزیز نے جواب دیا ''تیرا بہنوئی سعید اور تیری بہن فاطمہؓ '' عمرؓ یہ سنتے ہی اپنی بہن کے گھر دوڑے گئے۔ فاطمہؓ اپنے گھر میں بیٹھی اپنے شوہر سعید اور خبابؓ ابن ارت کے ساتھ جو صحابہ میں سے تھے' قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں۔ عمرؓ مکان میں داخل ہوئے اور پوچھا: ''یہ کیسی آواز تھی جو مَیں نے سنی؟'' انھوں نے جواب دیا ''کچھ نہیں'' عمرؓ نے کہا: ''نہیں تم کچھ پڑھ رہے تھے' اور مَیں نے سنا ہے' تم محمد ﷺ کے دین میں شامل ہو گئے ہو' یہ کہ کر عمرؓ اپنے بہنوئی سعید پر چڑھ دوڑے اور انھیں مارا۔ فاطمہ بیچ میں آگئیں تاکہ شوہر کو بچائیں' اور بھائی سے کہا: ''ہاں' ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں۔ مار ڈالو اگر تمھاری یہی مرضی ہے'' اس کش مکش میں عمرؓ کی بہن زخمی ہو گئیں اور جب عمرؓ نے بہن کے چہرے پر خون دیکھا تو نرم لہجہ میں کہا ''جو تم پڑھ رہے تھے' وہ مجھے بھی سناؤ'' انھوں نے قرآن کی بیسویں سورۃ طٰہٰ کی آیات سنائیں' تو عمرؓ نے بلند آواز سے کہا'' کیسا حسین کلام ہے اور کیسا گرامی خطاب ہے'' جوں جوں سنتے گئے' ایمان سے دل مغلوب ہوتا گیا' یہاں تک کہ بولے: ''مجھے محمد ﷺ کی خدمت میں لے چلو' تاکہ میں اسلام کا اقرار کروں''

(14)...... قریب قریب اُسی زمانے میں ایک اور بڑے شخص نے اسلام قبول کیا' یعنی حمزہؓ ابن عبدالمطلب نے جو رسول ﷺ کے چچا اور آپس میں دودھ شریک بھائی بھی تھے۔ حضرت حمزہؓ نے جب ایک واقعہ کا حال سنا جس میں حضور ﷺ کو کفار مکہ نے ایذا پہنچائی تھی اور آپ ﷺ نے صبر فرمایا تھا تو حمزہؓ کے دل پر ایسا نشتر لگا کہ انھوں نے رسول ﷺ کی نصرت اور معاونت کا فوراً ارادہ کر لیا' اور یکا یک دشمنی چھوڑ کر پکے دوست بن گئے۔ ایک حمزہؓ ہی کی مثال اس قسم کی نہ تھی بلکہ بہت سے لوگ نئے مذہب کے خفیہ طور پر طرف دار ہو چکے تھے' جنھوں نے اپنا مسلمان ہونا اس وقت تک ظاہر نہ کیا جب تک کہ اسلام کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہو گئی۔

(15)...... حضرت عمرؓ کا ایمان لانا اسلام کی تاریخ میں ایسا واقعہ ہے جس سے حالات کا نقشہ ہی بدل گیا۔ مسلمان اب اس قابل ہو گئے کہ زیادہ جرأت و جسارت کے ساتھ اظہار خیال کر سکیں۔ حضور ﷺ نے دارالارقم چھوڑ دیا اور مسلمانوں نے کعبہ کے سامنے علانیہ نماز پڑھنا شروع کر دی۔

لیکن یہ حفاظت تھوڑے عرصے تک رہی۔ قریش کی سفارت حبشہ سے واپس آئی' کیوں کہ وہاں کے بادشاہ نے مہاجرین کو اپنے ملک سے نکالنے سے قطعی انکار کر دیا۔ یہ حالت ایسی تھی کہ رؤسائے قریش کا خوف میں مبتلا ہونا قدرتی امر تھا' اس لیے کہ اب ان کا مقابلہ مظلوم اور کم زور لوگوں سے نہ رہا تھا' بلکہ مسلمان اب ایک قوی اور طاقت ور فریق بن چکے تھے' مکہ کے چند بارسوخ لوگوں کے شامل ہونے سے ان کی قوت و طاقت میں اضافہ ہوا اور مکہ کے استحکام کو ایک طاقت ور غیر ملک کے بادشاہ کی دوستی سے خطرے میں ڈال رہے تھے۔

(16)...... قریش نے یہ حالت دیکھ کر مستقل کوششیں کیں کہ اپنی عمل داری سے اس خطرناک عنصر کو نکال کر نیست و نابود کر دیں۔ انھوں نے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف' جو رشتہ داری کی وجہ سے آنحضور ﷺ کی حفاظت کرتے تھے' ایک عہد کیا' جس میں قریش نے اس پر اتفاق کیا کہ وہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کی عورتوں سے نکاح نہیں کریں گے اور نہ اپنی عورتوں کو ان کے نکاح میں دیں گے۔ نہ ان کے ساتھ خرید و فروخت کریں گے' اور یہ کہ ان سے ہر طرح کے معاملات بند رہیں گے۔

(17)...... ان مظالم نے مسلمانوں کو دوبارہ حبشہ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ اس دفعہ 83 مردوں اور 18 عورتوں نے حبشہ ہجرت کی۔ تین برس تک بنو ہاشم شہر کے ایک حصے (شعب ابی طالب) میں محصور رہے اور اس عرصے میں برابر قریش کے مقاطعہ کی وجہ سے سختیاں برداشت کرتے رہے۔ کسی میں ہمت نہ ہوتی تھی کہ حج کے مہینوں کے سوا کہیں باہر نکلتا' کیوں کہ ان مہینوں میں عرب میں ہر جگہ لڑائیاں بند ہو جاتی تھیں' اور یہ چند روزہ امن اس لیے ہوتا تھا کہ ان کے مذہب کے مرکز خانۂ کعبہ کی زیارت کے

لیے زائرین آسکیں۔

(18)......رحمتِ عالم ﷺ کو صرف حج کے زمانہ ہی میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا موقع ملتا تھا۔ مختلف قبائل کعبہ معظمہ کی زیارت کے لیے جوق در جوق آتے اور قریب کے میلوں ٹھیلوں میں جمع ہوتے تھے۔ آنحضور ﷺ زائرین کو اسلام کی دعوت دیتے، لیکن کچھ کام یابی نہ ہوتی کیوں کہ ابولہب آنحضور ﷺ کے پیچھے پیچھے چلاتا ہوا چلتا کہ یہ جھوٹا ہے اور چاہتا ہے کہ تمھیں تمھارے آبائی دین سے برگشتہ کر کے اپنے جھوٹے عقائد کی طرف مائل کرے، اس لیے اس سے علیحدہ ہو جاؤ اور اس کی بات نہ سنو لوگ رسول ﷺ کو طعن کر کے کہتے: ''تیرے قبیلے اور خاندان کے لوگ تجھ کو ہم سب سے بہتر جانتے ہیں۔ پھر وہ کیوں تیرا یقین اور پیروی نہیں کرتے''

(19)......رسول کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے عزیز و اقارب نے جو سختیاں اور تکلیفیں اٹھائیں، اس پر قریش کے بعض لوگوں کو ہمدردی پیدا ہوئی اور انھوں نے جو عہد نامہ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے خلاف جاری کیا تھا، اسے ختم کر دیا۔

(20)......جس سال عہد نامہ منسوخ ہوا حضرت خدیجہؓ کی وفات سے حضور ﷺ کو اندوہ و غم اٹھانا پڑا اور مزید یہ کہ اس واقعے کے فوراً بعد ابوطالب کی وفات نے آپ ﷺ کو ایک ایسے مشفق معاون سے محروم کر دیا جو ہمیشہ آپ کے قوی محافظ رہے، حضور ﷺ کو ایک بار پھر کفارِ قریش کے طعن اور منافرت کا نشانہ بننا پڑا۔

(21)...... اہل مکہ کی سخت عداوت، مخاصمت اور ظلم و ستم کے باوجود آنحضور ﷺ انھیں دس برس تک اسلام کی تبلیغ کرتے رہے، لیکن زیادہ کام یابی نہ ہوئی۔ اب آنحضور ﷺ نے قصد فرمایا کہ مکہ سے باہر لوگوں کو اسلام لانے کی طرف راغب کیا جائے۔ اس اُمید پر آپ ﷺ طائف تشریف لے گئے جو مکہ سے ساٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ وہاں عمائدین شہر کی ایک بڑی مجلس سے آپ ﷺ نے خطاب کرتے ہوئے اللہ کی وحدانیت اور رسالت کی اہمیت و فضیلت پر روشنی ڈالی۔ طائف کے بت پرست لوگ آپ ﷺ کی باتیں سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے حضور ﷺ کا مضحکہ اُڑایا، تحقیر کی اور پتھر مار کر شہر سے باہر نکال دیا۔

(22)...... طائف سے واپس آکر کام یابی کی کوئی صورت نہ رہی تو حد درجہ مایوس ہوگئے۔ آپ ﷺ کے حزن و ملال پر سورۂ نوح کی آیات 5 اور 6 نازل ہوئیں جس سے سکون قلب حاصل ہوا۔ ان آیات کا ترجمہ یہ ہے: ''(نوحؑ نے کہا) اے رب، میں بُلاتا رہا اپنی قوم کو رات اور دن۔ پھر میرے بُلانے سے اور زیادہ بھاگنے لگے، اور میں نے جب بھی انھیں بلایا، تاکہ تو انھیں بخشے، تو ڈالنے لگے انگلیاں اپنے کانوں میں، اور لپیٹنے لگے اپنے اوپر کپڑے، اور ضد کی اور غرور کیا، بڑا غرور۔''

یعنی حضرت نوحؑ ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو تبلیغ کرتے رہے۔ جب اُمید کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو مایوس اور تنگ دل ہو کر بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ اے ربّ! میں نے اپنی طرف سے دعوت و تبلیغ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ رات کی تاریکی میں اور دن کے اُجالے میں برابر انھیں تیری طرف بلاتا رہا۔ مگر نتیجہ یہ ہوا کہ جُوں جُوں تیری طرف آنے کو کہا، یہ بدبخت اور زیادہ ادھر سے منہ پھیر کر بھاگے اور جس قدر میری طرف سے شفقت اور دل سوزی کا اظہار ہوا، ان کی جانب سے نفرت اور بےزاری بڑھتی گئی۔

(23) اس اندوہ و غم اور مایوسی کی حالت میں رسول ﷺ کی تشفی اس صورت میں ہوئی جس کا گمان تک نہ تھا۔ موسم حج میں آپ ﷺ کی نظر چھے یا سات آدمیوں کے ایک گروہ پر پڑی جنھیں آپ ﷺ نے پہچان لیا کہ یثرب سے آئے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے ان سے پوچھا: ''تم کس قبیلے کے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''قبیلہ خزرج سے ہیں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہود کے ساتھیوں میں سے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ہاں'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم تھوڑی دیر کے لیے بیٹھو گے میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بولے: ''ضرور۔'' آنحضور ﷺ نے انھیں اللہ کی وحدانیت بیان کی اور انھیں اسلام کی دعوت دی اور قرآنی آیات ان کے سامنے تلاوت کیں۔

پس اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لیے عجیب اور حیرت انگیز معجزہ دکھایا۔ یثرب میں یہود رہتے تھے جو تورات پر ایمان اور عقل و دانش بھی رکھتے تھے، جب کہ خود مدینہ کے رہنے والے خزرج مشرک اور بت پرست تھے۔ یہود نے ان کے ہاتھوں اکثر ظلم و ستم اٹھائے تھے، اور جب کبھی یہود اور خزرج میں لڑائی ہوتی تو یہود ہمیشہ کہتے کہ ''جلد ایک رسول پیدا ہوگا اور اس کا وقت قریب ہے، جس کی ہم پیروی کریں گے اور اس کے ساتھ مل کر ہم تمھیں قتل کریں گے، عاد اور ارم کا سا قتل'' اب جب کہ رسول کریم ﷺ نے ان لوگوں سے باتیں کیں اور خدائے برحق کی تلقین کی تو انھوں نے آپس میں کہا: ''یقین جانو کہ یہی وہ رسول ہے جس کے بارے میں یہود ہمیں ڈرایا کرتے تھے۔ آؤ جلدی کرو اور اس کے ساتھ شریک ہونے میں پہل کرو۔'' پس خزرجی ایمان لائے اور اسلام قبول کیا اور آپ ﷺ سے عرض کیا کہ ''ہمارے ملک کے لوگ آپس میں ہمیشہ لڑائی میں مصروف رہتے ہیں، لیکن اب تیری تعلیم و ہدایت کی وجہ سے ان میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوگا۔ پس ہم انھیں اسلام کی دعوت دیں گے اور اس دین سے انھیں آگاہ کریں گے جو ہمیں تجھ سے ملا ہے۔''

آنحضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا یہ ایسا واقعہ ہے کہ آیندہ آنے والے بہت سے واقعات اس پر منحصر ہیں۔ اب آپ ﷺ کے حلقۂ زیر اثر میں ایک ایسی قوم آگئی جو اپنے سابقہ و موجودہ حالات کے پیش نظر آپ ﷺ کا پیغام قبول کرنے پر آمادہ تھی۔ چنانچہ یہ قوم آگے چل کر حضور ﷺ کے کاموں میں مدد و معاون ثابت ہوئی۔

(24)...... یثرب کا شہر مدت سے یہود کے قبضے میں تھا۔ یہ یہودی کسی قومی تباہی کے سبب، جو غالباً بادشاہ ہیدرین کے ظلم و ستم کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی اپنے ملک سے نکل کر یہاں آ بسے تھے۔ 300 عیسوی کے قریب خانہ بدوش عربوں کا ایک گروہ، جس میں خزرج اور اوس قبیلے کے لوگ تھے، یثرب میں آئے اور یہود سے صلح اور مراعات حاصل کر کے یثرب میں رہنے لگے۔

(25)......خزرج اور اوس قبیلوں کی رفتہ رفتہ آبادی بڑھنے لگی تو یثرب کے یہودی حاکموں سے وہ اقتدار و اختیار چھیننے لگے۔ یہاں تک کہ پانچویں صدی عیسوی کے اختتام تک یثرب خزرج اور اوس کے قبضے میں آ گیا۔

(26)......بعض عربوں نے یہودیت اختیار کرلی، بہت سے یہودی جو پہلے یثرب کے مالک تھے، وہ اب عرب فاتحین کے ملازم تھے۔ آنحضور ﷺ کے عہد میں یثرب میں یہودی کثرت سے آباد تھے۔ یثرب کے لوگ مسیحی عقیدہ رکھتے تھے اس وجہ سے بت پرست اہل مکہ کے مقابلے میں وہ آنحضور ﷺ کی رسالت کو سمجھنے کی زیادہ لیاقت رکھتے تھے۔ اہل مکہ کے لیے نبوت و رسالت ایک انوکھی چیز تھی اور قریش کے لیے تو اس کا تصور بھی ناقابل برداشت تھا، کیوں کہ وہ کعبہ کے موروثی متولی چلے آتے تھے۔

(27)......آنحضور ﷺ نے قصد فرمایا کہ خزرج کے ساتھ خود بھی یثرب تشریف لے جائیں، لیکن خزرج نے آپ ﷺ کو اس ارادے سے اُس وقت تک باز رکھا، جب تک قبیلہ اوس سے ان کی مصالحت نہیں ہو جاتی۔ یاد رہے کہ مدّت سے خزرج اور اوس قبائل کی خانہ جنگی اور باہمی فساد آرائی چلی آ رہی تھی، جس کے سبب یثرب کا شہر تباہ ہو گیا تھا۔ خزرج نے آنحضور ﷺ سے عرض کیا: ''ہم آپ سے استدعا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے لوگوں میں واپس جانے دیں۔ اگر خدا نے ہم میں اتفاق اور امن پیدا کر دیا تو ہم آپ کے پاس پھر آئیں گے اور حج کے موسم کو آیندہ برس مقررہ وقت پر ہونے دیں۔'' اس طرح خزرجی واپس یثرب چلے گئے اور وہاں اپنے لوگوں کو اسلام کی دعوت دی۔ ان میں کوئی کنبہ ایسا نہ رہا جس میں رسول خدا ﷺ کا ذکر نہ ہوتا ہو۔

(28)......اگلے برس جب حج کا زمانہ آیا تو ایک جماعت جس میں دس آدمی خزرج اور دو آدمی اوس کے تھے، رسول کریم ﷺ کی خدمت میں بیعت کی غرض سے حاضر ہوئے۔ اس اوّل بیعت کا مضمون، جو عقبہ کے مقام کی نسبت سے 'بیعت عقبہ اُولیٰ کہلاتی ہے' یہ تھا: ''خدائے واحد کے سوا ہم کسی کی بندگی نہ کریں گے۔ ہم چوری نہیں کریں گے اور نہ زنا کریں گے اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گے اور کسی کو برا کہنے اور غیبت سے پرہیز کریں گے۔ ہم اللہ کے رسول کی ہر بات کو تسلیم کریں گے اور خوشی اور رنج میں اُسی کے تابع رہیں گے۔''

(29)......انھوں نے خواہش ظاہر کی کہ ہمارے ساتھ کوئی ایسا آدمی بھیجا جائے جو ہمیں اسلام کی باتیں سکھائے اور ہمارے شہر میں جا کر وعظ کہے۔ آنحضور ﷺ نے اس کام کے لیے مصعبؓ بن عمیر کو چُنا۔ یہ عبد مناف کے پوتے تھے۔ شروع زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے اور تھوڑا عرصہ ہوا حبشہ سے واپس آئے تھے۔ اس وجہ سے انھیں تبلیغ کا بہت تجربہ تھا اور ظلم کے مکتب میں ایذا کی تربیت پا چکے تھے، جس نے ان میں نہ صرف متانت پیدا کر دی تھی، بلکہ یہ بھی سکھا دیا تھا کہ ظلم کا سامنا کس طرح کیا جاتا ہے، اور ان لوگوں سے کس طرح برتاؤ کیا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے اسلام کی تعلیم و تربیت کے اس مشکل کام کو مصعبؓ بن عمیر کے سپرد فرمایا۔ یثرب پہنچ کر مصعبؓ اسعد ابن زرارہ کے گھر میں ٹھہرے، اور مسلمانوں کو نماز اور تلاوت قرآن کے لیے کبھی اسعد اور کبھی بنی ظفر کے گھر میں جمع کیا کرتے۔ بنی ظفر کا گھر شہر کے ایسے محلے میں تھا جس میں ظفر اور عبدالاشہل کے خاندان مل کر رہتے تھے۔

(30)......اس زمانے میں عبدالاشہل خاندان کے سردار سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر تھے۔ ایک دن حضرت مصعبؓ اسعد ابن زرارہ کے ساتھ بنی ظفر کے گھر میں بیٹھے تھے اور چند نومسلموں کی تعلیم و تربیت میں مصروف تھے کہ سعد بن معاذ نے اسید بن حضیر سے کہا: ''اس داعی اسلام کو اور اس کے ساتھی کو اپنے محلے سے نکال دو۔'' یہ سن کر اسید نے نیزہ اٹھایا۔ اسعد اور مصعب کے پاس پہنچا اور چلا کر کہا: ''یہ تم کیا کر رہے ہو۔ ضعیف رائے والوں کو گمراہ کرتے ہو۔ اگر تمھیں اپنی جانیں عزیز ہیں تو ابھی یہاں سے چلے جاؤ۔'' حضرت مصعبؓ نے آہستہ سے جواب دیا ''بیٹھ جا اور ہماری بات سن۔ اگر تو نے ہم سے ایسی بات سنی جو تجھے ناخوش کر دے تو ہم چلے جائیں گے۔'' اُسید نیزہ زمین میں گاڑ کر بیٹھ گیا۔ مصعبؓ نے اسلام کے ضروری عقائد بیان کیے اور قرآن شریف کی چند آیات پڑھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اسید بے تاب ہو کر بولا: اس دین میں شامل ہونے کا کیا طریقہ؟ حضرت مصعبؓ نے فرمایا کہ ''پانی سے خود کو پاک کر اور کلمہ لا الہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کا اقرار کر۔'' اسید نے فوراً اس ہدایت پر عمل کیا اور کلمہ پڑھا اور کہا ''میرے بعد ایک اور شخص (سعد بن معاذ) ہے جسے تمھیں ایمان پر لانا ہوگا۔ اگر وہ ایمان لے آیا تو بنی اشہل کا سارا قبیلہ اس کی پیروی کرے گا۔ میں اُسے تمھارے پاس بھیجتا ہوں''

(31)......اسید بن حضیرؓ یہ باتیں کر کے چلے گئے اور تھوڑی دیر بعد سعد بن معاذ اسعد پر غصہ کھاتا ہوا آیا اور بولا: ''اگر تو میرا خالہ زاد نہ ہوتا تو تیری جرأت پر میں تجھے نادم کرتا۔ تجھے کیسے یہ جسارت ہوئی کہ اپنے دینی عقائد، جو ہمارے مذہب کے خلاف ہیں، ہم میں لایا۔'' مصعبؓ نے سعد سے کہا کہ اسلامی تعلیمات کو سنے بغیر، اسلام کو بُرا نہ کہو۔ اس پر سعد نے اسلام کی باتیں سننا منظور کر لیا۔ مصعبؓ کے کلام نے سعد پر فوری اثر کیا۔ اس کے دل میں ایمان پیدا ہوا اور اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گئے۔ سعد جوش اسلام سے بھرے ہوئے اپنے قبیلے میں پہنچے اور ان سے کہا: ''اے بنی اشہل، بتاؤ میں کون ہوں؟'' انھوں نے کہا: ''تو ہمارا سردار ہے اور ہم میں سب سے زیادہ دانا اور عاقل اور عالی نسب ہے۔'' سعدؓ نے کہا: ''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تم سے کبھی بات نہ کروں گا، جب تک کہ تم اللّٰہ اور اللّٰہ کے رسول محمد ﷺ پر ایمان نہ لاؤ گے۔'' اس دن سے عبدالاشہل کی تمام اولاد نے اسلام قبول کر لیا۔

ایسے جوش اور حمیت کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور پیام رسول ﷺ کی اشاعت و تبلیغ کی جاتی تھی کہ ایک سال کے اندر مدینہ میں کوئی گھرانا ایسا نہ رہا جس میں سے چند آدمیوں نے مسلمان ہو کر مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ نہ کیا ہو، ماسوائے قبیلہ اوس کے ایک حصے کے، جو ابو قیس شاعر کی وجہ سے اسلام سے علیحدہ رہا۔

(32)...... دوسرے برس جب حج کا زمانہ آیا تو مسلمانوں کا ایک گروہ جس میں 73 اشخاص تھے' اپنے ہم وطن مشرکین کے ساتھ یثرب سے مکہ میں آیا۔ یہ مسلمان مکہ اس لیے بھیجے گئے تھے کہ رسول کریم ﷺ سے یثرب چلنے کے لیے عرض کریں تاکہ آپ ﷺ دشمنوں کی ایذا رسانی سے محفوظ ہوجائیں دوسرے اس لیے کہ وہ آپ ﷺ کو اللہ کا رسول ﷺ اور اپنا سردار مان کر آپ ﷺ سے بیعت کریں۔ وہ تمام لوگ جو اسلام قبول کر چکے تھے' اس موقع پر مکہ آئے۔ حضرت مصعبؓ بھی' جو ان کے معلّم تھے' ہم راہ تھے۔ مصعبؓ بن عمیر مکہ پہنچتے ہی رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کام یابی کا حال بیان کیا جو دعوت اسلام میں انھیں حاصل ہوئی تھی۔

(33)......اس خیال سے کہ قریش کی بدظنی اور عداوت کو تحریک نہ ہو' عقبہ میں خفیہ ملاقات کی تجویز پیش کی گئی جہاں پہلے بھی وہ مسلمان جمع ہوئے تھے جنھوں نے اوّل بیعت عقبہ کی تھی اور اسلام قبول کیا تھا۔ آنحضور ﷺ اپنے چچا عباس کے ساتھ عقبہ میں تشریف لائے۔ حضرت عباس اگرچہ ابھی تک بت پرست تھے' مگر انھیں اس راز میں شریک کرلیا گیا تھا۔ انھوں نے اس خفیہ اجلاس میں آغاز گفتگو میں اپنے بھتیجے کے بارے میں کہا کہ وہ اپنے قبیلے میں سب سے زیادہ شریف خاندان کے فرزند ہیں۔ دشمنوں کے مقابلے میں ہم ہمیشہ ان کا ساتھ دیتے رہے ہیں۔ چوں کہ اب آپ ﷺ یثرب کے لوگوں میں پناہ لینا چاہتے ہیں تو اہل یثرب کو چاہیے کہ حفاظت کی ذمہ داری کو اچھی طرح سوچ سمجھ لیں' کیوں کہ جب ایک دفعہ انھوں نے اس کام کو اپنے ذمے لے لیا تو پھر انھیں اپنے عہد سے ہٹنا نہ ہوگا۔ تب براٗ بن معرور نے جو بنو خزرج میں سے تھے' اقرار کیا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کا پختہ یقین دلاتے ہیں۔ پھر انھوں نے رسول کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ جو کچھ آپ ﷺ ہم سے چاہتے ہیں' وہ مفصّل بیان فرمائیں۔

(34)......رسول کریم ﷺ نے قرآن مجید کی چند آیات پڑھ کر ان سے گفتگو کی اور انھیں نصیحت فرمائی کہ وہ ہمیشہ اس دین کی تصدیق کریں' جس میں وہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان لائے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم میری اور میرے رفقا کی حفاظت دشمنوں سے اس طرح کرو' جیسے تم اپنے اہل وعیال کی کرتے ہو۔ تب براٗ بن معرور نے رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ''قسم ہے اس کی جس نے تجھے رسول ﷺ بنا کے ہمارے پاس بھیجا اور تیرے ذریعے سے دین برحق کو ہم پر ظاہر کیا کہ ہم تیری حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے اپنے جسموں کی اور ہم تجھے اپنا سردار مان کر تیری بیعت کرتے ہیں۔ ہم میدان کے مرد اور ہتھیاروں کے آدمی ہیں جو ہم نے اپنے لائق باپوں سے لائق بیٹوں کی طرح ورثے میں پایا ہے۔'' ایک دوسرے سردار ابوالہیثم نے کہا: ''یارسول اللہ ﷺ! ہمارے اور یہودیوں کے مابین تعلقات ہیں۔ بیعت کے بعد یہ تعلقات ٹوٹ جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ جب اسلام کو قوت و طاقت حاصل ہوجائے تو آپ ﷺ ہمیں چھوڑ کے چلے جائیں۔'' حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا ''تمہارا خون میرا خون ہے۔ تم میرے ہو اور میں تمھارا ہوں۔''

(35)......جب قریش مکہ کو ان خفیہ سرگرمیوں کی خبر ہوئی تو مسلمانوں پر اور زیادہ ظلم ڈھانے شروع کردیے' یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے انھیں مکہ سے ہجرت کرنے کا حکم دیا: ''یثرب کو چلے جاؤ' کیوں کہ اللہ نے تمھیں اس شہر میں بھائی دیے ہیں' اور گھر دیا ہے' جس میں تمھیں پناہ ملے گی۔'' پس مسلمان چپکے چپکے دو دو اور تین تین کر کے یثرب کو ہجرت کرنے لگے' جہاں ان کا سچے دل سے خیر مقدم ہوا اور اہل یثرب نے مہاجرین کی بھرپور مدارات کی اور ان میں سے ہر ایک نے دوسروں پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تمام ضروری اشیا مہاجرین کو مہیا کیں۔ دو برس کے عرصے میں تقریباً کل مسلمانوں نے' سوائے ان کے جنھیں گرفتار کرلیا گیا تھا' مکہ سے یثرب کو ہجرت کی، ان کی تعداد ایک سو پچاس تھی۔

(36)...... یثرب آ کر جسے اس وقت مدینۃ النبی کا لقب ملا' رسول اللہ ﷺ کو پہلی فکر یہ ہوئی کہ ایک مسجد تعمیر کرائی جائے تاکہ نماز پڑھنے اور مسلمانوں کے جمع ہونے کے لیے ایک سایہ حاصل ہو۔ آپ ﷺ نے جہاں قیام کیا تھا' اس سے ملحق دو یتیم بچوں کی ایک پڑتی زمین تھی جسے آپ ﷺ نے مسجد کے لیے پسند فرمایا۔ دونوں یتیموں نے یہ زمین مفت دینا چاہی' مگر آپ ﷺ نے اسے پسند نہ کیا۔ ایک انصاری نے قیمت ادا کردی۔ زمین برابر کر کے مسجد بننا شروع ہوئی۔ اس مسجد کے بنانے والے معمار اور مزدور کون تھے؟ خود آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے وفادار ساتھی۔ سب نے مل کر ایک کچی دیوار اٹھا کر اوپر کھجور کے تنوں اور پتوں کی چھت ڈال دی۔ یہی مسجد نبوی ﷺ تھی۔

(37)...... مکہ میں چوں کہ امن و امان نہ تھا' نہ کھلے بندوں نماز پڑھنے کی اجازت تھی' اس لیے فرض نماز دو رکعتیں تھیں۔ مدینہ آکر جب مسلمانوں نے اطمینان کی سانس لی اور مذہبی آزادی ملی تو ظہر' عصر اور عشا کی چار چار رکعتیں پوری کی گئیں۔ مغرب کی تین رہیں اور فجر کی دوٗ کیوں کہ صبح کے وقت لمبی قرأت یعنی دو رکعتوں کے بدلے زیادہ قرآن پڑھنے کا حکم تھا۔

(38)...... جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے ضرورت اس امر کی تھی کہ مسلمانوں کو مقررہ وقت پر بلانے کے لیے کوئی انتظام کیا جائے۔ ہندوؤں میں اس کے لیے سنکھ' عیسائیوں میں گھنٹا اور یہودیوں میں قرنا کا رواج تھا۔ اسلام میں کھیل تماشے کی ان بے معنی آوازوں کی بجائے انسان کی فطری آواز کو پسند کیا گیا کہ کوئی کھڑا ہو کر ''اللہ اکبر' اللہ اکبر' پکارے اور سارے مسلمان اس فرمان خداوندی کی آواز (اذان) کو سن کر جوق در جوق مسجد کا رخ کریں۔

(39)...... جمعہ کی نماز بھی مکہ میں نہیں ہوسکتی تھی۔ مدینہ آکر اس فرض کی ادائیگی کا بھی موقع ملا۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت مصعبؓ بن عمیر نے' جو امام بنا کر مدینہ بھیجے گئے تھے' جمعہ کی نماز ادا کی۔ پھر جب حضور ﷺ آئے اور قبا میں چند روز ٹھہر کر مدینہ جانے لگے تو جمعہ کا دن آ گیا۔ آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور مسلمانوں کو جمعہ کی

نماز پڑھائی۔

(40)......شروع شروع میں مسلمان بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے تھے اور یہ انتظام غالباً اس اُمید پر مبنی تھا کہ یہود دائرۂ اسلام میں شامل ہو جائیں گے۔ رسول کریم ﷺ نے مختلف طریقوں سے مثلاً تورات مقدس کے حوالوں سے اور مذہبی رسوم کی آزادانہ ادائیگی اور ملکی اختیارات میں مساوی حقوق دے کر یہود کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا' لیکن انھوں نے ان مہربانیوں کا نفرت اور عداوت سے جواب دیا۔ یہود سے مواصلت کی تمام اُمیدیں لاحاصل ثابت ہوئیں اور یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ آپ ﷺ کی رسالت پر ایمان نہیں لائیں گے۔

حضور ﷺ جب تک مکہ میں رہے کعبے کے سامنے اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ بیت المقدس بھی سامنے پڑے۔ مدینہ آئے تو صورتِ حال بدل گئی۔ مدینے کے ایک طرف کعبہ تھا تو دوسری طرف بیت المقدس' اس لیے ان دو میں سے ایک ہی کو قبلہ بنایا جا سکتا تھا۔ پہلے تو آپ ﷺ حضرت داؤدؑ کی مسجد بیت المقدس ہی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے' مگر سولہ مہینے کے بعد اللہ کا حکم آیا کہ حضرت ابراہیم کی مسجد یعنی کعبے کی طرف منہ کر کے نماز ادا کریں، کیوں کہ وہی اللہ کا سب سے پہلا گھر ہے۔ اس وقت سے کعبہ اسلامیانِ عالم کا قبلہ قرار پایا۔

(41)......نماز میں سمت قبلہ کی تبدیلی سے فی الحقیقت اسلام کی قومی بلکہ بین الاقوامی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ اس حکم نے کعبہ کو اہل اسلام کے لیے بین الاقوامی مرکز بنا دیا' جو پہلے سے ہی عرب قبائل کی زیارت گاہ چلا آتا تھا۔ نیز قبائل عرب کی قدیم رسم حج کو اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کا رکن قرار دیا گیا' جس سے ہر صاحب استطاعت مسلمان پر عمر بھر میں ایک دفعہ حج فرض قرار پایا۔

(42)......قرآن مجید میں بہت سی آیات ایسی ہیں جو عربوں کی قومی زندگی کو اُجاگر کرتی ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ انھی کی زبان میں وحی نازل ہوئی اور انھی میں سے ایک آدمی کی زبان سے اسے ادا کیا گیا۔ چند آیات کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

☆ ''ہم نے اس کتاب کو عربی زبان میں اتارا' تاکہ تم سمجھو'' (الزخرف 2:43)

☆ ''ہم نے تیرے دل میں عربی کلام ڈالا' تاکہ تو مکہ والوں اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو ڈرائے'' (شوریٰ 7:42)

☆ ''اگر ہم اس کتاب کو عربی زبان کے سوا کسی دوسری زبان میں اتارتے تو وہ کہتے کہ اس کے احکام اچھی طرح کیوں نہیں سمجھائے گئے۔ یہ تو عربی زبان نہیں ہے اور ہم عربی ہیں'' (حم السجدہ 28:39، 29)

☆ ''ہم نے لوگوں کے لیے اس کلام میں ہر طرح کی مثال بیان کر دی ہے' تاکہ وہ نصیحت پائیں اور عربی زبان کا یہ کلام ایچ پیچ کے بغیر ہے' تاکہ وہ اللہ سے ڈریں۔'' (الزمر 28:39،29)

☆ ''بے شک یہ قرآن رب العالمین کا اُتارا ہوا ہے...... صاف صاف عربی زبان میں'' (شعرا 192:26 تا 195)

☆ ''ہم نے قرآن تیری زبان میں آسان کیا ہے تاکہ تم اس سے پرہیز گاروں کو خوش خبری پہنچا دو اور ہٹ دھرمی کرنے والوں کو ڈرسنا دو'' (مریم 97:19)

(43)......لیکن اسلام اور رسول ﷺ کا پیغام صرف عرب قوم کے لیے نہ تھا' بلکہ پوری انسانیت کے لیے تھا۔ چوں کہ خدا واحد ہے' اس لیے دین بھی واحد ہے' جس میں شرکت کے لیے تمام بنی نوع انسان کو دعوت دی جاتی تھی۔ اسلام کا یہ خصوصی استحقاق ہے کہ وہ ساری دنیا کے لیے ہے اور سب انسانوں اور قوموں پر حاوی ہے' اس کی عملی اور عمدہ مثال وہ مکتوبات ہیں جو رسول کریم ﷺ نے 6 ہجری (628ء) کو اس زمانے کے بڑے بڑے بادشاہوں اور سلاطین کے نام بھیجے۔

(44)......قرآن مجید میں بعض آیات ایسی ہیں جن سے اعلان ہوتا ہے کہ اسلام تمام دنیا کے انسانوں کے لیے ہے:

☆ ''یہ تو صرف ایک نصیحت ہے دنیا کے تمام لوگوں کے لیے اور تم ایک زمانے کے بعد اس کی سچائی جانو گے'' (ص 87:38،88)

☆ ''یہ تو صرف ایک نصیحت اور کھلا کلام ہے تاکہ پیغمبر ان لوگوں کو ڈرائیں جو عقل رکھتے ہیں اور کافروں پر حجت پوری ہو'' (یٰس 69:36،70)

☆ اور ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا' مگر اس لیے کہ تو تمام لوگوں کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا ہو۔'' (سبا 27:34)

☆ ''وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا' تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے' اگرچہ مشرک برا جانیں۔'' (الصف 9:61)

سب سے زیادہ مایوسی اور نا اُمیدی کی حالت میں اسلام کی آفاقیت اور اس کے غلبے کی خوش خبری دی گئی' جب کہ اہل مکہ رسول اکرم ﷺ کی بات ماننے سے انکار کرتے تھے' مثلاً:

☆ ''اور جب ان (کافروں) سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے پروردگار نے کیا اُتارا ہے' تو کہتے ہیں کہ وہ تو پہلے والے لوگوں کے محض قصے کہانیاں ہیں۔''
(النحل 24:16)

☆ ''اور ان کے پاس انھی میں سے ایک پیغمبر آیا تو انھوں نے اسے جھٹلایا۔ سو انھیں عذاب نے آ پکڑا اور وہ ظالم تھے۔'' (النحل 113:16)

جب کہ اسلام قبول کرنے والوں کو ایسی اذیت دی جاتی تھی تاکہ وہ اسلام سے پھر جائیں:

☆ جو شخص ایمان لانے کے بعد خدا کے ساتھ کفر کرے (النحل 106:16)

اور مجبور ہوتے تھے کہ ملک چھوڑ کر بھاگیں تاکہ ظالموں کے ظلم سے بچیں۔
(النحل 111:16)

تو اس وقت یہ وعدہ کیا گیا: ''اور جس دن ہم ہر امت میں سے گواہ (پیغمبر) کھڑا کریں گے تو نہ تو کفار کو بولنے کی اجازت ملے گی اور نہ ان کے عذر قبول کیے جائیں گے۔'' (النحل 84:16)

(45)...... اسلام کا یہ استحقاق کہ یہ پوری انسانیت کا دین ہے' صرف قرآنی آیات ہی سے نہیں' بلکہ آنحضور ﷺ کے منصب نبوت سے بھی اس طرح ظاہر ہوا کہ آپ ﷺ نے بلال کو حبشہ کا اور صہیب رومی کو یونان کا پہلا ثمر فرمایا۔ فارس کا پہلا شخص جو مسلمان ہوا (سلمان فارسی)' وہ مدینہ میں ایک عیسائی غلام تھا' اور ہجرت کے پہلے سال اس نے اسلام قبول کیا۔ علاوہ ازیں ایک حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے ملک چین کو تبلیغ میں شامل فرمایا۔

(46)...... تمام اقوامِ عالم میں مبلغین بھیجنے اور اسلام کی دعوت دینے کا واقعہ بھی اسلام کے اس دعوے کا ایک اور ثبوت ہے کہ اسلام عالم گیر مذہب ہے ''رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہ سے فرمایا' تم سب صبح کو میرے پاس آؤ۔ آنحضور ﷺ جب فجر کی نماز سے فارغ ہوتے تھے تو کچھ دیر تک تسبیح اور دعاؤں مصروف رہتے تھے۔ پھر آپ ﷺ صحابہ کی طرف متوجہ ہوتے آنحضور ﷺ نے چند صحابہؓ کو ایک طرف بھیجا اور کچھ کو دوسری طرف۔ اور ان سے فرمایا: ''تم بندگان خدا کے حق میں خدا کا فرض ادا کرنے میں سچے رہو' کیوں کہ جس شخص کو خدمت خلق کا کام سپرد کیا جاتا ہے' اور پھر وہ اس فرض کو سچائی سے ادا نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس پر بہشت حرام کر دیتا ہے۔ جاؤ اور حضرت عیسیٰ ابن مریم کے پیروؤں نے جیسا کیا' ویسا مت کرنا' کیوں کہ وہ قریب رہنے والوں تک پہنچے اور انھوں نے دُور رہنے والوں کو چھوڑ دیا۔'' آپ ﷺ نے زید ابن ثابت سے فرمایا کہ سریانی اور عبرانی زبان سیکھیں۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ جن صحابہ کو جن لوگوں کی طرف بھیجنے کا حکم ہوا تھا' انھوں نے ان لوگوں کی زبان بھی سیکھی۔

(47)...... غزوات کے زمانے میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا موقع بہت کم ملا' کیوں کہ اس عرصے میں قریش کی عداوت نے رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کو مقابلے پر مجبور کیا۔ البتہ مدینہ کے باشندوں اور مکہ کے چند لوگوں میں' اشاعت دین کی کوششیں جاری رہیں۔ مکہ کے ایک شخص عمیر بن وہب جو غزوۂ بدر کے بعد حضور ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے آئے تھے' مسلمان ہوگئے' اور وہ جو اس وقت تک مسلمانوں کے سخت مخالف تھے' اسلام قبول کر کے رسول اکرم ﷺ کے مشہور صحابہ میں سے ہوئے۔ ہجرت کے چوتھے برس (625ء) میں یہ کوشش کی گئی کہ بنو عامر بن صعصعہ کو اسلام کی دعوت دی جائے' چنانچہ بنی صعصعہ کے سردار نے مسلمانوں کو بلایا تو چالیس مسلمان نجد روانہ کیے گئے' مگر سب کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔ صرف دو شخص اپنی جانیں بچا سکے۔

(48)...... غزوات میں مسلمانوں کی فتوحات نے مختلف قبائل کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اسلام قبول کر کے مسلمانوں میں شامل ہو جائیں۔ سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ آنحضور ﷺ جس حسن اخلاق سے قبائل کے وفود سے برتاؤ کرتے اور جس توجہ سے ان کی شکایات سنتے اور جس فہم و فراست سے ان کے باہمی تنازعات کا تصفیہ کرتے اور جس تدبُّر سے ملکی نظم و نسق کا اہتمام کرتے' ان باتوں سے آپ کا نام ہر شخص کی زبان پر رہنے لگا اور آپ ﷺ کی فیاضی اور حسن سلوک کی شہرت پورے جزیرہ نمائے عرب میں پھیل گئی۔

ایسے واقعات عام تھے کہ کسی قبیلے کا آدمی آنحضور ﷺ کے پاس مدینہ میں حاضر ہو کر مسلمان ہوا اور پھر مبلغ اسلام بن کر وطن کو واپس آیا تا کہ اپنے قبیلے والوں کو بھی اسلام کی دعوت دے۔ یہاں اس سلسلے میں چند مثالیں پیش کی جارہی ہیں:۔

(49)...... یہ واقعہ 5 ہجری کا ہے ایک شخص نے اس طرح روایت کیا ہے کہ ''ایک روز جب ہم سب مسجد نبوی ﷺ میں بیٹھے تھے تو ایک بدّو اونٹ پر سوار آیا۔ مسجد کے صحن میں اس نے اونٹ کو بٹھایا اور اُسے باندھ دیا۔ تب وہ ہمارے قریب آیا اور پوچھا: ''کیا تم عبدالمطلب کے بیٹے ہو؟'' رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا: ''ہاں'' بدو نے کہا: ''مجھے یقین ہے کہ چند سوالات پوچھنے پر تم ناراض نہ ہوگے'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو تیری مرضی ہو' پوچھ''۔ بدو نے پوچھا: ''میں تمھیں خدا اور ان نبیوں کی' جو تم سے پہلے تھے' قسم دلاتا ہوں کہ مجھے بتاؤ' کیا اللہ نے تمھیں ساری دنیا کے سب آدمیوں کے لیے بھیجا ہے۔'' آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''ہاں قسم ہے اللہ کی''۔ اس نے پھر کہا۔ میں تجھے اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اس نے تجھے دن رات میں پانچ دفعہ نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔'' آپ نے فرمایا ''ہاں قسم ہے اللہ کی۔'' بدو نے پھر پوچھا: ''میں تمھیں اللہ کی قسم دلاتا ہوں۔ کیا اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے کہ دولت مندوں سے دسواں حصہ لو' تا کہ مسکینوں میں تقسیم کرو۔'' آنحضور ﷺ نے جواب دیا: ''ہاں' قسم ہے اللہ کی'' تب بدو نے کہا: ''میں اس وحی پر جو تمھارے پاس آئی' یقین کرتا ہوں۔ اور میں ضمام ابن ثعلبہ ہوں۔ اپنے قبیلے کا فرستادہ ہوں'' اس کے بعد ضمام اپنے قبیلے کو واپس گئے اور ان کے قبیلے کے تمام لوگ ایمان لے آئے۔

(50)...... ایسے ہی ایک اور مبلغ عمر بن مرّہ تھے جو قبیلہ بنو جہینہ سے تھے۔ یہ قبیلہ بحیرۂ قلزم کے ساحل اور مدینہ کے درمیان آباد تھا۔ عمر بن مرّہ کے اسلام لانے کا زمانہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔ اپنے قبول اسلام کا واقعہ انھوں نے یوں بیان کیا ہے: ''ہمارے ہاں ایک بت تھا جسے ہم پُوجتے تھے اور میں اس کا مجاور تھا۔ جب مَیں نے رسول اکرم ﷺ کی خبر سنی تو مَیں نے وہ بت توڑ ڈالا اور مدینہ میں آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمان ہو گیا اور کلمہ شہادت پڑھا اور حلال و حرام کے جو احکام آنحضور ﷺ پر نازل ہوئے تھے' ان پر ایمان لایا۔ آنحضور ﷺ نے عمر بن مرّہ کو مسلمان ہونے کے بعد ان کے قبیلے میں دعوت و تبلیغ اسلام کے لیے روانہ فرمایا۔ وہ اپنی کوششوں میں اس قدر کامیاب ہوئے کہ صرف ایک شخص ایسا تھا کہ جس پر تبلیغ کا کوئی اثر نہ ہوا۔

(51)...... صلحِ حدیبیہ (6 ہجری) کے بعد جب اہل مکہ سے دوستانہ تعلقات قائم ہوئے تو مکہ کے بہت سے لوگ' جو شروع زمانہ رسالت میں آنحضور ﷺ کی تعلیم و تلقین سے بہرہ مند نہ ہوئے تھے' اب مدینہ میں اس غرض سے آئے کہ اسلام قبول کریں اور ان میں سے بعض لوگ بہت اثر و رسوخ والے تھے۔

(52)......اہل مکہ سے متواتر لڑائیاں رہنے کے نتیجہ میں مکہ کے جنوبی قبائل اب تک اسلام سے بالکل بے بہرہ تھے صلح حدیبیہ کے بعد ان سے مراسلت ممکن ہو گئی اور قبیلہ بنو دوس کے چند لوگ پہاڑوں سے اُتر کر' جو یمن کی شمالی سرحد پر رہتے تھے' آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ سے پہلے بنی دوس میں چند لوگوں نے ایک ایسے مذہب کی جھلک دیکھی جو بت پرستی کے مذہب سے بہت اعلیٰ و برتر تھا اور اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ دنیا کا کوئی خالق ہے۔ اگرچہ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ خالق کون ہے' اور جب آنحضور ﷺ اس خالق کے رسول ہوئے تو ان میں سے ایک شخص' جن کا نام طفیل تھا' آپ ﷺ کی خدمت میں یہ تحقیق کرنے آیا کہ اس دنیا کا خالق کون ہے۔ آنحضور ﷺ کے سامنے اس نے اپنی چند نظمیں پڑھیں اور حضور ﷺ نے قرآن کی آخری تین سورتیں اُسے سنائیں۔ طفیل کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ حضور ﷺ نے تبلیغ کا کام ان کے سپرد کیا کہ وہ اپنے لوگوں میں جائیں اور انہیں اسلام کی دعوت دیں۔ شروع میں طفیل کو کچھ کام یابی نہ ہوئی۔ سوائے باپ اور بیوی اور چند قریبی دوستوں کے' بہت کم لوگ مسلمان ہوئے۔ اشاعت کی ناکامی سے مایوس ہو کر طفیل آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ''بنی دوس' سخت گردن کے لوگ ہیں۔ ان کے حق میں بددعا کیجیے لیکن آنحضور ﷺ نے دعا کی: ''یارب' بنو دوس کو صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت عطا فرما'' آپ ﷺ نے طفیل کو واپس بھیجا کہ تبلیغ و دعوت میں از سر نو کوشش کریں۔ اس مرتبہ طفیل کے ایک دوست نے بھی ان کی مدد کی اور یہ دونوں دوست گھر گھر وعظ کرتے پھرتے اور 6 ہجری کو قبیلہ دوس کے بڑے حصے کو مسلمان کرنے میں کام یاب ہوئے۔ دو برس بعد اس قبیلہ نے بت پرستی کے عقائد ترک کر دیئے اور سب لوگ مسلمان ہو گئے۔ طفیلؓ دوسی نے اس لکڑی کے ٹکڑے کے بُت کو آگ لگا دی جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔

(53)......سات ہجری میں پندرہ مزید قبیلوں نے آنحضور ﷺ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا۔ آٹھ ہجری فتح مکہ کے بعد اسلام کا عروج یقینی ہو گیا' اور وہ عرب جو یہ کہہ کر علیحدہ ہو رہے تھے کہ: ''محمد ﷺ اور اس کے قبیلے کے لوگوں کو لڑ کر فیصلہ کر لینے دو۔ اگر انہیں فتح ہوئی تو بے شک وہ سچا رسول ہوگا'' اب وہ اسلام قبول کرنے کے لیے دوڑے چلے آئے۔ فتح مکہ کے بعد جو لوگ مسلمان ہوئے' ان میں بعض وہ تھے جو شروع زمانہ رسالت میں آنحضور ﷺ کے سخت دشمن رہے تھے' مگر آپ ﷺ نے تحمل اور عفو و کرم سے کام لے کر انہیں اسلام میں شامل فرما لیا۔

(54)......اسی سال میں عروہ بن مسعودؓ جو طائف کے سرداروں میں سے تھے' شہید ہوئے۔ اہل اسلام نے طائف فتح کرنے کی کوشش کی' مگر ناکام رہے۔ عروہ بن مسعودؓ اس زمانے میں یمن گئے ہوئے تھے اور طائف کا محاصرہ اٹھنے کے تھوڑے عرصہ بعد یمن سے مدینہ واپس آئے تھے۔ دو برس پہلے حدیبیہ کے مقام پر وہ رسول کریم ﷺ سے شرف ملاقات حاصل کر چکے تھے اور حضور ﷺ کی عظمت ان کے دل میں بیٹھ چکی تھی۔ اب وہ مدینہ اسلام قبول کرنے کی غرض سے آئے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد اسلام کا جوش ان کے دل میں ایسا موج زن ہوا کہ طائف جانے کا ارادہ کر لیا' تاکہ اہل طائف کو اسلام کی دعوت دیں۔ عروہ بن مسعودؓ نے طائف پہنچ کر اعلان کیا کہ مَیں نے بت پرستی ترک کر دی ہے اور لوگوں سے کہا کہ تم بھی میری پیروی کرو۔ جس وقت وہ اسلام کی تبلیغ کر رہے تھے کہ ایک تیر آ کر انہیں لگا جس کے کاری زخم سے عروہ بن مسعودؓ شہید ہو گئے۔ غالباً ایک برس کے بعد رسول کریم ﷺ کے ایک اور صحابی نے پھر تبلیغ اسلام کے لیے یمن میں کوشش کی اور انہیں خاطر خواہ کام یابی حاصل ہوئی۔

(55)......یمن میں تبلیغ و دعوت کی یہ کوشش عیاش بن ربیعہ کے ہاتھوں انجام پزیر ہوئی۔ اس واقعے کا ذکر اس طرح ہوا ہے: ''رسول اللہ ﷺ نے الحرث' مسرح اور نعیم بن عبدکلال حمیری کو لکھا: ''تم پر سلامتی ہو' جب تک کہ تم اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے ہو۔ اللہ ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور عیسیٰؑ کو اپنے کلمے سے پیدا کیا۔ یہودی کہتے ہیں کہ عزیر خدا کا بیٹا ہے' اور عیسائی کہتے ہیں کہ خدا تین میں سے ایک ہے' اور عیسیٰؑ خدا کا بیٹا ہے۔''

یہ تبلیغی خط آنحضور ﷺ نے یمن میں عیاش بن ربیعہ مخزومی کو روانہ کیا اور فرمایا: ''جب تم ان کے شہر پہنچو تو رات کو نہ جانا' بلکہ صبح تک انتظار کرنا۔ تب وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھنا اور اللہ سے دعا مانگنا کہ وہ تمہیں کام یابی بخشے اور تمھارا خیر مقدم ہو اور تم ضرر سے امان میں رہو۔ تب میرا یہ خط اپنے دائیں ہاتھ میں لینا اور ان کے دائیں ہاتھ میں دینا۔ پھر ان کے سامنے سورہ انبیا پڑھنا اور جب ختم کر چکو تو کہنا: ''محمد ﷺ اس پر یقین کرتا ہے اور میں اس پر ایمان لانے والوں میں پہلا ہوں۔'' وہ تمھارے خلاف جو اعتراضات کریں گے' تم اس کا جواب دے سکو گے اور جو چمکتی کتاب وہ تمھارے سامنے پڑھیں گے' اس کی چمک جاتی رہے گی' اور جب وہ غیر زبان میں بولیں تو کہنا ''ترجمہ کرو' اور ان سے کہو: ''اللہ میرے لیے کافی ہے۔ میں اس کی بھیجی ہوئی کتاب پر ایمان رکھتا ہوں اور مجھے حکم ہے کہ تم میں انصاف کروں۔ اللہ ہمارا اور تمھارا رب ہے۔ ہمارے کام ہمارے ہیں اور تمھارے کام تمھارے۔ کوئی جھگڑا ہم میں اور تم میں نہیں۔ خدا ہم سب کو ملا دے گا اور ہم سب کو اسی کے پاس جانا ہے۔'' اگر وہ یہ کہنے پر اسلام قبول کریں تو ان سے تینوں لکڑیوں کی نسبت پوچھو' جن کے سامنے جمع ہو کر وہ بندگی کرتے ہیں۔ ان لکڑیوں میں سے ایک لکڑی اثل یعنی جھاؤ کی ہے جس پر سفید اور زرد داغ ہیں اور ایک بید کی طرح مُڑی ہوئی ہے' اور دوسری آبنوس کی مانند سیاہ ہے۔ ان لکڑیوں کو باہر لانا اور بازار میں سب کے سامنے جلا دینا۔''

عیاش کا بیان ہے: ''پس میں روانہ ہوا' تاکہ رسول کریم ﷺ نے جو مجھے حکم دیا تھا' اس کی تعمیل کروں۔ جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ لوگوں نے کسی میلے کے لیے سجاوٹ کی ہے۔ مَیں اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا اور تین بڑے پردوں کے قریب

آیا جو تین دروازوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ مَیں نے پردہ اٹھایا اور بیچ کے دروازے سے داخل ہوا اور دیکھا کہ مکان کے صحن میں لوگ جمع ہیں۔ مَیں نے ان سے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا بھیجا ہوا ہوں' اور پھر مَیں نے وہی کیا جس طرح رسول کریم ﷺ نے مجھے بتایا تھا۔ ان لوگوں نے میری بات کی پاس داری کی اور ایسا ہی ہوا جیسا کہ رسول ﷺ نے کہا تھا۔

(56)...... 9 ہجری کو واثلہ بن الاسقع نے' جو نئے نئے مسلمان ہوئے تھے' یہ کوشش کی کہ اپنے قبیلے والوں کو اسلام کی ترغیب دیں' مگر انہیں اس کوشش میں کام یابی نہ ہوئی۔ واثلہؓ کے والد نے یہ کہہ کر انھیں علیحدہ کر دیا: ''خدا کی قسم میں تجھ سے کبھی بات نہ کروں گا'' اور کوئی شخص' سوائے ان کی بہن کے ایسا نہ ملا جو واثلہؓ کی باتوں پر یقین کرتا۔ ان کی بہن نے ان کے لیے ایسا موقع پیدا کر دیا کہ وہ رسول اللہ کی خدمت میں واپس چلے جائیں۔

(57)...... ہجرت کے نویں سال کو سالِ وفود کہا گیا ہے' کیوں کہ عرب کے بہت سے قبیلوں اور شہروں نے اپنے آدمی آنحضور ﷺ کی خدمت میں بھیجے تاکہ آپ ﷺ کی اطاعت قبول کریں۔

(58)...... اہل عرب میں سماجی اتحاد و اتفاق کے نئے اصول ''اسلامی اخوت'' نے قبیلوں کی بندشوں اور پابندیوں کے زور کو' جس نے معاشرے کی عمارت کو نسلی رشتوں پر اُستوار کر رکھا تھا' کم زور کرنا شروع کر دیا۔ کسی شخص کا اسلام قبول کرنا اور اسلامی معاشرت میں داخل ہونا' اہل عرب کے پرانے اصول معاشرت کے قواعد و ضوابط کو توڑنا تھا' چوں کہ ایسی مثالیں کثرت سے پیش آئیں' اس لیے یہ قبائلی نظام کے خاتمے کا قوی سبب بن گئیں' اور قبائل کا سلسلہ و سرشتہ اہل اسلام کی اجتماعی و معاشرتی زندگی کے سامنے کم زور ہو گیا۔ اس لیے عرب قبائل میں تحریک پیدا ہوئی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت قبول کریں' صرف اس خیال سے نہیں کہ آپ ﷺ ملک عرب میں سب سے بڑی فوجی قوت کے سردار ہیں' بلکہ اس خیال سے کہ آپ ﷺ ایسے اُصولِ معاشرت کے داعی اور معلّم ہیں' جس نے پُرانے قبائلی معاشرتی نظام کو کم زور اور بے تاثیر کر دیا۔ اس طریقے سے اسلام نے مختلف قبائل کو' جو اس وقت تک برابر لڑائیوں میں مصروف تھے' متحد کرنا شروع کر دیا اور جوں جوں یہ جماعت ترقی پاتی گئی' کم زور قبیلے اس میں شریک ہوتے گئے۔ عرب قبائل کے مسلمان ہونے کی صورت میں رسول کریم ﷺ کے اس وعدے کا بار بار ذکر ہوا ہے' کہ اسلام قبول کرنے پر ان کی دشمنوں سے حفاظت کی جائے گی۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر ایک عرب نے سنی تو وہ چلاّ کر بولا: ''افسوس ہے مجھے محمد ﷺ کی وفات کا۔ جب تک وہ زندہ تھے' میں اپنے دشمنوں سے حفاظت اور امن میں تھا'' اور یہی آواز تمام عرب میں گونج اٹھی۔

(تھامس آرنلڈ کی کتاب ''اشاعت اسلام'' کا ایک باب' ترجمہ: عنایت اللہ)

نبی اکرم ﷺ اور تبلیغ

تبلیغ، ابلاغ اور بلاغ سب کے معنی ایک ہیں، یعنی پہنچانا۔ پہنچانے کا مفہوم خود لفظ "رسول" کے اندر بھی موجود ہے۔ رسول کے معنی ہیں بھیجا ہوا اور پیغام لے جانے والا۔ کوئی پیغام دے کر کسی کو بھیجا جائے، تو اس کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ اسے پہنچا دے۔ ان تمام باتوں کو قرآن کی ایک آیت بڑی عمدگی سے واضح کرتی ہے۔ ارشاد ہے کہ:

﴿یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ﴾ (المائدہ 5: 67)

"اے پیغمبر! تمھارے رب کی طرف سے تم پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اسے پہنچاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغامبری کا حق ہی ادا نہ کیا۔"

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسالت کے معنی ہی پیغام کے ہیں اور رسول وہی ہوتا ہے جو پیغام لائے اور اس کا اصلی فریضہ یہ ہے کہ وہ اس پیغام کو پہنچا دے، اسی پہنچا دینے کا نام ہے تبلیغ یا ابلاغ۔ رسول تو پیغام لانے والا ہے اور وہ پیغام قرآن مجید ہے جسے ھذا بلاغ للناس کہا گیا ہے۔ یعنی یہی کتاب پیغام خداوندی ہے اور اسے پہنچانے والا رسول ہے۔ قرآن کریم نے رسول کے فریضۂ تبلیغ کے متعلق واضح لفظوں میں یہ بھی فرمایا کہ:

﴿وَمَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ﴾ (النور 24: 54)

"رسول کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ وضاحت کے ساتھ پہنچا دے۔"

اس آیت سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ رسول کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کا پیغام سنا دے اور اس کے بعد آرام سے گھر پر آ کر سو رہے۔ گویا نعوذ باللہ وہ صرف ایک چٹھی رساں کی طرح آ کر خط دے جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے نہ خط بھیجنے والے سے کوئی مطلب ہوتا ہے، نہ خط وصول کرنے والے سے کوئی غرض۔ لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہیے کہ رسول کے ذمے جو تبلیغ کی گئی تھی وہ محض لغوی حیثیت کا پہنچانا نہیں بلکہ وہ ایک قرآنی اصطلاح ہے، جو اپنے بیسیوں لوازم کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ ایک ایسا فریضہ ہے، جس میں سردھڑ کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ پوری کائنات خم ٹھونک کر مقابلے پر آ جاتی ہے۔ دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے، قدم قدم پر شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور زندگی کی آخری سانس تک ایک ایک لمحے کو اسی مقصد کے لیے وقف کر دینا پڑتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے ذمے دو قسم کی تبلیغیں تھیں: ایک اہل کفر کو اسلام کی تبلیغ اور دوسرے اسلام لانے والوں کو سنبھالے رہنے کے لیے ہر ممکن تبلیغ۔ ان دونوں قسموں کی تبلیغ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ حضور ﷺ کی پوری زندگی ہی تبلیغ تھی اور زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اس کی ایک ایک ادا ہمہ تن تبلیغ تھی۔ ان دونوں قسموں کی مثالیں سننے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ تبلیغ کے ضروری لوازم کیا ہیں جو فریضۂ تبلیغ کو جان جوکھوں کا کام بنا دیتے ہیں۔

تبلیغی کام یابی کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مبلغ کو اپنے مشن سے ایسی لگن اور ایسا عشق ہو کہ وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھے اور اس کے لیے ہر متاع عزیز کی قربانی دینے کو اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھے۔ یہ دھن، یہ ایمان اور یہ اذعان وایقان نہ ہو، تو مبلغ کے لیے تبلیغی کام یابی تو الگ رہی، وہ اس راہ میں قدم بھی نہ رکھے گا۔

دوسری ہے استقامت۔ یعنی ارادہ وعزم میں کسی وقت بھی تزلزل نہ آئے۔ اگر اندر سے یقین کی گرفت ذرا ڈھیلی ہو تو وہ دھن اور وہ لگن ہی کم زور ہو جاتی ہے، جو تبلیغی سرگرمی کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم "فاستقم کما امرت" کا حکم دیتا ہے، یعنی اے رسول! حکم الٰہی کے مطابق جمے رہو۔

تیسری شرط ہے بے غرضی و بے لوثی۔ اس کے بغیر بھی کوئی تبلیغ کام یاب نہیں ہو سکتی۔ خود غرض انسان کے پیچھے کوئی نہیں چلتا یہی وجہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اس کی وضاحت کر دی کہ:

﴿لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ﴾ (34/47)

"میں تم سے اپنی تبلیغ کے عوض کسی قسم کا کوئی اجر نہیں چاہتا میرا معاوضہ تو بس اللہ کے ذمے ہے۔"

چوتھی شرط ہے حُسنِ افہام یعنی اپنا پیغام اتنی صفائی، خوب صورتی اور وضاحت سے پیش کرے کہ سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ گفتگو اتنی مختصر نہ ہو کہ مضمون تشنہ رہ جائے اور اتنی طویل بھی نہ ہو کہ سامع اکتا جائے۔ انداز مناسب اور مؤثر ہو، دلائل ناقابل تردید ہوں۔ مخاطب کی ذہنی سطح کے عین مطابق ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اسی کو قرآن کہتا ہے کہ:

﴿وَ قُلْ لَّھُمْ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ قَوْلًا ۢ بَلِیْغًا﴾ (النسآ 4: 63)

"ایسی بات کہو جو ان کے دل میں اُتر جائے۔"

پانچویں شرط ہے انسانی خیر خواہی۔ اگر زندگی کے ہر ہر مرحلے پر مبلغ عملاً یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ بنی نوع انسان کا بہی خواہ اور خیر طلب ہے، تو اس کے متعلق کسے یقین آئے گا کہ یہ بھی ہمارے ہی دینی و دنیوی فائدے کے لیے ہے؟ خیر خواہی تبلیغ کے لیے ایسی ضروری شرط ہے کہ پیغمبروں نے تبلیغ کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً حضرت ہودؑ فرماتے ہیں کہ:

﴿اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ﴾ (الاعراف 7: 68)

"میں نے تم تک اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا اور میں تم سب کا امانت دار خیر خواہ ہوں۔"

یہی مضمون حضرت نوحؑ، صالحؑ اور شعیبؑ کی زبان سے بھی قرآن میں ادا ہوا ہے۔ چھٹی شرط ہے خود مبلغ کا سراپا نمونہ عمل بننا۔ یہ ایسی ضروری شرط ہے کہ اس کے بغیر کسی کامیاب تبلیغ کا تصور بھی مشکل ہے۔ کون ایسے شخص کی بات مان سکتا ہے، جس کا عمل اس کے قول کے مطابق نہ ہو؟ مبلغ کے لیے صرف اسی قدر کافی نہیں کہ اس کی زندگی اس کے پیغام کے مطابق ہو بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ جتنا بھی دوسروں سے چاہتا ہے، اس سے بے شمار گنا زیادہ خود کر کے دکھائے۔ اگر وہ دوسروں سے مال کا چالیسواں حصہ طلب کرتا ہو، تو خود اپنی ساری پونجی پیش کر دے۔ اگر دوسروں کے ترکے کو قانون وراثت سے رفتہ رفتہ ختم کرنا چاہے، تو اپنے ترکے میں ایک درہم بھی نہ چھوڑے بلکہ اس کے پاس جو کچھ ہو وہ سب کا سب قوم کی ملکیت ہو۔ غرض اس کی زندگی ایک اعلیٰ نمونہ عمل ہو۔ جیسے قرآن کہتا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب 33: 21)

"تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔"

ایک ساتویں ضروری شرط جسے ان تمام شرائط کا مجموعہ کہنا چاہیے، یہ ہے کہ مبلغ کا اخلاقی کردار اتنا بلند ہو کہ بڑے سے بڑے مخالف اور دشمن کو کسی جہت سے بھی اس پر نکتہ چینی کا موقع نہ مل سکے۔ قرآن کریم اسی حقیقت کو یوں بیان فرماتا ہے کہ:

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾ (القلم 68: 4)

"آپ بہت اعلیٰ کردار پر قائم ہیں۔"

یہ ہیں وہ چند شرائط جو ایک مبلغ کے لیے ضروری ہیں، اور جن کے بغیر بلند سے بلند افکار کی تبلیغ بھی کامیابی سے ہم آغوش نہیں ہوتی، پھر اگر پیغام ایسا انوکھا ہو جو سننے والی قوم کے افکار، عادات اور روایات، سب کے خلاف ہو اور ہر متاع عزیز کی قربانی چاہتا ہو، تو کون ایسے مبلغ کی بات قبول کرنے پر آمادہ ہو سکتا ہے، جب تک اس میں یہ تمام شرائط تبلیغ بہ تمام و کمال نہ پائی جاتی ہوں؟ اب اس مبلغ اعظم ﷺ کا سب سے بڑا تبلیغی کارنامہ ملاحظہ فرمائیے۔ سب سے پہلے کون ایمان لایا؟ وہ جن کے لیے بظاہر سب سے آخر میں بھی ایمان لانا دشوار تھا، یہ ایمان لانے والے حضور ﷺ کی رفیقہ زندگی حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں۔ کسی انسان کی سیرت و کردار کی واقفیت بیوی سے زیادہ کسی کو نہیں ہوتی۔ انسان کی اصلیت گھر کی دن رات کی خلوتی زندگی میں بے نقاب ہو جاتی ہے۔ جلوت کی زندگی میں تقدس قائم کر لینا دشوار نہیں۔ حقیقت حال کا پتا تو گھریلو زندگی سے چلتا ہے۔ ایک بیوی شوہر کی زندگی کے متعلق سب کچھ جانتی ہے اور اس پر کسی شوہر کا جھوٹا جادو نہیں چل سکتا۔ ذرا سوچیے، حضور ﷺ کا کردار کتنا بلند ہوگا کہ ان کا پیغام سنتے ہی سب سے پہلے ان کی رازدار، واقف حال، تجربہ کار اور ہوش مند بیوی ہی ایمان لاتی ہیں اور یہ سمجھ کر ایمان لاتی ہیں کہ اب آخر دم تک ہر سرد و گرم کو جھیلنا پڑے گا۔ کیا ایک مبلغ کا اس سے بڑا بھی کوئی کارنامہ ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد کون اس پیغام کو قبول کرتا ہے؟ ایک رفیق جو بچپنے سے ساتھ کھیلا ہوا ہے، اور اس سے مبلغ اعظم کا کوئی راز پوشیدہ نہیں، اگر مبلغ کی سیرت و کردار پر اس کی امانت و صداقت پر سو فی صد اعتماد نہ ہو، تو کون ہم عصر دوست ہوگا، جو ایک خشک و بے مزہ پیغام کو قبول کر کے زمین و آسمان کو دشمن بن جانے کی دعوت دے گا؟ یہ تھے حضرت ابوبکر صدیقؓ جن کی زیرکی و فراست اور ایثار و صداقت پر کوئی دشمن بھی حرف نہ لا سکا۔ کیا ایک مبلغ کا اس سے بھی کوئی بڑا کارنامہ تصور میں آ سکتا ہے؟

پھر کون ایمان لایا؟ ایک منہ بولا فرزند زید بن حارثہؓ جو دن رات اس مبلغ کے ساتھ رہتا ہے، گھر کے اندر بے تکلف آتا جاتا ہے۔ ہر آن اس مبلغ کی صداقت و کردار کا بچشم خود مطالعہ کرتا رہتا ہے۔ کمال اعتماد و اعتقاد نہ ہو تو کون ایسے خطرناک پیغام پر لبیک کہنے کی جرأت کرے گا؟ کیا تبلیغ کی یہ کامیابی بجائے خود ایک عظیم الشان کارنامہ نہیں۔

یہ تو ذرا عمر رسیدہ لوگ تھے۔ جناب خدیجۃ الکبریٰؓ کے بعد ایک نوخیز نو (9) سالہ صاحب زادے کا ایمان لانا بھی کچھ معمولی کارنامہ نہیں۔ یہ ہیں حضرت علی مرتضیٰؓ جو ابھی جوان بھی نہیں ہوئے ہیں مگر اپنی عقل و فرزانگی میں ہزاروں بڑوں سے آگے ہیں۔ رسول ﷺ کی گود میں پرورش پائی ہے اور ان کی زندگی سے بخوبی واقف ہیں۔ کمال عزم و استقامت کے ساتھ یہ بھی ایمان لے آتے ہیں۔ یہ تمام لوگ ایک ہی دن آگے پیچھے ایمان لائے اور آخری دم تک ہر ایثار و قربانی کو برداشت کرتے رہے۔

یہ وہ تبلیغ تھی جس سے متاثر ہونے والے لوگ پہلے ہی سے حضور ﷺ کے کردار سے متاثر تھے اور اس تبلیغ کے قبول کرنے والوں میں کوئی ایسا نہ تھا، جس پر حضور ﷺ کی دشمنی کا کوئی دور گزرا ہو۔ لیکن آگے چل کر کمال درجے کا تبلیغی کارنامہ وہ ہے، جب کہ پیغام اسلام سن کر لوگ خون کے پیاسے اور جان کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ چند مثالیں اس کی بھی سن لیجیے:

سیدنا عمرؓ اس مبلغ اعظم ﷺ کا سر قلم کرنے کے ارادہ سے شمشیر برہنہ لے کر گھر سے نکلتے ہیں۔ اپنی بہن اور بہنوئی کو اسلام قبول کرنے کے جرم میں خوب مارتے ہیں۔ اس کے بعد ہی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی قوت بن جاتے ہیں۔ ضماد ازدی حضور ﷺ کو دیوانہ سمجھ کر جھاڑ پھونک کرنے آتے ہیں اور خود اسلام کے دیوانے بن جاتے ہیں۔ طفیل دوسی اپنے کانوں میں روئی ٹھونس کر آتے ہیں کہ محمد ﷺ کی کوئی آواز ان کے کانوں میں نہ

پڑے۔ مگر پھر ہمیشہ کے لیے اپنی غفلت کی ڈانٹ نکال دیتے ہیں۔ بریدہ اسلمی ستر آدمیوں کے ساتھ حضور ﷺ کو گرفتار کرنے کے لیے مدینہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں اور راستے میں حضور ﷺ سے مل کر سب کے سب گرفتارانِ اسلام ہو جاتے ہیں۔ ابوسفیان حضور ﷺ کے خلاف ہر تحریک کے پیرو بن جاتے ہیں۔ لیکن آخر فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کر لیتے ہیں۔ عمیر بن وہب زہر میں خنجر بجھا کر حضور ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے مدینے پہنچتے ہیں اور خود قتیلِ خنجر ایمان ہو جاتے ہیں۔ ثمامہ بن اُثال جیسے پیشہ ور ڈاکو گرفتار ہو کر آتے ہیں اور بغیر کسی تعزیر کے رہا کر دیے جاتے ہیں' پھر کشاں کشاں خود آ کر اپنے اسلام کا اعلان کرتے ہیں۔ مثالیں بے شمار ہیں۔ سارا عرب و عجم ہی دشمن تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ بے شمار انسان اپنے کفر سے تائب ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ تبلیغ کا یہ عظیم الشان کارنامہ اور کس مبلغ کے ہاتھوں ظہور میں آیا ہے؟

پھر اس کے بعد ایک تیسرا دورِ تبلیغ آتا ہے جو 6 ہجری میں شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب سلاطین کو تبلیغ نامے بھیجے گئے۔ نجاشی حبشہ اصحمہ بن ابجر کو' شاہ بحرین منذر بن سادہ کو' شام کے گورنر فروہ بن عمرو خزاعی کو' دُومۃ الجندل کے حکمران اکیدر کو' اضلاع یمن و طائف کے حکمراں ذوالکلاع حمیری کو' شاہِ عمان جیفر کو اسلام کے پیغام بھیجے اور یہ سب کے سب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

جو فرماں روا ایمان نہ لائے' ان میں ہوذہ بن علی حاکم یمامہ' جریج بن متی شاہِ مصر ملقب بہ مقوقس' خسرو پرویز شاہ ایران اور شاہ قسطنطنیہ ہرقل وغیرہ تھے۔ یہ سب کے سب تھوڑے ہی عرصہ میں تباہ و برباد ہو گئے۔

حضور ﷺ کی تبلیغی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پوری زندگی خصوصاً مکی زندگی میں حضور ﷺ کو اور حضور ﷺ کے تمام ساتھیوں کو ہر ممکن ایذا پہنچائی گئی' راستے میں کانٹے بچھائے گئے' گلا گھونٹا گیا' بائیکاٹ کیا گیا' گالیوں اور تالیوں سے استقبال کیا گیا' قتل کی سازش کی گئی' جنگ پر مجبور کیا گیا' وطن سے نکالا گیا۔ کیا کچھ نہ کیا گیا؟ لیکن استقامت' خیر خواہی' بے لوثی' ایقان اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی محافظت وغیرہ میں کبھی فرق نہ آیا۔ یہی وہ تبلیغی کردار کے اعلیٰ نمونے تھے' جنھوں نے حضور ﷺ کو دنیا کا سب سے زیادہ کامیاب مبلغ بنا دیا۔

(مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی)

رسولِ کریم ﷺ کا اسلوبِ تبلیغ

مفہوم و معنی

تبلیغ کا لغوی مفہوم پہنچانا ہے اور اصطلاحاً اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی اچھائی اور خوبی اور بالخصوص دینی اُمور کو دوسرے افراد و اقوام تک پہنچایا جائے اور انھیں قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی کچھ اور الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں جیسے انذار جس کے معنی ڈرانا یا خبردار کرنا ہے۔ دعوت جس کے معنی بُلانے اور پکارنے کے ہیں اور تذکیر جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں۔ تبلیغ ایک ایسا عمل ہے جس میں کسی نصب العین کی طرف اخلاص سے بلایا جاتا ہے؛ اس نصب العین سے اختلاف و انحراف کے نقصانات و خطرات سے ڈرایا جاتا ہے اور غفلت و نسیان کے پردوں کو چاک کر کے اصل نصب العین کو یاد دلانے کے لیے نصیحت کی جاتی ہے۔ اس سے بھی وسیع مفہوم میں تبلیغ کسی مذہب کا ایسا پرچار ہے جس کا مقصد لوگوں کو حلقہ مذہب میں شامل کرنا ہو۔ دنیا کے تمام بڑے مذاہب اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا پورا نظام رکھتے ہیں۔ اسی نظام کی بدولت علما نے مذاہب کو تبلیغی اور غیر تبلیغی نظام میں تقسیم کیا ہے۔ آرنلڈ نے پروفیسر میکس مولر (Max Muller) کے حوالے سے مذہب کی مذکورہ بالا تقسیم کرتے ہوئے تبلیغی مذہب کی یوں تعریف کی ہے:

''تبلیغی مذہب وہ ہے جس میں سچائی کا پھیلانا اور غیر مذاہب والوں کو اپنے مذہب میں لانا، بانی مذہب یا اس کے قریب العہد جانشینوں نے اسے ایک مقدس مذہبی فریضہ قرار دیا ہو۔ یہ ایمان والوں کے دلوں میں سچائی کا وہ جوش ہے جو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا تاوقتیکہ وہ ان کے عقیدے سے اور قول و فعل سے اپنے تئیں ظاہر نہیں کر دیتا اور انھیں اس وقت تک اطمینان نصیب نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ اپنا پیغام ہر فرد بشر تک نہ پہنچا دیں اور تمام بنی نوع انسان اس چیز کو تسلیم نہ کر لے جسے وہ برحق یقین کرتے ہیں۔

اہمیت

تبلیغ کسی فرد اور قوم کے لیے زندگی کی علامت ہے۔ تبلیغ کے بغیر انفرادی تشخص کا برقرار رہنا ناممکن ہے۔ تبلیغ کے دو دائرے ہیں۔ ایک دائرے میں یہ کسی قوم کے افراد کو اندرونی بگاڑ سے بچانے کا ذریعہ ہے اور دوسرے دائرے میں عام انسانوں کو کسی خاص نظریے اور نظام کا قائل کرنا ہے۔ ایک اعتبار سے یہ تحفظ ہے تو دوسرے لحاظ سے توسیع۔ تبلیغ کسی فرد اور قوم کا اندرونی داعیہ ہے، جس کے تحت وہ دوسروں کو اپنی بات منوانے کی سعی و جہد کرتا ہے۔ دنیا کے تمام مصلحین و بانیان مذاہب اسی داعیہ کے تحت فریضہ تبلیغ انجام دیتے ہیں۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حق و صداقت کی آواز کو عام کیا جائے اور فساد کو دور کیا جائے۔ بعثت نبوی کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذاہب تھے۔ تبلیغی و غیر تبلیغی۔ عیسائیت اور بدھ مت پہلے دائرے میں اور یہودیت، مجوسیت اور ہندو مت دوسرے دائرے میں آتے ہیں۔ تبلیغ کے وسیع تر مفہوم میں عیسائیت اور بدھ مت کے تبلیغی ہونے کا دعویٰ بھی مشکوک ہے کیوں کہ یہ بات ابھی ثابت ہونا باقی ہے کہ اس وسیع دائرے میں تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیروؤں کا عمل، وجہ یہ ہے کہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعمیل دعوت کی کھلی ہدایت اور ان مذاہب کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں۔ اصل میں مذاہب کی ایک قسم وہ ہے جن میں حق قبول کرنے کی عزت کا استحقاق صرف پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں۔ لہٰذا جو لوگ پیدائشی طور پر اس مخصوص نسل سے تعلق نہیں رکھتے وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس مذہب میں داخل ہوں۔ یہ نسلی احساس اتنی شدت اختیار کر گیا کہ اس محترم و بزرگ نسل کے سوا انسانوں کی تمام نسلیں ناپاک و کم تر تصور کی جانے لگیں۔ ان مذاہب میں داخلی استحکام و اصلاح کی تحریکیں اٹھتی رہیں اور پہلے دائرے میں تحفظ کی کوششیں بھی ہوتی رہیں لیکن ان مساعی کی توسیعی تصویر ہمارے سامنے نہیں اُبھر سکی۔ بدھ مت اگرچہ مستقل مذہب بن گیا۔ تاہم بنیادی طور پر یہ ہندو مذہب و معاشرت کی اصلاح کا اقدام تھا۔ اس کا تاریخی پس منظر اور ثقافتی ڈھانچا ہندو مت ہی کا ہے۔ اسی طرح مسیحؑ کی تبلیغی و اصلاحی مساعی کے پس منظر میں بنی اسرائیل کی روایات و ثقافت پوری طرح کارفرما نظر آتی ہے۔ مثلاً ایک عورت نے جب مسیحؑ سے برکت چاہی تو آپ نے فرمایا۔ میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ پھر فرمایا۔ ''مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی کتوں کو پھینک دیں'' پھر فرمایا ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا ''وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو'' مسیحؑ کا یہ انداز دراصل ایک ضرورت کے پیش نظر تھا۔ انھوں نے اصلاح کا دائرہ کار بنی اسرائیل کو بنایا تھا کیوں کہ اس کی ضرورت تھی۔ وہ اسی لیے مبعوث ہوئے تھے ورنہ یہ کوئی تنگ نظری کی بات نہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے بقول ''حضرت مسیحؑ کے اس قول پر بعضوں نے نافہمی سے اعتراضات کیے ہیں اور ان پر العیاذ باللہ تنگ نظری کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ انھوں نے جو بات فرمائی

ہے بالکل حقیقت ہے۔ ہر آدمی کے کام کرنے کا ایک فطری دائرہ ہے اور وہ صحیح اور نتیجہ بخش کام اس وقت تک کر سکتا ہے جب تک اپنی جدوجہد کو اسی دائرے کے اندر محدود رکھے۔ اگر وہ اس سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اس مغالطے میں مبتلا ہوتا ہے کہ اب اس کی جدوجہد کا میدان پہلے کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہو گیا ہے لیکن حقیقت میں وہ اپنی قوت کو ضائع کر رہا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ حضور ﷺ کی بعثت تک دعوت و تبلیغ کا کام زمان و مکان کی حدود و قیود کا پابند تھا اور انسانی معاشرت کا اجتماعی شعور ابھی عالمی دعوت کا متحمل نہ تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ ہندوؤں اور یہودیوں کی یہ تنگ نظری کہ کوئی دوسری قوم پاک کلام اور مقدس پیغام کو سن بھی نہ سکے انسانیت پر ایک زیادتی تھی۔ ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے چھپا کر رکھا اس کا سبب یہ تھا کہ وہ پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اسے ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے' یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔ ان مذاہب میں وسیع دائرہ کی تبلیغ نہ سہی مگر اپنے محدود حلقے میں اصلاحی کام ہوتا رہا۔ عیسائیت اور بدھ مت تو عالمی سطح پر بہت آگے نکل گئے۔ مسیحیت کی مشنری سرگرمیاں تو اظہر من الشمس ہیں۔ اب تو ہندو مت بھی پاؤں پھیلا رہا ہے اور یورپ و امریکہ میں اس کے تبلیغی مشن کام کر رہے ہیں۔

قرآن پاک نے دعوت و تبلیغ کی صحیح اہمیت اور اس کے اصول و ضوابط پر مفصل بحث کی ہے۔ حضور ﷺ نے تبلیغ کے تمام پہلوؤں پر عمدہ روشنی ڈالی۔ آپ ﷺ نے تبلیغ کے دونوں دوائر میں کام کی نوعیت و اہمیت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور احکام صادر فرمائے ہیں۔ آپ ﷺ نے اولین طور پر کام یہ کیا کہ دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا۔ آپ ﷺ نے اپنی تبلیغ کے لیے قریش و غیر قریش' حجاز و یمن' عرب و عجم اور روم و ہند کی کوئی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم ہر زبان اور ہر گوشے میں صدائے الٰہی کو پہنچانا فرض قرار دیا۔ البتہ عملی سہولت کے لیے ایک ترتیب ملحوظ رکھی۔ قرآن پاک میں تبلیغ کے ضمن میں دو طرح کے ارشادات ہیں۔ ایک وہ جن میں فریضہ تبلیغ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دوسرے وہ جن میں ترتیب کار کو بیان کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ کے تبلیغی مشن کے لیے قرآن پاک نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثلاً تبلیغ' تبشیر' انذار اور تذکیر وغیرہ۔ قرآن مجید میں آپ ﷺ کی مساعی کو انھی اصطلاحوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیام الٰہی لوگوں تک پہنچائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو سمجھیں کہ رسالت کا فرض انجام نہیں دیا۔

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ (المائدہ 5:67)

"اے خدا کے پیغام پہنچانے والے آپ کے پروردگار کے پاس سے جو کچھ آپ کی طرف اُترا ہے اسے پہنچاؤ۔ اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو آپ ﷺ نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور آپ ﷺ کو خدا لوگوں سے بچالے گا۔"

﴿فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ﴾ (المائدہ 5:92)

"اگر تم منہ پھیرو گے تو جان رکھو کہ ہمارے پیغمبر کے ذمے تو صرف پیغام کا کھول کر پہنچا دینا ہے۔"

﴿فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ﴾ (الشوریٰ 42:48)

"پھر اگر یہ منہ پھیر لیں تو ہم نے آپ ﷺ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا۔ آپ ﷺ کا کام صرف احکام کا پہنچا دینا ہے۔"

﴿فَذَكِّرْ إِنْ نَفَعَتِ الذِّكْرَىٰ﴾ (الاعلیٰ 87:9)

"لوگوں کو نصیحت کریں اگر نصیحت فائدہ مند ہو۔"

﴿وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِينَ﴾ (الذاریات 51:55)

"اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔"

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْآنِ مَنْ يَخَافُ وَعِيدِ﴾ (ق 50:45)

"قرآن سے سمجھاؤ اسے جو میری وعید سے ڈرتا ہے۔"

﴿فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ﴾ (الغاشیہ 88:21)

"آپ ﷺ نصیحت کرتے رہیں آپ ﷺ تو نصیحت کرنے والے ہیں۔"

﴿فَذَكِّرْ فَمَا أَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَلَا مَجْنُونٍ﴾ (الطور 52:29)

"اے پیغمبر ﷺ آپ ﷺ نصیحت کرتے رہیں اور آپ ﷺ اپنے پروردگار کے فضل سے نہ تو کاہن ہیں نہ دیوانے۔"

﴿وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ (الاسرا 17:105)

"اور اے محمد ﷺ ہم نے آپ ﷺ کو صرف خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا وَنَذِيرًا﴾ (الاحزاب 33:45)

"اے پیغمبر ہم نے آپ ﷺ کو گواہی دینے والا' خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔"

﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝﴾ (المدثر 74:1-2)

"اے چادر پوش اٹھو اور ہوشیار و آگاہ کرو۔"

﴿وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ﴾ (المؤمن 40:18)

"اور انھیں قریب آنے والے دن سے ڈراؤ جب کہ دل غم سے بھر کر گلوں تک آ رہے ہوں گے۔"

حضور ﷺ کے اپنے ارشادات میں تبلیغ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ اور آپ ﷺ نے اپنے پیروؤں کو تبلیغ کا حکم دیا ہے۔

"فَوَاللّٰهِ لَاَنْ یَّهْدِیَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ یَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ ." (بخاری۔ کتاب المغازی)

"آنحضرت ﷺ نے فرمایا اے علیؓ تمھاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق قبول کرلینا سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔"

"عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فبلسانه فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَ ذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ ." (مسلم، کتاب الایمان)

"ابوسعید خدریؓ رسول ﷺ اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے جو کوئی برائی دیکھے تو اسے ہاتھ سے درست کردے اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے اور اگر اس کی (بھی) استطاعت نہ ہو تو اپنے دل سے (براجانے) اور یہ کم زور ترین ایمان ہوگا۔"

"عَنْ حُذَیْفَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَیُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ یَّبْعَثَ عَلَیْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا یُسْتَجَابُ لَكُمْ ." (ترمذی۔ کتاب الفتن)

"حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تمھیں نیکی کی ضرور ہدایت کرنا ہوگی اور بُرائی سے ضرور روکنا ہوگا ورنہ عین ممکن ہے اللہ تم پر اپنی طرف سے عذاب بھیجے پھر تم اسے پکارو اور تمھیں جواب نہ آئے گا۔"

ان آیات واحادیث سے تبلیغ ودعوت کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو تبلیغ کا حکم دیا ہے اور حضور ﷺ اس کی افادیت پر زور دیتے ہوئے اسے ایمان کی علامت قرار دیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے تبلیغ کے دونوں دوائر کو ملحوظ رکھا اور اپنی اُمت کے لیے لازم قرار دیا کہ وہ تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھیں اور شہادت توحید ورسالت دیتے رہیں۔ قرآن پاک نے تو تبلیغ کو اس اُمت کی خصوصیت قرار دیا۔ فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران 3:110)

"(مومنو!) جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کو کہتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو۔"

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (آل عمران 3:110)

"اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے جو خیر کی طرف بلایا کرے اور نیک کام کرنے کو کہا کرے اور بُرے کاموں سے روکا کرے۔"

﴿تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی ص وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدہ 5:2)

"نیکی وتقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔"

رسول اکرم ﷺ نے اپنی امت کو نیکی پھیلانے اور بھلی بات کو آگے پہنچانے کی تربیت دی اور احساس بھی دلایا۔ بدی کو روکنے کا حکم دیا اور اس سے تعاون کرنے کے انجام بد سے ڈرایا۔ فرمایا:

"بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً ." (ترمذی۔ کتاب العلم)

"مجھ سے (علم) آگے پہنچاؤ خواہ ایک آیت ہو۔"

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ بار بار یہ ارشاد فرماتے اَللّٰهُمَّ هَلْ بَلَّغْتُ ازاں بعد فرمایا:

"فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ ." (بخاری۔ کتاب المغازی)

"جو موجود ہے اسے غیر موجود تک پہنچانا چاہیے۔"

"عَنْ جَرِیْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: مَامِنْ رَجُلٍ یَكُوْنُ فِیْ قَوْمٍ یُعْمَلُ فِیْهِمُ الْمَعَاصِیْ یَقْدِرُوْنَ عَلٰی اَنْ یُّغَیِّرُوْا عَلَیْهِ وَلَا یُغَیِّرُوْنَ اِلَّا اَصَابَهُمُ اللّٰهُ مِنْهُ بِعِقَابٍ قَبْلَ اَنْ یَّمُوْتُوْا ."

(ابوداؤد۔ کتاب الملاحم)

"جریر بن عبداللہ سے روایت ہے انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ کوئی آدمی ایسے لوگوں میں گناہ کرے اور لوگ اسے درست کرنے پر قادر ہونے کے باوجود درست نہ کریں تو مرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ انھیں ضرور عذاب دے گا۔"

دعوت وتبلیغ کے اُصول

رسول اکرم ﷺ اس اعتبار سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں کہ آپ ﷺ نے دعوت وتبلیغ کے تمام عملی مراحل کا نمونہ بھی دیا اور تبلیغی عمل کے لیے بہترین اُصول دیے۔ آنے والے تمام تبلیغی ودعوتی کارکنوں کے لیے یہ اصول بہترین راہ نمائی کا کام دیتے رہیں گے۔ قرآن پاک نے اختصار وجامعیت کے ساتھ یہ اصول بیان فرمائے ہیں:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ﴾ (النحل 125:16)

"اے پیغمبر لوگوں کو دانش اور نیک نصیحت سے اپنے پروردگار کے رستے کی طرف بلاؤ اور بہت ہی اچھے طریق سے ان سے مناظرہ کرو جو اس کے رستے سے بھٹک گیا' تمھارا پروردگار اسے بھی خوب جانتا ہے اور جو رستے پر چلنے والے ہیں ان سے بھی خوب واقف ہے۔"

سید سلیمان ندویؒ کے بقول:

تبلیغ ودعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے۔ عقل وحکمت' موعظہ

حسنہ اور مناظرہ بطریق احسن۔ مسلمان متکلمین نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں، جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں، یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعے سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں۔ دوسرے خطابیات جن میں مؤثر اور دل پذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے۔ اور تیسرے جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اور فریقین کے مسلم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ قرآن پاک نے پہلے طریق کو حکمت، دوسرے کو موعظت حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کر کے اس کے قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دل نشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اسے مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور مؤثر انداز سے اسے نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں، یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کر دیتے ہیں۔ اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں۔ پہلے طریقہ کا نام حکمت، دوسرے کا موعظہ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے۔ تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے ہیں۔ پھر قرآن میں دعوت الی اللہ کے ان تین طریقوں حکمت، موعظت، مجادلت کے ساتھ کیوں کہ کوئی قید اور تخصیص مذکور نہیں اس لیے یہ تینوں دعوتیں اپنے عموم اور اطلاق پر باقی رہیں گی اور دعوت و تبلیغ کا عموم یہی ہو سکتا ہے کہ خواہ وہ قولی ہو یا فعلی یعنی مبلغ خواہ زبان سے حق کی دعوت دے یا اپنے کسی طرز عمل سے دونوں کا ڈھنگ ایسا ہونا چاہیے کہ مخاطبوں کے دلوں میں حق سرایت کر جائے اور وہ حق کی طرف جھک پڑیں۔ گویا جس طرح داعی و مبلغ کے حسن بیان سے مخاطب کے شبہات رفع ہوتے تھے اور حق و صداقت پر قناعت قلبی اور طمانیت پیدا ہوتی تھی اسی طرح اس کا طرز عمل بلکہ ہر نقل و حرکت بھی تبلیغی ہونی چاہیے جس سے لوگ جوق در جوق دائرہ حق میں داخل ہو جائیں۔ حکمت عملی سے ان کے دلوں میں دین پر وثوق و ایقان پیدا ہو۔ عملی موعظت سے ان میں قناعت قلبی قائم ہو اور عملی مجادلت سے ان کے شکوک و شبہات کا قلع قمع ہو جائے۔ اس لحاظ سے دعوت کی یہ سہ گانہ قسمیں نظری اور عملی کی طرف منقسم ہو کر چھے ہو جائیں گی۔ حکمت نظری و حکمت عملی، موعظت نظری و موعظت عملی، مجادلہ نظری و مجادلہ عملی بہر حال حجت بیانی کے یہ تینوں طریقے قولی یا نظری کی قید سے مقید نہ تھے بلکہ نظری و عملی دونوں عام تھے اس لیے جہاں دعوت قولی کی یہ تین قسمیں اس آیت سے ثابت ہوئیں وہاں دعوت عملی کی بھی یہی تینوں قسمیں مبلغ کے لیے ضروری ٹھہریں اس لیے دعوت عملی بھی مبلغ کے لیے اسی آیت سے ضروری ثابت ہوئی۔

حکمت

قرآنی نقطہ نظر سے حکمت تبلیغی طریقہ کار میں اولین اہمیت کی حامل ہے۔
حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔ حکمت ایک جامع اصطلاح ہے اور اس کے تحت وہ تمام طرز ہائے عمل آجاتے ہیں جو مخاطب کو قبول حق پر آمادہ کریں۔ مثلاً موقع و محل کا لحاظ مخاطب کی نفسیات، عقلی استدلال وغیرہ۔

موقع و محل

دعوت و تبلیغ بلاشبہ ایک سچے جذبے اور حقیقی لگن کی متقاضی ہے لیکن جوش جنوں میں موقع و محل کا لحاظ نہ کرنا سخت مضر ہے۔ مثلاً ایک داعی حق کو ان تمام اوقات میں دعوت حق سے احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اعتراض اور نکتہ چینی کی طرف مائل ہو۔ نہ صرف اس حال میں، بلکہ دعوت پیش کرنے کے بعد بھی مخاطب پر اعتراض، نکتہ چینی کا دورہ پڑ جائے تو داعی کو چاہیے کہ بحث کو بڑھانے کی بجائے اسے وہیں ختم کر کے وہاں سے ہٹ جائے اور کسی اور مناسب موقع کا انتظار کرے جب مخاطب خالی الذہن یا کم از کم اعتراض و نکتہ چینی کے رجحان سے خالی ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَ اِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ ؕ وَ اِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ﴾ (الانعام 6:68)

"جب دیکھو ان لوگوں کو جو ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان سے اعراض کرو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمہیں یہ بات فراموش کرا دے تو یاد آنے کے بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو۔"

اسی طرح ایسے مواقع سے داعی کو احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اپنی کسی ایسی دل چسپی میں منہمک ہو جسے چھوڑ کر دعوت حق کی طرف متوجہ ہونا اس کی طبیعت پر گراں گزرے۔ اگرچہ یہ حالت پہلی حالت سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں عناد و اختلاف کا جذبہ شامل نہیں ہے لیکن مخاطب کی طبیعت کی عدم دل چسپی کے باعث دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

"عَنْ عِكْرِمَةَ اِنَّ ابنَ عباسٍؓ قال: حَدِّثِ النَّاسَ كُلَّ جُمُعَةٍ مَرَّةً فَاِنْ اَبَيتَ فَمَرَّتَيْنِ فَاِنْ اَكْثَرْتَ فَثَلاثَ فَلا تُمِلَّ النَّاسَ هٰذا القرآنَ وَلَا اُلْفِيَنَّكَ تَاتِي القومَ وَهُم فِي حَدِيثٍ مِنْ حَدِيثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَيْهِمْ فَتُمِلُّهُمْ وَلٰكِن اَنْصِتْ فَاِذَا اَمَرُوْكَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ يَشْتَهُوْنَهُ."

(مشکوۃ۔ کتاب العلم)

"عکرمہؓ سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا کہ لوگوں کو جمعہ جمعہ دین کی بات سنایا کرو اگر اس سے زیادہ ہو تو ہفتہ میں دو بار، اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہو تو تین بار اور لوگوں کو اس قرآن سے بیزار نہ کرو ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم لوگوں کے پاس ایسے وقت

میں آؤ جب وہ اپنی کسی اور دلچسپی میں ہوں اور اس وقت انھیں دین کی بات سنانا شروع کر دو اور اس کا نتیجہ بیزاری ہو۔ ایسے موقع پر خاموش رہو یہاں تک کہ لوگ تم سے خواہش کریں تو انھیں سناؤ تاکہ تمھاری بات رغبت سے سنیں۔"

آپ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے متعین کیا اور رخصت کرتے ہوئے فرمایا:

"یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا." (مسلم۔ کتاب الجهاد)

"دین الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں۔ لوگوں کو خوش خبری سنانا نفرت نہ دلانا۔"

نیز فرمایا: تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو انھیں پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں جب وہ یہ مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے۔ یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دلایا جائے اور جب وہ اسے تسلیم کر لیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بڑھیا مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔

(مسلم۔ کتاب الایمان)

گزشتہ بحث سے یہ بات عیاں ہوگئی ہوگی کہ دعوت و تبلیغ خواہ وسیع دائرے میں کی جائے یا اپنی جماعت کے محدود دائرے میں، بہرکیف ایسی حکمت عملی کی متقاضی ہے جس سے اچھے نتائج کی توقع ہو۔ وہ تمام طریقے ترک کرنے کی ہدایت ہے جو کسی نہ کسی طور پر حقیقی مقاصد کے حصول میں مانع ہوتے ہوں۔

مخاطب کی نفسیات

حکمت تبلیغ کے لیے دوسری اہم بات جسے داعی کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے وہ مخاطب کی استعداد اور نفسی کیفیات ہیں۔ مثلاً عام مخاطب کی ذہنی استعداد کو ملحوظ نہ رکھتے ہوئے منطقی استدلال اور فلسفیانہ بحثیں شروع کر دی جائیں یا کسی دانش ور سے گفتگو کرتے ہوئے بے رنگ اور بے ڈھب انداز گفتگو اختیار کیا جائے' بلکہ لوگوں سے ان کی ذہنی استعداد کے مطابق بات کی جائے۔ دعوت حق کے بعض مشکل تقاضے ہوتے ہیں اور بعض سہل۔ داعی کو آغاز ہی میں وہ تمام باتیں نہیں بیان کرنی چاہییں جن سے اکتاہٹ اور تنفر پیدا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا." (بخاری، کتاب العلم)

"آسانی پیدا کرو تنگی نہیں' خوش خبری دو لوگوں میں نفرت نہ پھیلاؤ۔"

آپ ﷺ نے داعیان حق کے لیے صحیح طرز عمل بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ." (عون المعبود)

"تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو۔ دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔"

پھر مخاطب کی کم زوریوں کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ داعی کو کسی حال میں بھی اپنے مخاطب کے اندر حمیت جاہلیہ کے بھڑکنے کا موقع نہیں پیدا ہونے دینا چاہیے۔ مخاطب کی معتقدات و روایات کے بارے میں محتاط انداز بیان اختیار کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اندھی وابستگی کے باعث بعض اوقات وہ بالکل غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ داعیان حق کو اسی چیز سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔

﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ﴾ (الانعام:108)

"اور تم گالی نہ دو انھیں جنھیں یہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں کہ وہ حد سے گزر کر بے جانے بوجھے اللہ کو گالی دے بیٹھیں۔ ایسے ہی ہم نے ہر اُمت کی نظروں میں ان کے اعمال کھبا دیے ہیں۔"

داعی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ خوامخواہ کی نفرتیں لیے پھرے۔ اس کے دل میں سب کے لیے ہمدردی و خیر خواہی ہوتی ہے۔ وہ دردمندی و دل سوزی سے اپنی بات کرتا ہے۔ وہ بے سبب درپے آزار نہیں ہوتا اور مخاطب کے پسندیدہ عقائد و اشخاص پر بے تکی تنقید نہیں کرتا۔

"اور میرے بندوں سے کہو کہ وہ بات کہیں جو بہتر ہے۔ شیطان ان کے درمیان وسوسہ اندازی کرتا ہے۔ بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ تمھارا رب تمھیں خوب جانتا ہے۔ اگر چاہے گا تو تم پر رحم کرے گا اور اگر چاہے گا تو تمھیں عذاب دے گا۔ اور ہم نے تمھیں ان کے ایمان کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا اور تیرا رب خوب جانتا ہے انھیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض نبیوں پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤدؑ کو زبور دی۔" (بنی اسرائیل 53:17،55)

اس ہدایت کا مقصد بھی یہی ہے کہ داعی حق کو ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیے جو عصبیت جاہلیہ کو بھڑکانے والی اور مخاطب کو عناد و اختلاف کی راہ پر ڈالنے والی ہوں۔ مخاطب کے معاشرتی و سیاسی مرتبہ کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ اس کا غلط پندار بسا اوقات اسے حق بات کو سننے سے روک دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو اسی پہلو سے ہدایت کی گئی تھی۔

"فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو گیا ہے اور اس سے نرمی سے بات کرو تاکہ وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈرے۔" (طٰہٰ 20:43تا44)

دعوت حق کو نرم انداز میں کہنے کی بات سے کہیں یہ مراد نہ لی جائے کہ مخاطب کے سیاسی و معاشرتی مرتبہ کے پیش نظر ایسی بات کی جائے جس سے حق کے وقار کو نقصان پہنچے۔ داعی کو ان تمام طریقوں سے پرہیز کرنا چاہیے جن سے دعوت کی عظمت اور شان میں فرق آتا ہو۔ جو سننا نہیں چاہتے انھیں سنانے کے درپے ہونا' بھاگنے والوں کے پیچھے پڑ جانا اور گھمنڈ کرنے والوں کی تواضع کرنا بس وہیں تک جائز ہے کہ داعی کی خودداری اور دعوت کی عظمت کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور نہ دعوت کے کام میں کوئی پہلو ابتذال اور اوچھے پن کا پیدا ہونے پائے۔ اسی حق کا تقاضا ہے کہ وہ پوری خودداری

ساتھ ایسے لوگوں سے الگ ہو جائے اور صرف انھی لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جن میں حق کی طلب اور علم کی پیاس موجود ہو۔

سورہ عبس کی آیات 5 تا 16 میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

﴿اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی ۙ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی ؕ وَمَا عَلَیْكَ اَلَّا یَزَّكّٰی ؕ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ یَسْعٰی ۙ وَهُوَ یَخْشٰی ۙ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰی ۚ كَلَّاۤ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ فِیْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِاَیْدِیْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ؕ﴾ (عبس 80: 5تا16)

"لیکن جو بے پروائی برتتا ہے تو آپ اس کے پیچھے پڑتے ہیں حالانکہ آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے اگر وہ اپنے آپ کو نہ سدھارے۔ اور وہ جو آپ کے پاس شوق سے آتا ہے اور اپنے خدا سے ڈرتا بھی ہے تو آپ اس سے بے پروائی برتتے ہیں، ہرگز نہیں یہ تو ایک یاددہانی ہے سو جو شخص چاہے اس سے فائدہ اٹھائے، معزز بلند رتبہ اور پاکیزہ صحیفوں میں گرامی قدر اور باوفا کاتبوں کے ہاتھ میں ہے۔"

تبلیغ کے جوش میں یہ بات بھی جائز نہیں کہ آدمی جس مجلس میں چاہے جا دھمکے اور کوئی متوجہ ہو نہ ہو وہ اپنی بات سنائے بغیر نہ ٹلے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے:

"میں تمھیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی جماعت کے پاس جاؤ اور وہ اپنے کسی اور کام میں مشغول ہوں اور اسی حالت میں تم انھیں اپنی بات سنانا شروع کر دو بلکہ تمھیں چاہیے کہ خاموش رہو اور جب لوگ فرمائش کریں تو انھیں سناؤ اور وہ خواہش سے سنیں" (مشکوٰۃ۔ کتاب العلم)

یہ بات بھی حکمت تبلیغ کے خلاف ہے کہ دعوت کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ وہ لوگوں کے لیے بوجھ بن جائے اور وہ اس سے گھبرانے لگیں۔

"ابو وائل سے روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ لوگوں کو ہر جمعرات کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے ان سے کہا اے ابو عبدالرحمٰن میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ نصیحت کیا کریں۔ انھوں نے کہا میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں تم پر بوجھ نہ بن جاؤں۔ میں بھی اسی طرح ناغہ کر کے تمھیں نصیحت سناتا ہوں جس طرح آنحضرت ﷺ ہمیں ناغہ کر کے نصیحت سنایا کرتے تھے کہ ہم بیزار نہ ہو جائیں۔"

(بخاری۔ کتاب العلم)

تدریج

حکمت تبلیغ کے ضمن میں ایک اور حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور وہ ہے تدریج۔ آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ یک بارگی اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کیے جائیں۔ پہلے توحید و رسالت اور دیگر عقائد کو پیش کرنا چاہیے اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھر اہم تر کے اُصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ عبادات میں سب سے اہم نماز ہے۔ پھر زکوٰۃ پھر دوسرے فرائض ہیں۔ تدریج کا یہ اصول فرد کے لیے بھی ضروری ہے اور جماعت کے لیے بھی۔ دین ایک نظام ہے اور اس نظام کو اگر حکیمانہ ترتیب سے پیش نہ کیا جائے تو مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے۔ دین کے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو طرح کے ہیں۔ ایک انفرادی احکام اور دوسرے اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام افراد کے لیے ہوتے ہیں اور ہر فرد کے لیے اس کی انفرادی حیثیت ہی میں ان کی تعمیل ضروری ہے۔ مثلاً نماز، روزہ اور انفاق وغیرہ۔ اجتماعی احکام کا تعلق جماعت سے ہے، جب جماعت وجود میں آ جائے تو اس کا فرض ہے کہ ان کی تعمیل کرے۔ مثلاً وہ احکام جو معاشرت، سیاست اور جہاد سے متعلق ہیں۔ پہلی قسم کے احکام کی تعلیم و دعوت میں افراد کے تحمل اور ان کی قوت برداشت کا لحاظ رکھنا ہوتا ہے کہ احکام ان پر بارش کی طرح برسا نہ دیے جائیں کہ وہ گھبرا کر سب کچھ چھوڑ بیٹھیں۔ دوسری قسم کے احکام میں جماعت کے تحمل کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہے بھی کہ نہیں کہ جو احکام اسے دیے جا رہے ہیں ان کا بوجھ سہار سکے۔ ایک طالب علم کی ذہنی استعداد کی طرح ایک جماعت کی مادی استعداد بھی تدریجاً ہی بڑھتی ہے اور جو لوگ کسی جماعت کی قیادت کرتے ہیں انھیں سب سے زیادہ بیدار مغزی کے ساتھ جماعت کی استعداد ہی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا صحیح اندازہ کیے بغیر جماعت پر کوئی بوجھ ڈال دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو استعداد اس نے ایک مدت میں فراہم کی ہے وہ ساری کی ساری برباد ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اشارہ فرمایا:

"اِنَّمَا نَزَلَ اَوَّلَ مَا نَزَلَ مِنْهُ سُوْرَةٌ مِّنَ الْمُفَصَّلِ فِيْهَا ذِكْرُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ حَتّٰى اِذَا ثَابَ النَّاسُ اِلَى الْاِسْلَامِ نَزَلَ الْحَلَالُ وَالْحَرَامُ وَلَوْ نَزَلَ اَوَّلَ شَيْءٍ لَا تَشْرَبُوا الْخَمْرَ لَقَالُوْا لَا نَدَعُ الْخَمْرَ اَبَدًا وَلَوْ نَزَلَ لَا تَزْنُوْا لَقَالُوْا لَا نَدَعُ الزِّنَا اَبَدًا".

(بخاری۔ کتاب فضائل القرآن)

"قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل کی گئی وہ مفصل کی ایک سورہ ہے جس میں دوزخ اور جنت کا ذکر ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے دائرے میں آ گئے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ اگر بالکل شروع ہی میں حکم آ جاتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر یہ حکم دیا جاتا کہ زِنا نہ کرو تو لوگ کہتے ہم ہرگز زِنا نہ چھوڑیں گے۔"

عقلی استدلال

حکمت تبلیغ کا تقاضا ہے کہ مخاطب کو غور و فکر کی دعوت دی جائے اور اسے تفکر و تدبر کی راہ پر ڈالا جائے۔ عقلی دلائل اور مشاہداتی براہین کے ذریعہ دعوتِ حق کو مؤثر بنایا جائے۔ مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمدیہ ایک منفرد ربانی آواز ہے جس نے محض حاکمانہ قانون اور آمرانہ احکام کی بجائے عقلِ انسانی کو مخاطب کیا، غور و فکر کی دعوت دی اور فہم و تدبر کا مطالبہ کیا۔ اس نے اپنی تعلیم کے ساتھ اس کی خوبی، مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیات الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت کی، قرآن پاک میں عقلی استدلال کی شاندار مثالیں جابجا بکھری پڑی ہیں مثلاً:

﴿قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ o قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ﴾

(الانعام 6:148تا149)

''اے پیغمبر! آپ ﷺ فرما دیں کہ تمھارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اسے تم ہمارے لیے ظاہر کرو، تم تو گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو۔ آپ ﷺ فرما دیں کہ اللہ ہی کی ہے پہنچی ہوئی دلیل۔''

﴿لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ o﴾ (الانفال 8:42)

''تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جیے اور اللہ ہے سننے والا اور جاننے والا۔''

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا:

﴿وَ كَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَ هُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ﴾ (یوسف 12: 105)

''اور آسمانوں اور زمین میں (خدا کی توحید کی) کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔''

غور و فکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا:

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ o الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ (آل عمران 3:190تا191)

''بے شک آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں۔ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے (یہ عالم) بیکار نہیں بنایا۔''

خارجی و مشاہداتی دلائل کے ساتھ اس نے نفسی دلائل بھی مہیا کیے:

﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الذاریات 51:21)

''اور خود تمھارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں؟''

قرآن مجید کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

﴿تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ﴾ (ق 50:8)

''یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لیے۔''

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الاعراف 7:203)

''یہ تمھارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔''

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ﴾ (الجاثیہ 45:20)

''یہ لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں۔''

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ﴾ (النساء 4:82)

''کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔''

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد 47:24)

''کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے ہیں۔''

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ﴾ (لقمان 31:2)

''یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔''

پورا قرآن صداقت کی عقلی دلیلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی گئی ہیں۔

موعظہ حسنہ

تبلیغ و دعوت کے لیے دوسری بنیادی چیز موعظہ حسنہ ہے۔ اس سے مراد عمدہ نصیحت ہے۔ عُمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کی جائے۔ برائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں ان کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اسے بھی ابھارا جائے اور ان کے برے نتائج کا خوف دلایا جائے۔ ہدایت اور عمل صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ ان کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقہ سے کی جائے جس سے دل سوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنے بلند مرتبہ سے لطف اندوز ہو رہا ہے بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ تبلیغ کوئی میکانکی عمل نہیں ہے کہ بس چند دلائل اور بعض الفاظ دُہرا دیئے اور حق ادا ہو گیا۔ یہ عمل تو گہری وابستگی اور جذباتی اخلاص کا مطالبہ کرتا ہے۔ بلاشبہ منطقی استدلال اور عقلی انداز تفہیم بھی بات منوانے کا ایک اہم ذریعہ ہے مگر جذباتی اپیل کا اسلوب بھی زیادہ موثر نہیں تو اس کے ہم پلہ ضرور ہے۔ جذبات انسانی شخصیت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور اگر کوئی بات کسی انسان کے جذبات کو مسخر کر جائے تو عقل کی فلسفہ طرازیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاؑ کے طریق خطابت میں جذبات کی فراوانی بھی دکھائی دیتی ہے۔ قرآن پاک نے عالم کی بے ثباتی اور آخرت کے اثبات پر جو دلائل دیئے ہیں ان میں تغیر و تبدل اور حیات و فنا کے عبرت انگیز اور اثر آفریں واقعات و مشاہدات موجود ہیں مثلاً قرآن پاک کے اس طرح کے جملے اسی حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں:

﴿مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (البقرہ 2:66)

''پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے۔''

﴿اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (الزمر 39:9)

''نصیحت تو وہی پکڑتے ہیں جو عقل مند ہیں۔''

﴿لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ (آل عمران 3:13)

''اہل بصارت کے لیے عبرت ہے۔''

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی﴾ (النّٰزعٰت 79:26)

''اس میں عبرت ہے اس کے لیے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔''

یہ الفاظ اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں کہ طریق تبلیغ میں انسانی جذبات تک رسائی حاصل کرنا انتہائی ضروری ہے۔ علمائے کرام نے یہاں ایک دل چسپ بحث چھیڑی ہے کہ انسانی شخصیت میں انقلاب بذریعہ عقل آتا ہے یا قلب؟ ایک رائے یہ ہے کہ ذہن بدلنے سے تبدیلی آتی ہے جب کہ دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ قلب ہی تمام انقلابات کا منبع ہے۔ جانبین نے اپنے مسلک کے لیے دلائل مہیا کیے ہیں۔

ذہنی انقلاب

انسانی ذہن غور وفکر کی بنیاد ہے۔ جس انسان کا ذہنی توازن درست نہیں وہ مکلف ہی نہیں۔ دین وشریعت کی پابندی کا مکلف وہی ہے جو صاحب عقل ودانش ہے۔ عقل ہی معرفت وعلم کا ذریعہ ہے۔ علم ومعرفت کے بغیر انسان کسی چیز کو قبول نہیں کرتا۔ عقل ہی وہ معیار ہے جس سے خیروشر کی تمیز ہوتی ہے۔ اگر عقل کسی کو مسترد کر دیتی ہے تو اسے قابل قبول بنانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ قرآن پاک میں صاحبانِ عقل وعلم ہی کو غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے۔ جہالت اور بے عقلی قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا یَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (الزمر 39:9)

''آپ ﷺ فرما دیں کیا علم والے اور جاہل برابر ہوتے ہیں۔ وہی لوگ نصیحت پکڑتے ہیں جو اہل عقل (سلیم) ہیں۔''

﴿بَلْ هُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾

(العنکبوت 29:49)

''بلکہ وہ کھلی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنھیں علم دیا گیا۔''

﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ﴾

(فاطر 35:28)

''اور خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔ واقعی اللہ زبردست ہے بڑا بخشنے والا۔''

﴿وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا یَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴾

(العنکبوت 29:43)

''اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے (سمجھانے کے) لیے بیان کرتے ہیں اور انھیں علم والے ہی سمجھتے ہیں۔''

حضور اکرم ﷺ نے بھی علم کو دین میں اولین حیثیت دی ہے۔ احادیث نبویہ میں علم اور اہل علم کی فضیلت کا واضح ذکر موجود ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) رسول اللہ ﷺ دو مجلسوں کے پاس سے گزرے جو مسجد میں منعقد ہوئی تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا دونوں مجلسیں بھلائی پر ہیں۔ لیکن ان میں ایک دوسری سے بہتر ہے۔ ان دونوں جماعتوں میں سے ایک عبادت میں مصروف ہے اور خدا سے دعا کر رہی ہے اور اس سے اپنی خواہش ورغبت کا اظہار کر رہی ہے اگر وہ چاہے تو انھیں عطا کرے اور چاہے تو روک دے اور دوسری جماعت تو وہ دینی فہم عطا کر رہے ہیں اور جاہلوں کو علم سکھا رہے ہیں لہٰذا یہ لوگ بہتر ہیں اور میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں (یہ کہ کر) پھر آپ ﷺ بھی ان میں بیٹھ گئے۔ (دارمی۔ کتاب العلم)

فہم علم کی عظمت بیان کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا:

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک فقیہ (عالم و عاقل) شیطان کے مقابلے میں ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے۔ (ابن ماجہ۔ ترمذی)

قرآن وسنت کی رو سے انسان کی عظمت کا راز ہی اس کے علم میں ہے۔ آدمؑ کو فرشتوں پر علم ہی کی بدولت فضیلت دی گئی۔ علم حاصل کرنے کا ذریعہ عقل وشعور ہے اور یہی انسانی شخصیت میں انقلاب کا ذریعہ ہے۔ قرآن وسنت کا سارا عقلی استدلال اور انبیا ومصلحین کے تمام دلائل دراصل انسان کی انھی فکری قوتوں کو درست اور مسخر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ چوں کہ کسی چیز کے حسن وقبح کا فیصلہ صرف عقل ہی کر سکتی ہے۔ اس لیے عقل ہی وہ قوت ہے جس کے قبول سے سارا نظام درست ہو جاتا ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ انسانوں کی ہر اجتماعیت میں ایسے افراد موجود رہتے ہیں جنھیں "Opinion Leader" کہا جاتا ہے۔ یہی لوگ اپنی صلاحیتوں، تدبیروں اور ہمتوں کی وجہ سے پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ گو انبیاؑ کی دعوت پورے انسانی معاشرے کے لیے ہوتی ہے لیکن تبلیغ کے اولین مخاطب یہی لوگ ہوتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی معاشرت کے وہ طبقے جن کے ہاتھ میں معاشی، سیاسی اور معاشرتی قیادت ہوتی ہے یہ لوگ غیر معمولی نفوذ رکھتے ہیں اور ان کے بدلنے سے انقلابی عمل کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اگر یہ طبقات رکاوٹ بنیں تو نچلے طبقوں سے شروع کی ہوئی تحریک کا بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے اور بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس میں سیاسی قیادت کا ذکر بھی ضروری ہے کیوں کہ اقتدار کے اہم رول کو نظر انداز کرنا پوری انسانی تاریخ سے بے اعتنائی برتنے والی بات ہے۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر کسی دعوت کو سوسائٹی کا ذہین اور دانش ور گروہ قبول نہیں کرتا تو اس کی توسیع واشاعت کے لیے اچھے کارکن میسر نہیں آ سکتے۔ ایک باصلاحیت اور ذہین آدمی کی سوچ کا رخ بدلنے سے اس کی ساری صلاحیتیں کارآمد ہو جاتی ہیں جب کہ عوام سے اچھے کارکن تیار کرنے میں خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ معاشرے میں بگاڑ کا سبب اور اس کی توسیع و توزیع کا باعث بھی یہ طبقات ہوتے ہیں انھیں درست یا ختم کیے بغیر بگاڑ اور فساد کا

علاج ممکن نہیں۔ قرآن پاک میں ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے سلسلے میں بصراحت موجود ہے کہ ان حضرات نے اپنی دعوت کا آغاز برسراقتدار گروہ سے کیا۔ ابراہیمؑ کے ضمن میں فرمایا:

''بھلا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا (نمرود) جو اس سبب سے کہ خدا نے اسے سلطنت بخشی تھی۔ ابراہیمؑ سے پروردگار کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ جب ابراہیمؑ نے کہا میرا پروردگار تو وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے وہ بولا کہ جلا اور مار تو میں بھی سکتا ہوں۔ ابراہیمؑ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال دو (یہ سن کر) کافر حیران رہ گیا اور اللہ بے انصافوں کو ہدایت نہیں کرتا۔'' (البقرہ 2:258)

موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

''فرعون کے پاس جائیں اس نے سرکشی کی ہے اور اس سے کہیں کہ کیا تجھ میں اس بات کی رغبت ہے کہ تو پاکیزگی حاصل کرے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ بتاؤں تو تو اس سے ڈرے۔'' (النزعت 79:17 تا 19)

مسیحؑ نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی اور ان کے جمود پر ضربیں لگاتے رہے۔ لیکن ایک عرصہ کی جدوجہد کے بعد جب ان کے کبر وغرور اور پندار سیادت کی چٹان نہ ٹوٹی تو وہ انھیں چھوڑ کر جھیل کنارے ماہی گیروں کے پاس چلے گئے کہ اے مچھلیاں پکڑنے والو آؤ میں تمھیں آدمیوں کا پکڑنے والا بنا دوں۔'' اللہ تعالیٰ نے انھیں دولت ایمان بخشی اور وہ حواری کہلائے۔ قرآن پاک میں ہے:

''جب عیسیٰؑ نے ان کی (علمائے یہود کی) طرف سے کفر پر اصرار کو بھانپ لیا تو (عام لوگوں کو مخاطب کر کے) کہا کون اللہ کی طرف بڑھنے میں میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ پر ایمان لائے اور آپ گواہ رہیں کہ ہم اس کے فرماں بردار ہیں۔'' (آل عمران۔52)

اسی طرح نوحؑ، ہودؑ، لوطؑ اور شعیبؑ وغیرہم کی دعوتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے اربابِ اقتدار ومنکرین کو جھنجھوڑا اور ان کے افکار ونظریات پر ضرب کاری لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تو آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں۔ یہ لوگ عرب معاشرت میں قیادت کا مرتبہ رکھتے تھے۔

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (الشعراء 26:214)

''اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو ڈر سنادو۔''

قبائل عرب میں آپ ﷺ کی دعوت کا انداز اور پھر سلاطین کو دعوت اسلامی کے لیے مراسلے بھیجنے کا اہتمام اسی حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے مکے کے سرکردہ راہ نماؤں کے بارے میں دعا بھی فرمائی تھی:

''اے اللہ تو اسلام کو ابوجہل اور عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کے ذریعے غلبہ اور عزت دے جو تجھے زیادہ محبوب ہو۔'' (ترمذی)

آپ ﷺ نے اس طبقہ کی طرف مسلسل توجہ قائم رکھی تا آنکہ ان سے اعراض کا حکم صادر ہوا:

''پس ان (متکبرین) سے اعراض کریں اب آپ کو کوئی ملامت نہیں ہے۔ (کیوں کہ آپ نے حق ادا کر دیا ہے) اور نصیحت کریں ان لوگوں کو (جو لوگ داخل اسلام ہو چکے ہیں) کیوں کہ نصیحت اہل ایمان کو نفع پہنچاتی ہے۔''

(الذاریات 51:54، 55)

''اور ان کفار کی بعض جماعتوں کو جس مال ومتاع سے ہم نے بہرہ ور کر رکھا ہے اس کی طرف نظر نہ اُٹھائیں اور ان کی بدبختی پر غم نہ کریں اور اپنا دامن شفقت اہل ایمان پر ڈالیں''۔ (الحجر 15:88)

یہ ذہنی برتری اور شعوری فوقیت تھی جس کی بنا پر یہ طبقات اولین خطاب کے مستحق قرار پائے۔ قرآن پاک کا سارا عقلی استدلال اس حقیقت کی تائید کرتا ہے۔

قلبی تبدیلی

قلب انسانی شخصیت میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ قلب تمام جذبات کا منبع ہے اور قلبی لگاؤ ہی سے جملہ اُمور بطریق احسن انجام پاتے ہیں۔ انسان کی جملہ خواہشات ورجحانات کو قلب ہی کنٹرول کرتا ہے۔ قلب کی سلامتی اور کجی فکر وکردار کے پورے ڈھانچے کو متاثر کرتی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا:

آگاہ رہو کہ بدن میں ایک ٹکڑا گوشت کا ہے جب وہ سنور جاتا ہے تو تمام بدن سنور جاتا ہے اور جب وہ خراب ہو جاتا ہے تو تمام بدن خراب ہو جاتا ہے۔ سنو وہ ٹکڑا دل ہے۔ (بخاری۔ کتاب الایمان)

قلب کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن پاک میں اس کی اثر پزیری، اس کی اصلاح کا ذکر خصوصیت سے کیا گیا ہے۔ مومنین کی صفات میں قلب کی نرمی اور منکرین کی خصوصیات میں ان کے دلوں کی سختی اور بیماری کا تذکرہ بالتفصیل موجود ہے:

''مومن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیتیں پڑھی جائیں وہ انھیں ایمان میں بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں۔'' (الانفال 8:2)

''عاجزی اختیار کرنے والوں کو خوش خبری دو کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل خوف محسوس کرتے ہیں اور اس پر صبر کرنے والے جو انھیں تکلیف پہنچتی ہے۔''

(الحج 22:35)

''اللہ نے بہترین کلام اُتارا یعنی کتاب جس کی باتیں ملتی جلتی دُہرائی گئی ہیں۔ اس سے ان لوگوں کے دل کانپ اٹھتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پھر ان کے بدن اور ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جاتے ہیں۔'' (الزمر 39:23)

''سن رکھو! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے۔'' (الرعد 13:28)

''کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے نرم ہو جائیں۔'' (الحدید 57:16)

''وہی ہے جس نے مومنوں کے دل میں تسکین نازل کی تاکہ وہ اپنے ایمان کے ساتھ

ایمان میں ترقی کریں۔" (الفتح 4:48)

"اور ہم نے اس کی پیروی کرنے والوں کے دلوں میں مہربانی اور رحم ڈالا۔"
(الحدید 27:57)

منکروں، کافروں اور فاسقوں کے قلوب کی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے ان تمام امراض کی نشان دہی کی گئی جن کے باعث یہ لوگ قبول حق سے انکار کرتے ہیں۔ یہ آیت مومنین اہل کتاب کے بارے میں ہے۔

"مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔"
(البقرہ 7:2)

"ان کے دلوں پر روگ ہے اللہ نے ان کے روگ کو بڑھا دیا ہے۔" (بقرہ۔10)

"ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گم راہ یہی بے خبر ہیں۔" (الاعراف 179:7)

"اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے سو وہ نہیں جانتے۔" (التوبہ 93:9)

"آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔"
(التوبہ 93:9)

"تو کیا قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔"
(محمد 24:47)

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (المطففین 14:83)

"ہرگز نہیں! بلکہ ان کے دلوں پر ان کے عملوں کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔"

"جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان لوگوں کے دل نفرت کرتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔" (الزمر 45:39)

"پھر جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اس میں متشابہ ہے فتنہ پیدا کرنے کے لیے اور یہ چاہتے ہیں کہ اس کی من مانی تاویل کریں"
(آل عمران 7:3)

اہل کتاب کے امراض قلبی کا خصوصی ذکر بھی موجود ہے۔ مثلاً:

"پھر تمھارے دل اس کے بعد سخت ہو گئے۔ سو وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ سختی میں اس سے بھی بڑھ کر۔" (البقرہ 74:2)

"سو جب وہ ٹیڑھے چلے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے ہی رہنے دیئے"
(الصف 5:61)

"اور کہتے ہیں ہمارے دل پردوں میں ہیں بلکہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کی۔ پس وہ بہت ہی کم مانتے ہیں" (البقرہ 88:2)

مندرجہ بالا نصوص سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی عملی زندگی میں قوت محرکہ قلب ہے اور اسی کی بدولت شخصیت میں انقلاب آتا ہے۔ صوفیائے کرام نے غالباً اسی حقیقت کے پیش نظر اصلاح قلب ہی پر تمام مساعی کو مرتکز کر دیا ہے۔ ان کے ہاں تو قلب کی موت وحیات اور صحت ومرض کے بہت اشارے ملتے ہیں۔ حضور ﷺ کو یہ ارشاد ہوا کہ ان لوگوں سے اجتناب کریں جن کے دل غفلت زدہ ہیں۔

"آپ اس کی بات نہ مانیں جس کا دل ہم نے اپنے ذکر سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے اور اس کا معاملہ حد سے گزرا ہوا ہے۔" (الکہف 28:18)

دعوت میں اصل مقصود افراد کے دل میں اللہ کی ذات کے لیے طلب پیدا کرنا ہے۔ قرآن پاک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید الوہیت پر زور دینے کا بنیادی سبب یہی طلب ہے۔ کیوں کہ اللہ کی ربوبیت اور خالقیت کو تو کسی نہ کسی صورت تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ دقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار واعتراف سے جی چراتا ہے۔ دینی زندگی میں عبودیت کے کامل اعتراف ویقین کے بغیر بات نہیں بنتی۔ قرآن مجید میں توحید الوہیت کے لیے مختلف پیرایوں میں اپنا مدعا بیان کیا گیا ہے۔ تمام انبیاؑ نے سب سے پہلے لا الہ الا اللہ کی دعوت دی ہے۔ انبیا و مصلحین کے طریق دعوت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے بگاڑ کا اصل سبب اللہ تعالیٰ سے رابطے کی کمی، کمزوری یا انقطاع ہے اور یہ رابطہ طلب ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آخرت کا تذکرہ، موت کی حقیقت، تغیر عالم، استعانت بالصبر والصلوٰۃ، تلاوت کلام پاک، آفاق و انفس میں غور و تدبر سب طلب پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں۔ یہ طلب قلب ہی سے اٹھتی ہے اور یہیں مستحکم ہوتی ہے۔ ذہن تو صرف دلیل مہیا کرتا ہے یا اس کے لیے ذرائع تجویز کرتا ہے۔ یہ طلب تصوف کا بھی مرکزی نقطہ ہے مگر اس میں الحاد و زندقہ کے امکانات اس وقت تک باقی رہتے ہیں جب تک نبوت کی راہ نمائی شامل نہ ہو جائے۔ اگر خدا کی معرفت بواسطہ نبوت واتباع شریعت حاصل نہ ہو تو شدید قسم کے مزلّات کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ قلب کو شخصیت کے انقلاب اور سیرت کی تطہیر میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کا ثبوت انبیا کے طریق تعلیم کے علاوہ تصوف کے اسلامی وغیر اسلامی سلسلے میں بھی ملتا ہے، جن میں زیادہ توجہ قلب کی تطہیر وتذکیر پر ہے۔

قلب وذہن کے بارے میں مندرجہ بحث سے یہ امر عیاں ہوتا ہے کہ دونوں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انسانی شخصیت میں انقلاب کا منبع نہ تنہا عقل کو قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ محض قلب کو۔ ان دونوں کی باہمی رفاقت ہی سے فکر و عمل کا کامل تصور پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ انسان کے طبقاتی اور مزاجی اختلاف کے باعث مختلف انداز کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ کوئی شخص محض عقلی استدلال سے مطمئن ہو جاتا ہے، کوئی صرف قلبی اپروچ سے اور کسی کے لیے دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ داعی ومبلغ کے لیے ضروری ہے کہ مخاطب کے مزاج کو سامنے رکھ کر ذہن وقلب کے لیے غذا مہیا کرے اور سامع کے اس گوشے پر توجہ دے جہاں دعوت کا اثر انداز ہونا یقینی ہو۔

داعی کی دل سوزی

موعظہ حسنہ میں دوسری اہم بات داعی ومبلغ کی دل سوزی وخیر خواہی ہے۔

دعوت ایک ایسا عمل ہے جس کے نتیجے میں قلبی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے۔ کوئی شخص اس وقت تک اپنے تاریخی پس منظر' نظریاتی وابستگی اور خاندانی وقار کے تقاضوں کو نہیں بھلا سکتا جب تک اسے داعی کی بے لوثی' نیک نفسی اور دل سوزی کا یقین نہ ہو جائے۔

تمام انبیاؑ کے دعوتی عمل میں یہ پہلو نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے استدلال میں' ان کی جذباتی وفطری اپیل میں اور عبرت آموز واقعات کے بیان میں ہر جگہ ایک ہی جذبہ' ایک ہی روح اور ایک ہی خواہش نظر آتی ہے کہ مخاطب کسی طرح حق کی آواز سن لے اور اس کی صداقت کو مان لے۔ یہ مقدس نفوس نہ صرف یہ کہ اس حقیقت کا خود شعور رکھتے ہیں بلکہ مخاطب کو بھی مختلف وجوہ سے اپنی بے غرضی اور ایثار کا احساس دلاتے ہیں کیوں کہ اس کی معرفت سے دعوت کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ہر نبی نے مخاطبین کو یہ یقین دلایا کہ وہ اس دعوت کے ذریعے کوئی ذاتی مفاد یا مالی منفعت حاصل نہیں کرنا چاہتے۔

قرآن مجید نے سابق انبیا کے بارے میں یہ جملہ اکثر نقل کیا ہے۔

﴿وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ﴾ (الشعرا 26 :109)

''میں اس کام کا تم سے صلہ نہیں مانگتا۔''

﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ﴾

''میرا صلہ تو اللہ پر ہے۔''

﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الشعرا 26:127)

''میرا صلہ تو جہانوں کے پروردگار ہی پر ہے۔''

﴿اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ط اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ (ھود 11 :51)

''میرا صلہ تو اس کے ذمے ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔ بھلا تم سمجھتے کیوں نہیں۔''

داعیانِ حق جس قدر مصائب و آلام کا شکار ہوتے ہیں اور جس طرح ثبات و استقامت کے ساتھ اپنا دعوتی عمل جاری رکھتے ہیں وہ بھی ان کی بے لوثی کی دلیل ہے۔ فساد و بگاڑ کی اصلاح کا جو انداز وہ اختیار کرتے ہیں اس سے صاف پتا چلتا ہے کہ ان میں نفرت وانتقام کی جگہ ایک حاذق معالج کی ہمدردی و خیر خواہی واضح ہے۔ وہ مخالفتوں کے طوفان میں گھبرانے اور چڑنے کی بجائے دعائیں دیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے ذکر میں ہے:

''اگر تو انھیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو (تیری مہربانی ہے) بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے'' (المائدہ 5:118)

غزوۂ اُحد میں حضور علیہ السلام کو لہولہان کیا جاتا ہے اور آپ ﷺ شدید ترین اذیت کے لمحات میں دست بدعا ہو کر یوں گویا ہوتے ہیں۔

ھم اغْفِرْ لِقَوْمِيْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ .

''اے اللہ میری قوم کو بخش دے۔ یہ حقیقت کا علم نہیں رکھتے۔'' (مسلم۔ کتاب الجہاد)

طائف کے سفر میں آپ سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے اس سے کون آگاہ نہیں مگر ان کے حق میں بددعا نہیں کرتے۔ درج ذیل روایت سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ یوم احد سے بھی زیادہ سخت دن آپ ﷺ پر آیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے تمھاری قوم کی جو جو تکلیفیں اٹھائی ہیں وہ اٹھائی ہیں اور سب سے زیادہ تکلیف جو میں نے اٹھائی ہے وہ عقبہ کے دن تھی جب میں نے اپنے آپ کو ابن عبدیالیل بن عبدکلال کے سامنے پیش کیا تو اس نے میری خواہش کو پورا نہیں کیا۔ پھر میں رنجیدہ ہو کر سیدھا چلا۔ ابھی میں ہوش میں نہ آیا تھا کہ قرن الثعالب میں پہنچا۔ میں نے اپنا سر اٹھایا تو بادل کے ایک ٹکڑے کو اپنے اوپر سایہ فگن پایا۔ میں نے دیکھا تو اس میں جبریل تھے۔ انھوں نے مجھے آواز دی اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے آپ کی قوم کی گفتگو اور ان کا جواب سن لیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتہ کو آپ ﷺ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ ﷺ ایسے کافروں کے بارے میں جو چاہیں حکم دیں۔ پھر مجھے پہاڑوں کے فرشتہ نے آواز دی اور سلام کیا پھر کہا اے محمد! ﷺ یہ سب کچھ آپ ﷺ کی مرضی پر ہے اگر آپ ﷺ چاہیں تو میں اخشبین نامی دو پہاڑوں کو ان کافروں پر لا کر رکھ دوں تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ مجھے اُمید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کافروں کی نسل سے ایسے لوگ پیدا کرے گا جو صرف اسی کی عبادت کریں گے اور اس کے ساتھ بالکل شرک نہ کریں گے۔

(بخاری۔ کتاب۔ کیف بدء الخلق)

یہ طرزِ عمل مبلغ کی دل سوزی و ہمدردی پر دال ہے اور بدترین مخالف بھی بالآخر حق کی طرف ضرور کھنچتا ہے۔

مجادلہ حسنہ

مجادلہ سے مُراد دلائل کا باہمی ردّ و بدل ہے جس سے مخاطب کو مطمئن کرنے کے لیے اس کے دلائل کا جواب دیا جاتا ہے۔ مزید ایسا مثبت استدلال کیا جاتا ہے جو فریق ثانی کو قبولِ حق پر آمادہ کر سکے۔ اس کی نوعیت محض مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود فریق مخالف کو چپ کرا دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور اُنچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سادے طریقے سے اسے بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گم راہی میں اور زیادہ دُور نہ نکل جائے۔ قرآن نے مجادلے کی جو عملی مثالیں نقل کی ہیں اور جن کی تعریف فرمائی ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ درحقیقت نام ہے اس بات کا کہ اپنی بات منوانے کے لیے مخاطب پر محبت' اعتماد' حسن اخلاق اور حسن استدلال سے گھیرے ڈالے جائیں۔ یہاں تک کہ وہ داعی کی دل سوزی' اس کی بے لوثی اور اس کے اخلاص سے متاثر ہو کر اس کی بات کی صداقت پر غور کرنے اور اسے تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ قرآن نے اس طرح کے متعدد مجادلے نقل کیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن جسے مجادلہ کہہ رہا ہے' وہ اس تصور سے قطعاً مختلف

ہے جو ہمارے ہاں مناظرہ بازی میں رائج رہا ہے۔ ابراہیمؑ نے قوم لُوط کے بارے میں مجادلہ فرمایا۔ قرآن نے اس کی تعریف فرمائی ہے کہ یہ مجادلہ ابراہیمؑ کی دردمندی و دل سوزی کا نتیجہ تھا۔ قرآن پاک میں اس کا اجمالاً ذکر ہے:

﴿فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ إِبْرٰهِيمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا فِي قَوْمِ لُوطٍ ۝ إِنَّ إِبْرٰهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ﴾ (ہود 11: 74تا75)

''جب ابراہیمؑ سے خوف جاتا رہا اور انھیں خوش خبری بھی مل گئی تو قوم لوط کے بارے میں لگے ہم سے بحث کرنے بے شک ابراہیمؑ بڑے تحمل والے نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔''

بائبل میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ آپ نے قوم لُوط کے بارے میں فرشتوں سے مندرجہ ذیل گفتگو فرمائی:

''تب ابراہام نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راست باز ہوں۔ کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس راست بازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟ اور خداوند نے فرمایا کہ اگر مجھے سدوم شہر کے اندر پچاس راست باز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہام نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھیے! مَیں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں۔ شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست و نابود کر دے گا؟ اس نے کہا اگر مجھے پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست و نابود نہیں کروں گا۔ پھر اس نے اس سے کہا شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا مَیں ان چالیس کی خاطر بھی نہیں کروں گا۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس بھی ملیں تو بھی ایسا نہیں کروں گا۔ پھر اس نے کہا: دیکھیے! مَیں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی شاید وہاں بیس ملیں۔ اس نے کہا۔ میں اس بیس کی خاطر بھی نیست و نابود نہیں کروں گا۔ تب اس نے کہا اگر خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا میں دس کی خاطر اسے نیست و نابود نہیں کروں گا۔ جب خداوند ابراہام سے باتیں کر چکا تو وہ چلا گیا اور ابراہام اپنے مکان کو لوٹا۔ (بائبل۔ پیدائش)

یہ طرز کلام' یہ اندازِ تخاطب' یہ اسلوب استدلال اور محبت بھرے اصرار کا یہ طریقہ ہے' جسے قرآن نے مجادلہ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ مجادلہ ہے جس کی قرآن کریم نے تعریف فرمائی ہے۔ اسی طرح قرآن مجید نے ایک اور مناظرہ بھی نقل کیا ہے جسے محاجہ کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔

عدم اکراہ

قرآن مجید میں دعوت و تبلیغ کے کچھ اور اُصول بھی بیان کیے گئے ہیں جن میں سے بہت اہم یہ ہے کہ کسی شخص سے بہ جبر اپنی بات نہ منوائی جائے۔ دعوت کے ابتدائی مراحل میں تو اس جبر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' البتہ حق کے مستحکم ہونے پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے لیکن قرآن پاک نے ان تمام خدشات کی نفی کر دی۔ فرمایا:

﴿لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ (البقرہ 2:256)

''دین اسلام میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت (صاف طور پر ظاہر اور) گم راہی سے الگ ہو چکی ہے۔ تو جو شخص بتوں سے اعتقاد نہ رکھے اور خدا پر ایمان لائے اس نے ایسی مضبوط رسّی ہاتھ میں پکڑ لی ہے جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں اور خدا (سب کچھ) سنتا (اور سب کچھ) جانتا ہے۔''

آپ نے دعوت کے تمام مراحل میں پُرامن تبلیغ کو اپنا مقصد بنائے رکھا۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس سے جبر و اکراہ ثابت کیا جا سکے۔ قبول حق ایک اختیاری معاملہ ہے اور اسلام ان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ ۖ فَمَن شَآءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾
(الکہف 18:29)

''آپ ﷺ فرما دیں کہ حق تمھارے پروردگار کی طرف سے ہے تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔''

قرآن مجید میں تبلیغ حق کے ضمن میں انبیائے کرامؑ کی مساعی کو متعین کیا ہے' اور ان حدود کو بیان کیا ہے جہاں پر انھیں رک جانا چاہیے۔

''ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔''
(المائدہ 5:92)

رسول اکرم ﷺ مشرکین کے اعراض سے غم گین ہوتے تھے تو انھیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلٰغُ﴾ (الشوریٰ 42:48)

''اے پیغمبر ﷺ آپ کا فرض صرف پہنچا دینا ہے۔''

﴿إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ﴾ (الغاشیہ 88:22)

''اے پیغمبر ﷺ! آپ تو نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر داروغہ نہیں بنائے گئے۔''

کسی شخص کو زبردستی دین میں شامل کرنا ایک ایسا فعل ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے ناپسند کیا ہے اور اپنے رسول ﷺ کو اس تصور سے منع کیا ہے۔

''اگر آپ ﷺ کا پروردگار چاہتا (کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنا دے) تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ تو کیا اے پیغمبر آپ لوگوں پر زبردستی کریں گے کہ وہ ایمان لے آئیں'' (سورۂ یونس 10:99)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام ابتدا ہی سے' نظریہ اور عمل دونوں کے اعتبار سے ایک تبلیغی مذہب رہا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت اس امر کی روشن مثال

ہے اور آپ ﷺ خود مبلغین اسلام کے اس طویل سلسلے کے سرخیل ہیں جنھوں نے کفار کے دلوں میں اپنے دین کے لیے راہ پیدا کر لی ہے۔ اگر اسلام کے تبلیغی جوش کا ثبوت تلاش کرنا ہو تو اسے کسی جابر شخص کی ایذا رسانی یا متعصب آدمی کے غیظ وغضب میں ڈھونڈنا عبث ہے۔ اسی طرح مسلم مجاہد کی وہ خیالی تصویر بھی حقیقت سے بہت دور ہے، جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن دکھایا گیا ہے۔ اسلام کی صحیح روح کا مظہر وہ مسلمان مبلغ اور تاجر ہیں جنھوں نے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے دین کو روئے زمین کے ہر خطے پر پہنچایا ہے۔ تبلیغ دین کے یہ پُرامن طریقے صرف اس زمانے میں اختیار نہیں کیے گئے جب کہ سیاسی حالات نے جبر واکراہ کے استعمال کو ناممکن یا خلاف مصلحت بنا دیا تھا بلکہ قرآن شریف کی بہت سی آیات میں ایسے پُرامن طریقوں کی سخت تاکید آئی ہے۔ اس ضمن میں مغربی علما کو بڑی غلط فہمی ہوئی ہے انھوں نے آپ ﷺ کے غزوات اور فتوحات سے یہ غلط استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے بہ جبر قبائل کو اسلام میں داخل کیا ہے۔ حالانکہ کفر کی سیاسی قوت کو توڑنا اور کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنے میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اسلام کو اس امر سے انکار نہیں کہ وہ کفر کے سیاسی اقتدار کو ختم کرتا ہے اور اس سلسلے میں کوئی معذرت نہیں کرتا البتہ وہ کسی فرد یا قوم کو قوت کے بل پر اسلام میں داخل کرنے کے سخت خلاف ہے۔ مخالفین اسلام کی اکثریت نے اس باریک فرق کو محسوس نہیں کیا البتہ بعض مغربی مصنفین کو اس امر کا احساس ہے۔ آرنلڈ لکھتے ہیں۔ ''اسلامی فتوحات کی یہ غلط توجیہ وتاویل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ وہ جنگیں، جو دراصل کفار کے ملکوں میں اسلامی حکومت وسطوت قائم کرنے کے لیے لڑی گئی تھیں، ان سے غیر مسلموں کا تبدیل مذہب مقصود تھا۔ گولڈزیہر (Gold Ziher) نے سلطنت اسلام کی توسیع اور مذہب اسلام کی تبلیغ کے درمیان بہت خوبی سے تمیز کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے دیارِ عرب میں کفار کے ساتھ جو محاربہ کیا اور اپنے پیروؤں کو بھی اس کی وصیت کی، اس میں انھوں نے کفار کو مسلمان بنانے پر اتنا زور نہیں دیا جتنا اس بات پر کہ انھیں اپنے دائرہ حکومت میں داخل کیا جائے جو بالفاظ دیگر حکومت الٰہیہ تھی۔ لہٰذا صدر اسلام کی اسلامی فتوحات کے دوران میں بھی مسلمان مجاہدین کا مقصد اولین یہ نہیں تھا کہ غیر مذاہب کے لوگوں کو مسلمان بنایا جائے بلکہ ان کی غرض وغایت یہ تھی کہ انھیں اسلامی حکومت کے زیرنگیں کیا جائے۔''

آرنلڈ مغربی علما کے نقطہ نظر کو نقل کرنے کے بعد اسے رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
غزواتِ نبوی کا بیان کتاب ہٰذا کے موضوع سے خارج ہے، لیکن اس امر کا اظہار ضروری ہے، کہ جب آنحضرت ﷺ ایک مسلح جماعت کے سردار بن گئے تو انھوں نے دفعتاً ایک پُرامن واعظ کے منصب کو چھوڑ کر ایک متعصب مذہبی جنونی کا قالب اختیار نہیں کیا، جو دوسرے لوگوں کو تبدیلی مذہب پر بزورِ شمشیر مجبور کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ولیم میور کو بھی اس بات کا اعتراف ہے۔ چنانچہ اس نے بنی قریظہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے جو طرز عمل اختیار کیا، اس کے اسباب واضح طور پر خالصتاً سیاسی تھے، کیوں کہ آنحضرت ﷺ نے تاحال لوگوں کو دائرہ اسلام میں بہ جبر لانے یا منکرین کو سزا دینے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ (سیرۃ النبی، جلد سوم۔ صفحہ 282)

مغربی مصنفین نے اکثر یہی لکھا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے مدینے کی طرف ہجرت کی اور ان کے حالات زندگی بدل گئے تو وہ ایک بالکل نئے انداز میں ظاہر ہوئے۔ اب وہ واعظ اسلام نہیں تھے جن کا کام رسول خدا کی حیثیت سے لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈرانا اور انھیں اسلام کی حقانیت کا قائل کرنا تھا۔ بلکہ (نعوذ باللہ) وہ ایک متعصب شخص ثابت ہوئے اور بغیر کسی پس وپیش کے اپنی قوت وتدبیر کے تمام ممکنہ وسائل کو اپنی بات منوانے کے لیے استعمال کرنے لگے۔ لیکن یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ مدینے میں آ کر آنحضرت ﷺ نے داعی اسلام کے منصب کو خیرباد کہہ دیا تھا، یا یہ کہ جب بڑا لشکر آپ ﷺ کی سرکردگی میں جمع ہو گیا تو آپ نے منکرین کو اسلام کی طرف بلانا چھوڑ دیا۔ ابن سعد نے اپنی کتاب ''الطبقات'' میں متعدد ایسے تبلیغی مراسلات درج کیے ہیں جو رسول خدا ﷺ نے مدینہ سے مختلف قبائل عرب کے سرداروں کو بھیجے تھے۔ یہ مراسلات ان مکاتیب کے علاوہ ہیں جو آپ نے بیرونی ملکوں کے حکمرانوں کے نام روانہ کیے تھے اور جن میں انھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی۔ ان صفحات میں آپ کو متعدد مثالیں اس بات کی ملیں گی کہ آنحضرت ﷺ نے ایسے قبائل کے ہاں مبلغین کو بھیجا جنھوں نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ بعض اوقات انھیں ناکامی ہوئی۔ مگر اس سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ان کی کوششیں خالص تبلیغی تھیں اور کسی طرح کا جبر اختیار نہیں کیا گیا تھا۔

(دعوت اسلام۔ صفحہ 39)

اس قسم کی ناکام کوشش کی مثال وہ تبلیغی مشن ہے جو آنحضرت ﷺ نے 4ھ میں قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کی طرف بھیجا تھا۔ اس قبیلے کا سردار ابو براء عامر مدینہ میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے اسے اسلام کی تلقین کی مگر اس نے قبول اسلام سے انکار کیا۔ تاہم اسے اسلام کی طرف قدرے رغبت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اس نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ چند مسلمانوں کو نجد میں اسلام کی تلقین کرنے کے لیے بھی بھیجیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس مقصد کے لیے چالیس مسلمانوں کی ایک جماعت بھیج دی جن میں سے اکثر مدینہ کے نوجوان تھے۔ یہ لوگ قرآن خوانی کے ماہر تھے اور قرأت اور عبادت کے لیے اکثر اوقات راتوں کو جمع ہوا کرتے تھے۔ باوجود اس پروانہ راہداری کے جو ان کی سلامتی وامان کے لیے ابوعامر نے دیا تھا، انھیں دھوکے سے قتل کرا دیا گیا اور ان میں سے صرف تین آدمی بھاگ کر اپنی جانیں بچا سکے۔ (ابن اسحاق 648)

اہلِ مغرب کے ہاں اس مسئلہ پر خاصا فکری الجھاؤ ہے۔ مسئلہ کی حقانیت اور اس کی واضح حقیقت کہیں کہیں انھیں اعتراف پر مجبور کرتی ہے تو وہ صحیح بات ریکارڈ کرتے ہیں ورنہ اکثر اوقات تعصب کا شکار ہو کر اپنے موہوم تصورات اور مزعومہ نتائج ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ مغربی استعمار کے نتیجے میں مستشرقین نے اسلامی روایات اور دینی

معتقدات کے خلاف زہر یلے علمی پروپیگنڈے سے کام لیا اور بعض اوقات جارحیت کے ساتھ حقانیت اسلام کو باطل اور پیغمبر اسلام کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی۔ مستشرقین کے اعتراضات میں سے بہت بڑا اعتراض یہ بھی تھا کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔ علمائے اُمت اور مفکرین اسلام نے اس کے مدلل جوابات دیے ہیں۔ ہم اسے سید سلیمان ندویؒ کے اس بیان پر ختم کرتے ہیں۔ ''اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام تلوار کے زور سے پھیلا لیکن جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا' ان کے اوصاف کو پیش نظر رکھنے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پزیر دل کا جویاں تھا اور جب آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طائر قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا۔ چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن اشخاص نے اسلام قبول کیا وہ وہی تھے جو نیک طبع' ایماندار' راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف وخصائص سے واقف تھے۔ گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت وتمدن سے بہرہ ور تھے۔ ایسے اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول میں پیش قدمی کی' وہ بھی وہی تھیں' جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ عرب کے دومختلف حصوں یعنی جنوبی وشمالی میں سے اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن' عمان' بحرین اور یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی۔ کیوں کہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی ممتاز' متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلاملا تھا۔ اہل مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن و معاشرت روایات اور رسم ورواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔ اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں۔ لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج مدینہ' یمن' یمامہ اور بحرین کو فتح کرنے کے لیے نہیں بھیجی گئی۔ انصار مدینہ نے خود مکہ میں آکر اسلام کو لبیک کہا۔ اطراف مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آکر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا۔ یمن سے دوس کے قبیلے کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے سردار نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لیے پیش کیا۔ اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا۔ ہمدان کا قبیلہ حضرت علیؓ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح کے اور بے شمار واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ تلوار کی بجائے کوئی اور قوت تھی جو لوگوں کو کشاں کشاں حلقہ بگوش اسلام کر رہی تھی۔ اسلام کی صداقت عیاں اور وحشت کی رکاوٹیں دُور ہونے لگیں تو عوام جوق در جوق اسلام میں شامل ہونے لگے۔ کارلائل کی بات ٹھیک ہے کہ ''نہتے اور یکہ وتنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس تلوار کے زور سے آئی۔''

دعوت کی زبان

قرآن کریم نے مبلغ وداعی کے لیے جو اصول وقواعد بتائے ہیں اور داعی اسلام خاتم الرسل ﷺ نے اپنی عملی زندگی سے ان اصولوں کی جس حقانیت کا ثبوت فراہم کیا ہے اور وہ اظہر من الشمس ہے۔ ان اصولوں میں ایک اہم اصول داعی کی زبان اور اس کا اسلوب بیان ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ایک مبلغ وداعی کی حیثیت سے گفتگو کا بے نظیر اسوہ چھوڑا ہے۔ آپ ﷺ کی داعیانہ زبان اور مبلغانہ کلام کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے: هُوَ الْمِسْكُ مَاكَرَّرْتَه يَتَضَوَّعُ ۔اس کی حیثیت کستوری کی سی ہے جتنا ملو گے اتنی زیادہ خوش بو ہوگی۔

اس طرز کلام میں وحدت مقصود' توضیح وتشریح' پرجوش استدلال' نرم روی اور مخاطب کی نفسیات کا لحاظ تک تمام خصائص شامل تھے۔ مثلاً آپ کے تمام خطبات اور جملہ مباحثے ایک ہی مقصد کا پتا دیتے ہیں۔ ان میں کوئی تضاد وتناقض نہیں۔ وہی اطاعت خداوندی اور وہی خدمت انسانی ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔ غالباً اسی لیے آپ کی ذات سے شعر کی نفی کی۔ رب کائنات نے فرمایا۔

﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِىْ لَهٗ﴾ (یٰس 36:69)

''اور ہم نے ان (پیغمبر) کو شعر گوئی نہیں سکھائی اور نہ وہ انھیں شایان ہے۔''

بالعموم شاعر کے سامنے کوئی متعین منزل نہیں ہوتی وہ اپنی خواہشات واحساسات کا تابع ہوتا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے:

''اور شاعروں کی پیروی گم راہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سر مارتے پھرتے ہیں اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں۔''

(الشعرا26:224-226)

پرجوش استدلال کا اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے۔

''رسول اللہ ﷺ جب خطبہ دیتے۔ آنکھیں سُرخ ہو جاتیں' آواز بھاری ہو جاتی' جوش تیز ہو جاتا یہاں تک کہ معلوم ہوتا کہ آپ کسی دشمن فوج کے آپڑنے کے خطرہ سے آگاہ کر رہے ہیں' فرماتے وہ تم پر صبح کو آپڑے یا شام کو۔''

(مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ)

یہ جوش وجذبہ یقیناً اس ہمدردی کا باعث ہوتا ہے جو مبلغ وداعی کو اپنی قوم سے ہوتی ہے۔ کلام کا نرم انداز مخاطب میں سننے کی صلاحیت کو مستحکم کرتا ہے اور اسے ضد وعناد کا شکار نہیں ہونے دیتا۔ اسی لیے قرآن پاک میں وضاحت سے آیا ہے کہ مخالف کو تحقیر واستخفاف کے انداز سے مخاطب نہ کریں:

''اور جنھیں وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں انھیں گالی نہ دو کہ وہ تجاوز کر کے بے جانے بوجھے اللہ کو گالی دے بیٹھیں۔'' (الانعام 6:109)

''بُرائی اور بھلائی دونوں یکساں نہیں ہوسکتیں۔ بُرائی کو بھلائی سے دفع کرو تو تم دیکھو گے کہ جو تمھارا دشمن تھا اب وہ تمھارا دلی دوست بن گیا ہے اور یہ حکمت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور انھیں ملتی ہے جو بڑے نصیب ور ہوتے ہیں۔ اگر تمھارے دل میں شیطان کی طرف سے کوئی دغدغہ پیدا ہو ہی جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ وہ سننے والا جاننے والا ہے۔'' (حٰم السجدہ 41:34-36)

داعی کو مناظرانہ انداز کلام سے ہمیشہ بچتے رہنا چاہیے۔ یہاں تک کہ اگر مخاطب

کے متعلق اندازہ ہو جائے کہ وہ مناظرہ پر اُتر آیا ہے تو داعی حق کو کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے کیوں کہ مناظرہ بازی سے کسی کو قائل نہیں کیا جا سکتا:

''پس وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا کرنے کی کوئی راہ نہ پائیں اور تم اپنے رب کی طرف دعوت دو۔ تم ایک سیدھی راہ پر ہو اگر وہ تم سے مناظرہ کرنا چاہیں تو کہ دو اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ تمھارے درمیان قیامت کے روز فیصلہ کرے گا ان چیزوں کے بارے میں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو۔'' (الحج 22:67۔69)

مخاطب کی نفسیات کو ملحوظ رکھے بغیر درُست ابلاغ، معانی کے انتخاب میں طول و اختصار، کلام، انداز بیان اور رلب و لہجے کے خاص معیار کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ آپ ﷺ نے تاکید فرمائی کہ جب نصیحت کرو تو مختصر کرو۔ آپ ﷺ نے خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانش مندی قرار دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''فرماتے تھے آدمی کی نماز کا طویل ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی سوجھ بوجھ کی علامت ہے۔ تو نماز لمبی کرو اور خطبہ مختصر کرو اور بعض بیان جادو ہوتے ہیں''

(مسلم۔ کتاب الصلوٰۃ)

اسی طرح مخاطب کے مرتبہ وفہم کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ حضور اکرم ﷺ بات کو دُہرا کر اچھی طرح ذہن نشین کراتے:

''آنحضرت ﷺ کوئی بات فرماتے تھے تو اسے تین بار دہراتے تھے تاکہ خوب سمجھ میں آ جائے۔'' (بخاری۔ کتاب العلم)

دعوت وتبلیغ نبوی کا عملی اِرتقا

اعلانِ نبوت سے پہلے آپ ﷺ کی پوری توجہ تعمیر شخصیت پر تھی یا گردو پیش کے حالات کے گہرے مطالعہ پر۔ آپ ﷺ اپنی خلوتوں میں تفکر وتدبر کے ذریعے انفس وآفاق کے اسرار کا جائزہ لیتے۔ آپ ﷺ کی تبلیغی مساعی کا آغاز اعلان نبوت ہے۔ آپ ﷺ نے الہامی راہ نمائی میں دعوت وتبلیغ کا کام جاری رکھا۔ آپ ﷺ کی پوری زندگی تبلیغی اُصولوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ آپ ﷺ کے عمل سے دعوت وتبلیغ کے قدرتی طریق کی وسعت کا پتا چلتا ہے۔ آپ ﷺ کو ابتدا میں اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ﴾ (الشعرا 26:214)

''اور اپنے سب سے نزدیک اہل خاندان کو آگاہ وہشیار کرو۔''

اس آیت کے نزول پر آپ ﷺ نے اپنا مشن شروع کر دیا۔ سیرت وحدیث کی کتابوں میں اس کی تفصیل مذکور ہے:

جب آیت وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ صفا پر چڑھے اور باآواز بلند قریش کے تمام قبیلوں کو نام بنام پکارا۔ مثلاً بنی فہر و بنی عدی وغیرہ ان میں سے بیش تر قبیلوں کے افراد پہنچ گئے۔ جو خود نہ پہنچ سکے انھوں نے اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دیا۔ ان میں ابولہب بھی تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اے صاجبو! اگر میں یہ کہوں کہ اس گھاٹی کی دوسری سمت ایک لشکر ہے جو تم پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کر رہا ہے تو تم میری اس اطلاع کو صحیح تسلیم کر لو گے؟ حاضرین نے کہا۔ ہمیں آپ ﷺ کے جھوٹ کا کوئی تجربہ نہیں۔ یہ سُن کر آپ ﷺ نے فرمایا میں تمھیں شدید عذاب سے ڈرانے والا ہوں۔ ابولہب نے کہا ''تَبًّا لَّکَ'' تم نے اسی بات کے لیے ہمیں جمع کیا تھا اس پر سورۂ لہب نازل ہوئی۔

اس کے بعد یہ دائرہ وسیع ہوتا ہے اور مکہ شہر اور اس کے اطراف کی آبادیاں شامل ہو جاتی ہیں تو ارشاد ہوتا ہے:

''تاکہ آپ مکہ اور اس کے آس پاس (کے جو بدوی) ہیں انھیں آگاہ وہشیار کریں۔''

(الشوریٰ 42:7)

اسی حکم کے تحت آپ ﷺ طائف کا سفر اختیار کرتے ہیں اور منکرین واعدا کی ایذا رسانی کا سامنا کرتے ہیں۔ مکہ میں آپ ﷺ کی دعوت سے بعض ایسے لوگ ایمان لائے جو مزید مؤثر شخصیتوں کو دائرۂ اسلام میں لانے کا باعث بنے۔ ان میں ابوبکر صدیقؓ کا نام سرفہرست ہے۔ آپ ﷺ کی مساعی سے مکہ کے بااثر لوگ مسلمان ہوئے۔ اس توسیع سے گھبرا کر کفار نے ایذا رسانی کا سلسلہ شروع کیا جو ہجرت تک جاری رہا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان مشکلات کے باوجود دعوت وتبلیغ کا کام جاری رکھا۔ دعوت کے اثر کو نمایاں کرنے میں ہجرت حبشہ نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح آپ ﷺ کی بات مکہ اور اس کے گردونواح سے نکل کر باہر تک پہنچی۔ اسی دوران میں حضرت عمرؓ نے اسلام قبول کیا اور دعوت حق کے کام کو تقویت پہنچی۔ اب تبلیغ کا دائرہ اور پھیلتا ہے اور ہر ذی حیات انسان کو خطاب ہوتا ہے:

﴿اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ وَّ قُرۡاٰنٌ مُّبِیۡنٌ ۙ﴿۶۹﴾ لِّیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا﴾

(یٰس 36:70)

''یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے تاکہ وہ اسے ہشیار کرے جو زندہ ہے۔''

اس طرح ان تمام لوگوں سے خطاب ہوتا ہے جہاں تک آواز پہنچتی ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے کہ آپ ﷺ قبائل عرب تک اپنی بات پہنچا رہے ہیں۔ ابن ہشام نے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''اے فلاں قبیلے کے لوگو! میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں جو تمھیں حکم دیتا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اللہ کے سوا اس کے مقابل ٹھہرائی ہوئی ہستیوں کو جن کی تم پرستش کرتے ہو چھوڑ دو۔ مجھ پر ایمان لاؤ اور مجھے سچا جانو اور میری حفاظت کرو کہ اللہ نے جو چیزیں دے کر مجھے بھیجا ہے میں انھیں صاف صاف بیان کروں''۔ (سیرۃ النبی۔ جلد دوم۔ صفحہ 64)

آپ ﷺ نے مختلف قبائل میں اپنا پیغام پہنچایا۔ آپ ﷺ جہاں جاتے ابولہب بھی پیچھے جاتا اور کہتا کہ یہ جُھوٹ کہتے ہیں۔ اسی طرح حج کے موقع پر آپ ﷺ مختلف قبائل کو اپنی بات سمجھاتے۔ انھی مواقع میں انصار مدینہ سے ملاقات

ہوتی ہے اور بیعت عقبہ اولیٰ اور بیعت عقبہ ثانیہ ہوتی ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جہاں دعوت و تبلیغ اپنے عمومی دائرہ میں داخل ہوتی ہے۔ قرآن پاک کی ان تمام آیات کا مصداق واضح ہوتا نظر آتا ہے جس میں تمام انسان شامل ہوتے ہیں۔ مثلاً:

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراھیم: 54)

''یہ قرآن تمام انسانوں کے لیے پیغام ہے''

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا﴾ (سبا 34:28)

''اور ہم نے آپ (ﷺ) کو تمام انسانوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

آپ ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنی عالمی رسالت کا اعلان فرمائیں:

﴿قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا﴾

(الاعراف 7:158)

''اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں''

تمام کائنات کو آپ کی دعوت و تبلیغ کے زیر اثر کیا اور فرمایا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (الفرقان 25: 1تا2)

''برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق و باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر نازل کی تاکہ وہ دنیا جہان کے لیے ہشیار و آگاہ کرنے والا ہو۔ وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے۔''

آپ ﷺ نے مسلمانوں کو تبلیغ و دعوت کی وسعت کا احساس دلایا اور انھیں مایوسی سے نکالتے ہوئے اس کی خوش خبری دی۔

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ﴾

(ص 38: 87تا88)

''یہ قرآن تو دنیا کے لیے نصیحت ہے اور تم ایک زمانے کے بعد اس کی خبر جانو گے۔''

آپ ﷺ کی بہت سی احادیث میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ارشاد فرمایا:

"بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ."

''میں کالے اور گورے سب لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔''

"اَمَّا اَنَا فَاُرْسِلْتُ اِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ كَافَّةً وَكَانَ مَنْ قَبْلِیْ اِنَّمَا يُرْسَلُ اِلٰى قَوْمِهٖ."

''میں عمومیت کے ساتھ تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا ہوں حالانکہ مجھ سے پہلے جو نبی بھی گزرا ہے وہ اپنی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا۔'' (مسند)

"عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ: كَانَ النَّبِیُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَ بُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً." (بخاری۔ کتاب الوضو)

''پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوتا تھا اور میں تمام انسانوں کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔''

"بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ وَيُشِيْرُ بِاِصْبَعَيْهِ يَعْنِیْ اِصْبَعَيْنِ."

(بخاری۔ کتاب الرقاق)

''میری بعثت اور قیامت اس طرح ہیں' یہ فرماتے ہوئے نبی ﷺ نے اپنی دو انگلیاں اٹھائیں۔''

مطلب یہ تھا کہ جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی تیسری انگلی نہیں اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان بھی کوئی نبوت نہیں۔ میرے بعد بس قیامت ہی ہے' اور قیامت تک میں ہی رہنے والا ہوں۔

ہجرت کے بعد نبی ﷺ نے مدینہ منورہ میں پہلے تو مسلم معاشرے کو مستحکم کرنے کی طرف توجہ دی۔ شہری دفاع کے لیے معاہدہ کیا اور مسلمانوں کی تعمیر سیرت اور ان کے معاشی مفادات کو محفوظ کرنے کا انتظام کیا۔ اسی دوران میں مشرکین مکہ سے تصادم ہو گیا۔ اور یہ تصادم پورے جزیرہ نمائے عرب سے جنگ کا آغاز تھا۔ چنانچہ بدر کے میدان میں حرب و ضرب کے جس طوفان کی ابتدا ہوئی وہ فتح مکہ تک سیل رواں کی طرح ہر قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہالے گیا اور مسلم قوت پورے علاقے پر چھا گئی۔ کفر کی سیاسی قوت کو توڑنے کے نتیجے میں لوگ فوج در فوج اسلام میں داخل ہو گئے۔

دعوت بذریعہ خطوط

حدیبیہ کی صلح سے کسی قدر اطمینان نصیب ہوا تو وقت آیا کہ اسلام کا عالمی پیغام تمام دنیا کے کانوں تک پہنچا دیا جائے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے ایک دن تمام صحابہ کو جمع کیا اور خطبہ دیا:

''اے لوگو! اللہ نے مجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے اس لیے میرے متعلق تم لوگ اس طرح اختلاف نہ کرو جس طرح حضرت عیسیٰؑ کے متعلق ان کے حواریوں نے اختلاف کیا تھا۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ! حواریوں نے کس طرح اختلاف کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عیسیٰؑ نے حواریوں کو اسی چیز کی دعوت دی تھی جس کی میں نے تمھیں دعوت دی ہے۔ عیسیٰؑ نے ان میں سے جن لوگوں کو قریب کے مقامات پر بھیجا وہ تو اس سے خوش رہے اور ہر طرح ٹھیک رہے لیکن جنھیں دور بھیجا انھوں نے ادھر کا رخ نہ کیا تو عیسیٰؑ نے اللہ سے ان کی شکایت کی تو نتیجہ یہ ہوا کہ انکار کرنے والوں میں سے ہر آدمی اس امت کی زبان بولنے لگا جس کی طرف بھیجا گیا۔''

(سیرۃ النبی۔ جلد چہارم۔ 254)

اس کے بعد آپ ﷺ نے قیصر روم' شہنشاہ عجم' مصر کے حاکم اور رؤسائے عرب کے نام دعوت اسلام کے خطوط ارسال فرمائے۔ جو لوگ خطوط لے کر گئے اور جن کے نام لے کر گئے ان میں سے کچھ حضرات کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

حضرت دحیہ کلبیؓ	قیصر روم
حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ	خسرو پرویز شہنشاہ ایران
حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ	حاکم مصر
حضرت عمرو بن امیہؓ	نجاشی بادشاہ حبش
حضرت سلیط بن عمر بن عبد شمسؓ	روسائے یمامہ
حضرت شجاع بن وہب الاسدیؓ	رئیس حدود شام، حارث غسانی

آپ ﷺ سے گزارش کی گئی کہ بادشاہ مہر کے بغیر خط نہیں قبول کرتے۔آپ نے مہر بنوائی جس پر محمد رسول اللہ ﷺ لکھا تھا۔آپ ﷺ اس مہر سے خطوط بھیجتے رہے۔آپ ﷺ نے جو خطوط بھیجے وہ اختصار اور جامعیت کے لحاظ سے دعوت کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔قیصر روم کے نام فرمان رسالت کے الفاظ یہ تھے۔

"بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ اِلٰی ہِرَقْلَ عَظِیْمِ رُوْمِ سَلٰمٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی اَمَّا بَعْدُ! فَاِنِّی اَدْعُوْکَ بِدِعَایَۃِ الْاِسْلَامِ۔ اَسْلِمْ تَسْلِمْ یُؤْتِکَ اللّٰہُ اَجْرَکَ مَرَّتَیْنِ فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَاِنَّ عَلَیْکُمْ اِثْمُ الْیَرِیْسِیِّیْنَ "وَیَا اَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْھَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم محمد (ﷺ) کی طرف سے جو خدا کا بندہ اور رسول ہے۔یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے اسے سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے۔اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں۔اسلام لا تو سلامت رہے گا۔خدا تجھ کو دگنا اجر دے گا اور اگر تو نے نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا۔اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں اور تم میں یکساں ہے۔وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پوجیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (اللہ کو چھوڑ کر) رب نہ بنائے اور تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔(بخاری)

قیصر نے اس خط پر ابوسفیان سے جو گفتگو کی وہ صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں منقول ہے۔

خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے نام آپ ﷺ کے نامہ مبارکہ کے یہ الفاظ ہیں:

اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے۔محمد پیغمبر کی طرف سے کسریٰ رئیس فارس کے نام سلام ہے اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو اور اللہ اور پیغمبر اللہ پر ایمان لائے اور یہ گواہی دے کہ اللہ صرف ایک اللہ ہے اور یہ کہ اللہ نے مجھے تمام دنیا کا پیغمبر مقرر کر کے بھیجا ہے تا کہ وہ ہر زندہ شخص کو اللہ کا خوف دلائے۔تو اسلام قبول کر سلامت رہے گا ورنہ مجوسیوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔(طبری۔جلد دوم)

اس بدنصیب نے جو رویہ اختیار کیا اس کا نتیجہ اس نے اور اس کی قوم نے دیکھ لیا۔

اسی طرح آپ ﷺ نے عزیز مصر مقوقس کے نام خط لکھا جس کا جواب اس نے دیا۔آپ کا نامہ مبارکہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

''اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے محمد اللہ کے بندے اور پیغمبر کی طرف سے مقوقس رئیس قبط کے نام۔سلام ہے اس شخص پر جو راہ راست کا پیرو ہے۔اما بعد میں تمھیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔اسلام قبول کرو سلامت رہو گے۔اسلام قبول کرو خدا تمھیں دُہرا اجر دے گا۔اگر تم اعراض کرو گے تو اہل قبط کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان متفق علیہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو (خدا کو چھوڑ کر) مالک نہ بنائے،تم نہیں مانتے تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں۔''

(السیرۃ الحلبیہ۔جلد سوم،صفحہ 281)

وفود۔دعوتِ نبوی ﷺ کا ایک مظہر

ان خطوط و رسائل کے علاوہ دعوت وتبلیغ کی وسعت کا ایک اور ذریعہ بھی ہے۔قاضی سلمان منصور پوریؒ کے بقول نبی ﷺ کے عہد میں اسلام کی اشاعت جس حسن وخوبی کے ساتھ ہوئی تھی اس کی مختصر کیفیت ان وفود (ڈیپوٹیشنوں) سے اندازہ کی جا سکتی ہے جو وقتاً فوقتاً حضور ﷺ کی خدمت میں دور دراز سے آیا کرتے تھے۔ڈیپوٹیشن کا آنا،واپس جانا،ہر منزل اور راہ پر مختلف قوموں اور قبیلوں سے ملنا اور اسلام کی آواز کو سب لوگوں کے کانوں تک پہنچانا کیسی خوبی سے انجام پاتا تھا۔رسول اللہ ﷺ کی مدافعانہ لڑائیاں جن میں بہ مجبوری شامل ہونا پڑا،ملک کے ایک محدود دائرہ ہی میں تھیں۔لیکن ان ڈیپوٹیشنوں کو دیکھو کہ ملک کے ہر گوشہ اور ہر حصہ سے چلے آتے تھے۔ہدایتِ اسلام ہی کے وہ چشمے تھے جو نبی ﷺ نے چٹیل میدان میں بہا دیئے تھے جس کی طرف تمام پیاسے چلے آتے تھے۔دعوتِ اسلام کی دوسری زبردست دلیل ان وفود کا حاضر ہونا ہے۔جن قبائل کے وفود آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے نام یہ ہیں۔ہم نے ان قبائل کے نام فہرست میں درج نہیں کیے جن کا نبی ﷺ کی خدمت میں آنا ملکی اغراض یا ذاتی فوائد کے لیے تھا۔

دوس، صدا،ثقیف،عبدالقیس،بنی حنیفہ،طے،اشعریین،ازد،فردہ جذامی،ہمدان طارق بن عبداللہ،بنی سعد ندیم،بنو اسد،بہرا،عذرا،خولان،محارب،غسان،بنی الحارث،بنی عیش،غامد،بنی فزارہ،سلامان،نجیر ان،نخع۔

ان وفود کے ساتھ آپ ﷺ کی گفتگوؤں سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ دین سکھانے اور اسلام کی تعلیم دینے کا کتنا عمدہ طریق اختیار فرماتے ہیں۔

غرض آپ ﷺ نے جس دعوت وتبلیغ کا آغاز اپنے خاندان واحباب سے کیا تھا اسے اپنی زندگی ہی میں عالمی سطح پر روشناس کرا دیا اور تبلیغی نظام کی بنیاد رکھی جو ہر دور میں اپنا اثر دکھاتی رہی۔مسلمان قوم کے سیاسی عروج وزوال اس پر زیادہ اثر انداز نہ ہو سکے۔(ڈاکٹر خالد علوی،مقالہ:رسول کریم ﷺ کا منہاج دعوت)

آٹھویں کتاب:

خطباتِ نبوی ﷺ

خطباتِ نبوی ﷺ

لغوی اعتبار سے ''خطبہ'' کے معنی وعظ و نصیحت کے ہیں۔ روایتی طور پر خطبے میں عموماً وعظ و تذکیر، نیکی کی تلقین اور نصیحت ہی کی جاتی ہے۔ خطیب اپنی بات کو موثر بنانے کے لیے حتی المقدور منطق و استدلال، جوش و جذبات اور زبان و بیان کے جملہ ذرائع سے کام لیتا ہے۔

انبیا علیہم السلام نے، جو تاریخ کی عظیم الشان ہستیاں تھیں، اپنی اپنی قوم تک پیغام رسانی کے لیے خطابت ہی کو ذریعہ بنایا۔ حضرتِ موسیٰؑ کی زبان میں لکنت تھی یا یہ کہ وہ اپنے اندر خطابت کی صلاحیت نہ پاتے تھے اور انھیں اندیشہ لاحق تھا کہ اگر تقریر کی ضرورت پیش آئی تو نبوت کے فرائض ادا کرنے میں طبعی جھجک مانع آ جائے گی اس لیے انھوں نے باری تعالیٰ سے درخواست کی:

''پروردگار! میرا سینہ کھول دے، اور میرے کام کو میرے لیے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ سلجھا دے تا کہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔'' (طٰہٰ 20:25-28)

حضرت موسیٰؑ کے بھائی حضرت ہارونؑ نسبتاً فصیح گفتگو فرماتے تھے حضرتِ موسیٰؑ نے مناسب سمجھا کہ پیغامِ رسالت کی ترسیل و تکمیل میں بھائی کی اعانت بھی شامل ہو چنانچہ بارگاہِ الٰہی میں التماس کیا:

''اور میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ زبان آور ہے اسے میرے ساتھ مددگار کے طور پر بھیج تا کہ وہ میری تائید کرے۔'' (القصص 28:۳۴)

عربی معاشرے میں خطابت بہت بڑا وصف تھا بحیثیت مجموعی اہلِ عرب کی خطابت مسلّم تھی، اس بنا پر وہ غیر عربی اقوام کو عجمی (گونگا) کہتے تھے۔ آنحضور ﷺ اُمّی تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تقریر و خطابت کی غیر معمولی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ بچپن میں آپ کی پرورش دائی حلیمہ کے ہاں بدوی ماحول میں ہوئی تھی۔ حلیمہ بنو سعد قبیلے سے تھیں اور یہ قبیلہ اپنے فصیح لہجے کے سبب عرب قبائل میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا اس وجہ سے آپ کے لہجے میں عربی فصاحت و بلاغت کی بہترین خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ بحیثیت ایک خطیب، آپ ﷺ کی شخصیت پر نظر ڈالیں تو آپ ﷺ کی خطابت میں بھی ایک انفرادی شان نظر آتی ہے۔

آپ ﷺ کے خطبے کا کوئی مستقل یا مقررہ اسلوب نہ تھا۔ آپ زمین پر کھڑے ہو کر یا کسی درخت سے ٹیک لگا کر یا منبر پر بیٹھ کر یا اونٹ پر سوار ہو کر خطبہ دیتے، سواری پر خطبہ جنگ وغیرہ کے موقع پر دیتے۔ خطبہ دیتے وقت عموماً آپ کے ہاتھ میں ایک عصا ہوتا، کبھی کبھی آپ ﷺ کے پاس کمان ہوتی تو آپ ﷺ اس پر ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرماتے۔ آپ ﷺ کے اُسلوبِ خطبہ کے بارے میں ابن ابی شیبہ کی روایت میں بتایا گیا ہے کہ جمعہ کے دن حضور ﷺ منبر پر آتے ہی لوگوں کی طرف منہ کر کے السّلام علیکم کہتے، منبر پر تشریف فرما ہوتے، پھر حمدِ باری تعالیٰ سے اپنے خطبے کو شروع کرتے اور حمد و ثنا کے بعد قرآنِ کریم کی کوئی سُورت پڑھتے پھر خطبہ ختم کر کے منبر پر سے اُتر آتے ...... خطبے کا یہ طریقہ محض جمعہ سے مخصوص نہ تھا بلکہ جمعہ کے علاوہ دیگر خطبوں میں بھی سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان فرماتے، اس کے بعد حسبِ ضرورت صحابہؓ کو وعظ و نصیحت فرماتے۔ روایات میں ہے کہ آپ ﷺ عورتوں سے علیحدہ خطاب فرماتے تھے۔

خطبے کے دوران میں آپ ﷺ کی آواز کم و بیش ہوتی رہتی تھی جب آواز بلند ہوتی تو آپ ﷺ کے چہرے پر جلال ہوتا آپ ﷺ جوش میں آ جاتے اور بدن مبارک اِدھر اُدھر جھومنے لگتا ایسے موقعوں پر آپ ﷺ ہاتھ کی حرکت سے بھی اپنی بات کی وضاحت فرماتے، مثلاً قیامت کے ذکر میں شہادت کی اور بیچ کی انگلی کو ذرا فرق سے دکھاتے اور فرماتے:

''مجھے اور قیامت کو اس طرح بھیجا گیا ہے۔''

خطبے کے دوران میں کوئی کام پڑ جاتا تو اسے پُورا کرتے اور پھر واپس آ کر خطبہ شروع کر دیتے۔ ''زاد المعاد'' کی روایت ہے کہ ایک بار خطبہ کے دوران میں حضرتِ حسنؓ اور حسینؓ سُرخ قمیص پہنے تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے خطبہ بند کر دیا، منبر سے اُترے، دونوں کو گود میں اٹھایا پھر دوبارہ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور قرآنِ حکیم کی یہ آیت پڑھی:

﴿اِنَّمَا اَمۡوَالُکُمۡ وَ اَوۡلَادُکُمۡ فِتۡنَةٌ﴾

''بے شک تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے باعثِ آزمائش ہیں۔''

اس کے بعد فرمایا: مَیں نے ان دونوں کو قمیصوں میں لڑکھتے آتے دیکھا تو میں برداشت نہ کر سکا، خطبہ ختم کیا اور انھیں اٹھالیا...... ایک اور روایت میں ہے کہ ایک بار آپ خطبہ دے رہے تھے اسی اثنا میں سلیک عطفانی حاضر ہوا، وہ بیٹھ گیا آپ ﷺ نے فرمایا:

''سلیک! اُٹھ، دو رکعت نماز پڑھ اور مختصر طور پر ادا کر''...... بعد ازاں آپ ﷺ نے حسبِ سابق لوگوں سے خطاب فرمایا دورانِ خطبہ میں اگر کوئی ضرورت مند سوال کرتا تو خطبہ روک کر اس کی حاجت پُوری کرتے، اس کے بعد باقی خطبہ مکمل فرماتے، کبھی ایسا

بھی ہوتا کہ خطبے کے دوران میں کسی کو بلاتے، مثلاً: اے فلاں! بیٹھ جا، اے فلاں! نماز پڑھ، وغیرہ۔ خطبے سے متعلق سامعین میں سے اگر کوئی شخص سوال کرتا تو اس کا جواب دیتے۔ آپ ﷺ کے بعض خطبے تو ایسے ہیں جو شروع سے آخر تک سوالات و جوابات ہی پر مشتمل ہیں۔

مدینہ میں ابتدائی دور میں آپ ﷺ مسجد نبوی ﷺ میں کھجور کے ایک تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اب کھڑا رہنا مجھے تکلیف دیتا ہے اس پر حضرت تمیم داریؓ نے مشورہ دیا کہ ایک منبر بنوالیا جائے، جیسا کہ ملک شام میں ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے دوسرے صحابہؓ کی رائے معلوم کی تو سب نے اتفاق کیا حضرت عباسؓ نے کہا: میرا ایک غلام ہے جس کا نام کلاب ہے، وہ بڑھئی کے کام میں بہت ہوشیار ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا، اس سے کہو کہ منبر تیار کر کے لائے۔ چنانچہ وہ جنگل سے لکڑی کاٹ لایا، اس کے تختے تیار کیے اور پھر اُن سے منبر بنایا اس کے دو زینے تھے، اس کے بعد تیسری بیٹھنے کی جگہ تھی۔ یہ منبر مسجد نبوی ﷺ میں لایا گیا، اور اس جگہ رکھ دیا گیا جہاں آپ ﷺ خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے، اور وہ خشک تنا وہاں سے ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا گیا آپ ﷺ اس منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب آپ ﷺ نے خطبہ شروع کیا تو لوگوں نے گریہ کی آواز سُنی۔ معلوم ہوا وہ کھجور کا تنا رو رہا ہے، کیوں کہ اب اسے رسول ﷺ اللہ کا قُرب حاصل نہیں رہا تھا، اس کے گریے میں بچوں کی سی بے تابی تھی آپ ﷺ منبر سے اُترے اور اُسے چمٹالیا وہ خاموش ہوگیا بعدازاں آپ ﷺ نے اسے منبر تلے دفن کرادیا۔

آنحضور ﷺ کے خطبے عموماً مختصر ہوتے تھے آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ عقل مندی یہ ہے کہ خطبہ مختصر اور نماز طویل ہو۔ مختصر خطبات سے آپ ﷺ کی قادر الکلامی ظاہر ہوتی ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

"بُعِثْتُ بِجَوَامِعِ الْكَلِمِ."

"مجھے جامع کلمات کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔"

آپ ﷺ کے جامع کلمات بلاغت، معانی کی وسعت و ہمہ گیری اور حکمت و دانش کا مرقع ہیں اور اس اعتبار سے اقوال زرّیں کی حیثیت رکھتے ہیں...... لیکن کبھی کبھی آپ ﷺ طویل خطبہ بھی ارشاد فرماتے۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ حضرت عمرو بن اخطب انصاری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک دن صبح کی نماز پڑھاتے ہی منبر پر تشریف فرما ہوئے اور مغرب تک نماز کے وقفوں کے علاوہ مسلسل خطبہ دیا اور اس میں وہ باتیں بتائیں جو قیامت تک پیش آنے والی ہیں۔

مجموعی حیثیت سے آپ ﷺ کے طویل و مختصر خطبات فصاحت و بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک دفعہ فرمایا کہ مَیں نے عرب کے بہت سے لوگوں کی باتیں سُنی ہیں مگر حضور ﷺ سے زیادہ فصیح زبان والا مَیں نے نہیں دیکھا خود آپ ﷺ کا قول ہے:

"اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ."

"میں عرب کا فصیح ترین شخص ہوں۔"

یُوں تو آپ ﷺ کا ہر خطبہ ہی فصاحت و بلاغت کا عمدہ نمونہ ہے لیکن بعض خطبے خصوصی طور پر یادگار حیثیت رکھتے ہیں، مثلاً فتحِ مکہ کا خطبہ اسی طرح حجۃ الوداع کا خطبہ وغیرہ...... غزوۂ حنین کے موقع پر مالِ غنیمت کا بیش تر حصّہ نومسلم مہاجروں کو دے دیا گیا تاکہ ان کی تالیفِ قلب ہو۔ اس پر بعض انصاری نوجوانوں کو کسی قدر رنج ہوا آپ ﷺ نے اس موقع پر ان کے سامنے ایسا پُر تاثیر خطبہ دیا کہ انصاریوں کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ آپ ﷺ کے اکثر خطبات کی اثر انگیزی کا یہ عالم تھا کہ صحابہؓ کے دل بھر آتے، اُن پر رقت طاری ہوجاتی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوجاتے۔ حضرت اسماء بنتِ ابی بکرؓ کا بیان ہے کہ ایک بار آنحضور ﷺ نے اپنے خطبے میں قبر کی آزمائشوں کو تفصیل سے بیان کیا، لوگ اس خطبے کو سُن کر چیخ اُٹھے...... بعض اوقات جب فضا میں اشتعال ہوتا اور لوگ عداوت میں ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تلے نظر آتے تو آپ ﷺ مختصر خطاب فرماتے، جس سے پوری فضا بدل جاتی اور دلوں پر اشتعال کے بجائے اخوت و محبت کی کیفیت طاری ہوجاتی۔

آنحضور ﷺ کے یہ خطبات، فصاحت و بلاغت اور تاثیر انگیزی سے قطع نظر اپنی معنوی اہمیت کی بنا پر بھی تاریخِ انسانی میں بہترین فکری ورثے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ﷺ نے مختلف مواقع پر بے شمار خطبات ارشاد فرمائے، مگر یہ سب خطبے اوّل تا آخر، مکمل صورت میں کتابوں میں نہیں ملتے۔ احادیث کے مجموعوں میں بالعموم خطباتِ نبوی ﷺ کے متفرق اور مختلف ٹکڑے ملتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ ہر راوی نے اپنی اپنی پسند یا ضرورت کی بات بیان کی ہے۔

یہاں آنحضور ﷺ کے خطبات کا ایک انتخاب پیش کیا جارہا ہے خطباتِ نبوی ﷺ کا یہ انتخاب آپ ﷺ کے طویل و مختصر خطبوں پر مشتمل ہے اور اس کا تعلق متنوع موضوعات و مسائل سے ہے...... یہ خطبے مختلف کتابوں سے لیے گئے ہیں عربی خطبات کے جو اُردو ترجمے ملتے ہیں ان کی صحت کے بارے میں اطمینان نہ تھا چنانچہ پروفیسر عبدالرشید ارشد صاحب نے، آئندہ صفحات میں پیش کیے جانے والے جملہ خطبات کے اردو ترجمے پر نظرِ ثانی کی ہے، اور بعض خطبوں کا ازسرِ نو ترجمہ کیا ہے۔

(ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہاشمی)

مختلف موضوعات پر خطبات

(خطباتِ رسول ﷺ کے صرف اُردو تراجم دیئے جا رہے ہیں۔ مدیر)

صفاتِ باری تعالیٰ

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسولِ خدا ﷺ کھڑے ہُوئے اور آپ نے اللہ تعالیٰ کی پانچ صفات بیان کیں۔ فرمایا:

''اللہ تعالیٰ سوتا نہیں اور نہ یہ اس کے لیے مناسب ہے کہ وہ سوئے وہ میزان کو جھکا دیتا ہے اور اونچا کر دیتا ہے (جس کے لیے چاہے) رات کے اعمال دن کے اعمال سے پہلے اس کے پاس پہنچائے جاتے ہیں اور دن کے اعمال رات کے اعمال سے پہلے اس کے پاس پہنچائے جاتے ہیں۔ اس کا حجاب نور ہے (ابوبکرؓ کی روایت میں ہے کہ نار ہے) اگر وہ حجاب ہٹا دے تو اس کے چہرے کی تجلّیاں جہاں جہاں تک اس کی نگاہ پہنچتی ہے تمام مخلوق کو جلا دیں۔'' (مسلم شریف)

اسلام کیا ہے؟

حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

''اصل اور جڑ اسلام کی صرف دو چیزیں ہی ہیں، ایک کلام دوسرے طریقہ، سب سے عمدہ کلام اللہ کا کلام ہے اور سب سے بہتر طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے۔ خبردار (دین میں) گھڑی ہوئی باتوں (پر عمل کرنے) سے بچو کیوں کہ جو کام میرے دین میں نئے نکلیں وہ تمام بُرے کاموں سے زیادہ بُرے کام ہیں اور ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت نری گمراہی ہے۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ تمھارے دل سخت ہوتے جائیں۔ جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے اور وہ دُور ہے جو آنے والی نہیں ہے بُرا شخص وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے ہی بُرا بن کر پیدا ہو، بھلا آدمی وُہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔

یاد رکھو مومن سے لڑنا کفر ہے اور مومن کو گالی دینا فسق ہے۔ کسی مومن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ (بول چال) چھوڑے رکھے۔ خبردار! جُھوٹ سے بہر حال بچو کیوں کہ جُھوٹ بولنا ارادۃً درست ہے نہ مذاق میں۔ کوئی شخص اپنے بچّے سے بھی ایسا وعدہ نہ کرے جسے وہ پورا نہ کرے کیوں کہ جھوٹ گناہ کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ جہنّم کی طرف لے جاتے ہیں۔ سچ نیکی کی طرف لے جاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ سچے شخص کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے سچ بولا اور نیکی کی جب کہ جُھوٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے جھوٹ بولا اور گناہ کیا۔ خبردار! بندہ جُھوٹ بولتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ اللہ کے ہاں وہ کذّاب لکھ دیا جاتا ہے۔'' (ابنِ ماجہ)

کلامِ الٰہی:

حضرت محمد بن اسحاقؒ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے مدینہ پہنچنے پر مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

بے شک تعریف اللہ کے لیے ہے میں اس کی تعریف کرتا ہُوں اور اس سے مدد کا طالب ہُوں اور ہم سب اس کے دامن میں اپنی نفسانی شرارتوں اور عمل کی خرابیوں سے پناہ چاہتے ہیں جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے اللہ راہِ راست پر نہ لائے اس کی راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں۔ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ وہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ سب سے بہتر کلام اللہ کی کتاب ہے۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کے محاسن آراستہ کیے اور کفر کے بعد اسے اسلام میں داخل ہونے کی توفیق دی اور انسانی باتیں چھوڑ کر اس نے اللہ کا کلام پسند کیا وہ بلاشبہ کامیاب ہوا کیوں کہ اللہ کا کلام سب سے سچا اور زیادہ پُر اثر ہے۔ جو اُسے دوست رکھتا ہے اُسے تم بھی دوست رکھو اور اللہ کے ساتھ دلی محبت پیدا کرو اور اس کا کلام پڑھنے اور نام لینے سے ملول نہ ہو، نہ تمھارے دل اس کی طرف سے سخت ہوں پس اللہ ہی کی عبادت کرو کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اس سے پورا پورا ڈرتے رہو اور اپنے نیک اعمال کی تصدیق زبان سے کیا کرو (زبان کو قابو میں رکھو) اور رحمتِ خداوندی کے واسطہ سے آپس میں پیار و محبت سے رہو۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ (اعجاز القرآن)

نماز

حضرت اشعریؓ کہتے ہیں کہ ایک بار رسولِ خدا ﷺ نے ہمیں خطاب فرمایا، جس میں سُنّتوں کی تعلیم دی اور نماز (کے طریقے) کی وضاحت فرمائی، آپ ﷺ نے اس خطبے میں ارشاد فرمایا:

جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو صفیں درست کر لو پھر تم میں سے کوئی تمھیں نماز پڑھائے۔ وہ جب اللہ اکبر کہے تم بھی کہو جب وُہ ولا الضالین کہے تم آمین کہو۔ اللہ تمھاری دعا قبول فرمائے گا پھر جب امام تکبیر کہے اور رکوع میں جائے تم بھی تکبیر کہو اور رکوع میں جاؤ امام تم سے پہلے رکوع میں جائے گا اور تم سے پہلے ہی رکوع سے سر اُٹھائے گا، یہ برابر ہو جائے گا' جب وُہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تم اللّٰھمّ ربّنالك الحمد کہو اللہ عزوجل کا بزبانِ رسول اللہ ﷺ وعدہ ہے کہ جو

حمدِ خدا کرے گا اللہ اس کی سُنے گا پھر جب وہ تکبیر کہے اور سجدہ کرے تو تم بھی تکبیر کہو اور سجدہ کرو۔ امام تم سے پہلے سجدہ کرے گا اور تم سے پہلے سجدہ سے اُٹھے گا' یہ ادلا بدلا ہو جائے گا۔ جب وہ قعدہ میں بیٹھے تو تم التحیات آخر تک پڑھو۔ (النسائی)

اللہ کا ذکر اور نمازِ جمعہ:

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا:

لوگو! اللہ کی طرف رجوع کرلو قبل اس کہ تمھیں موت آجائے اور نیک اعمال کی طرف بڑھو قبل اس کے کہ تمھیں فرصت نہ ملے۔ تمھارے اور تمھارے رب کے درمیان جو تعلق ہے اسے بکثرت ذکرِ خدا سے اور خفیہ اور علانیہ بکثرت صدقہ دینے سے جوڑو اس سے تمھیں (زیادہ) رزق دیا جائے گا۔ دشمن کے خلاف تمھاری مدد کی جائے گی اور تمھارے نقصانات کی تلافی کر دی جائے گی۔ جان رکھو اللہ نے میری اس جگہ میں' آج کے دن' اس سال کے اس مہینے میں قیامت تک کے لیے تم پر جمعہ فرض کر دیا ہے جس نے میری زندگی یا میرے بعد اسے حقیر سمجھ کر اور اس کا انکار کرتے ہُوئے چھوڑا' اللہ اس کا شیرازہ جمع نہ کرے گا اور نہ اس کے کاموں میں برکت ڈالے گا۔ آگاہ رہو کہ نہ اس کی نماز قبول ہوگی۔ آگاہ رہو کہ نہ اس کی زکوٰۃ قبول ہے' آگاہ رہو کہ نہ اس کا حج قبول ہے' آگاہ رہو کہ نہ اس کا روزہ قبول ہے' آگاہ رہو کہ نہ اس کی کوئی نیکی قبول ہے جب تک وہ توبہ نہ کرے پس جو توبہ کرے اللہ اس کی توبہ قبول فرمالیتا ہے۔ (ابنِ ماجہ)

تاکیدِ جمعہ

غزوۂ اُحد کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے سب کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

لوگو! ابھی ابھی مجھے وحی کی گئی ہے کہ جو شخص کسی حرام کام میں مبتلا ہو پھر ثواب حاصل کرنے کی نیت سے اسے چھوڑ دے اس کے گناہ خداوند کریم معاف فرما دیتا ہے اور جو شخص کسی مومن یا کافر سے نیکی کرے وہ اپنا بدلہ ضرور پاتا ہے جلدی حاصل ہونے والی دُنیا میں یا دیر سے آنیوالی آخرت میں۔ اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھنے والوں پر جمعہ کے دن جمعہ کی نماز فرض ہے' ہاں بچّوں پر' عورتوں پر' بیماروں پر اور غلاموں پر فرض نہیں (وہ ظہر پڑھ لیں) یاد رکھو جو جمعہ کی نماز سے بے پروائی کرے اللہ تعالیٰ بھی اس سے منہ موڑ لے گا اور اللہ تعالیٰ (سارے جہان سے) بے نیاز بے پروا اور غنی ہے اور وہی تعریفوں والا اور مستحق تعریف ہے۔ (مجمع الزوائد)

برکاتِ جمعہ

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک روز ہم سب صحابہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

جبریلؑ آئے ان کے ہاتھ میں ایک سفید آئینہ سا تھا جس کے درمیان میں ایک سیاہ نقطہ سا تھا میں نے پوچھا: اے جبریلؑ! یہ کیا ہے؟ فرمایا: یہ جمعہ کا دن ہے جو تم پر تمھارے رب نے پیش فرمایا ہے تاکہ یہ آپ ﷺ کے لیے اور آپ ﷺ کی امت کے لیے عید کا دن ہو۔ میں نے پوچھا: اے جبریل! اس کے بیچ میں یہ سیاہ نکتہ سا کیا ہے؟ فرمایا: یہ قیامت ہے جو جمعہ کے دن قائم ہوگی۔ یہ جمعہ دنیا کے تمام دنوں کا سردار ہے جنت میں اس کا نام انعام کا دن رکھ چھوڑا ہے۔ میں نے پوچھا: اے جبریل! تم اسے انعام کا دن کیوں کہتے ہو؟ فرمایا: اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت میں ایک وادی کو منتخب اور پسند کیا ہے جو سفید کستوری سے زیادہ خوش بودار ہے، جمعہ کے دن اللہ تعالیٰ اس وادی کی طرف ایک کرسی پر نزول فرماتا ہے اور عرش سونے کے جواہر لگے منبروں سے گھرا ہوتا ہے اور یہ منبر نور کی کرسیوں سے گھرے ہوتے ہیں پھر اللہ تعالیٰ جنتی بالا خانے والوں کو اجازت دیتا ہے وہ مشک کے ٹیلوں میں سے گھٹنوں تک دھنستے ہُوئے تشریف لاتے ہیں، سونے چاندی کے کنگن پہنے ہوئے ریشمی اعلیٰ لباس زیب تن کیے ہوئے حتّٰی کہ اس وادی میں پہنچ جاتے ہیں یہاں پہنچ کر جب آرام بیٹھ جاتے ہیں تو مشیرہ نامی بادِ صبا چلتی ہے ان کے کپڑوں اور جسم سے سفید مشک کے فوارے پُھوٹ نکلتے ہیں ان کے چہرے صاف ہوتے ہیں ان کی آنکھیں سُرمگیں ہوتی ہیں۔ یہ تینتیس 33 سالہ نوجوان ہوتے ہیں ان کی صُورتیں حضرت آدمؑ کی اس صورت پر ہوتی ہیں جو صورت ان کی اس دن تھی جب اللہ تعالیٰ نے انھیں پیدا کیا تھا۔ اب جناب باری تبارک وتعالیٰ رضوان کو جو داروغۂ جنت ہے بلاتا ہے اسے حکم دیتا ہے کہ میرے اور میرے بندوں اور میری زیارت کرنے والوں کے درمیان سے حجاب اٹھا دو۔ حجاب کے دُور ہوتے ہی خداوندی نور اور تازگی انھیں نظر آتی ہے چاہتے ہیں کہ سجدے میں گر پڑیں۔ اسی وقت جناب باری تعالیٰ فرماتا ہے بس سجدہ سے سر اُٹھاؤ عبادت کی جگہ دنیا تھی اب یہ آخرت تو بدلے کا گھر ہے تمھیں جو کچھ مانگنا ہو مجھ سے مانگو میں تمھارا رب ہوں میں نے اپنے وعدے تم سے سچ کر دیئے۔ تم پر اپنی بھرپور نعمتیں عطا فرمائیں یہ تمھاری عزت افزائی کا مقام ہے اب جو تم چاہو مجھ سے مانگو۔ جنتی حضرات جواب دیتے ہیں کہ پروردگار! کون سی بھلائی ہے جو تُو نے ہمارے ساتھ نہیں کی! تُو نے ہم پر سکراتِ موت آسان کر دی' تُو نے ہماری قبر کی تنہائی اور اندھیروں میں ہماری وحشت دُور کر دی۔ صور پھونکنے کے وقت تُو نے ہمیں گھبراہٹ اور پریشانی سے نجات دی ہماری لغزشوں سے درگزر فرمایا، ہمارے عیوب کی پردہ پوشی کی، پُل صراط پر ہمیں ثابت قدم رکھا' اپنا قرب نصیب فرمایا' اپنے پاک کلام سے ہمیں لذّت آشنا کیا' اپنا نور ہم پر ظاہر فرمایا۔ کون سی بھلائی تو نے ہمارے ساتھ نہیں کی! جناب باری عزّ وجلّ یہی فرمائے گا کہ میں نے وعدے تم سے سچے کیے۔ تم پر اپنی نعمتیں بھرپور کیں۔ اب تم مجھ سے مانگو کیا مانگتے ہو؟ وہ کہیں گے: الٰہی! ہم تیری رضامندی کے طالب ہیں، اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ تو تمھیں مل چکی' تمھاری لغزشیں معاف کیں تمھاری برائیوں کی پردہ پوشی کی تمھیں اپنا قرب نصیب فرمایا۔ تمھیں اپنی باتیں سُننے کا شرف بخشا تم پر اپنے نور کا پرتو ڈالا۔ یہ ہے تمھاری عزّت افزائی کی جگہ جو میں نے تمھیں عنایت فرمائی ہے پس تم مجھ سے مانگو۔ اب یہ جنّتی اللہ تعالیٰ سے مانگیں گے اور اللہ تعالیٰ اُنہیں دے گا یہاں تک کہ اُن کی تمنائیں سب پُوری ہو جائیں گی پھر بھی اللہ

عزّ وجل ان سے فرمائے گا اور مانگو یہ پھر مانگیں گے حتی کہ ان کی رغبت ختم ہو جائے گی پھر بھی ان سے کہا جائے گا اور مانگو یہ کہیں گے بس ہم راضی ہیں لیکن جناب باری تعالیٰ اپنے فضل خاص سے انھیں اور بھی مرحمت فرمائے گا اور جنّت کی تروتازگی اس قدر بڑھا دے گا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سُنی نہ کسی انسانی دل پر ان نعمتوں کا وہم گزرا۔ الغرض جمعہ کے دن ان کے الگ ہونے تک مزید لطف و کرم اور یہ مجلس اسی طرح ہوتی رہے گی۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ مَیں نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے ماں باپ آپ ﷺ پر قربان، ان کے الگ ہونے کی مقدار کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے برابر۔ رب العالمین کا عرش بلند درجے کے فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے جن کے ساتھ بڑے بڑے فرشتے اور انبیا علیہم السلام ہوں گے پھر ان بالاخانوں والوں کو اجازت دے دی جائے گی اور وہ اپنے زمردیں اور سبز بالاخانوں کی طرف لَوٹ جائیں گے۔ انھیں جمعہ کے دن سے زیادہ کسی چیز کا شوق نہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کی زیارت کریں تاکہ وُہ ان پر مزید اپنا فضل فرمائے اور ان کی عزت افزائی فرمائے۔ (دارقطنی)

رمضان المبارک

حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے ماہ شعبان کے آخری روز خطبہ دیا آپ ﷺ نے فرمایا:

لوگو! تمھارے پاس عظمت اور برکت والا مہینا آ رہا ہے اس میں ایک ایسی رات ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تم پر اس مہینا کے روزے فرض کر دیئے ہیں اور رات کا قیام نفل قرار دیا ہے اس میں نفلی عبادت کا ثواب اور دنوں کی فرض عبادت کے برابر ہے اور اس میں فرض ادا کرنے والے کو اور دنوں کے ستر فرضوں کے برابر ثواب ملتا ہے۔ یہ مہینا صبر کا ہے اور صبر کا ثواب جنّت ہے یہ مہینا باہمی غم خواری اور ہمدردی کا ہے، اس میں مومن کا رزق بڑھتا ہے جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا اُس کے گناہ بخشے جائیں گے اور آتشِ دوزخ سے نجات پائے گا اور اسی روزہ کے برابر ثواب پائے گا، بغیر اس کے کہ اس (غریب) کے ثواب سے کچھ گھٹا دیا جائے۔

ہم نے کہا: یارسول ﷺ اللہ! ہم میں سے ہر ایک کو اتنا میسّر نہیں ہوتا کہ اپنے پاس سے کسی کو افطار کرا سکیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ یہ ثواب ہر شخص کو دے گا جو کسی روزہ دار کو فقط لسّی، کھجور یا پانی کا ایک گھونٹ پلا دے اور جس نے روزہ دار کو کھلا کر سیر کیا اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض میں سے ایسا پانی پلائے گا کہ دخولِ جنت تک پیاسا نہیں ہوگا۔ اس مہینے کا اوّل حصہ رحمت، درمیانی حصہ مغفرت اور آخری حصہ جہنم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ہے جو اس مہینا میں اپنے غلام کا کام ہلکا کر دے اللہ تعالیٰ اسے بخش دے گا اور آگ سے نجات دلا دے گا۔ (مشکوۃ)

انفاق فی سبیل اللہ

حضرت عدی بن حاتم بیان کرتے ہیں کہ ایک بار مَیں رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں بیٹھا تھا اتنے میں کچھ لوگ آئے، جنھوں نے بالوں کے کمبل اوڑھے ہوئے تھے، وہ امداد کے مستحق معلوم ہوتے تھے اُن کی غربت کے پیشِ نظر آپ ﷺ نماز کے خطبے کے لیے کھڑے ہوئے اور ذیل کا خطبہ ارشاد فرمایا:

۔لوگو! بچے ہوئے مال سے غریبوں کی امداد کرو۔ زیادہ نہ ہو تو ایک صاع غلّہ ہی سہی، یا آدھا صاع، ورنہ ایک مٹھی یا آدھی مٹھی تم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو آتشِ دوزخ سے بچائے، خواہ ایک کھجور یا آدھی کھجور ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو اگر اتنا بھی نہ مل سکے تو اچھی بات کے ساتھ سہی کیوں کہ تمھیں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے وہ تم سے یہی کہے گا جو میں تم سے کہتا ہوں کہ کیا میں نے تمھیں مال اور اولاد نہیں دیئے تھے؟ بندہ عرض کرے گا ہاں۔ خداوند تعالیٰ فرمائے گا: کہاں ہے وہ جو تُو نے اپنے لیے آگے بھیجا ہے اس وقت بندہ آگے پیچھے، دائیں اور بائیں دیکھے گا مگر دوزخ کی گرمی سے بچنے کے لیے کوئی چیز نہ پائے گا پس کم از کم نصف خُرما دے کر دوزخ سے بچنے کا سامان کرو اگر وہ بھی نہ ہو تو ملائم جواب دے دیا کرو کیوں کہ مجھے یہ خوف بالکل نہیں کہ تم فاقہ کشی کا سامنا کرو گے کیوں کہ خدا تمھارا ناصر ہے اور وہی دینے والا ہے حتّی کہ تنہا ایک عورت مدینہ اور حیرہ کے درمیان سفر کرے گی اور اسے اپنی سواری پر چور چکار کا کوئی خطرہ نہ ہوگا۔

حضرت عدیؓ فرماتے ہیں کہ جس وقت مَیں نے یہ ارشادِ مبارک سُنا تو مجھے خیال ہوا کہ اُن دِنوں بنوطے کے چور کہاں گئے ہوں گے؟

(یعنی جو کچھ ہو مگر وہ چوری اور ڈاکازنی سے باز نہیں آئیں گے) مگر مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایک عورت قادسیہ سے سفر کر کے حرم تک آتی ہے اور اسے کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ (زادالمعاد۔ بخاری)

اسلام اور رُہبانیت

ایک بار آنحضور ﷺ نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا حکم دیا، پھر اُن کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ عورتوں کو، کھانے کو، خوشبو کو اور دنیا کی لذیذ چیزوں کو اپنے اوپر حرام کرنے لگے ہیں۔ مَیں تمھیں صوفی اور درویش اور راہب و تارکِ دنیا بننے کا حکم دینے نہیں آیا کیوں کہ گوشت کو اور عورتوں کو چھوڑ دینا اور خانقاہوں میں بیٹھ جانا میرے دین میں نہیں ہے۔ میری اُمّت کی سیاحت روزہ ہے، ان کی رُہبانیت جہاد ہے۔ اللہ کی عبادت کرتے رہو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، حج اور عمرہ ادا کرتے رہو، نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی ادائیگی اور پابندی کرو اور استقامت دکھاؤ تاکہ تمھارے معاملات بھی درُست کر دیئے جائیں۔ تم سے اگلے لوگ انھی سختیوں کی وجہ سے تباہ ہو گئے جُوں جُوں وہ اپنے اوپر سختی کرتے گئے اللہ تعالیٰ بھی ان پر سختی کرتا گیا۔ ان کے بچے کھچے اب گرجوں اور عبادت گاہوں میں باقی رہ گئے ہیں۔ (معالم التنزیل)

اس خطبے کے بعد یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾

(المائدہ5: 87)

(اے ایمان والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تم پر حلال کی ہیں انھیں حرام نہ کرو......)

خطبہ بدر

ہجرت کے بعد کفار سے مسلمانوں کا پہلا معرکہ میدانِ بدر میں برپا ہوا رسولِ خدا ﷺ تین سو تیرہ صحابہؓ کو لے کر میدانِ بدر میں اُترے۔ مسلمانوں کی صفوں کو مرتب کر کے اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثنا کی، پھر یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

لوگو! مَیں تمھیں اسی چیز کی طرف رغبت دلاتا ہوں جس کی رغبت خود اللہ عزوجل نے دلائی ہے اسی طرح میں تمھیں انھی چیزوں سے روکتا ہوں جن سے اللہ عزوجل نے تمھیں روکا ہے۔ وہ جلال و بلندی والا عظیم الشان خدا حق باتوں ہی کا حکم فرماتا ہے وہ سچائی کو پسند کرتا ہے، بھلائیاں کرنے والوں کو وہ اپنے پاس بڑے مرتبے عطا فرماتا ہے اسی لیے ان کا ذکر مذکور ہوتا ہے اور اسی طرح انھیں فضیلتیں ملتی ہیں۔ سُنو حق کی منزلوں میں سے ایک منزل پر آج تمھارے قدم آ پہنچے ہیں یہاں صرف وہی کام مقبول ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے ارادے سے کیا جائے گا۔ جنگ کے موقع پر صبر ہی وہ چیز ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ رنج و غم کو دُور کر دیتا ہے اور ان سے نجات دیتا ہے، ساتھ ہی آخرت کی نجات بھی میسر ہو جائے گی۔ تم میں خدا کا پیغمبر موجود ہے جو تمھیں ڈراتا بھی ہے اور حکم بھی دیتا ہے (امر و نہی کر رہا ہے) دیکھو آج ایسی غلطی نہ کر بیٹھنا جس سے اللہ تعالیٰ تم سے ناخوش ہو جائے۔ فرمانِ خدا ہے کہ اللہ کی ناراضی کا وبال اس سے بہت زیادہ ہے جو تمھاری آپس کی ناراضی کا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام جو اپنی کتاب میں تمھیں دے چکا ہے اور جو نشانیاں وہ تمھیں دکھلا چکا ہے، ذلت کے بعد اس نے تمھیں جو عزت عطا فرمائی ہے اسے پیشِ نظر رکھو پس تم احکامِ خدا پر صبر وعزم کے ساتھ جم جاؤ رب العالمین تم سے راضی ہو جائے گا اللہ تعالیٰ سے اس جہاد کے موقع پر ایسی دُعائیں کرو کہ جنت ومغفرت کا وعدہ جو اس نے تمھارے ساتھ کر رکھا ہے پورا ہو جائے۔ بے شک وعدۂ خداوندی اٹل ہے، بیشک کلامِ خدا راست ہے، بے شک اس کے عذاب بڑے ڈراؤنے اور نہایت سخت ہیں۔ خود میں بھی اور تم سب بھی اُسی حی وقیوم زندہ وقائم خدا پر بھروسا رکھتے ہیں جس کی طرف ہم پناہ کے لیے جھکتے ہیں اور جس کا ہم سہارا لیتے ہیں اسی پر ہم توکل کرتے ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے، اللہ ہماری اور جملہ مسلمانوں کی مغفرت فرمائے۔

''الجماعت''

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار حضور اکرم ﷺ نے حسبِ ذیل خطبہ دیا:

لوگو! سُنو، تم سے پہلے کے اہلِ کتاب بہتر فرقوں میں تقسیم ہو گئے اور میری یہ اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں سے بہتر جہنمی ہیں اور ایک جنتی۔ یہی جنتی گروہ ''الجماعت'' ہے۔ سُنو اور باور کر لو کہ میری امت میں ایسی قومیں بھی نکلنے والی ہیں جن کے رگ وپے میں خواہشیں اس طرح سرایت کر جائیں گی جیسے باؤلے کتے کے کاٹے کا زہر اُس شخص کے رگ وپے میں رچ جاتا ہے جسے وہ کاٹ لے، کہ اس کا زہر ہر ہڈی اور ہر جوڑ میں داخل ہو جاتا ہے۔ (مسند احمد۔ ابو داؤد)

ضابطۂ حیات

حضرت عمر فاروقؓ شام کا سفر کر رہے تھے اس سفر میں ایک روز صحابہؓ کے سامنے تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور کہا: ایک بار رسولِ اللہ ﷺ نے حسبِ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

میرے صحابہؓ کے ساتھ بھلائی (سے پیش آنے) کی (میری) نصیحت قبول کرو پھر ان کے بارے میں جو ان کے بعد ہوں پھر ان کے بارے میں جو ان کے بعد ہوں پھر جھوٹ پھیل جائے گا یہاں تک کہ لوگ خود بخود بن بلائے (جھوٹی) شہادتیں دینے لگیں گے پس تم میں سے جو بھی جنت کے بہترین مقام کا مالک بننا چاہے اُسے لازم ہے کہ جماعت سے چمٹا رہے شیطان تنہا کے ساتھ ہے اور وہ دو سے بہت دُور ہے۔ خبردار کوئی شخص کسی اجنبی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ بیٹھے اس لیے کہ ان دونوں کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ جسے اس کی نیکی اچھی لگے اور بُرائی بُری لگے وہ مومن ہے۔ (مسند احمد)

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

حضرت علقمہ بن سعیدؓ سے روایت ہے کہ ایک روز رسول خدا ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا: اس میں بعض مسلمان قبیلوں کی تعریف کی۔ پھر فرمایا:

لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ تو اپنے پڑوسیوں کو (دین) سمجھاتے ہیں نہ انہیں علم سکھاتے ہیں نہ انہیں نصیحت کرتے ہیں نہ انہیں بھلائیوں کا حکم کرتے ہیں نہ انہیں برائیوں سے روکتے ہیں۔ اور کیا حال ہے اُن لوگوں کا جو اپنے پڑوسیوں سے نہ (دین) سیکھتے ہیں، نہ پند ونصیحت سنتے ہیں۔ واللہ! لوگ یا تو اپنے آس پاس والوں کو سکھائیں، سمجھائیں، نصیحت کریں، نیکی کا حکم دیں اور بُرائی سے روکیں اور لوگ آس پاس والوں سے سیکھیں وعظ ونصیحت حاصل کریں ورنہ کہیں دنیا ہی میں انہیں سخت سزا دوں گا (طبرانی کبیر)

سُنّت اور بدعت

حضرت عرباض بن ساریہؓ کہتے ہیں کہ (ایک روز) رسول ﷺ خدا نے ایسا (پُر تاثیر اور درد بھرا) خطبہ ارشاد فرمایا کہ ہمارے دل تھرا گئے اور ہم زار زار رونے لگے ہم نے کہا: یا رسول ﷺ اللہ! یہ تو آپ کا الوداعی خطبہ معلوم ہوتا ہے آپ ہمیں کچھ آخری نصیحت فرماتے جایئے۔ آپ نے فرمایا:

مَیں نے تمھیں ایسے پاک صاف میدان میں چھوڑا ہے جہاں کی رات بھی دن کے برابر روشن ہے۔ میرے بعد تو وہی اِدھر سے اُدھر ہوگا جس کی قسمت پھوٹ گئی ہو میرے بعد تم میں سے جو زندہ رہے گا وہ بڑے بڑے اختلاف دیکھے گا پس تم اختلاف کے وقت میری جانی پہچانی سُنّتوں اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقوں سے وابستہ رہنا اور انھیں مضبوطی سے تھام لینا۔ تم فرماں برداری کرتے ہی رہنا خواہ وہ کوئی حبشی غلام ہی ہو کیوں کہ مومن کی مثال تو نکیل والے اونٹ کی سی ہے کہ جدھر نکیل مُڑی اُدھر گھوم گیا۔ اللہ تعالیٰ کا لحاظ اور ڈر خوف رکھو، سُنو اور اطاعت کرو خواہ وہ حبشی غلام ہی

کیوں نہ ہو۔ میرے بعد تم بہت سخت اختلاف دیکھو گے پس میری اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت پر عمل پیرا رہنا اور انھیں مضبوطی سے تھامے رکھنا (دین میں) گھڑی ہوئی باتوں (پر عمل کرنے) سے بچو کیوں کہ ہر گھڑی ہوئی بات (بدعت) گمراہی ہے۔(ابنِ ماجہ)

تصوّرِ دیانت

حضرت ابوحمید ساعدیؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے قبیلہ بنو اسد کے ایک شخص کو، جن کا نام ابن اللّتبیہ تھا، قبیلہ بنوسلیم کے صدقات وصول کرنے کے لیے عامل بنا کر بھیجا۔ وُہ واپس آئے تو انھوں نے کچھ مال تو آنحضور ﷺ کے حوالے کر دیا اور کچھ مال یہ کہ کر رکھ لیا کہ یہ مجھے بطور ہدیہ اور تحفہ کے ملا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: خُوب! اگر تم اپنے گھر میں بیٹھے رہتے تو پھر دیکھتے کہ کون آ کر تمھیں یہ تحفے تحائف دیتا ہے۔ ابوحمید ساعدیؓ کا بیان ہے کہ اس کے بعد رسولِ خدا ﷺ اٹھ کھڑے ہُوئے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی، پھر فرمایا:

جب میں تم میں سے کسی شخص کو تحصیل دار بنا کر بھیجتا ہُوں تو وہ واپس آ کر کہتا ہے کہ یہ آپ کا مال ہے اور یہ تحفے ہیں جو مجھے دیئے گئے اگر وُہ سچ کہتا ہے تو کیوں اپنے ماں باپ کے گھر نہیں بیٹھتا جہاں لوگ اسے تحفے بھیجتے رہیں خدا کی قسم جو شخص ناجائز طور پر کوئی چیز لے گا قیامت کے دن اسے اٹھاتے ہوئے دربارِ خداوندی میں حاضر ہو گا۔ میں تم میں سے ان شخصوں کو پہچانوں گا جو ایک بڑبڑاتے ہوئے اونٹ یا آواز دینے والی گائے یا ممیاتی ہوئی بکری اٹھائے خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔

پھر آپ نے دونوں ہاتھ بلند کر کے فرمایا:

"اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ." (مسلم شریف)

"یا الٰہی! کیا مَیں نے حقِ تبلیغ ادا کر دیا!"

خیانت اور طمع

حضرت حرماس بن زیاد سے روایت ہے کہ ایک بار رسولِ خدا ﷺ نے اپنی ناقہ پر بیٹھے بیٹھے خطبہ دیا، جس میں فرمایا:

خیانت سے بچو کہ وہ بدترین ساتھی ہے ظلم سے بچو کہ وُہ قیامت کے دن اندھیروں کا باعث ہو گا طمع اور لالچ سے بچو کہ اسی چیز نے تم سے پہلوں کو غارت کر دیا حتیٰ کہ وُہ ایک دُوسرے کا خون بہانے لگے اور انھوں نے اپنے رشتے ناتے توڑ ڈالے۔ (طبرانی، اوسط وکبیر)

خیانت سے اجتناب

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کے دور میں دو تین بار ایسے واقعات پیش آئے کہ کسی شخص نے دشمن کی فوج سے کوئی چیز چھین لی، مگر بیت المال میں جمع نہ کرائی اس پر ایک روز آپ نے حسبِ ذیل خطبہ دیا:

میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کی گردن پر (خیانت کا) بڑبڑاتا ہوا اُونٹ سوار ہو اور کہے یارسول اللہ میری مدد فرمائیں اور مجھے کہنا پڑے کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا مَیں نے تو (صحیح بات) تم تک پہنچا دی تھی۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کی گردن پر ہنہناتا ہوا گھوڑا سوار ہو اور وہ کہے یارسول اللہ ﷺ میری مدد کریں اور مجھے یہ کہنا پڑے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا مَیں نے تو (صحیح بات) تجھ تک پہنچا دی تھی میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کی گردن پر چیخنے والی بکری سوار ہو اور کہے یارسول ﷺ اللہ میری مدد کریں، اور میں کہوں کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا، مَیں نے تو (صحیح بات) تجھ تک پہنچا دی تھی۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی کی گردن پر واویلا کرتا ہوا کوئی غلام یا مقتول سوار ہو اور وہ (اٹھانے والا) کہے یارسول اللہ میری مدد کریں اور مجھے کہنا پڑے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا مَیں نے تو (صحیح بات) تجھ تک پہنچا دی تھی۔ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ قیامت کے دن کسی کی گردن پر چیتھڑے اُڑ رہے ہوں اور وہ کہے یارسول اللہ میری مدد کریں اور مجھے کہنا پڑے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا مَیں نے تمھیں سمجھا دیا تھا کہ قیامت کے دن تم میں سے کسی شخص کے ذمّے خیانت کا مال ہو اور کہے یارسول اللہ میری مدد کریں اور مجھے کہنا پڑے کہ میں کچھ نہیں کر سکتا مَیں نے تو (صحیح بات) تم تک پہنچا دی تھی۔ (مُسلم)

دُنیا کا فتنہ

حیاتِ طیّبہ کے آخری دَور میں حجۃ الوداع سے واپسی پر ایک روز آپ شہدائے اُحد کے مقابر پر تشریف لے گئے رقّت آمیز انداز میں ان کے لیے دُعا فرمائی پھر مسجد میں آ کر منبر پر تشریف فرما ہُوئے اور حسبِ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

مَیں تمھارے لیے سامانِ آخرت تیار کرنے کے لیے تم سے آگے جانے والا ہُوں۔ مَیں تم پہ گواہ ہُوں قسم خدا کی میں اس وقت بھی اپنے حوضِ کوثر کو دیکھ رہا ہُوں۔ مجھے رُوئے زمین کے خزانوں کی کنجیاں عطا فرمائی گئی ہیں یا فرمایا زمین کی چابیاں (عطا فرمائی گئی ہیں) واللہ مجھے تمھارے بارے میں یہ خدشہ نہیں کہ تم شرک کرنے لگو گے ہاں البتہ یہ کھٹکا ہے کہ تم دُنیا میں رغبت کرنے اور ایک دُوسرے سے آگے بڑھنے لگو گے۔ (بُخاری شریف)

دنیا اور نیکی

حضرت عمرو سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ایک روز اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا:

سُن لو! دنیا اسی موجودہ ساز وسامان کا نام ہے، جسے نیک وبد سب کھا رہے ہیں اور آخرت ایک حقیقی وقتِ مقرر ہے جس میں قدرتوں والا بادشاہ (اللہ ربّ العالمین) خود فیصلہ کرے گا (ایک روایت میں ہے کہ آخرت ایک سچّا وعدہ ہے جس میں عادل اور قدرت والا بادشاہ فیصلے فرمائے گا) جن میں حق کو حق ثابت کر دے گا اور باطل کو باطل۔ آخرت والے بنو، دنیا والے نہ بنو، ہر اولاد اپنی ماں کے پیچھے چلتی ہے تمام کی تمام بھلائی اپنے پیروکاروں کے ساتھ جنت میں داخل ہو گی اور تمام کی تمام بُرائی اپنے

پیروکاروں کے ساتھ جہنّم میں داخل ہوگی پس تم عمل کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور اس بات کا یقین رکھو کہ تمھیں (ایک دن) تمھارے اعمال کے سامنے پیش کیا جائے گا چنانچہ جس نے ایک ذرّے کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا' اور جس نے ایک ذرّے کے برابر بدی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔ (الشافعی)

اللہ سے عافیت طلب کرو

ایک بار حضرت ابوبکر صدّیقؓ خطبے کے لیے منبر پر کھڑے ہُوئے اور رونے لگے پھر فرمایا: پہلے ہی سال رسول ﷺ ہمیں خطبہ سنانے کے لیے منبر پر کھڑے ہوئے اور رو پڑے اس کے بعد ارشاد فرمایا:

اللہ تعالیٰ سے معافی اور عافیت طلب کرو کیوں کہ ایمان کے بعد کسی کو کوئی نعمت عافیت سے بہتر عطا نہیں کی گئی۔ (ترمذی)

قرابت داروں کے لیے صدقہ

عبداللہ بن طارق کا بیان ہے کہ ایک بار میں کھجوریں خریدنے مدینہ گیا۔ ہم لوگ شہر سے باہر ٹھہرے ہوئے تھے اتنے میں ایک شخص آخر ہمارا حال احوال پُوچھنے لگا' اس نے دو پرانی چادریں پہنی ہوئی تھیں' پھر اس نے ہمارے سُرخ اُونٹ کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا: کیا تم اسے بیچو گے؟ ہم نے جواب دیا: ہاں اتنی کھجوروں کے عوض۔ (اس نے سودا منظور کر لیا اور) وہ اونٹ لے کر چلا گیا ہم نے آپس میں کہا: یہ ہم نے کیا کیا! بغیر جانے ہم نے اونٹ کیسے دے دیا ہے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک شخص بہت سی کھجوریں لیے ہُوئے آیا اور کہا: یہ رسول ﷺ نے کھجوریں دی ہیں ان میں یہ تو اُونٹ کی قیمت ہیں اور یہ تمھاری مہمانی کی ہیں۔ عبداللہ بن طارق کہتے ہیں کہ ہم نے کھجوریں وصول کر لیں پھر مسجد نبوی میں پہنچے۔ ہم نے دیکھا ہمارے اونٹ کا وہی مقدس خریدار ذیل کا خطبہ دے رہا ہے۔ ہم نے اسے سُنا اور ہمارے دل پر اس عُمدہ سلوک اور ایسی بہترین تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ ہم بلا تامّل حلقۂ اسلام میں داخل ہو گئے، خطبہ کے الفاظ یہ ہیں:

لوگو! خیرات دیا کرو' خیرات دینا تمھارے حق میں بہتر ہے، دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ ماں کو' باپ کو' بہن کو' بھائی کو' پھر قریبی رشتہ داروں کو دیا کرو جو جس قدر زیادہ قریب ہے اس کا حق اسی قدر زیادہ ہے۔ (زادالمعاد)

ایک مبارک خواب

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ ایک روز نمازِ فجر کے لیے آنحضور ﷺ دیر سے تشریف لائے معلوم ہوتا تھا گویا سورج نکلنے ہی والا ہے بہرحال آپ نے نماز پڑھائی اور سلام پھیرتے ہی ہماری طرف رُخ کیا' پھر بلند آواز سے ہدایت کی کہ سب لوگ اپنی جگہ بیٹھے رہیں، بعدازاں حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

میں تمھیں بتلاتا ہُوں کہ آج صبح مجھے دیر کیوں لگی میں رات کو اُٹھا' وضو کر کے جتنی نماز مقدر میں تھی ادا کی' نماز ہی میں مجھ پر اونگھ جیسی کیفیت طاری ہوگئی بدن بوجھل ہو گیا ناگہاں مَیں دیکھتا ہُوں کہ اللہ عزّ وجلّ بہترین صورت میں میرے سامنے ہے اور فرما رہا ہے اے محمد! مَیں نے کہا اے میرے رب مَیں حاضر ہُوں فرمایا بتلاؤ بلند درجے کے فرشتے اس وقت کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ مَیں نے عرض کیا پروردگار میں نہیں جانتا۔ تو مَیں نے دیکھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنا ہاتھ میرے مونڈھوں کے درمیان رکھا یہاں تک کہ اس کی پوریوں کی ٹھنڈک مَیں نے اپنے سینے میں پائی پھر ہر چیز میرے سامنے کھل گئی اور مَیں نے ہر چیز پہچان لی۔ اب پھر فرمایا کہ اے محمد مَیں نے پھر لبیک اے پروردگار کہا فرمایا بتلاؤ بلند رتبہ فرشتے کس امر میں گفتگو کر رہے ہیں؟ مَیں نے عرض کیا کفّاروں کے بارے میں پوچھا بتلاؤ کفّارے کیا ہیں؟ مَیں نے کہا چل کر نماز کی جماعتوں میں جانا' نمازوں کے بعد مساجد میں بیٹھے رہنا' تکلیف کے وقت کامل وضو کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے دریافت فرمایا: ان فرشتوں کی بات چیت اور کس امر میں ہو رہی ہے؟ مَیں نے کہا: درجوں کے بارے میں پُوچھا: وہ کیا ہیں؟ مَیں نے عرض کیا: کھانا کھلانا' نرم کلامی کرنا' لوگوں کے سونے کے وقت نماز ادا کرنا۔ فرمایا: کچھ مانگ۔ تو مَیں نے کہا: اے اللہ! میں تجھ سے نیکیوں کے کرنے اور بُرائیوں سے بچنے کی توفیق اور مسکینوں کی محبّت کا سوال کرتا ہُوں اور یہ کہ تُو مجھے بخشے اور مجھ پر رحم فرمائے اور یہ کہ جب تو کسی قوم کو فتنے میں ڈالنا چاہے تو مجھے اس فتنے میں پڑنے سے پہلے ہی وفات دے دے۔ الٰہی! میرا سوال ہے کہ مجھے اپنی محبّت عطا فرما اور اُن کی محبّت بھی دے جن سے تُو محبّت کرتا ہے اور ان اعمال کی چاہت دے جو تیری محبت سے نزدیک کرنے والے ہیں پھر حضور ﷺ نے اپنے مقتدیوں سے فرمایا: سُو یہ سب حق اور سچ ہے' تم اسے سیکھو اور دوسروں کو سکھاتے رہو۔ (مسند احمد۔ ترمذی شریف)

دوزخ سے بچو

حضرت ابوبکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ مَیں نے رسولِ خدا ﷺ کو منبر پر یہ خطبہ دیتے ہوئے سُنا' آپ نے فرمایا:

آتشِ دوزخ سے بچو گو آدھی کھجور ہی سے ہو' کیوں کہ وہ (صدقہ) کجی کو درست کر دیتا ہے' بری موت کو دُور کر دیتا ہے اور وہ بُھوکے کے لیے بھی اتنا ہی کام کرتا ہے جتنا سیر شدہ کے لیے۔ (ابویعلیٰ)

نیکی اور بدی کے راستے

حضرت جابرؓ بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک روز صحابہؓ بیٹھے تھے کہ رسولِ خدا ﷺ تشریف لائے اور مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اے جماعتِ مسلمین! اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو' رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک سے پیش آتے رہو کیوں کہ کسی نیک کام کا ثواب صلہ رحمی کے ثواب سے جلدی ملنے والا نہیں۔ ظلم و زیادتی' بغاوت و سرکشی سے بچتے رہو' کیوں کہ کسی گناہ پر اس قدر جلد سزا نہیں ملتی جتنی سرکشی اور بغاوت پر۔ لوگو! ماں باپ کی نافرمانیوں سے بچو کیوں کہ جنّت کی خوش بو ایک ہزار سال کے فاصلے سے آجاتی ہے مگر خدا کی قسم ماں باپ کے نافرمان' رشتوں ناتوں کو توڑنے والے' بڑھاپے میں زنا کاریاں کرنے والے اور فخر و تکبّر سے اپنے تہ بند یا پاجامے کو ٹخنے سے نیچے لٹکانے والے اسے نہ پاسکیں گے۔ یاد رکھو کبریائی

ر بڑائی صرف اللہ ہی کے لیے ہے جو سب کا پالن ہار ہے۔ جھوٹ سرتاپا گناہ کی چیز ہے سوائے اس کے جس سے تو کسی مومن کو نفع پہنچائے یا اس سے اپنے دین سے کسی نقصان کو دُور کرے۔ جنّت میں ایک بازار ایسا ہے جہاں کوئی خرید و فروخت نہیں ہوتی اس میں صرف صورتیں ہیں جو مرد و عورت جس صورت کو پسند کرے وہی صورت اُس کی ہو جائے گی۔ (طبرانی)

جہاد کی فضیلت

حضرت قتادہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسولِ پاک ﷺ نے صحابہؓ کے مجمع میں کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا' جس میں ارشاد فرمایا:

جہاد فی سبیل اللہ اور ایمان باللہ ایمان کی افضل ترین صورتیں ہیں۔ یہ سُن کر ایک صحابی کھڑے ہُوئے اور دریافت کیا کہ یارسول ﷺ اللہ! اگر میں راہِ خدا میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا یہ میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! بشرطیکہ تُو راہِ خدا میں اس حال میں قتل کیا جائے کہ تُو صبر کرنے والا' ثوابِ آخرت کی جستجو کرنے والا اور آگے بڑھنے والا ہو نہ کہ پیچھے ہٹنے والا پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم نے کیا کہا تھا؟ اُس صحابی نے کہا: اگر میں راہِ خدا میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا یہ میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں' بشرطیکہ تُو راہِ خدا میں اس حال میں قتل کیا جائے کہ تُو صبر کرنے والا' ثواب کی جستجو کرنے والا اور آگے بڑھنے والا ہو نہ کہ پیچھے ہٹنے والا' سوائے قرض کے (کہ وہ معاف نہ ہوگا) کیوں کہ جبریلؑ نے (ابھی ابھی) یہ بات مجھے بتائی ہے۔ (مُسلم شریف)

جہاد

جنگِ اُحد کے موقع پر جب مسلمان' کفار کے بالمقابل صف آرا ہُوئے تو آپ ﷺ نے ان کے سامنے حسبِ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! میں تمھیں وہی وصیت کرتاہُوں جو وصیّت جناب باری نے اپنی کتاب میں کی ہے یعنی یہ کہ تم اس کی اطاعت بجالاتے رہو اور اس کی حرام کردہ چیزوں سے اجتناب کرتے رہو۔ سو آج تم اجر و ذکر کی جگہ ہو' جو شخص ذکر پر جم جائے' صبر و یقین' پختگی اور خوش نفسی سے جہاد کرے وُہ خدا کے ہاں اجر پائے گا اس کا نام دونوں جہان میں بلند ہو جائے گا کیوں کہ دشمن سے جہاد کرنا سخت اور مشکل کام ہے اس پر صبر بہت کم لوگوں سے ہوتا ہے وہی یہاں ثابت قدم رہتے ہیں جنھیں اپنے ہدایت یافتہ ہونے پر پختہ یقین ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرے اور جو اس کی نافرمانی کرے اس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے۔ اپنے اعمال کو جہاد کی سختیوں پر صبر کرنے سے شروع کرو اس کے ذریعے ان چیزوں کو تلاش کرو جن کا اللہ نے تم سے وعدہ کر رکھا ہے۔ میرے حکموں کی فرماں برداری کو لازم پکڑے رہو کیوں کہ میں تمھاری ہدایت پر حریص ہوں۔ اختلاف جھگڑا اور جنگ سے جی چرانا عجز اور ضعف ایسی چیزیں ہیں جنھیں اللہ ناپسند کرتا ہے اور ان پر فتح و نصرت عطا نہیں فرماتا۔ (حوالہ)

کبائر سے اجتناب

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ ایک بار منبر پر چڑھے اور دو مرتبہ قسم کھائی پھر منبر سے اُتر آئے پھر فرمایا:

"اَبْشِرُوْا اَبْشِرُوْا۔ مَنْ صَلَّى الصَّلَوٰاتِ الْخَمْسِ وَاجْتَنَبَ الْكَبَائِرَ۔ دَخَلَ مَنْ اَيِّ اَبْوَابِ الْجَنَّةِ شَآءَ۔"

"خوش ہو جاؤ' خوش ہو جاؤ' بشارت سُن لو جو پانچ وقت نماز ادا کرتا ہے اور کبیرہ گناہوں سے بچتا ہے وہ جنّت کے جس دروازے سے چاہے گا' جنّت میں داخل ہو جائے گا۔"

مطلب کہتے ہیں مَیں نے ایک شخص کو عبداللہ بن عمرؓ سے پوچھتے سنا کہ کیا آپ نے رسول اللہ ﷺ کو ان (کبیرہ گناہوں) کا ذکر کرتے سُنا تھا؟ اُنھوں نے کہا: ہاں (حضور ﷺ کے فرمان کے مطابق وہ گناہ یہ ہیں:)

ماں باپ کی نافرمانی' اللہ کے ساتھ شرک' ناحق کا قتل۔ پاک دامن عورتوں پر تہمت۔ مالِ یتیم کا کھا جانا۔ میدانِ جہاد سے بھاگ کھڑا ہونا۔ سُود کھانا۔ (طبرانی)

بہتر اور بدتر انسان

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ جنگِ تبوک کے موقع پر آنحضرت ﷺ نے اپنی اونٹنی سے ٹیک لگائے مندرجہ ذیل خطبہ دیا:

مَیں تمھیں بتلاؤں کہ بہتر لوگ کون ہیں اور بدتر کون ہیں' سُنو بہتر انسان وُہ ہے جو راہِ خدا میں کام (یعنی جہاد) کرے' اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر یا اپنے اونٹ کی پیٹھ پر یا اپنے پاؤں پر' یہاں تک کہ اسے موت آ جائے اور بدتر انسان وُہ فاسق و فاجر انسان ہے جو قرآن تو پڑھتا ہو لیکن اس کی کسی چیز کی طرف توجہ نہ کرے۔ (النسائی)

سورج اور چاند گہن

آنحضور ﷺ کے صاحب زادے حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو اُسی روز سُورج گہن لگا۔ آپ ﷺ نے اعلان کرایا کہ سب لوگ نماز کے لیے مسجد میں جمع ہو جائیں۔ لوگ اکٹھے ہُوئے تو آپ ﷺ نے دو رکعت نماز پڑھائی جس میں آپ ﷺ نے طویل قرأت کی۔ نماز میں مرد اور عورتیں شریک تھیں حضرت اسماءؓ بنت ابوبکرؓ کو غشی آ گئی نماز اس وقت ختم ہُوئی جب سورج گہن سے آزاد ہو چکا تھا۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا' جس میں فرمایا:

سورج اور چاند کو نہ کسی کے پیدا ہونے سے گہن لگتا ہے نہ کسی کی موت سے بلکہ وُہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو ڈراتا ہے۔ اے اُمتِ محمد ﷺ! تم جب اُنھیں دیکھو تو نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ' اللہ سے دعائیں کرو' تکبیریں کہو' صدقہ دو' اللہ کا ذکر کرو' اللہ تعالیٰ سے استغفار کرو' یہاں تک کہ گہن کھل جائے۔ اے اُمتِ محمد ﷺ! خدا کی قسم اللہ تعالیٰ سے زیادہ اس معاملے میں غیرت مند کوئی نہیں کہ اس کا کوئی بندہ یا اس کی کوئی لونڈی زنا کرے۔ اے اُمتِ محمد ﷺ! اگر تم وہ کچھ جانتے ہوتے جو میں جانتا ہوں تو بخدا تم بہت کم ہنستے اور بہت

زیادہ روتے ہر وُہ چیز جسے مَیں نے پہلے نہیں دیکھا تھا' وہ مَیں نے اب اسی جگہ دیکھ لی ہے حتیٰ کہ جنت اور دوزخ بھی۔ مجھے بذریعہ وحی خبر دی گئی ہے کہ تمھیں قبروں میں آزمایا جائے گا دجّال کے فتنے کے قریب (قریب یا اس کی طرح) تم میں سے کسی کو لایا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا: اس شخص کے بارے میں تمھیں کیا کچھ معلوم ہے؟ صاحبِ ایمان (یا صاحبِ یقین) کہے گا: یہ اللہ کے رسول محمد ﷺ ہیں' ہمارے پاس واضح دلائل اور ہدایت لے کر تشریف لائے تھے چنانچہ ہم نے تسلیم کرلیا' آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کی اتباع کی پس اس سے کہا جائے گا: آرام سے سو جاؤ ہم نے جان لیا ہے کہ تم صاحبِ یقین تھے مگر منافق یا شک کا مارا انسان کہے گا: مجھے کچھ معلوم نہیں' لوگوں کو کچھ کہتے سنا تو مَیں نے بھی وہی کہہ دیا تھا پھر آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ عذابِ قبر سے خدا کی پناہ مانگیں صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم نے دیکھا آپ اپنی جگہ سے کوئی چیز پکڑنے لگے' پھر ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے، آپ ﷺ نے فرمایا: مَیں نے جنت دیکھی تو ایک خوشے کو پکڑنا چاہا اور اگر میں اسے پکڑ لیتا تو تم اس میں سے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے پھر مجھے دوزخ دکھائی گئی اتنا بھیانک منظر مَیں نے کبھی نہیں دیکھا' مَیں نے دیکھا کہ اس میں اکثریت عورتوں کی ہے لوگوں نے پُوچھا: یارسول اللہ ﷺ! کس بنا پر؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان کے کفر و ناشکری کی وجہ سے۔ پُوچھا گیا: کیا وہ اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وُہ اپنے شوہروں کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان فراموشی کرتی ہیں۔ اگر تم کسی عورت سے عمر بھر بھی احسان کرو' پھر وُہ کوئی ذرا سی کمی دیکھ لے تو کہے گی: مَیں نے تجھ سے کبھی کوئی بھلائی نہیں دیکھی۔ (متفق علیہ)

خطبۂ نکاح

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے نکاح کے موقع پر رسولِ خدا ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بلوایا۔ اسی طرح انصار کے کچھ لوگوں کو بھی دعوت دی سب لوگ آ گئے تو آپ ﷺ نے حسب ذیل خطبۂ نکاح ارشاد فرمایا:

تمام تعریفیں ہیں اس خدا کی جو اپنی نعمتوں کی بدولت محمود ہے اپنی قدرتوں کی وجہ سے معبود ہے اس کی طاقت اور قوت کی بدولت اس کی اطاعت کی جاتی ہے جس کے عذاب اور جلال سے ہر وقت ڈرا جاتا ہے جس کا حکم اس کی زمین اور اس کے آسمان میں نافذ ہے۔ اس نے اپنی قدرت سے مخلوقات کو پیدا کیا، انھیں اپنے احکام کی تمیز کرا دی اور اپنے دین کے ذریعے انھیں عزّت بخشی اور اپنے نبی محمد ﷺ کے طفیل انھیں بزرگی عطا کی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ازدواجی رشتہ کو قرابت کا ذریعہ مقرر کیا ہے اور اسے ایک ضروری چیز قرار دیا ہے جس سے رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے اور تمام لوگوں کو فطرتاً اس کی طرف راغب کیا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وہی ذات ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا اور نسب اور دامادی کے رشتے مقرر فرمائے اور تیرا پروردگار بڑی طاقت والا ہے پس اللہ کے حکموں کا تعلق قضاءِ الٰہی سے ہے' اور قضاءِ الٰہی کا سلسلہ تقدیر پر ختم ہوتا ہے ہر قضا کے لیے قدر ہے اور ہر قدر کے لیے ایک خاص وقت مقرر ہے اور ہر کام کا وقت لکھا جا چکا ہے جسے خدا چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جسے چاہتا ہے رہنے دیتا ہے اور اسی کے پاس تمام تحریروں کی جڑ ہے اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ کا نکاح علی بن ابی طالب کے ساتھ کردوں پس تم سب گواہ رہو کہ مَیں نے 400 مثقال چاندی کے عوض ان کا عقد کردیا بشرطیکہ علی رضامند ہوں۔ (حوالہ)

ضابطۂ حیات

حضرت عیاض بن حمار المجاشعی سے روایت ہے کہ ایک بار غالباً مدینہ منوّرہ کے ابتدائی زمانے میں آپ ﷺ نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

آگاہ ہو جاؤ میرے پروردگار نے مجھے حکم دیا ہے کہ جو باتیں آج مجھے سکھائی گئی ہیں وہ تمھیں بتا دوں (خدا نے فرمایا ہے) کہ جو مال مَیں نے اپنے بندے کو اپنی مہربانی سے عطا کیا ہے وُہ اس کے لیے حلال ہے' مَیں نے اپنے بندوں کو راہِ حق پر پیدا کیا تھا مگر شیطان ان کے پاس آئے اور اُنہوں نے انھیں دینِ حنیف سے دُور کردیا اور میری حلال کردہ چیزوں کو ان کے لیے حرام کردیا اور انھیں شرک کرنے کی ہدایت کی جس کے لیے مَیں نے کوئی سند نہیں اُتاری تھی پھر فرمایا اللہ تعالیٰ نے اہلِ زمین کی طرف دیکھا تو باقی اہلِ کتاب کے سوا تمام انسانوں کو خواہ وہ عرب ہوں یا عجم ناپسند فرمایا اور کہا: مَیں نے تمھیں اس لیے بھیجا ہے کہ تمھیں اور تمھارے ذریعے دوسروں کو آزماؤں اور تم پر ایسی کتاب اتاری جو پانی سے محو نہیں ہوسکتی (بلکہ سینوں میں محفوظ ہے) تم اسے سوتے جاگتے پڑھ سکتے ہو اور اللہ نے مجھے حکم دیا کہ قریش کو جلا ڈالو مَیں نے کہا الٰہی! وہ بڑی طاقت ور قوم ہے مجھے توڑ کر رکھ دے گی خدا نے فرمایا: انھیں ایسا نکال دو جیسا انھوں نے تجھ کو نکال دیا ہے۔ ان سے لڑو اسباب ہم فراہم کریں گے' تم خرچ کرو ہم دیں گے' تم ایک لشکر روانہ کرو ہم اس کا پانچ گُنا بھیج دیں گے اور اپنے مطیع اور فرماں بردار لوگوں کو لے کر نافرمانوں سے خدا کی راہ میں غزوہ کرو (پھر فرمایا) تین قسم کے لوگ جنتی ہیں: منصف' سخی اور نیک حُکام۔ رشتہ داروں اور عام مسلمانوں کے ساتھ مہربانی کرنے والا نرم دل آدمی۔ عیال دار باعفت سوال سے بچنے والا شخص پانچ قسم کے لوگ دوزخی ہیں: (1) کم زور بے شعور' آوارہ گرد جو دوسروں پر بوجھ ہو اور بال بچّوں کے جھمیلے سے الگ رہے۔ (2) وہ جو خیانت کے کسی موقع پر نہیں چوکتا (3) وُہ شخص جو تمھیں تمھارے مال و منال اور اہل وعیال کے بارے میں دھوکا دیتا ہے (4) آپ ﷺ نے بخل یا جُھوٹ کا ذکر کیا (5) بدگو فحش بکنے والا اور لعنت ملامت بکثرت کرنے والا بدخلق بدزبان (ایک اور روایت میں ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ تم تواضع اختیار کرو اور کوئی شخص دوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی شخص دُوسرے کے خلاف بغاوت اور سرکشی اختیار کرے۔ (مُسلم شریف)

اسلام اور جاہلیت

قبیلہ بنو مراد کا ایک وفد آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وفد میں شامل ایک مقرر ظبیان نے تقریر کی جس میں قدیم تاریخ کے حوالے سے بتایا کہ طائف اور

اس کا نواحی علاقہ کسی زمانے میں بنو مراد کی ملکیت تھا' پھر دشمنوں نے بہ جبر ہم سے چھین کر ہمیں ساحلی علاقوں کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا آخر میں اس نے حضور ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام ظالم کے خلاف مظلوم کی مدد کا حامی ہے' آپ ہمارا حق دلوائیے۔

اسی محفل میں مخالف بنو ثقیف قبیلے کے سردار اخنس بن فریق اور اسود بن مسعود ثقفی بھی موجود تھے انھوں نے کھڑے ہو کر جوابی تقریر کی اور صورتِ حال کا دُوسرا نقشہ پیش کیا اور طائف پر اپنا حق جتلایا۔ فریقین کی تقریروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ ایک بے معنی جھگڑا ہے اور ان لوگوں کے اندر ابھی تک حُبِّ دُنیا اور جاہلیت کے اثرات موجود ہیں اس موقع پر رسولِ خدا ﷺ نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

دنیوی نعمتیں خدائے تعالیٰ کے نزدیک ریت کے چمکدار ذرّات سے بھی کم تر اور ذلیل ہیں اور اگر خدا کے پاس مکھی کے برابر بھی ان کی توقیر ہوتی تو کوئی مسلمان محتاج نہ رہتا نہ کوئی کافر یہاں عیش کرتا۔ اگر لوگوں کو اپنی اجل مقرر معلوم ہو جائے تو ان پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے اور عیش وعشرت انھیں بالکل راس نہ آئے لیکن اجل مخفی رکھی گئی ہے اور خواہشات پھیلائی گئی ہیں۔ زمانہ جاہلیت کو اس نام سے اسی لیے نام زد کیا گیا ہے کہ اُن لوگوں کے اعمال بے بنیاد تھے اور وہ مذہب سے کورے تھے پس جو کوئی شخص اسلام کے عہدِ مامون سے مشرف ہوا اس کے قبضہ میں جو بنجر یا آباد زمین ہو وہ شریعت کا مقررہ حصّہ ادا کرنے کے بعد اُس کی سمجھی جائے گی' یہ حصّہ (عُشر یا خراج) ہر مسلمان اور معاہد ذمّی پر مقرر ہو چکا ہے۔ جاہلیت والے غیر اللہ کو پُوجتے رہے' وہ اپنے اعمال کی سزا ضرور بھگتیں گے ان کا عذاب روزِ قیامت تک مؤخر کیا جا چکا ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت' جلال اور غلبہ کے باوجود انھیں موقع دیا سو طاقت ور لوگ کم زوروں پر غالب آئے اور بڑی قوموں نے چھوٹی جماعتوں کو ہڑپ کر لیا۔ خدا بہت بڑا اور بزرگ ہے زمانہ جاہلیت کے تمام خوں بہا اور ناجائز معاملات ملیامیٹ ہو چکے جو گزر چکا وہ اللہ نے معاف کر دیا اور جو کوئی آیندہ ایسا کرے' اللہ اسے سزا دے گا۔ اللہ غالب اور سزا دینے والا ہے۔ (مواہب الفتحیہ)

پانچ بُرائیاں

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسولِ ﷺ خدا نے مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

"یَامَعْشَرَ الْمُهَاجِرِیْنَ o خَمْسُ خِصَالٍ اِذَا ابْتُلِیْتُمْ بِهِنَّ وَ اُعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ تُدْرِکُوْهُنَّ۔ لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِیْ قَوْمٍ قَطُّ حَتّٰی یُعْلِنُوْا بِهَا اِلَّا فَشَا فِیْهِمُ الطَّاعُوْنُ وَ الْاَوْجَاعُ الَّتِیْ لَمْ تَکُنْ مَضَتْ فِیْ اَسْلَافِهِمُ الَّذِیْنَ مَضَوْا لَمْ یَنْقُصُوا الْمِکْیَالَ وَ الْمِیْزَانَ اِلَّا اُخِذُوْا بِالسِّنِیْنَ وَشِدَّةِ الْمُؤْنَةِ وَجَوْرِ السُّلْطَانِ عَلَیْهِمْ۔ وَلَمْ یَمْنَعُوْا زَکٰوةَ اَمْوَالِهِمْ اِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَآءِ۔ وَلَوْ لَا الْبَهَائِمُ لَمْ یُمْطَرُوْا۔ وَلَمْ یَنْقُضُوْا عَهْدَ اللّٰهِ وَ عَهْدَ رَسُوْلِهٖ اِلَّا سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ عَدُوًّا مِنْ غَیْرِهِمْ فَاَخَذُوْا بَعْضَ مَا فِیْ اَیْدِیْهِمْ وَلَمْ تَحْکُمْ اَئِمَّتُهُمْ بِکِتَابِ اللّٰهِ وَیَتَخَیَّرُوْا فِیْمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ بَأْسَهُمْ بَیْنَهُمْ۔" (ابن ماجه)

"اے گروہِ مہاجرین! میں خدا سے تمھارے لیے پانچ باتوں میں پڑنے سے پناہ مانگتا ہوں جب کسی قوم میں برملا فحش کام ہونے لگتے ہیں تو وہ لوگ طاعون اور دُوسری ایسی گوناگوں بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن سے ان کے اسلاف محض ناآشنا اور بے خبر تھے اور جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے تو وہ قحط سالی' سخت مصائب اور حکمرانوں کے مظالم میں پھنس جاتی ہے اور جب کوئی قوم زکوٰۃ ادا نہیں کرتی تو ان پر بارش بند ہو جاتی ہے اگر ان کے چوپائے نہ ہوں تو ان پر مینہ کی ایک بوند بھی نہ برسے اور جب کوئی قوم اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ عہد شکنی کرتی ہے تو اللہ ان پر دشمن مسلّط کر دیتا ہے جو ان کے اموال چھین لیتا ہے اور جب کسی ملک کے حکام احکامِ خداوندی کے مطابق فیصلے کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور احکامِ خداوندی میں اپنی مرضی برتتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قوم میں لڑائی ڈال دیتا ہے۔" (ابنِ ماجہ)

جنگ کے اُصول

آنحضرت ﷺ مجاہدین کو کسی مہم پر روانہ فرماتے' تو سردارِ لشکر کو خاص طور پر پرہیزگار رہنے اور اپنے رفقا کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ہدایت فرماتے پھر تمام فوج کی طرف مخاطب ہو کر اسلامی اصولِ جنگ کے متعلق ہدایات صادر فرماتے۔ ذیل میں آپ ﷺ کا خطبہ اسی نوعیت کا ہے۔ فرمایا:

خدا کا نام لے کر خدا کی راہ میں کفار سے لڑنا بدعہدی اور خیانت نہ کرنا مُردوں کے ناک کان نہ کاٹنا بچّوں کو قتل نہ کرنا اور جب کافر دشمنوں سے مقابلہ ہو تو ان کے سامنے (یکے بعد دیگرے) تین باتیں پیش کیا کرنا' جن میں سے کسی ایک کو بھی مان لیں تو ان سے ہاتھ روک لینا پہلے انھیں اسلام کی دعوت دینا' اگر منظور کر لیں تو ان سے ہاتھ روک لینا پھر ان سے کہہ دینا کہ اپنا ملک چھوڑ کر مہاجرین کے پاس آ کر سکونت اختیار کر لیں اور انھیں بتا دینا کہ ایسا کرنے پر ان کے ساتھ مہاجرین جیسا سلوک کیا جائے گا اگر وہ ایسا کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو انھیں بتلا دینا کہ وہ دُوسرے دیہاتی مسلمانوں کی طرح سمجھے جائیں گے اور مسلمانوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے تمام احکام ان پر جاری ہوں گے لیکن مالِ غنیمت میں سے اس وقت تک حصّہ نہیں پا سکیں گے جب تک خود جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہو کر نہ لڑیں پس اگر وہ اسلام میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ ہوں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو اگر مان جائیں تو ان سے ہاتھ روک لو ورنہ خدا کا نام لے کر اُن کے خلاف لڑائی شروع کر دو اور جب کسی قلعہ کا محاصرہ کرو اور وُہ لوگ اللہ اور رسول کو ذمہ دار ٹھہرا کر تم سے امان طلب کریں' تو اس بات کو قبول نہ کرنا بلکہ اپنے اپنے باپ دادا اور رفقا کی ذمہ داری پر پناہ دیا کرنا کیوں کہ اگر کسی وقت عہد شکنی ہو جائے تو آبا و اجداد اور رفقا کار کی عہد شکنی اللہ و رسول کا ذمہ توڑ دینے سے آسان ہے اسی طرح اگر قلعہ کے محصورین خدائی فیصلہ کی شرط پر صلح کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو راضی نہ ہونا' بلکہ ہمیشہ اپنے فیصلہ کی شرط پر امان دیا کرنا کیوں کہ

معلوم نہیں تم ان کے متعلق صحیح خدائی فیصلہ معلوم کر بھی سکتے ہو کہ نہیں۔ (ابنِ ماجہ)

تین اہم باتیں

حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ رسولِ خدا ﷺ مسجد میں تشریف لائے (ہمیں حکم دیا کہ ہم منبر کے پاس جمع ہو جائیں۔ جب ہم سب منبر کے پاس بیٹھ گئے تو) آپ ﷺ منبر پر چڑھنے لگے پہلے زینے پر آمین کہا پھر دوسرے پر آمین کہا پھر تیسرے پر آمین کہا پھر ہم سے فرمایا: جانتے بھی ہو کہ خلافِ عادت آج مَیں نے ان تین زینوں پر تین مرتبہ آمین کیوں کہا؟ ہم نے کہا: حضور ﷺ کو علم ہوگا اور اللہ جانتا ہے ہم بے خبر ہیں اس پر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

حضرت جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور اُنھوں نے کہا: جس کے پاس آپ ﷺ کا نام لیا جائے اور وہ درود نہ پڑھے تو اللہ اسے غارت و برباد کرے مَیں نے کہا: آمین۔ پھر اُنھوں نے کہا: جس نے اپنے ماں باپ کے یا ان دونوں میں سے ایک کے بڑھاپے کے زمانے کو پایا پھر بھی ان کی خدمت نہ کی؛ اور جہنّم میں داخل ہو گیا' اللہ اسے برباد کرے مَیں نے کہا: آمین۔ پھر انھوں نے کہا: جو رمضان المبارک کو پائے اور پھر بھی بخششِ خدا سے محروم رہ کر جہنّم میں جائے اللہ اسے بھی اپنی رحمت سے دُور کر دے مَیں نے کہا: آمین۔ (طبرانی)

آخری دور کے فتنے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت ہے کہ ہم ایک مرتبہ رسولِ ﷺ خدا کے ہم سفر تھے ایک جگہ قیام کیا سب لوگ قیام وطعام کے انتظام میں مشغول ہو گئے اتنے میں آنحضور ﷺ نے سب لوگوں کو جمع ہونے کا حکم دیا لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر ایک جگہ جمع ہو گئے اس موقع پر آپ ﷺ نے حسبِ ذیل خطبہ دیا۔ حمد وثنا کے بعد فرمایا:

مجھ سے پہلے بھی ہر پیغمبر پر یہ مقرر تھا کہ جو بھلائی بھی وہ لوگوں کے لیے جانتا ہے اس کی طرف اپنی اُمت کی راہ نُمائی کرے اور جو برائی بھی وہ ان کے لیے جانتا ہے اس سے انھیں ڈرائے اور میری اُمّت کی ابتدا میں آرام وعافیت ہے اور آخری حصّہ میں فتنے اور ایسے معاملات آنیوالے ہیں جنھیں تم سخت ناپسند کرتے ہو جن میں سے ہر پچھلا فتنہ پہلے کی نسبت زیادہ سخت ہوگا جب ایک فتنہ آئے گا تو مومن کہیں گے یہ فتنہ ہمیں ہلاک کر دے گا پھر وہ کھل جائے گا اور دوسرا فتنہ آجائے گا تو مومن لوگ اسی کو آخری فتنہ سمجھ لیں گے پس جو یہ چاہے کہ دوزخ سے بچ کر جنت میں داخل ہو جائے' چاہیے کہ اُسے موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں سے وہی سلوک کرے جس کی ان سے توقع رکھتا ہے جس نے ایک امام کی بیعت کر لی اُس نے جان و مال اُس امام کے ہاتھ میں دے دیئے پس حتی الوسع اس کی متابعت کرے اگر کوئی دُوسرا اُس کے مقابلہ پر نکل کر بغاوت کرے تو اس کی گردن مار دو۔ (مسلم شریف)

دُنیا کی مہلت غنیمت ہے

ایک بار جمعہ کے خطبے میں آنحضرت نے فرمایا:

اے لوگو! تمھارے لیے نشان ہیں وہیں ٹھہر جایا کرو۔ تمھارے لیے ایک انتہائی حد ہے اپنی اس حد پر رک جایا کرو۔ مومن دو خوف کے درمیان ہے گزری ہوئی عمر کے بارے میں بھی اُسے کھٹکا ہے کہ نہ جانے اللہ پاک نے اس میں اس کے لیے کیا رکھا ہے اسی طرح باقی عمر کے بارے میں بھی اسے ڈر ہے کہ نہیں معلوم اللہ اس کے بارے میں کیا کرنے والا ہے پس مومن کا فرض ہے کہ اپنی ذات سے اپنے لیے توشہ جمع کر لے، اپنی دُنیا سے اپنی آخرت کا توشہ لے لے اپنی جوانی سے اپنے بڑھاپے کا توشہ لے لے اپنی تن درستی سے اپنی بیماری کا توشہ لے لے۔ تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو اور دنیا تمھارے لیے بنائی گئی ہے مسلمانو! اس خدا کی قسم جس کے قبضے میں محمد ﷺ کی جان ہے موت کے بعد رضا جوئی کا کوئی موقع نہیں پھر تو ہر انسان کا گھر یا تو جنّت ہے یا دوزخ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمھارے لیے استغفار کرتا ہوں۔ (دُرِّ المنثور)

رسولِ خدا ﷺ کی حکمت

عمرؓو بن تغلب سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کے پاس مال آیا آپ ﷺ نے اسے تقسیم کر دیا پھر آپ کو معلوم ہوا کہ جنھیں مال نہیں ملا وہ بگڑ رہے ہیں اس پر آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں آپ ﷺ نے حمد وثنا کے بعد فرمایا:

میں مال کی تقسیم کے وقت بعض کو دیتا ہوں اور بعض کو نہیں بھی دیتا' حالانکہ جنھیں مَیں نہیں دیتا وہ مجھے ان سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں جنھیں دیتا ہوں، بعض لوگوں کو مَیں صرف اس لیے دیتا ہوں کہ اُن کے دلوں میں جزع فزع اور بے اطمینانی سی ہوتی ہے اور جنھیں نہیں دیتا اُنھیں سپردِ خدا کرتا ہوں' اس لیے کہ جانتا ہوں اُن کے دلوں میں غِنا اور خیر ہے انھی میں عمرو بن تغلب ہیں۔

حضرت عمرؓو فرمایا کرتے تھے کہ حضورِ اکرم ﷺ کے اس فرمان سے جس قدر میں خوش ہوا ہوں' قسم خدا کی اگر ساری دنیا بھی حضور ﷺ مجھے دے دیتے تو میں اتنا خوش نہ ہوتا۔ (بخاری شریف)

انصار سے خطاب

غزوۂ حنین میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوا اس کی تقسیم ہوئی تو اہلِ مکہ کو نسبتاً زیادہ حصہ ملا اس سے بعض نوعمر انصاریوں نے کہا کہ آنحضور ﷺ قریشیوں کو زیادہ مال دے رہے ہیں حالانکہ ہماری خدمات اُن سے زیادہ ہیں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے یہ باتیں سُنیں تو انصار کو طلب کر کے پُوچھا تمھاری طرف سے جو بات مجھے پہنچی ہے' اس کی حقیقت کیا ہے؟ انصار نے عرض کیا: یارسول ﷺ اللہ ہم میں سے بڑے آدمیوں میں سے تو کسی نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا' البتہ بعض نوجوانوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو بخشے' آپ قریشیوں کو دے رہے ہیں اور ہمیں چھوڑ رہے ہیں حالانکہ ہماری تلواروں سے ان کا خون اب تک ٹپک رہا ہے اس پر آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

سنو! میں انھیں اس لیے دے رہا ہوں کہ وہ تازہ تازہ کفر کو چھوڑ کر آئے ہیں میں چاہتا ہوں کہ ان کے دل اسلام کی طرف اور جھک جائیں۔ کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ لوگ مال لے کر جائیں اور تم اللہ کے رسول ﷺ کو لے کر اپنے وطن کو لوٹو۔ خدا کی قسم وہ جس چیز کو لے کر جائیں گے اس سے وہ بہتر ہے جسے تم لے کر لوٹو گے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

تم اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو اور واقعی سچ کہتے اور میں بھی تمھاری تصدیق کرتا کہ جب سب لوگ آپ کو جھٹلا رہے تھے اس وقت ہم نے آپ کی تصدیق کی جب کوئی آپ کو اپنا نظر نہیں آتا تھا اس وقت ہم نے آپ کی مدد کی۔ آپ جلاوطن تھے اس وقت ہم نے آپ کو پناہ دی، جب کہ آپ بے زر تھے اس وقت ہم نے آپ کی مدد کی۔ اے گروہِ انصار! محض دنیا کا خسیس مال نہ ملنے پر تم مجھ سے بگڑنے لگے۔ اس مال کے ذریعے میں نے ایک گروہ کی دل داری کی ہے کہ ان کے ایمان محفوظ رہیں اور تمھیں میں تمھارے اسلام کے سپرد کرتا ہوں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس موقع پر آپ نے فرمایا: اے گروہِ انصار! کیا میں نے تمھیں گم راہیوں میں نہیں پایا؟ پھر اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعے تمھیں ہدایت دی، تم آپس میں ایک دوسرے سے جدا تھے میرے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تم سب کو متحد کر دیا۔ تم مفلس تھے میرے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمھیں مال دار اور تونگر کر دیا۔ جب آپ ﷺ کوئی بات کہتے تو انصار عرض کرتے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احسان اس سے بھی زیادہ ہیں۔ اب آپ ﷺ نے فرمایا تم اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ آپ ﷺ ہمارے پاس اِس اِس حال میں آئے تھے (اب ہماری مدد سے ایسے ہو گئے) کیا تم اس سے راضی نہیں ہو کہ لوگ بکریاں اور اونٹ لے کر اپنے گھروں کو لوٹیں اور تم اللہ کے رسول ﷺ کو لے کر اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ اگر ہجرت نہ ہوتی تو میں انصار ہی کا ایک فرد ہوتا اگر سب لوگ ایک گھاٹی میں یا ایک وادی میں چلیں اور انصار کسی اور راستے پر چل رہے ہوں تو میں انصار کے راستے پر ہی چلوں گا۔ تم لوگ تو مثل اس کپڑے کے ہو جو جسم سے لگا کر پہنا جائے اور دوسرے لوگ گویا اس کے اُوپر کے کپڑے ہیں۔ میرے بعد یقیناً تمھیں کشادگی اور فراخی حاصل ہوگی۔ اس وقت تک صبر و سہار سے کام لینا یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر تمھاری مُجھ سے ملاقات ہو۔ الٰہی! انصار پر رحم فرما اُن کی اولاد پر بھی رحم فرما اور ان کی اولاد پر بھی رحم فرما۔

روایات میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ کا یہ خطبہ اس قدر موثر تھا کہ انصاری چیخ اُٹھے اور رونے لگے، ان کی ڈاڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو گئیں وہ پکار اُٹھے:

ہم اس پر بہت خوش ہیں کہ ہمارے حصّہ میں اللہ کے رسول آئے ہیں

یہ خطبہ بخاری شریف، زاد المعاد اور قسطلانی کی مختلف روایات کو جمع کر کے مرتب کیا گیا ہے۔

دعا کی تاثیر

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ایک بار لوگوں نے آنحضور ﷺ کے سامنے قحط سالی کا شکوہ کیا اس پر آپ ﷺ نے منبر عیدگاہ میں رکھنے کا حکم دیا اور وعدہ فرمایا کہ میں فلاں دن آؤں گا لوگ جمع ہو جائیں اس روز آپ ﷺ سورج طلوع ہوتے ہی گھر سے نکلے اور عیدگاہ پہنچ کر منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

تم لوگوں نے خشک سالی کی شکایت کی ہے اور یہ کہ اس سال وقت پر بارش نہیں ہوئی ایسے موقعوں پر خداوند تعالیٰ نے تمھیں دُعا مانگنے کا حکم دیا ہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ تمھاری دعا قبول کرے گا۔ (پھر فرمایا) سب تعریف خدا کی ہے جو مخلوق کا پالنے والا رحمٰن و رحیم ہے، قیامت کے دن کا مالک ہے خدا کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے الٰہی! تو ہی خداوند ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں، تُو غنی ہے اور ہم محتاج ہیں، ہم پر رحمت کی بارش نازل فرما اور اسے ایک مقررہ وقت تک ہمارے لیے قوّت اور روزی کا وسیلہ قرار دے۔

پھر آپ ﷺ نے دُعا کے لیے ہاتھ اتنے اوپر اٹھائے کہ بغلوں کی سپیدی نظر آنے لگی پھر لوگوں کی طرف پیٹھ پھیر کر تحویلِ ردا کی، پھر لوگوں کی طرف منہ کیا اُترے اور دو رکعت نماز پڑھائی اتنے میں بادل آیا، گرجا، چمکا اور خدا کے حکم سے برسا۔ ابھی آپ ﷺ مسجد تک نہیں پہنچے تھے کہ نالے بہ پڑے جب آپ ﷺ نے لوگوں کو جلدی جلدی سے گھروں کی طرف جاتے دیکھا تو (انسانی فطرت پر) مسکرا پڑے اور فرمایا:

"اَشْهَدُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ وَّ اَنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهٗ ."

میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے اور میں اس کا بندہ اور رسول ہوں۔

فتنۂ دجّال

10ھ کا واقعہ ہے سورج گہن لگا اس موقع پر نمازِ کسوف ادا کی گئی نماز سے فارغ ہو کر رسولِ خدا ﷺ نے ایک خطبہ دیا جس میں حمد و ثنا کے بعد اپنی رسالت کا ذکر فرمایا پھر آپ ﷺ نے حاضرین سے دریافت فرمایا:

لوگو! میں تمھیں خدا کا واسطہ دے کر پُوچھتا ہوں کہ اگر میں نے پیغامِ الٰہی کے پہنچانے میں کسی قسم کی کوتاہی کی ہو تو مجھے بتلا دو۔

ایک آدمی نے کھڑے ہو کر کہا: ''ہم گواہ ہیں کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہم تک پہنچا دیا ہے اور اپنی اُمت کی پوری طرح خیر خواہی کی ہے اور آپ ﷺ نے حق ادا کر دیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

امّا بعد! بعض لوگ گمان کرتے ہیں کہ سُورج اور چاند کو جو گرہن لگتا ہے یا جو ستارے ٹوٹتے ہیں یہ کسی بڑے آدمی کی موت سے تعلق رکھتے ہیں حالانکہ یہ گمان قطعاً غلط ہے، یہ تو خدا کی نشانیاں ہیں جس سے اس کے سمجھ دار بندے عبرت حاصل کرتے ہیں اور ان کے ذریعہ اللہ تبارک و تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون گناہوں سے توبہ کرتا ہے اور خدا کی قسم جب سے میں نماز میں کھڑا ہوں میں نے وہ تمام اُمور دیکھے جو تمھیں دنیا اور آخرت میں پیش آنے والے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی جب تک تیس جُھوٹے (مدعیانِ نبوت) ظاہر نہ ہوں ان میں آخری کذاب

یک چشم دجال ہوگا' جس کی بائیں آنکھ چوپٹ ہوگی ابوتحیہ کی آنکھ کی طرح ہے (ابوتحیہ ایک انصاری بوڑھا تھا جو اس وقت آپ ﷺ کے اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان بیٹھا ہوا تھا) وہ ظاہر ہوکر خدائی کا دعوٰی کرے گا سو جس نے اس کی تصدیق اور پیروی کی اس کے تمام پچھلے اعمالِ حسنہ ضائع ہوجائیں گے اور جس نے اس دعوٰی کو جھٹلایا اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردیے جائیں گے۔ وہ حرم اور بیت المقدس کے سوا تمام زمین پر غالب آئے گا، وہ بیت المقدس میں تمام مسلمانوں کو محصور کرلے گا جہاں انھیں سخت مصیبتیں جھیلنا پڑیں گی پھر اللہ تعالیٰ اسے اور اس کے لشکر کو ہلاک کردے گا حتٰی کہ اس وقت ہر دیوار سے آواز آئے گی کہ اے مسلمان' اے مومن! دیکھو یہاں ایک یہودی (یا کافر) ہے جلدی آؤ اُسے قتل کردو۔ دجال کے خروج سے پہلے تم میں بڑے بڑے فتنے برپا ہوں گے' جن کے متعلق تم ایک دوسرے سے دریافت کروگے کہ کیا نبی کریم ﷺ نے اس کی بابت کچھ ارشاد فرمایا تھا یا نہیں! ان فتنوں کی وجہ سے پہاڑ (جیسے اولوالعزم لوگ بھی اپنی جگہوں سے ٹل جائیں گے اس کے بعد نوع انسانی کا بس خاتمہ ہے۔ (زادالمعاد)

دجال کا ذکر

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسولِ خدا لوگوں کو خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی' پھر دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

میں تمھیں اس سے ڈرا رہا ہوں ہر نبی نے اپنی قوم کو (دجال سے اور اس کے فتنے سے) ڈرایا ہے یہاں تک کہ حضرت نوحؑ بھی اپنی قوم کو اس سے متنبہ فرماتے رہے لیکن میں تمھیں اس کی ایک ایسی علامت بتلاتا ہوں جو کسی نبی نے اپنی اُمت کو نہیں بتلائی تم جان لو کہ وہ کانا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کانا نہیں (وہ ہر نقص سے پاک ہے)۔ (متفق علیہ)

آخرت یقینی ہے

مندرجہ ذیل خطبہ نبوت کے ابتدائی دور کا ہے جو قریشِ مکہ کے سامنے دیا گیا حمد و ثنا کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

قافلے کا سالار اپنے ہی ساتھیوں کو جھوٹی خبر کبھی نہیں دیتا۔ خدا کی قسم' اگر میں سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار ہوجاتا تب بھی تم سے خلافِ واقعہ بات نہ کرتا اور اگر سب لوگوں کو دھوکا دینے پر بھی آمادہ ہوتا تو تمھیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈالتا۔ اُس خدا کی قسم جو وحدہٗ لاشریک ہے کہ میں تمھاری طرف خصوصاً اور باقی تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہوں بخدا تمھیں ضرور ایک دن مرجانا ہے بالکل اس طرح جیسا کہ روز سوتے ہو اور پھر بلاشبہ زندہ ہونا ہے جیسا کہ روز خواب سے بیدار ہوتے ہو اور تمھارے اعمال کا ضرور محاسبہ ہوگا' نیکی کا بدلہ نیکی اور بُرائی کا بدلہ بُرائی مل کر رہے گا اس وقت یا ہمیشہ کے لیے جنت ملے گی یا ابدی جہنم۔ (جمہرۃ الخطب)

فکرِ آخرت

رسول خدا ﷺ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مدینہ میں وارد ہونے سے پہلے قبا میں قیام فرمایا' اور یہاں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ پھر یہاں سے روانہ ہوکر قبیلہ بنو سالم بن عوف کے ہاں بطن وادی میں قیام پزیر ہوئے۔ حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ: یہاں کا خطبہ یہیں ارشاد فرمایا:

اے لوگو! مرنے سے پہلے اپنے لیے کچھ سامان کرلو۔ تمھیں معلوم ہوجائے گا' بخدا تم میں سے ہر ایک شخص پر موت کی بے ہوشی طاری ہوجائے گی اور اپنی بکریوں (مال مواشی) کو بغیر نگہبان کے چھوڑ جائے گا۔ پھر خدا اس سے پوچھے گا (جسے نہ ترجمان کی ضرورت ہے نہ دربار کی حاجت)۔ کیا میرے رسول ﷺ نے آکر تمھیں میرے احکام نہیں پہنچائے تھے اور مَیں نے تمھیں دولت نہیں دی تھی اور اپنے فضل و کرم سے نوازا نہیں تھا؟ پس بتاؤ تم نے اپنے لیے کیا آگے بھیجا ہے؟ اس وقت وہ حیران ہوکر دائیں بائیں دیکھے گا کچھ نظر نہ آئے گا۔ پھر سامنے کی طرف آنکھ اٹھائے گا تو صرف دوزخ ہی دکھائی دے گی۔ پس جسے توفیق ہو وہ اپنے آپ کو اس آگ سے بچالے' گو کھجور کے ایک ٹکڑے ہی سے کیوں نہ ہو اور جسے یہ بھی میسر نہ ہو تو اچھی بات کہ کر اپنے آپ کو عذاب الٰہی سے بچالے کیوں کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیا جائے گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ (زادالمعاد)

آخرت کی تیاری

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک روز نماز عصر کے بعد رسول خدا ﷺ خطبہ دینے کو کھڑے ہوئے اور اس میں قیامت تک پیش آنے والے واقعات بیان کیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''یقیناً دنیا ایک ہری بھری اور شیریں چیز ہے۔ اللہ عن قریب اس میں تمھیں اپنا خلیفہ بنانے والا ہے۔ پھر دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ پس تم دنیا سے اور عورتوں سے بچتے رہنا۔ اور آپ ﷺ نے ذکر فرمایا کہ دنیا کے ہر عہد شکن کے لیے قیامت میں ان کی عہد شکنی کے بقدر ایک جھنڈا ہوگا اور کوئی عہد شکنی حکمران کی عہد شکنی سے بڑھ کر نہ ہوگی، اس کا جھنڈا اس کی سرین کے پاس ہوگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کسی کو لوگوں کی ہیبت حق بات کہنے سے جب کہ اسے معلوم ہو نہ روکے۔

ایک روایت میں ہے کہ اگر برائی کو دیکھے تو اسے بدل ڈالے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ (آپ ﷺ نے فرمایا:)

''اَلَا اِنَّ اَفْضَلَ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ۔''

''خبردار! سب سے بہتر جہاد یہ ہے کہ انسان ظالم بادشاہ کے سامنے کلمۂ حق کہے۔''

یہ سن کر ابوسعید (راوی) رونے لگے اور کہا ہم نے (خلاف شرع) بات دیکھی اور لوگوں کی ہیبت نے اس کے بارے میں' ہمیں کچھ کہنے سے باز رکھا۔ (راوی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مزید فرمایا:)

''جان لو لوگ مختلف طبقات میں پیدا کیے گئے ہیں ان میں بعض تو مومن پیدا ہوتے ہیں' مومن جیتے ہیں اور مومن ہی مرتے ہیں۔ اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں' کافر جیتے ہیں اور کافر ہی مرتے ہیں۔ بعض مومن پیدا ہوتے ہیں مومن جیتے ہیں اور کافر

مرتے ہیں' اور بعض کافر پیدا ہوتے ہیں کافر جیتے ہیں اور مرتے مومن ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ پھر آپ ﷺ نے غصہ کا ذکر کیا اور فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں' جنھیں جلدی غصہ آتا ہے اور جلدی رفع بھی ہو جاتا ہے تو یہ ایک دوسرے کا بدلہ ہو گیا۔ بعض لوگ ایسے ہیں جنھیں دیر سے غصہ آتا ہے اور دیر سے جاتا ہے تو یہ بھی ایک دوسرے کا بدلہ ہو گیا۔ تم میں سب سے اچھے وہ لوگ ہیں جنھیں غصہ دیر سے آئے اور جلدی دور ہو جائے۔ اور بدترین لوگ وہ ہیں جنھیں غصہ جلدی آئے اور دیر سے دور ہو۔ فرمایا تم غصہ سے بچتے رہو وہ بنی آدم کے دل پر ایک چنگاری ہے کیا تم نہیں دیکھتے کہ آدمی کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ بس جس کسی کو غصہ آوے اسے چاہیے کہ لیٹ جائے اور زمین پر بیٹھ جائے۔''

پھر آپ ﷺ نے قرض کی ادائیگی کا ذکر کیا اور فرمایا:

''تم میں سے بعض ایسے ہیں جو ادائیگی میں اچھے ہوتے ہیں لیکن اگر ان کا کوئی مقروض ہوتا ہے تو تقاضے میں سختی کرتے ہیں۔ پہلی صفت دوسرے کے معاوضہ میں ہے (یعنی کوئی خوبی نہیں ہے) تم میں سے بعض ایسے ہیں جو ادائیگی میں بُرے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا کوئی مقروض ہوتا ہے تو تقاضے میں نرمی اختیار کرتے ہیں۔ پہلی صفت دوسرے کے معاوضے میں ہے۔ تم میں بہترین شخص وہ ہے جب وہ کسی کا مقروض ہو تو بھلے طریقے سے ادا کر دے اور اس کا قرض اگر کسی پر ہو تو تقاضا میں نرم تر ہو۔ اور تم میں سے بدترین شخص وہ ہے جب وہ کسی کا مقروض ہو تو بُرے طریقے سے ادا کرے اور اس کا قرض کسی پر ہو تو تقاضے میں سختی برتے۔ حتیٰ کہ جب دُھوپ کھجور کے درختوں کی چوٹیوں پر اور دیواروں کے پہلوؤں پر رہ گئی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

"اَمَا اِنَّهٗ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا فِيْمَا مَضٰى فِيْهَا۔ اِلَّا كَمَا بَقِىَ مِنْ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْمَا مَضٰى مِنْهُ۔"

''سارے دن کے مقابلے میں جتنا وقت اب باقی رہ گیا ہے اتنا ہی زمانہ ابتدائے دنیا سے اب تک کے وقت کے مقابلے میں قیامت آنے میں باقی رہ گیا۔''

(ترمذی۔ مسند احمد)

شرعی حُدود

ایک موقع پر آپ ﷺ نے صحابہؓ کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا جس کا موضوع دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی لازوال زندگی ہے:

لوگو! تمھارے لیے شرعی حُدود مقرر ہو چکی ہیں بس ان تک پہنچ کر تمھیں رک جانا چاہیے اور تمھارے لیے (عالمِ آخرت) ایک منتہیٰ ہے۔ پس تم (عمل صالح کر کے) وہاں پہنچو۔ مسلمان دو خوف ناک حالتوں کے درمیان ہے۔ ایک گزری ہوئی حالت' نہ معلوم خداوند تعالیٰ اس کا کیا کرنے والا ہے۔ ایک آنے والی حالت' معلوم نہیں اللہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کرنے والا ہے۔ پس چاہیے کہ انسان اپنے لیے اپنا توشہ تیار کرے اور دنیا میں رہ کر اپنی عاقبت سنوار لے۔ بڑھاپے سے پہلے جوانی میں اور موت سے پہلے زندگی میں عمل صالح کرے۔ پس قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے کہ مرچکنے کے بعد عتاب اور خجالت دُور کرنے کا کوئی موقع نہ ملے گا۔ نہ دنیا کے بعد جنت یا دوزخ کے سوا کوئی تیسرا ٹھکانا ہوگا۔

(مواہب الفتحیہ)

موت کی یاد:

یہ خطبہ کسی میت کو دفن کرنے کے موقع پر ارشاد فرمایا گیا ہے اس میں موت کی یاد دلا کر مسلمانوں کو نیک عمل کی نصیحت کی گئی ہے۔ حمد وثنا کے بعد فرمایا:

لوگو! (ہماری غفلت کا یہ حال ہے) گویا موت ہمارے لیے نہیں' بلکہ فقط دوسروں کے لیے مقرر ہو چکی ہے' اور گویا حقوق کی ادائیگی ہم پر نہیں' بلکہ تنہا دوسرے لوگوں پر واجب ہے' اور جن مُردوں کے ساتھ ہم قبرستان تک آتے ہیں' گویا وہ چند دن کے مسافر ہیں' جو واپس ہو کر ہم سے ملیں گے' ہم انھیں تو قبر میں دفن کر دیتے ہیں' اور ان کا مال ایسے اطمینان سے کھاتے ہیں گویا ہمیں ان کے بعد دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ نصیحت کی ہر بات ہم بھلا بیٹھے ہیں۔ اور ہر آفت کی طرف سے مطمئن ہو چکے ہیں۔ مبارک باد ہے اس شخص کے لیے جو اپنے عیوب پر نظر کر کے دوسروں کی عیب جوئی سے بچ رہا۔ مبارک باد ہے اس کے لیے جس نے حلال کی کمائی خدا کی راہ میں خرچ کی' علما اور عقل مندوں کی ہم نشینی اختیار کی' اور غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ ملتا جلتا رہا۔ مبارک ہے وہ شخص جس کے اخلاق اچھے ہوں' دل پاکیزہ ہو اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے۔ مبارک ہے وہ شخص جو ضرورت سے بچا ہوا مال خدا کی راہ میں خرچ کرے اور فضول گفتگو سے پرہیز رکھے۔ راہِ شریعت پر عمل کرنا اس کے لیے آسان ہو' اور بدعت اُسے اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔ (کنز العمال)

جنگِ موتہ

جنگ موتہ کے موقع پر اسلامی لشکر جہاد پر جا چکا تھا۔ اسی اثنا میں ایک روز آنحضور ﷺ نے صحابہؓ کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ لوگ جمع ہوئے تو آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ارشاد فرمایا:

''خیر کا دروازہ' بھلائی کا دروازہ' نیکی کا دروازہ' سنو! میں تمھارے غازی لشکر کی (جو موتہ کی طرف گیا ہے) خبر دیتا ہوں، وہ گئے اور دشمن سے ان کی مڈبھیڑ ہوئی۔ (سردار لشکر) حضرت زیدؓ شہید کر دیئے گئے (آپ ﷺ نے ان کے لیے دعائے مغفرت کی) پھر حضرت جعفرؓ نے سرداری کا جھنڈا بلند کیا اور بڑے زور کا حملہ کیا حتیٰ کہ وہ بھی شہید ہو گئے۔ (آپ ﷺ نے ان کی شہادت کی گواہی دی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی) پھر عبداللہ بن رواحہؓ نے جھنڈا تھاما۔ قدم جما کر خوب جہاد کیا یہاں تک کہ وہ بھی شہید ہو گئے (آپ ﷺ نے ان کے لیے بھی دعائے مغفرت فرمائی) پھر جھنڈا خالدؓ بن ولید نے تھام لیا۔ دادِ شجاعت میں امراء میں سے کوئی ان جیسا نہ تھا۔ انھوں نے مستقل مزاجی دکھائی۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الٰہی وہ تیری تلواروں میں سے ایک تلوار ہے تو ہی اس کی مدد فرمائے گا۔ (اسی دن سے ان کا نام خالد سیف اللہ ہو گیا)۔ پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: صبح ہی صبح اپنے ان

بھائیوں کی مدد کے لیے آگے بڑھ جاؤ۔ دیکھو کوئی ایک بھی تم میں سے پیچھے نہ رہ جائے۔" (پس پیدل اور سوار سب لوگ روانہ ہو گئے۔ یہ موسم شدید گرمی کا تھا)۔

آخری وصیتیں

رسولِ پاک ﷺ حجۃ الوداع کے بعد مدینہ واپس آئے تو منبر پر تشریف فرما ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی۔ پھر یہ خطبہ ارشاد فرمایا:

"لوگو! میں ابوبکرؓ سے راضی ہوں۔ تم ان کا یہ حق ہمیشہ مانتے رہنا۔ اے لوگو! میں عمرؓ۔ عثمانؓ۔ علیؓ۔ طلحہؓ۔ زبیرؓ۔ سعدؓ۔ سعیدؓ۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف اور ابوعبیدہؓ سے خوش ہوں تم ان کا بھی لحاظ رکھنا۔ اے لوگو! بدر اور حدیبیہ میں شمولیت کرنے والے میرے تمام اصحاب کو خدا نے بخش دیا ہے۔ لوگو! میرے اصحاب کے معاملہ میں، میرے سسرال کے معاملہ میں اور میرے دامادوں کے معاملہ میں میری حفاظت کرنا یعنی ان میں سے کسی کو برا نہ کہنا۔ ان کے حقوق تسلیم کرنا، ان کی عزت کرنا۔ دیکھو ان میں سے کسی کو تم ایذا نہ دینا۔ یہ وہ جرم ہے جس کا مطالبہ وہ بروز قیامت کریں گے اور خدا کی طرف سے معافی نہ ہوگی۔" (طبرانی)

حکمرانوں کی اطاعت

حضرت ابی سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول پاک ﷺ نے ہمیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"ممکن ہے میں جلدی خدا کے پاس بلا لیا جاؤں اور اس بلاوے پر لبیک کہوں۔ میرے بعد تمھیں ایسے حکمران ملیں گے جو وہی کام کریں گے جو تم کرو گے اور جن کے اعمال وہ ہوں گے جنھیں تم جان پہچان لو گے۔ ان کی اطاعت اطاعت ہے۔ کچھ عرصہ تم اسی طرح رہو گے پھر ان کے بعد تمھیں ایسے حکمران ملیں گے جو ایسے کام کریں گے جنھیں تم نہیں جانتے اور ایسے کام کریں گے جنھیں تم نہیں پہچانتے۔ پس جو ان کی قیادت کرے اور ان کی خیر خواہی کرے یہ لوگ ہلاک ہو گئے اور دوسروں کو بھی ہلاکت میں ڈال دیا۔ ان سے جسمانی رابطہ رکھو مگر عملی زندگی سے دور رہو اور جو بھلا آدمی ہے اس پر گواہی دو کیوں کہ وہ محسن ہے اور گناہ گار و خطا کار کی برائی کے گواہ رہو۔" (طبرانی)

آخری نصیحتیں

آخری علالت کے دوران میں جب آپ ﷺ کو افاقہ ہوتا تھا نماز کے لیے مسجد میں تشریف لاتے اور کبھی کبھی وعظ بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت فضل بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن آنحضرت ﷺ بخار کی حالت میں سر پر پٹی باندھے ہوئے میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: "اے فضل! میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے مسجد لے چلو"، آپ ﷺ مسجد میں رونق افروز ہوئے تو لوگ حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے منبر پر چڑھ کر فرمایا:

"لوگو! میں تمھارے سامنے اس خدائے واحد کی تعریف کرتا ہوں جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، اور (کہتا ہوں کہ) میں تم سے غائب ہونے والا ہوں۔ تو جس کی پشت پر میں نے کوڑا مارا ہو یہ میری پشت حاضر ہے اس لیے بدلہ لے لے، اور جسے نامناسب بات کہی ہو وہ بھی اپنا بدلہ لے لے۔ اگر کسی سے مال لیا ہو تو وہ آج اپنا حق میرے مال میں سے وصول کر لے، اور میری طرف سے کینہ جوئی کا وہم نہ کرے، کیوں کہ یہ میری عادت نہیں۔ تم میں سے وہ شخص مجھے زیادہ محبوب ہے جو مجھ سے اپنا حق وصول کر لے یا معاف کر دے تاکہ میں خوش و خرم اپنے پروردگار سے جا ملوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قدر کہنا کافی نہیں ہے۔ مجھے چند مرتبہ یہ اعلان کرنا پڑے گا۔"

پھر منبر سے اُتر کر آپ ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد دوبارہ منبر پر رونق افروز ہوئے اور اسی مضمون کو دُہرایا۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! ایک دفعہ جناب ﷺ نے مجھ سے تین درہم قرض لیے تھے جواب تک ادا نہیں ہوئے۔ آپ ﷺ نے اسے وہ درہم دے دیے۔ پھر فرمایا:

"اَیُّهَا النَّاسُ! مَنْ كَانَ عِنْدَهٗ شَیْءٌ فَلْیُؤَدِّهٖ وَلَا یَقُلْ فُضُوْحُ الدُّنْیَا۔ اَلَا وَاِنَّ فُضُوْحَ الدُّنْیَا اَهْوَنُ مِنْ فُضُوْحِ الْاٰخِرَةِ۔"

لوگو! جس کے پاس کسی کی کوئی چیز ہو تو اسے ادا کر دے اور دنیا کی فضیحت سے نہ ڈرے کیوں کہ دنیا کی رُسوائی آخرت کی رُسوائی سے بہت ہلکی ہے۔

پھر شہدائے اُحد کے لیے مغفرت طلب کر کے آپ ﷺ نے فرمایا:

"اِنَّ عَبْدًا خَیَّرَهُ اللّٰهُ بَیْنَ الدُّنْیَا وَبَیْنَ مَا عِنْدَهٗ فَاخْتَارَ مَا عِنْدَهٗ۔"

ایک بندہ کو خدا تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ دنیا لے لے یا وہ جو اللہ کے پاس ہے، تو اس نے وہی پسند کیا جو خدا کے پاس ہے۔

یہ سُن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ رو پڑے اور کہا: ہم اور ہمارے والدین آپ ﷺ پر فدا ہوں۔ حاضرین کو تعجب ہوا کہ آنحضرت ﷺ تو کسی شخص کا واقعہ بیان کرتے ہیں اس میں رونے کی کون سی بات ہے! لیکن صدیق اکبرؓ کے ذہن رسا نے تاڑ لیا تھا کہ وہ شخص خود سرورِ دو عالم ﷺ ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے تقریر کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

میں سب سے زیادہ جس کے مال اور صحبت کا ممنون ہوں وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں اپنے رب کے سوا کسی شخص کو دوست بناتا تو ابوبکرؓ کو بناتا لیکن اسلامی برادری کافی ہے۔ ابوبکرؓ کے دریچہ کے سوا مسجد کے رُخ کوئی دریچہ باقی نہ رکھا جائے۔ (بخاری شریف)

موت کی دعوت قبول

حیاتِ مبارک کے آخری ایام میں جب آپ ﷺ مرض الموت میں گرفتار ہوئے، زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! میں ایک انسان ہوں، عن قریب میرے پاس میرے رب کا بھیجا ہوا ملک الموت آنے والا ہے اور میں اس کی دعوت قبول کر کے یہاں سے وہاں جانے والا ہوں۔ لیکن میں تم میں دو مؤقر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ان دونوں میں سے پہلی تو کتاب اللہ قرآن کریم ہے، یہی اللہ تعالیٰ کی رسی ہے۔ اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ جو اسے مضبوطی سے تھامے گا اور اس پر عامل رہے گا وہ ہدایت پر ہوگا اور جو اسے چھوڑ دے گا وہ گم راہ ہو جائے گا۔ پس تم کتاب اللہ کو پکڑے رہو، مضبوط تھامے رہو۔

آپ ﷺ نے کتاب اللہ پر عمل کرنے پر اُبھارا اور اس کی رغبت دلائی۔ اس کے بعد فرمایا: (دوسری چیز) میرے اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمھیں خدا کی یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمھیں خدا کی یاد دلاتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمھیں خدا کی یاد دلاتا ہوں۔ (مسلم شریف)

حوضِ کوثر

بیماری کے ایام ہی میں ایک روز آپ ﷺ منبر پر تشریف فرما ہوئے اور حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنے نبی کی موت سے ڈرتے ہو۔ کیا مجھ سے پہلے کوئی نبی اپنی اُمت میں ہمیشہ رہا جو میں رہتا۔ میں اپنے رب سے ملنے والا ہوں اور تم مجھ سے ملنے والے ہو۔ مَیں تمھیں پہلے پہل ہجرت کرنے والے مہاجرین کے ساتھ بھلائی کی وصیت کرتا ہوں، اور خود ان مہاجرین کو بھی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی کی وصیت کرتا ہوں۔ جناب باری جل وعلا کا فرمان ہے، قسم ہے زمانے کی، انسان سب گھاٹے اور نقصان میں ہیں، بجز ان لوگوں کے جو ایمان دار اور نیک کار ہیں اور ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ تمام کام اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوتے ہیں۔ کسی کام کی دیر تمھیں اس کی جلدی پر آمادہ نہ کردے۔ اللہ تعالیٰ کسی کی جلدی پر جلدی کرنے پر مجبور نہیں جو اللہ پر غالب ہونے کی کوشش کرے وہ خود ہی مغلوب ہو جاتا ہے اور جو خدا کو دھوکا دینے کی کوشش کرے وہ خود دھوکا کھا جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم اُلٹے پھر جاؤ اور زمین میں فساد پھیلاتے اور رشتہ داریاں توڑتے رہو۔ میں تمھیں انصار کے ساتھ بھی بھلائی سے پیش آنے کی وصیت کرتا ہوں یہی ہیں جنھوں نے تم سے پہلے (تمہارے لیے) گھر تیار کیا اور ایمان لائے۔ تم ان کے ساتھ احسان وسلوک ہی کرتے رہنا۔ کیا انھوں نے تمھیں اپنے پھلوں میں شریک نہیں کرلیا؟ کیا انھوں نے اپنے گھروں میں تمھارے لیے وسعت نہیں کردی؟ کیا باوجود اپنی ضرورتوں کے انھوں نے تمھیں خود پر ترجیح نہیں دی؟ تم میں سے جو شخص دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے پر مامور ہو اسے چاہیے کہ وہ ان میں سے بھلائی کرنے والے کی بھلائی کو قبول کرے اور ان میں سے بُرائی کرنے والے کی بُرائی سے تجاوز کرتا رہے۔ دیکھو ان پر کسی اور کو اختیار نہ کرنا۔ میں تم سے آگے جا رہا ہوں تم بھی میرے بعد میرے پیچھے ہی آرہے ہو۔ ہمارے ملنے کی جگہ حوضِ کوثر ہے تم میں سے جو چاہتا ہو کہ وہ کل (قیامت کو) مجھ سے حوضِ کوثر پر ملے اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ اور اپنی زبان کو اپنے قبضے میں رکھے، سوائے نیک کاموں کے ان سے کوئی اور کام نہ لے۔ لوگو! گناہوں سے خدا کی نعمتیں ہٹ جاتی ہیں متغیر ہو جاتی ہیں۔ لوگ جب تک نیک رہیں گے ان کے حکمران ان کی فرماں برداری کرتے رہیں گے مگر جب لوگ گناہ کرنے لگیں گے تو ان کے حکمران ان کے نافرمان ہو جائیں گے۔ (سیرت النبویة والآثار المحمدیه از سید احمد الزینی)

آخرت

حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول خدا ﷺ مرض الموت میں مسجد میں تشریف لائے اور آپ ﷺ کے سر میں پٹی بندھی تھی۔ ہم سب اس وقت مسجد ہی میں تھے۔ آپ ﷺ منبر کی طرف گئے اور اس پر تشریف فرما ہوئے۔ ہم منبر کے اردگرد بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ٹھیک یہاں سے اپنے حوض کوثر کو برابر دیکھ رہا ہوں۔ سُنو! ایک بندے پر دنیا اور اس کی زینت اور آخرت پیش کی گئی لیکن اس نے آخرت کو اختیار کیا۔

راوی کا بیان ہے اس فرمان کے نکتے تک کسی کی رسائی نہ ہوئی سوائے حضرت ابوبکرؓ کے۔ ان کی آنکھیں ساون بھادوں برسانے لگیں۔ اور زبان کہنے لگی کہ اللہ کے رسول ﷺ! نہیں نہیں، بلکہ ہم آپ پر اپنی ماؤں کو اپنے باپوں کو اپنی جانوں کو اور اپنے مال کو فدا کردیں گے پھر حضور اکرم ﷺ منبر پر سے اُتر آئے اس وقت سے لے کر آخری دم تک پھر کبھی آپ ﷺ منبر پر کھڑے نہیں ہوئے۔ (دارمی)

موت کا وقت

دم نزع انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے، آنحضور ﷺ نے ایک خطبے میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ ارشاد فرمایا:

بندۂ مومن کا جب دنیا سے جانے اور آخرت سے قریب ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ اس کے پاس آسمان سے فرشتے اُترتے ہیں چمکتے ہوئے نورانی سفید چہروں والے گویا ان کے چہرے سورج کی طرح منوّر ہیں۔ ان کے ساتھ جنت کے کفن اور جنت کی خوش بوئیں ہوتی ہیں۔ یہ سب اس سے حدِ نگاہ کے فاصلے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی وقت ملک الموت علیہ السلام تشریف لاتے ہیں اور مرنے والے کے سرہانے بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں اے پاک رُوح نکل اور چل اللہ کی مغفرت اور اس کی رضامندی کی طرف۔ آپ ﷺ نے فرمایا یہ سنتے ہی اس کی روح (آسانی کے ساتھ) جسم سے باہر ہو جاتی ہے جیسے مشک سے پانی کا قطرہ ٹپک جائے اور ملک الموت اسے تھام لیتے ہیں۔ جب ملک الموت اسے پکڑتے ہیں تو دوسرے فرشتے اسے ایک لمحہ کے لیے بھی ان کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے۔ وہ اسے لے کر اس کفن اور خوشبو میں لپیٹ لیتے ہیں، رُوئے زمین پر پائی جانے والی عمدہ ترین کستوری جیسی خوشبو اس سے نکلتی ہے۔ اب یہ فرشتے اُسے لے کر آسمان کی طرف چڑھتے ہیں اور فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی گزرتے ہیں وہ ان سے دریافت کرتے ہیں کہ یہ پاک روح کس کی ہے؟ یہ اس کا وہ بھلا نام بتلاتے ہیں جس سے وہ دنیا میں مشہور تھا۔ اسی طرح آسمان اوّل تک پہنچتے ہیں۔ اُسے کھولنے کو کہتے ہیں چنانچہ وہ اس کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ ہر آسمان کے مقرب فرشتے اگلے آسمان تک اس کے ساتھ چلتے ہیں حتیٰ کہ (اسی طرح) اسے ساتویں آسمان پر پہنچایا جاتا ہے۔ پھر جناب باری عزّ وجل فرماتا ہے میرے اس بندے کی کتاب علیین میں لکھ لو اور اسے اس کے جسم میں زمین کی جانب لوٹا دو اس کے بعد آپ ﷺ نے فرشتوں (منکر نکیر) کے ان سوالوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے جن کا بیان پہلے گزر چکا ہے اس کے پاس ایک بہت ہی

خوب صورت، بہترین لباس پہنے ہوئے، خوش بو سے مہکتا ہوا ایک شخص آتا ہے اور اس سے کہتا ہے بشارت ہو تجھے ہر اس چیز کی جس سے تو خوش ہو۔ یہی وہ دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا یہ اس سے پوچھتا ہے تو کون ہے؟ تیرا خوب صورت چہرہ اچھی خبر لایا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے کہ میں تیرا نیک عمل ہوں۔ اب تو یہ (مارے خوشی کے) کہنے لگتا ہے کہ الٰہی! قیامت جلدی قائم کر دے۔ الٰہی قیامت جلدی قائم کر دے تا کہ میں اپنے گھر والوں میں جا بیٹھوں اور اپنے مال کو پالوں۔ کافر بندہ جب دنیا سے جانے والا اور آخرت سے قریب ہونے والا ہوتا ہے تو (خوف ناک) سیاہ چہروں والے فرشتے (جہنمی) ٹاٹ لیے ہوئے آتے ہیں اور اس سے حد نگاہ کے فاصلے پر بیٹھ جاتے ہیں پھر ملک الموت آ کر اس کے سرہانے بیٹھ کر فرماتے ہیں۔ اے ناپاک خبیث روح نکل اور اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور غضب وغصہ کی طرف چل۔ یہ سنتے ہی وہ رُوح جسم میں ادھر ادھر چُھپنے لگتی ہے۔ ملک الموت علیہ السلام اسے اس طرح کھینچ لیتے ہیں جس طرح بھیگی ہوئی اون میں سے گوشت بھوننے کی سیخ کھینچی جاتی ہے۔ پس وہ اسے پکڑ لیتے ہیں۔ جب وہ اسے پکڑتے ہیں (دوسرے) فرشتے ایک لمحہ بھی اسے ان کے پاس نہیں چھوڑتے اور جہنمی ٹاٹ میں اسے لپیٹ لیتے ہیں اور روئے زمین پر پائے جانے والے کسی مُردار کی بدترین بدبو جیسی بدبو اس سے نکلتی ہے (فرشتے) اب اسے لے کر اوپر چڑھنے لگتے ہیں۔ فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی وہ گزرتے ہیں وہ ان سے پوچھتی ہے کہ یہ اتنی بُری بو کیسی ہے؟ یہ اس کا وہ بدترین نام بتا دیتے ہیں جس نام سے یہ دنیا میں مشہور تھا۔ اسی طرح وہ اسے لے کر آسمان دنیا تک پہنچ جاتے ہیں۔ دروازہ کھلوانا چاہتے ہیں لیکن کھولا نہیں جاتا۔ پھر رسولِ اکرم ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جاتے اور نہ یہ جنت میں جا سکتے ہیں۔ جب تک کہ سوئی کے ناکے میں اونٹ نہ چلا جائے۔ اسی وقت جناب باری کا فرمان صادر ہوتا ہے کہ اس کی کتاب سب سے نیچے کی زمین سجین میں لکھ لو۔ پھر وہیں سے اس کی روح پھینک دی جاتی ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: خدا کے ساتھ جس نے شرک کیا گویا کہ وہ آسمان سے گر گیا۔ اب خواہ اسے راستے ہی سے پرندے اُچک لیں یا ہوا اڑا کر کسی خطرناک دور دراز کے گڑھے میں پھینک دے۔ اب اس کی رُوح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے (پھر آپ ﷺ نے فرشتوں کے سوال اور اس کے جواب اور عذاب قبر کا بیان فرمایا جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے) پھر اس کے پاس نہایت ہی خوف ناک سیاہ شکل والا بدترین لباس پہنے ہوئے اور بدبو کے بھبکے اُڑاتا ہوا ایک شخص آتا ہے اور اس سے کہتا ہے: خوش خبری ہو تجھے ہر اس چیز کی جو تجھے بُری لگے، خوش خبری ہو تجھے اللہ کی طرف سے ذلّت ورسوائی اور مستقل عذاب کی۔ آج وہی دن ہے جس کا تجھ سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ وہ شخص کہتا ہے: بُرائی کی بشارت تجھی کو ہو، تو ہے کون؟ تیرا چہرہ بہت بدصورت ہے جو بُری چیز لے کر آیا ہے۔ وہ کہے گا: میں تیرا بُرا عمل ہوں۔ تو اللہ کی اطاعت میں دیر کرنے والا اور اس کی نافرمانی میں تیز تھا۔ اللہ تجھے اس کی بُری جزا دے۔ اس پر وہ شخص کہے گا: الٰہی! قیامت کو قائم نہ کر۔

موت کے بعد، قبر میں

ایک مرتبہ رسولِ خدا ﷺ نماز کے لیے مسجد میں تشریف لائے۔ صحابہؓ اس وقت کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ چوں کہ مسجد تھی اور سب لوگ نماز کے لیے جمع ہوئے تھے، اسی لیے آپ ﷺ کو یہ ہنسی ناگوار گزری۔ اس موقع پر آپ ﷺ نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اگر تم لذتوں کا قلع قمع کرنے والی موت کو پیش نظر رکھتے تو یہ موت تمھیں اس چیز سے ہٹا دیتی جو میں تم میں دیکھ رہا ہوں۔ ان لذتوں کا قلع قمع کر دینے والی موت کو کثرت سے یاد کرو۔ کیوں کہ قبر سے ہر روز آواز آتی ہے کہ میں غربت اور تنہائی کا گھر ہوں، خاک (میں ملا کر خاک بنا دینے) والا مکان ہوں۔ میں کیڑوں والا مسکن ہوں۔ پس جب کوئی مومن قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو اس سے کہتی ہے: مرحبا! آنا مبارک ہو، میری پشت پر چلنے پھرنے والوں میں سے تم مجھے زیادہ محبوب تھے، آج جب کہ تم مجھے ملے ہو میرا سلوک دیکھ لوگے۔ پھر اس کے لیے حدِ نظر تک فراخ ہو جاتی ہے۔ اور اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے اور جب کوئی بدعمل یا کافر دفن ہوتا ہے تو قبر اسے دُھتکار کر کہتی ہے: تجھے فراخی اور اکرام نصیب نہ ہو، میری پشت پر چلنے والوں میں تو مجھے سب سے زیادہ مبغوض تھا، آج جب کہ تو میرے قابو میں آیا ہے تجھے میرا سلوک معلوم ہو جائے گا۔ پھر قبر سمٹ کر اسے بھینچتی ہے حتیٰ کہ اس کی پسلیاں توڑ پھوڑ کر ایک دوسری میں داخل کر دیتی ہے۔

راوی بیان کرتا ہے کہ اس موقع پر آپ ﷺ نے ہاتھوں کی اُنگلیاں ایک دوسری میں ڈال کر بتایا کہ اس کی پسلیاں ایک دوسری میں اس طرح داخل ہو جائیں گی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

اور اس کے لیے ستّر ایسے زہریلے اژدھے مقرر کیے جاتے ہیں کہ ان میں ایک بھی اگر دنیا میں پھنکار مار جائے تو رہتی دنیا تک زمین پر کوئی چیز نہ اُگے۔ حشر تک وہ اژدہے اسے ڈستے اور نوچ نوچ کر کھاتے رہیں گے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

"اِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ "

قبر یا تو جنّت کے باغچوں میں سے ایک باغچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں کا ایک گڑھا ہے۔ (ترمذی)

عذابِ قبر

حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی کا انتقال ہو گیا۔ ہم ان کے جنازے میں گئے۔ آنحضرت ﷺ بھی ہمارے ساتھ تھے۔ قبرستان پہنچے تو ابھی (لحد) قبر تیار نہیں ہوئی تھی۔ حضور ﷺ بیٹھ گئے ہم بھی آپ ﷺ کے اردگرد بیٹھ گئے۔ ہم سب یوں خاموش اور بے حس وحرکت بیٹھے تھے گویا ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہیں۔ جناب رسول خدا ﷺ کے ہاتھ میں ایک تنکا تھا جسے آپ ﷺ زمین پر پھیر رہے تھے۔ سر جھکا ہوا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد آپ ﷺ نے سر اٹھایا اور

فرمایا: لوگو! عذابِ قبر سے خدا کی پناہ مانگو۔ دو یا تین مرتبہ یہ حکم دیا' پھر مندرجہ ذیل وعظ بیان فرمایا:

لوگ جب میت کو دفن کر کے لوٹتے ہیں ابھی ان کی جوتیوں کی آہٹ وہ سُن ہی رہا ہوتا ہے کہ اسے کہا جاتا ہے: اے شخص! بتلا تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ تیرا نبی کون ہے؟ ایک روایت میں ہے کہ اس کے پاس دو فرشتے منکر اور نکیر آتے ہیں' اسے بٹھاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: مرا رب اللہ ہے۔ فرشتے اس سے کہتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔ فرشتے کہتے ہیں: یہ شخص جو تمھاری طرف بھیجا گیا تھا کون ہے؟ وہ شخص کہتا ہے: وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ فرشتے اس سے پوچھتے ہیں: یہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟ وہ کہتا ہے: مَیں نے اللہ کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا اور اسے سچا جانا۔ ایک روایت میں مزید یہ ہے کہ یہی مطلب ہے اس آیت کا' جس میں فرمانِ خداوندی ہے کہ اللہ پاک ایمان والوں کو سچی اور مضبوط بات کے ساتھ ثابت قدم رکھتا ہے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اسی وقت آسمان سے پکارنے والا پکارتا ہے کہ میرے اس بندے نے سچ کہا ہے اس کے لیے جنتی فرش بچھا دو۔ اسے جنتی لباس پہنا دو۔ اس کی قبر میں سے جنت کی طرف دروازہ کھول دو۔ چنانچہ جنت کی تازہ ہوا اور خوش بو اسے پہنچنے لگتی ہے اور حدِ نگاہ تک اس کی قبر کشادہ ہو جاتی ہے۔ کافر کی موت اور اس موت کی سختی اور برائی بیان فرما کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ قبر میں اس کی روح اس کے جسم میں لوٹائی جاتی ہے اور اس کے پاس بھی دو فرشتے منکر نکیر آتے ہیں اُسے بٹھاتے ہیں اور اس سے سوال کرتے ہیں کہ تیرا رب کون ہے؟ وہ (گھبرا کر) کہتا ہے: ہائے ہائے میں تو نہیں جانتا۔ فرشتے پھر پوچھتے ہیں: تیرا دین کون سا ہے؟ وہ پھر کہتا ہے: ہائے ہائے میں تو نہیں جانتا۔ فرشتے پھر پوچھتے ہیں: ان کے بارے میں تو کیا کہتا ہے جو تم میں بھیجے گئے تھے؟ وہ کہتا ہے: ہائے ہائے میں یہ بھی نہیں جانتا۔ اسی وقت آسمان سے آواز آتی ہے کہ یہ جھوٹا ہے اس کے لیے جہنم کا بستر بچھا دو اسے جہنمی لباس پہنا دو اور اس کے لیے جہنم کی طرف دروازہ کھول دو۔ چنانچہ جہنم کی حرارت اور گرم ہوا اسے پہنچنے لگتی ہے اور اس کی قبر اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ دائیں جانب کی پسلیاں بائیں پسلیوں میں اور بائیں طرف کی دائیں طرف گھس جاتی ہیں۔ پھر اس کی قبر میں ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جو نابینا اور بہرہ ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں لوہے کا ایک گُرز (بڑا ہتھوڑا) ہوتا ہے کہ اگر وہ اسے کسی پہاڑ پر مار دے تو وہ مٹی بن جائے، اس سے وہ اسے مارتا ہے جس کی آواز مشرق و مغرب والے سب سنتے ہیں سوائے انسانوں اور جنوں کے۔ اس سے وہ مٹی بن جاتا ہے لیکن پھر اس میں روح لوٹائی جاتی ہے' (اور یہی عذاب اسے ہوتا رہتا ہے) (حوالہ)

قبر کی آزمائش

اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک یہودیہ عورت اللہ واسطے کچھ مانگنے کے لیے آئی اور کہا کہ مجھے کھلا دو' اللہ تعالیٰ تمھیں دجال کے فتنے سے اور قبر کے عذاب سے بچائے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ مجھے ایک خیال سا بندھ گیا۔ جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو میں نے بطور تعجب اس یہودیہ عورت کا یہ قول نقل کیا۔ اس پر آنحضرت ﷺ اسی وقت (واپس لوگوں کے مجمع میں جا کر) کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے (پہلے تو) آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے فتنۂ دجال اور عذابِ قبر سے پناہ مانگی۔ پھر یہ ارشاد فرمایا:

جہاں تک فتنۂ دجال کا تعلق ہے' ہر نبی اپنی امت کو اس فتنے سے ہوشیار کرتا رہا۔ مَیں تمھیں اس کے بارے میں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جو کسی اور نبی نے اپنی اُمت سے بیان نہیں کی' وہ نشانی یہ ہے کہ دجال کانا ہے اور اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے' اور اس کی آنکھوں کے درمیان ''کافر'' لکھا ہوا ہے جسے ہر مومن پڑھ لے گا۔ رہا فتنۂ قبر' تو وہاں میری ذات سے ان کی آزمائش کی جائے گی۔ اور میری بابت ان سے سوال کیا جائے گا نیک شخص کو اس کی قبر میں بٹھایا جاتا ہے آرام اور اطمینان سے' بغیر گھبراہٹ اور پریشانی کے۔ پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو اسلام کے بارے میں کیا کہتا تھا؟ پھر کہا جاتا ہے: یہ صاحب جو تمھارے درمیان تھے کون ہیں؟ وہ جواب دیتا ہے کہ آپ خدا کے رسول محمد ﷺ ہیں' ہمارے پاس خدائی دلیلیں لے کر آئے تھے۔ ہم نے آپ ﷺ کی تصدیق کی۔ اس پر اس کی قبر میں سے ایک کھڑکی دوزخ کی طرف کھل جاتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اس کا بعض حصہ بعض کو کھائے جا رہا ہے۔ اُسے کہا جاتا ہے کہ دیکھ اس کی طرف جس سے اللہ تعالیٰ نے تجھے نجات دی پھر اس کی قبر میں سے ایک دروازہ جنت کی طرف کھل جاتا ہے اور یہ خود اس کی تروتازگی اور جو کچھ اس میں ہے دیکھتا ہے۔ اس وقت اسے کہا جاتا ہے کہ تیرا ٹھکانا یہ ہے۔ تو یقین پر ہی زندہ تھا' یقین پر ہی مرا۔ اور ان شاء اللہ یقین پر ہی تو اٹھایا جائے گا۔ ہاں جب انسان بُرا ہوتا ہے اسے اس کی قبر میں بٹھایا جاتا ہے تو وہ گھبراہٹ اور پریشانی میں بے ہوش سا ہوتا ہے۔ اس سے پوچھا جاتا ہے تو کیا کہتا تھا؟ وہ جواب دیتا ہے کہ مَیں نے لوگوں کو کچھ کہتے سنا تھا وہی میں بھی کہتا تھا۔ اب اس کی قبر میں جنت کی طرف کھڑکی کھولی جاتی ہے' یہ اس کی نعمتوں اور راحتوں کو دیکھتا ہے تو اس سے کہا جاتا ہے دیکھ ان چیزوں کو جو اللہ نے تجھ سے دُور کر دیں۔ پھر اس کی قبر کا ایک دروازہ جہنم کی طرف کھولا جاتا ہے یہ اسے دیکھتا ہے کہ پانی کے تلاطم کی طرح آگ اوپر تلے ہو رہی ہے تو اسے کہا جاتا ہے کہ اب تیرا ٹھکانا یہی ہے۔ تُو شک پر تھا' شک میں مرا اور ان شاء اللہ تعالیٰ شک ہی پر قبر سے بھی اٹھے گا۔ پھر اسے عذاب شروع ہو جاتا ہے۔ (ابوداؤد۔ بیہقی)

حشر میں احتساب

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول خدا ﷺ نے کھڑے ہو کر مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا' جس میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو افتراق اور دنیوی عیش و عشرت میں منہمک ہونے سے بچنے کی تلقین کی۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

اے لوگو! تم اللہ کے پاس ننگے پیر' برہنہ تن' بے ختنہ ہوئے زندہ ہو کر جمع ہو گے (جیسا کہ فرماتا ہے) جس طرح ہم نے پہلی پیدائش شروع کی تھی ہم اسے دوبارہ پیدا

کریں گے یہ وعدہ ہے کہ ہم ضرور کریں گے۔ آگاہ ہو جاؤ' قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیم کو لباس پہنایا جائے گا۔ آگاہ رہو' میری اُمّت کے کچھ لوگ بائیں طرف سے لائے جائیں گے' تو میں کہوں گا: اے پروردگار! یہ میرے ساتھی ہیں۔ جواب ملے گا: تو نہیں جانتا کہ انھوں نے تیرے بعد کیا کچھ کیا ہے۔ تو میں بھی وہی کہوں گا جو اللہ کا نیک بندہ حضرت عیسیٰؑ کہے گا کہ جب تک میں ان میں موجود تھا ان کے اعمال دیکھتا رہا۔ جب تُو نے مجھے ان سے بالکل جُدا کر لیا پھر تُو ہی ان کا نگہبان تھا اور تُو ہر چیز پر شاہد ہے۔ اگر انھیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر بخش دے تو تُو غالب حکمت والا ہے۔ مجھے جواب ملے گا کہ تیرے بعد یہ لوگ برابر ایڑیوں کے بل پیچھے کو پھر گئے تھے۔ (مسلم شریف)

حشر میں شفاعت رسول (ﷺ)

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں: ایک روز رسول خدا ﷺ نے نماز فجر پڑھائی اور وہیں بیٹھے رہے۔ جب خوب دن چڑھ آیا تو آپ ﷺ ہنسے' لیکن وہیں بیٹھے رہے' یہاں تک کہ ظہر کی نماز پڑھی۔ پھر عصر' مغرب اور عشا کی نمازیں ادا کیں مگر کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ گھر جانے لگے تو صحابہؓ نے مجھ سے کہا: آپ حضور ﷺ سے پوچھیں آج کیا بات ہے؟ اس طرح تو کبھی نہیں ہوا..... حضور ﷺ نے یہ سنا' تو قبل اس کے کہ صدیق اکبرؓ کچھ سوال کرتے' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

دنیا کے بارے میں جو کچھ ہونے والا ہے وہ اور آخرت آج میرے سامنے پیش کی گئی سارے اگلے پچھلے انسان ایک چٹیل میدان میں جمع کیے گئے۔ پسینے ان کے منہ تک پہنچنے کو تھے کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس گئے اور کہا اے آدمؑ! آپ انسانوں کے باپ ہیں آپ کو خدا تعالیٰ نے برگزیدہ بنایا۔ آپ خدا کے پاس ہماری سفارش کے لیے تشریف لے جایئے۔ لیکن حضرت آدمؑ نے فرما دیا کہ آج میں بھی تمھاری طرح مبتلا ہوں تم اپنے اس باپ کے بعد کے باپ حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو' نوحؑ کو اور آلِ ابراہیمؑ کو اور آل عمران کو برگزیدہ بنایا ہے اور سارے جہان پر انھیں عزّت دی ہے۔ اب یہ سب حضرت نوحؑ کی طرف جائیں گے اور ان سے کہیں گے: آپ خدا سے ہماری سفارش کیجیے کیوں کہ آپ خدا کے پیارے ہیں آپ کی دعا قبول فرما کر جناب باری نے روئے زمین پر کوئی کافر نہ چھوڑا۔ لیکن وہ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس قابل نہیں تم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جاؤ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیل بنایا ہے۔ چنانچہ سب لوگ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے پاس جائیں گے' لیکن وہ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس قابل نہیں تم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ جن سے اللہ تعالیٰ نے (بے واسطہ) بات چیت کی تھی۔ سب اہل محشر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے وہ بھی یہی جواب دیں گے کہ میں اس منصب کے لائق نہیں تم حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے پاس جاؤ وہ مادرزاد گونگے کو اور کوڑھیوں کو (بحکم خدا) اچھا بھلا کر دیتے تھے اور مُردوں کو (بحکم خدا) زندہ کر دیتے تھے۔ لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی یہی جواب دیں گے اور فرمائیں گے: تم اولاد آدم کے سردار کے پاس جاؤ وہی ہیں جو سب سے پہلے اپنی قبر سے نکلے ہیں جاؤ محمد ﷺ کے پاس جاؤ کہ وہ تمھارے رب کے ہاں تمھاری سفارش کریں۔ چنانچہ سب لوگ میرے پاس آئیں گے، میں جبرئیلؑ کے پاس جاؤں گا۔ جبرئیلؑ اللہ تعالیٰ کے پاس جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: جاؤ انھیں شفاعت کی اجازت دو اور جنّت کی خوش خبری بھی سنا دو۔ حضرت جبرئیلؑ سے یہ خوش خبری سن کر میں سجدے میں گر پڑوں گا۔ تقریباً ایک ہفتے تک سجدے میں پڑا رہوں گا پھر اللہ تبارک وتعالیٰ مجھ سے فرمائے گا۔ اے محمد (ﷺ)! اپنا سر اٹھاؤ' کہو تمھاری سنی جائے گی' سفارش کرو قبول کی جائے گی۔ آپ ﷺ اپنا سر اٹھائیں گے اور جناب باری کی طرف نظر کر کے پھر سجدے میں چلے جائیں گے بقدر جمعہ سے جمعہ تک پھر سجدے میں پڑے رہیں گے۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ فرمائے گا۔ اے محمد (ﷺ)! سر اٹھایئے' کہیے آپ کی بات سنی جائے گی' شفاعت کیجیے آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ میں اس نعمت پر پھر سجدے میں جانا چاہوں گا لیکن حضرت جبرئیلؑ میرے بازو تھام لیں گے۔ اب اللہ تعالیٰ مجھے وہ دعائیں سکھائے گا جو کسی انسان کو نہیں سکھائیں۔ پس آپ کہیں گے اے اللہ! تو نے مجھے تمام اولاد آدم کا سردار بنایا اور مجھے اس پر کوئی فخر نہیں' مجھے تو نے سب سے پہلے قبر سے اٹھانے والا بنایا اس پر بھی مجھے کوئی فخر نہیں (چنانچہ اب میں شفاعت کروں گا) اس کے بعد میرے حوض پر لوگ آنا شروع ہوں گے جو صنعا سے لے کر ایلہ سے بھی زیادہ وسعت والا ہوگا۔ پھر کہا جائے گا کہ صدیق لوگوں کو بلاؤ وہ بھی شفاعت کریں۔ پھر کہا جائے گا نبیوں کو بلاؤ۔ انبیا آنا شروع ہوں گے۔ کسی کے ساتھ تیس چالیس آدمی ہوں گے' کسی کے ساتھ پانچ کسی کے ساتھ چھ کسی نبی کے ساتھ ایک بھی نہ ہوگا۔ پھر کہا جائے گا: شہیدوں کو بلاؤ کہ جس کی چاہیں شفاعت کریں۔ جب شہید یہ کر لیں گے تو جناب باری جل وعلا فرمائے گا: میں ارحم الراحمین ہوں (حکم دیتا ہوں کہ) جن لوگوں نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کیا ان سب کو جنّت میں پہنچا دو۔ چنانچہ ایسے لوگ جنّت میں داخل ہو جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: دیکھو جہنم میں کوئی ایسا بھی ہے جس نے کبھی بھی کوئی بھلا کام کیا ہو؟ دیکھیں گے تو ایک شخص کو پائیں گے اس سے سوال ہوگا کہ تو نے کبھی کوئی نیکی کی ہے؟ وہ کہے گا ہاں صرف یہ کہ میں بیوپار میں بہت نرمی کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے اس بندے سے بھی نرمی کرو جیسے یہ میرے بندوں سے نرمی کرتا تھا۔ اتنے میں ایک اور آدمی دوزخ سے نکلے گا اس سے پوچھا جائے گا: تو نے بھی کبھی کوئی نیک عمل کیا تھا؟ وہ کہے گا نہیں سوائے اس کے کہ میں نے اپنی اولاد سے کہا تھا کہ جب میں مر جاؤں تو تم مجھے جلا دینا پھر میری خاک کو پیس ڈالنا حتیٰ کہ جب میں سرمے کی طرح ہو جاؤں تو سمندر کے کنارے جا کر تیز ہوا میں مجھے اڑا دینا۔ اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا: تو نے ایسا کیوں کیا؟ وہ کہے گا: فقط تیرے ڈر سے۔ جناب باری فرمائے گا: دیکھو سب سے بڑا ملک دیکھ لو تیرے لیے وہ ہے اور ویسے ہی دس ملک اور۔ تو وہ کہے گا کہ الٰہی! تو مجھ سے مذاق کیوں کر رہا ہے؟ تُو تو مالک

ہے۔اسی چیز نے صبح مجھے ہنسادیا تھا۔(مُسند احمد)

شفاعت رسول ﷺ

قریش کے بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ آنحضور ﷺ کے رشتہ دار ہیں اور اس سبب سے آخرت میں وہ شفاعت رسول ﷺ کے مستحق ہوں گے۔اس تصوّر کے پیشِ نظر ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اپنے قریبی رشتہ داروں' اہل خاندان اور بعض قریبی قبائل کو جمع کیا اور ان کے سامنے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اے عبدمناف کے بیٹو! تم اپنے آپ کو خدا کی آگ سے نکالنے کا انتظام کرو میں تمھیں خدا کے سامنے کچھ بھی نفع اور نقصان نہ پہنچاسکوں گا۔اے قصی کی اولاد' اے عبدالمطلب کی' تم بھی اپنے کو آگ سے بچاؤ میں خدا کے سامنے تمھارے لیے کچھ نہ کرسکوں گا۔اور اے صفیہ (رسولِ خدا ﷺ کی پھوپھی) اور اے فاطمہ (رسولِ خدا محمد ﷺ کی بیٹی) تم بھی اپنے کو آگ سے بچاؤ کہ میں خدا کے ہاں تمھارے لیے کچھ نہ کرسکوں گا۔ہاں دنیا میں تو میری رشتہ داری ہے اور میں اس کا حق ادا کرتا ہوں۔ (ترمذی)

شفاعت رسول ﷺ

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول خدا ﷺ نے ایک بار منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ کی رشتے داری آپ ﷺ کی قوم کو کچھ نفع نہ دے گی؟ ہاں سنو' میری رشتے داری دنیا آخرت میں ملی ہوئی ہے۔لوگو! میں حوض کوثر پر تم سب کا میر سامان ہوں۔جب تم آؤ گے تو لوگ مجھ سے کہیں گے کہ یارسول اللہ ﷺ! میں فلاں کا بیٹا ہوں' یارسول اللہ ﷺ! میں فلاں بن فلاں ہوں۔میں جواب دوں گا کہ ہاں نسب تو پہچان لیا لیکن تم نے میرے بعد بدعتیں نکال لی تھیں اور پچھلے پیروں لوٹتے گئے تھے۔(مُسند احمد)

حوضِ کوثر پر

اُم المومنین حضرت اُمِ سلمہؓ فرماتی ہیں کہ میں لوگوں سے حوضِ کوثر کے متعلق سنا کرتی تھی لیکن آنحضرت ﷺ کی زبانِ مبارک سے اس بارے میں سننے کا موقع نہیں ملا تھا۔ایک دن مشاطہ میرے بال گوندھ رہی تھی کہ مجھے آپ ﷺ کی آواز سنائی دی:

(اے لوگو!) میں نے مشاطہ سے کہا چھوڑ دو کہ آپ ﷺ کا وعظ سن سکوں۔ میں نے کان لگا کر سنا تو آپ ﷺ فرمارہے تھے:

میں حوض (کوثر) پر تمھارا پیش رُو ہوں۔خبردار! تم ایسے نہ بنو کہ میرے پاس آنا چاہو تو اس طرح دُور ہٹا دیے جاؤ جیسے پرایا اُونٹ' اور جب میں دریافت کروں کہ ان سے یہ سلوک کیوں ہورہا ہے' تو مجھے جواب دیا جائے کہ آپ ﷺ کے بعد انھوں نے جو وتیرہ اختیار کیا تھا آپ ﷺ کو معلوم نہیں۔اور میں بھی کہوں کہ ہلاک ہو جائیں۔(مُسلم شریف)

کتاب اللہ

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے مندرجہ ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:

اے لوگو! میں تم سب کے لیے (قیامت کے دن کا انتظام کرنے کے لیے) آگے جانے والا ہوں۔میرے حوض کوثر پر تم سب آنے والے ہو' جس کی چوڑائی صنعا سے لے کر بصرہ تک کی ہے۔اس میں آسمان کے ستاروں جتنے چاندی کے کوزے رہے ہیں۔جب تم حوضِ کوثر پر میرے پاس آؤ گے میں اُس وقت تم سے دو اہم چیزوں کے بارے میں سوال کروں گا۔پس نگاہ رکھو تم ان دونوں کے بارے میں میرے بعد کیسی کارروائی کرتے ہو؟ سب سے بڑی اہم اور وزنی چیز تو کتاب اللہ قرآن کریم ہے (جو خدائی رسّی ہے) جس کا ایک سرا خود خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا تمھارے ہاتھوں میں ہے۔پس تم کتاب اللہ کو مضبوط تھامے رہو' اس سے اِدھر اُدھر نہ ہونا' نہ اس میں کوئی تبدیلی کرنا۔اور (دوسری چیز) میرا خاندان اور میرے اہل بیت ہیں' اللہ تعالیٰ جو باریک بیں اور باخبر ہے مجھے خبر دے چکا ہے کہ یہ دونوں (یعنی کتاب اللہ اور میرے اہل بیت) الگ الگ نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس میرے حوضِ کوثر پر آئیں۔(کنزالعمال)

پانچ اہم خطبات

کوہِ صفا کا خطبہ

سورۂ شعرا کی یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾

''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے''

تو رسول اللہ ﷺ نے عربوں کی روایت کے مطابق کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کو پکارا: ''لوگو! دوڑو'' اہل مکہ گھبرا گئے اور اس طرف لپکے۔ عموماً کسی ایمرجنسی کے موقع پر اس طرح لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ لوگ جمع ہو گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اے فُلاں کی اولاد اے فُلاں کی اولاد اے فُلاں کی اولاد اے عبد مناف کی اولاد اے عبدالمطلب کی اولاد کیا خیال ہے اگر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ اس پہاڑ کے دامن میں سواروں کا ایک لشکر آ نکلا ہے تو تم مجھے سچا سمجھو گے؟ سب نے کہا ہمیں آپ سے کبھی جھوٹ کا تجربہ نہیں ہوا۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

اے کعب بن لوی کی اولاد! اپنے تئیں جہنم کی آگ سے بچالو۔ اے مرّہ بن کعب! تم بھی خود کو دوزخ کی آگ سے بچالو۔ اے اولادِ عبد شمس! تم بھی خود کو آتشِ دوزخ سے بچالو۔ اے عبدِ مناف کے خاندان والو! تم بھی اپنے تئیں آگ سے بچالو۔ اے بنو ہاشم! تم بھی خود کو آگ سے بچاؤ' اے عبدالمطلب کے اہل خاندان! اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ' اے میری پیاری بچی فاطمہؓ! تم بھی اپنے تئیں دوزخ سے بچالو کیوں کہ تمھارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا مختار نہیں ہوں بجز اس کے کہ میری تم سے قرابت داری ہے تو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ ایک روایت میں ہے (آپ ﷺ نے فرمایا) اے فاطمہ بنت محمد ﷺ! اے صفیہ بنت عبدالمطلب' اے بنی عبدالمطلب' اے عباس بن عبدالمطلب! مَیں تمھارے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز کا مختار نہیں ہوں بجز اس کے کہ میری تم سے قرابت داری ہے۔ سو میں اس کا حق ادا کرتا رہوں گا۔ البتہ میرے مال میں سے جتنا چاہو مانگ لو۔ اے گروہ قریش! اپنی جانیں اللہ سے خرید لو مَیں اللہ کی کسی چیز سے تمھیں مستغنیٰ نہیں کر سکتا میں تو ایک سخت عذاب سے پہلے تمھیں اس سے ڈرانے والا ہوں۔ میری اور تمھاری مثال اس شخص کی سی ہے جس نے دشمن کو دیکھ لیا ہو اور وہ اپنے اہل خاندان کا دیدبان بن جائے' اسے خدشہ محسوس ہو کہ وہ (اہل خاندان) دشمن کی طرف بڑھ جائیں گے۔ چنانچہ وہ پکارنے لگے: لوگو! ہوشیار ہو جاؤ

اس مجمع میں ابولہب بھی موجود تھا' حضور ﷺ کے ارشادات سن کر وہ بہت سیخ پا ہوا آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''تیرا برا ہو' تو ہلاک ہو' کیا تو نے ہمیں اس لیے جمع کیا تھا؟'' اسی طرح اول فول بکتا ہوا وہ وہاں سے چلا گیا۔ آپ ﷺ نے اس کا جواب نہیں دیا بعد ازاں سورۂ لہب نازل ہوئی جس میں ابولہب اور اس کی بیوی کو عذاب کی وعید سنائی گئی۔

(اس خطبے کے الفاظ مختلف حدیثوں میں بکھرے ہوئے ہیں' یہاں انھیں یک جا کر دیا گیا ہے)

پہلا خطبۂ جمعہ

ربیع الاول پہلی ہجری میں آنحضور ﷺ نے قبا میں تقریباً چار دن قیام فرمانے کے بعد جمعۃ المبارک کو اپنے رفقا سمیت مدینے کا رخ کیا۔ جب آپ ﷺ ناقہ پر سوار محلہ بنو سالم میں پہنچے تو جمعہ کا وقت ہو گیا۔ حضور ﷺ نے یہیں جمعہ کی نماز ادا فرمائی اور نماز سے پہلے خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ آپ ﷺ کی پہلی نماز جمعہ اور پہلا خطبہ جمعہ تھا۔ اسے ''خطبۂ تقویٰ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ یہ ہے:۔

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں میں اس کی تعریف کرتا ہوں اور اسی سے مدد اور بخشش اور راہ نمائی چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اسی پر ہے۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور نافرمانی کرنے والوں سے عداوت رکھتا ہوں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ سوا اللہ کے کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ یکتا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں جنھیں اس نے ہدایت' نور اور نصیحت دے کر اس وقت بھیجا جب مدتوں سے نبیوں کی آمد کا سلسلہ بند تھا۔ علم گھٹ گیا تھا اور لوگ گم راہ ہو گئے تھے۔ طویل عرصہ گزر گیا تھا۔ قیامت قریب تھی اور اجل بہر پر منڈلا رہی تھی۔ جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی وہ کام یاب ہوا اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی وہی گم راہ ہوا' درجہ سے گرا اور دُور کی گم راہی میں مبتلا ہوا۔

مَیں تمھیں اللہ سے ڈرنے کی وصیّت کرتا ہوں اور بہترین تاکید وہ ہے جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو آخرت کے لیے آمادہ کرے اور اللہ سے ڈرنے کا حکم دے۔ حق تعالیٰ سے ڈرتے رہو' جیسے کہ خود اس نے تمھیں اپنی ذات سے ڈرتے رہنے کی ہدایت فرمائی ہے' نہ تو اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت ہے' نہ اس سے افضل کوئی ذکر ہے' جان لو کہ آخرت کی جن بھلائیوں کے تم اُمیدوار ہو وہ سب موقوف ہیں ان نیک اعمال پر جو تم خوف خدا اور تقویٰ سے بجا لاؤ اور جو شخص صرف رضائے الٰہی کی جستجو میں اپنے ان تمام کاموں اور ارادوں کی اصلاح کر لے جو اس کے اور خدا کے درمیان

ہیں خواہ وہ پوشیدہ اُمور ہوں خواہ ظاہری۔ تو رب العالمین اسے دنیا میں نیک نام نیک انجام کر دے گا اور آخرت میں بھی اسے نیکیوں کا ذخیرہ عطا فرمائے گا۔ یہی وہ وقت ہوگا جب انسان اپنی نیکیوں کا سخت تر محتاج ہوگا اور نیکیوں کے سوا اور اعمال سے اسے اس روز اس قدر نفرت ہوگی کہ کہے گا کاش کہ میرے اور ان نکمے اعمال کے درمیان بے حد وغایت فاصلہ اور دُوری ہوتی۔ جناب باری تبارک وتعالیٰ تمھیں خود اپنی ذات گرامی سے ڈرا رہا ہے۔ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ جس نے اس کی بات کو سچ جانا اور اس کا وعدہ پورا کیا اس کے لیے اس کے خلاف نہ کیا جائے گا کیوں کہ اللہ عزّ وجلّ کا فرمان ہے کہ میرے ہاں کی باتیں بدلتی نہیں' اور نہ میں اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا ہوں۔ پس اللہ ربّ العزّت سے ڈرو دنیوی معاملات میں بھی اور اُخروی معاملات میں بھی' پوشیدہ بھی اور علانیہ بھی۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے جو ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرما دے گا اور اس کے اجر کو بڑھا دے گا۔ جو اللہ سے ڈرا اس نے عظیم کام یابی حاصل کر لی۔ اللہ کا ڈر اس کی بیزاری' اس کے عذاب اور اس کی ناراضی کو دور کر دیتا ہے اور اللہ کا ڈر چہرے کو منور کر دیتا ہے رب کو راضی کر دیتا ہے' درجات کو بلند کر دیتا ہے اپنا حصہ لے لو۔ خدا کی قربت حاصل کرنے میں کمی نہ کرو۔ اس نے اپنی پاک کتاب تمھیں سکھا دی۔ تمھارے لیے ہدایت کا راستہ کھول دیا' تاکہ وہ جان لے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں۔ جس طرح خدا نے تمھارے ساتھ احسان و سلوک کیا ہے تم بھی احسان وسلوک کا رویہ اختیار کرو۔ اللہ کے دشمنوں سے دشمنی رکھو۔ راہ خدا میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ اسی نے تمھیں برگزیدہ بنایا ہے اسی نے تمھارا نام مسلم رکھا ہے' تاکہ ہر ہلاک ہونے والا دلائل دیکھ لینے کے بعد ہلاک ہو اور ہر زندگی حاصل کرنے والا بھی دلائل کے ساتھ زندہ رہے۔ قوت صرف اللہ ہی کی ہے۔ اللہ کا ذکر بکثرت کیا کرو۔ جو موت کے بعد کام آئیں وہ اعمال کر لو جو اللہ تعالیٰ کے اور اپنے درمیان کے تعلقات سنوار لے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اور لوگوں کے تعلقات سنوار دے گا۔ کیوں کہ خدائے بزرگ و برتر کی لوگوں پر چلتی ہے' لوگوں کی اس پر نہیں چلتی۔ وہ تمام مخلوق پر حاکم اور سب کا مالک ہے مگر وہ اس کی کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے اور تمام قوتیں اور طاقتیں اسی خدائے بزرگ و برتر کی ہیں۔ (طبری' قرطبی' مواہب اللدنیہ)

فتح مکہ کے موقع پر

فتح مکہ کے موقع پر رسول خدا ﷺ نے جو کچھ ارشاد فرمایا' اسے مختلف راویوں نے بیان کیا ہے (بخاری' مسلم) ابوداؤد' ابن ماجہ اور ابن کثیر میں مذکور آپ ﷺ کے ارشادات ذیل میں یک جا پیش کیے جا رہے ہیں۔

حمد وثنا کے بعد فرمایا:

اس شہر مکہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود ہی ذی حُرمت، باعزت، متبرک اور مبارک بنایا ہے نہ کہ لوگوں نے۔ جو اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اسے یہاں خون بہانا حلال نہیں نہ یہاں کا درخت کاٹنا حلال ہے۔ اگر کوئی میرے آج کے جہاد کو دلیل بنا کر رخصت نکالنا چاہے تو تم اسے جواب دینا کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اجازت دے دی تھی لیکن تمھیں اس نے اجازت نہیں دی۔ مجھے بھی اللہ نے دن میں بس گھڑی بھر کے لیے رخصت دی تھی اس وقت مکہ کی حُرمت ویسی ہی لوٹ آئی ہے جیسی کل تھی تم میں سے جو موجود ہیں ان پر فرض ہے کہ جو حاضر نہیں ان تک میرا یہ خطبہ پہنچا دیں۔ (متفق علیہ)

"اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ بَیْعَ الْخَمْرِ وَالْمَیْتَةِ وَالْخِنْزِیْرِ وَ الْاَصْنَامِ ."

"اللہ تعالیٰ نے شراب کی' مُردار کی' سؤر کی اور بتوں کی تجارت حرام کر دی ہے۔"

اس پر کسی نے سوال کیا: حضور ﷺ! مردار کی چربی کی بابت کیا حکم ہے؟ اس سے کشتیاں روغن کی جاتی ہیں' کھالوں پر لگائی جاتی ہے اور لوگ اس سے چراغ جلاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"لَاھُوَ حَرَامٌ۔ قَاتَلَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْھِمْ شُحُوْمَھَا اَجْمَلُوْہُ ثُمَّ بَاعُوْہُ فَاَکَلُوْا ثَمَنَہٗ ."

"نہیں' وہ بھی حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ یہود کو غارت کرے' جب اللہ تعالیٰ نے ان پر چربیاں حرام کیں تو انھوں نے اسے پگھلایا' پھر اسے بیچ ڈالا اور اس کی قیمت کھا گئے۔"

لوگو! جاہلیّت کی بڑائی اور باپ دادوں پر فخر کرنے کی بُرائی تم سے دُور کر دی ہے۔ انسانوں کی اب دو ہی قسمیں ہیں یا تو وہ نیک اور پرہیزگار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں معزز۔ یا بد اور غیر متقی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ذلیل۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں شاخوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت اور پہچان رہے۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ شریف اور معزز وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ اللہ تعالیٰ باعلم اور باخبر ہے (پھر نبی ﷺ نے فرمایا) لوگو! مجھے یہی کہنا تھا میں اللہ تعالیٰ سے اپنے لیے اور تمھارے لیے استغفار کرتا ہوں۔ (ابن کثیر)

اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ اکیلا ہے' اس نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا۔ اپنے بندے کی مدد فرمائی اور مخالف طاقتوں کو اُسی اکیلے نے شکست دی۔ سُنو! جاہلیت کے کل شعبے جو خون اور مال کے بارے میں مذکور ہیں اور کہے جاتے ہیں سب کو آج اپنے پاؤں تلے روندر ہا ہوں۔ ہاں زمزم کا پانی پلانا اور بیت اللہ کی پاسبانی کرنا اپنی جگہ باقی ہے ان دونوں کو میں پہلے کی طرح ان کے لیے جن کے پاس یہ ہیں باقی رکھتا ہوں۔ خطا اور غلطی سے کوئی کسی کو مار ڈالے مثلاً کوڑا مارا' لکڑی ماری اور وہ مر گیا یہ مشابہ ارادی قتل کے ہے۔ اس کی دیت ایک سو اونٹ ہے جن میں چالیس گابھن اُونٹنیاں ہوں۔

(ابوداؤد۔ ابن ماجہ)

عورت اپنے خاوند کی دیت اور مال میں میراث پائے گی اور خاوند بھی عورت کی دیت اور مال میں سے میراث پائے گا جب تک انھی میں سے کوئی دوسرے کو قتل نہ کر دے۔ جب ان میں سے ایک دوسرے کو غلطی سے قتل کر دے تو وہ اس کے مال کا وارث تو ہوگا مگر دیت کا وارث نہ ہوگا۔ (ابن ماجہ)

اے لوگو! اسلام میں جتھا بنانے کے لیے معاہدہ کی اجازت نہیں البتہ جو معاہدے جاہلیت میں ہو چکے ہیں (اور اب دونوں طرف کے لوگ مسلمان ہو گئے ہیں) تو اسلام انھیں (توڑتا نہیں بلکہ انھیں) اور بھی مضبوط کر دیتا ہے۔ مومن غیروں کے مقابلے میں ایک ہاتھ کی طرح متفق ہیں۔ کوئی ادنیٰ مسلمان بھی کسی کافر کو پناہ دے سکتا ہے، دور والوں کے مال غنیمت میں ان کا بھی حصہ ہے۔ ان کے لشکری ان کے گھر بیٹھے ہوؤں کو حصہ دیں گے۔ مسلمان کافر کے بدلے قتل نہ کیا جائے گا۔ کافر کی دیت مسلمانوں کی دیت سے نصف ہوگی۔ زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے مال داروں کو اپنی جگہ نہ بلواؤ۔ نہ مال دار اپنی جگہ سے دُور چلے جائیں بلکہ زکوٰۃ ان کے گھروں، ان کے باڑوں، ان کے جانوروں کے رہنے سہنے کی جگہ پر ہی لی جائے۔ (ابوداؤد)

خطبہ تبوک

غزوۂ تبوک رسول کریم ﷺ کا آخری غزوہ ہے۔ چوں کہ کچھ دنوں سے حجاز میں سخت قحط تھا اور صحابہؓ بڑی تنگ دستی اور عُسرت میں مبتلا تھے، اس لیے اس غزوے کو غزوۃ العُسرۃ اور جیش العُسرۃ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ خطبہ آپ ﷺ نے تبوک کے مقام پر غزوے کے موقع پر ماہ رجب 9 ہجری میں ارشاد فرمایا تھا۔ یہ خطبہ حمد باری تعالیٰ کے بعد صرف پچاس مختصر فقروں پر مشتمل ہے، مگر ہر فقرہ ایک گوہر آبدار، ایک ضرب المثل، اور حضرت افصح العرب والعجم ﷺ کی پیغمبرانہ فصاحت و بلاغت کا ایک بے مثال نمونہ ہے۔ یہاں خطبے کے اصل عربی متن کے ساتھ ساتھ اردو اور انگریزی ترجمہ بھی، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کے شکریے کے ساتھ پیش ہے:

اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

1: فان اصدق الحديث كتاب الله

بلاشبہ سب سے زیادہ سچی بات اللہ کی کتاب (قرآن) ہے

Well, verily the most veracious discourse is the Book of Allah.

2: واوثق العرى كلمة التقوى

اور سب سے مضبوط حلقہ زنجیر تقویٰ کا ایک لفظ ہے۔

The most trustworthy handhold is the word of piety.

3: وخير الملل ملة ابراهيم

اور بہترین ملت ابراہیمؑ کی ملت ہے۔

The best religious Community is the Community of Abraham.

4: وخير السنن سنة محمد

اور بہترین سنت محمد ﷺ کی سنت ہے۔

The best of the precedents is the precedent of Muhammad (p.b.u.h)

5: واشرف الحديث ذكر الله

اور سب سے اشرف بات اللہ کی یاد ہے۔

The noblest speech is a word spoken in rememberance of Allah.

6: واحسن القصص هذا القرآن

اور سب سے اچھا قصہ یہ قرآن (مجید) ہے۔

The finest of the narratives is this Quran.

7: وخير الأمور عوازمها

اور سب سے اچھا کام وہ ہے جو پوری توجہ کے ساتھ صحیح طور پر کیا جائے۔

The best of the affairs is that which is pursued with firm determination.

8: وشر الامور محدثاتها

اور سب سے بُرا کام وہ ہے جو اصل کام پر نیا اضافہ (یعنی بدعت) ہو۔

The worst in religion are those things which are newly introduced without sanction.

9: احسن الهدى هدى الأنبيأ

اور سب سے اچھی راہ، انبیا کی راہ ہے۔

The best of the ways is the one trodden by the Prophets.

10: وأشرف الموت قتل الشهداء

اور سب سے زیادہ اشرف موت شہیدوں کی موت ہے۔

The noblest death is the death of martyr.

11: وأعمى العمى الضلالة بعد الهدى

سیدھی راہ پالینے کے بعد گم راہی سب سے بڑی بے صبری ہے۔

The worst blindness is straying from the right path after receiving true guidance.

12: وخير الاعمال مانفع

سب سے اچھا عمل وہ ہے جو نفع پہنچائے۔

The best of actions is that which is beneficent.

13: وخير الهدى ماتبع

اور سب سے اچھا طریقہ وہ ہے جس کی اتباع کی جائے۔

The best guidance is that which is put into practice.

14: وشر العمى عمى القلب

اور بہت بڑی نابینائی ہے دل کی نابینائی۔

The worst blindness is the blindness of the heart.

15: واليد العليا خير من اليد السفلى

اور اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے ہاتھ (لینے والا) سے بہتر ہے۔

The upper hand is better than the lower hand. (The hand which gives charity is better than the one which receives it.)

16: وما قل وكفى خير مما كثر والهى

جو مال کم ہو اور ضرورت کے لیے کافی ہو جائے، وہ اس مال سے بہتر ہے جو بہت ہو اور غافل کر دے۔

The little that suffices is better than what is abundant but tends to make one oblivious of God.

17: شر المعذرة حين يحضر الموت

انتہائی بُری توبہ اس وقت کی توبہ ہے جب موت سامنے آ جائے۔

The worst apology is that which is tendered when death stares one in the face.

18: وشر الندامة يوم القيامة

اور سب سے بُری ندامت وہ ہے جو قیامت کے دن ہوگی۔

The worst remorse is that which is felt on the Day of Resurrection.

19: ومن الناس من لا يأتي الجمعة الا دبرا

اور کچھ لوگ وہ ہیں جو جُمعہ میں نہیں آتے، مگر بڑی دیر سے۔

Some people do not come to Friday prayers except with hesitance and delay.

20: ومنهم من لا يذكر الله الا هجرا

اور کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کو نہیں یاد کرتے مگر کبھی کبھی

And some of them do not remember Allah except at long intervals and without full devotion.

21: ومن اعظم الخطايا اللسان الكذاب

اور بہت بڑے گناہوں میں سے ہے جھوٹ بولنے والی زبان۔

The tongue which is addicted to falsehood is a bubbling spring of sins.

22: وخير الغنى غنى النفس

اور بہترین بے نیازی نفس کی بے نیازی ہے۔

The best detachment from worldly possessions is the contentment of the heart.

23: وخير الزاد التقوىٰ

اور بہترین زادِ سفر تقویٰ ہے۔

The best provision for life's journey is that of piety.

24: ورأس الحكمة مخافة الله عزوجل

اور دانائی کا سب سے اونچا درجہ اللہ عزوجل سے ڈرتے رہنا ہے۔

The highest wisdom is fear of Allah, the Mighty, the Great.

25: وخير ما وقر في القلوب اليقين

اور بہترین چیز جو دلوں میں جاگزیں ہو یقین ہے۔

The best thing that can be instilled in hearts is faith and conviction.

26: والارتياب من الكفر

اور شک کفر کی ایک قسم ہے۔

Doubt is disbelief.

27: والنياحة من العمل الجاهلية

اور نوحہ کرنا دورِ جاہلیت کے اعمال میں سے ایک عمل ہے۔

Wailing over the dead is an act of the Days of Ignorance.

28: والغلول من حر جهنم

اور غلول جہنم کی تپش میں سے ہے۔

Deceitfulness is the road that leads to the fire of hell.

29: والسكر كي من النار

اور نشہ جہنم کی آگ سے داغ ہے۔

Intoxication amounts to burning in hell fire.

30: والشعر من ابليس

اور (فحش) شعر ابلیس کی طرف سے ہے۔

Obscene poetry is the work of the devil.

31: والخمر جماع الاثم

اور شراب سارے گناہوں کا مجموعہ ہے۔

Wine is the mother of all evils.

32: وشر المأكل مال اليتيم

اور بہت ہی برا کھانا ہے، یتیم کا مال کھانا۔

The worst thing unlawfully eaten is the property which belongs to orphans.

33: والسعيد من وعظ بغيره

اور سعید (خوش نصیب) وہ ہے جو دوسروں کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرے۔

Blessed is he who receives admonition from others.

34: والشقي من شقي في بطن امه

اور بدبخت وہ ہے جو اپنی ماں کے پیٹ ہی میں بدبخت ہو گیا۔

The unfortunate is the one who is born unfortunate from the womb of his mother.

35: وانما يصير احدكم الى موضع اربعة اذرع والامر الى الآخرة

اور تم میں سے ہر شخص بالآخر چار ہاتھ زمین ہی تک پہنچتا ہے اور معاملہ آخرت کے سپرد ہو جاتا ہے۔

Each one of you resorts to a place of four cubits (grave) and his affair is transferred to the Hereafter.

36: وملاك العمل خواتمه

اور عمل کی حقیقت اس کے آخری حصے ہوتے ہیں۔

Things can be judged only by their end or conclusion.

37: وشر الرؤيا رؤيا الكذب

اور بہت ہی برا خواب ہے جھوٹا خواب۔

The worst dream is false dream.

38: وكل ماهو آت قريب

اور جو پیش آنے والا ہے وہ قریب ہے۔

Whatever is in store is near.

39: وسباب المؤمن فسوق.

کسی مومن کو گالی دینا فسق ہے۔

To abuse a believer is transgression.

40: وقتاله كفر

اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔

Taking up arms against him is disbelief.

41: واكل لحمه من معصية الله

اور اس کا گوشت کرنا (غیبت کرنا) اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں سے ہے۔

To backbit him is disobedience to Allah.

42: وحرمة ماله كحرمة دمه

اور اس کے مال کی حُرمت اس کے خون کی حُرمت کے برابر ہے۔

Inviolability (and sacredness) of his property is like the sacredness of his blood.

43: ومن يتالى على الله يكذبه

اور جو اللہ کی قسم کھاتا ہے، اللہ اسے جھٹلا دیتا ہے۔

He who swears by Allah (falsely) in fact falsifies Him.

44: ومن يغفر يغفر له

اور جو بخش دیتا ہے، اسے بخش دیا جائے گا۔

He who pardons others is himself granted pardon.

45: ومن يعف يعف الله عنه

اور جو معاف کر دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے معاف کر دے گا۔

He who forgives others, is forgiven by Allah for his sins.

46: ومن يكظم الغيظ ياجره الله

اور جو غصہ پی جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اجر دے گا۔

He who represses his anger, Allah rewards him.

47: ومن يصبر على الزرية يعوضه الله

اور جو حق تلفی پر صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُسے معاوضہ دے گا۔

He who faces misfortunes with preseverance, Allah compensate shim.

48: ومن يتبع السمعة يسمع الله به

اور جو شہرت کے پیچھے پڑ جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے بدنام کر دیتا ہے۔

He who strives for fame and reputation is disgraced by Allah.

49: ومن يتصبر يضعف الله له

اور جو ثابت قدم رہتا ہے اللہ تعالیٰ اسے دوگنا عطا کرتا ہے۔

He who shows patience and forbearance, Allah gives him a double reward.

50 ومن يعص الله يعذبه

اور جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے اللہ اسے عذاب میں ڈالے گا۔

He who disobeys Allah, Allah will make him suffer the torment of hell-fire.

I Seek the forgiveness of Allah استغفر اللہ

I Seek the forgiveness of Allah استغفر اللہ

I Seek the forgiveness of Allah استغفر اللہ

خطبہ حجۃ الوداع

ہجرت کے دسویں سال آنحضور ﷺ نے حج ادا کیا۔ 8 ذوالحجہ کو آپ ﷺ منیٰ گئے اور اگلے دن طلوعِ آفتاب کے بعد عرفات کے لیے روانہ ہوئے۔ وہاں آپ ﷺ کے لیے اس جگہ خیمہ نصب کیا گیا' جہاں اب مسجد نمرہ ہے۔ آپ ﷺ نے اس خیمے میں آرام فرمایا۔ سورج ڈھلنے کے بعد آپ ﷺ میدان میں تشریف لائے۔ آپ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے۔ اس حج میں ایک لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ اتنے بڑے مجمع تک آواز نہیں پہنچ سکتی تھی' لہٰذا آپ ﷺ نے ربیعہ بن اُمیہ بن خلف کو کچھ فاصلے پر کھڑا کیا۔ آپ ﷺ جو کچھ فرماتے' ربیعہ اسے بلند آواز سے لوگوں کے سامنے دُہراتے۔ حضور ﷺ کا مکمل خطبہ اس وقت قلم بند نہیں ہوا۔ اس کے مختلف حصے لوگوں کے حافظے میں محفوظ رہ گئے اور انھی کی روایت سے وہ کتب حدیث میں نقل ہوئے۔ ان روایات کو جمع کر کے خطبے کے بنیادی نکات اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ ان بنیادی نکات پر مشتمل خطبہ ''ہمدرد فاؤنڈیشن پریس کراچی'' کے زیرِ اہتمام چار تراجم (اُردو' انگریزی' بنگلہ' سندھی) کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ یہاں ''ہمدرد'' کے شکریے کے ساتھ صرف اردو اور انگریزی ترجمے دیے جارہے ہیں:

خطبۂ حجۃ الوداع

1: اذا كان يوم الحج أتى رسول الله ﷺ عرفة' فنزل بها حتى اذا زاغت الشمس أمر القصواء' فرحلت له' فأتى بطن الوادي فخطب الناس خطبته التي بين فيها ما بين

حج کے دن حضور ﷺ عرفہ تشریف لائے اور وہاں قیام فرمایا۔ جب سورج ڈھلنے لگا تو آپ ﷺ نے اپنی اونٹنی ''قصوا'' کو لانے کا حکم فرمایا۔ اونٹنی تیار کر کے حاضر کی گئی تو آپ ﷺ اس پر سوار ہو کر بطن وادی میں تشریف لائے اور خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ ﷺ نے دین کے اہم اُمور کی وضاحت فرمائی۔

On the Haj day, Prophet Muhammad (peace be upon him), arrived in Arafa and stayed there. As the sun declined, he sent for his dromedary, Qaswa. It was brought and made ready. The Messanger of Allah rode into the heart of the valley and addressed the congregation. In his address which was his last Haj Sermon, the Messanger of Allah dwelt upon important matters of Islam.

2: فحمد الله وأثنى عليه قائلا: لا اله الا الله وحده لا شريك له' صدق وعده ونصر عبده' وهزم الأحزاب وحده

آپ ﷺ نے خدا کی حمد وثنا کرتے ہوئے خطبے کی ابتدا ان الفاظ میں فرمائی:

''خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہ یکتا ہے۔ کوئی اس کا ساجھی نہیں' خدا نے اپنا وعدہ پورا کیا' اس نے اپنے بندے (رسول ﷺ) کی مدد فرمائی اور تنہا اسی کی ذات نے باطل کی ساری مجتمع قوتوں کو زیر کیا۔''

After praising Allah, he said: "There is no one to be worshipped except Allah. No one is like Him or equals Him; none is His co-sharer. He has fulfilled His promise and helped His servant, His Apostle and all alone defeated the combined forces of falsehood.

3: أيها الناس اسمعوا قولي فاني لا أراني واياكم أن نجتمع في هذا المجلس أبداً بعد عامي هذا' أيها الناس ان الله يقول: ﴿يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُم مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ط إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللهِ أَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات 13:49) فليس لعربي على عجمي فضل' ولا لعجمي على عربي' ولا لأسود على أبيض' ولا لأبيض على أسود فضل الا بالتقوى۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

لوگو میری بات غور سے سنو! میں نہیں سمجھتا کہ اس سال کے بعد کبھی حج کے اس اجتماع میں میں اور تم سب یک جا ہوسکیں گے۔

لوگو! اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے۔ اور تمھیں جماعتوں اور قبیلوں میں بانٹ دیا کہ تم الگ الگ پہچانے جاسکو۔ تم میں زیادہ عزت والا خدا کی نظروں میں وہی ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔'' اب نہ کسی عرب کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل ہے نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر' نہ کالا گورے سے افضل ہے' نہ گورا کالے سے۔ ہاں بزرگی اور فضیلت کا کوئی معیار ہے تو وہ صرف

تقویٰ ہے۔

"O people! listen to me carefully as I do not think I will be here again with you in this congregation.

"O people! Allah, the great says: `O mankind, we have created you from a man and woman and divided you into groups and tribes so as to distinguish you from one another. Verily, the most righteous among you is the most honoured in the eyes of Allah and, hence, no Arab is superior to a non-Arab and no white is better than a black. The only criterion for superiority and honour is piety.

4: النّاس من آدمَ' وآدمُ من تراب۔ ألاكل مأثرةأودم أومال يدعى به فهو تحت قدمى هاتين الاّ سَدانة البيت' وسقاية الحاجّ۔

ثم قال: يامعشر قريش لا تجيئوا بالدّنيا تحملونها على رقابكم ويجئ النّاس بالآخرةفلا أغنى عنكم من اللّٰه شيئاً

سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مٹی سے بنائے گئے۔اب فضیلت و برتری کے سارے دعوے' خون و مال کے سارے مطالبے اور سارے انتقام میرے پاؤں تلے روندے جا چکے ہیں۔بس بیت اللہ کے انتظام اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمات علی حالہا باقی رہیں گی۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا قریش کے لوگو! ایسا نہ ہو کہ خدا کے حضور تم اس طرح آؤ کہ تمھاری گردنوں پر تو دنیا کا بوجھ لدا ہو اور دوسرے لوگ سامان آخرت لے کر پہنچیں۔ دیکھو! اگر ایسا ہوا تو مَیں خدا کے سامنے تمھارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔

"All human beings are the off-springs of Adam and Adam was created from dust. Hence all claims to superiority and greatness, all demands for blood and money and all rights to retaliate and revenge stand trampled under my feet. Only the maintenance of Kaaba and the right to serve water to the Hajees will remain as it is.

"O the people of Quraish, beware. lest you should appear before Allah heavily burdened with worldly affairs and others come laden with good deeds. Remember, if this happened then I will not be of any help to you in the presence of Allah.

5: معشر قريش ! اِنّ اللّٰه قد اذهب عنكم نخوةالجاهلية و تعظّمها بالآباء

قریش کے لوگو! خدا نے تمھاری جھوٹی نخوت کو ختم کر ڈالا اور باپ دادا کے کارناموں پر تمھارے فخر و مباہات کی اب کوئی گنجائش نہیں۔

"O people of Quraish! Allah had put an end to your vanity and arrgance and there is no room left for you to be proud of what forefather had done.

6: أيّها النّاس اِنّ دمائكم وأموالكم' وأعراضكم عليكم حرام اِلى أن تلقوا ربّكم كحرمة يومكم هذا' وكحرمة شهركم هذا' فى بلدكم هذا' وانّكم ستلقون ربّكم فيسألكم عن أعمالكم۔

ألا فلاترجعوا بعدى ضُلاّ لاَ يضرب بعضكم رقاب بعض' فمن كانت عنده أمانة فليؤدّها ألي من ائتمنه عليها

تمہارے خون اور تمھارے مال اور عزتیں ایک دوسرے پر قطعاً حرام کردی گئیں' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے!...... تمھارے جان و مال اور آبرو کی اہمیت ایک دوسرے کے لیے ایسی ہی ہے جیسی تمھارے اس دن یعنی یوم حج کی اور اس ماہ مبارک یعنی ذوالحجہ کی خاص کر اس شہر یعنی مکہ مکرمہ میں ہے۔تم سب خدا کے آگے جاؤ گے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی باز پُرس فرمائے گا۔

دیکھو! کہیں میرے بعد گم راہ نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی جائے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت اس کے مستحق تک بحفاظت پہنچادے۔

O pople! you are forbidden for ever to harm the life, property and honour of each other. The life, property and hounour of each of you is as sacred as this day of Haj and this month of Zilhijja specially in this city of Mecca. You will all appear before Allah who will ask you to give an account of all your deeds.

"Beware! do not go astray when I am gone and don't start cutting each other's throats. If you are given some thing to hold in trust it will be your duty to return it safely to its rightful owner.

7: أيها الناس كل مسلم أخو المسلم، وإنّ المسلمين إخوة، أرقائكم أرقائكم أطعموهم ممّا تأكلون، واكسوهم ممّا تلبسون۔

لوگو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سارے مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اپنے غلاموں کا خیال رکھو، ہاں غلاموں کا خیال رکھو، انھیں وہی کھلاؤ جو خود کھاتے ہو، ایسا ہی پہناؤ جیسا تم پہنتے ہو۔

"O people! a Muslim is another Muslim's brother and all Muslims are brothers among themselves. Lookafter your salves. Be kind to them. Give them the same food you eat and the same clothes you wear".

8: ألا كلّ شيئ من أمر الجاهلية تحت قدميّ موضوع، ودماء الجاهليّة موضوعة، وإنّ أوّل دم أضع من دمائنا دم ابن الرّبيعة بن الحارث، وكان مسترضعاً في بني سعد، فقتله هذيل۔

وربا الجاهليّة موضوع، وأوّل ربا أضع ربانا ربا عبّاس بن عبدالمطلب، فإنّه موضوع كله۔

دورِ جاہلیت کا سب کچھ میں نے اپنے پیروں تلے روند دیا۔ زمانۂ جاہلیت کے خون کے سارے انتقام اب کالعدم ہیں۔ پہلا انتقام جسے میں کالعدم قرار دیتا ہوں میرے اپنے خاندان کا ہے۔ ربیعہ بن الحارث کے (بنوسعد کے ہاں) دودھ پیتے بیٹے کا خون جسے بنوہذیل نے مارڈالا تھا اب میں معاف کرتا ہوں۔

دورِ جاہلیت کا سُود اب کوئی حیثیت نہیں رکھتا، پہلا سود جسے میں چھوڑتا ہوں عباس بن عبدالمطلب کے خاندان کا سود ہے، اب یہ ختم ہوگیا۔

"I have trampled under myfeet all that prevailed in the days of ignorance (Jahliya). All claims to vengeance of the dys of ignorance are now void. The first claim to vengenance that I renounce pertain to my own family. I forgive Banu Huzail for the murder of Rabia bin Al-Harith's suckling son.

"All usurious dues and interests of the days of ignorance are null and void. The first of such interest I waive belongs to the family of Abbas bin Abd al-Muttalib, it stands cancelled.

9: أيها الناس إن الله عزوجل قد أعطى كل ذي حقّ حقّه، فلا وصيّة لوارث۔ الولد للفراش وللعاهر الحجر، وحسابهم على الله

لوگو! خدا نے ہر وارث حق دار کو اس کا حق (ورثہ) خود دے دیا اب کوئی کسی وارث کے حق میں وصیت نہ کرے۔

بچہ اسی کی طرف منسوب کیا جائے گا جس کے بستر پر وہ پیدا ہوا۔ جس پر حرام کاری ثابت ہو اس کی سزا رجم ہے، حساب کتاب خدا کے ہاں ہوگا۔

"O people! Allah has fixed the share of every rightful inheritor Himself and therefore no bequest should be made in-favour of a heir.

"The child will belong to him on whose bed it was born. Adultery, if proved, is to be punished by stoning. The final accounting of the deed will take place on the day of judgement."

10: من ادّعى إلى غير أبيه أو يتولّى إلى غير مواليه فعليه لعنة الله

جو کوئی اپنا نسب بدلے گا یا کوئی غلام جو اپنے آقا کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا آقا ظاہر کرے گا اس پر خدا کی پھٹکار!

"Any one claiming false ancestary or ascribing untrue bondage against his real master is damned.

11: الدَّين مقضيّ والعارية مؤداة، والمنحة مردودة، والزعيم غارم

قرض قابلِ ادائی ہے۔ مستعار لی ہوئی چیز واپس کرنی چاہیے۔ تحفے کا بدلہ دینا چاہیے اور جو کوئی کسی کا ضامن بنے وہ تاوان ادا کرے۔

"A debt is payable. Whatever is borrowed must be returned. Gifts should be countered and the guarantor must make the loss good.

12: ولا يحل لامرء من أخيه إلا ما أعطاه عن طيب نفس منه فلا تظلمنّ أنفسكم

کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے، سوائے اس کے کہ جس پر اس کا بھائی راضی ہو اور خوشی خوشی دے۔ خود پر اور ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔

"It is not proper for a person to take anything from his brother except what is given to him willingly. Do not commit excesses on your own self and on others.

13: ألا لا يحل لا مرأة أن تعطى من مال زوجها شيئا إلا بإذنه

عورت کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کا مال اس کی بغیر اجازت کسی کو دے۔

"It is not proper for a woman to give away his

husband's property without his consent."

14: أيھا الناس إن لكم على نسائكم حقاً' ولھنّ عليكم حقاً' لكم عليھنّ ألا يوطئنّ فرشكم أحد تكرھونه' وعليھنّ أن لا يأتين بفاحشة مبيّنة' فإن فعلن فإن الله قد أذن لكم أن تھجروھن فى المضاجع' وأن تضربوا ضربا غير مبرح فإن انتھين فلھن رزقھن وكسوتھن بالمعروف

دیکھو! تمھارے اوپر تمھاری عورتوں کے کچھ حقوق ہیں' اسی طرح ان پر بھی تمھارے حقوق واجب ہیں۔ عورتوں پر تمھارا یہ حق ہے کہ وہ اپنے گھروں میں کسی ایسے شخص کو نہ آنے دیں جسے تم پسند نہیں کرتے اور وہ خیانت کا کوئی کام نہ کریں' کوئی کام کھلی بے حیائی کا نہ کریں اور اگر وہ ایسا کریں تو خدا کی جانب سے اس کی اجازت ہے کہ تم انھیں معمولی جسمانی سزا دو اور وہ باز آ جائیں تو انھیں دستور کے مطابق کھلاؤ پہناؤ۔

"O people! you owe to your women certain rights and likwise they owe certain rights to you. It is your right that they do not allow any person whom you do not like, to enter your house and do not commit any perfidious or shameful act. If they do so, you have Allah's permission to give light physical punishment to them. Treat them well if they desist from such acts.

15: واستوصوا بالنّساء خيراً' فإنھنّ عوان لكم لا يملكن لأنفسھنّ شيئاً' فاتّقوا الله فى النّساء فإنكم أخذتموھنّ بأمان الله واستحللتم فرجھنّ بكلمات الله

عورتوں سے اچھا سلوک کرو کیوں کہ وہ تو بس تمھاری پابند ہیں اور خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ ان کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو کہ تم نے انھیں خدا کے نام پر حاصل کیا اور اس کے نام پر وہ تمھارے لیے حلال ہوئیں۔ لوگو! میری بات سمجھ لو میں نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔

"Your women are your dependents and cannot manage things themselves so treat them well. Be fearful of Allah in matters pertaining to them because you have acquired them in the name of Allah and they have become lawfully yours in His name. O people! I have preached what I was enjoined to preach and I urge you to understand it."

16: وإنى قد تركت فيكم ما لن تضلوا بعده أبداً' إن اعتصمتم به' كتاب الله وإياكم والغلو فى الدين فإنما أھلك من قبلكم الغلو فى الدين

مَیں تمھارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ تم کبھی گم راہ نہ ہو سکو گے اگر اس پر قائم رہے اور وہ خدا کی کتاب ہے اور ہاں دیکھو دین کے بارے میں غلو سے بچنا کہ تم سے پہلے کے لوگ ایسی باتوں کے سبب ہلاک کر دیے گئے۔

"I am leaving in your midst something which if you held it fast will not let you go stray and it is the Book of Allah. Beware of exaggeration in religious matters. People before you have perished because of this."

17: وإن الشيطان قد يئس من أن يعبد فى أرضكم ھذه أبداً' ولكن ستكون له طاعة فيما تحقّرون من أعمالكم فسيرضى به فاحذروه على دينكم

شیطان کو اب اس بات کی کوئی توقع نہیں رہ گئی ہے کہ اب اس کی اس شہر میں عبادت کی جائے گی' لیکن اس کا امکان ہے کہ ایسے معاملات میں جنھیں تم کم اہمیت دیتے ہو اس کی بات مان لی جائے اور وہ اسی پر راضی ہے اس لیے تم اس سے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کرتے رہنا۔

"Satan has now lost all hope of being worshipped in this city. Yet, there are chances that in matters you consider insignificant, his bidding will prevail and he is statisfied with this. So be careful and safeguard your religion and faith against such possiblities."

18: ألا فاعبدوا ربكم وصلوا خمسكم وصوموا شھركم' وأدوا زكاة أموالكم طيبة بھا أنفسكم وتحجوا بيت ربكم' وأطيعوا ولاة أمركم تدخلوا جنّة ربكم

لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو' پانچ وقت کی نماز ادا کرو' مہینے بھر کے روزے رکھو' اپنے مالوں کی زکوٰۃ خوش دلی کے ساتھ دیتے رہو' اپنے خدا کے گھر کا حج کرو اور اپنے اہل امر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنّت میں داخل ہو جاؤ گے۔

"O people! obey the commands of your Lord. Offer prayers (Salat) five times a day, keep a month's fasting, pay the prescribed poor-rate (Zakat) willingly, perform Haj of the Holy House of Allah

(Ka'aba) and obey those who are charged with authority among you."

19: ألا لا يـجـنـى جانٍ إلا على نفسه' ألا لا يجنى جانٍ على ولده' ولا مولود على والده
اب مجرم خود ہی اپنے جرم کا ذمے دار ہوگا اور نہ باپ کے بدلے بیٹا پکڑا جائے گا' نہ بیٹے کا بدلہ باپ سے لیا جائے گا۔

"Henceforth, the offender himself will be responsible for the offence; no son will be charged for the father's crime and no father will be punished for the crime committed by the son."

20: ألا فليبلّغ الشاهدُ الغائبَ' فرُبَّ مبلّغ أوعى من سامع
سنو! جو لوگ یہاں موجود ہیں انھیں چاہیے کہ یہ ہدایتیں اور یہ باتیں ان لوگوں کو بتا دیں جو یہاں نہیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی غیر موجود تم سے زیادہ سمجھنے اور محفوظ رکھنے والا ہو۔

"Listen! those present here should convey my message to those who are not present. May be someone not present here have greater understanding of what I have said and be able to preserve it.

21: وأنتم تُسألون عنى فما ذا أنتم قائلون؟
لوگو! تم سے میرے بارے میں خدا کے ہاں سوال کیا جائے گا' بتاؤ تم کیا جواب دو گے؟

"O people! Allah will ask you about me on the day of judgement. What will you say?"

22: قالوا: نشهد أنك قد أديت الأمانة' وبلغت الرسالة' ونصحت
لوگوں نے جواب دیا کہ ہم اس بات کی گواہی دیں گے کہ آپ ﷺ نے امانتِ دین پہنچادی' حق رسالت ادا فرمادیا اور ہماری خیر خواہی فرمائی۔

The people replied: "We will bear witness to the fact that you conveyed to us the divine message entrused to you and fulfilled your duty as the Apostle of Allah and blessed us".

23: فقال رسول الله ﷺ بإصبعه السبابة يرفعها إلى السّماء وينكتها إلى النّاس: "اللّٰهمّ اشْهَدْ' اللّٰهمّ اشْهَدْ' اللّٰهمّ اشْهَدْ"
یہ سن کر حضور ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی جانب اٹھائی اور لوگوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تین مرتبہ ارشاد فرمایا" خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا! خدایا گواہ رہنا!"

Hearing this the Prophet (peace be upon him), raised his index finger towards the sky and then pointing to the congregation thrice said: "O Allah, be my witness! O Allah, be my witness! O Allah, be my witness".

نویں کتاب:

مکتوباتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مکتوباتِ نبوی ﷺ

ذوالحجہ چھ ہجری میں رسول اللہ ﷺ صلح حدیبیہ طے کرنے کے بعد حدیبیہ سے مدینہ پہنچے تو گویا اب وقت آ گیا تھا کہ اسلام کا پیغام تمام دنیا اور پوری انسانیت تک پہنچایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دے رکھا تھا: ''سارے انسانوں کو اسلام کی طرف بلاؤ اور انھیں خبردار کر دو۔'' سورۂ سبا (آیت 28) میں آپ ﷺ کی طرف وحی آئی تھی:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا﴾ (سبا 28:34)

''اور (اے نبی) ہم نے آپ ﷺ کو ساری انسانیت کو خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

اُس وقت آپ ﷺ بھی مکّہ ہی میں تھے اور اپنے خاندان، اہل شہر اور عرب کے دُور دراز علاقوں سے حج اور عمرے کے لیے مکّہ آنے والوں کو دعوتِ اسلام دے رہے تھے۔ اسی سورت میں (آیت 49) میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم بھی دیا تھا:

﴿قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَ مَا يُبۡدِئُ الۡبَاطِلُ وَ مَا يُعِيۡدُ﴾ (سبا 49:34)

''(اے نبی) کہ دو کہ حق آ گیا ہے اور جھوٹ تو کسی چیز کو نہ پیدا کرے اور پھیر کر لائے۔''

ایک روز رسول کریم ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام عالم کے لیے باعث رحمت بنا کر مبعوث کیا ہے۔ دیکھو، تم لوگ بھی کہیں عیسیٰ ابن مریم کے حواریوں کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو، اور نافرمانی نہ کرو۔'' صحابہ کرام نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! حواریوں نے کس طرح کی نافرمانی کی تھی؟'' ارشاد ہوا: ''ابن مریم نے بھی پیغام اپنے حواریوں کے ذریعے بادشاہوں کو پہنچانا چاہا۔ ان میں سے جسے نزدیک کے بادشاہ کے پاس بھیجا، اس نے خوشی سے تعمیل کی، مگر دور دراز بھیجے جانے والوں میں سے بعض کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔ اس طرح یہ لوگ اپنے فرائض کی انجام دہی پر پورے نہ اتر سکے۔''

اس کے بعد فرمایا: ''میں تم لوگوں کو بادشاہوں اور فرماں رواؤں کے پاس دعوت اسلام کے ساتھ بھیجنا چاہتا ہوں۔'' صحابہ کرامؓ نے اپنی اپنی خدمات پیش کیں۔ عرض کیا: ''ہم آپ ﷺ کے حکم سے سرِ مُو انحراف نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ ہمیں جہاں چاہیں بھیج دیں۔''

چنانچہ آنحضور ﷺ نے اُس دن (محرم سات ہجری) سے اپنی وفات تک کے عرصے میں حکمرانوں، مذہبی پیشواؤں، علاقائی افسروں اور قبائل کے شیوخ کے نام جو مکاتیب روانہ فرمائے، اُن کی تعداد ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تحقیق و جستجو کے مطابق ڈھائی سو کے قریب ہوگی۔ دنیا کے تمام نبیوں اور بانیانِ مذاہب میں یہ امتیاز بھی پیغمبر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ آپ ﷺ کے مکتوبات کی کم از کم پانچ اصلیں دریافت ہو چکی ہیں۔ ان کے دریافت ہونے کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی تصنیف ''رسول اللہ کی سیاسی زندگی۔''

آپ ﷺ نے کاتب سے، پہلے چھ بادشاہوں کے نام ایک ہی دن مکتوب لکھوائے۔ یہ خطوط خطِ کوفی میں لکھے گئے۔ خط لکھے جا چکے تو صحابہؓ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ ﷺ، ان پر آپ ﷺ کی مہر بھی ہونی چاہیے، کیوں کہ بادشاہوں اور حاکموں کے نام خصوصی طور پر بھیجنے والے کی مُہر نہ ہو تو وہ اسے عام خط سمجھتے ہیں۔'' رسول کریم ﷺ نے چاندی کی ایک انگوٹھی تیار کروائی۔ انگوٹھی کے چاندی کے نگینہ پر آپ ﷺ نے تین سطروں میں ''محمد رسول اللہ'' اس انداز میں کھدوایا کہ اللہ کا لفظ سب سے اوپر، رسول کا لفظ درمیان میں اور محمد ﷺ کا مبارک لفظ سب سے نیچے۔ مہر لگوا کر یہ چھ خطوط آپ ﷺ نے بند کر دیئے۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھنے کی ابتدا

عہد جاہلیت کے مشہور شاعر اُمیہ ابن صلت نے قریش کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی تحریر کی ابتدا ''باسمك اللهم'' سے کریں۔ شروع شروع میں تو رسول اکرم ﷺ بھی اسی طرح لکھوایا کرتے تھے، لیکن جب سورہ ہُود کی آیت 41 نازل ہوئی:

﴿وَ قَالَ ارۡكَبُوۡا فِيۡهَا بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖٮهَا وَ مُرۡسٰٮهَا﴾ (ھود 41:11)

''(نوح نے) کہا کہ اللہ کا نام لے کر کہ اُسی کے ہاتھ میں اس کا چلنا اور ٹھہرنا ہے، اس میں سوار ہو جاؤ۔''

اِس آیت کے نزول کے بعد سے ''بسم اللہ'' کا رواج ہوا۔ پھر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 110 نازل ہوئی:

﴿قُلِ ادۡعُوا اللّٰهَ اَوِ ادۡعُوا الرَّحۡمٰنَ ؕ اَيًّامَّا تَدۡعُوۡا فَلَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى﴾ (بنی اسرائیل 110:17)

''کہ دو کہ تم خدا کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے، جس نام سے پکارو، اُس کے سب نام اچھے ہیں۔''

اِس آیت کے نزول کے بعد ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' لکھا جانے لگا۔ سورہ نمل کی آیت 30 کے بعد ہر تحریر کا سرنامہ ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' قرار دیا گیا:

﴿إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ﴾ (النمل27:30)
''یہ سلیمان کی جانب سے ہے، اور یہ کہ شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔''

اِن مکاتیب نبوی ﷺ کا افتتاح ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے ہوا۔ عیسائی بادشاہوں کو لکھے جانے والے خطوط میں سورۂ آلِ عمران کی آیت 64 تحریر کروائی گئی جس کا ترجمہ یہ ہے:

''کہ دو کہ اے اہل کتاب، جو بات ہمارے اور تمھارے دونوں کے درمیان یکساں ہے، اُس کی طرف آؤ۔ وہ یہ کہ اللہ کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں، اور ہم میں کوئی کسی کو اللہ کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو اُن سے کہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔''

طرزِ تخاطب

ان تمام مکاتیب کا آغاز عام طور پر اس فقرے سے ہوتا ہے: ''محمد رسول اللہ کی طرف سے (مکتوب الیہ کا نام) کی جانب۔'' اس طرزِ خطاب میں حضور ﷺ کا اسم مبارک پہلے ہے اور مکتوب الیہ کا نام بعد میں۔ اس وقت خاص طور سے سلاطین و امرا کی بارگاہوں میں جو خطوط اور عرض داشتیں پیش کی جاتی تھیں، اُن میں کاتب اپنا نام بعد میں لکھتا تھا اور معزز مکتوب الیہ کا نام اُس کے اعزاز و مرتبے کے مطابق پہلے لکھتا تھا۔ اس زمانے کے اس طرزِ تخاطب کے برعکس یہ پہلی مثال تھی کہ حضور ﷺ کے خطوط میں سلاطین و امرا کے نام بعد میں لکھے گئے، اور وہ بھی مقررہ القابات و خطابات کے بغیر نہایت سادگی سے۔ ایسا ہونا ہی چاہیے تھا، کیوں کہ حضور ﷺ جس عالم گیر دین کے داعی تھے، اُس میں ان گم راہ سلاطین و امرا کی کوئی وقعت نہ تھی۔

سفیروں کا انتخاب

رسولِ کریم ﷺ نے یہ خطوط لے جانے کے لیے ایسے صحابہ کو قاصد یا سفیر کے طور پر منتخب فرمایا جو اس ملک کی زبان جانتے تھے، جہاں انھیں بھیجا جا رہا تھا۔ خوش بیان، باوقار، خوش لباس تھے، اور دلیل کے ساتھ گفتگو کرنے کے فن کے ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ نازک اور مشکل سفارتی معاملات اور صورتِ حال پر گرفت کر سکتے تھے۔ ان ابتدائی چھے سفیروں کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

1: حضرت عمروؓ بن امیہ ضمری (بجانب: اصحم بن ابجر نجاشی۔ شاہ حبش)
2: حضرت دحیہؓ بن خلیفہ کلبی (بجانب: ہرقل۔ قیصر روم)
3: حضرت عبداللہؓ بن حذافہ (بجانب: خسرو پرویز۔ کسرائے ایران)
4: حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ (بجانب: جریج بن متی مقوقس۔ عزیزِ مصر)
5: حضرت شجاعؓ بن وہب اسدی (بجانب: حارث بن ابی شمر غسانی۔ والی دمشق)
6: حضرت سلیطؓ بن عمرو عامری (بجانب: ہوذہ بن علی حنفی۔ والی یمامہ)

نامہ ہائے مبارک کی دریافت

رسول کریم ﷺ کے مکاتیب اور دستاویزات جواب تک مختلف ذرائع سے دستیاب ہوئے ہیں، اُن کی تعداد ڈھائی سو کے قریب ہے اور ان کا متن حواشی کے ساتھ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی تالیف ''الوثائق السیاسیہ فی العہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ'' (عربی) میں یک جا کر دیا ہے۔ یہ کتاب 1942ء میں پہلی بار مصر سے شائع ہوئی۔ اردو میں اس کا ترجمہ ''سیاسی وثیقہ جات'' کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے چھاپا ہے۔ رسول اللہ سے منسوب پانچ مکاتیب اصلی حالت میں دریافت ہوئے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:

(1) بنام نجاشی: اس مکتوب کے بارے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے 1942ء میں اپنے مضمون میں لکھا جو ان کی تصنیف ''رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی'' میں شامل ہے۔ ''ابھی حال میں حبشی اطالوی جنگ کی ابتدا میں اخباروں نے (''ہمدم'' نے مصر کے اخبار ''البلاغ'' سے، اور اس نے ادیس ابابہ کے اخبار ''برہانِ اسلام'' سے نقل کر کے) یہ خبر شائع کی تھی کہ نجاشی نے اپنے خزانے سے آنحضرت ﷺ کا یہ خط جو اَب تک محفوظ ہے، نکال کر مسلمانوں کے ایک وفد کو دکھایا۔''

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں: ''قدیم روایات میں بھی یہی ملتا ہے کہ نجاشی نے اس خط کو ہاتھی دانت کے ایک ڈبے میں مہر بند کر کے ایک کنیز کو دے دیا تھا کہ وہ اسے محفوظ کر دے۔ یہ اصل مکتوب اسکاٹ لینڈ کے ایک مستشرق ڈی ایم ڈنلپ، ساکن برائڈ کرک کو فلسطین کے ایک پادری سے ملا تھا۔ اس کا عکس پہلے ''جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی'' لندن، جنوری 1940ء میں شائع ہوا۔ اس خط کے جواب میں نجاشی، والی حبشہ نے جو خط بھیجا تھا، وہ بھی ابن اسحاق اور طبریؒ وغیرہ کے ہاں محفوظ ہے۔ ڈنلپ نے اس اصل مکتوب کی کیفیت تفصیل سے لکھی ہے۔ یہ اکتوبر 1938ء میں دمشق میں کسی شخص نے حبشہ کے ایک پادری سے خریدا تھا اور برٹش میوزیم وغیرہ کے ماہرین نے اس کی جانچ کر لی تھی۔

(2) بنام ہرقل (قیصر روم): یہ نامۂ مبارک بھی اصلی حالت میں شاہ حسین والی اردن کے قصر الہاشمی میں محفوظ ہے۔ اس کی اصل ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے فرانسیسی جریدے Arabica میں 1955ء میں شائع کرائی تھی۔ اس مکتوب کے لیے مستشرق کیتانی (مولف ''حولیاتِ اسلام'') نے اوّل تو یہ زور لگایا تھا کہ اس طرح کی سفارت بھیجے جانے کے واقعے ہی کو سرے سے بے بنیاد ثابت کرے۔ پھر اس خط کے اصلی ہونے پر شک وشبہ کا اظہار کیا تھا، مگر ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'' وہی برٹش میوزیم اور وہی اس کے ماہرین جو مکتوب بنام نجاشی کو کسی قطعی اور قوی دلیل کے بغیر جعلی قرار دے رہے تھے، وہ اب ہرقل، قیصر روم کے نام دریافت شدہ مکتوب نبوی ﷺ کے اصلی ہونے کی تصدیق کر رہے ہیں۔ (جزاک اللہ قاسم صاحب)

(3) بنام منذر بن ساوی: گورنر بحرین کے نام رسول کریم ﷺ کا نامۂ مبارک دمشق کے قوتلی خاندان میں محفوظ ہے۔ یہ مکتوب 1917ء میں خواجہ کمال الدین

نے بچشم خود دیکھا تھا اور رسالہ ''اسلامک ریویو'' ووکنگ میں اس پر تعارفی مضمون بھی لکھا تھا۔ مستشرق فلائشر (H.L. Fleischer) نے نہایت بودی دلیلوں کے ساتھ اسے جعلی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس خط کا اصلی ہونا شک وشبے سے بالاتر ہے۔

(4) بنام کسریٰ پرویز بن ہُرمز: رسول اللہ ﷺ کا یہ مکتوب بھی اپنی اصلی حالت میں دریافت ہو چکا ہے۔ اس کی اطلاع مئی 1963ء میں تمام اخباروں میں آ چکی ہے۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد، جو عربی مخطوطات کے مُستند عالم اور محقق ہیں، انھوں نے اس مکتوب کا عکس بیروت کے روزنامہ ''الحیاۃ'' (22 مئی 1963ء) میں چھاپا تھا۔ یہ خط بیروت کے سابق وزیر خارجہ ہنری فرعون نے دمشق میں ڈیڑھ سو اشرفی کے عوض خریدا تھا۔ یہ مکتوب مبارک بھی جھلی پر لکھا ہوا ہے۔

(5) بنام مقوقس، والئ مصر: یہ نامۂ مبارک استنبول کے توپ کاپی عجائب گھر میں محفوظ ہے۔ اس خط کا حوالہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے سیرت نبوی ﷺ پر اپنی تالیف ''محمد رسول اللہ'' میں دیا ہے (نقوش، رسول نمبر، جلد دوم، صفحہ 629)

اب رسولِ کریم ﷺ کے مکاتیب میں سے چیدہ چیدہ نامہ ہائے مبارک کا پورا تعارف پیش کیا جاتا ہے:

(1) بنام اَصحم بن ابجر، نجاشی حبشہ

حبشہ مشرقی افریقہ کی قدیم ترین مملکت ہے۔ اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوب مغرب میں بحیرۂ احمر کے دوسری طرف واقع ہے۔ اس کا موجودہ نام ایتھوپیا ہے جب کہ اس کا دارالحکومت شہر ادیس ابابا Addis Ababa ہے۔ لیکن زمانہ قدیم میں اس کا دارالحکومت اکسم (Axum) تھا۔ اہل حبشہ اپنے بادشاہ کو نجاشی (Magusa) (Nagashi) کہتے تھے، جس طرح روم کے بادشاہ کو ''قیصر'' اور ایران کے بادشاہ کو ''کسریٰ'' کہا جاتا تھا۔ حبشہ کے جس نجاشی کو رسول کریم ﷺ نے اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تھی، اس کا نام اَصحم بن ابجر تھا۔ وہ فطرتاً نیک اور شریف الطبع بادشاہ تھا۔ وہ عیسائی تھا اور اس کی رعایا کا بھی یہی مذہب تھا۔ عیسائیت کے فروغ اور تحفظ میں روم کا قیصر اور حبشہ کا نجاشی ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ جب نجران کے عیسائیوں پر یمن کے یہودی بادشاہ نے ظلم کیا تو اسے سزا دینے کے لیے نجاشی نے جو فوج بھیجی تھی، اسے سمندر سے پار پہنچانے کے لیے روم کے بادشاہ جسٹنین اوّل نے بحری جہاز بھیجے تھے۔ ایرانیوں کو ریشم کے تجارتی ٹیکس سے موصول ہونے والی آمدنی سے محروم کرنے کے لیے بھی قیصر روم نے حبشہ کے نجاشی کو ایک منصوبہ پیش کیا تھا۔ اس طرح ایران کے آتش پرستوں کے خلاف دونوں ممالک ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔

نجاشی اصحم بن ابجر عیسائیوں کے اس فرقے کے خیالات کا حامی تھا جو یونانی کلیسا کے برخلاف تثلیث کا قائل نہیں تھا، بلکہ ''طبع واحدہ'' کا عقیدہ رکھتا تھا۔ اس کی رعایا اور اس کے درباریوں میں بھی ایک گروہ اس عقیدے کا قائل تھا۔ دوسرا گروہ تثلیث کا قائل تھا، جسے رومی کلیسا اور رومی شہنشاہیت کی حمایت حاصل تھی۔ اُس کے دربار میں چند بُت پرست بھی تھے۔ ''طبع واحدہ'' کے قائل اور تثلیث کا عقیدہ رکھنے والے فرقوں کے درمیان اس مسئلے پر شاہی دربار میں اور عام مجلسوں میں مناظرے ہوتے رہتے تھے۔ اس طرح کی بحثیں اور فرقہ وارانہ نزاعات اس وقت تمام مسیحی ملکوں میں عام تھے۔ چوں کہ نجاشی تثلیث کے برخلاف طبع واحدہ کا قائل تھا، اسی لیے اسے اسلام کی دعوتِ توحید نے متاثر کیا۔ پھر وہ گزشتہ نو دس سال سے حبشہ میں مقیم مسلمان مہاجروں کی سیرت و کردار کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کس درجہ خدا ترس، نیک کردار لوگ ہیں، اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ جس رسول ﷺ کے پیرو ہیں، وہ بلاشبہ سچے رسول ہیں۔

عربوں اور مکّہ کے قریش سے حبشہ والوں کے پُرانے تجارتی اور سیاسی تعلقات تھے۔ جنوبی عرب پر طویل عرصے تک حبشہ والوں کی حکومت رہی تھی۔ رسول کریم ﷺ کی ولادت سے تھوڑا عرصہ پہلے حرم کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے جو ابرہہ ہاتھیوں کے ساتھ فوجیں لے کر مکّہ آیا تھا، وہ حبشہ کے بادشاہ کا اس خطے میں گورنر تھا۔ رسول کریم ﷺ نے پانچ نبوی سال میں صحابہ کرام کو مکّہ کے قریش کے مظالم سے بچنے کے لیے ہجرت کا حکم دیا تو وہ مہاجر حبشہ ہی گئے تھے اور نجاشی نے انھیں قریش مکّہ کے سفیر عمرو بن العاص کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت بھی آنحضور ﷺ نے حبشہ کے نجاشی کو ایک نامۂ مبارک ارسال فرمایا تھا اور ان مہاجرین کے ساتھ حُسنِ سلوک کا ثبوت دینے کی تلقین کی تھی۔ آپ ﷺ کا وہ تعارفی خط حضرت جعفر بن ابی طالب لے کر گئے تھے۔ اس پہلے خط کے جواب میں نجاشی نے رسول اللہ کو ایک جوابی خط بھی بھیجا تھا۔ ان مہاجرین میں سے بہت سے اب بھی حبشہ ہی میں تھے۔ گویا جب 7 ہجری کے اوائل میں حضور کا نامہ مبارک عمرو بن اُمیہ ضمریؓ لے کر حبشہ کے نجاشی کے پاس پہنچے تو وہ رسول کریم ﷺ کے مشن سے پہلے ہی آگاہ تھا اور حبشہ میں مقیم مہاجرین کے ساتھ حسن سلوک پر عمل کرتا تھا۔

جب حضرت عمرو بن اُمیہ ضمری یہ نامۂ مبارک لے کر نجاشی کی بارگاہ میں پہنچے تو خط پیش کرنے سے پہلے نجاشی سے اس طرح خطاب کیا:

''اے بادشاہ! میرے ذمے حق کی تبلیغ ہے، اور آپ کے ذمے حق کی سماعت۔ کوئی شبہ نہیں کہ گزشتہ دنوں سے ہم پر آپ کی شفقت و محبت کا یہ حال ہے کہ گویا آپ اور ہم ایک ہی ہیں اور ہمیں بھی آپ پر اس قدر اعتبار ہے کہ ہم آپ کو کسی طرح اپنی جماعت سے علیحدہ نہیں سمجھتے۔ ہم نے آپ سے جس بھلائی کی اُمید کی، وہ حاصل ہوئی اور جس خطرے کا اندیشہ کیا، اس سے محفوظ و بے خوف رہے۔ ہماری طرف سے آپ پر ایک قطعی حُجت ہے اور وہ آدم کی ولادت ہے۔ جس قدرت کے کرشمہ ساز ہاتھوں نے حضرت آدمؑ کو بغیر والدین کے مٹی سے پیدا کر دیا، اسی نے حضرت عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے بطن مادر سے پیدا کیا۔ اللہ کے نزدیک عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی طرح ہے۔ آدمؑ کو اس نے مٹی سے پیدا کیا اور پھر حکم دیا تو وہ عالم وجود میں آ گئے۔ ہمارے آپ کے درمیان انجیل وہ شاہد ہے جس کی شہادت کبھی مردود نہیں ہو

سکتی، اور وہ حکم ہے، جس سے ظلم کا امکان نہیں۔ اس لیے نبی ﷺ کی پیروی میں خیر و برکت کا نزول اور فضیلت و بزرگی کا حصول ہے۔

''اے بادشاہ! اگر آپ نے محمد ﷺ کا اتباع نہ کیا تو اس نبی امی ﷺ کا انکار آپ کے لیے اسی طرح باعثِ وبال ہوگا جس طرح یہود کے حق میں حضرت عیسیٰؑ کا انکار ثابت ہوا۔

''میری طرح رسول اکرم ﷺ کی جانب سے بعض دیگر اشخاص مختلف بادشاہوں کے نام دعوتِ اسلام کے لیے قاصد بن کر گئے ہیں، مگر سرور عالم ﷺ کو جو اُمید آپ کی ذات سے وابستہ ہے، دوسروں سے ایسی اُمید نہیں ہے اور جس بات کا ان سے اندیشہ ہے، آپ سے نہیں۔ آپ کے بارے میں پورا اطمینان ہے کہ آپ اپنے اور اپنے خدا کے درمیان گزشتہ طاعات اور آیندہ کے اجر و ثواب کا خیال رکھیں گے۔''

اصحم نے اس تقریر کو نہایت غور سے سنا۔ پھر جواب میں یہ کلمات ادا کیے: ''اے عمرو! بخدا میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ خدا کے وہی برگزیدہ پیغمبر ہیں، جن کی آمد کا اہل کتاب انتظار کر رہے ہیں۔ بے شک حضرت موسیٰؑ کا ''راکبِ حمار'' حضرت عیسیٰؑ کی بشارت دینا ٹھیک اسی طرح ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے ''راکبِ جمل'' محمد ﷺ کی بشارت دی ہے۔ دونوں میں سرِ مُو فرق نہیں۔ اور اس بارے میں میرے لیے مشاہدہ اور خبر دونوں برابر ہیں۔ مگر اہل حبشہ میں میرے حامی اور مددگار کم ہیں، اس لیے تم مجھے اتنی مہلت دو کہ میں اپنی قوم میں اپنے کافی مددگار اور ان کے دلوں میں نرمی پیدا کرلوں۔''

اس کے بعد اصحم نے عمرو بن اُمیہ کے ہاتھ سے وہ خط لیا۔ تعظیماً کھڑا ہوگیا اور نامۂ مبارک کو آنکھوں سے لگایا اور ترجمان سے خط کا مضمون پڑھوا کر سنا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محمد ﷺ رسول اللہ کی طرف سے نجاشی اصحم بادشاہ حبش کے نام

''تم سلامت رہو، اللہ کی حمد و تعریف تمھیں لکھتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو بادشاہ، مقدس، سلامتی والا، امان دہندہ اور سلامت رکھنے والا ہے۔

''میں اقرار کرتا ہوں کہ مریم کے بیٹے عیسیٰؑ روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں، جنھیں پاک مریم بتول کی طرف ڈالا گیا جو بُرائی سے محفوظ تھیں۔ اللہ نے ان (عیسیٰؑ) کو اپنی روح اور پھونک سے اسی طرح پیدا کیا، جس طرح اس نے آدمؑ کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا تھا۔

''میں تمھیں اسی خدائے وحدہ لاشریک کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ تم میری اتباع کرو، کیوں کہ میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں۔ میں تمھیں اور تمھارے لشکروں کو خدائے عزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔''

''میں نے اللہ کا پیغام خلوص کے ساتھ پہنچا دینے میں تمھاری خیر خواہی کی ہے۔ میری ہمدردانہ نصیحت کو قبول کرنا تمھارا کام ہے۔ میں تمھاری رعایا کو بھی یہی دعوت دیتا ہوں۔ اس پر سلامتی جو راہ راست پر چلے۔''

محمود فاروقی اپنے مقالے ''مکاتیب رسالت'' (مطبوعہ رسول نمبر، سیارہ ڈائجسٹ، جلد دوم) میں لکھتے ہیں: ''معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ خط بادشاہ کے دربار میں نہیں پیش کیا گیا، بلکہ نجاشی کی کسی خاص محفل میں پیش ہوا ہے، کیوں کہ نجاشی نے اپنے اسلام قبول کرنے کو اہلِ دربار اور عوام سے پوشیدہ رکھا تھا۔ سیسلی نے ''روض الانف'' میں بیان کیا ہے کہ نجاشی کے اسلام قبول کرنے کی اُفواہیں ملک میں پھیل گئیں تو اہلِ حبشہ بغاوت پر آمادہ ہو گئے اور نجاشی کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔ نجاشی نے جب یہ دیکھا تو اس نے حضرت جعفرؓ کو بلا کر کہا: ''میں نے تمھارے لیے کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کرا رکھا ہے۔ اگر حالات بگڑ گئے تو کشتیوں میں مہاجرین کو سوار کرا دینا۔ اگر میں نے حالات پر قابو پالیا تو حبشہ میں امن و امان سے قیام کرنا، وگرنہ یہاں سے فرار ہو جانا۔ اس انتظام کے بعد اس نے ایک پرچے پر لکھا:

''میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ نیز گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰؑ، ابن مریم خدا کے بندے ہیں اور اس کی روح و کلمہ ہیں، کہ جسے خدا نے مریمؑ پر القاء کیا۔''

یہ پرچہ نجاشی نے اپنے پوستین کے نیچے سینے کے پاس چھپا لیا۔ پھر اس نے دربار عام میں اہل حبشہ کے تمام قبائل کے نمایندوں کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ ''تمھارا میرے بارے میں کیا خیال ہے۔ کیا میں تمھاری حکومت کے لائق نہیں ہوں؟'' انھوں نے کہا: ''ہم آپ کو حکومت کے لیے بہترین شخص سمجھتے ہیں، مگر سنا ہے کہ آپ نے دینِ عیسوی ترک کر دیا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بندہ مان لیا ہے۔''

اصحم نے پوچھا: ''تم حضرت عیسیٰؑ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہو؟''

جواب ملا: ''وہ خدا کے بیٹے ہیں۔''

اصحم نے اپنا ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا: ''اس سے (یعنی جو کچھ پرچے میں لکھا ہے) زیادہ حضرت عیسیٰؑ نے کوئی تعلیم نہیں دی۔'' اہل حبش اس بات پر مطمئن ہو گئے اور بغاوت کا خطرہ ٹل گیا اور مہاجرین کشتیوں سے اُتر کر اپنے گھروں میں مقیم ہو گئے۔

اصحم نجاشی نے نبی کریم ﷺ کا نامۂ مبارک ہاتھی دانت کے ڈبے میں بند کر کے محفوظ کر دیا تھا اور کہا کرتا تھا کہ جب تک یہ مبارک تحفہ مملکتِ حبش میں محفوظ ہے، دشمن کا ہاتھ اس ملک تک نہیں پہنچے گا۔

بعض تاریخ کی کتابوں میں مذکورہ بالا خط کے آخر میں حسب ذیل فقرے بھی زائد ہیں: ''میں اپنے چچازاد بھائی جعفرؓ کو دوسرے مسلمانوں کے ساتھ تمھارے پاس بھیج رہا ہوں۔ جب یہ لوگ تمھارے پاس آئیں تو ان کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔''

حلبی، قسطلانی اور قلقشندی کی روایتوں میں اس اضافے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ فقرے طبریؒ کے پاس ضرور ہیں، مگر ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ یہ طبریؒ اور ان کے روایت کرنے والوں کا سہو ہے۔ یہ زائد فقرے یقیناً اُس مکتوب کے ہیں جو آنحضور ﷺ نے حضرت جعفرؓ اور مہاجرین کو مکہ سے حبشہ کی طرف ہجرت کرتے وقت دیا تھا، اور نجاشی اصحم کے نام یہی پہلا خط تھا جس کا متن دستیاب نہیں ہوا۔

مہاجرین حبشہ نے مکّہ سے 7 نبوی میں ہجرت کی ہے اور دس گیارہ سال بعد 7 ہجری میں رسول اللہ نے حضرت عمرو بن اُمیّہ ضمری کے ہاتھ یہ خط بھیجا ہے۔ ظاہر ہے، اس خط میں حضرت جعفرؓ کے لیے سفارش کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ وہ تو دس سال سے وہیں حبشہ میں مقیم تھے۔

غرض جب اہل حبشہ کی شورش رفع دفع ہوگئی تو نجاشی نے حضور ﷺ کے خط کا جواب لکھوایا، جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

نجاشی حبشہ کا خط رسول اکرم ﷺ کے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد رسول اللہ کے نام نجاشی اصحم بن ابجر کی طرف سے''

''اے اللہ کے رسول، آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے سلامتی ہو اور اللہ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں، اس اللہ کی طرف سے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور جس نے مجھے اسلام کی ہدایت دی۔''

''اے اللہ کے رسول ﷺ، آپ کا خط مجھے مل گیا، آپ نے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے۔ زمین و آسمان کے مالک کی قسم! عیسیٰؑ اس سے رتی بھر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ وہ ویسے ہی تھے جیسا آپ نے فرمایا ہے۔ ہم نے آپ ﷺ کے فرستادوں سے تعارف حاصل کیا۔ (آپ ﷺ جس شریعت کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں، اسے ہم نے پہچان لیا) اور آپ کے چچازاد بھائی اور ان کے ساتھیوں کی ہم نے مہمان داری بھی کی ہے۔''

''میں اقرار کرتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے سچے اور تصدیق یاب رسول ﷺ ہیں (یعنی پہلی کتابوں میں آپ ﷺ کی تصدیق کی گئی ہے)۔ مَیں نے آپ کے چچازاد بھائی اور ان کے ساتھیوں کے واسطے سے آپ ﷺ سے بیعت کر لی ہے اور ان کے ہاتھ پر اللہ رب العالمین کے سامنے سراطاعت خم کیا ہے (مسلم ہوگیا ہوں)''

''اب میں آپ ﷺ کی خدمت میں اپنے بیٹے اریحا بن اصحم بن ابجر کو بھیج رہا ہوں۔ مگر مجھے اپنے سوا کسی اور پر اختیار نہیں۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! اگر آپ ﷺ مجھے طلب کریں تو میں بھی حاضر خدمت ہو جاؤں گا، میں شہادت دیتا ہوں کہ جو آپ ﷺ فرماتے ہیں، وہی حق ہے۔ والسلام علیک یا رسول اللہ''

اصحم نجاشی حبش

اس خط میں نجاشی نے رسالت وہدایت پر ایمان لانے کا اقرار کیا ہے، مگر ساتھ ہی یہ وضاحت کردی ہے کہ اسلام کے معاملے میں وہ اپنے سوا کسی اور پر اختیار نہیں رکھتا۔

نجاشی پہلے ہی دل میں اسلام کا قائل ہو چکا تھا، جب کہ اس کے دربار میں مسلمانوں کے نمائندے حضرت جعفر طیارؓ نے قریش کے وفد کے ترجمان عمرو بن العاص (جو اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) کے استغاثے کے جواب میں ایک موثر تقریر کی تھی اور اس کے بعد رسول اللہ کا پہلا مکتوب نجاشی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اب جو دوسرا خط مدینے سے آیا، تو اس نے رسول اللہ پر ایمان لانے اور دین حق کو قبول کر لینے کا اقرار کرلیا۔

نجاشی کے نام دُوسرا خط

حضرت عمرو بن اُمیّہ ضمری نجاشی کے نام ایک اور خط بھی لے کر گئے تھے۔ (گویا یہ نجاشی کے نام فی الحقیقت تیسرا خط تھا) بدست عمرو ارسال کیے جانے والے اس دوسرے خط کے بارے میں ابن سعد نے ''طبقات'' میں لکھا ہے:

''آنحضور ﷺ نے نجاشی کے نام دو نامے بھیجے۔ پہلے فرمان میں اسلام کی دعوت دی گئی تھی اور دوسرے میں ام حبیبہ بنت ابی سفیان بن حرب سے نکاح کی نسبت ذکر کیا تھا اور یہ بھی لکھا تھا کہ اب مسلمان مہاجرین کو مدینہ بھیج دو۔''

اس خط کا متن نہیں ملتا ہے۔ البتہ تاریخوں میں اس کے حوالے ضرور ملتے ہیں۔ نجاشی نے دونوں ہدایات کی تعمیل کی۔ اُم حبیبہؓ کا غائبانہ نکاح حضور ﷺ کے ساتھ پڑھایا۔ ابوسفیان اللہ کے دین اور اس کے رسول ﷺ کے دشمنوں کا سردار تھا، لیکن اس کی بیٹی ام حبیبہؓ اوّلین مسلمانوں میں سے تھیں اور اپنے شوہر عبیداللہ بن جحش کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ میں مقیم تھیں۔ حبشہ میں قیام کے دوران میں عبیداللہ کا رجحان عیسائیت کی طرف ہوگیا۔ اس نے ام حبیبہؓ کو بھی عیسائیت کی ترغیب دی مگر وہ اسلام پر ثابت قدم رہیں۔ حبشہ کے قیام کے دوران ہی میں عبیداللہ فوت ہوگیا۔ اُم حبیبہ مکہ کے معزز خاندان کی بیٹی اور حضور ﷺ کے پھوپھی زاد کی بیوی تھیں۔ اُن کی بیوگی اور بے وطنی ایک مسئلہ تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اس بے سہارا معزز خاتون کو نکاح کا پیغام ارسال کیا۔ نجاشی نے حضور ﷺ کے حکم کی تعمیل میں نکاح کا خطبہ پڑھا اور اپنے پاس سے چار صد دینار حق مہر سب کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے بعد ام حبیبہؓ کے وکیل خالدؓ بن سعید بن عاص نے خطبۂ نکاح پڑھا۔ نجاشی نے مہر کی رقم خالدؓ بن سعید بن عاص کے سپرد کر دی اور اپنے پاس سے جہیز دیا۔ نکاح کے بعد لوگ واپس جانے کے لیے اٹھنے لگے تو نجاشی نے کہا: ''تشریف رکھیں، شادی کے بعد کھانا کھلانا سب پیغمبروں کی سنت ہے۔'' سب لوگ بیٹھ گئے۔ نجاشی نے سب کو کھانا کھلایا۔ اس کے بعد سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ رسول اکرم ﷺ کے حکم کے مطابق نجاشی نے حضرت ام حبیبہؓ کو مدینہ پہنچانے کا اہتمام کیا اور شرجیل بن حسنہ کو ساتھ بھیجا۔ اور تمام مہاجرین کو سامانِ سفر کے ساتھ دو جہازوں میں سوار کرا دیا۔ مذکورہ خط کے جواب میں نجاشی نے ایک عریضہ قاصدِ رسول ﷺ حضرت عمرو بن اُمیّہ کے ہاتھ بارگاہ رسالت میں روانہ کیا، جس کا متن یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد ﷺ کی طرف نجاشی اصحم کی جانب سے''

''سلام علیک یا رسول اللہ من اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امابعد:

''مَیں نے (حسبِ ارشاد) آپ ﷺ کی قوم کی خاتون سے، جو آپ ﷺ کے دین میں ہے، آپ ﷺ کا نکاح پڑھوا دیا ہے، اور وہ سیّدہ ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان ہیں۔ میں آپ ﷺ کے لیے ہدیہ بھیج رہا ہوں جس میں قمیص، پاجامے، چادر اور

چرمی موزوں کا ایک سادہ جوڑا شامل ہے۔ والسلام"

اصحم کا خط لے کر عمرؓو بن امیہ اور دوسرے مہاجرین ان جہازوں میں سوار ہو گئے جو نجاشی نے اُن کے لیے تیار کرائے تھے۔ یہ قافلہ 7 ہجری میں واپس آیا۔ اس وقت آنحضور ﷺ خیبر کی مہم پر تشریف لے گئے تھے۔ اس لیے قافلہ سیدھا خیبر کی طرف روانہ ہو گیا۔ البتہ راستے سے اُم المومنین ام حبیبہؓ، مہاجر خواتین اور بچوں کو مدینہ بھیج دیا گیا۔ اہل قافلہ عین فتح خیبر کے دن حضرت جعفرؓ ابن ابی طالب کی قیادت میں بارگاہِ رسالت ﷺ میں پہنچے۔ حضور ﷺ نے اُن کو سینے سے لگایا۔ اُن کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا: "میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے کس چیز سے زیادہ مسرّت ہوئی۔ فتح خیبر سے یا جعفرؓ کی آمد سے۔"

نجاشی کا دُوسرا خط

"سواطع الانوار" میں نجاشی کے دوسرے خط کا متن دیا گیا ہے، جسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے "الوثائق السیاسیہ" میں نمبر 25 پر درج کیا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"محمد ﷺ کی خدمت میں نجاشی اصحم کی جانب سے

"سلام علیک یارسول اللہ، من اللہ ورحمۃ وبرکاتہ،

"اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی ہے جس نے مجھے اسلام کی ہدایت عطا فرمائی، امابعد:

"اے اللہ کے رسُول ﷺ! میرے ملک میں مکّہ کے جو اصحاب مہاجرین آباد تھے، مَیں نے انھیں آپ ﷺ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ اور اب میں اپنے بیٹے اریحا کو اہل حبشہ کے ساٹھ آدمیوں کے ہم راہ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔ آپ ﷺ نے مجھ سے جو کچھ توقع کی تھی، یارسول اللہ، میں نے اس کی تعمیل وتکمیل کر دی، اور میں گواہی دیتا ہوں اس حق بات کی جو آپ ﷺ فرماتے ہیں۔ والسلام"

نجاشی کے اس دوسرے خط کے متعلق دو روایتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ عمرؓو بن اُمیہ ضمری، حضرت جعفرؓ، ام حبیبہؓ اور مہاجرین حبشہ کے قافلے کے ساتھ ہی نجاشی نے اپنے بیٹے اریحا کو بھی اہل حبش کے ساٹھ آدمیوں کے ہم راہ روانہ کیا، تو اریحا اور اہل حبش دو علیحدہ جہازوں میں سوار تھے۔ اور دوسرے دو جہازوں میں مہاجرین کا قافلہ تھا۔ سمندر میں طوفان آیا تو مہاجرین کے جہاز تو بچ نکلے، مگر اہل حبش کے جہاز ڈوب گئے، اور ان میں سے ایک بھی زندہ نہ بچا۔

دوسری روایت یہ ہے کہ اریحا اور اہل حبش بھی صحیح سلامت مدینہ پہنچ گئے۔ اریحا وہاں اپنے ہم راہیوں سمیت مسلمان ہو گیا، اور اپنے باپ نجاشی کا خط حضور ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا۔ جب نجاشی کا انتقال ہوا تو حبش سے ایک وفد اریحا کو لے جانے کے لیے مدینہ آیا۔ مگر اریحا نے بارگاہِ رسالت سے جدائی کو قبول نہ کیا اور واپس جانے سے انکار کر دیا، اور اپنے ہم راہیوں سمیت مدینہ ہی میں مقیم رہا۔ مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ یہ حبشی سپاہی، جو مدینہ میں رہ گئے تھے، بعض جنگوں میں مسلمانوں کے ساتھ شریک رہے ہیں۔

پہلی روایت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اریحا اور اس کے تمام ساتھی طوفان میں غرق ہو گئے تھے تو خط کس طرح محفوظ رہا؟ اس اشکال کو رفع کرنے کے لیے یہ کہا گیا ہے کہ دوسرا خط بھی عمرؓو بن اُمیہ کے پاس تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اریحا نے یہ خط، جس کا قاصد نجاشی نے خود اسے بنایا تھا، حضرت عمرؓو بن اُمیہ کے حوالے کیوں کر دیا۔ بظاہر یہ سفارتی آداب کے منافی معلوم ہوتا ہے۔ پھر اریحا والے خط کو دیکھیے۔ نجاشی لکھتا ہے کہ "مَیں نے آپ ﷺ کی ہدایات کی تعمیل کر دی ہے اور مہاجرین کو روانہ کر دیا ہے" اور "اب اپنے بیٹے کو بھیج رہا ہوں۔" اس عبارت سے یہی قیاس ہوتا ہے کہ اریحا کو مہاجرین کے ساتھ روانہ نہیں کیا گیا، بلکہ بعد میں کسی وقت بھیجا گیا ہے اور وہ اپنے باپ کا خط لے کر صحیح سلامت مدینہ پہنچ گیا۔ اس لیے دوسری روایت قابل ترجیح ہے۔ عمرؓو بن اُمیہ جو خط لے کر گئے، اس میں بھی اریحا کو بھیجنے کا ذکر ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہاجرین کے ساتھ نہ جا سکا۔ اس کی روانگی بعد میں ہوئی۔

مؤرخین نے نجاشی اصحم کے بعد حبشہ کے حالات سے کوئی واسطہ ہی نہیں رکھا، اس لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہو گیا ہے کہ نجاشی مذکور کی وفات کے بعد وہاں کیا صورتِ حال رہی۔ یہاں تک کہ اصحم کے جانشین کا نام بھی ہماری تاریخوں میں نہیں ملتا ہے۔ بہرحال متفرق واقعات کے جوڑنے سے جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ حبش میں نجاشی کے اثر اور مہاجرین سے میل جول اور دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں اہل حبش میں سے کچھ اور لوگ بھی مسلمان ہو گئے، مگر ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی، کیوں کہ ملکی مصالح کے تحت غالباً اسلام کی یہ دعوت علانیہ نہیں بلکہ خفیہ رہی۔ تاہم اہل دربار اور مسیحی پیشواؤں میں نجاشی کے مسلمان ہو جانے کی افواہیں گشت کرتی رہیں، اور وہ اس سے بدظن ہوتے چلے گئے۔ پہلے ہی مسیحی فقہ کے دو مکاتب موجود تھے۔ ایک نجاشی کا حامی، دوسرا اُس کا مخالف۔ اسلام قبول کر لینے کی افواہوں کے بعد مخالف گروہ زیادہ طاقت ور ہو گیا۔ مخالفین کے اس غلبے کو دیکھ کر نجاشی اصحم نے طے کیا کہ جو لوگ اس کے حامی تھے، اور جو در پردہ مسلمان ہو گئے تھے، انھیں مدینہ بھجوا دے کہ نہ معلوم حبشہ میں حالات کیا رُخ اختیار کر لیں۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹے اریحا کے ہم راہ ان لوگوں کو مدینہ بھجوا دیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد نجاشی کا انتقال ہو گیا۔

نجاشی کا انتقال 8 ہجری کے اواخر یا 9 ہجری کے اوائل میں ہوا ہے۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ جب نجاشی کا انتقال ہوا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "آج خدا کے نیک بندے اصحم کا انتقال ہو گیا۔ تم سب کھڑے ہو اور اپنے بھائی اصحم پر نماز پڑھو۔ پس ہم نے آپ کے پیچھے صف بندی کی۔" (صحیحین)

طبریؒ کا خیال ہے کہ یہ واقعہ 9 ہجری میں پیش آیا اور اس کے برعکس دوسری جماعت کا گمان ہے کہ یہ فتح مکّہ (8 ہجری) سے پہلے کا واقعہ ہے۔

دوسرے نجاشی کے نام مکتوبِ رسالت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''یہ خط محمد رسول اللہ ﷺ کا، حبشیوں کے سردار نجاشی (اصحم) کے نام ہے

''سلامتی اس شخص کے لیے جو راہِ ہدایت کی پیروی کرے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ سوائے اللہ کے، کوئی معبود نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے نہ بیوی ہے نہ بچہ۔ اور یہ بھی کہ محمد ﷺ اسی (اللہ) کا بندہ اور رسول ﷺ ہے۔''

''میں تمھیں اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں، کیوں کہ میں اُسی کا رسول ہوں۔ اسلام قبول کرلو تو تمھارے لیے سلامتی ہے، اور اے اہل کتاب! ایسی بات پر جمع ہو جاؤ، جو ہمارے اور تمھارے درمیان مساوی (اور مشترک) ہے۔ اور وہ بات یہ ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں، اور نہ اس کے ساتھ شرک کریں، اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں اپنوں ہی کو ربّ بنائیں۔ اگر وہ رجوع کریں تو کہہ دو، گواہ رہو، ہم تو اللہ کے مسلم (فرماں بردار) ہیں۔ اگر تم انکار کرتے ہو تو تمھاری قوم نصرانیوں (کی گم راہیوں اور بداعمالیوں) کا وبال تم ھی پر آئے گا۔''

اس خط کے متعلق بھی تاریخوں میں یہ تاثر ملتا ہے کہ جیسے یہ بھی اصحم نجاشی کے نام ہی لکھا گیا تھا۔ چنانچہ اس کے سرنامہ میں بھی نجاشی کے ساتھ ''اصحم'' درج کیا گیا ہے۔ اس کے مضمون کے ساتھ ایسی کوئی وضاحت نہیں ملتی کہ کب اور کس کے ذریعے بھیجا گیا، کیوں کہ اصحم کے نام پہلا خط وہ ہے جو حضرت جعفر طیارؓ 5 نبوت میں ہجرت سے پہلے لے گئے تھے۔ دوسرا وہ تبلیغی خط ہے جو عمروؓ بن اُمیّہ ضمری صلح حدیبیہ کے بعد سات ہجری میں لے کر گئے تھے۔ تیسرا خط انھی عمروؓ بن اُمیّہ کے ذریعے بھیجا گیا ہے جس میں اُم حبیبہؓ سے نکاح اور مہاجرین کی واپسی کا ذکر ہے۔ اس سارے عرصے میں مہاجرین کی واپسی تک مندرجہ بالا خط کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ تاریخوں میں یہ بحث ضرور موجود ہے کہ حضور ﷺ نے ایک نجاشی کے یا دو نجاشیوں کے نام خطوط بھیجے، مگر دوسرے نجاشی اور قاصد رسول ﷺ کا نام، نیز خط کی روانگی کی تاریخ کا کوئی ذکر ملتا ہے نہ دوسرے نجاشی کے جواب یا اس کے ردِعمل کا تذکرہ۔ خط کا مضمون ظاہر کرتا ہے کہ یہ خط اگر اصحم کے نام تھا تو اس کے بھیجنے کا صحیح وقت وہی ہو سکتا ہے جب کہ سات ہجری میں آپ نے سلاطین عالم کے نام خطوط بھیجے تھے۔ مگر اس وقت جو خط نجاشی کے نام بھیجا گیا، وہ متفقہ طور پر وہی ہے جس کا مضمون اس سے پہلے درج کیا جا چکا ہے، اور اس سے پہلے آپ ﷺ نے کوئی تبلیغی خط کسی نجاشی کے نام نہیں بھیجا۔ لازماً یہ بعد کا خط ہے، اور یہی بات دُرست معلوم ہوتی ہے کہ یہ خط دوسرے نجاشی کے نام بھیجا گیا، جو اصحم کی وفات کے بعد تخت نشین ہوا، اور مختلف قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ 9 ہجری کے اوائل میں بھیجا گیا۔ غالباً اس کے قاصد بھی عمروؓ بن اُمیّہ ہی ہوں گے۔

اس بات کی تصدیق، بقول محمود فاروقی صاحب، اُس روایت سے بھی ہوتی ہے جو قیصرِ روم کے نام خطوط کے سلسلہ واقعات میں ملتی ہے۔ سعید بن ابی راشد فتح شام کے بعد حمص پہنچے تو ان کی ملاقات ایک گرجا میں ایک بوڑھے شخص سے ہوئی، جس کے متعلق یہ بتایا گیا تھا کہ وہ قیصر روم کا قاصد بن کر حضور ﷺ کی خدمت میں آ رہا تھا، جب کہ آپ ﷺ تبوک میں (رجب 9 ہجری) مقیم تھے۔ اس سے گفتگو کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا: ''میں نے ایک خط کسریٰ (فارس) کے نام بھیجا تھا۔ اس نے اسے پھاڑ دیا۔ اُس کی حکومت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گی، اور ایک خط نجاشی کے نام بھیجا، اس نے بھی پھاڑ دیا۔ اس کی حکومت بھی چاک چاک ہو جائے گی، اور ایک خط تمھارے صاحب (قیصرِ روم) کو بھیجا اور وہ اسے لے کر بیٹھ گیا (کوئی جواب نہیں دیا)۔'' (اس واقعے کی تفصیل آگے قیصر روم کے واقعات میں آ رہی ہے)۔ اس خط میں نجاشی کے خط پھاڑنے کا ذکر ہے۔ ظاہر ہے، یہ اصحم نجاشی نہیں ہو سکتا، کیوں کہ مہاجرین حبشہ اصحم کے عہد حکومت ہی میں گئے تھے۔ لازماً یہ بعد کا نجاشی ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اصحم کے انتقال کے بعد اہل دربار میں سے متعصب مسیحی پیشواؤں نے جو متوفی نجاشی کے ''طبع واحدہ'' کے مسیحی عقیدے اور بعد میں اس کے مشرف بہ اسلام ہونے کی افواہوں کی وجہ سے اس کے سخت مخالف ہو گئے تھے، ایک ایسے شخص کو تخت نشین کیا جو ان کے کلیسا کے عقائد میں زیادہ سخت اور متعصب ہوگا۔ اور اس کے ''بدعقیدہ'' ہو جانے کا انھیں اندیشہ نہ ہوگا۔ چنانچہ اُن کے حسبِ توقع جب حضور ﷺ کا نامۂ مبارک دوسرے نجاشی کے نام گیا تو اس نے کسریٰ کی طرح اسے چاک کر دیا۔ اس کا ذکر تبوک میں حضور ﷺ نے قیصرِ روم کے قاصد تنوخی سے کیا ہے۔

(2) بنام ہرقل، قیصر روم

قیصر روم ہرقل (Heraclius) کا شمار عظیم جنگ جو شہنشاہوں میں ہوتا ہے۔ وہ 610 تا 641ء روم کا شہنشاہ رہا۔ اس سے پہلے وہ قرطاجنہ کا رومی حاکم اور سالار تھا۔ 610ء میں اس نے روم کے شہنشاہ فوقس (Phocas) کے خلاف بغاوت کر کے اُسے قتل کر دیا تو سینیٹ نے اُسے روم کا شہنشاہ مقرر کر دیا تھا۔ پاپائے اعظم نے اپنے ہاتھوں سے اسے تاج پہنایا تھا۔ رومی سلطنت کو اندرونی و بیرونی بحرانوں سے نکالنے کے لیے ہرقل نے بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ اُس نے علاقائی فوجی کمانڈروں کو سول اختیارات دے کر نظامِ حکومت کو فعال بنایا اور ایران کے ساسانی شہنشاہ (کسریٰ) خسرو پرویز کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی اتحاد کیے۔ ایرانیوں نے رومی سلطنت کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا اور 617ء میں یروشلم پر قبضہ کر کے وہ صلیب بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے جس کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اس پر حضرت عیسیٰؑ کو سُولی پر چڑھایا گیا تھا۔ رومی سلطنت کا مذہب عیسائیت تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق قیصر روم زمین پر خدا کا نمائندہ تصور کیا جاتا تھا۔ پاپائے اعظم کو بھی اُمورِ سلطنت میں بہت زیادہ اختیارات حاصل تھے۔ اس لیے ایرانیوں سے اپنے مقبوضات چھڑانا اور مقدس صلیب لا کر یروشلم کے گرجا گھر میں رکھنا رومی سلطنت کا دینی فرض تھا، اور یہ فرض ادا کرنے کے لیے قیصر روم اور پاپائے اعظم مل کر جدوجہد کر رہے تھے۔

627ء میں ہرقل نے خسرو پرویز کو زبردست شکست دے کر عراق اور شام پر قبضہ کرلیا اوران سے وہ مقدس صلیب بھی حاصل کرلی تھی۔ خسرو پرویز نے ہرقل کو خراج دینا منظور کرلیا۔

صلح حدیبیہ کے بعد آنحضور ﷺ نے ہرقل کے نام نامۂ مبارک تحریر فرمایا تھا۔ یہ خط قاصدِ رسول ﷺ حضرت دحیہؓ بن خلیفہ کلبی لے کر گئے تھے۔ قیصر کے دربار میں براہِ راست خط پہنچانا بہت مشکل تھا۔ اس لیے انھوں نے شہر بُصریٰ کے حاکم سے ملاقات کی اور اسے اپنی سفارت کے مقصد سے آگاہ کیا۔ بُصریٰ کا حاکم اس جلوس میں شریک ہونے کے لیے حمص آیا ہوا تھا جو صلیب مقدس کو لے کر بیت المقدس جا رہا تھا۔ اس شانِ دار فتح کی خوشی میں عیسائیوں نے یروشلم (بیت المقدس) میں ایک عظیم الشان جشن منعقد کیا۔ ہرقل خود پاپائے اعظم، امرا، وزرا اور درباری وہی مقدس صلیب یروشلم کے بڑے گرجا گھر میں رکھنے کے لیے یروشلم آئے ہوئے تھے۔ اس جلوس اور فتح کے جشن میں شریک ہونے کے لیے افریقہ، مصر، عراق اور عرب کے رومی مقبوضات اور ماتحت ریاستوں کی مختلف سفارتیں ہرقل کے حضور میں تہنیت اور مُبارک بادی کے لیے آئی ہوئی تھیں، اوران کے قافلے اس جلوس میں شامل ہوتے جا رہے تھے۔

ہرقل قیصرِ روم جب لاکھوں شیدائیوں کے جلو میں صلیب مقدس لیے ہوئے حمص پہنچا، تو یہاں شہر بُصریٰ کے حاکم کے توسّط سے حضرت دِحیہؓ کلبی قیصر کے دربار میں پہنچے، اور نامۂ رسالت ﷺ پیش کیا۔ اس خط کا مضمون درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد ﷺ کی جانب سے، جو خدا کا بندہ اور رسول ﷺ ہے ہرقل سردارِ روم کے نام۔

''سلامتی ہے اس کے لیے جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ بعدازاں میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرلو!

تمام آفات سے تم محفوظ ہو گے اور اللہ تعالیٰ تمھیں دُہرا اجر عطا کرے گا۔ اگر تم نے رُوگردانی کی تو تم پر واضح رہنا چاہیے کہ تمھاری رعیّت کی گم راہی کا وبال بھی تمھارے ہی اوپر رہے گا۔ اور

''اے اہلِ کتاب! آؤ! ایسی بات پر جمع ہو جاؤ جو تمھارے اور ہمارے درمیان یکساں طور پر تسلیم شدہ ہے۔ اور وہ (بات) یہ ہے کہ ہم سب اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں۔ اور نہ ہم اللہ کے سوا ایک دوسرے کو اپنا رب قرار دیں اور اگر وہ رجوع کریں تو کہہ دو! تم گواہ رہو کہ ہم تو مُسلمان ہیں۔''

پیشین گوئی

ایران وروم کی چارسالہ جنگ کے دوران میں قریش ایرانیوں کی حمایت کرتے رہتے تھے۔ ان کے برعکس مسلمانوں کی خواہش یہ تھی کہ رومی، جو اہل کتاب ہیں، اور ایک نبی کی اُمت ہیں، کام یاب ہوں۔ جب رومیوں کو شکست ہوئی تو قریش کے سرداروں نے رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ دیکھ لو، یہ تمھارے اہل کتاب ہار گئے اوراب تمھارا بھی اسی طرح بُرا حشر ہونے والا ہے۔ ان کے جواب میں اللہ نے سورۂ روم کی یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ هُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۝ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ۭ وَ يَوْمَىِٕذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (الروم 30: 1تا4)

''ا۔ل۔م۔ رومی قریب کی سرزمین میں مغلوب ہوگئے ہیں۔ اور اپنی اس مغلوبیت کے بعد چند سال کے اندر وہ غالب ہو جائیں گے۔ اللہ ہی کا اختیار ہے پہلے بھی اور بعد بھی۔ اور وہ دن وہ ہوگا جب کہ اللہ کی بخشی ہوئی فتح پر مسلمان خوشیاں منائیں گے۔''

دس سال بعد یہ پیشین گوئی پوری ہوگئی تھی اور ہرقل قیصرِ روم جشنِ فتح منانے کو بیت المقدس جا رہا تھا۔ بُصریٰ کے حاکم کا زیادہ تر واسطہ عرب قبیلوں سے پڑتا رہتا تھا۔ اور وہ چوں کہ ان تمام باتوں سے خوب واقف تھا، اس نے حمص میں قاصد رسول ﷺ کو پیش کرتے ہوئے اِن تمام واقعات کی تفصیلی رپورٹ قیصر کو دی تھی۔

قیصر کا ردِ عمل

قیصر یہ خط پڑھ کر خاموش رہا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ اسے بیت المقدس کے دربار میں پیش کیا جائے۔ اس موقع پر جب قیصر کی خدمت میں ہر جانب سے مدحت نامے پیش ہورہے تھے، یہ خط اپنے مضمون کے لحاظ سے انوکھا تھا۔ اوراس کا اندازِ تخاطب بھی رسمی اور مؤدبانہ نہیں تھا۔ اس پر ہرقل کو برافروختہ ہو جانا چاہیے تھا، مگر اس کے برعکس اس کا یہ تحمل اور سکوت معنی خیز تھا۔

دراصل بات یہ تھی کہ دس بارہ سال پہلے جب ایرانیوں نے ہرقل کو شکست دی تھی تو اس وقت رومیوں کے خلاف یہودیوں اور عرب کے قبیلوں نے خسرو پرویز کا ساتھ دیا تھا۔ ایرانی چوں کہ مشرک تھے، اس لیے عرب کے مشرک قبائل کی ہمدردیاں عام طور سے روم کے مقابلے میں ایران کے ساتھ ہوتی تھیں۔ رومی دربار کے لیے یہ بات بڑی اہم تھی کہ عرب قبائل میں، جو ہمیشہ ایرانیوں کے وفادار رہتے تھے، ایک طاقت ور گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے جو مشرک ایرانیوں کے مقابلے میں اہلِ کتاب عیسائیوں کا حامی ہے، اور جو حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا رسول بھی مانتا ہے۔ تدبر وسیاست کا یہی تقاضا تھا کہ ایران کے حامی قبائل، اور خاص طور سے قریش کے مقابلے میں اس نئے دین کے ماننے والوں کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

یہی وجہ تھی کہ ہرقل نے اس تلخی کو، جو نامۂ مبارک کو سُن کر محسوس کی تھی، برداشت کرلیا، اور حکم دیا کہ بیت المقدس پہنچ کر عرب کے اس نبی اور اس کے دعوائے نبوت کے متعلق اچھی طرح تحقیق کرلی جائے۔

بیت المقدس میں جشنِ فتح کے بعد قیصر کے دربارِ خاص میں جب نامۂ مبارک سنایا گیا تو وہاں قریش کا سردار ابوسفیان بھی موجود تھا جو تیس عربوں کے ایک تجارتی قافلے کو لے کر ان دنوں بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ وہ ہنوز کفر کی حالت میں تھا۔ حکام

شاہی اُن سب کو ہرقل کے پاس لے گئے، تو ہرقل نے کہا: ''مَیں نے آپ کو اس لیے بلوایا ہے کہ آپ مجھے ان کے بارے میں کچھ بتائیں جو مدینے میں ہیں۔''

دربار میں شہنشاہ کے امراء، وزرا اور درباری اور مذہبی راہ نُما بھی موجود تھے۔ شہنشاہ نے دربار کے ترجمان سے کہا کہ ان سے معلوم کرو کہ ان میں سے کوئی شخص اسے سب سے زیادہ جانتا ہے؟

ابوسفیان نے کہا: ''میں اس کا قریبی رشتہ دار ہوں۔'' ہرقل نے حکم دیا: ''ابوسفیان کو میرے قریب کر دو اور اس کے ساتھیوں کو اس کے پیچھے بٹھا دو۔'' پھر ترجمان سے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ میں اس شخص سے اس مدعی نبوت کے متعلق سوال کروں گا۔ اگر یہ شخص جھوٹ بولے تو وہ لوگ اس کی تکذیب کریں۔

ہرقل نے پوچھا: ''تمہارے درمیان ان کا نسب کیسا ہے؟''

ابوسفیان نے جواب دیا: ''وہ عالی نسب ہے''

ہرقل نے پوچھا: کیا اس سے پہلے بھی تمھاری قوم میں سے کبھی کسی نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے؟'

ابوسفیان: نہیں کبھی نہیں

ہرقل: اس کے آباؤاجداد میں سے کوئی بادشاہ بھی تھا؟

ابوسفیان: نہیں کوئی نہیں

ہرقل: اس کی پیروی کرنے والے اشراف لوگ ہیں یا غریب اور ناتواں؟

ابوسفیان: کم زور اور مسکین لوگ

ہرقل: اس کے ماننے والوں میں اضافہ ہو رہا ہے یا کمی؟

ابوسفیان: اضافہ ہو رہا ہے

ہرقل: اُس کے ماننے والوں میں کوئی ناراض ہو کر کبھی مرتد بھی ہوا ہے؟

ابوسفیان: جی نہیں

ہرقل: نبوّت کا دعوٰی کرنے سے پہلے انھیں کبھی تم نے جُھوٹ بولتے پایا ہے؟

ابوسفیان: جی نہیں

ہرقل: کیا وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی کرتا ہے؟

ابوسفیان: جی نہیں، مگر ہم اس کے صلح حدیبیہ کرنے کے بعد ایسے زمانے میں ہیں جس کے متعلق نہیں معلوم، وہ کیا کرے گا۔

ہرقل: کیا تمھاری اُن سے جنگ بھی ہوتی ہے؟

ابوسفیان: جی ہاں ہوتی ہے

ہرقل: جنگ کا نتیجہ کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی وہ غالب آ جاتے ہیں اور کبھی ہم

ہرقل: وہ تمھیں کن باتوں کی تبلیغ کرتے ہیں؟

ابوسفیان: وہ کہتے ہیں کہ ایک خدا کی عبادت کرو۔ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ اپنے آباؤاجداد کے طریقے ترک کر دو۔ نماز پڑھو، سچ بولو، پاک دامن رہو اور صلہ رحمی کرو۔

(قیصر روم، ہرقل کے دربار میں اس مشہور مکالمے کی تفصیل مسلمان ہونے کے بعد خود حضرت ابوسفیانؓ نے بیان کی ہے، اور تمام تاریخوں میں اس کا ذکر ہے)

علماءِ کلیسا کی ہٹ دھرمی

اُس زمانہ میں دنیا کی بیش تر قوموں اور اہلِ مذاہب میں یہ چرچا تھا کہ ایک آخری رسول، اللہ کی طرف سے مبعوث ہونے والا ہے۔ اور ہر ایک کو یہ توقع تھی کہ وہ نجات دہندہ رسول ﷺ یا اوتار اُن کی قوم میں مبعوث ہوگا۔ اس معاملے میں سب سے زیادہ آرزومند یہود تھے کہ رسول موعود ان کے درمیان مبعوث ہو اور انھیں دوسری قوموں کے ظلم و ستم سے نجات دلائے۔ ان کی طرح عیسائی بھی متوقع تھے کہ وہ رسول ﷺ انھی کے درمیان پیدا ہوگا اور ان کے فرقہ وارانہ اختلافات کو دور کر کے انھیں متحد و متفق کر دے گا اور پھر ساری دنیا میں صرف ایک ہی مذہب کو ماننے والے رہ جائیں گے اور وہ ہوں گے پیروانِ مسیح۔

کہتے ہیں جب حمص میں قیصر کو نامۂ مبارک ملا تو اس نے شہر روم میں ایک مسیحی عالم و پیشوا کے پاس اپنے ایک قاصد کو بھیج کر اس کی رائے طلب کی تھی، جب وہ بیت المقدس میں تھا تو اسے شہر روم سے اس عالم کا جواب مل گیا تھا، جس میں اس نے مبعوث ہونے والے رسول موعود کی نشانیاں لکھی تھیں، اور یہ بھی بتایا تھا کہ یہی وہ زمانہ ہے جس میں وہ رسول مبعوث ہوگا۔ اس خط کی روشنی میں قیصر نے ابوسفیان سے وہ سوالات کیے تھے جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔

اس مکالمے کے بعد ہرقل بڑے تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ کیوں کہ تمام آثار و قرائن سے غالب گمان یہی ہوتا تھا کہ محمد ﷺ اپنے دعوے میں سچے ہیں اور یہی وہ رسول ہیں، جن کی بشارت آسمانی صحیفوں اور مذہبی روایتوں میں دی گئی تھی۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ قیصر نے بیت المقدس میں اسی جشن کے موقع پر اعلیٰ سطح کی ایک مذہبی مشاورت بھی منعقد کی تھی۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو اس نے دروازے بند کرا دیے اور ان کے سامنے نامۂ مبارک پڑھ کر سنایا۔ روم کے اُس عالم کا خط بھی ان کے سامنے رکھ دیا، پھر اس نے ان سے کہا کہ اگر یہ نشانیاں مدعی نبوت پر صادق آتی ہیں تو کیا ہمیں ان کی رسالت کی تصدیق نہیں کرنی چاہیے؟

علمائے کلیسا کے درمیان اس مکالمہ کی وجہ سے، جو دربارِ خاص میں ابوسفیان سے ہوا تھا، پہلے ہی بڑی چہ مے گوئیاں ہو رہی تھیں۔ اب جو ہرقل نے اس طرح کی بات کہی، تو وہ سب برافروختہ ہو گئے اور بڑبڑاتے ہوئے مجلس سے اٹھ گئے، مگر چوں کہ دروازے بند تھے، اس لیے باہر نہ جا سکے۔ ہرقل نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق اس نے فوراً دوسرا رخ اختیار کیا اور کہنے لگا: ''مَیں نے تو یہ بات محض آپ لوگوں کی آزمائش کے لیے کہی تھی اور اب مجھے یقین ہو گیا کہ آپ حضرات دینِ مسیح کے لیے کس درجہ حمیّت و غیرت رکھتے ہیں۔'' پھر اس نے عیسائیت کو پیش آنے والے خطرات سے مقابلے کے لیے اپنے عزائم کا اظہار کیا اور جوشیلی تقریر

سے سب کو اپنے بارے میں پوری طرح مطمئن کر دیا۔ پھر انھیں اور ان کی عبادت گاہوں کو بیش قیمت نذرانے اور تحفے دے کر انھیں رخصت کیا۔

یہ وہ واقعات تھے، جن کا تعلق رسول اللہ ﷺ کے خطوط سے ہے۔

کا پس منظر

جس زمانے میں پہلا خط لکھا گیا تھا، مکّہ فتح نہیں ہوا تھا، اور قریش کی سیادت اسی طرح برقرار تھی۔ اسی لیے رومی دربار اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا صحیح اندازہ نہ کر سکا، اور اسے بھی اندرونِ عرب کے قبائلی نزاعات کا شاخسانہ قرار دے کر نظر انداز کر دیا گیا۔ مگر جب تین چار سال کے اندر اندر مکّہ فتح ہو گیا، اور حجاز کے تقریباً تمام قبائل نے اسلام قبول کر لیا، اور مدینے کی سیادت کو تسلیم کر لیا، تو عراق وشام کے عرب قبائل میں، جو رومی سلطنت کے باج گزار تھے، ہل چل سی مچ گئی۔ اس کے اثرات رومی دربار میں محسوس کیے گئے، اور پہلی بار قیصر اور اکابرِ روم نے اسلام کی روز افزوں طاقت کو مسیحی دنیا کے لیے بہت بڑا خطرہ تصور کیا۔ ہرقل نے شام کے عرب قبائل کو اشارہ کیا کہ وہ مسلمانوں کی گوشمالی کے لیے مکّہ اور مدینہ پر حملہ کی تیاری کریں۔ روم کے ماتحت سردارانِ قبائل نے مدینے کی تجارت کا راستہ روک دیا، اور حضور ﷺ کے قاصدوں میں سے چند کو شہید کر دیا۔ ہرقل نے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیا تھا کہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت کا آج ہی قلع قمع نہ کر دیا گیا تو کل رومی شہنشاہیت کے پرخچے اُڑ جائیں گے۔ چنانچہ اس نے حجاز پر حملہ کرنے کے لیے ایک لاکھ فوج کی تنظیم شروع کر دی، اور اپنی فوجی چھاؤنیوں کے دورے پر نکل کھڑا ہوا۔

رومی سرحدوں پر جنگی تیاریوں کی سرگرمیاں نگاہِ رسالت ﷺ سے اوجھل نہیں تھیں۔ حضور ﷺ نے بھی بروقت اندازہ لگا لیا تھا کہ آج نہیں تو کل رومی لشکر اسلامی حدود میں داخل ہو جائیں گے، اب دو ہی صورتیں تھیں یا مدینے میں بیٹھ کر دشمن کا انتظار کیا جائے، یا خود پیش قدمی کر کے دشمن پر اچانک ضرب لگائی جائے۔ یہ تدبرِ رسالت ﷺ اور حضور ﷺ کی جنگی بصیرت تھی کہ آپ ﷺ نے دشمن کے مقابلے میں پیش قدمی کا فیصلہ کیا، اور تیس ہزار جاں باز مجاہدوں کا لشکر لے کر نہایت تیزی سے کوچ کرتے ہوئے تبوک کے میدان جنگ میں پہنچ کر اپنی لشکر گاہ قائم کر دی۔ وہاں سے علیحدہ علیحدہ دستوں کو بھیجا کہ وہ رومیوں کی ماتحت عرب ریاستوں کو ایک دوسرے سے منقطع کر دینے کے لیے فوجی کارروائی کریں۔ یہ فوجیں نہایت سُرعت سے مختلف سمتوں سے بڑھیں، اور اس سے پہلے کہ وہ قیصر سے کمک طلب کرتیں، ان کا محاصرہ کر لیا۔

حضور ﷺ کی یہ سریع پیش قدمی ہرقل کے لیے غیر متوقع تھی۔ وہ سخت متحیّر و مرعوب ہو گیا۔ اس کے دل میں یہ کھٹکا بھی لگا ہوا تھا کہ اگر محمد ﷺ اللہ کے سچے رسول ہیں تو ان کے مقابلے میں دنیا بھر کی طاقت لے کر بھی سرخ رُو ہونا ممکن نہیں۔ دوسری طرف قسطنطنیہ میں مسیحی فرقوں کے تنازعات نے خانہ جنگی کی حالت پیدا کر دی تھی، اور رومی دربار کی سازشوں نے رومی فوجوں کے اندر بھی تفرقہ پیدا کر دیا تھا۔ ان تمام باتوں نے مل کر قیصر کو ایسا پریشان خاطر کر رکھا تھا کہ مسلمانوں کی اچانک فوج کشی کی اطلاع نے اسے سخت بدحواس کر دیا، اور وہ مسلمانوں کے مقابلے میں نکلنے کا فیصلہ نہ کر سکا۔

ماتحت عرب ریاستوں نے دیکھا کہ رومی شہنشاہ بھی مسلمانوں سے خوف زدہ ہے، تیس ہزار کا جرار لشکر ان کے سروں پر کھڑا ہے، اور ان کے رسل و رسائل اور کمک کے راستے منقطع ہو چکے ہیں، تو وہ اطاعت پر آمادہ ہو گئے، ان میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا اور بعض نے جزیہ پر امان حاصل کر لی۔ یہ ایک عظیم الشان فتح تھی جو مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

قیصر کے نام دوسرا خط

تبوک کے میدان جنگ سے آپ ﷺ قیصر کے نام آخری اور تہدیدی خط لکھا تھا، جو پہلے سفیر دِحیہؓ بن خلیفہ کلبی ہی قیصر کے پاس لے کر گئے تھے، اس خط کا مضمون درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے والی رُوم کے نام

''میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم اسلام قبول کر لو تو تمھارے حقوق بھی مسلمانوں کے سے ہوں گے اور فرائض بھی۔ اور اگر اسلام میں داخل ہونا نہ چاہو، تو پھر تم جزیہ ادا کرو۔ (ہمیں) اللہ کا حکم ہے کہ جو لوگ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہ لائیں، اور جسے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام ٹھہرایا ہے اسے حرام نہ ٹھہرائیں، اور خاص طور پر اہل کتاب، جو دین حق کا حق ادا نہ کریں، تو ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اگر، تمھیں یہ منظور نہیں ہے تو کم از کم تم ماتحت (عرب قبائل) رعیّت اور اسلام کے درمیان اس امر میں حائل نہ ہو کہ وہ اسلام قبول کر لیں یا جزیہ ادا کریں۔''

اس عہد کی دنیا کی سب سے بڑی شہنشاہیت کو، جس نے ابھی ایران کی عظیم سلطنت کو اپنے سامنے جھکنے پر مجبور کر دیا تھا، اور جو کسی بھی غنیم کے مقابلے میں آسانی سے لاکھ دو لاکھ تربیت یافتہ اعلیٰ درجے کی فوجیں لا کر کھڑی کر سکتی تھی، صرف تیس ہزار کے لشکر کے بل پر اس جرأت سے للکارنا نہایت ہی حیرت انگیز معاملہ ہے۔ بلاشبہ یہ نبی کریم ﷺ کے رسولِ برحق ہونے کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ کو رومی شہنشاہیت سے زیادہ عظیم طاقت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اور وہ اللہ جل شانہ، کی طاقت تھی۔ آپ ﷺ کو بھروسا اس تیس ہزار کے لشکر پر نہیں، بلکہ اس غیبی تائید و نصرت پر اعتماد تھا جس کا وعدہ اللہ نے کیا تھا۔

اس خط میں اصل مطالبہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لانے کا اور قانونِ الٰہی کو تسلیم کرنے کا ہے۔ دوسری متبادل صورت یہ بتائی گئی ہے کہ رومی شہنشاہ شام کی ماتحت عرب ریاستوں سے دست بردار ہو جائے اور ان کے اور مسلمانوں کے معاملات میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ ہرقل تبوک کی طرف بڑھنے کی بجائے حمص کی چھاؤنی میں

خاموش بیٹھا رہا، اور اس نے شام کی عرب ریاستوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اس طرح عملاً اس نے رسول اللہ ﷺ کے دوسرے مطالبے کو تسلیم کر لیا۔ تدبرِ رسالت کے مقابلہ میں رومی سیاست کی یہ شکست آخر کار رومی شہنشاہیت کے زوال کا پیش خیمہ بن گئی۔

جیسا کہ ہم لکھ آئے ہیں، حضور ﷺ نے ہرقل کے نام دوسرا خط تبوک کے میدان جنگ سے رجب 9 ہجری میں بھیجا تھا اور یہ جو علمائے کلیسا کو جمع کر کے نامۂ مبارک پر گفتگو کرنے کا واقعہ ہے، ایک روایت کے مطابق بیت المقدس میں نہیں بلکہ حمص کے کلیسا میں پیش آیا۔ اور یہی روایت زیادہ صحیح ہے۔ اس کی تصدیق ''تاریخ دمشق'' سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں ابن عساکر نے سعید بن ابی راشد کی روایت کو نقل کیا ہے۔ یہ ایک دل چسپ قصہ ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ قیصر روم کا وہ خط پہلے پڑھ لیں، جو اس نے حضور اکرم ﷺ کے دوسرے نامۂ مبارک کے جواب میں بھیجا تھا، پھر اس روایت پر نظر کریں جس میں سعید بن ابی راشد اور ہرقل کے قاصد کی گفتگو بیان کی گئی ہے:

''احمد رسول اللہ ﷺ کی طرف جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی دی ہے! بادشاہ قیصرِ روم کی جانب سے۔

''میرے پاس آپ ﷺ کا قاصد آپ کا خط لے کر آیا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ آپ کا ذکر ہم نے انجیل میں پایا ہے۔ اور عیسیٰ ابن مریم نے آپ ﷺ کی بشارت دی ہے۔ مَیں نے اہل روم کو دعوت دی کہ وہ آپ ﷺ پر ایمان لائیں۔ مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اگر وہ میری بات مان لیتے تو بلاشبہ اس میں ان کے لیے خیر ہی خیر تھی۔ اگر میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تو حاضر ہوتا، اور آپ ﷺ کے پاؤں دھوتا۔''

قیصرِ رُوم کے قاصد کا واقعہ

سعید بن ابی راشد، جو آلِ معاویہ کے مولیٰ تھے بیان کرتے ہیں کہ:

''میں شام آیا (حمص)، تو مجھے ایک کنیسہ کے متعلق بتایا گیا کہ اس میں وہ شخص رہتا ہے جو قیصر کا قاصد بن کر حضور ﷺ کی خدمت میں آیا تھا۔ ہم اس کنیسہ میں داخل ہوئے، مَیں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔ مَیں نے اس سے پوچھا: ''کیا تم ہی قیصر کے قاصد بن کر حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تھے؟'' اُس نے کہا: ''ہاں، ہاں، وہ میں ہی تھا۔'' مَیں نے اس سے کہا: ''براہِ کرم مجھے پورا واقعہ بتاؤ۔''

اُن نے کہا: ''رسول اللہ ﷺ جب تبوک تشریف لائے تو دحیۃ الکلبی کو ہرقل کے پاس بھیجا۔ جب ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کا خط پڑھا تو اس نے روم کے قسیس (بشپ) اور بطریقوں (پادریوں) کو بلایا، اور پھر بارگاہ کے دروازے بند کرا دیئے اور اُن سے کہا:

''جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ یہ اجنبی شخص (حضور ﷺ کی طرف اشارہ ہے) ہماری سرزمین میں داخل ہو چکا ہے۔ اس نے میرے پاس سفارت بھیجی ہے، اور تین باتوں کا مطالبہ کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کے دین کی پیروی اختیار کر لیں، یا اسے ہم اپنی مملکت اور اپنے مقبوضات کی طرف سے (بطور خراج) مال ادا کریں، وگرنہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، خدا کی قسم اس خط کے پڑھنے پر مجھے کچھ ایسا یقین سا ہو چلا ہے کہ میرے زیرِ قدم جو کچھ بھی ہے وہ چھین لی جائے گی۔ تو کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ ہم اس کے دین کو قبول کر لیں یا پھر اسے خراج میں مال ادا کریں؟''

یہ سن کر وہ سب کے سب ایک ساتھ چیخ اٹھے اور کہنے لگے: ''کیا تم چاہتے ہو کہ ہم نصرانیت کو چھوڑ دیں، اور حجاز سے آنے والے اس اعرابی کے غلام بن جائیں؟''

قیصر نے جب انھیں برگشتہ دیکھا، تو جان گیا کہ یہ باہر جاتے ہی سارے روم میں فساد برپا کر دیں گے۔ وہ ڈرا اور اس نے حیلہ جوئی کی میں تو آپ حضرات کو آزما رہا تھا کہ آپ اپنے عقیدے میں کس درجہ راسخ ہیں۔

پھر اس نے اپنے خادموں میں سے ایک نصرانی عرب کو بلایا اور کہا: ''میرے پاس ایسے آدمی کو لاؤ جس کا حافظہ تیز ہو، عربی زبان بولتا ہو، میں اسے خط کا جواب دے کر بھیجنا چاہتا ہوں۔'' وہ خادم میرے پاس آیا اور مجھے ہرقل کے پاس لے کر گیا۔

ہرقل نے مجھ سے کہا: ''تم اس شخص کے پاس میرا خط لے کر جاؤ، اور جب اس سے گفتگو ہو تو تین باتوں کا خیال رکھنا۔ ایک تو یہ کہ وہ اس خط کا کوئی ذکر کرتا ہے جو اس نے میرے پاس بھجوایا تھا (پہلے خط کی طرف اشارہ ہے) دوسرے یہ کہ جب وہ خط پڑھے تو رات اور دن کا کوئی ذکر کرتا ہے یا نہیں۔ تیسرے یہ کہ تم کسی طرح اس کی پیٹھ پر دیکھنا کہ کوئی خاص چیز نظر آتی ہے۔''

میں اس کا خط لے کر تبوک پہنچا۔ مَیں نے دیکھا کہ وہ (رسول اللہ ﷺ) اپنے اصحاب کے ساتھ چشمہ کے کنارے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں نے پوچھا: ''آپ کے آقا کہاں ہیں؟'' مجھے بتایا گیا: ''یہ بیٹھے ہیں۔'' میں آگے بڑھا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ انھوں نے مجھ سے خط لے لیا اور اسے اپنے پہلو میں رکھ لیا، اور مجھ سے پوچھا: ''تم کس قبیلہ کے ہو؟'' میں نے کہا: ''تنوخ سے۔'' کہا: ''کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اپنے جدِ اُمجد ابراہیمؑ کی ملتِ حنیف میں شامل ہو جاؤ، اور اسلام قبول کر لو؟'' مَیں نے کہا: ''فی الحال تو میں ایک قوم کا قاصد بن کر آیا ہوں۔ میں ان کے مسلک سے پھر نہیں سکتا، جب تک کہ مَیں ان کے پاس واپس چلا نہ جاؤں۔'' وہ اس بات پر ہنس دیئے اور کہا: ''تم جسے چاہو ہدایت نہیں دے سکتے لیکن اللہ ہی ہے وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں کے بارے میں خوب جانتا ہے۔'' (آیت) پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ''اے تنوخی بھائی! مَیں نے کسریٰ کو ایک خط بھیجا تھا۔ اس نے وہ خط پھاڑ دیا، اور اللہ اس کے ملک کو پارہ پارہ کر دے گا۔ مَیں نے نجاشی کو خط لکھا اس نے بھی اس نامے کو چاک کر دیا، اور اللہ اس کے ملک کو بھی چاک کر دے گا۔ پھر مَیں نے تمھارے آقا کے نام خط بھیجا اور وہ بس اسے لے کر بیٹھ گیا۔'' (یہاں جس اصحم نجاشی کا ذکر آیا ہے، یہ وہ نہیں ہے جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جس کی غائبانہ نمازِ جنازہ آنحضور ﷺ نے اواخر 8 ہجری یا اوائل 9 ہجری میں پڑھائی تھی۔ بلکہ یہ

نجاشی اصحم کے بعد تخت نشین ہوا تھا۔)

مَیں نے دل میں کہا: یہ ان تین باتوں میں سے ایک ہے جن کا خیال رکھنے کی مجھے ہدایت کی گئی تھی۔ پس مَیں نے اپنے ترکش میں سے تیر نکالا اور اپنی نیام پر اسے لکھ لیا۔ پھر انھوں نے اپنے بائیں ہاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کو خط دے دیا۔ مَیں نے لوگوں سے پوچھا: ''یہ صاحب جو خط پڑھ رہے ہیں کون ہیں؟'' انھوں نے بتایا: ''معاویہ۔''

میرے آقا قیصر نے اپنے خط میں (یہ سوال بھی) لکھا تھا: ''آپ نے مجھے جس جنت کی طرف بلایا ہے (بقول آپ کے) وہ آسمانوں اور زمین پر محیط ہے اور اہل تقویٰ کے لیے آراستہ کی گئی ہے (جب وہ آسمانوں اور زمین پر محیط ہے) تو جہنم کہاں ہے؟'' (اس کے جواب میں) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''سبحان اللہ! جب دن آ جاتا ہے تو رات کہاں جاتی ہے!'' مَیں نے ترکش سے تیر نکالا اور نیام پر (ان کی) یہ بات بھی لکھ لی۔

جب خط کا پڑھنا پڑھانا ہو گیا تو انھوں نے کہا: ''تم قاصد ہو۔ تمھارا حق ہے، مگر ہم اس وقت اپنے پاس انعام کے لائق کچھ نہیں رکھتے کیوں کہ ہم سفر میں ہیں اور زادِ راہ ختم ہو چکا ہے۔'' یہ سن کر اس مجمع میں سے ایک شخص نے کہا: ''میں اسے انعام دیتا ہوں۔'' پھر اس نے اپنا اسباب کھولا اور اس میں سے زرد رنگ کی عبا نکال کر میرے تھیلے میں رکھ دی۔ مَیں نے پوچھا: ''یہ انعام دینے والے کون ہیں؟'' مجھے بتایا گیا: ''عثمان۔''

پھر رسول اللہ ﷺ نے کہا: ''تم میں سے کون اس قاصد کو مہمان بناتا ہے''؟ ایک انصاری نوجوان نے کہا: ''میں۔'' انصاری کھڑا ہو گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم مجلس سے باہر نکلے ہی تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے آواز دی: ''اے تنوخی بھائی! ذرا یہاں تو آنا۔'' میں لوٹ کر اُن کے پاس گیا اور سامنے کھڑا ہو گیا، تو انھوں نے اپنی پیٹھ پر سے کپڑا ہٹایا اور کہا: ''دیکھو یہ ہے جس کے لیے تمھیں ہدایت کی گئی تھی کہ دیکھ کر آنا۔''

مَیں نے جھک کر پیٹھ پر دیکھا۔ وہاں مُہرِ نبوّت تھی۔ مونڈھوں کے درمیان اُبھرا ہوا گوشت تھا۔

ابُو عبید نے بکر بن عبداللہ المزنی سے روایت کی ہے کہ حضور ﷺ نے جب قیصر کو خط لکھا اور اسلام کی دعوت دی تو اس نے منادی کرائی کہ قیصر نے نصرانیت کو ترک کر دیا ہے اور دینِ محمد ﷺ کو قبول کر لیا ہے۔ یہ سنتے ہی اس کی فوج مشتعل ہو گئی اور اس نے شاہی قصر کو گھیر لیا۔ جب قیصر نے دیکھا تو اس نے منادی کرائی کہ وہ تو صرف ان کی آزمائش کر رہا تھا کہ وہ اپنے دین پر کتنی استقامت رکھتے ہیں۔ اہلِ لشکر مطمئن ہو کر لوٹ گئے۔ اور قیصر نے رسول اللہ ﷺ کے قاصد سے کہا: ''مجھے اپنی سلطنت کے چھن جانے کا خوف ہے۔'' اور پھر اس نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے خط میں لکھا کہ: ''میں مسلمان ہو گیا ہوں۔'' جب حضور ﷺ نے اس کا خط پڑھا تو فرمایا: ''دشمنِ خدا جھوٹا ہے وہ مسلمان نہیں ہوا نصرانیت پر قائم ہے۔'' قیصر نے خط کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں دیناروں کا نذرانہ بھی بھجوایا تھا۔ حضور ﷺ نے وہ دینار لوگوں میں تقسیم کرا دیے۔ ابو عبید نے کہا کہ بکر بن عبداللہ المزنی نے وہ دینار جو تبوک میں قیصر کے پاس سے آئے تھے ہمیں دکھلائے۔

(3) بنام کسریٰ خسرو پرویز

خسرو پرویز کا شمار ایران کے عظیم شہنشاہوں میں ہوتا ہے۔ اپنی بیوی شیریں کی محبت میں شاعری کرنے والے خسرو پرویز کے عہد میں ایران نے ہر شعبے میں بہت زیادہ ترقی کی۔ وہ ایک سخت گیر اور نڈر بادشاہ تھا۔ نوشیروان عادل کا پوتا اور ہرمزد چہارم کا بیٹا خسرو پرویز 590ء میں اپنے باپ کے قتل کے بعد ایران کے تخت پر بیٹھا تھا، لیکن بہرام کی بغاوت کی وجہ سے اسے ایران سے بھاگنا پڑا تو روم کے قیصر موریقس (Maurice) نے نہ صرف اسے پناہ دی، بلکہ اس کا تخت واپس دلانے کے لیے بہرام سے شدید لڑائیاں بھی لڑیں، مگر ایران کے تخت پر اس کی واپسی ایران کی خوش بختی اور رومیوں کی بربادی کا سبب بن گئی۔ اپنے محسن قیصرِ روم موریقس کے قاتل قیصر فوقس سے موریقس کا انتقام لینے کے لیے خسرو پرویز نے رومیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور ان کے مشرقی مقبوضات مصر، شام اور فلسطین پر قبضے کے بعد قبرص تک جا پہنچا۔ اس کی فوجیں رومیوں کے دارالحکومت قسطنطنیہ کے حدود کو چھو کر واپس آئیں۔ مشرق میں اس نے افغانستان اور اس سے ملحق بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا اور کسریٰ دارا کی وہ سلطنت بحال کر دی جو سکندرِ اعظم سے شکست کے بعد منتشر ہو گئی تھی۔ خسرو پرویز یروشلم کے گرجا گھر سے وہ صلیب بھی اٹھا لایا تھا جس پر عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کو سُولی پر چڑھایا گیا تھا۔ رومیوں اور ایرانیوں کی باہمی لڑائیوں میں فلسطین کے اندر اور باہر رہنے والے یہودیوں کی ہمدردیاں ہمیشہ ایران کے ساتھ ہوتی تھیں، کیوں کہ رومی ان کے علاقوں پر قابض تھے، اور رومن کیتھولک چرچ یہودیوں پر مظالم بھی ڈھاتا تھا۔ خسرو پرویز کے اس اقدام سے یہودی تو خوش ہو گئے لیکن ساری عیسائی دنیا اس کے خلاف متحد ہو گئی۔ قیصرِ روم ہرقل نے 627ء میں خسرو پرویز کو نینوا کے مقام پر شکستِ فاش دی اور اسے دجلہ کے دوسرے کنارے پر دھکیل دیا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب کہ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ ہجرت کر جانے پر پانچ سال گزر گئے تھے۔ ہجرت کے چھٹے سال قریش سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے سلاطین عالم کے نام تبلیغی خطوط روانہ فرمائے، انھی میں ایک خط خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے نام بھی تھا اور اس خط کو لے جانے والے آپ ﷺ کے صحابی حضرت عبداللہؓ بن حذافہ سہمی تھے۔ وہ اس نامۂ مبارک کو لیے ساسانی شہنشاہ کسریٰ کے ایوانِ سپید کے دروازے پر کھڑے ہوئے تھے۔

خسرو پرویز اُن دنوں سخت پریشان تھے۔ رومیوں کے ہاتھوں شکست کا صدمہ اتنا شدید تھا کہ وہ نہایت بدحواس اور تنگ مزاج ہو گیا تھا۔ اس کے غم و غصّے کا نشانہ امرائے دربار اور سردارانِ فوج بنے ہوئے تھے۔ کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ انھی امیروں

اور سرداروں کی غفلت، بزدلی، بلکہ غداری کی بدولت اسے ہرقل کے مقابلے میں شکست ہوئی تھی۔ اب وہ انھیں قرار واقعی سزا دینا چاہتا تھا۔ اس وقت پورے فارس میں خوف و دہشت کی فضا طاری تھی۔ آئے دن کسی نہ کسی امیر کے قید ہونے، کسی وزیر کے پھانسی چڑھنے، کسی سالار لشکر کے فرار ہونے کی خبریں پھیلتی رہتی تھیں۔ شہنشاہ زخمی سانپ کی طرح پھنکاریں مار رہا تھا، اور شکست خوردہ قوم خوف و مایوسی کے عالم میں دم بخود لرزاں و ترساں تھی۔

قاصدِ رسول ﷺ

اس پس منظر میں قصر سپید کے پھاٹک پر ایک اجنبی شخص عجیب ہیئت و لباس میں کھڑا ہوا جندرمہ کے افسروں سے اندر داخل ہونے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر کملی کا ایک ٹکڑا تھا جسے اس نے کفن کی طرح گلے میں ڈال رکھا تھا، جو دونوں طرف بغل کے نیچے سے دامن تک ببول کے کانٹوں سے سلی ہوئی تھی۔ کمر میں ایک رسی باندھ رکھی تھی۔ ایک ٹوٹی نیام میں تلوار لٹک رہی تھی۔ سر پر رومال بندھا ہوا تھا۔ مگر پاؤں میں جوتے نہیں تھے۔

قصر کے نگہبانوں نے اسے اندر داخل ہونے نہیں دیا۔ مگر ایک دن، جب کہ خسرو اپنے مشیروں سے عرب قبائل کے رویئے کے متعلق گفتگو کر رہا تھا، ایک امیر نے موقع پا کر اسے اطلاع دی کہ ایک شخص بارگاہِ سلطانی پر کئی دن سے حاضری دے رہا ہے اور خود کو مدینے کا سفیر بتاتا ہے۔ خسرو نے سفیر کو اسی وقت باریاب کرنے کا حکم دیا، اور قاصدِ رسول ﷺ عبداللہ بن حذافہ سہمی ؓ اپنی اسی درویشانہ ہیئت میں اندر داخل ہوئے۔

اہل دربار نے جب اس کملی پوش کو اس بے خوفی اور شان استغنا سے آتے دیکھا تو حیران رہ گئے کہ یہ کیسا نڈر آدمی ہے۔ جس بارگاہ میں بڑے بڑے بادشاہ بھی سر بہ سجود داخل ہوتے ہوئے لرز اٹھتے ہیں، وہ یوں چلا آ رہا ہے جیسے یہ دربار شاہی نہیں بلکہ کارواں سرائے ہے۔

چوب داروں نے اسے سجدہ کرنے کے لیے ٹوکا۔ مگر اس نے انکار کر دیا کہ "ہم اللہ کے سوا کسی مخلوق کو سجدہ نہیں کرتے!" یہ سن کر تند خو خسرو بھڑک اٹھا۔ اس وحشی کی یہ مجال کہ شہنشاہ فارس کی خود اس کے منہ پر اس طرح توہین کرے! سارا دربار خسرو کے جلال کو دیکھ کر کانپ اٹھا۔ مگر نو وارد پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اس نے اپنی آستین میں سے خط نکال کر اسی بے خوفی کے ساتھ خسرو کے آگے بڑھا دیا۔ حاجبِ دربار خط لے کر بادشاہ کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا اور پھر خسرو کے اشارے پر اس نے خط کا مضمون پڑھ کر باآوازِ بلند سنایا۔ مضمون یہ تھا:

کسریٰ کے نام خط

"اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے۔

محمد رسول اللہ کی طرف سے کسریٰ شاہ فارس کے نام۔

"جو ہدایت کی پیروی کرے اللہ پر اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے اس پر سلام ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی حق دارِ عبادت نہیں۔ وہ یکتا ہے، لاشریک ہے۔ اور محمد ﷺ اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اللہ نے مجھے تمام دنیا کے لیے رسول ﷺ بنا کر بھیجا ہے تا کہ ہر زندہ انسان کو آگاہ کر دوں اور خدا کا خوف دلاؤں۔ تم بھی اسلام قبول کر لو اور سلامتی کو پا لو۔ اگر تم نے انکار کیا تو تمام مجوسی قوم (کی گمراہی) کا وبال بھی تمھارے سر پر ہوگا۔"

کسریٰ کے نام جس خط کا مضمون لکھا گیا ہے اس کے متن کے بارے میں تاریخوں میں اختلاف ہے۔ مندرجہ بالا متن طبریؒ کی روایت کے مطابق ہے جب کہ حمد اللہ المستوفی کے ہاں خط کا آغاز کچھ اس طرح ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"محمد رسول اللہ کی جانب سے پرویز بن ہرمزد کے نام۔

"میں اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ الحی القیوم ہے۔ جس نے مجھے حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔ اس قوم کی طرف بھی جو نادان بنی ہوئی ہے اور اس کی عقل سلب ہو گئی ہے۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گم راہ نہیں کر سکتا اور جسے وہ گم راہ کر دے اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ بے شک اللہ اپنے بندوں پر خوب نگران ہے۔ اس کے بعد میں تمھارے سامنے اسلام پیش کرتا ہوں اسلام کو قبول کر لو ورنہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور تم ہر دو کو عاجز نہیں کر سکتے۔"

اسی طرح "الارب فی اخبار الفرس والعرب" میں یہ فقرے اضافہ ہیں:

"وہ اللہ جس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہی ہے جس نے میری سرپرستی کی جب کہ میں یتیم تھا، مجھے غنی کر دیا جب کہ میں محتاج تھا، مجھے ہدایت دی جب کہ میں راہ پر نہیں تھا اور میری رسالت کا وہی انکار کرے گا، جس کی عقل سلب ہو گئی ہے اور اس پر مصیبت غالب آ گئی ہو۔"

خسرو پرویز نے نامۂ مبارک کا جب مضمون سُنا تو غصے سے آگ بگولا ہو گیا۔ اوّل تو وہ اس بے باک قاصد کی گستاخی پر ہی پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس نے حسب دستور کسریٰ کو سجدہ نہیں کیا تھا۔ اب خط کے مضمون نے اسے اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ القاب و خطاب اس طرح کے تھے جیسے کوئی مقتدر حاکم اپنے ماتحت سے مخاطب ہو۔ عربوں کے بارے میں تو اس کا یہی تصور رہا تھا کہ ایک طفیلی قوم ہے جو معرکہ آرائیوں میں فاتحین کی رکاب میں لُوٹ مار کے لیے دوڑتی ہے اور انعام و اکرام لے کر صحرا میں لَوٹ جاتی ہے۔ اس قوم کے شیوخ شاہانِ ایران کے وظیفہ خوار اور ریزہ چیں رہے ہیں۔ مگر آج اُن کا ایک گم نام شیخ اسے یوں مخاطب کر رہا ہے جیسے وہ شہنشاہ نہیں بلکہ اُس کا ساربان ہو۔

شہنشاہ نے انتہائی اشتعال کے عالم میں تقریباً چیختے ہوئے کہا:

"اُس کی یہ مجال کہ اس نے اپنا نام میرے نام سے پہلے لکھا۔"

پھر وہ اس سفیر کی طرف متوجہ ہوا اور نہایت برہمی سے پوچھا:

"تم نے ہماری بارگاہ پر سجدہ کیوں نہیں کیا؟"

عبداللہؓ بن حذافہ نے بڑے تحمل و وقار کے ساتھ اللہ کی توحید پر ایک مختصر سی تقریر کی اور بتایا:

''ہم مسلمان اللہ کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکتے، ہمارے صاحب نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔''

۔ خسرو نے بگڑ کر کہا: ''اگر تم سفیر نہ ہوتے تو میں تمھارے قتل کا حکم دیتا۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے حضور اکرم ﷺ کے نامۂ مبارک کو اٹھا کر چاک کر دیا اور حکم دیا کہ اس قاصد کو دریا پار دھکیل دو۔ دوبارہ ہماری سرحد میں داخل نہ ہونے پائے۔

جب عبداللہؓ بن حذافہ نے مدینہ پہنچ کر ساری رُوداد سنائی، اور رسول اللہ ﷺ کو یہ بتایا کہ کسریٰ نے نامۂ مبارک کو پُرزے پُرزے کر کے پھینک دیا تو آپ ﷺ نے بے اختیار فرمایا:

''اللہ اس کے ملک کو پارہ پارہ کر دے گا۔''

پھر ایک سال بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ یمن کے ایرانی گورنر کے بھیجے ہوئے افسروں کو، جو کسریٰ کے حکم پر رسول اکرم ﷺ کی گرفتاری کے لیے مدینے آئے تھے، حضور اکرم ﷺ نے بتایا:

''کل رات میرے ربّ نے تمھارے ربّ کو ہلاک کر دیا۔''

چند ہی دنوں بعد عرب، یمن، شام، ہر جگہ لوگوں نے یہ خبر سُنی کہ فارس میں بغاوت ہوگئی۔ باغیوں نے خسرو پرویز کو قتل کر دیا، اور اس کے بیٹے شیرویہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

کسریٰ کا جواب

خطیب کی تاریخ بغداد میں ابو معشر نے اپنے بعض شیوخ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عبداللہؓ بن حذافہ کے ہاتھ کسریٰ کے پاس یہ خط بھیجا:

''محمد رسول اللہ کی جانب سے کسریٰ عظیم فارس کے نام! میں تمھیں اسلام کی طرف بلاتا ہوں۔ پس اسلام قبول کرلو۔ (اور یاد رکھو) جس نے ہماری شہادت پر شہادت دی اور ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرلیا اور ہمارا ذبیحہ کھالیا، تو اُس کے لیے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا ذمّہ ہے۔''

مگر معلوم ہوتا ہے یہ راوی کا سہو ہے۔ کیوں کہ یہی فقرے منذر بن ساویٰ کے مکتوب میں بھی ہیں دونوں کا مضمون خلط ملط ہوگیا ہے۔ خطیب بغدادی نے اس متن کو درج کرنے کے بعد ابو معشر کے حوالے سے مزید لکھا ہے کہ خط کو سننے کے بعد کسریٰ نے غضب ناک ہو کر مقراض منگوائی اور اسے کاٹ دیا۔ پھر آگ میں ڈلوا دیا۔ پھر (کچھ عرصہ بعد) اُسے اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور اس نے کہا: ''ضروری ہے کہ ہم (اس کی تلافی کریں اور) اس کے پاس ہدیہ بھیجیں۔'' پھر اس نے حکم دیا کہ اس کے لیے اطلس و ریشم پر خط بھیجا جائے، غرض یہ کہ اس نے خط اور تحفے حضور اکرم ﷺ کے پاس بھجوائے۔

یعقوبی نے کسریٰ کے جواب کو نقل کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''کسریٰ نے خط لکھوایا اور اسے ریشم کے غلاف میں جس میں مُشک (خوشبو) بھی تھی بھجوایا، جب یہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا، تو آپ ﷺ نے اسے کھولا، اور مشک کی ڈلی نکالی، اُسے سُونگھا اور اسے اصحاب میں تقسیم کر دیا۔ اور فرمایا: ''ہم کو اس ریشم کی تو ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہمارے لباس میں شامل نہیں ہے۔'' اور (کسریٰ کے قاصد سے) فرمایا: ''تم (تمھاری سلطنت) کو میرے تابع امر ہونا ہی پڑے گا۔ (یا پھر) میں یا میرے ساتھی تمھارے سر پر پہنچ جائیں گے۔ اور اللہ کا فیصلہ اس سے زیادہ سریع الاثر ہے اور جہاں تک تمھارے اس خط کی بات ہے۔ میں اس کے مضمون کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ اس میں یہ اور یہ لکھا ہوا ہے۔ (آپ ﷺ نے اس کا مضمون بیان فرما دیا حالانکہ) آپ ﷺ نے نہ تو اسے کھولا اور نہ اسے پڑھا۔ کسریٰ کا قاصد لوٹ کر گیا تو اس نے یہ سارا ماجرا اسے سنا دیا۔

خسرو نے نامۂ مبارک کو کیا چاک کیا تھا، اپنی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ زوال پزیر شہنشاہی زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی، اور خسرو کے بعد 628ء سے 632ء تک، صرف چار سال کے قلیل عرصے میں بارہ حکمران تخت نشین ہوئے، آخر کار حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد خلافت میں سوا چار سو سال پرانی یہ عظیم الشان ساسانی سلطنت ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

رسول اکرم ﷺ کے اس نامۂ مبارک کے بارے میں جناب محمد رفیق ڈوگر نے اپنی تصنیف ''الامین'' کے حواشی (جلد سوم، صفحہ 211) میں لکھا ہے: ''یہ نامۂ مبارک ایک جھلّی پر لکھا گیا ہے۔ پھاڑنے کی کوشش میں جھلّی مکتوب کی تیسری سطر سے درمیان تک پھٹ گئی ہے اور اوپر تیسری سطر سے نیچے دسویں سطر تک اوپر سے نیچے تک پھٹی ہوئی ہے۔ اس پھٹنے کی شکل یہ بن گئی ہے۔ بعد میں کسی نے اس جھلّی کی مرمت کرنے کی کوشش کی ہے ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کی تصنیف ''رسول اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی''، صفحات 233 تا238 پر اس بارے میں پوری تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔ اکثر اہل علم نے لکھا ہے کہ خسرو پرویز نے رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا، لیکن خسرو پرویز کے لیے آپ ﷺ کا نامۂ مبارک ٹکڑے ٹکڑے کرنا ممکن نہیں تھا، کیوں کہ نامۂ مبارک کاغذ پر نہیں بلکہ جھلّی پر لکھا تھا، اس لیے پھاڑنے کی کوشش میں جھلّی پھٹ گئی تھی، مگر ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہوسکی تھی۔ اس کے لیے لفظ ''مترق'' استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے پھاڑنا۔ خسرو پرویز شہنشاہ تھا۔ اگر شہنشاہ کوئی چیز دربار میں پھینک دے تو وہ فوراً اُٹھالی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک بھی فوراً اٹھالیا گیا تھا اور اس کی اہمیت کے پیش نظر اٹھانے والوں نے اسے محفوظ کرلیا ہوگا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب خسرو کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے رسول اکرم ﷺ کے سفیر کو تلاش کرنے کے لیے آدمی بھیجے تھے، مگر وہ انھیں مل نہیں سکا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ غصہ ٹھنڈا ہونے پر اس نے حضور ﷺ کا نامۂ مبارک محفوظ کرلینے کا بھی حکم دے دیا ہو۔''

(4) بنام مقوقس مصر، بن یامن کے نام

ارضِ تہذیب، مصرِ قدیم اُن دنوں رومیوں کے قبضے میں تھی۔ اسے روم کی عظیم

سلطنت کے ایک صوبے کی حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت کے مصر کی آبادی تین نسلوں سے تعلق رکھتی تھی۔ سب سے کم تعداد میں یہودی تھے۔ اسکندریہ میں اُن کا تجارتی اور علمی مرکز تھا، اس کے بعد رومی حاکم طبقے کے لوگ تھے مصر کی آبادی کا سب سے بڑا طبقہ قبطیوں کا تھا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت نوحؑ کے پڑپوتے مصر کی اولاد تھے۔ قبطی نسل تہذیبی اور مذہبی طور پر ایک الگ اور منفرد قوم تھے۔ وہ تھے تو عیسائی لیکن حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ رومن کیتھولک چرچ سے الگ تھا، جس کی بنا پر پاپائے روم سے ان کے مذہبی اختلافات تھے۔ قبطی مانوفزائٹ فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔

بیرونی خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہرقل نے اپنی سلطنت میں جو اصلاحات نافذ کی تھیں، ان کے تحت اس نے عیسائیت کے مختلف فرقوں کے باہمی اختلافات ختم کرانے کی بھی کوشش کی تھی، مگر جس زمانے کا یہاں ذکر ہو رہا ہے، اس وقت تک اسے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی تھی۔ مصر پر ایرانی قبضے کے دوران میں مانوفزائٹ فرقے نے اپنے مخالف فرقے سے حساب چکانے کی بھی کوشش کی تھی۔ مگر ہرقل نے مغربی صوبوں کی مانند مشرقی علاقوں میں بھی مذہبی عہدے داروں کو اُمورِ سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ ایرانیوں سے مصر، شام اور فلسطین واپس لینے کے بعد ہرقل نے ان ممالک کے عیسائی فرقوں اور ان کے راہ نماؤں کا تعاون حاصل کر لیا تھا۔ قبطی چوں کہ مصر کی سب سے بڑی نسلی، لسانی، تہذیبی اور مذہبی وحدت تھے، اس لیے ہرقل نے ان کے مذہبی پیشوا کو مصر کے لیے اپنا نائب مقرر کر دیا تھا۔ اس طرح قبطیوں کا مذہبی پیشوا اور ان کے کلیسا کا سربراہ مصر کا حاکم بن گیا تھا۔ مصر کے اس مذہبی حاکم کا نام جرتج بن منیا تھا اور وہ مقوقس کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے مقوقس کا نام بنیامین بتایا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ مقوقس اُس کا لقب تھا۔ مصر کے قبطی آلِ اسماعیل کے ننھیالی رشتے دار بھی تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے صحابہؓ کو مصر کی فتح کی بشارت دے کر ہدایت فرمائی تھی کہ "جب وہ وقت آئے تو اہلِ مصر کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ وہ ہمارے ننھیال ہیں۔" اور جب طویل لڑائی کے بعد اسکندریہ پر قبضہ ہو گیا تو حضرت زبیرؓ کے مطالبے کے باوجود خلیفۂ وقت نے حکم دیا تھا کہ اہلِ اسکندریہ کا مال مالِ غنیمت نہ سمجھا جائے اور انھوں نے مدینہ سے ان قبطیوں کو بھی آزاد کر کے واپس مصر بھیج دیا تھا جو رومیوں کی طرف سے لڑتے ہوئے جنگی قیدی بنائے گئے تھے۔

ہجرت کے ساتویں سال 628ء کے موسمِ گرما کا آغاز تھا، جب کہ مدینہ کے قاصد حاطبؓ بن ابی بلتعہ قدیم مصر کے قلعہ بابلیون میں داخل ہوئے اور انھوں نے حضور ﷺ کا نامۂ مبارک عظیم القبط مقوقس کے سامنے پیش کیا۔ عمر رسیدہ بن یامن مصر کے قبطی باشندوں کا ہر دلعزیز پیشوا تھا۔ ان قبطیوں میں بُت پرست، منکرینِ خدا اور دینِ مسیح کے پیرو، ہر طرح کے لوگ شامل تھے۔ مگر یہ سب لوگ بن یامن کو اپنا قومی راہنما مانتے تھے۔ پیروانِ مسیح کا تو وہ اُسقف تھا۔ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ مصر رومی شہنشاہیت کے زیرِ اثر تھا۔ ابھی تین سال پہلے تک مصر پر ایرانی قابض تھے، اور

انھوں نے بن یامن کو اسکندریہ کا اُسقف تسلیم کر لیا تھا۔ مگر جب ہرقل قیصرِ روم نے ایران کے کسریٰ خسرو پرویز کو شکست دی، تو ایرانیوں کو مصر سے بھی دست بردار ہونا پڑا تھا۔ مصر پر قابض ہونے کے بعد قیصر نے بن یامن کو اُسقف کے عہدے سے معزول کر دیا، اور اس کی جگہ کوہ قاف کے کلیسا کے اُسقف قیرس کو بلا کر اسکندریہ کا اسقف بنا دیا۔ بن یامن اور مصر کے دوسرے عیسائی یعقوبی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور اسکندریہ کا نیا اسقف قیرس ملکانی عقائد کا مبلغ تھا۔ اس نے مصریوں کو ملکانی عقائد قبول کرنے پر مجبور کیا، اور اس کے لیے ان پر شدید مظالم کیے۔ بن یامن کو بھی گرفتار کر لینے کا ارادہ کیا۔ بن یامن اسکندریہ سے چُھپ کر بھاگا اور بالائی مصر میں نیل کے کنارے قلعہ بابلیون میں جا کر پناہ لی۔ مصر کے قبطی بلاتفریق مذہب بن یامن کو اپنا حاکم اور راہنما سمجھتے تھے۔ اس لیے مقامی آبادی قیرس کی اور رومیوں کی مخالف ہو گئی۔ قیرس نے رومی فوجوں کو مقامی آبادی کی سرکوبی پر مامور کر دیا۔ محبِ وطن مصری ہر طرف سے بھاگ بھاگ کر بابلیون میں جمع ہونے لگے۔ بس یہی وہ زمانہ تھا جب مدینے سے آں حضرت ﷺ کا نامۂ مبارک موصول ہوا، اور جس کا مضمون یہ تھا:

مقوقس کے نام خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"اللہ کے بندے اور رسول محمد ﷺ کی طرف سے عظیم القبط مقوقس مصر کے نام۔

"سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں اگر تم نے اسے قبول کر لیا تو تم بھی سلامت رہو گے اور اللہ تعالیٰ اس کا دوگنا اجر ارزانی فرمائے گا۔ اور اگر انکار کیا تو سارے اہلِ قبط کے گناہ (کا وبال) تمھارے سر ہو گا۔

"اے اہلِ کتاب! اس بات کی طرف آ جاؤ جو ہم دونوں کے لیے یکساں تسلیم شدہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور نہ ہم میں سے کوئی انسان دوسرے انسان سے ایسا برتاؤ کرے، گویا خدا کو چھوڑ کر اُسے اپنا ربّ بنا لیا ہے۔ پھر اگر وہ رُوگردانی کریں تو آگاہ کیا جاتا ہے کہ ہم تو بہر حال خدا کے ماننے والے ہیں (اور اس کی یکتائی کا عقیدہ رکھنے والے ہیں)   مُہر

فتوحِ مصر میں واقدی کی روایت کے مطابق اس خط کا متن کچھ اس طرح تھا:

"محمد ﷺ رسول اللہ کی طرف سے مصر و اسکندریہ کے حاکم کی طرف۔ اما بعد، اللہ تعالیٰ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے، اور مجھ پر قرآن نازل کیا ہے، اور مجھے خبردار کرنے، ڈرانے اور کافروں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے دین میں داخل ہو جائیں۔ اور لوگ میری ملّت میں شامل ہو جائیں۔ میں تمھیں وحدانیتِ الٰہی کے اقرار کی دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم نے اقرار کر لیا تو تم خوش نصیب ہو گئے اور اگر تم نے انکار کیا تو بدبخت ہوئے۔"

بوڑھے اُسقف بن یامن نے جب یہ خط سُنا تو وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے قاصد سے کہا کہ جواب کے لیے انتظار کرے اور بابلیون میں اس کا مہمان

بن کر رہے۔ خط کے مضمون نے بن یامن کے دل میں بڑی ہل چل مچا دی۔ یہ بہت ہی پاکیزہ اور سیدھی بات تھی۔ توحید کی یہ دعوت یعقوبی اور ملکانی عیسائی فرقوں کی فقہی پیچیدگیوں سے زیادہ بلند اور فکر انگیز تھی۔ اس خط میں وہ گم شدہ صداقت بول رہی تھی جو مسیحی علوم کے گراں بار مذہبی صحیفوں میں دَب کر رہ گئی تھی۔ اس کا دل پکار پکار کر کہہ رہا تھا: یہی وہ حق ہے جس کی بشارت خداوند کے ربیوں اور سچے مخبروں نے دی تھی، یہ ایک نبی اور رسول ﷺ ہی کی پکار ہے۔ تو کیا میرے پاس ابن ابی بلتعہ کو بھیجنے والا اللہ کا سچا رسول ﷺ ہے؟ مگر وہ یروشلم کے بجائے مکّہ میں کیسے پیدا ہو گیا؟ عظیم القبط مقوقس گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

رات ہوئی تو اُس نے مدینے کے قاصد کو راز دارانہ طور پر اپنے پاس بلایا اور تخلیہ میں اس سے کہا:

''مجھے اس شخص کے متعلق بتاؤ جس نے تمھیں میرے پاس بھیجا ہے۔ وہ کیسے ہیں صورت کیسی ہے، حسب نسب میں، رفتار گفتار میں؟ انھوں نے اپنی قوم سے کیا کہا؟ اور اس نے اُن کو کیا جواب دیا؟ پھر ان کے اور ان کی قوم کے درمیان کیا معاملہ پیش آیا؟''

خوش گفتار قاصد نے، جو مصر کی زبان بڑی روانی سے بول لیتا تھا، وہ سب کچھ بتا دیا جو مکّہ اور مدینہ میں پیش آیا تھا۔ حرا کی خلوت، نزولِ وحی، صفا کا وعظ، قریش کی مخالفت، مکّہ سے جلا وطنی اور ہجرت، پھر بدر و اُحد اور خندق کے معرکے، اور پھر توحید، آخرت، اخوت و مساوات کی وہ انقلاب انگیز دعوت، جس نے فکر و نظر کے زاویے بدل دیے اور دلوں کی دُنیا بدل دی۔

یہ سب کچھ سن کر عظیم القبط اُسقف مصر کی شخصیت میں پوشیدہ ''بن یامن'' جاگ اُٹھا اور بے اختیار بول اُٹھا:

''میں جانتا تھا کہ خداوندِ خدا کے آخری پیغمبر کو ابھی آنا ہے، مگر میرا خیال تھا کہ وہ شام میں ظہور کرے گا۔ کیوں کہ اس سے پہلے تمام پیغمبر وہیں مبعوث ہوئے۔ مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ وہ جہد و مصیبت کی سرزمین عرب میں ظاہر ہوا ہے۔''

وہ کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتا رہا پھر کہنے لگا:

''مگر میرے نووارد مہمان! سنو! میری قوم کے لوگ اہل قبط اُس کی حلقہ بگوشی میں میرا ساتھ نہیں دیں گے۔ اے ابن ابی بلتعہ! میں اپنی آنکھوں سے کچھ ایسا دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے پیغمبر ﷺ کا اس ملک پر غلبہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھی ہمارے ان میدانوں میں، جو نیل سے گھرے ہوئے ہیں اُتریں گے اور ان پر چھا جائیں گے۔''

اس گفتگو کے بعد جب حاطب رضی اللہ عنہ رخصت ہونے لگے، اور قصرِ بابلیون کے زینے سے اُترنے لگے، تو بن یامن نے اپنا ہاتھ حاطب رضی اللہ عنہ کے کاندھے پر رکھا اور دھیمے لہجہ میں کہا: ''میں قبطیوں سے اس معاملے میں ایک حرف بھی نہیں کہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری اور تمھاری گفتگو کا انھیں علم ہو۔ ہاں، جب تم اپنے صاحب کے پاس جاؤ تو انھیں یہ سب کچھ بتا دینا جو میں نے تم سے کہا ہے۔''

مقوقس کا جواب

دوسرے دن بابلیون کے دربار میں رات والا بن یامن نہیں، دن والا عظیم القبط مقوقس مصر مدینے سے آئے ہوئے خط کا جواب اپنے عربی ترجمان کو لکھوا رہا تھا:

''عبداللہ کے بیٹے محمد ﷺ کے نام عظیم القبط مقوقس کا سلام

''مَیں نے آپ ﷺ کا خط پڑھا اور جو کچھ آپ ﷺ نے اس میں تحریر فرمایا ہے، اور جس بات کی طرف دعوت دی ہے اسے سمجھا۔ میں جانتا تھا کہ ایک پیغمبر کو ابھی آنا ہے۔ مگر میرا خیال تھا وہ شام میں ظہور کرے گا۔ مَیں نے آپ ﷺ کے قاصد کا احترام کیا ہے۔ آپ ﷺ کی خدمت میں دو لڑکیاں، جو قبطیوں میں بڑے درجے اور حیثیت کی مالک ہیں بھیج رہا ہوں اور سواری کے لیے ایک خچر ہدیہ میں پیش کر رہا ہوں۔

''آپ ﷺ پر سلام ہو۔''

جہاں تک بن یامن کے خط کا معاملہ ہے، وہ بلا شبہ ایک محتاط مدبر کا جواب ہے۔ کیوں کہ اس میں نہ تو رسالت کا اقرار ہے نہ انکار۔ تاہم قاصد کے احترام اور ہدیے پیش کرنے کا ذکر اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی قدر و منزلت ضرور تھی۔ حضور ﷺ نے بن یامن کو لکھا تھا کہ اگر تم نے اسلام کی دعوت قبول کر لی تو تم سلامت رہو گے۔ بن یامن نے چوں کہ رسالت ﷺ کا اقرار نہیں کیا تھا، اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اس نامۂ مبارک پر پانچ سال بھی نہیں گزرے تھے کہ رومیوں نے فوج کشی کر کے بابلیون پر قبضہ کر لیا اور بن یامن وہاں سے فرار ہو کر نیل کے بالائی حصّے کی طرف صحرا میں گم ہو گیا۔

مقوقس کے جواب کی ایک اور روایت واقدی سے فتوحِ مصر میں اس طرح نقل ہے:

''اللہ کے نام سے

''مقوقس کی جانب سے محمد ﷺ کی طرف

''اما بعد۔ مجھے آپ کا خط ملا، مَیں نے اسے پڑھا اور اس کے مضمون کو سمجھا۔ آپ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا، اور آپ کو فضیلت عطا کی ہے اور آپ پر قرآنِ مبین نازل کیا ہے۔ اے محمد ﷺ! میں بتا دوں کہ آپ کے متعلق ہمارے علوم میں خبر دی گئی ہے۔ ہم نے آپ کو داعی الی اللہ پایا ہے اور میں صدق و خلوص سے آپ کی بات کی تصدیق کرتا ہوں اور اگر مجھ پر اس ملک عظیم (مصر) کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں تو میں پہلا شخص ہوتا جو آپ کی طرف چل پڑتا۔ میرے علم کی حد تک بے شک آپ خاتم الانبیا اور سید المرسلین اور امام المتقین ہیں۔

''آپ ﷺ پر سلام اور اللہ کی رحمت و برکت ہو یوم آخرت تک۔''

بعض تاریخوں میں مقوقس کے خط میں یہ جملہ بھی تحریر ہے: ''مَیں نے آپ ﷺ کے قاصد کی تکریم کی ہے۔ میں آپ ﷺ کی خدمت میں دو کنیزیں بھیج رہا ہوں جنھیں قبطیوں میں بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ خلعت اور حضور ﷺ کی سواری کے لیے ایک خچر بھی پیش کر رہا ہوں۔ والسلام علیک''

ان کنیزوں میں سے ایک کا نام ماریہ تھا اور دوسری کا نام سیرین تھا۔ ماریہ رضی اللہ عنہا رسول

اکرم ﷺ کے پاس رہیں۔ آپ ﷺ کے اٹھارہ ماہ کی عمر میں وفات پانے والے فرزند حضرت ابراہیمؓ انھی ماریہؓ قبطیہ کے بطن سے تھے۔ سیرین آنحضور ﷺ نے حضرت حسان بن ثابتؓ کو عطا کر دی تھی۔ حضرت حسانؓ کے فرزند عبدالرحمٰنؒ اسی سیرین کے بطن سے تھے۔ مقوقس نے سفید رنگ کا جو خچر بھیجا تھا، اس کا نام دُلدُل تھا، جو امیر معاویہؓ کے دور تک زندہ رہا۔

اس خط سے تو مقوقس کے ایمان و تصدیق کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر تاریخوں میں بالاتفاق مقوقس کے اسلام نہ قبول کرنے کی روایت ہے۔ اس لیے اس خط اور اس سے پہلے حضور ﷺ کے خط کے متون کے متعلق واقدی کی روایت قرین قیاس نہیں ہے۔ ویسے بھی واقدی ہر طرح کی روایات و حکایات کو بغیر تنقیح کے جمع کر دینے میں حریص واقع ہوئے ہیں۔

(5) بنام منذر بن ساوی، حاکمِ بحرین

یہ رسول کریم ﷺ کا پانچواں نامۂ مبارک ہے جو دستیاب ہو چکا ہے، اور جس کی دریافت اور دستیابی کی مکمل رُوداد محترم ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی تصنیف ''رسول کریم ﷺ کی سیاسی زندگی'' میں قلم بند کی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، یہ مکتوب 1917ء میں خواجہ کمال الدین نے بچشم خود دیکھا تھا اور رسالہ ''اسلامک ریویو' ووکنگ میں اس پر تعارفی مضمون بھی لکھا تھا۔ مستشرق فلائشر نے نہایت بودی دلیلوں کے ساتھ اسے جعلی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اب یہ تسلیم کیا جا چکا ہے کہ اس خط کا اصلی ہونا شک وشبے سے بالاتر ہے۔

خلیج فارس، دریائے فرات، بادیہ شام اور نجد کے درمیانی علاقہ میں، جسے عراق عرب کہا جاتا ہے، شاہان حیرہ کی سلطنت قائم تھی۔ یہ قدیم عمالقہ عرب کی نسل کے لوگ تھے۔ ابتدا میں ایران کے حکمران خاندانوں سے ان کی متعدد لڑائیاں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ یہ سارا علاقہ ایرانی سلطنت کا باج گزار بن گیا۔ بلکہ بالائی علاقہ پوری طرح ایرانی سلطنت کی حُدود میں شامل کر لیا گیا۔ زیریں علاقہ، جسے بحرین کہا جاتا ہے، شاہانِ حیرہ کے قبضے میں رہ گیا۔ ان کا پایۂ تخت حیرہ تھا، جس کا محل وقوع کوفہ کے قریب تھا۔ شاہانِ حیرہ ایرانی سلطنت کو خراج ادا کرتے تھے اور جنگ کے مواقع پر ان کی کمک کے لیے فوج بھیجنے کے پابند تھے۔ مگر ایرانی تسلّط کے باوجود وہ داخلی طور پر خود مختار تھے۔

طلوعِ اسلام کے وقت حیرہ میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ ان میں ایک بڑی تعداد یہودیوں کی تھی۔ نصرانی بھی تھے، مگر بہت کم، ایران کے مجوسی مذہب کو ماننے والوں کی بھی مختصر سی تعداد تھی۔ مگر یہ صرف ایران کے سیاسی غلبے کی وجہ سے تھی۔ البتہ ستارہ پرست مشرکوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔

شاہان حیرہ اور شاہانِ غسان کے درمیان عراقِ عرب پر تسلّط قائم رکھنے کے لیے باہمی آویزش جاری رہتی تھی۔ دومتہ الجندل کا کیدار خاندان اور شام کا غسان خاندان، دونوں روم کے باج گزار اور مذہباً عیسائی تھے۔ ان کے برخلاف شاہانِ حیرہ ہمیشہ ایرانی سلطنت سے وابستہ رہے۔ حیرہ کا شاہی خاندان ایران کے شہزادوں کا اتالیق بھی رہا ہے۔ ایرانی بادشاہ اپنے بچوں کو صحرائی زندگی اور شکار کی تربیت کے لیے شاہانِ حیرہ کے پاس بھیجا کرتے تھے۔ ایران کا مشہور بادشاہ بہرام گور بھی اسی خاندان کے زیرِ تربیت رہا تھا۔ جب وہ تخت پر بیٹھا تو اس نے شاہانِ حیرہ کو اعزاز واکرام سے نوازا، اور انھیں اپنے عربی مقبوضات پر سلطنتِ ایران کا گورنر اور نمایندہ بنا دیا۔ اس طرح عراقِ عرب میں شاہانِ حیرہ کو بڑا اقتدار حاصل رہا اور عرصہ تک قائم رہا۔ بحرین اور حیرہ کی ریاست پر ایک ہی نسل کے مختلف خاندانوں نے حکومت کی۔ مگر عہد رسالت ﷺ میں بحرین پر جو خاندان حکمران تھا، وہ ''مناذرہ'' کہلاتا تھا۔ شاہانِ حیرہ اور بحرین کو خود مختاری حاصل تھی۔ مگر وہ چوں کہ نسلاً عرب تھے، اس لیے ایک عجمی قوم کے تسلط اور ماتحتی کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے اور اس غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے۔ ان کے اس جذبے سے ایرانی حکومت بھی واقف تھی، مگر وہ سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے انھیں ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے ان کی تالیف قلب اور دل دہی کے لیے کوشاں رہتی تھی۔ شاہانِ حیرہ ایرانی سلطنت کی اس مجبوری سے حسب موقع فائدہ اٹھاتے رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایران کی عجمی معاشرت کے اثرات نے حیرہ کے حکمرانوں اور ان کی رعایا کو بھی متاثر کیا۔ اوران کے درباروں اور جلسوں میں بھی عجمی تکلفات راہ پا گئے۔ عرب کی سادگی کی بجائے عجمی شان وشکوہ کی یہ جھلک ایرانی دربار میں تشویش کی نظر سے دیکھی گئی، شاہانِ حیرہ کا بڑھتا ہوا اقتدار شہنشاہِ ایران خسرو پرویز کی آنکھوں میں بُری طرح کھٹک رہا تھا۔ مگر وہ فی الحال ان سے بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس نے ہرقل قیصرِ روم سے معرکہ آرائی کا ایک بڑا منصوبہ بنا رکھا تھا، جس میں وہ عراقِ عرب کے قبائل، اور خاص طور سے شاہانِ حیرہ کو حریف بنا کر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

آخرکار ایران وروم کے درمیان لڑائیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان جنگوں کے پہلے مرحلے میں خسرو نے قیصرِ روم کو شکست دے کر انطاکیہ کی پہاڑیوں تک اس کا تعاقب کیا، اور عراقِ عرب اور شام کے تمام رومی مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ اس کے سپہ سالار فلسطین کو روندتے ہوئے مصر میں نیل کے کنارے تک پہنچ گئے اور انھوں نے مصر سے بھی رومیوں کو مار بھگایا۔ اس جنگ میں عراقِ عرب اور شام کے محاذ پر شاہانِ حیرہ و بحرین نے اپنی فوجوں کے ساتھ خسرو پرویز کی پوری طرح مدد کی اور رومیوں کے خلاف بڑی بہادری سے لڑے۔ ان خدمات کے عوض وہ ایرانی دربار سے بڑی بھاری توقعات رکھتے تھے مگر خسرو پرویز نے فتح مند ہونے کے بعد ان کے ساتھ شایانِ شان سلوک نہیں کیا۔ بلکہ ان کا زور توڑنے اور عراقِ عرب اور شام کی سیاست میں توازنِ قوت پیدا کرنے کی غرض سے اس نے شاہانِ حیرہ کے حریف خاندانوں کو اپنے دربار میں کچھ زیادہ اہمیت دے دی۔ اس پر شاہانِ حیرہ و بحرین ایرانی دربار سے ناراض ہو گئے۔ دراندازوں نے شاہانِ حیرہ کے خلاف خسرو کو اور بھی زیادہ بدگمان کر دیا۔ اس طرح یہ رنجش بڑھتی چلی گئی۔ شاہان حیرہ اپنے زیر اثر عرب قبائل کو در پردہ ایرانی حکومت کے خلاف متحد ومنظم کرنے لگے۔ یہ اطلاعات خسرو کو ملیں تو اس نے ان

کے خلاف تادیبی کارروائی کا ارادہ کر لیا۔ مگر اسی زمانہ میں ہرقل زبردست جنگی تیاریاں کر کے ایرانیوں کے مقابلہ پر آ گیا تھا۔ خسرو نے مصلحتِ وقت کی بنا پر بحرین اور حیرہ کے حکمرانوں کے پاس اپنے نمایندے بھیجے، ان کی بعض شکایات کو بھی دُور کر دیا اور تحائف بھی بھجوائے۔ بظاہر تو حیرہ کے حکمرانوں نے کسریٰ سے وفاداری اور اطاعت کا اظہار کیا، اور ہرقل کے مقابلہ پر اس کی کمک کا وعدہ بھی کیا، مگر وہ اب خسرو کی طرف سے کھٹک گئے تھے، اور خوب جانتے تھے کہ جیسے ہی سرحدوں پر سے رومی خطرہ ٹلے گا ایرانی بلّی پنجے نکال کر ان پر جھپٹ پڑے گی۔ اس لیے وہ بظاہر تو رومیوں کے مقابلے میں ایرانیوں کے حلیف بنے رہے، مگر عملاً انھوں نے قبائل کو ایرانیوں کا ساتھ دینے سے روک دیا۔

منذر حاکم بحرین

رُومیوں اور ایرانیوں کی اس آخری لڑائی میں، بحرین کے حکمران خاندان مناذرہ نے ایرانیوں کی کشادہ دلی سے مدد نہیں کی، بلکہ وہ اور ان کے زیر اثر عربی قبائل ایرانی افواج کی رسد کو بھی موقع پا کر لُوٹتے رہے۔ عراقِ عرب کے قبائل کی یہ در پردہ مخالفت بھی ایرانیوں کی شکست کا ایک بڑا سبب بن گئی۔

627ء میں ہرقل نے خسرو کو مدائن پر شکست فاش دے دی اور عراقِ عرب کے بڑے حصے پر رومیوں کا تسلّط قائم ہو گیا۔ شاہانِ حیرہ نے خسرو کے مقابلے میں ہرقل سے بہتر توقعات رکھی تھیں تو یہ ان کی خوش فہمی تھی۔ کیوں کہ فتح کے بعد قیصر نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ شام کی عرب ریاستوں کو، جو حیرہ کی حریف تھیں، کسی صورت ناراض نہیں کر سکتا تھا۔

بحرین اور حیرہ کے حکمرانوں کے لیے یہ سخت پریشانی کا وقت تھا۔ وہ ایرانیوں کا اعتماد کھو چکے تھے اور اب قیصر کی طرف سے برابر یہ اندیشہ لگا رہتا تھا کہ وہ دومۃ الجندل اور شام کے حریف عربی النسل والیانِ ریاست کے اُکسانے پر ان کے خلاف فوج کشی کر دے گا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب کہ مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہو چکی تھی اور آپ ﷺ قریش اور قبائل عرب کو اللہ کے دین کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ جب قریش کے مظالم ناقابل برداشت ہو گئے تو آپ ﷺ نے مسلمانوں کو ہجرت کی اجازت دے دی اور پھر چند سال بعد آپ ﷺ بھی ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے۔ پھر بدر، اُحد اور خندق کے معرکوں کے بعد ہجرت کے چھٹے سال مسلمانوں اور قریش کے درمیان مشہور معاہدہ صلح حدیبیہ طے پایا۔ اس وقت بحرین پر منذر بن ساوٰی العبدی حکمران تھا۔

مُنذر، غیور، منصف مزاج، اور نیک نفس آدمی تھا۔ وہ ایران کے تسلّط سے سخت بیزار تھا مگر خسرو کی شکست کے بعد وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ اس وقت وہ خود کو بے سہارا پا رہا تھا۔ اسے حضور اکرم ﷺ کی دعوتِ نبوّت کی اطلاع مل چکی تھی۔ حبشہ کے نجاشی کے قبول اسلام کی خبریں بھی اس کے سننے میں آئیں۔ حجاز سے آنے والے قافلوں کی زبانی قریش کے مقابلے میں مسلمانوں کی روز افزوں کامیابیوں کی بھی اطلاعات اسے پہنچتی رہی تھیں، اس نے ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ نئی اُبھرتی ہوئی تحریک کسی نہ کسی وقت ایک فیصلہ کن طاقت بن جائے گی۔

منذر دراصل ایک ایسی متحدہ عربی طاقت کا آرزومند تھا جو ان دو جابر قوتوں رومیوں اور ایرانیوں کو چیلنج کر سکے۔ اس کی خواہش تھی کہ اس طاقت کی بنیاد اسی کے ہاتھوں رکھی جائے۔ لیکن اس آرزو کی تکمیل کے جو دو ممکن ذرائع ہو سکتے تھے، ان دونوں سے وہ محروم تھا۔ یا ایسی قوت جو خود دار عرب قبائل کو ایک پرچم تلے بزورِ شمشیر جمع کر دیتی، یا ایسے جامع اصولِ معاشرت جو عربوں کی قوت اور عصبیّت کی دیواروں کو ڈھا کر انھیں اخوت و مساوات کی بنیادوں پر یک جا ہونے کی صلاحیت بخشتے۔ منذر بن ساوٰی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اسے ہادیٔ دو جہاں ﷺ کی طرف سے اس دین حق کا پیغام پہنچا جو نہ صرف قبائل عرب بلکہ پوری نوع انسان کو امن واخوت کے ایک ہی رشتے سے منسلک کر دینے کا ضامن تھا۔ یہ نامۂ مبارک حضرت علاؓ بن الحضرمی کے ہاتھ روانہ کیا گیا تھا۔ اس موقع پر حضور اکرم ﷺ نے قاصد کو ہدایت فرمائی: ''اگر وہ خاطر خواہ جواب دے تو وہیں قیام کرنا حتّٰی کہ میرا حکم تمھیں آ ملے۔ اور اس دوران میں وہاں کے مال داروں سے صدقہ وصول کر کے وہیں کے فقرا میں تقسیم کرتے رہنا۔'' اس پر حضرت علاءؓ نے عرض کیا کہ مجھے اس سلسلہ میں احکام لکھ کر دے دیجیے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اموال و مواشی کی شرح زکوٰۃ لکھ کر ان کے حوالے کی۔ منذر کے نام جو نامۂ مبارک لکھوایا، اس کا مضمون یہ تھا:

پہلے دو مکتوب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے مُنذر بن ساوٰی کے نام۔

''سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ بعد ازاں ہیں تمھیں اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ تم اسلام قبول کر لو تو سلامت رہو گے۔ اور جو کچھ تمھارے ماتحت ہے اسے اللہ تمھارے ہی سپرد کر دے گا اور جان لو کہ میرا دین عن قریب اس انتہا تک غالب آ جائے گا جہاں تک گھوڑے اور اُونٹ پہنچ سکتے ہیں۔''

یہ مکتوب غالباً صلح حدیبیہ کے فوراً بعد 6ھ میں لکھا گیا تھا۔ منذر بن ساوٰی نے اسلام قبول کر لیا اور قاصدِ رسول ﷺ نے جب اس کی اطلاع مدینے بھیجی تو رسول اکرم ﷺ نے ایک اور خط ارسال کیا جس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے مُنذر بن ساوٰی کے نام۔

''تم پر اللہ کی سلامتی ہو! میں اس خدا کی حمد کرتا ہوں جو یکتا ہے اور جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں خدا کی یکتائی کی شہادت دیتا ہوں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ﷺ ہوں۔''

''بعد ازاں میں تمھیں اللہ عزوجل کی یاد دلاتا ہوں۔ (سنو) جو نصیحت قبول کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی کو فائدہ پہنچاتا ہے، اور جو شخص میرے قاصدوں کی اطاعت اور ان کی

ہدایت پر عمل کرے گا اس نے حقیقت میں میری اطاعت کی اور جس نے ان کے ساتھ نیکی کی، اس نے میرے ساتھ نیکی کی۔ میرے قاصدوں نے تمھارے طرزِ عمل کی بے حد تعریف کی ہے۔ اور تم نے اپنی قوم کی جو سفارش کی ہے وہ منظور کی۔ پس مسلمانوں کے اس مال کو چھوڑ دو جس کے ساتھ وہ ایمان لائے میں قصور واروں کو معاف کرتا ہوں پس تم بھی ان سے درگزر کرو۔ تم جب تک صالح رہو گے۔ تمھارے منصب سے تمھیں ہم الگ نہ کریں گے اور جو شخص یہودیت یا مجوسیت پر قائم رہنا چاہے اس پر جزیہ واجب ہے۔''

اس خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ منذر کے کسی خط یا پیغام کا جواب ہے۔ اسلام قبول کرنے سے متعلق خطوں کا تبادلہ اس سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ نامۂ مبارک کا انداز ایک حاکمانہ فرمان کا سا ہے جس میں منذر کو اس کے عہدے یعنی ولایت بحرین پر بحال رکھنے کی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ اور ہدایت کی گئی ہے کہ دوسرے اہل مذاہب سے کیا سلوک کیا جائے۔

منذر بن ساوی نے اس کے بعد آنحضور ﷺ کے نام ایک اور مکتوب بھیجا، جس میں پہلے نامۂ مبارک کی وضاحت طلب کی گئی کہ زمرۂ مسلمین میں کون لوگ شمار ہوں گے، اور جو اس سے باہر ہیں، ان سے کتنا جزیہ لیا جائے، اس کا متن یہ ہے:

''امابعد یا رسول اللہ

''میں نے آپ کا خط پڑھا جو اہل بحرین سے متعلق ہے کہ ان میں سے جو اسلام کو پسند کریں اور اس میں داخل ہو جائیں اور ان میں سے جو اسے ناپسند کریں اور میرے ملک میں مجوسی اور یہودی بھی ہیں، سو اس معاملے میں وضاحت فرما دیجیے۔''

حضور اکرم ﷺ کا تیسرا مکتوب

اس استفسار کے جواب میں حضور ﷺ نے مندرجہ ذیل نامۂ مبارک ارسال فرمایا:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد رسول اللہ ﷺ کی جانب سے المنذر بن ساوی کے نام سلام اللہ علیک۔

''میں اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں۔ اما بعد۔ تمھارا خط میرے پاس آیا۔ میں نے اس کے مضمون کو سنا۔ پس جو ہماری نماز پڑھے، اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، وہی مسلمان ہے۔ اس کے حقوق وہی ہیں جو ہمارے ہیں، اس پر فرائض وہی ہیں جو ہم پر ہیں اور جو ایسا نہ کرے اس پر مُعافری کی قیمت والا ایک دینار (سالانہ جزیہ) ہے۔

والسلام ورحمة الله، يغفر الله لك۔''

جزیہ کے اس حکم نامے کا حوالہ امام یوسفؒ کی کتاب ''الخراج'' میں بھی ملتا ہے۔

9ہجری میں جب آپ ﷺ تبوک کا ارادہ کر رہے تھے تو مدینہ سے حضرت ابوہریرہؓ کو منذر کے پاس بھیجا گیا تھا کہ وہاں سے جمع شدہ جزیہ کی رقم لے کر آئیں۔ اس موقع پر ایک اور مسلمان حاکم کو بھی حکم دیا گیا تھا کہ وہ جمع شدہ جزیہ حضرت ابوہریرہؓ کے ذریعہ بھجوا دے۔ یہ ساری رقم تبوک کی جنگ کے اخراجات میں صرف ہوئی تھی۔

مُنذر بن ساوی آخر تک مخلص اور وفادار مسلمان رہا اور رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہی میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کے بعد بحرین پر علاؓ الحضرمی ہی مدینہ کے پہلے گورنر مقرر کیے گئے۔

(6) بنام ملک باذان، حاکمِ یمن

یہ سن 570 مسیحی کا قصہ ہے، جب ابرہہ ایک بھاری لشکر لے کر، جس کے ساتھ ہاتھی بھی تھے، خانۂ خدا کو مسمار کرنے کے ارادے سے مکّہ کی طرف گیا تھا۔ ابرہہ شاہِ حبش کا سپہ سالار تھا، جس نے یمن کے حمیری بادشاہ کو شکست دے کر اس کے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ یمن کے لوگ اس غیر ملکی اقتدار سے ناخوش تھے۔ چنانچہ جیسے ہی ابرہہ مکّہ کی طرف گیا حمیر کے شاہی خاندان کا ایک شہزادہ موقع پا کر فارس کی طرف نکل گیا۔ اس وقت ایران پر نوشیرواں عادل حکومت کر رہا تھا، جس کا زمانہ حکومت 531 مسیحی سے 579 مسیحی تک ہے، حمیری شہزادے نے ابرہہ کے خلاف جو مسیحی مذہب کا پیرو اور رومی سلطنت کا حلیف تھا، نوشیرواں سے مدد مانگی۔

یمن کی بندرگاہوں پر زمانۂ قدیم سے ایرانی تاجروں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ بلکہ وہاں ایرانی تاجروں کی ایک قوم بسی ہوئی تھی، اور تجارتی کوٹھیاں بھی قائم تھیں۔ یہ تاجر یمن کے شہروں سے صندل، عود، لوبان، گرم مصالحے، اور لکڑی کے شہتیر ایران لے جاتے تھے اور سواحلِ ہند سے آنے والی اشیائے تجارت کو بحرِ احمر کے ساحلوں کی طرف برآمد کرتے تھے۔ جب تک یمن میں ستارہ پرست مشرکوں، اور پھر ان کے بعد یہودی مذہب کے پیرو ذونواس کی حکومت تھی، ایران سے یمن کے تعلقات خوش گوار رہے۔ ایرانی تاجروں کے مفادات بھی محفوظ تھے۔ مگر حبش کے عیسائی بادشاہوں کی یمن پر فوج کشی اور ابرہہ کے برسرِ اقتدار آ جانے کے بعد یمن کے ساحلوں پر رومی تاجروں کی عمل داری ہو گئی، اور ایران کے تجارتی مفادات خطرے میں پڑ گئے۔

حمیری شہزادے نے جب نوشیرواں سے ابرہہ کے خلاف مدد طلب کی تو اس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنے ایک سپہ سالار کو لشکر دے کر حمیری شہزادے کے ساتھ یمن بھیج دیا۔ ایرانی لشکر خوش قسمت تھا کہ جب یمن میں داخل ہوا تو وہاں اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ ابرہہ اور اس کا لشکر مکّہ کی دہلیز پر ابابیل کی کنکریوں سے تباہ ہو چکا تھا۔ گنتی کے چند آدمیوں کے سوا وہاں سے کوئی سلامت لوٹ نہ سکا۔ ادھر یمن کے یہودی اور مشرک قبائل نے عیسائیوں کی ضد میں ایرانی لشکر کا خیر مقدم کیا اور ایرانی آسانی سے پورے یمن پر قابض ہو گئے۔ اس طرح یمن میں سلطنتِ ایران کا ایک صوبہ بن گیا اور بڑی تعداد میں ایرانی یمن کے ساحلوں اور شہروں میں آ کر بس گئے۔

جو ایرانی یمن میں رہ گئے بس گئے، وہ وہاں نبا (ن ب ا) کے نام سے مشہور ہوئے، یمن پر عرصے تک اسی خاندانِ نبا کی حکومت رہی، یہاں تک کہ مکّہ میں آفتابِ رسالت ﷺ طلوع ہوا اور ہجرت کے چھٹے سال حضور اکرم ﷺ نے ایران کے کسریٰ خسرو پرویز کے نام ایک خط بھیجا، جسے اس نے بے ادبی سے چاک کر

دیا اور مدینے کے سفیر کو دربار سے نکلوادیا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے یمن کے ایرانی گورنر باذان کو حکم دیا کہ دو آدمی بھیج کر اس حجازی کو گرفتار کر کے اس کے پاس بھجوا دے، جس نے شہنشاہ کے نام یہ خط لکھا تھا۔

ملک باذان اس زمانہ میں سخت پریشان تھا، کیوں کہ چند ہی ماہ پہلے 627 مسیحی میں قیصر روم نے نینوا کے قیام پر کسریٰ کو شکستِ فاش دی تھی، ایرانیوں کی اس شکست کی خبر جب یمن پہنچی، تو وہاں کے قبائل، جو اب ایرانیوں کے تسلط واقتدار سے بھی بیزار ہو چکے تھے، نئے حکمرانوں کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تھے، اور یمن میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی تھی، نجران کی عیسائی ریاست جو قیصرِ روم کی طرف دار تھی، قبائل کو باذان کے خلاف برابر اکسا رہی تھی۔ دوسری طرف حبشہ کی حکومت نے بھی، جس کا حکمران نجاشی مسلمان ہو گیا تھا، یمن کے ساحلوں پر طلایہ گردی شروع کر دی تھی۔ رومیوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات سے بھی اندیشہ تھا کہ کہیں ان کا رُخ ادھر نہ ہو جائے۔ ادھر ایران سے کسی قسم کی مدد کی توقع نہیں تھی۔ کیوں کہ نینوا کے سقوط کے بعد خسرو کے خلاف پورے ایران میں غم وغصہ پھیل گیا تھا، اور درباری سازشوں نے خسرو کو سخت پریشان کر رکھا تھا۔

اس وقت باذان خود کو بے یار و مددگار پا رہا تھا۔ یمن میں بغاوت کا آتش فشاں، جو اندر ہی اندر کھول رہا تھا، کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ ان حالات میں خسرو کا یہ حکم نامہ باذان کو ملا۔ وہ ذاتی طور پر خسرو کی اس کارروائی کو دُوراندیشی اور مصلحت کے خلاف سمجھتا تھا۔ کیوں کہ رومیوں کے مقابلہ میں عربوں میں اپنے دوستوں کی تعداد بڑھانے کی بجائے انھیں دشمن بنالینا کوئی عقل مندی کی بات نہیں تھی۔ دوسری طرف حبشہ سے تعلقات مزید نہ بگاڑنے کے لیے بھی ضروری تھا کہ مسلمانوں کے رسول ﷺ کے بارے میں اس طرح کا رویہ اختیار نہ کیا جائے، کیوں کہ حبشہ مسلمانوں کا حلیف تھا اور خبریں گرم تھیں کہ نجاشی بھی مسلمان ہو گیا ہے۔

ملک باذان کے سفیر

باذان نے یہ سب کچھ سوچا، مگر وہ شہنشاہِ ایران کا نائب تھا، اور ایرانی فوج کے افسروں کے ہوتے ہوئے اس کے حکم سے سرتابی نہ کر سکتا تھا۔ ناچار اس نے اپنے ایک درباری بابویہ اور ایک فوجی سردار خُرخسرہ کو حجاز کی طرف بھیج دیا۔

یہ 6 ہجری (628 مسیحی) کی سردیوں کا موسم تھا۔ دونوں سردار ایک مختصر سی جمعیت کے ساتھ مدینے میں داخل ہوئے۔ وہ طائف کی راہ سے آئے تھے۔ سرداران طائف اور قریش مکہ کو جب اطلاع ملی کہ یہ شہنشاہ ایران کے فرستادہ ہیں اور محمد ﷺ کو گرفتار کرنے مدینے جا رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے ایرانیوں کی خُوب آؤ بھگت کی یہیں پہلی بار انھیں حضور اکرم ﷺ، مسلمانوں اور ان کے دین وعقیدہ کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہوئیں، اور وہ واقعات بھی معلوم ہوئے جو بعثت سے صلح حدیبیہ تک پیش آ چکے تھے۔ اگر چہ یہ سب کچھ انھیں اسلام کے مخالفوں کی زبانی معلوم ہوا تھا، تاہم انھیں اندازہ ہو گیا کہ جس شخص کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں، وہ غیر معمولی شخصیت کا مالک ہے اور ان کے اندازے کے خلاف اس کا اثر واقتدار کہیں زیادہ ہے۔ اب وہ سوچ میں پڑ گئے کہ اپنی اس چھوٹی سی جمعیت کے ساتھ کس طرح کسریٰ کے حکم کی تعمیل کرا سکیں گے؟

مدینہ پہنچنے کے بعد جب انھوں نے وہاں کے لوگوں کے رہن سہن اور اس عقیدت ومحبت کو دیکھا جو انھیں اپنے رسول ﷺ سے تھی، تو انھیں پہلی بار ٹھیک اندازہ ہوا کہ ایک ایسا کام ان کے سپرد کیا گیا ہے، جسے انجام دینے کی وہ قدرت نہیں رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے گرفتار کر لے جانے کے خیال کو تو قطعاً ترک کر دیا اور صرف شہنشاہ ایران کے حکم کو پہنچا دینے پر قناعت کر لی، اور حضور اکرم ﷺ کے سامنے عرض کیا:

ہمارے شہنشاہ نے ملک باذان کو آپ ﷺ کی گرفتاری کا حکم دیا ہے اور باذان نے ہمیں اس کام پر مامور کیا ہے۔ لہٰذا مناسب ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلے چلیں۔ اسی میں آپ ﷺ کی اور آپ کی قوم کی بھلائی ہے۔ اگر آپ انکار کریں گے تو یہ آپ کے حق میں بُرا ہوگا۔ آپ ہلاکت میں پڑ جائیں گے۔ آپ کی قوم تباہ کر دی جائے گی۔ اور آپ کا ملک لُوٹ لیا جائے گا۔

یہ پیغام بھی انھوں نے ڈرتے ڈرتے ہی سنایا۔ خیال تھا کہ ان کا مخاطب مشتعل ہو جائے گا اور کوئی سخت جواب دے کر انھیں رخصت کر دے گا۔ وہ دل سے بھی یہی چاہتے تھے کہ معاملہ اس پر ٹل جائے اور وہ صحیح سلامت یمن لوٹ جائیں۔ مگر وہ حیران رہ گئے جب دیکھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کے چہرے سے اس پیغام کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ آپ ﷺ یوں پُرسکون تھے جیسے ایرانی شہنشاہ کا پیغام کوئی اہمیت ہی نہ رکھتا ہو۔ انھیں اور بھی حیرت ہوئی، جب آپ ﷺ نے اس کا جواب دینے کی بجائے بالکل ہی غیر متعلق بات کی طرف ان سفیروں کو توجہ دلائی۔

آپ ﷺ نے انھیں داڑھی منڈوانے اور لب بڑھانے سے منع فرمایا۔ اس پر خُرخسرہ نے کہا:

''ہمارے خداوند (کسریٰ) نے ہمیں ایسا ہی حکم دیا ہے۔''

یہ ایرانی لشکریوں کی خاص وضع تھی۔ لانبی لانبی مونچھیں ایرانی شہنشاہیت کے رعب داب کی علامت تھیں، جنھیں بل دے کر اور طرح طرح سے چڑھا کر وہ ایرانی مقبوضات میں غلام رعیت کے درمیان بڑے فخر سے چلتے پھرتے تھے اور انھیں نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ ان کے اس تکبر وغرور پر محکوم قومیں دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتی تھیں۔ عرب ویمن میں انھیں لوگ ''موچھیل سانڈ'' کہتے اور ان کی اس وضع پر پھبتیاں کستے تھے۔ مسلمانوں نے شہنشاہی دور کی اس متکبرانہ وضع کے خلاف ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھیں منڈوانے کی وضع اختیار کی، جسے رُوم وعجم کے جاہلانہ غرور کے مقابلہ میں اسلامی انقلاب کے داعیوں کی مخصوص وضع اور اس دور کا ایک نیا اور جداگانہ فیشن سمجھا جاتا تھا۔ اس موقع پر انھیں اپنی وضع بدلنے کا یہ مشورہ دراصل عجمی غرور وتکبر کو ترک کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا:

"ہمارے خدا نے تو ڈاڑھی بڑھانے اور مونچھ ترشوانے کا حکم دیا ہے۔"

وہ دونوں حیران تھے کہ جس شخص کو گرفتار کرنے آئے ہیں، اور جسے انھوں نے ایک عظیم الشان شہنشاہ کا حکم سنایا ہے، وہ کس درجہ سکون و اطمینان سے انھیں اپنی وضع بدل دینے کا مشورہ دے رہا ہے اور ان کی بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیتا، جس کا وہ بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، جب آپ ﷺ نے انھیں پہلو بدلتے اور بے قرار ہوتے دیکھا تو اپنے اصحاب کو ان کے قیام و طعام اور مہمان داری کے لیے ہدایات دیں اور جواب کے لیے اگلا دن مقرر فرمایا۔

دوسرے دن جب بابویہ اور خُرخسرہ بارگاہِ رسالت میں پہنچے تو انھیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ ابھی ٹھیک سے بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے انھیں ایک ایسی اطلاع دی جسے سن کر وہ سراسیمہ اور حیران رہ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

"شیرویہ نے کسریٰ کو کل رات قتل کر دیا ہے۔"

دونوں کچھ دیر تک بدحواس رہے، پھر اس گمان میں کہ ان کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے، انھوں نے کہا: "اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا، ہمارا شہنشاہ تمھیں اور تمھاری قوم کو تباہ کر دے گا، اور اس سرزمین کی خاک تک کا پتا نہ چلے گا۔"

ملک باذان کے نام پیغام

اپنی اس دھمکی کا اثر دیکھنے کے لیے انھوں نے بار بار حضورِ اکرم ﷺ کے چہرہ پر نظریں دوڑائیں، مگر یہ چہرہ ایسا نہیں تھا جس سے کسی جھوٹ یا تمسخر کو منسوب کیا جا سکے۔ وہی وقار و سکون، انتہائی سنجیدگی اور طمانیت، حق و یقین کی مرعوب کر دینے والی وہی جھلک، جس نے پہلی ہی ملاقات میں ان دونوں کو سخت خلجان میں مبتلا کر دیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اُسی شانِ بے نیازی سے فرمایا:

"تم اس فکر میں نہ پڑو، اور جاؤ ملک باذان کو اس واقعے سے مطلع کر دو۔ اور میری طرف سے اس سے کہہ دینا کہ میری حکومت اور میرا دین تمام عالم میں پھیلنے والا ہے۔ میرا غلبہ وہاں تک ہو جائے گا، جہاں تک کسی کا سکہ چل رہا ہے۔ اگر ملک باذان اسلام لے آئے گا تو میں اسے اسی سرزمین پر جس پر وہ متصرف ہے، بحال رکھوں گا، اور قوم کی سرداری دوں گا۔"

دونوں قاصد خُرخسرہ اور بابویہ یہ پیغام لے کر یمن واپس ہوئے اور باذان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اس نے پوچھا: "تم نے داعیِ نبوّت کو کیسا پایا؟" بابویہ نے کہا: "میں نے بڑے بڑے امرا و سلاطین سے گفتگو کی ہے اور ان کے ساتھ کھانا کھایا ہے، لیکن ان سے زیادہ بارعب میں نے کسی کو نہ پایا۔" باذان نے دریافت کیا: "کیا ان کے ساتھ جاں نثاروں کا فوجی دستہ بھی رہتا ہے؟" بابویہ نے کہا: "نہیں۔" باذان یہ سب کچھ سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا: "یہ کلام معمولی آدمیوں کا نہیں یہ باتیں نبیوں کی سی ہیں۔ تاہم ہم انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ جو کچھ کسریٰ کے بارے میں پیش گوئی کی ہے اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔"

کچھ ہی دن بعد ایران سے شاہی قاصد باذان کے پاس آیا اور اس نے نئے شہنشاہ شیرویہ کا خط اسے دیا۔ شیرویہ نے لکھا تھا:

"میں نے کسریٰ کو قتل کر دیا، اور قتل کرنے کا سبب یہ ہے کہ وہ اہلِ فارس پر ظلم کرتا تھا۔ شرفا و رؤسا کو بلاوجہ قتل کراتا تھا۔ ان کے مال و اسباب لُوٹ لیتا تھا، جس وقت میرا یہ فرمان تجھے ملے، فوراً میری اطاعت قبول کر لے۔ جیسا کہ اس سے پہلے تو شاہانِ فارس کا مطیع تھا، اور اس شخص کی بابت، جس کی گرفتاری کا کسریٰ نے تجھے حکم دیا تھا، یہ ہدایت کی جاتی ہے کہ اس سے تا حکمِ ثانی کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرنا۔"

قاصدوں نے جب کسریٰ کے قتل کی تفصیل بیان کی تو بابویہ اور خُرخسرہ نے کہا: "قسم خدا کی کسریٰ کے قتل کی رات وہی ہے جس کا ذکر مسلمانوں کے رسول ﷺ نے کیا تھا۔" یہ سن کر لوگ حیرت کرنے لگے کہ جس رات کسریٰ قتل ہوا اس کی خبر رسول ﷺ عرب کو کیسے ہوگئی، جب کہ ہمارے پاس یہ خبر آج آئی ہے، اور ہم اس سے بے خبر تھے۔ باذان نے کہا: "بے شک وہ اللہ کے سچے رسول ﷺ ہیں، ان کے پاس خبریں اللہ کے پاس سے آتی ہیں۔" پھر اس نے اعلان کیا "میں آج سے اللہ کے سچے رسول محمد ﷺ پر ایمان لاتا ہوں، اور ان کی رسالت کی تصدیق کرتا ہوں، اور ان کی اطاعت کا اقرار کرتا ہوں۔" پھر اس نے اپنے آدمیوں سے کہا: "کیا ان ظالم و قاتل بادشاہوں کی اطاعت سے اللہ کے ایک سچے رسول ﷺ کی اطاعت بہتر نہیں ہے؟"

باذان کے ساتھ اس کے بہت سے آدمی مسلمان ہو گئے۔ اس نے ایک قاصد کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے مسلمان ہونے کی اطلاع دی اور درخواست کی کہ اپنے کسی نمائندے کو یمن بھیج دیں جو یہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت دے اور دین کی باتیں سکھائے، آنحضور ﷺ نے حضرت معاذؓ بن جبل کو اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا اور وہ ملک باذان کے نام آپ ﷺ کا ایک نامۂ مبارک لے کر یمن روانہ ہوئے۔ تاریخ بیہقی میں اس مکتوب کا تذکرہ تو موجود ہے، لیکن اس کا مکمل متن دستیاب نہیں ہوا ہے۔

(7) بنام ضُغاطر، پاپائے روم

طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ نے حضرت دحیہؓ بن خلیفہ الکلبی کو قیصرِ روم ہرقل کے پاس روانہ فرمایا تھا تو عیسائیوں کے مشہور اُسقف (لاٹ پادری) ضُغاطر کے نام بھی، جو اس وقت روم میں تھا اور ان کا دینی پیشوا تھا، اور تورات و انجیل کا بڑا عالم تھا، ایک دعوتی خط دیا تھا اور ارشاد فرمایا تھا کہ روم جا کر انھیں پہنچا دینا۔

آنحضور ﷺ کے اس نامۂ مبارک کے الفاظ یہ تھے:

حضور ﷺ کا ایک مکتوب پاپائے روم کے نام بھی ہے۔ جس کا مضمون حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"سلام اس پر جو خدا پر ایمان لائے۔

"میں اس عقیدے پر ہوں کہ عیسیٰ ابن مریم، اللہ کی روح اور اس کا حکم ہیں۔ خدا نے

انھیں پاک دامن مریم پر القا کیا۔ میں اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتا ہوں جو مجھ پر نازل ہوئے اور جو ابراہیمؑ واسماعیلؑ واسحٰقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی آل پر اُتاری گئیں۔ اور اسی طرح ان پر بھی میرا ایمان ہے جو موسیٰؑ عیسیٰؑ اور دیگر نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دی گئی ہیں۔ ہم ایمان واعتقاد میں کسی ایک نبی کے تسلیم کرنے میں باہمی فرق نہیں کرتے ہم مسلم (تسلیم کرنے والے) ہیں۔ سلام اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔''

جس زمانے میں یہ خط پاپائے روم اور قیصر کے نام بھیجے گئے تھے، عیسائیت شدید ترین فکری انتشار میں مبتلا تھی۔ عیسائی ملّتِ واحدہ نہیں رہے تھے۔ بلکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے تھے، جو ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے تھے۔ ان کے کلیسا تک علیحدہ تھے۔ ایک فرقے کی عبادت گاہ میں دوسرے داخل نہیں ہوتے تھے۔ یہ سارا شاخسانہ یسوع کو خدا سمجھ لینے کے گم راہ کن عقیدہ کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

اس خط میں حضورِ اکرم ﷺ نے مسیح علیہ السلام کو روح اللہ اور اللہ کا حکم اور مریم کو پاک دامن کہا ہے۔ اور تمام نبیوں پر نازل ہونے والی کتابوں پر ایمان لانے کا اقرار کیا ہے۔ یہ وہ باتیں تھیں جن کا یہودی انکار کرتے تھے اور خاص طور سے بی بی مریمؑ پر تہمت لگاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ عیسائیوں کے لیے غنیمت تھا۔

اس وقت صورت حال یہ تھی کہ حضور ﷺ نے یثرب اور خیبر سے یہودی قبیلوں کو ان کی عہد شکنی کی وجہ سے جلا وطن کر دیا تھا، جس سے یہودی بُری طرح پیچ و تاب کھا رہے تھے اور بیت المقدس سے قسطنطنیہ تک ان کے پیشوا مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے پھر رہے تھے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح عیسائیوں کو اور رومی دربار کو بھڑکا کر مدینہ پر فوج کشی کرا دیں۔ ایک فتنہ پرداز شخص ابی عامر راہب یہودیوں کا گماشتہ تھا۔ اس نے خود کو مسیحی بنا لیا تھا اور مسیحی عالموں اور بیت المقدس سے قسطنطنیہ تک مذہبی حلقوں میں وہ اسلام اور داعیٔ اسلام کے خلاف گم راہ کن پروپیگنڈا کرتا پھر رہا تھا اور عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہا تھا کہ مسلمان حضرت عیسیٰؑ اور مریمؑ کی توہین کرتے ہیں۔

اس موقع پر حضور ﷺ نے اس خط کے ذریعہ حضرت عیسیٰؑ بی بی مریمؑ اور تمام انبیا کے متعلق اسلام کے عقیدے کی وضاحت کی ہے، تا کہ عیسائی مسلمانوں کے بارے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ انھیں مخالفت کرنا ہو یا موافقت، ان کے عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ہی کریں۔ اس خط کا یہی مقصود تھا۔ اس لیے آپ ﷺ نے دوسرے خطوط کی طرح پاپائے روم کو براہِ راست ایمان لانے کے لیے نہیں لکھا، بلکہ اشارہ کر دیا کہ جو ہدایت کی پیروی کرے اس پر سلام ہو۔

(8) بنام الحارث بن ابی شمر الغسانی

والیٔ دمشق حارث عرب نسل سے تھا اور عیسائی مذہب اختیار کر چکا تھا۔ غسانی ریاست رومی سلطنت اور جزیرہ نمائے عرب کے درمیان ایک طرح کی بفر (Buffer) ریاست تھی۔ رومیوں نے جزیرہ نمائے عرب میں اپنے سیاسی اور اقتصادی مفادات کے تحفظ اور توسیع کے لیے اپنی سلطنت کے ساتھ آباد عرب قبائل کے سرداروں کو ساتھ ملا لیا تھا۔ اسی طرح ایرانیوں نے اپنی سرحد کے ساتھ آباد عرب قبائل کے سرداروں کو اپنا اتحادی بنا لیا تھا۔ ایرانیوں اور رومیوں کے اتحادی ان عربوں کے مابین لڑائیاں بھی ہوتی رہتی تھیں اور رومی اور ایرانی اپنی لڑائیوں میں بھی انھیں استعمال کرتے تھے۔ رومی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد عرب قبائل کے سردار المنذر غسانی کو قیصر روم نے 580ء میں باقاعدہ عربوں کا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا اور اس کی تاج پوشی بھی کی تھی، لیکن جب المنذر کی وفاداری پر شبہ کرتے ہوئے اسے دھوکے سے گرفتار کر کے رومی دارالحکومت بھیج دیا گیا تو اس کے بیٹے نعمان کی قیادت میں بنوغسان نے رومیوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ اس بغاوت کو کچلنے کے لیے شام میں رومی فوجوں کے کمانڈر نے نعمان کو بھی گرفتار کر کے قسطنطنیہ بھیج دیا، مگر بغاوت پھر بھی رفع نہ ہو سکی۔ جب قیصر روم ہرقل اور کسریٰ خسرو پرویز کے درمیان لڑائیوں کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا، جس میں پہلے ایرانیوں کو کامیابیاں ہوتی رہیں تو بنوغسان نے رومیوں کی مدد نہیں کی تھی۔ اس وجہ سے جب ہرقل نے ایرانیوں کے خلاف کامیاب پیش قدمی شروع کی تو عرب قبائل اور بنوغسان کو ساتھ ملانے کے لیے اس نے ان کی حاکمیت بحال کر دی تھی اور حارث بن ابی شمر غسانی کو اس کی آبائی ریاست کا حاکم تسلیم کر کے بنوغسان کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ مذہبی طور پر وہ اپنے جدامجد حارث چہارم کے وقت ہی سے عیسائی چلے آتے تھے، لیکن اُن کا تعلق عیسائیوں کے فرقے مانوفرائٹ سے تھا، جس سے مصر کے قبطی عیسائیوں کا تعلق تھا۔ اپنے مذہبی، سیاسی اور خاندانی پس منظر کی وجہ سے حارث بن ابی شمر غسانی ایک مغرور ومتکبر عرب حکمران تھا اور جزیرہ نمائے عرب کے شمال میں آباد عرب قبائل میں بہت زیادہ اثر ورسوخ رکھتا تھا۔

قیصر روم ہرقل کی جانب سے دمشق کے حاکم حارث کے نام رسولِ اکرم ﷺ کا مکتوب حضرت شجاع بن وہب الاسدی لے کر گئے جو پہلے دن کے چھے قاصدوں میں سے ایک ہیں۔ یہ سابقون الاوّلون میں سے ہیں۔ آنحضور ﷺ کی رحلت کے بعد یمامہ کی جنگ میں ان کی شہادت ہوئی۔

حضرت شجاعؓ کا بیان ہے کہ میں حارث کے پاس پہنچا تو وہ قیصر روم کی مہمان داری کے انتظام میں مصروف تھا۔ میں حارث کے مکان میں دو تین دن ٹھہرا رہا۔ اس اثناء میں ایک حاجب سے ملاقات ہوئی جو رومی تھا اور اس کا نام مُری تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں اور دعوتِ اسلامی لے کر آیا ہوں۔ اس نے کہا، فلاں فلاں تاریخ تک تم اس سے نہیں مل سکتے ہو۔ وہ فلاں دن دربار کرے گا۔ چوں کہ اس حاجب سے، ایک رابطہ اور تعلق پیدا ہو گیا تھا اس لیے وہ ہم سے آنحضور ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کی دعوت کے متعلق سوال کرتا رہتا تھا۔ میں اُس کو بتاتا رہتا تھا۔ بالآخر توفیق الٰہی اُس کے شاملِ حال ہو گئی اور اسلامی صداقت اس کے دل میں گھر کر گئی، اور ایک روز اس پر گریہ طاری ہو گیا، اور

کہنے لگا، مَیں نے انجیل پڑھی ہے اور اس میں ان کے صفات کو مَیں نے پایا ہے۔ میں گمان کرتا تھا کہ ان کا ظہور شام میں ہوگا۔ اب مَیں نے سمجھا کہ ان کا ظہور ''ارضِ قرظ'' یعنی عرب میں ہوا۔ میں ان پر ایمان لاتا ہوں اور ان کی تصدیق کرتا ہوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ حارث مجھے قتل نہ کر دے۔

اب یہ حاجب حضرت شجاعؓ، قاصدِ رسول ﷺ کا پورا پورا احترام کرتا تھا اور اچھی طرح خاطر مدارات انجام دیتا تھا۔ تیسرے روز حارث نے دربار منعقد کیا۔ اسے رسول اللہ ﷺ کے سفیر کے بارے میں بتایا گیا تو اس نے حضرت شجاع بن وہب کو دربار میں بلوالیا۔ حضرت شجاعؓ نے رسولِ اکرم ﷺ کا نامۂ مبارک اس کے حوالے کر دیا۔ مکتوب کی عبارت یہ تھی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اللہ کے بندے اور اُس کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے حارث بن ابی شمر کے لیے۔ سلامتی ہو اُس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی اور اس پر ایمان لایا۔ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ واحد پر ایمان لے آؤ، جس کا کوئی شریک نہیں۔ تمھارا ملک تمھارا رہے گا۔''

حضرت شجاعؓ کا بیان ہے کہ جب مکتوبِ نبوی ﷺ پڑھا گیا تو حارث نے پھینک دیا اور برہم ہو کر بولا کہ میرا ملک کون چھین سکتا ہے۔ میں اس پر جارحانہ سبقت کروں گا، خواہ وہ یمن میں جا کر چھپ گیا ہو۔ اور غصّے میں مبہوت رات بھر دربار میں بیٹھا رہا، اور فوج کی تیاری کا حکم دے دیا۔ سفر کے گھوڑوں کی نعل بندی کا حکم جاری کر دیا اور حضرت شجاع بن وہبؓ سے کہا کہ تم نے جو کچھ دیکھا ہے، اس کی خبر جا کر اپنے نبی ﷺ کو پہنچا دینا۔ پھر اس نے قیصرِ روم کو اس صورت حال کے متعلق خط لکھ دیا، اس کا قاصد ایسے وقت میں وہاں پہنچا جب حضرت دحیہؓ کلبیؓ، جو قیصر کے پاس آنحضور ﷺ کا مکتوب لے کر گئے تھے، وہ بھی وہاں موجود تھے۔ جب قیصر نے حارث بن ابی شمر کا خط پڑھا تو حارث کو لکھا کہ تم حملے کے ارادے سے باز آ جاؤ اور اس خیال کو ترک کر دو اور ہم سے بیت المقدس میں آ کر ملو۔ جب قیصر کا جواب آیا تو میں وہاں موجود تھا۔ مجھے بلا کر حارث نے پوچھا، تم یہاں سے کب جانا چاہتے ہو؟ مَیں نے کہا، کل۔ تو اس نے حکم دیا کہ اسے سو مثقال سونا دیا جائے۔ میں جب حارث سے رخصت ہو کر آیا تو اس کے حاجب مُری نے چلتے وقت کپڑے اور زادِ راہ ہدیۃً دیئے، اور کہا کہ میری جانب سے رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کر دینا اور یہ کہنا کہ میں ان کے دین کا پیرو ہوں۔''

جب حضرت شجاعؓ بن وہب خدمتِ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور حارث کے واقعے کی خبر دی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''اس کا ملک برباد ہوگیا، اور مُری کا سلام پہنچا کر جب اس کی حالت بیان کی اور جو کچھ اس سے باتیں ہوئی تھیں، انھیں دہرایا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس نے سچ کہا۔ حارث بن ابی شمر نے عام الفتح میں انتقال کیا۔

(9) بنام ہوذہ بن علی حنفی، والیِ یمامہ

وسط عرب کا وہ حصّہ جو مشرق میں عمان، مغرب میں حجاز اور یمن کے بعض حصّوں، جنوب میں صحرائے رُبع خالی اور شمال میں نجد کے درمیان واقع ہے، یہ علاقہ یمامہ کہلاتا تھا۔ زرخیز خطّے میں واقع تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جس کے بارے میں صحابہ کرامؓ خیال کرتے تھے کہ انھیں مکّہ سے ہجرت کر کے وہاں جانا ہوگا۔ جزیرہ نمائے عرب میں غلّے کی پیداوار کا یہ اہم مرکز تھا۔ زمانۂ قدیم میں طلسم اور جدیس کے قبائل یہاں سکونت پزیر تھے۔ عہدِ رسالت میں بنوحنیفہ آباد تھے۔ نبی اکرم ﷺ کے وصال کے بعد نبوّت کے جھوٹے دعوے دار مسیلمہ کذاب کا تعلق اسی قبیلے سے تھا۔ اس وقت یمامہ کا حاکم ہوذہ بن علی، کسریٰ خسرو پرویز کے گورنر کی حیثیت سے حکمران تھا۔

رسولِ کریم ﷺ نے حضرت سلیط بن عمرو العامری کو (جو ان چھے قاصدوں میں سے ایک ہیں) ہوذہ بن علی، گورنر یمامہ کے پاس دعوتِ اسلام دینے کے لیے بھیجا اور ایک خط بھی دیا۔ مکتوب نبوی ﷺ کی عبارت یہ تھی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''یہ خط محمد ﷺ، رسول اللہ کی جانب سے ہوذہ بن علی کے نام ہے
اُس پر سلامتی ہو جس نے ہدایت کی پیروی کی
تمھیں معلوم رہے کہ میرا دین تمام عرب و عجم کی حد تک پہنچے گا اور غالب رہے گا۔
پس تمھیں چاہیے کہ اسلام لے آؤ۔ سلامت رہو گے۔ مجھے تمھارے ملک سے کوئی سروکار نہیں، وہ بدستور تمھارے ہی قبضے میں رہے گا۔''

سفیرِ رسول ﷺ حضرت سلیطؓ نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا: ''ہوذہ! اللہ تعالیٰ نے تجھے ایک بڑے قبیلے کا سردار بنایا ہے۔ تیرے پیش رَو نارِ جہنّم میں ہیں۔ حکومت اور سرداری کہیں تجھے بھی آگ میں نہ دھکیل دے۔ سردار وہی ہے جو ایمان دار ہو۔ تقویٰ کا زادِ راہ رکھتا ہو۔ تیرے فیصلے سے ایک قوم نیک بن سکتی ہے۔ اسے بدبخت نہ ہونے دے۔ میں تجھے ایک بہترین اور سچے مذہب اسلام کو قبول کرنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ اللہ کی عبادت کی طرف بلاتا ہوں۔ تجھے شیطان کی فرماں داری سے روکتا ہوں۔ تو مان گیا تو کام یاب ہوگا اور خوف سے امن میں آئے گا۔ انکار کیا تو کھلا دشمن کہلائے گا، جس کا مستقبل تاریک اور خطرناک ہے۔

''تقریر سن کر والیِ یمامہ نے جواب دیا کہ اے سلیط، مجھے اللہ نے سرداری بخشی ہے۔ اگر تجھے یہ سرداری مل جاتی تو اسے باعثِ فخر سمجھتا۔ مجھے ان اُمور پر غور کرنے کا موقع دے۔ عن قریب خط کا جواب دوں گا۔''

واقدی کی روایت کے مطابق ہوذہ نے دمشق کے ایک مسیحی عالم ارکون نامی سے مشورہ کیا۔ اس نے کہا کہ کتبِ سابقہ کے مطابق یہی وہ نبی آخرالزماں ﷺ ہیں، جن کی بشارت حضرت مسیح علیہ السلام نے دی ہے۔ اطاعت کرے گا تو قیام واستحکام نصیب ہوگا۔ لیکن حکومت اور طاقت کے نشے میں چُور ہوذہ نے اس کا یہ مشورہ ٹھکرا دیا۔ ارکون حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھ پر

ایمان لائے۔ چند دن کے بعد والئی یمامہ نے قاصد رسول ﷺ کو خلعت و انعام کے ساتھ اپنا جواب خط دے کر روانہ کر دیا۔ خط کا متن درج ذیل ہے:

"جس دین کی طرف آپ ﷺ دعوت دیتے ہیں، وہ بہت خوب اور بہترین ہے۔ میں اپنی قوم میں ایک مشہور خطیب اور بہترین شاعر ہوں، اسی لیے عرب میں میری بہت عزت ہے۔ عرب میری بہت عزت و تکریم کرتے ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنی حکومت میں شریک کر لیں تو میں آپ ﷺ کی پیروی کے لیے تیار ہوں۔"

رسول اکرم ﷺ نے ہوذہ کا یہ خط سن کر ارشاد فرمایا: "اگر وہ مجھ سے ذرا سی بنجر زمین بھی مانگے تو میں نہیں دوں گا۔ وہ خود بھی تباہ و برباد ہوا، اور جو کچھ اس کے قبضے میں ہے، وہ بھی گیا۔"

ہوذہ اس سعادت سے محروم رہا اور اس کا کفر پر خاتمہ ہوا۔ سیرت حلبیہ میں ہے کہ آپ ﷺ جب فتح مکہ سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ لوٹ رہے تھے تو حضرت جبرئیل نے اطلاع دی کہ ہوذہ مر گیا۔ اسی موقع پر حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یمامہ میں ایک کذاب پیدا ہوگا جو نبوّت کا دعوٰی کرے گا، اور وہ میرے بعد قتل کر دیا جائے گا۔

(10) بنام جیفر و عبد بنی الجُلندی

رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت عمرو بن العاص ؓ کو ذی قعدہ 8 ہجری میں جیفر اور عبد بن جلندی کے پاس عُمان بھیجا۔ عُمان عرب ہی کا ایک حصہ ہے جو خلیج فارس پر مشرقی عرب میں واقع ہے۔ (عمّان میم کی تشدید کے ساتھ ایک دوسرا شہر ہے جو شام میں ہے۔ وہ یہاں مُراد نہیں ہے)

عہد نبوت میں یہاں جیفر اور عبد حکمران تھے۔ یہ دونوں قبیلہ ازد سے تھے اور یہ دونوں اپنے باپ جیفر بن جُلندی کی وفات کے بعد مشترک طور پر حکمران ہوئے تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے نام مکتوب نبوی ﷺ کی عبارت یہ تھی (ترجمہ:)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"محمد ﷺ کی طرف سے جو اللہ کا بندہ اور رسول ﷺ ہے، جیفر اور عبد فرزندانِ جلندی کی طرف۔

اس پر سلامتی ہو جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ اما بعد، میں تم دونوں کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لے آؤ، سلامت رہو گے، کیوں کہ میں تمام انسانوں کے لیے اللہ کا رسُول ﷺ ہوں، تاکہ میں (خدا کے عذاب سے) ان تمام لوگوں کو ہوشیار کر دوں جو زندہ ہیں، اور خدا کے انکار کرنے والوں پر اتمام حجت ہو جائے۔ تم دونوں نے اگر اسلام کا اقرار کر لیا تو تم دونوں ہی کو ملک کا حاکم بنا دوں گا، اور اگر اسلام کے اقرار کرنے سے تم دونوں نے انکار کیا تو لاریب تمھارا ملک ہاتھوں سے جانے والا ہے۔ ہمارے مجاہدین تمھارے صحن کو روندیں گے اور میری نبوّت تمھارے ملک پر غالب ہو کر رہے گی۔"

یہ مکتوب حضرت ابی بن کعب ؓ نے لکھا اور رسول اکرم ﷺ نے مہر لگائی۔

حضرت عمرو بن العاص ؓ کا بیان ہے کہ میں مکتوب نبوی ﷺ لے کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوا اور عُمان پہنچ کر پہلے میں عبد سے ملا، اس لیے کہ دونوں بھائیوں میں عبد اپنے اخلاق کے اعتبار سے زیادہ بُردبار اور نرم تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں۔ مکتوب نبوی ﷺ لے کر تمھارے پاس اور تمھارے بھائی کی طرف آیا ہوں۔

عبد نے کہا میرے بھائی جیفر کو ہم پر اولیّت حاصل ہے۔ وہ عمر میں بھی بڑا ہے اور بادشاہ بھی ہے۔ مَیں تمھیں اس کے دربار میں پہنچا دوں گا، تاکہ تم خود اپنے خط کو اس کے سامنے پڑھو۔

اس کے بعد عبد نے عمرو بن العاص ؓ سے پوچھا: "تم کس بات کی دعوت دیتے ہو؟"

عمرو: مَیں اللہ وحدہ لاشریک لہ، کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں اور یہ کہ اللہ کے سوا، جن کی بھی تم پرستش کرتے ہو، اس کی پوجا چھوڑ دو، اور یہ کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسُول ہیں۔

عبد: عمرو! تم تو اپنی قوم کے سردار کے فرزند ہو، جن کی ذات اس کی مستحق ہے کہ ان کی پیروی کی جائے، بتاؤ تمھارے والد نے کیا کہا؟

عمرو: میرا باپ محمد ﷺ پر ایمان نہیں لایا۔ میری دلی خواہش تھی کہ وہ اسلام قبول کرتے اور آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرتے۔ پہلے میرے خیالات بھی ان کے جیسے تھے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام کی ہدایت فرمائی۔

عبد: تم نے اسلام کہاں قبول کیا؟

عمرو: نجاشی کے پاس اور نجاشی نے بھی اسلام قبول کر لیا

عبد: تو نجاشی کی رعایا نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا؟

عمرو: اسے بادشاہ برقرار رکھا اور اس کی اطاعت کی

عبد: کیا بڑے بشپ اور پادری نے بھی پیروی کی

عمرو: ہاں، ان لوگوں نے بھی پیروی کی

عبد کو یہ بات نہایت غیر معمولی محسوس ہوئی۔ اس نے کہا: "عمرو، ذرا سوچ سمجھ کر بولو۔ انسان کو جھوٹ سے زیادہ رسوا کرنے والی کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔"

حضرت عمرو بن العاص ؓ نے کہا: "مَیں نے جھوٹ نہیں بولا اور ہمارے مذہب میں جُھوٹ بولنا جائز نہیں ہے۔"

عبد: میں سمجھتا ہوں کہ قیصر روم ہرقل کو نجاشی کے اسلام لانے کی اطلاع نہیں ملی

عمرو: اسے اطلاع ہو گئی ہے

عبد: یہ تم نے کیسے سمجھا؟

عمرو: نجاشی ہمیشہ قیصر روم کو خراج دیا کرتا تھا، لیکن جب اس نے اسلام قبول کیا اور محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی تو اس نے کہا، خدا کی قسم، اب اگر ہرقل مجھ سے ایک درہم بھی طلب کرے گا تو میں نہیں دوں گا۔ جب ہرقل تک اس کی اطلاع پہنچی تو ہرقل کے بھائی نے اس سے کہا کہ کیا آپ نجاشی کو معاف کر دیں گے اور اس

سے کوئی مواخذہ نہیں کریں گے؟ وہ آپ کا غلام ہو کر آپ کو خراج ادا نہیں کرے گا۔ اس نے نیا دین اختیار کر لیا ہے۔ ہرقل نے کہا، اس میں کیا ہے؟ ایک شخص نے ایک دین کو پسندیدہ سمجھا اور اپنے لیے اختیار کر لیا۔ بخدا اگر شہنشاہی کی پروانہ ہوتی تو میں بھی وہی کرتا جو اس نے کیا ہے۔

یہ سن کر عبد کو پھر تعجب ہوا اور اس نے کہا: ''عمرو کیا کہہ رہے ہو، ذرا سوچ سمجھ کر بولو

عمرو: واللہ، میں سچ کہہ رہا ہوں۔

عبد: اچھا بتاؤ، وہ کن کن باتوں کا حکم کرتے ہیں، اور کن باتوں سے منع کرتے ہیں؟

عمرو: وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے منع کرتے ہیں، وہ نیکی اور صلۂ رحمی کا حکم دیتے ہیں۔ ظلم، عدوان، زنا اور شراب خوری سے منع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے منع کرتے ہیں۔

یہ سن کر عبد نے کہا، یہ باتیں بہت اچھی ہیں جن کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ کاش میرا بھائی میرا ہم خیال ہوتا تو ہم دونوں محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان پر ایمان لاتے اور ان کی رسالت کی تصدیق کرتے، لیکن میرا بھائی نہ تو اپنی سلطنت چھوڑنے پر راضی ہوگا اور نہ اس پر تیار ہوگا کہ وہ سرداری چھوڑ کر کسی کی فرماں داری اختیار کرے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا کہ اگر تمھارا بھائی اسلام قبول کر لے گا تو رسول اکرم ﷺ اس کی رعایا پر اسی کو حاکم بنا دیں گے۔ ان کے مال داروں سے صدقہ لیا جائے گا اور ان کے غریبوں پر اس صدقہ کو لوٹا دیا جائے گا۔

عبد نے پوچھا: صدقہ کیا چیز ہے؟

حضرت عمرو بن العاصؓ نے تفصیل سے صدقے کے مسائل بیان کیے۔ پھر وہ چند دن تک عبد کے ہاں مقیم رہے۔ عبد اپنے بھائی کے پاس آتے جاتے رہے اور تمام باتوں کی خبر پہنچاتے رہے۔ پھر ایک دن عبد نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو بلایا اور کہا، میرے ساتھ دربار میں چلو۔

حضرت عمرو جب دربار میں پہنچے تو جیفر کو مکتوب نبوی ﷺ حوالے کر دیا۔ اس نے نامۂ مبارک کی مہر توڑی اور پورا خط پڑھا، اور خط پڑھ کر اپنے بھائی کے حوالے کر دیا۔ عبد نے بھی پورا خط پڑھا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کا بیان ہے: ''مَیں نے دیکھا کہ عبد اپنے بھائی جیفر کی نسبت مکتوب کے مضمون سے زیادہ متاثر تھا۔

پھر جیفر نے پوچھا: قریش نے ان کے ساتھ کیا کیا؟

عمرو: سب لوگوں نے بالآخر اتباع کر لیا

جیفر: اس کے ساتھ رہنے والے لوگ کیسے ہیں؟

عمرو: وہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے خوش دلی اور پوری رغبت سے اسلام قبول کیا ہے، اور دنیا کی ساری چیزوں کو چھوڑ کر اُس کے دامن سے لپٹ گئے ہیں، اور اللہ کی توفیق و ہدایت سے ان لوگوں نے اپنی عقل سے اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ وہ غفلت اور گمراہی میں تھے۔

پھر کچھ اور باتیں ہوئیں، پھر جیفر نے کہا: ''آج تو مجھے چھوڑ دو، کل میرے پاس آؤ''

دوسرے دن جب حضرت عمرو بن العاصؓ جیفر کے پاس پہنچے تو جیفر نے کہا کہ مَیں نے تمھاری دعوت پر اچھی طرح غور و فکر کر لیا۔ اگر میں ایسے شخص کی اتباع کروں جس کی فوج ہمارے ملک میں پہنچی تک نہیں۔ اس کے باوجود میں خود کو اس کے سپرد کر دوں تو میں عرب کا سب سے زیادہ کم زور شخص سمجھا جاؤں گا، حالانکہ اگر اس کی فوج یہاں پہنچے تو ایسی جنگ لڑوں کہ کبھی سابقہ نہ پڑا ہو۔

حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا: میں تو کل چلا جاؤں گا

جب جیفر کو حضرت عمرو کے جانے کا یقین ہو گیا تو صبح ہونے پر اس نے انھیں طلب کیا۔ حضرت عمروؓ کا بیان ہے: ''میں آیا تو اس نے اور اس کے بھائی دونوں نے اسلام قبول کیا اور حضور ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی۔ وہ میرے اور صدقہ (زکوٰۃ) کی وصولی کے احکام کے درمیان سے ہٹ گیا، اور اگر کسی نے میری مخالفت کی تو میری مدد پر آمادہ ہوا۔ چنانچہ مَیں نے وہاں کے مال داروں سے زکوٰۃ وصول کی اور فقرا میں تقسیم کر دی۔ میں اُس وقت تک وہاں مقیم رہا، جب رسول اللہ ﷺ کے وصال کی خبر وہاں پہنچی۔''

(11) یہودِ خیبر کے نام

خیبر کے یہود میں جہاں بڑے بڑے جنگ جو اور شجاع لوگ تھے، وہاں ان میں ذمہ دار اور سنجیدہ علماء اور محقق بھی تھے۔ ان کی اسلام دشمنی اگرچہ انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور ان سے کسی خیر کی توقع نہیں تھی، پھر بھی رحمت عالم ﷺ نے ایک تبلیغی خط انھیں بھی لکھا، جس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد ﷺ رسول اللہ کی جانب سے جو نبوت و رسالت میں حضرت موسیٰ کی طرح ہیں اور ان تمام باتوں کی تصدیق کرنے والے ہیں جنھیں موسیٰ لے کر آئے۔ اے تورات کے ماننے والے لوگو! لاریب، اللہ نے تم لوگوں سے کہا ہے، اور بلاشبہ تم لوگ اپنی کتابوں میں پاتے ہو کہ اللہ کے رسول محمد ﷺ اور ان کے صحابہؓ منکرین پر بہت سخت ہوں گے اور باہم مہربان ہوں گے۔ تم انھیں دیکھو گے کہ کبھی رکوع کی حالت میں ہیں اور کبھی سجدے کی حالت میں، اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں۔ ان کی شناخت یہ ہے کہ ان کے چہروں میں نماز کا اثر (نور) پاؤ گے۔ یہ اوصاف ان کے تورات میں بھی ہیں اور انجیل میں بھی۔ یہ اس کھیتی کے مانند ہیں جس نے اپنی سوئی نکالی۔ پھر اسے قوی کیا۔ پس وہ موٹی ہو گئی۔ پھر اپنی جڑ پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ کاشت کار کو خوش کر دیا، تاکہ ان کے باعث اللہ کفار کو غیظ میں مبتلا کر دے۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے، اللہ تعالیٰ نے ان سے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

''میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں اور تورات کی قسم دیتا ہوں، اور خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے من و سلویٰ ان لوگوں کو کھلایا جو تم سے پہلے اسباط تھے، اور قسم دیتا ہوں اس خدا کی، جس نے تمھارے بزرگوں کے لیے دریا کو خشک کر دیا اور فرعون اور اس

کے اعوان و انصار سے نجات دی، تم لوگ بتاؤ، کیا تم لوگ تورات میں پاتے ہو کہ محمد ﷺ پر ایمان لاؤ۔ اگر تم اپنی کتاب میں نہیں پاتے ہو تو تم پر کوئی جبر نہیں ہے۔ ہدایت اور گمراہی واضح ہو چکی ہے۔ پس میں تم لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف دعوت دیتا ہوں۔

(12) بنام ہلال بن اُمیہ، رئیس بحرین

جیسا کہ مکتوب نمبر 5 میں بیان کیا جا چکا ہے کہ بحرین کا حاکم منذر بن ساوی تھا جو دراصل ایران کے زیر اقتدار تھا۔ جب منذر کو مکتوبِ نبوی ﷺ پہنچا اور وہ مشرف بہ اسلام ہو گئے تو بحرین کا ایک رئیس سردار، جس کا نام ہلال بن اُمیہ تھا، آنحضور ﷺ نے ان کے نام بھی ایک دعوتی مکتوب ارسال فرمایا، جس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''تم سلامت رہو، میں تم پر اُس اللہ کی حمد پیش کر رہا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ میں اللہ واحد کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ تم اللہ پر ایمان لاؤ اور اطاعت اختیار کرو، اور اسلامی جماعت میں داخل ہو جاؤ۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔ سلامتی ہو اس شخص پر جو ہدایت کا پیرو ہو۔''

ہلال بن اُمیہ کے متعلق یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس نے آنحضور ﷺ کے مکتوبِ گرامی کا کیا جواب دیا۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ اس نے اسلام قبول کیا یا نہیں؟

(13) بنام شاہانِ حمیر

حمیر کی مملکت کے محل وقوع کے متعلق ''ارض القرآن'' میں ہے: ''ملک یمن کا نقشہ دیکھو تو معلوم ہوگا کہ وہ مغربی اور مشرقی دو حصّوں پر منقسم ہے۔ قطعہ مشرقی جو اندرونِ مملکت سے ملحق ہے، مملکت سبا ہے۔ قطعہ مغربی جو ایک طرف بحرِ عرب اور دوسری طرف بحرِ احمر کو چھوتا ہے۔ حمیر کی مملکت ہے۔''

عہد نبوی ﷺ میں یمن کے جنوبی حصے پر جو حکومت قائم تھی، وہ حمیر کے نام سے موسوم تھی۔ جو مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھی، شاہانِ حمیر مذہباً عیسائی تھے۔ آنحضور ﷺ نے حضرت عیاش بن ابی ربیعہ مخزومیؓ کو ان کے نام دعوتی مکتوب دے کر روانہ فرمایا، جس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''حارث اور مسروح اور نعیم فرزندان عبد کلال، حمیر والوں کی طرف۔

''تم پر اس وقت تک سلامتی ہو کہ تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھو۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ یکتا ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی نے موسیٰؑ کو نشانیاں دے کر بھیجا، اور عیسیٰؑ کو اپنے کلمہ سے پیدا کیا۔ مگر یہود کہتے ہیں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ اللہ تین میں سے ایک ہے اور عیسیٰؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔''

جب حضرت عیاشؓ نے نامۂ مبارک انھیں پہنچایا تو نامۂ مبارک سن کر ان لوگوں نے بخوشی اسلام قبول کر لیا اور اپنے اسلام لانے کی خبر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجی، زرعہ ذی رُعین حمیر کا پہلا اسلام لانے والا تھا۔ اس نے اہل حمیر کو حکم دیا کہ صدقہ (زکوٰۃ) اور جزیہ جمع کریں، اور یہ سب معاذ بن جبل اور مالک بن مرارة کو دے دیں، اور حکم دیا کہ ان دونوں قاصدوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ مالک بن مرارہ شاہانِ حمیر کے اسلام لانے اور اطاعت کرنے کی علامت کے طور پر رسول اللہ ﷺ کی طرف ان کے قاصد تھے۔ یہ واقعہ 9 ہجری رمضان شریف کا ہے۔ مالک بن مرارہ مدینہ منورہ پہنچے تو آنحضور ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ ان کے قیام و طعام کا انتظام کریں۔ پھر ان کے خط کے جواب میں آنحضور ﷺ نے ایک تفصیلی خط لکھا، جس میں زکوٰۃ اور جزیہ کے مفصل احکام تحریر کیے گئے۔ اس مکتوب نبوی ﷺ کا ابتدائی حصّہ درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اللہ کے رسول اور نبی محمد ﷺ کی طرف سے حارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال، معافر، ہمدان اور ذی رُعین کے رئیس نعمان کے نام۔

امابعد، میں تمھاری طرف اس اللہ کی حمد پیش کرتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ارضِ روم سے لوٹنے کے بعد آپ کا قاصد آیا اور اس سے مدینہ میں ملاقات ہوئی، جس پیام کو لے کر تم لوگوں نے اسے بھیجا تھا، اس نے پہنچا دیا، اور جو واقعات پہلے کے تھے، ان کی اُس نے اطلاع دی اور تم لوگوں کے مشرف بہ اسلام ہونے اور مشرکین سے جنگ کے حالات بیان کیے۔ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنی ہدایت سے سرفراز کیا ہے، بشرطیکہ صالح اعمال پر کار فرما رہیں، اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے فرماں بردار رہیں۔ نماز پڑھتے رہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے رہیں۔''

(14) بنام یُوحنا بن روبہ حاکم ایلہ

ایلہ کا محل وقوع حجاز کی انتہا اور شام کی ابتدا میں بحرِ احمر کے کنارے خلیج عقبہ کے ساحل پر ہے۔ یہاں کے حاکم یُوحنا اور دیگر اکابرین قوم کو حضور ﷺ نے تبوک سے خط لکھا۔ تبوک 9 ہجری میں حضور ﷺ کو صحابہ کرامؓ کی بھاری جمعیت کے ساتھ بہ نفس نفیس جانا پڑا تھا۔ اس کی وجہ ''طبقات ابن سعد'' میں یہ لکھی ہے کہ آنحضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ شام میں رومیوں نے کثیر مجمع اکٹھا کیا ہے۔ ہرقل نے اپنے فوجیوں کو ایک سال کی تنخواہ دے دی ہے۔ قبیلہ لخم، جذام، عاملہ اور غسان بھی لائے گئے ہیں، اور اپنے مقدمۃ الجیش کو بلقا تک بھیج دیا ہے۔ طبرانی سے روایت ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ ''محمد ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے اور عرب قحط کی بنا پر بھوکے مر رہے ہیں۔'' اس بناء پر ہرقل نے چالیس ہزار کی فوج روانہ کی۔

یہ اطلاعات معمولی نہ تھیں۔ اس کی مدافعت میں آپ ﷺ کو مدینہ سے نکلنا پڑا۔ جب حضور ﷺ روانہ ہوئے تو تبوک پہنچ کر قیام فرمایا۔ آپ ﷺ کے ساتھ تیس ہزار صحابہ کی جمعیت تھی جس میں دس ہزار گھوڑے تھے۔ رومیوں کو جب مسلمانوں کی پیش قدمی کا حال معلوم ہوا اور یہ بھی اطلاع ملی کہ تیس ہزار مجاہدین اسلام کی جماعت آپ ﷺ کے ساتھ ہے تو آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ منتشر ہو گئے۔ بیس روز تک آپ تبوک میں مقیم رہے۔ وہاں سے جب واپسی کا ارادہ ہوا تو ایلہ کے

حاکم یُوحنّا کو اور دوسرے اکابرینِ قوم کو حسب ذیل دعوتی مکتوب لکھا۔ یہ مکتوب گرامی اپنے مندرجات میں مفصّل ہونے کی وجہ سے بہت قیمتی دستاویز ہے، اس لیے یہاں پورے متن کا ترجمہ دیا جا رہا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''عمائدین ایلہ اور یُوحنّا روبہ کی طرف

''تم پر سلامتی ہو۔ مَیں خدا کی حمد تم پر پیش کرتا ہوں، اللہ ہی کی ذات ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں اس وقت تک تمھارے ساتھ جنگ کا ارادہ نہیں رکھتا، جب تک تحریری حجت پیش نہ کر دوں۔ اسلام قبول کرو یا جزیہ دینا منظور کرو۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور رسول ﷺ کے قاصدوں کی فرماں برداری کرو۔ ان کا احترام کرو۔ انھیں ریشمی کپڑوں کے علاوہ اچھے کپڑے پہناؤ اور زید کو عمدہ لباس پہناؤ۔ جن باتوں پر یہ راضی ہوں گے، میں بھی راضی ہوں۔ انھیں جزیہ کے احکام بتا دیئے گئے ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ خشکی اور تری میں امن رہے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرو۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے حق کے سوا عرب وعجم کا کوئی حق تم پر نہیں رہے گا۔ تم اس سے محفوظ ہو جاؤ گے۔

''اور اگر تم نے انھیں رد کر دیا اور نہیں مانا تو میں تم سے کوئی چیز (ہدایا وعطایا) قبول نہیں کروں گا۔ اس کے نتیجے میں تم سے میں جنگ کروں گا۔ نابالغ کو قید کر لوں گا اور بڑے کو قتل کر دوں گا، اس لیے کہ میں خدا کا سچا رسول ﷺ ہوں۔ میں اللہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، اور اس بات پر کہ مسیح ابن مریمؑ کلمۃ اللہ ہیں، ایمان رکھتا ہوں، اور میں ایمان رکھتا ہوں کہ عیسیٰؑ خدا کے پیغمبر ہیں۔

''صحیح راہ اختیار کرو، قبل اس کے کہ تمھیں کوئی دکھ پہنچے۔ مَیں نے اپنے قاصدوں کو خوب سمجھا دیا ہے۔ حرملہ جو تین وسق لے کر آئے، انھوں نے تمھاری سفارش کی ہے۔ اگر اللہ کے حکم کی تعمیل اور حرملہ کی سفارش کا خیال نہ ہوتا تو میں تم سے مراسلت نہ کرتا، بلکہ تم جنگ سے دوچار ہوتے، اگر تم نے میرے قاصدوں کی اطاعت کر لی تو اللہ اور محمد ﷺ اور جو اس سے وابستہ ہیں، سب کی پناہ تمھیں حاصل ہے۔ میرے قاصد شرجیل، اُبی، حرملہ اور حریث جو بھی فیصلہ تمھارے متعلق کریں گے، میں اُس سے راضی ہوں، اور تمھارے لیے اللہ کا ذمہ اور محمد ﷺ کا ذمہ ہے۔ سلامتی ہو تم پر، اگر تم فرماں بردار ہو گئے اور اہل مقنا (یہود) کے لیے، اُن کے ملک میں جانے کے لیے زادِ راہ مہیا کر دو۔

ایلہ کا سردار یُوحنا حاضرِ خدمت ہوا اور اس نے جزیہ دینا منظور کیا، اور ایک سفید خچر بھی نذر میں پیش کیا، جس کے صلے میں آنحضور ﷺ نے اسے ردائے مبارک عنایت فرمائی۔

(15) بنام اہلِ مقنا

مقنا ایلہ کے قریب ہی واقع تھا۔ وہاں یہودیوں کی آبادی تھی۔ اہلِ مقنا کے قاصد بارگاہ نبوی ﷺ میں حاضر ہوئے اور اپنی اطاعت کا یقین دلایا اور حسبِ ذیل معاہدے پر ان کا معاملہ طے پایا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد ﷺ رسول اللہ کی طرف سے بنی جنبہ اور اہل مقنا کے نام

اما بعد، مجھے معلوم ہوا کہ تم لوگ اپنے دیہات کو واپس جا رہے ہو۔ جس وقت میری یہ تحریر تمھارے پاس پہنچے تو تم لوگوں کو امن ہے، اور تمھارے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا ذمہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے تمھارے ہر طرح کے جرائم معاف کر دیئے ہیں، اور تمھارے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ذمہ داری ہے۔ نہ تو تم پر کوئی ظلم ہو گا اور نہ زیادتی ہو گی، اور اللہ کے رسول ﷺ جن چیزوں سے اپنی جان کی حفاظت کرتے ہیں، تمھارے لیے بھی محافظ ہوں گے۔

''تمھارے تمام جنگی سامان، اسلحہ، زرہیں، گھوڑے، خچر، گدھے، ان کے نگران غلام رسول اللہ کے لیے ہوں گے، لیکن جو اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے قاصد معاف کر دیں، اور تم لوگوں پر کھجور کے باغات کی پیداوار کی چوتھائی اور سمندری شکار کی چوتھائی اور عورتوں کے کاتے ہوئے سُوت کی چوتھائی واجب الادا ہو گی۔ اس کے بعد تم ہر طرح کے جزیے اور بیگار سے بری ہو۔ پس اگر تم نے سمع وطاعت سے کام لیا تو تمھارے ذی مرتبت لوگوں کی عزت وتکریم کی جائے گی اور تمھارے مجرمین کو معافی دے دی جائے گی۔

''اما بعد، مسلمانوں کے لیے ہدایت ہے کہ جو اہل مقنا کے ساتھ بھلائی سے پیش آئے گا تو وہ اس کے لیے بہتر ہو گا، اور جو ان کے ساتھ بُرائی سے پیش آئے گا تو وہ اس کے لیے برائی ہو گی۔ تم لوگوں پر یا تو تمھی سے امیر ہو گا، یا رسول اللہ ﷺ کے متعلقین میں سے کوئی ہو گا۔''

(16) بنام بشپ نجران

نجران کا محلِ وقوع احقاف اور عسیر کے درمیان ہے جو مکہ معظمہ سے سات منزل دور، یمن کا ایک بہت بڑا شہر ہے۔ عہدِ قدیم میں یہاں بنو اسماعیل کا ایک خاندان آباد تھا۔ ظہورِ اسلام سے کچھ عرصہ پہلے روم وحبشہ کی کوششوں سے یہاں عیسائیت پھیل گئی تھی۔ یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم الشان کلیسا تھا، جسے وہ اپنا کعبہ سمجھتے تھے اور عربوں میں کعبہ نجران سے مشہور تھا۔ اس میں عیسائیوں کے بڑے بڑے پیشوا، راہب اور لاٹ پادری رہتے تھے۔ عیسائیوں کا کوئی مذہبی مرکز اس زمانے میں اس کا ہم سر نہ تھا۔ نجران کے مضافات میں 73 گاؤں تھے جو اس کے تابع اور ملحق تھے۔ یہاں ایک لاکھ سے زیادہ جنگ جو مَردوں کی آبادی تھی۔ اس کے حدود میں جو آ جاتا تھا، وہ ان کے نزدیک ان کی پناہ میں آ جاتا تھا۔ ان کے سرکردہ افراد میں تین شخص ایسے تھے جو ان کے تمام معاملات کے منتظم ومنصرم تھے۔ ایک جو پورے علاقے کا گورنر اور امیر تھا، امارت وسیادت اسی کے پاس تھی۔ تمام لوگ اُسی کی رائے اور حکم پر عمل درآمد کرتے تھے۔ دوسرے ابوالحارث بن علقمہ جو اُن کا اُسقف یعنی لاٹ پادری اور سب سے بڑا مذہبی عالم تھا۔ وہ ان کے گرجا کا بڑا پادری اور مذہبی مدارس کا منتظم تھا۔ تیسرے ایہم،

جس کا لقب سیّد تھا۔ یہ علاقے کا جج تھا اور معاشرتی جماعتی کاموں کا منتظم بھی تھا۔
آنحضور ﷺ نے نجران کے بشپ اور پادریوں کے نام جو مکتوب لکھا تھا، اُس کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''اللہ کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے نجران کے پادریوں کے نام
''مَیں اسلامی دعوت شروع کرتا ہوں۔ ابراہیمؑ، اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے خدا کے نام سے۔
اما بعد، مَیں بندوں کی عبادت کی بجائے اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں، اور بندوں کی حکومت کے بجائے، خدا کی حکومت کی طرف دعوت دیتا ہوں۔ اگر تم لوگوں نے اس کا انکار کیا تو تم پر جزیہ واجب الادا ہوگا، اور اگر تم لوگوں نے اس کا بھی انکار کیا تو پھر میں جنگ کا چیلنج کرتا ہوں۔''

دعوتی مکتوب ملنے کے بعد نجران کا ایک وفد بارگاہِ رسالت ﷺ میں حاضر ہوا۔ جو تقریباً ساٹھ آدمیوں کا قافلہ تھا۔ اس میں سیّد عاقب بھی شریک تھے۔ ان کے علاوہ چوبیس سردار اور بھی تھے۔ جب یہ لوگ مسجد نبوی ﷺ میں پہنچے اور حضور ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم تو پہلے ہی مسلمان ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تم صلیب پوجتے ہو اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا سمجھتے ہو تو مسلمان کیسے ہو سکتے ہو، غرض اس طرح کی اور باتوں پر بھی ان سے بحث مباحثہ ہوتا رہا، مگر جب یہ لوگ دعوتِ اسلامی کے قبول کرنے پر راضی نہ ہوئے تو سالانہ ایک مقررہ خراج پر ان سے معاہدہ ہو گیا اور یہ لوگ واپس ہو گئے۔

سورہ آلِ عمران میں وفد نجران کے مباحثے اور مباہلے کا ذکر ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب ''حیاتِ طیبہ'' اور کتاب ''وفود'')

(17) بنام قبیلہ بکر بن وائل

حضرت اسماعیلؑ کی اولاد میں عدنان کو قریش میں یہ خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ ان کے سارے قبائل عدنان ہی سے جا کر ملتے ہیں۔ عدنان کے بیٹوں میں آیندہ نسل صرف معد سے پھیلی۔ معد کا لڑکا نزار تھا۔ نزار سے پانچ مشہور قبیلے نکلے، جنھیں عرب کی تاریخ میں خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔ انمار، ایاد، ربیعہ، قضاعہ اور مضر۔ ان میں انمار اور ایاد کم پھیلے۔ ربیعہ، قضاعہ اور مضر اپنی کثرتِ تعداد، دنیاوی اعزاز اور تاریخی اہمیت کے لحاظ سے خصوصی شہرت کے مالک ہوئے۔

ربیعہ بن نزار کی متعدد اولادیں ہوئیں، جن سے بڑے بڑے قبائل نکلے اور جنھوں نے حکومتیں قائم کیں۔ اسی کی اولاد میں بکر بن وائل کا قبیلہ ہے۔ ان قبائل میں سب سے پہلے قبیلہ بکر بن وائل نے ہمسایہ حکومتوں کے مقابلے میں ''وطنی استقلال'' کی بنیاد ڈالی اس لیے انھیں عرب کے قبائل میں خصوصی امتیاز حاصل تھا۔
آنحضور ﷺ نے اس قبیلے کو بھی اسلام کی دعوت دی، خط کا مضمون یہ تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''محمد ﷺ رسول اللہ کی طرف سے بکر بن وائل کے نام
اسلام قبول کرو اور سلامتی سے ہم کنار ہو جاؤ''

بکر بن وائل کو کوئی خط کا پڑھنے والا نہیں ملا۔ آخر بنی ضبیعتہ بن ربیعہ کا ایک شخص آیا اور اس نے خط پڑھا۔ ان لوگوں کا نام بنی الکاتب پڑ گیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا یہ خط لے کر ظبیان بن مرثد السد وسی آئے تھے۔

(18) بنام جبلۃ بن الایہم

رسول اکرم ﷺ نے غسان کے بادشاہ جبلۃ بن الایہم کو دعوت اسلام دیتے ہوئے ایک خط تحریر فرمایا۔ وہ اسلام لایا اور اپنے اسلام لانے کی خبر خط کے جواب میں آنحضرت ﷺ کو بھی دی۔ آپ ﷺ کے لیے کچھ ہدایا بھیجے اور برابر مسلمان رہا، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں ایک دن دمشق کے بازار میں مزینہ کے ایک شخص نے اسے اپنے پاؤں سے روند دیا۔ وہ مزنی اس کے اوپر گرا تو اس نے ایک تھپڑ رسید کر دیا۔

دوسری اور زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ حج بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اس کا لباس کسی شخص کے پیروں تلے آ گیا، جو بنوفزارہ کا آدمی تھا۔ جبلہ نے اس کے ایک تھپڑ رسید کر دیا، جس سے اس کی ناک کا بانسہ ٹیڑھا ہو گیا۔ اُسے پکڑ کر ابوعبیدہؓ بن الجراح کے پاس لایا گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس شخص کو جبلہ نے تھپڑ مارا ہے۔ ابوعبیدہؓ نے کہا:
''تو اس کے بھی تھپڑ لگاؤ۔''
لوگوں نے کہا: کیا اسے قتل نہ کیا جائے گا؟
کہا: نہیں
کہا: کیا اس کے ہاتھ بھی نہ کاٹے جائیں گے؟
کہا: نہیں، اللہ کا حکم قصاص کے لیے ہے
جبلہ نے کہا: اے لوگو، میں تو ایک گنوار کے برابر ہوا جا رہا ہوں۔ یہ تو بہت ہی بُرا مذہب ہے! پھر وہ عیسائی ہو گیا اور اپنی قوم میں واپس چلا گیا، یہاں تک کہ وہ بھاگ کر ملکِ روم میں قسطنطنیہ چلا آیا۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ تک پہنچی تو انھیں بہت ہی ناگوار ہوئی، اور انھوں نے حسان بن ثابت سے کہا: ''ابوالولید! کیا تم نے بھی سنا ہے کہ تمھارا دوست جبلہ مُرتد ہو کر عیسائی ہو گیا ہے۔''
حسان نے کہا: ''اناللہ وانا الیہ راجعون۔ ایسا کیوں ہوا؟''
کہا کہ: مزینہ کے ایک شخص نے اسے تھپڑ مار دیا تھا۔''
یہ سن کر حسان نے کہا: ''تب تو اس نے ٹھیک ہی کیا۔''
یہ سن کر حضرت عمر فاروقؓ اُٹھے اور اپنا کوڑا سنبھالا اور حسان کے کوڑے لگائے۔

(19) بنام فروۃ بن عمرو الجذامیؓ

حضرت فروۃ بن عمرو الجذامیؓ عمان پر البلقا کے علاقے میں رومیوں کے گورنر تھے۔ یہ مسلمان ہو گئے، اور انھوں نے رسول کریم ﷺ کو خط لکھ کر ایک قاصد کے ہاتھ بھیجا جس کا نام مسعود بن سعد تھا، اور ہدایا میں ایک سفید خچر، ایک گھوڑا، ایک گدھا، کچھ باریک کپڑے اور زرتار لباس بھیجا۔ آنحضور ﷺ نے انھیں لکھا:

''محمد ﷺ رسول اللہ کی طرف سے فروۃ بن عمرو کے نام۔ اما بعد۔ تمھارا قاصد آیا اور جو کچھ تم نے بھیجا تھا، وہ پہنچا یا اور تمھارے احوال سے مطلع کیا اور تمھارے اسلام لانے کی خبر پہنچائی۔ اللہ نے تمھیں اپنی ہدایت سے نوازا ہے، اگر تم امن پسند رہو، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کرو، نماز پڑھتے رہو، اور زکوٰۃ دیتے رہو۔''

پھر آپ ﷺ نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تو انھوں نے قاصد مسعود بن سعد کو بارہ اوقیہ چاندی عطا کی۔ جب رومی بادشاہ کو فروۃ کے مسلمان ہونے کا حال معلوم ہوا تو اس نے انھیں اپنے دربار میں طلب کیا اور کہا: ''اگر تم اپنے پرانے دین پر واپس ہو جاؤ تو ہم تمھیں (گورنری پر) بحال کر دیں گے۔ انھوں نے کہا: ''میں محمد ﷺ کا دین نہیں چھوڑوں گا۔ تم جانتے ہو کہ حضرت عیسیٰؑ نے ان کے آنے کی بشارت دی تھی، لیکن تم اپنے ملک کو بچانے کی خاطر نہیں مان رہے ہو'' تب بادشاہ روم نے انھیں قید کر لیا۔ پھر قید خانے سے نکال کر قتل کیا اور سُولی پر لٹکا دیا۔

(20) بنام سمعان بن عمرو بن قریط

آنحضور ﷺ نے سمعان بن عمرو ابن قریط کو عبداللہ بن عوسجد العرنی کے ہاتھ خط بھیجا۔ یہ خط چمڑے پر لکھا ہوا تھا اور انھوں نے اس سے اپنے ڈول میں پیوند لگا لیا تھا، اس لیے انھیں بنوالراقع کہا جانے لگا۔ بعد میں سمعان مسلمان ہو گئے تھے۔ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔

جب سمعان نے ڈول میں پیوند لگایا تو ان کی بیٹی نے کہا، مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم پر کوئی بلا نازل ہوگی، کیوں کہ تمھارے پاس سید العرب کا خط آیا اور تم نے اس کی یہ قدر کی کہ ڈول میں چپکا لیا۔ کچھ زمانے کے بعد آنحضور ﷺ کے لشکر کا گزر ان کے علاقے سے ہوا اور ان کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا۔ تب یہ حاضرِ خدمت ہوئے اور اسلام لے آئے۔ آنحضور ﷺ نے تقسیم ہونے سے پہلے ہی سارا مالِ غنیمت واپس کر دیا۔

(21) بنام بنی خباب کلبی

''یہ خط محمد ﷺ رسول اللہ کی طرف سے بنی خباب اور ان کے حلیفوں کے لیے ہے، اور ان کے لیے جو نماز قائم کرنے، زکوٰۃ دینے، ایمان پر مستقیم رہنے اور عہد کو پورا کرنے میں ان کے معاون ہوں۔ چرواہے کے ساتھ اور بغیر چرواہے کے جانوروں میں انھیں ہر پانچ بکریوں پر ایک بکری زکوٰۃ میں دینا ہوگی، جس میں کوئی عیب نہ ہو۔ بار برداری کے جانور، جن سے اون اُتاری جائے اور جو بیکار ہوں، وہ ان کے ہوں گے۔ آبپاشی کی زمینیں اور وسائل اور بارش سے سیراب ہونے والی زمینوں کا لگان امین مقرر کرے گا جو ان پر زیادہ نہیں کیا جائے گا۔

(گواہ: سعد بن عبادہ و عبداللہ بن انیس اور دحیہ بن خلیفہ کلبی)

(22) بنام مہری بن الابیض

''یہ خط محمد ﷺ رسول اللہ کی طرف سے مہری بن الابیض کے نام ہے کہ مہرہ کے جو لوگ ایمان لائے ہیں، انھیں اُکھاڑا نہیں جائے گا، ان پر حملہ نہیں ہوگا، ان سے جنگ نہیں کی جائے گی۔ ان پر یہ ذمہ داری ہے کہ شرائع اسلام کو قائم کریں۔ جو ان میں تبدیلی کرے گا، وہ خدا سے جنگ کرتا ہے اور جو ان پر ایمان لائے، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ذمّے میں رہے گا، گری پڑی چیز واپس ہوگی اور چرنے والے مویشیوں کو سیراب کیا جائے گا۔ گندگی، بُرائی، فحش گوئی اور بدکاری سے بچیں گے۔''

دسویں کتاب:

معاہداتِ نبوی ﷺ

معاہداتِ نبوی ﷺ

کسی ملک کی ٹھوس بنیادوں پر مبنی خارجہ پالیسی اس کے مفادات کی ضمانت ہوتی ہے اور اس کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لیے تشکیل دی جاتی ہے۔ خارجہ پالیسی مرتب کرنے کے لیے مندرجہ ذیل عناصر بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

1: ریاست کا طبعی ماحول جس میں اس کا رقبہ، جغرافیائی خصوصیات، خدوخال اور آب وہوا شامل ہیں۔

2: ریاست کا محلِ وقوع۔

اسلام سے پیش تر عرب میں کوئی مرکزی طاقت نہیں تھی۔ ملک انواع واقسام کے جنگ جو قبیلوں میں بٹا ہوا تھا۔ عربی بد وتاریکیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے عیوب ان میں پائے جاتے تھے۔ معاشرتی بُرائیاں اپنے عروج کو پہنچ چکی تھیں۔ گناہِ صغیرہ وکبیرہ ان کے نزدیک بے حقیقت بن کر رہ گئے تھے۔ اپنے انسانیت سوز کارناموں کو بڑے فخریہ انداز میں بیان کرتے ہوئے بڑائی محسوس کرتے تھے۔

جب ظلمت کدے اسلام کی جگمگاتی کرنوں کے سامنے دم توڑنے لگے تو اس وقت عربی قبائل میں سے پانچ قبیلے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ جزیرہ نمائے عرب کے وسط میں اہلِ ربیعہ تھے اور یہ یمن کی قرابت داری کا دعوٰی کرتے تھے۔ مغرب میں قریش تھے جن کا مکہ پر قبضہ تھا۔ شمال میں قیس، تمیم اور ہوازن کے قبائل آباد تھے۔ پڑوس کی قدیم ترین مملکتوں میں سے ایک یمن تھی جس کا دارالحکومت جزیرہ نمائے عرب کے انتہائی جنوب میں واقع تھا۔ یمن کے ماتحت جرا کی حکومت تھی جو شمال مشرق میں واقع تھی۔ غسان شمال مغرب میں تیسری بادشاہت تھی جو پانچ چھے سو سال پُرانی تھی اور مشرق میں عظیم الشان سلطنتِ ایران تھی۔

عربوں کے دگرگوں حالات کے باوجود اس کے پڑوسی ممالک میں سے کسی نے بھی ان پر حملہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ انھیں ایک وحشی قوم تصور کرتے تھے اور ان کے اندازے کے مطابق انھیں وہاں سے کچھ وصول ہونے کی اُمید نہ تھی۔

جس وقت رسولِ خدا ﷺ نے عربوں کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں شروع کیں تو عربوں کے اخلاقی وسماجی حالات جوں کے توں تھے۔ آپ ﷺ نے ان باتوں کا بغور مشاہدہ کیا اور پھر اپنی تعلیمات کا آغاز اپنے ہی قبیلہ قریش اور ان کے اتحادیوں سے کیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے مرکز کے لاتعداد قبائل کو اسلام کی دعوت دی اور یوں آپ ﷺ ثابت قدمی، جرأت، دُور اندیشی، ذاتی خصائل اور خداوند تعالیٰ کی مدد کی بدولت رفتہ رفتہ وحشی عربوں کو سلامتی کے راستے پر چلانے میں کام یاب ہوگئے۔ آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر بے شمار کتابیں چھپ چکی ہیں۔ لیکن پھر بھی چند ایک پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔ کیوں کہ ان کی طرف عام ذہن متوجہ نہیں ہو پاتا۔ بحث وتحقیق کے انھی گوشوں میں سے ایک گوشہ آپ ﷺ کی سیاستِ خارجہ کا ہے۔

رسولِ اکرم ﷺ کی سیاستِ خارجہ جیو پالیٹکس کے اُصول کی مرہونِ منت نہیں تھی بلکہ عالم گیر نوعیت کی حامل تھی۔ آپ ﷺ تو تمام دنیا کے لیے سلامتی کا پیغام لے کر آئے تھے اور ہر کس وناکس چاہے دنیا کے کسی بھی دُور افتادہ کونے میں ہوتا، اسلام کے زرین اُصولوں کو اپنا سکتا تھا۔ اس مقصد کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں مختلف حکمرانوں، سرداروں اور قبائل کو خطوط بھیجے جو آپ ﷺ کی سیاستِ خارجہ کا ایک انتہائی اہم ستون ہیں۔ ان خطوط میں عیسائیت کی تردید کرنے اور بُرائیاں بیان کرنے کی بجائے مندرجہ ذیل آیات کا متن درج ہوتا تھا۔

1: ترجمہ: اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا رب نہ بنا لے۔

2: دین کے معاملے میں کوئی زور وزبردستی نہیں۔

3: تمہارے لیے تمھارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

اُمورِ خارجہ کو طے کرتے وقت رسالتِ مآب ﷺ نے کبھی کسی کے ساتھ جبر وزیادتی نہ فرمائی۔ معاملات کا فیصلہ صادر فرماتے ہوئے کبھی عقل وفکر کا دامن نہ چھوڑا۔ محکوم ریاستوں وقبائل کو کھلی اجازت دی کہ یا تو مسلمان ہو جائیں یا جزیہ ادا کریں اور اگر یہ دونوں شرائط منظور نہ ہوں تو پھر لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن نامسلموں نے جزیہ ادا کرنے کو ترجیح دی، ان کے جان ومال، عزت وآبرو کی مسلمانوں نے مکمل طور پر حفاظت کی۔ ان کے مذہبی رسم ورواج میں کبھی مداخلت نہ کی۔ ہاں البتہ اگر آپ ﷺ کے مشن کو یہودیوں یا عیسائیوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہوا تو آپ ﷺ نے ان کی سرکوبی سے کبھی گریز نہ کیا، لیکن اگر وہ آپ ﷺ کے مذہبی معاملات میں اختلاف کرتے تو آپ ﷺ ان سے کوئی تعرض نہ کرتے بلکہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیتے اور اپنی شریف النفسی، حلم ورواداری، عفو ودرگزر، ثابت قدمی، سچائی، وعدہ معافی وغیرہ کی بدولت ان کے دلوں پر گہرے نقوش ضرور ثبت کر دیتے۔

نتیجۃً وہی نا مسلم جو آپ ﷺ کے درپے آزار ہوتے آپ ﷺ کی محبت اور گرویدگی کا دم بھرنے لگتے۔

آپ ﷺ نے غیر مسلموں کی آزادی کو ہمیشہ تسلیم کیا۔ ان کے ساتھ جتنے بھی معاہدے کیے ان پر سختی سے کاربند رہے۔ ان تمام معاہدات میں سے معاہدہ حدیبیہ آپ ﷺ کی سیاستِ خارجہ کا شاہکار ہے۔ شروع شروع میں اس کی شقیں بظاہر مسلمانوں کے مفاد میں معلوم نہیں ہوتی تھیں، مگر حقیقتاً ان کے دُوررس نتائج سے سبھی بے خبر تھے۔ آپ ﷺ نے حال کے جذباتی فیصلوں کو مستقبل کی مستقل تعمیر پر قربان کر دیا۔ جس خوب صورتی اور بصیرت سے آپ ﷺ نے اس معاہدے کی رو سے قریش کو یہودیوں کے متعلق غیر جانب دار رہنے پر آمادہ کر لیا، سیاست کے میدان میں وہ آپ ﷺ کی بہترین کامیابی تھی۔ معاہدۂ حدیبیہ طے کرتے وقت اگر آپ ﷺ چاہتے تو بزورِ شمشیر نہایت آسانی سے مکہ پر قبضہ کر سکتے تھے مگر آپ ﷺ کی دُوراندیش اور دُوربین نگاہوں نے تابناک مستقبل دیکھتے ہوئے ایسا نہ کیا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ معاہدۂ حدیبیہ کی ایک شق تھی کہ اگر کوئی مکہ کا مکین مسلمان پناہ کے لیے مسلمانوں کے پاس چلا آئے تو اُسے اہلِ مکہ کے حوالے کر دیا جائے گا۔ معاہدہ طے پا جانے کے بعد حضرت ابوجندلؓ کسی نہ کسی طرح قریش کی قید سے رہائی حاصل کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو گئے اسی وقت سہیل بن عمرو بھی وہیں پہنچ گیا اور حضرت ابوجندلؓ کی واپسی کا تقاضا کیا۔ آپ ﷺ نے اپنے رفقاء صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ سب کی متفقہ رائے تھی کہ حضرت ابوجندلؓ کو قریش کے پاس واپس نہ بھیجا جائے۔ آپ ﷺ چوں کہ معاہدہ کر چکے تھے اس لیے اس کی پابندی کی خاطر حضرت ابوجندلؓ کو صبر کی تلقین کرتے ہوئے واپس کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابوبصیرؓ مدینہ منورہ پہنچے تو کفار نے ان کی واپسی کا بھی مطالبہ کر دیا اور آپ ﷺ نے معاہدے کے مطابق انھیں بھی واپس بھیج دیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ آپ ﷺ کے اس فیصلے نے جہاں اسلام کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ وہیں اس عظیم فیصلے اور معاہدے کی چہار دانگ عالم میں شہرت ہو گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رفقا کی تعداد بڑھتی رہی اور قریش تنہا رہ گئے۔ نتیجتاً جب مکہ فتح ہوا تو خون کی ایک بوند بھی نہ بہائی گئی۔ یہی نہیں بلکہ آپ ﷺ نے اپنے خونی دشمنوں پر کوئی تاوان عائد نہ کیا اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔

مسلمانوں کو ایک مضبوط محور عطا فرمانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے اپنے پڑوسی ممالک کو دعوت نامے بھیجے جس میں انھیں مسلمان ہونے کی تلقین فرمائی۔ اپنی حیاتِ طیبہ میں آپ ﷺ نے ڈھائی تین سو کے لگ بھگ خطوط بھیجے ہوں گے۔ ان خطوط کی ترتیب کچھ یوں ہوتی تھی۔

1: شروع میں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
2: بحیثیت مرسل رسول اللہ ﷺ کا اسمِ گرامی مع ضروری صفات اور کوئی ایسا لفظ جن سے من جانب کا مفہوم ادا ہوتا ہو۔
3: مکتوب الیہ کا نام مع لقب۔
4: امن و سلامتی ادا کرنے والا فقرہ۔
5: نامۂ مبارک کا مختصر مگر پُرزور اور شستہ مضمون۔
6: آخر میں مہرِ نبوت۔

ان خطوط سے گرد و نواح کے والیانِ ریاست پر یہ بات روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو گئی کہ اب عرب پہلے کی طرح مختلف گروہوں اور قبیلوں میں بٹے ہوئے نہیں بلکہ اب ان کا ایک مرکز قائم ہو چکا ہے جہاں باقاعدہ ایک نظام پنپ رہا ہے اور اس نظام کے تحت جس عظیم ہستی نے حکومت اسلامیہ قائم کی ہے اس کی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) شریف النفسی (2) عفو و درگزر (3) وعدہ کی پابندی (4) حلم و شفقت (5) سادگی (6) عبادت گزاری (7) ثابت قدمی (8) جُرأت (9) صُلح و آشتی۔

انھی خصوصیات نے آپ ﷺ کی سیاست خارجہ کو جلا بخشی اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ نامسلم جوق در جوق حلقہ بگوشِ اسلام ہونے لگے۔ جس نے راستے کی رکاوٹ بننے کی کوشش کی، حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا۔ نتیجۃً ہجرت مدینہ کے تقریباً دس سال بعد اسلام ایک طرف یمن، بحرین، یمامہ، عمان اور دوسری طرف عراق و شام کی حدود تک پھیل گیا۔ یہ مسلمانوں کے عروج کا آغاز رہا، جس کی بنیاد آنحضرت ﷺ کی ٹھوس اور عالم گیر سیاست خارجہ پر رکھی گئی اور اسی پر اسلام کی اس عالی شان عمارت کو ترتیب دیا گیا جس نے آنے والے وقتوں میں ایران، روم، قیصر و کسریٰ جیسی عظیم الشان سلطنتوں کو نیست و نابود کر دیا۔

(تحریر: کرنل اعجاز قدیر)

سفارتی وتجارتی معاہداتِ نبوی ﷺ

مدینہ میں پہلی اسلامی مملکت کے قیام کے بعد رسول کریم ﷺ نے قُرب وجوار کے غیر مسلم قبائل اور اہلِ مکہ کے ساتھ حالتِ امن اور حالتِ جنگ کے دوران تعلقات میں جن اُصولوں پر عمل شروع کیا' ان سے بین الاقوامی قانون کے بارے میں انسان کے اندازِ فکر کی واضح شکل سامنے آئی ہے اور بین الاقوامی قانون کا ایک ایسا معیار قائم ہوا جو قوموں کے درمیان معاملات کو ہر مرحلے پر انصاف اور حق پرستی کی بنیاد پر حل کر سکتا ہے۔ بین الاقوامی امن کے قیام کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ مملکتوں کی خود مختاری اور اقتدارِ اعلیٰ کے اُصولوں کو ایک مسلمہ حقیقت کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور کوئی مملکت بلا جواز کسی دوسری مملکت کے اندرُونی معاملات میں دخل انداز نہ ہو۔ اسلام مملکتوں کے بلا جواز ایک دوسرے کے معاملات میں دخل انداز ہونے اور جنگ کی سی حالت پیدا کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ بین الاقوامی اُمورِ امن اور آشتی سے طے کرنے کے حق میں ہے۔ اسلام میں جنگ کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب مخالف فریق پُر امن طریقے سے معاملات طے کرنے کیلیے تیار نہ ہو اور حق قائم کرنے کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہو یا ہوسِ ملک گیری کے تحت مختلف حیلوں بہانوں سے جنگ کے سے حالات پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسی صورت میں جنگ کے ذریعے اپنی آزادی کی حفاظت کرنا اور اپنی اقدار کو قائم رکھنے کے لیے مسلح جدوجہد کرنا مسلمانوں کے لیے فرض بن جاتا ہے اور جہاد کہلاتا ہے۔

مدینہ میں اسلامی مملکت کے قیام کے وقت سے رسولِ اکرم ﷺ نے قرب و جوار کے غیر مسلم قبائل اور قریش مکہ کے ساتھ تعلقات میں ہمیشہ پہلے یہ کوشش کی کہ گفت وشنید اور معاہدوں کے ذریعے اختلافات کو دُور کر کے بقائے باہمی کے اُصول پر امن سے زندگی بسر کی جائے اور جنگ کی راہ صرف اُس صورت میں اختیار کی جائے جب مخالف فریق کی طرف سے جنگ کا آغاز ہو یا اس نے ایسی صورت پیدا کر دی ہو کہ اسلامی مملکت اور مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے جنگ کے سوا کوئی صُورت باقی نہ رہے۔

مدینہ تشریف لانے کے بعد آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ قُرب و جوار میں جو یہود موجود تھے ان کے ساتھ عہد نامے کیے جن میں کئی شرائط تھیں۔ ان میں یہ شرط بھی تھی کہ دشمنوں کے مقابلے میں ایک فریق دوسرے فریق کی مدد کرے گا۔ کسی فریق کے دین اور جان و مال سے دوسرے فریق کو تعرض نہ ہوگا۔ جانبین میں اگر کوئی جھگڑا پیدا ہوگا تو اس کا فیصلہ آنحضرت ﷺ کریں گے اور یہود قریش کو یا ان کے حلیفوں کو پناہ نہ دیں گے۔

جنگ بدر میں مسلمانوں کی کامیابی کے بعد اسلام کا عروج دیکھ کر یہود کے دلوں میں حسد پیدا ہوا اور وہ اسلام کے سخت دشمن ہوگئے۔ انھوں نے قریش سے مخفی طور پر سازباز شروع کر دی اور مسلمانوں کو ایذا دینے اور رسولِ مقبول ﷺ کے ساتھ بدتہذیبی سے پیش آنے لگے۔ یہود کے قبیلوں میں سے بنی قینقاع نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ عہد توڑنے میں پہل کی اور کھلم کھلا مسلمانوں کے دشمن ہوگئے۔

ابتدا اس واقعہ سے ہوئی کہ بنی قینقاع کے بازار میں ایک یہودی نے ایک مسلمان عورت پر بے جاسختی کی' وہ عورت امداد کے لیے چلائی۔ کسی مسلمان نے پہنچ کر اس ظالم یہودی کو قتل کر دیا۔ یہودیوں نے مل کر مسلمان کو مار ڈالا۔ آنحضرت ﷺ اس کی اطلاع پا کر وہاں تشریف لے گئے اور یہودیوں کو سمجھانے لگے کہ اگر تم ایسا کرو گے تو اہلِ بدر کی طرح تم پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔ انھوں نے جواب دیا کہ قریش کے اوپر آپ ﷺ نے جو فتح پائی تو اس کے گھمنڈ میں نہ رہیں' وہ جنگ و پیکار سے ناواقف تھے ہم سے سابقہ پڑے گا تو ہم بتلا دیں گے کہ لڑائی کس کو کہتے ہیں۔

اس معاملے نے طول کھینچا یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ نے ان پر فوج کشی کی۔ وہ قلعہ گیر ہو کر بیٹھ رہے۔ پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا۔ آخر مدینہ کے راس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی تجویز کے مطابق، جو درپردہ یہود کا ہمراز تھا، یہ طے ہوا کہ بنی قینقاع یہاں سے جلاوطن کر دیئے جائیں چنانچہ انھیں مدینہ سے نکال دیا گیا اور وہ شام کی طرف چلے گئے۔

جنگ اور صلح

اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کا معاہدہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو بین الاقوامی قانون میں اخلاق اور اُصول پرستی اور پُر امن طریقے سے بین الاقوامی جھگڑوں کو طے کرنے میں اسلامی مملکت کے مثالی کردار کا آئینہ دار ہے۔ ذیقعدہ 6ھ میں آنحضرت ﷺ تقریباً ڈیڑھ ہزار ساتھیوں کی معیت میں عمرہ کی غرض سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس خیال سے کہ کفار کو جنگ کا گمان نہ گزرے آپ ﷺ احرام باندھ کر اور قربانی کے اُونٹ ساتھ لے کر چلے قریش کو آپ ﷺ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے مدافعت کی تیاری شروع کی۔ آنحضرت ﷺ نے مکہ کے قریب پہنچ کر مقامِ حدیبیہ میں قیام کیا اور قریش کو پیغام بھیجا کہ آپ ﷺ کا مقصد صلح اور امن کے ساتھ صرف طوافِ کعبہ کرنا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ

اپنے ہم راہیوں کے ساتھ مدینہ لوٹ جائیں گے۔ قریش نے سہیل بن عمرو کو حضور پاک ﷺ کے پاس یہ کہ کر بھیجا کہ صلح صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ آپ ﷺ اس سال مع اپنے ساتھیوں کے واپس چلے جائیں اور آیندہ سال آ کر عمرہ کریں۔ گفتگو کے نتیجے میں قریش کے ساتھ مندرجہ ذیل شرائط پر صلح طے پائی۔

1: مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، آیندہ سال آئیں۔ سوائے تلوار کے کہ وہ بھی میان میں ہوگی اور کوئی ہتھیار لگا کر مکہ میں داخل نہ ہوں۔ انھیں تین دن تک حرم میں ٹھہرنے کی اجازت ہوگی۔ ان دنوں میں قریش باہر نکل جائیں گے۔

2: قبائلِ عرب میں سے مسلمان جس قبیلے سے چاہیں معاہدہ کریں اور قریش جسے چاہیں اپنا حلیف بنائیں اس معاملہ میں دونوں فریق آزاد ہیں۔

3: اگر قریش میں سے کوئی شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مسلمانوں کے پاس چلا جائے گا تو اسے واپس کر دیا جائے گا لیکن اگر کوئی مسلمان قریش کے پاس جائے گا تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

4: فریقین میں دس سال تک لڑائی نہ ہوگی اور باہم امن و امان کے ساتھ رہیں گے۔

اس معاہدے کی تیسری شرط بظاہر مسلمانوں کے لیے بہت سخت تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس وقت عہد نامہ لکھا گیا' اسی وقت خود سہیل کے بیٹے ابوجندل جو مسلمان ہو گئے تھے مکہ سے کسی صورت بھاگ کر آ نحضرت ﷺ کی خدمت میں آ گئے۔ کافروں نے انھیں سخت سزائیں دی تھیں اور ان کے جسم پر جا بجا زخم تھے۔ انھوں نے فریاد کی اور آنحضرت ﷺ نے ان کے باپ کو بہت سمجھایا کہ انھیں مسلمانوں کے ساتھ مدینہ جانے کی اجازت دے دو' لیکن وہ راضی نہ ہوئے۔ آخر عہد نامے کی شرط کے مطابق انھیں واپس بھیج دیا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے اس شرط پر اس وقت تک عمل کیا جب تک خود قریش نے یہ نہ کہ دیا کہ وہ اس شرط کو قائم نہیں رکھنا چاہتے۔

عرب کے دو قبیلوں خزاعہ اور بنی بکر کے درمیان مدت سے عداوت چلی آ رہی تھی۔ صلح حدیبیہ کے بعد خزاعہ مسلمانوں کے حلیف ہو گئے اور بنی بکر نے قریش کے ساتھ دوستی اور اتحاد کا رشتہ اُستوار کر لیا۔ بنی بکر نے قریش کے ساتھ معاہدہ کے گھمنڈ میں خزاعہ سے لڑنے کی تیاری کی اور اپنے پرانے مقتولوں کا بدلہ لینا چاہا۔ قریش نے انھیں ہتھیار فراہم کیے اور ان کے بعض سردار لڑائی میں بنی بکر کے ساتھ شامل ہوئے۔ خزاعہ نے شکست کھا کر حدودِ حرم میں پناہ لی۔ بنی بکر نے یہ جان کر کہ ایسا موقع پھر نہیں ملے گا پناہ گزینوں کو حرم میں ہی موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ حالانکہ وہاں خوں ریزی حرام تھی۔

آنحضرت ﷺ کو اس صورتِ حال کی اطلاع ملنے پر سخت رنج ہوا۔ آپ ﷺ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا اور تین شرطیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کر لی جائے۔

1: مقتولوں کا خوں بہا دیا جائے۔

2: قریش بنی بکر کی حمایت چھوڑ دیں۔

3: اعلان کر دیا جائے کہ معاہدۂ حدیبیہ ٹوٹ گیا ہے۔

قریش نے جوش میں آ کر تیسری شرط منظور کر لی۔ چنانچہ رمضان 8 ہجری میں رسول اللہ ﷺ دس ہزار ساتھیوں کے ہم راہ مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور بغیر کسی مزاحمت کے شہر پر قابض ہو گئے۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس وقت تک معاہدۂ حدیبیہ کی پابندی کی جب تک قریش نے اسے خود نہ توڑ دیا۔

سفارت کاری

بین الاقوامی تعلقات میں سفیروں کا تبادلہ روابط قائم کرنے کا ایک مسلّمہ اُصول ہے۔ اسلامی قانون میں سفیروں کے لیے ان تمام ضروری تحفظات اور مراعات کی گنجائش موجود ہے جو انھیں اپنے فرائض کو احسن طریق پر ادا کرنے کے لیے حاصل ہونی چاہئیں۔ سفیروں کو اسلامی مملکت میں جان و مال کی پوری حفاظت حاصل ہوتی ہے، نہ انھیں موت کے گھاٹ اُتارنے کی اجازت ہے، نہ ان کے ساتھ بدسلوکی اور بے عزتی کا معاملہ روا رکھا جا سکتا ہے۔ کوئی سفیر جس مملکت میں بھیجا جائے بے شک وہ اس کا مجرم ہی کیوں نہ ہو اس کے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ وہی برتاؤ ہونا چاہیے جو سفیروں کا حق ہے۔ مسیلمہ کذاب کی طرف سے آئے ہوئے سفیروں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کا برتاؤ سفارتی عملہ کی مراعات کے بارے میں سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ جنھیں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر تمھیں سفیروں کی حیثیت حاصل نہ ہوتی' تو تمھارے سر قلم کر دیئے جاتے۔

سفارت کاروں کو اپنے مذہبی فرائض ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ نجران کے عیسائی وفد کو رسول اللہ ﷺ نے خود مسجدِ نبوی ﷺ میں عبادت کی اجازت دی۔

اسلام سفارت کاروں کو صرف غیر معمولی حالات میں قید کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ حضور نبی پاک ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر قریش کی طرف سے آئے ہوئے نمایندوں کو صرف اس وقت تک روکے رکھا جب تک مسلمانوں کے سفیر حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کو قریش مکہ نے واپس نہ آنے دیا۔

باہمی مراعات کے اُصول کے تحت اسلامی قانون کے تحت سفارت کاروں کو درآمدی محصول کی ادائیگی سے مبرا قرار دیا جا سکتا ہے۔ الشیبانی کہتا ہے کہ اگر غیر ممالک مسلم سفارت کاروں سے درآمدی محصول اور دوسرے ٹیکس وصول نہ کرنے کے اُصول پر عمل کریں تو مسلمانوں کی طرف سے غیر ملکی سفارت کاروں کو بھی یہ رعایت دی جانی چاہیے۔ ورنہ ان سے اسی طرح محصولات وصول کیے جائیں جس طرح غیر ملکی شہریوں سے وصول کیے جاتے ہیں۔

بین الاقوامی جھگڑوں کو بات چیت یا اس قسم کے دوسرے پُر امن طریقوں سے نپٹانے کے جو اُصول ان دنوں اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت اختیار کیے جاتے ہیں، وہ

کم وبیش سب کے سب اسلام کے بین المملکتی قانون میں ملتے ہیں اور ان پر ابتدائے اسلام سے تاریخ کے مختلف ادوار میں عمل ہوتا رہا ہے۔

جنگی قیدی

بین المملکتی قانون کا ایک اہم پہلو جنگی قیدیوں سے متعلق ہے۔ آج ہم جنگی قیدیوں کے برتاؤ کے سلسلے میں جنیوا کنونشنوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں، لیکن جنگی قیدیوں کے بارے میں اسلام نے شروع سے جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی مثال آج کسی سیکولر مملکت میں بھی نہیں ملتی۔ اسلامی قانون میں جنگی قیدیوں کی دو قسمیں زیر بحث آئی ہیں۔ ایک مسلم مملکت کے باشندے جو متحارب یا مخالف مملکت میں جنگی قیدی بن گئے ہیں اور ایک متحارب فریق سے تعلق رکھنے والے وہ قیدی جو مسلمانوں کے قبضے میں ہیں۔ مسلم قیدیوں کے بارے میں مملکت کا فرض ہے کہ وہ ان کی رہائی کے لیے معاہدہ کے قانون کے مطابق پوری کوشش کرے اور بیت المال سے رقوم ادا کر کے انھیں رہا کرائے۔ اگر انھیں رہائی کے مسلمہ اُصولوں کے مطابق کوئی مملکت رہا نہ کرے اور ان کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کرے تو انھیں بشرطِ اہلیت وہاں سے فرار ہونے اور دشمنوں کو نقصان پہنچانے کا اختیار ہے۔

غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ مسلمانوں کا برتاؤ ابتدا سے منصفانہ رہا ہے۔ اسلامی قانون جنگی قیدیوں کے قتل کی اجازت نہیں دیتا، نہ ان پر ظلم وستم کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ جن جنگی قیدیوں نے جنگ کے مسلمہ اُصولوں سے تجاوز کر کے جرائم کیے ہوں ان پر مقدمہ چلا کر انھیں سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

مسلم فقہا کا اس بات پر عام اتفاق ہے کہ جنگ کے دوران میں مسلمانوں کے جان ومال کو مخالفین کے مجموعی عمل سے جو نقصان پہنچا ہو اس کے لیے جنگی قیدیوں کو نہ ذمہ دار ٹھہرایا جائے اور نہ ان سے اس کا بدلہ لیا جائے۔ مسلم قانون اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ جنگ کے دوران انھوں نے جو کچھ کیا وہ اپنی فکری سوچ اور مجموعی عمل کے نتیجے میں کیا اور جب وہ جنگی قیدی بن کر مسلمانوں کے قبضے میں آگئے تو صورتِ حال بدل گئی اور انھیں جنگ میں حصہ لینے کی سزا دینے کا جواز باقی نہ رہا۔

جنگ بدر کے ساتھیوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے جو برتاؤ کیا وہ مسلمانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ہر لڑائی میں یہ دستور تھا کہ دونوں فریقوں کی جس قدر لاشیں ملتیں انھیں دفن کرا دیتے۔ یہاں بھی مسلمان شہیدوں کو دفن کرایا۔ مشرکین کے کشتوں کی تعداد چوں کہ زیادہ تھی اس لیے ایک بڑا گڑھا کھدوا کر سب کو اس میں ڈلوا دیا۔ پھر مع مالِ غنیمت اور اسیرانِ جنگ مدینہ واپس آگئے۔

اسیرانِ جنگ کے پاس کوئی کپڑے نہ تھے مدینہ پہنچ کر ان کے لیے کپڑے فراہم کیے اور انھیں متفرق طور پر صحابہؓ کے سپرد کیا اور حکم دیا کہ جب تک ان کے بارے میں تصفیہ نہ ہو جائے انھیں اپنے پاس آرام کے ساتھ رکھیں۔ بعض مفلس صحابہ آپ ﷺ کے فرمان کی وجہ سے قیدیوں کو اپنا کھانا کھلا دیتے تھے اور خود فاقہ کر لیتے تھے۔

مشرکین کے علم بردار ابوعزیز کا بیان ہے کہ میں جس انصاری کے حوالے کیا گیا تھا وہ روٹی تو مجھے کھلا دیتے اور خود کھجوریں کھا کر بسر کر لیتے۔ میں شرما کر روٹی ان کے سامنے رکھ دیتا مگر وہ باصرار مجھے کھلاتے۔

نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے اسیران جنگ کے متعلق مشورہ لیا تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انھیں قتل کرنے کی رائے دی۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دیگر صحابہ کرامؓ نے قتل کی تجویز کو پسند نہ کیا اور یہ رائے دی کہ انھیں فدیہ کے بدلے چھوڑ دینا مناسب ہے۔

رحمتِ عالم نورِ مجسم ﷺ نے اسی کو ترجیح دی۔

ہر اسیر کا چار ہزار درہم فدیہ مقرر ہوا۔ اہلِ مکہ جب مطلع ہوئے تو انھوں نے اپنے اپنے عزیزوں کا زرِ فدیہ بھیج دیا۔ وہ چھوڑ دیئے گئے۔ ان میں سے جو لکھنا جانتے تھے ان سے کہا گیا کہ مدینہ کے دس دس بچوں کو کتابت سکھا دیں اور آزاد ہو جائیں۔ باقی بلا فدیہ رہا کر دیئے گئے۔

راہ نُما اُصول

بین المملکتی تعلقات کے بارے میں اسلام کے اُصول انصاف اور اخلاق پرستی پر مبنی ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ مختلف اقوام کے درمیان تعلقات میں بنیادی انسانی حقوق کو پامال نہ ہونے دیا جائے اور ظلم کی ایسی تمام راہوں کا انسداد ہو سکے جو اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ اور انسانیت کے لیے تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ یہ اُصول بلاشبہ آج بھی اپنی برتری منوا سکتے ہیں اور مختلف قوموں اور مملکتوں کے درمیان بہتر تعلقات کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

(تحریر: ڈاکٹر مُنیر الدین چغتائی)

میثاقِ مدینہ

جن دنوں آنحضور ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں رونق افروز ہوئے، اُن دنوں اہلِ یہود کے تین قبیلے یعنی بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ اطراف مدینہ میں آباد تھے اور انھوں نے مضبوط قلعے اور بُرج بنا لیے تھے۔ انصار کے مشہور دو قبائل اوس اور خزرج میں جو آخری معرکہ (جنگ بعاث) ہوا تھا، اُس نے انصار کا زور توڑ دیا تھا اور یہود ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ انصار کے ان دونوں قبائل میں اتحاد نہ ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر اہل یہود ریشہ دوانیاں کرتے رہتے۔ آنحضور ﷺ جب مدینہ میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے پہلا کام یہ کیا کہ مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات واضح طور پر قواعد و ضوابط کے تحت کر دیئے۔ یہ معاہدہ ''میثاقِ مدینہ'' کے نام سے مشہور ہے یہ دنیا کا سب سے اولین با قاعدہ تحریری وفاقی دستور تھا۔ معاہدے کا ترجمہ یہ ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

1: یہ کتاب (دستور) اللہ کے نبی محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہے قریش کے مومن مسلمانوں یثرب کے مومن مسلمانوں اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی تھی اور ان کے ساتھ شامل ہو کر لڑائی کی تھی ان کے باہمی تعلقات اس دستور العمل کے مطابق ہوں گے۔

2: یہ سب (جن کے بارے میں یہ کتاب ہے) ایک سیاسی وحدت ہیں اور باقی سب لوگ ان سے الگ ہیں۔

3: مہاجرین (جو قریش سے تعلق رکھتے ہیں) اپنے رواج کے مطابق دیت دیں گے اور اپنے قیدی فدیہ دے کر چھڑائیں گے اور ایسا کرتے وقت مسلمانوں کے باہمی عدل اور حُسن سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

4: بنی عوف اسی رواج کے مطابق خوں بہا ادا کریں گے جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے عمل کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر گروہ مروجہ طریقے سے فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے گا اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی عدل اور حُسن سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

5: بنو ساعدہ اسی رواج کے مطابق خوں بہا ادا کریں گے جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے عمل کرتے تھے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدی مروجہ طریقے سے فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی انصاف اور حُسن سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

6: بنو حارث بن خزرج اسی رواج کے مطابق خوں بہا ادا کریں گے جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے عمل کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدی مروجہ طریقے سے فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی انصاف اور حُسنِ سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

7: بنو جشم اپنے اسی رواج کے مطابق خوں بہا ادا کریں گے جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے عمل کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدی مروجہ طریقے سے فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی انصاف اور حُسنِ سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

8: بنو نجار اپنے اسی رواج کے مطابق خوں بہا ادا کریں گے جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے عمل کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدی مروجہ طریقے سے فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی انصاف اور حُسنِ سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

9: بنو عمرو بن عوف اسی رواج کے مطابق خوں بہا ادا کریں گے جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے عمل کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدی مروجہ طریقے سے فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی انصاف اور حُسنِ سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

10: بنو النبیت اسی رواج کے مطابق خوں بہا ادا کریں گے جس پر وہ اسلام قبول کرنے سے پہلے عمل کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدی مروجہ طریقے سے فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی انصاف اور حُسنِ سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

11: اور بنو الاوس اسی رواج کے مطابق خوں بہا ادا کریں گے جس پر وہ اسلام لانے سے پہلے عمل کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر گروہ اپنے قیدی مروجہ طریقے سے فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایسا کرتے وقت وہ مسلمانوں کے باہمی انصاف اور حُسنِ سلوک کے اُصولوں پر عمل کریں گے۔

12: الف:- اہل ایمان اپنے میں سے کسی زیر بار قرض دار کو (خوں بہا فدیہ دینے کے معاملے میں) بے مدد گار نہیں چھوڑیں گے بلکہ قاعدہ کے مطابق خوں بہا فدیہ (جو بھی اس کے ذمہ ہو) ادا کرنے میں اس کی مدد کریں گے۔

ب:- کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے مولیٰ کو اس کے آقا کی اجازت کے

بغیر اپنے حلیف کے طور پر قبول نہیں کرے گا۔

13: تمام متقی اہل ایمان متحد ہو کر اس شخص کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے جو سرکشی اختیار کرے، ظلم، گناہ اور تعدی کے طریقے اپنائے یا ایمان والوں میں فساد پھیلائے ایسا کرنے والے شخص کی مخالفت میں ایمان والوں کے ہاتھ ایک ساتھ اُٹھیں گے خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

14: کوئی مومن، کسی دوسرے مومن کو کافر کے بدلے قتل نہیں کرے گا اور نہ ہی مومن کے خلاف وہ کسی کافر کی مدد کرے گا۔

15: اللہ کا ذمہ (اللہ کے لیے کسی کو تحفظ دینا) غیر منقسم ہوگا مسلمانوں میں سے کوئی ادنیٰ فرد بھی ان سب کی طرف سے کسی کو پناہ دے سکے گا مومن باقی سب لوگوں کے مقابلہ میں ایک دوسرے کے بھائی اور محافظ ہیں۔

16: یہودیوں میں سے جو کوئی ہماری اتباع کرے گا اسے امداد اور مساوات حاصل ہوگی اس پر نہ تو ظلم کیا جائے گا اور نہ ہی اس کے دشمن کی مدد کی جائے گی۔

17: مومنوں کی صلح غیر منقسم (ایک) ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی کے وقت کوئی مومن دوسرے مومن کو چھوڑ کر (دشمن کے ساتھ) الگ سے صلح نہیں کرے گا جب تک یہ صلح سب کے لیے یکساں اور عدل کے اُصولوں پر نہ ہو۔

18: وہ تمام گروہ جو لڑائی میں ہمارے ساتھ شریک ہوں گے وہ باری باری ایک دوسرے کی جگہ لیں گے۔

19: مومن اللہ کی راہ میں اُٹھائے نقصان کا (کفار سے) انتقام لینے میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

20: بلاشبہ متقی مومن (مدینہ کے مسلمان) سب سے اچھے اور سب سے سیدھے راستے پر قائم ہیں۔

21: مدینہ کا کوئی مشرک قریش (مکہ) کے کسی شخص کو جان اور مال کی کسی طرح کی پناہ نہیں دے گا، اور نہ ہی مسلمان کے مقابلے میں اس کی (کسی قریشی کی) مدد کرے گا۔

22: جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے گا اگر اس کا ثبوت پیش ہو جائے تو اسے مقتول کے عوض (بطور قصاص) قتل کیا جائے گا الا یہ کہ مقتول کا ولی خوں بہا لینے پر راضی ہو جائے اور تمام اہل ایمان اس کی تعمیل کے لیے متحد ہو کر اُٹھیں گے اور اس کے سوا ان کے لیے کوئی اور چیز جائز نہیں ہوگی۔

23: کسی ایمان والے کے لیے جو اس دستور العمل کے مندرجات کی تعمیل کا اقرار کر چکا ہے اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہے ہرگز جائز نہ ہوگا کہ وہ کوئی نئی بات نکال کر فتنہ انگیزی کے ذمہ دار کی حمایت کرے یا اسے پناہ دے۔ جو کوئی ایسے کسی (مجرم) کی حمایت اور مدد کرے گا یا اسے پناہ دے گا تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی لعنت اور اس کا غضب اس پر نازل ہوں گے اور اس سے کوئی فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کا کوئی اجر قبول ہوگا۔

24: جب تم میں کسی معاملے کے بارے میں اختلاف رائے ہو جائے تو وہ معاملہ فیصلے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے پاس لے جایا جائے گا۔

25: جب تک یہودی مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑائی میں شامل ہوتے رہیں گے وہ مصارف جنگ میں حصہ ڈالتے رہیں گے۔

26: بنی عوف کے (حلیف) یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک پارٹی ہیں یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین ہے خواہ موالی ہوں یا اصل البتہ جو کوئی ظلم یا عہد شکنی کرے گا (اسے وہ حقوق حاصل نہیں ہوں گے) اور ایسا کرنے والا اپنی ذات اور اپنے گھرانے کے سوا کسی اور کو ہلاکت و فساد میں نہیں ڈالے گا۔

27: اور بنی نجار کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

28: بنی الحارث کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

29: بنی ساعدہ کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

30: بنی جشم کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

31: بنی اوس کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں۔

32: بنی ثعلبہ کے (حلیف) یہودیوں کے بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کے ہیں البتہ جو کوئی ظلم کرے گا یا عہد شکنی کرے گا (اسے وہ حقوق حاصل نہیں رہیں گے) لیکن ایسا کرنے والا اپنی ذات اور اپنے گھرانے کے علاوہ کسی اور کو ہلاکت اور فساد میں نہیں ڈالے گا۔

33: جفنہ کو بھی جو (قبیلہ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے وہی حقوق حاصل ہیں جو ان کی اصل کو حاصل ہیں۔

34: بنی شطیبہ کو بھی وہی حقوق ہیں جو بنی عوف کے (حلیف) یہودیوں کو حاصل ہیں اور ہر ایک پر اس (دستور العمل) کی خلوص دل سے وفا شعاری لازم ہے جو عہد شکنی سے روکتی ہے۔

35: اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کے ہیں۔

36: یہودی (قبائل) کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو (ان کی) اصل کے ہیں۔

37: الف:- اور ان میں سے کوئی بھی (محمد ﷺ) کی اجازت کے بغیر (فوجی کارروائی) کے لیے نہیں نکلے گا۔

ب:- اور کسی ضرب یا زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔

ج:۔ اور جو کوئی ناحق قتل اور خوں ریزی کرے گا تو اس کی ذمہ داری اس کی ذات اور اس کے گھرانے پر ہوگی بجز ایسے شخص کے جس پر ظلم کیا گیا ہو اور اللہ اس کے ساتھ ہے جو اس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعاری سے تعمیل کرے۔

38: اور جو کوئی اس صحیفہ (دستور العمل) والے لوگوں کے خلاف جنگ کرے گا (مسلمان اور یہودی) مل کر اس کے خلاف لڑیں گے (ایک دوسرے کی مدد کریں گے) ان کا عمل ایک دوسرے کی خیر خواہی کا ہوگا وہ خلوص کے ساتھ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں گے اور ان کا طریقہ وفاداری کا ہوگا عہد شکنی کا نہیں اور یہودیوں پر ان کی جنگ کے خرچ کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر ان کی جنگ کے اپنے خرچ کا بار ہوگا۔

39: کوئی شخص اپنے حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہیں ہوگا اور مظلوم کی بہر حال مدد کی جائے گی۔

40: اور یہودی جنگ کا بار اس وقت تک برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ (مسلمانوں کے ساتھ) مل کر جنگ میں شریک رہیں گے۔

41: یثرب کا جوف (مدینہ منورہ کا میدانی اور پہاڑی علاقہ) اس دستور العمل والوں کے لیے حرم (مقدس اور محترم) ہوگا۔

42: پناہ حاصل کرنے والے سے ویسا ہی برتاؤ کیا جائے گا جو پناہ دینے والے کے ساتھ کیا جائے نہ اسے (پناہ حاصل کرنے والے کو) ضرر پہنچایا جائے اور نہ ہی وہ کسی جرم کا ارتکاب کرے گا۔

43: کسی پناہ گاہ میں وہاں کے لوگوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

44: اس دستور العمل کے ماننے والوں میں اگر کوئی (آپس میں) ایسا تنازع یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس سے نقصان اور فساد کا اندیشہ ہو تو اس متنازعہ امر میں فیصلے کے لیے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اللہ کی (تائید) اس شخص کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی زیادہ احتیاط اور وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے گا۔

45: قریش مکہ اور ان کے حامیوں کو کوئی پناہ نہیں دی جائے گی۔

46: اگر کوئی یثرب (مدینہ) پر حملہ کرے گا تو اس کے مقابلے میں یہ (سب اہل دستور العمل) ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

47: اگر انھیں (یہودیوں کو) کسی سے صلح کر لینے اور اس پر قائم رہنے کی (مسلمانوں کی طرف سے) دعوت دی جائے تو وہ اسے قبول کر لیں گے۔ اس طرح جب وہ (یہودی) کسی ایسی ہی صلح کے لیے دعوت دیں تو مومنین اسے قبول کر لیں گے الا یہ کہ کوئی دین کے لیے جنگ کرے۔

48: تمام فریق اپنی اپنی جانب کے علاقہ کے دفاع کے ذمہ دار ہوں گے۔

49: قبیلہ اوس کے (حلیف) یہودیوں کو خواہ وہ اصل ہوں یا موالی، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستور العمل کے ماننے والوں کو حاصل ہیں اور وہ بھی اس صحیفہ والوں کے ساتھ خالص وفا شعاری کا برتاؤ کریں گے اور اس دستور کی پابندی کریں گے اور عہد شکنی نہیں کریں گے۔

50: جو کوئی جیسا عمل کرے گا ویسا ہی بھرے گا زیادتی کرنے والا اپنے نفس پر زیادتی کرے گا اور اللہ اس کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی زیادہ سے زیادہ صدق دل سے وفاداری سے تعمیل کرے۔

51: یہ دستور (کتاب) کسی ظالم یا مجرم (کو اس کے کسی جرم کی سزا سے بچانے کے لیے) رکاوٹ نہیں بنے گا جو جنگ کے لیے نکلے وہ بھی اور جو گھر (شہر) میں بیٹھا رہے وہ بھی امن کا حق دار ہوگا (یعنی امن ناقابل تقسیم ہے) البتہ وہ لوگ امن کے حق دار نہیں ہوں گے جو ظلم اور جرم کریں گے۔

52: اللہ اس شخص کا مددگار ہے جو عہد و پیمان کی وفاداری اور تقویٰ سے تعمیل کرے اور محمد رسول اللہ ﷺ بھی اس کے حامی (خیر اندیش) ہیں۔

دستورِ مدینہ کی متعدد دفعات سے صاف ظاہر ہے کہ یہ اس ریاست کی حدود (جوف مدینہ) میں بسنے والے سب گروہوں اور اہل رائے کی مرضی اور منظوری سے تیار اور نافذ کیا گیا تھا۔ یثرب کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کا وہ اجلاس جس میں یہ دستور منظور اور نافذ کیا گیا حضرت انسؓ بن مالک کے والد کے گھر میں ہوا تھا اور رسول اللہ ﷺ کی تجویز پر یہ دستور العمل اجلاس میں تیار کیا گیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے بنو نجار کے محلے میں اُترنے کے بعد سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کا حکم دیا۔ مسجد کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ آپ ﷺ نے اسلامی ریاست اور معاشرے کے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھنے والا یہ دستور نافذ کر دیا اس دستور کی نوعیت اور اہمیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کا مجموعی اور اس کی مختلف دفعات کا الگ الگ تجزیہ ضروری ہے۔

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

گیارھویں کتاب:

وفودِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

وفودِ نبوی ﷺ

وفد کی تعریف

وافد کی جمع وفد ہے اور وفد کی جمع الجمع وفود ہے۔ وفد کے معنی ہیں آدمیوں کی ایسی جماعت جو مشترکہ مقصد کے لیے بھیجی جائے۔ امام نووی کے حوالے سے ''مواہب لدنیہ'' کے مصنف قسطلانی نے وفد کی تعریف یوں کی ہے۔

''وہ مختار جماعت جو عظما کی ملاقات کے واسطے آگے کی جائے۔'' دوسرے الفاظ میں وہ معزز افراد جو کسی مشترکہ غرض کو سربراہِ مملکت یا حاکم کے سامنے پیش کرنے کے لیے اکٹھے کسی شہر میں جائیں۔

عام طور پر وفد کے ارکان فصیح اور شائستہ لوگ ہوتے تھے۔ قبائل کے ذی اثر افراد اور سردار اس میں شامل ہوتے۔ یہ وفد ملک کے ہر حصے سے آتے اور مدینہ سے نورِ ایمان لے کر اپنے ٹھکانوں پر واپس جاتے۔ اثنائے سفر میں ہر پڑاؤ اور ہر منزل پر مختلف قبیلوں اور قوموں سے ملتے تو ان تک اسلام کا پیام ہادی برحق کا کلام پہنچاتے۔ یوں قدم قدم پر شمع حق کا اُجالا پھیلنے لگا اور چٹیل میدانوں میں ایمان کے چشمے اُبلنے لگے۔

عام الوفود

سنہ 8 ہجری کے اواخر سے 10 ہجری تک مدینہ میں وفود کی آمد کا سلسلہ جاری رہا۔ غزوۂ تبوک سے واپسی پر تو ان کا ایک تانتا تھا کہ بندھ گیا۔ ابن ہشام نے سنہ نو اور طبری نے سنہ 10 ہجری کو ''عام الوفود'' ''سنۃ الوفود'' کا نام دیا ہے۔ عربی میں عام کے معنی سال کے ہیں۔

ان وفود کی تعداد کے بارے میں سیرت نگاروں کا اختلاف ہے۔ ابن اسحاق کے پاس 15 وفود کا تذکرہ ہے۔ ''زاد المعاد'' میں حافظ ابن قیم اور ''مواہب لدنیہ'' میں قسطلانی نے 34 وفود کا حال لکھا ہے۔ ''طبقات'' میں ابن سعد نے 70 وفود کا حال بیان کیا ہے۔ دمیاطی' مغلطائی' ابن سید الناس اور حافظ زین الدین عراقی بھی اتنی ہی تعداد بتاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تعداد سیرت شامی میں 104 وفود کی ہے۔ شبلی نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' میں 17 یا 18' سلمان منصور پوری نے ''رحمۃ للعالمین'' میں 26 اور عبدالرؤف دانا پوری نے ''اصح السیر'' میں 29 یا 30 وفود کا مختصر حال لکھا ہے۔ خیال ہے کہ ان کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہوگی یا کوئی خاص بات نہ ہونے کی وجہ سے ان کا ذکر نہیں آیا۔ طالب ہاشمی نے ''وفود عرب بارگاہ نبوی'' میں 109 وفود کے حالات جمع کیے ہیں اکثر یوں ہوتا کہ مرکز اسلام سے داعی روانہ کیے جاتے وہ ان کے ٹھکانوں پر جاتے' انھیں دین کی تعلیم دیتے اس طرح بہت سے لوگ سفر کی صعوبت سے بچ جاتے اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت سے محروم رہتے۔

جب کوئی وفد مدینہ طیبہ میں آتا تو اسے کسی اچھی جگہ ٹھہرایا جاتا بعض کو مسجد نبوی میں اُتارا جاتا اور صحن میں ان کے لیے خیمے لگائے جاتے تاکہ وہ مسلمانوں کو عبادت کرتے ہوئے دیکھیں۔ قرآن مجید کی تلاوت سنیں۔ جس جگہ انھیں شرف ملاقات بخشا جاتا مسجد نبوی میں وہ مقام آج بھی ''اسطوانۃ الوفود'' کے نام سے موجود ہے۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ بہترین لباس زیب تن فرماتے۔ صحابہ کو بھی ایسا ہی حکم دیا جاتا۔ وفد کی ضیافت کی جاتی۔ وقت رخصت ان کی حیثیت کے مطابق انعام واکرام سے سرفراز فرمایا جاتا۔ تحفے تحائف دیئے جاتے۔ چند اہم وفود کا ذکر درج کیا جاتا ہے۔ جن سے اسلام یا سیرت طیبہ کے کسی نہ کسی گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ وفود کے سوال وجواب سے ان قبائل کی مخصوص فکر اور طرز معاشرت بھی اُجاگر ہوتی ہے۔

(1) وفد مزینہ

وفد کی آمد　سنہ 5 ہجری

تعداد　400

قبیلہ مضر کی شاخ مزینہ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آنے والا سب سے پہلا اور بڑی تعداد والا وفد تھا۔ یہ بہت بڑا قبیلہ تھا جو خاندانی شجرہ میں مضر تک پہنچ کر قریش سے مل جاتا تھا۔

کثیر بن عبداللہ مزنی کہتے ہیں کہ چار سو افراد پر مشتمل یہ وفد رجب 5 ہجری میں مدینہ حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ آنحضرت ﷺ نے انھیں مدینہ آنے کی بجائے اپنے ٹھکانوں پر رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ تم جہاں کہیں بھی رہو مہاجر ہو اور تمھیں ہجرت کا اجر وثواب ملتا رہے گا۔ اپنے علاقہ' مال اور مویشی کی حفاظت کرتے رہو۔ اس حکم کے بعد وہ لوٹنے کی تیاری کرنے لگے۔

حضرت نعمانؓ بن مقرن روایت کرتے ہیں کہ جب ہم نے واپسی کا ارادہ کیا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ انھیں زادِ راہ فراہم کرو۔ عرض کیا میرے پاس تھوڑی سی کھجوریں ہیں جو اس کثیر جماعت کی ضرورت کے لیے ناکافی ہیں۔ ارشاد ہوا۔ جاؤ اور انھیں زادِ راہ دے دو۔ حضرت عمرؓ انھیں لے کر اپنے گھر گئے۔ دیکھا کہ اُونٹ برابر اُونچا کھجوروں کا انبار ہے۔ ہر شخص نے حسب ضرورت کھجوریں اُٹھالیں۔ حضرت نعمانؓ کہتے ہیں میں سب کے آخر میں گیا اور دیکھا کہ کھجوروں کا ڈھیر جوں کا توں ہے۔ یہ واقعہ حضور ﷺ کے معجزوں میں شمار ہوتا ہے۔

حضرت نعمانؓ بن مقرن فتح مکہ کے موقع پر اپنے قبیلے کے علم بردار تھے۔ دورِ فاروقی کے بہترین جرنیلوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اصفہان جسے نصف جہاں کہا جاتا تھا انھی کے ہاتھوں فتح ہوا۔ حضرت نعمانؓ بن مقرن نے اپنے سات بھائیوں کے ساتھ مدینہ منورہ ہجرت کی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کہا کرتے تھے کہ کچھ گھرانے نفاق کے اور کچھ ایمان کے ہوتے ہیں۔ آل مقرن کا گھرانا ایمان کے گھرانوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عبداللہ ذی البجادین کا تعلق بھی اسی قبیلہ مزینہ سے تھا۔

(2) وفد بنی اسد بن خزیمہ

وفد کی آمد　9 ہجری کی ابتدا میں

تعداد　دس افراد

جب یہ وفد آیا تو رسول اللہ ﷺ مع صحابہؓ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ حضری بن عامر نے کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ کا کوئی نمائندہ ہماری طرف نہیں آیا۔ ہم اللہ کی وحدانیت اور آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں۔ ہم ازخود سخت خشک سالی کے موسم میں سفر کر کے حاضر ہوئے ہیں۔

اس پر سُورۂ حجرات کی آیت نمبر 17 نازل ہوئی۔

''یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہ دو کہ اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمھیں ایمان کا رستہ دکھایا بشرطیکہ تم سچے ہو۔''

ان میں سے کسی نے سوال کیا کہ جانوروں کی بولیوں اور دیگر شگونوں سے فال لینا کیسا ہے؟ جواب میں انھیں ان سب سے منع فرمایا۔ رمل (خط کشی) کے بارے میں استفسار پر فرمایا کہ اسے ایک نبی نے لوگوں کو سکھایا تھا اگر صحیح طریقہ سے مل گیا تو بے شک وہ علم ہے۔

اس وفد میں طلیحہ بن خویلد بھی شامل تھا جس نے عہد صدیقی میں نبوت کا دعویٰ کیا۔

(3) وفد بنی تمیم

ابن سعد نے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنوخزاعہ کی شاخ بنی کعب سے صدقات وصول کرنے کے لیے حضرت بشرؓ بن سفیان (نحام عدوی) کو بھیجا۔ زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت سے بنوخزاعہ نے اپنے مویشی جمع کیے۔ بنی تمیم کو یہ بُرا لگا اور انھوں نے مزاحمت کے لیے تلواریں بے نیام کر لیں۔

حضرت بشرؓ نے مدینہ آ کر تفصیل بتائی۔ حضور ﷺ کے حکم پر حضرت عیینہؓ بدر فزاری سرکوبی کے لیے پچاس سواروں کے ساتھ (جن میں کوئی بھی مہاجر یا انصار نہ تھا) گئے۔ مہم کی کام یابی پر گیارہ مرد' گیارہ عورتیں اور تیس بچے گرفتار ہوئے۔ انھیں لے کر وہ مدینہ آئے۔

اس واقعہ کے بعد بنی تمیم کا ایک وفد مدینہ آیا جو اسی (80) یا نوے (90) افراد پر مشتمل تھا۔ شرکا میں عطارد بن حاجب' زبرقان بن بدر' قیس بن عاصم' قیس بن حارث' نعیم بن سعد' اقرع بن حابس' رباح بن حارث اور عمرہ بن الاتہم بھی شامل تھے۔ عیینہ بن حصن فزاری جو مدینہ کی سرحد تک غارت ڈالتا تھا وہ بھی ساتھ آیا تھا۔ ان میں اقرع اور عیینہ دونوں فتح مکہ' غزوۂ حنین وطائف میں اسلامی لشکر میں موجود تھے اور حضور ﷺ کی عطا اور فیاضی سے نوازے جا چکے تھے۔

یہ لوگ ظہر کے وقت مسجد نبوی میں آئے۔ حضرت بلالؓ اذان کہہ چکے تھے۔ انھوں نے حجرہ نبوی پر عقب سے آواز دی۔ محمد ﷺ باہر آ ؤ۔ حضور ﷺ کو ان کا یہ طرزِ تخاطب ناگوار خاطر ہوا تو انھوں نے کہا کہ ہم مفاخرہ کرنے آئے ہیں۔ یہ عہدِ جاہلیت کا طریقہ تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر رسول اللہ ﷺ نے انھیں اجازت مرحمت فرمائی۔ ان کا خطیب عطارد بن حاجب (جس نے نوشیرواں کے دربار سے خوش بیانی پر خلعت فاخرہ حاصل کی تھی) یوں مخاطب ہوا۔

تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں فضیلت دی۔ جس نے ہمیں بادشاہ بنایا۔ مال و دولت دی۔ جس سے ہم بھلائی کے کام کرتے ہیں۔ ہمیں تمام اہلِ مشرق میں باعزت اور صاحبِ شوکت بنایا۔ عددی اکثریت دی۔ لوگوں میں ہم جیسا کون ہے؟ کیا ہم لوگوں کے سردار اور ان میں سب سے زیادہ فضیلت والے نہیں؟ پس ہم سے فخر میں جو مقابلہ کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ ہم جیسے مفاخر اور مناقب گنائے۔ ہم چاہتے تو مفاخر کے تذکرے کو طول دے سکتے تھے لیکن اللہ نے ہمیں جو کچھ دیا ہے اس کی فراوانی کے بیان پر شرم آتی ہے۔ اسی حیا سے ہم پہچانے جاتے ہیں۔ مَیں نے یہ اس لیے کہا کہ اگر کوئی اس کے مثل یا بہتر لا سکے تو لائے۔

اس زور دار تقریر کے بعد عطارد بن حاجب بیٹھ گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے بنو حارث بن خزرج کے حضرت ثابتؓ بن قیس بن شماس کو حکم دیا کہ اس تقریر کا جواب دو۔ خطیبِ نبوی نے کھڑے ہو کر کہا۔

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ ان میں اپنا حکم جاری فرمایا۔ اس کا علم تمام کائنات کو محیط کیے ہوئے ہے۔ کوئی چیز اس کے فضل کے بغیر نہیں ہوتی۔ اس نے اپنی قدرت سے ہمیں فرماں روا بنایا۔ اپنی بہترین مخلوق میں سے رسول کا انتخاب کیا جو نسب کے اعتبار سے سب سے زیادہ شریف، بات کے لحاظ سے سب سے زیادہ سچے اور اخلاق کی حیثیت میں سب سے زیادہ افضل ہیں۔ اس نے ان رسول اللہ ﷺ پر اپنی کتاب نازل فرمائی انھیں اپنی مخلوق پر امین بنایا۔ اس لیے وہ تمام عالم میں اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ انھوں نے تمام انسانوں کو اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ پر ان کی قوم اور ان کے اقرباء' مہاجرین ایمان لائے جو اخلاق میں سب سے زیادہ افضل ہیں۔ چہروں کے لحاظ سے تمام لوگوں میں اچھے ہیں عمل و کردار کے اعتبار سے تمام لوگوں میں اعلیٰ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق پر لبیک کہنے میں انھیں ساری مخلوق پر اولیت حاصل ہے۔ جس وقت رسول اللہ ﷺ نے مخلوق کو اللہ کی طرف دعوت دی تو ان کی آواز پر ہم نے بھی لبیک کہا۔ پس ہم اللہ کے انصار اور اس کے رسول کے وزیر ہیں۔ ہم لوگوں سے

اس وقت تک جہاد کرتے رہیں گے جب تک وہ اللہ پر ایمان نہ لے آئیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لے آتا ہے وہ اپنے جان و مال کو ہم سے محفوظ کر لیتا ہے اور جو کفر کرتا ہے ہم اس سے ہمیشہ جہاد کرتے ہیں۔ اس کا قتل ہمارے لیے حلال ہوتا ہے۔ یہ ہے جو مجھے کہنا تھا۔ اللہ سے اپنے لیے اور تمام مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے دُعائے مغفرت کرتا ہوں۔''

اس پُر اثر خطبہ نے حاضرین پر سکتہ کی سی کیفیت طاری کر دی۔ اہل وفد نے عرض کیا کہ اب ہمارے شاعر کو اپنا کمال آزمانے کا موقع دیجیے۔ اس موقع پر دربارِ نبوی کے شاعر حضرت حسانؓ بن ثابت موجود نہ تھے۔ ان کی طلبی میں قاصد روانہ ہوا۔ اجازت پر زبرقان بن بدر قصیدہ سنانے لگا۔ اس کے چند اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

1: ہم اشرف ہیں کوئی قبیلہ ہماری ہم سری نہیں کر سکتا۔ بادشاہ ہمارے اندر سے ہی ہوتے ہیں اور ہماری یہاں بیعت کی جاتی ہے۔

2: جنگ اور غارت گری کے وقت ہم نے تمام انسانوں کو مغلوب کر لیا ہے۔ ہم وہ ہیں جن کی فضیلت مآب عزت کا اتباع کیا جاتا ہے۔

3: ایسے قحط میں جب کہیں چولھا ہی نہیں جلتا' ہم اپنے سائل کی بھنے ہوئے گوشت سے ضیافت کرتے ہیں۔

4: ہم لوگوں کے مطالبات کا انکار کرتے ہیں' کسی کی مجال نہیں کہ ہماری بات کا انکار کرے۔ ہم اسی طرح اظہار فخر کے موقع پر بلند ہوتے ہیں۔

5: پس جو شخص اپنی فوقیت کا اظہار کر کے ہم سے اس معاملے میں فخر کر رہا ہے ہم اسے خوب جانتے ہیں کیوں کہ لوگ واپس جاتے ہیں اور خبریں سننے میں آجاتی ہیں۔

حضرت حسانؓ بن ثابت جب مسجد نبوی میں پہنچے تو بنی تمیم کا شاعر فخر و تعلّی کے دریا میں غوطے لگا رہا تھا۔ حضرت حسانؓ بن ثابت نے اسی کی زمین میں فی البدیہہ جواب دیا۔ ان کے اشعار کا ترجمہ:

1: فہر اور اس کے معاصر قبیلوں کے چوٹی کے سرداروں نے ہی شرف و کرم کی راہیں عربوں کے لیے بنائی ہیں۔ انھی راہوں کی عرب میں پیروی کی جاتی ہے۔

2: یہ پاک دامن لوگ ہیں ان کی عفت کا حال قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ گندگیوں سے آلودہ نہیں اور نہ انھیں لالچ ہلاک کر سکتا ہے۔

3: وہ قوم جس کی جماعت رسول اللہ ﷺ کی جماعت ہے اس وقت کتنی صاحب مجد و شرف معلوم ہوتی ہے جب جماعتوں اور ان کی خواہشوں اور خیالوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

4: رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو میری حمد و ثنا کا یہ تحفہ پیش کیا ہے۔ مدح کے اس ہدیہ میں میرے قلب کی وہ زبان پوری پوری موافق ہے جو اس دل کی بہترین اور فصیح ترجمانی کر رہی ہے۔

5: ہر حال میں رسول اللہ ﷺ کی قوم والے جملہ قبائل عرب سے افضل ہیں۔ چاہے حقائق کی بات چیت ہو یا خوش مذاقی کی۔

تلمیذ الرحمٰن حضرت حسانؓ نے اپنا قصیدہ ختم کیا تو اقرع بن حابس بول اُٹھا۔ مجھے قسم ہے اپنے باپ کی بے شک یہ شخص نبی برحق ہے۔ توفیق الٰہی ان کے ساتھ ہے۔ ان کا خطیب ہمارے خطیب سے زیادہ فصیح و بلیغ اور ان کا شاعر ہمارے شاعر سے زیادہ بلند فکر اور نکتہ رس ہے۔ ان کے الفاظ ہم سے زیادہ شیریں اور ان کا آہنگ ہم سے زیادہ اثر انگیز ہے۔

اس کے بعد سب کے سب ایمان لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انھیں اپنے پڑوس میں ٹھہرایا۔ حضرت بلالؓ نے ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی ہر فرد کو تحفہ میں دی۔ ان کے قیدیوں کو واپس کر دیا گیا۔ ان کے بارے میں سورۂ حجرات کی آیات نمبر 4 اور 5 نازل ہوئیں۔

''جو لوگ تمھیں حجروں کے باہر سے آواز دیتے ہیں ان میں سے اکثر بے عقل ہیں اور اگر وہ صبر کیے رہتے یہاں تک کہ تم خود نکل کر ان کے پاس آتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ جب ان کا وفد خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ اے بنو تمیم بشارت قبول کرو۔ انھوں نے جواب دیا: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے بشارت تو دے دی' کچھ عطا بھی فرمایئے۔'' یہ سن کر ایک ناگوار اثر چہرۂ مبارک پر ظاہر ہوا۔

(4) وفد بنی عبس

تعداد 9 افراد

سب کے سب اسلام لائے۔ حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کو ان سے عُشر وصول کرنے والا مقرر کیا گیا۔ وفد کے لوگوں کو آپ ﷺ نے ایک سَریہ کے مجاہدوں کے ساتھ بھی روانہ فرمایا۔ انھیں جھنڈا بھی عطا ہوا اور ''یا عشرۃ'' ان کا شعار مقرر کیا گیا۔

ان میں سے تین افراد دوبارہ حاضر ہوئے اور پوچھا آپ ﷺ کے قاری (معلم) نے خبر دی ہے کہ جو ہجرت نہ کرے اس کا اسلام مکمل نہیں ہوتا۔ زمین اور مواشی ہمارا ذریعہ معاش ہیں اگر ایسی بات ہو تو ہم انھیں بیچ کر ہجرت کریں۔ جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ جہاں کہیں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو وہ تمھارے اعمال کے اجر میں کمی نہیں فرمائے گا۔

(5) وفد بنی سلیم

بنو سلیم نجد میں آباد تھے۔ ان کا ایک فرد قیس بن نسیبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام لے آیا اُس نے چند اُمور دریافت کیے اور جتنا کلام اللہ سنا اسے حفظ کر لیا۔

اپنی قوم میں واپس ہوا تو لوگوں سے کہا میں نے اہل روم کی کتاب' فارس والوں کا کلام' شعرائے عرب کے قصائد' کاہنوں کی پیشین گوئیاں اور قبیلۂ حمیر کے خطیبوں کے خطبے سنے ہیں' لیکن ''کلام محمد (ﷺ) چیزے دیگر است'' میں ان پر ایمان لے آیا ہوں' تم بھی اپنا حصہ حاصل کرو۔

غادی نامی شخص بنی سلیم کے بت خانہ کا مجاور تھا اس نے ایک دن دیکھا کہ دو لومڑیاں بت پر پیشاب کر رہی ہیں بے اختیار ایک شعر موزوں ہو گیا "کیا وہ رب ہو سکتا ہے جس کے سر پر لومڑیاں موتتی ہوں؟ بے شک وہ بڑا ذلیل ہے۔" بت کو پاش پاش کیا اور خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوا۔

آپ ﷺ نے پوچھا! کون ہو؟ کیا نام ہے؟ عرض کیا: بنی سلیم کا مجاور۔ غادی بن عبدالعزیٰ۔

فرمایا۔ نہیں تم تو راشد بن عبدربہ ہو۔

(غادی کے معنی گم راہ اور راشد کے ہدایت یافتہ کے ہیں)

آپ ﷺ نے انھیں ایک رباط (مقام) عطا فرمایا جس میں ایک چشمہ تھا اس کا نام عین الرسول تھا۔

اسی قبیلہ کے ایک معزز شخص قدر بن عمار نے بھی مدینہ حاضر ہو کر اسلام پر بیعت کی۔ عہد کیا کہ اپنی قوم کے ایک ہزار شاہ سواروں کو لاؤں گا بیعت کے موقع پر شعر کہا۔ ترجمہ ہے۔

"میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے داہنے ہاتھ کو ایک بہترین ہاتھ سے وابستہ کیا۔"

قوم کو واپس آ کر اسلام کی دعوت دی سو آدمی قبیلہ میں چھوڑ کر نو سو شاہ سواروں کے ساتھ مدینہ چلے راستے میں پیام اجل آ گیا وقت آخر تین ساتھیوں کو مدینہ جانے کی وصیت کی اور تین سو شاہ سواروں پر امیر بنایا۔

فتح مکہ کے موقع پر پورے ایک ہزار شاہ سوار مقام قدید پر آ کر لشکر اسلام میں شامل ہوئے۔

عرض کیا۔ ہمیں مقدمہ الجیش میں رکھیے اور ہمیں سرخ جھنڈا عطا فرمائیے۔

آپ ﷺ نے ان کی بات منظور فرمالی۔ حضرت راشد بن عبد ربہ کو علم بردار اور حضرت عباس مرداسے امیر لشکر مقرر فرمایا "مقدم" ان کا شعار مقرر ہوا۔ یہ لوگ طائف اور حنین کے غزوات میں بھی اسلامی لشکر کے ساتھ رہے۔

(6) وفد صدا

حنین سے واپسی اور قیام جعرانہ (سنہ 8 ہجری) میں رسول اللہ ﷺ نے حسب ذیل سرایا روانہ فرمائے۔

1: صنعا کی طرف حضرت مہاجرؓ بن امیہ کو۔

2: حضرموت کی جانب حضرت زیادؓ بن بید کو۔

3: قناۃ کی طرف حضرت قیسؓ بن سعد بن عبادہ کو۔

حضرت قیسؓ کے ہم راہ چار سو سواروں کو روانہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ یمن کے علاقہ صدا پر ضرور جائیں۔ انھیں ایک سفید جھنڈا بھی عطا ہوا۔

زیادہ بن حارث صدائی کو جب اس کا علم ہوا تو خدمتِ اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ "یارسول اللہ ﷺ! میں اپنی قوم کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ آپ ﷺ اپنے لشکر کو بلالیں۔" آپ ﷺ نے حضرت قیسؓ بن سعد کو واپس بلالیا۔

چند دن بعد بنی صدا کے پندرہ افراد کا وفد مدینہ آیا تو حضرت سعدؓ بن عبادہ نے انھیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ ان کی خوب مہمانی کی سب نے اسلام قبول کیا اور اپنی قوم میں اسلام کی اشاعت کا وعدہ بھی کیا۔

آپ ﷺ نے حضرت زیادؓ سے فرمایا۔ تیری قوم تیری بہت اطاعت گزار ہے۔ عرض کیا۔ یہ سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کرم ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر ان کے ایک سو افراد نے رسول اللہ ﷺ سے شرفِ ملاقات حاصل کیا۔

حضرت زیادؓ بن حارث ایک سفر میں حضور ﷺ کے ہم رکاب تھے کہ نماز کا وقت آ گیا۔ آپ ﷺ نے انھیں اذان دینے کا حکم دیا۔ انھوں نے اُونٹ پر بیٹھے بیٹھے ہی اذان دی۔ اگلی منزل پر سب نماز کے لیے اترے۔ حضرت بلالؓ نے اقامت پڑھنی چاہی تو حکم ہوا جس نے اذان دی ہو وہی اقامت بھی کہے۔

حضرت زیادؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ ﷺ! ہمارا ایک کنواں ہے جو گرمیوں میں سوکھ جاتا ہے اس لیے ہمیں منتشر ہونا پڑتا ہے۔ اللہ سے دُعا فرمائیے کہ کنواں خشک نہ ہو۔

فرمایا۔ سات کنکریاں اُٹھالاؤ جب وہ کنکریاں لے آئے تو انھیں دست مبارک سے خوب ملا۔ انھیں عطا کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ اللہ کا نام لے کر ایک ایک کنکری کنویں میں ڈال دینا۔

حضرت زیادؓ کہتے ہیں کہ میں نے اسی طرح کیا۔ اللہ نے ایسی برکت عطا فرمائی کہ آج تک نہ وہ کنواں خشک ہوا اور نہ ہی اس کی گہرائی کا پتا چل سکا۔

(7) وفد ہمدان

آمد۔ تبوک سے واپسی پر سنہ 9 ہجری۔

یہ یمن کے قبیلہ ہمدان کا وفد تھا۔ حسن بن یعقوب ہمدانی نے اس وفد کی تعداد 120 لکھی ہے۔

یہ لوگ باوقار انداز میں حبری چادر اوڑھے اور عدنی عمامے باندھے ہوئے تھے۔ وفد کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت مالک بن نمط نے کھڑے ہو کر کہا۔

"یارسول اللہ ﷺ! ہمدان کے شہروں اور دیہاتوں میں سے قبیلہ خارف' قبیلہ یام اور شاکر کے منتخب افراد نو عمر اور تیز رو سانڈنیوں پر بیٹھ کر اسلام کی رسی میں بندھنے کے لیے حاضر ہیں۔ پیغمبر برحق کی دعوت پر ہم نے لبیک کہا ہے معبودانِ باطل کی نفی کی ہے۔ جب تک پہاڑ قائم اور صلیع کے ہرن دوڑتے رہیں ہمارا عہد ٹوٹنے نہ پائے۔"

انھوں نے جو بھی درخواست کی حضور ﷺ نے اسے منظور کر لیا۔ انھیں ایک تحریری فرمان بھی عطا فرمایا جس میں لکھا تھا کہ ہمدان کے خلاف یام اور شاکر کے علاقہ اہل الہبضب وحقاف الرمل مسلمانوں کے لیے ہیں۔ حضرت مالکؓ بن نمط کو ان

پر امیر مقرر فرمایا۔

فتح مکہ کے بعد طائف سے واپسی پر حضرت خالد بن ولید کو قبیلہ ہمدان میں دعوت اسلام دینے کے لیے بھیجا وہ چھے ماہ تک تبلیغ کرتے رہے لیکن خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا حضور ﷺ نے انھیں واپس بلا لیا اور حضرت علیؓ کو نامۂ مبارک کے ساتھ روانہ فرمایا۔

انھوں نے سب کو جمع کر کے خط پڑھا ایک ہی دن میں سارا قبیلہ اسلام لے آیا۔ قاصد اطلاع لے کر خدمت اقدس ﷺ میں آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے سجدۂ شکر ادا کیا فرمایا ہمدان پر سلامتی ہو۔ ہمدان پر سلامتی ہو۔

(8) وفد بنی منتفق

بنی منتفق سے لقیطؓ بن عامر اور نہیکؓ بن عامر ایک وفد کی صورت میں مدینہ آئے نماز فجر میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی آپ ﷺ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے۔

فرمایا: اے لوگو! چار دن سے تم نے میری آواز نہیں سنی آج جو میں کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔ کیا تم میں کوئی شخص ایسا ہے جو کسی قوم کی طرف سے بصورتِ وفد آیا ہو؟ تاکہ جو کچھ میں کہوں ان تک پہنچا دیا جائے جو ان میں پیچھے رہ گئے ہوں۔ مجھ سے بھی پوچھا جائے گا کہ کیا میں نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا یا نہیں؟

ارشاد ہوا۔ سب بیٹھ جاؤ لقیط اور ان کے ساتھی کھڑے رہے۔

لقیط نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! کیا آپ ﷺ کو علم غیب نہیں ہے؟

فرمایا۔ غیب کی پانچ باتیں ایسی ہیں جن کا علم صرف اللہ کو ہے۔

حضرت لقیطؓ کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا کون سی؟ ارشاد ہوا۔

1: موت کا علم کہ کون کب اور کہاں مرے گا؟
2: رحمِ مادر میں کیا ہے؟ نر یا مادہ؟
3: کل کیا واقع ہوگا؟
4: بارش کا وقت کہ کب ہوگی؟
5: قیامت کے دن کا علم۔

اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمارے جسم جو آفات، درندوں اور ہواؤں سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتے ہیں کس طرح جمع کیے جائیں گے؟

فرمایا: میں تمھیں اللہ کی نشانیوں سے سمجھاتا ہوں۔ زمین کو دیکھو سرسبز و شاداب ہے پھر مُردہ اور بنجر ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ بارش سے اسے دوبارہ نئی زندگی عطا فرماتا ہے۔ اللہ کی قسم وہ تمھارے منتشر اجزا کو جمع کرنے پر بھی ویسے ہی قادر ہے۔ تم اپنی قبروں سے نکلو گے اور اللہ کے سامنے حاضر ہو گے وہ تمھیں دیکھے گا اور تم اسے دیکھو گے۔

عرض کیا: یہ کیسے ہوگا؟ ہماری تعداد سے زمین بھری ہوگی۔

فرمایا: سورج اور چاند کو ساری دنیا دیکھتی ہے اور وہ سب کو ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ بس اسی مثال سے سمجھ لو۔

عرض کیا۔ ہم جب اپنے رب کے سامنے ہوں گے تو وہ کیا سلوک کرے گا؟

جواب میں روز حشر کی کیفیت، اعمال کا طریقہ، پل صراط کا گزر، حوض کوثر کا ذکر، مومن اور کافر کا حال اور اللہ تعالیٰ کے جلال کی کیفیت بیان فرمائی۔

حضرت لقیطؓ نے پوچھا: نیکی اور بُرائی کا بدلہ کس طرح ملے گا؟

فرمایا: نیکی کا بدلہ دس گنا اور بُرائی کا صرف ایک۔ اللہ چاہے تو وہ بھی معاف فرما دے گا۔

عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! جنت اور دوزخ کیا ہیں؟

فرمایا: دوزخ کے سات دروازے ہیں ایک سے دوسرے تک سوار کے لیے ستر برس کا راستہ ہے۔

جنت کے آٹھ دروازے ہیں ایک سے دوسرے دروازے تک ان کا بھی فاصلہ اتنا ہی ہے۔ جنت میں صاف شہد کی نہریں ہیں۔ شراب کی ایسی نہریں جن سے نہ دردِ سر ہوگا اور نہ نشہ۔ دودھ اور پانی کی ایسی نہریں کہ جن کا مزہ تبدیل ہوگا اور جو نہ خراب ہوں گی۔ ہر قسم کا میوہ ہوگا۔ میرے معبود کی قسم پاک باز بیبیاں ہوں گی مگر ان کے اولاد نہ ہوگی۔ وہاں ہر طرح کی بھلائیاں ہوں گی۔

عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہم کس بات پر بیعت کریں؟

فرمایا۔ صلوٰۃ قائم کرنے، زکوٰۃ دینے، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنے پر۔ پھر آپ نے اپنا دست مبارک پھیلا دیا۔

عرض کیا۔ کیا ہمارے لیے مشرق و مغرب کے درمیان کی ہر چیز ہوگی؟

رسول اللہ ﷺ نے اپنا دست مبارک کھینچ لیا۔ آپ ﷺ نے خیال فرمایا: شاید میں ایک ایسی شرط لگا رہا ہوں جو ممکن نہیں۔

عرض کیا۔ میرا مطلب ہے کہ ہم اس دنیا میں جہاں چاہیں رہیں اور انسان کا بار صرف اسی پر ہو۔ آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک دوبارہ پھیلا دیا پھر فرمایا تجھے اس کی اجازت ہے۔

بیعت کر کے ہم واپس ہو گئے آپ ﷺ نے فرمایا یہ دونوں یہ دونوں (دوبار فرمایا) اول و آخر تمام لوگوں سے زیادہ متقی ہیں۔ کعبؓ بن جذاریہ نے عرض کیا۔ وہ کون ہیں؟ فرمایا: بنو منتفق، بنو منتفق۔

(9) وفد نجران

آمد سنہ 9 ہجری

تعداد۔ ساٹھ سوار جن میں 24 بڑے سردار تھے ان میں تین عاقب، سید اور ابوحارثہ صاحب الرائے، ذی اثر نصرانی عالم تھے۔ قاضی سلمان منصور پوری کا خیال ہے کہ یہ دوسرا وفد تھا۔ نجران یمن کا ایک ضلع تھا جو مکہ سے سات منزل کی مسافت پر تھا۔ کعبہ کی طرح یہاں عیسائیوں کا ایک عظیم کلیسا تھا جو کعبہ یمانیہ کہلاتا تھا جس میں ان کے بڑے بڑے پیشوا رہتے تھے۔ اس گرجے کے تحت تہتر گاؤں تھے جن میں آباد

جنگ جو افراد کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان نصاریٰ کا ایک وفد مدینہ آیا۔ یہ لوگ نمازِ عصر کے بعد مسجد نبوی میں داخل ہوئے اپنی عبادت کرنا چاہی تو صحابہؓ نے مزاحمت کی۔ رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی۔ مشرق کی طرف رُخ کر کے عبادت کی۔

آنحضرت ﷺ نے انھیں اسلام کی دعوت کا خط لکھا تو یہ لوگ دریافت حال کے لیے مدینہ آئے۔ پہلے سفر کے کپڑے تبدیل کیے۔ قیمتی جبے زیب تن کیے۔ ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنیں۔ یمنی چادروں کو زمین پر گھسیٹتے نخوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ سلام کیا اور بات کرنے کی کوشش کی آپ ﷺ نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ خفگی محسوس کر کے وہ قیام گاہ پر چلے گئے۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو تلاش کیا جن سے ان کی پُرانی واقفیت تھی۔ وہ ملے تو ساری کیفیت سنائی انھوں نے حضرت علیؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ ان سے کہو کہ زیب و آرائش کا سارا سامان اُتار کر سفر کے معمولی کپڑے پہن لیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا آپ ﷺ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا۔ پچھلی بار جب تم آئے تھے تو ابلیسی حلیہ تھا۔ انھوں نے مختلف سوالات کیے۔ جس کے آپؐ نے وحی کی رو سے جوابات دیئے۔ علمائے نجران پر حق واضح ہو گیا لیکن انھوں نے دانستہ اتباع حق سے انکار کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے کہا کہ ہم پہلے ہی مسلمان ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تمھارا اسلام درست نہیں تم اللہ کے لیے بیٹا تجویز کرتے ہو صلیب کی پرستش کرتے ہو اور خنزیر کھاتے ہو۔

انھوں نے پوچھا آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

فرمایا: آج میرے پاس اس بارے میں کوئی علم نہیں اللہ تعالیٰ جو وحی کرے گا وہ بتا دوں گا۔ اگلی صبح سورۃ آل عمران کی آیات ۵۹ تا ۶۱ کا نزول ہوا جس کا ترجمہ ہے۔

''عیسیٰ کا حال اللہ کے نزدیک آدمؑ کا سا ہے کہ اللہ نے (پہلے) مٹی سے ان کا قالب بنایا پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا تو وہ ہو گئے (یہ بات) تمھارے پروردگار کی طرف سے حق ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں نہ ہونا پھر اگر یہ لوگ عیسیٰؑ کے بارے میں تم سے جھگڑا کریں اور تمھیں حقیقت حال تو معلوم ہو چکی ہے تو ان سے کہنا کہ آؤ ہم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں اور تم خود بھی آؤ پھر دونوں فریق (اللہ سے) دُعا و التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔''

اس حکم کے بعد آپ ﷺ مباہلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ سمیت ایک چادر میں لپٹے تشریف لائے۔ حضرت فاطمہؓ اپنے والد گرامی کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں۔ بعض روایات میں حضرت علیؓ کی موجودگی کا بھی ذکر ہے۔

یہ دیکھ کر نجرانی وفد کے ایک شخص نے کہا ''واللہ یہ وہ صورتیں ہیں کہ اگر وہ اللہ کو قسم دیں تو وہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دے گا'' یہ کہہ کر مباہلہ سے گریز کیا۔ ان میں بنی ہمدان کا شرجیل بن وداعہ وفد کا مشیر اور بڑی سوجھ بوجھ والا تھا۔ اس نے صلح پر آمادگی ظاہر کی۔ سیوطی کا بیان ہے کہ سید اور عاقب نے کہا کہ مباہلہ نہ کرو اگر وہ نبی ہوئے تو پھر تم فلاح نہیں پا سکو گے بلکہ اس کے بعد ہماری نسل ہی فنا ہو جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ آیت مباہلہ کے نزول کے بعد ان لوگوں نے تین دن کی مہلت مانگی۔ اس دوران میں یہود سے مشورہ کیا انھوں نے کہا کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی صفات تورات اور انجیل میں ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم صلح کر لو۔

شرجیل نے مشورہ دیا کہ معاملہ ان ﷺ ہی کی رائے پر چھوڑ دو کیوں کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ شخص سخت مزاج نہیں ہے اور نہ ہی انصاف کی راہ سے ہٹنے والا۔ سب نے مل کر عرض کیا کہ ہم آپ ﷺ ہی کو حَکَم تسلیم کرتے ہیں اور آپ ﷺ کا ہر فیصلہ ہمارے لیے قابل قبول ہوگا۔

دوسرے دن حسبِ ذیل عہد نامہ مرتب ہوا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

''یہ وہ تحریر ہے جو محمد ﷺ نے جو نبی اور اللہ کا رسول ﷺ ہے اہل نجران کے لیے لکھی ہے۔ یہ تحریر اس حق کی بنا پر ہے جو انھیں ان پر حکم کے طور پر حاصل ہے، اس کا اطلاق ہر کالے، سفید، سرخ، زرد، آزاد و غلام پر ہوگا اور وہی ان کے متعلق فیصلہ کریں گے۔

معاہدے کے مطابق دو ہزار حُلّے (حلّہ ایک لباس ہے جس سے سارا جسم ڈھپ جاتا ہے) جن میں سے ایک ہزار زنانہ ہوں گے ایک ہزار مردانہ دینا ہوں گے۔ ہر حلّہ ایک اوقیہ کا ہوگا۔ متعینہ خراج سے جو کمی بیشی ہوگی اس کی ذمہ داری متعلقہ جماعت پر ہوگی کہ وہ حساب کتاب کر کے پورا کرے اور جو وہ سواریں، گھوڑوں اور زرہوں کے متعلق فیصلہ کریں گے وہ بھی ان سے حساب کے مطابق لیا جائے گا۔

اہل نجران کے پاس میرے نمایندے بیس رات قیام کریں گے یا اس سے کچھ کم۔ اس دوران میں ان کے ذمہ تیس گھوڑے، تیس اُونٹ، تیس زرہیں ہوں گے۔ یمن میں کسی قسم کا غدر ہوگا تو ان پر ذمہ داری ہوگی اور میرے نمایندے جو چیز عاریت کے طور پر لیں گے ان میں سے جو ان سے ضائع ہوگی اس کی ذمہ داری میرے نمایندوں پر ہوگی تا کہ وہ اس کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔

نجران اور اس کے رہنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی پوری پوری ذمہ داری ہے۔ ان کے خون، ان کا مال، ان کی ملت، ان کے گرجے، ان کے مذہبی راہ نُما، ان کے پادری (اسقف) ان کے موجودہ و غائب سب کے حقوق کی ذمہ داری ہم پر ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ہر چیز کی حفاظت کی ہم پر ذمہ داری ہوگی چاہے وہ تھوڑی مقدار میں ہو یا زیادہ مقدار میں۔ اسی طرح ہمیں یہ حق نہ ہوگا کہ ان کے کسی پادری، بشپ یا مذہبی راہ نُما کو تبدیل کریں نہ ہی انھیں جنگی مہمات کے لیے جمع کیا جائے گا نہ ہی ان سے عشر لیا جائے گا، نہ ہی کسی قافلے کے ذریعے ان کی زمین کو پامال کیا جائے گا اور جس نے ان سے کچھ ایسا مطالبہ کیا تو اس میں سے نصف اہلِ نجران کا ہوگا بشرطیکہ اس میں سود کی آمیزش نہ ہو۔ جو سود کھائے گا اس سے ہماری ذمہ داری ختم اور وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ ان کے ذمے محنت و مشقت اور خیر خواہی ہوگی ان

پر ظلم اور زیادتی کسی طرح کی نہ کی جائے گی۔"

اس معاہدے پر گواہ کے طور پر حضرت عثمانؓ ابن عفان اور معیقیب نے دستخط کیے۔

"زاد المعاد" اور "فتوح البلدان" میں گواہوں میں ابوسفیان بن حرب، غیلان بن عمرو، مالک بن عوف، یکے از بنی نصر، الاقرع بن حابس منظلی، المغیرہ بن شعبہ کے نام ہیں نیز عبارت میں بھی تھوڑا اختلاف ہے یہ بھی درج ہے کہ دو ہزار حلّہ صفر کے مہینے میں اور دو ہزار حلّہ رجب کے مہینے میں دیا کریں گے جن کی قیمت فی حلّہ ایک اوقیہ ہوگی اور ایک اوقیہ کا وزن چالیس درہم۔

رخصتی کے وقت وفد نے کسی امانت دار شخص کو ساتھ بھیجنے کی درخواست کی جسے جزیہ ادا کیا جائے ارشاد ہوا: میں تمھارے ساتھ ایک امین آدمی کو بھیجوں گا اور وہ واقعی امین ہے۔ تمام اصحاب منتظر تھے کہ قرعہ فال کس کے نام نکلے گا۔

ارشاد ہوا: اے ابوعبیدہ ابن جراحؓ کھڑے ہو جاؤ۔ جب وہ کھڑے ہو گئے تو فرمایا: یہ اس امت کے امین ہیں۔

معاہدہ کی دستاویز لے کر یہ وفد نجران واپس ہوا۔ نجران کے سربرآوردہ لوگوں نے لارڈ پادری (اسقفِ اعظم) کے ساتھ ایک منزل پہلے استقبال کیا۔ لارڈ پادری نے راستہ ہی میں دستاویز پڑھنا شروع کی۔ اس کا چچازاد بھائی بشر بن معاویہ (جس کی کنیت ابوعلقمہ تھی) بھی برابر میں تھا۔ بشر کی اونٹنی نے ٹھوکر کھائی اور اسے گرا دیا۔ گرتے ہی اس کی زبان سے نکلا خرابی ہو اس شخص کی جس نے ہمیں تکلیف میں مبتلا کیا۔ لارڈ پادری نے کہا: تو کس کے بارے میں کہہ رہا ہے واللہ وہ تو نبی مرسل ہے۔ بشر نے یہ سن کر اسی لمحہ اپنی اُونٹنی کا رُخ مدینہ کی طرف پھیرتے ہوئے کہا: اللہ کی قسم اب اپنی سانڈنی کا پالان ان کے پاس جا کر ہی اُتاروں گا۔ وہ لاکھ روکتا اور چلاتا رہا لیکن بشر کے کانوں میں جرسِ ہدایت کی گونج تھی۔ خدمتِ اقدس ﷺ میں پہنچ کر دامنِ نبوت سے ایسے وابستہ ہوئے کہ مدینہ ہی کے ہو رہے اور بعد میں مرتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔

نجران میں واقع کلیسا کے برج میں ایک راہب سال ہا سال سے مصروفِ عبادت تھا۔ اسے جب بشر کا واقعہ معلوم ہوا تو وہ بھی چند تحائف لے کر سوئے مدینہ روانہ ہوا۔ ایک پیالہ، ایک عصا اور ایک چادر بطور تحفہ رسول اللہ ﷺ کی نذر کی۔ مدینہ میں ٹھہر کر تعلیم حاصل کرنے لگا پھر اجازت لے کر واپسی کے وعدہ کے ساتھ نجران چلا گیا لیکن حیات طیبہ میں واپس نہ آیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی پیش کردہ چادر خلفائے عباسیہ کے عہد تک محفوظ رہی۔

(10) وفد بنی باہلہ

اس قبیلہ کی مختلف شاخوں کے مختلف وفود تین مختلف مواقع پر مدینہ آئے۔ سب سے پہلے حدری بن عجلان جن کی کنیت ابوامامہ تھی 6 ہجری میں آئے۔

فتح مکہ کے بعد قوم باہلہ کی طرف سے مطرف بن الکاہن قاصد بن کر آئے۔ اسلام لائے اور اپنے لوگوں کے لیے امان طلب کی۔

ان کے بعد نہشل بن مالک بھی قوم کے نمائندے بن کر آئے اور اسلام کی دولت پائی۔ رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو تحریری فرمان دیے جن میں صدقات اور شرائع اسلام درج تھے۔ دوسرے فرمان کے کاتب حضرت عثمانؓ ابن عفان تھے۔

(11) وفد ازد

ان کی تعداد ابن سعد نے 19 نفر، ابن قیم اور قسطلانی نے 7 افراد لکھی ہے۔

امیر وفد حضرت صردؓ بن عبداللہ ازدی تھے۔ یمن کا یہ وفد حضرت فروۃؓ بن عمرو کے پاس دس دن ٹھہرا۔ جب یہ لوگ رسول اللہ ﷺ سے ملنے آئے تو آپ ﷺ نے ان کے اندازِ تکلم، طرزِ سکوت دونوں کو پُروقار اور پسندیدہ پایا۔ دریافت فرمایا تم لوگ مسلمان ہو یا کافر؟ عرض کیا ہم مومن ہیں حضور ﷺ نے یہ سن کر تبسم فرمایا۔ ارشاد ہوا ہر قول کی ایک بنیاد ہوتی ہے تمھارے ایمان کی علامت کیا ہے۔

عرض کیا: ہم میں پندرہ خصلتیں ہیں۔ پانچ وہ جن پر آپ ﷺ کے معلموں نے ایمان لانے کا حکم دیا۔ پانچ وہ جن پر عمل کرنے کی انھوں نے تلقین کی ہے اور پانچ وہ جن پر ہم زمانہ جاہلیت ہی سے کاربند ہیں۔

ارشاد ہوا وہ پانچ کون سے اُمور ہیں جن کا معلموں نے حکم دیا؟

عرض کیا (1) اللہ پر ایمان (2) اس کے فرشتوں پر ایمان (3) اس کی کتابوں پر ایمان (4) اس کے رسولوں پر ایمان (5) یوم آخرت اور مرنے کے بعد زندہ ہونے پر ایمان۔

فرمایا: اور وہ پانچ اعمال کیا ہیں جن کا امر کیا گیا؟

عرض کیا (1) لا الٰہ الا اللہ کہتے رہیں (2) صلوٰۃ قائم کریں (3) زکوٰۃ ادا کریں (4) رمضان کے روزے رکھیں (5) اور اگر استطاعت ہو تو حج کریں۔

پوچھا وہ پانچ کون سی خصلتیں ہیں جن کے تم عہد جاہلیت سے خوگر ہو؟

عرض کیا (1) راحت میں شکر (2) مصیبت میں صبر (3) قضا پر راضی رہنا (4) مقابلہ میں ثابت قدمی (5) دشمنوں کی مصیبت پر خوش نہ ہونا۔

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دانا ہو، عالم ہو، عقل سلیم کی وجہ سے مقامِ نبوت کو سمجھ سکتے ہو۔

میں تمھیں مزید پانچ باتیں بتاتا ہوں تاکہ بیس خصائل مکمل ہو جائیں۔

1۔ جس چیز کو کھانا نہ ہو اسے جمع نہ کرو۔
2۔ جس میں رہنا نہ ہو اس کی تعمیر نہ کرو۔
3۔ جس چیز کو کل چھوڑ کر جانے والے ہو اس پر حسد نہ کرو۔
4۔ اس اللہ سے ڈرو جس کی طرف لوٹ کر جانا اور جس کے سامنے پیش ہونا ہے۔
5۔ اس چیز کی طرف رغبت کرو جس میں ہمیشہ رہنا (جنت) ہے۔

یہ لوگ رخصت ہوئے آپ ﷺ نے حضرت صردؓ بن عبداللہ کو یمن کے قرب و جوار کے کافر قبائل سے جہاد کا حکم دیا "مبرور" لڑائی میں شعار مقرر فرمایا۔ انھوں نے واپس جا کر جرش میں مشرکوں کو اسلام کی دعوت دی انھوں نے انکار کیا اور

قلعہ بند ہو گئے۔ایک مہینا تک محاصرہ جاری رہا طویل لڑائی کے بعد فتح حاصل کی۔ان کے دو قاصد حاضر ہوئے تو رسول اللہ ﷺ نے مرحبا کے بعد فرمایا تم لوگ صورت کے اچھے، ملاقات کے سچے، گفتگو میں پاکیزہ اور امانت میں پکے ہو۔تم میرے ہو اور میں تمہارا ہوں۔

(12) وفد بنی فزارہ

آمد: تبوک سے واپسی پر سنہ 9 ہجری میں۔ان کی تعداد ابن سعد نے 19 اور ابن قیم نے دس اور ابن جوزی نے 14 یا 15 لکھی ہے۔

یہ وفد نحیف سواریوں پر اسلام کا اقرار کرتے ہوئے حاضر ہوا۔رسول اللہ ﷺ نے ان کے علاقہ کا حال دریافت فرمایا۔انھوں نے کہا کہ خشک سالی کا دور دورہ ہے، قحط سے نجات کے لیے دُعا کی درخواست کی۔رسول اللہ ﷺ نے منبر پر ہاتھ اُٹھا کر دُعا فرمائی اے اللہ! اپنی رحمت پھیلا دے۔ملک اور چوپایوں کو سیراب کر دے۔مُردہ علاقوں کو زندہ کر دے۔اس دُعا کے بعد اتنی بارش ہوئی کہ چھے دن تک آسمان نظر نہیں آیا پھر دُعا فرمائی کہ بارش ہمارے اُوپر نہ ہو ہمارے اطراف ہو اس کے بعد مدینہ سے بادل کپڑے کی طرح چھٹ گئے۔

(13) وفد بہرا

تعداد 13 افراد

اس وفد میں آنے والے یمن کے قضاعہ قبیلہ کی ایک شاخ سے تھے۔جب ان کی سواریاں بنی جدیلہ میں حضرت مقدادؓ بن عمرو کے دروازے تک پہنچیں تو انھوں نے نکل کر مرحبا کہا۔اپنے پاس ٹھہرایا۔ان کے لیے ایک بڑے لگن میں حیس (کھجور اور پنیر ملا کھانا) بنوایا سب نے سیر ہو کر کھایا۔جو حیس باقی رہ گیا اسے ایک چھوٹے لگن میں جمع کیا گیا۔

حضرت مقدادؓ نے حیس رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سدرہ نامی اپنی کنیز کے ذریعے روانہ کیا۔اس وقت آپ ﷺ حضرت اُمِ سلمہؓ کے گھر مقیم تھے۔گھر والوں نے پیٹ بھر کے کھایا۔حضور ﷺ نے سدرہ کو اپنی وہ لگن مہمانوں کے پاس دوبارہ لے جانے کا حکم دیا۔حضرت مقدادؓ نے اہلِ وفد کو بتایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس میں سے تناول فرمایا ہے۔آپ ﷺ کی انگلیوں کی برکت اس میں شامل ہے۔وہ جب تک مقیم رہے اسی سے سیر ہو کر کھاتے رہے۔اس طرح ان کا ایمان مستحکم ہو گیا اور انھوں نے رسالت کی گواہی دی۔چند دن ٹھہر کر فرائض دین کا علم سیکھا۔رخصت کے وقت انھیں انعام و اکرام سے نوازا گیا۔

(14) وفدِ نہد (تہامہ سے)

اس وفد کی آمد کا ذکر صرف ابن جوزی نے (الوفا باحوال مصطفیٰ میں) حضرت علیؑ کے حوالے سے کیا ہے۔یہ وفد تہامہ سے آیا تھا اس کے امیر مخفہ بن زہیر نے عرض کیا۔یارسول اللہ ﷺ! ہمیں اُونٹ اپنے وطن تہامہ کے نشیبی علاقہ سے نکال کر منزل بہ منزل یہاں لائے ہیں۔ہم دور دراز علاقہ سے کٹھن راہوں کو طے کر کے حاضر ہوئے ہیں۔ہمارا علاقہ سخت خشک سالی سے دو چار ہے۔تالابوں میں پانی سوکھ گیا ہے۔ٹہنیاں تنوں کا ساتھ چھوڑ چکی ہیں۔کھیتیاں ختم ہو گئی ہیں۔جانوروں کے تھنوں میں دُودھ سوکھ گیا ہے ہمارے لیے دعا فرمائیے۔

رسول اللہ ﷺ نے دُعا فرمائی۔اے اللہ! ان کے دودھ اور مکھن میں برکت عطا فرما۔پھلوں کو درختوں پر پختگی تک باقی رکھ۔ان کے تالابوں کو اُبلتے چشموں میں تبدیل فرما ان کی اولاد میں برکت عطا فرما۔

انھیں ایک تحریری فرمان بھی عطا فرمایا جس کا مفہوم درج ذیل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے قبیلہ نہد کے نام۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

السلام علیکم! جو نماز قائم کرے گا وہ مومن ہوگا اور جو شخص زکوٰۃ ادا کرے گا وہ صحیح مسلمان ہوگا جو شخص لا الہ الا اللہ کی شہادت دے گا وہ غافل نہیں لکھا جائے گا۔

شرعی طور پر مقرر کردہ مقدار زکوٰۃ میں بوڑھی بیمار ادھیڑ عمر والی اور بچہ دینے والی بھیڑ بکریاں وغیرہ تمھارے لیے ہیں جب تک کہ تمھارے دلوں میں اسلام و ایمان ہے اور اس کے فرائض و واجبات سے نفرت اور عجب و فخر پیدا نہ ہو اور طوق غلامی اور قلادۂ تقلید کو کاٹ نہ ڈالو اور ربا (سود) کھانے سے مجتنب رہو۔

حضرت علیؓ نے اس موقع پر عرض کیا۔''یارسول اللہ ﷺ! میرے والدین آپ ﷺ پر فدا ہوں ہم ایک جد کی اولاد ہیں۔ایک ہی مقام پر ہماری تربیت ہوئی۔آپ ﷺ وفود عرب سے ایسی زبان میں کلام فرماتے ہیں جو ہم سے مختلف ہوتی ہے۔''

فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے ادب سکھایا ہے اور مَیں نے بنی سعد میں پرورش پائی ہے۔یہ خصوصیت تم میں موجود نہیں۔

(15) وفد بنی سعد ہذیم

یہ لوگ یمن کے رہنے والے بنو قضاعہ کی ایک شاخ تھے۔ابن نعمان اس وفد کے رکن تھے۔مدینہ پہنچ کر اس کے نواح میں ٹھہرے۔جب مسجد نبوی آئے تو رسول اللہ ﷺ ایک جنازہ کی نماز پڑھا رہے تھے۔یہ لوگ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔حضور ﷺ نے پوچھا کیا تم لوگ مسلمان نہیں ہو؟

عرض کیا: بے شک ہم مسلمان ہیں۔

فرمایا: تم نے نمازِ جنازہ کیوں نہیں پڑھی؟

عرض کیا: ہم نے سوچا جب تک بیعت نہ کرلیں یہ جائز نہیں۔

فرمایا: جب تم نے اسلام قبول کیا اُسی وقت سے مسلمان ہو۔

ان میں سے ایک نے عرض کیا کہ امراؤ القیس کے دو شعروں نے ہمیں حیاتِ نو عطا کی۔

فرمایا: کس طرح اور کون سے شعر؟

عرض کیا: اثنائے سفر میں ہم فلاں جگہ پہنچے تو پانی کا کنواں بھول گئے۔پیاس سے

جان لبوں پر آ گئی۔ ہر شخص درختوں کے نیچے لیٹ کر موت کا انتظار کرنے لگا۔ رشتۂ جاں ٹوٹنے والا ہی تھا کہ ایک سوار آتا دکھائی دیا اسے دیکھ کر ہم میں سے ایک نے امراؤ القیس کے دو شعر پڑھے۔

پہلے شعر کا مطلب ہے ”جب جنگلی گدھوں نے خیال کیا کہ ان کا مقصود پانی ہے اور ندی پر پہنچنے کی صورت میں شکاریوں کے تیر انھیں زخمی کر کے خون آلود کرنے والے ہیں۔“

دوسرا شعر ”تو پھر انھوں نے اس چشمے کا قصد کیا جو مقام ضارج کے پاس ہے۔ جس پر پچھلے پہر سایہ لوٹ آتا ہے۔ اس پر عرمض کے لمبے درخت ہیں۔“

سوار نے دریافت کیا یہ شعر کس کے ہیں؟ ہم نے کہا امراؤ القیس کے۔ سوار نے کہا کہ چشمہ ضارج یہاں سے پچاس ہاتھ کے فاصلے پر ہے ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اس پر عرمض کے درخت ہیں اور ان کا سایہ دوپہر کو ڈھل کر چشمہ پر پڑتا ہے۔

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ”امراؤ القیس دنیا میں مشہور و معروف ہے مگر آخرت میں بے نام و نشان۔ قیامت کے دن وہ شعرا کی قیادت کرتا ہوا اور ان کا علم اُٹھائے ہوئے آگ میں داخل ہو جائے گا۔“

ہم نے بیعت کی۔ آپ ﷺ کے حکم سے ہم ایک مقام پر ٹھہرائے گئے۔ تین دن مقیم رہے ہماری مہمان داری کی گئی۔ حضرت بلالؓ نے چند اوقیہ چاندی تحفہ میں دی۔ ہمارے ساتھ ایک صغیر خادم تھا جسے خیمہ پر چھوڑا تھا۔ رخصت کے وقت ایک آدمی حضور ﷺ کی طرف سے آیا اور ہمیں آپ ﷺ کے پاس لے گیا۔ ہم نے عرض کیا یہ ہم میں سب سے چھوٹا ہے اور ہمارا خادم ہے۔

فرمایا: قوم میں چھوٹا اس کا خادم ہوتا ہے۔ اللہ اس پر برکات نازل فرمائے۔ وہ ہم سب سے بہتر نکلا اور سب سے زیادہ قرآن پڑھا اسی کو ہم پر امیر مقرر کیا گیا۔ ہماری ساری قوم اسلام کی نعمت سے سرفراز ہوئی۔

(16) وفد دارم یا داریین

آمد: یہ وفد تبوک سے واپسی پر آیا اور وصال تک مدینہ میں مقیم رہا۔

تعداد۔ وفد میں دس نفر تھے۔ حضرت ہانیؓ بن حبیب امیر وفد تھے۔ یہ وفد رسول اللہ ﷺ کے لیے تحائف لایا جن میں چند گھوڑے سونے کے پتر سے آراستہ ایک ریشمی قبا اور شراب کی ایک مشک تھی۔ دو چیزیں تو قبول فرمالیں۔ شراب کی مشک قبول نہیں کی۔ امیر وفد نے کہا کہ اسے فروخت کیے دیتا ہوں فرمایا اس کا بیچنا بھی حرام ہے۔ قبا آپ ﷺ نے حضرت عباسؓ کو عطا فرمائی عرض کیا۔۔ میں اس کا کیا کروں گا؟ (کیوں کہ ریشمی چیز کا پہننا جائز نہیں)

فرمایا: سونے سے عورتوں کے لیے زیور بنوالو اور قبا فروخت کر ڈالو۔ ایک یہودی نے اسے آٹھ ہزار درہم میں خرید لیا۔

ابن سعد کا بیان ہے کہ ان میں سے ایک تمیم بن اوس نے عرض کیا۔ ہمارے نواح میں رومیوں کے گاؤں جرئی اور بیت عیون ہیں۔ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ ملک شام کا فاتح کرے تو یہ گاؤں مجھے عطا فرمائیں۔ فرمایا: وہ تمھارے ہی ہوں گے۔ دورِ صدیقی میں حضرت ابوبکرؓ صدیق نے ایک فرمان کے ذریعے یہ دو گاؤں انھیں عطا فرمائے۔ حضور ﷺ نے ان لوگوں کے لیے ایک سو وسق (پیمانہ) غلہ کی وصیت بھی فرمائی۔

(17) وفد بنی سعد

آمد — سنہ 9 ہجری

تعداد — صرف ایک فرد

بنی سعد بن بکر نے حضرت ضمامؓ بن ثعلبہ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ وہ بڑے جری شخص تھے۔ مسجد پر اُونٹ باندھ کر سیدھے مجلس نبوی میں آئے اور پوچھا تم میں ابن عبدالمطلب کون ہے؟ حضور ﷺ نے جواب دیا۔ کہا میں کچھ سوال کروں گا ان کی درشتی سے دل میں میل نہ لانا۔

فرمایا: ﷺ میرا سینہ بے کینہ ہے جو چاہو پوچھو۔

ضمام نے کہا: میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں جو تمھارا، تمھارے خاندان، تم سے پہلے اور تمھارے بعد آنے والوں کا رب ہے کیا واقعی اس نے تمھیں ہماری طرف رسول بنا کر مبعوث کیا ہے؟

فرمایا: ہاں! اللہ نے مجھے رسول بنا کر بھیجا ہے۔

پوچھا: میں قسم دیتا ہوں اس معبود کی جو تمہارا، تمھارے کنبے کا، پہلے اور بعد میں آنے والوں کا رب ہے۔ کیا اس نے تمھیں حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کریں؟ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں؟ ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے آباؤ اجداد اس کے ساتھ ساتھ پرستش کرتے تھے؟

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اللہ نے اس کا حکم دیا ہے۔

قسم کو اسی انداز میں ہر بار دُہراتے ہوئے صلوٰۃ، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے بارے میں پوچھا۔

سوالات کا اثبات میں جواب پا کر کلمۂ شہادت پڑھا اور اعلان کیا میں ان فرائض کو ادا کرتا رہوں گا جن چیزوں سے منع فرمایا ہے چھوڑ دوں گا۔ ان میں زیادتی کروں گا نہ کمی۔

یہ کہ کر اُونٹ پر سوار ہو کر چلے گئے۔ ارشاد ہوا اگر دو زلفوں والے نے صدق دل سے یہ بات کہی تو جنت میں داخل ہو گیا۔ اپنی قوم میں جا کر کہا کہ لات و عزیٰ کی بدتر معبود ہیں۔ ایک رسول مبعوث ہو گئے ہیں۔ ان پر کتاب نازل ہوئی ہے۔ میں اس کی گواہی دیتا ہوں۔ شام ہونے تک قوم کے تمام مردوں اور عورتوں نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ وفود میں افضل بنی سعد کے وفد کو قرار دیتے ہیں۔

(18) وفد بلیؓ

آمد — ربیع الاول سنہ 9 ہجری

تعداد۔ معلوم نہیں۔ بلی یمن کا قبیلہ ہے۔ امیر وفد حضرت ابوالغیابؓ تھے۔

حضرت رویفعؓ بن ثابت نے اپنی قوم بلی کے وفد کا استقبال کیا اور بنی حدیلہ

کے محلے میں اپنے پاس ٹھہرایا انھیں لے کر خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہوئے۔
عرض کیا میرے قبیلے کے لوگ ہیں۔ ارشاد ہوا ''تجھے اور تیری قوم کو ہم خوش آمدید کہتے ہیں اللہ جس کے لیے بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اسے اسلام کی ہدایت دیتا ہے۔''
وفد کے امیر ابولغیابؓ نے عرض کیا کہ ہم نے بُت پرستی سے توبہ کر کے اسلام قبول کر لیا ہے جو کچھ آپ ﷺ لائے ہیں ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں۔
فرمایا: اللہ کا شکر ادا کرو غیر دین پر مرنے والا دوزخ میں جائے گا۔
پوچھا: مہمان نوازی میری فطرت ہے کیا اس پر کوئی اجر ہے؟
فرمایا: مسلمان غنی ہو یا فقیر اس کی ہر نیکی کا ثواب ہے۔
عرض کیا: مہمانی کی مدت کیا ہے؟
فرمایا: تین دن۔ اس کے بعد صدقہ۔ مہمان کے لیے جائز نہیں کہ اتنا قیام کرے کہ میزبان مشکل میں مبتلا ہو جائے۔
انھوں نے کچھ اور بھی سوالات کیے۔ وفد قیام گاہ پر لوٹا تو حضرت رویفعؓ کہتے ہیں کہ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ خود کھجوریں لیے میرے گھر کی طرف آ رہے ہیں۔ فرمایا ان کھجوروں سے ان کی دعوت کرو۔ وہ تین دن ٹھہرے۔ حضور ﷺ نے انعام اور تحائف دے کر رخصت فرمایا۔

(19) وفد تجیب

آمد سنہ 9 ہجری میں
تعداد یہ وفد تیرہ (13) نفر پر مشتمل تھا۔

یمن میں بنی کندہ کی سلطنت میں سکون نامی جگہ سے آئے تھے جو وسطِ حضر موت میں واقع تھا۔ اپنے ساتھ زکوٰۃ وصدقات کا بہت سا سامان لائے تھے۔ حکم ہوا اسے اپنی قوم کے حاجت مندوں میں تقسیم کرو۔ عرض کیا اس کے باوجود یہ بچ رہا ہے۔ ان کی آمد سے رسول اللہ ﷺ بے حد خوش ہوئے انھیں اچھی جگہ ٹھہرانے اور حضرت بلالؓ کو بہترین مہمان داری کرنے کے لیے حکم فرمایا۔
یہ لوگ مدینہ میں بہت کم عرصہ ٹھہرے لیکن کتاب اللہ، فرائض اور سنن کے بارے میں برابر پوچھتے رہے۔ جب رخصت ہونے لگے تو حضرت بلالؓ کو حکم ہوا کہ انھیں دوسرے وفود سے زیادہ انعامات اور تحائف دو۔ وداعی ملاقات کو آئے تو پوچھا تم میں سے کوئی باقی تو نہیں رہ گیا؟ عرض کیا ایک لڑکا ہے جو قیام گاہ پر جانوروں اور اسباب کی حفاظت پر مامور ہے۔ فرمایا اسے میرے پاس بھیج دو۔ وہ لڑکا حاضر ہوا اور کہا میں بھی بنی ابذی کا ایک فرد ہوں۔ میرے ساتھیوں کی حاجت تو آپ ﷺ نے پوری فرما دی اب میں حاضر ہوں۔ فرمایا تمھاری کیا ضرورت ہے؟ عرض کیا اوروں سے بہت مختلف۔ میرے لیے اللہ سے مغفرت، رحم اور دل کے غنا کی دُعا فرمایئے۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے ایسی ہی دُعا فرمائی اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ مردوں کے برابر انھیں بھی حصہ دو۔
سنہ 10 ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں بنی ابذی کے کچھ لوگ ملے۔
حضور ﷺ نے اس لڑکے کے بارے میں دریافت فرمایا۔
عرض کیا ہم نے اس جیسا قانع اور دل کا غنی انسان نہیں دیکھا۔
فرمایا مجھے امید ہے کہ وہ اس دنیا سے مکمل طور پر رخصت ہوگا۔
عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہر انسان مکمل طور پر نہیں مرتا؟
فرمایا: انسان خواہشات کی وادیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے اور ایسے میں موت اسے پکڑ لیتی ہے۔
رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد یمن میں جھوٹے نبی اور ارتداد کا فتنہ پیدا ہوا۔ اس لڑکے نے بنی ابذی کے لوگوں کو اس سے بچایا اور ان میں کوئی مُرتد نہیں ہوا۔
حضرت ابوبکرؓ فرمایا کرتے تھے کہ وفد تجیب کے مثل کوئی وفد نہیں آیا۔

(20) وفد اشعریین

اس زمانے میں یمن کا بہت بڑا اور معزز قبیلہ تھا جو اپنے جدِ امجد اشعر سے منسوب تھا۔ اشعر کے جسم پر بکثرت بال تھے۔ عربی میں شعر کے معنی بال کے ہیں۔
بارگاہِ نبوت میں اشعریین کے دو وفد آئے۔ پہلا سنہ 7 ہجری میں جس میں حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی تھے یہ 53 لوگ یمن سے کشتی میں نکلے اور بادِ مخالف نے جدہ کی بجائے حبش پہنچا دیا۔ حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کے ساتھ فتح خیبر کے بعد مدینہ آئے۔
دوسرا وفد 9 ہجری میں سنۃ الوفود میں آیا غالباً یہ وفد یمن کے حمیری خاندان کا تھا۔
حضرت جبیرؓ بن مطعم بیان کرتے ہیں کہ ایک سفر میں رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تمھارے پاس اہل یمن آتے ہیں۔ یہ لوگ مثل ابر ہیں۔ دنیا میں بسنے والوں میں سب سے بہتر ہیں۔ انصار میں سے ایک نے عرض کیا اے اللہ کے رسول سوائے ہمارے۔ یہ سن کر آپ ﷺ خاموش رہے۔ انھوں نے پھر دہرایا۔ اس دفعہ بھی آپ ﷺ نے سکوت فرمایا۔ تیسری بار دُہرانے پر دھیمی آواز میں ارشاد ہوا ہاں تمھارے سوا۔ ابن سعد کے الفاظ میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اشعریین لوگوں میں ایسے ہیں جیسے تھیلی میں مشک۔
حضرت انسؓ بن مالک کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا تمھارے پاس ایک قوم آ رہی ہے جو گداز قلب اور نرم دل ہے۔
حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں یہ بھی اضافہ ہے کہ ایمان تو بس یمن ہی میں ہے، حکومت بھی یمن ہی میں ہے۔ وقار اور تواضع اہلِ غنم (بکریوں والوں یعنی اہل یمن) میں ہے فخر اور ''خیلا'' (اپنے کو بڑا اور دوسرے کو حقیر سمجھنا) طلوعِ آفتاب سے قبل (اونٹوں والوں) بدویوں میں ہے اور مشرق کی جانب اشارہ فرمایا۔
قبیلہ اشعر کے لوگ آئے تو ان کی زبانوں پر ایک رجز تھا جس کے بول ہیں۔
''کل ہم دوستوں سے ملیں گے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ اور ان کی جماعت سے۔''
صحیح بخاری میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بنی تمیم کے افراد سے فرمایا کہ تمھیں بشارت ہے۔ انھوں نے کہا کہ بشارت کے ساتھ کچھ عطا بھی ہو۔ اس جواب سے چہرۂ

اقدس متغیر ہوگیا اتنے میں اہل یمن آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم بشارت قبول کرو بنی تمیم نے قبول نہیں کی۔

عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ ہم نے قبول کی۔ ہم دین سیکھنے حاضر ہوئے ہیں انھوں نے پوچھا اس دین کی ابتدا کیوں کر ہوئی ہے۔

فرمایا: اللہ ہی سب سے پہلے تھا اس کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اس کا عرش پانی پر تھا اس نے ہر چیز کتاب میں لکھ دی ہے۔

(21) وفد بنی عذرہ

آمد صفر سنہ 9 ہجری

تعداد بارہ افراد۔ یہ وفد اہل یمن سے تھا۔ یہ لوگ حضرت رملہؓ بنت حارث نجاریہ کے گھر ٹھہرائے گئے تھے۔

وقت آمد حمزہؓ بن نعمان کی زبان پر یہ شعر تھے۔

''میں نے دیار رسول (ﷺ) کی جانب اپنی سواری کا رُخ پھیرا ہے۔ ناہموار اور دُشوار گزار ریگستانوں کو طے کرنے میں اسے تکلیف دے رہا ہوں۔''

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی چیز نہیں۔ میں اس وقت تک اس دین پر رہوں گا جب تک میرا جوتا میرے قدم کو بھاری رکھے گا۔''

جب یہ وفد آیا تو رسول اللہ ﷺ نے پوچھا تمھیں ن لوگ ہو؟ انھوں نے عرض کیا آپ ﷺ سے شرفِ ہم کلامی حاصل کرنے والے اجنبی نہیں ہیں۔ ہم قصی کے بھائی بنی عذرہ ہیں۔ ہم وہ ہیں جن کی مدد سے قصی نے خزاعہ اور بنی بکر کو مکہ سے باہر نکال باہر کیا تھا۔ ہماری قصی سے رشتہ داریاں قائم ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلاً و سہلاً (خوش آمدید) کہتے ہوئے فرمایا ''تم اپنے گھر ہی آئے ہو میں نے تمھیں پہچانا نہیں تھا۔''

دین کے بارے میں سوال کر کے اسلام قبول کر لیا۔ عرض کیا کہ ہم تجارت کی غرض سے ملک شام جاتے ہیں جہاں ہرقل رہتا ہے۔ کیا اس کے بارے میں کوئی وحی نازل ہوئی ہے؟ فرمایا ان شاء اللہ قریب میں شام فتح ہو جائے گا اور ہرقل وہاں سے بھاگ جائے گا۔ انھوں نے کاہنوں سے قسمت کا حال پوچھنے اور ان کے ذبیحہ کے بارے میں دریافت کیا۔

آپ ﷺ نے اسے منع فرمایا۔ ذبیحہ صرف اللہ کے نام پر ہوگا۔ وہ لوگ چند دن مدینہ میں مقیم رہے۔ دین کو سیکھا۔ وقت رخصت انھیں انعام اور تحائف دیئے گئے۔ ان میں سے ایک کو حضور ﷺ نے چادر اوڑھائی۔ حضرت زملؓ بن عمرو کو قوم کی سرداری کا جھنڈا عطا فرمایا۔

(22) وفد بنی عامر

تعداد تیرہ افراد جن میں اکثر بدنہاد اور چند مخلص جیسے جبار بن سلمٰی شامل تھے۔

آمد۔ غزوۂ تبوک سے واپسی پر 9 ہجری میں۔

وفد میں عامر بن طفیل (بئر معونہ میں ستر 70 مسلمانوں کو دھوکے سے شہید کرنے والا) کچھ اور بدنہاد دروُسا جیسے اربد بن ربیعہ کے ساتھ سازش کر کے آیا تھا۔ عامر نے اربد سے طے کیا تھا کہ میں محمد (ﷺ) کو باتوں میں لگاؤں گا تم موقع پا کر (معاذ اللہ) کام تمام کر دینا۔ اس کا قبیلہ عرب کے مشہور قبیلے قیس عیلان کی شاخ تھا۔

عامر نے خوشامدانہ انداز میں ''آپ ہمارے آقا ہیں'' کہہ کر گفتگو کا آغاز کیا۔ آپ ﷺ نے جواب دیا ''آقا تو اللہ ہے۔''

عامر نے کہا کہ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو مجھے کیا ملے گا؟ فرمایا وہی حقوق جو تمام مسلمانوں کے ہیں۔

کہا: مجھے اپنا خلیفہ نامزد کر دیجیے۔

فرمایا: تم اور تمھارا قبیلہ اس لائق نہیں۔

عرض کیا: اہلِ بادیہ اور صحرانشینوں پر آپ ﷺ حکومت کریں اور شہروں پر مجھے حکومت دیں۔ آپ ﷺ نے انکار فرمایا۔

اب اس نے دھمکی دی کہ آپ ﷺ نے اگر میرا کہنا نہ مانا تو لشکرِ جرار سے حملہ کر دوں گا۔ یہ ساری باتیں ہوتی رہیں لیکن اربد بن ربیعہ نے جنبش تک نہ کی۔ باہر نکل کر پوچھا تو نے کیوں قتل نہ کیا؟ کہا جب بھی محمد (ﷺ) پر حملہ کرنا چاہا تمھیں درمیان میں حائل پایا کیا تمھیں قتل کر دیتا؟

یہ دونوں اسلام سے محروم رہے۔ ایک طاعون سے اور دوسرا آسمانی بجلی گرنے سے ہلاک ہوا۔ وفد کے دوسرے ارکان اسلام لائے۔

(23) وفد بنی کلاب

آمد سنہ 9 ہجری

تعداد 13 افراد جن میں لبید بن ربیعہ اور جبار بن سلمٰی بھی تھے۔

حضرت رملہؓ بن حارث کے مکان میں ٹھہرایا گیا۔

حضرت کعبؓ بن مالک کو وفد کلاب کی آمد کا علم ہوا تو ان کے پاس گئے۔ جبار بن سلمٰی سے ان کی دوستی تھی ان کی خاطر و مدارات کی اور تحائف دیئے۔ حضرت کعبؓ کے ساتھ وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اہلِ ایمان کی طرح سلام کیا۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت ضحاکؓ بن سفیان کی تبلیغ سے ہم کتاب اور سنت رسول ﷺ سے واقف ہوئے۔ ہم نے اسے قبول کر لیا۔ انھوں نے ہمارے امرا سے زکوٰۃ وصول کی اور فقراء میں تقسیم کر دی۔

شاعر سبعہ مُعلّقات

بنو عامر بن صعصعہ کے ساتھ آنے والا اربد بن قیس عرب کے نامور شاعر لبید بن ربیعہ کا سوتیلا بھائی تھا۔ لبید نے اربد کے پُرسوز مرثیے لکھے جنھیں ابن ہشام نے نقل کیا ہے۔

سنہ 9 ہجری میں اس قبیلے نے بنو جعفر کے لوگوں پر مشتمل ایک اور وفد بھیجا جو دراصل کلاب کی شاخ بنو عامر سے تھے۔ اس میں سبعہ معلقات میں شامل یہ شاعر لبید بھی شریک تھا۔ اس موقع پر انھوں نے اسلام قبول کیا پھر کوفہ چلے گئے۔

لبید عرب کے مایہ ناز اور باکمال شاعروں میں سے ہیں۔ ان کے ہم عصر نامور شعراء ان کا اتنا احترام کرتے تھے کہ لبید کے بعض اشعار پر سجدہ میں گر جاتے۔ ان کا ایک شعر جس کا مطلب ہے۔

''نور کے سیلاب نے ٹیلوں کو اس طرح صاف کر دیا گویا کہ وہ ٹیلے کتاب کے صفحات ہیں جس کے متن کو قلم نے درست کیا ہو''

اس شعر کو سن کر نامور شاعر فرزدق سجدہ میں گر پڑا لوگوں نے وجہ پوچھی تو بتایا کہ

''جس طرح اہل ایمان قرآن مجید کے مقام سجدہ کو پہچانتے ہیں میں شاعری کے مقام سجود کو پہچانتا ہوں۔''

بنی عامر کے اس شاعر کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ لبید شاعر کی سب سے سچی بات اس کا یہ مصرعہ ہے ؎

الا کل شیء ما خلا اللہ باطل

''سنو! اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے!''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عہد جاہلیت میں بھی ان کے کلام میں مذہبی تاثر تھا جب وہ اسلام لائے تو کہا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ میری موت نہ آئی' جب تک کہ میں نے اسلام کا لباس نہ پہنا''

کہا جاتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد انھوں نے شعر کہنا چھوڑ دیا۔ صرف ایک شعر کہا جس کا ترجمہ ہے۔

''کریم آدمی اپنی جان کے برابر کسی کو تکلیف نہیں دیتا اور آدمی کو اچھا ہم نشیں صالح بنا دیتا ہے۔''

ترک شعر گوئی کا خیال قرین صحت نہیں ان کے دیوان میں بہت سے شعر ایسے ہیں جن سے قرآن مجید کا فیض ظاہر ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بار لبیدؓ عامری سے کہا کہ اپنے کچھ شعر سناؤ۔ لبیدؓ نے جواب دیا۔ جب سے اللہ نے مجھے سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران سے روشناس کیا ہے میں نے کوئی تازہ شعر نہیں کہا۔ حضرت عمرؓ نے خوش ہو کر ان کے وظیفہ میں پانچ سو درہم کا اضافہ کر دیا۔ پہلے یہ وظیفہ دو ہزار تھا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے دور میں لبید سے کہا کہ یہ پانچ سو اضافہ کیوں ہوا؟ لبید نے کہا: اگر آپؓ اسے کم کریں گے تو میں مر جاؤں گا اور اصل مع اضافہ آپ کے لیے بچ جائے گا۔ جواب پر ہنس کر انھوں نے وظیفہ بدستور برقرار رکھا۔

''اسد الغابہ'' میں انھیں مولفۃ القلوب یعنی فتح مکہ پر مسلمان ہونے والوں میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا اسلام بہت اچھا رہا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد 60 سال تک زندہ رہے۔ 140 سال کی عمر میں 41 ہجری میں وفات پائی۔

24) وفدِ بنی عبد القیس

آمد ابن قیم کہتے ہیں یہ وفد سنہ 9 ہجری میں آیا۔

تعداد۔ 14 سوار تھے عبداللہ بن عوف الاشج العصری رئیس وفد تھے۔ یہ لوگ بحرین کے رہنے والے تھے۔ اس سے پہلے سنہ 5 ہجری میں بھی آئے تھے۔ وفد کے دیگر افراد سواریوں سے اُترتے ہی خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہو گئے البتہ رئیسِ وفد اشج نے بڑے وقار سے اُونٹ کو باندھا۔ ہاتھ منہ دھوئے۔ کپڑے تبدیل کیے۔ پھر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا۔ تم میں اشج کون ہے؟ عبداللہ بن عوف نے اپنے کو پیش کیا۔

فرمایا: آدمی کو اپنی زبان اور دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اے عبداللہ! تم میں دو پسندیدہ صفات ہیں ایک حلم دوسرا وقار۔ جسے اللہ پسند فرماتا ہے۔ بیعت کے وقت ان سے دریافت فرمایا کہ تم اپنی قوم کی طرف سے بھی بیعت کرتے ہو؟ عرض کیا ہم اپنے ذمہ لیتے ہیں انھیں دعوت دیں گے نہ مانیں تو لڑیں گے۔ فرمایا درست ہے اس واقعہ سے رسول اکرم ﷺ کی نفسیات انسانی پر گہری نظر کا ثبوت ملتا ہے۔ ہر فرد کی حرکت پر آپ ﷺ کی نظر تھی۔ عرض کیا ہمارا ملک بہت دُور ہے درمیان میں مضر کی آبادیاں ہیں جو کافر ہیں۔ صرف حرام مہینوں یعنی رجب' ذی قعدہ' ذی الحجہ اور محرم میں جب کہ جنگ و جدال بند ہوتی ہے حاضر ہو سکتے ہیں۔ ہمیں جامع عمل بتا دیجیے جس پر کار بند رہ کر ہم جنت میں داخل ہو سکیں۔

فرمایا چار چیزوں کا حکم ہے۔

1: اللہ پر ایمان: وحدانیت و رسالت۔
2: صلوٰۃ کا قیام
3: زکوٰۃ ادا کرنا اور مال غنیمت میں سے خُمس نکالنا۔
4: رمضان کے روزے رکھنا۔

چار چیزوں سے منع کرتا ہوں (1) دبا، کدو کا تونبا (2) ختم' سبز لاکھی گھڑیا (3) نقیر، کھدی ہوئی لکڑی کا برتن اور (4) مزفت، روغنی برتن

یہ چار برتنوں کی اقسام ہیں جن میں شراب بنائی جاتی تھی۔ اس طرح بنیاد ہی کو ختم کر دیا گیا۔

فرمایا یہ احکام ان تک پہنچا دو جو پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان میں ایک شخص جارود بن علا نصرانی تھے۔

پوچھا: میں دین حق پر ہوں کیا آپ ﷺ میری ضمانت لیتے ہیں۔

فرمایا: جس کی طرف میں بلاتا ہوں یہ اس سے بہتر ہے جس پر تم ہو۔ میں ضامن ہوں۔ وہ مسلمان ہو گئے زمانہ ارتداد میں یہ قبیلہ بڑی استقامت سے اسلام پر قائم رہا۔ اس دفعہ یہ لوگ دس دن تک مدینہ میں مقیم رہے۔ رخصت کے وقت ہر شخص کو 12 اور امیر کو ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی تحفہ میں دی گئی۔

(25) وفد بنی ذی مرہ

آمد۔ تبوک سے واپسی کے بعد سنہ 9 ہجری

تعداد۔ 13 افراد سردار وفد حارث بن عوف

اہل وفد نے عرض کیا کہ ہم آپ ﷺ ہی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں ہمارا سلسلہ لوی بن غالب سے ملتا ہے۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے تبسم فرمایا۔ پوچھا اپنے اہل کو کہاں چھوڑا؟ عرض کیا: سلاح اور اس کے نواح میں۔ فرمایا۔ تمھاری بستیوں کا کیا حال ہے؟ عرض کیا قحط زدہ ہیں ہمارے لیے دُعا فرمایئے۔ آپ ﷺ نے دُعا فرمائی۔

حضرت بلالؓ نے وقت رخصت ہر ایک کو دس اوقیہ اور سردار کو بارہ اوقیہ چاندی عطا فرمائی (ایک اوقیہ کی قیمت 40 درہم کے برابر ہوتی ہے) چند دن ٹھہر کر جب یہ لوگ اپنی بستیوں میں لوٹے تو علاقہ کو سرسبز و شاداب پایا جس دن دُعا کی گئی تھی اسی دن بارش سے علاقہ سیراب ہوا تھا۔

(26) وفدِ بنی البکّا

آمد　　سنہ 9 ہجری

تعداد۔ تین افراد جن میں معاویہ بن ثور جن کی عمر سو سال تھی۔ بشر بن معاویہ اور فُجیع بن عبداللہ شامل تھے۔

ان مہمانوں کو ٹھہرانے کا انتظام کیا گیا۔ بوڑھے معاویہ نے برکت کے لیے حضور ﷺ کو مس کیا۔ درخواست کی کہ میرے خدمت گزار بیٹے کے، چہرے پر دست شفقت رکھ کر برکت کی دُعا فرمائیں۔ حضور ﷺ نے بشر کے چہرے پر دست مبارک کو پھیرا اور ان کے لیے دُعا فرمائی۔

انھیں سفید رنگ کی بھیڑیں عطا ہوئیں۔ انعامات سے بھی سرفراز کیے گئے۔ فُجیع بن عبداللہ کے لیے ایک فرمان تحریر کیا گیا اس میں لکھا تھا۔

''محمد نبی (ﷺ) کی جانب سے فُجیع اور ان کے تابعین کے لیے جو اسلام لائے نماز قائم کرے زکوٰۃ دے اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرے۔ مال غنیمت سے اللہ کا خمس دے۔ نبی (ﷺ) اور ان کے اصحابؓ کی مدد کرے۔ اپنے اسلام پر گواہی دے اور مشرکین کو چھوڑ دے تو اللہ عزوجل اور محمد (ﷺ) کی امان میں ہے۔''

چوتھے رکن وفد عبد عمرو البکائی تھے۔ بہرے تھے اور اصم کے لقب سے مشہور تھے۔ حضور ﷺ نے ان کا نام تبدیل کر کے عبدالرحمٰن رکھا۔ انھیں ایک چشمہ ذوالقصہ کے حقوق ملکیت عطا فرمائے۔

(27) وفدِ بنی کنانہ

آمد۔　　غزوۂ تبوک سے چند دن پہلے۔

تعداد۔　　صرف ایک فرد

حضرت واثلہؓ بن الاسقع اللیثی بطور وفد غزوۂ تبوک کے موقع پر مدینہ حاضر ہوئے آپ ﷺ کے ہم راہ فجر کی نماز پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ نے بیعت کے وقت دریافت فرمایا۔ کیا تم ہر مہم میں خواہ پسند ہو یا نہ ہو شرکت کرو گے؟ عرض کیا۔ جی ہاں! بشرطِ استطاعت!

لوٹ کر اپنی بستی میں گئے۔ باپ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ بہن نے اسلام قبول کر لیا۔ وہ تیاری کر کے مدینہ آئے تو حضور ﷺ تبوک روانہ ہو چکے تھے۔ حضرت کعبؓ بن عجرہ نے مال غنیمت کے بدلے سوار کر لیا اور وہ تبوک میں حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے انھیں حضرت خالدؓ بن ولید کے ہم راہ دومۃ الجندل کی مہم پر بھیج دیا جس میں انھیں غنیمت میں چھ اُونٹنیاں ملیں حسب وعدہ حضرت کعبؓ کو پیش کیں۔ کہا میں تجھے لالچ کے لیے نہیں لایا ثواب مقصود تھا۔

(28) وفد بنی ہلال بن عامر

تعداد　　تین سردار اور کچھ ساتھی

اس وفد کے ایک سردار قبیصہ بن مخارق نے عرض کیا کہ ادائے قرض کے لیے مَیں نے اپنی قوم کی ضمانت دی ہے اس میں میری مدد فرمایئے ارشاد ہوا کہ جب صدقات آئیں گے ان سے تمھیں دیا جائے گا۔

اس موقع پر فرمایا کہ سوال صرف تین صورتوں میں جائز ہے۔

1: اس شخص کے لیے جو دیت ادا کرنے کے لیے قرض کا زیر بار ہو۔

2: کسی حادثہ میں جس کا مال ضائع ہو گیا ہو۔ وہ ضروری حاجتوں اور اپنی حالت سنبھالنے کے لیے سوال کر سکتا ہے۔

3: فاقہ میں مبتلا شخص۔ سوال کی مذمت میں فرمایا۔

''جو آدمی لوگوں سے مانگتا رہتا ہے قیامت کے دن وہ آئے گا تو اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہو گا۔''

اس وفد میں زیادہ بن عبداللہ، ام المومنین حضرت میمونہؓ بنت حارث کے بھانجے بھی تھے جو مدینہ میں داخل ہوتے ہی اپنی خالہ کے گھر آ گئے۔ حضور ﷺ حضرت میمونہؓ کے حجرہ پر تشریف لائے تو انھیں دیکھ کر ناراضی سے واپس ہونے لگے۔ حضرت میمونہؓ نے اپنی بہن غرہ بنت حارث کے حوالے سے تعارف کروایا۔ آپ ﷺ ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں گئے تو زیادہ بن عبداللہ کو نزدیک کیا۔ ان کے لیے برکت کی دُعا فرمائی۔ شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ برکت ایک نور کی صورت میں ان کے چہرے پر رہی۔

(29) وفد طے

آمد　　سنہ 9 ہجری

تعداد　　پندرہ افراد۔ حضرت زید الخیلؓ رئیس وفد تھے

طے یمن کا مشہور قبیلہ تھا۔ عہد رسالت میں ان میں دو سردار تھے جن کے حدود مملکت الگ الگ تھے۔ ان میں ایک زید الخیل اور دوسرے عدی بن حاتم ہیں۔ زید شاعر، خوش بیاں خطیب اور شجاع و کریم تھے۔ عدی مشہور سخی حاتم طائی کے صاحب زادے تھے۔ سنۃ الوفود میں حضرت زید الخیل مدینہ آئے۔ ابن سعد نے ان کا شجرہ زید (خیر) ابن مہلہل (بنی نبہان) لکھا ہے جب کہ مولانا شبلی نے شاہ سواری میں مہارت کی وجہ سے خیل کے نام سے مشہور ہونا لکھا ہے۔

قسطلانی نے لکھا ہے کہ ان کے پاس پانچ گھوڑے تھے اس لیے یہ نام پڑ گیا۔

خیل کے لفظی معنی گھوڑے کے ہیں۔

ایک سوار اپنی سواری کو صحن مسجد میں بٹھا کر خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ عرض کیا نو دن کے سفر کی مشقت برداشت کی۔ راتوں کو جاگ کر سواری کو تھکاتا رہا۔ دنوں کو پیاس کی نذر کرتا رہا۔ صرف دو سوالوں کے جواب کی خاطر۔ فرمایا تمھارا نام کیا ہے؟ عرض کیا زید الخیل۔ رسول اللہ ﷺ نے خیل کو خیر سے بدل دیا پھر وہ زید الخیر کے نام سے پکارے جانے لگے۔ ارشاد ہوا۔ جو چاہو سو پوچھو۔ پوچھا۔ اللہ جسے محبوب رکھتا ہے اور جسے ناپسند کرتا ہے اس کی نشانی کیا ہے؟ فرمایا۔ اس تعلق سے تمھارا کیا حال ہے؟ عرض کیا۔ میں خیر، عمل خیر اور اہل خیر کو محبوب رکھتا ہوں۔ اس پر ثواب کا اُمیدوار ہوں۔ اگر کوئی بھلائی کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا ہے غم گین ہو جاتا ہوں۔ ارشاد ہوا یہی علامت ہے اس شخص کی جسے اللہ محبوب رکھتا ہے۔ جسے وہ ناپسند فرماتا ہے اس کی اسے پروا نہیں کہ کس وادی میں ہلاک ہوتا ہے۔

جب یہ وفد مدینہ آیا تو حضور ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے۔ ان لوگوں نے اپنی سواریوں کو میدان میں چھوڑا اور اندر گئے۔ حضور ﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا سب ایمان لے آئے اور اچھے مسلمان ثابت ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے سامنے جس کسی کے فضل و کمال کا ذکر کیا گیا میں نے ملاقات پر اسے تعریف سے کم پایا بجز زید الخیل کے۔

حضرت زیدؓ نے عرض کیا کہ آپ ﷺ کے وجود کے باعث ہمیں اسلام اور ایمان میسر آیا۔ آپ ﷺ کی تعلیم اخلاق سے بہتر اخلاق ممکن ہی نہیں۔ مجھے اپنی عقل پر حیرت ہے کہ نہ جانے کس طرح پتھر کی پرستش کرتا رہا؟ بت گم ہو جاتا تو اسے ڈھونڈے بنا چین نہ آتا تھا۔

فرمایا: اللہ تعالیٰ تمھارے مقام اور علم میں ترقی فرمائے گا۔

فید کا مقام اور دو مزید زمینیں بطور جاگیر عطا فرمائیں۔ انھیں ایک فرمان بھی لکھ کر دیا۔ وقت رخصت وفد کے ہر فرد کو پانچ پانچ اوقیہ چاندی اور حضرت زیدؓ کو ساڑھے بارہ اوقیہ چاندی عطا فرمائی۔

وہ اپنے وطن لوٹ گئے تو ارشاد ہوا کہ اگر زیدؓ اس شہر کے بخار سے بچ گئے تو وہ بہت بولنے والا ہوگا۔ نجد کے چشمہ فردہ پر پہنچے تو بخار نے گھیر لیا۔ وہیں انتقال ہوا۔ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ وہ عہد فاروقی کے آخر میں فوت ہوئے۔ ان کی بیوی نے فرمان مبارک پر قبضہ کر کے اسے تلف کر دیا۔ ان کے دو بیٹے مخنف اور حرث اسلام لائے اور حضرت خالدؓ بن ولید کے ساتھ جہاد میں حصہ لیا۔ اللہ نے شہادت سے سرفراز فرمایا۔

حضرت عدیؓ بن حاتم کا ایمان لانا

ربیع الثانی سنہ 9 ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو بنی طے کے ''بت خانہ فلس'' کو منہدم کرنے کے لیے روانہ فرمایا۔ فلس بنی طے کی ایک شاخ تھی۔ 150 انصاری سو اونٹوں اور پچاس گھوڑوں پر سوار تھے۔ ابن سعد نے تعداد 200 لکھی ہے۔ ان کے پاس ایک سفید اور ایک سیاہ جھنڈا تھا۔ سب نے مل کر شب خون مارا اور بت خانہ مسمار کر دیا۔ بت کی گردن میں دو تلواریں حمائل تھیں ایک کا نام المخذم اور دوسری کا رسوب تھا۔ ابن سعد نے تیسری تلوار کا نام الیمانی بتایا ہے۔ تین زرہیں بھی تھیں۔ یہ تلواریں حارث بن ابی شمر نے بت کی نذر کی تھیں ان تلواروں کو بطور صفی رسول اللہ ﷺ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔ غنیمت میں تلواریں، اونٹ اور بکریاں حاصل ہوئیں۔ خمس نکال کر مال غنیمت تقسیم کر دیا گیا۔ چوپایوں اور غلاموں پر حضرت عبداللہؓ ابن عتیک کو نگہبان مقرر کیا گیا۔ آل حاتم میں بہت سے گرفتار ہوئے جن میں مشہور سخی حاتم کی بیٹی سفانہ بھی تھی جو بڑی خوش گفتار، دانا اور عدی سے چھوٹی تھی۔ قبیلہ کا سردار عدی بن حاتم شام کی طرف بھاگ گیا۔ حضرت ابو قتادہؓ کو قیدیوں کا محافظ بنایا گیا جنھیں وہ مدینہ لے آئے۔

ابن ہشام نے عدی بن حاتم کے ایمان لانے کا واقعہ تفصیل سے لکھا ہے۔ عدی کہتے ہیں کہ مجھے رسول اللہ ﷺ سے سخت بغض اور آپ ﷺ کے نام سے چڑ تھی۔ حالانکہ میں قبیلہ کا سردار اور شریف نصرانی تھا۔ میں اپنی قوم کے ساتھ مرباع نامی مقام پر رہتا تھا۔ اپنے غلام چرواہے سے کہ رہا تھا کہ محمد (ﷺ) کا لشکر آئے تو اطلاع دینا اور تیز رو سانڈنیاں تیار رکھنا۔ آخر وہ دن آ ہی گیا۔ میں نے اپنے اہل خانہ کو سوار کیا اور اپنے دین والوں کے پاس شام روانہ ہو گیا۔ میری بہن پیچھے ہی رہ گئی اور گرفتار ہوئی۔ اسیروں کو مدینہ بھیج دیا گیا ایک دن رسول اللہ ﷺ کا ادھر سے گزر ہوا جہاں قیدی رکھے جاتے تھے۔ یہ حجرہ مسجد کے دروازے کے قریب تھا۔ سفانہ نے عرض کیا میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں چھڑانے والا بھاگ گیا مجھ پر احسان فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر احسان فرمائے گا۔

دریافت فرمایا: تمھارا چھڑانے والا کون ہے؟

عرض کیا: عدی بن حاتم

فرمایا: وہ جو اللہ اور رسول ﷺ سے بھاگنے والا ہے۔ وہ دو دن تک یہی کہتی رہی۔ تیسرے دن مایوس بیٹھی تھی کہ آپ ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ کے پیچھے سے حضرت علیؓ نے اشارہ کیا کہ کھڑی ہو کر بات کر۔ میں نے وہی گزارش کی۔ سن کر فرمایا میں نے احسان کیا (آزاد کر دیا) لیکن جانے میں جلدی نہ کر۔ تیری قوم کا کوئی آدمی جو قابل اعتبار ہو اس کے ساتھ چلی جانا۔ قبیلہ قضا کا شام جانے والا ایک قافلہ مل گیا میں نے اپنے بھائی کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ آپ ﷺ نے سواری، خرچ اور کپڑے عطا فرمائے۔ وہ عدی کے پاس پہنچی اور ملامت کی کہ تو قطع رحمی کرنے والا ظالم ہے۔ اپنے بال بچوں کو لے آیا اپنے باپ کی امانت چھوڑ آیا۔ عدی نے ندامت کا اظہار کیا۔ دل صاف ہو گئے تو بہن سے مشورہ طلب کیا کہ اب کیا کروں؟ کہا اگر بنی طے کی سلامتی چاہتا ہے تو خدمت اقدس ﷺ میں حاضر ہو جا۔ وہ بڑے کریم ہیں اگر نبی ہیں تو سبقت کی فضیلت حاصل ہوگی بادشاہ ہیں تو تجھے عزت ملے گی۔

حضرت عدی کہتے ہیں کہ بڑے غور و فکر کے بعد میں نے مدینہ کے سفر کا ارادہ

کیا۔ مدینہ پہنچا تو آپ ﷺ مسجد میں ملے۔ بڑھ کر سلام کیا۔ پوچھا کون ہو؟ عرض کیا عدی بن حاتم۔ آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ راستے میں ایک ضعیف عورت نے روک لیا بڑی دیر تک اپنا حال سناتی رہی۔ آپ ﷺ سنتے رہے۔ مَیں نے دل میں کہا بخدا یہ بادشاہ نہیں۔ بوڑھی عورت نے فارغ کیا تو گھر تشریف لائے۔ مجھے بہ اصرار ایک چمڑے کے گدے پر بٹھایا جس میں خشک گھاس بھری تھی اور خود زمین پر بیٹھ گئے میرے دل نے گواہی دی یہ عمل بادشاہوں جیسا نہیں۔

ارشاد ہوا عدی بن حاتم! اسلام قبول کر لو تمھیں سلامتی حاصل ہوگی۔ مَیں نے کہا میں ایک دین کا ماننے والا ہوں۔ فرمایا میں تمھارے دین کو تم سے بہتر جانتا ہوں۔ مَیں نے پوچھا وہ کس طرح؟

فرمایا: کیا تو اپنی قوم کا سردار نہیں اور کیا تو لوٹ کے اموال میں سے چوتھائی حصہ وصول نہیں کرتا؟

مَیں نے کہا: برابر لیتا ہوں۔

فرمایا: تمھارے دین میں یہ حلال نہیں۔

مَیں خاموش ہو گیا۔ دل ہی دل میں سوچا یہ بات نبی ہی جان سکتا ہے۔

ارشاد ہوا: کیا تمھیں ہماری ناداری اسلام لانے سے روک رہی ہے؟ تم دیکھو گے کہ ایک قبیلہ کے بعد دوسرا قبیلہ ہماری اطاعت کرے گا۔ اے عدی! قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک قیصر و کسریٰ کے خزانے فتح نہ ہو جائیں۔

مَیں نے حیرانی سے پوچھا: کیا کسریٰ بن ہرمز کے؟ کیا کسریٰ بن ہرمز کے خزانے؟ آپ ﷺ نے دوبارہ فرمایا ہاں! کسریٰ بن ہرمز کے خزانے اور ہاں قیامت برپا نہ ہوگی جب تک کہ حیرہ سے ایک ہودج نشیں عورت تن تنہا سفر کر کے بیت اللہ کا طواف نہ کر لے۔ اسے سوائے اللہ کے کسی اور کا ڈر نہ ہوگا۔ اس وقت مَیں نے دل میں سوچا کہ قبیلہ طے کے راہ زن (ڈاکو) کہاں جائیں گے۔

اے عدی! قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی یہاں تک کہ ایک شخص صدقہ کی رقم کی تھیلی اُٹھائے اُٹھائے پھرے گا اور کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا یہاں تک کہ تنگ آ کر وہ اسے زمین پر دے مارے گا۔ عدی نے اسلام قبول کر لیا مدینہ میں ایک انصاری کے گھر میں قیام کیا۔ دن میں دو بار آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتے۔

حضرت عدیؓ بن حاتم کہتے ہیں کہ مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایک ہودج نشیں عورت حیرہ سے سفر پر نکلی اور تن تنہا کعبہ کا طواف کیا۔ میں خود اس لشکر میں شامل تھا جس نے مدائن پر حملہ کیا تھا اور مالِ غنیمت حاصل کیا۔ اللہ کی قسم! دو پیش گوئیاں اپنی آنکھوں سے پوری ہوتی دیکھ لیں تیسری بھی ضرور پوری ہوگی۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ تیسری بات حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ڈھائی سالہ عہد خلافت میں پوری ہوئی۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص مال اُٹھائے اُٹھائے محتاجوں کو تلاش کر رہا تھا مگر اسے کوئی ضرورت مند نہیں ملتا تھا آخر وہ اسے لے کر واپس گھر آ گیا۔

عدیؓ بن حاتم نے 68 ہجری میں 120 سال کی طویل عمر پا کر انتقال کیا۔ زمانہ ارتداد میں ثابت قدم رہے اور اپنے قبیلہ کو بھی اس فتنے سے روکے رکھا۔

(شاہ مصباح الدین شکیل

ماخوذ: سیرت احمد مجتبیٰ، جلد سوم)

إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

بسم الله الرحمن الرحيم

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دُعاءُ سَیِّدِ الاِسْتِغْفارِ

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ ۞ خَلَقْتَنِیْ وَاَنَا عَبْدُكَ
وَاَنَا عَلٰی عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ ۞ اَعُوْذُ بِكَ
مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ ۞ اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَیَّ ۞ وَاَبُوْءُ
بِذَنْبِیْ ۞ فَاغْفِرْ لِیْ فَاِنَّهٗ لَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّاۤ اَنْتَ ۞

بسم الله الرحمن الرحيم

فَإِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا إِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابوبکر عمر

محمد

عثمان علی

وما ارسلناك الا رحمة للعالمین

المؤمن يألف ويؤلف ولا خير فيمن لا يألف ولا يؤلف

١٤٠٩

عن عائشة رضي الله عنها أن رسول الله صلى الله عليه وسلم ۞ قال إن الله رفيق يحب الرفق ويعطي على الرفق ما لا يعطي على العنف وما لا يعطي على ما سواه ۞ وقالت عائشة قال رسول الله ﷺ إن الرفق لا يكون في شيء إلا زانه ولا ينزع من شيء إلا شانه ۞ وعن جرير عن النبي صلى الله عليه وسلم قال من يحرم الرفق يحرم الخير ۞ وقال إن الحياء من الإيمان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ

اتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بسم الله الرحمن الرحيم

قال رسول الله ﷺ

يسّروا ولا تعسّروا وبشّروا ولا تنفّروا

بسم الله الرحمن الرحيم

الله ولي التوفيق وهو نعم الرفيق

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من لزم السلطان افتتن

وما ازداد عبد من السلطان دنوا الا ازداد من الله بعدا

وعنه ما اسكر كثيره فقليله حرام صدق حبيب الله

بارھویں کتاب:

غزواتِ نبوی ﷺ

غزوات وسرایا

رسول کریم ﷺ ربیع الاول 13 نبوی میں ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان مکہ میں بے بسی اور کس مپرسی کی حالت میں تھے، اس لیے ہر قسم کے ظلم وستم برداشت کرتے رہے۔ لیکن مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ان میں قوت پیدا ہو گئی تو انھوں نے تلوار اُٹھالی۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مدینہ آنے کے بعد مسلمانوں کی مخالفت کے اسباب اور ان کے مخالفین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ مکہ میں اگر قریش کا ایک محاذ تھا تو مدینہ میں تین محاذ کھل گئے۔ ایک محاذ پر خود کفار قریش تھے جو حضور ﷺ کے مکہ سے صحیح وسالم محفوظ مقام پر نکل جانے پر سخت مضطرب تھے۔ دوسرے محاذ پر یہود تھے جو مدینہ پر رسول اکرم ﷺ کی آمد پر اوس وخزرج کے شیر وشکر ہونے پر اپنی معیشت کو تباہ ہوتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ تیسرا سب سے خطرناک محاذ ان دشمنان اسلام کا تھا جو منافق تھے۔ یہ لوگ بظاہر کلمہ گو تھے اور اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے تھے، لیکن ان کا سرغنہ عبداللہ بن ابی ابن سلول تھا جو یثرب کے تختِ شاہی پر بیٹھنے کا خواہش مند تھا، لیکن آنحضور ﷺ کے مدینہ تشریف لانے پر اس کا خواب ادھورا رہ گیا تھا۔ قریشِ مکہ نے یثرب کے تاج وتخت کے آرزومند بادشاہ کی نفسیاتی کیفیت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہا۔ چنانچہ انھوں نے رئیس المنافقین کو خط لکھا:

''تم نے ہمارے آدمی کو اپنے ہاں پناہ دی ہے۔ ہم قسم کھا کر اعلان کرتے ہیں کہ یا تو تم اسے قتل کر دو یا اپنے ہاں سے نکال دو، ورنہ ہم مدینہ پر حملہ کر دیں گے اور تمھیں فنا کر کے تمھاری عورتوں پر تصرف کریں گے۔''

انھی دنوں قبیلہ اوس کا ایک سردار سعد بن معاذ، جو ہجرت سے کچھ عرصہ پہلے اسلام لایا تھا، عُمرے کے لیے مکہ گیا تو کعبہ میں ابوجہل سے ملاقات ہو گئی۔ کہنے لگا کہ تم نے ایک مُرتد (خاکم بدہن) کو اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے۔ اگر تم امیہ بن خلف کے مہمان نہ ہوتے تو یہاں سے زندہ سلامت واپس نہ جاتے۔ سعد نے جواب دیا،

''ابوجہل، شرارتوں سے باز آ جاؤ، ورنہ ہم تمھارے تجارتی قافلوں کو حدودِ مدینہ سے گزرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔''

مدینہ میں متواتر خبریں آ رہی تھیں کہ قریش مدینے پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ مدت تک یہ حال رہا کہ حضور ﷺ رات کو جاگتے رہتے۔ یہی نہیں بلکہ صحابہ کرام ﷺ شب خون کے ڈر سے ہتھیار باندھ کر سویا کرتے۔ کاشانۂ نبوی ﷺ پر جاں نثار آٹھوں پہر پہرہ دیتے۔ صحابہ کرامؓ باری باری مدینہ کا حفاظتی گشت کرتے۔ چنانچہ ایسی ہی ایک رات جب خطرے کا زیادہ امکان تھا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دے۔'' چنانچہ ہونے والے فاتح ایران حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے نگہبانی کے فرائض سنبھال لیے۔ کبھی کبھی راتوں کو چیخ پکار سنائی دیتی۔ جب بھی ایسا واقعہ پیش آتا تو ساری بستی جاگ اٹھتی اور سب اپنی حفاظت کے لیے چوکس ومستعد ہو جاتے۔

ایک رات ایسی ہی خوف وہراس کی فضا تھی کہ آنحضور ﷺ نے حضرت ابوطلحہؓ کا ''مندوب'' نامی گھوڑا لیا اور گشت پر نکل گئے۔ عجلت اتنی تھی کہ گھوڑے پر زین کسنے کا بھی وقت نہ تھا۔ گشت سے واپس آ کر فرمایا، اپنے اپنے گھروں میں آرام سے سو جاؤ۔ ڈر اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ان حالات میں حفاظت خود اختیاری پر عمل کرنا ضروری تھا۔

حفاظت خود اختیاری کے علاوہ کچھ اور وجوہ بھی تھیں، جن کے باعث مہم جوئی اور تحریکی عمل ضروری تھا۔ آنحضور ﷺ نے مدنی زندگی کے دس برس میں کم وبیش 88 مہمات ترتیب دی تھیں، ان میں سے کچھ دعوتی اور تبلیغی تھیں، جیسے بئر معونہ، رجیع اور یمن کی مہمات۔ کچھ خالص دفاعی تھیں، جیسے بدر، اُحد اور احزاب کہ دشمن مدینے پر چڑھ آیا تھا اور حضور ﷺ کو تلوار اٹھانا پڑی تھی۔ کچھ اقتصادی تھیں جن کا مقصد قریش مکہ کو اقتصادی طور پر کمزور کرنا تھا اور اس کی واحد صورت یہ تھی کہ قریش کے تجارتی قافلوں کو، جو شام تک جاتے تھے، نواحِ مدینہ سے گزرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اس سلسلے میں حضور ﷺ نے کئی مہمات بھیجی تھیں۔ کچھ انسدادی مہمات تھیں۔ حضور ﷺ کا نظامِ اطلاعات اس قدر محکم ومکمل تھا کہ جہاں بھی کوئی سازش ہوتی، مدینے پر حملہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنتا یا قبائل آمادۂ پیکار ہوتے تو حضور ﷺ کو اطلاع مل جاتی اور آپ ﷺ فوراً کوئی مہم اس کی طرف بھیج دیتے۔ اس نوع کی مہمات چالیس سے کم نہ تھیں۔

سریہ اور غزوہ کا فرق

محدثین ومؤرخین نے ان دو اصطلاحوں کو حیاتِ طیبہ کے مدنی دور میں مخصوص معنوں میں استعمال کیا ہے۔

سریہ کے لغوی معنی قصد اور سیر کے ہیں۔ اصطلاحی معنی وہ فوجی مہم جس میں رسول اکرم ﷺ نے بذاتِ خود شرکت نہیں فرمائی، بلکہ اپنے صحابہؓ میں سے کسی کو امیرِ لشکر مقرر فرمایا۔ سریہ میں ایک یا زیادہ افراد بھی بھیجے گئے۔ اسے ''بعث'' بھی کہا جاتا ہے۔

ان الفاظ کو جنگ کا ہم معنی سمجھنا دُرست نہیں۔

غزوہ (جمع غزوات) اُس چھوٹے یا بڑے لشکر کو کہتے ہیں جس میں سرکارِ دوعالم ﷺ بہ نفس نفیس شریک ہوئے ہوں، خواہ اس سفر میں جنگ کی نوبت آئی ہو یا نہ آئی ہو، بلکہ خواہ اس لشکر کے پیش نظر جنگ کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو۔ انھیں مغازی بھی کہا جاتا ہے۔ خطیب بغدادی نے اپنی ''جامع'' میں اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں حضرت امام زین العابدین علی بن حسین بن امیر المومنین علیؓ سے روایت نقل کی ہے کہ ''ہمیں رسول اللہ کے مغازی یوں پڑھائے جاتے تھے، جیسے ہمیں قرآن کریم کی کوئی سورت پڑھائی جاتی تھی۔''

یہ دونوں محدثین اسماعیل بن محمد بن سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کرتے ہیں: ''اسماعیل فرماتے ہیں کہ میرے والد محمد بن سعد مجھے رسول ﷺ کے مغازی کی تعلیم دیتے تھے اور مغازی اور سریات کو گن گن کر ہمیں بتاتے تھے اور فرماتے، اے میرے نورِ نظر! یہ تمھارے آباؤ اجداد کا شرف ہے اور اس کے ذکر کو ضائع نہ کرنا تمھاری دنیا اور آخرت کی بھلائی ان مغازی کے جاننے میں ہے۔''

مغازی پر پہلی تصنیف

اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر علمائے اسلام نے اس موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ سب سے پہلے جسے یہ سعادت نصیب ہوئی، وہ حضرت زبیر بن عوامؓ کے فرزند حضرت عروہؓ تھے جو اپنے زمانے میں ائمہ کبار میں سے تھے۔ پھر ان کے دونوں شاگردوں موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن شہاب الزہری کو یہ شرف حاصل ہوا۔ امام مالکؒ فرمایا کرتے تھے کہ موسیٰ بن عقبہ کی غزوات کی کتاب تمام کتب مغازی سے صحیح تر ہے۔ جس کتاب کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی، وہ ابوبکر محمد بن اسحاق بن الیسار کی تالیف کردہ ''المغازی'' ہے۔ یہ کتاب درحقیقت ان تینوں کتابوں کی جامع ہے۔ ان اکابرین علم و فضل کے بعد ہر زمانے کے جیّد علما نے عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس موضوع پر کتب تصنیف کیں۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور یقیناً قیامت تک جاری رہے گا۔

غزوات و سرایا کی تعداد

مؤرخین نے سرایا کی تعداد 47 اور غزوات کی تعداد 27 بتائی ہے۔ ان میں سے نو غزوات ایسے ہیں جن میں حضور ﷺ نے قتال کیا، یعنی بدر، اُحد، اَحزاب، قریظہ، مصطلق، خیبر، فتح مکہ، حنین اور طائف۔ باقی اٹھارہ غزوات میں تلوار کا استعمال نہیں ہوا۔ ان غزوات میں جُملہ 1048 افراد کام آئے، جن میں مسلمان شہدا کی تعداد 125 اور کفار کے 923 آدمی قتل ہوئے۔

لشکر کی تعداد

قسطلانی نے ''فتح الباری'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ سریہ ایک سو سے پانچ سو افراد پر مشتمل ہوتا تھا۔ 500 سے زائد کے لشکر کو منسر کہتے تھے۔ اگر تعداد 800 سے زیادہ ہوتی تو جیش کا نام دیا جاتا تھا۔ اس کے پانچ حصے ہوتے جو مقدمہ، قلب، میمنہ، میسرہ اور عقبہ پر مشتمل ہوتے۔ ایسا جیش جو منتشر نہ ہو بلکہ جمع ہو تو کتیبہ کہلاتا۔ جیش عظیم کو خمیس کے نام سے پکارتے تھے۔ اگر لشکر کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہوتی تو اسے جحفل کہتے۔

اسلامی علم

جنگ کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ جس غزوے میں حضور ﷺ خود تشریف لے جاتے تو اس کی کمان اپنے ہاتھ میں رکھتے اور علم دوسروں کو عطا فرماتے تھے۔ جب کوئی سریہ روانہ فرماتے تو کمان کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی اور علم کسی اور کو عطا ہوتا۔ موتہ کی مہم کے وقت اس صورتِ حال پر عمل نہیں کیا گیا، کیوں کہ لشکر، شام کے دُور دراز مقام پر روانہ کیا گیا تھا۔ مقابلہ ایک نئی قوم یعنی عیسائیوں سے تھا۔ اس موقع پر حضرت زیدؓ بن حارثہ کو امیرِ لشکر مقرر فرمایا اور انھی کو علم بھی عطا فرمایا۔ اب انھیں اختیار تھا کہ علم خود رکھیں یا کسی اور کے سپرد کر دیں۔ یہ ایک استثنائی صورت تھی۔ اس کے سوا ہر غزوہ اور سریہ میں سپہ سالار اور علم بردار جُدا جُدا ہوتے تھے۔ علم بردار کا کام علم کو بلند رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہوتا، اس لیے کہ علم کو بلند دیکھ کر لشکر ڈٹا رہتا۔ لشکر آگے بڑھتا تو علم بردار بھی پیش قدمی کرتا۔

علم اور لوا جھنڈے کو کہتے ہیں۔ علم وہ ہے جو کُھلا رہے اور ہوا میں لہراتا نظر آئے۔ اس کے علاوہ وہ پرچم جو امیر کی قیام گاہ پر بطور علامت لہرایا جاتا تھا، وہ بھی علم ہی کہلاتا تھا۔ ابوبکر ابن عربی نے لکھا ہے کہ لوا وہ جھنڈا ہے جو نیزے کے ساتھ باندھ کر لپیٹ لیا جائے۔ لوا قابل اعتماد آدمی کو عطا کیا جاتا تھا۔

(1) سریہ سیف البحر

یہ واقعہ ہجرت سے سات ماہ بعد، رمضان، پہلی ہجری کا ہے۔

حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام سے آرہا ہے۔ چونکہ آپ ﷺ یہ طے کر چکے تھے کہ قریش کی اقتصادی قوت کو توڑنا مسلمانوں کے مفاد میں ہے اس لیے آپ ﷺ نے اپنے عمِ محترم حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کو تیس مہاجرین کا ایک دستہ دے کر ساحل کی طرف بھیجا۔ مجاہد سفر پر روانہ ہونے لگے تو رسول کریم ﷺ نے ایک نیزے پر ایک سفید کپڑا باندھا اور یہ پرچم سپہ سالار حضرت امیر حمزہؓ کو عطا فرمایا۔ اوّلین جنگی پرچم کے ہاتھ میں آتے ہی رسول اللہ ﷺ کے چچا جُھوم اٹھے۔ انھوں نے دورانِ سفر میں یہ پرچم حضرت ابومرثدؓ بن حصین غنوی کے حوالے کیا جو ابتدائی ایمان لانے والوں میں سے ہیں۔ عیص کے قریب سیف البحر میں ان کی قریش کے قافلے والوں سے مڈبھیڑ ہوئی۔ ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ دشمن نے اپنی صفیں دُرست کیں تو تیس مجاہدوں نے بھی قطاریں باندھ لیں۔ ایک اور دس کا مقابلہ تھا۔ حضرت امیر حمزہؓ اور ان کے ساتھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لیے سرفروشی کے جذبے سے سرشار تھے۔ ابوجہل اور اس کے نگہبان مالِ تجارت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف تھے۔

علاقے کے قبائلی سردار مجدی بن عمرو کو جب یہ خبر پہنچی تو دوڑا دوڑا آیا۔ اگر وہ بیچ

بچاؤنہ کرتا تو لڑائی چھڑ جاتی۔ وہ قریش کا قدیمی حلیف تھا، لیکن مدینے کی قربت کی وجہ سے مسلمانوں سے بھی تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بڑی دانائی سے کہا: ''میرے لیے قریش اور مسلمان دونوں برابر ہیں اور دوست ہیں۔'' ابوجہل نے مجدی کے فیصلے کو قبول کرلیا اور مکہ کی راہ لی۔

حضرت امیر حمزہؓ نے مجدی کی بات مان کر اس سے غیر جانب داری کا معاہدہ کیا۔ یہ مدینے کے باہر مسلمانوں کا پہلا سیاسی معاہدہ ہے۔ مجدی بن عمرو پہلا حکمران تھا جس نے مدینے کی مملکت کی آزادی اور خودمختاری کو تسلیم کیا۔

(2) سریہ رابغ

یہ مہم اگلے ماہ شوال میں وادی رابغ کی طرف روانہ کی گئی۔ اس مہم کا مقصد بھی قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنا تھا۔ اس میں ساٹھ مہاجر صحابہؓ شامل تھے اور اس کی سیادت حضرت ابوالحارث عبیدہؓ بن حارث بن المطلب کے سپرد تھی۔ جو حضور ﷺ سے دس سال بڑے تھے۔ جب یہ لوگ احیا کنوئیں پر پہنچے تو سامنے سے کارواں نمودار ہوا جس کا قائد ابوسفیان بن حرب تھا۔ اور اس کے ہم راہ دو سو محافظ بھی تھے۔ طرفین نے ایک دوسرے پر تیر تو چلائے لیکن تلوار کا استعمال نہ کیا۔ اس مہم کا علم حضرت مسطح بن اثاثہ بن المطلب بن عبد مناف کے پاس تھا جو حضرت ابوبکرؓ کے خالہ زاد بھائی تھے۔

(3) سریہ خرار

یہ مہم آئندہ ذی القعدہ میں بھیجی گئی تھی۔ اس میں صرف بیس مہاجر صحابہؓ تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص (بعد میں فاتح ایران) اس کے قائد تھے۔ علم حضرت مقدادؓ بن عمرو البہرانی کے پاس تھا۔ یہ لوگ حجاز کی ایک وادی خرار تک گئے یہ وادی مدینہ سے کوئی پچاس میل جنوب مغرب میں جُحفہ کے قریب تھی۔ لیکن کاروان نظر نہ آیا اور واپس آگئے۔

(4) غزوۂ ابواء

اسے غزوۂ ودان بھی کہتے ہیں۔ صفر ۲ھ میں حضور صلعم، ساٹھ مہاجرین کے ہم راہ مدینہ سے نکلے۔ مقصد قریش کی شامی تجارت کو بند کرنا تھا۔ آپ ﷺ مدینے سے نکل کر کوئی 80 میل جنوب مغرب میں ابواء تک گئے۔ یہ ایک پہاڑ کا نام ہے جو جُحفہ سے 13 میل دُور تھا۔ یہیں حضور ﷺ کی والدہ حضرت آمنہؓ مدفون ہیں۔ روایات میں ہے کہ حضور ﷺ کے والد حضرت عبداللہ ایک تجارتی سفر میں فوت ہوئے تھے اور مدینہ میں دفن تھے۔ حضرت آمنہؓ ہر سال ان کی قبر پر جایا کرتی تھیں۔ وہ ایک ایسے ہی سفر سے واپس آرہی تھیں کہ وفات پا گئیں اور ابوا میں دفن ہوئیں۔

اس مہم میں حضور ﷺ کی نیابت (مدینہ میں) کے فرائض حضرت سعد بنؓ عبادہ نے سرانجام دیئے تھے۔ علم حضرت حمزہؓ کے پاس تھا آپ ﷺ کارواں کو نہ پا سکے اور پندرہ دن کے بعد لوٹ آئے۔

(5) غزوۂ بُواط

یہ غزوۂ ہجرت کے تیرہ ماہ بعد ربیع الاول دو ہجری میں پیش آیا۔ بُواط مدینہ سے کوئی پچاس میل دور مغرب کی طرف پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ینبع سے ایک منزل مشرق میں، یہ بھی جُہینہ (قبیلہ) کی ملکیت تھا۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک کارواں جس میں اڑھائی ہزار اُونٹ ہیں، اور جس کی حفاظت امیہ بن خلف اور سَو دیگر آدمی کر رہے ہیں، شام سے آرہا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ دو سو صحابہؓ کو لے کر نکل پڑے۔ حضرت سعدؓ بن معاذ کو نائب مقرر کیا اور علم حضرت سعد بنؓ ابی وقاص کے ہاتھ میں دیا۔ آپ ﷺ بُواط تک گئے لیکن کارواں کو نہ پا سکے اور واپس آگئے۔

(6) غزوۂ سفوان

یہ واقعہ بھی ربیع الاول 2 ہجری میں پیش آیا تھا۔ مکہ کا ایک مہم جُو کُرز بن جابر مدینہ کی چراگاہوں سے بہت سے مواشی ہانک کر بھاگ گیا تھا۔ حضور ﷺ اس کی تلاش میں سوادِ بدر کی ایک وادی سفوان تک گئے تھے لیکن اسے نہ پا سکے۔ حضور ﷺ نے زیدؓ بن حارثہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر کیا تھا اور علم حضرت علیؓ کے سپرد تھا۔ یہ غزوۂ بدر اولیٰ کہلاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد کُرز بن جابر اسلام لے آیا۔ فتح مکہ کے دن بھٹک کر غلط راستے پر نکل گیا اور ایک مُشرک نے اُسے مار ڈالا۔

(7) غزوۂ ذی العشیرہ

جمادی الاول، دو ہجری۔ ذوالعشیرہ مدینہ کے مغرب میں ساحل کی طرف ینبع کے قریب ایک موضع تھا۔ یہاں حضور ﷺ ایک تجارتی قافلے کو روکنے کے لیے گئے تھے۔ آپ ﷺ کے ہم راہ ڈیڑھ دو سو مہاجر صحابہؓ تھے۔ فرائض نیابت حضرت ابوسلمہؓ بن عبدالاسد المخزومی کے سپرد تھے۔ علم حضرت حمزہؓ کے حوالے تھا۔ سواری اور بار برداری کے لیے تیس اونٹ بھی تھے۔ آپ ﷺ قافلہ کو نہ پا سکے اور واپس آگئے۔

(8) سریہ نخلہ

رجب 2ھ میں حضور ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن جحش کو آٹھ مہاجر صحابہ کے ہم راہ نخلہ کی طرف بھیجا۔ حضرت عبداللہؓ ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے۔ ہجرت حبشہ میں شامل ہوئے۔ ان کی بہن زینب بنت جحش حضور ﷺ کے نکاح میں تھیں۔ آں حضور ﷺ نے ایک خط بھی لکھ کر دیا اور ہدایت فرمائی کہ اس خط کو دو دن کے بعد کھولنا اور کسی ہم راہی کو ساتھ جانے پر مجبور نہ کرنا۔ جب دو دن کے بعد حضرت عبداللہؓ نے وہ خط کھولا تو اس میں تحریر تھا:

''تم برابر چلتے جاؤ اور مکہ و طائف کے مابین نخلہ میں جا کر قیام کرو۔ وہاں قافلے کا انتظار کرو اور حالات سے ہمیں اطلاع دیتے رہو۔''

خط پڑھ کر حضرت عبداللہؓ نے ساتھیوں سے کہا کہ تم میں سے جو چاہے واپس چلا جائے۔ سب نے آگے جانے پر اصرار کیا۔ جب وہاں پہنچ کر مقیم ہوگئے تو انھیں قریش کا ایک چھوٹا سا کارواں نظر آیا۔ چونکہ رجب میں جنگ ممنوع تھی۔ اس لیے سب سوچنے لگے کہ کیا کیا جائے۔ بالآخر انھوں نے حملے کا فیصلہ کیا اور لڑائی چھڑ گئی۔ چنانچہ واقد بن عبداللہ کے تیر سے قافلے کا ایک اہم رکن عمرو بن الحضرمی مارا گیا دو دیگر

ارکان یعنی عثمان بن عبداللہ بن المغیرہ اور حکم بن کیسان کو گرفتار کر لیا اور ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ جب یہ مہم مدینہ میں واپس آئی اور حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے شہر حرام میں جنگ کی ہے تو آزردہ خاطر ہو گئے اور وحی کے آنے تک مالِ غنیمت کی تقسیم روک دی۔ سورۂ بقر کی آیت 21 نازل ہوئی:

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ﴾ (البقرہ 217:2)

''(اے رسول! یہ لوگ آپ ﷺ سے شہر حرام میں جنگ کرنے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہیے کہ اس میں لڑنا ایک بڑا گناہ ہے لیکن اللہ کی راہوں سے روکنا، اس کا انکار کرنا، مسجد حرام میں داخل ہونے سے روکنا اور اس سے وہاں کے رہنے والوں کو نکال دینا اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔ یاد رکھیے کہ فتنہ (شرارت، ایذا، سازش) قتل سے بھی بدتر جرم ہے)''

چند روز بعد اہل مکہ نے عثمان و حکم کا فدیہ بھیجا لیکن حضور ﷺ نے فرمایا کہ دو آدمی یعنی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص اور حضرت عتبہؓ بن غزوان ابھی تک واپس نہیں آئے۔ مجھے خطرہ ہے کہ یہ کہیں تمھارے ہاتھ نہ لگ گئے ہوں۔ میں ان کے آنے پر قیدیوں کا فیصلہ کروں گا۔ چنانچہ ایک آدھ دن کے بعد یہ دونوں پہنچ گئے تو حضور ﷺ نے قیدیوں کو زرفدیہ لے کر چھوڑ دیا۔

جو قتل و گرفتار ہوئے وہ بڑے خاندانوں کے لوگ تھے۔ مقتول عَمر و عبداللہ الحضرمی کا بیٹا تھا۔ جو امیر معاویہ کے دادا حرب بن اُمیہ کا حلیف تھا۔ (اصابہ: ترجمہ علاء الحضرمی) عثمان بن مغیرہ (حضرت خالد کا دادا اور ولید کا والد) کا پوتا تھا جو حرب بن اُمیہ کے بعد دوسرے درجے کا رئیس شمار ہوتا تھا۔ حکم بن کیسان، خالد بن ولید کے بھائی ہشام بن ولید بن مغیرہ کا مولیٰ (آزاد کردہ غلام یا پناہ جُو) تھا۔

اس واقعہ نے قریش کو سخت مشتعل کر دیا اور وہ انتقام لینے پر تُل گئے۔ بدر، اُحد اور اَحزاب کے حملے اسی واقعہ کا نتیجہ تھے۔ کہتے ہیں کہ عمرو بن عبداللہ الحضرمی پہلا مقتول ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اور یہ پہلا مالِ غنیمت تھا جو مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

(9) غزوۂ بدر

بدر دراصل ایک کنویں کا نام تھا جو اس نواح کے ایک سردار بدر بن حارث یا بدر بن کلدہ نے کھدوایا تھا۔ لیکن بعد میں یہ ساری وادی بدر کے نام سے مشہور ہو گئی۔ یہ وادی مدینہ سے کوئی اسی میل جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ آج کل وہاں ایک اچھا خاصا گاؤں آباد ہے جس میں کئی سو مکان اور دو مسجدیں ہیں، جن میں سے ایک جامع کہلاتی ہے اور عین اس جگہ تعمیر ہوئی ہے جہاں غزوۂ بدر کے موقعے پر حضور ﷺ کے لیے ایک جھونپڑی بنائی گئی تھی اور گرد دور تک نخلستان ہیں۔

بدر ایک بیضوی شکل کا میدان ہے۔ کوئی ساڑھے پانچ میل لمبا اور تقریباً چار میل چوڑا، اطراف میں بلند پہاڑ ہیں۔ مکہ، شام اور مدینہ جانے کے راستے جو وادیوں میں سے گزرتے ہیں، یہیں ملتے ہیں۔ ترکی دور میں شریف عبدالمطلب نے اس میدان میں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا تھا، مگر اب وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ یہ میدان سنگلاخ یا ریتلا ہے، مگر جنوب مغربی حصے کی زمین نرم ہے۔ جنگ بدر کے دن بارش ہوئی تھی تو یہ مقام، جہاں قریش کا پڑاؤ تھا، دلدل بن گیا تھا، مگر اب یہاں سرسبز نخلستان ہے۔

بدر کے اطراف میں جو پہاڑ ہیں، ان کے مختلف حصوں کے نام مختلف ہیں۔ ان میں سے دُور دُور سے سفید ریت کے تودے نظر آتے ہیں۔ آج بھی ان سفید پہاڑوں میں سے ایک کا نام ''العدوۃ الدنیا'' اور دوسرے کا ''العدوۃ القصویٰ'' ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو بہت اونچا پہاڑ ہے، اسے اب جبل اسفل کہتے ہیں، کیوں کہ اس کے پیچھے دس بارہ میل پر سمندر ہے اور ابوسفیان کا قافلہ راستہ کترا کر ساحل کے کنارے کنارے گزر گیا تھا تو قرآن میں اس کا ذکر ''والرکب اسفل منکم'' (کاروان تم سے نیچے تھا) کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔

(''عہدِ نبوی کے میدان جنگ'' از ڈاکٹر محمد حمید اللہ، صفحہ 86)

حضور ﷺ کو مخبروں نے اطلاع دی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ جس میں ایک ہزار اُونٹ اور تقریباً پانچ چھے لاکھ درہم کا سامان ہے۔ شام کی طرف سے آ رہا ہے۔ آپ اس قافلے کو روکنے کے لیے 12 رمضان 2ھ کو 313 صحابہ کے ہمراہ مدینہ سے نکلے۔ حضرت عمرؓو بن اُم مکتوم کو اپنا نائب مقرر کیا۔ ان صحابہ میں 74 مہاجرین تھے اور باقی انصار۔ اس جیش میں چار علم تھے۔ رسول اکرم ﷺ کا علم حضرت علیؓ کے پاس تھا۔ مہاجرین کا حضرت مصعبؓ بن عمیر، خزرج کا حضرت خبابؓ بن منذر اور اوس کا حضرت سعدؓ بن معاذ کے پاس۔ گھوڑے صرف دو تھے اور اونٹ ستر۔ جب طرفین کی صفیں آراستہ ہو گئیں تو سب سے پہلے مسلمانوں کی طرف سے حضرت مہجعؓ نکلے اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ اس جنگ میں شہادت پانے والوں کی تعداد 14 تھی۔ چھے مہاجرین اور آٹھ انصار۔

دوسری طرف قریش کا لشکر 950 بہادروں پر مشتمل تھا۔ ان کے ساتھ سات سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے۔ بااین ہمہ ان کے ستر آدمی، جن میں ابوجہل، ولید بن عتبہ اور حنظلہ بن ابوسفیان جیسے سردار شامل تھے، مارے گئے اور ستر اسیر ہوئے۔ ان میں حضور ﷺ کے چچا عباسؓ اور خالد بن ولیدؓ کے بھائی ولید بن ولید شامل تھے۔ یہ تصادم جمعہ کے دن 17 رمضان 2ھ کو ہوا تھا۔ اور حضور ﷺ 22، 23 رمضان کو مدینہ واپس آئے تھے۔

(10) غزوۂ بنی قینقاع

شوال، 2 ہجری۔ مدینہ میں یہود کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ، یہ سب کے سب مدینہ کے حوالی میں رہتے تھے اور ان کا گزارہ تجارت، صناعی (زرگری و آہن گری) اور زراعت پر تھا۔ قینقاع زرگری کا کام کرتے تھے (اور اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ کے ذخائر بھی پاس رکھتے تھے) گو حضور ﷺ نے مدینہ

آتے ہی اوس، خزرج اور یہود سے ایک معاہدہ کر لیا تھا جس کی رُو سے انھیں یہ ضمانت دی گئی تھی کہ:

''جو یہود مسلمانوں سے تعاون کریں گے ان کی مدد کی جائے گی۔ اگر وہ ظلم کریں گے تو انھیں تنبیہ کی جائے گی۔ اور ہم ان کے خلاف کسی اور کی مدد نہیں کریں گے...... جنگ کی صورت میں یہود مسلمانوں کو مالی مدد دیں گے...... اور یہود کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔......''

لیکن یہود نے جلد ہی اس معاہدہ کی خلاف ورزی شروع کر دی اور اس سلسلے میں کئی ناگوار قدم اٹھائے۔ مثلاً:

الف:...... حضور ﷺ کی آمد سے پہلے یہود سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان طاقت ور ہو رہے ہیں تو پراپیگنڈا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہنے لگے۔

ب:...... یہ لوگ جب حضور ﷺ کی مجلس میں جاتے تو السلام علیکم کی بجائے ''السام علیکم'' (تم پر موت) کہتے۔ (یہ واقعہ صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں منقول ہے)

ج:...... مسلمانوں میں مایوسی وبددلی پھیلانے کے لیے صبح کو ایمان لاتے اور شام کو لوٹ جاتے۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾

(آل عمران 72:3)

''(اہل کتاب (مراد یہود) کا ایک طبقہ کہے گا کہ قرآن پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو پھر جاؤ تاکہ مسلمان بھی (بددل ہو کر) اسلام سے بھاگ جائیں)''

د:...... انھوں نے مسلمانوں کی طاقت توڑنے کے لیے اوس وخزرج کو باہم لڑانا چاہا۔

ھ:...... یہ قریش مکہ سے مل کر سازشیں کرنے لگے اور ان کی شرارتوں میں اس قدر اضافہ ہو گیا کہ حضور ﷺ کو اپنی جان کا خطرہ پڑ گیا۔

و:...... یہود کے اشتعال کا باعث اولاً غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی معجزانہ فتح تھی۔ اس سے قریش کا زور ٹوٹ گیا تھا اور مسلمانوں کی قوت بڑھ گئی تھی۔ ثانیاً وحی الٰہی یہود کی اخلاقی کمزوریوں کو کھول کھول کر بیان کر رہی تھی کہ یہ جھوٹ بولتے، حرام کھاتے۔ اپنی الہامی کتابوں کو بگاڑتے۔ خیانت سے کام لیتے۔ انبیا کو قتل کرتے اور حضرت مریمؑ پر افترا باندھتے ہیں۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ ابن سعد نے طبقات میں غزوۂ بنی قینقاع کے ذیل میں لکھا ہے:

''واقعہ بدر کے بعد یہود کے بغض وحسد میں اضافہ ہو گیا اور ان لوگوں نے عہد کو توڑ ڈالا۔''

ز:...... کعب بن اشرف مدینہ کا مشہور شاعر تھا۔ اصلاً یہ قبیلہ طے سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کا باپ مدینہ میں آ کر بنونضیر کا حلیف بن گیا تھا۔ اس نے ایک یہودی لڑکی سے شادی کر لی تھی اور کعب اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اسے اسلام سے اس حد تک عداوت تھی کہ جب بدر میں بڑے بڑے سردارانِ قریش ہلاک ہو گئے تو یہ تعزیت کے لیے مکہ میں گیا اور مدتوں کشتگانِ بدر کے مرثیے لکھ کر قریش کو انتقام کے لیے اُکساتا رہا۔ اس نے خود بھی حضور ﷺ کو ہلاک کرنے کی سازش کی تھی۔ اس کے اشعار نے بنوقینقاع کے دلوں میں مزید نفرت بھر دی اور وہ اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے شب وروز سازشیں کرنے لگے۔

ح:...... ان کے اقتصادی مظالم حد سے بڑھ چکے تھے۔ یہ بھاری شرح سُود پر قرض دے کر سب کچھ لوٹ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ بچوں اور عورتوں کو رہن رکھ لیتے تھے۔

ط:...... یہ آگ دہک ہی رہی تھی کہ ایک واقعہ نے اسے بھڑکا کر شعلۂ جوالہ بنا دیا۔ ہُوا یوں کہ ایک مسلم خاتون ایک یہودی کی دکان پر سودا لینے گئیں۔ چند نوجوان یہودیوں نے مل کر اس کی بے حُرمتی کی۔ اس پر ایک مسلمان نے اس دکان دار پر حملہ کر کے اُسے مار ڈالا اور یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ حضور ﷺ اس پر بھی مشتعل نہ ہوئے بلکہ خود چل کر یہودیوں کے ہاں گئے اور انھیں پُرامن رہنے کی تلقین کی۔ انھوں نے جواباً حضور ﷺ کی توہین کی اور بدزبانی سے کام لیا۔

جنگ

اب حضور ﷺ کے پاس جنگ کے سوا کوئی اور صورت باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ آپ ہفتے کے دن نصف شوال 2ھ کو صحابہؓ کا ایک دستہ لے کر محلہ قینقاع کی طرف بڑھے۔ حضرت ابولبابہؓ کو اپنا نائب مقرر کیا۔ علم حضرت حمزہؓ کے ہاتھ میں دیا اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ روز کے بعد یہود نے پیش کش کی کہ مسلمان ان کے مال میں سے جو چاہیں لے لیں۔ لیکن انھیں بال بچوں سمیت مدینہ سے جانے کی اجازت دے دیں۔ حضور ﷺ نے یہ پیش کش منظور فرمالی اور ان کے مال ومتاع سے اشیائے ذیل لے لیں:

1: تین کمانیں یعنی کُتوم، رَوحا اور بیضا۔
2: دو زرہیں: صُغدیہ اور فُضّہ۔
3: تین تلواریں: قلعی، بتار، اور تیسری کا نام معلوم نہیں۔
4: تین نیزے۔

اس کے بعد وہ لوگ مدینہ کو چھوڑ کر خیبر، فدک اور تیماوغیرہ کی طرف نکل گئے۔

(11) غزوۂ سَویق

ذی الحجہ، 2ہجری۔ سَویق کے معنی ہیں ستّو۔ بات یُوں ہوئی کہ شکستِ بدر کے بعد ابوسفیان نے قسم کھائی تھی کہ وہ اس شکست کا انتقام لینے سے پہلے نہ تو بیوی کے قریب جائے گا، نہ بالوں کو تیل لگائے گا۔ چنانچہ وہ دو سو شتر سواروں کے ساتھ مدینے پر بڑھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہود اس کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔ چنانچہ وہ پہلے بنونضیر کے ایک سردار حُیی بن اخطب کے ہاں گیا۔ لیکن اس نے دروازہ نہ کھولا۔ پھر

بنونضیر کے ایک اور سردار سلام بن مشکم کے پاس آیا۔ اس نے پُر جوش استقبال کیا۔ شراب پلائی، پُر تکلف ضیافت کی اور مسلمانوں کے متعلق ہر بات بتائی۔ چنانچہ اسے مسلمانوں کو للکارنے کی جُرأت نہ پڑی اور واپسی کا ارادہ کر لیا۔ مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مقام عُریض کہلاتا تھا وہاں ایک نخلستان میں دو مسلمان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ ابوسفیان نے ان دونوں کو قتل کر دیا اور پھر ڈر سے بھاگ نکلا اور اُونٹوں کو ہلکا بنانے کے لیے ستو کے تھیلے راہ میں پھینکتا گیا۔ اسی مناسبت سے یہ مہم غزوۂ سَویق کے نام سے مشہور ہوگئی۔

جب حضور ﷺ تک یہ اطلاع پہنچی تو آپ ﷺ 5 ذی الحجہ 2ھ کو اَسّی صحابہؓ کے ہم راہ ابوسفیان کی تلاش میں نکلے۔ دُور تک اس کا تعاقب کیا۔ لیکن وہ نہ ملا اور آپ پانچ دن کے بعد واپس آ گئے۔ آپ ﷺ کی غیر حاضری میں نیابت کے فرائض حضرت ابولبابہؓ بن عبدالمنذر نے سرانجام دیئے تھے۔

(12) غزوۂ قرقرۃ الکُدر

محرم 3 ہجری۔ اسے بعض مؤرخین نے غزوۂ بنوسلیم بھی لکھا ہے۔

حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ عرب کے دو اہم قبیلے سلیم اور غطفان اُرحضیہ کے قریب ایک موضع قرقرۃ الکدر میں، جو مدینہ سے کوئی اسی میل دور تھا، جمع ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے انھیں سزا دینے کا فیصلہ فرمایا اور دو سو صحابہؓ کے ہم راہ 14، 15 محرم 3ھ کو مدینے سے روانہ ہوئے۔ علَم حضرت علیؓ کے پاس تھا۔ حضرت عبداللہؓ بن امّ مکتوم کو بطور نائب پیچھے چھوڑا۔ آپ ﷺ تین چار روز کے بعد منزل پر جا پہنچے۔ لیکن وہاں دشمن کا نشان تک نہ تھا۔ وہاں صرف ان کے اُونٹ تھے جو صحرا میں چر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہی اُونٹ ان کی سواریاں ہیں جن پر چڑھ کر وہ مدینے پر حملہ کر سکتے ہیں، اس لیے انھیں ہانک کر لے چلو۔ چنانچہ وہ انھیں ہانک لائے، اور حضور ﷺ نے بیت المال کے لیے ایک سَو اونٹ رکھ کر باقی چار سو ہم راہیوں میں بانٹ دیئے اور ہر ایک کو دو دو اونٹ مل گئے۔

(13) غزوۂ بنوسُلیم

محرم 3 ہجری۔ اسے غزوۂ بحران بھی کہتے ہیں۔

مدینہ سے کوئی پچاس میل جنوب مشرق میں ایک مقام فُرع کہلاتا تھا اور اس کے قریب ہی ایک اور موضع بحُران کے نام سے مشہور تھا۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنوسُلیم بحران میں جمع ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ ابن اُمِ مکتوم کو نائب بنا کر 16 محرم 3ھ کو تین سو صحابہؓ کے ہم راہ روانہ ہوئے۔ منزل پر پہنچے تو وہاں کسی لشکر کا نشان نہ تھا۔

(14) غزوۂ غطفان

ربیع الاول، 3 ہجری۔ غزوۂ کُدر کے بعد حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ نجد کے دو قبیلے ثعلبہ اور محارب، جو غطفان کی شاخیں تھیں، ذوامر میں جمع ہو رہی ہیں۔ بنو محارب کے رئیس دُعثور بن حارث اس اجتماع کے قائد و محرک ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ 12 ربیع الاول 3ھ کو 450 صحابہؓ کے ہم راہ مدینہ سے نکلے اور حضرت عثمانؓ بن عفان کو بطور نائب پیچھے چھوڑ گئے۔ جب ان قبائل کو آپ ﷺ کی آمد کا علم ہوا تو پہاڑوں میں بھاگ گئے۔ آپ ﷺ وہاں دن کے وقت ایک درخت کے نیچے آرام فرما رہے تھے کہ دبے پاؤں دُعثور وہاں جا پہنچا۔ تلوار سونت کر حضور ﷺ کے سر پر کھڑا ہو گیا اور بلند آواز سے کہنے لگا: بتا اے محمد! تجھے اب مجھ سے کون بچائے گا؟ حضور ﷺ نے بے ساختہ جواب دیا: اللہ۔ جبریلؑ نے دُعثور کے سینے میں اس زور سے دو ہتڑ رسید کیا کہ اس کی تلوار گر گئی جسے حضور ﷺ نے فوراً اٹھا کر پوچھا: بتا اب تجھے کون بچائے گا؟ کہنے لگا: کوئی نہیں اور ساتھ ہی کلمہ پڑھ کر اسلام لے آیا۔ حضور ﷺ وہاں کچھ دیر ٹھہرے اور پھر کسی تصادم کے بغیر واپس چلے گئے۔

(15) سریہ محمد بن مسلمہؓ

قتل کعب بن اشرف یہودی 14 ربیع الاول، 3 ہجری۔ کعب بن اشرف یہودی رسول کریم ﷺ کو سخت تکلیف دیتا تھا۔ مدینہ میں جب فتح بدر کی خوش خبری پہنچی تو اس یہودی کو سخت صدمہ ہوا اور کہا کہ اگر یہ خبر صحیح ہے کہ مکہ کے بڑے بڑے سردار اور اشراف مارے گئے ہیں، تو پھر زمین کی پشت سے زمین کا بطن بہتر ہے (یعنی جینے سے مرنا بہتر ہے) تاکہ اس ذلت اور رُسوائی کو آنکھیں نہ دیکھیں، اور جب اس خبر کی تصدیق ہوگئی تو مقتولین بدر کی تعزیت کے لیے مکہ روانہ ہوا۔

مکہ پہنچ کر اس نے اہل مکہ کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ وہ جگہ جگہ مقتولین بدر کے مرثیے پڑھتا اور لوگوں کو رُلاتا۔ اس نے قریش کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف آتش انتقام بھڑکانے کے بعد قبائل کا دورہ کیا اور انھیں لڑائی پر اُکسایا۔ پھر مدینہ واپس آ کر مسلمان عورتوں کے متعلق حسب سابق عشقیہ اشعار کہنے شروع کیے اور آنحضور ﷺ کی ہجو لکھی۔

آنحضور ﷺ کو اس یہودی کی حرکات سخت ناپسند تھیں۔ مسلمان بھی اس سے حد درجہ نفرت کرتے تھے۔ چنانچہ محمد بن مسلمہؓ، عباد بن بشرؓ، حارث بن اوسؓ، ابوعبیس بن جبرؓ اور ابونائلہ سلکان بن سلامہؓ اُس کے قتل پر تیار ہوئے اور حضور ﷺ سے اجازت چاہی۔ آپ ﷺ نے اجازت فرمائی اور صحابہؓ کو رخصت کرنے کے لیے بقیع الفرقد تک ان کے ساتھ تشریف لے گئے۔

ان صحابہؓ میں سے ابونائلہ، کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے۔ پہلے ابونائلہ تنہا اس کے دروازے پر پہنچے اور آواز دے کر اُسے بلایا۔ جب وہ بالا خانے پر آیا تو ابونائلہ نے اس پر یہ ظاہر کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ سے منحرف ہو گئے ہیں اور تمھارے پاس غلّہ قرض لینے آئے ہیں۔ کعب یہ سُن کر بہت خوش ہوا، مگر غلّہ قرض دینے کے عوض کوئی چیز رہن رکھنے کو کہا۔ آخر وہ ہتھیار رہن رکھنے پر راضی ہو گیا۔ اس طرح ابونائلہ اپنے ساتھیوں کو مسلح اس کے مکان تک لے جانے میں کام یاب ہوگئے۔

جب یہ لوگ وہاں پہنچے اور اسلحہ لینے کے لیے کعب نیچے آیا تو ابونائلہ نے اسے پکڑ لیا۔ دوسرے ساتھیوں نے قتل کیا اور اس یہودی کا سر آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر حضور ﷺ کے سامنے ڈال دیا۔ آخر شب تھی اور حضور ﷺ نماز پڑھ

رہے تھے۔ آپ ﷺ نے یہودی کا سر دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ حضرت حارث بن اوسؓ اپنے ہی ساتھیوں میں سے کسی کی تلوار سے زخمی ہو گئے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے لعاب دہن لگایا، جس سے وہ اچھے ہو گئے۔

اسی رات یہودیوں کو کعب بن اشرف کے قتل کا علم ہو گیا، جس کے باعث وہ سخت مرعوب اور خوف زدہ ہو گئے۔ جب صبح ہوئی تو یہود کی ایک جماعت آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اپنے سردار کے اس طرح قتل ہو جانے پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتا اور لوگوں کو ہمارے خلاف قتال پر اُکساتا تھا، اور تم لوگ کعب کے اشعار، گفتگو اور طرزِ عمل سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہودی یہ جواب سُن کر دم بخود رہ گئے۔ اس کے بعد آنحضور ﷺ نے ان سے ایک عہد نامہ لکھوایا کہ یہود میں سے آیندہ کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

(16) سریہ زید بن حارثہؓ

جمادی الثانی، 3 ہجری۔ قریش مکہ بدر کے میدان میں شکست سے دوچار ہونے کے بعد اتنے خوف زدہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے شام کا قدیم تجارتی راستہ چھوڑ کر عراق کا راستہ اختیار کیا۔ اس سفر میں ابوسفیان کے ہم راہ صفوان بن اُمیہ، حویطب بن عبدالعزیٰ اور عبداللہ بن ربیعہ تھے، جن کے ساتھ کافی مالِ تجارت اور سونے چاندی کے ظروف تھے۔ قریش نے اس علاقے کے سردار بکر بن وائل سے رہبر طلب کیا جو حفاظت سے اس قافلے کو لے جائے۔ بکر بن وائل نے فرات بن حیان عجلی کا انتخاب کر کے ابوسفیان کے ہم راہ کر دیا۔ اہلِ مکہ نے کثیر رقم اس قبیلے کو دینے کا وعدہ کیا۔ ابوسفیان کا خیال تھا کہ موسم سردی کا ہے، اس لیے اس دُشوار گزار راستے سے پانی کی قلت کے باوجود ہم سفر کر سکتے ہیں۔

آنحضور ﷺ کو جب قریش کے تجارتی قافلے کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے زیدؓ بن حارثہ کی سرکردگی میں ایک سو سپاہیوں کا دستہ قافلے کو روکنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ مجاہدین جوں ہی قافلے کے سامنے پہنچے، انھوں نے حملہ کر دیا۔ سامانِ تجارت پر ان کا قبضہ ہو گیا، مگر تمام لوگ قائدین قافلہ سمیت بھاگ گئے۔ صرف قافلے کے رہبر فرات بن حیان عجلی کو گرفتار کیا گیا جو مدینے آ کر مسلمان ہو گئے۔ حاصل شدہ مالِ غنیمت کی قیمت ایک لاکھ درہم تھی، جس کا خمس بیس ہزار درہم سرکاری خزانے میں جمع کرایا گیا۔

(17) غزوۂ اُحد

7۔ شوال، 3 ہجری۔ غزوۂ سویق کے بعد اگرچہ ابوسفیان کی قسم برائے انتقام بظاہر پوری ہو چکی تھی، مگر زید بن حارثہؓ کے ہاتھوں تجارتی قافلہ کے لٹنے کی وجہ سے ایک لاکھ درہم کا جو نقصان قریش کو پیش آیا تھا اور بدر کے قیدیوں کے فدیہ میں جو ڈھائی لاکھ درہم دینے پڑے۔ مزید یہ کہ بدر کے ستر مقتولوں کا انتقام لینے کے لیے قریش سخت بے تاب تھے۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے انھوں نے اڑھائی لاکھ درہم جمع کیے۔ نواحی قبائل میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے شعرا بھیجے اور اس طرح تین ہزار جاں بازوں کا ایک لشکر تیار کیا جس میں سات سو زِرہ پوش تھے اور جن کے پاس دو سو گھوڑے اور تین ہزار اُونٹ تھے۔ یہ لشکر بدھ کے دن (5 شوال 3ھ) اُحد کے قریب فروکش ہوا۔ حضور ﷺ کو لمحہ لمحہ کی خبر مل رہی تھی۔ آپ ﷺ دو دن بعد نماز جمعہ سے فارغ ہو کر ایک ہزار افراد کے ہم راہ مدینہ سے نکلے۔ جب شہر کے باہر پہنچے تو رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو لے کر واپس چلا گیا۔ بایں ہمہ حضور ﷺ کے عزم میں فرق نہ آیا۔ آپ ﷺ نے میدانِ اُحد میں پہنچ کر صف آرائی کی حضرت زبیرؓ بن عوام کو رسالے کا افسر مقرر کیا۔ پچاس تیراندازوں کو حضرت عبداللہؓ بن جُبیر کی قیادت میں اس چوٹی پر متعین فرمایا جو مسلمانوں کے پیچھے تھی۔

7۔ شوال کو سب سے پہلے خواتین قریش دف پر اشعار پڑھتی ہوئی آگے بڑھیں جن میں کشت گان بدر کا ماتم اور انتقام کے رجز تھے۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ سب سے آگے تھی پیچھے چودہ دیگر عورتیں تھیں، جن میں ام حکیم (ابوجہل کے فرزند عکرمہ کی بیوی)، فاطمہ (خالد بن ولید کی ہم شیر) برزہ (طائف کے رئیس مسعود ثقفی کی بیٹی) اور ریطہ (عمرو بن عاص کی زوجہ) خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ رجزیہ اشعار میں سے دو یہ ہیں:

نحن بنات طارق   نمشی علی النمارق
ان تقبلوا نعانق   او تدبروا نفارق

''ہم مسافرانِ شہر یعنی تاروں کی بیٹیاں ہیں جو قالینوں پر چلنے کی عادی ہیں۔ اگر تم آگے بڑھو گے تو ہم تم سے گلے ملیں گی۔ پیچھے ہٹو گے تو ہم تمھیں چھوڑ جائیں گی۔''

جب صفیں آراستہ ہو گئیں تو حضور ﷺ نے مہاجرین کا علم حضرت علیؓ کو، اوس کا حضرت اسیدؓ بن حضیر کو اور خزرج کا حبابؓ بن منذر کو عطا کیا۔ جب جنگ شروع ہوگئی تو مسلمانوں کے تند و تیز حملوں سے قریش کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ رجز خواں عورتیں پیچھے کو بھاگیں اور مسلمانوں نے قریش کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ یہ صورت دیکھ کر قلۂ کوہ کے تیرانداز بھی نیچے کو بھاگے۔ عبداللہؓ بن جبیر نے بہت روکا۔ لیکن انھوں نے پروا نہ کی۔ اس پر خالد بن ولید نے پیچھے سے حملہ کیا۔ حملہ اتنا تیز تھا کہ مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ ایک خاصی تعداد شہید ہو گئی۔ حضور ﷺ کے چہرے پر چوٹ آئی۔ دائیں طرف کا ایک نچلا دانت ٹوٹ گیا اور آپ ﷺ ایک گڑھے میں گر پڑے۔ اس پر یہ افواہ پھیل گئی کہ حضور ﷺ شہید ہو گئے ہیں۔ اس سے عام بدحواسی چھا گئی اور حضرت عمرؓ نے تلوار پھینک دی۔ پاس ہی حضرت انسؓ بن مالک کے چچا حضرت ابن نضر کھڑے تھے۔ انھوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ یہ کیا؟ کہا: حضور ﷺ کے بعد لڑ کر کیا کریں گے۔ ابن نضرؓ نے کہا کہ ان کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ یہ کہ کر دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور اسّی سے زیادہ زخم کھا کر شہادت پائی۔

حضور ﷺ کو سب سے پہلے حضرت کعبؓ بن مالک نے دیکھا اور بلند آواز سے کہا ''مسلمانو! رسول اللہ صلعم یہ ہیں۔'' یہ سُن کر جاں نثار ٹوٹ پڑے اور کفار نے ان پر حملہ کر دیا۔ حضرت ابودجانہؓ اور حضرت طلحہؓ حضور ﷺ کے لیے سپر بن گئے اور

تمام وار اپنے جسموں پر سہنے لگے تاہم تلوار کا ایک وار حضور ﷺ کے خود پر پڑ گیا اور اس کی دو کڑیاں چہرہ مبارک میں چبھ گئیں۔ اس حالت میں بھی آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ تھے:

"رب اغفر لقومی فانهم لا یعلمون."

"اے رب! میری قوم کو معاف کر دے کہ وہ لاعلم ہے۔"

ابوسفیان کی بیوی ہندہ جس کے والد عتبہ کو حضرت حمزہؓ نے بدر میں قتل کیا تھا، کو حضرت حمزہؓ کی لاش نظر آ گئی۔ اس نے آپ کے کان اور ناک کاٹ کر ان کا ہار بنا لیا اور کلیجا نکال کر چبا گئی۔

جب دونوں فوجیں میدان سے الگ ہوئیں تو حضور ﷺ نے ایک دستہ تعاقب میں بایں غرض بھیجا کہ کہیں ابوسفیان مدینے پر حملہ نہ کر دے اور دوسرے دن زخمی ہونے کے باوجود آپ ﷺ خود بھی مدینہ کے جنوب میں آٹھ میل تک گئے۔ لیکن قریش جا چکے تھے اس لیے واپس تشریف لے آئے۔

اس جنگ میں شہدا و مقتولین کی تعداد یہ تھی:

1: شہدا 70۔ ان میں حضرت حمزہؓ، حضرت عبداللہؓ بن جحش، حضرت مصعبؓ بن عمیر و دیگر مہاجر صحابہ اور 65 انصار شامل تھے۔

2: مقتولین قریش کی تعداد 22 یا 23 تھی۔ ان میں قابل ذکر یہ تھے:

ولید بن عاص بن ہشام۔ ابواُمیہ بن ابی حذیفہ بن مغیرہ اور ہشام بن ابی حذیفہ بن مغیرہ۔ اس جنگ کے بعد مدینہ ماتم کدہ بن گیا۔ حضور ﷺ جس طرف سے گزرتے عورتیں کسی نہ کسی کو رو رہی ہوتیں لیکن حضرت حمزہؓ کا نوحہ خواہاں کوئی نہیں تھا س پر حضور ﷺ کو دکھ سا ہوا اور فرمایا:

"امّا حمزة فلا بواکی له."

"افسوس کہ حمزہ پہ رونے والا کوئی نہیں۔"

انصار کو اس ارشاد کا علم ہوا تو اپنی خواتین کو حضور ﷺ کے گھر ماتم حمزہؓ کے لیے بھیج دیا۔ جب یہ عورتیں حضور ﷺ کے در پر جمع ہوئیں تو آپ ﷺ گھر سے باہر آئے۔ ان سب کے لیے دعا فرمائی، شکریہ ادا کیا اور یہ کہ کر انھیں واپس بھیج دیا کہ آج سے مُردوں پر نوحہ کی رسم بند کی جاتی ہے۔

(18) غزوۂ حمرا الاسد

8 شوال، 3 ہجری۔ قریش جب اُحد سے واپس ہوئے اور مدینہ سے چل کر مقام روحا میں ٹھہرے، تو یہ خیال آیا کہ کام ابھی پورا نہیں ہوا اور مسلمان چوں کہ خستہ حالت میں ہونے کے باعث مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے، اس لیے چل کر مدینہ پر اچانک حملہ کر دینا چاہیے۔ صفوان بن اُمیہ نے کہا کہ بہتر یہ ہے کہ ہم مکہ واپس چلیں۔ محمد ﷺ کے اصحابؓ جوش جہاد میں بھرے ہوئے ہیں، ممکن ہے کہ دوسرے حملے میں ہمیں کام یابی نہ ہو۔ ابھی اس گفتگو میں ایک شب بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ رسول کریم ﷺ کو مخبر نے قریش کے ارادے سے آگاہ کر دیا۔ رسول کریم ﷺ نے اسی وقت حضرت بلالؓ کو بھیج کر تمام مدینہ شہر میں منادی کرا دی کہ خروج کے لیے تیار ہو جائیں۔ حضور ﷺ نے یہ حکم بھی فرمایا کہ صرف وہی لوگ ہم راہ چلیں جو غزوۂ اُحد میں شریک تھے۔

8 شوال کو مدینہ سے چل کر حضور ﷺ نے مقام حمراء الاسد پر قیام فرمایا۔ یہ جگہ مدینہ سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔ حضور ﷺ اپنے صحابہؓ کے ہم راہ اسی مقام پر مقیم تھے کہ قبیلہ خزاعہ کا سردار معبد خزاعی دربار رسالت ﷺ میں حاضر ہوا۔ وہ غزوۂ اُحد کے شہدا کی تعزیت کے لیے آیا تھا۔ معبد خزاعی حضور ﷺ سے رخصت ہو کر ابوسفیان سے جا کر ملا۔ ابوسفیان نے اس کے سامنے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ معبد خزاعی نے ابوسفیان کو بتایا کہ محمد بڑی بھاری جمعیت کے ساتھ قریش مکہ کے مقابلے اور تعاقب کے لیے نکلے ہیں۔ ابوسفیان نے یہ سنتے ہی مکہ کی راہ لی۔

رسول کریم ﷺ اس مقام پر تین دن تک قیام فرمانے کے بعد مدینہ واپس تشریف لائے۔ اسی ضمن میں سورۂ آل عمران کی آیت 172 نازل ہوئی:

﴿اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ؕ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ﴾ (آل عمران: 172)

"(ایسے مومنوں کے اجر کو) جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہا۔ ان میں جو اشخاص نیکوکار اور پرہیزگار ہیں، ان کے لیے بڑا اجر ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں: "جنگ اُحد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دُور چلے گئے تو انھیں ہوش آیا اور انھوں نے آپس میں کہا، یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ محمد ﷺ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقع ملا تھا، اسے کھو کر چلے آئے۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھہر کر اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینہ پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے، لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکہ واپس چلے گئے۔ ادھر نبی ﷺ کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر نہ پلٹ آئیں۔ اس لیے جنگ اُحد کے دوسرے ہی دن آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے۔ یہ اگرچہ نازک موقع تھا، مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے، وہ جاں نثار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور نبی ﷺ کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے جو مدینے سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ آیت انھی فداکاروں کی طرف ہے۔

(19) سریہ ابی سلمہ مخزومی

یکم محرم، 4 ہجری۔ کوفہ و مکہ کی راہ پر دونوں کے وسط میں ایک قصبہ فَید کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے قریب ایک پہاڑ قطن کہلاتا تھا کو قطن کی رعایت سے یہ "سریہ قطن" بھی کہلاتا ہے۔ حضور ﷺ کے زمانے میں وہاں بنو خزیمہ کی ایک شاخ اسد بھی آباد تھی۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ قبیلۂ اسد کے ایک سردار خویلد کے دو بیٹے سلمہ و طلیحہ مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے ایک لشکر ترتیب دے رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوسلمہ مخزومی کو ڈیڑھ سو صحابہؓ کے ہم راہ اس طرف بھیجا۔ یہ جیش یکم محرم 4ھ کو روانہ ہوا اور وہ لوگ ان کی روانگی کی خبر سن کر منتشر ہو گئے۔ جنگ اُحد میں حضرت

ابوسلمہؓ کے شانے پر ایک زخم آیا تھا، جو اگر چہ بظاہر اچھا ہو گیا تھا، مگر اس سفر میں پھر تازہ ہو گیا اور نتیجتاً جان لیوا ثابت ہوا۔

(20) سریہ عبداللہ بن انیسؓ (۵ محرم، ۴ ہجری)

وادی عرنہ مکہ کے مشرق میں عرفات کے قریب واقع تھی۔ یہ بنولحیان کی ملکیت تھی۔ اس قبیلے کے سردار کا نام سفیان بن خالد الہذلی تھا۔ حضور ﷺ کو خبر ملی کہ سفیان مدینے پر حملہ کرنے کے لیے ایک جیش ترتیب دے رہا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن انیس کو اس کے مقابلے کے لیے روانہ کیا۔ یہ 5/ 3 محرم 3ھ کو تنہا چل پڑے وہاں پہنچ کر اسے تلاش کیا۔ موقع پا کر مار ڈالا اور سر کاٹ کر ساتھ لے گئے۔ جب حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ بتایا تو حضور ﷺ نے خوش ہو کر اپنا عصا عطا کیا اور فرمایا: ''یہ عصا پکڑ کر جنّت میں اس کے سہارے سے چلنا۔ جنت میں عصا لے کر چلنے والا کوئی شاذ و نادر ہو گا۔'' حضرت عبداللہؓ ساری عمر اس عصا کی حفاظت کرتے رہے۔ مرتے وقت وصیّت کی کہ عصا کو میرے کفن میں رکھ دینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

(21) سریہ رجیع

صفر، 4 ہجری۔ قبائل عَضَل و قارہ کے چند آدمی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہماری قوم اسلام لا چکی ہے لیکن احکامِ شرعیہ سے نا آشنا ہے۔ اس لیے ہمارے ساتھ چند عالم و مبلغ بھیجیے۔ حضور ﷺ نے سات صحابہؓ کا انتخاب فرمایا اور حضرت مرثدؓ بن ابی مرثد کو ان کا امیر مقرر کر کے بھیج دیا۔ جب یہ لوگ مقام رجیع پر پہنچے تو انھوں نے غداری کی اور بنولحیان کے چند آدمیوں کو بلا کر پانچ کو تو مروا ڈالا اور باقی دو یعنی حضرت خبیبؓ بن عدی اور حضرت زیدؓ بن دثنہ کو مکہ میں قریش کے ہاں فروخت کر دیا اور قریش نے انھیں شہید کر ڈالا۔ خبیبؓ کو ابوسروعہ نے، جس کے والد حارث بن عامر کو خبیبؓ نے اُحد میں قتل کیا تھا اور زید کو صفوانؓ بن اُمیہ بن خلف نے، کیوں کہ اس کا باپ اُمیہ بن خلف بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوا تھا۔ اور صفوان اس کے بدلے میں کسی مسلمان کا سر لینا چاہتا تھا۔

ان قبیلوں نے چھے مسلمانوں پر جو ظلم کیا، حالانکہ یہ محض ایک تبلیغی مشن پر تھے، تو اس اطلاع سے مدینہ کے تمام مسلمانوں کو صدمہ ہوا۔ حضرت حسانؓ بن ثابت نے دردانگیز اشعار میں حضرت زیدؓ اور حضرت خبیبؓ کا مرثیہ لکھا۔ نبی کریم ﷺ کو اندیشہ ہوا، مبادا اس قسم کے مزید واقعات ظہور میں آنے لگیں اور اس سے مسلمانوں کی شان و شوکت کا آفتاب گہن میں آ جائے۔

(22) سریہ بیرِ معونہ

صفر، 4 ہجری۔ حضور ﷺ نے نجد کے ایک قبیلے عامر بن صعصعہ کے ایک رئیس ابوالبراء عامر بن مالک کو اسلام کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ قبیلے کی حمایت حاصل کرنے نیز اسے اسلام سے متعارف کرانے کے لیے چند صحابہ میرے ساتھ بھیجیے۔ حضور نے فرمایا کہ مجھے اہلِ نجد پر اعتبار نہیں۔ کہنے لگا کہ میں ضامن ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ نے چند صحابہؓ اُس کے ساتھ کر دیے۔ ان کی تعداد بعض روایات کے مطابق ستّر اور بعض دیگر کے مطابق چالیس تھی۔ جب یہ لوگ ارضِ بُنوسُلیم کے ایک کنویں بیرِ معونہ پر پہنچے تو وہاں سے اپنی جماعت کے ایک ہی آدمی حرام بن ملحان کو حضور ﷺ کا خط دے کر قبیلے کے سردار عامر بن طُفیل کی طرف بھیجا۔ اس نے قاصد کو قتل کر دیا اور بُنوسلیم کے چند آدمیوں کے ہم راہ بیرِ معونہ کی طرف چل پڑا۔ راہ میں سامنے سے صحابہ آ گئے جو قاصد کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑے تھے۔ عامر نے انھیں گھیر کر قتل کر دیا اور عمرو بن اُمیہ کو یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میری ماں نے ایک غلام کو آزاد کرنے کی مَنّت مانی تھی اس لیے تو آزاد ہے اور ساتھ ہی اس کی چوٹی کاٹ لی۔ اس جماعت کا سردار حضرت مُنذرؓ تھا اور اس میں حضرت عامرؓ بن فہیرہ اور حضرت نافعؓ بن بدیل جیسے مقدس لوگ شامل تھے۔ حضرت عمرو بن امیہ اس دردناک المیے کی خبر لے کر مدینہ پہنچے۔ ان 70 فضلا کی شہادت کے المیے نے جنگِ اُحد کا چرکہ تازہ کر دیا، اور یہ اس لحاظ سے زیادہ الم ناک تھا کہ شہدائے اُحد تو ایک کھلی اور دُوبدُو جنگ میں مارے گئے تھے، مگر یہ بےچارے ایک شرم ناک غداری کی نذر ہو گئے۔

(23) غزوۂ بنونضیر

ربیع الاول، 4 ہجری۔ بنونضیر یہود مدینہ کا ایک قبیلہ تھا جو مسجدِ نبوی ﷺ سے جنوب مشرق کی طرف شہر سے باہر آباد تھا۔ یہ ہر وقت اسلام کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ ایک دفعہ اُنہوں نے حضور ﷺ کو پیغام بھیجا کہ آپؐ ہمارے تین علما سے اسلام پر گفتگو کرنے کے لیے تشریف لائیں اور ساتھ تین صحابیؓ بھی لے آئیں۔ حضور ﷺ نے یہ دعوت منظور فرمالی اور حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر ان کے ہاں چلے گئے۔ یہود نے آپ ﷺ کے آنے سے پہلے چھت پر ایک یہودی کو چڑھا دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ جب مسلمان باتوں میں لگ جائیں تو وہ رسُول (ﷺ) پر ایک وزنی سِل گرا دے۔ جب حضور ﷺ وہاں پہنچے تو انھیں اسی دیوار کے سائے میں بٹھایا گیا لیکن وحی نے آپ ﷺ کو سازش کی اطلاع دے دی چنانچہ آپ ﷺ اُٹھ کر واپس چلے گئے اور بنونضیر کو سزا دینے کی سکیم بنانے لگے۔ آپ ﷺ ربیع الاول 4ھ میں صحابہؓ کا ایک جیش لے کر بنونضیر کے محلّے میں گئے۔ ان کا محاصرہ کر لیا اور پندرہ دن کے بعد اس شرط پر صلح ہوئی کہ یہود ہتھیار چھوڑ جائیں اور جتنا سامان اُٹھا سکتے ہیں لے کر مدینہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ خیبر کی طرف چلے گئے اور مدینہ سے بایں شان روانہ ہوئے کہ عورتیں دف بجا بجا کر گا اور ناچ رہی تھیں۔

جس روز یہود نے نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی سازش کی اور اس کا راز فاش ہوا، اُسی روز آپ ﷺ نے انھیں نوٹس دے دیا کہ دس دن کے اندر اندر مدینے سے نکل جاؤ۔ اس کے بعد تم میں سے جو یہاں پایا جائے گا، قتل کر دیا جائے گا۔ منافقین مدینہ کے سردار عبداللہ بن ابی نے انھیں حوصلہ دیا کہ ڈٹ جاؤ اور مدینہ چھوڑنے سے انکار کر دو۔ میں دو ہزار آدمیوں کے ساتھ تمھاری مدد کروں گا۔ بنی قریظہ تمھاری مدد

کریں گے، اور نجد سے بنی غطفان بھی تمھاری مدد کے لیے آئیں گے۔ ان باتوں میں آ کر انھوں نے حضور ﷺ کو کہلا بھیجا کہ ہم اپنا علاقہ نہیں چھوڑیں گے۔ آپ ﷺ سے جو کچھ ہو سکے، کر لیجیے۔ حضور ﷺ نے نوٹس کی میعاد ختم ہوتے ہی ان کا محاصرہ کر لیا اور ان کے حامیوں میں سے کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ مدد کو آتا۔ آخر کار انہوں نے اس شرط پر ہتھیار ڈال دیئے کہ ان میں سے ہر تین آدمی ایک اُونٹ پر جو کچھ لاد کر لے جاسکتے ہیں، لے جائیں گے اور باقی سب کچھ مدینہ ہی میں چھوڑ جائیں گے۔ اس طرح مضافات مدینہ کا وہ پورا محلّہ جس میں بنی نضیر رہتے تھے، ان کے باغات اور گڑھیوں اور سروسامان سمیت مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا اور اس بدعہد قبیلے کے لوگ خیبر، وادی القریٰ اور شام میں تتر بتر ہو گئے۔

(24) غزوۂ ذات الرقاع

دو ماہ بعد جمادی الاول، 4 ہجری میں حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ نجد میں غطفان کے دو قبیلے ثعلبہ اور انمار مدینے پر حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں آپ ﷺ نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو اپنا نائب مقرر کر کے چار سو صحابہؓ کے ساتھ کوچ کیا اور ایک ایسے میدان میں ڈیرے ڈالے جس کے چاروں طرف سُرخ، سفید اور سیاہ رنگ کی پہاڑیاں تھیں اور یوں نظر آتا تھا گویا رنگ برنگ کپڑے دھوپ میں لٹکے ہوئے ہیں۔ یہ مقام ذات الرقاع کہلاتا تھا۔ حضور ﷺ کے لشکر کے اچانک حملے نے ان کے حواس باختہ کر دیئے اور کسی جنگ کے بغیر وہ اپنے گھر بار اور مال اسباب چھوڑ کر پہاڑوں میں منتشر ہو گئے۔ اس غزوے میں پیدل چلنے سے مجاہدین کے پاؤں پھٹ گئے تھے۔ ایڑیاں چھد گئی تھیں۔ بعض کے ناخن تک گر گئے تھے، اس لیے اُن پر دھجیاں باندھ لی گئی تھیں۔ اسی لیے یہ غزوہ اس نام سے مشہور ہے یعنی کپڑوں کی دھجیوں والی لڑائی۔

(25) غزوۂ بدر الاخریٰ

ذی قعدہ، 4 ہجری۔ اسے غزوۂ بدر الموعد بھی کہتے ہیں۔ جنگ اُحد کے خاتمے پر ابوسفیان نے بلند آواز سے کہا تھا کہ اگلے سال ہمارا تمھارا مقابلہ میدانِ بدر میں ہوگا۔ چوں کہ حضور ﷺ نے اس چیلنج کو منظور کر لیا تھا اس لیے آپ ﷺ یکم ذی القعد 4ھ کو، حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو بطور نائب چھوڑ کر پندرہ سو صحابہؓ اور دس گھوڑوں کے ساتھ بدر کی طرف روانہ ہو گئے۔ ابوسفیان بھی دو ہزار راہیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا لیکن اسے حملے کی ہمت نہ پڑی اور واپس چلا گیا۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ جُوں جُوں دن گزر رہے تھے حضور ﷺ کی فوجی طاقت بڑھ رہی تھی۔ اس واقعے سے وہ دھاک جو اُحد میں اکھڑی تھی، پہلے سے بھی زیادہ جم گئی۔ اس نے پورے عرب پر یہ بات واضح کر دی کہ اب تنہا قریش محمد ﷺ کے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے۔

بدر میں آپ کے پاس صرف دو گھوڑے تھے۔ لیکن بعد کی جنگوں میں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ جدول یہ ہے، جو کہ منٹگمری واٹ کی کتاب سے اخذ کیا گیا ہے:

سال	غزوہ	گھوڑوں کی تعداد	مجاہدین کی تعداد
2ھ	بدر	2	313
4ھ	بدر الموعد	10	1500
7ھ	خیبر	200	ایضاً
8ھ	حنین	800	بارہ ہزار
9ھ	تبوک	دس ہزار	تیس ہزار

(26) غزوۂ دُومۃ الجندل

ربیع الاول، 5 ہجری۔ غزوۂ بدر الموعد میں مسلمانوں کی جو دھاک جم گئی تھی، اُس میں اس واقعے نے مزید اضافہ کیا۔ عرب اور شام کی سرحد پر دومۃ الجندل (موجودہ الجوف) ایک اہم مقام تھا جہاں سے عراق اور مصر و شام کے درمیان عرب کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ اس مقام کے لوگ قافلوں کو تنگ کرتے اور اکثر لُوٹ لیتے تھے۔ رسول کریم ﷺ ایک ہزار کا لشکر لے کر ان کی تادیب کے لیے خود تشریف لے گئے۔ وہ آپ ﷺ کے مقابلے کی ہمت نہ کر سکے اور بستی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ اس سے پورے شمالی عرب پر اسلام کی ہیبت بیٹھ گئی اور قبائل نے یہ سمجھ لیا کہ مدینے میں جو زبردست طاقت پیدا ہوئی ہے، اس کا مقابلہ اب ایک دو قبیلوں کے بس کی بات نہیں۔

(27) غزوۂ بنی مصطلق

شعبان، 5 ہجری۔ اسے غزوۂ مریسیع بھی کہا جاتا ہے۔ مریسیع ایک چشمے کا نام ہے جو مدینہ سے تقریباً سو میل جنوب مغرب میں ساحل کی طرف واقع تھا۔ اس کے نواح میں بنو خزاعہ کی ایک شاخ بنو مصطلق آباد تھی۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ یہ قبیلہ مدینہ پر حملے کا ارادہ رکھتا ہے۔ آپ ﷺ نے صحابہؓ کو تیاری کا حکم دے دیا اور حضرت زیدؓ بن حارثہ کو نائب مقرر کرنے کے بعد 2 شعبان 5ھ کو مدینہ سے روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے تو وہ لوگ جنگ کے لیے تیار تھے ان میں سے دس مارے گئے۔ چھ سو اسیر ہوئے۔ اور غنیمت میں دو ہزار اُونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں۔ اسیروں میں رئیس قبیلہ حارث (حرث) بن ابی ضرار کی بیٹی جُویریہ بھی تھی۔ یہ تقسیم کے وقت حضرت ثابتؓ بن قیس کے حصے میں آئی۔ جب حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ یہ سردار قبیلہ کی بیٹی ہے تو آپ ﷺ نے حضرت ثابتؓ کو کچھ رقم دے کر اسے آزاد کرا لیا اور اسے اپنی زوجیت میں لے لیا۔ اس تصادم میں صرف ایک صحابی شہید ہوا تھا۔

واقعۂ افک

یہ واقعہ اسی غزوہ سے واپسی پر پیش آیا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ واپسی پر حضور ﷺ نے رات کو ایک جگہ قیام فرمایا۔ آدھی رات کے وقت حضرت عائشہؓ رفع حاجت کے لیے لشکر گاہ سے باہر گئیں، واپسی پر انھیں محسوس ہوا کہ ان کا ہار، جو وہ اپنی بہن سے عاریتاً لائی تھیں کہیں گر گیا ہے۔ وہ واپس گئیں تو قافلہ چل دیا اور آپ رہ گئیں۔ آپ لشکر گاہ میں بیٹھ کر انتظار کر رہی تھیں کہ صفوان بن معطل، جس کا کام قافلہ کی گری پڑی اشیا کو سنبھالنا تھا، آ گیا۔ حضرت عائشہؓ کو تنہا دیکھ کر پہلے بلند آواز سے "انا للہ وانا الیہ راجعون" کہا۔ پھر اُونٹ کو بٹھایا، حضرت عائشہؓ کو سوار کیا اور

مہار پکڑ کر چل دیا۔ جب یہ اپنے قافلے میں پہنچے تو منافق اعظم عبداللہ بن ابی نے حضرت عائشہؓ کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ جب داستانِ افترا سارے مدینے میں پھیل گئی تو حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ سے کنارہ کر لیا۔ اس پر وہ سخت بے چین بلکہ بیمار رہنے لگیں۔ اور اندازاً ایک ماہ کے بعد وحی نے آپ کی برأت کا اعلان کیا۔

''افک'' کے معنی ہیں جھوٹ بولنا اور الزام تراشنا۔

(28) غزوۂ احزاب

ذی قعدہ، 5 ہجری۔ اسے غزوۂ خندق بھی کہتے ہیں۔ بنونضیر مدینہ سے نکل کر خیبر میں پہنچے تو انھوں نے انتقام کی ٹھان لی۔ ان کے رؤسا میں سے حُیی بن اخطب اور کنانہ بن ربیع قریش کو ساتھ ملانے کے لیے مکہ میں گئے۔ وہ پہلے ہی تیار بیٹھے تھے اس لیے جھٹ مان گئے۔ پھر غطفان، بنو اسد، بنو سلیم، بنو سعد اور چند دیگر قبائل کو ساتھ ملایا۔ اور اس طرح دس ہزار کا لشکر لے کر مدینے کی طرف بڑھے۔

حضور ﷺ تک یہ خبریں پہنچیں تو آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے رائے دی کہ فوج کے لیے ایک موزوں جگہ تجویز کر کے اس کے سامنے خندق کھود دی جائے۔ حضور ﷺ کو یہ تجویز پسند آئی اور آپ ﷺ چند صحابہ کے ہم راہ گھوڑے پر سوار ہو کر نکلے۔ مختلف مقامات کا مُعاینہ فرمانے کے بعد فوج کے لیے ایک موزوں جگہ پسند کی۔ نیز طے ہوا کہ بچوں اور عورتوں کو قلعہ نما مکانات (آطام: آجام) میں منتقل کر دیا جائے۔

شہر کے جنوب مشرق اور مغرب میں پہاڑیاں بھی تھیں اور گھنے جنگلات بھی۔ ان سے گزرنا مشکل تھا۔ صرف شمال کا رُخ ایسا تھا جہاں سے دشمن بآسانی مدینے پر حملہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس علاقے کی پیمائش کی گئی اور بیس بیس گز کے ٹکڑے دس دس آدمیوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ خود حضور ﷺ بھی کُھدائی کیا کرتے تھے۔ تیار ہونے کے بعد یہ خندق ساڑھے تین میل لمبی، کافی چوڑی اور اتنی گہری تھی کہ ایک دفعہ ایک حملہ آور نے کودنے کی کوشش کی تو گر کر مر گیا۔ یہ کُھدائی تین ہفتے جاری رہی حضور ﷺ ان دنوں اپنا گھر چھوڑ کر خندق کے پاس ایک ٹیلے پر خیمہ لگا کر قیام پزیر ہو گئے تھے۔ شہر کے باقی لوگ از خود اپنے اپنے محلوں کے سامنے خندقیں کھودنے لگے اور اس طرح سارا شہر ایک قلعہ بن گیا۔ جب یہ خندق مکمل ہو گئی تو دشمن بھی آن پہنچا اور اس نے محاصرہ کر لیا۔ محاصرے نے شدت پکڑی تو مدینہ کے بنوقریظہ بھی دشمن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ قریش نے ہر چند زور مارا کہ وہ خندق کو عبور کر کے آگے نکلیں لیکن تیر اندازوں نے انھیں کام یاب نہ ہونے دیا۔ البتہ ایک تنگ جگہ سے ایک دفعہ چار قریش سردار پار کود گئے لیکن جھٹ مارے گئے۔ جب محاصرہ طول پکڑ گیا اور قریش کے ذخائر رسد ختم ہونے لگے۔ ساتھ ہی ایک ایسی آندھی چل پڑی جس سے درخت اکھڑ گئے اور قریش کا مال و اسباب اُڑ گیا تو وہ گھبرا گئے اور اکیس دن کے بعد واپس چلے گئے۔

قرآن حکیم نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝﴾ (الاحزاب 33: 9)

''اے ایمان والو! اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب تم پر حملہ آور چڑھ آئے تھے اور ہم نے آندھی اور خفیہ لشکر بھیج کر انھیں بھگا دیا تھا۔ بے شک اللہ تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔''

ابن الجوزی لکھتے ہیں کہ خندق کا واقعہ ذی قعدہ 5ھ میں پیش آیا تھا۔

حضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن امِ مکتوم کو اپنا نائب مقرر فرمایا تھا۔ مہاجرین کے علم بردار حضرت زیدؓ بن حارثہ تھے اور انصار کے حضرت سعدؓ بن عُبادہ۔ آپ ﷺ خندق میں پندرہ یوم رہے آپ ﷺ کے ساتھ تین ہزار صحابہؓ تھے اور حملہ آوروں کی تعداد دس ہزار تھی۔

(29) غزوۂ بنوقریظہ

ذی الحج، 5 ہجری۔ بنوقریظہ یہود کا ایک قبیلہ تھا جو مدینہ میں مسجد نبوی ﷺ سے جنوب مشرق کی طرف آباد تھا۔ جنگِ احزاب میں یہ لوگ معاہدے کو توڑ کر قریش مکہ کے ساتھ مل گئے تھے اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے میدانِ جنگ میں اُتر آئے تھے۔ جب احزاب واپس چلے گئے تو حضور ﷺ نے صحابہؓ سے کہا کہ وہ ہتھیار نہ کھولیں اور سب سے پہلے بنو قریظہ کے فتنے کو ختم کریں۔ چنانچہ 22 ذیقعدہ 5ھ کو آپ ﷺ تین ہزار صحابہؓ اور 36 گھوڑوں کے ساتھ ان کے محلّے میں گئے اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ پندرہ دن کے بعد وہ چیخ اُٹھے اور حضرت سعدؓ بن معاذ کی ثالثی پر آمادہ ہو گئے۔ حضرت سعدؓ قبیلہ اوس سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اوس بن قریظہ کے حلیف تھے۔ آپ ﷺ نے یہود کی مقدس کتاب تورات ہی کے مطابق فیصلہ کیا۔ تورات میں درج ذیل ہے:

''.....تو اُن کا محاصرہ کر۔ اور جب تیرا خدا تجھے اُن پر قبضہ دلا دے تو مَردوں کو قتل کرا دے۔ عورتوں اور بچوں کو قیدی بنا لے۔''

سعد نے ان کے تمام لڑنے والے مَردوں کو قتل اور اطفال و خواتین کو قیدی بنانے کا حکم دے دیا۔ یہ تھی ان کی غداری، عہد شکنی اور تخریب کاری کی سزا۔

(30) سریہ محمد بن مسلمہؓ انصاری

محرم، 6 ہجری۔ اسے سریہ قرطا بھی کہتے ہیں۔ قرطا نجد کے ایک قبیلے عامر بن صَعصَعہ کی ایک شاخ تھی جو حرمین کے مشرق میں آباد تھی۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ ﷺ نے محرم 6ھ میں حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو تیس صحابہؓ کے ہم راہ ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ وہ لوگ پہاڑوں کی طرف بھاگ گئے اور صحابہؓ کچھ مالِ غنیمت لے کر واپس آ گئے۔

(31) غزوۂ بنولحیان

ربیع الاول، 6 ہجری۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ بنولحیان قبیلہ ہذیل کی ایک شاخ تھی، جو مدینہ کے جنوب مشرق میں آباد تھی۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنولحیان کسی شرارت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ حضرت عبداللہؓ بن امِ مکتوم کو اپنا نائب

مقرر کر کے دو سو صحابہؓ اور بیس گھوڑوں کے ساتھ ربیع الاول 6ھ کو مدینہ سے نکلے۔ وہاں پہنچے تو وہ سب پہاڑوں کی طرف بھاگ چکے تھے۔ اس لیے آپ ﷺ 14 دن کے بعد واپس تشریف لے آئے۔

(32) سریہ ذی قردہ

ربیع الثانی، 6ہجری۔ اسے سریہ غابہ بھی کہتے ہیں۔ غابہ ایک چراگاہ کا نام ہے جو مدینہ سے اندازاً بارہ میل کے فاصلے پر واقع تھی اور جس میں حضور کی اونٹنیاں چرتی تھیں۔ ایک رات بنو غطفان کی ایک شاخ فزارہ کے سردار عیینہ بن حصن نے چالیس سواروں کے ساتھ غابہ پر حملہ کیا اور بیس اونٹنیاں ہانک کر لے گیا۔ ساتھ ہی حضرت ابوذرؓ غفاری کے فرزند کو، جو اسی چراگاہ میں رہتا تھا قتل کر ڈالا۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی تو پانچ سو (یا سات سو) کی جمعیت لے کر ان کا پیچھا کیا۔ آپ ﷺ کے ساتھ آٹھ گھڑ سوار بھی تھے۔ انھوں نے چوروں کو جا لیا۔ لڑائی ہوئی۔ چار چور مارے گئے اور مسلمانوں میں سے صرف ایک شہید ہوا۔ انھوں نے دس اُونٹنیاں تو پکڑ لیں لیکن باقی دس کو وہ بھگا لے گئے۔

(33) سریہ عکاشہ

ربیع الثانی، 6ہجری۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ نجد کا ایک قبیلہ 'اسد' شرارت پر آمادہ ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت عُکاشہ بن محصن الاسدی کو ربیع الثانی 6ھ میں چالیس صحابہؓ کا ایک دستہ دے کر اس کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ جب یہ دستہ ارضِ اسد کے ایک چشمے غمر پر پہنچا تو وہ لوگ منتشر ہو گئے۔

(34) سریہ ذوالقصہ

ربیع الثانی، 6ہجری۔ مدینہ سے چوبیس میل دور نجد میں بنو ثعلبہ کا ایک موضع ذوالقصہ کہلاتا تھا۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ وہاں ثعلبہ کے آدمی حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں چنانچہ آپ ﷺ نے ربیع الثانی 6ھ میں محمدؓ بن مسلمہ کو صرف دس صحابہؓ کے ہم راہ مقابلے کے لیے بھیجا وہاں ایک سو آدمی اکٹھے ہو گئے اور انھوں نے سب کو مار ڈالا۔ صرف محمدؓ بن مسلمہ بچ کر نکل سکے۔ حضور ﷺ نے فوراً چالیس صحابہؓ کا ایک اور دستہ حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کی قیادت میں روانہ کیا لیکن وہ لوگ منتشر ہو گئے۔ دو تین ہفتے بعد ثعلبہ کے چند آدمی اپنے اونٹوں کو چرانے کے لیے مدینہ کے قریب ایک چراگاہ میں آ گئے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو دوبارہ چالیس صحابہ کے ساتھ بھیجا۔ وہ خود تو بھاگ گئے لیکن ان کے بیش تر مواشی پیچھے رہ گئے جنھیں یہ ہانک لائے۔

(35) سریہ جموح

یہ سریہ جسے سریہ جموم بھی کہتے ہیں، ربیع الثانی، 6ہجری میں ہوا۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ بنو سلیم کسی شرارت کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو ان کی گوشمالی کے لیے روانہ کیا۔ یہ لوگ ارضِ بنو سلیم کے ایک چشمے جموح (یا جموم) پر پہنچے تو وہاں ایک عورت حلیمہ نے بنو سلیم کے محلے تک ان کی راہ نمائی کی۔ چنانچہ یہ کچھ قیدی اور مالِ غنیمت حاصل کرنے میں کام یاب ہو گئے۔ ان قیدیوں میں حلیمہ کا شوہر بھی تھا۔ ان سب کو مدینہ لایا گیا۔ آنحضرت ﷺ نے حلیمہ اور اس کے شوہر کو آزاد کر دیا۔

(36) سریہ عیص

جمادی الاول، 6ہجری۔ مدینہ میں یہ خبر پہنچی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ سے کوئی پچاس میل مشرق میں ارضِ بنو سلیم سے گزرنے والا ہے۔ آپ ﷺ نے زیدؓ بن حارثہ کو 170 سواروں کے ہم راہ اس کی طرف بھیجا۔ ارضِ سلیم کے ایک مقام عیص پر قافلہ والوں سے مقابلہ ہوا اور حضرت زیدؓ کام یاب ہوئے۔ مالِ تجارت میں چاندی کی بھی خاصی مقدار تھی جو بیت المال میں داخل کر دی گئی۔

(37) سریہ طرف

جمادی الثانی، 6ہجری۔ طرف ایک چشمہ ہے۔ مدینہ سے 36 میل بصرہ (مشرق) کی طرف۔ خبر ملی کہ اس مقام پر کچھ اعراب (دیہاتی جنگلی) حملے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو پندرہ صحابہؓ کے ساتھ بھیجا۔ یہ طرف تک گئے۔ لیکن مقابلے میں کوئی نہ آیا۔

(38) سریہ وادی القریٰ

رجب، 6ہجری۔ مدینہ میں خبر آئی کہ بنو جزام، جو مدینہ سے کوئی تین سو میل شمال میں تیماء کے قریب آباد تھے۔ مدینہ کے قافلوں اور مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ حضور ﷺ نے رجب 6ھ میں حضرت زیدؓ بن حارثہ کو پانچ سو کا ایک لشکر دے کر اس طرف بھیجا۔ وادیٔ القریٰ سے ذرا شمال میں، بمقام حسمیٰ جزامیوں سے مقابلہ ہوا۔ انھیں سخت شکست ہوئی۔ زیدؓ کو غنیمت میں ایک سو اسیر، ایک ہزار اُونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ملیں۔

(39) سریہ دومۃ الجندل

شعبان، 6ہجری۔ دومۃ الجندل شمالی عرب کا ایک سرحدی شہر ہے جس میں بنو کلب آباد تھے۔ جب انھوں نے مدینہ کے قافلوں اور مسافروں کو تنگ کرنا شروع کیا تو حضور ﷺ نے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کو سات سو صحابہؓ کے ہم راہ ان کی طرف بھیجا۔ وہاں پہنچے تو ان کا امیر اصبغ بن عمرو الکلبی بہت سے دیگر آدمیوں کے ساتھ مسلمان ہو گیا اور اپنی بیٹی حضرت عبدالرحمٰنؓ کے نکاح میں دے دی۔

(40) سریہ فدک

شعبان، 6ہجری۔ مدینہ سے اندازاً ایک سو بیس میل شمال میں خیبر اور وادی القریٰ کے درمیان یہود کی ایک بستی فدک کہلاتی تھی۔ اس میں بنو سعد بن بکر کا قبیلہ بھی آباد تھا۔ اطلاع ملی کہ اس قبیلہ کے لوگ یہودیان خیبر کی امداد کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ایک سو صحابہؓ کے ہم راہ ان کی طرف بھیجا۔ یہ لوگ خیبر و فدک کے درمیان ہج نامی ایک چشمے پر جا رُکے۔ وہاں اس قبیلے سے جنگ ہوئی۔ وہ خود تو فوراً بھاگ گئے لیکن ان کے مواشی پیچھے رہ گئے جن میں سے حضرت علیؓ پانچ سو اونٹ اور دو ہزار بکریاں ہانک لائے۔

(41) سریہ اُمِ قرفہ

رمضان، 6ہجری۔ اُمِ قرفہ ایک عورت کی کنیت ہے جس کا اصل نام فاطمہ بنت

ربیعہ تھا۔ یہ عورت قبیلہ بنی فزارہ کی سردار تھی۔ ایک دفعہ حضرت زید بن حارثہؓ مالِ تجارت کے ساتھ شام کو جاتے ہوئے یہاں سے گزرے۔ بنی فزارہ کے لوگوں نے حملہ کر کے انھیں زخمی کیا اور تمام مالِ تجارت چھین لیا۔ حضرت زیدؓ زخمی حالت میں مدینہ پہنچے۔ آنحضور ﷺ نے حالات سے باخبر ہوتے ہی ایک جماعت حضرت زیدؓ کی سرکردگی میں بنی فزارہ کی سرکوبی کے لیے بھیجی جو نہایت کامیاب واپس آئی۔

(42) سریہ عبداللہ بن عتیک

رمضان، 6 ہجری۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ خیبر میں یہود کا ایک سردار ابورافع سلام بن ابی الحقیق النضری مدینہ پر حملے کے ارادے سے ایک لشکر جمع کر رہا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت عبداللہؓ بن عتیک کو چار دیگر صحابہؓ کے ہم راہ اُس کی طرف بھیجا۔ ان لوگوں نے رات کے وقت ابورافع کو اس کے گھر میں داخل ہو کر قتل کر دیا اور بخیریت لوٹ آئے۔ یہ مہم رمضان 6ھ میں بھیجی گئی تھی۔

(43) سریہ عبداللہؓ بن رواحہ

شوال، 6 ہجری۔ جیسا کہ ہم پچھلے سریے کے تحت بتا چکے ہیں، جب ابورافع قتل ہو گیا تو یہودِ خیبر نے اسیر بن زارم کو اپنا امیر بنا لیا۔ یہ قبائل غطفان کے ہاں امداد کے لیے گیا۔ جب حضور ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے شوال 6ھ میں حضرت عبداللہؓ بن رواحہ کو 30 صحابہؓ کے ساتھ اس کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ عبداللہؓ نے وہاں پہنچ کر اسیر اور اس کے تیس آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔

(44) سریہ کرز بن جابر فہری

شوال، 6 ہجری۔ قبیلہ عُرینہ کے آٹھ آدمی حضور ﷺ کے پاس مدینہ میں آئے اور اسلام لانے کے بعد مدینہ ہی میں رہنے لگے۔ انھیں مدینہ کی آب و ہوا راس نہ آئی تو حضور ﷺ نے انھیں مدینہ سے چھ میل دُور قُبا کی جانب ذوالجدر نامی ایک چراگاہ میں بھیج دیا جہاں حضور ﷺ کی اونٹنیاں بھی چرتی تھیں۔ چرواہے کا نام یسار تھا۔ یہ حضور ﷺ کا آزاد کردہ غلام تھا۔ جب وہ لوگ تن درست ہو گئے تو یسار کی آنکھیں پھوڑنے اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد اسے قتل کر دیا اور پندرہ اونٹنیاں ہانک کر لے گئے۔ حضور ﷺ تک یہ المناک اطلاع پہنچی تو آپ ﷺ نے حضرت کرز بن جابر الفہری کو 20 صحابہؓ کے ہم راہ ان کے تعاقب میں بھیجا۔ انھوں نے چوروں کو جا لیا اور حضور ﷺ نے انھیں سخت سزا دی۔

(45) سریہ عمرو بن امیہ

مکہ میں حضور ﷺ اور اسلام کا بدترین دشمن ابوسفیان تھا۔ یہ مسلمانوں کی تخریب و تباہی کے لیے مسلسل سازشوں میں مصروف رہتا تھا۔ تنگ آ کر حضور ﷺ نے حضرت عمرو بن اُمیہ اور سلمہؓ بن اسلم کو حکم دیا کہ وہ ابوسفیان کو ختم کر آئیں۔ یہ دونوں مکہ میں پہنچے۔ عمرو کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ ابوسفیان نے انھیں دیکھ لیا اور قریش کو خبر کر دی۔ قریش انھیں پکڑنے کے لیے جمع ہوئے تو یہ دونوں بھاگ نکلے اور نواحِ مکہ میں قریش کے تین آدمیوں کو قتل اور ایک کو گرفتار کرنے کے بعد واپس آ گئے۔

(46) غزوۂ حُدیبیہ

حُدَیْبِیَہ ایک کنویں کا نام ہے جو مکہ سے بارہ میل شمال میں واقع تھا۔ جب حضور ﷺ ذی قعدہ 6ھ میں تقریباً پندرہ سو صحابہؓ کے ہم راہ عمرہ کے لیے روانہ ہوئے اور قریش تک یہ خبر پہنچی تو انھوں نے خالد بن ولید کو دو سو سوار دے کر آگے بھیجا کہ وہ مسلمانوں کو روکے۔ بلدح میں فوجیں آمنے سامنے آ گئیں۔ لیکن حضور ﷺ کترا کر حدیبیہ کی طرف نکل گئے اور وہاں ڈیرے ڈال دیے۔ وہاں سے آپ ﷺ نے حضرت خراشؓ بن اُمیہ کو قریش کی طرف یہ پیغام دے کر بھیجا کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں بلکہ صرف عُمرہ کے لیے آئے ہیں۔ قریش نے انھیں گرفتار کر لیا۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو بھیجا۔ وہ بھی دیر تک نہ لوٹے تو آپ ﷺ نے تمام صحابہؓ سے ایک ببول کے درخت کے نیچے سرفروشی کی بیعت لی۔ یہ خبر قریش تک پہنچی تو انھوں نے سہیلؓ بن عمرو کو بات چیت کے لیے بھیجا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ:

1: مسلمان اس سال واپس چلے جائیں۔
2: اگلے سال آئیں اور صرف تین دن قیام کریں۔
3: صرف تلواریں لانے کی اجازت ہوگی اور وہ بھی نیام میں ہوں گی۔
4: جو مسلمان مکہ میں مقیم ہیں ان میں سے کسی کو ساتھ نہ لے جائیں اور اگر حضور ﷺ کا کوئی ساتھی مکہ میں رہنا چاہے تو اسے نہ روکیں۔
5: اگر اہلِ مکہ میں سے کوئی مدینے چلا جائے تو اسے واپس کر دیا جائے اور اگر کوئی مسلمان مکہ میں آ جائے تو اسے واپسی کی اجازت نہیں ہوگی۔
6: قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ کریں فریقین اس کا احترام کریں گے۔

تو یہ تھا معاہدۂ حُدیبیہ۔ جب یہ لکھا جا رہا تھا تو قریش کے نمائندے سہیل کے فرزند، حضرت ابوجندلؓ جو اسلام لا چکے تھے اور قریش کے ہاتھوں اذیتیں برداشت کر رہے تھے، کسی طرح رسیوں اور بیڑیوں سمیت بھاگ کر حضور ﷺ کی خدمت میں جا پہنچے لیکن آپ ﷺ نے انھیں شرائط معاہدے کے مطابق لوٹا دیا۔

اس معاہدے کے بعد مکہ و مدینہ کے لوگ آپس میں آزادانہ ملنے لگے اور اہلِ مکہ اہلِ مدینہ کے حسنِ کردار، حسنِ معاملہ اور حسنِ صحبت سے متاثر ہونے لگے۔ اس سے اسلام کے خلاف نہ صرف عناد کم ہو گیا بلکہ بے شمار دلوں میں اس سیدھے سادے دین کے لیے محبت بھی پیدا ہو گئی۔ یہ اس محبت کا نتیجہ تھا کہ جب دو سال بعد حضور مکہ میں داخل ہوئے تو چند گھنٹوں کے اندر اندر سارا مکہ مسلمان ہو گیا اور غالباً انھی نتائج کی بنا پر اللہ نے اس معاہدے کو ''فتحِ مبین'' کہا تھا۔

(47) غزوۂ خیبر

خیبر یہود کا ایک قلعہ بند شہر تھا مدینہ سے اندازاً سو میل شمال میں۔ بنونضیر، قریظہ اور قینقاع کے بیش تر جلاوطن یہود وہیں جا ٹھہرے تھے اور ارد گرد کے قبائل کو مسلمانوں

کے خلاف مُسلسل بھڑکاتے رہتے تھے۔ جب ان کی شرارتیں ناقابل برداشت ہو گئیں تو حضور ﷺ جمادی الاولیٰ 7ھ میں سولہ سو صحابہؓ کے ہم راہ مدینہ سے نکلے۔ ان میں دو سو سوار بھی تھے۔ حضرت سباعؓ بن عرفطہ کو اپنا نائب مقرر کیا اور تین علم تیار کرائے۔ علمِ خاص حضرت علیؓ کو دیا۔ دوسرا حضرت حبابؓ بن منذر کو اور تیسرا سعدؓ بن عبادہ کو۔ زخمیوں کی دیکھ بھال کرنے، تیر اٹھانے اور دیگر چھوٹے بڑے کاموں کے لیے کچھ مستورات بھی ساتھ ہو لیں۔

خیبر میں کئی قلعے تھے۔ مثلاً سلالم، قُموص، ناعم، نطاۃ، زبیر، نُصارہ، الوطیح، شق اور مَربطہ۔ جن کی حفاظت پر بیس ہزار سپاہی متعین تھے۔ ان میں قموص مضبوط ترین تھا۔ اس کا رئیس مَرحَب بن عنتر تھا۔ سب سے پہلے ناعم فتح ہوا۔ پھر کئی دیگر قلعے۔ لیکن قموص فتح نہ ہو سکا۔ حضور ﷺ نے یکے بعد دیگرے کئی صحابہؓ کو اس مہم پر بھیجا لیکن کام یابی نہ ہوئی۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: میں کل ایک ایسے شخص کو علم دوں گا جو ناکام نہیں آئے گا۔ دوسرے روز حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو علم عطا کیا۔ جب حضرت علیؓ قلعہ کے سامنے پہنچے تو مرحب اینٹھتا اور جھومتا ہوا سامنے سے نمودار ہوا اور حضرت علیؓ کی طرف نہایت حقارت سے دیکھ کر کہنے لگا۔ کیا عربوں کی فوج میں تم سے بہتر کوئی آدمی نہیں تھا؟ حضرت علیؓ نے کہا: ذرا سامنے تو آؤ۔ مرحب نے آگے بڑھ کر تلوار کا وار کیا لیکن حضرت علیؓ اچھل کر ایک طرف کو ہو گئے اور معاً مرحب کے سر پر وہ ضرب رسید کی کہ تلوار اس کے خود اور کھوپڑی کو کاٹ کر نچلے جبڑے تک اُتر آئی۔ مرحب گر گیا۔ اس کی فوج بھاگ نکلی اور پورے بیس دن کے بعد قموص فتح ہو گیا۔ ساتھ ہی اہل خیبر نے ہتھیار پھینک دیئے حضور ﷺ نے سالانہ نصف زرعی پیداوار کا لگان عائد کر کے انھیں کامل امن وامان دے دیا۔

خاتمہ جنگ کے بعد ایک جلاوطن مدنی یہودی سلام بن مشکم کی بیوی زینب نے آپ ﷺ کو ایک زہر آلود بریاں بکری بھیجی۔ آپ ﷺ نے ذرا سا لقمہ چکھ کر اسے ترک کر دیا، لیکن حضرت بشرؓ بن براء چند لقمے کھا گئے اور ہلاک ہو گئے۔ حضور ﷺ نے جرمِ قتل میں زینب کو قتل کر دیا۔

اس جنگ میں شہدا ومقتولین کی تعداد یہ تھی: شہدا۔ 17، مقتولین (یہود)۔ 93۔
فتح مکمل ہو چکی تو مہاجرین حبشہ میں سے بعض حبشہ سے واپس آ گئے اور حضور ﷺ سے ملنے کے لیے خیبر جا نکلے۔ ان میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب بھی شامل تھے۔ آپ ﷺ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کس چیز سے زیادہ خوشی ہوئی ہے فتح خیبر سے یا جعفر کے آنے سے۔

(48) غزوۂ وادیٔ القریٰ

محرم، 7 ہجری۔ خیبر سے واپسی میں مغرب کے وقت حضور ﷺ وادیٔ القریٰ پہنچے۔ یہودیوں نے تیر اندازی کی، جس کی وجہ سے آپ ﷺ کا غلام مدعم، جو سامان اُتار رہا تھا، ایک یہودی کے تیر سے شہید ہو گیا۔ آپؐ نے انھیں اسلام کی دعوت دی۔ یہودی جنگ کی تیاری کر چکے تھے۔ انھوں نے دعوت رد کر دی اور اُصولِ جنگ کے مطابق ایک یہودی نے مبارز طلبی کی۔ حضرت زبیرؓ نے اس کا مقابلہ کر کے اسے ختم کر دیا۔ دوسرے یہودی کو حضرت علیؓ نے قتل کیا۔ اس طرح گیارہ یہودی مارے گئے۔ دوسرے دن طلوعِ آفتاب سے قبل انھوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس جنگ میں مالِ غنیمت کافی ہاتھ آیا۔ وادیٔ القریٰ میں چار دن آپ ﷺ نے قیام فرمایا اور زمین کاشت کے لیے اُن کے حوالے کی۔

(49) غزوۂ تیما

محرم، 7 ہجری۔ تیما کے یہودیوں کو جب خیبر اور وادیٔ القریٰ کے حالات معلوم ہوئے تو انھوں نے خیبر کے کاشت کاروں کی طرح نصف بٹائی پر کاشت کے معاہدے پر صلح کی درخواست پیش کی جسے آنحضرت ﷺ نے منظور فرما لیا۔

(50) سریہ کدید

صفر، 7 ہجری۔ کدید حجاز میں ایک مقام ہے جہاں صفر 7ھ میں بنوملوح کے چند آدمی برائے شرارت جمع ہو گئے تھے۔ حضور ﷺ نے حضرت غالبؓ بن عبداللہ لیثی کو دس صحابہؓ کے ساتھ بھیجا۔ ان لوگوں نے رات کے وقت ان پر حملہ کیا اور ان کے مواشی ہانک لائے۔

(51) سریہ حسمیٰ

جمادی الثانی، 7 ہجری۔ آنحضور ﷺ کے قاصد حضرت دحیہ کلبی قیصر رُوم کے پاس دعوتِ اسلام کا خط لے کر گئے ہوئے تھے۔ وہ جب قیصر کے تحائف کے ساتھ واپس ہوئے تو حسمیٰ کے مقام پر بنوجزام نے ان کا راستہ روکا اور تمام تحائف چھین لیے۔ جب مدینہ میں آنحضور ﷺ کو اس واقع کی خبر پہنچی تو آپ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہؓ کو دحیہ کلبیؓ کے ہم راہ حسمیٰ کی طرف بھیجا۔ حضرت زیدؓ نے بنوجزام سے انتقام لیا۔ اپنے تحائف بھی چھین لیے اور ہزاروں جانور اور سیکڑوں قیدی گرفتار کر کے مدینہ لے آئے۔ اس سریہ میں پانچ سو مجاہدین بھی حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ تھے۔

(52) سریہ تربہ

شعبان، 7 ہجری۔ انھی ایام میں حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ مکہ سے چار رات کے فاصلے پر نجران کی طرف ایک مقام تربہ (تربہ؟) میں قبیلہ ہوازن کے کچھ لوگ آمادۂ شر ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروقؓ کو تیس سواروں کے ساتھ بنوہوازن کی جانب روانہ فرمایا۔ حضرت عمرؓ کے پہنچنے پر وہ لوگ بھاگ گئے۔ ایک دوسری مخالف جماعت کا پتا ملا، مگر حضرت فاروق اعظمؓ نے کہا کہ ان سے لڑنے کا ہمیں حضور ﷺ کی طرف سے حکم نہیں ملا، اس لیے جنگ کیے بغیر مدینہ لوٹ آئے۔

(53) سریہ بنوکلاب

شعبان، 7 ہجری۔ انھی دنوں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضور ﷺ نے نجد کے ایک قبیلے بنوکلاب کی طرف بھیجا۔ ان کے ہم راہ سلمہ بن الاکوعؓ بھی تھے۔ اس سریہ میں بھی مسلمان کام یاب رہے۔ دشمن کے کچھ لوگ قتل ہوئے اور کچھ گرفتار کر لیے گئے۔

(54) سریہ میفعہ

رمضان، 7 ہجری۔ اسے سریہ خربہ بھی کہتے ہیں۔ میفعہ مدینے سے سولہ میل دُور نجد میں ایک مقام تھا جہاں رمضان 7ھ میں دو قبائل، بنو عوال اور بنو عبد بن ثعلبہ کے چند شوریدہ سر شرارت کے لیے جمع ہو گئے۔ حضور ﷺ نے حضرت غالبؓ بن عبداللہ کو ایک سو تیس آدمی دے کر اس طرف بھیجا۔ وہاں جنگ ہوئی اور قبائل کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ کے دوران میں جب حضرت اسامہؓ بن زید ایک کافر نہیک بن مردا کی طرف تلوار لے کر بڑھے تو اس نے بلند آواز سے کہا: ''لا الٰہ الا اللہ''، لیکن حضرت اسامہؓ نے اُسے مار ڈالا۔ جب یہ خبر حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ ناراض ہوئے اور فرمایا: ھل شققت قلبہ۔ (کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا؟) اس پر اسامہؓ نے توبہ کی اور آیندہ محتاط رہنے کا عہد کیا۔

(55) سریہ بنی مرہ

شوال 7ھ میں حضور ﷺ نے حضرت بشیرؓ بن سعد کو تیس صحابہؓ کے ہم راہ فدک کے ایک قبیلے بنو مُرّہ کی گوشمالی کے لیے بھیجا۔ چونکہ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس لیے انھوں نے اس دستے کو بہت نقصان پہنچایا۔ حضرت بشیرؓ بن سعد کو سخت زخمی کر دیا اور انھیں ان کے ساتھی اُٹھا کر واپس لائے۔

(56) سریہ بشیر بن سعد انصاریؓ

شوال، 7 ہجری۔ الجناب ایک مقام ہے خیبر اور وادیٔ القریٰ کے درمیان حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ عیینہ بن حصن، قبیلۂ غطفان کی ایک جمعیت کے ساتھ الجناب میں مقیم ہے۔ اور مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت بشیرؓ بن سعد انصاری کو تین سو آدمی دے کر اس طرف بھیجا۔ وہ لوگ انھیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔ انھیں صرف دو آدمی اور چند اونٹ ملے جنھیں یہ پکڑ لائے۔ وہ دونوں آدمی مدینہ پہنچ کر مسلمان ہو گئے۔

(57) سریہ اخرم بن ابی العوجا

ذی الحجہ، 7 ہجری۔ بنو سلیم کی ایک جمعیت کو منتشر کرنے کے لیے حضور ﷺ نے حضرت اخرم ابن ابی العوجاؓ کو پچاس آدمیوں کے ہم راہ بھیجا۔ وہاں پہنچے تو قبائلیوں نے انھیں گھیر لیا۔ ان میں سے اکثر قتل ہو گئے اور ابن ابی العوجاؓ سخت زخمی ہوئے بعد میں صحت یاب ہو کر یکم صفر کو مدینہ پہنچے۔

(58) سریہ سی

سی ایک کنویں یا چشمے کا نام ہے جو مدینہ سے پانچ منزل دُور، مکہ و بصرہ کی راہ پر نجد میں واقع تھا۔ وہاں قبیلہ بنو ہوازن کے چند آدمی فتنہ کاری کے لیے جمع ہو گئے۔ حضور ﷺ نے حضرت شجاع بنؓ ابی وہب الاسدی کو چوبیس آدمی دے کر بھیجا۔ وہ لوگ مقابلے میں نہ آئے اور یہ غنیمت لے کر لوٹ آئے۔

(59) سریہ کعب بن عمیر

ربیع الاول، 8 ہجری۔ حضور ﷺ نے حضرت کعبؓ بن عمیر غفاری کو پندرہ صحابہؓ کے ہم راہ ذات اطلاح میں تبلیغ کے لیے بھیجا۔ ان لوگوں نے ان پر حملہ کر دیا اور سب کو مار ڈالا۔ صرف ایک زخمی کسی طرح مدینے میں واپس پہنچا۔

(60) سریہ موتہ

جمادی الاول، 8 ہجری۔ مُوتہ جنوبی اُردن کا ایک سرحدی شہر ہے۔ حضرت حارثؓ بن عمیر ازدی کو ایک تبلیغی خط دے کر بُصریٰ (شام) کے والی کی طرف بھیجا۔ جب قاصد مُوتہ میں پہنچا تو اسے قبیلہ غسان کے سردار شرجیل بن عمرو الغسانی نے قتل کر دیا۔ اس پر حضور ﷺ نے ایک مہم ترتیب دی۔ جو تین ہزار غازیوں پر مشتمل تھی۔ حضرت زیدؓ بن حارثہ کو امیر مقرر کیا اور ہدایت فرمائی کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو حضرت جعفرؓ بن ابی طالب اور اُن کے بعد حضرت عبداللہؓ بن رواحہ امیر ہوں۔ اگر یہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان خود ہی اپنا امیر منتخب کر لیں۔ جب یہ مہم وہاں پہنچی تو بہت سے صحابہؓ اور تینوں امیر شہید ہو گئے اور جب باقی ماندہ لوگ مدینہ میں واپس آئے تو لوگوں نے اُن پر مٹی اُچھالی۔

(61) سریہ ذات السلاسل

جمادی الثانی، 8 ہجری۔ مدینہ میں یہ خبر آئی کہ وادی القریٰ میں، جو مدینہ سے دس یوم کی مسافت پر واقع تھی، بنو قضاعہ کے کچھ لوگ فتنہ پردازی کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت عمروؓ بن عاص کو تین سو صحابہؓ کے ہم راہ اس سمت بھیجا۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے اطلاع دی کہ قبائلیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لیے کمک بھیجی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کو دو سو آدمی دے کر ان کی مدد کے لیے بھیجا۔ کہتے ہیں کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو زنجیروں سے باندھ لیا تھا تاکہ جم کر لڑ سکیں اور بھاگنے کی راہیں بند ہو جائیں۔ اسی بنا پر اس مہم کو ذات السلاسل (زنجیروں والی) کہتے ہیں۔ ان تمام انتظامات کے باوجود قبائل کو شکست ہوئی۔

(62) سریہ سیف البحر

رجب، 8 ہجری۔ اسے سریہ خبط بھی کہتے ہیں۔ خبط کے دو مفہوم ہیں۔ اول: درختوں کے سُوکھے پتے۔ دوم: مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر شمال مغرب کی طرف ساحل کے قریب قبیلہ جہینہ کا ایک موضع۔

رجب 8ھ میں حضور ﷺ نے حضرت عبیدہؓ بن جراح کو مدینہ سے پانچ دن کی مسافت پر ساحل کی طرف بھیجا۔ جہاں سے جہینہ کی شرارتوں کی اطلاعات آ رہی تھیں۔ اتفاقاً سفر میں ان کا راشن ختم ہو گیا اور انھیں سوکھے پتوں پر گزارہ کرنا پڑا۔ جب یہ ساحل پر پہنچے تو سمندر کی لہر میں لپٹی ہوئی ایک مچھلی خشکی پر رہ گئی اور انھوں نے اسے گھیر کر پکڑ لیا۔ پھر جہینہ کا رخ کیا۔ وہ لوگ بھاگ گئے اور صحابہؓ واپس آ گئے۔ اس سریہ میں چوں کہ مسلمانوں نے درختوں کے پتے جھاڑ کر اور پانی میں تر کر کے کھائے تھے، اس لیے اسے ''سریہ خبط'' بھی کہتے ہیں۔ خبط کے لغوی معنی پتے جھاڑنے کے ہیں۔

(63) سریہ خُضرہ

شعبان، 8 ہجری۔ نجد میں قبیلہ بنو محارب کے ایک موضع کا نام خُضرہ ہے۔

حضور ﷺ نے بنومحارب کی گوشمالی کے لیے حضرت ابوقتادہؓ بن ربعی انصاری کو خضرہ کی طرف بھیجا۔ انھوں نے مقابلہ کیا اور شکست کھائی۔ صحابہؓ اتنا مال غنیمت ساتھ لائے کہ خمس نکالنے کے بعد بھی ہر ایک کو بارہ بارہ اونٹ ملے۔

(64) غزوۂ فتح مکہ

بنوخزاعہ مکہ مدینہ کے درمیان بدر کے قریب آباد تھے اور مسلمانوں کے حلیف تھے۔ معاہدہ حدیبیہ کے مطابق قبائل عرب کو پوری پوری آزادی تھی کہ جس کے ساتھ چاہیں، معاہدہ کریں۔ فریقین اس کا احترام کریں گے۔ لیکن قریش نے اس شرط کو توڑ دیا اور نجد کے ایک قبیلے بنوبکر کے ساتھ مل کر حضور ﷺ کے حلیف بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔ ان لوگوں نے بھاگ کر حرم میں پناہ لی۔ لیکن حملہ آوروں نے انھیں وہاں بھی معاف نہ کیا۔ اس پر خزاعہ کے چند آدمی حضور ﷺ کے ہاں مدینہ میں گئے۔ حضور ﷺ نے بات سن کر قریش کو پیغام بھیجا کہ مقتولوں کا خوں بہا ادا کرو لیکن قریش نے انکار کر دیا۔ اس پر حضور ﷺ 10 رمضان 8ھ کو دس ہزار صحابہؓ کے ہم راہ مدینہ سے نکلے۔ جب مکہ کے قریب مرالظہر ان میں پڑاؤ ڈالا تو ابوسفیان رات کے وقت چند دیگر آدمیوں کے ساتھ جائزہ لینے کے لیے مرالظہر ان میں گیا۔ کسی فوجی نے اسے دیکھ لیا اور پکڑ کر حضور ﷺ کے ہاں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر ابوسفیان فوراً اسلام لے آیا۔ 20- رمضان کو صبح کے وقت لشکر اسلام مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ ہر قبیلے کا علَم جُدا تھا۔ علَم نبوی ﷺ حضرت زبیرؓ بن عوام کے پاس تھا۔ حسب الحکم مختلف دروازوں سے شہر میں داخل ہوئے۔ آں حضرت ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ جو شخص اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے گا یا خانہ کعبہ میں داخل ہو جائے گا یا ابوسفیانؓ کے گھر میں داخل ہو جائے گا اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ تاہم خالد بن ولید ایک دستہ لے کر مقابلے میں آ گیا۔ 13 لاشیں چھوڑ کر جلد بھاگ نکلا۔ صحابہؓ میں سے تین شہید ہوئے۔ تھوڑی دیر میں سارے شہر نے اطاعت قبول کر لی۔ حضور ﷺ نے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ پھر اپنی سواری پر بیت اللہ کا طواف کیا۔ اس وقت حرم میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ جب کسی بُت کے پاس سے گزرتے تو عصا سے اسے ٹھوکا دے کر پڑھتے: قل جاء الحق وزھق الباطل۔ ساتھ ہی ایک غیبی ہاتھ کی ضرب سے وہ اُوندھا پڑ جاتا۔ جب ظہر کا وقت آیا تو حضرت بلالؓ نے اذان دی۔ بقول ابن سعد (ج 1، ص 478) یہ کعبہ میں پہلی اذان تھی۔ پھر شہر میں منادی کرائی کہ ہر شخص اپنے گھر کے بتوں کو توڑ ڈالے۔ ساتھ ہی گردونواح کے اصنام مثلاً عزیٰ، منات، لات، سواع وغیرہ کو توڑنے کے لیے مہمات بھیجیں۔

نوٹ: خالد بن ولید کے مقابلے میں دستہ آیا تھا نہ کہ وہ مقابلے میں آئے۔

ابن اسحاق کے مطابق مکہ 20 رمضان 8ھ کو فتح ہوا تھا۔ بعد از فتح حضور ﷺ پندرہ دن اور وہاں رہے۔ پھر حضرت عتابؓ بن اسید کو عامل مکہ بنا کر واپس تشریف لے گئے۔

(65) سریہ خالد بن ولیدؓ

عزیٰ دراصل نخلہ میں ایک درخت کا نام تھا جس کے نیچے ایک بُت رکھا ہوا تھا جو لات و منات کے بعد تراشا گیا تھا۔ اس درخت کی مناسبت سے یہ بھی عزیٰ کہلانے لگا تھا۔ فتح مکہ سے پانچ دن بعد حضور ﷺ نے حضرت خالدؓ بن ولید کو تیس سوار دے کر ہدایت فرمائی کہ وہ اس بت کو توڑ آئیں اور آپ نے تعمیل کی۔

(66) سریہ عمرو بن العاصؓ

سُواع قبیلہ ہذیل کا بُت تھا جو مکہ سے تین میل دُور ایک مقام رُباط میں نصب تھا۔ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حضرت عمروؓ بن عاص کو حکم دیا کہ وہ اس بت کو گرا دیں اور انھوں نے تعمیل کی۔

(67) سریہ سعد بن زید اشہلی

منات اوس، خزرج اور غسان کا صنم تھا جو مکہ کے شمال میں ایک مقام مشلّل میں نصب تھا۔ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے بعد حضرت سعدؓ بن زید اشہلی کو حکم دیا کہ وہ اسے جا کر توڑ آئیں۔ سعد نے تعمیل کی۔ سعد کے ہم راہ بیس سوار تھے۔

(68) سریہ خالد بن ولیدؓ

شوال، 8 ہجری۔ عزیٰ کے انہدام کے بعد آنحضور ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو 350 مہاجر و انصار اور بنی سُلیم کے ساتھ دعوت اسلام کے لیے بنی جذیمہ کی طرف بھیجا۔ انھیں مقاتلہ کا حکم نہ تھا۔ وہاں پہنچ کر ان لوگوں سے حضرت خالدؓ نے پوچھا کہ تم لوگ کیا ہو؟ وہ لوگ صاف طور پر یہ بیان نہ کر سکے کہ وہ مسلمان ہیں، بلکہ یہ کہا کہ وہ صابی ہیں، یہ اس لیے کہ جو شخص مسلمان ہوتا، قریش اُسے صابی کہتے تھے۔ بہرکیف حضرت خالدؓ نے انھیں قتل کیا، اور جو باقی رہے، انھیں گرفتار کر کے لوگوں میں حفاظت کے لیے بانٹ دیا۔ دوسرے دن آپ نے قیدیوں کے قتل کا حکم دیا۔ انصار و مہاجرین نے تو قیدیوں کو قتل نہ کیا، بلکہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں لے آئے، مگر بنی سُلیم نے حضرت خالدؓ کے حکم کی تعمیل میں اپنی نگرانی میں دیئے گئے قیدیوں کو قتل کر دیا۔

آنحضور ﷺ کو جب حقیقتِ حال کا عِلم ہُوا تو مضطرب ہو گئے اور فرمایا: ''خداوندا، میں اس سے بری ہوں جو خالد نے کیا۔'' اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو بھیج کر بنی جذیمہ کے مقتولوں کی دیت ادا کی اور جن کا مال ضائع ہوا تھا، ان کے نقصان کی تلافی کی۔ اس واقعے کی وجہ سے آنحضور ﷺ چند روز تک حضرت خالدؓ سے ناراض بھی رہے۔

(69) غزوۂ حنین

شوال، 8 ہجری۔ حنین ایک وادی کا نام ہے جو مکہ سے تین دن کی مسافت پر شمال میں واقع ہے۔ اس کے نواح میں ثقیف و ہوازن آباد تھے۔ جب حضور ﷺ 6 شوال 8ھ کو بارہ ہزار مجاہدینؓ (ان میں دس ہزار اہل مدینہ تھے اور دو ہزار اہل مکہ) کے ہم راہ مکہ سے روانہ ہوئے تو 10 شوال کو وادی حنین میں پہنچے وہاں ثقیف و ہوازن ہزاروں کی تعداد میں پہلے ہی سے مقیم تھے۔ ان کی قیادت مالک بن عوف کے ہاتھ

میں تھی۔ ان لوگوں نے وہاں پہنچ کر تمام موزوں مقامات پر قبضہ کر لیا تھا اور تیراندازوں کے دستے گھاٹیوں میں جابجا جما دیئے تھے۔ جب 11 شوال کی صبح طلوع ہوئی اور صحابہؓ کی صفیں دشمن کی طرف بڑھیں تو سامنے سے ہزاروں جوان ٹوٹ پڑے۔ تیروں کا مینہ برسنے لگا اور یہ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ صحابہؓ اِدھر اُدھر بھاگ نکلے اور حضور ﷺ کے پاس صرف سات صحابہؓ رہ گئے یعنی حضرت عباسؓ، حضرت علیؓ، حضرت فضلؓ بن عباس، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت اسامہؓ بن زید اور حضرت ربیعہؓ بن حارث بن عبدالمطلب۔ حضور نے دائیں اور بائیں طرف دیکھ کر زور سے آواز دی یامعشر الانصار انا ابن عبدالمطلب۔ انا النبی لاکذب۔ (اے انصار میں عبدالمطلب کا فرزند اور بلا ریب نبی ہوں) حضرت عباسؓ نے بھی لوگوں کو آواز دی۔ چنانچہ وہ سب لوٹ کر دشمن پر ٹوٹ پڑے اور اس شجاعت و بے جگری سے لڑے کہ دشمن گھبرا کر بھاگ نکلا اور ستر لاشیں میدان میں چھوڑ گیا۔ صحابہؓ میں سے صرف چار نے شہادت پائی۔ اسیروں کی تعداد 6 ہزار تک جا پہنچی۔ مالِ غنیمت میں 24 ہزار اُونٹ، 40 ہزار بکریاں اور چار ہزار اوقیہ چاندی آئی۔ حضور ﷺ نے تالیفِ قلوب کے لیے سردارانِ قریش پر خاص نوازش کی۔ ابوسفیان کو 300، حکیم بن حزام کو 200، صفوان بن اُمیہ اور چند دیگر کو ایک ایک سو اُونٹ دیئے۔ دوسری طرف انصار میں سے ہر ایک کو چار چار اُونٹ ملے۔ اس پر انصار کو رنج ہوا۔ جب یہ اطلاع حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے سب انصار کو طلب فرمایا۔ ایک نہایت مؤثر اور دل دہلا دینے والا خطبہ دینے کے بعد پوچھا:

"اے انصار! کیا تمھیں یہ پسند نہیں کہ لوگ اُونٹ اور بکریاں لے کر گھر جائیں اور تم محمد ﷺ کو لے کر واپس پہنچو۔"

انصار بے اختیار بول اٹھے کہ ہم اس تقسیم پر بہت خوش ہیں اور اکثر کا یہ حال تھا کہ روتے روتے ان کی ڈاڑھیاں بھیگ گئیں۔

اس کے بعد قبائل کا ایک وفد قیدیوں کی رہائی کے لیے آیا اور رحمۃ للعالمین ﷺ نے سب کو چھوڑ دیا۔

(70) غزوۂ طائف

شوال، 8 ہجری۔ طائف۔ مکہ کے مشرق میں چالیس میل دور ایک سبز و شاداب مقام ہے جہاں وادیٔ حنین کے بھگوڑے جمع ہو گئے تھے۔ حضور ﷺ نے حنین سے فارغ ہو کر شوال ہی میں طائف کا محاصرہ کر لیا۔ لوگ قلعہ بند ہو کر چھتوں پر سے تیر برسانے لگے۔ جن سے بارہ صحابہؓ شہید ہو گئے۔ محاصرہ اٹھارہ دن جاری رہا چوں کہ طویل سفر اور دو مہمات (کعبہ و حنین) کی وجہ سے صحابہؓ اکتا گئے تھے۔ اس لیے حضور ﷺ نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چل دیئے۔۔ دو ماہ اور سولہ دن کے بعد آں حضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے۔

(71) سریہ بنو تمیم

محرم، 9 ہجری۔ تمیم عرب کا ایک اہم قبیلہ تھا جو خلیج ایران کے مغربی ساحل پر کویت کے قریب آباد تھا۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ یہ قبیلہ حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ آپ ﷺ نے حضرت عینیہؓ بن حصن الفزاری کو پچاس سواروں کے ہم راہ، جو خالص اعراب تھے اور ان میں کوئی مہاجر یا انصاری شامل نہ تھا اس سمت روانہ کیا۔ وہاں سے یہ گیارہ مرد، گیارہ عورتیں اور تیس بچے گرفتار کر لائے۔ پیچھے پیچھے رؤسائے تمیم کا ایک وفد بھی آن پہنچا۔ حضور ﷺ نے ان کی درخواست منظور فرما کر تمام قیدی چھوڑ دیئے۔

(72) سریہ قطبہ بن عامر

صفر، 9 ہجری۔ مدینہ میں اطلاع آئی کہ بنوخثعم جو مکہ کے شمال میں دو یوم کی مسافت پر وادیٔ بیشہ کے قریب رہتے تھے، آمادۂ فساد ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت قطبہؓ بن عامر کو بیس آدمی دے کر اس طرف روانہ کیا۔ وہاں شدید مقابلہ ہوا اور حضرت قطبہؓ کافی مالِ غنیمت کے ساتھ واپس آئے۔

(73) سریہ بنوکلاب

ربیع الاول، 9 ہجری۔ بنوکلاب نجد میں رہتے تھے۔ ان کے متعلق خبر ملی کہ یہ حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔ حضور ﷺ نے حضرت ضحاکؓ بن سفیان کو ان کی طرف بھیجا اور انھیں سخت شکست ہوئی۔

(74) سریہ علقمہ

ربیع الآخر 9 ھ میں حبشہ کے کچھ آدمی جدّہ میں آ کر قانون شکنی کرنے لگے۔ حضور ﷺ نے علقمہ بن مُجزِّز مدلجی کو تین سو آدمیوں کا ایک دستہ دے کر اس سمت بھیجا لیکن وہ لوگ انھیں دیکھتے ہی بھاگ گئے۔

(75) سریہ بنو طے

ربیع الثانی، 9 ہجری۔ اُلفُلس قبیلۂ طے کا بُت تھا اور یہ قبیلہ مدینہ سے اندازاً سو میل شمال مشرق میں آباد تھا۔ حضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو ڈیڑھ سو سواروں کے ہم راہ اس طرف بھیجا۔ یہ بُت مشہور کریم وفیاض حاتم کے محلّے میں نصب تھا۔ ان لوگوں نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی۔ غنیمت میں کچھ مواشی اور قیدی آئے۔ ان میں حاتم کی بیٹی بھی شامل تھی۔ روایات میں ہے کہ جب حاتم کی بیٹی حضور ﷺ کے سامنے لائی گئی تو آپ ﷺ نے اس کی طرف اپنی ردا پھینکی تا کہ وہ معزز خواتین کی طرح سارے جسم کو ڈھانپ سکے۔ غنیمت میں تین تلواریں بھی تھیں جو حضور ﷺ نے لے لیں۔ یعنی رَسُوب، مِخذَم اور یمانی۔ اور آلِ حاتم کو رہا کر دیا۔

(76) غزوۂ تبوک

رجب، 9 ہجری۔ تبوک۔ شمالی عرب کا ایک شہر ہے۔ مدینہ سے ساڑھے تین سو میل دُور اور خلیج عقبہ سے ایک سو میل مشرق میں۔ جب شامی تاجروں نے مدینے میں آ کر یہ بتایا کہ رُومی فوجیں عرب کی شمالی سرحد پر جمع ہو رہی ہیں تو حضور ﷺ نے جہاد کی تیاری کا حکم دے دیا۔ چوں کہ سفر بہت طویل اور موسم گرم تھا اس لیے آپ ﷺ نے ہر شخص سے کہا کہ وہ سواری کا انتظام کرے۔ ابن خلدون لکھتا ہے کہ

اس غزوہ میں حضرت عثمانؓ نے سب سے زیادہ مال و اسباب دیا تھا۔ آپؓ نے ایک ہزار دینار، ایک سو گھوڑے اور نو سو اونٹ پیش کیے تھے۔ حضور ﷺ ماہ رجب 9ھ میں تیس ہزار مجاہدین اور دس ہزار گھوڑوں کے ہم راہ مدینہ سے روانہ ہوئے۔ تیرہ چودہ دن کے بعد تبوک میں پہنچے وہاں بیس دن رہے لیکن رومی فوج سامنے نہ آئی اس لیے آپ ﷺ واپس چل پڑے اور دو ماہ کے بعد رمضان 9ھ میں مدینے پہنچ گئے۔

(77) سریہ اکیدر

رجب 9 ہجری۔ مقام تبوک پر قیام کے دوران میں آنحضور ﷺ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو چار سو بیس سواروں کے ساتھ اکیدر کی طرف روانہ کیا۔ اکیدر قیصر روم ہرقل کی طرف سے دومۃ الجندل کا حاکم اور فرماں روا تھا۔ آنحضور ﷺ نے روانگی کے وقت حضرت خالدؓ سے فرمایا کہ اکیدر تمھیں شکار کرتا ہوا ملے گا۔ اسے قتل نہ کرنا، بلکہ گرفتار کر کے میرے پاس لانا، البتہ اگر وہ انکار کرے تو قتل کر دینا۔ گرمی کا موسم تھا۔ حضرت خالدؓ رات کے وقت وہاں پہنچے۔ اکیدر اپنی بیوی کے ساتھ چاندنی رات میں قلعے کی فصیل پر بیٹھا گانا سن رہا تھا کہ اچانک ایک نیل گائے نے قلعے کے دروازے کے ساتھ آ کر ٹکر ماری۔ اکیدر فوراً نیچے اُترا اور اپنے بھائی اور چند دیگر رشتہ داروں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر نیل گائے کے شکار کو نکلا۔ یہ لوگ ابھی تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ حضرت خالد بن ولیدؓ آن پہنچے۔ اکیدر کے بھائی حسان نے مقابلہ کیا، مگر قتل ہو گیا اور اکیدر جو شکار کو نکلا تھا، خود حضرت خالدؓ بن ولید کا شکار ہو گیا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اکیدر کو اس شرط پر قتل سے پناہ دی کہ وہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونا قبول کرے۔ اکیدر حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہم راہ دربار رسالت ﷺ میں حاضر ہوا اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں دو ہزار اونٹ، آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے پیش کر کے صلح کی۔

(78) سریہ حضرت علیؓ

رمضان 10 ہجری۔ آنحضور ﷺ نے حضرت علیؓ کو تین سو سواروں کے ہم راہ یمن میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجا اور ہدایت کی کہ جب تک وہ لوگ تم پر حملہ آور نہ ہوں، تم ان سے جنگ نہ کرو۔ وہاں پہنچ کر جب حضرت علیؓ نے اسلام کی دعوت دی تو انھوں نے تیر اور پتھر برسانا شروع کر دیئے۔ اس پر جنگ چھڑ گئی اور بیس یمنی ہلاک ہو گئے، لیکن اس واقعے کے بعد ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

بعد ازاں حضرت علیؓ نے مالِ غنیمت جمع کیا اور خمس نکال کر باقی مال مجاہدین پر تقسیم کر دیا۔ پھر اپنی جگہ کسی اور کو امیر لشکر مقرر کر کے بہ عجلت مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ حضرت علیؓ کو یہ خبر مل چکی تھی کہ حضور ﷺ مدینہ منورہ سے حج کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ اس لیے حضرت علیؓ یمن سے سیدھے مکہ معظمہ پہنچ کر حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریک ہوئے۔

(79) حجۃ الوداع

ذی الحجہ، 10 ہجری۔ حضور ﷺ ذی قعدہ 10ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ کے ہم راہ تمام ازواج مطہرات اور دیگر لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ کہتے ہیں کہ اس حج میں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار آدمی شامل ہوئے تھے۔

''پھر میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ صیہون کے پہاڑ پر کھڑا ہے اور اس کے ساتھ ایک لاکھ چوالیس ہزار شخص ہیں۔'' (مکاشفہ یوحنا۔1-14/5)

آپ ﷺ نے عرفات میں وہ مشہور خطبہ دیا جو خطبہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ فرمایا:

''اے لوگو سنو! شاید میں اس سال کے بعد اس مقام پر آپ سے پھر نہ مل سکوں۔ جس طرح آج کا دن، یہ شہر اور یہ مہینا مقدس ہے اسی طرح تمھارے لیے ایک دوسرے کی جان و مال مقدس ہے۔ تم میں سے جس کے پاس امانت ہے اسے ادا کرے۔ قرضوں پر سُود نہ لو۔ عہد جاہلیت کے مقتولوں کا سلسلۂ انتقام آج سے ختم کیا جاتا ہے۔ اے لوگو! سرزمین عرب میں شیطان اپنی عبادت سے مایوس ہو چکا ہے۔ تم پر تمھاری بیویوں کے اور بیویوں پر کچھ تمھارے حقوق ہیں جنھیں ادا کرنا ضروری ہے۔ یاد رکھو کہ کسی عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اللہ کے ہاں بزرگ تر وہ ہے جو زیادہ متقی ہو۔ اے لوگو! کیا تم شہادت دیتے ہو کہ میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا، آواز آئی کہ ہاں۔ فرمایا کہ اس پیغام کو حاضر غائب تک پہنچائے۔''

حضور ﷺ 10 ذی الحجہ کو مکہ سے واپس چلے اور دس بارہ یوم کے بعد مدینہ میں تشریف لے آئے۔

(80) سریہ اسامہ بن زید

ربیع الاول، 11 ہجری۔ حضور ﷺ کو اطلاع ملی کہ شمالی سرحد پر رومی مصروف شرارت ہیں۔ آپ ﷺ نے حضرت اُسامہؓ بن زید کو بلایا اور تین ہزار مجاہدین کے ہم راہ 10 ربیع الاول 11ھ کو رُوم کی طرف روانہ کیا آپ مدینہ کے باہر جُرف میں آخری جائزے کے لیے ٹھہرے بارہ ربیع الاوّل کو آگے بڑھنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ حضور ﷺ کی وفات کی خبر ملی۔ لشکر واپس آ گیا۔ لیکن جوں ہی حضرت ابوبکرؓ بیعت وغیرہ سے فارغ ہو چکے تو آپؓ نے اسامہؓ کو اپنی مہم پر دوبارہ جانے کا حکم دے دیا۔ آپ یکم ربیع الثانی کو روانہ ہوئے۔ بیس دن کے بعد منزل (موتہ) پر پہنچے۔ شریروں کی گوشمالی کی۔ پھر واپس چل پڑے اور پندرہ دن کے بعد مدینے پہنچ گئے۔

(تحریر: ڈاکٹر غلام جیلانی برق)

غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک نظر میں

نمبر	کب	مہم	سالار	عرصہ (دن)	تیاری (دن)	کیفیت
1	رمضان یکم ہجری	بحری مہم	جناب امیر حمزہؓ	7-0	7-0	ابوجہل کے لشکر کے سلسلہ میں جوابی کارروائی، غیر جانب دار قبائل کا بیچ بچاؤ
2	شوال یکم ہجری	رابعہ کی مہم	جناب عبیدہؓ بن حارث	14-0	7-0	مکہ مکرمہ کے نزدیک بھرپور حربی مظاہرہ اور گشتی کارروائی
3	ذی قعد یکم ہجری	حرار کی مہم	جناب سعدؓ بن ابی وقاص	15-0	5-0	اوپر والی مہم کے اثرات قائم رکھنے کے لیے، ایک تیز رفتار ہلکے دستہ کا جعفہ کے مقام تک حربی مظاہرہ
4	صفر، دو ہجری	ابوا کی مہم	حضور پاک ﷺ	16-0	10-0	ودان اور ابوا کے علاقوں میں بھرپور حربی مظاہرے
5	ربیع الاوّل دو ہجری	بواط کی مہم	حضور پاک ﷺ	15-0	7-0	جلد تیار ہو کر امیہ بن خلف کے تجارتی قافلہ کے کھوج کے سلسلہ میں گھاتیں اور حربی مظاہرے
6	ربیع الاوّل ۲ ہجری	کرز بن جابر کا تعاقب	حضور پاک ﷺ	2دن	1دن	کرز بن جابر کا مسلمانوں پر چھاپا۔ پہلے جناب سعدؓ کی جوابی کارروائی اور پھر حضور پاک ﷺ کا تعاقب کے لیے نکلنا
7	جمادی الثانی دو ہجری	العشیرہ پر دھاوا	حضور پاک ﷺ	17دن	15دن	ایک مقصد ابوسفیان کے تجارتی قافلے کا کھوج لگانا تھا لیکن یہ ایک جنگی مشق اور حربی مظاہر بھی تھا۔
8	رجب دو ہجری	نخلہ کی جھڑپ	حضرت عبداللہؓ بن جحش	18دن	5دن	تیز رفتار ہلکے پھلکے دستے کی مکہ مکرمہ اور طائف تک گشت، جھڑپ ہو گئی جس میں دشمن کا عمرو الحضری مارا گیا۔
9	رمضان دو ہجری	جنگ بدر	حضور پاک ﷺ	14دن	7دن	حق اور باطل کا پہلا بڑا معرکہ، جو تفصیل کا محتاج نہیں
10	رمضان دو ہجری	عصماء کا قتل	حضرت عمیرؓ بن عدی	1دن	3دن	حضور ﷺ کی ہجو کرنے والی شاعرہ کو ٹھکانے لگایا گیا۔
11	شوال دو ہجری	ابوعفک یہودی کا قتل	حضرت سالمؓ بن عمیر	1دن	3دن	ایک شر پسند یہودی کا خاتمہ
12	شوال دو ہجری	بنوقینقاع کی سرکوبی	حضور پاک ﷺ از خود	15دن	7دن	میثاق مدینہ کو توڑنے پر بنوقینقاع کا محاصرہ اور پھر دیس نکالا۔
13	ذوالحجہ دو ہجری	ابوسفیان کا تعاقب	حضور پاک ﷺ	4دن	1دن	اسے سویق کی مہم بھی کہتے ہیں اور ابوسفیان کے ناکام چھاپا کے بعد قرارہ الکدر تک اس کا تعاقب

14	محرم تین ہجری	قرارہ الکدر کی مہم	حضور پاک ﷺ	14دن	7دن	بنوغطفان اور بنوسلیم کے علاقوں میں دُور دُور تک چھاپے کہ وہ قریش کے حواری تھے۔ مالِ غنیمت کا حصول
15	ربیع الاوّل تین ہجری	کعب بن اشرف کا قتل	جناب محمدؓ بن مسلمہ	1دن	5دن	شرپسند یہودی جو قریش کے ساتھ ملا ہوا تھا۔ اس کا خاتمہ
16	ربیع الاوّل تین ہجری	غطفان کی مہم	حضور پاک ﷺ	12دن	5دن	ذوامر بحران کی مہم بھی کہا جاتا ہے۔ بنوغطفان کے چھوٹے قبائل بنوثعلبہ اور بنومحارب کی سرکوبی بھی تھی۔
17	جمادی الاوّل تین ہجری	بنوسلیم کی مہم	حضور پاک ﷺ	14دن	6دن	حربی مظاہرہ جنگی مشق کے علاوہ بنواسد، بنوفزارہ اور بنوسلیم کو تتر بتر بھی کرنا تھا۔
18	جمادی الثانی تین ہجری	قریش کے قافلہ پر قروہ کے مقام پر حملہ	جناب زیدؓ بن حارث	18دن	5دن	قریش کے عراق کے راستے شام کے ساتھ تجارت کرنے کو بند کرنے کے لیے تیز رفتار گھات اور چھپاؤ والی مشکل مہم
19	شوال تین ہجری	جنگ احد	حضور پاک ﷺ	1دن	12دن	حق و باطل کا دوسرا بڑا معرکہ
20	شوال تین ہجری	حمراالاسد کی مہم	حضور پاک ﷺ	8دن	1دن	جنگ احد کے بعد قریش کے تعاقب اور حمراالاسد میں پانچ دِن قیام اور گشتی کارروائیاں
21	محرم چار ہجری	قطن کی مہم	جناب ابوسلمہؓ مخزومی	14دن	7دن	یہ بنواسد کی سرکوبی بھی تھی جناب ابوسلمہؓ کا زخمی ہونا اور بعد میں شہادت
22	محرم چار ہجری	خالد بن سفیان کا قتل	جناب عبداللہ بنؓ انیس	15-0	7-0	قبیلہ ہذل کے خالد کی اسلام دشمنی کی وجہ سے گھات لگا کر اسے قتل کے لیے لمبا سفر کرنا پڑا۔
23	صفر چار ہجری	بئر معونہ کی عظیم قربانی	جناب المنذرؓ بن عمرو	7-0	3-0	ستر صحابہ کرامؓ کو گھیرے میں لے کر دھوکے سے ان کو شہید کرنا عظیم قربانی اور عظیم لڑائی۔
24	ربیع الاول ہجری	رجیع کے شہدا	جناب مرثدؓ	7-0	3-0	صحابہؓ کرام کے ساتھ دھوکا آٹھ صحابہ کرامؓ کی شہادت اور دو کو قریش کے ہاتھ بھیجنا عظیم قربانی قریش نے انھیں پھانسی لگا دیا۔
25	ربیع الاول چار ہجری	بنونصیر کا محاصرہ	حضور پاک ﷺ	15-0	10-0	میثاقِ مدینہ کی تجدید سے بنونصیر کا انکار۔ حضور پاک ﷺ پر پتھر پھینکنا۔ ان کا محاصرہ اور جلاوطنی۔
26	جمادی الاول چار ہجری	ذاتِ رقاع کی مہم	حضور پاک ﷺ	16	7	بنوثعلبہ اور بنومحاریب کے علاقوں میں بہت دُور ایک عجیب وغریب رنگ کے پہاڑ تک جنگی مشق اور حربی مظاہرہ
27	شوال ذی قعد چار ہجری	بدر کی آخری مہم	حضور پاک ﷺ	12	10	ابوسفیان کے چیلنج کے بعد اپنا وعدہ پورا کیا۔ آٹھ دن وہاں قیام بھی کیا پھر بھی ابوسفیان نہ آیا
28	ربیع الاول پانچ ہجری	دومۃ الجندل کی پہلی مہم	حضور پاک ﷺ	1ماہ	10	ایک ماہ دومۃ الجندل آنے جانے میں لگتا ہے۔ لیکن شاید حضور پاک ﷺ دومۃ الجندل کے گرد ونواح سے واپس آگئے کہ یہ ایک جنگی مشق اور حربی مظاہرہ تھا۔ اس لیے مدت صرف ایک ماہ لکھی ہے۔

29	شعبان پانچ ہجری	المریسیع کی مہم	حضور پاک ﷺ	10	7	بنو مصطلق کے علاقوں کا ایک حربی مظاہرہ
30	شوال ذیقعد پانچ ہجری	جنگ خندق	حضور پاک ﷺ	22	20	حق اور باطل کا تیسرا بڑا معرکہ۔ مورخین نے خندق کی تیاری کے لیے بیس دن اور محاصرہ بائیس دن بتایا ہے۔
31	ذیقعد پانچ ہجری	بنو قریظہ کا قلع قمع	حضور پاک ﷺ	1ماہ	1دن	بنو قریظہ کی غداری اور اس کی انھیں سزا
32	محرم چھ ہجری	قرطاس کی مہم	حضرت محمدؓ بن مسلمہ	10	7	بئر معونہ اور ذات رجیع کے شہدا کا بدلہ لینے کے لیے اُن قبائل پر چھاپا
33	ربیع الاول چھے ہجری	بنو لحیان کی سرکوبی	حضور پاک ﷺ	17	10	بئر معونہ اور ذات رجیع کے شہدا کا بدلہ لینے کے لیے مکہ مکرمہ کے نزدیک تمام شر پسند قبائل پر چھاپے۔
34	ربیع الاول چھے ہجری	ذوقرد پر چڑھائی	حضور پاک ﷺ	5	1	یہ کارروائی عینیہ بن حصن کے چھاپا کے خلاف جوابی کارروائی اور اس کا تعاقب تھا۔
35	ربیع الاول چھے ہجری	بنو اسد کی سرکوبی	جناب عکاشہؓ بن محصن	14	7	بنو اسد کی سرکوبی کے لیے تیز رفتار چھاپا مار دستے کی کارروائی جو غمر پہاڑ تک گئے۔
36	ربیع الثانی چھے ہجری	ذیقعد کی مہم	جناب محمدؓ بن مسلمہ	10	5	بنو غوال اور بنو ثعلبہ پر چھاپا۔ لیکن بعد میں خود بھی دھوکا کھا گئے اور سالار کو چھوڑ کر سب دستہ والے شہید ہو گئے۔
37	ربیع الثانی چھے ہجری	بنو ثعلبہ کی سرکوبی	جناب ابو عبیدہؓ بن جراح	7	3	اُوپر والی قربانی کا بدلہ لینے کے لیے دشمن پر زبردست چھاپا۔
38	ربیع الثانی چھے ہجری	جموم کی مہم	جناب زیدؓ بن حارث	5	3	بنو سلیم کے جنگِ خندق میں کفار کے ساتھی ہونے کی سزا اور سخت چھاپا
39	جمادی الاول چھے ہجری	عیص پر چھاپا	جناب زیدؓ بن حارث	17	5	قریش کے عراق والے راستے شام کے ساتھ تجارتی قافلہ پر کامیاب جھپٹا اور بے شمار مال غنیمت کا حصول
40	جمادی الثانی چھے ہجری	طرف کی مہم	جناب زیدؓ بن حارث	7	4	بنو ثعلبہ کے مزید علاقوں پر چھاپا اور حربی مظاہرہ
41	رجب چھے ہجری	وادی القریٰ کی پہلی مہم	جناب زیدؓ بن حارث	10	4	شمال کی طرف بنو فزارہ کے خلاف حربی مظاہرہ اور چھاپا۔ لیکن متعدد لشکریوں کی شہادت صرف تین مجاہد زندہ بچے۔
42	رجب چھے ہجری	دومۃ الجندل کی دوسری مہم	جناب عبدالرحمٰنؓ بن عوف	1ماہ 15دن	7	دُور دراز علاقوں میں حربی مظاہرہ اور ایک بہت بڑی مہم
43	شعبان چھے ہجری	بنی مصطلق پر حملہ	حضور پاک ﷺ	20	10	نزدیک کے علاقوں کی بہت بڑی مہم اور بہت بڑا مظاہرہ۔ متعدد قبائل کا قبول اسلام
44	شعبان چھے ہجری	فدک پر چھاپا	حضرت علیؓ بن ابو طالب	7	3	یہودیوں اور بنو سعد بن بکر کے گٹھ جوڑ کا قلع قمع

45	شعبان چھے ہجری	وادی القریٰ کی دوسری مہم	جناب صدیق اکبرؓ بن ابوقحافہ	12	5	نمبر شمار 41 کی قربانی کا بدلہ۔ اُم قرفہ، راہ زن عورت کا قتل اور پورے علاقے میں حربی مظاہرہ
46	شوال چھے ہجری	خیبر پر پہلا چھاپا	جناب عبداللہؓ بن رواحہ	14	5	بنوغطفان اور یہودیوں کے گٹھ جوڑ کا قلع قمع اور یہودی سردار اُسیر کا قتل
47	ایضاً	خیبر پر دوسرا چھاپا	جناب عبداللہؓ بن عتیق	15	5	یہودیوں پر دباؤ قائم رکھنا اور یہودی سردار ابورفیع بن ابوالحقائق کا قتل
48	شوال چھے ہجری	کرزؓ بن جابر کی مہم	جناب کرزؓ	3	1	قبیلہ قیس اور عرینہ کے لوگوں کی احسان فراموشی حضور پاک ﷺ کے چرواہے کو شہید کرنا اور جناب کرزؓ کا اُن کا تعاقب اور اُن پر چھاپا مار کر پکڑنا۔
49	چھے ہجری	ذات رجیع کے شہدا کا بدلہ	جناب عمروؓ بن امیہ	20	3	مہم کا مہینا معلوم نہیں ہوسکا اور جناب عمرو کا اہل مکہ کی نیندیں حرام کرنا کہ جگہ، جگہ چھاپے مارنا۔
50	ذی قعد چھے ہجری	صلح حدیبیہ	حضور پاک ﷺ ازخود	17	7	امام بخاریؒ نے ''جنگ حدیبیہ'' کے الفاظ استعمال کیے۔
51	جمادی الاول سات ہجری	جنگ خیبر	حضور پاک ﷺ	20	1 ماہ	جارحانہ کارروائی کے سلسلہ میں یہ پہلی بھرپور جنگ ہے روایت ہے کہ اس کے لیے بہت زیادہ تیاری کی گئی۔
52	جمادی الثانی سات ہجری	حسمی اور جودھم کی مہم	جناب زیدؓ بن حارث اور بعد میں جناب علیؓ	21	10	شمالی علاقوں کی طرف پہلے حضرت زیدؓ کو بھیجا اور حالات کچھ قابو میں نہ آرہے تھے تو مزید لشکر کے ساتھ حضرت علیؓ کو بھیجا۔ جنھوں نے حالات ٹھیک کیے۔ انھیں دو مہمات بھی کہہ سکتے ہیں۔
53	شعبان سات ہجری	طربہ کی مہم	جناب عمر فاروقؓ بن خطاب	17	3	بنوہوازن کے دور دراز علاقوں میں ایک حربی مظاہرہ
54	شعبان سات ہجری	بنوکلاب کی سرکوبی	جناب ابوبکر صدیقؓ	10	3	بنوکلاب کے علاقوں میں سے شرپسندوں کا قلع قمع
55	شعبان سات ہجری	بنومرہ پر چھاپا	جناب بشیرؓ بن سعد	7	2	اسے فدک کی دوسری مہم بھی کہتے ہیں۔ شرپسندوں کے خلاف چھاپا اور خود جناب بشیرؓ زخمی ہوئے۔
56	رمضان سات ہجری	خربہ کی مہم	جناب اُسامہؓ بن زیدؓ	10	3	جہینہ کے علاقہ میں فتنہ وفساد کو ختم کرنے کی کارروائی
57	شوال سات ہجری	جناب بشیرؓ کی دوسری مہم	جناب بشیرؓ بن سعد	15 دن	6	مہم نمبر 55 کو وسعت دے کر بنوفزارہ بنولحیان اور بنوغطفان کے مزید قبائل کو راہِ راست پر لانا۔ فدک پر قبضہ
58	ذیقعد سات ہجری	ادا رعمرہ	حضور پاک ﷺ	15	6	صلح حدیبیہ کی شرط کے تحت مکہ مکرمہ کفار کے قبضہ میں تھا اس لیے ساتھ دو سو کا حفاظتی دستہ تھا اور ہتھیار بطن یاجج میں موجود رہے۔ سب کارروائی فوجی تھی۔

59	ذوالحجہ سات ہجری	بنو سلیم کا ظلم	جناب ابی العوجاءؓ	10	4	اسلام کی دعوت دینے کے سلسلہ میں بنو سلیم نے دھوکا سے تقریباً پچاس سواروں کے سب دستے کو شہید کر دیا صرف جناب ابی العوجا بچ گئے۔
60	صفر آٹھ ہجری	کدید پر کلہ	جناب غالبؓ بن عبداللہ	10	4	اوپر والی مہم اور بئر معونہ کے شہدا کا بدلہ لینے کے لیے مختلف قبائل پر شب خون مارے گئے
61	ربیع الاوّل آٹھ ہجری	ذاتِ عرق کی مہم	جناب شجاعؓ بن وہب	17	4	نمبر 53 والی مہم کے اثرات کو قائم رکھنے کے لیے زیادہ وسعت سے حربی مظاہرہ
62	ربیع الاوّل آٹھ ہجری	ذاتِ اطلاع کی قربانی	جناب کعبؓ بن عمیر غفاری	1ماہ	7	فلسطین کی سرحد کے نزدیک تک تبلیغ۔ دشمن نے دھوکا سے تمام دستے کو شہید کر دیا۔ صرف ایک مجاہد زندہ بچے۔
63	جمادی الاول آٹھ ہجری	جنگ موتہ	جناب زیدؓ بن حارث	1ماہ10دن	15	حضرت زیدؓ، حضرت جعفرؓ اور حضرت عبداللہؓ کی شہادت اور جناب خالدؓ کا کمانڈ سنبھالنا
64	جمادی الاخر آٹھ ہجری	ذاتِ سلاسل کی مہم	جناب عمروؓ بن عاص	1ماہ	10	کمک کے طور پر حضرت ابوعبیدہؓ بن جراح کے تحت ایک اور دستہ بھی بھیجنا پڑا جس میں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروقؓ عام مجاہد کے طور پر شریک ہوئے۔
65	رجب آٹھ ہجری	خبط کی مہم	جناب ابوعبیدہؓ بن جراح	1ماہ	10	سمندر کے کنارے دُور دُور تک حربی مظاہرے اور ایک مچھلی جو سمندر نے باہر پھینک دی اس پر اٹھارہ دن گزارہ کیا چوں کہ رسد ختم ہوگئی تھی
66	آٹھ ہجری	بنو تمیم پر حملہ	عیینہ بن حصن	1ماہ	7	عیینہ بعد میں مُرتد ہوگیا اس لیے کچھ مورخین نے اس مہم کا ذکر ختم کر دیا عیینہ البتہ بعد میں مسلمان ہوگیا تھا۔
67	آٹھ ہجری	وادیٔ عدم کی مہم	جناب ابن ابی حدردؓ	17	5	دُور دراز وادیٔ عدم میں جو لوگ اسلام لائے ان کی حفاظت کے لیے اور ان کے دشمنوں پر رُعب ڈالنے کے لیے۔
68	آٹھ ہجری	وادی الغابہ کی مہم	جناب ابن ابی حدودؓ	15	5	اسلام دشمن رفا بن قیس الجشامی کے خلاف کارروائی اور اس کا قتل مہینا معلوم نہ ہوسکا۔
69	آٹھ ہجری	ذوقرد کی مہم	حضرت علقمہ بن محیصر	10	3	ذوقرد کے علاقہ میں حضرت وقاصؓ کی شہادت کا بدلہ لینے کی مہم
70	شعبان آٹھ ہجری	قبیلہ خضرہ کی سرکوبی	جناب ابوقتادہؓ انصاری	12	4	قبیلہ خضرہ کے شرپسندوں کو شب خون مار کر سزا دینا
71	رمضان آٹھ ہجری	جناب ابوقتادہؓ کی دوسری مہم	جناب ابوقتادہ انصاریؓ	12	4	مکہ مکرمہ کی فتح کے لیے انحرافی کارروائی اور بعد میں یہ دستہ بھی حضور پاک ﷺ کے ساتھ شامل ہوگیا۔

72	رمضان آٹھ ہجری	فتح مکہ	حضور پاک ﷺ		آگے نمبر 79 تک حضور پاک ﷺ جنگوں اور مہمات میں مصروف رہے	کسی وضاحت کا محتاج نہیں
73	ایضاً	عزیٰ کا بت خانہ	جناب خالدؓ بن ولید			بت خانہ منہدم کر دیا
74	ایضاً	سوی کا بت خانہ	جناب عمروؓ بن عاص	کل وقت تین مہینے		بت خانہ منہدم کر دیا
75	ایضاً	مناۃ کا بت خانہ	جناب سعدؓ بن زید اشہلی		تیاری کم از کم ایک ماہ	بت خانہ منہدم کر دیا
76	شوال آٹھ ہجری	بنو سلیم کو دعوتِ اسلام	جناب خالد بنؓ ولید			نمبر 59 کو اب بھرپور طاقت سے دُہرایا گیا۔ کچھ لوگ غلطی سے مارے گئے اور حضرت علیؓ کو بھیج کر حضور پاک نے خوں بہا دلوایا۔
77	شوال آٹھ ہجری	جنگ حنین	حضور پاک ﷺ			کسی وضاحت کی ضرورت نہیں
78	ایضاً	طائف کا محاصرہ	ایضاً			
79	ذی قعد آٹھ ہجری	ادائے عمرہ	ایضاً			
80	شوال آٹھ ہجری	ذی الکفین کے بت کا انہدام	جناب طفیلؓ بن عمرو الدوسی	15	1	جنگ حنین کے بعد وہیں سے جناب طفیلؓ کو ذی الکفین کا بت منہدم کرنے کے لیے بھیج دیا۔
81	محرم نو ہجری	ولیدؓ کی مہم	جناب ولیدؓ بن عقبہ	7	2	بنو خزاعہ سے صدقہ کی وصولی کی شرارت کا قلع قمع
82	صفر ہجری	قبیلہ خثعم	جناب قطبہؓ بن عامر	12	3	قبیلہ کی اسلام دشمن کارروائیوں کی وجہ سے اُن پر شب خون
83	ربیع الاول نو ہجری	بنی کلاب کو دعوت اسلام	جناب ضحاکؓ بن عامر	15	4	یہ قبیلہ وسیع علاقوں میں پھیلا ہوا ہے نمبر 42۔ اور 54 بھی انھی لوگوں کے علاقہ کی کارروائیاں ہیں۔ اب دعوت اسلام اور کچھ قبائل نے اُج کے مقام پر مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی اور شکست کھائی۔
84	ربیع الاول نو ہجری	جدہ کی مہم	جناب علقمہؓ بن مجزز	10	3	حبشی النسل بحری ڈاکوؤں کی سرکوبی
85	ربیع الثانی نو ہجری	بنو طے کی دعوت	حضرت علیؓ بن ابو طالب	17	4	بنو طے کا بت خانہ منہدم کیا۔ حاتم طائی کی بیٹی کا قید ہونا اور بعد میں عدیؓ بن حاتم اور سارے قبیلہ کا قبول اسلام

86	ربیع الثانی نو ہجری	جناب عکاشہؓ کی مہم	جناب عکاشہؓ بن محصن	18	5	یہ مہم بنواسد کے علاقوں میں مہمات کو زیادہ وسعت دینے کے لیے بھیجی اور اُس وقت بنواسد اسلام لے آئے
87	رجب نو ہجری	تبوک کی مہم	حضور پاک ﷺ	2ماہ10دن	1ماہ	مشکل ترین مہم۔ کافی تیاری اور آگے کافی پھیلاؤ اختیار کیا۔
88	رجب شعبان نو ہجری	دومۃ الجندل پر چھاپا	جناب خالدؓ بن ولید			
89	ربیع الثانی دس ہجری	بنی حارث کو دعوت اسلام	جناب خالدؓ بن ولید	15	4	کچھ روایات کے مطابق جناب خالدؓ نے اس کام پر دو تین ماہ صرف کیے
90	رمضان دس ہجری	یمن میں دعوت اسلام	جناب خالدؓ بعد میں جناب علیؓ	2ماہ	7دن	جناب خالدؓ نے کام کی زیادتی کی خبر دی تو بعد میں جناب علیؓ کو بھیجا گیا اور انھوں نے کمانڈ سنبھال لی دونوں عظیم صحابیوں نے ذی قعد کے آخر میں مکہ مکرمہ میں حجۃ الوداع کے وقت حضور پاک ﷺ کی خدمت میں حاضری دی۔
91	آٹھ ہجری	بنو عبیس کو دعوت اسلام	جناب طلحہؓ بن عبیداللہ	15	4	قبیلہ کے کچھ لوگوں کی گزارش پر جناب طلحہؓ کو بھیجا گیا اور ان لوگوں نے مسلمان ہو کر قریش کے قافلہ پر چھاپا مارا۔ یہ فتح مکہ سے پہلے کی بات ہے وقت کا تعین نہ ہو سکا کہ کون سا مہینا تھا۔
92	آٹھ ہجری	بنوصدا پر چھاپا	جناب قیسؓ بن سعد	15	4	یہ بھی جنگِ حنین کے بعد کا واقعہ ہے۔ مہینا کا تعین نہ ہو سکا۔
93	شوال دس ہجری	اہل جرش کا محاصرہ	جناب حردؓ بن عبیداللہ	12	4	اسلام لانے کے بعد جناب حردؓ کی اپنے نزدیک والے قبائل کو اسلام کی دعوت اور مخالفت کرنے والوں کا محاصرہ
94	ذی قعد دس ہجری	حجۃ الوداع	حضور پاک ﷺ	1ماہ	10دن	تمام طریقہ فوجی تھا کہ قبائل منظم طور پر اپنے جھنڈے کے تحت حرکت کرتے تھے۔
95	محرم گیارہ ہجری	جناب اسامہؓ بن زیدؓ	حضور پاک ﷺ کی وفات کے بعد کارروائی	دو ماہ		
	26	10	3	25	7	دو سال
	تقریباً چار سال		تقریباً دو سال			

(مرتبہ: میجر امیر افضل (ر))